



ارك . طاهره

(بنام قوت و حیات)

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

کلیم

قیمت فی پرچہ ۵/
سالانہ چندہ للعہ
ششماہی ۵ہ

مدیر جوش ملیح آبادی
نائب مدیر آزاد انصاری

اُردو زبان کا ہر جہت سے سب سے زیادہ قیمتی ماہ نامہ

(آٹھ تصویریں)

جلد ۱ — نمبر ۱

فہرست جنوری سنہ ۱۹۳۶ء

کو روشن پرنٹنگ پریس فتحپوری دہلی میں جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر دفتر "کلیم" دہلی سے شائع کیا

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کرنیکی اُردو زبان میں پہلی کوشش

ہر صاحبِ عقل ہندی کو جو عصرِ حاضر کے رُجحانات سے واقف ہو، اسکا شدید احساس ہے کہ ہندوستانی زبان، ہندوستانی تہذیب، ہندوستانی معاشرت، ہندوستانی علم و ادب اور ہندوستانی زندگی، بلکہ یوں کہنا چاہیے، کہ ہندوستانی رُوح کو اسوقت صحیح رہنمائی اور زبردست انقلاب کی اسقدر شدید اور فوری ضرورت ہے کہ اب مزید تاخیر روا نہیں رکھی جاسکتی۔ تاریخ کے اوراق اُلٹیے اور وہ بتائیگی کہ اُسوقت تک کسی قوم میں بیداریٔ زندگی پیدا نہیں ہوئی ہو، جبتک اسکے ادبیات میں عظیم انقلاب پیدا نہیں کردیا گیا ہے چنانچہ اسی نقطۂ نگاہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے "کلیم" کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ اور ملک کے بہترین اربابِ فکر و نظر کی مستقل خدمات حاصل کرلی گئی ہیں۔ تاکہ کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ خدمات انجام دیجا سکے۔

فہرست اغراض و مقاصد

(۱) اشارات۔ حیاتِ انسانی کے گوناگوں مسئلوں، اور ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مختصر نوٹ۔ نیز مشرقی و مغربی مباحثِ علم و ادب پر بلیغ اشارات۔

(۲) افکار۔ حکیمانہ و محققانہ مقالات، جنکے ذریعے سے ہندیوں کے باسی ماغوں میں کامل حریتِ فکر کی نشوونما ہو، اور ہندی عقل کی اسطرح تربیت کیجائے کہ وہ تہ خانوں سے نکلکر صاف ہوا میں سانس لینا سیکھ جائے۔ جو روایات و اوہام، تقلید و جمود، اور تعصبات و تنگ نظری کو فنا کرکے ہندوستانی ذہنیت کو اس بلند سطح تک لے آئیں۔ جہاں سے نوعِ انسانی کی دماغی نجات کا چشمہ پھوٹتا ہے تعلیم دیجائے کہ انسانیت، نسل، رنگ، معاشرت، رسوم، لباس، زبان وطن، اور مذہب، سب سے بالاتر ہے۔

(۳) منتخبات۔ ادبی و عمرانی نقطۂ نگاہ سے دیگر زبانوں، اور دورِ جدید کے بلند پایہ صحائف کے تراجم۔

(۴) ادبیات۔ ادبی مضامین، نظمیں، افسانے، اور ڈرامے، صحیح ادبیت، اور حقیقی شعریت کے معیار پر، نیز صرف وہ غزلیں جو فطری، اور مسلسل ہوں۔

(۵) مقالات۔ عام علمی، اقتصادی، زرعی، تجارتی، اور صنعتی مضامین اور انکے دوش بدوش ایسے مقالے جو اہلِ ہند کو زندگی و بیداری، خودشناسی و خودداری، آزادی و فراخدلی، معاملہ فہمی و رواداری کا درس دیں، اور جسمانی صحت، [illegible] دماغی توازن اور سیاسی تدبر و تفکر کی [illegible] پیدا کریں۔ اور خصوصیت کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی ایسی زبردست منقش، یہ ہم تبلیغ کریں کہ ہندستان میں ایک متحدہ قومیت کی ایسی مضبوط بنیاد پڑ جائے کہ باہمی ازدواج ہونے لگے۔

(۶) لِسانیات۔ زبان میں اصلاح و ارتقا۔ اجتہاد و وضعِ اصطلاحات۔ تہذیب و تدوینِ قواعد و لغت۔ اور تصفیۂ مسائلِ ادبی و لسانی، نیز ایک ایسی مشترکہ انجمن کی تشکیل جو ہندوستان میں ایک مشترکہ زبان جاری کرسکے۔

(۷) نِسائیات۔ ایسے مقالے جو میانہ روی پر مبنی ہوں، مشرقی خصوصیات کے تحت عورتوں کی تعلیم اور آزادی، قدامت پرستی اور شدید بے پردگی کی شدید مخالفت کیساتھ اور عورتوں کے جائز مطالبات و حقوق کی حمایت میں۔

(۸) انتقادات۔ ذاتیات سے قطعی طور پر گریز، جدید نظریاتِ نقد و نظر کی روشنی میں، غیر طنز آمیز سنجیدہ ترین لہجے کیساتھ مکمل علمی و ادبی اسلوب پر۔

(۹) حیات و نشاط۔ ع خوش باش دمے، کہ زندگانی این است۔ محکومی و مفلسی نے وطنِ عزیز میں جو ایک عام افسردہ دلی، اور ناروا سنجیدگی پیدا کر رکھی ہے۔ یہ باب اُسکی بیخ کنی کیلئے قائم کیا گیا ہے۔ واضح رہے۔ جو مسکرا نہیں سکتا وہ مُردہ ہے

(۱۰) رفتارِ وقت۔ عصرِ حاضر کے اہم کوائف، اور اُن پر مختصر لیکن پُرمغز تبصرے؛

اشارات

اجرائے "کلیم" کے مقاصد کی تفصیلی فہرست آپ اس پرچے میں کہیں ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہاں ایک دوسرے نقطۂ نگاہ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ افسوس کہ سوسائٹی ایسی غیر ضروری تشریحوں پر مجبور کرتی ہے، جنہیں طبیعت کسی طرح قبول نہیں کرتی۔ لیکن کیا کیا جائے۔ گفتگو کے وقت خاموش رہنا بھی ایسا ہی بُرا ہے، جیسا خاموشی کے وقت گفتگو کرنا۔

"کلیم" کے اجراء سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ شہرت حاصل کروں۔ ہاں جب تک امردانہ ذہنیت غالب تھی، جی چاہتا تھا ہم کثرت سے "چھپیں"۔ دُنیا ہم کو بھی جانے پہچانے، اور ہمارا بھی مشاہیر میں شمار ہونے لگے۔

لیکن اب تو دُعا ہے کہ خدا یا اپنے اس عطیۂ شہرت کو واپس لے لے جس نے میری تمام آزادیاں سلب کر رکھی ہیں۔ اور جس نے "اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں" کا اطمینان ہی مجھ سے چھین لیا ہے۔

کیا تجارت مقصود ہے؟

دُنیا کا آخری جاہل انسان تک جب تجارت میں اجتہادی سند حاصل کر لیگا، اس وقت اس فن میں شاید میری ابجد خوانی کا سوال اٹھایا جا سکے ——— میں تجارت کے واسطے اس کرۂ ارض کا سب سے زیادہ نااہل وجود ہوں۔

لیکن میری اس میں کیا خطا ہے؟ بدقسمتی سے ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا جو دولت و ثروت، اور عزت کا مالک تھا، آنکھ کھولی تو ہر طرف لکشمی دیوی ہی کو متبسم پایا۔ جب دیکھا یہی دیکھا کہ ہمارے گھر سے ارباب حاجت پرزر پاشیاں ہو رہی ہیں، ہمیں سب کے حاجت روا ہیں، اور ہم اپنی حاجتوں کے واسطے کسی کا منہ نہیں تکتے۔

اس کا قدرتی اثر جو مجھ پر ہونا چاہیے تھا وہی ہوا، یعنی روپے کی حقارت اور اسراف ——— چنانچہ ہوش آتے ہی ان دونوں اوصاف، یا امراض میں گرفتار ہو گیا، اور بڑی حد تک اب بھی ہوں۔

جانتا ہوں روپیہ، عظیم الشان روپیہ، "ستار عیوب و قاضی حاجات" روپیہ، قندیلِ حیات، مسجود خلائق روپیہ، کس قدر بزرگ ہے، برتر ہے، عظیم ہے ——— جانتا ہوں یہ جلالت مآب دیوتا، دُنیا کا سب سے بڑا دیوتا، کتنی عدیم النظیر اہمیت اور کس درجہ ناقابلِ شرح کشش کا مرکز ہے، اور اس وجود بزرگ و برتر کی قوتِ خریداری کی کوئی انتہا نہیں ہے ——— لیکن میں کیا کروں، میں علیل ہوں، میرا منہ تو بخار کا منہ ہے، جسے مٹھائی کڑوی معلوم ہوتی ہے ——— میری جیب میں تو جس وقت روپیہ ہوتا ہے، برابر ڈنک مارتا رہتا ہے کہ مجھے جلد اس قید سے نکالو ———

آپ ہی فرمائیے، کیا اس مزاج کا آدمی روپے سے محبت کر سکتا ہے؟ کیا ایسا بیمار تجارت کے میدان میں دوڑ سکتا ہے؟

اس کے علاوہ مجھے تجارت کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے، میری آبائی جائیداد میں بفضلہ ابھی اتنا دم باقی ہے کہ میں عزت و آرام سے زندگی بسر کر سکتا ہوں اور اس کے ساتھ میرے تصانیف بھی ہیں۔ اور میری حیدرآباد کی پنشن بھی۔

اس سے زیادہ کی اب مجھے خواہش بھی نہیں۔ جتنی حسرتیں تھیں، سب نکال چکا ہوں، جتنی رنگینیاں تھیں، سب میں تا بہ لب غرق ہو چکا ہوں، اب نہ کوئی تازہ اُمنگ ہے، نہ نیا ولولہ، جس کے واسطے مزید دولت کی حاجت ہو ——— اب وہ طوفانی دَور ختم ہو گیا، اور وہ ولولوں، اور اُمنگوں کا زمانہ باقی نہیں رہا۔

اب تو ؎

اک عمر سے زہر پی رہا ہوں
اڑتیس برس سے جی رہا ہوں!

ہاں اس قدر ضرور چاہتا ہوں کہ رسالہ گھر سے اُٹھا کر نہ لے جائے، اور میری محدود آمدنی کے وسائل کو مجروح نہ کر سکے، اور اس سے اس قدر آمدنی ضرور ہو جائے کہ اس کے اخراجات اس سے پورے ہوتے رہیں، ——— یہ نہ سمجھئے گا کہ میں تنگدلی کے باعث رسالے سے اپنی ذاتی معاش کا دامن بچا رہا ہوں، آپ کو میری فطرت اور میرے خاندانی روایات کا حال معلوم نہیں، جن ہاتھوں نے لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہا دیا ہو، وہ تھوڑی سی رقم پھینک دینے سے نہیں رُک سکتا ——— اگر میرے حالات نامساعد نہ ہوتے، اور آج میری جائداد کی وہی حالت ہوتی جو چند سال پیشتر تھی، تو "کلیم" ہندوستان کا وہ پہلا شاندار پرچہ ہوتا جو تمام ملک میں مفت تقسیم کیا جاتا۔

اپنے کلیم کے باب میں ضمیر کی پوری شگفتگی کے ساتھ میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں اس پرچے کو ہندوستان، صرف ہندوستان کی خدمت کے واسطے نکال رہا ہوں! ہندوستان کی خدمت دوسروں کے مقابلے میں مجھ پر زیادہ فرض ہے

---

(۲) ہمعصروں سے اور مدیران رسائل واخبار کی خدمت میں عرض ہے کہ کسی خاص گروہ یا فرد کی طرف میرا روئے سخن نہیں، لیکن کیا کیا جائے کہ محکوم قوم کی یہ بھی ایک نمایاں خصوصیت ہوتی ہے کہ ہم پیشہ و ہم مذاق ایک دوسرے کے بدخواہ ہوا کرتے ہیں، کسی نئے اخبار، یا رسالے کے جاری ہونے ہی کے ساتھ آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں، اور نقصان رساں پروپگنڈا شروع کر دیا جاتا ہے۔

اور جب نئے رسالے یا اخبار کا مدیر اپنے پہلے پرچے کے "شذرات" کا آغاز کرتا ہے تو جو سب سے پہلی بات اپنا مطمح نظر معین بیان کرنے کے بعد کرتا ہے وہ موجودہ رسالوں، اور موجودہ مدیروں کی تحقیر و تذلیل پر مبنی ہوتی ہے، اور اس طرح ایک ایسی سوقیانہ "تُو تُو میں میں" کا بازار گرم ہو جاتا ہے کہ الٰہی توبہ۔

گویا ہر نیا اخبار، یہ رسالہ، گندی نالی میں اینٹ گرنے کے مثل ہوتا ہے، اور چھینٹیں اڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔

اس لئے میں نہایت عاجزانہ طور سے درخواست کرتا ہوں کہ ازراہ کرم مجھے میدان کارزار کی طرف نہ کھینچا جائے، میں ایک خاموش اور بے ضرر مزدور کی طرح کام کرنا چاہتا ہوں، اور وعدہ کرتا ہوں کہ کسی سے آنکھ ملانے کی بھی جرأت نہ کروں گا۔

کسی دیوار پر "اس دیوار پر مت تھوکو" کی تختی لگانا، ہر چند خود ایک نوع کی بدتمیزی ہے، لیکن کیا کیا جائے بعض اوقات بدتمیزیاں بھی ضروریات میں داخل ہو کر رہتی ہیں، میری یہ چند سطریں بھی اسی زمرے میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔

ہاں ایک بات اور عرض کردوں، میں نے اردو کے رسائل واخبارات اور ہمعصروں کے مطبوعات پر نہایت دقت نظر کے ساتھ انتقاد کروں گا، معنوی و لسانی اغلاط ایک ایک کر کے گن دوں گا، لیکن اس کا واحد مقصد ادبی اصلاح ہوگا، نہ کہ کسی فرد یا جماعت کی تحقیر ۔۔۔۔

تمام دنیا جانتی ہے، زندہ قوموں کے طالب علم تک واقف ہیں کہ انتقاد خالص ایک علمی و ادبی خدمت ہے، اس کا مقصود کسی کی تذلیل ہوتا ہے نہ توہین مگر بدقسمتی سے ایسی چھوٹی چھوٹی معروف باتوں کو بھی ہندوستان میں بچوں کی طرح کھول کھول کر سمجھانا پڑتا ہے۔

یہاں آئے دن "نقد و نظر" پر فریقین میں وہ ہنگامۂ عظیم برپا ہوتا ہے کہ اللہ دے، اور بندہ لے، گروہ بندیاں ہو جاتی ہیں، لوگ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو جاتے ہیں، اور یہاں تک تنبیزداریاں بڑھ جاتی ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کے ذاتی معائب، اور خاندانی کمزوریوں کو گنانے لگتے ہیں۔

جب "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے دور نظم و نسق میں ہندوستانی تمام ذمہ دار عہدوں سے محروم کر دیئے گئے، تو خدا بھلا کرے ایک ڈائرکٹر کا، جس کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں ہے، اس نے ولایت ایک بہت بڑی یادداشت بھیجی تھی جس میں یہ لکھا تھا کہ ہم ہندوستانیوں سے اچھا سلوک نہیں کر رہے ہیں، ہم نے انہیں تمام ذمہ دار عہدوں سے محروم کر دیا ہے، ہم نے ان کا اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے، اور اس کا کچھ دن کے بعد نتیجہ یہ نکلے گا کہ پوری ہندوستانی قوم رفتہ رفتہ اس قدر پست خیال، زبوں ہمت، دروغ گو، مکار، کمینہ اور ذلیل ہو جائیگی کہ قیامت کے دن مسیح کے سامنے ہمیں اس کا جواب دینا پڑیگا۔

میرے عزیز دوستو! کیا اس شریف انگریز کی پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت نہیں ہوئی؟

اوروں کو چھوڑیے کیا ہمارا علمی طبقہ، جسے قوم کا دماغ کہنا چاہیئے، اس قدر پست نہیں ہو گیا ہے کہ ذرا سا انتقاد برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اپنے متعلق ایک ادنیٰ سی گرفت پر بلبلا اٹھتا ہے؟

میں اپنے تمام ہمعصروں، اور ہم پیشوں کی خدمت میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ بھی نہایت بیباکی کے ساتھ "کلیم" پر تنقید کریں، اور میری طرف سے یقین رکھیں کہ میں نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کروں گا۔ "کلیم" ہی نہیں، میں انہیں اپنے کلام پر بھی ہر طرح کی نکتہ چینی اور خورده گیری کی دعوت دیتا ہوں، میں کوئی خالص قسم کا احمق نہیں ہوں کہ اپنے کو اغلاط سے مبرا سمجھ لوں، میرا تو قول ہے کہ صرف حمقا ہی غلطی نہیں کیا کرتے۔

میں اپنے ناقدوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ کلیم کے ساتھ ساتھ میرے کلام کے معائب سے بھی مجھے مطلع فرماتے رہیں گے تو [illegible] ان کا احسان مند ہونگا، اور انہیں اپنا محسن خیال کروں گا۔

"اللہ اس شخص پر رحمت کرے جو مجھے میری غلطیوں پر ہدایت کرتا ہے۔"

(۳) مشہور ادیبوں، اور غیر مشہور اہلِ علم کی خدمت میں گزارش ہے کہ "کلیم" اپنا معیار قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ طبقۂ ادب کے اربابِ علم و ادب کے علاوہ، اور کسی کی دماغی پیداوار شائع نہیں کریگا۔ البتہ اس سے وہ نوجوان قلم طبقہ مستثنیٰ رہیگا جو "می تافت ستارۂ بلندی" کا مصداق ہوگا۔

سب سے بڑی اور ہولناک دشواری یہ ہے کہ جو لوگ لکھا ہیں جانتے وہ ہر گلی کوچے میں "مضمون نویسی کا کام" کی صدائیں بلند کرتے پھرتے ہیں، اور جو لکھنا جانتے ہیں، اُن سے فرمائش کیجئے تو وہ بہن بہین مسکراتے ہیں اور "بھلا میں کیا لکھ سکتا ہوں" کے انکسار بیجا پر اُتر آتے ہیں۔

یہ مزاج بھی محکومی ہی کا عطیہ ہے، لوگ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ "خاکساری" جو آج ہم پر طاری ہے اور جسے ہم اپنے زعم میں ایک اعلیٰ صفت سمجھے بیٹھے ہیں، اور دل ہی دل میں اپنی اس صفت پر ناز بھی کرتے ہیں، درحقیقت "خاکساری" نہیں ہے بلکہ ہمیں علم نہیں کہ محکومی نے ہمیں خود ہماری نظروں میں کس قدر حقیر کر دیا ہے، اور ہم اپنے کو "کمتر" سمجھنے کے عوض قطرہ خیال کرنے لگے ہیں۔

بعض اہلِ علم عدیم الفرصتی کا عذر فرماتے ہیں، یہ سچ ہے کہ فکرِ معاش اور ذاتی مشاغل نہایت اہم چیزیں ہیں، لیکن کیا خدمتِ وطن اتنی اہمیت بھی نہیں رکھتی کہ پورے تیس اکتیس روز میں ہم چند سطروں کا ایک مقالہ سپردِ قلم کر دیں؟

قومی خدمت کو فکرِ معاش اور ذاتی مشاغل کے مقابلے میں غیر اہم سمجھنا بھی غلام قوم کے خصوصیات میں سے ہے۔

میں صاف صاف عرض کرتا ہوں کہ "کلیم" کو میں نے ادبی چٹخاروں کی خاطر نہیں نکالا ہے، میں اپنی قوم یعنی ہندوستانیوں کی ذہنی تربیت چاہتا ہوں، یہ کام معمولی اہلِ ادب کے بس کا نہیں ہے۔ اگر معیاری اربابِ ادب نے مجھ سے مستقل تعاون نہ فرمایا تو چھ مہینے انتظار کرکے میں "کلیم" کو بند کر دونگا، اور خریداروں کی خدمت میں ان کا باقی چندہ واپس کرکے پھر اُسی حلقۂ رنگ و بو میں داخل ہو جاؤنگا، جسے ترک کرکے میں اس صحافتی میدان میں آیا ہوں، اور دنیا پھر ایک بار یہ نعرہ سُن لیگی کہ ؎

اس فصل میں اس درجہ رہا بیخود و سرشار
پہنچا نے سے ہر مجھے دیکھا نہ کسی نے!

---

(۴) سکندرآباد دکن میں میرے ایک نہایت عزیز دوست اسرائیل احمد خاں رہتے ہیں جن سے ملک کو ابھی روشناسی کی مسرت حاصل نہیں ہوئی ہے، وہ نہایت خلوت پسند اور خاموش کام کرنیوالے واقع ہوئے ہیں، لکھتے کم ہیں سوچتے بہت زیادہ ہیں۔ وہ ایک خاص طرزِ نگارش کے مالک ہیں اور ایک خاص اسلوبِ فکر کے حامل۔

کبھی وہ فلسفی سے زیادہ ادیب معلوم ہوتے ہیں، کبھی ادیب سے زیادہ فلسفی۔ میں قارئین کرام کو خوشخبری سُناتا ہوں کہ میں نے اُن سے وعدہ لے لیا ہے کہ وہ کوماذ قلمی کو ترک کرکے "کلیم" کے واسطے ہر ماہ کچھ نہ کچھ لکھا کرینگے، چنانچہ آئندہ نمبر سے اُن کا وکٹر ہیوگو کے ایک نہایت دلچسپ و سبق آموز ناول "لا فنگ من" (   ) کا ترجمہ بہ الفاظ شائع ہونا شروع ہو جائیگا۔

(۵) (الف) ضرورت ہے کہ ملک میں ایک ادارہ "مفکرینِ آزاد خیال" کے نام سے قائم ہو جس کی بنیاد خالص انسانیت پر ہو یعنی ہر صاحبِ فکر انسان اس کا رکن ہو سکتا ہو۔

اور جس کے فرض یہ ہوں کہ وہ تعلید و قدامت پرستی اوہام و تنگ نظری کو دور کرکے ہندوستانی ذہنیت کو وسیع و بلند کرنے کی خاطر سال میں دو تین بار مختلف مقامات پر اجلاس کیا کرے۔

(ب) اور ملک کے مشاہیرِ علم و ادب کی ایک ایسی انجمن قائم ہو، جو ہندوستان کی مشترکہ زبان کے متعلق نہایت خلوص و وسعتِ قلب کے ساتھ غور کرکے کوئی ایک قطعی فیصلہ کر دے۔

قارئین کرام کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ ان دونوں مسئلوں پر غور کرکے اپنے مشوروں سے مجھے جلد تر بہرہ مند فرمائیں، تاکہ ان دونوں سمتوں کی طرف قدم اٹھایا جائے۔

(۶) میں اس پرچے کی ترتیب کے باب میں شکرگزار ہوں اپنے مشہور افسانہ نگار دوست، ل۔ احمد صاحب کا جن کے بغیر میری ناتجربہ کاریاں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتیں۔

ل۔ احمد صاحب کا ذکر آگیا ہے تو کیوں نہ میں یہ مژدہ سُناؤں کہ اُن کے افسانوں کا مجموعہ "انشائے لطیف" کے نام سے اِسی ہفتے میں شائع ہوا ہے، جس کے متعلق مختصراً یہ عرض کر سکتا ہوں کہ وہ اردو میں ایک مبارک

رنادر اضافہ ہے' وہ حضرات' جو سمجھتے ہیں کہ دُنیا کی تمام خوبیاں' انگریزی
بان میں سمٹ کر آگئی ہیں' میں اُن کی خدمت میں عرض کرونگا کہ وہ "انشائے
لطیف" کو ضرور دیکھیں' اور اندازہ لگائیں کہ ل' احمد کی انشا' پردازی نے
ہیں کس حد تک انگریزی سے بے نیاز کر دیا ہے۔

اُسی کے دوش بدوش میرا یہ بھی فرض ہے کہ میں اُن تمام اخباروں'
ور رسالوں کے مُدیروں کا شکریہ ادا کردوں' جنہوں نے اجرائے "کلیم" کی بابت
یرا اعلان شائع فرماکر میری مدد فرمائی۔ جن میں "تیج" "ہند"۔ "سرفراز"۔ "ہمایوں"
نیرنگ خیال" "زمانہ" "خلافت" اور "احسان" میرے شکریے کے
یادہ مستحق ہیں۔

اُسی کے ساتھ میں اپنے دوست لالہ دلیش بندھو' محمود علی خاں صاحب
ور حامد علی خاں صاحب مہتمم "مکتبہ جامعہ" کا بھی بیحد شکر گذار ہوں' لالہ جی نے
اپنے زریں مشوروں اور اپنے اخبار سے میری مدد فرمائی' اور میرے مخلص
دوست محمود علی خاں صاحب نے ہجوم مشاغل کے باوجود "کلیم" کے
ڈیکوریشن و طباعت وغیرہ کے مراحل میں اس قدر سرگرمی سے کام کیا کہ میں
ہی جانتا ہوں۔ اور حامد علی خاں صاحب نے کتابت کے مرحلوں کو طے
فرماکر مجھے بڑی مصیبت سے نجات دلادی۔ کاش کوئی انہیں جزائے خیر
دے سکتا۔

اسی سلسلے میں میرے دوست حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی
بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے ایک ایسا مرحلہ جلد طے کرادیا'
جو اُن کے بغیر بہت ہی صبر آزما ثابت ہوتا۔

آخر میں' لیکن نہایت ہی پرجوش انداز میں' اُن حضرات کا دلی شکریہ
ادا کرتا ہوں' جنہوں نے اخبارات میں میرا اعلان پڑھ کر اپنا چندہ پیشگی روانہ
فرماکر مجھے "کلیم" کے ابتدائی مراحل کے طے کرنے میں نہایت قیمتی مدد دی'
اور یہ ثابت کردیا کہ ہندوستان ارباب نظر سے خالی نہیں ہے۔

(۷) "کلیم" کے چندے کے متعلق بعض حضرات کا خیال ہے کہ
دس روپے بہت ہیں۔ بات یہ ہے کہ ابھی تک مفید مدوں میں روپیہ صرف
کرنے کی ہماری قوم میں عادت ہی نہیں پڑی ہے۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ'
جو پرچہ بآسانی خرید سکتے ہیں' وہ بھی دوسروں سے پرچہ مانگ کر ہی پڑھنے
کو ترجیح دیتے ہیں۔

جو قوم شب برات کی آتشبازی کے برابر بھی اپنی صحافت کو درجہ دینے
پر طیار نہ ہو' اُس سے یہ شکوہ فضول ہے کہ وہ کسی رسالے کی قیمت کو محض اس
بنا پر بہت زیادہ سمجھے کہ چار پانچ روپے کے عوض اس کا چندہ دس روپے ہے'
اسے چھوڑیئے کہ "کلیم" کن مقاصد کے ساتھ شائع ہو رہا ہے' اور
اس کے پیش نظر ملک کے کس قدر اہم خدمات ہیں' آپ تو صرف اس کے سائز'
اس کی ضخامت' اور اس کی اعلیٰ تصویروں پر نگاہ فرمائیں' اور خود اندازہ کریں کہ
آج جو رسالے چار چار' پانچ پانچ روپے سالانہ کے نکل رہے ہیں' کیا "کلیم"
اُن سب کے مقابلے میں ہر اعتبار سے تگنا' چوگنا نہیں ہے؟

اسی سلسلے میں یہ عرض کردینا بھی مناسب ہے کہ "کلیم" کا ششماہی
چندہ' رسم عام کے خلاف سالانہ چندے کا نصف ہی رہیگا' اور یہ اس لئے
ہے کہ جو حضرات یکمشت دس روپے صرف نہیں کرسکتے ہیں' وہ دو مرتبہ پانچ پانچ
روپے دیکر خریدار بن سکتے ہیں۔

(۸) میں نے "روح ادب" کے بعد سے لیکر اپنا اس وقت تک کا تمام
کمال کلام چھ جلدوں میں مرتب کرلیا ہے' جس میں کا ایک حصہ سردست
"نقش و نگار" کے نام سے زیر طبع ہے جو عنقریب شائع ہو جائیگا۔ اسی طرح
تمام جلدیں یکے بعد دیگرے طبع ہوتی رہینگی' اور اسی سلسلے میں "روح ادب" کا دوسرا
ایڈیشن بھی طبع ہو جائیگا' جن کی قیمتوں میں خریداران کلیم سے خاص رعایت ملحوظ
رکھی جائیگی۔

(۹) واضح ہو کہ یہ پرچہ جنوری کا پرچہ ہے' دوسرا پرچہ فروری کی دسویں
تک شائع ہو جائیگا۔

(۱۰) قارئین کرام یہ سُنکر خوش ہونگے کہ کلیم میں عنقریب ہندوستانی موسیقی
کی نادر تصویروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہونیوالا ہے۔

گوالیار کے قدیم محل میں آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے کسی جے پور کے صناع نے
تمام راگ راگنیوں کو منقش کیا تھا جس کے نقوش آج بھی تازہ ہیں۔

میں نے گوالیار کے فاضل' اور ادب نواز لا ممبر پنڈت سر کیلاش نرائن
ہاکسر کی خدمت میں درخواست کی تھی کہ وہ براہِ معارف نوازی کلیم کے واسطے اِن
تصاویر کے بلاک بنوادیں۔ چنانچہ انہوں نے میری اس ناچیز درخواست کو منظور
فرماکر بلاکوں کی طیاری کا حکم دیدیا ہے' اور غالباً کلیم کے دوسرے نمبر سے
ان نوادر کا سلسلہ شروع ہو جائیگا۔

صرف میں ہی نہیں، تصاویر دیکھ کر قارئین بھی کرنل ہاکسر صاحب کا شکریہ ادا کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اسی سلسلے میں میں نے حبیب اللہ صاحب سے جو موسیقی کے بڑے ماہر ہیں، درخواست کی ہے کہ وہ ان تصاویر پر علمی حیثیت سے نوٹ طیار فرمائیں اور میں شکرگذار ہوں کہ انہوں نے وعدہ فرمالیا ہے۔

(۱۱) "مسائلِ حیات" یہ ایک کتاب " " کا مولفانہ ترجمہ ہے، جس کے چند ابواب اس اشاعت میں حاضر کئے جا رہے ہیں، یہ سلسلہ بھی برابر طبع ہوتا رہے گا۔ جو امید ہے کہ ناظرین کے واسطے موجبِ دلچسپی سے زیادہ باعثِ اصلاحِ فکر ثابت ہوگا۔

(۱۲) دہلی کے مشہور و کامیاب آرٹسٹ سمیع صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ آئندہ سے وہ مصوری کے متعلق "کلیم" میں اپنے گراں پایہ مقالات کا سلسلہ شروع فرمائیں گے، جس کے واسطے میں صاحب موصوف کا شکرگزار ہوں۔

(۱۳) مجھ پر دلی شکریہ فرض ہے جناب قاضی سر عزیز الدین احمد صاحب دیوان ریاست دتیا، جناب اعزاز رسول صاحب تعلقدار سندیلہ، سر شاہ محمد سلیمان صاحب چیف جسٹس، الہ آباد۔ اور سر تیج بہادر سپرو کا، جنہوں نے کلیم کے دس دس پرچوں کی خریداری منظور فرما کر میری عزت افزائی فرمائی ہے جن میں سے قاضی سر عزیز الدین احمد صاحب پندرہ پرچوں کے خریدار ہیں۔

اسی طرح میرے شکریے کے مستحق ہیں نواب سر لیاقت حیات خاں صاحب وزیر اعظم پٹیالہ، کرنل امیر احمد صاحب، کرنل پنڈت سر کیلاش نرائن صاحب ہاکسر لا ممبر گوالیار، پنڈت سر امرناتھ صاحب　فنانس ممبر جے پور، اور خاندانِ سر سید مرحوم کے چشم و چراغ نواب سر راس مسعود وزیر تعلیم بھوپال، جنہوں نے کلیم کی ہر ممکن سرپرستی کا وعدہ فرما کر میری قوت خدمتگذاری میں بجلی کی رو دوڑا دی ہے۔

(۱۴) اگر میں اس سلسلۂ تشکر و امتنان میں مسز سروجنی نائیڈو کا شکریہ نہ ادا کروں تو ایک بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہونگا، جن کے زرین مشوروں، اور امدادی مساعی نے مجھے سب سے پہلے اجرائے کلیم پر آمادہ کیا تھا۔

(۱۵) کلیم کے مقالہ نگار۔

وہ حضرات میرا والہانہ شکریہ قبول فرمائیں، جنہوں نے اپنے گرانقدر مقالوں سے کلیم کی عزت افزائی فرمائی ہے، اور اس کے معیار کو تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ اگر یہ حضرات میری امداد نہ فرماتے تو قیامت تک ممکن نہ تھا کہ میں رسالہ نکال سکتا۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ باکمال ہستیاں مستقل طور سے میری ہمت افزائی فرما کر کلیم کو ایک ایسا معیاری و مفید رسالہ بنا دیں گی، جس کی مجھے آرزو ہے، اور میرے ملک کے یہ ارباب جوہر کبھی وہ وقتِ بد نہ آنے دیں گے کہ میں اپنے معیار کو قائم رکھنے کی خاطر کلیم کو بند کردوں۔

فہرستِ مضامین میں آپ کو ایک نیا نام ملیگا۔ ملک حبیب احمد بی اے آنرز کا، یہ میرے نزدیک اُن ہونہار نوجوانوں میں سے ہیں جو انشاءاللہ آگے چل کر ادب میں ایک ممتاز درجہ حاصل کرلینگے۔ "خزینۂ محبت" کو آپ اسی پرچہ میں ملاحظہ فرمائینگے، حبیب صاحب کا یہ پہلا افسانہ ہے، اگر "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کی ضرب المثل صحیح ہے تو افسانے کے تیور کہہ رہے ہیں کہ اس قلم کی، جوانی کیا ہوگی۔

رباعی

(حضرت سیماب اکبرآبادی)

عشرت کو گناہِ زندگی سمجھا ہے　　تسکینِ طبیعت کو بدی سمجھا ہے
ہو جائے گا چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خفا　　کیا تو نے خدا کو آدمی سمجھا ہے؟

صحیفۂ نو

جوشؔ

اے رُوحِ عصرِ حاضر و ہندوستانِ نَو
لایا ہے اک صحیفہ، سخنداں ترے لئے

اس مصحفِ عظیم کی اللہ رِی وسعتیں
ہر مدّ ہے مشرقین بداماں ترے لئے

ہر منظرِ حیات کو دیکھا ہے غور سے
چھوڑا نہیں ہے ایک بھی عُنواں ترے لئے

رُکتی ہے جس مقام پہ رُوح الامیں کی سانس
دل کو وہاں کیا ہے پَرافشاں ترے لئے

لایا ہوں بزم و رزم کی ارضِ تضاد سے
یہ طبلِ جنگ و سازِ شبستاں ترے لئے

کتنی شبوں کے طاق میں رکھ کر چراغِ دل
پرکھی ہے روحِ عالمِ امکاں ترے لئے

اس کی خبر بھی ہے، کہ بنایا گیا ہے لحن
کتنی شبوں کا گریۂ پنہاں ترے لئے؟

ڈھالے ہیں مرغزار و گلستاں کی شکل میں
کتنے مُہیب و تیرہ بیاباں ترے لئے؟

گوندھی گئی ہے تارِ سخن میں، خبر بھی ہے،
کن مہوشوں کی زلفِ پریشاں ترے لئے؟

کس کو خبر، تراش کے کن ظلمتوں کا دل
لایا ہوں میں یہ چشمۂ حیواں ترے لئے؟

میں تجھ سے کیا کہوں کہ سخن میں کیا ہے حل
کس شوخ کا تبسّمِ پنہاں ترے لئے

واقف بھی ہے کہ موجِ سخن میں ہوئی ہے صَرف
کن انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں ترے لئے؟

لایا ہوں وزن و شعر کی منزل میں، کیا کہوں
کیونکر جراحتِ دلِ انساں ترے لئے؟

تعبیر کی ترازوئے رزم و نہفتہ میں
تولے ہیں کتنے خواب پریشاں ترے لئے

کیا پوچھتا ہے جوشؔ کی بربادیوں کا حال
پُرزے ہے کب سے جیب و گریباں ترے لئے

اُردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت

(از جوش ملیح آبادی)

نوعِ انسانی کے مُصلح بننے کا خیال، کسقدر مضحکہ خیز خیال ہے! انسان، انسان کی اصلاح کرسکتا ہے؟ کیا یہ محض واہمہ نہیں جو صرف بہکی ہوئی ذہنیت ہی کی پیداوار ہو سکتا ہے؟

میں پوچھتا ہوں، انسان خود اپنی اصلاح بھی کرسکتا ہے؟ اور کیا یہ ایک عریاں حقیقت نہیں ہے کہ انسان خود اپنی اصلاح کے باب میں بھی قطعی بے دست و پا ہے؟ اور اس بے دست و پائی کے باوجود، نوعِ انسانی کی اصلاح کے خواب دیکھنا مسخرگی نہیں تو اور کیا ہے؟

"تو بہ خویشتن چہ کردی، کہ بما کُنی نظیری؟"

افسوس، اے مجبور و ناچار انسان! افسوس، کاش تو اپنی ہی اصلاح کرسکتا، لیکن —

"او نامراد تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا"

میں اربابِ عقل و عمل سے دریافت کرتا ہوں کہ اس مجبوری کے باوجود، اور اس بیچارگی کے باوصف، ہمارا انسانوں کے مصلح بننے کا تخیل، کیا عظیم الشان قدرت کی بارگاہ میں ایک احمقانہ اور ناقابلِ عفو گستاخی نہیں؟

انسان تو اس عظیم المرتبت کرۂ ارض کا فرزند، اور اس عظمت آفریں نظامِ شمسی کا بچہ ہے، جو سنگ ریزوں کو جواہر پارہ دل، اور مادۂ بے حقیقت کو پیکرِ انسانی میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ قدرت، انسان کی دایہ ہے، وقت اس کا معلم ہے، طلوع و غروب اسکی درسگاہیں اور ماہ و سال اسکے درسیات ہیں"

کیا وہ "ماہتاب اندر عنان و آفتاب اندر رکاب" قوت جو اس عظیم کارخانۂ عالم کو چلا رہی ہے، اسقدر ٹھنڈی اور کمزور واقع ہوئی ہے کہ کسی مصلح کی دخل اندازی، اور کسی برخود غلط راہبر کی گستاخی برداشت کرلیگی؟

کیا انسان، موجِ نفس پر تھرتھرانے والے حباب "انسان" کو یہ معلوم نہیں کہ اس پُرسطوت گردش کرنے والے کرۂ ارض میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، منشائے قدرت کے عین مطابق ہو رہا ہے؟

کیا جو ذرہ جہاں بٹھا دیا گیا ہے، وہی اسکا بہترین مقام، اور جو حرکت اسکی مقرر کر دی گئی ہے، وہی اس کا وظیفۂ فطری نہیں ہے؟

ہم انسانوں کے اعمال، اور اشیائے عالم کے خواص پر "خیر" و "شر" کے لیبل لگانے والے کون ہوتے ہیں؟

اِک مردِ حق آگاہ نظر آتا ہے ۔ اک کافرِ گمراہ نظر آتا ہے
اِس کہنہ سرا میں ہر بد و نیک مجھے ۔ مامور من اللہ نظر آتا ہے

میں پوچھتا ہوں اِس زمین کی، جو اپنی چھاتی پر پہاڑ اُٹھائے ہوئے ہے، ہر چھوٹی سی چھوٹی جنبش، اور اِس آسمان کی، جو تمام عالم کو ڈھانپے ہوئے ہے، ہر ادنیٰ سی ادنیٰ حرکت، کیا ایک پوشیدہ مگر مکمل قانون سے جکڑی ہوئی نہیں ہے؟

کیا وہ تمام سفاک و رحمدل، ہولناک و دلفریب، اور ناقابلِ تصوّر عظیم قوتیں، جو بپھرے ہوئے آوارہ مزاج و شریر عناصر کے دہانوں میں لگامیں دیئے ہوئے ہیں، انسان کی سی زمین پر رینگنے والی مخلوق کے کھوکھلے اصطلاحاتِ "زشت" و "خوب" کے روبرو سرِ تسلیم خم کرنے، اور انسانوں کی بنائی ہوئی بے مغز سوسائٹی کے مفروضات "اوامر" و "نواہی" کے سامنے سپر انداختہ ہو جانے پر آمادہ ہو سکتی ہیں؟

کیا وقت کا پہیا، جسکی نگرانی میں ماہ و سال کی پُرفن کمانیں ایک مقررہ رفتار کے ساتھ کھلتی رہتی ہیں، اتنی بعید از قیاس

صحیفۂ نو

جوش

اے روحِ عصرِ حاضر و ہندوستانِ نو
لایا ہے اک صحیفہ، سخنداں ترے لئے

اس مصحفِ عظیم کی اللہ ری وسعتیں
ہر مد ہے مشرقین بداماں ترے لئے

ہر منظرِ حیات کو دیکھا ہے غور سے
چھوڑا نہیں ہے ایک بھی عنواں ترے لئے

رکتی ہے جس مقام پہ روح الامیں کی سانس
دل کو وہاں کیا ہے پر افشاں ترے لئے

لایا ہوں بزم و رزم کی ارضِ تضاد سے
یہ طبلِ جنگ و سازِ شبستاں ترے لئے

کتنی شبوں کے طاق میں رکھ کر چراغِ دل
پرکھی ہے روحِ عالمِ امکاں ترے لئے

اس کی خبر بھی ہے، کہ بنایا گیا ہے لحن
کتنی شبوں کا گریۂ پنہاں ترے لئے؟

ڈھالے ہیں مرغزار و گلستاں کی شکل میں
کتنے مہیب و تیرہ بیاباں ترے لئے؟

گوندھی گئی ہے تارِ سخن میں، خبر بھی ہے،
کن مہوشوں کی زلفِ پریشاں ترے لئے؟

کس کو خبر، تراش کے کن ظلمتوں کا دل
لایا ہوں میں یہ چشمۂ حیواں ترے لئے؟

میں تجھ سے کیا کہوں کہ سخن میں کیا ہے حل
کس شوخ کا تبسمِ پنہاں ترے لئے

واقف بھی ہے کہ موجِ سخن میں ہوئی ہے صرف
کن انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں ترے لئے؟

لایا ہوں وزن و شعر کی منزل میں، کیا کہوں
کیونکر جراحتِ دلِ انساں ترے لئے؟

تعبیر کی ترازوئے بزم و نہفتہ میں
تولے ہیں کتنے خوابِ پریشاں ترے لئے

کیا پوچھتا ہے جوش کی بربادیوں کا حال
پرزے ہے کب سے جیب و گریباں ترے لئے

اُردو ادبیّات میں انقلاب کی ضرورت

(از جوش ملیح آبادی)

نوعِ انسانی کے مُصلح بننے کا خیال، کسقدر مضحکہ خیز خیال ہے! انسان انسان کی اصلاح کر سکتا ہے؟ کیا یہ محض ذہنیت نہیں جو صرف بہکی ہوئی ذہنیت ہی کی پیدا وار ہو سکتا ہے؟

مَیں پوچھتا ہوں، انسان خود اپنی اصلاح بھی کر سکتا ہے؟ اور کیا یہ ایک عریاں حقیقت نہیں ہے کہ انسان خود اپنی اصلاح کے باب میں بھی قطعیٔ بے دست و پا ہے؟ اور اس بے دست و پائی کے باوجود، نوعِ انسانی کی اصلاح کے خواب دیکھنا مسخرگی نہیں تو اور کیا ہے؟

"تو بہ خویشتن چہ کردی، کہ بما کنی نظیری؟"

افسوس، اے مجبور و ناچار انسان! افسوس. کاش تو اپنی ہی اصلاح کر سکتا، لیکن —

"او نا مراد تجھ سے تو یہ بھی نہو سکا"

میں اربابِ عقل و عمل سے دریافت کرتا ہوں کہ اس مجبوری کے باوجود، اور اس بیچارگی کے باوصف، ہمارا انسانوں کیلئے مصلح بننے کا تخیل، کیا عظیم الشان قدرت کی بارگاہ میں ایک احمقانہ اور ناقابلِ عفو گستاخی نہیں؟

انسان تو اِس عظیم المرتبت کُرۂ ارض کا فرزند، اور اِس عظمت آفریں نظامِ شمسی کا بچہ ہے، جو سنگ ریزوں کو جواہر پارہ دل، اور مادّۂ بے حقیقت کو پیکرِ انسانی میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ قدرت، انسان کی دایہ ہے، وقت اُس کا مُعلّم ہے، طلوع و غروب اُسکی درسگاہیں اور ماہ و سال اسکے درسیات ہیں"

کیا وہ "ماہتاب اندر عنان و آفتاب اندر رکاب" قوت جو اِس عظیم کارخانۂ عالم کو چلا رہی ہے. اسقدر ٹھنڈی اور کمزور واقع ہوئی ہے کہ کسی مصلح کی دخل اندازی، اور کسی بر خود غلط راہبر کی گستاخی برداشت کریگی؟

کیا انسان، موجِ نفس پہ تھرتھرانے والے حباب "انسان" کو یہ معلوم نہیں کہ اِس پُر سطوت گردش کرنے والے کرۂ ارض میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، منشائے قدرت کے عین مطابق ہو رہا ہے؟

کیا جو جہاں بٹھا دیا گیا ہے، وہی اُسکا بہترین مقام، اور جو حرکت اُسکی مقرر کر دی گئی ہے. وہی اُس کا وظیفۂ فطری نہیں ہے؟

ہم انسانوں کے اعمال، اور اشیائے عالم کے خواص پر "خیر" و "شر" کے لیبل لگانے والے کون ہوتے ہیں؟

اِک مردِ حق آگاہ نظر آتا ہے ÷ اک کافر و گمراہ نظر آتا ہے
اِس کُہنہ سرا میں بد و نیک نجھے ÷ مامور من اللہ نظر آتا ہے

میں پوچھتا ہوں اِس زمین کی، جو اپنی چھاتی پر بار اُٹھائے ہوئے ہے. ہر چھوٹی سی چھوٹی جنبش، اور اِس آسمان کی، جو تمام عالم کو ڈھانپے ہوئے ہے، ہر ادنیٰ سی ادنیٰ حرکت. کیا ایک پوشیدہ مگر مکمل قانون سے جکڑی ہوئی نہیں ہے؟

کیا وہ تمام سفاک و رحمدل، ہولناک و دلفریب، اور ناقابلِ تصوّر عظیم قوتیں، جو بپھرے ہوئے آوارہ مزاج و شریر عناصر کے دہانوں میں لگامیں دیئے ہوئے ہیں، انسان کی سی زمین پر رینگنے والی مخلوق کے کھوکھلے اصطلاحاتِ "زشت" و "خوب" کے روبرو سرِ تسلیم خم کرنے، اور انسانوں کی بنائی ہوئی بے مغز سوسائٹی کے مفروضات "اوامر" و "نواہی" کے سامنے سپر انداختہ ہو جانے پر آمادہ ہو سکتی ہیں؟

کیا وقت کا پہیا، جسکی نگرانی میں ماہ و سال کی پُرفن کمانیاں ایک مقررہ رفتار کے ساتھ کھلتی رہتی ہیں، اتنی لبعید از قیاس

سرعت کے ساتھ نہیں گھوم رہا ہے کہ اسکی سبک تیلیوں کو دنیا کی سب سے بڑی خوردبین بھی نہیں دیکھ سکتی؟ اور کیا وقت کی اس تند و تیز رو، اور آبِ روز و شب کے اس دریا میں دنیا کا ہر سفید و سیاہ اور عالم کا ہر خشک و تر جس میں آدمی بھی ایک ہے، منشائے قدرت کے مختلف سانچوں میں برابر ڈھلتا ہوا چلا جا رہا ہے؟

کیا ہم اس سلسلۂ عمل کو چھو سکتے ہیں؟ — کیا ہمارا جذبۂ اصلاح، اس پر ہول شنیری کے نکیلے اور گرم دندانوں کی گرفت سے انسان کو چھڑا لینے کی قوت رکھتا ہے؟

کیا ہم قدرت کی بلند اور اسرار کے گھرے میں چھپی ہوئی تربیت گاہ میں نقب لگا کر داخل ہو سکتے ہیں؟ اور کیا شہریارِ حیات یعنی وقت کے مکتبِ پنہاں سے ہم اسکے طلاب کا اغوا کر سکتے ہیں؟

قطبین کے درمیان کون ایسا سورما ہے جو خم ٹھونک کر، اور غرور سے گردن کو کج کر کے سامنے آئے، اور جواب دے "ہاں، میں ایسا کر سکتا ہوں"؟

میں بآوازِ بلند پوچھتا ہوں، کسکی مجال ہے، اور کس میں یہ جرارت ہے کہ انسان کو آغوشِ قدرت سے چھین کر اپنی گود میں اٹھا لے؟

اگر کوئی ایسا ساونت ہے، میں اُسے چیلنج دیتا ہوں، مردوں کی طرح سامنے آئے۔ یہ ہے بارگاہِ قدرت!

ایں است کہ دل بُردہ و خوں کردہ بسے را

بسم اللہ اگر تابِ نظر ہست کسے را!

ہاں ایسی کوششیں کی جا چکی ہیں، دُنیا نے ایسے صدہا ناکام تجربے دیکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے عظیم ترین "مصلحوں" کے کارنامے دنیا کی میز پر کھلے ہوئے رکھے ہیں۔

تاریخ کے بوسیدہ قصر کا دروازہ کھولئے، اس کے خاک آلود دفترِ پارینہ کی ورق گردانی کیجئے، اور دیکھ لیجئے کہ اکابرِ مصلحین کی نامرادیاں کسقدر جلی حروف میں لکھی ہوئی ہیں اور اُنکے نوشتوں کے سرِ ورق پر کن بھرے ہوئے الفاظ میں درج ہے:

السّلام لے بعدِ ما آیندگان رفتنی + بر شما نوش باد نا خوشہائے دنیائے دنی

خدا رحمت کرے مُصلحین پر، اِن نوعِ انسانی کے محسنوں کی وقتی کامیابیوں کی پرچھائیوں پر نہ جائیے خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود کی کرشمہ سازیوں کو اہمیت نہ دیجئے۔ اور عقلمندوں کی طرح اس "روشنی" کو روشنی کیوں کہئے جو "برق" سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم کے مانند عارضی و ناپائیدار ہوا کرتی ہے؟

دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا اِن مصلحوں نے نوعِ انسانی کی قلبِ ماہیت کر دی تھی؟ کیا یہ گروہ، فطرتِ انسانی پر قابو یافتہ ہو گیا تھا؟ اور کیا اِن "مصلحین" نے انسان کو قدرت کے آغوش سے چھین کر اپنے سایۂ تربیت میں لے لیا تھا؟

اور کیا اس سوال کا جواب، اثبات میں دیکھ کر ہم مجنونوں کی صف میں بیٹھنے کے قابل نہ ہو جائینگے؟ کیا اتنے مصلحوں اور ہادیوں کی سرگرمیوں کے باوصف، دنیا آجتک اُسی روش پر قائم نہیں ہے جس روش پر فطرت اُسے چلا رہی ہے؟

کیا انسانیت اپنے نئے اور پرانے ہادیوں کی گرفت میں ہے؟

ہاں نوعِ بشر چیں بہ جبیں ہے اب تک

انساں "رہِ راست" پر نہیں ہے اب تک

اللہ کو ہو مژدہ کہ "سرکش" بندہ

تھا روزِ ازل جہاں، وہیں ہے اب تک

زمانے کے ایوان، اور تاریخ کی محرابیں میں اب تک شکست خوردہ آوازیں گونج رہی ہیں، اُن غریب "مُصلحین" کی جو نورانی چہروں، محیّر العقول قوتوں، فصیح خطبوں، مضبوط سیرتوں، مقدس ارادوں، شفا بخش کلموں اور اپنے معتقدین کے سرفروش لشکروں کے ساتھ، رُشد و ہدایت کے آسمانی طبل پر چوبیں لگاتے ہوئے حیات کے اُفق پر ماہتاب دربغل، اور آفتاب برکف، طلوع ہوئے تھے — لیکن،

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"!

آؤ میں تمھیں مصلحین کی رُوحوں کی آواز سناؤں"

دم بھر بھی ہیں صبر کا یارا نہوا + پورا کوئی ارمان ہمارا نہوا

اصلاح کی ہینے تو بہت کی کوشش، لیکن تری حکمت کو گوارا نہوا

بت یا جاچکا ہے کہ انسان فطرت کا بچہ ہے، اور تمام انسانی کرتوتوں سے بالاتر واقع ہوا ہے۔ بیچارے مصلحین، خدا ان کو محفوظ رکھے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کرسکتے ہیں کہ اپنی پیشانیوں سے ناکامی کا پسینہ پونچھ ڈالیں اور بس!

ہاں مشغلۂ جام و سبو جاری ہے
اب تک وہی رسم ہاؤ ہو جاری ہے
کھائی ہے کچھ انسان نے ٹھوکر ایسی
سرد ین کے ماتھے سے لہو جاری ہے

فطرت کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے، فطرت کی حکمرانی ازل سے شروع ہوئی ہے، اور ابد تک جاری رہیگی۔

گل پہ ہیں نقوشِ دستِ باری اب تک
گُجذباں ہے دلِ بادِ بہاری اب تک
انساں کی پیمبری کا ڈر ہے مسدود
فطرت کی پیمبری ہے جاری اب تک

ذرا "مصلحین" کے پیروؤں کے دفتروں کو کھول کر دیکھئے، جو رہنمائی کے عوض، انسانی خون سے لکھے گئے ہیں۔ انسان کی بربادی، تباہی، دردمندی، اور ہلاکت کے واقعات ایک ایک کرکے، ٹھہر ٹھہر کر، صبر کے ساتھ پڑھیئے، ایک ایک سرخی، اور ایک ایک مد کو جانچیئے، ہر اجمال پر تفصیلی نظر ڈالئے، اور پھر دریافت کیجئے کہ اتنی زبردست بربادیوں کے بعد اولادِ آدم کو ملا کیا؟

میں خود کچھ عرض نہ کرونگا، آپ خود اپنی قوتِ فیصلہ اور شعور سے تنہا جا کے پوچھئے۔ البتہ میری جانب سے اسقدر ضرور یقین دلایا جاسکتا ہے کہ اگر آپکی قوتِ فیصلہ وہم پرست عورتوں کی طرح کبھی ہوئی نہیں ہے، تو وہ آپ کو گمراہ کن جواب دینے کی جسارت ہرگز نہ کرسکے گی۔

اور اب جب کہ نوعِ انسانی کی اصلاح کے باب میں ہماری بیچارگی اسقدر نمایاں، اور ہمارا عجز اسقدر غیر مبہم طور سے ہمارے سامنے آچکا ہے، تو ہمیں اپنے دماغ کی تمام قوتوں کو یکجا کرکے غور کرنا ہے کہ ہمارے سامنے کونسا راستہ کھلا ہوا ہے۔ یعنی:

"چیست یارانِ طریقت! بعد ازیں تدبیرِ ما؟"

کیا ہم دنیا کے سب سے بڑے مغنی حافظِ شیراز کی "حدیث از مطرب و مے گو" پر کاربند ہو کر خاموش ہو جائیں ہلے علی پر قناعت کریں؟ — "حدیث از مطرب و مے گو" پر تو عمل کیا جاسکتا ہے، اور اسوقت بھی تندرست ذہن کے مالک عقلا کے حلقے میں اس پر عمل ہو رہا ہے۔ لیکن اسکا دوسرا حصہ، یعنی "خاموش ہو جائیں" بے علمی پر قناعت کرلیں، قطعی طور پر ناقابلِ عمل ہے۔

انسان سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن خاموش و بے عمل کبھی نہیں ہو سکتا — حرکت اسکی زندگی ہے اور سکون موت —— وہ تو روزِ ازل کی صبحِ صادق سے "حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز" کے ترانے گا رہا ہے، اور جب تک موت اسے بظاہر خاموش نکردیگی وہ یہی ترانے گاتا رہیگا۔ "بظاہر" میں اس لئے کہتا ہوں، کہ کون کہہ سکتا ہے کہ ع خود موت بھی خواب ہے، کہ بیداری ہے؟ اور جبکہ سکون و اضمحلال، اور جمود و تعطل، انسان کے واسطے ناممکنات میں سے ہے، تو قرینِ دانشوری یہی ہے، یا یوں کہئے ہم اسپر مجبور ہیں کہ انسان کو مصروف، مشغول ہی رہنے کا مشورہ دیں، کیونکہ یہ مشورہ تو خود ہماری عینِ فطرت ہے۔

لیکن اس منزل پر کیا ہم دنیا کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ لاینحل، اور سب سے زیادہ قدیم مشکل سے دوچار نہیں ہوجاتے؟ یعنی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان اب تک، اس لمحے تک اپنی غایتِ تخلیق ہی سے ناواقفِ محض ہے، تو پھر اس سادہ ہموار صورتِ حال میں کیا ہم اس کے سامنے واقعی کوئی ٹھوس اور حقیقی کام پیش بھی کرسکتے ہیں؟

صدیوں اور قرنوں سے اس نیلے آسمان کی پُر رعب ڈاٹ کے نیچے "تمتعِ مرا، بہرچہ آراست، مرا" کی آوازیں گونج رہی ہیں، "پیغامبر" خاموش ہیں، "صحائف" نقش بدیوار ہیں، اور فلاسفہ سربہ درگلو —— آخر کس سے دریافت کیا جائے؟ کس سے پوچھا جائے: کس ماں نے آجتک کسی جاننے والے کو جنا ہے؟ ہر طرف کامل

خاموشی، زبردست سکوت، اور اتھاہ سناٹا ہے ——— اور غریب انسان۔ مشیت کا سوتیلا بیٹا انسان "کہ سر کوہ و بیاباں تو دادہ مارا"، کا رونا روتا ہوا تحقیق کی تاریک و ناہموار وادیوں میں سر پٹکتا پھر رہا ہے۔ اور ہر منزل، ہر قدم پر "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد" کی دردناک چیخ اُس کی زبان سے نکل جاتی ہے۔

وائے اے ذوقِ تحقیق! حیف اے دردمندِ انسانیت!!

یہ عقل زبوں، ستا کے چھوڑیگی ہمیں
یہ آتشِ غم، جلا کے چھوڑیگی ہمیں
یہ راز کی پیاس، دل کا پی لیگی لہو
یہ علم کی بھوک، کھا کے چھوڑیگی ہمیں

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، یا دردمند دل کی آہ، جو منہ سے نکل گئی ——— اب دیکھنا یہ ہے کہ جب تک علتِ ایجاد کا پتہ چلیگا جسکی امید "ایں خیال است و محال است و جنوں" کی حد تک موہوم ہے، اُس وقت تک انسان اپنے زعم میں خواہ کوئی کتنا ہی ٹھوس اور سنجیدہ کام کیوں نہ اختیار کرے، لیکن حقیقت شناس طبقے میں اُس "ٹھوس" اور "سنجیدہ" کام کو "شغلِ بیکاری" سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ کہنے والے نے کہا ہے، اور سچ کہا ہے۔

انسان کی جسقدر بھی طراری ہے
بس وقت گزارنے کی بیماری ہے
افسوس کہ بے معرفتِ رازِ حیات
جینا کتنی شدید بیکاری ہے

"شغلِ بیکاری" اور خلیفۂ ارض و وارثِ کائنات انسان!
کتنا غیر مشفقانہ برتاؤ! کتنا دردناک کھیل!!

اور جب "شغلِ بیکاری" ہی کے نقطے پر ہمارے تمام اعمال کی گردش منحصر ہے، تو آئیے، زندگی کو بہلانے، اور بچے کے ہاتھ میں کھلونا دینے کی خاطر، دنیا کے ناقابلِ شمار مشاغل میں سے کوئی ایسا شغل کیوں نہ منتخب کر لیں، جس پر ہم "بہترین شغل" کی مُہرِ تصدیق ثبت کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہوں؟

لیکن انفرادی و اجتماعی، دونوں جہتوں سے اِسکا کوئی ایک حل، یا ایک جواب بیحد دشوار معلوم ہوتا ہے ——— البتہ اس سلسلے میں بلاخوفِ تردید اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے، ممکن ہے میں غلطی پر ہوں، کہ جن جواں بخت، یا بدقسمت افراد کی سطحِ فکر کافی بلند، اور جنکے ذہن کی دھار کافی باریک اور تیز واقع ہوئی ہے اُنکے واسطے کارخانۂ عالم میں تفکر و تدبّر سے بہتر کوئی دوسرا مشغلہ اسوقت تک انسانی حدودِ معلومات میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اور یہی وہ تنہا مشغلہ ہے، جس سے ہم خدمتِ انسانی کی بہترین آرزوؤں کو وابستہ کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر یہ اعتراض قدرتی طور سے پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مان لیا گیا ہے کہ انسان کی اصلاح، انسان کے بس کا روگ نہیں ہے، تو پھر مشغلۂ تدبّر و تفکر سے "خدمتِ انسانی کی بہترین آرزوؤں" کی وابستگی کیا معنی رکھ سکتی ہے؟

سُنئے میں عرض کرتا ہوں ——— بات یہ ہے، اور اربابِ بصیرت، عقلی، اور زیادہ تر، وجدانی طور پر اِس سے بخوبی آگاہ ہیں، بلکہ تجربے بھی کر چکے ہیں کہ زمانہ اپنی مسلسل و پیہم رَو میں، چلتے چلتے خود بخود ایک ایسی موڑ پر آ جایا کرتا ہے، جہاں سے نو بہ نو انقلابات کے دروازے خود بخود کھلنے لگتے ہیں ——— اور مفکرین کے سینوں میں اُنکا عکس تھرتھرانے لگتا ہے ——— یعنی زمانے کی اِس موڑ کے معنی ہی یہ ہیں کہ اب قدرت خود اصلاح یا انقلاب پر تیار ہو چکی ہے، اور مفکرین کو تعاون پر آمادہ کر رہی ہے۔

عوام اِن انقلابی آثار و قرائن کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، انکی موٹی نگاہ زمانے کو مُڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی، لیکن جسطرح آلات کے ذریعے ستاروں کی گردش، شمس و قمر کی رفتار، موسموں کے تغیرات، قحط و بارش کے آثار، آندھیوں، طوفانوں، اور زلزلوں کی آمد کا حال معلوم کر لیا جاتا ہے، ٹھیک اُسی طرح، اور اُسی انداز پر، مفکرین کی بصیرت، آنیوالے انقلابات کا پہلے ہی سے مشاہدہ کر لیتی ہے۔ وہ فضا میں انقلاب کو دیکھ، اور ہوا میں انقلاب کو سونگھ لیتے ہیں۔ اور جیسے ہی زمین سے خفیف سی بھاپ اُٹھنے لگتی ہے، وہ اہلِ خرمن کو آگاہ کر دیتے

ہیں کہ برقِ خرمن سوز سے ہوشیار — اور جب آنے والے انقلابات کے تیور پہچان کر وہ انکی افتادِ مزاج کا صحیح اندازہ لگا لیتے ہیں، تو منشائے قدرت کے زیرِ سایہ، ہر ممکن عجلت کے ساتھ انقلابی سرگرمیاں شروع کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور اس شدت کے ساتھ کہ سُست رفتار زمانے کی رَو میں، جو انقلاب ممکن ہے کل رونما ہوتا، وہ انکے مساعی کی بدولت آج ہی پیدا ہو جاتا ہے اور اس طور پر مفکرین، زمانے کو اُسکے عزائم میں مدد دیکر انسان کی بہترین خدمت انجام دیتے ہیں، اور "مصلحین" کے خطاب سے سرفراز کئے جاتے ہیں۔

اسکو اس مثال سے سمجھئے، فرض کیجئے زمانہ ایک مطلق العنان بادشاہ ہے، اور مفکرین اُسکے مزاجداں مقربین میں سے ہیں — بادشاہ کے دل میں جیسے ہی کوئی انقلابی یا اصلاحی جذبہ پیدا ہوتا ہے، یہ فوراً اُسکے تیوروں سے پہچان جاتے ہیں، یا یوں کہئے بادشاہ خود اپنے تیوروں سے اُنہیں پہچنوا دیتا ہے، اور گروہ مفکرین اُن آثار کو پاتے ہی ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس سرگرمی سے جدّ و جہد شروع کر دیتا ہے، کہ بادشاہ کا عزم بہت ہی جلد عملی جامہ پہن لیتا ہے، اور وہ انقلاب جو خدا جانے ضمیرِ شاہ میں کب تک پہلو بدلتا رہتا، اُنکی مستعدی کی بدولت جلد تر رونما ہو جاتا ہے۔

اب آپ سمجھے کہ شغلِ تدبر و تفکر سے سینے "خدمتِ انسانی کی بہترین آرزوؤں" کو کیوں وابستہ کیا تھا؟

یہی حال آجکل ہندوستان کا ہے — ممکن ہے کسی کو نظر نہ آتا ہو، لیکن اربابِ نظر ہندوستان میں زمانے کو یوں مُڑتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، جیسے پیچ و خم کھاتی ہوئی پٹڑی پر ریل مُڑتی نظر آتی ہے، اور اس صفائی کے ساتھ کہ گارڈ کے ڈبے سے انجن نظر آنے لگتا ہے۔ ہاں۔

لذتِ سیرِ دگر چشمِ تماشا لیگی
ایک بار اور یہ دنیا ابھی پلٹا لیگی

لیکن ہندوستانیو! تمھاری سماعت کو کس طوفانی بجلی کی کڑک اُچک لیگئی ہے؟ کیا واقعی تم نہیں سُنتے کہ ہندوستان کی ہواؤں میں انقلاب سانس لے رہا ہے، سنسنا رہا ہے، راستے کے موڑ پر ہندوستان کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے؟

اور کیا تمھیں نہیں معلوم کہ جب رات کا پُر اسرار سناٹا، پہنائے عالم کا احاطہ کر لیتا ہے، تو نامعلوم سمتوں سے "انقلاب" "انقلاب" کی دھیمی آوازیں صبح تک آتی رہتی ہیں۔

ہندوستانیو! تمھاری بصارت کو کسکی نظر کھا گئی ہے؟ کیا واقعی تم نہیں دیکھتے کہ ہندوستان کی دھوپ، اور چاندنی میں انقلاب جھل جھلا رہا ہے؟

اور اے زمین کے عجیب ترین باشندو، اہلِ ہند! تمھاری قوتِ شامہ کو کس زہر نے سُن کر دیا ہے؟ کیا تمھاری سانس تمھیں خبر نہیں دیتی کہ ہندوستان کے گلزاروں میں انقلاب بوئے گل بنکر فضاؤں میں مچل رہا ہے؟

اور خدارا بتاؤ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ سینۂ ہندوستان میں انقلاب کا جو سُرخ شعلہ آہستہ آہستہ تھرتھرا رہا ہے، اُسے ہوا دینا شروع کر دیا جائے؟ — انقلاب۔ انقلاب ہر شے میں انقلاب۔ ہر جہت سے انقلاب۔ زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب۔ تہذیب و تمدّن میں انقلاب۔ آداب و رسوم میں انقلاب، نظریات و معتقدات میں انقلاب۔ مسلّمات و کلیات میں انقلاب سیاسیات و دینیات میں انقلاب۔ انقلاب۔ یکسر انقلاب — تمامتر انقلاب — اور مکمل انقلاب۔

لیکن آپ جانتے ہیں اِن تمام انقلابات کا سرچشمہ کہاں ہے؟ — نفسیات سے پوچھئے، وہ جواب دیگی کہ انسان کے ذہن و خیال اور صحیح فکر میں"

جب تک "ذہن و خیال" میں انقلاب نہ آئیگا، کسی نوع کے انقلاب کی امید رکھنا ایک مہمل سی بات ہے۔

لیکن اِس "ذہنی" انقلاب کا سرچشمہ کہاں ہے؟ "دنیا کی زندہ اور مُردہ قوموں کی تاریخ سے سوال کیجئے، وہ جواب دیگی "قوموں کے ادبیات" میں!

اس لئے آئیے، اپنے ادبیات کا جائزہ لیں، اور دیکھیں اس مجموعے میں زندگی، بیداری پیدا کرنے کی صلاحیت کہاں تک پائی جاتی ہے؟

نہیں ایکبار بار بار کی دیکھیے، جانچیے اور بہی ہوئی چیز کا جائزہ

کیوں لیجئے؟ ہمارے ادبیات میں ہے کیا؟ وہی روایتی، مصنوعی اور بے سمجھے بوجھے حسن و عشق کے چٹخارے۔ وہی ناروا قناعت اور ترکِ دنیا کے چبائے ہوئے نوالے۔ وہی "اگر شہ روز را گوید شب است این" کی غلامانہ تعلیم۔ وہی "ما مقیمانِ کوئے دلداریم" کی لوریاں۔ وہی "گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے" کی بزدلی۔ وہی "رات بھر لاشہ پڑا رکھا مسیحا نے مرا" کی کفن فروشیاں۔ وہی "یار کا سر چڑھ کے بوسہ لے لیا" کی بولی ٹھولی۔ وہی "ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا" کی کاہلانہ بے پروائیاں۔ وہی "لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی" کی بے غیرتیاں۔ وہی "ایسے میں کوئی جم سے جو آ جائے تو کیا ہو" کی سوقیانہ بول چال۔ وہی "اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے" کی زبوں ہمتی۔ وہی "کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما" کی نوم آور دوائیں۔ اور وہی "بہت سعی کیجئے تو مر رہیئے میر، بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے" کی نسائی ناچاریاں۔

میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر جواب دیجئے کیا ہم اِن رانڈوں کی طرح بین کرتی اور سوگوار بوڑھیوں کی طرح چھاتی پیٹتی ہوئی، چھوٹے آنسوؤں کی شاعری سے طوفانی سمندروں کے تڑپتے ہوئے سینوں پر جہاز چلا سکتے ہیں؟

جس شاعری کی ہڈیاں، زنداں کی زنجیروں سے گھرچ گھرچ کر نکالی جاتی ہوں، جس کی سفید آنکھیں ہمیشہ چھت سے لگی رہتی ہوں، جو حقیقی حُسن و عشق کی چاشنی سے بیگانہ ہو، جو اِس زندگی اور اُس کے تمام بے شمار پہلوؤں کے مطالعے اور اِس عظیم الشان کرۂ ارض کے مشاہدے سے قاصر ہو، جسکے آشیاں پر آئے دن بجلیاں گرا کرتی ہوں، جسے ہر بازاری آدمی، اگر وہ رقیب کی صورت سے نمودار ہوا ہے، دھکے دیکر بزم سے نکال سکتا ہو، جو دل کا جنازہ ہتیلی پر لئے پھرتی ہو، جسکی سانس سے شگفتگی کا جبڑ اُتر جاتا ہو، جسکا ہر روز "عشرۂ محرم" اور جسکی ہر شب "شبِ برات" کے مانند ہو، اور جس کی تھرتھراتی ہوئی آواز ایسی ہو گویا آدھی رات کے وقت ٹوٹی ہوئی قبروں کے روزنوں سے ہوا گزر رہی ہے۔ کیا ایسی ناتوں کی ماری، اونگھتی، بلبلاتی، تھرتھراتی، گڑگڑاتی، کانپتی، روتی، پیٹتی، چیختی، چلاتی، سسکتی، بسورتی، بلکتی اور لنگڑاتی ہوئی شاعری کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہم زندگی کے پُرہول و ناہموار میدانوں کے طے کرنے کا تصور بھی کر سکتے ہیں؟

ایکبار نہیں، ہزاروں مرتبہ، طویل راتوں کے سکون اور سناٹوں میں مینے اُردو شاعری کا مطالعہ کیا ہے، مینے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے اساتذہ کے سینے کھولکر دیکھے، مینے پوری دیانت کے ساتھ اپنے شعرا کی نبضوں پر ہاتھ رکھکر انکے ضربات کا شمار کیا، لیکن افسوس کہ مجھے انکے اندر زندگی، شعلہ فشاں زندگی، آگ اور بجلی سے کھیلنے والی زندگی، گرجتی گونجتی ہر قدم پر مچلتی، اور اُبھرتی ہوئی سُرخ خون والی زندگی کا کہیں نام و نشان تک نہ ملا۔

ہمارے کلیات، دواوین، ناول، اور افسانے، زمہریر کے کُرّے ہیں، جہاں حیات کا خون جم جاتا ہے اور دلوں کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں۔

کہاں تک روؤں؟ کس کس بات کا ماتم کروں؟ ذرا اپنے "شعرائے کرام" کے تخلص ہی ملاحظہ فرما لیجئے۔ اور کسی ماہر نفسیات سے دریافت فرمائیے کہ یہ تخلص کس نوع کی ذہنیت پیش کرتے ہیں، آپ جانتے ہیں اسکا جواب کیا ہوگا؟

وہ غیر مشتبہ الفاظ میں بتا دیگا کہ اِس نوع کے تخلص صرف وہی لوگ پسند اور اختیار کر سکتے ہیں جنکے ذہنوں کی کمریں ٹوٹ چکی اور جنکی ہمتوں کے منکے ڈھل چکے ہیں۔

سُنئے اور عبرت کے کانوں سے سُنئے۔

مجروح، شکستہ، ملول، مسکین، درد، سوز، ذرہ، نخچیر، داغ، افسوس، حزیں، عدم، بیدم، بیدل، بسمل، کشتہ، الم، اشک، آہ، قلق، اور یاس وغیرہ!

اور رنگے ہاتھوں اِن شعرا کے کلام سے متاثر ہونے والے

...وں کے اُن سابقوں کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو وہ بالعموم خطوں
...اپنے ناموں کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ناچیز، ذلیل، حقیر، فقیر، احقر، رُسوا، کمترین، فدوی،
بدذلیل، ہیچ میرز، بندۂ بے نوا، کمترین خلائق، اذل مخلوق،
حقر العباد، عاجز، ہیچمداں، گنا ہگار، عاصی، پُرمعاصی، اور
روسیاہ وغیرہ!

کیا آپ اپنے شاعروں اور ادیبوں کی پست ذہنیت کے سمجھنے کے لئے اِس سے زیادہ کسی ثبوت یا شہادت کے طلبگار ہیں؟

آخر صاف صاف کیوں نہ کہدیا جائے کہ ہمارا ادب کمزور ہے، علیل ہے، خوابیدہ ہے، مُقلد ہے، نقال ہے، غیر فطری ہے، بے روح ہے۔ مدقوق کی طرح زرد، مبروص کی طرح داغدار، مفلوج کی طرح اپاہج، اور سٹری ہوئی لاش کی طرح متعفن ہے؟

ہاں میں آپکے سامنے شاعری ہی کے کیمپ سے آیا ہوں، نہ میں غدّار ہوں، نہ خدانخواستہ مغرب زدہ —— ایسا معلوم تو ضرور ہوتا ہے کہ کچھ شعر کہنا اور سمجھنا جانتا بھی ہوں۔ میری طرف سے اس وہم میں نہ پڑیئے کہ میری نظر میں اپنی شاعری کے اُن اثر آفریں اور نازک پہلوؤں پر نہیں ہیں جو دلوں میں اُتر جاتے ہیں۔ لیکن آپ کو غالبًا ایک شاعر کی زبان سے یہ سنکر بہت استعجاب ہوگا کہ میں سردست اپنی قوم میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ "دل" دماغ پر غلبہ حاصل کئے رہے۔

"دل" ایشیا کا بہت پُرانا اور ہردلعزیز فرمانروا ہے، لیکن حالاتِ موجودہ کی عمرانی اور سیاسی پیچیدگیوں، اور عصر حاضر کے مقتضیات پر نگاہ کرتے ہوئے میں ایشیا کے اس شریف اور بوڑھے تاجدار کی خدمت میں عرض کرونگا کہ براہِ کرم خسروانہ، تھوڑے دن کے لئے، تاج وتخت سے اپنی دست برداری کا اعلان کردے۔

ہرچند یہ مشورہ دیتے ہوئے "دل را بدل رہیست" کے مطابق خود میرا دل بھی درد محسوس کرتا ہے، لیکن زندگی کی ضرورتیں جب ہٹ پر آجاتی ہیں، تو انکے قدموں پر دل و جان دونوں کو نچھاور کردینا پڑتا ہے۔ اور اِس وقت ہندوستانی زندگی کی ضرورتیں جان و دل ہی کی قربانی کے لئے مچلی ہوئی ہیں۔

میں حیران ہوں کیا واقعی آپ نہیں دیکھتے کہ ہندوستان ننگا اور بھوکا ہے، دانے دانے کو ترس رہا ہے؟

کیا آپ کے علم میں یہ اب تک نہیں آیا ہے کہ اکثر و بیشتر ہندوستانی مائیں بھوک سے تنگ آکر اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو خود اپنے ہی ہاتوں سے ذبح کرڈالتی ہیں؟

کیا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ ہر سال آپکے کتنے گریجویٹ بے روزگاری سے گھبرا کر زہر کھا لیتے ہیں؟

کیا آپ نہیں دیکھتے، آپ کی عورتیں مدقوق، جاہل اور فنِ تربیتِ اولاد سے قطعی بیگانہ ہیں۔

کیا آپ کو نظر نہیں آتا ہے کہ آپکے نوجوانوں کے چہرے ستے ہوئے ہیں۔ جن پر خون کی ایک چھینٹ بھی نہیں؟

اور کیا واقعی آپ کو اس حقیقتِ کبریٰ کی اِس لمحے تک خبر نہیں ہے کہ دوسری قومیں تو اجنبی اور غیر ممالک میں بھی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں، اور آپ ہیں کہ خود اپنے وطن، بلکہ اپنے گھر کے اندر اور اپنے بال بچوں کے سامنے جانوروں سے زیادہ حقیر و ذلیل ہیں؟

کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو شرم نہیں آتی؟ کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ کی خودداری کا معیار عبرتناک حد تک پست ہے؟

اور کیا یہ خبر صحیح دی گئی ہے کہ آپ "با درد بساز و ہیچ درماں مطلب" پر عمل پیرا ہوکر اِن تمام تذلیلوں اور توہینوں سے مصالحت فرما چکے ہیں؟ خیر، یہ صحیح ہو یا غلط— میں ایک مدت سے سنتا چلا آرہا ہوں کہ ہر قوم کے ادیب اور شاعر، انتہا درجے کے حسّاس، خوددار، اور غیور ہوا کرتے ہیں، اگر میرے ہندوستان میں بھی یہی ہے تو میں اپنے شاعروں اور ادیبوں کے سامنے دوزانو ہوکر گڑگڑاؤنگا کہ خدارا اپنے ادب میں عظیم انقلاب پیدا کرکے ہند کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو خونی گرداب کے خون آشام دانتوں سے چھڑا لیجئے، جلد

چھڑا لیجئے ورنہ کشتی ڈوب جائے گی۔ اور شباب و محبت کا واسطہ اپنے ادبیات میں حیات و بیداری کا خون دوڑائیے، اور وطن عزیز کے لئے دلوں کی طرح دھڑکتے ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا باب الہند تیار کیجئے، جس کی سنہری اور بلند محراب کے نیچے سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نقرئی جلوس، فوج در فوج، اور قطار اندر قطار ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔

یاد رکھئے ایک صحیح جنبش قلم نشتر ہزار برہنہ تلوار وں کے مقابلے میں زیادہ کارآمد آلۂ جنگ ہے۔

میں آخری بار پھر یہی کہونگا کہ جو کچھ کہنا ہے جلدی کہئے جو کچھ کرنا ہے جلدی کیجئے ورنہ :-

کی گئی نا وقت قربانی تو پھر کیا فائدہ؟
سر سے اونچا ہو گیا پانی تو پھر کیا فائدہ؟

جان آف آرک

(تصویر کے متعلق)

زیر نظر نمبر میں جان آف آرک کے مجسمہ کی تصویر شائع کی جا رہی ہے جس پر اس جگہ فنی اعتبار سے خامہ فرسائی کا خیال نہیں ہے۔ بلکہ سطور ذیل کا مقصد اصلی صرف اسقدر ہے کہ قارئین کرام کو جون آف آرک کی تاریخی شخصیت سے روشناس ہو جائیں۔

چارلس ششم شاہ فرانس کی موت کے بعد ہنری ششم شاہ انگلستان نے معاہدہ ٹرائیز ۱۴۲۲ء کی رو سے فرانس کے تخت پر اپنا حق ثابت کیا اور دعویدار ہوا۔ انگریز ایجنٹ ڈیوک آف بیڈ فورڈ کا حریف چارلس ڈیوفن آف فرانس تھا۔ انگریزی فوجوں نے فرانس کے تمام شمالی حصوں کو تاراج کر دیا' یہانتک کہ اورلینز کا شہر بھی جس پر چارلس ڈیوفن کا قبضہ تھا اس تیرہ بخت شہزادہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ڈیوفن کا چراغ اقبال حق تلفی اور استبداد کی آندھی کی تاب نہ لا کر بجھا ہی چاہتا ہے۔ جب ہر چہار جانب سیہ بختی کی گھٹائیں چھا رہی تھیں تو اورلینز کی ایک دہقانی الھڑ دوشیزہ جون آف آرک مقصد و عمل کو لیکر میدان کارزار میں کود پڑی اپنی کم حیثیت جھونپڑی میں رہتے ہوئے جون نے محسوس کیا کہ فرشتے اسے وطن عزیز کی محافظت کے لئے بلا رہے ہیں۔ قومیت کے جذبہ سے سرشار چارلس کے حضور میں آئی اور اپنا خواب بیان کیا۔ چارلس نے بادل نخواستہ اپنی فوجوں کی کمان جان آف آرک کے سپرد کر دی۔ جان کی قومیت، مقصد پرستی، اور قوت عمل نے سپاہ میں جان نثاری کی روح پھونک دی اور یکے بعد دیگرے فرانس ہر میدان کارزار میں کامیاب رہا۔ آخرکار ریمز کے مقام پر ۱۴۲۹ء میں چارلس کی تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی۔ انگریز جان آف آرک کو حراست میں لینے میں کامیاب ہو گئے اور راوئینز کے مقام پر جان کو "ساحرہ" ہونے کے الزام میں زندہ جلا دیا۔

"م - ح - ا"



جان آف آرک

Calcutta Art Press Delhi

مسائلِ حیات

یہ LIFE PROBLEMS کا مؤلفانہ ترجمہ ہے، جو گزشتہ سال ہی امریکہ سے شائع ہوئی ہے۔ مؤلفانہ ترجمہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اثنائے ترجمہ میں ایک ایک خیال سے کئی کئی خیال پیدا ہوتے رہے ہیں، اور میں نے ہر خیال کو ذہن میں اچھی طرح پختہ کرکے اسی ترجمے میں لکھ دیا ہے، بعض مقامات کی طوالت کو تراش دیا ہے، اور بعض مختصر دامنوں میں کلیوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ گھٹایا کم ہے، بڑھایا زیادہ ہے۔

البتہ بڑی حد تک اس کا لحاظ رکھا ہے کہ انگریزی کا طرزِ بیان اور "شری یوگندرا" مصنفِ کتاب کا اسلوبِ نگارش، اصل سے زیادہ دور نہ ہونے پائے۔ ممکن ہے اردو کے خالص طرزِ بیان کی رو سے احباب کو بعض مقامات زیادہ پسند نہ آئیں لیکن میرے خیال میں اگر اردو میں مختلف زبانوں کے اسالیب بیان کی ماہرانہ طور سے آمیزش کر دی جائے تو ایک وسیع اور خوشگوار تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔

اس کتاب میں دلائل و براہین، اور تشریح و تفسیر سے کام نہیں لیا گیا ہے، صرف اتنا کیا گیا ہے کہ زندگی کے چند نہایت اہم مسائل کی طرف، جن سے نوعِ انسانی آئے دن دوچار ہوا کرتی ہے، چند پُرمغز اور حکیمانہ اشارات کر دیئے گئے ہیں، اور بس۔

مجھے خوف ہے کہ یہ اشارات، ان افراد کے واسطے دلچسپ و قابلِ فہم نہ ہونگے، جن کا مطالعہ محدود، اور تفکر نارسیدہ ہے، البتہ وہ حضرات جو حکیمانہ مزاج رکھتے ہیں، جو کارخانۂ عالم میں تدبر و تفکر کیا کرتے ہیں، جو حقائقِ زندگی اور اشیائے عالم کے مختلف پہلوؤں کے دیکھنے کی سعی کر چکے ہیں اور جو ہر ایک ذرّے کو تمام دنیا کے پہاڑوں کے مقابلے میں مساوی اہمیت کے ساتھ تولنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں، وہ حضرات ان اشارات کو دلچسپ بھی پائیں گے، اور خیال انگیز بھی۔

کیونکہ اربابِ علم ہی ہر قوم کے دماغ ہوا کرتے ہیں، اگر دماغ تندرست ہوتا ہے، تو تمام اعضاء و جوارح بھی درست ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے میرے نزدیک ایسے مقالات کی بہت شدید ضرورت ہے جو قوم کے "دماغ" کی بیماریوں کا علاج کر سکیں۔

میں اہلِ نظر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اس مقالے کو "مشغلۂ ادبی" کے طور پر نہیں، "ضرورتِ وقت" کے نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائیں۔ ممکن ہے مقلد و جامد، اور حریتِ فکر سے ڈرنے والی سوسائٹی میں کچھ روشنی پیدا ہو جائے۔

فہرستِ ابواب:-

جوش

---

(۱) نقاد

(۱) اے نقاد! تو اپنے نئے مہمان، یعنی اس پیغام کا، خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کیوں نہ کر؟ کسے معلوم کہ اس کے اندر شاید علم کے تخم ہوں، جن سے کوئی چٹیل میدان، گلشن میں تبدیل ہو جائے۔

(۲) کیا ہمیں اس قدر بے عقل ہونے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی قوت اور وقت کو نکتہ چینیوں کے جوابات میں ضائع کر دیں؟ کیا ہمارے نقادوں کو ہم سے اختلافِ رائے کا اسی طرح حق نہیں ہے، جس طرح

انہیں ہم سے مختلف چہرے رکھنے کا حق حاصل ہے؟

(۳) کیا نقّاد، نکتہ چینی اور خوردہ گیری کی ہوس میں اکثر خود اپنی ہی فکر کا کھوکھلا پن، اور اپنی ہی نگاہ کی نارسائی کا پردہ نہیں چاک کردیتا؟

(۴) کیا نقّاد، نوعِ انسانی اور اشیائے عالم پر نقد کرتے ہوئے بسا اوقات خود اپنے ہی نقطۂ نظر کو رسوا نہیں کردیتا؟

(۵) کیا نقّاد، کتاب کے چند اشارات سے آگے بڑھ سکتا ہے؟ کیا وہ مصنّف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے؟ اور کیا نقاد اُن تمام منزلوں سے بھی گزرا ہے، جن منزلوں میں مصنّف نے اپنی کتاب کا سامان جمع کیا ہو؟

طورِ معنیٰ پر بھی اے نقّاد! چڑھ سکتا ہے تُو؟
کیا مصنّف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تُو؟

(۶) کیا نقّاد، مصنّف کی اُس وقت کی تمام دماغی، دلی، روحانی اور ذہنی کیفیتوں کو اپنے اوپر طاری کرلینے کی قدرت رکھتا ہے، جو اُس پر کتاب لکھتے وقت طاری تھیں؟

(۷) اس لئے آؤ ایسی فضا کیوں نہ پیدا کریں کہ ہر شخص کی آواز بہ اطمینان سُنی جاسکے؟

ہاں یہ دنیا بہت وسیع واقع ہوئی ہے، اور اس میں نئی نئی باتوں اور تازہ بہ تازہ مسائل کی گنجائش قیامت تک باقی رہیگی۔

متانت و رواداری سیکھو، شور نہ مچاؤ، اپنے خیالات کو اپنا معبود نہ سمجھو، اُس کی آواز بھی سُنو جو تمہارے خیالات کے خلاف صدا بلند کر رہا ہے، سوچو، غور کرو، بالغوں کی طرح سنجیدہ بنو۔ ممکن ہے وہ سچ کہہ رہا ہو۔ ممکن ہے تم غلطی پر ہو۔ ممکن ہے دونوں غلطی پر ہوں۔ ممکن ہے دونوں درست ہوں۔ ممکن ہے کچھ وہ غلطی پر ہو، اور کچھ تم۔ کچھ وہ درست ہو کچھ تم۔ برافروختہ نہ ہو محقق بنو، سنو۔ اور غیر متعصب ہوکر فیصلہ کرو۔

(۲)

کتاب

(۱) اگر کتاب، کوئی عظیم محبّت قائم کرکے اپنا لوہا منوا دے تو کیا وہ جنگ سے عظیم تر نہیں ہے؟

(۲) ایک صحیح کتاب، انسان کا درحقیقت سب سے بڑا شریفانہ کارنامہ ہے۔ لیکن کیا کوئی صحیح کتاب لکھنے کی جسارت بھی کرسکتا ہے؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارا تمدّن اِس ایمانداری کو برداشت کرسکے گا؟

افسوس بیشمار سُخنہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

(۳) کتابوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے، جن میں وہ باتیں درج ہیں، جن پر خود اُن کے لکھنے والوں کو اعتقاد نہیں ہے۔ کیا ایسے مصنّفینِ سالوس محض یہ ظاہر کرنے کی خاطر کتابیں نہیں لکھتے کہ وہ ریاکار نہیں ہیں؟

(۴) کیوں کسی مصنّف کا اعتبار کرو محض اس بنا پر کہ بہت سے افراد اُسے معتبر سمجھتے ہیں؟ کیوں ایک ایسے مصنّف کا اعتبار نہ کرو جو وہی بات لکھتا ہے جو خود اُس کے نزدیک معتبر ہے؟

(۵) بہت سے مصنّفین کو فلسفہ طرازیوں کی اتنی لت ہوتی ہے کہ وہ یہی بھول جاتے ہیں کہ اُن کا موضوع کیا ہے۔ اور کیا گروہِ مصنّفین میں بیشتر افراد اُس موضوع کو سمجھتے بھی ہیں جس پر وہ خامہ فرسائی کرتے ہیں؟ یا محض اس لئے لکھتے ہیں کہ لکھنا اُن کا ذریعۂ شہرت و معاش ہے؟

(۶) کتابوں کو تفریحی نقطۂ نظر سے زیادہ، اکتسابِ علم کی خاطر پڑھو۔ اگر کوئی کتاب تمہیں تفکّر و تدبّر کی جانب مائل کرنے میں ناکام رہتی ہے تو بہتر یہی ہے کہ اُسے دُور پھینک دو۔

(۷) اپنے خیالات کو صاف ہوا، اور چمکتی ہوئی دھوپ میں سانس لینے کا موقع دو، ورنہ گندے اور مرطوب ہو جائیں گے، اور تمہارا دماغ علیل ہو جائے گا۔

(۸) اہلِ تقلید سے نہ ڈرو، اپنے خیالات کو ہر جہت اور ہر سمت سے اپنی رہبری کا موقع دو۔ خیالات تو تمہارے بچے ہیں، کیا تم اپنے بچوں سے لرزہ براندام ہو؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہی آزاد و تندرست خیالات، جن کے اظہار سے آج تم جھجکتے ہو، آیندہ نسلوں کے عظیم مصنّفوں کا سرمایۂ ادب بن جائیں؟

(۹) ہر وہ شئے جو طبع ہو جاتی ہے، پڑھنے کے قابل نہیں ہوتی، صرف وہ چیز پڑھو جو محض "پڑھ لئے جانے" سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہو۔

(۱۰) تم تھوڑا لکھ کر بھی بہت کچھ کہہ سکتے ہو، اس سے کیا فائدہ کہ لکھو تو بہت کچھ، اور کہو بہت کم؟

(۱۱) کتاب پڑھنے کا فن، کتاب سے کہیں زیادہ اُس کے مصنّف کے دل کے پڑھ لینے کے فن پر مبنی ہوتا ہے۔ کیا تم اِس فن سے واقف ہو؟

---:(۳):---

عِلم

(۱) اُس ہنگامے میں بھی جب ہم اپنی حیوانی ضرورتوں میں مصروف ہوں، ہمیں ذوقِ علم اور تفکّر کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔

(۲) استدلال کی قوّت، ایک بہت بڑی جوانمردی ہے۔ لیکن کیا ہم میں سے اکثر اس سے بہرہ یاب ہیں؟

(۳) تم شمعِ علم کے دونوں سِروں کو روشن کرکے کیوں نہ قدم اٹھاؤ۔

(۴) کیا علم کے "ذریعے" سے ہمیں کچھ تلاش کرنا ہے، یا یہ "خود علم" ہی ہے جس کی تلاش ہم پر فرض کردی گئی ہے؟

(۵) یہ ایک غیر اہم بات ہے کہ فلاں کے علم کا مقصد کیا ہے، علم بجائے خود ایک مقصد ہے۔ ایک ذرّہ اپنی جگہ اُسی طرح اسرار و عجائب سے معمور ہے جیسے پہاڑ۔ تم اپنے کو کیوں تلاش نہیں کرتے؟

(۶) مجھے "میں نہیں جانتا" کہنے میں اِتنی شرم محسوس نہیں ہوتی جتنی "میں جانتا ہوں" کے دعوے میں، ہم حقیقت میں جانتے ہی کیا ہیں؟ اور جو بزعمِ خود ہم جانتے بھی ہیں، اُس پر کس قدر بھروسا کیا جاسکتا ہے؟ کیا اس حقیقت کے فراموش کردینے کی ہم جسارت کرسکتے ہیں کہ علم نامحدود ہے، اور ہماری جہالت کا دریا ناپیداکنار؟

(۷) مکمل علم کا فقدان، ہماری موروثی محرومیٔ قسمت ہے، جس سے آنی رسیدگی کی سعی کو ہم اپنی علمی ترقی سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اِس نام نہاد تمدّن کی کامرانیوں کے باوصف، کیا یہ ہمارے واسطے مقدّر نہیں کردیا گیا ہے کہ ہم تاابد علم کی تلاش میں سرگرداں رہیں؟

(۸) یہ تو اُس چیز کا ایک نہایت ہی قلیل حصّہ ہے، جس کے متعلق ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اُسے "بحیثیتِ مجموعی" جانتے ہیں۔ تم اُس چیز کے بزرگ تر حصّے کے متعلق کیا کہہ سکتے ہو۔ جو ہمیشہ نامعلوم رہا کرتا ہے؟

(۹) جب ہم کسی شے کے متعلق کچھ جان لیں، تو ہمیں یہ محسوس کرنا چاہئے کہ ہم نے اُس کے نہایت ہی مختصر سے حصّے کا علم حاصل کیا ہے۔ کیا ہم اُس کے نسبتہً لامحدود حصّوں اور پہلوؤں کے علم کا تصوّر تک کرسکتے ہیں؟

(۱۰) جب تم ایک پرِکاہ کا بھی علم حاصل کرلوگے، تو اس تمام کُرۂ ارض کا علم تمہیں حاصل ہوجائیگا۔ کیا پانی کی بظاہر ایک حقیر سی بُوند، اتنی ہی پُراسرار اور وسیع المعانی نہیں جتناکہ بے کنار سمندر؟

(۱۱) اندھا اعتقاد تو محض ایک قبضِ مزمن ہے۔ "اندھا اعتقاد" اور "قبضِ مزمن" دونوں ایسے قدیم اور عام امراض ہیں جو ازل کے روز سے انسان کو ستارہے ہیں۔ کیا تم اِس مرض میں گرفتار ہو؟ کیا یہ تمہیں گراہ رہے ہو؟

(۱۲) اشاعتِ علوم کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ جو کچھ تم جانتے ہو، دوسروں تک پہنچادو، اور جو تم نہیں جانتے، دوسروں سے حاصل کرو۔ کیا تم اِس لین دین میں مصروف ہو؟

(۱۳) ہر شخص اپنے جسم کا بیرونی حصّہ مُنقّش کرسکتا ہے، لیکن علم تو باطنی آرائش کا نام ہے، تم نے اپنے کس رُخ کے آراستہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟

(۱۴) ذہانت، جب تک اُس کی پُشت پر قوت نہ ہو، ایک بیکار محض شئے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ بعض اوقات، نچتہ ذہانت، غباوت سے بھی زیادہ باعثِ تکلیف، اور جہالت، بعض حالات میں، علم سے زیادہ خوش آئند ثابت ہوتی ہے۔

فراوانیٔ علم کے دوش بدوش اگر ہماری قوّت بھی برابر کی ترقی نہیں کررہی ہے، تو کیا ہماری حصولِ علم کی تمام کاوشیں، ضائع ہوجانے سے بھی بدتر نہیں ٹھہرائی جاسکتیں؟

(۱۵) عقلِ عمومی (Common Sense) سب سے زیادہ غیر معمولی عقل کے اقسام میں سے ہے۔ تعلیم ارزاں ہے، ذہانت قابلِ حصول ہے، لیکن عقلِ عمومی نوادر میں سے ہے۔ کیا ہم نوادر کے فقدان کی خانہ پُری کرسکتے ہیں؟

(۱۶) ہماری آنکھیں فریب کھاسکتی ہیں، لیکن کیا ہم اپنے الہامات کو دھوکا دے سکتے ہیں؟ طبعی اور الہامی عُلوم، جو بدبختی سے بآسانی حاصل نہیں ہوسکتے، ہمارے نفسی اور حیوانی عُلوم کے بالمقابل کہیں زیادہ قابلِ وثوق ہوتے ہیں۔ کیا اس محرومی کی ہماری مسخ شدہ فطرت ذمّہ دار نہیں ہے؟

(۱۷) اپنے کو حصولِ مقاصد میں محو کردو، اور اِس طرح تم استدلالِ محض کی منزل سے بلند ہوکر اُس رفیع تر حلقے میں داخل ہوجاؤ گے جہاں "استدلال"

کے عوض "وجدان" رہبری کرتا ہے۔ لیکن کیا تم جانتے ہو کہ اس رفیع تر حلقے میں داخل ہونے اور اس وجدانی علم کے ذوقِ حصول سے قریب رہنے کی خاطر تمہیں اپنے کو کس نقطے پر قائم رکھنا چاہیئے؟

(۱۸) آخر میں یہ بھی غور کرنا ہے کہ محض "علم" قابلِ لحاظ ہے، یا علم کا "طریقِ استعمال"؟ کیا سارق کو یہ "علم" نہیں ہوتا کہ سرقہ، فعلِ مذموم ہے، اور کیا اس علم کے باوجود وہ برابر سرقے کی مشق کئے ہی نہیں چلا جاتا۔ علم کیونکر مفید ہو سکتا ہے، اگر وہ ہضم ہو کر خونِ صالح نہ بن جائے؟ "جاننا" اور "رچ جانا" دوسری چیز ہے۔ کیا تم صرف "جاننے" ہی تک رہنا چاہتے ہو؟

(۱۹) ذہنی جنون دوہرا ہوتا ہے، جس کے ایک طرف تو ... اعتقاد ہوتا ہے، اور دوسری طرف عدم استدلال کیا تم نے اس سے باہر، اور ان دونوں کے درمیان کوئی راستہ نکال لیا ہے؟

(۲۰) اس دُنیا میں دو طرح کے حمقا پائے جاتے ہیں۔ ایک سمجھتا ہے ہر شئے قابلِ فہم ہے، دوسرا سمجھتا ہے۔ ایک شئے بھی قابلِ فہم نہیں۔ تم کدھر ہو؟ کیا تم اِن میں سے کسی ایک جُرم کا ارتکاب کر چکے ہو؟

—— (۴) ——

حق و راستی

(۱) حق، اس دُنیا میں صرف ایک ہی ہے، لیکن اُس کی تاویلیں لاکھوں اور اُس کے مفسر بیشمار ہیں۔

(۲) حق، خود آشکارا ہے۔ کیا یہ دکھانے کے لئے شمع کی ضرورت ہے کہ دیکھو یہ روشنی ہے،

(۳) ثقافت (CULTURE) نے نہایت ہی غیر دانشمندانہ طور سے حق کو اوہام اور پروپگنڈے کے بادلوں میں چھپا دیا ہے، اور اس وقت جو کچھ بھی ہم دیکھ رہے ہیں، وہ حق نہیں ہے، بلکہ اُس ابر کے مختلف رنگ ہیں۔ جو حق کو مستور کئے ہوئے ہے —— حق کی یہ کتنی شاندار قدر افزائی ہے!

(۴) اگر مجھے بتا دیا جائے کہ دیکھو یہ حق و راستی ہے، تو میں مرتے دم تک اس کا اتّباع کرونگا۔ لیکن کیا حق و راستی کے متعلق، اکابرِ عقلا کے درمیان شدید و ناقابلِ تصوّر اختلافِ آرا کا ہنگامہ برپا نہیں ہے؟ آخر میں کس کی تقلید کروں؟

(۵) جب ہم اس پروپگنڈے کے بے پایاں انبار کو دیکھتے ہیں جو ہمارے دماغوں پر لاد دیا گیا ہے، اور حق و راستی کی اُس خفیف مقدار کو محسوس کرتے ہیں، جس پر ہم سے ایمان لانے کا مطالبہ، محض اس بنا پر کیا جاتا ہے کہ حق کی وہ خفیف سی مقدار ایک ذہنی وراثت کی طرح نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی چلی آرہی ہے، تو ہم اس درجہ سراسیمہ و بدحواس ہو جاتے ہیں کہ ہمیں خود اپنی ہستی مشکوک نظر آنے لگتی ہے؛ اور سوال یہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ آیا ہماری عقل اب تک درست ہے، یا ہم مجنوں ہو چکے ہیں؟

(۶) کوئی شخص دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُس نے راستیٔ مطلق کو پا لیا ہے اس غریب نے جو کچھ بھی اپنے خیال میں پایا ہے وہ محض اسکے نقطۂ نظر سے راستیٔ مطلق کی تاویل ہے اور کچھ نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کسی تاویل و تعبیر کو اسقدر اہمیت و استواری کیوں دی جائے

(۷) اس کائنات کی پہنائیوں، اور وسعتوں کے مقابلے میں انسانیت اُس مینڈک یا چیونٹی کے مانند معلوم ہوتی ہے جو دلدل میں پھنسی ہوئی ہو۔ پھر بھی ہم میں سے بعض نہایت ہی شوخ چشمی کے ساتھ یہ دعویٰ کرنے کی جسارت کرتے ہیں کہ انہیں اُس حق و راستی کا علم حاصل ہو گیا ہے جو ایک بے پایاں وسعت ہے، اور جس کا صرف ایک رُخ، محض اُس مخصوص ذہنیت کے سامنے آسکتا ہے۔ جسے اُس رُخ کے ساتھ طبعی مناسبت ہو۔ کُل حق ہمیشہ نامعلوم رہیگا، تو پھر یہ معلومہ حق و راستی کیا ہے؟ جزو، یا کُل؟

(۸) جب تم یہ محسوس کرنے لگو کہ تمہیں حق کا علم حاصل ہو گیا ہے تو آگاہ ہو کہ تم درحقیقت اپنے کو دھوکا دے رہے ہو۔ حق وہ نہیں ہے جسے تم حق سمجھ رہے ہو، وہ تو قطعی اور لازمی طور پر وہ شئے ہے جس کے سمجھنے میں تم ناکام ہو چکے ہو۔

کیا تلاشِ حق کے رستے کی ناکامیاں اتنی مسخری ہیں کہ اپنی شکلوں پر حق کے چہرے لگا کر اپنا جلوس نکالتی ہیں؟

جب حق و راستی کی خیرہ کُن روشنی کی طرف تم نگاہ اُٹھاتے ہو، تو کیا تمہیں یقین نہیں ہوتا کہ تم اُس کے نسبتہً غلط رُخ پر نگاہیں جمائے ہوئے ہو؟

(۹) کسی چیز کے دونوں رُخ دیکھنے کی سعی کیوں نکرو، خواہ اس کاوش میں تمہیں ہزار بار گردن موڑنا، اور گردش کرنا ہی کیوں نہ پڑے؟ کسے معلوم کہ اُس شئے کا دوسرا رُخ زیادہ درست، اور زیادہ خوبصورت نہ ہوگا؟

(۱۰) اگر تم اُس حق و راستی پر قانع ہو جو تمہیں معلوم ہے، تو یاد رکھو

تم مرنے کے بعد بھی حق کو معلوم نہ کر سکو گے۔ کیا تم جانتے ہو کیوں؟

(۱۱) اگر کوئی حق کی جستجو کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے جھوٹی شرم اور بیجا تحقیر کو خیرباد کہہ دے، اور پھر جس طرح سے جو بات محسوس کرے، اُسی طرح بے جھجکے دوسروں کو بھی محسوس کرادے، کیا تم میں اِس قدر جرأت ہے؟

(۱۲) تنگ اور چھوٹے دماغوں میں وسیع حقائق کی گنجائش نہیں ہوتی، حق کو اِن دماغوں میں داخل ہونے کے لئے سکڑنا، اور سمٹنا پڑتا ہے، اور اِس طرح سکڑنے اور سمٹنے کے باعث حق، چھوٹے اور تنگ دماغوں میں مختصر اور بدہیئت ہو کر ہی داخل ہو سکتا ہے۔

کیا ہمارے تمدّن کے کارخانوں میں آئے دن ایسے ہی ارزاں حق طیار نہیں ہوا کرتے، جو چھوٹے چھوٹے دماغوں میں داخل کرنے کیلئے بنے بنائے ہر بڑی دکان سے مل جاتے ہیں؟

(۱۳) اکثریت، حق کو ہمیشہ اپنی جلو میں نہیں رکھ سکتی۔ اور کیا حمقاء کے واسطے، عقلاء کی پیروی کرنے کے عوض، یہ آسان نہیں ہے کہ وہ اکثریت کی تقلید کریں؟

(۱۴) بیشک تم حق پسند ہو سکتے ہو، لیکن اِس کے یہ معنی تو کبھی ہو ہی نہیں سکتے کہ تم تلاش حق میں کامیاب و کامراں ہو کر ہی رہو گے۔ اِس پروپگنڈے کی دُنیا میں حق، ایک ایسی زنِ بازاری ہے، جس کے خدمات بہت آسانی کے ساتھ خرید، یا فروخت کئے جا سکتے ہیں۔ تو اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ ہم "حق" کی تلاش کریں، یا اُن "ذرائع" پر قابو پانے کی سعی کریں، جن سے حق خریدا جا سکتا ہے؟

(۱۵) میں حق کا نام کیوں لوں؟ کیا اِس لئے کہ میں اُس کی اولیت پر اعتقاد رکھتا ہوں، یا ترجیحی طور پر محض اس لئے کہ اُس کا تذکرہ بہت ہی سادہ اور دلچسپ ہوا کرتا ہے؟

(۱۶) ہمارا اعلیٰ حق، "نظری مکروہات" سے، اور ہمارے عملی کردہات "نظری مطمح نظر" سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ آہ یہ کس قدر مشکل ہے کہ ہم اشیا سے بالکل وہی سلوک کریں، جیسی کہ وہ درحقیقت واقع ہوئی ہیں، اور اِس سے قطع نظر کرلیں کہ وہ اُس وقت کیسی معلوم ہوتی ہیں، جب حروف والفاظ کے ذریعے سے انہیں پیش کیا جاتا ہے!

(۱۷) تم خواہ کتنی ہی حقانیت وراستی سے کام کیوں نہ لو، لیکن موقع، یا وقت اگر اُس کے خلاف ہے، تو کیا تمہاری وہی حقانیت وراستی، بطالت وناراستی کا کام نہیں کرجاتی؟

کتنے مواقع پر حق، نفسِ حق پر مبنی ہونے کے عوض، محض اِس امر پر مبنی ہوتا ہے کہ ہم کسی نہ کسی سبب سے اُس پر اعتبار کرنے کے واسطے رضامند ہوتے ہیں۔

(۵)

فطرت

(۱) فطرت، نفاست کے ساتھ خوبصورت ہے، اور کیا درحقیقت وہ اِس سے بھی زیادہ خوبصورت نہ ہوتی اگر جاہل انسان کی فریب کاریوں نے اُسے بہت سی خوبیوں سے محروم نہ کر دیا ہوتا؟

(۲) فطرت کی "بیماریوں" کے دور کرنے کے لئے ہمارے غیر فطری مساعی اس قابل ہیں کہ اُن کا مضحکہ اُڑایا جائے۔ فطرت میں اضافے کی کوشش کرو، اور پھر دیکھو کیا تم خود قابلِ تمسخر نہیں بن گئے ہو؟

(۳) فطرت، انسانی حماقتوں کے واسطے کافی حاشیہ (گنجائش) چھوڑ دیا کرتی ہے، لیکن فریب خوردہ تحقیرِ انسانیت، اِسے تمدّن کی فتحمندی سے تعبیر کرتی ہے، کیا فطرت پر فتح یابی کا تخیّل، محض ایک فریب نہیں ہے؟

(۴) فطرت کے اصول میں تقریباً بے عنصر استثنیٰ، اور انسان کے استثنیٰ میں، تقریباً بے عنصر اصول۔

(۵) فطرت، گاہ گاہ مستثنیات کو ترجیح دے سکتی ہے، لیکن اُس کے قوانین واصول انہیں برداشت کرنے سے قطعی انکار کردیتے ہیں،

(۶) فطرت، اور تمدّن کی جنگ میں ہمیشہ فطرت ہی فتحیاب رہتی ہے، لیکن کیا اب تک تمدّن مایوس نہیں ہوا ہے؟

(۷) فطرت کے حدود سے نکل جاؤ، اور کیا اُس وقت وہ تم پر اپنی تمام ناقابلِ دفاع قوتوں سے حملہ نہ کردیگی؟ اور اگر اُس سے صلح کرلو تو کیا وہ اپنے تمام خزانے تمہارے قدموں پر نہ ڈال دیگی؟

(۸) فطرت مقروض نہیں ہے، وہ تمام مطالبات مع سود ادا کردیتی ہے، تم فطرت کو آسانی کے ساتھ دھوکا نہیں دے سکتے، اور اپنے افعال کو بے قیمت نہیں سمجھ سکتے، کیا فطرت انکی تمام قیمت ادا نہیں کردیتی؟

(۹) فطرت، بشدت تمام "عملی" ہے، لیکن احمق انسان "نظریات" کے انبار سے اس میں افزائش کی سعی کرتا ہے۔

(۱۰) جب ہمارے اہلِ سائنس، فطرت کے نہاں خانے سے کسی چیز کے چرا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو فطرت انسانی تجسّس کی نبضیں ٹھہرا دینے کی خاطر ہزاروں گھاتوں سے مسلح ہو کر کمینگاہ میں ہمارا انتظار کرتی رہتی ہے۔

(۱۱) ہمارے تمام قرنوں، اور صدیوں کے سائنس جمع ہو کر بھی فطرت کے ایک انچ کی بھی خانہ پُری نہیں کر سکتی۔

(۱۲) تمدّن کی تمام متفحص کاوشیں، صرف یہ ایک معمولی سا فیبا امتیاز پیدا کرتی ہیں کہ یہ شئے "ساختۂ فطرت" ہے، وہ "ساختۂ تمدّن"۔

(۱۳) فطرت کے منہ میں لگام چڑھانا اُس وقت تک انسان کی قوّت سے باہر ہے، جب تک وہ خود اپنی رضامندی کا اظہار نہ کر دے۔ کیا اسے فتح یابی کہا جا سکتا ہے؟

(۱۴) فطرت سے جنگ کر کے انسان، ایک مستقل مایوسی کو دعوت دیتا ہے۔ خوشی عصری صنعتوں میں نہیں، فطرت سے قرب میں مضمر ہے۔

(۱۵) ہم فطرت کو اپنے موروثی نظریات کا مطیع بنانے کی سعی کرتے ہیں، اور جو زندگی یوں بسر کی جاتی ہے، کیا وہ ایک مصیبت کی زندگی بن کر نہیں رہ جاتی، اور کیا ہم اس طرح غیر فطری ہونے کے نتائج سے مجروح نہیں ہو جاتے ہیں؟

(۱۶) فطرت کے بدل کا تلاش کرنا امیدِ موہوم سے زیادہ نہیں۔ ہماری عصرِ حاضر کی اعلیٰ درجے کی مصنوعی زندگی نے صرف یہ کیا ہے کہ ہماری مصیبتیں اور بربادی ہیں، اور بس۔

(۱۷) اپنے انواع کی ترتیب میں فطرت، کسی کی جنبہ دار واقع نہیں ہوئی ہے، اور جب میں "فطرت کی طرف پلٹو" کا نعرہ بلند کرتا ہوں، تو اُس سے میرا یہ مقصود ہوتا ہے کہ ہم اُس مجلسی و اقتصادی مساوات کی سطح پر آجائیں، جو ہماری ہستی کے لئے ایک قدرتی چیز ہے۔ اور کیا اُس سطح پر آجانے کے بعد ہم اُس پروپگنڈے سے نجات حاصل کرنے کی توقع نہیں کر سکتے، جو عدم مساوات نے پیدا کر رکھا ہے؟

(۱۸) ہر چند فطرت، پُر اسرار ہے، لیکن کیا وہ اپنے پرستاروں کے سامنے اپنے اسرار پیش نہیں کر دیتی؟

(۱۹) جو کمزور ہیں، وہ فطرت سے کمزوریاں حاصل کرتے ہیں، اور جو قوی و توانا ہیں، وہ توانائی، کون ملزم ہے، الزام کسے دیا جائے؟

(۲۰) تمدّن کی کامرانی اِس تناسب پر مبنی ہے کہ ہم نے فطرت سے علم کی کس قدر مقدار، اور خود فطرت سے کس قدر قربت حاصل کی ہے۔ کیا عصرِ حاضر کی مصنوعی زندگی سُن رہی ہے؟

(۲۱) فطرت کا بہاؤ نرم ہے، کیا ہماری تکلیفیں خود ہمارے ہی ایجادات کے نتائج نہیں ہیں؟

(۲۲) میں فطرت کے احکام کی پابندی کرتا ہوں، اور میرے افعال پر جو بھی تحسین و نفرین کی جائے، صرف فطرت ہی اُس کی تنہا مستحق ہے، میرے اعمال کی جو بھی مذمت یا تعریف کی جاتی ہے، اُس کا رُخ صرف فطرت کی طرف ہوتا ہے، یعنی فطرت ہی لائقِ مدح ہے، اور شایانِ مذمت، میں بیچ میں اپنی ٹانگ کیوں اڑاؤں؟ سوسائٹی مجھے کیوں نوچے ڈالتی ہے؟

(۲۳) کیا اس باب میں درحقیقت فطرت رقیق القلب و رحمدل نہیں ہے کہ وہ ہمارے معزز شہریوں کو یہ معلوم ہونے نہیں دیتی کہ وہ اس درجہ حقیر ہیں کہ اُن کے مر جانے کے بعد بھی کارخانۂ عالم اِسی رونق سے چلتا رہیگا جیسا کہ اُن کی حیات میں چل رہا ہے؟

(۲۴) ایک نہ ایک دن انسانیت، اپنے تمام شاندار و عظیم تمدّن و تہذیب اور اپنے تمام مقدس دیوتاؤں اور اوتاروں کے ساتھ صفحۂ ارض سے مٹ جائے گی، لیکن فطرت ہمیشہ باقی رہنے پر اَڑی رہیگی۔ اِس سے کسے خوف کھانا چاہئے، انسانیت کو، یا فطرت کو؟

(۶)

اِنسانیت

(۱) آدمی "غیر معلوم" درخت کا "معلوم" پھل ہے۔

(۲) پہلے بچے کی پیدائش، انسانیت کو اپنے ساتھ لائی تھی۔

(۳) جب پہلے پہل دُنیا خلق کی گئی تھی، کیا خدا اپنی مخلوق سے خوش نہ تھا؟

(۴) اُس دن کو بھی کس قدر منحوس ہونا چاہئے، جب خدا نے نوعِ انسانی کو خلق فرمایا تھا، اُس نے انسانوں کو غالباً اپنے سے زیادہ دانشور پایا ہوگا، اِسی وجہ سے تو دُنیا کی حکومت، انسان کے سپرد کر کے اُس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

(۵) انسانیت کے سمجھنے کا بہترین اسلوب کیا ہے؟ کیوں نہ یہ سمجھ جائے کہ خدا انسانی شکل میں اپنی کم نظری کی معذرت کر رہا ہے؟ کیا انسان

بحیثیتِ مجموعی، ایک کامل صانع کی ایک شر آمیز صنعت نہیں ہے؟

(۶) اس دُنیا کا سب سے اہم مسئلہ "انسانیت" ہے، لیکن ہم میں سے کتنوں کو اس کا موقع دیا گیا ہے کہ اُس کا صحت کے ساتھ مُطالعہ کر سکیں؟ اور چونکہ ہم مطالعۂ انسانیت کے باب میں ناکام رہتے ہیں، اس لئے کیا ہم انسان کی حقیقی قدر و منزلت اور واقعی اہمیّت کا اندازہ کرنے میں افراط و تفریط کے مرتکب نہیں ہو جاتے؟

(۷) "انسان" معارف و حقائق کا ایک لبریز خزینہ ہے، اور خود ہی ایک ایسی حقیقت ہے، جو تمام خزائن معارف و حقائق کے مقابلے میں عظیم تر ہے۔

انسان کا مُعمّہ خود انسان ہے، اور نوعِ انسانی کے علاوہ اس مُعمّے کو حل کون کر سکتا ہے؟

(۸) اِدھر آدمی ہیں، اُدھر آدمی ہیں، ہر طرف آدمی ہی آدمی ہیں، اور ہم اس کے سوا کیا جانتے ہیں کہ سب "آدمی" ہیں، بعض تو صرف بہائم کی صحبت کے لئے موزوں ہیں، اور اکثر اس مرتبے سے بھی فروتر ہیں۔

اگر فطرت کے مُردود و کمزور افراد کی اس باب میں امداد کی جائے کہ وہ جلد تر اس دُنیا کو چھوڑ دیں، اور ہماری وہ قوتیں جو ناکارہ و کمزور افراد پر رحم کرنے میں برباد و ضائع ہو رہی ہیں، صرف قوی اور فطرت کے محبوب انسانوں کی تکمیل میں صرف ہونے لگیں، تو غور تو کرو انسانیت کے ارتقاء کی صورتیں کس قدر جلد پیدا ہو سکتی ہیں!

(۹) انسان کی فطرت اس درجہ مُسرف اور فضول خرچ واقع ہوئی ہے کہ صرف اسی چیز کو بچا سکتی ہے، جس کا برباد و ضائع کر دینا اُس کے امکان سے خارج ہوتا ہے۔

(۱۰) انسان کی فطرت تو یہ ہے کہ وہ کُتّوں کی طرح ہڈیوں پر لڑتا ہے، لیکن دکھاتا یہ ہے کہ میں فرشتوں سے بھی افضل ہوں، کتنی غیر فطری بات!

(۱۱) ہم آج بھی وہی زمانہ قدیم کے وحشی انسان ہیں، صرف اتنا ہوا ہے کہ انسانیت کے باب میں ہمارا نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ اور ہم نے اپنے غُرّاتے ہوئے چہروں پر تبسم و تمدّن کی نقاب ڈال لی ہے۔

(۱۲) کیا محض چند نفوس کی مسّرتوں کی خاطر، انسانوں کے ایک عظیم گروہ کو ابتلا میں گرفتار کر دینا، نوعِ انسانی کے غیر انسانیت آمیز ادراک کی علامت نہیں ہے؟

(۱۳) کیا "انسان" تمام روئے ارض پر، اور تمام جانداروں میں سب سے زیادہ خطرناک جانور نہیں ہے؟ اسکے دائرہ حکومت میں کوئی شے بھی محفوظ نہیں ہے، نہ خود ہماری زندگی ہی، نہ یہ کُرۂ ارض جس پر ہم آباد ہیں۔ سائنس نے خوفناک آلات ایجاد کر کے اس کی خوفناکیوں، اور درندگیوں کو اور بھی پُرہول بنا دیا ہے، اور آج سوال عتابِ الٰہی کا نہیں، بلکہ عتابِ انسانی کا ہے۔ اس استیلائے نوعِ انسانی کا آخر کب خاتمہ ہوگا؟

(۱۴) جب ہم سب، اس طور سے زندگی بسر کرنے سے نافر ہیں، جس پر زندگی کا موجودہ نظم ہمیں مجبور کر رہا ہے، تو حیرت ہے اب تک انسانیت نے خودکشی کیوں نہ کر لی؟

اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، اس منزل پر بھی اگر ہم سب مل کر کوشش کریں، کہ یہ دُنیا جنت بن جائے، تو کیا آدم کی اولاد اسکی صلاحیت نہیں رکھتی؟ صلاحیت ہے تو پھر انتظار کاہے کا ہے، آج ہی سے کام کا آغاز کیوں نہ کر دیا جائے؟ جھجکتے کیوں ہو؟ کیا تم بُزدل ہو؟

—— :(باقی آئندہ):

رباعی

حضرت سیماب اکبرآبادی

پندار سے دل تباہ ہو جاتا ہے
انساں یونہی روسیاہ ہو جاتا ہے
نیکی کے فرشتے، تجھے معلوم بھی ہے
ہر سانس میں اک گناہ ہو جاتا ہے

خزینۂ محبت

میرے رونے کا جس میں قصہ ہے
عمر کا بہترین حصہ ہے! (جوشؔ)

(ملک حبیب احمد۔ بی۔ اے۔ آنرز)

—— (۱) ——

لاہور

۱۰۔ جنوری ۱۹۳۶ء

انور۔ میں جانتا تھا کہ تمہارے فیض آباد جانے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ بہرحال وہی ہوا، جس کا مجھے خدشہ تھا، تم وہی پیام لائے جس کو میں سنتے سنتے زچ ہو چکا ہوں۔ تعجب ہے کہ تم بھی باوجود اپنی تعلیم اور خیالات کے مجھے شادی پر مجبور کرتے ہو۔ شادی کر لوں اور اپنی حیاتِ آزادی کا خاتمہ خود ہی کر لوں۔ "کسی" کی مرضی کا مقید ہو جاؤں، یہی چاہتے ہو نا، انور! یا اس سے زیادہ اور کچھ؟ . . . . میرے نزدیک "مرد" خلقت کی تفصیل نفسی ہے، "عورت" تفصیل تقابلی اور شیطان تفصیل کل۔ تم نے دیکھا کہ مرد، عورت کے قریب ہونے سے شیطان سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اگر قدرت عورت کی تخلیق نہ کرتی تو ہماری تمہاری دنیا کا اور ہی رنگ ہوتا . . . . قناعت اور خوشی، خوشی اور نجات، سب ہمارے ہوتے، لیکن اب تک جو کچھ عورتیں مرد کو دے سکی ہیں، وہ ایک شرمناک داستان ہے۔ رقابت، غصہ، قتل، اور رسوائی کی، اور جن احمق مردوں نے اس سراب سے دھوکا کھا کر اس کو بھی گوارا کر لیا، تو عورت اس مرد کو بھی ناگن بن کر ملی جس نے اس محسن ہاتھ کو ڈسنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ جس نے اسے پالا تھا۔ تمہیں کہو کہ کیا کبھی کوئی عورت آیۂ رحمت و ملاطفت ثابت بھی ہوئی؟ حوّا کی آرزو، زلیخا کا عشق، ہیلن کی عشوہ سازیاں، کلوپٹرا کی فریب کاریاں، ایک ایک کر کے تاریخ کے صفحات پر خونی حروف میں لکھی ہوئی ہیں۔ تم ان کو دیکھنے سے انکار کر دو۔ انور، نہیں، میں تو جان بوجھ کر آنکھوں پر پٹی نہیں باندھ سکتا۔

تم کہو گے، یہ سب فلسفیانہ موشگافیاں ہیں۔ لیکن میں تمہیں اس سے زیادہ اور کیا جواب دوں کہ عورت ابھی تک نہیں بھولی کہ وہ حوّا کی بیٹی ہے اور وہ اپنی اُن بیشمار بہنوں کے فسانے جانتی ہے۔ جن کی ناممکن الحصول آرزوؤں نے اس دُنیا کو کچھ دوزخ سے بھی بدتر چیز بنا دیا۔ سوچو، سوچو، انور کونسی خونریز جنگ ایسی تھی، جس کی تہ میں عورت نہ ہو۔ کونسا بھیانک فعل ایسا تھا۔ جس کے ارتکاب میں اس کی رضا نہ ہو، . . . . عورت سمجھتی ہے کہ وہ مرد کے دل و دماغ پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے، وہ اپنی اس خواہش، اس آرزو، اس تمنا، کا اعتراف خواہ صاف الفاظ میں نہ کرے۔ لیکن اس کا ہر فعل اس جذبے کے ماتحت ہے کہ وہ مرد کو اپنا بے عذر غلام بنا لے اور اس کی آزادانہ قوت عمل کو سلب کر دے۔ وہ جہانگیر کی غلامی اور نورجہان کی حکومت سے واقف ہے اور اسی لئے چاہتی ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو اس کی خاطر ایک بار پھر دہرائے . . . . . کنواری، بیاہی، بیوہ، —— عورت آخر عورت ہے اور ہر وقت اپنے خیال اور ارادے کو تبدیل کر سکتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت حسین ہے اور ہر حسین چیز اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہے لیکن اس پُرفن مخلوق نے اپنی مکاری اور حیلہ سازی کی بدولت صیادی میں کمال پیدا کیا ہے۔ تعجب ہے، مرد زیادہ عاقل اور زیادہ ہوشیار ہونے کے باوجود اس معاملے میں عقل سے کام نہیں لیتا۔ عورت کے حسن کی ضیا وایک جہنمی بھٹی کی چمک ہے۔ جو مردوں کے معصوم تخیلے کو جھلس دینے کے لئے ہر وقت شعلے بھڑکاتی رہتی ہے۔ اس کا جسم ایک خطرناک بھنور ہے، جو حسین اور نظر فریب ہونے کے باوجود یقینی طور پر قعر دریا سے



ملک حسن احمد بی اے آنرز ۔

Calcutta Art Press Delhi

ۓ ارادہ رکھتا ہے۔ اس کی خوبصورت آنکھیں، تم
...یف وصہبا کے چھلکتے ہوئے پیمانے ہی کیوں نہ ہوں،
...ہا شیطانی نظر آتا ہے۔ جس چیز کو تم عورت کی معصومیت
...ں گند ذہنی اور حماقت خیال کرتا ہوں۔ تم اس کی نزاکت،
...ے قائل ہو، لیکن انور میں اسے نکما پن سمجھتا ہوں۔
... کے تخلیق کردہ کرداروں کی رومانوی دنیا میں بسنے والے انور!
... کا ... افسانہ محض تھی۔ تم سے خود غرض اور فریب کاری کی
... اس کو ... نہ کرو۔ ڈسڈیمونا کی پاکیزگی اور محبت ... اہ
... میں نہ ملے گی۔ روزالنڈ کی وفاداری اور ... کے
... تمام ہی محدود ہیں۔ ... کی پشیمانی، یوسف کی ... پر ...
... کی حسرتیں ... کا خون، ... کا زوال تم ... سے
... بھیک مانگ رہے ہیں۔ ... ...

——— ٭(۳)٭ ——— منور

لکھنو

۳- اپریل ۱۹۳۵ء

انور! میری حورِ ارضی کے متعلق دریافت کرتے ہو؟ محمود نے تمہیں
بتایا ہوگا کہ اس کیف آور شام کو ——— باغ کی نکہت نواز فضا
میں اس پیکرِ رنگ و بو کو دیکھ کر میری وارفتگی کا کیا عالم تھا۔ پروفیسر یونس
کے الفاظ یاد کرو۔ جب انہوں نے ایک مرتبہ میرے متعلق ہنستے ہوئے
کہے تھے "وہ عورت فاتحِ عظیم ہوگی جو منور کے دل پر حکمرانی کرے گی" لیکن
انور آج میں وہی منور ہوں جو ایک الله الجمال کی تجلی پاش نگاہوں کی تاب
نہ لاکر اپنا دل، اپنا دماغ، اپنی تمام کائنات، بازنگاہ کی پرآرزو درخواست
کے ساتھ اس کے ملکوتی قدموں پر نچھاور کر چکا۔ ہر مرد کی زندگی کے راستے
میں ایک عورت آتی ہے جو اس کی تمام کائنات پر حاوی ہو جاتی ہے، اس کے
افعال اور ارادوں پر چھا جاتی ہے۔ میں نے معلوم کر لیا۔ انور، اپنی موت و
حیات کو پا لیا۔

کاش تم اسے دیکھ سکتے! میری تمناؤں اور آرزوؤں کو ایک ہی
بار دیکھ لیتے۔ کاش! میں روز شام کو دن بھر کی سینہ کوبی کے بعد باغ
میں جاتا ہوں، اور اپنے صبر و سکون کی نذر اس کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔

انور! روز بروز اس کی وحشی نگاہیں پُرمحبت ہوتی جاتی ہیں۔ اس کی شرمیلی
لیکن پھر بھی بیباک نگاہیں، مجھے دعوتِ بے خودی دیتی ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ اس کی زیبائی اور رعنائی کو الفاظ کی قید میں
لاکر تمہارے لئے ایک مرقع بناؤں۔ لیکن چاند کی ٹھنڈی اور نظر نواز چاندنی
کو باکمال سے باکمال مصور کی رنگ آمیزی اور چابکدستی بھی صفحۂ تصویر پر ایسی
دلآویزی کے ساتھ منقوش نہیں کر سکتی ... خدائے حسن و جمال سے تم مرکی
زبان اور ... کا ... چاہتا ہوں!

وہ شباب و سحر کا پیکرِ جمیل ہے، جو شاعر کے تخیل سے زیادہ
اچھوتا، نغمے کی کیفیت سے زیادہ لطیف، تصویر کی رنگینی سے زیادہ
خوش منظر ہے۔ اور وہ جانِ آرزو گلستانِ حیات کی سولھویں روش پر
شباب کے وجد آفریں پھول کھلا رہی ہے۔ اس کے پُر وقار سینے کی گہرائیوں
میں خدائے عشق ایک پُرخمار انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا ہے۔ اس کے پیارے
پیارے چہرے کی ساخت میں یونانی صنم گری کی رعنائی پنہاں ہے اور
حسن خوابیدہ کی ... کیفیت۔ اس کی آنکھیں، "ظالم آنکھیں" بڑی بڑی سیاہ
اور ... آنکھیں، بدن سڈول، چہرہ ... اور - - -
- - کیسا؟ - - - - کیا انور؟ اس کی تشبیہ
کی تلاش خیال کی گہرائی سے ... اور کچھ نہیں۔

جی نہیں چاہتا کہ میں اس کے ذکرِ جمیل کو چھوڑ دوں لیکن دماغ میں
ارتعاش پیدا ہو چکا ہے۔ اب رات کے دو بجے ہیں۔ وہ ساحرہ سو رہی ہے
اور سوتے فتنے جگا رہی ہے۔ مجھ نامراد کی آرزوئیں۔ اس کی کافرماجرائی کو
تھپک تھپک کر، جھلا جھلا کر سلا رہی ہیں۔ اچھا خدا حافظ! میں بھی
ایک افسانے کے آغوش میں سو جانا چاہتا ہوں! تمہارا
——— ٭(۴)٭ ——— منور

لکھنو

۱۹- اپریل ۱۹۳۵ء

انور! کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس حسن رنا کی دیوی کا نام کیا ہے؟
تم نے کبھی سنا بھی نہ ہوگا جس طرح اس کی خوبصورتی اور لطافت تمہارے
تخیل کے بس کی نہیں۔ اسی طرح اس کا پیارا پیارا نام بھی تمہارے خیال
میں نہیں آ سکتا، دیکھو اس کا نام ہے۔ گلنار، جمال گلنار، سمجھے کس قدر

گو میں آزادی سے گلنار کے وہاں جا سکتا ہوں۔ جاتا بھی ہوں لیکن اپنے لئے نہیں۔ گلنار کے لئے۔ میں اپنے قیام کو طویل نہیں کر سکتا جب وہاں تھوڑی دیر ہوں یا زیادہ دیر، میری نگاہ شوق نہایت غیر ارادی طور پر میرے عشق کا پیام رنگین بیان کرتی رہتی ہے۔ میں باوجود ہزار شوق کے بھی اپنے رخ سخن کسی اور جانب نہیں کر سکتا۔ اس حالت میں تم جانتے ہو "کسی" کی آرزو کب تک پردے میں رہیگی؟ گلنار بھی اس معاملے میں مجھ سے متفق ہے، میں اس کے پاس جاتا ہوں۔ مگر صرف ایک دفعہ کالج سے واپسی پر، تھوڑی دیر بیٹھتا ہوں، اور اس کے والدین سے فراوانی کار کا عذر کر کے چلا آتا ہوں، اور پھر دوبارہ اس دیار شعر و موسیقی کی جانب روانہ ہو جاتا ہوں۔ رات ہو جاتی ہے! یکے بعد دیگرے بہت سی راتیں، اسی طرح گذر گئیں کہ میں ان کی کوٹھی کے باہر چکر کاٹ رہا ہوں، اور گلنار کو خبر تک نہیں۔ انور! گو یہ وقت نہایت تکلیف و اضطراب میں گذرتا ہے لیکن مجھے اس میں بھی ایک تسکین معلوم ہوتی ہے۔ گلنار کا کمرہ شرق کی جانب کھلتا ہے آج کل کی راتیں، خنک، بھیگی، بھیگی راتیں ایک دیوانے کو دیکھتی ہیں جو مولسری کے پر شوکت درختوں کے قریب کھڑا رہتا ہے۔ کھڑکی کے قریب سے ایک سایہ گذر جاتا ہے اور وہ دیوانہ اس وقت معلوم نہیں اپنے دل سے کیا کیا باتیں کرتا ہے۔ خاموش اور ہولناک رات میں کوٹھی کے درخت دیو معلوم ہوتے ہیں۔ جو الف لیلہ کی کہانیوں سے نکلکر اپنی شہزادی کی محافظت کو کھڑے ہیں۔ جب تک روشنی گل نہیں ہو جاتی، میں کھڑا رہتا ہوں۔ کمرے میں ہر حرکت جس کا سایہ منور کھڑکی کے شیشوں اور پردے پر پڑتا ہے۔ میرے دل میں ایک نہ ایک تاویل پا لیتا ہے۔ کبھی وہ کتاب بند کرتی ہے۔ کبھی دوسری کتاب اٹھا لیتی ہے کبھی اپنے رخ پر بکھرنے والی گستاخ زلفوں کو جھنجھلا کر ہاتھوں سے ہٹا لیتی ہے۔ اس ارمان و حسرت کے جیتے جاگتے ڈرامے کا انجام ایک پر شباب انگڑائی ہوتی ہے۔ جس کے بعد روشنی گل کر دی جاتی ہے، اور میں آرزو و حسرت سے ہم کنار اپنے خوابوں کی شہزادی کو ایک ساکت الوداع کہکر چل دیتا ہوں۔

انور! میں نے آج تک گلنار کو اپنی ہر روز کی آمد سے مطلع نہیں کیا۔ گلنار کو اس کے متعلق بتا کر میں اس چیز کی شعریت تباہ نہیں کر سکتا یقیناً حسن آگاہ عجیب چیز ہے۔ لیکن حسن بے خبر لطیف تر۔ تمہارے خطوں میں اب کافی دیر ہو جاتی ہے لیکن میری طرح ۔ ۔ ۔ ؟ تمہارا منور

—:(۶):—

دارجلنگ

۱۸۔ اگست ۱۹۳۵ء

انور! کل رات کو سخت بارش ہوتی رہی۔ اور پھر پہاڑی مقامات پر بارش تھوڑی سی بھی ہو تو بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ دن بھر باہر جانا تو ممکن نہ ہوا لیکن میں گلنار کو غالب کے اشعار سناتا رہا۔ اچھے شعر پر گلنار جھوم جاتی تھی، اس کا تمام شباب جھوم جاتا تھا۔ اور اس پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی تھی، وہ کیا کیفیت تھی، انور! میں خود الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھو کہ اس کے دونوں خوبصورت رخسار دفور شباب سے تمتما اٹھتے تھے۔ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آ جاتی تھی، جیسے کوئی دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن جائے۔ اس کی سانس موزونیت سے تیز چلنے لگتی تھی گویا جوش جوانی بہ نکلے گا۔ اور یہ حسین سیلاب دنیا کی تمام بدصورت چیزوں کو رنگین اور حسین کر دیگا۔

کوئی چار بجے ابر کھل گیا لیکن ہوا میں خنکی تھی۔ سنکر آفریں ہوا، اور شباب کی رعنائیوں سے چور، عورت کی معیت، ایک تنہائی سیر کے لئے کیسے ناممکن الحصول لوازمات ہیں، تم تصور نہیں کر سکتے؟ جوان ہو جاؤ انور! جوان!! سن و سال میں نہیں، جذبات میں جوان اور محسوس کرو کہ میں کیا کر رہا ہوں۔

ہم دونوں سیر کے لئے چلدیئے۔ صاف شفاف، نیلا نیلا آسمان، شراب و شباب سے لدی ہوئی ہوا، پہاڑوں کے تنگ راستے، درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑ، ان کی چوٹیوں پر دھوئیں کی مانند بادل، ایک جانب ڈوبتے ہوئے سورج کی کئی منتشر کرنیں، اور پھر ان کے درمیان ایک حوروش دوشیزہ، جو گیا ساری میں ملبوس، کالی کالی لمبی لٹیں ایک فیروزی ربن کے سوباف میں بندھی ہوئی، مگر اڑ کر چاند کو بدلی میں چھپا لینے کیلئے فضا میں بے قرار! پہاڑی کھڈ، ان سے ڈرنا، سہمنا، جھجکنا، تھکنا، بیٹھ جانا، خودرو جھاڑیوں سے الجھنا، خود ہی جھنجھلانا، میری پر شوق نگاہوں کو دیکھنا، مسکرانا، جھینپنا، مجھ سے آگے بڑھ جانا۔ چار قدم جا کر پیچھے مڑ کر دیکھنا، متبسم ہونا، پھر چل دینا، چلتے چلتے لالۂ صحرائی کو توڑ لینا، سونگھنا، پنکھڑیاں نوچ کر ہوا میں بکھیر دینا، ۔ ۔ ۔ ان سب باتوں کو میں سمجھتا

حسین وجمیل اور شعریت سے پُر نام ہے۔ گلنار! گلنار! جانِ گلنار!
ہزار بار کہوں گلنار! ہر بار نام لیتا ہوں اور جھوم جاتا ہوں۔ گلنار! میری زندگی! میری عافیت! میری جان! میری گلنار!

کل شام میری زندگی کی ایک مخصوص شام تھی۔ ایک ایسی شام تھی جس سے میرا مستقبل مرتب کیا جائے گا۔ یہ ایک زرین شام تھی، جو عشق کو حسن سے روشناس کر گئی! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں "نشاط ٹاکیز" میں نرگس کا رقص دیکھ رہا تھا کہ یاسمن کی خوشبو نے میرے حواس کو مسحور کر لیا۔ وقفے میں جب روشنی ہوئی تو دیکھا کہ برابر کی کرسیوں پر ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے ہیں۔ ایک تو جمیل تھے لیکن بھلا وہ عورت کون تھی؟ نہیں بتا سکتے انور! تو خیر وہ تھی میرے تخیل کی ملکہ، میری حیات کا مرکز، کون بھلا؟ گلنار! جمیل نے تعارف کروایا کہ میں مشہور شاعر منور ہوں۔ معلوم ہوا کہ گلنار کو بھی شعر سے دلچسپی ہے۔ کیوں اب تو تم غالب کو سروشِ غیب کہو گے نا؟ ؎

سیکھے ہیں مہ رخوں کیلئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہئے

باتوں ہی باتوں میں گلنار سے وعدہ ہو گیا کہ میں اسے اپنی بعض نظمیں بھیجونگا پرسوں صبح باد بہاری، ادھر کو چلے گی۔ دیکھوں اس کا ابر کرم میری تہی دامنی کو کہاں تک بامراد کرتا ہے۔

ابھی سے انتظار کی لذت اور کاہش سے دوچار ہوں

تمہارا
منور

—— (۴) ——

لکھنؤ
۲۲۔ اپریل ۱۹۳۵ء

انور!

آج حالی بھی بلاتے ہیں انہیں گھر مہمان
دیکھئے آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت!

لیکن عشق باوجود اپنی بے مائگی کے حسن کا میزبان۔ گلنار مجھ سے باتیں کر رہی تھی، اور میں باہمہ اضطراب بالکل خوش تھا۔ وہ شعر کو خوب سمجھتی ہے، وہ خود بھی کسی نازک خیال شاعر کا ایک بدیع تخیل ہے مجھ سے کہنے لگی: "دیکھئے نا، منور صاحب، تقریب کی ضرورت تھی، جب وہ ہو گئی تو ہم دونوں کے درمیان اب رسمیات کا پردہ حائل نہ ہونا چاہئے۔ آپ ہمارے ہاں آتے رہیں گے نا؟" انور! تم خود سمجھتے ہو کہ میں نے کیا جواب دیا ہوگا؟

انور! میں نے ابھی تک اپنی شاعری کا موضوع مناظرِ قدرت کو بنایا ہے۔ لیکن جب کبھی میں نے دوسرے شعراء کے اشعار میں عورت کو دیکھا تو ہمیشہ محسوس کیا کہ ان ہنرمندوں میں جمالیات کو سمجھنے کی ذرا بھی اہلیت نہیں ورنہ عورت سے بھدی اور بدگناہ ہستی کو معصوم اور حسین مناظر کے ماحول میں کبھی نہ دکھلاتے۔ لیکن انور آج میرا اپنا نظریہ خطرے میں ہے۔ مری "کشمیر کی ایک شام" کو نقادوں نے میرا شاہکار مانا ہے۔ آج —— آج گلنار سے مل لینے کے بعد بے کیف اور پھیکی نظر آتی ہے۔ مجھے اس نظم میں ایک کمی نظر آتی ہے۔ ایک بہت بڑی کمی، ایک عورت کی کمی، کاش میں پہلے ہی اس شام کے سلونے پن میں ایک عورت کا پیکر بھی دکھا سکتا۔ گلنار چشمے کے پانی میں اپنا عکس دیکھ کر، پانی میں ہاتھ ڈال کر اس عکس کو معدوم کر رہی ہوتی، یہ کیفیت ہے جس کو نظم کرنے کی مجھے اس وقت آرزو ہے۔ میں مر جاؤں گا۔ میرے بعد بھی دنیا اس نظم کی تعریف کرے گی۔ لیکن کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ میرے خیال میں وہ نظم ناقص ہے۔ نامکمل ۔ ۔ ۔ ۔ ایک عورت کی غیر موجودگی نے اس میں ایک خلا پیدا کر دیا۔

میری اپنی زندگی بھی نامکمل ہے۔ کیا انور! اسکی تکمیل ہو سکے گی؟ تمہیں کہو؟

تمہارا
منور

—— (۵) ——

لکھنؤ
۱۸۔ جولائی ۱۹۳۵ء

انور! میری تعلیم جیسی کچھ بھی ہے، جاری ہے۔ لیکن میں شاعری کو خیرباد کہہ چکا۔ اور کیا کرتا مجبور ہو گیا، مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ میری تمام کائنات پر گلنار چھائی ہوئی ہے۔ اگر میں چاہتا ہوں کہ کوئی شعر کہوں تو سوائے گلنار کی صورت و خیال کے اور کوئی چہرہ یا خیال سامنے نہیں ہوتا میرے تمام جذبات، خیالات، اور محسوسات گلنار کی ذات میں مرکوز ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ میری زندگی کا تنہا و عظیم خیال ہے۔ ایک ایسا خیال جس کی تمام شوکت، رنگینی، خوبی میری گلنار کے دم سے ہے۔

ہوں! دیوانہ، پُر آرزو، متوالا، سمجھے ہو سمجھے، تم کیا سمجھو گے انور؟ سمجھا ہو
توسینے کے اندر بھی دل پیدا کرو!

سیر کرتے ہوئے بہت دُور نکل گئے، سورج چھپ چکا تھا، تاریکی
ہر سمت بڑھ رہی تھی، فضا میں سناٹا تھا، گویا بوڑھی زمین اس طرح خاموش
ہو گئی۔ جیسے لونڈیاں کسی شہزادی کے تلوے سہلانے کے لئے اشارے تو کرتی
ہیں لیکن باتیں نہیں کرتیں۔ تم جانتے ہو کہ سردیوں میں چاند گرمیوں سے زیادہ
بھلا معلوم ہوتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی دیکھنے والا ہو۔ چشمے کے کنارے گلنار اس
انداز سے بیٹھی تھی، گویا وہ رات کی پریوں کی ملکہ ہے اور تنہا اس لئے ہے کہ آس
کی محافظ پریاں کوہستانی گلزار سے اس کے تاج کے لئے پھول چننے گئی ہیں۔
میں چمکیلے چاند کے تڑپتے ہوئے عکس کو بہتے ہوئے پانی میں دیکھ رہا تھا۔ بیخود
ہو گیا۔ اور معلوم نہیں کہ کہاں تھا، کہ گلنار نے چلّو میں سرد پانی بھر کے میرے
منہ پر مارا۔ اور ساتھ ہی ایک ملائم قہقہہ فضا میں اپنے حسن و موسیقی کو بکھیرتا
ہوا تحلیل ہو گیا، جی چاہا کہ اس انداز کی داد گلنار سے لپٹ کر دوں لیکن حسن
اجلال عشق کی اُمنگ کو اکثر دبا دیتا ہے! ہم واپس چل دیئے! گلنار کا ہر سر
ہم ایک نغمۂ خموش ہے۔ جسے صرف ایک وارفتۂ محبت کا ہی دل سُن سکتا
ہے۔ چاند کے سیلاب سیمیں نے ہر برگ و گیاہ کو سیم تن بنا دیا تھا چلتے چلتے
گلنار راستے سے ذرا ہٹ کر ایک جنگلی گلاب کے سُرخ پھول کو لینے کے لئے
ھی، لیکن ایک پتھر پر سے پاؤں پھسل گیا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش
پیچھے کی طرف گری اور میں نے اپنے ہاتھ سے سنبھال لیا۔ جیسے شبنم صبحگاہی
قطرہ برگ گل پر مل رہا ہو معلوم نہیں یا بے خودی تھی یا احساس مدد کہ
سے آغوش میں اپنے آپ کو محفوظ پا لینے کے بعد اس نے ایک ایسی چیخ ماری
جیسے کوئی مطربہ اپنے نغمے کے تاثرات کی تاب نہ لاکر پورے جوش اور وارفتگی
، اپنے بربط کے سُریلے تاروں پر ایک دم سے ہاتھ مار دے اور دل سے
ہ جھنکار نکل جائے۔ اس کی سانس تیز تھی، بہت تیز اور یہ پہلا موقع
تھا کہ میں نے گلنار کی سانس کو اپنے چہرے پر محسوس کیا اور اس کی حرارت
، لذت یاب ہوا۔

پہلے تو میں ایک نیم مردہ انسان تھا، احساسِ حُسن سے متاثر
اور وفورِ عشق سے جھکنا چور۔ میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ اور سچ یہ ہے
باوجود وفورِ محبت کے جب میں گلنار کے ساتھ اکیلا ہوتا ہوں تو سوا

اس خواہش کے دل میں کچھ نہیں ہوتا کہ میں دوزانو ہو کر اس کو سجدہ کروں،
وہ دیوی ہے، میرے خیالات کی دیوی!

اب چار بجے ہیں، ڈاک کا وقت نزدیک ہے۔ معلوم نہیں کیا کچھ
لکھ گیا ہوں۔

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم

گلنار اس وقت اپنی ایک سہیلی راحت سے ملنے گئی ہے! اور آہٹ
پر اس کا منتظر ہوں۔

بیٹھا ہوا ہوں آن کا تصوّر کئے ہوئے

تمہارا
منور

——— (۷) ———

دارجلنگ
۲۷۔ اگست ۱۹۳۵ء

انور! جمعرات سے بارش ہو رہی ہے، موسلا دھار بارش! آج پیر ہے
اور بارش ابھی تک ہو رہی ہے، گلنار کہتی ہے کہ اس بارش سے وہ تنگ
آ گئی۔ لیکن میں اس کے اور طولانی ہونے کی دل ہی دل میں دعا کر رہا ہوں،
خدا اس کی سُنے گا یا میری؟ یقیناً "اللہ جمیلٌ و یحب الجمال" کی صداقت
قبولِ دعا میں بھی ظاہر ہو گی۔ دیکھیں!

گڑھے، گھاٹیاں، نالے، نالیاں، سبھی پانی سے لبریز ہیں،
رات کی خوفناک تاریکی میں جب بجلی چمک اٹھتی ہے تو تاریک اور بھیانک
فضا میں پانی جہاں تہاں بھرا ہوا ایسا دلفریب معلوم ہوتا ہے، جیسے کسی
سبزہ رنگ حسینہ کے سیاہ دوپٹے پر ہیرے کی کنی کے دانے آویزاں ہوں۔

کل میں بہت زیادہ رنجیدہ تھا۔ میں اپنے رنج کو بہت چھپاتا رہا۔
لیکن گلنار سمجھ گئی، اور وجہ دریافت کی۔ میں نے ٹالنا چاہا۔ اسے موسم کا
اثر کہا، معدے کی خرابی بتایا، کم خوابی کا بہانہ کیا، لیکن وہ کسی عذر
سے مطمئن نہ ہوئی۔ آخر میں نے ہمت کر کے وجہ بیان کر ہی دی۔ کہ مجھے اس
سے کس درجہ محبت ہے"! اور اب جبکہ وہ چند دن کے بعد اپنے گھر واپس
جانا چاہتی ہے۔ اس مراجعت کا خیال مجھ پر کیا ستم ڈھا رہا ہے! میں نے
اپنی آرزو بیان کر دی، کہہ دیا کہ وہ میری ہو جائے"! اور پیشتر اس سے کہ
گلنار کچھ کہے میں اس خیال سے رو دیا کہ میری آرزو ایک ایسی بلند شئے

کے لئے تھی، جس کا حاصل ہو جانا یقینی نہ تھا، گلنار نے بڑھ کر آنسو پونچھے، اور باوجود ضبط دو گرم گرم آنسو، اس کی آنکھوں سے اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ اس نے اس پھول کی مانند سر جھکا لیا جس پر سجدہ شبنم کا ہر قطرہ اشک حسرت بن جاتا ہے۔ میں نے گلنار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا میرے بدن میں ایک بجلی سی دوڑ گئی، اور میں نے پھر اپنی آرزوئے شوق کا اعادہ کیا۔ بہت دیر کے بعد اس نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی سرمگیں آنکھوں کو اونچا کیا۔ کچھ کہنے کی ہمت کی لیکن پھر سر جھکا لیا۔ ہم دونوں رو رہے تھے! وفور غم سے بے حال ہو کر میں نے سر پیچھے کی طرف جھکا لیا معلوم نہیں کتنی دیر تک آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ یہاں تک کہ گلنار کے گرم اور نرم ہاتھ مجھے اپنے رخساروں پر محسوس ہوئے۔ اور اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ "میں آپ کی ہوں" اندازہ کرو، انور! میری حالت اس وقت کیا ہوئی ہوگی، قریب تھا کہ شادی مرگ ہو جاؤں۔ میں نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ لیکن میرے قدم زمین پر نہ لگتے تھے۔ ان جاں نواز ہونٹوں کا کھلنا اور ایک سرمدی پیام کے ذریعے کسی مردے کو جلا دینا! "میں آپ کی ہوں"! کیسے حسین الفاظ ہیں! تقویت دینے والے! انور، اب میں اپنے اندر کام کرنے کی قوت، ایک حوصلہ، ایک عزم پاتا ہوں، نظام کائنات کو درست کر دینے کی قابلیت کا احساس کر رہا ہوں! "کسی" کے لئے کر رہا ہوں تو کام بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ اور کامیابی یقینی! میری تمام ہستی میری تمام متاع جان گلنار کے لئے ہے، اسی کے لئے زندہ ہوں، اور اسی کے لئے مرونگا!

خود ہی خیال کر لو کہ اس مژدۂ جاں بخش کے بعد میرا دن کن آرزوؤں اور امیدوں کے خواب دیکھنے میں گذرا ہوگا۔ دنیا امن و نعمت، راحت و مسرت کا گہوارہ معلوم ہوتی ہے! "میں آپ کی ہوں"! "میں آپ کی ہوں"! معلوم نہیں میں نے کتنی مرتبہ دہرایا! خوشی نہیں بے خودی کے عالم میں دہرایا! گلنار میری ہے۔ صرف میری ہے اور میں اپنی گلنار کا ہوں! اپنی بھابی کو مودب ہو کر آداب کرو! انور، ہاں ایسے!

رات ہو گئی، بارش زیادہ تیزی سے ہونے لگی، بجلی کڑکتی تھی، دل دہل جاتا تھا، ایک دفعہ اس زور سے بادل گرجا، کہ گلنار کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا، بجلی پھر کڑکی، گلنار بالکل غیر ارادی طور پر مجھ سے لپٹ گئی۔ بادل گرجتے اور بجلی کڑکتی رہی، اور گلنار خوفزدہ نظروں سے آسمان کو بار بار، اور باہر کی تاریکی کو دیکھتی اور ہر بار پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ چمٹ جاتی۔ میں اسے اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھا اور اپنے ہاتھ اس کے نرم نرم بالوں پر پھیر رہا تھا۔

نبند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

میں دعا کر رہا کہ خدا کرے بجلی یونہی کڑکتی رہے۔ دنوں، مہینوں، برسوں۔ مدتوں، یونہی کڑکتی رہے! مسلسل، پیہم، لگاتار، اور گلنار مجھ سے اسی بہانے ہم کنار رہے!

میرے کمرے میں چاندنی اور قالینوں کا فرش ہے۔ اگر کی بتیاں اور شمعیں روشن ہیں۔ میرے قریب ہی ایک گاؤ تکئے سے لگی ہوئی گلنار فیروزی دوشالہ اوڑھے جوانی کی نیند سو رہی ہے مجھے حسین عورت کا غصہ اور اسکی نیند دونوں بہت بھاتے ہیں۔ اور اس وقت تو سونے والی ہے "افسانوں کی شہزادی" جسے نیند کی پریاں آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔

میں آج بہت خوش ہوں، اگر آج تم یہاں ہوتے تو میں تمام رات تم سے باتیں کرتا۔ لیکن نہیں ایسا نہ کرتا، ورنہ گلنار کی نیند میں خلل پڑتا۔ عشق حسن آزار تو نہیں ہوتا! کیوں ہوتا ہے!

تمہارا
منور

—— :(۸): ——

لکھنو

۱۰۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء

انور! میں آج شام کو جب باہر سے آیا تو کچھ جھٹ پٹے کا سا وقت تھا، آفتاب غروب ہو چکا تھا، آسمان پر شفق کے آثار باقی تھے، دن کی روشنی شام کی تاریکی سے گلے مل رہی تھی، میں سیدھا گول کمرے میں پہنچا تو گلنار ایک صوفے پر آرام کر رہی تھی، نظریں ملیں، اس کی نظریں اس وقت معلوم نہیں کیا کچھ کہہ رہی تھیں۔ غالباً میرے دیر سے آنے پر شکایت آمیز غصے کا اظہار تھا۔ یا رحم و کرم کی التجا۔ حسن منتظر شکوہ کرے تو عشق بھی کیوں نثار نہ ہو جائے! میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ سوچتا تھا کہ کچھ کہوں لیکن جذبات گلوگیر ہو رہے تھے۔ شفق کی سرخی کھڑکی کے نیم وا پردے سے چھن چھن کر گلنار کے چہرے اور سامنے کی دیوار پر منعکس ہو رہی تھی۔

دھیمی دھیمی روشنی جو عشق کی تابش کی طرح چمکاتی تو ہے لیکن بھیانک نہیں!

افق پر رنگین سحاب بادلوں کا رنگ کہیں کہیں پھیکا پڑ چکا تھا کہیں نارنجی تھا اور کہیں ہلکا گلابی، لیکن یہ بھی ایک حسن تھا! دور کہیں بہت دور پورب کی جانب بجلی کی آواز ہوا کے بادل پر سوار ہو کر آ رہی تھی، میں نے گلنار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبایا، میری روح کو ایک پاکیزگی کا احساس ہوا، میرا احساس محبت وسرت سے بیدار ہو گیا۔ اور یہ معلوم ہونے لگا کہ میں اسی رنگ ونغمہ کی فضا میں اس محبت کی دیوی کے ہمراہ اڑا جا رہا ہوں۔ ان نیلے نیلے سرخ بادلوں کی جانب، اس لامتناہی آسمان کی طرف، اڑا جا رہا ہوں — — — —

تمنا تھی کہ اس کیفیت میں جذب ہو جاؤں لیکن اتنے میں گلنار نے مچل کر ہاتھ چھڑا لئے، اور دومنزلے کے سامنے والے برآمدے میں جا کھڑی ہوئی، میں بھی وہاں پہنچا۔ لیکن اس نے میری طرف سے منہ موڑ لیا۔ میں نے ہاتھ پکڑنا چاہا تو میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس پر میں نے آگے بڑھ کر اپنی گلنار کو مضبوط گرفت میں لے لیا، ———— اور طولانی اور خموش برآمدے کے دھندلکے میں دو روحیں لبوں کے منہ سے متصل ہو گئیں۔ مولسری کی لانبی شاخوں نے جو اس برآمدے میں بھی گھس آئی تھیں، ہم دونوں کے سروں پر اپنا دیپک راگ الاپا، جو محب ومحبوب کی ملاقات پر گانے کے لئے قدرت نے ان کو سکھایا تھا۔

گلنار نے میرے آغوش میں اپنی خوبصورت آنکھیں نیم وا کر دیں جن کے اندر ڈبڈبائے آنسوؤں کی صورت میں ایک ناقابل بیان تمنا مرتعش تھی۔ ان ڈبڈبائی ہوئی حسین آنکھوں میں ایک چمک تھی، خیرہ کر دینے والی چمک نہیں بلکہ ٹھنڈی ٹھنڈی سکون آمیز اور دل میں اپنا مستقل نقش چھوڑ جانے والی چمک! میں نے چاہا کہ گلنار کے چہرے کو اپنے پُرارمان بوسوں سے منقش کر دوں، لیکن کسی مورتی کا پجاری اپنی معبودہ کو پاش پاش کر دینے کی کوشش نہیں کرتا! اس خیال کے آتے ہی اس کے قدموں پر گر پڑا، تاکہ اپنے متاع دل وجان کو اس کے تقدس اور وقار پر سے قربان کر دوں لیکن انور، اس سے قبل کہ میں اس کے قدموں پہ تڑپ تڑپ کر جان دیدوں اس پیکر حسن وخوبی نے مجھے اٹھا کر گلے لگا لیا، میں اس سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتا تھا کہ معلوم نہیں، ایسا کیوں ہوا؟

انور آج میں سمجھا کہ باد بہاری کیوں چلتی ہے، ننھی ننھی چڑیاں کیوں گاتی ہیں؟ خدا نے نور اور روشنی کو کیوں پیدا کیا ہے؟ یہ سب پرتو محبت وصداقت ہے! تم متفق ہو نا؟

تمہارا منور

———:(۹):———

لکھنؤ

۳۰۔ جون ۱۹۳۶ء

انور! میں جہاں کہیں بھی ہوں، گلنار میرے ساتھ رہتی ہے۔ جسماً نہیں تو روحاً! گلنار نہیں تو گلنار کے محبت نامے میری تسکین قلب کا باعث ہیں۔ یہاں گیارہ بجے ڈاک آتی ہے لیکن میں صبح ہی سے بے قرار ہو جاتا ہوں۔ گیارہ بجنے میں ہی نہیں آتے، اکثر اوقات خود ڈاکخانے چلا جاتا ہوں تاکہ پیام روح جلد سے جلد مجھے مل جائے۔ دنیا کو تو تم جانتے ہی ہو نا، معلوم نہیں لوگ میرے اس معصوم فعل کو کیا سمجھیں، اس لئے اپنے چٹھی رساں سے اکثر کہہ دیتا ہوں "شیخ جی میں ایک کام سے بازار جا رہا ہوں سوچا کہ آپ سے بھی ملتا چلوں۔ کوئی خط ہے تو دیدیجئے" بوڑھے پوسٹ مین کی بوڑھی لیکن مشاق انگلیاں خطوں کے بنڈلوں میں سرعت سے میرے خط کو تلاش کرنے کی کوشش میں دوراں ہو جاتی ہیں۔ اور اگر میری نظر اسی رنگ کے لفافہ پر پڑ جاتی ہے جس رنگ کا میری گلنار استعمال کرتی ہے تو میں خطوں کے بنڈل پر جھک جاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ "ٹھیریئے یہ ہے میرا خط" لیکن اکثر اوقات وہ کسی اور کا نکلتا ہے۔ جب مجھے میرا خط مل جاتا ہے تو میں اکثر اپنے اضطراب کو چھپانے کی غرض سے چٹھی رساں سے دو چار منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرتا ہوں تاکہ اسے معلوم نہ ہو سکے کہ میں اس خاص خط کو پڑھنے کے لئے کس قدر بے قرار ہوں، خط پڑھتا ہوں کہ، ایک بار، دو، تین، چار، معلوم نہیں کتنی بار، چومتا ہوں، سینے سے لگا لیتا ہوں اور اس زور سے کہ میرا سینہ کھل جائے گا۔ اور میں اس امانت محبت، اس صحیفۂ عشق کو خود پرست دنیا کی نظروں سے پوشیدہ کر سکوں گا۔ گلنار کے لکھے ہوئے پیارے پیارے فقرے، دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بار بار دہراتا ہوں۔ مجھے گلنار کے خط کے خط حفظ ہیں۔ ایک محبت نامے میں اس نے مجھے "چراغ زینت" دوسرے میں "نخل حیات" تیسرے میں "تمناؤں کی جان" چوتھے میں "پردیسی پریتم" لکھا، انور! کیا میں اپنی گلنار کے لئے واقعی "چراغ زینت" ہوں۔ کیا میں واقعی اس کی "جان آرزو" ہوں، پردیسی تو ضرور ہوں لیکن کیا میں سچ مچ گلنار کا پریتم بھی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا، میرے ایسے نصیب کہاں! لیکن نہیں نہیں، محبت مساوی تقسیم پر مبنی ہے۔ صرف محبت ہی

وہ طاقت ہے، جو ایک بھکاری کو شہزادی کے قریب کر دیتی ہے!

میں اپنی گلنار سے کبھی کوئی بات نہیں چھپاتا۔ محبت کرکے آدمی جھوٹ بولنے پر قادر نہیں رہتا۔ جو کچھ میرے دل میں ہوتا ہے۔ انہیں جذبات کو من و عن بیان کر دیتا ہوں۔ اس کو خط لکھنا میرا اہم ترین فرض اور لذیذ ترین شغلہ ہے ایک ایسا فرض جس سے میرے ماضی کی دلکشی وابستہ ہے میرے حال کی مسرتیں قائم اور میرے مستقبل کی تمنائیں ہویدا ہیں۔ . . . ذرا سوچو تو یہی نیپ طوفانی رات کو جب کمرے کے باہر زور کا جھکڑ چل رہا ہو۔ تم لیمپ کے قریب بیٹھے ہوئے اپنے پارہ ہائے دل کو کاغذ پر منتقل کر رہے ہو تمہارے گرد اگرد ایک خاموشی چھائی ہو، ایک ہولناک خاموشی، رات سائیں سائیں کر رہی ہے۔ تم نامۂ محبت لکھتے چلے جاؤ، اور ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی احساس ہو، تمہارے گرد و پیش کی تمام کائنات سو رہی ہے۔ مدہوش ہے، لیکن تم نامۂ محبت لکھتے جاؤ، اس ڈراؤنی لیکن پُرسکون خاموشی میں ایک ہوا کا جھونکا تمہارا دروازہ کھٹکھٹائے، تم ایک منٹ کے لئے اس جانب دیکھنے لگو، اور پھر نامۂ محبت لکھتے چلے جاؤ۔ بہت رات گئے۔ تک لکھتے ہی چلے جاؤ۔ کیا یہ مصروفیت اپنے اندر ایک دنیائے حسن و بے خودی نہیں رکھتی۔ خط صبح کے وقت بھی لکھا جا سکتا تھا۔ لیکن تم اسے شبستانِ محبت کی خلوتوں میں ہی لکھنا چاہتے ہو! ایسے میں معلوم نہیں انسان کیا کچھ لکھ جاتا ہے۔ وہ سرمدی پیام دنیا بھر میں ایک ہی ہستی کے ملکوتی کانوں کے لئے ہوتا ہے۔ اسے ایک ہی آنکھ دیکھ سکتی ہے اور اسی لئے وہ قاعدوں اور ضابطوں سے آزاد، ایک ایسی جاں بخش تحریر ہوتی ہے جس پر بڑے سے بڑے ادیب کی کاوشِ ذہن و دماغ لاکھوں کروڑوں بار قربان ہے!

میں اس حالت میں خط ہاتھ میں لئے ہوئے رات کی اوس سے بھیگے ہوئے اونچے سُرخ لیٹر بکس کے قریب جا کھڑا ہوتا ہوں، خط اس کے اندر ڈال دیتا ہوں۔ اس کے گرنے پر اندر سے ایک آواز آتی ہے، "کھٹ" اور دل بھی ساتھ ہی ساتھ دھڑکنے لگتا ہے۔ میں کہتا ہوں انور! اگر وہ نادر دل بھری رات کا مالک خدا دنیا بھر کے لیٹر بکسوں کو زبان دیدے تو وہ محب و محبوب کے خطوں کی کیسی کیسی پُر ارمان اور حسرت زا داستانیں نہ کہہ ڈالیں گے؟ جب میرا اور گلنار کا نام آئے تو . . . ؟ لیٹر بکس اپنے قریب میرے کھڑے ہو کر رونے کی کہانی کو کتنی بار دُہرائے گا، وہ یہ بھی بتائے گا کہ میں نے اس سُرخ پیامی کو رات کے اندھیرے میں کس کس محبت اور کس گرمجوشی سے وارفتہ ہو ہو کر چوما ہے۔ ہاں یہ بھی کہے گا کہ میں نے کتنی دفعہ اس سے لپٹ کر اپنی گلنار کے متعلق سوال کئے ہیں، اور ہاں اس کے جواب نہ دینے پر کتنی دفعہ اسے جھنجھوڑا ہے۔ . . . یہ لیٹر بکس جانتا ہے، اور کسی کے سننے کی بات نہیں۔

میں آئندہ مہینے میں گلنار کے پاس آگرے جا رہا ہوں۔ تمہارا

منور

لکھنؤ

۹۔ دسمبر ۱۹۳۶ء

انور! یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ گلنار میرے عوض "کسی" اور کی ہو گئی! انور! عورت کی فطرت نے ایک بار پھر کروٹ لی۔ اور ان تلخ اور حسرت زا خونیں داستانوں کو دہرایا۔ جن کی وجہ سے ہزاروں، لاکھوں بے گناہ محبت کرنے والے مردوں کی زندگیاں تباہ ہو گئیں، میری مسرتیں اور امیدیں ایک ایک کرکے مجھ بدقسمت سے گلے ملیں اور مجھے حرمان و یاس کو سونپ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں۔ دل ابھی گلنار کی محبت کا دم بھرتا ہے اور فریب کھاتا ہے لیکن عقل اور آنکھیں اس خوش فہمی کا ماتم کرتی ہیں۔ میری نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی اور اگر مجھے اپنی ماں کی ضعیفی کا خیال نہ ہوتا تو آج ان سطروں کے قلمبند ہونے کی نوبت ہی نہ آتی۔ انسانی مجبوری! جس عورت کو میری تمناؤں اور میرے تخیل نے پروان چڑھایا وہ کسی اور کے پہلو میں ہو!

ایسی تقدیر بھی اللہ غنی ہوتی ہے:

میں نے گلنار کے مانگنے پر اس کے تمام خطوط واپس کر دیئے۔ جو کچھ میرے پاس اس بیوفا کی یاد کا سرمایہ ہے، وہ مشتمل ہے دل کی ایک خلش اور جگر کی ایک ٹیس پر۔ رونا چاہتا ہوں لیکن آنسو نہیں۔ دل کے علاوہ میرے پاس گلنار کی ایک افعی نما نیلے رنگ کی ایک چوڑی کے چند ٹکڑے ہیں۔ جن کو آنکھوں سے لگاتا ہوں اور سینے سے متصل کرکے خوب دباتا ہوں اور بس! یہ ہے جو کچھ باقی ہے، اس عورت، اس محبوب کی ہستی کی یاد کا، جس نے روتے ہوئے کہا تھا کہ "میں آپ کی ہوں"۔ کسی دن یہاں چلے آؤ۔ تاکہ تمہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھو کہ کیا

"کرموں کی گت ٹارے ناہیں ٹرے؟"

سوگوار ماضی
منور

(۱۱)

لاہور

۱۲ مئی ۱۹۳۸ء

انور! میری بیچاری زندگی، مسلسل داستان ہے، بدقسمتی اور بدنصیبی کی، گلنار کا شوہر! میں اور کو اس کا شوہر کہہ رہا ہوں!! میری ماتحتی میں تبدیل ہو کر آگیا ہے۔ آدمی عمر اور صورت سے شریف معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اُسے بُلا کر پوچھا کہ وہ ترقی پاکر دوسرے افسر کے ماتحت رہنا چاہتا ہے۔ جس کا جواب اس نے بدقسمتی سے نفی میں دیا۔

مکان پر جاتا ہوں تو گلنار کا خیال میرے ہمراہ رہتا ہے۔ گلنار کا خیال تو گلنار سے زیادہ باوفا ثابت ہوا! دفتر میں آتا ہوں تو گلنار کا شوہر پیش نظر رہتا ہے اور میں کام نہیں کر سکتا۔ تمام فضا پر ایک موت کی سی مُردنی چھائی رہتی ہے، رات ایک ناقابل بیان خواہش اور کرب میں گزر جاتی ہے۔ دن اسی طرح گزرتے ہیں، راتیں اسی طرح گزرتی ہیں۔ ہر روز، پہلے روز کی طرح سورج نکلتا، اور ڈوب جاتا ہے، ہر رات تارے اور چاند مجھے دیکھ کر سرگوشیاں کرتے ہیں، اور صبح ہوتے ہی وقت کی آغوش میں سونے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ بے کیف زندگی، قابلِ رحم زندگی، اُداس زندگی، بے مصرف زندگی! روتا ہوں انور! اور جب تک سانس باقی ہے روتا رہونگا۔

پرسوں گلنار کے شوہر کے ہمراہ دو بچے میرے ہاں آئے۔ یہ دونوں کون تھے؟ فرحت اور شہباز، گلنار کی آنکھوں کے تارے، اس کے دل کا سکون، اس کی بیوفائی کے دو زندہ، متحرک، اور خوبصورت مجسمے! فرحت چار برس کی معصوم بچی ہے۔ ننھی سی گلنار ہے، بات کرتی ہے تو ماں کی طرح اُس کے گالوں میں بھی خوبصورت بھنور پڑتے ہیں۔ ناک، نقشہ، سب کچھ گلنار کا پایا ہے۔ لیکن خدا کرے ماں کی طرح دل تو وفا ناآشنا اور بے احساس نہ ملا ہو۔ شہباز کی طبیعت میں ماں کی فطرت کا شریر پہلو زیادہ نمایاں ہے، میں اس منظر کو برداشت نہ کر سکا، میں اپنے جذبات سے اس قدر مجبور ہو گیا کہ جلدی سے اُنہیں رخصت کر کے کمرہ میں اپنے بستر پر لیٹا۔ اور معلوم نہیں کب تک روتا رہا۔ وہ گلنار کے بچے تھے، جنہیں کبھی میرے تخیل نے تخلیق کیا تھا۔ لیکن وہ مجھے تو "ابامیاں" نہیں کہہ سکتے تھے، خدا کے لئے مجھے معاف کرو انور! میں معلوم نہیں، کیا کچھ کہہ رہا ہوں۔

کل صبح گلنار کا ایک دو حرفہ خط آیا جس میں لکھا تھا "فضل باغ" میں مجھ سے چند منٹ کے لئے مل لو۔ کیا میں اس سے ملنے کے لئے گیا؟ کیا میں اس سے ملنے جاؤنگا؟ نہیں کبھی نہیں! اب میرا اس پر کوئی حق نہیں، وہ کسی اور کی ملکیت ہے، ایک شریف کی بیوی۔ اب ملکر کیا ہوگا؟ جب تمام امیدیں خاک میں مل ہی چکیں!

آخر شب، دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم، کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

موت کا منتظر
منور

(۱۲)

دہلی

۱۴ نومبر ۱۹۴ء

انور! اسی دن شام کو جس دن میں نے تمہیں پچھلا خط لکھا تھا۔ اسمبلی سے "حقوقِ نسواں" پر تقریر کر کے واپس آ رہا تھا، کہ راستے میں مجھے خیال آگیا اس خیال سے کہ تازہ ہوا کچھ فائدہ دیگی میں موٹر سے اتر کر دلکشا باغ میں ٹہلنے لگا۔ معلوم نہیں کیوں میری بدقسمتی مجھے یہاں لے آئی تھی۔ سبزے پر ٹہلتا رہا۔ اور تھک کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا جس پر کوئی خاتون میری جانب پشت کئے ہوئے پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی چند سکنڈ کے بعد مڑ کر دیکھتا ہوں کہ وہ عورت گلنار تھی، اور میری جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی، دل پر ایک سانپ سا لوٹ گیا، اور میرے حواس مجھے خیرباد کہہ گئے، ذرا سوچو تو انور، ایک تنہا باغ کا سبزہ زار اتفاق ایک ایسی عورت کو تمہارے سامنے پیش کر دیتا ہے، جس کو کبھی تم اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے، محبت کرتے تھے، اب بھی محبت کرتے ہو، لیکن وہ چیز نہیں، اس کا مالک کوئی دوسرا ہے! ایک ایسی عورت جس سے کبھی تم تنہائی میں مل چکے ہو، جس سے تم نے بارہا رازِ دل بیان کیا، جس نے اپنے ملکوتی ہونٹوں سے بارہا تمہارے لئے آبِ حیات کے قطرے ٹپکائے ہیں، ایسی عورت بالکل تنہا ہے، اور تم اس سے کچھ نہ کہہ سکو، کیونکہ وہ کسی دوسرے شخص کی بیوی ہے! تمہارے دل کی سُلگتی ہوئی چنگاری کیا دہکتا ہوا شعلہ نہ بن جائے گی۔ جو اس جھوٹ اور فریب کی دُنیا کو ایک پل بھر میں جلا کر خاکستر کر سکتی ہے۔ شرافت اور جذبات میں جنگ ہونےلگی،

میں بہت سنبھلا، لیکن ایک بے خودی کے عالم میں، ایک پرزے پر لکھ کر وہاں چھوڑا اور اُٹھ کر چلا آیا ؂

تم نہ دیکھو کہ میرے چہرے پر!
اک تمنا سی پائی جاتی ہے! (جوش)

گذری ہوئی دلچسپیاں، بیتے ہوئے دن عیش کے، ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے پھر گئے۔ اسی شام سے طبیعت زیادہ، بہت زیادہ خراب ہے، تیز بخار، اور حد درجہ کا ضعف، دل بیٹھا جاتا ہے، سینے میں کوئی چیز ہے جو رینگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، شاید میری سرخیب اس مسافر خانے سے چلنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ایک ولولہ سا اٹھتا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر ایک کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے، اور بعض اوقات میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا سینہ پھٹ جائے گا، اور اس کے ساتھ ہی یہ ہیجان بھی ختم ہو جائے گا۔ کبھی کبھی کوئی چیز سینے کے اندر سے اٹھ کر گلے کی جانب آتی ہے، اور وہیں پھنس کر رہ جاتی ہے، اور میں اس وقت سانس گھٹ جانے کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہوں لیکن ظلم یہ ہے کہ کبھی سانس پوری طرح نہیں گھٹتی، تاکہ اس بظاہر خوبصورت مگر باطن بھیانک جہان کو نہ دیکھوں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک بے وفا عورت کی یاد نا یاد کو آخری بار گلے لگا کر آنکھیں بند کر لوں۔

اس وقت مجھ پر ہذیان کی سی کیفیت طاری ہے، جی چاہتا ہے کہ زور زور سے چیخوں۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخوں، اتنا چیخوں، کہ روح و جسم کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، روزِ محشر تک کیلئے منقطع ہو جائے۔ گلنار! گلنار!! میری گلنار!!! میری اپنی گلنار!!! نہیں منور، گلنار میری نہیں گلنار میری اپنی نہیں، وہ کسی اور کی ہو چکی، مجھے تو اب اس کا نام لینے کا بھی حق نہیں رہا۔

آج میں سخت نڈھال ہو رہا ہوں، میرا سر چکرا رہا ہے، اور معلوم نہیں کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ "کسی" کی سڈول مرمریں بانہیں، میری گردن میں حائل ہو جائیں۔ کسی کی پیاری پیاری گوری گوری کلائیاں جن میں سونے کی چوڑیاں کھن کھن کر رہی ہوں، میرے سر کو سنبھال لیں میرا دل اچھلتا ہے، انور، ان چوڑیوں کی دلکش اور جانفزا آواز سننے کے لئے جس کو برسوں پہلے سن چکا ہوں، ان کا نغمہ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے، اُس موسیقی کو ایک بار پھر سننا چاہتا ہوں، شاید آخری مرتبہ!

عورت ایک خاص عورت میری بے کیف زندگی کا مرکزی تخیل رہی ہے دنیا میں میں نے بڑے بڑے اعزاز حاصل کئے۔ میرے اشعار کی تعریف ہوئی، میری تصانیف کو لوگوں نے آنکھوں پر رکھا۔ میری تقریروں نے ملک بھر میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ میری ڈاک میں ہر صبح سینکڑوں تعریفی خطوط آتے، لوگوں نے مجھے قیمتی سے قیمتی تحائف بھیجے۔ میرے لئے پھولوں کے ہار آتے رہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود مجھے سچی خوشی نصیب نہ ہوئی، اکثر میں اپنی دیوی کا پجاریوں سے مدہوش شام کو گھر واپس آتا ہوں، لیکن جونہی میں اندر قدم رکھتا ہوں تو وہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے! اس کے عوض کہ میری بیوی . . . میری . . . گلنار بڑھ کر میرا استقبال کرتی، اور میں اُسے گلے سے لگا لیتا۔ ہمیشہ بے کسی اور تنہائی نے میرے قدم لئے ہیں، دنیا کی نظروں میں کتنا خوش نصیب ہوں لیکن درحقیقت کتنا بڑا بدنصیب! جو کچھ میرے باورچی نے سامنے رکھ دیا، میں نے کھا لیا، لیکن ہر لقمہ زہر بن کر گلے سے اُترا، اور میں گلنار کی محبت اور حسن انتظام کو رو دیا۔ میرا لباس باوجود نوکروں کی دیکھ بھال کے بیوی کی ــــــ گلنار کی محبت اور دیکھ رکھاؤ کا محتاج رہا، میرے خدام میرے کمرے کو بہترین طریقے پر آراستہ کرتے ہیں لیکن یہ زیبائش عورت کے سلیقے کو ہمیشہ ترسی، میری ہر چیز، میرا تخیل، میری زندگی بھی، گلنار کے بغیر نامکمل رہی، وہی اس خلا کو پورا کر سکتی تھی لیکن اب تمنا ہے کہ کل سورج کو نکلتا ہوا نہ دیکھوں!

. . . . .

یہ دیکھو میرا نوکر مجھے دوا پلانے کے لئے آ گیا۔ سفید سفید نیلی پیلی بوتلیں زہر اثر دوا، عشق اُن کا مذاق اُڑاتا ہے، سفید، سفید، نیلی، پیلی، بوتلیں گھر میں ہوٹل کی زندگی کا مزہ، ہر چہار طرف کلرکوں، پیش کاروں، نوکروں کی آوازیں، فیشن زدہ روکھی پھیکی زندگی . . . . ایک عورت کی آواز . . . . گلنار کی آواز نہیں! ٹھیرو، ٹھیرو، وہ بول رہی ہے۔ "میں آپ کی ہوں"۔ "میں آپ کی ہوں"۔ میرا دل . . .

. . . .

(۱۳)

واقعہ دہلی، ۱۵ نومبر ۱۹۳۴ء

ملک بھر کے اخبار صبح سیاہ سیاہ حاشیوں سے اپنے لیڈر کی موت میں سوگوار تھے۔ ہر اڈیٹر نے اپنی کاغذی لیاقت سے زیادہ آنسو بہائے کسی نے لکھا کہ آفتاب ادب غروب ہوگیا، کسی نے شیر دل لیڈر کا ماتم کیا' کوئی جادوئے بیان کے ختم ہونے پر اشکبار رہا۔ ملک بھر میں ایک سناٹا تھا دفتروں اور سرکاری عمارات کے جھنڈے سرنگوں ہوکر اس عظیم شخصیت کو آخری خراج دے رہے تھے' . . . تمام ملک ماتم کناں تھا . . . . سرکاری نوجوانوں نے جاہ وحشم کے معزول دیوتا کو آخری سلام کیا . . . . اس کی تحریر کے دیوانوں نے اس کی قبر پر پھولوں کے گلدستے اور ہار پیش کئے . . . . چار پانچ ادمیوں کے ایک مجمع میں ایک نے کہا" مرحوم نے مدتوں تک قوم، ملک اور ادب کی بے غرض اور شاندار خدمت کی' اس کی اولاد کو کچھ نہ کچھ صلہ ضرور ملنا چاہئیے۔ گلنار کے شوہر نے جو شہباز کی انگلی پکڑے ہوئے تھا کہا' اس کا تو کوئی بچہ بھی نہیں' شہباز خالی خالی نظروں سے' ایک انسان کی موت سے متاثر نظروں سے اُن کا منہ تک رہا تھا . . . .

. . . . کچھ دن کے بعد رات کی تاریکی میں ایک عورت قبرستان میں آئی۔ ہمیں معلوم نہیں وہ کون تھی' . . . . . وہ ایک تازہ قبر سے لپٹ کر روئی . . . بہت دیر تک روتی رہی۔

. . . معلوم نہیں اس کا کیا انجام ہو! . . .

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی
سُناتا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

شام

بڑھتی جاتی ہیں اُفق پر نرم رَو تاریکیاں
جھکتا آتا ہے زمیں کی سمت نیلا آسماں

خار وخس پر ہے سکوتِ شام کا دلکش خمار
پڑ رہی ہے صحن گلشن میں ملاحت کی پھوار

تھم گئے دریا، ہوائیں لوچ پیدا ہوگیا
جھاڑیوں کا سایہ پانی سے لپٹ کر سو گیا

ایک غبارِ سرمہ گوں ہے خاک پر سایہ فگن
ہے فضاؤں میں ملائم تیرگی کا بانکپن

نقشِ باطل بن کے تاریکی میں یکسر مٹ گئے
سانپ کے مانند، میدانوں کے ٹیڑھے راستے

بجتے بجتے جس طرح خاموش ہوجاتا ہے ساز
پھر ہوا میں دیر تک رہتا ہے نغموں کا گداز

چھا رہا ہے ہر طرف ایسا ہی کچھ غمگیں سکوت
وجد آور، پُر اثر، خواب آفریں، شیریں سکوت

تیرتی ہے شام کی بھیگی ہوا میں تازگی
سانس کے ہمراہ کھنچ آتی ہے شبنم کی نمی

رفتہ رفتہ چھپتے جاتے ہیں نظر سے دشت وباغ
دُور کی آبادیوں میں ٹمٹماتے ہیں چراغ

ہے بلندی پر معلق تنگ شہروں کا دھواں
دھیمی دھیمی بج رہی ہیں مندروں کی گھنٹیاں

جھانکتے ہیں ایک دو تارے فلک کے بام پر
نور کچھ کچھ چھن رہا ہے چرخ نیلی فام پر

ذوقی

قومی اتّحاد کیوں کر ہو سکتا ہی؟

از منشی پریم چند صاحب

ابتدا میں اس خیال سے گونہ تسلی ہوئی تھی کہ جیسے جیسے عوام پر تعلیم کا بیدار کن اثر ہوگا آپس کی یہ جاہلانہ منافرت اور فرقہ وارانہ کدورت دور ہو جائے گی لیکن گذشتہ پچیس سال میں تعلیم نے افلاس کی مناسبت ہی سے ترقی کی ہے طلبار کی تعداد سے اندازہ کیجئے تو کئی گنی نظر آتی ہے ایک کی جگہ صوبۂ متحدہ میں پانچ پانچ یونیورسٹیاں ہیں جہاں بمشکل ہزار بارہ سو گریجویٹ امتحان میں شریک ہوتے تھے۔ اب ان کی تعداد بدرجہا زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن اسی رفتار سے منافرت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے جہاں حرف گئو کشی اور قربانی ہی ہنگامہ اور شر کا باعث ہوا کرتی تھی وہاں اب آرتی اور نماز اور باجے اور اذان اور سنکھ اور جلوس غرض بے شمار ایسے اسباب نکل آئے ہیں جن پر آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ اور جس زمانے کا خواب دیکھ کر قوم پرستوں کو تسلی ہوئی تھی وہ زمانہ دور ہوتے ہوتے اب شاید افق کے اس پار بھی کہیں نظر نہیں آتا، یہاں تک کہ جو کش مکش نوکریوں اور ممبریوں کے بھکاریوں تک محدود تھی عوام میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ اور ہندوؤں سے کوئی چیز مت خریدو۔ مسلمانوں کی دوکان پر مت جاؤ۔ وغیرہ تحریکوں نے گویا آتش گیر مادے کو ایسا جمع کر دیا ہے کہ ذرا سی چنگاری عالم گیر تباہی کا باعث ہو سکتی ہے کبھی کبھی نوجوانوں کی طبیعت کا رنگ دیکھ کر امید ذرا دیر کے لئے لہلہا اٹھتی ہے علی گڈھ سے یا کبھی کسی دوسری انجمن سے قوم پروانہ جذبات کی کمزور سی آواز سن کر بھی خون میں ذرا حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور قومیت کا سرور دل پر طاری ہونے لگتا ہو کہ یکایک ایک دوسری طرف سے مخالفانہ جذبات کی گھن گرج صدا کانوں میں آکر نشہ ہرن کر دیتی ہے۔ اور اب تو یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ ہندو مسلمانوں کے محلے میں رہتے ہوئے کانپتا ہے۔ اور مسلمان ہندوؤں کے محلوں میں رہتے ہوئے

مگر کیا اس سیاسی سرسام سے پہلے بھی یہی حالت تھی۔ کسی پرانی بستی کو دیکھئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دیواریں ملی ہوئی ہیں۔ اگر اس قسم کے خطرے ہوتے تو ہمسائیگی کا خیال ہی کیوں پیدا ہوتا۔ گاؤں گاؤں میں مکتب ہوتے تھے بالعموم مولوی صاحب لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ سید سالار کے مزار پر اور عزاداری کے موقعوں پر ہندو مسلمانوں کے شریک ہوتے تھے۔ اور ہولی کی تقریب میں مسلمان ہندوؤں کے شادی بیاہ میں بھی اس بھائی چارے کا نباہ کیا جاتا تھا۔ شادی اور غمی میں دونوں ایک دوسرے کے شریک حال رہتے تھے۔ اور آج کوئی ہندو چراغ جلنے کے بعد مسلمانوں کے محلے سے صحیح سلامت نکل جائے۔ تو دیوتاؤں کو دھنہ باد دیتا ہے اور شاید مسلمان بھی ہندوؤں کے سایے سے ڈرتا ہو۔ اور اگر ابھی خرید و فروخت یا عام انسانی تعلقات قائم بھی ہیں تو بدرجہ مجبوری یا رقابت کے جنون میں ہندو دوکان۔ ار مسلمان پارچہ فروش ریشمی کپڑے اس لئے خریدتا ہے کہ ہندو کاریگر اسے میسر نہیں آتے۔ اور مسلم خریدار ہندو بساطی کی دوکان پر اس لئے جاتا ہے کہ کوئی مسلمان بساطی نظر نہیں آتا۔ ورنہ دلوں میں اس درجہ نفرت پیدا ہو گئی ہے کہ اگر ایک قوم دوسرے سے بے نیاز رہ سکتی تو اپنے معبود کا شکریہ ادا کرتی۔

پرانی تاریخ میں مجلسی تعلقات کا ذکر بہت کم ملتا ہے مسلمان فرماں رواؤں کے زمانے میں ہندوؤں کے ساتھ کہیں کہیں زیادتیاں کی گئی ہونگی۔ ہندوؤں نے بھی اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں سے لڑائیاں لڑی ہوں گی مگر اب یہ امر شہادت کا محتاج نہیں ہے کہ ہندو مسلمان فرماں رواؤں کی لڑائیاں صلیبی یا الٰہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ محض ملک گیری کی ہوس یا ذاتی بدگمانی یا رقیبانہ شورید سری ان کی محرک ہوا کرتی تھی، ہاں ادبیات میں ہندوؤں کی کثرت اور ہندی فن شعر میں مسلمانوں کی طبع آزمائیاں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے۔ کہ ان میں مجلسی تعلقات بھی تھے اور سطحی نہیں۔ بلکہ کافی گہرے تھے۔ کیوں کہ ادبی ارتباط بلا دوستانہ تعلقات کے ممکن نہیں۔ اور اگر مان بھی لیں کہ پہلے ہی باہمی منافرت موجود تھی اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے تو وہ جہالت و سیاسی جمود اور بے خبری کا زمانہ تھا۔ ورنہ سلطنت ہی کیوں جاتی۔ اور تاجروں کی ایک چھوٹی سی جماعت اپنی ہمت اور تدبیر سے ایک برّاعظم پر تسلط کیوں کر پا لیتی؟ یہ دور تو بیداری اور روشنی کا ہے آج ایک بچہ بھی جتنی تاریخ جانتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال پر جس بیدار مغزی سے محاکمہ کر سکتا ہے اتنا ایک صدی قبل بڑے بڑے علمار کے لئے ناممکن القیاس تھا۔ جب لوگ پندرہ سو سال پہلے کی

دنیا میں بستے تھے۔ اور حالانکہ آج بھی ہماری وہ قدامت اور جمود پرستی قائم ہے اور آج بھی ہم مجلسی اور سیاسی معاملات میں قدیم روایتوں سے الہام حاصل کرتے ہیں لیکن پھر بھی مقابلتہً ہم نے دورِ جدید کی ذہنیت بہت کچھ حاصل کر لی ہے۔ اب ہمیں معلوم ہے کہ قوم اپنے عیبوں اور اور خوبیوں کے ساتھ کیا چیز ہے۔ وہ کیوں کر بنتی ہے۔ کیوں کر منظم ہوتی ہے اور کن کن حالات میں منتشر ہوتی ہے اس کے ارکان کیا ہیں۔ محرک اسباب کیا ہیں۔ ضروریاتِ روزگار سے ہم کافی باخبر ہیں۔ چنانچہ اس دور میں بھی جب انتشار اور افتراق کے اسباب ہی روز بروز غالب آتے جاتے ہیں تو قدرتی طور پر ہمیں اپنا مستقبل تاریک اور مایوس کن نظر آنے لگتا ہے۔ اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ شاید ہم دنیا سے مٹ جانے کے لئے ہی ہیں شاید ازل تک ہمارا غلام، رہنا ہی مشیت الٰہی ہے۔ شاید اس زمانے میں جب حبشی قومیں بھی آزاد ہیں اور آزادی کی وقعت کرتی ہیں اور خون سے اس کی حفاظت کرنے کو آمادہ رہتی ہیں۔ ہمیں آزادی کے درشن ہوں گے! اقتصادی کش مکش کے ساتھ جب دل پر مایوسی ہی غالب آجائے تو قوم میں زندگی کہاں سے آئے۔ روح کہاں سے آئے۔ طاقت اور تقویت تو امید سے آتی ہے۔ ہمت تو بڑھتی ہے۔ پودے کی ہری ہری پتیاں دیکھ کر۔ جو پودا روز بروز خشک اور مردہ ہوتا جاتا ہو اس سے کیا توقع کی جائے۔

اس فریب سے ہم اپنے دل کو نہیں دھوکے میں ڈال سکتے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے جہلا کی کم نظری اور تعصب اور مذہبی جنون کے ماتحت ہو رہا ہے۔ کاش ایسا ہوتا تو اصلاح کی امید قائم رہتی۔ جہلا ہمیشہ جاہل نہیں رہ سکتے۔ اور ایک ایسے زمانے کا خواب دیکھا جا سکتا تھا۔ جب جہلا جہلا نہ ہوں گے لیکن رونا تو یہی ہے کہ یہ ان ہستیوں کی عنایتیں ہیں جو خدا کے فضل سے علم اور فضیلت اور عقل کی علم بردار ہیں ان میں قوم کا درد بھی ہے اپنی قوم کو پھر اسی عروج پر دیکھنے کی قابل ناز تمنا بھی ہے اور یہ کیسے کہا جائے کہ وہ گمراہ ہیں یا کسی تیسری طاقت کے ایما اور تحریک کے زیر اثر ہیں یا رسوخ اور وقار اور منصب کی دھن میں عمداً قوم کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ جو قدم رکھتے ہیں پوری ذمہ داری کے ساتھ ضمیر کی تحریک سے۔ کسی کو کسی کی نیت پر شبہ کرنے کا حق نہیں ہے ہاں ہم یہ تحقیق کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ جن دماغوں میں اتحاد و مساوات اور اخوت کی اسپرٹ پیدا ہونی چاہئے تھی اُن میں منافرت اور تعصب اور برادر کشی کے جذبات کیوں مشتعل ہو رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں فرقوں میں کسی حد تک بدگمانی ہمیشہ رہی ہے ہندو کبھی یہ نہ بھول سکا کہ مسلمانوں نے اس پر فتح پائی ہے نہ مسلمان ہی یہ بھول سکے کہ وہ فاتح ہیں اور ہندو مفتوح، فاتح مفتوح کو ہمیشہ ذلیل اور حقیر سمجھتا ہے اور اس کی معاشرت کے ہر ایک پہلو میں اسے عیب ہی عیب نظر آتے ہیں۔ ہندوؤں نے فلسفہ اور عملیات میں کتنا ہی کمال کیوں نہ حاصل کیا ہو وہ ایک حملہ آور قوم سے اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ جب ان کا فلسفہ اور عمل اور تہذیبی اتحاد انھیں مسلمانوں سے نہیں بچا سکتا تو قدرتاً ہندوؤں کے ساتھ ان کا فلسفہ اور ان کے روحانی انکشافات بھی ذلت کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے کہیں کہیں ایک شاہ دارا شکوہ پیدا ہو گیا ہو۔ لیکن مسلمانوں نے اسے مرتد سمجھا اور مسلم علمانے یہ فریب قائم رکھا کہ ہندو بت پرست اور باطل پرور اور توحید ناآشنا ہیں۔ اور اس لحاظ سے مرتد اور ملحد سب کچھ ہیں۔ آج انگریز بھی قائم ہیں۔ مگر اس قوم کی بیدار مغزی دیکھئے کہ ہندو اور مسلمان اپنے مذاہب کے متعلق جو کچھ نہیں جانتا۔ وہ یہ لوگ جانتے ہیں۔ ہندو فلسفہ اور یوگ اور اپنشد دوں پر جتنی عالمانہ تصانیف انھوں نے کی ہیں اتنی ہندوؤں نے نہیں کیں۔ علیٰ ہذا مسلم تاریخ اور فلسفے پر بھی یورپینوں نے جتنے فاضلانہ انداز سے بحث کی ہے شاید یہ بھی کسی مسلمان نے کی ہو۔ تمدنِ عرب ایک فرانسیسی تصنیف کا ترجمہ ہے اور ایسی ہی ابھی تک ہندوستان میں پیدا نہیں ہو سکا۔ چنانچہ وہ فاتح اور مفتوح کی بدگمانی برابر قائم رہی اور وہ ایک لازمی بات تھی۔ مگر ہونا یہ چاہیے تھا۔ کہ جب فاتح بھی مفتوح ہو گیا تو اسے مفتوحوں سے ہمدردی ہو اور بدگمانی کے بجائے اتحاد اور اتفاق رونما نہ ہو۔ اور دونوں متحد ہو کر حکمراں طاقت سے آزادی کے لئے مطالبہ کریں یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے لیکن ہندوستان میں وہ نفسیاتی حقیقت باطل ہوئی جاتی ہے اور آج دونوں محکوم اور مظلوم اور مفلوج جماعتیں پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ نفرت اور بدگمانی کا شکار ہو رہی ہیں۔ اگر مذہب فی الواقع جنگ و جدل ہی سکھاتا ہے تو وہ دنیا کے لئے برکت کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اگر خالق کا یہ منشا ہوتا کہ ہندوستان میں صرف ہندو یا صرف مسلمان رہیں تو وہ ان میں سے ایک کو فنا کر دیتا۔ اس کے لئے یہ تو کوئی بہت مشکل بات نہ تھی مگر جب ایک ہزار سال تک اس ملک میں دونوں موجود ہیں تو خالق کا منشا کسی ایک کو فنا کرنا نہیں، دونوں کو زندہ رکھنا ہے۔ اور ایک دوسرے کو مٹانے کی کوشش کرنا خالق کے منشا کے خلاف عمل ہے

اس لئے مذہب سے یہ فعل بعید ہے، اور جو لوگ منافرت پھیلاتے ہیں وہ حکم الٰہی سے انحراف کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص سچا اور دین دار ہے وہ غیر مذاہب کے پیروؤں سے تو کیا ہر ایک ذی حیات سے محبت رکھتا ہے وہ ہر ایک وجود میں اُسی وحدت کا جلوہ دیکھتا ہے اور اس کی طبع روشن منافرت کی تاریکی کو اپنے اندر داخل نہیں ہونے دیتی۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے وہ لیڈر جو خاص حقوق اور خاص رعایتوں اور تحفظات کے قدردان ہیں وہ مذہب کے زیر اثر یہ عمل اختیار نہیں کرتے بلکہ ذاتی اور شخصی اعتبار سے سربرآوردگی کی ہوس تو ہر شخص میں ہوتی ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ اتحاد کے حامیوں میں اس کی پرسش نہیں ہے اور اس کے برعکس افتراق کے مؤیدوں کی خوب پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے اور انھیں منصب اور عہدے عطا ہوتے ہیں اور برگزیدوں کے بیٹھنے میں اس کی قدر و منزلت کہیں زیادہ ہو جاتی ہے تو ایک جاہ پرست اور خود پسند طبیعت کے لئے توازن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میرے لئے یہ باور کرنا محال ہے کہ خان عبدالغفار خاں یا شیخ مفتی کفایت اللہ یا حکیم اجمل خاں مرحوم کی سی برگزیدہ ہستیاں فرقہ پرست قائدوں کے مقابلے میں کم مسلمان ہیں، یا بھائی پرمانند جی، ڈاکٹر مونجے، مہاتما گاندھی اور سی راج گوپال چاری کے مقابلے میں زیادہ ہندو ہیں۔ مذہب کا یہاں مطلق سوال نہیں ہے۔ مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ یہ محض حرص اور خود غرضی کا سوال ہے اور جتنی جلد ہم یہ حقیقت سمجھ لیں گے اتنی ہی جلد ہم ان نقلی رہنماؤں سے پرہیز کریں گے۔ ورنہ جب وقت بھی ایسا ماحول پیدا ہوگا۔ اس وقت اپنی قوم کو اپنی ذات پر قربان کرنے والوں کے لئے زندہ رہنا دشوار ہو جائے گا۔

مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے جسے آج بھی یاد کرتا ہوں تو یہی جی چاہتا ہے کہ کاش وہ جہالت کا گذرا ہوا زمانہ پلٹ آتا، ہولی کا دن تھا ہندو دیہاتیوں کی ایک منظم جماعت رنگ اور پچکاریوں اور عبیر و گلال سے مسلح ہو کر مسلمان تحصیل دار پر حملہ کرنے چلی، میں بھی اپنے والد مرحوم کے ساتھ اُس جماعت کے ساتھ تھا۔ تحصیل دار صاحب بڑے دین دار بزرگ تھے روزہ نماز کے پابند۔ انھیں جیسے ان حملہ آوروں کی خبر ملی انھوں نے اپنا دیوان خانہ تو کھلا چھوڑ دیا۔ اور محل کے کمرے میں روپوش ہو کر دروازہ بند کر لیا، حملہ آوروں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ تحصیل دار صاحب بغل کے کمرے میں چھپے ہوئے ہیں۔ اب ادھر سے بار بار گذارش ہو رہی ہے کہ حضور باہر تشریف لائیں۔ ہم صرف سلام کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ کوئی حضور کے اوپر ایک قطرہ بھی رنگ نہ ڈالے گا۔ مگر حضور ہیں کہ خبر بھی نہیں ہوتے قسمیں کھائی جا رہی ہیں مگر تحصیل دار صاحب کو اعتبار ہی نہیں آتا۔ آخر محلے والوں نے ایک نئی ترکیب سوچی۔ دیوان خانے اور اس کمرے کے بیچ میں ایک پردے کی دیوار تھی جو چھت سے دو ڈھائی ہاتھ نیچے ہی ختم ہو گئی تھی۔ لوگوں نے ایک دم کا منگوایا اور اس میں رنگ بھر کر جو چھوڑا تو تحصیل دار صاحب سر سے پاؤں تک رنگ سے تر بتر ہو گئے۔ اور آخر ایک شان محبت کے ساتھ دروازہ کھول کر ہنستے ہوئے باہر نکل آئے۔ پھر تو ان کے جسم کا کوئی عضو نہ بچا۔ لوگوں نے داڑھی بھی رنگ ڈالی بھی رنگے اور اس کے بعد عطر اور پان بھی پیش کیا گیا۔ تحصیل دار صاحب ایسے خوش تھے کہ ان کا متبسم چہرہ آج ۵۰ سال کے بعد بھی میری نظر کے سامنے ہی ہے۔ اور جب میں کسی فرشتے کا خیال کرتا ہوں تو وہی نورانی صورت سامنے آ جاتی ہے اور آج یہ لغویت پھیلی ہوئی ہے کہ رنگ کھیلنا کفر سے بدعت ہے اور کہیں کہیں ہولی کے زمانے میں رنگ کا چھینٹا پڑ جانے پر خون کے دریا بہ جاتے ہیں۔ اس بیداری کے زمانے سے تو وہ بے خبری کا زمانہ ہی غنیمت تھا۔ جب کہ لوگوں میں رواداری تھی۔ پاسداری تھی شادی و غم میں شریک ہونے کی توفیق تھی۔ اگر مذہب ہمیں اتنا تنگ نظر بنا دیتا ہے تو میں ایسے مذہب کو دور سے سلام کروں گا۔ تو کیا تہذیبی اختلافات اس برادر کشی کے باعث ہیں۔ بے شک ہر ایک قوم اپنی تہذیب کی اپنے کلچر کی حفاظت کرنا چاہتی ہے اور اس کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔ اپنی زبان کی رسم الخط کی، ادب کی۔ معاشرت کی۔ رسوم و آداب کی محبت ہر ایک باخبر انسان میں ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے۔ لیکن اس کی بھی حد ہے۔ سچی آزادی وہی ہے جو دوسروں کی آزادی کی بھی قدر کرے اگر ایک جماعت کو اپنی مسجد میں اذان دینے کا حق ہے دوسری جماعت کو اپنے گرجہ میں گھنٹی بجانے کا تو تیسری جماعت کو اپنے مندر میں ناقوس بجانے کا حق کیوں نہ ہو بعض ہندو ریاستوں میں مسلم کلچر کی توہین کی جاتی ہے بعض مسلمان ریاستوں میں ہندو کلچر کی، دونوں کا ہی طرز عمل انصاف سے بعید ہے۔ ہر ایک جماعت کے لیے آزادی کا ایک ہی معیار ہونا چاہیئے۔ مگر یہاں آئے دن مسجدوں کے سامنے سے نکلتی ہوئی براتوں اور جلوسوں پر حملے ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہندوؤں کی براتوں کے عوض کوئی سرکاری جلوس بینڈ بجاتا ہوا نکلے تو مسجد کے نمازی خاموشی سے نماز پڑھنے میں مصروف رہیں گے۔ لیکن ہندو باجہ حالانکہ اس کے بجانے والے

مسلمان ہونے ہیں نماز میں مخل ہوجاتا ہے۔ اور دین داری کا جوش اُبل پڑتا ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ دنیا ہمت والوں کی ہے ۔ اور یہاں وہی غالب آتا ہے جو اپنا ڈھول خوب زور سے پیٹ سکتا ہے ۔ طاقتور حکومت کرتے ہیں ۔ کمزور محکوم رہتے ہیں ۔ یہ اصول قانون قدرت ہے ۔ انصاف اور مساوات وغیرہ اصول شاعروں اور اخلاقیات کے مصنفوں تک ہی محدود ہیں جرمنی اور اٹلی میں آج کل یہی ذہنیت یہودیوں کو ستائے ڈال رہی ہے اور یہ ایک مسلّم اصول ہوگیا ہے کہ یورپ کی طاقتور قومیں ہی خدا کے گھر سے دنیا پر حکومت کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں ۔ لیکن یہاں تو حکومت کوئی تیسری ہی طاقت کررہی ہے ۔ اور ایک جماعت اگر دوسری پر غالب بھی آجاوے تو بھی اسے اپنی فتح کا ثمرہ نہیں مل سکتا ۔ اور اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ۔ کہ اس کی غلامی کی مدت اور دراز ہو جائے ۔ کہا جاتا ہے ۔ کہ ہندوؤں کے چھوت چھات کے باعث دونوں فرقے آپس میں متحد نہیں ہو سکتے کیوں کہ جب تک دونوں ہم نوالہ اور ہم پیالہ نہ ہوں باہم خلوص کہاں اور اعتبار کہاں مگر اس خیال میں صداقت کا ایک جزو مانتے ہوئے بھی ہم اس کے قائل نہیں۔

پنجاب میں چھوت چھات کا نام نہیں ۔ لباس بھی قریب قریب دونوں جماعتوں کا یکساں ہے زبان بھی ایک ، رسم الخط بھی ایک ، پھر بھی جتنی کشاکشی پنجاب میں ہے اتنی کسی اور صوبے میں نہیں ہے اور کیا مسلمان مسلمان نہیں لڑتے یا عیسائی عیسائی نہیں لڑتے یا ہندو ہندو نہیں لڑتے ہم مذہب ہونا باہمی جنگ و جہد کو نہیں مٹا سکتا یہ خلوص اور رواداری تو سچی بیداری ہی سے پیدا ہو سکتی ہے جو مذہبی ، معاشرتی اور تہذیبی معیاروں اور تخیلات کو مناسب اور بے ضرر حدود کے اندر رکھ سکتی ہے ۔ جب تک ہم میں یہ ذہنیت نہ زندہ ہوگی کہ مذہب سبھی منجانب خدا ہیں اور سب ہی مذاہب کو زندہ رہنے کا یکساں حق ہے سب ضرورتوں اور حالات کے زیر اثر پیدا ہوئے ہیں ۔ اور جب تک ان کی ضرورت رہے گی وہ زندہ رہیں گے ۔ کوئی مذہب کوئی معاشرت کوئی عبادت کسی دوسرے پر فضیلت نہیں رکھتی اس وقت تک ملک میں سکون نہ ہوگا اور یہ مناقشے روز بروز زور پکڑتے جائیں گے اور ملک جہنم سے بدتر ہوتا جائے گا ۔ میں ایک ہندو کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو کسی قسم کی اعانت ، حفاظت ، علیحدگی نہیں چاہتا وہ ہر ایک میدان میں آزادی سے مسلمانوں کے دوش بدوش چلنے کو تیار ہے وہ قوم کو متحد اور مضبوط بنانے کے لئے بسا اوقات اس حد تک دب جاتا ہے کہ اس پر بزدلی اور پست ہمتی کا الزام عاید کیا جا سکتا ہے اور وہ کسی کے حقوق چھیننا نہیں چاہتا ملازمت میں ، نیابت میں وہ اپنے حق سے ایک جو بھی زیادہ نہیں مانگتا ۔ وہ مشترکہ نیابت کا حامی ہے مگر اس لئے نہیں کہ وہ اکثریت پاکر مسلمانوں کو ستائے ، اور دبائے بلکہ اس لئے کہ اشتراک عمل سے قوم مضبوط ہوتی ہے ۔ مگر یہ اس سے برداشت نہیں ہوتا ۔ کہ ایک جماعت تاریخی ، نسلی ، معاشری ، یا کسی بنا پر بھی دوسری جماعت سے تفوق اور ترحم کی طالب ہو مساوات اور کامل مساوات کے سوا دونوں جماعتوں میں خلوص اور یک جہتی پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں ۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ کسی اسلامی مذہبی جلوس پر ہندو جماعت نے حملہ کیا ہو یا کسی مسلمان لڑکی یا عورت کی کسی ہندو کے ہاتھوں عصمت دری ہوئی ہو یا ملازمت میں مسلمانوں کے حصے پر کسی ہندو لیڈر نے اعتراض کیا ہو مگر اس کے برعکس مسلمانوں کی جانب سے اس قسم کی وارداتیں اور اعتراضات برابر ہوتے رہتے ہیں ۔ ہندو اگر اعتراض کرتا ہے تو انگریزوں کے تناسب یا جبر پر مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا ان کی نگاہ ہندوؤں کے حقوق پر رہتی ہے ہندوؤں کا یہ حلم خالص اور مصلحت یا تدبیر پر مبنی ہے ایسا کہنا غلط ہوگا ۔ ہندو فرقوں میں کتنی ہی ایسی ذاتیں ہیں جو مذہباً جنگ و جدل سے دور رہنے کے باعث اب اس قدر پست ہمت ہوگئی ہیں کہ ان میں اپنی حفاظت کرنے کی طاقت نہیں رہی اور کوئی بھی منظم جماعت چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان ہو یا عیسائی ہو یا محض مفسدوں کا گروہ ہو انھیں بڑی آسانی سے پامال اور ذلیل کرسکتا ہے ۔ ہندو فرقے میں ایک بڑے حصے اور فرقے کی بے بسی اور کمزوری جس کے لئے ہندو دھرم کی سختیاں اور قیدیں ذمے دار ہیں ۔ اس قسم کی بے حرمتی برداشت کرنے پر مجبور ہے اور شاید اس کی کمزوری ہی دوسری جماعتوں کو اس پر حملہ کرنے کی تحریک کرتی ہو اور اگر آپس میں قومی اتحاد ہوتا ہے تو ہر دو فرقوں کے سربرآوردہ اصحاب کا فرض ہے کہ ان شرمناک وارداتوں کے انسداد کی کوشش کریں جب تک ہم ہر ایک معاملے کو چاہے وہ سیاسی ہو یا معاشرتی یا تمدنی قومی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادت نہ ڈالیں گے اور فرقہ وارانہ جذبات ہی ہمارے دل پر غالب رہیں گے ۔ اس وقت تک اتحاد امر محال ہے ۔ جب تک کسی غریب ہندو عورت کی بے حرمتی کو مسلمان لیڈر ، غیر جانب داری کی نظر سے نہ دیکھیں گے جس سے وہ ایک غریب مسلمان عورت کی بے حرمتی کو دیکھتے ہیں اس وقت تک کانگریس اور جمعیۃ العلما کی کوشش اتحاد ، کارگر نہ ہوگی ۔ ہندو جماعت

سیاسی وجوہ سے موردِ عتاب ہے اور تنگ نظر مسلم اصحاب اس ماحول سے فائدہ اٹھا کر اسلامی حقوق کی حمایت کے پردے میں ذاتی اغراض کی تکمیل پوری کرنے میں دریغ نہیں کر رہے ہیں۔ ذاتی وقار اور منفعت کے اعتبار سے تو ان کا یہ فعل سراسر حق بجانب ہے۔ لیکن قومی اعتبار سے اس طرزِ عمل کی کافی مذمت کی جا سکتی ہے کیوں کہ یہ ہندوستان کی مستحکم حکومت کا ضامن ہو رہا ہے۔

کشمیر اور الور میں مسلمانوں پر جو سختیاں ہو رہی تھیں اسلامی ریاستیں ہی نہیں بلکہ یہ تو ہر ایک ریاست کا دستور ہے۔ عام رعایا پر یہ مرتب کئے مظالم ڈھائے جاتے ہیں مسلم لیڈروں نے قابلِ تعریف ہمتِ قومی سے کام لے کر رعایا کو ان ریاستوں کے مظالم سے بچایا۔ سیاسی بیداری کے معنی بھی ہیں۔ کہ حریتِ استبداد کے قلعوں کو توڑ دے۔ خوش قسمتی سے ہندو لیڈروں کے سوا اور سب نے مسلمانوں کی اس جد و جہد کو احترام کی نظر سے دیکھا، ہاں اس کی شکایت ضرور رہی کہ اس کشمکش میں ہندو رعایا کی اقلیت گیہوں کے گھن کی طرح پیسی گئی۔ وہی کام اگر کمیونل اصول سے نہ ہو رعایا کے اعتبار سے ہوتا تو کسی کو شکایت کا موقع نہ رہتا۔ مگر یہ ہندوستان کی بدنصیبی ہے کہ یہاں ایک مقتدر جماعت ہر ایک مسئلے پر کمیونل پہلو ہی سے نگاہ ڈالتی ہے اور عام رعایا کے فلاح سے اسے کوئی تعلق نہیں ہوتا یہاں بھی اس کی نظر تعلیم یافتہ طبقے تک ہی محدود رہتی ہے نیچے طبقے کے انسان کس بری طرح پامال ہو رہے ہیں، ادھر اس کی بھول کر بھی آنکھیں نہیں اٹھتیں۔ کاشتکاروں اور مزدوروں میں بھی ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل ہیں۔ لیکن ان کی حمایت میں کوئی مسلم آواز نہیں اٹھتی۔ افلاس اور بیکاری اور تجارتی کساد بازاری اور سیاسی بے عنوانیوں کے ہاتھوں دونوں ہی جماعتیں یکساں پریشان ہیں۔ مگر ان امور پر فریاد کرنے کا بار غیر مسلم طبقے ہی پر ہے مسلمانوں کی یہ بے حسی بڑی حد تک تاریخی اسباب پر مبنی ہے۔ اگر ان میں یہ سیاسی جذبہ نہ آ جاتا تو ہندوستان پر دوسروں کا اقتدار ہی کیوں ہوتا، منصب اور وقار کا لالچ اور رسوخ اور حکام پرستی کے جنون کا بھی تاریخ ہی سے تعلق ہے۔ آج حیدرآباد دکن اور دوسری اسلامی ریاستوں میں ..... زیادہ تر عہدے مسلمانوں کے ہاتھوں ہی میں ہیں۔ شاہی زمانے میں بھی یہ ہی دستور تھا، وہ ہندو ذاتیں جو اس زمانے میں برسرِ اقتدار تھیں۔ مثلاً کشمیری اور کایستھ اصحاب ان میں بھی وہی تمکنت اور امارت کی بو سرایت کر گئی چنانچہ ایک آدمی کسی عہدے پر پہنچ جاتا تھا تو درجنوں مفت خورے، کاہل، نکمے رشتہ دار آ کر گھیر لیتے تھے اور اس کے بل پر زندگیاں پار کر دیتے تھے۔ اسی طرح عوام میں خوشامد سہل پسندی اور منعم پرستی کی عادت پڑ گئی اور رفتہ رفتہ یہی ان کی جبلت ہو گئی مگر اب اس زمانے میں وہ اقتدار و منصب کہاں، جہاں مسلمان ۸۰ فیصدی تھے وہاں اب انھیں ۲۴ فیصدی جگہیں بھی مشکل سے ملتی ہیں۔ اب تو تعداد شماری ہوتی ہے اور اس کے اعتبار سے نیابت اور ملازمت میں حصے ملتے ہیں سہل پسندی کے باعث ان سے مقابلے کی صلاحیت بھی غائب ہو گئی اور ذہنی انحطاط پیدا ہونے لگا۔ چنانچہ مسلم نوجوان آج بھی مقابلے سے گھبراتے ہیں اور انتخاب کے دامن میں چھپ کر اپنی عافیت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں مناسب یہ تھا اور دانشمندی اور دور بینی اس میں تھی کہ وہ زمانہ با تو نہ ساز و تو با زمانہ بساز۔ کا ثبوت دیتے۔ اور بدلتے ہوئے حالات روزگار سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتے مگر وہ آج بھی اسی دورِ قدیم کے خواب دیکھ رہے ہیں اور اپنے کیرکٹر میں اس خامی کے باعث ملک کو تباہی کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ جو کچھ ذہنی استحکام سے حاصل کر سکتے تھے۔ وہ اسے خوشامد اور تفرقات کی تحریک اور دیگر قابلِ اعتراض طریقوں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہیں یہ نعرے لگائے جاتے ہیں کہ ہم ہندوستان کے حکمران ہیں، کہیں یہ کہ ہم فرمانروایانِ قدیم کے نام لیوا ہیں کہیں کچھ اور مہمل صدائیں بلند کی جاتی ہیں اور اپنے وقار اور سطوت اور اولوالعزمی کا سکہ جمانے کے لئے عوام کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے سے بھی پرہیز نہیں کیا جاتا اور عوام تو عوام ہیں بھیڑ ہیں ان کو جس طرف چاہے ہانک لے جائیے اس کا ذرا بھی خیال نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ میری تحریر سے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ میں بھی ہندو ہوں اور فطرتاً ہندوؤں کی جانب داری کر رہا ہوں مجھے ہندو ہونے سے تو انکار نہیں ہے اور بہت ممکن ہے کہ ہندو ہونے کے باعث میں نے مسلمان بھائیوں کے ساتھ کچھ بے انصافی کی ہو لیکن میرا خیال ہے۔ میں متعصب ہندو نہیں ہوں اور جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ صداقت کے اظہار کے خیال ہی سے لکھا ہے۔ اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ ہم اپنے خیالات اور شکایتیں صاف صاف لکھیں اور ٹھنڈے دل سے ان پر بحث کر کے صورتِ حال میں اصلاح کر سکیں۔ خاموشی بعض حالتوں میں تریاق ہے تو اکثر حالتوں میں زہرِ قاتل ہے ہندوؤں کی قوم پرستی کا بین ثبوت کانگریس ہے جس نے فرقہ وارانہ معاملات کو ہمیشہ پسِ پشت ڈالنے کی کوشش کی ہے اور ہر ایک

مسئلے کو قومی پہلو ہی سے دیکھا ہے۔ اور یہ اس کی صداقت ہی ہے جس نے بیدار مغز مسلمانوں کو اس میں شریک کر دیا ہے۔ ہندو سبھا جیسی جماعت کو اس کے مقابلے میں فروغ حاصل نہیں ہوا۔ یہ ہندوؤں کی قوم پرستی کی دلیل ہے۔ لیکن جب فرقہ وارانہ رائیں اس قدر تند ہو جاتی ہیں کہ کانگریس کو اپنی جان بچانی مشکل ہو جاتی ہے تمام ہندوؤں کی ہمدردی اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور وہ ایک مفلوج جماعت بن کر رہ جاتی ہے۔ میں کتنے ہی ایسے قوم پرور ہندوؤں کو جانتا ہوں جو فیروزآباد کے حادثے سے بے حد متاثر ہوئے ہیں اور ہندوستان کی نجات کی طرف سے اب ان میں انھیں پوری مایوسی ہو گئی ہے۔ میں اسلامی اخوت اور مساوات کا معتقد ہوں اور ہندو تہذیب پر اسلامی تہذیب کا جو اثر ہوا اسے بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ میرا اعتقاد ہے کہ ہندوستان میں دونوں تہذیبیں پہلو بہ پہلو رہ کر ہی ترقی کر سکتی ہیں اور روز بروز ان میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ کانگریس کے اثر سے بہت سی بے معنی بندشیں ٹوٹ چکی ہیں اور آئندہ بھی ٹوٹتی جائیں گی۔ فطری رفتار قائم رہنے دی جائے مگر اس کے ساتھ میرا یہ بھی ایمان ہے کہ اتحاد خالص مساوات کے سوا اور کسی طرح ممکن نہیں۔ جب تک کسی طرف سے خاص حقوق کے مطالبے ہوتے رہیں گے اس وقت تک یہ کشمکش جاری رہے گی اب تمام امید قوم کے نوجوانوں سے ہے۔ انھیں کے ہاتھ میں قوم کی کشتی ہے اگر انھوں نے نئی روشنی اور نئی تہذیب اور سیاسیات کے زریں اصول کی پابندی کی اور مذہب کو اس کے صحیح معنوں میں سمجھا۔ تب تو مستقبل روشن ہوگا۔ ورنہ ایک دن وہ آئے گا کہ دونوں جماعتیں لڑ لڑ کر مر جائیں گی اس لیے ایک میں بھی اتنی طاقت نہیں ہے کہ دوسری کو فنا کر کے خود زندہ رہے

رباعیات

تقدیر کے لکھے کو مٹانے والے   گستاخ ہیں کتنے گڑگڑانے والے
خالق پہ ہے ایک اعتراضِ پنہاں   کہتے ہیں جسے "دعا" زمانے والے

گل پر ہیں نقوشِ دستِ باری اب تک   جنباں ہے دلِ بادِ بہاری اب تک
انساں کی پیمبری کا در ہے مسدود   قدرت کی پیمبری ہے جاری اب تک

دنیا معلوم، فکرِ دنیا معلوم   عقبیٰ معلوم، خوفِ عقبیٰ معلوم
پی بادہ کہ "حشر و نشر و میزانِ عمل"   اِن سب سے میں واقف ہوں تجھے کیا معلوم

انساں پہ ہے کس درجہ خرافات کا بار   دن کا ہے کبھی وزن، کبھی رات کا بار
پیدا ہو بشر میں کیا حکیمانہ مزاج   عقلوں پہ ہے صدیوں کے روایات کا بار

نیا شوالہ

ایک انسان اور مخصوص ایک عورت کی زندگی میں وہ وقت بھی آجاتا ہے جب قہرمانِ محبت اس کے دل کو مٹھی میں لے کر اس طرح دباتا ہے جیسے چڑیا پکڑ لی جائے اور وہ پھڑپھڑا بھی نہ سکے کام دیو کے روپ کی کرنیں عورت کی نگاہوں کو اس طرح چوندھیا دیتی ہیں کہ وہ اس مرد کی صورت کے عیب بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہتی۔ وہ بس ایک دیوتا معلوم ہوتا ہے اور تمام مردوں میں سربلند نظر آتا ہے

رکمنی بالا دیوی سرکار اس قسم کے جذبے سے اس وقت دوچار ہوئی جب اس کی عمر کم و بیش تیس سال کی تھی۔ اس کی حالت ایسے شخص کی سی ہو گئی جس کے پاؤں تلے سے دریا کی مٹی کھسک جاتی اور پانی کا بہاؤ اسے چاروں خانے چت کر کے موجوں کا کھلونا بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے اس جذبے کی حیرت آفرینیوں میں گم تھی۔

جس کے متعلق تمام جاننے والے فیصلہ کر چکے تھے کہ اب وہ اپنی عمر کنوارپنے ہی میں گذارے گی۔ اس کا کسی ایسے شخص کی محبت میں دیوانہ وار مبتلا ہو جانا جسے وہ چند مہینوں کی مختصر مدت سے جانتی ہو نہ صرف اوروں کے لئے بلکہ خود اس کے لئے بھی قابلِ قبول بات نہ تھی۔ اور اس سے زیادہ دشوار یہ یقین تھا کہ وہ شخص اسی ولولہ و جوشِ محبت سے اس کی محبت کا جواب دے سکتا ہے۔ مگر رکمنی بالا اپنے جذبے کی شدت میں اس بات کا خیال بھی نہ کر سکی تھی گویا اس کی نظر میں یہ بات ایک فطری بات تھی۔

رکمنی سرکار کی سوانحِ حیات سے واقف ہو کر آپ خود کہنے لگیں گے کہ اس میں خود بینی کا تو شائبہ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسے پورا احساس تھا کہ وہ حسین نہ تھی، ہاں وہ مرگ نین ضرور تھی، اس کے علاوہ سڈول اور گداز بدن، جو رکمنی کو کمال کی حد تک حاصل تھا، حسن میں شمار کیا جا سکتا تھا لیکن بہرحال اس کا مدار تندرستی پر ہوتا ہے اور چونکہ وہ ہوش سنبھالتے ہی آفتوں اور مصیبتوں کا شکار ہو گئی تھی اس لئے غازۂ شباب کی لطافت و تازگی باقی نہ رہی تھی۔ بہرحال وہ یقین کر بیٹھی تھی کہ جوتیش اس کو محض اس کی ذات کے لئے چاہتا ہے ـــــ اس کی روح سے محبت کرتا ہے!

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس خیال کے مستحکم ہو جانے نے رکمنی کی نظر و خیال کے سامنے پریم نگر کی کیا کچھ چمن بندیاں پیش کر دی ہوں گی وہ اپنی آئندہ زندگی کی فردوس نگاریوں میں کھوئی تھی

رکمنی کی داستانِ زندگی بھی غیر معمولی تھی، چودہ سال کی عمر میں فالج نے اس کا ایک پاؤں بیکار کر دیا تھا، اور وہ اپنی معذوری سے ہمیشہ صدمے کا احساس کرتی تھی، اس کا اندازہ ایک ایسی ہی لڑکی کو ہو سکتا ہے جو اپنے اندر رکمنی کی طرح زندگی کی طلب بھی رکھتی ہو ـــــ اس چیز کی آرزومند ہو جو ایک نوجوان لڑکی کی زندگی کو پوری طرح مسرور و خنداں بنا دیتی ہے غرض رکمنی کی حالت اور اس کی آرزوئے شباب فطرت کی ستم ظریفی کا ایک شہ پارہ تھی۔

وہ اپنی ہم عمر اور ہم جماعت لڑکیوں کی طرح نہ تو اچھے کپڑے پہن سکتی تھی اور نہ ان کے سادہ کھیلوں اور چہلوں میں شریک ہو سکتی تھی۔ وہ ایک غریب اور یتیم لڑکی تھی۔ اس کے باپ نے معمولی پنشن کے باوجود رکمنی کو انٹرنس پاس کرایا تھا، اور جب اس کو ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے ڈھاکے سے کلکتے بھیجنے کی فکر کر رہا تھا، موت نے آلیا۔ اور رکمنی اس دنیائے غرض و ہوس کے اندر یکہ و تنہا رہ گئی۔

کلکتے میں اس کا ایک دور کے رشتے کا ماموں رہتا تھا، مگر وہ بھی آسودہ حال نہ تھا۔ لیکن شاید اس کی غریبی ہی رکمنی کی سرپرستی قبول کر لینے کا سبب بن گئی ورنہ اگر وہ دولت مند ہوتا تو دور کے رشتہ کی بھانجی تو درکنار سگی بھانجی کے سر ہو جانے کا بھی غالب امکان تھا۔ غرض رکمنی نے جو خط اسے لکھا اس کا ہر لفظ بتاتا تھا کہ وہ اس کو نہ صرف اپنا حقیقی ماموں سمجھتی ہے بلکہ اس سے بہتر دنیا میں کوئی ماموں ہو ہی نہ سکتا تھا

آپ نے سنا ہوگا کہ خوشامد سے خدا بھی خوش ہوتا ہے لیکن ذرا تامل و تفکر سے کام لیجئے گا تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ اس لفظ "خوشامد" کو نہایت غلط معنے میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ انسان اگر اپنی خوبیوں کو سنکر خوش ہوتے

تو تعرض نہونا چاہئے۔ لیکن یہ ظالم و جاہل توان باتوں کو اپنی ذات سے منسوب سنکر خوش ہولیتا ہے جن کو وہ بدرجۂ یقین جانتا ہے کہ اس میں موجود نہیں۔ اس لئے میں انسان کو خوشامد پسند ہونے کے عوض "فریبی" کہنا زیادہ موزوں سمجھتا ہوں کہ یہ مورکھ سب سے بڑا فریب خود اپنے آپ کو دیتا ہے اور ایسا کامیاب فریب دیتا ہے کہ اپنے متعلق جھوٹی باتوں کو بھی سچ سمجھ لیتا ہے۔

الحاصل رکمنی کے خضر نے ماموں کو پرتیت لیا، اور وہ کلکتے پہنچ گئی۔ وہ زمانے کی اونچ نیچ دیکھے تھا۔ جب یہ پہنچی تو اس نے ایک روز کہا:-

" رکمنی ایک رشتہ دار کا جو فرض ہے میں اسے ادا کروں گا۔ اور تم سے جو ہو سکے کام کاج میں اپنی بوڑھی مامی کا ہاتھ بٹانا۔ کیونکہ ہم سے لوگ اگر روٹی کھانا چاہتے ہیں تو پھر دوسری حماقتوں کے لئے وقت نہیں نکل سکتا۔"

اس کی ممانی نے کہا کہ کہاری جو آتی ہے اسے الگ کر دیا جائے۔ دو روپے مہینا بچے گا۔ جھاڑو بُہارو رکمنی کر لیا کرے گی۔ مگر رکمنی نے ان کو بتلایا کہ " مامی کام کاج کے لئے مجھے ذرا بھی عذر نہ ہوگا۔ لیکن ایک تو مجھ سے کچھ ہو نہ سکے گا اور دوسرے میں پڑھنا بھی چاہتی ہوں۔ اس لئے نوکرانی کو جواب نہ دیجئے۔ اس کی تنخواہ میں دیدیا کروں گی۔ میرے کھانے پینے کا بوجھ بھی آپ پر نہ پڑے گا۔ باپو نے کچھ روپیہ بنک میں چھوڑا ہے، سو روپے سال وہاں سے ملتے ہیں، وہ سب میں آپ کو دیدیا کروں گی۔ اب آپ ہی میرے ماتا پتا ہیں۔ میں پڑھائی کے خرچ کے لئے کہیں "ٹیوشن" کر لوں گی۔"

ماموں ممانی کے دلوں کے تو کنول کھل گئے۔ انھیں یہ امید کب تھی؟ دونوں نے اس کو پیار کیا، کلیجے سے لگایا اور اس کے پڑھنے کے شوق کی بہت تعریف کی۔

رکمنی کی صبح زندگی میں سولھویں سال میں ایک عجیب ترین واقعہ رونما ہوا۔ اس معجز نما واقعے نے اس کی تاریک زندگی میں نور کی وہ شعاعیں پھیلادیں جن کے خیال سے بعد کی زندگی میں بھی اس کی آنکھیں چمک جاتی تھیں۔

ابھی اسے کلکتے آئے ہوئے زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ وائی، ڈبلیو سی۔ اے میں ایک ناموروں مشہور ڈاکٹر کا لکچر ہوا۔ اور یہ بھی ایک ہمسایہ لڑکی کے ساتھ وہاں گئی۔ تقریر کا موضوع "زنانہ حفظان صحت" تھا۔ ہر چند رکمنی کی نظر میں بحث نہایت غیر اہم تھا ـــــ کہ اس کا مفلوج پاؤں جسمانی صحت کی تمام صورتوں کو مایوس کر چکا تھا۔

مقرر نے ایک موقع پر کہا کہ:-

" ہر عورت پر شکر واجب ہے کہ قدرت نے اس کو ایسا خوبصورت بدن عطا کیا ہے۔ اس بخشش واکرام کے ساتھ تم پر یہ فرض خود بخود عائد ہوجاتا ہے کہ تم اپنے بدن کی نگہداشت وحفاظت کرو۔"

تقریر کے دوران میں، مقرر کے بعض اشاروں اور فقروں نے رکمنی کے احساس قلب کو کافی سے زیادہ متاثر و المناک بنا دیا تھا۔ لیکن ان الفاظ کو سنکر تو وہ بے قابو ہوگئی اور ضبط نہ کرسکی۔ وہ زار زار رونے لگی۔ سارا مجمع اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس کی یہ حالت اضطرار اتنی شدید تھی کہ شاید رکمنی اپنی جان دیکر بھی قابو یافتہ نہ رہ سکتی تھی۔ اس کا دل دُکھا ہوا تھا، اور احساس محرومی کا دریا نہ معلوم کب سے ضبط کے بند کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ بے حال ہوگئی۔ اور ایک دوسرے کمرے میں پہنچادی گئی۔

" مجھ پر کس بات کا شکر واجب ہے؟ اس نے جذبات کی طوفانی حالت میں کہا۔ " میں بدرُو ہوں اپاہج ہوں، بےکس ہوں، لوگوں کے رحم یا نفرت کا موضوع ہوں ـــــ ایسا رحم جو نفرت سے بدتر ہے! میں خدا کی مخلوق ہی نہیں: میں تو ہر شئے کے نعم البدل سے محروم رکھی گئی ہوں ـــــ پھر شکریہ کس بات کا؟"

" تم پر تو شکریہ بدرجۂ اولےٰ واجب ہے: تمہاری اس ذکاوت حس کا سبب تمہارا ذہن ہے، اور ذہنی ذکاوت ہر بات کا نعم البدل ہے! قدرت کا یہ مطالبہ ہے کہ اس وسیع نظام میں تم اپنے ذہن و ذکاء سے اس کی خدمت کرو!" ایک گہری اور سنجیدہ آواز رکمنی کے کانوں میں پہنچی۔ یہ اس [illegible] ڈاکٹر کی آواز تھی۔

رکمنی نے نگاہیں اوپر کیں تو مشہور و معروف ڈاکٹر چیٹرجی کو اپنے برابر کھڑا دیکھا۔ اور اس کی پرجوش آنکھوں کی ڈوب جانے والی نگاہوں کو اپنے اوپر [illegible] پایا۔ چیٹرجی ایک معمر شخص تھا۔ لیکن اس بوڑھے ڈاکٹر کی آنکھوں میں رکمنی [illegible] جو کشش محسوس کی، وہ اس نے ساری عمر میں کسی دوسرے آدمی کے اندر [illegible] ڈاکٹر نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور محض اس [illegible] سیرت کی مخفی قوتوں سے رکمنی کی تسکین و تشفی ہونے لگی۔

پھر ڈاکٹر چیٹرجی نے اس کی بیماری کے متعلق مختلف سوال [illegible] دوسرے دن اس کو اسپتال میں بلاکر نہایت دقتِ نظر سے اس کا [illegible]

جب خوب دیکھ بھال چکا تو اس نے کہا کہ اگرچہ نہایت خفیف مگر امید باقی ضرور ہے' اور امکان ہے کہ رکمنی اپنی بیساکھی کو سلام کر سکے۔

رکمنی اسپتال میں داخل ہو گئی اور چٹرجی نے نمایاں ہمدردی و دل سوزی کے ساتھ علاج کیا؛ قیمتی دوائیں جو اسپتال سے نہ مل سکتی تھیں وہ اپنے پاس سے منگاتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک روز رکمنی ہنستی ہوئی اسپتال سے رخصت ہوئی اور اپنی بیساکھی کو وہیں چھوڑ دیا۔ اس روز رکمنی کی مسرت اور احساس احسان مندی کا اندازہ دنیا کے کسی پیمانے سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر چٹرجی ایک وقف کمیٹی کا صدر بھی تھا۔ اس نے کمیٹی کے فنڈ سے رکمنی کے لئے وظیفہ مقرر کرا دیا؛ اور اسے مشورہ دیا کہ وہ گانے کا علم حاصل کرے۔ کیونکہ رکمنی کی آواز کی گھلاوٹ اور اس کا سوز ڈاکٹر کی نظر میں قدرت کا مخصوص عطیہ تھا

اب ڈاکٹر چٹرجی رکمنی کا صرف بہترین دوست ہی نہ تھا بلکہ کسی جنم کا نہایت شفیق باپ بھی تھا۔ وہ اسے دادا کہنے لگی تھی۔ اور وہ اکثر و بیشتر اپنے مصروف اوقات میں دو ایک گھنٹے نکال کر رکمنی کے پاس صرف کیا کرتا تھا۔ اس کی ان صحبتوں نے رکمنی کی طبیعت کے رقت و ترحم کو حکیمانہ سانچے میں ڈھال دیا اور معاشرتی و اخلاقی تعصبات کو بالکل ہی مٹا دیا۔ ایک روز جب چٹرجی اس سے ملنے آئے تو رکمنی نے سوال کیا:۔

" دادا' آپ نے اخبار میں دیکھا ہو گا کہ آرتی اور نماز کے جھگڑے میں آگرہ میں کئی آدمی قتل ہو گئے؟"

" ہاں بیٹی' میں نے پڑھا اور اپنی اوقات پہ ہزار ہزار نفریں کی۔ کہ ایسے غیر انسانی ملک میں' ایسے ادھرمی ملک میں' پیدا ہوا اور جی بھی رہا ہوں۔ یہ کام حیوانوں کا ہے یا ان انسانوں کا جن کا کوئی دھرم نہیں ہے۔"

" مگر دادا' میری تو سمجھ میں نہیں آسکا کہ کوئی خدا یا پرمیشور اپنی نماز یا پوجا پاٹ دو چار منٹ کی دیر سویر ہو جانے سے خفا ہو سکتا ہے' اور اس کے ماننے والوں کا فرض انسانی خون بہا کر اس کو خوش کرنے ہی سے ادا ہو سکتا ہے!"

" رکمنی' تم انسانوں کی باتیں کر رہی ہو اس بدقسمت ملک میں تو درندوں سے بھی بدتر کوئی مخلوق بستی ہے۔ کیونکہ درندے کا گزند پہنچا دینا دیا جانتی ہو لیکن یہ انسان درندے کس وقت بپھر جائیں کوئی نہیں جانتا۔ جیو رکھشک'

ہیں اور "رمش ہتیا" کرکے شدھ ہندو بنتے ہیں' یہ میرے بندوں کے دل میں گھر کر گئے تو میری جنتوں میں داخل ہو گئے" کی تلاوت کرتے اور دل آزاری کرکے حاجی مسلمان بنتے ہیں۔" ڈاکٹر نے گہرے محسوسات کرب کے ساتھ کہا۔

" پردادا' مقامی حکام بھی تو ان قضیوں کو آسانی رفع کر سکتے ہیں؟" رکمنی نے پھر کہا۔

" بیٹی یہ اس کا سیاسی پہلو ہے' میں اس سوال کو مذہب و اخلاق کے اندر حل کرنا چاہتا ہوں' ہر چند وہ ختم سیاست ہی پہ ہوتا ہے۔ ہم میں سے مذہب کی روح غائب ہو گئی اور صرف ڈھانچے کی پوجا ہو رہی ہے۔ اسی لئے مذہبی اور اخلاقی باقی نہیں رہی۔ قصور کسی ایک کا نہیں' دونوں ہی ملزم ہیں' لیکن میں ہندو ہوں اس لئے انھیں کو الزام دوں گا ہندو دھرم پرم آتما اور اہنسا کی تعلیم دیتا ہے پھر کتنی بڑی جرأت کی بات ہے کہ ایک دھارمک ہندو کسی انسان کو نقصان پہنچائے! اس کی علت یہی ہے کہ بھگوان کی پوجا نہیں کی جاتی بلکہ قصے کہانیوں اور طور طریق یعنی پنڈت پروہتوں کی پوجا ہوتی ہے۔ ہمارے دیس میں لاکھوں پنڈت کھلوے اور بیکار کرکے چھوڑ دیئے گئے ہیں اور وہ اپنے پالن کے لئے ڈھونگ گانٹھنے پر مجبور ہیں؛ اس لئے وہ غیروں یا مسلمانوں کو ملچھ کہتے اور نفرت کی آگ بھڑکاتے ہیں۔"

" مگر ان جھگڑوں میں تو لالہ اور بابوؤں کے نام دیکھنے میں آتے ہیں۔" رکمنی نے دخل دیا۔

" ہاں بیٹا یہ ٹھیک ہے' یہ لالہ بابو' یہ خود فروش تیسرے درجے کے نیتا بھی تو پروہت ہی ہیں۔ ایسا پروہت بننے کے لئے وید اور شاستروں کا جاننا ضروری نہیں بلکہ دو چار الٹی سیدھی تقریریں یا ایک سڑا سا اخبار نکال کر سرٹیفکٹ مل جاتا ہے۔ زمانے کے ساتھ نام بدل گیا ہے کام وہی ہے۔ میرا خون تو اس وقت کھولنے لگتا ہے جب انھیں نیتاؤں کو یہ کہتے سنتا ہوں کہ" بھس میں چنگاری تو جمالو ڈالتی ہے"—— بدبخت سمجھتے ہیں اور لڑواتے ہیں

" تو دادا' یہ بڑے بڑے نیتا کیا اتنا بھی نہیں سمجھتے؟"

" بیٹی سمجھتے سب ہیں مگر سچ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتے ورنہ ان کا بڑا پن باقی نہیں رہ سکتا۔ وہ بھی مصلحتوں کے نیتا ہیں۔ ورنہ اگر یہ چھوٹے موٹے نیتا اور اخبار نویس ان کی برائی کر دیا تو جاتی کب مانے گی۔ اور جب جاتی ساتھ نہیں تو حکومت بھی نہ پوچھے گی۔ پھر ساری بڑائی غائب! میرے خیال میں

اس زمین پر تو ایک ہی سچا نیتا پیدا ہوا اور وہ اکبر بادشاہ تھا اس نے سچے دل سے چاہا تھا کہ ہندوستان میں ایک قومیت قائم ہو جائے۔ مگر ہمارا ملک ہمیشہ سے بدنصیب ہے۔ اکبر مہاراجہ کا مشن اس کے شاہی خاندان سے باہر تو مقبول نہ ہوا لیکن دکن کے بادشاہوں نے اسے پورا کرنا شروع کیا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں نے آپ کو ہندوستانی سمجھ لیا تھا اور ہندوؤں نے ان کو ہندوستانی مان لیا تھا۔ آپس میں شادی بیاہ معمولی بات ہو گئی تھی، مگر اورنگ زیب کی ملک گیری کی ہوس کا برا ہو کہ دکنی حکومتیں مٹ گئیں اور ہندوستانی قومیت کا ارادہ بھی ان کے ساتھ فنا ہو گیا۔ اس آخر زمانے میں کشب چندر سین اور رام موہن رائے کو بھی کوئی سچا جانشین نہ ملا کہ ہندو جاتی تو ایک ہو جاتی۔

"کاش وہ زمانہ پھر پلٹ آئے اور ایک سچا نیتا پیدا ہو کر ہندوستان کو ایک جاتی بنا دے، کہ بھارت میں پھر پریم کی مرلی بجنے لگے"

"میں تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کی بدنصیبیاں بہت پرانی ہیں۔ مسلمانوں کے وجود میں آنے سے بہت پہلے چندر گپت نے سکندر سے اپنے بھائیوں کے خلاف ساز باز کر لی تھی۔ اور اس کی نحوست سے اس کی معنوی اولاد اب تک بڑھ رہی ہے۔ یہ خطابوں کے بھوکے، نوکریوں کے غلام، تنخواہوں کے بھکاری، چندر گپت ہی کی اولاد ہیں ——— اور یہ ہمارے نیتا ہیں!"

یہ تھا وہ پرواز تعلیم جس کے اثر میں رکمنی کے دماغ نے تربیت پائی اور جس نے اس کو بالغ نظر اور وسیع الخیال بنا دیا تھا۔

اسپتال چھوڑنے کے تین سال کے اندر بوڑھے کلا نوٹ، پروفیسر کملاپت نے رکمنی کی خوش گلوئی سے خوش اور اس کے حال و شوق سے متاثر ہو کر اپنا فن اس کو گھول کر پلا دیا۔ بیس سال کی عمر میں رکمنی بالا دیوی ایک مشہور مغنیہ تھی اور اتنی ہی معزز بھی۔ گھنٹے آدھ گھنٹے کی نشست اور سیکڑوں روپے فیس ریکارڈ، ریڈیو اور ٹاکی میں دو چار گانے اور ہزاروں روپے معاوضہ! مختصر یہ کہ چھبیس سال کی عمر میں رکمنی دیوی لاکھوں میں کھیل رہی تھی۔ ماموں اور ممانی گھر کے مالک تھے اور کبھی اس گھڑی کو نہ بھولے جب یہ لکشمی ان کے تنگ و تاریک گھر میں داخل ہوئی تھی۔

رکمنی کے ہاتھ میں جس روز اس کی پہلی آمدنی کے روپے آئے اس کے سارے جسم میں ایک سنسناہٹ اور آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک تھی۔ اس وقت اس نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنی ضروریات کے سوا ساری آمدنی اپاہج اور مصیبت زدہ لڑکیوں کی خبر گیری میں صرف کرے گی۔ چنانچہ اول اول تو وہ ہفتے میں دو بار زنانہ اسپتال جا کر مریضوں سے اچھی اچھی باتیں کرتی، ان کی بپتائیں سنتی اور انھیں دیتی، ان کی دوائیں اور راحت و آرام کی دوسری چیزیں مہیا کرتی رہتی۔ لیکن جب اس کی آمدنی بڑھی اور کافی سرمایہ جمع ہو گیا تو چٹرجی کے مشورے سے اسی اسپتال میں ایک زنانہ وارڈ کی تعمیر شروع کرا دی جس کا نام "رکمنی وارڈ" رکھا گیا۔ چٹرجی اس کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے صدر مقرر کئے گئے۔ اس کے پاس جتنا وقت بچتا وہ وارڈ کی نگرانی اور مصروفیت میں صرف کرتی تھی۔ ڈاکٹر چٹرجی کے توسط سے رکمنی کی ملاقات ڈاکٹر اشرف جمالی سے ہوئی اور بالآخر وہی اس وارڈ کا انچارج قرار پایا۔

"اشرف جمالی خود اپنا مطلب کرتا تھا اور کلکتے کے چند نہایت مقبول اور کامیاب ڈاکٹروں میں سے تھا۔ اس نے اسپتال کو اپنے اہتمام میں کسی معاوضے کے بغیر لے لیا اور اپنا نصف وقت اس کے لئے وقف کر دیا تھا۔

الغرض رکمنی کی شدت ابتلا کے زمانے کے نازک ترین محسوسات ایک ایک کر کے اس طرح پورے ہو رہے تھے جیسے سچے خوابوں کی تعبیر جوں کی توں نکلتی ہے۔ رکمنی وارڈ جب بن کر مکمل ہوا تو وہ پورے تیس سال کی ہو چکی تھی۔ اب اس کا حلقۂ تعارف وسیع تھا، اور کسی ایسی ہی صحبت میں آکے جوتیس کمار بوس سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ ایک دلکش جوان اور شائستہ انسان اور ایک بیرسٹر تھا۔ ان کی یہ ملاقات بہت جلد دوستی اور پھر محبت میں تبدیل ہو گئی۔

اب گویا رکمنی کے پر لگ گئے تھے اور وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ جوتیش کی غلافی آنکھوں کی ایک نگاہ اس کو مستقل سنسنی بنا جاتی تھی، اس کے منہ کا ایک لفظ اس کے خون کی تھرتھراہٹ بنا تا تھا۔ اور اس کی انگلیوں کا ہلکا سا مس ہی اس کے ریشے ریشے کو کپکپا دیتا تھا۔

اور جس روز جوتیش نے اس کو شادی کا پیغام دیا تو وہ محسوس کرنے لگی

کہ درختوں پر چہچہانی ہوئی چڑیاں دفعتاً خاموش ہو گئی ہیں، تاکہ وہ رکمنی کے دل کی دھڑکن کا ترانہ سن سکیں۔ ہوا چلتے چلتے رُک گئی ہے، تاکہ وہ رکمنی کے سانسوں کی موسیقیت کو سُن سکے اور دنیا گھومتے گھومتے ٹھہر گئی ہے، تاکہ وہ رکمنی کو اپنے ساتھ لے لے، غرض رکمنی اپنے جذبات و محسوسات کی کلز مین کی نیرنگیوں اجنبیں آسمان کی پُرنائیوں میں گم ہو گئی تھی۔

ایک دن جوتیش آیا اور دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ رکمنی نے اس کو متبسم نہ دیکھا۔

"آج کیا بات ہے جوتیش؟ پورے پانچ منٹ ہو گئے، تمہارے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔" رکمنی نے سوال کیا۔

"رکمو، میں تمہیں خیال کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں، تم سیاہ ساری نہ پہنا کرو۔" اس نے بھی جواباً مسکرا کر کہا

"میں امید کرتی ہوں کہ تم مجھے ایک "فیشن ایبل" سوسائٹی دیکھنا نہ چاہو گے" رکمنی ہنس دی اور کہنے لگی:۔

"مجھے لباس آرائی کی بالکل پروا نہیں، میری دلچسپی سنجیدہ باتوں میں ہے اور سیاہ رنگ تو مجھے مرغوب بھی ہے۔ ڈاکٹر جمالی کا خیال کہ یہ رنگ مجھ پر خوب کھلتا ہے۔

"رکمنی، مجھے یقین ہے کہ تم شادی کے بعد اپنی مصروفیتوں اور اپنے اوقات میں تبدیلی پیدا کرو گی۔ تم ہر وقت ایسی گندی اور مریض عورتوں میں گھسی رہتی ہو کہ کسی روز خود تمہارے بیمار ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اور جمالی کے ساتھ اس طرح کا میل جول سماج میں چرچے شروع ہو جانے کا موجب ہو سکتا ہے" اس کے لہجے میں تلخی کا ایک ایسا ڈور اتھا جس نے رکمنی کو ڈرا دیا۔

"مگر جوتیش، میرا خیال تھا کہ تم اس کو بخوبی جانتے ہو کہ میں مریض عورتوں کی خدمت عمر بھر ترک نہیں کروں گی۔" اس نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔ "میں اپنی زندگی، زندگی کی خوشیوں اور خود تمہاری محبت کے لئے اسپتال ہی کی ممنون ہوں، میں خود بھی مریض تھی اور میرا کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ اس لئے میں جانتی ہوں کہ دکھ اور بیکسی کیا چیز ہے، اور اس ڈاکٹر جمالی کے اشارے کو ذرا واضح کرو تمہارا کیا مطلب ہے؟ دوسروں کی چہ میگوئیاں مجھے متاثر نہیں کر سکتیں ــــ کہ دوسروں کا مجھ پر کوئی حق نہیں۔ سماج نے میرے لئے کیا کیا جو مجھ پر تنقید کرے؟ میرے کرموں کی دیکھ بھال تو میرا ضمیر بہتر کر سکتا ہے! اور کیا بنگالی سوسائٹی اتنی تنگ خیال ہو گئی ہے؟"

"میں نے اس خیال سے کہا تھا کہ میرے موکل تمام مارواڑی ہیں، میرا سارا کام انھیں لوگوں میں ہے اور اس سال کونسل الیکشن میں بطور امیدوار کھڑا بھی ہو رہا ہوں۔" جوتیش، رکمنی کے لہجے میں تیزی محسوس کر کے اس کی انگلیاں اپنی ہتھیلی پر رکھ کر نرمی کے ساتھ ان کو تھپ تھپانے لگا تھا۔ اس کی آواز میں لغزش تھی اور لہجے میں خوف شامل تھا۔ "یہ دیکھ کر کہ تم ایک مسلمان سے اتنی گھلی ملی ہو، یہ لوگ اسے اچھی نظر سے نہ دیکھیں گے، جس کا نتیجہ تم خود سمجھ سکتی ہو کہ میرے اور تمہارے لئے بھی کچھ مفید نہ ہو گا۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ تم اس سے ملنا بہت ہی کم کر دو۔"

"جوتیش میں تمہارے منہ سے یہ باتیں سنتی ہوں؟ کیا تعلیم کا مقتضا تنگ ذہنی و پست خیالی ہے؟ میں یقین نہیں کرتی کہ مسلمانوں کے ساتھ میل جول رکھنا ہندو سماج کو پسند نہیں، ورنہ اس کا یہ "ہندوستانی قومیت" کا نعرہ مکاری و بزدلی سے عبارت ہو گا۔ مسلمانوں کو غیر سمجھنا سب سے بڑی نادانی ہے۔ وہ ہمارا ہی خون اور گوشت ہیں، بلکہ چوتھائی سے بھی زیادہ ہیں۔ وہ اسی آب و ہوا کے پروردہ ہیں جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔ آٹھ سو سال سے اسلامی تہذیب ہمارے خون میں شامل ہو رہی ہے، اسی طرح ہماری معاشرت ان کے خون میں مل گئی ہے۔ اس اتحاد کو دنیا کی کوئی طاقت باطل نہیں کر سکتی۔ اور نہ کوئی مہذب و متمدن انسان ایسا ہو سکتا ہے جو اس اتحاد کی سچی قدر و قیمت سے چشم پوشی کرے۔ ایک تعلیم یافتہ محب وطن سے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس ممزوج کلچر کو زیادہ شدید کرنے کے عوض اس کو قطع کرے میرے خیال میں ایسا آدمی ملک کا دشمن تو ہے ہی، ہندو جاتی کا بھی دوست نہیں۔"

"مگر ہندو مسلمان ایک کیونکر ہو سکتے ہیں؟ مسلمان متعصب ہیں" وہ کھسیانا ہو کر کہنے لگا۔

"میں مایوس ہوئی جا رہی ہوں کہ تم ایسی لغو باتیں بھی کر سکتے ہو جن کو ذہن و عقل سے دور کا بھی لگاؤ نہیں، غور کرو مسلمانوں کو ہم سے کوئی پرہیز نہیں ہے اور ہم ہیں کہ اپنے بھائی بندوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ چھوت چھات کا مسئلہ موجود ہوتے ہوئے جس نے ہندوؤں سے اپنے بھائیوں کا بائیکاٹ کرا رکھا ہے مجھے حق نہیں کہ کسی کو بھی متعصب کہوں؟

"یہ تم ڈاکٹر چٹرجی کے سبق دہرا رہی ہو۔ تم نے تاریخ نہیں پڑھی مسلمانوں کے مظالم ایسے نہیں جن کو کوئی ہندو بچہ بھلا سکے۔ مسلمانوں کے مذہب میں بت شکنی پہلا اصول ہے۔" جوتیش نے پیچ میں زور پیدا کر کے کہا۔

"اس مرتبہ تم نے ایک سانس میں کئی غلط باتیں غلط ملط کر دیں، ان باتوں کو ان کی واقعاتی جڑ تک دیکھنا ایک تعلیم یافتہ انسان کا فرض ہے! اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مذہبی اور اخلاقی ادب کا بغور مطالعہ کریں۔ اگر ایسا ہو تو یہ غلط فہمیاں رفع ہو سکتی ہیں۔ میں ان سب باتوں کو غلط فہمی پر مبنی سمجھتی ہوں۔ تاریخی مظالم اول تو خود سر بادشاہوں کے انفرادی افعال تھے دوسرے اُس زمانے میں سب ہی جگہ شخصی حکومتیں تھیں۔ اور دنیا بھر میں ایسے مظالم ہوئے ہیں۔ دور کیوں جاتے ہو خود ہندوستان کی تاریخ کو دیکھو مذہب کے نام سے بودھ کے بھکشوں کا خون ندی نالے بنکر بہا ہے۔ کنس نے کیا ظلم نہیں کیا اور کوروں نے کونسی بے ایمانی اٹھا رکھی، کیا اس کا الزام ہندو دھرم پر لگایا جائے گا۔ جب اپنوں نے یہ کیا ہے تو صرف مسلمان کیوں قابلِ الزام ٹھیرے؟

"دوسری بات تم نے یہ کہی کہ مسلمانوں کے ظلم کوئی ہندو بچہ نہیں بھلا سکتا۔ لیکن پہلے یہ تو دیکھ لو کہ وہ مظالم کوئی تاریخی صداقت بھی رکھتے ہیں میں تو دیکھ رہی ہوں کہ آئے دن ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہ غلط کہانیاں غیروں نے اس لئے مرتب کی ہیں کہ دونوں آپس میں کبھی نہ مل سکیں اور بالفرض اگر یہ صحیح بھی ہو اور ہندو ان مظالم کو یاد رکھیں تو ہندو بچوں کو وہ سلوک اور احسانات بھی یاد کرانا شرافت اور انسانیت، ممنونیت واحسان مندی کا مقتضا ہے جو مسلمانوں نے اس ملک کے باشندوں پر ساتھ کئے، تہذیبِ نفس و تربیت دماغ کی خدمت مسلمانوں نے جس قدر اس ملک میں آ کر کی وہ امٹ ہے۔

"اب رہ گئی بت شکنی، سو وہ نہ تو اسلام کا کوئی اصول ہے اور نہ اس کے اصول کی فرع۔ یہ تو شخصی خود نمائی کا ایک جذبہ تھا جو کسی خود مختار بادشاہ سے سرزد ہوا، یا کسی دوسرے نے اس کی تقلید کی۔ تحقیق و استدلال کی نظر میں اس سے زیادہ اس فعل کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے!"

"مسلمانوں کو اسی ملک پر قابض ہو جانے کا حق ہی نہ تھا۔" جوتیش نے پھر اعتراض کیا۔

"میں سمجھی، تم کسی بات پر خود کچھ غور کرنے کے عادی نہیں۔ جو سُنا پڑھ لیا وہی دُہرا دیا۔ ہمارے ملک کی جو حالت اُس وقت تھی وہ قوی جماعتوں کو بلانے کا ایک اعلان تھا یہ قدرت کا قانون ہے۔ خود ہم اس ملک میں کس استحقاق پر آئے تھے، اور کیا ہمارا یہ اعتراض بھیل اور گونڈ ہمارے منہ پر نہیں دُہرا سکتے؟ پھر جب مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا اور یہیں رہ پڑے تو ہم اور وہ یکساں ہو گئے۔ یہ ملک جتنا ہمارا ہے اسی قدر اُنکا بھی ہے۔

"مگر میں تو ہندو جاتی کے خیالات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ تم مجھی پر برس پڑیں"

"جوتیش، مذہب کے نام سے تعصبات کو پھیلانا کسی محبِ وطن وانسان کا کام نہیں۔ اس کا کام حق کا اعلان اور شر کو مٹانا ہے۔ مذاہب سچے ہیں تو سب ورنہ کوئی نہیں۔ کوئی سچا مذہب کسی دوسرے کو جھوٹا نہ کہے گا۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کے پیرو کو جھوٹا کہہ رہا ہے اور نفرت پھیلا رہا ہے۔ ان سب خرابیوں کا صرف ایک علاج ہے اور وہ "انسانی برادری" کا قیام ہے ——— ہر مذہب کی روح بھی ایک بات ہے۔ دونوں فرقوں کے اہلِ علم و فراست اگر ذرا سی تکلیف گوارا کریں تو ان تمام شکایتوں کی توجیہیں آسانی سے مل سکتی ہیں جنہوں نے ہم کو جدا کر رکھا ہے اور صحیح عقل ہی ان شکایتوں کا سدباب کر سکتی ہے۔ خواص اگر اس طرح سمجھ لیں تو عوام کے متحد ہو جانے کی ضمانت ہو جاتی ہے۔

"یاد رکھو کہ ہندوستان کی نجات ان دونوں کے ملنے پر منحصر ہے، ورنہ بھارت ماتا غلامی کی لعنت سے کبھی آزاد نہ ہو سکے گی، اگر کسی کا خیال اس کے خلاف ہے تو وہ احمق اور جھوٹا ہے۔ اور یہ مقصد کلچر کے ممزوج ہونے سے ایک دوسرے کے ادب کے گہرے مطالعے سے، اور معاشرت کے متحد ہو جانے ہی سے پورا ہو سکتا ہے، ہم زبان، ہم لباس اور باہمی تزویج میں ہندوستان کی قومیت یعنی نجات مضمر ہے، جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ وطن و انسانیت کی خدمت کرتے ہیں اور آنے والی نسلیں اُن کے نام عزت واحترام سے لیں گی۔"

"یہ لکچر ہندو مسلم افتراق کو دور کرنے کے لئے تھا یا ڈاکٹر جمالی کی حمایت میں" جوتیش نے طنزاً کہا۔

"میں ڈاکٹر جمالی سے بخوبی واقف ہوں۔ وہ صحیح طور پر وطن دوست انسان ہے"۔ رکمنی نے اس کے لہجے کا غیر مخلصانہ انداز محسوس کر کے جواب دیا۔ لیکن غیر محسوس طریق پر اس سے کھنچی نظر آنے لگی اس نے گھڑی دیکھی اور کہنے لگی "چلو

میرے ساتھ چل کر رکمنی وارڈ دیکھو۔ جن سکھیں لڑکیوں کی طرف سے تمہارے خیالات اتنے خراب ہیں ان کو دیکھ کر یقیناً تمہارا نقطۂ نگاہ بدل جائے گا۔ وہاں ڈاکٹر جمالی سے بھی ملاقات ہو گی۔ اس وقت تم سمجھ سکو گے کہ انسانیت و شرافت کسی مذہب یا جماعت، یا خاندان میں محدود نہیں۔ جمالی کو میں اپنا بہترین دوست سمجھتی ہوں۔

"ہوئے اتفاق سے اس وقت ایک قرارداد ہے، لیکن ساڑھے چھ بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ کہیں چل کر ساتھ کھانا کھائیں گے۔" جوتیش نے رکمنی کی نگاہوں میں مایوسی دیکھ کر اور جمالی کی دوستی کے اعتراف کے اثر کو زائل کرنے کے خیال سے کہا۔

اس سے نہ صرف رکمنی کا افسوس رفع ہو گیا بلکہ وہ بہت خوش ہوئی۔ کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ ایک مرتبہ جوتیش وارڈ کو دیکھ کر اور جمالی سے مل کے خود اس کا پُرجوش مداح ہو جائے گا۔ چنانچہ اس کا دل پھر ایک بار مسرت بھرا گیت گنگنانے لگا۔

رکمنی کے پاس ایک چھوٹی سی موٹر تھی جسے وہ خود ہی چلایا کرتی تھی۔ یہ دونوں خوش خوش اس میں سوار ہوئے۔ اور رکمنی نے تو بازار اور چیز بخن اونچ کے چوراہے پر جوتیش کو اُتار دیا۔

"بھولو گے تو نہیں؟ دیکھنا ہم نے کتنا کام کیا ہے"۔ رکمنی نے جب یہ کہا تو اس کی معاشقانہ اور شکرانہ نگاہیں جوتیش کے چہرے اور خوش وضع لباس پر جم کر رہ گئیں اور تھوڑی دیر قبل جو ایک قسم کی مایوسی اس کی طرف سے محسوس ہوئی تھی نسیاً منسیاً ہو گئی۔

جوتیش کا نیچے کا ہونٹ ذرا موٹا تھا اور بنگالی خلافی آنکھوں کے نیچے خفیف سے آماس کے علاوہ، وہ مردانہ حسن اور وجاہت کا ایک عمدہ نمونہ تھا۔ اور رکمنی دل میں خوش تھی کہ وہ ایسے خوش شکل و خوش قطع آدمی کی محبت حاصل کر سکی ہے۔

"نہیں، میں ٹھیک ساڑھے چھ بجے پہنچ جاؤں گا۔ جوتیش نے مسکراہٹ کے ساتھ اپنے وعدے کی تکرار کی۔

اسپتال کی عمارت وسیع اور شاندار تھی، اور بڑے احاطے میں سبزی کی طراوت اور جابجا بڑے اور گھنے درختوں کا سایہ اپنی سکون خیزی محسوس کراکے مئی کے مہینے کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ ساری فضا سکون سے معمور تھی۔ رکمنی کی گاڑی جب غلام گردش میں جا کر رکی تو اس کی آنکھیں اطمینان سے پیدا ہونے والے رقص میں مصروف معلوم ہوتی تھیں۔

ڈاکٹر اشرف جمالی رکمنی کو آتے دیکھ کر برآمدے جاتے جاتے رک گیا اور زینے کی بالائی سیڑھی پر ٹھہر گیا تھا۔ مگر جس وقت رکمنی موٹر سے اتر رہی تھی، وہ وہیں کھڑا نہ رہ سکا اور ہاتھ بڑھائے ہوئے شگفتہ چہرے کیساتھ سیڑھیاں اتر آیا۔ جمالی کی شخصیت میں کوئی خاص کشش اور موثر انداز تو نہ تھا لیکن دیکھنے والے کی نظر میں سب سے پہلے جو بات کھب جاتی تھی وہ اس کی تندرستی اور چہرے کی تازگی تھی۔ جو کسی وقت اس سے علیحدہ نہ ہوتی تھی۔ اس کے خط و خال کچھ بھدے تھے۔ لیکن ذہانت سے چمکنے والی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی، اور وہ دوسرے کے خیالات کو پڑھ لینے میں مشاق تھیں۔ اس کا ڈیل اپنی صحت و تناسب اور اس کے شانے قوی ہونے کے باعث نظر کو جذب کر لیتے تھے۔ غرض اس کی کچھ اس قسم کی شخصیت تھی کہ کہیں اور کسی موقع پر سب سے زیادہ نمایاں ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ اس کی عمر چالیس کے قریب تھی، اور کامل پانچ سال سے رکمنی کا قریبی دوست تھا۔

اس دن کی طرح جوتیش نے اس سے قبل بھی ان کی دوستی کے متعلق کئی بار اشارے کئے تھے۔ اور رکمنی ہنس ہنس دی۔ کیونکہ اس نے جوتیش کے جذبۂ رشک کو محسوس کر لیا تھا۔ اور وہ اس سے ایک گونہ خوش ہوئی تھی۔ جمالی جب رکمنی کی طرف ہاتھ ملانے کو بڑھا تو رکمنی کو جوتیش کا وہ جذبہ یاد آیا اور اسے خیال ہوا کہ شادی ہو جانے کے بعد ان کی باصفا دوستی میں کاوش ضرور پیدا ہو گی۔ بلکہ ممکن ہے کہ اس بے لوث و پُرمسرت دوستی کی محض یاد باقی رہ جائے۔

"سب خیریت؟" رکمنی نے ہاتھ ملاتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں سب خیریت ہے"، جمالی نے جواب میں کہا۔ "تم نے جو ریڈیو بھیجا تھا وہ لگا دیا گیا۔ اور یہ سن کر یقیناً خوش ہو گی کہ اس سے تمام وارڈ والوں کو بہت خوشی ہوئی اور رکمنی دیوی کے جے کارے لگائے گئے۔

اس خبر سے رکمنی کا دل بھی مسرت و فخر سے بھر گیا اور اس نے آس پاس پُرشوق نگاہیں ڈالیں۔ یہ اس کی دلی آرزو تھی کہ خود بھی دن رات اسپتال ہی میں قیام کر کے آلام زدہ انسانیت کے آلام میں کمی کرتی۔ پھر جب اس نے

نظریں اٹھائیں تو جمالی کی نگاہوں سے اس کی غور کرتی ہوئی آنکھیں ے دوچار ہوئیں جو مطالعہ کرتا نظر آیا۔ اس سے رکمنی کا خون رخساروں کی طرف دوڑنے لگا۔ پانچ سال کی ملاقات میں اس وقت رکمنی کو محسوس ہوا اور جبلی طور پر محسوس ہوا کہ وہ اس بے لوث و بے غرض انسان کی نگاہوں میں بے حد محبوب تھی۔ اس کی نظروں میں عزیز تھی جس کو لوگ ایک دفعہ جان کر محبت کرنے لگتے ہیں۔

"چلو وارڈ میں ہو آئیں۔" رکمنی نے اس لمحے کو بھلا دینے کے لئے جلدی سے تجویز کیا۔ اس کی آواز اٹکتی ہوئی نکلی۔

"تم سب سے پہلے غریب سکینہ کو دیکھو!" ڈاکٹر جمالی نے وارڈ کی طرف بڑھتے ہوئے رُک کر تجویز کیا۔ "یاد ہے پچھلے ہفتے ہم اسے رُفیوج سے لائے تھے۔ فی الواقع وہ ہمارے ہاتھ میں دیر سے آئی۔ اب وہ بسرعت ختم ہو رہی ہے۔ اس کا دل نہایت متاثر ہو چکا ہے۔"

"وہ ننھی سی لڑکی؟" رکمنی نے مغموم لہجے میں دریافت کیا۔ "غریب بچی! اچھا میں پہلے اسی کے پاس چلتی ہوں۔"

رکمنی تیز تیز قدموں سے وسیع برآمدے میں ایک مُتّے اور مُرجھائے ہوئے چہرے والی مریضہ کی طرف باتیں کرتی ہوئی۔ کونے کی طرف بڑھی اور ایک اونچے سفید روغن کے پلنگ کے پاس پہنچی جس پر ننھی سی لڑکی کا جسم دراز تھا، اور جسے بمشکل کہا جا سکتا تھا کہ اپنے بچپن کو رخصت کر چکی ہے۔ اس کے کالے اور چمکیلے بال تکیئے پر بکھرے ہوئے تھے، سیاہ آنکھیں بیماری میں زیادہ بڑی ہو گئی تھیں، اور اس کے نازک ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی رکمنی مسکراتی ہوتی اس کے پلنگ پر جھکی مریضہ کا چہرہ دمکنے لگا

"دیوی، آپ ہنستی ہوئی ہمیشہ کیسی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔" ہاتھ جس پر نیلی رگوں کا جال نمایاں تھا۔ رکمنی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "آپ کی ہر چیز برساتی چڑیوں کی طرح چونچال نظر آتی ہے۔"

شاید دوسروں کے مقابلے میں رکمنی کو اپنا سراہا جانا زیادہ خوش کرتا ہو۔ اس طرح خوش کرتا ہو جیسے سورج کی روشنی پھولوں کو خوش کرتی ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہو گی کہ اوائلِ عمر میں وہ اس تعریف اور محبت سے بالکل محروم رہی تھی۔

"اچھی سکینہ" رکمنی نے بڑی محبت سے جواب دیا۔ "آج میں واقعی بہت خوش ہوں کاش میں اپنی اس خوشی میں سے دوسروں کو حصہ دے سکتی! کاش میں تمھیں جلد اچھا کر سکتی کہ تم اٹھ کر سورج کی روشنی میں چل پھر سکتیں — سورج کی روشنی تمہاری نوجوانی کا حق ہے۔"

"میری جوانی!" اس لڑکی نے نہایت سترحم لہجے میں کہا "اسے تو میں اُس جھونپڑی میں چھوڑ آئی جہاں میں پیدا ہوئی تھی، رکمنی دیوی، یہ میرا اٹھارہواں سال ہے اور میں بڑھاپے کا سا احساس کر رہی ہوں۔ آپ اور ڈاکٹر صاحب کے ملنے سے پہلے میرے نصیب میں کوئی پریمی لکھا ہی نہ تھا۔

"رکمنی کی آنکھوں میں آنسوؤں کا دھندلکا پیدا ہو گیا۔ ایک کرسی سرکا کر وہ اس کے پلنگ کے برابر بیٹھ گئی اور اس انسانی ایندھن پر جھک گئی جو اتنی سرعت کے ساتھ جل کر خاکستر ہوا جا رہا تھا۔ مریضہ کی بخار سے دہکتی ہوئی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جیسی ستاروں کے ڈوبتے وقت ان میں نظر آتی ہے۔

"تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟" رکمنی نے اس کے خیال کی رو کو بدلنے کی غرض سے کہا "کوئی تکلیف تو نہیں؟"

"شریمتی، مجھ پر جو بیتا پڑ چکی ہے، اس کے دیکھتے ہوئے تو اب میں جنت میں ہوں۔" اس نے ایسے جوشیلے لہجے میں جواب دیا جو اس کی نقاہت میں ممکن ہو سکتا تھا۔ "مجھے بس — بس ایک ڈر ستا رہا ہے کہ آپ میرا سارا حال سنکر خفا ہو جائیں گی۔"

"غریب بچی"، رکمنی نے نہایت پیار اور شفقت سے اس کی انگلیاں سہلاتے ہوئے کہا "تمہاری کسی بات کا علم بھی مجھے بد گمان نہیں کر سکے گا۔

"آپ سی دیوی کا ایک نصیبوں جلی، ایک بدچلن لڑکی کے ساتھ ایسے پریم اور مہربانی کا برتاؤ دیویوں کا سا بھاؤ ہے!" وہ غم کی تلخیوں سے مملو لہجے میں کہنے لگی۔

"سکینہ، تم ایسے لفظ اپنی زبان سے نہ نکالو۔" رکمنی نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

"دیوی" یہ میرا لقب ہے۔ مجھے دیا گیا ہے!" خشک اور استہزا آمیز ہنسی کے ساتھ سکینہ نے کہا۔ "میں اس کو کیسے بھول سکتی ہوں؛ میری سی مصیبت والی لڑکی کو کوئی سہارا نہیں رہتا۔ یہاں آنے سے پہلے میں یہ سوچ کر خوش تھی کہ اب زیادہ نہ جیوں گی۔ پر آپ کی مہربانیوں نے اب جینے کا ارمان دلا دیا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ اچھی ہو کر یہاں سے آپ کے پاس سے چلا جانا پڑے گا تو مجھے رنج ہوتا ہے۔"

رکمنی نے بڑی جد و جہد سے اپنی رو پڑنے کی زبردست خواہش کو دبایا۔ اور اس دم توڑتے وقت جینے کی خواہشمند لڑکی کو دیکھتی رہی جو اتنی کمسن، ایسی بیمار اور اتنی بیکس تھی! اسنے زندگی کے اس شعبدے کو ایک فلسفی کی نظر سے دیکھا۔ پھر اس نے خیال کیا کہ اگر پرمیشور کی کرپا نہ ہو جاتی جس پر اسے اکثر شبہ پیدا ہو چکا تھا تو وہ بھی اسی طرح بے یار و مددگار اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتی ـــــ اگر دنیا میں کسی کے چاہنے والے اور احباب نہیں، تو وہ بیکس ہے اور زندگی ایک سزائے مستقل ہے:

"شریمتی، آپ ایک مسلمان لڑکی سے اتنا پیار کیوں کرتی ہیں؟ آپ تو ہندو ہیں"۔

"سکینہ، تم انسان پہلے ہو اور مسلمان بعد میں! ایسے ہی میں انسان پہلے ہوں اور ہندو بعد میں ہوں۔ میں ہندو ہوں جب ہی تو تم سے اور ہر شخص سے پریم کرتی ہوں، یہ خیال تمہارے دل میں کیسے آیا؟"

"دیوی جی، میں نے اس لئے پوچھا کہ آج کل لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ بڑے بازار میں میرے باڑی والے (مکاندار) کو مرنے جوگی کر چھوڑا تھا"۔

"یہ باتیں بنگالیوں میں نہیں۔ پچھاں کے لوگ شرارت کرتے رہتے ہیں اور وہ کسی کے سکھائے پڑھائے ہوتے ہیں۔ تم ایسی بیہودہ باتوں کو اپنے دل میں کبھی جگہ نہ دو"۔ پھر اس نے سکینہ کے تکئے کے نیچے ہاتھ لیجا کر اسے آہستہ سے اُٹھایا اور کہنے لگی:۔

"دیکھو ڈوبتا ہوا سورج کیسا اچھا معلوم ہو رہا ہے! سنہرے اور اودے رنگ دریا کے پانی میں کیسے سندر معلوم ہوتے اور کیسی چندریاں رنگ رہی ہیں"

سکینہ نے دروازے میں سے مغرب کی سمت دیکھا جہاں شام کے سورج کی طلائی کرنیں، درختوں میں سے چھن کر ہگلی کے نالے کے پانی پر دھنک کی شکل میں پڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر رکمنی کی طرف دیکھا اور ایک طرفہ نرم، اور ہلکی سی مسکراہٹ اس کے مضمحل و حزندار لبوں پر چمکتی دکھائی دی۔

"رہا دریا کا پانی! ہنسی کی سی بات ہے۔ پر مجھے بہتے پانی سے ہمیشہ پریم رہا ہے۔ اگر آپ سننا چاہیں تو آپ کو اپنی بیتی سنانا چاہتی ہوں۔ میرے دل میں آپ کو دھوکا دینے کا کانٹا چبھ رہا ہے۔"

"بچی، جو کچھ کہنا چاہتی ہو بے دھڑک کہو"۔ رکمنی نے جواب دیا۔ "تمہاری مرضی پوری کر کے مجھے خوشی ہوگی ـــــ کیا تم کسی سے ملنا چاہتی ہو؟ کوئی رشتہ دار یا کوئی اور؟"

"رکمنی دیوی، دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے" اس نے نہایت دردناک لہجے میں کہا "میرا باپ ایک بڑی کوٹھی میں صاحب کا خانساماں ہے۔ میں اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ برابر والی کوٹھی میں ایک بیرسٹر بابو رہتے ہیں انھوں نے مجھے دیکھا اور اپنے مالی کو میرے پاس بھیجا اس نے کہا کہ بابو مجھے میم صاحب بنا لیں گے۔ میں کوٹھی میں رہوں گی، موٹر میں چڑھوں گی، اچھی اچھی ساریاں پہنوں گی، اور جانے کیا کیا بلا تتر کہا میں اس کی باتوں میں آگئی۔ اس نے جو کہا میں نے وہی کیا۔ میں اپنے باپ کے پاس سے چلی آئی۔ اور اُنھوں نے میرے لئے ایک چھوٹا سا مکان لے دیا۔ بابو کو میں بھی پہلے دیکھا کرتی تھی۔ وہ میرے پاس آئے اور مجھ سے ملے اچھی اچھی باتیں کیں۔ آہ، شریمتی کیا آپ نے کسی کو اپنی جان سے زیادہ چاہا ہے؟" اس نے دفعتاً اپنی بیمار آنکھیں رکمنی کے چہرے پر قائم کر کے سوال کیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہتی رہی: "میں اُن سے پریم کرنے لگی۔ وہ مجھے ننھی گڑیا کہا کرتے تھے۔ اُن دنوں میں بہت مگن رہتی تھی

"تھوڑے دن بعد میں نے بابو سے کہا کہ وہ مجھے اپنی پتنی کب بنائیں گے میں شدھ ہونے کو طیار تھی۔ بابو نے میرے ہاتھوں کو پیار سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور مجھ سے کہا خاندانی ملکیت کے خیال سے وہ میرے ساتھ تھوڑے دنوں شادی نہ کر سکیں گے، جب سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا تو مجھے اپنی پتنی بنا لیں گے۔ میں نے اس کی سب باتیں سچ مان لیں۔

"اُفوہ! اُن دنوں میں بہت خوش تھی، سونے کے لئے ایک سچ مچ کی مسہری اور نہانے کے لئے نل کا تازہ پانی! جن لوگوں کو یہ آرام نصیب نہ ہوے ہوں وہ کیا جانیں کہ وہ چھوٹا سا گھر میرے لئے کیسی جنت تھی! دیوی مجھے اپنے رویے میں کوئی برائی دکھائی نہ دی۔ میری شادی ہونے برابر تھی میں کھیں اور تو جانے سے رہی مجھے ان سے سچا پریم تھا۔ میں نے لکھنا پڑھنا بھی شروع کر دیا تھا کہ میرے سبب سے بابو جی کو آنکھیں نیچی نہ کرنا پڑیں۔

"میں پڑھتی لکھتی رہتی یا اپنے گھر کو صاف ستھرا رکھنے میں لگی رہتی گلابی اور کسومی ساریاں بدل بدل کر پہنتی اور خوش ہوتی تھی۔ اس کو خوش کرنے کے لئے میں اپنے بال طرح طرح سے سنوارا کرتی تھی جنھیں اُنھوں نے کٹتی ہوئی رات کا نام دیا تھا

"وہ میرے پاس روز تو نہ آتا لیکن جب بھی آتا میں اپنے آپ کو دنیا بھر کی لڑکیوں سے زیادہ نصیبے والی سمجھتی تھی، میں اس دن پہلے ہی سے جان جاتی کہ وہ آج آئے گا! اور جس رات وہ نہ آتا میں اس کی لائی ہوئی کتابیں پڑھا کرتی۔ شریمتی میرے اوپر مصیبت کا پہاڑ اچانک آ پڑا۔ میرا جی بُرا رہنے لگا۔ اور میں آپ ہی سمجھ گئی کہ میری بیماری کیا تھی، میں سفید پڑ گئی تھی۔ اس دفعہ وہ ایک ہفتے کے بعد آیا اور مجھ سے بیسیوں باتیں پوچھ ڈالیں۔ میں اس کی گود میں جا بیٹھی اور اپنا بھید اس کے کان میں چپکے سے کہہ دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اب شادی کی فکر جلد کرنا چاہئے۔ دیوی جی! مجھے اپنی خوشی میں کسی بات کا خیال نہ رہا تھا۔ لیکن اب میں چاہتی تھی کہ میرا بچہ اپنے باپ کا بچہ ہو۔

"میرے اس کہنے پر اس نے مجھے اپنی گود سے ڈھکیل دیا۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے پر سے غلاف اُترتا ہوا معلوم ہوا۔ لیکن صورت سے بید رو بھی نظر نہ آتا تھا! اس رات وہ زیادہ دیر تک نہ ٹھہرا۔ وہ چلا گیا، اور جاتے جاتے آنے کا وعدہ کر گیا۔ آہ، مگر شریمتی، وہ پھر واپس نہ آیا۔ ایک دفعہ بھی نہ آیا!"

یہاں پہنچ کر اس کی آواز بہت خفیف ہو گئی اور وہ بے حال ہو کر اپنے تکیے پر ڈھل گئی۔ رکمنی اس کے اوپر جھک گئی اور اس کی پیشانی پر سے بالوں کو ہٹانے لگی۔

"اب تم بولنے کی کوشش نہ کرو، میری بچی میں سمجھ گئی ہوں"۔ رکمنی نے اس کو تھپکتے ہوئے کہا۔

اس لڑکی کے تھکے ہوئے پپوٹے جھک گئے اور رکمنی اسے سوتی ہوئی سمجھا کی۔ لیکن یکایک اس نے آنکھیں کھول دیں، اور نہایت دھیمی مگر ہموار آواز میں کہنے لگی:-

"اس کے کوئی آٹھ روز بعد ایک خط آیا اور اس میں دو نوٹ بھی رکھے تھے، خط میں لکھا تھا کہ اپنی ماں کو لیکر دارجلنگ جانا ضروری تھا اس لئے وہ مجھ سے کچھ دن تک نہ مل سکے گا۔ تھوڑے دنوں تک تو مجھے زیادہ بُرا نہ معلوم ہوا، مگر اس کی یاد ستاتی رہی۔ میرے پاس خرچ کو بھی تھا اور دن بھر کچھ نہ کچھ کرتی دھرتی بھی رہتی تھی۔ مگر گرمیاں ختم ہو گئیں اور وہ نہ پلٹا ——— کبھی نہ آیا۔ میرے پاس روپے سب خرچ ہو گئے تھے۔ میں نے وہ مکان چھوڑ کر ایک چھوٹی سی کوٹھری کرائے پر لے لی تھی۔ میری خراب حالت دیکھ کر ایک کٹنی نے جال ڈالنا چاہا، مگر شریمتی آپ جھوٹ سمجھیں گی، میں نے اس مکارہ کو لاتیں مار کر نکال دیا۔

"اب میں ان تھوڑے سے داموں کو جو بچے تھے خرچ نہ کرنا چاہتی تھی ایک دن شام کے وقت میں گھر سے نکلی۔ دو وقت سے کچھ کھایا نہ تھا، میں بہت بھوکی تھی، آپ کیا جانیں کہ بھوک کسے کہتے ہیں؟ اور ایسے حال میں جب کوئی بیمار بھی ہو، بیکس بھی ہو ——— پیسے کی آس نہ ہو! میں یہ سب کچھ تھی! میں نراس تھی اور آنے والی ہر گھڑی موت کی طرح ڈراؤنی تھی، پر موت ڈراؤنی نہ تھی!

"میں کالج اسکوئر ہی سے جا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ جو چند آنے میرے پاس تھے اس میں سے کتنے پیسے خرچ کروں اور کیا کھاؤں! اسی سوچ بچار میں میں تو بازار تک جا پہنچی اور داہنی طرف مڑ گئی۔ جب میں گرجے سے بڑھ کر چترنجن ایونیو کے چوراہے کے قریب پہنچی تو ایک بڑے گھر کے دروازے کے سامنے میں نے اس کو ایک دوسرے آدمی سے بات کرتے دیکھا۔ آپ تو اس بلڈنگ کو جانتی ہوں گی۔

رکمنی نے گردن کے اشارے سے بتایا کہ وہ سمجھ گئی ہے۔ وہ کئی مرتبہ جوتیش کو "انڈین ایسوسی ایشن" کی بلڈنگ کے برابر اس کے کلب میں پہنچانے یا لینے گئی تھی۔

"میں اس کی طرف لپکی۔ مجھے اس وقت کسی بات کا دھیان نہ رہا تھا، بس میرا حق تھا کہ مجھے مصیبت میں ڈال کر الگ نہ ہو جائے۔ میں نے اس کا نام لے کر پکارا۔

"شریمتی، اُف! اس نے جس نگاہ سے مجھے دیکھا وہ مرتے وقت تک میرے سامنے رہے گی۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے جانتا بھی نہ تھا، مجھے دھوکا ہوا تھا پھر میری نراسی کا حال نہ پوچھئے۔ میں ضرور پاگل ہو گئی تھی۔ ورنہ ایسا نہ کرتی،

"جو..... تی! میں نے چیخ کر کہا "تم مجھے نہیں پہچانتے؟" میں نے اس کا کوٹ پکڑ لیا تھا۔ اس نے ایک ڈانٹ دی اور مجھ سے الگ ہو جانے کو کہا مجھے بیسوا کہا اور پولیس کی دھمکی دی، شریمتی میں جانتی تھی کہ وہ مجھے بھولا نہیں ہے اور کوئی آواز میرے کان میں کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے شروع سے دھوکا دے رہا تھا وہ برابر کلکتے ہی میں رہا۔ ایک وقت میں اس کی سُندری تھی۔ پر اس دن بیسوا ہو گئی تھی۔ کوئی منٹ بھر کے لئے سنسار تیزی کے ساتھ چکر کھانے لگا۔

اس نے مجھے جھٹک دیا۔ اور گر کر نڈھال ہو گئی۔ مجھے تھانے میں ہوش آیا اور وہاں سے میں "رفیوج" میں بھیجدی گئی۔ "رفیوج" ہی میں میرے لڑکی پیدا ہوئی شکر ہے وہ زندہ نہ رہی۔ دیوی جی! اس کا دھیان جب آجاتا ہے تو دل بیٹھ جاتا ہے!

"اس دن سے آج تک میں اپنے تئیں سنبھالے رکھنے کی فکر میں رہی ہوں دو مہینے ہوئے مجھے بچہ کھلانے کی ایک نوکری مل گئی تھی، اس بچے سے میرا جی بہلنے لگا تھا۔ پھر میری کمزوری کو ان لوگوں نے دق کی بیماری سمجھا اور مجھے الگ کر دیا۔ کوئی سہارا تو تھا نہیں، میں پھر "رفیوج" میں جا پہنچی۔ منیجر صاحب نے بڑی مشکل سے میری حالت پر ترس کھا کر رکھ لیا اور مجھے بخار آنے لگا۔

"میں اپنی اس بپتا کے سنانے کے لئے بے چین تھی۔ آپ کو مجھ سے نفرت تو ہوگی، اور ڈاکٹر صاحب کو بھی خیال ہوگا کہ مجھ سی بُری لڑکی پر رحم کیا، پر میں دھوکے میں آپ دونوں کی مہربانیاں سہار نہیں سکتی تھی"

سکینہ نے اپنی درد انگیز داستان ختم کر کے رکمنی پر جو ایک نظر ڈالی جو اگر کچھ تھی تو یکسر التجا و معذرت تھی۔ رکمنی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور رکمنی نے ان کو روکنے کی کوشش بھی نہ کی۔

"میری بچی، تم جلدی اچھی ہو جاؤ گی۔ میں تمہیں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گی ......"۔ رکمنی یکایک چپ ہو گئی اور تعجب سے سکینہ کو دیکھنے لگی۔ رکمنی کے لفظوں نے جادو سا کر دیا، کیونکہ سکینہ کے چہرے پر ایک عجیب تغیر نمایاں ہو گیا تھا ـــــ ایک ایسی تبدیلی آگئی تھی کہ اس کا رنگ درخ تندرستی اور مسرت سے چمکنے لگا ـــ وہ اُٹھ بیٹھی، اس کے بکھرے ہوئے بال بکھرے ہوئے چہرے کا ہالہ بن گئے۔ اس کی ہرنی کی سی آنکھوں میں ایک سادی روشنی جھلکنے لگی۔ اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ پہلے آہستہ اور پھر با آواز کہنے لگی۔

"جاتی! اوہ جوتی! تم آگئے، میرے پاس آگئے"! سکینہ نے نہایت صاف اور بجتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی نگاہیں رکمنی کے پس پشت جم کر رہ گئی تھیں اور اس کے بازو التجائے شوق بن کر کھل گئے تھے۔

رکمنی نے مڑ کر دیکھا اور اپنے پیچھے کھڑے ہوئے آدمی کو متحیرانہ تکنے لگی، پھر پلٹ کر سکینہ کو دیکھنے لگی۔ رکمنی کی رگوں میں خون جم کر رہ گیا، کہ اس پر ایک جاں گسل و روح فرسا حقیقت آشکارا ہو رہی تھی۔ وہ کھڑا ہوا شخص جس کی آنکھوں میں خوف و ہراس نے گھر بنا لیا تھا۔ جوتیش کمار بوس تھا۔

"جوتیش!" رکمنی نے کہا اور آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر ایک مختصر وقفے کے انتشار و تذبذب کے بعد جس میں یہ تین ہستیاں بت بنی کھڑی تھیں رکمنی نے اپنے جذبات کو قابو میں لا کر سکینہ کو مخاطب کیا:۔

"سکینہ کیا وہ آدمی یہی ہے، وہ ناپاک جانور یہی ہے جو تمہیں بیکسی، بیماری اور فاقہ کشی میں چھوڑ گیا؟ بچی تم ڈرو مت، بتاؤ یہ وہی ہے"۔ رکمنی کی آواز بھرائی ہوئی تھی، وہ خود بھی اپنی آواز کو مشکل سے پہچان سکتی تھی۔

"رکمنی کے منہ سے اس کا نام سنتے ہی سکینہ کے چہرے پر سے وہ رنگ مسرت جو جوتیش کو دیکھ کر چھا گیا تھا غائب ہو گیا۔ اس نے جوتیش اور رکمنی کو حیران نگاہوں سے دیکھا۔ گردن جھکا لی۔ اور پھر کچھ سمجھ کر ایک دبی ہوئی کراہ کے ساتھ اپنے تکئے پر گر گئی

"شریمتی میں ... مجھے دھوکا ہوا یہ وہ ...... وہ نہیں ہے"! اس نے رُک رُک کر کہا اس کی آواز سرگوشی سے کچھ یونہی سی بلند تھی جس کو سننے کے لئے رکمنی کو جھکنا پڑا۔

جس وقت رکمنی جھکی ہوئی اس کے الفاظ سننے کی کوشش کر رہی تھی، تو اس نے دیکھا کہ موت کا بے رحم ہاتھ سکینہ کے گھٹتے ہوئے چہرے کو ڈھانپ رہا ہے۔ رکمنی کے ذہن سے تھوڑی دیر کے لئے ہر خیال محو ہو گیا اور یہ ایک حقیقت باقی رہ گئی کہ طوفانِ زندگی اور طغیانِ مظالم کی ماری ہوئی سکینہ مر رہی ہے۔

رکمنی نے بجلی کی گھنٹی بجائی جس کی تیز آواز دور تک گونج گئی۔ دوسرے لمحے میں ڈاکٹر جالی اور دو نرسیں کمرے میں داخل ہوئے۔ رکمنی ان کی کوششوں کو انہماک کے ساتھ دیکھتی رہی، کہ وہ لڑکی ہوش میں آسکے۔ مگر وہ تو ہوش کو بھی غافل کر گئی تھی۔

رکمنی وہاں سے اُٹھی سر جھکائے دفتر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔ جوتیش اس کے پیچھے پیچھے گیا، اس کی آنکھوں میں ڈرپوک نگاہیں تھیں اور ہاتھوں کی رگیں اُبھر آئی تھیں۔

"رکمنی اس کے کیا معنے ہیں، اس لڑکی نے مجھے کون سمجھا!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں سوال کیا اور ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

رکمنی نے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے غضبناک نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہنے لگی۔

"وہ میرے پاس روز تو نہ آتا لیکن جب بھی آتا میں اپنے آپ کو دنیا بھر کی لڑکیوں سے زیادہ نصیبے والی سمجھتی تھی۔ میں اُس دن پہلے ہی سے جان جاتی کہ وہ آج آئے گا، اور جس رات وہ نہ آتا میں اُس کی لائی ہوئی کتابیں پڑھا کرتی۔ شریمتی میرے اوپر مصیبت کا پہاڑ اچانک آپڑا۔ میرا جی بُرا رہنے لگا، اور میں آپ ہی سمجھ گئی کہ میری بیماری کیا تھی، میں سفید پڑ گئی تھی۔ اس دفعہ وہ ایک ہفتے کے بعد آیا اور مجھسے بیسیوں باتیں پوچھ ڈالیں۔ میں اس کی گود میں جا بیٹھی اور اپنا بھید اس کے کان میں چپکے سے کہدیا۔ میں نے اُس سے کہا کہ اب شادی کی فکر جلد کرنا چاہئے۔ دیوی جی! مجھے اپنی خوشی میں کسی بات کا خیال نہ رہا تھا۔ لیکن اب میں چاہتی تھی کہ میرا بچہ اپنے باپ کا بچہ ہو۔

"میرے اس کہنے پر اُس نے مجھے اپنی گود سے ڈھکیل دیا۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے پر سے غلاف اُترا ہوا معلوم ہوا۔ لیکن صورت سے بھید رد بھی نظر نہ آتا تھا! اس رات وہ زیادہ دیر تک نہ ٹھیرا۔ وہ چلا گیا، اور جاتے جاتے آنے کا وعدہ کر گیا۔ آہ، مگر شریمتی، وہ پھر واپس نہ آیا۔ ایک دفعہ بھی نہ آیا!"

یہاں پہنچ کر اُس کی آواز بہت نحیف ہو گئی اور وہ بے حال ہو کر اپنے تکیے پر ڈھل گئی۔ رکمنی اس کے اوپر جھک گئی اور اس کی پیشانی پر سے بالوں کو ہٹانے لگی۔

"اب تم بولنے کی کوشش نہ کرو، میری بچی میں سمجھ گئی ہوں"۔ رکمنی نے اس کو تھپکتے ہوئے کہا۔

اس لڑکی کے تھکے ہوئے پپوٹے جھک گئے اور رکمنی اسے سوتی ہوئی سمجھی لیکن یکایک اس نے آنکھیں کھولدیں، اور نہایت دھیمی مگر ہموار آواز میں کہنے لگی:-

"اس کے کوئی آٹھ روز بعد ایک خط آیا اور اس میں دو نوٹ بھی رکھے تھے، خط میں لکھا تھا کہ اپنی ماں کو لیکر دارجلنگ جانا ضروری تھا اس لئے وہ مجھ سے کچھ دن تک نہ مل سکے گا۔ تھوڑے دنوں تک تو مجھے زیادہ بُرا نہ معلوم ہوا، مگر اس کی یاد ستاتی رہی۔ میرے پاس خرچ کو بھی تھا اور دن بھر کچھ نہ کچھ کرتی دھرتی بیٹھی رہتی تھی۔ مگر گرمیاں ختم ہو گئیں اور وہ نہ پلٹا —— کبھی نہ آیا۔ میرے پاس روپے سب خرچ ہو گئے تھے۔ میں نے وہ مکان چھوڑ کر ایک چھوٹی سی کوٹھری کرائے پر لے لی تھی۔ میری خراب حالت دیکھ کر ایک کُٹنی نے جال ڈالنا چاہا، مگر شریمتی آپ جھوٹ سمجھیں گی، میں نے اس مکارہ کو لاتیں مار کر نکال دیا۔

"اب میں ان تھوڑے سے داموں کو جو بچے تھے خرچ نہ کرنا چاہتی تھی ایک دن شام کے وقت میں گھر سے نکلی۔ دو وقت سے کچھ کھایا نہ تھا، میں بہت بھوکی تھی، آپ کیا جانیں کہ بھوک کسے کہتے ہیں؟ اور ایسے حال میں جب کوئی بیمار بھی ہو، بیکس بھی ہو —— پیسے کی آس نہ ہو! میں یہ سب کچھ تھی! میں نراس تھی اور آنے والی ہر گھڑی موت کی طرح ڈراونی تھی، پر موت ڈراونی نہ تھی!

"میں کالج اسکوئر ہی سے جا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ جو چند آنے میرے پاس تھے اس میں سے کتنے پیسے خرچ کروں اور کیا کھاؤں؟ اسی سوچ بچار میں بو بازار تک جا پہنچی اور داہنی طرف مُڑ گئی۔ جب میں گرجے سے بڑھ کر چترنجن ایونیو کے چوراہے کے قریب پہنچی تو ایک بڑے گھر کے دروازے کے سامنے میں نے اس کو ایک دوسرے آدمی سے بات کرتے دیکھا۔ آپ تو اس بلڈنگ کو جانتی ہوں گی۔

رکمنی نے گردن کے اشارے سے بتایا کہ وہ سمجھ گئی ہے۔ وہ کئی مرتبہ جوتش کو "انڈین ایسوسی ایشن" کی بلڈنگ کے برابر اس کے کلب میں پہنچانے یا لینے گئی تھی۔

"میں اس کی طرف لپکی۔ مجھے اس وقت کسی بات کا دھیان نہ رہا تھا۔ بس میرا جی تھا کہ مجھے مصیبت میں ڈال کر الگ نہ ہو جائے۔ میں نے اُس کا نام لیکر پکارا۔

"شریمتی، اُف! اُس نے جس نگاہ سے مجھے دیکھا وہ مرتے وقت تک میرے سامنے رہے گی۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے جانتا بھی نہ تھا، مجھے دھوکا ہوا تھا پھر میری نراسی کا حال نہ پوچھئے۔ میں ضرور پاگل ہو گئی تھی۔ ورنہ ایسا نہ کرتی "جو ...... تی! میں نے چیخ کر کہا "تم مجھے نہیں پہچانتے؟" میں نے اس کا کوٹ پکڑ لیا تھا۔ اس نے ایک ڈانٹ دی اور مجھ سے الگ ہو جانے کو کہا مجھے بیسوا کہا اور پولیس کی دھمکی دی، شریمتی، میں جانتی تھی کہ وہ مجھے بھولا نہیں ہے اور کوئی آواز میرے کان میں کہہ رہی تھی کہ وہ تجھے شروع سے دھوکا دے رہا تھا، وہ برابر کلکتے ہی میں رہا۔ ایک وقت میں اس کی شُندری تھی۔ پر اس دن بیسوا ہو گئی تھی۔ کوئی منٹ بھر کے لئے سنسار تیزی کے ساتھ چکر کھانے لگا۔

اس نے مجھے جھٹک دیا۔ اور گر کر نڈھال ہو گئی۔ مجھے تھانے میں ہوش آیا اور وہاں سے میں "رفیوج" میں بھیجدی گئی۔ "رفیوج" ہی میں میرے لڑکی پیدا ہوئی شکر ہے وہ زندہ نہ رہی۔ دیوی جی! اس کا دھیان جب آجاتا ہے تو دل بیٹھ جاتا ہے!

"اس دن سے آج تک میں اپنے تئیں سنبھالے رکھنے کی فکر میں رہی ہوں دو مہینے ہوئے مجھے بچہ کھلانے کی ایک نوکری مل گئی تھی۔ اس بچے سے میرا جی بہلنے لگا تھا۔ پھر میری کمزوری کو ان لوگوں نے دق کی بیماری سمجھا اور مجھے الگ کر دیا۔ کوئی سہارا تو تھا نہیں، میں پھر "رفیوج" میں جا پہنچی۔ منیجر صاحب نے بڑی مشکل سے میری حالت پر ترس کھا کر رکھ لیا اور مجھے بخار آنے لگا۔

"میں اپنی اس بپتا کے سنانے کے لئے بے چین تھی۔ آپ کو مجھ سے نفرت تو ہو گی اور ڈاکٹر صاحب کو بھی خیال ہوگا کہ مجھ سی بُری لڑکی پر رحم کیا، پر میں دھوکے میں آپ دونوں کی مہربانیاں سہار نہیں سکتی تھی۔"

سکینہ نے اپنی درد انگیز داستان ختم کر کے رکمنی پر کچھ اس نظر سے نظر ڈالی جو اگر کچھ تھی تو یکسر التجا و معذرت تھی۔ رکمنی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور رکمنی نے ان کو روکنے کی کوشش بھی نہ کی۔

"میری بچی، تم جلدی اچھی ہو جاؤ گی۔ میں تمہیں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گی ......"، رکمنی یکایک چپ ہو گئی اور تعجب سے سکینہ کو دیکھنے لگی۔ رکمنی کے لفظوں نے جادو سا کر دیا، کیونکہ سکینہ کے چہرے پر ایک عجیب تغیر نمایاں ہو گیا تھا —— ایک ایسی تبدیلی آگئی تھی کہ اس کا رنگ و رخ تندرستی اور مسرت سے چمکنے لگا —— وہ اُٹھ بیٹھی، اس کے بکھرے ہوئے بال بکھرے ہوئے چہرے کا ہالہ بن گئے۔ اس کی ہرنی کی سی آنکھوں میں ایک سماوی روشنی جھلکنے لگی۔ اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ پہلے آہستہ اور پھر باآواز کہنے لگی۔

"جاتی! اوہ جوتی! تم آگئے، میرے پاس آگئے!" سکینہ نے نہایت صاف اور بجتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی نگاہیں رکمنی کے پس پشت جم کر رہ گئی تھیں اور اس کے بازو التجائے شوق بن کر کھل گئے تھے۔

رکمنی نے مڑ کر دیکھا اور اپنے پیچھے کھڑے ہوئے آدمی کو متحیرانہ تکنے لگی، پھر پلٹ کر سکینہ کو دیکھنے لگی۔ رکمنی کی رگوں میں خون جم کر رہ گیا، کہ اس پر ایک جاں گسل و روح فرسا حقیقت آشکارا ہو رہی تھی۔ وہ کھڑا ہوا شخص جس کی آنکھوں میں خوف و ہراس نے گھر بنا لیا تھا۔ جوتیش کمار بوس تھا۔

"جوتیش!" رکمنی نے کہا اور آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر ایک مختصر وقفے کے انتشار و تذبذب کے بعد جس میں یہ تین ہستیاں بت بنگئی تھیں، رکمنی نے اپنے جذبات کو قابو میں لا کر سکینہ کو مخاطب کیا:۔

"سکینہ، کیا وہ آدمی یہی ہے، وہ ناپاک جانور یہی ہے جو تمہیں بیکسی، بیماری اور فاقہ کشی میں چھوڑ گیا؟ بچی تم ذرہ سنبھلو، بتاؤ یہ وہی ہے؟" رکمنی کی آواز بھرائی ہوئی تھی، وہ خود بھی اپنی آواز کو مشکل سے پہچان سکتی تھی۔

"رکمنی کے منہ سے اس کا نام سنتے ہی سکینہ کے چہرے پر سے وہ رنگ مسرت جو تیش کو دیکھ کر چھا گیا تھا غائب ہو گیا۔ اس نے جوتیش اور رکمنی کو حیران نگاہوں سے دیکھا۔ گردن جھکا لی۔ اور پھر کچھ سمجھ کر ایک دبی ہوئی کراہ کے ساتھ اپنے تکئے پر گر گئی

"شریمتی، میں .... مجھے دھوکا ہوا، یہ وہ ..... وہ نہیں ہے!" اس نے رُک رُک کر کہا اس کی آواز سرگوشی سے کچھ یونہی سی بلند تھی جس کو سننے کے لئے رکمنی کو جھکنا پڑا۔

جس وقت رکمنی جھکی ہوئی اس کے الفاظ سننے کی کوشش کر رہی تھی، تو اس نے دیکھا کہ موت کا بے رحم ہاتھ سکینہ کے مٹتے ہوئے چہرے کو ڈھانپ رہا ہے۔ رکمنی کے ذہن سے تھوڑی دیر کے لئے ہر خیال محو ہو گیا اور یہ ایک حقیقت باقی رہ گئی کہ طوفانِ زندگی اور طغیانِ مظالم کی ماری ہوئی سکینہ مر رہی ہے۔

رکمنی نے بجلی کی گھنٹی بجائی جس کی تیز آواز دور تک گونج گئی۔ دوسرے لمحے میں ڈاکٹر جالی اور دو نرسیں کمرے میں داخل ہوئے۔ رکمنی ان کی کوششوں کو انہماک کے ساتھ دیکھتی رہی، کہ وہ لڑکی ہوش میں آسکے۔ مگر وہ تو ہوش کو بھی غافل کر گئی تھی۔

رکمنی وہاں سے اُٹھی سر جھکائے دفتر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔ جوتیش اس کے پیچھے پیچھے گیا، اس کی آنکھوں میں ڈرپوک نگاہیں تھیں اور ہاتھوں کی رگیں اُبھر آئی تھیں۔

"رکمنی اس کے کیا معنے ہیں، اس لڑکی نے مجھے کون سمجھا؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں سوال کیا اور ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

رکمنی نے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے غضبناک نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہنے لگی۔

"اس کے پہچاننے میں کوئی غلطی نہ تھی، اس نے صحیح شناخت کی، اور اب وہ تمہیں پانے کی فضول کوشش میں دم توڑ رہی ہے — تم قاتل بھی ہو!"

جوشی رکمنی کو اس حال میں دیکھ کر پیچھے ہٹا، زیرِ لب کچھ کہا ہی، اور کمرے سے نکل گیا۔

کامل ایک گھنٹے کے بعد جمالی نے رکمنی کو دفتر کے کمرے میں بیٹھے پایا۔ اب وہ بالکل سکون کی حالت میں تھی۔ رکمنی نے اس سے نگاہوں میں سوال کیا۔

"وہ ختم ہو گئی! اس صدمے نے اسے اور بھی جلدی ختم کر دیا، ورنہ شاید چند گھنٹے، چند دن یا چند مہینے اور جی سکتی۔" جمالی نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "رکمنی میں نے سب کچھ سُن لیا ہے —— مجھے سخت صدمہ ہے۔ تمہارے رنج کے اسباب مجھے بھی ملال پہنچاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ دفعتاً چپ ہو گیا۔

مگر اس الہامی لمحے میں رکمنی کو معلوم ہو گیا کہ جمالی سے متعلق اس کے محسوسات رفتہ کی نوعیت کیا تھی۔ اور جوتیش کی ذہانت اور خوش قطع وضع ہونے کی خوش غلافی نے اسے کیسا گمراہ کر دیا تھا۔

رکمنی نے اپنے اہتمام سے سکینہ کی تجہیز و تکفین کرائی اور ڈاکٹر جمالی کے ساتھ قبرستان بھی گئی۔

تقریباً ایک مہینے کے بعد ایک روز چیٹرجی اور جمالی رکمنی کے مکان میں چائے پر مدعو تھے، چیٹرجی ایک گھنٹہ ٹھہر کر رخصت ہو گیا اور جمالی نے موقع پا کر رکمنی سے کہا۔

"رکمنی" اس کی آواز لڑکھڑانے لگی۔ "اجازت ہے کہ میں اپنی محبت کے جذبات کو تمہارے قدموں پر ڈال دوں جن کو میں نے مایوسی کی گود میں سلا دیا تھا۔"

رکمنی پر تو الہام اسی روز ہو چکا تھا جس روز جھوٹے سکے کا کھوٹا پن ظاہر ہو گیا تھا۔ وہ اُٹھی اور سیدھی جمالی کی آغوش میں پہنچ گئی۔ اس کا قلب پُر محبت دنیائے امن و مسرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا۔ تمتماتے رخساروں پر آنسو گلاب پر شبنم کی بوندیں معلوم ہونے لگے

"پیارے جمالی، میں بہت خوش ہوں کہ میں خود اپنے فریب سے بچ گئی۔ شکر ہے کہ بروقت آگاہ ہو سکی۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ مجھے تم سے اول روز ہی سے محبت تھی —— اس دن سے پہلے میں اپنے جذبے کی نوعیت کو خود نہ پہچان سکی تھی۔"

"زندگی بھی کیا معمہ ہے! ہماری مسرتوں کی تعمیر غریب سکینہ کی خاک قبر پر ہوئی ہے!" رکمنی نے نہایت متاسفانہ لہجے میں کہا:—

"خدا اس کی روح پر اپنی رحمت نازل کرے!"

زمانہ گلشنِ عیش کرا بہ یغما داد؟
کہ گل بدامنِ ما دستہ دستہ می آید

ڈاکٹر چیٹرجی نے دونوں کے ہاتھ پکڑ کر مبارکباد دی اور ان کے ساتھ رجسٹری آفس تک گیا۔ وہاں سے جمالی اور رکمنی سیدھے سکینہ کی قبر پر پہنچے اور قبر کو بیچ میں لے کر ہاتھ ملائے اور اس طرح اپنی شادی اور محبت کی مسرتوں کی تصدیق کی۔ پھول چڑھائے آنسو بہائے اور رخصت ہو آئے —— کہ زندگی اسی کا نام ہے۔

دوسرے روز صبح کے اخباروں میں جمالی اور رکمنی کی تصویروں کے ساتھ یہ خبر نہایت جلی عنوان کے ساتھ شائع کی گئی کہ کلکتہ کے مشہور و معروف ڈاکٹر جمالی اور شریمتی رکمنی بالا دیوی سرکار کی شادی رجسٹری کے ذریعے سے ہو گئی اور ہر چند شادی رجسٹری سے ہوئی ہے مگر نوشہ و عروس اسی بات پر سختی کے ساتھ مصر ہیں کہ وہ اپنے آبائی عقائد مذہبی پر ہمیشہ قائم رہیں گے اور اس طرح ایک نئی برادری، ایک نئی قومیت، ایک نئے مذہب کی — انسانیت کے مذہب کی، محبت کے مذہب کی بنیاد ڈالیں گے۔ ایک "نیا شوالہ" قائم کریں گے۔

ل۔ احمد

اُردو کی تنظیم

(علامہ دتاتریہ کیفی)

کئی مہینوں سے اُردو کے اکثر رسالوں، اور اخباروں میں اس کا چرچہ ہو رہا ہے، کہ اب وقت آگیا ہے، کہ اُردو کی تنظیم ہونی چاہئے۔ لکھنؤ میں، دہلی اور پنجاب میں دو نئی منظم جماعتیں اکیڈیمی یا کانفرنس کے نام سے قائم بھی ہوئی ہیں، بعضوں کا خیال ہے کہ اردو ایسی لکھی جا رہی ہے جس کے سمجھنے لے لیے فارسی اور عربی کی اچھی واقفیت کی ضرورت ہے۔ بعضوں کو اردو کی تصحیح اور توسیع کا نہیں، بلکہ اس کی توشیع کا خیال دامنگیر ہے۔ بعض اپنے صوبے کے خصوصیات کو ٹکسالی شان دینا چاہتے ہیں۔ اوّل دو طبقوں کا خیال خواہ کسی نوعیت کا ہو، ہندی کی روز افزوں ترقی اور اشاعت سے پیدا ہوا۔ اُردو کے بہی خواہ، اُردو کی ترقی۔ اصلاح۔ توسیع اور توشیع سے غافل نہ تھے۔ برسوں ہوئے کہ راقم نے ایک تجویز انہیں امور اور ان سے متعلق طرز عمل کی بابت مولوی عبدالحق صاحب کے پاس بھیجی۔ تفصیلات کی بحث تک نوبت پہنچی۔ لیکن وہ تحریک عمل پذیر نہ ہونی تھی، نہ ہوئی۔ یہ یاس آگیں نتیجہ موصوف کے اور راقم کے بعض ذی رسوخ احباب کی سرد مہری سے ہوا۔ اب پچھلے سال "اُردو کی موجودہ ضروریات" کو موضوع قرار دے کر ایک مفصل لکچر میں نے لاہور میں دیا۔ نتیجہ صرف یہ ہوا کہ اردو سروے کی تکمیل کی۔ ایک باضابطہ تحریک محبّی مولوی عبدالحق صاحب کی تجویز سے شروع ہوئی جس کے متعلق ملک کے مختلف حصوں میں کام ہو رہا ہے۔

میں کئی بار توضیح سے بتا چکا ہوں کہ جب ایک زبان میں ضرورت یا بے ضرورت دوسری زبانوں سے الفاظ یا مرکبات مستعار لینے کی عادت لوگوں کو پڑ جاتی ہے۔ تو وہ زبان تصریفی قوت اور توضیعی استعداد سے محروم اور نادار ہو جاتی ہے۔ غور۔ وفکر۔ عرض۔ نشوونما۔ اور مالا وغیرہ کو مذکر ماننا صحیح اور فصیح ہے یا مؤنث۔ لکھنؤ کا "کوشش کرنا پڑیگی" ٹھیک یا دہلی کا "کوشش کرنی پڑیگی"۔ منشی پریم چند جو فردوس خیال میں دھرم سالہ کو مذکر لکھ گئے ہیں یہ اُردو یا ہندی کے قاعدے کے مطابق درست ہے یا نہیں، یہ اور ایسی باتیں محض فروعی ہیں۔ اصول کی بات وہ ہے۔ جو میں اوپر کہہ آیا ہوں۔ "رنگ و روپ" "چوڑی دار" "گرگرا"۔ جیب کترا۔ کی سی ترکیبوں سے بھی بحث فضول ہے۔ مجھے تو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ کہ پچھلے پچاس برس میں بعض اصطلاحوں سے قطع نظر ایک نیا لفظ۔ ایک نیا مرکب جو ٹھیٹ اُردو ہو۔ اُردو میں ایزاد نہیں ہوا۔ یہ حال ہمارے لسانیاتی افلاس اور ناداری کا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ نئے خیالات اپنے ساتھ نئی زبان یعنی نئے الفاظ لایا کرتے ہیں۔ اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اُردو میں نئے خیالات آرہے ہیں۔ اور زور شور سے آرہے ہیں۔ سوال اُٹھتا ہے کہ پھر کیا کیا جائے اس کا جواب ہی وہ شاہراہ ہے۔ جس کی نشاندہی اور جس پر چلنے کی اہل اُردو کو ضرورت ہے۔ وہ شاہراہ اگر دریافت ہو جائے تو دشوار گذار نہیں۔ سنیئے نئے اور انوکھے میں نوعیت کا بیّن فرق ہے۔ میری غرض یہاں نئے خیالات سے ہے۔ اور میں انہیں دو زمروں میں رکھتا ہوں یعنی داخلی اور خارجی۔ نیا خیال جو داخلی ہو۔ کسی قسم کی لسانیاتی دقت پیش نہیں کرتا کیونکہ اس کا مولد آپ کا ذہن ہے۔ اور ذہن عموماً جانی پہچانی یعنی دیسی زبان کے ذریعہ سے تخیلہ کو روانی دیتا ہے دقت جو آکے پڑتی ہے وہ خارجی خیالات سے وابستہ ہے۔ وہ آپ کے ذہن کا مولود نہیں ہوتے۔ ان کا مولد دوسرے ذہن ہوتے ہیں جن کا وطن اور زبان بھی دوسری ہوتی ہے ترجمہ کا تو ذکر ہی کیا۔ پہلے جس طرح شعر کہتے وقت ذہن جامی اور نظامی۔ حافظ اور نظیری کو دُہرایا کرتا تھا۔ اسی طرح اب شیکسپیئر اور ورڈز ورتھ شیلے اور اینا تول فرانس وغیرہ کو دُہراتا ہے۔ پہلے نظم نثر پر چھائی ہوئی تھی۔ اب دونوں ایک ہی پلڑے میں ہیں۔ وہ خارجی خیالات ہی ہیں جو زبان میں نیاپن اور کہیں کہیں انوکھا پن اور اوپرا پن پیدا کر رہے ہیں۔ ہر شخص کی نسبت یہ توقع کرنا کہ وہ اردو کا ماہر کامل اور قادر الکلام ہوگا

سلہ منثورات صفحہ ۲۲۶ سلہ صفحہ ۱۰۱

بے معنی ہے سو ایسا ہو یا نہ ہو۔ نئے الفاظ گھڑنے اور نئی ترکیبیں وضع کرنے کی ضرورت لابد ہے۔ پھر یہ ہونا چاہئے کہ جب ایسی ضرورت پیش آئے تو سب سے پہلے اپنی معلومات کے مطابق اپنی زبان کا جائزہ لیا جائے۔ اس میں ناکامی ہو تو کسی اردو لفظ کو نئے معنی پہنانے کی مناسبت اور معقولیت کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس سے بھی کام نہ نکلے تو اردو کا نیا لفظ یا مرکب اختراع کیا جائے۔ اس پر بھی مطلب پورا نہ ہو تو غیر زبان کے لغت سے استفادہ کیا جائے۔ اگر ہم میں سے اکثر اس اصول پر عامل ہوں تو اردو اپنی تصرفی قوت اور فعل اختراعی سے محروم نہ ہوگی۔

غیر زبانوں سے جو لغت لئے گئے۔ مان لیجئے کہ ضرورتاً لئے گئے لیکن یہ نہ سوچا گیا کہ اس سے اور ضروری کلمے بھی بن سکیں گے یا نہیں۔ بلدیہ۔ سوفد قنوطیت۔ استعمار۔ اور سماج (سوسائٹی۔ جماعت) وغیرہ الفاظ جو اردو میں نوارد ہیں۔ ایسے ہیں کہ ان سے اور کلمے مثل۔ اسم فاعل۔ صفت۔ متعلق فعل وغیرہ نہیں بنائے گئے۔ یا یہ کہئے کہ اردو میں نہیں لائے گئے۔ یہ کیوں ہوا یہ یوں ہوا کہ اپنی زبان میں تلاش سے پہلو تہی کرکے باہر کا ایک لفظ لے کر موقع پر ٹانک دیا۔ وہ ضرورت حقیقی تھی یا غیر حقیقی پوری تو ہوگئی لیکن زبان اس لفظ پر متصرف نہ ہوسکی۔

انگریزی میں یہ سہل لٹکا ہے کہ ہر اسم سے پہلے To علامت مصدری لگا کر مصدر بنا لیتے ہیں۔ جیسے کوئی نہیں ٹوکتا۔ ٹو ٹوسٹ۔ ٹو ایر (to ،، ء ٹ) کو دیکھئے۔ ہمارے ہاں بخشنا۔ بدلنا۔ گزرنا۔ بدلنا۔ گزرنا۔ پھسلنا۔ آزمانا وغیرہ کی عمر ایک صدی کے قریب ہے تیس سال گزرے۔ میں نے بجو برنا گھڑا تھا۔ اب مولوی عبدالحق نے برقانا۔ وضع کیا۔ بس قصہ ختم۔

ہم میں ایک جماعت کو یہ ضد ہوگئی ہے کہ مصر اور دوسری جگہ کے عربی اور فارسی جرائد وغیرہ میں جو اختراعات مستعمل ہو رہے ان کی بعینہٖ نقل کی جائے۔ معمولی چیزوں۔ اداروں کے نام اور اعلام تک کے لئے۔ حریت لسانی کے جذبے سے محروم ہو کر غیر زبانوں کا رنگ اپنی زبان پر چڑھایا جاتا ہے۔ چڑیا گھر چھوڑ کر بیت الوحوش۔ پاگل خانہ کو چھوڑ کر بیت المجانین۔ بھوک ہڑتال سے دستبردار ہو کر مقاطعہ جوعی کے سے عجیب و غریب مرکب استعمال کرنے کا لپکا پڑ گیا ہے۔

جب آپ کی زبان میں ٹ ہے اور رہیگی تو ٹالسٹائی کے بدلے تالستائی کیوں لکھا جائے۔

ایک امر میں صاف کردینا چاہتا ہوں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ اردو میں فارسی اور عربی لفظ ابتدا سے داخل ہونے شروع ہوئے۔ اگرچہ اس کی انشا کا ڈھانچ اول سے ہندی یا پراکرت رہا۔ انگریزی سے سابقہ بہت بعد میں جاکر ہوا۔ اس لئے اردو پر عربی کا حق انگریزی کے مقابلے میں فائق ہے۔ ایسا استدلال ہم کو لسانیاتی خودکشی کے اقدام کا مرتکب ٹھیرائیگا۔ زبان کے معاملے میں جدی جائداد اور وارثان بازگشتی کا اصول نہیں چل سکتا۔ سنیے اور غور سے سنیے کہ زبان کا بڑا مقصد افہام و تفہیم ہے اور یہ کہ اس زمانے میں ہمارے تعقات کی اکثریت انگریزی داں ہے۔ میں اپنے بزرگوں کو فارسی میں خط لکھا کرتا اور فارسی ہی میں جواب آتے تھے۔ اب میرے اور بندہ زادوں کے درمیان انگریزی میں خط و کتابت ہوتی ہے اور یہی حال تقریباً ننانوے فیصدی کا ہے۔ اردو کے تقریباً ہر رسالے اور ہر اخبار کا اڈیٹر انگریزی جاننے والا ہوتا ہے۔ انگریزی میں مباحثے اور لکچر ہوتے ہیں۔ عربی فارسی یا سنسکرت میں نہیں۔ اردو اور ہندی کے بعد انگریزی زندہ زبان بن گئی ہے۔ اگر آپ تھرمامیٹر کہیں تو مجھے یقین ہے کہ سب سننے والے سمجھ جائینگے۔ مگر ان میں سے کئی شخص ایسے ہونگے جو مقیاس الحرارت کو نہیں سمجھیں گے۔

علم معانی کے مدونوں نے جو غرابت۔ مخالفت قیاس لغوی اور اضمار قبل الذکر وغیرہ کو فصاحت کے منافی قرار دیا ہے اس کی علت غائی یہی تھی کہ کلام کے سمجھنے میں سامع یا قاری کو دقت نہ ہو۔

دیکھئے دو نئے لفظ یا ادارے حال میں ہمارے علم میں آئے ہیں ایک وائرلیس اور دوسرا ایئر مائنڈڈ۔ آپ اردو میں ان کی جگہ کیا کہیں گے۔ اول کی جگہ آپ لاسلکی کا نام لیں گے تسلیم لیکن اس سے مصدر کیا بنائیگا۔ اگر آپ ایسا نہیں کرسکتے تو اردو کے نقول میں ابزادی سے قاصر رہے۔ ایک جملے میں آپ اپنا مطلب ادا کریں گے نتیجہ یہ کہ آپ اس لفظ کو اپنانے سے عاری رہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے ایک نیا مصدر لسلکانا کیوں نہ بنایا جائے۔ مرکبات میں ہمارا قدیم دستور ہے کہ شروع سے دوسرا حرف حرف علت ہو تو مرکب بناتے وقت اسے گرا دیتے ہیں۔ گال سے گل تکیہ۔ ناک سے نکسیر اور نکٹا۔ کان سے کن پھیڑ اور کن بسیا۔ موںڈ سے منڈ بھیڑ۔ بھیک سے بھک منگا وغیرہ۔ اسی قیاس پر لاسلکی سے الف اڑا دیا۔ اب یہ لفظ اپنا لیا گیا اور متردد ہو گیا۔ اب تک اجنبی اور متداخل تھا۔ اب اردو والا بے تکلف لکھے گا کہ حملہ آور فوج کا کمانیر (تاریخ وقت) لسلکاتا ہے کہ دشمن کی فوج —— ورنہ یہ لکھنا پڑتا —— بذریعہ

لاسلکی خبر دیتا ہے کہ ـــــ اب دوسرے لفظ ایر ما نیڈ ڈ کو لیجئے ہیں تو اس کی جگہ اردو میں ہواگیر کہونگا۔ اس سے ہواگیری وغیرہ آسانی سے بنائے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ سلکانا کے حق میں نہیں تو لاسلکی سے ہاتھ اٹھا لیجئے اور بے تار کی خبر سے کام چلایئے۔ اردو میں لاسلکی جبھی قبول ہوگی جب اس مبتدا کی خبر بھی نکلے ورنہ یہ لفظ اجنبی اور راو پار رہیگا۔ سبمیرین کے لئے آبدوز نہایت موزوں اختراع ہے لیکن یہ اختراع اب تک مصدر اور افعال کے زیور سے عاری ہے۔ ۱۹۱۵ء کے شروع مہینوں میں ایک اخباری تار کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے "ـــــ لوٹی تینا جہاز کو سارڈینیا کے نیچے آبدوزوں نے تباہ کر دیا۔" کتنا اختصار ہو جاتا اگر یوں لکھ سکتے "ـــــ آبدوز اگیا" مطلب یہ کہ آبدوز سے آبدوزنا کیوں نہ بنایا جائے۔ ادہر کو اور تنے رخصت ہوئے۔ ادہر مرکب فعل کی جگہ اس نئے فعل نے لی۔ آزمانا۔ ہچکچانا۔ تلملانا۔ چہچہانا کے سے کئی نئوں کے مصدر ہمارے ہاں پہلے سے موجود ہیں۔

غیر ذی روح کلموں کی جنسیت کا تصفیہ یہاں پیش نہیں کیا جائیگا جس سے متعلق عالم اردو میں اندرونی اختلاف پایا جاتا ہے کیونکہ اس سے مفصل بحث پہلے ایک جگہ آچکی ہے۔ وضع اصطلاحات پر بھی اردو میں اہل ادب کافی بحث سے کام لیچکے ہیں۔ مگر ایک اصول اس بارے میں نظر انداز ہوا ہے جس کا افسوس ہے یعنی اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا کہ اسم سے صفت بھی آسانی سے اور مدونہ قواعد کے تحت بن سکے مثال کے لئے مابعد الطبیعات ہی کو لیجئے یہ اتنا بڑا مرکب ہے کہ صفت کی توضیع کی اجازت نہیں دیتا۔ لواحق و روابط کی فہرست بھی ترمیم چاہتی ہے یہی حال استناد اور تصرف تشخصی و لسانیاتی کا ہے۔

مختصر یہ کہ اگر کسی کا عندیہ صرف یہ اور اسی قدر ہو کہ ایک شاندار اور بارعب نثر یا ایک زور دار نظم اور اثر ریز غزل لکھ دے اور بس تو میرا روئے سخن اس کی طرف نہیں۔ جن کا شعار اندھا دھند قدامت پرستی ہو گیا ہے۔ وہ بھی اس بحث سے خارج ہیں۔ وہ اپنی اردو کی ملکیت پر ناز و فخر کے ساتھ بیٹھے رہیں۔ اور اس کے مرثیے کی بحر اور صنف سوچتے رہیں۔ روئے سخن ان کی جانب ہے۔ جو اپنے تئیں اردو کا مالک نہیں امین سمجھتے ہیں۔ جن کو اس مقدس کفالت کا احساس ہے۔ جن کی نظر ترقی کی اس شاہراہ پر پہنچتی ہے جس پر ملک کی اور زبانیں مستعدی سے چل رہی ہیں۔ اُن کا مطمح نظر ماضی نہیں بلکہ حال اور استقبال ہے۔ ان کا ذہن تیز اور رسا ہے۔ قاموس اور برہان کے قلعوں میں محصور نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے سخن اور ادب دانش کا میدان اسلاف کے میدان سے مختلف ہے۔ جن کی غائر نظر آنے والی دقتوں اور ہفت خوانوں کا صحیح قیاس کر سکتی ہیں۔ جو نہ اردو کی ـ نغزیت اور روتج سے بے پروا ہیں۔ اور نہ جن کو فن کے معقول قواعد سے للّہی بغض ہے۔ وہ نہ ماخذ پرست ہیں نہ آثار عتیقہ کے دشمن۔

جاننا چاہیئے کہ اگر اردو زندہ زبان ہے تو اس میں تبدیلیاں ہونگی۔ وہ اصلاح و ترمیم اور ترقی یا تنزل سے آزاد اور مستغنی نہیں رہ سکتی۔ قدامت پرست ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ کیا وہ حضرات وہی زبان لکھتے اور بولتے ہیں جو اب سے دو صدی پہلے سو برس پہلے ـ میں کہتا ہوں پچاس برس پہلے بولی جاتی تھی۔ متروکات کی لمبی فہرست کیا سبق سکھاتی ہے۔ جب آپ نے ناجی اور یکرنگ ـ ولی اور مظہر کی زبان چھوڑ دی اور اس میں تبدیلیاں اور ترقیاں کیں تو اب کہ ضرورت جائز ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہی ہے کیا وجہ ہے کہ ناسخ اور آتش۔ غالب اور ذوق و مومن کی زبان میں ترمیم اور ترقی سے روکا جائے۔ ایک ترمیم دوسری ترمیم کے اور ایک ترقی مزید ترقی کے جواز کو مستحکم اور لابد قرار دیتی ہے۔ ہم کو آئندہ پر نظر رکھنی چاہئے۔ بزرگ کہ گئے ہیں

مرد آخر بین مبارک بندہ الیست　　　　سہ

رباعی

ایسا ہے کوئی جس سے ہوا ہو نہ گناہ؟　　اعمال سے جس کے آشنا ہو نہ گناہ؟

وہ ترکِ گناہ کا سبق دے مجھ کو　　جس نے کوئی دنیا میں کیا ہو نہ گناہ!

سیماب

سلہ ملاحظہ ہو نشورات صد ۴۲

غزل گوئی

میں آج ایک ایسا مسئلہ چھیڑ رہا ہوں، جس کی مخالفت تو ہوگی ہر طرف سے۔ اور موافقت میں بمشکل دو چار سے زیادہ آوازیں بلند نہ ہو سکیں گی۔

کسی کلیۂ قدیم اور رواج محکم کا توڑنا بچوں کا کھیل نہیں، اس کے لئے کافی جرأت اور طعن و تشنیع برداشت کرنے کی پوری قوت درکار ہے۔ جرأت تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اردو کی محبوب ترین چیز یعنی غزل کے خلاف مضمون لکھ رہا ہوں۔ رہی طعن و تشنیع سننے کی قوت، سو اس کا بھی انشاء اللہ جلد اندازہ ہو جائے گا۔

میں سوال یہ اٹھانا چاہتا ہوں:-

(۱) کیا غزل "مصنوعی" اور جھوٹی شاعری کا آلۂ کار نہیں؟

(۲) کیا غزل گویوں کو صحیح معنی میں شاعر کہا جا سکتا ہے؟

ظاہر ہے اس سوال کا جواب دینے کی خاطر، پہلے ہمیں یہ طے کرنا پڑے گا کہ

(۱) شاعری کیا ہے؟

(۲) اور شاعر کسے کہتے ہیں۔

(۱) شاعری کیا ہے؟

یہ مسئلہ اس قدر طویل اور پیچیدہ ہے کہ دفتر کے دفتر سیاہ کرنے کے بعد بھی تسلی وشوار ہے۔ اس موضوع پر دنیا کی مختلف زبانوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن موضوع کی وسعت و نزاکت کے باعث کوئی ایک ایسی تعریف، جس پر کسی زمانے میں بھی اجماع ہو سکا ہو، اب تک معرضِ وجود میں نہیں آئی ہے

میں اس مقالے میں طوالت سے گریز کر کے مختصر راستہ اختیار کرنے ہی پر قناعت کروں گا۔ اس لئے اور بھی طوالت کو فضول سمجھتا ہوں کہ ظاہر ہے اس مقالے کو وہی حضرات دلچسپی سے پڑھیں گے۔ جن کا ادبی ذوق اچھی طرح ترقی یافتہ ہوگا۔ اور یہ یقین ہے کہ ان کے واسطے اشارات کے ذریعے سے عبارات کے تمام محذوفات و مقدرات تک پہنچ جانا دشوار نہ ہوگا

یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی میں آئے دن انسانی قلب پر جو اثرات پڑا کرتے ہیں۔ وہ شعوری و غیر شعوری طور پر نوعِ انسانی کے افعال، افکار اور اقوال کو مختلف سانچوں میں ڈھالا کرتے ہیں۔ لیکن جب شاعر کے قلب پر یہی اثرات پڑتے ہیں تو اُن کی کیفیت و شدت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ توپوں اور بادلوں کے گرجنے سے غیر شاعر پر وہ اثر نہیں پڑتا جو چینک کے تال پر ایک ذرے کے گرنے سے شاعر کے دل پر ہوتا ہے۔ ہر وہ جذبہ خواہ دیکھنے میں کتنا ہی حقیر ہو جو شاعر کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور ہر وہ اثر جو شاعر کے قلب پر پڑتا ہے وہ اس کے دل و دماغ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جنبش کرنے لگتا۔ اور اس کے خون میں شامل ہو کر اس کے ہر بن مُو میں سرایت کر جاتا ہے۔ اور اس کے مشتعل سینے میں اس وقت تک برابر تڑپتا اور مچلتا رہتا ہے۔ جب تک کہ اپنے بہ احسن الوجوہ اظہار کے لئے مناسب الفاظ اور موزوں بحر انتخاب نہیں کر لیتا۔ اور مناسب الفاظ اور موزوں بحر، جیسے ہی اس کی گرفت میں آ جاتی ہے وہ شعر بن کر شاعر کے قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔

میرا مدعا یہ ہے کہ شاعر جو کچھ دیکھتا اور سنتا، سونگھتا چھوتا اور چکھتا ہے۔ جو کچھ اس پر گذرتی یا وہ دوسروں پر گذرتے ہوئے دیکھتا ہے نیز جو کچھ بھی وہ سوچتا، سمجھتا اور غور کرتا ہے، یہ تمام چیزیں اس کے دل و دماغ میں کروٹیں لیتی رہتی ہیں اور جلد یا بدیر پختہ و رسیدہ ہو کر "شعر" کا لباس اختیار کر لیتی ہیں۔ کبھی تو یہ عمل بجلی کی سرعت کے ساتھ واقع ہوتا ہے۔ اور کبھی دیر لگ جاتی ہے۔ لیکن ....

قطعی ناممکن ہے کہ شاعر پر کوئی اثر پڑے اور وہ "شعر" بننے کے عوض خود اسی کے دماغ میں کھپ کر رہ جائے۔ اور اپنے پالنے ہی میں گھٹ کر مر جائے

شاعری جہاں آپ بیتی ہے۔ وہاں جگ بیتی بھی ہے۔ شاعری اگر داخلی ہے تو خارجی بھی ہے۔ اس لئے اگر ہم شاعری کو حیات کی مصوری اور زمانے کی تاریخ نویسی کا لقب دیں تو دراصل یہ لقب حقیقت سے بعید نہ ہوگا

اس بات کو ذہن میں رکھئے گا کہ میں نے شاعری کو "حیات کی مصوری" اور زمانے کی "تاریخ نویسی" کہا ہے۔

(۲) شاعر کسے کہتے ہیں؟

ہر چند یہ سوال پہلے سوال کے مقابلے میں آسان ہے لیکن اس کے متعلق بھی ارباب فن میں اختلاف آرا کا کافی ذخیرہ موجود ہے

میں تو بہر حال مختصر طور پر یہ عرض کروں گا کہ میرے نزدیک شاعر وہ شخص ہے، جو سب سے زیادہ حساس ہو۔ اس کے جذبات شدت کے ساتھ سریع الاشتعال ہوں اور وہ اپنے احساسات اور جذبات کو بہترین الفاظ میں ادا کر دینے کی قدرت بھی رکھتا ہو۔

یہ تو شاعری کی عمومی اور مختصر تعریف ہوئی۔ میں تشریح کی خاطر شاعر کی چند خصوصیتیں بھی عرض کر دوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

شاعر کی طبیعت یہ ہے کہ وہ کائنات کے ہر ذرے، حیات کے ہر تیور، حواس و ماورائے حواس کے ہر پہلو، احساسات کے ہر رخ اور جذبات کی ہر ادا کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس سے متاثر ہوتا ہے اور ان تاثرات کو موزوں ترین جامۂ الفاظ پہنانے کی صلاحیت و قدرت بھی رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ شاعر کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی ایک موضوع، کسی ایک مقصد، کسی ایک تعلیم، کسی ایک فلسفے اور حیات کے کسی ایک رخ کے اندر قید ہو کر نہیں رہ سکتا ہے۔ وہ تو قرآن کی زبان میں ہر آن نئی نئی وادیوں کی سیر کیا کرتا ہے۔ وہ تو ہواؤں کی طرح آوارہ ابر کی طرح بے پروا خرام۔ تصورات کی طرح بے قید و بند، اور ایتھر کی طرح آزاد ہوتا ہے

وہ کہیں ٹھہر بھی کیوں کر سکتا ہے؟ اس کے کانوں میں تو ہر آن "جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا" کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں اس کے سپرد تو اتنے ناقابل شمار فرائض ہوتے ہیں کہ وہ کسی ایک منزل میں ٹھہر ہی نہیں سکتا اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ حالانکہ ہر منزل اس کی ہے اس کا کام تو آفتاب کی طرح ہر پست و بلند پر چمکنا اور ہواؤں کی طرح ہر خار و گل کا منہ چومنا ہے۔ وہ

تو اپنے مشاغل کی فراوانی کے باعث گھبرایا گھبرایا سا رہتا ہے۔ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے، کس فریضے کو انجام دے اور کسے ملتوی کرے۔ اسے تو ہر چھوٹے سے چھوٹا ذرہ دردناک لہجے میں آواز دیتا ہے کہ "اے شاعر مجھے بھی شعر بنایا جائے" وہ تو زمین اور آسمان کی طرف دیکھ کر "ہر گلِ تازہ مرا بانگِ نوازد کہ بیا" کی آواز بلند کرتا رہتا ہے اور پھر قدرت کی طرف اشارہ کر کے چیخ اٹھتا ہے۔

در ہیچ مقامم نہ گذارد بدر رنگے
زبوئے بسوئے برد ز رنگے برنگے

اس کے علاوہ عرض کیا جا چکا ہے اور اس کے یاد رکھنے کی استدعا بھی کی جا چکی ہے کہ "شاعری حیات کی مصوری" اور زمانے کی تاریخ نویسی کا نام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شاعر کا ہر شعر اس کی سیاحتِ حیات کا اندازہ لگانے والوں کے لئے "ایک قدم" ہوا کرتا ہے۔ شاعر کے کلام سے آپ اس کے مزاج کی افتاد، اس کے احباب اور خاندان کا معیار، اس کی زندگی کے مختلف واقعات معلوم کر سکتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اس کا کلام اس کی ایک نوع کی بیاگرافی (سوانح عمری) ہوتا ہے۔ اور صرف یہیں تک نہیں۔ آپ کو اس کے کلام سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کے زمانے کی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا اس کے دور میں عام پبلک خیالات کی نوعیت کیا تھی، اس وقت کے معاشرتی تمدنی مذہبی اور سیاسی اشعار کیا تھے اور اس کے ہم عصروں کی ذہنیتوں کا رخ بالعموم کس طرف تھا

اگر شاعری اور شاعر کی یہ مختصر تعریفیں جو میں نے مجملاً پیش کی ہیں درست ہیں تو آئیے اس روشنی میں اپنی "غزل" اور اپنے "غزل گویوں پر نگاہ" ڈالیں

ہماری غزل

شاعری کے باب میں عرض کر چکا ہوں کہ قلب پر جو اثرات پڑا کرتے ہیں وہ اپنے اظہار کے لئے موزوں بحر اور مناسب الفاظ تلاش کر کے شاعر کے قلم سے شعر بن کر ٹپک پڑتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہماری غزل اسی فطری عمل کا نتیجہ ہوتی ہے؟ یعنی کیا پہلے غزل گو حضرات پر کسی نوع کا کوئی اثر پڑتا ہے۔ اس اثر سے ان کے جذبات میں ہیجان آ جاتا ہے اور اس کے بعد وہ اثر ان کے سینے میں اس وقت تک تڑپتا رہتا ہے جب تک اپنے اظہار کی خاطر موزوں بحر و مناسب الفاظ تلاش کر کے شعر کی صورت اختیار نہیں

کرلیتا؟ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا سب سے پہلے ان کے پیش نظر چند ردایات اور چند الفاظ کا ایک مجموعہ ہوتا ہے جسے موزوں کردینے کی خاطر وہ بعد کو شعر پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں، اور آیا حقیقی اور سچی شاعری کی تعریف میں پہلی صورت درست ہے یا دوسری؟

اس کی تحقیقات کا سب سے آسان ذریعہ یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ آیا غزل کس طور سے معرض وجود میں آتی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ غزل بالعموم مصرعِ طرح پر کہی جاتی ہے اگر مصرعِ طرح ہے

"اقرار کرلیا کبھی انکار کردیا"

تو ہمارے غزل گو کیا کریں گے؟ بیمار، رفتار، گفتار، تلوار، اغیار، یہ تمام قوافی لکھ کر سامنے رکھ لیں گے، یا جو مشاق ہیں وہ ان تمام قوافی کو ایک خاص حصۂ دماغ میں جمع کرلیں گے یا انتہائے مشق کے باعث یہ تمام قوافی خود بخود ان کے دماغ میں یکے بعد دیگرے آتے جائیں گے۔ اور اس کے بعد انتہائی کد و کاوش اور دقتِ نظر کے ساتھ ہمارے شعرا غور فرمانے لگیں گے کہ "اقرار" پر کیا کہا جائے۔ "انکار" کو کس طرح نباہیں، اور "اغیار" کو کیوں کر "باندھا جائے" اس کے بعد دوسری منزل آئے گی، "اقرار"، "انکار" اور "اغیار" کے بندھے گرے، یا کہے ہوئے مصرعوں پر مصرعے لگانے کی، اور بسا اوقات یہ ہوگا کہ پہلا مصرع دس دس بار کاٹنے پر بھی حسبِ مراد نہ لگ سکے گا۔

یہ ہے وہ سلسلۂ عمل، جس سے غزل تیار کی جاتی ہے۔ میں دریافت کرتا ہوں کیا یہ سلسلۂ عمل حقیقی اور فطری ہے؟ یہ جذبات اور تاثرات کی سحر کاریاں ہیں؟ یا الفاظ کی بازی گریاں؟ کیا ایسے اشعار کو جنھیں محض چند الفاظ کی خاطر جذبات نے نہیں، مشاقی و موزونیٔ طبع نے پیدا کیا ہے الہامی اور حقیقی شعر کہا جاسکتا ہے؟

کیا یہ ناقابلِ انکار حد تک واقعہ نہیں ہے کہ ہمارے غزل گو حضرات تمام انسانی جذبوں کی گرفت سے بالاتر رہتے ہوئے محض الفاظ کو توڑا نہیں کرتے اور محض چند قوافی کو باندھ کر شاعری کو رسوا نہیں کیا کرتے ہیں؟ اور کیا یہ حقیقت اور ثابت شدہ امر نہیں کہ ہمارے "شعرا" الفاظ کے ذریعے سے اپنے اوپر وہ اثر یا کیفیت، طاری کرنے کی ناکام، غیر فطری اور قابلِ مضحکہ سعی نہیں کرتے جو حقیقی شعرا پر خاص حالت کے ماتحت قدرت طاری کیا کرتی ہے؟ اور کیا یہ سعی بالکل ایسی نہیں ہے کہ جسے قطعی طور پر ہنسی نہ آرہی ہو۔ وہ بہ تکلف اور زور لگا کر ہنسنے کی کوشش کرے یا ہنسی کا منہ بنائے۔

جذبے کے ذریعے سے الفاظ کا سیدھا اور فطری راستہ چھوڑ کر ہمارے غزل گویوں نے "الفاظ کے ذریعے سے جذبے" کا غلط اور غیر فطری راستہ، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کیوں اختیار فرمایا ہے؟

کیا طرح بالکل ایسی صورت حال نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی عورت کو راستے سے پکڑ کر ہمارے سامنے لے آئے اور کہے اس پر عاشق ہو جایئے کیا ہم واقعی عاشق ہو جائیں گے۔ کیا عشق فرمائشی چیز ہو سکتا ہے کیا انسان فرمائشی عاشق بن سکتا ہے اور کیا اس کے یہ صاف و صریح معنی نہیں کہ ہم سے مسخراپن کیا جا رہا ہے؟

فرض کیجئے دوست کی خاطر ہم ایسی لائی ہوئی عورت سے اظہارِ عشق بھی کرنے لگیں۔ لیکن کیا وہ اظہار ہر جہت و ہر حیثیت سے فرضی و مصنوعی نہ ہوگا؟

اب رہیں طبع زاد غزلیں، سو اُن کی شان میں بھی کچھ سُن لیجئے۔

غزلوں کی نوعیت کے باب میں خواہ وہ طرحی ہوں یا طبع زاد، یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رکھیے گا کہ ان کا ہر شعر علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک شعر کو دوسرے شعر سے قطعی کسی قسم کی معنوی یا لفظی مناسبت نہیں ہوا کرتی مطلع میں اگر ہجر پر نالہ و شیون ہے تو عین مطلع کے بعد وصل پر اظہار شادمانی و کامرانی ہے اس کے بعد کوئی تصوف کا مسئلہ آجاتا ہے پھر معشوق کی شقاوتِ قلب کا رونا رو دیا جاتا ہے اس کے بعد فوراً زاہدوں سے ہاتا پائی ہونے لگتی ہے کہ یکایک رقیبِ روسیاہ ظاہر ہوتا ہے اور شاعر صاحب کو دھکے دے کر بزمِ جاناں سے نکال دیتا ہے اور فوراً ہی اس کے بعد شاعر صاحب اپنے آبا و اجداد کی سو پشت کی مانی ہوئی سپہ گری کی قصیدہ خوانی شروع فرما دیتے ہیں —— یہی ہے نہ غزل، یا کچھ اور؟

اب ملاحظہ فرمائیے۔ بات تو نفسیات ہی کی ہے مگر اس قدر سادہ اور عام فہم کہ ہر شخص اتنا بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ کم سے کم نوعِ انسانی پر تو وقتِ واحد میں جذبۂ واحد ہی طاری ہو سکتا ہے ایسا تو ازل سے اس لمحے تک کبھی ہوا ہی

نہیں ہے اور نہ ہو ہی سکتا ہے کہ ہم ایک ہی لمحے میں مغموم بھی ہوں اور مسرور بھی ——— ایک ہی لمحے میں رو بھی رہے ہوں اور ہنستے بھی جا رہے ہوں'

اور جب یہ شکل قطعی طور پر ناممکن ہے تو خدارا بتائیے کہ پھر غزل میں اتنے متضاد جذبے کہاں سے آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور ہمارے شعرا پر اس قدر مختلف کیفیتیں ایک ہی وقت میں کیوں کر طاری ہو جاتی ہیں؟ کیا غزل کہتے وقت دنیا بھر کے تمام مختلف النوع اور متضاد جذبے اور اثرات ہمارے شعرا کے دل و دماغ کو ہارمونیم نواز کی انگلیوں کی طرح چھونے لگتے ہیں؟

کیا اب بھی یہ ثابت کرنے میں کسر باقی رہ گئی ہے کہ ہماری طرحی اور طبع زاد دونوں قسم کی غزلیں جذبے اور تاثر کے تحت نہیں۔ بلکہ محض الفاظ کی خاطر کہی جاتی ہیں؟

اگر کوئی غزل کسی خاص جذبے اور کسی خاص اثر کے تحت کہی جائے تو لازماً وہ شروع سے آخر تک ایک، اور صرف ایک ہی جذبہ و اثر کی حامل ہوگی اس میں کسی دوسرے جذبہ و اثر کی گنجائش کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری غزلیں تو محض الفاظ کی بازی گری، اور شاعری کی نقالی کے نمونے ہیں، اُن کو شعر و شاعری سمجھنا، اپنی سخن سنجی کو رسوا کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

اس کے علاوہ غزل کے دو بڑے عیب اور بھی ہیں۔ غزل بالعموم محفلوں میں ساز پر گائی جاتی ہے۔ فرض کیجئے کسی محفل میں رندانِ خوش دل کا اجتماع ہے اندھیری رات ہے۔ اور جھاجھم پانی برس رہا ہے۔ اس وقت ہر طبیعت چاہتی ہے کہ کوئی ایسی چیز گائی جائے جو خالص نشاطی اور ولولہ انگیز ہو، یا کسی محفل میں ہجر کے مارے ہوئے چند احباب جمع ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کوئی ایسی چیز گائی جائے جس سے انھیں تسلی ہو۔ انھیں ٹھمریوں اور دادروں میں تو ایسی بے شمار چیزیں مل جائیں گی۔ لیکن نہیں ملے گی تو ہماری غزلوں میں کوئی ایسی چیز جو اُن کے جذبات کو آسودہ کرے۔ یہاں تو ہر غزل ایک ایسا "چوں چوں کا مربہ" جس میں کسی جذبے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

دوسرا عیب یہ ہے کہ تندرست ذہنیت کے سامع کو جو شروع سے آخر تک ایک خاص جذبے کا ایک مکمل مطالعہ چاہتا ہے غزل ایک شدید انتشارِ طبع میں مبتلا کر دیتی ہے

غزل کے اشعار در اصل ٹھوکریں ہوتے ہیں اور سامع کا دماغ فٹبال'

اسی کے دوش بدوش یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ غزل یا غزل کے مماثل کوئی صنف دنیا کی کسی زبان کی شاعری میں نہیں پائی جاتی۔ تمام دنیا کی زبانوں میں مسلسل نظموں کے علاوہ غزل کا کہیں نام تک نہیں ہے۔ اور اس نقطۂ نظر سے کیا یہ مان لیا جائے کہ فارسی کے علاوہ اردو جس کی بچی ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں آج تک کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا ہے؟ کیا آپ اس کے ماننے پر تیار ہیں؟

بعض حضرات گھبرا کر انگریزی کے "سانٹ" پیش کر دیا کرتے ہیں۔ اور گھبراہٹ ہی ٹھہری۔ انھیں یہ خیال نہیں رہتا کہ سانٹ بھی ایک اور صرف ایک خیال ہی کی ترجمانی کرتے ہیں۔

بعض احباب فرماتے ہیں کہ ہم ایک نشست میں کب غزل کہتے ہیں کم سے کم دو چار نشستوں میں غزل پوری ہوتی ہے اور اس لئے اس کے اشعار میں اختلاف و تضاد ہوتا ہے۔

اول تو مشاق شعرا کے وہاں یہ ہوتا ہی نہیں' وہ اکثر و بیشتر ایک ہی سانس میں ایک نہیں دو دو تین تین غزلیں "طیار" کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے تو کم سے کم ہر نشست کے شعر تو ایک ہی رنگ کے ہونا چاہئیں جن سے پتا چل جائے کہ اول نشست میں شاعر کے دل و دماغ کی یہ کیفیت تھی اور دوسری نشست میں وہ ان جذبات کا حامل تھا۔ لیکن افسوس کہ ایسا بھی نہیں ہوتا۔ ہر شعر دوسرے سے جدا ہوتا ہے اور ہر نفس کہ فرو می رود ممد زیست و چوں بر می آید مائل بہ آسماں" کے مانند اپنے اپنے ترانے الگ الاپتا ہے۔

بعض متغزلین کا یہ ارشاد ہے کہ ہم جذبات اور تاثرات سے خالی ہو کر کبھی شعر نہیں کہتے۔ ہماری زندگی کے تاثرات و تجربات کو تو قوافی جگا دیا کرتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر اتفاق سے "بیمار" کا قافیہ ہمارے پیش نظر ہے تو ہمیں کوئی اپنی بیماری یاد آ جاتی ہے اور اگر سرشار کا قافیہ سامنے ہے تو ہمیں اپنی یا کسی دوسرے کی سرشاری یاد آ جاتی ہے اور اس طرح حافظے کے بیدار ہوتے ہی ہمارے تاثرات اور جذبات بھی بیدار ہو جاتے ہیں اور اس کیفیت میں ہم جو شعر بھی کہتے ہیں وہ فطری ہوتا ہے — یہ الفاظ کے ذریعے سے بیتے ہوئے اور خوابیدہ واقعات کے اتفاقیہ طور پر جاگ اٹھنے کی کیفیت بہ قدر "چیستاں چیستی" اور ناقابلِ اعتبار ہے کہ اس پر غور بھی نہ کرنا چاہئے الفا

کے ذریعے سے معانی اور حافظے کی وساطت سے جذبات تک رسائی خواہ کچھ بھی ہو، الہامی اور حقیقی شاعری تو ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تو بالکل ایسی چیز ہے جیسے مشین کے ذریعے سے انڈوں سے بچے نکالے جاتے ہیں۔

بعض حامیانِ غزل یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہم وسیع خیالات کو دبا اور بھینچ کر صرف دو مصرعوں میں ادا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ کمال نہیں ہے؟ میں بھی اس کمال کا اسی طرح قائل ہوں جیسے سرکس کے مختلف کرتبوں کا۔ لیکن اگر وہ مجھ سے یہ مطالبہ بھی کریں کہ میں اس "کمال" کو "شعر" بھی تسلیم کر لوں تو کم سے کم میں تو اس پر ایک لمحے کے واسطے بھی تیار نہیں ہو سکتا۔

یہاں تک تو غزل کا مسئلہ تھا۔ اب آئیے ذرا غزل گویوں کا بھی جائزہ لے لیں۔ عرض کر چکا ہوں کہ شاعر سب سے زیادہ حساس اور سریع الاشتعال جذبات کا حامل ہوتا ہے، وہ آفتاب کی طرح اس کرۂ ارض کے ذرے ذرے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ حیات کے کسی ایک خاص پہلو، اور کائنات کے کسی ایک خاص شعبے کا صید زبوں ہو کر نہیں رہ جاتا اور اس کے کلام سے اس کے سوانح، اور اس کے عہد کے حالات مرتب و مدون ہو سکتے ہیں۔

اس تعریف کی روشنی میں ذرا اپنے "شعراء" کے خال و خط ملاحظہ فرمائیے۔ تعریف کے ہر پہلو کو پیش نظر رکھئے اور دیکھئے آپ کے "شعراء" کہاں تک "شاعر" کے پیمبرانہ خطاب کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

قطب شاہیوں کے دور سے لے کر اس عہد تک کے شعراء کا کلام پڑھئے کیا وہی ایک حسن و عشق کا موضوع ہر جگہ نہیں پایا جاتا؟ شاعر اور صرف ایک موضوع۔ کتنی حیرت ناک بات ہے!

یہ سچ ہے کہ شاعری میں سب سے زیادہ دل کش موضوع حسن و عشق ہی کا ہے۔ لیکن شاعر کے لئے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ زندگی بھر ایک ہی موضوع سے وابستہ رہے اسے اس پورے کرۂ ارض کی کوئی دوسری شے تمام عمر متاثر ہی نہ کر سکے؟

کیا ہمارے "شعرائے کرام" کی زندگیوں میں کبھی مست گھٹائیں جھوم کر نہ آئی تھیں کبھی پپیہا نہیں کوکتا تھا کبھی چاندنی کھیت نہیں کرتی تھی، کبھی برستی اور جھومتی ہوئی راتیں بال نہیں بکھراتی تھیں کبھی پیچ و خم کھاتے ہوئے دریا اُن کے سامنے نہیں لہراتے تھے اور کبھی افق کا دریچہ کھول کر دوشیزۂ سحر اُن کے روبرو نہیں مسکراتی تھی۔

اس کے علاوہ کیا اُن کی معاشرت و سیاست میں کبھی کوئی قابل ذکر انقلاب نہیں ہوا تھا کبھی اُن کی قوم پر کوئی دل ہلا دینے والی مصیبت نہیں آئی تھی۔ کبھی ان کا کوئی دوست نہیں بچھڑ گیا تھا کبھی کسی نے ان پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ کبھی انھوں نے کسی یتیم کا اُترا ہوا منہ، اور کسی نوجوان بیوہ کی اجڑی ہوئی کلائیں نہیں دیکھی تھیں؟ اور کیا کبھی انھوں نے کسی ظالم و غاصب کو خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے نہیں دیکھا تھا؟

اور اگر انھوں نے یہ تمام مناظر و واقعات دیکھے تھے، اور ضرور دیکھے تھے۔ تو مروت و رعایت اور بزرگ پرستی کو بالائے طاق رکھ کر جواب دیجئے کہ کیا اس گروہ کو حساس ترین گروہ کہہ سکتے ہیں اور کیا یہ شعراء سریع الاشتعال جذبات کے حامل کہے جا سکتے ہیں؟

حساس ہونا تو بڑی چیز ہے میں تو یہ پوچھوں گا کہ وجہ بتائیے میں انھیں قطعی طور پر بے حس، اور سُن کیوں نہ تسلیم کر لوں؟ پھر یہ سوال کروں گا کہ اس بے پایاں حد کے بے حس اور سُن اشخاص کیا "شاعر" کے لقب سے پکارے جا سکتے ہیں؟ کیا "شعراء" ایسے ہی ہوتے ہیں؟ اور کیا شاعر اس پورے کرۂ ارض اور اس عظیم الشان حیات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے زندہ بھی رہ سکتا ہے؟

اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب آپ اس قدر تلخی نہ کریں یہ تو مغلوب الحال عشاق تھے، انھیں اپنے عشق اور معشوق سے فرصت ہی کب ملتی تھی۔ کہ دنیا کی کسی اور شے کو دیکھ سکتے۔

اس کا ایک جواب تو بہت ہی طوالت آمیز نفسیاتی بحث چاہتا ہے یعنی اس نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی جائے کہ عشاق کی ذہنیت کیا ہو جاتی ہے اور کیا اس ذہنیت کے پیدا ہو جانے سے ان میں اپنی قوم کی محبت، یا کسی یتیم پر ترس کھانے، یا کسی بیوہ پر رحم کرنے کا مادہ باقی رہ جاتا ہے کہ نہیں؟ اور عشاق پر آیا موسموں کے اثرات بھی مترتب ہوتے ہیں، یا وہ "مسلم پروف" ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن طوالت کے خیال سے میں سرِ دست اس بحث میں پڑنا مناسب نہیں سمجھتا۔

میں تو اس بات کا کہ یہ حضرات عشاق تھے اور اس وجہ سے دنیا کی کسی اور شے کو دیکھ ہی نہیں سکتے تھے، یہ سیدھا سا جواب دوں گا، کہ آئیے اُن کے کلام پر نگاہ ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ یہ صحیح معنیٰ میں عشاق

تھے کہ نہیں

میں نے تو جہاں تک ان "شعراء" کا کلام پڑھا ہے، روایتی اور موروثی عشق کی بجو اس کے علاوہ حقیقی اور عملی عشق کا تو مجھے کم سے کم ایک بار بھی پتہ نہیں چلا۔

واضح ہو کہ حقیقی، ور عملی عشق کے تیور ہی کچھ اور ہوا کرتے ہیں، اگر یہ حضرات واقعی جیتے جاگتے معشوقوں کے عاشق ہوتے تو لاکھوں ... ہزاروں میں کم سے کم دو چار معشوق تو ایسے بھی نکل آتے جو ان کے عشق کو قبول کر لیتے ان سے بھی محبت کرنے اور ان کے عشق میں بھی آہیں بھرتے۔ لیکن ایک ایک کر کے ان شعراء کے تمام، دلبت وار کلیات، "دواوین" دیکھ جائیے ہر جگہ آپ کو معشوق بے وفا، قاتل، خونی، اغیار پسند، رقیب نواز اور عاشق کش ہی ملے گا۔

آخر یہ کیا بات ہے؟ کیا ہمارے "شعرائے کرام" بغیر استثنار سب کے سب اس د چه مکر وہ صورت وا قع ہوئے تھے کہ آج تک ان پر کسی معشوق کا دل آیا ہی نہیں؟ اور اس کے ساتھ اس پر بھی غور کیجئے کہ اگر یہ عملاً عشق پیشہ حضرات تھے تو کسی ایک خدا کے بندے کو تو اتنی توفیق ہوتی کہ وہ رقیب روسیاہ پر غالب آجاتا!

آخر یہ کیا معمہ ہے؟ کیا ہمارے "شعرائے کرام" بغیر استثنار سب کے سب اتنے بزدل تھے کہ آج تک رقیبوں سے جیت ہی نہ سکے؟

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ اگر یہ حضرات واقعی شاعر و عاشق تھے تو ان کے کلام میں ان کی انفرادیت کیوں جھلکتی نظر نہیں آتی ہے؟

یہ سب کے سب تو ایک ہی طرح کی باتیں کر رہے ہیں کیا ان کی شاعری پولیس کے سکھائے ہوئے گواہوں کے بیانات کی طرح ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوئی نہیں ہے؟

اردو شاعری کے آغاز سے اس وقت تک ہندوستانی زندگی میں کتنے سیاسی و معاشرتی انقلابات ہو چکے ہیں لیکن ان کے دواوین میں ان کا پتہ تک نہیں چلتا۔

کیا ان کی شاعری حیات کی مصوری اور زمانے کی تاریخ نگاری کہی جا سکتی ہے؟ کیا ان شعراء کو ہم "مصورِ حیات" اور "مورخِ عصر" کا خطاب دے سکتے ہیں؟

یہ چیزیں تو بہت بڑی ہیں ان غریبوں کے کلامِ موزوں سے تو یہ تک نہیں چلتا۔ کہ یہ کس عہد میں پیدا ہوا اور وہ کس زمانے میں مرا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام شعراء ایک ہی زمانے میں موجود تھے ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ ایک ہی غسل خانے میں نہاتے اور ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔ ایک ہی کمرے میں اور ایک ہی لاٹین سے تکیے پر سب شعر کہتے تھے اور ایک ہی دن سب پیدا ہوئے تھے اور ایک ہی دن سب کے سب مر گئے تھے یہ ہیں ہمارے مصورانِ حیات یہ ہیں ہمارے مورخانِ عصر یعنی ہمارے شعرائے جلیل و کبیر!!

نہ کس سے یہ حقیقت بیان کی جائے اور اس دورِ خام و خام نوازی میں کون اس پر یقین لا سکیگا کہ ہر شاعر، موزوں طبع ہوتا ہے لیکن ہر موزوں طبع شاعر نہیں ہوتا۔ کیا میری قوم ایک لمحے کے لیے غور کرے گی کہ غزل کو باقی رکھنے میں کتنا ادبی نقصان اور کس قدر سیاسی خطرہ ہے؟

رباعی

او [illegible] و تعصب [illegible] ساقی
[illegible] دنیا [illegible] ساقی
اس دور میں ارض و سما کو للہ
اُٹھ، رطلِ گراں میں غرق کر دے ساقی

(جوش ملیح آبادی)

بالِ جبریل پر ایک نظر

(از جناب نواب جعفر علی خانصاحب اثرؔ کلکٹر دیرہ دون)

بانگِ درا کے بعد ڈاکٹر سر محمد اقبال کی دوسری تصنیف اردو میں بالِ جبریل کے نام سے شائع ہوئی ہے، عام خیال ہے کہ بالِ جبریل ہر اعتبار سے بانگ درا سے پست اور مایوس کُن کتاب ہے، اس میں وہ جوش و ولولہ، وہ تڑپ، وہ درد قومی وہ جذبۂ ملّی نہیں ہے جو بانگ درا کا طرۂ امتیاز ہے۔ سطحی نظر جو چاہے فیصلہ کرے غائر بیں نگاہیں بالِ جبریل میں شاعر کے تخیلی ارتقا کی بلند تر منزل دیکھتی ہیں۔ خیالات بانگ درا کی بہ نسبت زیادہ گہرے، اور زیادہ دقیق حقائق پر مبنی ہیں جن پر عبور کے لئے دِقّت نظر درکار ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ الفاظ کے تار و پود میں اُلجھکر حقیقت کی عقدہ کشائی سے معذور ہو چکے ہیں۔

دونوں کتابوں کے نام بھی اُنکے مطالب پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بانگِ درا میں مسلمانوں کے قافلے کو منزلِ مقصود تک پہونچانا شاعر کا مطمح نظر تھا۔ بیداری و آزادی و گرم روی کا پیام دیا، اسلاف کے گزشتہ شاندار کارنامے یاد دلائے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کے پردے میں پچھلی عظمت اور موجودہ پستی سے آگاہ کیا، جمود و تنزل کے اسباب گنائے۔ "دنیائے اسلام"، "طلوعِ اسلام" اور اسی نوع کی دوسری نظموں کے ذریعے سے تلقین کی کہ ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مگر نتیجہ کیا ہوا؟ مسلمان بدستور خوابِ غفلت میں مبتلا ہیں۔ گویا بانگِ درا صدا بصحرا ثابت ہوئی! اب غیور و خوددار اقبال ایسی مُردہ قوم سے تخاطب اپنی کسرِ شان سمجھتا ہے، مگر دل میں درد کی کسک باقی ہے لہٰذا فضائے ملکوتی میں بال کشا ہوکر جبریل کو دوبارہ "لب تشنۂ وحی" بناتا ہے اور اُن اسباب و علل پر غور کرتا ہے جو ایسی تیز حدی خوانی کے باوصف مسلمانوں کو برسرکار آنے سے مانع ہیں۔ وہی سوز و گداز جو بانگِ درا میں "شکوہ" بنکر زبان پر آیا بالِ جبریل میں اسلام کی تباہی پر آنسو نہیں بہاتا بلکہ خدا سے پوچھتا ہے ع زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

اقبال کا خیال ہے اور بالکل درست ہے کہ ہم میں سچے رہنما یا لیڈر باقی نہیں رہے، لیڈر سے اُنکی مراد محض سیاسی مدبّر نہیں ہے بلکہ ایسا شخص جو اسلام کو صحیح معنی میں اسلام جانتا اور مانتا ہوا در کار بند ہوکر ایک زندہ مثال اسلامی شعار و کردار کی دنیا کے سامنے پیش کرنے ؎

منزلِ راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے + کوئی اس قافلے میں قافلہ سالار بھی ہے!
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن + اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے؟

دل کے ٹکڑے ہیں جو شعر بن گئے ہیں۔

مگر دیکھتا ہے تو حیدرِ کرارِ ثانی کی جگہ نرے گھرے کٹھ مُلّا لیڈری کے علمبردار ہیں، ٹھنڈی سانس بھر کے کہتا ہے ؎

میں جانتا ہوں انجام اُسکا + جس معرکے میں مُلّا ہوں غازی

حالانکہ ؎

حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیری + بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

آنکھیں ایسے لیڈر کو ڈھونڈتی ہیں جس کی آواز یا پیام خون کے ہر قطرے کو رگوں میں ایک چنگاری بنا دے اور فتوائے کفر سے بے نیاز ہوکر ڈنکے کی چوٹ کہے کہ ؎

کوہ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشادِ شرق و غرب
تیغِ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گزر
تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

پھر کہتے ہیں کہ ہمارے اسلاف جو کام کرتے تھے خلوص و یقین کی رو سے لوجہ اللہ کرتے تھے اور ہم دنیوی اغراض و مصالح، دنیوی سود و

زباں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس خیال کو اقبال نے اسقدر دلکش و موثر طریقے سے ادا کیا ہے کہ آدمی پڑھے اور جھومے اور حصولِ مقصد میں آگ کا دریا بھی حائل ہو تو کود پڑے اور پار کر جائے، ہم اب بھی پا بہ جا رہیں تو شاعر کا کیا قصور۔ کہتے ہیں ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن۔ اپنا تو بن
من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی، جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا، مکر و فن!
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے، نہ من تیرا، نہ تن

ایک وجہ ادبار یہ بھی ہے کہ شکم پہ پتھر باندھ کے مجاہدہ کرنے کے عوض ہم بندۂ شکم بن گئے ؎

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم؟
اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ، ملا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

پستی کا ایک اور سبب ہماری عصبیت اور عدم رواداری ہے، ہم میں خلق نہیں رہا۔ ؎

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں + فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

کیا دراصل ہمیں مومن کا خطاب زیبا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم نے تقدیر کے آگے تدبیر کی سپر ڈال دی؟ ؎

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری + مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا + مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں + مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

پھر حقارت آمیز لہجے میں کہتے ہیں ؎

سینے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک + دیرینہ ہے تیرا مرضِ کور نگاہی

ہمارے دل مر گئے ہیں ؎

وہ سجدہ، روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی + اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

اللہ اللہ! بے حسی کا یہ عالم ہے کہ بالِ جبریل کو جس میں ایسے ہزاروں دل ہلا دینے والے، قیامت بپا کرنے والے شعر ہیں پیامِ سرد و خنک اور کلامِ نرم و نازک سے تعبیر کیا جاتا ہے:

رہنما کا فقدان اسپر مصیبت آپس کا تفرقہ و نفاق ؎

میرِ سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف + آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

بانگِ درا میں اقبال نے مزدوروں کی بہت کچھ حمایت کی تھی مگر تجربے نے سکھا دیا کہ ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو۔ پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبال کو یہ شبہ پیدا ہوا کہ مبادا انکو درویشی و عزلت گزینی کا موید سمجھا جائے، لہذا اعلان کر دیا کہ انکا منشا ترک و فقر سے کیا ہے ؎

کمالِ ترک نہیں آب و گل سے مہجوری + کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری
میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا + تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کیلئے + وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے + خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے
بتوں سے تجھکو امیدیں، خدا سے نومیدی + مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

مثنویات اسرارِ خودی و رموزِ بیخودی کی طرح بالِ جبریل میں بھی اقبال نے خودی کو خاص اہمیت دی ہے اور اس کا صحیح مفہوم بتایا ہے ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا + کہاں سے آئے صدا، لا الٰہ الا اللہ

نہ ہے ستارے کی گردش، نہ بازئ افلاک * خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت جاہ
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک * نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

ہم اسقدر یورپ زدہ ہوگئے ہیں کہ اُسی کے قدم بقدم چلنا چاہتے ہیں، تقلید چاہتے ہیں، تقلید پہ مٹے مرتے ہیں اور اسی کو ترقی سمجھتے ہیں۔ اقبال تنبیہ کرتے اور توجہ دلاتے ہیں کہ تمکو جو نعمت اور جوہر عطا ہوا ہے یورپ میں کہاں؟ وہاں صرف سائنس کی شعبدہ بازی ہے جو دلیل و برہان کی محتاج ہے وہ لذتِ حضوری معدوم جو قلب و وجدان اور علم الیقین سے حاصل ہوتی ہے سہ
نہ کر افرنگ کا اندازہ اُسکی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی بُراقی

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں * کہاں حضور کی لذت، کہاں حجابِ دلیل
غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم * نہایت اسکی حسینؑ، ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

یورپ زدگی نے ہمارا یہ حال کر دیا سہ
یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا * دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے * مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق * کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

پھر کہتے ہیں سہ
رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے * وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج * یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

طارق کی زبان سے دعا کرتے ہیں سہ
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے * وہ بجلی کہ تھی نعرۂ "لاتذر" میں
عزائم کو سینے میں بیدار کر دے * نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

یورپ کی اصلی تصویر، ظاہری طمطراق اور سرمایہ داری کی مذمت ان شعروں میں دیکھئے سہ
یورپ میں بہت روشنئ علم و ہنر ہے * حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں * گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے * سود ایک کا، لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت * پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس * کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم * حد اُسکے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت * احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر * تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل * بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام * یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں * ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ * دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی * اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

واضح رہے کہ سرمایہ داری کے نقائص بیان کرنا اور اس کے مظالم و استبداد سے بیزاری کا اظہار مزدور کو سرمایہ دار بنانے کی تحریک سے بالکل علٰحدہ چیز ہے اور اقبال کے اُن شعروں میں جو پہلے درج کئے گئے اور ان شعروں میں کوئی تناقض نہیں ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ بانگِ درا کا یہ مطلع سہ
کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
پورے بالِ جبریل پر بھاری ہے۔ جواب سنئے سہ
تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے * طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے
اس کے مطالب، اسکی لطافتیں داد سے مستغنی ہیں ع
آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!
بالِ جبریل کے شائع ہوتے ہی لوگوں نے اعتراضوں کی

بوچھار کردی۔ حیرت یہ ہے کہ بانگِ درا کو صرف پرانے خیال کے لوگوں نے تختۂ مشق بنایا تھا جو الفاظ کے دروبست، مضمون کی صفائی کے دلدادہ اور نئی ترکیبوں، جدید تشبیہوں کے مخالف اور ہر آہنگ کے جانی دشمن ہیں، نوجوان اور انگریزی داں طبقے نے اسکا خیر مقدم کیا تھا، مگر بالِ جبریل کی منقصت میں یہ جماعت بھی شامل ہے۔ ایک نے زبان و اسالیب بیان کی ناپسندیدگی پر بالِ جبریل کو ٹھکرا دیا تو دوسرے نے فقدانِ پیام کا فیصلہ صادر کیا اور جوش و علوئے تخیل سے معرا کہدیا۔ حالانکہ سرورق پر جو مطلع ہے وہی ہزاروں پیاموں کا ایک پیام ہے ؎

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں ✤ نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

پیام سرد کا الزام اس شعر کی پاداش میں لگایا گیا ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر ✤ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر!

حالانکہ شعر کے تیور کہہ رہے ہیں کہ خوش آیند صدائیں اور دلکش نغمے بانگ درا کے ساتھ رخصت ہوگئے، ان کا اثر نہیں ہوا تو اب خارا شگاف نعرے سنو، بالِ جبریل میں برق و باد و صاعقہ برسر کار ہیں، تاب لاسکتے ہو تو بنجلۂ طوفاں ہوجاؤ ورنہ کانوں میں انگلیاں دے کر کسی کوٹھری میں دبک رہو۔

خنک پیامی کے ساتھ اقبال پر خدا کی جناب میں گستاخی و دریدہ دہنی کا اتہام بھی عائد کیا جاتا ہے۔ جو لوگ "شکوہ" کے مصنف سے گھٹ گھٹ کے رونے اور تضرع و زاری کی توقع رکھتے ہیں تیر سے ڈکارنے کے بجائے امین کلیان کی فرمائش کیوں نہیں کرتے، بجلی سے شعلے کی جگہ دودھ کی دھاریں کیوں نہیں مانگتے؟ شاید ان کا گمان ہے کہ خدا بھی انکی طرح اسلوبِ بیان کا دلدادہ اور تملق پسند ہے، لفظوں پر دھیان دیتا ہے اور نیت نہیں دیکھتا۔ ان سے کون کہے کہ مثنوی میں اُس چرواہے کا قصہ یاد کرو جو خدا کو دیکھنے اُسکے بالوں میں کنگھی کرنے، صاف ستھرے بستر پر بٹھانے اور بھیڑ کے دودھ کی کھیر پکا کر کھلانے کا متمنی تھا، حضرتِ موسیٰ نے سُن لیا اور چشم نمائی کی بیچارہ گناہ کے احساس سے دیوانہ وار کسی طرف نکل گیا فوراً خطاب ہوا کہ موسیٰ تم نے ہمارے عاشق کو ہم سے جدا کردیا ؎

تو برائے وصل کردن آمدی ✤ نے برائے فصل کردن آمدی

خود قرآنِ پاک میں حضرتِ خضر اور حضرتِ موسیٰ کا قصہ درج ہے۔ کشتی کے پیندے میں چھید کرکے اُسکو ڈبو دیا، دیوار گرادی، کسی کو قتل کر ڈالا۔ یہ کیا وہ کیا ور ہر فعل مستحسن ٹھہرا کیونکہ بغاوت کے پردے نیک نیتی پر مبنی اور مصلحت ایزدی کے تابع تھا۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے مگر اقبال کی مومنیت اور خلوص و عبودیت میں شبہہ کی گنجائش نہیں، پہلو میں درد بھرا دل ہے اور جو کچھ کہتے ہیں قوم کی بہبود کے لئے کہتے ہیں۔ خدا کے سامنے غلامانہ لہجے میں نہیں گڑگڑاتے تو ایسے آپ ہوا خذہ کرنے والے کون۔ سب سے زیادہ جو نظم اس نقطۂ خیال سے مطعون کی گئی ہے وہ ہے جسکی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے ؎

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے، یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

ایک گروہ اقبال کو ٹکسالی اردو سے ناواقف کہتا ہے، یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر اسکو اہمیت دینا ظلم ہے، ایک تو یوں ہی وہ اردو پر فارسی کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اپنے پیام کو ہندوستان کے علاوہ دیگر بلادِ اسلامیہ میں پہونچانا چاہتے ہیں اور ایشیائی زبانوں میں یہ صلاحیت شاید فارسی ہی میں ہے۔ اعتراضوں کی یورش نے اور بھی اردو سے دل برداشتہ کردیا ہے۔ اگر انھوں نے اردو میں سخن رانی ترک کردی تو یہ ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ناممکن ہوگی اردو میں دوسرا اقبال مجھے تو نظر نہیں آتا۔ مینے آجتک سر اقبال کی صورت نہیں دیکھی نہ اُن سے تعارف ہے مگر اُنکے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان پر نکتہ چینی سے اسقدر بددل نہیں ہوتے جتنا اُس بدمذاقی سے جو اشعار کے مطالب تک رسائی سے محروم رہنے کے باوصف خاموش نہیں رہتی، غلط معنی پہناتی، غلط نتیجے نکالتی اور ستم پر ستم یہ کرتی ہے کہ اپنے ہذیانات کو منظر عام پر لاتی ہے۔ اقبال کی خودداری اور شانِ استغنا جواب کی طرف ملتفت نہیں ہوتی اور غلط فہمیاں پھیلتی جاتی ہیں۔ رسالہ شاعر کے صرف ایک نمبر میں تین

مضمون دیکھیے جن میں بالِ جبریل کو نشانہ بنایا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ توجہ کے مستحق حضرتِ سیماب اکبرآبادی کے اعتراض ہیں کیونکہ جناب موصوف خود بھی ایک نامور و گراں پایہ شاعر، "دز" کا بدامروز" سی معرکہ آرا کتاب کے مصنف ہیں۔ ماہرِ فن ہیں، نقاد ہیں، محقق ہیں موصوف کے اعتراضوں کی نوعیت اور وقعت کا تجزیہ ہو جانے کے بعد باقی اعتراضوں کا بھرم خود بخود کھل جائیگا۔

رسالۂ شاعر بابت مئی۔ جون ۱۹۳۵ء۔

اعتراض: ضمیر بغیر اسم۔ خطاب بہ خدا ؎

اُسے صبحِ ازل انکار کی جراءت ہوئی کیونکر

مجھے معلوم کیا؟ وہ راز داں تیرا ہے یا میرا

"اُسے" اشارہ ہے غالباً شیطان کی طرف جو شعر کے مفہوم سے ظاہر ہوتا ہے، لیکن کسی شعر ما قبل میں شیطان کا نام نہ لینا اور شعر "اُسے" سے شروع کر دینا، پھر دوسرے مصرع میں بھی "وہ" لکھکر اسم کا ذکر نہ کرنا ایک غلطی ہے جو غالباً کوئی مبتدی بھی تحریر یا تقریر میں نہیں کر سکتا۔

جواب: جب تسلیم کر لیا گیا کہ شعر کے مفہوم سے ضمیر کا اشارہ ظاہر ہوتا ہے، ضمیر کا منشا پورا ہو گیا۔

کسی کا مشہور مطلع ہے ؎

اک فقط میں ہی نہیں چاہنے والا تیرا ✢ جس نے پیدا کیا وہ بھی تو ہے شیدا تیرا

خدا یا رسول کسی کا نام نہیں لیا گیا مگر مطلب سمجھنے میں ذرا تکلف نہیں ہوتا، جب ایسی صورت ہو تو اسم کی جگہ ضمیر صرف کرنا عینِ فصاحت ہے۔

اعتراض: شعر دیکھئے ؎ عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں

یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر ✢

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے مصرع سے دوسرے کا ربط کیا ہے؟ اگر ڈاکٹر اقبال کا مفہوم یہ ہے کہ حسن اور عشق دونوں کا حجاب میں رہنا مناسب نہیں تو پہلا مصرع اس مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہے۔

جواب: پہلے مصرع کا مفہوم وہی ہے جو حضرتِ معترض سمجھے ہیں "ہے" کی جگہ "ہو" لانے سے اندازِ بیان میں استعجاب کا اضافہ ہو گیا۔

اعتراض: ؎ کیا عشق ایک زندگیِ مستعار کا

کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا

اس شعر میں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ پائدار کسے کہا ہے اور ناپائدار کسے ٹھہرایا ہے؟ پھر "ایک زندگیِ مستعار" کیا معنی؟ زندگی تعدد و حساب سے بالاتر ایک عالم ہے۔ اسکے علاوہ کیا عشق کی دونوں مصرعوں میں تکرار خلافِ فصاحت اور بے محل نہیں ہے؟

جواب: یہ ایک مسلسل نظم کا افتتاحیہ شعر ہے۔ پائدار ذاتِ باری ہے اور ناپائدار انسان ہے۔

"زندگیِ مستعار" عام فقرہ ہے، سر اقبال نے اتنی جدت کی ہے کہ زندگیِ مستعار سے خود انسان کو تعبیر کیا ہے اور اس کی طرف توجہ دلانے کو لفظ ایک کا اضافہ کر دیا۔ "ایک زندگیِ مستعار" یعنی فانی انسان۔ جس طرح انسان کو ایک "مشت خاک" کہتے ہیں۔

کسی لفظ کی تکرار کو خلافِ فصاحت اور بے محل کہنا اسوقت جائز ہے کہ حشو و زائد کی صفت میں آتی ہو۔ اگر نثر میں بھی لفظِ عشق کی تکرار ضروری ثابت ہو تو اعتراض بیجا ہے۔ شعر کی نثر یہ ہوئی:-

ایک زندگیِ مستعار کا عشق کیا، پائدار سے ناپائدار کا عشق کیا۔ کہیں سے لفظِ عشق نکال دیجئے مطلب خبط ہو جائیگا۔

اعتراض: اس شعر میں ؎

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے

جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

پھر وہی مشکل نہ بن جائے خلافِ محاورہ ہے، پھر وہی مشکل نہ پیش آئے کہنا چاہئے۔

جواب: یہ عجیب مشکل ہے کہ مشکل کے ساتھ پیش آئے کے سوا اور کچھ نہ کہو، مشکل رونما نہ ہو، مشکل صورت پذیر نہ ہو۔ مشکل مترتب نہ ہو، کچھ نہ کہو خواہ مشکل پیش نہ آنے سے شاعر کا مافی الضمیر ادا ہو خواہ نہ ادا ہو۔ شاعر کا مدعا یہ ہے کہ میری خاک پریشان ہو کر دل کی صورت نہ اختیار کر لے اور جس مشکل سے نجات پانے کو میں خاک ہو گیا وہی مشکل خاک کے ذروں کے اجتماع

سے دوبارہ مترتب یا پیدا نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ مشکل پیش نہ آنا کہنے میں یہ لطافت اور تنوع باقی نہ رہتا۔ جس طرح شعر نظم کیا گیا ہے مشکل پیش آ ہی نہیں سکتی، جب تک ترتیب نہ پائے، سے نہیں یا متشکل نہ ہو۔

اعتراض: ایک قطعے کے پہلے دو مصرع ملاحظہ فرمائیے ؎

وہی اصل مکاں و لامکاں ہے + مکاں کیا شئے ہے؟ اندازِ بیاں ہے

پہلا مصرع تو غیر درست ہے مگر دوسرے مصرع کے سبب سے پن کی کوئی حد ہی نہیں۔ اول تو مکان و لامکان کے بعد صرف مکان کی تحقیر بے معنی، پھر مکان کی تفسیر و تصریح کرکے اُسے اندازِ بیان سے تعبیر کرنا عجیب قسم کی تفسیر و تعبیر ہے۔ بھلا مکان کو ڈاکٹر اقبال کے سوا "اندازِ بیان" اور کون کہہ سکتا ہے؟

جواب: حضرت معترض نے ابتدا میں لکھ دیا ہے کہ یہ ایک قطعے کے پہلے دو مصرع ملاحظہ فرمائیے قطعے کا مطلب اس کے سب شعروں کو ملا کر واضح ہوتا ہے نہ کہ پہلے دو مصرعوں سے۔

پورا قطعہ یہ ہے ؎

وہی اصل مکان و لامکاں ہے + مکاں کیا شئے ہے؟ اندازِ بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے، کیا بتائے + اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

نتیجہ ظاہر ہے کہ حضرتِ معترض مطلب سمجھنے سے قاصر رہے اقبال نے مکان کی تحقیر نہیں کی بلکہ سوال کیا کہ مکان کیا ہے اور خود ہی جواب دیا کہ اندازِ بیان ہے یعنی اظہارِ خیال کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔ اگر خدا کو اصلِ مکان و لامکان کہنے کے بعد یہ طریقہ اختیار نہ کیا جاتا تو ذاتِ بحت کو محدود ماننا پڑتا۔ اب یہ حاصل ہوا کہ خدا قیدِ مکان سے مستثنیٰ ہے، صرف اُسکی لامکانیت ثابت کرنے کو لفظ مکان استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی خیال کی مزید توضیح دوسرے شعر میں ہے۔ ایک برگزیدہ پیغمبر نے حضرت خضر سے پوچھا کہ تصورِ باری کے ذیل میں مکان کیا شئے ہے؟ وہ بھی فکر میں پڑ گئے اور جواب نہ دے سکے کیونکہ اگر یوں سمجھانا چاہتے ہیں کہ مکان و لامکان میں وہی نسبت ہے جو ماہی و دریا میں ہے تو اُسکی ذات کے مقابل دریا بھی اندازِ بیان کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ سائل پوچھے گا دریا کیا ہے؟ اور سوالوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، ہر جواب تازہ سوال کی بنیاد ہوگا۔

حاصل یہ ہوا کہ اگر وجودِ باری سے انکار کیا جائے تو ہر شئے موہوم و بے بنیاد ہو جاتی ہے، لہٰذا مکان کا تخیل کسی اصل کا محتاج ہے اور وہی اصل خدا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سر اقبال نے بارکلے کا پورا فلسفہ ایک شاعرانہ اضافے کے ساتھ اس قطعے میں نظم کر دیا ہے۔ بارکلے نے وجودِ عالم کو ایک شخص مدرک کے تصور کا مرہون قرار دیکر استدلال کیا۔ اقبال نے خود عالم کو اندازِ بیان کہکے وجودِ باری تعالیٰ ثابت کر دیا۔

اعتراض: فرماتے ہیں ؎ کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو۔

"کدو" غزل میں کبھی استعمال نہیں ہوا، اس کی جگہ کشکول، کچکول، کاسہ، پیالہ وغیرہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ کدو میں جو ایک تنافر لفظی اور ایک ایہام گندہ ہے اُسکی بنا پر ثقہ شعرا اس لفظ کو متروک سمجھتے ہیں۔

جواب: خدا معلوم حضرتِ معترض نے کیوں فرض کر لیا کہ جس نظم میں یہ مصرع واقع ہے وہ نظم نہیں غزل ہے۔ اُردو فارسی کی قید نہیں لگائی۔ فارسی میں بیسیوں ہزار جگہ لفظ کدو غزلوں میں دیکھا ہے۔ اُردو کے قدیم شاعروں نے بھی استعمال کیا ہے مگر لطف یہ ہے کہ حضرت معترض کے اس ارشاد میں کہ لفظ کدو میں تنافر و ایہام گندہ ہے اُنکا جواب اور لفظ کدو کے استعمال کا جواز پنہاں ہے کیونکہ اسکے لانے سے شاعر کا جو منشا تھا یعنی صوفیوں کی تضحیک و تحقیر وہ بخوبی حاصل ہو گیا۔ لفظ کدو (البتہ دال کی تشدید کے ساتھ) سر کے معنی بھی دیتا ہے، "کدو پھوٹ گیا" عام روزمرہ ہے۔ صوفیوں کے کدو خالی ہونے کا یہ مطلب ہوا کہ سفیہ و جاہل و بے مغز ہیں۔

اعتراض: صفحہ ۲۵ پر ایک مصرع ہے۔

اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

پرہیز لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ مذکر بولا اور لکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال اہل زبان نہ سہی شاعری میں مرزا داغ دہلوی کے

شاگرد ہیں اس لئے انہیں فصحائے دہلی کا اتباع کرنا چاہئے۔ مدعا یہ ہے کہ توڑ دیا نہیں آیا تو توڑ دی تک دیا۔ زبان کے معاملے میں یہ اجتہاد کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہوسکتا بلکہ شاعر کے عجزِ طبیعت کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔

جواب: سوال یہ ہے کہ پنجابی کس طرح بولتے ہیں اور اگر وہ لکھنؤ یا دہلی کا تتبع نہیں کرتے تو میرا یا آپ کا کیا اجارہ ہے۔ اور اقبال کو اتباع کی ہدایت کرنا تو آہوئے وحشی کو میکا... کے پکڑنے کی کوشش کرنا ہے۔

اعتراض: فرماتے ہیں ؎

نہ چھین لذتِ آہ سحر گہی مجھ سے ٭ نہ کر نگاہ سے تغافل کو التفات آمیز

دوسرا مصرع سُست ہے جو ذرا سی فکر کے بعد چست ہوسکتا تھا۔ یعنی اسی مصرع کو اگر یوں پڑھیں "نہ کر نگاہ تغافل کو التفات آمیز"

جواب: کیا اچھا ہوتا اگر حضرت معترض یہ بھی غور فرما لیتے کہ اصلاح کے بعد مصرع مہمل ہوگیا یا کچھ معنی رہ گئے۔ نگاہِ تغافل ہر حال میں نگاہ تغافل ہے وہ التفات آمیز کیونکر ہوسکتی ہے۔ اسی ابہام کے بچانے کو اقبال نے مصرع یوں موزوں کیا ؏

نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز

اب تغافل اور التفات دو مختلف کیفیتیں ہیں جنہیں معشوق نگہ کی وساطت سے آمیزش پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ عاشق کو آہِ سحر میں خالص تغافل کی وجہ سے جو لذت ملتی ہے اُسکو التفات کے شمول سے زائل کردے۔ اب اس غریب کی جان کشمکش میں پڑ جائیگی تغافل آہ پر آمادہ کریگا التفات عنان گیر ہوگا۔

اعتراض: صفحہ ۸۲ پر یہ شعر دیکھئے ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے

کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

پہلا مصرع بغیر سوچے سمجھے، ربط و بے ربطی، معنی و مفہوم، غرض کہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر بس کہدیا اور لگا دیا گیا ہے۔ امیرِ کارواں میں خوئے دلنوازی نہیں، اس لئے کوئی کارواں سے ٹوٹا۔ بالکل صحیح۔ مگر کوئی بدگمان حرم سے، کیا معنی؟ یعنی کارواں اور امیر کارواں کا ذکر ہے، حرم کا کیا ذکر؟ امیرِ کارواں میں اگر دلنوازی نہیں تو کارواں اپنی منزل سے بدگمان ہوسکتا ہے۔ حرم، دیر، کلیسا اور کنشت کا تعلق یہاں قطعاً بے معنی ہے، لفظِ منزل رکھ کر اس ان چاروں مقامات کا مفہوم پیدا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حرم لکھکر منزل کا مفہوم پیدا کرنا غلط ہے ٭

جواب: حضرتِ معترض نے رعایت الفاظ کی دُھن میں کہ کارواں ہے تو منزل ضرور آئے یہ غور نہیں فرمایا کہ اقبال نے منزل کے بجائے لفظ حرم لاکر اس امر کا تعین کر دیا کہ انکی مراد صرف کاروانِ اسلام سے ہے۔ اعتراض کا جواب تو ہوگیا لیکن دل چاہتا ہے کہ اس شعر کا مفہوم بھی بیان کر دیا جائے تاکہ اقبال کا پیام شاید کسی دل میں جگہ کرلے اور اسلام میں جو فرقہ وارانہ اختلافات خطرناک صورت اختیار کر رہے ہیں مٹ نہ جائیں تو کم سے کم انکی رفتار دھیمی پڑ جائے۔ شعر میں لفظ کارواں کل جماعت اسلام کا مرادف ہے، حرم اپنے معمولی معنی دیتا ہے، کعبہ، امیر کارواں خدا یا نائب خدا ہمارے رسول کریم صلعم ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہ نوبت پہونچی ہے، ایمان اسقدر کمزور ہوگیا ہے، ایقان سے اتنے دور ہوگئے ہیں کہ جہاں کسی کی منہ مانگی مراد نہ ملی یا کوئی مصیبت یا مشکل پیش آئی اور وہ کارواں سے ٹوٹا (منحرف ہوا)، کسی نے خود حرم سے جو مرکزِ اسلام ہے بدگمانی کا اظہار کیا اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی، حج کو بیکار اور اجماع کو بے سود سمجھا، حالانکہ اسلام کی قوت و شوکت کا راز اسی اجماع و اتحاد و اخوت میں مضمر ہے۔ یہی جماعتِ اسلام کا شیرازہ بند ہے، یہی سفر، یہی پابندیاں مسلمانوں کو سادہ زندگی بسر کرنے اور سختیاں جھیلنے کا خوگر بناتی تھیں۔ سب سے زیادہ قابل افسوس یہ بات ہے کہ اس انحراف و بدگمانی کا ذمہ دار امیرِ کارواں کو بناتے اور اُسکے سر یہ الزام تھوپتے ہیں کہ اُس میں خوئے دلنوازی نہیں ہے، حالانکہ اُسکی ظاہری عدم التفاتی کا راز انکے جذبۂ ایمانی کے ضعف میں پنہاں ہے ورنہ مبتلا کو استواری ایمان کا امتحان سمجھ کر لبیک کہتے اور ہر مصیبت ہر دشواری کا سینہ تان کر مردانہ وار مقابلہ کرتے انھیں چاہئے کہ ؏ حدی را تیز تر

میخواں جو عمل راگراں بینی بر عمل پیرا ہوں اسکے عوض کوئی قافلے کو چھوڑ کے پیچھے پاؤں پلٹتا ہے، کوئی خود اسلام کو تقویم پارینہ اور یہ موجودہ ضروریات پوری کرنے، سیاسی و اقتصادی گتھیاں سلجھانے میں ناکافی سمجھتا ہے حالانکہ ادبار کا سبب یہ ہے کہ ہم سچے مسلمان نہیں رہے۔

اعتراض: صفحہ ۳۴ پر اس شعر میں ؎

مت سے ہی آوارۂ افلاک مرا فکر + کر دے اسے اب چاند کی غاروں میں نظر بند

فکر کو مذکر اور غار کو مؤنث خلاف مذہب فصحا نظم کیا گیا ہے۔ فکر مؤنث ہے اور غار مذکر ہے، کیا ڈاکٹر اقبال کو ابھی معمولی الفاظ کی تانیث و تذکیر کا بھی علم نہیں؟

جواب: جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں نزاع لفظی تذکیر و تانیث کی بحث اقبال کے کلام سے متعلق بیکار ہے۔ حضرت معترض کا ادعا ہے کہ فکر بلا استثنائے اختلاف مؤنث ہے، لکھنؤ میں ایسا ہی ہے مگر دہلی والے اب بھی فکر کو مذکر بولتے ہیں۔ غاروں کی تانیث بہ غلطی کتابت ہے لہذا ناقابل التفات ہے۔

دوسرا مصرع خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ پہلے یہ عرض کر دوں کہ آج کل مسافرت اور بے اطمینانی کا عالم ہے۔ کتابیں حوالے کو موجود نہیں، حافظے کی مدد سے لکھتا ہوں اگر واقعات میں کچھ اختلاف نکلے تو معاف کیا جاؤں؛ البتہ نفس مطلب کی صحت کا ذمہ لیتا ہوں۔ غالباً ۱۸۶۶ء میں ایک جرمن سائنسداں (زیگ (؟)) نے دریافت کیا کہ چاند کی سطح روشن نہیں ہے بلکہ اس میں غار ہیں اُن غاروں سے روشنی نکلتی، پھیلتی اور کل سطح کو منور کرتی ہے۔

اب اقبال کا شعر پڑھئے ؎

مت سے ہی آوارۂ افلاک مرا فکر + کر دے اسے اب چاند کی غاروں میں نظر بند

تاکہ وہاں سے اک لمعۂ نور بنکر نکل آئے اور تاریکیٔ شب (لوگوں کی جہالت) میں دور ہو جائے۔ آپ نے دیکھا؟ اقبال ہماری زبان کے ذخیرۂ علم میں کیا کیا اضافہ کر رہے ہیں۔

اعتراض: ذرا اس شعر کی عروضی شان دیکھئے ؎

یوں داد سخن مجکو دیتے ہیں عراق و پارس + یہ کافر ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز

پہلا مصرع قید بحر و وزن سے خارج ہے اور کچھ ایسا مبہم و مہمل ہے کہ باوجود کوشش اُسے صحیح بھی نہیں کیا جا سکتا یعنی "عراق و پارس" کسی طرح بھی اس مصرع میں نظم نہیں کئے جا سکتے۔

جواب: اوپر اپنی مجبوریوں کا اظہار کر چکا ہوں۔ کوئی لغت کی کتاب ہمراہ نہیں۔ نہ دستیاب ہو سکتی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ شعر میں لفظ پارس میں ر متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے اور پارس بروزن یافت ہے نہ کہ بروزن آمد۔ اگر میری عرضداشت بر شئے لغت صحیح ہے تو مصرع قواعد عروض کے مطابق اور موزوں ہے ورنہ حافظ کے اس مصرع کو بھی جس کی بالکل یہی صورت ہے ناموزوں کہئے ؏ بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت۔

اصل میں مصرع کو "نخواہی یا" پر ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ بدہ ساقی (مفاعیلن) مئے باقی (مفاعیلن) کہ در جنت (مفاعیلن) نخواہی یا (مفاعیلن)، مگر حروف مکتوبی غیر ملفوظی کی شق میں لاکر یافت تقطیع کے لئے یاف رہ گیا اور مفاعیلن مفاعیلان ہو گیا جو ہر طرح جائز ہے۔

اسی طرح اقبال کے مصرع میں جس کی بحر مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن ہے مندرجہ بالا عمل سے مفاعیلن مفاعیلان ہو گیا مگر یہ سب کچھ اُسی صورت میں درست ہے کہ پارس میں ر ساکن ہو اگر متحرک ہے تو بحث ختم ہو جاتی ہے اور مصرع ناموزوں ماننا پڑیگا۔ غالباً کتب لغات میں پارس کے دونوں تلفظ درج ہیں یعنی چاہے پارس بروزن آمد کہو چاہے پارس بروزن یافت لاؤ۔

اعتراض: "خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں" اس مصرع میں "ہیں" کی جگہ "ہے" عیب الکاتب سے تعبیر کر کے ڈاکٹر صاحب کو اس الزام سے بری کیا جا سکتا ہے۔

جواب: میں بادب عرض کرونگا کہ جسے ذرا بھی فصاحت سے مس ہے "خودی کی موت ہیں اندیشہ ہائے گوناگوں" نہ بولے گا کیونکہ زور لفظ موت پر ہے اور موت واحد ہے۔

اعتراض ؎ برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح + اور

چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن +
رکھ گئی اور چمکاتی ہے دو مختلف زمانے ایک ہی شعر میں نظم ہوگئے ہیں۔

جواب: ایک ہی شعر میں دو زمانے نظم ہونا کوئی گناہ نہیں اور یہاں تو اختلافِ زمان نے معنویت میں اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ حقیقت سے مطابق کردیا کیونکہ برگِ گل پر شبنم کے ورود اور سورج کی کرن پڑنے میں یقیناً فاصلۂ زمانی ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ برگِ گل پر شبنم کا موتی آیا اور اُسکو فوراً سورج کی کرن نے چمکایا۔ یہ صداقت تعریف کی مستحق ہے نہ کہ اعتراض کی آماجگاہ بنائی جائے۔

اعتراض: ؎ اک اضطرابِ مسلسل غیاب ہو کہ حضور + میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں۔

غیاب میں غرابت ہے اور شعر مہمل ہے، جو مفہوم و مقصدِ شاعر کے اظہار سے بے نیاز ہے۔

جواب: یہ تسلیم کہ غیاب میں غرابت ہے اور ادائے مطالب کی اور صورتیں بھی ممکن تھیں مگر شعر مہمل ہرگز نہیں ہے، شاعر کہتا ہے کہ دوری ہو یا حضوری (معشوق یا خدا کی) مجھ پر ایک اضطرابِ مسلسل طاری رہتا ہے۔ میری داستان صرف اسقدر ہے، ظاہر ہے کہ جب اضطرابِ مسلسل پوری داستان ہے تو اسکو دراز نہیں کہہ سکتے۔ مگر یہی داستان دراز ہو جاتی ہے اگر اضطرابِ مسلسل کی شرح کیجائے اور اُسکے اسباب بتائے جائیں

اعتراضات مندرجۂ رسالہ شاعر بابت ماہ ستمبر ۳۵ء

اعتراض: ؎ گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند + میری فغاں سے رستخیز کعبۂ و سومنات میں +

اس شعر کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ "اگرچہ میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند (معمور) ہے لیکن میری فغاں سے کعبۂ و دیر میں قیامت برپا ہے" جستجو نقشبند دیر و حرم ہے اور جستجو کرنے والے کی فغاں قیامت دیر و حرم ہے۔ اس مفہوم میں کوئی ربط و ہم آہنگی نظر نہیں آتی اور اگرچہ کے مقابلے میں لفظ صلہ نہ لانے سے شعر کی ترکیب میں جو اختلال پیدا ہوتا ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں اگر دو مصرعوں میں دو مقصد ظاہر کرنے تھے تو پھر یہ شعر اس طرح چست کیا جاسکتا تھا میرا دماغ جستجو دیر و حرم کا نقشبند + میری فغاں سے رستخیز کعبۂ و سومنات میں

جواب: بات یہ ہے کہ جب شعر کا مطلب سمجھ میں نہ آئے تو اعتراض سے خاموشی بہتر ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ میری ہی تلاش حقیقت کا نتیجہ ہے کہ دیر و حرم کی بنیا دپڑی، معبد تعمیر ہوئے مگر سخت حیرت ہے کہ میں اظہارِ نارسائی میں جب فغاں کرتا ہوں اور اس طرح ظاہر کرتا ہوں کہ معرفت کی آخری منزل دیر یا حرم نہیں ہے، آگے بڑھو تو ان مقامات میں ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے اور وہاں کے ساکن کہتے ہیں کہ ہمارے معتقدات میں شبہہ کیوں ڈالتا ہے، جو کچھ پائے گئے اُسی میں مگن رہنے دے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ یہ بھی صورت سے معنی کی طرف پھریں مگر نہیں مانتے۔

حضرت معترض کی اصلاح کے متعلق کیا کہا جائے۔ جہاں جستجو اور تگ و دو تھی اب وہاں دماغ بیٹھا ہوا کاغذ پر گل بوٹے بنا رہا ہے!

اعتراض: ؎
محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا + مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا
یہ حرفِ شیریں میں "یہ" کا مشارٌ الیہ کون ہے؟ کون سا حرف شیریں؟ اسکے علاوہ شعر مفہوم سے قطعاً آزاد ہے۔

جواب: شعر سمجھ میں نہ آئے یہ اور بات ہے ورنہ مطلب صاف ہے، یہ کا مشارٌ الیہ کھلا کھلا پہلے مصرع میں لفظ قرآن ہے۔

یہ شعر ایک مسلسل نظم کا جزو ہے جو بالِ جبریل کے صفحے پر درج ہے۔ نظم کا خاکہ یہ ہے کہ شاعر زوالِ آدم کے مسئلے پر غور کرتا ہے اور اپنے شکوک خلاقِ عالم کے حضور میں پیش کرتا ہے۔ سوچتا ہے کہ ستاروں کی گردش خلاف ہے ؎

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا + مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

عرض کرتا ہے کہ ستارے بھی تیرے، آسمان بھی تیرا، جہان بھی تیرا، رکھ یا مٹا۔ مجھے امین اور خلیفہ بنا کر زمین پر کیوں بھیجا۔ اور بھیجا تھا تو بھیا

کمزور ونا چار کیوں بنایا۔ پھر دیکھتا ہے کہ وہ مردانِ عارف و باصفا نہیں رہ گئے جنکے نعرہائے شوق فضائے قدس و عالمِ لاہوت میں ہنگامہ برپا کرتے تھے، جنکے مقابلے میں کروبیوں کی تسبیح و تہلیل ماند پڑ جاتی تھی۔ عرض کرتا ہے ۔ ؎

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی + خطا کسکی ہے یارب! لامکاں تیرا ہے یا میرا

سخت ظلم ہوگا اگر دوسرے مصرع کے استفہام سے یہ مطلب نکالا جائے کہ معاذ اللہ خدا کو خطاوار ٹھہرایا جاتا ہے، صرف یہ سمجھنا چاہیئے کہ قائل کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خطا کا تعین کسکے ساتھ کرے۔

شیطان یا عزازیل کی نافرمانی یاد آتی ہے خیال ہوتا ہے کہ خرابی کی ابتدا وہیں سے ہوئی، خیر و شر کی بنیاد پڑی۔ فلسفیانہ دماغ اسپر قانع نہیں ہوتا اور پوچھتا ہے کہ عزازیل کو سجدۂ آدم سے انکار کی جرأت ہی کیونکر ہوئی جب حکمِ خداوندی ہو چکا تھا یہ راز سمجھ میں نہیں آتا۔ ؎

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر + مجھے معلوم کیا؟ وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

خیر جو کچھ ہونا تھا ہوا۔ ختم المرسلین آئے رحمت بنکر مبعوث ہوئے۔ فسا کو مٹ جانا تھا مگر قائم ہے۔ وہ نہیں رہے مگر اُنکے ذریعہ سے خدا کا کلام شیریں، رموزِ الٰہی کا ترجمان قرآن ہم تک پہونچا اور ہم میں موجود ہے لیکن انسان پھر بھی ظلوم و جہول ہے اس کی فطرت نہیں بدلی، یہ کیا معمّا ہے ؎

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا + مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

آخر میں کہتے ہیں کہ اے خدا انسان ہی سے جہاں کی رونق ہے اگر اس احسنِ تقویم کو مٹا دینا چاہتا ہے تو مٹا دے مگر اس طرح کسکا زیاں ہوگا؟ ؎

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن + زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

اعتراض: ؎

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل + آپ بھی شرمسار ہو، مجکو بھی شرمسار کر

ردیف کر صیغۂ امر ہے، امر کا تعلق ہمیشہ زمانۂ حال سے ہوتا ہے، پھر جب دفترِ عمل پیش ہو کے ساتھ امر کا تعلق کیونکر ہو سکتا ہے کہنا یوں چاہیئے تھا کہ جب دفترِ عمل روزِ حساب پیش ہو تو خود بھی شرمسار ہونا اور مجھے بھی شرمسار کرنا مگر کہہ گئے یوں۔ شعر ذرا سے غور کے بعد ہر پہلو سے اس طرح صحیح ہو سکتا تھا ؎

حشر میں دفترِ عمل پیش ہوا اسکو دیکھکر + آپ بھی شرمسار ہو مجکو بھی شرمسار کر

لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ مخاطب صحیح اس شعر میں کون ہے؟ محبوبِ مجازی یا خدا؟ اسی غزل کے پچھلے ۳ شعر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا مخاطب خدا ہے۔ تو پھر خدا سے یہ کہنا کہ آپ بھی شرمسار ہو عبودیت کا کتنا خوفناک تجاوز ہے!

جواب: یہ دعویٰ ہی بے دلیل ہے کہ امر کا تعلق ہمیشہ زمانۂ حال سے ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص دوسرے سے کوئی گزشتہ واقعہ کہتا ہے وہ شخص جواب دیتا ہے "تجھ سے کسنے کہا تھا کہ دخل در معقولات دے" کیا یہاں دے کی جگہ دینا کہینگے؟ کوئی فعل سرزد نہیں ہوا ہے مگر کہتے ہیں "کر تو کر نہیں تو خدا کے غضب سے ڈر" کہیں زمانۂ حال کا پتہ بھی نہیں۔ حضرت معترض کی اصلاح نے تو شعر کو غارت ہی کر دیا۔ حشر ہوا نہیں اور ہے، دفترِ عمل پیش نہیں ہوا اور پیش ہے۔ پیش ہونے میں دیکھنے کا مفہوم شامل ہے، مگر پیش ہے اور دیکھکر دونوں ملاتے ہیں۔ روزِ حساب اور دفترِ عمل میں جو عمدہ ربط تھا فنا ہو گیا۔ دونوں مصرعوں کی ردیف "کر" ہو گئی جو مسلمہ طور پر اصولِ فصاحت کے خلاف ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ خدا کو شرمسار ہونے کی صلاح دینا عبودیت سے خوفناک تجاوز ہے۔ اگر شعرِ ماقبل کے ساتھ اس شعر کو پڑھیئے تو اقبال کی بغاوت اسقدر سنگین نہیں رہتی۔ ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں + کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل + آپ بھی شرمسار ہو، مجکو بھی شرمسار کر

"انی جاعل فی الارض خلیفہ" مخاطب اور حشر کی بازپرس۔ ذرا سی لغزش اور بہشت سے محروم۔ اشعار کا مفہوم واضح کیا جائے اور انکے فلسفیانہ نکات بیان ہوں تو شاید میں اور اقبال دونوں کافر قرار پائیں ابھی تو صرف اُنھیں پر عبودیت سے متجاوز ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔

اعتراض ؎ دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر + حریمِ کبریا سے آشنا کر

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے + اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

پہلے بیت میں خطاب انسان سے ہے اور دوسرے میں خدا سے' ایک ہی رباعی (قطعہ) میں یہ تضاد تخاطب فنی اعتبار سے ناروا' ناجائز اور قابلِ اعتراض ہے۔

جواب: جناب معترض لفظِ کبریا کے معنی نہیں سمجھے۔ خدا کے علاوہ اسکے اور بھی معنی ہیں اور یادداشت سے کہتا ہوں (لغت موجود نہیں) کہ اس سے جلالتِ استغنا کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔ اسی سے عدم واقفیت کی بنا پر حضرت معترض سے تسامح ہوا ورنہ قطعہ میں "تضاد تخاطب" نہیں ہے۔

اعتراض: ؎

یہ مشتِ خاک' یہ صرصر' یہ وسعتِ افلاک + کرم ہے یا کہ ستم تیری لذتِ ایجاد

دوسرے مصرع میں "یا کہ" خلاف فصاحت ہے اور "لذت ایجاد" خشک' ناگندہ بے مزہ۔ شعر یوں ہونا چاہئے ؎

یہ مشتِ خاک' یہ صرصر' یہ وسعتِ افلاک + کرم ہے یا ہے ستم تیرا شیوۂ ایجاد

جواب: مجھے حضرت معترض سے صرف یہانتک اتفاق ہے کہ لذت ایجاد مبہم ترکیب ہے، خدا کو ایجاد میں لذت ملنا اور اُسکی لذت کو کرم یا ستم سمجھنا بعید از قیاس باتیں ہیں۔ مگر اصلاح میں لذت کی جگہ شیوہ خود حضرت معترض کی نقل کردہ مثل کا مصداق ہے۔ ایجاد جب شیوہ ہو گیا تو پھر کرم و ستم کے مابین اشتباہ کا پہلو نہیں رہ جاتا۔ سیاق عبارت سے کسی ایسی لفظ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس سے ایجاد میں انہماک کا مفہوم پیدا ہو۔ میں ایک لفظ تجویز کر سکتا ہوں مگر لہو لگا کے شہیدوں میں کیوں داخل ہوں۔

اعتراض: اسی طرح اس قطعے میں "نورِ بصیرت" بے محل ہے ؎

جوانوں کو مری آہ سحر دے + پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے + مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اگر چوتھا مصرع یوں ہوتا تو بہتر تھا ع

مرے ذوقِ طلب کو عام کر دے

جواب: مجھے حضرت معترض سے اختلاف ہے۔ ذوقِ طلب پھر بھی صرف ذوق ہے جس میں کامرانی کا پہلو غائب ہے۔ اقبال کو نورِ بصیرت حاصل ہے اور دعا کرتے ہیں کہ قوم بھر میں عام ہو جائے۔

اعتراض: ؎

وہ عشق جسکی شمع بجھا دے اجل کی پھونک + اُس میں مزہ نہیں تپش و انتظار کا

پہلا مصرع سُست ہے، اسے اس طرح چست کر دینا چاہئے تھا، "وہ شمع عشق جسکو بجھا دے اجل کی پھونک" بار بار کی کی کیا انداز کلام ہے۔

جواب: حضرت معترض نے سخت دھوکا کھایا۔ یہ نہ سوچے کہ شمع عشق کہنے کے بعد دوسرے مصرع میں "اُس" کا مشارٌالیہ بجائے عشق شمع ہو جائیگی اور شمع کے متعلق کہنا کہ "اُس میں مزہ نہیں تپش و انتظار کا" بے تکی سی بات ہے۔ علاوہ بریں "شمع عشق" میں دو شین اور دو عین مع قاف اس بری طرح جمع ہو گئے ہیں کہ "کی کی" کی تکرار سے بدتر ہیں اگر اس تکرار میں تنافر مان بھی لیا جائے جو حضرت معترض کا وہم ہی وہم ہے' دراصل تنافر کا شائبہ بھی نہیں۔ دونوں "کی" نہ صرف ایک دوسرے سے فاصلے پر ہیں بلکہ انکی ی دبکے نکلتی ہے اور روانی میں مخل نہیں ہوتی۔

اعتراض: ؎

لا پھر اکبار وہی بادہ و جام اے ساقی + ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی

"ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام" محاورۂ اردو نہیں، پنجابی دستورِ گفتگو ہے۔ "مجھے میرا" فصحا نہیں بولتے، یہ مصرع یوں ہونا چاہئے ع "نظر آ جائے مجھے اپنا مقام اے ساقی"

جواب: منظور کہ اقبال کا مصرع دلکش نہیں مگر اصلاح تو عجیب و غریب ہے۔ "نظر آ جائے مجھے اپنا مقام اے ساقی"! اچھی اچھی! اس گندگی پر مزید قباحت یہ ہے کہ اصلاح نے شعر کو مہمل کر دیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ بادہ و جام کا مل جانا اپنے منصب قدیم پر بحال ہو جانا ہے، منصبِ قدیم کا ہاتھ آ جانا ہے مگر مقام نظر آ جانا تو محض دور سے دیکھنا اور ترسنا ہے یا اپنے مرتبے سے واقف ہونا ہے، جو مطلب بھی لیجئے شعر کا ڈھانچا کاواک ہی

رہتا ہے۔

"مجھے میرا" کے باب میں فیصلۂ ناطق کر دینا کہ فصحا نہیں بولتے دانشمندی سے دور ہے۔ مثلاً ایک مصرع یوں ہے ؎ پھر عنایت ہو مجھے میرا مقام اے ساقی۔ دوسرا مصرع یوں ہے ؎ پھر عنایت ہو مجھے اپنا مقام اے ساقی دونوں مصرعوں کا مفہوم علیحدہ علیحدہ ہے۔ پہلے مصرع میں قائل اپنا مقام دوبارہ مانگتا ہے اور دوسرے مصرع کا یہ مطلب ہوگا کہ ساقی سے اس کا مقام مانگتا ہے۔ اگر اس مصرع کو اقبال کے پہلے مصرع سے ربط دیدیجئے تو یوں بھی درست ہوگا کہ ؎ پھر عنایت ہو مجھے میرا مقام اے ساقی۔ اسے اصلاح نہ سمجھا جائے بلکہ حضرت معترض کے اس قول کی تردید ہے کہ فصحا "مجھے میرا" نہیں بولتے۔

اعتراض :—

عشق کی تیغ جگردار اڑا لی کس نے + علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

اوّل تو ساقی سے تیغ و نیام کے متعلق گفتگو ہی بے جوڑ ہے۔ دوسرے تیغ جگردار کی ترکیب غلط ہے، جگردار کی صحت میں بھی ہمیں کلام ہے۔ "بے جگر" تو سنا ہے مگر جری یا مضبوط کے معنی میں جگردار کسی سے نہیں سنا۔ تیغ کو جوہر دار کہتے ہیں جگردار نہیں کہتے یہ ترکیب ضعفِ تالیف کی تعریف میں آتی ہے۔

جواب: ساقی کے معنی ہیں تقسیم کرنے والا۔ شراب ہو یا اور کوئی شے ہو۔ خدا کو ساقیٔ بزم ازل کہتے ہیں۔ حضرت علیؑ و ساقیٔ کوثر کہتے ہیں۔ یہاں عشق کے ساقی سے خطاب ہے اور اسے بے جوڑ گفتگو کہنا غلط ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تیغ کی صفت جگر دار بھی آئی ہے، کتابیں پاس نہ ہونے سے مثال پیش نہیں کر سکتا مگر تیغ جگردار اس تیغ کو کہتے ہیں جو ایک ہی وار میں سر سے جگر تک چاک کر دے۔ کلیجے میں اتر جائے۔ جگردار کے معنی جری یا مضبوط سمجھنا افسوسناک غلطی ہے اور اس سے زیادہ افسوسناک امر "بے جگر" کو جری یا مضبوط کا مرادف جاننا ہے "بے جگر" کے معنی ہیں بودا، بزدل، کم ہمت۔ جری کے معنی میں پر جگر آتا ہے۔

(کوئی اللہ کا بندہ کسی معتبر کتاب لغت یا بہار عجم کے حوالے سے میری تائید یا تردید کر دے۔ مضمون روکتا ہوں تو، مدیر صاحب روٹھے جاتے ہیں اور یہ سانحہ میرے لئے قیامت سے کم نہ ہوگا، عجب خلفشار میں مبتلا ہوں)۔

اعتراض :—

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات + ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

دوسرے مصرع میں سخن کی تکرار غیر مستحسن اور کریہہ ہے اور مصرع سے کا مخنان نظر آتا ہے، سخن کو بغیر دہرائے بھی مصرع یوں کہا جا سکتا تھا ؎ جو نہ روشن ہو تو ہے مرگ دوام اے ساقی۔

جواب: اصلاح نے شعر کا مطلب مبہم کر دیا۔ کیا مرگ دوام ہے؟ سینے کا نہ روشن ہونا، یا سخن؟ اسی اغلاق کے بچانے کو اقبال نے لفظ سخن کی تکرار کو جائز رکھا مگر "ہے" کے حذف سے مصرع ناقص اور کمزور ہوگیا۔

"شاعر" میں "باقی" درج ہے یعنی ابھی اعتراضوں کی قسط باقی ہے مگر میرا مضمون ختم سمجھئے۔

بالِ جبریل کا ایک ایک شعر حقائق سے لبریز اور درسِ عمل ہے، خودداری کی تعلیم ہے۔ اقبال کی پیشنگوئی یقیناً پوری ہو کے رہیگی ؎

الٹ جائینگی تدبیریں بدل جائینگی تقدیریں + حقیقت ہے نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

[redacted]

دنیا سے بیزاری

(۱)

نشترِ غم کی خلش، پیکانِ حرماں کی کھٹک / مجھ سا پامالِ جفائے آسماں کوئی نہ ہو
آہ، میں وہ آشیاں برباد ہوں جس کے لئے / شہر و گلشن میں کہیں جائے اماں کوئی نہ ہو
رحم اس بیکس پہ فرماتے ہیں ابنائے زماں / برگ و سازِ زندگی جس کے یہاں کوئی نہ ہو
لطف یہ مجھ پر بھی ہوتا ہے مگر اس شان سے / جس سے بدتر صورتِ جورِ نہاں کوئی نہ ہو
یا الٰہی ایسا اک گوشہ کہیں ملتا جہاں / راز جو کوئی نہ ہو اور رازداں کوئی نہ ہو
جی میں آتا ہے کہ اب اس تنگنائے دہر میں / رہیئے بس ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

(۲)

بارِ منت سے گراں تر تو نہیں بارِ الم / شوقِ گل میں خار سے الجھاؤں دامن کس لئے
اقربا دادِ جراحت دیں گے اس امید میں / ہر نفس کے ساتھ کیوں انسان خونِ دل پیئے
کی نہ بھولے سے بھی پروائے رفیق و رہنما / اہلِ دل نے زندگی کے راستے یوں طے کئے
کنجِ استغنائے تنہائی مجھے بھی ہے پسند / ظلمِ راہ و رسمِ ہمدردی سے بچنے کے لئے
محض ویرانی میں اب ڈھونڈھوں گا میں تسکینِ دل / کون یوں ہنگامہ زارِ دہر میں مضطر جیئے
اس کو وحشت ہی کوئی سمجھے مگر دل میں یہ ہے / بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

(۳)

بس زمیں پر میں ہوں اور ہو میرے سر پر آسماں / یہ فضا شاید ہو روحِ مضطرب کو سازگار
یوں بسر ہو جتنی باقی رہ گئی ہے زندگی / کوئی مونس ہو نہ ہمدم ہو نہ کوئی غمگسار
چارہ سازی کیسی، کوئی پوچھنے والا نہ ہو / یعنی دردِ دل نہ ہو احسانِ درماں سے دوچار
تابشِ داغِ ستم جب نور پھیلانے لگے / ظلمتِ شامِ الم بن جائے اس کی پردہ دار
کوئی پہلو میں نہ ہو اور کوئی بالیں پر نہ ہو / کس مپرسی پہ ہو مرگ و زندگی کا انحصار
ہو اگر صحت تو کوئی تہنیت فرما نہ ہو / پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مانی۔ جائسی

دیہات کا کنواں

(از خان بہادر علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری ڈائریکٹر انفارمیشن بیورو، شملہ)

جو لوگ شہر کی گہما گہمی اور مصروفیتوں میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ دیہات کی سادہ، فطری اور مطمئن زندگی کی خیر تخیلی تصویر بھی قیاس میں نہیں لاسکتے۔ اسوقت چونکہ دیہاتی فلاح و ترقی کیطرف حکومت نے خاص طور پر توجہ کی ہے اور ملکی سیاسیات کا رخ اس بنا پر دیہاتوں کی طرف جھک گیا ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ دیہاتی معاشرت کا صحیح نقشہ شہر والوں کو سمجھا دیا جائے اور اسلئے میں آج میں اس زندگی کا ایک ممتاز پہلو واضح کرنا چاہتا ہوں، جس سے دیگر مصروفیتیں قیاس میں لائی جاسکتی ہیں، اور آئندہ انشاءاللہ تعالیٰ بشرطِ فرصت دیہاتی معاشرت کے دوسرے پہلو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کرونگا۔

دیہات میں جہاں پانی کے نل اور آبپاشی کی نہریں نہیں ہیں کنوئیں کو ایک اہم ادارے کی حیثیت حاصل ہے جسے بڑی حد تک دیہات کی معاشی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز کہا جاسکتا ہے۔ یہی کنواں اہل دیہہ کے کھیتوں کی آبیاری کرتا ہے، اور انہیں نہانے دھونے اور پینے کے لئے پانی مہیا کرتا ہے، اور یہ چیزیں چونکہ زندگی کی اہم ترین ضروریات میں سے ہیں، اسلئے گاؤں کے ہر طبقے اور ہر عمر و جنس کے انسان کو کنوئیں پر آنا پڑتا ہے، اور جس کنوئیں کا پانی شیریں ہو وہاں بسا اوقات مردوں، عورتوں، بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کا قرار واقعی مجمع رہنا لازمی ہے۔ چنانچہ حضرت سعدی نے شیراز میں ہی بیٹھے بیٹھے یہی نقشہ دیکھا تھا اور فرما گئے ہیں ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں
مردم و مور و مرغ گرد آیند

دیہاتی کنوئیں کی یہ قدرتی کشش ایک طرف تو کاشتکار کو کھینچ لاتی ہے جو اپنے بیوی بچوں سمیت ایک ایک چرسہ پانی کھینچتا ہے اور نالیاں بنا کر اپنے کھیت میں پہونچاتا ہے تو دوسری طرف پینے کا پانی بھر کر لیجانے والی عورتیں سر پر گھڑے رکھے ہوئے اور برتن صاف کرتی ہوئی عورتیں ریت لگا لگا کر ان برتنوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے، اور غسل کرنے والے مرد لٹیوں میں بھر بھر کر پانی سر پر ڈالتے ہوئے اور راہگیر مسافر پیاس بجھاتے ہوئے اور سفر کی تکان کو دور کرنے کے لئے کھیت کی مینڈ پر بیٹھکر آرام کرتے ہوئے، اور کھیتوں کی نگہبانی کرنے والے حقے کے کش لگاتے ہوئے اور آس پاس سے گزرنے والوں سے خوش گپیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو آبپاشی کرنے والا کاشتکار رستہ کھینچنے والے بیلوں کو فراز سے نشیب کی طرف ہانکتے ہوئے دیہاتی ترنم کے ساتھ گیت گا رہا ہے، اور کبھی کبھی بیلوں کو بار دینے کے لئے خود بھی اچک کر رستے پر بیٹھ جاتا ہے تو دوسری طرف چرسے کو کھینچکر پانی میں پانی گرانے والا آدمی اسی ترنم آمیز لہجے میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد معین وقفوں کے ساتھ "رام لایو" کی صدا بلند کر رہا ہے۔ ایک طرف دیہات کی تندرست اور رچھ ریتلی نوجوان لڑکیاں رنگ برنگ کپڑوں میں ملبوس کودتی پھاندتی کلیلیں کرتی اور سہیلیوں سے فلک شگاف قہقہوں کے ساتھ مذاق کرتی ہوئی نظر آتی ہیں تو دوسری طرف مضبوط ہاتھ پیر والے نوجوان لڑکے ایک دوسرے کو چھیڑتے اور چھلانگیں مار مار کر آس پاس کے کھیتوں کی کیاریوں میں دوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف ایک سنجیدہ مرد یا عورت نہایت ہی انہماک کے ساتھ کھیت کی کیاریوں میں پانی کی رفتار دیکھ رہی ہے، اور گیلی مٹی ادھر سے اٹھا کر ادھر رکھتی ہے تاکہ ایک کیاری پر ہو جانے کے بعد پانی دوسری کیاری کی طرف چلا جائے تو دوسری طرف اسی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ نالی کے کنارے بیٹھی ہوئی

ایک عورت گھر کے برتنوں کو پوری قوت سے رگڑ رگڑ کر چمکا رہی ہے۔ کچھ لوگ گردنوں میں دھاگے ڈالے ہوئے کنوئیں کے پاس نہا رہے ہیں اور پانی جسم پر پڑنے سے جو کپکپی پیدا ہوتی ہے، اس کے اظہار کو روکنے کے لئے سنسکرت اور ہندی کے الفاظ ایک خاص لہجے میں بڑبڑا رہے ہیں۔ دوسری طرف کچھ عمر رسیدہ عورتیں دیہاتی اور خانگی سیاسیات پر بحث کر رہی ہیں اور کسی بات پر اختلاف ہو جاتا ہے تو عریاں گالیوں کے وہ لغات استعمال کرتی ہیں جنہیں سنکر شہر کے لوگ لرزہ براندام ہو جائیں۔ کچھ تھکے ماندے مسافر پانی پینے اور سستانے کے بہانے سے کنوئیں کے پاس بیٹھ گئے ہیں اور سفری صعوبات، دھوپ کی شدت، وقت کی خرابی، فصل کی حالت بیان کرنے کے بعد اپنے اپنے گاؤں کا حال کہہ رہے ہیں اور اس سلسلے میں تھوڑی بہت مقامی اور غیر مقامی داخلی اور خارجی سیاسیات اور رانو کبھی مابعد الطبیعیات کی بحث بھی ہو جاتی ہے جو شہر والے سنیں تو ہکا بکا رہ جائیں۔ اس متنوع اجتماع میں بڑے نوجوانوں کو ڈانٹ پھٹکار کرتے ہوئے اور بچے بڑوں کی نقل کرتے ہوئے اور آپس میں کھیلتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ اور باہمی گفتگو میں خانہ جنگیوں کے تذکرے اور ایک دوسرے کی عیب جوئی کے ساتھ بہت سے خانگی معاملات اور مذہبی اور قانونی مسائل کے فیصلے بھی ہو جاتے ہیں۔

لیکن یہ تمام باتیں اسقدر سہل انگاری کی رفتار سے ہوتی ہیں اور انکا دائرۂ تخیل اتنا تنگ ہوتا ہے کہ زمانۂ حال کے تمدن کی ذرا سی بھی جھلک بھی نظر نہیں آتی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیہات میں تمدن اور معاشرت کا آج بھی وہی معیار ہے جو مہا بھارت کے زمانے میں تھا۔ اس تخیل میں بلندی اور رفتار میں تیزی پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور یہی فلاح و ترقی کی اسکیم کی تمام متنوع سرگرمیوں میں بھی مقصد پوشیدہ ہے۔ جو لوگ دیہی فلاح و ترقی کے کام میں حصہ لے رہے ہیں انہیں دیہی معاشرت کے اس پہلو کو ملحوظ رکھنا چاہیئے جو اس مضمون میں بیان کیا گیا ہے اور دیہات کی معاشی سرگرمیوں کے اس اہم مرکز کو ضروری اصلاح کے بعد کام میں لانا چاہیئے۔

رُباعیات

کیا شیخ ملیگا گل فشانی کر کے — تشریحِ مآلِ شادمانی کر کے
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے اُنھیں! — جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

وہ رات گئے شراب ڈھلنا، ہے ہے — وہ پچھلے پہر صبا کا چلنا، ہے ہے
معشوقۂ نوخیز کا وہ رہ رہ کر — آنکھوں کو ہتیلیوں سے ملنا، ہے ہے

(جوش ملیح آبادی)

بدحواسیاں

(از مدیر)

میں اس دلچسپ سلسلے کو سب سے پہلے اپنی بدحواسیوں کے واقعات سے شروع کرتا ہوں۔ اور اُسی کے ساتھ ساتھ قارئین کرام سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ فرصت کے لمحوں میں اپنے اس قسم کے حالات و واقعات کو نوٹ کر کے "کلیم" میں اشاعت کے واسطے مرحمت فرمادیا کریں۔

میری قوم ناقابل برداشت حد تک سنجیدہ ہو چکی ہے حالانکہ کل کی بات ہے کہ ہماری زندہ دلی اور ہماری رنگینیاں ضرب المثل تھیں۔ آج بھیپھڑے کی پوری قوت کے ساتھ قہقہہ مارنا مرتبے سے گری ہوئی بات سمجھا جاتا ہے ۔ کل تک ہماری ہولیوں کی پچکاریاں روئے زمین کو رنگین کر دیا کرتی تھیں آج اگر کہیں رنگینی ہے تو صرف ہماری خونچکاں آنکھوں میں —

اے میرے ہندوستان! تیری زندہ دلیوں اور رنگینیوں کو کس کی نظر کھا گئی۔ ہنس اے دکھیا ہندوستان ہنس، پروا نہ کر مصائب و آلام کی، تو نے سنا ہے؟

ع غم، موجِ تبسم سے ترشح جاتا ہے!

میں اپنے غمگین بھائیوں کو ہنسانا چاہتا ہوں، خواہ وہ مجھی پر کیوں نہ ہنسیں، لیکن ہنسیں تو، اُنکے اترے ہوئے چہرے دیکھکر میرے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔ میں اپنی قوم کو ہنساؤنگا، ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔ ہاں تو سُنئے میری بدحواسیاں —— لیکن آپ بھی اپنی بدحواسیاں بیان کیجئے گا، یہ نہو کہ آپ تو مجھ پر ہنس لیں، اور میں آپ پر ہنس نہ سکوں۔

میری بدحواسیاں

(۱) صبح کا وقت تھا، میں اپنے والدِ گرامی کے نہایت قابلِ قدر دوست، علم محترم جناب منشی التفات رسول صاحب مرحوم تعلقدار سندیلہ کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کی غرض سے سندیلے گیا ہوا تھا۔ ایک روز غالباً صبح کے وقت، جی بہلانے کی خاطر اسٹیشن پر ٹہل رہا تھا، کہ اتنے میں گاڑی آئی، اور پلیٹ فارم پر آکر رک گئی۔ میں گاڑی کی سیر کرنے لگا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک فرسٹ کلاس میں میرے ایک نہایت محبوب دوست بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں ہمہ تن اشتیاق بنکر اُنکی طرف بڑھا، وہ بھی کھڑکی کے پاس آکر کھڑے ہو گئے، انکے چہرے سے بھی میری ملاقات کا کسقدر شوق ٹپک رہا تھا۔

لیکن جیسے ہی کھڑکی میں سے ڈالکر میں نے اُن سے ہاتھ ملانا چاہا، دفعتہً کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی، میرے ماتھے سے خون ٹپکنے لگا۔ اور وہ محبوب دوست یکایک غائب ہو گئے آپ سمجھے وہ میرے دوست کون تھے؟ کھڑکی کے بند شیشے میں خود میرا ہی عکس پڑ رہا تھا!

(۲) ایک نوجوان دوست کے ساتھ حیدرآباد کے دلفریب باغِ عامہ میں ٹہل رہا تھا کہ سامنے سے موٹر میں ایک پیر مرد گزرتے نظر آئے، مجھ سے اُن سے صاحب سلامت ہوئی موٹر گزر گیا۔ اور میں نے اپنے دوست سے جو میرے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ بڑے دردناک انداز میں کہا "دیکھئے، زندگی میں کیسے کیسے ممقاوں سے صاحب سلامت کرنا پڑتی ہے" اور یہ کہتے ہی میں نے دیکھا کہ یکایک اُنکا رنگ اُڑ گیا، اور یہ رنگ دیکھتے ہی مجھے فوراً یاد آگیا کہ وہ تو ان کے باپ تھے!

(۳) ایک صاحب دفتر میں بڑے ہی تپاک سے آکر گلے ملے، اور مجھے میرے لڑکپن کے نام "شبیر" سے مخاطب

کیا۔ لیکن مینے اُنھیں مطلق نہیں پہچانا۔ ہر چند انکی ہر بات کا انتہائی گرمجوشی اور بے تکلفی سے جواب دیتا رہا۔ لیکن دل ہی دل میں سوچتا جاتا تھا کہ یہ ہیں کون — اِتنے میں ایک سن رسیدہ اور ثقہ دوست تشریف لے آئے جو پُرانی تہذیب کے حامل تھے، انھوں نے میرے ان دوست کے متعلق جنھیں میں پہچاننے کی انتہائی سعی کر رہا تھا۔ مجھ سے کہا:-

"آپ کی تعریف"

اور خدا جانے یہ کیا معاملہ تھا کہ یکایک میرے مُنھ سے نکل گیا:-

آپ کے شوہر!!!

(۴) میں اپنے ایک نہایت خاموش اور سنجیدہ دوست کے وہاں مہمان کے طور پر ٹھہرا ہوا تھا، جو ایک مشہور شاعر ہیں۔ رات کے وقت جب دسترخوان بچھا تو انھوں نے اپنی غزل سنانا شروع کی میں داد دیتا رہا۔ وہ شعر پڑھتے پڑھتے رک گئے اور کہنے لگے اب ایسا شعر سُناتا ہوں جو آپ کو بیحد پسند آئیگا۔ مینے کہا "ارشاد" انھوں نے ایک نہایت معمولی سا شعر سُنایا، اور میری زبان سے بیساختہ نکلگیا "کیا لغو شعر ہے"۔

میرے سنجیدہ دوست نے، جن سے مجھ سے کبھی ایک بات بھی مذاق نہیں ہوا تھا، اپنی عینک کے تالوں سے مجھے انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھا۔ اور میرے واسطے اِسکے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ مینے انکے خدمتگار سے کہا "رمضانی! تھوڑا سا پانی"!

(۵) ایک روز دفتر جانے میں ذرا دیر ہوگئی تھی مینے جلدی جلدی کپڑے پہنے، اور پردا اُٹھا کر باہر جانے لگا، کہ اتنے میں میری بیوی، اور اُسکے ساتھ بچوں کے فلک شگاف قہقہوں کی آواز نے مجھے وہیں روک دیا — اور اب کیا دیکھتا ہوں کہ میں پائجامے کے علاوہ پورا لباس پہنے ہوئے ہوں!

(۶) ایک مرتبہ میرا موٹر بگڑ گیا تھا۔ تانگے پر آمدورفت رہتی تھی، کارخانے والوں کی بدعہدیوں کے باعث دو ماہ تک مجھے تانگوں ہی میں بیٹھنا پڑا۔

دو مہینے کے بعد خدا خدا کرکے موٹر واپس ہوا، اور اُسی روز شام کو میں اپنے دوست حضرت ذوقی کو لیکر سیر کرنے نکلا، اور جیسے ہی تانگوں کے اڈے کے قریب پہونچا، موٹر روک کر ذوقی صاحب سے کہا بھئی دیکھو یہ سامنے والا تانگا بہت اچھا ہے، اِسے لے لو، ورنہ اِس سے بہتر تانگہ نہ مل سکیگا۔

اور جب ذوقی صاحب نے زور سے قہقہہ مارا، اسوقت معلوم ہوا کہ میں تو موٹر میں بیٹھا ہوا ہوں!

(۷) موٹر کے دو واقعے اور بھی ہیں۔

رات کو ٹہلنے نکلا، دو ایک احباب بھی ساتھ تھے، اتنے میں چوراہے سے پولیس کی سیٹی کی آواز آئی، میں فوراً ہی ٹھہر گیا اور ایک دوست سے کہا ذرا دیکھ لیجئے شاید پیچھے کی لایٹ گل ہوگئی ہے!

(۸) ایک روز سویرے سے چہل قدمی کرتا ہوا ایک چوراہے پر آنکلا، سامنے پولیس کا آدمی کھڑا تھا، اُسے دیکھتے ہی میں ٹھہر گیا، اور سیدھے ہات سے سائڈ دینے لگا۔ وہ ہکا بکا ہوکر میرا مُنھ دیکھنے لگا، اور مجھے غصہ آنے لگا کہ یہ کمبخت میرے موٹر کو کیوں روکے ہوئے ہے، اور سائڈ کیوں نہیں دیتا۔

اتنے میں نہایت خشونت کے ساتھ مینے اپنا ہات ہلانا شروع کردیا، اور پولیس والا، مجھے اُسکی حیرت اور پریشانی اب تک یاد ہے، گھبرایا ہوا میری طرف آیا، اور اپنی مخصوص زبان میں کہنے لگا "صاحب! کیا ہوا؟" بس یہ سُنتے ہی مینے دیکھا کہ میں تو سڑک پر کھڑا ہوا ہوں — اور اسقدر تیزی سے روانہ ہوا کہ جب مینے موڑ سے پولیس والے کو مُڑ کر دیکھا تو وہ مجھے ایسی حیرت کے ساتھ دیکھ رہا تھا گویا میں قطعی طور پر مجنون ہوں۔

(۹) ایک روز مینے ایک نہایت متین دوست کے وہاں انکی بیوی کی وفات پر تعزیت کی رسم ادا کرنے گیا۔ باتوں باتوں میں، تصاویر کا ذکر چھڑ گیا، اور وہ ایک البم مجھے دکھلانے لگے۔ ناگاہ ایک ورق جو پلٹتے ہیں تو ایک عجیب صورت کی تصویر نظر پڑی، مینے بیساختہ پوچھا، "تو ابھلا یہ کون جانور ہے"؟

اُنھوں نے سر جھکا کر جواب دیا "میرے والد ہیں"!

جاپان کی قوت کا راز

از مسٹر چمن لال صاحب جرنلسٹ

(جاپانی ثقافت (Culture) کے دس ستون)

کس طرح جاپان ایک ایسی عظیم طاقت بن گیا جو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے منہ آسکتا ہے؟ اس کے راز جاپانی سیرت کے اندر مستور ہیں۔

(۱) جاپانی ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں (۶) جاپانی سب سے زیادہ صاحب ذوق و انتظام ہیں
(۲) جاپانی مناظرِ قدرت سے محبت کرتے ہیں (۷) جاپانی حیرت ناک انتظامی قابلیت رکھتے ہیں
(۳) جاپانی سادہ معاشرت رکھتے ہیں (۸) جاپانی دیانت و خوش معاملگی کو بیحد محبوب رکھتے ہیں
(۴) جاپانی ثقافت کی بنا پائدار ہے (۹) جاپانی ضابطے کی نہایت سختی سے پابندی کرتے ہیں
(۵) جاپانی گھریلو زندگی پسند کرتے ہیں (۱۰) جاپانیوں کا اخلاقی معیار نہایت بلند ہوتا ہے

(۱) دائمی متبسم قوم

اصلی جاپان، اس کی گلشن آرائیاں، اور اس کے باشندوں کی عالمگیر شگفتگی و خوش مزاجی، اگر ہم وہاں کی مغربی نقالی کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں، جو خوردبین کے سامنے خودبخود نمایاں ہوجاتی ہے، ایک ایسی شئے ہے جو شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔

جاپانیوں کی یہ خصوصیت کہ وہ آپ کو ہر وقت خوش رکھنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ مغربی "امرِ واقعہ" ( ) لوگوں کو اچیرن ہوجاتی ہے، ان میں بعض تو یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ جاپانی کردار کا یہ رُخ، بالکل غیر فطری چیز ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔

جاپان دراصل "اکتسوشیا" بھی کہا جاتا ہے۔ "اکتسو" کے معنی ہیں "خوش و خرّم" اور "شیما" جزیرے کو کہتے ہیں جس کے معنی ہوئے "جزیرۂ خوش دلان"

دیانت داری، اور ذکاوت، جاپانیوں کے ممتاز اوصاف ہیں۔ یہ لوگ رشوہ دوانیوں اور فریب کاریوں کو نہایت ذلیل و معیوب سمجھتے ہیں ... ر یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ قوم اپنے ہر وقت بشاش اور متبسم رہنے کے باعث بہت فائدہ اٹھاتی ہے۔

تبسم انہیں دولت دیتا ہے

آپ خواہ کسی بڑے اسٹور میں جائیں، یا کسی "بس" میں سوار ہوں، کسی "لفٹ" پر چڑھیں، یا کسی "رسٹوران" میں داخل ہوں، جاپانی خُلق آپ کا ہر جگہ خیر مقدم کریگا، اور اس قدر کہ اجنبیت کا احساس آپ کے دل سے محو ہو جائیگا، اور کامل احتیاط و توجہ سے آپ کے احکام بجالائے جائیں گے۔

آپ جہاں بھی پہنچیں گے، ایک دلنواز تبسم سے آپ کی پذیرائی ہوگی، "خوش آمدید" کہا جائے گا، اور رخصت ہوتے وقت آپکی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا جائے گا۔

جاپان کی اس خصوصیت نے، سیاحوں کے لئے وہاں روپیہ صرف کرنے کو ایک ایک لذت و مسرت بنا دیا ہے، جس کے باعث وہاں کی تجارت کو خوب فروغ حاصل ہوتا ہے۔

جاپانیوں کے اس تبسم پیہم کے کئی اسباب ہیں، جن میں بعض تو فطری ہیں، اور بعض اکتسابی، لیکن اکتسابی بھی اتنے "قرون در آغوش" اسباب پر مبنی ہیں کہ اب وہ بھی فطری ہی ہوچکے ہیں۔

جاپانیوں کا یہ تبسم، جیساکہ بعض شکّی اور امتیاز سے عاری یورپی لوگوں کا خیال ہے۔ ہرگز "چہرے پر" ایک "مصنوعی چہرہ" یا "نقاب" نہیں ہے، بلکہ "شنتو" کے اولین اصول کی روشنی میں ان کا تبسم ایک آئینہ ہے، جس میں وہ اپنے عقیدے کے مطابق اپنی روح، اور علت العلل کے جمال سے دوچار ہوتے ہیں، اور ابدیت سے اپنا حصہ و انعام حاصل کرتے ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تبسم ان کا مذہبی و روحانی شعار ہے۔

گوشت پوست خواہ کتنی ہی بلاؤں کا ہدف رہے، لیکن بودھی ( ) روح، ان تمام بلاؤں کی گرفت سے بالا رہتے ہوئے مسکراتی رہتی ہے۔

میرے خیال میں دنیا کی کسی ایک قوم نے بھی جاپانیوں کی طرح اتنی طویل مدت تک ایسے قطعی اور غیر متزلزل ضابطے کی آجتک پابندی

نہیں کی ہے۔ انہوں نے اس ضابطے کو بھی آداب و تہذیب میں داخل کرلیا ہے، یہ ضابطے کی شدید پابندی، بلحاظ نوعیت اسپارٹا سے منسوب کی جاسکتی ہے لیکن اس نے اشتراقیین پیدا نہیں کئے۔

اس ضابطے سے معمولی سی روگردانی بھی شدید تعذیب، اور بعض حالات میں سزائے موت کا سبب بن جاتی تھی، اور اس سخت گیری نے جاپانیوں کو اس دنیا کی سب سے زیادہ "ثقافت یافتہ" (   ) اور سب سے زیادہ (   ) قوم بنا دیا ہے۔

ایسی قوم کا سمجھنا، جو ضرورت سے زیادہ بامروّت و خلیق ہو، ہمارے لئے دشوار ہو جاتا ہے۔ ہم اُن کی نیّت اور اُن کے اغراض پر شک کرنے لگتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا تو حال یہ ہے کہ جب ہمیں غصہ آجاتا ہے، ہم دست و گریبان ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی شخص سے نفرت کرتے ہیں، تو ہم اسے کردہ طور پر ظاہر کر دیتے ہیں، اور جب ہمیں کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو دھاڑیں مار مار کر رونے پیٹنے لگتے ہیں، لیکن ان تمام حالتوں میں جاپانی کیا کریگا؟ وہ اس وقت بھی مسکراتا نظر آئیگا۔ پھر بھی اس کا تبسّم ارادی (   ) نہ، یا تجارتی اقتضاء نہیں ہوتا، نہ اسے اشتراقیت کا مظاہرہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جاپانی قوم ہر ابتلا کے برداشت کرنے، اور ہر مصیبت کے موقع پر مسکرانے والی قوم ہے، مسکرانا تو اُن کے دین و ایمان کا ایک جزو، اور لاینفک جزو ہے،

جاپانی ایک حلیم، بردبار اور بشّاش قوم کے افراد ہیں، جن کے پرداز سرشت جذبات، مسکراہٹ، ہنسی، اور قہقہوں کے دوش پر اڑانے کے لئے ہمیشہ طیار رہتے ہیں۔

(۲) مناظرِ قدرت کی محبّت

جاپانی مناظرِ قدرت کے سچّے پرستار ہیں، اُن کی روایتی شوالہ پرستی کے ساتھ، اُن کی دائمی فطرت پرستی بھی وابستہ ہے۔

پہاڑیوں، وادیوں، سمندروں، دریاؤں، ندیوں، نالوں، جھیلوں، چشموں، درختوں، باغوں، پھولوں، یہاں تک کہ پتھروں اور سنگریزوں تک سے دنیا کے کسی ملک کے باشندوں کو اتنا شدید عشق نہیں ہے، جتنا کہ جاپانیوں میں پایا جاتا ہے۔

فطرت کے ساتھ ان کی یہ دیوانہ وار محبّت، ثقافتِ "نپن" (   ) کا ایک ضروری جزو ہے۔

قدیم روایات کے تحت، اور قوم کے رجحان کے مطابق، جاپانی حکومت نے وسیع باغوں، اور لہلہاتے ہوئے مرغزاروں کا ایک نظام قائم کر دیا ہے، جو بدرجۂ غایت قابلِ ستائش اقدام ہے، اور ہماری ہندوستان کی گورنمنٹ کے لئے قابلِ رشک و تقلید ہے۔

ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر فریب پارکوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ جہاں لوگ بکثرت جمع ہوتے ہیں۔ تفریح کرتے، اور مناظر کی لطافتوں، پھولوں کی مہکوں، اور اُمنگ پیدا کرنے والی ٹھنڈی ہواؤں سے حیات حاصل کرتے ہیں۔

کیا ہماری ہندوستان کی گورنمنٹ کے ذرایع اتنے وسیع نہیں ہیں کہ جاپان کی طرح ہندوستان کو بھی سامانِ حیات و نشاط سے بہرہ مند ہونے کا موقع دے سکے؟

(۳) خانگی زندگی کی سادگی

جاپانی طبائع کا سادگی پسند ہونا، اُن کے لئے ایک رحمت و برکت ہے، جاپان کی خانگی زندگی ایک غیر معمولی دلکش تصویر پیش کرتی ہے۔ ہر چند جاپانی معاشرت میں ایک نوع کی رسم پرستی ضرور پائی جاتی ہے، لیکن وہ اتنی نرم و نازک واقع ہوئی ہے کہ بُری معلوم ہونے کے عوض دلکش نیگی ہے،

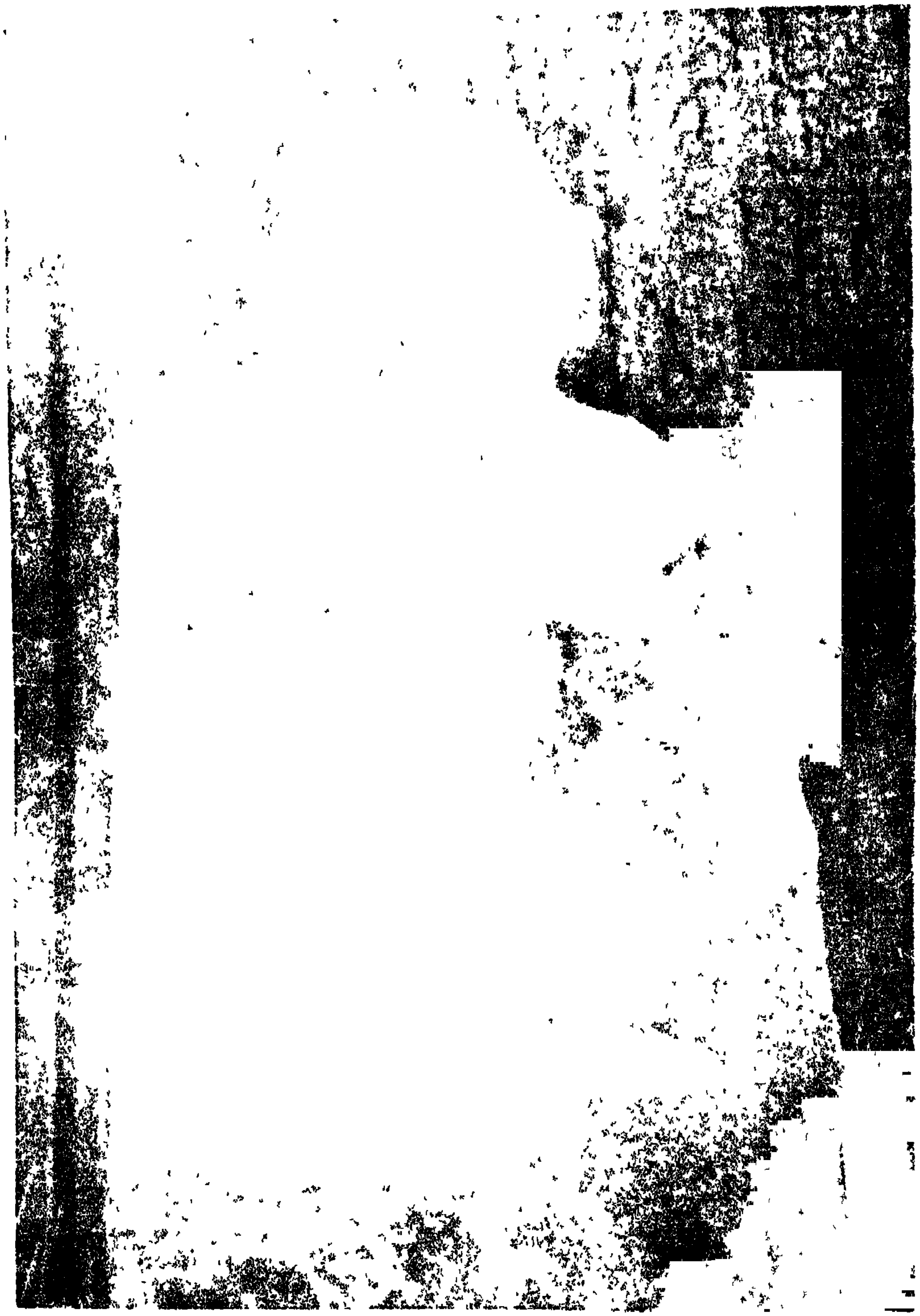
ہر بزرگِ خاندان صبح بستر سے اُٹھتے ہی سُورج کی طرف رُخ کر کے گردن جھکا لیتا ہے۔ اور اس مبدائے حیات کے حضور سادہ لفظوں میں اپنی تہنیت پیش کرتا ہے:۔

"اے مُتبرّک وجود! تجھے آج کا دن مُبارک ہو"

اِس کے بعد خاندانی لوح کے سامنے کچھ زیرِ لب دُعا کرتا ہے۔

غروب کے وقت کام سے پلٹ کر گھر پہنچتا اور غسل کرتا ہے۔ یہ غسل کی عادت رسمِ عام کی صورت میں ادا ہوتی ہے۔ پانی کے ظروف باہر نکال لئے جاتے ہیں۔ اور غسل کرنے میں باہم کر "خوش گپیاں" اور خوش فعلیاں ہوتی رہتی ہیں

جاپانیوں کے مکان رات کے وقت بالکل بند ہو جاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے، تو مکان کی کاغذی دیوار [illegible] کرتا ہوا مکان میں داخل ہو سکتا ہے، لیکن یہ محض ایک خیال ہے جاپان میں دوسری چیزوں کی طرح پہلی نظر میں تو دیواریں نازک اور کمزور معلوم ہوتی ہیں، لیکن دراصل ان کی تہ میں پتلے فولاد کی چادریں لگائی جاتی ہیں۔







تصاوير متعلقه جاپان

مکانوں کے اندر فرنیچر تو بالکل ہوتا ہی نہیں یا برائے نام ہوتا ہے، کوئی کرسی، کوچ یا جدید تمدن کی کوئی آرام دہ چیز نہیں ہوتی۔

موسم سرما میں ایک روغنی لکڑی کا گدا سا ہوتا ہے جس کے گرد سب بلکہ ایک "فیوتون" ( ) کے اندر بیٹھتے ہیں۔ کھانا اور سونا ایک ہی کمرے میں ہوتا ہے۔

امراء کے مکان بھی ایسے ہی ہوتے ہیں، میرے تجربے میں توشہنشاہ کا محل بھی اسی طرز کا تھا۔

جہاں دیکھئے کفایت شعاری پر سختی کے ساتھ عمل درآمد نظر آتا ہے۔ لیکن جاپانیوں کے آداب، رسم و رواج، اور خاطر مدارات کی فراوانی میں یہ کفایت شعاری اجنبیوں کو محسوس نہیں ہوتی۔ اور خاصہ "ثقافت" اور نسل کی قوت کا راز اسی میں مضمر ہے۔

ایک معمولی خاندان ایک خندق کے اندر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ کا کیمونو (۹)، ایک گلدان، ایک چوبی گگرا، ایک کیتلی، چند پیالے، برتن بہ ترتیب خانہ داری کی کائنات ہوتی ہے

جاپانی زندگی میں نمائش کا یہ فقدان، عدم شعور، افلاس یا ثقافت ( ) کی کمی کے باعث نہیں، بلکہ قطعاً ارادی ہوتا ہے۔

جاپان، دنیا کی سادہ ترین قوم ہے، اُن کی زندگی کا ہر پہلو سادہ ہوتا ہے، اُن کی سادگی محض قیاسی، یا ذہنی نہیں ہوتی، وہ تو اپنی لطف اندوزیوں اور جذبات کے مظاہروں میں بھی سادہ نظر آتے ہیں۔

بکفایتی، اور مادی انتفاع میں بھی جاپانیوں کا انہماک مذہبی خیالات کی بنا پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن کے شاہنشاہ، پیشوائے اعظم روحانی مقتدا "ہیروہتو" نے "بازمانہ بساز" کا انہیں حکم دیا ہے۔

جاپانیوں کی اس انتہائی سادگی کو حیات و بار حیات کی طرف سے بیمانہ بے تعلقی نہ سمجھنا چاہئے۔ یہ سادگی تو ان کی زندگی کا ایک زبردست لائحۂ عمل ہے۔

یہ قانع و صابر لوگ جو کھیتوں کے اندر مشقت کرتے، یا اپنی چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور پیشوں میں مصروف نظر آتے ہیں، درحقیقت زبردست ہیرو ہیں۔ جو قومی اغراض کے لئے شخصی و انفرادی یا نمائشی جذبے کے بغیر ہر ممکن قربانی کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں، یہ ہیں وہ تمام باتیں جو جاپان کی قومی اور انفرادی سیرت کے لازمی اجزا ہیں۔

(۴) سادگی جاپانیوں کا وصف

سرکاری عمارتوں اور استعمالی فرنیچر وغیرہ کے معاملے میں

جاپانی حکومت بھی نہایت اعتدال پسند واقع ہوئی ہے۔ وہ بھی ہر قدم پر انتہائی کفایت شعاری پیش نظر رکھتی ہے، لیکن ان کے مقابلے میں یورپ اور امریکہ کے تجارت، بینکس، بیمہ اور اسٹور کی عمارتیں اتنی عظیم اور دلکش ہیں حتیٰ کہ روپے کی طاقت سے کوئی عمارت مہیا ہو سکتی ہے۔ ہر چند سرکاری عمارتیں بہت ہی سادہ اور معمولی ہوتی ہیں۔

جاپان کی بری و بحری فوج میں بھی انتہائی سادگی و کفایت شعاری پائی جاتی ہے۔ اُن کی وردیاں قیمتی نہیں ہوتیں؛ اور زیادہ آرام و راحت کا فقدان اُن کے ادائے فرائض میں قطعاً حارج نہیں ہوتا ہے۔ جاپانی سپاہیوں کو ہمارے ہندوستانی سپاہیوں کے مقابلے میں بہت کم ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔

جاپانی بری و بحری فوج زنگار رنگ وردیوں، اور پیتل کے چمکتے ہوئے بٹنوں کے عوض، ایک ایسے اخلاقی نظام کا مظاہرہ کرتی ہے، کہ دنیا دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔

جاپان میں بھی روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، اور بعض اوقات دل کھول کر خرچ کیا جاتا ہے، مگر واقعی اور حقیقی ضرورتوں پر، حکومت چمکیلی اور بھڑکیلی چیزوں پر روپیہ برباد کرنے کو اپنے ملک سے غداری سمجھتی ہے۔

ان سب باتوں کے دوش بدوش جاپان کی سرکاری ملازمتوں کی جو خصوصیت اعلیٰ ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمام محکموں میں خدمت وطن کی وہ سچی روح کارفرما ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

ملک کا ادنیٰ اور حقیر باشندہ بھی سرکاری ملازموں کے خدمات سے پوری طرح بہرہ یاب ہوتا ہے۔

ہر ملک کے سرکاری ملازموں، اور حاکموں میں جو رعونت، شیخی، نمائش حکومت، اور تبختر پایا جاتا ہے۔ وہ جاپان میں اس قدر مفقود ہے کہ کہیں نظر نہیں آتا۔

وہاں خدمتگزاری، اور دستگیری کی روح سرکاری محکموں سے لیکر

معمولی دوکانوں اور ہوٹلوں تک دوڑی ہوئی ہے۔

جاپانی حکومت اپنی رعایا اور اپنی قوم کے ساتھ وہ کرتی ہے جس کا شائبہ تک کسی دوسری حکومت میں نہیں پایا جاتا۔

عام اہلِ جاپان کے جو کارنامے ہیں، وہ دُنیا کے سامنے ہیں، اور ان کارناموں ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کی حکومت خدمتِ خلق کی کس شدّت کے ساتھ پابند ہے۔

اگر آپ عمیق نظر ڈالیں گے۔ تو جاپانیوں کی تجارت کا فروغ، صنعت کی وسعت، اور جاپانی مال کی عالمگیر مانگ سے خود اندازہ کرلیں گے کہ وہاں کی حکومت اپنی رعایا اور قوم کے ساتھ کیا قابلِ ستایش سلوک روا رکھتی ہے، اور اس سے جاپان کو کس قدر کثیر فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔

(۴) اساسِ ثقافت

صفحۂ ہستی پر جاپان ایک ایسی قوم ہے، جس کی معلومہ تاریخ مسلسل ہے، اور اس کے سلسلے میں کوئی وقفہ نظر نہیں آتا ہے۔ اور جہاں شاہنشاہوں کے ایک ہی خانوادے کی حکومت رہی ہے۔ جاپان کے اساسی قومی خصوصیات میں یہ وصف سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ وہ بادشاہ کے وفادار اور قومی روایات کے علمبردار ہوتے ہیں۔

جاپانی بادشاہ کی وفاداری، اور قومی روایات کی علمبرداری کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اُن کے یہاں یہ روایت ہے کہ آفتاب کے دیوتا، یعنی سلاطین جاپان کے آسمانی مورثِ اعلےٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ جاپان وہ مُلک ہے میرے وارث جہان کے دانا بادشاہ ہوا کریں گے۔ اور آئینِ حکومت کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ جاپانی شاہنشاہی ہمیشہ اُس خاندان میں رہیگی جو زمانۂ قدیم سے حکومت کرتا چلا آرہا ہے۔

لیکن قدامت پرستی کی یہ عجیب وغریب رُوح، جاپانیوں کو مغربی تمدّن وثقافت سے بہرہ مند ہونے کے معاملے میں مانع نہ ہوسکی، بلکہ اس کے برعکس انہیں اس قابل کر دیا کہ وہ نئے نئے تجربوں اور جدید تمدّن کو اپنے اسلاف کے تجربوں کی ترازو میں تول لیں، اور اپنے بزرگوں کی روحوں سے مشورہ لیں۔

یہ مشورے محض برائے نام نہیں ہوتے، بادشاہ سے لیکر گدا تک سب اپنے آباو اجداد کے مقبروں میں جاتے ہیں، اور ان کی قبروں کے سامنے ایسے مراسم ادا کرتے ہیں۔ گویا وہ اپنے خیالات کو اُن کی روحوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

جاپانیوں کی اہلی فطرت (   ) کے متعلق ایک جاپانی کا عقیدہ ہے کہ ان کے نزدیک بادشاہ کی حیثیت تمام قوم کے شفیق باپ کی سی ہوتی ہے۔ اور ہر اولاد ورثے میں شریک ہے، نیز بادشاہ کا خاندان دیوتاؤں کی نسل سے ہے، اور اُن کا یہی عقیدہ بادشاہ کی مستقل وفاداری، اور وطن کی غیر متزلزل محبّت کا سرچشمہ ہے۔ اور یہی وقتِ ضرورت اُنہیں مجبور کر دیتا ہے کہ وہ مفادِ عامہ کے موقع پر اپنی شخصیت قربان کر دیں، اور خیرِ مشترک کے برکات زیادہ سے زیادہ مقدار میں حاصل کریں۔

بادشاہ، اور اسلاف، جاپان میں مقدس ہیں، اور اس نوع کی پرستش اس قوم کے اندر حیرتناک کارنامے انجام دیتی ہے۔

دوسرے مُلکوں کے قبرستانوں سے جاپانی قبرستان بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ وہاں وحشت وخوف کی کارفرمائی ہوتی ہے، یہاں زندہ اور مُردہ لوگوں کی رُوحوں میں ہم آہنگی وموانست کی فضا پائی جاتی ہے۔

اکثر مسلمان اپنے گورستانوں میں شب برات کے موقعے پر سال بھر میں ایک بار جاتے ہیں، لیکن جاپانی اپنے مقابر میں آئے دن جایا کرتے اور اُن کی آرائش کیا کرتے ہیں، اور اس طرح یہ مقابر، جن کو جاپانیوں کا شوالہ کہنا چاہئے، مرے ہوئے لوگوں کے کارناموں کو زندہ رکھتے ہیں۔

دیوتاؤں اور رُوحوں کی پرستش کا خیال ہندوستان سے جاپان میں پہنچا ہے۔

(۵) متاہل زندگی

جاپانیوں کی زندگی کا، اُن کی قابلِ رشک خانگی زندگی کا ایک نمایاں پہلو ہے، جو باہمی فلاح کی خاطر اُنہیں تعاون وایثار کا سبق دیکر اُنہیں متحد رکھتی ہے۔

مشقّت کرنے والے جاپانی کاشتکار طبقے کے اندر جاپان کی رُوح اور اُس کے مقاصد جھلکتے نظر آتے ہیں۔

میاں بیوی، اور بچّے انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ محنت میں لگے رہتے ہیں۔ جو لوگ مزدور ہوتے ہیں، وہ نہایت قلیل اُجرت پر کام کرتے ہیں لیکن وہ اس درجہ کفایت شعار ہیں کہ اس قلیل معاوضے میں سے بھی کچھ نہ کچھ

پس انداز کرلیتے ہیں۔

نگاساکی کے جہاز پر سالہا سال سے لڑکیاں خلاصی کا کام کرتی ہیں۔ بدرقی علاقوں میں عورتیں بھاری بھاری بوجھ اٹھاتے دیکھی جاتی ہیں۔ اور تمام مشقت عہد آغازِ آفرینش کے باقیات سے نہیں، بلکہ ان کے تمدن کا ایک جزو ہے۔

ہر کنبہ ایک جسم ہوتا ہے، جس کا کوئی عضو جدا نہیں ہوتا۔ میں نے نوکروں تک کو دیکھا ہے کہ ان سے خوش خلقی اور عزت کا برتاؤ کیا جاتا ہے جاپانی اپنے ملازموں ہی کو نہیں، بلکہ کتوں تک کو "آپ" کہہ کر سے پکارتے ہیں اور نوکر اپنے آقاؤں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔

ہمیں غور کرنا چاہئے، اور عبرت کے ساتھ غور کرنا چاہئے کہ ہم ہندوستانیوں کا برتاؤ اپنے نوکروں اور اپنے غریبوں کے ساتھ کیا ہے۔ کیا انہیں جھوٹا کھانا اور اترن کا کپڑا نہیں دیا جاتا، اور کیا اس برتاؤ کے بعد ہمیں توقع رکھنا چاہئے کہ وہ ہمارے وفادار ہوں گے۔ اور خود اپنی نظروں میں حقیر نہ ہو جائیں گے؟

ہندوستان میں درزی، موچی، دھوبی، کاتب اور اسی قسم کے کام کرنے والے اس بات کے لئے مشہور ہیں کہ ان کے وعدے کبھی ایفا نہیں ہوتے۔ لیکن جاپان میں آپ کو کوئی ایسا واقعہ کبھی پیش نہ آئیگا، اور کوئی ایسا وعدہ نہ ہوگا۔ جو وقت پر وفا نہ ہوجائے۔

(۶) دیانت کی حکومت

مجھے جاپانی تجارتی کمپنیوں کا تو تجربہ نہیں کہ غیر ممالک کے ساتھ ان کی معاملت کیسی ہے لیکن جہاں تک عام جاپانی دیانت کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کا دیانت کا معیار بحد بلند ہے۔ اور وہ ہر شعبۂ حیات میں دیانت و خوش معاملگی کے شدت سے پابند ہیں۔

جاپانی ملازم بھی بہت زیادہ متدین ہوتے ہیں، اور اپنے مالک کے مال کو ایک مقدس امانت سمجھتے ہیں۔

میں "ٹوکیو" میں اکثر ہفتوں مکان سے باہر رہتا تھا، میرے بکس اور میرا مکان غیر مقفل رہتا تھا، لیکن کبھی ایک بار بھی مجھے کوئی تلخ تجربہ نہیں ہوا۔

آپ نے سنا ہوگا کہ پہلے ہندوستان کی بھی یہی حالت تھی، لیکن اس سنی ہوئی بات کو آج آپ جاپان میں دیکھ سکتے ہیں۔ جاپان نے ہندوستان سے اس صفت کو لیا، اور قائم رکھا۔

(۷) پولیس

۱۹۲۶ء میں میں نے کوہستان ہمالہ کے اندر تقریباً ایک ہزار میل کا پیادہ سفر کیا، اور ایسے مقاموں کو بھی دیکھا جہاں لوگ چوری سے قطعی بیگانہ تھے۔

میں نے وہاں کے گورنر سے سوال کیا کہ ایسے اہم مقامات میں بھی جو تجارت کے مرکز ہیں۔ پولیس کا نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ گورنر نے مجھ سے کہا کہ ہمیں پولیس کی ضرورت نہیں، یہاں جرائم نہیں ہوتے، پولیس کی شکل دیکھتے ہی جرائم کا ولولہ موجیں مارنے لگتا ہے۔

ہندوستان کے وسیع براعظم کی پولیس پر جو "یونین جیک" اٹھائے پھرتی ہے، یہ کتنی افسوسناک، لیکن سچی چوٹ ہے!

لیکن غور کرو تو اس کا الزام پولیس پر نہیں، ہندوستان کے نظامِ حکومت پر ہے، جو سب سے زیادہ جاہل و غیر مہذب لوگوں کو پولیس میں بھرتی کرتا ہے تاکہ انہیں خود ہندوستانیوں پر گولی چلانے کے لئے آمادہ کیا جا سکے۔

جاپانی پولیس ہندوستانی پولیس سے قطعی مختلف چیز ہے۔ جاپان کی پولیس، اہلِ جاپان کی بہترین دوستانہ جماعت ہے، وہ مہذب ہے، تعلیم یافتہ ہے، خوش خلق ہے، اور دوست کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ ان کی وردی ڈراؤنی نہیں ہوتی، وہ گرمیوں میں سفید، اور سردیوں میں نیلی ہوتی ہے۔ جاپانی پولیس کبھی یہ نہیں چاہتی کہ رعیت دہشت زدہ رہے، اور اس سے چاندی کی آخری کیل تک چھین لی جائے۔

جاپان کی پولیس مقدمات بننے نہیں دیتی۔ مجرموں کی اصلاح میں سرگرم رہتی، اور غریبوں کی دستگیری کو اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتی ہے۔ یہاں تک ہر دلعزیز ہے کہ غرباء کے لئے جو چندہ جمع کیا جاتا ہے، وہ تقسیم کرنے کی خاطر پولیس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

(۸) احساسِ ذمہ داری

جاپان میں کسی ماتحت سے کوئی قابلِ ملامت فعل ہو جاتا ہے، تو اس کا افسرِ اعلیٰ اس وقت تک ملامتِ ضمیر کی آگ میں تپتا رہتا ہے، جب تک کہ وہ اپنا استعفیٰ نہ پیش کردے۔ ایسے استعفے جاپان میں بہت عام ہیں، اور یہ استعفے کسی سوسائٹی کے دباؤ سے نہیں دیئے جاتے ہیں۔

ہمارے لائقِ پرستش "لیڈروں" میں سے کتنے ہیں جن کو صحیح طور پر احساسِ فرائض اور انضباطِ قومی سے سچی محبت ہے؟

یہاں تو معمولی سے اختلافات پر پارٹیاں بن جاتی ہیں، لوگ جنگ سننے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور خدا کے بندوں میں سے کسی کو احساس نہیں ہوتا کہ اس چھچھورے پن سے قومی وقار کو کس قدر ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ کس قدر عبرتناک صورت حال ہے؟

(۹) معیارِ اخلاق

"معیارِ اخلاق" کو میں "جنسی اخلاقیات" کے معنی میں استعمال نہیں کر رہا ہوں جیسا کہ بالعموم ہمارے ملک میں سمجھا جاتا ہے، اور نہ میں جاپانیوں کی کثرت مے نوشی اور فواحش پسندی ہی پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں، بلکہ میں جاپان کے اخلاقیات کے صحیح رُخ پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ جاپانی معیارِ اخلاق بیحد بلند ہے۔ جاپانی زبان، حیرتناک طور پر اُن تمام لغات سے پاک ہے، جو گالی کا مفہوم رکھتے ہوں۔ جاپانی زبان میں گالی کے لئے ایک ہی لفظ ہے، اور وہ "باکا" ہے، جس کے معنی ہیں "بیوقوف"۔

اب ذرا اپنی زبان کے لغات فواحش و دشنام سے اس صورت حال کا موازنہ فرمائیے۔ جہاں سنجیدہ گفتگو میں بھی گالیوں کے ہزاروں پہلو نکلتے رہتے ہیں۔

جاپانی جب اپنے بچوں کو ڈانٹتے ہیں تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ "کیا تم جاپانی نہیں ہو"۔ اور ہم جب کسی سے کوئی وعدہ لیتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ "ہندوستانی وعدہ نہ ہو"۔ کتنا حسرتناک تضاد ہے!

(۱۰) پابندیٔ ضابطہ سنگِ بنیاد ہے

جاپان میں ضابطے کی بجاآوری تمام خوبیوں کی جڑ ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں، کہ اس باب میں دنیا کی کوئی قوم، حتٰی کہ جرمنی تک جاپان کی نظیر نہیں پیش کر سکتا۔

جاپانی زندگی کے ہر پہلو میں ضابطہ بندی سب سے نمایاں نظر آتی ہے، بری و بحری فوج کی ضابطہ پرستی تو ہر ملک میں قانون کا درجہ رکھتی ہے، مگر جاپانی زندگی میں تو یہ ضابطہ ہر گوشے اور ہر شعبے کے اندر پایا جاتا ہے مدرسے ہوں یا کارخانے، سینما ہوں کہ ہوٹل، بازی گاہیں ہوں کہ مندر، غرضکہ ہر جگہ ایک ایسا نمایاں ضابطہ ہے، جسے دیکھ کر عقل دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔

آپ کو جاپان میں ہندوستان کی سی بدنظمی کہیں نظر نہ آئیگی کہ سینما ہے تو ایک ہنگامہ برپا ہے، اسٹیشن ہے تو ایک ہلچل مچی ہوئی ہے، اور میلہ ہے تو ایک قیامت کا غوغا ہے، وہاں نہ تو آپ گالیاں سُنیں گے اور نہ ٹکٹ گھروں پر کُشتم کُشتا اور دھکا پیل نظر آئیگی۔

اگر ہجوم کے اندر کسی کا شانہ آپ کے شانے سے مس ہو جائے گا، تو گردن آپ کے روبرو جھکا دی جائیگی، اور تین مرتبہ معذرت کی جائیگی۔

ہزاروں عورتیں روز ٹرام وغیرہ میں بیٹھتی ہیں۔ مگر آج تک مردوں کی ناشائستگی کی ایک شکایت بھی سُننے میں نہیں آئی۔

کیا ہندوستان میں یہ صورت حال ممکن ہے؟ کیا ہندوستانیوں کے لئے یہ ایک شرمناک ذلت نہیں ہے؟

کیا ہمارے لیڈروں نے اپنے نوجوانوں میں ضابطہ و تنظیم پیدا کرنے کی تکلیف کبھی گوارا فرمائی ہے؟ کیا ہمارے محترم لیڈر خود بھی ضابطے کے پابند ہیں؟

کیا ہماری لائق پولیس کبھی یہ زحمت بجا پسند کرتی ہے کہ میلوں اور تماشاگاہوں میں ڈنڈوں کے علاوہ، زبان سے ضابطے کی تلقین فرمائیے؟

کیا ہم اپنی تماشا گاہوں، سڑکوں، ریلوں اور اسٹیشنوں کے غیر انسانی ہنگاموں کو رفع نہیں کر سکتے؟

کیا ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ فقدانِ ضابطہ کے باعث، ہر سال ہم میں سے کتنی قیمتی جانیں ضائع ہوتی رہتی ہیں؟

میں نے خود کمبھ کے میلے میں یہ سانحہ دیکھا کہ ہجوم کی بے ترتیبی کے باعث چوبیس آدمی ایک دم سے کچل کر ہلاک ہو گئے۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایک بے ضابطہ قوم کو آزادی کے تصور کرنے کا بھی حق پہنچتا ہے؟

جاپانی، جب ایک طرزِ عمل طے کر لیتے ہیں تو ساری قوم ایک واحد جسم کی شکل میں حرکت شروع کر دیتی ہے، اور پھر ایک مخالف آواز بھی سُننے میں نہیں آتی۔ یہ صحیح ہے کہ جاپان میں بھی داخلی سیاست کا عنصر موجود ہے، جس سے خودغرض افراد سامنے آجاتے ہیں، لیکن تھوڑی ہی مدت میں خود اُن کی شرافت اور عالمگیر حُبِّ وطن اُنہیں مجبور کر کے مفادِ عامّہ کی راہ پر لے آتی ہے۔ اور وہ اپنے ذاتی اغراض و مفاد کو ٹھکرا کر ملک کے وفادار ہو جاتے ہیں، گے ہاتھوں جاپان کی وطن پرستی کے متعلق بھی مجملاً کچھ سُن لیجئے، شاید

ہم کچھ سبق لے سکیں۔

(۱۲) انتہائی جذبہ وطن پرستی

"دنیا جانتی ہے کہ روئے زمین پر کوئی قوم جاپانیوں کے برابر وطن پرست نہیں ہے۔ جب تک میں جاپان آیا نہ تھا مجھے اس کا پوری طرح احساس نہ ہوا تھا لیکن یہاں آکر تو میں نے ان کی وطن پرستی کو جیسا میں سمجھتا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ حیرت انگیز پایا۔

جب کبھی اُن کے ملک کی بہبود وغیرت کا سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی جانوں کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتے یقیناً یہی وہ خصوصیت ہے جس نے جاپانیوں کو ایک عظیم الشان قوم بنادیا ہے۔"

آج روئے زمین پر سب سے زیادہ وطن پرست ملک دو ہیں۔ جاپان اور جرمنی۔ دنیا اس وطن پرستی پر جیسے بعض لوگ قومی تنگ نظری سے تعبیر کرتے ہیں انہیں خواہ کتنا ہی بُرا کہے گر یہ واقعہ ہے کہ اگر ان میں وطن پرستی کا یہ انتہائی جذبہ موجود نہ ہوتا تو ان دونوں ملکوں کا نام صفحۂ ہستی سے کب کا مٹ چکا ہوتا۔

اگر ہندوستان آزاد ہونا چاہتا ہے تو اُسے اپنے مشرقی بھائی جاپان سے بہت کچھ سیکھنا چاہئے۔ کیونکہ وہ ہندوستان سے بہت سی باتوں میں ملتا جلتا ہے۔ جیساکہ ڈاکٹر شیرز نے تحریر فرمایا ہے کہ "ہندوستان سے بغیر جاپان جاپان نہ ہوتا"۔ اسی طرح میرا بھی خیال ہے کہ ہندوستان اس وقت تک آزاد نہیں ہوسکتا۔ جب تک وطن پرستی کا سبق جاپان سے حاصل نہ کرے۔

وطن پرستی کوئی جرم نہیں ہے، البتہ یہ اُن لوگوں کی نظر میں ضرور کھٹکتی ہے جن کے ذاتی اغراض میں یہ سدِ راہ ہوتی ہے۔ بین الاقوامی تخیل کے جنم داتا سوئٹ بھی اب وطن پرستی کی ضرورت کو محسوس کررہے ہیں۔ وطن پرستی کا وہ جذبہ جو کسی زمانے میں روس میں ممنوع تھا، آج سرکاری طور پر اس کی ہمت افزائی کی جارہی ہے۔ تاکہ لوگ وطن پرست بن سکیں۔ اور اُن میں مادرِ وطن کے ساتھ محبت اور وفاداری کا جذبہ پیدا ہو۔

ہمارے اُن ہندوستانی بھائیوں کو جو بین الاقوامیت کے حامی ہونے کی وجہ سے سودیشی تحریک اور قومی سرگرمیوں کو ہمیشہ تنگ نظری سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ اس سے سبق سیکھنا چاہئے۔ پنڈت جواہرلال نہرو، اُن معدودے چند اشتراکیوں میں سے ہیں۔ جن کا عقیدہ ہے کہ بین الاقوامیت سے پہلے قومیت کا جذبہ پیدا ہونا چاہئے۔ اس لئے جو لوگ اُن کی پیروی کا دعوے کرتے ہیں انہیں پنڈت جی کی بنائی ہوئی بین الاقوامیت کی تعریف کو بھی سمجھنا اور اس پر عمل کرنا چاہئے۔ دراصل پنڈت جواہرلال سچی اور بے غرض وطن پرستی کے پیکر ہیں۔ وہ اس خالص قوم پرستی کے علمبردار ہیں جس پر پنڈت تو س مولویان، مہاسبھا ؤں اور لیگوں کے مشورے کا جو ملک کی ترقی کے راستے میں حائل ہیں۔ کوئی اثر نہیں ہوتا۔

جاپان کا ایک مختصر سا سفر بھی ہر سیاح کو اس جذبے سے معمور کردیتا ہے۔ ہندوستان کے سرکاری افسر بھی یہاں کی اس سحر آفرینی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

جاپان میں تقریباً پانسو مذہب یا فرقے ہونگے لیکن وہاں کبھی آپ یہ نہ سنیں گے کہ مذہبی یا فرقہ وارانہ انجمنیں سیاسیات میں دخل دیتی ہوں۔ مذہب کو سیاست سے بالکل علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ اور تمام سرکاری اور امدادی مدارس میں اس کی سخت ممانعت ہے۔ میری جاپانی ٹائپسٹ جو ایک زنانہ کالج کی گریجویٹ ہیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگیں کہ میرے والد بودھ مذہب کے پیرو ہیں، میری بہن عیسائی ہیں۔ میرے بھائی شنتو یعنی شاہی مذہب کے معتقد ہیں۔ اور میں کسی مذہب یا خدا کو نہیں مانتی، لیکن ہم سب ایک ہی مکان میں ایک ہی خاندان کے افراد کی حیثیت سے ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ پھر آپ ہندوستان میں ایسا کیوں نہیں کرسکتے۔ انہیں یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ لیڈر اپنے ذاتی اغراض کے لئے مذہب کو آلۂ کار بناتے ہیں۔ کیونکہ ان کا اصل مذہب تو وطن جیک کی پرستش کرنا ہے لیکن مذہبی جنون رکھنے والوں کو اتنی عقل بھی نہیں ہوتی کہ وہ اُن کے ذلیل مقاصد کو سمجھ سکیں۔

جاپانیوں میں اپنی عزت ووقار کا غیر معمولی پاس ہے۔ اور ملک کے ساتھ وفاداری کا انتہائی جذبہ موجود ہے۔ جس کا مختلف صورتوں میں اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے ملک والوں کو ان میں سے اکثر چیزیں بہت ہی عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ دراصل جاپانی وطن پرستی عام وطن پرستی سے بالاتر ہے۔ اور اسی کی وجہ سے حکومت جاپان کی انتہائی قومی پالیسی ہے، ترقی کے مدارج طے کرنے اور اعلیٰ سے اعلیٰ مقاصد حاصل کرنے میں اُن کی حب الوطنی اور قوم پرستی کا بڑا ہاتھ ہے۔

پُرشاندار مثالیں

جاپانیوں کی وطن پرستی کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں اور ملک وقوم کی قربان گاہ پر وطن پرستوں کی قربانیوں کے واقعات تو بے شمار ہیں۔

کسی جاپانی کے اصول، دوست، عاشق، [illegible] کی ساکھ و وفاداری کی بنا پر خودکشی اور [illegible] کا ایک نہ ایک واقعہ اخبارات میں روزانہ دیکھنے میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر چند واقعات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) جنرل جانشی وزیرجنگ کو جب معلوم ہوا کہ اُن کے چھوٹے بھائی کو جو ٹوکیو کے نائب میئر تھے۔ بدعنوانیوں کے جرم میں سزا ہو گئی تو انہوں نے فوراً اپنا استعفیٰ داخل کر دیا۔ بالآخر بڑی مشکل سے ان کو اس پر راضی کیا جا سکا کہ وہ استعفیٰ واپس لیں حالانکہ حکومت اور پبلک دونوں یہی رائے رکھتے تھے کہ اُن کے بھائی کے جرم اور اُن کے سرکاری فرائض میں کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن وہ یہی کہے جاتے تھے کہ اخلاقی طور پر میں اپنے چھوٹے بھائی کی تربیت کا ذمہ دار ہوں۔ اس لئے اس کے ساتھ مجھے بھی اس جرم کی کچھ نہ کچھ سزا ضرور بھگتنا چاہئے۔

(۲) جنرل نوگی روس و جاپان کی جنگ کے سلسلے میں بہت مشہور ہوئے ہیں انہوں نے اپنی بیوی سمیت خودکشی کر لی تھی۔ کیونکہ انہیں ہمیشہ یہی خیال رہتا تھا کہ پورٹ آرتھر کی شہرۂ آفاق فتح کے موقع پر میں نے اپنے ہم وطنوں کی بہت سی قیمتی جانیں ضائع کر دی تھیں۔

(۳) ۱۹۳۱ء میں جب ایک نوجوان فوجی افسر کو منچوریا جانے کا حکم ملا تو اُس کی بیوی نے خودکشی کر لی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اپنے ملک کے ساتھ میری محبت کا تقاضہ یہی ہے کہ میں اپنے خاوند کی توجہ میدانِ جنگ سے ہٹا کر اپنی جانب تقسیم نہ کروں۔ اگر میں مر جاؤں گی تو میرا خاوند اچھی طرح لڑ سکے گا۔ ادھر اُسے کسی چیز کی فکر نہ ہوگی دیکھئے قربانی کی کیسی شاندار مثال ہے۔

(۴) جاپانیوں کی وطن پرستی اور مادرِ وطن کی خاطر قربانیوں کی مثالیں اتنی کثرت سے ہیں کہ اگر انہیں لکھا جائے تو بڑی بڑی جلدیں بھر جائیں لیکن یہاں میں ایک قصہ اور لکھنے پر اکتفا کروں گا۔ یقین ہے کہ یہ قصہ ہر پیر و جوان کے دل میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیگا۔

تین انسانی بم

تین انسانی بم کیا ہیں؟ سنئے شنگھائی کے حملے کے تمام واقعات میں کردم ڈویژن کی سفرمینا پلٹن کے تین سپاہی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی بے مثل قربانی اور شجاعت ہر جاپانی کے دل میں ہمیشہ ہمیشہ جاگزیں رہے گی۔ جاپان کے دورِ جدید میں کسی واقعے نے قوم پر اتنا جوش و خروش پیدا نہیں کیا۔ جتنا ان تینوں کے انتہائی وطن پرستی کے کارنامے نے۔

۲۲ر فروری ۱۹۳۲ء کو علی الصبح جب سخت سردی پڑ رہی تھی سفرمینا پلٹن کے ان تین سیکنڈ کلاس سپاہیوں نے اپنی جانیں اس لئے قربان کر دیں کہ چاپئی محاذ مایوہنگچن کے سامنے اُن کی فوج دشمن کے مقابلے میں پیش قدمی کر سکے ان تینوں کے نام کیجی اِشیتا، جو سالو روکیٹا گوا اور انوسوکے ساکوی تھے۔ جب محاذ کی دشوار گذار احاطہ بندی توڑنے کی تمام کوششیں بیکار ہو گئیں تو ایک آخری اور جانبازانہ کوشش کے طور پر یہ تینوں نوجوان ایک بارہ فٹ لمبا نل لیکر جس میں خطرناک مادۂ آتش بھرا ہوا تھا اور جس کا فیوز جل رہا تھا گولیوں کی بارش کے سامنے آگے بڑھے اور کانٹے دار جال کے اوپر بم کے ساتھ بے تحاشہ کود پڑے۔ بم پھٹا اور دشمنوں کی احاطہ بندی میں ایک خلا پیدا ہو گیا پس پھر کیا تھا۔ جاپانی فوج دوڑ پڑی اور چینیوں کو پسپا کر دیا۔ لیکن یہ تینوں ہیرو پھر کبھی واپس نہ آئے۔

کیپٹن تاکی متسوشیٹا نے جو اس سفرمینا کی کمان کر رہے تھے سب سے پہلے اس کارنامے کا صحیح اور مفصل حال بیان کیا۔ انہوں نے اس روح کو گرما دینے والے واقعے کا حال اپنے ہیڈکوارٹر سے چیاپے پر واپس آنے کے بعد فوراً ہی لکھ لیا تھا۔ جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

کردم ڈویژن کو حکم ملا تھا کہ ۲۲ر فروری کو ساڑھے پانچ بجے صبح مایوہنگچن محاذ پر حملہ کرے۔ اور اس پر قبضہ کرے۔ سفرمینا پلٹن چونکہ میرے ماتحت تھی، اس لئے ایک دن قبل میں نے حکم دیا کہ تار کی احاطہ بندی کو توڑ کر راستہ بنانے کی طیاری کی جائے تاکہ ہماری پیدل فوج چینی خندقوں پر حملہ کر سکے۔

اس سلسلے میں ہم بانس کے بموں سے کام لیتے تھے۔ یہ بم اس طرح بنائے جاتے تھے کہ چار انچ موٹا اور بارہ فٹ لمبا بانس لیکر اس میں مادۂ آتش گیر بھر دیا جاتا تھا۔ اور فیوز لگا دیا جاتا تھا۔ کانٹے دار تار کو توڑنے کے لئے رضاکاروں کے دو گروہ بنائے گئے۔ پہلا گروہ تو بائیں جانب تار توڑ کر تیس فٹ چوڑا راستہ نکال لینے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے گروہ کو کسی طرح کامیابی نہ ہوتی تھی۔ علی الصبح انہوں نے ایک آخری کوشش کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اور پیٹ کے بل رینگ کر اپنی خندقوں سے دشمن کی طرف روانہ ہوئے۔ تار کے پیچھے مائی۔۔۔

۱؎ ماخوذ از سالنامہ اوساکا مے نچی۔

... خندق تھی - جو کئی گز چوڑی تھی، اس کے پیچھے چینی خندق تھی جس کے سامنے ... خاردار ... بچھی ہوئی تھی۔ خندقوں میں نشانہ باز موجود تھے تاکہ جو جاپانی ... نشانے پر رکھ ... علاوہ مشین گن بھی برابر گولہ باری ... ۔

... کاٹنے کے لئے تار کو اڑانے کی متعدد بار کوشش کی گئی لیکن ناکام رہی ... وہ لوگ جو بانس کے ... ہوئے بم لے کر بڑھتے تھے ... یا تو کام آجاتے تھے، یا زخمی ہوجاتے تھے، اگر وہاں تک پہنچ بھی جاتے تھے تو اتنا وقت نہ ملتا تھا، کہ بم کو موقعے سے رکھ کر فیوز جلادیں، اس سے پیشتر ہی چینی ان کو نشانہ بنا لیتے تھے۔

ایک آخری جانبازانہ کوشش کے لئے تین نوجوانوں نے اپنے آپ کو پیش کیا اور کہا کہ چاہے اس سلسلے میں ہم زخمی یا ہلاک ہی کیوں نہ ہو جائیں، ہم یہ تل فیوز جلا کر لیجانے کو طیار ہیں، تاکہ تار کسی نہ کسی طرح ضرور اڑا دیا جاسے۔

وقت بہت تھوڑا تھا۔ اور پیدل فوج کی پیشقدمی کا وقت بہت قریب آگیا تھا۔ ساری فوج کی اور اپنے دستے کی عزت اور ذلت کا سوال تھا۔ کیونکہ تاروں میں سے راستہ طے بغیر چینی محاذ پر حملہ کامیاب نہ ہوسکتا تھا۔

جب پو پھٹ رہی تھی، اور صبح کی پہلی کرن افق پر نمودار ہو رہی تھی یہ تینوں نوجوان اپنی خندقوں سے نکلکر چینی محاذ کی طرف روانہ ہوئے۔ جگہ جگہ بم کے گولوں سے بڑے بڑے گڑھے ہوگئے تھے۔ ان گڑھوں میں یکے بعد دیگرے پناہ لیتے ہوئے یہ اپنے پُرخطر راستے پر بڑھ رہے تھے۔

جب تار تھوڑی دور رہ گئے تو یہ تینوں نوجوان فیوز جلتا ہوا بم لئے ایک دفعہ جان پر کھیل کر جھپٹ پڑے۔ اور قریب پہنچکر تاروں کی جڑ میں بم پھینک دیا۔ فوراً ہی یہ تل ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ پھٹا۔ تار اڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ تینوں بہادر بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئے۔

لیکن ان کی جانیں بیکار نہیں گئیں۔ کیونکہ تیس فٹ چوڑا راستہ نکل آیا تھا جس میں سے جاپانی فوج نے فاتحانہ طور پر پیش قدمی کی گویا یہ "تین انسانی بم" تھے جنہوں نے اپنے گوشت پوست سے ناکہ بندی کو توڑا۔ یہی وہ قابل قدر جذبہ ہے جس نے جاپانی فوج کو سب سے ممتاز کر دیا ہے۔ اور یہی وہ خوبی ہے جس پر بدقسمتی سے ہمیں زیادہ فخر کرنے کا موقع حاصل نہیں ہے۔

ان تینوں بہادروں کے کارنامے نے ساری قوم کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ گولیوں کی بارش میں ان کی جانبازی درحقیقت جاپانی سپاہیوں کی غیر معمولی شجاعت کی مظہر ہے۔ جب حملے کا وقتی ہنگامہ ختم ہوا۔ تو قوم کی توجہ اور ہمدردی ان شہدائے وطن کے والدین اور خاندانوں کی طرف ہوئی۔ اب تک محکمۂ جنگ نے یہ اصول ... کر رکھا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے لئے چندہ نہ لیتا تھا لیکن اب پہلی دفعہ ... اصول توڑا۔ چنانچہ جس دن جاپان میں یہ خبر آئی، اسی دن شام سے پہلے پہلے ... ان کے خاندانوں کے لئے ایک ہزار ین ... ان تینوں سپاہیوں کے بچوں کو پرورش کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ اس کی دولاکھ ین کی جائداد ان بچوں کی تعلیم کے لئے وقف ہے۔

اس واقعے کے چند دن بعد شنگھائی سے ایک اطلاع موصول ہوئی کہ ان کے تین کٹے ہوئے بازو ایسے جھلس گئے تھے کہ پہچانے نہ جاتے تھے۔ فتح کے بعد تلاش کر کے حاصل کئے گئے۔ اور ساری فوج نے ان کی پرستش کی۔ ان تین انسانی بموں کے اعضاء مل جانے کے بعد سنیما موٹو کی سرکردگی میں نئی عقیدتمندی کے ساتھ ان کے کارنامے دہرائے گئے۔ ان کی ... کے گیت گائے گئے اور ان کی روحوں کے لئے دعا کی گئی۔

جب ان بہادروں کی جانبازی کا حال ہز مجسٹی شاہ جاپان کو معلوم ہوا تو انہوں نے ان شہدائے وطن کی ماؤں کے لئے مالی امداد منظور فرمائی۔ اوساکا مے نیچی اور ٹوکیو نچی نچی کے زیر اہتمام ان تینوں بوڑھی ماؤں کو ان کے مواضعات سے ٹوکیو بلایا گیا۔ اور لفٹنٹ جنرل سداؤ آراکی وزیر جنگ نے انہیں اپنا مہمان بنایا۔ اس موقع پر انہوں نے فرمایا۔

"تمہارے لڑکوں کی بہادری کے کارنامے ہز مجسٹی شاہ جاپان کی خدمت میں عرض کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ایسا اعزاز ہے۔ جو شاذ و نادر ہی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ دراصل میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ ان نوجوانوں کے اس شاندار کارنامے کی تعریف کرسکوں۔ انہوں نے جاپانیوں کی پوشیدہ روح کا صحیح نمونہ پیش کیا۔ قابل رشک ہیں وہ مائیں جنہوں نے ایسے سپوتوں کو جنم دیا۔"

بن راکو پیٹ شو تھیٹر اوساکا قدیم زمانے کا ایک نہایت ہی معزز اور ممتاز تھیٹر ہے۔ جو ہمیشہ علمی اور ادبی تمثیلیں پیش کیا کرتا ہے۔ لیکن اس نے بھی

اپنے سابقہ رویئے کے خلاف ایک جدید کھیل طیار کیا۔ جس میں مایوہنگچن کے یہ تینوں ہیرو دکھائے گئے تھے

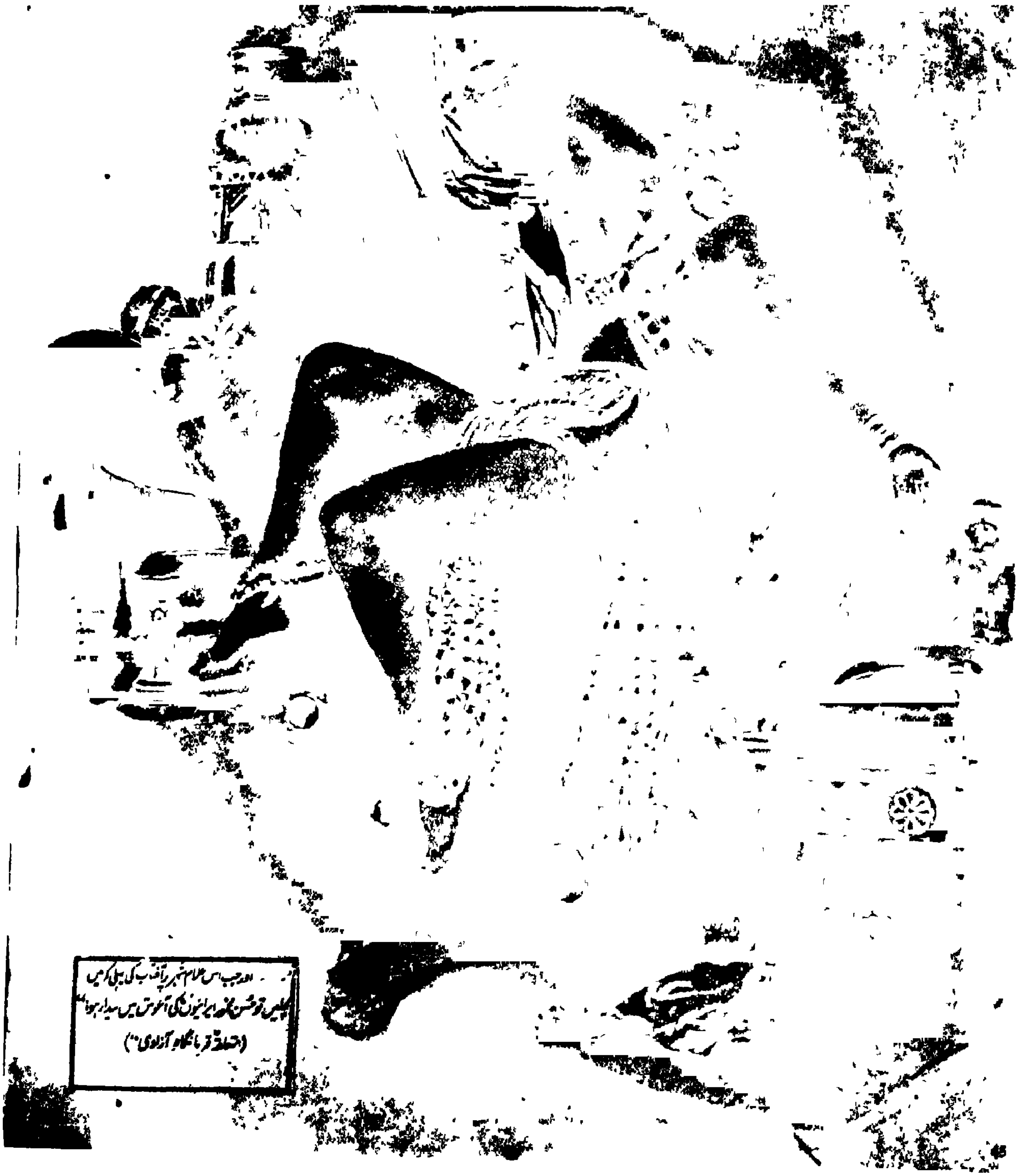
۲۶-اپریل کو جب ان تینوں سپاہیوں کی راکھ جاپان پہنچی تو جس شہر سے گذری لوگوں نے اس کا زبردست احترام کیا۔ اور جس وقت ٹوکیو کے نشی ہانگ وینجی مندر میں وہ چڑھائی گئی تو لاکھوں آدمیوں نے اپنی آخری نذر عقیدت پیش کی۔

اس واقعے کے بعد ہی سارے جاپان کے بچے اپنے کھیلوں میں اُن کی نقلیں کرنے لگے۔ ہر کھیل کے میدان میں چھوٹے چھوٹے بچے مایوہنگچن کے ان تین "انسانی بھول" کا پارٹ ادا کرتے نظر آتے تھے۔ اور اس کارنامے کے گیت پر گیت طیار ہوئے۔ اور اُن کے ریکارڈ کثرت سے فروخت ہوئے جس سے اُنکی جاں نثاری کے اعتراف اور اُن کی غیر معمولی مقبولیت کا ثبوت ملتا ہے۔ آج بھی ان گیتوں کے جملے اور مصرعے زبان زدِ خاص و عام ہیں اور اب تک "مایوہنگچن کے سامنے خندقوں میں" والی نظم بکثرت گائی جاتی ہے۔

غزل (مسلسل)

(جناب نواب جعفر علی خاں صاحب آثر لکھنوی)

رنگین خیالوں کا اک باغ لگانا ہے   آج اُن کے تصور کو پھولوں میں بسانا ہے
ہر برگ کی جنبش میں، ہر تار کی لرزش میں   گرداب کی گردش میں تیرا ہی ترانا ہے
ہر نغمۂ شیریں میں، ہر پردۂ رنگیں میں   چھپ چھپ کے تجھے اپنی آواز سنانا ہے
ہر رنگ میں شامل ہے، ہر رنگ سے بیگانہ   سمجھے تو یہ سمجھے ہیں، جانا تو یہ جانا ہے
انوار ترے جلوے، اسرار ترے پردے   کیا جلوے ہیں، کیا پردے، سچ ہے کہ یگانا ہے
خورشید و مہ و انجم چلتے ہیں اشاروں پر   گردش سے نگاہوں کی گردش میں زمانا ہے
لیلائے تخیل کا زیور ہے۔ ترا پرتو   سلمائے معانی کا آئینہ ہے، شانا ہے
خمیازۂ رنگیں ہے تو صبح دمیدہ کا   صہبائے تجلی سے عالم کو جھکانا ہے
شبنم کے بھی موتی ہیں، مظلوم کے آنسو بھی   یہ جوڑ کے رکھ لینا، وہ تجھکو لٹانا ہے
بلبل کی ہو شیوائی یا گل کی ہو رعنائی   افسانہ در افسانہ تیرا ہی فسانا ہے
پروانۂ سوزاں ہو، یا شمع فروزاں ہو   جی تجھ پہ جلانا ہے، کو تجھ سے لگانا ہے
ہر شے میں ترا جلوہ، ہر شے ہے ترا جلوہ   پھر کس سے یہ پردا ہے، منہ کس سے چھپانا ہے
مشہود بھی، شاہد بھی، مستور بھی، ظاہر بھی   پانا تجھے کھونا ہے، کھونا تجھے پانا ہے
یہ نقش بنا ڈالا، وہ نقش مٹا ڈالا   ہر آن سنورنے کو اک تازہ بہانا ہے
ہے عشق کے پردے میں آپ اپنا تماشائی   سو طرز سے اک محفل امکاں کی سجانا ہے
اللہ ری محبوبی، اللہ ری محجوبی   نزدیکی و مہجوری شوخی کا ٹھکانا ہے
پھوٹیں گی آخر کرنیں، انوارِ حقیقت کی   اس دل کو مگر پہلے اک نقطے پہ لانا ہے



اور جب اس غلام شہر پر آفتاب کی بجلی گری
پلیس تو حسن مجسمہ ایرانیوں کی آغوش میں بیدار ہوا
(افسانۂ قربانگاہ آزادی")

اپنے سابقہ رویئے کے خلاف ایک جدید کھیل طیار کیا جس میں مایوہنگچن کے یہ تینوں ہیرو دکھائے گئے تھے

۲۴- اپریل کو جب ان تینوں سپاہیوں کی راکھ جاپان پہنچی تو جس شہر سے گذری لوگوں نے اس کا زبردست احترام کیا۔ اور جس وقت ٹوکیو کے نشی ہانگ وہجی مندر میں وہ چڑھائی گئی تو لاکھوں آدمیوں نے اپنی آخری نذرِ عقیدت پیش کی

اس واقعے کے بعد ہی سارے جاپان کے بچے اپنے کھیلوں میں اُن کی نقلیں کرنے لگے۔ ہر کھیل کے میدان میں چھوٹے چھوٹے بچے مایوہنگچن کے ان تین "انسانی بھول" کا پارٹ ادا کرتے نظر آتے تھے۔ اور اس کارنامے کے گیت پر گیت طیار ہوئے۔ اور اُن کے ریکارڈ کثرت سے فروخت ہوئے جس سے انکی جان نثاری کے اعتراف اور اُن کی غیر معمولی مقبولیت کا ثبوت ملتا ہے آج بھی ان گیتوں کے جملے اور مصرعے زبان زدِ خاص و عام ہیں اور اب تک "مایوہنگچن کے سامنے خندقوں میں" والی نظم بکثرت گائی جاتی ہے۔

غزل (مسلسل)

(جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی)

رنگین خیالوں کا اک باغ لگاتا ہے — آج اُن کے تصوّر کو پھولوں میں بساتا ہے
ہر برگ کی جنبش میں، ہر تار کی لرزش میں — گرداب کی گردش میں تیرا ہی ترانا ہے
ہر نغمۂ شیریں میں، ہر پردۂ رنگیں میں — چھپ چھپ کے تجھے اپنی آواز سنانا ہے
ہر رنگ میں شامل ہے، ہر رنگ سے بیگانہ — سمجھے تو یہ سمجھے ہیں، جانا تو یہ جانا ہے
انوار ترے جلوے، اسرار ترے پردے — کیا جلوے ہیں، کیا پردے، سچ ہے کہ یگانا ہے
خورشید و مہ و انجم چلتے ہیں اشاروں پر — گردش سے نگاہوں کی گردش میں زمانا ہے
لیلائے تخیل کا زیور ہے۔ ترا پر تو — سلمائے معانی کا آئینہ ہے، شانا ہے
خمیازۂ رنگیں ہے تو صبح دمیدہ کا — صہبائے تجلی سے عالم کو چھکانا ہے
شبنم کے بھی موتی ہیں، مظلوم کے آنسو بھی — یہ جوڑ کے رکھ لینا، وہ تجھکو لٹانا ہے
بلبل کی ہو شیوائی یا گل کی ہو رعنائی — افسانہ در افسانہ تیرا ہی فسانا ہے
پروانہ سوزاں ہو، یا شمع فروزاں ہو — جی تجھ پہ جلانا ہے، کو تجھ سے لگانا ہے
ہر شے ہیں ترا جلوہ، ہر شے ہے ترا جلوہ — پھر کس سے یہ پردا ہے بنہ کس سے چھپانا ہے
مشہود بھی، شاہد بھی، مستور بھی، ظاہر بھی — پانا تجھے کھونا ہے، کھونا تجھے پانا ہے
یہ نقش بنا ڈالا، وہ نقش مٹا ڈالا — ہر آن سنورنے کو اِک تازہ بہانا ہے
ہے عشق کے پردے میں آپ اپنا تماشائی — سو طرز سے اِک محفل امکاں کی سجانا ہے
اللہ ری محبوبی، اللہ ری مجبوبی — نزدیکی و مہجوری شوخی کا ٹھکانا ہے
پھوٹیں گی آثر کرنیں، انوارِ حقیقت کی — اِس دِل کو مگر پہلے اِک نقطے پہ لانا ہے


اور جب اس علام شہر پر آفتاب کی پہلی کرنیں
چمکیں تو حسن مخمور ایریون کی آغوش میں بیدار ہوا"

ڈلیم، دھلی





قربانگاہِ آزادی

تاریخ بابل کا ایک خونیں ورق

(از ملک حسیب احمد بی اے آنرز)

آیئے، حُسن وعشق کو شبستانِ مُحبّت کی خلوتوں میں مچلتے ہوئے چھوڑ کر، ہم آپ جگ بیتی کہیں۔ اور آج تاریخ کے صفحات خونیں سے بابل کی داستان پڑھیں!۔

کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے ——— تمدّنِ انسانی اپنی ابتدائی منزلوں میں تھا ——— ایشیا میں، ایک عظیم سلطنت، گہوارۂ تہذیب تھی۔ لازوال دولت کی مالک، جاہ وحشم کی پروردگار، خوش باش رعایا کا مامن۔ بابل اس سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ بابل کے مکانات خوبصورت اور عالیشان تھے۔ لوگوں کے پاس زر وجواہر کی اتنی افراط تھی کہ زمانۂ قدیم کے لوگ بابل والوں کی امارت کی قسم کھایا کرتے تھے۔

بابل ——— جہاں لاکھوں انسان حیاتِ انسانی کی مصروفیتوں میں مشغول، زندگی کو بہار سے زیادہ مسّرت آفریں مانتے تھے۔ . . . جہاں عشق کامگار تھا۔ اور حُسن ظفر موج . . . !

یہ سب اس زمانے کی باتیں ہیں۔ جب سائنس نے انسانی زندگی کی شعریت کو تباہ نہ کیا تھا!

برسوں، صدیوں، مدّتوں، بابل والے امن اور چین سے رہتے رہے، حتّٰے کہ ایرانی بادشاہ کیکاؤس کو حرص و آز نے اُکسایا اور وہ جذبۂ جہانداری کے نشے میں چور بابل پر چڑھ دوڑا۔ آن کی آن میں بابل کی آزادی، حملہ آور کے قدموں پر تڑپ تڑپ کر جان توڑ رہی تھی، بابل کچھ اس انداز سے فتح کیا گیا کہ عام لوگوں کو خبر تک نہ ہوئی کہ وہ اس قدر جلد ایران اور ایرانیوں کے غلام ہوگئے ہیں . . . رات کی تاریکی میں، جب دوشیزگانِ بابل جوانی کی نیند سو رہی تھیں اور شباب جہانبانی کے پُرشوکت خواب دیکھ رہا تھا، کیکاؤس نے فرات کا پانی بند کر دیا۔ تو بابل کے حکمرانوں نے نااُمید ہو کر شہر پناہ کے دروازے کھول دیئے۔ . . . ایرانی سپاہ جوق در جوق اندر گھس آئی۔ . . . ایرانی سپاہیوں کو بابل کے مدہوش لوگوں نے شرابِ آتشیں کے چھلکتے ہوئے، جام رات کے دھندلکے میں پیش کئے اور جب اس غلام شہر پر آفتاب کی پہلی کرنیں مچلیں تو حسنِ مخمور ایرانیوں کی آغوش میں بیدار ہوا . . . !

. . بابل تین ایرانی بادشاہوں کا یکے بعد دیگرے غلام رہا، یہاں تک کہ دارا کا آفتابِ تخت ایرانی پر طلوع ہوا۔ اور بابل والوں کا جذبۂ انتقام بھڑک اُٹھا۔ . . . مگر مقابلہ غلامی اور جہانگیری میں تھا۔ . . . زیردستی اور زبردستی کی جنگ تھی . . .

لیکن اس پر بھی بابل والوں نے چپکے ہی چپکے ہر ممکن طیّاری کر لی۔ اسلحہ جات جنگ مہیا کر لئے گئے، ہر تہ خانہ میگزین بن گیا۔ لاکھوں تیر بنائے اور جمع کرائے گئے لیکن سامانِ رسد تو پوشیدہ طور پر جمع نہ کیا جاسکتا تھا۔ . .

. . . یہ صحیح ہے کہ کیکاؤس نے ایک لاکھ یہودیوں کو شہر بدر کر دیا تھا لیکن ابھی کھانے والے لاکھوں کی تعداد میں تھے، اور رسد کی ضرورت لابُداور شدید۔ اس پر بھی بغاوت کے سرغنہ موقعے کے بے صبری سے منتظر تھے۔

آخرکار وقت آگیا، اور بابل کا ہر باشندہ ایرانیوں پر ٹوٹ پڑا۔ شہر پناہ کے دروازے بند کر دیئے گئے! فصیلوں پر بابل کی سپاہ تیر وکمان لیکر ہر اُس شخص کو ختم کر دینے کو طیار تھی، جو اُن کی آزادی کو ختم کر دینے کی کوشش کرے۔

دارا کی ہوسِ عالمگیری اس خبر کی تاب کیونکر لاتی؟ چند ہی دنوں میں بابل کی فصیلوں کے نیچے ایرانی شمشیر خون آشامی کے لئے بے نیام تھی! محاصرہ کئے ہوئے ایک مدّت گذر گئی، اور بابل والوں کی رسد کم ہونی شروع ہوئی۔ رسد جس قدر کم ہوتی گئی، تشویش بڑھتی گئی۔ شہر میں قحط پھیل گیا، اور لوگ بھوکے مرنے لگے۔ . . . رسد تو زیادہ نہ کی جاسکتی تھی،

لیکن آبادی کا کم کرنا اضطراراً ممکن تھا۔ بابل والوں نے فیصلہ کیا کہ آبادی سے بوڑھوں کا اخراج کر دیا جائے۔ بوڑھے مرد، بوڑھی عورتیں، اپنے گھروں اور گھروں سے زبردستی کھینچ کھینچ کر لائے گئے۔ اور انہیں شہر پناہ کے باہر بے خانماں چھوڑ دیا گیا کہ جہاں انہیں قسمت لے جائے چلے جائیں ۔ ۔ ۔ !

دن گذرتے گئے رسد کم ہوتی گئی - آخرکار فیصلہ کیا گیا کہ آزادی کی خاطر صرف سپاہیوں کی سلامتی ہی مقدم اور عزیز ہے۔ فوراً اعلان کیا گیا کہ سب عورتوں کے گلے گھونٹ دیئے جائیں، مگر مورخ وضاحت نہیں کرتا کہ بچوں کی معصوم جانیں کیونکر لی گئیں۔ ہاں صرف اتنا معلوم ہے کہ ہر گھر ایک ماتم کدہ بن گیا۔ جہاں غلغلۂ عیش بلند ہوا کرتا تھا، وہاں موت کی ہچکیاں سنائی دیتی تھیں۔ ہر طبقے اور ہر عمر کی عورتیں جوان، بوڑھی، کنواری بیاہی بیوہ، دوشیزگانِ قمر جمال شباب کے بوجھ سے دبی ہوئیں، امنگوں بھری جوانی سے بھرپور، فتوحاتِ حسن کے زریں خوابوں سے آخری بار گلے مل کر موت سے ہمکنار ہونے کو پابجولاں لے جائی جا رہی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔

اس قتلِ حسن کے لئے شہر کے مخصوص مقامات پر انتظام کیا گیا۔ ہزاروں گورکن خوبصورتی کو دفن کرنے میں مشغول ہوگئے! آیئے ہم ان بے گناہ عورتوں کا تصور کریں جنہیں نامحرم ہاتھ بازاروں میں گھسیٹے لئے جا رہے تھے، جو ظالموں سے چھپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں، جو جلادوں کے قدموں پر پچھاڑیں کھا کھا کر گر رہی تھیں۔ اور جن کی اٹھتی جوانی بے احساس انبوہ میں بے رحمی سے مسلی جا رہی تھی!

مورخِ وقت نے بے گناہ مقتولوں کی تعداد نہیں لکھی۔ شائد اس کا خوفزدہ قلم صحیح تعداد لکھتے ہوئے کانپ گیا ہوگا!

محاصرہ جاری رہا۔ انیس ماہ گذر گئے ۔ ۔ ۔ ایرانی سب جتن کر چکے، لیکن بابل فتح نہ ہوا، آخرش جب دارا بہت مایوس ہوگیا تو زوفرس اس کا سب سے بہادر اور چالاک جرنیل بارگاہِ سلطانی میں آیا اور کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد واپس چلا گیا۔ زوفرس نے کہا کہ وہ اپنے تئیں غدار ظاہر کریگا اور بابل والوں سے کہے گا کہ اس کے مشورہ دینے پر کہ محاصرہ اٹھا لینا چاہئے دارا خشمگیں ہوگیا اور اس کو اس کے عہدے سے معزول کر کے نکال باہر کر دیا۔ زوفرس کا خیال تھا کہ وہ اس ترکیب سے بابل والوں کا اعتماد حاصل کر لیگا اور ایرانیوں کا قبضہ بابل پر آسانی سے ہو جائیگا۔ ۔ ۔ کچھ دیر بعد زوفرس دارا کے حضور میں آیا، ناک کٹی ہوئی، بال خاک میں اٹے ہوئے، زخمی کانوں سے خون جاری سیاہ بہا نہ بدن پر کپڑے تار تار۔ دارا کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں، اور جھپٹ کر تخت سے نیچے اتر آیا۔ پوچھا کہ "زوفرس! یہ کیا ماجرا ہے؟ کون ہے جس نے یہ جرأت کی؟ کیا دارا کی بے پناہ قوت اور سخت انتقام کو دنیا بھول گئی؟" زوفرس نے دارا کے کان میں کچھ کہا، اور دارا نے زوفرس کو مستحسن نظروں سے دیکھتے ہوئے شاباش کہا۔

ایک دن علی الصبح (ابھی چڑیوں نے بسیرا بھی نہیں چھوڑا تھا) زوفرس بہ حالِ زبوں بابل کے سب سے بڑے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ شہر پناہ کے محافظوں کے پوچھنے پر زوفرس نے تمام ماجرا کہہ سنایا، اس کے لہجے میں سوز و درد تھا۔ بابل کے لوگوں کو اس پر رحم آیا۔ اور اور زوفرس کو اندر بلا لیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس قوم پرست لیکن دون فطرت جرنیل نے اس قدر اعتماد حاصل کر لیا کہ بابل والوں نے اس کو سپہ سالارِ اعظم مقرر کر دیا۔ اور غضب یہ کیا کہ شہر کے سب دروازوں کی چابیاں بھی اس کے حوالے کر دی گئیں۔

زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ ایرانیوں نے اپنی پوری طاقت سے حملہ کیا، اور زوفرس نے غنیم کے لئے سب دروازے کھول دیئے۔

فتح مندی کے بعد، جنگ و جدال سے اجڑے ہوئے دیار میں صلح و آشتی کی بنیادیں استوار ہونا شروع ہوئیں۔ شہر میں امن اور چین تھا لیکن موسیقی۔ شعریت اور جذباتی محبت کا فقدان، عورت کی نرمی، لچک کی کمی، ۔ ۔ ۔ ۔ شہر بھر میں عورت ایک نہ تھی۔ ۔ ۔ دارا نے اطراف واکناف کی سلطنتوں میں قاصد بھیجے اور درخواست کی کہ وہ جس قدر جوان اور تندرست عورتیں مہیا کر سکیں، بابل بھیجدیں۔

القصہ پچاس ہزار نوجوان عورتوں کے قافلے بابل کی جانب روانہ ہوگئے۔ جب یہ کاروانِ رنگ و بو بابل کے قریب پہنچے تو شہر پناہ کو افق سے نمودار ہوتے دیکھ کر ہر پری وش سوچنے لگی کہ معلوم نہیں، اس کی جوانی کس آغوش میں مچلے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔

—— (تقصاویر از ماتانیا) ——

نعرۂ شباب

(فرسودہ لیڈروں کی انجمن میں)

ہوشیار! اپنی متاعِ رہبری سے ہوشیار
اے جنوں ناآشنا پیریٔ وشیبِ ہرزہ کار!

اُڑ گیا رُوئے نگارِ آسماں سے رنگِ خواب
جھلملاتی شمع! رخصت ہو، کہ اُبھرا آفتاب

ہٹ، کہ اب سعی و عمل کی راہ میں آتا ہوں میں
خلق واقف ہے کہ جب آتا ہوں، چھا جاتا ہوں میں

اے قدامت! یہ کھلی ہے سامنے راہِ فرار
بھاگ، وہ آیا نئی تہذیب کا پروردگار!

کام ہے میرا تغیّر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ "انقلاب" و "انقلاب" و "انقلاب"!

کوئی قوّت راہ سے مجھ کو ہٹا سکتی نہیں
کوئی ضربت میری گردن کو جھکا سکتی نہیں

رنگ سُورج کا اُڑاتا ہے مرے سینے کا داغ
بادِ صرصر کا بدل دیتا ہے رُخ میرا چراغ

سنگ و آہن میں مری نظروں سے چبھ جاتی ہے پھانس
آندھیوں کی، میرے میداں میں اُکھڑ جاتی ہے سانس

دیکھ کر میرے جنوں کو ناز فرماتے ہوئے
موت شرماتی ہے میرے سامنے آتے ہوئے

الاماں، کبڑی، ریا آلودہ پیری! الاماں
اب کڑکتی ہے ترے سر پر جوانی کی کماں

یہ ستم کیا، اے کنیزِ "کفر و ایماں" کر دیا؟
بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قرباں کر دیا!

کر دیا طولِ غلامی نے تجھے کوتہ خیال
جھرّیاں ہیں یہ ترے منہ پر کہ غدّاری کا جال

دیکھتی ہے صرف اپنے ہی کو اپنی دُھندلی نگاہ
سر بھڑک اُٹھا ہے، لیکن دل ابھی تک ہے سیاہ

پوپلے منہ! ختم کر یہ "عاقبت بینی" کا شور
دیکھ اب بزدل! مری "نا عاقبت بینی" کا زور

چہرۂ "امروز" ہے میرے لئے ماہِ تمام
خوفِ "فردا" ہے مری رنگیں شریعت میں حرام

تیر جاتی ہے دلِ فولاد میں میری نظر
خون میرا خندہ زن رہتا ہے موجِ برق پر

اور تمنائیں ہیں تیری سسکیاں بھرتی ہوئی،
اونگھتی، گڑھتی، بلکتی، کانپتی، ڈرتی ہوئی

تیری باتوں سے پڑی جاتی ہے کانوں میں خراش
"کفر وایماں"! "کفر وایماں" تاکجا! خاموش باش!

حُبِ انساں، ذوقِ حق، خوفِ خدا، کچھ بھی نہیں
تیرا "ایماں" چند وہموں کے سوا کچھ بھی نہیں

تیرے جھوٹے "کفر وایماں" کو مٹا ڈالوں گا میں
ہڈیاں اس "کفر وایماں" کی چبا ڈالوں گا میں

ولولے میرے بڑھیں گے ناز فرماتے ہوئے
فرقہ بندی کا سرِ ناپاک ٹھکراتے ہوئے

ڈال دونگا طرحِ نو! اجمیر اور پریاگ میں
جھونک دونگا "کفر وایماں" کو دہکتی آگ میں

کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لانے کے لئے
اک نیا سنگم بناؤں گا زمانے کے لئے

ایک دینِ نو کی لکھوں گا کتابِ زرفشاں
ثبت ہوگا جس کی زریں جلد پر "ہندوستاں"!

اس نئے مذہب پہ سارے تفرقے وارونگا میں
تجھ پہ پھر گردن ہلا کر قہقہے ماروں گا میں

پھر اٹھونگا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا
گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا

خون میں لتھڑی بساطِ "کفر ودیں" الٹے ہوئے
فخر سے سینے کو تانے، آستیں الٹے ہوئے

ولولوں سے، برق کے مانند، لہرایا ہوا،
موت کے سائے میں، رہکر، موت پر چھایا ہوا!

(جوشؔ)

رباعی

(حضرتِ سیماب اکبرآبادی)

ہے کفر گناہ اور اسلام گناہ
یہ کام گناہ، اور وہ کام گناہ
القصہ ہر اک چیز کا اس دنیا میں
اک نام کچھ اور ہے اور اک نام گناہ!

رفتارِ وقت

قضیۂ حبش و ایطالیہ

حبش و ایطالیہ کے قضیے سے جس عالمگیر جنگ کے چھڑ جانے کا اندیشہ کیا جاتا تھا۔ وہ ابھی تک پیش نہیں آیا۔ اور بدقسمتی سے ہمارے پاس وہ مسالہ بھی نہیں ہے، جس سے ہم صحیح طور پر پیش گوئی کرسکیں کہ آیا اب بھی یہ خطرہ باقی ہے یا جاتا رہا۔ اس قضیے کا آغاز اخبار بیں حضرات کو معلوم ہے کہ اٹلی اپنی فوجی قوت کے زعم میں مملکت حبشہ پر فاتحانہ قابض ہونا چاہتا ہے عذر یہ ہے کہ گذشتہ جنگِ عظیم میں دولِ اتحاد کو مالِ غنیمت میں قطعاتِ ملک مل گئے، اور برطانیہ و فرانس نے اپنے اپنے حصوں پر قبضہ کرلیا۔ لیکن اٹلی اس سلسلے میں محروم رہی۔ اب سائینور مسولینی اطالوی قوم کے ترجمان کی حیثیت سے اس ناانصافی کی جو معاہدۂ ورسائی کی رو سے اطالوی قوم کے ساتھ کی گئی، تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ اس تلافی کے لئے ناطاقت حبشہ کی جانب نگاہ اٹھانا بالکل فطری تھا، کیونکہ

بہتر نہیں کوئی ناتواں سے بڑھکر
احقر نہیں کوئی ناتواں سے بڑھ کر
از روئے شریعتِ نظامِ کم و بیش
کافر نہیں کوئی ناتواں سے بڑھ کر

یہ تلافی بآسانی ہو بھی جاتی، اس لئے کہ حبشہ کمزور ہے، اور اٹلی طاقتور، اور جس طرح جاپان اپنی قوت کے زور میں چین کے قطعاتِ ملک ایک ایک کرکے ہضم کرتا چلا جارہا ہے۔ اسی طرح اٹلی بھی مجلسِ اقوام کی چیخ پکار کے باوجود اپنا مقصد حاصل کرلیتی۔ لیکن دقت یہ آپڑی کہ چین میں تو برطانیۂ عظمیٰ کا کوئی مفاد نہیں تھا۔ اور حبشہ سے اس کا مفاد وابستہ ہے۔ بات یہ ہے کہ دریائے نیل جو مصر و سوڈان کی جان ہے۔ اسی حبشہ کے ملک میں جھیل تسانا سے نکلتا ہے۔ اور اٹلی کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ وہ اس نکاس کا رُخ اپنے مقبوضہ ملک ایریٹریا کی طرف پھیر دے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر اٹلی اس مقصد میں کامیاب ہوگئی، تو مصر و سوڈان جو برطانیہ کے زیرِ اقتدار ہیں، خشک و غیر آباد ہوکر رہجائیں گے۔ یہی چیز تھی، جس نے برطانیہ کو اٹلی کے جارحانہ مقاصد کی سختی سے مخالفت کرنے پر آمادہ کیا۔ اور چونکہ مجلسِ اقوام درحقیقت برطانیۂ عظمیٰ ہی کے بل بوتے پر قائم ہے۔ اس لئے اس نے بھی درشت رویہ اختیار کیا۔ اور اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اپنے آئین کے تعزیری دفعات کو اٹلی کے خلاف متحرک کیا۔ لیکن اس کے باوجود اٹلی اپنے ارادوں سے باز نہ آئی۔ اور موجودہ صورت یہ ہے کہ مجلسِ اقوام نے تعزیرات کے نفاذ کی تاریخ مقرر کردی ہے۔ اور اطالوی فوجیں اس کی پروا کئے بغیر حبشہ میں جارحانہ اقدام کررہی ہیں۔ سُنا اٹلی کیا کہہ رہی ہے؟

قانون نہیں ہے کوئی فطرت کے سوا
دنیا نہیں کچھ نمودِ طاقت کے سوا
قوت حاصل کر، اور مولےٰ بن جا
معبود نہیں ہے کوئی قوت کے سوا

چنانچہ ایک تازہ تقریر میں تو سائینور مسولینی نے یہ بھی اعلان کردیا ہے، کہ وہ مجلسِ اقوام کے تعزیرات کا بھی مقابلہ کریگا۔

تعزیرات کی حیثیت سردست اقتصادی ہے یعنی اٹلی سے تجارتی اور اقتصادی تعلقات کا انقطاع، لیکن اگر ان تعزیرات سے مقصد نہ حاصل ہوا، تو از روئے آئین، مجلسِ اقوام کو حربی تعزیرات کا اعلان بھی کرنا پڑیگا اور وہی وقت ہوگا، جبکہ مختلف دولِ یورپ کے دعاوی کا عملی امتحان ہوگا۔ اور یہ معلوم ہوجائیگا کہ کون کون حکومتیں محض زبانی باتیں کرنے والی ہیں، اور کون واقعی طاقتور کے مقابلے میں کمزور کا ساتھ دیتی ہیں۔

خوش بود گر محکِ تجربہ آید بمیاں
تا سیہ روئے شود ہر کہ در و غش باشد

آئینِ نو

ع مبارکباد مرگِ نو بہ استاد!

ہندوستان کا نیا دستور جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نام سے شاہی منظوری حاصل کرچکا ہے۔ عنقریب اس ملک میں نافذ العمل ہوجائے گا۔ اور اس کے عملی نفاذ کے ابتدائی مراحل اس وقت طے ہورہے ہیں۔ اس آئین کو اصولاً ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں مسترد کرچکی ہیں، اور جن معدودے چند جماعتوں نے اسے قبول کرنے پر آمادگی ظاہر

گیا ہے، وہ بھی اسے بالکل ناقص اور نکمّا سمجھتی ہیں۔ اور اُنہوں نے اسے اِس لئے قبول نہیں کیا ہے، کہ اِس میں کوئی خوبی ہے، بلکہ اِس لئے کہ اُن کے لئے اِس کے قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہے، لیکن ہندوستان کی بے بسی اور بے چارگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ جس چیز کو ہم ناقابلِ قبول سمجھتے ہیں، وہ ہمارے گلے میں پھندا بنا کر ڈالی جا رہی ہے، اور لُطف یہ کہ ہمیں اِتنا طفلِ نادان بتایا جاتا ہے کہ اپنا نفع نقصان سمجھنے کی اہلیت بھی ہم سے مفقود سمجھی جاتی ہے۔ اور ہمارے جذبات کے علی الرغم دُنیا کو بتایا جاتا ہے کہ یہ آئینِ حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں کے نفع کے لئے نافذ کیا ہے۔ اور ہندوستانی اسے ناقابلِ قبول کہہ کر سخت ناسمجھی اور ناواقفیت کا اظہار کر رہے ہیں۔

نئے آئین کی رُو سے صوبہ جات میں ایسے مجالسِ قانون ساز قائم ہونگے جن میں غیر سرکاری اراکین نہ ہونگے اور وزرا بھی منتخب شدہ اراکین میں سے ہونگے؛ اِسی طرح مرکز میں فیڈرل اسمبلی ہوگی، جس میں غالب حصّہ منتخب شدہ اراکین کا ہوگا لیکن یہ انتخاب براہِ راست نہ ہوگا۔ جیسا آجکل لیجسلیٹو اسمبلی کا ہوتا ہے۔ بلکہ صوبہ جات کی مجالسِ قانون ساز کے اراکین ان اراکین کا انتخاب کریں گے۔ پھر زیادہ تر صوبوں میں ایک ایوانِ دوم بھی ہوگا۔ جس میں آجکل کی کونسل آف اسٹیٹ کی طرح اونچے طبقے کے لوگ ہونگے، اور اِس کے باوجود گورنر کے اختیاراتِ امتیازی اتنے وسیع رکھے گئے ہیں کہ مجالسِ قانون ساز کی ذمّہ دارانہ حیثیت سلب ہو گئی ہے۔ مرکز میں فیڈرل اسمبلی سرکاری اراکین سے تو تقریباً خالی ہوگی، لیکن ایک معتد بہ حصّہ اس کا والیانِ ریاست کے نامزد کردہ اراکین پر مشتمل ہوگا۔ اور پھر اس کے سر پر بھی ایک ایوانِ دوم اور وائسرائے کے اختیاراتِ امتیازی مسلط ہوں گے۔ اس طرح اِس آئین کے جمہوری عنصر کو چاروں طرف سے گھیر گھار کر مُقیّد اور بے اثر کر دیا گیا ہے، اور اِس آئین پر حضرت اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر پورے طور پر منطبق ہوتا ہے ؎

مہربانی سے مجھے گودام کی کُنجی تو دی
لیکن اب باقی نہیں گیہوں فقط گھُن کو کیا کرُوں

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی شرمناک فرقہ وارانہ کشمکش اس سے بہتر سلوک کی مستحق بھی نہ تھی۔ اور ہم اتنا اور اضافہ کر سکتے ہیں کہ اگر آج یہاں کے مختلف فرقے ناقوس و اذان کے ہنگاموں سے دستبردار ہو کر کسی ایک لائحۂ عمل پر متفق ہو جائیں تو اس ناقص آئین سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اِس میں مؤثر تبدیلیاں بھی کرا سکتے ہیں! لیکن یہاں تو "کیا ہاتھ مرے پہنچینگے داماںِ بُتاں تک ۔ اپنے ہی گریباں سے فرصت نہیں ملتی" کا ہنگامہ برپا ہے۔ اللہ رحم کرے!

رباعی

حضرت سیماب اکبرآبادی

گھیرے ہوئے ہر طرف سے فطرت ہے مجھے
جو کام ہے، فطرت کی ودیعت ہے مجھے
ڈر کر نہیں کرتا میں کبھی کوئی گناہ
کر کے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے مجھے؟

میخانوں میں بہرِ میکشی جاتا ہوں
سرگشتۂ کیفِ بے خودی جاتا ہوں
جس آگ سے روز مانگتا ہے تو پناہ
بھر کر میں اُسے جام میں پی جاتا ہوں

دُنیا کا پہلا فسانۂ محبت

پہلا بوسہ

(سید فرید جعفری مچھلی شہری، مدیر نیرنگِ خیال ویکلی لاہور)

"جوش بھائی کی اُن چند رنگین راتوں کے نام جن کی کیفیات نے "مجھے شاعرِ انقلاب بنا دیا ہے" فرید

گرمی کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی، اور آدم و حوا مزے سے بیکہ "آفتابی غسل" کر رہے تھے، دن کے کھانے کے بعد یہ اُن کا معمول سا ہو گیا تھا۔

حوّا، آدم کے گالوں کو محبت سے سہلا رہی تھیں۔ یکایک وہ بولیں "تمہارے بال کس قدر سخت ہیں آدم! تمہارے بدن پر کوئی ملائم حصہ نہیں معلوم ہوتا، مجھے دیکھو میں سراپا ملیح ہوں" حوّا نے بات ابھی ختم بھی نہ کی تھی کہ اُن کی اُنگلیاں آدم کے سونے ہونٹوں سے مس ہو گئیں، اور خوشی سے چلّا اُٹھیں "اے ہے پا نہ لیا آخر میں نے، کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے آدم" اور وہ اپنی ننھی انگلیوں سے آدم کے لبوں کو سہلانے لگیں۔

آدم کو بھی حوّا کی یہ حرکت بھائی، اُنہوں نے "ردِّ عمل" شروع کیا۔

"مگر تمہاری انگلیاں بھی کھُردری ہیں، میں بتاؤں، صرف تمہارے لب ہی تو نرم ہیں، ان سے تم میرے لبوں کو چھوؤ (مس کرو) تو شاید زیادہ اچھا معلوم ہو، کوشش تو کرو آدم" حوّا نے لجاتے ہوئے کہا۔

حوّا نے اپنے لب نزدیک کر دیئے۔ اور آدم نے اُن پر اپنے لب پیوست کر دیئے لیکن ابھی وہ مس بھی نہ ہوئے تھے، کہ حوّا نے اپنا سر کھینچ لیا، اور کہنے لگیں "تم بڑے خراب ہو جی، مونچھ کے بال چبھ رہے ہیں تمہارے"

آدم گھبرا کر دور ہو گئے، مگر حوّا نے پھر نشیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا "خیر کوئی حرج نہیں، اِس کا بھی انتظام کبھی ہو جائے گا، آؤ دوبارہ کوشش کریں"

پھر اُسی طرح حوّا نے اپنے لب سامنے کئے اور آدم نے اپنے لب پیوست کر دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں سانس لینے کے لئے الگ ہوئے، اور دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، حوّا لجا گئیں۔ اور آدم نے اُنہیں کھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا، اور پھر حوّا کے لبوں کو چوسنا شروع کیا، نتیجہ دونوں کے لئے ہیجان آفریں تھا، حوّا پسینے پسینے ہو گئیں، اور آخر بے اختیار ہو کر بولیں۔

"ہے ہے آدم، تم نے تو ہلکان کر دیا" حوّا کی آنکھیں آپ ہی آپ جھپک گئیں، اور اُنہوں نے ایک ذرا سی "انگڑائی" لے لی۔

"سیب کی دو قاشیں، ایک دوسرے پر رکھی معلوم ہوتی ہیں حوّا" آدم نے اُس وقت کی زبان میں کہا۔

"کیسی سنسناہٹ سی پیدا ہوئی ہے آدم، جب میں نے لب ہٹائے ہیں جیسے "بوسہ"" حوّا بولیں۔

"میں اِسے "بوسہ" ہی کہوں گا" آدم نے جواب دیا۔

لیکن آدم ابھی عورت کے جذبات کو اچھی طرح نہ سمجھ سکے تھے، اُنہیں بہت سی باتیں سیکھنی باقی تھیں، دوسری طرف حوّا اپنی جنس کی تمام حسیاتِ خفیہ سے باخبر ہو کر پیدا کی گئی تھیں۔ اس لئے فطرتاً اُنہوں نے اپنے "رفیقِ کرختہ" کو اپنے جذبات کے شعلوں سے گرمانا چاہا، پہلے مُسکرائیں، پھر زانو بدلے اور ایک مرتبہ پھر لجا گئیں، شعلے کی آنچ کی سی ایک چیز اِن کے دل سے نکلی، آدم بیقرار ہو گئے، حوّا نے اُنہیں پلکوں کے گھونگھٹ سے دیکھا اور پھر شرم کے نقاب میں اپنے کو چھپا لیا، اِس طرح جیسے اُنہیں چوری کرتے پکڑ لیا گیا ہو، مگر آدم کچھ سوچ رہے تھے، اُنہوں نے کسی قدر سمجھ کر ٹال دینا چاہا، حوّا سے ضبط نہ ہو سکا، منہ سے ایک دبی ہوئی آہ نکل گئی۔ اور دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ بولیں "پیارے کیسی دلچسپ بات ہم نے جان لی"۔ اور پھر اُنہوں نے آدم کے سینے کے ملائم بھورے ریشمیں بالوں پر اپنا سر رکھ دیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔

"ہاں، بہت دلچسپ، پہلے معلوم نہ تھا؟" آدم نے حوّا کی گھنیری زلفوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"لیکن اب تو معلوم ہوگیا" سرگوشی کے لہجے میں حوّا بولیں، یہ گویا ایک سوال تھا آدم سے۔ آپ ہی آپ وہ آدم کی گود میں گر گئیں، شوخی رخساروں پر دوڑ گئی، بند لب ذرا سے کھلے۔ آدم کے جذبات بھی چونکے آدم نے ان کا بوسہ لے لیا۔

گو آدم ناتجربہ کار تھے، مگر رفتہ رفتہ حوّا نے انہیں عورت کی تمام خواہشیں بتادیں۔

اب بوسے کے لئے حوّا ہر وقت بیقرار رہنے لگیں، مگر چونکہ وہ عورت تھیں، اس لئے اپنی بیقراری آدم پر ظاہر نہ کرسکتی تھیں کہ ان کی تمام باتیں آدم کو خوش کرنے کے لئے ہیں، اور بوسہ انہیں ایک نئے پھل کے انعام میں دیتی ہیں، اور ان کے بوسوں کو سیبوں کے معاوضے میں قبول کرتی ہیں۔

ایک دن دونوں مستی میں ایک درخت کی چھاؤں میں لیٹے آرام کررہے تھے کہ آدم بولے۔

"مرد کو چاہیئے کہ عورت کا بوسہ سورج نکلنے سے پہلے اور سورج ڈوبنے کے بعد لیا کرے۔" حوّا نے سر ہلا دیا۔ اور آدم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اور مرد کو یہ بھی چاہیئے کہ عورت کا بوسہ باہر جاتے ہوئے یا باہر سے واپس آکر لیا کرے۔" حوّا نے اس مرتبہ بھی سر ہلا دیا۔ آدم نے حوّا کی خاموشی سے چڑھ کر کہا۔ "اور مرد کو عورت کا بوسہ اُس وقت بھی لینا چاہیئے جب اُس کے جذبات کے شعلے بھڑکنے شروع ہوں۔"

اب حوّا ضبط نہ کرسکیں، گہری سانس کھینچکر آنکھیں آہستہ آہستہ بند کرتے کرتے بولیں "او خدایا"! اور حسب مطابق ہوتا رہا۔

غزل

حضرت سیماب اکبرآبادی

آ، کہ ہستی بے لب و بے گوش ہے تیرے بغیر
کائنات اِک محشرِ خاموش ہے تیرے بغیر

تُو نہیں تو رات ہے محرومِ نورِ زندگی
شام ہی سے چاندنی روپوش ہے تیرے بغیر

ایک تیرے حسن میں رقصاں ہیں لاکھوں میکدے
تشنۂ بادہ لبِ مے نوش ہے تیرے بغیر

آ، کہ پھر دل میں نہیں اُٹھتی کوئی موجِ نشاط
سرد پانی، بادۂ سرجوش ہے تیرے بغیر

نیند آ آ کر اُچٹ جاتی ہے تیری یاد میں
تارِ بستر، نشترِ آغوش ہے تیرے بغیر

جلوۂ ہر روز، جو ہر صبح کی قسمت میں تھا
اب وہ اِک دھندلا سا خوابِ دوش ہے تیرے بغیر

زندگی تجھ سے عبارت تھی، مگر جب تُو نہیں
زندگی کا اپنی کس کو ہوش ہے تیرے بغیر

زحمتِ تکیہ ترے زانو کو دیتا ہے خیال
سر پہ ہر پہلو وبالِ دوش ہے تیرے بغیر

بیٹھ کر بوندوں میں کس کے ساتھ دیکھونگا بہار
ابر کی آمد، وداعِ ہوش ہے تیرے بغیر

آ کہ موضوعِ غزل کو ڈھونڈتی ہے ہر نگاہ
نغمۂ مطرب بلائے گوش ہے تیرے بغیر

کیا خبر سیماب کب گھبرا کے دیدے اپنی جان
ضبط گو اب تک تحمل کوش ہے تیرے بغیر

مکتبہ جامعہ کی تازہ ترین مطبوعات

خطبات خالدہ خانم

محترمہ خالدہ ادیب خانم کے خطبات جو انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دئے تھے۔ پہلے چار لکچروں میں ترکی تاریخ نہایت دلکش انداز میں پیش کی گئی ہے۔ پانچویں اور چھٹے لکچر میں ترکی ادب، ان کی شاعری، ان کے ڈرامے اور ان کے صحیح ذوق پر بسبب انتہا دلچسپ تبصرہ ہے۔ ساتویں لکچر میں بتایا گیا ہے کہ وہاں کی عورتوں نے کس طرح مردوں کے دوش بدوش قومی تعمیر میں حصہ لیا۔ اور آٹھویں لکچر میں آئندہ کی امیدوں کو پیش کیا گیا ہے

انگریزی قیمت ...... ے

اردو " ...... عا

جوش کے تئیس شعر

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی پانچ منتخب اور روح پرور نظموں کا مجموعہ

اس مجموعہ میں حضرت جوش کی پانچ نظمیں ہیں۔

(۱) کسان (۲) آثار انقلاب (۳) انگیٹھی

(۴) منہ اندھیرے کا جادو (۵) پروگرام

یہ تمام نظمیں سو اشعار پر مشتمل ہیں۔ شروع میں حضرت جوش کے سوانح حالات بھی درج ہیں سرورق پر تصویر ہے۔ پاکٹ سائز۔ سرورق خوش نما رنگین

قیمت ۱۲ر

جاپان

مشرقی عظمت کا علمبردار

مصنفہ چمن لال صاحب جرنلسٹ۔ مترجمہ محمود علیخان صاحب (جامعی)

آج سے صرف اسی برس پہلے جاپان جس سے اب ایشیا کا نام روشن ہے بالکل گمنامی میں پڑا تھا۔ لیکن اس مختصر مدت میں اس نے وہ حیرت انگیز ترقی کی کہ اس کا شمار دنیا کی زبردست طاقتوں میں ہونے لگا اس انقلاب کی داستان اس زبردست تصنیف میں ملاحظہ کیجئے ضخامت ۲۵۰ صفحات۔ ہاف ٹون بلاک کی ۲۰ تصویریں

قیمت مجلد ...... عہ

نفرت کا بیج

از پروفیسر اشتیاق حسین صاحب قریشی

زندگی میں اس سے زیادہ کوئی چیز تلخی پیدا نہیں کر سکتی کہ دوست ناراض ہو کر دشمن بن جائے یا اپنی خود غرضیوں پر دوستی کو قربان کر دیں لیکن اس کے باوجود اس سے زیادہ کوئی چیز ظلم بھی نہیں ہے ایسا تو بہت ہوتا ہے کہ خود غرضیاں جو دوستی کو بددلی میں تبدیل کر دیتی ہیں صرف تعلقات میں خشکی تک پہنچ جائیں۔ لیکن کبھی کبھی ان کی حد سخت نفرت تک پہنچ جاتی ہے وہ لوگ جو اپنے دل میں محبت کی جگہ نفرت کا بیج بوتے ہیں۔ اس تمثیل کو ذرا غور سے پڑھیں۔

قیمت ۸ر

مضامین رشید

اردو میں طنز نگاری کے موجد پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ

اردو طنز نگاری میں پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا جو درجہ ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ سچ پوچھئے تو آپ ہی نے اس انشا کی اردو میں داغ بیل ڈالی اور اب تک آپ اس کے تنہا مالک ہیں۔ آپ کے وہ تمام مضامین جن میں مزاح کے ساتھ ساتھ ادبیت کو مجروح نہیں کیا گیا ہے۔ اور جو مختلف اخبارات و رسائل میں طبع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ زیر طبع ہیں۔ اور امید ہے کہ جنوری میں شائع ہو جائیں گے۔

میدان عمل

مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کا ایک ولولہ انگیز ناول

اس ناول میں دیہاتی معاشرت کے وہ کیف پرور مناظر اور دیہاتیوں کی زندگی کا وہ سادہ رخ پیش کیا گیا ہے جو ایک حساس دل رکھنے والے انسان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا "میدان عمل" ایک ایسا اخلاقی، انقلابی اور اصلاحی ناول ہے جو ہندوستان کی غلامانہ ذہنیت کو بدل سکتا ہے۔ آج ہندوستان کی مختلف المذاہب قوموں میں تعصب کی جو تباہ کن آندھی چل رہی ہے۔ میدان عمل اسے نسیم سحر بنا کر ہندوستان کیلئے ایک روشن اور تابناک فضا پیدا کر سکتا ہے غرض میدان عمل ہندوستان کے لئے ایک نعمت ہے اور گم کردہ راہ قوم کے لئے مشعل ہدایت۔ دسمبر میں شائع ہوگا۔



پربھات فلم کمپنی کا بہترین پیش کش :-
مہاتما
महात्मा
پربھات
کا نام اس کے بہترین ہونے
کی
کافی ضمانت ہے
प्रभात चित्र
IT'S - PRABHAT
فیمس پکچرز ڈسٹری بیوٹرز چاندنی چوک دہلی۔ لاہور۔ کراچی




کلیم
مُدیر: جوشؔ ملیح آبادی

کلیم دہلوی



آندھی

بنام قوت و حیات

کلیم

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

مُدیر

جوش ملیح آبادی

سالانہ چندہ ۶؍

ششماہی چندہ ۳؍

قیمت فی پرچہ ۹؍

اُردو زبان کا ہر جہت سے سب سے زیادہ قیمتی ماہ نامہ

(باتصاویر)

جلد ۱ — فہرست ماہ فروری سنہ ۱۹۳۶ء — نمبر ۲

(کوہِ نور پرنٹنگ ورکس مخموری دہلی میں چھپ کر، ملیح آباد)، [illegible]

اشارات

(جوش ملیح آبادی)

"کلیم" کا دوسرا نمبر حاضر ہے۔ ملک نے جس گرمجوشی سے "کلیم" کا استقبال کیا ہے، وہ نہایت درجہ ہمت افزا ہے۔

"کلیم" کا پہلا نمبر بہت بڑی تعداد میں طبع کرایا گیا تھا جسے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا گیا ہے۔

شکر ہے کہ کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور کراچی سے لے کر رنگون تک سے اس کی فرمائشیں آ رہی ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت سے خطوط ایسے بھی آئے جن میں قیمت کی زیادتی کا شکوہ تھا۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ قیمت میں کمی کر دوں چنانچہ آج

(۱) فروری نمبر کے ذریعے سے اعلان کیا جاتا ہے کہ اب کلیم کا چندہ دس روپیہ کے عوض چھ روپیہ سالانہ کر دیا گیا ہے۔ تاکہ اس کی اشاعت کافی ہو سکے۔ اور اس کے ذریعے سے جن خیالات کی تبلیغ مقصود ہے، وہ زیادہ افراد تک پہونچ سکیں۔

باوصف کمی چندہ کے کلیم کی ظاہری و معنوی خوبیوں میں کسی قسم کی کمی نہ کی جائے گی۔

وہ حضرات جو دس روپے ادا فرما چکے ہیں اُن کی خدمت میں گزارش ہے کہ سال آئندہ اُن کے نام صرف بقایا روپیہ کا وی پی کیا جائے گا۔

(۲) جنوری نمبر میں اعلان کیا گیا تھا کہ فروری نمبر سے موسیقی کے متعلق ان تصویروں کی اشاعت شروع ہو جائے گی جو گوالیار کے راج محل میں موجود ہیں۔ اور جن کے بلاکوں کی طیاری کا ہندوستان کے مایۂ ناز فرزند پنڈت سر کیلاش نرائن ہاکسر لا ممبر گوالیار نے بکمال لطف و کرم وعدہ فرمایا ہے۔ لیکن محترم پنڈت جی نے یہ خدمت جن صاحب کے سپرد کی تھی وہ اپنے فرائض منصبی اور بالخصوص دورے کی مصروفیتوں کے باعث اس کام کو اب تک انجام نہیں دے سکے۔ قوی امید ہے کہ مارچ نمبر سے ان نوادر کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

(۳) "لافنگ مین" (Laughing man) کا ترجمہ جیسا کہ جنوری نمبر میں اعلان کیا گیا تھا۔ اس نمبر سے طبع ہونا شروع ہو گیا ہے۔

امید ہے کہ یہ سلسلہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ثابت ہوگا، اور اس سے یہ اندازہ کرنے میں مدد ملے گی کہ استبداد، نوعِ انسانی پر کیا کیا بے پناہ مظالم کرتا رہتا ہے۔

(۴) مجھے "کلیم" کے قارئین سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے میری اس تجویز پر کہ مفکرینِ آزاد خیال کی ایک انجمن بنائی جائے، اور اُسی کے ساتھ ایک ایسی جماعت طیار کی جائے جو ہندوستان کی مشترک زبان کے متعلق غور کرے، کوئی توجہ مبذول نہیں فرمائی۔

مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر ملک کے صاحبِ فکر اس سلسلے میں مجھے اپنی رایوں سے مطلع فرمائیں گے۔

اس اثنا میں لاہور سے ایک خط آیا ہے، جس سے یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی کہ وہاں اس قسم کا ایک ادارہ قائم ہو چکا ہے جس کے تفصیلی حالات کا میں بے چینی کے ساتھ منتظر ہوں۔

(۵) جنوری نمبر میں میں نے اپنی چند بدحواسیاں سپردِ قلم کی تھیں، اور قارئین سے درخواست کی تھی کہ وہ بھی اپنی اپنی بدحواسیوں کو منظرِ عام پر لائیں، لیکن اب تک کسی نے اپنی بدحواسیاں قلمبند کرنے کی جرأت نہیں کی ہے۔ میرے نزدیک تو یہ ایک نہایت دلچسپ سلسلہ ہوگا۔ لیکن اس کا باقی رکھنا قدردانانِ کلیم کا کام ہے۔

آخر انسانے خدا کے بندوں میں کچھ تو بد حواس ہوں گے ہی۔ پھر کیوں قلم نہیں اُٹھایا جاتا؟

(۶) "قربان گاہ آزادی" کے سلسلے میں جو دو تصویریں جنوری نمبر میں شائع کی گئی ہیں اُن کے باب میں علامہ سر عبد اللہ یوسف علی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ ادبی رسائل میں ایسی تصویریں شائع نہ ہونا چاہئیں۔ اور میرے شہر سلیٹ حضرت ہاشمی فرید آبادی نے تو مجھے یہ اطلاع دی ہے کہ انھوں نے وہ ورق ہی رسالے سے علیحدہ کر دیا ہے۔

میں اُن تصویروں کے متعلق صرف اس قدر عرض کروں گا کہ اُن میں حسن عریاں نہیں۔ بلکہ حسنِ مظلوم پیش کیا گیا ہے۔ اُن کی اشاعت کا مقصود چونکہ آنکھوں کو غذا پہنچانا نہیں، بلکہ حساس دلوں پر چوٹ لگانا ہے اور یہ کہنا ہے کہ آزادی کی خاطر غیرت مند قومیں کیا کیا کر چکی ہیں۔

(۷) میں اپنے اُن معاصرین کا نہایت شکر گزار ہوں جنھوں نے کمالِ کرم "کلیم" پر ریویو تحریر فرمائے ہیں اور مجھے اپنے مشوروں سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیا ہے

میرے کان ہر وقت ہر مخالف و موافق آواز کا استقبال کرنے کے لئے کھلے ہوئے ہیں اور میں مخالفت و موافقت دونوں سے مساوی استفادہ کرنے کے لئے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ہر لمحہ تیار رہتا ہوں۔

میری آرزو ہے کہ کلیم کے تمام عیوب ایک ایک کر کے سنائے جائیں، تاکہ میں اس پرچے کو ہر صورت اور ہر حیثیت سے مکمل بنانے میں کامیاب ہو سکوں۔

یقین فرمائیے میرا ضمیر ادارت تحسین اور نفرین دونوں سے بالا رہے گا۔ تحسین سے میں اپنے پرچے کو بے عیب سمجھنے کی غلطی کا ارتکاب نہ کروں گا۔ اور نفرین سے مجھ پر غیظ و غضب غلبہ نہ پا سکے گا۔ بلکہ ٹھنڈے دل سے بات کے ہر پہلو پر نگاہ کر کے اُس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کروں گا۔

(۸) میں نے کلیم کی توسیعِ اشاعت کے واسطے اس اثنا میں ایک مختصر سا دورہ کیا تھا میں اس سلسلے میں شکر گزار ہوں اپنے بھائی خان بہادر محمد یوسف خاں تعلقدار کسمنڈی، جناب اعزاز رسول صاحب تعلقدار سندیلہ، اور سید ضامن علی صاحب پروفیسر و صدر شعبۂ اردو و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کا کہ اُن کے مخلصانہ مساعی نے مجھے نہایت گراں قدر امداد دی۔

(۹) ہندوستانی ایکاڈمی کا جلسہ

میں بارھویں جنوری کو ہندوستانی ایکاڈمی کے سالانہ جلسے میں شرکت کی غرض سے الہ آباد گیا تھا۔

پہلے اجلاس کی کرسیِ صدارت پر جناب سنہا صاحب جلوہ افروز تھے جن سے مجھے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے ہندوستانی زبان کے عوض انگریزی میں تقریر کی تھی۔

البتہ تمام ہوا خواہانِ ہندوستان کو علم و ادب کے حقیقی مربی و سرپرست رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کا شکر گزار ہونا چاہئیے کہ آپ کی تمام و کمال تقریر ہندوستانی زبان میں تھی، اور اس قدر شائستہ زبان میں کہ جب تک آپ تقریر کرتے رہے دل آپ کی طرف کھنچتا رہا۔

اسی سلسلے میں اکاڈمی کی طرف سے ایک اردو ہندی مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا جو نہایت کامیاب رہا۔

المختصر اکاڈمی کے جلسے بہت کامیاب رہے۔ اور اس ادارے سے ہمیں توقع ہے کہ یہ ہماری زبان اور ہمارے ادبیات کو نہ صرف باقی رکھے گا بلکہ ایسا فروغ دے گا کہ آنے والی نسلیں فخر کے ساتھ یاد رکھیں گی۔

(۱۰) میں اپنے محترم بزرگ حضرت آغا شاعر دہلوی کے باب میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ فصیح الملک مرزا داغ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، اور علمی حیثیت سے بھی آپ کا پایہ نہایت بلند ہے۔

آپ نے بیس پچیس برس کی جگر کاریوں کے بعد قرآن مجید کے بائیس پاروں کا منظوم ترجمہ فرمایا ہے۔ جن میں سے صرف تین پارے اب تک طبع ہو سکے ہیں۔ میں اُن حضرات کی خدمت میں جو قرآن کریم سے عقیدت رکھتے ہیں، اور جو قرآنی تعلیم کے متعلق یہ تمنا رکھتے ہیں کہ اس کی تعلیم تمام عالم میں عام ہو جائے، بزور یہ استدعا کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں حضرت افسر الشعرا آغا شاعر کی دل کھول کر امداد کریں اور اس کارِ خیر میں حصہ لے کر نہ صرف اپنی قوم کے آلام میں گھرے ہوئے ایک بوڑھے شاعر کو مصائب سے نجات دلائیں، بلکہ اپنی عاقبت سنوارنے کا بندوبست بھی کریں۔

خدا کے تین قہر

(۱) (۱) ہندوستانی ہونا۔

(۲) مسلمان ہونا۔

(۳) یو۔ پی کا باشندہ ہونا۔

میں اِن تینوں قہروں پر تین چھلکتے ہوئے اشارے کروں گا۔ قارئین اپنے تخیل سے خانہ پُری فرمالیں۔

(الف) ہندوستانی ہونا:۔

جس نے بھی بدبخت ہندوستان کی عبرت انگیز تاریخ پڑھنے کی ایک مدبر کی طرح تکلیف اٹھائی ہے، وہ انتہائی قلق کے ساتھ یہ ہمت شکن فیصلہ کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے کہ اِس نامراد ملک کی آب وہوا، حیات وکشمکش حیات کے حق میں سم قاتل کا حکم رکھتی ہے۔

یعنی ہندوستان ایک ایسی مردانہ قوتوں کو نچوڑ لینے والی عورت ہے جو آئے دن نئے نئے شوہر تلاش کیا کرتی ہے، یہ ایک ایسی ابدی کلیوپٹرا ہے جس کی خواب گاہ تازہ بتازہ جوانیوں کی سانسوں سے مہکتی رہتی ہے۔

لیکن چند رنگین بہاروں کی معطر چاندنی راتیں گزارنے کے بعد شوہر کو ہڈیوں کا مالا بناکر اور اس کا تمام رس چوس کر آخر کار گھر سے باہر نکال دیا کرتی ہے۔

غور کیجئے ہندوستان کے قدیم باشندے گونڈ اور بھیل کتنے قوی، کس قدر مضبوط اور کس قدر بلا کے طاقتور تھے۔ اُنھیں ہندوستان کے چٹیل میدانوں، اور ہولناک صحراؤں نے اپنے آغوش میں پالا تھا، وہ شدید موسموں کے چہیتے بیٹے تھے، اُن کی ہڈیوں میں شاندار وسربلند ہمالیہ کی چٹانیں صرف ہوئی تھیں، اور گوشت پوست کے اعصاب کی جگہ اُن کی کھردری اور تابناک جلدوں کے نیچے تپائے ہوئے فولاد کے تار کھنچے ہوئے تھے۔

لیکن عروسِ ہند کا ذوقِ عیاشی دیکھئے کہ اِن شیر افگن جوانمردوں کو مفتوح بنانے کی خاطر آوارہ گرد آریوں کا ایک مختصر سا تھکا ہوا گروہ یکایک ہندوستان میں وارد ہوتا ہے، اور اِن فرزندانِ تیر وکماں اور گُردانِ دلیر کو ایک ادنیٰ سی جدوجہد کے بعد چوپاؤں کی طرح جنگلوں اور پہاڑوں میں ہانک کر اپنی بادشاہی کے ڈنکے بجانے لگتا ہے۔

آریوں کی حکومتیں ملک کے ہر گوشے میں قایم ہو جاتی ہیں راجپوتوں کی برچھیاں، برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں پر چمکنے والی کرنوں کو شرمانے لگتی ہیں، اور اُن کی جھلکتی ہوئی تلواروں کا پانی، ہندوستان کی شاداب سرزمین پر گنگا جمنا بن کر بہنے لگتا ہے۔

لیکن عروسِ ہند کی دوسری کروٹ ملاحظہ فرمائیے کہ عین اُسی عالم میں جب کہ راجپوتوں کی تلواروں کی جھنکار سے دشت وجبل گونجے ہوئے تھے، گرہیں لگی ہوئی باگوں، اور پھٹی ہوئی زرہوں کے ساتھ مٹھی بھر معدودے چند مسلمان اُن پر حملہ آور ہوتے ہیں، اور بیک گردشِ شمشیر اِن ارجن اور بھیم کے وارثوں کے پاؤں میں غلامی کی زنجیریں ڈال دیتے ہیں۔

اسلامی حکومت کا اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کی گونج میں اعلان کیا جاتا ہے۔ پتھروں کے سینے تراش کر ہیبت آفریں قلعے اور قصر تعمیر کئے جاتے ہیں۔ شوکت وصولت دربار میں حاضر ہو کر مجرا بجالاتی ہے۔ طبل وعلم آستانۂ شاہی پر سر جھکا دیتے ہیں، دبدبہ اور طنطنہ مورچھل لیکر پشت پر آ کھڑا ہوتا ہے ذرّے ذرّے پر سطوتِ اسلام کا آفتاب چمکنے لگتا ہے، اور گنگا جمنا کے دھاروں پر کوثر وتسنیم کی موجیں انگڑائیوں پر انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہیں۔

لیکن عروسِ ہند تجدیدِ عشرت کے شوق میں پھر پھریری لیتی ہے، جماہی لیکر، اور بکھری زلفوں کا جوڑا باندھ کر اپنی خوابگاہ کے زرّیں دریچے کے شیشے سے پھر کسی اٹھلا اٹھلا کر چلنے والے رس بھرے نوجوان کا راستہ دیکھنے لگتی ہے کہ اِتنے میں پھیکے رنگ روپ والے سوداگروں کا ایک مختصر سا قافلہ، گُربۂ مسکین کی طرح پنجوں کو بند کئے ہوئے اِس شیر کے کٹہرے یعنی کشورِ ہندوستان میں داخل ہوتا ہے، اور رفتہ رفتہ ہزاروں سادگیوں اور پُرکاریوں کے بعد سلمانوں صرصر وسموم کو چٹکیوں میں اُڑانے والے مسلمانوں، ریگستانوں کے شہریار سلمانوں آندھیوں کا رُخ بدل دینے والے، اور تیغوں کی چھاؤں میں پل کر پروان چڑھنے والے مسلمانوں کی گردنوں میں آہستہ سے محکومی کا طوق ڈال دیتا ہے، اور اپنی ٹھنڈی اور سفید پیشانی پر تیموری تاج کو کج کرکے اسلامی خون کی گرمی وسُرخی پر قہقہے مارتا نظر آتا ہے۔

یہ ہے اس بدبخت ملک کی سیاسی روداد، اور تاریخی سرگزشت!

جو کوئی آئے ہے، نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں!

اب رہا ہندوستان کا اخلاقی، معاشرتی، مذہبی، اور قومی معیار سو

اُس کے بیان کرنے کے لئے ایک دفتر چاہئیے، اور اُس پر ماتم کرنے کے لئے پتھر کا کلیجہ درکار ہے۔

خدا کے لئے ذرا غور تو کیجئے کہ جس کم بخت ملک میں ذرا ذرا سی باتوں پر خون کی ندیاں بہہ جاتی ہوں، جہاں ایک ذرا سے اختلافِ رائے اور ایک معمولی سی نکتہ چینی پر لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہوں —— جہاں نہ کوئی ایک مشترک لباس ہو نہ ایک مشترک معاشرت —— نہ ایک مشترک زبان ہو —— جہاں "قوم" کے معنی "شیخ" "سید" "برہمن" اور "کائستھ" ہوں —— جہاں لوگ اپنے کو "ہندوستانی" کہنے کے عوض "ہندو" "مسلمان" اور "سکھ" کہتے ہوں۔ جہاں اغیار کا لباس پہنکر فخر سے اکڑا جاتا ہو، اور بیگانوں کی زبان میں کلام کرکے اپنی شرافت کا ثبوت دیا جاتا ہو۔ جہاں اوہام و روایات کی بنا پر انسانیت کے گریبان کو تار تار کر دیا گیا ہو، اور جہاں اینٹ چونے کے احاطوں اور گھاس پھونس چرنے والے چوپاؤں پر انسانی خون بہا دیا جاتا ہو۔ وہاں زندگی اور قومیت پیدا ہو تو کیوں کر؟ وہاں آزادی و حریت کا خواب دیکھا جائے تو کس طرح؟

کیا ہات مرے پہنچیں گے دامانِ تباں تک
اپنے ہی گریبان سے فرصت نہیں ملتی

(ب) دوسرا قہر، مسلمان ہونا۔

مسلسل تموّل، اور مسلسل افلاس، دونوں ابنِ آدم کے حق میں مساوی طور پر انتہائی خطرناک ہیں۔

پہلے تموّل و افلاس کے متعلق میری دو رباعیاں جو مجھے اِس وقت یاد آ گئی ہیں سُن لیجئے۔

تموّل۔
انسان کو رفتہ رفتہ حیوان کر دے
ہر نُور کو، صد نار بداماں کر دے
دولت کہ فرشتوں سے بڑھا دیتی ہے
جم جائے اگر کہیں تو شیطاں کر دے

افلاس۔
ہر صاحبِ جوہر کو سُبک سر کر دے
فطرت کو زبوں کرکے زبوں تر کر دے
افلاس، کہ کھینچتا ہے ایماں کی طرف
کم بخت مسلسل ہو تو کافر کر دے

مسلمان اِن دونوں زہروں کو پیے ہوئے ہیں، اور اِن دونوں سانپوں کے ڈسے ہوئے ہیں۔

اِس قوم نے کرۂ ارض کے ایک بہت بڑے حصّہ پر صدیوں حکومت کی ہے۔ سونا چاندی پانی کی طرح بہایا ہے۔ عیش و عشرت کی موجوں میں ایک طویل مدّت تک شناور رہی ہے۔ اِس کے دن جھرے دریاؤں میں، اور اِس کی راتیں مہکتی ہوئی زلفوں کے سائے میں گزری ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم میں وہ تمام معائب آ چکے ہیں، جنھیں مسلسل تموّل پیدا کیا کرتا ہے۔

پھر تاج و تخت سے محروم ہو جانے کے بعد اِس قوم پر ایک ایسی بے پایاں افسردگی، اور ایک ایسا غیر محدود جمود طاری ہو گیا کہ اِس کا ہر فرد حرکت بھول گیا، اور اِس قدر مبہوت و معطل ہو کر رہ گیا کہ تمام قوم پر ہولناک افلاس نے قبضہ کر لیا۔

اِس پر بھی اِن خدا کے بندوں نے بانکپن نہ چھوڑا، اور اپنی طمطراق والی میرزائیت ترک نہ کی، اور اِس رعونت آبی نے انھیں اور بھی خاک میں ملا دیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِس قوم پر وہ تمام لعنتیں مسلط ہو گئیں جو مفلسی ہمیشہ اپنے ساتھ لایا کرتی ہے۔

اب مسلمانوں کے مخصوص عادات کی فہرست یوں شروع ہوتی ہے۔

حسد، رشک، بدگمانی، غیبت، کاہلی، تنگ نظری، دروغ گوئی، اسراف، لاف زنی، ناعاقبت اندیشی، اوہام پرستی، اور غدّاری؛

انگریزوں کو چھوڑیئے کہ وہ تو زندہ قوم کے افراد ہیں۔ آپ ہندوستان ہی کے دوسرے فرقوں کو لے لیجئے۔ پارسی، بنگالی اور کسی حد تک ہندو، سب کے سب دن بھر کے سنجیدہ اُمور سے فراغت حاصل کرکے اپنا شام کا وقت کسی نہ کسی تفریحی مشغلے میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے جس محلّے سے گزریئے، قبرستان کا سا سماں نظر آتا ہے۔ ہر برآمدے یا کمرے میں آپ دیکھیں گے کہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی کے پھیکے دائرے میں مسلمان پسینے پسینے بیٹھے ہوئے ہیں۔ چہرے مئی جون کے آسمان کی طرح خشک ہیں۔ زور سے "آمین" کہنے نہ کہنے پر رُوکھی بحثیں چھڑی ہوئی ہیں، یا حقّے پی پی کر بھائیوں کے عیوب بیان کئے جا رہے ہیں۔

جس قوم میں سازش، غیبت اور مناظرے، شام کی تفریحوں میں شامل ہوں اُس قوم میں پیدا ہونا قہرِ خدا نہیں تو اور کیا ہے؟

دولت بغلط نبود ، از سعیٔ پشیمان شو
کافر نتوانی شد ، ناچار مسلمان شو

(ج) تیسرا قہر - یُو - پی - کا باشندہ ہونا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یُوپی ہندوستان کا باغ اور قلب ہے، اور یُوپی کے باشندے ذہانت و ذکاوت، خوش خلقی و تمدن، شائستگی اور علم و ادب میں ہندوستان کے تمام دوسرے صوبوں سے ہمیشہ ممتاز رہے ہیں۔

لیکن ہر چیز کا اعتدال سے گزر جانا ایک ناقابل برداشت مصیبت ہوا کرتا ہے۔ یوپی والے بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ یعنی ان کی غیر معمولی ذہانت ہی ان کی تباہی کا سبب بنی ہوئی ہے۔

یہ ایک کلیہ ہے کہ جس کا تخیّل وسیع ہوتا ہے اُس کا دائرۂ عمل تنگ ہوا کرتا ہے۔ یوپی والوں کا تخیّل وسیع ہے اس لئے قدرتی طور پر اُن کا دائرۂ عمل تنگ ہے۔ اور اس تنگیٔ دائرۂ عمل نے اُنھیں افلاس کی بلا میں گرفتار کر رکھا ہے۔

اربابِ عقل سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ذہانت و عسرت کا سنگم کتنا خطرناک ہوا کرتا ہے، اور اسی بنا پر یُو۔پی والے ہندوستان کے دوسرے کم ذہین صوبوں میں نکو بن کر رہ گئے ہیں۔ خالص علمی و ادبی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یُوپی ایک ہولناک مقام ہے۔

یہاں کے باشندے خود تو کچھ کرتے دھرتے نہیں ہیں، لیکن دوسرے کام کرنے والوں کا مضحکہ اُڑانے میں سب سے آگے آگے نظر آتے ہیں۔

پنجاب ، زندہ رہنے کے اسرار کے حامل پنجاب میں اگر کوئی معمولی سا صاحب جوہر بھی پیدا ہو جاتا ہے تو اہل پنجاب اُس کا ڈنکا پیٹنے لگتے ہیں، اُسے کاندھوں پر اُٹھائے پھرتے ہیں، اور اگر کوئی اُس پر کسی نوع کا اعتراض کر دیتا ہے تو سب کے سب مل کر اُس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

لیکن یوپی والوں کا خُدا بھلا کرے، یہ تو ہمیشہ آپس ہی میں دست و گریباں رہتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی اُبھرنے لگتا ہے تو سب کے سب مل کر اُس کی ٹانگیں پکڑ کر نیچے کی طرف کھینچنے لگتے ہیں۔

میں نے اِسی اثنا میں یُوپی والے کا ایک مضمون یوپی والے ہی کے خلاف دیکھا ہے اور مجھے شرم کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اُس کا لب و لہجہ اس شدت کے ساتھ غیر شریفانہ ہے کہ تہذیب و شائستگی کے ماتھے سے پسینہ ٹپکنے لگتا ہے۔

آپ نے اِن تینوں قہروں کی۔ روئداد سُن لی؟ کیا آپ مجھ پر ترس نہ کھائیں گے؟ میں تو ایک چھوڑ ان تینوں قہروں میں مبتلا ہوں۔ ہندوستانی بھی ہوں۔ مسلمان خاندان میں بھی پیدا ہوا ہوں اور یوپی کا باشندہ بھی ہوں۔ میری حالت پر دو آنسو ہی بہا لیجئے، ایک زوجہ قوم آنسو بہانے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی ہے؟ اور اگر جی چاہے تو میری ہمت کی داد بھی دے دیجئے۔ ہر چند یہ تینوں قہر کے پہاڑ میری چھاتی پر رکھے ہیں، پھر بھی اُٹھنا اور اُبھرنا چاہتا ہوں۔ اور اپنی قوم کو آگے بڑھنے اور زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے للکار بھی رہا ہوں۔

آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ ما؟

---

(۱۲) آخر میں قارئین کرام تک یہ مژدہ بھی پہونچانا چاہتا ہوں کہ کلیم کی بنیادیں بفضلِ قوّت و حیات اس قدر مضبوط ہو چکی ہے کہ یہ پرچہ ہندوستان کی ناقدر شناسیوں اور بد ذوقیوں کا بخوبی مقابلہ کر سکتا ہے، اور اس کے بند ہو جانے کا امکان نہایت ہی موہوم ہو چکا ہے۔

پھولوں کی اگر ہوس ہے خاروں کو نہ دیکھ
عشرت کی ہے دھن تو سوگواروں کو نہ دیکھ
تعمیرِ حیات ہے اگر پیشِ نظر
بھولے سے بھی پامال مزاروں کو نہ دیکھ
(رقیب)

رفتارِ وقت

شہنشاہ جارج پنجم کا انتقال

۲۰ر جنوری کی شب کو گیارہ بجکر پچپن منٹ پر تاجدار برطانیہ و مقبوضات نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ شہنشاہ آنجہانی کا انتقال قصر سنڈرنگھم میں ہوا جبکہ شاہی خاندان کے اکثر افراد بستر مرگ کے قریب موجود تھے۔

ملک معظم آنجہانی کے مرگ عالمگیر کے متعلق تو ناظرین روزانہ اخبارات میں پڑھ چکے ہوں گے اس لئے ان سطور کا بہترین مصرف یہی ہے کہ مجمل طور پر اُن کے سوانح حیات کو قلمبند کر دیا جائے۔

تاریخِ عالم میں ۱۸۶۵ء خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کوبڈن۔ پامرسٹن اور کارڈنل وائیزمین کا انتقال اسی سال میں ہوا۔ امریکہ کی شمالی اور جنوبی ریاستوں کے مابین جنگ ہونے والی تھی۔ غلامی اپنی حیاتِ مستعار کے آخری سانس لے رہی تھی۔ اور وہ امریکہ جسے سیاسیاتِ عالم میں آگے چل کر ایک نمایاں حصہ لینا تھا، آہستہ آہستہ بساطِ زندگی پر اپنی جگہ پیدا کر رہا تھا۔ پرشیا اور ڈنمارک کے مابین جو جنگ محض پرشیا کے اقتدار کی خاطر ہوئی ابھی ختم ہوئی تھی اور جرمن قومیت کا خواب ایک سنگین حقیقت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پرشیا کی پارلیمنٹ نے جنگی بیڑے کی تعمیر کا اقدام اسی سال میں کیا۔ یہ ماحول تھا جس میں ملک معظم آنجہانی ۵ر جون ۱۸۶۵ء کو پیدا ہوئے۔

ولادت کے ایک مہینہ بعد نومولود شہزادہ کو بپتسمہ دیا گیا۔ اس رسم کی ادائگی قصر ونڈسر کے گرجا میں دن کے ایک بجے ملکۂ وکٹوریہ کی موجودگی میں عمل میں آئی۔ اس زمانہ کے ایک ڈائری نویس نے اپنے مشاہدات کو قلمبند کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ننھے شاہزادہ کو ملکہ وکٹوریہ کی گود میں دیدیا گیا اور انھوں نے اس ہونے والے بادشاہ کو لاٹ پادری کو بپتسمہ کے لئے دیا۔ جب بپتسمہ دیا جا رہا تھا تو لاٹ پادری نے ملکہ سے دریافت کیا کہ شہزادہ کا نام کیا رکھا جائے گا، اس پر ملکہ نے کہا "جارج فریڈرک ارنسٹ البرٹ" اور یہی نام قرار پایا۔

شاہ جارج کی تربیت اُن کے بڑے بھائی ڈیوک آف کلیرنس کی معیت میں شروع ہوئی اور مبری بلیک برن نامی ایک دایہ کو یہ خدمت تفویض ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس دایہ کو ڈیوک آف کلیرنس زیادہ عزیز تھے اور وہ شاہ جارج کو اکثر تادیب کیا کرتی تھی، اور جب کبھی دونوں بھائیوں کا جھگڑا ہوتا تو ان کی دایہ بڑے شہزادہ کی حمایت کرتی۔

جب شہنشاہ جارج کی عمر چھ برس کی ہوئی تو اُنھیں اتالیق کے سپرد کر دیا گیا۔ مرحوم شاہ ایڈورڈ ہفتم یونیورسٹی کی تعلیم کے چنداں قائل نہ تھے اور اپنے خیالات کے مطابق تعلیم دلوانے کے لئے انھوں نے ڈین ڈالٹن کا انتخاب کیا جو کرائسٹ چرچ کالج کے ایک ممتاز استاد ہونے کے علاوہ ایک وحید العصر عالم تھے۔

درسی کتب کے علاوہ شہزادہ جارج کبھی نقاشی سے دلچسپی کا اظہار کرتے اور کبھی ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہو جاتا۔ اور اکثر اوقات وہ مختلف ممالک کے ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے عمائدین سلطنت سے درخواست کرتے۔ ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ملک معظم آنجہانی کو آخر عمر تک رہا۔ دونوں بچوں کی طبیعت میں بھی نمایاں فرق تھا۔ ڈیوک آف کلیرنس خاموش اور متین تھے اور شہزادہ جارج شوخ اور خوش باش۔

اب شہزادہ جارج کی زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا یعنی انھیں بحری فوج میں تربیت کے لئے بھیج دیا گیا۔ یہ واقعہ اکتوبر ۱۸۷۷ء کا ہے۔ یہاں شہزادہ کو شہزادہ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی مراعات نہ ملیں۔ شہزادہ جارج ابتدائی

امتحان پاس کرکے "برٹینیا جہاز" پر تعلیم کے لئے گئے۔ یہاں وہ سوا سات بجے صبح سے پونے دس بجے رات تک اپنے فرائض انجام دیتے تھے جب اس جہاز پر اُن کی تعلیم کی تکمیل ہوگئی تو اُنھیں دنیا کے گرد سفر کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ جس سفر کے دوران میں وہ سوائے ہندوستان کے تقریباً سب انگریزی مقبوضات میں ہو آئے۔

جنوری ۱۸۹۲ء میں ڈیوک آف کلیرنس کا انتقال ہوگیا اور جنوری ۱۸۹۳ء میں شہزادہ جارج کو ڈیوک آف یارک بنایا گیا اور اس کے چھ مہینے کے بعد اُن کی شادی شہزادی وکٹوریہ میری آف ٹیک سے ہوئی جو قبل ازیں شاہ جارج کے بڑے بھائی ڈیوک آف کلیرنس سے منسوب تھیں۔

۱۹۰۱ء میں جب ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا تو شاہ ایڈورڈ ہفتم آنجہانی سریر آرائے سلطنت ہوئے اور شاہ جارج کو تخت کا وارث قرار دیا گیا اور وہ اسی سال آسٹریلیا کی پہلی مجلس عاملہ کا افتتاح کرنے کے لئے آسٹریلیا گئے۔ آسٹریلیا سے ہوکر ملک معظم آنجہانی نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ اور کنیڈا بھی تشریف لے گئے۔

۱۹۰۵ء میں ملک معظم مرحوم ملکہ معظمہ کی معیت میں ہندوستان بھی تشریف لائے اور ۹ر نومبر سے ۱۹ مارچ تک ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کرتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں جب شاہ ایڈورڈ کی وفات ہوئی تو شہزادہ جارج ۶ر مئی ۱۹۱۰ء کو تخت پر بیٹھے۔

۱۹۰۶ء میں شاہ آنجہانی ہندوستان کو ساحل بمبئی سے خیرباد کہنے والے تھے تو ملکہ نے ایک ممتاز افسر سے کہا "آپ تو یہاں کبھی دوبارہ بھی آسکیں گے اور شاید میں کبھی نہ آؤں" اور یہ کہہ کر آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔ لیکن مشیت سن رہی تھی اور اُسے اس پر محبت آرزو کی تکمیل منظور تھی چنانچہ ۱۹۱۱ء میں ملک معظم آنجہانی اور ملکہ معظمہ نے دوبارہ تاجپوشی کے لئے ہندوستان میں دوبارہ نزول اجلال فرمایا۔ دہلی میں دربار ہوا اور اس شان کا کہ دیکھنے والوں کے دلوں میں مغلوں کے ذوقِ شوکت کی یاد تازہ ہوگئی۔

۱۹۱۴ء میں جب جنگ جرمن شروع ہوئی تو شہنشاہ آنجہانی نے قربانی اور ہمدردی کی عدیم المثال نظیر پیش کی۔ اس مجمل اور بے رنگ خاکہ میں ممکن نہیں کہ ان کے ۲۵ سالہ دورِ حکومت کی ترقیوں پر تبصرہ کیا جائے اور نہ اس دور کی سیاسی تبدیلیوں اور آویزشوں کا تذکرہ ہی ہوسکتا ہے۔

ملک معظم آنجہانی اس دور کے بلاشبہ عظیم شہنشاہ تھے۔ وہ عظیم تر انسان تھے۔ اپنے ممالک محروسہ کی رعایا سے اُنھیں سچی محبت اور ہمدردی تھی اور یہی چیز اُن کی بلند فطرتی کی لافانی یادگار ہے!

(ملک حبیب احمد۔ بی اے۔ آزرز)

سرِ ہمالہ سے بلند ہے نشیمن اپنا
[illegible] ہے گلشن اپنا
[illegible]
[illegible] دامن اپنا
[illegible]

[illegible] خدا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]



[illegible]

قومیت کا تخیل اور ہندو مسلمان

(از جوش ملیح آبادی)

آؤ، میں تم سے کچھ کہوں، اے اپنی تاریخی عظمت پر فخر کرنے والے تنگ نظر، جاہل و فاقہ مست مسلمانو! اور اے اپنے مذہبی فلسفے کی قدامت پر اترانے والے تنگدل وہم پرست و نیم جان ہندوؤ! ہاں میں بدبخت تمہیں میں سے ہوں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ خون کے رشتے کبھی منقطع نہیں ہوتے ہیں، تو میں تم سے کیونکر جدا ہو سکتا ہوں! میں اس پر فخر کروں یا ماتم؟

ہاں، اے اپنوں کے مقابلے میں ساونت ہندوؤ! اور اے بھائیوں کے روبرو صف شکن مسلمانو! تم حیات کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا، اور انسانیت کے جسم پر کوڑھ کا داغ ہو۔

عاقبت اندیش احباب مجھ سے کہتے ہیں رسالہ تو نکال رہے ہو، اور اپنی قوم کی ذہنی اصلاح پر تم نے کمر تو باندھی ہے، لیکن خدا را خطابت میں نرم لہجہ اختیار کرنا، ورنہ ہندو مسلمان تمہارے خلاف بھڑک اٹھیں گے "کونین" دینا، مگر شکر میں لپیٹ کر، ورنہ لوگ منہ بنانے لگیں گے!

لیکن میں کیا کروں، میرا سینہ تو پھوڑے کی طرح پک رہا ہے، میرا دل تو انجن کی بھٹی کی طرح سنسنا رہا ہے، اور میری چھاتی تو آتش فشاں پہاڑوں کی طرح بھڑک کر شق ہو جانے کے لئے تیار ہے ——— میں نرم لہجہ کہاں سے لاؤں؟

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوازی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اے ہندوؤ! اور اے مسلمانو! اے بھارت ماتا کے سپوتو! تمہاری آئے دن کی خانہ جنگیوں نے تو مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ تمہارے دیر و حرم، اور ناقوس و اذان کے جھگڑوں نے تو مجھے کف در دہاں، اور آتش بجاں بنا دیا ہے۔ میں تو دیوانہ وار خود اپنی بوٹیاں نوچ رہا ہوں۔ خدا کے لئے بتاؤ ایسی نرم لہجہ کہاں سے لاؤں؟ وہ جو غصے کی شدت میں دانت پیس رہا ہو، کیونکر مسکرا سکتا ہے؟ اور کیا ایسے سنگین، اور دوزخ کی طرح بھڑکتے ہوئے موقع پر مسکرانا، ایک انتہا درجے کا بزدلانہ نفاق نہیں کہا سکتا؟

میں آج کی صحبت میں کھری کھری سناؤں گا۔ جی کھول کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑوں گا، میں تو تمہاری صفوں میں سے آندھیوں کی طرح گزروں گا۔ تمہارے بے مغز سروں پر کڑی کمانوں کی طرح کڑکوں گا، اور طوفانی بادلوں کی طرح گرجونگا۔

اس وہم میں نہ پڑنا کہ تم سے ڈر جاؤں گا، سنو میں ایک ایسا کفن بردوش، اور بکف انسان ہوں جو ہر سانس میں موت سے کھیلتا، اور فرشتۂ اجل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا رہتا ہے۔

ہندوستان کی اس گزری ہوئی عظمت کی قسم، جو، اب گلیوں میں برہنہ ماری ماری پھر رہی ہے۔ اور جس کا واپس لانا ہر اس ہندوستانی پر فرض ہے جو اپنی ماں کی عصمت پر فخر کرتا ہو، کہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مرنے سے ڈرنے والے صرف بزدل ہی نہیں، احمق بھی ہیں۔ میں تو ایک مدت سے پکار پکار کر کہہ رہا ہوں۔ ع

اے اہل دہر! موت سے ڈرنا حرام ہے

ایک مرتبہ میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا تھا "خاں صاحب کھانے پینے میں اتنی بے ضابطگی نہ برتا کیجئے۔ ورنہ مر جائیگا" اور مجھے یاد ہے میں نے جواب میں کہا تھا "مجھے سب سے زیادہ گھٹیا قسم کی دھمکی نہ دیجئے" ———

اب کوئی میرے لئے حدِّ ترقی نہ رہی
اک جھجک موت کی باقی تھی، سو وہ بھی نہ رہی

اے "بہادر" ہندوؤ، مسلمانو! کہہ چکا ہوں، اور پھر کہتا ہوں کہ میں موت سے نہیں ڈرتا ——— اچھا ہے مجھے تمہیں میں سے کوئی موت کے گھاٹ اتار کر مجھے ہندوستان کی اس بے حمیت زندگی کے پاپ سے چھڑا دے ——— میں تمہارے کمزور سے مردانہ ہاتھوں سے مجھ کا پیاسا قتل ہو جانے کو اس سے کہیں زیادہ پسند کروں گا کہ اغیار کی پری رخساروں کے نازک ہاتھوں سے آب حیات نوش کروں۔

ہاں میں تم پر بیحد برافروختہ ہوں، میں تم سے بدرجۂ اتم ناخوش ہوں، تم

یہ میرا غیظ و غضب بپھرے ہوئے دیوتاؤں کا غیظ و غضب ہے۔ کاش میں تم سے نفرت کرسکتا! کاش میں تم سے نفرت کرسکتا، کاش میں تم سے نفرت کرنے پر قادر ہوتا!!

یاد رکھو اے افلاطونو، اے لقمانو! اگر تم میں کسی شخص کا بھی اور ... حافظہ عاقلانہ باتوں کے محفوظ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو یاد رکھو کہ وہ تمہاری جبلّی تہ میں امرت بھریں نہ رہا ہے، اُس بیہودہ کلامی سے کہیں بہتر ہے جس کے سبب سے کے نیچے زہر ہلاہل بہہ رہا ہو۔

میں دریافت کرتا ہوں کہ وہ عقیدہ قابل قدر نہیں ہے جس کی بنیاد محبت پر قائم ہو؟

سُنو، اے سسکتے ہوئے پامال ہندوستان کے سوا تیس کروڑ غلام سورماؤ! اے "گائے"، "باجے" پر حیات کی سی مقدس شے، اور سناتنوں، اذان پر بھائیوں کے خون کی سی متاعِ عزیز کو بھینٹ چڑھا دینے والے دو پاؤں کے جانورو! تم نے ہندوستان کو ذلیل کر ڈالا ہے، تم نے انسانیت کو رُسوا کر دیا ہے، تم نے آدمیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے، تم نے نوعِ انسانی کو پارہ پارہ کر دیا ہے، تم نے حقیقت کو کُند چھری سے حلال کر ڈالا ہے۔

جامۂ انسانیت کے پُرزے ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں ——— لباسِ طینت و کی دھجیاں فضا میں رقص کر رہی ہیں۔ یہ ہیں تمہاری چنگاری بازیاں، یہ ہیں تمہارے لہراتے ہوئے پرچم!! اور اے میرے بہکے یا بہکائے ہوئے عزیزو! یہ ہیں تمہارے کرتوت!!!

کیا تم شرم سے سر جھکا لینے پر اب بھی آمادہ نہیں؟

تمام دُنیا کی برادری، اور قومیت کے تصوّر کا "وطن" اور "انسانیت" پر مدار ہوا کرتا ہے ——— اور یہی عاقلانہ و فطری دستور بھی ہے۔

لیکن تمہاری برادری، اور قومیت کے تصوّر کی کس چیز پر بنیاد ہے؟ ٹھہرو، ذرا ٹھہرو ——— غصے کے مارے مجھے اپنے سینے سے تھرتھراتی ہوئی آنچ کی سنسناہٹ سُنائی دے رہی ہے۔

لیکن کیا سانس روک کر اور غُصّے کو ضبط کر کے مجھ نامراد و بدبخت کو یہ کہنا پڑیگا کہ تمہارے برادری، اور قومیت کے تصوّر کو "وطن" اور "انسانیت" سے دُور کا بھی علاقہ نہیں ہے؟ — اور "وطن" و "انسانیت" وہ الفاظ ہیں جو تمہاری فرہنگ میں درج ہی نہیں کیے گئے ہیں؟

ہاں اے عقل کے دشمنو! تمہاری برادری تو "عقائد" و "رسوم" کی برادری ہے، تمہاری قومیت تو "روایات" و "اوہام" کی قومیت ہے۔

اگر میں ہندوستان سے باہر جاؤں، اور کوئی خدا کا بندہ خدانخواستہ مجھ سے سوال کر بیٹھے کہ تیرے ہندوستان میں قومیت کا تصوّر، اور برادری کا معیار کیا ہے، تو تمہیں بتاؤ، کیا میں شرم سے زمین میں گڑ نہ جاؤں گا؟

کیا میں اُس سے یہ کہنے کی جسارت کرنے کے لیے زندہ بھی رہ سکتا ہوں کہ "میرے ملک میں "وطن" اور "انسانیت" کوئی معیار نہیں ہے، میرے ملک میں کوئی اس بنا پر بھائی نہیں ہو سکتا کہ وہ میرا ہم وطن ہے، میری ہی طرح ایک انسان ہے" میرے ہندوؤں مسلمانوں کو تو اگر اجنبی شخص کے متعلق بھی یہ علم ہو جائے کہ وہ اُنھیں کی ترکیب کے مطابق برتن مانجھتا ہے، اُنھیں کے رسوم کے موافق ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر عبادت کرتا ہے، اُنھیں کی طرح ایک خاص گھوڑے کو سلام کرتا ہے۔ اور اُنھیں کے عقاید کی مطابقت کرتے ہوئے بندروں کی ایک خاص قسم کو اپنا پیشوا سمجھتا ہے، تو وہ دیوانہ وار نعرے لگاتے ہوئے اُس کی طرف دوڑیں گے، اُسے گلے لگائیں گے، اور اُس کے غلاموں تک کو اپنی برادری میں شامل کر لیں گے۔ لیکن "وطن" و "انسانیت" کے نام پر کسی کو بھائی نہ سمجھیں گے۔

اے میرے ہندوؤ، اور مسلمانو! ماتم ہی کرنے کی نہیں، مر جانے کی بات ہے کہ کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی شائستہ و شریف کیوں نہ ہو، اِس قدرتی اور فطری بنیاد پر تمہارا بھائی نہیں ہو سکتا کہ وہ تمہارا ہم وطن ہے، اور تمہاری ہی طرح ایک انسان ہے۔

تم تو اپنی قومیت، اور برادری کے حلقے میں صرف اُس شخص کو داخل کر سکتے ہو جو تمہارے عقائد و روایات کے مطابق ٹخنوں سے اونچا پائجامہ پہنتا ہو، شانے پر چارخانے کا رومال ڈالتا ہو، اُس کے ماتھے پر سیاہ دھبّا ہو۔ اُس کی مونچھیں تمہاری مرضی کے مطابق خوب کتری ہوئی ہوں، وہ ایک خاص انداز سے کچھ خاص کلمات ادا کرتا ہو، حلوؤں اور مٹھائیوں پر کچھ بڑبڑا بڑبڑا کر شیریں کام ہوتا ہو، اور داڑھی اتنی دراز رکھتا ہو کہ حریف اگر چاہے تو اُسے مٹھی میں پکڑ کر اپنے طمانچے کو زیادہ شدّت کے ساتھ کامیاب بنا سکتا ہو۔

تم تو اپنی برادری میں صرف اُس شخص کو داخل کر سکتے ہو جو گلے میں ایک نز جھاڑو سا ڈالتا ہو، جسے غسل خانہ میں کان سے لپیٹ لیا جاتا ہو، جو اپنے جسم پر بھبوت ملتا ہو جس کی چاند پر بالوں کا ایک گچھا ہو، ایسا گھنا ہو، کہ دشمن اگر اُسے گرفت میں لے لے تو جسم کو اوپر اٹھا کر گڑھے میں ڈال سکتا ہو، وہ ایک

خاص چوپائے کے فضلے پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہو۔ وہ اپنے بھائی اور باپ تک کو نجس تصور کرتا ہو اور اُن کے ہاتھ کی پکائی ہوئی چیز کا کھانا حرام سمجھتا ہو جس کا ایمان، پانی کی ایک بوند سے پگھل جاتا ہو اور جب کہ ماتھے پر موٹی موٹی رنگین لکیریں اس طرح بنائی جاتی ہوں کہ ماتھا دیوالی کی کلھیا سے ملنے لگے۔

تم تو اپنی برادری میں اُس شخص کو داخل کر سکتے ہو جو ہاتھ میں ایک کڑا پہنتا ہو۔ سر پر پگڑی باندھتا ہو۔ تم کو کسی شخص کی خوشبو سے پیار ہو جاتا ہو جس کے جسم کو قینچی یا استرا مرتے دم تک نہ چھو سکتا ہو۔ اس کی مونچھ۔ بھوں۔ گلا، گُدّی، گردن سب بالوں کے جھنڈ میں اس طرح چھپے ہوئے ہوں گویا اندھیرے میں ایک بڑا ناریل پڑا ہوا ہے۔

تمہارے حلقے میں تو صرف وہ شخص داخل ہو سکتا ہے جو کانوں میں انگلیاں دے کر عبادت کا آوازہ بلند کرتا ہو، یا گردن کی رگیں پھلا کر تونبیاں بجاتا ہو۔

تمہاری برادری میں تو صرف اُس شخص کو بار مل سکتا ہے جو مہا... کی مرضی کے مطابق ایک خاص طرز کا لباس پہنتا ہو، ایک خاص سمت پاؤں نہ پھیلاتا ہو اور ایک خاص طرف مُنھ کر کے کُلّی نہ کرتا ہو۔

اور اے صاحبِ عقل و حکمت ہندو، مسلمانو! تمہاری قومیت اور برادری کی مُہر تو صرف اُسی کی پیشانی پر ثبت کی جا سکتی ہے جو چھینک آتے ہی "الحمد للہ" کہتا ہو یا جماہی آتے ہی ناک کے پاس ہاتھ لیجا کر چٹکیاں بجانے لگتا ہو۔

اور اگر ان باتوں میں سے کسی ایک ادنیٰ سی بات میں بھی، کوئی تمہارا ہموطن، جو فطری طور پر تمہارا بھائی ہے، زیادہ نہیں، ایک خفیف سا بھی تم سے اختلاف رکھتا ہو، تو تمہارا خدا اور تمہارا پرمیشر تمہیں حکم دے دیتا ہے کہ تم اُسے گالیاں دو، کوڑے مارو۔ شہر بدر کر دو۔ سُولی پر چڑھا دو، قتل کر ڈالو۔ جلا دو، پھونک دو، بھون ڈالو، بھسم کر دو۔ اُس کے گھر میں آگ لگا دو۔ اُس کے بال بچوں کو اُسے دکھا دکھا کر ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اُتار دو۔ اور اُس کی بہو بیٹیوں کی شارعِ عام پر اس طرح عصمت دری کرو کہ شیطان تک کے ماتھے سے غیرت کا پسینہ ٹپکنے لگے ——— کیوں! یہی ہے نہ تمہاری برادری، تمہاری قومیت، اور تمہاری شرافت کا معیار؟ کیا تم سن رہے ہو؟ سچ مچ سن رہے ہو؟ اور حیرت ہے کہ اب بھی شرم سے تمہاری آنکھیں نیچی نہیں ہیں؟

تم آزادی کا مطالبہ کرتے ہو۔ حالانکہ تمہیں زندہ رہنے کا بھی حق نہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ غلامی کی روح کو بھی تم سے منسوب ہوتے ہوئے بے غیرتی محسوس ہوتی ہے۔ تم تو غلامی سے بھی بد تر ہو۔ میں تمہیں کیا خطاب دوں؟

ہر ہاتھ میں تیغِ خوں چکاں ہے یارب — پاؤں میں زنجیرِ گراں ہے یارب
مذہب کی روا... سے دل تنگ ہیں — انساں کی برادری کہاں ہے یارب

شور شور شاعر کی دردناک آواز گنگا جمنا کے کناروں پر گونجتی ہے؟

مذہب کوئی تو دوزخ طوفاں کوئی — خنجر ہے کوئی، تو تیغِ بُرّاں کوئی
انساں سے کہاں واسطہ ہے ان کا جنہیں — یاں تو کوئی ہندو ہے مسلماں کوئی

اے مغرور ہندوؤ اور اے نادان مسلمانو. کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اللہ نے جو تفریق کی تختیاں اپنے ہاتھوں پر چپکا رکھی ہیں، انھیں کھرچ کر جیبوں میں رکھ لو اور اپنی ان فرضی اور جھوٹی قرابتداریوں کو اس مقدس عظیم قرابت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دو جو حقیقی اور فطری ہے؟

دین، دین، تو دھرم، دھرم، کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ ان جھوٹی اور کھوکھلی آوازوں سے، کانوں میں زخم پڑے جاتے ہیں ان مولویوں اور پنڈتوں کی نامراد صداؤں سے!

اے بھائیو! اے عقل و حکمت کے دشمن بھائیو! اے زمین پر فساد برپا کرنے والے بھائیو! تمہاری کس کس بات پر روؤں؟

اے دھوتی اور پائجامے کے گروہو! اے لوٹے اور بدھنے کی انجمنو! اور اے ڈاڑھی اور چوٹیا کے ادارو! تمہاری کس کس حماقت پر ماتم کروں؟

میں تمہارے جنونِ خانہ جنگی، اور ذوقِ محکومی و کفش برداری کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اب تو خیر سے تمہارے پانی اور تمہاری چائے نے بھی دین اور دھرم کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔

بہ مکتب می رود طفلِ پری زاد
مبارک باد مرگِ نو بہ استاد

کیا تم ریلوے اسٹیشنوں پر "مسلمان پانی" اور "ہندو چائے" کی ناپاک آوازیں نہیں سنتے ہو۔ کیا تم اس قدر بے حیا ہو کہ ان آوازوں کی گونج میں بھی تم کھڑکی سے باہر سر نکالتے ہو، اور پلیٹ فارموں پر اُتر کر غیر دنیا کو مُنھ دکھانے کی جرأت کرتے ہو؟

اور کیا کبھی تم نے یہ مطالعہ نہیں کیا ہے کہ تمہارے "مسلمان پانی" اور "ہندو چائے" کے ذلیل نعروں کی گونج، اغیار کے چہروں پر سرخی بنکر کھیلنے لگتی ہے؟

اے میرے نادان دوستو! اے ہندوؤ، اور اے مسلمانو! خدا تمہیں ان

بخشنے کی توفیق دے ——— اگر تم سب کو ایک ہی لباس میں ملبوس کر کے کسی وسیع میدان میں کھڑا کر دیا جائے۔ تو کیا تب بھی صورتیں دیکھ کر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ہندو ہے اور وہ مسلمان؟

کیا تمہاری شکلیں، لہجے، آواز، چال ڈھال، رنگ روپ، قد و قامت، مزاج اور عادات و اطوار یہ تمام چیزیں بلا استثنا ایک دوسرے سے نہیں ملتی ہیں؟

کیا تمہارا گوشت، پوست، خون اور ہڈیاں ایک نہیں ہیں؟

کیا تم اسی خاک سے پیدا نہیں ہوئے ہو، اور اسی خاک میں نہ مل جاؤ گے؟

جب موسم گرما چڑھتا ہے اور بے مہر و مروّت موسم گرما کی تُند خو ہواؤں کے بھکّڑ چلتے ہیں، کیا تم دونوں کے چہروں پر ایک ہی قسم کی تُرش پژمردگی نہیں پائی جاتی؟

جب گلابی جاڑے، گلابی دھوپ دیواروں سے اُترنے لگتی ہے، اور ہلکی دُلائیوں کی زلفوں میں بسی ہوئی خوشبو تمہارے دماغوں کو معطّر کر دیتی ہے، کیا تم دونوں کے چہروں پر ایک ہی قسم کی میٹھی شگفتگی نہیں پائی جاتی؟

جب بھری برسات کی مچلتی اور برستی راتوں کی تاریکیوں میں دُور کے باغ سے پپیہے کی صدا آنے لگتی ہے تو کیا تم دونوں کسی بچھڑے ہوئے کی یاد میں آنسو نہیں بہانے لگتے ہو؟

سچ کہو کیا ایک ہی موسم کی ہوائیں تمہیں جھولا نہیں جھلاتیں؟ کیا ایک ہی فضا میں تمہاری مسیں نہیں بھیگتیں، کیا تم پر ایک ہی قسم کے باغوں میں ہوا کھا کر جوانی نہیں آتی۔ کیا تم ہندوستان ہی کی مہ جبینوں سے دل نہیں لگاتے۔ کیا ایک ہی سرزمین کے پھول تمہارے سہروں میں نہیں مہکتے۔ اور کیا ایک ہی دلفریب انداز سے تمہاری دُلہنیں نہیں شرماتیں؟

اے ہندو مسلمانو! حیران ہوں، جنون کی حد تک حیران ہوں کہ اس مکمل یک جہتی و یک رنگی، اور اس زبردست ظاہری و باطنی وحدت کے باوصف تم ایک دوسرے کو غیر کہتے ہو، دشمن سمجھتے ہو۔ ایک دوسرے کا خون بہاتے ہو!!

اے ہندیو! اے اپنی "آسمانی" کتابوں اپنے "اوتاروں" "دیوتاؤں" اور "پیغمبروں" کو رُسوا کرنے والے دیندار بے دینو! اور دھرمی اُدھرمیو! تم احمق بھی ہو۔ مسخرے بھی۔ تم بدبخت بھی ہو، اور درندے بھی۔

تمہارے مُنہ سے اپنے بھائیوں کے کچّے گوشت کی بُو آ رہی ہے، تمہارے پنجے خون سے رنگین ہو رہے ہیں۔ تمہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پنجے کھلے ہوئے ہیں۔ آنکھیں نفرت سے اُبلی ہوئی ہیں۔ تمہاری زبان بار بار باہر نکل پڑتی ہے۔ تمہارے جبڑے ہل رہے ہیں۔ تم غرّا رہے ہو۔ تمہارے دانت باہر نکلے ہوئے ہیں۔ اور تم بس اب کلہ کیا ہی چاہتے ہو۔

اے بہکے یا بہکائے ہوئے ہندوستانیو! میں پوچھتا ہوں تمہاری کھوپڑیوں کے اندر بھیجا ہے کہ پگھل گیا، تمہارے دماغی خلیوں میں رطوبت باقی ہے کہ خشک ہو چکی؟

میں کیونکر، اور کن آگ اور بجلی سے بنے ہوئے الفاظ میں تم سے کہوں کہ اے اوتاروں اور دیوتاؤں کے رسیو! آگاہ ہو کہ تمہارے دماغ اندھیرے اور گہرے غاروں میں گر چکے ہیں، تمہاری عقلیں گندے نالوں میں بہتی پھر رہی ہیں۔ تمہاری ذہنیت کے عقاب، سڑی ہوئی مُردار لاشوں پر منڈلا رہے ہیں تمہاری بصیرت جلتی ہوئی ناپاک ہڈیوں کے دھوئیں میں گردش کر رہی ہے، اور تمہارا ایمان، شیطان کے سب سے زیادہ تاریک کارخانے میں مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال رہا ہے۔

میں تمہاری کس کس بات پر ماتم کروں اے بدبخت ہندوؤ۔ اور اے بدقسمت مسلمانو! تم اپنے راہبروں، اور لیڈروں کو پہچانتے ہو؟ کیا یہی تمہارے لیڈر ہیں؟ کیا سچّے راہبروں کی صورتیں ایسی ہی نورانی ہوا کرتی ہیں؟ کیا مخلص لیڈروں کے چہرے چوروں، ڈاکوؤں، قزاقوں اور غدّاروں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں؟ اور کیا اُن کے اعمال و اقوال یہی ہوا کرتے ہیں جو تمہارے لیڈروں کے ہیں؟

ہوشیار ہو، ہوشیار! یہ سچّے لیڈر اور حقیقی وطن پرست نہیں ہیں۔ یہ تو ڈاکو "محافظ" راہزن "راہبر" شیطان "اوتار" اور کافر "پیغمبر" ہیں — اگر تمہاری عقلوں پر پتھر نہ پڑ گئے ہوتے تو کیا تم ان بھیڑیوں کو گلّے کا نگاہبان بنا سکتے تھے؟

بچو، بچو، اپنے کانوں کو اُن کے لبوں سے دُور رکھو۔ اِن کے الفاظ بچھو، بھورے بچھو کے ڈنک ہیں۔ جو کانوں کے پردوں میں اِس طرح اُتر جاتے ہیں کہ دفعتہً کھوپڑی شق ہو جاتی ہے۔

دیکھو اے ہندوؤ اور مسلمانو! اب بھی اُمید باقی ہے۔ اب بھی زہر پورا نہیں چڑھا ہے۔ اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے، اور اب بھی سویرا ہے،

آپس میں اس طرح شیر و شکر ہو جاؤ کہ سائنس کا کوئی آلہ تمہیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے اور دنیا کی کوئی ضرب تمہاری محبت کے بنتے ہوئے پاک دھاگے کو چاٹ نہ سکے۔

اور اگر، شیطان کے کان بہرے، تنے نصیب اعداء، اپنی متحدہ قومیت کا آوازہ جلد تر نہ بلند کر دیا تو دیکھو، آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھو، بلندیوں سے ایک آرا اترتا ہوا چلا آ رہا ہے، وہ تمہیں عنقریب یوں کاٹ دیگا کہ تم میں سے ہر شخص کی لاش دو برابر کے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اور چونکہ زندگی میں تم ایک جگر نہیں، دو جگر۔ جینے پر مصر ہو۔ مرنے کے بعد دو حصے جدا ہو جاؤ گے۔ آج بھائی سے نہیں ملتے ہو، کل خود سے بھی نہ مل سکو گے۔ تمہاری لاش کا آدھا ٹکڑا مشرق میں ہوگا۔ آدھا مغرب میں!

ہوشیار اے ہندو! خبردار اے مسلمان!!

ہو چکے ہیں شور سے بہری فضا کے واسطے
جاگ اٹھو، اب بھی سویرا ہے خدا کے واسطے!!!

اَستقلال

چٹانوں کو دیکھا ہے میں نے یہ اکثر
تھپیڑے سمندر کے کھاتی ہیں جم کر
پڑے غار پر غار، جسموں کے اوپر
مگر تو بہ تو بہ سرکتا ہے لنگر؟

وہ جس طرح قدموں کو گاڑے کھڑی ہیں
اُسی طرح پانی کو پھاڑے کھڑی ہیں

(آغا شاعر قزلباش)

تجدیدِ شوق

وہ ہمیں اور ہم انھیں کل راہ میں پا ہی گئے
آنکھ ملنی تھی کہ حسن و عشق شرما ہی گئے

دیکھ کر وارفتۂ جلوہ وہ گھبرا ہی گئے
لاکھ کترائے، بچے، ہم سامنے آ ہی گئے

بن کے وہ طوفاں مرے احساس پر چھا ہی گئے
لاکھ روکا، آنکھ میں آنسو مگر آ ہی گئے

قصۂ پارینۂ ماضی کو دُہرا ہی گئے
کفر تھا احساسِ غم لیکن وہ تڑپا ہی گئے

دل کا ہر زخمِ کہن رِسنے لگا بہنے لگا
رات وہ ذوقِ جراحت تازہ فرما ہی گئے

وہ ہوائے سرد وہ گھرا اندھیرا الاماں!
ہنس کے وہ تاریکیٔ قسمت کو چمکا ہی گئے

وہ ہوا کی ژالہ باری وہ فضا کی کپکپی
وہ بہ ایں موسم تمناؤں کو گرما ہی گئے

دیکھ کر تاریکیٔ شامِ زوال و انقلاب
دن عروجِ عاشقی کے ہم کو یاد آ ہی گئے

ساغر نظامی

انکار

(میکش اکبرآبادی)

وجود خیر محض ہے۔ شر عدم اضافی کا نام ہے۔ عدم حقیقی لاشے محض ہے اس لئے بحث و اعتبار سے بھی خارج ہے۔ وجود واحد ہے اور وحدت، وجود، حسن، حق، خیر ایک شے کے مختلف نام ہیں۔ خیر اپنے مرتبۂ ظہور میں اقرار اور انکار کی خواہشمند ہے۔ تمام خوبیاں وحدت میں ہیں، الحمد للہ، اور تمام برائیوں کا محل کثرت ہے۔ کثرت عدم اضافی ہے یعنی عدم وحدت کا نام کثرت ہے، اگرچہ کثرت ایک جہت سے ترکت وحدت ہی کا نام ہے۔ مگر مرکزیت بُعد اور حقیقت سے دوری کی وجہ سے ناجموں ہے۔

مادی حُسن بھی وحدت ہی کا مظہر ہے جسن اس وحدت تناسب کا نام ہے جو اشیا میں باہم پائی جاتی ہے۔ یہ نسبت غیر مادی ہے مختلف اعضا میں جو وحدتِ تناسب پائی جاتی ہے اس کا نام حُسن صورت ہے اور مختلف آوازوں میں جو وحدتِ تناسب پائی جاتی ہے اس کا نام نغمۂ دل کش ہے اور مختلف قوی و ملکات میں جو وحدتِ تناسب پائی جاتی ہے اس کو عدل کہتے ہیں۔ کلام کے مختلف اجزا میں جو وحدتِ تناسب ہے ان کو فصاحت کہتے ہیں۔

انکار دو قسم کا ہے ایک انکار اس عدم اضافی کا جو نتیجے کے طور پر وحدت کا اقرار ہے یہ انکار محمود ہے جیسے لا الٰہ الا اللہ میں لا الٰہ۔

دوسرا انکار اس وحدت کا ہے جو عمراً کثرت یا شرک کا اقرار ہے۔ یہ انکار مذموم ہے جیسے انکارِ حق۔

ہر جگہ معبود حق ہی ہے، طرزِ عبادت کا فرق ہے بچہ باپ کی عبادت تعمیل احکام سے کرتا ہے اور باپ بچے کی عبادت تکمیلِ ضروریات و پرورش کی صورت میں، ہوس پرست اپنی صورت کی پرستش تکمیل ہوا و ہوس کی صورت میں اور ایک عارف اپنی حقیقت کی پرستش ترکِ ماسوا کے عنوان سے، مگر ہر چیز اعتبارات سے اوصاف حاصل کرتی ہے اور اعمال کے نتائج اعتبارات پر مترتب ہوتے ہیں۔ باطل بھی بحیثیت اثبات حق ہی ہے، لیکن وہ اپنے ظہور میں انکار کا خواہشمند ہے۔ انکار ہی اس کے حق کو ادا کرنا ہے۔ اس کا انکار دوسری جہت سے حق کا اثبات ہے۔ سانپ اپنے ظہور میں مارے جانے کا خواہشمند ہے اور گلا ہوا عضو کاٹے جانے کا۔

اسی طرح تشبیہ جہاں بھی ہے عبدیت کی مقتضی ہے اور تنزیہہ جس مقام پر بھی ہے معبودیت کی مستحق۔ ہر شے کا اس کے مقتضیات کے مطابق حق ادا کرنا یہی عبادت ہے۔ لہٰذا اقرار اور انکار دونوں ایک جگہ حق ہیں۔ اور دوسری جگہ باطل ایک جگہ ایمان ہیں اور دوسری جگہ کفر۔ ایک جگہ حُسن ہیں اور دوسری جگہ قبح۔

تشبیہ پرستار ہے اور تنزیہہ معبود، آقا سے روگردانی کر کے غلام کے سامنے سر جھکانا گمراہی اور محرومی ہے۔ گمراہی اور ہدایت دونوں حقیقت ہی کے مظاہر ہیں مگر خاک سے پیاس نہیں بجھ سکتی۔ صفات اور نام اپنی خواہشات اور طبائع میں مجبور ہیں۔

وہ شخص جو آگ کی گرمی سے انکار کرتا ہے اور وہ شخص جو متکلمین کی طرح غیر متیقن ہے آگ سے یکساں جلتے ہیں۔ اعتبار و فہم سے حقائق تبدیل نہیں ہوتے۔ البتہ یہ اعتبار و فہم خود اپنا ایک مستقل اثر فہم کرنے والے میں چھوڑ جاتے ہیں۔

تمام مذاہب وحدت کو پیش کرتے رہے ہیں اور جو موانع کہ اس راہ میں حائل ہوتے ہیں یا حائل ہونے کا امکان اپنے میں رکھتے ہیں ان سے روکتے ہیں اس کلیہ میں استثنا نہیں ہے اس لئے وہ سب ایک ہیں اور اس لئے وہ سب حق ہیں،

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ۔

اس کے برعکس مذاہب باطل افتراق سے شروع ہوتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی بنیاد سو ظن پر ہے ان کی ہستی ان کا وجود اور ان کا امتیاز بغیر کسی کو برا کہے اور جانے ہوئے قایم بھی نہیں ہوسکتی۔ مذاہب حق اپنی تعلیمات کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔ اور مذاہب باطلہ کی ساری امتیاز شخصیتوں اور افراد پرستی ہو جاتی ہیں۔ مذاہب حق کے پیرو بھی جب تعلیمات سے رُو گردانی کرکے اشخاص کے پیچھے پڑ جاتے ہیں تو ان میں بھی اختلاف رونما ہو جاتا ہے۔ وہ اختلاف نہیں جس کی تہ میں تلاش حق یا اثبات حق ہو۔ بلکہ وہ اختلاف دوسروں کی توہین اور اپنی بڑائی پر مبنی ہوتا ہے۔

"آدمِ نو کا ترانۂ سفر"

فریب کھائے ہیں رنگ و بو کے سراب کو پوجتا رہا ہوں ،
مگر نتیجوں کی روشنی میں خود اپنی منزل پہ آ رہا ہوں

جو دل کی گہرائیوں میں صبحِ ظہورِ آدم سے سو رہی تھیں ،
میں اپنی فطرت کی اُن خداداد قوتوں کو جگا رہا ہوں

میں سانس لیتا ہوں ہر قدم پر کہ بوجھ بھاری ہے زندگی کا
ٹھہر ذرا گرمِ روز مانے کہ میں ترے ساتھ آ رہا ہوں

جہاز رانوں کو بھی تعجب ہے میرے اس عزمِ مطمئن پر
کہ آندھیاں چل رہی ہیں تند اور میں اپنی کشتی چلا رہا ہوں

طلسمِ فطرت بھی مُسکراتا ہے میری افسوں طرازیوں پر
بہت سے جادو جگا چکا ہوں، بہت سے جادو جگا رہا ہوں

یہ مہرِ تاباں سے کوئی کہدے کہ اپنی کرنوں کو گِن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرّے ذرّے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں

مرا تخیل مرے ارادے کریں گے فطرت پہ حکمرانی
جہاں فرشتوں کے پَر ہیں لرزاں میں اُس بلندی پہ جا رہا ہوں

یہ وہ گھروندے ہیں جن پہ اک دن پڑے گی بنیادِ قصرِ جنت"
نہ سمجھیں "سکانِ بزمِ عصمت" کہ میں گھروندے بنا رہا ہوں

یہ نازِ پروردگانِ ساحل، ڈریں مری سعیِ گرم رُو سے
کہ میں سمندر کی تند موجوں کو روندتا پاس آ رہا ہوں

اِس انجمن میں ہر ایک دل پر فضا کی افسردگی ہے طاری
جمیل مدفن کی خاموشی میں اپنی بنسی بجا رہا ہوں ،

جمیل مظہری (کلکتہ)



ہندوستان کا افلاس * فی کس آمدنی

از عبدالرحیم شبلی (بی۔ کام)

یہ تو ایک مسلمہ امر ہے کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے۔ لیکن چونکہ "افلاس" یا "امارت" نسبتی اصطلاحیں ہیں اور اُن کو جانچنے کے لئے مختلف ممالک کے لئے مختلف اصول برتنے پڑتے ہیں۔ اس لئے یہ معلوم کرنا کہ کن وجوہ کی بنا پر اور کن پہلوؤں کے لحاظ سے ہمارا ملک دوسرے ممالک کی نسبت زیادہ غریب ہے، ایک نہایت ہی پیچیدہ اور تحقیق طلب مسئلہ ہے۔

معاشی حالت کو پرکھنے کے ذرائع

بالعموم کسی ملک کی بے زری یا امارت کے پرکھنے کے لئے ہمارے پاس تین ذرائع ہیں۔

(۱) اس ملک کے انکم ٹیکس کے اعداد و شمار اکٹھا کئے جائیں۔ اگر حیثیتی ٹیکس دینے والے زیادہ ہوں تو وہ ملک امیر ہوگا ورنہ غریب۔

(۲) پیشوں کے لحاظ سے اعداد و شمار جمع کئے جائیں اور دیکھا جائے کہ کون سے پیشے ملک کی امارت یا فلاکت کے ذمہ دار ہیں۔

(۳) ملک کی مجموعی پیداوار کا مقابلہ آبادی سے کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ اُس کے لئے کافی ہے یا نہیں۔

لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں ایسے اعداد و شمار کے جمع کرنے کا تا حال کوئی منظم طریقہ رائج نہیں ہوا ہے۔ جو اعداد و شمار حکومت کی طرف سے جمع کئے جاتے ہیں وہ بالکل ادھورے اور ملک کی اقتصادی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے قطعی ناکافی ہوتے ہیں۔ مثلاً انکم ٹیکس کے اعداد و شمار صرف اُن لوگوں تک محدود ہوتے ہیں جن کی سالانہ آمدنی دو ہزار روپیہ یا اُس سے زائد ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ ہندوستان میں صرف معدودے چند ہیں اور لاکھوں باشندے ایسے باقی رہ جاتے ہیں جن کی آمدنی پچاس روپے سالانہ بھی نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہندوستان میں ہزارہا چھوٹے چھوٹے پیشے ہیں جن کے متعلق کوئی اعداد و شمار ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ پیداوار کے لحاظ سے زراعت اور کان کنی کے متعلق اعداد و شمار قدرے مکمل ہیں۔ لیکن گھریلو مصنوعات اور چھوٹے چھوٹے پیشوں کی مجموعی آمدنی اور یافت وغیرہ کے متعلق کوئی اعداد و شمار جمع نہیں کئے جاتے۔ اور نہ ایسا کرنا ممکن ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے باشندے ابھی تہذیب کی اُس منزل تک نہیں پہونچے کہ وہ صحیح صحیح تفصیل کا علم اپنی گورنمنٹ کو پہنچا سکیں۔

---

* اس مضمون کی تیاری میں میں نے مندرجہ ذیل کتابوں کی امداد لی ہے۔

(۱) انڈین اکنامک انکوائری کمیٹی رپورٹ ۱۹۲۵ء
(۲) پاورٹی اینڈ ان برٹش رول ان انڈیا دادا بھائی نوروجی۔
(۳) ویلتھ اینڈ ٹیکسیبل کپیسٹی شاہ اینڈ کھمباتا۔
(۴) پراسپرس انڈیا ڈگبی
(۵) انڈین اکنامکس جتھار اینڈ بیری
(۶) سائنس آف پبلک فنانس فنڈلے شیراز (۷) واڈیا اینڈ جوشی

مثلاً اگر آپ کسی زمیندار سے اُس کی صحیح آمدنی یا نٹ کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں تو وہ زیادہ ٹیکس کے خوف سے اپنی صحیح پوزیشن واضح نہیں کرے گا۔

پس ہمارے پاس کوئی ایسے سائنٹیفک اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن کے ذریعے سے ہم ہندوستان کی اقتصادی حالت کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔ تاہم مختلف زمانوں میں مختلف مفکرین نے اپنی توجہ اس طرف مبذول کی ہے اور انھوں نے اپنی اپنی تحقیقات کے متعلق مختلف اندازے لگائے ہیں جن کا تذکرہ ہمارے لئے اس تحقیقات کے لئے ضروری ہے۔

دادا بھائی نیروجی کی تحقیقات

سب سے پہلی تحقیقات ۱۸۷۰ء میں مسٹر دادا بھائی نیروجی نے کی جو اُن کی کتاب الموسومہ "فلاکت اور ہندوستان میں برطانوی راج"

Poverty & British Rule in India

میں درج ہے۔ مسٹر دادا بھائی نے جن اصول پر اپنی تحقیقات مرتب کی وہ اُن کے اپنے الفاظ میں یہ ہے۔

"میں نے ہر صوبہ کے ایک دو منتخب پیداواری لی ہے پھر ہر ضلع کا کل زیر کاشت رقبہ لے کر فی ایکڑ پیداوار نکالی ہے اور اشیا کی قیمتیں لیکر کل زراعتی پیداوار کی اوسط قیمت معلوم کی ہے۔" (صفحہ ۱۳)

اس طریق سے اُن کا اندازہ ہے کہ کل زرعی پیداوار کی قیمت ستائیس کروڑ ستر لاکھ پونڈ ہوتی ہے جس میں سے اگر چھ فی صدی بیجوں وغیرہ کی قیمت نکال دی جائے تو خالص پیداوار کی مجموعی قیمت چھبیس کروڑ پونڈ رہ جاتی ہے۔ جو ایک معتدل موسم میں ایک سال کے لئے انسانی خوراک کے لئے ہمارے پاس موجود ہے پھر اگر اس میں ایک کروڑ ستر لاکھ پونڈ نمک، افیون، کوئلہ اور صناعت کا نفع ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ مصنوعات کی قیمت اتنے ہی پونڈ، دودھ، گوشت مچھلی اور حیوانات کی پیداوار کے اور تین کروڑ پونڈ اتفاقیہ پیداوار کے جمع کرلئے جائیں تو یہ کل آمدنی جس کو National Income یا اجتماعی آمدنی کہتے ہیں چونتیس کروڑ پونڈ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اگر ہم اس رقم کو سترہ کروڑ باشندوں کی آبادی پر (جو مسٹر دادا بھائی کے زمانے میں تھی) تقسیم کریں تو برطانوی ہند کے لئے فی کس چالیس شلنگ یا بیس روپیہ سالانہ آمدنی ہوتی جو ظاہر ہے کہ کس قدر قابلِ تاسف اور اندوہناک ہے۔

یہ بیس روپے بھی مسٹر دادا بھائی کا خیال ہے کہ تمام باشندگانِ ہند پر مساوی طور سے تقسیم نہیں ہوتے۔ کسی کو زیادہ حصہ ملتا ہے اور کسی کو کم غرضکہ ہندوستان کے لوگ کجا یہ کہ وہ تعیش کی اشیاء استعمال کریں خالص ضروریاتِ زندگی سے بھی بے نیاز ہیں۔

فلاکت کے کرشمے

بعض لوگوں نے اس نتیجے کے خلاف یہ اعتراض کیا ہے کہ ہندوستان کے لوگ چونکہ زندہ و موجود ہیں اس لئے اُن کی خالص ضروریاتِ زندگی ضرور پوری ہو جاتی ہوں گی۔ لیکن مسٹر دادا بھائی نے اس اعتراض کا یوں جواب دیا کہ جب لوگوں کی سالانہ آمدنی سارے سال کی ضروریات کے لئے مکتفی نہیں ہوتی تو وہ ملک کی اساسی دولت کے ذریعے سے اپنی ضروریات پورا کرتے ہیں اس سے ملک روز بروز قلاش ہو رہا ہے اور پیداوار کی قابلیت بھی کم سے کمتر ہو رہی ہے مطلب یہ کہ چونکہ ہندوستان کے لوگ زیادہ تر زراعت پیشہ ہیں اس لئے جب اُن کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو وہ اپنی زمینیں بیچنا شروع کر دیتے ہیں جو بہر حال قومی نقصان ہے اور پیداوار کے لئے ضرر رساں۔ پھر جو دیہاتی مقروضات جمع ہو گئے ہیں وہ بھی اسی فلاکت کے کرشمے ہیں۔

۱۸۷۰ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان بہت سے محققین نے ہندوستان کی فلاکت کا اندازہ لگایا جس کا مختصر طور پر تذکرہ ناکافی ہوگا۔

بیرنگ و باربر کا اندازہ

۱۸۸۲ء میں ارل کرومر (جو اُس وقت میجر ایولین بیرنگ تھا) اور سر (اُس وقت مسٹر) ڈیوڈ باربر نے جو تحقیقات کی اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُن کے نزدیک ہندوستان کی زرعی آمدنی تین ارب پچاس کروڑ روپیہ اور غیر زرعی آمدنی ایک ارب پچھتر کروڑ روپیہ تھی۔ گویا ہندوستان کی کل قومی آمدنی پانچ ارب پچیس کروڑ روپیہ ہوئی جو اگر اُس وقت کی اُنیس کروڑ چھیالیس لاکھ اُنتالیس ہزار لوگوں کی آبادی پر تقسیم کر دی جائے تو فی کس آمدنی ستائیس روپیہ ہوتی ہے۔

ڈگبی اور لارڈ کرزن

ڈگبی کے تخمینے سے ۱۸۹۸-۹۹ء میں ہندوستان کی زرعی آمدنی دو ارب

پچاسی کروڑ روپیہ تھی اور غیر زرعی آمدنی ایک ارب تینتالیس کروڑ روپیہ۔ گویا کل آمدنی چار ارب اٹھائیس کروڑ روپیہ تھی جو اگر ۱۹۰۱ء کی تیئس کروڑ آبادی پر تقسیم کر دی جائے تو فی کس آمدنی قریباً اٹھارہ روپیہ آٹھ آنے ہوتی ہے۔

لارڈ کرزن نے جو اُس وقت وائسرائے ہند تھا ان تمام بیانات کی تردید ایک علیحدہ تحقیقاتی کمیشن کے ذریعہ سے کرنی چاہی جو ۱۸۹۹ء میں قحط کی تحقیقات کرنے کے لئے بیٹھا تھا۔ اور جو فیمین کمیشن ۱۹۰۱ء کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس نے ثابت کیا کہ ہندوستان کی زرعی آمدنی چار ارب اسّی کروڑ روپیہ سالانہ سے کم نہیں ہے۔ اس لئے ۱۹۰۰ء میں فی کس آمدنی بیس روپیہ ہونی چاہئے۔ جو ۱۸۸۰ء سے بقدر دو روپیہ زیادہ ہے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ غیر زرعی آمدنی بھی اسی نسبت سے بڑھی ہے تو ۱۹۰۰ء میں ہندوستان کی فی کس آمدنی تیس روپیہ ہونی چاہئے۔ جو ۱۸۸۰ء کے مقابلے میں بقدر تین روپیہ زیادہ ہے لارڈ کرزن نے لکھا ہے کہ اگرچہ یہ ترقی کوئی قابلِ تشکر یا قابلِ ستائش نہیں ہے تاہم ترقی روز افزوں ہے۔ ترقی معکوس نہیں۔

ڈگبی نے اس کا جواب پھر ایک نئی تحقیقات کی بنا پر دیا جس کی رُو سے ہندوستان کی فی کس آمدنی سترہ روپے چار آنے ہوتی تھی۔ اور کہا کہ لارڈ کرزن نے خوش خیالی کا پہلو اختیار کیا ہے۔

فروری ۱۹۲۳ء میں آنریبل ای۔ ایم کک نے کونسل آف اسٹیٹ میں یہ بیان دیا کہ اگر ہم ۱۸۸۲ء اور ۱۹۰۱ء کی تحقیقات کو صحیح تسلیم کرلیں تو ۱۹۱۱ء میں فی کس آمدنی پچاس روپیہ تک بڑھ گئی تھی لیکن اگر زیادہ سائنٹیفک طریق اختیار کیا جائے تو آمدنی اسّی روپیہ سالانہ ہوتی ہے۔

(منقول از پلائی نصاللہ)

وادیا اور جوشی کا تخمینہ

ان کے بعد ۱۹۱۳ء میں وادیا اور جوشی کی تحقیقات آتی ہے جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

زرعی پیداوار	۸۵۸،۳۹،۹۴،۶۲۶
کان کنی	۱۱،۵۳،۶۷،۰۰۰
متفرق پیداوار اور صناعین کی آمدنی	۱۵۴،۳۹،۵۸،۶۵۰
آمدنی از حیوانات	۱۲۵،۱۰،۳۴،۰۹۳۴
مصنوعات	۲۰،۹۵،۳۳،۰۰۰
	۱،۲۱۰،۰۲۷،۹۰،۰۱۰

اس بارہ ارب دس کروڑ کی آمدنی سے وہ اُس رقم کو نکال دیتے ہیں جو ہیں بطور اخراجات غیر ملکی Home Charges. (از قسم پنشن یافتہ افسروں کی تنخواہیں غیر ملکی سرمایہ اخراجات انڈیا آفس وغیرہ) انگلستان بھیجنے پڑتے ہیں۔ اگر یہ رقم بارہ کروڑ بھی فرض کر لی جائے تو ہماری خالص آمدنی دس ارب ستاسی کروڑ روپیہ رہ جاتی ہے اگر اس آمدنی کو چوبیس کروڑ لوگوں کی آبادی پر تقسیم کیا جائے تو فی کس آمدنی چوالیس روپیہ پانچ آنے چھ پائی ہوتی ہے۔

کے ٹی شاہ کی تحقیقات

اسی طرح مسٹر کے ٹی شاہ اور کھمباٹا کے اندازے ہیں جو ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۲۲ء تک اپنی تحقیقات کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں۔

۱۹۰۰ء سے لیکر ۱۹۱۲ء تک فی کس آمدنی ۳۶ روپیہ
۱۹۱۳ء " ۱۹۲۲ء " " ۵۰½ "
۱۹۰۰ء " ۱۹۲۲ء " " ۴۴½ "
۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں " ۷۴ "

اس آمدنی سے مصنفین نے بطور اخراجات غیر ملکی وغیرہ بہت سی رقم منہا کی ہے اور ان کا اندازہ ہے کہ یہ رقم سات روپیہ فی کس ہوتی ہے۔ اس لئے ۲۲-۱۹۲۱ء میں ہندوستان کی فی کس آمدنی سترسٹھ روپیہ تھی۔

فنڈلے شیراز

سب سے تازہ اندازہ مسٹر فنڈلے شیراز کا ہے جس نے ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کی فی کس آمدنی ۱۰۷ روپیہ اور ۱۹۲۲ء میں ۱۱۶ روپیہ قرار دی تھی۔ مسٹر شیراز نے اپنے اندازے میں غیر زرعی آمدنی بیجوں وغیرہ کی قیمت نکالے بغیر درج کی ہے جو گزشتہ تحقیقات سے مختلف طریقہ ہے۔

دوسرے اُس نے کئی نئے پیشے غیر زرعی آمدنی میں شامل کر لئے ہیں۔ اس لئے اُس کا اندازہ غیر معمولی طور پر اونچا ہے۔

خلاصۂ بیانات

اب ہم قارئین کی سہولت کے لئے تمام تخمینات کا خلاصہ پیش کئے دیتا ہوں تاکہ بیک نظر جانچا جاسکے کہ مختلف زمانوں میں مختلف مفکرین نے کیا اندازے لگائے ہیں۔

اندازہ کنندگان	سن عیسوی	آمدنی فی کس
دادا بھائی نوروجی	۱۸۷۰ء	بیس روپے
بیرنگ باربر	۱۸۸۲ء	ستائیس روپے
ڈگبی	۱۸۹۸-۹ء	اٹھارہ روپے ۹ آنے
لارڈ کرزن	۱۹۰۰-۱ء	تیس روپے
واڈیا جوشی	۱۹۱۳-۱۴ء	چوالیس روپے ۵ آنے ۶ پائی
شاہ و کھمباٹا	۱۹۲۱-۲۲ء	ستاسٹھ روپے
فنڈلے شیراز	۱۹۲۰	ایک سو سات روپیہ
فنڈلے شیراز	۱۹۲۲ء	ایک سو سولہ روپے

حکمی فیصلے کے لئے تحفظات

اِن مختلف اندازوں سے ملک کی اقتصادی حالت کا جائزہ لینے کے لئے بہت سی احتیاطوں کی ضرورت ہے ورنہ بہت ممکن ہے کہ نتیجہ غلط ہو جائے۔

(۱) سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ اندازے مختلف زمانوں اور مختلف تاریخوں کے ہیں۔ اس لئے اس عرصے کی قیمتوں کا فرق معلوم کرنا بھی اشد ضروری ہے۔

مثلاً یہ کہنا سخت غلطی ہوگی کہ ۱۸۷۰ء کے لوگ ۱۹۲۲ء کے لوگوں سے غریب تھے۔ کیونکہ اُس زمانے کی قیمتیں بھی اِس زمانے سے اِتنی فیصدی کم تھیں۔

(۲) ہر محقق نے اپنی تحقیقات کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں مثلاً کسی نے برطانوی ہند کا رقبہ ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور کسی نے ہندوستانی ریاستیں بھی شامل کرلی ہیں۔ کسی نے غیر زرعی آمدنی سے بیجوں وغیرہ کی قیمت منہا کی ہے اور کسی نے نہیں کی ہے۔ پھر کسی نے غیر زرعی پیشوں میں ادنیٰ ملازمین کو شامل کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا ہے۔ پس ہمیں صحیح اندازہ تک پہنچنے کے لئے ان تمام باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا۔

(۳) اگر ہمیں فی کس آمدنی معلوم بھی ہو جائے تو پھر بھی ہم ملک کی خوش حالی یا پستی کے متعلق کوئی قطعی حکم نہیں لگا سکتے کیونکہ خصوصاً ہندوستان کے بارے میں ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ فی کس آمدنی کے جزئیات کیا ہیں اور اُن میں کھانے والی اشیاء کا کتنا حصہ تھا۔

(۴) پھر ان تحقیقات کے متعلق یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ہر شخص کے تعصبات اور خاص مقاصد ہوتے ہیں جن کو لیکر وہ تحقیقات کرتا ہے۔ اور بلحاظ ایک ماہر اعداد و شمار ہندسوں سے ہر کوئی اپنا برا بھلا مسئلہ ثابت کر سکتا ہے مثلاً اگر اُس وقت تحقیقات کی جائے جب قیمتیں گر رہی تھیں تو قدرتی طور پر ملک کی زبوں حالی ثابت کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر تحقیقات چڑھتی ہوئی قیمتوں کے زمانے میں کی جائے تو ملک غیر معمولی طور پر خوش حال ثابت کیا جا سکتا ہے۔

ایک انگریز کی یہی خواہش ہوگی کہ عہدِ سلطنت تاریک نظر آئے۔ اور وہ عہدِ ایک نہایت روشن زمانہ ثابت ہو۔ پس ہمیں کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے سے پہلے ان تمام باتوں کا بدرجۂ اَتم خیال رکھنا پڑے گا۔

غیر مساوی تقسیمِ دولت

باوجودیکہ یہ سب تخمینے مختلف ہیں لیکن ایک بات جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا وہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اکثر لوگ ضروریاتِ زندگی پورا کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ اگر ہم فنڈلے شیراز کا سب سے بڑا اندازہ بھی لے لیں تو بھی فی کس پانچ آنے روز کی آمدنی ثابت ہوتی ہے جس میں سے ایک اوسط درجے کے آدمی کو نہ صرف اپنی ضروریاتِ زندگی پورا کرنا ہوتی ہیں۔ بلکہ اپنے بیوی بچوں اور دوسرے متعلقین کا پیٹ بھی پالنا ہوتا ہے۔ پھر اسی میں سے کپڑے بنوانے ہوتے ہیں اور مکان پر بھی خرچ کرنا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پانچ آنے بھی روزانہ ہر ایک کو نہیں ملتے جو بڑے بڑے زمیندار ہیں یا تاجر اور صناع اُن کو چھ آنے بھی روزانہ مل جاتے ہیں لیکن غریب مزدوروں کو تین آنے روزانہ بھی بعض اوقات میسر نہیں ہوتے [illegible]

تلخیص از انڈین اکنامکس مصنفہ جاتھر اینڈ بیری جلد دوم صفحہ ۱۴۰

اور کمبا تا نے اندازہ لگایا ہے کہ ہندوستان میں دولت ازحد غیر مساوی طور پر تقسیم ہے۔ اُن کی تحقیقات کے مطابق اعداد و شمار مندرجہ ذیل ہیں۔

چھ ہزار باشندے جن کی سالانہ اوسط آمدنی ایک لاکھ روپیہ فی کس ہے صرف تیس ہزار آدمیوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

دو لاکھ ستر ہزار باشندے جن کی سالانہ آمدنی پانچ ہزار روپیہ فی کس ہے تیرہ لاکھ پچاس ہزار آدمیوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

پچیس لاکھ باشندے جن کی سالانہ آمدنی صرف ایک ہزار روپیہ فی کس ہے بارہ کروڑ پانچ لاکھ آدمیوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

تین کروڑ پچاس لاکھ باشندے جن کی سالانہ آمدنی صرف دوسو روپیہ فی کس ہے دس کروڑ آدمیوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

باقی باشندے جن کی فی کس آمدنی پچاس روپیہ سالانہ سے زیادہ نہیں۔ بقیہ تمام آبادی کا پیٹ پالتے ہیں۔

دوسرے معنوں میں جتنی جتنی فی کس آمدنی کم ہوتی چلی جاتی ہے متوسلین اور متعلقین کا وجود زیادہ سے زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر یہ آمدنی بھی مساوی طور پر حصے میں نہیں آتی۔ بلکہ ملکی دولت کا قریباً ایک تہائی حصہ صرف ایک فی صدی حصۂ آبادی استعمال کرتا ہے یا اگر اُن کے متوسلین کو بھی شامل کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ پانچ فی صدی حصۂ آبادی ایک تہائی حصۂ دولت کو اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ اور دوسرا تہائی حصۂ آبادی کے پینتیس فی صدی لوگوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے۔ دولت کی بقیہ تہائی آبادی کے ساٹھ فی صدی لوگ استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں آبادی کا قریباً دو تہائی حصہ "ملعون" ہو کر ہندوستان میں بیچا جاتا ہے اور صرف ایک تہائی حصۂ "جنتی" قرار دیا جاتا ہے۔

بین الاقوامی موازنہ

اگر ہم ہندوستان کی فی کس آمدنی کا مقابلہ دیگر ممالک کی آمدنی سے کریں تو ہماری ناامیدی اور بھی بڑھ جاتی ہے لیکن ایسا کرنے میں بہت سی باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً مختلف ممالک کی قیمتوں اور معیارِ زندگی میں فرق ہے جن کا مقابلے کے وقت خیال رکھنا چاہیئے۔ اگر ہندوستان کی فی کس آمدنی انگلستان سے کم ہے تو یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہندوستانیوں کا معیارِ زندگی بہت پست ہے اس لئے تھوڑی آمدنی میں اُن کے اخراجات پورے ہو سکتے ہیں۔ مگر ان سب باتوں کا خیال رکھتے ہوئے بھی اگر ہم مختلف ممالک کی فی کس آمدنیوں کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان اس معاملے میں سب سے زیادہ بدقسمت ملک ہے۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں مختلف ممالک کی فی کس آمدنیاں مندرجہ ذیل تھیں۔

نام ملک	فی کس آمدنی سنہ ۱۹۱۴ء	
امریکہ متحدہ	۷۲	پونڈ
انگلستان	۵۰	"
آسٹریلیا	۵۴	"
کینیڈا	۴۰	"
فرانس	۴۸	"
جرمنی	۳۰	"
اطالیہ	۲۲	"
ہسپانیہ	۱۱	"
جاپان	۶	"
ہندوستان	۲	"

سنہ ۱۹۱۹ء میں مختلف ممالک کی فی کس آمدنی مندرجہ ذیل تھی۔

نام ملک	آمدنی فی کس (ڈالروں میں)	
امریکہ متحدہ	۵۶۱	ڈالر
برطانیہ عظمیٰ	۳۴۷	"
فرانس	۳۰۰	"
رُوس	۴۰	"
اطالیہ	۲۰۸	"
جاپان	۴۶	"
پرتگال	۸۵	"
یونان	۱۶	"
رُومانیہ	۱۳	"
جرمنی	۱۵۴	"
آسٹریا ہنگری	۹۴	"
بلگیریا	۸۴	"

ترکی	۴۲	ڈالر
ہندوستان (مطابق شاہ اور کھمباٹا)	۲۳	؍؍ (قریباً)

۱۹۲۵ء میں امریکہ متحدہ کی آمدنی ۱۹۲۵ روپے فی کس تھی اور برطانیہ کی ایک ہزار روپیہ۔ آسٹریلیا اور کنیڈا کی ۵۵۰ روپیہ اور ہندوستان کی سب سے زیادہ اندازہ لگانے والے یعنی فنڈلے شیراز کے مطابق ۱۱۶ روپیہ سے زیادہ نہ تھی۔

کیا افلاس دُور ہو رہا ہے

اعداد و شمار کی رُو سے ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ہندوستان ایک بے حد غریب ملک ہے اور مالی طور پر اُس کی بین الاقوامی حیثیت نہایت کمزور بنیادوں پر کھڑی ہے۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ آیا اُس کی یہ غربت نئے زمانہ کی پیداوار ہے یا وہ ہمیشہ اِسی طرح غریب چلا آ رہا ہے۔ واڈیا اور جوشی جیسے معاشین کا خیال ہے کہ ۱۸۸۰ء اور ۱۹۱۲ء کے درمیان لوگوں کی حالت بالکل یکساں رہی ہے اور اُس میں سر مو تجاوز نہیں ہوا۔ لیکن سرکاری بیان یہ ہے کہ اِس عرصہ میں لوگوں کی معاشی حالت غیر معمولی طور پر روز افزوں رہی ہے چنانچہ "گذشتہ پچاس برس میں ہندوستانی نظام حکومت کے نتائج" میں لکھا ہے کہ:-

"جس حد تک عام نشانیوں کا تعلق ہے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اوسط درجہ کا زمیندار۔ مزارع۔ تاجر یا صنّاع گزشتہ پچاس برس سے کہیں زیادہ خوش حال ہے۔ اُس کی نمک کی خوراک زیادہ ہو گئی ہے۔ چینی کی زیادہ ہو گئی ہے۔ تمباکو کی زیادہ ہو گئی ہے اور درآمدہ تعیّش اور آسائش کی چیزوں کو وہ اپنی پہلی پشت سے کہیں زیادہ استعمال کرتا ہے جن مقامات پر مختلف گھرانوں کے متعلق تحقیقات کی گئی ہے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اوسط درجہ کا دیہاتی اپنے آباؤ اجداد سے زیادہ خوراک کھاتا ہے۔ اور اُن سے بہتر گھر میں مکین ہے۔ مٹی کے بدنما برتنوں کی جگہ پیتل، تانبے اور دیگر دھاتوں کے برتنوں نے لے لی ہے۔ اور اس کے خاندان کے پاس پہلے سے زیادہ کپڑے اور پارچات ہیں"

اِس بیان کی صداقت کو کئی غیر سرکاری مفکرین نے اپنی دلائل کی رُو سے رد کیا ہے۔ اور اُن کے نزدیک یہ بیان بعض جزئیات کے لحاظ سے بالکل غیر مصدقہ ہے۔ مثلاً اُن کا خیال ہے کہ یہ بات ایک اوسط درجہ کا دیہاتی اپنے آباؤ اجداد سے زیادہ کھاتا ہے بالکل واقفیت پر مبنی نہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ وہ تعداد کے لحاظ سے اشیا زیادہ استعمال کرتا ہوگا لیکن اُس کی خوراک کا معیار ابھی تک وہی دیرینہ ہے بلکہ بعض حالات میں بالکل گر گیا ہے۔ مثلاً پہلے وہ دودھ گھی اور مکھن وغیرہ بکثرت استعمال کیا کرتا تھا لیکن اب نفع حاصل کرنے کے شوق میں (جو ہم سمجھتے ہیں کہ مجبوری پر مبنی ہے) اُس نے اِن اشیا کی فروخت کرنا شروع کر دی ہے۔ اور اِس سے اُس کی صحت پر بُرا اثر پڑ رہا ہے۔

دیگر ممالک سے مقابلہ

اگر ہم سرکاری بیان کو صحیح بھی تسلیم کر لیں تو بھی یہ قابلِ تصفیہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ آیا یہ ترقی دیگر ممالک کی حیرت انگیز خوش حالی سے مقابلہ کر سکتی ہے؟

دوسرے ملکوں میں افلاس (جس سے ہماری مراد وہ افلاس ہے جو انسان کو خطرناک جرائم کا مرتکب ہونے کے لئے مجبور کرتا ہے) بہت حد تک دُور ہو گیا ہے۔ غربت اور بیماری کی وجہ سے جو اموات ہوا کرتی تھیں اُن کی شرح میں خاطر خواہ کمی واقع ہو گئی ہے۔ مزدوروں کے معاوضہ میں گراں قدر اضافہ ہو چکا ہے۔ اوقاتِ کار کم ہو گئے ہیں۔ تعلیم و تربیت کی اشاعت پہلے سے زیادہ ہے۔ تفریح کے سامان لوگوں کو زیادہ میسر ہیں اور وہ پہلے سے بہتر گھروں میں مکین اور پُر فضا شہروں میں آباد ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ صحیح طور پر زندگی کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ لیکن کیا ہندوستان میں ابھی اِن ترقیات کی بُو بھی آئی ہے؟ کیا حکومت نے اِن مسائل میں سے کسی کو بھی درخورِ اعتنا سمجھا ہے؟ اور کیا وہ دل و جان سے لوگوں کی بہتری اور بہبودی کے لئے کوششیں عمل میں لا رہی ہے؟ میں یہ نہیں کہتا کہ حکومت نے اِس بارے میں کچھ بھی نہیں کیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اُس کی کوششیں وہی نتیجہ پیدا کر رہی ہیں جو امریکہ میں روزویلٹ کی، رُوس میں جوزف اسٹالین کی۔ اطالیہ میں مسولینی کی۔ جرمنی میں ہٹلر کی اور ترکیہ جمہوریہ میں مصطفےٰ کمال پاشا کی پیدا کر رہی ہیں؟

افلاس کی انتہا

ہمارا سر ندامت سے جھک جاتا ہے اور ہماری اُمید یکسر ناامیدی اور یاس سے بدل جاتی ہے جب ہم اِن تمام سوالوں کا جواب صرف نفی میں پاتے ہیں۔

ہندوستان میں کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو دو وقت کھانا برابر مل جاتا ہے؛ کتنے ہیں جن کو محنت کم کرنا پڑتی ہے اور معاوضہ زیادہ مل جاتا ہے؛ کتنے ہیں جو آرام و آسائش سے ایک قابل رہائش مکان میں زندگی بسر کرتے ہیں؛ کتنے ہیں جن کو رفتار واقعات کا علم ہوتا رہتا ہے؛ کتنے ہیں جو بافراغت اور خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں؟

ناظرین یہ سن کر حیران نہ ہوں کہ ہندوستان میں صرف دس فی صد لوگ دونوں وقت کھانا کھاتے ہیں۔ باقی سب نانِ شبینہ کے بھی محتاج ہیں۔

صرف سات فی صدی تعلیم یافتہ طبقہ ہے اور ان میں سے بھی اکثر صرف الف بے ہی جانتے ہیں باقی سب جاہل اور علوم جدیدہ سے بے خبر ہیں۔

شرح اموات کا یہ حال ہے کہ دنیا کے کسی حصہ میں اس قدر اموات نہیں ہوتیں جتنی کہ یہاں ہوتی ہیں۔ محنت و مزدوری کا معاوضہ شاید دنیا بھر میں سب سے کم ہے۔ رہائش کا یہ عالم ہے کہ ایک انگریز سیاح کے الفاظ میں "یہاں کے مکانوں میں ایک یورپین اپنے جانور بھی رکھنا پسند نہیں کرے گا۔"

ان باتوں کے باوجود کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی حالت پہلے سے بہتر ہو رہی ہے؟

جس ملک کی آبادی خوراک کی نسبت زیادہ ترقی کر رہی ہو جس ملک میں بیماریوں اور وباؤں کا یہ حال ہو کہ ایک یورپین مفکر کے الفاظ میں لوگ "کتوں اور مکھیوں کی طرح مرتے ہوں" جس ملک کے لوگ ۱۰-۱۲ گھنٹے روزانہ محنت کرتے ہوں اور پھر اُن کی مزدوری دس آنہ سے زیادہ نہ بڑھتی ہو کیا وہ ملک امیر ہے۔ کیا وہ تمدن و عمرانیت کے لحاظ سے مہذب ممالک میں شمار ہو سکتا ہے؟

اعداد و شمار کا فقدان

ان تمام باتوں سے جو چیز زیادہ اندوہناک اور قابل تاسف ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایسے ٹھوس اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن کے سہارے پر ہم اپنے دعوے کی بنیاد رکھ سکیں۔

مختلف تحقیقات اور اپنے مشاہدہ کی بنا پر جو ہم کہہ سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان ایک انتہا درجہ غریب ملک ہے اور اس کے ثبوت میں ہم اس کے منکرین کو صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنی آنکھیں کھولو اور مشاہدہ کر لو "اعداد و شمار کا اس صاف اور بیّن بات کے ثبوت کے لئے پیش کرنا محض سورج کو چراغ دکھانا ہے"۱؎

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں اعداد و شمار کو جمع کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ایک تو ملک کی وسعت اس بارہ میں سخت حارج ہے۔ دوسرے آبادی زیادہ تر مختلف دیہاتوں میں پھیلی ہوئی ہے اور ایک جگہ چند شہروں اور قصبوں میں موجود نہیں ہے۔ تیسرے لوگ اس قدر جاہل اور علوم جدیدہ سے ناواقف ہیں کہ برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کی طرح یہاں تحریری سوالات سے کام نہیں بنتا۔ اُن ممالک میں تو یہ ہوتا ہے کہ تحریری سوالات مختلف اداروں اور لوگوں کو بھجوا دئے جاتے ہیں جن کے جواب اُن کو فی الفور مہیا ہو جاتے ہیں لیکن یہاں اس کام کی قدر و منزلت سمجھانے کے لئے بھی ایک عرصہ درکار ہے۔ چوتھے یہاں کے کاموں اور پیشوں میں کوئی تنظیم نہیں ہے جس کے ذریعہ سے ہم مختلف لوگوں کی معاشی حالت کا اندازہ لگا سکیں۔

اقتصادی تحقیقات کے ذرائع

لیکن ان سب باتوں کے باوجود "انڈین اکونامک کمیٹی رپورٹ" میں پروفیسر بوئنٹ ہرسٹ اور دیگر مفکرین کی طرف سے بعض ایسی مفید تجاویز کی گئی ہیں جن کو ہندوستان کے اعداد و شمار جمع کرنے کے لئے کافی حد تک زیر عمل لایا جا سکتا ہے۔ مثلاً رپورٹ کا خیال ہے کہ اگرچہ اجتماعی دولت اور آمدنی وغیرہ کے اندازے لگانے کا بھی اپنی جگہ پر فائدہ ضرور ہے لیکن کئی دوسرے طریقے بھی ہیں جن کے ذریعہ معاشی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً "معیار زندگی" ایک اہم ذریعہ ہے جس کو ہم استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اس کے لئے ہمیں وقتاً فوقتاً مختلف گھرانوں کے میزانئے معلوم کرنے چاہیں۔ پھر کئی قسم کی مقامی اور خاص تفتیشیں ہیں جو ہم گھریلو مصنوعات، مزدور پیشہ لوگوں کی اقتصادی حالت، دیہاتی مقروضات اور صنعتی علاقہ جات کی حالتِ عمومی وغیرہ کے متعلق کر سکتے ہیں۔ بعض خاص دیہاتوں اور شہروں کے متعلق تفصیلی معلومات کا حاصل کرنا بھی مفید رہے گا۔ کیونکہ ان سے بعض اہم اور ضروری امور پر روشنی پڑتی ہے۔

اعداد و شمار جمع کرنے کے لئے کمیٹی نے کئی سفارشیں کی ہیں جن کا خلاصہ میں یہاں درج کر دیتا ہوں۔

۱؎ جتھلا بنڈیری جلد دوم

(۱) ہر سال زراعتی پیداوار کے اعداد و شمار جمع کئے جائیں اور اُن پر ایک سالانہ تبصرہ کیا جائے

(۲) صنعتی پیداوار کی بھی ایک تفصیلی تفتیش ہر پانچ سال کے بعد کی جائے۔

(۳) تمام اعداد و شمار کا کام ایک مرکزی مجلس کے سپرد کیا جائے۔ تاکہ مقصد میں ہم رنگی اور یکسانیت پیدا ہو۔

(۴) ہر صوبہ میں ایک صوبجاتی دائرۂ اعداد و شمار قائم کیا جائے جس کا تعلق ایک مرکزی دائرۂ اعداد و شمار سے ہو تاکہ سب دریافت کردہ مسائل ایک صدر مقام پر جمع ہوتے رہیں۔

۱۹۳۴ء میں حکومت کی طرف سے انگلستان کے دو مشہور ماہرین اعداد و شمار ہندوستان میں آئے تھے جن کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وہ اعداد و شمار جمع کرنے کی ممکنات کا جائزہ لیں۔ اب انتظار ہے کہ حکومت اُن کی سفارشات پر کوئی عملی کارروائی کرے۔

افلاس کے اسباب

ہندوستان کے افلاس کا مسئلہ نہایت پیچیدہ اور اہم ہے اس سے اُس کی وجوہات بھی اس قدر پیچیدہ ہیں کہ ہم ان کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ تاہم موٹی موٹی وجوہات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) مذہبی اور معاشرتی رسومات جن کی وجہ سے لوگوں کا نظریہ مادی ترقی کی طرف سے متشائم ہو گیا ہے۔ مثلاً تَوَکُّلْ بِالدُّنْیَا اور تَرکْ بِاللَّذَّاتْ کے مسائل لوگوں کو دنیا سے بے پرواہ کر دینے کے ذمہ دار ہیں اور وہ عاقبت کے سہانے خوابوں کے تصور میں اس قدر مستغرق ہیں کہ اُن کو دنیاوی خوش حالی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

پھر معاشرتی رسومات میں صغر سنی کی شادی۔ پردہ (جو میرے نزدیک حجاب اور شرم سے بالکل مختلف ہے) ذات پات۔ قوانین وراثت۔ اشتراک خاندانی۔ وغیرہ جو سوسائٹی کی بیخ کنی کر رہی ہیں۔ اور جن کا ایک تفصیلی تذکرہ ایک علیحدہ مضمون میں آئے گا۔

(۲) ہندوستان کے جملہ اقتصادی شعبہ جات مثلاً زراعت۔ صنعت۔ حفظانِ صحت۔ مالیات۔ بنکنگ وغیرہ سب غیر ترقی یافتہ ہیں۔ اس لئے پیدائش آبادی کی نسبت کم ہے جس کی وجہ سے تقسیم دولت غیر مساوی ہے اور ہندوستان کے لوگ غریب ہیں۔

(۳) حکومت کا نقطۂ نظر ہندوستان کی طرف کوئی ہمدردانہ اور ملکی نہیں ہے جس کی وجہ سے ملک ابھی اُس جادۂ ترقی پر گامزن نہیں ہو سکا جس پر کہ دیگر ممالک مثلاً روس۔ امریکہ اور جاپان وغیرہ ہیں۔ ہندوستان کو ہر سال کروڑوں روپیہ صرف پنشن یافتہ افسروں اور وائٹ ہال کی جیبوں کو گرم کرنے کے لئے بھیجنا پڑتا ہے۔ جو اگر محض ملک کے اندر صرف ہو تو ہماری دولت میں گرانقدر اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۴) ہندوستان کا طریقۂ تعلیم نہایت ناقص ہے اور ایک گریجویٹ جب اپنی یونیورسٹی سے نکلتا ہے تو جس طرح مغرب میں ایک نوجوان لڑکی کو شادی کی درخواست کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہاں کرے یا نہ اسی طرح وہ بھی اپنے مستقبل کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے عاجز ہوتا ہے[1]۔

یہ میں نے مختصر طور پر چند باتیں عرض کی ہیں ورنہ ان کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے اور خدا نے چاہا تو ہم آئندہ کی اشاعتوں میں ان میں سے بعض اہم مسائل پر روشنی ڈالیں گے۔ وَمَا تَوْفِیقِیْ اِلَّا بِاللّٰہ۔

[1] پنجاب جرنل آف کامرس اینڈ اکونامکس۔ پروفیسر کپور

نفسِ انسانی

مضمون مندرجۂ ذیل میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ اس اعتبار سے بہت دلچسپ اور اہم ہے کہ جبر و اختیار اور بقائے روح کے مسئلوں پر روشنی ڈالتا ہے اور یہ دونوں مسئلے مذہب و دہریت، روحانیت اور مادّہ پرستی کی جان ہیں۔ اگرچہ اس بحث کے نتائج بالکل فیصلہ کن نہیں ہیں تاہم اُن علمی مذاق کے لوگوں کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں جن کو حقائقِ اشیاء کی کرید اور جستجو ہوتی ہے۔ اور باوجود نامکمل ہونے کے اس قابل ضرور ہے کہ غور و فکر کو تلاشِ حق میں ایک صحیح راستے پر لگا دے جو آگے چل کر قیمتی نتائج پیدا کر سکے۔ اس میدان میں ابتک جس قدر جد و جہد کی گئی ہے وہ مجاہدین کے طبعی رجحان اور تعصب کے اثر سے بری نہیں ہے لیکن یہ مضمون کسی خاص نقطۂ نظر سے نہیں لکھا گیا ہے بلکہ علم النفس کی تحقیقات نے سلسلے کا ایک جزو ہے۔ اس لئے ایسے مضرت رساں اثرات سے پاک ہے جو علمی تحقیقات کے لئے بہت مارج ہیں ہم نے کوشش کی ہے کہ علمی اصطلاحات سے صاف کرکے طرزِ بیان کو عام فہم کر دیا جائے تاکہ عوام کے لئے بھی کارآمد و دلچسپ ثابت ہو۔ (الوزری)

نفس سے مُراد عرفِ عام میں خواہشات سے لی جاتی ہے علمی اصطلاح میں اس سے مراد انسانی دماغ کی اُس قوت سے ہے جو جملہ قوائے مدرکہ کی حاکم اور ان کو متحد کرنے والی ہے بعض دفعہ عقل پر اور بعض دفعہ روح پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے لیکن صحیح معنی وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ انسانی دماغ مدت سے فلسفیانہ غور و فکر کا تختۂ مشق رہا ہے۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ انسان بیرونی عالم کے ساتھ کس قسم کا تعلق رکھتا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے کن قوانین کے بموجب متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے خیالات ہمارے مادّی جسم پر کس قسم کا اثر ڈالتے ہیں اور آیا حقیقت میں کوئی اثر ڈال بھی سکتے ہیں یا یہ محض ایک دھوکا ہے۔

ہمارے عام عقائد کے اعتبار سے دماغ ایک مادّی چیز ہے اور نفس کوئی ایسی شے ہے جو روحانی ہے یا کم از کم مادّی نہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے پر برابر اپنا اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اگر دماغ پریشان و متفکر ہو تو جسمانی اضمحلال کا باعث ہوتا ہے اور اگر بدن کو بھوکا پیاسا رکھا جائے تو روحانی پژمردگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی جسم اور نفس ہماری ذات کے دو جزو ہیں۔ ان دونوں میں نفس جسم پر فائق معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم اپنی گفتگو میں "میں" اپنے تئیں "کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا اشارہ ہمارے جسم کی طرف اس قدر نہیں ہوتا جس قدر نفس کی طرف ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک عام خیال ہے کہ رنج و راحت کا تعلق جسم سے اس قدر نہیں ہے جس قدر دل یعنی نفس سے ہے اس عقیدہ میں بھی نفس کی فوقیت مضمر ہے۔

یہاں تک تو عام معتقدات کا ذکر تھا لیکن انسانی دماغ کے مطالعہ کے لئے سائنس نے اپنی جملہ تحقیقات اور انکشافات کے اسلحہ سے مسلح ہو کر جا کیا ہے جس کا نتیجہ درج کرنے سے پہلے ہم دو چار باتیں اور بیان کر دینی چاہئے ہیں جن کا جاننا اس سلسلے میں ضروری ہے۔

سائنس کی تحقیقات ہم کو یہ بتاتی ہے کہ ساری کائنات کا خلاصہ دو چیزیں ہیں۔ مادّہ اور قوت۔ مادّہ کے متعلق اب سے کچھ عرصہ قبل تک یہ خیال تھا کہ اسکی اصلیت ساٹھ یا ستّر عناصر ہیں اور انہی موجوداتِ بسیط کی مختلف ترکیبوں سے سارا مادّی عالم تشکیل پذیر ہے۔ تاہم عقل کا مقتضی یہ تھا کہ ساری کائنات کا سلسلہ کسی منبع واحد سے ملنا چاہئے اور عناصر کی اس قدر کثرت و ہجوم دماغ کو پریشان کرنے والا تھا۔ ریڈیم کے انکشاف کا خدا بھلا کرے کہ اُس نے اس خواہشِ عقلی کو ایک حد تک پورا کر دیا۔ اور اب کائنات کی بدایت برقِ منفی کے ذرات سے سمجھی جاتی ہے۔ قوت کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ ایک صورت سے دوسری صورت میں منتقل ہوتی رہتی ہے بجلی سے حرارت کی صورت میں اور پھر یہاں سے برق کی صورت میں۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان انقلابات کے دوران میں اسکی

معینہ مقدار میں کمی بیشی نہیں ہوتی یعنی عالم میں جو قوت کی مقدار ہے وہ معینہ ہے مادہ کے متعلق بھی ایسی ہی رائے ہے کہ وہ غیر فانی ہے۔ مادہ ہمیشہ حرکت میں ہے اور اسی سے گوناگوں تغیرات ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ حرکت کی نوعیت یا علت سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ وہ مسلسل ہے یعنی گذشتہ سے پیوستہ۔ گویا ہر ایک تغیر جو عمل میں آتا ہے وہ خود بخود پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ نتیجہ ہوتا ہے تغیرات ما سبق کا اور وہ تغیرات ما سبق بجائے خود نتیجہ ہوتے ہیں دیگر گذشتہ تغیرات کے۔ اسی طرح ساری کائنات ایک تسلسل ضروری ہے جس کی ہر ایک کڑی دوسری کڑی سے علت و معلول کے قانون کے ساتھ مربوط ہے جس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ کوئی واقعہ اپنی ذات سے منفرد اور اتفاقیہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اسی تسلسل ضروری کی ایک کڑی ہے جو لازم بھی ہے اور ملزوم بھی ہے۔ علت بھی ہے معلول بھی ہے۔ اس اعتقاد کے مطابق جملہ امور پہلے سے مقدر ہو چکے ہیں۔ (PREDETERMINED) جس میں مافوق الفطرت مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔ انسانی ارادے اور اس کی قوت مداخلت تغیرات یا واقعات کے سلسلے کو روک نہیں سکتی اور نہ اُس سمت کو بدل سکتی ہے جو ان واقعات نے اختیار کر رکھی ہے بلکہ اس کی قوت مداخلت خود اسی تسلسل ضروری یا حرکت کے ماتحت ہے جو از خود پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ بعض تغیرات ما سبق نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔

اب ذرا انسان کی بناوٹ پر غور کیجیے۔ علم تشریح الاعضا نے اس کو بیسیوں حصوں میں تقسیم کیا ہے مگر ہم کو سردست ان سب سے بحث نہیں ہے۔ دو بڑے حصے جسم اور دماغ ہیں ان میں پانچ قوائے حسیہ ہیں جو مادی عالم کا پانچ طرح سے ادراک کرتے ہیں جسم میں دو طرح کے اعصاب ہیں ایک وہ جو محسوسات کو دماغ تک پہنچاتے ہیں اور ایک وہ جو دماغ کے ہیڈ آفس سے احکامات کو اعضا تک پہنچا کر ان کو حرکت میں لاتے ہیں۔ دماغ میں دو قسم کا گودا ہوتا ہے ایک سفید رنگ کا اور ایک بھورے رنگ کا۔ اس بھورے رنگ کی ترکیب میں تیس کروڑ ذرات ابتک معلوم ہو سکے ہیں اور ہر ایک ذرہ ایک پیچیدہ اور باریک نظام کا مظہر ہے۔ یہ دماغ گویا جسم کے سارے کارخانہ کا ہیڈ آفس ہے جو نفس کا مقام ہے۔ وہ تمام خیالات و جذبات و حرکات جو حیات کا ثبوت دینے والے ہیں اس جگہ عمل میں آتے ہیں۔

انسانی دماغ کے عمل کے تین پہلو یا حصے ہیں اول خیال۔ دوم جذبات سوم فعل۔ حواس خمسہ کے ذریعے سے محسوسات دماغ تک پہنچتے ہیں جس سے خیال پیدا ہوتا ہے خیال کی ہمیشہ دو صفتیں ہوتی ہیں مسرت بخش یا تکلیف دہ اسی کا نام جذبہ ہے گویا خیال سے جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس جذبہ کی نوعیت کے لحاظ سے فعل عمل میں آتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ انسانی دماغ بھی اسی مادہ کا ایک ٹکڑا ہے جس سے اور کائنات مرکب ہے لہٰذا جس طرح مادی عالم طبعی قوانین کے ماتحت ہے اسی طرح دماغ انسانی بھی اُن کا پابند ہے اور جس طرح مادی عالم میں یکسانیت پائی جاتی ہے یعنی ایک ہی قسم کے حالات میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے نتائج کا پیدا ہونا۔ وہی خصوصیت انسانی دماغ کا بھی ہونا چاہئیے اور جس طرح ہم مادی عالم میں اسباب کے مطالعہ سے مستقبل کے متعلق اکثر پیشین گوئی کر سکتے ہیں اسی طرح اس عالم صغیر میں بھی جس کا نام دماغ ہے۔ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا دماغ کے جملہ افعال کی توجیہہ مادہ متحرک کے نظریہ کے مطابق ہونی چاہئیے۔ چنانچہ سترہویں صدی کے فلسفہ دانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جانور کی جملہ حرکات و افعال ایک متحرک مشین سے زیادہ وقیع نہیں۔ اُن میں خواہش و اندیشے۔ نفرت و محبت کے جذبات کے وجود سے انکار کیا گیا۔ ان کی چیخ و پکار کو پہیے کی رگڑ کی آوازوں سے تشبیہہ دی گئی۔ یہ خیال رفتہ رفتہ اس قدر دلنشین ہوتا گیا کہ انسانی افعال کو بھی اسی قانون کے تحت میں لانے کی کوشش کی گئی جس طریقے سے اس کی توجیہہ کی گئی ہے وہ بظاہر دور از فہم معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے حامیان جس وجہ سے اس کے ماننے پر مجبور ہیں وہ یہ ہے کہ ساری کائنات میں مادہ متحرک یا تسلسل لازمی کا قانون جاری و ساری ہے اور اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ انسانی افعال کو اس سے مستثنیٰ کیا جاوے۔ مثال کے طور پر روزمرہ کے کسی معمولی سے فعل پر غور کیجئے۔ مثلاً انسان جب دھوپ میں چلتے چلتے چھتری لگاتا ہے تو متذکرہ بالا قانون کا عمل اس طرح پر ہوتا ہے کہ سورج کی شعاعیں انسان کے جسم کے بیرونی حصہ پر پڑتی ہیں جس کا اثر اعصاب کے ذریعہ سے دماغ تک پہنچتا ہے۔ دماغ میں ایک ہیجان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ناگوار کیفیت کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ بعض متعلق جسمانی قوا رُک رُکتے ہیں اور چھتری کھل جاتی ہے۔ یہ تاویل جس قدر کھینچ تان کے کی گئی ہے اس سے صاف عیاں ہے۔ مدعیان نے حرکت کے قانون کو محض نباہنے کی کوشش کی ہے لیکن کسی قانون کا ایسی جگہ پر اطلاق کرنا چاہئے

گیا تھا اس کی تصدیق نہیں ہوئی ہے۔ بڑی غلطی ہے اور سائنس جب ایسے ناروا تحکم سے کام لینے لگے تو وہ سائنس کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔ بہرحال یہ تنبیہ از حد قابل از وقت ہے۔ اگر بالفرض اس کو صحیح مان بھی لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسانی افعال ایک مشین کی حرکت سے زیادہ وقیع نہیں تو یہ کیفیت شعوری کہاں سے اور کیوں کر پیدا ہوگئی۔ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ دماغ کی حرکت مادی جب ایک خاص حد تک شدید ہو جاتی ہے تو اس میں شعور کی شان پیدا ہو جاتی ہے جس طرح پہیہ کی شدید رگڑ سے شعلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق کیفیت شعوری ایک زائد اور فاضل یا فضول شے ہے۔ کیونکہ انسانی افعال و حرکات مثل دیگر تغیراتِ عالم کے پہلے سے مقدر ہیں۔ اور وہ اپنے اسی ڈھرے پر چلے جائیں گے جو کہ ہر ایک واقعہ ماسبق واقعہ مابعد کے لئے معین کر دیتا ہے۔ کیفیتِ شعوری کا عدم وجود برابر ہے۔ تاہم علم الحیات ہم کو یہ بتاتا ہے کہ ذی روح اجسام میں کوئی شے وجود میں نہیں آتی تاوقتیکہ اس کی ضرورت اور مصرف نہو اگر یہ کہا جائے کہ یہ کیفیت شعوری حرکتِ دماغی کا ایک قدرتی خاصہ ہے تو یہ ایک ایسی آڑ کے پیچھے پناہ لینی ہے جس کا توڑنا محال ہے یا کم از کم یہ ماننا پڑیگا کہ یہ حرکتِ دماغی اس عام حرکت سے مختلف اور جداگانہ ہے جو بیرونی عالم میں ہم ابتک دیکھتے چلے آئے ہیں۔ لیکن یہ امر قانونِ حرکت کی اس عمومیت میں خلل انداز ہوتا ہے جس کے نباہنے کے لئے اس قدر تاویلیں کی گئی ہیں۔

انسانی افعال کی مشین کی حرکت کی بناپر توجیہ کرنے میں جو اور دقتیں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ اس صورت میں حق و باطل کی تمیز فرض اور ذمہ داری کا احساس یہ سب الفاظ بالکل بے معنی ٹھہرتے ہیں۔ چونکہ انسانی افعال ایک خاص معین اور مقررہ نہج پر واقع ہوتے چلے جاتے ہیں جو پہلے سے مقرر ہیں۔ اس میں اخلاقی محرکات کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ کسی قسم کی مداخلت تسلسل ضروری میں ناممکن ہے حالانکہ ہم سب کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ بعض محرکات پر عمل کرے اور بعض کو قصداً نظرانداز کردے۔ اس کے سامنے مختلف راہِ عمل کھلی ہیں وہ ان میں سے چاہے جس پر قدم زن ہو۔ کوئی سا مسلک اختیار کرے۔ مختصر یہ کہ وہ اپنا کیرکٹر بنانے کا مختار اور ذمہ دار ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ وہی راہ اختیار کرتا ہے جس کو تغیرات ماسبق نے پہلے سے مقدر کر دیا ہے تو اس کا حل بجز اس صورت کے نہیں ہو سکتا کہ تجربے کیلئے کائنات کے گردش کرنے والے پہیوں کو الٹی حرکت دی جائے اور ہم پھر اس جگہ جا کھڑے ہوں جہاں سے چلے تھے۔ اور وہ راستہ اختیار کریں جو پہلے چھوڑ دیا تھا، اور دیکھیں کہ آیا اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں یا نہیں۔ یہ عقیدہ کہ انسان کو اپنے افعال کا اختیار ہے معترضین کے نزدیک محض دھوکہ ہے۔ لیکن یہ دھوکہ کیونکر لاحق ہوا؟ اس کا کوئی جواب نہیں۔ الغرض اس حرکت سالمی کے قانون نے مادہ کے اقتدار قایم کرنے میں اس قدر کوشش کی ہے کہ بیرونی عالم سے نفس کے ہر قسم کے تعلقات کو بے حقیقت اور دھوکہ پر مبنی بتایا ہے۔ مگر کیا مزے کی بات ہے کہ یہ مغرور سالمہ جہاں تک ہمارے علم میں ہے اور مادہ پرستوں کے علم میں بھی ایک خیالی ہستی ہے سوا نہیں جو اس غریب نفس کے منجملہ کرشموں میں سے ایک کرشمہ ہے۔

اصل میں دماغ کا رجحان جب کسی خاص طرف زیادہ بڑھ جاتا ہے تو تمام خیالات اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں اسی کا نام عصبیت ہے۔ مادہ پرستی کی تند ہوا نے ہمارے بعض نہایت قابل دماغوں کو اس قدر پریشان کیا ہے کہ ان کو خیال کے مقابلہ میں مالیکیول MOLICULE جذبے کے مقابلہ میں کیمیکل ایکولیشن CHEMICAL EQUATION اور قوتِ ارادی کے مقابلہ میں اٹامک انرجی Atomic ENERGY زیادہ وقیع اور زیادہ پرحقیقت نظر آتے ہیں۔ حالانکہ تمام وہ نظریات جو دنیائے سائنس میں آئے وہ قایم ہوتے رہتے ہیں اور جن میں ہر نیا سوچنے والا تغیر و تبدل کر جاتا ہے۔ اسی بیچارے نفس کی قوتِ متخیلہ کا ظہور ہیں۔ اسی بنا پر ہم حرکتِ سالمی حامیان کو جواب دیتے ہیں کہ یہ حرکت سالمی نہیں ہے بلکہ انسانی تخیل ہے۔

نفسِ انسانی چونکہ اپنے وجود کے لئے محتاج ہے دماغ کا۔ اور دماغ مادہ کا ایک جزو ہے، اس لئے اس میں شک نہیں کہ طبعی قوانین کو انسانی افعال سے ایک حد تک تعلق ضرور ہے۔ چنانچہ اکثر انسانی افعال میکانیکل ہوتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں خیالات کا ایک تسلسل ہوتا ہے جس میں ایک خیال دوسرے کی مدد سے پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی بات ذہن سے اتر جاتی ہے تو اس کو یاد کرنے کے لئے ہم اسی خیالی تسلسل سے مدد لیتے ہیں۔ دماغ جب کمزور ہو جاتا ہے تو اس میں یہ میکانیکل عنصر غالب آجاتا ہے۔ چنانچہ بعض آدمیوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جو خیال دل میں آیا وہ منہ سے نکل گیا۔ یا معمولی سے معمولی محرکات

پر وہ عمل کرتے ہیں بعض آدمی باوجود کسی دوسرے کام میں مصروف و منہمک ہونے کے خاص سمجھ کی باتیں کرتے چلے جاتے ہیں اور بہت روانی کے ساتھ کرتے ہیں برخلاف اس کے جن لوگوں کے دماغ کمزور نہیں ہوتے وہ ہر خیال کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ گفتگو بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں بعض نامناسب خیالات کو دبا جاتے ہیں اور مناسب کو بیان کر دیتے ہیں۔ زیادہ بکواس کے عادی نہیں ہوتے۔ گویا میکانکل عنصر اُن میں بہت کم ہوتے ہیں بعض محرکات پر وہ عمل کرتے ہیں اور بعض کو قصداً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایسے مواقع پر انسانی افعال میکانیکل نہیں ہوتے بلکہ ارادی ہوتے ہیں۔ کیونکہ میکانیکل افعال کے لئے ضروری ہے کہ وہ تغیرات ماسبق کا نتیجہ ہوں اور بلا ارادہ یکے بعد دیگرے سرزد ہوتے چلے جائیں جو سلسل لازمی کا مقتضی ہے۔ افعالِ ارادی میں اختیاری عنصر ہوتا ہے۔ ان کے محرکات ماضی میں نہیں ہوتے جیسے تغیرات ماسبق۔ بلکہ مستقبل میں ہوتے ہیں افعال ارادی ایک مقصدِ پیشِ نظر کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں اور میکانیکل افعال تغیرات گذشتہ کے آگے آگے۔

چونکہ نفسِ انسانی مادی دماغ سے وابستہ ہے اس لئے نفس کے جملہ کیفیات و افعال کے ساتھ دماغ میں بھی تغیرات واقع ہوتے ہیں جو اول الذکر کا عکس ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں جس قدر بحث کی گئی ہے اس کا مقصد یہ دریافت کرنا ہے کہ ان دونوں حالتوں میں مقدم کون ہے اور مؤخر کون ہے علت کونسی ہے اور معلول کونسی ہے۔ نفسی کیفیات، دماغی کیفیات کی مسبب ہیں یا نتیجہ ہیں۔ ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں متوازی ہیں یعنی نہ علت نہ معلول۔ یعنی ایک ہی تصویر کے دو پہلو ہیں۔ اس میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تصویر کونسی ہے۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔ اگر تصویر کے خیال کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان دونوں میں توازن قایم نہیں رہتا۔ یعنی قدرتی طور پر ایک کی طرف زیادہ رجحان ہوتا ہے بہ نسبت دوسرے کے۔ اگر دماغی پہلو پر زور دیا جائے یعنی اس کو علت گردانا جائے تو وہی حرکت مادی کا نظریہ قائم ہو جاتا ہے جس کے قابلِ اطمینان توجیہ ہونے میں اوپر اعتراض ہو چکے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر یہ کہا جائے کہ نفسی کیفیات سبب ہوتی ہیں دماغی کیفیات کا اور یہ اس وجہ سے کہ نفسِ انسانی مادی دماغ سے اس طرح وابستہ ہے کہ اس کا کوئی فعل دماغ میں تغیر پیدا کئے بغیر عمل میں نہیں آتا۔ تو یہ ایک حد تک قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے بیرونی عالم میں جس قدر تغیرات ہوتے ہیں اُن کو ہم مادہ اور حرکت

کی اصطلاح میں ظاہر کرتے ہیں چونکہ ہمارے حواس اُن کا اسی صورت میں ادراک کرتے ہیں لیکن جو تغیرات ہماری کیفیتِ شعوری میں ہوتے رہتے ہیں اُن کو ہم قدرتی طور پر خیالات و جذبات و خواہشات کے تغیرات سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ یہ تغیرات خود ہمارے ہی اندر پیدا ہوتے ہیں اس لئے اُن کی اصلیت سے ہم خود بہ نسبت ایک ظاہر بین شخص کے زیادہ واقف ہیں۔ رہا دوسرا پہلو یعنی دماغی تغیرات وہ گویا اسی باطنی اصلیت کی محض صورت ظاہری ہے اور وہ کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ بجز سائنس کے جس کو محض عالمِ محسوس ہی سے غرض تعلق ہے۔

علاوہ ازیں اگر نفس محض مختلف محسوسات کا مجموعہ ہوتا تو ہم کو مخالفین کی رائے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔ لیکن نفس انسانی کی بڑی خصوصیت جو ہے وہ محض یہی نہیں کہ محسوسات کا ادراک کرتا ہے بلکہ مختلف اور پریشان محسوسات کو جمع کر کے اُن کو متحد کر دیتا ہے تاکہ شے محسوس کی شناخت اور اس کی دیگر اشیاء سے تمیز ہو سکے۔ مثال کے طور پر دو ایک قسم کے پھلوں کو لیجئے، مثلاً نارنگی۔ آم۔ کیلا وغیرہ۔

ان میں سے ہر ایک پھل کو ہم مختلف حسیات کے ذریعہ سے معلوم کرتے ہیں۔ خاص قسم کا رنگ جو قوتِ باصرہ محسوس کرتی ہے، خاص قسم کی خوشبو جو قوتِ شامہ محسوس کرتی ہے خاص قسم کا مزہ جو قوتِ ذائقہ محسوس کرتی ہے اور خاص قسم کی نرمی اور سختی جو قوتِ لامسہ محسوس کرتی ہے یہ سب محسوسات مختلف طور پر مادی اعصاب کے ذریعہ سے دماغ میں پہنچتے ہیں۔ اب نفس کا کام یہ ہے کہ وہ ان سب محسوسات کو متحد کر کے اُن کا ایک ذہنی تصور قایم کرلے جس کا سہولتِ اظہار کے لئے ایک خاص نام رکھ لیا جاتا ہے۔

یہ متحد کرنے کا فعل خاص نفس کا حصہ ہے۔ دماغ کا نہیں، کیونکہ دماغ میں تقسیم افعال کے لئے جس قدر خانے ہیں اُن میں سے اس خاص فعل کے لئے کوئی کوئی بھی نہیں، اس متحد کرنے والی قوت کو رُوح کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس خیال کے حامیان کے نزدیک انسان اس مادی عالم میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ وہ طبعی قوانین کے ہاتھوں میں دیگر مادی اشیاء کی طرح کھلونا نہیں ہے بلکہ وہ ارادہ اور اختیار رکھتا ہے اس کے افعال تغیرات ماسبق کے تحت میں پہلے سے مقدر (PREDETERMINED) نہیں ہوتے بلکہ خاص مقاصد کو پیش نظر رکھ کے (self determined) ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اُس کا فرض اور ذمہ داری کا احساس محض دھوکہ اور غلط فہمی نہیں ہے بلکہ بالکل اصلی اور حقیقی شے ہے۔ اس ضمن میں ایک اعتراض اور باقی رہ گیا ہے جو یہاں قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ اگر انسان کو صحیح معنوں میں فاعل سمجھا جائے تو مقدارِ قوت کے قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے جس کی ابتدائے مضمون میں تشریح کی جاچکی ہے۔ مگر اول تو اس کا اطلاق انسان پر کرنا غلطی ہے۔ کیونکہ انسان کے متعلق اس کے صحیح ہونے کا اب تک کوئی ثبوت نہیں دوسرے یہ کہ اگر بالفرض اس کو صحیح مان بھی لیا جائے اور فرض کرلیا جائے کہ انسان جس قدر قوت غذا کے ذریعہ سے قدرت کے خزانۂ عامرہ سے حاصل کرتا ہے وہ مختلف افعال کی صورتوں میں خارج کردیتا ہے تب بھی یہ قانون محض مقدار کے متعلق ہے انسان کا یہ اختیار کہ وہ اس معینہ مقدارِ قوت کو چاہے جس سمت میں لگادے اس قانون کی رُو سے شکست نہیں ہوتا۔ جب تک اندر جانے والی قوت اور باہر آنے والی قوت برابر ہے اس قانون کی شرائط پوری ہوجاتی ہیں۔ اِس قوت کی سمت اخراج کے متعلق یہ قانون کچھ نہیں کہتا اور زیرِ بحث یہی بات ہے کہ انسان مختلف راہوں میں سے خواہ کوئی سی راہ اختیار کرے۔ بتسلسل لازمی کے قانون کے تحت میں وہ اپنے افعال میں دیگر مادّی عالم کی طرح مجبور اور بے اختیار نہیں۔ اگر کسی نفس کا وجود اس مادّی دماغ کی وساطت کے بغیر ممکن ہو تو وہ ان طبعی قوانین کے اثر سے بالکل بَری ہو جن کا وہ دماغی تعلق کی وجہ سے ایک حد تک پابند ہے اور جس مادی تعلق کی وجہ سے اس کی قوت ارادی اور اختیار بالکل آزاد اور مطلق العنان نہیں ہے۔ مادہ طبعی قوانین کا بالکل پابند ہے اور نفس ان سے بالکل آزاد ہے۔ اب نفسِ انسانی چونکہ مادّی دماغ کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے اس کی حالت جبر و اختیار کے درمیان ہے، نہ مجبورِ محض ہے نہ مختارِ محض۔ لیکن اگر کوئی نفس بلادماغ کے ہو تو اُسکی قوت ارادی کُنْ فَیَکُوْنُ سے کیا کم ہوسکتی ہے۔

(سید انور علی صاحب انوری فرید آبادی)

کہاں آئے ہو تم قبریں ہیں دِل سینوں میں ہلتے ہیں
گھنا جنگل ہے تاریکی ہے، دونوں وقت ملتے ہیں

مجھے بیساختہ تیرا تبسم یاد آتا ہے
لبِ دریا شبِ مہتاب میں جب پھول کھلتے ہیں

(انتخاب از روحِ ادب مصنفہٗ جوش ملیح آبادی)

رازِ حسن

نمودِ صبح نے عالم کو یہ پیام دیا
کہ خوابِ ناز سے چونکی ہے ایک حورِ لقا

نسیم خلد سے صحنِ چمن میں آئی ہے
نویدِ شوق پیامِ سرور لائی ہے

طیورِ صبح کے نغمے چمن میں سنتی ہے
گلوں کی روح چنبیلی کے پھول چنتی ہے

کلی کلی کی دعا ہے کہ مجھ کو ہاتھ لگائے
جسے چھوا اُسے یہ آرزو کہ ہار بنائے

نظر جھکائے تو غنچوں پہ نیند سی چھائے
نظر اُٹھائے تو پھولوں میں تازگی آئے

خرامِ ناز میں انگڑائیاں جو لیتی ہے
تو کائنات کو لرزش کا حکم دیتی ہے

رخِ صبیح میں جاگی ہوئی لطافتِ نور
کنارِ چشم میں سوئی ہوئی امانتِ طور

سرورِ رنگ میں محلول نزہتِ سحری
وجودِ پاک میں محصور طلعتِ قمری

شعاعِ مہر کی دوشیزگی کی اک تصویر
جبیں پہ عصمتِ ماہِ مبیں اقامت گیر

ہلالِ لب پہ درخشاں تبسمِ خوبی
عذارِ نرم پہ اک خال حرزِ محبوبی

بیاضِ دوش پہ بکھرے ہوئے سیہ گیسو
سوادِ شام میں پنہاں طلسمِ نکہت و بو

کسی ادائے تغافل میں شانِ لیلائی
کسی نگاہِ تلطف میں طرحِ عذرائی

فروغِ حسن سے آئینۂ جمالِ حیات
شبابِ تند سے افسانۂ جلالِ حیات

شرابِ تند میں یہ آتشیں خواص نہیں
ایاغِ چشم میں جوئے ہلاہلِ شیریں

مزاجِ قطرۂ شبنم بسر و بر بوئے نسیم
خنک لطافتِ گل موجِ کوثر و تسنیم

دلِ خراب کی نکلی ہوئی دعائے صمیم
گدا کے حال سے ناآشنا نگاہِ کریم

وہ شمع جس کی ضیا صوفیوں میں عرفاں ہے
وہ نور جس کی جھلک مومنوں کا ایماں ہے

الم فروش تپش آفریں بستم پرداز
سکوں کے نام کی دشمن خلش کی محرمِ راز

وہ اضطراب رگِ تاک جس کی اصل شراب — وہ التہاب دلِ خاک جس کی شکل گلاب
وہ آگہی کہ پگھل جائے جس سے کانِ جمود — وہ شوقِ قلبِ تجلّی کہ جس کا نام شہود
وہ جوش جس نے دلِ سنگ کو رخام کیا — وہ لمس جس نے سدا کیمیا کا کام کیا
وہ رنگ جس کی شعاعوں کو جمرِ گلخن — تپا کے خاک کے ذروں کو کر گئی کُندن
ضیائے مہر ہے جس کی دمک، وہ دُرِّ ثمیں — قمر میں جس کی جھلک بس کے رہ گئی وہ نگیں
نمودِ منظرِ تسکیں پیامِ وضعِ مضمار — کلیدِ گنجِ نوا میں مخزنِ اسرار
شبابِ نو کے تقاضائے دلبری کا وفور — شبِ وصال کی بیخواب انکھڑیوں کا سُرور
وہ ضَو کے پیکرِ رعنا ہے جس کی قسمت میں — وہ برق، دل پہ جو گرتی ہے قد کی صورت میں
ازل میں حسن کو متشکّل کیا وہ رازِ جمال — جہاں کو جس سے مسخر کیا وہ سحرِ حلال
نظر کے سامنے اللہ کیا تماشہ تھا — کہ اس کو دیکھ کے پھر کچھ نظر نہ آتا تھا
قرارِ جاں سے ہوا، اعتمادِ قلب سے دُور — خودی کی شب میں ہوا صبحِ بیخودی کا ظہور
وفورِ شوق میں آخر جب اور بس نہ چلا — جبیں زمین پہ رکھدی، خدا کا نام لیا
عجب مقام پہ تھی روحِ انبساط قریں — کہ کائنات نظر آ رہی تھی زیرِ نگیں !
اسی مقام کو کہتے ہیں ماورائے حواس — یہیں حرام ہے اپنے وجود کا احساس
یہ حال تھا کہ درِ قدس سے صدا آئی — کہ اے جمالِ خلش آفریں کے شیدائی
غمِ حیات کو جز عجز کچھ نہیں زیبا — کہ بندگی سے حسیں تر نہیں ہے کوئی ادا
بلند عرشِ بریں سے ہے یہ وہ پستی ہے — تری یہ گم شدگی عین حق پرستی ہے
کمالِ زیست ہے دنیا میں اس شرف کا حصول — کیا ہے ہم نے ترا سجدۂ نیاز قبول
نہ سر اٹھا کہ تجھے آج دل کی بات سنائیں — جہاں سے جس کو چھپایا تجھے وہ راز بتائیں
شکستِ عرضِ محبت سے دل ملول نہ ہو — ہو نہ رو جو تری آرزو قبول نہ ہو

جمالِ رُخ میں نہ ابروئے بے پناہ میں ہے
جہانِ حسن کا مرکز تری نگاہ میں ہے

مخمور-اکبرآبادی

ادبِ لطیف

سازش

ایک ناجائز طور سے حاملہ عورت، چہرہ وحشتناک، اختلاج قلب، غرق۔ حمل پوشیدہ رکھنے کے خبط میں دیوانی۔۔۔۔۔۔

ہر چند بشاش بننا چاہتی ہے۔ مگر رگ رگ میں اُترا ہوا خوف پژمردہ ہی رکھتا ہے اور دھڑکتا ہوا دل مطمئن ہونے نہیں دیتا۔

وہ ایک مطلق خاموشی۔ ایک کامل سناٹے کی جویا رہتی ہے۔ اُس کی روح تاریک گوشوں اور پوشیدگیوں سے لبریز خلوتوں کی تشنہ رہتی ہے۔

ہر صدا خواہ وہ نغمۂ شادی ہی کیوں نہ ہو، اُسے اس قدر پریشان کر دیتی ہے جس طرح دیہاتی چوکیداروں کی بھیانک اور گرجتی ہوئی آوازیں آدھی رات کے وقت شیر خوار بچوں کو، روز روشن اُسے اس طرح ڈراؤنا معلوم ہوتا ہے جیسا بھوتوں کے قائل کو بھری برسات کی سیاہ رات میں گھنا جنگل۔

رفتہ رفتہ اس کا خوف اس درجہ ترقی کر جاتا ہے کہ ایک شب جبکہ وہ خیالات میں غرق اپنے بستر پر لیٹی ہوتی ہے کہ اُسے دفعتہً "کھانسی" آتی ہے۔ کھانسی آتے ہی اس کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے اور یہ خیال کرکے کہ محلہ میں اس کی آواز سُن لی گئی۔ ایک چیخ مارتی ہے اور بیہوش ہو جاتی ہے۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔"

انتخاب از "روحِ ادب" مصنفہ جوش ملیح آبادی

عِلمِ تخیل

چھٹکے ہوئے تاروں سے ایک روشنی چلی فضا کو جلاتی ہوئی آئی اور میرے سینے میں جذب ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔"

"صبح ہوتے ہی وہ روشنی میرے سینے سے باہر آئی، بلند ہوئی اور آفتاب کی کرنوں میں پیوست ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کرنوں سے چلی اور دریا کی لہروں میں نہانے لگی۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ دریا سے باہر آئی باغ میں گئی، اور نازک نازک کلیوں میں چھپ گئی۔ کلیاں مسکرانے لگیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کلیوں کو چٹکاتی ہوئی پھر میرے نزدیک آئی اور میری آہستہ سے چھو کر تمام کائنات میں پھیل گئی۔

۔۔۔۔۔۔۔۔"

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھ میں اور فضا میں قدرت ایک ہی روح ہے۔ جو دورہ کیا کرتی ہے۔ میں کائنات میں ہوں اور کائنات مجھ میں"

یہ عجیب بات ہے کہ کشتی دریا میں غرق ہے اور دریا ڈوبا ہوا ہے!!!

(انتخاب از "روحِ ادب" مصنفہ جوش ملیح آبادی)



ہندو مسلم اتحاد

(جناب حکیم محمد یوسف حسن صاحب لاہور)

حضرت جوش کے اصرار پر مجھے اُن کے رسالے کے لئے ایک ایسے عنوان پر مضمون لکھنا پڑا ہے. ہندو مسلم اتحاد پر بارہا لکھا جا چکا ہے. لیکن پھر بھی یہ عنوان ہنوز تشنہ ہے اور تشنہ رہے گا۔ اس لئے اگر میں کچھ عرض کروں اور وہ کسی طرح مفید ثابت ہوا تو سمجھوں گا کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔

ایشیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ہلکا سا خاکہ نیرنگ خیال کے مشرق نمبر میں شائع ہو چکا ہے. ہندوستان ایشیا کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس میں تینتیس کروڑ انسان بستے ہیں، جو اگر متحد و منظم ہو جائیں تو اپنی دیرینہ روایات جرأت و شجاعت کے بل پر وہ ایشیا بھر میں ممتاز ترین حکومت کے وارث بن سکتے ہیں۔ جاپان ایشیائی روس اور چین ان تینوں میں سے کوئی سلطنت بھی اتنی طاقتور نہیں بن سکتی جتنا آزاد اور منظم ہندوستان بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس لئے ہندوستانیوں کو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرلینی چاہیئے کہ باہمی خانہ جنگی سے وہ نہ صرف اپنے ملک کی آزادی کا گلا گھونٹ رہے ہیں بلکہ ایشیا کی ترقی اور آزادی کے راستہ میں بھی روڑا اٹکا رہے ہیں۔

ہندو مسلم اتحاد پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ہمیں جن ذیلی عنوانات پر کچھ لکھنا پڑیگا وہ یہ ہیں۔ (۱) مذہبی اتحاد (۲) سیاسی اتحاد۔ (۳) معاشرتی اتحاد۔ (۴) لسانی اتحاد۔ (۵) اخباری اتحاد۔

سب سے اہم مسئلہ مذہبی اتحاد ہے۔ ہندوؤں کے اندر مذہبی تعصب مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ ہندو آپس میں مذہبی اصول میں سارے منتشر و متفرق ہو گئے ہیں. ہندوؤں میں ذاتوں کی تقسیم اور چھوت چھات ہی انھیں اپنوں سے بھی بیگانہ بنانے کے لئے کافی ہے۔ گو مسلمانوں سے میل جول اور انگریزی تعلیم کے اثر سے اس میں کچھ نہ کچھ کمی پیدا ہو چکی ہے. مگر جو قوم اپنے ہی بھائی ہندوؤں سے ایسا خلاف انسانیت سلوک روا رکھتی ہو اُن سے مسلمان زیادہ توقع نہیں رکھ سکتے. مسلمانوں کے بھی فرقے ہیں. اُن میں بھی انتشار و تفریق ہے. لیکن وہ اس قسم کا نہیں جیسا ہندو قوم میں پایا جاتا ہے. مسلمانوں کی باہمی اخوت ہمیشہ ذاتوں اور فرقوں کی تفریق پر چھا جاتی ہے اور مسلمان اس معاملہ میں ہندوؤں کی نسبت بہت زیادہ محفوظ ہیں۔

مسلمانوں کی روش ہندوؤں کے متعلق قابل اصلاح ہے. مسلمانوں کو اس معاملہ میں قرآن مجید سے استنباط کرنا چاہیئے جس میں صاف اور واضح احکام موجود ہیں اللہ پاک نے ہر قوم اور ہر ملک کی طرف ہدایت اور ہادی بھیجے ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان جیسا اتنا اور وسیع ملک اس سے محروم رہا ہو. یقیناً ہندوستان میں بھی خدا کا پیغام اور شریعت ضرور نازل ہوئی ہوگی. یہاں بھی پیغمبر آئے ہونگے مسلمانوں نے تیرہ سو سال میں قرآن مجید کو تو نہیں بدلا اور نہ بدل سکتے ہیں لیکن شریعت کے دوسرے اصولوں میں اس قدر افراط و تفریط سے کام لیا ہے کہ حقیقت کی تلاش میں الجھن ہونے لگتی ہے۔ اس لئے اگر ہندوؤں نے دین الہٰی میں ہم سے چار گنا یا دس گنا زیادہ وقت میں ہم سے کئی گنا زیادہ تحریف کرلی ہو تو ہم نا ممکن نہیں نہ معلوم ہندوؤں کا اصل مذہب کیا ہوگا اور اب اس کی مسخ شدہ صورت کیا رہ گئی ہے. لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ہندوؤں کو "بےدین" یا "کافر" کہیں. ہندو بھی اللہ کی ایک قوم اور اس کے پیغمبر کی امت ہیں۔ اگر انھوں نے خدا کے آخری احکام یعنی اسلام کو قبول نہیں کیا۔ تب بھی وہ خدا کے پیدا کردہ انسان اور خدا کی ایک پرانی اُمت تو ضرور ہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔

"یہ تمہاری جماعت دراصل ایک ہی جماعت ہے اور میں
تم سب کا پروردگار ہوں اس لئے صرف مجھ سے ڈرو مگر
لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کٹ کر الگ ہوگئے اور انہوں نے
نئے نئے مذہب بنا لئے۔ اب ہر ٹولی کے پاس جو کچھ ہے اسی
میں مگن ہے۔ (المؤمنون ع ۳)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

جس قوم کے پاس آسمانی کتاب ہو اُس سے جھگڑا نہ کرو۔ مگر
ہاں بہت اچھے طریقے سے اُس قوم میں وہ لوگ مستثنیٰ ہیں
جو ظالم ہیں اور اُن سے کہو کہ جو احکام ہمارے اور تمہارے
لئے نازل ہوئے اُن پر ہمارا یقین ہے۔
ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ ہم سب اسی کے سامنے
جھکنے والے ہیں۔ (عنکبوت۔ ع ۵)

تیسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

سب لوگ ایک ہی مذہب و طریقہ پر تھے۔ بعد میں اختلاف
پیدا کر لیا۔ (یونس ع ۲)

چوتھی جگہ حکم فرمایا ہے۔

اے ایمان والو کسی قوم پر نہ ہنسو۔ ممکن ہے اس میں نیک
آدمی ہوں۔ اسی طرح عورتوں پر بھی نہ ہنسو ممکن ہے اُن
میں بھی نیک ہوں۔ (الحجرات ع ۲)

گویا نیک اور پارسا مرد یا عورتیں صرف مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ دوسری قوموں میں بھی ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ دوسری قومیں مسلمان نہیں تھیں۔

پانچویں جگہ لکھا ہے۔

کہو ہم اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور ہماری طرف جو قرآن نازل
ہوا اُس پر اور جو کچھ ابراہیم۔ اسمٰعیل۔ اسحٰق۔ یعقوب اور اولاد
یعقوب پر نازل ہوا۔ اس پر یقین رکھتے ہیں اور موسیٰ عیسیٰ
اور دوسرے تمام پیغمبروں کے پاس جو احکام ان کے پروردگار
کی طرف سے آئے ان پر یقین ہے۔ ہم ان میں سے کسی کو جدا
نہیں سمجھتے۔ (البقرہ ع ۲)

گویا ہمیں ان الہامی کتابوں اور پیغمبروں پر بھی یقین رکھنا چاہئے جنہوں نے خدائے واحد
کی عبادت کی طرف بلایا۔ گو اُن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں کیا گیا۔

چھٹی جگہ فرمایا ہے۔

ہر ایک قوم کے لئے ایک رہنما ہوتا رہا ہے۔ (رعد ع ۱)

ساتویں جگہ ارشاد ہوا۔

کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہ آیا ہو۔
(فاطر ع ۳)

آٹھویں جگہ لکھا ہے۔

ہم نے ہر رسول کو اُس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ احکام
الٰہی بہتر طرح بیان کرے۔ (ابراہیم ع ۱)

گویا خدائی الہامی زبان صرف عربی نہیں ہے بلکہ جس قوم کے پاس پیغام بھیجا گیا اس کی زبان میں بھیجا گیا تاکہ وہ لوگ سمجھنے میں تکلیف نہ پائیں۔ ہندوستان میں جو پیغام بھیجا گیا ہوگا وہ اِس ملک کے باشندوں کی زبان میں بھیجا گیا ہوگا۔

نویں جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

اور بیشک ہم نے ہر قوم یا ہر جماعت میں ایک رسول بھیجا،
اور اُس کے ذریعہ سے یہی حکم دیا کہ صرف اللہ کی عبادت
کرو اور سرکش اور شیطانی قوتوں سے بچو۔ (نحل ع ۵)

دسویں جگہ لکھا ہے۔

اور کئی رسول ہیں جن کے حالات ہم نے تجھے پہلے ہی سنا دیئے
اور کئی رسول ہیں جن کے حالات نہیں سنائے۔ (النساء ع ۲۳)

مندرجہ دس احکام قرآن مجید کی مختلف آیتوں سے لئے گئے ہیں۔ جو تمام کے تمام واضح ہیں۔ اِن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ

(۱) تمام قومیں ایک ہی جماعت کی مختلف شاخیں ہیں (۲) ہر قوم میں عبادت صرف خدائے واحد کی مقصود تھی۔ (۳) ہر قوم میں نیک مرد اور نیک عورتیں ہوتی ہیں۔ (۴) دنیا کے تمام پیغمبروں کو سچا سمجھو اور ان کی عزت کرو (۵) خدا نے ہر قوم میں رہنما اور پیغمبر بھیجے ہیں (۶) خدا نے پیغمبروں کو صرف عربی زبان ہی میں پیغام نہیں دیا بلکہ ہر اُس زبان میں پیغام دیا جس قوم میں خدا کا حکم نازل ہوا (۷) قرآن مجید میں بہت سے پیغمبروں کا ذکر موجود ہے اور بہت کا ذکر نہیں بھی کیا گیا۔

ان واضح احکام کی روشنی میں مسلمانوں کو سوچنا چاہئے کہ گو اُن کے پاس آخری پیغام اور دنیا کا مکمل ترین مذہب ہے۔ ان کے پاس خدا کی بھیجی ہوئی ایک

ایسی کتاب ہے جو ابتدا سے لیکر آج تک جوں کی توں موجود ہے جس سے ایک حرف اور ایک نقطہ بھی کم نہیں ہوا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خدا کے دوسرے مذاہب کا مذاق اڑائیں۔ اگر ہزارہا برس کی دست برد سے دیگر مذاہب کی صورت مسخ ہو گئی ہو پھر بھی مسلمانوں پر واجب نہیں ہے کہ دوسروں کی تحقیر کریں۔ اللہ پاک نے قرآن مجید میں ایک جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہوئے اُن سے ان کے دینوں کے مطابق حساب کتاب ہوگا جن پر وہ باپ دادا کے وقت سے قایم چلے آتے ہیں۔ گویا اللہ پاک نے غیر مسلموں سے بھی اپنا الہامی اور دینی تعلق کسی نہ کسی صورت میں قایم رہنے دیا ہے۔

جب صورت حال یہ ہو جو اوپر بیان کی گئی ہے تو مسلمانوں سے بار بار سوال کرنا پڑتا ہے کہ اگر وہ دوسرے مذاہب کے متعلق ایسی نفرت و حقارت نہ پھیلائیں جس کے وہ مستحق نہیں ہیں تو اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کتنا فائدہ پہنچتا۔ ہندوستان میں تبلیغ اسلام میں کتنی آسانیاں پیدا ہو جائیں دوسرے مذاہب والے کشادہ دلی سے اسلام کا مطالعہ کرتے۔ اور جب دیکھتے کہ اسلام تو صرف پہلے دینوں کا مُصَدِّق ہے اور خدا کے ان احکام کو مصفا و مجلا حالت میں پہنچانے والا ہے جو ہزارہا سال کے عرصہ میں انسانوں کی دست برد و ذاتی اغراض سے مستور ہو چکے تھے تو اس سے خدا کے آخری پیغام کی نشر و اشاعت میں زیادہ آسانیاں پیدا ہوتیں مسلمان علمار نے کافر کافر اور مشرک مشرک کا نعرہ بلند کرکے خدا کے دو دینوں کو ایک جگہ جمع ہونے سے روک دیا۔ کیا مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد علانیہ شرک میں مبتلا نہیں۔ کیا قبروں۔ گنبدوں، معبدوں۔ کپڑوں اور پیروں فقیروں سے وہی کچھ نہیں مانگا جا رہا اور اُن کی ویسی ہی پرستش نہیں کی جا رہی جیسی خدا کی کی جاتی ہے۔ جب مسلمان شرک کرنے لگیں اور خدائے قدیر کے نام کو پس پشت ڈال کر غیر حق کے سامنے جھکیں۔ اسی طرح اگر ہندوؤں نے اپنے بزرگوں کی مورتیاں اور تصویریں بنانے میں ٹھوکر کھائی ہو اور ان کے وسیلہ سے پرمیشور تک رسائی چاہتے ہوں یا وسیلہ کے لئے رب کو قربان کر چکے ہوں تو انصاف سے بتلایئے کہ ہندو مشرکوں اور مسلمان مشرکوں میں خدا کے نزدیک کچھ زیادہ فرق رہ جائے گا یا دونوں اُس کی نظر میں یکساں مجرم ہوں گے۔ میرے خیال میں تو مسلمان مشرکوں کو ہندو مشرکوں سے شاید زیادہ ہی سزا ملے۔

اللہ کا دین ایک ہے۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی سب اللہ کے بندے اور بچے ہیں ان میں سے جو فطرت کے قوانین کی زیادہ پابندی کرتا ہے وہ عروج اور ترقی پاتا ہے۔ حدت بڑھنے اور اعمال بد کی سزا سب کو یکساں ملتی ہے۔ مسلمان خدا کے آخری پیغام کے حامل ہیں۔ اس لئے ان کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں انھیں قولاً و فعلاً قرآن کے احکام پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں میں جو مذہبی تعصب ہے ہندو جو مسلمانوں کے خلاف زہر اُگلتے ہیں یہ تمام کا تمام بے اثر رہ جاتا ہے۔ اگر مسلمان قرآن مجید کے احکام کی متابعت میں ہندوؤں اور دوسری قوموں سے مصافحہ کریں اور خدا کے احکام محبت سے انھیں سنایا کریں۔

سیاسی اتحاد

ہندوستان کے سیاسی اتحاد میں ہندو بحیثیت ایک وطن پرست اور مسلمان بحیثیت ایک اسلام پرست کے پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ وطن پرستی کے سلسلہ میں مسلمان ہندوؤں سے کبھی پیچھے نہیں رہے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں جو حقائق اعداد و شمار کے شرمندۂ احسان ہیں۔ اُن سے مسلمانوں کی برتری ظاہر ہوتی ہے۔ والنٹیروں کو قید کرانا یا بڑے بڑے لیڈروں کا ایثار اور قید و بند کی تکالیف اٹھانے میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے کبھی کم نہیں رہی۔ کانگرس کی تحریک میں مسلمانوں کی تعداد کبھی قابلِ افسوس نہیں ہوئی۔ ہندوؤں میں کئی فرقے اور جماعتیں ایسی ہیں جو کانگریس میں شامل نہیں ہوئیں۔ مگر بدنام ہیں تو مسلمان۔ یہ ہمیں قبول ہے کہ مسلمانوں کی وہ جماعت بہت قوی اور مضبوط ہے جو کانگرس کے خلاف اپنا علیحدہ پلیٹ فارم بنائے ہوئے ہیں۔ اگر یہ جماعت کمزور یا ناقابلِ توجہ ہوتی تو مسلمانوں پر علیحدگی کا الزام نہ لگتا۔

ہندو اور مسلمان دونوں انفرادی گفتگو میں ہمیشہ اتحاد اتحاد پکارتے اور اُس کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن عملی زندگی میں وہ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے سے گریز کرتے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد میں سب سے بڑی رکاوٹ سیاسی اتحاد ہے۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی حالت حکمران طبقہ کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ برٹش حکومت اپنی ہوائی اور بحری جہازوں یا بری کثیر فوجوں کے بل بوتے پر دنیا کے ¼ حصہ پر حکومت نہیں کر رہی بلکہ یہ برٹش ڈپلومیسی ہے جو سلطنت برطانیہ کی طاقت کا راز ہے جس دن برٹش ڈپلومیسی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اُسی دن یورپ کی کوئی ہم پلہ طاقت اس کا تیا پانچا کر ڈالے گی۔ اس لئے ہندوستانیوں کو حکمران جماعت کی جنگی قوت کا مقابلہ نہیں کرنا بلکہ اصل قوت اس کی ڈپلومیسی کا مقابلہ مقصود ہے۔

برطانیہ کے دشمن کہا کرتے ہیں کہ تقسیم کرو اور حکومت کرو۔ اس کا مطمح نظر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اصول تو شاید ہر حکومت کا پہلا قانون ہوتا ہے خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی۔ مگر اس کے ذہنی اثرات اُس کے عملی تاثرات سے زیادہ خوفناک ہوتے ہیں۔ ہندوستانیوں کا فرض ہے کہ وہ ان زہریلے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی تجویز سوچیں۔

ہندوستان کا سیاسی دنگل سالہا سال سے قایم ہے، اور سیاسی مداری برابر شعبدہ بازی سے کام لے رہا ہے۔ نت نئے تماشے وہ اپنے پُراسرار تھیلے سے نکال کر تماشینوں کے سامنے پھینک دیتا ہے جس کی نیرنگیوں میں وہ گم ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کے قابل ترین دماغ بھی ہندوستان کی تعلیم سیاسی آج تک نہ کرسکے۔ جب کبھی تقسیم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو حقوق کی حفاظت کے لئے سب قومیں کٹ مرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان کی دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ ہندو بمثل بڑے بھائی کے ہیں۔ اور چونکہ انگریزوں نے ہندوستان کی سلطنت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے وہ کم از کم نصف صدی تک راندہ بارگاہ رہے اس عرصہ میں ہندو قوم بہت آگے نکل گئی۔ اگر مسلمانوں کو اب قدم اٹھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو محض اپنی مٹتی ہوئی ہستی کو بچانے کے لئے یا حکمراں طبقہ چاہتا ہے کہ ہندوؤں کے مقابل ایک دوسری قوت بھی لاکھڑی کرے۔ یہ ضرورتیں با اصول مسلمانوں کو سیاسی میدان میں کھینچ لائے ہیں۔ اس صورت میں ہندوؤں کو سوچنا چاہیئے کہ ایک طرف تو حکومت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کو دبانا اُن کا اصول ہے تو اس دوہری جنگ میں کیا کبھی وہ کامیاب بھی ہو سکیں گے۔

ہندو چونکہ آبادی میں، ترقی میں، تعلیم میں اور روپیہ میں مسلمانوں سے آگے نکل چکے ہیں اس لئے قربانی اُنھیں ہی کرنی پڑے گی۔ جو جگہیں وہ مسلمانوں کے لئے خالی کریں گے وہ گویا اپنی ملکیت کا حق کھو رہے ہیں۔ اصولاً اگر مسلمانوں کو ساتھ ملانے اور مادرِ وطن کو آزاد کرانے کے لئے ہندوؤں کو کچھ گرہ سے بھی دینا پڑے تو انھیں احتراز نہ کرنا چاہئے۔ گو مسلمان اپنے جائز قانونی حقوق سے ذرہ برابر بھی زیادہ نہیں چاہتے۔ لیکن ہندو کو اُنھیں وہ چیز واپس دیتے ہوئے دُکھ ہوتا ہے جو اُن کی ملکیت قرار دی جا چکی تھی۔ یہ ہے سیاسی حقوق کی جنگ میں فساد کی جڑ۔ مگر ہندوؤں کو سوچنا چاہئے کہ اگر ملکی قوانین۔ اصلاحات اور حکمراں جماعت کی وہ پالیسی جس سے وہ رعایا کی قوتوں میں توازن رکھنا چاہتی ہے۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر لے آئی۔ تو اس صورت میں ہندوؤں کے پاس مسلمانوں کو دینے کے لئے کیا چیز رہ جائے گی۔ ہندو آج سے پچاس سال بعد اس وقت کو یاد کر کے افسوس کریں گے جب مسلمانوں پر مفت کرم داشتن کی شکل وہ احسانِ عظیم کرسکتے تھے۔

بعض پولیٹیکل رہنما کہا کرتے ہیں کہ پہلے غیر ملکی حکومت کو باہر نکالو پھر حقوق کی تقسیم کر لینا۔ یہ خیال نہ صرف عیارانہ ہے بلکہ احمقانہ بھی ہے۔ ایسے لوگ دنیا کی سیاسیات اور قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے بے بہرہ ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ عراق اور عرب نے ترکوں کے خلاف اس وقت تک بغاوت نہیں کی جبتک انہیں کامل آزادی کا پروانہ نہیں دے دیا گیا تھا۔ مصریوں نے برطانوی گرفت کو ڈھیلا کرانے میں اُس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کی جب تک مصری مسلمانوں نے مصری عیسائیوں کو زاید حقوق دے کر ساتھ نہیں ملا لیا۔ اب مصر کے عیسائی عیسائی حکومت سے نبرد آزما ہونے کو تیار ہیں اور مصری مسلمانوں کے پسینے پر خون بہاتے ہیں۔ کیا مصریوں نے بھی عیسائیوں سے یہ کہا تھا کہ پہلے انگریزوں کو نکالو اور پھر حقوق کی تقسیم کر لینا؟ سیاسیات میں ہمیشہ حقوق کا مسئلہ اول طے کر لیا جاتا ہے تاکہ مخالف قوت کبھی وقت پر رعایا کے مختلف طبقوں میں سے بعض کو توڑ نہ لے۔

میں اس مضمون میں مسلمانوں کی وکالت نہیں کر رہا۔ ہندو بڑے بھائی ہیں۔ وہ ترقی کی رفتار میں پچاس سال آگے ہیں۔ اس لئے وہ ملک کی حکومت اور ترقی میں زیادہ حصہ پائے ہوئے ہیں۔ اگر اُنھیں چھوٹے بھائی کو اُس کے تعلیم یافتہ اور جوان ہو جانے پر کچھ دینا پڑے تو خنداں پیشانی سے دینا چاہیئے۔ اگر ہندو خنداں پیشانی سے نہیں دیں گے تو آج نہیں سو پچاس سال بعد بھی مسلمانوں کو اُن کا حق مل جائیگا۔ پھر کیوں نہ ہندو اس وقت تھوڑی سی قربانی کر کے مسلمانوں کو احسان مند بنالیں اور اتحاد کی چٹان قایم کرلیں جو آئندہ سیاسی جنگ میں ہندوستان کی آزادی کی ضامن ہوگی۔ اگر ہندوؤں نے آج یہ موقع کھو دیا تو پھر آئندہ نہ اس کا کوئی موقعہ آئے گا اور نہ ہی پھر اس کا کچھ اثر ہوگا۔

حقوق کی تقسیم کا مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں ہے جتنا سیاسی مفکرین و پولیٹیشنو نے اسے بنا رکھا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں جو تعلیم ... نشستوں کی جاری ہے وہ محض دھوکہ اور فریب اور ہمیشہ کی جنگ کا ذریعہ ہے۔ ہر قوم یہ چاہتی

ہے کہ کوئی دوسری قوم اس پر حکومت نہ کرے۔ اس کے صرف دو علاج ہیں۔

اول یہ ہے نشستوں کی تقسیم آبادی کے اصول کے مطابق کی جائے یعنی جہاں ہندو جس تعداد میں ہوں اسی تعداد میں انھیں نشستیں دی جائیں اور مسلمان جس تعداد میں ہوں انھیں اتنی ہی نشستیں ملیں جن کے وہ حق دار ہیں۔ ویٹیج سسٹم کو قطعاً سامنے نہ لایا جائے۔ اس اصول پر اگر ہندوستان میں نشستوں کی تقسیم ہو تو چار صوبوں بنگال۔ پنجاب۔ صوبہ سرحد اور سندھ پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور بمبئی۔ مدراس۔ آسام۔ صوبہ متوسط۔ صوبہ متحدہ۔ دہلی وغیرہ باقی صوبوں پر ہندوؤں کی حکومت ہوگی۔ اگر سات صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت گوارا کی جاسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ چار صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت کیوں برداشت نہ کی جائے۔ پھر ایک لطف اور ہے کہ صوبہ سرحد اور صوبہ سندھ پر تو مسلمانوں کی اکثریت برداشت کی جاتی ہے لیکن پنجاب پر یہ ظلم گوارا نہیں کیا جاتا۔ یہ کیا صریحاً واضح اصولوں سے انحراف نہیں ہے؟

دوسرا علاج یہ ہے کہ کسی بھی صوبہ میں کسی قوم کی اکثریت نہ رہے۔ مثلاً مدراس میں ہندو اکثریت اقلیت میں بدل دی جائے اور صوبہ سرحد کی مسلمان اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا جائے۔ دو ہی اصول کارفرما ہو سکتے ہیں جب تک ان دونوں میں سے ایک اصول کو تسلیم کر کے اُس پر عمل نہیں کیا جائیگا۔ نشستوں کی جنگ کبھی بھی ختم نہ ہوگی۔

تیسری صورت ایک اور بھی ہے اس کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔ وہ یہ ہے کہ کسی جگہ بھی جہاں کسی قوم کو اکثریت حاصل ہے۔ ۵ فی صدی سے زیادہ حقوق نہ دیے جائیں اور باقی نشستیں اقلیتوں کو دیدی جائیں۔ بہرحال جو اصول بھی ہو وہ سب جگہ کے لئے ایک ہی ہونا چاہیئے۔ یہ نہ ہو کہ پنجاب اور بنگال اس سے مستثنیٰ رکھے جائیں۔

نشستوں کے حقوق کے بعد ملازمتوں کا سوال ہے۔ بعض محکمے ایسے ہیں کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مگر بیشتر محکموں میں ہندو زیادہ ہیں۔ اس کا باعث وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ یعنی مسلمان انگریزوں کو سلطنت دینے کے بعد پچاس سال تک راندۂ بارگاہ بنا رہا۔ اور ہندو انگریزوں کا چہیتا بیٹا۔ ہندو تعلیم میں بڑھتے چلے گئے اور مسلمان حجرہ نشین رہے۔ اس لئے ہندوؤں کا لازماً تمام عہدوں پر قبضہ کر لینا فطری تھا۔ اب جب مسلمانوں کو ملازمتیں دینے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو ہندو بھائی قابلیت قابلیت پکارتے ہیں۔ اگر قابلیت سے مراد کسی مقررہ امتحان کی سند یونیورسٹی سے حاصل کرنا ہے تو یہ صحیح معیار ہے لیکن اگر اس سے مراد مقابلہ کا امتحان ہے تو یہ لفظی جنگ ہے جس محکمہ پر ہندو قابض ہیں۔ وہاں مقابلہ کے امتحان میں کسی مسلمان کا کامیاب ہو جانا محال ہے اور جہاں مسلمان قابض ہیں۔ وہ ہندو کو کبھی بھی قریب نہ پھٹکنے دیں گے۔ اس لئے عہدوں کی تقسیم آبادی کے لحاظ سے ہونی چاہیے۔ تاکہ بے انصافی نہ ہو اور قابلیت کا معیار یونیورسٹی کی سندیں ہوں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ نالائق مسلمان لئے جائیں۔

معاشرتی اتحاد

قوموں کے میل ملاپ اور دلی کدورتوں کو دور کرنے کے لئے معاشرتی اتحاد کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں ہمارے ملک نے بھی کسی قدر ترقی ضرور کی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے طرزِ معاشرت اور لباس و خوراک میں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اور ایک دوسرے کے قریب ہونے کی کوشش کی ہے۔ آج سے سو سال بعد لباس و طرزِ معاشرت، شکل و صورت میں دونوں میں بہت کم فرق رہ جائیگا۔ اور شاید ہندو اور مسلمانوں کو شناخت کرنے کے لئے نام پوچھنے کی ضرورت پیش آیا کرے گی۔

یہ یک جہتی بھی ملکی ترقی کے لئے لازمی ہے۔ لیکن اس مسئلہ کو مرورِ ایام کے سپرد کر دینا مناسب نہیں۔ اب بھی دونوں قوموں کا فرض ہے کہ وہ مناسب پیش قدمی کرتی رہیں۔ ہندو مسلمانوں کے درمیان سب سے بڑی معاشرتی تفریق ہندوستان کے ریلوے اسٹیشنوں پر نظر آتی ہے جہاں مسلمان پانی اور ہندو پانی کے آوازے دن میں کئی بار سنائی دیتے ہیں۔ یہ منظم اور مسلسل اور مؤثر پروپگنڈا ہے جو ہندوؤں کو مسلمانوں سے جدا کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ خدا کی زمین پر خدا کا پیدا کیا ہوا پانی جس دونوں قوموں کے لئے سرچشمۂ علیحدگی اور چھوت چھات کا ذریعہ بن گیا ہے۔

جب تک ہندوستان سے چھوت چھات دُور نہ ہو گی ہندوستانی کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ جو قومیں مُردار خوار گندے اور ناپاک اچھوتوں کو سیاسی وجوہ پر گلے لگانا چاہتی ہیں وہ صاف ستھرے۔ خوش پوش۔ خوش جمال مسلمانوں کو گلے لگانے سے گریز کرتی ہے؛ کیا وہ خدا کی نظروں میں کبھی سرخرو ہو سکتی ہیں۔ اور اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب ہو سکیں گی؟

معاشرتی اتحاد کے لئے ہر شہر میں ہندو مسلمانوں کے مشترکہ کلب کھولے

جا سکیں جہاں، دونوں قوموں کے سپوت کھانے پینے میں یک جائی اور یک رنگی کا منظر پیش کریں۔ یہی چیز اتحاد کا سنگ بنیاد بن جائیگی۔

اخباری اتحاد

ہندو مسلم اتحاد کے لئے اخباری اتحاد کی بھی اشد ضرورت ہے۔ دونوں قوموں میں نفاق کی آگ کو ہوا دینے میں اخبارات نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ مذہبی اور سیاسی لیڈروں کی نفاق انگیز تقریریں تو کبھی کبھی ہوا کرتی ہیں مگر اخبارات ہر روز تازہ ترین زہر ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیتے ہیں۔ اس لئے جو لوگ چاہتے ہیں کہ ملک میں اتحاد قایم ہو، اُنھیں چاہئے کہ ملک کے اخبارات میں بھی اتحاد کرائیں۔ اس غرض کے لئے اخبار نویسوں کی ایک کانفرنس ہونی چاہئے جس میں اس مسئلہ پر شرح و بسط سے بحث کی جائے اور وہ قواعد وضع کئے جائیں جن کے ماتحت چل کر وہ اتحاد کے لئے مفید بن سکتے ہیں۔ ایک ہندو ندی کا فرار کی جگہ ایک عورت کا فرار اور ایک مسلمان بدمعاش کی گرفتاری کی جگہ ایک بدمعاش کی گرفتاری لکھنے سے اخبار نویسی میں کچھ کمی نہیں رہجاتی۔

اگر مسجد کے آگے باجا بجانے کا حق مانگنا ہندوؤں کا پیدائشی حق اور قانونی حق ہے۔ تو کبھی ہندو مسلمان ہمسایوں کے حق ہمسائیگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر مسجد کے آگے سے گزرتے وقت نماز کے وقت میں صرف دو منٹ کے لئے باجہ بند کردیں گے تو انھیں نقصان تو نہیں ہوگا۔ اگر مسلمان گائےکشی میں ہندوؤں کے جذبات کا احترام کریں، اگاؤکشی ترک کردیں تو اُن کے حق گاؤکشی کو نقصان تو نہیں پہنچتا۔ اللہ پاک نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

"تم میں سے ہر ایک گروہ کے لئے خاص طور و طریقہ اور
دستور العمل ہم نے بنا دیا ہے۔ ہر قوم اور ہر جماعت کے لئے
ہم نے ایک خاص طریق عبادت مقرر کردیا ہے جس کے
مطابق وہ عبادت کرتے ہیں۔ پس لوگ اس امر خاص
میں تجھ سے نزاع نہ کریں اور تو اپنے پروردگار کی طرف
بُلاتا رہ۔ بیشک تو سیدھے راستے پر ہے۔"

اسلام کی یہ رواداری بے مثال ہے۔ اگر مسلمان قرآن کی تعلیم کو پس پشت ڈال دیں گے تو دین اور دنیا دونوں میں پریشان ہوں گے۔ قرآن مجید میں بتوں تک کو گالی دینے سے منع کیا ہے۔ تاکہ غیر قومیں تمہارے خدا کو گالی نہ دیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں سر پھٹول کرانے والی باتیں بالکل سطحی اور سرسری ہیں جیسے۔ اذان۔ باجا۔ آرتی۔ نماز۔ گائےکشی۔ پیپل کا درخت۔ محرم اور دسہرہ کے جلوس۔ معمولی معمولی باتوں پر دونوں قومیں ہمیشہ برسر جنگ ہو جاتی ہیں۔ اُن کا علاج یہ ہے کہ مسلمانوں کے تہواروں پر شہر کا انتظام ہندو والنٹیروں کے سپرد ہو۔ اور ہندو تہواروں پر انتظام کی ذمہ داری مسلمان لیں تو یہ جنگ تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ گائےکشی۔ نماز اور باجا کے لئے اصول وضع کر لئے جائیں جن پر ہندوستان کے ہر حصہ میں عمل کیا جائے۔

لسانی اتحاد

کوئی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک اس میں لسانی اتحاد نہ ہو۔ اگر ہندوستان میں مدراسی کی بات پنجابی نہ سمجھے تو بتلائے کہ ہمارا ملک کہاں اور ہم کہاں۔ ہم ہندوستانی نہ ہوئے۔ افریقی اور روسی ہوئے جو ایک دوسرے کی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ حالانکہ ہمارا رشتہ وطن کا رشتہ جو خون کے رشتہ سے بھی قوی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی زبان ہو۔ جسے ہندوستانی سمجھ سکیں اور بول سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی زبان انگریزی ہوگی یا ہو رہی ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے ہندوستان میں پڑھے لکھوں کی تعداد ماشاء اللہ صرف سات فیصدی ہے۔ گویا سو میں سے ۹۳ کورے ہیں۔ اور ان سات پڑھے لکھوں میں تین انگریزی جانتے ہیں باقی اپنی لوکل زبانیں۔ اب بتلائیے کہ ۳ فیصدی لوگ انگریزی جانتے ہیں تو اُسے ہندوستان کی لنگا فرینکا بننے کا حق کیسے پہونچ سکتا ہے۔ انگریزی تو حکمران قوم کی نشانی ہے۔ جس طرح سے مسلمانوں کی حکومت کی نشانی فارسی زبان تھی۔ انگریزی زیادہ رائج ہے اور فارسی اب مٹتی جاتی ہے۔ باقی زبانیں ہیں جنھیں بہت احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ سنسکرت اور عربی ہیں۔ سنسکرت ہندوؤں کی مذہبی زبان ہے۔ اور عربی مسلمانوں کی اس سے زیادہ انھیں ہندوستان میں اہمیت حاصل نہیں۔

ہندوستان میں لسانی اتحاد کی اشد ضرورت ہے۔ مگر ... کی کوشش کی ضرورت نہیں۔ یہ زبان کا مسئلہ ہے اور خود بخود ... کرتا ہے۔ بنگالی زبان بنگال میں بولی جاتی ہے۔ مرہٹی اور گجراتی ... تامل اور تلنگو جنوبی ہند اور مدراس میں۔ ہندی صوبہ متحدہ میں ...

پنجابی ہے یہ تو بولنے کی زبانیں ہوئیں۔ علمی حیثیت سے بنگالی سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ پھر گجراتی کا نمبر ہے۔ پھر ہندی کا اور آخر میں اردو کا۔

لیکن اردو کو ایک اور خصوصیت بھی حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اسے سارے ہندوستان میں بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ ہمارا ملک تقریباً ایک براعظم ہے جس میں ۳۰ کروڑ آدمی بستے اور کوئی دو سو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اگر کسی ایک زبان سے کام چلایا جا سکتا ہے تو وہ صرف اردو ہے۔ مدراسی اور بنگالی جو تلنگو اور پنجابی بولنے کے عادی ہیں، اردو کے ذریعے ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ یہ طاقت اور کسی زبان کو نہ حاصل ہے نہ ہوگی۔

اردو ہندی کی جنگ کا مسئلہ بھی یار لوگوں نے سر درد کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے۔ اردو ہندی کی کوئی جنگ نہیں۔ اور اگر ہے تو صرف ایک صوبہ تک محدود ہے۔ وہ صوبہ متحدہ ہے۔ جہاں اردو ہندی دوش بدوش چل رہی ہیں۔ اردو ہندی غلبہ پائے ہوئے ہے۔ ہندی کا مسئلہ آل انڈیا مسئلہ نہیں ہے۔

ذرا ہندی بمبئی میں قدم تو جا کر دکھ لے۔ گجراتی زبان اسے دھکے مار کر باہر نکال دیگی۔ بنگال کا رخ کریگی تو بنگالی اس کی آنکھیں نکال لے گی۔ پنجاب کی طرف قدم اٹھائیگی تو اسے اردو نگل جائے گی۔ ہندی کے لئے ملک کے کسی صوبہ میں گنجائش نہیں ہر صوبہ کی اپنی زبان زیادہ قوی ہے۔ بنگالی۔ گجراتی اور تامل کا مقابلہ ہندی زبان کبھی نہ کر سکے گی نہ ان کی جگہ لے سکیگی۔ اس لئے ہندی کا مسئلہ آل انڈیا مسئلہ نہیں ہے۔

اردو نہ ہندوؤں کی ہے نہ مسلمانوں کی ہے۔ یہ زبان ہندوستان کی متحدہ زبان ہے جس کو جانتے ہوئے ہم ہندوستان بھر کا سفر کر سکتے اور ایک دوسرے کی زبان کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور جب کبھی ہندوستان کی قوموں میں اتحاد کرائے گی تو یہی زبان کرائے گی۔ اس لئے ہندو مسلم اتحاد کے حامیوں کو اردو کی جے کا نعرہ ہمیشہ بلند کرنا چاہیئے۔

جس شمع کو شمع طور کردے ساقی
ظلمات شب کو نور کردے ساقی
[illegible] دنیا میں بہار
[illegible] دور کردے ساقی

([illegible])

رباعی

ساقی قدح بادہ رنگیں کو [illegible]
حاضر ہیں [illegible]
ہیں اور تصور [illegible] وقت
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

([illegible])

ایک تقابُل

مال کا وہ درجہ جس میں ریل کے مزدُور تھے! — آ کے ٹھہرا دوسرے درجے کے بالکل سامنے
اُس طرف ناپاکیاں تھیں، خاک کا انبار تھا — اِس طرف ہر ذرّہ گویا مصر کا بازار تھا
اُس طرف وہ درجہ کیا، اِک دیدۂ بے نُور تھا — اِس طرف تقدیر سے رُوشن چراغِ طُور تھا
اُس طرف جورِ خزاں تھا، اِس طرف لُطفِ بہار — اُس طرف مزدُور تھا، اور اِس طرف سرمایہ دار
اُس طرف جانِ حزیں تھی موسمی جلووں سے دُور — اِس طرف تھا سایۂ ابرِ خراماں کا سُرور
اُس طرف سامانِ دل تنگی تھا چولھے کا دُھواں — اِس طرف چہروں پہ تھیں ٹھنڈی ہوا کی سُرخیاں
اُس طرف ہر آنکھ میں غلطیدہ تھی فکرِ معاش — اِس طرف چہرے تھے روشن، اور سینے بے خراش
اُس طرف سرگشتہ تھا بے برگ و باری کا شعُور — اِس طرف اُٹھلا رہا تھا ساز و ساماں کا غرُور
چیتھڑوں میں اُس طرف لپٹی ہوئی تھی زندگی، — اِس طرف تھی مخمل و سنجاب کی رخشندگی،
اُس طرف ہمّت کا سر رکھا ہُوا تھا خاک پر — اِس طرف تھے ولولوں کے نقشِ پا افلاک پر
اُس طرف موجِ نَفَس، اِک نالۂ بیتاب بھی — اِس طرف تارِ سکُوں پر ذہن کی مضراب تھی
آہ اِن دونوں میں اِک شے مشترک جو ہَر نہ تھی — اِن کے جوتوں پر چمک تھی، اُن کے چہروں پر نہ تھی
اُس طرف دردِ زیاں تھا، اِس طرف تمکینِ سُود — ہو رہی تھی آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ گفت و شنُود
اللہ اللہ اِس قدر عدل و تناسُب کی کمی! — اُس طرف بھی آدمی تھے، اِس طرف بھی آدمی
کوئی محرُوم، اور کوئی رحمتوں سے بہرہ مند — آدمی، اور آدمی میں اِس قدر پست و بلند

آہ اِس منزل سے بے ماتم گزر سکتا ہے کون؟
جُز خُدا اِس ظلم کو برداشت کر سکتا ہے کون؟

(جوش)

مردِ مُضحِک

وکٹر ہیوگو کے ناول "لافنگ مین" کا ایک باب

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

قومِ کاپرشیکو کا تعارف

(از جناب اسمٰعیل احمد صاحب سکندرآباد دکن)

(۱)

اِس وقت کون ہے جو لفظ "کاپرشیکو" کو جانتا ہو، یا اُس کے معنی بیان کر سکتا ہو؟

تاہم کاپرشیکو تاریخ یورپ کے ایک دَور میں روشناس برِ اعظم اور آشوبِ عالم رہ چکے ہیں۔

کاپرشیکو آوارہ گرد لوگوں کی ایک جماعت تھی جن کے چہرے بڑے مُہیب تھے اور جن کے خدوخال کا مرقع کھینچنا قلم کے اِمکان سے باہر ہے: اِس گروہِ یاجوج وماجوج نے سترہویں صدی مسیحی میں خروج کیا، اٹھارہویں صدی میں پردۂ گمنامی میں چلے گئے، اور انیسویں صدی میں مفقود الخبر ہو گئے۔ قومِ کاپرشیکو تاریخ یورپ کے ماضی وحال کے مابین ایک برزخی رشتۂ اتصال ہے، اور عہدِ قدیم کی ہیئت اجتماعیہ کی ایک خصوصیتِ خاصہ کی حامل: وہ ماضیٔ بعید کے بدنما چہرۂ انسانیت کا ایک داغ ہیں! تاریخ کی وقت پیما آنکھ کو جو ہر چیز کا ایک نظارۂ طائرہ کرنا چاہتی ہے، کاپرشیکو لوگ غلامی کی ہولناک ترین صورت کے شواہد کے زمرے میں نظر آتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کی اپنے بھائیوں کے ہاتھوں بیع کا واقعہ اُنہی کی تاریخِ کہنہ کا ایک بابِ پارینہ ہے! ہسپانیہ اور انگلستان کے قدیم مجموعہ ہائے تعزیرات کے صفحات میں اُن کے مُجرمانہ نقوشِ قدم دیکھے جا سکتے ہیں۔ صحرا میں کسی وحشی انسان کے نشانِ پا کی طرح قومِ کاپرشیکو کے خوفناک وجود کے آثار انگریز قوم کی گوناگوں اور رنگا رنگ کتابِ آئین میں جابجا نظر آتے ہیں۔ کاپرشیکو ہسپانوی لغت کا ایک مرکب لفظ ہے جس کے معنی ہیں "بچہ فروش لوگ": ——

چنانچہ کاپرشیکو لوگ بچوں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ وہ بچوں کی خرید وفروخت کرتے تھے۔ لیکن وہ بچوں کو چُراتے نہ تھے! بچوں کا سرقہ واغوا اِسی قسم کے کاروبار کا ایک دوسرا شعبہ تھا!

اچھا، تو وہ اِن بچوں کا کیا کیا کرتے تھے؟

وہ اُن سے عجیب الہیئت انسانوں کی "تخلیقِ جدید" کیا کرتے تھے!

کیوں؟

صرف ہنسنے ہنسانے کے لئے!

لوگوں کو آخر ہنسی دل لگی کی ضرورت ہوتی ہی ہے۔ بادشاہوں کے لئے یہ تفریح وتفنن لازمی ہے! جس طرح ایک تماشاگر سرکس کی دلچسپی کا سامان ہُوا کرتا ہے اِسی طرح ایک مسخرہ شاہی دربار کی خوش طبعی وشگفتگی کی جان ہوتا ہے! بعض اوقات عام لوگ اپنی ضیافتِ طبع کے لئے جو کوششیں اور کاوشیں کیا کرتے ہیں وہ ایک حکیم کے لئے بھی دعوتِ نظر ہُوا کرتی ہیں۔ ان چند تعارفی صفحات میں ہم کس چیز کا خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں؟ —— ایک ایسی چیز کا جس کے ذکر سے تاریخ کے اوراق تاریک ہیں، اور خوش باش وتفریح بازدولتمندوں کے مردم آزارانہ اشغال نامے رنگین!

(۲)

"بچہ بحیثیت بازیچہ"! ایسی چیز کا تاریخ میں وجود ہے! —— ایسی چیز آج بھی معرضِ وجود میں ہے! معشرِ انسانی کے ابتدائی دَور میں، جبکہ بنی آدم عالمِ وحشت وبدویت میں زندگی بسر کرتے تھے، یہ چیز اک مستقل صنفِ تجارت تھی! بستیوں

صدی تاریخِ بشری کے اسی دورکا نشانِ راہ ہے! یہ ایسا زمانہ تھا جو بازنطینی عہد کے سارے خصوصیات اپنے اندر رکھتا تھا۔ وہ سادگی و بدکاری، لطافت ووحشت کے اجتماعِ ضدین کا مظہر تھا! تہذیب انسانی کے حسن و خلقت کا یہ ایک طرفہ معجون مرکب تھا! اُس کی تشبیہ اک ایسے درندے سے دی جاسکتی ہے جو اپنے خون آلودہ ہاتھ پر ایک موجِ تبسم بھی رکھتا ہو! اُس عہد کے مصنفین اِس قسم کے مناظر کا مرقع کھینچتے ہیں "الغرض اس سترھویں صدی کے لوگ بچوں کی جنس کے بڑے بڑے تاک التجار تھے ۔ شاہی درباروں کے بعض خوشامدی تو جنہیں نے اِن خونی حوادث کا اخفا کیا ہے لیکن دوسرے ضمنی اذکار میں نادانستہ انہیں از طشت از بام کر گئے ہیں!

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

ایک انسانی کھلونے (انسانی بچے) کو پورا ساختہ پرداختہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کی تربیت ابتدائے عمر ہی سے شروع کردی جائے۔ اگر ایک بچے کو بونا بنانا ہے تو اُس کے قد و قامت کے نشوونما پر بچپن ہی سے گرفت قایم کرنی چاہئے۔ ہم بچوں کے مجسمۂ معصومیت بنکنے کو اپنے بیہودہ لہو ولعب کا کیسا آماجگاہ بناتے ہیں! ایک صحیح و سالم جسم کا بچہ ہمارے لئے کوئی دلچسپ آلۂ تفریح نہیں ہوتا۔

ہمارا ذوقِ تماشا اک کوزہ پُشت معصوم کو چاہتا ہے ؂

طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم!

بس اِس طرح ایک "فن" ظہور میں آگیا تھا۔ ایسے "ماہرینِ فن" پیدا ہوگئے تھے جو ایک صحیح الاعضاء انسان کو لیتے تھے اور اُس کی ہیئت بدنی بالکل مسخ کردیا کرتے تھے: وہ ایک چہرے کو لیتے اور اُس پر "ٹیکا" لگا دیتے! جسم کے مختلف حصوں کی نمو کو حسبِ ضرورت روک کر خشک کردیتے! وہ انسانوں کے خط و خال کی نوک پلک بالکل اک ہیولیٰ میں تبدیل کردیتے۔ اور پھر اِس خمیر سے نئی شکلیں ڈھالتے!! یہ نسخ و تشکیل، خرق و التیام کا فن اپنے مقررہ اصول و قواعد، شرائط و ضوابط رکھتا تھا! سارے مدارجِ ارتقا سے گزر کر اُسے ایک "مستقل سائنس" بنا دیا گیا تھا! "تغیر خلق اللہ" کے اس ملعونانہ "عمل الشیطان" کے "گندہ مگر ایجاد بندہ" کاروبار کی تفصیلات کو کس کس طرح بیان کیا جائے! صناعِ ازل نے حسین و مہ جبین چہرے بنائے تھے، مگر انھوں نے اُن کی آنکھوں میں اک کجی سی پیدا کردی تھی! مصورِ حقیقی نے تمام خط و خال میں خوش قطعی و ہم آہنگی کا التزام کیا تھا، مگر انھوں نے حُسن و جمال کے اِن سارے لوازم کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا تھا اور بالکل ان کے برعکس جدید پیکر پیدا کر دیے تھے: خالقِ بیچون و چگون نے اک ایسا مکمل مجسمۂ حُسن بنایا تھا جس میں کہیں اُنگلی رکھنے کی جگہ نہ تھی، مگر اِن گدھوں نے بزعمِ خود، ترمیم اُس کی صورت گری کی تھی!——

لطف یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ کے اِن مُبصرین کے فتووں کی بنا پر قابلِ ترجیح نمونہ یہ آخر الذکر چیز ہی ہوتی تھی: ؂

حجام ہر دو دست ترا قطع لازم است

اصلاح می دہی خطِ پروردگار را!!

(۳)

چہروں کے مسخ و تخریب کی صنعت کا وسیع پیمانے پر دور دورہ تھا۔ فنون کے بہت سے شعبے پیدا ہوگئے تھے۔

سلطانِ ترکی اور پاپائے روم ہر دو کو یکساں طور پر ان کی ضرورت ہوا کرتی تھی: مقدم الذکر کو اپنی حرم سرا کی حفاظت کے لئے۔ اور موخر الذکر کو کلیسا کے اندر بعض فرائضِ عبادات کی ادائی کے لئے! جس نوع کے مسخ انسانوں کی بھرتی اِن محلوں میں ہُوا کرتی تھی۔ وہ ایسے عجیب الخلقت و غریب الہیئت ہوتے تھے کہ اک نہایت چابکدست مصور کا مُو قلم بھی اُن کی شبیہ پیش کرنے سے عاجز ہے! بمشکل اُن پر نوعِ انسانی کے افراد کا اطلاق ہوسکتا تھا! سلطانِ عثمان کے محلات اور پاپائے اعظم کے معابد میں اِس خلقِ جدید کے الگ الگ نمونے استعمال ہوا کرتے تھے۔

کیتھرائن ثانی کی خود نوشت روزنامچہ کے اندراجات سے معلوم ہوا ہے کہ اُس زمانے میں جس کو بمشکل سو برس کا عرصہ گذرا ہوگا پایۂ تخت سینٹ پیٹرسبرگ میں جب کبھی زار یا زارینہ کا عتاب شاہی خاندان کے کسی رُکن پر نازل ہوتا تو اُسے قصر کے اندرونی بندیخانے میں چوزا لوکر کے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جہاں وہ اس ہیئت کذائی میں مسلسل کئی کئی شبانا روز رہتا! یہاں اُس کو بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرنا پڑتا۔ اک کڑک مرغی کی آواز سے کُٹ کُٹ کرنا ہوتا۔ اور اک مُرغی ہی کی طرح زمین سے اپنی غذا بذریعۂ منقارِ دہن اٹھانا پڑتا!!

ملوکیت کی یہ خلاقانہ جدت نوازیاں اب باقی نہیں۔ لیکن اُن کا استیصال بھی نہیں ہوا ہے جتنا لوگوں کا خیال ہوگا! آج بھی درباری لوگ اپنے آقائے ولی نعمت کی خوشنودیٔ مزاج کے لئے اُس آواز سے تھوڑا ہی مختلف لب و لہجہ اختیار کیا کرتے ہیں جو معتوبینِ زار کی "ماکیاں نوائی" میں ہوا کرتی تھی!! اور بہت سے ننگ انسانیت وابستگانِ دامنِ دولت اب بھی (اگر کیچڑ سے نہیں تو) خاکِ مذلت سے ضرور اپنے رزقِ مقسوم کے دانے چُنتے ہیں!!

خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ ذاتِ شاہانہ غلطی و غلط کاری سے مبرا و منزہ

ہوا کرتی ہے پس اُن کی مطلق العنانیوں اور خوش فعلیوں کا بُرا ماننے کی ضرورت نہیں : بدمزگی کا جو کچھ رہا ہے وہ اک غلط فہمی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ع

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

بادشاہ سلامت کا نطق بہایونی بھی تناقض بیانی سے بالاتر ہوا کرتا ہے اس لئے یہ تنبیہ حرفاً حرفاً صحیح ہے کہ ؎

اگر شہ روز را گوید شب است
بباید گفت اینک ماہ و پروین !

الغرض ع

ہمیں تو خو ہے وہ جو کچھ کہیں بجا کہئے !

یہ بلا تمیز ہمنوائی ہمیشہ ہم آہنگِ مصلحت ہوا کرتی ہے :

تاہم شہنشاہ لوئی چہارم اپنے قصرِ ورسائی میں کسی شہزادے یا امیر کو مرغا مرغی بنانا اپنے لئے زیبا نہ سمجھتا تھا ؛ جو چیز روس یا انگلستان میں شاہی آدابِ مجلس میں شمار ہوتی تھی اس کو فرانسیسی لوئی اعظم "مقدس سینٹ لوئی کے تاجِ تقدیس کے منافی خیال کرتا تھا ؛ ہمیں وہ ماجرا یاد ہے کہ جب مادام ہینریٹ اپنے درباری تعلق کے آداب و وقار کو ایسا بھول گئی کہ (اگرچہ خواب ہی میں سہی) اُس کو ایک مرغی نظر آئی تو شہنشاہ کیسا برافروختہ ہوا ہے ! حقیقتہً اک درباری خاتون کی بارگاہِ بلند ہے۔ یہ بات بہت ہی فروتر ہے کہ اُسے ایسی حقارت انگیزی اور پست فطری کے مناظر دکھائی دیں ؛ بارگاہِ سلطانی کی فضائے قدس میں رہ کر مرغی خانے کے غلیظ صحن کا خواب دیکھنا واقعی کتنی رکیک حرکت ہے۔

بایں ہمہ عامیانہ تاریخی روایات نے لوئی کو بُری طرح مطعون کیا ہے، لوئی کی طرح ماسویٹ بھی اسی تاریخی ناانصافی کا شکار بنا ہے۔

(۴)

الغرض سترھویں صدی میں تمام براعظم یورپ کے اندر کاپرشیکو لوگوں کی طرف سے بچوں کی تجارت کا بازار گرم تھا۔ وہ بچوں کو خریدتے تھے فطرت کی اس خام جنس پر اپنی قلمکاری کرتے تھے اور خدا کی صناعی کو اپنی کاریگری کے نمونے بنا بنا کر دوبارہ بیچ ڈالتے تھے مدت دراز تک قوم کاپرشیکو نے اپنی ہستی اور اپنے مخصوص مشاغل کو صیغۂ راز میں رکھنے کی چنداں پرواہ نہ کی۔ بعض اوقات نظامِ اجتماعی کے بعض آداب و رسوم ایسے ہوتے ہیں جو اس قسم کے ظالمانہ کاروبار پر ایک پردہ پوشانہ نقاب ڈال دیا کرتے ہیں جس کے زیر سایہ یہ مکروہ اعمال بے خلل و غش سرسبز ہوتے رہتے ہیں۔ خود ہمارے زمانہ میں بھی ایک ایسی نظیر موجود ہے۔ ہمارا روئے سخن ہسپانیہ کی اُس جماعت کی طرف ہے جس کا بانی اور سرغنہ مشہور بدمعاش ریحان سیلے تھا۔ اس تحریک کا دورِ حیات ۱۸۳۴ء سے ۱۸۷۶ء تک ہے۔ یہ ملک کے پورے تین صوبوں بلنشیہ۔ الیکانٹے۔ مرتسیہ پر مسلط ہو گئی تھی۔ اور مسلسل تیس سال تک اُس نے اس وسیع خطے کی آبادی کو لرزہ براندام رکھا۔

انگلستان میں بھی خاندان اسٹوارٹ کے تاجداروں کے عہد میں کاپرشیکو کے تعلقات دربار کے ساتھ کچھ غیر خوشگوار نہ تھے بعض اوقات تو خود حکومت کو اپنی خاص اغراض کے لئے ان لوگوں سے کام لینے کی ضرورت ہوا کرتی تھی، اور جیمس ثانی کے دورِ حکومت میں تو وہ دربار کا ایک مستقل آلۂ کار بن گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اُن خاندانوں کو جو حکومت کے ساتھ کسی قسم کی سرتابی کیا کرتے تھے، یا کسی اور طرح سرکاری کارروائیوں میں حائل یا حارج ہوا کرتے تھے۔ منتشر کر دیا جاتا تھا۔ بعض دفعہ ان کی نسل ہی منقطع کر دی جاتی تھی۔ کبھی اُن کے ورثاء اور پسماندگان کو محجوب الارث قرار دیدیا جاتا تھا۔ نیز وقتاً فوقتاً شجرِ خاندان کی ایک شاخ کو دوسری شاخ سے دست و گریباں کر کے خراب کر دیا جاتا تھا ! کاپرشیکو انسانی چہروں کو مسخ و مسخ کرنے کے فن میں جو دستگاہِ کامل رکھتے تھے اُس نے اِن لوگوں کو حکومت کے اک خاص مصرف کے لئے بہت کارآمد بنا دیا تھا۔ وارثوں کی صورتوں کو بدل دینا اُن کی صورتوں کو پیوند زمین کر دینے سے زیادہ اچھا سمجھا گیا ؛ اس میں شک نہیں کہ اس وقت وہ "آہنی نقاب" والا دستور بھی موجود تھا لیکن ظاہر کہ یہ بہت ہی متشددانہ طریق کار تھا۔ علاوہ ازیں پورے یورپ کو آہنی نقاب پوشوں کا ملک نہ بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن مسخ شدہ اعضاء کے لوگ بلا تکلف بازاروں میں قلابازیاں کھاتے ہوئے چلے جاتے تھے : اور مطلق کسی پر دہشت طاری نہ ہوتی تھی : قطع نظر اس سے آہنی نقاب کو ہٹایا بھی جا سکتا تھا، لیکن چہروں کے گوشت و پوست میں جو نیا نقشہ اُبھر کر دیا جاتا تھا اُس سے گلوخلاصی حاصل کرنا ممکن نہ تھا ! یہ مصنوعی خط و خال انسان کے خطِ تقدیر کی طرح ناقابلِ تغیر ہوتے تھے ؛ اس سے بڑھکر اک آدمی کے تشخص کو مشتبہ، اور وجود کو مبدّل کر دینے کی کون سی کم خرچ بالانشین تدبیر ہو سکتی تھی ؟ کاپرشیکو لوگ انسانی چہروں کو اپنی دستکاری کا ایک ہی تختۂ مشق بناتے تھے۔ جیسا کہ اہلِ چین اپنی صنعتکاری کے لئے درختوں کو منتخب کیا کرتے ہیں ؛ اس فن کے مخصوص قواعد و

عنو الابھی تھے. لیکن یہ سارے اسرار و رموز ان ہی لوگوں کے سینہ بسینہ رہ کر اپنے بانیانِ فن کے ساتھ مفقود ہو گئے! اُن کے ناشدنی ہاتھ کی ہنرمندی سے نقش ہکو اک زندہ و شگفتہ صورت اک خشک و چوبین چیز ہو کر رہ جاتی تھی: وہ قہقہہ آور بھی ہوتی تھی اور گریہ آور بھی: وہ اک ننھے معصوم بچے کی کچھ اس طرح قلبِ ماہیت کر دیا کرتے تھے. پھر اُس کے والدین کا بھی اپنے لختِ جگر کو پہچاننا دشوار ہوتا تھا! ایک فرانسیسی مصنف رِسکین نے اپنے مخصوص اسلوب بیان میں اس اصل و نقل کے "تفاوتِ راز" کو خوب واضح کیا ہے. بعض اوقات وہ اپنے معمول کی پُشت کی ہڈی، غیرہ سے کچھ تعرض نہ کرتے تھے. اور صرف چہرے کی "نشاۃ الثانیہ" پر اکتفا کیا کرتے تھے: وہ اپنے بنائے ہوئے چہروں پر اپنا "عمل" ظاہر کرنے کے لئے اس طرح اپنے مخصوص نشان بنا دیا کرتے تھے. جس طرح سے دستی رومال پر بیل بوٹے کاڑھنے کے بعد سوزن کار اپنے مرموز دستخط کر دیا کرتا ہے! جن بچوں کو قلاباز بنانے کے لئے تیار کرنا ہوتا تھا ان کے جوڑوں اور ہڈیوں کو کچھ ایسے اُستادانہ کمال سے درہم برہم کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ اُنھوں نے اِن بچوں کے جسم کے اندر اک "جدید نظامِ استخوانی" کو قائم کر دیا ہے: اسی طریق سے جمناسٹک کے گرہ باز بھی بنائے جاتے تھے!

جماعتِ کارپشیکو کے "صناعانِ جنسِ انسانی" اپنے زیرِ عمل بچے سے اُسکا چہرہ ہی نہیں لیلیا کرتے تھے. بلکہ اُسکو اُس کے حافظے سے بھی محروم کر دیا کرتے تھے! کم از کم وہ اُس کی دنیائے دماغ میں جتنا انقلاب ممکن ہو سکتا تھا کر دیا کرتے تھے! بچے کو اپنے اعضا و جوارح کی قطع و برید اور نسخ و مسخ کئے جانے کا کوئی شعور باقی نہ رہتا تھا! یہ ہولناک سرجری (عملِ جراحی) اپنے چابکدست نشتر کے صرف نقوشِ قدم ضرور چھوڑ جاتی تھی. لیکن بچوں کی لوحِ دماغ اِن عذاب ناکیوں کی یادداشت سے بالکل سادہ رہتی تھی! زیادہ سے زیادہ اک ایسے بچے کے ذخیرۂ حافظہ میں جو واقعہ باقی رہ جاتا تھا وہ صرف اتنا ہوتا تھا کہ ایک دن اُسکو کچھ مردانِ غیب نے پکڑ لیا تھا. اور پھر اُس پر اک نیند طاری ہو گئی تھی، اور تھوڑی دیر کے بعد اُس کا علاج مکمل ہو گیا تھا! لیکن علاج کس مرض کا؟ —— غریب بچہ اس مرض کی تشخیص کی فہم سے قاصر تھا! گندھک سے داغ جانے اور لوہے کی گرم گرم سلاخوں سے جُھلسے کھانے، اِن ساری سرگزشتوں میں سے کوئی بات بھی اُس کے ذہن میں نہ رہتی تھی! کارپشیکو جرّاح حواس کو معطل کر دینے والے ایک سفوف سے بچے کے اعصاب کو اک عارضی موت سے ہمکنار کر دیتے تھے. اِس سفوف کو وہ "خاکِ اعجاز" کی اصطلاح سے تعبیر کیا کرتے تھے! خاکم بدہن اِس خاکِ اعجاز کی اعجاز نما تاثیر کا اتنا قائل ضرور ہونا پڑیگا کہ اُس سے بچے پر یہ مرحلۂ صعب آسان ہو جاتا تھا.

(۵)

اوباشوں اور آوارہ گردوں کے بارے میں انگلستان کے قوانین ہمیشہ سے بہت سخت رہے ہیں. عہدِ گاتھک کے انگلستان میں جو دفترِ آئین و قوانین مدوّن ہوا ہے اُس میں اک سخت گیرانہ روح جاری و ساری نظر آتی ہے. چنانچہ اِس تشدد پسند آرڈر کی کتابِ آئین کے ایک قانون کا فتویٰ یہ ہے کہ "جن لوگوں کا کوئی گھر در نہیں وہ صحرائی جانوروں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں" اک مدتِ دراز تک انگلستان بھیڑیوں "(عہدِ گزشتہ و موجودہ کی ایک رسوائے عالم و جہاں گرد قوم) کا تدارک کرنے میں بیحد کد و کاوش کرتا رہا. ان لوگوں کا وہ اس طرح قلع قمع کر دینا چاہتا تھا جس طرح کہ اُس نے اپنی سرزمین کو بھیڑیوں سے پاک کر دیا تھا. آئرستان کے لوگ اس معاملے میں انگریز قوم سے کتنا مختلف مذاق رکھتے تھے! چنانچہ اُس زمانے میں اُن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اپنے وطن کے جنگلی جانوروں کی صحت کے لئے اپنے اولیاء اللہ سے دُعائیں مانگا کرتے تھے! اور بھیڑیئے کو تو وہ "اپنا مذہبی باپ" کہا کرتے تھے! حضرتِ گرگ پورے "بزرگ" بنے ہوئے تھے.

تاہم انگریزی قانون بھی باوجود اپنی ساری سختی و درشتی کے بھیڑیئے کے وجود کو چشم پوشی کی نظر سے دیکھتا تھا. چنانچہ اس جانور کو عام طور پر پالا جاتا تھا. اور اُس کو اس درجہ مانوس بنایا جاتا تھا کہ وہ بالکل ایک اہلی جانور میں تبدیل ہو جاتا تھا: بالفاظِ دیگر کہہ سکتے ہیں کہ اُس زمانے میں بھیڑیا بھی اک قسم کا پالتو کتا ہو گیا تھا. انگریزی قانون کے محتسب. نیم حکیم کی سربازار خطبہ خوانی و دوافروشی، پھیری کرنے والے حجام کی سیر و گردش، سڑکوں پر چلتے پھرتے سودا بیچنے والے بساطیوں کی داد و ستد، نیز آسمان کی سقفِ نیلی فام والے وسیع ہال میں نشرِ علم کرنے والے عالم کی معارف پاشی اِن میں کسی سے بھی کچھ تعرض نہ کرتے تھے! قانون اِس بات سے مطمئن تھا کہ اِن سب لوگوں کا کوئی نہ کوئی پیشہ یا حیلہ ہے اور حصولِ معاش کے لئے وہ کسی قانون شکنی پر مجبور ہونے والے لوگ نہیں ہیں! لیکن ایک آوارہ گرد کی "شُتر بےمہاری" سے بیحد خوف و دہشت کا اظہار کیا جاتا تھا! ایک بے معاش و بے مشغلہ کوچہ گرد قانون کی نظر میں مخدوش ترین حیوان تھا! جہاں کوئی مشتبہ

صورت و ہیئت کا آدمی نظر آیا اور اُس کی دار و گیر شروع ہوئی: جرائم پیشہ لوگوں کا مشکوک رنگ، ڈھنگ کسی جامع و مانع طریق سے بیان نہیں کیا جاسکتا لیکن پھر بھی وہ اک ایسی حقیقت ہے جس سے ہر شخص آشنا ہے، اور اپنی فراست سے بآسانی اُسے محسوس کرسکتا ہے: چنانچہ پولس کی گرفت کے لئے یہ وجدانی شعور کافی ہوتا تھا، تم کہاں رہتے ہو، تمہارا ذریعۂ معاش کیا ہے؟ —————
اور اسی نوع کے گوناگوں سوالات تھے جو اک مجہول الحال اجنبی سے کئے جاتے تھے اور اگر وہ تشفی بخش جواب دینے سے ——— یا خود ارباب پولس تشفی قبول کرنے سے ——— قاصر رہتے تو قانون کی شدید ترین سزاؤں کا مستوجب قرار پاتا؛ چنانچہ آوارہ گرد لوگوں کو داغ دیا جاتا تھا! اور آہن و آتش کا یہ استعمال ضابطۂ تعزیرات میں بہت عام تھا:

الغرض انگریزی قانون نے ایسے لوگوں کے خلاف اک جہاد عام جاری کر دیا تھا، اور ارباب حل و عقد کی نظر میں یہ گروہ بدترین باغیوں کے زمرے میں داخل تھا! اسی سلوک کا آماجگاہ جپسی لوگوں کو بنایا گیا جن کا اخراج اتنا ہی مہتم بالشان اور ثواب عظیم سمجھا گیا تھا جتنا کہ ہسپانیہ کے عربوں اور یہودیوں، اور فرانس کے نوزائیدہ مسیحی فرقہ پروٹیسٹنٹ (احتجاجیہ) کی جلا وطنی کو: لیکن حق یہ ہے کہ ایک آئینی جنگ کو پرستارانِ قانون کی ان تعزیروں اور مجذوبانِ مذہب کی ایسی تعذیبوں سے مخلوط کرنا ظلم ہے!

کاپرشیکو اور جپسیوں کے مابین وجہ مشابہت اور قدر مشترک کے طور پر کوئی چیز نہ تھی۔ جپسی اک قوم تھے۔ درآنحالیکہ جماعتِ کاپرشیکو بیشمار اقوام و جماعات کے عناصر کا اک معجون مرکب تھی۔ جن میں ہر قسم کے کثیف و غلیظ اجزا کا اختلاط تھا۔ کاپرشیکو کے پاس بخلاف جپسیوں کے اپنی کوئی مخصوص زبان بھی نہ تھی۔ وہ متعدد زبانوں کا اک ملغوبہ سا بولتے تھے جس میں انواع و اقسام کے تلفظ و مخرج اور گوناگوں لب و لہجہ داخل تھے: اپنے دیس بدیس کی آوارگی کے مابہ الامتیاز مشغلے کی بنا پر اُن پر ایک قوم کا غلط اطلاق ہونے لگا تھا۔ لیکن قومیت کے مقررہ شرائط سے وہ عاری تھے۔ اُن کی وحدتِ قومی کا سنگِ بنیاد ان کی ہم شغلی و ہم مشربی، اور اُن کا باہمی ربط و ضبط تھا! ورنہ کوئی ایک نسلی خون اُن کا سرچشمہ نہ تھا۔ تاریخ عالم کے تمام ادوار میں انسانیت کے بحر ذخار کے اندر جابجا ایسے متبائن دھارے بیچ بیچ سے چلتے ہوئے نظر آتے ہیں جو اپنے گرد و پیش کے آب مصفا میں غلاظت و کثافت کی آمیزش کرتے جاتے ہیں۔ قوم کاپرشیکو

کی تاریخی تعبیر انہی الفاظ میں کی جاسکتی ہے۔ الغرض جپسی لوگ علانیہ اک قوم تھے، اور قومیت کے لوازم عمومی سے آراستہ۔ مگر یہ کمبخت کاپرشیکو تو اک قسم کے فری میسن (معماران آزاد) تھے؛ لیکن فری میسن بھی ایسے جن کے پاس کوئی اعلیٰ و ارفع مقصد نہ تھا بلکہ اک غائت درجہ شنیع و ملعون دو کی حرفت و تجارت مزید برآں ان دونوں قوموں میں مذہبی اختلاف بھی تھا۔ جپسی لوگ قریباً بیدین و کافر تھے۔ مگر کاپرشیکو ماشاء اللہ مسیحی تھے۔ اور بہت مقدس قسم کے مسیحی جیسا کہ ایک ایسی جماعت کے شایان شان بھی تھا جس میں گو دوسری نیرنگیاں اور بوقلمونیاں تھیں۔ لیکن جس کی پیدائش کا اولین گہوارہ یا دش بخیر وہ خدا پرست و خداترس ملک تھا جسے اسپین کہتے ہیں۔

چشم بد دور کاپرشیکو مسیحی ہی نہ تھے بلکہ مسیحیوں سے بھی کچھ زیادہ، یعنی کیتھالک، اور نہ صرف کیتھالک، بلکہ رومن۔کیتھالک۔ جن کا دین ایسا اچھوتی سُوتی تھا اور جن کے وجود ایسے پاکیزہ، منزہ واقع ہوئے تھے کہ وہ اہل ہنگری کے ساتھ ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونے سے سخت پرہیز و گریز کرتے تھے: آسٹریا کے ان بے دین لوگوں کا مقتدا ایک بڈھا شخص تھا جس کے ہاتھ میں پادریوں کے عصا کے بجائے اک لکڑی سا کرتی تھی جس کی موٹھ ایک گیند کی شکل کی ہوتی تھی، اور جس پر ملک کا مخصوص نشان قومی یعنی "دوہرا عقاب" بنا ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہنگری کی یہ عیسائی جماعت روافض و خوارج کا سا ایک مذہبی گروہ تھا جن کے جہل و ضلالت کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے "رفع الی السماء" کی تقریب کی یادگار کو بجائے اصل دن کے ۲۹ اگست کی تاریخ کو منایا کرتے تھے!

انگلستان میں جب تک کہ تاجدارانِ اسٹوارٹ کا دور رہا کامپرشیکو کے جتھوں پر اک خاص حد تک نگرانی قائم رہی۔ جیمس ثانی اگرچہ ایک مذہبی آدمی تھا ——— چنانچہ اُس نے یہودیوں کو سخت عذاب دیا تھا اور جپسیوں کو بھی بیدردی سے ملک بدر کر دیا تھا! ——— مگر وہ کامپرشیکو کے حق میں بڑا فیاض شہریار ثابت ہوا۔ کامپرشیکو پر اس نوازش کی وجہ خاص یہ تھی کہ یہ لوگ جس جنس انسانی کے گاہک تھے شاہ جیمس اُس کی تجارت کیا کرتا تھا! وہ چہروں کے مسخ کرنے کے کام میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور اس صنعت کی بعض اوقات حکومت کو اپنی مخصوص اغراض کے لئے ضرورت ہوا کرتی تھی۔ ملک کی کسی جاگیر کا ایسا نابالغ وارث جو دربار کے لئے تکلیف دہ ثابت ہونے والا ہو، اُس کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے اُس کو کامپرشیکو کے حوالے کر دیا جاتا تھا، جو اُس سے

اس کی کمل وشمکل چھین لیا کرتے تھے؛ اس طرح خفیہ جانچ پڑتال اور خطابات کا کام سرانجام ہو جاتا تھا؛ اور شاہ کے منظورِ نظر ان لاوارث رفعات و اکرامات کے موجب بنا جاتے تھے؛ کانپرشیکو بہت ہی دور اندیش اور رازدار لوگ تھے۔ وہ اپنے عہد کا پورا پاس رکھتے تھے۔ ہر راز اُن کے سینوں کے دفینوں میں اک رازِ سربستہ ہو جاتا۔ سلطنت کی سازشوں اور کارستانیوں میں یہ چیز از بس ضرور تاریخ میں شاید ہی کوئی نظیر افشائے راز کی ہو؛ خود اُن کی مصلحتیں بھی اس سے وابستہ تھیں؛ اگر وہ کبھی بد اعتمادی کا ثبوت دیتے تو اُن کی جان کی خیر نہ تھی؛ پس اس طرح سیاسی مصالح کی خاطر وہ ایک خاص با معروف گروہ بن گئے تھے

۔۔۔ میں انگلستان کا تخت و تاج ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہوا۔ خاندانِ اسٹوارٹ کا وارث شاہزادہ آرنج ہوا، اور ولیم ثالث نے انگریزی تخت پر جیمس ثانی کو بے دخل کیا۔

معزول شاہ جیمس ملک بدر کیا گیا اور اسی عالمِ جلاوطنی میں اس نے سفرِ آخرت لیا۔ اُس کا مقبرہ خوارقِ عادات و معجزات کی جلوہ گاہ بن گیا؛ چنانچہ اُس کی تربتِ پاک کی خاکِ شفا نے اِن آئین کو اک سخت مرض سے نجات بخشی: یہ امر شاہِ موصوف کی خاص الخاص مسیحانہ صفات کا اک شایانِ شان مظہر تھا۔

شاہ ولیم نہ جیمس کے سے خیالات و جذبات کا آدمی تھا۔ نہ اس کے یہ ۔۔۔ طرح مذکورہ دفعات کے ۔۔۔ سے یہ سلوک کیا گیا کہ اُن کو پہلے تو گرفتار کیا گیا، اور پھر ۔۔۔ کیفرِ کردار تک پہنچا دیا گیا۔ اک سرخ گرم آہنی سلاخ سے اس نیک محضر جماعت کے ہر فرد و فرید کے شانے پر "ب" کا حرف داغ دیا گیا جس کے معنی تھے کہ "بدمعاش"؛ زیریں بازو پر "س" کا نشان نقش کر دیا گیا جس سے مقصود تھا کہ "سارق"؛ داہنے ہاتھ کو حرف "ق" سے منقوش کیا گیا جس سے مراد تھی "قاتل"!

اُن کے سرغنہ چونکہ دولتمند لوگ تھے ۔۔۔۔ اگرچہ انہوں نے بھی ۔۔۔ نیم مذہبی بنا رکھی تھی؛ ۔۔۔۔ اس لئے اُن کو یہ سزا دی گئی کہ اُن کا سارا مال و زر ضبط کر لیا گیا، پھر اک شکنجے میں اُن کے جسموں کو کس کر اُن کو اپنے جانگسل کرتوتوں کا مزہ چکھایا گیا، اور بعد ازاں اُن کی عین پیشانیوں پر اُن کی حقیقت کو واشگاف کرنے والے طغرا ہائے امتیاز "آہن و آتش" سے ثبت کئے گئے؛ جن لوگوں نے اُن کی رازداری یا پناہ دہی کی اُن کے اخفائے جرم و مجرم کی پاداش میں اُن کی جائدادیں چھین لی گئیں اور انہیں ساری عمر کے لئے جیل خانوں میں ڈال دیا گیا۔

افسوس کہ قبیلۂ مجنوں کسے نماند

اتفاق ۔ جب نپولین ثالث بحیثیت فاتح بورڈو میں داخل ہوا تو اس کے واسطے ایک استقبالی پھاٹک بنایا گیا تھا جس پر پھولوں کی ایک محراب کے اوپر ایک تاج بنایا گیا تھا جس کے نیچے یہ الفاظ بڑے بڑے حروف سے لکھے ہوئے تھے "تم اس کے مستحق ہو"۔ اتفاق سے آندھی بہت زور سے آئی جس سے وہ محراب اور تاج سب ٹوٹ پھوٹ گئے صرف ایک گول رسی کا حلقہ باقی رہ گیا جو لٹک رہا تھا اور اس کے نیچے وہی جملہ تھا "تم اس کے مستحق ہو"۔
جب نپولین کی سواری پھاٹک کے نیچے پہونچی تو جمہوریت پسند جماعت نے بادشاہ کو اس کے نیچے نکلتے ہوئے دیکھ کر بہت زور سے تالیاں بجائیں اور خوشی کے نعرے مارے۔

مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری دونوں بزرگ اورنٹیل کالج لاہور میں برسرِ خدمت تھے۔ مگر دونوں میں کچھ شکر رنجی تھی۔ جب مولانا فیض الحسن مولانا آزاد کے کمرے کی طرف سے گذرتے تو اُدھر منہ کرکے کھنکار کر تھوک دیتے۔ جب دو ایک مرتبہ یہ حرکت ہوئی اور آزاد سمجھ گئے کہ یہ اتفاقی نہیں بلکہ ارادی ہے تو ایک مرتبہ جب مولوی فیض الحسن اُدھر سے گزرنے لگے آزاد اپنے کمرے کے دروازے پر آکر منہ بنا کر کہنے لگے ارے میں تو تھوکتا بھی نہیں۔

جلوس

گشت میں ہے کانگریوں کا گروہِ مختصر — لب پہ افسردہ ترانہ سوگ میں ڈوبی نظر
آگے آگے پرچمِ سہ رنگ لہراتا ہوا — لیڈروں کے قول کے مانند بل کھاتا ہوا
پچکے پچکے دست و پا رُخ پر فلاکت کا غبار — ملگجی آنکھوں سے فاقوں کے شدائد آشکار
جسم تھرّائے ہوئے آواز بھرّائی ہوئی — دل کی اُلجھن مضمحل چہروں تلک آئی ہوئی
اُن سے یہ کہدو یہی جن سربلندوں کے مکاں — اُن کو فریادوں کے سننے کی بھلا فرصت کہاں
سائے میں سنگین دیواروں کے فریادیں عبث — وہم کے خاکوں پہ مستقبل کی بُنیادیں عبث
بے محل بے وقت یہ بے رُوح تقریریں فضول — جن کے پُشتیاں ہوا پر ہوں وہ تعمیریں فضول
بجھ نہیں سکتا ہے آنکھوں سے شقاوت کا چراغ — پھُونک کر محفل کو ہنستا ہے امارت کا چراغ
موسوی لطف و عطا ممکن نہیں شدّاد میں — لوچ ہرگز آ نہیں سکتا دلِ فولاد میں
دھات کے تودوں میں تقریریں سما سکتی نہیں — عجز کی آنچیں چٹانوں کو گلا سکتی نہیں
یہ مکاں آہ و فغاں کو جذب کر سکتے نہیں — نالے شیشے کے دریچوں سے گزر سکتے نہیں
فطرتِ زردار میں لطف و عطا شامل کہاں — پیچ و خم کھائی ہوئی گلیوں میں اہلِ دل کہاں
اُن کو کیا معلوم بیواؤں کے دل کی واردات — سانس لیتی ہیں جو رکھ کر سینۂ غمگیں پہ ہات
اِن کو کیا تقدیر کے ہاروں کی باتوں کی خبر — اُن کو کیا افلاس کے ماروں کی راتوں کی خبر
اِن لئیموں کو بھلا کیا فاقہ مستوں سے غرض؟ — زر کے اندھے ظالموں کو تنگدستوں سے غرض؟

اہلِ نخوت کو کسانوں کی زبوں حالی سے کام؟
آسماں جاہوں کو مزدوروں کی پامالی سے کام؟

ہو جہاں تعداد بکوں کی ضرورت سے زیاد
اس جگہ ہوتی ہے بارِ گوشِ غم کی روئیداد

چھوڑ دو اِن تن کے اُجلے من کے گندوں سے اُمید
قطع کر دو قطع اِن عشرت پسندوں سے اُمید

اُن کو چونکاؤ جو سر سے پاؤں تک فریاد ہیں
چھپّروں میں حاشیے پر گاؤں کے آباد ہیں

تم حقیقت میں ہو صرف اُن کو جگانے کے لئے
ٹمٹماتے ہیں جہاں راتوں کو مٹی کے دیئے

جن کے دل میں اہلِ سرمایہ کے چرکوں سے ورم
جن کی بالیں پر جنوں بردار رہتی ہے نسیم

چند میلے چیتھڑے ہیں جن کا سامانِ حیات
موت دیتی ہے لقب جن کو پریشانِ حیات

جھونپڑی پر رات بھر روتا ہے جن کی ماہتاب
کھینچتا ہے چھپّن کے بستر پر لکیریں آفتاب

گھُٹ رہا ہے جن کے سینوں میں فلاکت کا دھواں
آپ بیتی کے لئے کھُلتی نہیں جن کی زباں!

جانتے ہیں جن کو منعم زندگی کا بارِ دوش
عورتیں تک جن کی سو رہتی ہیں فاقے سے خموش

جن کی پلکوں پر نمی رہتی ہے لب خاموش ہیں
جن کے سر پر قرض کی چھت پاؤں بے پاپوش ہیں

زمزمے جن کے تڑپتے ہیں الم کے ساز پر
رحمتیں جھکتی ہیں جن کے شعلۂ آواز پر

جو بیاں جا کر کہیں حالِ زبوں کرتے نہیں
بھوک سے معصوم بچے جن کے چوں کرتے نہیں

بنتے ہیں جن کی کمائی سے امیروں کے محل
جن کا حصّہ ہے خدائی میں فقط بیل اور ہل

جسم ہو جاتے ہیں جن کے محنتوں سے چور چور
جن کے ہل سے ٹوٹ جاتا ہے زمینوں کا غرور

یہ اگر چاہیں تو چمکے قسمتِ ہندوستاں
ورنہ آزادی خیالِ خام، آزادی کہاں؟

گردنیں خم اُن کے احسانوں سے ہیں اصنام کی
دل ملا اُن کو فرشتوں کا نظر ضرغام کی:

اُن کے سینوں میں زمیں کی کروٹوں کے راز ہیں
التجا پر اُن کی عرشی گوش بر آواز ہیں

تل رہا ہے چرخ ظلمِ ناروا کے واسطے
اِن اسد زادوں کو چونکاؤ خدا کے واسطے

(احسان بن دانش)



اخبارِ اُردو

(از مُلّا رموزی)

اُردو والوں کے لئے یوں تو ہمیشہ سے اُردو کی حمایت، حفاظت اور اشاعت کا فرض نہایت اہم فرض رہا ہے لیکن جدید دستورِ حکمرانی کے نفاذ و اجرا سے یہ فرض اور بھی اہم ہو جاتا ہے جبکہ سیاسی اور کارکن جماعتوں نے کوشش شروع کر دی ہے کہ سارے ہندوستان کی سرکاری زبان کس زبان کو قرار دیا جائے، ہندی یا اردو؟

لیکن مجھے یہ کہنے میں نہ تکلف نہ کسی کا خوف کہ اس مسئلہ میں سب سے زائد سُست کاہل اور بے خبر جماعت اُردو والوں کی ہے جن کے ہاں آج تک اردو کے لئے کوئی ایک ایسی جماعت موجود نہیں، جسے تمام ہندوستان کی "مرکزی مجلس" کہا جائے، شبہ نہیں کہ بے شمار انجمنیں ہیں جو اُردو کے نام سے قایم ہیں مگر جہاں تک زبان کی حفاظت اور اشاعت کا فرض ہے ایک بھی ایسی نہیں ہے جسے صحیح معنی میں ناشر و محافظ جماعت کہا جا سکے اور یہ اصل خرابی ہے۔ مسلمانوں میں "تقسیم" کے فقدان کی، جبکہ آج تک ایک شخص بھی نہیں جو سارے ہندوستان میں صرف اُردو کے حق میں ہوائی جہاز بنا چکر لگاتا رہے اور جب تک کہ کوئی گشتی مبلغ "اُردو کے لئے" پیدا نہ ہوگا یہ مختلف مقامی انجمنیں اُردو کے لئے کچھ نہیں کر سکتی ہیں۔

یاد ش بخیر وہ اپنے حضرت خواجہ حسن نظامی پچھلے سال اُردو کے حق میں قدرے پُر جوش ہو گئے تھے تو ایک شور بھی ہوا تھا اور ایک ہنگامہ بھی، لیکن اب جو ممدوح "میلاد دی جنتری" وغیرہ قسم کے کاموں میں پھر مصروف ہو گئے تو وہ تحریک پھر تحتِ حکومت مخدوش ہو چکی۔

البتہ اس عرصہ میں اردو کے لئے قابلِ اعتنا تحریکات میں سے دو تحریکیں ہیں ایک وہ جو امرتسر پنجاب میں تمام ہندوستان کی نمائندہ مجلس اردو کے نام سے اجلاس کرنے والی ہے۔ دوسری تحریک شہرِ لکھنؤ کی ہے جہاں ایک عظیم الشان مجلس مستقلہ منعقد ہونے والی ہے جس کا نصف اردو اور نصف انگریزی نام "اردو اکاڈیمی" ہے۔ یہ دونوں تحریکیں اپنے اپنے شہر اور کارکنوں کے لحاظ سے یقیناً لائق وقعت ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ مجلسیں کب منعقد ہوں گی اور کیا کر کے دکھائیں گی اس کا جواب متعلق ہے حکیم عامل کریم الدین صاحب نجومی لاہوری سے:

مسلمانوں نے اردو والوں کے اس "آدھورے پن" کا راز ظاہر یہی ہے کہ اُن میں عملی استقلال کے ساتھ ہی زرِ نقد بھی نہیں۔ لہٰذا سوال ہو سکتا ہے کہ اگر مُلّا رموزی ہی اُردو کی تبلیغ و تشہیر اور تشویق کے لئے گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے وعظ کہتا پھرے تو آخر وہ اپنے وقت کا نہ سر آغا خاں ہے نہ کہیں کا راجہ یا نواب جو معارف کے معاملہ سے مستغنی ہو اس لئے اگر اردو کا معاملہ ہنوز روزِ اول بنا ہوا ہے تو اب ایک ہی چیز ہے اور وہ مسلمانوں کے تمام تعلیمی ادارے ہیں جو اپنی اپنی تحویل سے اُردو کی حفاظت اور اُس کی ترقی کے لئے خاصی رقم دے سکتے ہیں اور یہ اس لئے کہ خود اُن کو جو رقم قوم کی جانب سے دی جا رہی ہے وہ علم اور تعلیم ہی کے نام سے دی جا رہی ہے اور ظاہر ہے کہ زبان کا مسئلہ بھی علمی و تعلیمی ہے اس لئے ہونا چاہئیے کہ اگر اس عرصہ میں اُردو کے لئے کوئی مرکزی تحریک ہو تو اُس کی امداد کے لئے انجمن حمایت اسلام لاہور، مسلم یونیورسٹی، انجمن اسلامیہ جبل پور سے نقد امداد لی جائے جبکہ یہ تینوں مجلسیں بحمد اللہ خاصے سرمایہ کی مالک ہیں۔ اب سوال ہے ایسے آدمی کا جو صرف زبانِ اُردو کا "قائدِ اعظم" بن کر ہندوستان کے چپّہ چپّہ پر "اُردو" کے جلوس نکلواتا پھرے، اُردو کی انجمنیں بناتا پھرے اور اردو کی ترقی کے وسائل بہم پہنچاتا رہے اور جب تک یہ نہ ہوگا اُس وقت تک اپنے اپنے شہر میں ایک ایک "بزم اردو"

اور بزمِ ادب وہ بناکر بیٹھے ہیں مشاعرے منعقد فرماتے رہنا کام نہ آئیگا۔

۱۹۱۸ء کے بعد سے یعنی یورپ کی بڑی لڑائی کے ختم ہونے کے بعد سے ایشیائی اقوام میں اپنی قومیت کی اصلاح و ترقی کا جو احساس بیدار ہوا ہے اُس میں ایک جوش اپنی اپنی مادری اور ملکی زبانوں کی تخلیص کا بھی ہے یعنی ۱۹۲۳ء میں سب سے پہلے شہر سمرنا میں فیلڈ مارشل کاظم قرہ بکر پاشا فاتح آرمینیہ کی صدارت میں نوجوان ترکوں کی جو عظیم الشان مجلس منعقد ہوئی تھی اُس نے طے کیا تھا کہ ترکی زبان کو تمام غیر ترکی زبانوں سے پاک وصاف کیا جائے اور اُسی کے بعد سے انگورہ میں علامہ احمد اوغلو بے کی صدارت میں سرکاری طور پر یہ کام شروع ہوگیا۔ اس تحریک نے نہ فقط ایشیا میں ایک حس پیدا کی بلکہ آج یورپ کی سب سے بلند اور متمدن اقوام یعنی جرمنی اور اٹلی بھی ترکوں کی اس تحریک پر عامل ہو رہی ہیں چنانچہ ہوا کہ ترکی کے بعد عراق اور ایران نے اعلان کیا کہ حدود ایران میں فارسی اور عراق میں عربی ہی عربی میں ہر کام کیا جائے۔ دوکانوں کے تختوں پر بجز فارسی کے دوسری زبان کی عبارت نہ ہو اور اطلاعی تار دئے جائیں تو اُنکی زبان انگریزی کے عوض عربی ہو۔

اب آخری اطلاع یہ ہے کہ حکومت اٹلی نے حکم دیا ہے کہ اٹلی میں جانوروں کے نام بھی خالص اطالوی زبان میں رکھے جائیں۔

ظاہر ہے کہ تخلیص زبان کی اس ترکی تحریک میں جو حکیمانہ راز ہے اُسی کی طاقت تھی کہ جرمن اور اطالوی ایسی متعصب و مغرور اقوام نے اس کی تقلید کی اور وہ راز یہ ہے کہ جو قوم صرف اپنی ہی چیزوں سے مانوس رہتی ہے وہ کبھی کسی غیر ملکی چیز کو برداشت نہیں کرسکتی مثلاً غیر ملکی غنیم کا حملہ وغیرہ۔

بارے یہ محل نہیں کہ میں زبان کو خالص ملکی الفاظ سے سنوارنے کے فوائد سے طویل بحث کرسکوں۔ البتہ اگر غیر ملکی زبانوں سے کسی ملکی زبان کا پاک کرنا غیر ضروری ہے تو بتایئے کہ دنیا کی اتنی بلند اقوام نے ایسا کیوں کیا؟

اب رہا ہندوستان جنت نشان تو جس طرح یہاں کی اقوام کی سیاسی روح ہنوز مفلوج و مضمحل ہے اُسی طرح یہاں کی زبانوں کی زندگی بھی بیمار۔ البتہ کچھ دن سے اردو والوں کی ایک پُرجوش جماعت اس امر پر متوجہ ہوئی ہے کہ اُردو کو سارے ہندوستان کی زبان بنانے کے لئے اس میں سنسکرت اور عربی فارسی کے بے ضرورت الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔ بلکہ ہو سکے تو ہندوستان ہی سے نئے الفاظ گھڑ لئے جائیں مگر استعمال نہ ہوں تو سنسکرت اور عربی کے الفاظ جیسا کہ ادارۂ اردو الہ آباد نے اپنے سہ ماہی رسالے کو "ہندوستانی" لکھنا شروع کردیا تھا جو اسی جذبے کا ہندوستانی نمونہ تھا۔

شک نہیں کہ اُردو کی مقبولیت اُس کی ترقی اور اس کے عام فہم ہوکر سارے ہندوستان میں پھیل جانے کی یہ ایک لائق تعریف کوشش ہے اور اہلِ قلم حضرات کو اس پر شدت سے عمل کرنا چاہیئے۔ لیکن زبانِ اردو کے خالص وطنی ذخیرۂ ادب و الفاظ کے حق میں یا اردو کی ادبی رگوں میں جو زہر بھرا جارہا ہے وہ اردو میں انگریزی الفاظ کی بھرتی ہے۔

لیکن حیدرآباد کے علاوہ ہندوستان میں کوئی علاقہ نہیں جہاں کے اردو والے اس عظیم الشان وبا کے دور کرنے پر مستعد ہوئے ہوں جس نے اردو کے جسم اور اُس کی روح کو اندر ہی اندر کھوکھلا کردیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر آج اخباروں کی اردو کو سب سے زیادہ علمی اور ادبی زبان تسلیم کیا جائے تو اس میں ۹۹ فیصدی انگریزی کے الفاظ بتائیں گے کہ یہ اُردو نہیں بلکہ نومسلم سی انگریزی ہے جس کا نام خواہ مخواہ اُردو رکھ لیا ہے۔

اب فرمایئے کہ اُدھر تو دنیا کی متمدن قومیں اپنی ملکی اور مادری زبان کو غیر ملکی زبانوں کے الفاظ سے اس حد تک صاف کر رہی ہیں کہ خبر کا تار بھی اپنی ملکی زبان میں دیتی ہیں اور ادھر ہندوستان کے اُردو والے ہیں جن کے باہمی خطوط بھی انگریزی میں ہوتے ہیں خطوط کی پیشانی کی عبارت شہر اور محلہ یہاں تک کہ دستخط بھی انگریزی میں ہوتے ہیں۔ حد ہوگئی کہ جو مجلسیں اور جماعتیں اُردو کی خالص علمی و ادبی مجلسیں کہی جاتی ہیں اُن کے ہاں بھی ۹۹ فیصدی انگریزی الفاظ استعمال ہو رہے ہیں۔ البتہ اس معاملہ میں برادرانِ ہنود بیدار ہوگئے ہیں اور آج ہندو بھائیوں کا ہر کام ہندی یا اُن کی قومی زبان میں ہوتا ہے اور اس حد تک خالص ہندی میں کہ باید و شاید، چنانچہ سارے مسلمانانِ ہند نے جب اپنی سب سے اونچی نمایندہ مجلس بنائی تو اُس کا نام رکھا "مسلم لیگ" اور ہندو بھائیوں نے جب اسی قسم کی انجمن بنائی تو اس کا نام رکھا "ہندو مہاسبھا"۔

اُردو میں انگریزی الفاظ کا استعمال اصل میں اُس تعلیمی نصاب کا نتیجہ ہے جو حکیمانہ محبوبیت کے ساتھ ذہن و دماغ کو قومیت یا قومی خصائص سے بیگانہ و بے خبر بناتا ہے یہی راز ہے کہ آج سب سے پہلے غلط کار درس گاہوں کے اُستاد نظر آتے ہیں اور بعد میں اُن کے شاگرد، چنانچہ یہ ایسی درسگاہوں کے اساتذہ ہی ہیں جن کے پاس نہ اُن کا قومی لباس ہے نہ اُن کی قومی اور وطنی شکل و صورت اور نہ اُن کے پاس اُن کی قومی زبان لہذا جب استاد ہی ہر تحریر میں انگریزی میں دستخط کرتا ہے تو شاگرد کو عمر بھر ہوش ہی نہیں آتا کہ وہ اردو کی تحریروں میں انگریزی میں کس قاعدہ سے دستخط کرتا ہے۔ اللہ ری بے ہوشی!!!

پس اگر اردو "غیر اردو الفاظ" سے تباہ ہو رہی ہے اور اس کا ذخیرہ افہام و تفہیم تک اس کا ذاتی نہیں جو ایک شرمناک داغ ہے۔ قوم کی لسانی زندگی پر تو مان لیجے کہ اس گھناؤنے گناہ کے مرتکب سب سے پہلے موجودہ درس گاہوں کے ہندوستانی اساتذہ ہیں جو اپنی زندگی کے ہر حصہ میں غیر ہندوستانی زبانوں کو رواج دے رہے ہیں۔

ان کے بعد اردو کو تباہ کرنے میں حصہ لے رہے ہیں ہندوستان کے امراء و رؤسا جن کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہی یورپ اور یورپ کی زبانیں ہیں۔ ان کے ہاں زبان اردو کو افریقہ کے وحشیوں کی زبان سمجھا گیا ہے اور آج وہ اپنی مادری زبان اردو میں گفتگو تک پر قادر نہیں گویا ان کی قومی غیرت اور ذمہ داری اس حد تک مسخ و مفلوج ہو چکی ہے کہ ان کے ہاں اخبارات و رسالے کتابیں اور جملہ خط و کتابت انگریزی کی ملیگی اور اردو بولتے ملیں گے ان کے غلام اور چاکر، اللہ ری بے حسی!!!

امراء و رؤسائے ہند کے بعد اُردو کے خالص وطنی ذخیرۂ ادب کو تباہ کرنے میں جو جماعت بے انتہا اندھے پن سے کام لے رہی ہے وہ جماعت ہے اردو کے اخبار نویسوں کی جسے اُردو کا سب سے بڑا محافظ ہونا چاہیئے تھا مگر بدقسمتی سے یہ اخبار نویس جماعت بھی اُسی درسگاہ کی ماری ہوئی ہے جس کا اُوپر تذکرہ ہوا، اس لئے اس کے بس کی بات بھی نہیں کہ وہ اپنے اخباروں میں بجز اردو کے انگریزی کے الفاظ کو استعمال نہ کرے کیونکہ اُردو کے موجودہ اخبار نویسوں اور انشا پردازوں میں بہت کم ہوں گے جنہیں عربی اور فارسی میں کافی دستگاہ حاصل ہوگی ورنہ ان کا مبلغ انشا رہی جب اے بی سی ڈی ہے تو پھر یہ غریب انگریزی الفاظ کو جا اور بے جا استعمال نہ کریں تو کیا مولوی ابو الکلام آزاد کریں گے؟ یہی وجہ ہے کہ آپ چاہیں اُردو کے جس اخبار کو ملاحظہ فرمائیں بغیر انگریزی دانی کے محال ہوگا جو اخبار کا ایک صفحہ بھی آپ صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ سکیں حالانکہ اخبار کہنے کو اردو کا ہوگا، بس حد ہوگئی کہ اردو کے ایک اخبار نہیں دس اخباروں کے نام تک انگریزی میں رکھے گئے ہیں جیسے "مسلم گزٹ" کلکتہ۔ "جنرل نیوز دہلی" "کانفرنس گزٹ علی گڈھ" "نیوشپل گزٹ لاہور"۔

اب ان بھائیوں سے اتنا ہی سوال ہے کہ اردو کے اخباروں کے آخر یہ انگریزی نام کس طرح مفید اور ضروری ہو سکتے ہیں؟ بہر حال آج اگر اُردو کا ٹکسالی ذخیرہ یا خالص زبان برباد ہو رہی ہے تو اُس میں اردو کے اخباروں کو کافی سے زیادہ دخل ہے جن کا نا اہل عملہ آنکھ بند کئے اردو میں انگریزی الفاظ کو رواج دے رہا ہے۔

اِن کے بعد اردو میں انگریزی الفاظ کو رواج دینے والے ہندوستانی تاجر ہیں۔ اگرچہ یہ طبقہ "علمیات" سے دُور رہنے کے باعث قدرے معذور بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اتنا معصوم بھی نہیں۔ چنانچہ آج ہندوستانی تاجروں کے اشتہارات پڑھ لیا کیجے ہر اشتہار میں مشتہر کا پتہ انگریزی میں ہوگا مثلاً۔ "کلاتھ مرچنٹ" "پرفیومری ایجنٹ" "جنرل مرچنٹ" "فارمیسی" اور "بکڈپو" وغیرہ حالانکہ یہ اور ایسے کتنے الفاظ ہیں جن کے معروف عام الفاظ قدیم سے اردو میں چلے آ رہے ہیں اور جن کو ہندوستان کے کسان تک پڑھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ مگر غلامی کے عہد کے فطری مرغوبات کہئے کہ ہر حال میں انگریزی الفاظ ہی سے رُوحِ غلامی شاد و محسوس ہوتی ہے اور تو اور نائی صاحبان بھی جب اپنی دکان پر تختہ لٹکاتے ہیں تو بجائے عام فہم لفظ "نائی کی دوکان" کے "ہیر کٹنگ سیلون" ارقام فرماتے ہیں اور مشکل تو یہ ہے کہ ایسے تمام الفاظ اور جملے کے جملے اردو کی املا میں ہوتے ہیں جنہیں غیر انگریزی داں لوگ صحت کے ساتھ پڑھ بھی نہیں سکتے!

اس قسم کے الفاظ سے حضرات علماء کرام کا طبقہ بھی بہت نا صاف مرعوب ہوا ہے جیسا کہ بعض گزرے ہوئے مولویوں کی تصنیفات میں ۲۵ فیصدی انگریزی کے الفاظ ملتے ہیں اسی طرح آج کل مجلس علماء ہند دہلی کے ترجمان اخبار "الجمعیتہ دہلی" میں ایک کتب خانے کا پتہ یہ ہے "الجمعیتہ بکڈپو، گلی قاسم جان دہلی"

اس عبارت میں عربی کا یہ زور کہ جمعیتہ پر ایک الف کا اضافہ ہے ہیچ میں "بکڈ پو" اور آخر میں خالص اُردو کی گلی قاسم جان موجود ہے۔

ان کے بعد وہ مسلمان ہیں جنھوں نے اپنے حروف سے ناموں کو انگریزی حروف سے خفیف کیا ہے جیسے عبدالغفور خان کے "اے جی ۔خان" حاجی محمد سلیمان کے عوض "ایچ ۔ایم سلیمان"، اگر ان ناموں کو اسی طرح زبان سے ادا کیجیے تو محسوس ہوگا کہ کسی جرمنی سے بھگائے ہوئے یہودی کا نام ہے، ہمارے اُردو کے ذخیرہ وطنی میں اس قسم کے ناموں کا رواج بھی مادری زبان کی بربادی ہے۔

اسی طرح اردو میں انگریزی الفاظ کو رواج دینے والے مالکان مطابع بھی ہیں جن کے ہاں انگریزی الفاظ کو اردو میں خاصا رواج دیا جارہا ہے یہاں تک کہ اچھے خاصے مشہور اور عام فہم لفظ مطبع کے عوض "اے ۔ پریس" کہا جاتا ہے اور وہ بھی "مسلم پرنٹنگ پریس" یا "الیکٹرک پریس" پھر مہتمم و منصرم ایسے مشہور الفاظ کے عوض منیجر یا ناشر و طابع کے عوض "پرنٹر" اور "پبلشر" یا پروپرائٹر ایسے ثقیل الفاظ مالکان مطابع ہی اُردو میں ٹھونس رہے ہیں۔

بہرحال ایسے ۵۰ فیصدی انگریزی الفاظ اردو میں داخل ہو رہے ہیں، جن کے خالص اُردو کے بدل موجود ہیں۔ لیکن انگریزی زدہ طبقہ اس اعتراض کا جواب یہ دیتا ہے کہ زبان کی وسعت چاہتی ہے کہ اُس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو رائج کیا جائے۔ مگر یہ جواب اصل میں انگریزی زدہ طبقہ کی نااہلیت ہے جبکہ وہ خالص اردو یا اردو کے قدیم ماخذ سے اپنے دماغ میں کوئی ذخیرہ نہیں رکھتا ورنہ اُسے معلوم ہوتا کہ جو الفاظ اردو میں قدیم ہیں اور مشہور عام و خاص آخر اُن کی جگہ انگریزی کے الفاظ کی کیا ضرورت ہے، مگر آخر کار غلامانہ ذہنیت بھی کوئی بلا ہے یا نہیں؟ اسی لئے خود حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ بڑے شوق سے "لٹریچر" اور "کانفرنس" وغیرہ لکھتے ہیں!!!

گویا فاتح قوم نے مفتوح قوم کے منہ تک کا مزا بدل دیا ہے۔

زیادہ صد ادب۔

جبر

جبر کو اختیار کون کرے؟ — تم سے ظالم کو پیار کون کرے؟
زندگی ہے ہزار غم کا نام — اس سمندر کو پار کون کرے؟
آپ کا وعدہ آپ کا دیدار — حشر تک انتظار کون کرے؟
اپنا دل جب ہو جان کا دشمن — غیر کا اعتبار کون کرے؟
ہم جِلائے گئے ہیں مرنے کو — اس کرم کی سہار کون کرے؟

آدمی بلبلہ ہے پانی کا
زیست کا اعتبار کون کرے

آغا شاعر قزلباش دہلوی



مسائل حیات



(گذشتہ سے پیوستہ)

(جوش ملیح آبادی)

تاریخ

(۱) کون صدیوں اور قرنوں سے یہی رہا ہے کہ وہ مورخوں کی ہر زہ اندیشیوں کی تصدیق کرنے ہمارے سامنے آئے۔

(۲) ہمارا علم دراصل اُن واقعات کے مقابلہ میں جو اب تک نامعلوم ہیں حقیقت ہی کیا رکھتا ہے کہ ہم ایک صحیح تاریخ کی تمدوین کرسکیں۔

(۳) ہم تاریخ کے متعلق صرف اتنا جانتے ہیں جتنا ہم سے بیان کیا گیا ہے، اور اس کے سوا ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ اب اگر تاریخ نے تمام مشتبہ اندازوں خیال آرائیوں اور نیم درست مسائل کو خارج کردو تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے ؟ فقدان تاریخ :

(۴) تاریخ ایک ایسی کھونٹی ہے جس پر ہماری طبعی تاریخ کا لبادہ لٹکایا جا سکتا ہے۔ تاریخ اس استعجاب و تفحص کو برانگیختہ کرتی ہے جو مُردوں کے لئے بے فائدہ ہے۔ اور زندوں کے حق میں اذیت رساں۔

(۵) اگر یہ دنیا کتاب ہے، انسان اُس کی فہرست مضامین۔ تاریخ کا مقصد تو ایک صحیح انسان کو تفصیل کے ساتھ دکھا دینا ہے اور بس۔

(۶) تاریخ کیا ہے ؟ کیا ہم تاریخ پر اعتماد کرسکتے ہیں ؟ کیا یہ فاتحین کا پروپیگنڈا نہیں ہے ؟

(۷) صحیح تاریخ ایک قفل زدہ تہ خانہ ہے جو قیامت تک نہ کھل سکیگا۔

(۸) تاریخ اُس وقت مکمل نمائندگی کرسکتی ہے جب وہ واقعات کے پس پردہ واقعات ہمارے سامنے لے آئے۔ کیا ہم کبھی اُن پس پردہ واقعات کے جاننے کی امید کرسکتے ہیں ؟

(۹) عصر حاضر کی تاریخ واقعات عالم کو ان قابو یافتہ لوگوں کی خرد برد کے اغراض و مقاصد سے ہم آہنگ کرنے کی خاطر دیدہ و دانستہ توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی محض ایک سازش ہے جو اس وقت اس چھوٹی سی دنیا کے والی بنے ہوئے ہیں۔ صرف اتنا کرو کہ واقعات کی تاویلوں کے دونوں پہلوؤں کا عمیق نظر سے مقابلہ و موازنہ کرو اور تم پر ثابت ہو جائے گا کہ ہماری تاریخ قابل اعتبار نہیں ہے۔

(۱۰) صرف یہی ایک بات کہ جب تاریخ اپنے کو دوہراتی ہے تو ہمیں اُس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ تاریخ کے کھوکھلا ہونے کا روشن ثبوت ہے۔

کیا ہم نے ابھی تک اپنے سبق نہیں پڑھے ہیں ؟

تمدّن

(۱) تمدّن انسان اور فطرت کی قوتوں سے فائدہ اٹھانے کا نام ہے۔

(۲) شکار کرنا ہر شکاری پرندے کی سرشت میں داخل ہے، انسان نے صرف اتنا کیا ہے کہ اپنی اس سرشت کو ترقی دیکر ایک باقاعدہ سائنس بنا دیا ہے۔

(۳) نکمے دماغ شرارت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ فرصت یافتہ دماغ تہذیب سے کھیلتے ہیں۔ اور مصروف دماغ صرف اپنے پر غور کیا کرتے ہیں۔

(۴) اگر گدھے پر بوجھ نہ لادا جائے تو اس کے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔ یہ کہاوت صرف بھٹکے ہوئے گدھوں پر صادق آتی ہے تو پھر بھٹکی ہوئی انسانیت کے لئے کیا کہا جائے گا ؟

یہ ایک عام تجربہ ہے کہ اگر آدمیوں کے واسطے مسلسل آرام مہیا نہ کئے جائیں تو وہ تھک اور گھبرا جاتے ہیں۔ کیا ہماری تہذیب آرام کو دعوت دیکر مصائب سے بچانے کا ایک مستقل سلسلۂ عمل نہیں ہے ؟

(۵) تہذیب کے مقدس نقشی پردے کے پیچھے سوسائٹی، قانون اور مذہب

اپنے پڑگاہ و دائرۂ عمل میں کیا کیا شیطنتیں کرتے رہتے ہیں اور اس وقت بھی جب سوسائٹی، قانون اور مذہب کے اعمال مکروہ بالکل ہمارے سامنے ہوتے ہیں کیا ہم انھیں انسانوں کو دور بربریت سے نجات دلانے والا نہیں کہتے اور ان کا احترام نہیں کرتے ہیں؟

(۶) انسان کی بنائی ہوئی سوسائٹی میں انسانیت کا سب سے بڑا مربی و سرپرست قانون اور مذہب ہے۔ جس کا حق یہ کام ہے کہ انسان کے فطری شعور کو خیر و شر کے مشتعل اور شرارت آمیز پروپگنڈے کے ذریعہ سے کلیتہً فنا کر دے اور دنیا کا تمدن اب صرف اس صورت میں باقی ہے کہ وہ ارذل ترین ریاکاری کا بازار بنی ہوئی ہے۔ ایسا ہی ہے؟ یا ایسا نہیں ہے؟

(۷) تہذیب انسان کی زندگی کی تو حفاظت ضرور کرتی ہے، مگر اس کی روح کو کچل دیتی ہے۔ تہذیب سے میرا مقصد قائم شدہ مذاہب، قوانین اخلاق سوسائٹیاں اور سیاست ہے، اور روح سے میرا مقصد وہ انسان ہے جو خود اپنے سے سچا ہو۔

(۸) مسیح کو سُولی پر چڑھا دیا گیا تھا، سقراط کو زہر پلا دیا گیا تھا، اور منصور کو خاک میں ملا دیا گیا تھا۔ اور یہ سب اس خطا پر کہ وہ اپنے ذاتی عقائد میں استوار تھے۔ اور آج بھی ہماری اس تہذیب یافتہ دنیا میں لاکھوں آدمی اس لئے سولی پر چڑھا دئے جاتے ہیں کہ وہ صرف اپنے ہی اعتقادات پر ایمان رکھتے ہیں، اور خدا کے لئے بتاؤ کیا اپنے ذاتی معتقدات پر ایمان رکھنا کوئی جرم ہے، گناہ ہے؟ کیا ہمیں تقلید پر مجبور کیا جا رہا ہے، کیا دنیا ہم سے زندہ رہنے کے لئے ریاکاری کا مطالبہ کرتی ہے۔

اور کیا اب بھی ہم میں اتنا شعور نہیں پیدا ہوا ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی دراصل غلامی کی ترقی ہے۔

(۹) اگر غلاموں کو زندہ کہا جا سکتا ہے تو پھر مُردے کیا ہیں؟ کیا یہ دنیا سماجی، سیاسی اور مذہبی غلاموں کا قید خانہ نہیں ہے؟ اور پھر بھی مُردے زندہ ہیں، سانس لیتے ہیں اور غلامی ہماری ترقی تہذیب کے ہاتھوں اور بھی مضبوط ہوتی چلی جا رہی ہے؟ آزادی! آزادی! آزادی! تو کس گرتے میں چھپی ہوئی ہے؟

(۱۰) کامل دو ہزار برس سے ہم پر مختلف قسم کے اصلاحی آداب، ملکی قوانین مقدس جماعت، اور آسمانی مذاہب کے لشکر ٹوٹ رہے ہیں، اور ان سب نے ہمیں صرف اتنی مدد دی ہے کہ ہم اپنے گناہوں کو بڑھاتے چلے جا رہے ہیں اور ان بڑھتے ہوئے گناہوں کے چہروں پر اخلاق، دینداری اور خدمتِ خلق کی نقابیں ڈالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ کیا ہمیں ان سب کا شکرگزار نہ ہونا چاہیئے۔

(۱۱) عصری تہذیب اب ہمیں اس نقطے پر لے آئی ہے جہاں یہ [illegible] کہ ہم آپس میں ایک دوسرے سے لرزہ براندام ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو آپ خود اپنے سے ڈر لگنے لگتا ہے۔

کیا اب اس سے بھی زیادہ کوئی مصیبت آنے کو باقی ہے؟

(۱۲) فطرت اپنے قوانین کو بزور ہم سے منوا دینا چاہتی ہے اور ہم اپنے قوانین کو فطرت سے بزور منوا دینا چاہتے ہیں۔ اور یہی ہے وہ مسلسل جنگ جو تہذیب نے چھیڑ رکھی ہے۔ کون مصیبت جھیل رہا ہے اور کون فتح یاب ہے؟

(۱۳) ہم اکثر یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ تمدن محض کاہلی کے بتدریج ترقی کا دوسرا نام ہے۔ ہمارے تازہ ترین اخبار و انکشافات چبائے ہوئے لقموں کا کامیابی کے ساتھ تجارت کرنے سے زیادہ نہیں۔ اور ہمارے ہوٹلوں میں ان کھانوں کا بیوپار ہوتا ہے جو معدوں میں پہونچ کر ہضم ہو چکے ہیں۔ کیا اس آسمان کے نیچے کوئی نئی چیز نہیں مل سکتی ہے؟

(۱۴) روز بروز غیر فطری عادات و خیالات کے لقمے ہمارے منہ میں ٹھونسے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارا معدہ جواب دینے لگا ہے اور اب اپنی روحوں کو بچا لینے کا ایک راستہ ہمارے سامنے کھلا ہوا ہے کہ ہم ان تمام نوالوں کو اُگل دیں۔ اور فطرت کی طرف واپس جائیں۔ لیکن صحت و شفایابی کے حدود سے ہم کتنے ناامیدانہ طور سے باہر ہو چکے ہیں۔

(۱۵) یہ مسلّم ہے کہ غیر مصروف دماغ شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔ اور بعض افراد کے دماغوں میں بالعموم شیطان سب سے زیادہ مصروف کار پایا جاتا ہے۔

(۱۶) ہمارے تمام ادارے دراصل کمند ہیں جو ہماری ذہانتوں نے انسانی شعور کو پھانس لینے کے لئے پھینکی ہیں۔ اور اب جبکہ ان کے حلقے سخت ہو چکے ہیں، پھر بھی صرف ناخن ذہانت ہی کا کام ہے کہ اس کے کھولنے کی راہ پیدا کرے۔ یہ ہے انسانی ذہانت

(۱۷) فطرت کی تمام چیزوں میں سے جو شے غیر فطری ہے وہ حضرت انسان کی تہذیب گزیدہ فطرت ہے۔ اور بس۔

(۱۹) تہذیب اپنی مخصوص مسرتیں اور غم اپنے ساتھ لائی ہے یہ محض انتخاب کا معاملہ تھا لیکن ہمارے اجداد نے فطری مسرتوں اور فطری غموں کے مقابلہ میں مہذب مسرتوں اور مہذب غموں کا انتخاب پسند فرمایا۔

(۲۰) عصری سائنس اور اس کے تمام جدید ترین ارتقائی منازل اور ان کے ذرائع و وسائل۔ قانون اور مذہب کے مطالعہ میں کس قدر انتہائی مشاغل نہ ہوتے ہیں جو صرف اُن پرانی کرم خوردہ کتابوں کی اوراق گردانی پر منحصر تھا۔ جن کے مصنفوں نے گرجتے ہوئے بادلوں کے طوفان کے علاوہ برقی روشنی کبھی نہ دیکھی تھی اور جنہیں بانس کے سہارے کے علاوہ کسی پل کے عبور کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔

(۲۱) عصری تہذیب کی چمک دمک پر فریفتہ ہونے سے بچنے کے لئے نہایت دور اندیشی اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات تہذیب کی خوبصورت پریاں اٹھلاتی اور رقص کرتی ہوئی اس قدر قریب آجاتی ہیں کہ شدید ترغیب و تحریص یہ فریب دینے لگتی ہے کہ ان کے ساتھ تھوڑے سے اختلاط و التفات سے بھلا کیا نقصان پہونچ سکتا ہے، اور افسوس کہ جو نقصان پہونچ جاتا ہے وہ اُس وقت معلوم ہوتا ہے جب نقصان پہونچے ہوئے بہت دیر گزر جاتی ہے۔ اس لئے خبردار! پھونک پھونک کر قدم اٹھاؤ نہایت ہی استواری اور دلیری کے ساتھ ہر پہلو پر نگاہ رکھو۔ اور تہذیب کو اپنے سے تحفظ آمیز فاصلے پر رہنے دو۔

اگر تم فریب میں آجانے کی صلاحیت رکھتے ہو اور زندگی کے مختلف متنوع پہلوؤں پر تمہاری نگاہ نہیں ہے تو تہذیب کے پیچ و خم تمہیں اپنی شکنوں کے اندر پیس ڈالیں گے اور پھر تمہارے سلامت بچ نکلنے کی بہت کم امید باقی رہے گی۔

(۲۲) کیا اسے دلیل کہا جاسکتا ہے کہ اگر پردے کی رسم اٹھادی گئی تو پردہ نشین خواتین بداخلاق ہوجائیں گی؟ کیا ایسی بیشمار عورتیں اس وقت موجود نہیں ہیں جو پردے کے باہر اور پردے کے اندر بھی بداخلاق ہیں؟

ہمیں اس کا خوف کیوں کرنا چاہئے کہ اگر ہم نے رسوم اُٹھادئے تو خلقت بے لگام اور دیوانی ہوجائے گی؟

خدارا بتاؤ کہ ان تمام رسوم و ضوابط کی موجودگی میں بھی جنہیں انسان نے ہر ممکنہ سعی سے وضع کیا ہے کیا انسانیت ہزاروں بے پناہ جرائم اور بد اخلاقیوں میں مبتلا نہیں ہے؟

تو پھر ان نمائشی رسم و ضوابط کو محض عادت کی بنا پر کیوں قایم رکھا جائے؟

(۲۳) غور کرو!! ہم سب مل کر انسان کی نجات کی راہ نکالنے پر غور کرنا شروع کریں تو ہماری یہی تہذیب کی فتح ہوگی یا موت؟

محبت

(۱) شعر، عشق و محبت کا نام لیتے ہیں اور فطرت اسے ہوائے نفس سے منسوب کرتی ہے اور ہرچند اس مباحثے میں صدیاں گزر چکی ہیں کیا ابتک ہم فیصلہ کرسکے ہیں کہ دونوں میں سچا کون ہے؟

(۲) عشق و محبت کو ہوائے نفس کہنا نظری طور سے ناخوشگوار ہوسکتا ہے۔ لیکن کیا یہ عملی طور پر صحیح نہیں ہے کہ بے شائبہ محبت بھی ہوائے نفس کا وجود ہوسکتا ہے، درآنحالیکہ کوئی محبت ایسی نہیں ہوسکتی جو بے شائبہ ہوائے نفس وجود پذیر ہو۔

(۳) اگر ہم محبت کے باب میں ضرورت سے زیادہ روحانی تصورات سے باز آجائیں تو محبت ہی دراصل اس دنیا کا حقیقی فلسفہ کہا جاسکتا ہے۔

محبت روزمرہ کی زندگی کی حقیقی عملی قوت کا نام ہے کیونکہ یہ وہ قوت ہے جو مہمات سر کرتی ہے اور وہ طاقت ہے جو بالآخر کامران ہوکر رہتی ہے۔

(۴) محبت ایک بہت بڑی بدبختی ہے، اور محبت کا مزہ نہ چکھنا اس سے بھی زیادہ بدبختی ہے اور سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ بے صرفہ محبت کی جائے۔

(۵) محبت، آلام کو دعوت دیتی ہے۔ بعض اسے قربانی کہتے ہیں بعض اسے نشاط سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور بعض اسے کمزوری سمجھتے ہیں۔ کیا محبت ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے؟ کیا محبت یہ سب کچھ ہے؟

(۶) حیات کی برومندی کو محبت کے رنگین نقوش سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ جب تم محبت شروع کردیتے ہو، کیا اُسی وقت سے تم زندگی شروع نہیں کرتے؟

(۷) اگر تمہاری محبت سچی ہے تو سُود و زیاں کا شمار چھوڑ دو۔ غرض مندانہ محبت تو نفرت سے بھی بدتر ہے۔

(۸) یہ نہ دریافت کرو کہ محبت کیا شے ہے؟ کیونکہ اس کا جنون مسرت،

گونگے کا خواب نشا ہے۔ الفاظ سے باہر۔ بیان کی دسترس سے دُور۔

محبت کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اِس کا مزا چکھا ہے۔

(۹) سچّی محبت کی سب سے بڑی کسوٹی یہ ہے کہ اس کے آلام بھی دنیا کی عظیم ترین مسرتوں سے زیادہ شیریں معلوم ہوتے ہیں۔

اس سے محبت کرو جس کے متعلق تمہیں یقین کامل ہو کہ اُس سے تم نفرت کر ہی نہیں سکتے ہو۔

(۱۰) بادہ خوران میکدۂ محبت کی نگاہ میں یہ کائنات اور اُس کا تمام طمطراق کس قدر حقیر ہے! اور دنیا کی نظر میں؟

(۱۱) محبت خود اندھے پن سے بھی زیادہ اندھی ہے۔

(۱۲) حقیقی مکان وہ نہیں ہے جہاں انسان سکونت رکھتا ہے۔ وہ دراصل ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں سے ہمارے قدم تو باہر نکل سکتے ہیں۔ مگر دل نہیں نکل سکتا۔ کیا تمہارا ایسا کوئی مکان ہے؟

(۱۳) انسان کی پوشیدہ ترین آرزوئیں صرف خالص محبت ہی سے آسودہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن کتنے بار ہم جادۂ صحیح سے دھکا دیکر دُور پھینک دیئے جاتے ہیں۔

(۱۴) بہت سے دل تشنہ ہیں۔ بہت سے ضرورت سے زیادہ سیراب، کیوں ہم ایک دوسرے کو آپس میں حصے تقسیم کرکے مدد نہ دیں۔

حیات

(۱) تمہیں ہمیشہ دو قسم کی کشمکشوں کا سامنا رہتا ہے۔ ایک تو زندگی میں داخل ہونے کی اور دوسری اس سے باہر نکلنے کی۔ کیا تم موخرالذکر کے واسطے تیار رہو؟

(۲) ہم گھبرا گھبرا کر جی رہے ہیں گویا ہم اپنے وجود کو خزینۂ فطرت سے چُرا لائے ہیں۔

آخر یہ بوکھلاہٹ اور بے اعتباری کس بات کی ہے؟

(۳) زندہ رہنا نہایت ہی خوب ہے بشرطیکہ جس طرح تم زندہ رہنا چاہتے ہو دوسرے لوگ اُسی طرح اجازت بھی دیدیں لیکن کیا وہ ایسا کریں گے؟

(۴) سب سے بڑی مہم زندگی سے مقابلہ کرنا ہے اور جو اس مقابلے سے بھی چُراتا ہے، مستحق ہے کہ وہ مایوسی کا منہ دیکھے۔

کیا تم زندگی کا مقابلہ کر رہے ہو؟

(۵) عصر حاضر کی سوسائٹی۔ قانون اور مذہب کے تم از روئے فتاویٰ تمدن غلام ہو۔ اور حقیقی دشواری یہ ہے کہ تم اس سے واقف ہی نہیں ہو کیا آخر کار تم نے اسے معلوم کر لیا ہے؟

(۶) کیا ہم زندگی کے مزے اُڑا رہے ہیں۔ یا ایک دوسرے سے مسرتوں کی نوچ کھسوٹ میں مصروف ہیں؟

(۷) ہم حقیقت میں مبالغہ کرتے ہیں اور صرف یہی مبالغہ ہے جس کے ذریعے سے ہم میں زندہ رہنے کی ترغیب و تحریص پیدا ہوتی ہے۔ کتنا دردناک کھیل ہے۔

(۸) زندگی شروع کرنے سے پیشتر اپنی نجات کے تخیل کو زمانہ خوردہ مذہبی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی قوانین سے آزاد کر لو

عملی زندگی میں اس سے بڑی اور کیا نجات ہو سکتی ہے کہ اس فاسد دائرے سے روح کو آزادی مل جائے۔

(۹) میں جو کرنا چاہتا ہوں نہیں کر سکتا کیونکہ سفید سر کی سوسائٹی کہتی ہے کہ یہ سوسائٹی کے "اداب" کے خلاف ہے۔ مغرور تما توان کہتی ہے کہ یہ قانون کے خلاف ہے، اور مقدس مذہب ریش دراز پر ہاتھ پھیر کر کہتا ہے کہ یہ مذہب کے خلاف ہے اور پھر یہ تینوں سوسائٹی، قانون اور مذہب، باہمی طور پر فیصلہ کرکے مجھے بتاتے ہیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں، اور میرا دل کہتا ہے کہ یہی وہ چیز ہے جسے میں کرنا نہیں چاہتا تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

(۱۰) اگر تم اُس اسلوب پر زندگی نہیں گزار سکتے جس اسلوب پر زندگی گزارنے کا سوسائٹی تم سے مطالبہ کرتی ہے، تو سوسائٹی تمہیں اُس اسلوب پر زندگی گزارنے نہ دے گی جس اسلوب پر تم زندگی گزارنا چاہتے ہو۔ اور صرف ایک چارۂ کار جو تمہارے واسطے باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ تم زبُوں حالی میں عمر گزارو اور جب دونوں طریقوں سے تمہاری زبُوں حالی یقینی ہے تو پھر اُس اسلوب پر زندگی کیوں نہ گزارو جو تمہیں خود پسند ہے۔

(۱۱) زندگی کے ہر موضوع پر اس قدر شدید اختلاف آراء کا انبار ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی کا حصر اسی پر کر دے کہ وہ سب سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی کام شروع کرے گا تو شاید نزع کے وقت تک وہ مباحث ہی سنتا رہے گا۔

تو پھر اپنی ہوس مشورہ طلبی میں کافی اعتدال پیدا کرکے تدبّر و تفکر کے ساتھ اپنے





امید اور دعا



حالی کی مصلحانہ شاعری

(خواجہ غلام السیدین صاحب)

ہمارے ملک میں کچھ عرصے سے یہ خیال پھیلتا جاتا ہے کہ فنونِ لطیفہ کا مقصد محض ذوقِ حسن کی تسکین ہے اور انھیں کسی دوسرے مقصد کا تابع کرنے سے اُن کی لطافت جاتی رہتی ہے۔ چونکہ شاعری ایک فنِ لطیف ہے اس لئے اخلاق کی اصلاح سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان لوگوں کے خیال کے مطابق شاعر اور مصلح کا میدان بالکل الگ الگ ہے۔ ایک کا مقصد ذوقِ جمال کی تشفی ہے دوسرے کا کام اخلاق کی درستی۔ وہ مذاقِ لطیف کو اپنا مخاطب بناتا ہے۔ یہ خدا کا خوف اور دنیا کی شرم دلاتا ہے۔ شاعر کی چوٹ دل پر پڑتی ہے مصلح دماغ کو سلجھانے اور سنوارنے کی فکر کرتا ہے۔ شاعر کے لئے دل آئینۂ حسن ہے اور مصلح کے لئے حسن آئینۂ حق۔ لہٰذا آرٹ کا پرستار ایک نیم مستہزی انداز میں یہ سوال کرتا ہے کہ ان دو مختلف ہستیوں کو، جن کی ترکیب متضاد عناصر سے ہوئی ہے ایک ساتھ وابستہ کرنے سے کیا حاصل؟ اخلاقی مضامین کو نظم میں بیان کر دینے سے شاعری پیدا نہیں ہوتی!

حالی کی مصلحانہ حیثیت پر بحث کرنے سے قبل اس اعتراض کا مختصر سا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آج حالی کا شاعرانہ کمال اس درجہ مسلّم ہو چکا ہے کہ اُس کو ثابت کرنے کے لئے کسی طویل ثبوت کی ضرورت نہیں۔ ابتدا میں تعصب اور تنگ نظری نے بہت گرد اڑائی اور ان کی روشنی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی لیکن جب زمانے نے اس گرد و غبار کو اُڑا دیا تو معلوم ہوا کہ حالی نہ صرف ایک حقیقی شاعر ہیں بلکہ شاعری کی دنیا میں ایک انقلابِ عظیم کے بانی ہیں اور انھوں نے زبان اور مضمون کے اعتبار سے اُسے ایک نئی اور معنی خیز وسعت سے آشنا کر دیا ہے۔

ان معترضین کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر جن جذبات اور خیالات کو شعر میں ادا کرتا ہے وہ خود بخود بغیر کسی شعوری تحریک کے اس کے نفس کی گہرائیوں سے پھوٹ نکلتے ہیں اور ان کی سوتیں گرد و پیش کی زندگی میں ڈھونڈھنا بیکار ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ادب، شاعری، مصوّری بلکہ انسانی قوتِ تخلیق کے تمام مظاہر دراصل زندگی سے وابستہ اور اس کے دست نگر ہیں۔ اور ان سب کا اعلیٰ ترین مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی کے احساس کو زیادہ مستحکم، اس کی معنویت کو زیادہ گہرا اور اس کے امکانات کو زیادہ وسیع بنائیں۔ اگر ان کا رشتہ زندگی سے قائم نہ رہے تو ان میں تصنع، رسمیت اور تنگ نظری راہ پا جاتی ہے۔ یہ مانا کہ شاعر جن جذبات اور خیالات کو حسین الفاظ کا جامہ پہناتا ہے انھیں اپنے دل کی گہرائیوں سے ڈھونڈ کر لاتا ہے لیکن آخر دل میں وہ کہاں سے آتے ہیں؟ وہ اس کے تجربوں اور مشاہدوں، اس کی گذری ہوئی مسرتوں، اس کے بیتے ہوئے دکھ درد کا ثمر ہوتے ہیں۔ بیشک شاعری خالی خولی شاعری کا نام نہیں۔ اگر جوش، موعظت شاعری کی روح پر غالب آ جائے تو شعر شعر نہیں رہتا۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ شاعری محض الفاظ کے اُتار چڑھاؤ، بندش کی چستی، ترکیبوں کی خوبی سے عبارت نہیں بازی گر کی طرح الفاظ سے کھیلنا اور چیز ہے اور الفاظ کو دل کا ترجمان بنا کر آپ بیتی اور جگ بیتی کو دل لگتے انداز میں بیان کرنا اور چیز۔ جن شاعروں کی قسمت میں حیاتِ دوام آئی ہے ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان کی خودی وسیع ہو کر سارے جہان پر محیط ہو گئی تھی یعنی قطرے نے دریا میں فنا ہو کر عشرتِ ابدی حاصل کر لی تھی۔ اُنھیں اپنے ابنائے جنس کی خوشی سے خوشی اور ان کے غم سے غم ہوتا تھا وہ ان کے عروج پر فخر اور اُن کے زوال میں ندامت محسوس کرتے تھے۔

چیست انسانی تپیدن از تپِ ہمسائیگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن پژمان شدن

شاعر ہونے کے لئے یہ "انسانیت" ضروری ہے اور تجدد و جدت کا اہتمام لازم۔ اسی کی بدولت اثر آفرینی، سوز و گداز، خلوص اور درد کے وہ خزانے ہاتھ آتے ہیں جو بیان الفاظ میں روح ڈالتے اور انھیں قوت پرواز بخشتے ہیں۔ جو شاعر اس تڑپ اور احساس سے محروم ہے جس کا دل اپنے زمانے کی خرابیوں اور نا انصافیوں پر نہیں دکھتا، جو صداقت اور شرافت کی طرف سعی نہیں کرتا جس کا خون حق و باطل کی جنگ کو دیکھ کر تیز تیز حرکت نہیں کرنے لگتا۔ ممکن ہے ایسا شاعر اپنے کلام میں محاورے اور روزمرہ کا کمال دکھائے لیکن نگاہِ حقیقت بین میں اس کی وقعت بازی گر کے کرتبوں سے زیادہ نہیں۔

اب حالی کی طرف آیئے۔ حالی کو حساس اور درد آشنا دل ملا تھا اور حق پسندی اور حق گوئی کا جوہر عطا ہوا تھا۔ تربیت نے دینداری کو ان کی طبیعت میں راسخ کر دیا تھا۔ جب انھوں نے ہوش سنبھالا اور اپنے ماحول پر نظر ڈالی تو ایک عبرت خیز اور دردناک نقشہ نظر آیا۔ عہدِ مغلیہ میں جس تہذیب و تمدن نے نشو و نما پائی تھی اور معاشرتی اور ذہنی زندگی کے جو سانچے بن کر تیار ہوئے تھے وہ سب حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت آنکھوں کے سامنے گذری تھی۔ مسلمانوں کا آفتابِ اقبال ایسا گہن میں آیا کہ نہ صرف اُن کی بساطِ حکومت الٹ گئی بلکہ علوم و فنون، اخلاق و معاشرت، عزت و ثروت سب ہاتھ سے جاتے رہے۔ اس بربادی کو دیکھ کر اُن کے دل پر چوٹ لگی اور اس کا مرثیہ اِن الفاظ میں اُن کی زبان پر آیا۔

"قوم کی حالت تباہ ہے عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے، زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔"

یہی نقشہ تھا جس کو حالی کے خونچکاں قلم نے مسدس میں اس طرح کھینچا ہے۔

پھر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر　　جہاں خاک اڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر　　ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر
نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں زہر کا کام کرتا تھا باراں　　جہاں آ کے دیتا تھا رو ابر نیساں
تر و تازہ ہوتا تھا جو اور ویراں　　نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں
یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

کیا حالی کے لئے ممکن تھا کہ وہ ملتِ اسلامیہ کے اس اجڑے ہوئے باغ کا نظارہ دیکھنے کے بعد گل و بلبل کی شاعری میں نازک خیالیاں دکھاتے؟ بیشک ایسے شعرائے کرام بھی اس زمانے میں گذرے جن کے پاس آنکھیں تھیں، لیکن انھوں نے دیکھا نہیں۔ کان تھے لیکن سنا نہیں۔ دل تھا لیکن کچھ محسوس نہیں کیا۔ قوم کا گھر جلتا رہا اور وہ روم کے شہنشاہ نیرو کی طرح بیٹھے بانسری بجایا کئے۔ لیکن حالی کے دل و دماغ پر اس آگ کا دھواں چھا گیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑا۔ حالی کی شاعری ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کی فریاد ہے۔ مگر کس کے دل کی؟ وہ ایک فردِ واحد الطاف حسین حالی کا دل نہیں بلکہ ایک قوم و ملت کا، ایک تہذیب و تمدن کا دل ہے جو اپنی وسعت میں ایک جہان درد و آرزو لئے ہوئے ہے۔ حالی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ محض اُن کے اپنے جذبات، اور وارداتِ قلب کا آئینہ نہیں بلکہ ایک پوری قوم کی داستانِ عروج و زوال ہے۔

اس کی دوسری اہم خصوصیت شاعر کی نظر کی رسائی اور رائے کی اصابت ہے۔ اس نے قوم کی نبض پر ہاتھ ہی نہیں رکھا۔ بلکہ مرض کی صحیح تشخیص کر کے مناسب دوا بھی تجویز کی۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا، کیونکہ اس دورِ آشوب میں بڑوں بڑوں کی عقلیں جواب دے چکی تھیں۔ لوگ افراط و تفریط میں گرفتار تھے۔ بعض قدامت پرستی کے بندے، ماضی کے نشے میں سرشار۔ یہ چاہتے تھے کہ جدید علوم و تمدن کو بالکل مسترد کر دیں۔ بعض تہذیبِ مغرب سے مسحور ہو کر اپنی قومی روایات اور خصوصیات کو اس پر قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔ اس نازک موقع پر حالی کی عقلِ سلیم نے شمعِ ہدایت کا کام دیا۔ انھوں نے ایک طرف مسدس میں مسلمانوں کو ان کے عروج کی داستان سنائی۔ اُن کی خودداری اور عزتِ نفس

کو ابھارا اور انھیں اسلام کے بھولے ہوئے اصول یاد دلائے۔ اور دوسری طرف مغربی تہذیب و تمدن کا جائزہ لیکر اس کی ان خصوصیات کی طرف توجہ دلائی جو مغربی اقوام کی ترقی اور فروغ کا باعث ہوئی ہیں۔ ان کی حق پسندی نے اپنے تمدن کی برائیوں پر پردہ ڈالنا گوارا نہیں کیا اور نہ دوسروں کی خوبیوں کے اعتراف میں کوتاہی کی۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک تم اپنے آپ کو جدید ذہنی ہتھیاروں سے مسلح نہیں کریں گے کارزارِ حیات میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کا سارا کلام خصوصاً مسدس جہاں دردآشنا کے لئے ایک مرثیہ کا حکم رکھتی ہے وہاں عقلِ سلیم کے لئے دعوتِ فکر اور سرچشمۂ ہدایت ہے۔

غدر کے بعد مسلمانوں کے زوال کی سب سے بڑی علامت یہ تھی کہ ان کی قومی سیرت مسخ ہو گئی تھی اور ان تمام صفات کے بجائے جو ان کی ترقی کا باعث ہوئی تھیں، ان پر تعصب، پست ہمتی، غلامی، جھوٹ اور ریاکاری مسلط تھی اور ستم یہ تھا کہ متاعِ کارواں کے ساتھ "احساسِ زیاں" بھی گم ہو گیا تھا۔ اس وقت کوئی تعمیری تحریک ایسی نہ تھی جو دوبارہ مسلمانوں کی تنظیم کرے۔ خدا بھلا کرے سرسید کا جنھوں نے اس نازک وقت میں علیگڈھ تحریک کی بنا ڈالی اور تمدن، تعلیم اور علم و ادب میں ایک نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا۔ یہ تحریک محدود معنی میں صرف تعلیمی تحریک نہ تھی بلکہ اس کا مقصد قوم میں ایک عام بیداری پیدا کرنا تھا تاکہ اس کا جمود، افسردگی اور ناامیدی دور ہو جائے اور وہ دوبارہ اجتماعی معاملات میں تخلیقی جدوجہد کر سکے۔ اس تحریک کی زبان حالی تھے جنھوں نے اس کے اثر کو تعلیم یافتہ طبقہ کے تنگ دائرے سے باہر نکال کر ملک اور قوم میں عام کر دیا اور اس کا ذریعہ ان کا شہرہ آفاق مُسَدَّس تھا جس کی تصنیف سرسید کی فرمائش سے ہوئی تھی۔

اصلاحی نقطۂ نظر سے سب سے اہم مسدس کا وہ حصہ ہے جس میں شاعر نے قوم کے ہر گروہ اور ہر طبقے کی حالت کو اپنی بے پناہ اور دردناک تنقید کے ذریعہ بے نقاب کیا ہے، جس کے ہر شعر میں انھوں نے سوسائٹی کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا ہے۔ پوری مسدس کا تو کیا ذکر ہے۔ اس کے آخر میں محسنِ سرورِ کائنات کی بارگاہ میں عرضِ حال کرتے ہوئے انھوں نے چند اشعار میں وہ حقائق بیان کر دئے ہیں جن پر مورخین، معلمینِ اخلاق اور مصلحینِ معاشرت مدتوں سر دھنیں گے۔ اس دردبھری اور دلدوز نظم میں سے کوئی کیا سنائے اور کیا چھوڑے؟ مثال کے طور پر چند شعر سُن لیجے۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے — اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے — اس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آ کے ملائے — اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا — اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیرِ غنا بھی — اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے
عالم ہے سو بے عقل ہے، جاہل ہے سو وحشی — منعم ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے
چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں — پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے
دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے — ایک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

صرف اسی ایک نظم کی تنگ زمین میں حالی نے ان "مقامات" کو بیان کر دیا ہے، جہاں مذہب و فلسفہ کے بڑے بڑے مدعی نہیں پہنچ سکے۔ اسلام کی تعلیم کے رُخِ روشن پر زمانے کے تعصب، مخالفوں کی غلط بیانی اور خود مسلمانوں کی بے راہ روی کی وجہ سے پردہ پڑ گیا تھا۔ حالی نے اس پردہ کو اٹھا کر دکھایا کہ اسلام ایک مذہبِ امن ہے جو دنیا میں سلوک اور محبت کی حکومت قایم کرنے آیا تھا۔ اسلام کا مقصد قوموں اور جماعتوں کے اختلاف اور تعصب کو مٹانا اور ان میں ایک عالمگیر اخوت قایم کرنا تھا۔ اس نے فقر میں خودداری اور جدوجہد، اور ثروت میں فیاضی، خدا ترسی اور حق شناسی سکھائی تھی۔ اس نے علم و حکمت کو مومن کی کھوئی ہوئی پونجی سے تعبیر کیا تھا۔ اسی کی برکت سے مسلمانوں نے دنیائے فکر و عمل کو مسخر کر لیا تھا۔ لیکن اب خود ملتِ اسلامیہ میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور افراد اور جماعتوں کے تعلقات میں حسنِ مراعات کا نام تک باقی نہیں رہا۔ عمل کی سرگرمی کی جگہ جمود اور بے حسی کا دور دورہ ہے۔ منعم اپنی دولت میں مست ہیں اور مفلس خودداری کو چھوڑ کر ہر ایک کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ نہ ان میں قوتِ عمل باقی رہی ہے نہ ان میں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ خدا کے یہاں انصاف ہے۔ پاسداری نہیں۔ جو قوم اس کے احکام اور قوانین کی پیروی نہیں کرے گی وہ اس کا خمیازہ اٹھائے گی۔ اس میں تقدیر کا گلہ کرنا اپنے نفس کو فریب دینا اور حقیقت کی تلخی سے گریز کرنا ہے۔

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلہ ہے،

تمدن اور معاشرت کے تمام مختلف فیہ مسائل میں حالی ادھر ہوتے ہیں جو عدل، انسانیت اور انصاف کا راستہ ہے۔ وہ حق پرستی، انصاف پسندی خودداری، جرأت، بلند حوصلگی، اور رواداری کے حامی ہیں اور وقت کی قدر کرنا،

محنت کی عزت کرنا۔ ابنائے جنس کے حقوق کی پاسداری کرنا اور مفاد ملی کے لئے ذاتی اغراض کو قربان کرنا سکھاتے ہیں۔ ان کی تعلیم میں ایک انقلاب عظیم کا امکان پوشیدہ ہے جس کو ان لوگوں نے بھی پوری طرح نہیں سمجھا جو ان کے کلام پر سر دھنتے ہیں اور ان کا قومی مرثیہ پڑھکر آنسو بہاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں نہ صرف قوم کا دل دھڑکتا ہے بلکہ اس کے بلند ترین جذبات اور اعلیٰ ترین مقاصد کی ترجمانی موجود ہے۔ اقبال نے شیکسپیر کی شان میں جو شعر لکھا ہے اس کا اطلاق بدرجۂ کمال حالی پر ہوتا ہے۔

حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حُسنِ کلام آئینہ

حالی کی مصلحانہ حیثیت کی سچی قدر شناسی کے لئے ان کی بلند اور پاکیزہ سیرت کو سمجھنا ضروری ہے۔ دنیا میں بہت سے بڑے بڑے آدمی گذرے ہیں جن کا نام لوگوں کی یاد اور تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ لیکن باوجود ان کے بڑے بڑے کارناموں کے ان میں کم ایسے ہوئے ہیں جن کا ظاہر و باطن، قول و فعل، اصول اور عمل، زندگی اور تعلیم بالکل ایک ہوں۔ حالی کی کامیابی اور اثر آفرینی کی ایک بڑی وجہ ان کا خلوص ہے۔ ان کی شاعری میں بھی وہی خالص سونا دمکتا ہے جس سے ان کی فطرت کا خمیر تیار ہوا تھا۔ ان میں تصنع اور تکلف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا لفظ جو دل سے نکلتا ہے، بجلی بن کر دل پر گرتا ہے۔

سرسید کے حلقۂ احباب اور رفقاء میں جو بڑے بڑے مشاہیر اور قابل احترام لوگوں پر مشتمل تھا، حالی کی سیرت سب سے برتر اور بلند تھی جس پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے عصر جدید میں لکھا تھا: "بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط انسان اور صوفیہ خیالات کی رُو سے ایک صاحب باطن ولی تھے"

اس کی تائید میں جسٹس سید محمود کا وہ جملہ بھی سن لیجے جس کے ناقل سرسید راس مسعود ہیں اور جو انھوں نے اپنے والد سرسید کے سامنے کہا تھا۔

" ابا جان اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے ان میں سے کوئی ایسا ہے جس کی پرستش کرنے کے لئے تیرا دل تیار ہے تو میرے پاس جواب حاضر ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے"

سید محمود جس زبردست دل و دماغ کے شخص تھے وہ محتاج بیان نہیں انھوں نے ایسی آزاد طبیعت پائی تھی کہ ان کا سر نیاز کسی بڑی سے بڑی بارگاہ میں بھی خم نہیں ہوا۔ ان کا یہ کہنا کہ تمام انسانوں میں حالی قابل پرستش ہیں اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے۔

ان ذاتی اوصاف اور باطنی کمالات کا تذکرہ غیر متعلق یا خارج از بحث نہیں۔ کیونکہ حالی کی ذات اب انفرادیت کی حدود کو توڑ کر ہماری تہذیب و تمدن اور ہماری تاریخ و ادب کے سرمایۂ عزیز میں سما گئی ہے۔ اس لئے ان کی شاعری کی قدر شناسی کے لئے ان نفسی خصوصیات اور محرکات عمل کو پہچاننا ضروری ہے جنھوں نے حالی کو حالی بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلاح کا جذبہ اور خدمت خلق کا شوق ان کی زندگی اور عمل کے ہر پہلو پر محیط تھا۔ اس لئے ان کو غم عشق اور غم روزگار دونوں سے آزاد کرکے قوم کے غم اور قوم کے عشق میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہی جذبۂ اصلاح تھا جس نے اُن کی زندگی کی ابتدا سے رہنمائی کی۔ اسی کی بدولت انھیں مسدس کے مضامین کا الہام ہوا۔ اسی کا بے پناہ تقاضا تھا جس نے پرانی شاعری کے فرسودہ سانچوں کو توڑ کر ان کی خلاق طبیعت کے لئے نئے سانچے تیار کئے۔ اور ایک شاعری پر ہی کیا منحصر ہے؟ ادب کی کونسی صنف تھی جس کی تہذیب اور اصلاح انھوں نے نہ کی ہو، اور اس میں چار چاند نہ لگا دئے ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ حالی نے جس طرح دنیائے عمل میں تمام عمر جھوٹ، مبالغہ اور ریاکاری کے خلاف جہاد کیا اسی طرح دنیائے فکر میں بھی ان چیزوں کو روا نہیں رکھا۔ ان کی ہر تصنیف میں وہی سچائی، سادگی اور ہمدردی جھلکتی ہے جو ان کی سیرت میں کارفرما تھی۔ اور اس کی بدولت ان کے لئے نہ صرف شعرائے عالم کی صف اول میں جگہ مخصوص ہے بلکہ اہل نظر کے نزدیک ان کا شمار خاصانِ خدا میں ہے۔ کیونکہ انھیں خدا کی مخلوق سے محبت تھی اور اس کی خدمت کا ذوق اور ولولہ تھا۔

آج جو لوگ قومی خدمت کی راہ میں گامزن ہیں حالی کی سیرت اور شاعری ہر قدم پر اُن کی رہنمائی کرتی ہے۔ اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے



انقلابِ رُوس

از جناب کشن پرشاد صاحب کول لکھنؤ

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم نے جو قیامت خیز ہنگامہ اطرافِ عالم میں بالعموم اور سرزمین یورپ میں بالخصوص برپا کیا اُس نے نہ معلوم کتنے تاجداروں کو خانماں برباد کر کے قعرِ گمنامی میں ڈھکیل دیا جن قوموں اور ملکوں کی شہرت اور دبدبے کے آگے دنیا زانوِ ادب تہ کرتی تھی وہ آج بے کسی اور بے حیائی کی زندگی بسر کر رہی ہیں اور ان میں سے بعض کا تو نام و نشان تک صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ہے۔ میدانِ سیاست میں ایسے ایسے حیرت انگیز انقلاب دیکھنے میں آئے اور جمہورِ عالم پر مصائب و آلام کے وہ پہاڑ ٹوٹے کہ خلقت آج بھی ان سے سہمی ہوئی ہے۔ مگر یہ حادثے ایسے نہیں کہ جن کا اثر دیرپا ہو۔ دنیا اُن کو بہت جلد بُھلا دیگی اور یہ قصۂ پارینہ ہو کر رہ جائینگے۔ مگر رُوس کے انقلاب نے اُس ملک کی جیسی کچھ کایا پلٹ کی ہے اور جن قوتوں اور اصولوں کو عملی جامہ پہنا کر بساطِ سیاست پر برسرِ پیکار لا کر کھڑا کیا ہے اور مغربی تہذیب و تمدّن کو جو پیغامِ جنگ وہ آج دے رہے ہیں یہ دنیا کی آنے والی نسلوں کو مدّت مدید تک نچلا اور چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ اس تلاطم کی موجیں ابھی عرصۂ دراز تک تمدّنِ انسانی کے ساحل سے ٹکرایا کریں گی۔ بولشوی انقلاب کی یہ تعبیر کہ اُس نے زارِ رُوس کی سی عظیم الشان ہستی کو مٹا کر حکومت کا تختہ پلٹ دیا ناکافی ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس انقلاب کے آغوش میں زمانہ نے ایک اور کروٹ بدلی ہے۔ بہرحال دنیا کی تاریخ میں فرانسیسی انقلاب کے بعد سے کوئی حادثہ یا واقعہ ایسا نہیں گزرا ہے جس کی اہمیت کا مقابلہ بولشوی انقلاب سے کیا جائے۔ بولشوی تہذیب و طرزِ معاشرت اور مغربی تمدن کے باہمی کشاکش میں کون بالآخر بازی لے جائیگا یا اگر بولشوی دورِ انقلاب کا سکہ رُوس کی طرح دنیا پر بیٹھتا گیا تو خلائقِ عالم کے لئے یہ رحمت و برکت یا زحمت و مصیبت ثابت ہوگا اس کے متعلق قطعی فیصلہ صادر کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ یہ منصب تو زمانۂ آئندہ کے ہی کسی نسل کے مورخ کو حاصل ہو سکتا ہے۔ ایسے معاملہ میں پیشین گوئیاں کرنا فعلِ عبث ہے۔ البتہ صورتِ حال کا سمجھنا اور جو کچھ ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ لگانا ہر صاحبِ رائے کا حق اور فرض ہے۔

بولشوی انقلاب نے قطعی نئے عقیدے اور ایمان کی تلقین شروع کی ہے جیسا کہ ایسی صورتوں میں بالعموم ہوتا ہے اس کے پیرو نئی زمین، دنیا، آسمان پیدا کرنے کے دعویدار ہیں اُن کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے رُوس کے سے ملک میں جو عام رعایا کے لئے نارِ جہنم ہو رہا تھا جنت کی سی فضا پیدا کر دی ہے اور اگر یہی لیل و نہار رہا تو وہ زمانہ دُور نہیں کہ وہ تمام دنیا کو فردوسِ بریں کا نمونہ بنا کر دکھا دیں گے بخلاف اس کے اُن کے دشمن اور مخالف اُن کے اوپر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے تمام مُلک کو تباہ و برباد کر دیا ہے اور وہاں کے باشندوں پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے ہیں کہ جو نہ اب تک دیکھے تھے نہ سُنے تھے۔ نہ صرف یہی بلکہ بولشوزم کو ایک ایسا ہوا بنا کر دکھایا جاتا ہے کہ جس سے نہ صرف بچے بلکہ جوان اور بُوڑھے بھی خائف نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں حقیقتِ حال کا پتہ چلانا آسان کام نہیں اور وہ بھی ہزاروں میل کے فاصلہ سے۔ پھر وہ تمام مسالا جو ہر ایسے معاملہ کی چھان بنان کے لئے ضروری ہوتا ہے اس ملک میں آسانی سے بہم نہیں ہو سکتا۔ بعض کتابوں کا تو ملک میں آنا ہی ممنوع ہے۔ جو کتابیں انقلابِ روس پر بالعموم دستیاب ہوتی ہیں اُن میں حد سے زیادہ رنگ آمیزی پائی جاتی ہے۔ تاہم معدودے چند وقائع نگاروں نے حتی الامکان غیر جانب داری اور بے لوثی سے کام لے کر صورتِ حال کے انکشاف میں سعی بلیغ کی ہے۔ یوں تو اپنی اپنی جگہ اکثر مصنفین نے مسئلہ کے کسی نہ کسی پہلو پر بڑی قابلیت اور صفائی سے روشنی ڈالی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی ہیںڈن گیسٹ

Haden Guest مورس ہینڈس Maurice Hindus
رینی فلپ مُلر Rene Fullup Muller اور امریکن ٹریڈ
یونین ڈیلیگیشن American Trade Union delegation
کا مرتبہ اس فہرست میں خاص طور سے ممتاز ہے۔ اِن مصنفین نے ایسی چھان بین سے کام لیا ہے اور اس بے لاگی سے واقعات کا انکشاف کیا ہے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ نظر آتا ہے۔ اس مسئلہ کا مطالعہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا کہ جب تک ان مصنفین کی تصنیفات پر کامل توجہ نہ کی جائے۔ اس مختصر مضمون میں انقلاب روس کی روداد کا بیان کرنا یا بولشوی حکومت نے جو کچھ کارنمایاں کئے ہیں اُس کا خاکہ کھینچنا نہ ممکن ہے نہ مقصود ہے۔ یہاں صرف چند منتشر خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے اور بولشوزم کے دو ایک بنیادی اصولوں سے اس غرض سے بحث کی جاتی ہے کہ ناظرین میں سے جن احباب کو اس مسئلہ کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو تو ان کو اس کے حل کرنے میں شاید اس بحث سے کچھ مدد ملے۔

بولشوی لیڈر اور بولشوی پارٹی کا عقیدہ اور مسلک یہ ہے کہ ذاتی ملکیت کے دستور کو قطعی مٹا کر ایسی حکومت کی بنیادیں مستحکم کی جائیں جس پر ادنیٰ طبقے کی رعیت کو پورا اختیار اور کامل قدرت حاصل ہو۔ اگر اس عقیدے اور مسلک کے آگے سر جھکا دیا جائے تو روس میں بولشوی پارٹی جو کچھ کر رہی ہے وہ بے معنی نہیں کہا جا سکتا۔ اس اعتراض کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے کہ اُن کے دعوؤں اور طریق کار میں منطق کی کمی ہے۔ نہ اُن کے پروگرام پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ عملی پہلو سے یہ سب باتیں دور از کار اور محض پرانی ہیں۔ بخلاف اس کے اُنکی منطق لاجواب اور اُن کے پروگرام ایسے نپے تلے اور کیل کانٹے سے درست معلوم ہوتے ہیں کہ اُن میں نقص نکالنا کارے وارد۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ حضرت انسان بھی ایک چیز ہیں۔ عقل۔ دلیل اور منطق کا جادو ان پر چلتا ہے لیکن اُسی وقت تک جب تک کہ ان کے حسیات و جذبات کو اس سے ٹھیس نہیں لگتی۔ اپنی ازلی عریانی کو انھوں نے تہذیب و شائستگی کے جامہ سے ڈھانپ ضرور لیا ہے اور دیکھنے میں خاصے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن برتنے سے قلعی کھل جاتی ہے اور حرص۔ خودی اور حیوانیت کا ازلی جوش جھلکنے لگتا ہے۔ ارتقار تہذیب و تمدن کی مختلف منزلیں طے کر کے انسان نے انسانیت کا درجہ اس معنی میں حاصل کر لیا ہے کہ اُس کا دماغ تعلیم و تربیت کی روشنی کا اثر قبول کرتا ہے۔ وہ اپنے دماغ کی قوت سے آسمان کے تارے توڑ لاتا ہے۔ اس کے تخیل کی بلند پروازی اُس کو چرخ ہفتمین سے پرے پہونچا دیتی ہے اور اس کے عقل و دانش کے کرشمے بعض اوقات ہم کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ ابھی تک حسیات و جذبات میں لطافت و پاکیزگی کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی ہے اور اخلاق و روحانیت کا وہ نمونہ جس کو انسانیت کہتے ہیں بہت کمیاب ہے۔ دُنیا واجب طور سے دارالمحن کہلاتی ہے۔ اچھا ہے یا بُرا۔ اس سے بحث نہیں اصلیت یہ ہے کہ خودی اور حرص انسان کی ازلی سرشت ہے۔ دنیا میں آکر اپنے قدم جمانا۔ گھر بار بسانا ملکیت اور دولت پیدا کرنا۔ مرتبہ اور اختیار حاصل کرنا انسان کی ایسی سرشت اور خصلت ہے جو عارضی حوادثات کا اثر نہیں بلکہ اُس کے رگ و ریشے اور خون و پوست میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ پیغمبران دین اور مصلحان قوم نے فقر و فاقہ کا وعظ دیا۔ ارتقار تہذیب و تمدن کے دور نے شائستگی کے ساتھ ہی ساتھ سادگی کی زندگی کا معیار پیش کیا۔ تعلیم و تربیت نے انسان میں صلاحیت کا مادہ پیدا کیا اور دنیا نے پچھلے سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس کے زمانہ میں ترقی کے کئی مدارج طے کئے لیکن انسان ابھی اپنی ازلی سرشت کو بھولا نہیں ہے۔ پرانے زمانے میں عیسیٰ مسیحؑ اور گوتم بدھ اور موجودہ عہد میں ٹالسٹائی اور گاندھی کی سی ایسی برگزیدہ ہستیاں ضرور پیدا ہوئیں کہ جنھوں نے یہ باور کرایا کہ انسان کے لئے فرشتہ ہو جانا حیطۂ امکان کے باہر نہیں اور بھی بہت سے لوگ گمنامی کے پردے میں ایسے پڑے ہوں گے جن کے لئے انسان اور سراپا انسانیت کا لقب بجا طور سے استعمال کیا جا سکتا ہے مگر کروڑوں مخلوق میں کتنے؛ تعلیم۔ تربیت۔ اخلاق۔ معاشرت۔ تہذیب و تمدن۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں دنیا جس رفتار سے ترقی کر رہی ہے اور شائستگی کا دور جس طرح سے ہماری جہالت اور حیوانیت پر قابو و اختیار پاتا جاتا ہے اس سے بعید نہیں معلوم ہوتا کہ چند صدیوں بعد یہ دنیا اصلی معنے میں انسانوں کی بستی ہو جائے۔ ممکن ہے کہ کبھی وہ زمانہ بھی آئے کہ انسان اگر فرشتہ نہیں تو فرشتہ کا ہمسر بن جائے۔ لیکن یہ ارمان ابھی خواب کی سی باتیں ہیں۔ بایں ہمہ بولشوی پارٹی کے لیڈر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ انسان کی اس ازلی سرشت کو بدل کر چھوڑیں گے۔ اور یہ معجزہ اسی دور اور اسی نسل میں کر کے دکھائیں گے۔ انکا عقیدہ ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلتا۔ پیغمبران دین اور مصلحان قوم کے وعظ سے جو نہ ہوا وہ زور حکومت

اور قانون کی زبردستی سے ہوکر رہے گا۔ مانا کہ دنیا کا کام زیادہ تر یوں ہی چلتا ہے۔ آخر فرانسیسی انقلاب نے بھی تو زمانہ کی کروٹ بدلوانے میں سہارا دیا تھا۔ ٹھیک ہے۔ لیکن فرانسیسی انقلاب اور بولشوی انقلاب میں بڑا فرق ہے فرانسیسی انقلاب نے جس دور تمدن کو رواج دیا، اور پچھلے ڈیڑھ سو برس میں دنیا جن اصولوں اور خیالات پر کاربند ہوئی اُن کا ماحصل یہ تھا کہ دنیا کی نعمت و دولت۔ حکومت و ثروت۔ حقوق و اختیارات صرف معدودے چند مجہول۔ کاہل اور عیش پسند لوگوں کے لئے جن کا شمار رؤسا کے طبقے میں ہوتا تھا مخصوص نہیں۔ بلکہ دنیا میں ہر طبقہ اور ہر درجہ کے افراد کو خواہ وہ کیسے ہی حقیر و ادنیٰ کیوں نہ ہوں یہ موقع حاصل ہونا چاہئیے کہ وہ اپنے بل بوتے۔ اپنی قابلیت اور کیرکٹر کے مطابق اپنی ہمت اور کوشش سے اپنا وقار اور مرتبہ دنیا میں قایم کر سکیں۔ بولشوی انقلاب نے جس فلسفہ اور اصولوں کو اپنا پشت پناہ بنایا ہے وہ اُس کے بالکل برعکس ہیں۔ بولشوی حکومت ہر طبقہ، ہر گروہ اور ہر رائے کے افراد کے لئے مساوی موقع اور مساوی حقوق نہیں قایم کرتی، بلکہ اس کے اصول اور اس کے عمل کے مطابق تمام حقوق اور رعائتیں اُن افراد کیلئے مخصوص ہیں جو بولشوی عقائد اور اصولوں کے پیرو ہیں اور جن میں زیادہ تر کسان اور مزدور پیشہ لوگ ہیں۔ اُمراء اور رؤسا کے لئے یا متوسط طبقہ کے واسطے جس کو بولشوسٹ بورژوئی BOLSHEVIst کہتے ہیں اس سوشل نظام میں کوئی گنجائش نہیں۔ فرانس میں قبل از انقلاب دنیا کی تمام نعمت و دولت۔ حکومت و ثروت صرف رؤسا کے طبقے کے لئے مخصوص تھی۔ روس میں بعد از انقلاب ملک کی تمام دولت و ثروت مزدور پیشہ طبقے کی کائنات ہے۔ دونوں صورتوں میں اصول اور عقیدے کا کوئی فرق نہیں صرف اکثریت و اقلیت کا فرق ہے۔

بولشوی لیڈر اس صورت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ جس نظام معاشرت کی داغ بیل ڈال رہے ہیں اُس میں تمام مخلوق مساوی درجہ رکھیگی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق مٹ جائیگا۔ ہر شخص معمولی حیثیت سے آرام کے ساتھ زندگی بسر کریگا۔ اور جو لوگ حوصلہ و ارمان رکھتے ہیں اور جنھوں نے دل و دماغ بھی پایا ہے وہ بنی نوع انسان کی خدمت اور اپنے ملک کی ترقی و بہبودی کی کوشش میں نام روشن کریں گے اور اس طرح اُن کا وقار و مرتبہ اعلیٰ قرار پائیگا۔ اسی خیال کو کروپوٹکن نے اپنی کتاب CONQUEST OF BREED میں بڑی وضاحت و خوبی سے یوں بیان کیا ہے کہ دنیا میں اس وقت اس قدر وافر زر و زمین موجود ہے کہ اگر انسان اپنے حرص و حسد۔ خودی و انانیت اور ازلی جوش حیوانیت سے اندھا نہ ہوکر اس سب کو حصہ رسدی طریقے سے تقسیم کرے تو دنیا میں ہر فرد آرام و اطمینان سے زندگی بسر کرسکتا ہے اور اگر سائنس کے اُن نئے طریقوں کو احتیاط اور توجہ سے کام میں لایا جائے جو کاشت و صنعت و حرفت میں دُگنی بلکہ چوگنی ترقی کرکے دکھا سکتے ہیں تو ضروریات زندگی کا سامان اس قدر وافر مہیا ہو جائیگا کہ جس طرح اس وقت پانی میسر ہے کہ کام میں بھی آتا ہے بہتا اور ضائع بھی ہوتا رہتا ہے۔ کوئی اسکی پروا نہیں کرتا۔ اسی طرح کھانے پینے اور پہننے اور رہنے سہنے کا سامان بافراط ہو جائیگا۔ ہر شخص آرام سے زندگی بسر کریگا اور بچ کر ضائع بھی ہوتا رہیگا لیکن اس کو کیا کیجئے کہ انسان کی خود غرضی۔ حرص و حسد اور ازلی سرشت حیوانیت منطقی اور فلسفی دماغوں کی اچھی سے اچھی اور سلجھی ہوئی سے سلجھی ہوئی تجاویز کو رد کا نہیں ہونے دیتی۔ اور بنا بنایا گھروندا ڈھے جاتا ہے۔ بولشوی انقلاب زور حکومت اور نفاذ قانون سے اس ازلی سرشت حیوانیت کو کس طرح آناً فاناً بدل دیگا اور انسان چولا بدل کر دفعتہً فرشتہ کیسے ہو جائیگا یہ آسانی سے باور نہیں آتا لیکن بولشوی عقیدے اور ایمان کے حامی دعویٰ کرتے ہیں اور باصرار کہتے ہیں کہ ہم نے روس میں یہ معجزہ کرکے دکھادیا ہے۔ یہ دعویٰ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس کے متعلق بھی دو ایک باتیں غور طلب ہیں۔ جہاں تک بولشوی اُمت کا تعلق ہے یہ دعویٰ غلط نہیں۔ اس کا حوصلہ و ایثار۔ اُس کا فقر و قناعت۔ اُنکی انسانی ہمدردی اور جوش خلاق انسانیت کے ایسے جوہر ہیں کہ جن کی داد نہ دینا بدتر از کفر ہوگا لیکن بولشوی اُمت روس کی کروڑوں کی آبادی میں دو چار لاکھ سے زیادہ نہیں اور بقیہ کثیر آبادی کے متعلق یہ دعویٰ صحیح نہیں۔ پھر یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر عقیدے اور مذہب کے پیروکاروں میں جو ہمت و جوش شروع شروع میں ظاہر ہوتا ہے وہ کچھ عرصہ بعد قایم نہیں رہتا۔ یہ تاریخی واقعہ ہے۔ کون جانتا ہے کہ جو جوش اور دُھن بولشوی اُمت اور اُس کے پیشواؤں میں آج نظر آتی ہے وہ نسل و نسل بعد بھی باقی رہے گی اور یہ نیا تجربہ جو کیا جا رہا ہے بالآخر کامیاب ثابت ہوگا۔

تہذیب و تمدن کے دور حاضرہ نے دنیا کی مخلوق کو جس دولت و نعمت سے مالا مال کیا ہے وہ انسان کی شخصی آزادی ہے۔ ہر وہ حکومت اور سوسائٹی جس کو مہذب ہونے کا دعویٰ ہے اس اصول کو تسلیم کرتی اور اس حق کا تحفظ کرتی ہے اور ضرورتاً جب رعیت کی شخصی آزادی سلب کی جاتی ہے خواہ جا یا بیجا

توحکومت کو عذر خواہ ہونا پڑتا ہے۔ آزادی کے اصول سے کبھی انحراف نہیں کیا جاتا بخلاف اس کے بولشوی حکومت کا عقیدہ اصول ہی اس سے مختلف ہے اُس کے اصول کے لحاظ سے حکومت اور سوسائٹی محض رعیت کے امن و تحفظ کے لئے نہیں بلکہ گویا رعیت اور مخلوق ہی اسٹیٹ اور حکومت کے بقا اور استحکام کے لئے پیدا کی گئی ہے لہٰذا شخصی آزادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بالشوی عقیدے کا یہ نظریہ حق سیاسی یا اقتصادی شعبوں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں حتیٰ کہ فنون لطیفہ مثل نقاشی۔ موسیقی۔ سنگتراشی تھیئٹر، سنیما وغیرہ تک میں اسکو کام میں لیا جاتا ہے اور ایک ہی طرز و قماش کو رواج دیا جاتا ہے اور وہ طرز و قماش بھی ادنیٰ قسم کا۔ اِس سے اختلاف کرنا داخل کفر ہے یوں سمجھئے کہ ایک قسم کی وردی بنوا دی گئی ہے جس پر سرکار کی مہر لگی ہے۔ ہر جوان۔ بوڑھے اور بچے پر اُس کا پہننا لازم ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ چھوٹی ہوتی ہے یا بڑی تنگ ہوتی ہے یا ڈھیلی۔ یا تو اُسے پہنو یا ننگے ناچو۔ یہ ممکن نہیں کہ تم دوسری پوشاک بنوا کر زیب تن کر سکو جس تہذیب و حکومت میں شخصی آزادی کو حکومت یا سوسائٹی کے استحکام و بقا کے لئے اس طرح سلب کیا جاتا ہے اُس میں ارتقائے تمدن کا نشو و نما پانا معلوم! یہ بات دوسری ہے کہ نشو و نما پانے کے معنی ہی بدل دیے جائیں۔ راقم الحروف کو اس بالشوی عقیدے سے قطعی اختلاف ہے۔ یہ لازم نہیں کہ ناظرین اس رائے سے جس کا اظہار یہاں کیا گیا ہے اتفاق کریں۔ ہر شخص کو اپنی رائے قائم کرنے کا اختیار ہے لیکن بولشوی انقلاب کے مسئلہ کو سمجھنے اور اُس پر سنجیدگی سے صائب رائے قائم کرنے کا خیال ہے تو یہ ناگزیر ہے کہ مسئلہ کے ان پہلوؤں پر بھی جن کا تذکرہ اس مضمون میں کیا گیا ہے غور و فکر کے ساتھ نظر ڈالی جائے۔ اگر ناظرین میں سے چند نے بھی اس عرضداشت پر توجہ کی تو راقم الحروف اپنی محنت کو رائیگاں نہ سمجھے گا۔

احساس

پپیہا جب تڑپتا ہے گھٹا میں "پی کہاں" کہہ کر
ہماری رُوح سوزِ عشق سے اس طرح جلتی ہے
تلاشِ تربتِ عاشق میں کوئی نازنیں جیسے
بَلا کی دھوپ میں پتھر پہ ننگے پاؤں چلتی ہے

اندھیرا کرنے والے دن کو ساون کے یہ بادل
سمندر کی طرح لبریز ہیں جس طرح پانی سے
یوں ہی دوشیزگی کے جوش سے اے فتنۂ محشر
تری آنکھیں چھلکتی ہیں شرابِ ارغوانی سے

(انتخاب از روحِ ادب مصنفہ جوش ملیح آبادی)

ہندوستان میں جذبۂ قربانی کی موت

(از سید مطلبی فرید آبادی)

یہ مضمون ۱۹۳۲ء میں لکھا گیا تھا۔ اس لئے ممکن ہے کہ بادی النظر میں یہ قصہ گذشتہ معلوم ہو۔ لیکن ہندوستان کے حالات میں تین سال کے اندر جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے اب بھی اسے قصۂ ایام گذشتہ نہیں کہہ سکتے۔ ممکن ہے کہ یہ مضمون ناظرین کلیم کے دل میں وہ بیکلی پیدا کر سکے جو ہندوستان کی فلاح کے لئے ضروری ہے۔

ہر میرا سا وہ آدمی جو ۱۹۲۴ء کے بعد برطانوی ہند سے چلا گیا ہو، آج اس ملک میں واپس آئے۔ اور موجودہ سیاسی جماعتوں کی حقیقت سے آشنا ہو تو اس کے دل کو ایسا ہی صدمہ پہنچے گا جیسا میرے دل کو پہنچا ہے۔ جب وہ دیکھے گا کہ آج جو سیاسی قربانیاں کی جاتی ہیں۔ لوگ جیل خانوں میں جاتے ہیں، جن کی شجاعت اور وطن پرستی کا اخبار میں بڑا بھاری اشتہار دیا جاتا ہے، وہ سب محض غلامانہ خود غرضیوں کا نام ہے، اور صرف ایک مقررہ تنخواہ یا اسی قسم کا دوسرا معاوضہ، ہندوستانی نوجوانوں کو اس "فقید المثال" قربانی کے واسطے ابھارتا ہے جسے قید کہتے ہیں۔ جن کے لئے قومی اخبارات مطالبے کرتے ہیں کہ عمدہ غذا سے ان سورماؤں کی آؤ بھگت کی جائے، تو یقیناً اس کا سر اگر وہ غیرت مند ہے تو شرم سے جھک جانا چاہیئے۔

راقم الحروف ۵۔۶ سال سے برطانی ہند سے باہر تھا۔ سوائے اخبارات میں قومی سرگرمیوں کا حال پڑھ لینے کے جو درحقیقت صرف اشتہار بازی تھی، سیاسی جماعتوں کے اندرونی حالات سے بالکل بے خبر رہا۔ لیکن اب جبکہ وطن میں واپس آکر قومی تحریکات اور مجالس کا بہ نظر غور مطالعہ کرنے کا موقع ملا، تو اس ناگوار حقیقت کا انکشاف ہوا کہ ان اشتہار زدہ تحریکات نے جن کے نام سوراج، آزادی، حصول ڈومینین اسٹیٹس، عدم تعاون، سول نافرمانی وغیرہ ہیں، ہندوستانیوں کو صحیح قربانی سے بہت دور پھینک دیا ہے۔ اور اُن کی قربانیاں تمام وکمال داؤد پر موقوف ہو گئی ہیں۔

گو تمام دنیا نہایت تیزی سے ایک دورِ انقلاب سے گزر رہی ہے لیکن یہ بات دل کسی طرح ماننے کو تیار نہیں کہ قربانی جو محض ایک بے لوث، مخلصانہ جذبے کا نام ہے، اس وقت بھی قربانی کہی جائے گی، جبکہ نام نہاد قربانی کرنے والے کو اس کی پوری پوری مزدوری ادا کر دی جائے یقیناً ہم اس دورِ انقلاب میں جذبۂ قربانی کے معنے اور کیفیت کے بدلنے سے قاصر ہیں وہ وہی رہے گا جو ہمیشہ سے رہا ہے اُس کو استدادِ زمانہ کسی طرح بھی تبدیل کرنے سے قاصر ہے۔

اگر کوئی بالغ النظر ہندوستانی سیاست اور سیاسی مجالس کا بغور مطالعہ کرے تو اس کو آج کل صرف دو قوتیں برسرِ پیکار نظر آئیں گی۔ ایک طرف تو یورپ کا سرمایہ دار تاجِ حکمرانی پہنے کشور کشایانہ جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ فرما نظر آئے گا۔ دوسری طرف ہندوستانی سرمایہ دار تمام ہتھیاروں سے مسلح نظر آئے گا۔

ہندوستانی سیٹھ جس حکومت برطانیہ سے سلطنت چھین کر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ حکومت نہیں ہے جو سابق اسلامی فرماں رواؤں کی طرح ہندوستان پر صرف حکومت کرنا چاہتی ہو۔ بلکہ وہ اپنی تجارت کا فروغ اپنی حکومت کا سب سے ضروری جزو سمجھتی ہے چنانچہ جس وقت ہندوستان کی تحریک مقاطعہ کے سبب سے لنکاشائر کے مال کی کھپت خطرے میں پڑتی ہے تو اُن کی چیخ و پکار سے ایوانِ حکومت لرز جاتا ہے

درحقیقت "حکمرانی برائے تجارت" گو آج کی متمدن دنیا کا ایک عام اصول ہے۔ لیکن اس کے باعث محکوم ملک کبھی مفلوک الحالی سے نجات نہیں پا سکیں گے۔ اور اسی سبب سے وہ ہمیشہ اپنے اجنبی حکمرانوں سے منحرف اور ان کے دشمن بنے رہیں گے۔

لیکن دوسرا گروہ یعنی ہندوستانی سرمایہ دار ابھی تک اس درجہ بے نقاب نہیں ہے۔ یہ لگاتار جماعت کچھ غیر سرمایہ داروں کو بہ طریقہ ہائے مختلف اپنے ساتھ ملائے ہوئے اور چہرہ پر وطن پرستی کی نقاب ڈالے، برابر انگریزی حکومت کی جڑیں کھودنے اور سوراج استوار کرنے میں مصروف ہے۔ اس کا نام کانگریس ہے، اس کی شاخیں لاانتہا ہیں، جمعیۃ العلماء ہند۔ آل انڈیا ہندو مہاسبھا، آریہ سماج، مسلم نیشنلسٹ، لبرل فیڈریشن، اچھوت اودھار منڈل، سکھ لیگ۔ اور متعدد اسی قسم کی دوسری جماعتیں۔ یہ سب اُسی ایک پیکر کی مختلف رخوں کی تصویریں ہیں۔ یہ سب یا ہندو جماعتیں ہیں، یا اُن کی ساختہ پرداختہ مجالس ہیں۔ ہندو سے مراد آج کل سیاسی طور پر صرف سرمایہ دار ہیں۔ جنھوں نے غیر سرمایہ دار ہندوؤں کو اس درجہ مرعوب کر لیا ہے کہ وہ بچارے اِن کے اشاروں پر کٹ پتلیوں کی طرح بالکل اس طرح گردش کرتے ہیں جس طرح مسلم نیشنلسٹ کانگریس کے اشارے پر، جو درحقیقت اس وقت سرمایہ دار ہندوؤں کی مرکزی قوت ہے۔

اِن نام نہاد وطن پرست، یا ہندو مہاسبھا کی طرح فرقہ پرست جماعتوں کے علاوہ ملک میں "خالص اسلامی" جماعتیں بھی ہیں۔ مثلاً مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء کانپور اور اسی قسم کی دوسری مجالس جن کے ارکان اس درجہ حکومت سے ارتباط رکھتے ہیں کہ اُنھیں "جی حضوری" کہنے میں لوگ حق بجانب ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اس وقت بدنصیب ہندوستان، دو سرمایہ داروں کی کشمکش کا جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ اور ہندوستانی نوجوان جس سے دونوں ایجنسیوں کو کام لینا پڑتا ہے ان کا زر خرید غلام بنا ہوا ہے جس کے باعث قربانی کا جذبہ معدوم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ جذبۂ خود غرضی کارفرما ہے۔

جذبۂ قربانی نے جب کبھی اپنا مظاہرہ کیا ہے تو وہ ہمیشہ ذاتی اغراض کو پس پشت ڈال کر خلقِ خدا کے فائدے یا خدائی احکام کی تعمیل کے لئے کیا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اُن جماعتوں کا جو سرمایہ پرستی سے دُور کا بھی واسطہ رکھتی ہوں اس سے تعلق ہونا ہی نہیں چاہیے۔ تاہم اگر کبھی بھی ایسا دعویٰ کیا گیا تو اُس کی تہ میں ہمیشہ ذاتی یا جماعتی اغراض پوشیدہ نظر آئیں۔ اگر ہندوستان کے اس دور سیاسی میں جس کے آغاز کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے، آپ صحیح قربانی دیکھنا چاہتے ہیں تو مسجد کانپور کے واقعہ کو دیکھئے۔ جہاں مسلمانوں نے قربانی کا سب سے پہلا مظاہرہ کیا۔

اور اس کے بعد جنگِ طرابلس و بلقان کے ایام میں بھی وہ مسلسل قربانیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ اور پھر تحریکِ خلافت میں جو جو مصائب مسلمانانِ ہند نے برداشت کئے وہ صحیح قربانی کہلانے کے سزاوار ہیں۔

اسی طرح تحریک عدم تعاون میں مسلمانوں کا گاندھی جی کے ایک اشارے پر علی گڈھ یونیورسٹی کو ویران کرنا۔ لڑکوں کا مدرسے چھوڑ چھوڑ کر تعلیم سے ہاتھ اٹھانا، ملازمتیں چھوڑنا اور جیل خانوں کو آباد کرنا یہ سب واقعات سچی قربانی کی داستان سے معمور ہیں۔

ہندوؤں نے بھی، جو تحریکِ عدم تعاون کے درحقیقت اصلی محرک تھے۔ اس وقت ہندوستان کی تاریخ میں نہایت شاندار قربانیوں کا مظاہرہ کیا۔ لیکن بنارس یونیورسٹی سے کاوا کاٹ کر نکل گئے۔ ملازمتیں اگر چھوڑیں تو دکانیں سنبھال لیں۔ وکالتوں کو اگر ترک کیا تو اس کا بھی نعم البدل حاصل کر لیا۔ لیکن مسلمان ملازمین! وکلا کی طرح مال و نمک کے مصائب برداشت کرنے کا انھوں نے اقدام نہیں کیا۔

کچھ بھی ہندوؤں کی سی قوم کے لئے جو صدیوں سے نہیں ہزاروں سال رسم و رواج اور ذات پات کی غلامی کے نیچے دبی پڑی تھی یہ بھی بہت تھا جو اس نے کیا۔

ان قربانیوں اور فداکاریوں کے کیا کیا اسباب تھے؟ ہندوؤں اور مسلمانوں نے یہ قربانیاں کیوں کیں؟ اگر یہ بات کھول کر نہ بیان کی جائے تو مضمون تشنہ رہ جائے گا۔

ہندو یقین رکھتے تھے کہ بقول مہاتما گاندھی سوراج ایک سال میں حاصل ہو جائے گا۔ انگریزی حکومت کا تختہ الٹ جائے گا۔ اور مسلمان اپنی اقلیت کے باعث خواہ بہ طیبِ خاطر خواہ بہ جبر اُن کی اکثریت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ وہ تمام منافعہ جو بیرونی سرمایہ دار ہندوستان سے کما کر لے جاتے ہیں۔ ہندوستانی سرمایہ داروں کے پاس رہے گا۔ (جو بیشتر ہندو ہی ہیں) نظامِ حکومت خواہ جمہوری ہو خواہ دستوری، ایسی حقِ رائے دہندگی کے اصول سے منتخب شدہ ممبروں کے ہاتھ میں ہو گا جو اس وقت رائج ہے جس کا نتیجہ ہندوستانی یا ہندو سرمایہ داروں کی حکومت کی صورت میں نکلے گا۔ اور تیس اکتیس کروڑ مفروض ہو کے ہندوستانی ہندوستانی سوراجیہ کی شان قایم کرنے کے لئے ان کے اشاروں پر ناچا کریں گے۔

لیکن مسلمانوں کے سامنے صرف ایک مقصد تھا، اور وہ یہ کہ اس دشمن سے جس نے ترکوں کو تباہ کیا۔ تمام اسلامی ممالک کی آزادیاں سلب کیں اور سلطنت

نہ جانے مبنی ہے، انتقام لیا جائے۔ اُن کو سمجھایا گیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی م ممالک اسلامیہ کی آزادی کے مرادف ہے۔ کیونکہ ہندوستانی روپیہ ہی ہندوستانی دی ہی اُن کی وہ اصل قوت ہے جو اُن کو ہر جگہ کامیاب بناتی ہے۔ مسلمانوں کی آرزو تھی کہ کسی طرح ترکی انگریزی گرفت سے نکل سکے۔ ہندوستان کی آزادی اور سوراج یہ سب ضمنی چیزیں تھیں۔ محض اس کے لئے کسی مسلمان نے قربانی نہیں کی تحریک خلافت میں بھی مسلمانوں کی شرکت محض اسی اور ہندوؤں کے ساتھ وضع داری نباہنے کے لئے تھی ورنہ تجارتی دباؤ سے حریف کو پریشان کرنا یہ بات نہ کسی مسلمان کے دماغ میں بھی پہلے آتی تھی اور نہ آج ہی یہ اُن کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت وہ ہی لاج اور بہبود سے زیادہ اسلام اور محاسن اسلام (ترکوں) کی بہبود اور فلاح کے خواہاں تھے۔ اس لئے اُن کی قربانیاں نہایت بلند معیار رکھتی ہیں اور وہ ہی قربانی کہلانے کی مستحق ہیں۔ ہندوؤں نے بھی جو مصائب اس وقت اٹھائے وہ بھی سچی قربانیوں کے واقعات ہی ہیں، مگر اُن میں وہ بلندی نہیں ہے جس کا مظاہرہ مسلمانوں نے کیا۔

مذکورہ قربانیاں کرنے والے نہ تنخواہیں لے کر جیلوں میں جاتے تھے نہ فرضی طور پر بیمار پڑ پڑ کر اے۔ بی کلاس کے دعاوی کرتے تھے۔ اُس دَور میں بہت بڑی تعداد اُن مجاہدین کی تھی جو خود تو جیلوں میں بند ہوتے تھے اور اُن کے بیوی بچے فاقے کرتے تھے۔ یا کسی قسم کی امداد اُن کو نہ ملا کرتی تھی۔ اور ایسے بھی تھے جو سارے ہندوستان کے دورے اپنی ہی گاڑھی کمائی سے کیا کرتے تھے۔

لیکن کیا آج بھی وہی حالت ہے؟ یا کیا آج ہندوستان کا کوئی بھی بڑے سے بڑا لیڈر وہی قربانی کر رہا ہے جو اُس زمانے میں بعض نے نہیں عام طور پر سب لوگوں نے کی تھی۔ افسوس ہے کہ ایسا بندۂ خدا اب نکلنا مشکل ہے۔ وہ لوگ یا تو مر گئے یا اشتہار زدہ تحریکات سے بد دل ہو کر گوشہ گیر ہو گئے۔

جب ہم مسلمانوں کے طبی وفد کو دہلی سے ترکی کے لئے روانہ ہونے کا منظر یاد کرتے ہیں، اور جب ہم لاہور کی شاہی مسجد کا وہ تاریخی منظر یاد کرتے ہیں جس میں کھڑے ہو کر اقبال نے درگاہِ الٰہی میں طرابلس شہداء کے خون کی نذر گزرانی تھی تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے زعمائے والا شان سرمایہ داروں کے دستر خوان کے چند ٹکڑوں کی خاطر "بجا" اور "درست" کہہ کر اپنی زندگی گزار رہے ہیں تو وہی سر خاکِ مذلت پر گر پڑتا ہے اور ہمت نہیں ہوتی کہ اُسے قیامت تک بلند کیا جائے۔

آخر اس ترقی معکوس کے کیا وجوہ ہیں؟ کہ آج کوئی ہندو یا مسلمان خدمت وطن یا خدمت قوم و ملت کے لئے بغیر معاوضہ آمادہ نہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ؟ کہ ایک مسلمان مسلمانوں کے اعلیٰ ترین مقصد کے خلاف جدوجہد کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور وہ کوئی معمولی مسلمان نہیں ہوتا بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک مسلّم لیڈر ہوتا ہے جس کی گذشتہ قربانیوں کی طویل داستان سننے کی چیز ہے۔ ہمارے خیال میں تبدیلی کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی مہاجن بنیوں کی ایک دوکان یا تجارتی کوٹھی بن کر رہ گئی ہے۔ جہاں سے ہر لوزر ایشدا اور جگہ لیس چند روز کو ملازم رکھا جا سکتا ہے۔ اور وہ پیٹ اور پوزیشن کی خاطر اپنا ایمان اپنی عزت سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ انگریزی سرمایہ دار کی دوکان کی تباہی کے لئے جس سے ہندوستانی سرمایہ دار کی دوکان فروغ پکڑ سکتی ہے یہ جماعت معقول سرمایہ لگاتی رہی ہے۔ جو کانگریس کی سب کمیٹیوں یعنی مختلف نام کی مجالس کے توسط سے لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ وہ انگریزی مال پکٹنگ کریں، اور سول نافرمانی کر کے جیل میں جائیں۔ اخباروں کو روپیہ دیا جاتا ہے کہ وہ سوئی کا پھاوڑا بنائیں، اور مقابل کی دکان کی ساکھ بگاڑیں۔ نیز ہندوستانی دوکان کے لئے اعتماد پیدا کریں۔ غرضیکہ ایک تجارتی مقابلہ ہے جس میں ہندوستانی نوجوان قیمت دے کر خریدا جاتا ہے۔ اور اس سوداگرانہ جنگ آزادی کا ہی یہ انجام ہے کہ کوئی نوجوان آزادیٔ وطن یا فلاحِ ملت کے لئے بغیر معاوضہ کوئی خدمت انجام دینے کے لئے تیار نہیں، اور اگر کوئی بد نصیب کارکن بساپید ابھی ہو جائے تو شک آمیز تقریریں، اور طعن انگیز فقرے اُس کو قربانی سے علیحدہ رکھتے ہیں، اور وہ گوشہ گیر ہو جاتا ہے۔ اُس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور ایسے کارکن منظر عام پر رہ جاتے ہیں۔ جو محض اپنی غرض کے لئے ہر خدمت کی انجام دہی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کبھی وہ ہندوستانی دوکان کے ایجنٹ ہوتے ہیں اور کبھی انگریزی دوکان کے۔

ہندوؤں کی تمام نام نہاد قومی مجالس سرمایہ داروں کے ہاتھوں سے چلتی ہیں۔ اس لئے اُن کے آمد و خرچ کا پتہ لگنا یا مشتہر ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ اگر صحیح حالات کا پتہ عوام کو ہو جائے تو خواہ وہ کیسے ہی زہر آلود ہو چکے ہوں لیکن مجلس (دوکان) کی ہوا اکھڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہو بھی چکا ہے! لیکن اسلامی مجالس یعنی اُن دوکانوں کے واقعات (جو ہندوستانی یا انگریزی سرمائے سے چلتی ہیں) اکثر دنیا کے سامنے آتے رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عامۃ المسلمین کا ہر رکن کو بلا امتیاز و تحقیق، ہر وقت بے ایمان، لیڈر، ہندو سرمایہ دار کا غلام یا

انگریزی حکومت کا دلال سمجھے بیٹھے ہیں۔ اکثر اسلامی سیاسی مجالس جو قوم پرستی یا وطن پرستی کا دعویٰ کرتی ہیں ایسی ہیں، جو کثیر اخراجات اپنے ذمّہ رکھتی ہیں، اُن کے دفاتر بھی ہیں۔ دفاتر کا خرچ بھی ہے۔ اُن کے کارکن ریلوں اور موٹروں میں دورے بھی کرتے ہیں۔ بعض ہیں کہ جو رضا کاروں کو معاوضے دے دے کر جیل بھی بھجواتی ہیں۔ ایک کے سوا سب ایسی ہیں جن کو کئی سال سے کوئی امداد مسلم طبقے سے نہیں ملی ہے یا خود انھوں نے کوئی چندہ بھی نہیں کیا ہے۔ پھر آخر یہ چلتی کس طرح ہیں؟ اس کا جواب اُن کی طرف سے ملنا مشکل ہے۔ اسی لئے وہ عوام کا اعتماد کھو چکی ہیں اور دنیا نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہندوستانی سرمایہ داروں کی جماعت مرکزیہ کی چھوٹی بڑی شاخیں ہیں اور کچھ نہیں۔

اب رہیں وہ مجالسِ اسلامی جن کا کام صرف قراردادیں پاس کرنا ہے اور بس۔ وہ عموماً وزرائے حکومت کی ساختہ پرداختہ ہیں۔ یا اُن کے اثرات کے قایم کرنے کے لئے قایم ہیں۔ نہ اُن کو قوم کی نمائندگی حاصل ہے اور نہ اُنھیں کوئی مسلمان مخلص ہی سمجھتا ہے حکومت کی نظروں میں رسوخ حاصل کرنا اُن کے ارکان کی سب سے بلند آرزو ہے۔ جس کے لئے وہ برابر ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنیکی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اور وہ شرمناک حرکات کی جاتی ہیں جو ہر قوم کے لئے باعثِ عبرت ہیں۔ چنانچہ گزشتہ سال جو مسلم لیگ کے ممبروں نے تماشے دکھائے ہیں وہ کچھ کم قابلِ افسوس نہیں ہیں۔

کانگریس کمیٹی کی مرکزی جماعت یا صوبہ واری مجالس میں گو چند غیر سرمایہ دار شخصیتیں آپ کو نظر آسکتی ہیں، جو سرمایہ داروں کی ہاں میں ہاں ملانے اور کانگریس کو ملک کی نمائندہ جماعت قرار دینے کے لئے ہیں۔ لیکن اگر آپ تفصیل میں جائیں اور اضلاع کی کمیٹیوں اور اُن کے کارندوں کو دیکھیں تو آپ کو ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جس کے متعلق دعویٰ کیا جاسکے کہ وہ غیر سرمایہ دار ہے یا وہ سرمایہ داروں کے زیر اثر نہیں ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ ہر تحصیل اور ضلع کی مجلسِ تجارت، اور کانگریس کے ارکان اکثر مشترک ہوتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے متعلق محض اس واسطے تصفیہ نہیں ہوتا کہ یہ بات سرمایہ داروں کے اغراض کے منافی ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ فرقہ وارانہ دورنگی کے ہوتے ہوئے جو ہندو، ہندو سرمایہ داروں سے اور مسلمان مسلمان سرمایہ داروں سے لپٹے رہتے ہیں۔ علیحدہ ہو کر سرمایہ داری کی کسی مخالف تحریک میں نہ شامل ہو جائیں، جن سے سرمایہ داروں کی قوت ختم ہو سکتی ہے چنانچہ تحریک شدھی کی علم برداری اور مخالفت کے لئے یہی جماعت برسرکار نظر آتی ہے۔

اور یہ سب کانگریسی ہی ہوتے ہیں، اِن تحریکات میں بھی روپیہ اپنی خدائی دکھاتا ہے۔ اور جس وقت وہ ختم ہو جاتا ہے تو سارے جھاشے اور مولانا اپنے گھروں کا راستہ لیتے ہیں۔ کسی کے ہاں تعمیرِ جدید کا پھیلاؤ پھیل جاتا ہے اس لئے وہ معذوری ظاہر کرتے ہیں۔ کسی کی اماں جان بے وقت داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیتی ہیں۔ اور وہ بسورتے ہوئے اُس عظیم الشان مقصد کو خیرباد کہتے ہیں۔ غرض بالکل وہی حال ہوتا ہے جو کانگریس کا حال ہی میں ہوا کہ جب ہندوستانی مالکان کارخانہ ہائے پارچہ بافی نے انگریزی سوداگروں سے سمجھوتہ کر لیا۔ اور وہ گراں قدر رقومات جو وہ کانگریس کو ملکی کپڑے کی ترویج کی خاطر دیتے تھے بند ہوگئیں۔ تو سارا کانگریسی نظام بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔

غرض ہندوستانی نوجوان کو خودغرض اور طامع بنانے میں کانگریس کمیٹی نے گزشتہ چند برسوں میں وہ عظیم الشان کام انجام دیا ہے جس کو ہندوستان کی غیر ملکی حکومت شاید دو سو سال میں بھی انجام نہ دے سکتی۔ گو یہ کہنا بھی بہت حد تک صحیح ہے کہ وہ تمدّن اور تہذیب جس کی لہریں اُمنڈ اُمنڈ کر یورپ کے سمندروں سے آتی ہیں۔ ہندوستان میں خودغرضانہ جذبات کے رواج دینے میں اور قربانی اور فداکاری کا خاتمہ کرنے میں مدّت سے لگی ہوئی تھی، اور اُس نے اپنا بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے۔ لیکن جس سرعت کے ساتھ اور جس وسیع پیمانے پر کانگریس کے طریق کار نے ہندوستانی نوجوان کی فدائیت کو فنا کیا ہے اس کا مقابلہ یورپ کے اثرات سے کرنا مضحکہ خیز ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اِس زہرباد کا جو ہندوستان کی رگوں میں سرایت کر گیا ہے کس طرح ازالہ کیا جاسکتا ہے، اور اُس غلامانہ خودغرضی کو کس طرح دفع کیا جاسکتا ہے۔ جو ہندوستان میں کانگریس کمیٹی کی شاخوں نیز اُس کی مخالف جماعتوں کے تصادم کی یادگار ہے۔ کیونکہ وہ تصادم اب ختم ہوتے نظر آرہے ہیں، اور کانگریسی جماعت عنقریب حیرت انگیز کروٹ لینے کی طیاری کر رہی ہے جس کے بعد اس کا کسی سے تصادم ممکن ہے کہ ممکن ہی نہ رہے۔ تاہم وہ اثرات جو مرتب ہو چکے ہیں موجود ہیں، اور ہندوستان کی ساری روزمرہ کی زندگی میں تباہ کاری پھیلا رہے ہیں۔؟؟

شاعری میں درسِ عمل کی تلاش

یہ نظم میرے نہایت عزیز اور محبوب دوست حضرت آخر لکھنوی کی فکرِ گہر بار کا نتیجہ ہے جہاں تک زبان، بندش اور شاعرانہ خوبیوں کا تعلق ہے اس کی داد نہ دینا سراسر ظلم اور بے انصافی ہے، لیکن یہ نظم جس نوع کی حامل ہے اُس سے مجھے قطعی اختلاف ہے، جیسے کسی قدر مجمل طور سے اس نظم کے آخر میں ظاہر کر دیا گیا ہے

رُوحِ الہام مدد، ذہنِ پُر اسرار مدد — کلکِ خوش کار مدد، فکرِ گہر بار مدد

جوہرِ نطق مدد، طبعِ فسوں کار مدد — مرحلہ سخت ہے اے دیدۂ بیدار مدد

نقش جو ہے مرے دل پر وہی تحریر کروں

صدق سے کذب کو بھولے سے نہ تعبیر کروں

شاعری کیا ہے؟ وہ فطرت کی زبانِ شیریں — سیکھنے اور سکھانے سے جو آتی ہی نہیں

اُس طرف سے جو نہ ہو بارشِ دُرہائے ثمیں — نوکِ خامہ سے نہ ٹپکے کبھی شعرِ رنگیں

مشغلے اور ہیں، گر قصد نہ اِس وادی کا

شاعری نام نہیں وقت کی بربادی کا

میں نے مانا کہ تجھے نظم کی قدرت بھی ہے — یہ تو کہہ طبع میں رفعت بھی ہے، جدّت بھی ہے؟

تربیت یافتۂ دامنِ فطرت بھی ہے؟ — دِل ترا خلوتیِ رازِ حقیقت بھی ہے؟

یہ نہیں ہے تو پھر اشعار میں تاثیر کہاں؛

آتشِ تیز کہاں! شعلۂ تصویر کہاں!

شاعری اصل میں کیفیتِ وجدانی ہے — تو سمجھتا ہے فقط لذتِ نفسانی ہے!

یا گدایانہ امیروں کی ثناخوانی ہے یاد رکھ، یاد رکھ، انجام پشیمانی ہے
فکرِ شہرت ہے اگر، اور ندامت ہوگی
اپنی اوقات سے اک دن تجھے نفرت ہوگی

درحقیقت ہے اگر شعر کا جوہر تجھ میں شکر کر، جلوۂ صد رنگ ہے مضمر تجھ میں
محو ہے نورِ سحر، تابشِ اختر تجھ میں بستے ہیں حُسن کے انفاس معطر تجھ میں
معجزہ ہوگا ترا شعر مسیحائی کا
رُوح کو دے گا جو پیغام توانائی کا

شاعری ہدیۂ فطرت ہے، مگر فن بھی ہے کچھ اصول ایسے ہیں جن پر اسے قدغن بھی ہے
باغبانی کے لئے حاجتِ گلشن بھی ہے طائرِ قدس کو درکار نشیمن بھی ہے
ابتدا ہوتی ہے اس جا سے زباں دانی کی
لفظ و تخئیل نے مل کر ہی جہاں بانی کی

برمحل صرف ہو الفاظ کا، تخئیل بلند استعارے جو دل آویز ہوں، تمثیل بلند
لفظ و معنی کے توازن سے ہو تکمیل بلند خسروِ شعر کے ہو فرق پہ اکلیل بلند
کچھ تصنع کو ہو دخل اور نہ آورد کو دخل،
مئے سرجوش میں جس طرح نہیں دُرد کو دخل

کوئی خامی نہ ہو انداز کی شیوائی میں نقص رہ جائے نہ مضمون کی رعنائی میں
خونِ تخئیل نہ ہو قافیہ پیمائی میں رنگ بھرتا ہے کوئی لالۂ صحرائی میں

سادگی وہ ہو، بھی جائے نزاکت جس پر
تازگی وہ ہو کہ گُل کھائے لطافت جس پر

جن کی خواہش ہے کہ ہر شعر ہو پیغامِ عمل اُن کی مشکل ہے عجب عقدۂ مالاینحل
وونِ ہمت کا ہو الفاظ سے کیا خاک تدل گرم اشعار سے کُھلتا ہے کہیں پنجۂ شل
کام کرنا ہے جنھیں، کام کیا کرتے ہیں؟
کُتبِ شعر سے یا درس لیا کرتے ہیں؟
پیش کرتے ہیں مثالیں عرب و یوناں کی جیسے اُن میں بھی نہ تھا جذبۂ قومی باقی!
جیسے اُن میں بھی تھی مضبوط ارادوں کی کمی جیسے اُن کی بھی طبیعت میں تھی راحت طلبی!
کلفتِ دل کا سبب قید تھی دیواروں کی
ماں کی لوری اُنھیں جھنکار تھی تلواروں کی
جو ہوں سادنت وہ اوروں کے اُبھارے سے لڑیں نغمۂ چنگ و دَف و نَے کے سہارے سے لڑیں!
جو صفیں اُلٹیں، وہ عورت کے پکارے سے لڑیں دھنی تلوار کے ابرو کے اشارے سے لڑیں!
بندہ پرور یہ حقیقت ہے تو بزدل تھے عرب
ورنہ کیوں عورتوں سے جوش کے سائل تھے عرب
وہ جَری تھے، زن و فرزند بھی تھے اُن کے جَری کوئی غیرت اُنھیں دلوائے، ضرورت ہی نہ تھی
ایک دل، ایک زباں، ایک ہی منزل سب کی سَیل کی طرح بڑھے، سیدھ جدھر کی باندھی
مشغلہ یہ بھی دمِ جنگ رہا کرتا تھا،
کوئی گاتا تھا، رجز کوئی پڑھا کرتا تھا،

سنئے یونان کی اب ایک لڑائی کا حال اہلِ فارس سے ہوا گرم جو میدانِ جدال
فتح فارس کی ہوئی، اُن کو ہوا سخت ملال کیوں کہ جرأت میں تھا اسپارٹا آپ اپنی مثال
لکھا ایتھنس کو سامان نہ لشکر بھیجو،
ہم کو لڑوائے جو ترتیب سے افسر بھیجو،

ٹرٹس شہرۂ آفاق جو شاعر تھا گیا وہ اپاہج تھا، لڑائی سے اُسے مس ہی نہ تھا
ہو کے آزردہ و مایوس، یہ آپس میں کہا ہم نے مُنہ پھوڑ کے کیا مانگا تھا اور کیا پایا
طیش کھاتے رہے، بکتے رہے، خاموش ہوئے
جنگ درپیش تھی، یہ صدمے فراموش ہوئے

آخرِ کار لڑائی کا جو ہنگام آیا: نظم پڑھ کر اُنہیں شاعر نے اُبھارا ایسا
صاعقہ بن کے ہر اک فوجِ مخالف پہ گرا، فتح جب تک نہ ہوئی مُڑ کے نہ پیچھے دیکھا
ہاتھ میدان رہا، خرم و دل شاد پھرے
جن کو اندیشہ غلامی کا تھا، آزاد پھرے

ملک کے واسطے مرنے سے نہ ڈرتا تھا کوئی تیغ کے گھاٹ اُترنے پہ تھے آمادہ سبھی
شاعری کی جو کرامات تھی بس اتنی تھی اُن میں تنظیم کی خامی تھی، وہ پوری کردی
اپنے کس بل پہ جو اُن کو نہ بھروسا ہوتا
فوج کی فوج، کہ اک شخص بُلایا ہوتا؟

حالی و اکبر و اقبال نے کیا کیا نہ کہا، نوحے کا، طعنے کا، شکوے کا اثر کچھ بھی ہوا؟
جوش نے نعرۂ مستانہ سنایا تو کیا؟ بے حسی ہے وہی، انداز وہی غفلت کا
آپ تو شعر سے کھوئی ہوئی غفلت مانگیں
دو گھڑی کو بھی نہ ہم غم سے فراغت مانگیں

اثر لکھنوی

اثر صاحب فرماتے ہیں شعر قوموں کو اُبھارنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔
لیکن پھر خود ہی عرب اور یونان کے اُن واقعات کا ذکر فرماتے ہیں جن سے تاریخی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ شاعری قوموں کو کیوں کر زندگی کا پیام بخشا کرتی ہے۔
اثر صاحب اس کی توجیہ یوں فرماتے ہیں کہ عرب اور یونان جوانمرد تھے ی سے شعر نے انھیں اُبھار دیا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ یہاں تک تو اثر صاحب د پر وہ یا غیر ارادی طور پر میرے ساتھ ہیں کہ اگر کوئی قوم مرد اور غیور رہے تو شعر اُسے اُبھار سکتا ہے۔ لیکن اُن کی نظم کا عام لہجہ اس کی بھی نفی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اور یہ نظم اجتماع ضدین کا ایک نمونہ بن کر رہ گئی ہے۔
میرے نزدیک شاعری سے زیادہ قوموں میں زندگی پیدا کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے، اور ہندوستان اس نقطہ نظر سے کہ جہاں وبا کا زور ہو وہیں سب سے زیادہ طبیب کی ضرورت ہے۔ اور جہاں ہر طرف خزاں نے ہی خزانے ہوں وہیں سب سے زیادہ نار جرس کی احتیاج ہوتی ہے۔ اس وقت اس کا سب سے زیادہ محتاج ہے کہ یہاں کے شعرا گل و بلبل چھوڑ کر قوم کے بیدار کرنے میں مصروف ہو جائیں۔
شعر سب سے زیادہ اثر انگیز چیز ہے، اور جب ایک لگتی ہوئی بات کا دل پر اثر ہوتا ہے تو شعر کا کیوں نہ ہوگا۔ شعر تو وہ چیز ہے کہ:۔

چاہے تو زہر سے اُڑنے لگیں شرار
گلبرگِ تر کے بطن سے پیدا ہو ذوالفقار
آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگے شراب
پیری کی ہڈیوں میں چھلکنے لگے شباب
خود موت سے حیات کے چشمے اُبل پڑیں
قبروں سے سر کو پیٹ کے مُردے نکل پڑیں

بلاستان

یہ جا کر کوئی کہہ دے مغربی کشور کشاؤں سے
کہ ہے بے سود اُلجھنا ربِّ اکبر کی قضاؤں سے

بہا لے جا چکی ہے بارہا باطل کو رَو جس کی
وہ دریا پھر برسنے کو ہے بطحا کی گھٹاؤں سے

نجاشی کے وطن پر سایۂ لطفِ پیمبر ہے
نہ ٹکراؤ بلاستان کی کالی بلاؤں سے

اثر پھر چھننے والا ہے محمد کی دعاؤں کا
"عدووا" کی طرح "ادیس ابابا" کی فضاؤں سے

ہلا دی تھیں جنھوں نے رومۃ الکبریٰ کی بنیادیں
مسولینی کی ٹکر ہے پھر اُن تیغ آزماؤں سے

زمیں کردی گئی تھی تنگ جن کی ترکتازی پر
اماں اب مانگی جاتی ہے انھیں کوتہ قباؤں سے

عرب کا اور عجم کا رشتہ ربِّ کعبہ نے جوڑا
بغل گیر آشنا پھر ہو رہے ہیں آشناؤں سے

گدا نے شاہ کو ہر مرتبہ نیچا دکھایا ہے
ہوئی ہے جب کبھی شاہوں کی آویزش گداؤں سے

سلیقہ سیکھنا ہو بم گرانے کا نہتوں پر
تو جا کر سیکھ لو یورپ کے جنگی دیوتاؤں سے

وہ نافرجام بیڑا ڈوبنے سے بچ نہیں سکتا
خدا کا ساتھ چھوٹا جس کے خود بیں ناخداؤں سے

"احسان"

(مولانا) ظفر علی خان

نغمۂ بیداری!

دیوانہ مصطفیٰ آبادی

اے مسافر! جاگ
اپنے خوابِ غفلت سے ہوشیار ہو جا
دیکھ، ریل گاڑی کے آنے کا وقت قریب آگیا
اور سُن، اسٹیشن کے قریب بجنے والی سیٹی کی آواز آرہی ہے
اس سرد پتھریلی زمین سے اُٹھنے کا وقت ہو گیا
اس ٹین کی ٹھنڈی چادر کے بدن کپکپا دینے والے سایہ سے باہر نکل آ،
اے مسافر، جاگ
گاڑی اسٹیشن پر آ گئی۔ کاہل نہ بن
اُٹھ اور بھاگ، کہ گیا وقت ہاتھ نہیں آتا
جاگ، کہ یہ وقت ہے بیداری کا!!

اے پرستیدۂ مذہب، بیدار
اپنے مذہب کو اپنے تک محدود رکھ
تو اپنی راہ چل، دوسرے کو اپنی راہ جانے دے۔
اُس کی طرف ہاتھ بڑھا، لیکن اُس کو اپنے راستہ پر کھینچنے کی سعی ہنگامہ خیز نہ کر،
اپنے جیسے انسانوں سے محبت کر
کہ مذہب آپس میں بَیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ پھر خدا تجھ سے محبت کرے گا،
اے پرستیدۂ مذہب، بیدار
اختلافات کے ختم کرنے کا وقت آگیا، متعصب نہ بن،
ہند کا شکوہ و آرام، آزادی و بیداری تیرے بے معنی تعصب کا شکار
ہو رہی ہے۔
رواداری و اتحاد سے کام کر،
بیدار، کہ یہ زمانہ ہے رواداری کا،

اے مردِ جوان، ہوشیار
کام کرنے اور غلامی سے نجات پانے کا وقت آگیا
کامیابی کا پھریرا دُور فضا میں لہرا رہا ہے
سماج کے بندھنوں کو توڑ دے، دلِ محبت طلب کے کہے پر نہ جا،
قوم تیری راہ تک رہی ہے
اپنے شبستانِ راحت سے ایک ہندی جوان کے عزمِ آہنی کا زرہ بکتر پہنے باہر نکل آ۔
اور آزادی کے اس سنہرے جھنڈے کو ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں پر نصب کر دے۔
اے ہندی جواں مرد، ہوشیار
کہ سونے کا وقت ختم ہو چکا، بزدل نہ بن
عمل کر، کہ زرّیں موقعے بار بار نہیں آیا کرتے
ہوشیار، کہ یہ عالم ہے بیداری کا۔

(طبعزاد)

انشائے لطیف پر ایک نظر

(از اثر لکھنوی)

حضرت لطیف الدین احمد یا آل احمد اکبرآبادی اُن گنتی کے لوگوں میں ہیں جنھوں نے مغربی ادبیات سے متاثر ہو کر نثر اُردو میں دلکشی و رعنائی قائم رکھتے ہوئے غلامانہ و کورانہ تقلید کے بجائے شانِ انفرادیت پیدا کی ہے اور زبان کی حدوں میں رہنے کے باوصف ذخیرۂ خیالات میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اُنھوں نے محض نئے نئے خیالات کے پودے اُردو کے باغ میں خوش سلیقگی سے نصب نہیں کئے بلکہ اُسے جھاڑ جھنکاڑ سے بھی پاک صاف کیا۔ مزید مسرت کا باعث یہ امر ہے کہ تراش خراش، نفاست اور البیلا پن صرف زبان اور اسالیب بیان پر ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ میدانِ تخیل میں بھی کارفرما ہے، اور یہاں بھی سلاستِ مذاق و جودتِ طبع نے وہی گل کھلائے ہیں۔

ہمارا ذوق ابھی اتنا وسیع نہیں ہوا ہے کہ عشق و محبت کے علاوہ انسانی جذبات و محسوسات کے دوسرے بے شمار مظاہروں اور رجحانات کا تجزیہ افسانے کی صورت میں پیش کریں یا انسان کے ماسوا دوسری ذی حیات مخلوق کی زندگی کا مطالعہ کر کے دلکش پیرایہ میں منتقل کر دیں۔ بڑی ہمت کی تو انگریزی افسانوں پر چھاپہ مارا۔ اس کی ٹانگ توڑ دی اُس کی گردن مروڑی۔ چلئے ایک جاسوسی کا افسانہ ترتیب پا گیا اور "شستہ سے" اور "دلچسپ" کہہ کے شائع کر دیا گیا! پبلک میں اتنی بیداری پیدا نہیں ہوئی ہے کہ اُن افسانوں کی قدر کرے اور بنظرِ استحسان دیکھے جن میں کردار کی تخلیق یا نفسیاتی تحلیل و تعبیر ہے۔ اس شاہراہ میں بھی آل احمد صاحب نے قدم اُٹھایا ہے اور ایک حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ موصوف کے اُن افسانوں کا مجموعہ جو ۱۹۲۲ء و ۱۹۳۵ء کے مابین لکھے گئے "انشائے لطیف" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اُن کی تعداد ۱۵ ہے جس میں گیارہ طبعزاد اور چار ایسے ہیں جنھیں لطیف صاحب نے "مختار" کہا ہے۔ یعنی اُن کے پلاٹ کا کوئی جزو مستعار ہے۔

ناقد کی حیثیت سے کہنا پڑتا ہے کہ بیشتر افسانے ایسے ہیں جن میں آرٹ کی تکمیل میں کوئی نہ کوئی خامی رہ گئی ہے۔ غالباً اس کی یہ وجہ ہے کہ افسانے مصنف کی ابتدائی مشق کا نمونہ ہیں۔ جب خیال میں پختگی نہ طرزِ تحریر میں اعتمادی و اجتہاد کی شان پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کا احساس مصنف کو بھی ہے اور "معروضہ" کے تحت میں فرماتے ہیں کہ

"اِن بارہ تیرہ سال کی تحریروں میں میں نے لفظی تصحیح کے علاوہ کوئی خاص تبدیلی نہیں کی ہے کیونکہ میرے خیال میں ادبی دیانت کا مقتضا یہی ہے"

دل چاہتا ہے کہ اس مجموعے کے تمام افسانوں پر مسلسل نقد و تبصرہ کیا جائے مضمون کی ابتدا پہلے "مختار" افسانے یعنی "سمنستان کی شہزادی" سے کرتا ہوں۔

افسانے کی نوعیت ایسی ہے جس کو انگریزی میں فین ٹے سی (PHANTASY) کہتے ہیں اُس کے لئے کوئی اردو لفظ اس وقت ذہن میں نہیں آتا مگر مفہوم یہ ہے کہ ایسا فسانہ جس کا پلاٹ عجیب اور ایک گونہ مافوق الفطرت ہو۔ قصّے کا خاکہ بس اتنا ہے کہ ایک بادشاہ کے محل میں ایک حسین لڑکی تولد ہوتی ہے ایک بدنفس عورت جو دوسرے ملک کی شہزادی ہے پیشینگوئی کر کے خوشی پر پانی پھیر دیتی ہے کہ لڑکی ایک باغبان زادے کے گھر جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر دراصل باغبان زادے کے بھیس میں ایک جلیل القدر شہزادہ ہے۔ آپ نے ملاحظہ کیا پلاٹ کچھ بھی نہیں ہے اور گھرے

چاہیئے تو صرف اس قدر رہ جاتا ہے کہ علی الصباح بیلی کا پھول کھلا! مگر عبارت کی دلکشی و نزاکت و ندرت نے افسانے کو لٹریچر کی "ملکۂ سنبر" بنا دیا ہے۔ بخوفِ طوالت صرف ایک دو اقتباس پیش کروں گا۔ کہتا یہ ہے کہ شہزادی صبح صادق کے وقت پیدا ہوئی

"اس ساعت میں جب گلاب کی پنکھڑیاں کھلنے لگتی ہیں، اُس لمحے میں جب کلیاں ایک جرعۂ نسیم کے عوض اپنا جامۂ احرام اُتار ڈالتی ہیں، اور ٹھیک اُس وقت جب ستارے اس محشرِ رنگ و نور کا تماشا دیکھکر آخری کرنیں نچھاور کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں شہزادی سنبر نے اس عالم میں قدم رکھا تھا"

اگر یہ عبارت محض ترجمہ ہے تو مترجم کامیاب ترجمے پر تحسین کے مستحق ہیں اور اگر خود اُنھیں کے صنّاع دماغ کی پیداوار ہے تو قلم و اُردو کی ہر فرد کو اس "ملکۂ ادب" کی تخلیق پر اُن کو مبارکباد دینا چاہیئے کیونکہ عبارت کی لطافت و رنگینی کے علاوہ حاصل اس قدر اچھوتا ہے کہ زبان تعریف سے قاصر ہے۔ گلاب کی شگفتگی کلیوں کی بانکی اور بے ساختہ جامہ زیبی پھر ستارہ جامہ دری اور نجومِ سحر کی نور بیزی کو صبح کے دھندلکے میں فطرت کے جادوگر نے امتزاج دے کر ایک شنگرف مرقعِ حسن و جمال و نزاکت ترتیب دیا جس کا نام "ملکۂ سنبر" ہوا! آرٹ کا کمال یہ ہے کہ تصویر دھندلی ہے خطوط غیر متعین ہیں، تاہم نقش اس قدر شوخ رنگین اور پُرکیف ہے کہ آدمی بغیر جھومے نہیں رہ سکتا۔

واقعہ کے مناسب ماحول بھی قائم کر دیا گیا تو ایسی شہزادی کی پیدائش باعث حیرت نہیں رہتی۔

"یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تمام ولائت سمنستان میں کوئی شخص کام نہ کرتا تھا اور وہاں کے باشندے صفحۂ عالم پر سب سے زیادہ خوش باش اور عشرت پرست تھے۔ سیر و تماشا اُن کا مقصودِ زندگی اور کچھ نہ کرنا ہی اُن کا کام تھا اُن کا بس یہی شغلہ تھا کہ باغوں میں جا کر (اور سمنستان کا چپہ چپہ باغ تھا) رقص کرتے اور جب خستہ و مضمحل ہو جاتے تو گلاب کے بچھے ہوئے پھولوں پر گر پڑتے، اپنی گودوں کو اُن سے بھر لیتے اور پھر تازہ دم ہو کر صرفِ رقص ہونے لگتے"

"یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے" ایسا شوخ مگر معصوم جھوٹ ہے جسے انگریزی میں "نئے ویٹ" (NAIVETE) کہتے ہیں۔ عبارت کا آخری جملہ "پھر تازہ دم ہو کر صرفِ رقص ہونے لگتے" ایک لحاظ سے محلِ نظر ہے اور ایک لحاظ سے اُس احتیاط و کاوش کا پتہ دیتا ہے جو لطیف صاحب نے انتخابِ الفاظ میں کی ہے۔ بادی النظر میں اس کی جگہ "پھر تازہ دم ہو کر مصروفِ رقص ہوتے" بہتر معلوم ہوتا ہے مگر جب یہ مقصد ادا کرنا ہو کہ رقص میں جان کھپاتے۔ ہلکان ہوتے تو جس طرح تحریر ہے بالکل درست ہے۔ سیاقِ عبارت بھی موخر الذکر مفہوم کی تائید کرتا ہے۔

لطیف صاحب نے ایک جگہ "پاؤں، پاؤں، صندل کے پاؤں" لکھا ہے، خبر نہیں کہ اکبرآباد کا روزمرّہ کیا ہے مگر لکھنؤ میں عورتیں اس موقع پر "مِیّوں، مِیّوں، صندل کی مِیّوں" بولتی ہیں[1]۔

پلاٹ صرف ایک جگہ کمزور نظر آیا اور غور کرنے پر بھی کوئی توجیہ سمجھ میں نہ آئی۔ یہ مقام وہ ہے جہاں دایہ نے بھونرے کے مارنے کو دربارِ شاہی کی تاریخ اٹھائی مگر بھونرے کی طرف پھینکنے کے بجائے پڑھنا شروع کر دیا۔ اوّل تو ایسی اہم کتاب کا الماری یا کتب خانے یا خزانے کے بجائے میز پر رکھا ہونا ہی خلافِ قرینہ ہے، پھر اس کتاب کو اُٹھاتے ہوئے بھونرے پر کھینچ مارنا بھی عام طرزِ عمل کے خلاف ہے۔ علاوہ بریں ایسے ملک میں جہاں کے باشندے رقصِ مسلسل میں بسر کریں، تاریخ سے گھبرائیں کسی دایہ کا پڑھا لکھا ہونا کچھ لگتی ہوئی بات نہیں۔ اسی طرح جس وقت دایہ باغبان کے لڑکے کو شہزادی کی موجودگی میں نکال باہر کرتی ہے۔ شہزادی کی خاموشی فطرت کے مطابق نہیں معلوم ہوتی شہزادی کم سن ہے اُسے ضد کرنا، رونا مچلنا چاہیئے تھا کہ باغبان کا لڑکا نکالا نہ جائے۔ غرضکہ شہزادی کی موجودگی میں باغبان زادے کا اس طرح دُتکار دیا جانا اور شہزادی کا کچھ نہ بولنا افسانے کی دلکشی اور خوبیٔ تعمیر میں حارج ہے۔ انتظام کیا جاتا ہے کہ باغبان زادے کے بجائے کوئی شہزادہ کھیلنے کو روزمرّہ آیا کرے شہزادی باغبان زادے کی جُدائی پر آنسو بہاتی ہے۔ مگر کچھ وقت گزر جانے کے بعد۔ کم سے کم جس طرح افسانے کی ترتیب ہے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔

ایک جگہ لطیف صاحب نے لکھا ہے کہ

"شہزادی کے گلاب آسا رخساروں پر آنسوؤں کے آبدار موتی بکھرنے لگے"

[1] مگر دلّی میں پاؤں پاؤں صندل کے پاؤں بولا جاتا ہے۔

گلاب آسا کے معنی ہوئے گلاب کے مثل جس میں رنگ کے علاوہ گلاب کی ساخت بھی شامل ہے۔ یہ منظور کہ چہرے کو گلاب سے تشبیہ دیتے ہیں مگر یہاں گلاب آسا کے بجائے "گلابی" مناسب لفظ تھا کیونکہ اس طرح ذہن صرف رخسار کے رنگ کی طرف متبادر ہوتا اور گلابی چہرے پر آنسوؤں کے آبدار موتیوں کا بکھرنا پوری قوت سے اپیل کرتا۔ موجودہ صورت میں خیال گلاب آسا کی ترکیب میں اُلجھ کر معنوی لطافت سے فی الفور لطف اندوز نہیں ہوتا اور موتیوں پر گلابی رنگ کی چھوٹ سے جو ذہنی دعوت نظر ہوتی اُس سے محروم کر دیتا ہے۔

ذیل کی عبارت میں لفظ "ہی" کی تکرار گراں ہے۔

"لوگ اس طرح آئے اور جمع ہوگئے گویا کہیں چھپے ہوئے
اس گھڑی کا انتظار ہی کر رہے تھے اور اس کے سوا انھیں
اور کام ہی نہ تھا"

پہلا "ہی" بیکار ہے۔

اسی طرح اس جملے میں۔

"چنانچہ اس نے اس کا کجرہ ٹھیک اُس وقت کیا جب کہ
سمنستان کی طرف روانہ ہو رہا ہے"

"روانہ ہو رہا تھا" کی جگہ "روانہ ہونے والا" یا "روانہ ہونے کو تھا" چاہئے روانہ کے ساتھ "ہو رہا تھا" کا استعمال نادرست ہے۔

یہ میرے ایک دوست کے فسانے پر میرے ہی ایک دوست کا تبصرہ ہے۔ افسانہ لطیف کا ہے، اور تبصرہ نگار ہیں اثر۔ اور یہ دونوں اُردو ادب میں ایک خاص نوک پلک کے لوگوں میں سے ہیں۔

جیسا لطیف صاحب کا افسانہ ہے، ویسا ہی حضرتِ اثر کا تبصرہ ہے، اگر افسانہ لاجواب ہے تو تبصرہ بھی بے نظیر ہے۔

لیکن بعض مقامات پر مجھے اپنے دوست حضرتِ اثر سے اختلاف ہے، جسے ظاہر کئے دیتا ہوں۔

اثر صاحب نے دربار شاہی کی کتاب کے متعلق یہ اعتراض فرمایا ہے کہ الماری، یا خزانۂ شاہی کے عوض، ایسی نادر کتاب میز پر کیوں پڑی تھی۔

میں عرض کروں گا کہ ہو سکتا ہے شاہی خاندان کے افراد میں سے کسی نے مطالعے کی غرض سے یہ کتاب طلب کی ہو۔ اور اُسی سلسلے میں وہ میز پر رکھی ہوئی ہو۔ اس میں عدم امکان کا کوئی پہلو نکلتا ہو تو معلوم نہیں ہوتا۔

دوسرا اعتراض ہے کہ دایہ نے اس کتاب کو اُڑتے ہوئے بھونرے کو مارنے کے لئے کیوں اُٹھایا۔ یہ بھی ایک معمولی اور روزمرہ پیش آنے والی بات ہے اور بالخصوص جب اس کا صدور کسی عورت سے ہو۔ کیونکہ جب آدمی گھبرا جاتا ہے تو اپنے دماغ کی خاصر جو شے ہاتھ آجاتی ہے اُسے استعمال کرنے پر قدرتی طور پر مجبور ہو جاتا ہے۔

تیسرا اعتراض ہے کہ اُس گروہ میں رہنے والی دایہ کو جو رقص پیہم میں مصروف رہتا ہے لکھنے پڑھنے کا شوق کیونکر پیدا ہوا۔ میں عرض کروں گا کہ کیا رقص سرود، لُرشت وخواندے یکسر بیگانگی کا نام ہے؛

چوتھا اعتراض ہے کہ باغبان زادے کے نکالے جانے کے وقت شاہزادی نے احتجاج کیوں نہ کیا، میرے نزدیک تو بعض ناخوشگوار واقعات کچھ اس طرح یکایک پیش آجاتے ہیں کہ آدمی فرطِ حیرت سے مُنھ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اور یہی واقعہ شاہزادی کے ساتھ بھی پیش آیا اور اس شدت کے ساتھ وہ احتجاج کر ہی نہ سکی۔

پانچواں اعتراض ہے کہ گلابی رنگت کے عوض شاہزادی کے چہرے کو گلاب آسا کیوں لکھا، کیونکہ "گلاب آسا" کی ترکیب میں گلاب کے رنگ کے علاوہ اُسی کی ساخت بھی شامل ہے۔

میں حضرتِ جلیل مانک پوری کا ایک مطلع پیش کرتا ہوں۔

یہ عارضوں کا رنگ، یہ عالم نقاب کا … دامن میں تم تو پھول لئے ہو گلاب کا

کیا اس مطلع میں رنگ کے علاوہ گلاب کی ساخت کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، اگر نہیں تو "گلاب آسا" کی ترکیب سے ساخت کی طرف کیوں خیال جانے لگا۔ البتہ اس قدر ہے کہ اگر چہرے کو صرف "گلابی" کہا جاتا تو حضرتِ اثر کے بقول معنوی لطافت اور بڑھ جاتی۔

چھٹا اعتراض ہے "ہی" کے استعمال کے متعلق کہ یہاں اس کا صرف بیکار ہے میرے نزدیک گویا کے بعد اس موقعے پر اگر "ہی" نہ لکھا جاتا تو جملہ کچھ بے ربط سا ہو جاتا اور زور باقی نہ رہتا۔ آخری اعتراض ہے "روانہ" کے ساتھ "ہو رہا تھا" کے باب میں حضرتِ اثر فرماتے ہیں کہ "روانہ کے ساتھ "ہو رہا تھا" کا استعمال نادرست ہے۔

میں کیا عرض کروں، میں تو ایسے مواقع پر یوں ہی بولتا ہوں، اور اب تک اسی طرح سُنا بھی ہے۔ کوئی شعر تو اس وقت ذہن میں نہیں ہے اور نہ اس وقت اتنی فرصت ہی ہے کہ تلاش کروں، بہرحال میں اثر صاحب کی خدمت میں عرض کروں گا کہ براہِ کرم اس کے عدم جواز کی کوئی دلیل پیش فرمائیں۔ پھر میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

جوش

گلبانگِ نوشانوش

اُٹھا ساغر کہ بیداری وبالِ ہوش ہے ساقی
زمانہ تیغ در دست و کفن بر دوش ہے ساقی

مرے آزادہ مشرب روزہ خواروں کی تمنائیں
ہلالِ عید اک کھلتا ہوا آغوش ہے ساقی

زمانہ رقص میں ہے بج رہی ہے وقت کی چھاگل
چمن میں آج وہ گلبانگ نوشانوش ہے ساقی

پسینہ آگیا ہے خلد میں حوروں کے ماتھے پر
حسینوں کی جوانی آج یوں گل پوش ہے ساقی

اگر اک بوند ٹپکا دوں تو لَو دینے لگے دُنیا
مرے ساغر میں ایسا بادۂ سرجوش ہے ساقی

زمیں کے آبگینے کو کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے
ترے رندوں کو مستی میں بھی اتنا ہوش ہے ساقی

اٹھا لے جامِ زر اس کو پلا جامِ سفالیں میں
کہ یہ کونین کا ٹھکرانے والا جوش ہے ساقی

جوش ملیح آبادی



خوابِ جوانی

گلنار کے روزنامچہ کے چند اوراق

(از ملک حبیب احمد، بی۔اے، آنرز)

(بجواب "خزینۂ محبت" مطبوعہ رسالہ کلیم، جنوری ۱۹۳۶ء)

۱۰ر جنوری ۱۹۳۴ء ——————

معاذ اللہ! آج کا دن تو میرے لئے نزع مسلسل ہو کر رہ گیا۔ احمقوں کی انجمن یاد کرتی ہوں تو غصہ آتا ہے۔ کاش مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ بلا کی ٹی پارٹی میں "عشق" کے سوا دوسرا موضوع نہ ہوگا تو کبھی بھولے سے بھی وہاں جاکر نہ جھانکتی۔ ایک محمود پر مرتی ہے تو دوسری منظور پر جان دیتی ہے۔ کسی کو ہندر پسند آگیا تو کوئی نوازش کو دل دے چکی۔ میں بھی چپکی بیٹھی سنتی رہی اور اُن کی حماقت کی داد دیتی رہی۔ کھانا پینا عشق، سرمایۂ دین و دنیا عشق، عشق، عشق، عشق، اُن کی ہستی عشق، اُن کی دنیا عشق، اُن کی کائنات عشق۔ بھولی، معصوم، احمق لڑکیاں! بھاگی جارہی ہیں اس جہنم کی جانب۔ کچھ اس میں کود چکیں، کچھ کود دیں گی، شاید ہی کوئی سلامت رہے۔ جلیں گی سب!

نزہت نے تو کمال ہی کر دیا۔ بیگم رونے بیٹھ گئیں۔ اگر کوئی سنے تو ہنسے بے اختیار اُن کے احمق پن پر۔ بات یہ ہوئی کہ سب کے اصرار کرنے پر الماس گانے بیٹھیں تو وہی پرانی چیز "پیا بن نا ہیں آوت چین" گائی۔ معلوم نہیں نزہت کو ہوا کیا خوب رو ئی، اور جی بھر کے روئی۔ وُور اکہنے لگی کہ "پیا" کی یاد میں روتی ہے۔ بیوقوف کہیں کی! میں کہتی ہوں کہ ایسی عورتوں نے تو موئے شکسپیر سے کہلوایا تھا کہ "کمزوری تیرا نام عورت ہے" ——————— مٹی جاتی ہیں، مرد کی غلامی کے لئے۔ مری جاتی ہیں کہ کوئی مرد اُنہیں شکار کرے۔ جب کوئی مرد اُنہیں معصوم، بھولی اور نازک کہہ دیتا ہے تو پھولی نہیں سماتیں، گویا کل کائنات اُن کے قدموں پر جھکی ہوئی اُنہیں خراجِ عقیدت پیش کر رہی ہے۔ نہیں سمجھتیں کہ مرد کے نزدیک تم سب میں وہی سب سے زیادہ معصوم ہے جس کو ہوس ران مرد بغیر کسی دقت کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں دھکیل سکتا ہے۔ وہی سب سے زیادہ بھولی ہے جو اُس کی پُرفریب باتوں کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر جلد تر اُن پر ایمان لے آئے۔ مرد کی لغت میں نازک کی تعریف یہ ہے کہ چینی اور بلور کی ایسی مورت جس سے مرد کی ہوس کچھ دیر کھیلے، اور بعد ازاں اس کا وحشی پن اسے آنِ واحد میں توڑ ڈالے۔ درحقیقت مرد کے نزدیک "حسن" وہ تحریک ہے جس سے اس کے جذبات خوابیدہ اپنی پوری قوتوں سے بیدار ہو جائیں، اور خون اپنی پوری سرعت سے اس کی ناپاک شریانوں میں دوڑنے لگے۔ مرد کی محبت آندھی کے اس تیز و تند جھونکے کی مانند ہے جو صحنِ چمن میں صرف اسی غرض سے آتا ہے کہ نازک پنکھڑیوں کو فضا میں آوارہ کر دے۔ ہر مرد کا سانس تپتے ہوئے صحرا میں چلنے والی بیرحم بادِ سموم ہے جو نزاکت کی قاتل اور رنگ آفرینی کی دشمنِ جان ہے!

اگر قدرت عورت کی تخلیق نہ کرتی تو؟ ——————— یہ دنیا کسی آہنگر کی دہکتی ہوئی بھٹی کی مانند ہوتی، جس کا ہر ذرۂ لرزاں کسی جائے سکون کی تلاش میں دیوانہ وار فضائے بسیط میں رقصاں نظر آتا ہے۔ اگر عورت نہ ہوتی تو ساون کی مد بھری راتوں میں کوکنے والی برہ کی ماری کوئل، پچھلے پہر سسکیاں لے کر ڈوبنے والے تارے، گاتے ہوئے چشمے، چٹکنے والی معصوم دوشیزہ کلیاں، عطر بیز ہوائیں، اُودی گھٹائیں۔ نغمہ کی لطافت، شفق زریں، خندۂ صبح یہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ شاعری، موسیقی، مصوری، دنیا کی ہر لطیف شے محتاجِ عنوان ہوتی۔ عورت سرنامۂ حیات ہے اور اس حسین دنیا کا پاکیزہ موضوع ——————— اور اگر مرد ہی مرد ہوتا تو وہ روزِ اولین کی طرح آج بھی ننگے سر ننگے پیر جنگلی جانوروں کے تعاقب میں

زوت کی بلندیوں سے بے خبر بھاگا پھرتا۔ تہذیب و آسائش کے نام سے آشنا بھی نہ ہوتا وہ نہ ہی پاکیزگی، خیالات میں رفعت، عزم میں بلندی، زبان میں شیرینی سب مفقود ہوتے۔ قدرت نے عورت کی تخلیق کر کے مرد کو انسان بنا دیا اور پھر احسان فراموش کہتا ہے کہ عورت اُسے قعر مذلت کی جانب لئے جاتی ہے۔ کون اُن سے پوچھے کہ سیتا جی نے راون کو، پدمنی نے علاء الدین کو، انارکلی نے جہانگیر کو کس دن دعوت گناہ دی؟ ——

—— ہمیں حوا کی بیٹیاں کہا جاتا ہے: اچھا اگر حوا نے آدم کو دانۂ گندم کھانے کو کہا تو آدم نے خود گرہ کی عقل سے کام کیوں نہ لیا؟ نہ کھاتے، اور انجام پر نظر رکھتے لیکن وہ تو بات یوں ہوئی کہ مرد کی آتش گرسنگی بھڑک اٹھی۔ حوا تیز فہم نہ تھیں، اُنھیں سمجھایا ہوتا مگر نہیں اُنھیں ٹھہرایا گیا گنہ گار۔ اچھا مان لو وہ گنہ گار بھی، مگر گنہ کا پروردگار کون تھا؟ آدم۔ اور کون؟ اس لئے کہ حوا تو اُنھیں کی پسلی سے پیدا کی گئی تھیں —— مرد اپنے دعوے کی دلیل ہمیشہ تاریخ سے دیا کرتے ہیں۔ مگر "قلم در کف دشمن است" جو چاہیں لکھ ڈالیں۔ کہتے ہیں کہ پرائم اور پیرس کی تباہ حالی، جولیس سیزر کے خون اور انٹونی کے زوال کا باعث عورت تھی۔ حالانکہ واقعہ اسی قدر ہے کہ یہاں مرد کی شب وصل کسی قدر دراز ہو گئی اور وہ اپنے کمزور و حسین کھلونے کو چکنا چور کرنے میں اس قدر منہمک ہوا کہ جاہ و حشم کے رقیب موقعہ پا کر چال چل گئے۔

انھیں مردوں کی لکھی ہوئی تاریخ شاہد ہے کہ روزِ ازل سے آج تک مرد کی سب سے بڑی خواہش یہ رہی کہ عورت کو تقاضائے فطرت کے خلاف عقلیت سے محروم کر کے ایک نادار لونڈی بنا لے تاکہ جب وہ جاہ و جلال کا مظاہرہ کرے تو یہ بے زبان مخلوق اُسے مورچھل ہلائے۔ جب وہ مظلوموں کے ٹھوکریں مار مار کر تھک جائے تو یہ سراپا نزاکت سر اپا کی طویل راتوں میں ایک لمحہ بھی آنکھ جھپکائے بغیر اس کے پاؤں دبایا کرے، جب اُسے جمعیت خاطر ہو تو یہ اس کی محفلِ نشاط میں عریاں رقص کیا کرے اور جب اس کی فطری درندگی اپنی وقتی نیند سے چونک کر آمادۂ خوں ریزی ہو تو بغیر کسی حجت کے اس کی شکار ہو جائے۔

کوئی ان بیوقوف عورتوں سے کہے کہ مرد کی چیرہ دستیوں کی خونیں داستان اس بوڑھے آفتاب سے سنیں جو بازار بردہ فروشی کے حیاسوز مناظر کی تاب نہ لا کر لاکھوں بار آغوشِ شام میں شرم کے مارے چھپ چھپ گیا، پاک دامن عورتوں کی بے بسی کے قصے ان تاروں سے سنیں جو سرِ شام سے صبح تک ان لرزہ خیز مناظر کو ٹک ٹک دیکھا کئے بنظلومیت اور بیچارگی کی داستان، ہاں عورتو ان کنجہائے چمن سے پوچھو جنھوں نے تمہاری جنس کی برہنگی کی ستر پوشی کی! —— اپنی جنس کی بے بسی کی پُر الم کہانی اس شمع محفل سے پوچھو جس کے سامنے مردوں نے تمہاری ہم جنسوں کو بارہا تادیب کی کہ ساقی گری کی خدمات انجام دیتے ہوئے شراب ارغوانی کے ساتھ ساتھ مینائے شباب کو بھی چھلکاتی جاؤ —— !

رقابت، قتل اور رسوائی —— شرمناک داستانیں ——

اور تم اب بھی مرد کا اعتبار کرتی ہو؟

وہ تمہاری سادگی کو اب بھی ذوقِ شکست سمجھتا ہے —— —

کاش تمام دنیا کے مرد سمجھ لیں کہ عورت صرف اس لئے طالب شکست ہے کہ فطرت نے اُسے رحم و کرم کے علاوہ اور کچھ ودیعت کیا ہی نہیں: وہ شکست جو ولفریبیوں سے معمور ہو اس فتح سے برگزیدہ تر ہے جو لطافتوں سے محروم رہے ——

مرد سے خوف کھاتی ہوں، کانپتی ہوں، نفرت کرتی ہوں اور اگر کبھی بدقسمتی سے ایسی محفل میں جانا ہی پڑ جاتا ہے تو واپس آ کر اپنے لباس کو دیوانہ وار جھٹکتی ہوں کہ مبادا کوئی تارِ نگاہ اب تک لباس میں الجھی ہوئی نہ ہو! ——

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۴ء ——

کوئی تین مہینے سے زندگی کچھ عجیب سی ہو رہی ہے۔ دنیا پہلی سی دنیا نہیں رہی۔ جہاں یکسر بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیا سچ مچ ایسا ہی ہے، یا میں کچھ بدل گئی ہوں۔ کہتے ہیں ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے لیکن مجھے تو کوئی چیز ایسی سجھائی ہی نہیں دیتی جس نے میرے دل و دماغ کی کیفیات کو بدل دیا ہو۔ سوچتی ہوں کہ اگر مجھے کسی سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع ملے تو وہ ممکن ہے کہ وہ اس کو میری اپنی ہی ذہنیت پر محمول کرے۔ لیکن ایسا بھی کیا اندھیر ہے کہ اتنی بڑی "تبدیلی" ہو جائے اور مجھے خبر بھی نہ ہو ——

دنیا کی ہر چیز حسین معلوم ہوتی ہے اگر کبھی سیر کے لئے نکلتی ہوں تو وہ مناظر جن سے کبھی مجھے ذرا سی بھی دلبستگی نہ ہوئی تھی، آج مجھے، میری تمام ہستی کو، ہاں مجھے اور میرے تمام ماحول کو جذب کر لینے کے لئے بیقرار نظر آتے ہیں۔ وہی فطرت جسے میں کبھی قہر بار خیال کرتی تھی اب تمام تر ذرہ نگار نظر آتی ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز بیقاعدہ اور غیر اصولی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اب جب سوچتی ہوں تو .... ہمیشہ اس نتیجہ پر پہنچتی ہوں کہ اس آئینہ خانہ کے سوارنے میں کسی سلیقہ مند اور بلند ترین ذوقِ جمالیات رکھنے والی قوت کارفرما ہے ——

جب صحنِ چمن میں پھول مسکراتے ہیں، بلبل گاتی ہے، قمری بولتی ہے، اور نیلے نیلے شفاف بادل پہنائے آسمان میں "کسی نامعلوم شے" کی تلاش میں اِدھر سے اُدھر دوڑتے ہیں، جب کالی کالی اور اُودی گھٹائیں جھوم جھوم آتی ہیں اور ساون کی بوندیوں میں ننھے ننھے پرندیا ڈلے ہو ہو کر کسی "نامعلوم مخاطب" سے اپنی کہتے ہیں اور اس کی سنتے ہیں تو معلوم نہیں میں کیوں اُداس ہو جاتی ہوں میں بھی اپنی کہنا چاہتی ہوں اور "اس" کی سننے کی تمنا دل میں پیدا ہوتی ہے۔ لیکن وہ کون ہے جو میری سنے اور اپنی کہے۔ کالی اور ڈراؤنی رات کی گہری تاریکیوں میں جسم کو یہیں چھوڑ کر روح کے ہمراہ اس فضائے بسیط میں اُڑتی ہوں اور تلاش کرتی ہوں۔ ایک ایسے مغنّی کو جو میرے سازِ دل پر نوحی نغمے گائے اور مجھے مدہوش کر دے، جو میری ہستی کو مجھ سے چھین لے اور صرف رازِ ہستی بتا دے——

سوچتی ہوں کہ کہیں میں مرد کی جانب تو کھنچی نہیں جا رہی———

نہیں نہیں گلنار مرد کی تمام فریب کاریاں تجھے اس خونخوار، وحشی، اور بھوکے جانور کے مضبوط چنگل میں نہیں لا سکتیں۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے اور شائد جتنا میں مرد کو سمجھتی ہوں اور کوئی نہ سمجھتی ہوگی۔ میں جانتی ہوں وہ دغاباز ہے، فریب کار ہے، سست پیماں ہے، درندہ ہے! تو پھر اس کے کیا معنی کہ میں اس کی شکار ہو جاؤں۔ میرے دل میں مرد کے لئے سوائے نفرت اور حقارت کے کسی اور جذبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ محبت اور کشش اور مرد کے لئے، خوب، یہ ایک دلکش خواب ضرور ہے لیکن واقعاتی دنیا کے کس قدر خلاف، اور خدا کرے یہ خواب کبھی تشنۂ تعبیر نہ ہو——— مرد فطرت کا بھدا مذاق ہے، قدرت کی ایک عظیم ستم ظریفی۔ میں یہ سب کچھ جانتی ہوں، مگر یہ خیال دل میں پیدا ہی کیوں ہوا کہ شائد میں مرد کی جانب کھنچی جاتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس بھرے جہان میں کوئی مرد باوفا ہو، اس تمام دنیا میں صرف ایک مرد پر محبت——— اور میں اُسے حکایت مہر و وفا سنا کر اپنا لوں"——— مگر میں بھی بیوقوف بن جاتی ہوں۔ آخر یہ حقیقت کیوں نظر انداز ہوئی جاتی ہے کہ عقاب بلبل کی طرح گا نہیں سکتا، شیر کی آنکھوں میں ہرنی کا رحم کبھی نہ جھلکے گا۔ نظامِ قدرت کو میں نہیں بدل سکتی، کوئی عورت بھی تو بدل نہیں سکتی تو یہ آنکھوں دیکھی کھائی میں کودنا کیسا؟——— نہیں میں مرد سے ہمیشہ نفرت کروں گی، اس جنگلی مخلوق سے ہمیشہ دور رہوں گی اور شائد——— شائد کچھ نہیں——— مگر بفرضِ محال کبھی اس سے قریب بھی ہوئی تو——— صرف اس پر تھوکنے کے لئے، ٹھکرا کر مارنے کو، ذلیل کرنے کو، انتقام لینے کو، خون آشامی کے لئے——— :

——— مگر یہ سب کچھ بھی اس آگ کو ٹھنڈا کر دیں، جو محبت یہ سب کچھ لکھوا رہی ہے، کیا کروں یہ لپکتے ہوئے شعلے یکسر گلزار ہو جائیں، یہ ذوقِ تلاش کیا ہے؟ کسے ڈھونڈھ رہی ہوں؟ امّاں اور ابا کی محبت بھری باتیں دل کو سکون سے آشنا نہیں کرتیں، سہیلیوں سے کہنا چاہتی ہوں لیکن کہا نہیں جاتا۔ ہزار بہانوں سے دل بہلاتی ہوں مگر کون جانے دل بہلتا کیوں نہیں؟

——— نت نیا رنگ ہوتا ہے——— آج دن چڑھے بیدار ہوئی تو بے اختیار آئینہ کے سامنے پہنچی جیسے کسی نے زبردستی آئینہ کے روبرو کھڑا کر دیا ہو۔ رنگ بھی پہلے سے زیادہ نکھرا ہوا معلوم ہوا، اور دل کہتا ہے کہ ایک نامعلوم شے اگر مجھے حاصل ہو جائے تو یہ اور بھی نکھر جائے گا۔ آنکھوں میں ہلکے گلابی ڈورے دکھائی دیتے ہیں، اور دل کہتا ہے کہ یہ سرخ آتشین بھی ہو سکتے ہیں۔ آئینہ کے سامنے تن تن کر کھڑی ہوئی، معلوم ہوا کہ قد سرو ہو گیا۔ مگر دل کہتا ہے کہ یہ سرو چپل بھی لا سکتا ہے۔ لانبے لانبے گھنیرے بال مجھے وجد میں لے آئے مگر دل کہتا ہے کہ میرے سوا اور بھی وجد میں لائے جا سکتے ہیں۔ کیا ہے یہ سب کچھ؟ کون بتائے؟ کون پوچھے؟——— جی کیوں چاہتا ہے گلنار کہ کوئی آئے اور تیری تمام ہستی کو تجھ سے چھین لے۔ تیرا تمام سکون تجھ سے چھین لے اور تجھے اضطراب دیدے——— چاہتی ہوں کہ اپنے کو مٹا دوں لیکن کس کے لئے؟ میں خود نہیں جانتی! جاننا چاہتی ہوں لیکن بتاتا کوئی نہیں! خدا کرے موت ہی آ جائے۔ لیکن یہ آرزو میری خواہش کی صحیح ترجمانی نہیں کرتی——— میں تو کچھ اور چاہتی ہوں اور نہیں جانتی کہ کیا چاہتی ہوں!

۳ر اپریل ۱۹۳۵ء

آج کا دن میری سولہ سالہ زندگی میں شائد ایک پہاڑی آبشار کی مانند تھا جو اپنے شدّت بہاؤ میں مجھ جیسی دل کو بھی بہا لیجانا چاہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمین پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے۔ دل کہتا ہے کہ میری کتابِ زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہونے والا ہے بلکہ زیادہ درست یوں ہے کہ آغاز آج ہی ہوا ہے——— -

ہوا یہ کہ مسرت کو ہمراہ لے کر——— باغ میں ٹہلنے گئی۔ ٹاؤن ہال کے عقب پر مدن بان کی جو روشیں ہیں انھیں دیکھ رہی تھی کہ ایک سائیکل سوار

وہ ان قریب سے ہوکر نکلا۔ شام کا وقت تھا۔ صورت اچھی طرح سے نہ دیکھ سکی گو دماغ میں اس طرح ایک ارتعاش سا پیدا ہوگیا جس طرح اندھیری رات میں بجلی کے کوندنے سے فضا ایک لمحہ کے لئے منور ہوجاتی ہے۔ کہنے کو تو وہ نوجوان قریب سے ہوکر نکل گیا لیکن ایسا معلوم ہوا کہ اس کی تمام ہستی میری روح میں جذب ہوگئی یا وہ جاتا ہوا میرے خیالات کے سکون کو ابدی اضطراب سے بدل گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ نوجوان اپنی دھن میں نکل گیا ہوگا۔ لیکن پیچھے مڑ کر جو دیکھتی ہوں تو چار قدم پر رک کر وہ بھی میری جانب دیکھ رہا تھا۔ دھندلکے میں میری نظروں نے اس کی نگاہوں کو ڈھونڈھ لیا۔ ادھر میں کچھ مجبور سی ہو لی ادھر شاید اسے بھی وضعداری نے مجبور کیا کہ وہ اپنی نظروں کو میرے نظارہ میں ضائع نہ کرے۔ وہ چلدیا —————— لمحہ رکا —————— پھر مڑ کر دیکھا اور —————— پھر چلدیا —————— اب میری نگاہیں اسے ڈھونڈھ رہی تھیں۔ لیکن وہ اندھیرے میں آ چکا تھا۔

میں بھی مسرت کو لئے اسی جانب چل دی۔ گو دماغ نے بہتیرا سمجھایا کہ میں اس جذبہ سے مجبور ہوگئی ہوں جسے دنیا عورت کی کمزوری سے تعبیر کرتی ہے۔ لیکن پھر بھی دل تھا کہ اسی جانب چلنے کے لئے مچل رہا تھا۔ دماغ نے دل کو سمجھانے کے لئے تمام اس فلسفہ سے کام لیا جو میں نے مرد ذات کے متعلق ترتیب دے رکھا تھا۔ لیکن دل اثر قبول کرنے سے انکاری ہوچکا تھا۔ اس وقت جو جذبہ میری تمام کائنات پر چھایا ہوا تھا صرف اس مرد کا خیال تھا۔ جی چاہتا تھا کہ میں یہاں کھڑی رہوں اور وہ نوجوان ایک بار پھر میرے قریب سے گزر جائے۔ آج تمام رات یہیں رہوں اور وہ بار بار میرے قریب سے گزرتا رہے۔ دنوں، ہفتوں، مہینوں، سالوں، صدیوں یہی ہوتا رہے اور ہر بار جب وہ میرے قریب سے گزرے تو میں اپنے متاعِ دل وجان کو اس پر نثار کرتی رہوں۔ صدقہ کرتی رہوں۔ نچھاور کرتی رہوں اور اسی "گل بازی" میں قیامت آجائے اور شفق زرین کا پروردگار ہم دونوں کو یہی کھیل کھیلنے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قادر کردے۔

آگے بڑھی —————— اس طرف جس جانب وہ گیا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد دیکھا کہ بجلی کی روشنی کے نیچے وہ کنارِ حوض کھڑا ہے۔ فوارہ چھوٹ رہا تھا —————— وہ ایک دیوتا معلوم ہوتا تھا جس کے قدموں میں فوارہ کی باریک ونازک دھاریں یوں لوٹ رہی تھیں جس طرح تمام دنیا کی لطافتیں سیال ہوکر دیوتا کو غسل دینے کے لئے تڑپ رہی ہوں —————— پہلے تو میں ٹھٹکی —————— دو تین قدم پر رکی —————— پھر آگے بڑھی —————— اور اب میں بھی حوض کے قریب تھی۔ میں اس کے خوبصورت چہرے کو اس طرح تک رہی تھی جیسے کوئی مایوس دیوی کے سامنے دوسرے پجاری کی موجودگی میں افشائے عشق کے خیال سے صرف آنکھوں ہی آنکھوں میں رحم وکرم کی درخواست کرے —————— اس نے میری جانب دیکھا —————— صرف ایک لمحہ —————— اور میں نے محسوس کیا کہ میری تمام کائنات مجھ سے چھین لی گئی —————— ہاتھ پاؤں میں ہلکا سا رعشہ محسوس ہو رہا تھا اور میں دل وجان سے اپنا سب کچھ اس کے سپرد کرچکی تھی۔ اس نے پھر دیکھا —————— میں دیوانی ہوگئی —————— مجھے حوض کے پانی میں کنول یوں معلوم ہوتے تھے کہ روشن ہوگئے —————— نرگس نے پرخمار آنکھیں کھول دیں —————— سورج مکھی جو آفتاب کے آغوش شام میں سوجانے کے بعد سر جھکا چکی تھی حیران معلوم ہوتی تھی کہ یہ بے وقت آفتاب کیوں کر طلوع ہوگیا؟ —————— میں اس کی ہو چکی تھی —————— زیادہ دیر تک وہاں رک نہ سکتی تھی آگے بڑھی۔ گو دل چاہتا تھا کہ اپنی تمام زندگی بھر یہیں کھڑی رہوں اور اس خدائے حسن کا نظارہ کرتی رہوں —————— لیکن شرم شاید عورت ہی کے لئے بنائی گئی ہے، چنانچہ مجھے ہی سبقت کرنا پڑی۔ ہر قدم جو آگے کو جا رہا تھا واپس جاتا ہوا معلوم ہوتا تھا، سوچ رہی تھی کہ ہر گام پر اپنی آرزو کو نقشِ پا کے ساتھ ساتھ دفن کر رہی ہوں —————— سبزہ سے نکل کر جب سڑک پر ہولی تو وہی کافر میرے قریب سے ہوکر نکلا —————— سیدھا گیا —————— اور معلوم نہیں کیوں بے اختیار اس کی سائیکل مولسری کے ایک پیڑ سے ٹکرائی اور وہ گر گیا ——————

میں ہوش وحواس میں تو اغلب ہے کہ یہ جرأت نہ کرتی مگر اس وقت اس طرح اس کی جانب لپکی جس طرح کسی آتش زدہ مکان کا مکین دیوانہ ہو ہو کر اپنی متاعِ حیات کو شعلوں کی لپیٹ سے محفوظ کرنے کے لئے بے اختیار دوڑے ——————

میں اس کے قریب پہنچی ہی تھی کہ وہ زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے جب دیکھا کہ وہ محفوظ ہے تو مجھے اپنی موجودگی سے حجاب آنے لگا۔ بہرحال سنبھلی، اور جب اس نے شکریہ ادا کیا تو باوجود ذوقِ تکلم کے خاموش رہی —————— اور کیا کرتی —————— معلوم ہوتا تھا کہ کسی نامعلوم طاقت نے قوتِ گفتار سلب کرلی

——————

وائے فریاد کہ آج گلنار بھی ایک مرد کے قدموں میں تڑپ تڑپ کر جان دیدینا چاہتی ہے!

۱۸ر اپریل ۱۹۳۵ء ————

کتنا سُندر ہے اس کا نام، کتنا منوہر! سیرا من موہن: کون؟ منور۔ اور کون؟ منور، منور، کتنا پیارا نام ہے، کتنا دل کش، منور میرے سیہ خانۂ دل کا نور، میری شمعِ حیات کی ضو، میری تندیلِ زندگی کی روشنی، اپنی گلشنِ دیہ "بالم" "نور"!—— ——اپنی پجارن کا سُکھ منور، اپنی بھکارن کا داتا منور، منور، منور، کام و دہن کی شیرینی—— ——دنیا کی تمام لطافتیں اس نام میں ہیں ——

————

آج شام ایسی شام شاید آج کے بعد پھر کبھی نہ آئے گی————

ایک ایسی شام جس میں زندگی کی دلفریبیاں، طالع بلند، دولتِ بیدار سب کچھ سمٹ کر آگیا ہو۔ قسمت نے مجھے اس کے قریب کر ہی دیا اور، وہ یوں کہ میں جمیل کے ہمراہ نشاط ماٹا کیز میں نرگس کا رقص دیکھ رہی تھی کہ مجھے معلوم ہوا کہ برابر کی کُرسی پر بیٹھنے والے مرد کا سانس میری ہستی کا ماحول ہے اور یہ کہ میں ہزار کوشش کروں لیکن اس سے آزادی نصیب نہیں ہو سکتی، اور اگر آزادی مل جائے بھی تو شاید میں خود ہی ایسی بے کیف آزادیوں کو لاکھوں بار ذوقِ اسیری پر سے قربان کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی ماحول کی پابند ہو جاؤں۔ اس کی شخصیت میرے حواس پر چھائے جا رہی تھی اور میں معلوم نہیں کیوں اپنے اور اس کے درمیان ایک رشتۂ لطیف کا تصور کئے جا رہی تھی۔ وقفے میں جب روشنی ہوئی تو خوشی اور حیرت سے میں نے معلوم کیا کہ "وہ" منور تھا—— میرے خوابِ جوانی کی پُرشعریت تعبیر———— میرے خوابوں کے مندر کا پُرشوکت، حسین دیوتا————

تعارف ہوا، وعدہ ہو گیا کہ وہ پرسوں یہاں آئیں گے———— خزاں کے دن گئے، گلنار، بہار آنے کو ہے، لیکن کیسی کیسی رنگینیاں لئے ہوئے خدا جانے! ڈر بھی رہی ہوں———— خوش بھی ہوں: وہ آنے کو ہے!

۲۲ر اپریل ۱۹۳۵ء ————

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!

آخر کار وہ آئے۔ میں اُن سے باتیں کر رہی تھی، لیکن معلوم نہیں وہ کیوں خاموش تھے۔ بس۔ وہاں ایک خامشی تیری سب کے جواب میں، وہ اپنے اشعار سنانے لگے۔ میں ہمہ تن گوش تھی۔ کتنے حسین و جمیل اشعار تھے، معلوم نہیں کیوں میرا دل چاہنے لگا کہ میں اس کے اشعار کی موضوع بن جاؤں————

میں جھوم رہی تھی اور اپنے خیال میں ایک ایسی دنیا میں پہونچ گئی جہاں کا ماحول تصویر کی رنگینی سے زیادہ خوش منظر ہے، جہاں سبز جوانی پر گائے ہوئے نغموں کی بارش ہوتی ہے، جہاں مادّیت کا نام نہیں، روح ہی روح اور روح بھی کیسی پاکیزہ، حسین، دونیزہ—— —— ——جب بھی منور کی آواز کانوں میں آتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ اس رنگا رنگی دنیا میں معصوم فرشتے اپنے زرّین پروں کو قوسِ قزح کے رستے پر تولے ہوئے پریم بھرے گیت گا رہے ہیں۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی اور کئی بار، کہ منور کا ترنم مجھے اپنے ساتھ اسی دنیا میں لے جائے جس نگر کا وہ "باسی" ہے۔ جب سُنتی تھی کہ اپنے اشعار میں منور نے کسی کو مخاطب کیا ہے تو چاہتی تھی کہ اس کی مخاطب میں بن جاؤں———— گو میں اس لائق نہیں۔ لیکن گنہگار کے دل میں بھی تو رحمتِ خدا کبھی دیا جلا ہی دیتی ہے۔

آج سمجھتی ہوں کہ میری زندگی محتاجِ عنوان ہے: سرِ باب کچھ لکھا ہی نہیں گیا، ممکن ہے کہ مشیت نے منور کا نام لکھ دیا ہو! کاش مجھے معلوم ہو جائے!————

۲۶ر جولائی ۱۹۳۵ء

اب منور روز آتے ہیں، شام کے وقت———— صبح سے اُٹھ کر انتظار کی کاہش اور لذت سے دوچار ہو جاتی۔ دل، کام کچھ بھی نہیں کر سکتی، گھریلو زندگی میں میری حیثیت ایک خفیف شغل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ سودائیوں کی طرح ایک کمرہ میں جاتی ہوں اور تب پھر کر نکل آتی ہوں۔ ذہن ماؤف ہو چکا، منور اور منور کے خیال کے علاوہ ذہن میں اور کچھ آتا ہی نہیں۔ دن پہاڑ سا معلوم ہوتا ہے اور آنکھ دروازے پر لگی رہتی اور ہر لحظہ سوچتی ہوں کہ شباب و شعر کا وہ پیکرِ حسین ابرِ کرم بن کر اس پیاسی دھرتی پر کب اُمنڈ کر آئے گا۔ تمام دن انتظار کرتی ہوں اور شام کا تصور اس طرح رہتا ہے جیسے درماندہ مسافر کو منزل کا خیال———— لیکن وہ نہیں آتے اور میں اس انہماک سے اُن کا انتظار کرتی ہوں جیسے کسی خزینۂ تخیل میں ناظرین بیٹھے ہیں اور پھر اُن کے وصال کی آرزو کریں————

میں اور منور ابھی تنہائی میں زیادہ دیر تک نہیں مل سکتے۔ وہ ابا کے پاس آتے ہیں اور میں کسی بہانہ سے اُن کے پاس جا کر بیٹھ جاتی ہوں، لیکن زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکتی اس لئے کہ جانتی ہوں ع

چھپتی نہیں ہے نگہِ شوق ہم نشیں

جب وہ رات کو چلے جاتے ہیں تو میں بجا طور پر خیال کرتی ہوں کہ میری حیات کی تمام رنگینیاں اُس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئیں۔ جب رات کی آسائش آفرین

سانولی پریاں تمام دنیا کو سکوتِ شب میں تھپک تھپک کر سلا دیتی ہیں، جب ناداری جہانگیری کے جبر و اکراہ سے کچھ دیر کے لئے غافل ہو جاتی ہے۔ جب گنہگار فکرِ عذاب سے بے خبر اور دین دار آرزوئے فردوس سے بری ہو جاتے ہیں تو سائیں سائیں کرتی ہوئی رات میں آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں سے پوچھنے کے لئے کہ میرا پریتم مجھ سے کب ملے گا۔ کوٹھی کے پائیں باغ میں چلی جاتی ہوں۔ سنسناتی ہوئی ہوا سے بسیرا کرنے والے طیور سے، سوتے ہوئے پھولوں سے، دیوقد درختوں سے، کائنات کی خاموشی سے سوال کرتی ہوں ——— کوئی جواب نہیں دیتا ———

——— واپس آجاتی ہوں کمرہ میں۔ اور اپنے سنگار میز کی دراز سے اپنے من موہن کی تصویر لے کر باتیں کرتی ہوں۔ چومتی ہوں۔ گلے لگا لیتی ہوں بھینچتی ہوں اور اس زور سے کہ شاید میں اور یہ کاغذی پیکر ایک دوسرے میں جذب ہو کر حسن و عشق کا ایک مشترک مجسمہ ہو جائیں۔

جانی! اگر تو اس وقت آجاتے تو کیا ہو؟ ——— اگر تو آجائے تو میں دوڑ کر تیرے قدموں سے لپٹ جاؤں، کہ تو مجھے پاؤں تلے روند ڈالے۔ تیرے قدموں میں اس وقت تک تڑپا کروں جب تک کہ میری رُوح میرے جسم کی کثافتوں کو بیچ کر آزادانہ تیرے گرد طواف نہ کرنے لگے ———

——— لیکن آہ تو نہیں آئے گا۔ کیا میں یوں ہی تڑپتی رہوں گی۔ دیکھ لے ظالم اس برہن کو جو چپکے چپکے ہی جلی جا رہی ہے اس سوکھی لکڑی کی مانند جو بن میں اکیلی سلگ سلگ کر راکھ ہو جاتی ہے!

۱۸ر دسمبر ۱۹۳۷ء ———

آج میری اور منور کی حیاتِ رنگین کو کچھ اوپر دو برس ہوتے ہیں۔ آج جب میں اس مشترک ماضی کو دیکھتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک داستانِ مسلسل ہے عیش و بیفکری کی۔ یہ طویل مدت تو گزرتے معلوم ہی نہ دی۔ ایک مسلسل آزاد قہقہہ ہے جو ان سالوں پر پھیلا ہوا ہے۔ وقت آنکھ جھپکاتے گزرا اور ہنوز وہ ساعت نہ آئی ——— شادی کی گھڑی ——— اچھا ہوا نہ آئی، ورنہ منور کی تباہی پر مہر توثیق ثبت ہو گئی ہوتی ——— میں کل ایک عظیم قربانی کرنے والی ہوں ——— محبت کی قربانی جو صرف ایک عورت ہی سے ممکن ہے ——— شاید اگر مرد چاہیں بھی تو اُن سے نہ ہو ——— کل میں اپنے تئیں منور کے زریں آئندہ اور شاندار مستقبل پر سے قربان کر دوں گی ——— منور کچھ نہیں کرتا۔ عورت کا فرض محبت کے باب میں یہ ہے کہ وہ محبت کرے اور اپنے

اور اپنے آپ کو محبت مجسم بنا ڈالے۔ لیکن منور مرد ہوتے ہوئے بھی وہ کچھ کر رہا ہے جو صرف عورت کو فطرت کی جانب سے قدرت ہوا ہے۔

مجھے اپنے جذبات، اپنے خیالات، اپنے آئندہ سے زیادہ منور کا آئندہ عزیز ہے اور اگر میں منور کے پیش نظر رہی تو ڈرتی ہوں اور بجا طور پر خوف کھاتی ہوں کہ منور بجائے اُبھرنے کے ڈوبے گا، اور اس مرگِ آرزو کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی ——— میں اگر خودغرضی سے کام لوں تو منور کو صرف اپنی ذات میں مرکوز کر سکتی ہوں۔ مگر نہیں منور کی حیاتِ درخشندہ کا مقصد اس سے بہت بلند اور ارفع ترین ہے۔ وہ اپنے میں اولین ادیب ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور کیا علم و ادب صرف ایک عورت کی خودغرضی کے لئے ایک بہترین شخصیت سے محروم ہو جائے گا؟ ——— گلشا اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ قوم و ملک کو منور کی زیادہ ضرورت ہے تو کیا کروں؟ منور سے رشتۂ یگانگت نہ رکھوں۔ ہاں ایسا ہی ہوگا۔ عورت کی محبت کا بلند ترین نصب العین دائمی وصل نہیں ابدی ہجر ہے۔ میں بھونرے کی طرح شاد کام نہیں بلکہ بلبل کی طرح فراق زدہ رہ کر اس کی محبت میں سرشار رہوں گی ——— گو میری بے پناہ محبت منور کے لئے غیر فانی ہے۔ لیکن کل سے کرب و اضطراب کی راتوں میں تھوڑی بہت تسکین کے لئے منور نہ ہوگا ——— منور کا خیال ہوگا ———

——— دنیا اور جاہِ دنیا منور کے قدموں پر جھک جائیں گی اور میں دور سے خوش ہو لیا کروں گی یہ سمجھ کر کہ میں نے اس دنیا کو ایک بلند فطرت اور عالی دماغ شخص دینے میں خودغرضی سے کوئی کام نہیں لیا ——— میں اس سے کل کے بعد نہ ملوں گی اور دور سے اُسے دیکھ کر اس طوفانِ زندگی کے جادۂ مستقیم پر اس طرح قائم رہوں گی جس طرح ایک طوفانی اور ہولناک رات میں ایک ملاح صرف قطبی تارہ پر نگاہ رکھ کر اپنی راہ گم نہیں کرتا ——— منور کے آئندہ نے میری خودغرض محبت کو شکست دیدی اور میں اپنا فرض سمجھ چکی ——— میں اُسے نہ بتاؤں گی کہ میں اُسے چھوڑ کیوں رہی ہوں، اور پھر شادی منور کرے تو شوق سے لیکن میں ——— آہ منور کے سوا دوسرا "شوہر" میرے لئے تخلیق ہی نہ ہوا۔

۱۵ر نومبر ۱۹۴۷ء ———

آہ موت! ظالم و خونخوار موت! تجھے خود ہی موت کیوں نہیں آئی۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں کہ منور میرا پیارا منور اس دنیا کو اپنی جدائی سے بھیانک،

ڈراونی اور سنسان بنا گیا۔ اُمنگوں کا تو خاتمہ آج سے دس برس پہلے کر چکی جب اپنے دُلارے منور کو اپنی تنہائی گوارا کرکے اس دغاباز دنیا کو امانت دیا تھا لیکن آہ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس دولت بیدار پر یہ یوں بیچ جائے گی اور امانت میں خیانت کا اس قدر جلد موقع آجائے گا ——— منور آج پیارا نہیں ——— مجھے کیوں نہ موت آگئی ——— اب تو آجانی چاہیئے۔ جب مقصدِ حیات ہی نہیں تو زندگی کیوں ہو ———

آج دل کی دنیا سُونی ہوگئی۔ جذبات کا موضوع ہی باقی نہ رہا ———

میری ہستی تک کا سہاگ لُٹ گیا ——— گو میں دنیا کی نگاہ میں ایک دوسرے ہی شخص کی بیوی ہوں۔ میں کیوں نہ اپنے عہد پر قائم رہی۔ لیکن بیٹی کیسے باپ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور ماں کی آنکھوں میں خونیں آنسو بھی کیونکر دیکھ سکتی تھی ——— معاذ اللہ ہمارے خاندان کی بھی لب لا کیونکر اٹھی۔ لاکھوں پتی باپ چشم واحد میں کنگال ہوگیا اور اگر جیل جانے سے بچا تو صرف اسی قیمت پر کہ میں اپنے آپ کو ایک دولت مند کی بیوی بنا دوں۔ ایک قربانی منو کو چھوڑ کر کی، دوسری اپنے آپ کو خاندان کی عزت و آسائش کی خاطر سونے اور چاندی کے چند سکوں کے بدلے میں فروخت کرکے ——— گو میرے خاوند کو میرے جسم پر اقتدار تو ضرور حاصل رہا لیکن کیا وہ میری رُوح کو بھی رام کر سکا۔ نہیں، اس لئے کہ میں، وہ تو منور کی ہو چکی تھی ———

محبت منور کی آج بھی اسی شدت سے میرے دل میں باقی ہے جس طرح روزِ اوّل تھی ——— منور۔ آہ منور، آج تو اس دنیا میں نہیں، اور میں تیری، تیری اپنی ———

منقول از روزنامہ آفتاب، مورخہ یکم دسمبر ۱۹۳۶ء

آج صبح قدسیہ باغ کے قریب ایک عورت لاری کے نیچے دب کر مرگئی۔ جن لوگوں نے یہ تماشہ خود دیکھا بیان کرتے ہیں کہ مقتولہ ڈرائیور کے بار بار ہارن دینے اور بچانے کے باوجود لاری کی جانب لپکی چلی آتی تھی۔ قدسیہ باغ کے قریب رہنے والے مظہر ہیں کہ یہ عورت تقریباً پندرہ دن سے دیوانی ہو چکی تھی۔ اور اس کا بیشتر وقت قبرستان میں گزرتا تھا ———

——— کوئی نہیں بتا سکا کہ وہ کون تھی ———

——— ؟

ارباب جبہ و قصہ سنا دو تو لو بوسی
سُنّو ذرا بیاں آؤ، دو تو لو بوسی

مے چھیڑی جام اور نگارین مو فرض
پیمانہ کی کیسا ہوا بتا دو تو لو بوسی

(راجپتی)

موتی یا شبنم؟

اِک دَور وہ آنے والا ہے، دُنیا کی خوشی مٹ جائے گی
چلنے میں قدم تھرائیں گے، اُٹھنے سے نظر شرمائے گی
آئینہ فروغِ طلعت کا، چھٹ جائے گا دستِ زینت سے
قندیلِ حیاتِ فانی کی، ہر سانس میں لَو تھرائے گی
اِس نازِ تکبّر فطرت کا پندارِ خودی مِٹ جائے گا
اِس حُسنِ کشیدہ قامت کی، بَل کھا کے کمر جھک جائے گی
بدمست جوانی کی آنکھیں جس چیز کو موتی کہتی ہیں،
دیکھے گی جو پیری جُھک کے اُسے، اِک قطرۂ شبنم پائے گی

(جوشؔ)

نقد و نظر

سالنامہ ساقی (جاپان نمبر)

مدیر۔ شاہد احمد صاحب دہلوی قیمت۔ پرچہ ایک روپیہ چار آنے
بی اے (آنرز) سالانہ قیمت چار روپے آٹھ آنے

دلی کا ساقی آج کل ہندوستان کے مؤقر رسائل میں شمار کیا جا رہا ہے۔ ا۔ رجو جدت سال بھر میں کئی خاص نمبر نکالنے میں اُس نے دکھائی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اس دفعہ اُس کا سالنامہ جاپان نمبر کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ درحقیقت اس سالنامہ ساقی کو اگر براس نمبر کہا جائے تو صحیح ہے۔ کیونکہ وہ پروفیسر نور الحسن صاحب براس کی محنت سعی، اور اُس دلچسپی کا مظہر ہے جو موصوف کو رسالہ ساقی سے ہے۔ براس صاحب کے ادبی خدمت کے جذبے کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے، اور جس قدر اُن کے اس احسان کو اردو خواں ہندوستانی محسوس کریں تھوڑا ہے۔ کہ انھوں نے جاپان اور جاپانیوں کے ہر شعبۂ زندگی سے اُنھیں روشناس کرانے کی سعی کی ہے، ادب، تجارت۔ مذہب۔ سیاست۔ صحافت، روزمرہ کی زندگی، پھول ہیں۔ مناظر۔ تعمیرات۔ شادی بیاہ، غرض حتی الوسع کسی شعبے کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ جس قدر مضامین جاپان سے اپنے اور دوسروں کے بھیجے میں سب اچھے ہیں۔ بالخصوص وہ مضامین جو خود انھوں نے لکھے ہیں قابل تعریف ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ رفع شر کے خیال سے کہ شریک زندگی کی ملکیت میں اُن کا بہر صورت سا حصہ قدرتی ہے۔ "گذارش" میں صرف مسز براس کی ہی ستائش کی ہے اس کہنے کا یہ مدعا نہیں ہے کہ مسز براس کی محنت کی داد نہ دی جائے۔ جو کسانو کے چشمے دیکھنے گئیں اور گو خود چڑھائی پر نہ چڑھ سکیں تب بھی اپنے شوہر مسٹر براس کے مشاہدات کو اس خوبی سے سپرد قلم کیا ہے کہ وہ خود اُن کے ذاتی مشاہدات معلوم ہوتے ہیں۔

تصاویر کا اہتمام سبحان اللہ کیا کہنا، ۲۰۰ صفحات کے رسالے میں ۵۱ چھوٹی بڑی تصاویر ہیں۔ اور ساقی کے اس ٹائٹل پیج کا کیا کہنا، کہ "جلوہ دشمن ایمان و آگہی ہے"۔

ہمیں امید ہے کہ شاہد صاحب معاف فرمائیں گے اگر ہم یہ کہدیں کہ دو نظمیں "جاپان" اور "دنیا کا کامیاب دارالتجارت"، شائع کر کے جاپان نمبر پر انھوں نے بڑا ظلم کیا ہے۔ شعرائے نازک خیال کی ناخوشی کو فروری کے ساقی میں شائع کر کے بھی رفع کیا جا سکتا تھا۔ غرض اِن دو مجبوریوں کے سوا جاپان نمبر نہایت کامیاب نمبر ہے، اور ہم دلی مسرت سے مسٹر براس کو اُن کی محنت پر مبارکباد دیتے ہیں اور شاہد صاحب کو بھی کہ اُن کے حلقۂ مضمون نگاران میں پروفیسر براس ایسے مخلص اور محقق ادیب موجود ہیں۔ "م"

سالنامہ ادبِ لطیف

مدیران۔ چودھری برکت علی بی اے۔ قیمت ۱۲
میرزا ادیب، بی اے۔
ملنے کا پتہ۔ پنجاب بک ڈپو ۵ لوئر مال۔ لاہور

ادبِ لطیف کا سالنامہ جس محنت و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے وہ بہت قابلِ تعریف ہے۔ دو سو صفحات میں مضامین اور نظمیں ہیں۔ بعض تصاویر بہت اچھی ہیں۔ تاریخی مضامین علمی قابلیت کے آئنہ دار ہیں۔ "اکبر اور دین الٰہی" کے عنوان سے جو مضمون سپرد قلم کیا گیا ہے وہ ممکن ہے کہ اردو رسائل میں ایک ضروری تاریخی بحث کا افتتاح کردے، اور ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ فیصلہ کریگا کہ دین الٰہی واقعی کوئی مذہبی تصور تھا یا وہ محض اکبری شاہنشاہی کے مضبوط کرنے کے لئے ابوالفضل کی ایجاد کردہ دسیسہ کاری تھی۔

افسانے سب اچھے ہیں اور بعض تمثیل حکیمانہ انداز پر بیان کی گئی ہیں۔

مذاحیہ مضامین بعض قابل قدر ہیں۔ مذاح نویسوں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مذاق اگر پھکڑ بن جائے تو پھر وہ بجائے ادبی رسائل میں جگہ پانے کے جنڈو خانوں میں جگہ پانے کا زیادہ مستحق ہے۔ یہ اشتباہ ہمارا کسی مذاح نگار، ادب لطیف سے لئے نہیں ہے بلکہ ہمارا اخطاب اُن سے ہے جو اس کے مستحق ہیں۔

بلاستاں مولوی ظفر علی خاں صاحب کی نظم بعیر اُن کا نام پڑھے کہہ رہی ہے کہ میں اُس تخیل کا نتیجہ ہوں جو کملی والے کو غاروں میں ڈھونڈھتا پھرا ہے۔ باقی اور نظمیں اور غزلیں بھی اچھی اور اکثر خاصی ہیں۔

رسالہ ظاہری شان۔ کتابت، طباعت اور ضخامت ہر لحاظ سے عیر سے زیادہ قیمت کا مستحق ہے۔ "م"

پردۂ تصویر

مدیران: سید ابن الحسن فکر ایم اے، دھرمپال گپتا — قیمت سالانہ دو روپے بارہ آنے، فی پرچہ چار آنے

ملنے کا پتہ۔ دفتر پردۂ تصویر۔ دہلی

۶۴ صفحات پر یہ ماہوار مصور رسالہ دہلی سے نکلتا ہے۔ نام خود کہہ رہا ہے کہ وہ ایک فلمی رسالہ ہے۔ زیر ریویو نمبر میں ٹیگور کے مشہور آفاق ڈرامے چترا کا ترجمہ ہے۔ جو سید آصف علی صاحب بیرسٹر ایم۔ ایل اے جیسے قابل ادیب نے کیا ہے جس کو ترجمہ کہنا زیادتی ہے۔ ٹیگور کی حکیمانہ نازک خیالی کو جس خوبی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے وہ ہمارے نزدیک اپنی مثال آپ ہے۔ درحقیقت مسٹر آصف علی ادب کے وہ گوہر گرانمایہ ہیں جن پر سیاست نے استحصال بالجبر کر کے اُردو ادب کو بڑا بھاری صدمہ پہنچایا ہے۔ اس ڈرامے کے علاوہ اور مضامین بھی خوب ہیں۔ اور تصاویر کی تو کچھ کمی ہی نہیں۔ ایک نہیں متعدد ہندی اور فرنگی ایکٹرسوں کی تصاویر ہیں۔

ہم کو یہ معلوم ہو کر بہت خوشی ہوئی کہ پردۂ تصویر اپنے دوسرے ہمعصر فلمی رسائل کے مقابلہ میں بہت زیادہ کثیر الاشاعت ہے۔

ناشران فلم کو یقیناً پردۂ تصویر سے مستفید ہونے کی کوشش کرنی چاہئے جس کے فلمی مضامین علمی و ادبی حیثیت سے بہت بلند پایہ ہیں۔

"م"

نوادر

مولفہ مرزا محمد عسکری صاحب بی اے۔ — قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:
(۱) مرزا محمد عسکری بی اے۔ (حکیم عبدالعزیز روڈ)
(۲) سنیم انوار المطابع (امین آباد پارک)
(۳) ان ظریک ایجنسی (وکٹوریہ اسٹریٹ)
} لکھنؤ

فاضل مولف نے عربی، فارسی، انگریزی کتب کے بہت سے لطیفے، ظریفانہ اقوال مشاہیر کے دلچسپ جملے جمع کر دئے ہیں، اور نامور نگار کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں۔ پھر التزام یہ کیا ہے کہ ہر طبقے کے ظریفانہ اقوال و اذکار کو علیحدہ علیحدہ ترتیب دیا ہے یہ نہیں کیا کہ ابھی تو حکیم ارسطو کا لطیفہ رکھا جاتا، پھر یکایک کسی مسجد کے امام صاحب گل فشانی کرتے نظر آتے۔ شیخ ممتاز حسین صاحب عثمانی اڈیٹر اودھ پنچ نے "پیش گفت" لکھکر مولف کی محنت کی داد دی ہے۔ اور آج کل کے مذاح نویسوں پر چوٹ کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ آج کل کے ظریف بے نتیجہ افسانے لکھتے ہیں اور اپنی عبارت کو ادبی، اور اخلاقی محاسن سے معرا کرتے جاتے ہیں۔ بڑی ظرافت کی تو کسی پردہ نشین کی بدکاری کا حال لکھ ڈالا۔ یا اپنی "بدحواسی" چُن کے رکھ دی۔"

مقدمہ مولف خوب ہے۔ جو ہر مذاح نویس کو پڑھنا چاہیئے۔ بقول مولف اس میں کوئی شک نہیں کہ سوسائٹی کے مذاق کے ساتھ ہر ذوق میں تبدیلی ہونی لابد ہے۔

بہرنوع یہ کتاب تفریح حاصل کرنے کا بہت اچھا ذریعہ ہے، اور جو محنت اس کے ترتیب دینے میں کی گئی ہے وہ قابل داد ہے۔

آخر میں ہم حضرت مولف کو داد دیتے ہیں کہ انھوں نے FORE WARD کا "پیش گفت" ایسا اچھا ترجمہ کیا ہے جس سے بہتر ممکن ہی نہیں ہے۔

کلیم کے فروری نمبر میں ہم اس نادر کتاب کے چند اقتباسات بھی شائع کر رہے ہیں۔

فاضل مصنف کی یہ کوشش قابل داد ہے اور اس لائق ہے کہ ہر صاحب ذوق اس کا مطالعہ کرے۔

"م"

داستانِ عشق! کس کی؟ —— اُنکی

جو سب سے زیادہ پاک نام لے سب سے زیادہ ناپاک کام کرتے ہیں!

جو عباؤں اور ڈاڑھیوں کے سائے میں رینگتے ہوئے سانپ ہیں!

جو مذہب کی تحقیق صرف اس لئے کرتے ہیں کہ مذہب کی جڑوں کو کاٹ دیں!

جو وظیفے اس لئے پڑھتے ہیں کہ سادہ لوحوں کی دولت اور اُن کی عورتوں پر قبضہ کرلیں!

پاپائے رُوم کی داستانِ عشق

از ملک حبیب احمد بی۔ اے آنرز

پڑھیئے اور دیکھئے کہ تقدس اور روحانیت کی عبا میں حُسن کس کس رنگ میں جلوہ گر ہوا، فاحشہ عورتوں نے خدائی سلطنت پر کیونکر حکومت کی، کس پوپ نے اپنی بھابی سے عشق کیا، کس پوپ کی سُونی آغوش اپنی بھتیجی سے آباد ہوئی، کس پوپ کے حمام میں جوان عورتوں کو اذنِ عام تھا، کونسا پوپ اپنی حقیقی بھانجی کو دل دے بیٹھا، کن جمالوں کے اشارہ چشم پر مسیحی دُنیا ناچتی تھی، کیوں کر ایک عورت پوپ بنی اور وضع حمل سے یہ راز کیونکر فاش ہوا۔ ایسے ایسے بیسیوں سنسنی خیز اور حیرت انگیز سچے واقعات، دیکھئے کہ شبستانِ محبت میں کافر جوانی بیتاب جذبات کی آغوش میں کیونکر مچلی، حبِ مسیحی و نیا حضرت عیسیٰؑ کے پاک نام پر قربان ہوئی جاتی تھی تو سُنئے کہ پوپ کے محلوں میں آنند کی مُرلی نے کیسے کیسے سریلے گیت گائے فاضل اور صاحبِ طرز مصنف نے اس اچھوتے موضوع پر شباب کی رعنائیوں میں کھو کر پیاری پیاری زبان میں دیر و حرم کے پردے اُٹھا کر کیسے کیسے صنم بے نقاب کر دئے ہیں!

بدمعاش کی ڈائری

۵ ؍ اپریل ۱۹۱۵ء

"لمبی لمبی زلفوں کے نیچے میری پیشانی ستارہ کی طرح چمکتی ہے۔ اس لئے آدمی مجھے انجم کہتے ہیں، میں نے سائنس نہیں پڑھی اور زباندانی پر مجھے ہمیشہ فخر رہا ہے۔ پھر بھی ایک ہم جماعت کو در غلا کر کالج کے سائنس کے کمرہ سے آتش گیر مادہ اور ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایسڈ منگا کر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بم کے گولے بنانے کا تجربہ کرنا میرا ابتدائی مشغلہ رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے حالات کی تاریخ میری میز پر رہتی ہے اس کا ایک ایک ہیرو میری نگاہ میں فوجی جنرل سے کم حیثیت نہیں رکھتا۔ میں اپنے تئیں قلمرو ۔۔۔۔۔۔۔ کا بادشاہ سمجھتا ہوں اور اس تصور سے خوش ہوتا ہوں جبکہ فوجی پہرے مارچ کرتے ہوئے میری تخت نشینی کے روز سلامی اتاریں گے اور دنیا کی حسین ترین عورت میری ملکہ بن کر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میری زندگی ایک معمہ بن گئی ہے طبیعت اشتراکیت کی تحریک کی طرف مائل ہے۔ لیکن پیٹ بھی تو بھرنا ہے۔ اس لئے میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اچھے لوگوں پر اپنی نیک سیرتی کا اعتماد پیدا کر کے دھوکا دوں اور روپیہ بٹوروں۔ اب شادی تو کر رہا ہوں ایک اچھی جگہ پر بھولی بھالی لڑکی ہتھے چڑھ گئی ہے بیوقوف پیتل کو سونا سمجھ کر میرے جال میں پھنس گئی۔ دنیا کہتی ہے کیرکٹر پیدا کرو لیکن میں کیرکٹر کو لیکر کیا چاٹوں اس سے اونچا تو۔ روپیہ ہے! روپیہ!! روپیہ!!! اب تک زندگی کا یہی مقصد رہا اور جب تک میرا شیطان میری مدد کر رہا ہے اسی اصول پر چلوں گا۔ میں بھی خوب ہوں جو ملتا ہے اُسے پھانس لیتا ہوں اور اس وقت تک اپنے خلوص کا اظہار کرتا ہوں جب تک کہ اُس کی جیب خالی نہ کر دوں۔ مکر و دغا میرا ایمان ہے اور روپیہ میرا خدا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اپنے محسن کو دھوکا دینا میرا فرض ہے۔ میرے عزم اور استقلال کے آگے فاصلہ کوئی چیز نہیں ۔۔۔۔۔ کلکتہ سے ۔۔۔۔۔۔ گڑھ۔ گڑھ سے ۔۔۔۔۔۔۔ ر آباد۔ اور ۔ر آباد سے قطب صاحب کی لاٹ کے پاس۔ اور آگے خدا جانے کہاں کہاں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا۔ دُنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں
اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کرسکوں، تعمیلِ حکم کے لئے فردوس مثال کشمیر، جنت نظیر سوئزرلینڈ، شباب انگیز تسمانیہ،



اور گل پاش مرغزاروں میں گُل چینی کی گئی .... جب سب پھول دُور
دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے، تو بیشتر اپنی خوشبو
کھو چکے تھے اور باقی اس قدر مُرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حُسن شناس
نگاہوں کو تکلیف ہوئی، مہارانی اس خواہش کو پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی
کھانا پینا ترک کردیا، مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا اور وزراء سے مشورہ طلب کیا۔ مہتمم
توشہ خانہ نے "اصغر علی محمد علی" سے عطر منگوانے کو کہا۔ رائے معقول
تھی، فوراً عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا۔

اصغر علی محمد علی، تاجرانِ عطر، لکھنؤ، دہلی

REGD NO L. 3694



ملنے کا پتہ۔ منیجر کلیم بک ڈپو کٹرہ بڑیاں فتح پوری دہلی


کلیم
مدیر۔ جوش ملیح آبادی

چیرمین۔ آنریبل سرہومی مہتہ

زینت لاہ

جنرل مینیجر۔ مسٹر بہرام جی۔ ہرمزجی

تحفظ

صدر مشاورۃ۔ مسٹر جی۔ ایس۔ مراٹھی
بی اے۔ اے آئی اے

نفس

ہیڈ آفس۔ اپا اسٹریٹ، ساؤتھ
فورٹ بمبئی

خوش معاملگی

سکرٹری۔ مسٹر ایم۔ آئی ڈوکشٹ
بی اے۔ ایل ایل بی

میں

سپرنٹنڈنٹ برانچ۔ مسٹر بی اے۔ انصاری
کورونیشن ہوٹل بلڈنگ دہلی

دیانتداری

اعتماد

دی

ایوری مین پالیسی

نے

پبلک کی آنکھیں کھول دی ہیں، اور ہندوستان بھر کی دنیائے بیمہ میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے
بحالت بیماری کوئی بیمہ دینا نہیں پڑتا، بلکہ ہر ماہ ایک معقول رقم بطور امداد ملتی ہے

بنام قوت و حیات

کلیم

بجملہ حقوق محفوظ ہیں

اردو زبان کا ہر جہت سے سب سے زیادہ قیمتی ماہنامہ

مدیر
جوش ملیح آبادی

نائب مدیر
سید مطلبی فریدآبادی

سالانہ چندہ ۶ے
ششماہی چندہ ۳ے
قیمت فی پرچہ ۹ر

جلد	فہرست مضامین ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۶ء	نمبر ۳

اِشارا

(جوش ملیح آبادی)

(۱) ملک کے نامور فرزند مسٹری آر سبندرو کا مضمون "شاعری کی اصلی اور امتیازی خصوصیات" کی سرخی سے اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ جس کے واسطے میں بی۔ پی ورما صاحب کا دل سے شکرگذار ہوں۔

مضمون شروع سے آخر تک نہایت بلند پایہ ہے اور ایسے لطیف نکات پر مشتمل ہے، جن تک عوام کیا، خواص تک کی نظر نہیں جاتی۔ کاش ہمارے شعرائے کرام توجہ فرمائیں۔

شری آروندو کا طرز تحریر جس قدر حکیمانہ ہے، وہ اس اہم مضمون سے ظاہر ہے موصوف نے معیار شاعری کی جن بلند فلسفیانہ موشگافیوں سے توضیح کی ہے، وہ قابل غور ہیں۔

میں ورما صاحب کے اس کرم کا شکرگذار ہوں۔ اور ان کی خدمت میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ براہ کرم اس سلسلے کو قائم رکھیں۔ اور مسٹری آر بندو کی خدمت میں نئی میری یہی آرزو پہنچا دیں۔

(۲) اس نمبر کے ذریعے میں آج روشناس کراتا ہوں اس فرد کو جو "سیکڑوں قابلِ شہرت ہیں کہ مشہور نہیں" کا مصداق ہے۔

متین الدین صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ، ایک نہایت کامیاب وکیل کی حیثیت سے تمام شہر میں معروف ہیں، مگر یہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ شاعر، اور کس پایہ کے شاعر ہیں بات یہ ہے کہ متین صاحب حد سے زیادہ خاموش اور شہرت سے بھاگنے والے انسان ہیں۔ اور پسند نہیں کرتے کہ دنیا انہیں شاعر کی طرح جانے۔ معلوم نہیں وہ اس باب میں کہاں تک راستی پر ہیں۔

اس نمبر میں ان کی دو نظمیں، .... شائع ہو رہی ہیں۔ وہ نظمیں جو انہوں نے خود اپنے ہی لئے کہی تھیں، آج خلوت سے جلوت میں آ رہی ہیں۔

آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ کم مشقی؛ اور اس کے اثرات کے باوصف متین صاحب کے کلام میں حقیقی شاعری کی بجلیاں کیونکر چمک رہی ہیں، اور یہ معلوم ہوتا ہے گویا حافظ اور نظیری کی روح اردو قالب میں بول رہی ہے۔

وہ جس طرح ایک اچھے شاعر ہیں اسی طرح ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ اور یہ میرے اس قول کی تصدیق ہے کہ اچھا شاعر، کبھی برا آدمی نہیں ہو سکتا۔

(۳) اس نمبر میں آپ "آدم و حوا" کی تصویر ملاحظہ فرمائیں گے، پہلے "آدم و حوا" کے متعلق دو حرف سن لیجیے۔

آدم کوئی معمولی انسان نہ تھے، آدم نے کسی بُرے ماحول میں پرورش نہیں پائی تھی۔ آدم ابوالبشر تھے یعنی پہلے انسان تھے، اس لئے ان کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے سرتابی اور گناہ کا جوہر اپنے آباؤ اجداد سے وراثت میں پایا تھا، اسی کے دوش بدوش آدم "پیغمبر" بھی تھے، یعنی وہ کسی دنیوی شاہنشاہ کے پیغمبر نہ تھے بلکہ اس خالق ارض وسما کے وزیر تھے، جس کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔

اب اس بات کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمایئے، آدم کو نصیحت کی جاتی ہے کہ شجرِ ممنوع کے پاس بھی نہ پھٹکنا، نصیحت کسی فرشتے یا جن کے وسیلے سے نہیں کی جاتی۔ بلکہ خود پروردگار عالم براہ راست نصیحت فرماتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ یہ اہتمام بلیغ بھی کرتا ہے کہ آدم کے "عدو ئے مبین" کو بھی پہنچوا دیتا ہے۔ کہ دیکھو یہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے، یہ تمہیں دھوکا دے گا۔ خبردار اس کے فریب میں نہ آنا۔

آپ معاملے کی نزاکت کو سمجھے! رب کائنات براہ راست نصیحت کرتا ہے کس

کو بیٹھا ہو کہاں عصمت و طہارت کے آغوش یعنی جنت میں۔ اور اسی کے ساتھ دشمن بھی دکھا دیتا ہے۔ کہ دیکھو اس سے ہوشیار رہنا —— ——— ۔ لیکن پھر ہوتا کیا ہے، آدم، ابوالبشر، اور پیغمبر ہونے کے باوجود اور پروردگار عالم کی ہی تنبیہ کے باوجود ہم آغوش ہو کر دم لیتے ہیں۔

آخر یہ ذوق گناہ کہاں سے آیا؟ یہ جذبہ سرتابی کس کا عطیہ تھا؟

اگر یہ کہا جائے کہ "عدو نے" آدم پر غلبہ حاصل کر لیا، اور فریب دینے میں کامیاب ہو گیا تو میں پوچھوں گا، آدم میں فریب کھانے اور اس آسانی سے فریب کھانے کی صلاحیت کا ذمہ دار کون ہے؟

آخر پروردگار عالم کی تنبیہ کے اثر پذیر ہونے میں کون سی چیز کیوں غالب آ گئی، کیا آدم کے دل کی ساخت ہی ایسی تھی کہ اس پر اپنے رب کے الفاظ کا نقش اتنا گہرا نہیں بن سکتا تھا، جتنا دشمن کے الفاظ کا؟

کون کہہ سکتا ہے کہ حقیقت کیا تھی؛ مگر اتنا ضرور معلوم ہے۔ معلوم کیا ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اگر حضرت آدم جنت میں گناہ نہ کرتے تو زمین پر نہ پھینکے جاتے۔ اور اگر زمین پر نہ پھینکے جاتے تو اس زمین کی خلافت اور نیابت الٰہی کا تاج نہیں پہن سکتے۔

اور اگر آدم کے سر پر خلافت ارض اور نیابت الٰہی کا تاج نہ جگمگاتا، تو پھر یہ دنیا پیغمبروں، اوتاروں، اور آسمانی کتابوں کی روشنی سے بھی محروم رہ جاتی۔

غور کیجیے آدم کے ذوق گناہ کی عظمت پر، کہ وہ کتنی بلندیوں اور پاکیوں کا سرچشمہ بن گیا۔

گرداب کھیل کر ابھرنے والے — ممنوع شجر سے لے نہ ڈرنے والے
اس ارض کا تحفۂ خلافت ہو قبول — فردوس میں لے گناہ کرنے والے

زندہ باد انجام سرتابی! پائندہ باد مآل عصیاں!

غلامی کے نظارے

(۲) بڑی بڑی باتیں تو سب کو نظر آتی ہیں۔ آیئے چھوٹی چھوٹی باتوں پر نگاہ کریں۔ اور دیکھیں کہ ہماری قوم کی ذہنی کیفیت کیا ہے؟

لوگ بڑے بڑے واقعات کو دیکھنے کے خوگر ہیں، حالانکہ اس ناقابل فہم دنیا میں ہر معمولی سا واقعہ بھی ایک زبردست سانحہ، اور ہر چھوٹی سی بات بھی ایک عظیم حادثہ ہے۔

بازاروں کو سب دیکھتے ہیں حالانکہ ایک ذرے میں بھی وہ سب کچھ موجود ہے، جو پہاڑ میں وسیع و بلند ہو کر نمایاں ہو گیا ہے۔ دل والے قطرے کو دریا دیکھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ قطرہ حقیقی سی چیز ہے بھی وہ سب موجود ہے، جو بازار کی کثرت بن کر ظاہر ہو گیا ہے۔ چلیے میں آپ کو بازار میں لے چلوں گا۔

دکانیں دیکھیے یہ تمام دکانیں ہندوستانیوں ہی کی ہیں، اس سرے سے اس سرے تک نظر ڈال لیجیے، کہ تاشائی اور دکاندار بھی تمامتر ہندوستانی ہی ہیں۔ جو سڑک پر چل رہے ہیں وہ بھی ہندوستانی ہیں۔ جو سواریوں میں جا رہے ہیں وہ بھی ہندوستانی ہیں۔ اور جو سواریاں چلا رہے ہیں، وہ بھی سب کے سب ہندوستانی ہیں لیکن بازار کے اس شدت سے ہندوستانی ہونے کے باوجود دکانوں کے تختۂ ساین بورڈ ملاحظہ فرمائیے کہ سب کے سب انگریزی میں لکھے ہوتے ہیں۔

اگر آپ آزردہ نہیں ہو جاتے، تو کم سے کم ایک ٹھنڈی سانس ہی بھر لیجیے۔

کیا ان خدا کے بندوں کو حکومت نے انگریزی بورڈ لگانے پر مجبور کیا ہے یا اس کے مذہب نے دیسی زبان کے استعمال کو شجر ممنوع قرار دے کر حرام کر دیا ہے؟

شاید ہماری تجارت کے نمائندے، جو دراصل بدبختی عادت ہی کے ایجنٹ ہیں یہ فرمائیں کہ اس ملک میں، چونکہ انگریز خریدار بھی ہیں اس لئے ان کی رعایت و آسانی کی خاطر انگریزی حروف کے بورڈ لگائے جاتے ہیں۔

لیکن یہ سراسر غلط بیانی ہے، بلکہ کم غلامانہ نفس کا ایک فریب ہے جو خود اپنی ہی ذات کو دیا جا رہا ہے۔

سنیے، اول تو پورے ہندوستان میں انگریزوں کی آبادی ہی کتنی ہے اس کے علاوہ ہر بڑے شہر میں خود انگریزی دکانیں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ اور انگریز قوم کا یہ ایک زبردست اصول ہے کہ سودا خواہ کتنا ہی گراں کیوں نہ پڑے وہ ہمیشہ اپنے ہم قوموں ہی کی دکانوں میں خریداری کرتی ہے۔ بعض کم حیثیت یا بخیل قسم کے انگریز کبھی کبھی ہماری دکانوں کی طرف ضرور چلے آتے ہیں، لیکن ان کی یہ گاہ گاہ کی آمد ہرگز اس حد کی اہم نہیں ہو سکتی کہ لاکھوں اور کروڑوں مستقل ہندوستانی گاہکوں کی اہمیت کو پس پشت ڈال کر اپنی زبان میں بورڈ لگانا ہی ترک کر دیا جائے۔

یاد رکھیے، جو قوم اپنوں کی عزت نہیں کرتی اور اپنی زبان کو حقیر سمجھتی ہے، وہ آزاد ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔

خیر یہ تو بڑے شہروں کا ذکر تھا، آیئے ذرا اپنے قصبوں اور دیہاتوں کی طرف

کی پیروی کریں۔ جہاں ایک انگریز بھی نہیں رہتا، اور نہ جہاں اُدھر سے کوئی انگریز گذرتا ہی ہے۔ اس کے علاوہ ان دکانوں میں جو ماں ہوتا ہے وہ اس شدت کے ساتھ خالص دیسی ہوتا ہے کہ انگریز اس سے واقف بھی نہیں۔ ہر نے ماتم کرنے کا مقام ہے کہ وہاں تک سائن بورڈ آپ کو انگریزی ہی میں ملیں گے۔

اس سلسلے میں ایک سب سے زیادہ مضحکہ خیز مثال۔ ورت حال اور بھی ملاحظہ فرمائیے یعنی آپ کی جو دکانوں پر دوسرے بورڈ بھی نظر آتے ہیں انہیں آپ خوش نہ ہوں۔ پکار رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ پڑھنے تو جیں حروف میں لیکن زبان کے الفاظ تمام تر انگریزی ہی ہوتے ہیں۔

"دی نان ہاؤس کیبری" "دی جیلانی کلاتھ مرچنٹس" "دی ترنج پنجید مرید" "دی گڈ بوٹ فیکٹری"۔

کوئی ان دشمنان عقل و خرد اور غلامان مادر زاد سے یہ پوچھے کہ اے دانشمندو تم نے یہ بورڈ کس قوم کی خاطر آویزاں کئے ہیں۔

انگریزوں کی خاطر؟ انگریز تو ان کا ایک حرف بھی نہیں پڑھ سکتا۔

انگریزی داں ہندوستانیوں کی خاطر؟ وہ تو انگریزی ہی میں پڑھ سکتے تھے۔

انگریزی سے ناواقف ہندوستانیوں کے لئے؟ ہاں اسی کو عقل کی آنکھیں پھوٹ جانا کہتے ہیں، اور یوں نہیں کیا جاتا ہے اپنی ذہنی غلامی کا اعلان۔

(ب) اب بازار سے آئیے اپنے "تعلیم یافتہ طبقہ" میں۔

اس بحث کو سردست چھوڑئیے کہ اس گروہ کو "تعلیم یافتہ" کہہ بھی سکتے ہیں؟ اور سردست اس سوال کو بھی نہ اٹھائیے کہ انہیں سند یافتہ جاہل کیوں نہ کہا جائے، اس وقت تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے تاجروں کے مقابلے میں ان کی ذہنیت کتنی بلند ہے۔

ذرا نظر اٹھا کر دیکھیے، یہ ایک "تعلیم یافتہ" نوجوان گریجویٹ آپ کے سامنے کھڑا ہوا پائپ پی رہا ہے، کوٹ، پتلون، ٹائی، کالر، اور ہیٹ، سیاہ چمکتا ہوا جوتہ، قمیص کے سخت کف کوٹ کی آستینوں سے جھلکتے، اور رنگین رومال کا ایک کونا کوٹ کی جیب سے جھانکتا ہوا، اور جیب میں نامنظور شدہ درخواستوں کا انبار، یہ لیجیے اس کا ایک دوست آتا ہے، اور انگریزی میں بات چیت ہوتے ہوتے اردو یوں شروع ہوتی ہے "کل رات سے میری وائف کو ہیڈک بہت اپ سٹ کئے ہوئے ہے"۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا تھا، انہوں نے جو دوا پرسکرائیٹ کی ہے اسے لینے جا رہا ہوں۔ کہا تمہارے فادر کی ہیلتھ اب کیسی ہے، سنا ہے وہ لانگ لیو پر آؤٹنگ کے واسطے جانے والے ہیں"۔

میں پوچھتا ہوں "وائف" کے عوض "بیوی" کہنے سے کیا ان کی اہلیہ محترمہ بے پردہ ہو جاتیں؟ اور "فادر" کے بدلے "باپ" کہنے سے کیا ان کے والد بزرگوار کی عزت اور ان کے تن و توش میں کوئی کمی آ جاتی؟

دیکھیے چند "تعلیم یافتہ" چائے پی رہے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے، انگریز چائے میں شکر کم استعمال کرتے ہیں۔ میزبان دریافت کرتا ہے، "مسٹر محمود ہاؤ مچ شوگر"؟ اور مسٹر محمود سعید کالر میں اپنی کالی گردن کو فرنگیوں کی طرح جنبش کرتے ہیں صرف ایک "ٹی سپون فل" اور یہ لیتے ہی اپنے گرد و پیش بیٹھے ہوئے احباب کو فخر کے ساتھ دیکھ کر جیب سے نکلے ہوئے رومال کے کونے پر لگا ہیں جما دیتے ہیں۔

اب ذرا ناموں کی کر بیونت ملاحظہ ہو۔

حضرت کا نام ہے، زاہد علی جعفری۔ مگر لکھینگے "زیڈ۔ اے۔ جعفری"۔ نام ہے تجمل حسین رضوی، تحریر فرمائیں گے "ٹی۔ ایچ۔ رضوی"۔ اگر اسم گرامی ہے طاہر بیگ قادری، تو حضرت اپنے خلاصے "ٹی۔ بی۔ قادری" بن کر رہ جائیں گے۔

انگریزوں میں ایک دیا سلائی سے تین سگرٹ جلانا فال بد سمجھا جاتا ہے، یہ حضرات ان کے اوہام کے بھی وارثانِ حقیقی واقع ہوتے ہیں، ایک دیا سلائی سے دو سگرٹ جلاتے ہی ایک خاص فخر آمیز آواز کے ساتھ "پھو" کی آواز نکال کر دیا سلائی بجھا دی جاتی ہے۔ اور اس کے بجھتے ہی ان کی آنکھوں میں غرور تہذیب کا شعلہ تھرتھرانے لگتا ہے۔

اکثر انگریزوں اور بالخصوص میموں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ اثنائے کلام میں وہ اپنے شانوں کو ایک ادائے خاص سے جھٹک دیا کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ چیز بھی ہمارے "تعلیم یافتہ" حضرات نے خیرات پالی ہے، اور خواہ موقع ہو کہ نہ ہو، یہ غریب اثنائے گفتگو میں برابر اپنے شانے جھٹکتے رہتے ہیں۔

ہمارا سب سے بہتر لباس خواب ڈھیلے پائجامے اور کرتے ہو سکتے ہیں، مگر آپ جس مغرب گزیدہ کی خواب گاہ میں جائیں گے، تو حسرت کے ساتھ دیکھیں گے کہ دھاریوں والے پتلون کی میانی ایک چھوٹے سے کوٹ کے نیچے لٹکی ہوئی ہے۔ (باقی آئندہ)

---

(۵) افسوس کہ بعض موانع کے باعث حضرت آزاد انصاری سردست حیدرآباد کی سکونت ترک نہیں فرما سکتے، اس لئے میں نے اپنے مخلص دوست جناب مُطلبی صاحب فریدآبادی سے درخواست کی کہ وہ نائب مدیر کے فرائض انجام دیں۔ جسے انہوں نے براہ کرم منظور فرما لیا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ "کلیم"، ان کی بے پناہ قوت عمل کے طفیل نہایت حسن و خوبی کے ساتھ چلے گا۔

رفتارِ وقت

(ادارہ ظلیہ)

...ہے شہنشاہ انگلستان اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کی رسمِ تاجپوشی کے متعلق اعلان کر دیا گیا ہے کہ شہنشاہ سابق کے سوگ کا زمانہ ختم ہونے کے بعد ... منائی جائے گی، اور پھر ۱۹۳۷ء میں شہنشاہ معظم سرزمین ہند میں بھی اس رسم کی ادائیگی کے لیے رونق افروز ہوں گے۔

یورپ آجکل عجیب حالات میں سے گذر رہا ہے۔ مسولینی کے اقتدار کے متزلزل ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ سپین میں روز بروز ایک اشتراکی حکومت کے قیام کے امکانات قوی تر ہوتے جا رہے ہیں۔ گویا اٹلی و حبش کی آویزش نے یورپ کے دو مشہور مدبروں کو یعنی سابق وزیرِ خارجہ انگلستان وایم لاول وزیرِ خارجہ فرانس کو اپنی کرسیاں چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن تیل کی بندش خواب و خیال بن کر رہ گئی ہے۔ اور سنا جاتا ہے کہ ... فرانس اب پھر اٹلی سے آخری شرائطِ صلح طلب کر رہی ہے۔

مجلس اقوام کی پول گو قضیۂ جاپان و چین سے بھی کھل گئی تھی، لیکن ہنگامۂ حبشہ نے اس کی رہی سہی قلعی اور کھول کر رکھ دی، اور دنیا سمجھ گئی کہ وہ محض کمزوروں کو مرعوب کرنے کا ڈھکوسلہ ہے۔ اور زبردست کے استحصال بالجبر کا اس کے پاس سوائے خاموشی کے اور کوئی علاج نہیں ہے۔

جس قدر اٹلی میں مسولینی کا اقتدار غیر مستقل معلوم ہو رہا ہے اسی قدر جرمنی میں ہر ہٹلر کی قوت اور اقتدار میں استحکام نظر آتا ہے۔ اور نازی پارٹی نہ صرف جرمنی بلکہ آسٹریا ہنگری اور سوئٹزرلینڈ میں اپنے پنجے پھیلانے کی کوشش کر رہی ہے۔

فرانس اپنے ہمسایہ جرمنی کی جنگی تیاریوں کو نہایت اشتباہ کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ فرانس اور جرمنی کی مسلسل رقابت اور دشمنی ہی مسولینی کے حبش پر استحصال کی ذمہ دار ہے، فرانس کوئی ایسا عملی اقدام انگلستان کی دوستی میں جو اس کے لئے بہت قیمتی ہے اٹھانے سے قاصر ہے ... کو جرمنی کے علاوہ کسی اور حریف سے بھی الجھا دے۔ اور جرمنی خطرے کو کم کرنے کے لئے ... سوویٹ روس کے ساتھ سلسلۂ اخوت مستحکم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

جرمنی صرف فرانس کے لئے ہی اندیشہ کا باعث نہیں ہے، بلکہ اس کی روز افزوں جنگی تیاریاں روس کے لیے بھی خطرے کا باعث بنی ہوئی ہیں ... بالخصوص اب جبکہ جاپان اور روس کے معاملات چین کے سرسبز میدانوں میں متصادم ہو رہے ہیں اور جرمنی جاپان سے رشتۂ اخوت روز بروز استوار کر رہا ہے۔ روس یہ سمجھنے میں حق بجانب ہے کہ اس کو ایک ہی وقت میں یورپی حریف اور ایشیائی دشمن سے جنگ آزمائی کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے، چنانچہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ روس ایک کروڑ انسانوں کے ٹڈی دل کو مسلح کرنے کا انتظام کر رہا ہے۔

گویہ بات اب صاف طور سے عیاں ہو چکی ہے کہ حبشہ اور اٹلی کی وہ جنگ جو میکالے کے قریب ۱ فروری سے شروع ہوئی تھی، کئی روز کی خون فشاں کشمکش کے بعد حبش کی شکست کی صورت میں منتج ہوئی۔ اور ... ایراڈم کی بلندیوں پر اٹلی نے قبضہ کر لیا۔ تاہم جنگ کے اختتام کے آثار ابھی تک رونما نہیں ہوئے ہیں۔ اور گو اٹلی ابھی تک پوری آزادی کے ساتھ نہر سویز سے اپنی فوجیں و سامان حرب حبشہ میں بھیجتا رہا ہے۔ اس کے ذرائع جنگ بھی کافی وسیع ہیں۔ لیکن دفاعِ ملک کا جذبہ حبشیوں کو ایسی شکستوں سے مایوس نہیں کر سکتا، وہ برابر ایک ایک انچ زمین پر اپنی جانیں فدا کر رہے ہیں۔ اور سامان حرب و ضرب بھی ان کو ہر چہار طرف سے حاصل ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی یورپ کی وہ سوداگر اقوام جن کے اغراض اٹلی کو حبش پر پوری طرح قابض نہیں دیکھ سکتے، حبش کو ہر اخلاقی مدد

درسہارا دینے میں مشغول ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ حبش کی قوت مدافعت یا اٹلی کی زور آزمائی کی طاقت جلد ختم ہو سکے گی۔

شمالی افریقہ میں اور یورپ کی ایسی خود ساختہ دفاقی حکومتوں میں خلاصی وطن کے نعرے بلند ہونے شروع ہو گئے ہیں . . . . فلسطین کو وطن یہود بنانے کے خلاف فلسطینی تمام عرب علاقہ میں برسر شورش ہیں . . . . اور حکومت برطانیہ کی اعانت سے . . . . . . مدرسے بند کئے جاتے ہیں، طلبا و طلبات برسر شورش ہیں جلوس نکل رہے ہیں۔ گولیاں بھی چلائی جا رہی ہیں، غرض مصر کو منہ توڑ جواب دیا جا رہا ہے۔ جو ہر محکوم کا اس کے وطن سے استخلاص وطن برملا کرتا ہے۔

الجزائر، تونس، مراکو میں بھی آزادی وطن کا جذبہ بیدار ہے۔ اور فرانسیسی حکومت اس کو آہستہ آہستہ تدبیر و قوت سے کچلنے میں مصروف ہے۔

اتا ترک ایک طرف بلقانی ریاستوں کو ایک ہی لڑی میں پرونے میں مصروف ہے۔ اور دوسری جانب وہ مسلم ایشیا کی سرحد بندی کا قائم کر رہا ہے۔ ایران و عراق، حجاز و افغانستان و ترکی سے اعیان و سواخات کے قرار دادوں سے منسلک کئے جا رہے ہیں۔

مشرق بعید تین حریف ممالک کی حوصلہ مندیوں کا رزمگاہ اور مناقشوں کا میدان بنا ہوا ہے۔ جاپان چین کو بلا شرکت غیرے صاف نگل جانا چاہتا ہے لیکن امریکہ اور روس اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کے پورا ہونے میں زبردست روک بنے ہوئے ہیں اور اس امر کا نہایت یقینی امکان ہے کہ وہ آئندہ ہونے والی جنگ میں، جو جلد یا بدیر جنگ روس و جاپان کی صورت میں چینی منگولیا کی حدوں پر برپا ہونے کے لئے منڈلا رہی ہے، متحدہ محاذ پیش کریں گے۔ اور اگر اس وقت جرمنی اور اٹلی نے جاپان کی، اور فرانس نے روس کی معیت اختیار کی جو آخرکار انگلستان کو بھی کسی نہ کسی طرف مل جانے کے لئے مجبور کر دے گی تو کرۂ ارض ایک ایسے خونریز تصادم کا نمونہ پیش کرے گا، جو مستقبل میں آنے والی نسلوں کو کبھی نہ بھولے گا۔ اور جو زمانہ ماضی کی تمام خونباریوں کی یاد کو صفحۂ تاریخ عالم سے اگر بالکل محو نہ کر سکے گا، تب بھی مدھم ضرور کر دے گا۔

آؤ ذرا ہندوستان کی طرف بھی رخ کریں اور دیکھیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے، اور سمجھیں کہ اہل ہند کیا کر رہے ہیں۔ جبکہ دنیا کا ہر ملک ایک عظیم الشان امتحان میں اپنے کو ڈال کر اپنی عزت و اقتدار کو وسیع اور مستحکم کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

کہنا چاہیئے کہ آجکل کا سارا تعلیم یافتہ اور متمول ہندوستان آنیوالے انتخابات کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ وزارتوں کے خواب دیکھے جا رہے ہیں۔ اور ان خوابوں کی کامیاب تعبیریں حاصل کرنے کے لئے نت نئے سوانگ کھیلے جا رہے ہیں۔ اور طرح طرح کے روپ بھرے جا رہے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی آوازیں ان ہی ہونٹوں سے بلند کی جا رہی ہیں جنہوں نے ہمیشہ ہندو مسلم اختلافات کی خلیج کو وسیع کیا ہے۔ کاش کوئی ان سے کہہ دے کہ: ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ڈاکٹر امبیدکار کے اعلان عزم تبدیل مذہب سے ہندوستان کی فضا ابھی تک گونج رہی ہے، اور اس نے سیاسی ہندوستان میں جو ارتعاش ایک سیاسی اور مذہبی تخیل کے تصادم سے پیدا کر دیا ہے وہ ابھی کم نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بنارس یونی ورسٹی کا مشہور معمار، ہندو سیاست کا مایۂ ناز مفکر، اور قدیم تہذیب ہنود کا مشہور و زندہ محافظ تک قدامت پسند ہندوؤں کے متعصبانہ حملے کا شکار ہوتا نظر آتا ہے۔

"اچھوت ہندو ہیں، اور انہیں ہندو ہی رہنا چاہیئے" "مسیحیت ہی، اچھوت اقوام کو راست نصیب ہوگی" "اسلام اور صرف اسلام ہی وہ خداوندی کنبہ ہے جہاں شاہ و گدا کو ایک ہی صف میں جگہ مل سکتی ہے"۔ یہ آوازیں ہیں جن میں گو اب پہلی سی شورا شوری تو نہیں رہی لیکن بالکل بے تکی بھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔

ہم یہ تو ہرگز نہیں کہتے کہ اچھوتوں کو ہندو ہندو نہ بنائیں۔ یا مسلمان انہیں مسلمان، اور عیسائی ان کو عیسائی بنانے کی کوشش نہ کریں۔ مگر ان حضرات سے یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا اچھوتوں کی اصلی بیماریاں، غربت، افلاس اور جہالت، تبدیلی مذہب سے جاتی رہیں گی؟ جس کے باعث اونچی ذاتوں کے ہندو، مسلمان اور عیسائی روز بروز اچھوتوں کے برابر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اس طرح فطرت کی انقلابی مشیت ایک ایسے کنبے کی تدریجی تاسیس میں مصروف ہے، جس سے ہندوستان میں کچھ بہت دیر بعد نہیں بلکہ بہت جلد اس جماعتی آویزش (class war) کے تباہ کن جھکڑ کے چلنے کا امکان قریب ہوتا جاتا ہے جس نے آجکل دوسرے متمدن ممالک میں تہذیب و تمدن کی بیخ و بن میں زلزلہ ڈال دیا ہے ۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر امبیدکار کی چوکھٹ پر تو آج ہر مقتدر مذہبی و سیاسی لیڈر سجدے کرنے کو تیار ہے اور کر رہا ہے لیکن کیا کوئی اس کے لئے بھی تیار ہے۔ کہ خود اپنے ہم مذہب و ہم قوم مفلوک بھائیوں کی فلاکت اور تباہ کن غربت کی چھوت دور کرنے کا مداوا کرے افسوس کہ اس کے لئے کوئی تیار نہیں۔ حق رائے دہندگی ہندوستانیوں کو جب

سے، اب اچھوت اقوام کی بھی دوسرے فرقوں کی طرح پوچھ ہونے لگی ہے اور ہندو مسلمان زعماء اپنی اپنی تعداد آبادی کو بڑھانے کی دھن میں لگ گئے ہیں کیونکہ دستور میں تناسب آبادی کے لحاظ ہی سے ہر فرقہ کی نمائندگی ہوتی ہے۔ شدھی ماعث مذہب وغیرہ کی تحریکیں اسی تناسب نمائندگی کی پیداوار ہے، اور یہ مسئلہ تبدیلی مذہب اچھوت اقوام تو فوراً پیدا ہوا۔ جب ان کی دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی تقریب سعید پر سیاستان ہند و فرنگ کے اختلاط سے شکم مادر میں جنم لیا تھا۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی صدارت کے لئے پنڈت جواہر لال جی نہرو تجویز کیے جا چکے ہیں۔ اور وزارتوں کے قبول کرنے یا نہ قبول کرنے کا مسئلہ بھی ان کی ہونے والی صدارت میں طے ہونے والا ہے۔ جو کہ اشتراکی نصب العین سے دلچسپی رکھتا لیکن اس گروہ اشتراکین کے افکار سے کسی قدر مانوس نہ پایا۔ جو آج کل حقوق طلب کہلاتے ہیں۔ اور انتہا پسند اشتراکیوں کی نظریت مذہب ... زیادہ نہیں ہیں۔ پنڈت جواہر لال کی صدارت کی خبر کے ساتھ اگر یہ خبر بھی ... جائے کہ مہاتما گاندھی پھر گوشہ نشینی ترک کر کے میدان سیاست میں تشریف لا رہے ہیں: تو کانگرس کمیٹی کی آئندہ سیاست میں اس انتہاپسندانہ اقدام کا قطعاً امکان نہیں رہتا جو بعض سیاسیین سمجھے بیٹھے ہیں۔ وہی چرخے کی روں روں ہوگی یا ... اچھوت ادھار کا شور جس کا ہندوستان ایک دو سال سے نہیں، بلکہ برسوں سے مشاہدہ کر رہا ہے۔

یہ اجلاس آل انڈیا کانگرس بہت ممکن ہے کہ اس ہندوستانی سیاسی جماعت کے تعطل ... کر دے، کیونکہ اشتراکی کانگرسی اس کو کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ کانگرس وزارتیں سنبھال بیٹھے اور آزادی ہند کی عملی جدوجہد سے، جس کو وہ کچھ عرصہ سے بالکل نہ بادل ہی سکتی ہے اور لوگ بھی صحیح تقریریں ... کام نہیں لے رہی ہے بالکل ہٹ ہو جائے۔ لیکن آجکل کانگرس کی اکثریت کی باگ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو وزارت کی سیٹیں ترک ... کرنے کے لئے تمام سلیبی آغوش کو سمیٹ میں، اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں ع

... و زر آلی والسعد ...
نہ خوابانیدہ ... مقفل ما آ ...

گذشتہ اقتصادی ... سے اشتراکیت ... ہندوستان ... ہے اور افکار جو صرف ... نوجوانوں کے افکار سمجھے جاتے تھے اقدامات کی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ ... ان کے ... ملکوں میں ان ... حکومت کی ان جوابی کارروائیوں سے عیاں ہو رہا ہے جو اشتراکی جماعت ... کی تشہیر کرنیوالی مطبوعات کی ضبطیوں اشتراکی سازشوں کی گرفتاریوں کی صورت سے ظاہر ہوتی رہی ہیں۔

اشتراکیت کی روح مقام پر صرف دشمنان اشتراکیت و عاشقان سرمایہ داری ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن ان ہندوستانیوں کو بھی اسی اشتراکی کشمکش کی خبر دینے والی ہے جو گو مفلس ہیں، مگر اس قدر افلاس کی تلخیوں سے لذت آشنا ہو چلے ہیں کہ اس میں ایک قسم کا راحت بخش سکون محسوس کرتے ہیں۔ اور دست و پا کی حرکت ... جدید ... کی طرف، وہ کسی خیالی عصو کشمکش کو بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے ہندوستان کی سرزمین میں اشتراکیت کے متعلق یہ دیکھنا کہ وہ اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگی یا نہ ہوگی۔ بہت دشوار ہے۔

یہ سب صحیح لیکن ساری دنیا میں جب تیزی اور عجلت سے تبدیلی کے آثار پائے جاتے ہیں اس کے مقابلہ میں ہندوستان پر ایسا سکون و جمود طاری ہے کہ بعض دفعہ یہ ڈر لگنے لگتا ہے کہ کہیں ہمارا تعلق اس کرۂ ارض سے منقطع کر کے کسی اور کرے سے تو قائم نہیں کر دیا گیا ہے؟ کہ

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی "تم"

رباعی

گلشن کی روش پہ مسکراتا ہوا چل
مست ہوا ہے، لڑکھڑاتا ہوا چل
کل خاک میں مل جائیگا یہ زور شباب
جوش آج تو بانکپن دکھاتا ہوا چل

(جوش)

رہبر راہ دیتے ہوئے مشغول ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ حبش کی قوت مدافعت یا اٹلی کی دُرندگی کی طاقت بلند تر ہو سکے گی۔

مشرق قریب میں دوسرے یورپ کی بڑی حد و ساتھ رونمائی ہو کر وستوں میں استعادی وطن کے نعرے بلند ہونے شروع ہوئے ہیں . . . . فلسطین کو وطن یہود بنانے کے خلاف فلسطینی نامہ جدوجہد ترقی نظر آتی ہے ہر سمت ہی شامل ہیں، مصر سرگرم ہے، طالبات بر سر شورش ہیں۔ مارتے بھی جاتے ہیں کہ یہاں بھی جانیں جا رہی ہیں۔ غرض مصر کو بھی جواب دیا جا رہا ہے۔ ہر محکوم کو ان کے حوالے اخلاص وطن پر ملا کرتا ہے۔

دیکھ آئیں تو تیونس، مراکو میں بھی آزادی وطن کا جذبہ عام ہے۔ فرانسیسی حکومت اس کو آنکھ پوری ظالمانہ تدبیروں سے کچلنے میں مصروف ہے۔

اناطولیہ ایک طرف ملقانی ریاستوں کو ایک دوسرے کی لڑی میں پرونے میں مصروف ہے۔ اور دوسری جانب وہ مسلم ایشیائی شیرازہ بندی کا اہتمام کر رہا ہے۔ ایران و عراق، حجاز و افغانستان و ترکی سے عہد و مواخات کی قرار دادوں سے منسلک کئے جا رہے ہیں۔

مشرق بعید تین حریف ممالک کی حوصلہ مندیوں کا آماجگاہ اور رقابتوں کا میدان بنا ہوا ہے۔ جاپان چین کو بلا شرکت غیرے صاف نگل جانا چاہتا ہے لیکن امریکہ اور روس اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کے پورا ہونے میں زبردست روک بنے ہوئے ہیں اور اس امر کا نہایت قوی امکان ہے کہ وہ آئندہ ہونے والی جنگ میں، جو جلد یا بدیر جنگ روس و جاپان کی صورت میں چینی منگولیا کی حدود پر برپا ہونے کے لئے منڈلا رہی ہے، متحدہ محاذ پیش کریں گے۔ اور اگر اس وقت جرمنی اور اٹلی نے جاپان کی، اور فرانس نے روس کی معیت اختیار کی جو آخر کار انگلستان کو بھی کسی نہ کسی طرف مل جانے کے لئے مجبور کر دے گی تو کرۂ ارض ایک ایسے خونریز تصادم کا نمونہ پیش کرے گا، جو مستقبل میں آنے والی نسلوں کو کبھی نہ بھولے گا۔ اور جو زمانہ ماضی کی تمام خونباریوں کی یاد کو صفحۂ تاریخ عالم سے اگر بالکل محو نہ کر سکے گا، تب بھی مدھم ضرور کر دے گا۔

آؤ ذرا ہندوستان کی طرف بھی رخ کریں اور دیکھیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؛ اور سمجھیں کہ اہل ہند کیا کر رہے ہیں۔ جبکہ دنیا کا ہر ملک ایک عظیم الشان امتحان میں اپنے کو ڈال کر اپنی عزت و اقتدار کو وسیع اور مستحکم کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

کہنا چاہیے کہ آجکل کا سارا تعلیم یافتہ اور متمول ہندوستان آنیوالے انتخابات کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ وزارتوں کے خواب دیکھے جا رہے ہیں۔ اور ان خوابوں کی کامیاب تعبیریں حاصل کرنے کے لئے نت نئے سانگ کھیلے جا رہے ہیں۔ اور طرح طرح کے روپ بھرے جا رہے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی آوازیں ان ہی زبانوں سے بلند کی جا رہی ہیں جنہوں نے ہمیشہ ہندو مسلم اختلافات کی خلیج کو وسیع کیا ہے کاش کوئی ان سے کہہ دے کہ:- ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ڈاکٹر امبیدکار کے اعلان عزم تبدیل مذہب سے ہندوستان کی فضا ابھی تک گونج رہی ہے، اور اس نے سیاسی "ہندوستان" میں جو ارتعاش یک بیک پیدا کیا ہے اور مذہبی تخیل کے تصادم سے پیدا ہوا ہے وہ بھی کم نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بنارس یونیورسٹی کا مشہور معمار، ہندو سیاست کا مایۂ ناز مفکر اور قدیم تہذیب ہنود کا مشہور زمانہ محافظ تک مذامت پنڈت ہندوؤں کے متعصبانہ حملے کا شکار ہوتا نظر آتا ہے۔

"اچھوت ہندو ہیں، اور انہیں ہندو ہی رہنا چاہیے" "مسیحیت ہی سے اچھوت اقوام کو راحت نصیب ہوگی"۔ "اسلام اور صرف اسلام ہی وہ خداوندی کنف ہے جہاں شاہ و گدا کو ایک ہی صف میں جگہ مل سکتی ہے" یہ آوازیں ہیں جن میں گو اب پہلی سی شورا شوری تو نہیں رہی لیکن بالکل بے نمکی بھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔

ہم یہ تو ہرگز نہیں کہتے کہ اچھوتوں کو ہندو ہندو نہ بنائیں، یا مسلمان انہیں مسلمان، اور عیسائی ان کو عیسائی بنانے کی کوشش نہ کریں مگر ان حضرات سے یہ پوچھنے کو دل چاہتا ہے کہ کیا اچھوتوں کی اصلی بیماریاں، غربت، افلاس اور جہالت، تبدیلی مذہب سے جاتی رہیں گی؟ جس کے باعث اونچی ذاتوں کے ہندو مسلمان اور عیسائی روز بروز اچھوتوں کے برابر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اس طرح فطرت کی انقلابی مشین ایک ایسے کنبے کی تدریجی تاسیس میں مصروف ہے، جس سے ہندوستان میں کچھ بہت دیر بعد نہیں بلکہ بہت جلد اس جماعتی آویزش (Class war) کے تباہ کن جھگڑے کے چلنے کا امکان قریب ہوتا جاتا ہے جس نے آجکل دوسرے متمدن ممالک میں تہذیب و تمدن کی بیخ و بن میں زلزلہ ڈال دیا ہے۔ ———— ڈاکٹر امبیدکار کی چوکھٹ پر تو آج ہر مقتدر مذہبی و سیاسی لیڈر سجدے کرنے کو تیار ہے اور کر رہا ہے لیکن کیا کوئی اس کے لئے بھی تیار ہے۔ کہ خود اپنے ہم مذہب و ہم قوم مفلوک بھائیوں کی فلاکت اور تباہ کن غربت کی چھوت دور کرنے کا مداوا کرے افسوس کہ اس کے لئے کوئی تیار نہیں۔ حق رائے دہندگی ہندوستانیوں کو جب

سے وابستہ اچھوت اقوام کی بھی دوسرے مذہبوں کی طرح توجہ ہونے لگی ہے۔ اور ہندو مسلمان رہنما اپنی اپنی تعداد آبادی کو بڑھانے کی دھن میں لگ گئے ہیں۔ کیونکہ موجودہ اسمبلی میں تناسب آبادی کے لحاظ ہی سے ہر فرقہ کی نمائندگی ہوتی ہے۔ یہ شدھی بالاسے مذہب وغیرہ کی شورش اسی تناسب نمائندگی کی پیداوار ہے۔ اور یہ سلسلہ تبدیلی مذہب اچھوت اقوام دراصل اسی زمانہ سے شروع ہے جب کہ دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی تقریب سعید پر سیاستان ہند و فرنگ کے اشارہ سے کمیونل ایوارڈ نے جنم لیا تھا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صدارت کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو کا نام تجویز کیا جا چکا ہے۔ اور وہ اس کو قبول کرنے یا نہ قبول کرنے کا اعلان بھی اس سنہرے تاج صدارت کی صدارت میں طے ہونے والا ہے۔ جو اشتراکی نصب العین کے زیر اثر ہی ہیں۔ لیکن اس گروہ اشتراکیین کے انکار سے کسی قدر مانوس تباہ کن اور ترقی پسند حقوق طلب کہلاتے ہیں۔ اور انتہا پسند اشتراکیوں کی نظر میں مذبذب ہونے سے زیادہ نہیں ہیں۔ پنڈت جواہر لال کی صدارت کی خبر کے ساتھ اگر یہ خبر بھی ملا کر پڑھی جائے کہ "مہاتما گاندھی پھر گوشہ نشینی ترک کر کے میدان سیاست میں تشریف لا رہے ہیں" تو کانگریس کمیٹی کی آئندہ سیاست میں اس انتہا پسندانہ اقدام کا قطعاً امکان نہیں رہتا جو بعض سیاسیین سمجھے بیٹھے ہیں۔ وہی چرخے کی رول رول ہوگی یا دیہات سدھار و اچھوت ادھار کا شور جس کا ہندوستان ایک دو سال سے نہیں۔ بلکہ برسوں سے مشاہدہ کر رہا ہے۔

یہ اجلاس آل انڈیا کانگریس بہت ممکن ہے کہ اس ہندوستانی سیاسی جماعت کے تعلق کو ختم کر دے، کیونکہ اشتراکی کانگریسی اس کو کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ کانگریس وزارتیں سنبھال بیٹھے۔ اور آزادی ہند کی عملی جد و جہد سے، جس کو وہ کچھ عرصہ سے بالکل بیکار اور بے کار سمجھ بیٹھے ہیں، کنارہ کش ہو جائے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ایوان کی اکثریت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو وزارت کی ذمہ داری کے لئے خوش ہونے والے ہیں۔ اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں ع

> ہے آج روز کار کی محبت نا کی
>
> ہے خدا یہ موسم گل بار آئی

گذشتہ اقتصادی تباہی اور بدحالی سے اشتراکیت اور بھی بڑھ گئی۔ ہندوستان میں دو سال پہلے تک جو افکار صرف یورپ کے نوجوانوں کے افکار سمجھے جاتے تھے۔ ان کی علامات کی صورتیں اختیار کر رہے ہیں۔ تمام ہندوستان کے صوبوں میں ان کا وجود حکومت کی ان جوابی کارروائیوں سے نمایاں ہوتا ہے جو اشتراکی جماعت کی نشر و اشاعت کرنے والی مطبوعات کی ضبطیوں، اشتراکی سازشیوں کی گرفتاریوں کی صورت سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

اشتراکیت کی روک تھام صرف دشمنان اشتراکیت و عاشقان سرمایہ داری ضروری سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان ہندوستانیوں کو بھی اشتراکی کشمکش کی خبر دہشت دینے والی ہے جو گو مفلس ہیں، مگر اس قدر افلاس کی تلخیوں سے لذت آشنا ہو چکے ہیں، کہ اس میں ایک قسم کا راحت بخش سکون محسوس کرتے ہیں۔ اور دست و پا کو حرکت و جد و جہد تک کی طرف وہ کسی خیالی صورت کشمکش کو بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے ہندوستان کی سرزمین میں اشتراکیت کے متعلق کہہ دینا کہ وہ اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگی یا ناکام بہت دشوار ہے۔

یہ سب صحیح لیکن ساری دنیا میں جس تیزی اور سرعت سے نئی تبدیلی کے آثار پائے جاتے ہیں اس کے مقابلہ میں ہندوستان پر ایسا سکون و جمود طاری ہے کہ بعض وقت یہ ڈر لگنے لگتا ہے کہ کہیں ہمارا تعلق اس کرۂ ارض سے منقطع کر کے کسی اور کرے سے تو قائم نہیں کر دیا گیا ہے؟ کہ

> ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
> کچھ ہماری خبر نہیں آتی

"م"

رباعی

> گلشن کی روش پہ مسکراتا ہوا چل
> مست ہو کے، لچک کر اتراتا ہوا چل
> کل خاک میں مل جائیگا یہ زور شباب
> جوشؔ آج تو بانکپن دکھاتا ہوا چل

(جوشؔ)

کِس کو ہے کِس کی جستجو؟

شب ماہ میں حسین ناخدا کی کشتی دیکھ کر

اے صنمِ قمر جبیں، نازشِ حُسن نازنیں، کھول دے زلفِ عنبریں
بحر کی آب و تاب دیکھ اے صنمِ قمر جبیں

بحر کی آب و تاب دیکھ، موج کا پیچ و تاب دیکھ بہتی ہوئی شراب دیکھ
تیرتا ماہتاب دیکھ نازشِ حُسن نازنیں

جلوۂ ذات چاندنی، مستِ صفات چاندنی آبِ حیات چاندنی
اک تو ترا شباب نَو اُس پہ یہ رات چاندنی

جلوۂ حُسن کی ضیا، ماہ لقا، سمن برا دیکھا تھا یہ کبھی بتا؟
تجھ سا حسین ناخدا اور یہ رات چاندنی

ماہ کی تجھ کو جستجو، مہ کو ہے تیری جستجو کِس کو ہے کِس کی جستجو؟

کچھ تو بتا دے کامنی ماہ سے ہو کے روبرو

اے صنمِ شگفتہ رُو، دیکھ اِدھر اُدھر نہ تو کِس کو ہے کِس کی جستجو
صاف بتا دے کامنی دیکھ اِدھر اُدھر نہ تو

کیا ہے بھلا یہ ماجرا؟ دونوں کا عکس ایک سا عکسوں کا رقص ایک سا
بہرِ خدا ذرا بتا کیا ہے بھلا یہ ماجرا

خواہ بتا کہ مت بتا، رہنے دے بس سمجھ گیا حُسن ہے منبعِ ضیا
عکس ہو دونوں حسن کا خواہ بتا کہ مت بتا

خواہ بتا دے کامنی خواہ بتا کہ مت بتا
ماہ سے ہو کے رُوبرو خواہ بتا دے کامنی

(سید مطلبی سیّل فرید آبادی)

شاعری کے اصلی و امتیازی خصوصیات

(حقیقت نگار شری اروبندو کے قلم سے)

شاعری کی روح کی سی عمیق اور ناقابلِ تحدید شے کی تعریف کرنے کی کوشش بیشک ایک بے سود مشغلہ ہے۔ سرسوتی دیوی کے لاکھوں اور کروڑوں تاروں سے آراستہ عودینا (بربط) کو علمی تحلیل کی غرض سے ٹکڑے ٹکڑے کرنا محض تنگ نظری ہی نہیں بلکہ ایک فعلِ عبث ہے۔ تاہم اس امر سے کوئی انکار نہیں کرے گا کہ ہمیں کچھ ایسے نظریات اور بیانات کی ضرورت ہے جو ہماری راہِ تلاش میں شمع ہدایت کا کام کریں گے اور فن شاعری کے اصول قایم کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

شاعری کے متعلق ہم دو عام غلط فہمیوں سے دوچار ہوا کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق معمولی غیر تربیت یافتہ ذہنیت سے ہے اور دوسری کا از حد تربیت یافتہ نقاد یا اشد ذہنی خاصہ رکھنے والے فن پرست یا صنّاع سے۔ معمولی ذہنیت کے نزدیک جو اس فن کا تصور محض سطحی طور پر کرسکتی ہے شاعری واہمۂ ادراک، اور سامعہ کی حسن پرستارانہ مسرت کا ایک وسیلہ یعنی وقت گزارنے کا ایک اعلیٰ ذریعہ ہے۔ فی الحقیقت اگر شاعری ایک تفنن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے تو اُس کی رُوح کا تجسّس، اُس کی اندرونی غرض و غائت کی تلاش، اور اُس کے عمیق تر قواعد و ضوابط کا تفحص نری تضیع اوقات ہوگی۔ ہر ایک خوشنما، طرب انگیز اور مسجع کلام جو ایک حسین اور لطیف خیال کا حامل ہو شعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم شاعری سے اُسی قدر مسرت کی امید رکھتے ہیں جیسی کہ اور تمام فنون سے۔ مگر یہ امر فراموش کرنے کے قابل نہیں کہ حواس نہ ہی حتیٰ کہ حواس باطنی کی مسرت افزائی فنِ شاعری کا محض ابتدائی عنصر ہے۔ حواس ظاہری و باطنی شاعرانہ مسرت کے سچے اور اصلی ماخذ نہیں ہوتے۔ یہ فقط وسیلے اور آلۂ کار کا کام کرتے ہیں۔ رُوح ہی وہ تنہا شے ہے جو اصلی آفرینندہ ہے اور اصلی سامع بھی، ادراک، واہمہ، سامعہ اور جملہ حواس جس قدر سرعت و شفافیت بنا کارِ ترسیل انجام دیں گے اور اپنی علیحدہ خوشنودی کا مطالبہ جس قدر کم کریں گے اسی قدر زیادہ بلاواسطہ طریق پر کلام رُوح کے اندر پہنچکر پیوست ہو جائے گا اور نظم بھی عظیم الشان ہوگی۔ چنانچہ شاعری کا اعلیٰ ترین وظیفہ اس امر سے وابستہ ہے کہ وہ ان تمام آلاتِ ترسیل کی مسرت کو رُوح کی عمیق تر خوشنودی میں تبدیل کرے۔ جب ایک اعلیٰ درجے کا شاعر تمام انسانی مشکلات پر عبور حاصل کرکے اپنی اندرونی موزونیت کو اُبھارنے میں کامیاب ہوتا ہے اُس وقت جو سرور و انبساط اُس کے حصے میں آتا ہے وہ اسی آنند کا پرتو ہوتا ہے جیسے ابتدائے آفرینش میں عالمگیر روح (Universal soul) نے اپنے اندر سے ایک عظیم طاقت کو اُبھارنے اور عالم نظم کو

ترتیب دینے میں مصروف رہتا تھا۔ شاعر کی مسرت اسی روحانی مسرت کی تعبیر و توضیح کرتی ہے جو ازل کے روز فضائے بسیط میں پھیل گئی تھی، جب کہ تنگ بے رنگ ہیولی صورتوں اور طرح طرح کی حرکتوں کے راگ اور سرود پر مشتمل ایک کائناتی نغمہ کسی پُر اسرار وجود کے نہاں خانے سے گونج اُٹھا تھا۔ شاعری کا عظیم کارنامہ نہ صرف اس اصلی و ابتدائی مسرت کی صدائے بازگشت ہوتا ہے بلکہ یہ بھی اپنی اصل کی طرح ایک تخلیقی و تعمیری قوت کی حامل ہوتی ہے۔ جو لوگ اس کی لازوال طاقت سے فیضیاب ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان تک اس کی تخلیق نئے اور تغیر زدہ نوید پہنچا کر ایک نئی زندگی کی نیو ڈالتی ہے۔

خاص قسم کے نقاد اور اشد ذہین حضرات شاعری کو اصطلاح و ضابطے کا تابع مدرسانہ نقص و خطا یا زیادہ سے زیادہ نفیس کارنامہ سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر فن کے لئے اصطلاح اور ضابطے کا تجزیہ زوال اطلاق کمال کی طرف پہلا قدم ہے۔ لیکن اس اول قدم اور شاعر کے منتہائے مقصد کے درمیان متعدد منازل حتی کہ ایک عالم کائنات واقع ہے۔ چنانچہ طرز نگارش کی کم و بیش خامی ایک سریع الحس مشاق کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی اور نہ شاعری کی ایسی عظیم الشان کرداروں کی تخلیق میں رخنہ ڈال سکتی ہے جن کی بقائے دوام کی مہر صدیوں پر ثبت رہے گی۔ علاوہ بریں قواعد و ضوابط کا صحیح اطلاق کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو۔ شاعری میں اس کا مقام اس قدر بلند نہیں جیسا کہ دوسرے فنون میں۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ شاعری کا آلہ کار یعنی کلمۂ مسجع (Rhythamn word) بمقابلہ دوسرے فنون کے زیادہ باریک اور غیر مادی عناصر سے مالا مال ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حسن پرست صانع کے دیگر آلات کار کی نسبت زیادہ پیچیدہ اور بوقلمون اثر آفرینیوں کی حامل ہونے سے شاعری اور سب فنون کے بالمقابل مختلف قسموں اور جہتوں میں مزید امکانات کی مالک ہوتی ہے۔ کلمۂ مسجع (Rhythamn word) دو عناصر پر مشتمل ہوتا ہے ایک دقیق طور پر قابل احساس جسے صوت یا آواز کہتے ہیں۔ اور دوسرا قطعی طور پر غیر مادی جسے معنی یا تخیل کا عنصر کہتے ہیں۔ پھر یہ دونوں عناصر فرداً فرداً اور مجموعتہً ایک تیسرے عنصر کو اپنے اندر جگہ دئے ہوئے ہیں جس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے اور جسے ایک براہ راست روحانی قوت سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ گو شروع شروع میں یہ قوت قواعد و ضوابط کی رعایت اختیار کر کے معرض اظہار میں آتی ہے لیکن فی الفور اپنی اولین پرواز میں ہی قواعد و قوانین کے قلمرو سے مافوق بلند پروازیاں کرنا شروع کرتی ہے۔

یہ قوت اپنی ظہوری صورت کا تعین آپ ہی کرتی ہے۔ قواعد اور ضوابط کے صحیح اطلاق کے لحاظ سے شاعر دیگر تمام ماہران فنون کی بہ نسبت زیادہ آزاد ہے اس میں شک نہیں کہ قواعد و ضوابط کا علم اس پر تمام و کمال لازم ہے۔ لیکن جس وقت اس کی تخلیقی قوت اپنے جوش پر آتی ہے اس وقت شاعر کے دل میں اس کا خیال ایک ثانوی سی جگہ اختیار کر لیتا ہے یا دھیما پڑ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بلند پروازیوں کی بہترین ساعتوں میں تمام پابندیوں سے قطعی آزاد ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اس کے طرز سخن اور حرکت آواز کا کمال سراسر اس کی روح کا بے ساختہ اظہار ہوتا ہے کلام اس کے اندر سے ایک مسجع الہام ایک بدیع مکاشفے کی صورت میں نکلتا ہے اس طرح سے جیسے عالمگیر روح نے اپنے اندر کے سرمدی کلمۂ مسجع (Sacred word) کی طاقت سے کُن فکاں کی ہم آہنگیوں کو پیدا کیا تھا۔ نظم عالیہ اسی افضل ترین کلام کا نام ہے اور اسی کو شاعری کا عنصر لایموت سمجھنا چاہئیے اس کا کا ایک شمہ بھی شاعر کے تمام کلیات کو فنا ہونے سے محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

شاعر کا مسجع کلام روحانی تجلیات کے اظہار کے واسطے اعلیٰ ترین وسیلہ بہم پہنچاتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جب اہل معرفت اپنے خالص روحانی تجربات کی جو ایسی چیزوں سے وابستہ ہوتے ہیں جن کا مکمل بیان ناممکن ہے محض ذہنی تشریح کرنے کے بجائے انہیں اُن کی اصلی صورت میں ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تب ان کی زبان پر شاعری کی شیریں ترکیب اور خوشنما کلام اُتر آتے ہیں۔ مگر شاعر اپنی جلوہ آگیں طرز اظہار کو تمام حتی کہ خارجی سے خارجی تجربات کے بیان میں بھی لے آتا ہے۔ اگرچہ ظاہری طور سے دیکھنے والوں کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کسی شئے کے فقط خارجی پہلو سے لطف لے رہا ہے لیکن در اصل اس کا رجحان اس سے بھی ماورا بلند ہوگا جو اس کی اصلی حقیقت کا انکشاف کرنے کی طرف ہوتا ہے۔

اب بہ احسن الوجوہ شاعرانہ اظہار کے ابتدائی عناصر پر نظر ڈالنا غیر مفید نہیں ہوگا۔ گو اس کے انقطاعی اور ناقابل بیان راز پر تبصرہ کرنا خارج از بحث ہے معمولی بول چال میں زبان کا استعمال زیادہ تر روزمرہ کے باہمی کاروبار کی عملی ضروریات پورا کرنے پر محدود رہتا ہے۔ ہماری روزانہ زندگی میں الفاظ اسی طرح کام آتے ہیں جیسا کہ ایک صنعتی کل یا اوزار۔ یہ فقط خیالات کی رسمی علامات ہوتے ہیں اور ان کی قدرتی طاقت پر کچھ زیادہ توجہ نہیں کی جاتی۔ گویا اُن کے ساتھ ہمارا وہی سلوک ہوتا ہے جیسا کہ روزمرہ کام آنے والی بے جان چیزوں کے ساتھ۔ اگر ہم ان میں زندگی ڈالنا چاہیں تو ہمیں لب و لہجہ کی خاص تبدیلیاں عمل میں لانا پڑتی ہیں تاکہ ہماری جذباتی یا حیاتی (vital) قوتیں ان رسمی علامات میں سرایت

کرتا ہیں لیکن اگر ہم انسانی زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کے ماخذ پر غور کریں تو ہمارے خیال میں یہ امر واضح ہو جائے گا کہ انسانی کلام کی حالت ان قدیم زمانوں میں کچھ اور ہی تھی۔ الفاظ اس وقت ایک حقیقی اور آبدار زندگی کے حامل ہوتے تھے اور ان کا احساس بہت زیادہ ہوتا تھا۔ بمقابلہ ہم لوگوں کے، جو ایک میکانکی اور لیکچر جیسی ذہنیت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دنیا کے ابتدائی دور میں زبان جذبات، احساسات اور رجحانات اور وقائع خصوصیات رکھنے والے وسیع اور غیر معین ذہنی تاثرات کی حامل تھی نہ کہ ذہن کے منفصل خیالات کی۔ آج کل کا بے عیب ذہنی ادراک اس وقت کے انسانی شعور کا ایک ادنیٰ سا عنصر تھا جو تمادی ایام اور مرور زمانہ سے زبان کے ساتھ ساتھ غالب آنے لگا۔

اب سوال یہ ہے کہ آواز مقررہ خیالات کا آلۂ اظہار کیوں بن گئی۔ آواز اور اس کے ذہنی مفہوم میں تو کوئی فطری اور ذاتی مطابقت نہیں ہے۔ کیونکہ ذہنی نقطۂ نظر سے کوئی بھی آواز کسی بھی معنی کی حامل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ ان لوگوں کے درمیان اس کی مطابقت کے باب میں اتفاق ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آواز کے اندر ایک ایسی ناقابل تحدید صفت یا قوت موجود ہوتی ہے جو قدرتاً انسان کی روح اور (soul mind) کو جنبش میں لاتی ہے۔ اور جو اس کے حواس، جذبات اور لطیف ذہنی وجود پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مثلاً "بھیڑیا" یہ لفظ جس کے وجود میں آنے کے سبب کا خیال ہمارے ذہن میں اب قطعی نہیں آتا۔ ہمارے ادراک کے اندر ایک ذی حیات شے کا خیال پیدا کرتا ہے اور بس۔ باقی سب تفصیلات ہمیں خود پیدا کرلینی پڑتی ہیں سنسکرت لفظ "وریکا" یعنی پھاڑنے والا شروع شروع میں بھیڑیا اور انسان کے درمیان اس شئے اعصاب آزار کا اظہار کرتا تھا جو انسان کی زندگی پر ایک گہرا اثر ڈالتا ہے۔ لیکن بعد میں اس کا حشر بھی وہی ہوا جو اب لفظ بھیڑیا کا ہے۔ اس لفظ کی آواز میں ایک ایسی خصوصیت تھی جو اس کے اور پھاڑنے کی سنسناہٹ کے درمیان ایک قدرتی تلازمہ پیدا کرتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس خصوصیت کی بدولت افتتاحی دور کی زبان میں ایک زبردست زندگی اور ایک منجمد طاقت رہی ہوگی اور ایک فطری شعری قوت بھی جسے اس نے اب کھو دیا ہے۔ گو صحیح خیال آفرینی، صراحت، اور عملی ضروریات پورا کرنے کی صلاحیت کے لحاظ سے اس نے خاصی ترقی کی ہے۔

شاعری صدیوں اور مدتوں کے مسلسل ہجوم کو چیرتی ہوئی قرون افتتاحیہ کے اس سرچشمۂ تکلم پر جا پہنچتی ہے، جہاں انسانی زبان کی فطری شعریت محفوظ ہے۔ اور اسے حتی القدور ہمارے سامنے لاکر ایک نئے پیرائے میں پیش کرتی ہے۔ اول تو یہ کہ زبانِ قدیمہ کی بحد طور پر حسی پیدا کرنے والی خصوصیت (sensuousness) (concreteness) کا کام یہ تشبیہوں اور استعاروں سے لیتی ہے اور دوسرے اس کی قوت اثر آفرینی و ارتعاش خیزی اور اس کی ذہنی اثر پذیری کی طرف زیادہ توجہ کرتی ہے۔ پھر یہ اپنے اس عمل اور جدید الفاظ کی امتیازی خصوصیت یعنی صحیح اور معین خیال پیدا کرنے کی قوت کے درمیان تلازم عمل میں لاکر دونوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ پروان چڑھاتی ہے۔ اس طور سے شاعری یا اسے علم کو ایک ایسے معراجی طبقے پر لے جانے میں کامیاب ہوتی ہے جہاں ذہنی یا حیاتی (vital) طبقوں کی بہ نسبت ایک اعلیٰ تر طبقے کے تجربات کا بلا واسطہ اظہار ممکن ہو جاتا ہے۔ اس بلندی پر پہنچنے کے بعد یہ نہ صرف لفظ اور تخیل کی مقررہ باہمی مناسبت اور لفظی جذباتی اور حسی اثر اندازی اور حیاتی اثر آفرینی کو حرکت میں لاتی ہے بلکہ ان سب کی وساطت سے الفاظ کی روحانی اثر آفرینی (soul - suggestion) یعنی حقیقی اسپرٹ کو آشکارا کرتی ہے چنانچہ شاعری الفاظ کے محدود و تخیلی معنوں سے پرے لامحدود و لامتناہی معنوں کا اشارہ کرتی ہے۔ یہ نہ صرف ابتدائی عہد کی زبان کی مانند انسان کی روح حیاتی (soul life) اور عہد موجودہ کے کلام کی مانند اس کے دماغی خیالات کی حامل ہوتی ہے بلکہ اس کی اصلی و حقیقی روح کے تجربات، جلوہ بینی، اور تخیلات کا اظہار کرتی ہے اور ان روحانی حرکات کو حیات اور دماغ کی منقبت میں لاکر ہمارے داخلے کے واسطے الوہیت کا دروازہ کھول رکھتی ہے۔

نثری عبارت کلام کو اس کے معمولی روزمرہ کے استعمال کے مقابلہ میں ایک اعلیٰ تر قوت عطا کرتی ہے۔ لیکن نظم سے اس کا اختلاف اس امر میں ہوتا ہے کہ یہ روحانی زاویۂ نگاہ سے ہر شے کا اظہار کرنے کی سعی نہیں کرتی۔ یہ الفاظ کی تخیلی قدر و قیمت کی بنیاد پر ہی اپنی ہستی کو متعلق رکھتی ہے۔ یہ ایسے مسجع لہجے سے کام لیتی ہے جس سے ہماری معمولی بول چال بے پرواہ ہے اور اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ حرکت کلام میں ایک عام سیالانہ ([illegible]) ہم آہنگی پیدا کرے۔ یہ الفاظ کے درمیان ایک ایسی خوشگوار اور بصیرت افروز مناسبت قائم کرنا چاہتی ہے جو انسانی ادراک کے لئے بیک وقت خوش مذاق اور صراحت انگیز ثابت ہو۔ یہ معمولی بول چال کے خشونت آمیز اسالیب کی بہ نسبت ایک زیادہ صحیح، باریک، لچیلی، اور خاطر خواہ عبارت کے درپے رہتی ہے۔

ایک برتر کلام کی کفایت و سلامت روی کے ساتھ تب دینا نثر کا اولین مقصد ہے۔ اس کے علاوہ یہ خوشنما ترکیبوں کے ذریعہ سے کلام میں فصاحت، جوش اور قوتِ تاثیر بھی پیدا کر سکتی ہے۔ پھر اس پر توازن، استحکام اور انضباط کا سایہ ہو۔ نثر تجاوز کر کے ایک زیادہ پُرشکوہ لہجہ کو گنجائش دے سکتی ہے اور جذبات کو زیادہ بلند سطح اور پُرزور حرارت پر جنبش میں لانے کی قوت بہم پہنچا کر ایک آہنگ اور زبردست احساس سے اپیل کر سکتی ہے۔ نثر نگار تشبیہوں کا اس قدر زیادہ یا بافراط استعمال کر سکتا ہے جس سے اس کا کلام شاعرانہ طرز کے حوالے میں آ جائے لیکن وہ انہیں آرائش یا زینت کے لئے یا اپنے خیال کی صریح توضیح کے لئے کام میں لاتا ہے نہ کہ محض [illegible] جلوہ ریزی کے لئے جو شاعر کا نصب العین ہے۔ انسانی ذہن و ادراک [illegible] خاص سامع وسعت ہے جس کی حمایت حاصل کرنا نثر اپنا مقصد قرار دیتا ہے۔ دوسری قوتوں کو وہ صرف اسی مقصد کی تکمیل میں تعاون کرنے کے لئے طلب کرتا ہے۔ ذہن کی دو طاقتیں یعنی منطق (reason) مذاق (taste) اس کے اعلیٰ دیوتا ہوتے ہیں۔ مگر شاعر کے لئے یہ ادنیٰ دیوتاؤں میں سے ہیں۔

اگر ناثر ان حدود سے پار ہو کر اپنی عبارت کے اندر ایک زیادہ متاثر لہجہ سے کام لے تو تشبیہوں کو فقط جلوہ ریزی کی غرض سے استعمال کرے اور اپنے آپ کو ایک قادر تر روحِ تکلم سے وابستہ کرے تب نثر اپنے علاقہ کی حد پار کر جاتی ہے اور نظم کے قلمرو میں جا داخل ہوتی ہے۔ اور نثرِ منظوم (poetic prose) ایسی ایک چیز وجود میں آ جاتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ نظم نثر کے روپ یا ڈھیلے لباس میں اپنے آپ کو پوشیدہ کرتی ہے۔ ایک اعلیٰ و نفیس سلاست روی، اثر اندازی، ذہنی جلوہ افروزی اور ایک محتاط و معتدل حسن پرستانہ آسودگی اس کے کلام کی فطری و عمومی قوتیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس سے آگے بڑھنا شاعری کا مخصوص حق ہے۔ وہ ایک تیز تر و برتر متجلہ و باہمہ شدید و زبردست کلام کا انکشاف کرتا ہے جس کی الہامانہ و صحیح صورت ایک عمیق معنی و نامحدود اثر آفرینی سے ہم آہنگ ہو کر اس کی اندرونی روح کے سرچشموں سے براہِ راست نکل پڑتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ اس پُررونق صورت کی تلاش میں اکثر یا ہمیشہ کامیاب نہ ہو مگر اس کی تلاش میں رہنا شاعر کی فطرت کا خمیر ہے اور جب وہ اسے پا کر اس کے سانچہ میں کسی عمیق الہامانہ مکاشفے کو ڈھالتا ہے تب وہ منتر اچارن کرنے والا یعنی الہامی شاعر کی حیثیت سے ممتاز ہوتا ہے۔

شاعر کی روح جب اپنی تجلّی آمیز نگاہوں سے کسی چیز کا مشاہدہ کرتی ہے تب شاعر کے دل میں ایک اضطراب سا برپا ہو جاتا ہے اور اپنے تجربہ کا اظہار کئے بغیر اسے چین نہیں پڑتا۔ نظم کی عبارت اور لہجہ اسی اضطراب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مشاہدہ خواہ کسی چیز کا ہو۔ فطرت کا۔ ذاتِ الٰہی کا۔ مخلوقات یا موجودات کی زندگی کا۔ کسی قوت متحرک کا، یا حسن و جمال کا۔ کسی تخیلی حقیقت کا یا جذباتی مسرت اور دکھ کا۔ زندگی کا یا آخرت کا۔ بس صرف اتنا ہی کافی ہے کہ روح ہی مشاہدہ کرے اور باصرہ، حواس، دل و دماغ اس کے آلۂ کار ہوں۔ اسی حالت میں سچی اور بلند معیار نظم وجود میں آتی ہے۔ اگر دماغ و اہمہ جذبات اور وظائف نفسی کی تڑپ روح تک نہ پہونچے اور اس میں سرایت کر کے مصفا، رفیع الشان اور متغیر نہ ہو جائے اس کا کتنا ہی زور اور جوش و خروش الفاظ میں اظہار کیوں نہ کیا جائے نظم کا معیار پست ہوگا اور شاعر کے کارنامہ کو بقائے دوام حاصل نہ ہو سکے گی۔ اور اگر شاعر ذہن کے سے پست عناصر سے اپیل کرے تو اس کا عمل شاعری کے دائرہ سے خارج ہو جاتا ہے۔ وہ یا تو نثر کے ڈانڈے پر جا پہنچتا ہے یا نظم کے لباس میں نری نثر پیدا کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ نثری عبارت کے سہل اور ڈھیلے وزن کے بجائے وہ زیادہ موزوں ترکیب اور پُرکار و پیوستہ اور جاذبِ توجہ و پُرزور عبارت سے کام لیتا ہے۔ غرضیکہ اس کی پیداوار شاعری کی اصلی و امتیازی خصوصیت سے خالی رہ جاتی ہے۔

ہر وہ شے جو کلام کے ذریعہ ظاہر کی جاتی ہے دو عناصر پر مشتمل ہوتی ہے ایک خارجی یا اوزاری اور دوسری اصلی یا روحانی۔ مثلاً خیال کو لیجئے اس کے دو عنصر ہیں۔ ایک دماغی اور دوسرا روحانی۔ دماغی عنصر کو ادراک اس کی صحیح و متعین صورت میں ہمارے روبرو پیش کرتا ہے۔ لیکن روحانی عنصر دماغی عنصر سے بالاتر ہوتا ہے اور ہمیں اظہار کردہ شے کی جامع صداقت کے جوار یا ضمن میں داخلہ کی اجازت دیتا ہے۔ اب جذبہ کے حق میں بھی یہ امر اسی قدر صادق آتا ہے۔ شاعر نہ صرف محض جذبہ کے درپے رہتا ہے بلکہ وہ جذبہ کی روح سے دوچار ہونا چاہتا ہے۔ یعنی اس چیز سے جس کی مسرت آمیزی کی خاطر ہماری اور دنیا کی روح جذباتی تجربات قبول کرتی ہے۔ شاعرانہ احساس کے اندر بھی وہی بات ہے۔ شاعر ایک عظیم تر صداقت کا جویا ہے اور ایک اعلیٰ تر حظ و حسن کا خواہاں۔ صداقت اور حسن کی ہم آہنگی جو غیر فانی مسرت کی مظہر ہوتی ہے شاعر کی منزلِ مقصود ہے۔ اس کی روح کو اپنی اندرونی گہرائیوں کی حقیقتوں کو ابھارنے میں سرور محسوس ہوتا ہے۔ نثر کا خالی از جرأت اور معتدل کلام گاہ بگاہ اس عظیم تر عنصر کی جھلک پیدا کر سکتا ہے۔ مگر نظم کی بلند اور پُر جسارت عبارت ہی اسے ایک زندہ اور پُررونق پیرایہ میں پیش کر سکتی ہے اور جب شاعر اپنے حسبِ معمول لب و لہجہ سے بھی بلند ہو کر ایک مستثنیٰ نغمہ و لحن کے آسمان پر بلند پروازیاں شروع

کرتا ہے تب وہ اُس عنصر کی اصلی ضیا، و رونق کو اور بھی کامیابی کے ساتھ آشکارا کرتا ہے۔ شاعرانہ کلام کی قدرتی وحدت و شدت کا ماخذ ۔ اصل لفظی بلند وازیوں سے وابستہ ہے یا یوں کہئے کہ روح اندرونی اور بیرونی عالموں کے امتزج

کے افسونی جز اور کے درمیان اپنی ذات کا انکشاف کرنے کی غرض سے شاعرانہ سیاحی کرتی ہے اور یہ وحدت و شدت اسی سیاحی کی کیفیت سے پیدا ہوتی ہے۔

سعیِ لاحاصل

اے جوشؔ تنگیوں میں پُر افشاں ہوئے تو کیا؟ بہروں کی انجمن میں غزلخواں ہوئے تو کیا؟
ہندوستاں غلام ہے، گونگا ہے، بہرہ ہے ہندوستاں میں آپ سخنداں ہوئے تو کیا؟
اک وسوسہ جو قوم ہو خود فی صدور ناس اُس وسوسے میں جذبۂ ایماں ہوئے تو کیا؟
جس چرخِ تیرہ پر ہو سیہ ابر کا ہجوم اُس چرخِ تیرہ پر مہِ تاباں ہوئے تو کیا؟
جو سرزمینِ شور ہو، محرومِ رنگ و بُو اُس سرزمیں پر ابرِ خراماں ہوئے تو کیا؟
موجوں نے جس کی توڑ دیا ہو صدف کا دِل اُس جوئے غم میں قطرۂ نیساں ہوئے تو کیا؟
جس گلستاں میں ایک ہے، کانٹا ہو یا گلاب اُس گلستاں میں سُنبل و ریحاں ہوئے تو کیا؟
ہم وزن و ہم گہر ہوں جہاں، زاغ و عندلیب اُس بوستاں میں مرغِ خوش الحاں ہوئے تو کیا؟
جس تیرگی میں ہو نہ سکندر، نہ رُوحِ خضر اُس تیرگی میں چشمۂ حیواں ہوئے تو کیا؟
نکلے نہ صحن خانہ سے باہر جہاں نظر واں آپ کائنات بداماں ہوئے تو کیا؟

اَندھوں سے جب پڑا ہے زمانے میں سابقہ
اے جوشؔ! آپ یوسفِ کنعاں ہوئے تو کیا؟

جوشؔ ملیح آبادی

کسی عالمگیر مذہب کی اشاعت میں نوجوانانِ عالم کیا حصّہ لے سکتے ہیں؟

(مصلح الدین احمد اسیر)

کاش ازیں طوفانِ بیداری و ہوش
وارہیدی ایں ضمیر و چشم و گوش

زندگی کا اعتبار کیا، جب تک سانس آتی ہے سبحان اللہ۔ نہیں تو انا للہ غنیمت ہے جو دم بھی اپنے معبود کی یاد میں بسر ہو جائے۔ انسان محض آب و گل کے ایک کھوکھلے ڈھانچے کا نام نہیں ہے، بلکہ ہمارے اندر ایک بڑا راز مضمر ہے جس کی مدد سے ہم حقائق اشیار کا ادراک کرتے ہیں۔ باصرہ۔ سامعہ۔ ناطقہ۔ شامہ۔ لامسۂ حسِ مشترک۔ متصرفہ۔ متخیّلہ۔ واہمہ اور حافظہ۔ نیز نفس کی آمد و شد سب اسی کے تابع ہیں۔ اسی پر ہمارے تمامی اصول کا مدار ہے، جس کو کہ ہم رُوح کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی حقیقت کا ادراک ہی ہماری تمام دینی و دنیادی صلاح و فلاح کا پیش خیمہ ہے۔ دنیا کے تین مسلمہ اصول جو تمام کاروبارِ عالم کا احاطہ کئے ہوئے ہیں: علم سیاست مدن۔ تدبیر منزل۔ امورِ معاد و معاش، سب اسی کے حلقۂ اقتدار میں ہیں۔ اور ان اقتدارات کی کنجی ہر نوجوان کے ہاتھ میں ہے بشرطیکہ وہ اپنے وجود کو تزکیۂ نفس۔ تصفیہ قلب، اور تجلیۂ رُوح کی تجلیوں سے معمور کر کے قُربِ حق حاصل کرے۔ تمام کائنات میں ایک ہی رُوح کو کارفرما پائے۔ فرش سے عرش تک ایک ہی نُور کا دریا موجیں مارتا دیکھے۔ تاکہ اجسامِ خاکی کا کثیف پردہ جو اس کی آنکھوں پر پڑا ہوا ہے بالکلیہ اُٹھ جائے۔ اس کی نظر میں حاضر و غائب۔ ماضی و مستقبل سب یکساں ہو جائیں۔ اس پر ظہورات کی حقیقت کا انکشاف ہو جائے۔ اور تمام عالم تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی ڈورے میں پرویا ہوا نظر آنے لگے،

بس یہی وہ ہتھیار ہے جس سے آراستہ ہو کر ایک نوجوان تنِ تنہا تمام عالم کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ہر جنبشِ نگاہ میں ستیوں کے دریا کے دریا لنڈھا سکتا ہے۔ اپنی کافرادائیوں سے عالم والوں کے قلوب پر چھاپہ مار سکتا ہے۔ ع

جس پر نگاہ پڑ گئی دیوانہ کر دیا

کے راز کو آشکارا کر سکتا ہے اور اس طرح اپنی تیغ دو دم کا لوہا منواتا ہوا اس عالم گیر صداقت کی اشاعت میں حصّہ لے سکتا ہے کہ جس کے لئے تمام قوتیں سلب ہیں۔ ہاتھ پاؤں۔ دل و دماغ مفلوج۔ جہاں نہ کوئی تدبیر کارگر ہوتی ہے اور نہ کوئی دنیادی طاقت ہی کام کرتی ہے۔ حسنِ اخلاق و عادات، علم و عمل۔ سوزِ بیانی۔ اعجازِ قلم۔ لطافتِ خیال۔ وسعت نظری۔ پامردی و مستقل مزاجی۔ قوّتِ ارادی و ہمّت۔ زہد و ورع۔ عفت و عصمت۔ ایمان و صداقت۔ دیانت

سخاوت۔ شجاعت۔ عشق و محبت۔ غرض کہ ایک عالمگیر مذہب کے تمام محاسن اس کے حلقہ بگوش ہیں۔ خیال تو فرمائیے کہ صرف اسی ایک تلوار بے نیام کو ہاتھ میں لے کر ایک نوجوان کتنی تلواروں اور بتھیاروں کی صورت میں زندگی کی شاہراہ پر قدم اُٹھاتا ہے۔ کتنی قوتیں اس کے ہمراہ رکاب ہو جاتی ہیں۔ کتنی نوجیں میمنہ و میسرہ پر اور عقب اس کی کمک کے لئے کمر بستہ رہتی ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کسی نوجوان کو کوئی معراج حاصل ہو سکتی ہے اور کیا وہ اس معراج کے حصول کے بعد پھر ایک عالمگیر مذہب کی اشاعت کرنے میں پیچھے رہ سکتا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس صورت کے بعد بھی کسی نتیجہ مذہبانی اسامت کے لئے کسی دوسری تدبیر کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے تاہم دنیا عالم اسباب ہے، یہاں کا کارخانہ ہی سبب بینی اور عقل کی رہنمائی کے ہاتھوں چل رہا ہے۔ مالک

ع۔ ہر سبب را آں مسبب آورد

کا معاملہ ہے۔ یعنی جو کچھ ہونے والا ہے۔ اس کے لئے خواہ مخواہ اسباب بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کی موت واقع ہو جاتی ہے اس کا سبب دریافت کیا جاتا ہے تو کسی نہ کسی مرض کا نام لے دیا جاتا ہے حالانکہ اسی مرض میں مبتلا ہو کر صدہا جانیں صحت یاب ہو چکی ہونگی اب اگر مرض ہی موت کا باعث تھا تو پھر اسی مرض کے دوسرے مریض کیوں جانبر ہو گئے۔ نہیں! معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اصل میں اس شخص کی زندگی کا خاتمہ ہونے والا تھا تو اس مرض کو اس کا سبب بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ جہاں کوئی مرض معلوم نہ ہو سکا تو دفعتہ قلب کی حرکت بند ہونے ہی کو سبب قرار دے دیا جاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ قلب کی حرکت کا بند ہو جانا ہی موت کا پیغام ہے۔ جب وہ کسی مرض کے باعث ہوتی ہے تو اس مرض کو سبب گردانا جاتا ہے۔ ورنہ یہی بیچاری مورد الزام ٹھہرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس عالم میں جو کچھ واقع ہوگا اس کو کسی نہ کسی سبب کے تحت ہی پیش کیا جائے گا۔ اسی لئے اس کو عالم اسباب کہتے ہیں۔ اس کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ تقدیر عالم سبب کی پابند ہے۔ پھر ہم کو کیا پڑی ہے جو ہم بیکار اپنا وقت ضائع کریں اور خواہ مخواہ سبب بینی میں پڑنے کی دردسری مول لیں۔ کہیں اس کے یہ معنی نہ نکال لئے جائیں کہ انسان تعطل اختیار کر بیٹھے بلکہ سہ

غور سے دیکھا نظام دہر تو ثابت ہوا

آدمی پیدا ہوا ہے کام کرنے کے لئے (جوش)

جب نظام عالم کا مدار ہی اسی پر ٹھہرا تو کوئی متنفس کبھی خاموش بیٹھ ہی نہیں سکتا۔

دلکی مثال ایک بڑے کارخانہ کی ہے ہم لوگ اور تمام کائنات اس کے کل پرزے ہیں تو جس طرح مشین کو حرکت میں لانے والے کل پرزے نہیں ہو سکتے بلکہ یہ عمل مشین کے چلانے والے کا ہے اور جب وہ اس کو حرکت میں لائے گا تو کل پرزے چلنے پر مجبور ہوں گے۔ اسی طرح عالم کو گردش میں لانے والے ہم لوگ نہیں ہو سکتے بلکہ یہ کام کسی دوسری ہی قوت کا ہے جس کو کہ قدرت کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور قدرت ایک آن معطل نہیں ہے تو ہم لوگ کیوں کر معطل رہ سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہم لوگوں کو بدات خود تگ و دو میں پڑنے کی ضرورت بھی نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خیریت اسی میں ہے کہ ہم اپنی تمام قوتیں چپ چاپ قدرت کے حوالہ کر دیں جس طرح کہ تنکا دریا کی موج کے حوالے ہوتا ہے۔ موج اس کو جس طرف چاہتی ہے لے جاتی ہے۔ اب تنکا نہ تو معطل ہی ٹھہرایا جا سکتا ہے اور نہ بیکار تگ و دو کرنے کا الزام ہی اس کے سر عائد ہو سکتا ہے۔ اس وقت اس کا فعل عین موج کا فعل ہے۔ اسی طرح جب ہم اپنی تمام قوتیں قدرت کے حوالے کر چکے تو ہم بے فکر ہو گئے۔ اب قدرت جانے اور اس کا کام جانے۔ جو کام وہ مناسب سمجھے گی ہم سے لے گی۔ اور جو کام نامناسب سمجھے گی نہ لے گی۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس سے فائدہ کیا حاصل ہوا۔ اوّل تو نفع و نقصان فائدہ و ضرر کس شمار میں ہے جن کی تلاش میں ہم بیکار اپنا وقت ضائع کریں۔ دوسرے یہی کیا کم ہے کہ ہم نے اپنی قوتوں کو مسلوب دیکھا اور قدرت کو جاری و ساری۔ جس کا مطلب یہ برآمد ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم سے سرزد ہوتا ہے وہ عین قدرت حق کی کارفرمائی ہے۔

ع۔ آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

چلئے چھٹکارا ملا۔ گناہ و ثواب، جنت اور دوزخ کہاں۔ نجات ابدی جس کی کہ ہم کو تلاش تھی وہ نقد حاصل ہے۔ اور یہی منشا ہماری تخلیق کا بھی ہے۔ تاہم اس عالم تگ و دو میں خال ہی خال انسان میرے ہم خیال ملیں گے۔ زیادہ تر تو اسی قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو صبح سے شام تک لٹھیا لئے ہوئے اپنی خواہشات کے پیچھے پھرا کرتے ہیں۔ اور اگر اتفاق سے بعد از خرابی بسیار وہ کسی خواہش کے حصول پر قادر بھی ہو گئے تو اس کامیابی کو اپنی ہی کوششوں کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہر لمحہ ہماری ناکامیاں اشتہار دے رہی ہیں کہ جاری و ساری ہے لَا تَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ مگر سنتا ہی کون ہے اور فرصت بھی کسے ہے جو سمجھنے کی کوشش کرے ایک رَو ہے جس میں منہ اُٹھائے ہوئے تمام عالم بہتا چلا جا رہا ہے۔ اس لئے لازم ہوا

۔ کچھ جیل الاصول، تراپ بھی پیش کروں۔ جو اس کی تشنگی کا باعث ہوا۔ الا یہ کہ یہ بھی ایک راستہ ہے جس میں ازل سے لے کر ابد تک عالم مذہب اصلاح رہا ہے۔

جس طرح کہ آفتاب اپنی ضیا باریوں سے کسی صلہ پر، ساری دنیا ہوتا اسی طرح حسن خواہ کسی پیرایہ میں ہو نگاہوں کو جذب کئے بغیر نہیں رہتا۔ اس کے تاثر سے خود بخود لوگوں کے قلوب گرما جاتے ہیں اور ایک خاص جذبہ کے تحت اسی طرف کشاں کشاں چلے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر نوجوانان عالم اپنے پسندیدہ عادات دپاکیزہ خصائل کی برکت سے لوگوں کے قلوب کو مسخر کرنے کا ملکہ پیدا کریں تو وہ دن دور نہیں ہے کہ خود بخود لوگ ان کی صحبت کو زینۂ حیات ابدی سمجھ کر اُن کے پاس آئیں گے۔ اور الصحبت مؤ الثر کے فیض سے مالا مال ہو کر رفتہ رفتہ ان کے ہم خیال ہوتے جائیں گے۔ اُن سے محبت و عقیدت کریں گے اور یہی خلوص بالآخر اُن کو اس عالمگیر شاہراہ پر لا ڈالے گا۔

سالہا اصحاب کہف روزے چند

پئے نیکاں گرفت و مردم شد (سعدی)

مذہب کی پیروی عقل و خرد کی رہنمائی کے ہاتھوں نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ اُس کے لئے حسن عقیدت درکار ہے اور جب تک کوئی قوت بدعقیدگی کو حسن عقیدت سے تبدیل کر دینے پر قادر نہ ہو محض افہام و تفہیم شاذ و نادر ہی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ تاہم ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس عالمگیر مذہب کو منظر عام پر پیش کیا جائے۔ لوگوں کو تبادلۂ خیال کا موقع دیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو ان کی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے ایک سحر بیان اپنی سوز بیانی کو کام میں لاتے ہوئے بہت سے قلوب کو اپنا گرویدہ بنالے گا جو اُسی کا کلمہ پڑھنے لگیں گے۔

اسی طرح ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس عالمگیر مذہب کی صداقت کا اعلان کرتے ہوئے رسائل۔ جرائد۔ قصائد۔ نظمیں۔ مضامین وغیرہ کی اشاعت کی جائے جو پاکیزہ زبان اور پُرمغز مطالب کی بدولت لوگوں کے خیالات میں انقلاب عظیم برپا کر دینے کی طاقت رکھتے ہوں۔ جس کے لئے بھی زورِ قلم سے زیادہ سحر صداقت درکار ہے اور جہاں تک پیمانہ پر ممکن ہو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نگاہوں تک پہنچائے جائیں۔ اس کے لئے بھی نوجوانانِ عالم کو اپنی قوتِ فکری کو بلند سے بلند تر مثال پر پہونچانا چاہیے۔ تاکہ اُن کے قلم کے نکلے ہوئے نقوش خواہ نظم کی شکل میں ہوں یا نثر کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر بکھرتے ہی لوگوں کے قلوب میں اپنا گھر کر لیں۔

اگر قلوب کو تلوار کے زور سے مسخر کیا جا سکتا ہوتا تو میں بھی یہ رائے دیتا کہ نوجوانانِ عالم فن حرب کو بدرجۂ اتم حاصل کریں اور اپنی تلوار کی ضرب سے اس عالمگیر مذہب کی اشاعت میں حصہ لیں۔ لیکن افسوس ہے کہ تلوار کا اثر قلب سے زیادہ جسم پر ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ جسمانی تکلیف کے خوف سے کوئی شخص اس مذہب کو قبول کرنا پسند کرے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ایک ایسی کمزور فطرت سے جو ہر رسی کو سانپ سمجھ کر اور ہر سایہ کو بھوت سمجھ کر لرزہ براندام ہو جاتی ہے کسی مذہب کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ مذہب کو پامرد مستقل مزاج اور اٹل ارادے کے افراد درکار ہیں۔ کہ جو اپنی آنکھوں سے آسمان کو روئی کے گالوں کی طرح اُڑتا ہوا دیکھیں اور زمین کو خاک ہو کر دوشِ ہوا پر سوار پائیں۔ مگر ان کی پیشانی ہمت پر بل نہ آنے پائے۔ دنیا کے تمام پہاڑ ٹکرا ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ سمندر کی جگہ خشکی اور خشکی کی جگہ سمندر رہے لیں مگر ان کو اپنی جگہ پر ذرا بھی جنبش نہ ہو۔ مذہب کو ایسے نام نہاد افراد کی ضرورت نہیں ہے کہ جو تمام عمر منافقانہ اور بزدلانہ زندگی گذارنے کے عادی ہو چکے ہوں کہ جن کی ذات سے خود ان کے نفوس کو بھی کوئی مفاد نہیں پہونچتا۔ جن کا وجود خود اُن کے ہی لئے عذاب الیم بنا ہوا ہے۔ مذہب کو ایسے پاکیزہ سیرت انسان درکار ہیں جو ع

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

کا کلمہ پڑھتے ہوں۔ دوسروں کے درد کو اپنا درد۔ دوسروں کی راحت کو اپنی راحت سمجھتے ہوں۔ صفا کیشی جن کا ایمان ہو۔ صدق معاملگی جن کا پیشہ ہو۔ خوش عقیدگی جن کا شعار ہو اور اکل حرام پر موت کو ترجیح دیتے ہوں۔ ایک نوجوان جو اپنے دل میں صحیح جذبہ خدمتِ مذہب کا پاتا ہے اس کے لئے لازم ہوا کہ وہ ان خصوصیات کا بھی حامل بنے۔ پھر اس کے بعد اُٹھے اور دنیا والوں سے نبرد آزمائی کے لئے آمادہ ہو جائے۔ اس کا جذبۂ صحیح اور ذوقِ کامل اس کی رہنمائی کرے گا۔

آخر میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ مذہب کیا ہے؟ اور اس کے صحیح معنی کیا ہیں؟ میرے خیال میں مذہب ایک راستہ ہے حیاتِ ابدی کے حاصل کرنے کا یا یوں سمجھئے کہ منزلِ مقصود پر پہونچنے کا۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ منزلِ مقصود (خدا) ایک ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس منزل تک پہونچنے کے لئے راستہ بھی ایک ہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ راہِ راست کوئی ایک ہی ہو اور دوسرے راستے خطرناک ہوں۔ نشیب و فراز سے پُر ہوں۔ لیکن اُن کا اختلاف بعید از عقل نہیں۔ اس لئے سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا اور اس کی خواہش کرنا کہ تمام عالم ایک ہی مذہب کے ڈورے میں تسبیح کے دانوں کی طرح پرو دیا جائے بے جا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ باغبان اپنے باغ کو گلہائے رنگا رنگ و بوقلموں کی بیلوں ہی سے آراستہ دیکھنے کا آرزومند ہوتا ہے اور یہی منشائے قدرت بھی اس عالم کی تخلیق سے ہے اور یہی تقاضائے جامعیت ہوا۔ اس لئے مذہب کا اختلاف تو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور ہمیشہ چلا جائے گا۔ کیونکہ بمصداق ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند
میل آں اندر دلش انداختند

قدرت کو جس سے جو کام لینا منظور تھا اسی کا میلان اس کے ضمیر میں رکھ دیا۔ اس کی فطرت میں ودیعت کر دیا اور فطرت کے حدود سے باہر نکلنا ناقص تو کیا ایک کامل سے کامل انسان کے بھی حیطۂ اختیار سے باہر ہے۔ البتہ ناقص اپنے ماحول، صحبت اور زمانے کی آب و ہوا سے بھی متاثر ہوتا ہے اور ایک کامل ان تمام زنجیروں کو توڑ پھوڑ کر عین فطرت کے مطابق ہو جاتا ہے۔ یہی اس کا کمال انسانیت اور منشائے حقیقی اس کے خالق کا ہے۔ اس کو "جنت الفردوس" کہئے یا "جنت الماویٰ" یا جس قدر بلند ترین مقام تک آپ کا تصور آپ کی رہنمائی کرے۔
اس کے علاوہ فطرتیں بھی مختلف ہیں۔ سمندر، مچھلی اور انسان کو لے لیجئے۔ اول کو آگ، دوسری کو پانی اور تیسرے کو ہوا سانس لینے کے لئے درکار ہے جس طرح پہلے کو دوسری اور دوسری کو تیسرے اور تیسرے کو پہلے کی جگہ پر رکھنا گویا ان کی موت کو دعوت دینا ہے۔ اسی طرح جب یہ مسلمہ امر ہے کہ جناب باری عز اسمہ کی دو شانیں ہیں (۱) جلال (۲) جمال۔ تو مظہر جلال سے جمالی افعال و خواص اور مظہر جمال سے جلالی آثار کی توقع کرنا دن کو رات کہنے کی سعی لاحاصل نہیں تو کیا ہے۔ کل شیء یرجع الیٰ اصلہ کو بھی نہ بھولنا چاہئے یعنی ہر شے اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے۔

اس لئے اگر نوجوانان عالم واقعی کسی عالمگیر مذہب کی اشاعت میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ وہ سب سے پہلے ہر نفس کی فطرت کا مطالعہ کریں پھر اپنے علم و عمل اور قوتِ ارادی کی مدد سے اُن کو اُن کے ماحول کی زنجیروں سے آزاد کر کے عین فطرت پر لانے کی کوشش کریں جو حقیقی معنوں میں صراطِ مستقیم کی طرف دعوت نیز نجاتِ ابدی کے حصول کا کھلا ہوا راستہ اور کسی عالمگیر مذہب کے اشاعت کا مقصد وحید ہے۔

آنسو

یہ کس کی یاد میں آنسو بہا رہا ہوں میں؟ — تمہارے نام پہ موتی لٹا رہا ہوں میں
اک آرزوئے محبت کا خواب دیکھا تھا — اب اس کی یاد بھی دل سے بھلا رہا ہوں میں
اُمنڈ رہا ہے جو طوفانِ گریہ آنکھوں سے — ہنسی کی موجوں میں اُس کو ڈبا رہا ہوں میں
ہوا تھی تیز، جلایا چراغ الفت کا — اب آہ و گریہ سے اُس کو بجھا رہا ہوں میں

اُبھر رہے تھے نقوشِ امید پھر میرے
اِن آنسوؤں سے اُنھیں کو مٹا رہا ہوں میں

(تمنائی)

بالِ جبریل پر ایک نظر

سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑی

"بالِ جبریل پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک نافدانہ مضمون جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کلکٹر کا ہے جو رسالہ "نگار" بابت جنوری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں جناب اثر نے اُن اعتراضات کی تردید کی ہے جو بالِ جبریل پر رسالہ "شاعر" آگرہ میں شائع ہوئے ہیں اور ڈاکٹر سر اقبال کے کلام کی آئینہ نمائی ہے۔

بعض اعتراضات کی تردید کرتے ہوئے کئی مرتبہ لکھا ہے کہ آج کل مسافرت اور بے اطمینانی کا عالم ہے۔ کتابیں حوالے کو موجود نہیں، حافظے کی مدد سے لکھتا ہوں۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں "اوپر اپنی مجبوریوں کا اظہار کر چکا ہوں کوئی لغت کی کتاب ہمراہ نہیں نہ دستیاب ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شعر میں لفظِ پارس میں "ر" متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے۔ پھر فرماتے ہیں کوئی اللہ کا بندہ کسی معتبر لغت یا بہارِ عجم کے حوالے سے میری تائید یا تردید کر دے۔" میری رائے میں حضرت اثر نے تردیدِ اعتراضات میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی اور کما حقہٗ دادِ تحقیق دی ہے۔

مضمون میں جہاں کہیں اسناد و شواہد کی کمی رہ گئی ہے میں لغت کے حوالہ جات سے پورا کئے دیتا ہوں۔

حوالہ جات کے علاوہ بعض مواقع پر مضمون تشنۂ توضیح و تصریح رہ گیا ہے وہاں اپنی جانب سے مختصر مگر مفید تشریح و تفسیر بھی کر دی ہے تاکہ جنابِ اثر کا مفہوم واضح تر ہو جائے۔

کلیم صفحہ ۱۶۹ ——————— —

مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے اب چاند کے غاروں میں نظر بند

اعتراض :۔ فکر کو مذکر اور غار کو مؤنث خلافِ مذہبِ فصحا نظم کیا گیا۔ فکر مؤنث ہے اور غار مذکر۔

جواب مزید۔ فکر مذکر خلافِ مذہبِ جمہور نہیں ہے، اور یہ صحیح نہیں کہ فکر لکھنؤ میں بلا اختلاف مؤنث ہے۔ اسیر لکھنوی۔ از دستور الشعراء صفحہ ۱۲۰

قرار آ ہی گیا غم میں دل سنبھل ہی گیا
گئے وہ دن کہ جو تھا فکر جان جانے کا (اسیر)

ڈاکٹر اقبال اور حضرتِ معترض کے اُستاد فصیح الملک داغ دہلوی۔ از دستور الشعراء صفحہ ۱۲۷

گذر جائے گی ہر صورت کروں کیا داغ اندیشہ
مرے مولا کو خود ہی فکر ہے میرے گزارے کا (داغ)

غار بالاتفاق مذکر ہے۔ اور ڈاکٹر سر اقبال نے بھی شعر مبحوث عنہ میں مذکر ہی نظم کیا ہے کوئی شخص بھی نہیں کہہ سکتا کہ شعر مذکور میں غار مؤنث ہے کیا و۔ ن سے مذکر کی جمع نہیں ہوتی۔ بار۔ خار مذکر میں اسی طرح اُن کی جمع بھی۔ و۔ ن سے یاروں، خاروں۔ آئی ہے۔ رہا حرفِ اضافت (کے) یا (کی)، اس کی ذمہ داری کاپی نویس پر۔ نہ اقبال پر۔

اعتراض :۔ ذرا اس شعر کی عروضی شان دیکھئے ؎

یوں دادِ سخن مجھکو دیتے ہیں عراق و پارس
یہ کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز

پہلا مصرع قیدِ بحر و وزن سے خارج ہے اور کچھ ایسا مبہم اور مہمل ہے کہ باوجود کوشش اُسے سمجھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

یعنی عراق و پارس کسی طرح بھی اس مصرع میں نظم نہیں کئے جا سکتے۔

اس کی تردید میں حضرتِ اثرؔ نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا ہے کہ کوئی لغت کی کتاب موجود نہیں ہے۔ مگر بدُون حوالہ کتاب یہی موصوف نے یہ اس تیج دیا ہے کہ پارس میں رے متحرک نہیں ہے اور پارس بر وزن یافت ہے نہ کہ بروزن کاہ۔

مجھے تعجب ہے کہ جناب سیمابؔ اکبرآبادی جو رسالہ عروض کے مؤلف ہی نہیں ہیں بلکہ قدیم عروض کے تابع اور جدید عروض کے مدوّن بھی ہیں کس طرح پہلے مصرع کو قیدِ بحر و وزن سے خارج فرماتے ہیں۔ ہم کو ایک عروضی ماہر سے یہ توقع کسی طرح نہیں ہوسکتی کہ وہ اس مصرع کو قیدِ بحر و وزن سے خارج بتائے۔ واقعہ یہ ہے کہ جناب سیمابؔ کو لفظِ پارس کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ اس کا صحیح تلفظ کیا ہے۔ اُن کے خیال میں بحرکت راے بر وزن آمد ہے۔

حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔

(۱) پارس یک حرف این لفظ کہ رائے مہملہ باشد۔ اکثر اوزان شعرا بدمی دید وساکن باشد یعنی ملک فارس۔ (غیاث)

(۲) پارس نام ولایتے و در استعمال یک حرف پارس زیادت از وزن آمدہ است (مؤید الفضلا)

(۳) پارس نام ملک بارائے موقوف است نہ برائے متحرک (تحفۃ الشعرا)

(۴) پارس نام ولایتے در استعمال یک حرف پارس زیادت از وزن آمدہ است۔ (کشف اللغات)

(۵) پارس نام ملکیت عوام بحرکتِ را خوانند۔ (ازاحۃ الاغلاط)

جس شخص نے گلستانِ سعدی شیرازی کے ابتدائی دو ورق پڑھے ہوں گے سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ قطعہ ضرور اُس کی نظر میں ہوگا۔ قطعہ

اقلیمِ پارس راغم از آسیب دہر نیست
تا بر سرش بود چو توائے سایۂ خدا
یارب ز بادِ فتنہ نگہدار خاکِ پارس
چندانکہ خاک را بود و آب را بقا

مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن یا فاعلات۔ مضارع مثمن اخرب مکفوف یا محذوف۔

تقطیع:۔ اقلیم مفعول پار راغ فاعلات م ز اسیب مفاعیل دہر نیس فاعلات۔
یا رب ز مفعول باد فتن فاعلات نگہدار مفاعیل خاک پار فاعلات، دیکھئے دونوں مصرعوں میں لفظِ پارس بسکون را نظم ہوا ہے اور حرف (س) ساکن سوم ہے تقطیع سے ساقط ہے

یہ ہے لفظ پارس کا صحیح حلیہ اور یہ ہے صورتِ استعمال۔

جس طرح سعدی کے آخر مصرع میں لفظ پارس نظم ہوا ہے اسی طرح سر اقبال کے آخر مصرع میں درست کیا گیا ہے ؎

بوں بادہ سخن دیتے ہیں مجکو عراق و پارس

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن۔ ہزج مثمن اخرب مکفوف مجبوب

تقطیع۔ بوں وادہ مفعول سخن دیتے مفاعیلن ہے مجکو مفعول عراق و پار مفاعیلان دیکھئے یہاں بھی (س) ساقط التقطیع ہے۔

فردوسی نکتا ہو کیا ... در جہد عاج
سوے پارس رفت آن خداوند تاج

اشعارِ قاآنی

مانم چرا پارس کہ نبود وراں یار ‖ نے آب و خاک نے شہر و گاہ شہر را
دولت ہواست کہ در ملک پارس فتنہ میشند ‖ یکے ز خلق مکشو آں دو شہنشاں را
اے اہل پارس شرم کہ از فضل کردگار ‖ آمد ملک پارس امید بزرگوار را
اگرچہ پارس گلستانِ عشرت است ولے ‖ چو نیست جنت بہ شادی و بہ گلستانم
مراد ملک یزد و پارس بخشیدہ ‖ لقب داوش لیعماسب افتیاری
ز و جیہ تا لب جیحوں ز نہ دوس تا سر پارس ‖ ز پارس تا رشوشی زرشت ناشنستر

اب عروضی شان بھی دیکھئے۔

عام قاعدۂ عروض ہے کہ ساکن سوم جہاں کہیں بھی ہوگا ساقط ہو جائے گا اور محسوب التقطیع نہ ہوگا کیونکہ اوزان عروض میں تین ساکن متوالی کہیں نہیں۔ گو فارسی اور اُردو میں ایسے الفاظ ہیں جن کے اواخر میں تین ساکن حروف ہوتے ہیں اور سنسکرت اور انگریزی میں تو چار ساکن بھی الفاظ میں پائے جاتے ہیں، جیسے چار اسٹر بسکون الف، سین، ٹے، رے اور اسپارکس (sparks) بسکون الف و رے و کاف و سین اس قاعدہ کی بنا پر ساکن سوم اکثر ساقط ہو جاتا ہے جیسے اس مصرع سیفی میں ؎

کارد برکش گوشت برگشتاسپ را

کارد کی دال گوشت کی تے اور گشتاسپ کی پے ساقط از تقطیع ہیں۔ کار برکش فاعلاتن گوش برگش فاعلاتن تاس را فاعلن۔ (از عروض قاضی جہاں سیفی)

یا جیسے اس مصرع میں ؎

نیست مشکل زایت یابد زیست طہورش گر

نیست اور زایت کی ت طہورش کی ت ساقط اتقطیع میں نیستن کل فاعلاتن رسیں
یابد فاعا تن از لبت طہ فاعلاتن مُورگر فاعلن

کار دا گوشت بنشستہ، زایت بر و دس بار سا ۔

بعض اساتذہ نے تو ساکن دوم کا بھی سقوط جائز رکھا ہے حضرت مولانا
نظامی گنجوی علیہ الرحمتہ کے مشہور قطعہ کا شعر ہے

پا سے از شب بگذشت بشترک بالمتہ
رنہ سے از حرفہ بردل سہ دسرو رخ بخود

تقطیع ۔ پاس نیز شب ناعلاتن بگذش بے معلاتن شترک یا فعلاتن تر فعلن
دیکھئے ت ساکن دوم صاف اُڑ گئی۔

یہ قاعدہ بلا استثنائے اعلام و افعال تمام الفاظ پر عام اس سے وسط مصرع
میں ہوں یا اواخر مصرع میں حاوی ہے۔

مجھے امید کرنا چاہیے کہ جناب سیماب اکبرآبادی نیز ش ع اس سے معترض بھی
کے بعد مطمئن ہو جائیں گے۔

اعتراض ؎

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

پہلے بیت میں خطاب انسان سے ہے اور دوسرے میں خدا سے، ایک ہی
رباعی (قطعہ) میں یہ تضاد تخاطب فنی اعتبار سے ناروا، ناجائز اور قابلِ اعتراض ہے۔

اس کا جواب حضرتِ اثرؔ نے یہ دیا ہے: "جنابِ معترض لفظ کبریا کے معنی
نہیں سمجھے ۔ خدا کے علاوہ اس کے اور بھی معنی ہیں اور یادداشت سے کہتا ہوں -
(لغت موجود نہیں) کہ اس سے جلالتِ استغنا کا مفہوم ادا ہوتا ہے - اسی سے عدم
واقفیت کی بنا پر حضرتِ معترض سے تسامح ہوا"

اب میں صرف لغات کا حوالہ دے کر سندِ استعمال پیش کئے دیتا ہوں۔
کبریا بالکسر بمعنی بزرگی (از منتخب) کبریا، بزرگی عزت. بڑائی ۔ شانِ مرتبہ (لغاتِ سروری)
اسناد ۔ سعدیؔ شیرازی علیہ الرحمتہ از "بوستان"

مرا در ا رسد کبریا و منی
کہ ملکش قدیم است و ذاتش غنی

دیکھئے اس شعر میں بالفاظِ حضرتِ اثرؔ جلالتِ استغنا کا مفہوم ادا ہوا ہے یعنی
اسم تبارک وتعالیٰ نہیں ہے ۔ قاآنی

دوشم ندا رسید ز درگاہِ کبریا
کے بندہ کبر بہتر از عجز باریا

اس لفظ میں لفظِ کبریا بمعنی اسم تبارک وتعالیٰ ہے اسی قصیدہ کا دوسرا

شعر ہے ؎

یارب بنور حجتِ قایم کہ تا قیام
قایم باد ست تا ۔ عرش کبریا

اس شعر میں جنابِ الٰہی سے تخاطب یارب کہہ کر کیا ہے اس لئے عرش
کبریا سے عرشِ الٰہی مراد نہیں ہو سکتی بلکہ عرش جلالت و شانِ عظمت مراد ہے۔

تسبیح

عربی	اردو
سبحان ذی الملک والملکوت	پاک ہے مالک زمین و آسمان کا
سبحان ذی العزۃ والھیبۃ	پاک ہے مالک عزت و بزرگی اور
والقدرت والکبریا والکمال	ہیبت اور قدرت اور بزرگی
والجمال والجبروت	کمال اور جمال اور غلبہ کا۔

یہ سندِ عربی میں کبریا بمعنی بزرگی کی ہے۔

اعتراض :- ؎

عشق کی تیغِ جگردار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

اول تو ساقی سے تیغ و نیام کے متعلق گفتگو ہی بے جوڑ ہے ۔ دوسرے
تیغِ جگردار کی ترکیب غلط ہے ۔ جگردار کی صحت میں ہیں کلام ہے، بے جگر تو سُنا
ہے مگر جری یا مضبوط کے معنی میں جگردار کسی سے نہیں سنا ۔ تیغ کو جوہر دار کہتے
ہیں جگردار نہیں کہتے ۔ یہ ترکیب ضعفِ تالیف کی تعریف میں آتی ہے۔

حضرتِ اثرؔ نے جواب تو وہی دیا ہے جو ایک معقول شخص کو دینا چاہیئے
اور آخر میں لکھا ہے کوئی اللہ کا بندہ کسی معتبر کتاب لغت یا بہارِ عجم کے حوالے سے
میری تائید یا تردید کر دے۔

مجھے صرف تیغِ جگردار کی صحت سے تعلق ہے، مجھے اس سے مطلب نہیں
کہ گفتگو بے جوڑ ہے یا نہیں، اس کا جواب حضرتِ اثرؔ دے چکے ہیں ۔ تیغِ جگردار کی
ترکیب غلط ہے کیونکہ جنابِ داغؔ مرحوم نے نہیں لکھا، حضرتِ معترض نے نہیں دیکھا۔

کے لغات میں نہیں آیا۔ اُردو مصطلحات میں نہیں ملا۔ دہلی والے بڑا دیں کی سے نہیں سنا۔ فارسی غیر زبان ہے اس کا ایک دو بائی پایکاٹ کردیا جائیے فارسی فرہنگ و لغات متروک الاستعمال ہیں موضوعی ہیں یہ وجوہ ہیں جو ترکیب غلط کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہیں اور واقعی ان وجوہ کے معقولیت میں کلام بھی نہیں ہے۔

میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ جگر دار اور تیغ جگر دار کے متعلق فارسی ادب کو پیش نظر رکھ کر لکھتا ہوں۔ اس کا فیصلہ ناظرین خود کریں گے کہ وجوہ اعتراض صحیح ہیں یا نہیں ایک فارسی داں سے بعید ہے کہ وہ بغیر تحقیق ایسا اعتراض کرے جس کو تردید لغات متداولہ سے باسانی ہوسکے۔

جگر دار۔ جگر اور دار سے مرکب ہے دار داشتن کا امر ہے۔ پہلے دیکھنا چاہئے جگر داشتن مصدر مرکب کس معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

جگر داشتن تاب و طاقت داشتن۔ طغرا

دارم دو ہزار دستہ چوں بید

در کشتنِ خود جگر ندارم

جگر بمعنی تاب و طاقت بسیار آمدہ چنانچہ جری را جگر دار گویند

(از مصطلحات وارستہ)

جگر داشتن تاب و طاقت داشتن۔ (از غیاث اللغات)

جگر چیزے داشتن تاب و طاقت آن داشتن (از بہار عجم)

ان اسناد سے واضح ہے کہ جگر داشتن بمعنی حوصلہ و بہادری ہے اور جگر دار بمعنی حوصلہ مند و بہادر ہے۔

اب صرف یہ اور دیکھنا ہے کہ جگر دار تیغ کی صفت ہوسکتی ہے یا نہیں بہار عجم میں صفاتِ تیغ میں بہت سے الفاظ سیماب گوں۔ سیماب ریز۔ جگر شگاف وغیرہ کے ساتھ جگر دار بھی لکھا ہے، جگر دار کو ردیف جیم میں جداگانہ لغت قرار دیکر لکھا ہے۔

جگر دار کنایہ از مرد دلیر و بیباک و اطلاق آن بالفظ تیغ نیز آمدہ۔

صائب ؎

در قبضۂ گردوں ستم آں تیغ جگر دار

کز سختیٔ ایام مرا سنگ فشاں است

اب یہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ تیغ جگر دار کی ترکیب غلط ہے اور جگر دار کی صحت میں بھی کلام ہے۔ حضرت سیماب کا یہ ارشاد کہ بے جگر تو سنا ہے مگر جری یا مضبوط کے معنی میں جگر دار کسی سے نہیں سنا۔ کسی کا سننا یا نہ سننا کوئی دلیل استقرائی نہیں ہوسکتا۔

اُردو میں اکثر ساد ہ شخص کو کہا کرتے ہیں کہ وہ بڑے بے جگر ہیں۔ معلوم ہے اُردو محاورہ۔ مگر سیماب کے شعر میں فارسی ترکیب ہے فارسی زبان کے متعلق کہنا چاہئے تھا کہ فارسی میں بے جگر بمعنی بہادر نہیں آیا۔ اردو کے محاورہ کو فارسی کے لئے معیار صحت قرار دینا فارسی زبان سے انتہا درجہ کی بیگانگی ہے۔ سر اقبال اردو کی طرح فارسی کے بھی مستقل شاعر ہیں۔ اُن کے اردو کلام میں فارسی ترکیب کو فارسی ادب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے۔ یہی بات جناب سیماب کے پیش نظر نہیں رہی۔

فائدہ۔ اکثر الفاظ فارسی و عربی زبان کے اُردو میں اپنی لغوی معنی کے خلاف مستعمل ہیں جیسے سرپرست فارسی میں بمعنی غلام ہے اُردو میں بمعنی مربی مستعمل ہے۔ موسم لغت عربی میں بمعنی میدان اور اُردو میں زمانہ کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بے جگر بھی اُردو میں جری کی معنی بولا جاتا ہے۔ اور صحیح ہے۔ لیکن فارسی نہیں۔ خیت اللغات میں ہے کہ بے جگر بمعنی بیمائی کہ ضد بہادری است راست ہے جگری نزد من ہم دو غزل ہے ناصر علی کے دیوان میں ایک غزل کا مطلع ہے ؎

ہیچ یا بے جگر بگریزد از میدان ما

بشنود گر کوہ آوازِ غضنفر خان ما

اس مطلع میں بے جگر بمعنی ڈرپوک ہے۔ تحفۃ الشعرا میں لکھا ہے کہ بے جگر آنچہ در اردو بمعنی بہادر شہرت دارد غلط است۔

یہ غلط بلحاظ محاورۂ فارسی ہے نہ باعتبار محاورۂ اردو۔ دونوں میں بون بعید ہے۔

جہاں تک حضرت آثر نے دعوتِ شرکت دی تھی میں نے وہیں تک اپنے مضمون کو محدود رکھا میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کہاں تک اس بحث و تحقیق میں کامیاب ہوسکا ہوں۔ اس کا فیصلہ حضرت آثر اور دیگر ناظرین کلیم پر چھوڑتا ہوں۔ مجھے حضرت سیماب سے بھی کوئی عناد و اختلاف نہیں ہے۔ میں اُن کو دورِ حاضرہ کا نہایت کامیاب شہرت شاعر جانتا ہوں۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر کامیاب شاعر محقق بھی ہو۔

شاعری امر آخر ہے اور تحقیق امر دیگر

برقِ رہ گذر

جو کوئی یوں سرِ رہ دن کے وقت لٹ جائے
وہ کیا کرے غمِ دل کو اگر کہے بھی نہیں

وہ ایک برقِ تجلی جو دل کے خرمن پر
نہ چاہے گرنا مگر بے گرے رہے بھی نہیں

وہ اُن کی مانگ میں سیندور میرے دل میں تپش
وہ شمعیں ہیں جنھیں کوئی بجھا سکے بھی نہیں

نیا سلام نگاہوں کا یوں نگاہوں سے
کہ جانتے ہیں مجھے اور جانتے بھی نہیں

غرور ان کا مرے سوزِ تازہ دم کی کشش
وہ جا سکے بھی نہیں اور ٹھہر سکے بھی نہیں

جبھی ہوئی ہے زمیں پر نگاہ میرے قریب
وہ دیکھتے ہیں مجھے یوں کہ دیکھتے بھی نہیں

کبھی نگاہ میں یہ سعیِ رائگاں اُن کی
کہ مجھکو دیکھ بھی لیں اور نظر ملے بھی نہیں

کبھی ہنسے تو ملائی نہ پھر نگہ مجھ سے
کبھی نگاہ ملائی تو پھر ہنسے بھی نہیں

تڑپ رہی ہے رگ و پے اُن کے وہ بجلی
جلا بھی دے مری پلکوں کو اور گرے بھی نہیں

ز فرق تا بہ قدم وہ پیام ہیں دونوں
جو کہہ سکے بھی نہیں اور چھپا سکے بھی نہیں

کہا یہ اُن کے تبسم نے آرزو سے مری
کہ روکتے بھی نہیں اور مانتے بھی نہیں

عجیب قسم کا ارمان ہے مرے دل میں
کہ رہ سکے بھی نہیں اور نکل سکے بھی نہیں

مآلِ سوزِ تصادم کا کیا کہیں میکشؔ
اگرچہ مر نہ سکے ہم مگر جئے بھی نہیں

میکش اکبرآبادی

مرجھائے ہوئے پھول

از مجنوں گورکھپوری

لکھنؤ - ۱۰ جولائی ۱۹۳۱ء

پیاری نوشابہ

شکایت نیست مطلب نالہ آہنگ است می نالم
زدل تنگی نمی نالم دلم تنگ است می نالم

خط بھی ملا اور باسی ہار بھی۔ قبل اس کے کہ کچھ اور کہوں ان دونوں کا شکریہ قبول کرو۔ آج آٹھ برس سے تم مجھ کو برابر اپنے چنے ہوئے پھول یادگار رہنے کے لیے بھیجتی رہی ہو اور اس کو اپنا وظیفہ سمجھے ہوئے ہو یہ میرے لئے معمولی بات نہیں ہے یہ تمہارا ایسا زبردست احسان ہے جس پر مجھے قربان ہو جانا چاہیئے۔ خدا تم کو خوش رکھے اور تمہاری آئندہ زندگی کو ہموار و خوشگوار بنائے۔ لیکن اگر اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہوں کہ

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را

تو تم شاید مجھے کوسنے لگو اور کہو کہ یہ شخص زخموں پر نمک چھڑکتا ہے اس لئے کچھ نہ کہوں گا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب مجھے یہ کہنے کا حق حاصل ہے اور اگر نہ سنو تو تمہاری زبردستی ہوگی۔

تمہاری شادی آخر ہو گئی۔ یہ خبر خلاف توقع کسی طرح سے نہ تھی اور مجھے اس سے کوئی صدمہ نہ پہنچنا چاہیئے۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ دن تاریخ کی اطلاع مجھے قید ہی میں مل گئی تھی۔ لیکن میری اچھی نوشابہ نہ جانے کیوں اب یہ جان کر کہ آج تمہارے بیاہ کو چار دن ہو گئے اور یہ خط تم نے اپنے نئے گھر سے لکھا ہے میرے دل کی عجیب حالت ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی اور جس کو میں اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے تم سے کنارہ کش ہوئے دو برس ہو گئے جس دن سے میں نے تم کو چھوڑا اسی دن سے یہ معلوم تھا کہ اب میں تم کو نہیں پا سکتا اور تمہاری شادی کسی دوسرے کے ساتھ یقیناً ہوگی۔ پھر آج جبکہ وہی ہوا جس کا ہونا اس قدر قطعی تھا تو میرا دل بیٹھا کیوں جاتا ہے۔ غالب کا یہ شعر اب میری سمجھ میں آیا۔

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

آج مجھے ... مرزا کے مقطع کا ... یقین کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

کیا مجھکو یقین اس ناتوانی نے خجل ورنہ
گلی کو یار کی لہو سے اپنے گلستاں کرتا

تم جانتی ہو یقین کون تھا؟ میری محنت سے تم کو کسی اور شاعر سے نہ سہی فائدہ تو ہوا ہی ہے کہ تم بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے اردو اور فارسی شاعر کے نام سے واقف ہو گئی ہو۔ یہ سچ ہے کہ اگر تمہاری خداداد صلاحیت اور تمہاری اپنی تعلیم و تربیت اس درجہ کی نہ ہوتی تو میں تمہارے ساتھ کچھ نہ کر سکتا اور تم کو کچھ نہ دے سکتا۔ فیض رسانی کے لئے فیض پانے کی قابلیت پہلی شرط ہے جو تمہارے اندر بدرجۂ تمام موجود تھی۔ لیکن پھر بھی نوشابہ مجھ سے تم نے جو کچھ پایا اس کا بھی اعتراف کرنا ہی ہے۔ مگر اصل مطلب تو رہا جاتا ہے۔ اور وہ یہ تھا کہ تمہاری گلی کو میں اپنے لہو سے گلستان نہ بنا سکا۔ یہ حسرت قیامت تک خجالت بن کر ساتھ رہی۔

نوشابہ! میں نے جو سوال تم سے کبھی نہیں کیا وہ آج کرتا ہوں یہ پھول تم نے کہاں پائے؟ جواب دو۔ پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ جب تک میں قید میں تھا تم مجھے ہفتہ وار پھول نہیں بھیج سکی تھی اسی لئے اب اکٹھا اتنے سارے پھول بھیج کر اس مدت کی خلا کو بھرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن پھر نہ جانے کیسے مجھے یہ خیال

آگیا اور دل میں بیٹھ گیا کہ یہ وہ پھول ہیں جن سے تم کو دولہن بنایا گیا تھا۔ نوشابہ! کیا تم انھیں پھولوں سے دولہن بنی تھیں؟ میرا یہ پوچھنا یقیناً فضول ہے۔ لیکن میں اپنے کو یہ پوچھنے پر مجبور پاتا ہوں۔ تم کہوگی۔ کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ ہاں نوشابہ! آج آٹھ برس سے مَیں مجھے اپنے چنے ہوئے پھول بھی بارج دیتی رہی ہو اور گذشتہ دو سال سے جبکہ میں وطن اور تم سے دو ہزار میل سے دُور ہوں تم ہفتہ وار ڈاک سے برابر یہ پھول مجھے بھیجتی رہی ہو۔ میں تمہاری ذہانت اور تمہارے ذوق کا قائل ہوں۔ تم بڑی نکتہ سنج ہو۔ مگر نوشابہ! ان پھولوں سے عجیب قسم کی خوشبو آرہی ہے۔ یہ پھول کیسے ہیں؟ اگر یہ وہی پھول ہیں جو میں ان کو سمجھتا ہوں تو تم نے میرے ساتھ بڑی بے دردی کی۔ تمہاری فطرت سے جو بہرحال نازک واقع ہوئی ہے یہ کوئی بعید بات نہیں۔ اسی لئے پوچھتا ہوں۔

مگر میرے لئے تو آج زندگی میں سب سے زیادہ سنگین سب سے زیادہ ناقابلِ تردید اور سب سے زیادہ ناقابلِ قبول حقیقت یہ ہے کہ تمہاری شادی ہوگئی۔ تم پوچھتی ہو "کیوں؟" میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ جس بات کو دل قبول نہ کرے وہ ہمیشہ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تم کو چھوڑے ہوئے تو دو سال ہوگئے لیکن خدا جانے یہ کیا منطق تھی کہ اس پر بھی تم کو اپنی ہی نوشابہ سمجھتا تھا اور اسی بھروسے پر جی رہا تھا۔ میری زندگی میں تمہاری کمی دراصل اب ہوئی ہے اور یہ احساس مجھے آج ہوا ہے۔

جان کو صبر ہے نہ دل کو ہے تاب
تو نہیں ہے تو زندگی ہے خراب

نوشابہ! تم اب کس کی ہو؟ اس کندۂ ناتراش کی جو نوشابہ اور ایک جاہل دیہاتی عورت میں کوئی فرق محسوس کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا جس کے لئے زائن اور بیری دونوں ایک عنوان کی چیزیں ہوں اور عورت کا حکم رکھتی ہوں؟ .... مگر نہیں۔ نوشابہ! مجھے معاف کردو۔ لِلّٰہ معاف کردو۔ وہ تمہارا شوہر ہے۔ تمہاری زندگی اب اس سے وابستہ ہے۔ دنیا میں مجھ سے بہتر لوگ ہیں ممکن ہے نعمان بھی مجھ سے بہتر ہو اور مجھ سے بہتر تمہاری زندگی کا ذمہ دار بن سکے۔ دنیا کی معاشرت میں محض حسنِ لطیف اور ندرتِ ذوق سے کام نہیں چلتا۔ زندگی کو جو لوگ یکسر شعر و موسیقی سمجھے ہوئے ہیں وہ سراب کو پانی سمجھ رہے ہیں۔ نعمان کو میں اچھی طرح نہیں جانتا۔ مجھے اس سے بہت کم سابقہ رہا ہے۔ میری اس کی طبیعت میں بچپن سے بیگانگی تھی۔ اتنا جانتا ہوں کہ دنیا کے معاملات میں وہ مجھ سے کہیں زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا ہے اور زندگی کو مادی حیثیت سے کامیاب بنانا خوب جانتا ہے۔ حکمتِ عملی، مصلحت اندیشی، زمانہ شناسی میں بچپن ہی سے وہ مشہور رہا ہے ظاہر ہے کہ اگر ایسا شخص جاہ و ثروت میں ترقی نہ کرے تو اس کو محض بدبختی کہیں گے لیکن نعمان کی قسمت کا ستارہ بھی حسبِ مراد گردش کر رہا ہے۔ اس کو عزت بھی میسر ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ مجھ سے زیادہ وہ تمہاری زندگی کو کامیاب نہ بنا سکے کہ سے ذمیری یہی دعا ہے اور یہی امید۔ یہ تو میں نہ جانے کس ہیجان و اضطراب میں ایسی ناشائستہ اور رکیک باتیں لکھ گیا۔ دنیا میں شعر و ادب، نزہت و لطافت، خلوص و معصومیت کے علاوہ بھی بہت سی خوبیاں ہیں جو شوہر اور بیوی کے تعلقات کو پائدار اور خوش آئند بنانے کے لئے بے حد ضروری ہیں اور جو مجھ سے بدرجہا زیادہ نعمان میں نظر آئیں گی۔ وہ یقیناً تمہارے حق میں شوہر کی حیثیت سے ایک برکت ثابت ہوگا۔ میری ہرزہ سرائیوں کو معاف کردو اور بھول جاؤ۔ لیکن پھر بھی اتنا تو کہہ لینے ہی دو کہ اگر تم مجھے مل ہوتیں جن کا تصور بھی استحالہ تھا تو میں تم کو وہ بناتا جو کوئی دوسرا نہیں بنا سکتا۔ نعمان تم کو صرف اپنی بیوی بنائے گا۔ میں تم کو اپنا معبود بناتا .... مگر خیر۔

جاتے ہو جاؤ ہم بھی رخصت ہیں
ہجر میں زندگی کی مدت کیا!

میں تم کو دردمند کی مثنوی کے اشعار اکثر سنایا کرتا تھا اور تمہاری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ آج آخری بار بھی ایک شعر سن لو۔

یہی تھا لکھا میری قسمت میں جان
قیامت تلک ہجر و وصل اک آن

معلوم نہیں آج تمہاری آنکھوں میں آنسو آئے کہ نہیں میری آنکھوں میں تو آئے نہیں۔ اول تو میری آنکھوں میں آنسو رہے نہیں۔ دوسرے جن بات کو زندگی کی سب سے زبردست حقیقت مان لیا جائے اُس پر کوئی کیا روئے۔ تم اس کو میرے تخیل کی خرابی کہوگی۔ لیکن نوشابہ ہجر ہی کا دوسرا نام زندگی ہے۔ اور شاعر موت کو وصال اسی لئے کہتا ہے کہ اس سے ہجر کی میعاد پوری ہو جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد بھی وصل میسر نہ ہو اور ہجر کی پھر دوسری میعاد شروع ہو جائے۔ مگر میں بھی بہک کر کہاں پہنچا!۔

ہاں تو تمہارا بیاہ ہوگیا؟ تم اب بیگم نعمان ہو؟ خدا مبارک کرے اور تمہارا مستقبل یکسر کیف و مسرت ہو۔ تمہاری زندگی میں اس چیز کی ارزانی ہو جو میری

قسمت میں نہ تھی۔ نوشابہ! مقدر بھی کیسا طرفہ ماجرا ہے! کبھی دو آدمیوں کا مقدر ایک نہیں ہوتا۔ اسی لئے اب کبھی کبھی مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ زندگی کی اصل حقیقت انفرادیت ہے اور یہ محبت اور خود باختگی کا دعویٰ محض فریب ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ اپنے مقدر میں مبتلا ہے اور اس کی تکمیل کر رہا ہے۔ اب ذرا تم بھی اس مسئلہ پر غور کرو اور جواب دو۔ خواہ خواہ طنز و طعن کو راہ نہ دو۔ ذرا اپنی اور میری قسمتوں کا مقابلہ کرو۔ تم کو دلہن بنے ہوئے دو چار روز ہوئے اور مجھے قید سے چھوٹے ہوئے بھی کچھ اتنی ہی مدت ہوئی۔ تمہارے سامنے اس کا سامان ہے کہ کم سے کم کچھ دنوں تک تمہاری زندگی میں کچھ نئی باتیں ہوتی رہیں اور تم کو خستہ و درماندہ نہ ہونے دیں۔ میں اپنی زندگی کو دیکھتا ہوں تو دور تک کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جو مجھے اپنے میں کھوئے رہے۔ میری زندگی ایک ریگستان ہے جہاں سوا اکتا دینے والی ریت کے اور کچھ نہیں ہے۔

تمہارے اس خط اور ان گلے شکوؤں نے اب سے آٹھ برس پہلے کی دنیا میرے پیش نظر کر دی ہے۔ کچھ تمہیں بھی یاد ہے وہ تمہارے والد کا نوکری سے پنشن لے کر آنا اور میرا پہلے پہل تم کو دیکھنا اور یہ محسوس کرنا کہ شیخ آباد میں ایک نئی جان پڑ گئی ہے۔ تمہاری عمر اس وقت ۱۲ اور ۱۳ برس کی تھی۔ لیکن تمہاری تعلیم و تربیت اور تمہاری اپنی دانائی اور بصیرت تم کو سب سے بلند و برتر بنائے ہوئے تھی میں خود اپنے کو تمہارے مقابلہ میں بے مایہ سمجھنے لگا تھا اور شاید آج تک سمجھ رہا ہوں۔ پھر وہ چھ برس کا زمانہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے جو کم و بیش میں نے تمہارے ساتھ گزارے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ میں خود کو تمہارا اور تم کو اپنا سمجھ رہا تھا۔ خود تمہارا خیال تھا کہ میرے سوا تم کسی کی نہیں ہوگی اور کسی کو اپنا نہیں بناؤ گی۔ ہم اپنے اس زعم میں کس قدر بلند آہنگ اور پر خود غلط تھے۔ اور پھر ساری دنیا جانتی تھی کہ مجھے تم سے اور تم کو مجھ سے عشق ہے۔ ہمارے ماں باپ بھی اس کو مانتے تھے اور اپنی اپنی جگہ اس پر ناز بھی کرتے تھے۔ اب معلوم نہیں لوگوں کا کیا خیال ہے۔ مجھے اس زعم کو چھوڑے ہوئے تم جانتی ہو ایک زمانہ ہو گیا لیکن اب تم سے پوچھتا ہوں۔ تمہارا اب کیا خیال ہے؟ تم کس کی ہو؟ اور میں کس کا ہوں؟ تم نے آخرکار کس کو اپنا بنایا؟ آہ نوشابہ!

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم نے خط میں ایک سنگین الزام مجھ پر لگایا ہے اور اس سے پہلے بھی کئی بار یہی الزام لگا چکی ہو۔ نوشابہ یہ سچ ہے کہ بنے کو میں نے خود تمہارے خیال کو چھوڑ دیا ورنہ اگر میں اپنی جگہ ثابت قدم رہتا اور میرے گھر والے اصرار کرتے رہتے تو تمہارے ماں باپ بھی رام ہو ہی جاتے اور کچھ نہیں تو برادری کی پاسداریوں سے مجبور ہو کر آخر کار تم کو مجھ سے بیاہ دیتے۔ لیکن نوشابہ تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اصل بات کیا تھی۔ پھر بیان کرانا کیا ضروری ہے؟ اس کو کیا کہتے ہیں؟ میں تمہارے والدین کے (اور شاید تمہارے بھی) اس خیال کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا کہ دولت و ثروت اور بخت و اقبال میں تم مجھ سے فائق ہو۔ اور تم کو اس اعتبار سے تمہارے ہی لائق شوہر ملنا چاہئے جیسا کہ آخر ملا۔ تم جانتی ہو اسی خیال نے میری آنکھیں کھول دیں۔ بات کی بات میں میرے تمام التباسات دور ہو گئے۔ پھر میں کیا سے کیا ہو گیا اور کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ شاہ و گدا کی تفریق کتنا بڑا ظلم ہے اور اس ناروا اور انگیز حقیقت کو بھولے رہنا کہ کوئی محتاج ہے کوئی غنی، کوئی آقا ہے، کوئی غلام، کتنی زبردست خود فریبی اور جہل انکاری ہے۔ اپنی اور تمہاری شادی سے میں نے قیاس کرنا شروع کیا کہ آج سارے انسانی تمدن اور ساری ہیئت اجتماعی کی بنیاد اسی غیر انسانی تفریق پر ہے۔ پھر تم تو جانتی ہو کہ کیا ہوا۔ اب میرے سر میں ایک ہی سودا تھا۔ اپنی چند روزہ زندگی کا کوئی ایسا مصرف نکالو جس سے اس فرق و امتیاز کے مٹانے میں مدد ملے۔ چاہے یہ مدد بجائے خود کتنی ہی حقیر اور ناقابل لحاظ ہو۔ اس سے کم سے کم مجھے یہ تسکین ہوگی کہ میں اس حد فاصل کو توڑنے میں حصہ لے رہا ہوں جو میرے اور تمہارے درمیان حائل ہے اور جو ہزاروں بندگان خدا کے درمیان بے معنی مدارج قائم کئے ہوئے ہے۔ بڑی حیرت ہوئی کہ میرے سر میں یہ سودا سما گیا ورنہ نوشابہ مجھے تم سے نفرت ہو جاتی اور میں اس نفرت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میری شادی اگر تمہارے ساتھ ہو بھی جاتی تو بھی میں اپنے دل میں یہ کھٹک لئے رہتا کہ تم مجھ سے زیادہ دولت مند ہو اور یہ کھٹک ہمارے دو دلوں کو کبھی ایک نہ ہونے دیتی۔ تم کو اپنے سے زیادہ خوبصورت اپنے سے زیادہ لائق اور ہوشمند، اپنے سے زیادہ ذی علم ماننے میں میرے لئے سکون تھا۔ حالانکہ کوئی اس کو تسلیم نہیں کرے گا اور خود تم کو بھی یہ ماننے میں تامل ہوگا کہ تم مجھ سے زیادہ ذی علم اور دانا ہو اس لئے کہ کم سے کم دنیا کے کہنے کے لئے میں نے تم سے کہیں زیادہ تعلیم پائی ہے اور عالم و فاضل سمجھا جاتا ہوں۔ مگر نوشابہ

تم نے یہ بھی مانتا تھا کہ تمہارا ذوقِ علم و ادب زیادہ سنجیدہ اور زیادہ صحیح ہے لیکن اس سونے چاندی کے امتیاز نے مجھے تم سے بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ یہ خیال میرے لئے ایک کانٹا تھا کہ تم مجھ پر دولت و ثروت کی فوقیت رکھتی ہو۔ یہ خیال سراسر غلط ہی تھا۔ اور ہم دونوں کو گندہ اور ناپاک کر رہا تھا۔

بہر حال یہ تھی میری اس دو سالہ زندگی کی ابتدا۔ اس کی انتہا کیا ہوگی؟ یہ سوال بے معنی ہے۔ شمع کا آغاز و انجام ہی کیا؟ جلنا اور جل بجھنا۔ جو آغاز تھا وہی انجام ہے۔ مولانا روم کا ایک شعر ہے:

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بُدم، پختہ شدم، سوختم،

میری زندگی کا ماحصل بھی یہی رہا۔ البتہ یہ خیال چین لینے نہیں دیتا کہ میں پختہ ہونے سے پہلے ہی جل جاؤں گا۔ نوشابہ! ہر چیز کی اصلیت اس کا آغاز ہے۔ انجام کی نہ کوئی اصلیت ہے نہ اس کا کوئی اعتبار۔ مجھے بتاؤ جس محبت کی میں نے اور تم نے اس ولولے اور فراخ دلی کے ساتھ ابتدا کی تھی، اُس کی حقیقت سوائے اس کے آغاز کے اور کیا ہے؟ انجام تو کچھ رہا نہیں۔

تم نے بڑے طنز کے ساتھ پوچھا ہے "کہو تمہاری قوم کا کیا حال ہے اور تمہارے ہندوستان کا کیا مستقبل ہے؟" میں جانتا ہوں کہ اس سوال سے تمہارا اصل مقصد کیا ہے؟ اور اس کا محرک کونسا جذبہ ہے۔ ورنہ عام حالات سے تم بے خبر نہیں ہو۔ تم میری زبان سے یہ سنکر خوش ہونا چاہتی ہو کہ یہ ساری شورش بے نتیجہ ثابت ہوئی، اور میرا ہر زعم غلط نکلا۔ ہاں نوشابہ تم اِس خیال سے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لو۔ ہمارا سارا شور و غل ابھی بھی بیکار ہی رہا اور کسی خواب کی کوئی تعبیر نہیں نکلی۔ میں اس نمک کی شورش اور مالگذاری کی مخالفت سے بہت کچھ امیدیں لگائے ہوئے تھا۔ مجھے یہ تحریک ہندوستان کی پچھلی تحریک سے زیادہ معقول زیادہ مستقل اور زیادہ جاندار معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد ایسی چیزوں پر تھی جن کا تعلق جمہور کی زندگی سے بھی اسی قدر ہے جس قدر کہ معدودے چند امراء اور اعیان کی زندگی سے۔ نمک اور خدا کی دی ہوئی زمین پر محصول لگانا ایسا اندھیر ہے جو قضا و قدر کی زبردستیوں سے بھی بڑھ گیا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اب کے مرتبہ کا سیاسی شور کچھ نہ کچھ حاصل کر کے دم لے گا۔ لیکن اس نے تو ایسا دم توڑا کہ اب عرصہ تک کوئی نئی تحریک شروع ہوتی نظر نہیں آتی۔ اللہ اللہ! جس وقت ہم لوگوں نے اس نمک اور مالگذاری کے جہاد کے لئے تیاریاں شروع کی تھیں اس وقت ہمارے دل میں کیسی کیسی امنگیں تھیں! اور آج ہر طرف ایک سناٹا ہے۔ نہ کانگریس میں جان ہے۔ نہ ہمارے سرداروں میں زندگی کے کوئی آثار باقی ہیں۔ ہر چیز پر پستی چھا رہی ہے اور ہر شخص جمائیاں لے رہا ہے۔ تم کو یہ کہنے کا حق ہے اور تم یہ کہہ سکتی ہو۔

اب کہیں آسیٔ نالاں ہے نہ قیس و فرہاد
کیا ہوئے کنگرۂ عرش ہلانے والے

میں خود بھی سوچ رہا ہوں۔ آخر یہ اُداسی اور بے حسی کب تک رہے گی۔ اور اس کا حشر کیا ہوگا؟ کاش کسی گوشہ سے کوئی ہلاکو یا چنگیز ہی اٹھ کھڑا ہو اور وہ لوٹ مار ہی شروع کر دے؟ کاش کسی طرف سے ظلم و استبداد ہی کی تحریک ہو اور کشت و خون کا بازار گرم ہو جائے۔ پھر کچھ ردِ عمل ہو۔ کچھ صدائے احتجاج بلند کی جائے۔ کچھ دار و گیر کا ہنگامہ برپا ہو اور سوتی ہوئی دنیا پھر جاگ اُٹھے۔ مگر نوشابہ یہ اداسی صرف ہندوستان پر مسلط نہیں ہے بلکہ دنیا کے کسی حصہ میں بھی آج کوئی حرکت و زندگی نہیں پائی جاتی اور "کنگرۂ عرش ہلانے والوں" کا ہر جگہ کال ہے۔ اس لئے اکیلے ہندوستان کو طعن و ملامت کا نشانہ نہ بناؤ۔

مگر تم نے تو دراصل مجھ پر طعن کیا ہے اور میری ناکامیوں پر ہنسی ہو۔ نوشابہ میں تمہاری محبت میں بھی ناکام رہا، وہ ناکامی تنہا میری ناکامی تھی یہ ناکامی ایک خلق اللہ کی ناکامی ہے۔ تم اُس ناکامی کا تو مجھے طعنہ دے سکتی ہو۔ لیکن میری یہ ناکامی تمہاری زد میں نہیں آتی۔ نوشابہ اب اگر میں کامیاب ہوا تو میرے ساتھ خدا کی ایک دنیا کامیاب ہوگی۔ اور میں مایوس نہیں ہوں۔ وہ زمانہ آکر رہے گا جبکہ دنیا میں خواجگی اور بندگی دونوں باقی تو رہیں گی، لیکن دونوں میں بلند و پست کا کوئی فرق تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ آج کیا جا رہا ہے۔ آقا اور مزدور میں صرف اتنا امتیاز باقی رہے گا کہ ایک کا کام کام کرانا ہے اور دوسرے کا کام کرنا۔ دونوں کو اپنے اپنے کام سے کام ہوگا۔ اور دونوں کا مرتبہ مسلم رہے گا۔ نہ حاکم کو محکوم سے کوئی ضد اور کد ہوگی نہ محکوم کو حاکم سے۔ میرا ایمان یہ ہے کہ آقا اور مزدور دونوں یکساں آزاد اور آسودہ ہو کر رہیں گے۔ صفحۂ ہستی پر اس وقت جو قوم ہے اس کو غلام اور محتاج ہو کر نہیں رہنا ہے۔ ہندوستان بھی ہمیشہ اس بندگی اور بیچارگی میں مبتلا نہیں

ہوسکتا۔ اس وقت اس پر جو اوبار بھی چھا رہا ہو اس کو ایک دن زندہ ہو کر فروغ پانا ہے۔

اس وقت کی فضا افسردہ اور ملال کرنے والی ہو رہی ہے اور میں بے انتہا افسردہ اور مضمحل ہو رہا تھا۔ لیکن نوشابہ تمہارے خط نے میری بھی کسلمندی میرے دل سے چھین لی، اور میں ایسا محسوس کرنے لگا ہوں کہ میرے جیتے جی ہندوستان پر کچھ نہیں ہو گا۔ ممکن ہے یہ محض ایک توہم ہو جو میرے اپنے ذاتی جذبات کا نتیجہ ہو۔ جو کچھ بھی ہو مجھے اطمینان ہے کہ کبھی نہ کبھی ہمارے ہندوستان کا ستارہ چمکے گا اور اس کا بھی زندوں میں شمار ہو گا۔

تمہارا ایک سوال میری سمجھ میں نہیں آیا تم نے لکھا ہے:۔

کہوں کون ہے وہ جواہر مثال

بسے اس کے ہیرے میں اے میرے لال

اور پھر کہتی ہو "سنا ہے آج کل پریوں کے جھرمٹ میں گھرے رہتے ہو۔ اور ان میں سے کسی خاص پری کہ جس کا نام مجھے معلوم نہیں تم کو سایہ بھی ہو گیا ہے۔ خدا کرے یہ خبر غلط نہ ہو اور دنیا میں کوئی ہستی تو ایسی نکل آئے جو تم کو عمر بھر اپنا بنائے رکھ سکے"!

نوشابہ سب سے پہلے تو مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ تم اب بھی مجھکو "اپنا لال" کہہ سکتی ہو۔ یہ کس منہ سے؟ اگر میں اس کے جواب میں صرف یہ کہہ دوں تو بھی تم کو چپ ہو جانا چاہیئے۔

عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو؟

لیکن یہ بات میرے کہنے کی نہیں ہے جو تمہارے سوچنے کی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں تمہاری بات سمجھا ہی نہیں۔ تمہاری مراد کس سے ہے؟ نمک کی شورش۔ ہڑتال بدیشی سے مقاطعہ اور دوکانوں کے محاصرہ میں کئی عورتیں میری سرکردگی میں شریک رہی ہیں، اور اُن میں سے دو ایک ایسی بھی ہیں جن کو میرے ساتھ غیر معمولی انس ہو گیا ہے۔ لیکن نوشابہ میں ان سب کو تمہاری بہنیں سمجھتا ہوں۔ ان میں سے ایک پاربتی ہے جس کے حوصلے اگر میں بڑھاتا تو آج وہ میرے قدموں سے لگی میری پوجا کرتی ہوتی۔ شاید تمہاری مراد اسی سے ہے اس لئے کہ قریب و دُور مشہور ہے کہ وہ میرے ساتھ والہانہ وابستگی رکھتی ہے اور میں بھی اس کا گرویدہ ہوں۔ لیکن نوشابہ

تم نہ مانو کہ یہ اغیار کی افواہیں ہیں

پاربتی کو مجھ سے جو یہ تعلق خاطر پیدا ہو گیا ہو مجھے اس سے صرف اس قدر ہمدردی ہے کہ وہ میرے ساتھ اس شورش اور ہنگامہ میں شروع سے آج تک شریک رہی۔ تمہارے بعد اگر واقعی کوئی عورت میری زندگی میں آئی ہے تو تم کو یہ سنکر تعجب ہو گا کہ وہ ایک مالدار بیوہ ہے جس کا نام شیاما ہے اور جو بنارس کی سب سے زیادہ دولتمند اور حسین بیوی ہے۔ وہی حسن خیز اور عبادت انگیز بنارس جس کو غالب نے "کعبۂ ہندوستان" بتایا ہے اور جہاں کے معشوقوں کے بارے میں اُن کا تجربہ ہے۔

بتانش چو ذرّوے مہر جوشند	شکر گویند و گوہر می فروشند
قیامت قامتاں مژگاں دراز اں	ز مژگاں بر صف دل نیزہ باز اں
میانہا نازک و دلہا توانا	ز نادانی بہ کار خویش دانا

شیاما کہنے کو تو ایک بازاری عورت ہے لیکن اس میں یہ تمام انداز دلبری بھرپور موجود ہیں نوشابہ۔ اس کی صورت بہت کچھ تمہاری یاد تازہ کردیتی ہے، اور پھر وہ تم سے کم دولتمند نہیں ہے۔ دیکھو دولت ایسی چیز ہے جو اس مذموم اور مکروہ طریقہ سے بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ شیاما میں کوئی پندار نہیں ہے نہ عورت کا نہ دولت کا۔ اور علم تو خیر اس کو چھو بھی نہیں ہوا۔ اس اعتبار وہ تجھ سے اور تم دونوں سے بلند ہے، اور اس کے اندر ایثار اور خود گزاشتگی کی قابلیت بھی ہم دونوں سے زیادہ ہے۔ جب سے اس کی مجھ سے ملاقات ہوئی ہے اُس نے بڑے بڑے راجاؤں اور رئیسوں کو جُوتی پر مار دیا ہے اس نے اپنی ساری دولت میرے اشارہ پر چھوڑ دی ہے۔ وہ ہم دونوں سے زیادہ صاحب دل ہے۔ وہ ہم دونوں سے زیادہ خیرات کرسکتی ہے اور زیادہ صدق نیت اور فراخ حوصلگی کے ساتھ خیرات کرسکتی ہے وہ اپنے اوقات کا زیادہ حصہ چرخہ کاتنے میں صرف کرتی ہے، صرف اس لئے کہ میں اس سے خوش ہوتا ہوں۔ میں نے اگر کبھی شادی کی تو اسی عورت سے کروں گا۔ تم بھی ذرا اس معاملہ میں سوچ کر مجھے مشورہ دینا۔ مگر اب اس واسوخت کی لے بہت بڑھ چکی ہے۔

نوشابہ یہ تو محض جلے پھپھولے پھوڑ رہا تھا، ورنہ کیسی پاربتی اور کہاں کی شیاما! کہاں میں اور کہاں شادی کا تصور! اگر میری باتوں کا تم کو یقین آگیا تو تم اب بھی بڑی بھولی ہو۔ یہ سچ ہے کہ پاربتی مجھ پر دم دیتی ہے، اور شیاما میرے نام کی تسبیح پڑھتی ہے۔ لیکن نوشابہ

تم سے جہاں میں لاکھ سہی تم مگر کہاں؟

یہ خیال مجھے دنیا میں اب کسی کا نہیں ہونے دے گا۔

تمہارا خط میرے سامنے ہے۔ تمہاری شادی کی خبر اپنی تمام واقعیت اور سنگینی کے ساتھ مجھے اپنا یقین دلا رہی ہے۔ اور نوشابہ میرے کلیجہ پر چھریاں چل رہی ہیں۔ خدا جانے کیوں میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ اب میں کسی کام کے قابل نہیں رہا۔ اب میں اس قابل بھی نہیں کہ پلٹ کر تمہاری خاکِ پا کا سجدہ کر سکوں۔

مجھے اپنے ماں باپ کی چنداں فکر نہیں جن کا تم بار بار مجھے واسطہ دلاتی رہی ہو۔ اُن کے پاس خدا کے فضل سے میرے اور بھائی بہن ہیں جن میں وہ بہل جائیں گے اور مجھے بھول جائیں گے۔ لیکن نوشابہ تم کیا سے کیا ہو گئیں اور مجھ سے کتنی دُور نکل گئیں! مجھے ابھی اس حقیقت کو دن دن سمجھنا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب اور کیا لکھوں۔ تم جاننا چاہتی ہو کہ اب آئندہ میرے ارادے کیا ہیں؟ اگر انسان کے ارادے کوئی چیز ہیں اور وہ اگر پورے ہو سکتے ہیں تو سنو۔ اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ عمر بھر اسی ہیجان وانتشار کی زندگی میں پڑا رہوں گا۔ اس سے پہلے اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ جب سب کچھ کر چکوں گا اور جب کسی قدر سکون اور اطمینان نصیب ہوگا تو تم سے قریب شیخ آباد میں معتکف ہو کر بیٹھ رہوں گا اور زندگی کے باقی دن عبادت یا ذکر کر کے گزار دوں گا لیکن اب میرے اندر یہ حوصلہ بھی نہیں۔ تم پوچھتی ہوگی کیوں؟ میں خود اس کی تشریح نہیں کر سکتا۔ آخر اس سے پہلے بھی تو یہ قطعی تھا کہ اب تم میری نہ ہوگی اور اس سے زیادہ یہ قطعی تھا کہ کسی دوسرے کی ضرور ہوگی۔ اور میں اس کو اچھی طرح سمجھے ہوئے تھا۔ یہ سچ ہے، لیکن اس وقت یہ واقعہ نہیں ہوا تھا اور مجھے نہ جانے کیوں اور کسی قسم کی تم سے ڈھارس تھی۔ میں تم کو اپنی زندگی کا آسرا سمجھ رہا تھا۔ یہ سراسر خود فریبی تھی۔ مگر تھی۔ اب میری نجات اسی میں ہے کہ جس طرح مٹ رہا ہوں اسی طرح اپنے کو مٹاتا رہوں اور میں یہی کروں گا۔ تم کو اب میرے معاملہ میں مداخلت کا کوئی حق نہیں اور تم فضول میرے پیچھے اپنی اوقات تلخ نہ کرو۔ میں اب کسی کے کہنے سننے سے نہ بدراہ ہو سکتا نہ راہ راست پر آ سکتا ہوں۔ تم میری فکر چھوڑ دو۔ تم کو یہ سنکر شاید رنج ہو کہ اب میں تمہاری اس فکر کو ریا سمجھوں گا۔ اگر تم کو واقعی میری اس "بدانجامی" کا غم ہے تو کیا تم اس غم میں اتنی از خود رفتہ ہو سکتی ہو کہ معاشرت اور ہیئت اجتماعی کی پروا نہ کرو اور ننگ و نام کو بالائے طاق رکھکر اپنا گھر بار تج دو۔ اور دیوانہ وار میرے پاس چلی آؤ؟ مجھے اگر کوئی قوت برباد ہونے سے بچا سکتی ہے تو وہ تمہاری یہی مجنونانہ جرأت ہوگی۔ اگر واقعی تم کو میرا غم ہے جیسا کہ تم دعویٰ کرتی ہو تو نوشابہ کچھ اس غم کی مردانگی کا ثبوت دو۔ لعمان کی خوابگاہ چھوڑ دو اور میرے غم خانہ کو اپنی زندگی کی شبستان بناؤ۔ لیکن نوشابہ نہ تم ایسا کر سکتی ہو نہ تم کو ایسا کرنا چاہیے۔ پھر بیکار میری حالت پر غم کا اظہار نہ کرو۔ میں اس غم کا قائل نہیں جو کچھ کر نہ دکھائے۔ قصہ مختصر اب مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں اپنی زندگی کا دستور العمل خود بنا لوں گا۔ اگر کانگریس پر یہی مردنی عرصہ تک چھائی رہی اور اگر پھر کسی طرف سے جلد کسی تازہ منظم تحریک کا جھنڈا نہ بلند کیا گیا تو میں اور سمتوں میں نظر دوڑاؤں گا۔ اور اپنی زندگی کو یکسر شورو اضطراب بنائے رہنے کی پوری کوشش کرتا رہوں گا۔ چاہے اس میں میری جان ہی کے لالے کیوں نہ پڑ جائیں۔ نوشابہ اگر یہ نہ ہوا تو اب میں بے موت مر جاؤں گا۔ غرضکہ اب میری زندگی اور میرے ارادوں کو کیا پوچھتی ہو۔ اب تو

جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

تم البتہ اپنے نواب کے محل میں ناز و نعم کی زندگی بسر کرو۔ مگر یہ میں نے ناحق کہا۔ تم سوا اس کے کر ہی کیا سکتی ہو؟۔

مجھے اب صرف ایک اندیشہ لگا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ سے میری صحت خراب ہو رہی ہے۔ ڈاکٹروں کو تشویش ہے اور وہ اصرار کر رہے ہیں کہ میں کچھ دنوں اپنی موجودہ زندگی سے برطرف ہو کر آرام کروں۔ میرے رفیقوں کو بھی یہی اصرار ہے۔ لیکن نوشابہ! اوّل تو اس "جہانِ خراب" میں آرام سے کون رہ سکتا ہے دوسرے میرے لئے آرام موت کا حکم رکھتا ہے۔ ڈرتا ہوں میری صحت کہیں زیادہ خراب نہ ہوتی جائے۔ پھر میری کوئی نہیں سنے گا اور مجھے زبردستی الگ کر دیا جائے گا۔ اس وقت میں کیا کروں گا۔ اور کہاں جاؤں گا اور مرنے سے پہلے زندہ رہنے کی کیا صورت ہوگی؟ کہیں مجھے یہ ماتم نہ کرنا پڑے:۔

جفا اُس کی نہ پہنچی انتہا تک
دریغا عمر نے کی بے وفائی!

نوشابہ! کاش زمانہ الٹی گردش بھی کر سکتا! یا انسان زمانہ میں بھی سفر کر سکتا۔ اور جس طرح وہ آگے پیچھے جہاں چاہے ایک جگہ سے دوسری جگہ آتا جاتا رہتا ہے اسی طرح زندگی کے ایک دور سے دوسرے دور میں نقل و حرکت کرنے پر بھی قادر ہوتا۔ کاش تم مجھے کچھ ہی دنوں کے لئے ایک بار پھر مل جاتیں! آج ایک پوری مدت کے بعد میں اپنے کو اس حسرت سے مغلوب و مجبور

پاتا ہوں مگر آہ:

اب تجھے اے ستم یار کہاں سے لاؤں

میں تو ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ وہ عزیزؔ جو برسے سالہا سال کا زمانہ گزر گیا ہے اور اب میں وہ عزیزؔ نہیں رہا جس کو احباب "عزیز خاطر آشفتہ حالاں" کہا کرتے تھے اور جو بس اب سے چند گھنٹوں پہلے تک ہی تھا۔

نوشابہ! ذرا تم بھی اپنے کو آئینہ میں دیکھنا۔ کیا تم اب بھی وہی میری نوشابہ ہو؟

تم نے مجھ سے یہ بھی دریافت کیا ہے کہ ادھر میں نے کیا کیا لکھا پڑھا ہے۔ تم شاید اس کے سننے کے لئے تیار نہ ہو کہ گزشتہ چند سال میں میں نے مشکل سے دو تین کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ بھی مختصر۔ اور لکھنے کا تو نام ہی نہ لو۔ سوا مجلسوں کی روداد وں کے اور کچھ نہیں لکھا ہے، اور نہ آئندہ کچھ لکھنے کی امید ہے۔ نوشابہ اب مجھے شعر و ادب سے کوئی راحت نہیں ملتی۔ میں اب اپنی اس حقیقت ہی کو محو کر رہا ہوں جس کو شعریت یا روحانیت کہا جا سکتا ہے اور جس کی تم کو میں ایک زندہ تمثیل سمجھتا تھا۔

میں نے اتنا طویل خط لکھکر تمہارا بڑا وقت ضائع کیا۔ معاف کرنا۔ میرا جی امنڈا چلا آتا تھا اور میں لکھنے پر مجبور تھا۔ اگر میں نے اپنی کسی بات سے تم کو دکھ پہنچایا ہو تو اس کو بھول جاؤ۔ اگر میری خرابیٔ صحت کی خبر سنکر تم کو کوئی تازہ تردد ہو گیا ہو تو اس کو دل سے نکال دو۔ اب تم کو یہ زیبا نہیں۔ اب تمہاری دنیا اور ہے اور اس کے فرائض اور ہیں۔ میری آخری دعا ہے کہ تم اپنی اس نئی زندگی سے ہمیشہ خوش اور آسودہ رہو اور نعمان سے تم کبھی مایوس نہ ہو۔ نوشابہ میرا دل کہتا ہے کہ تمہاری زندگی ہموار اور صعوبتوں سے آزاد رہے گی۔ اور کسی لئے نہیں تو صرف اس لئے کہ تم مجھ سے زیادہ متین اور مستقل مزاج۔ مجھ سے زیادہ کم سلیم الطبع اور صابر و شاکر اور مجھ سے زیادہ معصوم اور خوش اعتقاد ہو۔ اس کے علاوہ نعمان دل کا برا آدمی نہیں ہے اور چونکہ تعلیم و تربیت میں تم سے فروتر ہے اس لئے اور بھی وہ تمہاری خوشنودی کو ہمیشہ ہر چیز پر مقدم سمجھے گا۔ اب خوش رہنا اب تمہارا کام ہے۔

نوشابہ! تو یہ سچ ہے کہ اب زندگی بھر کے لئے نہ تم میری نہ میں تمہارا۔ میرے اس خط کو آخری خط سمجھنا۔ اور اب تم بھی مجھے خط نہ لکھنا۔ اور وہ پھول جو تمہارے بھیجے ہوئے پھولوں کا میرے پاس خاصا ذخیرہ ہو گیا ہے اور اب یہ سب کالے ہیں۔ آج میں اُن تمام مرجھائے ہوئے پھولوں کو نکال کر گھنٹوں سونگھتا رہا ہوں۔ اُن میں سے بہت سے تو ایسے ہیں جو ہاتھ لگاتے ہی خاک ہو جاتے ہیں لیکن اُن سے اب تک تمہاری مہک آتی ہے۔ میرے لئے اب اتنا بھی بہت ہے۔ تم سے تو یہ خاک شدہ پھول ہی اچھے۔ جو زندگی بھر میرا ساتھ دیتے رہے۔ اب میں انہیں سے تسکین حاصل کروں گا۔

اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری

یہ پھول میرے اس ماضی کا تابوت ہیں جو کبھی یکسر رنگ و بو رہ چکا ہے۔

اچھا نوشابہ! تو اب رخصت۔ جس حال میں رہو خوش رہو۔ میری زندگی بھی گزر ہی جائے گی۔ ممکن ہے زندگی میں کبھی اس کا موقع بھی آئے کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔ لیکن نوشابہ! اب اس ملاقات میں کوئی جان نہ ہوگی۔ تم جیسی صاحب تمیز اور ہوشمند عورت کو اس کا ملال نہ ہونا چاہیئے۔

خدا حافظ!

تمہارا

آخری بار

عزیز

طوفاں کی ندی میں ناؤ کھیتا ہوں میں
دھوکے سے ہوا میں سانس لیتا ہوں میں
اتنے سر کوئی دشمن کو بھی دیتا نہیں جل
جتنے خود سر کو فریب دیتا ہوں میں

انیس

اچھوت

اے کہ یہ دنیا تجھے سمجھی ہے اک ننگِ فضول   یا گناہِ خلق یا فطرت کی اک معصوم بھول
تو بہ ایں صورت نظر آتا ہے لالہ زار میں   برگِ خشک الجھا ہوا ہو جیسے تازہ ہار میں
رنگ ہے پیراہنِ گل کا، مگر اُڑتا ہوا   شمع ہے، لیکن فروغ و نور سے ناآشنا
آج اپنی ظرف فہمی کے بھی دعویدار دیکھ   رنگ میں اقرار کے لپٹا ہوا انکار دیکھ
ہیں تری گنجائشیں پیدا ہر اک آغوش میں   نبضِ دُنیا دیکھنے والے اب آئے ہوش میں
فی الحقیقت ایک دھوکا ہے یہ سارا انقلاب   بحر قطرے کو بنا دیتا ہے مطلق اضطراب
دعوتِ بزمِ کلیسا ہو کہ پیغامِ حرم   ثبت کر دے گا یہ تیرے دل پہ تازہ مُہرِ غم
آج کل مذہب بھی اک سوداگری کا نام ہے   برتری کہتے ہیں جس کو ابتری کا نام ہے
عرش پہ تجھ کو بٹھا دے گا سیاست کا شکیب   یہ غلط، بالکل غلط، دھوکا ہے اور مطلق فریب
بتکدوں سے اُٹھ چکی اصنام کی وہ آذری   حرص آلودہ حرم کی ہو چکی پیغمبری
یہ جہاں اس امتیازِ خاص سے محروم ہے   ہے اچھوتا پن تجھی میں یعنی تو معصوم ہے

اپنے مرکز پر تو دنیا میں بہت ممتاز ہے   چھو سکا جس کو نہ کوئی نغمہ تو وہ ساز ہے
اختلافِ رنگ و بو کو چھوڑ اور پردہ اُلٹ   مہرِ عالم تاب نکلے گا ذرا ذرہ الٹ
آئینہ خانے میں فطرت کے کبھی دیکھ اپنا روپ   پھر نظر آئے گی ان تاریکیوں میں تجھ کو دھوپ
درس لے خودداریوں کا بزمِ گل میں جا کے دیکھ   ابرِ گوہر بار کی صورت چمن پر چھا کے دیکھ
باغ میں پتہ بھی ہے، غنچہ بھی ہے، کانٹا بھی ہے   خشک ویرانوں میں لہرایا ہوا دریا بھی ہے
ہیں یہ سب اپنی جگہ، ان میں نہیں کچھ انقلاب   التہابِ مہر کیوں چاہے فروغِ ماہتاب
تو جہاں اب ہے، وہیں ہے دائمی منزل تری
اپنی منزل پر بہت وزنی ہے یہ محفل تری

فضل اثر۔ بی۔ اے
آگرہ

معاش اور معاد!

انوری خانم

بیگم اسرائیل احمد خاں

قرض خدا و قرضۂ دنیا بہ گردنم.
آیا ادائے فرض کنم، یا ادائے قرض؟

سیاسی آزادی کا ایک روحانی پہلو بھی ہے: پولٹیکل قید و بند جس طرح ایک قوم کی مادی ترقی و سرسبزی میں حائل ہوتی ہے اُسی طرح وہ امتوں کے خدا کا پرستار بننے کی راہ میں بھی ایک سنگِ راہ ہوا کرتی ہے: یہ ایک سیدھی سادی سی بات ہے جو ادنیٰ تامل سے دیکھنے پر ایک عریاں حقیقت نظر آئے گی۔

جو انسان ایک دوسرے انسان کا غلام ہو، وہ خدا کا بندہ نہیں بن سکتا۔ بقول حضرتِ مسیحؑ کے "ایک غلام دو آقاؤں کی خدمت کا حق ادا نہیں کرسکتا": ع

سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے!

یہ فرمودہ خود قرآن حکیم کا ہے!" دینِ حنیفی" یہی ہے، نبیوں اور پیغمبروں کے جد امجد حضرت ابراہیم "خلیل اللہ" کا مشرب یہی تھا۔ حضرت یوسفؑ اپنی اسی طریقت کے متعلق اپنی شیفتگی کا اظہار کرتے ہیں جب کہ وہ تحدّی آمیز لہجے میں فرماتے ہیں، ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؟! (بہت سے معبودوں کا بندہ بننا اچھا، یا ایک ہی خدائے قہار کی کبریائی کے سامنے سربسجود ہوجانا؟!)

مہاتما گاندھی کو دیکھئے خالص رُوحانی اُفتادِ مزاج کے آدمی ہیں۔ چنانچہ موجودہ "کلجگ" کی جس لعنت پر وہ سب سے زیادہ نالاں و نوحہ کناں ہیں وہ بالفاظ اُن کے یہی ہے کہ "لوگ بالکل خدا فراموش ہوگئے ہیں، اور کم از کم اپنی عملی زندگی میں ہر شخص "این بندہ را خدائے نیست" کی عبرت ناک مثال بن کر رہ گیا ہے!"—

لیکن پھر ہم کو تعجب ہوگا کہ مہاتما گاندھی "روحانی" سے "سیاسی" کیوں بن گئے؟! حقیقت یہ ہے کہ اُن کے نصب العین روح کی پہلی منزل ہی "سیاست" ہے: خدا اور بندوں کے درمیان معنی "بندے" ہی حائل ہوجاتے ہیں: انسانی پرستش "ماسویٰ اللہ" کا سب سے بڑا بُت انسانی گوشت و پوست ہی سے بنتا ہے! یہی خداوندانِ مجازی ایک طرف اپنی آنی و فانی ہستی کی بے حقیقتی کو بھولتے ہیں، اور دوسری طرف خدائے قہار و جبار کی عظمت و جبروت سے دیدہ بردوختہ ہوجاتے ہیں: خدا تک پہونچنے کے لئے درمیان کے اس "انسانی طاغوت" کے خار و خس کو صاف کرنا ضروری ہے: یہی راز ہے اس حقیقت کا کہ مذہب کے فکر و عمل کا اولین قدم عموماً منفی اور تخریبی نوعیت رکھتا ہے: وہ خدا کو بعد میں پیش کرتا ہے، لیکن خدا کے "انسانی حریف" اس فرعون بے سامان کے ت کو اپنی ضرب کے لئے پہلے رکھتا ہے! اسی پہلی چیز کے برطرف ہوجانے کے بعد دوسری چیز از خود قائم ہوجاتی ہے! کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کی "نفی و اثبات" والی ذو وجہتین حقیقت کی یہی تعبیر ہے!! سچ یہ ہے کہ جو انسان اپنی عزت کی تاراجیوں، اور اپنی مالی حالت کی قلاشیوں سے اس مصیبت میں گرفتار ہو کہ ایک ایک صاحبِ زر کے سامنے "دستِ سُوال" دراز کرنے پر مجبور ہو، وہ خدا کے حضور کیا "دستِ دُعا" بلند کرسکتا ہے! سہ

شب چو عقدِ نماز بربندم
چہ خورد بامداد بچہ و زن؟

جو شخص اپنی مقروضیت کی زیر باریوں میں اپنے کو اس طرح فروخت کرچکا ہو کہ سوائے "قرضخواہ" کے کوئی اُس کو اپنا "رزق" و "پروردگار" نظر نہ آتا ہو۔ اُس کو ہنگام نماز اگر اس قسم کا ماجرا پیش آئے تو کیا تعجب ہے کہ سہ

بزمیں چو سجدہ کردم، ز زمیں ندا برآمد
کہ مرا خراب کردی تو ز سجدۂ ریائی!

معاشی بے نوائی، جو بیرونی سیاسی تسلط کے ساتھ ساتھ "شجر و ثمر" کی طرح لازم و ملزوم ہے، نہ صرف توحید باری و خدا پرستی کی راہ میں ایک سدِ راہ ہوتی ہے، بلکہ بعض اوقات وہ نہایت مخدوش طریقے سے کفر کی علانیہ دعوت دیا کرتی ہے! آنحضرتؐ کی نظرِ حقیقت رس میں یہ خطرہ موجود تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوا تھا "کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا" (بہت ممکن ہے کہ فقر کفر ہو جائے!) پھر "معاش" کا فقدان جس طرح "معاد" کے سارے توشے کو سوخت کر دیا کرتا ہے اُس کو اس طرح انکشاف بیان فرمایا "اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْہِ فِی الدَّارَیْنِ" (افلاس دین و دنیا میں روسیاہی کا سامان ہے!)

بلاشبہ مخصوص شخصیتیں "دام و درم" کے اس "دامِ سخت" کی گرفت سے بالاتر ہوا کرتی ہیں، چنانچہ خود اپنی ذات قدسی صفات کے متعلق رسول اللہ صلعم کا یہ مقولہ بالکل برمحل اور شایانِ شان تھا کہ "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" (فقر میرا فخر ہے!) لیکن ان برگزیدگانِ انام کا اور عوام کالانعام کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے۔ بقول مولانا حالی کے "حضرت عمرؓ فاروق اپنی ذات کے لئے تو اس حالت میں شاداں و فرحاں تھے کہ "ستر پیوند" کی عبا زیبِ تن کریں، لیکن فرزندانِ اسلام کو تو جب تک "قبائے سلطنت اور خلعتِ حشمت" میں ملبوس نہ دیکھ لیا چین نہ آیا! پیغمبرِ عربی کی لائے ہوئے "فقر و بادشاہی" کو اپنے اپنے صحیح محل پر اقبال یوں بیان کرتا ہے ؎

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش،
تختِ کسریٰ زیرِ پائے اُمّتش!

ایک مستبد اور مطلق العنان حکومت خدائے قدوس کے اعتقاد کی راہ میں ایک سدِ سکندری بن جاتی ہے: خالق کائنات اور رب السمٰوات والارض کی ساری آیاتِ رحمت اور مظاہرِ ربوبیت پر وہ ایک "گہرا پردہ" ڈال دیتی ہے! لاریب کہ بتکدۂ ماسوی اللہ کے "صنمِ کبیر" کے نام کا اطلاق اگر کسی چیز پر کیا جا سکتا ہے تو وہ ایک شخصی بادشاہت ہی ہے! انسانیت و بشریت کے لئے اس سے بڑا کوئی فتنہ نہیں! جس طرح وہ خدا کی ذاتِ منبعِ برکات کے لئے ایک "حجابِ اکبر" بنتی ہے۔ اُس کی تھوڑی تفصیل سننے کے قابل ہے:

سب کو معلوم ہے کہ صحفِ سماوی و اسفارِ دینی میں خدائے جلیل کی طرف سے زمین کی پہنائی اور زرخیزی، کشت و باغ کی ثمرداری و ذائقہ نوازی، بارش و انہار کی روانی و اثر شادابی، سبزہ زار و گلستان کی خوش منظری و دلفریبی، مادرِ ارضی کے دئے ہوئے رزق و لباس کی ارزانی، مال و زر کی فراوانی، مواشی کی خدمتِ سواری و بار برداری و شیر خورانی، اہل و عیال کی قرۃ العینی، مایۂ زمین کی گود میں پلے ہوئے انسان کی تنومندی و خوش جمالی وغیرہ وغیرہ انہی آثار و برکاتِ حیاتِ بشری کی دعوتِ نظر و فکر دی گئی ہے اور انہی کی بلیغ زبانِ حال سے تمتع پذیر انسان کو ایمان باللہ کا پیام سنایا گیا ہے:———— لیکن اب دیکھئے کہ انسانی دنیا میں شخصی حکومت کی بدعتِ سیئہ کی فرمانروائی ہو جانے کے نتیجے میں یہ سارا منظرِ رحمت کس طرح "محجوب" اور یہ سارا دفترِ معرفت کس طرح "سیاہ" ہو گیا ہے! جابر بادشاہوں، کشورکشا حکومتوں، اور نوآبادیاں تعمیر کرنے والی قوموں نے اللہ کی وسیع و عریض زمین کو باوجود اس کی غیر معمولی وسعت و فراخی کے انسان پر تنگ کر دیا ہے! خود ہندوستانِ "جنت نشان" کی بابت بعض حق گو برطانوی ماہرینِ معاشیات کی تحقیق یہ ہے کہ اس خطۂ ارم صفت کی زمین اپنی قدیم ضرب المثل زرپاشی کو خیرباد کہہ چکی ہے اور فطرت کے اس عظیم خزینۂ رزق نے جو عبارت ہے ہندوستان کے ناپیداکنار رقبۂ کاشت سے اپنی سالانہ بخشش برآورد کو بقدرِ نصف کے روک لیا ہے!!!"

ہندوستان کے کشت و باغ میں ایک "بارہ ماسی" منظرِ خزاں برپا رہتا ہے۔ پھر جو گندم اور چاول، جو آم اور امرود، اور جو گل و شگوفہ پیدا بھی ہوتے ہیں اُن کی صفتِ شکم پُری و ذائقہ نوازی، اُن کی نکہت باری و نسیم انگیزی، اُن کی رنگ طرازی اور نظر افروزی کی ساری جنت اُسی سوختہ سامان ہندی کاشتکار پر حرامِ مطلق ہے جس کی عرق ریزیوں اور خوں فشانیوں کے "آب و رنگ" نے اس سارے عالمِ "رنگ و بو" کی تخلیق کی ہے، اور جو صرف سرمایہ داروں کی اس بہشت کے معمار، لیکن خود اپنے افلاس و فاقہ کشی کی دوزخ کے آبادکار ہیں؟!

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
وز جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

پھر دیکھئے کہ یہی ہندوستان براعظم ایشیا کے "مانسونی ممالک" میں ایک مرکزی جائے وقوع رکھتا ہے۔ لیکن بارش ہو یا امساکِ بارش اس کے "بیچارگانِ سرزمین" کی دائم الحال بینوائی کی ترجمان بس یہ رباعی ہے:

سرما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں — گرما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں
القصہ تمام سرد و گرمِ عالم — بر ما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں

ہندوستان ایک بین الاقوامی غلّے کا گودام ہے، اور امریکہ کے بعد دنیا کا دوسرے نمبر کا کپاس کا کھیت ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنی آغوش میں اُس لکھوکھا ازلی محروم و پیدائشی خلقت کو لئے ہوئے۔ ایا ستم ظریفانہ بو العجبی نہیں کہ یہ بات جو کہ سال کے بیشتر حصے میں "نیم شکم" اور "نیم برہنہ" رہا کرتی ہے!

ہندوستان جو صدیوں تک "کرۂ ارضی کا دولت مند ترین ملک" تھا، آج دنیا کے "دیوالیہ ممالک" کی سرفہرست ہے؛ وہ جس دن سے "برطانوی تاج کے نگار کا سب سے زیادہ باآب و تاب الماس" بنا ہے، اس کی پیشانی کی سیاہی بڑھ لگ چکی ہے؛ جو سرزمین دولت کی ایک لامتناہی "کان" تھی وہ افلاس و تنگی کا ایک بے آب و گیاہ "صحرا" بن گئی ہے جس دیس نے نہ معلوم کتنے بادشاہوں کی جھولیاں لبریز زر و جواہر کر دیں آج وہ غیر ملکوں کی، عطا کئے ہوئے "پونڈوں" سے ایک گراں بار "قومی قرضے" میں دبا ہوا ہے! الغرض قدرت کی بخشش و عطا کا سرچشمہ آج خشک ہے، اور اللہ کی مخلوق ماہی بے آب بنی ہوئی ہے ع

وایں طرفہ تماشا ہیں لب تشنہ و آب اندر!

برنارڈ شا، جو مغرب کا سب سے بڑا مجاہد دقت اور مجتہد ادب ہے، کیا خوب کہا ہے "شخصی حکومت انسانی پرستش کے شرکِ عظیم کا ایک عظیم بت خانہ ہے، اور سیاسی غلامی انسانی حقوق کی قربانی کا ایک خونریز ذبح خانہ!"

قیصریت پرست حکومتوں اور اُن کے زیر سایہ بے شمار سرکاری و غیر سرکاری یا نیم سرکاری سرمایہ دار نوعیت کے اداروں کے کاروبار نوعِ انسان کے امن و عافیت پر جیسی قیامت برپا کئے ہوئے ہیں وہ ایک نہایت ہی ہوش رُبا منظر ہے! سرمایہ داریت کے بعض ناقابلِ رشک کارنامے اس درجہ سیاہ کارانہ ہیں کہ اگرچہ خود اس ملعون دستورِ تمدن کو اُن کے ارتکاب میں مطلق باک نہیں، لیکن اُن کو بیان کرتے ہوئے ہمارا قلم لرزہ براندام ہونے لگتا ہے: رُوکشِ دیارِ فرنگ، شہر بمبئی کی مزدور عورتیں صبح کے وقت اپنے شیر خوار بچوں کو اتنی افیون دے کر کارخانوں کو جایا کرتی ہیں کہ وہ دن بھر ایک گہری مدہوشی کی خود عاید کردہ "مصنوعی موت" کی آغوش میں سوتے رہتے ہیں! اس لئے کہ خود ان کی ماؤں کو اپنی ساری "ساعاتِ کار" میں اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ ایک درندہ صفت کارخانہ دار کی "مشینوں کی غلامی" کو ترک کر کے ایک دفعہ بھی اپنا شیر خورانی کا "وظیفۂ مادری" ادا کر سکیں! کبھی کبھی نشے کی مقدار کے زیادہ ہو جانے کے خمیازہ میں ان معصوم بچوں کی یہ نیند موت کی دائمی "خوابِ راحت" کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اُن کو اس پُر لطف زندگی سے نجات مل جاتی ہے جو دراصل موت و حیات کے درمیان ایک مسلسل کشمکش ہوتی ہے! چنانچہ یہ سوختہ سامان مائیں جب دن بھر کی محنت و مشقت سے اپنے گھروں کو لوٹتی ہیں تو گہوارے کے اندر اُن کے لختِ جگر کی محض "نعش" اُن کا خیر مقدم کیا کرتی ہے ع

الاماں اے سنگدل سرمایہ داری الاماں

کیا اِن جگر خراش اور روح فرسا مناظر کے بعد تمدن کی ربوبیت و رحمانیت کا کوئی لطیف ترین تصور بھی ممکن ہے؟ اس زمین کی بے شمار نعمتوں سے لبریز ہونے پر بھی خدا کی اس پامال ستم مخلوق کے لئے اس میں اتنا حصہ بھی نہیں جتنا کہ جنگل کے چرند و پرند کے لئے ہے!

کیا خدا اسے گوارا کرے گا کہ العیاذ فضائل و اکرام کو اُن سے منقطع کر کے اِن ناہنجاروں اور فرعونوں نے اِن لوگوں کے سینے بھی ایمان و اعتقاد سے اُسی طرح ویران نہیں کر دئے ہیں جس طرح کہ اُن کے معدے نان خشک سے؛ کیا اُنھوں نے فاقہ کشی اور ارتدادِ روحانی دونوں لعنتوں میں ملک کے ان کروڑ بے بس بندوں کو گرفتار نہیں کر دیا ہے؛ کیا خدا کی راہ کا "رہزن" ان جابر لوگوں سے زیادہ شیطان بھی ہو سکتا ہے؟

اور یہ حالت ہمہ گیر ہے! ہندوستان عزیز ارض و ضعفاء ارض کے اس مقتلِ عظیم کا صرف ایک مختصر گوشہ ہے! اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس کے نقوشِ خونین سب سے زیادہ رنگین ہیں! لیکن بہرحال یہ ایک عالمگیر طوفانِ مصیبت و صعوبت ہے جو مظلوم قوموں کو غرقِ ہلاکت کئے ڈالتا ہے: قابوچی حکومتیں اور سرمایہ دار سامراج اِن کو ایک بے رحمانہ "اقتصادی تاخت و تاراج" کا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں، اور اِن کے آخری مار الحیات کو خشک کر رہے ہیں۔

الغرض دستِ قدرت کے دئے ہوئے سارے بے پایاں افضال و نعائم کو ظالم انسان کے دستِ ستم نے چھین لیا ہے، اور پھر اس زبوں حالی اور انتشارِ دماغی میں مظلوم انسان کے ہوش و حواس کو اس قابل بھی تو نہیں رکھا کہ وہ اس بات کو صحیح طور پر بھی سمجھ سکے، کہ آیا یہ ایک "بلائے آسمانی" ہے یا صرف ایک "آفتِ ارضی"؛ جس کا اندوہناک نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس نرغۂ مصائب میں بجائے "شیاطین الانس" کی ایک جماعت پر لعنت بھیجنے کے خود خدائے قدوس کی پروردگاری اور بندہ پروری کے متعلق سنگین شبہات میں مبتلا ہو گیا ہے! اس طرح بے درد قیصریت نے اُس کے جسم کی تازگی اور دل کی خوشی کے ساتھ ساتھ اُس کی رُوح کی دولتِ ایمان کو بھی

نا اج کر ڈالا ہے؛ کبھی لات وہبل نے بھی یہ کفر پروری و عالم آشوبی دکھائی تھی۔

ہاں کیا ان فاقہ زدہ پیٹوں کو بھرنے، ان نگوں سار سروں کو بلند کرنے اور ان تشنگ روحوں کو اُس کا ایمان و سکینت واپس دلانے سے بڑھ کر آج تختۂ زمین پر مذاہب و ملل کا کوئی فرض ہو سکتا ہے؛ کم از کم اسلام کی طرف سے جواب دیا جا سکتا ہے کہ وہ اس فریضۂ عظیم و جلیل کی اہمیت و موکدیت کو اس سے زیادہ بلیغ و معنی خیز الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا تھا کہ

اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ الْحَقِّ عِنْدَ السُّلْطَانِ الْجَائِرِ!

انیسِ خلوت سے

میں قرباں اے مرے ترکِ قبا پوش — کبھی آ اس طرف بھی زلف بردوش
نگارِ خوش خرام و یارِ شیریں — بُتِ آشوبِ عقل و فتنۂ ہوش
ہنوز اے شہریارِ کشورِ دل — گدائے راہ کا خالی ہے آغوش
کسی دن تو بَن اے جانِ خرابات — انیسِ خلوتِ رندانِ مے نوش
کروں کس طرح دامن پارہ پارہ! — کدھر ہے اے مری سلمائے گل پوش
کبھی تو سامنے آ، جام برکف — بہ زعمِ زاہدانِ خرقہ بردوش
وہ گونجا نغمۂ شیرینِ جاناں — زمین و آسماں! خاموش، خاموش

وہ دستک دی ترے دَر پر کسی نے
بجا لا سجدۂ شکرانہ اے جوشؔ

(جوشؔ)

وصیّت

مزدور کی تصویر

چشمِ عبرت! آ دکھاؤں میں تجھے وہ سرزمیں — چُھوتی ہے جس کی چوکھٹ کو فرشتوں کی جبیں
سوکھا ٹکڑا بھی جہاں مزدور کو حاصل نہیں — بے بہو ہے جس کے رنگیں اہلِ زر کی آستیں
محنت و اندوہ و غمِ شام و سحر جس کی غذا — جگمگاتا ہے پسینہ بن کے بجلی کی عذار
جس کی ہے گاڑھی کمائی سود خواروں کیلئے — جس کی جانِ زار ہے سرمایہ داروں کے لئے
آہ یہ اُس شیر دل مزدور کی تصویر ہے — جس کے ہاتھوں رحمتوں کے باب کی زنجیر ہے
ابنِ آدم جس کے باعث صاحبِ توقیر ہے — جس کی محنت اہلِ زر کے واسطے اکسیر ہے
آہ! لیکن اُس کی ساری کلفتوں کا یہ مآل — ننھے بچوں کو ملے نانِ شبینہ یہ محال!

مزدور جمیلہ بسترِ علالت پر

موسمِ سرما کی شب سہمی ہوئی ہے کائنات — سو رہا ہے خامشی کی گود میں سازِ حیات
تیرگی کا دَور دورہ ہے فضا ویران ہے — اہلِ زر کے گھر میں لطف و عیش کا سامان ہے
جھونپڑوں میں فاقہ کش مزدور ہیں کھوئے ہوئے — گویا اپنے ہی نصیبوں کی طرح ہیں سوئے ہوئے
اک جمیلہ جس کا شوہر گھر سے کوسوں دُور ہے — اپنے بیکس لاڈلوں کو دیکھکر رنجور ہے
چہرہ افسردہ تنِ نازک علالت کا شکار — دم لبوں پر اور آنکھوں میں کسی کا انتظار
مشعلِ راہِ عدم ہیں سینۂ بریاں کے داغ — ہچکیاں سی لے رہا ہے زیست کا دھندلا چراغ

ماں [illegible] ای زباں [illegible] دل میں مگر — کہہ رہی ہے کون لے گا ان یتیموں کی خبر
آہ یہ معصوم [illegible] زندگی — جن کا اک ہلکا تبسم ہے مدار زندگی
آہ یہ [illegible] جائیں گے اب — ٹھوکریں کھایا کریں گے راستوں میں روز و شب
سو نے ہوتے خواب سے جب چونک اٹھیں گے غریب — کون دیکھے گا انھیں اور کون سوئے گا قریب
کون ہوگا جو دھڑکتی چھاتیوں پر رات کو — رکھ کے سوئے مادرانہ شفقتوں سے ہات کو
کھیل کر آئیں گے یہ معصوم گھر میں جب کبھی — کس سے پوچھیں گے کہ کیا ابا نہیں آئے ابھی:
کیا خبر کب کام سے باپ اُن کا واپس آئے گا — اور بلکتے بیکسوں کو پیار سے سمجھائے گا:

مزدور جمیلہ کی وصیت

اے ہوا اے تیرگی بخت اے پُرغم فضا — جب سنبھالیں ہوش یہ معصوم دل نام خدا
اُن سے کہنا کر گئی ہے یہ وصیت ماں تمہیں — اہل دولت نے ملایا خاکِ ذلّت میں تمہیں
ہر طلسم ان کا نہ توڑو گر تو جینا ہے فضول — نیند بھر سونا حرام اور کھانا پینا ہے فضول
ہاں اُڑا دو عیش کے متوالے انسانوں کی گرد — اور فلک سے باتیں کرنے والے ایوانوں کی گرد
زورِ بازو سے بدل دو گردشِ ایام کو — نوچ لو زربفت میں لپٹے ہوئے اجسام کو
چھین لو اِن معصیت کاروں کی بینائی کا نور — توڑ کر رکھ دو زر و دولت کے بندوں کا غرور
بوٹیاں سرمایہ داری کی فضا میں چار سُو — اُڑ رہی ہوں اور ٹپکتا ہو ہواؤں سے لہو
مجھ کو خاکِ گور میں راحت ملے گی تب کہیں — ورنہ انگاروں کا بستر ہوگی تربت کی زمیں
ٹھوکروں سے سیم و زر کے بُت ملا دو خاک میں — تا مسرت کی چمک ہو دیدۂ نمناک میں
ہاں مٹا دو صفحۂ ہستی میں نامِ نابکار — تنگ عالم ہے، نہ رہنے پائے یہ سرمایہ دار
ہڈیاں جب تک چباؤ گے نہ زر داروں کی تم — گردنیں جب تک اڑاؤ گے نہ زر داروں کی تم
قبر میں تڑپا کرے گی میری رُوحِ غم شعار — چونک چونک اُٹھا کریں گی حسرتیں بے اختیار

کہنے پائی تھی یہیں تک وہ کہ شمعِ زندگی
موت کے زہریلے جھونکوں سے اُلجھ کر بجھ گئی!

شاعر کا خدا سے خطاب

اے خدا اے ہمت اس داماں کے مدعی [illegible] / وسعتِ رحمت [illegible] پہ دوڑے بھی
اے خدا بندہ نوازی کیا اسی کا نام ہے : / ان بچے مزدور کی محنت کا کیا انعام ہے :
کیا اسی پہ تو ہے رحمان و رحیم دو جہاں / کیا اسی پہ نام چلتے ہیں ترا غفور و کمال :
کیا یہی ہے تیری رزاقی کی حدِ نعمت تمام / کیا یہیں پہ جوش کھاتا ہے غضب تیرا مدام
کیا اسی پر چھاؤں میں تاروں کی شب بھر غم نصیب / کیا اسی پہ برف زا ٹھنڈی ہواؤں میں غریب
تیرے منظورِ نظر خوں خوار کتوں کے لئے / پیش کرتے ہیں لہو دل کا جگر کے ٹکڑے
کیا اسی پر مجرموں کی ٹھوکریں سہتے ہیں یہ ؟ / کیا اسی پر رحمتوں کے منتظر رہتے ہیں یہ
کیا اسی حُسنِ کرم پر تجھ کو کہتے ہیں کریم ؟ / کیا اسی بل پر دکھاتا ہے اُنھیں نارِ جحیم؟
کیا یہی خونخوار ہیں ناز و نعم کے واسطے، / اور یہ مزدور ہیں بس ہر ستم کے واسطے :
ہیں سنہری قصر میں اربابِ زر جلوہ فگن / اور یہ مزدور بیچارے اسیرِ صد محن
کس لئے تُو نے بنایا ہے اُنھیں ذی احتشام / چھینتے ہیں کس لئے مزدور کے منہ سے طعام
کوئی حد بھی ہے یہ آخر تابکے رنج و محن / سڑ رہی ہے جھونپڑی میں دیکھ نعشِ بے کفن
آہ دُنیا میں نہیں ہمدم کوئی ایسا کہ جو / اشکباری میں یتیموں کا شریکِ حال ہو
آہ وقفِ بیکسی فطرت کا رنگیں شاہکار / حیف اے خونخوار دنیا حیف اے سرمایہ دار
اب کوئی دن میں چھلکنے کو ہے جامِ اضطراب / دیکھنے والی ہے چشمِ شوق دورِ انقلاب

فضائے آسمانی میں شاعر کا نالہ

شاعرِ آتش نوا کا نالۂ بے اختیار / عرش پر پہنچا ہوا کے دوش پر ہو کر سوار
لرزہ براندام تھے کرّوبیاں سُن کر صدا / قاضیٔ الحاجات خود حیران تھا یہ کیا ہوا :
زلزلہ ہے آگ کا شعلہ ہے یا طوفان ہے / ذرّے ذرّے سے عیاں اک حشر کا سامان ہے
بڑھ گئی حد سے پریشانی فلک والوں میں جب / لے کے انگڑائی لگا بڑھنے اثر نالوں میں جب

عرض کی جھک کر ہوا نے خالقِ ارض و سما
ہے یہ اک تیرے پریشاں حال بندے کی صدا

رات دن سیلِ حوادث میں بہا کرتا ہے جو!
داستاں مزدورِ بیکس کی کہا کرتا ہے جو!

سن کے قسّامِ ازل نے جوش میں آکر کہا
اے فلک کے رہنے والو ہوش میں آؤ ذرا

آہ اُن ناپاک انساں کی مرے افلاک پر
حیف ہے صد حیف ایسی جرأتِ بیباک پر

کھینچ کر لاؤ زمیں سے بے ادب کو تم یہاں
تاکہ ٹوٹے اس کی جرأت کا طلسمِ بیکراں

گونج اٹھی آسماں پر اک صدائے جاں رُبا
اور فلک سے اک فرشتہ جوش میں نازل ہوا

دیکھتا کیا ہے کہ اک عصمت کی دیوی خاک پر
دیکھتی ہے دیدۂ بے نور سے افلاک پر

منتظر ہے بے نوا کب وہ خدائے ذوالمنن
بھیجتا ہے خُلد سے میرے لئے زرّیں کفن

ماتمِ خاموش ہے گھر پر مسلط اس طرح
دور ویرانے میں پردیسی کی تربت جس طرح

حسرتیں ہیں نعشِ بے گور و کفن پر نوحہ خواں
یاس کا مضراب تارِ اشک پر جیسے رواں

آتی ہے گھر کے جھروکوں سے ہوائے برفبار
چھیدتے ہیں ان کے جھونکے تیز تر خنجر کی دھار

ماں کی جانِ آرزو، غربت کے پروردہ یتیم
ہاتھ اُٹھا کر کہہ رہے ہیں موت لے ذاتِ کریم

گھر کی حالت دیکھ کر اندوہ گیں، حسرت فزا
آنے والے کا غرورِ قدس بھی تھرّا گیا

ننھے بچوں کو بچشمِ غور دیکھا اور کہا
آہ! یہ تو اُس کے بچے ہیں جو کل شب چل بسا

آہ! یہ تو اُس کے بچے ہیں جو دستِ قہر سے
بھینٹ زرداری پہ چڑھ کر اُٹھ گیا ہے دہر سے

آہ وہ مزدور پردیسی وہ جسمِ ناتواں
جس کی کوڑوں سے اُڑائیں ظالموں نے دھجیاں

یہ کہا اور نعش کو ہاتھوں پہ لے کر اُڑ گیا
اور چشمِ دہر سے پل مارتے غائب ہوا

اہلِ گردوں نے کیا پُرحشمت و شوکت تپاک
آسماں کی نورِ دیدہ بن گئی وہ روحِ پاک

اُس کے بچے درسِ عبرت ہیں زمانے کے لئے
منتظر سرمایہ داری جن کے کھانے کے لئے

ہندوستان سے خطاب

شرم اے ہندوستاں! ہے ڈوب مرنے کا مقام
دیکھ مزدوروں کے خوں سے اپنے تلوے لالہ فام

شرم اے غیرت کے گھر محکومیت کی سرزمیں
پھٹ کے زرداروں کی ہستی کو نگلتی کیوں نہیں!
ہوش میں آ توڑ کر رکھ دے غلامی کی کمند
ڈال آزادی کے میداں میں ترقی کا سمند
آ بدل دیں اُٹھ کے بندی کی غلامانہ روش
آ کچل دیں زر کے بندوں کی کدورت ہائے خاش

آ کہ سفاکانہ فطرت ہی کو کر دیں ختم آج
آ کہ دنیا سے مٹا دیں اِن جفاؤں کا رواج

سیّد الطاف مشہدی الرضوی

بے بہا آنسو

کیا میں نے کبھی آنسو دیکھے نہیں تھے؟ کیا میں کبھی رویا نہیں تھا؟

برسوں میں اپنی محرومیوں اور ناکامیوں پر رو چکا تھا، مدتوں میں فراق و غم کی طویل راتوں میں آنسو بہا چکا تھا۔

میں نے لاکھوں مرتبہ آنسو دیکھے تھے ——— ؛

لیکن اُس شام کو میری حیرت کی کوئی حد نہ تھی جبکہ میں ایک پہاڑی پر غروب کا تماشا دیکھ رہا تھا ———

میں نے ایک اسّی برس کے بُڈھے کو دیکھا کہ لکڑیوں کا ایک بہت بڑا بوجھ سر پر لادے آ رہا ہے اس کا تمام جسم وزن سے کانپ رہا ہے اور اس کی گردن کی سب رگیں اُبھری ہوئی ہیں۔

میں یہ دیکھکر بیقرار ہوگیا۔ فوراً بلندی سے اترا اور اُس کا بوجھ اپنے سر پر لے لیا ———

غریب بُڈھا ڈر گیا۔ اُس کی سانس چڑھ رہی تھی اور وہ مجھے اپنی دُھندلی آنکھوں سے دیکھنے لگا ———

اُس کی اس حالت پر میرا دل بس گیا، اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ اُس شام کو میرے آنسو ایسے روشن تھے کہ اس سے قبل کبھی نہ تھے۔ معلوم ہوتا تھا ستارے چمک رہے ہیں۔ ایسی روشنی تھی کہ میری نظر خیرہ ہوئی جاتی تھی، اور یہ میری زندگی کا گریہ وزاری میں پہلا موقع تھا کہ میں نے ایسے درخشاں آنسو دیکھے۔

جوش ملیح آبادی

(انتخاب از روحِ ادب)

شاعر

ذوقِ جمالیات کے نام

ملک حسیب احمد

آپ بیتی کہوں یا جگ بیتی: اچھا تو آج جگ بیتی ہی سُنیئے!

ایک تھا شاعر، نحیف الجثہ، منحنی سا آدمی مختصر سا انسان جسے تخلیق کرنے میں قدرت نے کفایت شعاری سے کام لیا تھا۔ اُس کا چہرہ ہر ذکی اور حساس انسان کی مانند غور و فکر کی آماجگاہ رہا تھا جس پر حیاتِ انسانی کے سرد و گرم نے ایسے واضح اور پائدار نقوش چھوڑے تھے جیسے صحرا کی خشک ریت برسات کی چھینٹوں سے ہم آغوش ہونے کے بعد کسی رہرو کے نقوشِ پا کو اپنے سینے پر جوں کا توں محفوظ کرلے! گو اس کے اشعار میں عشق و سیہ چشمی کے جذبات ہنوز باقی تھے۔ لیکن سب درباری اور خود بادشاہ فیصلہ کر چکے تھے کہ شاعر بوڑھا ہو گیا ہے اُس کی بینائی بھی کم ہو رہی ہے۔ مگر شاید اس کا علم اس قدر عام نہ ہو جاتا اگر گذشتہ نوروز کے دربار میں وہ بیلا تعدار کو اعلیٰ حضرت شہنشاہ جہاں پناہ سمجھ کر مجرا بجا نہ لاتا۔

قانونِ کائنات کے برعکس صرف شاعر اور مصور ہی ایسی دو ہستیاں ہیں جن کی زندگی بڑھاپے پر ختم نہیں ہوتی۔ جب نوعِ انسانی پر بڑھاپا آئے۔ جب درختوں پر پت جھڑ کا موسم ہو، جب چمن کی شادابی کو خزاں جھلس دے، جب ہر چیز پر انحطاط ہو اس وقت ایک صناع کا حقیقی شباب شروع ہوتا ہے۔ گو بظاہر قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں، عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا مگر شاعر کا دل صرف اسی منزل میں پہونچ کر جوان ہوتا ہے۔ گو بظاہر قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں، عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا۔ مگر شاعر کا دل صرف اسی منزل میں پہونچ کر جوان ہوتا ہے۔" یہ تھے وہ خیالات جن کا اظہار درباری مورخ نے صدرِ اعظم سے اس وقت کیا جب نشاط باغ میں ان دونوں نے شاعر کو رسیلی اور من سکھ کی خوش فعلیوں سے متاثر ہو کر آزادانہ ہنستے ہوئے سنا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاعر کی آواز میں شباب و تمنا پوری شدت سے مچل رہے تھے۔

باوجود اس کے کہ شاعر کی زندگی کو کبھی کسی عورت نے اپنے پریم بھرے اور رسیلے گیتوں سے پُرکیف نہ بنایا تھا لیکن اس کے اشعار سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی ایک طویل شبِ مسرت تھی جس میں کسی کسی گوری گوری سڈول کلائیاں شاعر کے گلے میں مسلسل حائل رہی ہوں اور شاید اسی لئے لوگ محسوس کرتے تھے کہ اس کے اشعار ایک کامیاب عاشق کے جذبات تھے جس میں وصل و ہجر بھی کچھ تھا لیکن وہ درد، وہ تڑپ۔ وہ سوز مفقود، جو حقیقت میں جانِ شعر ہے، اور شاید اسی لئے قصیدے کا وہ بادشاہ تھا اس لئے کہ صنفِ شعر کا معاملہ دل نہیں بلکہ دماغ سے ہوتا ہے۔

——— آخر وہ دن بھی آگیا جب جواں بخت و جواں سال شاہ گیتی پناہ شہزادی مہر نیم روز کو بیاہ لایا۔ اس خوشی میں اس شان کا دربار کیا گیا کہ بوڑھے اب تک اپنے نواسوں اور نواسیوں کو اس کے قصے سناتے ہیں۔ انعام و اکرام سے کل رعایا کو نہال کر دیا گیا۔ اکابرِ سلطنت کو زر و جواہر عطا ہوا۔ وزرا، دولت کو جاگیریں ملیں۔ قرنا پھونکنے والوں، جھانجھ بجانے والوں، بھانڈ، گایت، اور رہتکاروں کو جوڑے بٹے۔ شاعر اس موقعہ پر تن زیب کا انگرکھا پہنے اور کمر سے دوپٹہ باندھے اپنی جگہ مودب بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ خسرو دنیا نے اعلان کیا کہ "ما بدولت اپنے شاعر کو ملک الشعرار کا خطاب عطا فرماتے ہیں" اشاعر

شاعر نے ترقی اقبال و دولت کی دعائیں دیتے ہوئے قصیدہ سنایا۔ ---- ملکہ نے چلمن کے قریب بلاکر داد دی اور حکم دیا کہ شاعر ہر روز سہ پہر کو ان چڑھتے قصر سلطانی پر حاضری دیا کرے۔ حکم بظاہر لینے کو تو دے لیا۔ لیکن جس آواز نے حکم دیا وہ ایسی پیاری، ایسی شیریں، اتنی لوچدار، اتنی مدبھری تھی کہ شاعر کو اس کی لذت سے مدہوشی سی معلوم ہونے لگی۔ ایک کپکپی سی محسوس ہوئی، اور سارا جسم سنسنا گیا —— معلوم نہیں اس آواز میں کیا جادو تھا کہ شاعر اس کو سننا چاہتا تھا اور سننا چاہتا تھا، سننا چاہتا تھا اور مرتے دم تک سننا چاہتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ ایک ایسی لذت سے دوچار ہوا تھا جس کے لئے نا آشنا تھا۔ ہمکلام ہونے کے وہ کوئی اور نام تجویز بھی نہ کرسکتا تھا۔ مسرت، ایک ناقابل بیان مسرت اس کے رگ و پے میں اُمنڈی چلی آتی تھی۔ مردہ رگوں اور خفیف شریانوں میں خون اُبلا پڑتا تھا —— یہ آواز ایک دعوت تیز تھی کہ شاعر اس دنیا کو پھول کی پنکھڑی کی طرح مل کر رکھ دے۔ لئے تیار رہے کہ سوائے اس توبہ شکن آواز کے اُسے اور کچھ دکھائی نہ دے، سنائی نہ دے۔ وہ ایک لطیف نغمہ کی مانند فضا کے بسیط میں تحلیل ہو جانا چاہتا تھا۔ اس سحر شیریں کلامی نے اس کے جسم نزار میں ایک آگ سی پھونک دی تھی اور بوڑھا شاعر نہ جانتا تھا کہ اُس کے خون میں جو شعلے سے لپک رہے ہیں اُنھیں کونسی چیز ٹھنڈا کرسکے گی —— وہ دربار سے سیدھا پھول باغ کی جانب بھاگا۔ وہاں کی نرم و نازک بیلوں کو جھکا کر اُن کے روپہلی پھولوں سے اپنے جلتے ہوئے رخسار ملنے لگا۔ چنپا کی جھاڑیوں سے اُلجھ گیا۔ پریم چکری کے پتے نوچ ڈالے —— دیوانے کو کیا خبر کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ آج شاعر کی جوانی کا پہلا دن تھا! ---- آج پہلی مرتبہ جذبات رنگین نے اس کے سازِ دل پر ایک متوالا گیت گایا!۔

—— گھر آکر چراغ کی مدہم روشنی میں فکرِ سخن شروع کی۔ جس رفتار سے اس کا دل دھڑک رہا تھا، اسی انداز سے چراغ بھی ٹمٹما رہا تھا! آج غضب کی آمد تھی۔ جو کچھ اُس کی بوڑھی اُنگلیاں لکھ سکیں محفوظ ہوگیا۔ بیسیوں شعر ہوئے اور بے لکھے ضائع ہوگئے۔ اسے یقیناً الہام ہو رہا تھا۔ زرطلبی، جاہ طلبی، شہرت پسندی، خطاب یافتگی کوئی چیز اس کے پیش نظر نہ تھی۔ آج اس کا موضوع اور نیت سخن بالکل جداگانہ تھے —— ان سب کے مقابلہ میں حسین تر کیف آور، پاکیزہ اور لطیف تر —— ہاں! وہ ملک الشعراء بھی تو تھا اُسے یاد آگیا! مگر نہیں اب وہ اس خطاب کا محتاج نہیں رہا۔ وہ اس خطاب کو بالکل اسی طرح بھول جانا چاہتا تھا جس طرح ایک بھولی لڑکی بالغ ہوتے ہی اپنی گڑیوں کو کسی اونچے سے طاق میں رکھ کر بھول جائے —— آج تو اس بڈھے شاعر نے پیارے پیارے شعر کہے۔ آج اس کا دل شعر کہہ رہا تھا اور اس کے نزدیک دماغ کی حیثیت ایک منفعل عضو کی سی تھی یا وہ کچھ نہ تھی ——

شاعر نے بے شمار تیز شراب ہورلی ہتا میں کاٹ دی گئیں بالآخر کہ اس نے معلوم نہیں کس ترنگ میں شراب انگوری پی ہی لی۔ ایک جام بھرتا اور شوق سے پی جاتا دوسرا تیسرا معلوم نہیں کتنے جام پی لیا۔ اور جب صراحی اس جذبۂ آتشیں سے خالی ہوگئی تو اسے اس انداز سے پرے پھینک دیا جس طرح کوئی مہ لقا حیرت دلہن کے گلے سے رات کے پہنائے ہوئے ہار سہرے کو اتار کے دور نہیں اور پھینک دیتا ہے۔ بہت سے شعر کہہ گیا —— کچھ دیر ٹھہرا —— کچھ سوچا —— ایک جھنجھنی سی لی اور یہ شعر کاغذ پر لکھ لیا ؎

بس مرنا بنائے جا تیرے ساغر ہی کا ملکے
لب جاں بخش کے پیوے ملیں گے خاک میں مل کے

—— شاعر اس رات کو اُچاٹ سی نیند سویا۔ ایک عجیب سی کیفیت اس کے دل و دماغ پر مستولی تھی۔ اس نے خواب دیکھا کہ دنیا بھر کی حسین اور جوان عورتیں ایک مرغزار میں جمع ہیں، اور سیوتی، گلاب، اور نیلی کے پھولوں میں اسے تول رہی ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ان عورتوں نے شاعر کو حلقہ میں لے لیا اور سب کی سب پریت کے گیت گانے لگیں۔ شاعر نے محسوس کیا کہ وہ اپنے جسم کی کثافتوں کو تج کر اس نغمہ کی ان لطیف تاروں پر جو فضا میں ان حسین گلوں سے تخلیق ہو کر بکھر گئی تھیں۔ شاعر خود بھی ایک رقص مستانہ میں مصروف ہے۔

—— ابھی آفتاب کی ٹکیا سنہری سے روپہلی نہ ہوئی تھی کہ شاعر بیدار ہوا۔ شہزادی کی حلاوت آفرین آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ شاعر کے دل میں ایک گدگدی سی محسوس ہوئی اور وہ چاہتا تھا کہ ہمہ تن سامعہ ہو جائے۔ اس کے دماغ نے کہا۔ شاعر کیوں بن آئی مرنے چلے ہو؟ دل نے کہا۔ شاعر ایسی ہی موت کا نام تو حیات ابدی ہے؟

—— شاعر سوچنے لگا کہ آخر رات اس نے شراب کیوں پی لی آخر وہ کیوں اپنے شیشۂ تقدس کو توڑنے پر مجبور ہوگیا۔ کیوں اس نے شراب پی لی؟

داغ نے کہا "شاعر یہ تھی تیرے اخلاق کی موت" دل نے کہا "نہیں شاعر تُو نے فطرت کی بلندی کو پالیا" شاعر نے اپنے تئیں کہا "خیر یہ تو سب کچھ ہوا مگر میں اپنے آپ کو کیوں باؤلا کئے ڈالتا ہوں۔ بھلا سوچ تو سہی دیوانے کہاں تو اور کہاں شہزادی کا عشق" "ہونہ۔ بھکاری کہیں کا" دل نے کہا "بھکاری کیوں" "تو بھی تو ملک الشعراء ہے" داغ کہنے لگا "بیشک، تھوڑے دنوں اسی خیال میں" شاعر نے یہ کہہ کر فیصلہ ہی کر دیا کہ ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

——— شاعر نے پھر ایک بار اپنے تئیں کہا "شہزادی کو بولتے ہوئے سنتے رہنے کی تمنا مجھ پر کیوں اس قدر قابو پا گئی ——— شائد اسی کا نام ——— اسی کا نام محبت ہے ——— آخر ہوگا کیا اگر میں اس کی آواز سننے سے محروم کر دیا جاؤں ——— مر تو جاؤں گا نہیں کچھ ——— اس خیال کے آتے ہی شاعر کا دل دھک دھک کرنے لگا اور وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

——— آج شاعر نے اپنے تئیں خوب سنوارا، اتنا کہ لوگ دیکھکر ہنس دیتے۔ جب چوک سے گزر رہا تھا تو مالتی نے دریچہ سے جھانک کر دیکھا اور پریم متاست کہنے لگی "اے ری سکھی اور بھی دیکھا تو نے۔ بوڑھی گھوڑی اور لال لگام" اور دونوں ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگیں ———

——— وقت سے کچھ پہلے ہی شاعر قصرِ سلطانی میں تھا۔ ملکہ کے حضور میں باریابی ہوئی تو بادشاہ بھی وہیں موجود تھا ———

——— شاعر نے اپنا کلام سنانا شروع کیا ——— بادشاہ حیرت میں تھا۔ مورچھل ہلانے والی پرستار اپنی جگہ پر بُت بن کر رہ گئی، اچوبدار عصا کو کونے میں ٹیک کر آدابِ شاہی سے بے خبر چلمن کے قریب آ کھڑا ہوا، باندی جسے صبوحی لانے کو حکم دیا گیا تھا ساکت کھڑی ہو کے خالی صراحی کو تھپکیاں دینے لگی۔ ملکہ حزن و حیرت کی نظروں سے شاعر کو تک رہی تھی، ساکت و صامت بعینہٖ اس مورتی کے مانند جس کے پجاریوں نے ایک نیا صنم ترشوا لیا ہو۔ ملکہ اس وقت اپنے باپ کے نوجوان و حسین وزیرِ تشریفات کے تصور میں تھی۔ وہی جو اصلی معنوں میں اس کے دل کا مالک تھا، وہی جو اس کے جذبات پر حکمران تھا۔ ملکہ نے نظریں نیچی کر لیں اور سوچنے لگی کہ انسان فاعلِ مختار ہونے کے باوجود کس حد تک سماج کا غلام ہے۔ اس وقت اُسے ان رس بھری راتوں کا تصور مارے ڈالتا تھا جب اس کا بالم پچھلے پہر مولسری کے درختوں کے نیچے اس کے انتظار میں بیٹھا رہتا تھا ——— افسوس وہ اس سے شادی نہ کر سکی، مراتب کا فرق مانع تھا ——— ——— ملکہ کو دل میں ایک چبھن سی محسوس ہوئی، ایک ہوک سی اُٹھی، ایک پھریری لے کر اس خواب سے بیدار ہوئی۔ ہر چہار جانب سناٹا تھا۔ صرف شاعر کی آواز اس سکوت پر حکمراں تھی ——— ———

شاعر نے شعر پڑھا ؎

پس مردن بنائے جائیں گے ساغر مری گل کے
لبِ جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مل کے

بادشاہ نے کہا "وہ کیوں کر؟" شاعر نے ہاتھ باندھکر جواب دیا "شعر قصہ طلب ہے جہاں پناہ" بادشاہ نے کہا "وہ کیا قصہ ہے جہاں پناہ؟" شاعر نے یوں قصہ کا آغاز کیا ——— : "ایک زمانہ گذرا کہ اپنی سلطنت کے شمال میں بہت دور ایک سلطنت تھی۔ بادشاہ بہت عادل اور رعایا پرور تھا۔ اُس کی ایک بیٹی تھی کام روپ نام۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب، ایک دن شہزادی مہتابی پر کھڑی بال سکھا رہی تھی کہ ایک نوجوان رہگیر کی نگاہ اچانک اُن پر پڑی اور وہ ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ لیکن کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگلا تیلی، قرب نصیب ہوتا تو کیوں کر، ایک مدت تک وہ نوجوان اس چنگاری کو دل کے خاکستر میں چھپائے رہا۔ لیکن جب یہی ننھی سی چنگاری اُسے شعلہ بنتی ہوئی معلوم ہوئی تو وہ جنگل و بیابان کی جانب اس خیال سے چل دیا کہ شائد صحرا کی وسعتوں میں اس کا جنون سما جائے۔ لیکن قدرت کے حسین مناظر یہاں اُسے اور زیادہ تڑپانے لگے۔ دلِ وحشی مچلتا، وہ خود تڑپتا، ایک مدت تک تڑپا کیا۔ آخر موت نے آ کر اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سکون کی نیند سلا دیا ——— ——— ایک چشمے کے کنارے اُس کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی۔ وقت گذرا اور اس کی لاش مٹی کا ایک حقیر سا تودہ بن کر رہ گئی اور بالآخر چشمے کا پانی اُسے بہا کر لے گیا اور اِس امانت کو اُس دریا کو سونپ دیا جس سے چشمہ خود وصل ہو جاتا تھا ——— ———

اِدھر کام روپ کسی دوسری جگہ بیاہ دی گئی۔ ایک دن شہزادی کام روپ نے اپنے شوہر سے کہا "ہر چند ساغرِ بلور نمائش مے کو خوب ہے لیکن مٹی کا کوزہ خوب تر۔ جی چاہتا ہے کہ کل سے مٹی کے کوزہ میں مے پیوں۔ کیوں! کیسی سوندھی معلوم ہوگی۔ سوامی!؟" دوسرے ہی دن کوزہ گر مٹی کے کوزے بنا لایا اور نصیبِ عاشق

بنی بھی ملی تو وہی جسے دریا بہالے گیا تھا ———— برسات کی بھیگی بھیگی راتیں تھیں۔ کام روپ اور اُس کا سوامی شبستانِ عزلت سے شبستانِ محبت میں آ گئے۔ کام روپ کے لبوں کو کوزے نے چھوا ہی تھا کہ آواز آئی سے

پس مردن بنائے جائیں گے ساغر مری گِل کے
لب جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مل کے

کام روپ تھرا کر گری اور ایک سسکی لینے کے بعد ختم ہو گئی ———

شاعر خاموش ہو گیا ———— تھرا کر گرا ———

غلام چیخے ———— ملکہ نے بڑھ کر پوچھا۔ شاعر! یہ کیسے ہوا؟ شاعر نے ایک لمحہ کے لئے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نگاہیں مسکرا رہی تھیں۔ پرسشِ حال کرنے والے کو دیکھتے ہوئے اُس نے خاموشی سے آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر لیں۔

شاعر کی موت کو تقریباً ڈیڑھ برس گزر گیا۔ ملکہ مہر نیم روز کے ہاں ایک چاند سا بچہ پیدا ہوا۔ ولی عہد سلطنت کی ولادت پر اس قدر جشن ہوئے کہ لوگ اُکتا گئے اور اس یک رنگ زندگی سے تھک کر ایک گروہ تو رنج و غم کی تمنا کرنے لگا۔ جس دن سب سے بڑا دربار منعقد کیا گیا تو ہر اس سلطنت کے سفیر حاضر تھے جن سے دوستانہ تعلقات تھے۔ شہزادی مہر نیم روز کے باپ نے بھی اپنے نوجوان وزیر تشریفات کو ننھے ولی عہد کے لئے تحائف دے کر بھیجا ———

اس دربار میں وزیر تشریف اپنی جگہ پر ہاتھ باندھے ایستادہ تھا۔ وہ مردانہ حسن و وجاہت کا مکمل نمونہ تھا، اور معلوم نہیں اس کی شخصیت میں کونسی کشش پنہاں تھی کہ ہر شخص کی نگاہیں بار بار اُس کی جانب اٹھی جا رہی تھیں۔ ہر سفیر نے باری باری اپنے دوستانہ تعلقات کا اعادہ کیا، اور اپنے آقائے ولی نعمت کی جانب سے محبت اور خلوص کا پیام دیا۔ وزیر تشریفات بھی آگے بڑھا۔ ملکہ مہر نیم روز نے اپنا خوبصورت ہاتھ بڑھا دیا۔ وزیر تشریفات نے اپنے گھٹنے کو خم دے کر ملکہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور دو آنسو ٹپکا دیئے۔ دربار برخواست ہوا اور مہمان رخصت ہوئے ——— بادشاہ اور ملکہ نے دوسرے دن سنا کہ واپسی پر وزیر تشریفات نے دریا میں کود کر خودکشی کر لی ——— کوئی نہ سمجھ سکا کہ اس خودکشی کا سبب کیا تھا ———

——— ملکہ اپنی خوابگاہ میں جا کر خوب روئی، پھوٹ پھوٹ کر روئی، اس قدر کہ جوشِ گریہ سے چہرہ سرخ ببوکا سا ہو گیا۔

——— چند دن کے بعد ملکہ کو حرارت رہنے لگی وہ دن بدن لاغر ہوتی چلی گئی۔ کوئی چیز تھی جو اُسے اندر ہی اندر گھلائے دے رہی تھی۔ کندن سا رنگ سیاہ ہو چلا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ طبیبوں نے دق تجویز کی۔ ہر چند دق بادشاہوں کا مرض ہے۔ لیکن ملکہ کو اس کی شاہی نے بھی کچھ کام نہ دیا۔ بوڑھے طبیب شاہی نے نہایت محنت سے ایک دوا تیار کی۔ اس کی ہدایت کے مطابق یہ دوا مٹی کے ایک کوزہ میں جانسپار ملکہ کے سامنے لائی گئی ——— ملکہ نے لڑکھڑاتے ہوئے ہاتھوں سے کوزہ تھام لیا اور لبوں سے لگاتے ہی کوزہ کو فوراً ہٹا لیا ——— کون جانے کہ ملکہ کے دل نے کیا کہا کہ اس کوزہ کو چھاتی سے لگا کر بھینچ ڈالا ——— قصر سلطانی میں رہنے والے کچھ تو رو رہے تھے اور کچھ سناٹے میں تھے ——— ملکہ سماج کی تیوروں سے ہمیشہ

جب وقت جھلکتی ہے بنا ظرف کی جبیں
رائج ہوتا ہے ذاتِ باری کا یقیں
کرتا ہوں جب انساں کی تباہی پہ نظر
دل پوچھ اٹھتا ہے خدا ہے کہ نہیں

حبیب

عرضِ حقیقت

مری فطرت میں گو موجود ہیں جذباتِ طوفانی — نرالا ہے جہاں سے گو مرا ذوقِ سخن دانی
مری کوشش ہے گو میں نظم کو سلکِ گہر کردوں — مری خواہش ہے گو اشعار کو پاکیزہ تر کردوں
مری گو آرزو ہے داستانِ شوق ہوجاؤں — تمنا ہے مری گو ترجمانِ شوق ہوجاؤں
مجھے گو اک زمانے سے نرالی دھن سمائی ہے — مگر حارج مرے رستے میں میری بے نوائی ہے
جو لاؤں شاعری میں انقلاب اک کس طرح لاؤں — جو پاؤں جوہرِ فطرت کی قیمت کس طرح پاؤں
سناؤں تو سناؤں کس طرح جذباتِ پنہانی — نہ دنیاوی حشم حاصل نہ حاصل فضلِ ربانی

گرفتارِ غمِ ہستی اسیرِ قعرِ پستی ہوں — جو بس بس کر اجڑ جائے میں وہ برباد بستی ہوں
دیا فطرت نے بہرہ جس قدر روشن خیالی کا — اڑایا اس قدر حصہ مری آسودہ حالی کا
نہ شکوہ ہے مقدر کا نہ قسمت کی شکایت ہے — مجھے صبر و رضا کی راہ پر چلنے کی عادت ہے
مذاقِ شعر گو اک آئینہ ہے ہوشمندی کا — مگر الٹا ہے اس میں عکس میری سربلندی کا

اگر چاہوں تو ذرے میں ضیا خورشید کی بھردوں — اگر چاہوں خزف کو آب میں رشکِ گہر کردوں
اگر چاہوں تو قطرے کو سمندر کر دکھاؤں میں — اگر چاہوں بگولا بن کے صحرا کو اڑاؤں میں
اگر کہنے پہ آجاؤں بقا کو لافنا کردوں — زمیں کو عرش کردوں، عرش کو تحت الثریٰ کردوں
اگر ہر جھوٹ سچ کہنے پہ آجائے زباں میری — روانی میں بڑھے گنگا سے بھی طبعِ رواں میری
خوشامد کی ریاکاری سے لیکن دور رہتا ہوں — میں ہوں مجبورِ فطرت اس لئے معذور رہتا ہوں
قصیدہ خوانیوں سے سربسر مجبور ہے فطرت — زمیں سے آسماں مجھکو ملانے کی نہیں عادت

یوں ہی در در پہ مجھ کو جبّہ سا ہونا نہیں آتا
مری خودداریوں کو منت کا رونا نہیں آتا

عرش ملسیانی۔ بی اے

انتقام

میکش اکبر آبادی

ثابت ابن جابر ایک عربی ورجاہلی شاعر ہے جس کا لقب "تابط شرا" ہے۔ تابط بغل کو کہتے ہیں۔ اس نے ایک دفعہ چھری بغل میں چھپا کر اس سے اپنے کسی دشمن کو قتل کر دیا تھا، عربی بہادری کے لئے یہ عمل باعث صد ننگ تھا، اس لئے اس کا لقب تابط شرا ہوگیا۔ کسی شخص نے اس کو قتل کر دیا جس پر اس کے بھانجے نے ذیل کا مرثیہ لکھا ہے۔ پڑھئے اور یہ بھی دیکھئے کہ غم کے ساتھ شجاعت اور عدل کی خصوصیات کس درجہ نمایاں ہیں، اور انفعالی کیفیات کے ساتھ قوائے فعالیہ حرکت کے لئے کس طرح بے چین ہیں۔ مقتول ماموں کی یاد بھی ہے اور قاتل کی مظلومی کے واقعات کا بیان بھی۔ واقعات اور جذبات کو اس قدر صداقت اور فطری سادگی کے ساتھ بیان کر دینا حقیقی شاعری کی روح ہے۔

ان بالشعب الذی دون سلع	اس گھاٹی میں جو سلع پہاڑ سے ادھر طرف ہے
لقتیلا دمہ ما یطل	ایک ایسا آدمی قتل ہوگیا جس کا خون رائگاں نہیں جا سکتا
خلف العبء علی وولی	اس نے مجھ سے پیٹھ پھیر لی اور مجھ پر بوجھ رکھ دیا
انا بالعبء لہ مستقل	اب میں اس بوجھ (بار انتقام) کو اٹھائے ہوئے ہوں۔
ووراء الثار منی ابن اخت	انتقام کے ضمن میں اس کا ایک بھانجہ بڑا جنگجو ہے
مصع عقدتہ ما تحل	جس کی گرہ کبھی کھولی نہیں جاتی
مطرق یرشح سما کما	وہ خاموش سر جھکائے ہوئے زہر اگلتا رہتا ہے
اطرق افعی ینفث السم صل	بالکل افعی سانپ کی طرح
خبر ما نابنا مصمئل	بڑی سخت خبر ہمیں موصول ہوئی جس کے مقابلہ میں
جل حتی دق فیہ الاجل	خوفناک ترین خبریں بھی حقیر معلوم ہوتی ہیں۔
بزنی الدھر وکان غشوما	ظالم زمانے نے مجھ سے ایسے متکبر جوان کو چھین لیا
بابی جارہ ما یذل	جس کا ہمسایہ کبھی ذلیل نہیں کیا جاسکتا۔
شامس فی القر حتی اذا ما	وہ سردی کے موسم میں آفتاب کی طرح گرم
ذکت الشعری فبرد وظل	تھا اور جب ستارہ شعری چمکنے لگے اور گرمی ہو جائے تو ٹھنڈا اور سایہ دار
یابس الجنبین من غیر بوس	بغیر مفلسی کے اس کا پیٹ پسلیوں سے ملا
وندی الکفین شھم مدل	ہوا رہتا تھا، اس قدر سخی تھا اور دشمنوں کو ہر طرف سے ٹکرانے والا
ظاعن بالحزم حتی اذا ما	ہشیاری کے ساتھ سفر کرنے والا، ہوشیاری
حل حل الحزم حیث یحل	وہیں مقیم ہوتی جہاں وہ قیام کرتا
غیث مزن غامر حیث یجدی	بخشش کے وقت موسلا دھار بارش کی
واذا یسطو فلیث ابل	مانند، حملے کے وقت مضبوط ارادے کا شیر۔
مسبل فی الحی احوی رفل	اپنی قوم میں جب بیٹھتا تو ڈھیلے ڈھالے
واذا یغزو فسمع ازل	نرم کپڑے پہنتا اور لڑائی کے وقت بھیڑیے کے بچے کی طرح چست و چالاک اور بہت تیز دوڑنے والا۔
ولہ طعمان اری وشری	اس کے دو مزے تھے ایک شہد کی طرح
وکلا الطعمین قد ذاق کل	شیریں، دوسرا ایلوے کی طرح تلخ، دونوں ذائقے (دوست و دشمن) سب چکھے ہوئے ہیں۔
یرکب الھول وحیدا ولا	وہ خوف پر اکیلا ہی غالب آجاتا، کوئی
یصحبہ الا الیمانی الافل	اس کے ساتھ نہ ہوتا، سوا اس کی دانتے پڑی ہوئی یمانی تلوار کے۔

وفتو ھجروا ثم اسروا　　جیسے جوان دوپہر کو چلے پھر رات کو
لیلھم حتی اذا انجاب حلوا　　سفر اور جب رات صبح سے الگ ہوگئی
تو ...

کل ماض قد تردی بماض　　تو ... ہر ایک ... تلوار پہنے ہوئے
کسنا البرق اذا ما یسل　　جو بجلی کی طرح چمکتی ہے ... نیام سے نکلتے وقت بجلی کی طرح ...

فادرکنا الثار منھم ولما　　ہم ان جوانوں سے ... اور ہم نے
ینج ملحیین الا الاقل　　ان سے بدلہ لے لیا، دونوں طرف کے آدمی باقی نہ رہے مگر کم

فلئن فلت ھذیل شباہ　　میں تیزی سے مرحوم ہذیل کو کند کیا کرتا
لبما کان ھذیلا یفل　　تھا اسی تیزی کے سبب ہذیل نے مرحوم کو کند کر دیا

وبما ابرکھا فی مناخ　　اس ہلاکی کا سبب یہی ہے کہ اس نے
جعجع ینقب فیہ الاظل　　ہذیل کو ایسی سخت جگہ بٹھایا جہاں اونٹوں کے تلوؤں میں بھی سوراخ ہو جاتے۔

وبما صبحھا فی ذراھا منہ　　اسی لئے ہذیل نے صبح کے وقت اس کو
بعد القتل نھب وشل　　قتل کر دیا اس کا مال لوٹ لیا اور اس کے اونٹ ہنکا لے گئے

صلیت منی ھذیل بخرق　　اب ہذیل کا مجھ جیسے جوان ...
لا یمل الشر حتی یملوا　　ہوا جو لڑنے سے ... نہ تھکے
... ہذیل ہی تھک ...

ینھل الصعدۃ حتی اذا ما　　وہ جوان ... پہلے ...
نھلت کان لھا منہ عل　　خون پلاتا ہے ... جب ...
سیراب ہو جاتے ہیں تو پھر ...

حلت الخمر وکانت حراما　　(میں نے ماموں کا بدلہ ہذیل سے لے لیا)
وبلای ما المت تحل　　اب شراب میرے لئے حلال ہے ورنہ حرام تھی، ... بعد شراب میرے لئے حلال ہوئی ہے

فاسقنیھا یا سواد بن عمرو　　اے سواد بن عمرو شراب پلا کہ مجھ میں قوت
ان جسمی بعد خالی لخل　　آجائے، کیونکہ ماموں کے بعد میرا جسم ناتواں ہو گیا ہے۔

تضحک الضبع لقتلی ھذیل　　گفتار (درندے) ہذیل کو جو میں نے قتل
وتری الذئب لھا یستھل　　کیا ہے تو ہنستے ہیں اور بھیڑئے خوشی منا رہے ہیں۔

وعتاق الطیر تغدو بطانا　　بڑے بڑے پرندے پیٹ بھر کر ناشتہ کر رہے ہیں
تتخطاھم فما تستقل　　اور ان کی لاشوں کے گرد ٹہلتے پھرتے ہیں اس قدر کھا گئے ہیں کہ اڑا بھی نہیں جاتا۔

اخلاص کا ذریعہ ہیں احباب کو سر کر دیں
الفت کا جہاں میں بول بالا کر دیں
حاضر ہیں زمیں بلند کرانے ...
معدوم کو پیکر سے پیدا کر دیں

انیس

شاعرِ قیصریت

اسمٰعیل احمد خاں

کپلنگ کی وفات نے ہندوستان میں ایک بڑی دلچسپی کو بیدار کیا ہے۔ اخبارات وجرائد نے اس حادثے پر جو نوٹ لکھے ہیں، اور مختلف ادیبوں اور ناقدوں نے جو خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ کافی شایانِ شان معلوم ہوتا ہے۔ رائے عامہ کے یہ مظاہر بالکل قدرتی اور عین قرینِ توقع تھے۔ اس لئے کہ یہ "شاعرِ سلطنت" بڑی قربت کے ساتھ ہماری سرزمین سے وابستہ رہا ہے۔ ہندوستان اس کی ولادت کا گہوارہ تھا: اُسی نے اُس کو زندگی کا پہلا قدم بہم پہنچایا: اور یہ ہندوستان ہی کے متعلق "شاعرِ متوفی" کے وہ قصے تھے جنھوں نے اُسے "زندۂ جاوید" بنا دیا!!

لیکن وہ ہندوستان کا ایک ناخلف فرزند ثابت ہوا۔ اور اس محسن سرزمین کا ایک محسن کُش مستفید۔ "کپلنگ پرلے درجے کا قیصریت پرست واقع ہوا تھا: وہ ہندوستان کی بہترین آرزوؤں کے خلاف تازلیست صف آرا رہا! ان معکوس سپاس گذاریوں کے لئے یہ ملک کبھی اُسے فراموش نہ کرے گا۔

کپلنگ کی نسبت کیا خوب کہا گیا ہے کہ "وہ ایک بڑا شاعر تھا، اور ایک چھوٹا انسان!" موخر الذکر حصۂ بیان کے بارے میں مطلقاً کوئی شبہ نہیں: وہ ایک بہت ہی ننھا سا دل ودماغ رکھتا تھا، اتنا ننھا کہ ایک عظیم سلطنت بھی جس کے جلوس تزک واحتشام کے ساتھ وہ ہمیشہ رواں دواں رہا۔ اُس میں وسعتِ ظرف پیدا نہ کرسکی۔ اور اب ایک شاعر اور نیز ایک ادیب کی حیثیت سے بھی، اُس کے حلقۂ نقد دداد میں وہ سابقہ گرم جوشی باقی نہیں رہی ہے: بلاشبہ "ویسٹ منسٹر ایبے" (انگلستان کا گنجِ شہیداں) کے اندر اُس کی خاک کو "شعرار کا گوشہ" مل گیا ہے! تاہم یہ امر کہ وہ انگریزی ادبیات کے "سلسلۃ الذہب" کی ایک کڑی ہے، بیحد مشتبہ ہے: یہ کوئی متعصبانہ قول نہیں جو اک ایسے جذبے کی پیداوار ہو جس کا منشا ایک عظیم صاحبِ قلم کی بے وقاری کرنا ہو، محض اس بنا پر کہ وہ اک بے رحم دشمنِ حریت واقع ہوا تھا!

خود انگریزی ماتریز کا روشن خیال طبقہ اسی نقطۂ نظر کا قائل ہوتا جا رہا ہے۔ مشہور نقاد، اے جی گارڈینر نے عرصہ ہوا لکھا تھا۔

"مسٹر روڈیارڈ کپلنگ پہلا انگریز ہے جسے ادبیات کا "نوبل انعام" ملا ہے، وہی پہلا فرزندِ انگلستان ہے جو یورپ کے دربارِ ادب میں تاج پوش کیا گیا ہے: اُسے علم وادب میں ہمارے ترجمان کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے، اور آج کہ الیگزینڈر میریڈتھ ہارڈی اور سوئن برن ہنوز ہماری محفلِ ادبی میں ضیا پاشی کر رہے ہیں: ریڈروں کے مینا بازار سے لوگ گزر جاتے ہیں اور جوہر شناسوں کی نظریں ادبی آہنگ روش کی تجلیوں پر مرکوز ہو رہی ہیں: ہم نہیں جانتے کہ بزمِ خاص کے اس فتوے کے کیا اسباب ہیں، لیکن اپنے اس اذعان کے متعلق ہمیں شمہ برابر شبہ نہیں کہ کپلنگ ہماری بزمِ ادب کا صدرنشین ہرگز نہیں ہے!"

مسٹر گارڈینر کے قلم سے منقولہ بالا الفاظ نے اُس وقت تراوش کی تھی جسے اب بیس سال کی مدتِ مدید گزر چکی ہے۔ اور دنیائے ادب کے ماضیِ قریب کے حوادث اب اس کے شاہدِ عادل بن رہے ہیں: اپنے دمِ واپسیں سے کُل دو ہفتے قبل کپلنگ نے اپنی ہفتاد سالہ سالگرہ منائی تھی: لندن کے ایک صفِ اول کے روزنامے نے اس موقعے پر جو اظہارِ خیال کیا یہ ہے:۔

"آج مسٹر روڈیارڈ کپلنگ کی ہفتاد سالہ سالگرہ ریاست ہائے متحدہ کے طول وعرض میں اپنا جشن منعقد کر رہی ہے۔ لکھوکھا امریکنوں کے گھروں میں مخصوص ہمہ گیر "لاسلکی نشریات" کا التزام کیا گیا ہے: —— لیکن یہ کپلنگ صاحب سوائے اس کے کیا ہیں کہ برطانوی سامراج کے مُنادی ہیں: چنانچہ خود اس ملک میں کسی قومی وعمومی تقریب کا سامان نہیں کیا گیا!"

خیالات وجذبات کے اس انقلاب کی کیا علت ہے؟ مسٹر گارڈینر اپنے

خطیبانہ مرثیے ہیں اس حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں:-

"کپلنگ کسی فلسفۂ حیات کا پیغمبر ہے نہ کسی رفیع نصب العین کا داعی: وہ صرف ایک قوم کی مختص العہد سفلی ذہنیت کی رہبر ہے! اس بارے کی کیفیت یہ ہے کہ بنی اسرائیل فرعون پر در پہونے لگے تھے، وہ طلائی گوسالہ سامری کی پرستاری پر تُلے بیٹھے تھے: یہ حسیاتِ اسفل کے صعود کا ایک دور تھا! طاقت کی پرستی کا ایک عہد تھا! ایسی طاقت کا جو قطعاً عصبیت محض واقع ہوئی تھی، جس کا کوئی بھی جمالیت مقصود نہ تھا! یہ ایک ایسا زمانہ دولت و عشرت تھا جس میں اکل حلال اور صدق مقال حرام تھا۔ جنوبی افریقہ کی کان ہائے زر نے خون میں اک بحران پیدا کر رکھی تھی: ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی قوم کی روحانی زندگی میں اک تحویلِ قبلہ کا انقلابی نغمہ آیا تھا جس نے اس کے چہروں کو کلیساؤں سے موڑ کر بازار ہائے مبادلہ کی طرف کر دیا تھا!"

کپلنگ کی مشہور عالم وطن پروری بھی ایک رسوائے عالم چیز تھی! وہ مدینۂ تمدن کے قلب و مرکز سے بالکل منحرف تھی: اُس کا مرکزِ ثقل "ٹیروں کی بارگیں" تھا: یہ دعوت تھی اک ایسی قوم کے جاذبۂ وطنیت کو جسے بشریت کی خدمت کی کوئی سعادت حاصل نہ ہو بلکہ بجائے اس کے جو اپنی جہانگیریوں اور کشورکشائیوں کے نشۂ فخر سے بدمست ہو! جس چیز کی اُس نے مدحت گری کی وہ انگلستان کی رُوح نہ تھی بلکہ اُس کی قوت و بازو! اُس کے نغمۂ قلب کو اُس نے نہیں گایا، اُس کے جنگی جہازوں کی اژدر دَم توپوں کی صدائے بازگشت بلند کی! اُس نے انگلستان کی اُس عظمت کو بیان نہیں کیا جس کا طغرائے امتیاز یہ ہو کہ ؎

بزرگ اوست کہ برخاک ہمچو سایۂ اَبر
چناں رَوَد کہ دلِ مُور را نیازارد

بلکہ اُس کی اُس سینہ زوری کی بجتی کی جو جرار فوجوں کی حملہ آوریوں اور قہار لشکروں کی ارض پامالیوں میں نظر آتی ہے: اس نے انگلستان کے ہر فرد کے متعلق چاہے جو کہا ہو ٹیلن، شیکسپیئر اور ملٹن کی تو ایک جگہ بھی ہمنوائی نہ کی!۔

سُنئے، اقوامِ عالم کے بارے میں اُس کا نعرۂ فرعونی کیا ہے؟

"نیکی اور راستبازی؟! لاحول ولاقوۃ! کیا ہمارے بازوئے قومی کو ایک پنجۂ فولادی نصیب نہیں؟ کیا رب الافواج ہمارے عقب میں ہماری کمک پر نہیں؟ کیا اِس خوش سواد روئے ارض کو ہم نے اپنے نقدِ شمشیر سے اپنے نام بیع نہیں کرا لیا ہے؟ کیا اپنے خون و گوشت کی صورت میں ہم نے خدا کو اس کی پوری قیمت نہیں ادا کر دی ہے؟ اور کیا ہم اپنی خدائی جاگیر کے سیاہ و سفید کے مختار نہیں ہیں؟ ہندوستان کا بندی۔ ٹرانسوال کا بوئر۔ آئرلینڈ کا آئرستانی یہ کیا ہیں، اگر ہمارے معدۂ قیصریت کی غذائے لذیذ اور ہمارے دہنِ سلطنت کے لقمۂ تر نہیں؛ یہ اہلِ ہند کو ہماری ذاتِ بجاں دیگچوں کے سامنے منقارِ شکایت کھولنے کا حق کیا ہے! اور یہ آئرلینڈ کے شور، یدہ سر اگر انگریز خلفائے ارض کے بردہ و باغی نہیں ہیں تو کیا ہیں؟!"

کیا یہ غلط ہے کہ کپلنگ، ہندوستان کے دورِ بدعت اور عہدِ رجعت کی ایک آواز تھا؟ یا ورڈزورتھ کی نسبت ایک نابغ نقاد نے کہا تھا کہ:

رہانیدی مرا از شرِ ہستی
چو یہودی پیالے بہ جام مے را

انگلستان کی نئی پود کو یہ ذاتِ شریف ایک آنکھ نہیں بھاتے، ایک نوجوان نے ابھی حال میں کہا تھا:-

"جب میں رڈیارڈ کپلنگ کا کلام پڑھتا ہوں تو میرا تخیل ہمیشہ لوہار کی بھٹی، اور چمار کی رانپی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے: یہ شاعر کے رشحاتِ خامہ ہیں، یا آہنگر کی ضرباتِ گُرز؟ اُس کا قلم عین برمنگھم کی کسی کارگاہِ اسلحہ کا ساختہ معلوم ہوتا ہے!"

مشہور ادیب ہینن سویفٹر نے اپنے ایک مکتوبِ مفتوح میں رڈیارڈ کپلنگ کے "ضیاءِ قیامِ ہند" کی طرف اس طرح چشمک کی تھی۔

"آپ کے شباب کو ایک ایسا ملک ملا تھا جو کرۂ ارض کی ہر سرزمین سے زیادہ رنگینی، بوقلمونی، اور بوالعجبی رکھتا تھا۔ یہاں فیلانِ کوہ پیکر مع ہودجِ زر، اور جذامیوں کے لشکر، تاج محل اور پھوس کی جھونپڑی، "تاجِ برطانیہ کا درخشاں ترین الماس" اور سلطنتِ برطانیہ کا پامال ترین افلاس ——— پہلو بہ پہلو نظر آتے تھے! تاہم اِس ہموار جہنم و جنت کے منظر میں بھی آنجناب کی تراوشِ خامہ کی زہر چکانی اس سے زیادہ نہیں کہ کس طرح تین گورہ سپاہیوں نے شراب پی اور کس طرح شملہ میں اطالوی افسر بدمست ہوئے اور عزبار کی بیویوں کو خراب کیا؟"۔

تفو، بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

طوفان نوح



کجا دانند حال ما سبکباران ساحل‌ها
حافظ

"کلیم" دہلی

سفر حیات



میں مسافر ہوں گزر جاؤنگا پار اک دم میں
تجھکو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

"آتش" ؔ

آئینۂ خیالات

(آرٹ)

سچا آرٹ خالق کی مؤدبانہ نقل ہے (اڈورڈز)

حقیقی آرٹ اظہار ہے انسان کی مسرت کا اللہ تعالیٰ کے کاموں میں ... نہیں ہیں۔ (رسکن)

سب سے بڑا مسئلہ کسی آرٹ کا یہ ہے کہ کسی اعلیٰ اصلیت کی جھلک دکھا... (گیٹے)

آرٹ کے سچے کام کمال الٰہی کا سایہ ہوتے ہیں۔ (مائیکل اینجلو)

آرٹ کا کمال یہ ہے کہ ایک روح دوسری روح سے گفتگو کرے ... جتنی روح بڑی ہوگی اسی قدر آرٹ کا درجہ بڑا ہوگا (رسکن)

بہترین آرٹ نیچر کی نقل کرتا ہے۔ جیسے کوئی شاگرد استاد کی نقل کرے ... آرٹ ... اولاد الٰہی سے ہے۔ (ڈینٹے)

آرٹ کا کمال یہ ہے کہ آرٹ نہ معلوم ہو۔ (کوئنٹیلین)

کسی آرٹ کے کام کی جانچ اس کی عیب گوئی کرکے نہ کرو۔ (واشنگٹن ارونگ)

شہوت مارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ حسین چیزوں کی قدر کرو۔ تمام اعلیٰ ... برلازمی طور پر صنعت کی تصویریں ہیں خواہ تصویر کا مضمون کچھ ہی کیوں نہ ہو ... مطالعہ سے خیالات میں پاکیزگی اور بزرگی پیدا ہوتی ہے جس طرح ... سے جذبات ... پاک و صاف ہوتے ہیں۔ (شلیگل)

بہترین آرٹ نیچر کی بہترین پیروی ہے۔ (ڈیس)

آرٹ کی اصلی غرض یہ ہے کہ نیچر کی ... کرے نہ کہ اس کی نقل۔ (ہنٹ)

چونکہ سنگتراشی، مصوری اور ... نویسی کی بنیاد تخیل پر قائم ہے، اس وجہ سے ... برتنے والا قطعی حق کا جز نہیں ہوتا۔ بلکہ حق کی ایک خیالی تصویر کی تلاش میں رہتا ہے (ویلوگی)

[illegible]

... عقل ... [illegible]

[illegible]

... ہے ... [illegible]

... تصویر کے ... [illegible]

... طریقہ نظر کے سامنے واضح رہتا ہے ... [illegible]

... یاد کرتا ہے۔ (ابجور)

سیر جہات



میں مسافر ہوں گزر جاؤںگا پل اک ا ن

تجھکو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

"افسر"

آئینۂ تخیلات

محمد عسکری لکھنوی

(آرٹس)

سچا آرٹ خالق کی سرد بانہ نقل ہے۔ (ڈورڈس)

حقیقی آرٹ اظہار ہے انسان کی مسرت کا اللہ تعالے کے کاموں میں جو خود ساختہ نہیں ہیں۔ (رسکن)

سب سے بڑا مسئلہ کسی آرٹ کا یہ ہے کہ کسی اعلیٰ اصلیت کی جھلک دھوکہ سے دکھائی جائے۔ (گوئٹے)

آرٹ کے سچے کام کمال الٰہی کا سایہ ہوتے ہیں۔ (میکائیل انجلو)

آرٹ کا کمال یہ ہے کہ ایک روح دوسری روح سے گفتگو کرے اور جس قدر بولنے والے کی روح بڑی ہوگی اسی قدر آرٹ کا درجہ بڑا ہوگا۔ (رسکن)

بہترین آرٹ نیچر کی نقل کرتا ہے۔ جیسے کوئی شاگرد استاد کی نقل کرے پس آرٹ گویا اولاد الٰہی میں سے ہے۔ (ڈانٹے)

آرٹ کا کمال یہ ہے کہ آرٹ نہ معلوم ہو۔ (کوئنٹیلین)

کسی آرٹ کے کام کی جانچ اس کی عیب گوئی کرکے نہ کرو۔ (واشنگٹن آلسٹن)

شہوت مارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ حسین چیزوں کی قدر کرو۔ تمام اعلیٰ درجہ کی تصاویر لازمی طور پر عفت کی تصویریں ہیں۔ گو کہ تصویر کا مضمون کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے مطالعہ سے خیالات میں پاکیزگی اور بزرگی پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح ٹریجڈی سے جذبات انسانی پاک وصاف ہوتے ہیں۔ (شلیگل)

بہترین آرٹ نیچر کی بہترین پیروی ہے۔ (ڈیں)

آرٹ کی اصلی غرض یہ ہے کہ نیچر کی نیابت کرے نہ کہ اس کی نقل۔ (ہنٹ)

چونکہ سنگتراشی، مصوری اور قصہ نویسی کی بنیاد تخیل پر قائم ہے، اس وجہ سے ان کا برتنے والا قطعی حق کا جویا نہیں ہوتا۔ بلکہ حق کی ایک خیالی تصویر کی تلاش میں رہتا ہے۔ (دیلوٹ)

عملی حقائق یا اشیا کی اصلیت آرٹ کے دائرہ اثر سے باہر ہیں۔ ایک ایسا دھوکا جس کی بنا اصلیت پر ہے، تمام فنون لطیفہ کی جان ہے۔ (گوبرٹ)

آرٹ نیچر کی نقل نہیں کرتا، بلکہ نیچر کے مطالعہ سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ نیچر سے ایسی چیزوں کو چن لیتا ہے جن سے اس کے خیالات میں مطابقت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ان چیزوں کو ایسی صفیں دیتا ہے جن کا وجود نیچر میں نہیں ہے۔ یعنی عقل و روح۔ (ڈیبو)

آرٹ کی غرض جذبات کو خیالات میں تبدیل کرنا اور پھر ان خیالات کو تشکل کرنا ہے۔ (ڈیپارٹ)

سمجھدار آرٹ کے اسباب پر غور کرتا ہے، اور ناسمجھ اس سے صرف لطف اندوز ہوتا ہے۔ (کوسٹبیں)

مفید فنون کی ماں ضرورت اور لطیف فنون کی ماں عیش ہے۔ اور مفید فنون کا باپ عقل اور لطیف فنون کا باپ تخیل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ تخیل بھی عیش کی ایک صورت ہے۔ (شوپنہار)

جہاں تک کسی تصویر کے عمل کا تعلق ہے تو مصور محض ایک دستکار ہے، اور جہاں تصویر کا تعلق تخیل اور رومانیت سے ہے تو مصور اور شاعر میں کوئی فرق نہیں۔ (شیلر)

تصویر میں رنگ کو شکل سے وہی نسبت ہے جو نظم کو نثر سے ہے یعنی اظہار خیال کا وہ بہترین ذریعہ ہے (مسز جیمسن)

آرٹ ایک متناسب اظہار حسن کے لئے ایک طریقہ اختیار کرتا ہے۔ یہی طریقہ سائنس بھی احقاق حق کے لئے اختیار کرتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ سائنس کی تحقیق میں وہ طریقہ نظر کے سامنے واضح رہتا ہے۔ اور آرٹ میں وہ چھپ کر رنگ اور شکل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ (دبلوئر)

کیا اچھا ہوتا کہ ہماری آنکھوں میں تصویر کھینچنے کی قوت ہوتی خیال کرو کہ آنکھ سے ہاتھ تک اور پھر ہاتھ سے نپل تک کس قدر طویل وقت ہے۔ (لیسنگ)

ابتدا

ہر چیز کی ابتدا کا خیال رکھو، نتائج اپنا خود خیال رکھیں گے (ایگزنڈر کلارک)

خدا کا قول تھا کہ کسی کام کی ابتدا اگر ایسی ہو تو گویا وہ آدھا پورا ہو جاتا ہے

(پائیس)

ہر چیز میں پہلا قدم مشکل ہے۔ (مدام ڈی اسٹیل)

نقصان کو ابتدا ہی میں روک دو تاکہ وہ وقت کے ساتھ بڑھنے نہ پائے۔ (شیکسپیر)

ابر

وہ آسمان کی رنگ آمیزیاں ہیں۔ (البرٹ اسمتھ)

ابر ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا کسی فرشتہ نے اپنی رنگین قبائیں ہوا میں معلق چھوڑ دی ہیں۔ (جوانا بیلی)

اے اللہ یہ ابر تیری گاڑیاں ہیں۔ ان پر تو سوار ہو کر اپنے کھیتوں، اپنے باغوں، اپنی چراگاہوں، اپنے جنگلوں اور میدانوں کی سیر کرتا ہے۔ یہ وہ پردے ہیں جن کو تو جب ضرورت ہوتی ہے تو جب تو چاہتا ہے درختوں پر ڈال دیتا ہے۔ تاکہ وہ دھوپ کی تپش سے محفوظ رہیں۔ اور مرجھا نہ جائیں، کبھی وہ تیرے توپخانوں کا کام دیتے ہیں جن سے تو اپنے قہر و غضب کے رعد و برق سے لوگوں کو ڈراتا ہے۔ اور کبھی ان کو اسی سے سزا بھی دیتا ہے۔ (کاشمولٹ)

اتفاق (حادثہ)

خدا کے نزدیک کوئی امر اتفاقی نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ (لانگفیلو)

ہر برے سے برے امر اتفاقی سے عقلمند کوئی مفید نتیجہ نکالتا ہے اور برا اچھے سے اچھے امر اتفاقی سے بے وقوف اپنے واسطے نقصان تصور کرتا ہے۔ (روشی فوکو)

عقل اور تدبیر جن چیزوں کو آہستہ آہستہ اور محنت سے جمع کرتے ہیں ان کو اتفاق بعض وقت ایک لمحہ میں مہیا کر دیتا ہے۔ (شلر)

جس کو ہم اتفاق کہتے ہیں وہ خدا کی عین مشیت ہے (بیلی)

اتفاق کوئی چیز نہیں، جو چیز ہم کو اتفاق معلوم ہو وہ تقدیر کے گہرے پردوں سے نکلتی ہے۔ (شلر)

لفظ اتفاق کسی واقعہ یا نتیجہ کے اسباب کے جہل پر دلالت کرتا ہے۔ نہ کہ ہم خود اتفاق کو سبب قرار دیتے ہیں۔ (ہنری فرگس)

اتفاق ضرور ایک چیز ہے، مگر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ کیوں نہ اس سے کام لے۔ (ہمس)

اس سے بڑھ کر کون خیال بے وقوفی کا ہو سکتا ہے کہ اتنا بڑا کارخانہ۔ زمین، آسمان۔ اتفاق سے وجود میں آیا۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی سیپی کا خلق بھی ہمارے امکان سے باہر ہے۔ (جیری ٹیلر)

اتفاق کو خدا کا دوسرا نام سمجھنا چاہیے۔ ان صورتوں میں جبکہ خدا اپنا اصلی نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ (کولرج)

اکثر اتفاق سے علم کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ (ڈیٹر)

اکثر کارنمایاں اتفاق سے ہوتے ہیں، مگر تعریف کسی بڑے آدمی کی ہو جاتی ہے (ہیوم)

کسی کام کی کامیابی پر پورا بھروسہ نہ کرو۔ کیونکہ دنیا میں سلسلہ اتفاقات کی ایسی نظر میں نہ آنے والی کڑیاں پھیلی ہوئی ہیں کہ اگر وہ سب خود تمہارے اختیار میں ہوتیں تب بھی کامیابی یقینی نہ تھی۔ (ہربرٹ)۔

اتفاق نے کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی کوئی خوبصورت مکان نہیں تعمیر کیا۔ کوئی عمدہ تصویر نہیں بنائی، پھر بھی یہ چیزیں بمقابلہ ایک پھول یا ایک درخت کی آفرینش کے ہیچ ہیں۔ (بٹرد)

اتفاق بہت قوی چیز ہے۔ تدبیر کے کانٹوں سے ہر وقت کام لو تو ماہی مراد کبھی نہ کبھی ضرور مل جائے گی۔ (اوود)

اتفاق ایک بے معنی لفظ ہے۔ کوئی چیز دنیا میں بغیر سبب کے نہیں ہوتی۔ (والٹیر)

اتفاق بھی ذی فہم کی مدد کرتا ہے۔ (جوبرٹ)

ﷺ مقابلہ کرو سے سرچشمہ شاید گرفتن بہ بیل ۔ چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل (سعدی)

احتیاط

دوسروں کے مصائب سے احتیاط سیکھنا عقلمندی ہے۔ (ملس سائرس)

جب ہر چیز فانی ہے تو ہر چیز سے ڈرنا چاہیئے۔ (دیان)

احتیاط یعنی گفتگو سمجھ بوجھ کے کرنا اور اپنے دلی خیالات بہت کم لوگوں پر ظاہر کرنا اس امر کی ضمانت ہے کہ تم ہمیشہ اچھے رہوگے اور اپنے [illegible] کو بھی مطمئن رکھوگے۔ (ٹامس اے کیمپس)

کوئی شخص اس سے ہمدردی نہیں کرتا جو کسی جال میں باوجود آگاہ کئے جانے کے پھنس جاتا ہے (برک)

اپنی زبان اور اپنی روپیہ کی تھیلی ہمیشہ احتیاط سے بند رکھو اس سے تمہاری دولت اور تمہاری شہرت ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ (ازہرٹین)

جب تمہارے پڑوس میں آگ لگے تو تھوڑا پانی احتیاطاً اپنے مکان پر بھی ڈلواؤ۔ اس سے ممکن ہے کہ بعض لوگ تم کو وہمی خیال کریں گے، مگر احتیاط میں افراط بہ نسبت تفریط کے بہتر ہے۔ (برک)

جو شخص تمہارے ساتھ ایک مرتبہ بدعہدی کرے اس پر کبھی اعتبار نہ کرو کیونکہ جس نے ایک مرتبہ دغا کی وہ پھر دغا کرے گا۔ (شکسپیر)

افراط احتیاط کمی عمل کا باعث ہوتی ہے۔ (شیلر)

لوگوں کے مصائب سے سبق سیکھو، تاکہ دوسرے تم سے مثال نہ حاصل کریں (شیخ سعدی)

جو چیزیں کمال غور و فکر سے عمل میں آتی ہیں، وہ خوف سے مبرا ہوتی ہیں۔ (شیکسپیر)

میں کبھی ایسے محتاط لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اس خوف سے کہ کوئی بات غلط ان کے منہ سے نہ نکلے زبان بند رکھتے ہیں اور اس خوف سے کہ کوئی کام غلط نہ کریں کوئی کام ہی نہیں کرتے۔ (ہیجر)

اختصار فی الکلام

اختصار روح ذہانت ہے۔ (شکسپیر)

حقیقی خوش مذاقی زیادہ مطلب کم الفاظ میں ادا کرنا۔ اپنے خیالات کو جمع و منتخب کرنا، اپنی گفتگو میں ایک ترتیب و نظام قائم رکھنا۔ اور جو کچھ ہم کو کہنا ہو اس کو نہایت سکون، دلجمعی سے ادا کرنا ہے (فینیلون)

جب کوئی شخص کوئی اچھی بات کہتا ہے [illegible] اپنی غرض [illegible] نہیں کہتا تو وہ [illegible] مطلب چند الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ (اسٹیل)

[illegible] کلام سے ظاہر ہوتی ہے۔ (امرسن)

[illegible] شاعر کی قوت زبان کا اندازہ ہے کہ کلام مختصر ہو۔ (ہائنے)

اختصار تقریر کی بہترین خوبی ہے۔ عام اس سے کہ وہ کسی [illegible] ممبر کا ذکر یا کسی [illegible] (سسرو)

مطلب کی بات کہو اور جب مطلب ختم ہو جائے تو کلام ختم کرو۔ جو کچھ منہ سے کہو یا قلم سے لکھو وہ جامع اور مختصر ہو۔ [illegible] مطلب عبارت سے کتاب بھر دینا کوئی تعریف کی بات نہیں ہے۔ (ذیل)

جتنے ہی کم الفاظ ہوں گے اتنی ہی دعا موثر ہو گی۔ (لوتھر)

الفاظ مثل پتوں کے ہیں۔ اور مطلب مثل پھل کے، جب کسی درخت پر پتیاں زیادہ ہوں تو اس پر پھل کم ہوتے ہیں۔ (پوپ)

اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری تقریر موثر ہو تو اس کو مختصر کرو کیونکہ الفاظ مثل شعاع آفتاب کے ہیں جتنی زیادہ مجتمع ہوں گی اتنی ہی تیز ہوں گی (ساؤدے)

جو کچھ لکھنا ہو اس کو جہاں تک ہو سکے مختصر کرو، ورنہ پڑھنے والا الفاظ چھوڑتا جائے گا اور جہاں تک ہو سکے سادہ الفاظ میں کہو۔ ورنہ وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکے گا۔ (رسکن)

جب کوئی اخلاقی سبق دینی وعظ تم کو دینا ہو تو اس کو مختصر کرو۔ (ہارس)

اتنا اختصار نہ چاہیئے کہ مطلب خبط ہو جائے۔ (اڈورڈس)

اخفا

جن سے میں محبت کرتا ہوں ان سے میں کوئی بات نہیں چھپاتا، جن کے واسطے میرا دل کھلا ہوا ہے ان کے لئے میرے ہونٹ بند نہیں ہو سکتے۔ (ڈکنس)

جو اپنی خوشیاں چھپا سکتا ہے اس سے بزرگ تر ہے، جو اپنے رنج چھپا سکتا ہے۔ (لیویٹر)

کسی چالاکی کا چھپانا بڑی چالاکی ہے۔ (روچی فوکو)

اخوت

آدمی نہایت ہوتا ہے، اگر سہارا دینے کے لئے ہر انسان کو چاہئے کہ ایک دوسرے کی مدد کرے۔ (مینانڈر)

اگر خدا ہمارا باپ پیدا کرنے والا ہے تو انسان تیرا بھائی ہے۔ (لامارٹین)

ہم سب ایک ہی جسم کے اعضا ہیں، فطرتاً ایک دوسرے سے محبت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اور ایک معاشرتی زندگی کے قابل ہیں، ہم کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے، کہ انسان کی غرض آفرینش نیکی و بھلائی ہے[1] (سنیکا)

اگر انسان امداد باہمی چھوڑ دے تو صفحۂ ہستی سے فنا ہو جائے۔ ہمارا وجود بغیر ایک دوسرے کی مدد کے ناممکن ہے، پس نتیجہ نکلا کہ حاجتمند کو حاجت روا سے مانگنے کا حق ہے، اور حاجت روا کو مدد سے انکار کرنا گناہ ہے۔ (والٹر سکاٹ)

تمام عالم ایک بڑا شہر ہے، جس میں ہمارے پیارے آباد ہیں، اور فطرت نے محبت باہمی کا سبق ہم کو دیا ہے۔ (ریکٹیٹس)

انسان گو کیسا ہی ذلیل و خوار ہو، پھر بھی آخر انسان ہے۔ (سنیکا)

ہمارے تمام مسائل مساوات و آزادی و انسانیت سب اسی خیال کے نتیجے ہیں کہ تمام انسان خدا کے بندے اور ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ (کایون گولیج)

استواری (ثابت قدمی)

تمام فضائل کی تکمیل استواری ہے۔ (مریبی)

مقصد کی استواری کامیابی کا راز ہے۔ (ڈزرائیلی)

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے ٭ مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

(غالب)

کامل انسان تو مجھ کو کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی ثابت قدم ہی مل جائے تو میں اس کے قدم آنکھوں سے لگاؤں۔ (کنفیوشس)

کبھی تعصب سے بھی استواری ثابت ہوتی ہے۔ (ہول)

بغیر استواری کے نہ دنیا میں محبت کوئی چیز ہے، نہ دوستی اور نہ نیکی۔ (ایڈیسن)

حق اور اصول کی استواری اہل دنیا کی زبان میں بعض وقت عقل کی کمزوری کہلاتی ہے۔ (واڈورڈس)

ے اللہ! اگر انسان ثابت قدم ہوتا تو کیسا کامل و مکمل ہوتا۔ (شیکسپیر)

اشتراکیت

کمیونزم کیا چیز ہے؟ وہ اس امر کی خواہش ہے کہ غیر مساوی محاصل مساوی طور پر تقسیم ہونا چاہئیں، یعنی کوئی سست، کاہل، اپاہج اپنا پیسہ تو الگ رکھے اور تمہارا روپیہ اینٹھنا چاہے۔ (ابنیزر الیٹ)

مساوات پسند یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کے لوگ ایک سطح پر آجائیں۔ مگر یہ نہیں چاہتے کہ جو ان سے نیچے ہیں وہ ان کے برابر پہنچ جائیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ کچھ لوگ ان سے نیچے ضرور رہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کچھ لوگ ان کے برابر کیوں نہ رہیں۔ (جانسن)

اشتہا

عقل کو حاکم اور اشتہا کو محکوم ہونا چاہئے۔ (سسرو)

اچھی غذائیں اچھی زندگی کے منافی نہیں ہیں۔ (ارطینوس)

بہتر یہ ہے کہ تم اشتہا کو سزا دو، نہ اشتہا تم کو سزا دے۔ (ٹیکیٹس)

جانور چرتے ہیں، آدمی کھاتا ہے، مگر صرف عاقل و ہوشیار آدمی کھانا جانتا ہے۔

(ساوارین)

دسترخوان کا خرچ اپنی آمدنی کے ربع سے کبھی نہ بڑھاؤ۔ غذا مقوی ہونا چاہئے نہ کہ متکلف۔ ان میں صنعت سے زیادہ قدرت کو دخل ہو۔ انکی تیاری میں اسراف مطلق نہ ہو اگر تمہارے مہمان اچھے قسم کے لوگ ہیں تو تمہاری دعوت دعوت ورنہ تضیع زر ہے، دعوت میں اسراف نمائش ہے۔ (کوارلے)

دعوت میں بے جا تکلف اکثر جنازہ کے تکلف سے مشابہ ہوتا ہے۔ (ولیس)

اعتدال اور محنت انسان کے دو بہترین طبیب ہیں، محنت اشتہا کو بڑھاتی اور اعتدال اس کو زیادتی سے ہمیشہ روکتا ہے۔ (روسو)

ایک مستحکم اشتہا ایک عظیم جزو آزادی ہے۔ (سنیکا)

اپنی خواہشات کو جتنا دباؤگے اتنا ہی ان پر قابو رکھوگے۔ خواہش اور عقل مثل دو ڈولوں کے ہیں جنمیں سے ایک اگر اوپر رہتا ہے تو دوسرا ضرور نیچے ہوگا۔ (کالیر)

جس طرح دوائیں تولہ ماشہ کے حساب سے کھاتے ہو اسی طرح تندرستی کے واسطے غذائیں بھی تول ناپ کر کھایا کرو۔ (اسکلٹن) (باقی آئندہ)

[1] مقابلہ کرو۔ بنی آدم اعضائے یکدیگرند ٭ کہ در آفرینش زیک جوہر اند۔ اگر عضوے بدرد آورد روزگار ٭ دگر عضوہا را نماند قرار (شیخ سعدی)۔

علم کی تشنگی

دولتِ دنیا نہیں، آسائشِ عقبیٰ نہیں / تشنگی، کم ہے کہ، میرے لئے زیبا نہیں
عرصۂ عشرت نہایت تنگ ہے میرے لئے / خواہشِ دنیا و عقبیٰ ننگ ہے میرے لئے
نعمتِ حور و طہور و دولتِ تاج و سریر / ہو نہیں سکتے ہیں میرے ولولے اتنے حقیر
اس زمیں کو، اور خطابِ "نعمتِ بسیار" دوں، / آسماں بھی سامنے آئے تو ٹھوکر مار دوں
اپنی چوکھٹ پر جھکاؤں صرف گردوں کی جبیں؛ / اس تصور کو بھی میں برداشت کر سکتا نہیں
کیا؟ مرا نقشِ قدم ہو، اور جبینِ آفتاب!! / اس قدر رذیل نہیں میری تمناؤں کے خواب
اُڑ سکوں عرشِ بریں پر، اور سمندر پر چلوں؟ / میں ہوں شاعر، اس قدر اوچھی تمنا کیوں کروں؟
"لے یہ دنیا کے خزانے ہیں۔ یہ نقد و جنس دیں"؛ / اے خدا! شاعر سے یہ کہنا تجھے زیبا نہیں
مجھکو تو پیغمبری دے، اور نہ شاہنشاہ کر / بن پڑے تو سرِ موجودات سے آگاہ کر

اپنے اصلی خال و خد سے آشنا کر دے مجھے
بندگی اک جہلِ مطلق ہے "خدا" کر دے مجھے

(جوشؔ)

مردِ مُضحکہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

(از جناب اسرائیل احمد صاحب سکندرآباد دکن)

باب

فصل

ایک بیزو تند شمالی ہوا سارے براعظم یورپ پر چلی، اور جب یہ طوفان باد انگلستان پر سے گذرا تو شدید تر ہوگیا۔ یہ دسمبر ۱۶۸۹ء کا ماہ و سال تھا۔ طوفان ۱۶۹۰ء کی جنوری تک طوالت پذیر رہا۔ دریائے ٹیمس یخ پوش ہوگیا۔ جغرافیہ طبعی کا یہ ایسا نظارہ تھا جو پوری صدی میں شاید ایک ہی دفعہ دیکھنے میں آتا ہے، اس لئے کہ بحر اعظم کے مدّ و جزر کی پیہم ضربوں سے ٹیمس کی امواج کا انجماد ناممکن ہوتا ہے۔ برف کے براق تختے پر، جو دریا پر دور دور تک بچھ گیا تھا، گاڑیاں اور سواریاں نقل و حرکت کرنے لگیں۔ لوگوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ اور ایک میلا سا جم گیا۔ یہ جنگل میں منگل تھا۔ "سردی" کی سرگرمی تھی۔ تفنن طبع کے مستانہ جوش میں لوگوں نے ایک بڑا بیل ذبح کیا، اور اسے سلم بھونا یہ عجیب و غریب مناظر پورے دو مہینے تک جاری رہے۔ سنہ ۱۶۹۰ء کی سردیوں کی شدت سترھویں صدی کی یادگار موسم سرما پر بھی سبقت لے گئی۔ ڈاکٹر گڈمین ڈیلین نے ان غیر معمولی موسمی انقلابات کے مشاہدات بڑے ذوق علمی اور دقتِ نظر کے ساتھ قلمبند کئے، اور ان کی ان نادر علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کے اعزاز پر شہر لندن کی پبلک نے ان کا ایک نیم جسم بت نصب کیا۔

ان ہی ایام میں ایک دن شام کے وقت ساحل پورٹ لینڈ کی ایک طوفانی خلیج میں کچھ خلاف معمول حوادث پیش آرہے تھے۔ بحری طیور اور آبی جانور سمندر کے شور و شر سے ڈر کر کنارے پر نکل آئے تھے۔ اور اپنے اصلی "عنصر" (مساکن آبی) میں واپس جانے سے خائف تھے۔

اسی خلیج میں بحر مواج کے طوفان و تلاطم سے بچنے کے لئے ایک میانہ قامت کا جہاز اس وقت پناہ گزیں ہے، جس موقع پر وہ لنگر انداز ہے، ایک مامون "گودی" ہے:

آفتاب سارے دن ابر و غبار میں روپوش رہا تھا۔ اور اب غروب بھی ہوگیا تھا۔ سارے عالم آب پر اک یاس و حسرت کا منظر طاری تھا۔ گویا افق عالم سے آفتاب جہاں تاب کی "رحلت" پر محفل قدرت نے صف ماتم بچھائی تھی۔ سمندر بھی اب قدرے سکون پر تھا۔ اور خلیج کے اندر بھی کوئی تموج نظر نہ آتا تھا۔

خوش قسمتی سے یہ سردیوں کا زمانہ تھا، اس لئے کہ ایسا حسن اتفاق شاذ و نادر ہی ہوا کرتا ہے پورٹ لینڈ کے ساحل بحر کی ساری خلیجیں ریتیلے کنارے رکھتی ہیں، طوفانی موسم میں ان موقعوں سے صحیح و سلامت گذر جانے کے لئے بڑی چابکدستانہ کشتی رانی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ یہاں کے بندرگاہوں میں جہازوں کی حفاظت کی خاطر کوئی قدرتی لوازم نہیں ہیں۔ اور بالعموم ان میں داخلہ، اور ان سے خروج، ہر دو مخدوش ہوا کرتے ہیں۔ مگر ان تمام معمولات و روایات کے خلاف آج یہ نواح بالکل پرسکون اور بے خطر ہے۔

پورٹ لینڈ کا جزیرہ نما، اگر شاعرانہ تصور کی عینک سے دیکھا جائے تو ایک پرندے کے سر کی سی ہئیت پیش کرتا ہے جس کی چونچ سمندر کی طرف مڑی ہوئی ہے، اور سر کی پشت ویماؔتھ کی طرف مائل ہے۔ اس موقع پر جو خاکنائے پیدا ہوگئی ہے وہ سر اور سینہ کے مابین اس پرندے کی گردن کی شبیہ بن گئی ہے۔

پورٹ لینڈ کا سارا اقتصادی وجود اس تجارتی کاروبار سے وابستہ ہے، جو وہاں جاری ہے۔ اس خطّے کا گذشتہ صحرائی منظر موجودہ تمدّنی رونق سے بہت کچھ

کچھ کم ہوگیا ہے۔ سواحل پورٹ لینڈ کا انکشاف سترھویں صدی کے وسط میں ملاحوں نے کیا تھا۔ اسی زمانہ سے پورٹ لینڈ کے پتھر سے وہ صنعت چلی آرہی ہے جس کو "روہن سیمنٹ" کہتے ہیں۔ یہ بڑی نفع بخش حرفت ہے۔ جس نے اس آبادی کے اس حصہ کو مالامال بنا دیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی خلیج کے قدرتی منظر کے سارے حسن کو بھی تباہ کر دیا ہے۔ سمندر کی موجوں اور لہروں کی شکست و ریخت نے اس ساحل پر بہت کچھ رد و بدل کر ڈالا ہے اور اکثر موقعوں پر ریگ و گل کٹ کٹ کر ریت کی سطح کی سنگلاخ چٹانیں نکل آئی ہیں۔ قدیم ایام میں پورٹ لینڈ کا بندر جو بحری انجنیری سے بنایا گیا تھا بہت مشہور تھا۔ اس کے شکستہ آثار جا بجا اب بھی نظر آتے ہیں۔ اور مختلف موقعوں پر لنگرگاہ کی ساری ضروری تعمیرات کے باقیات دیکھے جا سکتے ہیں۔ قدیم گودی کے ستون ہمارے جہازی کی ہستی ہوئی یادگاروں کی نشانیاں دہی ہیں ممکن ہے۔

شام کا ملکا حجاب اور بعد ازاں شب کی دبیز نقاب چہرہ عالم پر پڑتی ہے مغرب کے وقت کی شفقی سرخی و زردی اور جھٹپٹے کی نیم سیاہی رفتہ رفتہ کامل تاریکی میں بدل ہوگئی ہے۔ غور سے دیکھنے سے وہ کشتی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے گودی کے کنارے سے بندھی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگرچہ اب تمام مناظر پر کالی رات کے تہ بہ تہ پردے پڑتے چلے جاتے ہیں۔

کشتی پر اک تختہ رکھا جاتا ہے، اور اس کے ذریعہ ساحل سے اتصال قائم کیا جاتا ہے۔ تاکہ کشتی کے مسافر خشکی پر اتریں۔ ناگاہ سیاہ سیاہ پیکر ادھر ادھر تلملاتے نظر آئے۔ اور چند لوگوں نے کشتی کے عرشے کو چھوڑ کر زمین پر قدم رکھا۔

خلیج کا درجۂ حرارت کھلے سمندر کی سردی سے زیادہ تھا۔ صفائی موسم کی لطیفاً اس خوشگوار اعتدال کے لئے ہمیں اس کوہستانی چٹان کا ممنون ہونا چاہئے جو اک دیمے کی طرح اس جہازی پناہ گاہ پر چھائی ہوئی تھی۔ الغرض یہاں لوگ سردی کی شدت سے لرزندہ براندام نہ تھے۔ اگرچہ بندرگاہ سے باہر "صحن بحر" پر بھی کیفیت تھی۔

کشتی سے اترنے والے اپنے کام میں بہت سرگرم اور شتاب کار معلوم ہوتے ہیں۔ نیم تاریکی میں ان کے جسم ایسے نظر آتے ہیں۔ کہ گویا وہ کاٹھ کی پتلیاں ہیں جن کو کسی مصنوعی اور مخفی "ریشہ دوانی" سے متحرک کر دیا گیا ہو۔ ان کے لباس کی ہیئت کذائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انگلستان کے اس طبقہ آبادی سے تعلق رکھتے ہیں، جس کے افراد اپنے بدن پر کپڑوں کے بجائے چیتھڑے لگائے پھرتے ہیں۔ اس سنگستانی چٹان پر چڑھنے کا راستہ بڑا پیچ در پیچ تھا۔ اور اس قدر دشوار گذار کہ بجائے انسان کے پہاڑی بکریوں کی چال ہی اس کی حریف ہو سکتی تھی۔ یہ راستہ ایک عمودی حالت میں اٹھتا ہوا اس تخت نما قطعۂ سطح پر جا کر ختم ہو جاتا تھا جس پر اہل کشتی ابھی تک کھڑے اتر رہے تھے، یہ راہ اپنی بالائی منزل میں درحقیقت پیچ در پیچ ہو گئی تھی۔ قدم قدم پر اک موڑ تھا۔ اور گوشے گوشے پر اک عقدہ کا سامنا۔ جگہ جگہ اک درخت منظر بنے ہوئے تھے۔ اور کوہستانی رستے کی آبرو رہے مسافروں کے لئے ایک خوف سہرا رہا تھا جس کشتی جن لوگوں کا انتظار کر رہی تھی وہ امید ان ہی ناقابل گذر ڈھلوانوں سے ہو کر اس سطح مرتفع سے رستہ ہوں گے۔

کشتی میں سوار ہونے کی کارروائی بڑی احتیاط اور رازداری سے معلوم ہوتی تھی۔ سب دم بخود تھے۔ اور ایک ایک قدم پھونک پھونک کے رکھ رہے تھے ان کی تمام حرکات و سکنات سے بہ حقیقت عیاں تھی کہ انہیں کسی کا خوف ہے ہجوا خلیج زنگسٹینڈ کے ایک حصہ میں ماہی گیر کشتیوں کا اگرچہ ایک پورا بیڑا لنگر انداز تھا۔ لیکن ان کی طرف سے یہ لوگ مطلق خائف نہ معلوم ہوتے تھے، گویا ان کی موجودگی کو انہوں نے نظر انداز سی کر دیا تھا۔

یہ شکاری بیڑا دراصل ان ڈنمارک کا تھا جن کو سمندر کی مچھلیوں نے اس ملک کے سواحل پر نہایت کثرت سے یہاں کر انگریزی "پانیوں" میں لا ڈالا تھا۔ سمندر کی یہ ہوسناک فضا باں اکثر جاری رہتی ہیں۔ چنانچہ جو غیر ملکی کشتیاں اس وقت پورٹ لینڈ کے بندرگاہ میں پناہ گزیں ہیں وہ بحر اعظم کے موسم کی ان ہی مطلق العنانیوں کی "صید رسیدہ" ہیں۔

اس بیڑے کو لنگر اندازی میں بڑی بڑی مشکلات میں آ پڑی تھیں۔ کشتیوں کا کماندار ایک بیش قدم کشتی کے اندر وزنی آہنی لنگر کو جھکانے اور گرانے کے کام میں دیر تک اس کے ساتھ دست و گریباں رہا تھا۔ اس نے لنگر کے ثقل کو بڑھانے کے لئے اس کے ساتھ وہ سارے کانٹے برچھے اور جال بھی شامل کر دیئے تھے، جو مختلف قسم کی مچھلیوں اور آبی جانوروں کے شکار میں استعمال ہوتے ہیں۔

سارے جہاز اور کشتیاں باستثنائے چند کے بندرگاہ کے ایک ہی گوشے میں جمع ہو گئے ہیں۔ خلیج کا بقیہ حصہ تقریباً اک "بالکل خالی" بن گیا ہے بر و بحر کے دونوں افقوں پر جہاں تک نگاہ جاتی ہے سارا منظر ویران اور سنسان نظر آتا ہے۔ سطح بحر پر کوئی جہاز ہے۔ نہ روئے ارض پر کوئی مکان۔

ساحل کا یہ حصہ بیشتر غیر آباد ہے۔ خال خال مسافروں کا گذر بھی اب موقوف ہو گیا ہے۔ سال کے اس موسم میں یہ علاقہ پر خطر، اور راستے مخدوش ہو جاتے ہیں۔

سمندر میں نکلنے کے لئے اگرچہ یہ موقع بالکل غیر موزوں ہے اور حالات گردوپیش سفر کی قطعاً اجازت نہیں دیتے، لیکن جو لوگ ابھی ابھی کوہستان کا پرشور راستہ قطع کر کے آئے ہیں اور بندرگاہ کی نا تراشیدہ پلیٹ فارم پر آ کر اس کشتی میں سوار ہوئے ہیں وہ سخ "ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم" کی بیباک تقدیر آزمائی پر تلے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ جلد از جلد محفوظ ساحل کو چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ اور طوفانی سمندر کے سینے پر سوار ہو جانا چاہتے ہیں۔

انہوں نے اپنی کشتی کا لنگر اٹھانے کی آخری تیاریاں کیں، آپس میں جمع ہو کر کچھ مشورہ کیا۔ وہ بہت سہمے ہوئے اور عجلت میں معلوم ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کے تشخص کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے یہ تمیز کرنا بھی دشوار ہے کہ ان کی جماعت میں کون جوان ہے اور کون بڈھا۔ رات کی پردہ پوش تاریکی نے ان کے چہروں پر اک نقاب ڈال رہی ہے۔ تاہم اتنا معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ تعداد میں آٹھ ہیں۔ بدقت نظر دیکھنے سے یہ بھی منکشف ہوا کہ ان کے گروہ میں دو عورتیں بھی ہیں۔ جو مردوں سے بمشکل ہی متمائز دکھائی دیتی ہیں۔ اس لئے کہ ان کا کوئی جداگانہ نسوانی لباس نہیں ہے۔ پوشاک کی نوعیت کے لحاظ سے وہ "مردانہ پوشش" بھی نہیں کہی جا سکتیں، کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ سب چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ہیں۔ اور "چیتھڑوں" کو کس "صنف پوشش" کے تحت شمار کیا جائے۔

اس ٹولی میں ایک چھوٹے قد و قامت کا آدمی بھی ہے، جو ادھر ادھر چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ یہ غالباً بونا کوئی بالشتیا ہے یا بچہ۔

لیکن انسانی نقل و حرکت کے قیافے کا ایک مبصر اس کی تشخیص ایک "بچے" ہی کی حیثیت سے کرے گا۔

فصل ۲

کوئی یہ جا کے مرے ساتھ والوں سے کہہ دے
یہ ناتواں ہے پس قافلہ رہا جاتا

عازم سفر جماعت میں ایک سارق معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک زرق برق صدری پہنے ہوئے ہے جس کے کناروں پر زریں سنجاب لگی ہوئی ہے، اس کے لبادے کے نیچے سے یہ چیز ایسی چمکتی نظر آتی ہے، جیسے کسی مچھلی کے زیر پشت اس کا سینہ! ایک دوسرے شخص نے اپنے چہرہ کے اوپر ایک ادنیٰ نقاب ڈال رکھی ہے جس میں منہ کی جگہ پر کوئی روزن بھی نہیں ہے، جس کی ضرورت پائپ پینے کے لئے ہوا کرتی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی "تعلیم یافتہ آدمی" ہے۔

بچہ اپنے خاک آلود چیتھڑوں کے نیچے ایک ملاح کا کھردری جیکٹ پہنے ہوئے ہے جس میں وہ ننھا سا آدمی بالکل چھپ سا گیا ہے۔ جیکٹ کے دامن چوغہ کی طرح اس کے گھٹنوں سے بھی نیچے لٹکے ہوئے ہیں۔

بچے کے قد و قامت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا سن تخمینۃً دس گیارہ برس کا ہوگا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں بالکل ننگے ہیں، گھر کے آغوش نما صحن میں، تو ان پاؤں سے چلنا پھرنا آسان ہے، لیکن اس سنگدل کوہستان پر یہ پا کوبی کیا معنی رکھتی ہے۔؟

کشتی کا عملہ ایک کپتان اور دو ملاحوں پر مشتمل ہے۔

کشتی اپنی ساخت کے اعتبار سے ہسپانوی معلوم ہوتی ہے، وہ غالباً ہسپانیہ سے آئی ہوئی ہے۔ اور اب اس سفر مراجعت میں اس کی منزل مقصود بھی شاید یہی ملک ہے۔ وہ یقیناً کسی مخفی اور مجرمانہ کام میں مشغول ہے۔ جس کے سلسلہ میں وہ ساحل بساحل سیر و گردش کرتی رہی ہے کشتی کے مسافر آپس میں مصروف سرگوشی ہیں۔

ان کی یہ رازدارانہ گفتگو ایک قسم کی لسان "ریختیہ" میں معلوم ہو رہی تھی جو ہسپانی، فرانسیسی، جرمن وغیرہ زبانوں کے الفاظ سے مخلوط تھی بعض اوقات دو ایک قدیم اور متروک زبانوں کے لغات بھی ان کی زبان پر آ جاتے تھے، یہ گروہ گوناگوں قومیتوں سے مرکب تھا۔ لیکن اتحاد مقصد اور ایک ہی کام میں اشتراک عمل کی بنا پر ان پر ایک "واحد جماعت" کا اطلاق کیا جا سکتا تھا۔

اگر روشنی ذرا زیادہ ہوتی۔ اور ان لوگوں کے ملبوسات و زیورات کے تمام جزئیات کا دیکھنا ممکن ہوتا تو ان کے گلوں میں خاص قسم کی تسبیحیں بھی پڑی نظر آتیں، جو ان کے تار تار اور پارہ پارہ کپڑوں میں کہیں چھپی ہوئی، اور کہیں کھلی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک عورت کی گردن میں، جو اپنی شباہت و ہیئت سے صرف "نیم عورت" معلوم ہوتی تھی، اک ایسی بڑی تسبیح ہزار دانہ تھی جو مشرقی درویشوں کے لوازم زہد میں دیکھنے میں آتی ہے۔ بعض گلوں میں ایسے مالے بھی تھے جو آئرستان وغیرہ ممالک کے مخصوص مذہبی مرکزوں کا تبرک معلوم ہوتے تھے۔

اگر تاریکی نے منظر کو ناقابل معائنہ نہ بنا دیا ہوتا تو دیکھنے والوں کو کشتی کے برجی پر حضرت مریم اور "فرشتے" ولوز سعود کی تصویریں بھی نظر آتیں۔ یہ مرقع مس بگ نقوش شش تھا، اسی کے قریب ایک لالٹین بھی نصب تھی۔ جو اس وقت روشن نہ تھی۔ جیسا ظاہر تھا یعنی اس نازک موقع پر انتہائی احتیاط و اخفا کی ضرورت تھی، لیکن عام اوقات میں یہ لالٹین جلائی جاتی تھی، تو دو اغراض سے۔ ایک تو یہ کہ اس مقدسہ کی شبیہ پر روشنی ڈالی جائے، یا یہ کہ گرد و پیش کی بحری سرزمین اور کشتی کی گذرگاہ دکھائی جانے میں آجائے۔ بظاہر لالٹین کے بھی دوگونہ فرائض تھے۔

کشتی کا اگلا حصہ، جو پانی کو کاٹنے کا کام کرتا ہے بلالی شکل کا تھا۔ [illegible] ایک فرشتے کی تصویر اس وضع سے بنی ہوئی تھی کہ وہ "پاک کنواری" کے قدموں میں اپنے ملکوتی بازو سمیٹے دو زانو بیٹھا ہے۔ فرشتے کی آنکھوں پر نایاب [illegible] کا پردہ سا تھا جس کے متعلق [illegible] "حجاب" اس کی مودب آنکھیں [illegible] کا نظارہ کر رہی تھیں۔ ان سب محترم ہستیوں اور متبرک مناظر کے مرقعے [illegible] رنگ سے بنائے گئے تھے۔

حضرت مریم کی تصویر کے نیچے طلائی حروف میں لکھا ہوا کشتی کا نام تھا "نیبو ڈینا"۔

ابلین فرصت میں ساحل کو چھوڑ دینے اور کشتی کا لنگر اٹھا دینے کے اضطراب [illegible] میں اس جماعت نے اپنا بہت سا سامان بھی خشکی پر چھوڑ دیا۔ جو ذخائر [illegible] اور مختلف اسباب معیشت پر مشتمل تھا۔ اجناس غذا میں مچھلیاں اور دوسرے [illegible] جانور تھے۔ اثاث البیت میں منجملہ دیگر چیزوں کے بحری سفر میں کام آنے والی جہازی مشعلیں اور سگنل کے آلات تھے۔ سارق اور قزاق یات کی بابت [illegible] مال و متاع کا مالک بن جایا کرتا ہے۔ لیکن جس دائمی خوف و خطر میں اس کی زندگی بسر ہوا کرتی ہے، اور جو اس کے مجرمانہ پیشہ کا ناگزیر لازمہ ہے، وہ بعض اوقات اس تمام مال و متاع پر اس کے قبضہ و تصرف کو "حقوق ساقط الملکیت" میں تبدیل کر دیا کرتا ہے۔ تاہم راکبان کشتی نے کوئی ایسی چیز ترک کر دینے کی فروگذاشت نہ کی، جو ان کے کاروبار کے مصرف میں آنے والے ضروری اسباب و آلات سے ہو، خانہ بدوش زندگی میں اور خانہ برانداز قزاقانہ پیشے میں، بالخصوص جبکہ کسی ناگہانی گرفتاری سے بچنے کے لئے عاجلانہ نقل مکانی کی ضرورت پیش آجائے۔ چیزیں کبھی کبھی ایک تکلیف دہ بار بن جایا کرتی ہیں۔ لیکن پھر ان اتفاق و فیز ان احوال سے کوئی مفر بھی نہیں۔

الغرض ان مفرورین کی سرگرمی اور مستعدی قابل دید تھی کسی نے کوئی گٹھڑی اٹھائی تو کسی نے کوئی پیٹی۔ ساحل سے کنارہ کشتی تک، اور کشتی سے لب ساحل تک، ان کی پیہم آمد و شد کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ سب زن و مرد اور خورد و کلاں یکساں مصروف کار تھے، چنانچہ بچہ بھی پوری مستعدی سے حمالی کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ اور ضعیفی و نقاہت کے باوجود زیادہ بوجھ اٹھانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

یہ امر مشتبہ تھا کہ آیا بچے کے والدین اس جماعت میں تھے یا نہیں لیکن بظاہر یہ دستی کی بستی میں "یتیم و بیسہارا" ہی معلوم ہوتا تھا، وہ خاندان کا کوئی "جیہ لطر" آزاد فرد [illegible] اس کے وہ قبیلے کا "غلام" دکھائی دیتا تھا۔ اس سے کم ہی کسی کی ہمدردی [illegible] کی بھلائی پڑتی تھی، اور کوئی شخص اولاد یا عزیز کی طرح اسے منہ نہ لگاتا تھا۔

تاہم بچہ اس پُر اسرار مجمع کا بالکل جزو لاینفک بنا ہوا ہے۔ وہ دوسروں ہی کی طرح دوڑ دوڑ کر چیزیں بھی اٹھا رہا ہے۔ اور جلد جلد وہاں سے چل دینے کے لئے بھی ساری جماعت کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ لیکن یقیناً یہ معصوم نہیں جانتا کہ کیوں اس کے تمام افعال [illegible] کی نقالی سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ اضطراری طور پر خود بخود حرکت میں ہے نہ کہ اس وجہ سے کہ دوسرے بھی اس کو [illegible] نظر آتے ہیں۔

آخر کار سب تیاریاں مکمل ہو گئیں، اسباب کا ایک ایک عدد کشتی میں پہنچ چکا ہے، اور آخری [illegible] بھی تختے کے عارضی پل پر سے منتقل ہو کر کشتی میں جا چکا ہے۔ اب صرف آدمیوں کا سوار ہونا باقی ہے۔ جماعت کی دو عورتیں بھی کشتی کے عرشہ پر نمودار ہو رہی ہیں۔ خشکی پر اب صرف چھ مرد رہ گئے ہیں جن میں وہ بچہ بھی ہے۔

بالآخر کشتی نے روانگی کے لئے پہلی جنبش کی، نا خدا اپنی مخصوص نشست پر آگیا، ایک ملاح نے اس رسے کو کاٹ دیا جس سے کشتی کنارے کے ساتھ لنگر گاہ میں بندھی ہوئی تھی۔ یہ علامت عجلت اور خطرے کی تھی، اس لئے کہ طبعی حالات میں رسے کو کاٹا نہیں جاتا۔ کھولا جاتا ہے۔

"ہوشیار، خبردار!" کپتان کے منہ سے زیر لب آواز میں نکلا، معاً بچہ تختے پر سے دوڑ کر سب سے پہلے کشتی میں جا پہنچے، لیکن فوراً جماعت کے آدمی اس کے پیچھے لپکے، قریب تھا کہ بچہ پانی میں جا پڑے، لیکن خیریت گذری۔ تاہم بچہ کشتی کی سمت میں پہلا قدم بڑھاتے ہی واپس گھسیٹ لیا گیا۔ اب نہایت سرعت کے ساتھ دوسرے آدمی یکے بعد دیگرے دوڑے اور کشتی میں جا داخل ہوئے، سردار نے جو اس تنا

میں پھر خشکی پر لوٹ آیا تھا۔ سب کے آخر میں ساحل کو چھوڑا، درمیانی تختے کا وسیلہ اختیار کرنے کے بجائے وہ براہِ راست ایک رسّہ لٹکا کر کشتی میں جا گرا، اور پھر لات مار کر تختے کو ہٹا دیا۔ جو پانی میں جا پڑا، میخوں کی مبہم دو تین ضربوں سے رسیاں بھی کاٹ دی گئیں، جو کشتی کو لنگر سے ہم رشتہ کیے ہوئے تھیں، مستول استادہ کر دیا گیا، بادبان کھول دیا گیا، اور کشتی پانی کو کاٹتے ہوئے، اور سکوت و حقیقت میں بچہ اور تنہا پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ جو اس وقت حیران و ششدر کنارے پر کھڑا ہوا ہے۔

حبشی بچہ . . .

فصل ۳

بچہ ساکت و صامت کنارے پر کھڑا رہ گیا۔

وہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ نہیں اپنے ساتھیوں کو پکارتا ہے نہ ان سے کچھ فریاد کرتا ہے۔

اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

یہ بات توقع کے بالکل خلاف معلوم ہوتی تھی۔

یہی سکوتِ مطلق اور اندازِ بے اعتنائی کا عمق کشتی میں بھی نظر آتا ہے۔

جس طرح بچے کی طرف سے کشتی والوں کو کوئی "صدائے مدروے" نہ دی گئی، اسی طرح انہوں نے بھی اس کو "خوش آمدی" نہ کہا۔ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ کی یکساں قرات طرفین نے زبانِ حال سے کی۔

بچہ روانہ ہو جانے والی کشتی کو دیکھ رہا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساحل کی سنگین چٹان پر خود اس کے قدم گڑ کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ اس کی جائے قیام کو اب سمندر کے مدّ نے چھینٹے دینا شروع کر دیئے ہیں۔ بالآخر معلوم ہوا کہ اسے اپنے گرد و پیش کی صورتِ حال کا شعور ہوا۔ لیکن آپ کو خبر ہے کہ اس کا خیال کس چیز کی طرف منتقل ہوا ہے!

رات کی تاریکی کی طرف۔

کشتی خلیج کی گردن نما تنگنائے میں داخل ہو رہی ہے، دو طرفہ ساحل دو بلند دیواروں کی شکل اختیار کرتا نظر آ رہا ہے۔ جن کے درمیان آبنائے نے ایک گلی کی سی صورت پیدا کر لی ہے۔ "آبی راہرو" کشتی اسی "بحری کوچے" میں گھس گیا۔ اس وقت اس کا صرف بلند "خرطوم" "مستول" نظر آ رہا ہے۔ آخر کار یہ پیچیدہ راستہ ختم ہو گیا کشتی وسیع بحرِ محیط میں جا پہنچی۔ اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

بچے نے کشتی کی روپوشی کو دیکھا۔ وہ غمگین اور سہمگین ضرور تھا لیکن کسی خاص خیال میں غرق بھی معلوم ہوتا تھا۔ وہ کم و بیش ایک نیم خوابی حالت میں تھا اس کے احساسِ وحشت کو شبِ دیجور کی ظلمت نے شدید تر بنا دیا ہے۔ زندگی کی تصویر کا تاریک ترین رخ اس کے پیش پا افتادہ ہے اور عملی حقائق کے سنگین ترین خط و خال ایک مشاہدہ، کیا اس نے اپنی قوتِ فیصلہ سے کام لینا شروع کر دیا؟ کیا ایک ملہم بالغیب کی طرح اس کے دل و دماغ پر ہفت طبق روشن ہو رہے ہیں؟ جب کسی کمسن بچے پر زندگی کے مصائب کا دور اس طرح قبل از وقت شروع ہو جاتا ہے تو اس کے معصوم قلب کی گہرائیوں میں خدائے حیّ و قیوم کی شان بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ہی کو تولنے کے ایک خطرناک قسم کی میزانِ عدل کھڑی ہو جاتی ہے۔

لیکن اسی لمحے پر اپنی ہی معصومیت کی مبہم صورت بچے کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے، اور اس کی روح ایک نیاز آگیں گداز لطافت میں ڈوب جاتی ہے وہ بالکل رضا بالقضا ہو جاتا ہے۔ بچوں کی فطرت کی ازلی جمالیت جلالِ الٰہی سے آشنا ہونا نہیں چاہتی۔

جس سنگدلی سے شقی القلب انسانوں کی اس جماعت نے اس بچے کا مقاطعہ کیا تھا اس پر اس ننھی سی بے نیاز مخلوق نے ایک آہ سرد بھی نہ بھری صرف اس کے مزاج میں ایک گونہ "صلابت" پیدا ہو گئی۔ فطرت کی جو ناگہانی افتاد دنیا کے اس "نو وارد" کو ایسے وقت میں فنا کر دینا چاہتی تھی، جبکہ ابھی بمشکل اس کے وجود کا آغاز بھی ہوا تھا، اس کے سامنے ذلت سے اس نے سرِ تسلیم خم نہ کیا۔ ایک برقِ خاطف اس پر ٹوٹ پڑی تھی، لیکن وہ ایک سنگین چٹان کی طرح کھڑا رہا تھا۔

وہ عالمِ خیال میں ایسا گم تھا کہ اس "عالمِ آب و گل" کی سردی کا بھی اس نے احساس نہ کیا، آخر سمندر کی موج نے اس کے پاؤں کو تر کیا۔ کیونکہ بحری مد کی ساعت آ گئی تھی۔

بادِ شمال کا ایک تیز جھونکا اس کے بالوں میں سے گزرتا ہوا نکل گیا اس کے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی، ایک بیداری کی پھریری سر سے پاؤں تک اس کے جسم پر چھا گئی۔

اس نے اپنے گرداگرد نگاہ ڈالی۔ اس نے پہلی دفعہ بصحتِ حواس و ثباتِ ہوش دیکھا کہ وہ تن تنہا ہے۔

بلکہ سوائے ان آدمیوں کے انسانوں کی کسی جماعت یا بنی آدم کی کسی دوسری نوع سے اس بچے کو سابقہ نہ پڑا تھا۔ لیکن خود اس اختلاط وارتباط کی باگیں بھی سمجھنے کے قابل ہے جبھی وہ اپنے گروہ کے کسی فرد سے بھی واقف نہ تھا۔

اس کا پورا بچپن ان ہی میں گذرا تھا لیکن ایک لحظہ کے لیے بھی کبھی وہ ان کی آغوش محبت سے مانوس نہ ہوا تھا، وہ اپنی ذات کو اس مجہول الحال برگ کا طبعی جزو سمجھنے کے لئے اپنے سینے میں کوئی انشراح نہ پاتا تھا۔ وہ صرف ان کے حلقہ عمل میں رہا تھا۔ ان کی محبت اس کے دل میں نہیں۔

اور اب ان لوگوں سے یہ بڑے نام تعلق جسمانی بھی اس سے منقطع ہو رہا تھا ایک سرد مہرانہ سیلاب نے ایک عاجلانہ دامن کشی سے بدل گئی تھی۔

بچے کی کس مپرسی اور بے سروسامانی کا کیا عالم ہے اس کے بازو اس کے دو پیال ہیں جن قسم کے چیتھڑوں میں بدن لپٹا ہوا ہے ان پر مشکل سے جامہ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس کی خورجی میں روٹی کا ٹکڑا ہے، نہ اس کی جیب میں تانبے کا پیسہ۔

سردیوں کا موسم ہے اور رات کا وقت، اور قبل اس کے کہ کوئی انسانی آبادی ملے اسے میلوں تک پیدل چلنے کی ضرورت ہے۔

اسے یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کس سرزمین پر کھڑا ہے اور یہ کون سا مقام و نواح ہے۔

وہ اپنے رفیقوں کا حال اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ انہوں نے یہ "رفاقت" بھی اب اس کے ساتھ ترک کر دی ہے۔

وہ اپنے کو ملک حیات سے خارج البلد تصور کر رہا ہے۔

وہ محسوس کر رہا ہے کہ نسل آدم نے اس سے غداری کی ہے۔

اس کی روح کا یہ غیر مسموع شور و شیون بجا ہے۔ آہ کہ وہ صرف دس برس کی ایک جان ہے۔

وہ اک لق و دق ویرانے میں کھڑا ہے، اور اک عالم ہو میں استادہ۔

وہ بحر ظلمات کے طوفانوں کے دو پاٹوں کے درمیان آگیا ہے ایک طرف سے کالی رات، دوسری طرف سے بھیانک سمندر۔

بچے نے فضا میں اپنی باہیں تانیں، اور ایک جماہی لی بیکسی اور بے بسی کی دو طفلانہ دادیں۔

ناگہاں عزم و ہمت کے آثار اس پر نمایاں ہوئے۔ اس نے ساحل کی طرف پشت کی اور خشکی کی طرف لپکا۔

وہ چٹانوں پہاڑیوں پر سے رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کون منزل مقصود اس نے اپنے دل ہی میں طے کر لی ہے۔

لیکن حیات کی اس کی ساری دوا دوش نقش بر آب ہے، وکن منزل کا تعین جا رہا تھا اس کی ساری ہمت انسانی دریا کی رکاوٹ ہے۔ وہ ہر قدم مقدر کے سمندر تلاطم کے سامنے ایک بے پناہ سفر ورزی ہے، جیسے اپنی ہمت ذرا بھی معلوم نہیں۔

بلندیاں۔ پہاڑوں پر چڑھنے کے آدمی اور جانور کے۔ ٹک الٹ انداز میں مگر یہ مصیبت روز ہو گزرتا۔ وہ تو ایک دارو سبانی منازل در اصل کو طے کرنے میں انسانی و حیوانی ہر دو طریق سے کام لے رہا ہے۔ بلکہ نادی پر شادونی مدد کی کسی جلد رفت تھی لیکن زمہریری سردی نے اس کے سنگریزوں کو بھی یخ جامد اولے بنا دیا تھا۔ جو کسی اور جسم یا سائر کے تموز کی جلد کو ریزہ ریزہ کئے ڈالتے تھے۔ اس کا کوٹ جو اسے اتر کے برابر تھا اور ہوا کی شدت سے کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا اس کی رفتار میں مزید دقتیں پیدا کر رہا تھا۔ کہیں کہیں رستہ کاوی تو وہ پسل راہ میں حائل ہو جاتی تھی۔ ان موقعوں پر ناآزمودہ کار مسافر بے بس حادثہ تھا کبھی تو جگہ جاکر ٹھہرتا اور میں سے جھنڈ جھنڈ کسی گھاس یا کسی جھاڑی کی ٹہنی کو پکڑ لیتا اور ادھر ادھر کی طرف اچک جاتا۔ ایک مقام پر سامنے پتھر کا ایک تختہ آیا ہم اور وہاں ہی اس پر بچے کا قدم پڑا پتھر نے جواب دے دیا۔ اس قسم کا پتھر بعض اوقات "ریگ رواں" ثابت ہوا کرتا ہے۔ اور نادانستہ کار چلنے والوں کو لغزش میں آتی ہے۔ چنانچہ بچہ بھی بے اختیار پھسلا اور تھوڑی دور تک اسی طرح لڑھکتا چلا گیا۔ جس طرح کسی چھت پر سے کھپریل کا کوئی ٹکڑا سرکا ہو۔ بالآخر سوکھی گھاس کا ایک بوٹا ملا جس پر اس نے بروقت ہاتھ مارا اور خوش قسمتی سے وہ اس کی گرفت میں آگیا۔ اس طرح اس چھوٹے سے حادثے کا انجام بخیر ہوا۔ گذر انسانیت سے عاری چٹانوں اور قلب انسانیت سے خالی غاروں کی ان "سرزمینوں" کو اس نے ویسے ہی صبر و شکر سے برداشت کیا جس کا ثبوت اس نے اپنے ان "انسانیت مآب" محسنوں کے معاملہ میں دیا تھا۔

حیران نے پھر کر ہمت چست کی، اور اک مختصر وقفے کے بعد پھر بالائی سفر کو از سر نو طے کرنا شروع کیا۔ لیکن اس ناقابل گذر سنگستان کے "پل صراط" کو قطع کرنا زمین کی طنابیں کھینچنا تھا۔ قلہ کوہ بالکل عمودی ہیئت میں بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ اور پھر اس کا کوئی اور چھور معلوم نہ ہوتا تھا۔ بچہ برابر چڑھتا چلا جاتا تھا۔ لیکن راہ میں کوئی اختصار ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ گویا پہاڑ بھی اس کی چڑھائی کے ساتھ ساتھ اونچا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پہاڑ نے بچہ کی منزل مقصود ہی کو ناپید و بے نشان نہیں کر دیا تھا بلکہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی سر بفلک چوٹی خدا کی بہشت اور اس ناکردہ گناہ "رامدۂ درگاہ"

کے درمیان ایک برزخ بن گئی ہے۔

آخر بہزار خرابی وہ چوٹی پر جا پہنچا۔ اور خدا خدا کرکے یہ فانی سفر ختم ہوا اس وقت بچہ [illegible] کی سطح پر کھڑا [illegible] سامنے اک وحشت [illegible] [illegible] آ گئی۔

بچے کے سامنے اب [illegible] کا منظر [illegible] بیدار کرتا چلا گیا ہو [illegible] ایک [illegible] تحت [illegible] برف کی [illegible] ہوئی چلی گئی ہے اور دور جاکر نیلگوں افق آسمانی کی [illegible] مکان پڑ رہا ہے۔ [illegible] پر سانکا سے [illegible] اور [illegible] معدوم [illegible] کہیں کسی نوعے کی [illegible] نظر نہیں آتی کسی کسی جگہ خشک [illegible] گھانسیں اور جھاڑیوں کی چوٹیاں برنانی [illegible] کا نیتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ دراصل یہ کوئی نباتاتی [illegible] نہیں۔ بلکہ ہوا نے ادہ برف کے گالے ہیں جنہیں ہوا اڑا اڑا کر یہ مغالطہ آمیز نظارہ پیش کر رہی ہے۔ زمین کی صورت یخ جامد کے اس دبیز گدیلے کے نیچے گم ہے۔ [illegible] مطلق طاری ہے۔ جو ذات سرمدی کی طرح ہر شے پر حاوی و مستولی ہے۔ اور جس نے ساری کائنات پر اک منظر ممات کا "کفن" ڈال رکھا ہے۔

بچے نے پھر سمندر کی طرف رخ کیا۔

بحر زخار کی ناقابل پیمائش وسیع دامانیاں سامنے تھیں یہاں "مینیوشا" بھی دکھائی دی۔ جو اپنی بجھی ہوئی لالٹین کے ساتھ بحر ظلمات کے سینے پر رواں تھی۔ اس کی قامت اب لحظہ بلحظہ کم ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ سطح بحر پر فاصلے کے سواد میں اک کشتی اک برف کے تودے کی مثال جس طرح "تحلیل" ہوتی نظر آیا کرتی ہے، وہ بھی ایک دیدنی تماشا ہوا کرتا ہے۔

یکبارگی مینیوشا کی لالٹین روشن ہوئی۔ اور اس روشنی میں دیکھا گیا کہ اہل کشتی کہیں سے نظر آتے ہیں۔ اب ناپیداکنار بحر اعظم میں یہ نورانی نقطہ نقرہ آسمانی کے کسی تارے کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ عالم تخیل کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ گویا سمندر میں واقع ہو جانے والی کسی میت کا "تابوت" ہے، جس پر ایک "چراغ مزار" جل رہا ہے۔

سمندر کے اندر طوفان کے آثار نظر آئے، بچہ اس "بحری انقلاب" کی آمد آمد سے قطعاً غیر متاثر رہا، لیکن نہنگ آہنگ جہازراں کے لئے بھی یہ کانپ اٹھنے کا مقام تھا۔ یہ وہ ساعت قیامت تھی جس کو بے جان عناصر "زندہ وجود" بنتے معلوم ہوتے ہیں ساری فضا اک "ذی شعور ارادے" کی حامل بن جاتی ہے، ایک ایک لہر اک اژدر کا روپ اختیار کرلیتی ہے۔ ہوا کے تھپیڑے "نطمہائے یا اللہ" کی ضربت حاصل کر لیتے ہیں۔ کرۂ بادکی شورش "نفخ صور" کی ہمنوائی کرنے لگتی ہے۔ اور بحر مہیب کی سطح متلاطم عرصۂ محشر کا منظر پیدا کرلیتی ہے

فطرت کا حسن خوابیدہ اک رستخیز کا سید ری کی انگڑائی لیتا ہے [illegible] انسان ضعیف البنیان کی جان [illegible] کائنات کی [illegible] سے اپنے کو دوچار پاتی ہے۔

طوفان سمندر میں اک طوفان بے تمیزی بپا کر [illegible] [illegible] ساکت تھی، اب فطرت کے اس ہولناک "ڈرامے" [illegible] ہے جیسے طبیعات کی زبان میں طوفان [illegible] کہتے ہیں۔

سمندر میں اک [illegible] رہا ہے، جہازوں اور کشتیوں نے خشکی کا رخ کر دیا [illegible] قریب ترین ساحل کی کسی نزدیک ترین گودی کی طرف گریز اختیار کر رہی ہیں۔ بحری پناہ گاہوں کی سمت میں اک "دوڑ" سی جاری ہو۔ گھٹا ٹوپ بادلوں کے دل کے دل چھا رہے ہیں جنہوں نے رات پر اک [illegible] رات پیدا کر دی ہے۔ ظلمات بعضہا فوق بعض کا نقشہ ہے۔

فی الواقع سمندر میں نکلنے کا یہ کوئی موقعہ و محل نہ تھا لیکن جرائم پیشہ لوگوں کی اس کشتی کے راکبوں نے خدا معلوم کون سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا تھا کہ [illegible] گویا ان کا بوجھ سنبھالنے کی تاب نہ لا سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے خوفناک سمندر کو اپنا "دارالامان" قرار دیا تھا اور اپنے کو اسی کی آغوش کے حوالے کر دیا تھا۔

اس اثنا میں متلاطم کرۂ ہوائی میں اک متواج دھارا آیا، جس کا رخ خشکی سے عین برعکس سمت میں واقع ہوا تھا "مینیوشا" نے اپنے کو لنگر و بادبان ہر دو سے آزاد کر لیا اور مصداق

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کو توڑ دوں

اسی تند جھکڑ کی رو میں اپنے تئیں ڈال دیا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس دوز سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتی ہو اور بیش از بیش ساحل سے دور ہو جانا چاہتی ہو۔ اہل کشتی کی نیت و غایت کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ خلاف توقع نہ تھی اس لئے کہ درحقیقت یہ کوئی "سفر" نہ تھا۔ بلکہ اک "فرار" تھا مسافروں کے سامنے کوئی "منزل مراد" نہ تھی، انکے پیچھے اک "نامراد تعاقب" تھا، "سمندر" میں اتنا خطرہ مضمر نہ تھا جتنا کہ "خشکی" میں، "آب و ہوا" کی دار و گیر سے اس قدر بھاگنے کی ضرورت نہ تھی جس قدر کہ "آب و گل کے پتلے" انسان کی گرفت سے۔

الغرض کشتی لحظہ بلحظہ دور تر اور کوتاہ تر ہوتی چلی گئی۔ اور بالآخر "عمق افق" میں غرق ہو گئی۔ جو ستارہ نما روشنی اس میں ٹمٹماتی دکھائی دے رہی تھی وہ بتدریج زرد ہوتی گئی۔ اور ایک وقت جاکر تاریکی سے واصل ہو گئی کشتی بھی درجہ بدرجہ رات کی سیاہی میں جذب ہوتی گئی۔ اور آخر کار اسی میں معدوم ہو گئی۔

بچے نے بھی مایوس نظارہ ہو کر اپنی آنکھیں سمندر کی طرف سے پھیر لیں

[illegible]

دکھیا ماں

(گوروتن داس سبوانی)

تجھے کس نے ستایا ہے ماں؟ تیرے بال بکھرے ہوئے ہیں! تیری آنکھوں میں آنسو ہیں! تو رو رہی ہے! ماں پیاری ماں تجھے کس نے ستایا ہے؟

تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔ وہ تیرے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیں گے، ماں تو غم نہ کر، تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔

ماں وہ کمزور نہیں ہیں۔ ان میں ہمت ہے۔ حوصلہ ہے دل ہے، دماغ ہے۔ سب ہے ماں، سب کچھ ہے۔ ماں تو فکر نہ کر غم نہ کر۔ وہ دن گئے ماں، جب وہ بچے تھے، جب وہ نادان تھے۔ لیکن ماں اب وہ تیری عزت کو تیری آبرو کو سمجھتے ہیں۔ ان میں عقل آگئی ہے۔

وہ کریں گے ماں سب کچھ کریں گے وہ تیرے دشمنوں کو پچھاڑ دیں گے۔ ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھیں گے۔ ہاں ماں، تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔

جب وہ سب مل کر تیرے گرد جمع ہونگے تو تو پرسن ہو جائے گی۔ تو مسکراوے گی، تیری خوشی کا ٹھکانا نہ رہے گا۔ اور ... اور جب وہ سب مل کر تیری جے کے نعرے لگائیں گے، تو تیرے دشمن دہل جائیں گے۔ کانپ اٹھیں گے۔

جب وہ حسن و عشق، دھرم ادھرم، مذہب و ملت کے جھگڑے چھوڑ کر میدان میں آئینگے، اور دشمنوں کو للکاریں گے۔ تو دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

وہ تجھے خاک سے اٹھا کر تخت پر بٹھائیں گے، تیرے سر پر تاج رکھیں گے، تیری پوجا کریں گے، تو ان دنوں کو بھول جائے گی ماں ... یقیناً بھول جائے گی۔

ہاں ماں تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔

ہندوستانی پردہ

(از جوش ملیح آبادی)

مسلمانو! صاف لفظوں میں کیا تم اپنے خدا اور اپنے رسول دونوں سے زیادہ غیرت مند نہیں بنتے؟ ایک دم سے بھڑک اٹھنا، بے سمجھے بوجھے مشتعل ہو، دوسروں کی باتیں صبر کے ساتھ سننے کی عادت ڈالو۔ یقین مانو ہر وہ بات جو تمہارے مزاج کے خلاف ہو لازمی نہیں کہ ہمیشہ غلط ہی ہو۔ بات سننے سے پہلے ... ہو جانا آدمی کے واسطے زیبا نہیں۔ یہ روش تو بادشاہ ذہیر اس عہد کی یادگار ہے جب ہمارے اجداد جنگلوں میں رہا کرتے تھے۔

سنو! میں بالفاظ دیگر تم سے پھر یہی سوال کرتا ہوں کہ اے پردہ کے حامی مسلمانو! اے اپنی عورتوں، اور اپنی آئندہ نسلوں کے قاتلو! کیا واقعی تمہارا پردہ یہ غیر ملفوظ اعلان نہیں ہے کہ تم اپنے خدا اور اپنے رسول دونوں سے زیادہ غیرتمند واقع ہوئے ہو؟

تم سمجھے بھی میں کیا کہہ رہا ہوں؟ تم سے مجھے یہ بہت سخت شکایت ہے کہ تم بیداری و زندگی کی باتوں کو بہت دیر میں سمجھا کرتے ہو۔ نہیں یہ بھی میں تمہاری خوشامد کر رہا ہوں، حالانکہ واقعہ تو در اصل یہ ہے کہ زندگی و بیداری کی باتیں سمجھنے کی تم میں کئی صدیوں سے صلاحیت ہی باقی نہیں رہی ہے۔

لیکن اس باب میں تم سخت مجبور بھی ہو، تمہاری صلاحیتوں کو تو نہایت چالاکی کے ساتھ سُلا دیا گیا ہے۔ تمہاری عقلوں پر تو قبہائے حرام کے پیچھے دوڑنے والے ریاکار "علمائے دین متین" اور "گندم نما" صوفیائے خانقاہ نشین" کی جھوٹے وضو کے پانی سے پالی ہوئی سفید و سیاہ ڈاڑھیوں کی دھوپ چھاؤں کے مضبوط جال تنے ہوئے ہیں۔

تمہاری عقلیں اس جال کے نیچے پھڑک رہی ہیں اور لطف تو یہ ہے کہ تم اس پھڑکنے کو اتباع کتاب و سنت کی چہل پہل سمجھ رہے ہو۔

ہاں تو میں تم سے دریافت کر رہا تھا اے "علما زدہ" اور "صوفیا گزیدہ" بھولے مسلمانو! کیا واقعی تم اپنے کو اپنے خدا و رسول دونوں سے زیادہ غیرت مند نہیں سمجھتے؟

میرا مدعا صاف لفظوں میں یہ ہے کہ جب تمہاری کتاب، یا یوں کہو تمہارا خدا عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے اور تمہارا رسول عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے کا حکم صادر نہیں فرماتا، تو پھر یہ تمہارا پردہ کیا اس بات کا گستاخانہ غیر ملفوظ اعلان نہیں ہے کہ تم نعوذ باللہ اپنے خدا اور اپنے مقدس رسول دونوں سے زیادہ غیرتمند واقع ہوئے ہو؟

کیا تم نے اپنی کتاب کے آیاتِ حجاب کا مطالعہ خود کیا ہے؟ یا اپنے محلے کی مسجد کے بڑے مولوی صاحب ہی کے ارشادات عالی پر عمل پیرا ہو؟

مسلمانو! میں سفارش کرتا ہوں کہ برائے خدا و رسول، تم قرآن حکیم کی سورۂ "نِسَاء"، "نُور"، اور "احزاب" کا خود مطالعہ کرو۔ اور جیسا کہ خود تم سے قرآن بار بار مطالبہ کرتا ہے تدبر و تفکر سے مطالعہ کرو۔

اگر تقلیدی آوازوں کی طرف سے کان بند کر کے صحیح اسلامی طرز پر تم مطالعہ کرو گے تو آن واحد میں یہ حقیقت تم پر کھل جائیگی کہ تمہارا یہ پردہ جس پر تم آج اس قدر اترانے پھر رہے ہو اسلام سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا۔ بلکہ تم پر یہ بھی واضح ہو جائیگا کہ از روئے اسلام حشر کے روز تم سے اس ظلم و بدعت کا جواب بھی طلب کیا جائیگا کہ کس خطا پر تم نے حوا کی بیٹیوں کو حبس دوام کی سزا دے رکھی تھی۔

ہاں، تمہارے اس پردے کے جواز کی ایک صورت ضرور نظر آتی ہے۔ سورۂ "نساء" میں ارشاد ہوتا ہے کہ "تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بدچلنی کی مرتکب ہوں، تو چاہیئے کہ اپنے آدمیوں میں سے چار آدمیوں کی اس پر گواہی لو، اگر چار گواہ بیان دے دیں تو پھر ایسی عورتوں کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ موت ان کی عمر ختم کر دے۔"

اے غیور مسلمانو! تمہیں اپنی معصوم بہو بیٹیوں کی مسلّمہ عصمت و عفت کی قسم، سچ کہو، کیا اس وقت غصے کے مارے تم دیوانے نہ ہو جاؤ گے، جب کوئی شوخ چشم تم سے یہ پوچھ بیٹھے گا کہ اے مسلمانو، کیا اسی حکم قرآنی کے اتباع میں تم نے اپنی عورتوں کو زندگی بھر کے لئے گھروں میں بند کر رکھا ہے؟

کیا تمہیں نہیں معلوم ہے کہ خود تمہارے برگزیدہ رسول کی زندگی میں مسلمان عورتیں باہر آتی جاتی تھیں، اپنا تمام کام کاج خود کرتی تھیں، اور غزوات میں مسلمانوں

[illegible] سے یہ وجہ [illegible] تی ہی؟

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] بیبیاں اور بیٹیاں، رسول کی بیویوں اور بیٹیوں سے بھی [illegible]

[illegible] صولت و شوکت پر پابند کیا جا رہا ہوں

آخر وہ اُمّت [illegible] کی جو اپنے رسول [illegible] وہ بندے [illegible]

اپنے خدا سے نہ بڑھ جائیں!

اے ابلیس! یہ نمایاں فتح مبارک ہو!!

شاید تم میں سے کوئی اس موقع پر یہ سمجھکر کہ وہ زمانہ [illegible] رہا ہے، یہ کہے کہ "جناب وہ عرب تھا۔ یہ ہندوستان ہے، وہاں ایک ہی قوم آباد تھی یہاں ستر ہزار قومیں بستی ہیں"

سب سے پہلا اعتراض تو اس بات پر یہی ہے کہ ہندوستان میں ستر ہزار یا متعدد قومیں بستی ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے، قوم تو یہاں بھی صرف ایک ہی بستی ہے، جسے "ہندوستانی" کہتے ہیں۔ البتہ مذاہب مختلف ہیں، سو عرب میں بھی مسلمانوں کے دوش بدوش بت پرست موجود تھے اور مسلمان عورتیں اُن بت پرستوں، اور منافقوں سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔

دوسرا اعتراض اس پر یہ وارد ہو سکتا ہے کہ جب آیاتِ حجاب کا نزول ہوا تھا، آیا خدائے بزرگ کے علم میں یہ بات تھی کہ اسلام عرب سے باہر بھی نکلے گا، مسلمان دوسری قوموں کے دوش بدوش بھی زندگی بسر کریں گے، اور ۱۹۳۸ء میں آٹھ کروڑ مسلمان، محکوموں اور غلاموں کی طرح ہندوستان میں رہنے پر مجبور ہوں گے؟

اگر خدا کے علم میں یہ بات تھی، تو کیا ہندی عورتوں کے احکامِ حجاب کے باب میں اُس سے بھول ہو گئی؟ اُن کے ذہن میں اتنی سی موٹی بات بھی نہ آئی کہ اسلامی پردہ ہندوستان میں کیوں کر قبول ہو سکیگا؟

اور جس وقت پیغمبرِ اسلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر "دین کے "مکمل" اور نعمتوں کے "تمام ہو جانے" کا بشارت دہ اعلان فرمایا تھا، کیا حضور کے پیشِ نظر اس وقت یہ بات نہ تھی کہ ہندی عورتوں کے پردے کے باب میں قرآن کے آیاتِ حجاب، تشنہ، غیر مکمل، اور نا تمام ہیں؟

[illegible] وقت [illegible] کی عبرت [illegible] نہیں [illegible] بڑی بوڑھیوں سے تاریخ [illegible] واقعہ سنا دوں [illegible] کے کانوں سے سنو۔

[illegible]

[illegible] تھے۔

[illegible] کا اندیشہ [illegible] ہوں۔ تمہارے [illegible] کہ میں [illegible] بلکہ دوش بدوش [illegible] جنگ کے شعلوں [illegible] رہی ہوں [illegible] کوئی بات نہیں [illegible] جنگ کی طرف اس لئے للکار رہی ہوں کہ معاملہ بے قوم غیرت [illegible] کا [illegible] کی سربلندی کا، یہ معاملہ ہے روحِ عرب کی سرفرازی کا [illegible] ایک ماں کے بیٹے ہو اسی طرح ایک ہی باپ کے فرزند بھی ہو [illegible] نہیں کی۔ تمہارے ماموں کو رسوا کیا [illegible] بیٹو! آج سعادت کا دن ہے۔ آج تم مجھ سے بھی یہ باتیں نہ کرنا، اور مجھے بھی رسوا کرنے سے احتراز کرنا!!

مسلمانو! یہ بڑھیا کتنی بڑی آگ تھی، جو تمہارے مَردوں ہی میں نہیں، تمہاری عورتوں تک کے سینے میں شعلے مار رہی تھی۔ ذرا اپنی پردے میں بیٹھنے والی عورتوں کے سینے چاک کر کے دیکھو، کیا وہ بھی اسی طرح مشتعل ہیں؟

اِس تو جو واقعہ میں بیان کرنا چاہتا تھا، وہ بھی سُن لو۔ شاید کوئی سبق حاصل کر سکو۔

یہ عراقِ عرب کی جنگ کا واقعہ ہے، مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی خاطر عیسائی، بحر و بر سے آندھیوں اور طوفانوں کی طرح اُمڈے چلے آ رہے تھے۔

خانقاہ نشین راہب، اور خلوت گزیں پادری بھی اپنے اپنے گوشوں سے نکل نکل کر عیسائی فوجوں میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے تھے۔ آدمیوں کا ایک بھرا ہوا سمندر تھا، جو مسلمانوں کے بیڑے کو غرق کر دینے کے لئے تڑپ رہا تھا، مچل رہا تھا، موجیں مار رہا تھا۔

الغرض دیکھتے ہی دیکھتے دو لاکھ سے زیادہ رُومیوں کا جنگل، صرف تیس ہزار مسلمانوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ رُومی عربوں کی قلّت پر مسکرائے، اور یہ خیال کیا کہ شاید عرب دیوانے ہو گئے ہیں۔

آخر کار طبلِ جنگ پر چوب پڑی، آگ اور خون کے دیوتا نے انگڑائی لی، موت نے کروٹ بدلی ——— قتال کا بازار گرم ہو گیا، زمین، دریا کی موجوں کی

طرح جلنے لگی، تلواروں کی بجلیاں کرنے لگیں، اور سنسناتے ہوئے تیر دلوں میں ترازو ہونے لگے۔ مردوں کی جانیں، اور عورتوں کا سُہاگ لُٹنے لگا ——————

رُومیوں کے جوش کا یہ عالم تھا گویا وہ وقت کا پہیا ہیں جو کبھی پیچھے کی طرف گردش نہیں کرتا۔

اتنے میں پادری اور بشپ ہاتھوں میں صلیبیں لے اور مسیح کا نعرہ بلند کرتے ہوئے نمودار ہوئے اور ایک لمحے کے اندر رومیوں نے اس شدت سے حملہ کر دیا کہ مسلمان پسپا ہونے لگے۔ اور یہاں تک کہ اپنی عورتوں کے خیموں تک پہونچ گئے ———— یہ دیکھنا تھا کہ تمام عورتیں وفورِ طیش میں آگئیں، اور خیموں کی چوبیں نکال نکال کر دیوانہ وار چلّانے لگیں کہ اے عرب کے سپاہیو، اب اگر ایک قدم بھی پیچھے ہٹے تو خدا کی قسم انھیں چوبوں سے ہم تمہارے سروں کو پاش پاش کر دیں گے، کچل ڈالیں گے۔"

لیکن اس اثناء میں رومیوں کے ایک مزید قیامت ریز ریلے نے مسلمانوں کو چند قدم اور پیچھے دھکیل دیا ———— اب کیا تھا، آگ لگ گئی، اور تمام عورتیں دیوانی شیرنیوں کی طرح دشمنوں پر ٹوٹ پڑیں۔ اور اس حیرتناک ولولے اور جوش کے ساتھ حملہ کیا کہ عیسائیوں کی نہتّی قدسیوں کی سانس دفعتہً رک گئی، اور وہ سراسیمہ ہو کر ان عورتوں کو دیکھنے لگے ——— اتنے میں بپھری ہوئی شیرنیوں نے اپنے مردوں کو پھر للکارا: "اے عرب کے بہادر بچو، اے محمد عربی کے غلامو، اے خدائے بزرگ و برتر کے آخری پیغام کے حاملو! آگ اور خون کے دریا میں کود پڑو۔ مر جاؤ، یا رومیوں کو پیس ڈالو۔ دیکھو تو رسول اللہ کی روحِ مطہر تمہیں غور سے دیکھ رہی ہے۔"

یہ سننا تھا کہ مسلمانوں کی رگوں میں بجلیاں دوڑنے لگیں، اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ مسلمان رومیوں پر ٹوٹ پڑے ———— عورتیں صف دشمن سے پیچھے آگئیں اور پکار پکار کر کہنے لگیں "اے اسلام کے فرزندو، اے عرب کے بیٹو، اب ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے، اب اگر ایک انچ بھی تم ہماری طرف کھسکے تو تمہیں قسم ہے خدائے بزرگ و برتر کی کہ پھر زندگی بھر ہمارا منہ نہ دیکھنا، ہم تم پر حرام ہو جائیں گے۔"

اور اے مسلمانو! جانتے ہو تمہاری ان بہادر عورتوں کی مردانگی کا نتیجہ کیا ہوا؟

مسلمانوں نے رُومیوں پر ایسی شاندار اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسی حیرتناک فتح پائی کہ تاریخ آج تک انگشت بدنداں ہے۔

انصاف سے کہو کیا یہ پردہ نشین عورتوں کے کارنامے ہیں؟

اے دور کے ہیرو! تمہاری عورتیں تو بھوتوں اور چڑیلوں کے تذکروں سے کانپتی ہیں، تمہاری عورتیں تو اپنی اپھانیوں سے تمہارے بچوں تک کو بزدل بنا رہی ہیں۔ کیا تم انھیں میدانِ جنگ میں لے جا سکتے ہو! کیا یہ طبلِ جنگ کی آواز سنتے ہی "اوئی، اوئی" کر کے بیہوش نہ ہو جائیں گی؟

کیا تم سمجھ رہے ہو اے بھولے بھالے مسلمانو، کہ میں تم سے کیا مطالبہ کر رہا ہوں؟ آہ تمہاری عقلوں پر تو پردے پڑے ہوئے ہیں۔

کان کھول کر سنو، میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں، یورپ والیوں کی ریس کرنے لگیں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں ایتھنز کی طرح آزاد ہو جائیں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں مشرقی شرافت کو بالائے طاق رکھ کر مغربی عشوہ گری اختیار کر لیں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں پنڈلیاں اور باہیں عریاں کر کے اونچی ایڑیوں پر کھٹکھٹاتی پھریں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں، پریاں بن کر لال دیو کے ساتھ، اڑن کھٹولوں پر سوار ہو کر راجہ اندر کے اکھاڑے میں اترنے لگیں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں فانوسِ خلوت کے عوض شمعِ جلوت بن جائیں۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تمہاری عورتیں، یونیورسٹیوں کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے، اپنے چہروں پر مجتہدانہ خشکی پیدا کر لیں ———— میرا تو تم سے صرف یہ خفیف سا مطالبہ ہے کہ اپنی عورتوں کو کھلی ہوئی ہوا میں سانس لینے کا موقع دو، انھیں اس طرح پردے میں گھونٹ کر نہ رکھو۔ انھیں باہر نکالو۔ انھیں اتنی تعلیم دو کہ وہ تدبیرِ منزل، اور تربیتِ اولاد کو سمجھنے لگیں، زندگی اور اس کے مقتضیات سے واقف ہو جائیں۔ اور بس۔

میں کہوں گا، اور بار بار کہوں گا اپنی عورتوں سے تمہارا سلوک نہایت ہی ظالمانہ، بلکہ وحشیانہ ہے، تم نے انھیں زندگی کے تمام حقوق سے یکسر محروم کر دیا ہے تم نے ان سے وہ سب کچھ چھین لیا ہے، جو تمہارے خدا اور رسول نے انھیں بخشا تھا۔

اے مسلمانو! کیا تم نہیں دیکھتے کہ پردے کی وبا نے تمہاری عورتوں کی کیا درگت بنا رکھی ہے؟

کیا مردہ اور بجھے ہوئے خون کی مائیں، تازہ اور شگفتہ بچے پیدا کر سکتی ہیں؟ کیا تم اپنے گھروں کی گندگی اور بدسلیقگی کو نہیں دیکھتے۔ کیا ایسے مکانوں کے مکیں، اور اس ماحول میں پروان چڑھنے والے بچے بلند خیالی اور شائستگی کا

تصور تک کرسکتے ہیں؟

اے بھائیو۔ ذرا اپنی عورتوں کو غور سے دیکھو، کیا وہ زرد اور بدذوق نہیں ہیں؟ کیا اُن کے جسم ترس آنے کی حد تک لاغر نہیں ہیں، کیا اُن کی پنڈلیاں اور اُن کے بازو سوکھے ہوئے نہیں ہیں؟

خدارا ان مقیّد عورتوں کے گھٹتے ہوئے، رُوکھے، پھیکے، سہمے ہوئے اور روتے سے چہروں پر نگاہ ڈالو ——— کیا تمہارے پردے نے انھیں تمام زنانہ رعنائیوں سے محروم نہیں کردیا ہے؟

ذرا اپنی عورتوں کی غیر فطری چالوں، اُگرتے ہوئے بالوں، اُبھری ہوئی پسلیوں اور اُڑتے ہوئے رنگ دیکھو۔ یہ لاغر تصویریں تمہارے ہی ہاتھ کی کھینچی ہوئی ہیں۔

آنکھیں اچھی طرح کھول کر دیکھو، کیا اس نامراد پردے کے باعث حسنِ جمال تمہاری جماعت سے روز بروز مفقود ہوتا نہیں چلا جا رہا ہے، اور کیا تمہارا ذوقِ جمال، تنگ حجروں کی اور گندی مرطوب ہواؤں کے مارے ہوئے حسن ہی پر قانع ہو جانے پر آمادہ ہو چکا ہے؟

اے جھوٹی غیرت کے مجسّم اوتارو! اے اپنی عورتوں کی جہالت، کمزوری، وہم پرستی، بزدلی، اور بدصورتی پر فخر کرنے والے حاجیو، قاریو، اور حافظو!

ذرا سینماؤں میں جاؤ، تھیٹروں کی سیر کرو، اور زنانِ بازاری کی خلوت گاہوں میں جھانک کر دیکھو، ان تمام مقامات پر تمہیں سو فیصدی مسلمان نظر آئیں گے۔

تمہیں خبر نہیں تمہارے پردے کے ذوق ہی نے ان نوجوانوں کو بہکا رکھا ہے ——— تم ہی ان تمام بداخلاقیوں کے ذمہ دار ہو۔

تم نے اپنی عورتوں کو پردوں میں محبوس کرکے انھیں اس قدر بیکار، بے دلچسپ اور بدصورت بنا دیا ہے کہ شام ہوتے ہی تمہارے نوجوان گھروں سے رسیاں تڑا کر بھاگ جاتے ہیں، اور وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں انھیں "چنچل" سی عورتیں مل سکتی ہیں، جو خطرناک ہونے کے باوصف اُن کی جوانیوں کو اپنی دلچسپ باتوں، اور اپنے ٹھنڈی ہوا کے پالے ہوئے سُرخ رخساروں سے آسودہ کرسکتی ہیں۔

یاد رکھو کاغذ کے مصنوعی پھول، اصلی پھولوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے، اور بہتے ہوئے پانی پر ٹھہرے ہوئے پانی کو صرف وہی لوگ ترجیح دے سکتے ہیں، جن کی کھوپڑیوں کا گودا خشک ہو چکا ہے۔

کیا تو نے نہیں سنا؟

کہ بو فنا کی آتی ہے بند پانی سے

اَخبارِ اُردُو

فروری کے کلیم میں حضرتِ نیرنگ کو ہندو مسلمانوں کے موجودہ اختلافات پر جو تاؤ آیا ہے اور موصوف نے اس سلسلہ سے جو کچھ لکھا ہے اُس کے متعلق عرض ہے کہ اگر آئندہ بھی ایسا ہی ہو تو براہ کرم ہندو مسلمانوں کو کچھ کہنے سے پہلے اُس نصابِ تعلیم پر بھی کچھ ارشاد فرمائیے گا جس نے یہ جذبہ بیدار و مشتعل کیا ہے۔

بے شک یہ ایک ہی ملک کے باشندوں کا ایک دوسرے کے خلاف حرکت کرنا اُس ملک کے باشندوں کی آخری بدنصیبی ہے۔ لیکن وہ مجبور بھی ہیں اور بے خبر بھی، جبکہ اُن کے دماغوں میں کچھ ایسی ہوائیں بھر دی گئی ہیں" جن کے ہوتے ہوئے اُن کا متحد ہو جانا خام خیالی ہو، حد ہے کہ ہندو مسلم سوال مذہب و سیاست سے گزر کر اب تہذیب و تمدن اور علم و ادب تک کو متاثر کر رہا ہے، حالانکہ ادبیاتِ ہند کا کوئی حصہ نہیں ہے جو ہندو مسلمانوں ہی سے مل کر پیدا نہ ہوا ہو۔ مگر اب ایسے بھی ہیں جو "ہندی ہندوؤں کے لئے" اور "اردو مسلمانوں کے لئے" کا نعرہ بلند کرنے کو اپنے دماغ کی سب سے اونچی لیاقت سمجھتے ہیں۔

~~~~~~~~

چنانچہ گزشتہ ماہ نومبر ۱۹۳۴ء میں "ہندی اور اردو" کا جو دنگل صوبہ سرحد میں ہوا اُس کی تفصیلات ہندوستانی باشندوں کی تہذیب و سربلندی اور اُن کی ذہنی فضیلت پر کلنک کا داغ ہیں۔ یعنی اس صوبہ کی حکومت نے کہیں حکم دے دیا کہ آئندہ سے صوبۂ سرحد کی درس گاہوں میں ذریعہ تعلیم زبانِ اردو ہوگی۔

اس حکم کا نافذ ہونا تھا کہ ہندی اور گورمکھی والوں نے صوبۂ سرحد کا پورا آسمان سر پر جو اُٹھایا ہے تو آج تک نیچے دھرنے کا نام نہیں لیتے۔ حد ہو گئی کہ جھگڑا ہے صوبۂ سرحد میں اردو ہندی کا مگر ہندی اور گورمکھی والے ہیں کہ شہر بمبئی اور شہر مدراس میں قابو سے باہر نظر آتے ہیں۔ حالانکہ یہ امر حقیقت ہے کہ حکومت صوبۂ سرحد نے اس معاملہ کو کامل تحقیق اور غور و فکر کے بعد صحیح اور ضروری تسلیم کیا ہے۔ ابھی صوبۂ سرحد کی مجلسِ قانون ساز میں ہندوؤں اور سکھوں کو وہ حقوق دے دیے گئے ہیں جو صوبہ مدراس کے مسلمانوں کو حاصل نہیں ہیں، لیکن صوبۂ سرحد کے مسلمانوں نے ان حقوق کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کی، لیکن جہاں اُردو ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی کہ پہلے تو اس کے مقابل ہندی اور گورمکھی لائی گئی اور اب صاف صاف ہندو مسلمان اور سکھ صاحبان ہیں اور اُن کی ملی ملی زبانیں، مگر میں وہی عرض کروں گا کہ اس سلسلے سے نہ ہندو مسلمان ہیں نہ سکھ بابا، یہ تو وہی "حکیمانہ تعلیم" ہے جسے "اعلیٰ تعلیم" مشہور کیا گیا ہے اور یہی ہے جو آج ہندو مسلمان بن کر لڑ رہی ہے یا لڑا رہی ہے۔ اس لئے جب تک نصابِ تعلیم کی اصلاح نہ ہو ہندو مسلم اختلافات پر کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

از ملا رموزی

~~~~~~~~

تحافتِ اردو کے سلسلہ سے چند دن سے شہر دہلی بھی کچھ ہوتا جا رہا ہے خصوصاً مہین اور باریک لکھائی چھپائی اور خوبصورت رسالوں اور اخباروں کے حساب سے دہلی بھی اب لاہور ہوا جا رہا ہے، لیکن زبان و ادبِ اردو کے حق میں دہلی نے کوئی قابلِ اعتنا قدم اُٹھایا، یہ قدرے مشکوک ہے۔ پھر بھی یہاں اردو کے لئے جو کچھ ہوتا رہتا ہے اُس میں نومبر ۱۹۳۴ء میں خواتینِ ہند کی مجلس کا جو اجلاس ہوا اُس کی یہ تجویز لائقِ احترام ہے کہ

"حکومت ایک ایسی جماعت مقرر کرے جو ایک ایسا لغت
تیار کرے جس میں زیادہ سے زیادہ وہ الفاظ جمع کئے جائیں
جو دیسی زبانوں میں زیادہ مستعمل ہیں، اور حکومت اس کا بھی
بندوبست کرے کہ درسگاہوں میں ایسا نصابِ تعلیم پڑھایا
جائے جس میں مشترک الفاظ مستعمل ہوں"

اس تجویز پر دہلی کے معزز و محترم اخبار "ملت" نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۳۴ء

کے مقالہ مدیری میں ذیل کی موزوں رائے پیش کی ہے کہ

"جہاں تک خواتین کا تعلق ہے وہ زبان کے معاملہ میں
سب سے موثر خدمت انجام دے سکتی ہیں، اس طرح کہ وہ
اپنے بچوں کو شروع ہی سے ایسی زبان سکھائیں جو مشترک
ہو، خصوصاً جہاں کی درسگاہیں عورتوں کے ہاتھوں میں
ہیں وہاں یہ کام زیادہ آسان ہے، اس طرح زبان کی
بنیادیں مضبوط ہو سکتی ہیں"

شک نہیں کہ دونوں تجویزیں مبارک اور لائق عمل ہیں۔ لیکن مصیبت ہے تو یہ کہ ہندوستانیوں کی "والدائیں" تو زبان کی خدمت انجام دیں اور وہ بھی ایک مشترکہ زبان کی۔ لیکن ہندوستانیوں کے "والد لوگوں" کو کیا کہئے کا جو پیدائش ہوتے ہی انگریزی میں چیختے ہیں، انگریزی ہی میں سوتے ہیں اور انگریزی ہی میں بیدار ہو کر کام کاج کرتے ہیں؟

~~~~~~~~~~~~~~~~

اردو کے حق میں قابلِ اعتنا تحریکات میں سے ایک تحریک مدراس کی ہے جہاں سے کوشش کی گئی کہ پورے صوبے میں اردو کے حق میں بنام "ہفتۂ اردو" کچھ کیا جائے، یہ تحریک "ہفتۂ اطفال" سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے، جو علی گڈھ میں بھی رونما ہوئی تھی، مگر اس کی تفصیلات مجھے حاصل نہ ہو سکیں، البتہ "ہفتۂ اردو مدراس" کی تفصیلات کو اخبار "الجمعیۃ دہلی" نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۶۳ء میں شائع کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"انجمن اردو مدراس نے تمام صوبے میں اردو کی تحریک کو
مقبول بنانے کے لیے وہاں کی مختلف زبانوں میں اشتہارات
تقسیم کئے، رضا کاروں نے گشت اور ملاقات کے ذریعہ لوگوں
کو متوجہ کیا جس کے نتیجہ میں یہ ہفتہ کامیابی سے منایا گیا، اور
مختلف دار المطالعے اور کتب خانے کھولے گئے۔ جلسے ہوئے
اور تقریریں"

اس سلسلہ سے ملّا رموزی کو معلوم ہوا ہے کہ مدراس میں جب سے حضرت پروفیسر مولوی محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی رونق افروز ہوئے ہیں وہاں زبان اردو سے نہ فقط کافی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے بلکہ موصوف کی کامیاب کوشش سے وہاں سے متعدد اخبارات اور رسالے اردو میں جاری ہو رہے ہیں۔ پس خدا کرے اس قسم کے محبین محوی ہندوستان کے ہر شہر میں پیدا ہو جائیں جو بجبر اردو ہندی کے مقابلے مجادلے، مکالمے، مناظرے اور مقاتلے کے اردو کو ترقی دیتے رہیں۔

~~~~~~~~~~~~~~~~

۲۳ نومبر ۱۹۶۳ء کے اخبار "انقلاب" لاہور نے یہ مسرت بخش اطلاع شائع کی ہے کہ ایک مدت کے بعد شہر لاہور میں بھی اردو کی ایک لائق اعتنا انجمن بنا لی ہے جس کا "اینگلو انڈین اردو سوسائٹی" کا نفرنس ہے، اس کے مقاصد میں قیمتی مقاصد شامل ہیں، لیکن پُر لطف بات یہ ہے کہ اس کی مختصر روداد میں انگریزی کے اتنے الفاظ موجود ہیں۔ سیکچر ہال۔ پوائنٹ۔ لائف ممبر۔ جنرل سکریری۔ فنانشل سکریٹری۔ اسسٹنٹ سیکرٹری نائب صدر۔ فرنیچر۔ اٹیم۔ نارتھ۔ وکیشنیت۔

میری حقیر فقیر اور کمترین سی رائے میں یہ وہ الفاظ ہیں جن سے زیادہ عام فہم الفاظ دیسی اور ایرانی اردو میں موجود ہیں۔ بارے تحریک لائق احترام ہے۔ جن صاحب کو اس مجلس سے دلچسپی ہو وہ ذیل کے پتہ سے خط و کتابت کریں۔

مولانا عاشق بٹالوی بی اے۔ ایل ایل بی، ناظم پنجاب اردو کانفرنس نمبر ۱ چیمبرلین روڈ لاہور۔

~~~~~~~~~~~~~~~~

ترقی اردو یا حفاظت اردو کی جو خدمت حیدر آباد نے انجام دی ہے ظاہر ہے کہ اس کی بلندی کو ہندوستان کی نہ کوئی ریاست پہونچ سکی نہ کوئی صوبہ۔ اگرچہ اس خدمت و بلندی میں مخلوق حیدر آباد کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کو کافی دخل ہے۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ وہاں کے باشندوں نے "خالص اردو بولنے" اور "خالص اردو لکھنے میں" ہندوستان کے تمام اردو والوں پر فوقیت حاصل کر لی ہے۔ یقین نہ ہو تو حیدر آباد اور پنجاب کے اخبارات ملاحظہ فرمایئے۔ حیدر آباد ہی کے اخبارات ہوں گے جن کی اردو وطنی مصطلحات اور محاورات سے آراستہ ہو گی اور ان میں بجز بے حد ضروری انگریزی الفاظ کے اور کچھ نہ ہو گا۔ لیکن پنجابی اخباروں میں بجز الا ماشاء اللہ کے ۲۵ فیصدی سے کچھ زیادہ ہی انگریزی الفاظ ہوں گے جو ان اخباروں میں روزانہ ڈھلتے اور داخل ہوتے نظر آئیں گے، بارے اب حیدر آباد کے لائق احترام "اردو پسندوں" نے ایک اور قدم اٹھایا ہے، چنانچہ اخبار "رہبر دکن" حیدر آباد مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۳ء کے صفحہ ۵ پر جناب اشفاق حسین صاحب عثمانی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ:-
~~~~~~~~~~~~~~~~

بجائے اس کے ہمیں کا فرض ہے کہ وہ ایک سادہ اور عام فہم
اسلوب اختیار کریں جسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں،
حیدرآبادی محاوروں کو رواج دیں "

حیدرآبادی خاص یا پنجابی محاوروں کو اردو میں رواج دینے سے اگرچہ دوسرے صوبوں کے باشندوں کو پہلے ان مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا لیکن چند دن کے بعد ہی یہ آسانی ہو جائے گی کہ آیندہ ہم ذخیرۂ الفاظ "ہندوستانی" ہو گا جس کے سمجھنے اور سمجھانے میں وہ مشکلات پیدا ہوں گی جو انگریزی الفاظ کی بھرتی سے عمر بھر رہیں گی۔

خضر علیہ السلام کی عمر کا ایک اخبار گورکھپور سے شائع ہوتا ہے جس کا نام نامی و اسم گرامی "مشرق" ہے اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر حال میں شائع ہو کر رہتا ہے۔ بس اس کی اشاعت مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے صفحہ ۱۰ پر حضرت علامہ سلیمان ندوی کا ایک مضمون شائع کیا گیا ہے جس میں ممدوح نے "اردو ہندی" والوں کے متعلق یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ:-

"اس وقت ہندی اور اردو ملک کی عام زبان بننے کے لئے کوشش کر رہی ہیں۔ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے شک نہیں کہ وہ اپنے حامیوں کی انتھک کوششوں کی ممنون ہے ایک زبان جو صرف چند مذہبی کتابوں میں تھی انگریز دُور اندیشوں کی قوتِ فکر سے وہ کلکتہ کے فورٹ ولیم میں سب سے پہلے ہندوستانی یعنی اردو کے مقابل دوسری زبان کی حیثیت سے رواج پائی۔ اب صوبہ صوبہ اس کی شاخیں ہیں، مرکزی انجمنیں ہیں، اہلِ دولت اس کی مدد کر رہے ہیں، اہلِ قلم اس کو پھیلا رہے ہیں، وہ ریاست کشمیر راجپوتانہ، بڑودہ، گجرات اور مدراس میں قدم جما رہی ہے اور ہندو ریاستیں اس کی سرپرستی میں نمایاں حصہ لے رہی ہیں، اس کے مقابل اردو کے لئے نہ تبلیغی انجمنیں ہیں، نہ اس مقصد پر ایک پیسہ خرچ ہو رہا ہے، نہ حیدرآباد کے سوا کوئی اسلامی ریاست اس کے لئے اعزازی یا تنخواہ یاب مبلغ مقرر کرتی ہے۔"

حضرت علامہ کے مذکورہ بالا بیان کے دو حصے ہیں، ایک یہ کہ ہندی زبان کو فورٹ ولیم میں چند "دور اندیش انگریزوں" نے رواج دیا، گویا آج اُردو ہندی جو "ہندو و مسلم فساد" کی طرح ہندوستانی قومیت کے حق میں ایک مصیبت بنی ہوئی ہے سو الحمد للہ کہ یہ بھی انگریز بھائیوں کی "نظر" کا کرشمہ ہے۔

دوسرا حصہ متعلق ہے اسلامی ریاستوں کی اُردو کی طرف سے بے اعتنائی کا۔ سو اس پر کچھ زیادہ لکھنے سے بہتر ہے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ اُن کے اونٹ کی وہ کونسی کل سیدھی ہے جسے سیدھا کہا جا سکے، بلکہ میرا تو عقیدہ ہے کہ مسلمان ریاستیں ہی کیا ہر وہ مسلمان اُردو کے حق میں جہنم ہے جس نے انگریزی پڑھی ہے، اور اگر وہ بی اے پاس ہو گیا ہے تو پھر اس کے گھر میں ایک اردو کیا، جو کچھ بھی ہو گا یورپ ہی کا ہو گا، اور اگر مسلمانوں میں یہ خواص پیدا نہ ہوں گے تو وہ زوال یافتہ کس طرح کہے جائیں گے! یہ حال خدا اردو کو مسلمان امیروں اور دولت مندوں کے ہاتھ سے محفوظ ہی رکھے۔

انھیں دنوں اردو کے لئے ایک کوشش کلکتہ میں بھی ہوئی، یعنی یہاں مردوں کے ساتھ عورتوں نے بھی اردو کے حق میں تقریریں کیں، اور یہ تو ساری دنیا کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ہندوستان کے مسلمان رسمی تقریریں اور رسمی تحریریں لکھنے میں خاص کمال رکھتے ہیں، چنانچہ شاید ہی کوئی بدنصیب جلسہ ہو گا جس کے صدر نے اردو پر اتنی جامع تقریر نہ کی ہو جس سے دنیا مان لے کہ اس صدر کے برابر اردو کا نہ کوئی حامی ہے نہ سرپرست، لیکن اردو کے تمام جلسوں کے صدر حضرات میں ایک آدھ ہی ایسا صدر نکلے گا جس کے گھر میں بھی اردو سے ہمدردی اور دلچسپی ہو ورنہ عام صدر وہی ہوتے ہیں جو جلسہ میں اردو کے حامی اور گھر میں انگریزی کے سرپرست۔

لیکن غنیمت ہے کہ کلکتہ کے جلسوں کے صدر ضرور ایسے ہیں جن کے ہاں اردو سے محبت کی جاتی ہے، مثلاً ایسے ایک جلسہ کی صدر محترمہ بیگم مولانا محمد علی مغفور بھی تھیں، چنانچہ موصوفہ نے جو تقریر اردو سے متعلق ارشاد فرمائی اُس میں آپ نے متعدد حوالوں سے دکھایا کہ اس زبان کی ترقی میں پچھلے زمانے کی خواتین نے خاصا حصہ لیا ہے، اور اس کے ثبوت میں ممدوحہ نے چند "گزری ہوئی شاعر خواتین" کے اشعار بھی نقل فرمائے اور موجودہ عہد کی خواتین کو اردو کی حمایت پر آمادہ فرمایا۔

اس جلسہ کے دوسرے صدر کیا بتاؤں کہ کون تھے، یعنی خاص اردو کے جلسہ کے صدر کا نام تک جب سنا اے کے فضل الحق صاحب، ہو تو کہتے کہ ملا رموزی تو زیادہ سرور نہیں ہو سکتا، یقین نہ ہو تو کلکتہ کا اخبار "مسلم گزٹ" مورخہ ۲ جنوری ۱۹۳۶ء ملاحظہ فرمائیے جس نے اس نام سے صدر اور مجلس کی روداد شائع کی ہے، اسی طرح خود اس مجلس کا نام "اردو لٹریری کانفرنس" تھا

ہم پھر بھی اس مجلس کے کارکنوں کا خلوص اور عمل لائق احترام اور ان کی عزت لائق صد تحسین ہیں خدا کرے طاقت والے اس تحریک کو کامیابی کی حد تک پہنچانے سے پہلے آرام نہ لیں۔

اردو کے متعلق اب تک تو "دیا" چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں، لیکن اب دو بڑی باتیں بھی سن لیجئے جن میں سے ایک ہے گاندھی جی کے متعلق اور دوسری ہے بابو راجندر پرشاد صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس کے متعلق۔

چنانچہ اخبار "مدینہ بجنور" مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۳۵ء کے صفحہ ۹ پر ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا ایک حصہ یہ ہے کہ

"گاندھی جی خلافت اور سوراج کی تحریک کے دنوں میں آپ
اردو کے بجائے "ہندوستانی" کا لفظ استعمال کرتے رہے،
اگرچہ یہ لفظ بھی مسلمانوں کو ناگوار تھا تاہم اس میں تلخی کم تھی، مگر
اب ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ آپ نے کھلم کھلا
مدراس کے دورہ میں ہندی کانفرنس کی صدارت کرتے
ہوئے اردو کی مخالفت کی وغیرہ"

مجھے یہ گاندھی جی پر اعتراض نہیں بلکہ اہم ذمہ داری ہے جس کا جواب دیں جناب مولانا جوش ملیح آبادی، جب تک کہ وہ رسالہ "کلیم" کو اردو میں چھاپ رہے ہیں۔ کہ اس موقع پر گاندھی جی سے کیا سوال کریں؟۔

اب رہے گاندھی جی کے برابر کے راجندر بابو صاحب، سو موصوف کے لئے ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے اخبار "ملت دہلی" کے صفحہ ۳ پر لٹھ کے برابر موٹے قلم سے لکھا ہوا ہے کہ آپ نے پنڈولپور اور دھاراپورم کی جلسہ اور اس کے ارکان کے سپاس نامہ کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ

"ہم ... ضلع، اور دوسرے قومی اداروں سے مدارس وغیرہ

میں ہندی زبان کی ترویج کی درخواست کرتا ہوں
یہ ہیں ہندوستانی قومیت کے دوسرے بڑے بزرگ، اور اردو کے خلاف ان کے
یہ خیالات مع حوالوں کے حاضر ہیں، اب ناظرین جو حکم دیں وہ لکھوں؟

اب آئیے اور ذرا صوبجات متوسط میں اردو کی کس مپرسی بھی معلوم کیجئے، چنانچہ یہ صحیح ہے کہ ان علاقوں میں اکثر مقامات کی پیدائشی زبان اردو نہیں ہے، پھر بھی ان علاقوں میں اردو خاصی بولی اور سمجھی جاتی ہے، مگر اس طرف اردو جو بے اعتنائی ذمہ دار افراد کی جانب سے نظر آتی ہے اس کی افسوسناک تفصیلات کے لئے ناگپور کا ایک چھوٹا سا اخبار ملاحظہ فرمائیے جو "امید" نام سے ناگپور سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار نے زبان اردو کی حفاظت، حمایت، اصلاح، ترقی، ترویج اور تشویق کے لئے جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا ہے نہ آپ کے اورنگ آباد کے "اردو" نام کے رسالے نے لکھا ہوگا نہ اردو کے کسی اخبار نے، لیکن اہم سوال ہے اردو والوں کی تحریکات اور ان کی ہر جگہ ناکامی کا، سو اس کا سبب ایک اور صرف ایک ہے، وہ یہ کہ اصلاح و ترقی کی ہر تڑپ اور ہر کوشش کا احساس پیدا ہوتا ہے غریبوں میں اور غریبوں کے پاس روپیہ نہیں، اس لئے زبان اور قومی ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی ہر تحریک ناکام رہتی ہے، اور مسلمان دولت مندوں کے ہاں صرف ایک ہی احساس ہے، اور وہ صرف اُن کے ذاتی عیش اور نمود و نمائش کا، سو بدقسمتی سے نمود و نمائش بھی وطنی تحریکات کے ذریعے نہیں، بلکہ یورپی لغویات اور یورپی تحریکات کے ذریعے، اس لئے جب تک مسلمان دولت مندوں کو قومیات پر خرچ کرنے پر آمادہ نہ کیا جائے گا اس وقت تک زبان اردو کی کوئی تحریک کامیاب ہوگی نہ ملا رموزی کی دوسری شادی ہوگی، کیونکہ دولت مندوں میں خصوصیت سے وطنی علوم اور وطنی زبان سے اس لئے کوئی دلچسپی اور ہمدردی نہیں کہ وہ خود نہ اردو میں صحیح خط لکھ سکتے نہ رسالہ "کلیم" کی تحریریں صحیح پڑھ سکتے۔ اس لئے وہ حضرت جوش کی نظموں کے لئے کیا خرچ کریں، اور حضرت ملا رموزی کی غزلوں کو کیا خاک سمجھیں؟

باقی سب خیریت ہے، خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام

چلتے چلتے اتنی اور سن لیجئے کہ جس پنجاب کی شہرت ہے کہ اس نے اردو کو موت کے منہ سے بچا لیا، اسی پنجاب میں اللہ میاں کے ایسے بندے بھی موجود ہیں جن کے لئے روزانہ اخبار "حریت" لاہور مورخہ ۱۴ فروری ۱۹۳۶ء کے صفحہ ۲ پر

لکھا ہے کہ:-

ہم ہمدردی کے اخبار "انقلاب" لاہور ... چھٹے صفحہ پر پنجاب یونیورسٹی کی ایک ہیبتناک اعلان کی اطلاع ... کہ یونیورسٹی میں اس امر پر بحث ہوتی رہی کہ آئندہ ... زبان میں تعلیم دی جائے ... مسلمانوں نے اردو، ہندوؤں نے ہندی اور سکھوں نے گورمکھی کی حمایت کی ... یونیورسٹی نے اس گتھی کو سلجھانے کا یہ طریقہ سوچا کہ ... کی زبان ہے پنجابی، اس میں تعلیم بھی پنجابی میں ہو ... [illegible]

... من میں؟

غلام ہونے پر بھی زندگی کے ہر معاملہ کو یورپ ایسی بلند افق ... پر لانے کے لئے جو ہندوستانی دماغ مشتعل رہا کرتے ہیں، ایسی حرکات انہی سے سرزد ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ رسم الخط کا معاملہ غلامی کے معاملہ سے پہلے ... طے ہو جائے۔ لیکن پورے ہندوستان کو یورپ کی ہر ترقی کے برابر لانے سے پہلے کم سے کم اردو والے یہ تو برداشت نہیں کر سکیں گے کہ رومن میں ... [illegible] ... "...رٹ" بڑی ... سے لکھیں۔

عِشق!

محبّت کے طوفانی سمندر کی سب سے اونچی موج، سوز و گداز کی نے کا سب سے بلند نغمہ۔ خارستانِ اضطراب و کشمکش کا سب سے بڑا کانٹا، چھالوں کی تپاک کا جوہر، سوز و گداز کی رُوح، سوزش و شورش کا ست۔

جنون کے رگوں کا گرجتا ہوا نالہ، زہرِ ہلاہل کا چھلکتا ہوا پیالہ۔

تکلیف میں جہنم کے ساتویں طبقہ کا "صدرِ آتشدان"

راحت میں فردوسِ بریں کا بہترین چشمہ۔

کتابِ فنا کا پہلا ورق، دفترِ حیاتِ ابدی کا آخری باب۔

خود داریاں سلب کرنے والا آلہ، نظامِ ہستی بدل دینے والا انقلاب، پہاڑ اُڑا دینے والی بارود، دل و دماغ کو تلاطم میں لانے والا زلزلہ، فراغت کی مشتِ خاک کو اُڑا دینے والی آندھی، دنیائے عافیت کی وبا، صحرائے امن کا رہزن۔ بحرِ غم کا سفید طوفانی کف،

محشرستانِ آرزو کا شاہدِ حقیقی، دنیائے تمنّا کا فرمانروا، آسمانوں پر چڑھا دینے والا زینہ۔ قبروں میں اُتار دینے والا رعشہ، استقلال کا حاکم۔ دربارِ حُسن کا گدا۔

دل کا غنی، بات کا دھنی، قول کا پورا، دُھن کا پکا، ارادوں کا مضبوط، ——————

روحانی اثرات کی بہترین تشریح، حُسن کے سوال کا پورا پورا جواب —————— "

"انتخاب از روحِ ادب"

ترے بغیر

جلد آ، کہ زندگی ہے پریشاں ترے بغیر
اب زہر ہے یہ چشمۂ حیواں ترے بغیر

مضطر ہے روحِ لالہ و نسریں ترے لئے
برہم ہے زلفِ سنبل و ریحاں ترے بغیر

جس کا ہر ایک شعبہ تھا، گلبانگِ صد نشاط
شیون ہے اب، وہ لحنِ ہزاراں ترے بغیر

گھٹتی ہے نبضِ سبزۂ چمن تیری یاد میں
ڈستا ہے ابرِ کوہ و بیاباں ترے بغیر

پھیکا ہے رنگِ لالہ و گل تیرے ہجر میں
گونگے ہیں، طائرانِ خوش الحاں ترے بغیر

دامن ہے پارہ پارہ نہ دھوئیں چمن چمن!
کیا کیا بہار سے ہوں، پشیماں ترے بغیر

جلد آ، کہ شوقِ دید میں لیلائے زندگی
بھولی ہوئی ہے جنبشِ مژگاں ترے بغیر

اے فتنۂ زمانہ و آشوبِ روزگار
سونی پڑی ہے انجمنِ جاں ترے بغیر

لرزاں تھی، جس کے پنجۂ وحشت سے کائنات
اب وہ جنوں ہے سر بہ گریباں ترے بغیر

اک اشکِ خوں ہے تیری جدائی میں نجمِ صبح
اک شامِ غم ہے صبحِ بہاراں ترے بغیر

اک زخمِ دشنہ ہے تری فرقت میں بوئے گل
اک داغِ تازہ ہے مہِ تاباں ترے بغیر

اے پیکرِ شگفتگی، اے بنتِ ابر و باد
کیوں کر کٹے گا موسمِ باراں ترے بغیر

جوش ملیح آبادی

مولانا راشد الخیری مرحوم

ماہِ گذشتہ میں علامہ راشد الخیری کا انتقال پُرملال دہلی کا ایک افسوسناک سانحہ ہے، مرحوم مشہور ادیب تھے، تحریکِ آزادیٔ نسواں کے علم بردار تھے۔ دہلی کے ایک قدیم خاندان کی یادگار تھے۔ مرحوم اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے سر سید علیہ الرحمۃ، مولوی ڈپٹی نذیر احمد، مولوی حالی، اور مولوی منشی ذکاء اللہ سے حضرات کی صحبتیں اُٹھائیں۔ اور اُن سے استفادہ کیا۔ چنانچہ ان سب حضرات کا رنگ مرحوم کی تحریر، تقریر، اور چال ڈھال تک میں نمایاں نظر آتا تھا۔

مرحوم ہندوستان کے اُن چند مایۂ ناز دردمند مردوں میں سے تھے جو رسم و رواج میں گرفتار، جہالت اور مرد کی غلامی کی آغوش میں پہنچی ہوئی اپنے آقا کی جابرانہ ٹھوکروں میں ٹھکرائی ہوئی، مظلوم ہندوستانی عورت کا درد رکھتے ہیں، مولانا راشد نے جو کچھ لکھا اس جنسِ لطیف کے لئے لکھا، اور جو کچھ کیا اس قابلِ رحم مخلوق کے لئے کیا۔

روئے روئے تو اس کے لئے، اور ہمت افزا گیت گائے تو اس کی خاطر، عورتوں کے مظلومانہ جذبات اور حسیات کے اظہار کے لئے زبان میں نسائیت پیدا کی، اور ان کی جہالت پر ماتم کرنے کے لئے۔ کوسنے، رد جھنے سیکھے اور ٹونے ٹوٹکے سیکھے۔ اور وہ سب کچھ کیا جس کے کرنے کی اُن کی عقلِ سلیم نے رہنمائی کی۔

متعدد ادبی رسالے مرحوم نے نکالے، جس میں عصمت سب سے کامیاب زنانہ ماہنامہ ہے۔ لاتعداد کتابیں چھوٹی بڑی لکھیں، لوگ اُنھیں مصورِ غم کے خطاب سے موسوم کرتے تھے، اور اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے رزم و بزم کا مرانی و عشرت پر کبھی کچھ قابلِ ذکر طور پر نہیں لکھا۔ وہ اَلم نگار تھے، اگرچہ لوگ اُن کی زندگی میں اس طرزِ نگارش کا مضحکہ اُڑاتے تھے کہ "جب دیکھو پھوڑ لگائیوں کی طرح آنسو بہا رہے ہیں" یہ اعتراض مرحوم کے جذبات کی ہمارے نزدیک نادانستہ ستائش ہے۔

جو شخص ساری عمر صرف عورتوں کے متعلق سوچتا اور غور کرتا رہا ہو، اُن کے درد دکھ کی دوا کا جویا رہا ہو، اُن کے جاہلانہ عادات و اطوار کے لئے نسخے تیار کرتا رہا ہو، جس نے عورت کو سمجھنے کے لئے اس کے دل میں گھسنے کی کوشش کی ہو۔ اگر وہ عورتوں کی طرح آنسو بہانے لگے تو کیا عجب ہے۔ ہندوستانی عورت کا گھر وہ گھر ہے جس میں صرف اُس کے خاوند، باپ، بھائی یا بیٹے کے سوائے کوئی غیر داخل نہیں ہو سکتا۔ مولانائے مرحوم بھلا کس کس کے باپ، بھائی اور بیٹے یا خاوند بنتے۔ اُن کی کامیابی کا راز یہی تھا جس پر لوگ معترض تھے۔ شکل دیکھو تو ایک ضعیف سفید ڈاڑھی کے مولانا، اور اگر نہ دیکھو اور صرف اُن کی تصنیفات پڑھو تو کسی گھر کی بھیدی عورت کی قلم کاری معلوم ہوتی ہے۔

بلاشبہ مولانا راشد الخیری اپنے وقت کے بہت بڑے خادم تھے جس جنس کی اصلاح کا اُنھوں نے بیڑا اٹھایا، اور جس کی فوز و فلاح کی دُھن میں اُنھوں نے اپنی عمر کا معتد بہ حصہ صرف کیا، اس کی عدم اصلاح ہندوستانی زندگی کی راہِ ترقی میں عظیم ترین رکاوٹ ہے۔ اور اس کے لئے اگر سیکڑوں راشد الخیری بھی اپنی جانیں گنوا دیں تو کم ہے۔

ہمیں مرحوم کے پسماندگان سے جن میں اُن کی ادبی اولاد اور اصلاحی تحریکات بھی شامل ہیں۔ صدق دل سے ہمدردی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اس سانحہ پر ہمدردی ہمیں ہندوستانی عورت سے ہے۔ کہ جس کا ایک بڑا دردمند آج نہیں ہے۔

"م"

آخری ملاقات

سید مُطّلبی فریدآبادی

آسمان پر کچھ تارے، سورج کی آمد کے خوف سے سسکیاں لے رہے تھے، اور کچھ اس حسرت و ارمان بھرے بدنصیب مسافر کے مستقبل کو دیکھ کر ہنس رہے تھے جو میلی زین پوشیک اُن کے نیچے، بندوق بغل میں دبائے، ننگے سر پورے انہماک و مدہوشی سے اُسی سمت قدم اُٹھائے جا رہا تھا جس طرف سے وہ آدھی رات سے برابر چل کر آ رہے تھے۔

مغرب سے مشرق کو چلنے والی ہوا کے تند فراٹے، آہوں میں تبدیل ہو کر رہ گئے ——— کیا وہ ہوا اُس سترہ سالہ ہم سفر کی آنے والی گھڑیوں سے متاثر تھی، جو ایک مسحور کی طرح اُس کے متحرک آغوش میں گھنٹوں سے سرگرم سفر تھا ——— !

پو پھٹی۔ سپیدۂ صبح بڑھتے بڑھتے صبح بن گیا۔ مشرقی تاجدار کی جلوہ فروزی کا احساس سب سے پہلے ببول کی کٹی ہوئی پتیوں سے جو کھلنی شروع ہو گئی تھیں ہوا ——— پھر الگن اور فاختہ کی بولیوں سے ——— پھر ہرنوں کے چوکنے پن سے، جو بستیوں کی طرف سے واپس ہونے والے درندوں کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے، اور اُٹھے ہوئے کانوں اور بڑی بڑی پریشان آنکھوں سے اُن کو دیکھنے لگے تھے ——— مدہوش مسافر ابھی تک چلا جا رہا تھا ——— اور اُسی انہماک سے چلا جا رہا تھا۔

کائنات کا ذرہ ذرہ بیدار ہونے لگا تھا ——— مگر وہ اسی انہماک سے چلا جا رہا تھا ——— خاموش، مدہوش ———

سرمئی پہاڑی سے نکل کر ٹھٹھرے ہوئے آدمی کی طرح، خورشید مشرق کو گھورتا ہوا سبز گہرے رنگ کے درختوں میں سے جھانک رہا تھا ——— کس کو؟ ——— خیالات میں مستغرق، مضطرب و ہیجان نوجوان مسافر کو، جس کی آنکھیں اس منظر سے قطعاً بے خبر شمال مغرب کے ایک گاؤں پر جمی ہوئی تھیں جس کا ہلکا ہلکا دھواں ایک دریدہ اور باریک چادر کی طرح لپٹا ہوا نظر آتا تھا۔

سامنے جمنا بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ مسافر کی نظریں اس راستے پر جمی ہوئی تھیں جو گاؤں سے جمنا کے کچے گھاٹ کو آ رہا تھا ——— رنگ برنگ کی اوڑھنیوں میں لپٹی ہوئی عورتیں سروں پر مٹکے، بغلیں اُٹھائے گاؤں سے آ رہی تھیں۔

مدہوش نوجوان اب مدہوش نہ تھا، اُس کی متجسس نگاہ کسی کی تلاش میں تھی۔ ——— وہ برابر گھاٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ خوش گلو عورتوں کی سُریلی آوازیں اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

جل کیسے بھروں جمنا گہری

یہ میٹھے سُر نوجوان کے کانوں میں جذب ہو رہے تھے ——— مگر وہ حسرت، حزن و ملال، اور مایوسی مجسم بنا ہوا گھاٹ پر کھڑا تھا۔ نہ اُس جمنا کو دیکھتا تھا جس میں سورج کی سنہری کرنیں لہروں کے کندھوں پر سوار اُن کے نشیب و فراز سے

بیل رہی تھیں۔ وہ گھاٹ پر نظر ڈالتا تھا جہاں پانی کے متحرک آئینے میں اس کا جمال زیادہ اُجاگر ہو رہے تھے۔

~~~

انہی ہنسی مذاق۔ شرارتیں اٹکھیلیاں کرتے کرتے کیف و لذت کی رنگینیوں میں ڈوب کر مست ہو جاتے ذرا سی آہٹ پر ناچتے ہوئے گزر جاتے ہیں ـــ پھر کچھ نہ تھا خاموشی ہو گئی۔

ایک بوڑھی آئی۔ یکایک آواز آئی "سپاہی آ رہے ہیں! جلدی چھپو!" نوجوان گھنے درختوں میں گھرے ہوئے گاؤں کو غور سے دیکھ رہا تھا، سرایا انتظار بنا ہوا کیا دیکھ رہا تھا؟ منتظر تھا!

~~~

گاؤں سے کوئی نہ آیا۔ بند وقچی نوجوان کی موجودگی سے گھبرائی ہوئی اور سہمی ہوئی دو دوشیزہ لڑکیاں برابر سے گزر رہی تھیں، اتنی ڈری ہوئی کہ قدم ڈگمگا رہے تھے اور گھڑیوں سے پانی چھلک چھلک کر گر پڑتا تھا۔

~~~

نوجوان ابھی تک گاؤں سے آنے والے راستے پر نگاہ جمائے کھڑا تھا ـــ بُت کی طرح ـــ گھاٹ نے ایک لمبا مایوسی سے بھرا ہوا سانس اپنی خاموش فضا میں جذب کیا۔

~~~

کئی گھنٹے گزر گئے اور وہ گاؤں کی طرف ہی دیکھتا رہا ـــ کیا وہ دیکھ ہی سکتا تھا؟ ـــ رسیلی اور بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے ـــ اس کی پشت جمنا کی طرف اور منہ گاؤں کی طرف تھا۔

~~~

آفتاب نصف النہار پر شکن اپنے جھلس دینے والے تارہائے نظر سے اس مدہوش انسانی پیکر کا مطالعہ کر رہا تھا جو گھاٹ کے قریب ایک ببول کے درخت سے کمر لگائے بیٹھا تھا ـــ اسی ببول سے بندوق بھی لگی کھڑی تھی، اس کی نگاہیں گاؤں کے راستے کی فضا کو چیرتی ہوئی کسی کی تلاش میں گاؤں کے اندر گھسنے کی کوشش کر رہی تھیں ـــ اپنے ناقابل شکست انہماک سے گاؤں کے اندر۔

ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ !

~~~

وہ یکایک چونکا ـــ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملا پھر شبہ دور کرنے کے لئے گاؤں کی طرف دیکھا ـــ ـــ ہاں آلودہ رات دوشیزہ کے ساتھ ـــ ـــ سفید چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت پتیل کی گاگر ہاتھ میں لٹکائے اس کی طرف بڑھتی آ رہی تھی ـــ مسافر نے رومال جیب سے نکال کر آنکھوں کو صاف کیا، شبہات مٹ گئے۔ وہ لرزتی ہوئی ٹانگوں سے کھڑا ہو گیا۔ بندوق اس کی پنڈلی سے ٹکرائی اور گر پڑی ـــ ـــ وہ آگے بڑھا ـــ ـــ پھر رک گیا ـــ ـــ گھبراہٹ، خوف، آنے والے واقعات کا خوف ـــ ـــ وہ کانپ رہا تھا۔

~~~

سفید چادر میں لپٹی ہوئی حسینہ اس کے سامنے تھی۔ شباب کی رنگینی لئے ہوئے گندم گوں چہرہ کھلا ہوا تھا، جیسے برف کی تہوں میں سے صبح کا سورج جھانک رہا ہو، ایسی نازک جیسے گل نوخیز کی پنکھڑی ـــ نوجوان کی نگاہ زمین کی طرف تھی ـــ ـــ اور حسینہ کی نگاہ نوجوان کے چہرے کی جانب ــ ـــ ـــ !

~~~

ہوا خاموش ہو گئی کہ ان کی غمناک گفتگو میں مخل نہ ہو ـــ ـــ جمنا ساکت تھا۔ افسانۂ عشق کا دردناک منظر دیکھنے کے لئے ـــ ـــ گھاٹ گوش برآواز تھا کہ آج پھر کچھ ہونے والا ہے ـــ ـــ مگر وہ ہنس کے جوڑے کی طرح دونوں خاموش پاس پاس کھڑے تھے۔

~~~

"اختر" ـــ ـــ "اختر" ـــ ـــ !

ہوا چیخی سے سرسرائی ـــ ـــ

ببول اس سریلی آواز پر جھوما ـــ ـــ

گھاٹ پر جمنا کی لہریں مچل مچل کر چڑھنے لگیں ـــ ـــ

نوجوان کی نظریں نیچے کسی کے قدموں پر ـــ ـــ

پھر وہی سکون ـــ ـــ
~~~

یہاں آئے ہو مجھے بدنام کرنے ــــ ــ ــ ــ جب میرے ماں باپ بدگمان ہو گئے تو یہ تو پھر سسرال ہے ـــــــ ــ ــ ــ یہاں کیوں آئے ہو اختر ــــ

پھر وہی سکوت طاری ہو گیا

نوجوان کی آنکھیں آنسو بہانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

"خدا کے واسطے جاؤ اختر پھر نہ آنا جب یہ کہے جا یار [illegible] بات ہے کہ آج تک ہم نے تو کوئی نہیں کی۔"

~~~~~~

آخر نوجوان نے مہر خاموشی توڑ دیا

"اب میں کبھی نہ ملوں گا ــــ ــ ــ ــ یہ وہ مجھ پر کوئی شبہ کرے گا، نہ یہاں نہ وہاں

کبھی کبھی نہیں ـــــــ میں ـــــــ میں ــ ــ ــ ــ

نوجوان سلسلۂ کلام جاری نہ رکھ سکا۔

~~~~~~

"کہیں جا رہے ہو کیا؟ ــ ــ ــ ــ کہاں؟ ـــــــ کیوں؟

دور ــ ـــــــ بہت دور!"

"کتنی دور؟ ـــــــ کس جگہ؟"

"بہت دور زہرہ، بہت دور، جہاں سے کوئی لوٹا نہیں کرتا ـــــــ

ــ ــ ــ کوئی بھی نہیں"

"کیوں؟ آخر کیوں"

"تو بدنام ہوتی ہے زہرہ، میں نے آج تک کبھی تجھ سے بات کرنے کی جرأت نہیں کی ـــــــ اور اگر کی بھی تو ڈر کر، شرما کر، ہمت سے جواب دیدیا ــ ــ ــ ــ کبھی بات نہ کی ـــــــ کبھی بھی نہیں ــ ــ پھر بھی لوگ شبہ کرتے ہیں، جب تیرے سامنے آیا، ہمت، ارادے، جرأت سب سُن ہو کر رہ گئے ـــــــ پھر بھی لوگ شبہ کرتے ہیں ــ ــ ــ مگر آج! آہ آج! میری زندگی کی صرف ایک آرزو ـــــــ وہ آج پوری ہو گئی ـــــــ سب سے بڑی آرزو! بس اب جا، جا۔ یہاں بھی کوئی شبہ نہ کرنے لگے۔ تو بدنام نہ ہو جائے کہیں"

~~~~~~

"جاتی ہوں، اختر جاتی ہوں۔ جب گھر آؤں تو ضرور آنا، ضرور، اب تو بات کرنے وہاں مجھے ایک بات پوچھنی ہے، وہاں ہی پوچھوں گی:

"اس دنیا میں اس دنیا میں، اب ہم نہ ملیں گے۔ یہ ــــ ــ

یہ ــ ــ ــ ـــــــ ہماری آخری ملاقات ہے" "اور آخری بات چیت!"

میں کیا کہوں! آخری ملاقات [illegible] آخری بات چیت" "اب نہ ملیں گے:

میں نہ کہا ـــــــ کیوں؟ کہو، کہو، جلدی"

~~~~~~

آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں اوپر اٹھیں بہت شاید آخری دفعہ حسینہ کا جمال دیکھ رہی تھیں۔

"تجھ سے بس یہ بات کرنی ـــــــ وہ میرے کانوں نے تیرے الفاظ سن لے ــ ــ ــ ــ ــ زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہو گئی ــ ــ ــ ــ تیری شادی کے بعد اب کوئی آرزو ہو سکتی ہے جس کے لیے زندہ رہوں؟ ہاں! کیوں! ٹھیک ہے نا؟"

~~~~~~

دو موتی کی بول کی پتیاں کانپنے لگیں، اور ایک ٹھنڈی سانس بھرنے لگا، بادل کے چھوٹے سے غلیظ ٹکڑے سے سورج نے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔

حسینہ کی آنکھیں استعجاب سے باہر ابلنے لگیں، اس کا سانس زور زور سے چلنے لگا۔

پھر خاموشی، سکون، حیرت ـــــــ غم انگیز حیرت۔

ـــــــ

~~~~~~

"جو بات گھر پر جا کر پوچھنی چاہی تھی وہ اب پوچھ، بول: بول!!"

ٹھنڈا سانس گلاب کی پتیوں کے سے نازک ہونٹوں کو مس کرتا ہوا نکلا۔

"اب کیا پوچھوں ـــــــ تم نے بے پوچھے بتا دیا، مگر ـــــــ

"بول، کچھ بول، پھر یہ آواز شاید میری بھٹکتی ہوئی روح ہی یہاں آ کر سُن سکے۔ بول میں جواب دوں گا، ہمیشہ کے برعکس میں آج دلیر ہوں، میری وہ آرزو آج پوری ہوئی ہے جس کو میرے خواب تک نہ پوری کر سکے۔ مگر آج! آہ آج وہ پوری ہو ہی گئی"

حسینہ کا چاند سا چمکتا ہوا چہرہ زرد چنبیلی کے پھول کے ہم رنگ ہو چکا تھا۔

~~~~~~
~~~~~~

دیر تک سکوت رہا

اچھا الوداع۔

مرد نے عزم سے بھرآئی ہوئی آواز کو اس طرح کہا سے سہی

نہیں، نہیں، ٹھہرو، ٹھہرو، تم کہاں جاؤ گے، میں اکیلا نہیں ہوں ——

جہاں بھی —— میں ساتھ ہوں، چلو —— چلو ——

وہ اُس کی طرف بڑھی، گلا کرنے کو بڑھی، بغیر ارادے کے جس طرح پانی کے کنارے سے جمنا کے کنارے پانی میں پھسل پڑتے ہیں۔

"نہیں نہیں، ابھی نہیں، زہرہ کیا میرے کہے بغیر؟ ——"

"تمہارے کہے بغیر! —— نہیں —— تمہارے کہے بغیر —— نہیں"

"بس ٹھیک ہے، معصوم فرشتے، بالکل ٹھیک ہے۔ ایک دن میں خود آؤں گا، تیرے لینے کے لئے، میری معصوم زہرہ"

"کب؟ کس دن؟"

"جس دن اندھیاؤ کا جھکڑ چل رہا ہوگا، ایسا اندھیاؤ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے گا۔ ایسا تند جھکڑ کہ جو آدمیوں کو اُڑانے کے لیے دھکے دے گا۔ زلزلہ آئے گا، اور ایسا سخت کہ جمنا کا پانی جگہ کو چھوڑ کر پہاڑوں پر چڑھ جائے گا۔ —— پیاری! معصوم فرشتوں سے زیادہ پاک، زہرہ، میں آؤں گا اُس دن تجھے لینے، سنا تو نے؟"

"ہاں سنا"

"تو تیار ہوگی"؟

"ہاں اختر بالکل تیار، میں اسی وقت سے اُس گھڑی کا انتظار کروں گی"

عدم کے مسافر کا ہاتھ بے اختیار کانپتا ہوا بلند ہوا اور آہستہ آہستہ لرزتی ہوئی، کانپتی ہوئی، معصوم حسینہ کے گرد حمایل ہوگیا ——

حسینہ کی معصوم آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوگئیں۔

زمین و آسمان کانپ کر رہ گئے، ببول کی پتیاں سمٹ گئیں، اور تیز تیز کانٹے کھڑے ہوگئے، جمنا کا پانی گہرے سانس کی طرح اندر کی طرف سمٹ گیا، گھاٹ کے جبڑے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ تمام کائنات کے محسوسات سُن ہوگئے، ایک سناٹا چھا گیا، مکمل سناٹا ——

تھوڑی دیر کے بعد حسینہ نے آنکھیں کھولیں —— مگر وہ جا چکا تھا۔

کہاں؟

کسی نامعلوم جگہ

غریب حسینہ کی مایوس نظر نے چاروں طرف اُسے تلاش کیا، مگر لاحاصل —— وہ آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف چلدی۔

پیتل کی گاگر اور آہنی سخت دل بندوق اس آخری ملاقات کی یادگار پر نوحہ خوانی کرنے کے لئے رہ گئے تھے۔

حسینہ ہر آندھی اور جھکڑ چلنے پر انتظار کرتی ہے کہ وہ آئے گا، مگر زلزلہ نہیں آتا، اس لئے وہ نہ آتا ہوگا ——

زمین کا پتہ ہلا دینے والے زلزلے آئے، مگر جھکڑ اور اندھیاؤ ان دنوں میں نہ تھا، شاید اسی واسطے وہ نہ آیا ——

جھکڑ بھی چلا اور اندھیاؤ بھی سخت تاریک، زلزلہ بھی سخت خوفناک آیا، مگر بے رحم جمنا کا پانی اپنی جگہ سے نہ ہلا، اس لئے وہ بھی نہیں آیا ——

"شاید وہ یوں ہی گھاٹ پر گشت کرتا ہوا نکل آئے"

وہ گھاٹ پر جاتی ہے، ببول کے درخت سے کمر لگا کر گھنٹوں اس کا انتظار کرتی ہے، مگر پھر مایوس ہوکر گاؤں کو لوٹ جاتی ہے۔ ایک ناقابل فراموش دن کی یاد، اور ایک پُرمسرت آنے والے دن کی آرزو، اپنے دل میں چھپائے ہوئے ——"

وہ پھر گھاٹ پر آتی ہے، مگر بے سود، صرف ایک غم سے بھرے ہوئے دن کی یاد ببول کو ضرور دلا جاتی ہے ——

ہاں وہ آتی ہے، مگر بے حس گھاٹ کا دل دکھانے کے لئے ——

وہ آتی اور چلی جاتی ہے۔ لیکن جمنا کو گھنٹوں کے لیے سامانِ ملال و غم بخش جاتی ہے۔ جو اول اول شدتِ غم سے بے تاب ہو کر کنارِ دل سے ٹکرایا کرتی ہے۔ سارے دن میں یہ شدت آہستہ آہستہ کم ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ رات گئے تک سسکیاں اس میں بلند ہوتی رہتی ہیں۔

جمنا اپنا آغوش کھولے لیٹ رہے کہ وہ آئے اور اپنے سینے کی گہرائی میں جذب کر لے، اور اس کے ساتھ اس دردناک دن کی یاد میں غرق ہو جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ایک پُرمسرت دن کی منتظر ہے ——

~~~~~~~~~~~~

آہ معصوم حسینہ!

~~~~~~~~~~~~

حُسن

یہ کائنات مرا اک تبسمِ رنگیں
بہارِ خلد مری اک نگاہِ فردوسیں

ہے نور ریز فضائے جہاں مرے دم سے
ہیں جلوہ خیز زمین و زماں مرے دم سے

گھٹا، نہیں، یہ مرے گیسوؤں کا پرتو ہے
ہوا نہیں مرے جذبات کی تگ و دو ہے

جمالِ گُل؟ نہیں بے وجہ ہنس پڑا ہوں میں
نسیمِ صبح؟ نہیں، سانس لے رہا ہوں میں

ہے میرا خندۂ بیباک شورِ بلبل کا
ہے میرا دامنِ صد چاک، پیرہن گُل کا

مری تجلّیٔ زیبا ہیں چاند کی کرنیں
مری حیات کی اجزا ہیں چاند کی کرنیں

مری نگاہ کی تابانیوں کا مظہر ہے
جو نورِ سینۂ سینا میں جلوہ گستر ہے

یہ عشق تو ہے اک احساسِ بیخودانہ مرا
یہ زندگی تو ہے اک جذبِ والہانہ مرا

ہر ایک چیز ہے ظلمت نصیب میرے بغیر
جہاں ہے ایک طلسمِ مہیب میرے بغیر

ظہورِ کون و مکاں کا سبب فقط میں ہوں
نظامِ سلسلۂ روز و شب فقط میں ہوں

مجید امجد
(جھنگ)

دیر تک سکوت رہا۔

〰〰〰

اچھا الوداع۔

مرد اس پر زور سے بھرائی ہوئی آواز سے نزاں گوش کہا ہے سنی:

"نہیں، نہیں ٹھہر و، ٹھہر و، تم کہاں جا رہے ہو، میرے اچھا جیون جی ——

جیون جی ———— میں ساتھ ہوں، ٹھہرو ———— چلو —— ——"

وہ اُس کی طرف بڑھی، لڑکھڑا کر نیچے گر پڑی۔ بڑی پرواہ سے جس طرح پانی کے کناروں سے جمنا کے کنارے پانی نے پھسل پڑتے ہیں۔

〰〰〰

"نہیں نہیں، ابھی نہیں، زہرہ کیا میرے کہے بغیر؟ ————"

"تمہارے کہے بغیر! ———— نہیں ———— تمہارے کہے بغیر ———— نہیں"

"بس ٹھیک ہے معصوم فرشتے، بالکل ٹھیک ہے۔ ایک دن میں خود آؤں گا، تیرے لینے کے لئے، میری معصوم زہرہ"

"کب؟ کس دن؟"

"جس دن اندھیاؤ کا جھکڑ چل رہا ہوگا، ایسا اندھیاؤ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے گا۔ ایسا تند جھکڑ کہ جو آدمیوں کو اُڑانے کے لئے دھکے دے گا۔ زلزلہ آئے گا۔ اور ایسا سخت کہ جمنا کا پانی جگہ کو چھوڑ کر پہاڑوں پر چڑھ جائے گا۔

———— پیاری! معصوم فرشتوں سے زیادہ پاک، زہرہ، میں آؤں گا اُس دن تجھے لینے، سُنا تو نے؟"

"ہاں سنا"

"تو طیار ہوگی"؟

"ہاں اختر بالکل طیار، میں اسی وقت سے اُس گھڑی کا انتظار کروں گی"

〰〰〰

عدم کے مسافر کا ہاتھ بے اختیار کانپتا ہوا بلند ہوا اور آہستہ آہستہ لرزتی ہوئی، کانپتی ہوئی، معصوم حسینہ کے گرد حمایل ہو گیا ————

حسینہ کی معصوم آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔

〰〰〰

زمین و آسمان کانپ کر رہ گئے، ببول کی پتیاں سمٹ گئیں، اور تیز تیز کانٹے کھڑے ہو گئے۔ جمنا کا پانی گہرے سانس کی طرح اندر کی طرف رُک گیا گھاٹ کے جبڑے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ تمام کائنات کے محسوسات سُن ہو گئے ایک سناٹا چھا گیا۔ مکمل سناٹا ————

〰〰〰

تھوڑی دیر کے بعد حسینہ نے آنکھیں کھولیں ———— مگر آہ... وہ جا چکا تھا۔

کہاں؟

کسی نا معلوم جگہ

غریب حسینہ کی مایوس نظر نے چاروں طرف اُسے تلاش کیا، مگر لا حاصل ———— وہ آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف چل دی۔

پیتل کی گاگر اور آہنی، سخت دل بندوق اس آخری ملاقات کی یادگار پر نوحہ خوانی کرنے کے لئے رہ گئے تھے۔

〰〰〰

حسینہ ہر آندھی اور جھکڑ چلنے پر انتظار کرتی ہے کہ وہ آئے گا، مگر زلزلہ نہیں آتا، اس لئے وہ نہ آتا ہوگا ————

زمین کا پتہ ہلا دینے والے زلزلے آئے، مگر جھکڑ اور اندھیاؤ ان دونوں میں نہ تھا، شاید اسی واسطے وہ نہ آیا ————

جھکڑ بھی چلا اور اندھیاؤ بھی سخت تاریک، زلزلہ بھی سخت خوفناک آیا۔ مگر بے رحم جمنا کا پانی اپنی جگہ سے نہ ہلا، اس لئے وہ بھی نہیں آیا ————

〰〰〰

"شاید وہ یوں ہی گھاٹ پر گشت کرتا ہوا نکل آئے"

وہ گھاٹ پر جاتی ہے، ببول کے درخت سے کمر لگا کر گھنٹوں اس کا انتظار کرتی ہے، مگر پھر مایوس ہو کر گاؤں کو لوٹ جاتی ہے۔ ایک ناقابل فراموش دن کی یاد، اور ایک پُر مسرت، آنے والے دن کی آرزو، اپنے دل میں چھپائے ہوئے ————

〰〰〰

وہ پھر گھاٹ پر آتی ہے، مگر بے سود! صرف ایک غم سے بھرے ہوئے دن کی یاد ببول کو ضرور دلا جاتی ہے ————

ہاں وہ آتی ہے، مگر بے حس گھاٹ کا دل دکھانے کے لئے ————

وہ آتی اور چلی جاتی ہے۔ لیکن جمنا کو گھنٹوں کے لیے سامانِ ملال دے جاتی ہے، موا اول اول شدتِ غم سے بے تاب ہو کر کناروں سے ٹکریں مارتی ہے۔ سارے دن میں یہ شدت آہستہ آہستہ کم ہوتی ہے۔ پھر بھی رات گئے تک اس کی سسکیاں اس میں بلند ہوتی رہتی ہیں۔

جمنا اپنا آغوش کھولے کھڑی ہے کہ وہ آئے اور وہ اپنے سینے کا ابھار لو جب غرق کر دے، اور اس کے ساتھ اس دردناک دن کی یاد بھی غرق ہو جائے، دراصل میں وہ تنہا، کیوں کہ وہ ایک پُرمسرت دن کی منتظر ہے۔

آہ معصوم حسینہ!!

حسن

یہ کائنات مرا اک تبسمِ رنگیں — بہارِ خلد مری اک نگاہِ فردوسیں
ہے نور ریز فضائے جہاں مرے دم سے — ہیں جلوہ خیز زمین و زماں مرے دم سے
گھٹا، نہیں، یہ مرے گیسوؤں کا پرتو ہے — ہوا نہیں مرے جذبات کی تگ و دو ہے
جمالِ گل؟ نہیں بے وجہ ہنس پڑا ہوں میں — نسیمِ صبح؟ نہیں، سانس لے رہا ہوں میں
ہے میرا خندۂ بیباک شورِ بلبل کا — ہے میرا دامنِ صد چاک، پیرہن گل کا
مری تجلیٔ زیبا ہیں چاند کی کرنیں — مری حیات کی اجزا ہیں چاند کی کرنیں
مری نگاہ کی تابانیوں کا مظہر ہے — جو نورِ سینۂ سینا میں جلوہ گستر ہے
یہ عشق تو ہے اک احساسِ بیخودانہ مرا — یہ زندگی تو ہے اک جذبِ والہانہ مرا
ہر ایک چیز ہے ظلمت نصیب میرے بغیر — جہاں ہے ایک طلسمِ مہیب میرے بغیر

ظہورِ کون و مکاں کا سبب فقط میں ہوں
نظامِ سلسلۂ روز و شب فقط میں ہوں

مجید امجد
(جھنگ)

انشائے لطیف پر ایک نظر

(۲)

اثر لکھنوی

فسانہ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز"

لطیف صاحب نے یہ فسانہ موپاساں کے انداز میں لکھا ہے جو حقیقت نگار جماعت (REALIST SCHOOL) کی ایک نمایاں فرد ہے۔ اس جماعت کا خیال ہے کہ فسانہ نویسی میں اخلاقی پہلو سے قطعاً بیگانہ ہوکر فطرت کے تابع مسائل نفسیات خصوصاً تحریکات جنسی کو من و عن بیان کر دینا چاہیئے۔ میں اسی معیار کو پیش نظر رکھ کر اس افسانے پر تنقید کروں گا۔

نوشابہ فلسفے کے ایک پروفیسر کی لڑکی ہے۔ بہت کم سن تھی کہ ماں کا انتقال ہوگیا۔ باپ نے اُس کی پرورش بالکل فطرت کے مطابق کی "نہ کبھی کوئی حکم دیا، نہ کبھی کوئی نصیحت کی اور نہ کبھی کسی بات پر جھڑکا۔" آزاد و بیچ تی۔ گاتی اور "چشمے کے پانی میں گھنٹوں تیرا کرتی۔" جوان ہونے پر ایسی لڑکی کے جذبات، ولولے اور جنسی خواہشات کیا ہوں گی۔ کہاں تک اُن پر قابو رہے گا۔ کس طرح اُن کا ظہور ہوگا؟ فسانے میں انہی امور سے بحث کی گئی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ماحول، تعلیم و تربیت، صحت، اور دیگر واقعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو افعال اُس سے سرزد ہوئے فطرت کے مطابق تھے یا خلاف۔

سولہ برس کی عمر میں ایک صبح آئینے کے سامنے یہ لڑکی محسوس کرتی ہے کہ جوانی اپنی تمام رعنائیاں، رنگینیاں، امنگیں، اسرار اور الجھنیں لئے ہوئے اُس پر چھاگئی ہے۔ لطیف صاحب کے الفاظ ہیں :-

"عالم طفلی کی پرسکون سطح سے ایک ہستی واقعی اُسی طرح طلوع کرتی ہے جس طرح سطح بحر سے چاند، اور وہ ہستی اسی لئے طلوع ہوتی ہے کہ آفتاب کی شعاعوں سے تپش حاصل کرے، ہواؤں کی چھیڑ میں لذت پائے، ایک وسیع البسط دنیا کا وجود اُس پر منکشف ہو جائے اور بہ سرور تماشا آنکھوں کے سامنے وہ سرِّ عظیم و عجیب جسے حیات کہتے ہیں بے نقاب ہو جائے۔ اس کے بعد "سب میرے لئے ہے" "سب میرا ہے" کا ترانہ، ساز دل سے اس کی سانسوں کی شکل میں نکلے گا۔"

اس لڑکی کی دنیا کو بہار مرغزار سے قطع نظر جذباتی اعتبار سے اس کے باپ تک محدود تھی۔ خیالی و جذباتی فسانہ نگاری اس اصول پر کہ "ایسا ہونا چاہیئے" اس کی حیات کو کامیاب، پُر عشرت اور مسلسل ترانۂ مسرت بنانے کے لئے ایک مضبوط، خوش رو مرد کو جس کی عمر اس سے دو چار برس زیادہ ہوتی۔ جو صورت میں یوسف تو سیرت میں شستہ ہوتا، اس کے مقابل پیش کر دیتی۔ لیکن حقیقت نگاری جو "کیا ہونا چاہیئے" کے بجائے "کیا ہوتا ہے" دکھانا چاہتی ہے ایسا شخص تجویز کرتی ہے (پروفیسر کے فلسفی سکرٹری کی صورت میں) جو رعنائیت سے کوسوں دور ہے۔ اس کا حلیہ ملاحظہ ہو:

"وہ چنداں دل کش بھی نہ تھا، تاہم بعض باتیں محبت کی سفارش کرنے والی اپنے اندر ضرور رکھتا تھا۔ اُس کا شباب سب سے بڑی نوید تعشق تھا۔ لیکن وہ نہ تو بالکل متمدن تھا اور نہ قطعی وحشی: افسوس ہے کہ اُس کی زندگی کے رنگین لمحات شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگئے تھے: وہ فلسفے کا جویا تھا، اس لئے متین و سنجیدہ تھا ——— وہ چشمہ بھی لگاتا تھا، مگر اس سے بھی اُس کے حُسن میں کوئی اضافہ نہ ہوتا تھا۔ وہ خوبصورت نہ تھا بلکہ کچھ بدصورتی کی طرف مائل تھا۔ جو کپڑے پہنتا اُس سے بھی کوئی رعنائی پیدا نہ ہوتی تھی" ——— تاہم ایک ہفتے کے اندر نوشابہ اس کی محبت میں اس شدت سے مبتلا ہوتی ہے کہ غیر دلچسپ جمال "ایک خوبصورت دیوتا بن جاتا ہے۔"

ایک "شباب درخشاں" بن کر نوشابہ کی آنکھوں کو چوندھیا دیتا ہے، اور وہ حیران ہوتی ہے کہ اس نے "اب تک اس محل تک اپنے دیوتا کے عناصر لیتی ہیں کیوں"۔ دیکھا گر دیدگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دل ہی دل میں جمالی جمالی کہتی ہے اور ایک ایک نرت جو دو دمہوں کئے دیتا ہے۔ باپ ناشتے کے لئے پکارتا ہے مگر انکار کر دیتی ہے، اور جمالی کی دعوت نظر کو پھولوں اور پتیوں کا گجرا بنا کر اپنے سر کو سجاتی ہے اور خواہشات و جذبات سے مغلوب ہو کر فرش سبزہ پر گر پڑتی ہے۔ جمالی متاثر نہیں ہوتا غالباً اس وجہ سے کہ فلسفی ہونے کی بنا پر نوشابہ کے حسن اور اداؤں سے زیادہ اس کی فطرت کو ایک مسئلہ سمجھ کر مطالعہ اور حل کی فکر میں محو ہے۔ یہ سن گن کر کھانے کے کمرے میں داخل ہوتی ہے، جمالی ایک مرتبہ بھی اُس کی طرف نہیں دیکھتا۔ یہ اُسے گھورتی ہے مگر بے سود۔ اُٹھکر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے اور وہاں خوب روتی ہے۔ رات کے کھانے پر ماتم نظر آتی ہے مگر جمالی پھر بھی توجہ نہیں ہوتا۔ پروفیسر صاحب چلے جاتے ہیں، اب یہ دونوں خاموش اور تنہا ہیں۔ جمالی اب بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ نوشابہ کے غصے کی انتہا نہیں رہتی، کیونکہ جمالی اس لمحے کی نوعیتی و شعریت کو تباہ کئے دے رہا تھا: نوشابہ عاجز آگئی، اور آخر کار فیصلہ کیا کہ وہ میرے ساتھ معاشقے کی ابتدا نہیں کرتا، تو میں ہی پیش قدمی کروں گی اور ایسا ہی کرتی ہے۔

رومانوی فسانہ نگار نوشابہ کو اس کے بعد ایسے شخص سے ملا دیتا ہے جو اس کی تباہی کے باوصف جان و دل سے عاشق ہو جاتا ہے، اور سب جانتے ہوئے کہتا "پیاری نوشابہ اس اعتراف نے تجھے میری نظروں میں پہلے سے زیادہ حسین بنا دیا" اور یہ سسکیاں بھرتی ہوئی اُس کی آغوش میں ہوتی، مگر حقیقت نگاری صرف اتنے پر اکتفا کرتی ہے کہ جمالی جسے فلسفے میں ڈگری لینا تھا، اور مضمون (THESIS) لکھنے کے لئے نوشابہ کے والد کے ایما سے اُس نے نوشابہ کی فطرت کو اپنے مضمون کا موضوع بنایا مقصد پورا ہو جانے کے بعد نوشابہ کی منت سماجت رونے دھونے کی مطلق پروا نہیں کرتا اور رخصت ہو جاتا ہے۔ فسانے کا یہی پہلو ہے جس نے حقیقت نگاری کی آرٹ کا حق ادا کیا۔ مگر میں اتنا عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ لطیف صاحب نے اس امر کو اس قدر مبہم طریقے سے بیان کیا ہے کہ میں بہت غور کے بعد تہ تک پہنچ سکا۔ اور میرا دعویٰ خود ستائی پر محمول نہ کیا جائے تو گذارش کروں کہ شاید سو میں ایک متنفس افسانے کی یہ باریک سلاخیں معلوم کر سکے۔ افسانے بھر میں صرف دو جملے ہیں جو انتقال ذہن کے معین ہیں، دونوں ایک دوسرے سے بہت الگ اور بے حد مبہم۔ پہلا فقرہ جمالی کا ہے کہ "میں جس غرض سے آیا تھا وہ پوری ہو چکی" اور دوسرا فقرہ نوشابہ کے باپ کا کہ "میرا سکریٹری مل سکا میں میرا ساتھ نہیں دے سکا"۔

آخر میں ایک اور بات حقیقت نگاری کے متعلق عرض کر دوں۔ اس میں افادی پہلو بھی نکلتا ہے۔ وہ اس طرح کہ پڑھنے والے کو حرکات انسانی کی عریاں و کریہہ تصویر دکھا کر اُن کی طرف سے متنفر کر دے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد آپ نوشابہ کے مماثل کیرکٹر سے نفرت کئے بغیر نہیں رہ سکتے، جوان لڑکیوں کو جن میں ایسی امنگیں اور تحریکیں موجود ہوں فسانہ پڑھکر غیرت آئے گی اور اپنی طبیعت پر زیادہ قابو رکھیں گی، یا کم سے کم قابو رکھنے کی کوشش کریں گی۔ خصوصاً اس دور میں کہ پردے کا رواج قریب قریب اُٹھ گیا ہے۔

رُت آگئی

ہاں ساقیا رُت آگئی پھر سُرخ بنادے بے کیف ہوں مُدّت سے چھلکتا ہوا لادے
صدقے تری اس نیم نگاہی کے جِلادے ساغر نہ سہی اوک لگائے ہوں پِلادے
شورش نہ سُنی ہو یا نہیں معلوم سُنی ہے
تیری تو سخاوت کی بڑی دُھوم سُنی ہے

جب لطف ہے سرِ جوش چھلکتی ہوئی آئے ٹوٹے ہوئے ہوں پھُول مہکتی ہوئی آئے
ایک ایک رگِ گُل سے اُلجھتی ہوئی آئے بُلبل لبِ مینا سے چہکتی ہوئی آئے
لغزش سے مری ہاتھ ذرا بھی جو بہک جائے
چھینٹیں وہ پڑیں زردئ رُخسار چمک جائے

پیتے ہیں شبِ ماہ میں تو خوب ہے آگاہ رُخسار پہ گیسو نہیں رکھنے کی سند واہ
گُل زار کا رسیا ہوں تبسّم کی بھی ہو راہ تو ہنس پڑے تو پھُول برسنے لگیں واللہ
دریائے طبیعت تری، پھر کیا ہے ذرا میں
جھُوما کروں بیٹھا ہوا، گلشن کی ہوا میں

آغا شاعر قزلباش دہلوی

مسائلِ حیات

(گذشتہ سے پیوستہ)

حیات

(جوشؔ ملیح آبادی)

(۱۲) وہ آدمی جو ہر شخص سے مشورہ کرتا پھرتا ہے، جو اپنے سے مشورہ کرنا بھول جاتا ہے۔ اور اس کا مقسوم ہمیشہ قابل رحم ہوا کرتا ہے۔ مشوروں کی کثرت سے ہوشیار!۔

(۱۳) جب تم تمام لوگوں کو مطمئن کرنا چاہتے ہو تو چھپن ہزار مرتبہ اپنی روح فروخت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دوسروں کو کیوں مطمئن کرو؛ کیا تمھیں بھی اس کا مسا.ی حق نہیں ہے کہ زندہ رہو۔ اور مطمئن کیئے جانے کا دوسروں سے مطالبہ کرو۔

(۱۴) ہم تصورات کے ذریعہ سے جیتے ہیں۔ ہماری صناعت، فلسفہ، سائنس، اور اس کے ساتھ سب کچھ، محض ان تصورات پر قائم ہیں۔ جن کا مستقبل میں ابطال کیا جانے والا ہے۔ ہماری راستیاں وقتی راستی کے اعتبار سے چند محبوب تصورات کا مجموعہ ہیں۔ اور ہماری زندگی ان چند موہوم الوقوع امور کی امیدواری ہے، جو ہمارے کردار کے لئے ایک نیا میدان پیدا کردیں گے۔

دنیا کے سرور افراد حقیقت میں کاارباب تصورات ہیں۔ کیا تم ان میں سے ایک ہو؟

(۱۵) اس حیات چند نفس کے لذائذ سے محض اس بنیاد پر منہ پھیر لینا کہ کسی دوسری دنیا میں اس سے بہتر لذتیں حاصل ہوں گی، ایسا ہی احمقانہ فعل ہے کہ ہاتھ کی مچھلی کو اس امید پر دریا میں پھینک دیا جائے، کہ بڑی مچھلی مل جائے گی۔

ایک عملی کاروباری آدمی کی حیثیت سے کیا ہم زندگی کی مقدس شئے سے جوا کھیلنے کی جسارت کرسکتے ہیں؛ کیا نو نقد نہ تیرا ادھار کی ضرب المثل بنی ہے؟۔

(۱۶) کیا اس مہذب دنیا میں ہم نہیں دیکھتے کہ لوگ دوسروں سے وہ شئے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو بہت ممکن ہے ان کے قبضے ہی میں نہ ہو۔

(۱۷) عملی زندگی میں انسان کی آزادی کا بلند ترین اوج صرف انتہائی اشتراکیت کے اندر، اور نظری زندگی میں ذہنی بدعملی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ان چیزوں کو کیسے جوڑ کھانا چاہیئے؟۔

(۱۸) تغیر اور تبدل صرف ضروری نہیں بلکہ مفید بھی ہے۔ کیونکہ دراصل تغیر و تبدل ہی زندگی ہے۔ ابداع۔ زندگی کی نوجوانی۔ نقالی۔ خودکشی اور جمود و یکرنگی سانس لیتی ہوئی موت ہے۔

(۱۹) عملی زندگی میں "آیڈیل" (منتہائے نظر) تسویلات شیطانی ہیں۔ "مذہب" ایک مقدس سازش اور "اخلاقیات" ایک شائستہ بکواس ہے۔

(۲۰) زندگی ہم سے بسر کرائی جاتی ہے۔ اس کے تراشے ہوئے احکام ہم پر لادے جاتے ہیں۔ ہمیں بار بار آگاہ کیا جاتا ہے کہ دیکھو یہ تم کرسکتے ہو۔ وہ نہیں کرسکتے۔

کتنی عجیب مگر سچی صورت حال! یعنی دنیا ہماری ضروریات کو ہم سے زیادہ سمجھنے کی کوشش کرتی معلوم ہوتی ہے۔

(۲۱) کیا ہم دنیا کے پیشتر سے مرتب کردہ اصول حیات کی مطابقت میں زندگی بسر کرائے جانے کی مصیبت میں مبتلا رہیں۔ اور اس طرح قبل اس کے کہ ہمیں حیات کے آغاز کرنے کا موقع ملے، خودکشی کرلیں۔

(۲۲) کیا زندگی محض ایک مایوسی سے گذر کر دوسری مایوسی سے دوچار ہونے کا نام نہیں ہے۔ مایوسی کا ایک دور و تسلسل۔

(۲۳) قانون ہمیں دباتا ہے سوسائٹی ہمیں نچوڑتی ہے۔ اور مذہب ہمارا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ ہمارے اب تک زندہ رہنے کی جرأت، کاوش کا صرف یہی ایک سبب و حیلہ ہے کہ اب دیکھیں کیا ہونے والا ہے۔ کیا تمہیں علم ہے کہ آئندہ کیا ہوگا۔

(۲۴) میں ایک قطرۂ شبنم کی طرح آتا ہوں لیکن ایک طوفان کی طرح واپس جاتا ہوں۔ کیوں؟ یہی انسانیت ہے نا؟

(۲۵) ہر طلوع سحر کے وقت اس شگفتہ امید کے ساتھ ہم آنکھیں کھولتے ہیں کہ ممکن ہے آج کسی لطیفۂ غیبی کی بنا پر ہماری موافقت میں قطعی اچانک طور پر کوئی ایسا امر ظہور پذیر ہو جائے جس سے ہم اپنی زندگی کے متعین و محقق مقصود کو پالیں لیکن کیا ہر غروب کے بعد اپنی تمام مایوسیوں اور نا امیدیوں کے ساتھ ہم بستروں پر کروٹیں بدلتے بدلتے تھک کر سو نہیں جاتے۔ یہاں تک کہ آخرکار موت ہمیں وہ چیز دے دیتی ہے جس کا ہمیں گمان بھی نہ تھا۔

(۲۶) جب میں اس دنیا میں آیا تو وہ تنہا چیز جو حقیقی طور پر مجھ سے وابستہ تھی میرا جسم تھا۔ اور جب مجھے یہاں سے جانا پڑے گا تو کیا اس تنہا چیز کو مجھے موت کے حوالے نہیں کر دینا پڑے گا؟

(۲۷) زندگی کو متبدل و ملول کیوں بناؤ۔ خوش و خرم کیوں نہ ہو کیونکہ دنیا میں اس سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کہ وہ محض جینے کے لئے زندہ رہے، کیا مسرت ہمیں یہ محسوس نہیں کراتی کہ حیات قابل قدر شے ہے۔

(۲۸) جب تمہیں زندہ رہنا ہی ہے تو کیوں ان سیاہ مست رندوں کی طرح نہ رہو، جو بساط عشرت پر پیالے ہی پیالے خالی کر دیتے ہیں۔ اور ہر بار زندگی کو مخاطب کر کے آواز دیتے ہیں: "ایک اور جام"۔

(۲۹) جب خوشی کا لمحہ تمہارے دروازے پر دستک دے۔ ممکن ہے تم اس وقت سو رہے ہو، اور تمہارے جاگتے جاگتے وہ کسی غلط راستہ پر گامزن ہو جائے، زندگی بھی ایک ایسا ہی زریں لمحہ ہے، بیدار رہو۔ کیونکہ یہ لحہ ایک بار اور صرف ایک بار آتا ہے۔

جنس

(۱) خواہ ہمارے شعور اخلاقی اور آداب ظاہری کو کتنا ہی صدمہ کیوں نہ پہنچے لیکن ایک صاف گو آدمی کیا بغیر ادنیٰ ترین فرق الطال یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ اگر انسانیت و دنیا کے تمام تر مقاصد سے بڑھکر کسی ایک مقصد کے واسطے زندہ ہے تو وہ مقصد مقصد جنس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

(۲) مرد خوشامد کرتے اور جھوٹ بولتے ہیں، اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں عورتیں اسے پسند کرتی ہیں، اور عورتیں یہ سب کچھ اکراہ کے ساتھ برداشت کرتی رہتی ہیں، یہ سمجھکر کہ یہ مرد کی فطرت ہے۔

مردوں کے نزدیک عورتیں دلفریب لیکن بے مغز پریاں ہیں۔ اور عورتوں کے نزدیک مرد شائستہ ذوی شعور درندے ہیں۔ اور کیا یہ دونوں فریق تھوڑی سی ایمانداری کی کمی کے باعث اور اس علم کے بغیر کہ ان دونوں کے دماغوں کے پس پردہ کیا ہے زندگی کا تناسب قائم رکھنے کی خاطر ایک دوسرے کو در پردہ سبک کرانے اور جا بنے کے شغلے میں مصروف نہیں رہتے ہیں۔

(۳) کیا اس محل پر جب ہماری جنسی زندگی کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے ہم سب کے سب دروغگو نہیں ہیں؟

(۴) کیا تم نے اسے نوٹ نہیں کیا ہے کہ کتنے بیشمار عورتوں سے نفرت کرنے والوں کی خوش قسمتی سے کوئی بیوی نہیں ہے، جو ان کے اقوال کی تکذیب کر سکتی۔

(۵) کسی صاحب معلومات مرد سے ملنا مسرت کا باعث ہے۔ اور کسی پر از معلومات عورت سے ملنا اس سے بھی زیادہ خوشی کا سبب ہے ذہین عورت ایک ذہین مرد کے مقابلے میں انسانیت کی ایک زیادہ قابل ستائش قسم ہے۔

کیا عورت کو پہچان لینا ایسا ہی مشکل ہے۔ جیسے اسرار حیات کو جاننا۔

(۶) عورتیں مردوں کے مقابلہ میں زیادہ حساس واقع ہوئی ہیں۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ ان میں اچھے شعراء بہت ہی شاذ ہوتے ہیں۔

(۷) کیا عورت کا سمجھ لینا اسرار حیات کے سمجھنے سے زیادہ دشوار کام ہے؟

(۸) جنس کے متعلق ہماری معلومات کس قدر محدود ہیں، تمام جنسی

معصیتیں اس چیز کے مخفی رکھنے کی عادت سے پیدا ہوتی ہیں۔ جس کا اظہار وجہ ب دلالت ہوسکتا ہے لیکن فطری طور سے جنہیں ترک نہیں کیا جاسکتا۔

(۹) کیا جنسی مصائب اس محبوب خواب وخیال یا وہم پر مبنی نہیں ہوتے کہ جہالت ہمیشہ معصومیت کے ہم مرتبہ اور علم کی کمی ہمیشہ خیر کے ہم پایہ ہوتی ہے۔

(۱۰) جنسی جہل ایک جرم ہے اور جنس کی خودبرد دوسرا جرم ہے۔ کیا ہم ان دونوں جرموں سے پاک ہیں؟

(۱۱) قوت متخیلہ کی پرواز جنسی جذبات میں نمایاں حصہ لیتی رہتی ہے۔ جنسی آسودگی محض میکانکی ہے۔ کیا اس کے لذائذ دماغ سے متعلق نہیں ہوتے؟

(۱۲) خیال خود نے شعور ہے، کیا مقصد فطرت انسان کو اسی طرح لذت اندوز کرتا ہے جتنا کہ اس کے مبادی جو علانیہ طور پر اضطراب انگیز ہوتے ہیں۔

(۱۳) شرم عفت کا نشان ہے، اور کیا یہ ثابت نہیں کرتی کہ کوئی ایسی شے ضرور ہے جس کا مخفی رکھنا ضروری ہے۔ اور جس کے باب میں خوف ہے کہ ظاہر نہ ہوجائے۔

(۱۴) ایک پرجوش عاشق قبل اس کے کہ اس کی شرمیلی محبوبہ کو اس سوال کا موقع ملے جواب دیتا ہے کہ "میں چاہتا ہوں"۔

کیا عشاق جب "کیوپڈ" ان کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے آپس میں لڑنے جھگڑنے نہیں لگتے ہیں؟

(۱۵) جنسی آشفتگی وعدم موافقت ایک ایسا سنگ گراں ہے جو ہزاروں دلوں کے شیشوں کو چور چور کرچکا ہے۔

جنسی جبلت کے غلط استعمال کے مواقع ازدواجی زندگی میں، مجرد زندگی سے کہیں زیادہ ہیں۔ کیا شادی فطری خرد برد کے واسطے ایک بلینک چیک (صفحۂ سادہ) نہیں ہے۔ ایک غیر مشروط فرمان نہیں ہے۔

(۱۶) کیا جنسی جرم ایک ایسے اجنبی کے ساتھ جو صرف کل وارد ہوا ہے محض اس وجہ سے یکایک اخلاقی حق کا خطاب حاصل نہیں کرلیتا ہے، کہ قانون یا سوسائٹی نے اس پر ازدواج کی مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔

(۱۷) جب ہم مردوں کے عزائم کا ذکر کرتے ہیں تو عورتوں کے آزادانہ انتخاب کے حق کا چرچا کیوں نہ کریں۔ کہ انہیں ایسی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں کہ وہ یہ خود انتخاب کرسکیں کہ ان کے بچے کا باپ کون ہوگا؟۔

(۱۸) کیا یہ ہمیشہ عورت ہی ہوتی ہے جو مرد کو بداخلاقی کی ترغیب دیتی ہے؟ یہ مرد کی ذات ہوتی ہے، جو حسب موقع ایک قابل حصول عورت کے پالینے میں اپنی آپ امداد کرتا ہے؟۔

(۱۹) کیا کسی غیر آمادہ رفیق سے حلیف دو فرض کے ادا کرنے کا مطالبہ جرم، جور اور بدمذاقی نہیں ہے؟

(۲۰) جنسی معاملات میں انفرادی آزادی، اور دماغ کے صحیح میلان کا لحاظ رکھنا سب سے زیادہ ضروری اور خوشگوار مسئلہ ہے۔

(۲۱) تحمل و نیازمندی عورت کی فطرت کی قابل پرستش صفتیں ہیں۔ کیا مرد کا فرض نہیں ہے کہ وہ عورت کے ان اوصاف کی تقدیس کرے، اور ان نادر صفات کے بیجا استعمال سے گریز کرتا رہے۔

(۲۲) جنسی معاملات میں تہذیب اس وقت تک محض شائستگی اور نفاست کا ایک کھیل ہے۔ جو جہالت وابہام کے قدیم مندر کی پرستش میں مصروف رہتی ہے جب ہمارے نقطۂ نظر میں تبدیلی نہ پیدا ہوگی، جنسی تفصیلات غیر متبدل ہی رہینگی جنسی امور میں کیا ہم وحشیوں سے زیادہ شائستہ کہے جاسکتے ہیں؟۔

ازدواج

(۱) ازدواج، انتفاع باہمی کے لئے صرف ایک معاہدہ یا ٹھیکہ ہے۔ . . .

کیا یہ محض اس لئے اچھا مشغلہ نہیں ہے کہ خوش آیند ہے۔

(۲) ازدواج میں جنسی جبلت کے علاوہ اور بھی کچھ ہے، ازدواج اس تناسب سے کامیاب کہا جاسکتا ہے، جس تناسب سے فریقین اپنے کو ایک دوسرے کے حوالے کردیتے ہیں۔ حقیقی ازدواج کے معنی ہی ایک جان و دو قالب کے ہیں۔ جیسے ایک چراغ کی دو بتیاں۔

(۳) کیا تم نے کبھی اس کا حساب لگایا ہے کہ کتنی عورتیں جن سے وہ شادی کرنا چاہتی ہیں، شادی نہیں کرسکتیں، اور کتنے مرد جن سے ان کی شادی ہوتی ہے محبت نہیں کرتے۔

(۴) صحیح تعلق فراخدلی کی مناسبت سے پیدا ہوتا ہے۔ نہ کہ خون سے لیکن کیا ازدواج محض ایک کاروباری چیز نہیں ہے، رومان سے دور، لطافت سے بعید۔

(۵) کیا ازدواج حسن ولطافت کو آخرکار فنا نہیں کردیتا ہے، کیا شوہر کا احساس ملکیت عورت کے حسن کی تب وتاب کو زیادہ مدت تک باقی رکھ سکتا ہے کیا ہمیشہ کے لئے کسی شے کے قبضے میں آجانے سے اس کی روحانی لطافتیں فنا

[illegible] نہیں ہو جائیں؟

(۶) چہرہ خواہ کتنا ہی دلفریب ہو، اگر لگاتار صبح و شام دیکھا جائے تو کیا اس میں دلکشی باقی رہ جا سکتی ہے؟

(۷) کیا ہماری بسم ازدواج پر ایسی ہی سلبی حسب ایک بکرمانہ نادری مرتب کریں گی، تو ہمیں ان الفاظ سے یاد رکھنی کہ ہمارے آبا و اجداد [illegible] مدراجن تھے کہ شادیاں کیا کرتے تھے؟

(۸) اگر جل علائق کا نام انسانی نجات ہے تو کیا ازدواج دنیا کی سب سے بڑی وابستگی اور علاقہ نہیں ہے۔ اور اس کی موجودگی میں کیا کوئی شخص [illegible] زندگی بسر کر سکتا ہے؟

(۹) بچوں کی موت اور زندگی دونوں مساوی طور پر جب ایذا ہیں۔ ان کی زندگی میں یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ کہیں مر نہ جائیں۔ اور ان کے مر جانے پر دل میں ایسا ناسور پیدا ہو جاتا ہے جو کبھی بھر نہیں سکتا۔ اور کیا انہیں برکات کی خاطر رسم ازدواج کو زندہ رکھنا چاہیے؟

(۱۰) [illegible] سے ایسے ہیں جن کی شادی ہو چکی ہے۔ مگر نکاح نہیں ہوا ہے بہت سے ایسے ہیں جن کا نکاح تو ہو چکا ہے۔ مگر شادی نہیں ہوئی ہے۔ میرا شادی سے مقصود وہ مضبوط روحانی قربت ہے، جو معدوم نہیں ہو سکتی۔

(۱۱) رسمی یا خلاف مرضی شادی مذہبی مراسم عقد کے ادا ہونے کے بعد بھی ایک ناجائز تعلق سے زیادہ نہیں ہے۔

(۱۲) کتنے بچے ہیں۔ جو غیر منکوحہ ماؤں کے بطن سے پیدا ہو کر حقیقی نقطۂ نظر سے جائز بچے کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اور کتنے بچوں کا منکوحہ ماؤں کے بطن سے پیدا ہونے کے باوجود ناجائز بچوں کی فہرست میں نام لکھنا چاہیے۔

(۱۳) صرف اس موقع پر جب کوئی شخص کسی عورت سے جبریہ جسمانی تمتع کرے عورت مرد کی مقاربت کو ناجائز ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ ورنہ فریقین کی رضامندی خواہ وہ کسی شکل میں ہو، اصلی طور پر ازدواج کہی جا سکتی ہے۔

(۱۴) ازدواج اعلان رسوم اور چند الفاظ کے دہرائے جانے کا نام نہیں ہے۔ وہ فریقین کے باہمی سمجھوتہ کی بات ہے۔

(۱۵) ازدواج تو جس پر سوسائٹی کو کوئی پابندی عائد کرنے کا حق نہیں ہے ہیں۔ فریقین کے طبائع کی ہم آہنگی، وقتی ضروریات۔ دلی پسندیدگی۔ اور ذہنی رجحانات لیکن کیا قانون اور سوسائٹی جب تک اس پر مہر تصدیق نہ ثبت کر دیں، گرفتار رسوم دنیا اسے جائز سمجھنے پر تیار ہو سکتے ہیں؟

(۱۶) کیا کوئی جسمانی ازدواج، ازدواج کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو سوسائٹی اور قانون کی اصطلاح میں محض ایک محاورہ ہے، اور کیا ہماری اکثریت اس جسمانی [illegible] کی بلا میں گرفتار نہیں ہے؟

(۱۷) صرف وہی ازدواج حقیقتاً مقدس ہے، جو پورے خلوص اور کامل [illegible] کے ساتھ واقع ہو۔ اور اس طرح کے ازدواج کو اس کی پروا کیوں ہو کہ دنیا کے اور [illegible] مہر تصدیق ثبت فرمائیں

(۱۸) قانون اور سوسائٹی سے شوہر یا بیوی بننے کے لئے کیوں مدد لو۔

(۱۹) جب تم آزادی کے ساتھ لطف زندگی بسر کر سکتے ہو تو شوہر [illegible] بار گراں کو دعوت دینا کیا انتہائی حماقت اور بدذہنی نہیں؟

(۲۰) انگور ایک بہترین پھل سہی، لیکن کیا تمام عمر اور [illegible] انگور [illegible] خطرناک ہو گی! قابل گریہ جمود!!

(۲۱) شادی بزدلوں کی اس بات میں مدد کرتی ہے [illegible] بزدل [illegible] ہے کیا تم بزدل ہو یا خود غرض؟

(۲۲) ازدواج کی الوہیت اور تقدیس کو فاتحہ [illegible] اور اس کی جگہ محض میلان خاطر اور محبت کو کیوں نہ قائم کر لو۔

(۲۳) سوسائٹی سے کہہ دو کہ ازدواج کو فریقین کے علاوہ [illegible] علاقہ نہیں ہے۔ آخر یہ تمام غیر متعلق چھوٹے بڑے خورد و کلاں [illegible]

(۲۴) آجکل کا ازدواج تو محض ایک آنکھ مچولی ہے۔ دونوں [illegible] سرگرداں رہتے ہیں کہ کون کیا چھپا رہا ہے لیکن کیا ازدواجی زندگی [illegible]

(۲۵) تم ایک دوسرے کو اس وقت تک تعلقی [illegible] نہیں [illegible] جاتے، اور اس پر بھی ایک کافی مدت گذر نہ جائے [illegible] کرتے ہو کہ کاش ہم نے ایک دوسرے کو [illegible]

(۲۶) وہ ہمیشہ مجرد ہی رہا [illegible] کے تخیل کو برداشت نہیں کر سکتا [illegible]

(۲۷) ازدواجی زندگی [illegible] ازدواجی زندگی کی نقریبا [illegible] ذمہ داریاں نہیں ہوا کریں؟

کلامِ متین

(۱)

تجھے بھی [illegible] طرح [illegible] دیکھا ہے
سکوت شب میں بھی انقلاب دیکھا ہے

[illegible] حسن کو بھی مضطرب ہی پایا
نگاہ ناز کو بھی شرمسار دیکھا ہے

جگر نے خنجر ابرو کے زخم کھائے ہیں
خدنگ ناز [illegible] جادو کا وار دیکھا ہے

فیود رسم و راہ [illegible]
کبھی کبھی تجھے بے اختیار دیکھا ہے

[illegible] نگاہ میں دیکھا [illegible]
جمال زشت و حسن [illegible] دیکھا ہے

بہار صبح کی رنگینیوں میں [illegible]
کنار آب و سبزہ لالہ زار دیکھا ہے

چراغ مہر میں قندیل ماہ [illegible]
تری ہی برق نظر کا شرار دیکھا ہے

فضائے نور میں اے شمع انجمن تجھ کو
نگاہ شوق نے پروانہ وار دیکھا ہے

خرام صبح میں اکثر مری نظر نے تجھے
[illegible] سبزہ بستانہ زار دیکھا ہے

سواد کوہ میں میں نے کبھی کبھی تجھ کو
بہ زمزمۂ آبشار دیکھا ہے

لباس گل میں کبھی نغمۂ بلبل میں
غرض تجھی کو بہر رنگ بہار دیکھا ہے

---

(۲)

بے ترے حسن بہار چمنستاں معلوم
بے ترے [illegible] ضیائے مہ تاباں معلوم

[illegible] جو کچھ ہے سو ترے دم سے ہے
[illegible] سنبل و ریحاں معلوم

[illegible] خوبی ہے تری ہی سے خوبی [illegible]
[illegible] سرہ جبیناں معلوم

تو نہیں پاس تو رنگینی عالم بیکار
[illegible] طربستاں معلوم

زندگانی [illegible] لب شیریں مری
ورنہ جان [illegible] چشمۂ حیواں معلوم

خندہ برق دلآویز تبسم سے ترے
بے ترے دلکشی موسم باراں معلوم

نقد و نظر

اخبار و رسائل

سالنامہ وطن۔ دہلی

قیمت ۸ر

اڈیٹر۔ سشیو نرائن بھٹناگر۔

ملنے کا پتہ۔ دفتر روزنامہ وطن۔ دہلی۔

وطن کا سالنامہ جس کا سائز ۲۲×۲۹ ہے ۱۸۶ صفحات پر شائع ہوا ہے جو نامور ادیبوں کے مضامین، اور مشہور شعرا کے کلام سے مزین کیا گیا ہے۔ دیگر اخبارات کے سالنامے اس کاوشس اور انہماک سے بہت کم ترتیب دیئے جاتے ہیں، منشی پریم چند کا مضمون "اقلیت کے حقوق" پڑھنے سے اندیشہ ہوتا ہے کہ ایک نامور فسانہ نگار کہیں آہستہ آہستہ ایک فرقہ وار سیاسی مضمون نگار کا چولہ نہ بدل لے۔

ترتیب مضامین تو کچھ زیادہ قابل اعتراض نہیں لیکن اشتہارات کا ایسا شدید حملہ ہوا ہے کہ بچارے مضامین اکثر بارہ باٹ ہو ہو گئے ہیں۔

اخبار وطن آہستہ آہستہ مگر بڑی مستقل مزاجی سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہو رہا ہے۔ ہم فاضل مدیر اور منتظمین کو مبارکباد دیتے ہیں، اور توقع رکھتے ہیں کہ آیندہ سالانہ نمبر نکالتے وقت وہ اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کا اہتمام اس دفعہ سے زیادہ شاندار طریق پر کریں گے۔

"م"

کنول (خاص نمبر)

قیمت سالانہ ؁ نی پرچہ ۵ر۔ خاص نمبر ۱۲ر

مدیر۔ منظر صدیقی اکبرآبادی۔

ملنے کا پتہ۔ آگرہ۔

حضرت سیماب (اکبرآبادی) کے خلف الصدق کی ادارت میں یہ رسالہ نکلتا ہے۔ جنوری نمبر جو زیر ریویو ہے اس کا خاص نمبر ہے۔ جو اعلیٰ پایہ مضامین، دلآویز افسانوں اور پاکیزہ نظموں سے جس حسن ترتیب کے ساتھ آراستہ کیا گیا ہے، وہ قابل داد ہے، اور اس چھچھورپن سے جس کی رو میں ہمارے اکثر و بیشتر اردو رسائل بہے چلے جا رہے ہیں۔ بالکل منزا اور پاک ہے۔ ہم کنول کی اس کامیابی پر منظر صاحب کو صدق دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ ۱۴۰ صفحات کا رسالہ جس میں متعدد تصاویر یک رنگی و سہ رنگی ہوں اور پھر مضامین بھی قابل قدر، کسی طرح ۱۲ر میں مہنگا نہیں، ارباب ذوق ضرور مذکورہ بالا پتہ سے طلب کر کے منظر صاحب کی سعی و محنت کی داد دیں۔

"م"

مصحف

مدیر۔ شاطر نائطی۔

ملنے کا پتہ۔ مینجر مجلہ مصحف، عمرآباد۔ (شمالی ارکاٹ)

شمالی ارکاٹ سے یہ مذہبی اور ادبی رسالہ ۲۸ صفحات کا دو سال سے نکل رہا ہے۔ ماہ فروری کا پرچہ ریویو کی غرض سے دفتر کلیم میں بھیجا گیا ہے۔ شروع میں چند خالص مذہبی مضامین ہیں۔ درمیان میں دو ایک تاریخی اور علمی مضامین ہیں۔ اور آخر میں ادبی چاشنی کے لئے چند افسانے بھی موجود ہیں۔ شعر و سخن سے بھی خالی نہیں ہے۔ زبان کے لحاظ سے رسالہ اچھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ جامعہ دار السلام عمر آباد کے زیر نگرانی نکالا جاتا ہے۔ ایک مضمون "عورتوں کی تعلیم و تربیت" کے متعلق بفضل العلماء مولوی محمد یوسف صاحب کوکن عمری کا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ آخر طبقہ علماء نے بھی عورتوں کے جہل اور اس جہل کے نتائج کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔ مولانا نے حسب دستور عہد حضور سرور کائنات (صلعم) اور خلفاء و تابعین وغیرہم کے زمانہ کی خواتین کا ذکر فخر و مباہات سے کیا ہے کیا آجکل کے علمائے کرام اس آزادی کو مردوں کے لئے بھی جائز رکھ سکتے ہیں۔ جو حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک عورت کے لئے جائز تھی۔ اگر آج کوئی مسلمان خطبے یا وعظ کے دوران میں واعظ یا خطیب صاحب کو ٹوک دے، تو پھر خدا ہی ہے جو وہ خیریت سے مسجد سے باہر آ سکے۔ اس رسالہ کی طباعت کتابت اور کاغذ نہایت عمدہ ہے۔ اور سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ گو جنوبی ہند کے اس حصہ سے نکلتا ہے، جہاں اردو کی پرستش شمالی ہند یا حیدر آباد دکن کی طرح نہیں ہے۔ پھر بھی معلوم ہوتا ہے، گویا اعظم گڑھ کے معارف کا سائز بڑھا دیا گیا ہے ہم حضرت مدیر مسئول اور انکے معاونین کو اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ "م"

الاصلاح

قیمت سالانہ للعہ۔ فی پرچہ ۶ر

مرتب۔ امین احسن۔ اصلاحی۔

ملنے کا پتہ، دفتر دائرہ حمیدیہ الاصلاح۔ سرائے میر۔ اعظم گڑھ۔

الاصلاح مذہبی رسالہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مقصد اجرا کو ضرور پورا کرتا ہے۔ صوری حیثیت سے اپنے ہمعصر "معارف" کے ہمرنگ ہے۔ جو اصحاب دینی شغف رکھتے ہوں، وہ ضرور مطالعہ فرمائیں۔ "م"

باغ و بہار نئی دہلی

نمونہ مفت، قیمت سالانہ ۸ر۔ فی پرچہ ار۔ ضخامت مع اشتہارات ۴۰ صفحے

مدیر۔ سعدی۔ مچھلی شہری۔

یہ اردو کا سب سے پہلا ماہوار پرچہ ہے، جو نئی دہلی سے نکالا گیا ہے۔ اگر ایک جگہ کے اس قدر ادیب یکجا نہ کئے جائیں تو تنوع کے لحاظ سے یہ امر نہایت مناسب ہوگا۔

شذرات میں مدیر صاحب نے فرمایا ہے کہ پہلے "اردو رسالہ نکالنے کا خیال پیدا ہوا" ساتھ ہی یہ خیال ہوا کہ "بچوں کا ماہوار رسالہ ہو" اور "آخرکار ایک سستا سا علمی رسالہ "نظیر" ناظرین کر رہا ہوں"

ہونہار مدیر نے عمدہ مضامین جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ جعفری ڈائرکٹر پبلک انفارمیشن بیورو حکومت ہند۔ خواجہ حسن نظامی، اور مصور درد حضرت سید فرید جعفری۔ نیرنگ خیال و لیلیٰ کے مضامین دلچسپ ہیں۔

سعدی صاحب سے ہمیں یہ کہنے کا حق ہے، کہ بھائی پڑھو اور خوب پڑھو اور رسالہ احتیاط سے نکالو، تو تم ضرور ایک دن ادیب بن کر رہوگے، جس کے آثار ابھی سے ہویدا ہیں

"م"

کوثر

مدیر۔ محمود خاں محمود بنگلوری۔

قیمت سالانہ ۲ عہ۔

فی پرچہ ۲ر۔

یہ ۲۴ صفحے کا ماہنامہ جنوبی ہندوستان کے مشہور شہر بنگلور سے نکل رہا ہے۔ لکھائی، چھپائی پاکیزہ ہے۔ اور کاغذ پاکیزہ تر ہے۔

ماہ فروری کا رسالہ ہمیں ریویو کے لئے ارسال کیا گیا ہے۔ جس میں بعض مشہور ادیبوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ زیادہ تر جنوبی ہندوستان کے اہل قلم کی معاونت اسے حاصل ہے۔ جنوبی ہندوستان سے اردو رسائل کا اجرا، درحقیقت ادب اردو کے پرستاروں کے لئے نہایت دل خوش کن اور مسرت آگیں خبر ہے۔ ہمیں کوثر کی کامیابی کی یقینی توقع ہے۔

ارباب ذوق جس قدر جنوبی ہند کے رسائل کی سرپرستی خریدار بن کر فرمائیں گے اسی قدر خدمت زبان و ادب ہے۔ "م"

اتحاد (خورجہ)

قیمت سالانہ ۲؎ ۔ فی پرچہ ۵؍

ایڈیٹر بشیر بھائی ۔

۴۴۔۴۴ صفحات کا یہ ماہوار رسالہ کئی سال سے خورجہ ضلع بلند شہر سے نکلتا ہے ۔ صرف افسانے اس رسالے میں ہوتے ہیں ۔ ہم ہندوستانیوں میں اور بالخصوص مسلمانوں کی تو گھٹی تک میں قصے اور کہانیاں پڑی ہوئی ہیں ۔ پھر کیوں نہ ایسے رسائل مقبول ہوں ۔ جن میں صرف کہانیاں ۔ قصے اور افسانے ہی افسانے ہوں ۔ چنانچہ اتحاد کا یہ نمبر جو ہمارے پاس بغرض ریویو ارسال فرمایا گیا ہے گو ہمیں ورق گردانی اور کافی جستجو کے بعد بھی یہ بتانے سے قاصر رہا کہ وہ جنوری ۱۹۳۶ء کا رسالہ ہے یا فروری ۱۹۳۶ء کا ، جنوری ۱۹۳۵ء کا ہے یا جنوری ۱۹۲۲ء کا لیکن ورق پلٹتے ہی اس نے یہ بتا دیا کہ اس کا بہترین افسانہ جناب مدیر کے نزدیک چونکہ "نور جہاں" ہے ، اس لئے "آج" کے ماہنامے کو اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔ جدت تو یہ واقعی بالکل انوکھی ہے ۔

اس سے زیادہ افسوس رسالہ کے مطالعہ سے یہ ہوا کہ جس فسانے کو پسند کیا گیا ہے ، وہ بلا وجہ طویل ہے پلاٹ فرسودہ ہے ۔ اور کوئی بھی خوبی اس میں ایسی نہیں جو چڑے چڑیا کی کہانی سے اسے ممیز کر سکے ۔ دوسرا افسانہ خود حضرت مدیر کا ہے جو ان کے پسندیدہ فسانے سے یقیناً بہتر ہے ۔ باقی افسانوں کا تو ذکر ہی فضول ہے ، لیکن اس میں نہ حضرت مدیر کا کچھ قصور ہے ۔ اور نہ افسانہ نویسوں کا ، بلکہ اس قسم کے رسائل سے ہمارے عوام کے ذوق ادب کا پتہ لگتا ہے ۔ جو قوم کوک شاستر ، دلہن کی ڈائری پہلی شب وغیرہ مہملات اور مخربات ہزاروں کی تعداد میں خرید سکتی ہے ، وہ اگر ایسے رسائل کی بھی سرپرستی کرے تو کوئی برائی نہیں ۔ جو یقیناً اس درجہ مخرب تو نہیں ہیں ۔

ساربان

مدیر ۔ غلام محمد خاں بی ۔ اے ۔ ملنے کا پتہ ۔ دفتر ساربان آسٹریلیا بلڈنگ ۔ لاہور ۔

چندہ سالانہ عمومی ۲؎ ۔

یہ رسالہ اس قدر کم قیمت اور اس کے دوش بدوش اس قدر مفید اور اعلیٰ مقاصد کے تحت جاری کیا گیا ہے ، اس میں ایک ایسی عظیم روح کارفرما ہے کہ اگر اس کی یہی رفتار رہی تو عنقریب ہی ملک کا ایک بہترین راہنما اور سچا خادم ثابت ہوگا ۔ لکھائی چھپائی قابل تعریف اور کاغذ نفیس ہے ۔ ہمدردانِ ادب ضرور ملاحظہ فرمائیں (م م)

کتب

کلیم عجم

مصنفہ ۔ حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی ۔

حجم ۔ ۴۰۰ صفحات ۔

قیمت ۔ ۲؎ علاوہ محصول ۔

ملنے کا پتہ ۔ قصر ادب آگرہ ۔

"افسوس ہے کہ مارچ کا رسالہ تیار ہے ، اور ہمیں اتنی مہلت نہ مل سکی کہ ہم کلیم عجم کا بہ نظر امعان مطالعہ کر کے ، مکمل تبصرہ نذر ناظرین کر سکتے ، یہ کسی چلتے پھرتے شاعر کا مجموعۂ کلام نہیں ہے ، بلکہ اپنے زمانے کے ایک کہنہ مشق شاعر و ادیب کی تصنیف ہے ۔ جو صاحب فکر ہے جدت آفریں ہے ۔ "نقد و نظر" میں اتنی گنجائش بھی نہیں ہے کہ حضرت سیماب کے اس گنج گراں مایہ کی اس میں تفصیل سما سکے ۔ لیکن ہم یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ عنقریب کلیم عجم پر ایک ایسا مضمون لکھ کر نذر ناظرین کریں جو صحیح معنوں میں تبصرۂ "کلیم عجم" کہلا سکے " ! تاہم جس قدر اس قلیل مہلت میں اسے دیکھا ہے ، اس کے لحاظ سے یہ چند سطور بطور تبصرہ حاضر ہیں "

حضرت سیماب کی غزلیات اور خطبات شاعری کا مجموعہ "کلیم عجم" کے نام سے حال ہی میں جلوہ گر ہوا ہے ۔ سیماب صاحب نے اس میں ایک کے بجائے دو جدتیں دکھائی ہیں ۔ اول تو نظم و نثر کو ایک جگہ اکٹھا کیا ، دوسرے چند اوراق اپنی سوانح کے متعلق بھی بہ اختصار سپرد قلم کر دیئے ہیں ۔

پہلے حصہ کا نام خطبات شاعری ہے ۔ جس میں وہ تمام خطبے شامل ہیں جو آپ نے مختلف مشاعروں اور ادبی مجالس کی صدارت کرتے ہوئے شاعری پر پڑھے ہیں ۔ مشاعرہ میں صدر کا خطبہ پڑھنا بھی سنت سیمابی ہی ہے ۔ دوسرا حصہ یا باب شعر الحیات ہے ۔ جس میں کچھ اپنی زندگی کا احوال اور شعر گوئی کا تذکرہ ہے ، تیسرے حصے کا "تشید نو" نام ہے ، جس میں ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۵ء تک کی غزلیات جمع کی گئی ہیں چوتھے حصے "بادۂ دوشیں" میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۸ء تک کی غزلیات ہیں ، اور آخری حصہ صہبائے کہن ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء تک کی غزلیات کا مجموعہ ہے ۔

تمام خطبات شاعری پڑھنے کے قابل ہیں۔ حضرت سیماب کا یہ احسان کہ انہوں نے مشاعروں میں تحقیق و تنقید کی بنیاد رکھی، ادب اردو پر ہمیشہ رہے گا۔

۵ اپریل ۱۹۳۶ء کے مشاعرہ بزم ادب آگرہ کے خطبہ صدارت میں حضرت سیماب نے آگرہ کو اردو کی جنم بھومی قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے۔ کہ

"عہد جلال الدین محمد اکبر میں ہر روز ایک بازار قلعہ (آگرہ) میں لگتا تھا، اسے اردو کہتے تھے، جہانگیر کے عہد میں بھی یہ بازار آباد رہا۔ وہاں لین دین بدستور اسی زبان میں ہوتا تھا، شاہجہاں نے اسے اور رونق دی۔ اور یہ شاہی بازار چونکہ احتراماً و تعظیماً "اردوئے معلے" کہلاتا تھا اس لئے اس نئی زبان مرکب کا نام بھی اردوئے معلے رکھا گیا۔"

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان کی بنیاد سب سے پہلے آگرہ میں پڑی چنانچہ آگے چل کر حضرت سیماب صاحب ظہیر الانشا کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ "اس مخلوط زبان کی بنیاد سب سے پہلے آگرہ میں پڑی" جو صحیح نہیں ہے۔ اردو زبان کی پیدائش فی نفسہ ہر جگہ مختلف اقوام کے میل جول اور مختلف زبانوں سے پیدا ہوئی۔ اس کے لئے کوئی خاص کوشش اور عمل میں نہیں لائی گئی، اور سب سے پہلے اردو کی جنم بھوم بننے کا فخر دکن کو حاصل ہوا۔ چنانچہ خود حضرت سیماب نے اپنے خطبۂ افتتاحی ۲۹ نومبر ۱۹۳۶ء میں اس امر کا اقرار کیا ہے کہ "پنچھی نامہ" "تحفۂ عاشقاں" وجدی دکنی کی دونوں مثنویوں کا زمانہ ۱۱۰۵ء ہے مگر ان کی زبان آجکل کی اردو سے مختلف ہے، اور اسی طرح اپنے ساتویں خطبہ میں دکن کے شعراء نوری۔ غواصی، ابن نشاطی، نصرتی کا زمانہ ۱۰۱۶ھ و ۱۰۹۵ھ کے درمیان قرار دیتے ہیں۔ اس زمانے کے آگرہ، دہلی یا لکھنؤ کے کسی اردو شاعر کا نام پیش نہیں کیا جا سکتا، اس لئے آگرہ یا دہلی والوں کا یہ کہنا کہ اردو نے سب سے پہلے جنم یہاں لیا صحیح نہیں ہے۔ خدا بھلا کرے "حب وطن" کا کہ آدمی کی طبیعت مچل ہی جاتی ہے، اور وہ اس کا تصور ہر جہت سے بلند ترین ہی کرنا چاہتا ہے۔

حضرت سیماب کا کلام کسی خاص تعارف کا محتاج نہیں، کلام کے سرسری مطالعہ سے صاف نظر آرہا ہے کہ جوں جوں شاعر عمر رسیدہ ہوجاتا ہے، اس کی بلندی فکر میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور استادانہ پختگی ہر شعر میں جلوہ فرما نظر آتی ہے بعض شعر ایسا ہوتا ہے کہ ناظر جھوم جاتا ہے۔ کبھی دل پکڑ کر رہ جاتا ہے۔ اور کبھی مدہوش ہوجاتا ہے۔ زبان سیماب کا کیا کہنا، "اردوئے معلے کے مالک ہیں"، چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل کئے جاتے ہیں:۔

منزل ملی، مراد ملی۔ مدعا ملا سب کچھ مجھے ملا جو ترا نقش پا ملا

سرگشتۂ جمال کی حیرانیاں نہ پوچھ ہر ذرے کے حجاب میں اک آئینہ ملا
جلوہ گاہ دل میں مٹتے ہی نذر ہوگیا جس میں تجھ جلوے تھے وہ آئینہ کیا ہوگیا
دل کھنچا جتنا قفس میں آشیانے کی طرف وہ اتنا ہی قفس سے آشیانہ ہوگیا

اٹھا ہے حسن پھر محفل سے پیغام وفا لیکر نیا اب شیوۂ آئین دنیائے وفا ہوگا
وفا و حسن مل کر اک نئی دنیا بنا لینگے نہیں معلوم کب ہوگا وہ عالم اور کیا ہوگا
وفا کے گیت جب حسن و محبت مل کے گائینگے وہ دور عاشقی سیماب کتنا دلربا ہوگا

وہ نور حسن بن کر برسات میں آئے ہیں منظور ہے بوندوں کو پروانہ بنا دینا
تمہید خرابی کی تکمیل خدائی ہے اک بت کا بنانا ہے بتخانہ بنا دینا

کسی کو تو نہ ملا اور کھو دیا سب کو رہی تلاش میں گم وہ اک زمانہ ملا
وفا کی سطح سے اونچی ہوئی ملی دنیا غرض کے رنگ میں ڈوبا ہوا زمانہ ملا

مثال نکہت آوارۂ گل، چار سو ہو جا سکوں چاہے تو آزاد قیود رنگ و بو ہو جا
اگر تو چاہتا ہے آرزو تیری کرے دنیا تو دل پر جبر کر کے بے نیاز آرزو ہو جا
تصور میں کسی کی طلعتوں کا منتظر کیوں ہے خود اپنا آئینہ بن جا، خود اپنے روبرو ہو جا
غرض تو صرف اے سیماب ہستی کا مٹانا ہے نتیجہ ایک ہی ہے خاک ہو جا یا لہو ہو جا

ہستی و نیستی کی حدیں دور و گئیں یہ آ گیا کہاں میں تجھے ڈھونڈتا ہوا
محفل کسے دکھاؤں کہ ہے زندگی اداس اب شمع کیا جلاؤں کہ ہے دل بجھا ہوا

ہمیں یقین ہے کہ تمام ہمدردان ادب کلیم عجم کو خرید کر خدمت ادب کا ضروری فرض انجام دینگے۔

"م"

بادۂ مشرق حصہ اول

مصنفہ و مرتبہ، ساغر نظامی، ایڈیٹر ایشیا۔ میرٹھ

قیمت صہ۔ پانچ روپیہ۔

ملنے کا پتہ (۱) حضرت ساغر میرٹھ۔ (۲) کلیم بک ڈپو فتح پوری دہلی۔

حضرت ساغر نظامی میرٹھی، حضرت سیماب اکبرآبادی کے شاگرد رشید ہیں۔ انہی کے کلام کا مجموعہ "بادۂ مشرق" حصہ اول کی حسین صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ یہ مجموعہ جس کی ضخامت ۳۰۰ صفحات سے کم نہیں، چھوٹی بڑی ۱۵۸ نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہے، غزلیات اس کے علاوہ ہیں۔ نظر پہلے حسن ظاہری پر ہی پڑا کرتی ہے، اور ظاہری حسن جب اپنی طرف کھینچتا ہے، تو آدمی حسن باطنی کا متوقع ہو جاتا ہے، بادۂ مشرق کا حسن طباعت و ترتیب اردو کی مطبوعات حاضرہ میں اپنی مثال آپ ہے۔ ہر باب از

ہر عنوان کہتا ہے کہ ساغر صاحب شاعر ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن ذوق مصوری سے کما حقہٗ بہرہ ور ہیں۔

بادۂ مشرق کو بارہ مختلف ابواب پر منقسم کیا گیا ہے۔ ہر باب کا عنوان شاعرانہ کیف سے مخمور نظر آتا ہے۔ مثلاً "صبح نو"۔ "ہدیۂ روح"۔ "بہار سروستاں"۔ "صنم کدہ حیات"۔ "رموز میکدہ"۔ "جرعۂ آخریں"۔ "شاعرستان"۔ "روح بادہ" وغیرہ۔ لیکن جب رموز باطن کی تلاش کے لئے ورق گردانی کی جاتی ہے۔ تو اکثر یہ دل چاہتا ہے کہ بس اس نظم کو پڑھیئے اور پڑھتے رہیئے، نہ معلوم دوسری نظم لطف کو بے مزہ کر دے لیکن جب ڈرتے ڈرتے دوسری نظم کو شروع کیا جاتا ہے۔ تو اکثر وہی کیفیت پھر پیش آتی ہے۔ بلا بعض دفعہ وہ سرور و کیفیت جرعات بادہ پیدا کرتے ہیں کہ روح وجد کرتی ہے اور قلب سرشاری و سرمستی کے کیف میں گم ہو جاتا ہے۔

بادۂ مشرق نے اردو زبان میں ادائے تخیل کی جدید داغ بیل ڈالی ہے جس کو محترمی مولوی عبدالحق صاحب نے جدید فارسی شاعری کے تتبع سے تعبیر کیا ہے بعض دفعہ یہ طرز جدید بہت دلکش اور رس بھری معلوم ہوتی ہے۔ اور اس پر ہی کچھ موقوف نہیں "بادۂ شاعر" تمام تر رسیلا ہے۔ اور اپنے رسیلے پن کو شاعر نہ میکدے میں بھولتا ہے اور نہ سیاسی مجالس و مباحث میں، یہ رس شاعر نے گوکل۔ بندرابن کی "بنیوں" اور جمنا کے کنارے کے "تیلیوں" کے گلبار درختوں کے پھولوں میں سے بھونرا بن کر چوسا اور چوس کر بادۂ مشرق میں ملا دیا ہے۔ چنانچہ اکثر جہاں اس سے برج بھومی کی بولی الگ ہو جاتی ہے، وہ مٹھاس بھی گم ہو جاتی ہے۔ جو اس کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔

بادۂ مشرق کا ساقی اول درجہ کا وطن پرست ہے۔ وہ ہندوستان سے محبت کرتا ہے۔ اس کے ہر خار کو وہ گل اور ہر گل کو حسین بلبل سمجھتا ہے۔ آزادی ہند اس کا قصر آرزو ہے۔ اور ہر وہ شے جو اس قصر تک اس کو پہنچنے سے روکتی ہے اس کا وہ دشمن ہے اور اس کی شکل دیکھتے ہی وہ جوش غضب میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ وہ ارتقائی دور میں سے گذر رہا ہے۔ اور بلندی کی طرف اڑ رہا ہے۔ اور ابھی وہاں تک نہیں پہنچا، جہاں پہنچکر شاعر "صاحب فکر" کہلاتا ہے۔ کیونکہ "صاحب فکر" وطنیت قومیت اور جنسیت کی قید و بند سے آزاد ہے۔ وہ صرف انسانیت کا مبلغ ہے بہی خواہ ہے۔ اور اس کی نظر عرب و عجم، ہند و فرنگ سے گذر کر سارے کرۂ ارضی کے لئے سکون و راحت کی متلاشی رہتی ہے۔ ہمارا اس سے یہ مقصد نہیں کہ وطن پرست ہونا گناہ ہے بلکہ وہ "سیڑھی" ہے اس بام کامرانی کی، جہاں ایک صاحب فکر کے لئے پہنچنا مقدر ہو چکا ہے۔ خدا کرے ایسا نہ ہو کہ ہمارے مہربان دوست اس پہلی منزل کی بھول بھلیاں میں ہی بھٹک کر رہ جائیں۔

دل چاہتا تھا۔ کہ حضرت ساغر کے بادۂ خوش رنگ کو جرعہ جرعہ کرکے پیا جاتا۔ اور ہر قطرہ کی لذت اور کیف سے ناظرین کلیم کو آشنا کیا جاتا لیکن افسوس ہے کہ مارچ کا رسالہ تیار ہے، اور سشاف کا یہ تقاضا ہے کہ "حضرت کیا بادۂ مشرق" کا کوئی ذکر اس دفعہ بھی کلیم میں نہ ہوگا" اس لئے مجبوراً اس نامکمل تبصرے کو یہ عرض کرکے ختم کیا جاتا ہے کہ بادۂ مشرق ہر صاحب ذوق کے پڑھنے اور دیکھنے کے قابل ہے۔ اور کسی بھی لائبریری میں اس کا نہ ہونا بہت بڑی کمی ہے۔

بشرط فرصت حضرت ساغر کے اس ہدیۂ گراں مایہ پر ایک مکمل مضمون سپرد قلم کرنے کا ارادہ ہے۔ تاکہ پوری طرح ہمارے قابل فخر دوست کے جذبات و حسیات سے ارباب ذوق آشنا ہو سکیں۔ "م"

ایمان اکبر

مؤلفہ۔ حکیم مفتی سید علی اکبر صاحب۔ دولت پوری۔

قیمت ۲ آنہ

ملنے کا پتہ۔ عبدالرزاق خاں فیض آبادی ایجنٹ اخبارات پوسٹ بکس ۲۳ مکان نمبر ۱۰۲، باراسٹریٹ۔ رنگون۔

مفتی صاحب موصوف نے یہ چھوٹی سی کتاب مسلمانوں کے افادۂ دینی کے لئے لکھی ہے۔ اور اس کوشش کا دعوے کیا ہے کہ "طرز بیان ایسا ہو کر لہو باز طبیعتوں کو پڑھنے اور سننے پر اپنا گرویدہ بنائے رہے"! جو لوگ دینی شغف رکھتے ہیں وہ پتہ مندرجہ بالا سے اس کتاب کو طلب کر سکتے ہیں۔ جس میں توقع ثواب دارین کی کشش کم از کم ضرور موجود ہے۔ "م"

جذبات خادم الموسوم بہ روح جذبات

مؤلفہ و مصنفہ، محمد خادم حسن قاصنوی گدڑی شاہی منتظم محی الاوقاف سعینی گدڑی شاہی انجمن اجمیر۔

حضرت مصنف جو کسی گدڑی شاہی "سلسلۂ صوفیہ" سے تعلق رکھتے ہیں، ۲۰×۲۶/۱۶ کے سائز کے ۹۰ صفحات پر اپنا کلام شائع کرایا ہے۔ جو دو حصص "عقیدت" و "عشق و محبت" پر منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں قوالوں، نعت خوانوں، و مولود خوانوں کے لئے جن کے سرود سے ہماری درگاہیں، مزار و مجالس پر کیف ہیں، کافی مسالہ موجود ہے۔ رہا دوسرا حصہ "عشق و محبت" اس کے کیا کہنے کہ نفس مضمون ہی بہت وسیع ہے۔ قیمت ۸ر ہے۔ اہل ضرورت مندرجہ بالا پتہ سے طلب فرما سکتے ہیں۔ "م"

رسالہ "کلیم" کے ایجنٹ

مولوی عبدالرزاق خاں نظامی ۱۷۲ بار اسٹریٹ رنگون،

محمد شفیع صاحب نیوز ایجنٹ ۱۴ ذکریا اسٹریٹ کلکتہ۔ مینجر سعیدیہ بک ایجنسی بھوپال

میاں غلام محمد صاحب اینڈ سنز نیوز ایجنٹ چوک انارکلی لاہور۔ احمد حسین صاحب نیوز ایجنٹ سبزی باغ بانکی پور پٹنہ

احمد بخش صاحب مالک کتب خانہ ادبیہ، سول ایجنٹ اخبارات۔ کارنر جے جے ہاسپیٹل بمبئی نمبر ۹

اکرام الدین صاحب قدوائی ایجنٹ اخبارات محلہ تلیا بنارس۔ صادق کمیشن ایجنٹ بازار قصہ خوانی پشاور

بدمعاش کی ڈائری

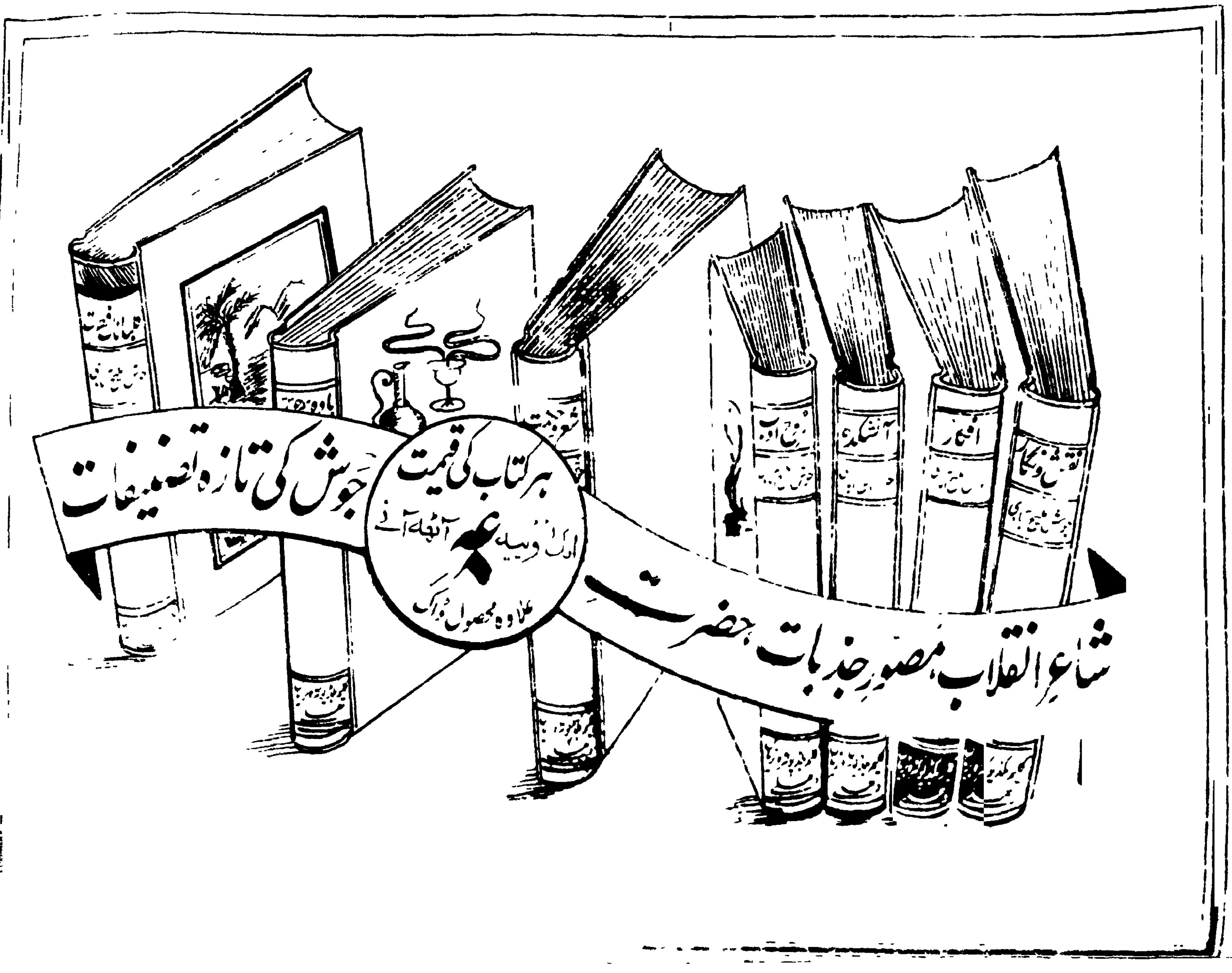
۵ راپریل ۱۹۰۵ء

"لمبی لمبی زلفوں کے نیچے میری پیشانی پر ستارہ کی برق چمکتی ہے۔ اس لئے آدمی مجھے آنجم کہتے ہیں میں نے سائنس نہیں پڑھی، اور زبان دانی پر مجھے ہمیشہ فخر رہا ہے، پھر بھی ایک ہم جماعت کو ورغلا کر کالج کے سائنس روم سے آتش گیر مادہ اور ——— ایڈ منگوا کر ——— بم کے گولے بنانے کا تجربہ کرانا میرا روزمرہ کا عمل رہا ہے ۱۸۵۷ء کے غدر کی تاریخ میری میز پر رہتی ہے۔ اس کا ایک ایک ہیرو میری نگاہ میں فوجی جنرل سے کم حیثیت نہیں رکھتا۔ میں اپنے تئیں قلمرو ——— کا بادشاہ سمجھتا ہوں، اور اس تصور سے خوش ہوتا ہوں جبکہ فوجی پریڈ مارچ کرتے ہوئے میری تخت نشینی کے روز سلامی اتاریں گے، اور دنیا کی حسین ترین عورت میری ملکہ بن کر ———

یہی زندگی ایک معمہ بن گئی ہے۔ طبیعت اشتراکیت کی تحریک کی طرف مائل ہے۔ لیکن پیٹ بھی تو بھرنا ہے۔ اس لیے میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اپنے لوگوں پر اپنی نیک سیرتی کا اعتماد پیدا کر کے دھوکا دوں۔ اور روپیہ بٹوروں، اب شادی تو کر رہا ہوں ایک اچھی جگہ پر بھولی بھالی لڑکی ہے بیوقوف بیل کو سونا سمجھ کر میرے جال میں پھنس گئی، دنیا کہتی ہے کیرکٹر پیدا کرو۔ لیکن میں کیرکٹر کو لیکر کیا چاٹوں، اس سے اونچا تو روپیہ ہے۔ اب تک زندگی کا یہی مقصد رہا، اور جب تک میرا شیطان میری مدد کر رہا ہے، اسی اصول پر چلوں گا۔ میں بھی خوب ہوں، جو ملتا ہے اور اس وقت تک اپنے خلوص کا اظہار کرتا ہوں جب تک کہ اس کی جیب خالی نہ کر دوں، مکر و دغا میرا ایمان ہے، اور روپیہ میرا خدا ہے ——— اپنے محسن کو دھوکا دینا میرا فرض ہے، میرے عزم و استقلال کے آگے فاصلہ کوئی چیز نہیں ——— کلکتہ سے ——— گڑھ، گڑھ سے اور آباد سے قطب صاحب کی لاٹ کے پاس، اور آگے خدا جانے کہاں کہاں ———

یہ اس دلچسپ کتاب کا **اقتباس ہے جس کو** ——— لکھ رہے ہیں۔ یعنی وہ ایک ایسے بدمعاش کی زندگی کا مرقع ہے جو ہمیشہ نئی کی زمین شکار ادیبوں کو ادیب بن کر، طلباء و استادان یونیورسٹی کو ایک اچھا ذہین طالب علم بن کر، دوستوں کو ایک اچھا دوست بن کر، نوجوان لڑکیوں کو ایک وفا پرست عاشق بن کر، محب وطن بن کر، اشتراکی کارکنوں کو خالص دشمن سرمایہ داری بن کر، غیر ملکی زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود اس کا فرضی ادیب بن کر، بڑے بڑے مولویوں پر اپنی ——— جادو ڈال کر لوٹتا اور دھوکا دیتا رہا ہے ——— کتاب از حد دلچسپ ہوگی۔ صفحات ۲۰۰ قیمت صرف ۲/- علاوہ محصول۔ ملنے کا پتہ: **مینیجر کلیم بک** ...




شاعرِ انقلاب مصورِ جذبات حضرت
جوش کی تازہ تصنیفات
ہر کتاب کی قیمت
ایک روپیہ آٹھ آنے
علاوہ محصول ڈاک

REGD. No L 3694

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدر اعظم سے کہا، دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کر سکوں، تعمیل حکم کے لئے فردوس مثال کشمیر، جنت نظیر سوئٹزرلینڈ، شباب انگیز تسمانیہ اور عطر پاش مرغزاروں میں گل چینی کی گئی ——— جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے، تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی، مہارانی اس خواہش کو پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی کھانا پینا ترک کر دیا، مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا، اور وزراء سے مشورہ طلب کیا مہتمم توشہ خانہ نے "**اصغر علی محمد علی**" سے عطر منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی، فوراً عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا۔

اصغر علی محمد علی، تاجران عطر، لکھنؤ و دہلی



بنامِ قوّت و حیات

کلیم

سالانہ چندہ چھ روپیہ

ششماہی چندہ تین روپیہ

قیمت فی پرچہ نو آنے

اُردو زبان کا ہر جہت سے قیمتی ماہنامہ

جلد ۱ — فہرست مضامین ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء — نمبر ۴

(کورونیشن پرنٹنگ ورکس دہلی میں جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر دفتر کلیم سے شائع کیا)

اِشارات

جوش ملیح آبادی

(۱) بعض انسان ایسے ہوتے ہیں کہ اگر زمین کا سینہ شق ہو جائے، اور آسمان کی ذات ٹوٹ جائے، پھر بھی اُن کے کان پر جُوں تک نہیں رینگتی، کروٹ لینا کیسا، وہ کُنمناتے تک نہیں۔

بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جب تک کوئی عظیم حادثہ واقع نہ ہو جائے، یعنی جب تک اُن کی آنکھوں کے سامنے پہاڑ نہ چلنے لگیں، اور عین اُن کے کان پر رکھ کر توپ نہ چلائی جائے، وہ بیدار ہونے کا نام نہیں لیتے، اور اگر بیدار ہوتے بھی ہیں تو اس طرح کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد پھر اُونگھنے لگتے ہیں۔

بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اُن کی پیشانی سے ایک خفیف سا ذرّہ بھی مَس ہو جاتا ہے، اور اگر راہ میں اُن کے پاؤں کے نیچے گھاس کا ایک حقیر ریشہ بھی ٹوٹ جاتا ہے تو اُن کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں، اور وہ اس حادثے پر غور کرنے کے لئے بیتاب ہو جاتے ہیں۔

معلوم نہیں ان تینوں طبقوں میں سے کون سا طبقہ نسبتہً زیادہ اطمینان سے زندگی بسر کرتا ہے۔

یہ حیرتناک دُنیا جس میں ہم رہتے ہیں اس درجہ عقلوں کو دنگ، اور فراستوں کو سرنگوں کر دینے والا مقام ہے، اور نوعِ انسانی کے ناقابلِ فہم نفسیات کا مسئلہ اس حد کا پیچیدہ اور دقیق ہے کہ کوئی بات دعوے کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ یوں ہے اور یوں نہیں ہے۔

جو لوگ دنیا، اور انسان کے متعلق کُلیات و نظریات بنایا کرتے ہیں، اُن کی جسارت قابلِ داد ہے۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ اِن متذکرہ بالا طبقوں کے متعلق کوئی دعوے کے ساتھ یہ حکم نہیں لگا سکتا کہ اِن میں نسبتہً کون سا طبقہ اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے۔

لیکن جہاں تک دیکھنے میں آتا ہے اُس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اِن طبقوں میں سے طبقۂ اوّل، اور ایک بڑی حد تک طبقۂ ثانی بھی طبقۂ ثالث کے مقابلے میں زیادہ اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس کارگاہِ آلام، اور اس کارخانۂ حوادث میں دل و دماغ کا غیر حسّاس، اور حواس کا دبیز ہونا ایک بہت بڑی دولت ہے، اور اِس ہر قدم پر زہرہ آب کر دینے والے عالمِ کون و فساد میں قوتِ احساس کی غنودگی اور ادراک و شعور کا خوابِ گراں ایک بے پایاں برکت و نعمت ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آپریشن کے وقت مریض کا بیہوش رہنا، مریض کے حق میں کتنی بڑی نعمت ہے، چنانچہ طبقۂ اوّل کے افراد اس نعمت سے بہرہ مند ہیں۔ آپریشن ہو رہا ہے تو ہو، سلامت رہے اُن کی بیہوشی کہ انھیں خبر تک نہیں ہوتی۔

البتہ طبقۂ ثانی کے افراد کی لذّتیں، اور اُن کا اطمینان مسلسل نہیں ہوتا، اُن پر بیداری کے گاہ گاہ دورے پڑتے رہتے ہیں، اور بقدرِ مدّتِ بیداری وہ مصائب کا شکار ہوتے رہتے ہیں، پھر بھی چونکہ اُن کی شیرینیاں، اُن کی تلخیوں پر، اور اُن کی گراں خوابیاں اُن کی بیداریوں پر غالب رہا کرتی ہیں، اِس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ ہر چند یہ طبقہ، طبقۂ اوّل کی طرح اس دُنیا کا لاڈلا بیٹا نہیں ہے، پھر بھی طبقۂ ثالث کے مقابلے میں زیادہ اطمینان سے زندگی بسر کرتا ہے۔

اب رہا طبقۂ ثالث، سو اس کی دردمندیاں اس قدر ہولناک معلوم ہوتی ہیں کہ اُن کے تصور سے بھی دماغ پاش پاش ہونے لگتا ہے۔

طبقۂ اوّل و ثانی کو اگر کوئی تکلیف پہنچتی بھی ہے، تو وہ تکلیف اُس کے ذاتی

ہوائی یا زیادہ سے زیادہ اُسی کے متعلقین کے معمولی ضروریاتِ زندگی تک محدود ہوتی ہیں۔ لیکن اِس بدبخت تیسرے طبقے کی دردمندیوں کا دامن تو قطبین اور ماورائے قطبین تک پھیلا ہوا ہے۔

"اِس دُنیا کا کوئی خالق ہے کہ نہیں؟" "اگر خالق ہے تو کیا وہ ذی شعور، عادل، مشفق، اور حکیم بھی ہے؟" "اگر کوئی خالق نہیں ہے تو یہ دُنیا کیوں کر، کس اتفاق، یا مادّے کی بدولت خلق ہوگئی؟" "رُوح کیا شے ہے، مادّہ کسے کہتے ہیں؟" "ہماری اور تمام مخلوق کی علّتِ تخلیق کیا ہے؟" "انسان اپنے افعال کا ذمہ دار ہے کہ نہیں؟" "مذاہبِ عالم کی حقیقت کیا ہے؟" "مذاہب کی دُنیا کو اب ضرورت ہے کہ نہیں؟" "روس کے دوش بدوش" "ذہنی امراض، اور مہلک وباؤں کا کیونکر ازالہ ہو سکتا ہے؟" "قوم اور فرقے کی کیوں کر خدمت کی جا سکتی ہے؟" "نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر اخوت کے سانچے میں کیونکر ڈھالا جا سکتا ہے؟" "دُنیا سے یہ اقتصادی عدم مساوات، اور مذہبی منافرت کیونکر دُور کی جا سکتی ہے؟"

یہ، اور اِسی قبیل کے بے شمار سوال ہیں، جو مفکّرین کے دماغوں میں پیدا ہو کر اُن کے دَورانِ خون میں گردش کیا کرتے ہیں، اور اُن کے دِلوں کو پاش پاش کرتے رہتے ہیں۔

کون اِن بیچارے اربابِ فکر و تامّل کو سمجھائے کہ اے دردمند گروہ ع

تجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تُو

لیکن اگر کوئی سمجھائے گا بھی تو اُن کا جواب ہوگا ع

گر تو نمی پسندی، تغییر کُن قضا را

اِس گروہ پر ہنسی بھی آتی ہے، اور رونا بھی — ہنسی تو اگر سطحی نظر سے دیکھا جائے اِس لئے آتی ہے کہ بھلا اِن چند نفس زندہ رہنے والوں، اور حیات کی مَوج پر اِن دَم بھر رقص کرنے والے حبابوں کو اِن تمام جھگڑوں میں پڑنے سے فائدہ ہی کیا ہے؟

اوّل تو دوسرے ستاروں کے مقابلے میں ہمارا یہ ننھا سا ستارہ، جسے ہم کرۂ خاکی کہتے ہیں، حیثیت ہی کیا رکھتا ہے، دوسرے اِس ستارے میں پھر ہمارا وجود، جو اتنا بھی نہیں جیسے سمندر میں قطرہ، صحرا میں ذرّہ، اور ضمیرِ انسانی میں نیکی کی استعدلو، اِس قدر حقیر، صغیر اور بے مایہ ہونے کے باوصف اِس قدر اہم، بزرگ اور عظیم ترین مسائل کے سُلجھانے کی فکر میں گھلنا کیا کوئی دانائی ہے؟

دریا بہ وجودِ خویش موج دارد

خس پندارد کہ این کشاکش با اوست

لیکن اگر عمیق نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اِن بیچاروں کی حالت پر آنسو ہی بہانا پڑتا ہے، قدرت نے ان غریبوں کے ساتھ وہ ظلم یا سلوک کیا ہے، جس کی نظیر نہیں ملتی۔ کیونکہ اِن کے دماغوں کی ساخت ہی ایسی رکھی گئی ہے کہ اِس قدر حقیر و فانی ہونے کے باوصف وہ کارخانۂ عالم پر غور کرنے، اور غور کر کے تڑپتے رہنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ سچ کہا ہے۔

اپنے ہی دماغ و دِل کا سَتھورا ہوں میں

خود اپنے ہی دِل میں ایک ناسُور ہوں میں

واقف ہوں کہ سوچنے میں ہے جی کا زیاں

پر کیا کروں، سوچنے پہ مجبور ہوں میں

یہ بدنصیب گروہ تو اُس محفلِ عشرت پر بھی جب کہ رقّاصۂ زہرہ جمال کے گھنگروؤں کی رسیلی آواز دوشِ ہوا پر رقصاں کرتی ہوتی ہے، نالہ و شیون ہی کی صدائیں سُنتا ہے، اور چیخ اُٹھتا ہے :-

اِس دہر میں کچھ بھی نہیں، اِلّا افسوس

افسوس ہے اے نظامِ دنیا، افسوس

غم ہی کا نتیجہ غم ہو، اِتنا ہی نہیں

غم تو ہے خوشی کا بھی نتیجہ، افسوس

اور عین اُس ساعتِ سرمستی و کیف میں بھی جب ساغر و مینا، اور رامش و رنگ، کی ایک ایک کلی چٹک چکی ہوتی ہے، پُوچھنے لگتا ہے۔

یہ لمحۂ خوش، رمیدہ آہو تو نہیں؟

اِس عیش میں کوئی غم کا پہلو تو نہیں؟

آنکھوں میں ہے پھر شرارِ عشرت غلطاں!

ڈرتا ہوں کہ اِس نمیں میں آنسو تو نہیں؟

اِس طبقۂ نامراد کا حال تو اُس آل بین گوسفند کا سا ہے جو قصاب کے چُمکارنے میں بھی چھُری کی جھلک دیکھ لیتا ہے۔

اِس گروہ کو کوئی دوسری قوت تباہ نہیں کر سکتی۔ یہ طبقہ دشمنوں یا دوستوں کا مٹایا ہوا نہیں ہوتا۔ یہ تو خود اپنا دشمن ہے، خود اپنے ہی ہاتھوں تباہ ہے، اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا گلا دبائے ہوئے ہے، اور فریاد کرتا رہتا ہے کہ :-

خود اپنے ہی فرماں سے معزول ہوں میں
جو جس کی ہے خود حریف، وہ بھول ہوں میں
خود اپنی ہی تیغ سے ہوا ہے جو شہید!
اے اہلِ جہاں وہ ظفر مقتول ہوں میں

اب یہ بات میں آپ ہی کی قوتِ فیصلہ پر چھوڑتا ہوں کہ اِس دُنیا میں حُمقا زیادہ اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں یا عقلاء۔ اور خصوصیت کے ساتھ اِس موجودہ نظامِ عالم اور جدید ضابطۂ تمدن و تہذیب میں عقلمند ہونا بہتر ہے کہ بے وقوف؟

کیا آپ اُس دِل کے دیکھنے کی جرأت کر سکتے ہیں جس کے اندر اِس پورے نظامِ شمسی کا درد کروٹیں لے رہا ہے؟

---

(۳) آج بقرعید کا دن ہے، صبح کے آٹھ بجے ہیں، دہلی میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں ——— عیدگاہ میں تِل دھرنے کی جگہ نہیں ہے، شانوں سے شانے چھِل رہے ہیں۔ گرد ہے، غُبار ہے، ہجوم ہے، ہنگامہ ہے ———"

تانگوں اور موٹروں کا یہ عالم ہے گویا سمندر کی موجیں بلند ہوتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔

ہر طرف ریل پیل ہے۔ شور و غوغا ہے۔ دھکم دھکا ہے، چہچہے ہیں، قہقہے ہیں ——— مگر ایک شخص، جو دُور سے اِس منظر کو دیکھ رہا ہے، وہ خاموش ہے، ساکت ہے، مغموم ہے۔ ضبط سے سینے میں گھُٹی ہوئی ہچکیاں اُس کا گلا رُوندے ہوئے ہیں۔

وہ آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی عید کا تصور کر رہا ہے، اُس کی نگاہیں لال قلعے پر ہیں ——— وہ لال قلعہ جس کے مُنہ پر اب خُون کی ایک چھینٹ بھی نہیں۔

"آج سے ڈیڑھ سو برس پیشتر کی عید ——— توپوں کی دَندناہٹیں، جلاجل کی جھن جھناہٹیں، گھوڑوں کی چل بل، ہاتھیوں کی قطاریں، پرچموں کی لہریں، جلوس کے ٹھٹھے، فوجوں کی صفیں ——— زر و گوہر کی بارشیں، انعام و اکرام کے غلغلے، نقیبوں کی آوازیں، اور شادیانوں کی دُھومیں ——— کیا سب ختم ہو گیا؟ کیا سب خواب تھا؟

وہ جاہ و جلال کا تناور درخت، جس کی جڑیں گاؤ زمین تک پہنچی ہوئی تھیں اور وہ عظمت و جبروت کا فلک بوس پہاڑ جس کی چوٹی ثریّا سے سرگوشیاں کرتی تھی۔

کیا وہ درخت سُوکھ گیا؟ کیا وہ پہاڑ شق ہو گیا؟"

کیا یہ سب ایک خواب تھا؟ کیا یہ سب کچھ ایک افسانہ تھا؟"

ہاں سب کچھ ختم ہو گیا ——— خواب ہو گیا ——— افسانہ بن گیا۔

آخر بتاؤ کیوں، اور کیونکر؟

یہ داستان بہت تلخ ہے ——— اور خطرناک بھی۔

زمانہ ہونٹوں پر قفل لگا چکا ہے۔ اور دُنیا قلموں کو توڑ چکی ہے۔ کہا جائے تو کیوں کر، اور لکھا جائے تو کس طرح؟

سچی بات تو تم کس قدر تلخ ہوا کرتی ہو ——— اگر سچائی شہد کے سامنے پیش کر دی جائے، تو اُس کا مُنہ بھی کڑوا ہو جائے۔

ہاں یہ "کیوں" اور "کیوں کر" ہندوستان کی "انفرادیت" سے پوچھو، شاید وہ کوئی ذمہ دارانہ جواب دے سکے۔

ہندوستان کی مسلمہ انفرادیت سے سوال کرو کہ کیا یہاں کے باشندوں کے دماغوں میں مجموعی مفاد اور قومی مصالح کا کوئی تصور کبھی قایم ہوا ہے؟

کیا واقعی یہاں "میں صرف اپنے لئے جیتا ہوں" کے علاوہ بھی کبھی کچھ اور سوچا گیا ہے؟"

ہماری شدید و بے پروا "انفرادیت" سے "قوم" کے معنی پوچھو، وہ کہے گی "شیخ"، "سید"، "سکینہ" اور "اگروال" اور بس۔

"میں صرف اپنے لئے ہوں، ملک و قوم کا روگ میرے بس کا نہیں، اگر تمام ملک و قوم کو تباہ کر کے میں دولت کا ایک ذخیرہ، یا خطاب کے دو حرف حاصل کر سکتا ہوں تو مُلک و قوم کو تباہ کر دینے کی سعی سے مجھے دُنیا کی کونسی قوّت باز رکھ سکتی ہے؟"

ہاں یہی خیالات، اور یہی اصول ——— اِنفرادیت، اور اِس شدت کے ساتھ انفرادیت: العظمۃ للہ!

ہر حلقہ، اپنی ایک مستقل دُنیا رکھتا ہے، اور دوسرے حلقے سے مَس ہونا تک گوارا نہیں کرتا ——— زنجیر بنے تو کیونکر؟ مشین کے تمام پُرزے صرف اپنے ہی کو دیکھتے ہیں، ایک دوسرے سے تعاون پر کسی طرح آمادہ نہیں، مشین چلے تو کس طرح چلے؟

"انفرادیت" ——— "انفرادیت" ——— "انفرادیت"

اے انفرادیت تو ہمارے تاج و تخت کو کھا چکی ہے، اب کیا ہماری ہڈیوں پر بھی تیری نظر ہے؟

کہتے ہیں قیامت کے دن ہر شخص "نفسی نفسی" پکارتا نظر آئے گا۔ یہ "نفسی نفسی" والی قیامت تو مدت ہوئی ہمارے سر سے گزر چکی ہے۔ "گزر چکی ہے" کیا واقعی گزر چکی؟ بندۂ خدا یہ کیوں نہیں کہتا کہ "اب بھی گزر رہی ہے"؟ یہاں تو صدیوں سے

میدانِ حشر گرم ہے، اور نفسی نفسی کی صدائیں فضا میں گونج رہی ہیں۔

ہندو مشرق کی طرف بھاگ رہا ہے، اور مسلمان مغرب کی جانب، یہیں تک نہیں، یہ پھر بھی غنیمت ہوتا۔ یہاں تو ہندو ہندو سے اور مسلمان مسلمان سے ٹکرا رہا ہے۔

یہاں تو سناتن دھرمیوں اور آریہ سماجیوں میں کُشتیاں ہو رہی ہیں ——— یہاں تو سُنیوں اور شیعوں میں پینترے بدلے جا رہے ہیں ——— احمدیوں اور حنفیوں میں گھونسے چل رہے ہیں ———

دُنیا ہوائی جہازوں پر اُڑ رہی ہے، اور ہم عمیق غاروں کی دلدل میں پھنسے ہوئے ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھال رہے ہیں۔

اِن حالات میں اُمید قایم کی جائے تو کس طرح، اور آس لگائی جائے تو کیوں کر؟

اے خدائے مغربین و مشرقین، اگر تو محض ایک وہمِ انسانی نہیں ہے تو دیکھ اور ترس کھاتے ہوئے دیکھ کہ ہم تمام ہندوستانی، اپنی اپنی مذہبی کتابوں کے گٹھڑے سروں پر لادے ہوئے صدیوں سے تیرے اِس میدانِ حشر یعنی ہندوستان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن ہمارا فیصلہ نہ آج ہوتا ہے، نہ کل۔ کیا ہمارے اعمال نامے اِتنے طویل ہیں کہ اُن کے کھولنے میں صدیاں لپٹ جاتی ہیں؟

نہیں اے پروردگارِ عالم نہیں ——— پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے، اور مخالف تھپیڑوں سے ہماری ہڈیاں ٹوٹی جا رہی ہیں ——— کب تک یہ رُوح فرسا کشمکش ——— تا کَے یہ موت سے بدتر امید و بیم؟

اے خالقِ ارض و سما، اگر تو واقعی سمیع و بصیر، دانا و بینا، اور رحیم و کریم ہے، تو ہمارا فیصلہ کر، جلد تر فیصلہ کر ———

ہماری بکھری ہوئی کڑیوں کو جوڑ کر ایک ایسی مضبوط زنجیر بنا دے کہ اگر دو پہاڑوں میں بھی رسّہ کشی ہونے لگے تب بھی وہ زنجیر نہ ٹوٹ سکے۔

آخر ہم بھی انسان ہیں، اور دوسرے ملکوں کے انسانوں کی طرح ہمیں بھی جینے کا حق حاصل ہے۔

اور اگر یہ تیری مصلحت، یا اقتدار سے باہر ہے تو اے طُوفانِ نُوح کے خدا، اے فرعون و شدّاد کے پروردگار! دیکھ یہ سامنے تیرا دہکتا ہوا اُمیدوں کو جلا کر خاک کر دینے والا جہنّم ہے ——— جھونک دے، ہاں اِس دہکتے ہوئے جہنّم میں جھونک دے ہم تمام گناہگار ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں ——— شیعوں، سُنیوں ——— سناتن دھرمیوں اور آریوں کو ——— جھونک دے، اور جلد جھونک دے ——— اِس بھڑکتے ہوئے جہنّم میں، اے طُوفانِ نُوح کے خدا، اور فرعون و شدّاد کے پروردگار!

آہ! تیری رحمت کے دعوے!

حیف کہ من بخونِ تپم، واز تو سخن رُود کہ تو

اشک بہ دیدہ بشمری، نالہ بہ سینہ بنگری!

---

(۳۴) ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں جہاں "شعرائے کرام" یا بالفاظ دیگر "متغزّلین" پائے جاتے ہیں، وہاں بلا استثنا یہ دیکھا جاتا ہے کہ اُن کے درمیان شدید عناد اور سخت دُشمنی ہوتی ہے۔ مشاعروں کی شرکت کے سلسلے میں یہ شرطیں کی جاتی ہیں کہ اگر فلاں دائرہ ادب کو دعوت دی جائے گی تو ہم شریک نہ ہو سکیں گے اور یہ دُشمنیاں بالکل اُسی نوعیت کی ہوتی ہیں جیسی مقدّس اہلِ مذاہب داویان کے درمیان پائی جاتی ہیں۔

اِن دُشمنیوں اور نفرتوں کی بنیاد محض اِتنی سی بات پر ہوتی ہے کہ فلاں شخص، شاعر، یا گروہ میری شاعری کا مُعترف نہیں ہے، اور فلاں موقع پر فلاں شخص نے میری فلاں بندش پر اعتراض کیا تھا، اور فلاں شاعر نے فلاں مشاعرے میں مجھے حسبِ مُراد داد نہیں دی تھی۔

میں پوچھتا ہوں کیا شاعروں کی فطرت ایسی ہی ہوتی ہے؟ کیا حقیقی شاعر اِتنا کم ظرف، تنگدل، کینہ پرور، اور اوچھا ہو سکتا ہے؟

یہ ایک مُسلّم حقیقت ہے کہ اگر دماغ رسیدہ اور دل پگھلا ہوا نہ ہو تو انسان کا شاعر ہونا اِمکان سے خارج۔ بالغ دماغ، اور گداختہ دل کی موجودگی میں کیا کسی کی یہ مجال بھی ہے کہ وہ کسی سے نفرت یا عداوت کر سکے؟

نفرت و عداوت تو وہ مُردار خوار پرندے ہیں جو سڑے ہوئے دماغوں اور گلے ہوئے دِلوں پر منڈلایا کرتے ہیں ———

جب ہم گِدوں کو کسی جگہ منڈلاتے دیکھتے ہیں تو ہمیں اُس مقام پر غلاظت کے جمع ہو جانے کا یقین ہو جاتا ہے ——— اِس طرح جب ہم کسی کے دل و دماغ کو نفرت و عداوت کا آشیاں پاتے ہیں تو ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اُس کے دل و دماغ سڑ چکے ہیں ——— اور کیا یہ ایک لمحے کے واسطے بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ اِس قدر ناپاک دل و دماغ میں شعر کی دیوی اپنا مسکن بنا سکے گی؟

شعر گلاب کی سی حقیر شے نہیں ہے جو گھُورے پر بھی پیدا ہو سکتا ہے ——— شعر کی اساسی بُنیاد تو لامحدود اور عالمگیر محبت ہے ——— جب دل میں محبت اپنے لشکر لے کر

تک پہونچ جاتی ہے — اُس وقت شعر شروع ہوتا ہے، اور جب اپنے قاتل دشمن کی اداؤں پر بھی پیار آنے لگتا ہے۔ اُس وقت قلبِ انسانی میں شعر کی تخلیق ہونے لگتی ہے ———

شعر ایک ازلی عکس ہے ——— کیا مکدر آئینہ عکس قبول کرسکتا ہے؟ پیمبر و شاعر دونوں ایک ہی روحانی خاندان کے چشم و چراغ ہیں — کیا پیمبر کے متعلق کبھی یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی فرد یا گروہ سے نفرت کرتا اور ذاتیات کی بنا پر عداوتیں پالا کرتا تھا؟ اس طرح میں دریافت کروں گا کہ کیا کسی شاعر کے اختیار میں یہ بات ہے کہ وہ کسی سے نفرت کرے۔ یا کسی کی عداوت دل میں پال سکے؟

اور اگر "شعراء" میں آپ یہ مشاہدہ کریں کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں، ایک دوسرے کی غیبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے خلاف مضمون لکھتے اور لکھواتے ہیں۔ تو آپ اس موقع پر کیا فیصلہ کریں گے؟

شاعر کی سیرت کے مانے ہوئے اصول بدل ڈالیں گے؟ یا ایسے "شعراء" کے شاعر ہونے سے قطعی انکار کردیں گے؟

میں "کلیم" کے جنوری نمبر میں "غزل گوئی" کے سلسلے میں تحریر کرچکا ہوں کہ "ہر شاعر موزوں طبع ہوتا ہے۔ لیکن ہر موزوں طبع، شاعر نہیں ہوتا"!

کیا آپ کا یہ فعل مبنی بہ حقیقت اور منطقی طور سے قطعی درست نہ ہوگا، اگر آپ ان کینہ پرور "شعرائے کرام" کو "شاعر" کے مقدس لقب سے محروم کرکے محض "موزوں طبع" کے نام سے یاد کرنا شروع کردیں گے؟

اب بات کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"شعرائے کرام" کی گنجان آبادی میں تمام لڑائیاں صرف اس بنیاد پر ہیں کہ فلاں ہماری شاعری کا مداح نہیں ہے، اور فلاں ہمارے اشعار کو پسند نہیں کرتا؟

یہ تو ایک "معلوم عوام" حد تک مانی ہوئی بات ہے کہ شعر سراسر ایک ذوقی اور وجدانی شئے ہے۔ یہ کوئی مادی چیز تو ہے نہیں کہ ہم اُسے چکھ، یا چھو سکیں — یہ کوئی نگینہ بھی نہیں ہے کہ کانٹے میں رکھا، اور پل بھر میں وزن معلوم کرلیا۔

شعر کا تو تمام تر انحصار، سامع کے ذوق اور وجدان پر ہوتا ہے، اور کیا ہر فرد کا وجدان اور ذوق ایک ہی نوعیت کا ہوتا ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو برائے خدا و رسولؐ دوسروں کو موقعہ دیجیے کہ وہ آپ کے شعر ناپسند بھی کریں۔

اگر غلطی کا وجود خود ہمارے شعر کے اندر ہے تو پھر بُرا ماننے کی کوئی بات ہی نہیں — اور اگر غلطی، سامع کے ذوق و وجدان کے اندر موجود ہے، تو پھر اس بیچارے سامع کا قصور ہی کیا ہے؟

کیا ہماری شاعری کا منکر محض اُس قدرت کے عطا کئے ہوئے ذوق کی بنا پر جو ہمارے ذوق سے متضاد واقع ہوا ہے، اس قابل ہے کہ وہ ہمارے تیروں کا ہدف اور ہماری ملامتوں کا نشانہ بنے؟

ایک صاحب تھے جنھیں آم کے نام سے متلی ہونے لگتی تھی۔ تو کیا آموں کے عاشق مرزا غالب کو محض اُن صاحب کی آم سے اس فطری نفرت کی بنا پر یہ لائسنس دیا جاسکتا تھا کہ وہ اُس کا گلا گُھٹوا کر پھینک دیں؟

یہ حقائق سے کتنی بے پایاں ناواقفیت، اور نفسیات سے کیسی لامحدود بیگانگی ہے کہ میں کسی شخص سے صرف اس بنا پر نفرت کرنے لگوں کہ وہ مجھے اچھا شاعر ہی نہیں سمجھتا، یہ کیسی مضحکہ خیز جاہلانہ زبردستی ہے کہ صاحب ہمیں شاعر مانو، نہیں تو ہم آپ کی اور اپنی جان ایک کردیں گے، اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ قدرت نے روزِ ازل تمام انسانوں کے ذوقِ ادب کو میری شاعری کی پسندیدگی کے سانچے میں ڈھالا تھا، اور جو شخص مجھے پسند نہیں کرتا وہ اپنی فطرت اور میری شاعری کا باغی ہے، اور ظاہر ہے کہ بغاوت کی سزا موت سے کم کیا ہوسکتی ہے؟

انقلاب کی آواز

اگر انساں ہوں، دنیا کو حیراں کر کے چھوڑوں گا
جہانِ تیرگی کو خاورستاں کر کے چھوڑوں گا

تری اس زلف کی سوگند اے لیلائے رنگینی
کہ ارضِ خار و خس کو سنبلستاں کر کے چھوڑوں گا

وہ پنہاں قوتیں، زک دے رہی ہیں جو زمانے کو
انھیں آپس ہی میں دست و گریباں کر کے چھوڑوں گا

وہ ظلمت آج جو چھائی ہوئی ہے ذہنِ انساں پر
اسے سرچشمۂ صد آبِ حیواں کر کے چھوڑوں گا

نیامِ عجز میں پوشیدہ ہے جو ایک مدت سے
میں اس تیغِ جہاں بانی کو عریاں کر کے چھوڑوں گا

سرِ تقلید کو مغزِ تفکر سے جلا دے کر
چراغِ فسردہ کو مہرِ درخشاں کر کے چھوڑوں گا

شعارِ تازہ کو بخشوں گا آب و رنگِ جمعیت
رسومِ کہنہ کی محفل کو ویراں کر کے چھوڑوں گا

چراغِ اجتہادِ نو بہ نو کی جلوہ ریزی سے
سرِ راہِ خردمندی چراغاں کر کے چھوڑوں گا

میں اس راہِ طلب میں جس میں نور رہبرِ عالم ہے
سمندِ فکرِ انسانی کو جولاں کر کے چھوڑوں گا

عرق آ جائے گا تاروں بھری راتوں کے ماتھے پر
میں اس محفل میں وہ شمعیں فروزاں کر کے چھوڑوں گا

مُسلّط ہیں ازل کے روز سے جو ابنِ آدم پر　　میں اُن اوہام کو سر در گریباں کر کے چھوڑوں گا

جو انساں، آج سنگ و خشت کو معبود کہتا ہے　　اُس انساں کو الوہیت بداماں کر کے چھوڑوں گا

قناعت جس نے کرلی ہے عناصر کی غلامی پر　　میں اُس کو کردگارِ بادوباراں کر کے چھوڑوں گا

قسم کھاتا ہوں اے کوہِ الم دستِ زلیخا کی　　کہ داماں کو ترے یوسف کا داماں کر کے چھوڑوں گا

پکاروں گا کلیمِ نُو کو طورِ عصرِ حاضر سے　　جو کچھ کہدوں گا اُس کو دین و ایماں کر کے چھوڑوں گا

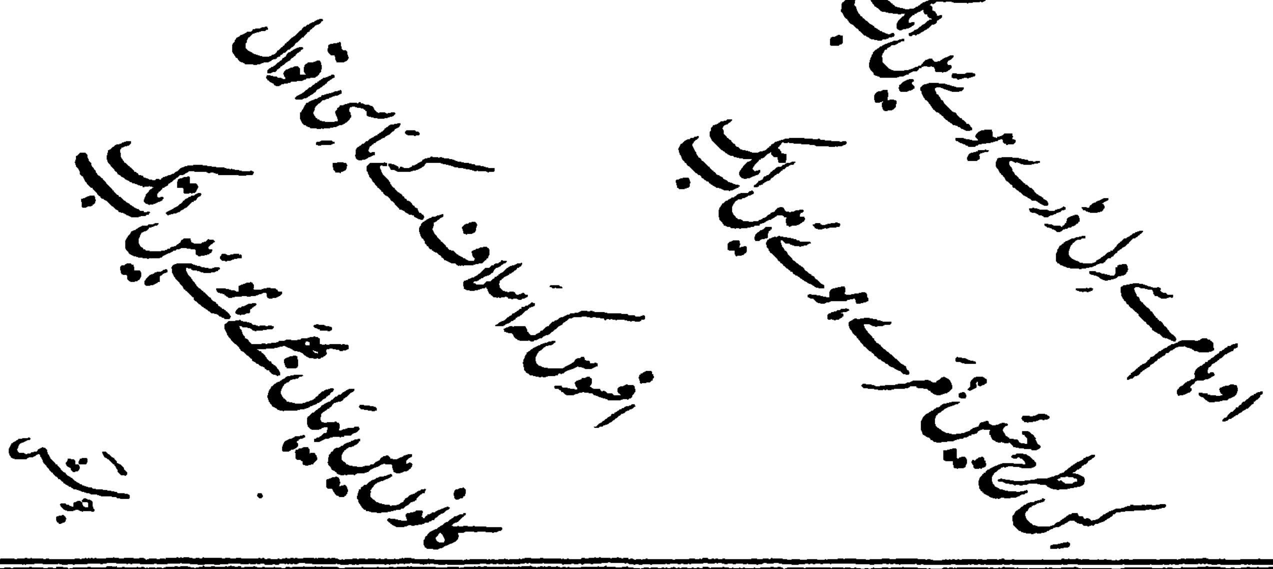
مری حکمت، بشر کو دعوتِ نُو دے کے دم لے گی　　میں اِس بھٹکے ہوئے انساں کو "انساں" کر کے چھوڑوں گا

اگر یہ کُفر ہے جو کچھ زباں پر میری جاری ہے　　تو میں اِس کُفر کو گلبانگِ عرفاں کر کے چھوڑوں گا

اگر عصیاں ہی پر موقوف ہے انساں کی بیداری

تو میں دُنیا کو غرقِ بحرِ عصیاں کر کے چھوڑوں گا

جوش



ذرّہ

(ایک عالم و عامی کی گفتگو)

(نیاز فتحپوری)

زائر۔ "میں چاہتا ہوں کہ ذرّہ کو دیکھ سکوں"۔

عالم۔ "میں خود بھی تمنا رکھتا ہوں ۔۔ مگر ۔۔"

ز۔ "تو کیا واقعی آپ نے بھی کبھی ذرہ کو نہیں دیکھا، آپ لوگوں کے پاس تو بڑے بڑے نازک و دقیق آلات ہیں اور میں سمجھتا تھا۔ کہ آپ ضرور کوئی خوردبین ایسی رکھتے ہونگے جو ذرہ کو نگاہوں کے سامنے لے آئے؛

ع۔ "ہاں باوجود ان تمام آلات کے اس وقت تک ذرہ کا مشاہدہ نہیں ہو سکا"۔

ز۔ کیا یہ واقعی صحیح ہے؟"

ع "ہاں بالکل صحیح ہے، کیونکہ قوی سے قوی دوربین کے ذریعہ سے جس مجسم شے کو دیکھا جا سکتا ہے، وہ ایک انچ کے لاکھویں حصہ کے برابر ہوتی ہے، لیکن ذرہ اتنا صغیرالجسم ہے، کہ اس ایک انچ کے لاکھویں حصہ میں اس کی تعداد دس کروڑ سے کم نہیں ہوتی۔ پھر اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ وہ ہر وقت حرکت و گردش میں رہتا ہے اور اس اہتزاز دائمی کی وجہ سے ہم اس کی معرفت حاصل نہیں کر سکتے۔

ز۔ "پھر جو آپ لوگوں نے ذرہ کے متعلق یہ تمام حقائق مرتب کئے ہیں، ان کا علم آپ کو کیونکر ہوا؟

ع۔ "حقیقت یہ ہے کہ نفس ذرہ کے متعلق تو ہم کو ابھی تک کچھ نہیں معلوم ہوا، البتہ اس کے اثرات و نتائج ضرور تھوڑے بہت دریافت ہوئے ہیں۔ جو کیمیاوی و طبیعی تجربات کے دوران میں مشاہدہ کئے گئے ہیں، مثلاً حرارت و برودت کی تاثیر، یا کہربائی اثرات، بہرحال جس حد تک ذرہ کی شکل کا تعلق ہے ہم لوگ ہنوز تاریکی میں ہیں۔

ز۔ "یہ جو کہا جاتا ہے کہ ذرہ بالکل نظام شمسی کے مشابہ ہے، یعنی اس کے "نوات" (protons) بمنزلہ آفتاب کے ہیں، اور اس کے برقپارے (Electrons) سیاروں کی طرح چاروں طرف گردش کرتے رہتے ہیں۔ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

ع۔ "یہ رائے ڈنمارک کے ایک عالم بوہر کی تھی، اور اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک بہت مفید ثابت ہوئی۔

ز۔ ایک حد تک؟

ع۔ "ہاں ایک حد تک۔ کیونکہ علوم جدیدہ کے تمام مسائل میں بوہر کا یہ استنباط صحیح ثابت نہیں ہوتا، لیکن چونکہ اس وقت تک کوئی اور تاویل اس سے بہتر نہیں کی گئی تھی، اس لئے عارضی طور پر اس کو سب نے تسلیم کر لیا۔

ز۔ لیکن بوہر کی یہ "نظام شمسی" والی تعلیل بظاہر بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔

ع۔ اگر کسی وقت ہم کو بنا ذرہ کی حقیقت کا علم ہو گیا تو وہ اور زیادہ خوبصورت ثابت ہوگی، کیونکہ وہ علم "حقیقت مجردہ" کا علم ہوگا۔

ز۔ اور ہاں، یہ آپ نے کیا کہا کہ بوہر نے ذرہ کا استنباط کیا، کیا یہ اس کا "انکشاف" نہیں تھا۔

ع۔ نہیں، کیونکہ ذرہ کا تصور تو بوہر سے پہلے اور علماء بھی پیش کر چکے تھے، اور مختلف تجربات کی بناء پر اس کی مادی شکل متعین کرتے تھے۔ بوہر نے اس کو نظام شمسی کی صورت میں پیش کیا۔

ز۔ ذرہ کی شکل اول کا استنباط کس نے کیا؟

ع۔ قدماء کا خیال تھا۔ کہ مادہ "ذرات دقیقہ" سے مرکب ہے، لیکن

کوئی تجربہ انہوں نے نہیں کیا تھا، کہ اس خیال کی توثیق ہوسکتی، سب سے پہلے نیوٹن نے ذرے کی تعریف ہمارے سامنے پیش کی، کہ وہ ایک ٹھوس، سخت متحرک چیز ہے، اور اس کا تجزیہ نہیں ہو سکتا، گویا اجسام کی سختی و نرمی کا تعلق انہیں ذرات کی کثرت و قلت پر ہے۔

اس کے ۱۰۰ سال بعد لارڈ کالوِن نے اس نظریہ کے خلاف دوسرا نظریہ پیش کیا، اور وہ یہ کہ اجسام کی سختی کا سبب وہ نرم ذرات ہیں، جو ہر وقت نہایت سریع گردش میں رہتے ہیں۔

ز۔ مجھے بھی یاد آگیا، کالون نے ذرہ کو دھوئیں کے حلقہ سے مشابہت دی تھی۔

ع۔ اس نے اس کا نام ذرۂ زوبعیہ (بگولے کی طرح حرکت کرنے والا ذرہ) رکھا تھا، اور بہت سی دلیلیں اس باب میں پیش کی تھیں، مثلاً ایک یہ کہ اگر کسی باریک نلکی سے پانی چھوڑا جائے تو وہ ایک بڑے پیئے کو گردش میں لا سکتا ہے، اس سے مدعا اس کا یہ ظاہر کرنا تھا کہ سیال پانی محض حرکت سریع کی وجہ سے جو امدی قوت حاصل کرلیتا ہے۔ الغرض کالوِن کی رائے یہ تھی، کہ ذرہ ایک حلقہ ہے جو بگولے کی طرح ایتھر پر گردش کرتا رہتا ہے۔ اور نور بھی اس کے ساتھ چلتا ہے۔

ز۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا؟

ع۔ کالوِن کا یہ نظریہ پچاس سال تک طبیعات کا مرکزی نظریہ قرار پایا کیونکہ اس کی بنا پر بہت سی ایسی باتوں کی تاویل کر سکتے تھے، جو اس سے قبل ممکن نہ تھیں، مثلاً یہ کہ ذرہ کی اس حرکت سے ایتھر کے اہتزازات اور ان اہتزازات کی وجہ سے نور کا تموج سمجھ میں آیا، لیکن اس کے ساتھ چونکہ اس نے اس میں قوت کشش کا ہونا ظاہر نہیں کیا تھا، اس لئے بعض مسائل میں یہ نظریہ بھی ناکام ثابت ہوا۔

ز۔ پھر اس کی جگہ کس نظریہ نے لی؟

ع۔ اس کے بعد ایک زمانہ تک کوئی جدید نظریہ قائم نہیں ہوا، البتہ گذشتہ صدی کے آخر میں امریکہ کے پروفیسر رولینڈ نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ ذرہ کی بناء پیانو کے تاروں کی تار و پود کی طرح ہے۔ لیکن وہ ایکس ریز (X RAYS) یا دوسرے روشن عناصر دریافت ہونے سے قبل مرگیا، اور اس لئے اپنے نظریہ کو ان جدید انکشافات سے منطبق نہ کرسکا۔ اور اب اساسی طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا، کہ ذرہ کی بناء بالکل کہربائی ہے اور اس میں کشش بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن آئنسٹین ذرہ کی قوت جاذبہ کا منکر ہے، وہ کہتا ہے کہ ایک جسم کا دوسرے جسم کی کھینچنا اس لئے نہیں ہے کہ ذرات میں قوت جذب پائی جاتی ہے، بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ فضا کی شکل ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ ایک جسم دوسرے جسم سے متصل رہے۔

ز۔ تو کیا اب اصولی طور پر سب نے آئنسٹین کے اس نظریہ کو تسلیم کرلیا ہے؟

ع۔ نہیں، بلکہ اب ایک اور نظریہ قائم کیا گیا ہے۔ جسے شروڈنگر کا ذرۂ موجیہ کہتے ہیں۔

ز۔ اس کا نام میں نے آج تک نہیں سنا تھا۔

ع۔ ہاں یہ بالکل حال کی بات ہے، اور تمام علماء اس نظریہ کی تحقیق میں مصروف ہیں۔

ز۔ اس نظریہ کے مطابق بھی ذرہ کو کہربائی مانتے ہیں؟

ع۔ ہاں کہربائی مانتے ہیں، لیکن بوہر کے نظریہ سے اتنا اختلاف ہے کہ اس میں "ذرات" کو کہربائی ایجابی قوت کا مرکز مان کر، برقپاروں کو چاروں طرف سلبی قوت کہربا پیدا کرتے ہوئے مانتے ہیں، اور اس جدید نظریہ کے ماتحت کہربائی قوت کو ہر جگہ یکساں تسلیم کرتے ہیں۔ گویا بوہر کے ذرہ کے برقپارے ہر وقت گردش میں رہتے ہیں۔ اور شروڈنگر کے ساکن ہیں، لیکن وہ اس بات پر قادر ہیں کہ معین اوقات اور معین فصلوں میں وہ اپنی کہربائیت کی مقدار کو کم زیادہ کرسکیں۔

ز۔ تو کیا یہ جدید نظریہ علوم جدیدہ کے تمام مباحث پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے؟

ع۔ تمام مباحث میں تو نہیں۔ لیکن ہاں بعض مباحث میں ضرور مفید ثابت ہوتا ہے۔

ز۔ ممکن ہے، آیندہ اس میں بھی کوئی نقص نکل آئے۔

ع۔ بے شک، اس کا امکان ہے، کیونکہ انسان مرتبۂ کمال سے ابھی بہت دور ہے۔ اور اس وقت تک جتنا علم حاصل ہوا ہے وہ حدِ طفلی سے آگے نہیں بڑھا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ شباب تک پہنچتے پہنچتے ہم کو اپنے کتنے نظریے بدلنا پڑیں گے، اور کسے خبر ہے کہ حقیقت کا علم پھر بھی حاصل ہوگا یا نہیں۔

بسنت رُت اور شاعر

چمن چمن یہ بستیاں یہ دلفریب ہستیاں! شمیم گل کی مستیاں جنوں کی چیرہ دستیاں
یہ میرے دل کی پستیاں یہ میری غم پرستیاں

گلوں کی بادہ نوشیاں صبا کی گرمجوشیاں ہزار دل راز کوشیاں ہزار دل پردہ پوشیاں
اُدھر جنوں فروشیاں، ادھر مری خموشیاں

یہ نیلی پیلی تتلیاں طلسم کی یہ پتلیاں بسنت رُت کی بجلیاں، بہار کی تعلّیاں
یہ حسن کی تجلّیاں، یہ میری لاابالیاں

یہ آب بستہ ندیاں، یہ رنگ رنگ مچھلیاں شفق کی اُف یہ سُرخیاں، ہوا کی نغمہ ریزیاں
یہ دل کی بے قراریاں، خموشیاں اُداسیاں

بسنت رت کا جوش ہے زمین سبز پوش ہے جہاں میں اک خروش ہے صدائے نائے و نوش ہے
اسے بھی اتنا ہوش ہے، مگر یہ دل خموش ہے

گلوں پہ بھی نکھار ہے، ہوا بھی مشکبار ہے جہان لالہ زار ہے، کہ ہر طرف بہار ہے
مگر وہ غم کا بار ہے کہ کچھ نہ خوشگوار ہے

کلی کلی کی یہ نمو چمن تمام مشکبو! یہ سبزہ زار و آب جو، زمیں بہشت ہو بہو
نہیں مگر وہ رنگ و بو ہے دل کو جس کی جستجو

گلوں کا یہ شباب ہے کہ مستی شراب ہے جہاں میں انقلاب ہے دلوں میں اضطراب ہے
مرا یہی جواب ہے یہ زندگی کا خواب ہے

رہین دیدِ یار ہے، ازل کی یادگار ہے لئے وہی خمار ہے اسی سے اشکبار ہے
یہ چشمِ انتظار ہے، اسے کہاں قرار ہے

کرشن سہائے وحشی کانپوری

پریم کا یوگ

ل - احمد ، اکبرآبادی

قومیت کی بنا، زبان و خیال کا اتحاد ہے، کوئی قوم اس وقت تک قوم نہیں بن سکتی، جب تک کہ اس کا طریق تخیل اور معاشرت ایک نہ ہو، ہندوستان کے اندر زمانہ ماضی میں ایک حد تک اتحاد ملی رونما ہو گیا تھا، مگر باشندگان ہند نے حریفوں کی چالوں کو نہ سمجھکر آپس میں ایک دوسرے کو حریف سمجھ لیا، اور اختلاف وافتراق کی ایک خلیج حائل ہو گئی ہے اس افتراق کو مٹانے کے لئے ہر وطن دوست اور بہی خواہ قوم بے چین ہے اور اس پر تمام غور و فکر کرنے والے متفق ہیں کہ اس مرض کا علاج کلچر کے امتزاج کے سوا کچھہ نہیں۔

کلچر کے امتزاج کا یہ مقصد ایک دوسرے کے ادب و معاشرت سے واقف ہونے پر ہی حاصل ہو سکتا ہے، یا کہ ایک میں دوسرے کی ذہنیت اور روح تہذیب آہستہ آہستہ سرایت کرتی جائے۔

اس مدعا کو حاصل کرنے کے لئے ہمارے تعلیمی اداروں میں درسی کتابوں کا انتخاب صحیح سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اس کے بعد اشاعت ادب اور مطالعے کا شوق پیدا کرنا ہے، یہ کام ہمارے قومی اداروں اور ملکی رہنماؤں کی توجہ چاہتا ہے۔

"کلیم" کا مقصد اولی "اتحاد ملی" ہے، اس لئے میری خواہش ہے کہ کلیم کے ذریعہ سے سنسکرت اور ہندی ادب کو اردو میں منتقل کرنے کا ایک سلسلہ قائم ہو جائے، اس سلسلے کا آغاز کر دینے کے لئے مہابھارت سے ایک فسانہ اخذ کر کے پیش کرتا ہوں، امید ہے کہ کلیم کے دیگر مضمون نگار بھی توجہ فرمائیں گے۔

ل۔ احمد

ملک دکن میں، پرانے زمانے میں، ایک نیک اور خدا ترس راجہ تھا، جس کے پن دان کی کوئی حد نہ تھی، وہ نہایت قابل حکمراں اور منصف راجہ تھا، اس وجہ سے اس کی تمام رعایا اسے بہت محبوب رکھتی تھی، اس پرمتقوی راج کا نام اسواپتی تھا، لیکن اس حق پسند اور رحمدل راجہ کا خاندان حکومت بے چراغ تھا، اور اس وجہ سے راجہ اور پرجا دونوں کو رنج اور صدمہ رہتا تھا، راجہ اسواپتی کی عمر جتنی زیادہ ہوتی جا رہی تھی، بے اولادی کا غم بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

اس آرزو و تمنا میں کہ اس کے گھر میں کوئی تاج و تخت کا وارث پیدا ہو، سواپتی بہت خیر خیرات اور پن دان کرتا رہتا تھا، اور ہمیشہ دیوی ساوتری یعنی برہما کی استری کی پوجا پاٹ نہایت عقیدتمندی وانہماک کے ساتھ کرتا رہتا، اور ہر وقت اسی کے بھجن گایا کرتا تھا، کھانا، پینا قریب قریب چھوٹ گیا تھا، چھہ گھنٹے کے بعد نہایت احتیاط کے ساتھ برائے نام کچھہ کھا پی لیتا تھا۔ جب اس طرح سنیاس اور پوجا پاٹ کرتے ہوئے اٹھارہ برس گذر گئے، تو راجہ اسواپتی کو دیوی ساوتری نے درشن دیئے اور کہا:-

اسواپتی میں تجھسے بہت پرسن ہوں، اس کی دیا سے جو آپ روپ ہے تیرے گھر میں ایک کنیا جنم لے گی۔ جو بڑی شکتی مان ہوگی، تو کچھہ بولے مت، بھگوان کی اچھا یہی ہے"

دیوی یہ کہکر غائب ہو گئی۔ اور راجہ اس جگہ سے جہاں وہ اتنی مدت سے تپسیا کر رہا تھا اپنی راجگدی کو پلٹ آیا۔ جب کچھہ دن گذر گئے تو اس کی بڑی

رانی کے جو خود بھی دیالو اور بڑی دھارمک استری تھی، حمل قرار پا گیا۔ اور جب وقت آیا تو ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کی آنکھیں کنول کٹوریاں تھیں۔

راجکماری چونکہ دیوی ساوتری کی کرپا اور اسی کی پوجا کا پھل تھی، اس لئے پنڈتوں کی تجویز اور راجہ کی پسند سے اس کا نام ساوتری ہی رکھا گیا۔ راجکماری روپ دیوی استری کا روپ بن کر بڑی ہوئی، معلوم ہوتا تھا کہ خود حسن کی دیوی نے ساوتری کے روپ میں جنم لیا ہے۔

اب ایک دن آیا کہ انوپ رانی جوان ہوئی اور اس طرح جوان ہوئی کہ اس کی پتلی کمر، سڈول کولہے، اور کندنی بدن دیکھکر دنیا پکار اٹھی۔

"یہ تو سچ مچ دیوی ہے!"

بڑی ہوکر ساوتری اتنی شکتی مان اور اس کی چلت پھرت اتنی تیز تھی کہ اب اس پدم پنکھڑی آنکھوں والی اور سورج پرکاش چہرے والی ابلا کو بیاہنے کے لئے کسی ویر جونت کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

کسی تہوار کا دن تھا، اور ساوتری نے اُپاس کیا تھا۔ اس نے اسنان کیا کپڑے بدلے اور پوجا پاٹ سے فارغ ہوکر ٹھاکر جی کے درشن کئے، برہمنوں کو ہوما کی آگیا دی۔ اور پھر وہی پھول ہات میں لے، جو اس نے مورتی پر چڑھائے تھے یہ روپ دیوی کی مورت راجکماری اپنے پتا باپ کے چرن چھونے گئی۔ باپ کی خدمت میں پہنچ کر پالاگن کیا، اور ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

راجہ اسواپتی نے بیٹی کو دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا، کہ ساوتری اب جوان ہو گئی تھی۔ اور اس کا روپ سنگھار اپسراؤں کا سا تھا۔ مگر ابھی تک کوئی راجکمار اس سے شادی کرنے کا طلبگار نہ ہوا تھا۔ اس خیال نے راجہ کو بہت اداس اور غمگین بنا دیا، اور وہ ساوتری سے کہنے لگا:۔

"بیٹی تو اب بیاہنے جوگ ہے، پر ابتک کسی راج رجواڑے نے ٹیکا نہیں بھیجا، اس لئے میں تجھے آگیا دیتا ہوں کہ جا اور چل پھر کر اپنے لئے اپنا ہی سا کوئی دھرم پتی ڈھونڈھ لا، میں نے رشیوں کے یہ شبد سنے ہیں، تو بھی سن لے کہ جو باپ اپنی بیٹی کو بیاہ نہیں دیتا، اس کا اپمان ہوتا ہے! اور جو بیٹا اپنی ودھوا ماں کی رکھشا نہیں کرتا اس کا بھی اپمان ہوتا ہے! جا، میں تجھے اسیرواد دیتا ہوں، کوئی ایسی بات مت کیجیو کہ دیوتاؤں کو ہم سے کرواہ ہو!"

پھر راجہ نے اپنی راج منتریوں کو ضروری ہدایتیں کیں اور کہا "جاؤ!"

سہمی اور لجائی ہوئی ساوتری نیچی گردن کئے باپ کے چرنوں پر جھک گئی اور اپنے راج پتا کے حکم کی تعمیل میں آہستہ آہستہ مگر مضبوط قدموں سے رخصت ہوئی۔ راجہ کے حکم کی تعمیل فوراً ہوئی: ساوتری جب محل سے باہر آئی تو سنہرا رتھ تیار تھا، جس پر وہ رتھ میں سوار ہوئی، اور راج منتری اور پیادوں سپاہیوں کو جلوس میں لئے بڑے بڑے رشیوں منیوں کے درشن کرتی پھری۔ ان سنیاسیوں اور تیاگیوں کے چرن لے کر، ڈنڈوت اور دان سے فارغ ہوکر، جنگل جنگل اور بستی بستی گھومتی پھری تیرتھ اور یاترائیں کیں، اور پھر اپنے باپ کی راجدھانی کو پلٹ آئی۔ جس وقت وہ باپ کے محل میں پہنچی تو راجہ، رشی نارد کے پاس بیٹھا ہوا گیان دھیان کی باتوں میں مصروف تھا۔ راجکماری نے سیس نواکر دونوں کو پالاگن کیا، اور رشی نارد پوچھنے لگا۔

"راجکماری کہاں گئی ہوئی تھی؟ راجہ، راجکماری کہاں سے آ رہی ہے؟ تونے ابتک اس کا بیاہ کیوں نہیں کیا، ـــ اب تو وہ بیاہ کے جوگ ہو گئی ہے؟"

راجہ اسواپتی نے جواب دیا:۔

"مہاراج راجکماری اسی کارن گئی ہوئی تھی، آپ اسی سے پوچھیے کہ اس نے اپنا دھرم پتی کس کو چنا ہے!"

یہ سنکر راجکماری ساوتری نے اپنی سیاحت کا بیان شروع کیا۔

"مہاراج، چھتریوں کے سلوا گوت کا ایک راجہ ہے، جن کا نام دیومت سینا ہے، وہ اندھا ہو گیا تھا، ان آنکھوں سے اندھے پر بدھی مان راجہ کے ایک بیٹا تھا، راجہ کے ایک پرانے بیری نے یہ دیکھکر کہ راجہ دیومت سینا اندھا ہو گیا ہے، اس پر چڑھائی کر دی۔ اور اس کا راج پاٹ چھین لیا، اندھا راجہ اپنی رانی کو ساتھ لے کر بن باس ہو گیا ان کا پتر اس سمے گود میں تھا، بن باس لے کر اندھا راجہ تپسیا میں لگ گیا، اور بڑا یوگ کرنے لگا، راجکمار جس نے انواس میں جنم لیا تھا، اب جنگل میں سنیاسی کی کٹیا میں پلنے بڑھنے لگا، مہاراج یہ راجکمار ہر بات میں میرا دھرم پتی بننے کے جوگ ہے۔ اور میں اسے اپنے من، اپنے ہردے کا دیوتا بنا لیا ہے!"

رشی نے یہ سن کر راجہ سے کہا:۔

"راجہ، تیری بیٹی سے بڑی چوک ہوئی، اس نے اپنی بھول میں ستیوان کو جس میں بہت سے گن ہیں اپنا پتی چنا ہے!"

اس پر راجہ نے رشی مہاراج سے سوال کیا:۔

"مہاراج، کیا ستیوان شکتی مان ہے۔ اس میں ویرتا ہے؟ کیا وہ بدھی مان ہے؟ اس میں گمبھیرتا ہے؟"

رشی نارد نے راجہ کو بتایا:۔

"ستوان بھی میں سورج کے مان ہے، اور بدھی میں ورہسپتی کے برابر ہے وہ اندر سا ویر اور دھرتی سا گمبھیر ہے!"

راجہ نے پھر پوچھا:-

"مہاراج، کیا پن دان دینے میں اس کی شکتی کھلی ہوئی ہے؟ کیا وہ برہمنوں کا مان رکھتا ہے؟ کیا وہ روپ وان اور دیکھنے میں منوہر ہے؟ کیا وہ من چلا بھی ہے!"

نارد رشی نے پھر بتایا:-

"پن دان دینے میں وہ اپنے پھر سانکرتی دیو کے پوت انتی دیو کے برابر ہے اور سچی بات کہنے اور برہمنوں کا مان رکھنے میں اُشینارا کے بیٹے سبیوی کا جوڑ ہے، وہ چندر ماں سا منوہر اور یاتی سا من چلا ہے، اس کو اپنی اندریوں پر ادھکار ہے اور وہ بھولا اور سچا ہے۔ وہ دھیر جوان ہے، منتریوں کا پریمی ہے، کپٹی نہیں اور لاج والا ہے!"

راجہ نے پھر کہا۔

"گیانی مہاراج آپ نے ستوان میں سب گن گنوا دیئے، اب اس کے جو اوگن ہوں وہ بھی بتایئے!"

رشی نارد نے جواب دیا۔

"راجہ، اس کا اوگن بس ایک ہے جس نے سارے گنوں کو ڈھک لیا ہے اور وہ ایک اوگن ایسا ہے، جو کسی کرتوت سے سدھارا نہیں جا سکتا، ستوان کا جیون تھوڑا ہے۔ اور آج سے ٹھیک ایک برس بیتنے پر وہ اپنا یہ چولا چھوڑ دے گا، اس کا اوگن بس یہی ہے، جس نے اس کے سارے گنوں کا ناش کر رکھا ہے"

راجہ نے جب رشی کے منہ سے یہ سنا تو راجکماری سے کہنے لگا:-

"روپ ناری ساوتری، تو اپنے لئے کوئی دوسرا پتی ڈھونڈھ، کیونکہ تیرے اس چناؤ میں جو ایک اوگن ہے، وہ اس کے بہت گنوں کو دھو دیتا ہے"

راجکماری نے اپنے باپ کے جواب میں کہا:-

"پتا جی، پانسہ ایک ہی بار پھینکتا ہے، اور بیٹی بھی ایک ہی بار بیاہی جاتی ہے۔ اور ایک منش ایک ہی بار کہہ سکتا ہے کہ "میں نے دیا!" یہ تینوں باتیں ایک ہی بار کی جا سکتی ہیں! اب اس کا جیون تھوڑا ہو یا بہت، اس میں گن ہوں یا اوگن، میں نے اپنا پتی چن لیا ہے، میں اب پھر کوئی چناؤ نہ کروں گی، ایک بات جب دھیان میں نشچے کر لی جاتی ہے، تو پھر اس کی لاج رکھی جاتی ہے۔ میرے دھیان میں ایک بات کا نشچے ہو جانا بھی ایسا ہی ہے!"

اس پر رشی نارد بولا:-

"مہاپرش راجہ، تیری بیٹی کا من ڈانواں ڈول نہیں ہے۔ اور اب اس کے ہردے کو اس رستے سے ہٹایا نہیں جا سکتا، اس لئے میں ساوتری کے اس چناؤ کو مان لیتا ہوں"

راجہ نے جواب میں کہا:-

"رشی مہاراج آپ کے کہے سچے ہیں۔ آپ میرے گرو ہیں۔ جو آپ کی اچھا ہو میں وہی کروں گا"

نارد نے پھر کہا:-

"بھگوان اس بیاہ کو سپھل کرے۔ راجہ، اب میں جاؤں گا۔ تم سب سکھی رہو!"

یہ کہا اور رشی نارد فضا میں بلند ہو کر غائب ہو گیا، اور راجہ اسواپتی اپنی بیٹی کی شادی کے انتظام میں لگ گیا، تمام بڑے بڑے پنڈت پجاری اکٹھے ہوئے، اور جب سب انتظام ہو گیا تو راجہ ایک شبھ دن اور شبھ گھڑی میں راجکماری کو ساتھ لیکر روانہ ہو گیا، جب یہ دلہن کی برات رشیوں منیوں کے پوتر بن میں پہنچی۔ جہاں دیومت سینا کی کٹیا تھی، تو اسواپتی بڑھکر اس راج رشی کی خدمت میں پہنچا۔ اور ڈنڈوت کرنے کے بعد عزیزی اور مسکینی کے لفظوں میں اپنے آپ کو پہچنوایا۔ وہ چپ ہوا تو سنیاسی راجہ دیومت سینا نے سوال کیا۔

"مہاراج، آپ میرے پاس کس کارن آئے ہیں؟"

اس سوال کے جواب میں راجہ اسواپتی نے سارا حال بیان کر دیا، اور کہا:-

"ودیا وان مہاراجہ، یہ پرم روپ ابلا میری بیٹی ہے، اور آپ کا سبھاؤ سچا ہے۔ اس لئے میری پرارتھنا ہے کہ اس کو اپنی بہو بنا کر میرا آدر کیجئے"

"مہاراجہ، ہم سے ہمارا راج چھن گیا ہے، اور اب ہم بن باس ہو کر سنیاس کا نپا تلا جیون بتا رہے ہیں، تمہاری راج دلاری کی پلی بڑھی راجکماری بن کا جیون اور اس کی بپتائیں کیسے سہارے گی؟"

"مہاراج، جتنا میں جانتا ہوں اتنا ہی میری بیٹی بھی جانتی ہے کہ سکھ اور دکھ، دونوں آتے اور چلے جاتے ہیں۔ ٹھہرنے والی چیزیں نہیں۔ اس لئے آپ کے یہ شبد مجھ سے منش کے لئے تو ہو نہیں سکتے، اور میرے ساتھ آپ کا ناتا کرنا ایک برابر والے سے ناتا کرنا ہے۔ آپ گن وان ستوان کو آگیا دیں، کہ وہ ساوتری کو اپنی دھرم پتنی بنا لے"

اس کے جواب میں دیومت سینا نے کہا۔

"تپاماہو، ایک سمے مجھے آپ کے یہاں ناتا جوڑنے کی اچھا تھی، پر اپنا راج پاٹ چھن جانے سے میں جھجکتا تھا، اس لئے اب میری وہ اچھا ترت پوری ہو نے دیجئے، اب میں آپ کا آدیش کرتا ہوں"

اس کے بعد سنیاسی راجہ نے بن کے سارے یوگیوں کو بلایا اور ان سب کے سامنے ستیاوان اور ساوتری کے بیاہ کی ریت رسم پوری ہوئیں، اور راجہ اسواپتی کنیا دان کرکے خوشی خوشی اپنی راجگدی کو پلٹ گیا۔

ایک طرف راجکمار ستیوان ایسی سگھڑ اور سروپ رانی کے ملنے سے بے حد خوش تھا، اور دوسری طرف راجکماری ساوتری اپنے من کی ملا کو پا کر پھولی نہ سماتی تھی، باپ کے چلے جانے کے بعد ساوتری نے راج محل کے کپڑوں کو تہ کرکے رکھدیا، اور کسومی رنگ کے معمولی کپڑے پہن لئے اور تھوڑے ہی دنوں میں ساوتری کی نرم مزاجی، محبت، احترام اور ایثار و خدمت نے ہر ایک کو خوش کر دیا، اس نے اپنے کپڑے اور زیور ساس کی نذر کردیئے، اور اس کے دل میں گھر کرلیا، ادب اور عزت اور اپنے میٹھے بولوں سے سسرے کو اپنا گرویدہ کرلیا، اور خوش کلامی، سلیقہ مندی شگفتہ مزاجی اور تخلئے کی محبت و دلنوازی سے شوہر کو موہ لیا۔

غرض ان بن باسیوں کی زندگیاں ہنسی خوشی میں گزر رہی تھیں، لیکن رشی نارد کے بچن ساوتری کے دل کو اداس رکھتے تھے، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا، جو ستیوان کے دیہانت کے لئے مقرر تھا، اور اس لئے کہ نارد کی بات کسی وقت ساوتری کے دھیان سے نہ اترتی تھی، وہ ایک ایک دن گنتی رہی تھی، اب صرف چار دن باقی رہ گئے تھے، ساوتری نے رات دن کا برت رکھا، اور "تری راتری" کا پرتیاگ کیا، مگر جب اس کے سسرے کو اس بات کا حال معلوم ہوا، تو اسے افسوس ہوا اور اس نے ساوتری کی دلداری کرنے کے لئے کہا۔

"بیٹی تو ایک راجکماری ہے، اور یہ تین دن رات کا برت جو تو رکھنا چاہتی ہے بڑا کٹھن ہے"

ساوتری نے جواب میں کہا:۔

"پتاجی، آپ چنتا نہ کریں، میں اس برت کو پورا کرلوں گی، میں نے اپنے آپ میں اتنی شکتی پیدا کرلی ہے —— اور ایک پرتگیا پوری کرنے کے لئے من کا پکا ہونا دوشش ہے"

دیومت سینا ساوتری کا جواب سن کر کہنے لگا۔

"بیٹی، میں تجھ سے یہ تو کہنے سے رہا کہ تو اپنی پرتگیا پوری مت کر —— مجھ منش تو یہی کہے گا کہ اپنے بچن کی رکھشا کرنی چاہیئے"

بلند خیال دیومت سینا یہ کہکر خاموش ہوگیا۔

ساوتری نے اپنا برت جاری رکھا، مگر برابر گھلتی رہی، یہاں تک کہ تیسرے روز کا نقشہ کی تپلی معلوم ہونے لگی، اور اس غم سے کہ دوسرے روز اس کا پتی مرجانے والا ہے، یہ دکھیا لڑکی برت کی حالت میں رات بھر تڑپتی رہی تھی، اور جب سورج دو ہاتھ اونچا ہوا تو وہ اپنے دل میں سوچنے لگی، کہ وہ دن آپہنچا۔

صبح کو پوجا پاٹ سے فارغ ہوکر اپنے حواس بجا کرکے برہمنوں اور اپنے ساس سسرے کو ڈنڈوت کی، اور بات جو گھڑی ہوگئی، تمام سنیاسیوں نے ساوتری کی بھلائی کے لئے اسے دعا دی کہ وہ کبھی بیوہ نہ ہو۔ اور ساوتری نے دھیان میں ڈوب کر ان کی دعا پر اپنے دل میں کہا، کہ "بھگوان ایسا ہی کرے" مگر نارد کا قول یاد کرکے وہ اس گھڑی کا انتظار کرنے لگی۔

اس کے ساس سسرے ساوتری سے اتنی محبت کرتے تھے کہ اسے اس طرح کمزور دیکھکر کہنے لگے۔

"ساوتری، تیرا برت پورا ہوگیا، اب بھوجن کر لے"

اس کے جواب میں ساوتری نے کہا۔

"ہاں، برت تو پورا ہوگیا ہے، پر میں نے یہ بھی پرتگیا کی ہے کہ سورج ڈوبے بھوجن کروں گی"

جب اس نے یہ کہا تو ستیوان کلہاڑی کاندھے پر رکھ جنگل کو پھل پھلاری کے لئے جانے لگا، ساوتری نے اس سے کہا:۔

"بھگوان، آپ اکیلے بن کو نہ جائیں، میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی، مجھے آپ کی جدائی دو بھر ہے"

اس کے جواب میں ستیوان نے کہا۔

"راجکماری، تم بن میں کبھی پھری نہیں ہو، بن کی پگڈنڈیاں کٹھن ہیں، اور اپاس نے تمہیں نڈھال کردیا ہے، تم پیدل چل نہ سکوگی"

ساوتری نے جواب میں کہا:۔

"برت سے میں کچھ نڈھال نہیں ہوں، آپ مجھے نہ روکیں، میں نے یہ پرتگیا کی ہے"۔

ستیوان نے کہا:۔

"تمہاری بھی اچھا ہے تو اچھا، پر تم ماتا پتا کی آگیا لے لو، کہ جو پر دو کھنہ آئے"

اپنے شوہر کی مرضی پا کر عالی ہمت ساوتری ساس سسرے کے پاس گئی، اور پرنام کر کے کہنے لگی:۔

میرے پتی پھل توڑنے بن کو جا رہے ہیں، آپ مجھے بھی ان کے سنگ جانے کی آگیا دیجئے، آج میں ان کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتی، اور یہ بن کے پھولنے کی رُت ہے، میں نے پھولا بن دیکھا بھی نہیں ہے"

سینا سی راجہ نے کہا:۔

ساوتری جس دن سے میری بہو بن کر آئی ہے۔ مجھ سے اس نے کبھی کچھ نہیں مانگا، میں چاہتا ہوں کہ اس کی یہ اچھا پوری کر دوں، اچھا بیٹی جاؤ، پر ستوان کے کام میں رکاوٹ نہ ڈالنا"

ساس سسرے کی اجازت حاصل کر کے ساوتری اپنے شوہر کے ساتھ جنگل کو چل دی، اور اگرچہ شوہر کے ساتھ ہونے کے سبب سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، مگر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا، مرگ نین ساوتری ہرے بھرے جنگل کو پھولوں سے لدا ہوا دیکھتی، موروں کا ناچ اور چڑیوں کے گیت دیکھتی سنتی چل رہی تھی لیکن اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

ستوان نے محبت بھرے لہجہ میں کہا:۔

"راجکماری، ندی کی پو تر لہروں کو دیکھو، اور دیکھو یہ رنگ برنگے پھول کیسے سندر ہیں"

لیکن ساوتری اپنے شوہر کی ایک ایک بات اور ایک ایک ادا کو جانچ رہی اور اس میں کھوئی ہوئی تھی۔ نارد رشی کے الفاظ اس کے حافظے میں گونج رہے تھے، وہ ستوان کو مرا ہوا سمجھ لینے پر مجبور ہو رہی تھی، اور اس کا دل ٹکڑے ہوئے جا رہا تھا، وہ اس کی کسی بات کا جواب اگر دیتی بھی تھی تو اس بات کے ایک حصے کا جواب ہوتا تھا، دوسرا ٹکڑا اس گھڑی کی آمد کے خیال میں محو ہو جاتا تھا، ستوان نے جب ندی اور پھولوں کی بہار کی طرف اسے توجہ دلائی، تو اس نے کچھ نہ سنا، اور چپ چاپ اس کے ساتھ چلتی رہی۔

قوی اور مضبوط ستوان نے درختوں سے پھل توڑے، اور جھولی بھر لی اور لکڑیاں کاٹنے لگا۔ لکڑیاں کاٹنے میں اس کی طبیعت بگڑی اور پسینہ بہنے لگا، اور پھر سر میں درد شروع ہو گیا، محنت کے بیمار ستوان نے اپنی بیوی سے کہا:۔

"ساوتری میرا سر اور سر کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے، جی بگڑ رہا ہے، بیسیوں میں سیکڑوں بان چبھ رہے ہیں، نیند آئی جا رہی ہے، اور مجھ سے کھڑا نہیں رہ جاتا"

یہ سن کر ساوتری جھپٹی، اور اسے لٹا کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا، اور پھر وہ بیکس لڑکی رشی نارد کی پیشینگوئی کو یاد کر کے گھنٹے اور گھڑی پل کا شمار کرنے لگی، ٹھیک یہی وقت تھا، جب نارد نے پیشینگوئی کی تھی، ابھی وہ اسی خیال میں منہمک تھی کہ اچانک اس کے سامنے ایک ڈراؤنی ہیئت کا شخص نمودار ہو گیا۔ اس کا لباس سرخ تھا، اور ایک سرخ رنگ کا تاج سر پر پہنے ہوئے تھا، جسم بھاری تھا، اور اس کا تانبے رنگ کا چہرہ سورج کی طرح جھلکتا معلوم ہوتا تھا، اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ہاتھ میں ایک پھندا لئے ہوئے تھا، وہ بڑھکر آیا اور ستوان کو گھور کر دیکھنے لگا، ساوتری نے آہستہ سے اپنے شوہر کا سر زمین رکھدیا، اور اچانک کھڑی ہو کر کانپتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے لہجہ میں پوچھنے لگی:۔

"مہاراج، آپ کا سبھاؤ منشوں کا سا تو ہے نہیں، اس لئے میرا وچار ہے کہ آپ کوئی دیوتا ہیں، بتائیے آپ کونسے دیوتا ہیں، اور کیوں آئے ہیں؟"

اس پر یم، خدائے موت نے جواب میں کہا:۔

"ساوتری میرا سبھاؤ بات کرنے کا نہیں ہے، پر تو پتی کی پجارن ہے اور تیری آتما سینیاسی ہے، اس لئے میں تجھ سے بات کر سکتا ہوں، میرا نام یم ہے، تیرے پتی ستوان کے، جو ایک راجہ کا بیٹا ہے، دن پورے ہو چکے ہیں اور میں اسے اپنے پھندے میں باندھکر لیجانے کو آیا ہوں"

ساوتری نے موت کے دیوتا سے پوچھا:۔

"پر دیوتا مہاراج، میں نے تو سنا تھا کہ منش آتما کو لینے آپ کے چیلے چانٹے آتے ہیں، اس کام کے لئے آپ کیوں آئے ہیں؟"

"زبتریوں کے نامور دیوتا نے ساوتری کا سوال سنکر اس کا دل رکھنے کے لئے بتایا:۔

"یہ راجکمار گنوان بھی ہے، اور سندر بھی، اور ہر بات میں اونچا ہے اور اس کے گنوں ہی کے کارن اس کو لینے کے لئے میں آپ آیا ہوں"

یہ کہکر یم نے اپنی دیوشکتی سے ستوان کے اندر سے ایک شخص کو کھینچ نکالا، جو انسانی انگوٹھے کے برابر تھا، پھر اس کو اپنے پھندے میں باندھکر بالکل قبضے میں کر لیا، اور جب ستوان کے شریر سے جیو آتما نکال لی گئی، تو اس کا بیچارہ بدن بے رونق اور دیکھنے میں برا ہو گیا، یم ستوان کی روح کو لے کر دکن کی سمت روانہ ہو گیا، مگر عالی حوصلہ ساوتری بھی جس کا دل اگرچہ رنج و غم سے چور چور

ہو رہا تھا، لیکن اس کی آتما سنیاس کی شکتی سے بہت اونچی تھی یم کے ساتھ ہولی، یم نے اس کو اپنا پیچھا کرتے دیکھکر اس سے کہا:۔

"ساوتری، میرے پیچھے کیوں آتی ہے، پلٹ جا اور اپنے پتی کا کریا کرم کر، تو نے اس کی سب سیوا کرلی ہے، اور تو جہاں تک اس کا ساتھ دے سکتی تھی دے چکی ہے"

ساوتری نے جواب میں کہا:۔

"مہاراج جہاں میرے پتی دیوتا جائیں گے یا لیجائے جائیں گے وہیں میں بھی جاؤں گی، پراناچین یہی چلا آرہا ہے، میرے سنیاس کی شکتی، بڑوں کی بات کی لاج، پتی کا پریم، برت پورے کرنا، اور مجھ پر آپ کا دیا کرنا، ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے میرا راستہ تو کھلا ہوا ہے، سچے اور بڑے بدھی مانوں نے بتایا ہے کہ کسی کے ساتھ سات پگ چل لینے سے متر تا کا بچن ہوجاتا ہے، اب میں نے آپ سے متر تا جوڑ لی ہے، اور اس لئے میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جن کو اپنی آتما پر ادھکار ہوجاتا ہے وہ جیون کے چاروں آشرم، برہم چریج اور گیان گرہست مائب پرست، درسنیاسست کرکے بھی پھل نہیں پاتے، دھرم کا تت یہی ودیا ہے اس لئے بڑے بڑے بدھی مانوں نے دھرم کے تتو کو سب سے اونچی چیز بنایا ہے ان چاروں آشرم سے گذر جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، بڑوں کے بتاتے ہوئے رستوں پر چل کر، میں نے اور میرے پتی نے ان چاروں میں سے ایک، گرہست آشرم سے سچی بھلائی پالی ہے، اور اب ہم کو اور کسی آشرم کی اچھا نہیں ہے، اور جیسا کہ بدھی مان کہہ گئے ہیں ہمارا یہ گرہست ہی دھرم کی سب سے بڑی بھلائی ہے"

ساوتری کا بیان سن کر یم کہنے لگا:۔

"راجکماری، میرا اچھا نہ کر، میں تیرے اس ودیا گیان سے، تیرے سگھڑ شبدوں سے بہت پرسن ہوا ہوں، اس لئے سندرمکھ ساوتری، اپنے پتی کا جیون چھوڑ کر جو مانگنا چاہتی ہے، مانگ لے"

ساوتری نے اس کے جواب میں کہا:۔

"دیوتا، میرے سسرے کی آنکھوں کی قوت جاتی رہی ہے، اور وہ ایک سنیاسی کا جیون کر رہا ہے، ہم سب بن کی ایک کٹیا میں رہتے ہیں، آپ کی دیا ہو تو اس کی آنکھیں ایسی ہوجائیں، کہ وہ آگ اور سورج سی چمکنے لگیں"

یم بولا:۔

"سگھڑ مکھ ساوتری، جا، تیری یہ اچھا پوری ہوگی، اس کی آنکھیں جیسی تو چاہتی ہے ویسی ہی ہوجائیں گی۔ اب تو تھک گئی ہے، جا لپٹ جا"

ساوتری نے پھر جواب میں کہا:۔

"اپنے پتی کے ساتھ مجھے تھکن بھی نہیں ہوتی، جو گت میرے پتی کی ہوگی وہی میری ہوگی، آپ میرے پتی کو جہاں لیجائیں گے وہیں میں بھی جاؤں گی، دیوتاؤں کے راجہ! میری بات سنیئے: یوگیوں اور گیانیوں کی ایک بار ڈنڈوت کرلینا بھی بڑی بات ہے، اور ان سے متر تا ہوجانا تو بہت ہی اچھی بات ہے، اس لئے یوگیوں اور گیانیوں کی سیوا میں رہنا چاہیئے۔

یم نے پھر کہا:۔

"ساوتری تیرے بچنوں میں بڑی سکھشا ہے، ان سے من کو آنند ہوتا ہے، اور بدھی مانوں کی بھی بدھی بڑھتی ہے، اس لئے میں تجھے پھر آگیا دیتا ہوں کہ اپنے پتی کے جیون کو چھوڑ کر، جو تیری اچھا ہو، وہ مانگ لے"

ساوتری نے کہا:۔

"دیوتا مہاراج، میرے سسرے کا راج پاٹ چھن گیا ہے، آپ کی کرپا ہو تو وہ اسے پھر مل جانا چاہیئے، وہ میرے بڑے ہیں، میں ان سے کچھ کہہ نہیں سکتی، پر آپ سے یہ بھی چاہتی ہوں کہ وہ اپنی راج نیتی پر قایم ہوجائیں۔

یم نے کہا:۔

"راجہ کو اس کا راج پاٹ پھر مل جائے گا، اور وہ راج نیتی بھی کرے گا پر راجکماری اب تیری یہ اچھا بھی پوری ہوگئی، اب تو میرے ساتھ نہ آ:"

ساوتری نے اس کے جواب میں کہا:۔

"دیوتا، آپ سنسار کے رکھیا بھی ہیں، اور جس کو چاہتے ہیں بلا بھی لیتے ہیں، اس لئے مہاراج آپ کو سنساریم (حکم کرنیوالا) کہتا ہے، اچھا منش وہ ہے جو سارے سنسار میں اپنے کرتویہ سے کسی کو دکھ نہ دے، اپنے شبدوں سے کسی کا دل نہ دکھائے، اپنے ہردے میں کسی کا برا نہ چیتے، سب کا مان رکھے اور سب کا پریم رکھے، پر اس جگ میں میرے اس دہانت پتی کے سمان نہ تو کوئی دھیان کرنا جانتا ہے، اور نہ کسی میں بدھی ہے، اچھوں کا کرتویہ ہے، کہ بیری بھی ان کا سہارا لے تو اس پر دیا کریں"

یہ سنکر یم نے کہا:۔

"ساوتری، تیرے شبد سوکھی دھرتی پر مینہ کی بوندوں کے سمان ہیں سندر ابلا، ستوان کی آتما چھوڑ تجھے جو کچھ اور چاہیئے مانگ لے"

ساوتری بولی :-

دیوتا مہاراج ، میرے پتا کے کوئی پتر نہیں ہے ، میری تیسری اچھا یہ ہے کہ میرے باپ کے سو پتر ہوں ، اور ان کا کل چلتا رہے "

یم نے جواب دیا :-

بڑے راجہ کی پتری ، تیرے باپ کے سو نامی پتر ہونگے ، اور اس کا کل بڑھیگا اب تو رک جا ، تو بہت چل چکی ہے "

ساوتری نے پھر کہا :-

"اپنے پتی کے ساتھ ہونے سے میں یہ بھی نہ جان سکی ، کہ میں کتنی دور چل چکی ہوں - اور میرے دھیان میں تو ابھی بہت دور چلنا میٹھا ہوا ہے ، اس لئے دیوتا مہاراج چلتے چلتے میں آپ سے جو کہوں وہ سن لیجئے ، آپ دیوسوت کے شکیتمان پوت ہیں ، اسی لئے سب بدھی مان آپ کو دیوسوت کہتے ہیں ، اور آپ سب سنساریوں کے ساتھ ایک سا نیائے کرتے ہیں ، اسی لئے آپ کو نیائے دیو نام ملا ہے - کسی منش کو اپنے اوپر اتنا بھروسا نہیں ہوتا ، جتنا بھروسا اسے ایک سدھ پرش پر ہو سکتا ہے ، اس لئے ہر منش کی یہی اچھا ہوتی ہے کہ وہ سدھ پرشوں کی سیوا میں رہے ، وہ اس منش کے من کی اچھائی ہے کہ لوگ اس پر بھروسا کرنے لگ جاتے ہیں ، اور من کی اچھائی ہی دوسرے منش سے بھروسا کراتی ہے "

یہ سنکر یم نے پھر کہا :-

"سندر ابلا ، تیرے شبد ایسے ہیں کہ میں نے کسی دوسرے کے منہ سے نہیں سُنے ، مجھے تیری باتوں سے بہت آنند ملا ، ستیوان کے جیون چھوڑ تجھے اور بھی جو کچھ مانگنا ہے ، مانگ لے ، اور پھر چلی جا "

ساوتری نے پھر جواب میں کہا :-

دیوتا ، میری چوتھی اچھا یہ ہے ، کہ ستیوان کے اور میرے سنجوگ سے سو بلونت اور شورما پیدا ہوں ، جو ہمارے کل کا نام چلائیں "

ساوتری کی چوتھی خواہش سنکر یم بولا :-

"راجکماری جا تجھے سو بڑا درشکتی مان پتر بھی ملیں گے ، پر اب تو میرا پیچھا نہ کر ، تو بہت تھک گئی ہے "

ساوتری کہنے لگی :-

"مہاراج : یوگیوں کا سبھاؤ نت اونچا ہوتا ہے ، اور سدھ کا سدھ کے ساتھ متر تا کرنا پھل لائے بنا نہیں رہتا - سنتے ہے کہ یوگیوں کے ست کے کارن ہی سورج آکاش میں گھومتا ہے ، اور ان کی تپسیا دھرتی کو سنبھالے رہتی ہے اور اے بھگوان ، اگلے اور پچھلے دونوں سمے یوگیوں ہی کے آسرے پر ہیں ، اس لئے جو یوگ کرتے ہیں وہ یوگیوں کے پرتوں میں کبھی دکھی نہیں ہوتے ، اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ پرکاسش کا کرتو یہی ہے ، یوگ کرنیوالے دوسرے کی بھلائی کے کام کرتے ہیں ، اور اس کے بدلے کی کبھی اچھا نہیں رکھتے ، بھلوں کے ساتھ بھلائی اکارت نہیں جاتی ، ایسے کرتوں سے نہ تو کوئی اپمان ہوتا ہے ، اور نہ کبھی ٹوٹا ہوتا ہے ، یوگی اپنا یہ کرتو کبھی نہیں چھوڑتا ، اور سب کا رکھیا بن جاتا ہے "

یم نے ساوتری کا یہ ودیا گمیان سنکر پھر کہا :-

"ساوتری ، تیرے شبدوں میں ست ہے ، تیرے بچن میٹھے ہیں ، تیری باتوں میں گن بھرا ہوا ہے ، تیرے بول من کو بھاتے ہیں ، اور جیسے جیسے تو کہتی جاتی ہے ، میرے من میں تیرا مان بڑھتا ہے ، اور اس کے کارن کہ تو اپنے پتی کی ایسی بھگت ہے ، تجھے جو مانگنا ہے اور مانگ لے "

یہ دیکھکر کہ اس دفعہ یم نے کوئی شرط نہیں لگائی ہے ساوتری نے کہا :-

"کرپا ندھان ، آپ نے میری جتنی اچھائیں پوری کی ہیں ، وہ میرے پتی کے بنا کیسے پوری ہوں گی ، مجھے اپنے پتی کا جیون اوش مانگنا پڑتا ہے ، پتی بنا تو میں آپ ہی مری ہوئی ہوں ، پتی بنا مجھے کوئی آنند ، سرگ کا آنند بھی نہیں چاہیئے ، اس کے بنا میں اپنے من کو جیون کے لئے بھی نہیں منا سکتی ، دیوتا مہاراج ، آپ نے مجھے سو پتروں کا بچن دیا ہے - اور آپ میرے پتی کو لئے جا رہے ہیں ، آپ کا بچن کیسے پورا ہوگا ، اس لئے میری پانچویں اچھا ہے کہ ستیوان کو جیون پھر مل جائے تو آپ کا بچن پورا ہوگا "

اس پر یہ کہہ کر کہ "ایسا ہی ہوگا " "یم نیائے کریا" نے اپنا پھندا ڈھیلا کر دیا اور پھر بڑے آنند میں ساوتری سے کہا :-

"بڑے کل کی کنیا ، میں تیرے پتی کو چھوڑتا ہوں ، تو اسے اپنے ساتھ لے جا ، وہ پھلے پھولے گا ، اور تیرے ساتھ چار سو برس کا جیون کرے گا ، ہون اور بھینٹ کرنے سے اس کا بڑا نام ہوگا ، تیرے پیٹ سے اس کے سو پتر ہونگے ، اور یہ سب چھتری پوت راج کریں گے ، اور تیرے نام سے نامی بنیں گے ، اور تیرا باپ بھی اپنی رانی ملاوی سے سو پوتوں کا باپ ہوگا ، اور ملاوا کے نام سے تیرے چھتری بھائی آکاش باسیوں کے سمان ہونگے "

پتری کا دیوتا ، ساوتری کی خواہش پوری کرکے اپنے استھان کو چلا گیا ،

اور اس کے جانے کے بعد ساوتری وہاں پہنچی، جہاں اس کے شوہر کا بے جان جسم پڑا ہوا تھا، اس نے ستوان کا سر پھر اپنے زانو پر رکھ لیا، اور ستوان نے اچانک آنکھیں کھولدیں، اور ساوتری کو بار بار پریم کی نگاہوں سے دیکھنے لگا، جیسے وہ بہت دن تک پردیس میں رہ کر پلٹا ہو، اور پھر اس سے کہنے لگا:-

"میں بہت دیر تک سوتا رہا۔ تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟ وہ شخص کہاں ہے جو مجھے لئے جا رہا تھا؟"

ساوتری نے اسے بتایا:-

"تم میری گود میں بہت دیر سوئے، سنسار کے سنبھالنے والے دیوتا، یم آ چلے گئے، سدھ ستوان تم پھر جی گئے، اور اے راجکمار اب تم جاگ گئے ہو، اٹھ بیٹھو!"

ہوشیار ہو کر ستوان اس طرح اٹھ بیٹھا جیسے کوئی گہری نیند سے جاگا ہو، اور اس طرح پریم آتما کی شکتی نے موت پر فتح پائی: (ماخوذ)

خدا ہوجا

اٹھی وہ مست گھٹا رقص آشنا ہوجا
اُٹھ اور باغ میں خود جھومتی گھٹا ہوجا

ہٹا دے کشتیٔ عالم کے ناخداؤں کو
خود آج کشتیٔ عالم کا ناخدا ہوجا

کلاہ و کفش کا کیا کام صحنِ بستاں میں
برہنہ سر ہو خدارا، برہنہ پا ہوجا

گھٹا میں شور بپا ہے کہ محو کر آداب
ہوا پکار رہی ہے کہ بے ریا ہوجا

بس آج مستیٔ رندی کی انتہا کر دے
کل آئے ایسی ہی شامت تو پارسا ہوجا

یہ کیا جمود ہے اے تو اسیرِ زلفِ حیات
خود آج فاتحِ عمرِ گریز پا ہوجا

بڑھ اور تختِ کیانی پہ جلوہ فرما ہو
اُٹھ اور صاحبِ جامِ جہاں نما ہوجا

تجھے معاملۂ غنچہ و صبا کی قسم
بمثالِ خندۂ جاناں گرہ کشا ہوجا

بہ شکل بندہ تو رہنا ہے عمر بھر اے جوشؔ
اُٹھ اور چند نفس کے لئے خدا ہوجا

(جوشؔ)

واکھوست

(واسوخت)

یہ واسوخت میرے محترم دوست حضرت ماتی جائسی نے مجھے مرحمت فرمایا ہے، یہ ایک ٹھاکر صاحب کے عشق کی یادگار ہے، جسے ٹھیٹ پوربی بھاشا میں محفوظ کیا گیا ہے، لائق مصنف نے اس میں حقیقت اور سادگی کو اس طرح شروع سے آخر تک قائم رکھا اور نباہا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔۔

چونکہ پوربی زبان عام فہم نہیں ہے، اس لئے ہر مصرعہ کے نیچے اس کا ترجمہ دے دیا گیا ہے۔۔

قصہ صرف اس قدر ہے کہ ایک زمیندار ٹھاکر صاحب یہ سنکر کہ ان کے گاؤں کے قریب حاکم ضلع دورے کے سلسلے میں ٹھیرے ہوئے ہیں، "صاحب" کے سلام کے لئے روانہ ہوتے ہیں، راہ میں ایک "طوائف" نظر آتی ہے، یہ بے تحاشا اُسے دل دے بیٹھتے ہیں، اور "صاحب" کے سلام کو دور ہی سے سلام کرکے اپنی معشوقہ سے نامۂ و پیام کرنے لگتے ہیں۔

بات طے ہو جاتی ہے، اور یہ رات کو اسی کے ہاں قیام کرتے ہیں، اور صبح جب وہ ان سے ان کی جیبیں پوری طرح خالی کرا لیتی ہے تو ان کے اس پر جوشش سوال پر کہ ہم جائیں گے تو تم ہمارے گاؤں [illegible] دیکھ دیکھ نہیں با چشم گریاں گاؤں واپس جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

بات تو اتنی سی ہے، مگر دیکھیئے کس صفائی اور حقیقت نگاری کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

(۱)

کاہی تم نے! الاکے کارکھت چیت رہی … گاؤں ماں جاکے کنکوت کرت کھیت رہی
(کیا کہیں کبھی علاقے کی ہم نگرانی کرتے تھے) … (گاؤں میں جاکے اپنے کھیتوں کا تخمینہ کیا کرتے تھے)
آپ پٹّا ہم اسامی کا سدا دیت رہی … اپنے مہتوں سے نجر بھینٹ بھی لے لیت رہی
(آسامیوں کو ہم خود پٹّا دیا کرتے تھے) … (اپنے مہتوں سے نذرانے بھی لے لیا کرتے تھے)

کاہے جر جائے کریج اب نہ تما کو ہو سکے؟
(اب کلیجہ تما کو ہو کے کیوں نہ جل جائے)
یہہ کے جھو نجھ ماں ہم بیٹھے ہیں الّو ہو سکے
(محبت کے جھونجھ میں ہم الّو کی طرح بیٹھے ہوئے ہیں)

(۲)

جو کبھی تم تے دہی ست گجو دھر جانیو! … ہم کا منئی نہ کہیو، منئی کا ماتجر جانیو
(اسے گجودھر تم سے جو کچھ کہوں سچ جاننا) … (ہم کو آدمی نہیں، آدمی کا ڈھانچا سمجھو)
تم کو ناتب کیا آپن، تم اپن گھر جانیو … اس کیہو کام نہ اب آپ کا نوکر جانیو
(ہم نے تمہیں اپنا نائب کیا، اب اسے اپنا گھر سمجھو) … (ایسا کام کرنا کہ اب اپنے کو نوکر نہ سمجھنا)

گھر کے کی اُدر سے تنگی نہ دیہو تم اِن کا
(خرچ کی طرف سے تم انہیں تنگی نہ دینا)

تم کا سونپت ہے دکھو ہین سے ٹھکرائن کیا
(تمہیں سونپتے ہیں، ٹھکرائن کو ہین سو رکھنا)

جو تو بیاکل ہے بہت، کا کہی ہم اپنی کتھا   چیت تو ہوت وہار و لگ ہے بس تن کا!
(تم تو بہت بیکل ہے، ہم اپنی کتھا کیا کہیں)   (محبت تو آدمی کو سب سے بڑا روگ ہو جاتا ہے)
سیہ تیہہ پہ وا اماں جیہ دن سے سنا صاحب کا   کھوب بالن میں ملائیں کا، جلیبن بانچا
(جب صاحب کو تو پروا میں خبر نہ ملنا شنا)   (خوب بالوں میں تیل ڈالا، اور زلفوں کو سنوارا)

دھر کے موڑے پہ چمکدار پگریا نکسن
(سر پہ چمکتی ہوئی پگڑی باندھ کے ہم نکلے)
جیسے تن جات ہے پھن کاڑھ کے کریا نکسن
(جیسے ناگ پھن اٹھا کر تن جاتا ہے، ہم اٹھ کر نکلے)

جب دیوڑھی کو سے پہ ان کا جو سنا سب کا کام   جیو ماں اوا کہ کرن جائے کہ صاحب کا سلام
(جب سب سے ان کا دو کوس پر قیام سنا)   (جی میں آیا صاحب کو سلام کر آئیں)
دوئے گھڑیا پہ بڑے ٹھاٹھ سے تھا بن جو لگام   گھڑیا کس بینگ بھرن، کا کہی نہتے کا نام
(دو گھوڑی پر سوار ہو کر جب بڑے ٹھاٹھ سے لگام تھامی)   (نیتا نام، تہت کیا کہیں گھوڑی کیسے بینگ بینڈی گی)

پاؤں دھر دیں رکابن ماں جو چیلا ایسے
(ہم نے چیلا سے پاؤں جب رکابوں میں رکھ دیئے)
ہم چلت جات رہن راہ ماں چھیلا ایسے
(ہم راہ میں چھیلا بنے چلے جا رہے تھے)

... ماں پڑا پال رہے کنس پورت   بیٹھی تو ماں رہی اک کامنی سندر مورت
(... میں خوبصورت چھپر پڑا ہوا تھا)   (اس میں ایک نازک حسینہ بیٹھی ہوئی تھی)
... سیدھا بھی، بس دم دھکے ... مورت   ہم جو دیکھا تو رہی وو رتے ہم کا گھورت
(ایسی تو ل ... کہ نا تب ہم کیا کہیں)   (ہم نے جو دیکھا تو وہ دور سے ہمیں کو گھور رہی تھی)

دھر کے کن ... جیسے
(ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے زور سے ہمارا کلیجہ بینچ لیا)
سیکوا کا ہے ایسی ہے ... کہت ہیں جیسے
(دل سیکوا کیوں ہم جو کچھ ہیں ...)

... تما بھری گھڑیا سے گھوڑ ... جم سے   من ماں یہ سوچ بھوا کیسے ملیں جا جم سے
(...)   (دل ہی دل میں یہ سوچنے لگے تا جم ... کیسے ملیں)

ہائے دیدی کہا، اور ... تم کو   ہوسے گیں گست گجب، ہوش گوا بیٹھو ہم سے
(ہم نے ہائے دیدی کہا، اور ہم کو زمین پر گر پڑے)   (ہمیں غضب کا غش آگیا، اور دل غم سے بیٹھ گیا)

سیکوا حال یہ دیکھیں تو بہت گھبرا دایا
(سیکوا نے جب یہ حال دیکھا بہت گھبرایا)
دوڑو، دوڑو لوگو، ٹھاکر کو ہے مرجھا آوا
(دوڑو، ارے کوئی دوڑو، ٹھاکر کو غش آگیا)

ہمری چھاتی ماں لگی سانس چلے جب گھر گھر   دوڑے بجراج، مہاپال، بھون، بل بھدر
(جب ہماری چھاتی میں سانس گھر گھر چلنے لگی)   (تو گجراج، مہاپال، بھون، اور بل بھدر دوڑے)
کو ٹیکیس پاؤں، اور کوئی سنگھائس انتر   اور کو ڈو لو کہا جیت ماں آؤ ٹھاکر
(کسی نے پاؤں دبائے کسی نے لخلخہ سنگھایا)   (اور کسی نے یہ کہا ہوش میں آؤ ٹھاکر)

ہم ذرا کوؤ جتن سے رجگائے جاگن
(ہم مگر کوئی جتن سے نہ جگائے جاگے)
گر پڑا جو بہت پیٹ تلائے بھاگن
(پیٹ جب بہت گر پڑا یا تو تالاب کی طرف ہم بھاگے)

ہم تلائے جو گیئں، تب تو وہ چنچل بد کھا نہ   سیکوا سے تو کہیں کا ہے رب باری بات آؤ
(ہم جب تالاب گئے تو وہ طرار و شوخ)   (سیکوا سے کہنے لگی ارے میاں کہاں ہو آؤ)
پال کھینچ کے پلنگا، تنی باہر تو بچھاؤ   تیرے ٹھاکر کا تو ہم بوجھ گئیں سب بھیداؤ
(چھپر سے کھینچ کر پلنگ باہر تو بچھاؤ)   (تیرے ٹھاکر کے تو ہم سب بھید (منو رتھ) سمجھ گئے)

ہی پلکا پہ جب آئیں، تو بچھیبا ان کا
(جب وہ آئیں گے تو اسی پلنگ پر انہیں بٹھائیں گے)
(ان کے بچھونے کا مجا کھوب چکھیبا ان کا)
(اور ہم ان کے عیبوں (منو رتھ) کا انہیں خوب مزا چکھائیں گے)

ہم تلائے سے پھرن، باگ ماں پلکا پاوا   تب تو اوی چھیل چھبیلی کو تنک بلوا وا
(ہم جو تالاب سے پھرے، باغ میں پلنگ پایا)   (پھر تو اس چھیل چھبیلی کو ہم نے بلوایا)
پاس بٹھای کے ان کا یہ جباں پر آوا   تم تو بگیا ماں ہوا کھوب کرت ہو کھاوا
(انہیں کے پاس بٹھا کر یہ ہماری زبان پر آیا)   (تم تو باغوں میں ہوا خوب کھایا کرتی ہو[1])

[1] کتنی معقول بات کہی، سبحان اللہ! اسی کو کہتے ہیں، اور بلاغت اسی کا نام ہے۔

ہم کہا اُن سے کبہن آنکھ سے لگی نہ کریو
(ہم نے ان سے کہا کہیں ہم سے آنکھ نہ لگا بیٹھنا)
میکوا! کاہے کبہن ہنس کے، لگی نہ کریو
(کیوں مجکو! یہ سن کے انھوں نے ہنس کہا تھا کہ ہم سے دل لگی نہ کرو)[ف]

دوس تو بیت گوا ہم کا ہتوَن باتن بات — جب گئے سُرج اتھے، اور تنک آئی رات
(ہمارا دن تو وہیں باتوں ہی باتوں میں گذر گیا، — اور جب سورج غروب ہوگیا، اور رات ہو چلی)
ہم کہا ان تے کہ لئو ہم تو ہن اب گھر کا جات — بولیں رہ چلتے کی کچھ ہوت نہیں سُولی کات
(ہم نے ان سے کہا کہ ہم تو اب گھر جاتے ہیں) — (کہنے لگیں راہ روؤں کی ملاقات بھی کس کام کی)

آس نہ تم تم نہہَن نہات کو دو کا جیو بار کے جاؤ
(تم اس طرح ناحق ہی ناحق کسی کا جی جلا کے نہ جانا)
جی کے اب کا کر بے، جات ہو تو مار کے جاؤ
(جی کے اب کیا کرینگے۔ جاتے ہو تو ہمیں فنا کر کے جاؤ)

ان کی انکھین سے لگن آنس بہے جب جھر جھر — پھر تو تھانے نہ تھما جیو کا مُتو سا دھر دھر
(ان کی آنکھوں سے جب آنسو جھر جھر بہنے لگے) — (پھر تو ڈانوا ڈول دل کو سوسنا چاہا لیکن قابو میں نہ آیا)
ہم کہا روؤ نہ، جیو ہمرا بہت سہے بَر بَر — بات چھاتی پہ دھرو، آنچ ہے نکست بھر بھر
(ہم نے کہا روؤ نہ، ہماری چھاتی جلی جارہی ہے) — (سینے پر ہات رکھو، بھر بھر آنچ نکل رہی ہے)

ہوئے سکت اب تو ہے او پتر سے جاؤب کیسے
(اب یہ کیسے ہوسکتا ہے، ہم اس جگہ سے کیونکر جاسکتے ہیں)
بن کہے تمرے بھلا گوڑ، ہٹاؤب کیسے؟
(تمہارے حکم کے بغیر بھلا اب ہم کیونکر قدم اٹھاسکتے ہیں)

پھر تو بس ریجھ گئن، پیٹھ ماں مُکّا مارِن! — اٹھ کے پلکا سے گئن، پال ماں دیا بارن
(پھر تو بس ریجھ گئیں، اور ہماری پیٹھ میں گھونسا مارا) — (پلنگ سے اٹھ کر گئیں، اور چھپر میں دیا جلایا)
مانگ کے ہم سے انگوچھے کا، بچھونا جھارِن — اور کہِن کی نہاگا اُو ئی ہم پر ڈارن
(اس نے ہم سے انگوچھا مانگ کے بچھونا جھاڑا) — (اور کہا سُوئیں دبا پچھانے، اس ہمارے ساتھ کھانا کھانا)

ہم کہا اُن سے کبہو کام نہ ایسا دیکھیو
(ہم نے ان سے کہا دیکھو ایسا غضب نہ کرنا)
کھرچ آپن نہ کیہو، ساتھ ہے سیدھا دیکھیو
(دیکھو اپنا خرچ نہ کرنا، ہمارے پاس سیدھا سامان خورونوش، موجود ہے)

بولیں تم روج ہیاں کاہے کا آوا کر ہیو — اور پھر آسے کے تم، روج نہ کھاوا کر ہیو
(بولیں تم یہاں روز روز تو آؤ گے نہیں) — (اور تم روزمرہ تو یہاں کھانا کھانے سے رہے)
ہم تو جانت ہیں کبہو مُنہ نہ دکھاوا کر ہیو — بیٹھو، بس تم یہی بکواس مچاوا کر ہیو:
(ہم تو سمجھتے ہیں تم منہ بھی اب نہ دکھاؤ گے) — (بیٹھو بس تم یہی بکواس مچاتے رہوگے)

میکوا! پیڑ تر سے جائے کے چوکا دے دے
(لے میکو پیڑ کے نیچے جا کے چوکا دے دے)
دیدی! کھیشا تَرے چیلا ہیں، تو لے کاٹے نے
(دیدی! (بڑی بہن) چارپائی کے نیچے جلانے کی لکڑیاں ہیں، لے آؤ)[ف]

میکوا پھیر کے منہ، ہمری تر پہ دیکھے لاگ — ہم کہا ہمری یہ مرجات رہی ساری بھاگ
(میکوا منہ پھیر کے ہماری طرف دیکھنے لگا) — (ہم نے کہا ہماری تو آبرو ہی جارہی ہے)
چوکہ آپن تو ئی الگ بارکے، اولائے کے آگ — جاکر میاں جو کا نذر کا ملے بھونج لے ساگ
(تو اپنا چولھا الگ جلاکے۔ اور آگ لاکر) — (اگر کانذر کا ساگ مل جائے تو جا کر تھائی بھون لے)

ہم چہیت ان کا کوئی بات کی تکلیف نہ ہوئے
(ہم چاہتے ہیں انکو کسی بات کی تکلیف نہ ہو)
ان کی دیدی سے نہ ڈر کر، دیدی کوئی چلیبو نہ ہوئے
(ان کی دیدی سے نہ ڈرو، دیدی کوئی ہوا نہیں ہے)

سانجھ تو ہوئی گئی، اب جائے کے کرِبا اشنان — آگے تمنا ہے، یہی ہم کا بنت ہے ادسان
(شام تو ہو ہی گئی، اب جا کے اشنان کرینگے) — (اس کے علاوہ ہمارے نزدیک یہ بیکار کا جھگڑا ہے)
سیر اٹھا یک، ایمن کا رہو لے تھیلا سے پسان — آج کرمن ماں تو پوری کی لکھت میں بھگوان
(فوراً آٹھ سیر آٹا تھیلے سے نکال لے) — (آج تو تقدیر میں پوریاں کھانا لکھا ہے)

ہم او تو، دوئی منّی، بھوک ہے کم، ہو جیسے
(ہم اور تو صرف دو آدمی ہیں، بھوک بھی کم ہے، آٹھ سیر آٹا کافی ہوگا)
پن پیاؤ کے لیئے اتنی رکم ہو جیسے
(پانی پینے کے لئے اتنی مقدار کام دے جائیگی)

بانٹ پھر ساتھ کے منیتن کا دیا ہم چَتّھا! — اور کہا باگ ماں تم جائے کے سینکو بھو تُرا
(پھر ہم نے اپنے دوسرے ساتھ والوں کو آٹا تقسیم کیا) — (اور کہا تم لوگ باغ میں جا کر روٹی پکاؤ)
گھوڑیا کا پیڑ ترے باگ ماں بندھوائے دیہا — آپ کنوئیاں پہ گئن، کھوب نہاوا دھوٗوا
(گھوڑی کو درخت کے نیچے بندھوا دیا) — (خود کنوئیں پر گئے، خوب نہائے دھوئے

ف اس گواہی کے قربان۔

ف اللہ رے کم خوری۔

بسترے پر جو پھرن آئی گلے دا بیرا
(اور پھر کر اس وقت جب بسترے پر آنے تو)

ہم او دوئی دو نیوں جنے بیٹھ کے کھا دا بیرا
(ہم نے اور انہوں نے، دونوں نے مل کر بیر کھائے)

میکو استنے میں چونہے سے کہس ہہسے پکار،
(استنے میں چولہے سے میکو نے پکار کر کہا)

آؤ بھوجن کر د ٹھاکر۔ ہے رسوئی طیا
(ٹھاکر آؤ بھوجن کرو، رسوئی تیار ہے)

ہم تو چوکا ماں گئن، او دیہا پنہیں کا اُتار
(ہم چوکے میں گئے، اور جوتے اتار دیئے)

گوڑ کا دہوئے کے، پھر بیٹھ گئے پلتھی مار
(پاؤں دھو کے پلتھی مار کے بیٹھ گئے)

میکوا پرس دہس ساگ او پوری جھٹ سے
(میکو نے ہمارے سامنے پوری اور ساگ جھٹ سے رکھ دیا)

ایک پل بھر ماں تو سرمیٹ گئن سب سٹ سے
(ہم نے تو ایک پل میں سب سمیٹ لیا، کھا گئے)

پھر تو چوکا سے بھین جھاڑ کے چو تر باہر
(پھر تو چو تر جھاڑ کے ہم چوکے سے باہر آئے)

پیٹ پر پھیر کے ہاتھن کا ڈکارن اُز اُز
(پیٹ پر ہاتھ پھیر کر "ار ار" ڈکاریں لیں)

پال ماں جائے اُکٹا اُن پنی سٹ سٹ نریر
(چھپر میں جا کر تھوڑی دیر سٹ سٹ ناریل پیا)

گوڑ پھیلاتے کے پھر لوٹ دہ رہن پلکا پر
(پھر پاؤں پھیلا کے پلنگ پر دراز ہو گئے)

اوئی گئن آئی کے، لیٹت جو بنے سوئی ہے
(انہوں نے آ کے کہا اگر لیٹ سکتے ہوں تو ہم بھی تمہارے پاس لیٹ جائیں)

نر چلو، تھوڑ کرد، ہم بھی تنے سوئی دیب
(کھسک جاؤ، جگہ دو، ہم بھی ذرا سو رہیں)

تھوڑ پائن ڈ ترے لاگ کے پھر سوت رہن
(جگہ پائی تو ہمارے گلے لگ کے وہ سو رہیں)

پھر تو اس سوئیں کہ دو نیوں نہ جگاسے جاگن
(پھر تو ایسے سوئے کہ ہم دونوں جگائے سے بھی نہ جاگے)

اُڈی نذا ہوت بھور ہی تو تنک جیت بھین
(لیکن جب وہ تڑکے ذرا چونکیں)

فینٹ ماں بھرے رو پیار ہیں، ٹوون لاگن
(ہماری کمر میں روپے تھے، ٹٹولنے لگیں)

ہم کہا کا کر ہیو، بولیں جو پیتن، پیتم!
(ہم نے کہا روپے کیا کرو گی، بولیں اے پیتم اگر روپے ہم پا جائیں گے)

گوٹ لنگا ماں گزنٹے کی لگتیں، پیتم
(تو پیارے، ہم لہنگے میں گزنٹ کی گوٹ لگائینگے)

دس رو پیار ہیں بس فینٹ ماں ہم کھول دیہا
(ہماری فینٹ میں دس روپے تھے سو ہم نے کھول کر دیئے)

اور کہا لیہ پران آج سیا دُ لہنگا!
(اور کہا لو جان جہاں، آج ہی لہنگا سلا دُ)

پھر کہا ان سے کہ "ایہو جو پلبیا تم کا؟"
(پھر ہم نے پوچھا آؤ گی جب ہم بلائینگے)

بولیں، ہم کا جنی، یو حال تو جانیں دو یا"
(بولیں ہم کیا جانیں، یہ حال تو دو یا جانتے ہیں[1])

سُن کے یو، آنس او انکھیں ماں تنک بھر آئے
(یہ سن کر تھوڑے آنسو تو آنکھوں میں آ گئے)

ہم مُدا گھوڑ یا پہ اسوار بھئے، گھر آئے
(لیکن ہم گھوڑے پر سوار ہوئے اور گھر پلٹ آئے)

ازو بدوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

---

[1] ہائے ناکامی۔

مل جاؤ تو جواب میں تو شکوی ہے
آجاؤ تو صبر تابہ سے دوری ہے
کھلتا ہے ایسے کہیں باب قبول
دو ہاتھ ملاؤ کہ دعا پوری ہے
(از نیاز شاعر)

فرقہ پرست

نہ یہ بزمی نہ یہ رزمی نہ یہ آزاد و زندانی — نہ ذوقِ جاں دہی اُس نہ شوق و فکرِ قربانی
نہ مذہب سے اُسے مطلب نہ مشرب سے اُسے مطلب — نہ اپنی قومیت کے اصل مطلب سے اُسے مطلب
یہ ناموسِ وطن کی جنس کا سوداگرِ اَرذل — یہ دنیا میں متاعِ حُرّیت کا غاصبِ اوّل
یہ اک خونخوار بیٹا مادرِ گیتی کے سینہ پر — مُصر ہے جو بجائے شیر ماں کا خُون پینے پر
یہ اک فردِ وطن، لیکن وطن سوز و وطن دشمن — یہ اک نخلِ چمن، لیکن چمن سوز و چمن دشمن
نمایندہ یہ ظلم و جور کا نیکی کی خدمت میں — یہ چشمِ اہرمن کا نُور بربادی کی ظلمت میں

مگر کیا اس کی ہستی حُرّیت کو روک سکتی ہے؟ — بُرائی نیکیوں کے قافلے کو ٹوک سکتی ہے؟
کہیں انوار پر ظلمت کا غلبہ ہو بھی سکتا ہے؟ — کہیں احرار پر رجعت کا حملہ ہو بھی سکتا ہے؟
کبھی اخلاق پر اعمالِ بَد نے فتح پائی ہے؟ — کبھی یزدانیت پر شیطنت بھی غالب آئی ہے؟

بھرو نگّار رنگ تصویرِ وطن میں رُوحِ پُرغم کا
تو پانی ہو کے رہ جائے گا خوں اِس ننگِ عالم کا

ساغر نظامی

شاعری کے اصلی و امتیازی خصوصیات

(خاص رسالہ کلیم کے لئے)

(حقیقت نگار شری اروندو کے قلم سے)
(آروندو آشرم پانڈیچری)

کلامِ منظوم کے تین اعلیٰ ترین جزو یعنی بحر و وزن - ترکیب و معنویت (طرزِ سخن) اور نظارہ ہائے صداقت جب اپنی پوری رونق پر ہوتے ہوئے لاینفک طور سے باہم ممزوج ہو جاتے ہیں تو اسی موقعے پر عمیق ترین روحانی صداقت کا شاعرانہ اظہار ممکن ہوتا ہے۔ نظمِ عالیہ اِن تینوں عناصر کے اتحاد سے ہی متحرک ہوتی ہے۔ اُن میں سے کسی ایک کی کمی اُن خامیوں کا باعث ہوتی ہے جو ہم بڑے سے بڑے شاعروں کے کارناموں میں پاتے ہیں۔

ایک مخصوص نقطۂ نگاہ سے بحر و وزن کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ یہی وہ اوّلین بنیادی و ناگزیر عنصر ہے جس کے بغیر باقی سب عناصر خواہ اُن کی قدر و قیمت کتنی ہی کیوں نہ ہو، شاعری کی دیوی کی درگاہ میں مقبول نہیں ہوتے۔ اگر ایک شاعرانہ کردار بہ احسن الوجوہ بحر کا مالک ہو تو اکثر اوقات کما حقہٗ قوّتِ جلوہ ریزی اور طرزِ کلام کی اعلیٰ ترشدتوں سے محروم رہتے ہوئے بھی یہ غیر فانی رہ سکتا ہے۔ بحر سے میرا مطلب صرف بحر و قافیہ کی خوبی و کمال نہیں ہے، یہ خوبی و کمال تو ایک ابتدائی قدم ہے۔ اسے شعر و سخن کی محض ہیولائی بنیاد سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ میرا مطلب ایک عمیق تر اور باریک تر موسیقیت سے ہے، ایک ایسی خوش الحان روحانی تحرک سے جو بحر میں سما جائے، اور اکثر اپنی شدّتِ سیلاب سے اس پر محیط ہو جائے۔ دراصل یہ حقیقی شاعرانہ کارنامے کی شرط ہی ہے بحض بحور کی موسیقی پر ور افضلیت خواہ وہ کتنی ہی باریک شائستہ یا بوقلموں کیوں نہ ہو، بیرونی سمع کے لئے کامل تسلی کا باعث ہوتے ہوئے بھی تخلیقی روح کے عمیق ترین مقاصد کو پورا نہیں کر سکتی۔ ایک اندرونی سامعہ ہے جو اپنا قابلِ ترجیح استحقاق پیش کرتا ہے، اور ایک خالقِ لحن و موسیقی پر لازم ہے کہ وہ اُس تک پہونچ کر اُس کی مرادوں کو بر لائے۔

بحر جس سے ارکانِ عروضی کا مقررہ اور متواتر سلسلہ منسوب ہے۔ نسبر شعر کی۔ صرف ایک روایتی بنیاد ہے بلکہ اس کی صحیح ہیولائی بیخ و بُن بھی یقیناً یہی ہے تو ایک جدید رجحان جو وٹمین (WHIT MAN) اور کارپینٹر (CARPENTER) اور فرانس اور اٹلی کے آزادانہ شعر گو حضرات کے کرداروں کی صورت میں پیدا ہوا ہے اس روایتی نظریے کا منکر ہے۔ یہ بحر و وزن کی قید کو نہ صرف ایک ناجائز نکار مندی قرار دیتا ہے بلکہ اسے صادق، آزادانہ اور قدرتی ترنم ریزی کا سدِّ راہ سمجھتا ہے، اور اسے حقیقی موزونیت کی تکذیب یا مصنوعی تشکیل سے منسوب کرتا ہے، مگر میرے خیال میں یہ نقطۂ نظر انجام کار فوقیت نہیں حاصل کر سکتا، اور نہ یہ ترویج پانے کا مستحق ہے البتہ اگر یہ رجحان ایسے اعلیٰ کارناموں کا محرک ہو سکے جو ماضی کے اساتذۂ شاعری کے شاہکاروں کو پسِ پشت ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اُس وقت اسے فروغ حاصل ہو سکتا ہے، لیکن ہنوز یہ اس معیار کے کردار پیدا نہیں کر سکا ہے۔ برعکس اس کے اس آزادانہ شعر گوئی (Vers libre) کا بہترین عمل ایک تنگ دائرے میں ہی محدود رہا ہے، اُس کی تخلیقی قوت اسی وقت کارفرما ہوئی ہے جب اُس نے اپنی سجع طرازیوں کو ایک خوش الحان نظم آمیز نثر کی حد سے آگے

بڑھنے نہیں دیا ہے۔ یا اپنے آپ کو ایک قسم کے بے قاعدہ اور پیچیدہ وزن پر مبنی کیا ہے جو اپنے تصنع کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنے اندرونی ضابطے کے لحاظ سے یونانی نصابی شاعری (Choric poetry) کی یاد دہانی کرتا ہے۔

ملٹن نے قافیے (rhyme) کو اپنی ابتدائی اور کم درخشاں مگر زیادہ خوبصورت نظموں میں بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کیا تھا۔ لیکن بعد میں جب اُس نے اُس کے ساتھ ایک تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا اُس وقت وہ اس کی روحانی قدر و قیمت سے یا تو بے پروا ہو گیا تھا یا اُسے بالکل فراموش کر چکا تھا۔ اُسے اس امر کا احساس نہ رہا کہ قافیہ جو نظم کی متوازن حرکت کا ایک خاص عنصر ہے ۔ ۔اگ ، درشر کے دریا سے تاثرات کو موسیقی کے کوزے میں بند کر کے ایک شدید نشاط پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ، اور یہ کہ الہام کے ' سدد: دروازوں کو کھول دینا اس کا فطری جوہر ہے ، اور اس کی موسیقیت میں وہ طاقت کارفرما ہے جو ہمارے اندر رہنے والی ایک مافوقِ دماغ شے کو جھنجھوڑ کر جگاتی ہے اور اُس پر حسن و جمال کا انکشاف کرتی ہے۔ وہٹمین کا تصنع آمیز نظریہ بھی ایک مماثل مگر وسیع تر غلطی کا شکار ہے۔ جب انسان صوت کے مقررہ پیمانوں میں ڈھلے ہوئے تخیل اور احساس کی قوتِ تاثیر سے پہلے پہل آگاہ ہوا۔ جب الفاظ کی نغمہ خیز و ترنم ریز ترتیب اُس کے ذہن و روح کو جنبش میں لا کر اُن پر قابض ہونے لگی، اُس وقت یہ بات کھل گئی کہ کلامِ منظوم نہ صرف ایک محض حُسن کارانہ ترکیب سے منسوب ہے بلکہ یہ ایک دقیق نفسیاتی حقیقت سے بھی وابستہ ہے جس کا علمی نظریہ آج بھی وید میں سربمہر محفوظ ہے۔ قدیم ہندیوں کو اس امر کا کامل احساس تھا کہ کلامِ منظوم ، نثر کے مقابلے میں نہ صرف ایک سہل تر پائیداری کا کفیل بلکہ ایک عظیم تر فطری قوت کا حامل بھی ہوتا ہے اور یہ نہ صرف ایک شدید تر صوتی قیمت کا مالک ہوتا ہے بلکہ اپنے اندر ایک ایسی طاقت رکھتا ہے جو صورت اور معنی کو ایک بلند پایہ حیثیت عطا کر دیتی ہے۔

چنانچہ ویدک زمانے کے ہندی ہر اُس ادبی پیداوار کو جسے وہ زندہ و پائندہ رکھنا چاہتے تھے بحری سانچے میں ڈھال دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ فلسفہ ، سائنس اور قانون بھی ان کے اس عمل سے مستثنیٰ نہ رہا۔ یہ نظریہ کہ اُن کی یہ شاعرانہ سرگرمی، یادداشت کو مدد دینے کی غرض سے عمل میں آتی تھی سراسر غلط ہے کیونکہ وہ وید کے نثری حصّے (براہمن) بھی اسی قدر صحت و خوبی کے ساتھ حفظ کر لیتے تھے جس طرح کہ اس کے منظومہ اُنیشدوں کو۔ شاید وید کا یہ خیال خالی از صداقت نہیں ہے کہ خالق نے اس عالمِ کُن فکاں کے تمام حرکات و سکنات کو کئی چھندوں کے مقررہ وزنوں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ترتیب دیا تھا، اور یہ کہ کائنات کے بنیادی حرکات اس لئے غیر متبدل طور پر مستقل رہتے ہیں کہ وہ اُن عالمگیر وزنوں سے کبھی منحرف نہیں ہوتے۔ چنانچہ عالمِ موجودات کی اصولی غیر فانی حالت ایک ایسی متوازن ہم آہنگی پر مبنی ہے جسے دقیق و صحیح صوتی تکرار تھامے رکھے ہوئے ہے، اور جب یہ اصلی اور تخلیقی صوت انسان کے اندر بیدار ہو کر اپنی قوتوں کے راز افشا کرتی ہے، اُسی وقت شاعرانہ بحر اور وزن وجود میں آتے ہیں۔

بہرکیف اس قوت کے استعمال میں انواع و اقسام کے مراتب و مدارج واقع ہوتے ہیں۔ رائے عامہ تو ہر قماش کے کلام کو جو ایک پُرزور یا جاذب توجہ بحر کے سانچے میں ڈھال دیا گیا ہو شعر کے نام سے تسلیم کر لیتی ہے وسیع انخیالی چونکہ نیکیوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اس لئے میں شعر کی ان انتہائی وسیع تعریف پر اعتراض نہیں کروں گا، اور ہر چند اس روش نے میکالے (Macaulay) اور کپلنگ (Kipling) کے سے انگریز شعر گروں کو بھی عجیب و غریب شاعرانہ میناروں پر چڑھا رکھا ہے۔ لیکن محض زور کلام خواہ وہ بحری تال سُر سے کتنا ہی دست و گریباں کیوں نہ ہو، پھر بھی اس سے اعلیٰ شعر گوئی مرتب نہیں ہوتی۔ یہ زیادہ سے زیادہ شاعری کا سطحی روپ یا سایہ پیدا کر سکتا ہے نہ کہ اس کی اصلیت۔ اشعار کا ایک بہت بڑا انبار اسی نوعیت کا واقع ہوا ہے۔ مثلاً فرانسیسی منظومہ افسانے اور عہدِ متوسط کے زیادہ تر پنواڑے اور آلھے (Ballad poetry) جن کی لحن و سجع کی دوڑ قافیہ بندی تک ہی محدود ہے، اور جن کا طرزِ بیان ایک محض معمولی و سطحی سیاقِ عبارت ہی سے وابستہ رہا کرتا ہے چنانچہ ان میں شاید ہی کوئی مصرع ایسا ملے گا جس کے سُر کی لہر ہمارے اندر سما جائے یا جس کا اسلوبِ اظہار ہمارے دل کی گہرائیوں میں اُتر سکے۔ بعد کی یورپین شاعری میں بھی، اختراع سازی اور سخن رانی کی قدرے ترقی کے باوصف، اصولاً یہی بھدا اسلوب جوں کا توں رہ جاتا ہے، اور طرفہ یہ ہے کہ اسے نہ صرف رائے عامہ کی داد حاصل ہے بلکہ یہ نقادانِ سخن کی توصیف و تحسین سے بھی سرفراز ہوا ہے۔ مگر اس نام نہاد شاعری پر صحیح اور معین الفاظ میں یہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کمیتِ سخن کی ایک خوشنما کلی یا اثر انگیز پوتا یا خود نما سر پٹ سے کچھ زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ ایک بڑی قوتِ استقلال کی مالک ہے۔ جب ایک مرتبہ اس کا سُوتا شاعر کی طبیعت میں پھوٹ نکلتا ہے تو مستقل روی کے ساتھ علی الدوام بہتا ہوا چلا جاتا ہے

ہر چند ایسے سانچے میں کوئی روحانی حرکت بہ آسانی نہیں ڈھل سکتی۔ پھر بھی اس قسم کے اشعار مخصوص اوصاف اور قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ ایک نوع کی حکایاتِ منظوم کے لئے اور رزمیہ شعر گوئی (War poetry) اور عام پسند وطن پرستانہ گیتوں کے واسطے نیز ایسی نظموں کے لئے جو زندگی کی صدائے باز گشت بن سکیں، نہایت موزوں ہوتے ہیں۔ مگر یہ رُوح کو حرکت میں نہیں لا سکتے۔ تنہی کے مانند۔ یہ ہمارے حیاتی وجود (Vital being) کو ہلا تو سکتے یا اُس میں نقارے کا سا جوش و ارتعاش تو پیدا کر سکتے ہیں، لیکن صرف تُرہی اور نقارہ ہمیں رُوحانی فضا پر دازیوں کے راستوں پر کیونکر لے جا سکتے ہیں؟

مگر اس پست معیار سے بہت بلند ہونے پر بھی وہ عظیم تر حرکتِ صوت دستیاب نہیں ہوتی، جو اس مضمون کا موضوع ہے۔ بعض اوقات بڑے سے بڑے شعرا بھی ایسے ایک باقاعدہ مرتب لحن ہی پر اکتفا کرتے جو سامعۂ خارجی کے لئے بہت تشفی بخش ہوتا ہے اور احساسِ حُسن پرستی کو ایک قسم کی ہموار گول اور غیر منفصل مسرت کے دھارے پر بہائے بہائے پھرتا ہے۔ شعرا اس سہل طریق کے سینے میں اپنے اُمنڈتے اور بہتے ہوئے دریائے خیال کو بے روک ٹوک ڈھال لیتے ہیں اور حرکتِ بلند پروازی کی شدت یا عمیق تر اثر ریزی کی ضرورت سے ناآشنا رہتے ہیں۔ ایسے شعرا کے کلام میں ہمارے کان شروع سے آخر تک وہی ایک راگ سنتے رہتے ہیں۔ یہاں کسی نئی اور ممتاز دلچسپی کی توقع قطعی نہ رکھنا چاہئے۔ اس کوچے میں ہماری باطنی سماعت پر یلغار کرنے کے لئے کوئی دل آویز استعجاب گھات میں نہیں بیٹھا، اور اس منزل میں ہماری عروسِ رُوح کو دامِ محبت میں گرفتار کر کے لامعلوم گہرائیوں تک ورغلا کر لے جانے کے لئے کوئی رس بھرا بدیع الجمال وجود کمیں گاہ میں پوشیدہ نہیں ہوا کرتا۔ ہاں اتنا ضرور ہوتا ہے کہ اس سجع اور لحن کی موجوں پر ہماری رُوح کا سفینہ ہموار طور پر بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات تو اس قسم کا کلام موج کی حیثیت بھی نہیں رکھتا اور محض ایک مستقل کوچ (steady march) یا ایک ہموار حرکت کے مشابہ ہوا کرتا ہے۔ یہ آخر الذکر کیفیت اُن شاعروں میں پائی جاتی ہے جو موسیقی کے بہ نسبت تخیل سے زیادہ تر اپیل کرتے ہیں۔ اُن کی غرض خاص طور پر یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے موضوع کے واسطے تفصیلات بہم پہنچائیں، اور اگر کوئی کافی مسجع جامہ ان کے خیال کے لئے مل جاتا ہے تو وہ اسی پر بس کرتے ہیں، اور مزید فکر سے کنارہ کر لیتے ہیں۔

بحر اور وزن کی ہر امکانی ترکیب کے استعمال میں اگر بڑی توجہ اور مہارت سے بھی کام لیا جاوے، اور نئے نئے سر اور نئی نئی ترکیبیں ایجاد کر کے سامعہ کو اس حد تک تسخیر کر لیا جاوے کہ سننے والے کی دلچسپی میں شروع سے آخر تک کمی یا اختلال پیدا نہ ہونے پائے تو اس حالت میں بھی وہ اعلیٰ معیار موسیقیت میسر نہیں آتا جس کی توضیح ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ادبیات کی تاریخ میں کتنے ایسے دور گزر چکے ہیں۔ جن میں وکٹورین شاعری کی طرح اس مہارت کو حدِ اعتدال سے بھی بہت دور بڑھایا گیا ہے۔ کبھی تو اس قسم کی شاعری میں حسن کارانہ کمال دیکھنے میں آتا ہے، اور کبھی کلاسک یا رومانوی صناع کی حکمت۔ کبھی تو یہ ایک مخمل فروز مغنی یا نوا پردازی کی کرامتوں کو منظرِ عام پر لاتی ہے، اور کبھی ایک زبردست نغمت گری کی قوت یا ایک شاعرانہ پہلوان کے شہزورانہ کرتب دکھاتی ہے ایسی شاعری میں انواع و اقسام کے اوزاری مادے (Instrumental qualities) تو ضرور بر سرِ کار رہتے ہیں۔ مگر اس میں وہ تعمیری رُوح مفقود ہوتی ہے، جو اپنے اندر سے عظیم ترین حرکاتِ صوت کو اُبھار لاتی اور خود سامع ہو کر اُن سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ البتہ چند ملہمانہ لمحوں یا وقفوں کے لئے یہ رونما ہوتی ہے اور ایک جھلک دکھا کر پھر گم ہو جاتی ہے۔

رُوح جب ان متذکرۂ بالا قوتوں سے بالاتر اور ماورا ہو کر ایک عمیق تر تسلی کی خواہش مند ہوتی ہے، اور زبان کے سامنے اپنا بلاواسطہ مطالبہ پیش کرتی ہے۔ اُس وقت شاعرانہ راز اپنے نقطۂ کمال تک پرواز کرنا شروع کرتا ہے اور اعلیٰ ترین اوزان وجود میں آتے ہیں۔ یعنی حقیقی شاعری صرف اُس وقت جاگتی ہے۔ جب کہ اندرونی سامعہ اس سے لطف اندوز ہونا شروع کرتا ہے۔ اصطلاحاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعرانہ موسیقی اُسی وقت کمال کو پہنچتی ہے جب شاعرِ الفاظ کیٹس (Keats) آواز و الفاظ کے استعمال میں کفایت شعار ہو جاتا ہے۔ یعنی اپنے ذریعے کو کمالِ سلامت روی کے ساتھ مصرف میں لاتا ہے اور ان کے ایک ایک صوتی امکان سے مکمل استفادہ کرتا ہے۔ اس حالت میں شاعری اور نثری سجع گوئی کی باہمی دوری بُعد المشرقین کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ طرزِ بیان میں ایک عام ہم آہنگی پیدا کرنا نثری سجع گوئی کا امتیازی مقصد ہے اور اس مقصد کی خاطر کلام کے ہر جزو کو مجموعی تاثیر کا دُم چھلا بننے پر مجبور کیا جاتا ہے حتیٰ کہ اُس تاثیر کو سہارا دینے یا اُبھارنے والے اصوات بھی اپنی انفرادیت کو ایک بڑی حد تک فنا کر دینے میں کوشاں رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے اشد نمایاں خصوصی اثر کے ذریعے سے عمومی آہنگ کو صدمہ نہ پہنچائیں۔ برعکس اس کے

شاعری میں تال، وزن یعنی انتر ہے کہ ہر ایک انفرادی رکن کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ یہاں ایک متعین اور مسلسل لحن کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اور ہر ایک آواز سے پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے چاہے وہ دبی ہوئی ہو یا ابھری ہوئی۔ چاہے وہ سمٹی ہوئی ہو یا پھیلی ہوئی تاکہ ایک ایسا امتزاجی اثر (Combined effect) پیدا ہو سکے جس سے معمولی شاعرانہ کلام بے بہرہ رہتا ہے۔

مگر یہ تو شاعری کے محض صناعانہ پہلو یعنی اس کی اثر انگیزی کے صیغے کا بیان ہوا۔ اب میں یہ واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ شاعری کی شدید روحانی لذتوں اور فسوں طرازیوں کی تہ میں نہ تو صناعانہ اور اک ہی غالب طور سے کارفرما رہتا ہے، اور نہ ظاہری قوت سامعہ کی نغمہ سنجیاں ہی اس کے صحیح اظہار کی ضامن ہوتی ہیں۔

شاعری کی قوتِ فاعلہ تو ایک ایسے داخلی وجود سے وابستہ ہوتی ہے جو ہماری فطرت کی پنہاں نغمہ سرائیوں کو ابھارنے میں مصروف رہا کرتا ہے، اور ہمارے دل کے پوشیدہ ولولوں کی بیکرانیوں کو منظر عام پر لانے میں ساعی رہتا ہے۔

شاعری کی شدید کیفیتیں نہ تو صاحبِ تدبیر دماغ کی پیداوار اور نہ ذوقِ جمالیات ہی کی تخلیق ہوتی ہیں، بلکہ وہ تو روح کے اس حیرتناک سلسلۂ عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں جو ناقابلِ تصور گہرائیوں میں مچلتی ہوئی شعری لہروں کو لفظ و معنی کے دام میں گرفتار کر لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہر چند شعر کی کارگاہ میں مختلف مادے اور مختلف قوتیں اپنی اپنی جگہ عمل کیا کرتی ہیں، مگر ان کے مجموعی آرکیسٹرا (Orchestra) کی مہتمم روح، اور صرف روح ہی ہوتی ہے، وہ روح جو اپنے مخصوص، ناقابل تخیل اور اعلیٰ سلیقوں کے ذریعے سے ذوقِ شعری کی نوک پلک درست کرتی رہتی ہے۔

یہ روحانی عمل، دل میں ایک ایسی فضا، اور ایک ایسی جنبش پیدا کر دیتا ہے جسے رنگ اور لحن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جس کی لطافتیں زمان و مکان کی گرفت میں نہیں آسکتیں۔

یہ ایک ایسی موسیقی ہوتی ہے کہ بحور و اوزان اس کی تاب نہیں لا سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت دور سے ایک غیبی موج لہراتی چلی آ رہی ہے، اور بحر و وزن سے ٹکرا کر دونوں کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔

انھیں روحانی لہروں سے شاعرانہ جذبوں میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ اور زمزمہ پرواز روح، اپنے طبعی آلات کی تمام دشواریوں اور مشکلوں پر ظفریاب ہو کر اپنے اصلی راگ سے ہماری انسانیت کے سر پر تاجِ مسرت رکھ دیتی ہے۔

(بی پی ورما)

(باقی)

آجا

اگر گیسو بدوش آتا نہیں، اچھا یونہیں آجا
کسی دن تیغ بر دست و کفن در آستیں آجا

حرم ہو، مدرسہ ہو، دیر ہو، مسجد، کہ میخانہ
یہاں تو صرف جلوے کی تمنا ہے، کہیں آجا

سرِ راہِ طلب ہر گام ہے اک منزلِ تلخی
کبھی اِن تلخیوں میں مثلِ موجِ انگبیں آجا

بڑے دعوے ہیں اہلِ انجمن کو صبر و تمکیں کے
کبھی جلوت میں بھی اے فتنۂ خلوت نشیں آجا

افزائیں ابر پیما ہیں، تو سجدے آسماں فرسا
ذرا مسجد میں بھی اے دشمنِ ایمان و دیں آجا

جوش

مسائلِ حیات

(مسلسل)

جوشؔ ملیح آبادی

سوسائٹی (سماج)

(۱) سوسائٹی کہیں نہیں ہے مگر ناکارہ بدگفتاروں کی نوکِ زبان پر۔

(۲) تم تو پُرامن طور سے زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہو۔ لیکن کیا تمہارے پڑوسی اِس کی اجازت دے سکتے ہیں؟ یہ بات دریافت طلب نہیں ہے کہ تم امن کے خواہشمند ہو کہ نہیں، سوال تو یہ ہے کہ کیا تمہاری سوسائٹی امن کو برداشت کر بھی سکتی ہے؟

(۳) سوسائٹی ہمیشہ نامطبوع افراد کی قدر و حفاظت کرتی ہے، کیونکہ یہی تو وہ افراد ہیں، جن سے سوسائٹی متشکل ہوتی ہے۔

(۴) کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی شیر سوسائٹی میں رہا ہو؟ یہ تو صرف بھیڑیں ہیں جو باہمی تحفظ کی خاطر گلّوں میں رہا کرتی ہیں۔ تم سوسائٹی کے بغیر نہیں رہ سکتے؟ تم بھیڑ ہو کہ شیر؟

(۵) انسان سوسائٹی کے بغیر آرام نہیں پا سکتا، لیکن صحیح سوسائٹی وہ ہے جو انسان کے طبعی میلانات پر ہمدردانہ نگاہ رکھتی ہو، اور جو انسان کو فطرت سے قریب تر رکھنے کے اسباب و ذرائع مہیا کرتی ہو——— کیا روئے زمین پر کہیں ایسی سوسائٹی کا وجود پایا جاتا ہے؟

(۶) یہ موجودہ سوسائٹی تو اُس پارینہ و قدیم دورِ بربریّت کا بھوت ہے، جو صرف اُنھیں کو ڈراتا ہے۔ جو ڈرانے پر رضامند ہیں۔

(۷) قانون نے سوسائٹی کے واسطے کوئی عملی پہلو باقی نہیں رکھا ہے۔ مجلسی و اخلاقی طور سے جو چیزیں ناروا ہیں، اُن میں سے اکثر و بیشتر آج قانونی حیثیت سے روا سمجھی جاتی ہیں۔ بتاؤ ہم قانون کا اتباع کریں کہ سوسائٹی کا۔

(۸) عصرِ حاضر میں مجلسی ارتباط، اور باہمی تعاون، نسلی رشتے کے بغیر بھی ممکن ہو چکا ہے، اور اب جبکہ عنقریب دماغی رشتوں، اور فکری قرابتوں کی بنا پڑنے والی ہے تو پھر عملاً ہر شے برداشت کر لی جائے گی۔

(۹) کسی سوسائٹی کو اپنی نج کی زندگی پر حکمرانی کا موقع نہ دو۔ اُس سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے واسطے آسانی اور گنجائش مہیا کرے۔

(۱۰) تمہارے معاملات صرف تمہارے معاملات ہیں، دوسروں کو اُس وقت تک تمہارے معاملات میں دخل دینے کی جسارت نہ کرنا چاہیئے۔ جب تک تم دوسروں کے معاملوں میں دخل دینے کی بدعت نہ شروع کر دو۔

(۱۱) قومی افراد، سوسائٹی کے ہر بند سے آزاد ہوتے ہیں۔ سوسائٹی تو صرف دُور سے اُن کا تماشہ دیکھا کرتی ہے——— یہ تو صرف کمزور افراد ہیں۔ جن بیچاروں کو سزا دے کر سوسائٹی یہ نمائش کیا کرتی ہے کہ وہ ابھی تک سانس لے رہی ہے۔ زندہ ہے۔

(۱۲) سوسائٹی کے پھندے صرف خیالی ہوا کرتے ہیں۔ کیا کسی حقیقی اور عمومی سوسائٹی کا وجود زمین کے کسی حصّے میں پایا جاتا ہے؟

(۱۳) مفید سوسائٹی تو صرف وہی ہو سکتی ہے جس میں انسانوں کے واسطے

ٹھیک بھی ہو، اور وسعت بھی۔

(۱۴) ہم اپنی آبادی میں کروڑوں کا اضافہ کرسکتے ہیں، لیکن زمین کی پہنائی میں ہم ایک انچ کا بھی اضافہ نہیں کرسکتے، اور ایک زمانہ آنے والا ہے کہ یا تو ہمیں زمین کے چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائیں گے یا خود زمین ہی ہمیں چھوڑ دے گی۔ تو پھر کیا کرنا چاہیئے؟

(۱۵) ہم آخر معصوم بچھڑے کا تعاقب کیوں کریں؟ کیا صرف اس واحد مقصد کے لئے کہ ہم اُسے ذبح کرکے کھا جائیں؟

خدارا بتاؤ غریب بچھڑے نے ہمارا کیا بگاڑا ہے؟ کیا اس کا قصور محض اتنا ہے کہ وہ شیر کی طرح اتنا قوی واقع نہیں ہوا ہے کہ خود ہمیں پھاڑ کھائے؟ اور کیا اُس کی خطا صرف اس قدر ہے کہ بچھڑا وہ شے ہے جسے سوسائٹی کھا جانا چاہتی ہے؟

(۱۶) کیا ہماری سوسائٹی اُس وقت دیوالیہ نظر نہیں آتی، جب وہ انفرادی سیرتوں کا جائزہ لینا شروع کردیتی ہے؟

(۱۷) میں عصری (MODERN) سوسائٹی کا اس کے علاوہ اور کوئی تصور مشکل ہی سے قایم کرسکتا ہوں کہ یہ صرف لامحدود پابندیوں کی اصطلاحات کا ایک ایسا جال ہے جو نہایت بے رحمی کے ساتھ کمزوروں کو جکڑا کرتی ہے۔

(۱۸) کیا تمدن گزیدہ سوسائٹی، انسانی فطرت کا الٹا رُخ پیش نہیں کرتی؟

(۱۹) جوتے اکثر کاٹنے لگتے ہیں۔ لیکن کیا کیجئے کاٹنے والا جوتا ہی وہ شے ہے جو تمہارے حصے میں آیا ہے۔ تم یہ چاہ ضرور سکتے ہو کہ اس خراب جوتے کو بہتر جوتے سے بدل لو۔ لیکن کیا عزت آنے والی سوسائٹی تمہیں اس کی اجازت دے سکے گی؟

(۲۰) جس شے کو ہم عصری سوسائٹی (MODERN ZOCITEY) کہتے ہیں، وہ تو خود کامیوں اور ناانصافیوں کا ایک باریک مگر مضبوط جال ہے۔ اگر تمہاری کوئی ذاتی غرض اٹکی ہوئی نہیں ہے۔ اور تم دوسروں کو بیوقوف بناکر اپنا کام نکالنا نہیں چاہتے ہو تو پھر اس افراتفری میں پڑ کر اپنے کو بیٹھے بٹھائے ہلکان کیوں کرو؟ کیا تمہیں کتے نے کاٹا ہے؟

(۲۱) کیا سوسائٹی، راستی کو، اور راستی، سوسائٹی کو برداشت کرسکتی ہے؟

(۲۲) سوسائٹی صرف زبان ہی سے جھوٹ نہیں بولتی۔ اُس کے جھوٹ تو لبالبوں کی جگمگاہٹوں، مسکراہٹوں کی دلآویزیوں، فیشنوں کی جھلکیوں، مصافحوں اور معانقوں کی گرمجوشیوں کے ذریعہ سے بولے جاتے ہیں، اور اس لئے یہ لفظ جھوٹ کو بھی آسمانی الفاظ سے زیادہ محترم سمجھا جاتا ہے۔

اخلاقیات

(۱) کیا "زشت وخوب" اور "خیروشر" کا وجود درحقیقت "اعمال وافعال" میں پایا جاتا ہے، یا ان کا تصور اُس وقت وجود میں آتا ہے جب ہم انسانی "اعمال وافعال" کی اپنے اعتبارات کی رُو سے ترجمانی شروع کردیتے ہیں؟

(۲) ہمارے اعمال وافعال قدرتی وفطری ہوجاتے ہیں۔ صرف اس بناپر کہ وہ دراصل قدرتی وفطری ہی ہوتے ہیں، لیکن جب ہم اُن پر "زشت وخوب" اور "خیروشر" کے لیبل چسپاں کرتے ہیں، تو کیا دراصل اس کا مطلب نہیں ہے کہ ہم اپنے اوہام وتعصبات کا مظاہرہ کررہے ہیں، اور اپنے کو ایک ایسی ترازو میں تول رہے ہیں جس کا وجود قطعی طور پر فرضی ہے؟

(۳) کیا حقیقت میں انسان کے اندر "اخلاقی ضمیر" کی نوعیت کی کوئی شے موجود ہے؟

(۴) کیا قصاب کو جانور کے ذبح کرتے وقت بالکل اُسی طرح کا لطف نہیں آتا، جیساکہ مکڑی کو مکھی کے نگل جانے میں آتا ہے؟ ——— اور کیا ہمارے نام نہاد مدبرین سیاست کا "اخلاقی ضمیر" "حب وطن" کے ملعون حیلے سے دوسروں کو ذبح کرکے نہیں دکھ دیتا؟

خود اپنی روزمرہ کی زندگی کا جائزہ لو۔ ہم "خیر" کا احترام کرتے ہیں، کہ "قانون" کا؟

(۵) کیا ہم میں اکثر وبیشتر افراد کی یہ ایک عادت جاریہ نہیں ہے کہ خوف اسیری کی قربان گاہ پر "اخلاقی خیر" کو بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے؟

(۶) اگر قانون کا طنطنہ آج آنکھیں بند کرلے تو انصاف سے بتاؤ کہ ہم میں سے کتنے اُس شرافت پر قایم رہ سکیں گے جو اُن کے بقول انسانیت کے شعور، اور اخلاقی ضمیر سے پیدا ہوتی ہے۔

(۷) کیا تم اس کا اظہار کررہے ہو کہ تمہارا دامنِ حیات بے داغ ہے؟ کتنے مواقع آئے ہوں گے جب تم نے خود اپنے سے سوال کیا ہوگا کہ آخر ایماندار رہنے سے کیا فائدہ۔ کتنے بار تم نے تمنا کی ہوگی کہ کاش تم ذرا کم ایماندار، اور زیادہ چالاک قسم کے آدمی ہوتے، اور اس طرح اپنی اُن تمام حسرتوں کو نکال لیتے جن کے

واسطے آج تم اپنی بسر رہے ہو، رو رہے ہو؟

اور کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم فضول مقاصد میں اکثر محض اس بنا پر ناکام رہے کہ تم اتفاق سے کسی قدر زیادہ ایماندار آدمی واقع ہوئے ہو؟

اور کیا اکثر ایسے مواقع پر جب پورے طور پر تم کو یہ یقین پختہ ہو گیا ہے کہ اب ایک ایسی اسکیم کا بنانا جو ایک حد تک دیانت کے خلاف ہو، بحکم ضرورت ناگزیر ہو چکا ہے، تو تم نے اُس اسکیم کے بنانے میں ذرہ بھر بھی پس و پیش کیا ہے؟ اور اگر تم ایسی اسکیم نہیں بنا سکے ہو تو کیا بوجوہ اُسی سے بال بال نہیں بچ نکلے ہو؟

(۸) کون بے ایمان و بد اخلاق بننا پسند کرے گا، اِلّا اس کے کہ وہ مجبور ہو جائے؟ کیا یہ سوسائٹی کی جماعتی، اور اقتصادی عدم مساوات ہی نہیں ہے جو معصوم انسان کو بداخلاقیوں اور بے ایمانیوں کی آگ میں کود پڑنے پر مجبور کر دیتی ہے؟

(۹) کیا اس عالم کون و فساد، اور اس دنیائے پست و بلند میں دو قسم کے اخلاق نہیں پائے جاتے، ایک آقا قسم کا، دوسرا غلام قسم کا اخلاق؟

اور اگر غلاموں کو یہ علم ہو جائے کہ وہ آقائی اخلاق حاصل کر کے غلامی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں، اور اس علم سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ آزادی کی خاطر آقاؤں کا اخلاق حاصل کرنے کی سعی میں مصروف ہو جائیں تو راستی و انصاف کے نام پر بتاؤ کہ غلاموں کی اس جہدِ آزادی میں وہ کونسا غیر فطری، یا مجرمانہ عنصر شامل ہے جس کی بنیاد پر آقا کی پیشانی پر بل پڑنے لگتے ہیں، اور شمشیر باری کف در دہاں ہو جاتی؟

(۱۰) کیا امراء غربا کو چوری کرنے کی ترغیب نہیں دیتے جیسی کہ تم نہیں سکھاتے؟

کیا امراء کے سربفلک محل، اُن کی شاندار سواریاں، اُن کی سونے کی کلائی گھڑیاں، اُن کے قیمتی لباس، اُن کی گراں قیمت چھڑیاں، اور اُن کے کھنکتے ہوئے کیسہ ہائے زر مفلس نظارگیوں سے پکار پکار کر نہیں کہتے کہ آؤ ہمیں چھین کر لے جاؤ؟

کیا امراء کے مطبخوں کی خوشبو سے بھوکوں کے منہ میں پانی نہیں بھر آتا؟

اور کیا یہ تمام چیزیں چوری کی قابلِ مقابلہ شدید ترین ترغیبیں نہیں ہیں؟ انصاف سے کہو سزا کسے ملنا چاہیئے۔ غریب کو، یا امیر کو؟

آہ انسان! محتاج و دردمند انسان!

(۱۱) صرف وہ افراد جو قدامت کے دانتوں سے زخمی نہیں ہوئے ہیں، پارینہ روایات کو زندہ رکھتے ہیں، لیکن جو مجروح ہو چکے ہیں، کیا وہ دوسرا راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں ہو جاتے؟

مرد صالح سے ہماری مراد ایک ایسے شخص سے ہے جو بھیڑیوں کی طرح گلّے کے اندر رہتا ہے اور جو قدیم اداروں کا جاروب کش اور دفترِ رسوم پارینہ کا چپراسی ہے۔

اگر تم سوسائٹی کے فرزندِ صالح بننا پسند کرتے ہو تو تمہیں یہ فائدہ ضرور حاصل ہو گا کہ تم بد اخلاقیاں تو کر سکتے ہو لیکن اس طرح کہ تم بد اخلاق نہ کہے جاؤ۔ اور کیا بے شمار بزدل مسکلے میں محض اس لئے نہیں بنے ہوئے ہیں کہ وہ محفوظ طور سے بد اخلاقیاں کر سکیں؟

کتنے اخلاقیات کے لکچر محض اس لئے دئے جاتے ہیں کہ دُنیا ہمیں معلّمِ اخلاقیات کا خطاب دے۔ اور ہماری بد اخلاقیوں کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکے۔

(۱۲) کتنے لوگ ہیں جو دوسروں کے عیوب کی تشہیر اور اُن کی بد اخلاقیوں کا چرچا کرتے ہیں، حالانکہ وہ خود بڑے درجے کے بد اخلاق ہوتے ہیں، اور کتنے لوگ ہیں کہ دوسروں کو درسِ اخلاق دیتے ہیں محض اس سبب سے کہ اُن کی بد اخلاقیوں پر پردے پڑے رہیں۔

(۱۳) کیا باستثنائے معدودے چند، تمام شدّت کے ساتھ صالح صورت، اور مقدس آداب افراد، انتہا درجے کے غیر صالح، اور نامقدّس نہیں ہوتے؟

(۱۴) ہر شخص، اگر افشا اور رسوائی کا خوف باقی نہ رہے، کیا جھوٹ بولنے پر آمادہ نہیں رہتا ہے؟

(۱۵) کیا "اچھا" آدمی، "بُرے آدمی" سے کسی صورت میں بھی مختلف ہوتا ہے، اِلّا یہ کہ وہ "بُرا آدمی" کہے جانے سے خوف زدہ رہتا ہے؟ کیا ہم "اچھے" ہیں، محض بزدلی کی بنا پر؟

(۱۶) اگر ایمانداری، بہترین پالیسی بننے والی ہے (HONESTY IN THE BEST POLICY) تو صرف ایمانداروں کے مقابلے میں ایماندار بنو۔ ورنہ تم اپنے گوشت تک کو دوسروں کے جذبۂ حبِ منفعت کے سامنے پیش کر دوگے۔ "زشت و خوب" کے معاملے میں کیا چالاک "زشت"، ہی سادہ لوح "خوب" کی معیّت سے ہمیشہ فائدہ نہیں اُٹھاتا؟

(۱۷) اخلاق، اگر مذہب اور اُس کے تمام تصوراتِ سزا و جزا کی خاطر نہیں بلکہ صرف اخلاق ہی کی خاطر اختیار کیا جائے تو بیشک ایک بے خطر راستہ ہے، کیونکہ اگر نصیب اعدا مذہب ناکام ہو گیا تو پھر اخلاق کا کیا حشر ہو گا؟

(۱۸) روائتی اخلاق کو اپنی راہبری کا موقع دینا، گویا اپنے کو اندھے پن

میں مبتلا کرتا ہے، اور روایتی اخلاق کے سامنے سر جھکانا، اپنے سر کو اپنے ہاتھ سے قلم کرتا ہے۔

(۱۹) ایک کٹر مذہبی انسان، اور مُصلحِ معاشرت میں یہ فرق ہے کہ وہ الفاظ ورسُوم کی پیروی کرتا ہے، اور یہ اپنی آسائشوں کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔

(۲۰) اخلاقی ضابطہ، ہر گروہ اور ہر مُلک کے لئے گویا ایک ضابطۂ آسائش وراحت ہے، لیکن اس کا معیار کیا ہے؟

(۲۱) انفرادی، اور اجتماعی اخلاقوں میں کتنا زبردست فرق ہے ——
جب کوئی فرد، کسی دوسرے کی کوئی چیز چُرا لیتا ہے تو اُسے "سرقہ" کہتے ہیں، اور جب کوئی فرد، کسی شخص کو ہلاک کر دیتا ہے تو اُسے "قتل" کہا جاتا ہے، لیکن جب جماعتیں دِن دہاڑے لوگوں کو لُوٹتی، اور اُن کی جیبیں خالی کرتی ہیں تو اُسے "تجارت" کا لقب دیا جاتا ہے، اور جب کوئی قوم، کسی دوسری قوم کو ہلاک کر دیتی ہے تو اُسے "جنگ" کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

آہ! انفرادی سارق "چور" اور "ڈاکو" ہے، اور اجتماعی سارق، "ملک التجار" اور "خسرو بانارہ" ہے۔

انفرادی شمشیر زن "خونی" اور "قاتل" ہے، اور اجتماعی خون آشام "ہیرو" اور "غازی" ہے —— خُدا را جواب دو کیا "اخلاق" اکثریت کا خانہ زاد ہے؟

(۲۲) آؤ عصرِ حاضر کے قانون و اخلاق پر گفتگو کریں۔ کیا بہت سی مائیں، اپنی خوبصورت لڑکیوں کو کرائے کے فرنیچر یا نوٹوں کی طرح استعمال نہیں کرتیں —— اور کیا بہت سے باپ، اپنے لڑکوں کو خچروں کی طرح نہیں برتتے؟ اور کیا سوسائٹی اِس پر کوئی اعتراض کرتی ہے؟

آخر ایسا کیوں ہے؟ محض اِس بنا پر کہ قانون اور اخلاق، والدین کی پشت پر ہوتا ہے۔

لُطف تو یہ ہے کہ ہم رسمِ غُلامی کے مٹا دینے پر فخر کیا کرتے ہیں، حالانکہ ہم نے تو محض اُس کی شکل میں تبدیلی کر دی ہے، اور بس۔

(۲۳) "اخلاق" انسانی اعمال کی واہمہ انگیز ناپ تول کے معیار کے علاوہ اور ہے ہی کیا؟ کیا اِس کے ضوابط ضروریاتِ وقت کے لحاظ سے بدلتے نہیں رہتے ہیں؟ تو پھر ہمارے "اخلاقیات" غیر مستقل اور وقتی تخیلات کے مجموعے کے سوا اور ہیں کیا؟ اور پھر حقیقی اخلاق کے معنی کیا ہو سکتے ہیں؟

(۲۴) علمائے اخلاقیات کو اعمالِ انسانی کا محاکمہ اِس نقطۂ نظر سے نہ کرنا چاہیے کہ حسبِ اصطلاحاتِ سُود وزیاں اُس کی کیا قدر و قیمت ہوگی۔ یا اُس کے نتائج کس قبیل کے ہوں گے۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ کون ایسی فوری اور شدید ضرورت یا احتیاج تھی جس کے حکم سے وہ فعل سرزد ہوا ہے۔

ایک فاقہ کش انسان، جس کے اختیار میں کوئی دوسرا امکانی ذریعہ نہیں ہے، اُس پر، اپنا وجُود قایم رکھنے کی خاطر، یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ چوری کرے۔ اور اُس کی یہ چوری قطعی کوئی جُرم نہیں کہی جا سکتی۔

کیا اُس کی یہ ناگزیر چوری، جو بحکمِ حیات، اُس کے فرائض میں داخل ہو چکی تھی، اپنے اندر بد اخلاقی کا ادنیٰ سا شائبہ بھی رکھتی ہے؟

اُس نے تو، اصل وہی کیا، جس کا درحقیقت زندگی نے اُس سے مطالبہ کیا تھا۔

فاعل کے مرکزی تخیّل کی روشنی میں اُس کے تمام افعال پر نگاہ کرنا چاہیئے اور یہ درست طریقہ اختیار کیا گیا تو ہر شخص حق بجانب ثابت ہو کر رہے گا۔

کیا افعالِ انسانی پر رائے زنی کی جائے، اُن کے نتائج کے اعتبار سے، یا محض نفسِ فعل کی حیثیت سے؟

اگر نفسِ فعل کے لحاظ سے رائے زنی کی جائے گی تو معلوم اور ثابت ہو جائے گا، کہ اُس فعل میں بد اخلاقی کی سی کوئی شئے درحقیقت واقع ہی نہیں ہوئی ہے۔

(۲۵) اگر ہم اپنے قدیم سلبی تعصبات کے مقرر رکھے ہوئے اخلاقی معیار کی رُو سے نظر ڈالیں گے تو اِس دنیا میں "بد اخلاقی" کو ہر جگہ حاضر و ناظر دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔ اور ہماری تسکینِ خاطر اِسی میں ہے کہ ہم اُس کی طرف دیکھنے سے انکار کر دیں۔

کیا یہ خوش آیند مشورہ نہیں ہے؟

(۲۶) ہمارا مجلسی قانونِ اخلاق، ایسی فطری حماقتوں کا مجموعہ ہے جو ایماندار لوگوں کو ریاکار بننے میں انتہائی مدد دیتا ہے۔

میں قطعی حیران نہ ہوں گا اگر ہماری عصرِ حاضر کی بد اخلاقیاں، مستقبل میں نہ صرف اخلاق ہی سمجھی جائیں گی بلکہ اُنھیں قابلِ تحسین نادر محاسن میں شمار کیا جائے گا۔

(۲۷) کیا فطرت کے بُنیادی وعمُومی مطالبات سے بے قید و بند وابستگی ہی صحیح اخلاق نہیں ہے؟

کیا اس وابستگی میں ناکامی کا کوئی امکان پایا جا سکتا ہے؟

جس لمحے میں ہم اس چیز کو ایک غیر متزلزل اصول کی حیثیت سے قبول کر لیتے ہیں، تو کیا اُسی لمحے میں ہم تمام بد اخلاقیوں سے نجات نہیں پا لیتے، اور کیا یہی وہ



"ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم"
(سر سید مرحوم)

بین الاقوامی شہرت کے مالک مسٹر اوندل کا شاہکار

کلام دہلی



نہ وہ حقیقی عمل نہیں ہے جو اجتماعی اور انفرادی دونوں حیثیتوں سے ہماری ابھری ہو سکتا ہے؟

ذرا میرے سامنے اس شخص کو لاؤ جس نے پہلے پہل یہ کہا تھا کہ نیک آدمی بننے کی خاطر انسان کو غیر فطری زندگی بسر کرنا چاہیے۔ میں اس خدا کے نیک بندے سے دریافت کروں گا کہ با تہذیب و تمدن کے تمام مساعی کے باوصف ہم نے آج تک کتنی ترقی کی ہے۔ اور کیا ہم نے دونوں چیزیں تلف نہیں کر دی ہیں۔ یعنی نہ تو ہم نیک آدمی ہی بن سکے ہیں، اور نہ فطری انسان۔

پُرمغز ظرافت

بندہ رہا ہے ہر ایک چیز پہ ٹیکس　　خیر ہو یا خدا محبت کی
ناخنِ تیغ سے سلجھتی ہے　　گتھی اُلجھی ہوئی سیاست کی

گلچیں کی حکومت ہے جبھی مستحقِ داد　　جب باغ میں کوئی نہ گلِ تر نظر آئے
ایک اُن میں زمیندار ہے اور ایک مہاجن　　کل شہر میں خوش حال یہ دو گھر نظر آئے

رُکے نہ دورِ مئے پالیسی کا اے ساقی　　کچھ اور بزمِ خرد میں ہیں ہوشیار ابھی
خیالِ ممبری و ووٹ میں ہوں بیخود و مست　　خدا کرے نہ اِس نشہ کا اُتار ابھی

سخت ہوتے جائیں گے یونہی قوانینِ قفس　　تا بہ حدے تجھ میں بلبل طاقتِ پرواز ہے
باوفا رہ کر ہے آزادی کا خواہاں ماڈریٹ　　مرغِ ناداں کو قفس میں خواہشِ پرواز ہے

مداح (احمق) پھپھوندوی

نوحہ

بر وفات منشی مہاراج بہادر صاحب برقؔ دہلوی

حشر کے ساماں زمین و آسماں پیدا کریں — اور دل تھامے ہوئے ہم ناتواں دیکھا کریں
مائلِ فریاد ہے دل اپنا لیکن کیا کریں — اذنِ تسلیم و رضا ہے لب نہ ہرگز وا کریں
یہ دلِ رنجور کی مجبوریاں ناچاریاں
اور یہ امواجِ طوفانِ حوادث الاماں

ہمصفیرانِ چمن یوں مائلِ پرواز ہوں — بے نوا اک ایک کر کے پردہ ہائے ساز ہوں
نالہ و شیون کے پیدا ہر طرف انداز ہوں — ہم اسیرانِ قفس یوں گوش بر آواز ہوں
سخت جاں ہیں مرگِ بے ہنگام سے معذور ہیں
ہم یونہیں گھٹ گھٹ کے مرنے کے لئے مجبور ہیں

تھا دلِ خوں گشتہ میں تازہ رواں کا غم ابھی — تھا عزیزِ خوش بیاں کا گو بکو ماتم ابھی
حشر کی فرقت میں مصروفِ بکا تھے ہم ابھی — ہونے پائے تھے نہ یہ صدمات ہرگز کم ابھی

برق بھی ہم سب کو آخر داغِ فرقت دے گئے
ساغر و مینا و محفل ساتھ اپنے لے گئے

وہ کہ جس کے شعر سے بزمِ ادب گلزار تھی
وہ کہ جس سے بزمِ ہستی مطلعِ انوار تھی
وہ کہ ہر اک نظم جس کی ایک موسیقار تھی
رُوح جس کے نغمہ ہائے مست سے بیدار تھی

باغ سے وہ بلبلِ رنگیں نوا رخصت ہوا
توڑ کر ہم سب سے پیمانِ وفا رخصت ہوا

آہ اب کیا کہہ کے بہلائیں دلِ مغموم کو
کیا فریبِ آرزو دیں دیدۂ محروم کو
ڈھونڈھنے جائیں کدھر اب ہستیٔ معدوم کو
لائیں پھر دُنیا میں یارب کس طرح مرحوم کو

مرنے والے، کچھ تو اہلِ غم کو برگ و ساز دے
جنت الماویٰ کے کس گوشے میں ہے آواز دے

تُو تو قید و بندِ ہستی کے اب آزاد ہے
ہم اسیرانِ بلا کا ہر نفس ناشاد ہے
بے پر و بالی پہ بھی یہ اک عجب اُفتاد ہے
دَرِ قفس کا بند ہے اور سامنے صیاد ہے

جانے کتنی اس اسیری کی ابھی میعاد ہے
اے ستمگر زندگی فریاد ہے فریاد ہے

کشن سہائے جوشی
(کانپور)

مشرقی موسیقی کا پیام

اسرائیل احمد خاں

آج جبکہ دنیائے موسیقی تصادم احزاب سے پارہ پارہ ہو رہی ہے، اور اور نوخیز نسل کے ترقی پسند ارباب انشا، و ادب اور عام پبلک کے درمیان فقدانِ ربط و ضبط کی ایسی وسیع خلیج حائل ہے کہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی، ایسے نازک وقت میں تمام مخلص اور بیدار رُوح اہلِ موسیقی کا یہ فرضِ عین معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے حالات گرد و پیش پر ایک نگاہ غلط انداز ہی ڈالیں، اور اس وسیع دنیا کا ایک جائزہ لیں، جو ہر روز تنگ سے تنگ تر ہوتی چلی جا رہی ہے، اور پھر اسی ظلماتِ زوال و ضلالت میں ایک ایسے چراغِ ہدایت کی جستجو کریں، جو نئی نئی حقیقتوں کو ——— اور اُن پُرانی حقیقتوں کو بھی جو بقدرِ نصف کے فراموش ہو چکی ہیں ——— بارِ دیگر روشنی میں لائے!

ایک مغربی ماہرِ موسیقی جو ایک شایانِ شان شوق و اشتیاق کے ساتھ اپنی رُوح پرور فن پر غور کرنا چاہتا ہے ——— بشرطیکہ اِس قسم کا کوئی خادمِ موسیقی سر زمینِ مغرب میں موجود ہو! ——— اُس کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے ایشیا کی طرف رُخ کرنے کے سوا چارہ نہ ہوگا؛ وہ لامحالہ اپنا استفسار و استفتا مشرق ہی کی اُن قدیم قوموں کے سامنے پیش کرے گا جن کے قدیم صناعانہ مطامحِ نظر آج ایک نشاۃ ثانیہ کے دَور سے گذر رہے ہیں۔ ممالکِ مشرق میں اِس تمدنی موسم بہار کی گردش میں اُس وقت آئی جب کہ اِس سرزمین کے وطنی باشندے اپنے گذشتہ "عہدِ گل" کو تقریباً فراموش کر چکے تھے۔

مشرقی موسیقی ممالکِ مغرب میں عملاً ایک عنقا صفت چیز ہے؛ مغربی لوگ اگر کہیں کہیں اُس سے آشنا بھی ہیں تو محض اُس کے اُس مسخ شدہ سایہ کی معرفت جو فرنگستانی پیانو کے پردوں کی بھدی اور بھونڈی دیوار پر نظر آتا ہے؛ لطف یہ ہے کہ مشرق کے نامور خطوں، چین و ہندوستان کا ادب، فلسفہ، فنِ تعمیر، اور مُصوری یہ سب تو یورپین صناعوں اور اُستادانِ فن کے قلوب میں روز افزوں جگہ پا رہے ہیں، لیکن اِنہی ممالک کی موسیقی، بالخصوص امریکہ میں، کسی قدر غریب و نامانوس سی چیز خیال کی جاتی ہے! ——— چنانچہ موسیقی کی مغربی تاریخیں اُس کا ذکر یا تو سرسری طور پر کر دیتی ہیں، یا اُسے ایک مبہم سے عنوان ——— "بدوی موسیقی" ——— کے ذیل میں ڈال دیتے ہیں!

اِس صورتِ حالات کی وجوہ بکثرت ہیں، اور ہم ایک محدود گنجائش کے مضمون میں اُن سب کا استقصا نہیں کر سکتے ہیں، پس ہم اس فہرستِ اسباب کے سب سے نمایاں سبب کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس جزوی تبصرہ ہی سے اُن لوگوں کی فکر و نظر کے لئے نئے نئے میدان کھل جائیں گے جو اس موضوع پر بعض اُن سطحی کتابوں سے گمراہ ہو گئے ہیں جو اُس وقت بھی مشکل قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے کہ خود اہلِ مشرق کے قلم سے وہ تراوش کریں؛ ایسے تنگ مشرق مشرقیوں کی مثالیں کچھ شاذ نہیں جو اپنی نسلی روایات کو عاق کر چکے ہیں، اور اکثر اوقات اپنی تہذیب کی عین رُوح الرّوح سے نا آشنائے محض پائے جاتے ہیں۔

مشرقی اور مغربی موسیقی کے درمیان اصولی اور عمومی فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر قوانینِ فطرت پر مبنی ہے اور بجائے خود ایک جزوِ لاینفک ہے موسیقی فطرت کی؛

درآنحالیکہ آخرالذکر اپنی بُنیاد و اساس ہی میں انسان کی شخصیت اور ایک غیر معتدل حد پر عقلیت آب تہذیب کی پیداوار ہے!

مشرقی موسیقی کی ماہیت کے اِس اصل الاصول نے جو آداب و قواعد پیدا کئے ہیں اُنہی کا ایک اقتضا یہ ہے کہ، کم ازکم ہندوستان میں، موسیقی کی محفل ایک رسم مذہبی اور ایک نماز با جماعت کی طرح برپا کی جاتی ہے جس کی صفوف "سماع" میں مِل کر انسان عناصرِ فطرت سے ہم رشتہ ہو جاتا ہے، جو ہر فصل و موسم، ہر روز و شب، ہر وقت و ساعت میں اپنے مخصوص مظاہر کی موسیقی سے متابعت و مطابقت کیا کرتے ہیں ——— کائناتِ فطرت کی ہر شے حرکت میں ہے، اور ان تمام قویٰ کی حرکت گویا ایک مرتب و منظم ساز ہے، جس کی کلید گردشِ شمس و قمر کے ہاتھ میں ہے: اِس اصولی التزام کا نتیجہ یہ ہے کہ موسیقی کو کسی مقررہ و معینہ اور ناقابلِ تغیر مادی ضابطہ و جبر اری کے شکنجے کے ساتھ "دست و تہِ سنگ آمدہ" ہونا نہیں پڑتا۔ بلکہ عالمِ فطرت کے اُن احوال و ظروف سے ہم آہنگ ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، جو ماہ بماہ، روز بروز، ساعت بساعت متغیر ہوتے رہتے ہیں! بالفاظِ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ ہندوستانی موسیقی کے مختلف بُنیادی نمونے جو اصطلاحاً "راگ" اور "راگنیاں" کہلاتے ہیں، وہ ایک عجیب مقناطیسی انداز میں گردشِ شمس کے حالات و کیفیات سے وابستہ ہوا کرتے ہیں، اور اِس لئے اُن کو اصولاً عین اُنہی اوقات میں بجایا جاتا ہے، جبکہ صبح و شام، دوپہر و سہ پہر کے متعلقہ منازلِ شمسی اپنے معلومہ مظاہر میں جلوہ گر ہوتے ہیں: اِن اوقات کے علاوہ کسی بھی دوسرے وقت و ساعت میں اُن کا شغل بمنزلۂ ایک جرم و گناہ کے ہے۔ ترنمِ فطرت کی شریعت میں، ٹھیک جس طرح کہ سرقہ ایک برہم زنی ہے مجلسیؔ "امن و قانون" کی ایک ایسی ساکھ میں جس کی بُنیاد شخصی ملکیت کے اصول پر رکھی گئی ہو!

مشرقی موسیقی کے محققین کی طرف سے یہ حقیقت اکثر محسوس کی گئی ہے، تاہم میں حیران ہوں کہ اُن مغربی لوگوں کا شمار گنتی کی کئے انگلیوں پر آئے گا جنھوں نے اُس کے معنی و معنویت کو کبھی نقشِ دل کیا ہے! اکثر تو اُن میں سے موسیقیٔ مشرق کی اِس تشخیص و تعبیر پر ہنسا کرتے ہیں، اور بعض دوسروں کی فہمِ رسا کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے بعض اُلٹے سیدھے تراجم ہی کو مشرقی نظم و ترنم کی کامیاب صورتگری سمجھتے ہیں! آہ، وہ اِس حقیقت کی معرفت حاصل کرنے کی اہمیت کہاں سے لائیں کہ مثلاً ہندوستانی موسیقی کا ایک حقیقی نمونہ نقل و ترجمہ سے بالا تر واقع ہوا ہے!، اور اُس کا پیکرِ جمال و لطافت اِس طرح کبھی فرنگی کوٹ پتلون کا جامہ پہن ہی نہیں سکتا: حتیٰ کہ ہمارے گراموفون بھی اُس کی رونگشی و ہمصفیری کرنے سے قاصر ہیں! ———

جو متعارف گانے والے گراموفون کے لئے گاتے ہیں وہ حقیقی ہندو موسیقی سے ناآشنا ہیں: اور وہ اُستادانِ فن جو اِس متاعِ عزیز کے امانت دار ہیں وہ کبھی اس طرح کوچہ و بازار کی رسوائی کے لئے اپنی موسیقی کو عریاں کرنا پسند نہ کریں گے: اِس لئے کہ جو حقیقی ہندو موسیقی کو عریاں کرنا پسند نہ کریں گے: اِس لئے کہ جو حقیقی ہندو موسیقی ہے وہ اِس ننگ کو کبھی گوارا کر نہیں سکتی کہ جب کبھی ——— وقت بے وقت ——— سُننے والوں کا شوقِ سماع چرائے وہ اپنے کو ضیافتِ طبع کے لئے پیش کر دے! ہندوستانی گانے کے نام سے جو چیز ہمارے ہاں (امریکہ میں) آتی ہے وہ صرف ایک ذلیل و زوال پذیر شکل ہے قدیم ہندو موسیقی کی:

مختصر یہ کہ وہ گانا جو ہر وقت گایا جا سکے ——— بدون لحاظ و رعایت اُس مقناطیسی ماحول و فضا کے جو وقتِ ترنم کا ری ہوتی ہے ——— اُس پر بشکل سے "ہندی موسیقی" کا اطلاق کیا جا سکتا ہے! خود ہندوستان کے ایک سچے اور کامل الفنّ گویّے کے نقطۂ نظر سے تو اس "صدائے بے ہنگام" کی کوئی بھی وقعت نہیں: کم ازکم ایسا گانا "فطرت کی موسیقی" تو ہوگا نہیں! ——— فطرت کی موسیقی کہئے یا "مقناطیسی موسیقی"! پس ایسی سمع نوازی ——— یا سمع خراشی! ——— اُس ضرب المثل طلسمی طاقت و تصرف سے محض عاری ہوتی ہے جو حقیقی موسیقی کی فضائی امواج اہتزاز کے ساتھ ہندوستان میں منسوب کیا جاتا ہے!

ہندوستانی گانے کا یہ وہ اعجاز ہے جس کا مغربی لوگ تو مضحکہ اُڑایا کرتے ہیں، لیکن ہم اُن کی ہنسی پر روتے ہیں کہ اُن کو اپنی نارسائی و ناآشنائی حقیقت پر ہی ہنسنا ہے، اور اُنھوں نے شاید کبھی اس بات کا خواب بھی نہیں دیکھا کہ ہندی موسیقی شے کیا ہے؟ وہ اپنی بے خبریوں اور معذوریوں میں لامحالہ اُس کو اپنے مغربی معیار پر ہی جانچا کرتے ہیں، جس کی رُو سے موسیقی تمام و کمال ایک انسانی عنصر ہے!

تاہم ممالکِ مشرق میں ایک ایسی چیز بھی ہے جو عوام کالانعام کی موسیقی کہی جا سکتی ہے، اِس نوع کی تمدنی پیداواریں تقریباً ہر اُس ملک میں نظر آئیں گی جہاں قومی تہذیب نے ابھی تک دیہات کے انسان کی حسِ جمالیات کے ساز پر مضراب نہیں لگائی ہے: "عوام کالانعام کی موسیقی" سے میری مراد وہ گانا نہیں ہے جو ایک بگڑی ہوئی شکل ہے، اُس مقدس "صوتِ سرمدی" (موسیقی) کی جو تمام ممالک کی روایات کے بموجب بعض فوق العادت ہستیوں کے قلب و رُوح کی وساطت سے ہر قوم پر منکشف ہوئی تھی۔ میرا مفہوم و ذہنی اس اصطلاح سے یہ ہے کہ یہ وہ موسیقی ہے جو عبادت ہے عقائد مشترک کے جذبات کے قدرتی و اضطراری اظہار سے۔ جن کا مخرج بعض مخصوص اور تقریباً

غیرانفرادی نوعیت کے مشترک عام واردات قلب ہوا کرتے ہیں؛ عوام الناس کے یہ گیت جو عموماً بیت ہی سیدھی سادی زبان میں انشا کئے جاتے ہیں، اور اکثر ایک شانِ بے تکلفی و بے ساختگی رکھتے ہیں، اور اپنی عام فہمی و رَوانی کی وجہ سے جلد مقبول عام ہو جایا کرتے ہیں۔ اُن کا مطالعہ ایک نہایت ہی دلچسپ شغل ہے؛ یہی گیت ہیں جو اُس سارے "ہنگامۂ سرود و نوا" کی تعمیر کرتے ہیں جنھیں مشرقی موسیقی کے سامعین شائقین گراموفون کے ریکارڈوں پر سُنا کرتے ہیں؛

اس سارے مجموعۂ منظومات کو بلا شبہ ضرور محفوظ کرنا چاہیئے، اور پوری ہمہ گیری و وسیع دامانی کے ساتھ، اور پھر یہ سارا ذخیرہ تمام متمدن ممالک کی بڑی بڑی پبلک "موسیقی کی لائبریریوں" کی الماریوں میں، آنے والی نسلوں کی یادداشت و استفادہ کے لئے رکھا جانا چاہیئے، اس لئے کہ اب یہ گیت بڑی تیزی کے ساتھ ہماری نام نہاد مغربی تہذیب کے "مقدس سیلاب" کی نذر ہو رہے ہیں۔

یورپی ممالک میں سچ پوچھئے تو اصل دیہاتی و عوامی گیت تقریباً مفقود ہو گئے ہیں، بجز اُن خطّوں کے جہاں کہ سلافی اقوام اب بھی آبادی کا غالب حصہ ہیں، لیکن اِن مخصوص و محدود ماتمُنوں میں بھی مغربی موسیقی کی یہ بارک اکیڈ بڑی سُرعت کے ساتھ اپنی آخری سامعہ نوازی کی خدمت انجام دے کر ایک دم واپسین بھرنا چاہتی ہے! اِس موہنی موسیقی کو اَرضِ فرنگ کے بڑھتے ہوئے رنگِ عقلیت نے ایک خارج از آہنگ صدا بنا دیا ہے؛ دنیائے موسیقی میں خالص و مخلص طور پر غیر شخصی و عمومی قسم کے نسلی جذبات کی نوائے دلکش کا ساز سوت بج چکا ہے، دیہات کے لوگوں میں بھی اب اِتنی ذہانت آ گئی ہے کہ اُنکا اخلاص، اُن کی غرض مندی سے؛ اور اُن کی معصومیت، اُن کی دُنیا داریت کی لوث سے ملوث ہونے لگی ہے؛ عام نسلی حسیات جو عوام الناس کے گیتوں کا سرچشمہ ہوا کرتے ہیں اس درجہ انحطاط میں آ گئے ہیں کہ اُن کو تقریباً کالعدم سمجھنا چاہیئے۔ آج کی دُنیا میں احساسِ ذات بہت شاذ ہے، بجائے اِس کے ہم یورپی تہذیب کے جلوس کی گھُما بگوں کو سُن رہے ہیں، اور اس آخر الذکر چیز کا طغرائے امتیاز ہے، تنقیدی اور جمالیاتی ذہنیت! میں خُود چونکہ ایک یورپین ہوں، اور ایک نجیب الطرفین فرنگی، اس لئے میری طرف معاملۂ زیر بحث میں کسی نسلی عصبیت کے جذبے کو منسوب نہیں کیا جا سکتا، اور بحیثیت ایک پیشہ ور شاغلِ موسیقی کے جو مشقِ سخن بھی کرتا ہو، اور نقاد فن بھی ہو، اور جس کا مولد و منشا پیرس رہا ہو، مجھ پر یہ حرف گیری بمشکل سے ہو سکتی ہے کہ میں مسئلۂ متنازعہ فیہ کے حقائقِ اصلی سے بے خبر ہوں؛

الغرض دہقانی موسیقی بُنیاد و اساس ہے موسیقانہ جذباتیت کی، اور مقناطیسی موسیقی سرچشمہ ہے سائنٹفک موسیقی کا، اِس لئے کہ وہ فطری قوانین پر تعمیر کی گئی ہے، جن کا کامل عقلی طریقوں سے مطالعہ اور جن پر سختی کے ساتھ عملدرآمد کیا گیا ہے۔ ہمارے عہدِ موجودہ کی مروجہ موسیقی اِنہی ہر دو اقسام کا ایک متبدل معجون مرکب ہے؛ یورپ میں یہ اختلاط و فساد نسبتہً بہت زیادہ ہے، جہاں کہ عہدِ یونانی کی مصری و شامی اسرار والی موسیقی یکسر ایک قصہ پارینہ ہو چکی ہے، اِس نقصانِ فن کا پہلا موقع تو وہ تھا جبکہ افلاطونی و فیثاغورثی عیسائیوں کا اخراج حرمِ مسیحیت سے عمل میں آیا، اور دوسرا وقت وہ جبکہ گریگوری کے عہد کے "نغمۂ بسیط" کو امیروزی طرزِ ترنم پر غلبہ حاصل ہوا، تاہم جو نقصان ایک بحث میں پہنچا اُس کی تلافی دوسری بحث کے نفع سے ہو گئی؛ جو ہولناک فقر و افلاس موسیقی کے ساز و برگ کے بُنیادی و نظیری ذخیرے کو پہنچا، اور نیز موسیقی کی رَوانی میں جو ایک خشک تقشّف و تحجّر سا پیدا ہو گیا، اُس نے بالآخر اہلِ موسیقی کو "تعدد اصوات" کے اصُول پر قسمت آزمائی کرنے پر مجبور کر دیا ——— یعنی راگوں اور راگنیوں کو گوناگوں اور بوقلموں طریقوں سے آمیزش و ترکیب دینا:

عہدِ قدیم کے یورپ کی اُستادانہ موسیقی ایک مبہوت کُن قسم کی معمارانہ کاریگری و طلسم بندی تھی، جو اگرچہ ماہیت میں عقلی ہی واقع ہوئی تھی، تاہم اکثر موقعوں پر اُس میں دہقانی و جذباتی عناصرِ اصلی کی کافی باقیات الصّلحٰت موجود تھیں، جو اُس کو زندہ و شگفتہ رکھنے کا کام دیتی تھیں؛ مکتبِ عشق کے "قیس و فرہاد" والے مشرب نے موسیقی کے اندر "جذباتیت" کے "سمندِ ناز" پر ایک اور تازیانہ لگایا؛ چاپن اور لِزٹ کی تصانیف کا یہ عمومی نتیجہ تھا۔ اِنہی اقطابِ فن کی کارروان سالاری میں پہلی دفعہ ——— یا بیتھوون کی سرکردگی میں (جو ایک طریقے سے موسیقی میں رنگِ قیسیت و فرہادیت کا آدمِ اوّل ہے) شاید اِس سے بھی قبل ——— موسیقی کی شاہراہ "نسلیت" کی منزل سے گزر کر اندرونی اِنسانی جذباتیت کے مرحلے میں داخل ہو گئی؛ ایوانِ موسیقی کے اِنہی اربابِ حل و عقد نے اپنے فن کے اندر ایک اندرونی انسانی دہقانیت کے رنگ کی گویا تخلیق کی، جس کی بیخ و اصل خالص طبعی قسم کے نسلی جذبات کی سرزمین میں نہیں رکھی گئی تھی، بلکہ اُس کا سنگِ بُنیاد ایک نفسی، آفاقی زمین پر نصب ہوا تھا؛ یہی چیز جرمانی عقلیت موسیقی سے ممزوج و مخلوط ہو کر واگنر کی تصنیفات کی شکل میں مُنتج ہوئی، جو شاید بلند ترین معراج تھی یورپی موسیقی اور صناعانہ معرفت (اگرچہ عملی حصول نہیں) کی!-

ہندوستان کی سرزمین میں وہاں کے لوگوں کی خلقی روحانیت مذاتی کے طفیل میں قدیم مقناطیسی موسیقی کے جادو نے اپنے اثر کو نسبتہً زیادہ کامیابی کے ساتھ باقی رکھا ہے، اور یہ وہ روح ہے جو آج بھی تمام ایشیائی صنعہ جات کو سیقی میں جاری و ساری ہے! نسلی شعور کو مسخ کرنے کے لئے چونکہ وہاں غیر معتدل قسم کی عقلیت ابھی موجود نہیں ہے، اس لئے دیہاتی موسیقی نے اپنے "تارہ" کو "رباب فطرت" کے ساتھ وابستہ رکھا ہے! مقناطیسی موسیقی بھی روح فطرت کے ساتھ چونکہ ہمساز تھی اس لئے ہندوستانی موسیقی جس کی بنیاد بحیثیت مجموعی نوامیس فطرت پر رکھی گئی ہے نغمہ و ترنم کے فطری اوزان ہی استعمال کرتی ہے جو موسیقی کے بالائی سروں کے ہم آہنگ نشو و تقدم کے قانون سے مستنبط ہوتے ہیں: ایسی موسیقی کا اندرونی اور خفی پہلو مقناطیسی موسیقی کو وجود میں لاتا ہے جس نے سخت گیر آداب و ضوابط اور جس کا قانون معنوی نظم و ترنم مشہور ہے۔ اُس کا بیرونی اور عام پہلو وہ ہے جس کی سماعت کسی آشنائے فن اجنبی کو حاصل ہوسکتی ہے، اس لئے کہ یہ وہی چیز ہے جو عامیانہ گیتوں کا ایک ملغوبہ ہے، اور یہ گویا قدیم مقدس موسیقی اور درباری سماع کی ایک ذلیل و زوال یافتہ شکل ہے!

تاہم یہ موسیقی، اگرچہ وہ اپنی قدیم شان و رفعت پر باقی نہ رہی، اب بھی قوم کی زندگی میں ایک مخصوص و متعین مقصد رکھتی ہے، جو کم از کم مغربی موسیقی میں ناپید ہے! مشرق میں مستند ارباب موسیقی آج بھی قوم کے معلم اور ایک ایسے عالم کے پیامبر سمجھے جاتے ہیں جس کے سارے بام و در ایک روحانیت کی آب و گل سے بنے ہیں! موسیقی وہاں کوئی فن نہیں سمجھی جاتی، بلکہ ایک تعبیر زندگی، اور ایک طرز حیات! اور اُس کی یہی خصوصیت ہے جو ایک مغربی کے لئے اُس کو بالکل بیگانہ بنا دیتی ہے، اس لئے کہ وہ غریب تو فرنگی نغمہ خانوں اور رقص گاہوں میں محض تفریح طبع اور شغل بیکاری کے لئے جایا کرتا ہے، اور اُس کے واہمہ میں بھی اس کام کو محفل فطرت کے سماع کی حاضری سے ہم رشتہ کرنے کا کوئی تصور نہیں گزرتا!

مغربی موسیقی کی کُل کائنات بس ایک مادی و ظاہری صورت ہے — صرف صورت! مشرقی موسیقی اپنے عطر و عصارہ میں ایک حقیقی زندگی ہے — ایک پُراسرار جلوۂ حیات، جس کی جھلک کسی رمز آشنائے موسیقی کی روح عارفانہ کی چشم تخیل نے دیکھ لی، اور پھر اُسے عام مخلوق انسانی کی آنکھوں پر بے نقاب کردیا! اور یا پھر یہ موسیقی وہ چیز ہے جو قوم کی نسلی روح کی تخلیق کرتی ہے، جو ایک زندہ و پائندہ سرچشمہ ہے، جو تمام فرزندان قوم کی رگوں میں ایک خون حیات دوڑاتا ہے، اور اس کا وسیلہ وہ ایک مشترک سلسلۂ رنج و راحت کو بناتا ہے جس میں ایک مشترک مقصد ملحوظ رہا کرتا ہے!

یہاں امریکہ میں، اب ملی موسیقی بڑی سرعت کے ساتھ معرض ارتقا میں آرہی ہے، جہاں کے عشرت خانوں کے تمام آلات ساز اور جماعتہائے رامشگراں منفرق و منتشر، محدود ذوات و مرکوز ذات، اور اُن وابستہ ذوات عالم کو — جو عبارت ہیں آج کل کے مرد اور عورتوں سے! — فوج در فوج ایک انبوہ عظیم میں سمیٹ کر آپس میں ایک نظم وحدت کے نیچے جمع کیا کرتے ہیں! اس طرح موسیقی کے مستقبل کے لئے آہستہ آہستہ ایک بلند تر مقصد ظہور میں آرہا ہے، جو ممکن ہے کہ ایک وقت ایسے خلاق صنعت مجتہدین فن کو پیدا کردے جو اپنے ہجوم نوا اور شور نشور کو ایک نظم و ربط میں لے آئیں۔ اور پھر اُسے کسی عظیم ملی صحیح نعرہ کے ساتھ وابستہ کردیں!

ایک ملت وہی ہوتی ہے جو اُس کے اجزائے ترکیبی ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک نغمہ بھی اپنے سازندہ اصوات و ترنمات کا دوسرا نام ہے۔ اب یہی مایۂ خمیر و سرمایۂ تعمیر ہے ——— بالفاظ دیگر افراد و جماعت یا ذرات موسیقی — کہ جس میں یکسر ایک انقلاب برپا کرنا پڑے گا، بشرطیکہ ہمیں یہ منظور ہے کہ جدید ملی موسیقی جو ابھی گہوارۂ طفولیت کے ساز کی "لوری" سن رہی ہے ایک بلند، باشرف، اور روحانی نصب العین حیات کی خدمت انجام دے!

اپنے سالہا سال کی جد و جہد اور تجربہ و آزمائش سے حاصل ہونے والے اذعان و تعین کے ساتھ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ جب تک مغربی موسیقی اپنی مشرقی ہمسنیر کے پیام کی سماعت نہیں کرتی، اور اُن عناصر حیاتی کو ذہن نشین و اختیار نہیں کرتی جو ہندوستانی موسیقی کو اُس کا فطری و مقناطیسی جادو عطا کرتے ہیں، نیز جب تک کہ مغرب کے ارباب موسیقی اپنے فن شریف کے اُس مقصد جلیل کی معرفت حاصل نہیں کرتے جو اُن کے مشرقی رفقائے کار کے سامنے ہے، ہاں جب تک کہ وہ اپنی "ہیو پاریت" کو خیرباد کہہ کر اُس ہم آہنگی فطرت کے، جو دراصل روح حیات کائنات ہے، معلم اور علمبردار نہیں بنتے، اور مزید براں جب تک کہ صناعی ایک ایسی روحانیت آموز قوت نہیں ہو جاتی جس کے سینے میں ایسا دل رکھا گیا ہو جو ایک مقصد عظیم کے شعور اور اعتراف اور اختیار کے جذبے سے معمور ہو — اُس وقت تک ——— اس امر کی بہت کم اُمید ہوسکتی ہے کہ موسیقی مستقبل میں بشریت کی زندگی کا ایک عظیم اور رفعت آموز ملی عنصر بن سکے گی!! موسیقی

کی اگر یہ مطلوبہ تکمیل عمل میں آجائے تو وہ یقیناً اُسی طرح سارے مراکز و مظاہر حیاتِ انسانی پر چھا جائے گی جس طرح کہ یہی کام مذاہب کیا کرتے ہیں! لیکن یہ عقد امتزاج، بدون اس کے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں کوئی حقیقی تبدیلی ظہور میں آئے محض ایک سطحی و بیرونی، خشک و بے جان رشتۂ ائتلاف ہوگا، جو فرد کی نشو و نما کو منجمد و متحجر کردے گا۔ جو اس کی زیرین بُنیاد کو مسمار و ہموار کرکے ایک ویران سطح پر یکسانی پیدا کردے گا، اور ہاں وہ ایک "روحانی افیون" ہوگا۔ جو بمصداق "خود مرض وجود مرضہا دوا است"۔ اگرچہ ہم کو وارستۂ ہوش کردے گی لیکن بالآخر پا بہ زنجیر کرکے چھوڑے گی۔

"مشین" اور "اشتراکیت" کا یہ دَور مغربی اِبداع کی طرح مغربی موسیقی پر بھی فرمانفرمائی کر رہا ہے۔ لیکن مشرقِ عتیق کی روایات پارینہ بھی، جو خود جدید کے مشرقیوں کو بھی نیم فراموش ہو چکی ہیں، آج تنہا سادہ نجات ہیں، اور تنہا شمعِ ہدایت، جو حقیقی جمالیاتی اور روحانی منازلِ حیات کی نشان دہی کر رہی ہے! مغرب کے اہلِ موسیقی کو اُس صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے "السابقون الاوّلون" بننا چاہیئے، جسے یہ سراجِ مُنیر روشنی میں لایا ہے!!

نگاہِ شوق

دیکھ فضا میں آفتاب آئینۂ حیات ہے
گردشِ مستقل یہاں اک سببِ ثبات ہے
ایک جہانِ جد و جہد ذرۂ کائنات ہے
قفلِ رموز کی کلید تارِ نگاہِ شوق ہے

موجِ رواں میں ہیں شرر برقِ تپاں کے عکس ریز
قطرۂ آب میں نہاں ہے اک صدائے حشر خیز
نکہتِ گُل سے تخم کا سینۂ تنگ مشک بیز
قفلِ رموز کی کلید تارِ نگاہِ شوق ہے

مشتِ غبارِ دشت میں بند شعاعِ آفتاب
اور فضائے دہر میں قید ہے نغمۂ رباب
نخلِ چمن کے برگ کا ہر ورق اک نئی کتاب
قفلِ رموز کی کلید تارِ نگاہِ شوق ہے

محمود۔ اسرائیلی

آئینہ تخیلات

(اشتہار)

(گزشتہ سے پیوستہ)

اشتہار کا کمال یہ ہے کہ ایک ایسا مناسب طریقۂ تحریر استعمال کیا جائے جس سے لوگوں کی آنکھ اشتہار پر ضرور پڑے۔ (ایڈیسن)

وہ کاروبار جو اپنے تئیں اشتہارات سے مستغنی سمجھتا ہے چند دن میں خود کاروبار سے مستغنی ہو جائے گا۔ (ڈر بی براؤن)

پیشہ کی حیثیت سے اشتہار نویسی ایک جدید چیز ہے مگر قوت اور اثر کی رو سے وہ بہت قدیم ہے۔ (بروس بارٹن)

آجکل کاروبار کا اصلی مقصد کثرت سے خریداروں کو جمع کرنا ہے۔ (لی)

اشتہار تجارت کی روح ہے۔ (کولج)

اگر اشتہارات عقل کے ساتھ دئے جائیں تو دنیا کی حیثیت بدل سکتی ہے۔ (الیس چیز)

اشتہار ہی وہ جن ہے جسکے زور سے امریکہ کے کروڑوں آدمی دولت عشرت۔ آرام و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ (وہائٹ)

اگر کوئی شخص تجارت میں صفر رہنا چاہے تو وہ اشتہار کی بیقدری کر سکتا ہے۔ (کیٹرنگ)

اشتہار دنیا کی دولت کی کنجی ہے۔ (کلین)

اشتہار تھوک فروشی کا بہترین ذریعہ ہے۔ (ڈوورنیس)

اشتہار پبلک میں جول کا بہترین ذریعہ ہے۔ (کرٹس)

اشتہار سے تجارت کی روحانی قوت بڑھتی ہے۔ (کولج)

میں دس لاکھ روپیہ کی گڈول (تجارتی نام) بغیر جائداد کے لینا پسند کرونگا اور ایک لاکھ روپیہ کی جائداد بغیر گڈول کے نہ لونگا۔ (مارو)

محمد عسکری بی۔ اے لکھنوی

اطوار (ڈھنگ)

اطوار وہ آئینہ ہیں جن میں ہر شخص اپنی شکل دیکھ سکتا ہے۔ (گیٹے)

اطوار میں ہر وہ چیز جو مناسب ہے معزز ہے اور جو چیز معزز ہے مناسب ہے۔ (سسرو)

اپنی ذات کے علم سے اطوار میں استواری اور اعتبار پیدا ہوتا ہے (فلٹم)

چھچھورا پن ہر نیکی اور اچھی صفت پر پانی پھیر دیتا ہے۔ (سینکا)

بعض بڑے بڑے لوگ بھی شک اور عجیب عادتوں سے خالی نہ تھے لیکن یہ اُن کا قصور اور بدقسمتی کہی جائیگی۔ ہر بڑے شخص کے لئے ایسی چیزیں قطعاً معیوب ہیں اور کوئی معزز شخص اپنے تئیں کسی بری عادت یا خصوصیت سے ممتاز کرنا کبھی نہیں پسند کریگا۔ (سر ولیم ٹمپل)

اعتبار

اُس شخص کا اعتبار نہ کرو جس نے تم سے ایک دفعہ بیوفائی کی ہو (شیکسپیر)

اعتبار ایک دیر میں بڑھنے والا پودا ہے خاص کر ایک سن رسیدہ دل میں۔ (جانسن)

اُس شخص کا اعتبار نہ کرو جو بغیر جانچے ہوئے تمہارا ہر بات میں اعتبار کرے یا جانچنے کے بعد تمہارا کسی بات میں اعتبار نہ کرے۔ (لیویٹر)

جوانی میں ہم اعتبار زیادہ کرتے ہیں اور بڑھاپے میں کم۔ پس بے احتیاطی اور جلد بازی جوانی کی غلطی ہے اور مزید احتیاط بڑھاپے کی۔ (کولٹن)

سوسائٹی کا دارومدار اعتبار پر ہے اور خود اعتبار کا مدار دوسرے کی

راستبازی پر ہے۔ (ساؤتھ)

اعتبار ناقص بہت مُضر اور خوفناک ہے۔ ہم کو چاہئے کہ اکثر موقعوں پر یا تو اظہار کامل کریں یا اخفاے کامل۔ (بُرویر)

اُن لوگوں سے کبھی اپنا دل نہ کھولنا چاہئے جو اپنا دل ہم سے بند رکھیں۔ (لوہانٹ)

تمہارا دل اُسی سے کُھلتا ہے جو ہم سے کُھلتا ہے۔ (میریا ایجورتھ)

خود اعتباری رُوحِ شجاعت ہے۔ (اِمرسن)

گفتگو میں اعتبار کا جُز ظرافت سے زیادہ ہونا چاہئے۔ (رو کی فوکو)

دوسرے کی نیکی پر اعتبار خود اپنی نیکی کا ثبوت ہے۔ (مانٹین)

جو دُنیا بھر کی تعریف کرے اُس کا اعتبار کم کرو۔ جو دُنیا بھر کی مذمت کرے اُس کا اعتبار اُس سے کم کرو۔ اور جو ان دونوں سے بے تعلق ہو اُس کا اعتبار سب سے کم کرو۔ (لیوٹیر)

اعتبار کرنا اور اس میں نقصان اُٹھانا مطلق بے اعتباری سے بہتر ہے کیونکہ پہلی صورت میں تمکو اپنے دوست سے نقصان پہنچیگا۔ (سِمس)

ایسے آدمیوں پر اعتبار نہ کرو جو دوسرے پر اعتبار نہ کریں اس وجہ سے کہ جو دُنیا بھر کو ناقص سمجھے گا وہ گویا دُنیا میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔ (ہیر)

اعتقاد (یقین)

کوئی چیز اس سے زیادہ آسان نہیں کہ انسان خود اپنے کو دُہوکا دے ہماری خواہشیں ہی ہمارے اعتقادات ہیں۔ (ڈیما ستھنیز)

بہت سے اہم حقائق ہیں جن سے ہم انکار تو نہیں کرتے مگر پوری طرح اُن پر یقین بھی نہیں رکھتے ہیں۔ (الگزینڈر)

وہ شخص جو صرف اُن چیزوں پر اعتقاد رکھتا ہے جن کو وہ پوری طرح سمجھ لیتا ہے یا تو اُس کا سر بہت لنبا ہے اور یا اُس کا مذہب چھوٹا ہے۔ (کولٹن)

ممکن ہے کہ کوئی شخص حق کو مان کر بھی ملحد ہو یعنی اُس کے معتقدات کی بُنیاد صرف دوسروں کی تاویلات ہوں۔ پس ایسی صورت میں اُس کا اعتقاد تو ٹھیک ہوگا مگر وہ تاویلات جن کو وہ مانتا ہے الحاد سے کم نہیں ہیں۔ (ملٹن)

یادرکھو کہ تمہارے معتقدات تمہاری خواہشات کا پرتو ہیں۔ (نوح پورٹر)

ہم اُن چیزوں کو آسانی سے نہیں قبول کرتے جن کے ماننے میں ہمارے احساسات کو ضرب لگیگی۔ (اووڈ)

اعتقاد کا عملی اثر اس کی صداقت کا اصلی معیار ہے۔ (فرووڈ)

اُن چیزوں کا اعتقاد بہت آسان ہے جن کی ہم دل سے اُمید رکھتے ہیں۔ (ٹرِنس)

بعضوں کے معتقدات وہی ہوتے ہیں جو اُن کے والدین اور اعزا اور اساتذہ کے ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک معتقدات بھی ایک جائداد ہیں جو ورثہ میں ملتی ہے اور وہ اپنے کو اُن کا وارثِ حقیقی سمجھتے ہیں۔ (واٹس)

جس طرح میں اپنی روٹی اپنے نانبائی سے، اپنے کپڑے درزی سے اور اپنا جوتا موچی سے لیتا ہوں اُسی طرح اپنے معتقدات اپنے مذہبی پیشوا سے حاصل کرتا ہوں۔ (گولڈ اسمتھ)

اعتقاد میں ہر قیمتی سعی کا راز مضمر ہے۔ (بُلور)

ایک نوجوان آزاد خیال آدمی نے مشہور ڈاکٹر پار سے اثنائے گفتگو میں کہا کہ میں ہرگز اُن چیزوں کو نہیں مانتا جو میری سمجھ میں نہیں آتیں جواب دیا کہ میاں! تب تو تمھارا مذہب ہی مختصر ہوگا۔

میں اُن نازک اور مشکل پسند ضمیر والوں سے جو اپنے معتقدات کے تسلیم کرنے میں بہت احتیاط برتتے ہیں ہرگز نا اُمید نہیں ہوں بلکہ اُن کی اُنکی غلطیوں سے درگزر کرکے اُنکی راستبازی کی عزت کرتا ہوں۔ مگر ان لوگوں سے بہت ڈرتا ہوں جو ہر چیز کو مانتے ہیں، ہر چیز پر یقین رکھتے ہیں اور ہر چیز کی موافقت میں اپنی راے بے سمجھے بوجھے دیدیتے ہیں۔ (شیلی)

جو شخص یہ اُمید رکھتا ہے کہ ہر شخص اپنے معتقدات کے موافق نیک ہوگا وہ ایک فضول اُمید رکھتا ہے اور جو شخص یہ اُمید رکھتا ہے کہ ہر شخص اپنے اعتقاد کے موافق بد ہوگا۔ وہ فضول خوف رکھتا ہے۔ (کیفر)

یہ عجیب بات ہے کہ بہت سے بڑے بڑے صاحبِ عمل لوگ صبر کے اور بڑے بڑے صاحبِ فکر لوگ تقدیر کے قائل تھے۔ (بالزیک)

نیوٹن، پاسکل، بوسوے، السینس، فنیلون یعنی دُنیا میں جو بڑے روشن خیال لوگ گذرے ہیں اور انکا زمانہ فلسفہ کی بہترین ترقی کا قدر تھا یہ سب اپنے پیغمبر کے ماننے والے تھے اور کانڈی نے تو خوش ہوکے یہ الفاظ کہے تھے کہ کہ اب میں خدا کو بالمشافہہ دیکھونگا۔ (دا دنیارگس)

ہندوستان کا معاشری نظام

اور

اُس کا اثر ملک کی اقتصادی حالت پر

از عبدالرحیم شبلی (بی کام)

"کلیم" کی فروری کی اشاعت میں مَیں نے سرسری طور پر بتایا تھا کہ ہندوستان کے افلاس کی ایک بڑی وجہ ہمارے مذہبی و معاشرتی مروجات و معتقدات ہیں۔ اس مضمون میں میرا ارادہ ہے کہ ملک کے معاشری نظام کا کماحقہٗ تجزیہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ کس حد تک ہماری پستی یا خوشحالی کا ذمہ دار ہے۔

ذات پات

سب سے پہلا جزو ہماری معاشری زندگی کا "ذات پات" ہے جس کے آغاز معنی۔ اور حسن و قبح پر تفصیلی بحث درکار ہے۔

مفہوم ہندوستان میں "ذات پات" کا وہ مفہوم نہیں جو دیگر ممالک میں ہوتا ہے۔ یہاں قوم پیشوں کے لحاظ سے تقسیم نہیں۔ بلکہ مذہب اور معاشرت کے لحاظ سے بٹی ہوئی ہے۔ دوسرے معنوں میں یہاں نہ تو لوگ اپنے پیشوں میں تبدیلی کرنے کے لئے تیار ہیں اور نہ بیاہ شادی کے ذریعے سے آپس میں میل جول رکھنے پر آمادہ ہیں۔" ان کے خیال میں انسان کے معاشری یا خانگی تعلقات صرف پیدائش کے ذریعہ سے مقرر ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کو اپنی زندگی میں اپنے خاندانی رسم و رواج کے مطابق ہی کھانا پینا۔ پہننا اور شادی کرنا چاہیئے۔" (امپیریل گزٹ آف انڈیا جلد اوّل صفحہ ۳۲۳) الغرض ہمارے یہاں تقسیم عمل یا Division of labour پیشہ یا دماغی رجحان کے مطابق نہیں بلکہ پیدائش کے لحاظ سے ہے۔

آغاز "ذات پات کے آغاز کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں کی گئیں ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ اس کی داغ بیل منو نے ڈالی۔ جس نے انسان کی زندگی کو مختلف مدارج میں تقسیم کیا اور ہر چھوٹی ذات والے کو بڑی ذات والے بڑی ذات والے کی خدمت پر مقرر کیا۔ جیمز مِل کی تھیوری کے مطابق سوسائٹی کا یہ انتشار اُس انسان کی ذہنی قابلیت کا مرہون منت ہے جس نے اپنی روحانی آنکھ سے منظم تقسیم عمل کے فوائد کو دیکھ لیا پھر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ سوسائٹی کی تقسیم در تقسیم اس لئے ہوئی کہ کمزور ارکان کو اپنے سے بڑے مرتبہ والوں سے قدرتی خوف تھا اور بڑے مرتبے والے یہ جانتے تھے کہ اُن کی اپنی ذات اس قدر مضبوط ہو جائے کہ دیگر سب لوگ اُس کی تعظیم و تکریم کریں۔

(انسائکلوپیڈیا برٹینیکا جلد گیارہ موضوع ذات)

سینارٹ کے نظریے کے مطابق ذات پراچین آریاؤں کے ادارے کی ایک معمولی ترقی یافتہ شکل ہے جس نے اپنے آپ کو ہندوستان کے خاص حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش میں موجودہ صورت اختیار کر لی"۔ اس کے ثبوت میں وہ یونانیوں اور رومیوں کی ترقی کے ابتدائی مدارج کو پیش کرتا ہے اور موجودہ ہندوؤں کی تنظیم کو پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ہندوستان میں "ذات" کا بندھن نہایت سخت رہا ہے درآں حالیکہ

مذکرۂ بالا حالات میں وہ بہت حد تک نرم ہو چکا ہے۔ اُس کے خیال میں ذات پات کے تدریجی جزو مندرجہ ذیل ہیں :-

"ایک بڑے علاقے پر پھیلاؤ اور جماعتی ترقی۔ ابتدائی باشندوں سے تعلق لیکن نسلی فخر کی حوصلہ افزائی نسلی اور پرخلوص ہونے کا خیال جس کی وجہ سے ملکی باشندوں کو مزدور بنایا گیا اور اعلیٰ پیشے صرف آریوں کے لئے مخصوص رکھے گئے۔ قسمت اور کرم کے عقائد کی ترویج قومی انتشار کے اجتماع کے لئے کسی سیاسی طاقت کا نقدان، دربرہمنی نظام کا اقتدار ۔ ۔ ۔ ۔"

بندھن بہرحال "ذات پات" کے آغاز اور اُس کی مابعد ترقی کے متعلق کوئی حتمی رائے موجود نہیں ہے۔ خصوصاً یہ بات آج تک چیستان ہی ہے۔ باوجودیکہ یورپ میں بھی جہالت اور لاعلمی کا دور دورہ تھا لیکن وہاں ذات پات کے بندھن اس قدر مضبوط نہیں رہے جس قدر کہ ہندوستان میں رہے حتیٰ کہ جب مسلمانوں نے بارھویں اور اٹھارھویں صدی کے درمیان اس ملک پر پے در پے حملے کئے پھر بھی ان میں سر مو فرق نہیں آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں رسل و رسائل کے ذرائع موجود نہ تھے اس لئے دیہات کے لوگ شہروں کی علمی ترقی سے مستفید نہ ہو سکے چنانچہ وہ اپنی ذات پات کے بندھنوں میں زیادہ مضبوطی کے ساتھ جکڑ گئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مغرب میں بھی اُنیسویں صدی کے صنعتی و تجارتی انقلاب سے پہلے یہ حالات موجود تھے تو پھر وہاں یہ معاشری جکڑبند کیوں نہ پیدا ہوئی؟ ایک حل اس کا یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں پہلے ایک ہی مجتمع سوسائٹی تھی جس کے لوگ مختلف پیشوں کے لئے آپس میں بٹ گئے اور بعد میں یہ تقسیم پیدائشی اور نسلی بن گئی۔ (ادیا جوشی صفحہ ۱۲۵) لیکن اس پر بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صورت حال ولدیت میں موجود نہ تھی؟ تو پھر وہاں یہ جکڑبند کیوں نہ موجود نہ رہی

میرا اس پر بھی یقین رکھنے کے لئے وجوہ موجود ہیں کہ ابتدا میں سوسائٹی کے اندر "عنصرِ قربت" موجود تھا۔ کم از کم کھتریوں، ویشوں، اور برہمنوں کے پیشوں میں آپس کا تبادلہ ہو جاتا تھا۔ اور وہ باہمی شادیاں بھی کر لیا کرتے تھے۔ لیکن یہ "عنصر قربت" کب دور ہوا۔ اور کب آپس کا بُعد اور دوری زور پکڑ گئی۔ یہ مفکرین کے لئے ہمیشہ عقدۂ لاینحل رہا ہے اس لئے ہم بھی ذات پات کے آغاز اور تدریجی ترقی کو ناقابلِ حل اور غیر مفید مسئلہ سمجھ کر چھوڑتے ہیں۔

خوبیاں جہاں کوئی ذی ہوش آدمی ذات پات کی موجودہ زمانے میں حمایت نہ کرے گا وہاں یہ خیال کرنا بھی سخت حماقت ہے کہ ذات پات قطعاً غیر مفید اور سراسر نقصان دہ رہی ہے۔ ایک بڑا اُصول جو ذات پات کے نظام میں کار فرما رہا ہے وہ "تقسیمِ عمل" Division of labour کا تھا۔ یعنی ہر فرد اپنے پیشے کی طرف دھیان رکھتا تھا اور اُسی میں مہارت درجۂ طولیٰ حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مثلاً اگر کوئی شخص دُکان دار ہے تو پشتوں تک یہی کام کرے گا۔ بدیہی طور پر اس طریق سے انسان میں قابلیت اور حسنِ کارکردگی بڑھتا ہے لیکن یہ اُصول اُس وقت قابلِ مذمت ہو جاتا ہے جب انسان کو پیشہ اختیار کرنے میں آزادی اور حقِ انتخاب نہ دیا جائے۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا)

ذات پات کا مقابلہ انگلستان میں عہدِ وسطیٰ کی "حزب العمال" اور تجارتی انجمنوں سے کیا گیا ہے۔ جس طرح وہ ارکان کی مصیبت میں امداد اور آپس کے جھگڑے نپٹنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ اسی طرح ذات پات کے نظام سے بھی یہی کام سرانجام ہوتا تھا۔ دوسرے معنوں میں ہندوؤں کے لئے ذات پات ہی اُن کی حزب العمال تھی۔ اور ذات پات ہی خیراتی یا نفع بخش انجمن کا کام دیتی تھی"

(ایس لو۔ وژن آف انڈیا صفحہ ۲۶۳)

اگر کوئی شخص بیکار ہو یا کام کرنے کے نااہل ہو جائے تو سوسائٹی اُس کی مدد کرتی تھی۔ اسی طرح وہی متفق ہو کر اپنے ممبروں کی حفاظت خارجی حملہ آوروں سے کرتی تھی اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ باوجود پے در پے لڑائیوں کے منتشر نہیں ہوئی۔

نقصان ذات پات کے یہ فائدے صرف اُسی وقت گنائے جا سکتے تھے جب وہ موجودہ صورت میں ارتقا پذیر نہیں ہوئی تھی۔ اب تو اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے تھوڑی ہے۔ اسکی وجہ سے ہماری قومی اور سیاسی ترقیاں بالکل مسلوب ہو چکی ہیں اور یہی باہمی رابطہ و اتحاد کی راہ میں بڑی روک ہے۔ اگر آج ہم سیاسی اور اقتصادی سوراج حاصل نہیں کر سکتے تو اسکی وجہ صرف ذات پات کی وسیع خلیج ہے جو ہماری قوم کے مختلف افراد کے درمیان حائل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ "ذات پات" سے نسلی خون قائم رہتا ہے لیکن اگر ہم غور سے اس اقتصادی ردِ عمل کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اگر نسلی امتیاز برقرار رکھا جائے تو کبھی کسی فرقے میں عورتیں زیادہ ہو جائیں گی اور کبھی مرد زیادہ ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جنس کا توازن قائم نہ رہ سکے گا اور بردہ فروشی وغیرہ کی ترویج ہوگی۔ چنانچہ آجکل پنجاب میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے بہ نسبت مردوں کے جس کی ایک وجہ یہی ہے کہ مختلف فرقے آپس میں شادیاں نہیں کرتے۔ پھر جو کثیر جو کثیر التعداد مہر اور جہیز وغیرہ دینے کا طریق پیدا ہو گیا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ایک ہی ذات میں لڑکا یا لڑکی حاصل

کرنے کے لئے مقابلہ ہونے کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ جہیز یا مہر ادا کیا جاتا ہے۔

"پھر ذات پات" کی وجہ سے اختیارِ انتخاب چھینا جاتا ہے جو اقتصادی ترقی کے لئے زہر قاتل ہے۔ جب کسی شخص کو اپنے فطری رجحان کے مطابق کام نہ کرنے دیا جائے تو وہ کس طرح حسنِ کارکردگی حاصل کر سکتا ہے؟

"ذات پات کی وجہ سے مزدوروں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ انتقال بھی ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ ہر شخص کو اپنے پیشے کے انتخاب میں آزادی حاصل نہیں ہوتی اور اس وجہ سے مقابلہ رُک جاتا ہے اور ممکن ہے کہ ایک پیشہ میں مزدوری اور اُجرت مہنگی ہو جائے اور دوسرے میں اس قدر ارزاں کہ مزدوروں کا گزارا بھی نہ ہو۔

"ذات پات" اُصولِ مساوات کی دشمنی کا نام ہے۔

ایک طرف تو اس سے اعلیٰ ذات والے مغرور ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف کم ذات والے اپنی خودداری بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں چھوت چھات کا مسئلہ ذات ہی کا ایک شاخسانہ ہے۔ صدیوں کی غلامی نے اچھوتوں سے خودداری اور خود اعتمادی کا مادہ چھین لیا ہے اور اب وہ اپنے آپ کو ہر ترقی کے لئے نکما اور ناکارہ سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے کئی لاکھ آدمی ہماری اقتصادی ترقی کے لئے بالکل مُردہ ہیں۔

مغربی تہذیب کا اثر

مغربی تہذیب و تمدن نے ذات پات کے بندھنوں کو کچھ حد تک ڈھیلا ضرور کر دیا ہے۔ مثلاً ریلوے کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے تعلق کرنے پر مجبور ہو گئے اور اچھوتوں میں بھی خودداری کا مادہ ترقی پا رہا ہے۔ شہروں میں مشینوں اور صنعتوں کے رواج سے لوگ اپنی پسند کے مطابق پیشوں کا انتخاب کر رہے ہیں اور بڑی ذات والے بھی بوجہ اقتصادی مجبوریوں کے وہ کام کرنے لگے ہیں جو آج تک چھوٹی ذات والوں تک ہی محدود تھے۔ مثلاً آجکل کئی برہمن دکاندار، درزی اور تاجر بن رہے ہیں درآں حالیکہ یہ کام صرف ویش کیلئے مخصوص تھے۔

مغربی تعلیم اور مغربی ثقافت۔ یونیورسٹیاں اور کالج۔ شہروں کا مروج اور حکمران قوم کی روحِ آزادی یہ سب قوتیں ذات پات کی بیخ کنی کے لئے ممد ثابت ہو رہی ہیں۔ حکومت نہ تو بڑی ذات والوں کو کوئی خاص مراعات دیتی ہے اور نہ چھوٹی ذات والوں کو کسی حق سے محروم رکھتی ہے۔ اس لئے سب لوگوں میں مساوات کی اسپرٹ پیدا ہو رہی ہے۔

پھر بعض قائدین نے اس لعنت کو ہماری معاشرتی زندگی سے دور کرنے کے لئے زندگیاں وقف کر دی ہیں چنانچہ مہاتما گاندھی کا نام اس مقصد کے لئے پیش از پیش ہے۔

علاج

آجکل ایک بحث ہو رہی ہے کہ آیا مذہب کے تبدیل کرنے سے چھوت چھات دور ہو سکتی ہے؟ میرا خیال یہ ہے کہ اگر مذہب تبدیل کروانے سے پہلے اچھوتوں میں علوم جدیدہ اور اعلیٰ تعلیم کی ترویج کی جائے تو وہ زیادہ مفید اور سریع الاثر علاج ہوگا۔ بہ نسبت اس کے کہ ان سے کہا جائے کہ مسلمان ہو جاؤ یا بدھ مت اختیار کر لو۔ ہمارا سارا زور اس بات پر صرف ہونا چاہئے کہ کسی طرح اُن میں خود اعتمادی اور خودداری کا جذبہ پیدا ہو جائے نہ کہ وہ مختلف مذاہب کے جھگڑے میں پڑ کر ایک دوسرے کے لئے زیادہ مہلک ہوں۔

اِشتراکِ خاندانی

جب انسان نے گلہ بانی کو چھوڑ کر زراعت اور صناعت کے پیشوں کو اختیار کیا تو اُس وقت ضرورت پیش آئی کہ تمام مزدور ایک جگہ مل کر کام کریں اور مکان بنائے جائیں تاکہ سکونت اور نگہداشت کا مستقل انتظام ہو سکے۔ اُسی وقت سے "خاندان" کے تخیل کا آغاز ہوا۔ جو خاندان میں سب سے بوڑھا شخص ہوتا تھا اُسکو اپنا "پرہت" یا سردار بنا لیا جاتا تھا اور وہی اپنے خاندان کے سیاسی یا مذہبی امور طے کرتا تھا۔ ایک طرح وہ اپنے خاندان کا نگران ہوتا تھا جو تمام جائداد وغیرہ کی حفاظت کرتا اور اُنکی دینی و دنیوی خوشحالی کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ خاندان کے ہر رکن کی آمدنی ایک مرکز پر اکٹھا کر لی جاتی تھی۔ امیر قبیلہ کو اختیار ہوتا تھا کہ وہ تمام کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر اپنی مرضی سے خرچ کرے۔ ہر شخص اپنی قابلیت اور حیثیت کے مطابق کماتا اور اُسکو اپنی ضروریات کے مطابق خرچ ملتا تھا۔

اِس اقتصادی اتحاد میں مذہبی رنگ بھی پایا جاتا تھا اپنے بڑوں کی پرستش اور اُن کے فرمان کا اتباع جزوِ ایمان خیال کیا جاتا تھا۔ اور اگر کوئی نوجوان اپنے امیر قبیلہ کے سامنے سرکشی کا اظہار کرتا تو اُس کو نہ صرف خاندان سے نکال دیا جاتا تھا بلکہ اُخروی دروازے بھی اُس کے لئے بند سمجھے جاتے

صدیوں تک یہ سیاسیاتِ معاشرت "کا نظریہ قائم کر رہا اور آمدورفت کے ذرائع مفقود ہونے کی وجہ سے اشتراکِ خاندانی کی بنیادیں بھی مضبوط تر ہوتی گئیں حتیٰ کہ دورِ جدید کی شخصیت پسند طاقتوں نے اُن کو جڑ سے اکھاڑنا شروع کر دیا ہے۔

فائدے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اشتراک خاندانی کی بُنیاد امداد باہمی اور تعاون پر رکھی گئی ہے اگر کوئی شخص خاندان میں بیکار بھی ہو تو اُسکی مصیبت کا بار سب پر پھیلا دیا جاتا ہے اور اِس لئے وہ کسی پر بار نہیں ہوتا بیوائیں اور یتیم بچے بے کسی کی حالت میں دُنیا کی سرد مہری پر چھوڑ نہیں دئے جاتے بلکہ اُن کی دیکھ بھال اور غور و پرداخت کے لئے باقی افراد ہر وقت تیار رہتے ہیں اِس سے حکومت کا بھی سب کچھ خرچ جو بڑھاپے اور ناکارگی کی پنشنوں پر صرف ہونا ضروری تھا بچ جاتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ جو ادارے یورپ کو اپنی شخصیت پسندی کی وجہ سے بینکوں۔ انشورنس کمپنیوں اور تعاونی کمیٹیوں وغیرہ کی صورت میں بنانے پڑے ہیں وہ مشرق میں نظام خاندان مشترک کی شکل میں سب موجود ہیں۔ اِن سب اداروں کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ مصیبت کے ایام میں افراد کی مالی مدد کی جائے۔ اور یہی مقصد اشتراک خاندانی کی صورت میں پورا ہو جاتا ہے پھر اشتراک خاندانی کا ایک اور فائدہ بھی ہے مختلف افراد کی مختلف ڈیوٹیاں مقرر ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے اپنے مقررہ فرائض ادا کرنے کے لئے اُن میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اقتصادی ترقی کے لئے از حد مفید ہے۔

نقائص نظام خاندان مشترک کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں محنت اور معاوضے کی کوئی نسبت قائم نہیں رہتی۔ فرض کیجئے ایک شخص اپنی ذہانت اور محنت کی وجہ سے سب سے زیادہ کماتا ہے۔ ممکن اُس کو ضروریات ۔زندگی کے لئے اُتنا ہی خرچ ملے گا جتنا کہ ایک معمولی فرد کو ملتا ہے جو نسبتاً کم کماتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی شخص ضرورت سے زیادہ محنت کرنا پسند نہیں کریگا۔ اور یہ چیز مجموعی طور پر اقتصادی پستی کا باعث بنتی ہے۔

پھر اشتراک خاندانی میں انفرادیت اور شخصیت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات اختراع اور جدت کے لئے زہر قاتل ہے۔

اشتراک خاندانی سے آدمی میں گھر اور مُلک کی محبت بڑھتی ہے اور اس وجہ سے وہ گھر یلو بن جاتا ہے اور باہر جا کر وہ اپنے لئے کوئی بہتر میدانِ عمل کے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے لوگ زیادہ تر گھریلو زندگی کے خوگر ہیں۔ اور اُن میں جدت و اختراع پسندی کا مادّہ نہیں ہوتا۔

خاندان کی تمام آمدنی تھوڑی تھوڑی کر کے سب پر تقسیم ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے سرمایہ کا جمع کا کرنا مشکل ہو جاتا ہے جو اعلیٰ پیمانہ پر کسی کام کرنے کے لئے سدّراہ ہے۔

بوڑھے بے شک قابل عزت ہیں لیکن ضروری نہیں کہ اُن کی ہر بات ہمارے لئے مفید ہو۔ ممکن ہے وہ جبلّی جہالت کی وجہ سے جدت کو پسند نہ کرتے ہوں درآں حالیکہ جب تک اختراع پسندی کسی قوم میں پیدا نہ ہو وہ ترقی نہیں کر سکتی۔

پس کنبہ پروری کے نظریہ کو ہم اقتصادی لحاظ سے مفید نہیں سمجھ سکتے اِس لئے ہمارے لئے اُس کی مخالفت ضروری ہے۔

قوانین وراثت

پروفیسر سالیمن (امریکن ماہر مالیات) کے الفاظ میں موجودہ اقتصادی نظام کی جڑ ذاتی ملکیت ہے اور یہ تین ارتقائی منازل میں سے گذری ہے۔ پہلا درجہ اجتماعی دولت کا تھا جب ساری جائداد قوم کی ملکیت تھی اور اُس میں کسی فرد بشر یا گھرانے کا قابلِ تفریق حصہ نہ تھا۔ دوسرا دَور وہ آیا جب ہر خاندان کی علیحدہ مشترکہ جائداد بن گئی اور اُس میں کسی رُکن کا انفرادی طور پر حصہ نہ تھا۔ امیرِ قبیلہ ہی ساری جائداد کا منتظم تھا۔ انتظام اور ملکیت میں امتیاز کا اُس وقت تک کوئی سوال نہ اُٹھا جب تک شخصی طور پر وراثت کا طریق رائج نہ ہوا۔ یہ موجودہ اقتصادی نظام کا دَور تھا۔ اور ہندوستان میں اِسی کا آغاز ہو رہا ہے۔

جب یہ دَور آیا تو وراثت کے متعدد نظریے قائم کئے گئے۔ ہندو رواج کے مطابق وِراثت دو قسم کی ہوتی ہے ایک میتاکشرا۔ اور دوسری دیا بھاگ میتاکشرا میں بیٹے اپنے باپ کی زندگی میں ہی اُس کی جائداد کے مالک سمجھے جاتے ہیں اور دیا بھاگ میں صرف اُس کی وفات کے بعد وہ مالک بن سکتے

ہیں دونوں صورتوں میں جائداد کی تقسیم بیٹوں میں مساوی ہوتی ہے اور لڑکیوں اور بیوائوں کو مردوں سے کم حصہ ملتا ہے۔

اِسی طرح اسلام میں تمام بچوں کا برابر حصّہ ہے اور لڑکیوں کو کم ملتا ہے

ہندوستان چونکہ ایک زرعی ملک ہے اِس لئے قوانین وراثت کی وجہ سے یہاں اقتصادی طور پر نقصان پہنچا ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص کے پاس ۵ ایکڑ زمین ہے اور اُس کے پانچ ہی بیٹے ہیں جب وہ مرے گا تو ہر شخص کے حصے میں صرف ایک ایکڑ زمین آئے گی۔ جو ظاہر ہے کہ اس قدر کم ہے کہ مفید طور پر اُس کی کاشت نہیں ہو سکتی۔ یورپین ملکوں میں ہر شخص کے پاس بیسیوں ایکڑ زمین ہوتی ہے جس پر وہ زراعتی مشنری کا استعمال کر سکتا ہے لیکن ہمارے ہاں یہ بالکل ناممکن ہے کہ زمین تھوڑی ہوتی ہے اور اس میں کسی جدید طریق سے ترقی کرنا بعید از قیاس ہے۔

مشکل یہ ہے کہ جب زمین تقسیم ہوتی ہے تو ضروری نہیں کہ ہر وارث ایک ہی جگہ زمین مِل جائے بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کے پاس مختلف جگہ چند ٹکڑے زمین کے ہوتے ہیں اور وہ مساوات کی خاطر سب بیٹوں کو مختلف جگہ سے برابر کا حصّہ دے دیتا ہے۔ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ ایک جگہ زمین زیادہ زرخیز اور دوسرے کی اُس سے کم پھر بعض زمینیں منڈی یا پانی کے پاس ہوتی ہیں اور اُن کی قیمت دوسری زمینوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے اس ہر وارث کو خوش کرنے کے لئے مورث کے لئے لازمی ہے کہ ہر قطعے سے اس کو برابر حصّہ دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زمین چھوٹے چھوٹے مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ہے اور ہر شخص کے پاس غیر اقتصادی قطعات رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے نفع بخش فلاحت قطعی ناممکن ہے۔

قوانین وراثت کی حمایت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا رواج انصاف اور مساوات کی رُو سے بہترین ہے۔ دوسرے اس طریق سے دولت کا اجتماع جو سرمایہ داری کا باعث ہے ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ جائداد بہت سے آدمیوں پر برابر تقسیم ہو جاتی ہے تیسرے جب زمین تھوڑی ہوگی تو ہر شخص کا رجحان گھریلو صنعتوں کی طرف بھی ہوگا تاکہ اپنی آمدنی کو اپنی ضروریات کے مطابق بڑھانے کا امکان ہو۔

قطع و برید آراضی کو دُور کرنے کے لئے ہم امدادِ باہمی کی انجمنیں سکتے ہیں جو ایک لمیٹڈ کمپنی کی طرح تمام زمینوں اور کاشتکاری کے انتظام کو سنبھالیں اور عام حصہ دار برابر کے اُس کی آمدنی میں شریک ہو سکتے ہیں۔ الغرض استمال آراضی کی تحریک کو پھیلانے کے لئے ہمیں تمام تر کوششیں وقف کر دینی چاہئیں تاکہ ہمارے قوانین وراثت کا ازالہ ہو سکے۔

پردہ

پردہ ہماری معاشرتی زندگی کا ایک اور پہلو ہے جو نہایت تاریک سمجھا جاتا ہے۔ جب دُنیا میں جہالت تھی لاعلمی تھی تو پردہ ایک غیر ضروری عمل تھا۔ لیکن موجودہ تہذیب و تمدن کے آغاز سے حسن و شباب کا تجزیہ ہوا۔ خوبصورتی کا فلسفہ چھانٹا گیا۔ عورتوں اور مردوں دونوں کو اپنی خوبیوں کا احساس ہوا۔ اور وہ اپنی جائز آمدنی سے بڑھ کر معاشرت میں حصّہ لینے لگے۔ اس لئے پردہ کی ضرورت پیش آئی۔ دیہات کی عورتیں اب بھی حسن و عشق کے فلسفے سے ناواقف ہیں اِس لئے اُن کو ویسے پردے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی جیسے شہر کی عورتوں کو ہوتی ہے

میں سمجھتا ہوں پردہ ہماری اقتصادی زندگی میں کسی طرح بھی حارج نہیں ہو سکتا۔ بشرطیکہ کام کرنے کی نیت ہو۔ اِس بارے میں ہمیں ہٹلر کی مثال لینی چاہیئے۔ اُس نے برسر اقتدار آتا ہی حکم دیا کہ تمام عورتیں دفتروں وغیرہ میں سے نکل جائیں اور گھر جا کر خانہ داری کے امور کو سنبھالیں۔ تربیت اولاد کریں اور صرف مرد کمانے کے لئے رہ جائیں۔

پھر اگر عورتیں چاہئیں اور اُن کو خانگی امور سے واقعی فرصت ہو تو وہ دستکاری اور گھریلو مصنوعات کی طرف توجہ کر سکتی ہیں مثلاً کشیدہ کاری اور دیگر ایسے چھوٹے چھوٹے کام جو کم سرمائے سے فرصت کے لمحات میں کئے جا سکتے ہوں۔

اِن سب باتوں کے باوجود میں اُس پردے کا حامی نہیں ہوں جو آجکل بڑے شہروں میں مروج ہے۔ مثلاً یہ کہ عورتوں کو صبح سورج نکلنے کے بعد اور شام کو سورج ڈوبنے سے پہلے مکان کی چاردیواری کے باہر نہ نکلنے دیا جائے اور اگر وہ کہیں جائیں بھی تو تانگہ کے اردگرد اس قدر غلاف لپیٹے جائیں کہ وہ ایک "متحرک تنبو" کی صورت اختیار کر لے۔

عورتوں کو کھلی ہوا میں پھرنے کی اجازت ہونی چاہئیے۔ اُن میں نشا

کرنے کا شوق ہونا چاہئے۔

ایک دوسرے کے گلے یا شکوہ کے عوض، انھیں مطالعہ کتب میں اپنا وقت گذارنا چاہئے کہ یہی چیزیں ہماری اقتصادی بہبودی کے لئے بہترین ہیں۔ آپس میں آزادانہ اختلاط مردوں کے ساتھ ٹینس کھیلنا، راتیں کلبوں میں بسر کرنا مشرقی شریف بیبیوں کا شیوہ نہیں ہونا چاہئے۔ اِس سے قومی اخلاق بگڑتے ہیں جو ہمارے اقتصادی نظام کی بیخ کنی کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

صغرسنی کی شادی

ہندوستان کا افلاس اِس حد درجہ ترقی کر چکا ہے کہ لوگ اپنی اولاد کو زیادہ دیر تک اپنے گھر نہیں رکھ سکتے وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح جلد ہو سکے وہ اپنے بچوں اور خصوصاً لڑکیوں کو دوسرے کے حوالے سپرد کر دیں تاکہ اُسکی پرورش اور تربیت کا خرچ اُن پر نہ پڑے۔

اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکیاں چھوٹی عمر میں ہی مائیں بن جاتی ہیں جن سے اُن کی عمر کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں عورتوں کی بہت کم ہوتی ہے۔ بہ نسبت یورپین عورتوں کے۔ پھر مردم شماری سے ظاہر ہے کہ دس سے بیس سال کی عمر میں یہاں کی عورتوں کی رفتارِ اموات بہت زیادہ بہ نسبت مردوں کے ہے۔ چنانچہ اِس عمر میں ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں صرف ۸۶۹ عورتیں رہ جاتی ہیں۔ اور اِس کی وجہ زیادہ تر یہی ہے کہ ہماری اولاد کو جلد سے جلد حبالۂ عقد میں پھانسنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

صغرسنی کا نہ صرف یہ نقصان کہ بچوں کی عمر کم ہو جاتی ہے۔ بلکہ اُنکی تربیت اور پرورش کا بھی خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خانگی ذمہ داریاں اُن کو یہ مہلت نہیں دیتیں کہ وہ تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کر سکیں

ترک دُنیا

ترک کی تعلیم نے ہماری معاشی ترقی کو سخت نقصان پہنچایا ہے ہندوستان میں بعض مفکرین ایسے گذرے ہیں جن کا خیال تھا کہ اُخروی بھلائی دنیوی بھلائی سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔ اس مسئلہ کو عوام نے غلط سمجھا اور انہوں نے اپنی تمام کوششیں دُنیا کے حصول کے لئے بالائے طاق رکھدیں۔ اس بارہ میں مسلمانوں کا عقیدہ ہندوؤں سے اچھا ہے اسلامی تعلیم لا رہبانیۃ فی الاسلام کی رو سے اسلام میں رہبانیت منع ہے۔ اور حضرت رسولِ مقبول صلعم کا یہ فرمان بھی کہ دُنیا کے لئے ایسے طریق سے کام کرو گویا ہمیشہ یہیں رہنا ہے اور عاقبت کے اس طریق سے گویا کل مر جانا ہے۔

ترک دُنیا اور ترک لذّات کے مسائل سے لوگوں کا نقطۂ نظر دُنیا کی طرف متشائم ہو گیا ہے اور وہ زندگی کو صرف وقت گذارنے کا ایک بہانہ سمجھتے ہیں اس سے قسمت اور کرم کے مسائل لوگوں میں پیدا ہو گئے اور وہ اپنی غلطیوں کو درست کرنے کے عوض سب کچھ قسمت اور خدا پر چھوڑ دیتے ہیں۔

صدیوں کی غلامی اور جون سون اور ہواؤں کی بے قاعدگی نے قسمت کا مسئلہ اور بھی زیادہ پیچیدہ کر دیا ہے جس کے ازالے کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم زیادہ سے زیادہ لوگوں میں پھیلائی جائے۔

خلاصۂ سخن

الغرض ہماری معاشرتی زندگی نے ہمارے اقتصادی نظام کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اگر ہم معاشی ترقی چاہتے ہیں تو ہمیں اُس میں ایک یکسر اور عظیم انقلاب واقع کرنے کی ضرورت ہے ہم اپنے مذہب کو جو خدا سے تعلق پیدا کرنا سکھاتا ہے تبدیل کرنا نہیں چاہتے بلکہ اُن رسوم اور تعصبات کو بدلنا چاہتے ہیں جو باہمی ہمدرداری اور اخوت کے راستے میں حائل ہیں ہم مشرقی تمدن کو مغربی تمدن کے طریقے پر نہیں ڈھالنا چاہتے بلکہ اپنی معاشرت اور تمدن کو قائم رکھتے ہوئے صرف اُن قبیح و مذموم رسوم اور طریقہ معاش کے اُن برے اُصول کو رفع کرنا چاہتے ہیں جو ہماری اقتصادی ترقی میں حارج ہیں اور زندگی کے متعلق ہمارے نظریے کو متشائم بنا دیتے ہیں۔

مردِ مضحک

(گذشتہ سے پیوستہ)

(از جناب اسمٰعیل احمد صاحب، سکندرآباد دکن)

(۴)

ہاں تو کچھ معلوم ہوا، کہ یہ کون گروہ تھا جس نے فرار ہوتے ہوئے اس بچے کو بردہ بھر کے اس شکنجے میں چھوڑ دیا تھا۔

یہ مفرورین کہیں "کامپرشیکو" لوگ تو نہ تھے؟

ممکن ہے!

کامپرشیکو کے خلاف جو قوانین شاہِ وقت نے نافذ کئے تھے، اور جن کی زد میں اس مخصوص جماعت کے علاوہ اسی قماش کے دوسرے جرائم پیشہ جتھے بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے ان مجرمین و ملزمین کی دنیا میں اک کھلبلی ڈال دی تھی، اور چاروں طرف اک عالم ہنگامہ برپا کر دیا گیا تھا۔ (؟)

اس گروہِ شیاطین کو بڑی طرح اپنی خیریت منانے کی فکریں لاحق ہو گئیں، کامپرشیکو کا سوادِ اعظم ہسپانیہ بھاگ گیا۔ اس لئے کہ یہی "خاکِ پاک" ان کا اصلی گہوارہ تھی۔

لیکن بوالعجبی دیکھئے کہ جو قانون ان گرفتارانِ بلا (بچوں) کی گلوخلاصی کے لئے وضع کیا گیا تھا اس کا ثمرِ اولین یہ ہوا کہ یہ معصوم بے یار و مددگار رہ جا بجا ماحول کے رحم پر چھوڑ دیئے گئے۔ ؎

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جا
کاش یوں ہی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

لاتعداد بچے تقدیر کے حوالے کر دیئے گئے، جن میں سے بعض تو حکام کو ادھر ادھر سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے مل گئے، اور باقی مفقود الخبر رہے۔ جن کا نہ معلوم پھر کیا حشر ہوا۔

قانون مذکور نے ایک گونہ ناگوار، مضرت رساں صورت پیدا کر دی تھی جس گروہ کے پاس کوئی بچہ ہوتا، وہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا، کسی خاندان میں محض ایک بچے کی موجودگی اُسے ایک مشتبہ گروہ بنا دینے کے لئے کافی تھی۔ صرف اسی "معصوم متاع" پر وہ پولیس کی پرسش و تفتیش کی دار و گیر میں پھنس جاتے۔

جہاں کسی ایسے ویسے مجہول الکیفیت گروہ کو دیکھا۔ اور عمال و محتسبین سرکاری کی زبانوں پر یہ جملہ جاری ہوا، "یہ بھی کامپرشیکو ہی کی طرح معلوم ہوتے ہیں!" —— اور پھر کیا تھا بس اتنے ہی قیاس و احتمال پر حراست و تحقیقات شروع ہو جاتی۔ بعض ایسے لوگ جو محض ناداری کی وجہ سے دربدر پھرتے اور دریوزہ گری کرنے والے تھے ان کی بے نوائی اور پریشان حالی پر بھی آوارہ گردی اور جرائم پیشگی کا اطلاق کیا جانے لگا۔ حالانکہ یہ غریب بالکل ناکردہ گناہ تھے، اور انہیں کامپرشیکو کی جماعت سے کوئی رابطہ نہ تھا، مگر بیچارے قانون کی ہمہ گیری سے اپنی جان لئے لئے پھرتے تھے، کہ بمصداق "ایں ہم بچۂ شتر است" کہیں وہ بھی پولیس کی قید و بند میں نہ لے لئے جائیں۔ بلا امتیازانہ معدلت گستری کا لاوارث لوگ اکثر شکار ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر فلاکت زدہ اور بے خانماں آدمی اس عجیب و غریب قانون کی بے پناہیوں سے ہر لحظہ لرزاں و ترساں رہا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اصلی بانیان کار عموماً گرفت سے بچ جایا کرتے ہیں۔ وہ بروقت خبردار ہو کر اپنی روپوشی و مفروری کا بند و بست کر لیتے ہیں۔ اور قانونی دام سے بیشتر مامون رہتے ہیں کامپرشیکو کا جرم یہ تھا کہ وہ غیروں کے بچوں کو پکڑ لیتے تھے۔ اور پھر اس مال غنیمت کو "مال تجارت" بنایا کرتے تھے، لیکن ہر مرتکب جرم کو کیفر کردار کو پہنچانے کے

علاوہ جوعش نے بکثرت بےگناہوں کو بھی ملوث فرض کرلیا تھا۔ ہر عورت یا مرد جس کی آغوش یا دوش پر کوئی بچہ ہوتا اسی سوئے ظن کا محل قرار پاتا۔ یہ ستم ظریفی اس نوبت تک پہنچ گئی تھی کہ بعض وقت والدین اپنے جگر گوشوں کو اپنی صحیح النسب اولاد ثابت کرنے کی کوشش میں مشکلات میں پڑ جاتے تھے۔

غرض کہ بے ضرر بچہ ایک جانستاں خطرہ بن گیا تھا۔ "اَوْلَادُکُمْ فِتْنَةٌ" ایک زندہ و مشہود حقیقت تھی۔

"تم کو یہ بچہ کہاں سے ملا؟ — بتلائیے اس سہوت کن استفسار کا کیا جواب تھا؟ وہ دلائل دعوے کو پایۂ ثبوت کو پہنچانا کس درجہ دشوار تھا کہ "بچہ ہم کو اللہ نے دیا!" — کس قانون شہادت کی رسائی آسمان کی حدود ارضی تک ہے؟ ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

نتیجہ یہ تھا کہ اس ہر گھڑی کے محاسبہ و مواخذہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے نہ معلوم کتنے صاحبِ اولاد لوگوں نے اپنی گودوں ہی کو خالی کر لیا، کسی ماں نے اپنے لختِ جگر کو کسی جھاڑی میں چھوڑا، اور کسی باپ نے اپنے نورِ نظر کو کسی کنوئیں میں جا چھپایا — اس بار سے سبکدوش ہو کر بھاگنا بھی آسان تھا، اور کسی الزام کی تردید یا کسی دعوٰی کی تائید کا "بارِ ثبوت" بھی اب ان پر نہ تھا۔

بعض بچے حوضوں میں ڈوبے ہوئے ملے۔ بدحواس والدین نے شاید اس چادرِ آب ہی کو تھہ کا میاب پردہ پوش سمجھا تھا۔

لطف یہ کہ انگلستان کی نظیر کی تقلید میں سارے یورپ میں یہ ہوا چل گئی، اور براعظم کے تمام بلاد میں کامپرشیکو کا شکار و تعاقب شروع ہو گیا، ہر ملک کی پولیس اور فوج "بچہ وار" آوارہ گردوں کی پکڑ دھکڑ میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی سابقت کرنے لگی۔

سچ یہ ہے کہ بلی کی گردن میں گھنٹی باندھنا بھی ایک نرالی حرکت ہوا کرتی ہے۔ انسداد جرائم کی ان بلاتمیز سرگرمیوں کا ایک بڑا حصہ بجائے خود ایک قابلِ انسداد قانون شکنی تھی۔

ابھی حال ہی میں کچھ سال ادھر تک۔ یورپ کے مختلف ممالک کے شہروں کے پھاٹکوں پر قوم کامپرشیکو کی تعذیب و تعزیر کے متعلق احکام و فرامین، کتبوں کی صورت میں سنگی لوحوں پر منقوش نظر آتے تھے، ملک کستائل (ہسپانیہ) کا ایک کتبہ آج بھی صفحاتِ تاریخ پر محفوظ ہے۔ مجرمین کے درمیان بعض جزوی اختلاف کی بنا پر جداگانہ تجویزِ سزا میں خاص التزام کیا جاتا تھا، قانونی سلوک کی یہ تفریق "بچے خریدنے والوں" اور "بچے چرانے والوں" کے درمیان خاص طور پر نمایاں تھی۔ سزا کے مختلف مدارج کی رعایت پر سختی سے عملدرآمد کیا جاتا تھا۔ اور قانون وقضا کی ان موشگافیوں کے خلاف ماخوذین کی طرف سے ہرگز کوئی استدلال یا احتجاج مسموع نہ ہوتا تھا۔

آوارہ گردوں میں ایک عالمگیر فرار و خلفشار برپا تھا، وہ ہانپتے ہوئے ایک جگہ سے بھاگتے تھے، اور کانپتے ہوئے دوسری جگہ داخل ہوتے تھے، یورپ کے تمام سواحل پر ان کی نقل و حرکت پر شدید نگرانی رکھی جاتی تھی، اب کسی بچہ کو لے کر جہاز میں سوار ہونا کتنا مخدوش ہوتا، جبکہ صرف کسی بچے کی معیت میں کسی ساحلی شہر میں لنگر انداز ہونا ہی باز پرس کے لئے کافی تھا۔

پس تمام مشکوک و مشتبہ لوگوں کا بچے کے "دُم چھلے" سے پیچھا چھڑانا ہی اک واحد سبیل تمام شکوک و شبہات کے سدِ باب کی تھی۔

ہاں تو کیا اب ہم اس معاملے میں کسی اطمینان بخش نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ جن پراسرار لوگوں نے انگلستان سے روانہ ہوتے وقت ابھی اس بچہ کو پورٹ لینڈ کے ساحل پر چھوڑ دیا تھا، وہ کون مخلوق تھی؟۔

تمام آثار و قرائن کو دیکھتے ہوئے ہم قریباً یکسو ہو کر کہہ سکتے ہیں، کہ وہ "کامپرشیکو" ہی تھے۔

(۵)

شام کے سات بجے ہوگئے، ہوا قریب قریب بالکل ساکن ہو گئی ہے اور یہ اس بات کا پیش خیمہ ہے کہ کوئی نیا طوفان بادِ پردۂ غیب میں ہے، جو چند ساعت کے اندر ظہور کرنے والا ہے۔ وہ بچہ اس وقت کوہستان کی سطحِ مرتفع پر ہے۔ یہ مقام علاقہ پورٹ لینڈ کا وہ موقع ہے، جو اس کا منتہائے جنوب ہے۔

بچے نے اس کوہی بالاخانہ کو ایک وتری خط میں قطع کیا، اس کے بعد دیگرے متعدد اسی شکل کے تختہ نما قطعے اور ملے۔ جن کے درمیان جا بجا دوسری قسم کی زمین کی پٹیاں تھوڑا تھوڑا فصل پیدا کر دیتی تھیں۔ معاً وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اور کچھ سننے لگا۔ پھر اک نیم شعوری انداز میں، ایک غیر محسوس اشارہ پا کر اس نے اپنا رخ پلٹا۔ اور سامنے ایک بلندی کی طرف منہ کر کے اس طرف افتاں و خیزاں چڑھنا شروع کیا، اس کے کان میں ایک خاص آواز پڑی ہے جسے وہ دنیا نے نوا میں کسی دوسری چیز سے تشبیہ دینے سے قاصر ہے، یقیناً

...... بچے کے قیاس و حواس کی شہادت صحیح تھی، چنانچہ وہ شے آنکھوں کے سامنے ہے۔ مگر وہ اب بھی اس کی شناخت و تعبیر سے عاجز تھا، یہ ایک عجیب الصورت و عزیب الہیئت چیز تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تلوار کا ایک بہت بڑا نیام ہے جو ایک زنجیر سے لٹک رہا ہے۔ ہوا کے تھپیڑوں سے جب یہ زنجیر ہلتی ہے تو اس سے اک جھنکار سی پیدا ہوتی ہے۔ یہی آواز دور سے بچے کے گوش زد ہوئی تھی، اور اسی نے اسے آوارۂ جستجو کر کے اس طرف مائل کر دیا تھا۔

اس چیز کی شکل و شباہت کا تعین مشکل تھا، وہ اک ہیولائی تودہ سا تھی۔ جس طرح اک نوزائیدہ بچے کو کپڑے کے ایک بندے سے باندھ دیتے ہیں اسی انداز سے یہ شے بھی لپٹی ہوئی تھی، البتہ وہ پوری انسانی قامت کی طوالت و جسامت رکھتی تھی، اس عالم ہو میں اس ناقابل فہم چیز کی غرابت اور ہیبت المضاعف ہو گئی تھی۔ نیچے کی طرف سے وہ کچھ تار تار سی ہو رہی تھی اور یہ چیتھڑے کم و بیش گوشت کے ریشے سے معلوم ہوتے تھے، لحظہ بہ لحظہ اس شے کی پر اسراری دماغ کو مختل اور دل کو مبہوت کر رہی تھی بعض وقت بچے کی آنکھیں پتھرا جاتی تھیں۔ اور ایک لمحہ کے لئے وہ اپنے سامنے اک بے شکل و بے معنی سی چیز کو پاتی ہیں۔ جو اپنے غیر معمولی عفریتی آثار سے بے حد ہول و ہراس پیدا کر رہی تھی۔ تاریکی نے اُسے اور بھی ناقابل تشخیص بنا دیا تھا۔ بیجان کائنات کے اس حصار میں وہ بھی از قسم جمادات ہی معلوم ہوتی تھی، اس وقت اگرچہ وہ موجوات عالم کی اسی ذیل میں داخل تھی، لیکن ایک وقت وہ اک چلتی پھرتی انسانی ہستی رہی تھی۔

کیا انقلاب ماہیت ہو گیا تھا، طویل گردشِ ایام کی کتنی مہیب "آسیا" نے اس انسانی لاشے کو پیسا تھا۔ فطرت کی اس خلوت گاہ میں نیرنگی وقت کے کتنے مناظر اس نے چشم حال سے دیکھے تھے۔ روز و شب صبح و شام، سپیدۂ سحر و سرخیٔ شفق، غروب آفتاب و طلوع قمر، اجرام فلکی کی انجمن آرائی اور لیلائے شب کی زلف کی درازی۔ ان سب کے نقوش اس تماشگاہ کی لوح نفس پر موجود تھے۔ سیاہ کوہستان۔ وسیع بحر اعظم۔ اور نا پیدا کنار نیلے نیل آسمان، یہ سارے پر شوکت نظارے پیش نگاہ رہے تھے۔ زمستان و تابستان۔ برشگال۔ و امساک۔ شبنم و خورشید سبھی نے باری باری سے اسے اپنا تختۂ مشق بنایا تھا۔ اور ان سارے عوامل طبعی کی کارفرمائیاں اس نعش پر نقش تھیں۔ نہ بدن پر جلد تھی۔ نہ جلد کے نیچے گوشت، نہ گوشت کے نیچے ہڈیاں، نہ ہڈیوں کے اندر مغز استخواں، اک عجیب قسم کی بے گوشت و پوست اور بے گور و کفن میت تھی۔ موت کے بعد قانون فنا جو ہیبتناک عمل "کون و فساد" اپنے زیر زمین "معمل کیمیاوی" (قبر) کے اندر انجام دیا کرتا ہے، وہ سارا نادیدہ و نادیدہ ماجرا یہاں "طشت از بام" تھا۔ یہ منظر ہر دیکھنے والے کو دعوت نظر دیتا تھا، اور ایک مخفی جستجو ہر دل میں چٹکیاں لیتی تھی۔ کہ زمانے یہاں کون سا دہشتناک راز مدفون ہے، اسرار کے سنگین قلعوں کے اندر کبھی کبھی رخنے پڑتے نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ بجائے خود اتنے تیرہ و تار ہوتے ہیں کہ اندر کے محفوظ امانت خانوں کی ایک جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی۔

جس وقت عالم کے عجائبات کی ساری بوالعجبی، اور ارض و سما کے اسرار کی پوری گہرائی اور بے پایانی ہمارے دل و دماغ کی مغلوب و مرعوب ہستی کا احاطہ کر لیتی ہے۔ تو ہم کو حق الیقین ہو جاتا ہے، کہ کائنات کا معما قطعاً لاینحل ہے۔ تمام حقائق راز سربستہ ہیں۔ اور جملہ اسرار سربمہر قدرت کے راز درون پردہ کے پیچھے کسی کی رسائی نہیں۔ ع

پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

(۶)

بچہ اس عجیب و عزیب چیز کے سامنے بالکل ساکت و صامت، مرعوب و مبہوت کھڑا ہوا ہے، یہ استغراقی نظارہ اسے "جنبشِ مژگاں" کی بھی اجازت نہیں دیتا۔

سن شعور کو پہنچا ہوا آدمی اس اعجوبہ چیز کو پھانسی کا لٹکا سمجھتا، اور ایک بچہ اسے کوئی آسیب یا سایہ جانتا، چنانچہ بچہ کے طفلانہ تخیل نے اک عفریتی منظر ہی کو اپنے سامنے زیادہ نمایاں پایا۔ اگرچہ وہ محض ایک انسانی لاش تھی۔ تاہم وہ بالکل یکسو نہ ہو سکا، اور اس شے کی تشفی بخش تعبیر سے ناکام ہی رہا۔

پر اسرار اشیا کی جاذب اشتیاق کشش بھی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ انسان اک غیر شعوری طریق سے "پا بدست دگرے دست بدست دگرے" کا مصداق ہوتا ہے۔ بچے کے دل و دماغ پر بھی یہی واردات و تاثرات طاری ہوئے تحقیق حال کے لئے وہ بے اختیار اوپر چڑھنے لگا۔ اگرچہ اس کا ارادہ اب نیچے اترنے کا تھا۔ اس نے مزید پیش قدمی شروع کی۔ درانحالیکہ اس نے واپسی کی نیت کر لی تھی۔

بشارت آمیز اقدام کرتے ہوئے، اگرچہ ساتھ ہی ساتھ لرزہ براندام نظر آتے ہوئے۔ وہ اس چیز کے بالکل قریب چلا گیا، تاکہ اعتباری مغالطے یا حقیقی مشاہدہ کی قطعی آزمائش کر سکے۔

نعش پر روغن قطران لگا ہوا تھا۔ جا بجا اس میں روشن نقطوں کے روزن سے پیدا ہو گئے تھے، بچے نے چہرے کو شناخت کر لیا، اس پر بھی اک رال کی تہ جمی ہوئی تھی۔ جسم پر لیسدار چپچپی چیز کی، یہ مصنوعی جلدرات کی تاریکیوں میں عجیب عجیب انداز سے جھلکتی تھی۔ بچے نے منہ کو ٹٹولا، جس کے لوازم میں اب صرف اک سوراخ باقی رہ گیا تھا۔ آنکھوں اور ناک کے موقعوں پر بھی دریچے پیدا ہو گئے تھے۔ سارا لاشہ اک موٹے قسم کے جامہ میں لپٹا ہوا تھا۔ اور غالباً اس پر ڈوریاں کس دی گئی تھیں، اس غلاف کو روغن نفط میں غوطہ دے دیا گیا تھا۔ بیرونی پوشش پر پھپھوندی آگئی تھی۔ اور جا بجا سے پھٹ بھی گئی تھی۔ ایک ٹانگ کا گھٹنا ایک جگہ سے نکلا ہوا تھا، اور ایک دوسرے شگاف سے پسلیاں دکھلائی دے رہی تھیں۔ سارا بدن جزءً لاشہ نظر آتا تھا، اور جزءً ڈھانچہ۔

ٹھیک لاش کے قدموں کے نیچے زمین پر دو جوتے پڑے ہوئے تھے۔ جن کو برف و بارش کی "قلعی گری" اور "شوب کاری" نے ناقابل تمیز بنا دیا تھا۔

کرۂ ہوا کے اندر اس تمام اثنا میں اضطراب کے آثار قائم رہے تھے لیکن پے در پے اس موہوم و مبہم تلاطم میں ایک عارضی انقطاع پیدا ہو ہو جاتا تھا۔ یہ تمام علامات ایسی تھیں جو مستقبل قریب میں اک طوفان کی سرگوشی کرتی تھیں۔ تاہم گذشتہ چند لمحوں سے تو ہوا میں پھر بالکل سکوت پیدا ہو گیا ہے چنانچہ نعش کی خفیف جنبش بھی موقوف ہو گئی ہے۔ اور زنجیر اک خط عمودی میں بالکل اس طرح قائم ہو کر رہ گئی ہے۔ جس طرح معماروں کے لنگر کی ڈوری۔

بچہ پھر غرق حیرت ہو گیا اسی حالت میں کہ وہ سر بگریباں تھا کسی چیز نے اس کے پاؤں میں کاٹا، وہ چونکا۔ اور سر اٹھا کر لٹکتی ہوئی لاش کو دیکھا جس کا چہرہ زمین کی جانب نگراں تھا۔ اس چہرے میں آنکھوں کے قائم مقام چونکہ سوراخ تھے، اس لئے بغیر آنکھ جھپکائے بچے سے دوچار معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑی غائر نظروں سے بچے کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس میں دانتوں کی جگہ اک چمک پیدا تھی اور آنکھوں کے محراب نما حلقوں اور کاسہ سر کے دوسرے خلاؤں میں تاریکی نظر آ رہی تھی، یہ چہرہ چشم حال سے "تعبیہ" دیکھتا معلوم ہوتا تھا، اگرچہ اس میں اب آنکھیں باقی نہیں تھیں۔ لیکن بچہ یہی محسوس کر رہا تھا۔ کہ "میرا چہرہ مردے کی بینا آنکھوں کی نظرگاہ ہے" اس واہمے سے اس کا رونگٹا رونگٹا کانپ جاتا تھا۔

ہوا کا اک ناگہانی تیز جھونکا آنے والے طوفان کا مقدمۃ الجیش ہوا کرتا ہے۔ بہت جلد ہوا نے آندھی کی سی حرکت و سرعت و شدت اختیار کر لی۔ اور نعش نے اک کلاک کے لنگر کی طرح دائیں بائیں اپنی وحشت خیز جنبش شروع کر دی۔ طوفانی تھپیڑوں میں مزید غلظت پیدا ہوئی، اور اب نعش صرف ہل ہی نہیں رہی ہے، بلکہ زور زور سے اچھل رہی ہے۔ زنجیر سے پہلے جھنکار پیدا ہوتی تھی، لیکن اب وہ اک معنی خیز طریقہ سے "شور و شیون" کرتی سنائی دے رہی ہے۔

اگر یہ آوازیں زبان حال سے کوئی داد فریاد کر رہی تھیں تو یہ داد و فریاد بہت جلد درِ قبول کو پہنچ گئی۔

بعید ترین افق کی گہرائیوں سے اک شور پیدا ہوا، — ایسا جو کرۂ ہوا میں سرعت و طاقت سے حرکت کرنے والی کسی چیز کی آمد کی خبر دیتا ہے۔

یہ کسی نہ کسی نوع کے پرندوں کے — قوی بال پرندوں کے — بازوؤں کا شور تھا۔

یہ اک طوفانی و عفریتی یورش تھی، جس کا تماشا کبھی کبھی قبرستانوں اور ساحلوں میں نظر آیا کرتا ہے۔

یہ زاغہائے صحرائی کی اک یلغاری پرواز تھی، خراب آباد کے ان پرندوں کے اک جم غفیر نے فضائے آسمانی کو لبریز کر دیا۔ انہوں نے بادلوں کو چیرا، آبی غبار کو چھانٹا، ہوا کو پھاڑا، لحظہ بہ لحظہ ان کی جمعیت و جسامت زیادہ ہوتی گئی، وہ نزدیک آئے، اک گھنا جھنڈ بن گئے، اور پہاڑ کی چوٹی پر اک دریا کے امواج کی طرح آناً فاناً امنڈ آئے۔ یہ گویا کسی منقدم دستۂ فوج کا ناگہانی حملہ تھا، عالم ظلمات کے ان حشرات الارض نے نعش کا نرغہ کر لیا۔

بچہ کانپ گیا۔ اور جھرجھری لیکر ایک طرف کو ہٹ گیا۔

پرندوں نے اس لاشہ نما شئے کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا، ان میں بری طرح چونچیں ہونے لگیں، چیخ پکار، سیٹیاں، بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دینے لگیں، مردہ جسم گویا اک مزار کہنہ تھا جس کے انہدام کا وقت آگیا تھا۔

بچے کے خون کو برفستانی سردی نے بھی اس قدر منجمد نہ کیا تھا، جتنا کہ

ان واردات پر حیرت و ہراس نے اسے ایک جسد جامد بنا دیا۔

ایک لمحہ کے لئے پرندے خاموش ہو گئے، پھر ان میں سے ایک نعش کے عین سر پر جا بیٹھا، یہ ایک صلائے عام تھی، جس پر ساری جماعت نے لبیک کہی، سب کے سب نعش پر ٹوٹ پڑے۔ جو اُن کے ہجوم میں بالکل غرق ہو گئی، کثیر التعداد کالے کوؤں کے بازوؤں سے ایک بادل سا چھا گیا، سیاہ شب کے پردے میں یہ شیاطین "ظلب" پرندے وقف شیطنت تھے۔

ناگہاں نعش میں ایک حرکت سی پیدا ہوئی، یہ تن مردہ کی ایک ارادی جنبش ہے، یا کوئی خارجی محرک مثلاً ہوا وغیرہ کی تحریک۔

واقعہ یہ تھا، کہ طوفان لحظہ بہ لحظہ شدید تر ہو رہا تھا، چنانچہ ایک بار ایک تند جھونکا آیا، ایسا کہ لٹکتی ہوئی نعش نے ایک زندہ جسم کی طرح ایک حرکت کی، گویا کہ وہ اس بے طرح گلوگیری سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہو۔

یہ آندھی سچ مچ اس کی نجات دہندہ بن کر آئی۔

طوفانی کرۂ باد اپنے قوی تھپیڑوں کی پوری قوت آزمائی کر رہا تھا، نعش ایک دہشت ناک طریقہ سے جست وخیز کرنے لگی۔

یہ بے جان نعش، یہ بے گوشت و پوست جسم ایک پراسرار روح کا حامل، اور ایک مخفی قوت کا حامل معلوم ہوتا تھا، ہوا کی کمک پا کر وہ پرندوں سے دست وگریباں ہو گیا، اور ایسا نظر آیا کہ شاید وہ اپنی عقب گذاری کے لئے ان جانستاں دشمنوں کی ہنگامہ آرائی سے بھاگ نکلے گا۔ لیکن اس کی گردن کا آہنی حلقہ اسے گلوخلاصی دینے والا نہ تھا۔

پرندوں نے بھی اپنی نشست وگرفت کو نعش کی حرکات وسکنات کے مطابق بنا لیا، تیز جھٹکے پر وہ اڑ کر علیحدہ ہو جاتے تھے، اور تھوڑی دیر سکون میں آنے پر وہ اس پر پھر آ بیٹھتے تھے، نعش کی لگدکوبی بار بار ان کو جھٹک کر دور پھینک دیتی تھی لیکن ان حرکات مذبوحی سے وہ اس کی جان چھوڑنے والے نہ تھے، کبھی مجبوراً پرے ہٹ جاتے، مگر اولین لمحۂ فرصت میں پھر اس پر آن پڑتے، یہ مردہ جسم ہوا کی مدد پا کر بار بار جوش و غضب میں آتا، اور شش جہت میں دست افشانی و پاکوبی مچاتا، مگر بے سود، بعض دفعہ دیکھنے کو ایسا گمان ہوتا تھا، کہ گویا وہ کوئی موٹا سا لٹھا ہے، جس کی پیہم مار حملہ آوروں پر پڑ رہی تھی۔

نعش پرندوں کے بے پناہ نرغے سے اور بھی پیچ وتاب میں آ گئی وہ مجسم ایک "تازیانہ" بن گئی، اور ان نوچنے والوں پر اس نے ضربوں کی ایک بارش کر دی۔ لیکن اس بلائے بے درماں کے خلاف کوئی چارہ نہ تھا۔

بالآخر یہ شیاطین کچھ تھکتے نظر آئے، اور رفتہ رفتہ انہوں نے فرار کرنا شروع کیا۔

یہ بلا کدھر گئی؟

صرف جہنم کے دروازے ہی ان خون آشام عذابی پرندوں کا خیر مقدم کر سکتے تھے۔

طوفان کی شورش، غارتگر عفریتوں کی بے پناہ یورش، نعش کی نعل در آتش خفیف، وجوشش زنجیر کا نالہ ونالش، شب تار کی ساعات سیاہ منظر کائنات کا ناپیدا کنار بحر ظلمات، اور ایک یکسر فضائے آفات و بلیات۔ یہ سب چیزیں مل کر بچے کے لئے ایک مشہود منظر جہنم تھیں، اس کے سراپا پر ایک رعشہ طاری ہو گیا، بدن کا رونگٹا رونگٹا کانپ گیا، اور جسم کا ریشہ ریشہ لرز گیا، اس کا دل ڈوبنے لگا، اور روح تحلیل ہونے لگی، اس کی آنکھیں پتھرائیں، سر چکرایا، پاؤں لڑکھڑائے، اور قریب تھا کہ وہ تیورا کر زمین پر گر پڑے، کہ وہ دفعۃً سنبھلا، . . . . اس کو اپنے تن بدن کا ہوش آیا . . . . اور اس نے اپنا سفر یاد کیا، جس کے منازل و مراحل کو اس سر نیزہ بولعجبی ماجرے میں گرفتار ہو جانے سے پہلے وہ اس بلند آہنگی اور پامردی سے طے کر رہا تھا۔

معاً وہ پلٹا، اس وحشت زار مقام، اور اس مہیب جہنم کدے میں اب اس کو ایک لمحہ ٹھہرنا دوبھر تھا۔ اس نے کوہستان کے ڈھلان کی طرف رخ کیا، اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، شب دیجور کی وہ "دوزخ روح" اب پیچھے چھوٹ گئی تھی۔

(۷)

بچہ بے تحاشا بھاگا، وسیع وعریض برف پوش میدان اس کی جولانگاہ تھا، وہ یہانتک بھاگا کہ بے دم ہو گیا، اس تیز رفتار فرار نے اس کے بدن کو گرم کر دیا، اس حرارت آفرینی کی اس کو اشد ضرورت تھی، اگر اس غیر معمولی دہشت و وحشت نے اسے بے اختیار رواں دواں اور پرّاں نہ بنا دیا ہوتا تو اس کی رگہائے خون منجمد ہو جاتیں، اور اس کی حرکت قلب مسدود، حرارت وحدت ہی اس وقت اس کی "قوت لا یموت" تھی۔

...آخر بیجاں ہوکر وہ رکا، لیکن اسے پیچھے مڑکر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی، وہ سمجھتا تھا کہ نقش نے اپنی مسلسل جدوجہد سے ایک اپنی زنجیر اور اس کے پھندے سے پیچھا چھڑالیا ہوگا۔ اور غالباً اب وہ بھی اس کے پیچھے آرہی ہوگی، پھر یقیناً وہ سارے نعش خور پرندے بھی نقش ہی کے نقش قدم پر اس کے غیر مختتم تعاقب میں ہوگئے، چنانچہ اگر اس نے پشت کی طرف نظر ڈالی، تو بلاشبہ یہ تمام مناظر پیش نگاہ ہوجائیں گے۔

مقتونا سستا کر اس نے اپنی گریزیا اگریز پیش قدمی کو پھر شروع کیا، میدان میں کوئی نشان راہ دکھائی نہ دیتا تھا، اس لئے کہ برف کی ناپیداکنار چادر نے سارے راستوں کو حرف غلط کی طرح مٹادیا تھا۔ بھاگتے بھاگتے بچہ بلاارادہ شرق کی جانب مڑگیا، نوکدار سنگریزوں نے اس کے پاؤں کو زخمی کردیا تھا، اور اگر دن ہوتا تو نظر آتا کہ خونچکاں تلوؤں نے اس کے خط رفتار کو رنگین بنادیا ہے۔

اس وقت اس کو کچھ ہوش وحواس نہ تھے، یہ سمت رفتار بھی اس نے ایک نیم شعوری حالت میں اضطراراً اختیار کرلی تھی۔ جس سے اگر کوئی مقصود تھا تو شاید یہ کہ ان لوگوں کے گروہ سے پھر بھینٹ نہ ہوجائے جن کے پنجے سے وہ اتفاقیہ طور پر ابھی آزاد ہوگیا تھا۔ اب وہ اس غیر محدود میدان کو شرق سے مغرب کی سمت میں قطع کررہا تھا۔

کامپرشیکو کا وہ جتھا کسی ماہی کشتی یا کسی بلا محصول ناجائز تجارت کرنے والے جہاز میں سوار ہوکر فرار ہوا تھا۔ ان کی منزل مقصود ساحل پورٹ لینڈ کا ایک خاص بندر تھا۔ یہاں ان کا اپنا جہاز ان کی آمد کا منتظر تھا ہوتے اتفاق سے یہ راہ اسی راستے کے خط کو ایک نقطے پر قطع کرتی تھی، جس پر بچہ اب پڑگیا تھا، اس کے پاس اس بے راہ روی کا کوئی علاج نہ تھا، اس لئے کہ ع

نہ کوئی دلیل ورہبر، نہ نشان راہ کا ہے

میدان پورٹ لینڈ میں جا بجا بلند زمینوں کی پٹیاں سی چلی گئی ہیں جو ساحل بحر پر جاکر ختم ہوجاتی ہیں۔ ہمارا گم کردہ راہ خورد سال مسافر ان ہی موقعوں میں سے ایک پر پہنچکر رک گیا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی، کہ کوئی آثار آئندہ منزل کا سراغ بتائیں۔ سامنے اک صاف مطلعے کے بجائے اک غبار آلود افق تھا، بچے نے بغور دیکھا، کہ شاید کوئی روشن نقطہ تاریکی کو مس کرے لیکن اس پر کاوش معائنے سے منظر تاریک تر ہوگیا، البتہ اک پہاڑی کی کی طرح بلند زمین کے دامن میں مشرق رویہ کچھ خاکستری اور کچھ سیاہی مائل دھبے سے دکھائی دیئے۔ یہ علی الترتیب غبار وود کی نمود تھی۔ دھوئیں نے "مشعل راہ" کا کام کیا۔ بچے نے اک منطق صغری وکبری سے یہ نتیجہ اخذ کیا، کہ جہاں دھواں ہوتا ہے، وہ آگ ہوتی ہے۔ اور جہاں آگ ہوتی ہے وہاں کوئی انسانی آبادی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس موقعے کو اک ممکن انسانی آبادی سمجھکر وہ اس کی طرف چل کھڑا ہوا۔

جس بلند زمین پر بچہ گرم رفتار ہے اس کے زیریں حصے میں تھوڑے فاصلہ پر خشکی کا اک آبی کنارہ سا نظر آرہا ہے۔ اس موقع پر چٹانیں کچھ بے شکل سی ہوگئی ہیں، غبار کے حجاب نے انہیں اور بھی مبہم بنادیا ہے۔ اپنی طبعی ہیئت کذائی کے اعتبار سے یہ قطعہ مثل اک "زبان زمین" کے دکھائی دیتا ہے جس سطح مرتفع پر بچہ اب تک گامزن رہا تھا، اب افق سے ہم آغوش ہوا جاہتی ہے، اور ہمارے مسافر کی موجودہ منزل کا منتہا بظاہر قریب آلگا ہے۔

یہ دراصل خاکنائے پورٹ لینڈ کا منظر ہے۔

جس مقام کو بچے کے قدم چند لمحوں میں مس کرنے والے ہیں اس کی جھلکیاں وقتاً فوقتاً نظر آجاتی ہیں۔ وہ تیز رفتاری کے ساتھ بلندی سے اتر رہا ہے۔ کہیں سے جست کرتا ہے۔ اور کہیں سے اپنے جسم کو ٹپکا دیتا ہے۔ ان ہی موقعوں سے گذرتے ہوئے بچے نے کئی دفعہ ٹھٹک کر اک "غزال رمیدہ" کی ادا سے اپنے کان کھڑے کئے۔

الٹے ہاتھ کی طرف دور سے متعدد مخلوط آوازوں کا اک خفیف موہوم اور ناقابل فہم سا شور گوش زد ہوا، یہ اک بوق یا ناقوس کی سی آواز تھی۔

قطب شمالی سے خوفناک باد زمہریر چل رہی ہے، بچے نے دفعتہً ایسا محسوس کیا کہ کسی نے اپنے سرد ہاتھوں کی ہتھیلیاں اس کے رخساروں اور پیشانی سے مس کردیں، یہ برف کی قلمیں تھیں، جو کسی آنے والے طوفان برفباری کی نقیب بن کر پہلے سے نازل ہونا شروع ہوجاتی ہیں، بچہ دیکھتے دیکھتے برف کی براق پوشش میں ملبوس ہوگیا۔ وہ طوفان جس کی تخلیق چند ساعات قبل سطح بحر پر ہوئی تھی، اب رفتہ رفتہ خشکی پر منتقل ہورہا ہے۔ اور عنقریب میدانوں پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے، یہ لمحہ بلمحہ قریب تر ہونے والا طوفان برف وباد گوشۂ شمال ومغرب کی سمت سے خطۂ پورٹ لینڈ میں نزول اجلال کررہا ہے۔ (باقی)

انشائے لطیف پر ایک نظر

(اثر لکھنوی)

(۳)

قربانگاہِ وطن

جناب لطیف کے اس فسانے میں ترک سوالات کی تعلیم اور حب قومی کی ترغیب ہے، اول الذکر ایک خشک و پرخار سیاسی موضوع ہے، مگر لطیف صاحب کی تخئیل اور حسن ادا نے اسے (IDYLL) رومانیت آمیز وقوع یا منظر نگاری کی حد تک دلکش بنا دیا ہے۔

اس کامیابی پر فنی نقطۂ نظر سے ان کو جس قدر سراہا جائے، کم ہے، ترک سوالات بحیثیت ایک مسئلے کے میرے دائرے سے خارج ہے، لیکن اس وجہ سے کہ ایسے فسانے کی تخلیق کا موجب ہوا، اس کے سیاسی پہلو نے خیر و شر یا نفع و ضرر سے خالی الذہن ہو کر بحث ہو سکتی ہے۔

فسانے کا خلاصہ یہ ہے کہ احمد اسمٰعیل نے عہدۂ ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لے کر کوہ سوری کے دامن میں سکونت اختیار کی، ان کے ساتھ ان کی اکلوتی لڑکی تسنیم اور ان کا بھانجا جمالی بھی رہتا تھا، دونوں کو خود انہوں نے تعلیم دی، اوقات درس کے علاوہ یہ دونوں بچے جنگل اور مرغزار کی سیر کیا کرتے تھے رفتہ رفتہ دونوں میں محبت پیدا ہو گئی، باہم عزیز ہونے کے اعتبار سے بھی محبت تھی، اس محبت کو جنسی کشش میں تہذیب اور عفت قائم رکھتے ہوئے بطریق احسن منتقل کرنا ہر فسانہ نگار کے بس کی بات نہ تھی، اور یہ صناعت کی وہ بلند سطح ہے جس کی رسائی لطیف صاحب کو ہندوستان کیا دنیا کے بہترین فسانہ نگاروں میں ممتاز بناتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ مغربی فسانہ نگار رشتے کے بھائی بہن کی باہمی محبت کو شادی یا "عشق" کے درجہ تک پہنچاتے ہیں، ایسا ہوتا بھی ہے تو لڑکی ہدیۂ عشق کو ہنسی میں ٹال دیتی یا صاف الفاظ میں انکار کر دیتی ہے۔ "ہم میں وہ محبت اور گرویدگی ہے جو رشتے کے بھائی بہن میں ہونا چاہیے، یہی کافی ہے اس سے آگے .... اوں ہونہہ!"

یہ غریب کہتا ہے۔

"اچھا کلیرا! تمہاری خوشی مقدم ہے۔ کم سے کم اتنا وعدہ کر لو کہ دوسرے شخص سے شادی کے بعد مجھے اس کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے، اپنے پہلے لڑکے کا نام میرے نام پر رکھنا، اور میں تو کسی دوسری عورت سے محبت یا شادی کر ہی نہیں سکتا، تنہائی کی طویل گھڑیاں ہوں گی، اور میں ہوں گا، اور تمہاری یاد۔"

قضیہ ختم ہو جاتا ہے۔ بعض فسانوں میں یہ بھی دیکھا، کہ انہیں بھائی صاحب نے بہن کا ہونے والے شوہر سے تعارف کرایا، اور ہمت دلائی، ادھر بہن صاحبہ نے اپنی کسی "گوئیاں" کے اوصاف بیان کر کے اور قسمیں دلا کے ناشاد بھائی کو ازدواجی زندگی پر آمادہ یا مجبور کیا، اور انہوں نے اپنی پہلی لڑکی کا نام "کلیرا" رکھا۔

لطیف صاحب کس طرح عہدہ برآ ہوئے، انہیں کے الفاظ میں سنیے

"تسنیم کی عمر کا پندرھواں سال تھا اور جمالی کا بیسواں، یہ دونوں شام کے وقت چشمے کے کنارے ایک گھنے درخت کے محبت طلب سائے میں بیٹھے ہوئے پانی کے اندر اپنے عکس توام کے تماشے میں محو تھے، اور وہاں سے آنے

کے بعد گویا ان دونوں کا نطق زائل ہوگیا تھا، گویائی گم ہوچکی تھی۔ انہوں نے پانی کی تہ میں سے محبت کے دیوتا کا پراسرار مجسمہ نکال کر اپنے عمق دل میں قائم کرلیا تھا۔۔"

خط کشیدہ جملے اس قدر بلیغ و پرمعنی ہیں کہ ان کی داد دینا مشکل ہے، اگر محبت کے معصوم اور روحانی پہلو کا اظہار شاید ہی اس سے بہتر طریقے سے ممکن ہو۔

ادھر ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی، ادھر تسنیم و جمال کے جذبات محبت نے پلٹا کھایا، ترک موالات میں قربانی مضمر ہے۔ سچا عشق یکسر قربانی ہے تسنیم کو آرزو ہوئی کہ جمالی کو خدام وطن کی صف اول میں دیکھے، جمالی خود تیار تھا تسنیم کا اشارہ پاکر مردانہ وار میدان عمل میں کود پڑا، ان دونوں کی قربانیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ضعیف العمر احمد اسمٰعیل جو اب تک اعتدال پسند تھا پنشن اور خطاب سے دست بردار ہوکر تارک موالات ہوگیا۔

لطیف صاحب کے دوسرے فسانوں کی طرح یہ فسانہ بھی ادبی لطافتوں سے مالامال ہے، پچھلے کسی فسانے کے سلسلے میں اس امر کی طرف اشارہ کرچکا ہوں کہ لطیف صاحب الفاظ کے نازک فروق مفاہیم ادا کرنے میں کتنی احتیاط برتتے اور سعی و کاوش سے کام لیتے ہیں۔ جس کی بنا پر بعض جملوں کی بظاہر غلط نحوی ترکیب یا غرابت دراصل ایک معنوی اضافہ ہوتا ہے۔ اس فسانے میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں۔

۱۔ تسنیم نے چشم گہربار کے ساتھ کہا:"

بادی النظر میں اس جملے کی ساخت انگریزی معلوم ہوتی ہے، اور تکلف و تصنع پایا جاتا ہے۔ سیدھی سی بات تھی، "تسنیم نے آبدیدہ ہوکر کہا" مگر نہیں! لطیف صاحب کا یہ مطلب ہے کہ ادھر تسنیم کی چشم گہربار زبان حال بنی ہوئی تھی، اُدھر تسنیم الفاظ میں اپنے خیالات و جذبات کی ترجمانی کر رہی تھی۔ یقیناً یہ انداز بیان جتنا غیر معمولی اتنا ہی بلیغ ہے۔

۲۔ "تم سے اس زندگی میں دوبارہ ملنے کی امید اگر چاہتی بھی ہوں تو میرے دل میں پیدا نہیں ہوتی"

لفظ امید کا نا درصرف تعریف سے مستغنی ہے، یہاں لفظ امید محبت مایوسی اور حرماں کی ایک خوں چکاں داستان ہے، جو کچھ بیان کرتے چلے جایئے، اس جملے کے مطالب محتاج شرح رہیں گے، سامنے کا لفظ "آرزو" یا "تمنا" تھا۔ مگر اس کے ساتھ جملہ پڑھیے، جسد بے روح معلوم ہوگا۔

ایسی مثالوں کے پہلو بہ پہلو خامیاں بھی نظر آئیں، جن کا اعلان میرا فرض ہے۔

۱۔ ایک جگہ ایک گھنے درخت کے سائے کو "محبت طلب" کہا ہے، یعنی ایسا سایہ جو محبت کا خواستگار ہو۔ ظاہر ہے کہ سایہ محبت طلب نہیں ہوتا، البتہ دو شخصوں کے جذبات محبت کو اپنے پرسکون آغوش میں اس مشابہ شکر کیفیت میں منتقل کرسکتا ہے جس کی خصوصیت ہے:

"خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ"

یا ایسی مکمل خاموشی کہ دل کے دھڑکنے کی صدا سنائی دے۔

منظر اور اس کے پراسرار اثرات کو ملحوظ رکھتے ہوئے "طلسمی سایہ" شاید بیجا نہ ہوتا، "محبت طلب سایہ" اظہار مفہوم میں قطعاً عاجز ہے۔

۲۔ "اور آخر کار یہ ابر اب نیچا ہونا شروع ہوا۔ اور ان کے مطلع خیال پر محیط ہوگیا"

خط کشیدہ الفاظ نہ صرف زائد بلکہ عبارت کے زور اور روانی میں مخل ہیں۔ "محیط ہوگیا" سے "چھاگیا" کہیں بہتر تھا، "چھاگیا" میں محاورے کے لحاظ سے تسلط کا مفہوم مضمر ہے۔ "محیط ہوگیا" اس نزاکت سے معرا ہے۔ "ابر اب" میں تنافر بھی ہے۔

۳۔ "احمد اسمٰعیل ...... اعتدال پسند خیالات کا آدمی تھا" موجودہ صورت میں "اعتدال پسند" "خیالات" کی تعریف ہوتی ہے، حالانکہ یہ امر بدیہی ہے کہ خیالات اعتدال پسند یا انتہا پسند نہیں ہوتے، بلکہ لوگ ہوتے ہیں۔ لہذا یوں کہنا چاہیئے تھا "احمد اسمٰعیل اعتدال پسند طبقہ کے خیالات کا آدمی تھا"

۴۔ "تسنیم سہمی ہوئی تھی، اور اپنے اس خطرے کی بار بار تکرار کر رہی تھی، جمالی نے اُسے نسوانی کمزوری خیال کیا، وہ عورت کے اُن حسیات سے باخبر نہ تھا، جو واقعات مستقبل کو معلوم کرلیتے ہیں۔ اور تسنیم سے خطرات کا بظاہر اسے کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔ اس لئے وہ ہنستا تھا اور تسنیم اور زیادہ مغموم ہوتی تھی۔

کاش لطیف صاحب اس نازک فرق کو ملحوظ رکھتے، جو ہنستا تھا اور ہنس دیتا تھا میں ہے۔ ایک سے حقارت یا مضحکہ کا اظہار اور دوسرے سے خطرات کو اہمیت نہ دینے کا مفہوم ادا ہوتا ہے اور یہی ان کا مقصود تھا۔

۵۔ "لیکن تسنیم کی خواہش تھی کہ وہ (جمالی) قوم و وطن کا حق ادا کرکے سرخرو ہو اور وہ چاہتا تھا کہ تسنیم کی رضامندی حاصل کرے"

سیاق عبارت سے ظاہر ہے کہ رضامندی کی جگہ "خوشنودی" چاہیئے، رضامندی کے معنی ہیں اجازت یا منظوری جس کا محل نہیں۔

مناظرِ فُرات

یہ چند بند میرے بنایت قدیم اور بیحد مخلص مگر بزامش دوست حضرت آشفتہ نے اپنے ایک بنایت کامیاب نئے مرثیے سے نقل کرکے مرحمت فرمائے ہیں، جو شکریے کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔ (جوش)

لہروں کی وہ تڑپ وہ لبِ جُو وہ سبزہ زار گرتے ہوئے بلند کگاروں سے آبشار
اک ایک شاخِ گل پہ قیامت کا وہ نکھار وہ سُرخ و سبز پھولوں پہ چھائی ہوئی بہار
وہ رنگ عکسِ چرخ سے دھانی فرات کا
سبزے کی کروٹوں میں وہ پانی فرات کا

چھلکی ہوئی فرات کا اللہ رے بناؤ پیاسی نظر نثار وہ بے ساختہ بہاؤ
لہروں کی مست چال سے بھرتے ہیں دل کے گھاؤ ہوتا ہے دیکھ دیکھ کے ٹھنڈا لہو کا تاؤ
موجوں کا رنگ کرتا ہے دھیمی نظر کی آگ
ہوتی ہے سرد دیکھ کے پھنکتے جگر کی آگ

کاہی ہے عکسِ آب سے ضَوِ آفتاب کی لگتی ہے خود نظر نظرِ انتخاب کی
سرخی جہاں پہ ملتی ہے خود روگلاب کی کیا پُر بہار بنتی ہے چادر سحاب کی
گرتی ہیں سُرخ و سبز شعاعیں محیط پر
ہیں جدولیں دھنک کی فضائے بسیط پر

کلیاں سفید ہیں تو شگوفے گلابی ہیں کچھ پھول سرخ سرخ ہیں کچھ پھول آبی ہیں
افشانی گل کہیں تو کہیں آفتابی ہیں پانی میں جو کھلے ہیں وہ سارے جوابی ہیں
آئینہ سطحِ آب ہے اور لالہ زار ہے
سچ تو یہ ہے بہار کے اندر بہار ہے

وہ مست، بادہ خوار کی صورت سے ڈالیاں گرتی ہیں جھوم جھوم کے عشرت سے ڈالیاں
کھاتی ہیں جھونک پھولوں کی کثرت سے ڈالیاں سبزے پہ لوٹتی ہیں نزاکت سے ڈالیاں
پھولوں کو جب کلی کوئی الزام دیتی ہے
اک ایک موج دوڑ کے منہ چوم لیتی ہے

بیلوں کی دوڑ دھوپ کچھ ہے عجب بہار قابو ہر ایک چیز پہ ہر شے پہ اختیار
بلبل کو اعتماد تو گلچیں کو اعتبار یہ گل گلے کا ہار تو وہ شاخ درکنار
جانِ بہار و رنگِ گلستاں بنی ہوئی
لپٹی ہوئی جگر سے رگِ جاں بنی ہوئی

اٹھتی ہے سطحِ آب سے چادر جو آب کی کرتی ہے زرنگار کرن آفتاب کی
تاروں میں کب یہ شان بھلا آب و تاب کی ہر پھر کے پڑ رہی ہے نظر انتخاب کی
اک سطحِ نور ہے کہ بلندی پہ جاتی ہے
اک چادرِ ضیا ہے کہ لہرا کے آتی ہے

مَوجوں پہ کروٹیں نگہ شوق کھاتی ہے　　لچتا ہے دِل جو بڑھ کے کوئی لہر آتی ہے
اِٹھلائی چال چلتی ہے شیدا بناتی ہے　　اک اک ادائے ناز قیامت ہی ڈھاتی ہے

ہیں دل میں کون کون سے پہلو ملال کے
کیوں کر کوئی دکھائے کلیجہ نکال کے

موجوں سے جب ہوا کے تھپیڑے گزرتے ہیں　　کیا کیا نہ سطح آب پہ موتی بکھرتے ہیں
بن کر حباب یہ جو لبِ جو اُبھرتے ہیں　　ارمانِ شرحِ حسرتِ دیدار کرتے ہیں

ہیں بیخودی سے دل کی طنابیں تنی ہوئیں
تصویرِ اضطراب ہیں لہریں بنی ہوئیں

کرتی ہے موج، موج کے آئینہ میں سنگار　　سجتی ہے یا بہار کے آغوش میں بہار
اس کو یہاں قرار نہ اُس کو وہاں قرار　　بن بن کے کیا بگڑتی ہے دُنیائے اِعتبار

جب جوش میں گلے سے ملی ایک ہو گئی
کھویا اُسے بھی آن کے اور خود بھی کھو گئی

کیوں کر نہ بیقرار بنے دِل جگر کے ساتھ　　کھلتا ہے رنگ پھولوں کا ذوقِ نظر کے ساتھ
پڑتا ہے ہر جمال کا پَرتو اثر کے ساتھ　　آئینہ ناز کرتا ہے آئینہ گر کے ساتھ

سب لطف ہیں سکوں ہے اگر قلب زار میں
پھنکتا ہے دِل تو آگ لگی ہے بہار میں

آشفتہ لکھنوی

اخبارِ اُردو

ملّا رموزی

ہندوستان کے "انگریزی یافتہ حضرات" جنھیں عموماً اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کہا جاتا ہے یورپی اقوام کی نقل اُن کی تقلید اور اُن کی مثالوں سے اپنی زندگی کو سنوارنے کے عادی ہیں۔ اس لئے ایسے بہن بھائیوں کو معلوم ہونا چاہئیے کہ یورپی اقوام میں ترکی، جرمن اور اٹلی والوں نے اپنی اپنی ملکی اور مادری زبانوں کی حفاظت میں اس حد تک اہتمام کیا ہے کہ دوسری غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنی زبان سے "جلاوطن" کر دیا ہے، اور ان ممالک میں اب "نئی اولاد" کے نام تک اُنہی کی مادری زبان سے رکھے جاتے ہیں۔

یہ تو متمدن، ترقی یافتہ، اور آزاد اقوام کا عمل تھا، لیکن اب ایشیا ہی کی بعض ایسی اقوام کو لیجے جن کی ذہنی، علمی اور سیاسی بیداری کو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے ہیں، مگر وہ ہیں کہ دوسری تمام سیاسی و ذہنی تحریکات کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان کی حفاظت، اشاعت اور اُس کی ترقی کے لئے کافی سے زیادہ حد تک مصروفِ عمل ہیں۔ چنانچہ مملکتِ عالیہ ایران اور دولتِ اسلامیہ عراق میں خبر رسانی کا تار بھی فارسی اور عربی زبان میں ہوتا ہے۔

اب اخبار "خلافت" بمبئی ۲۷ر فروری ۱۹۳۶ء کے صفحہ ۴ کالم ۴-۵ پر یہ خبر ملاحظہ ہو کہ

"ٹیونس میں ایک ایسا قانون نافذ ہو رہا تھا جس کی رُو سے انتظامی عہدوں کے امیدواروں کے لئے فرانسیسی زبان سے واقف ہونا لازم قرار دیا جائے گا۔

اِس قانون سے جامعہ زیتونیہ میں سخت ہیجان برپا ہے اور اس قانون کے خلاف نفرت و حقارت کی وجہ سے جلسے ہو رہے ہیں، جن کے سلسلے اشتراکیوں اور قوم پروروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے، اِن کے علاوہ بہت سے طلبہ کو جلا وطن کر دیا گیا ہے، اور اس تحریک میں بہت سے حصہ لینے والوں کو جنوب کے فوجی علاقہ میں بھیجدیا گیا ہے۔"

ظاہر ہے کہ ٹیونس کے مسلمان بھی ایک یورپی قوم کے، فدوی، غلام، نمک خوار، نمک پروردہ، دعاگو اور وفاکیش ہیں، مگر اپنی مادری زبان کی حفاظت میں اُنھوں نے لات، جُوتی، گھونسے، ڈنڈے، طمانچوں، چانٹوں، دنگل، لٹھ بازی، قتلِ عمد، اقدامِ قتل، اور قتلِ عام تک معاملہ کو پہنچا دیا، اور نتیجے میں گو جلا وطن ہو گئے اور فوجی علاقہ میں نظر بند، مگر اپنی مادری زبان کی حفاظت سے باز نہ آئے، اب زبان کی محبت میں اِس حد تک کی قربانی پر نظر ڈالیے اور پھر ذرا اپنے ہندوستان کے بی اے زدہ حضرات اور "حضراتیوں" کی اُردو سے نفرت ملاحظہ ہو!

مادری زبان کی حفاظت میں ایک ایسی قوم کا تذکرہ تھا جو ہندوستان سے قدرے دُور اور باہر ہے، لیکن خود ہندوستان کے اندر ہندی زبان کی حفاظت کرنے والوں کا عمل مُلاحظہ ہو، چنانچہ ۸ر مارچ ۱۹۳۶ء کے اخبار "حریت" لاہور کے صفحہ ۷ کالم ۴ پر یہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ

"ہندی اور گورمکھی کے حامی ارکان مجلسِ قانون ساز صوبہ سرحد کی مجلس کے اجلاس میں اِس مرتبہ بھی بطور احتجاج شریک نہ ہوں گے۔"

صوبہ سرحد میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے پر ہندی کے حامیوں نے جس سرگرم اور

متفقہ جدوجہد یا اُردو کی مخالفت کا کام کیا ہے وہ اُردو کی حمایت کرنے والوں کے حق میں عبرت کا بہت موثر سبق ہے، اگر وہ اس ضرب کو محسوس کریں؟

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

لیجے ایک اور ملاحظہ فرمائیے، یعنی اب تک ہندی اور اُردو کا معاملہ تھا اب ایک ایسی زبان کی بھی سُن لیجے جسے اگر جناب جوش ملیح آبادی ایسے شگفتہ نگار ادیب سُن لیں تو میں دن تک ایک مصرعہ موزوں نہ کرسکیں، یعنی مرہٹی زبان، چنانچہ اخبار "خلافت بمبئی" مورخہ ۲۰ فروری ۳۶ء کے صفحہ ۸ کالم ۳ پر لکھا ہے کہ

"ناسک میں ہندی کُتب خانے اور ہندی دارالمطالعہ کا
افتتاح کرتے ہوئے سری شنکر اچاریہ نے مرہٹی زبان میں تقریر
کی، اور فرمایا کہ مرہٹی زبان کوئی فصیح زبان نہیں ہے، یہی سبب
ہے جو میں ہندی زبان سیکھنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔
ہندی اب ہندوستان کی قومی زبان ہوتی جاتی ہے چونکہ
ہندوستانی عموماً اور ہندو خصوصاً متعدد زبانیں سیکھ لینے
کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لئے بحالتِ موجودہ ہندوؤں
کو چار زبانیں سیکھنا چاہیئے۔ ایک تو اپنے صوبے کی مادری،
دوسرے سنسکرت، تیسرے ہندی زبان اور چوتھے انگریزی
جو بین الاقوامی مسائل کے لئے ضروری ہے"

گویا اچاریہ جی کے خیال میں زبان اردو کی کوئی ضرورت ہی نہیں، بس سنسکرت، ہندی انگریزی اور مرہٹی ایسی "ہر بونگ" قسم کی زبان، ہی کافی ہے، اب معلوم نہیں کہ موصوف کے نزدیک وہ کونسا صوبہ ہے جس کی مادری زبان اُردو ہوگی، کیونکہ صوبجات متحدہ تک میں "اچاریہ وضع کے ہندو بھائی"، ہندی ہی کو صوبہ کی مادری زبان قرار دیتے ہیں، لہٰذا اس حساب سے اب مرہٹی کے بعد جو ہندوستانی بھی اُردو سیکھے وہ بیوقوف اور اس کا------ ---------- بے وقوف؟

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

ہندو مسلم فسادیا ہندو مسلم سوال کے سلسلہ سے ہندو مسلمانوں میں جن مشہور و معروف حضرات کا اسمِ گرامی عوام و خواص کی زبانوں پر ہے اُن میں قبلہ گاہی پیر و مرشد پرمانند بھائی کے رُتبۂ رفیع اور پایۂ بُلند سے کسی کو انکار نہیں۔ پس ممدوح نے اور معرّ اُدمعر بلکہ اجمیر شریف کے بیچ میں ایک گُل ہندی زبان کے حق میں بھی کھلایا ہے جس کی تجویز کی پنکھڑیاں ملاحظہ ہوں، یعنی اخبار "تیج دہلی" مورخہ ۹ مارچ ۳۶ء کے صفحہ ۹ کالم ۱ پر لکھا ہے کہ

"راجپوتانہ ہندو سبھا اجمیر نے حکومتِ ہند سے مطالبہ کیا ہے
کہ آئندہ نئے بادشاہ کے روپیہ پر لفظ" ایک روپیہ "ہندی
زبان میں ہو"

اس تجویز پر اخبار "حریت لاہور" نے لکھا ہے کہ پرمانند بھائی کو چاہیئے کہ وہ اس مجلس سے یہ تحریک بھی پیش کریں کہ چونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کی کثرت ہے لہٰذا نئے بادشاہ کا ایک نام ہندوانہ بھی ہو۔ زیادہ ادب۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

ہندی کی حمایت کی ایک اور ملاحظہ ہو، چنانچہ انگریزی اخبار بمبئی کرانیکل مورخہ ۲۳ فروری ۳۶ء میں ہندی کے چند مدارس کا اعلان ہوا ہے جو ریل کے مقامات پر کھولے جائیں گے۔

نیو بیٹ واڑی ہندی مہلا سماج کے دفتر میں ابتدائی تعلیم کے لئے۔
موڑ ہاؤس ہورنجز روڈ پر۔ گاندھی سیوا اسینا میں وغیرہ۔

اس سلسلہ سے اخبار "مصور بمبئی" مورخہ ۸ مارچ ۳۶ء کے صفحہ ۵ پر جو مقالۂ افتتاحی لکھا ہے اُس میں ایک حامیٔ ہندی کی تقریر کا زورِ شور ان الفاظ میں دکھایا ہے کہ آپ نے تقریر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

"شہر بمبئی میں دو لاکھ انسان ہندی زبان بولتے ہیں، ان کے لئے
ہندی زبان کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے"

یہ مدسے سوا مختصر اطلاعات اور تحریکات ہیں، ہندی زبان کی ترقی حفاظت ترویج و تشویق کی، جن میں زیادہ حصہ ایسا ہے جس میں ہندی کے حامی عملاً متحد اور مصروف نظر آتے ہیں، لیکن اس کے مقابل زبانِ اُردو کے لئے جو کچھ ہورہا ہے وہ صرف اخباروں اور رسالوں کے صفحات تک محدود ہے، اور خال خال ہی ایسی اطلاعات ہیں جن سے اُردو کے حامی عملی صورت سے کچھ کرتے نظر آتے ہیں، بس حد ہے کہ جب ہمارے آپ کے خواجہ حسن نظامی قبلہ اُردو کا جھنڈا لے کر رنگون تک گئے اور اب جو اس باب میں چُپ ہوئے ہیں تو اس حد تک گویا کسی غریب آدمی کو سی۔ آئی۔ ڈی۔ والوں نے ڈانٹ دیا ہو کہ خبردار سیاسی تحریکات میں حصہ نہ لینا، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

اب نام خدا اُردو والوں کا "دیگر احوال" ملاحظہ ہو، چنانچہ اخبار "خلافت بمبئی" مورخہ ۲۰ فروری ۳۶ء نے بعنوان "ہندوستانی صحافت" جو مقالۂ ادیری

شائع کیا ہے اُس میں لکھا ہے کہ

"ہندوستان میں انگریزی اخبارات نسبتاً بہتر حالت میں ہیں لیکن جو اخبارات مقامی زبانوں میں نکلتے ہیں اُن کی حالت بہت ابتر ہے۔ اس لئے کہ اول تو ہندوستان میں لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے، دوسرے جو یورپ زدہ ہیں وہ اپنی مادری زبان کے اخباروں کا پڑھنا معیوب سمجھتے ہیں، اور انگریزی اخبارات کا مطالعہ اُن کے نزدیک منجملۂ واجبات ہے۔ یہ غلامانہ ذہنیت ہے، پس جب تک ہندوستانی لوگ اپنی مادری زبان میں اخبار بینی کا ذوق پیدا نہ کریں گے۔ ہندوستانی صحافت کی ترقی ناممکن ہے"

یہ پہلی صورت ہے اُردو کی کس مپرسی کی کہ اُردو کا ایک جلیل القدر اخبار، اُردو والوں ہی کو رو رہا ہے اور وہی رونا جو مُلّا رموزی ۱۹۲۹ء سے رسالہ "مخزن لاہور" میں رو رہا ہے۔ یعنی اُردو سے اُردو والوں ہی کی نفرت اصل میں سبب یا اثر ہے اُس نصاب تعلیم کا جس میں یورپ پسندی کی وہ درجہ اوّل کی افیون ملا دی گئی ہے کہ جس ہندوستانی نے آٹھویں جماعت تک بھی انگریزی پڑھی نہیں کہ کچھ بھی نہیں تو کم سے کم وہ اُردو کے عوض اپنا نام اور دستخط اور تاریخ تو انگریزی ہندسوں ہی میں کرتا ہے اور "عورتوں والے بھائی" معاف فرمائیں تو میں عرض کروں گا کہ اب تو نیم انگریزی داں عورتیں بھی انگریزی ہی میں دستخط اور تاریخ ارقام فرماتی ہیں، اور انگریزی دستخط کے عوض نشانِ انگشت سے کام لے لیتے ہیں بے چارے مُلّا رموزی :

کیونکہ مجبوب بے چارے مُلّا رموزی کے نزدیک انگریزی دستخط سے یہ بہتر ہے کہ ہندوستانی تعلیم یافتہ لوگ کاغذات پر انگوٹھے کا نشان ہی لگا دیا کریں کہ اس طرح اُردو میں انگریزی الفاظ تو آمیختہ اور کوفتہ بخیتہ نہ ہوں!

اب اُردو کے حق میں ایک خان بہادری ترکیب ملاحظہ ہو، چنانچہ اخبار "انقلاب لاہور" مورخہ ۲۵ رفروری ۱۹۳۶ء کے صفحہ ۳ کالم ۲ پر لکھا ہے کہ

"خان بہادر سردار حبیب اللہ خاں نے پنجاب کی مجلس قانون ساز کے آئندہ اجلاس میں یہ تجویز پیش کرنے کی ٹھان لی ہے کہ پنجاب میں سرکاری عدالتوں کی زبان سلیس اُردو ہو اور رسم الخط رومن کر دیا جائے۔ اس سے ایک تو زبان کی بحث کا خاتمہ ہو جائے گا، دوسرے مغرب کی مہذب و متمدن قوموں کے ساتھ یگانگت پیدا ہو جائے گی"

اس تجویز پر اخبار مذکور نے لکھا ہے کہ مسلمان اُردو کے لئے رسم الخط کی تبدیلی کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے جبکہ اُن کا تمام مذہبی ذخیرۂ تحریر اسی رسم الخط میں ہے جو آج رائج ہے، دوسرے یورپی قوموں سے یگانگت کا خیال بھی اس لئے بیکار سی بات ہے کہ خود یورپ میں متعدد اقوام کا رسم الخط مشترک ہے، مگر اُن میں خود یگانگت کا پتہ نہیں۔ نیز پنجاب میں ہر قوم کو اپنے مذہبی ذخیرۂ تحریر سے گہری وابستگی ہے اس لئے کوئی ایک قوم بھی اس رسم الخط کو پسند نہ کرے گی لہذا سردار صاحب کی یہ کوشش ناکامیاب رہے گی۔

اخبار مذکور کے بعد اس تجویز پر دوسرے پنجابی اخباروں نے بھی مخالفانہ خیالات کا اظہار کیا ہے، اُن میں اخبار "حریت" لاہور مورخہ ۲۳ رفروری ۱۹۳۶ء نے اپنے ایک ذیلی مقالہ میں نہایت درجہ "مولویانہ اردو" میں اس تجویز کا یوں مذاق اُڑایا ہے کہ

"اول تو پنجاب کے ساتھ پنجاب کی یگانگت کے لئے ایسی قطعی ضرورت کے احساس سے بھی قاصر ہیں کہ یوپی، بنگال، بمبئی، مدراس پرے کو دھکیل کر یورپ کے ساتھ یگانگت کا ساز باز شروع کر دے۔

لیکن اگر اس اقدام میں کوئی وجہ استحسان تاویل و توسل کی زبان سے منصۂ ظہور پر آ بھی جائے تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ صرف رومن رسم الخط کا ظاہری لباس مشرقی و مغربی زبان کی باہم فطری بیگانگی کے ارتفاع کے لئے کس طرح مؤثر ہو سکتا ہے! بلکہ اس سے مشرقی زبان کی اس ثقافتِ دیرینہ کو صدمہ پہنچے گا جس کے ساتھ مشرقی رجحانِ فکر و وجدان طواطف کی بہترین روایات مربوط ہیں"

مذکورہ بالا عبارت میں جو عربی فارسی استعمال کی گئی ہے وہ بجائے خود رومن رسم الخط ہے، اور ایسی سلیس اُردو سے تو بہتر ہے کہ اس موقع پر اُردو کے لئے "عربی رسم الخط" کا سوال بھی اُٹھا دیا جائے۔ الحاصل یہ تجویز ابھی دماغوں میں گھوم رہی ہے، چونکہ

ہند اور قومیات کے لوازم سے بے خبر اور صرف جدید تعلیم کے مارے ہوئے ہیں، ورنہ ہندوستان کی آزادی کے پہلے یورپ کی اقوام سے ہندوستانیوں کی یگانگت ایک ایسا مضحکہ خیز المیان ہے کہ اس پر جس کا جی چاہے زور سے قہقہہ لگائے۔

حق تو یہ ہے کہ بی اے پاس ہوتے ہی ہندوستانی آدمی یورپ پسندی کا جو نمونہ بھی تیار کرتا ہے اُس سے اس تعلیم کا "اول فول پن" زیادہ ہی نمایاں ہوتا ہے، مگر مصیبت تو یہ ہے کہ غیر بی اے حضرات بھی اپنی مرعوبیت سے بی اے پاس لوگوں ہی کو "اعلیٰ تعلیم یافتہ" کہتے ہیں۔ حالانکہ اُن غریبوں سے بین الاقوامی مسائل بھر تو ایک طرف اُن کی ذاتی زندگی کی ترتیب و تہذیب تک کی امید نہیں، ورنہ یہ خط سے ایک سراپا غلام قوم کی یورپ والوں سے یگانگت معلوم!!!

〰〰〰〰〰

ہندوستانیوں میں وہ ہندوستانی بے حد لائق قدر و احترام ہیں جو اُردو ہندی کے جھگڑے کو نہایت درجہ شائستہ دوستانہ اور خالص علمی و عقلی دلائل سے چکا دینا چاہتے ہیں۔ ایسے حضرات میں شاید مسلمانوں کی تعداد ہی زیادہ ہے، کاش یہی طریقہ ہندی کے حامی اختیار کریں تو یہ "ہندی اُردو فسادات" آج کافور نظر آئیں، جیسا کہ اخبار "انقلاب لاہور" مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۶ء کے صفحہ ۲ پر حضرت محترم مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب دانا پوری کا ایک طول طویل مضمون بعنوان "اُردو اور ہندی کے اختلاف پر محققانہ بحث" شائع ہوا ہے، اس کی سطر سطر سے ہندی زبان کے مقابل دوستانہ لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے نہایت اعلیٰ درجہ علمی اصول سے اُردو کی فوقیت ضرورتِ سلاست اور دوسرے محاسن کو ثابت کیا گیا ہے، چونکہ مضمون بہت زیادہ طویل ہے اور "کلیم" کی لکھائی چھپائی دوربین سے پڑھنے کے قابل "مہین" "لاغر" اور دُبلی پتلی ہے اس لئے اُس کا خلاصہ بھی مناسب نہیں، بار ضرورت ہے کہ ایسے مواقع پر مولانائے موصوف کا انداز خطاب و کلام اختیار کر کے اُردو کی اہمیت کو واضح کیا جائے۔

〰〰〰〰〰

میرے نزدیک اُردو کے اخباروں اور رسالوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے صفحات میں اُردو کی حمایت، حفاظت، ترقی، اور تبلیغ پر کافی مضامین لکھتے رہیں، تاکہ اُن کے خریدار اُردو کی ضرورت اور خدمت پر متوجہ رہیں، لیکن بدقسمتی سے اُردو کے اخبارات اور رسالے وہی لوگ نکال رہے ہیں، جو خود انگریزی زدہ ہیں اور اپنی زندگی کے ہر حصہ میں اُن کے ہاں انگریزی رچی ہوئی ہے، چنانچہ اُردو کے اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹروں کے ذاتی خطوط کی پیشانی پر اُردو کے عوض انگریزی کی مطبوعہ عبارتیں ہوتی ہیں، یعنی اُن کا اخبار اُردو میں ہوتا ہے، مگر اخبار کے خطوط کی پیشانی پر اس اخبار کا تعارف اور پتہ اور تاریخ انگریزی میں، اس لئے اُردو کے اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر زبانِ اُردو کی حمایت وغیرہ میں اُسی وقت ایک آدھ مضمون لکھتے ہیں جب اُردو پر لوٹنے کی طرح کا کوئی بہت بڑا بھونچال آجائے، اس کے بعد اُردو کے اخباروں اور رسالوں میں ایڈیٹر کے قلم کا ایک مضمون بھی نہ ملے گا۔ البتہ اُن کے صفحات میں کبھی کبھار دوسرے حضرات جو کچھ لکھ دیتے ہیں، اُن میں سے اخبار "ہمدم" لکھنؤ مورخہ ۹ مارچ ۱۹۳۶ء کے صفحہ ۷ کالم ۲ پر ایک مضمون بعنوان "زبان اُردو کیسے ترقی کر سکتی ہے" شائع ہوا ہے، اس کا پہلا حُسن تو یہ ہے کہ ہمدم والوں نے اس مضمون کا پہلا حصہ ۹ مارچ کی اشاعت میں دیا ہے اور دوسرا حصہ ۱۰ مارچ کی اشاعت میں چھوڑ ہی اس طرح کہ دوسرے حصہ کا خاتمہ ہی نہیں ملتا۔ اس طرح غریب مراسلہ نگار کا نام بھی ندارد ہے، بارے اس مضمون میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہو تو
چاہیئے کہ ہم ایسے عملی کاموں میں مشغول ہو جائیں جس سے
حاسدوں کی کوششیں فنا ہو جائیں، اور بنگالیوں کی طرح
ہمارا ہر کام اور گفتگو اُردو میں ہو"

زبانِ اُردو کے دعویدار گہوارے لکھنؤ شریف کے لئے یہی صاحب لکھتے ہیں کہ

"لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو میں ایم اے کے درجے نہیں ہیں،
کیا یونیورسٹی کے انتظامی افسروں کا فرض نہیں ہے کہ وہ
اردو کے درجہ ایم اے کے لئے کھول دیں"

لیجے اس سے زیادہ حسین اور جمیل اطلاع کیا ہوگی کہ لکھنؤ شریف کی یونیورسٹی میں اُردو غائب، گویا چراغ کے نیچے اندھیرا!!!

〰〰〰〰〰

دہلی کے رسالے "شاہجہاں" نے اپنی اشاعت بابتہ ماہ مارچ کے صفحہ ۲ پر جو مقالۂ مدیری شائع کیا ہے اُس میں اس کے محترم ایڈیٹر سید وصی اشرف صاحب نے اُردو کی حمایت کا حق ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ

"اُردو غریب اس وقت جس دَور سے گزر رہی ہے وہ نہایت ہی صبر آزما ہے، اپنے لوگوں کی بے اعتنائی، اغیار کے جابرانہ
حملے اور پھر چند دیگر اسباب نے مل کر ہندوستان کی مسموم

فضا میں زندگی کا سانس لینا اس کے لئے ناممکن کر دیا ہے۔
ہندی زبان جو باوجود کافی کوششوں کے قلیل تعداد کو
بھی اپنے زیرِ اثر نہیں لاسکی، بھلا کس طرح ہندوستان کی مشترکہ
زبان بن سکتی ہے؟

مگر بعض ایسے حضرات جن کی شہرت کا سبب غریب اُردو
ہی بنی اور بعض ایسے مدیرانِ رسائل جو اُردو کے صدقہ میں
پرورش پا رہے ہیں اِس کی جان کے لاگو بنے ہوئے ہیں وغیرہ
افسوس کہ محترم مدیرہ شاہ جہاں نے نہیں بتایا کہ مدیرینِ رسائل کون ہیں جو اُردو کی جان کے لاگو بنے ہوئے ہیں، اگر وہ بتا دیتے تو مُلّا رموزی آسانی سے اُن کو رگید دیتا!

مورخہ ایک مارچ ۱۹۳۶ء کے اخبار "اُمید" ناگپور کے صفحہ ۳ کالم ۲ میں ایڈیٹر صاحب "اُمید" نے ایک ذیلی مقالہ میں یہ مسرت بخش اطلاع شائع فرمائی ہے کہ محمد احمد صاحب وکیل تمام صوبجات متوسط کی ایک نمائندہ مجلسِ اُردو منعقد فرمانے والے ہیں، اور اُس کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اِس پر ایڈیٹر صاحب نے بتایا ہے کہ یہ مجلس شہر جبل پور میں منعقد ہو، کیونکہ اس شہر میں اُردو کی پرورش اور نوازش کے مواقع کافی ہیں۔

شک نہیں کہ یہ شہر ایسا ہی ہے اور اِس میں اُردو کے حامیوں کی تعداد بھی کافی ہے، چنانچہ جون ۱۹۳۲ء میں مُلّا رموزی بقلم خود اِس شہر میں ایک انجمن اُردو قایم کر کے آیا ہے، جس کے سرگرم ناظم جناب ڈاکٹر اعظم کریوی تھے، جو افسوس کہ جبل پور کے عوض سرحد کے قریب رسالپور میں بدل دئے گئے ہیں، لیکن دوسرے ارکان جبل پور ہی میں ہیں۔ مگر عرصہ ہوا کہ اس انجمن کے متعلق کوئی اطلاع اخباروں میں نہیں دیکھی گئی، اب خدا کرے محمد احمد صاحب کی کوششیں بار آور ہوں، اور صوبجات متوسط میں اُردو ترقی پائے، زیادہ حدِّ ادب، خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام،

مکرر آنکہ، اگر اُردو کے اخبارات اور رسالے میرے اِس مضمون کو اپنے پرچہ میں نقل کر دیں تو اُردو پر احسان۔

آبگینہ

ہم حباب آسا ہیں، لازم ہے، کہ جب ہم سے ملو
دوستو! باریک بینی سے خدا را کام لو
ظنِ غالب ہو اہانت کا، کہ ذِلّت کا یقیں
اہلِ دنیا کے دلوں کو، توڑ دے ممکن نہیں
مُشتبہ سا اک تبختر، ایک مبہم سا غرور
شیشۂ شاعر کو کر دیتا ہے لیکن، چُور چُور

جوشؔ

حیات

ل - احمد اکبرآبادی

میرے محترم اور مخلص دوست لطیف صاحب نے ٹولسٹائی کی کتاب **معرفت** کا ترجمہ کیا ہے، جس میں سے مندرجۂ ذیل مضمون، جو اس کتاب کا مقدمہ ہے، حاضر کیا جا رہا ہے۔

فلسفۂ حیات پر حکیم ٹولسٹائی کی یہ کتاب ایک بیش بہا تصنیف ہے۔ اور لطیف صاحب نے اس کا ترجمہ کر کے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔

میں خود عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ و تالیف میں دس برس تک مترجم اور ناظرِ ادب کی حیثیت سے کام کر چکا ہوں، اور جانتا ہوں کہ ترجمہ کرنا کتنا مشکل اور روح فرسا کام ہے، اور اس کا بھی مجھے تجربہ ہے کہ بالخصوص علمی کتاب کا ترجمہ، انسان سے اُس کی عمر کے کتنے ماہ و سال چھین لیتا ہے۔

مجھے اس کی بڑی خوشی ہے کہ لطیف صاحب نے مترجم کی حیثیت سے بھی ایک بلند درجہ حاصل کر لیا ہے، اور خصوصیت کے ساتھ اُن کا یہ ترجمہ اُن کے شعورِ ترجمانی کو اور بھی بلند ثابت کرنے میں ایک قوی دلیل کی طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

لطیف صاحب کے ترجمے کی خوبیوں کا صحیح اندازہ اُس وقت کیا جا سکتا ہے، جب کوئی اصلی کتاب لے کر بیٹھے اور خود ترجمہ کرنے کی سعی کرے۔

ہمارے نزدیک یہ ترجمہ اس قابل ہے کہ جامعۂ عثمانیہ اور برطانوی ہند کی دیگر یونیورسیٹیوں کی اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں داخل کیا جائے۔

جوش

"انسان ایک نہایت کمزور تنکے کی مثال ہے، لیکن ایک تنکا جو متفکر ہے، اُسے تباہ کرنے کے لئے ایک کائنات کا حملہ آور ہونا ضروری نہیں۔ ذرا سا دھواں یا پانی کا ایک قطرہ اُس کو ہلاک کر دینے کے لئے کافی ہے، لیکن اگر ساری کائنات اسے ہلاک کر دینا چاہے تو انسان اس علمِ محض کے باعث کہ وہ ہلاک کیا جا رہا ہے، اپنے تباہ کرنے والے کے مقابلے میں اشرف ہوگا۔ اور کائنات باوجود اس تفوق کے جو اُسے انسان کے مقابلے میں حاصل ہے، علم و آگہی سے مطلقاً بے بہرہ ہے، اس لئے ہمارا تمام عز و وقار خیال کے باعث ہے، اور خیال ہی وہ چیز ہے جس کا ہمیں سہارا لینا چاہیئے، نہ کہ زمان و مکان کا۔ چنانچہ ہمارا کام صحیح تخیل ہے اور صحیح تخیل ہی اصل اخلاق ہے" (پاسکل)

"سر کے اوپر انجمنیں آسمان اور خود میرے اندر اصولِ اخلاق ——— یہ دو چیزیں ہمیشہ میری رُوح کو تازہ اور ترقی پذیر تحیّر سے معمور کرتی رہتی ہیں۔ اوّل الذکر اپنا کام اُس مقام سے شروع کرتا ہے جو مجھے خود خارجی دُنیا میں حاصل ہے اور اس غیر مرئی مکان تک جہاں عالم پر عالم اور نظام پر نظام غالب ہے، اور جہاں میں نگاہِ انسان کے ماورا ارکھڑا ہوں سلسلہ و تعلق پیدا کر لیتا ہے، ان عالموں اور نظاموں کی ابتدا و اواخر کے ساتھ لامحدود زمان کے اندر ان کی موسمی اور مقررہ حرکتوں کے ساتھ تعلق پیدا کر لیتا ہے، اور ثانی الذکر اپنا کام میرے غیر مرئی وجود۔ میری شخصیت سے، شروع کرتا ہے اور مجھے حقیقی ابدیت کے عالم میں پہنچا دیتا ہے، لیکن یہ عالم صرف قوتِ مدرکہ کو نظر آ سکتا ہے، وہ قوتِ مدرکہ جس کے ذریعہ سے میں اپنی ہستی کا شعور کرتا ہوں، اوّل الذکر صورت کی طرح اتفاقی طور پر نہیں بلکہ کائناتی اور شبلازم رشتہ و تعلق پیدا کر لیتا ہے" (کینٹ)

"میں تمہیں ایک نیا حکم دیتا ہوں۔ تم ایک دوسرے سے محبت کرو!" (یوحنّا کی انجیل)

تعارف

ایک ایسے شخص کا تصوّر کیجیے، جس کا ذریعۂ معاش صرف پن چکی ہے، اُس آدمی کا باپ اور دادا بھی یہی کام کرتے تھے، اور یہ آدمی، روایتی طریق پر چکی کے ہر حصّے اور پُرزے کو سمجھتا ہے، اور جانتا ہے کہ چکی کس طرح اچھے کام کر سکتی ہے، اگرچہ یہ شخص میکنزم سے بالکل واقف نہیں، لیکن چکی کے تمام اجزا کو اِس طرح جانتا اور لگاتا بٹھاتا ہے کہ وہ خوب کام دیتی اور اُس کی آمدنی سے وہ شخص بآرام بسر کرتا ہے۔

لیکن اتفاق سے یہ آدمی چکی کی ساخت کے متعلق غور کرنے لگتا ہے، اُس کے میکنزم کے متعلق کچھ اُلجھی ہوئی باتیں سُنتا ہے، سوچنے لگتا ہے کہ چکی کا کونسا حصّہ کس حصّے کو گھماتا یا چلاتا ہے۔

چنانچہ وہ فلائی وھیل (FLY WHEEL) سے چکی کے پاٹ، پاٹوں سے مال، مال سے پہیا، اور پہیئے سے پانی کی موری، بند اور ندی پر غور و استدلال کرتے کرتے اِس واضح نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ اُس کی جڑ بند اور اس کا پانی ہے۔ اِس انکشاف سے اسے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ اب وہ آٹے کا موٹا اور باریک دیکھنے، پاٹوں کو اونچا نیچا کرنے یا اُن کو کھٹوانے، مال کو تنگ یا ڈھیلی کرنے کو تو بھول جاتا ہے اور ندی کے متعلق غور و فکر کرتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کی چکی باقاعدہ کام نہیں دیتی۔ لوگ اُس کی غفلت کی شکایت کرتے ہیں، مگر وہ ندی کے متعلق بحث مباحثے میں لگا رہتا ہے، اور اب وہ اِس مسئلے پر اتنی بحث و تکرار کر چکا ہے اور اس خیال میں اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ بالآخر اُسے کامل یقین ہو جاتا ہے کہ ندی ہی چکی ہے۔

جب بھی اُس کے نتیجۂ فکر کی غلطی بتائی جاتی ہے وہ جواب دیتا ہے کہ:-

"کوئی چکی پانی کے بغیر آٹا نہیں پیس سکتی۔ اِس لئے چکی کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ پانی کس طرح اندر آ کر گرے۔ دھارے میں قوّت ہے، وہ اُس میں کیوں کر پیدا ہو جاتی ہے۔ اِن باتوں کا جان لینا ضروری ہے، اس لئے چکّی کو سمجھنے کے لئے ندی کو سمجھنا لازمی ہوا!"

چکی والے کے اِس استدلال پر کوئی منطقی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کے مغالطے کو دُور کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ اُسے یہ بتایا جائے کہ ہر طریقِ استدلال میں نفسِ استدلال اتنا زیادہ اہم نہیں جتنا اہم کہ اُس استدلال کا محل و طریق ہے۔

یعنی اگر غور و فکر کو نتیجہ خیز بنانا ہے تو یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ پہلے کس بات پر غور کیا جائے، اور کس پر اِس کے بعد۔ اُسے بتانا ہے کہ عقل مندانہ فعلیت (ACTIVITY) بے عقل فعلیت سے اس طرح ممیز ہوتی ہے کہ عاقلانہ فعلیت اپنے غور و انہماک میں مدارج کی اہمیت کا یہ لحاظ رکھتی ہے کہ پہلے کونسا استدلال لایا جائے، اور کونسا دوسرے تیسرے نمبر پر آنا چاہیئے۔ لیکن بے عقل فعلیت بے ترتیب و سلسلہ غور کرنے لگتی ہے۔ پِل چکی والے کو یہ دکھانا پڑے گا کہ یہ ترتیب و سلسلہ کوئی اتفاقی امر نہیں ہے، بلکہ اس کا انحصار اِس موضوع و مقصد پر ہے جس کے متعلق استدلال کیا جاتا ہے۔ ہر طرزِ استدلال کا مقصد و مدعا ہی اس کی ترتیب و سلسلہ کو اس طرح مقرر کر لیتا ہے کہ جداگانہ سلسلہ ہائے خیال کی ترتیب ایسی ہو جو سمجھ میں آ سکے۔

لیکن وہ تمام دلیلیں جو ایک مشترک مقصد سے باہم متحد و متعلق نہیں ہوتیں اُنسے تمام استدلال اور بحثیں احمقانہ ہیں، خواہ وہ کیسی ہی مدلل کیوں نہ ہوں۔

چکّی والے کا مقصد و مدعا اس پر مشتمل ہے کہ وہ عمدہ آٹا تیار کر سکے، اور اگر وہ اِس مقصد کو پیشِ نظر رکھے گا تو یہی مقصد چکّی، پہیا، بند اور ندی کے باب میں اِس کے لئے استدلال کی سب سے زیادہ ناقابلِ حجت، باقاعدگی نتائج مرتب کر دے گا۔

لیکن اِس کے استدلال کے اِس تعلق و مدعا کے بغیر چکی والے کے دلائل خواہ کیسے ہی منطقی کیوں نہ ہوں نہایت بے ضابطہ اور لاطائل ہوں گے۔ اور یہی اصولی نکتہ قابلِ غور ہے۔ اِس کا استدلال کچھ اِس قسم کا ہوگا جیسا کیفامو کو دیچ کا استدلال، کہ اگر ہاتھی انڈا دینے لگے تو اُس کے چھلکے کی موٹائی کیا ہوگی۔ ہماری رائے میں مسئلۂ حیات کے متعلق عصری علوم کا استدلال بھی اِسی نوع کا ہے۔

زیست کی مثال پنچکّی کی سی ہے، جس کے متعلق انسان تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ چکی کا کام اچھی پسائی کرنا ہے، زندگی صرف اس لئے ضروری ہے کہ وہ باخیر ہو، اور انسان اس شعبۂ تحقیق کو معقولیت کے ساتھ ایک لمحے کے لئے ترک نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس کو ترک کر دیتا ہے تو اس کا تدبر لامحالہ غلط اور موکیو دیچ کے استدلال کی مانند ہوگا۔ کہ ہاتھی کا ایک انڈا توڑنے کے لئے کس قدر ریاروو درکار ہوگی۔

اِنسانی زیست کا مطالعہ اِس غرض سے کرتا ہے کہ اِس میں بہتری پیدا ہو، اور اِس طور پر زیست کا مطالعہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے انسان کو جادۂ علم پر کچھ آگے بڑھا دیا ہے۔ لیکن اِن سچے معلموں اور انسانیت کے فیض رسانوں کے ساتھ ساتھ ایسے استدلال کرنے والے بھی رہے ہیں اور اب بھی ہیں جو مدعائے بحث کو بالائے طاق رکھ دیتے اور مبدءِ حیات کے مسئلے کی تحقیقات کرنے لگتے ہیں ——————

یہ چکی کیوں کر گھومتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ پانی کی وجہ سے چلتی ہے، بعض اس کے چلنے کی وجہ اس کے نظام کو قرار دیتے ہیں۔ اس بحث میں تیز و تند بحثیں ہونے لگتی اور اصل موضوع سے ہٹتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ خارجی مباحث اصل موضوع کی جگہ لے لیتے ہیں۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے مباحثوں کے متعلق ایک بہت پرانا لطیفہ چلا آرہا ہے، وہ لطیفہ یہ ہے کہ ایک عیسائی نے ایک یہودی کی ژولیدہ بلند خیالیوں کے جواب میں، اس کی چکنی کھوپری پر ایک چپت لگائی تو اس سے بڑے زور کی آواز پیدا ہوئی، اور پھر اس یہودی سے سوال کیا۔

"یہ آواز کھوپری سے نکلی یا ہتھیلی سے؟"

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب و عقیدے کی بحث کی جگہ ایک نئے اور ناقابل حل مسئلے نے لے لی۔

انسان کی عقلِ صحیح کی جانب سے، اور مسئلہ زیست کے باب میں، بہت قدیم سے کچھ اسی قسم کی باتیں ہوتی رہی ہیں۔

یہ بحثیں بہت قدیم زمانے سے ہوتی آرہی ہیں، کہ مبدائے حیات کیا ہے؟ آیا اس کی ابتدا غیر مادی ہے یا مختلف عناصر کی ترکیب سے ہے؟ اور یہ بحثیں آج تک جاری ہیں اور ختم ہوتی نظر نہیں آتیں۔ کیونکہ مقصودِ بحث ترک ہو گیا ہے، اور زندگی پر اس کے مدعا سے ہٹ کر بحثیں کی جا رہی ہیں، جنہیں حیات کے لفظ سے خود "حیات" مفہوم نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ چیز سمجھی جاتی ہے جس سے حیات کا آغاز ہوتا یا وہ شے جو حیات کے ساتھ آتی ہے۔

اب نہ صرف علمی کتابوں میں بلکہ عام گفتگوؤں میں بھی جب حیات کا تذکرہ ہوتا ہے تو بحث اس چیز سے نہیں ہوتی جس کو ہم سب جانتے ہیں ——— یعنی حیات، ان بلاؤں اور مصیبتوں سے جن میں خوفزدہ ہوں اور جن سے مجھے نفرت ہے، اور ان خوشیوں اور لذتوں سے جن کی مجھے خواہش ہے گفتگو نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک ایسی شے کے متعلق بحث ہوتی ہے جو محض طبعی قوانین کے مطابق، شاید "اتفاق کے کھیل" سے وجود میں آگئی ہے یا شاید اس لئے کہ خود اُن کے اندر وجود پذیر ہونے کا ایک سبب مخفی ہے۔

"حیات" ایک قابلِ حجت و تکرار لفظ ہو گیا ہے جس کے اندر حیات کی مخصوص علامتیں یا معانی موجود نہیں ہیں۔ ابتلاء و بہجت کا شعور اور بھلائی کی آرزو۔

"زندگی حامل جسم ہے، ان قوا کی جو موت کی مدافعت کرتے ہیں، زندگی حاصل جمع ہے ان مظاہر کی جو ایک عضوی ہستی کے اندر محدود وقت میں یکے بعد دیگرے رونما ہوتے ہیں"۔

اگر ان تعریفات کی عدم صحت اور تکرار مضمون سے قطع نظر کر لی جائے تو اصل مطلب ان سب کا ایک ہے۔ یعنی لفظ "حیات" جس کو تمام لوگ بالعموم ناقابلِ تکرار و حجت سمجھتے ہیں۔ اس کی تعریف ان بیانات سے نہیں ہوتی بلکہ بعض عمل (process) یا دوسرے مظاہر کا بیان ہوتا ہے، جو حیات کے لوازم میں سے ہیں۔

ان عنوانات کی اکثریت تو بلور کے عمل دانکاد میں اس کی فعلیت کی شامل ہے، اور بعض عنوانات کے تحت سڑنے گلنے اور ترک کر دینے کی فعلیت آجاتی ہے، اور یہ چند عنوانات میرے جسم کے ہر خلیئے کی جداگانہ زندگی پر حاوی ہیں۔ خلیئے کی وہ زندگی جس کے نزدیک کسی ایسی شے کا وجود نہیں جو انتشار خوب ہو۔ بلور کے اندر تجزمایہ[1] کے اندر تجزمایہ کے حرم کے اندر میرے بدن کے اور دوسرے اجسام کے خلیوں کے اندر جو عمل جاری رہتے ہیں وہ تمام اعمال ایک ایسے عمل سے یا ملکے جاتے ہیں جو ناقابلِ حل طریق پر میرے اندر میری آرزوئے بہبود کے شعور سے متعلق ہوتا ہے۔

زندگی کی بعض حالتوں کے متعلق، خود زندگی کی طرح، بحث و دلیل کرنا بالکل ویسا ہی ہے جیسا چاندنی کو چکنی بیان کر کے اس کے متعلق استدلال کرنا۔ شاید یہ دلیلیں دوسری اغراض کے لئے نہایت ضروری ہوں، لیکن وہ اس موضوع کو چھوتی بھی نہیں۔ جس پر بحث کرنا ان کا مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ہر استنباط جو زندگی کے متعلق ایسے استدلال سے حاصل کئے گئے ہوں لاجرم و پُر فریب ہوگا۔

لفظ "زیست" نہایت مختصر اور نہایت سادہ لفظ ہے، اور اس کے معانی کو ہر شخص سمجھتا ہے، اور ہم اس کو اسی مفہوم میں استعمال کرنے پر ہمیشہ مجبور ہیں جو مفہوم عام لوگوں کے لئے قابلِ فہم ہے، یہ لفظ بالیقین ہر ایک کے لئے قابلِ فہم ہے، اور اس وجہ سے نہیں ہے کہ دوسرے الفاظ اور خیالات اس کی صحیح تعریف کر دیتے ہیں بلکہ اس کے بالکل برخلاف، اس وجہ سے ہے کہ یہ لفظ ایک اصل یا اساسی خیال کو ظاہر کرتا ہے جس سے اگر سب نہیں تو بہت سے خیالات مستنبط ہوتے ہیں، اور اس لئے کہ ہم اس خیال سے استنباط کر سکیں ہم سب سے پہلے اس پر مجبور ہیں کہ اس خیال کی اصل و اساسی حیثیت کو تسلیم کر لیں، جس پر کوئی بھی کسی نوع سے حجت و تکرار نہیں کر سکتا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیست کے تصور کے ذیل میں یہ نکتہ اختلاف کرنے والی جماعتوں کی نظر سے اوجھل ہو گیا ہے۔

---

[1] فرہنگ اصطلاحات علمیہ میں (Protoplasm) کا ترجمہ تجزمایہ کیا گیا ہے۔

صورتِ واقعہ یہ ہے کہ زیست کا اساسی تصوّر، اُس کے متعلق حجت و تکرار کے باعث پہلے ہی سے اُس کی مرکزی حیثیت کے خلاف اختیار کر لیا جاتا ہے، اور اس کے اساسی مفہوم سے برابر بعد ہوتا تھا، اور اس کو ہر شخص تسلیم کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اب اسی اساسی تصوّر نے دوسرے معانی اختیار کر لئے ہیں۔ جو اس سے بالکل مطابق نہیں ہیں۔ سبب یہ ہو گیا ہے کہ اصل مرکز چھوٹ گیا۔ اور ایک دوسرا ہی نقطہ سامنے آ گیا ہے۔ اب لوگ اس سوال پر جھگڑ رہے ہیں کہ زندگی خلیئے میں ہے یا تجزیہ (مادۂ اولی) یا اس سے بھی ادق، غیر عضوی مادے میں ہے۔

لیکن حجت و تکرار کرنے سے قبل ہمیں خود سے سوال کرنا چاہئے کہ آیا ہم اس کے مجاز بھی ہیں کہ زیست کا مفہوم ایک خلیئے کے ساتھ متعلق کر دیں؟

مثلاً یوں سمجھئے۔ ہم کہتے ہیں کہ زندگی خلیئے میں ہے، خلیہ ایک ذی حیات ہستی ہے، لیکن حیاتِ انسانی کا اساسی خیال اور اس زندگی کا خیال جو خلیئے کے اندر ہے، دو جداگانہ تصورات ہیں جو نہ صرف قطعاً مختلف ہیں بلکہ کبھی متحد نہیں کئے جا سکتے ایک خیال دوسرے کو خارج کر دیتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرا سارا جسم بلا استثنا خلیوں سے مرکب ہے۔ مجھے بتایا جاتا ہے کہ یہ خلیئے اسی نوع کی زندگی کے حامل ہیں جیسی میری زندگی ہے، اور بالکل میری طرح ذیحیات ہستیاں ہیں۔ لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اپنے تئیں اس وجہ سے زندہ سمجھتا ہوں کہ ان تمام خلیوں کے ساتھ جو میری ترکیب میں شامل ہیں مجھے شعور ہے کہ میں ایک منفرد ہستی ذی حیات ہوں۔ مگر مجھ سے یہ کہا جاتا ہے کہ بلا استثنا میری پوری ہستی ذیحیات خلیوں سے مرکب ہے۔ اب میں خاصۂ حیات کو کس چیز کے ساتھ وابستہ کروں۔ خلیوں کے ساتھ یا اپنی ذات کے ساتھ؟ اگر میں یہ مان لوں کہ خلیوں میں زندگی ہے تو پھر مجھے زیست تصوّرِ زیست کی دلیل ملنا چاہئے، مجھے یہ شعور ہونا چاہئے کہ میں ایک مالک ذیحیات ہستی ہوں۔ لیکن اگر میں تسلیم نہیں کرتا کہ میں ایک جداگانہ ہستی کی طرح زندگی رکھتا ہوں تو پھر یہ ظاہر ہے کہ میں کسی طرح اس خاصے کو ان خلیوں کے ساتھ وابستہ نہیں کر سکتا۔ جن سے میرے جسم کی ترکیب ہے۔ اور جس کے شعور کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا ہوں۔

یا تو میں زندہ ہوں اور میرے بعض حصے جن کو خلیہ کہا جاتا ہے زندہ نہیں ہیں یا ذیحیات خلیوں کا ایک جمِ غفیر ہے اور میرا شعور زیست، زیست نہیں بلکہ محض التباسِ حواس ہے۔

چونکہ ہم یہ کبھی نہیں کہتے کہ خلیوں کے اندر ایک چیز (Brain) نام کی بھی ہوتی ہے بلکہ ہم صرف یہی کہتے ہیں کہ خلیوں میں حیات ہے، اور اس کو "حیات" ہم اس لئے کہتے ہیں کہ اس لفظ کا مفہوم ہمارے ذہن میں کسی غیر متعین شکل کا نہیں بلکہ واضح طور پر بیان کردہ ابعاد (Dimensions) کا مفہوم ہوتا ہے جس کا ہم سب کو برابر کا علم ہے اور خود اپنی ذات کو صرف اپنے صحتِ جسم کے شعور کی صورت میں جانتے ہیں، جو اپنی جگہ ناقابلِ تقسیم ہے، اس بنا پر یہ خیال ان خلیوں کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جا سکتا جن سے میرا بدن مرکب ہے۔

انسان کسی تحقیقات یا مشاہدے میں مصروف ہو وہ اس پر مجبور ہے کہ الفاظ کو اسی مفہوم میں استعمال کرے جس مفہوم میں تمام آدمی ان کو بلا حجت اختلاف سمجھتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ شخص الفاظ کو کسی خاص مفہوم میں جس کی اُسے ضرورت ہے اور وہ مفہوم اس لفظ کے اساسی مفہوم سے جس کو سب سمجھتے ہیں بالکل مختلف ہو۔ استعمال نہیں کر سکتا۔

اگر لفظ "حیات" کا استعمال اس مفہوم میں کیا جاتا ہے کہ وہ ایک شے کا خاصہ بیان کرتا ہے اور اس کے تمام اجزائے ترکیبی کے، خواہ مختلف خاصے بھی، جیسا کہ خلیئے اور اور خلیوں سے مرکب حیوان کے باب میں کیا جاتا ہے، تو پھر دوسرے الفاظ سے بھی اسی طرح کام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ تمام الفاظ حروف سے مرکب ہیں اور حروف خطوط سے بنتے ہیں اس لئے خط کھینچ دینا اور اظہارِ خیال کرنا ایک ہی بات ہے، اور یہ کہ اس وجہ سے خطوط کو خیال سے تعبیر کرنا چاہئے۔

سائنس کی دنیا میں سب سے زیادہ معمولی مظاہرِ طبعی اور مکان کی قوتوں کے کھیل کے تحت اصل حیات کے متعلق بحثیں سننا اور پڑھنا ہے۔

لیکن یہ مشتبہ ہے کہ علمائے سائنس کی اکثریت اس رائے کی ہے جو رائے نہیں کہی جا سکتی بلکہ ایک مذاق یا ایک پہیلی ہے۔

اس رائے کا ادعا ہے کہ حیات کا آغاز طبعی اور مکان کی قوتوں کے کھیل سے ہے۔ وہ طبعی اور مکان کی قوتیں جن کو طبعی اور مکان کی محض اس لئے کہا گیا ہے کہ تصوّرِ حیات کے متعلق فرق پیدا ہو سکے۔

ظاہر ہے کہ لفظ "حیات" ناجائز طور پر ان خیالات کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے جو حیات سے بعید اور خارج ہیں اور اُس کے اساسی مفہوم سے بعید ہوتے ہوتے اُس کا مرکز اس حد تک ترک کیا جا چکا ہے کہ ہمارے تصوّر کے مطابق حیات کا مبدا، وہ قرار پا گیا ہے جہاں اُس کا وجود نہیں ہو سکتا یہ مفروضہ اس دائرے کی مثال ہے جس کا مرکزی نقطہ دائرے سے باہر رکھا ہو۔

درحاصل، زیست جس کو میں بدی سے نیکی کی جانب ایک جہد کے علاوہ کسی اور صورت میں تصور ہی نہیں کر سکتا، اس عالم سے متعلق ہے جہاں میں نیکی دیکھ سکتا ہوں اور نہ بدی۔

یہ ظاہر ہے کہ تصورِ زیست کا مرکز بدل گیا ہے۔ مزید برآں جس شے کو زیست کہا جاتا ہے اس کی تحقیقات کرنے میں میں دیکھتا ہوں کہ یہ جستجو مشکل کسی ایسے خیال تک پہنچتی ہیں جس سے میں واقف ہوں۔ میرے سامنے نئے خیالات کا ایک پورا سلسلہ ہے۔ اور ان الفاظ کی فہرست بھی میرے سامنے ہے۔ جو سائنس کی زبان میں روائتی معانی کے حامل ہیں۔ مگر وہ الفاظ موجودہ خیالات کے ساتھ بالکل مطابقت نہیں کرتے۔

جس تصورِ زیست کو میں جانتا ہوں وہ اس طرح نہیں سمجھا جا سکتا جس طرح کہ لوگ اُسس کو سمجھتے ہیں اور اس سے جو خیالات مستنبط ہوتے ہیں وہ ان عمومی تخیلات سے مطابقت نہیں کرتے جو اپنے آپ کو نئے تصورات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اور جن کے لئے گو مناسب نام وضع کردئے گئے ہیں۔ لیکن ہیں وہ وہی روائتی تصورات۔

سائنس کی تحقیقات میں انسانی زبان کی بیش از بیش بیخ کنی ہو رہی ہے۔ اور ان الفاظ کی جگہ جو موجودہ موضوعات وخیالات کے اظہار کا ذریعہ ہیں، ایک سائنٹیفک وُلاپک (VOLA PUK) حکمرانی کر رہا ہے جو اصلی وُلاپک سے صرف اس وجہ سے ممیز ہے کہ وہ موجودہ موضوعات وخیالات کے لئے معمولی الفاظ استعمال کرتا ہے۔ لیکن سائنس کا وُلاپک ایسے لفظ استعمال کرتا ہے جن کا کہیں وجود نہیں ملتا، ایسے خیالات جو وجود پذیر نہیں۔

انسانوں کے درمیان انتقالِ ذہنی کا تنہا ذریعہ الفاظ ہیں، اور اس لئے کہ یہ ذریعۂ رسائل ممکن ہو سکے ضروری ہو جاتا ہے کہ الفاظ کا استعمال اس طرح کیا جائے کہ ہر لفظ تمام سننے والوں کے اندر، لزوماً صحیح اور مطابق خیالات کو پیدا کر دے لیکن اگر الفاظ کا اٹکل پچو استعمال ہونے لگے اور ان الفاظ سے جو جی چاہے سمجھ لینا ممکن ہو تو یہ بہتر ہے کہ گفتگو کی ہی نہ جائے۔ بلکہ اشاروں سے کام لیا جائے۔

میں مانتا ہوں کہ مشاہدے اور تجربے کے بغیر دنیا کے قوانین کا صرف ذہنی استنباط سے تصفیہ کرنا غلط اور بے اصول طریقہ ہے ———— یعنی اس طرح صحیح علم حاصل نہ ہو سکے گا۔ لیکن کیا یہ طریقہ اس سے بُرا نہیں ہے کہ مظاہرِ عالم کا مطالعہ تجربے اور مشاہدے سے کیا جائے، اور ان تجربوں اور مشاہدوں میں ان خیالات کی رہنمائی قبول کرلی جائے جو اساسی اور تمام انسانوں کے لئے یکساں نہیں بلکہ روائتی ہیں؟ اور کیا ان تجربوں کے نتائج ایسے الفاظ میں بیان کرنا جن کے مختلف مفہوم ہو سکتے ہیں صحیح ہوگا؟ ایک ایسے عطار کی دکان بہت زیادہ ہلاکت کا باعث ہو سکتی ہے جس کی بوتلوں پر دواؤں کے اصلی نام کی جگہ ایسے نام لکھے ہوں جس سے عطار کو سہولت ہوتی نہ ہو۔

لیکن لوگ مجھ سے کہتے ہیں۔

"سائنس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ حیات کے تمام متعلقات کی (جس میں اعلیٰ نیکی، اور روحانی دنیا کی خواہش شامل ہے) تحقیقات کرے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ان اشکال سے جو اس کی اختیاری تحقیقات کا موضوع ہیں، تصورِ حیات کا ایک جوہر نکال لے"

واقعی یہ ایک عمدہ بات ہے اور اختیار وحق کے اندر ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہمارے عہد کے علمائے سائنس جو استحضار کرتے ہیں وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اگر سب سے پہلے تصورِ حیات اپنے مرکزی مفہوم میں جسے سب سمجھتے ہیں، اختیار کیا جاتا تو بعد میں نہایت واضح طور پر ہو سکتا تھا کہ سائنس اس خیال کے تمام پہلوؤں سے بجز اس کے بدیہی مشاہدے کا ایک جوہر نکال کر، اس منظر پر صرف اس ایک پہلو سے نظر ڈالتی ہے اور اس کے لئے سائنس کے پاس اتنا مخصوص طریق تحقیق ہوتا تو معاملہ سلجھا ہوا تھا، اور وہ بالکل ایک مختلف بات ہوتی۔ اس کے بعد وہ منصب جو سائنس کو اس حالت میں حاصل ہوتا، اور وہ نتائج جس حد تک ہم سائنس کی بناء پر پہنچتے، غالباً جداگانہ باتیں ہوتیں، جو صورت حال ہے وہ کہدینا چاہیئے، اور جس بات کو سب جانتے ہیں ہمیں چاہیئے کہ اُسے مخفی نہ رکھیں۔ کیا ہم ناواقف ہیں کہ اختیاری سائنس کے اکثر محققین اپنی جگہ متیقن ہیں کہ وہ حیات کے کوئی ایک پہلو کا مطالعہ نہیں بلکہ حیات من حیث الکل کا مطالعہ کر رہے ہیں؟

ہیئت۔ میکنزم۔ طبیعیات۔ کیمیانات، اور دوسرے علم، بحیثیت مجموعی اور جداگانہ زیست کے اُس پہلو کا مطالعہ کرتے ہیں، جو پہلو ان علوم میں سے ہر ایک کے ساتھ علاقہ رکھتا ہے، اور کبھی حیاتِ کُلّی کے متعلق کسی نتیجے پر نہیں پہونچتے، اور ان علوم میں بعض نے اپنے وحشیانہ وجاہلانہ دَور میں یعنی ژولیدگی اور غلط تعریف کی حالت میں اپنے نقطۂ نظر سے سعی کی کہ حیات کے کُلّی مظاہر کا استحصار کریں، مگر اس وجہ سے زیادہ اُلجھ گئے کہ اُنھوں نے اپنے نئے تصورات اور نئے الفاظ وضع کئے اور یہ وہی حالت تھی جیسی کہ علم النجم کو ہیئت اور الکیمیا کو کیمیائیات سمجھا گیا تھا اور یہی حالت آجکل اختیاری علم ارتقا کی ہو رہی ہے۔ جو زیست کے ایک یا کئی پہلوؤں کا استحصار کرکے حیاتِ کُلّی کے مطالعے کا مُدّعی ہوتا ہے۔

جو لوگ سائنس کا ایسا غلط مشاہدہ کرتے ہیں وہ اس کا اقرار نہیں کرتے کہ انکی تحقیق کا موضوع زندگی کے صرف چند پہلو ہیں۔ بلکہ اس کے معنی ہیں کہ حیات کلی، اس کو جملہ مظاہر، اُن کے مطالعے میں آجائیں گے، اور وہ بھی حیات کے خارجی اختیارات کے ذریعے سے، ان کا قول ہے کہ۔

"گو روحانیات (Psychics) سے ہم ابھی تک واقف نہیں، لیکن ایک روز واقف ہو کر رہیں گے۔ بظاہر حیات کے ایک یا چند پہلوؤں پر غور کرتے کرتے ہم اس کے تمام پہلوؤں کا علم حاصل کرلیں گے۔ بالفاظ دیگر۔ اگر ہم کسی شے کے ایک پہلو کو غور سے دیکھتے ہیں تو اس کے دوسرے پہلو، بلکہ اس کا اندرونی رُخ بھی نظر آجائیگا:"

یہ عقیدہ کتنا عجیب ہے ——— اس کی توجیہہ و تعلیل توہم پرستانہ تعصب ہی سے ہوسکتی ہے۔ مگر اس عقیدے کا وجود ہے، اور دوسرے وہمی و متعصبانہ عقائد کی طرح یہ عقیدہ خیالِ انسانی کی فعلیت کو ایک غلط راستے پر لگا کر تباہ کن اثرات پیدا کر رہا ہے۔ ایک قطعاً بیکار موضوع پر اپنی زندگیوں کو منحصر کرکے صاف باطن و دیانتدار محنت کرنے والے تباہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک بے نتیجہ تلاش میں معروف ہو کر انسان کی مادی قوتیں فنا ہو رہی ہیں۔ انسانیت کی برترین خدمت کے نام سے کیفا مو کو دیکھ کی سی بے نتیجہ فعلیت میں لگا دی جا کر، نئی نسلیں مٹائی جا رہی ہیں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سائنس زندگی کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کرتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہر مسئلے کے پہلو بے شمار ہوتے ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ بیک وقت تمام پہلوؤں کا مطالعہ کیا جا سکے۔ اس لئے یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ کونسا پہلو اہم اور ضروری ہے۔ اور کونسا کم اہم اور کارآمد ہے، اور چونکہ یہ ممکن نہیں کہ کسی موضوع کے قریب تمام تر حصص سے بیک وقت پہنچا پایا جائے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ مظاہر حیات پر ایک ہی وقت میں تمام پہلوؤں سے نظر ڈالی جائے۔ چار و ناچار ایک سلسلہ مدارج اختیار کیا جانا لازم ہو جاتا ہے بس اسی میں نکتے کا حل مرکوز ہے لیکن یہ سلسلہ مدارج صرف زیست کی تفہیم سے مہیا ہو سکتا ہے صرف صحیح تفہیم حیات ہی بالعموم سائنس اور بالخصوص منفرد سائنس میں دلالت اور ہدایت پیدا کرتی اور زیست کے متعلق اُن کی دلالت و معانی کی اہمیت کے لحاظ سے اُن کی ترتیب و تنظیم کرتی رہتی ہے۔ لیکن اگر تفہیم حیات وہ نہیں جو ہم سب میں ودیعت کی گئی ہے تو خود سائنس غلط و گمراہ ہو جائے گا۔

جیسے ہم سائنس کہتے ہیں وہ حیات کو متحتم (determined) نہیں کرتا، بلکہ ہمارا تصورِ حیات یہ متحتم کرتا ہے کہ سائنس کو کس بات کا اعتراف کرنا ہے۔ اور اس سے کہ سائنس، سائنس ہو یہ سوال پہلے طے ہوتا ہے کہ سائنس کیا ہے اور کیا نہیں ہے، اور ہمارا تصورِ حیات اس مقصد کو سامنے رکھ کر واضح کیا جانا چاہیئے

میں اپنے تمام خیالات صاف صاف بیان کروں گا۔ ہم سب اس اختیاری سائنس کے مفروضہ عقیدہ اساسی سے واقف ہیں نہ مادے اور اُس کی توانائی کا وجود ہے؛ توانائی متحرک ہے، میکانی حرکت سالمے میں تبدیل ہو جاتی ہے، سالمے کی حرکت حرارت سے، برقی، اعصابی اور دماغی حرکت سے ظاہر ہوتی ہے، اور زندگی کے تمام مظاہر، بلا استثناء، اپنے آپ کو توانائی کے متعلقات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح ہر چیز خوبصورت، سادہ اور واضح اور سب سے زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے، یہاں تک کہ اگر وہ سب چیزیں جن کی ہمیں خواہش ہے اور جو ہماری زندگی کو آسان سہل بنا دیتی ہیں، موجود نہیں ہیں تو وہ سب کسی نہ کسی نوع سے ایجاد و اختراع ہونا چاہئیں۔

چنانچہ میں اس خیال کے اظہار کی جسارت کرتا ہوں کہ اختیاری سائنس کی توانائی، گرمجوشی اور فعلیت کا جزو غالب اس بات کی خواہش پر مبنی ہے کہ ہر وہ چیز ایجاد کی جائے جو ایسے تمام وہ استحضار (حیات) کے قوی استحکام کے لئے ضروری ہے۔

سائنس کی اس تمام فعلیت میں ایک شخص جو کچھ دیکھتا ہے اُس میں مظہر حیات کی تفتیش کی خواہش ایک مستقل فکر و تجسس کی صورت میں ہے کہ اس کے اساسی اعتقاد کی راستی ثابت ہو سکے نظر نہیں آتی۔ بلکہ وہ قوت ان تجربوں میں صرف کر دی جاتی ہے کہ غیر عضوی کے مقابلے میں عضوی اور روحانی کے مقابلے میں عمل عضویاتی کی حرکت کی توجیہہ و تعلیل کی جائے۔ عضوی غیر عضوی میں مبدل نہیں ہوتا۔ اگر ہم عمق بحر میں تلاش کریں تو وہاں ہم کو ایک شے ملے گی جس کو ہم مغزیا گو واکہیں گے۔ مُنیرا (monera)

لیکن اگر وہ شے وہاں نہیں ملتی، تو ہم باور کرلیں گے کہ وہ مل جائے گی ——— زیادہ تر اس لئے کہ گزشتہ صدیوں کا پورا سلسلہ ہماری مدد کے لئے حاضر ہے تاکہ ہم وہ تمام باتیں جن کو ہمارے مسلک کا جزو ہونا چاہیئے، ہم اُس کے سر تھوپ دیتے ہیں ——— لیکن وہ شے وہاں فی الواقع نہیں ہے۔

کیا عضوی سے روحانی فعلیت میں منتقل ہونے کی حقیقت یہ ہے؛ مگر ہم یقین کرلیتے ہیں کہ ایسا ہو جائے گا۔ اور اس لئے ہم اپنے تمام قوائے ذہنی کو اس بات کے آخری امکان کو ثابت کرنے میں لگا دیتے ہیں۔

مبدا رحیات کیا ہے؛ وہ شے جس کا زیست سے کوئی تعلق نہیں ———

خواہ وہ (ANIMISM) ہو یا حیاتیت (VITALISM) یا پھر کسی مخصوص قوت کا تصور ——— اس سوال نے اس کے متعلق حجت تکرار نے، انسان کی آنکھ سے زندگی کے اصل مسئلے کو مستور کر دیا ہے، اور یہ وہ مسئلہ ہے کہ جس کے بغیر تصورِ حیات کی شگفتگی و تعلق گم ہو جاتا ہے۔ اور ان سائنسدانوں کو جن کو وہ عمر کا راہبر جتنا تھا بتدریج ایسے آدمی کی حالت میں پہنچا دیتا ہے جو تیز قدمی کے ساتھ جا سکتا ہے مگر منزلِ مقصود کو بھول گیا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ میں عمداً اُن زبردست نتائج کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو سائنس نے اپنے موجودہ روش سے مہیا کئے ہیں۔ لیکن یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بہتر سے بہتر نتیجہ کسی غلط یا رہ عمل کی تائید نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر ہم اس محال کو تسلیم بھی کر لیں کہ وہ تمام عصری سائنس جزئیات کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے، اور پھر چند خود اس کا یہ عقیدہ نہیں مگر دعوے کرتا ہے کہ یہ سب روشن و منکشف ہو جائے گا۔ ہم مانے لیتے ہیں کہ وہ سب روشن و منکشف ہو گیا اور روز روشن کی طرح واضح ہے۔ یہ بالکل صاف ہو گیا ہے کہ عضوی مواد، طبعی توانائی کے ذریعے سے غیر عضوی کے اندر سے کس طرح رونما ہوتا ہے، یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ طبعی توانائی سے حس، ارادہ اور خیال میں کس طرح تبدیلی ہو جاتی ہے، اور یہ باتیں اسکول کے بچوں کو بھی معلوم ہو گئی ہیں۔

میں واقف ہوں کہ فلاں فلاں خیالات اور احساسات، فلاں فلاں حرکت سے پیدا ہوتے ہیں۔ خوب۔ مگر اس کے آگے کیا؟ اس لئے کہ میرے اندر یہ اور دوسرے خیالات پیدا ہوں۔ یہ حرکات میری کوئی راہبری کر سکتی ہیں یا نہیں؟ یہ سوال کہ میں اپنے بطون میں اور دوسرے خیالات و احساسات میں بیدار ہوں، صرف غیر منفصل رہتا ہے بلکہ اس کو چھوا تک بھی نہیں گیا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ سائنس داں اس سوال کا جواب دینے کی تکلیف نہیں دیتے، اس مسئلہ کا حل اُن کے خیال میں بہت آسان ہے۔ اسی طرح جیسے ایک ایسے آدمی کو جو اُس کو سمجھتا نہ ہو ایک مشکل مسئلہ ہمیشہ آسان معلوم ہوا کرتا ہے۔ اس سوال کا جواب کہ جب یہ ہماری قدرت میں ہے تو ہم اپنی زندگی کی ترتیب و تنظیم کس طرح کریں۔ سائنسدانوں کو آسان معلوم ہوتا ہے، وہ جواب دیتے ہیں۔ اس کی ترتیب و تنظیم اس طرح کرو کہ تمام لوگ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ سائنس پہلے وہ ذرائع فراہم کر لیتا ہے کہ ضروریات مستحکم ہو جائیں، اور پھر وہ ذرائع فراہم کرتا ہے کہ نہایت آسانی اور بہتات کے ساتھ وہ اشیا پیدا کی جائیں جو ضروریات کو بسہولت پورا کر دیں، اس سے دنیا مسرور ہو سکے گی۔

لیکن اگر ہم سوال کریں کہ جن کو وہ ضروریات کہتے ہیں وہ کیا ہیں۔ اور ان ضروریات کی حدود کیا ہیں، تو وہ صرف یہ جواب دیتے ہیں کہ سائنس یعنی سائنس کا مقصود یہ ہے کہ ان ضروریات کو طبعی، ذہنی، جمالی اور اخلاقی شعبوں میں منقسم کر دے۔ اور صرف یہ بتا دے کہ کونسی ضروریات واجب ہیں، اور کس حد تک ناواجب۔ سائنس اُن کی تعریف استبداد وقت کے ساتھ ساتھ بیان کرے گا۔ لیکن اگر پوچھا جائے کہ ایک شخص ضروریات کے جائز اور ناجائز ہونے کا فیصلہ کرنے میں اپنے آپ کو کس اصول کا پابند بنائے تو وہ برملا جواب دیتے ہیں کہ ضروریات کا مطالعہ کرنے سے۔ لیکن لفظ ضرورت کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ یا تو حالتِ وجود۔ مگر ہر شے کے وجود کی حالتیں خاصے کے اعتبار سے بے شمار ہیں، اس لئے تمام حالات کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا، یا انسانی ہستیوں کی مسرت کی ضرورت، جو صرف شعور کے ذریعے سے جانی اور محکم کی جا سکتی ہے۔ اس لئے یہ معنی عصری سائنس کی تحقیق و تفتیش کے لئے زیادہ غیر اثر پذیر ہیں۔

جس کا نام سائنس ہے وہ ایک نوع کا نا ممکن الخطا ادارہ، جماعت، یا مجلس ہے، اور امتداد وقت کے ساتھ وہ ان تمام باتوں کو محکم کر لے گا۔

کیا یہ ظاہر نہیں کہ سوالات کے یہ تمام حل مسیحائی مملکت کی توضیح و تفسیر ہیں، جس میں سائنس مسیحا کا پارٹ ادا کر رہا ہے۔ اور یہ کہ محض توجیہہ و تعلیل کی خاطر ہر شے کی توجیہہ و تعلیل کی جاتی ہے؛ یہ مستلزم ہے کہ سائنس کے مفروضات کو ویسے ہی بلا حجت و تکرار تسلیم کر لیا جائے جس طرح مسیحا کے متعلق یہود کا عقیدہ ہے۔ کیونکہ سائنسداں بھی یہودیوں ہی کا سا عقیدہ رکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خدا پرست یہودی اپنے مسیحا کا استحضار مرسل الٰہی کی طرح کرتے ہوئے ایمان رکھتا ہے کہ مسیحا اپنی طاقتوں سے جو کچھ ظاہر و قائم کرے گا وہ بہترین ہوگا اور خدا پرست سائنس داں، اشیا کی فطرت کے تحت یہ یقین نہیں کر سکتا کہ ضروریات کی خارجی تحقیق کے ذریعے سے حیات کے متعلق مخصوص اور تنہا سوال حل کیا جا سکتا ہے۔

(ترجمہ از ثنا الستانی)

اللہ کرے

اللہ کرے اے ہند! اس فتنۂ دوراں میں
ہو گوئے ظفر مندی تیرے خمِ چوگاں میں

کانٹوں کو بناتی ہے جو بادِ صبا گلشن
آئے وہ صبا تیرے اُجڑے ہوئے بُستاں میں

دِل مِلتے ہیں جس مے سے معبود! وہ مے ٹپکا
پیمانۂ ہندو میں، مینائے مسلماں میں

راتوں کو چمکتے ہیں سینے میں جو شاعر کے
وہ عُقدہ کُشا غنچے مہکیں ترے داماں میں

اَوراق سے اُڑ جائیں اغیار کی تحریریں
اب مُہر تری جھلکے ہر دفتر و دیواں میں

ہاں نُوح کی کشتی کی تقدیر ملے تجھ کو
اِس بحرِ سیاست کے بپھرے ہوئے طوفاں میں

اے طاقِ وطن تجھ میں اے کاش پر افشاں ہو
وہ نُور کہ غلطاں تھا قندیلِ سلیماں میں

اے کاش کبھی تیری ظُلمت کی طرف دیکھے
وہ شمع کہ روشن ہے عشر تگہِ یزداں میں

ساقی کے تبسّم سے، اور جوشؔ کے بربط سے
روشن ہوں کنوَل تیری محرابِ زر افشاں میں

جوش ملیح آبادی



مقدس الدین صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ



تقدیر اگر دست دهد ، غنیمت انگار - ساقی و مغنی و کتابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند - حق را بسجودے و نبی را بدرودے
(غالب)

ایک ایرانی مصور کے [illegible] کا شاہکار

سماج کی قتیل

سید فرید جعفری کا تازہ افسانہ

"بیگم!"

میں چونک پڑی۔ ایک پہر رات گزری تھی، نیند اچٹ گئی تھی، میں کمرے کی
سے لگی شوپنہار کے نظریات اشباب دیکھ رہی تھی۔

"لکھنؤ سے رشید میاں تشریف لائے ہیں۔"

"تو امی سے کہو۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

کہاں شوپنہار کے نظریات اور فلسفے اور کہاں رشید میاں۔ میں انہیں جانتی بھی تو نہیں تھی۔ پھر یہ اخلاق کہاں کا تھا کہ گیارہ بجے رات کو بغیر اطلاع مہمان صاحب تشریف لائیں۔ میں غصے میں دوبارہ کتاب پڑھنے لگی۔ مگر خادم کے اچانک آجانے پر طبیعت اچاٹ کر دی۔ میں نے نظر اٹھائی خادمہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہ تھی۔

"کمبخت! کیوں سر پر کھڑی ہے" جھلا کر میں نے کہا

کنواری لڑکی ہونا بھی قہر ہے، گویا ہمارے جان ہی نہیں ہوتی، نہ وقت کا خیال، نہ موقع کا احساس، نہ تکلفات کا پاس۔ میں جانتی تھی کہ کھانا ختم ہو چکا ہوگا اور امی جان چاہتی یہ ہونگی کہ چولھا گرم کروں، نئے مہمان صاحب کو کھانا کھلانا ہے۔ بڑی بیگم نے آپ کو نیچے بلایا ہے۔

"یہ ہیں کون؟" غیر اختیاری طور پر زبان سے نکلا۔

"اے ہے آپ رشید میاں کو نہیں جانتیں آپ کے منگیتر اور کون؟"

"کیا؟" یونہی میری زبان سے نکل گیا۔ مگر خادمہ جا چکی؟"

نہ معلوم کیوں بالکل غیر آزادی طور پر کتاب میرے ہاتھ سے گر پڑی اور میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ امی جان کے پاس گئی تو انہوں نے ہدایات دیں اور میں باورچیخانہ میں چلی گئی۔ توے پر روٹیاں ڈال رہی تھی اور سوچ رہی تھی سوسن کی بات

"میرے منگیتر" ؟ تو یہی میرے چچا جان کے صاحبزادے ہیں۔ میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بچپن میں ہم کبھی ایک ساتھ ضرور کھیلے تھے۔ مگر وہ زمانہ خواب و خیال ہو چکا تھا۔ میری سہلیاں میری بہنیں مجھے اکثر چھیڑا کرتیں اور مجھے بہت پریشان کرتی رہتی تھیں۔ مگر میں طبعاً اس قدر آزاد تھی کہ ان کی باتوں کو مہمل سمجھ کر ٹال دیا کرتی۔ فطرتاً اس وقت مجھے ان کو دیکھنے کا خیال پیدا ہوا۔

"کیسے بد اخلاق ہیں کہ گیارہ بجے رات کو آ دھمکے اور اطلاع بھی دی"

کھانا تیار کر چکی تھی سینی میں رکھ کر امی جان کے پاس لے گئی۔ رشید صاحب پیڑ پر پیر رکھے، نظریں جھکائے تشریف رکھتے تھے۔

"سوسن! کھانا لے لے!" امی نے خادمہ سے کہا۔ میں ٹھٹھک کر آڑ میں ہو گئی۔

"تو امی میرا سامنا کرانا نہیں چاہتیں!" دل میں میرے خیال آیا۔
اور میں سوسن کو کھانا دے کر کوٹھے پر واپس چلی گئی۔

"شرمیلے ضرور ہیں!" میں نے سیڑھیاں ختم چڑھتے چڑھتے سوچا۔ یا تو نظریں پہلے ہی سے نیچی تھیں یا مجھے دیکھ کر جھکالی تھیں مگر یہ میرے منگیتر ہیں اور میں ان سے بالکل بے بہرہ ہوں۔ نہ معلوم مزاج کے کیسے ہونگے؟"

میں آرام کرسی پر لیٹ گئی۔ گری ہوئی کتاب دوبارہ اٹھائی اور پڑھنا چاہا۔ مگر یا تو میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا تھا یا چھپی کتاب کے الفاظ ہی باریک تھے میں پڑھ نہ سکی۔ دراصل میرے جذبات متلاطم تھے۔ مستقبل کی زندگی کی کتاب کا سادہ ورق نظروں کے سامنے تھا۔ میں ایک نتیجے پر پہونچنا چاہتی تھی اور نہ پہونچ سکتی تھی، شوپنہار اور تمام مفکرین عورت کے معاملہ میں "درشت مزاج" واقع ہوئے ہیں۔ وہ عورت کی عزت کرتے ہوئے بھی اسے بے اعتبار سمجھتے ہیں اور ہندوستان

خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ایک صاحب کو مجھے بغیر مشورہ کئے ہوئے منسوب کر دیا گیا تھا اور میں نہیں جانتی کہ وہ اللہ میاں کے بیل ہیں یا اور کچھ تو بہ! مجھے غصہ آگیا، ہم عورتیں کب مساوات اور خودداری کی زندگی بسر کر سکیں گی؟۔ یہ نصف صدی بیشتر کے آدمی بوصرف حُسن تعلق سے ہمارے والدین ہو گئے اور یہ بھی اتفاق تھا کہ رشتے چالیس برس پیشتر ہی دُنیا میں نئے ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں اور اُمید یہ کرتے ہیں کہ ہم اسی طرح بندھی ہوئی آنکھوں سے ٹھوکریں کھا کھا کر سنبھل سنبھل کر اپنی زندگی کے بے رفیقوں کو مجازی خدا بنا کر اُن کے پاؤں دھو دھو کر پئیں۔ ابا جان سے اگر میں کہوں کہ یہ ظلم ہے تو وہ سر پیٹ لیں گے مگر جب میں اخبار میں پڑھتی ہوں کہ مجلس عوام میں ہماری بہنیں بھی ممبر ہوتی ہیں گول میز کانفرنس میں بھی اُن کے چہروں پر کان لگائے جاتے ہیں، سیاسیات کی باگ بھی انہیں دی جاتی ہے اور جب دوسری طرف اپنی چار دیواریوں کی قید میں بسر ہوتی ہوئی زندگیوں پر نظر ڈالتی ہوں تو کیسے نہ باغی ہونے کو طبیعت چاہے کیا لڑکوں کی جان لڑکیوں سے بہتر ہے؟ پھر انہیں ہر طرح کی آزادی کیوں دی جاتی ہے، وہ طرح طرح کی تفریحات میں دل بہلاتے ہیں اور ہماری کائنات صرف ایک کوٹھا، ایک مختصر سا آنگن اور چند کمرے! کہا جاتا ہے کہ اسلام نے عورت کا درجہ نہ صرف بلند اور بہتر کیا بلکہ ہمیں مردوں کے برابر حقوق دئے اور ہمیں شریک زندگی کی حیثیت سے متعارف کیا مگر یہ کونسی بلندی ہے، یہ کیسی بہتری ہے اور کیسے حقوق ہیں یہ؟ سنتی ہوں کہ زمانہ قدیم میں عورت کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا مگر یہ بھی تو زندہ ہی درگور رہنا ہے کہ مرد کے طوفانی جذبات میں اپنی کشتی حیات کو ڈال دیا جائے اور وہ تھپیڑے کھاتے ہی کھاتے غرق ہو جائے۔ اللہ! میں شادی نہ کرونگی،، سوچتے ہی سوچتے میں تھک کر آرام کرسی پر سوگئی۔

(۲)

میں جھوٹ نہیں بولتی، مجھے معلوم ہوا کہ میری منگنی کی رسم کب شروع ہوئی اور کب ختم۔ ہے میں نے ضرور محسوس کیا کہ بارہ بجتے بجتے میری تمام سہیلیاں میرے پاس آگئیں تھیں اور سب مجموعی طور پر معمولی سے کہیں زیادہ مجھے چھیڑ رہی تھیں، چند اعزا بھی چلتے پھرتے نظر آتے تھے، گھر دوسرے دنوں سے زیادہ صاف اور آراستہ تھا۔ کھانے بھی اچھے پکے تھے اور بہ خلاف معمول باورچیوں نے پکائے تھے۔ میرے ساتھ بھی کچھ رسمیں کی گئیں تھیں مگر میں نہیں بھول گئی، فکر و آلام سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔

میں بہت پریشان تھی فکر اور غصہ مجھے اندر ہی اندر گھلا رہا تھا۔ کاش میں نے والدین سے چھپ چھپا کر اخبارات اور مغربی مفکرین کے افکار نہ پڑھے ہوتے۔ کاش میں بالکل ہی جاہل ہوتی۔ میں برآمدے سے اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی اور میں نے اپنی سب سے پیاری سہیلی سوشیلا کو اندر بلا کر دروازے میں کُنڈی لگا دی، سوشیلا پڑوسی کے پاٹ شالے کی اُستانی تھی اور ایسی حیثیت سے پہلی بار مجھ سے متعارف بھی ہوئی تھی، رفتہ رفتہ ہم میں بہناپا ہو گیا اور ہم ایک دوسرے کے رازدار ہو گئے۔ سوشیلا مجھے گھبرائی ہوئی دیکھ کر ہنس دی، پھر مسکرائی اور جب میں نے اس کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا تو اُس نے میرا منہ چڑھا دیا۔ سوشیلا چنچل تھی یہ مجھے معلوم تھا۔ مگر موقع کی نزاکت کا احساس تو مجھے تھا میں جل ہی تو گئی۔ غالباً سوشیلا نے اُسے محسوس کیا ہوگا، اُس نے یکایک میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی پتلی اُنگلیوں کو میرے بازوں کے گوشت میں چبھوتے ہوئے بولی "کیا ہے حنا، کیوں پریشان ہو؟ کچھ آج تو رخصتی ہوئی نہیں جاتی۔ یہ تو فقط منگنی کی رسم ہے ہی ایسی پریشانی ظاہر کرو گی تو تمہاری اتنی نازک جان ہی جائیگی پھر اگھر ہے دل قابو میں رکھو،،

میں نے اُسے بتانا چاہا مگر زبان نے یاری نہ دی، اُنگلی کے اشارے سے سمجھانا چاہا مگر اُن میں بھی جنبش نہ ہوئی آنکھوں کی حرکت سے میں نے اظہار جذبات کی کوشش کی مگر کمبخت آنسو بھی اس موقع پر نہ چھلکے۔ سوشیلا مجھے گہری نظر سے دیکھتی رہی تھی، یکایک قہقہہ مار کر ہنس پڑی، اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ باہر سہیلیاں دروازہ کھٹکھٹا رہی اور بُری طرح چیخ رہی تھیں۔ بدن میں "جھرجھری" سی آئی اور میں بے اختیار رونے لگی، سوشیلا سمجھ گئی پردہ کی پابند نہ ہونے کی باعث ہندو لڑکی نسبتاً بہتر حالت میں ہے۔ وہ نہ صرف ماحول پر گہری نظر رکھتی ہے بلکہ اُس کی آواز میں اثر ہے۔ اس میں خود مختارانہ شان ہے اور مرد کو اُس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ باہر کی یورش میں اس قدر اضافہ ہوا کہ مجھے مجبور ہو کر دروازہ کھول دینا پڑا اور پھر ہم میں گفتگو نہ ہو سکی۔

(۳)

تیسرا دن تھا اور میرے منگیتر صاحب ابھی واپس نہیں گئے تھے میں نے اب ذرا زیادہ سنجیدگی سے اپنے مستقبل پہ غور کرنا شروع کیا میں نے

سوچا کہ جو ہونا تھا ہو گیا جس طرح بھی ممکن ہو "منسوب" کی زیارت ضرور کر لینی چاہئے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ میں اپنے اس خیال میں کہاں تک حق بجانب تھی رینالڈز کے انگریزی ناول اس کے ذمہ دار تھے یا مولانا عبدالحلیم شرر کے؟ سوشیلا کی ہم صحبتی تھی یا پاٹ شالہ کی دوسری لڑکیوں کا انداز تحریک جنگ آزادی میں ہندو دیویوں کی شرکت ملکی اخباری خبریں یا آل انڈیا خواتین کانفرنس کے جلسوں کی روئداد، بہرصورت میں باوجود ایسی شدید قید اور نظر بندی کی زندگی بسر کرتے ہوئے بھی بیدار اور طوفانی حسیات سے روشناس تھی اور میں نے آخر کار سوسن کو آواز دے ہی دی سوسن پر مجھے اس قدر اعتبار تھا میں نے اُسے ایک خط لکھکر دیا اور کہا کہ اسے میرے منگیتر تک پہنچا آئے اور جواب لے آئے، مُنہ مانگے انعام کا وعدہ کیا۔ وہ راضی ہو گئی۔ میں نے انہیں لکھا۔

میں یہ نہیں جانتی کہ آپ کو کیسے خطاب کروں۔ یہ کیا کم جرات ہے کہ دو حرف لکھ بھی رہی ہوں اور شاید یہی آپ کو گراں گزرے، اور آپ ناراض ہو جائیں بہرصورت یہ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کو آج تک نہیں دیکھا اور نہ فی الحال اس کی اُمید نظر آتی ہے۔ ہمارے درمیان رشتہ یگانگی قایم ہو چکا ہے اچھا ہے۔ اچھا ہے اگر یہ مستحکم ہو جائے اور غلط فہمیوں کے باعث آئندہ کبھی نہ ٹوٹے۔ میں پہلی بات تو آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ اگر میں آپ سے پوشیدہ ملاقات کرنا چاہوں تو آپ ملیں گے؟ ہمارے رشتے گزشتہ اور موجودہ دونوں ہمیں ایک دوسرے سے واقف ہونے کا اختیار دیتے ہیں۔ پھر شرع اسلام کی رُو سے بھی میرا یہ مطالبہ ناجائز نہیں ہے میں پھر اس جسارت کی معافی چاہتی اس اشتیاق ملاقات کے ساتھ ختم کرتی ہوں۔ فقط حنا

سوسن خط لے گئی اور جواب میں اپنا سا مُنہ لے کر واپس آ گئی۔ میں نے استفسار کے طور پر اُسے گھورا تو وہ صرف اس قدر کہکر میرے پاس سے چلی گئی کہ "میاں چلے گئے"

تھوڑی دیر میں کہرام سا مچ گیا۔ آواز اڑتے اڑتے میرے کانوں میں بھی پڑی اور مجھے معلوم ہوا کہ میرے منگیتر میری اس آزادی پر چراغ پا ہو کر بغیر کسی سے ملے واپس چلے گئے۔

مجھ سے اُمی کے سامنے نہ جایا گیا۔ تقدیر کے آگے تدبیر نہیں کام کرتی۔ مجھے نفسیات داں ہونے کا موقع نہیں ملا اُس بات کی اگلی پچھلی جھلک ہی انہیں سمجھنے کے لئے کافی تھی۔ مجھے بیحد غصہ تھا اور خفت بھی تھی اور میں خوش بھی بے انتہا تھی۔

غصہ اس بات پر کہ ایسے مولوی مزاج نوجوانوں کے ہاتھوں میری زندگی کا بیوپار کیا گیا تھا، خفت اس لئے کہ والدین سے باوجود فطری آزادی کے آنکھیں چار کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا اور خوشی یہ تھی کہ بہت جلدی ہی میری سمجھ میں آ گئے۔

زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اُمی خود ہی کوٹھے پر آ گئیں اور جس قدر بُرا بھلا کہہ سکتی تھیں اُنہوں نے کہا اور جب میں رونے لگی تو ہزاروں کوسنے دے کر وہ نیچے چلی گئیں۔

(۴)

واقعات نے اہمیت پکڑی۔ الجھاوے پڑے اور میں ہر طرف سے نکو بنائی گئی۔ جسے دیکھتی اپنے سے ناخوش پاتی۔ جس سے باتیں کرنا چاہتی، کترا جاتا، جس کو بُلاتی مُنہ پھلا لیتا۔ زندگی اجیرن ہو گئی، کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا، مُشکل ہو گیا۔ اور میں عجیب و غریب مصیبتوں میں گرفتار ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک روز امی جان نے انتہائی رنج اور غصہ کے ساتھ مجھے بتلایا کہ میرے چچا صاحب نے نسبت توڑنے کے لئے لکھا ہے۔ کیونکہ لڑکا ایسی بے باک اور بے حیا لڑکی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔

رائی کا پربت بن گیا اور اب میرے متعلق قسم قسم کے افسانے گڑھے جانے لگے اور چند ہی دن میں خاندان کے لئے کلنک کا ٹیکہ بن گئی۔ میں دور و نزدیک ہر جگہ آوارہ مزاج، آزاد، بے باک، بے حیا اور نہ معلوم کیا سمجھی جانے لگی۔

ایک دن میں نے امی جان اور ابا جان کو سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ سُن گُن لی تو معلوم ہوا کہ میرے ہی متعلق مشورے ہو رہے ہیں۔ امی جان کے آقائی و مولائی حضرت پیر کے فرزند ارجمند میرے لئے منتخب ہوئے ہیں اور طے یہ پایا ہے کہ چُپ چپاتے نکاح ہو جائے میں کانپ کر رہ گئی۔

(۵)

اخبار میں پڑھا تھا کہ اطالوی ڈکٹیٹر مسولینی صاحب جب کہیں تشریف لے جاتے ہیں تو کھلبلی سی مچ جاتی ہے، ایک دن میں مدتوں کے بعد صبح کی کیفیت میں انگڑائیاں لے رہی تھی مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے غریب خانے پر حضرت مسولینی ہی رونق افروز ہوئے ہیں اطمینان اور بے اطمینانی دونوں کی موجیں میرے ساحل حیات سے ٹکرائیں اور میں تھوڑی دیر کے لئے ضرور ڈگمگا گئی، ہر کھڑکی سے نظر نیچے آنگن میں دوڑائی تو دیکھا کہ ایک بزرگ جنکی شمع حیات نصف

زیادہ اُجھل چکی تھی تشریف لا رہے ہیں امی جان بڑھکر استقبال کر رہی ہیں۔

"غالباً یہی میری زندگی کی نیّا کے کھویا منتخب ہوتے ہیں" کانپتے ہوئے میں نے سوچا۔ "جو ذرا گہری نظر سے دیکھا تو عارض پر نور پر جگہ جگہ چیچک ہونے دھاگے اتباع سنت، نشان مردانگی اور شرعی پابندی کی مظہر کتری ہوئی مونچھ جو یقینی حساس۔ دلوں کیلئے ایک بار اور ایک مصور کی نگاہ میں ایک بھوری تلوار تھی جس نے آرٹ کا خون کر دیا ہو، ٹیکنے بیل کی طرح سپاٹ سر پر ایک گول ٹوپی، کاندھے پر چار خانے کا ایک رومال، گھٹنوں سے نیچے تک لٹکا ہوا کرتہ ٹخنوں سے اوپر تک ڈھیلی گرفت سے جٹا ہوا پائجامہ اور ایک بھول کا دلّی والا جوتہ پاؤں میں۔ میں بے اختیار آواز سے ہنس پڑنے کے لئے مجبور ہوئی مگر میرا دل جانتا تھا کہ ہنسی کس قدر کھسیانی تھی۔ ہنسی کی آواز غالباً نیچے تک پہونچی کیونکہ امی کی غصیلی نظریں اوپر اٹھیں اور مجھے جھجک کر ہٹ جانا پڑا۔

(۶)

دوسرے دن مجھے سوسن سے معلوم ہوا کہ گزشتہ شب سے میری زندگی کا نیا باب شروع ہوگئی، میرا نکاح بغیر میری اطلاع کے "خاموشی نیم رضا" کے مصداق کر دیا گیا۔ اور اب میں ایک مولوی صاحب کی رفیقہ حیات ہونے کی مستحق ہوگئی۔ ایک پیر طریقت بزرگ کے آخری سانس لیتے ہوئے شعلۂ نفسانیت پر اپنے ارمانوں کا پکوان پکانے کے لئے مجبور ہو چکی۔ جس طرح ایک پیا دیوانگی میں خود اپنے ہی آشیانہ کو نوچ کھسوٹ ڈالتا ہے اُسی طرح میں نے بھی اپنے لانبے لانبے بالوں کے ساتھ کیا ہوش آیا تو بزرگ محترم اُسی طرح نظر پڑے جیسے ابا جان بیماری کی حالت میں کبھی میرے سرہانے ہوا کرتے تھے۔ مجھے اس طرح تھپک رہے تھے جیسے میں انکی نور نظر تھی، ہاتھوں میں ایسی خنکی تھی ان کا ہر مس میرے لئے ایسا ہی تھا جیسے کہ ایک من برف کی سل سے میں مرکزدی گئی ہوں۔ میں نے اُنکا گلا گھونٹ دینا چاہا مگر پھر رحم آگیا، مرد ہم عورتوں پر اس لئے ہاتھ نہیں اُٹھایا کرتے کہ ہم صنف نازک سمجھی جاتی ہیں اور یہ میرے آقا مجھے جنس عجیب ہی سے معلوم ہوئے، جو مرد اپنی جوانی کی زیب نما نمائش کے لئے لال کبوتر بننا گوارا کر سکتا ہو جو اپنی آنکھوں سے زندگی کی تلچھٹ دور کرنے کے لئے بریلی کے سرمہ والوں کی دوکانوں کی پھیری کر سکتا ہے، جو اپنے گوشت و پوست کی گئی گذری کساوٹ چھپانے کے لئے ڈھیلی بنڈی کا جھولا اٹکا سکتا ہو۔ یا اپنے ہاتھوں کے رعشہ کو چھپانے کے لئے تسبیح کا ڈھونگ رچا سکتا ہے۔

وہ بھلا عورت کے انتقام کی تاب کیا رکھ سکتا ہے؟ توبہ! مجھے اُنپر رحم آگیا۔ وہ مجھے دیکھنے لگے اور انہوں نے کہنا چاہا "بیوی تم بیچ بڑی چُپ رہنے"۔ وہ گھبرا سے گئے۔ بیوی! گویا کہ میں امی جان تھی، اور وہ ابا جان، گئی گذری جوانی پر حسرت کا نوحہ پڑھنے کے لئے، بجھی ہوئی کیفیات پر وقت کا مرثیہ پڑھنے کے لئے عورت کو بیوی سے خطاب کرنا درست ہو سکتا تھا مگر اُس وقت تک تو میرا احساس شباب بھی بیدار نہوا تھا۔ بھولے بادلوں میں سے چھنی ہوئی دوپہر تھی اور ٹھٹھرے ہوئے دنوں میں منہ سے بے معنی نکلے ہوئے الفاظ میں سے ایک لفظ! بے اختیار میرے ہاتھ اپنے سینہ پر پٹے اور میں نے اپنا سینہ مل ڈالا۔ دفعتاً مجھ میں احساس شباب بیدار ہوا، میرے جذبات میں تموّج پیدا ہوا، میں ایک بھنور کی طرح چکر کھا گئی۔ میری آنکھوں میں ایک نشیلی لہر دوڑی کہ میری رگ رگ پھڑک اُٹھی۔ میں نے اُنہیں دیکھا اور اُنہوں نے مجھے۔ میرے ہاتھ کچھ اُنکی طرف بڑھے اور اُن کے میری طرف مگر میرے بڑھتے ہوئے ہاتھ آپ ہی آپ رُک گئے، اُنہوں نے میری کلائیاں پکڑلیں مگر میں دہک رہی تھی اور اُن کے ہاتھ تھے جیسے پہاڑ کے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس، میں ایک بار پھر سُن ہو کر رہ گئی۔ ٹھنڈی آہ نکلی اور میں نے دوپٹہ کے آنچل میں رونا شروع کیا مگر وہ گر کر بھی اُبھر رہے تھے۔ اُنہوں نے مجھے گھسیٹ لیا۔ میں نے انہیں دھکا دیا وہ دور جا پڑے۔ اُن کے سنبھلتے سنبھلتے میں عورت کے اصلی روپ میں آگئی۔ میں نے اُن سے صاف صاف کہدیا کہ وہ میرے لئے نامحرم ہیں میری اُن کی شادی ہی نہیں ہوئی ہے۔ نکاح بغیر اطلاع کے ہوا، میں اس تمام تماشہ میں شریک ہونے سے انکار کرتی ہوں۔ انہیں فوراً میرے پاس سے چلا جانا چاہیئے۔ اور آئندہ کبھی مجھے صورت نہیں دکھانی چاہیئے۔

میں نے دیکھا کہ میری بے ساختہ تقریر پر انہیں میری بیزاری کی حقیقت معلوم ہوئی، اُنکی آنکھیں کھلیں اور کھلی کی کھلی رہ گئیں وہ بغیر کچھ کہے ہوئے اُٹھے اور اپنی غیر استوار داڑھی کو کُھجاتے کوٹھے سے نیچے اُتر گئے۔

(۷)

تھوڑی دیر بعد امی جان آئیں تو میں نے اُسی غصہ میں لکچر دے ڈالا۔ اُمی کی بھی اُس وقت ہمت نہیں پڑی کہ مجھے باز پرس کر سکتیں مگر دوسرے دن سے میں نے دیکھا کہ گھر میں کوئی شخص مجھ سے نہیں بولتا۔ میں کوٹھے پر مقید ہوں اور کھانا پینا بھی میرا قیدیوں کا سا ہے ابا جان میری زندگی کے درپے ہو رہے ہیں۔

واقعات خوفناک کروٹیں لے رہے تھے۔ میں نے سوشیلا کو بلانا چاہا مگر بندش ایسی سخت تھی کہ سوشیلا تو سوشیلا پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ تیسرے دن طلاق نامہ آگیا۔ اور میں اپنے نزدیک ایک مرتبہ پھر آباد ہوگئی۔

(۸)

دن گزرے راتیں بیتیں۔ ساون گیا، بھادوں گیا، مہینے منٹوں کی طرح ختم ہوئے، کنوار بھی گزر گیا اور کاتک آیا اور وہ بھی مجھے بغیر بیدار کئے گزر گیا، پوس نے مجھے راتوں کو بے چین کرنا شروع کیا اور ماگھ میں گدیلے لحاف میں بھی مجھے چین نہ پڑتا، میں بے کل رہنے لگی، سوچتے ہی سوچتے میری جوانی نے انگڑائیاں لینی شروع کیں اور ہوش کا ہر لمحہ عجیب وغریب کیفیت میں گزرنے لگا۔ اب میں شرر کے ناول دو صفحہ سے زیادہ نہ پڑھ سکتی۔ دیتا اللہ کی ایک سطر بھی مجھے متزلزل کر دیتی۔ یہاں تک کہ جوانی نے ایسی دلربا شکل اختیار کر لی کہ میں زندگی کے اس مدوجزر میں اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکی۔ پہلے درد سر کی شکایت ہوئی پھر اس نے مسلسل مرض کی صورت اختیار کی۔ یہاں تک کہ مجھے حرارت رہنے لگی۔ میرے دکھی دل کی مزاج پرسی کرنے والا کوئی نہ تھا۔

(۹)

میں نے سوشیلا کو خط لکھا "موہنی بہن! بیٹھے بیٹھے دھیان میں مجھکو دھکے دئے سنسار نے" اور سوشیلا بھی دھتکارے با! میری شانتی کے لئے میرے پاس نہ آئے۔ زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی ہوں جس طرح بھی بن پڑے آؤ۔ میرے دل کا دکھ امانتاً اپنے پاس محفوظ کر لو! تمھیں شاید کچھ علم نہیں ہے اور تعجب ہے کہ میں اس ہذیاں سرائی کے لئے کیسے زندہ رہ گئی۔ تم سے کیا، مجھ سے بھی چھپا کر میری شادی کی گئی جسے عرف عام میں خانہ آبادی کہا جاتا ہے مگر میری شادی ایسی تھی کہ زندگی کا سارا سکھ اپنی موجوں میں بہا لے گئی۔ چونکہ میں نے احتجاج کیا اور میرے شوہر شاید کچھ عزت والے تھے کہ مجھے شادی کے تیسرے ہی روز طلاق مل گئی۔ اس کے بعد سے میں آج تک شدید قید خانہ میں ہوں۔ یہاں تک کہ تمھارے پاس اطلاع پہنچنی بھی ناممکن ہے۔ بہرصورت میں کوشش کروں گی کہ رات کو چھت پر چڑھ کر یہ خط سڑک پر گرا دوں، ممکن ہے کہ تمھارا ننھا بھائی کانتی اسے اٹھالے اور تمھارے پاس پہونچا دے۔

جو واقعہ میرے ساتھ ہوا وہ ایسا روح فرسا ہے کہ بہن، اب میں ایک بیوہ سے بھی بدتر سمجھی جاتی ہوں۔ مجھ سے سماج چھوت کرتی ہے۔ میرے سایہ سے بھی لوگ کانپتے ہیں۔ میں اب رستا بیوی بنائے جانے کے قابل نہیں ہوں۔ زمانہ میرے کان میں کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ تجرد کی زندگی بسر کرو، جوانی کی آندھی میں اپنے کو جھلسا دو اور تباہ و برباد ہو جاؤ۔ سینے میں جو آگ دہک رہی ہے اسی میں جل بھن کر خاک ہو جاؤ مگر زبان سے اف نہ نکلے تیوریوں پر بل نہ پڑے۔ چہرے پر مایوسی نمایاں نہ ہو اور زندگی میں جنون کا شائبہ نہ آئے۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ زمانہ کی پیش کردہ شرطیں بیسویں صدی کی تمام طغیانیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد غلط ثابت ہوتی ہیں۔ غلط ہی نہیں بلکہ تہذیب کُش اور تکلیف دہ۔

"مصلح" بننے کے لئے ہر ایک آمادہ نظر آتا ہے مگر رسوم کی ان جکڑبندیوں کو توڑنے کے لئے کوئی آمادگی ظاہر نہیں کرتا، میں کہتی ہوں، اور غالباً تم بھی مانوگی کہ جھوٹ نہیں کہتی ہوں کہ اگر زندگی کی کشتی کو منجدھار سے نکالنے کے یہی طریقے ہیں تو میرے نزدیک یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمام اعتقادات قدیم کی ایک چتا بنائی جائے اور اس کے اڑتے ہوئے شعلوں میں اپنے آپ کو جھونک دیا جائے۔ پھر نکھار آپ ہی آپ دور ہو جائیں گے، یہ زہریلی تلخیاں امرت کے جام اور نہتالوں کے ڈالے ہوئے دامنوں کے دھبے نظر آنے لگیں گے۔

میرے خاندان میں طلاق کے بعد عورت بیوہ سے بدتر سمجھی جاتی ہے جو اپنے شوہر کو کھو کر دنیا کی تمام لذتوں سے محروم کئے جانے کی ہر طرح سزاوار ہوتی ہے۔

بہرصورت یہ تو مجذوب کی بڑ تھی۔ اب کسی طرح اپنے انوپ درشن دو تاکہ میں تمھارے مشوروں سے سکھ کا کوئی رشتہ تلاش کرسکوں۔"

(۱۰)

صبح کے پانچ بجے تھے اور موذن گلی کی مسجدوں میں سے "بانگ فجر" بلند کر چکا تھا کہ یکایک سیڑھیوں کے دروازے پر کھٹکا ہوا" ساری رات کروٹوں میں گزری تھی۔ اٹھ کر میں نے دروازہ کھولا۔ سوشیلا رات کے لباس میں کھڑی تھی۔ میں حیران رہ گئی۔ سوشیلا اندر آگئی اور بات شروع ہونے سے پہلے اس نے خود ہی دروازہ میں کنڈی لگادی۔ پھر ان سے کہا کہ "آتے سویرے میں اس لئے آئی تاکہ آسانی سے آسکوں۔ نماز کا وقت ہوتا ہے۔ باہر کا

پھاٹک بھی کھل جاتا ہے اور گھر والے نماز میں مشغول ہوتے ہیں میں نظروں سے بچتی بچاتی تمہارے پاس آ گئی۔ تمہارا خط مجھے رات ہی مل گیا تھا۔ میں رات کے شو سے سینما دیکھکر واپس ہوئی تھی کہ "کمپاؤنڈ" میں ایک لفافہ چمکتا ہوا نظر پڑا۔ میں نے جا کر اُٹھایا اور کھولا تو تمہارا خط تھا۔ وقت کم ہے مجھے جلدی رخصت بھی ہونا چاہئے، بولو کیا کہتی ہو"۔

میں نے تمام واقعات دہرائے۔ سوشیلا اِس قدر متاثر ہوئی کہ رونے لگی، پھر یہ طے پایا کہ اسی طرح دوسرے دن صبح کو میں گھر سے ساڑی پہن کر نکلوں اور سوشیلا کے پاٹ شالہ میں پناہ لوں۔

(۱۱)

دوسرے دن میں پاٹ شالہ پہونچنے میں کامیاب ہو گئی: امی جان نماز پڑھ رہی تھیں، سوسن منہ موڑے وضو کر رہی تھی، میں دبے پاؤں ڈیوڑھی تک پہونچ گئی، باہر ابا جان نوکروں کی پوری جماعت کے ساتھ نماز میں مصروف تھے۔ میں اُسی طرح پھاٹک سے باہر ہو گئی۔ پاٹ شالہ پہلو میں ہی تھا وہاں جب میں پہونچی تو سوشیلا کو اپنا منتظر پایا۔

(۱۲)

سوشیلا کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے کئی دن ہو گئے۔ گھر کی خبریں برابر ملتی تھیں میری گمشدگی سے امی جان کو روحانی صدمہ پہونچا اور وہ سخت بیمار ہو گئیں۔ ابا جان کی اس کرختگی میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ میرے فرار کو راز میں رکھا گیا اور ابا جان امی کو لے کر حج کے لئے چلے گئے۔

(۱۳)

ایک رات کو مجھے سوتے سے سوشیلا نے جگایا۔ میں پہلے گھبرائی مگر سوشیلا کے ہنستے ہوئے چہرے نے مجھے فوراً ہی مطمئن کر دیا، اُس نے مجھے بتایا "بمبئی میں آل انڈیا کانفرنس" ہونا قرار پائی اور اُسے الہ آباد سے بہ حیثیت نمائندہ بھیجا جانا منظور کر لیا گیا ہے۔ بمبئی کی گاڑی صبح سویرے ہی چھوٹتی تھی اور سوشیلا کے اصرار پر مجھے بھی اُس کے ساتھ ہی جانا تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ میں با قاعدہ طور پر ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے نکل رہی تھی مگر میں نے دل قابو میں کیا اور سوشیلا کے ساتھ بمبئی چلی گئی۔

(۱۴)

کانفرنس میرے لئے نہایت دلچسپ رہی۔ فلسفۂ اشتراکیت پر میں نے اُردو میں پیشتر کئی کتابیں پڑھی تھیں اور اسی لئے میں رسم و رواج بندشوں اور اعتبارات قدیمہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوئی تھی۔ مگر کانفرنس میں شرکت کے بعد میری آنکھیں اچھی طرح کھل گئیں۔ میں جان گئی کہ مذہبی رہنما اور ملک کے سرمایہ دار بہ یک وقت جونک بنکر ہمارا خون چوس رہے ہیں۔

پاپ کی دھمکی اور زر کی بارش سے ہمارے صحیح ایمانوں کو نہ صرف ڈانواں ڈول کر رہے ہیں بلکہ اُنہیں خرید بھی رہے ہیں در اصل پاپ کوئی چیز نہیں ہے۔ پاپ صرف ایک کہر ہے جو ہمارے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے مذہبی رہنماؤں نے لذات دنیا کا نام پاپ رکھ چھوڑا ہے اور ہماری زندگیوں کو بہت سی نعمتوں سے محروم بنا رہے ہیں۔ زندگی چند روزہ ہے۔ اس لئے جس قدر پُر کیف گزاری جا سکتی ہے گزاری جانی چاہئے۔ میں یکایک کیفیات شباب کے انتہائی عروج پر تھی۔

جلسے میں ہی سوشیلا نے میرا تعارف بمبئی کے ایک گرلس کالج کی پرنسپل سے کرایا وہ اس قدر متاثر ہوئیں کہ اُنہوں نے مجھے بہ حیثیت اردو اُستانی کے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اب سوشیلا پر میرا بار ہٹ گیا اور سوشیلا کو بھی اطمینان ہوا کہ مجھے سکون ہو گیا۔

ایک ہفتہ کے بعد جلسہ ختم ہو گیا۔ سوشیلا الہ آباد واپس چلی گئی اور ہمیں پھر ایک مدت کے لئے علیحدہ ہو جانا پڑا۔

(۱۵)

ایک دن کالج میں میرا گھنٹہ خالی تھا۔ بارش کی وجہ سے لڑکیاں کم آئیں تھیں، اِس لئے میں نے چھٹی منالی تھی "ٹیچرس روم" میں اکیلی بیٹھی ہوئی ماضی پر غور کر رہی تھی کہ اتنے میں پرنسپل صاحبہ تشریف لائیں۔ وہ اس قدر ترنگ میں تھیں کہ آتے ہی فرمانے لگیں "میں چاہتی ہوں کہ تم شادی کر لو۔ کالج میں تمام اُستانیاں شادی شدہ ہیں۔ صرف تم کنواری ہو، پھر آزادی کا بھی ہو، تفریح وغیرہ کے لیے بھی ضرورت سے زیادہ نکلتی رہتی ہو۔ کالج بدنام ہو رہا ہے۔

"میں نے طے کر لیا ہے کہ زندگی اسی طرح گزار دونگی، میری شادی میری اپنی زندگی سے متعلق ہے آپ مجھے اس کے لئے مجبور نہیں کر سکتیں"۔ میں نے جواب دیا اب طویل مکالمہ کے لئے ایک بات پیدا ہو گئی۔ پرنسپل صاحبہ بولیں "مگر شادی تو تمہیں کرنی ہی چاہئے تم نے ساری عمر پردے میں گزاری

اور آمادہ ہوئی تو اس قدر کہ مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ، اور تو اور خود میرے شوہر اس کا انجام میرے اور میرے اسکول کے لئے اچھا نہیں سمجھتے. تم غلط راستے پر جا رہی ہو، ہم سب تمہارے لئے سخت پریشان ہیں"۔

میں نے آہستہ سے کہا۔

"آپ نے شادی کی، آپ کو کیا فائدہ ہوا؟ نظر بندی کے سوا، زندگی کو محدود بنانے کے علاوہ اور بھی کچھ حاصل ہوا آپ کو؟ میں نے ساری زندگی نظر بندی اور قید محنت میں گزاری ہے، اب مجکو آزادی کا موقع ملا تو میں پھر پابند کیوں ہو جاؤں۔ میں آزاد پیدا ہوئی تھی مگر مجھے رواج نے اپنے شدید ترین جکڑ بندیوں میں لیلیا۔ میں نے اپنے مقابلہ کی طاقت پیدا کی، یہاں تک کہ میں آزاد ہو گئی۔ اب میں پھر ایک جنجال، میں کیوں پھنسوں!

میرے لہجہ میں کرختگی پیدا ہو چلی تھی، اس لئے میں نے سانس کا وقفہ لیا۔

پرنسپل صاحبہ نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم شادی کو جنجال سمجھتی ہو، یہ خوفناک بات ہے جتنا، اسی لئے تم روز بن ٹھن کر جو پارٹی پر جایا کرتی ہو. تمہارے یہ لچھن اچھے نہیں ہیں وہاں کنج کنج بھونرے بھن بھنایا کرتے ہیں، تمہارا سارا رس چوس لیں گے۔ پھر کوئی دو کوڑی کو بھی نہ پوچھے گا تمہیں"۔

میں آپے سے باہر ہو گئی اور میں نے تیز ہوکر جواب دیا۔

"زندگی محبت اور مسرت کا نام ہے۔ چند دن جینا ہے، ہنس کھیل کر نہ گزاریں تو دُنیا میں آنے سے فائدہ؟"

پرنسپل صاحبہ کو بھی غصہ آگیا کہنے لگیں۔

"دیوانی ہو گئی ہو کیا؟ مسلمان ہوکر ایسی باتیں کرتی ہو، مانتی ہوں کہ اسپنے شہر میں مرزا رف شک کی طرح تمہاری خوشبو پھیلی ہوئی ہے، تمہارا چرچا ہے میں نے مانا تم خوبصورت ہو تمہاری پوجا ہو سکتی ہے مگر اس طرح کب تک زندگی بسر کرو گی، تمہیں اندازہ نہیں کہ ہم سب تمہاری خاطر کس قدر متفکر رہتے ہیں، تمہاری وجہ سے ہم سب بدنام ہو رہے ہیں۔ شریف گھرانوں کی لڑکیاں کالج سے نام کٹا رہی ہیں"۔

"زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہنسو، کھیلو، مزے اڑاؤ اور مرجاؤ، پریم کے دریا میں روز نہاؤ اور پوتر ہو جاؤ، مذہب! دھرم! کیسا مذہب؟ کیسا دھرم؟ میں آپ کے مذہب کو جانتی ہی نہیں، آپ کا دھرم میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں تو مذہب اور دھرم کو اس طرح سمجھتی ہوں کہ ہر جگہ پھول کھلیں پچکاریاں چلیں اور محبت اور مسرت سے گلابی اور بسیری رنگ میں ہم سب نہا جائیں۔ یہ چند دن کی جوانی بھی اگر رو رو کر دن تو ڑتا یا سنے پر کیا لروں گی۔ جوانی دن ہے لہریا گیتوں کے گانے جانے کا۔ اللہ اللہ کرنے یا پران پتی کے پاؤں دھو دھو کر پینے کا جب دن آئیگا وہ بھی کروں گی"۔

پرنسپل صاحبہ غصہ میں کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں اور میرے ہاتھوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لیکر بولیں صرف تین صورتیں ہیں یا تو تم خود اپنی شادی کر لو یا تمہاری شادی زبردستی کی جائے یا تم کالج سے علیحدہ ہو جاؤ"۔

مجھے بھی انتہائی غصہ آگیا میں بھی کھڑی ہو گئی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر میں نے کہا۔

"میں شادی کروں! یا زبردستی میری شادی کیجائے؟ میں ابھی شادی نہیں کرونگی، مردوں پر اعتبار نہیں ہے اور ابھی مجھے جس مرد کی تلاش ہے وہ نہیں ملا ہے اور زبردستی آپ کرانا چاہتی ہیں تو کرکے دیکھ لیجیے، جس شادی کے لئے آپ مُصر ہیں، میں اُسے ضروری ہی نہیں سمجھتی، میرے نزدیک وہ صرف پابندی ہے، غلامی ہے، بس وہ بیاہ تو کبھی نہ کرونگی۔ رسمیات کے سامنے سر تسلیم خم کرکے میں مرد کی لونڈی اور باندی بننے سے رہی۔ مرد شادی کا مقصد یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اُن کی لونڈی بن جائیں، اُن کے چولھوں میں اپنے ہاتھ جھلسائیں۔ اُن کے لئے بہترین کھانے پکائیں۔ اُن کے نفسانی خواہشات پر اپنی جوانی اور جوبن کی بھینٹ چڑھائیں بچے پیدا کریں اور زندگی کے باقی دن پابندیوں میں گھل گھل کر کاٹ دیں۔ میں اس شادی کی قائل نہیں۔ آپ اپنی مثال پیش کرینگی۔ مگر کیا آپکی ازدواجی زندگی سکھی ہے؟ آپ خود اپنے کو فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ ورنہ میں حقیقت جانتی ہوں۔ کیا دن بھر آفس میں کام کرنے کے بعد جب تھکی تھکی ہوئی آپ گھر واپس ہوتی ہیں تو ہر صاحب سے آپ کو سخت کلامی نہیں کرنی پڑتی اور کیا جب رات کے دو دو بجے تک وہ اپنے احباب کے ساتھ برج کھیلتے رہتے ہیں۔ تو آپ کی اُن سے لڑائی نہیں ہوتی! یہی وہ ازدواجی زندگی ہے جس میں آپ مجھے پھنسانا چاہتی ہیں، میں یہ نہیں کہتی کہ میں شادی کبھی نہ کرونگی جب تک میں پابند ہوئے بغیر زندگی کے "سوم رس" سے لطف اٹھا سکونگی اٹھاؤنگی، پھر میں بھی شادی کرلونگی. مگر آپ کے قاعدے کی شادی نہیں۔ میں شادی کو صرف اخلاقی اتحاد کی صورت میں پسند کر سکتی ہوں، بس، مجھے

ایک مرد سے محبت ہے میں اُس کی ہو رہی ہوں، جب میں اُسے پا جاؤں گی، شادی کر لوں گی، میرے نزدیک شادی کے لئے صرف دلوں کے اتحاد کی ضرورت ہے، آپ جس شادی کے لئے مجھے مجبور کر رہی ہیں وہ شادی نہیں ہے۔ آپ کے طریقۂ شادی میں مرد حاکم ہوتا ہے اور عورت محکوم۔ میں اس کی قائل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک شادی ایک ایسا رشتہ ہے جو مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا ہمیشہ کے لئے رفیق اور انیس تو دیتا ہے، دائمی دوست، آپ کے طریقۂ شادی میں مرد بالکل آزاد ہوتا ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہ کبھی ایک بیوی کا ہو کر نہیں رہتا۔ لیکن بیوی اُف نہیں کر سکتی، اور قانون اور مذہب مرد کا پشت پناہ بن جاتا ہے۔ مرد کا دل جب چاہتا ہے وہ اُس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے، دوسری شادی کر لیتا ہے۔ میں اس بات کو ایک منٹ کے لئے بھی برداشت نہ کر سکوں گی۔ مجھے جب تک صحیح معنوں میں ایک دل درد آشنا، نہیں ملجاتا، میں شادی نہیں کر سکتی"

میں نے اتنی لمبی تقریر گویا ایک سانس میں کر ڈالی اور پرنسپل صاحبہ کانوں سے نہیں بلکہ اپنی دو بڑی آنکھوں سے اسے سنتی رہیں، پھر جب میں سانس لینے کے لئے رُکی اور کرسی کے ڈنڈے پر بیٹھ گئی تو وہ بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گئیں اور اُنہوں نے نہایت سنجیدہ لہجہ میں مجھ سے سوال کیا۔

"اور جو تم کنواری ہو کر نامحرموں سے ملتی رہتی ہو تو یہ گناہ نہیں ہے، اس میں پاپ نہیں ہے۔ تمہاری عصمت نہیں مجروح ہوتی"

میں نے منہ اُن کی طرف سے پھیر کر کہا۔

"میرے نزدیک گناہ کی آپ جو تعریف کرتی ہیں وہی بے معنی ہے گناہ کا معیار صدیوں کی پرانی سوسائٹی ہی کا بنایا ہوا ہے۔ ہم جب چاہیں زمانہ کی ضروریات کے مطابق اس معیار میں تبدیلی کر سکتے ہیں۔ آخر عصمت کے معنی کیا ہیں؟ ہماری آنکھیں ملتی ہیں۔ پھر عصمت کا شیشہ کیوں نہیں چُور ہوتا دل کا ملاپ ہوتا ہے، پھر عصمت کو کیوں نہیں داغ لگتا۔ وہ ایک میاں بیوی جو محبت کے دو بیجاری ہونے کے عوض دو کاروباری ہیں اور ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں اُن کی عصمت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ اور جب محبت کے دو بیجاری جن کے جذبات میں ساری خدائی موجیں مارتی ہو اُسی طرح زندگی کو کھیلانا چاہتے ہیں تو "اعتبارِ عصمت" ٹوٹ جاتا ہے"؟

میں اور کہنا چاہتی تھی مگر پرنسپل صاحبہ نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔

"مگر کنوارپن کوئی چیز ہے کہ نہیں؟ ہر مرد کی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے کنواری بیوی ملے۔ خیال تم نے مجھے ڈرا دیا ہے، سخت ڈرا دیا ہے، میں تمہارے انجام کا خیال کر کے کانپ رہی ہوں تم پتی بھگتی کی لطیف کیفیات کو نہیں سمجھ سکتیں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ پابندیوں میں ہی زندگی کا لطف ہے، تم بیسوا ہو، بازاری رنڈی سے بدتر"

میں سمجھ رہی تھی کہ میں وحشی ہوئی جا رہی ہوں مگر مجھے نہ رکا گیا۔

"کنوارپن اگر کوئی چیز ہے تو صرف اُن کے لئے جو بچپن سے کنوارپن کی مہمل تشریحات سے متاثر ہوتے آتے ہیں۔ ورنہ در اصل بیاہ نام ہی ہے اُس وقفہ آرام کا جس کی خواہش بہت زیادہ کھیل کر تھک جانے کے بعد ہوا کرتی ہے اور خواہش کو پوچھتی ہیں تو خواہش بھی بچپن کے مسلسل تاثرات سے پیدا ہوتی ہے۔ کورے گھڑے میں پانی پینے۔ نئے برتن میں کھانا کھانے اور نئے لباس پہنے کی خواہشیں بھی ہوتی ہیں۔ دونوں میں فرق بتاؤ اور اگر اپنی سی چاہتی ہیں تو آپ میری سنئے۔ جس طرح مرد کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کو کنواری بیوی ملے۔ اُسی طرح عورت کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کو کنوارا شوہر ملے۔ مگر بیوی ننانوے فی صدی کنواری ہی قبول کی جاتی ہے اور شوہر فی صدی ان گنتی بیاہ کیا ہوا۔ اور یہ تو بتائے کہ کنوارپن کی لوٹ کے ذمہ دار تو یہی مرد ہیں نا؟ —"

میں رُکی کہ پرنسپل صاحبہ کچھ اور فرمائیں گی مگر وہ کچھ نہ بولیں میں نے بات جاری رکھی۔

"آپ مجھے بیسوا سمجھتی ہیں، بازاری رنڈی سے بدتر کہتی ہیں مجھے بتائیے کہ ایک بازاری رنڈی اور گھرست بیوی میں کیا فرق ہے؟ ایک کے پاس عیاشی کا "مذہبی پاسپورٹ" یا "لائسنس" ہوتا ہے دوسری کے پاس اسی چیز کا "سوشل حکم نامہ"۔ صرف تعصب سے الگ ہو کر غور کرنے کی ضرورت ہے، مگر بازاری رنڈی گھرست نہیں ہوتی اور محلوں کی بیگم گھرست ہوتی ہے۔؟ صرف ایک جام پی کر بدمست بنتی ہے، دوسری خُم خُم پہ لنڈھاتی ہے، آپ ہی بتاؤ کون اچھی ہے؟"

پرنسپل نے رُک رُک کر کہا۔

"مگر بازاری رنڈی اپنے استری دھرم کا بیوپار کرتی ہے اور گھرست شریف عورت مذہب اور سوسائٹی کے تحت زندگی بسر کرتی ہے"

میں نے فوراً جواب دیا۔

"مگر بازار کی رنڈی بھی تو سوسائٹی ہی کی پیداوار ہے آپ جانتی ہیں کہ بازار کی رنڈی اپنے استری دھرم کا بیوپار کرتی ہے۔ کیا ایک گھرست شریف عورت بیوپار نہیں کرتی؟ جہیز نقدی مہر، استری دھن، کنیادان، کیا یہ سب بیوپار نہیں ہے، کون بیوپار نہیں کرتا سب بیوپاری ہیں، صرف طریقہ میں فرق ہے، بعض کو ہماری صدیوں کی سوسائٹی کے قوانین نے پاپ اور حرام بنا رکھا ہے اور بعض کو جائز، حالانکہ بیوپار خوبصورت کنیا نے لئے دان اور مہر کی بڑی رقم مقرر ہوتی ہے، بعض لڑکیوں کو استری دھرم میں کافی رقم ملتی ہے بعض کو کم، کیا یہ بیوپار نہیں ہے؟ آپ نے بازار کی رنڈی کو برا بتایا تھا، اسی لئے میں یہ سب بک گئی، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ رنڈی سے بہتر اخلاقیات کی معلمہ دستیاب ہونی مشکل ہے۔ مرد اپنی تعلیم اور اپنے ہنروں کا بیوپار کرسکتا ہے تو عورت اپنے حسن اور جوانی کا بیوپار نہیں کرسکتی؟"

پرنسپل صاحبہ اس سے زیادہ نہ برداشت کرسکیں۔ وہ غصہ سے لال ہورہی تھیں "چپ رہو" کی ایک گرج کے ساتھ وہ اٹھیں اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ میری طبیعت بھی اس قدر بدمزہ ہورہی تھی کہ میں بھی اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

(۱۶)

گھر پہونچنے کے ایک گھنٹہ ہی کے بعد نوکری سے علیحدگی کا پروانہ میرے پاس آگیا اور ساتھ ہی کوارٹر چھوڑنے کی چوبیس گھنٹہ قبل کا نوٹس۔ میں اپنے جوش کے ابال میں ایک مرتبہ اور بہ گئی۔ میں نے سوچا کہ سوشیلا کا سہارا پھر پکڑ لوں، اسے تار دوں اسی کے پاس چلی جاؤں مگر اب میں تیز رفتار واقعات کے ساتھ حالات کی اس منزل پر تھی جہاں سوشیلا بھی میرے پاس آنے سے لرزتی۔ یعنی مجھے چھ ماہ کا حمل تھا۔ میں نے باوجود بیباک اور آزاد خیال ہونے کے اسکول میں اپنی اس تبدیلی کو مشتبہ ہونے سے بچایا تھا۔ اپنے نزدیک میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ یہ صرف چوپاٹی کی ایک شام کی محبت کا بیج تھا جس کا پھول میں کھلانے والی تھی۔ میرا معمول تھا کہ روز شام کو چوپاٹی یا قلابہ کا زوے تفریح کے لئے جایا کرتی ایک دن ایک سینما کمپنی کے ایکٹر مجھے وہاں ملے، تھوڑی دیر میں ہم آپس میں بے تکلف ہوگئے۔ نوجوان اور خوبصورت ایکٹر کی حسین باتوں نے مجھے موہ لیا میں اس کے ساتھ کشتی رانی کے لئے تیار ہوگئی۔ ہم ساحل سے لگے دیر تک گھومتے رہے، یہاں تک کہ شام کے لطیف جھونکوں میں برانڈی اور شمپین کی مہک آئی اور ہم اپنی محبتوں کی سرشاریوں میں اچھی طرح مدہوش ہوگئے۔ اس کے بعد میں معمول کے مطابق روز تفریح کے لئے گئی مگر وہ نوجوان مجھے نہ دکھائی۔ کالج کی وہ مصروفیتوں نے زندگی کے نئے اعتبارات میرے سامنے پیش کئے تھے اور میں ان میں کھوگئی تھی یہاں تک کہ جذبات پر افکار ہجوم نے غلبہ پالیا۔ اور جوانی کو موسم کی خنکی نے ٹھٹھرا دیا تھا۔ چند دنوں بعد ہی میں نے اپنی زندگی کو لہریں لیتے محسوس کیا۔ اس وقت سوتی ہوئی حس جاگ گئی اور اسی وقت سے میں نے انجام پر نظر ڈالی اور اس کی نوجوانوں کو تلاش کرنے لگی مگر وہ اپنی کمپنی کے ساتھ شوٹنگ کے سلسلے میں ہندوستان کے مشہور مقامات کے دورے پر چلے گئے تھے نئی صورتوں کی دلکشی اکثر انہیں بھلانے پر مجبور کرتی اور بالکل غیر اختیاری طور پر میں جھجک جایا کرتی دن گزرتے اور راتیں بیتی چلیں انجام کے خیال نے شباب کی کیفیات کو دبادیا اور میں نے اپنے جذبات کو صرف آیندہ کے عجیب وغریب واقعے کے مرکز تک محدود پایا۔ اسی طرح چھ مہینے گزرگئے۔

پرنسپل صاحبہ سے بحث کے بعد اور ان کا پروانہ معزولی پاکر میرے حسیات شباب دوبارہ بیدار ہوگئے اور میں نے چھ مہینے کے بعد ایک مرتبہ پھر اپنے کو بے چین پایا۔

میں نے کمپنی کے دفتر میں ٹیلیفون کیا معلوم ہوا کمپنی دو ماہ کے بعد دورہ سے واپس آجائے گی۔ دو روز کا انتظار بھی اب میرے لئے سخت تکلیف دہ تھا۔ دو مہینے تو بڑی بات تھے۔ مگر میں مجبور تھی، ٹیکسی لی اور ضروری سامان لیکر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے، چلی گئی۔

(۱۷)

دو مہینے گزر گئے، کمپنی آگئی اور میں نے نوجوانی پریمی کو فون کیا خوب وہ آئے ضرور اور باتیں بھی انہوں نے ہی کیں لیکن مجھے کچھ اکھڑے اکھڑے سے محسوس ہوئے، میں نے انہیں اپنی موجودہ حالت سے آگاہ کیا تو انہوں نے کوان سنی کردیا۔ میں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو فون کاٹ دیا۔ صورت حال حال میرے سامنے آئینہ ہونی چاہئے تھی مگر میں نے ان باتوں کو بھی انکی معمول عام اداکاری سے تعبیر کیا اور ٹیکسی کرکے ان کے پاس گئی۔ مجھے دروازہ ہی پر روک دیا گیا۔ اور میں ان سے نہ مل سکی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انہوں نے اس سفر کے دوران میں کشمیر کی ایک "لالہ رخ" سے شادی کرلی ہے اور اسے

اپنی اداکاری میں شریک بنانے کے لئے ہمراہ لائے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار میری آنکھوں سے مریخ کے ارتقائی بوندیں ٹپکیں اور میں انہیں پونچھتی واپس ہوئی۔ دنیا بالکل تاریک معلوم ہوئی کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد طبیعت اعتدال پر آئی تو میں نے دور پہاڑ کی ایک اونچی چوٹی کو چھپائے سب ساحل ایک ربا ٹمٹماتا ہوا دیکھا۔ میں اُس کی طرف بڑھی۔ سوشیلا کو خط لکھ ہی دیا تھا تمام باتیں صاف صاف بیان کر دیں اور اب انتظار کرنے لگی۔

(۱۸)

جواب سات دن گزرنے پر بھی نہیں آیا، دن قریب آتے جا رہے تھے اور میں ناچار اور کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ آخر میں نے طے کر لیا کہ سوشیلا کے پاس خود جاؤں، شاید اُسے رحم آجائے، حسب ارادہ دوسرے ہی وقت میں الہ آباد کے لئے روانہ ہو گئی۔ راستہ بھر مجھے خلجان رہا، اور جب الہ آباد پہونچی تو قدم صحیح نہیں پڑتے تھے، میری ساری جان کانپ رہی تھی۔

پاٹ شالہ کے سامنے جب میرا تانگہ رُکا تو میں دروازہ کے سامنے ہی سوشیلا کو دیکھا، ایک مرد اُس کے پہلو میں کھڑا تھا اور وہ اُس کے ہاتھوں کا بوسہ لے رہی تھی، میں مسکراتی ہوئی تانگے سے اتری مگر ویسے ہی دروازہ بند ہو گیا اور دونوں اندر ہو رہے۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بچہ کی آواز آئی "استانی جی نہیں ہیں" مجھے چکر آگیا، بجلی کے کھمبے سے بمشکل سہارا لے کے تانگہ تک نہایت دقت سے پہونچ سکی۔ میں نے سوچا کہ "ددھوا آشرم" میں پناہ لوں اور میں سوشیلا کے اُسی پاٹ شالہ میں مایوس اور زخمی ہو کر پہونچی جہاں کبھی میری "مرہم پٹی" بھی ہوئی تھی۔

(۱۹)

ددھوا آشرم والوں نے مجھے چوبیس گھنٹے سے زیادہ قیام کرنے کی اجازت نہیں دی، جب دن چھپا اور رات کی سیاہی پھیلی۔ میں آشرم سے نکلی اور میں نے ایک مرتبہ پھر سوشیلا کے گھر کا رُخ کیا تانگہ نہیں ملا میں پیدل ہی چل پڑی مجھے اب بھی یقین تھا کہ اگر میں اُس سے اکیلے میں مل سکی تو وہ میری مدد کرنے سے دریغ نہ کرے گی۔ مگر ابھی میں نصف راستہ بھی طے نہ کر پائی تھی کہ میرے درد اُٹھا اور میں سڑک کے کنارہ بیٹھ جانے کے لئے مجبور ہوئی۔ درد ایسا شدید تھا مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں بیہوش ہو گئی اور جب دو تین گھنٹہ کے بعد ہوش آیا تو ایک بچہ میرے [illegible] رو رہا تھا، قدرت کی اس ستم ظریفی پر غشی میں بھی ہنس دی۔ صبح تک جس طرح بھی گزر سکتی تھی، گزری، بیان کرتے قلم تھرّاتا ہے اور آتی ہوئی موت بھی رُک رُک جاتی ہے۔ پو پھٹتے پھٹتے میری ہمت اور کچھ ضرورت نے مجھے اس قابل ضرور بنا دیا کہ گھسیٹتے گھسیٹتے اپنے کو سوشیلا کے دروازہ تک پہونچا دوں۔ وہاں پہونچ کر میں نے اپنی ساری کا پلّو پھاڑا اور اس میں بچہ کو لپیٹ کر ڈیوڑھی کے قریب لٹا دیا۔ اور دنیا کا آخری مطالعہ کرنے کے لئے پاس کی گلی میں ہو رہی جہاں پہونچتے پہونچتے مجھے پھر غشی آگئی۔

(۲۰)

دیر کے بعد ہوش آیا تو میں گلی کی دیوار سے ٹیک لگائے سوشیلا کے مکان کی طرف جھانک کر دیکھا وہاں ایک بھیڑ تھی، سارا محلہ گلے پھاڑ پھاڑ چیخ رہا تھا عورتیں بھی کچھ تھیں جو چُپ کھڑی تھیں اور میں نے محسوس کیا کہ ان کو بچہ اور اُس کی نامعلوم ماں دونوں سے ہمدردی ہے سوشیلا نے ایک مرتبہ بچہ کو زمین پر سے اُٹھا لیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اُس کا محبوب مرد ناراض ہو کر مکان کے اندر چلا گیا۔ یہ سارا منظر میرے لئے اس قدر تکلیف دہ تھا کہ مجھے مزہ آگیا۔

"میرا بچہ کیا آدمی کا بچہ نہیں ہے؟ میرا بچہ کیا دوسروں کے بچوں سے بدنما ہے؟ پھر لوگ اُس کو پیار کیوں نہیں کرتے؟ کیا صرف اس لئے کہ وہ اقرار کے دو بول کا نتیجہ نہیں ہے؟

مگر آدم اور حوا میں کونسا اقرارنامہ ہوا تھا، پھر اُنکے بچوں سے کیوں پیار کیا گیا؟ ہم بھی تو انہیں کی اولادیں ہیں؟" میں سوچتی بھی جا رہی تھی اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے اپنے لعل اور سوشیلا اور محلہ والوں کو دیکھتی بھی جا رہی تھی کہ اتنے میں پولیس والے آگئے۔ اور تھوڑی دیر میں میں نے دیکھا کہ میرا سوشیلا اور سارا مجمع اُس پولیس والے کے پیچھے چلا گیا۔ میں بڑے زور سے چیخ دی، یہ.................... خیریت تھی کہ اُس انتشار میں کسی نے میری چیخ نہیں سُنی۔ جب سب چلے گئے میں گرتی پڑتی بیٹھتی، لوٹتی آشرم کو واپس گئی۔ وہاں پہونچ کر میں نے دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل کر ستا ستا کر۔ اپنا یہ فسانۂ حیات مرتب کیا۔ اب ان آخری سطور کے ساتھ میں ڈھلی جا رہی ہوں میرا دل ڈوبا جا رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں صرف چند لمحوں کی مہمان ہوں۔ سکرات، لوگ اسی کو سکرات کہتے ہیں نہیں مجھے تو ابھی ہوش ہے "یہ کیا ہے مائی"؟ لو، آشرم کی مائی جی فرماتی ہیں

کہ بینٹ گنج کے کنیا پاٹ شالہ میں بھی جو کچھ پایا گیا ... زوال میں مرگیا
... کے کرپا کرم کے لئے ودھوا آشرم والوں سے ہی لیا ہے۔ ...
جنت دنیا۔
اللہ ——

(۲۱)

لزوال صاحب کو مرحومہ نے فسانۂ حیات میں اس قدر دلچسپی معلوم ہوئی کہ انہوں نے اُس وقت اُسے مجھے سپرد کیا۔ اب میں اسے شائع کرتا ہوں۔

۱۱ نومبر ۱۹۳۵ء - ۵ کلائیو روڈ، نئی دہلی۔

نوٹ۔ ہر چند اس فسانے کا باعث ... درہو گیا ہے، مثلاً بیوہ عورتوں کا طریقہ مراسلات یا اس ... بچے کو ... ملائے ... ایسا ... جس کی بے بہری ثابت ہو چکی ہے۔ یا عالم ... میں ... اپنا فسانہ زندگی مرتب کرنا، تاہم جناب فرید کا یہ افسانہ بعض سماجی ... نہایت خوبی کے ساتھ پیش کرتا ... صاحب الرائے افراد معاشرہ سے ... کا حق ہے۔ ہم ... دوست کو مشورہ دینگے کہ ... ادھر ... دیکھ کر۔

(ایڈیٹر)

ترے بغیر

شبنم ہے اشکبار مری جاں ترے بغیر
گلشن میں گل ہیں چاک گریباں ترے بغیر

اُف داغ داغ ہے مہِ تاباں ترے بغیر
آتش بجاں ہے مہرِ درخشاں ترے بغیر

خوں ہو کے اختیار کیا ہے شفق کا رنگ
لالے میں بھڑکی آتشِ سوزاں ترے بغیر

جب سے یہ اُڑتی اُڑتی سنی ہے نسیم سے
اُجڑا اُجڑا ہوا ہے گلستاں ترے بغیر

اُترا ہوا ہے طرّۂ سنبل کا پیچ و تاب
بُت بن گئی ہے نرگسِ حیراں ترے بغیر

بے نور آبشار ہیں صحرا اُداس ہیں
خوں رو رہی ہے چشمِ غزالاں ترے بغیر

انجم میں ہو رہی ہیں سرگوشیاں سی کیا؟
زہرا نے کی ہے زلف پریشاں ترے بغیر

شاعر غلط نہیں ہے مگر ہاں حقیقتاً
ہے کائنات برق بداماں ترے بغیر

آغا شاعر

حُرّیت فکر اور عُلماء

سیّد اختر علی تلہری

یورپ میں مذہب کی طرف سے عام بددلی پیدا کرنے والی شے علیسائی مذہب کے علماء کی تنگ خیالیاں اور کوتاہ بینیاں ہیں۔

ابتدا میں اُن کی یہ کوششیں رہیں کہ فکری حُرّیت" کے رجحان کو پھیلنے نہ دیا جائے اور آزادانہ بحث و نظر پر الحاد و بے دینی کی تہمت رکھکر اُسے پروان نہ چڑھنے دیا جائے۔ اس کے لئے حکومتی اقتدار بھی استعمال کیا گیا اور عوام کو بھی اس کے خلاف مشتعل کیا گیا مگر انسان کے اس پیدائشی حق کے دبانے میں یہ جابرانہ کوششیں مسلسل ناکام رہیں۔ جب غیر معمولی ظلم و جبر کے باوجود بھی "فکر و نظر" کی جولانیاں قایم رہیں تو بادل ناخواستہ عیسائیت نے اس کے مقابلے کے لئے استدلال کے اسلحہ سنبھالے مگر توہمات اور تعصبات اور اُن کے "مذہبی تخیل" کی بے اعتدالیوں نے عقل و دماغ کے بازو شل کر دئے تھے۔ اس لئے ہر مورچے پر شکست کھا گئے اور لا مذہبیت کی قوتوں کا سر اونچا ہوتا چلا گیا۔ اب فتح و کامرانی کا پندار سروں میں بھرے ہوے طاقتیں ہماری طرف متوجہ ہوئی ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے علمائے مذہب میں بھی تنگ خیالیوں اور کوتاہ بینیوں کا مادّہ پورے طور سے موجود ہے۔ وہ اپنے "شخصی مزعوبات" کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ جو شخص "آمنا و صدقنا" کہکر اپنا دماغ اُن کے حوالے نہ کر دے تو اُس کا مذہبی حیثیت سے "ملعون و مردود" ہو جانا لازمی ہے۔ اُن کی نگاہوں میں مہمات مسائل و غیر مہمات میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ اصل میں یہی مورچہ مسلمانوں میں کمزور ہے اور فطرتاً لا مذہبیت کی فوجیں اسلام کے "حصن حصین" میں اسی جگہ سے داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔

علمائے سُوء سے مراد:- پیغمبر اسلام کی روحانی بصیرت کی مثال

نہیں پائی جاتی اُنھوں نے ابتدا ہی میں اس کا احساس کر لیا تھا کہ اس قسم کے علماء کی طرف سے مذہب کو نقصان عظیم پہونچے گا۔ اسلامی منبع سے فطری و عملی تعلیمات کا جو صاف شفاف چشمہ جاری ہوا ہے اُسے اپنے توہمات و تعصبات کے خس و خاشاک کی آمیزش سے بالکل ہی خراب کر دینگے۔ اس بنا پر مختلف الفاظ میں اس خطرہ سے اپنی امت کو متنبہ کر دیا تھا۔

بہت ممکن ہے کہ علماء سوء سے مراد درحقیقت حامیان مذہب کی بھی برخود غلط صنف مراد ہو جو اپنے کو معصوم سمجھتی ہوئی اپنے ذاتی و شخصی افکار و آرا کو واقعیت و حقیقت کا درجہ دیتی ہے اور جو شخص ان خیالات کی تنقید کی جسارت کرے اُسے کافر بناتی اور تمام "ایزدی مغضوبوں" کا مستحق قرار دیتی ہے۔ یہ طبقہ حقیقت میں یہ نہیں سمجھتا کہ مذہب کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ آزادانہ بحث و نظر کو روک کر کوئی مذہب اپنی "زبانی حیثیت" باقی بھی رکھ سکتا ہے یا وہ اہم معاشرتی و تمدنی مسائل جن پر آئندہ نسلوں کی ترقی و تنزل کا مدار ہے اُن پر غور و فکر کرنے کے لئے کون سا زاویۂ نگاہ مناسب ہے؟"

دوسرے مذہب کے علماء کی طرح ہمارے علماء کی بھی بڑی تعداد معاملات میں غلط رجحانات کا شکار ہے۔ اُن کے افکار سے عقلی وسعتیں مفقود ہو چکی ہیں۔ کاش اُن کی فقہی مہارتیں، حکیمانہ باریک نظری اور فلسفیانہ ژرف نگاہی کی بھی لذت آشنا ہوتیں۔

یہ امر یقیناً قابل افسوس ہے کہ غیر دانشمندانہ قدامت پسندی نے اُن میں جو غلط خیالات پھیلا دئے ہیں اور غیر صحت بخش فکری فضا میں رہتے رہتے اُن میں جو تنگ خیالی اور غیر رواداری پیدا ہو گئی ہے اُس کے نتائج وہ بھی

تعلیمات میں غلط ملط کر دیتے اور مذہب کو علمی حیثیت سے مہمل بنا دیتے ہیں۔

حکیم اسلام کی علمائے سوء کے متعلق معنی خیز تشریحات

سرورِ کائنات کی آغوش پروردگی کی برکتوں نے علی ابن ابی طالب کی ذات کو حکمتوں کا گنجینہ بنا دیا تھا۔ اُن کی بصیرت کی نگاہیں حقائق و معارف کے پردوں کو چیرتی ہوئی تہ تک پہونچ جاتی تھیں۔ آپ نے علماء سوء کے متعلق بہت ہی بلیغ ارشادات فرمائے ہیں۔

آپ نے بتایا کہ خداوند عالم کے انسانوں کو بہت زیادہ دشمن رکھتا ہے دوسرے قسم کے انسانوں کی حسب ذیل خصوصیات گنائی ہیں۔

"دوسرے وہ لوگ ہیں جنھوں نے غلط مسائل کو جمع کر لیا ہے۔ جاہل عوام میں بہت تیز رفتار بن جاتے ہیں اور فتنوں کی تاریکیوں میں خوب دوڑتے ہیں امن وصلح میں جو مصلحتیں ہیں اُن سے بالکل اندھے ہوتے ہیں۔ عوام نے اُن کا نام عالم رکھا ہے درنجالیکہ اُنھیں اس لفظ کے مفہوم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان لوگوں نے غلط مسائل کے جمع کرنے کی طرف جلد بازانہ اہتمام کیا ہے اور ان امور کا کثیر حصہ جمع کر لیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ اِس ذخیرے کا کم ہونا اُس کے کثیر ہونے سے بہتر ہے۔ اِن لوگوں کے تبحر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب غلط مسائل کے بدمزہ اور گدلے پانی سے سیراب ہو چکتے ہیں تو پھر اُن مسائل کی توضیح کے ضامن وذمہ دار بن کر جو دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتے ہیں مسند قضا پر خاص شان کے ساتھ جلوہ فرما ہوتے ہیں۔ اب اگر کہیں کوئی مشکل پیش آگئی تو اُس کے حل میں اپنی رائے کو دخل دیتے ہیں جو بالکل ہی فضول کہنہ و بوسیدہ ہے اور اُس کے بعد اُنھیں یہ بھی زعم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے وہ مشکل حل کر دی۔ (حقیقت میں) ایسا شخص جاہل ہے۔ جہالتوں کی تاریکیوں میں اِدھر اُدھر آوارہ وسرگرداں پھرنے والا۔ اندھا ہے۔ غیر معلوم چیزوں پر سوار ہونے والا۔ علم کی لکڑی کو قطع کرنے والی ڈاڑھ سے اُس نے کہیں کاٹا ہے وہ روایات و احادیث کو اس طریقہ سے چاروں طرف چھڑکتا اور اُڑاتا ہے جس طرح تیز ہوا خشک گھاس کو چاروں طرف اڑاتی ہے۔ جو مسائل اُس کے سامنے ہیں اُن کو فیصلہ کرنے کا وہ اہل نہیں ہے اور نہ اُسے اُن تعریفوں کا کوئی استحقاق ہے جو عوام کی زبانوں سے ادا ہوتی ہیں جو باتیں وہ نہیں جانتا اُن کے متعلق اُسے یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ علم وہاں بھی ہو سکتا ہے اور نہ وہ یہی محسوس کر سکتا ہے کہ اُس کی رسائی کے ماورا بھی کچھ راستے ہیں"!

اس حکیم ربانی نے علما وفقہاء سوء کی جو خصوصیتیں اس خطبے میں گنوائی ہیں اُن کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اس خطرناک جماعت کی شناخت ومعرفت بہت بہت آسانی سے ہو سکتی ہے اور اُن کی تنگیٔ خیال وغیر رواداری نظر اور بغیر سوچے سمجھے روایات واحادیث کو بنائے استدلال بنانے سے حریت فکر کو جو نقصان پہونچ سکتا ہے اُس سے نجات مل سکتی ہے۔

اسلام آزاد، غور و فکر کا حامی ہے، وہ تفکر و تعقل کی قوتوں کا خوابیدہ رہنا ناپسند کرتا ہے۔ "فکری حریت" کو وہ غلط رجحانات توہمات اور تعصبات سے محفوظ رہنے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

مسلمانوں کی کتاب مقدس مذہب کی عقلی تنگ دامانیوں اور "فکری سنگ ظرفیوں" کی طرفدار نہیں ہے۔

اُس نے بیشتر مقامات پر "تفکر و تعقل وتدبر و تفقہ" کی طرف انسانی طبائع کو متوجہ کیا ہے اور عدم تفکر و تعقل کی خرابیاں اپنے مخصوص عنوان میں بتائی ہیں۔

قرآن کریم کی تفکر و تعقل کی پشت پناہیاں

پارہ و اذا سمعوا میں ارشاد ہوتا ہے۔ ہم نے اپنی آیات کی تفصیل اُس جماعت کے لئے کر دی ہے جو غور و فکر سے کام لیتی ہے۔

اس کا صاف صاف مطلب یہی ہے کہ جو لوگ اپنے غور و فکر کی قوتوں کے بال و پر نوچ ڈالتے ہیں اُن کے لئے آیات الٰہیہ کا صحیح طور سے سمجھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

دوسری جگہ اسی پارہ میں فرمایا ہے۔

هل يستوى الاعمٰى والبصير افلا تتفكرون ۝

(کیا نابینا و بینا برابر ہو سکتے ہیں پھر تم کیوں نہیں تفکر و تعقل سے کام لیتے ہو) ظاہر ہے اس مقام پر اعمٰی سے مراد جاہل ہے اور بصیر سے مراد عالم ہے اس آیت میں عالم و جاہل کی عدم مساوات ظاہر کرنے کے بعد تفکر کا شوق دلایا گیا ہے گویا تفکر ہی وہ چیز ہے جو انسان کو عالم بنا سکتی اور اُس کے فقدان سے انسان جاہل رہتا ہے کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ علما جو تفکر و تعقل کو مطلقاً مقید رکھنے کے مویّد ہیں وہ علم سے قطعاً بے بہرہ ہیں اور صحیح معنوں میں

اعمیٰ کے مصداق ہیں۔

سورۂ انفال میں ارشاد ہوتا ہے

ان شد الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون ہ

(بے شک اللہ کے نزدیک سب سے بدتر جانور وہ ہیں جو بہرے اور گونگے ہیں اور تفکر و تعقل سے کام نہیں لیتے۔

اس آیۂ مبارکہ میں غور و فکر کرنے والوں کو "بدترین جانور" قرار دیا گیا ہے غور و فکر کی اہمیت واضح کرنے کا اس سے زیادہ موثر عنوان اور کیا ہو سکتا ہے؟ غور و فکر محرومی جانور ہی نہیں بلکہ بدترین جانور بنا دیتی ہے؛ اس سے بڑھ کر اور کون مصیبت ہو سکتی ہے۔

سورۂ یونس میں فرماتا ہے۔

ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون ط

(جو لوگ عقل و دانش سے کام نہیں لیتے دوسرے لفظوں میں قوائے فکریہ کو بے دست و پا بنا لیتے ہیں باری تعالیٰ اُن لوگوں پر رجس (شک) مسلط کر دیتا ہے۔ اس آیہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ لوگ جو تفکر و تعقل سے گریزاں ہیں وہ، یزد تعالیٰ کی نگاہوں میں عقوبت و عذاب کے مستحق ہیں۔ اس سے زیادہ تفکر و تعقل کی اہمیت واضح کرنے کا اسلوب کیا ہو سکتا ہے۔

قرآن اس قسم کے ارشادات سے بھرا ہوا ہے "افلا تتذکرون۔ افلا تعقلون" پُرہیبت صداؤں سے بار بار انسانی عقل و فکر کی خوابیدہ قوتیں جگانے کی کوشش کی گئی ہے۔

قرآن مجید نے اس غلط رجحان کے بھی مٹانے کی کوشش کی ہے کہ مذہب تقلیدی حیثیت سے اختیار کر لیا جائے اُس نے صاف کہہ دیا ہے کہ آبا و اجداد کے دین کو محض اس لئے اختیار کرنا کہ وہ آبا و اجداد کا دین ہے نہایت ہی غیر حکیمانہ طریقہ ہے۔ حقیقت میں دین وہی ہے جو اپنے عقل و فہم کی روشنی میں اختیار کیا گیا ہو۔

واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اٰبائنا ولو کان اباءھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون۔

اور جبکہ اُن سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے جو امور نازل کئے ہیں اُن کی پیروی کرو تو دیتے ہیں کہ نہیں ہم تو اُن چیزوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے آبا و اجداد کو پایا ہے اگرچہ ان کے آبا و اجداد نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ سیدھے راستہ پر ہوں اس آیہ کریمہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان معاملات میں غور و فکر کو اپنی پوری آزادی استعمال کرنے کا حق دیتا ہے۔

غور و فکر کی اہمیت کے متعلق بعض احادیث

قرآن مجید کے ان خیالات کی تائید اسلام کے اُن مایۂ ناز حکمائے روحانی کے اقوال و ارشادات سے بھی ہوتی ہے جو علی سے زبردست حکیم و فلسفی کے لائق اخلاف ہیں۔ انھوں نے مختلف پیرایوں میں ہمارے عقلی جذبے کو قوت پہونچانے کی کوشش کی ہے اور عقل کی اہمیت پر قول و فعل دونوں عنوانات سے روشنی ڈالی ہے۔

جناب ابو عبداللہ سے مروی ہے۔

قال رسول اللہ اذا رائتم الرجل کثیرۃ الصلوٰۃ کثیر الصوم فلا تباھوا بہ حتیٰ تنظروا کیف عقلہ۔ (الکافی باب العقل)

(رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر تم کسی شخص کو بہت ہی نمازی اور بڑا ہی روزہ دار دیکھو تو جب تک کہ اُس کی عقل پر نظر نہ کر لو اُس پر مباہات نہ کرو)

اس حدیث کا صاف منشا یہ ہے کہ بدون عقل کثرت عبادت کوئی قابل فخر چیز نہیں ہے۔ یعنی جب تک کہ قوائے عقلیہ کی صیقل نظر و فکر نے نہ کر دی ہو اور دماغ صحیح معنوں میں شائستہ نہ بن چکا ہو ہماری عابدانہ زندگی غیر قابل اعتنا ہے۔

اسی کافی کے باب العقل میں دوسری حدیث یہ ملتی ہے۔

قال لا یعباء باھل الدین بمن لا عقل لہ،

(وہ دیندار اور مذہبی لوگ بالکل ہی در خور اعتنا نہیں ہیں جو عقل سے محروم ہیں۔

اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جو لوگ تفکر و تعقل نہیں کرتے اُن کا دین بالکل ہی شائستہ التفات نہیں ہے۔

اس قسم کے احادیث سے اقوال ان حضرات کے موجود ہیں جن سے عقل کی اہمیت و افادیت مختلف، عنوانات سے واضح ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی حقیقت آشنا نگاہوں میں ہماری عملی زندگی جب تک کہ

اُسے فکری تربیت اور عقلی شائستگی" کا سہارا حاصل نہو [illegible] ہے۔

حقیقت بھی یہ ہے کہ" ارتقائے فکری" کی منزلیں طے کئے بغیر چند عقائد کا زبان سے دُہرا دینا اور کچھ اعمال کا رسمی طور پر سے پابند ہوجانا حکم پروردگار کی مخلوق کے شایاں شان نہیں ہے۔

شائد کہا جائے کہ قرآن اور احادیث کے پیش کردہ مقامات سے صرف غور و فکر کی اہمیت واضح ہوتی ہے، اُن سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہمیں غور و فکر کی آزادی دی گئی ہے یا اپنے نتائج فکر کے اعلان کا حق ہمیں حاصل ہے۔

اس کے جواب میں گذارش کی جائیگی کہ جب ہمیں بار بار غور و فکر پر آمادہ آمادہ کیا گیا اور تفکر و تعقل کے فقدان کو ایک بلا (رجس) قرار دیا گیا تو اس کے معنی اور کیا ہو سکتے ہیں کہ ہم غور و فکر سے کام لیں اور ہر امر کو سوچ سمجھ کر تسلیم کرنے کے خوگر بنیں، یہی معنی آزادی غور و فکر کے ہیں اور چونکہ اسلام اپنے افکار و نظریات کی نشر و تبلیغ کا زبردست حامی ہے اس لئے اپنے نتائج فکر کی اشاعت میں بھی ہمیں حق ہے البتہ جہاں عقل کے پر و بال کام ہی نہ دے سکیں وہاں غور و فکر کی عدم افادیت دیکھتے ہوئے پرواز کی حکیمانہ حدبندی کر دی گئی ہے

بعض فکر و نظر کے روکنے والے اقوال قرآن مجید اور دوسری احادیث کی ان صریح ہدایتوں کے موجود ہوتے ہوئے بعض جلیل القدر اعاظم فقہا نے بحث و نظر کو مردود قرار دینے کی جو سعی کی ہے وہ قابل توجہ نہیں قرار پائی۔

انہیں میں کے ایک زبردست فقیہ فرماتے ہیں۔

علیك بالفقه وایاك وعلم الكلام فلان یقال اخطأت خیرٌ لك من ان یقال كفرت ـ

(فقہ سیکھو اور خبردار علم کلام نہ سیکھو۔ اس لئے کہ تمہارے متعلق یہ کیا جانا کہ تم نے خطا کی بہتر ہے اس بات سے کہ تمہیں کافر کہا جائے۔

الیواقیت والجواھر فی بیان عقائد الاکابر

جلد اول مطبوعہ مصر

احیاء العلوم امام غزالی جلد اول میں اسی قسم کے اقوال دوسرے اساطین فقہ سے بھی نقل کئے گئے ہیں۔

ایک صاحب فرماتے ہیں

"بحث و مباحثہ کرنے والوں کے لئے میرا حکم یہ ہے کہ انھیں لکڑیوں سے پیٹا جائے اور ان کو مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں تشہیر کیا جائے اور کہا جائے کہ یہ اس شخص کی سزا ہے جو کتاب و سنت کو ترک کرے اور علم کلام میں مصروف ہو جائے"

ایک دوسرے صاحب آزادی بحث کی تنقیص ان لفظوں میں فرماتے ہیں؟

"علم کلام کا عالم کبھی فلاح نہ پائیگا اور علم کلام پڑھنے والے کو جب دیکھو گے تو اُس کے دل میں کھوٹ ضرور رہے گی۔

ان امام صاحب کو علم کلام کی مخالفت میں اس قدر شدت تھی کہ اُنھوں نے حارث محاسبی سے جو ایک زاہد اور پرہیزگار شخص تھا بالکل قطع تعلق کرلیا صرف اس لئے کہ اُنھوں نے فرقہ مبتدعہ کی رد میں ایک کتاب تصنیف کر دی تھی۔

ان دلچسپ خیالات کی صداہائے بازگشت اب تک سنائی دیتی ہیں اور دین و مذہب کے مقدس سرپرستوں کی طرف سے بحث و مباحثہ اور غور و نظر کو "شجر ممنوعہ" قرار دینے کی کوششیں کی جاتی ہیں لیکن چونکہ یہ خیالات قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے بالکل مخالف ہیں اس لئے ہم بالکل مجبور ہیں کہ انھیں "غیر اسلامی" قرار دیں۔

ایک سچا مسلمان اس امر کے اعتراف پر مجبور ہے کہ مذہبی افکار و عقائد کے متعلق اظہار رائے کی آزادی پر مذہبی یا قانونی پابندیاں عائد کرنا چند خاص الخاص صورتوں کے علاوہ نفس مذہب کے لئے کسی طور سے مفید نہیں ہے۔ دُنیا جن حدود تک پہونچ چکی ہے اُنھیں دیکھتے ہوئے اس کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ اظہار رائے کی آزادی کا عمومی حیثیت سے سلب کرلینا گوارا کیا جاسکیگا۔

علماء مذہب کو یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ جب قرآن حمید نے تفکر و تعقل کا اس شدومد کے ساتھ حکم دیا ہے اور حکیمانہ عنوان سے عقل انسانی کو غور و فکر کے جادے پر ڈال دینے کی کوشش کی ہے تو ایسی حالت میں مہمات مسائل کا عقلی جائزہ لینا کیونکر روکا جاسکتا ہے؟ جن لوگوں کو "حریت فکر" کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا ہے اور جو آزادی خیال کی نعمتوں سے متمتع ہو سکے ہیں وہ اُن مساعی کو جائز نہیں رکھ سکتے جو حدیث فکر و آزادگی اظہار خیال کا سر کچلنے میں صرف ہوئی ہیں۔ میں پھر عرض کرونگا کہ اسلام کی صحیح تعلیمات

حریت فکر و آزادیٔ اظہار خیال کے مخالف نہیں ہیں اُس نے تمدن کے اس نکتے کو کبھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا کہ انسانی تہذیب و شائستگی کا ارتقا زیادہ تر اُن اسباب و علل پر موقوف ہے۔ جو ہمارے تمہارے قبضہ میں ہیں اور ان اسباب و علل میں ممتاز حیثیت علم کی ترقی اور ہماری اس صلاحیت کو حاصل ہے کہ ہم اپنے عادات و خصائل نئے حالات کے مطابق بنائیں اور فکری ترقی کے لئے آزادانہ بحث و مباحثہ کو واجب قرار دے لیں۔

آزادی اظہار خیال کے متعلق ایک خدشہ

کہا جاتا ہے کہ افراد و جماعتوں کے تحفظ کے لئے افکار و آرا کی نشر و اشاعت پر پابندی عائد کرنے کی ضرورت بہر حال پڑے گی ایسے خیالات کی نشر و اشاعت جو افراد یا جماعتوں کے لئے مُضر ہوں اُن کا روکنا انسانی جمعیت (سوسائٹی) کا فرض ہے۔ اگر جماعت کے کسی فرد کے خیالات کی اشاعت سے اُن جماعتوں کی بنیادوں ہی کو نقصان پہونچے تو ان خیالات کے اظہار کی اجازت کیونکر دی جا سکتی ہے؟ سوسائٹی کے نظم و نسق اور اُس کے امن و امان کے جو افراد ذمہ دار ہیں وہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون سے افکار و آرا مضر ہیں ممکن ہے کہ اُن کا فیصلہ غلط ہو لیکن جبکہ اُنھیں اپنے فیصلوں کے صحیح ہو جانے کا یقین ہو جائے تو اُنھیں اس کا بھی حق ہے کہ وہ آزادی پر پابندیاں عائد کر دیں اگر جماعتی نظم و نسق کے برہم آن افکار و آرا سے صرف دماغ کے گوشے ہی آباد رہیں تو کوئی محل اعتراض نہیں ہے لیکن جب کہ ان کی نشر و اشاعت سے سوسائٹی کے تہ و بالا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ان مفکرین کی زبان بندی لازمی ہے۔

اس اعتراض کی اہمیت ایک حد تک تسلیم کی جا سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر فی الواقع کچھ ایسے نظریات ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے جمعیت انسانیہ کی سب سے بڑی تعداد کو سب میں بڑا محسوس نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے تو نہایت ہی احتیاط سے اس حق کا کم سے کم وقت کے لئے استعمال جائز رکھا جا سکتا ہے۔

مثلاً اگر کوئی شخص کسی مخصوص استدلالی عنوان سے اس نتیجے تک پہونچ جائے کہ سوسائٹی کے کل افراد کا ہلاک کر دینا ضروری ہے اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے عملی جد و جہد بھی شروع کر دے تو اُس پر "فلسفۂ افادت" کے نقطۂ نظر سے پابندی عائد کرنا لازمی ہے مگر ایسی ہی شاذ و نادر استثنائی صورتوں کے علاوہ جو بہت کم پیش آسکتی ہیں، اس حق کے استعمال کی تجویز مطلق استبداد کی واضح ترین مثال ہوگی۔

محض توہمات کی بنیاد پر افراد و جماعتوں کی آزادیاں سلب کرنا انسانی ترقی کے لئے مضر ہے۔ استثنائی حق کے پردہ میں اپنے مخالف عقائد و خیالات دبانے کے لئے جو طریقے گزشتہ دوروں میں استعمال کئے گئے تھے یا اگر اب اُنھیں اختیار کر لیا جائے تو اُس روش کو انسانیت سے کوئی ربط نہیں ہو سکتا۔

حریت فکر و آزادی اظہار خیال کا گلا اپنی شخصی سہولتوں اور جماعتی آسائشوں کے لئے دبانا کیونکر باعث فخر کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔؟

اس مقام پر بہت سے اُن افراد کو جو غلط طور سے مذہبی واقع ہو گئے ہیں حریت فکر کی یہ حمایت کھٹک رہی ہوگی اُنھیں یہ ڈر لگا ہوگا کہ اگر انسانی افکار کی باگیں چھوڑ دی گئیں تو پھر اس دنیا میں مذہبیت کے قدم جمتے نہیں دکھائی دینگے۔ ہر طرف "دہریت و الحاد" کا پرچم لہراتا نظر آئیگا۔ ان صاحبان کی خدمت میں یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ آخر وہ مذہب اتنا کمزور کیوں سمجھتے ہیں؟ اُس کی قوت استدلال کی طرف سے اتنے بدگمان کیوں ہیں؟ تربیت یافتہ غور و فکر کے نتائج آخر کیوں الحاد و بے دینی کی صورت میں لازماً ظہور پذیر ہونگے کیا واقعاً فکر و غور اور لامذہبیت میں کوئی عقلی لزوم ہے؟ اگر غور و فکر کا لازمی نتیجہ لامذہب ہے تو پھر ایک انسان کا لامذہب ہی رہنا حق بجانب ہے۔

میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ اگر غور کوئی شخص غور و فکر کی سچی جادہ پیمائی کرنے کے بعد لامذہبیت کی طرف مائل ہو جائے تو وہ اُس شخص سے اچھا ہے جو کسی مذہب کا جاہلانہ اور مقلدانہ طور سے پابند ہے "تحقیقی لامذہبیت"، "تقلیدی مذہبیت" پر بدرجہا فوقیت رکھتی ہے۔

حقیقی اسلام اس نظریہ کا مخالف نہیں ہے۔

سید اختر علی تلہری

قدر و قیمت

منوّر لکھنوی

(۱) پورنیہ کے "تارادت سرکار" کی تمام تصانیف "منتوش" کے نام سے شائع ہوکر مقبول ہو رہی تھیں۔

(۲) ہندوستان کے اور بدقسمت مصنفوں کی طرح "تارادت" بھی اپنی تصنیف کا حقِ طبع پبلشروں کے ہاتھ بیچ دیتا تھا اور "حقِ طبع" کی یکمشت قیمت کے علاوہ اُس کو ایک پائی بھی زیادہ نہ ملتی تھی۔

(۳) تارادت کو "ادیبوں اور شاعروں کی فطرت" نصیب ہوئی تھی، جتنا پیدا کرتا، خرچ کر ڈالتا۔ آمدنی اور مصارف کے میزانیہ میں آخرالذکر ہی کی مد "فاضل منفی" کی صورت نما ہوتی تھی۔ اس کا کنبہ بھی بڑا تھا۔ وہ شراب کا بھی "بری طرح" عادی تھا، اب عسرت اور افلاس کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔

(۴) کلکتہ کے ایک "متموّل جوہری" کو اپنے "کتب خانہ" کی ترتیب کے لئے ایک لائق و فائق ادیب کی ضرورت تھی، اس اسامی کا ماہوار مشاہرہ ۵۰۰ تھا۔ کتب خانہ نہایت عالیشان اور بے نظیر تھا، اور اُس کی ترتیب کے لئے غیر معمولی ذہانت کی ضرورت تھی، اس ضرورت کا اعلان اخباروں میں ہو رہا تھا۔

۵- آزاد و غیور تارادت کو اُس کی "رفیقۂ حیات" نے مجبور کیا کہ اخبار کے اعلان سے فائدہ اُٹھا کر وہ بھی قسمت آزمائی کرے۔ کیونکہ عسرت کی زندگی زیادہ پاؤں پھیلا رہی تھی، اور بینکوں کی نازک صورتِ حالات کے باعث پبلشر اصحاب "منتوش" کی تازہ تصنیف "زندگی کی کشمکش" کا حقِ طبع خریدنے میں لیت و لعل سے کام لے رہے تھے۔

(۶) کسی کاروبار میں "تارادت" تھا۔ "منتوش" نہ تھا۔

(۷) کلکتہ کے "متموّل جوہری" کے طلب کرنے پر "تارادت" پورنیہ سے روانہ ہوا۔ وہ اس وقت پہونچا جب جوہری ایک کتاب کے مطالعہ میں ہمہ تن "غرق" تھا، تارادت سراپا سوال تھا، حالانکہ اس کی "گویائی" کے بجائے اس کی "خاموشی" ترجمانِ قلب تھی: وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور جوہری کے "لمحاتِ فرصت" کا انتظار دیکھنے لگا۔

(۸) جوہری نے ایک مرتبہ آنکھیں اوپر اُٹھائیں، اس کی زبان پر بےساختہ یہ الفاظ آ گئے۔

"واہ رے منتوش کمال کر دیا۔ اگر تو اس وقت میرے سامنے ہوتا تو میں تیرے پاؤں چوم لیتا تیرا منہ موتیوں سے بھر دیتا۔"

(۹) تارادت نے یہ فقرہ سنا۔ اُس کے جذبات میں ایک عجیب ہیجان پیدا ہوا۔ مگر کوئی طاقت تھی جس نے اُس کے جذبات کو "اُبھرنے نہ دیا۔ اس کو "کمالِ ضبط" کی تصویر بنا دیا۔ وہ دفعتہً اُٹھا اور چلنے ہی کو تھا کہ جوہری نے روکا۔

(۱۰) تارادت نے جواب میں کہا "میرا وقت ختم ہو گیا"، اب میں معافی کا خواستگار ہوں۔ ایک دوسرا کام درپیش ہے۔ آپ نے میری طرف پہلے توجہ نہ کی۔

(۱۱) یہ کہہ کر تارادت نے اپنی راہ لی اور جوہری سربہ گریباں ہو کر عالمِ حیرانی میں سوچنے لگا کہ "یہ ماجرا کیا ہے؟"

[illegible]

آدمؑ و حوّاؑ کی تصویر

جوشؔ ملیح آبادی

جو حضرات آدمؑ و حوّاؑ کی تصویر کی اشاعت پر معترض ہیں، اُن کی خدمت میں اس مسئلے کا چھیڑنا وقت کی بات نہیں ہے کہ صناعت (آرٹ) کسے کہتے ہیں، اور صناعت انسانی فطرت میں کس قدر رقت پیدا کرسکتی ہے ——— نہ اُن حضرات سے تصویر کے جواز و عدم جواز پر ہی گفتگو مناسب معلوم ہوتی ہے ———

میں تو اس موقع پر صرف یہ عرض کروں گا کہ اس تصویر کی اشاعت سے میری یہ نیت ہرگز نہ تھی کہ اُن کے جذبات کو ٹھیس پہونچاؤں یا اُن کی دل آزاری کروں۔

دوسروں کے جذبات سے تمسخر کرنا، اُنھیں صدمہ پہونچانا، اور دوسروں کے دل دُکھانا میری شریعت میں سب سے بڑا گناہ ہے۔

میں دُنیا کا ہر گناہ بے جھجکے ہوئے کرسکتا ہوں، لیکن اگر تمام عالم کے خزانے میرے قدموں پر ڈھیر کردئے جائیں، اور مجھ سے یہ کہا جائے کہ تو دل آزاری کر، تو میں ایڑیاں رگڑ کے مرجانے کو پسند کروں گا، لیکن دُنیا کے کسی شقی ترین انسان کے دل کو بھی صدمہ نہ پہنچاؤں گا، اس لئے

کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

اس سے کم سے کم آپ کو یہ اندازہ تو ضرور ہوگیا ہوگا کہ اس تصویر کی اشاعت کے پردے میں میری نیت ہرگز خراب نہ تھی ——— اور اگر نیت ہی پر تمام افعالِ انسانی کا مدار ہے تو ہر صاحبِ انصاف یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ میں سراسر بے قصور ہوں۔

پھر بھی چونکہ اس تصویر کی اشاعت سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ لوگوں کے دل کو صدمہ پہنچا ہے۔ اس لئے یہ میرا اخلاقی فرض ہے کہ میں اُن تمام حضرات کی خدمت میں یہ عرض کردوں کہ مجھے اس کا بیحد قلق ہے کہ یہ تصویر کیوں شائع ہوگئی۔

کاش مجھے اس کا پہلے ہی سے علم ہوتا۔

~~~~~~~~~~~~~~~~

یہاں تک تو میں نے وہ سب کچھ لکھدیا جو ایک انسان کی حیثیت سے مرا فرض تھا۔ اور چونکہ انسانی قلوب کا احترام میرا دین و ایمان ہے، میں خوش ہوں کہ مندرجہ بالا سطور لکھکر اس باب میں میں نے اپنا سب سے بڑا فرض ادا کردیا۔

لیکن یہ مضمون تشنہ و ناتمام رہ جائیگا، اگر میں ایک سخن گسترانہ بات عرض نہ کروں گا ——— یعنی دلوں کا احترام، جیسا کہ ابھی عرض کرچکا ہوں ہر چند میرا دین و ایمان ہے، لیکن اگر کبھی کوئی ایسا معاملہ آ پڑیگا جو میرے مقاصد اور اغراض «مقاصد یا جسے «کاز» (cause) کہتے ہیں، اُس سے متعلق ہوگا، تو اُس وقت میں صرف راستی کی حمایت کروں گا۔ غلط جذبات اور غلط دلوں کا احترام اُس موقع پر میرے اختیار سے باہر ہوجائے گا۔

میرا مُدعا یہ ہے کہ اگر میں کسی چیز کو نوعِ انسانی کے حق میں مُضر اور مہلک سمجھتا ہوں، یا جن اُمور سے اپنی قوم کو بچانا مجھ پر فرض ہے، اگر ان مسائل میں لوگوں کے دلوں کو مجھ سے صدمہ پہونچے گا تو میں اُس صدمے کی کوئی پروا نہ کروں گا۔

مریض کے کڑوی دوا سے مُنہ بنانے پر طبیب کا یہ ہرگز فرض نہیں ہے کہ وہ علاج سے دستکش ہوجائے۔

میں جانتا ہوں یہ راستہ کتنا ہولناک ہے۔ اور مجھے اس کا بھی علم ہے کہ

"اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں"

لیکن میں یہ عزم کرچکا ہوں کہ تھوڑی یا بہت، جو کچھ بھی مجھ سے ہوسکے گی میں اپنی قوم و ملت کی خدمت کرتا رہوں گا اور مصائب سے ایک لمحے کے
~~~~~~~~~~~~~~~~

بی خوف زدہ نہ ہوں گا۔

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بسے
شرط اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

اسی سلسلے میں یہ بھی عرض کروں کہ اگر آدم و حوّا کی تصویر میں اپنے متذکرہ مقاصد کے تحت شائع کرتا، تو دنیا کی کون قوت مجھے اظہار خیال پر مائل نہیں کرتی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تصویر اصل میں میرا انتخاب بھی نہیں ہے۔ میری عدم موجودگی میں میرے ایک دوست نے اسے پسند کیا، اور بلاک بھی بنوا لیا جس وقت میں دہلی پہنچا جب رسالہ تقریباً طبع ہو چکا تھا اور ... ناظرین سے ... نظارہ میں آ رہی تھیں۔ چنانچہ اشارات کے سلسلے میں اس کے متعلق بھی یہ ایک قطعہ خود بخود میرے ذہن میں آ گیا۔ ... دوست اس کے متعلق بھی چند سطریں سپرد قلم کریں۔

~~~~~~~~~~~~

... کر چکا ہوں۔ تصاویر کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ ... قدر تو ضرور ہی دریافت کرکے چھوڑوں گا کہ جو حضرات تصاویر ... کیا ...

(۱) ... دوستوں ... دوکانوں میں لگی ہوئی تصویریں نہیں دیکھتے؟
(۲) احباب اور حکام کی ملاقات کے کمروں میں اس ... قدم نہیں رکھتے ... تصویریں آویزاں ہیں؟
(۳) آدم و حوّا، اور مریم و عیسیٰ کی جو تصویریں آئے دن انگریزی اخباروں ... میں شائع ہوتی رہتی ہیں اور سینماؤں میں دکھائی جاتی ہیں اُن پر کبھی ... کی جرأت فرماتے ہیں؟
(۴) ... دیواروں، اخباروں اور رسالوں میں تصاویر دیکھ کر احتجاج بلند ... ہیں؟
(۵) سینما کبھی نہیں دیکھتے؟
(۶) پیسے، روپے، اشرفی اور نوٹ کو کبھی نہیں چھوتے کہ اُن پر تصویریں ... ہیں؟

... پیسے والی آخری چیز بڑی سخت ہے۔ یہ چیز تو علمائے کرام کی جیبوں میں اکثر نہایت احتیاط کے ساتھ رکھی ہوئی پائی گئی ہے۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔ ہاں سچ ہے:-

ہر کسے ناصح برائے دیگراں

~~~~~~~~~~~~

سب سے آخر میں ایک ... ضروری بات عرض کرکے اس طولانی مضمون کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ میرا روئے سخن ہے ... روز صحافت کی طرف۔

... تک آپ کو حق ہے کہ اگر کوئی مضمون یا تصویر آپ کے نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہے تو آپ بھی معقول ... اور ڈنکے کی چوٹ پر اس پر اعتراض فرمائیں، اس سے ... کو ... دینا، ہر شخص کا فطری حق ہے۔

لیکن ... احترام اتنا ضرور عرض کروں گا کہ آپ حضرات مدیر ہیں، ... نہیں اور بازاری ... ہیں۔ آپ کی تحریروں کو کم سے کم اتنا تو ضرور ہونا چاہئیے کہ ان کے مطالعے سے پڑھنے والے کے دل پر یہ خوشگوار اثر پڑے کہ ان کے لکھنے والے مہذب، تعلیم یافتہ، شریف اور شائستہ انسان ہیں۔

کلام میں گرمی اچھی چیز ہے، مگر اس گرمی بھی کس کام کی کہ یہ دھوکا ہونے لگے کہ بھٹیارے اور کنجڑے آپس میں گالم گلوج کر رہے ہیں۔

... پھبتی جملے، اور بازاری بولیاں جس قوم کے ایڈیٹروں کے شعار میں داخل ہوں، اندازہ کیجئے وہ قوم کس قدر رکیک اور پست ہوگی:

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

آہ! کیا غلام قوم کے دماغ میں اچھے خیالات کے ساتھ ساتھ اچھے الفاظ کا بھی ذخیرہ باقی نہیں رہتا ...؟

سچ ہے۔

"پیری و صد عیب"

اور

"محکومی و صد عیب"

رفتارِ وقت

اِدارۂ کلیم

فروری کے آخری اور مارچ کے ابتدائی ہفتوں میں اٹلی اور حبشہ میں نہایت خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ اٹلی کا دعویٰ ہے کہ اُس نے ہزاروں حبشیوں کو فنا کر دیا۔ دریا لاشوں سے پٹ گئے حبش گر اپنی شکست کو تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن پسپائی کا اقرار کرتا ہے۔ اٹلی کا دعویٰ ہے کہ ہم نے حبشی کمانداروں راس جسٹا اور راس سیوم کی فوجوں کو اس طرح گھیرا کہ دونوں تباہ ہوگئیں۔ اور اب صرف راس عمرو کی فوجیں محفوظ رہ گئی ہیں۔ خواہ یہ دعاوی صحیح ہوں یا غلط لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اٹلی نے آغادین کے علاقے میں حبشہ کو شکست ضرور دی اور حبشی افواج پیچھے ہٹ گئی ہیں جن پر زمین اور آسمان سے تباہ کُن گولہ باری کی جا رہی ہے۔ زہریلی گیسوں سے متمدن اٹلی اپنے غیر متمدن حریف کی تواضع کر رہا ہے۔ اور صرف مسلح دشمن کے ساتھ ہی یہ فیاضانہ برتاؤ نہیں کیا جا رہا ہے، بلکہ صلیب احمر کے اُن ہسپتالوں کو بھی نذرِ آتش کیا جا رہا ہے، جو انگلستان اور دوسرے ممالک سے وہاں اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ زخمی حبشیوں کی تیمارداری کریں۔ اٹلی کے ہوائی جہازوں نے ادیس ابابا پر بھی گشت لگایا ہے، اور توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس غیر مدافع شہر کو بھی آسمانی گولہ باری سے تباہ و برباد کر دیں گے۔ چنانچہ اس شہر کے بوڑھے، بچے، عورتیں، اپنے گھروں کو چھوڑ کر دوسرے مقامات میں پناہ لے رہے ہیں۔

مجلس اقوام نے جو تیل کی بندش سے مایوس ہو چکی ہے اب صلح کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ جس پر حبشہ نے تو آمادگی کا فوراً ہی اظہار کر دیا ہے، لیکن مسولینی نے ہنوز کوئی جواب نہیں دیا ہے، اٹلی کا جواب وہی شرائط ہوں گی، جو ایک دفعہ دنیا کے علم میں آچکی ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مفتوحہ علاقہ، اور اس کے متصل صوبے اٹلی کو بلا شرکت غیرے دیدیئے جائیں، اور اندرونی حصص ملک میں کہیں اٹلی کی نگرانی رہے، اور کہیں فرانس اور انگلستان کی، اور شاہ حبشہ کو شاہِ شطرنج بنا دیا جائے اور حبش کی رعایا غلامِ فرنگ بنا دی جائے۔

اٹلی کے حبشہ کو نگلنے کا سبب جیسا کہ ہم نے ماہ گزشتہ میں عرض کیا تھا، بہت کچھ وسطی یورپ کی سیاسیات بن رہی ہیں، اور اب یہ بات اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ فرانس اور روس میں معاہدہ ہو چکا ہے کہ بصورتِ جنگ دونوں ممالک ایک دوسرے کے حلیف ہوں گے۔ اس خبر کو ہٹلر نے جو خود ایسا ہی معاہدہ جاپان سے کر چکا ہے، ایک بہانہ بنایا، اور رائن لینڈ میں جرمن افواج داخل ہوگئیں، اور نظر آنے لگا ہے کہ فرانس اور جرمن ایک خونریز جنگ میں کُود پڑنے کے لئے بالکل تیار ہو چکے ہیں دونوں ممالک کوشاں ہیں کہ اٹلی کو اپنے سے ملا لیں۔ فرانس کے پاس اٹلی کو رشوت دینے کے لئے اس وقت صرف حبشہ ہی ہے۔ اس لئے سمجھ لینا چاہیئے کہ مجلسِ اقوام اُنہی شرائط پر صلح کرائے گی۔ جو اٹلی پیش کرے گا۔

جرمنی کے عہدنامہ۔ وارسائی اور لوکارنو سے قطعاً منحرف ہو جانے نے انگلستان کو بھی بظاہر متفکر بنا دیا ہے، اور یہ سوال کہ انگلستان اپنے پُرانے حلیف فرانس سے وضعداری نبھائے گا یا نئے آشنا جرمنی سے؟ جس کو جنگِ عظیم کے بعد سے اب تک وہ کئی معاملات میں اپنی چشمِ التفات سے نواز چکا ہے۔ بہت غور کے باوجود بھی ہنوز بے جواب ہی ہے۔ انگلستان کے اغراض کا تقاضہ یہ ہے کہ جاپان جو جزائر ہند تک پھیلنے کی خفیہ آرزوئیں اپنے سینے میں چھپائے بیٹھا ہے ایک زیر دست چینی کھائے اور اتنا کمزور ہو جائے کہ وہ انگلستان کی دوستی میں ہی اپنی خیریت سمجھے۔ اس لحاظ سے خیال ہوتا ہے کہ انگلستان اپنے پُرانے حلیف فرانس کا ہی ساتھ دے جس نے جاپان اور جرمنی کے خلاف روس سے اتحاد پیدا کر کے ایک مشترکہ محاذ قائم کیا ہے لیکن دوسری طرف انگلستان کی ایشیائی سیاسیات کا تقاضہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی عظیم الشان سرمایہ پرست سلطنت کے دشمن سویٹ روس کے خلاف اس طرح

جاپان سے اشتراکِ عمل رکھتے کہ ایک طرف رُوس کی طاقت ٹوٹ جائے جو اُس کی کشور کشایانہ آرزوؤں میں ایک ناگوار رکاوٹ ہے، اور دوسری طرف فرانس کو بھی کمزور کردے۔ جو کسی وقت اٹلی سے متحد ہوکر بحرِ روم میں اُس کی بحری فوقیت کے لئے خطرات کے امکان مہیا کرسکتا ہے۔ یہ نوع انگلستان کی سیاست اس وقت غیر معمولی ذہانت کا مظاہرہ کر رہی ہے، اور کوئی ملک اُس سے بے نیازی نہیں برت سکتا۔ سب اُس سے اتحاد چاہ رہے ہیں۔ اور اُس کو اپنا بنا لینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، اور وہ سب کو امیدوار بنائے ہوئے ہے۔

رُوس، جاپان کی کشمکش منگولیا کی حدود پر ہنوز خطراتِ جنگ کی آئینہ دار ہے۔ فوجی دستوں کا جاپانی وزرار کو قتل کرنا۔ مدتوں تک کچھ کا کچھ سمجھا جاتا رہا۔ کیونکہ مارشل لا اور احتساب، دونوں اصلی خبروں کو چھپائے رہے، اور اب بھی صحیح وجوہِ فساد کا علم دنیا کو آہستہ آہستہ ہوا ہے۔ جاپان میں دو سیاسی گروہ ہیں۔ ایک وہ جو منگولیا کے قبضے کے حق میں ہے، اور دوسرا وہ جو اِس گروہ سے اختلاف رکھتا ہے۔ مقتول وزرار اِسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلا گروہ فوجی اخراجات کو بے اندازہ حد تک لیجانا چاہتا تھا۔ تاکہ لڑائی کی صورت میں فوج محتاج نہ رہے۔ اور دوسرا گروہ ان اخراجات میں کتر بیونت کرتا۔ اور فوجی اخراجات کو محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ ہم نے کوریا منچوریا اور چین کے دوسرے حصص فتح کئے، مگر وہاں کے انتظامات پر جتنا روپیہ صرف ہوتا ہے آمدنی اُتنی نہیں ہوتی۔ اِس لئے استحصالِ ممالک کی یہ کارروائی سود مند نہیں ہے۔ لیکن مخالف گروہ کو منگولیا میں کوئلے اور دوسری معدنیات کی کانیں نظر آرہی تھیں، اور اُن کا دعویٰ تھا کہ اس پر قبضہ کرنے سے تمام مشکلات حل ہوجائیں گی۔ لیکن اوّل الذکر گروہ کے مدبرین رُوس سے جنگ کرنے کو بہت تشویشناک نتیجے تھے جبکہ وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ جاپان کی روز افزوں ترقیاں فرنگی اقوام کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہیں۔ لیکن فوجی گروہ جس کو سیوکائی جماعت کی پوری پوری ہمدردی اور حمایت حاصل تھی نافرمانہ وضع اختیار کرتا رہا۔ جاپانی فوجیں اپنے آپ ہی سوویٹ کے علاقے میں گھس جاتی تھیں۔ کئی دفعہ سرحد پر جو لڑائیاں ہوئیں وہ سب فوجیوں کی خود کردہ بلغاریں ہوئیں جن سے اربابِ حکومت قطعاً ناواقف تھے۔ یہ حالات تھے کہ بجٹ پیش ہوا۔ اور اُس میں فوجی مصارف سے بڑی حد تک بے پروائی برتی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پایۂ تخت کی فوجوں نے ایک خوفناک سازش مرتب کرکے بے خبر وزرار اور اُن کے ہم خیالوں پر دھاوا بول دیا، اور اُن میں سے اکثر قتل کردئے گئے۔ دُنیا بھر کے سیاسی حلقوں اور بالخصوص روسی مدبروں نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ لڑائی جو ٹل رہی تھی اب نہ ٹلے گی۔ دوسرے یہ خیال عام تھا اور اب بھی ہے کہ اٹلی اور جرمنی کی طرح جاپان میں بھی فاشی حکومت کی قسم کی حکومت قائم ہوجائے گی اور اُس کا کرتا دھرتا ڈکٹیٹر کوئی فوجی افسر ہوگا۔ لیکن اب کہ مسیو ہروٹا نے قلمدانِ وزارت سنبھال لیا ہے، جو مقتول وزرار کے گروہ سے ہی تعلق رکھتے ہیں، اِن خیالات میں تذبذب پیدا ہوگیا ہے اور چونکہ مسیو ہروٹا نے سیوکائی طبقے سے اتفاق نہیں کیا ہے اور فوج پرست طبقے کی ہمدردی اُنھیں حاصل نہیں ہوئی ہے، اس لئے موجودہ حکومت کے متعلق یقین کرنا کہ وہ کامیاب ہوگی دشوار ہے نیز جماعت اعتدال پسند (جماعتِ وزرائے مقتول) اور سیوکائی جماعت کے علاوہ ایک تیسری جماعت اشتراکیین کی بھی ملک میں سرگرم جد و جہد ہے۔ اگر یہ جماعت ذرا بھی قوت حاصل کرلے تو سرمایہ پرست جاپان کے پاس اس کا حل سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ وہی کرے، جو اٹلی اور جرمنی میں ہوچکا ہے۔ یعنی ایک مضبوط فاشی نظامِ حکومت قایم کی جائے جس کے متعلق ہنوز یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ ایک کامیاب نظامِ حکومت ہے یا نہیں؟

ہندوستان کی "قومی کانگرس" کے آئندہ صدر پنڈت جواہرلال نہرو کی اہلیہ محترمہ کے انتقالِ پُر ملال کی خبر ہندوستان میں بڑے رنج و غم کے ساتھ سُنی گئی۔ نہرو خاندان سے قریب قریب تمام پڑھے لکھے ہندوستانیوں کو جو محبت ہے۔ اُس کا اظہار اُن ہڑتالوں، اور ماتمی جلسوں سے ہوتا ہے جو کملا نہرو کے انتقال پر سارے ملک میں ہوئے۔ ایسی رفیقۂ حیات کی جُدائی پر جس نے اُن کی زندگی کے ہر دور میں اُن کا ساتھ دیا، پنڈت جواہرلال سے جس قدر ہمدردی کی جائے وہ صحیح ہے۔

کچھ دنوں سے دہلی میں ہندوستانی سیاسی جماؤ ہو رہا ہے۔ مہاتما گاندھی جی بھی موجود ہیں، اور مہادیو ڈیسائی بھی۔ پنڈت نہرو اور بابو راجندر پرشاد بھی آتے اور جاتے ہیں۔ وزارتیں قبول کرنے کا مسئلہ زیرِ غور ہے، اور کہا جاتا ہے کہ غالباً یہ "افتخار" اِس دفعہ کانگریس ضرور قبول کرلے گی۔ اور ساتھ ہی یہ خبر بھی سنی جا رہی ہے کہ کانگریسی اشتراکی، آئندہ آل انڈیا نیشنل کانگریس سے اپنا تعلق قطع کریں گے۔ غرض جس اندیشے کا ماہ مارچ کے کلیم میں اظہار کیا گیا تھا وہ اب حقیقت بنتا نظر آتا ہے، اور وہ وقت اب دُور نہیں رہا ہے کہ جب مہاتما گاندھی سیدھے ہاتھ میں "پوتی" اور اُلٹے ہاتھ میں "یونین جیک" کا جھنڈا اُٹھائے، اپنے کئی ہزار یا کئی لاکھ معتقدین کے ساتھ ایوانِ حکومت کا طواف کرتے نظر آیا کریں گے۔

محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

مگر حیرت اور استعجاب نہ فرمائیے۔ ہندوستانی کانگریس بہت بڑھی ہوگئی ہے جن چندر پال سا انقلاب پسند جب حکومت پرست بن سکتا ہے تو کانگریسیوں کا اعتدال پسندوں میں جا ملنا کیا ہندوستان میں تحریکِ آزادی کا خاتمہ کر دے گا؟ اس سوال کا جواب دشوار نہیں ہے۔ تمام دنیا کی تاریخ میں سے جد وجہدِ آزادی کے ابواب پلٹ کر دیکھئے، آپ کو اُن میں لکھا ہوا نظر آئے گا "بڑھے قائد جب میدان سے پیٹھ دکھا گئے تو نوجوان نکلے اور اُنھوں نے آزادی چاہنے والوں کی قیادت کی"۔ یہی یہاں ہوتا نظر آتا ہے۔ چاہے یہ نوجوان اشتراکیوں کی جُون میں نکلیں یا جمہوریت پسندوں کے چوغے میں۔

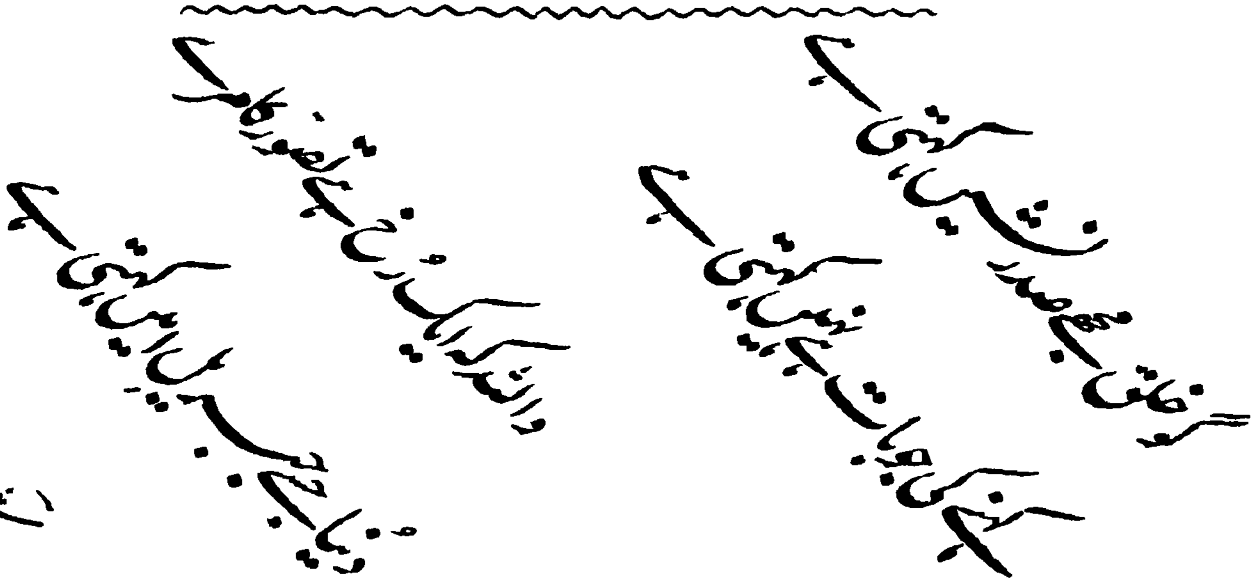
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خار زار ہوگا!

~~~~~~~~~~~~~~~~

ادبی حلقوں میں غالباً یہ خبر مسرت سے سُنی جائے گی کہ دہلی میں ترقی پسند مصنفین کی ایک جماعت کی تاسیس عمل میں آئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دہلی میں ایسے مصنفین کا ادارہ قایم کیا جائے، جو چاہے کسی بھی ہندوستانی زبان سے تعلق رکھتے ہوں۔ لیکن اُن کی تصانیف عالمِ خیال کے بجائے ایک عالمِ عمل، اور عالمِ رُوح کے بجائے عالمِ زندگی سے ادب کو روشناس کرائیں۔ انگریزی ادب کو چھوڑ کر اُردو یا ہندی ادب ہندوستانیوں کی زندگیوں کے متعلق اس قدر بے مایہ ہے کہ اس کا علاج ضرور کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے تھا۔ آپ کو عشق و محبت کی صدہا تصانیف تازہ بتازہ نو بہ نو میسر آسکتی ہیں۔ لیکن اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ ہندوستان میں آباد ۳۰ کروڑ انسان کن حالات میں رہتے ہیں۔ اسبابِ معیشت کیا ہیں۔ اور سامانِ زندگی اُن کو کس قدر حاصل ہیں۔ اُن کی اقتصادی حالت کن مدارج سے گزر رہی ہے۔ اقتصادیات کی حالت ترقی پذیر ہے یا تنزل پذیر؟ کیا اسباب ہیں، جن سے ہندوستانیوں کے اخلاق و اطوار روز بروز زوال پذیر ہوتے چلے جا رہے ہیں، تو آپ کو یوں استفسارات کا جواب اپنے ادب میں نفی کے برابر ملے گا، اور کہنا پڑے گا کہ بھائی ہمارا تعلق زمین سے تو ہے نہیں۔ ہم تو آج تک ایسی فضا میں رہتے آئے ہیں، جہاں عشق ہے، رُوح ہے، خدا ہے، پیر و پیغمبر ہیں، معشوق ہیں، کچھ مجازی، کچھ حقیقی، کچھ پھُول ہیں، چند بلبل ہیں، جنت کے دل خوش کن خواب ہیں، اور دوزخ کے پُرہیبت تصوّرات، اور بس! مگر یہ کس قدر دردناک ہماری ادبی بے مایگی ہے، اس لئے اس اقدام پر جو انجمن ترقی پسند مصنفین کی صورت میں چند اصحاب نے کیا ہے ہم دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

انجمن مذکور کے قیام کے بعد ہی ہمارے کرم فرما اور مشہور زمانہ ہندوستانی ادیب منشی پریم چند صاحب دہلی آئے۔ اور یہ دل خوش کن سندیسہ لائے، کہ اردو و ہندی کے مصنفین کو ایک دوسرے کے قریب کرنے کے لئے ایک مجلس ہونی چاہیئے۔ جامعہ ملیہ اکادمی نے ہندی و اردو ارباب ادب کو جمع کیا۔ اور اس اجتماع نے "ہندوستانی سبھا" کی تشکیل کی۔ ہم اس "سبھا" کا قیام ہندوستانی ادب کے لئے ایک خبر نیک کے مرادف سمجھتے ہیں، اور اردو و ہندی کے ادیبوں سے اس میں دلچسپی لینے کی درخواست کرتے ہیں۔

~~~~~~~~~~~~~~~~



شاعرِ ہندوستان

زندہ مُردوں کی ہے بستی، کون سُنتا ہے یہاں
تابہ کے چیخا کروں "ہندوستاں! ہندوستاں!"

اک نظر بھی قدر دانِ جوہرِ قابل نہیں
ہند کے اُجڑے ہوئے سینے کے اندر دل نہیں

آئیں یوسف بھی اگر لپٹے ہوئے انوار میں
ایک گاہک بھی نہ پائیں ہند کے بازار میں

سچ کہا ہے جزو میں اندازِ کُل ہوتا نہیں
اس چمن کی بلبلوں کو عشقِ گُل ہوتا نہیں

ہند ہے وہ مُلک جس میں کشمکش سے دھوکے ہات
سو رہی ہے موت کے زانو پہ لیلائے حیات

وہ جماعت، شرم سے نام اپنا لے سکتی نہیں
ایڈریس[1] سی چیز جو شاعر کو دے سکتی نہیں

آہ اے ٹیگور" تو کیوں ہند میں پیدا ہوا
سچ بتا تو کس ادائے مُلک پر شیدا ہوا؟

اس جگہ تو کانپتی ہیں قہر کی پرچھائیاں
زندگی غائب ہے، مُردے سانس لیتے ہیں یہاں

شعر کو، بہروں میں ممکن ہی نہیں حسنِ قبول
شاعرِ ہندوستاں ہے اصل میں جنگل کا پھول

جس کے گردو پیش رہتا ہے بہائم کا ہجوم
روندتے ہیں جس کو چوپائے، جھلستی ہے سموم

جہل کا دریا ہے، اور ناقدریوں کی لہر ہے
شاعرِ ہندوستاں ہونا خدا کا قہر ہے

(جوشؔ)

[1] دہلی میونسپلٹی نے ٹیگور کو ایڈریس دینے سے انکار کر دیا تھا، اسی جذبے کے تحت یہ چند شعر چند لمحوں کے اندر کہے گئے ہیں۔

غرورِ راد

میرے جلسے سے اُٹھ آنے پر خفا ہے ہمنشیں؟ — شاعروں کی فطرتِ عالی سے تو واقف نہیں
جوہرِ ذاتی کا جب افسردہ ہوتا ہو وقار — کفر سے بدتر ہے اُس موقع پہ وضعِ انکسار
ناشناسانِ ادب بھولے ہوئے ہوں جب شعور — اُن مواقع پر عبادت کے برابر ہے غرور
دل ہمارا جذبۂ غیرت کو کھو سکتا نہیں — ہم کسی کے سامنے جھک جائیں، ہو سکتا نہیں
راہِ خودداری سے مرکر بھی بھٹک سکتے نہیں — ٹوٹ تو سکتے ہیں ہم، لیکن لچک سکتے نہیں
حشر میں بھی خسروانہ شان سے جائیں گے ہم — اور اگر پرسش نہ ہوگی تو پلٹ آئیں گے ہم
اہلِ دُنیا کیا ہیں، اور اُن کا اثر کیا چیز ہے — ہم خُدا سے ناز کرتے ہیں بشر کیا چیز ہے

(جوشؔ)

ذوقِ عصیاں

بُت پرستی ہے وہی اور وہی مستی اب تک — مجھ میں باقی ہے وہی شیوۂ رندی اب تک
مجھ کو اب تک نہیں بھولا ہے گناہوں کا مزہ — ذوقِ عصیاں ہے وہی دل میں الٰہی اب تک
دل فریبی ہے وہی کفر کی رنگینی میں — ظلم کرتی ہے وہی حُسن کی شوخی اب تک
زلفِ ہندو میں وہی رنگِ دل آویزی ہے — چشمِ جادو میں وہی سحر طرازی اب تک
شعرِ دل کش میں وہی آج بھی اک سوزِ لطیف — سازِ مطرب میں وہی شعلہ نوائی اب تک
جس کے تیروں سے ہوا تھا کبھی مجروح شباب — حکمرانِ دل و دیں ہے وہی دیوی اب تک
آشنا جس نے کیا رازِ محبت سے مجھے — ہے وہی زخمِ کہن وجہِ تسلّی اب تک
اب بھی پڑھتا ہوں کبھی حافظ و خسرو کی غزل — لطف دیتا ہے وہی شعرِ نظیری اب تک

متین الدین ایڈووکیٹ لکھنؤ

REGD. No. L 3694

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدر اعظم سے کہا "دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو، کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کرسکوں، تعمیل حکم کے لئے فردوس مثال کشمیر، جنت نظیر سوئٹزرلینڈ، شباب انگیز تسمانیہ اور گل پاش مرغزاروں میں گل چینی کی گئی —— جب سب پھول دُور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے، تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حُسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی، مہارانی اس خواہش کو پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی، کھانا پینا ترک کردیا، مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا، اور وزرا سے مشورہ طلب کیا، مہتمم توشہ خانہ نے **اصغر علی محمد علی** سے عطر منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی، فوراً عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا،



اصغر علی، محمد علی، تاجرانِ عطر، لکھنؤ و دہلی


کلیم
مدیر: جوش ملیح آبادی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ناہیم ادھا



شدخ. در زن باحسنه گدا مستی — که حدرکسسدی و ده سر ددوسدی
زن گفت چنانکه می دانم هستم — تو بدر حدانکه می دانی هستی

Coronation Printing Works, Delhi

بنامِ قوت و حیات

کلیم

اردو زبان کا ہر جہت سے قیمتی ماہنامہ

سالانہ چندہ - چھ روپے
ششماہی چندہ - تین روپے

قیمت فی پرچہ - نو آنے

جلد | فہرست مضامین ماہ مئی سنہ ۱۹۳۶ء | نمبر ۵

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے کومد نیشن برقی پریس فتح پوری میں چھپوا کر دفتر کلیم دہلی سے شائع کیا)

اشارات

(۱) "کلیم" کی رفتار ترقی بہت امید افزا ہے، اور قرائن خود بخود ایسے پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں جن سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا مستقبل نہایت درخشاں ہوگا۔

---

(۲) رسالے کی امداد کے سلسلے میں مجھ پر شکر یہ واجب ہے، ہندوستان کے جواں مرد والئی ملک یعنی ہز ہائنس مہاراجہ پٹیالہ، اور سر ہیر زا اسمٰعیل دیوان میسور کا، کہ انہوں نے اودھ کے رؤسا کی طرح بے اعتنائی نہ برتتے ہوئے "کلیم" کی معقول امداد کرکے حوصلہ افزائی فرمائی۔

رؤسائے اودھ پر اردو زبان کا جس قدر حق ہے، وہ ظاہر ہے، اس کے علاوہ چونکہ میں بھی تعلقدار خاندان کا ایک فرد ہوں، اس لئے برادرانہ حیثیت سے بھی ان پر لازم تھا کہ میرا ہاتھ بٹاتے، لیکن ان میں سے ایک کے علاوہ کسی نے بھی کوئی توجہ نہیں کی۔

وہ "ایک" جنہوں نے توجہ فرمائی، میرے محترم کرم فرما راجہ سید ابوجعفر صاحب مغفور کے صاحبزادے سید حید ر مہدی صاحب تعلقدار پیر پور ہیں۔ جو صرف تعلقدار کی حیثیت ہی سے نہیں۔ بلکہ شرافت، علمیت اور حسن اخلاق میں بھی اپنے قابل فخر باپ کے صحیح وارث اور جانشین ہیں۔

(۳) گاڑی کے پلیٹ فارم سے رینگتے ہی پوری رفتار کی امید تو نہیں کی جا سکتی ظاہر ہے کہ ہر رسالہ پورے ایک سال کے بعد اپنے مضمون نگاروں کا حلقہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوا کرتا ہے، پھر بھی یہ امر بڑی مسرت کا باعث ہے کہ کلیم سرعت کے ساتھ ایسے مضمون نگار پیدا کر رہا ہے جو اس کے مقاصد کو بڑے عمل لا سکتے ہیں اور ایک ایسی ذہنی فضا پیدا کر سکتے ہیں جو تندرست و امید افزا ہو۔

کوشش کی جا رہی ہے کہ مشہور مضمون نگاروں کو "کلیم" کے سانچے میں ڈھالا جائے اور غیر مشہور حضرات کو جو ہر طرح کی صلاحیتوں سے معمور ہیں، پردۂ غیب سے نکالا جائے۔

غیر معروف حضرات میں سے سید انور علی بی۔ اے، اور اسرائیل احمد خاں تو بزم کلیم میں آ ہی چکے ہیں اور ثابت کر چکے ہیں کہ تفکر و انشا پردازی کسے کہتے ہیں اور عبدالرحیم شبلی صاحب کے مضامین بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ وہ کس قدر محنت و جانفشانی، اور عرق ریزی سے مرتب کئے جاتے ہیں اور ان سے ہندوستان کو کس قدر فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ گویا کہ تین قابل نازش حضرات اور پیش کئے جائینگے جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں، حکیم احمد صاحب۔ ڈاکٹر ضیا عباس صاحب ہاشمی اور منظر صاحب حکیم احمد صاحب فلسفیانہ دماغ رکھتے ہیں، ڈاکٹر ضیا عباس صاحب ادبی اور منظر صاحب بلند فلسفے کے بڑا ماہر ہیں

(۴) تھوڑے دن ہوتے کہ میں ایک مجتہد العصر کی زیارت کے لئے ان کے دولتکدے پر گیا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ برآمدے میں چند ترس آنے کی حد تک دبلے پتلے مومنین مرعوبیت و انتظار کی فضا میں بیٹھے ہوئے اونگھ رہے ہیں۔

میں بھی ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ دبلے مومنوں نے مجھے اس طرح دیکھنا شروع کیا گویا وہ چاندنی رات میں کسی دور کی شے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کامل آدھ گھنٹہ کے انتظار کی الجھی ہوئی گرم سانسوں کے بعد یکایک نعرۂ "صلوٰۃ" بلند ہوا، اب جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ مجتہد صاحب آنکھوں کو جھکائے اور جسم کو چرائے ہوئے اس طرح چلے آ رہے ہیں گویا آدھی رات کی تاریکی میں کوئی سہمی ہوئی سازش حرکت کر رہی ہے۔

میں نے بڑھ کر سلام کیا جس کا اس طرح جواب دیا گیا جس طرح ہندوستانی لڑکیاں ایجاب و قبول کے وقت "ہوں" کرتی ہیں، میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ قبلۂ و کعبہ نے اپنی انگوٹھیوں سے آراستہ انگلیوں کی نوکوں کو میری انگلیوں سے بسرعت تمام مس کرکے فوراً ہاتھ کھینچ لیا، میری انگلیوں کو وہ مس بالکل ایسا معلوم ہوا گویا خواب میں کسی دیوی کا آنچل ہوا دیتا ہوا نکل گیا۔

اتنے میں ایک دیہاتی وضع کے موٹے تازے بزرگ، جن کی سیڑھیوں پر چڑھنے سے سانس چڑھ رہی تھی۔ اور مونچھوں کے پولے لہلہا رہے تھے لپکے ہوئے آئے۔ اور بغیر دم لئے ہوئے جیب سے ایک پرچہ نکال کر قبلۂ و کعبہ کی جانب بڑھا دیا، "حضور اس پر دستخط فرما دیں"۔

دیہاتی مومن کی اس خلاف آداب مجلت پسندی پر تمدن کے آغوش کا پلا ہوا اور معتقدین کی پابوسیوں کا پروان چڑھایا ہوا اجتہاد و چین بجبیں ہو گیا بگڑ گیا۔ تیوریوں میں بل پڑ گئے، اور "مجھے اس وقت فرصت نہیں ہے" کا منتقی جواب دے کر قبلۂ و کعبہ نے منہ پھیر لیا۔ اور اس برہم ہو کر منہ پھیر لینے کے بعد زیر ملفوظ طور پر کہا۔ "دیہاتی، بدتمیز۔ اجڈ۔ گنوار"۔

لیکن دیہاتی مومن دھن کا پکا، اور عقیدت میں راسخ تھا۔ اس کا پرچہ در انگشت ہاتھ قبلۂ و کعبہ کی جانب بلند ہی رہا، "آپ پرچے لے جائیں"۔

مجتہد العصر نے پھر جھڑک کر کہا۔ "حضور! میری گاڑی میں صرف دو گھنٹے باقی ہیں۔ اور کام اس قدر ضروری ہے کہ میں ٹھہر بھی نہیں سکتا ہوں۔ قبلۂ و کعبہ کی بڑی پرورش ہوگی اگر اس پرچے پر اس وقت دستخط کر دیں"۔ دیہاتی مومن نے بڑی لجاجت کے ساتھ عرض کیا۔

"وقت، ناوقت لوگ پریشان کیا کرتے ہیں"۔ قبلۂ و کعبہ نے یہ کہہ کر "لائیے، پرچہ لائیے"، پرچہ دست مبارک میں لے کر پڑھنا شروع کیا۔ پرچہ پڑھنے کے وقت قبلۂ و کعبہ کا چہرہ مئی جون کے آسمان کی طرح رو کھا، اور کھرا ہوا تھا۔ اور آسمان سے آواز آ رہی تھی، "اخاہ رے مادّے"! پرچہ پڑھ کر قلم اٹھایا اتنے زور سے دستخط کئے کہ روشنائی کی چھینٹیں دور دور تک پھیل گئیں، اور صریر قلم سے سب و شتم کی آوازیں آنے لگیں۔

تو لیجئے کی تراز دے غیظ میں تلی ہوئی آواز کے ساتھ مجتہد العصر نے دستخط کرکے پرچہ ان کی طرف پھینک دیا —— یہ دیکھتے ہی "حضور، مہر مہر" کی گھبرائی ہوئی آواز دیہاتی مومن کے گلے سے نکلی۔ اور اس آواز کے سنتے ہی قبلۂ و کعبہ نے اپنے ملازم کو گرج کر صدا دی: "مہر لاؤ، مہر لاؤ" —— "مہر لاؤ، مہر" کے لہجے میں وہی گونج تھی جو لکھو کھیلے امیروں کی "کوئی ہے" کی مرعوب آواز میں پائی جاتی ہے —— ملازم نے دہشت زدہ ہو کر مہر پیش کر دی، گھبراہٹ اور خوف سے اس غریب کے مرتب بیٹے اسپنج کی طرح پھول کر رہ گئے۔

قبلۂ و کعبہ نے کاغذ پر ثبت فرمانے کے لئے مہر بلند کی۔ اس انداز سے گویا کسی کافر کا سر کچلنے والے ہیں —— اٹھے ہوئے ہاتھ کی انگوٹھیوں کے نیچے جھلے، مہر لگنے کی دھم سے مہیب آواز آئی —— دیہاتی مومن اچھل پڑا —— مہر ثبت فرما دی گئی، اور ثبت کرتے ہی بیچاری کو پرزے دور پھینک دیا گیا۔

یہ ہے ہمارے مجتہدین کرام کا اخلاق —— یہ ہے ان مقدس ہستیوں کا عقیدتمند مسلمانوں سے برتاؤ، جو اپنے کو انبیائے بنی اسرائیل کا ہم پایہ سمجھتے ہیں۔

اور یہ ہے آپ کے "علمائے کرام" کا کر و فر، آپ کے "حامیان دین متین" کا دبدبہ، اور آپ کے "شمس العلماؤں" کا طنطنہ؟

اور یہ بھی غور کیجئے کہ یہ فرعونیت کا مظاہرہ کس مقام معصومیت سے کیا جاتا ہے؟ بساط امت، اور مسند رسول سے! کون ائمہ، اور کون رسول؟ وہ ائمہ، جو سلام میں سبقت کرنے والے، سب و ستم کا جواب احسان سے دینے والے، منہ پر تھوک دینے والے کے سینے سے اترنے والے، اور اپنے قاتل کو شربت پلانے والے تھے۔

اور وہ رسول جو صاحب خلق عظیم، اور رحمۃ للعٰلمین تھا۔ وہ رسول جس نے حکم دیا ہے کہ سائل کو بھی نہ جھڑکا جائے۔ اور وہ رسول جس نے کفار کی نجاست اپنے مقدس ہاتوں سے صاف کی تھی۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

شکایت کی جاتی ہے مغربی تہذیب، مغربی ثقافت اور مغربی لٹریچر سے کہ یہ ہمارے نوجوانوں کو ملحد و کافر بنا رہا ہے۔ حالانکہ دنیا اور بالخصوص بھولے بھالے مقلد قسم کے مسلمانوں کو اس کا علم نہیں ہے کہ ان خطاب یافتہ مولویوں، ان حکومت گزیدہ مجتہدوں اور ان زوالی زدہ پیروں کی ہر سانس

ایک زبردست دارالضرب ہے۔ جہاں آئے دن ارتداد و الحاد کے لاکھوں سکے ڈھلا کرتے ہیں۔

من از بیگانگاں ہرگز ننالم
کہ با ما ہر چہ کرد آں آشنا کرد

---

(۵) یہ دیکھیے ایک پیر صاحب خانقاہ کے احاطے میں بیٹھے قوالی سن رہے ہیں، کالی کھونزاسی لنڈوں میں تیل رینگ رہا ہے جو مونچھ میں گھل رہی، اور گلوری میں قوام مہک رہا ہے۔ عبا سبز رنگ کی ہے، تسبیح سر پر ہے، اور چاندی کا عصا سامنے رکھا ہوا ہے۔ جس کے پاس ہی ایک تھالی میں گلوریاں اور ٹوکری میں پھول رکھے ہوئے ہیں۔

مریدوں کا ہجوم ہے مشتاقان زیارت کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ کھڑے ہوئے ہیں، کچھ بیٹھے ہیں۔ کھڑے ہوئے لوگوں میں ہلچل ہے۔ کوئی کسی کے کاندھے پر جھکا ہوا ہے۔ کوئی کسی کی بغل سے جھانک رہا ہے۔ اور کوئی کہنیاں مار مار کر اندر آنا چاہتا ہے۔ بیٹھے ہوؤں میں کوئی تو کسی کے گھٹنے پر گھٹنا اس زور سے رکھے ہوئے ہے کہ اس کی قوالی کا تمام مزا کرکرا ہو رہا ہے۔ اور کسی کے بغل میں دبے ہوئے جوتوں سے کڑوے تیل کی اس قدر بد بو آ رہی ہے کہ پاس والوں کی ناکیں سڑی جاتی ہیں۔ اور کوئی اس طرح جھوم رہا ہے کہ دوسروں کے سروں میں ٹکریں لگ رہی ہیں ——— البتہ بازاری عورتیں نسبتاً آرام سے بیٹھی ہوئی ہیں۔ کیونکہ انھیں جوار پیری میں جگہ دی گئی ہے اور ان سے آنکھیں لڑا لڑا کر روحانیت کی نبضوں میں خون دوڑایا جا رہا ہے۔

تالیوں کے ساتھ "آہے وا" کی بلبلا دینے والی صدائیں ایسی ہیں کہ بڑی بڑی داڑھیوں والے بوڑھوں کے مونڈھے رقص کرنے کے لئے ہلے چلے جاتے ہیں

دھوتیاں باندھے ہوئے مرید ہر "آرے آرے می کنم" کی آواز پر جس کے معنی وہ بالکل نہیں سمجھتے لانبے لانبے ڈگ رکھتے ہوئے پیر کے سامنے آ آ کر نذریں پیش کر رہے ہیں کہ اتنے میں ایک نہایت بھدا تندیل ادھیڑ آدمی جس کی صورت ناریل سے ملتی ہوئی ہے یکایک ایک چیخ مارتا ہے، اور کھڑا ہو کر تھرکنے لگتا ہے۔ "آرے آرے می کنم، رے آرے آرے می کنم ہاں آرے آرے می کنم۔ ۔ آرے آرے می کنم" کا ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے اور تمام محفل اچھل کود میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

مرید چیخیں مار مار کر پیر کو نذریں دینے لگتے ہیں۔ دو روپے کی نذر والے سے پیر صرف مصافحہ کرتا ہے، اور چار روپے دینے والے کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا ہے۔ اور چیخیں مار مار کر رونے لگتا ہے۔

یہ ہے اسلامی تہذیب کا مظاہرہ، اور یہ ہے اسلام کی روحانیت کا اعلان ——— ڈنکے کی چوٹ پر اعلان۔ چیخیں مارتا ناچتا تالیاں بجاتا اور تھرکتا ہوا اعلان!۔

شکایت کی جاتی ہے کہ ہم مظلوم ہیں۔ بے دست و پا ہیں۔ مفتوح ہیں تو کیا تم سارنگیوں کی روں روں، تالیوں کی چٹا چٹ، اور "آہے وا" کی گونج میں ممالک عالم کو مسخر کرنا چاہتے ہو؟ کیوں نہ ہو الٹے ناچنے والو سور ماؤ۔

الفاظ اور شاعر

الفاظ کو کاغذ پر روشنائی کی لکیریں نہ سمجھو، وہ نہ تو بے جان لکیریں ہیں، نہ ہوائی گرہیں۔

الفاظ تو ذی حیات ہیں انسانوں کی روح ذی حیات۔

الفاظ بھی آدمیوں ہی کی طرح پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ بیمار پڑتے اور تندرست ہوتے ہیں۔ بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ گوشہ نشین رہتے اور سفر کرتے ہیں۔ یہ بھی اپنے اپنے خاص مزاج، عادات، رسوم، روایات اور تاریخی واقعات رکھتے ہیں۔ ان کی دنیا میں بھی ذات پات اور مذہب و معاشرت کا رواج ہے۔ یہ بھی انجمنیں اور سوسائٹیاں بنا کر رہتے اور ترقی کے مدارج سے انھیں بھی گذرنا پڑتا ہے۔

ان میں بھی مختلف نسلیں، خاندان اور شجرے ہوتے ہیں۔ اور ہر خاندان اپنے ہی عزیزوں اور کفو میں بیاہ شادی کرتا ہے۔

الفاظ پر بھی لڑکپن، جوانی، اور بڑھاپے کی فضائیں آتی ہیں۔ ان میں بھی بعض تو ہم انسانوں کی طرح نیکنام ہوتے ہیں۔ اور بعض بدنام، بعض عبائیں پہنے ہوئے دیوتاؤں کے مندروں میں رہتے ہیں بعض دستاریں زیب سر کئے ہوئے درباروں میں اور بعض ننگے پاؤں بازاروں میں مارے

مارے پھرتے ہیں۔ بعض کے ہات پاؤں چومے جاتے ہیں۔ اور بعض جب دروازے پر آتے ہیں تو انھیں دھتکار دیا جاتا ہے۔

ان میں متقی و پرہیزگار بھی ہوتے ہیں۔ اور آزاد و خراباتی بھی۔ ان میں امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی، متوسطین کا طبقہ ان میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔

الفاظ میں بھی ہم انسانوں کی طرح بعض الفاظ انتہا درجے کے شریف النفس اور بردبار ہوتے ہیں۔ اور بعض پرلے درجے کے مفسد … و دل آزار۔ ان میں سے بعض تو باغی قسم کے ہوتے ہیں۔ اور بعض چپراسی … بعض بزم کے رسیا ہوتے ہیں اور بعض رزم کے مرد میدان۔ بعض کی کمر … پر تلواریں لٹکی رہتی ہیں اور بعض گلے میں پھولوں کی بدھیاں … کان میں سونے کے در پہنتے ہیں۔

لیکن تمام الفاظ میں یہ ایک عجیب مشترک و نمونی خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ بے ہمہ و باہمہ رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ملتے تو سب سے ہیں۔ مگر اپنے کونے دبیے ہوئے۔ معلوم نہیں یہ شرمیلے ہوتے ہیں کہ مغرور۔ مگر اب یہ ایک عام عادت ہے کہ جلد بے تکلف ہوجانے کو بہت ہی برا سمجھتے ہیں۔ … دیر آشنائی پر کاربند رہتے ہیں۔

آدمی کے حافظے کی کمزوری، یا درس و تدریس کے شوق نے نہایت ہی گستاخی کے ساتھ انہیں لغات کی نمائشی الماریوں میں سجا دیا ہے۔ یہ ان الماریوں میں طوعاً و کرہاً بیٹھے تو ہیں، مگر بڑی چالاکی کے ساتھ انھوں نے اپنے چہروں پر نقابیں ڈال رکھی ہیں۔ تاکہ انھیں بہ آسانی پہچانا نہ جا سکے اور مکمل خط و خال تو کبھی نمایاں ہی نہ ہو سکیں۔

جب تک کوئی اللہ کا بندہ ان کے پیچھے نہ پڑ جائے، ان کی گلیوں کی خاک نہ چھان ڈالے، مہینوں نہیں برسوں ان سے ملے جلے نہ، ان کی میزبانی نہ کرے۔ ان کے گھر مہمان نہ رہے، سالہا سال تک ان کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھے، ان کی غمی شادی میں شریک نہ ہو ان سے رشتہ ناتا نہ جوڑے ان کی نبضوں کی رفتار، ان کے خون کی گردش، اور ان کے خاندانی و ذاتی خصوصیات کو نہ پرکھ لے، اس وقت تک یہ مغرور یا شرمیلے الفاظ اس سے بے تکلف نہیں ہوتے، اور اسے اپنے مزاج کی افتاد اور اپنے اسرار سے آگاہ کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔

انسانوں کے بے شمار طبقوں میں سے صرف ادیبوں اور شاعروں کے دو ایسے طبقے ہیں جن سے ان کی بے تکلفانہ رسم و راہ اور مخلصانہ دوستی ہے۔

ادیبوں سے ہر چند ان کی ملاقات دوستانہ اور مخلصانہ ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے گھر اکثر آنا جانا بھی کرتے ہیں لیکن بعض نازک مزاج سرا پسند اور … پرور … الفاظ ان سے کھل کھیلنا اور غلط ملط ہونا پسند نہیں کرتے … ادیبوں کے سامنے آئے بھی ہیں تو ان شوخ و شنگ دلہنوں کی طرح جو دور سے تو خوب لگاوٹ دکھاتی ہیں لیکن جب ان کا دامن پکڑنے کے لیے لپکو تو انگلیاں مٹکاتی اور قہقہے مارتی ہوئی ننگے پاؤں بھاگ جاتی ہیں۔

البتہ شاعروں کے ساتھ ان کا برتاؤ دوستوں ہی کا سا نہیں، قرابت داروں کا سا ہوتا ہے۔ وہ شاعروں سے اس طرح ملتے جلتے ہیں جیسے ایک ہی گھر کے مختلف افراد۔ یا ساتھ کھیلے ہوئے لنگوٹیا یار۔

شاعروں کو انھوں نے یہاں تک اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جب چاہیں ان کے لباس تبدیل کر دیں، ان کی لے اور رنگ بدل دیں۔ ان کا رخ موڑ دیں، ان کے معنوں میں تنگی یا وسعت پیدا کر دیں۔ اور ان کے خط و خال میں کمی بیشی فرما دیں۔ شاعر سے ان کے گھروں کی عورتیں بلکہ کنواریاں تک پردہ نہیں کرتیں۔ وہ جب چاہے، دوپہر ہو یا آدھی رات بے دھڑک ان کے گھروں اور ان کی خوابگاہوں میں آ جا سکتا ہے۔

شاعر کے سامنے آتے ہی ہر نسل اور ہر مزاج کے الفاظ اپنی نسلوں اور مزاجوں کا جھگڑا بھول جاتے ہیں، ذات پات اور رنگ مذہب کی کوئی آویزش باقی نہیں رہتی، وہ سب ایک ہی تھالی میں کھاتے، ایک ہی کونے میں بیٹھتے اور ایک ہی حلقے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ شاعر کا مکان الفاظ کی عبادتگاہ ہے۔ جہاں ادنیٰ و اعلیٰ اور شاہ و گدا ہر قسم کے الفاظ ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں، اور صفوں میں ایسی شائستگی ہوتی ہے۔ جیسے راگنی کے بولوں میں ہم آہنگی۔

اکثر اوقات رومانی لمحوں اور وجدانی ساعتوں میں جبکہ شاعر کے احساسات انگڑائیوں پر انگڑائیاں لینے لگتے ہیں، الفاظ کی ٹولیوں کی ٹولیاں جن میں بوڑھے جوان لڑکے اور لڑکیاں سبھی ہوتے ہیں شاعر کے پاس ہواؤں کے دوش پر آتے ہیں اور اس کی معنویت کے گرد حلقہ باندھ کر اس طرح ناچنے اور گانے لگتے ہیں کہ کبھی تو ماہی سے ماہ تک تبسم ہی تبسم جھلکنے لگتا ہے۔ اور کبھی ذروں سے لیکر ستاروں تک آنسو ہی آنسو نظر آتے ہیں۔

خاتونِ مغرب

جب ضمیرِ حق میں انساں کا ہیولیٰ بن چکا — مرد کو فصلِ خزاں کی دھوپ سے پیدا کیا
اور عورت کو بنایا اک سبک رو نہر سے — موسمِ گل کی معطر چاندنی کی لہر سے
مرد کو بخشنے میں دی شمشیرِ تدبیرِ حیات — اور عورت کو چراغ و بربط و قند و نبات
راستے میں مرد کے ڈالے گئے تیر و تبر — اور عورت کی طرف پھینکے گئے گلہائے تر
مرد کے اعضا کو بخشا سنگ و آہن کا جلال — اور عورت کو صبا کا لوچ شبنم کا جمال
مرد کو بخشا لہو، افسردۂ میدانِ جنگ — اور عورت کو دیا پگھلے ہوئے سونے کا رنگ
اُس کو بخشی سنگ کی تعمیر، صرصر کا جلال! — اور اسے طبعِ حریر و سُستیِ بادِ شمال!
اُس نے صولت پائی اِس نے جلوۂ سند طراز — اُس کو محنت دی گئی، اِس کو محبت کا گداز
اُس کو طبلِ جنگ کا ہنگامۂ دہشت فزا — اِس کو ہلکی نرم کلیوں کے چٹکنے کی صدا
اُس کو طوفاں گاہِ بیداری اِسے خوابِ خیال — اِس کو چشمِ ضیغم و شاہیں، اِسے چشمِ غزال
اُس کو شانِ مہر، اِس کو جلوۂ ماہِ منیر — اِس کو سنگ آشوب تیشہ اِس کو رقصِ جوئے شیر
اُس کو تاجِ زرفشاں، اِس کو خمِ زلفِ دراز — اُس کے ماتھے کو شکن، اِس کے لبوں کو موجِ ناز
اُس کو چھانٹا زخمِ دندانِ تلاطم کے لئے — اِس کو رکھا موجِ رنگینِ تبسم کے لئے
اُس کو چھانٹا عشوۂ بزمِ تمنا کے لئے — اُس کو رکھا کاوشِ امروز و فردا کے لئے
اُس کو شورِ حرب، اِس کو شوخیِ گفتار دی — تیغ دی اُس کو، اِسے پازیب کی جھنکار دی

مرد کے زانو کی جنت بن گیا عورت کا سر
کچھ دنوں چلتی رہی دنیا اسی انداز پر

لیکن اک شب دفعتہً تاریکیوں کے درمیاں — جب فرازِ چرخ پر منڈلا رہی تھیں بدلیاں
تنگ تھا دنیا کے ننھے سے کرے کا عرض و طول — ہو رہا تھا چرخ سے اوہامِ باطل کا نزول

رات یوں تاریک تھی جس طرح مجرم کا ضمیر　　　سر کیا شیطان نے عورت کی جانب ایک تیر

سرخ تیر، افسردہ سناٹے میں سنّاتا ہوا

آتے ہی عورت کے سینے میں ترازو ہو گیا

تیر کھانا تھا کہ روحِ ناز بل کھانے لگی!　　　مرد بننے کی تمنا دل کو تڑپانے لگی!

دی صدا عورت نے اس نرمی کو کھونا چاہیے　　　مرد کا مدِ مقابل مجھ کو ہونا چاہیے

نازکی ہے اک اہانت آفرینِ افتادگی　　　مسکرائی ہوگی میرے نوک پر مردانگی

ابنِ آدم کی سنا دیں نازشِ تاب و تواں　　　مرد بن جائیں اگر حوا کی نازک بیٹیاں

روح پر عورت کی یہ دیوانگی جب چھا گئی

لو، سحر ہوتے ہی وہ مردوں کی صف میں آ گئی

آئی، اور خم ٹھونک کر آئی مثالِ پہلواں　　　پنڈلیاں گھومی ہوئی، شانوں کی ابھری مچھلیاں

ترک کر بیٹھی ادا و ناز کا شغلِ رکیک　　　اب ہے وہ دنیا کی ہر مردانہ ورزش میں شریک

باگ پر ہے ہات اور ترشی ہوئی زلفوں پہ گرد　　　تن کے کہتی ہے کہ دیکھو، زن سے یوں بنتے ہیں مرد

لیکن اس تریاق میں ہے زہر کی بھی ایک موج

کس گراں قیمت پہ عورت نے خریدا ہے یہ اوج

اپنے سینے کا خزانہ، اپنی فطرت کا جمال　　　مرد بننے کی ہوس میں کر دیا ہے پائمال

کر چکی ہے بے طرح محرومِ چشمِ التفات　　　اپنے اس شیریں تبسم کو کہ تھا اک کائنات

زلف غائب ہو گئی اور دست و پا کھنچ کر طویل　　　بجھ گئی برنائی، رُوکھا ہو گیا روئے جمیل

جذبۂ مردانگی نے بڑھ کے تلووں سے ملی　　　جنبشِ مژگاں کی موسیقی، تبسم کی کلی

جلد کی سختی کے اندر لوچ پنہاں ہو گیا　　　ایک سیٹھاپن سا ہونٹوں پر نمایاں ہو گیا

جنتِ ارضی کو دوزخ کا نمونا کر دیا　　　چشمکِ بے باک نے آنکھوں کو سُونا کر دیا

جامِ زریں کی کھنک گم ہو گئی گفتار سے　　　ابر کی سی شوخیاں جاتی رہیں رفتار سے

ہو گیا سنگِ جرز سے شیشہ بھولے پن کا چور　　　مر گیا دیدوں کا پانی، اڑ گیا چہرے کا نور

نازکی، عفت، محبت، آرزو کچھ بھی نہیں

نام تو ہے پھول، لیکن رنگ و بو کچھ بھی نہیں

جوش

بحضرتِ ساقی

تجھے کیا، دورِ گل ہے. یا زمانِ خار ہے ساقی تو خود اپنی جگہ اک دولت بیدار ہے ساقی
حقیقت کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتی دو عالم کی جو کچھ آتی بھی ہے ناقابلِ اظہار ہے ساقی
ترے مستوں کو روز و شب کی آویزش سے کیا مطلب یہاں تو تیرگی بھی مطلعِ انوار ہے ساقی
ترے خدمت گذاروں کو حق و باطل سے کیا نسبت یہاں تو خیر بھی، شر کی رفیقِ کار ہے ساقی
یہاں ہر عقدہ، اک کھلتا ہوا در ہے فراغت کا یہاں ہر قید اک گرتی ہوئی دیوار ہے ساقی
قسم اس جام کی رقصاں ہے جس میں کیف و سرمستی کہ اس مٹھی میں روحِ ثابت و سیار ہے ساقی
عقائد کے ہزاروں عقل پیما کاروانوں کا! فقط اک واہمہ ہی قافلہ سالار ہے ساقی
نہ گھبرا، انتہائی صبر و نرمی سے مدارا کر! کہ عقل انسان کی اک عمر سے بیمار ہے ساقی
بہت عجلت نہ فرما کاروبارِ دل کے اجرا میں کہ یہ دنیا اسیرِ اندک و بسیار ہے ساقی
ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی
مرا ایمان ہے اک لرزہ براندام بے دینی مرا اقرار اک سہما ہوا انکار ہے ساقی

نظر کر جوشؔ پر اپنے کہ اتنی بیخودی پر بھی
یہ رندِ لاابالی کس قدر ہشیار ہے ساقی

جوشؔ

لفظ و معنی

حقیقت نگار شعری از وونڈو کے قلم سے

(از وونڈو آشرم پانڈی چری)

(... برسالہ کلیم کے لیے)

شری [illegible] کے [illegible] مقالے کی [illegible] ... ... شاعری پر کس قدر عمیق نظر ڈالی ہے جو اردو شاعروں کے لیے [illegible] کا کام دے سکتی ہے ۔۔۔ یہ [illegible] صاحب کی خدمت میں [illegible] ... [illegible] کا اصلی مضمون بھی جو انگریزی زبان میں ہے ... فرمائیں تاکہ ترجمے کے سمجھنے اور [illegible] میں آسانی پیدا ہو جائے ۔۔۔ ترجمہ ... [illegible] ... ترجمے کی [illegible] اس سے [illegible] مضمون کی افادی قوت میں اضافہ کر سکے گی۔ (ادارہ کلیم)

ترنم (RHYTHM) شاعرانہ اظہار کا اولین ضروری عنصر [illegible] اسی سے وہ صوتی حرکت منسوب ہے جس کی موجیں [illegible] [illegible] حاصل ہوتی ہیں، اور ایک سُریلی صوتی تصویر ہی وہ چیز ہے جو تخیلی جذباتی [illegible] (VITAL) تاثرات کا مکمل مبسوط باریک اور عمیق نقشہ پیش کر سکتی [illegible] اپنی مخصوص و امتیازی قوت کے ذریعے سے معنی کو ایک ایسے اوج پر [illegible] جہاں دماغی مظاہرات کی گنجائش نہیں۔ [illegible] موجود کی ذہنیت اور عصر [illegible] سامعت کے مقابلے میں متقدمین کو اس ترنم کی حقیقت کا مجموعی طور [illegible] کم از کم زیادہ مستقل احساس تھا، اس کا سبب شاید یہ تھا کہ وہ لوگ اپنے [illegible] گاتے تھے، بیٹھی آوازوں میں پڑھتے، اور تال، سُر کے ساتھ گنگناتے۔ برخلاف اس کے ہم اپنی نظموں کو فقط رواں پڑھنے پر اکتفا کرتے ہیں، ہماری [illegible] شعر کے دماغی اور جذباتی عناصر کو تو آشکارا کرتی ہے، مگر اس کی غنائی [illegible] کو غیر مناسب طور پر پس پشت ڈال دیتی ہے۔ متقدمین کے مقابلے میں [illegible] متاخرین نے طرزِ بیان اور تخیل میں ایک بدرجہا باریک تر، نفیس تر، [illegible] تر اثر آفرینی کی قوت بہم پہنچائی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زورِ کلام، بلند خیالی و ایجاد کی وسعت کے لحاظ سے اُن کی سخن گوئی شاید متقدمین کے مقابلے میں ضعیف زوال واقع ہوئی ہو۔ قدیم زمانوں میں آج کل کی روش کے خلاف ایک [illegible] صحافتی مادہ رکھنے والا نظم گو، بلند پایہ شعراء کی بزم میں بآسانی بار نہیں پا سکتا تھا۔

آج کل ہر اس کلام کو جو قدرے پُرزور انداز میں ترتیب دیا گیا ہو، اور کسی قسم کے مسجع [illegible] ڈھال لیا گیا ہو، اشعار کے زمرے میں داخل کر لیا جاتا ہے، لیکن ہمارے مضمون کا موضوع ہے بہترین و اعلیٰ ترین سخن گوئی کے نقدِ آغاز کی تلاش، اور یہ وہ چیز ہے جو ہم سے اس امر کا تقاضہ کرتی ہو کہ ہم اسلوب و طرزِ بیان کے لحاظ سے شاعری کی مختلف صورتوں کے درمیان امتیاز پیدا کریں۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے سمع و وزن کے مضمون میں کر چکے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ طرزِ کلام میں کس قسم اور کتنی شدت کا زور ہونا چاہیئے کہ اُسے شاعرانہ کردار کے شایانِ شان سمجھا جائے۔ نظموں اور شعروں کی یہ افراط جو چند روزہ یا دائمی شہرت رکھنے والے شعراء کے ناموں سے وابستہ ہے اس قماش کی واقع ہوئی ہے کہ اُسے اکثر و بیشتر ہم شاعری کے حدود میں محصور کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

کیونکہ اس شاعری میں اصولِ نظم اور اصولِ نثر کے درمیان کافی مسافت نہیں پائی جاتی ہے۔ یہ شاعری اس امر سے غافل دکھائی دیتی ہے کہ جہاں نثری اسلوب کے اندر سخن فہم اور ادراک کے روبرو کسی شے یا حقیقت یا احساس یا تخیل کی تجدید وارتسام خاص طور سے مقصود ہے، اور سلاست، زورِ کلام، فصاحت یا دوسری کوئی خوبی محض ضمنی حیثیت رکھتی ہے۔ وہاں شاعرانہ اسلوب کا اوّل مقصد یہ ہوتا ہے کہ موضوعِ اظہار کو تخیل بنیا، حُسنِ معنوی اور احساس وبصیرتِ روحانی کے آگے زندۂ جاوید صورت میں پیش کیا جاوے، جہاں فقط زورِ کلام میں کوتاہی واقع ہوتی ہے وہاں دونوں کی تفریق وتمیز بہ آسانی کی جا سکتی ہے اور ہم فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ محض الفاظ کا اُتار چڑھاؤ ہے۔ شعر نہیں ہے، لیکن جہاں قدرے زورِ کلام کے ساتھ ساتھ کچھ تخیلی قوت یا کوئی دوسرا معنوی جوہر موجود ہوتا ہے وہاں قدر وقیمت کا غلط تخمینہ رائج ہوجاتا ہے، اور بہت ممکن ہے کہ ایک کامل ادبی دور اسی نوع کی نظم ونثر کی درمیانی منزل میں مقید رہے یا اس نیم شاعری کی ناجائز تحسین وقدر دانی کے باعث گمراہ ہوجائے۔

مصوری، سنگ تراشی اور معماری کے سے ہم صنف فنون کی مانند شاعری بھی معنوی تصاویر کے ذریعے سے انسان کی رُوح سے اپیل کرتی ہے، فرق صرف اسی قدر ہے کہ اس کی تصویریں ذہنی اور لفظی ہوتی ہیں، اور اس کی مادی شاعرانہ کلام کی اصلی قوت اسی میں ہے کہ وہ کسی شے کا خیال یا احساس بہم پہنچانے کے عوض اُسے دکھا دیتا ہے۔ یہاں نظارے کی وقعت سب سے زیادہ ہے اور تخیل اور احساس اس کے نتیجے یا جزو ہوتے ہیں۔ شاعر پر یہ فرض ہے کہ وہ ہمارے وجود کو خارجی ذہنیت اور حواس سے علیحدہ کرکے رُوح اور داخلی ذہنیت میں مرکوز کردے۔ شاعری کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ جس چیز کو ہم بالعموم حواس اور ادراک کی محدود اور پُرفریب طاقتوں سے دیکھتے ہیں اُسے وہ رُوح کی روشنی اور عمیق تر مشاہدے میں پیش کرے۔ متقدمین کو اس امر کا پورا علم تھا کہ شاعر ایک حقیقت نگر وجود کا نام ہے نہ کہ محض ایک قافیہ پیما بھاٹ، شریلہ گویا یا مصرعوں اور بندوں میں فکر کرنے والے کا جو قافیے ردیف کو ٹٹول ٹٹول کر الفاظ جوڑا کرتا ہے، شاعر سطحی ذہن کی دسترس سے ماورئی دیکھتا ہے اور کلمۂ کاشفہ یا نطقِ عالیہ (REVEALING WORD) کا سُراغ لگایا کرتا ہے، یعنی وہ اس کلمے کو ڈھونڈھ نکالتا ہے جو کفایت آمیز اور اثرانگیز ہونے کے علاوہ تجلی آمیز وتجلی بخش ہوتا ہے۔ نیز ایک الہام آمیز ناگزیر حیثیت رکھتا ہے اور جو ہمیں حقیقت بینی پر مجبور کرسکتا ہے۔ شاعرانہ اسلوبِ بیان کی تمام تر کوشش اسی کلمۂ کاشفہ کی تلاش سے وابستہ ہوتی ہے۔

جدید خیال کی رُو سے شاعر وہ ہے جو تخیل (IMAGINATION) کو متاثر کرتا ہے نہ کہ ذہن ودماغ کو، مگر تخیل کے مختلف اقسام ہوتے ہیں، ایک خارجی تخیل ہے جو حیات اور اشیاء کے بیرونی پہلوؤں کا اثر آفریں مرقع پیش کرتا ہے، دوسرا باطنی تخیل ہے جو حیات اور اشیاء کے چھیڑے ہوئے دماغی اور جذباتی تاثرات کی تصویریں کھینچتا ہے، ایک تخیل شاعرانہ تخیل کے نام سے مخصوص ہے جو ذہنی تصورات (MENTAL FICTIONS) سے کھیلتا ہے اس کے علاوہ ایک جمالی تخیل بھی ہے جو محض حسنِ الفاظ اور تناسب تشابہ کی نشاط آفرینیوں میں جھومتا رہتا ہے۔ اور اُس کے آگے کچھ نہیں دیکھتا، ان میں سے ہر ایک کو شاعری کے اندر گنجائش ہے، مگر تخیل کے یہ مختلف اقسام صرف شاعری کے مسالے فراہم کرتے ہیں اور شاعرانہ اسلوب کے محض ابتدائی اوزار ہوتے ہیں حقیقی شاعرانہ تخیل خارجی یا داخلی اشیاء کے باریک سے باریک انعکاس پر اکتفا نہیں کرتا، یا وہم وخیال کے گوناگوں اور نازک ترین حرکات یا الفاظ وتشبیہات کی دلآویز رنگینیوں پر قانع نہیں ہوتا۔ یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے تعمیری ہوتا ہے اور حقیقی سے حقیقی اشیا کو وجود میں لاتا ہے: کہ واقعاتی یا مصنوعی خبروں کو۔ یہ مختلف المدارج روحانی صداقتوں کا شائق ہوتا ہے گو اُس کے تجربے کا نقطۂ آغاز واقعاتی خبروں پر بھی ہوتا ہے، اور تصوراتی خبروں پر بھی۔ جملہ فنون کے مانند شاعری کا مقصد بھی محض فطرت کی عکسی یا کسی دوسری قسم کی واقعاتی تقلید نہیں ہے، نیز اُس کے فرائض میں فطرت کے چہرے کا آب ورنگ دے کر چمکانا یا اس کے خط وخال میں ایک خاص دلبری پیدا کرنا بھی داخل نہیں ہے حقیقی شاعری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ فطرت کی تعمیر وتفسیر ان صورتوں اور شبیہوں کے ذریعے سے کرے، جنہیں قدرت اپنی آفرینش کے متعدد طبقات کے روبرو پیش کرتی ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ جب شاعری کو بجا طور پر مخاطب کیا جاتا ہے تب وہ اُس وقت اُس راز کا انکشاف خود کر دیتی ہے جو وہ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔

شاعر کا اعلیٰ ترین، اصولی اور اسی لئے حقیقی مقصد وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا، مگر اُس تک پہنچنے کے لئے انسانی ذہن رفتہ رفتہ قدم اُٹھاتا ہے، اس بُرونہ کا اوّل قدم تو منزلِ مقصود سے کوسوں دُور دکھائی دیتا ہے، شروع

مجموعہ میں انسانی ذہن اشیا کے متعلق اپنے سب سے بدیہی اور خارجی خیالات، جذبات اور حسیات کو مصرعوں کی لڑیوں میں پروتا ہے، اور معیارِ کلام اس مقصد کے لئے کافی ہوتے ہوئے بھی کچھ ایسا بلند نہیں ہوتا، اگر کچھ زیادہ کفایت آمیزی اور قوتِ تاثیر سے کام بھی لیا جاتا ہے تو اُس کی نوعیت محض بیاتی، جذباتی یا ذہنی ہی ہوتی ہے، ایک پُرزور حیاتی شاعری کا کارنامہ ہمارے احساسِ زندگی سے اپیل کرتا ہے۔ ایک متاثر جذباتی شاعر کا کلام ہمارے جذبات کو جنبش میں لاتا ہے اور سوز و گداز کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ایک زبردست ذہنی شاعر زندگی اور اُس کے پیچیدہ سلسلے کی نسبت ہمارے راز جو نفس کو تسکین بہم پہنچاتا ہے یا دُنیا و حیات کے نفسیاتی مسائل وغیرہ سے بحث کرتا ہے، یا ہمارے تخیلات کی ایک متاثر و حیرت انگیز طریقے پر تشکیل کرتا ہے، اور اکثر ایسے ڈھنگ پر کہ اُس کی کمال خوش اسلوبی کے باعث ہم اسے ہر موزوں موقع پر پڑھنا یا اُس کا اقتباس کرنا پسند کرتے ہیں، اس میں کلام نہیں کہ ان سب سے ذہن اور نفسِ انسانی کو مسرتیں حاصل ہوتی ہیں اور یقیناً راہِ ارتقا پر اُن سے تامرد کمال لطف اندوز ہونا قطعی جائز ہے، لیکن اگر ہم انھیں پر اکتفا کرلیں تو اُس پہاڑ کی نیچی چوٹیوں تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے جس کی سب سے اونچی چوٹی پر شاعری کی دیوی کا مندر واقع ہے۔

ان سب سے بھی ایک اعلیٰ اور ارفع تر طرزِ بیان ہے، مگر یہ بھی اُس بلند معیار تک نہیں پہنچتا جو ہمارا مطمحِ نظر ہے، صرف ذہنی طاقت، یا حیاتی اور جذباتی جوش و خروش ہی حقیقی شاعری کی امتیازی خصوصیت نہیں ہوا کرتا، بلکہ اُس کے عوض یا یوں کہئے کہ اس کے ماورا، حقیقی شاعری میں ناقابلِ تصور طرزِ بیان (IMAGINATIVE STYLE) کا پورا غلبہ ہوتا ہے، ایسا طرزِ بیان جس میں نامعلوم بجلیاں چمکتی رہتی، اور ایک عظیم، مگر غیر معین روحانی قوتِ نغمہ سرا نظر آتی ہے۔ موخر الذکر ہر دو عناصر کا کچھ نہ کچھ جزو تو ہمیشہ دیکھنے آتا ہے، لیکن ہر اُس کلام میں جو اس انداز پر ترتیب دیا جاتا ہے یکساں شدت نہیں پائی جاتی جو سر CHAUCER کی تصانیف کے اُن حصوں میں جہاں وہ اظہارِ مشاہدات کی عوض پروازِ تخیل میں مشغول نظر آتا ہے اِس شدت کی معتدل مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں اور اسپنسر (SPENSER) میں بمقابلہ چوسر اس شدت کا زور قدرے زیادہ ہے ملٹن کی ابتدائی شاعری میں اس کی بلند و برتر مگر ایک خاص قسم کی مثالیں جا بجا پائی جاتی ہیں اسی طرح کیٹس (KEATS) اور شیلی (SHLLEY) جیسے شاعروں کے کلام میں بھی جو قوتِ حقیقت بینی کے مالک تھے، اس کی مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں۔ دراصل انگریزی شاعری کا عمومی سانچہ یہی ہے۔ مگر اس سے وہ انبادرجہ کی شدت منسوب نہیں کی جا سکتی جسے مکاشفانہ (RIVELATORY) شاعری کا طرۂ امتیاز کہا جاتا ہے۔ اور جس سے منتر کی ہدایت ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک حد تک قوتِ مکاشفہ رکھتی ہے۔ مگر اس کی عمیق ترجلوہ مئی خارجی چیزوں کی استرکاری سے ڈھکی رہتی ہے۔ شاعری کے اندر یہ زیبائش و آرائش کا رجحان اندرونی رُوح کے عمیق تر ارادوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اس اندرونی رُوحِ مستور کا نظارہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کوئی بالغ نظر انسان تشبیہوں کے اثر سے بالا ہوکر اور معجز کلام کو استعاروں کی تار و پود سے چھڑا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتا ہے۔ ہر چند درجۂ دوم کی شاعری سے ایک خاص مسرت ضرور حاصل ہوتی ہے، جو اپنی نوعیت میں غیر روحانی بھی نہیں ہوتی، پھر بھی یہ اُس نقطۂ کمال تک نہیں پہنچتی جہاں انسانی مسرت، خالص رُوحانی یعنی تخلیقی شاعرانہ مکاشفے کی وجد آمیز بے خودی میں تبدیل یا جذب ہو جاتی ہے۔ موخر الذکر کیفیت صرف اس صورت میں پیدا ہوتی ہے، جب ایک زبردست و ناقابلِ تصور پرتوِ الہام دل و دماغ کو سیال و درخشاں بنا کر اور شاعرانہ اسلوبِ بیان کے تمام بے پناہ عناصر کو اپنی گرفت میں لے کر دریائے تخیل میں طوفان برپا کرنے لگتا ہے۔ اس موقع پر شاعری کے دیگر عناصر میں سے ایک دو یا سب کے سب موجود رہ سکتے ہیں۔ مگر پرتوِ الہام کی تابانی سے یہ اس قدر خیرہ و متغیر ہو جاتے ہیں کہ ایک نورانی و دل رُبا لکیر کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

یہ شدت کسی خاص طرزِ بیان سے وابستہ نہیں ہوتی اور نہ اس کا انحصار انتخابِ الفاظ کے کسی خاص ضابطے ہی پر ہوتا ہے۔ یہ شدت کالیداس اور شیکسپیر کے کلام کی طرح ایک مجلّی اور آراستہ تشابیہ اسلوبِ بیان کے انتہائی مدارج پر پائی جا سکتی ہے۔

رَبّانی اِنقلاب

مولانا آزاد سبحانی

رَبّانی انقلاب نمودار ہوچکا، اب اُس کی جگہ آسمانِ تخیل پر نہیں ہے بلکہ زمینِ حقیقت ہے، دیکھو وہ انقلابات کا ایک گراں قدر ابنوہ اور لا تعداد لشکر لئے ہوئے عالم واقعات میں کس طرح ہنگامہ آرائیاں کر رہا ہے، اور بصیرت ہی کی نہیں بصارت کی آنکھیں بھی اس کا تماشا دیکھ رہی ہیں، اس کے چند ذیلی انقلابات نمونے کے طور پر پیش کر دئے جاتے ہیں۔ ان سے دوسرے انقلابات کی طرف بھی ذہن متوجہ ہوسکیں گے یا موقع بہم پہنچا تو ان کے ذکر بھی اسی پیرائے میں ہو جائیں گے۔

(۱) کارخانۂ ہدایت وخدمت کا نظم منقلب ہوچکا۔ ہدایت وخدمت کی مرکزیت شخصیتوں سے جمعیتوں میں اور حکموں سے حکمتوں میں منتقل ہوچکی۔ اب انسانیت کی مرکزی ہدایت وخدمت بڑی بڑی شخصیتیں نہیں کریں گی جمعیتیں کریں گی۔ اور احکام سے نہیں حکمتوں سے برآئیں گی۔

(۲) عظمت ورفعت کا معیار کہن بدلا جاچکا۔ اب بڑی سے بڑی شخصیتیں نقطۂ موہوم اور خیالِ معدوم سے زیادہ نہیں رہجائیں گی۔ انقلابات کے تھپیڑوں اور تغیرات کے طوفانوں میں حبابوں کی طرح ٹوٹتی رہیں گی۔ اور پرکاہ کی طرح اُڑتی پھریں گی عظمت، رفعت کا پائدار محل صرف جمعیتیں ہوں گی، اور حکمتیں۔

(۳) سیادت وقیادت کا دستورِ کہن تقویم پارینہ ہوچکا شخصیتوں اور حکموں کی سیادت وقیادت ناممکن ہوگئی۔ سیادت وقیادت کا تاج جمعیتوں اور حکمتوں کے سروں پر رکھا جاچکا۔ شخصیتیں اور فرمانبرداریتیں صرف اس کام کے لئے رکھ لی گئی ہیں کہ جمعیتوں اور حکمتوں کی کارندگی ونمائندگی بجالاتی رہیں جب تک کہ معزول نہ کر دی جائیں۔

(۴) جمعیتوں اور حکمتوں کے بھی پرانے تار وپود بکھیرے جاچکے ہیں اور نئے تار وپود سے اُن کی نئی بناوٹیں شروع ہوگئیں۔ نفسانی جمعیتیں اور نفسانی حکمتیں اب جھڑتے ہوئے مصالحے کے مانند ہیں۔ ربّانی حکمتوں اور ربّانی جمعیتوں کی نئی اینٹیں تیار ہوچکیں، اور انھیں سے ربّانی نظام کے نئے محل کی تعمیر شروع کر دی گئی۔

(۵) مقاصد ومطالب کی پرانی دُنیا بھی فنا کی بھٹی میں پگھل رہی ہے اور مقاصد ومطالب کی نئی دنیا خمیر پا رہی ہے۔ جن باتوں کے کل صرف خواب دیکھے جاتے تھے آج ان کی تعبیریں مجسم ہیں، اور کل جن چیزوں کی تمنا میں بھی جھجک تھی آج اُن کا شکار کھیلا جا رہا ہے۔

(۶) نبوتیں ختم ہوچکیں، الہامات بند ہوچکے۔ نبوتوں کی جگہ فراستیں ہیں اور الہامات کی جگہ ادراکات جو کام نبوتوں نے کیا وہ فراستیں کریں گی اور جو کچھ الہامات سے ہوسکا وہ ادراکات سے بن پڑے گا، اور یہ حقیر بدل اپنے معظم مبدل سے بھی زیادہ کر دکھائیں گے، یہ اس لئے کہ پودا درخت ہوچکا ہے۔ بچہ جوان بن چکا ہے، گوشہ میدان ہو رہا ہے، انسانیت جو زمین پر رینگتی چلتی تھی ہوائیں فراٹے بھرتی پھرتی ہے، اور ستاروں کو چھو لینے کے لئے بے چین ہے۔

(۷) ربانیت کا اجمال تفصیل میں پھیل رہا ہے، ربانیت اجمال کا لبادہ پھینک کر تفصیل کے جتے میں آراستہ ہو رہی ہے۔ ربانیت اب بھی دوپہر کا سورج بن سکی ہے۔ پو پھر کا آفتاب یقیناً بن چکی اور اپنی صبحی شعاعوں سے ظلمتکدہ انسانیت کو نورانی بنانے میں مصروف

صنعت وحیات

عبدالوالی

صنعتگری کیا ہے؟ انحراف و بغاوت، فطرت سے اور اُن چیزوں سے جوشکوہ کے منجمد ہو کے ہیجان ہوگئی ہیں۔ پہلا صنعتگر اعظم وہ متحاس نے فطرت کی غلامی سے انسان کی گلوخلاصی کی۔ پہلی عظیم بغاوت اور اعلیٰ صنعتگری انسان کی یہ تھی کہ عالم ظاہر کی ہیبت اگران ڈیل ہستیوں کی قوتوں کا منکر ہوا۔ اُن کی بندگی چھوڑی۔ اپنے خداوند بنائے۔ اپنے ذہن میں اُن کی شکل وصورت قایم کرکے بُت تراشے۔ یہ انسانی عالمِ باطن کی جنگ عالمِ ظاہر سے تھی۔ کون نہیں جانتا کہ عالمِ ظاہر کو فاش شکست ہوئی۔ چاند، سورج، پہاڑ، دریا، آگ اور پانی کا رُعب انسان کے دل سے اُٹھا۔ اُن سے جوڈر اور خوف تھا وہ زائل ہوا۔ اُن کا حُسن بھی سیمیائی نمود انسان کی نگاہ میں ہوا۔ دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش شروع ہوئی۔ بتکدوں کے دَر کھُلے۔ کفر اپنی پوری انسانی شان اور کروفر کے ساتھ جلوہ آرا ہوا، وہ بُت بنے جن میں سے

"اعجاز سے زیادہ ہے سحر اُن کے ناز کا
آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیان نہ ہو"

باطن کے جلوے ظہور میں لائے جانے لگے۔ انسانیت کا دَور دَورہ ہوا، وہ حسن جو انسانیت نے ہویدا کیا، وہ حقیقت جو انسان کے باطن سے کھُلی، اس کی کارفرمائی شروع ہوئی۔ خوفناک، تباہ کن، اُبلتے ہوئے دریاؤں کی نہیں، گراں ڈیل، سربلند مہیب پہاڑوں کی نہیں، طوفان خیز، ڈراؤنے سمندروں کی نہیں، اُن میں سے کسی چیز کے نہ حُسن سے مسحور، اور نہ حقیقت سے مفرا اپنے بنائے مندروں، اُن کی آراستگیوں اور مندروں کے مکین، دیوتاؤں اور دیویوں کے حُسن سے مسحور اور اُن کے حقائق سے مسخر ہونا شروع ہوا۔ ہر چیز پڑی ہنس رہی ہے کہ ہر چیز میں گویا انسانی دل اور انسانی جان ہے، وہ غیریت، اجنبیت اور بے تعلقی جو کوہ، دشت و دریا اور انسان کے درمیان تھی وہ جاتی رہی۔ ان اپنی بنائی چیزوں سے رابطہ و اتحاد قایم ہوا۔ یہ "ہم مناز" کی ہوئی چیزیں ہوئیں، خصوصیاتِ انسانی اُن میں پیدا ہوگئے۔ صنعتگری حقیقت میں فطری اشیا میں خصائص انسانیت پیدا کرنا ہے۔ آسمان اور زمین کی جتنی چیزیں ہیں اُن کو تسخیر کرکے انسانی بنالینا صنعتگری بشرگری ہے۔ چیز میں بشر کا سا دل، اور بشر کی سی جان پیدا کر دینا ہے، تاکہ انسان کا دل اُس چیز سے مل سکے، اُس چیز سے موانست پیدا ہو جائے۔

ہاں تو صنعتگر منحرف اور باغی ہے، کس سے منحرف ہے اور کس سے بغاوت کرتا ہے؟ بجائی جو جان داری کی شکل میں نمودار ہو، بڑھاپا جوانی دکھایا جائے، موت حیات کی شکل میں لائی جائے۔ یہ چیز غیر حقیقی اور کریہہ صرف نہیں، بلکہ مضررساں ہے۔ صنعت گر اس سے اسی لئے انحراف و بغاوت کرتا ہے، انسانیت جانداری اور حیاتِ باطن ہے۔ صنعت گر حیاتِ باطن کا پیامبر ہے ؎

ہر روز نو جامم دہد تسکین و آرامم دہد
ہر روز پیغامم دہد ایں عشق چوں پیغمبرم

جو چیز مائل بہ موت ہو اُس کا وہ دشمن قاتل ہے۔

کفر و بت پرستی میں بھی انحطاط شروع ہوا، اس درخت کے بھی پتے سوکھنے لگے۔ اور چھال موٹی و منجمد ہونے لگی۔ پھولنا پھلنا کم ہو، پیغامِ موت آیا۔ جو درخت پھل نہ دے اُس کی جگہ باغ کی زمین نہیں چولھے کا منہ ہے۔ کفر و بُت پرستی سے

روشن باطنی پیدا ہونا بند ہوئی۔ جو کیفیت مستی اور سر در پیدا ہوتا تھا وہ غائب ہو گیا۔ زہد و تقوے، عبادت و پرہیزگاری جو کہ باطنی کے علامات ہیں وہ شروع ہو گئے، وامق باطنی اٹھا، اِن بتوں سے بھی روگردانی کی، اُن کا بھی منکر ہوا، باطنی بے شکل و صورت خدا کو لا کھڑا کیا۔ خدا اور انسان کے درمیان انسانی واسطہ پیغمبر کے ذریعے قائم کیا کہ انسان خدا کی نشانی ہے نہ کہ بُت، اوتاروں اور پیغمبروں کا دَور دورہ ہوا۔ الہامی کتابوں کے ذریعے مذاہب قائم ہوئے، اِن درختوں نے بھی خوب پھل دیے۔ اور حیاتِ انسانی کی نشو و نما میں بہت ممد و معاون رہے۔ زمانہ گزرنے کے بعد مذاہب کے عقائد اور شریعتیں الحاد کی جانب مائل ہوئیں۔ کور باطنی پھر پھیلی۔ سحرِ ابدی صنعت گر پھر چونکا۔ ایمان دِ مذہب کے درخت میں کفر کی قلم باندھی۔ کہ ایک نیا بار آور درخت تیار ہو۔

زنّار را نیابتِ تسبیح میدہم

اے اہلِ شرع مژدہ کہ اسلام تازہ شد

یہ دعوتِ کفر بالاعلان دی گئی، چوری چھپے نہیں۔

مسلماناں مسلماناں نگہ دارید دینِ خود

کہ شمس الدین تبریزی مسلماں بود کافر شد

عالمِ باطن کا پیام بآوازِ دہل دنیا کو پہنچایا گیا۔

مرا آں دلبرِ پنہاں ہمی گوید بہ پنہانی ۔۔۔ بمن دہ جاں بمن دہ جاں رہا کن ایں گرانجانی
یکے لحظہ قلندر شو قلندر را مسخر شو ۔۔۔ سمندر شو سمندر شو در آتش رو بہ آسانی
در آتش رو در آتش رو، در آتش این خوش شو ۔۔۔ کہ آتش با خلیلِ ما کند رسمِ گل افشانی
نمیدانی کہ نمایہ ما بود شاہنشہ گلہا ۔۔۔ نمیدانی کہ کفرِ ما بود مقصودِ ایمانی
خداوندا تو میدانی کہ صحرا از قفس خوشتر ۔۔۔ ولیکن جغد نشکیبد ز گورستان و ویرانی

تصوّف میں بھی ایک زمانہ کے بعد انجمادی کیفیت پیدا ہوئی، خرقہ پوشی اور خانقاہ نشینی بجائے دل میں آگ پیدا کرنے کے ٹھنڈک پیدا کرنے لگی۔ سرد دل صوفی کفر و ایمان کی آگ سے خائف ہو کر شریعت کے سرد و خشک پتھروں کے نیچے جا چھپا، اور اپنے حشر کا ساتھی فقیہہ کو بنایا یا فلسفہ کی گندگی کیچڑ میں غلطاں ہو گیا۔ فقہ اور فلسفہ انسانی آتشِ حیات کو سرد کرنے والی اور بجھانے والی چیزیں ہیں۔ عملِ انجماد یہی شروع کرتی ہیں۔ فقہ و فلسفہ رُوح و ذہن کی دُرشتگی کے نتائج ہیں۔ حیات مقصودِ وجود ہے، حیات موجودات کی تکمیل ہے، عالمِ موجودات نے بے حساب گردشیں کیں۔ جب نورِ حیات ظہور میں آیا۔ حیات میں الکترونی کیفیت ہے نہ کہ پروٹونی۔ فیزکس کے محققین نے ایٹم میں دو جزو پائے ہیں، الکترون اور پروتون۔ الکترون کی کیفیت یہ ہے کہ اپنی گردش میں جگہیں بدلتا ہے کسی قاعدہ کا پابند نہیں۔ کسی قانون کا تابع نہیں۔ رِندی کیفیت رکھتا ہے۔ بچوں کی طرح کودتا، اچھلتا پھرتا ہے۔ جب ذرہ جس سے موجودات بنے ہیں اس کی یہ کیفیت ہے تو دنیا میں قانونِ قدرت کی تلاش بے سود ہے۔ سائنس کی لاٹ کہ قوانینِ قدرت معلوم کرتی ہے اتنی ہی غلط و بیہودہ ہے جیسا کہ مسئلہ تقدیر۔ خدا انسان اور الکترون قانون کے تابع نہیں۔ حیات جتنی کم ہوتی جاتی ہے قانون کی جانب مائل ہوتی ہے، اور اس کا وفور قانون شکنی کی طرف آمادہ کرتا ہے۔ فقہ یا قانون بڑھی یا بیوہ عورت ہے۔ جو دل میں اپنی جوانی اور سہاگ کا زمانہ یاد کر کے خون کے آنسو بہاتی ہے۔ لیکن تازہ جان رکھنے والے جوان مرد و عورت کو زندگی کا مزہ نہیں اٹھانے دیتی۔ طرح طرح کے رخنے ڈالتی ہے۔ اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو کپور اور رنگینا کی کا قصہ اخباروں میں پڑھو۔ رنگینا کی سترہ برس کی جوان لڑکی ہے۔ شادی ہوئی۔ میاں نے چھوڑ دیا۔ ہندو فقہ نکاحی رشتہ باندھ کے توڑنے نہیں دیتی چاہے عورت کی مٹی خراب ہو جائے۔ رنگینا کی اپنے باپ بھائی کے ساتھ عاطفت میں رہنے لگی۔ یکایک ایک رومیو کپور کی شکل میں رنگینا کی جیولیٹ سے عشق کرنے لگا اور ہوائی جہاز پر سے کے چمپت ہو گیا۔ رنگینا کی کا بھائی تلاش میں نکلا اور بمبئی میں پتہ لگا لیا۔ قانون کی مشین چالو کی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ پنجابی رومیو کپور اس وقت جیل میں ہے۔

رنگینا کی اور کپور کا واقعہ ہیرو رانجھے کے قصے سے زیادہ دلچسپ ہے کہ زمین اور پانی پر نہیں ہوا میں ہوا۔ رند جاندار اصرار سے وہ کرتا ہے جسے فقہ و قانون بُرا اور قابلِ سزا سمجھتا ہے۔ اور اس ضد میں کرتا ہے کہ جس مقصد کے لئے فقہ اور قانون بنے تھے۔ وہ مقصد اُن سے پورا نہیں ہوتا، اس وجہ سے بیکار صرف نہیں بلکہ مضر ہیں۔ فقہ اور قانون کے شوقِ خون آشامی کو کون بھول سکتا ہے اور رندانِ بلاکش کے ذوقِ خون افشانی کو کون نہیں جانتا۔ ایک بوڑھا بیوی نے اپنے بوڑھے شوہر کا قصہ یہ بیان کیا کہ جوانی سے لیکر بڑھاپے تک یہاں نہ معلوم کتنے بیاہ کئے لیکن سوا اِن بیاہتا بیوی کے کوئی بھی نہیں۔ کہنے لگیں تو بھی میں نے بھی کہا تو کرتا جا میں کھاتی جاؤں، تو کرتا جا میں کھاتی جاؤں۔ بوڑھی

فقہ بھی رندوں سے یہی کہتی ہے "تم کرتے جاؤ میں سزا دیتی جاؤں" لیکن بازرہ یہ مانتے ہیں نہ وہ۔ جس چیز کے لئے فقہ اور قانون کا سانچہ بنا تھا وہ چیز اس سے بچ کر جب نہیں نکلتی تو وہ سانچہ بیکار ہے۔ اُسے شکست کیا جائے۔ نیا سانچہ بنے۔ مگر کور باطن جماعت پُرانی چیزوں کی بیکاری پر نہیں غور کرتی۔ برخلاف اس کے چیز جتنی پُرانی ہوتی جاتی ہے اسی قدر اُس کی قدر و منزلت بڑھائی جاتی ہے۔ رند چیز کے پرانے پن اور بوسیدگی کی عزت بگاڑتا ہے اُسے نظرت کرتا ہے۔ اس کا مضحکہ کرتا ہے۔ اُس کی رُوح آزاد ہے، وہ فقہ قانون کے تابع ہو کر نہیں رہ سکتا۔

تصوف نے جب چنگاری دنیا چھوڑی انسان کے لئے بیکار رہ گیا، خانقاہ بے جان اور زندگی کے نشانات ہو گئے۔ دور علم شروع ہوا۔ شینوں کا زمانہ آیا۔ حرفت و تجارت کو ترقی ہوئی۔ کارخانہ دار سرمایہ دار ہو۔ سوسائٹی کی ساخت بدلی۔ سرمایہ داروں کی حکومت ہوئی۔ مولوی کی دستار اور درویش کا خرقہ تو بے حقیقت عالم کی نگاہ میں ہو ہی چکا تھا۔ بادشاہوں کے تاج بھی سر سے اُتر گئے۔ بنئے اور مہاجن اپنی بے ڈھنگی شکلیں لئے پیتل پہنے ہوئے۔ بجائے بادشاہ کی حکومت کے بنک کی حکومت ہوئی۔ بابر و بونا پارٹ کی نبرد آزمائیاں گئیں، اُن کی جگہ خام اشیا اور سود خواری کے لئے جنگیں شروع ہوئیں۔ اس دور نے جب استحکام حاصل کیا تو رُوح کشی کی نئی نئی تدبیریں اختیار ہوئیں انسان کو بے انسان بنانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا گیا۔ فقہ نے قصرِ مذہبی میں انسانی روح کو محبوس کیا تھا، دورِ تجارت و مہاجنی کے قانون نے اس سے زیادہ مستحکم اور مضبوط قلعہ میں اُسے قید کیا۔

انقلاب فرانس نے آزادی، اخوت اور مساوات کے لئے معرکے کئے۔ مگر نتیجہ ان معرکوں کا صرف یہ ہوا کہ تاج حکومت بادشاہ کے سر سے اتر کر بنئے کے سر پر چلا گیا۔ اس نام نہاد جمہوری حکومت کی مضبوطی و استحکام کے لئے سخت قوانین درکار تھے۔ قانون ایک نیا ادارہ بنا۔ اس ادارہ کو اس درجہ بلند کیا کہ مذہب اور شاہی تاج کو حکم ہو کہ چوکھٹ چومیں۔ خدا نہیں، انسانیت نہیں، قانون کی پرستش کرو۔ صرف تعریف ثابت ہے واسطے قانون کے، جو انسانی حقوق پر حدِ سماعت عارض کرتا ہے۔ جو اس کی مدد چاہنے والے سے اپنی فیس چاہتا اور بے فیس پوری پوری وصول کئے عدل کے دروازے نہیں کھولتا۔ عدل و انصاف صرف پیسہ خرچ کرنے والے کے لئے، وہی اس سے فیضیاب ہو۔ رند پاک باطن وجدان کو انسانیت کو مقید نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے اس جدید دورِ سرمایہ داری کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، گو کہ صنعتگری کو اس دور نے کافی رشوت اس کی قدر و منزلت بڑھا کے دی۔ آرٹ کا حرف اول بجائے چھوٹے کے بڑا لکھا جانے لگا، جیسے کہ اشبرٹ کا C ماتیل کا B اور گاڈ کا G بڑے حرف سے لکھا جاتا ہے لیکن صنعتگر نے جب غور کیا تو یہ پایا کہ آرٹ کی قدر و منزلت سوتیلی ماں کی قدر و منزلت کی ایسی ہے جب باپ مر گیا ہو کہ قدر و منزلت کے ساتھ گوشۂ عافیت بٹھا دی جاتی ہے، گھر کے معاملات میں اس کا کوئی تعلق اور دخل باقی نہیں رہتا۔ صنعتگری کا تعلق معاملاتِ زندگی سے سرمایہ داری تہذیب نے قطع کرا دیا، اور سجا بنا کے اُسے طاق پر رکھ دیا۔ یہ شاعرانہ خیال ہے ایسے جملے روزمرہ کی گفتگو میں سنائی دیتے ہیں۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ یہی کہ یہ غیر حقیقی خیال ہے۔ سن کے دل خوش کر لو۔ اور بھول جاؤ۔ تمہارے اعمال اور افعال پر اس کا کوئی اثر ہے نہ ہونا چاہئے۔ گویا کہ شاعری زندگی کے درخت کی کٹی ہوئی شاخ ہے۔ درخت سے توڑے ہوئے پھولوں کا گلدستہ ہے۔ سرمایہ دار نے اس کی تر و تازگی و بُو سے ایک لحظہ حظ اُٹھایا اور دوسرے دن پھینک دیا۔ یہ آرٹ کی قدر و منزلت ہے جس پر جدید تہذیب کو فخر ہے "یہ شاعرانہ خیال ہے" کے ایسے جملے اتنے دہرائے گئے کہ خود شاعر یہ سمجھنے لگا ہے کہ اس کی شاعری کو انسان کی عملی زندگی سے تعلق نہیں کہہ کہہ کے اس کو غیر ذمہ دار بنا دیا۔ وہ ایسا ہوا باز ہو گیا کہ عملی زندگی سے اُسے مطلب ہی نہیں رہا۔ الامان والحفیظ، صنعتگری جس کی پہونچ عالمِ باطن تک ہے، جو احساسات، کیفیات اور تحریکاتِ باطن کو معرضِ اظہار میں لاتی ہے اُسے انسانی زندگی سے تعلق نہیں!! دل کو جان سے بے تعلق کر دیا!! انیسویں صدی کی بنیادی تہذیب کا یہ کارنامہ ہے! اس افتراق سے دل کو الگ تڑپایا اور جان کو الگ پھڑکایا۔ یہ حکم ہے کہ بے روحی زندگی بسر کرو۔ یہ بے رُوحی اور بے دلی زندگی رندِ حقیقت پرست کو کیسے گوارا ہو سکتی ہے۔ امپرومنٹ ٹرسٹ کے حالات دریافت کرنے کے لئے صوبہ متحدہ میں ایک کمیٹی حال میں بنی تھی۔ اس کی سفارشوں میں سے ایک سفارش یہ ہے کہ جن رقبات کو ترقی دی جائے اُن میں مکانات کے متعلق یہ تاکید رہے کہ ایک طرح کے ہوں۔ کمیٹی کا خیال حسن قابلِ داد ہے مشینی یکسانیت مکانوں میں بھی۔ مکان کھڑے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، ایک وردی پہنے ایک قد کے سپاہیوں کی قطار کھڑی ہے۔ یہ مشینی حسن مشینی حسن کہ ہر چیز صاف صاف برابر کی۔ چیونٹیوں کی قطاروں سے تمہیں پھریری نہیں آتی؟

نوج کی قطاریں دیکھکر تمہیں ہیبت نہیں ہوتی ؟ خدا کے لئے بتاؤ یکساں مکانوں کی قطاریں دیکھکر تمہیں فرحت کس طرح ہوگی۔ پھر مکان مکان بنانے والے کی روح کا مظاہرہ ہے۔ کیٹی کا حکم ہے کہ بے روح مکان بناؤ سیدھی قطار جو دغا ر تکرار حسن ہے۔ حسین حسین عورتیں جو منفرد اً حسن صحبت بنا جائیں اُسے منور کردیں۔ اگر اکٹھا ایک جگہ ایک سیدھی قطار میں کھڑی کردی جائیں تو اُن کے حسن میں کشش باقی نہ رہیگی۔ پھر یکساں مکانوں کی قطار تو سونے میں سہاگہ ہے۔ بالکل یہ معلوم ہوگا کہ قید خانہ کے قیدی نمبر گلے میں ڈالے کھڑے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ رُوح کشی طرح طرح سے یہ تہذیب لاتی ہے۔ رہائش کو رُوح سے تعلق نہو۔ لباس اس سے بے نیاز رہے۔ غذا تو بہت جلد محکمہ حفظانِ صحت یکساں کردے گا۔ قانون پاس ہوتے کتنی دیر لگتی ہے روح کے لئے عالمِ ظاہر میں اب کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ باطن ہی میں رہے اور وہیں گھٹ گھٹ کے مرے، یہی مرضی اس جلاد دور کی ہے۔

رندانِ روشن باطن رُوح کی یہ گت دیکھتے اور خاموش رہتے۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ اس حاجتی تہذیب کے خلاف واویلا مچایا۔ جنگِ عظیم نے جہاں قیصر جرمنی کا تاج سر سے اُتارا وہاں روس کی شہنشاہی کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا، اور یورپ کی آنکھیں انسانی زندگی کے متعلق کھولیں۔ اُنیسویں صدی کا فلسفہ پاش پاش کردیا، سرمایہ داری تہذیب کے بدنما دھبے جو قومیت اور شہنشاہیت کی دُخانی چادروں سے چھپائے جاتے تھے۔ کھول کے دنیا کی آنکھوں کے سامنے کردئے۔ امریکہ کی مشہور رقاصہ ایسا ڈورا ڈنکن ایک نیا رقصِ روحانی جو جسم کے ذریعہ روح کا نظارہ کرائے جنگِ عظیم سے پیشتر یورپ میں لائی۔ یورپ نے اس کی خوب تعریفیں کیں۔ اس کی بڑی قدر ہوئی۔ مگر وہ بےچاری یہ رقص یورپ کو سکھا نہ سکی۔ اس کی تعلیم کا مدرسہ قائم کرنے کی یورپ میں کوئی سبیل نہ ہوئی، کیونکہ یورپ پر اُس وقت سرمایہ داری چھائی ہوئی تھی۔ سرمایہ داری تہذیب، جیساکہ اوپر کہا جا چکا ہے حقیقی صنعت گری کو طاقِ نسیاں کے نقش و نگار میں صرف صَرف کرتی ہے۔ زندگی بنانے میں اُسے دخل نہیں دینے دیتی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد روسی بالشویکی حکومت کا تار ۱۹۲۱ء میں بدیں الفاظ اُسے ملا "روسی حکومت ہی صرف تمہیں سمجھ سکتی ہے، تم ہمارے یہاں آؤ۔ تمہارے اسکول کو ہم قایم کریں گے" ڈنکن کہتی ہے "مجھے حیرت و استعجاب تھا کہ یہ پیام اس جگہ سے آیا ہے جسے سرمایہ دار یورپ جہنم بتاتا ہے" آگے لکھتی ہے "روس کے سفر میں مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری روح موت کے بعد نئے عالم میں جا رہی ہے۔ یورپی زندگی کے تمام اشکال پیچھے چھوڑے جا رہی ہوں" پھر لکھتی ہے "میرے صنعتی شعور فنی یورپ میں معرضِ اظہار میں نہ آسکے۔ اس مایوسی کے بعد جدید بالشویکی زندگی والی جگہ میں داخل ہونے کے لئے تیار ہوں۔ پُرانی دنیا کی ناسمات نا انصافی و محنت ملی کو دور سے سلام کرتی ہوں جنہوں نے میرا اسکول نہ قائم ہونے دیا" آگے چل کر اپنی نہایت دلچسپ سوانح عمری ان الفاظ میں ختم کرتی ہے "جب جہاز ساحل سے لگا تو میرا دل خوشی کے مارے اُچھل رہا تھا۔ اس نئی بنی ہوئی دنیا میں آگئی۔ نئی اخوت کی دنیا، وہ دنیا جس کا خواب گوتم بدھ نے دیکھا اور اس کی آواز بازگشت حضرت مسیح کے الفاظ میں ہوئی۔ اور اب لینن ایک سحرِ عظیم سے اسے وجود میں لے آیا۔ میں اُسی خوابی وجود میں داخل ہو رہی ہوں۔ میرا کام اور میری آئندہ زندگی اس کی شاندار امیدوں کا جز بنیں گے، اے دنیائے کہن تو جا، اور اے نئی دنیا تو نت نت آ"!!

غرض یہ ہے کہ نئی دنیا آرہی ہے، اور نئی تہذیب بن رہی ہے۔

گل آمد در چمن مے در خم و پیمانہ می بینم
ہجومِ مے پرستاں بر درِ میخانہ می بینم

دل چاہتا ہے اتنا جیوں کہ اس حاجتی تہذیب کا ایک ایک نشان مٹتے دیکھلوں۔ یہ ملعون تہذیب جس میں ہر چیز کے دام و قیمت غلط لگی ہے یہ نامراد تہذیب جس میں روح حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹائی جا رہی ہے۔ یہ مردود تہذیب جس میں جان کی غرض سے روپیہ اکٹھا کرنا ہے۔ یونیورسٹیوں میں جاؤ تو بے جان لاشیں طلباء کی دیکھو۔ عدالتوں میں قدم رکھو تو بے روحی کے تماشے دیکھو حدِ سماعت عارض ہے دعوے خارج۔ کورٹ فیس کم ہے، دعوے واپس۔ اسٹامپ کم لگا دستاویز ضبط، جرمانہ۔ کونسلوں میں گذر ہو تو جھوٹی فرقہ پرستی، بے دماغی کی بحثیں۔ قوم سازی کے بجائے صرف قانون سازی۔ عالمِ انسانیت کو شکنجوں میں کسنا۔

ایک بات اور رہتی ہے۔ صنعت میں طبیعت، آرٹسٹک مذاق کے متعلق غالب کے تین شعر پیش کرتا ہوں۔

پہلا شعر
دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بشمارِ دلبری
در رگِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

دوسرا شعر
بامن میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

تیسرا

حُسن فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسد
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

صنعتگری اور صنعت بینی کے متعلق بہت کچھ ان تین شعروں میں کہہ دیا ہے دل عالمِ باطن کا نام ہے۔ وہ احساسات وہ کیفیات اور وہ تحریکات جو باطن میں پیدا ہوتی ہیں اُن کا مجموعی نام دل ہے، اور وہ صُور و اشکال جو ذہن میں نمودار ہوتی رہتی ہیں، اُن کا نام دیدہ ہے۔ صورت و شکل دیکھنے کی چیز ہے۔ اور جب وہ باطنی ہے تو اُس کے دیکھنے والی قوت بھی باطنی ہوگی۔ نظرِ باطنی کو دیدہ وری کہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دیدہ و دل باطنی صورتیں، کیفیات۔ احساسات و تحریکات ہیں: "پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی" یعنی پہلے باطنی تحریکات شروع ہوں، احساس باطنی پیدا ہو اور کیفیات باطنی طاری ہوں۔ تب شمعِ سخن کے فروغ پر حسن پیدا ہوتا ہے۔ ڈنکن رقاصہ کہتی ہے کہ اسٹیج پر جانے سے پیشتر میں اپنی سمت سے موڑ کو اگنائٹ کرلیتی تھی۔ جب یہ چالو ہوجاتا تھا تو میرے جسم کے حرکات اس کے تابع ہوجاتے تھے۔ بغیر میرے قصد کے چلتے تھے۔ پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی۔ پہلے دل جس کا دوسرا نام روح ہے۔ اُس میں آگ دے لو تو انسانیت چالو ہوجائے گی، صنعتیں پیدا ہونے لگیں گی۔ غالب کے وقت میں موٹر ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اس لئے مصدر گداختن سے کام لیا۔ اور اپنا مطلب ظاہر کیا۔ اب جبکہ موٹر دنیا میں آگیا تو اگنائٹ کا لفظ استعمال کیا جائے۔ ایک بات ہوئی دل کا ذکر ہوچکا۔ اب دونوں فارسی شعروں میں دیدہ کا ذکر ہے۔ ایک چیز ظاہر بینی ہے اور ایک باطن بینی، ظاہر بینی وہ ہے جو آنکھوں سے عالمِ ظاہر میں دکھائی دے، انگریزی میں وژن اس کے واسطے لفظ ہے، دیدہ وری یہ نہیں ہے کہ آنکھوں سے جو دکھائی دے وہ دیکھے۔ ظاہر بینی دیدہ وری نہیں ہے۔ دیدہ وری باطن بینی ہے، وہ چیزیں دیکھنا جو آنکھ کو نہیں دکھائی دیتیں، ذہنی صورتیں دیکھنا۔ ظاہری صورتیں دیکھکر باطن جو صورتیں پیدا کرتا ہے وہ صورتیں دیکھنا پتھر کی رگوں میں پریوں کا ناچ دیکھنا۔ موجودہ دورِ مصوری آنکھ کی دیکھی چیز بناتی ہے۔ کیونکہ مہاجن و سرمایہ دار چاہے جتنی خوبیاں رکھتا ہو ظاہر بین ہوتا ہے باطن بین نہیں ہوتا۔ وہ مصوروں سے اپنی تصویر بنواتا ہے، جب تصویر ہو بہو اُس کی سی بن جاتی ہے تو اُس کا دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔ تعلقداروں کے گھروں میں جاؤ، کوئی گھر نہ پاؤ گے جس میں تعلقدار زرق برق کپڑے پہنے دیوا

پر ٹنگا ہو، موجودہ دور کا ماحصل اور مآل کار ترقی فوٹو ہے۔ ہو بہو ظاہری شکل ہونا کمال سمجھا گیا ہے۔ نیچر کو آئینہ دکھانا عروجِ فن اس دور میں ہے۔ حقیقتاً یہ صناعی کی مٹی خراب کرنا ہے۔ صنعت کار باطن ہے کار ظاہر نہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ دلبری دل کا لیجانا، بیخود ہوجانا۔ اپنے آپے سے گزرنا یعنی کیفیتِ وجد ہے۔ وجد کے حُسن کے جلوے جب باطن میں دکھنا شروع کرتا ہے تو سنگِ بے جان میں بھی حرکات حسن دکھائی دینے لگتے ہیں۔ غالب کو یہی کہنا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ حقیقتاً یہی ایسے ہی فیشن اور دیدہ وری ہے۔ مگر یہ باطن بینی یہ رقصِ روح اور حُسن کے جلوے کیا خالی تماشہ ہیں؟ کیا صنعتگر تماشہ گر ہے، صنعتگری کیا اربابِ نشاط کا کام ہے کہ توندیلے مہاجن اور حلق تک پیٹ بھرے سرمایہ دار کے تفننِ طبع کے لئے استعمال کی جائے؟ صنعتگری اور صنعت بینی کا کام غالب نے بتایا ہے "ہر کس نہ شد صاحب نظر دینِ بزرگان خوش نہ کرد" یعنی وہی جو اوپر بتایا جاچکا ہے، بغاوت، انحراف و انقلاب۔

ہیاتنے ہومن شاعر بھی یہی کہتا تھا کہ میرے تابوت پر بجائے پھولوں کے ہار کے تلوار رکھنا، کیونکہ میں اُس جنگ کا سپاہی ہوں جو انسانیت کی آزادی کے لئے ہو رہی ہے۔

صنعت گری عالمِ باطن سے یہ پیام لاتی ہے کہ فقہ ہو یا فلسفہ، قانون ہو یا مادی علوم اُن کے پیچھے آدمی اپنی انسانیت برباد کرنے اس دنیا میں نہیں آیا ہے۔ تمہاری فقہوں نے کور باطن متقی و پرہیزگار پیدا کئے، تمہارے قانونوں نے ناانصافی درمیان انسان و انسان اور انسانی حقوق شکنی کی۔ ایک نیا انصاف پیدا کیا جس کا نام قانونی انصاف ہے۔ تمہارے فلسفوں نے قوموں میں جنگیں کرائیں، انھیں سودخواری کا عادی کیا۔ تمہارے مادی علوم نے ذمہ دار انسان کو پہیا چلانے والا غیر ذمہ دار مزدور بنا دیا۔ اہلِ دل اور صاحبِ نظر انسان کے یہ الزامات موجودہ تہذیب کے خلاف ہیں۔ ذرا میں بھی سنوں اس کی تردید میں کیا کہا جاتا ہے۔

نذرِ امام

وفا سرشت نیاقت! محبّ من تسلیم — غلام بادہ پرستاں کا ہو قبول سلام
سُنا ہے تو نے مری مے کشی کے بارے میں — کسی عزیز کے خط میں کیا ہے کچھ ارقام
عزیز من! تمھیں اِن رفعتوں کا علم نہیں — سمندِ وقت کی ساقی کے ہاتھ میں ہے لگام
یہ رازِ بادہ و ساغر ہے آج تک اس کو — سمجھ سکے ہیں نہ سمجھیں گے مسجدوں کے امام
یہاں کا زینۂ اوّل ہے عالمِ ملکوت — بہت بلند ہے آزاد میکشوں کا مقام

یہاں نماز کے لب پر ہے مُہرِ خاموشی — یہاں وضو و طہارت ہیں لرزہ بر اندام
عبائیں چاک گریباں دعائیں سر بسجود — یہاں ہے سبحہ و زُنّار کا فسوں ناکام
اذان گنگ ہے، ناقوس گم، گجر خاموش — یہاں ہیں مستی و رندی کے سکّہ و احکام
یہاں ہر ایک ہے مناظرِ گردشِ انجم — یہاں ہر ایک سمجھتا ہے معنیٔ الہام
ہر ایک رند یہاں صرف بے نیازی ہے — یہاں نہ زیست کو طعنہ نہ موت کو الزام
خیالِ دیر و حرم ننگِ شانِ رندی ہے — یہاں نہیں کوئی ذی ہوش بستۂ اوہام
یہاں اُٹھاتے ہیں راز و نیاز کے پردے — یہاں اُلٹتے ہیں اوراقِ چرخِ نیلی فام
یہاں نہیں ہے غمِ روزگار کی فرصت — کہ گم ہے گردشِ ساغر میں گردشِ ایام
یہاں کے مُرغکِ نوخیز تک بھی واقف ہیں — گیا ہے گھات میں صیاد لے کے دانہ و دام
اس انجمن میں حقیقت پرست ہے ہر فرد — نہ مسجدوں کے گدا ہیں نہ مندروں کے غلام
یہاں نہیں ہے صحافت ذریعۂ تبلیغ — یہاں نگاہ کی جنبش کا نام ہے الہام
[illegible] کسی کو ضرورتِ جبریل — براہِ راست ہیں رندوں کے نامہ و پیغام
[illegible] گشت — میں اپنے پیرِ مغاں کا ہوں بندۂ بے دام

[illegible] ہستیٔ عالم کو پار رہا ہوں میں
ورائے کُرسی و افلاک جا رہا ہوں میں

(احسانِ دانش۔ کاندھلہ)

جو امام مسجد بھی ہیں۔ (احسانِ دانش)

بالِ جبریل پر دو نظریں

عطاء اللہ پالوی

پہلی نظر

علامہ حضرت سیماب اکبرآبادی مدظلہٗ کے بالِ جبریل پر جو اعتراضات رسالہ شاعر (آگرہ) میں شائع ہوئے تھے اُن کا نہایت محققانہ جواب جناب اثر لکھنوی نے اپنی نظرِ متعینہ لیا۔ یو پی صاحب نے سپردِ قلم کیا تھا۔ جو رسالہ کلیم بابتہ جنوری میں شائع ہوا۔ یہ تبصرہ مضمون واد سے مستغنی اور کرحقہٗ کامیاب، کافی اور بس تھا لیکن پھر بھی جو تشنگی استاد کی بہ سبب عدم دستیابی کتب کے رہ گئی تھی اُس کو جناب سید معشوق حسین صاحب اطہر نے پوری کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مجھے معاف فرمائیں جناب اطہر صاحب اگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ وہ کمی اپنی حد تک پوری نہ ہوئی اور اُن کا تاقدانہ مضمون اب بھی محتاجِ نظر ہے۔ اِس لئے اُن کا یہ کہنا کہ "جہاں تک حضرتِ اثر نے دعوتِ شرکت دی تھی میں نے وہیں تک اپنے مضمون کو محدود رکھا"، صحیح نہیں۔ بعض اعتراضات کو نظرانداز کر دیا گیا ہے اور بعض کے جواب پر بھی تشنہ ہیں۔ جن کے متعلق میں عرض کروں گا۔

ہمیں سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی ایسے نکتہ رس، باہوش اور سمجھدار شاعر نے جن کا دورِ حاضرہ کے استادانِ فن میں شمار ہے اور جو کارنامہ زندگی سی ہوش ربا تصنیف کے مصنف اور رسالہ عروض کی سی تالیف کے مولف ہونے کے بعد بھی کیوں اُنھوں نے ایسے مہمل اعتراضات کر کے سر اقبال کے نازک حسنات کو ٹھیس لگانے کا گناہ اپنے سر لیا۔

سے کہ بدنام کند اہلِ خرد را غلط است
بلکہ مے میشود از صحبتِ ناداں بدنام

امید کہ جناب سیماب میری اس ناچیز گزارش پر لمحاتِ فرصت میں غور کریں گے۔

اب قبل اس کے کہ میں "بالِ جبریل" کے اعتراضات اور جناب اثر کے ارشادات کے متعلق کچھ عرض کروں، ہمیں جناب اطہر کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

جناب اطہر صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "سر اقبال اردو کی طرح فارسی کے بھی مستقل شاعر ہیں" یہ تحریر توجیہ طلب ہے۔ الفاظ "اردو کی طرح" اور "فارسی کے بھی" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے خیال میں سر اقبال کی اردو شاعری بہ نسبت فارسی کے زیادہ ہے اور نہیں تو کم از کم برابر تو ضرور ہے۔ لیکن اُن کا یہ خیال صحیح نہیں۔ زبانِ اردو کو سر اقبال کی کم التفاتی کا ہمیشہ سے گلہ رہا اور ہے۔ جس طرح غالب مرحوم فارسی کے شاعرِ بے بدل تھے مگر اردو میں بھی کچھ لکھ لیتے تھے۔ اسی طرح علامہ اقبال بھی فارسی کو اردو پر ترجیح دیتے ہیں اور دراصل وہ فارسی ہی کے شاعرِ بے نظیر ہیں، اُردو میں تو محض گنتی کے اشعار کہتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است

فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت
خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام
درخورد با فطرتِ اندیشہ ام

بانگِ درا اور بالِ جبریل دونوں اُردو مجموعہ میں بہت زیادہ اشعار فارسی کے ہیں اور وہ ایسا کرنے پر مجبور رہیں کیونکہ یا تو اُن مطالب و معانی کو اردو

میں بحسن وخوبی ادا نہیں کرسکتے اور یا اُن کو قالب میں ڈھال کر اس کی شعریت کو برباد کرنا نہیں چاہتے۔ مثلاً بالِ جبریل میں "پیر و مرید" کے مکالمے کو دیکھئے، پیر رُومی کا کُل جواب فارسی میں ہے۔

عنوان۔ یورپ سے ایک خط" دیکھئے جوابِ خط فارسی میں ہے، غالب کی طرح اقبال کے بھی پچاسوں مصرعے ایسے ملیں گے جو ہیں تو اُردو۔ لیکن دیکھنے میں بالکل فارسی ہیں۔ مثلاً

یہی شیخِ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی سرمستی و رعنائی

"جبریل و ابلیس" کے مکالمے میں سوال اُردو میں اور جواب فارسی میں ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سوال۔ جبریل، ہمدمِ دیرینہ، کیسا ہے جہانِ رنگ و بُو
جواب۔ ابلیس، سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزُو

اسی طرح "بالِ جبریل" میں ایک مصرع ہے

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی

اس کے متعلق ایک ایم اے، صاحب نے لکھا تھا کہ "یہ مصرع ایک لفظ کے تغیر سے فارسی کا مصرع کہا جا سکتا ہے، اس لئے اس مصرعے کو ہندوستان سے ایران پارسل کر دیا جائے۔

پس اُن کے متعلق یہ خیال کہ وہ "اُردو کے شاعر ہیں اور فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں" غلط ہے۔ وہ در اصل فارسی کے شاعر ہیں اور اسی وجہ کر اُن کے اُردو کلام میں قریب قریب کل تراکیب فارسی کے ہیں، اور پائے جاتے ہیں۔

دوسری نظر

علامہ سیماب کے اعتراضات کی تردید جو جنابِ آثر نے لکھی ہے اُس میں دوسروں کو بھی شرکت کی اجازت دی ہے۔ اس لئے میں جنابِ آثر کو اپنا بزرگ سمجھ کر اُن کا ہاتھ بٹانے کی سعی کرتا ہوں، اب رہی یہ بات کہ کامیابی یا ناکامی اس کا فیصلہ بقول جنابِ اظہر قارئین پر ہے۔

اعتراض۔

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر
مجھے معلوم کیا؟ وہ راز داں تیرا ہے یا میرا
اقبال

اس شعر پر اعتراض یہ ہے کہ ضمیر "اُسے" لکھ کر اور اسم "شیطان" کا ذکر کسی شعرِ ماقبل میں نہ کرنا ایک غلطی ہے، جو مبتدی بھی نہیں کرسکتا: اس کا جواب جنابِ آثر نے نہایت عمدہ دیا ہے کہ "جب تسلیم کر لیا گیا کہ شعر کے مفہوم سے ضمیر کا اشارہ ظاہر ہوتا ہے تو ضمیر کا منشا پورا ہو گیا" لیکن میں یہ عرض کرتا ہوں کہ استادانِ فن نے ایسا کیا ہے، غالب کی ایک غزل اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

یہ غزل کا پہلا شعر ہے اس میں ضمیر کا اسم کہاں ہے، مگر کیا مطلب صاف نہیں ہے؟ مومن کی ایک غزل اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

آگ اشکِ گرم کو لگی جی کیا ہی جل گیا
آنسو جو اُس نے پونچھے شب اور ہاتھ پھل گیا

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں "اُس" ضمیر کا "اسم" کدھر ہے؟ لیکن کیا مطلب خبط ہے؟

امیر کی ایک غزل اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

اوروں کو اُس نے اِذن دیا دیدِ عام کا
ہم ڈھونڈتے ہیں دُور سے موقع سلام کا

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں "اُس" ضمیر کا اسم کس طرف ہے؟ پھر یہ لوگ تو گویا مبتدی ہیں اور ہوئے۔ اس لئے یہ کہہ دینا کہ "ایسا کرنا بدترین غلطی ہے جو تحریر یا تقریر میں ایک مبتدی بھی نہیں کرسکتا" صریحاً ظلم ہے۔

اعتراض۔

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو
اقبال

اس شعر کے اعتراض میں علاوہ غلط اعتراض کے کہ "کبھی استعمال نہیں ہوا" معترض موصوف نے خود دو غلطیاں کی ہیں، ایک تو سہواً جو "نظم" کو غزل لکھا، دوسری ظرافتاً جو لفظ "استعمال" استعمال کیا، کیونکہ اعتراض لفظ کدو پر ہے

امدکدد کے لئے استعمال ہی لکھنا زیادہ موزوں تھا، بہرکیف کدو اُردو میں بھی استعمال ہوا ہے۔ استاد وزیر فرماتے ہیں۔

سما گئے مرے سینے میں مثلِ دلِ شیشے
تمہارے محتسب ہاتھ کیا کدو آیا

اس لئے اقبال پر یہ اعتراض غلط ہے کہ کدو بھی استعمال نہیں ہوا۔

اعتراض۔

مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کردے اسے اب چاند کی غاروں میں نظربند — اقبال

فکر تو یقینی مذکر ہے، اور جناب اثر نے صحیح فرمایا ہے کہ دونوں جائز ہیں مزید برآں جناب اطہر نے سند بھی پیش کی ہے، مگر اس سند میں غلطی ہے۔ اسیر لکھنوی کا شعر اس طرح ہے۔

قرار آہی گیا غم میں جی سنبھل ہی گیا
گئے وہ دن کہ جو تھا فکر جان جانے کا

پہلے مصرعے میں بجائے "جی" کے "دل" غلط لکھا گیا ہے۔ اب رہا "غار" اس کے متعلق جناب اطہر فرماتے ہیں کہ "غار" کو مؤنث کاتب نے لکھدیا ہے "میں اُن سے یہ پوچھتا ہوں کہ ساری کی ساری کتاب میں کاتب نے غلطی کی تو یہی کہ "غار" کو مؤنث لکھدیا اور اگر فرض کیجے کہ کاتب نے اُس کو غلط لکھدیا ہے تو پھر اطہر صاحب نے اس اعتراض کا جواب کیوں نہیں دیا؟

ضمیر لالۂ مے لال سے ہوا لبریز
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

اس شعر پر بھی تو یہی اعتراض ہے کہ "پرہیز کو خلافِ جمہور مؤنث لکھا ہے" کیا یہ بھی کتابت کی غلطی ہے؟ ہرگز نہیں یہ تاویل سراسر غلط ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ تذکیر و تانیث کے بحث و تمحیص میں پڑ کر تو تو میں میں کرنا تحصیل حاصل ہے جس طرح آج تک شیعہ اور سنی کا مذہبی مسئلہ طے نہ ہوا، اور نہ ہوگا۔ اُسی طرح اُردو میں یہ مذکر و مؤنث کا جھگڑا ابھی نہ طے ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ استادوں کو حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہیں لکھیں اُن پر کسی استاد کا تتبع فرض نہیں۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو بالاتفاق مؤنث ہیں، مگر بعض اُستاد اُس کو نہیں مانتے اور مؤنث لکھتے ہیں اور عوام اُس کو مانتے اور سند میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً قلم جو بالاتفاق مذکر مستعمل ہے مگر ظفر نہیں مانتے وہ کہتے ہیں۔

ظفر جو خوف سے تیرا نہ کانپتا تھا ہاتھ
قلم تری دمِ تحریر چل گئی تھی کیوں

نقاب بالاتفاق مونث ہے۔ مگر امانت نہیں مانتے وہ فرماتے ہیں۔

چہرے سے اپنے دُور جو اُس نے نقاب کی
رنگت سفید شب کو ہوئی ماہتاب کی

بعض الفاظ ایسے ہیں جو مؤنث ہیں مگر بعض ادیب اُس کو نہیں مانتے مثلاً فغاں بالاتفاق مؤنث ہے مگر آسی نہیں مانتے۔ وہ لکھتے ہیں۔

عشقِ گل میں وہی بلبل کا فغاں ہے کہ جو تھا
پرتوِ مے وہی حالِ کتاں ہے کہ جو تھا

افشاں بالاتفاق مؤنث ہے۔ مگر آتش نہیں مانتے۔ فرماتے ہیں۔

حُسن و جمال کو بھی طمع سیم و زر کی ہے
افشاں ہوا ہے یار کے رخسار کو پسند

گریز کو فصحا مؤنث بولتے ہیں۔ مگر رشک اُن لوگوں کا تتبع نہیں کرتے وہ فرماتے ہیں۔

جس سے گریز تھا مجھے اب ہے اُسی کا اشتیاق
کام لیا ہے عشق نے جبر سے اختیار کا

ان سب کو جانے دیجے۔ بہت سے الفاظ ایسے ملیں گے جن کو ایک ہی شاعر ایک جگہ مؤنث لکھتا ہے تو دوسری جگہ مذکر۔ اور دونوں کو صحیح کہنا پڑتا ہے۔ استاد وزیر زنار کو ایک جگہ مؤنث کہتے ہیں تو دوسری جگہ مذکر۔ ملاحظہ ہو۔

مؤنث۔
اُس بتِ بے دیں پہ ہم دیندار بھی مرنے لگے
برہمن زنار پہنا دے کفن کے تار کی

مُذکر۔
کافر ہوا ہوں پی کے مے عشقِ بُت وزیر
زنار مجھ کو چاہیئے موجِ شراب کی

حضرتِ ناسخ بلبل کو ایک جگہ مذکر لکھتے ہیں تو دوسری جگہ مؤنث دیکھئے۔

مُذکر
بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا
رُوح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

مؤنث:۔ گُل ترے دامِ محبت میں ہیں یوں تازہ اسیر
جس طرح دام میں بلبل ہو گرفتار نئی

اسی طرح اقبال عہد حاضرہ کے باکمال شاعر ہیں اور اُستاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اُنھیں حق حاصل ہے کہ دوسروں کا تتبع کئے بغیر جس طرح اور دوسرے استادوں نے کیا یہ بھی اپنا اسکول الگ قائم کریں اور اگر ایسا نہ تھا اور نہیں ہے تو پھر اُن اساتذہ پر کسی نے کیوں نہیں اعتراض کیا؟ یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کو اس کا حق حاصل تھا اور وہ کسی کے اتباع پر مجبور نہیں تھے اور نہ کئے جاسکتے تھے۔ اس میں نہ تو دہلوی کی قید تھی اور نہ لکھنوی کی۔ "قامت" کو انیس مؤنث لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

سروشرمائے قد اس طرح کا قامت ایسی
اسد اللہ کی تصویر تھی صورت ایسی

لیکن دبیر اس کو نہیں مانتے وہ مذکر لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ قامت سرک گیا
ٹوپی گری زمیں پہ منکا ڈھلک گیا

اب بتائیے دونوں لکھنوی ہیں۔ مگر ایک دوسرے کی اتباع نہیں کرتے۔

اعتراض:۔ یوں دادِ سخن مجھکو دیتے ہیں عراق و پارس
یہ کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز — اقبال

اعتراض یہ ہے کہ "عراق و پارس قیدِ بحر و وزن سے خارج ہے۔ اور کسی طرح بھی اس مصرعے میں نظم نہیں کئے جاسکتے"۔

شبہ ہوتا ہے کہ کیا واقعی یہ اعتراضات علامہ سیماب ہی کے ہیں؟ جناب آثم نے تو اس کی تقطیع کرکے اعتراض کے پہلے ٹکڑے کی کہ "قیدِ بحر و وزن سے خارج ہے" تردید کر دی تھی، اور اُن کے بعد جناب آلہی نے بھی بڑی محنت سے لغات کی اسناد پیش کرکے اور فارسی کے چند شعر لکھکر یہ ثابت کر دیا ہے کہ شعر "قیدِ بحر و وزن سے خارج" نہیں ہے اور پارس کی "ر" متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے لیکن اب بھی اعتراض کے اس آخری ٹکڑے کا جواب شافی کہ "کسی طرح بھی اس مصرعے میں نظم نہیں کئے جاسکتے" نہیں ہوا، اور ضرورت ہے کہ اُس سے زیادہ مستند ثبوت پیش کیا جائے۔

جناب سیماب بلاشبہ پارس کی "ر" کو متحرک پڑھکر بہک گئے اور ایسے بہکے کہ لکھدیا "کسی طرح عراق و پارس" اس مصرعے میں نظم ہی نہیں ہوسکتا" حالانکہ حضرت حافظ کا شعر ثبوت میں موجود ہے فرماتے ہیں۔

عراق و پارس گرفتی بشعرِ خود حافظ
بیا کہ نوبتِ بغداد و وقتِ تبریز است

دیکھئے تو کس طرح اس مصرعے میں نظم کئے گئے ہیں۔ کیا آپ مسلم الثبوت فصیح البیان حافظ کے متعلق یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ اُن کا یہ شعر ایسا مبہم اور مہمل ہے کہ باوجود کوشش کے اُسے صحیح بھی نہیں کیا جاسکتا؟

اعتراض۔ روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھکو بھی شرمسار کر — اقبال

اس پر کئی اعتراضات ہیں جن کا جواب جنابِ آثم نے بہت کافی طور پر دے دیا ہے اور اب اُس میں اضافہ کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ لیکن پھر بھی بقول چغتائی صاحب کے ایک "ٹکڑا" لگانے کو جی چاہتا ہے کہ جب سیماب کا اقبال کے اس شعر پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں "عبودیت کا خوفناک تجاوز" ہے۔ تو حضرت جامی کے اس شعر کے متعلق کیا خیال ہے؟ خدا سے کہتے ہیں

ساختی مومن کسے را کردہ کافر کسے
رخنہا انداختی خود فتنہ برپا کردہ

حضرتِ جامی تو اقبال سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ اُنھوں نے تو صرف شرمساری ہی کی رائے دی تھی اور یہ تو "رخنہ انداز" اور "فتنہ برپا" وغیرہ سب کچھ کہہ گئے ہیں خیر اُن کو چھوڑئے، غالب کے اس شعر کے متعلق اُن کا کیا خیال ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اس میں تو غالب عبودیت کے درجہ سے تجاوز کرکے خود معبود بن بیٹھے ہیں۔ کیا جناب سیماب اُن پر بھی اعتراض کرکے اُن کی رُوح کو خوش کریں گے؟ دوسرے اس شعر میں اصلاح دے کر تو غالباً وہ بھی اس گناہ کبیرہ میں حصہ رسدی کے قاعدہ پر برابر کے شریک ہوگئے۔

اعتراض:۔

حریم کبریا سے آشنا کر — دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر
اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر — جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے

اس شعر پر اعتراض یہ ہے کہ "پہلے بیت میں خطاب انسان سے ہے، اور دوسرے میں خدا سے"

جناب اثر مدظلہ نے معترض کی غلط فہمی کو خوب سمجھا اور سمجھایا ہے، اور جناب اطہر نے اپنے مضمون میں سند بھی پیش کی ہے۔ مگر قاآنی کے پہلے شعر سے کبریا کا مفہوم یعنی "خدائے جبار" ہے، اور دوسرے شعر میں "عرش کبریا" کا مفہوم عرشِ الٰہی ہی ظاہر ہوتا ہے، اس لئے قابل اطمینان نہیں، ہاں اگر حضرات اثر اور اطہر اجازت دیں تو میں زیادہ صاف شعر ثبوت میں پیش کرسکتا ہوں جو بلاشبہ پوری طرح جناب اثر کے جواب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ حضرتِ حافظ فرماتے ہیں۔

ترک مادشہ سے کس نمی نگرد
آہ ازیں کبریا و جاہ و جلال

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

وانکہ پیشش بنہد تاجِ تکبر خورشید
کبریا ئیست کہ در حشمتِ درویشاں است

غالباً اس سے زیادہ توضیح و تصریح کی ضرورت نہیں، کیونکہ آخر جناب سیماب بھی تو نکتہ رس استادِ وقت ہی ہیں۔

اعتراض۔　　عشق کی تیغِ جگردار اُڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی　　اقبال

ساقی سے تیغ و نیام کی بے جوڑ گفتگو کے ضمن میں جناب اثر مشعل راہ ہدایت بن چکے ہیں، اور اُن کے بعد جناب اطہر نے تو فارسی میں صائب کا شعر سند میں پیش کرکے یہ ثابت ہی کر دیا کہ کیسی جوڑدار ترکیب ہے۔ لیکن اگر اُردو کا شعر بھی چاہئیے تو حاضر ہے۔ مرزا کاظم فرماتے ہیں۔

غازی نے اِدھر میان سے لی تیغِ جگردار　　چھیڑا جو ذرا ہیچ میں تھا فوج کے رہوار
لشکر کے نمو داروں سے چلنے لگی تلوار　　سرداروں کے سر کٹ کے ہوئے کھیت میں انبار

لاشے تھے لپاں ہاتھ تھے نہ جسم پہ سر تھے
نخلِ قدِ اعدا میں نہ پتّے نہ ثمر تھے

اس کے علاوہ یہ کیا مشکل ہے کہ تیغ کے ساتھ آبدار۔ آتش بار۔ باڑھ دار جوہر دار۔ شرربار۔ جگر افگار، تو لکھا جائے مگر نہ لکھا جائے تو جگردار۔ کیوں بھائی! آخر جگردار نے کیا قصور کیا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ جناب سیماب کے سے اُردو دوست اردو زبان میں الفاظ کے اضافے کی اجازت نہیں دیتے۔

اب رہے یہ اعتراضات کہ "مشکل نہ بن جائے" یا "مجھے میرا" فصحا نہیں بولتے، اور محاورے نہیں ہیں تو اس کے متعلق صرف اتنی گذارش ہے کہ مانا فصحا نہیں بولتے مگر یہاں فصحا سے کون مراد ہیں، صرف فصحائے دہلی اور لکھنؤ، تو اس کے یہ معنی کہاں ہوئے کہ پنجابی اگر کوئی ادیب یا شاعر ہو تو وہ اپنے یہاں کے محاورات استعمال نہ کرے۔ جس طرح فصحائے دہلی اور لکھنؤ نے اپنے اپنے محاورات استعمال کئے ہیں اُسی طرح فصیحانِ پنجاب کو بھی اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے محاورات استعمال کریں۔ وہ کسی طرح اس بات پر مجبور نہیں کئے جاسکتے کہ وہ اپنے یہاں کے محاورے متروک کرکے فصحائے دہلی اور لکھنؤ کی اتباع کو اپنا فرض سمجھیں۔ بقول اسیر۔

کیوں کسی استاد کے دیواں کو دیکھیں وقتِ فکر
حاکمِ مردہ کا دستور العمل پایا تو کیا

علاوہ بریں "مجھے میرا" ایک جملہ تو ہیں "ہاتھ آجائے مجھے" ایک جملہ ہوا، اور "میرا مقام" ایک جملہ ہوا "اے ساقی" ایک جملہ ہوا، ہر ایک جملے بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں جس میں کوئی ثقالت نہیں، اور اگر فرض کیجے کہ "مجھے میرا" ایک ہی جملہ یا لفظ ہو تو کیا ظلم ہے کہ "تیری تو" استعمال ہو اور "مجھے میرا" نہ لکھا جائے۔ شوق فرماتے ہیں۔

آبرو جان مری جائے گی
تیری تو اس میں بھی بن آئے گی

بہرکیف جناب سیماب کی سی ذمہ دار ہستیوں کا ایسے ایسے اعتراضات کرکے اُردو زبان کی ترقی و ترویج میں حارج اور معترض ہونا بعید از دانشمندی ہے۔

اس سلسلے میں مجھے کچھ اور کہنا ہے اور وہ یہ کہ بالِ جبریل پر جتنے اعتراضات اب تک شائع ہوئے ہیں اگر اُن کو ایک جگہ ترتیب دیا جائے تو غالباً پوری تصنیف "بالِ جبریل" میں صرف چند ہی شعر نکلیں گے جن پر اعتراض نہ ہو۔ لیکن اب تک جتنے اعتراضات و اصلاح کے سلسلے میں خود معترضین سے ایسی غلطیاں سرزد ہوتی گئی ہیں جو بے حد افسوسناک ہیں۔

غزل مستزاد

بتلا تو ہی کیا وعدہ تھا، مجھ کو جو نہیں ہوش
او وعدہ فراموش

گردن نہ جھکا، دیکھ ادھر، کیوں رہوں خاموش
او وعدہ فراموش

کیا قول تھا، کیا فعل ہے، انصاف ذرا کر
کچھ خوفِ خدا کر

دل چاک، جگر خون ہے، ارمان سیہ پوش
او وعدہ فراموش

خونابۂ دل اشکوں کے ہمراہ بہا ہے
وہ جبر سہا ہے

گُل پوش ہے دامن تو گریبان ہے گُل جوش
او وعدہ فراموش

کیا چال نکالی ہے، تری چال کے قرباں
بسمل ہیں دل و جاں

مدہوش کا ہوتا ہے گماں، گو نہیں مدہوش
او وعدہ فراموش

قابو میں اثرؔ کے دلِ دیوانہ نہیں ہے
مستانہ نہیں ہے

غم اُس کو فراموش نہ وہ غم کو فراموش
او وعدہ فراموش

اثرؔ لکھنوی

قدیم ترین افسانہ

ل۔ احمد، اکبرآبادی

بدبخت ہیں وہ ملک جہاں علم وفن کی پرستش نہ ہوتی ہو۔۔۔ اور وہاں اہتمام ہی نہ ہو۔ قومیں جو اس دھن میں بسر کرتی ہوں۔ یادش بخیر! ہم بھی کبھی علم کے ایسے ہی بھوکے اور فن کے ایسے ہی پیاسے تھے، لیکن آج یہ عالم ہے کہ اقوام مغرب کی وسیع علمی ترقی تک بھی ہم تیرہ بختوں کی رسائی تصور میں نہیں آ سکتی۔

قدیم مصری ادب کا میدان جتنا وسیع اور متنوع تھا، اس کے باوجود یہ گمان ہوتا تھا کہ مصر قدیم نے تخیلی و رومانی ادب میں کوئی ارتقا حاصل کیا ہی نہ تھا، کیونکہ دنیا کے تمام عجائب خانے، جملہ کتب خانے، اور کل مجموعۂ نوادر میں ایسی کوئی شہادت موجود نہ تھی۔

۱۸۵۲ء میں ایک انگریز خاتون مسز ڈوربنی کی جستجو کامراں ہوئی، اور وہ خوش قسمت مشتری ثابت ہوئی جس کے ہاتھ ایک قدیم قرطاس لگ گیا جس نے قدیم مصری ادب کے تخیلی جزو کی شہادت بہم پہونچا دی۔

پیرس کے مجموعۂ نوادر مصریات کے سپرنٹنڈنٹ اور اپنے عہد کے برترین ماہر مصریات، دیکانت، دُروژ ے، کو جب یہ مسودہ دیا گیا تو اس کی قدر و قیمت کا فوراً اندازہ ہو گیا، اور اس نے پیرس کے "آرکیالوجی ریویو" میں اس پر ایک مختصر تبصرہ شائع کرکے علما و مجتہدین فن کو توجہ دلائی، وہ دن یورپ کے شیدائیانِ فن و ہنر کے لئے عید کا دن تھا جس روز یہ مضمون شائع ہوا۔

یوں تو معلوم نہیں کس نامعلوم زمانے سے ذہن و تخیل انسانی مصروف ہے اور اس کی بارآوری بہت سے قصے کہانیوں کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہے، اور اس وقت بھی تھی جب یہ مصری فسانہ لکھا گیا تھا، اور یہ کہانیاں جو اکثر صورتوں میں اپنی اصل کے اعتبار سے ایک مگر شکل میں متغائر، امتدادِ وقت کی گود میں لوٹتی ہوئی کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں محض مقامی تغیرات رنگ و صورت کے ساتھ موجود تھیں۔ لیکن یہ ایک حقیقتِ امری ہے کہ ان کہانیوں کا اوّلین عہدِ آغاز محو ہو چکا ہے۔ یہ کب وضع ہوئیں، ان کا مخترع کون تھا، اور ان میں تغیرات کیونکر رونما ہوئے۔ کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ نسلِ انسانی میں زبانی طریق پر منتقل اور متغیر ہوتی رہتی ہیں۔ ان کہانیوں کو اگر "تخم پران" کا نام دیا جائے تو زیادہ مناسب حال معلوم ہوتا ہے، کہ وہ جہاں تہاں، مختلف آب و ہوا میں پہنچکر مخصوص مقامی چیزیں بن گئیں، اور اپنی اصل نسل کی تحقیق کو ناکام جستجو ہی رکھنا پسند کرتی ہیں، ان اساطیر، کہانیوں، افسانوں کی تدوین معلوم نہیں کتنے زمانے کے بعد ہوئی، اور جن مجلدات کے اندر ان کو قرار ملا، وہ جلدیں خدا جانے ان کے اختراع کے کتنے بعد کی ہیں!

لیکن تمام مسودات قدیم ہیں جو اس وقت دریافت ہوئے ہیں، یہ فسانہ جو اس مسودے میں رقم ہے قدیم ترین نوشتہ باور کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی اصلی و واقعی اور مستند صورت میں ہم تک پہنچا ہے، اور اس افسانے کی صورت ان کہانیوں سے مختلف اور جداگانہ ہے، جن کی قدرت کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس افسانے کی صورت آج بھی وہی ہے جو روز تحریر تھی۔ اور قرطاسِ قدیم جس کا رنگ بھورا پڑ گیا، اور جو کھنچا ہوا ہے، جس پر پُر رمز حرف منقوش ہیں، بتیس صدی پہلے ایک کاتب فرعون انانا (ANNANA) نے تصنیف کیا اور آج برٹش میوزم لندن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس فسانے کی وجہ تصنیف یہ معلوم ہوئی ہے کہ ٹوسم ڈیلفنی میں شہزادے

لیکن میں تجھ سے ایک بات کہتا ہوں، جو تجھے کرنا چاہئیے (تو) اپنے گھر جا، اپنے مویشی کی رکھوالی اور خدمت کر، کیونکہ (اب) میں وہاں نہ جاؤں گا جہاں تو رہتا ہے، بلکہ میں صنوبر کے جنگل میں نکل جاؤں گا، اور جب تو مجھے پھر ڈھونڈھنے آوے تو میرے لئے تو اتنا کرنا، سُن رکھ، (کہ) میں اپنی جان کو اپنے آپ سے الگ کر دوں گا تاکہ میں اسے صنوبر کے سب سے اونچے شگوفے پر رکھدوں، اور وہ صنوبر کا درخت جیسے ہی کاٹا جائے گا تو وہ (شگوفہ) زمین پر آرہے گا، جب تو اُسے ڈھونڈھنے آوے تو سات برس ٹھہر کر ڈھونڈھیو، اور اگر تیری رُوح اس (انتظار کو) سہار سے گی، تو پھر (تو) اُسے (شگوفے کو) ٹھنڈے پانی کے ایک برتن میں ڈال دیجو، تب میں پھر زندہ ہو جاؤں گا اور (تیرے) سب سوالوں کا جواب دوں گا، اور جو کے پانی کی ایک بوتل بھی اپنے ہاتھ میں لے کر اُس پر رال لپیٹ دیجو، مگر جو تو آوے تو اُسے اپنے ہاتھ میں نہ رکھیو۔"

اور (پھر) وہ صنوبر کے پہاڑ پر چلا گیا، اور اُس کا بڑا بھائی سر میں خاک ڈالتا ہوا اپنے گھر کو پلٹ گیا۔ اور جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا، اُس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا، اور کتوں کے سامنے ڈال دیا، اور بھائی کے غم میں رہنے لگا۔ بہت دنوں کے بعد چھوٹا بھائی کوہِ صنوبر پر پہنچا، وہ اکیلا تھا اور درندوں کا شکار کیا کرتا تھا، اور شام کو اس صنوبر کے درخت کے نیچے سو رہتا تھا جس کے سب سے اونچے پھول میں اُس کی جان (رہتی) تھی۔

اس کے بہت دن کے بعد اسی صنوبری پہاڑی پر اُس نے اپنے لئے ایک جھونپڑی بنائی اور جو چیز اُس کو پسند آتی وہ اپنی جھونپڑی میں جمع کرتا رہتا (ایک روز) جب وہ اپنی جھونپڑی سے نکلا (تو) اسے نَو ن دیوتاؤں سے ملاقات ہوئی، جو اس لئے آئے تھے کہ سارے ملک (مصر) کے باشندوں کی ضروریات پوری کریں، اور دیوتاؤں نے آپس میں باتیں کر کے اس سے کہا۔

"اور دیوتاؤں کے بیل باتو۔ تو اس طرح اکیلا کیوں ہے؟ اپنے بڑے بھائی کی بیوی کے سبب سے تو نے اپنا گاؤں کیوں چھوڑ دیا ہے؟ (تجھے) خبر ہے، اُس کی بیوی تو ماری گئی؟ بھائی کے پاس گھر چلا جا، وہ تجھے سب حال بتائے گا؟"

اور ان (دیوتاؤں) کا دل میں اُس کی طرف سے، رحم آگیا تھا، اور سُورج کے دیوتا ہرماخیس نے کنوم سے کہا کہ باتو کے لئے ایک بیوی بناؤ کہ وہ اکیلا نہ رہے، اور کنوم نے اُس کے لئے ایک بیوی بنا دی جو وہاں (جنگل میں) بیٹھی ہوئی سارے ملک کی عورتوں سے خوبصورت تھی، اس میں تمام الوہیت (سی معلوم) ہوتی

تھی، اور وہ ساتوں ہاتھور اس کے دیکھنے کو بڑھے، اور انھوں نے ایک آواز ہو کر کہا۔ "اس کی موت ناگہانی ہوگی!"

اور وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا، اور جب وہ دن بھر جنگلی جانوروں کو شکار کر کے اس کے قدموں میں لا ڈالتا، وہ اس کے گھر میں بیٹھی رہتی، اور وہ اس سے کہنے لگا۔

"گھر سے باہر مت نکلیو، اگر تجھے سمندر اٹھا لے گیا (تو) اس کے قبضے سے تجھے نہ چھڑا سکوں گا۔------ کیونکہ میری جان صنوبر کے سب سے اونچے شگوفے میں ہے، اگر کوئی ڈھونڈھ لیگا تو مجھے اس کے ساتھ جنگ کرنا پڑیگی۔"

اور اُس نے اپنا سب بھید اسے بتا دیا (اس کے) بہت دن کے بعد باتو روزمرہ کے معمول کے مطابق شکار کو گیا ہوا تھا کہ اس کی انکھڑ بیوی بھی اس صنوبر کے درخت کے نیچے ٹہلنے کو باہر نکلی جو اس کے گھر کے برابر (ہی) کھڑا تھا۔ سمندر نے اُس کو دیکھ لیا اور اُس کے پیچھے لپکا، لیکن وہ جھپٹ کر گھر کے اندر ہو رہی، مگر سمندر نے صنوبر سے پکار کر کہا۔

"اوہ، مجھے اس سے کس قدر محبت ہے!"

اس پر صنوبر نے اس کے بالوں کا ایک گچھا سمندر کو دے دیا، اور سمندر اُس کو مصر لے پہنچا، اور وہاں رکھ دیا، جہاں فرعون کے دھوبی (اُس کے کپڑے) دھوتے تھے، اور ان بالوں کی خوشبو فرعون کے کپڑوں میں بس گئی، اور پھر فرعون کے دھوبیوں میں جھگڑا ہونے لگا (وہ آپس میں) کہنے لگے۔

"فرعون کے کپڑوں میں کس تیل کی خوشبو ہے؟"

اور ان (دھوبیوں) میں روزانہ خوشبو کے متعلق حجت رہتی، اور وہ اپنے فعل کو سمجھتے نہ تھے۔ لیکن سردار دھوبی سمندر کے پاس گیا، کیونکہ وہ اس معاملے میں روز کی لڑائی جھگڑے سے بہت پریشان (ہو گیا) تھا۔ اور وہ کنارے پر وہاں کھڑا ہو گیا جس کے مقابل، پانی کے اندر، وہ (بالوں کا) گچھا پڑا (رہتا) تھا۔ پھر وہ جھکا اور اُس گچھے کو اُٹھا لیا جس میں ایک عجیب قسم کی خوشبو تھی۔ پھر وہ اُسے فرعون کے پاس لے گیا۔ اور فرعون کے (دربار کے) تجربہ کار مذہبی پیشوا بلائے گئے اور انھوں نے فرعون سے کہا۔

"یہ بال سورج کے دیوتا کی بیٹی کے ہیں، اور اس کے اندر تمام الوہیت ہے، سارا ملک تیرے قبضے میں ہے۔ ہر طرف اپنے سفیر بھیج کہ اُس کو ڈھونڈھ لائیں،

لیکن جو سفیر کوہ صنوبر کو جائے اُس کے ساتھ میرے آدمی بھی جائیں کہ وہ اُسے یہاں لاسکیں"

اور بادشاہ نے کہا۔

"تم نے جو کچھ کہا (وہ تو) بہت (ہی) عمدہ بات ہے"

اور لوگ بھیج دئے گئے۔ بہت دن (گزرجانے) کے بعد وہ لوگ پلٹے، جو (مختلف) مقامات کو بادشاہ کے لئے (اس معطر گیسوؤں والی کو) لینے گئے تھے۔ لیکن وہ لوگ نہیں پلٹے جو کوہ صنوبر کو گئے تھے، کیونکہ باتو نے اُن کو قتل کر دیا تھا، اور صرف ایک آدمی کو زندہ چھوڑ دیا کہ بادشاہ کو خبر کر دے۔

پھر بادشاہ نے بہت سی فوج، سوار اور پیدل، روانہ کی کہ جاکر اُس کو لائیں، اور اُن میں ایک عورت بھی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں قسم قسم کے زنانہ زیور دے گئے۔ تب دکھیں، اُس کے ساتھ وہ عورت (باتو کی بیوی) مصر میں آئی اور اس کے سبب سے سارے ملک میں خوشی اور جشن کیا گیا۔ اور بادشاہ اس سے بہت محبت کرتا تھا، اور اُس کی حیرت آفریں خوبصورتی کے مطابق اُس نے (بادشاہ نے) اُس کی خاطر و دلداری کی۔ اور اُنھوں نے (لوگوں نے) اس سے کہا کہ اپنے شوہر کا حال بتا دے۔ تب اُس نے بادشاہ سے کہا۔

"صنوبر کے درخت کٹوا دو تو وہ فنا ہو جائے (گا)"

پھر مسلح آدمی روانہ کئے گئے جو صنوبر کو کاٹ ڈالنے کے لئے کلہاڑیاں لیگئے۔ اور وہ اُس صنوبر کے پاس آئے اور اُنھوں نے اُس شگوفے کو کاٹ ڈالا جس کے اندر باتو کی جان تھی۔ پھر وہ (شگوفہ) گر پڑا اور باتو مر گیا۔ جب زمین (پھر) روشن ہوئی اور ایک نیا دن نکلا تو وہ صنوبر کا درخت بھی کاٹ ڈالا گیا، اور انپو، باتو کا بڑا بھائی اپنے گھر میں گیا اور ہاتھ دھونے بیٹھا، اور اُس نے جو کے پانی کا برتن لیا جسے اُس نے رال سے بند کر دیا، اور ایک دوسرے (برتن) کو شراب سے (بھرا) اُسے مٹی سے بند کیا، اور اُس نے اپنی لکڑی اُٹھالی اور اپنے جوتے (پہنے) کپڑے بھی لئے اور سفر کا ناشتہ لیا اور کوہ صنوبر کا راستہ پکڑا، اور وہ اپنے چھوٹے بھائی کی جھونپڑی میں پہنچا۔ اور اُسے چٹائی پر پڑا پایا۔ وہ مر گیا تھا۔ چھوٹے بھائی کو مردے کی طرح پڑا دیکھکر وہ رونے لگا۔ پھر وہ اپنے چھوٹے بھائی کی رُوح کو ڈھونڈھنے صنوبر کے درخت کے نیچے گیا جس کے نیچے اُس کا چھوٹا بھائی شام کو لیٹتا تھا، اور وہ تین سال تک ڈھونڈھتا رہا۔ مگر پتا نہ ملا۔ جب چوتھا سال آیا تو مصر کو واپس ہونے کی

خواہش ہوئی اور اُس نے (اپنے آپسے) کہا "میں کل صبح بہت تڑکے چلا جاؤں گا"

اس میں اس کا (ایک) مطلب تھا۔ جب زمین روشن ہوئی اور ایک نیا دن نکلا، وہ اس صنوبر کے نیچے پہنچا۔ اور دن بھر (بھائی کی) رُوح کو ڈھونڈھتا پھرا، اور جب وہ شام کے وقت گھر کو پلٹنے لگا اور اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے ایک پھل نظر آیا، اور جب وہ اُسے لے کر گھر پہنچا تو اُس کے چھوٹے بھائی کی رُوح وہاں (موجود) تھی۔ تب اُس نے ٹھنڈے پانی کا برتن اُٹھاکر اُس میں اس (پھل) کو ڈال دیا، اور خود بیٹھ گیا، جو اُس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ اب رات ہوتے ہی وہ رُوح پانی چوستی رہی، اور باتو نے اپنے تمام اعضاء کو جنبش دی، اور اپنے بڑے بھائی کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن اُس کا قلب حرکت نہ کر سکتا تھا۔ اور انپو، اس کے بڑے بھائی نے ٹھنڈے پانی کا برتن اُٹھا لیا جس میں اُس کے چھوٹے بھائی کی رُوح تھی (اور وہ پانی) اُسے پلا دیا۔ اور (اُس کی) روح اپنی جگہ پہنچا دی گئی، تب وہ ویسا ہی ہو گیا جیسا کہ پہلے تھا، اُنھوں نے ایک دوسرے کو چھاتی سے لگایا، ایک دوسرے سے باتیں کیں، اور باتو نے اپنے بڑے بھائی سے کہا۔

"دیکھو (اب) میں اپنے تئیں ایک بیل کا چولا بدلتا ہوں جس پر سب مقدس نشانیاں ہوں گی۔ اس کا راز کسی کو معلوم نہ ہوگا، اور تو میرے اوپر سوار ہو جانا (اور لے چلنا)، اور جیسے ہی سورج نکلے گا ہم وہاں پہنچ جائیں گے جہاں میری بیوی ہے، (بتا دیا) تو مجھے وہاں لے چلے گا؛ اس سے تیری سب خواہشیں پوری ہوں گی، جو مناسب ہوں گی۔ اگر تو مجھے فرعون کے سامنے لے جائے گا تو سونے چاندی سے لاد دیا جائے گا، کیونکہ میرا نصیبہ بہت چمکنے والا ہے، ملک کے تمام لوگ خوشی کے نعروں سے میرا خیر مقدم کریں گے۔ لیکن (اب) تم اپنے گاؤں کو چلے جاؤ"

جب پھر روشن ہوئی اور ایک نیا دن نکلا تو باتو نے (بیل کا) چولا بدل لیا، جیسا کہ اُس نے اپنے بھائی سے کہا تھا، اور انپو اُس کا بڑا بھائی، سویرے پو پھٹے اُس کی پیٹھ پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا، اور جب وہ اس مقام کے قریب پہنچے تو لوگوں نے بادشاہ کو خبر کی، اور جب بادشاہ نے اُس کو دیکھا تو بہت خوش ہوا اور اُس کے خیر مقدم میں ایک بہت بڑا جشن کیا، اُس سے بڑا جو بیان میں آسکتا ہے، کیونکہ یہ بہت بڑی خوش نصیبی (کی بات) تھی، اور اُس کی وجہ سے سارے ملک میں خوشی تھی، اس کے بڑے بھائی کے لئے جو اپنے گاؤں میں رہتا تھا، لوگ بہت سا سونا چاندی لائے، اور بہت (دوسری) چیزیں (بھی اُسے) دیں، اور فرعون کو

بہت عزت کرنے لگا۔ سارے ملک کے لوگوں سے زیادہ (اُس کی عزت کرتا تھا)

کچھ دن کے بعد وہ بیل "حرم" میں داخل ہو گیا، وہاں جا کھڑا ہوا جہاں وہ حسینہ (اُس کی بیوی) تھی، اور اُس سے کہنے لگا۔

"اِدھر دیکھ: میں ابھی زندہ ہوں (اور سچ مچ)!"

اس پر وہ بولی۔

"تُو کون ہے؟"

"میں باتو ہوں! اس وقت جب تُو صنوبر کو کٹوا سکتی تھی، تو نے فرعون کو میرا پتہ بتا دیا تھا تاکہ میری زندگی ختم کر دی جائے۔ (مگر) مجھے دیکھ: میں اب بھی سچ مچ زندہ ہوں، البتہ ایک بیل کی صورت میں ہوں۔"

تب اُس کی حسین بیوی نے یہ سن کر کہ اُس کا شوہر (یہی) اس سے بات کر رہا ہے بہت ڈری۔ پھر وہ "حرم" سے نکل گئی۔ اور بادشاہ اُس کے برابر بیٹھ گیا، اور اُس نے دیکھا کہ بادشاہ (ابھی تک) اُس پر مہربان ہے، اور وہ (خود) اُس کی نظروں میں بہت محبوب ہے، تب اُس نے بادشاہ سے کہا۔

"مجھ سے دیوتاؤں کی قسم کھاؤ کہ تم جو میں کہوں گی اُسے پورا کرو گے!"

پھر اُس (بادشاہ) نے وعدہ کیا کہ وہ جو کچھ کہے گی (وہ اُسے) پورا کرے گا، تب وہ کہنے لگی۔

"میرے کھانے کو اس بیل کی کلیجی ہونی چاہیئے، کیونکہ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

جب اُس نے اس (بادشاہ) سے یہ کہا تو وہ اُس کی بات سن کر بہت رنجیدہ ہوا، اور فرعون بہت بڑی مشکل میں پڑ گیا۔

جب دُنیا روشن ہوئی اور ایک نیا دن نکلا اور ایک بڑا جشن ترتیب دیا گیا کہ بیل کے سامنے قربانی چڑھائی جائے تو اُس وقت بادشاہ کا ایک خاص خادم بیل کو مار ڈالنے کے لئے بڑھا۔ اور جب وہ اس کو ذبح کر دینا چاہتا تھا، یہ واقعہ ہوا کہ لوگوں نے اُسے بچانا چاہا، اور جب اُس نے اس (بیل) کی گردن پر ہاتھ مارا تو خون کے دو قطرے اُچٹ کر اُس مقام پر جا پڑے جہاں فرعون کے محل کا پھاٹک تھا اور پھاٹک کے دو کھمبے نصب تھے، ایک قطرے فرعون کے دروازے کے ایک جانب اور دوسرا دوسری جانب (جا) گرا۔ اور وہاں الگ الگ دو خوبصورت درخت نمودار ہو گئے، تب لوگوں نے بادشاہ کے پاس اطلاع پہنچائی کہ خود شاہی محل کے پھاٹک پر دو خوبصورت درخت پیدا ہو گئے ہیں اور اس وجہ سے سارے شہر میں خوشی ہے،

چند دن کے بعد بادشاہ جواہر کا ہار پہنے اور پھولوں کی مالائیں گلے میں ڈالے، اپنے سنہری رتھ میں سوار جب شاہی پھاٹک پر پہنچا تو (اُسنے) اِن دونوں درختوں کو دیکھا، فرعون کی سواری کے پیچھے اُس کی خوبصورت ملکہ بھی اپنی رتھ میں سوار آ رہی تھی۔ بادشاہ ایک درخت کے نیچے ٹھیر گیا، اور اس درخت نے ملکہ سے کہا۔

"آہ، بیوفا عورت: میں باتو ہوں۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ میں نے چولا بدل لیا ہے، تُو نے فرعون کو میرا پتا بتا دیا تھا کہ میں جان سے مار دیا جاؤں۔ میں ہی بیل بھی تھا، اور (بیل کے رُوپ میں بھی) تو ہی میری موت کا سبب تھی۔"

بہت دن گزر گئے، اور (جب وہ) حسین عورت بادشاہ کی نظر میں مقبول تھی اور وہ اُس کو عزیز رکھتا تھا۔ اُس نے بادشاہ سے کہا۔

"دیوتاؤں کی قسم کھا کر مجھ سے کہو کہ جو کچھ میں کہوں گی وہ سب پورا کرو گے!"

اس (بادشاہ) نے پھر اس کی ہر طرح کی خواہش پوری کرنے کا وعدہ کر لیا، تو وہ کہنے لگی۔

"اِن دونوں درختوں کو کٹوا دو تاکہ اِس میں سے خوبصورت میزیں بنائی جائیں۔"

اور اُس کی جو خواہش تھی وہ سب پوری کی گئی۔ بہت دنوں کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ ہوشیار کاریگر آ کر فرعون کی درختوں (کی لکڑی) کو چیر ڈالیں، اور (وہ) حسین ملکہ قریب کھڑی تھی، اور ایک چھپٹی (کاریزہ) اُڑ کر اُس کے منہ میں جا پڑا۔ اور کچھ عرصے کے بعد یہ واقعہ رونما ہوا کہ اُس کے ایک لڑکا پیدا ہوا، اور بادشاہ کو خبر پہنچائی گئی۔

"آپ کے شہزادہ پیدا ہوا ہے۔"

اور وہ (بچہ) باہر لایا گیا، اور اُس کی نگہداشت کے لئے دایہ اور خادمائیں مقرر ہوئیں، اور سارے ملک میں خوشی منائی گئی۔ لوگوں نے اُسے ایک تہوار بنایا اور اُس کا (لڑکے کا) نام رکھا گیا۔ اُس وقت سے بادشاہ اُس سے بہت محبت کرنے لگا۔ اور اُسے "شاہزادۂ حبش" کا لقب دیا۔

بہت عرصے کے بعد بادشاہ نے اُسے ساری سلطنت کا نائب شاہ بنا دیا اور جب نائب کی طرح کام کرتے بہت دن گزر گئے تو بادشاہ مر گیا، فرعون آسمانوں پر پرواز کر گیا۔ اور دوسرے (شاہزادے) نے کہا۔

اب سارے بڑے بڑے سرداروں اور بڑے بڑے درباریوں کو جمع کروا دیں اُن کو پوری تاریخ سُناؤں گا کہ میرے اور ملکہ کے درمیان کیا (واقعہ) گزرا ہے اور اُس کی (فرعون) کی بیوی اُن کے سامنے لائی گئی۔ اور اُس نے (شاہزادے نے) سب کے سامنے اپنے تئیں اِس (عورت) کو پہچنوایا۔ اور اُنھوں نے (درباریوں نے سزا کا) فیصلہ سنادیا، اور (پھر) اُن کے پاس اُس کے بڑے بھائی کو لائے۔ اور اُس نے اُس کو (بڑے بھائی کو) سارے ملک کا نائب سلطنت مقرر کیا۔ اُس نے تیس سال شاہِ مصر کی طرح حکومت کی۔

جب وہ یہ تیس سال تک زندگی گزار چکا (مرگیا)، تو اس کے بھائی نے اُس کے دفن کے دن اس کی جگہ لے لی۔ (سلطنت اختیار کی)

~~~~~~ ~~~*~~~~~~ ~~

اولوالعزم شاعر کا ترانہ

خستہ حالی سے مری جان کے ادنیٰ تجھ کو
ہمنشیں! پائے حقارت سے نہ ٹھکرا مجھ کو

مانا ظاہر میں نہیں کچھ بھی حقیقت میری
پا نہیں سکتا مگر کوئی بھی قیمت میری

سازِ ہستی کے لئے میں ہی ہوں مضراب بنا
دردِ دُنیا کے لئے صورتِ سیماب بنا

میں وہ شاعر ہوں اگر آئے مرے جی میں ذرا
آنِ واحد میں بدل ڈالوں نظامِ دنیا

گرمیٔ شعر سے پانی میں لگا دوں میں آگ
اور پھر نغموں کی بارش سے بجھا دوں میں آگ

میں اگر چاہوں تو پتھر کو بھی گویا کر دوں
ذرے کو مہر کروں، مہر کو تارا کر دوں

ہم سُخن ہوتے ہیں بے نطق و دہاں بھی مجھ سے
باتیں کرلیتا ہے خلاقِ جہاں بھی مجھ سے

راز کی بات بیاں کرتا ہوں ہمدم سُن لے
آج کرتا ہوں عیاں تجھ پہ ارادے اپنے

غیریت صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالوں گا
عنقریب اک نئی دُنیا کی بِنا ڈالوں گا

لاکے ترتیب میں شیرازۂ ہستی پھر سے
میں بساؤں گا یہاں اک نئی بستی پھر سے

دوں گا پیغامِ جوانی دلِ افسردہ کو
زندگی بخشوں گا ملت کے تنِ مُردہ کو

ہند میں لطف و محبت کی بِنا ڈالوں گا
خرمنِ رنجشِ باہم کو جلا ڈالوں گا

تاجور سامری۔ لائل پوری
~~~~~~

کوہستانِ دکن کی عورت

یہ اُبلتی عورتیں، اِس چلچلاتی دھوپ میں　　سنگِ اسود کی چٹانیں، آدمی کے رُوپ میں
واہ کیا کہنا ترا، اے حُسنِ ارضِ آفتاب!　　یہ برشتہ رنگ، یہ تپتے ہوئے سنگیں شباب
ہر سراپا، بُت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل　　اِتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل
چال، جیسے تُند چشمے، تیوریاں، جیسے غزال　　عارضوں میں جامنوں کا رنگ، آنکھیں بے مثال
عورتیں ہیں، یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب　　پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز پتھریلا شباب
یہ جواں چہرے، یہ چہروں میں توانائی کا جوش　　تو کہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش
جسم میں کچھ اِس قدر ٹھوسس، الحفیظ والاماں!　　لیجے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں
مچھلیاں شانوں کی اُبھری سی، بٹی سی کاکلیں　　آہن و فولاد کے پٹھے، سلاخوں کی رگیں
دید کے قابل ہے اِن کافر بتوں کا رنگ روپ　　کھپ چکی ہے جس میں بارش، ڈس چکی ہے جس کو دھوپ
اِن بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی الاماں　　پتھروں کا دُودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں
کنکروں کے فرش پر دُنیا سُلاتی ہے جنھیں　　آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنھیں

کیا خبر کتنے دلوں کی جوشؔ پامالی ہوئی
اِن اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہریالی ہوئی

جوش



کماری اندرا   راشترپتی پنڈت جواہر لال نہرو   سورگیہ کملا نہرو

"کلیم دہلی"

اقوام یورپ کا فریب خوردہ شہنشاہ حبش



عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

چند ڈراموں پر تنقید

مجیب احمد۔ ایم اے

آرٹ یا فنِ لطیف دراصل ہمارے مَن کی موجوں کا بنایا ہوا سمندر ہے اور ہماری فطرت یہ چاہتی ہے کہ اس میدان میں ہر شخص طبع آزمائی کرے۔ کیونکہ آرٹ ان تمام حوصلوں اور خواہشوں، اُمنگوں اور حسرتوں کا نتیجہ ہے جو سبھی کے دلوں میں ہوتی ہیں، اور زندگی میں جیسا کہ ہم چاہتے ہیں پوری نہیں ہوتی ہیں۔ غریب اور امیر، نیک اور بد، عقلمند اور بیوقوف، سب اپنے اپنے طور پُرانی زنجیروں کے توڑنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں پیٹ پالنے کی ضرورت، روزمرّہ کا کام۔ عادتیں اور کمزوریاں اُنھیں جکڑ دیتی ہیں، اور آرٹ بیداری کا وہ خواب ہے جس میں یہ آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ خواب آدمی خود بھی دیکھتا ہے اور اُسے دکھایا بھی جاتا ہے، اور جتنی آسانی اور خوشی سے آدمی کا مذاق اور اس کی طبیعت آرٹ کے پیدا کئے ہوئے خواب کو قبول کرلے اتنا ہی گہرا اُس کا اثر ہوتا ہے۔ یہ خواب ہمیں زندگی کے بندھنوں سے بالکل آزاد تو نہیں کر دیتے۔ مگر اُن کا بوجھ ہلکا کر سکتے ہیں، اُن کی بدولت ہمیں شخصی زندگی کی کال کوٹھری سے اگر بالکل نجات پانے کا موقعہ نہیں ملتا تو دھوپ اور تازی ہوا اور زمین اور آسمان پر نظر ڈالنے کا موقعہ تو مل ہی جاتا ہے۔

ڈراما بھی آزادی حاصل کرنے کے اُنھیں ذریعوں میں سے ایک ذریعہ ہے۔ اُسے ایک رُخ سے دیکھئے تو وہ زندگی کی ایک تصویر ہے، دوسرے رُخ سے نظر ڈالئے تو وہ زندگی کو سمجھانے کی ایک ترکیب یا اُسے بدلنے کی تدبیر ہے۔ لیکن ڈرامے میں زندگی ایک ندی کی طرح چپ چاپ نہیں بہتی، اس میں سمندر کی سی شان ہونا چاہیے جس کی لہریں اُٹھتی ہیں، تڑپتی ہیں، ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور پھر آسمان کی طرف لپکتی ہیں۔ ڈرامے کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں اُٹھان ہو، ہر بات، ہر واقعے کا ایک مرکز کی طرف رجحان ہو اور اس کے اُتار میں بھی ایسا زور ہو کہ ہمارے جذبات میں نئی لہریں پیدا کر سکے۔ ڈراما نام ہے کشمکش کا، خیالات، جذبات اور اغراض کی ٹکر کا۔ اُن کے اُلجھنے اور سُلجھنے کا۔ یہ کشمکش بالکل قدرتی نہیں ہوتی۔ مگر بالکل من گھڑت بھی نہیں ہوتی، جیسے کسی زمانے میں بھی آدمی کی زندگی بالکل قدرتی یا بالکل مصنوعی نہیں ہوتی۔ پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جو زمانے میں بھی آدمی کی زندگی بالکل قدرتی یا بالکل مصنوعی نہیں ہوتی۔ پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جو زمانے کے ساتھ بدلتی نہیں ہیں۔ بعض ایسی ہیں جنھیں مختلف زمانوں میں مذہب، قانون اور تعلیم ایک نرالا رنگ دیدیتے ہیں۔ اور ہمارے من کے اُن دونوں ٹکڑوں کا جوڑ کبھی ٹھیک بیٹھتا ہے کبھی نہیں۔ ڈراما نویس کی نظر میں اس کی قدرت ہونا چاہیئے کہ اِن دونوں کو الگ کر سکے۔ آدمی کے دل کے بھید بتلائے۔ اِن بھیدوں کے سمجھ نہ سکنے یا کسی اور غلطی سے زندگی میں جو گتھیاں پڑ گئی ہوں اُنھیں بھی سلجھائے۔ ڈراما نویس کا ایک فرض یہ دکھانا بھی ہے کہ اس کے زمانے کے موضع زندگی کا رُوپ بھرتے ہیں تو اُن کی کیا شکل ہوتی ہے، یا اگر وہ زندگی کا روپ بھر نہیں سکتے تو اِس سے کیا نقصان ہوتا ہے، آدمی کی سیرت اور سماج کی تعلیم اور قانون کا حال دنیا کی آزمائشوں میں کیسا ہے، اور ڈرامے کی کشمکش کو اسی آزمائش کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہونا چاہیئے۔

آرٹ کے نقطۂ نظر سے اگر اس وقت کی ہندوستانی زندگی کی موٹی موٹی تقسیم کی جائے تو اس کے تین حصے ہو جاتے ہیں۔ ایک تو روحانی حوصلے، دوسرے

سیاسی اور قومی اور تیسرے معاشرتی۔ ہندوستانی ڈرامے پر سرسری جرح کرنے کے لئے کافی ہوگا اگر ہم ایسے ڈراموں کے نمونے چن لیں جن میں ہماری زندگی کے یہ تینوں پہلو نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور نے نئی ڈراموں میں وہ کیفیتیں بیان کی ہیں جو پرماتما سے جدا ہونے کے سبب سے ہر آتما پر گذرتی ہیں، لیکن جس سادگی اور سچائی سے یہ اُن کے ڈرامے "ڈاک خانے" میں پیش کی گئی ہیں اُس کا جواب اور کہیں نہیں ملتا۔ "ڈاک خانے" کا ہیرو ایک لڑکا ہے جسے یہ خیال ہو گیا ہے کہ بادشاہ کے یہاں سے اُس کے نام ایک خط آنے والا ہے۔ وہ ہر وقت اسی انتظار میں اپنی کھڑکی کے پاس کھڑا ڈلکئے کا راستہ دیکھتا رہتا ہے، اور جو لوگ سامنے سے گزرتے ہیں اُنھیں اپنی بھولی بھالی سیدھی کہانی سناتا ہے۔ یہ لڑکا بیمار بھی ہے۔ اور ہمیں رفتہ رفتہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جس خط کا اُسے انتظار ہے وہ اس کی موت کا پیغام ہوگا۔ لیکن موت آتی ہے تو آزادی کا مژدہ سُنانے آتی ہے۔ اس حبس اور تاریکی کو دور کرتی ہے جس میں نادان طبیبوں نے بچے کو قید کر دیا تھا، اور ان تمام پابندیوں کو توڑ دیتی ہے جس میں جاہل خیر خواہوں نے اُسے جکڑ دیا تھا۔ آخر میں جب شاہی طبیب آتا ہے اور تمام دروازے اور کھڑکیاں کھولنے کا حکم دیتا ہے تو ہمیں بھی معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہمارے دل کے دروازے کھُل گئے ہیں، اور مدتوں گھٹ گھٹ کر رہنے کے بعد ہمیں روشنی اور تازہ ہوا نصیب ہوئی ہے۔ ڈرامے کے قصے، اس کے کیرکٹروں، اور اُن کی گفتگو کی سادگی اثر کو دوبالا کر دیتی ہے، اور جب ہم بعد کو سمجھ جاتے ہیں کہ یہ سارا تماشا ایک تمثیل ہے، تو ہماری نظروں میں ڈرامے کی قدر اور بڑھ جاتی ہے، کیونکہ ہم کو اپنی زندگی بھی ایک تمثیل معلوم ہونے لگتی ہے، جن مصیبتوں اور دشواریوں میں ہم پھنسے ہوتے ہیں وہ دھوئیں کی زنجیروں کی طرح آپ ہی آپ اڑ کر غائب ہو جاتی ہیں اور امید ہمیں کھُلی فضا میں سیر کرانے کو لے جاتی ہے۔

لیکن "ڈاک خانے" کی اُنھیں خوبیوں سے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ خالص روحانی مسائل کو جہاں تک ہو سکے ڈرامے سے الگ رکھنا چاہیے۔ یہ خاص حصہ ہیں فلسفے اور شاعری کا۔ ڈرامے کی کشمکش کے لئے زیادہ ٹھوس چیزیں چاہئیں، جن کی آدمی کو اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی کہ فلسفے اور شاعری کے لطیف خیالات کی، اُن سے وہ محروم کر دیا گیا تو اُس کی روح کا وہی حال ہوگا جو ترکی کے مشہور بزرگ ناصر الدین خوجہ کے گدھے کا ہوا تھا۔ سنتے ہیں کہ ناصر الدین خوجہ کے ایک دوست نے اُن سے کہا کہ اگر کوئی شخص چاہے تو گیہوں کے ایک دانے پر گزر کر سکتا ہے، بس عادت ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ان حضرت کی اپنی جان تو بہت پیاری تھی، اس لئے اُنھوں نے سوچا کہ گدھا ٹھیک راہ پر آ جائے تو کافی ہوگا۔ اُنھوں نے اس کا دانا گھٹانا شروع کیا، یہاں تک کہ اُسے دن بھر میں ایک چنا دینے لگے۔ لیکن گدھے کی عادت نہ پڑنا تھی اور نہ پڑی، اور اگرچہ وہ جنت میں ناصر الدین سے پہلے ہی پہونچ گیا، دُنیا کے مصرف کا وہ نہ رہا۔ اسی طرح ہم بھی چاہیں تو جنت میں وقت سے پہلے پہنچ سکتے ہیں، مگر اس سے دنیا کی مشکلیں آسان نہ ہوں گی اور ہمیں وہ تجربہ حاصل نہ ہوگا۔ ہمارے ارادے میں وہ پختگی نہ آئے گی جو دنیا کی آزمائشوں میں پورے اُترنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہماری زندگی پر اور اس لئے ہمارے ڈرامے کی کشمکش پر بھی روحانیت کا سایہ ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن اگر اس کشمکش کو ہم نے بالکل رُوح کی لطیف بیتابیوں کی شکل دے دی تو ڈرامے کی صورت بگڑ جائے گی اور ہمارا اصل مطلب بھی پورا نہ ہوگا۔ "ڈاک خانہ" اپنی جگہ پر ڈراما نویسی کے فن کا کارنامہ ہے۔ پھر بھی اگر ہم اس کی نقل نہ کریں اور رُوحانی مسائل کی بحث کو ایسے مہاتماؤں کے لئے چھوڑ دیں جیسے کہ ڈاکٹر ٹیگور ہیں تو بہتر ہے۔

ہندوستانیوں کی بیداری کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ پچھلے بیس پچیس سال میں بہت سے تاریخی ڈرامے لکھے گئے ہیں اور اب بھی اُن کا سلسلہ جاری ہے۔ ان ڈراموں میں زیادہ تر ایسے ہیں جو کسی خاص سیاسی مقصد سے لکھے گئے ہیں اور ڈرامے کی حیثیت سے اُن پر تنقید کی جائے تو شاید یہ سمجھا جائے گا کہ اُن کے مقصد پر اعتراض کیا گیا ہے۔ اس لئے میں نے ایسا نمونہ لیا ہے جس میں ڈرامے کی خوبیاں پیدا کرنے کے سوا اور کسی بات کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ سید امتیاز علی صاحب تاج کا ڈراما "انارکلی" ہے۔ مصنف نے اس پر جتنی محنت کی ہے اُتنی محنت لوگ علمی کاموں میں کم کیا کرتے ہیں، اور اُن کی محنت ہر اعتبار سے بار آور ہوئی ہے۔ ڈرامے کا قصہ مغل دربار کی ایک مشہور داستان ہے۔ اور اگرچہ مغل دربار میں اُردو نہیں بولی جاتی تھی، "انارکلی" کی زبان میں وہ تمام صفتیں نظر آتی ہیں جو ایک درباری بات میں ہونا چاہئیں۔ آپ بادشاہ کی گفتگو سنئے، یا اس کی راجپوت رانی کی، شہزادہ سلیم یا دربار کی خواصوں کی، سب کی زبان کو اُن کی حیثیت، اُن کے مزاج اور اُس خاص موقعہ سے صحیح اور سچی مناسبت ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغل اپنی مادری زبان بول رہے ہیں۔ یہ خود بھی ایک کمال ہے، کیونکہ تاریخی ڈرامے کی گفتگو میں وہ انداز اور وہ محاورے آ گئے جو ہمارے زمانے کے ہیں، یا ڈرامے کے کیرکٹر

کے لئے موزوں نہیں تو پھر سارا کام کھوٹا ہو جاتا ہے۔ "انارکلی" میں مغلوں کی بود و باش کا بھی بہت صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس میں دربار کے آداب اس طرح برتے گئے ہیں کہ انارکلی اور شہزادہ سلیم کا عشق ہمیشہ شہزادہ اور نوجوان خواص کا عشق معلوم ہوتا ہے معمولی مرد و عورت کی محبت کا قصہ نہیں معلوم ہوتا۔ اسی طرح اکبر کے کارنامے کہیں بیان نہیں کئے گئے ہیں، پھر بھی اس کی ہر ادا سے شہنشاہی ٹپکتی ہے۔ آخر میں اس کا غصہ جس نے انارکلی کو موت کے گھاٹ اتارا۔ صرف اسی اعتبار سے صحیح نہیں ہے کہ اکبر واقعی غصے میں آپے سے باہر ہو جاتا تھا، بلکہ ڈرامے میں اکبر کی جو حیثیت ہے اُسے دیکھتے ہوئے بھی نامناسب نہیں۔ پھر اگر سارے قصے پر غور کیجئے تو اس میں محبت کی کہانی کا پورا رس ملتا ہے اور ڈرامے کی فضا میں اس شراب کی تاثیر ہے جس نے سلیم اور انارکلی دونوں کو مدہوش کر دیا تھا۔

انارکلی میں ڈرامے کا حق ہر طرح سے ادا کیا گیا ہے، اس میں اگر کمی ہے تو بس یہ کہ اکبر کا حق مارا گیا ہے۔ ڈرامے میں دو ایک جگہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اکبر بڑے حوصلے کا بادشاہ ہے، وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کو اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھتا ہے۔ اور سلیم کے چلن سے اُس کو خاص تکلیف اس کے سبب سے ہوتی ہے کہ اپنے جانشین سے اُس کو جو امیدیں تھیں اُنھیں سلیم خاک میں ملا رہا تھا۔ یہی غم آخر میں اُس کے غصے کی آگ کو اور دہکا دیتا ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ڈراما نویس نے اکبر کی سیرت کو مکمل کر کے دکھایا ہے اور اپنے پلاٹ کو چوکس رکھنے کے لئے اکبر کی سیاسی حوصلہ مندی کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے، اور میرا مطلب یہ ہے کہ اکبر کی تاریخی عظمت اُسے گوارا ہی نہیں کر سکتی کہ وہ ایک درباری بادشاہ بنا کر دکھایا جائے۔ چاہے ہم یہی جتانا چاہتے ہوں کہ اکبر کے اعلیٰ حوصلوں کا اس خاندان اور محل کے لوگوں پر کوئی اثر نہیں تھا اور وہ اُسے بیہودگیوں میں پھنسائے رکھتے تھے۔ عشق اور رقابت کی داستانیں ہماری تاریخ کا جوہر نہیں ہیں، ہماری تاریخ کا جوہر اکبر کی سی شخصیتیں ہیں، اور اُنھیں بھی ہم نے حسن و عشق کی نذر کر دیا تو ہم بالکل خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔

اگر ہر بات کا پورا خیال رکھا جائے تو تاریخی ڈرامے میں سیاسیات اور تاریخ کو بہت زیادہ دخل ہو جاتا ہے، جیسے روحانی مسائل کے پیش کرنے سے فلسفہ اور شاعری ڈرامے پر چھا جاتی ہے۔ ڈرامے کو اُس کی حد کے اندر رکھتے ہوئے اس میں اثر اور جان ڈالنے کا سب سے آسان اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے زمانے کے سماجی یا معاشرتی یا عام انسانی مسائل کو ڈرامے کا لباس پہنایا جائے۔ لیکن ان ڈراموں میں بھی اس کا خطرہ رہتا ہے کہ مصنف کسی خاص خیال یا تعلیم کے پرچار کی فکر میں پڑ جائے گا اور ڈراما اسی پرچار کے لئے ایک بہانہ بن کر رہ جائے گا۔ اتنا ہی اندیشہ اس کا بھی ہوتا ہے کہ ڈراما نویس اس دلچسپی کا سہارا لے کر جو سماج کو اپنی زندگی سے ہوتی ہے پُرلطف مگر بے حقیقت خیال آرائیوں میں پڑ جائے گا اور ڈرامے سے تفریح کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

جدید طرز کے معاشرتی ڈراموں کا ایک اچھا شافی نمونہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی تصنیف "پردۂ غفلت" ہے۔ اس میں شریف گھرانوں کے ایک طرف بگڑنے اور دوسری طرف بننے کی کیفیت دکھائی گئی ہے، اور ان تمام مسائل پر بحث کی گئی ہے جو اس وقت ہمارے سماج کے رہبروں کو مصروف رکھتے ہیں یعنی نئی تعلیم کا اثر، عورتوں کی آزادی، زمینداری، سود خواری، لیڈری، بے روزگاری اور پیدائشی حماقت۔ میر الطاف حسین، رسول آباد کے زمیندار، بالکل سٹھیا گئے ہیں۔ لیکن ان میں انتظام کرنے اور آدمی یا موقعے کے پہچاننے کی صلاحیت کبھی نہ تھی۔ میر محمد حسین، اُن کے سالے برسوں سے اُن کے مختار بنے ہوئے ہیں، اور خاندان کی آبرو رکھنے، یعنی ہر چھوٹی بڑی تقریب پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کے لئے خاندانی جائداد کو ایک ساہوکار کے پنجے میں پھنسا رہے ہیں۔ جائداد کو فوراً نیلام ہونے سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ میر الطاف حسین کی بھتیجی سعیدہ کا مقامی مڈل اسکول کے ہیڈ مدرس محمد جواد سے نکاح کر دیا جائے۔ کیونکہ اس قوار میں وہی ایسا احمق ہے جو اس کا ضامن ہو سکتا ہے کہ جو جائداد کا وہ حصہ جو میر الطاف حسین کے بھتیجے اور بھتیجی کا حق ہے ساہوکار کے قبضے میں پہنچ جائے گا۔ میر الطاف حسین کا بھتیجا اور سعیدہ کا بھائی منظور حسین ہمت کر کے اپنی بہن اور اپنی جائداد کو تباہی سے بچا لیتا ہے اور اس کے والد کے اتالیق شیخ کرامت علی فلسفے اور مذہب کی رُو سے اُس کے عمل کو، جس نے خاندان کے دو ٹکڑے کر دئے اور رسم و رواج کی پرانی عمارت کو ٹھکرا کر گرا دیا۔ صحیح اور ضروری ثابت کر دیتے ہیں۔ اُن کی تقریروں میں غور و فکر کی جو گہرائیاں ہیں وہ مصنف کی پیدا کی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اور اگر یہی باتیں ذرا سادہ دیہاتی انداز سے بتائی گئی ہوتیں تو ڈرامے میں اس قدر اونچ نیچ نہ ہوتی لیکن شیخ جی کی بلند پروازیوں کے مقابلے میں محمد جواد بھی اپنی قابلیت کی نمائش کرتا رہتا ہے، اور کہیں وہ ایسے موقع پر ہنسا دیتا ہے کہ شیخ جی کا فلسفہ ہمیں اڑا نہیں

سے جانے پاتا۔

"پردۂ غفلت" کے تمام کیرکٹر اپنی اپنی جگہ پہنے اور پرانے لوگوں کے صحیح اور دلچسپ نمونے ہیں۔ اُس کی زبان میں لطافت بھی ہے اور زور بھی، اور اگرچہ قصے میں دو تین پشتوں کی سرگزشت چند مہینوں کے اندر ختم ہوتے دکھائی گئی ہے اور انجام میں ہیرو اور ہیروئین کے ساتھ ایسی باتیں کی گئی ہیں جو زمانہ بہت کم کرتا ہے۔ اس میں کوئی چیز ایسی خلاف معمول نہیں ہے کہ گھڑی ہوئی معلوم ہو، یہ بات تو چھپی ہوئی نہیں رہتی کہ مصنف نے کیرکٹروں، واقعات اور گفتگو کو جان بوجھ کر ایک خاص رنگ دیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ڈرامے کی لوازمات کا اتنا لحاظ رکھا گیا ہے کہ یہ رنگ ڈرامے میں اچھی طرح کھپ جاتا ہے، اور یہ تو ہو بھی نہیں سکتا کہ ڈراما ارادے یا مقصد سے بالکل خالی ہو، ہاں اتنا ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انسانی فطرت کے بھید بتانے اور جذبات کی کشمکش دکھانے کے مقصد کو اور تمام مقاصد یا ارادوں پر غالب رہنا چاہیئے۔ اس اعتبار سے "پردۂ غفلت" میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے۔ اور اگر کوئی کسر رہ بھی گئی ہے تو مصنف کی سنجیدگی اور ظرافت کی دھوپ چھاؤں میں وہ نظر نہیں آتی۔

دنیا میں جتنے تعلیم کے طریقے ہیں سب اسی لئے ہیں کہ بہتر سے بہتر انسان پیدا کئے جائیں، اور یہ سب اسی قدر کامیاب ہوتے ہیں جہاں تک کہ وہ انسان کی فطرت اور زمانے کی مصلحت کا صحیح اندازہ کرتے ہیں - - - - - - -

. . . . - - - - . . . - - - - - - . . . .

. . . . - - - - . . ڈراما بھی اگرچہ وہ فن لطیف میں شمار ہوتا ہے، اسی طرح انسان کی فطرت اور زمانے کی ضرورت اور مذاق کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن اس کا خاص مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس کے رسم و رواج اور معاشرت سے علیحدہ کرکے دیکھے، اور اس طرح یہ ظاہر کرے کہ زندگی میں کونسی رکاوٹیں ہیں جو انسان کو پورا انسان بننے سے روکتی ہیں، اس وقت تک ہمارے ڈرامے کا معیار رسم و رواج کی پابندیوں سے آزاد نہیں ہوا ہے۔ یعنی اس میں انسان اپنی اصل صورت میں کم دکھائی دیتا ہے، اس کی باتیں معلوم ہوتا ہے کہ دل سے نہیں نکلتی ہیں بلکہ ڈاڑھی مونچھ اور لباس کی طرح خاص کیرکٹر یا تماشے کے لئے موزوں کی گئی ہیں اور اس میں اب تک یہ لازمی سمجھا جاتا ہے کہ میاں بیوی بچھڑنے کے بعد ملیں تو بیوی شوہر کے پیر چومے یا اُس کے قدموں سے لپٹ کر جان دے دے۔ تنقید کا فن بھی، جو آرٹ کے لئے کسوٹی کا کام دیتا ہے، اسی طرح معاشرتی احاطہ بندیوں میں گھرا ہوا ہے۔ انسان کی ہستی ان سب سے بالاتر ہے، ہم اگر اسے دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی نظر بہت اونچی کرنا پڑے گی۔

شعلہ کی طرح اُدھر لپکتا ہوں میں
صورت سے حسین کی تعبیر بنا ہوں میں
نظر میں سب کے کھٹکتا ہوں میں
کانٹے کی طرح مری
ہر غنچۂ گلستاں کا کھٹکا ہوں میں

(رنجور لکھنوی)

تہمت چھوڑا اچھالا سب آزادی کا
ہو جو نہ سبب تو اپنی بربادی کا
تا فلک یہاں زلزلہ برپا ہو جائے
آ جائے کلیجہ منہ کو فریادی کا

(رنجور لکھنوی)

نعرۂ انقلاب

مشرق و مغرب کی دیکھی اے تصور کائنات
اُس طرف پُر نور دن ہے اِس طرف تاریک رات

اِس طرف ہے روزِ روشن میں رواجِ کافری
اُس طرف تاریک شب ہے پردہ دارِ نیات

اِس طرف ہے قاریِ قرآن اِک پیرِ خراب
اُس طرف زہرہ سے ہے روح الامین کا التفات

اِس طرف جعفر بنا ہے مرکبِ روحِ مسیح
اُس طرف محمودیوں نے آلیا ہے سومنات

اِس طرف داؤد ہیں عیسیٰ کے دھوبی گھاٹ پر
اُس طرف ہے گوپیوں میں اک کنھیا کی حیات

اِس طرف لنکا میں سیتا کو صلائے قید و بند
اُس طرف خود رام سے اپنوں نے چاہی ہے نجات

اِس طرف ہے ڈارون میں ملک و ملت کا خیال
اُس طرف ہے ابنِ آدم پیرِ و نفسانیات

اِس طرف ہے رند مشرب ساجدِ بیت الحرام
اُس طرف ریش و بروت اور نشۂ کُل کائنات

اِس طرف یونانیوں کی عقل ہے ہر چیز میں
اُس طرف کُل شاستر ہیں غرقِ گنگ بے ثبات

الغرض مغرب کا ہے ہر ایک ذرہ آفتاب
اور تختِ شاہِ مشرق ہو چکا ہے غرقِ آب

پھر ضرورت ہے صدا گونجے یہاں الہام کی
اے خدا مشرق پہ بارش ہو ترے پیغام کی

وائے ناکامی کہ ذوقِ زندگی باقی نہیں
ابتدا سے ایک سی ہیں صورتیں انجام کی

پھر اگر کوشش ہو، آسکتا ہے دورِ کامیاب
انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

عبید اللہ خاں، قدسی

مسائلِ حیات

جوش ملیح آبادی

سیاست

(۱) تمام اعمال و افعال درحقیقت افراد یا مختلف فرقوں کے رجحانوں اور اور آسانیوں کے زیرِ ہدایت صادر ہوتے ہیں، اور دراصل یہ سب سے بڑی ایمانداری ہوگی۔ اگر اِن اعمال و افعال کو انفرادی و اجتماعی میلانات ہی سے منسوب رکھا جائے، سیاست، اِس متذکرۂ بالا حقیقت کے چھپا دینے سے نہایت ہی پیچیدہ شکل اختیار کرلیتی ہیں۔

جب ہم "انسانیت" پر نگاہ کرتے ہیں تو حبِّ وطن، ایک خود کامانہ سرگرمی سے مشابہ ہونے لگتی ہے، کیا کسی فرد کے حق میں اِس خود کامانہ سرگرمی کے جرم کا مرتکب ہونا جائز ہوسکتا ہے۔

(۲) ہم نے ایک دوسرے کو نوچنے کھسوٹنے کا فتنہ کب سے بپا کیا؟ میرے خیال میں تو یہ فتنہ اُسی لمحے سے برپا ہوا، جب قوی نے کمزور کو آنکھیں دکھا کر یہ آواز دی کہ "دیکھ یہ حصہ میرا ہے اور وہ تیرا"

(۳) حدیثِ امن کی اطمینان بخشی اُسی وقت دوبالا ہو جائے گی جس وقت قومیں ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرکے یہ صدا نہ دیں گی کہ "دیکھو یہ ہے ہمارا شاندار مستقبل"

(۴) عصری سیاست (Modern Politics) ہمارے دامنِ تمدن پر ایک بہت بڑا داغ ہے جس قدر زیادہ ہم اُس پر نگاہ کرتے ہیں اتنا ہی دور دحشت و بربریت کے احترام پر ہمیں مجبور ہونا پڑتا ہے۔

(۵) اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ جب تک دنیا میں جنگ کا وجود ہے انسان ایک خونخوار درندے کے سوا اور کچھ نہیں، تو تمہیں اُس پر معترض ہونے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

حضرتِ انسان کے علاوہ کیا تم دُنیا کے کسی ایسے حیوان کا پتہ دے سکتے ہو جو انسان کی طرح بے رحمی کے ساتھ اپنی ہی جنس کے خون اور گوشت پر زندگی بسر کرتا ہو؟

(۶) سیاسیات میں عقلِ عامہ (Common sense) کی سی کسی شے کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔ یہاں تو حکومت کرنے کی محض ایک تنہا عقل بہیمی پائی جاتی ہے۔ سیاست، کیا اُن حیوانی قوتوں کی بازی گری نہیں ہے جو کہیں ٹھہرنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اور اپنے مقصدِ اصلی کی طرح ہوسِ حکمرانی کو کلیجے سے لگائے رہتی ہیں؟

(۷) انسانی امکانات کی ایک حد و نہایت ہوا کرتی ہے۔ لیکن اربابِ سیاست کی ہولناکیاں قطعی طور پر کوئی انتہا نہیں رکھتیں۔

(۸) حکومت ایک مشین ہے جو صرف اپنے خفیہ مفاد کی مطابقت میں حرکت کیا کرتی ہے۔

اِس مشین کو خدا یا انصاف کے نام پر چیلنج دو، اور پھر دیکھو کہ یہ مشین تمہیں پیش کرکتنے بے شمار ذروں میں تقسیم کردیتی ہے۔

اگر تم سیاست کا بہت قریب سے علم حاصل کرلوگے تو پھر انسان اور خدا دونوں پر تمہیں اعتقاد باقی نہ رہے گا۔

(۸) ہماری سیاسی زندگی کی باگ صرف اُن چند افراد کے ہات میں رہتی ہے، جن کی نا امیدیاں ہی اُن کا اقتدار اور کامرانی ہوا کرتی ہیں۔ کیونکہ دانا، ایمانداری کو پسند کرتے ہیں اور ناکارہ افراد بے ایمانی کے ذریعے سے سیاسی رفعت حاصل کرتے رہتے ہیں۔

اِن ناکاروں کو اُن کے سیاسی اقتدار سے محروم کر دو، اور پھر دیکھو کہ ان میں سے اکثر و بیشتر مقتدر ہستیاں، جو ہماری زندگیوں کو دہشت زدہ رکھتی ہیں حقارت کے بگولوں میں کس طرح رقص کرتی نظر آتی ہیں۔

(۹) کیا یہ بات آئے دن ہمارے مشاہدے اور تجربے میں نہیں آیا کرتی ہے کہ اُن خود کام ریاکاروں کا ایک گروہ جو "آنریبل" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اور ذہانت کے بل پر وہ لوٹنے والی جماعت جسے "گورنمنٹ" کہتے ہیں جس وقت یہ دونوں طاقتیں اپنے باہمی مفاد کی خاطر متحد ہو جاتے ہیں تو انتہائی ایمانداروں کو بھی اہانت کے غاروں میں دھکیل کر دم لیتی ہیں؟

(۱۰) اکثریت کی مکاری ایک قفل ہے جو پبلک کی زبان پر لگا رہتا ہے۔ اور بے ایمانوں کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے ایمان سوز منصوبوں کو پورا کرتے ہیں،

کیا تمہیں علم ہے کہ یہ اکثریتیں کس بنا پر مستقل و محفوظ رہتی ہیں؟

(۱۱) تدیّن اور لیڈری دونوں چیزیں کبھی یکجا نہیں ہوا کرتیں۔

لیڈر کی حیثیت سے ایماندار آدمی ہمیشہ ناکام رہتا ہے اور صرف اس بنا پر ناکام رہتا ہے کہ وہ ایمانداری کا صید زبوں ہے۔

(۱۲) اگر تم پبلک لیڈر بننا چاہتے ہو تو تمہیں کج رفتاری اختیار کرنا پڑے گی۔ پوری قوت کے ساتھ شور مچانا ہوگا، تاکہ لوگ حیرت زدہ ہو جائیں، اُچھل پڑیں۔

(۱۳) ہر فرد قدرتی طور پر توقع رکھے گا کہ لیڈر اپنے گلّے کی محافظت کرے گا، لیکن کیا یہ ہمیشہ گلّہ ہی نہیں ہوا کرتا جو اپنے لیڈر کی حفاظت کرتا رہتا ہے؟

(۱۴) یہ نام نہاد لیڈر تو اپنے مدّاحوں کی جہالت سے تجارت کیا کرتے ہیں، جہاں یہ لیڈروں کی خاص فطرت ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنے ہی گلّے کو نوچا کھسوٹا کرتے ہیں، وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اُن کے گلّے بھی اسی میں خوش رہتے ہیں کہ وہ اپنے لیڈروں کی دست درازیوں کے مطیع و شکار بنے رہیں۔ یہ ہے حقیقت میں سیاست۔

(۱۵) سیاست کے بھنبھوڑے ہوؤں کو کوئی شکایت کا موقع نہیں۔ انہیں تو اپنی تقدیروں کو دعا دینا چاہئے کہ حکومت کے کارندوں نے انہیں غیرت اتنی اجازت تو دے رکھی ہے کہ وہ سانس لے رہے ہیں۔

(۱۶) اگر انسانوں کا خون پینا ایک مستوجب قتل جُرم تھے تو غریبوں اور کمزوروں کو دُوہنا اُس سے عظیم تر جرم کیوں نہیں سمجھا جاتا؟

(۱۷) غریب غذا چاہتا ہے، لیکن امیر اُسے اپنے معدے میں رکھ لیتا ہے۔

(۱۸) کیا امیر اپنی عمارتیں غریبوں کے خُون سے تعمیر نہیں کرتے۔ اور برائے خدا بتاؤ امیروں کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ غریبوں کو نچوڑ لیں؟ میرا مدعا یہ ہے کہ وہ کون ایسا مقدّس اخلاق اور مذہب تھا، جس نے اس مجرمانہ کارنامے پر مہر تصدیق ثبت کی تھی؟

وہ مقدّس اخلاق اور مذہب، کہیں سوسائٹی اور قانون تو نہیں؟

(۱۹) امیر، امیر ہیں۔ غریبوں کی بدولت، غریب غریب ہیں۔ امیروں کے باعث۔ غریب کی مصیبت، اُس کی عُسرت ہے، اور امیر کی مصیبت ہے اُس کی دولت۔

(۲۰) کیا دایہ خانوں میں کسی بچے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خالص اپنی تفریح کی خاطر دوسرے بچوں کے کھلونے غصب کر لے؟

(۲۱) ہمارے تمام ادارے بالعموم، اور سوسائٹی، سیاست و مذہب بالخصوص "ذاتی ملکیت" کی پیداوار ہیں۔

(۲۲) لعنت اُس مُلک پر جہاں کام کرنے والے کوڑی کوڑی کو محتاج ہوں۔ اور کاہل فیشن پرست مزے اُڑائیں۔

(۲۳) خواجگی و خسروی اپنے غلاموں سے خوف زدہ ہے۔ لیکن کیا غلام اپنے معدوں سے ڈرے ہوئے نہیں ہیں؟

(۲۴) اگر آج کہیں کوئی ایسا آدمی موجود ہے جو دنیا کے موجودہ نظم و نسق سے مطمئن ہے۔ کیا وہ اِس قابل نہیں ہے کہ اُسے پاگل خانے میں ٹھونس دیا جائے؟

(۲۵) دنیا کے کسی حصّے میں بھی آدمی، آدمی پر کیوں کر اعتبار کر سکتا ہے، جب کہ تمام افراد معاشری و اقتصادی ہی اعتبار سے درجۂ مساوات پر فائز نہیں ہیں؟

کیا اشتراکیت اعتمادِ باہمی کا مذہب نہیں ہے؟

(۲۶) اب وقت آگیا ہے کہ ہر انسان غور کرے کہ "میں مصیبت زدہ کیوں ہوں"

(۲۷) ایک کامیاب انقلابی ہی نجات دہندہ ہو سکتا ہے، اور اگر انقلاب ناکام رہا تو وہ محض ایک باغی ہوگا اور بس۔

ایک نجات دہندہ اور باغی کو اِس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا جاتا کہ درحقیقت یہ دونوں ہیں کیا۔ بلکہ فیصلہ اِس بنیاد پر ہوا کرتا ہے کہ اُن کی سرگرمیوں نے اُنھیں کیا بنا دیا ہے۔ انقلابی ہونے کی حیثیت سے کیا ایک نجات دہندہ ویسا ہی بُرا یا اچھا نہیں ہوتا، جیسا کہ ایک باغی ؟

(۲۸) آزادی کوئی زیب بازاری نہیں ہے جو ہر تن آسان پسند کا پہلو گرم کر سکتی ہے، یہ تو ایک ایسی شرمیلی دوشیزہ ہے کہ تن من دھن سب کچھ قربان کر چکنے کے بعد بھی یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ضرور اُس کے پہلو میں جگہ مل سکے گی۔

یہ کتنی حد سے گزری ہوئی حماقت ہے کہ آزادی کی سی شے کو بھیک میں مانگا جائے۔

گدا اپنا کاسۂ گدائی لئے تختِ شاہی کے روبرو کھڑا ہوا ہے اور بھیک میں تاج مانگ رہا ہے۔ اِس گستاخ کی جگہ سولی ہے، یا قید خانہ۔

کیا ہم اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں؟

(۲۹) اگر کوئی آزادی کی خاطر اپنے آپ کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتا تو اِس دنیا میں وہ کونسا دوسرا انسان ہے جو اُس کی خاطر اِس کاروبار کو سنبھالے گا، اور آزادی کو اُس کی جیب میں ڈال دے گا؟

(۳۰) اِس وقت کیا یہ ہم پر فرض نہیں ہو گیا ہے کہ آزادی کا سودا سر میں اور سر ہتھیلی پر لے کر ہم میدانِ عمل میں نکل آئیں ؟۔

(۳۱) بُزدلو، اپنے کو تسکین دے لو، اس خیال سے کہ سیاسی حالات آخرکار ایک چلتی پھرتی چھاؤں ہوتے ہیں۔ ثقافتی ارتقا (....... political evolution) ہی کو دراصل ترقی کی ایک صحیح علامت کہا جا سکتا ہے، اِس لئے ہمیں موجودہ دردمندیوں پر صبر کرنا چاہیئے۔

(۳۲) مجھے دراصل دُکھ پہنچتا ہے جب کوئی مجھے ہندو یا مسلمان کہتا ہے، کیونکہ میں اِن دونوں سے ایک بھی بننا پسند نہیں کرتا۔

لوگ مجھے اشتراکی، ویدانت اور صوفی کہتے ہیں۔ ہر شخص اپنے قیاس سے مجھے کوئی نہ کوئی نام دے دیتا ہے۔ یہ انسانوں کی بہت پُرانی عادت ہے کہ وہ لوگوں کے نام کسی نہ کسی ایسے رجسٹر میں، اور کسی نہ کسی ایسے خاص نام کے تحت لکھ لیتے ہیں جو اُن کے سطحی دماغوں کی پیداوار ہوا کرتے ہیں۔

لیکن میں اِن سے کچھ بھی نہیں ہوں۔

نہیں معلوم یہ اہلِ دنیا مجھے میری مرضی کے خلاف اپنے تفرقہ پرور ناموں کی طرف کیوں گھسیٹتے ہیں اور مجھے اپنے پروپاگنڈا کی چیز بنانے میں اُنھیں کیوں لطف آتا ہے ؟

یہ مجھے "اشتراکی"، "ہندو" اور "رعیتِ برطانیہ" کہنے والے یہ کیوں نہیں پسند کرتے کہ میں صرف ایک "انسان" کی حیثیت سے زندگی بسر کروں !

اب زمانہ وہ آ گیا ہے کہ انسان، اپنے کو "انسان" کے علاوہ سب کچھ بنانے پر آمادہ رہتا ہے۔

(۳۳) حُبِّ وطن ایک تنگ ظرفی ہے، اپنے وسیع معنی میں ہمیں اپنے کو "ہندو"، "عیسائی"، "ہندی"، "ایرانی" اور "فرانسیسی" کہلانے سے انکار کر دینا چاہیئے، اور ہر اُس شے سے مُنھ موڑ لینا چاہیئے جس سے بوئے فرقہ داری آتی ہو۔

ہمیں اپنے کو صرف "انسان" کہلوانا چاہیئے۔ ہم اوّل بھی انسان ہیں آخر بھی انسان ہیں۔

ہمیں اب انسانیت کو تقسیم کرنے اور آویزشِ باہمی کے مواقع نکالنے کے لئے جدید الفاظ اور نئی اصطلاحیں مشکوک نہ کرنا چاہیں۔

(۳۴) کیا یہ مسخرگی نہیں ہے کہ ہم جماعتوں میں تقسیم ہو کر اور "مشرقی" "مغربی" لیبل اپنے ماتھوں پر لگا لگا کر اپنے حقوق کی خاطر ایک دوسرے سے ہاتھاپائی کرتے نظر آئیں، درآنحالیکہ "انسانی حقوق" حاصل کرنے کی عظیم مہم ہمارے سامنے ہے ؟

اک مردِ حق آگاہ نظر آتا ہے
اک کافرِ گمراہ نظر آتا ہے
اک سینہ سراپا ہے بہ پیشِ بت
ہاں مومنِ اللہ نظر آتا ہے

رجنیش

مردِ مضحک

(گذشتہ سے پیوستہ)

(جملہ حقوق محفوظ)

(از جناب اسرائیل احمد صاحب سکندرآباد دکن)

باب ۲

کامپریشیکو کی کشتی سطح بحر پر

(۱)

جبتک کشتی خلیج پورٹ لینڈ میں رہی طوفان کے آثار کچھ برلئے نام ہی نظر آتے تھے، چہرۂ بحر اگرچہ قدرے مکدر تھا لیکن تھا عموماً ساکن، مطلع بھی صاف تھا کشتی نے جس وقت بادبان اٹھایا ہے، ہوا اس قدر کمزور تھی کہ بمشکل کشتی کو کوئی جنبش دے سکتی تھی، چنانچہ وہ ساحل سے بالکل ہمکنار ہوکر چل رہی تھی سنگستانی لب سے متصادم ہوجانے کا کوئی خطرہ نہ تھا، ساحل کے زیر دیوار چلنے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ وہ اہل کشتی کے فرار کے لئے اک گونہ پردہ داری کا کام دے رہا تھا۔ اس جرائم پیشہ جماعت کی نقل و حرکت امن و حفاظت کے ساتھ اس طرح بصیغۂ راز جاری تھی۔

راکبانِ کشتی تعداد میں دس نفر ہیں۔ ان میں سے تین اہل عملہ ہیں، اور سات مسافر، از اں جملہ دو عورتیں۔ بیرونی سمندر کی روشنی میں جہاں غروب آفتاب کا جھٹپٹا بھی قبل طلوع کی سی آسماں تابی کا جلوہ رکھتا ہے، سب لوگ صاف صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ اب ان کو اخفائے راز کی ضرورت بھی نہیں رہی ہے، اس وقت وہ پانی کی "محفوظ سرزمین" میں ہیں۔ "ارض غیر مملوکہ" ہیں! اک "وقفِ عام" "ملک خدا" کے "حرماً آمنا" میں! چنانچہ وہ بالکل بے غل وغش ہیں، اور کھلے سمندر میں کھل کھیلے ہیں، یعنی خوب گا بجا رہے ہیں۔ اُن "درمیان قعر دریا" انہیں "تر دامنی" کی کوئی پروا نہیں ہے، بندرگاہ سے ان کی رخصتی ان کی نجات یا نگی کے ہم معنی تھی۔ خلیج سے ان کا خروج ساحل مراد کی رسائی کے مترادف تھا۔

اس معجون مرکب جماعت کی بوقلموں نوعیت دور سے نظر آتی تھی عورتوں کی عمر کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے، ممکن ہے قیاس غلطی کرے، آوارگی و اسیری کی زندگی ضعیف نازک کے توئے میں قبل از وقت اضمحلال، اور ان کے پرشباب چہروں میں حسن کا زوال پیدا کردیتی ہے۔ چنانچہ کشتی والی عورتوں کے مرجھائے ہوئے گالوں کی جھرّیاں گویا فلاکت و مصیبت کی تحریریں تھیں ان میں سے ایک عورت ان ساحلی شہروں میں سے کسی ایک کی رہنے والی تھی، جو "خشک بندرگاہ" کا "لب تشنہ بہ آب اندر" قسم کا نام رکھتے ہیں دوسری عورت اپنے خط و خال سے آئرستانی معلوم ہوتی تھی۔

کشتی میں سوار ہو جانے کے بعد سب لوگ ان صندوقوں پر یکجا ہو کر بیٹھ گئے جو کشتی کے مستولوں کی جڑ میں رکھے ہوئے تھے، بعض ہمسفروں کی زبانیں ہمجنس تھیں۔ چنانچہ وہ آپس میں ہمکلام تھے۔ ملاحوں میں سے ایک کوہستان پیرینیز کے شمالی خطے کا رہنے والا تھا، اور دوسرا اسی کے جنوبی علاقے کا متوطن اس طرح یہ دونوں ہم وطن تھے، اگرچہ جغرافیائی، وطنی نقطہ نظر سے اول الذکر فرانسیسی تھا اور آخر الذکر ہسپانوی، اہل کشتی میں سے دو آدمی خالص فرانسیسی النسل تھے۔ اور ایک شہر جنیوا کا باشندہ تھا، ان کے علاوہ ایک بوڑھا شخص تھا، جو ایک لبادے میں از سرتاپا ملفوف تھا، ٹوپی میں پائپ وغیرہ کے لئے کسی جگہ کوئی شگاف یا روزن نہ تھا۔ اپنے حلیے کی غمازی کی بنا پر یہ شخص المانوی الاصل معلوم ہوتا تھا۔ پانچواں آدمی وہ ہے، جو اس گروہ کا سرغنہ ہے۔ یہی وہ شخص ہے، جس نے یاد ہوگا کہ کشتی میں سوار ہوتے ہوئے بچے کو چڑھنے سے باز رکھا تھا۔ اسی نے کشتی میں پہنچ کر اپنی لات سے تختے کو گرا دیا تھا۔ اور کشتی و ساحل کے مابین کے راستے کو منقطع کر دیا تھا، یہ شخص بہت قوی الجثہ و طویل القامت چست و چالاک، بیقرار و سیماب وش واقع ہوا تھا، اس کی پوستین بڑی زرق برق تھی۔ یہ ایک مضطرب فطرت کا آدمی تھا، اس سے ایک گھڑی نچلا نہ بیٹھا جاتا تھا، کبھی جھکتا، کبھی کھڑا ہو جاتا، اور کبھی کشتی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور دوسرے سرے سے پہلے تک مسلسل گرد آوری کرتا اس وقت اس کی سرگرمی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماضی قریب میں جو کچھ گذر چکا ہے اور مستقبل قریب میں جس کے پیش آنے کی توقعات ہیں، اس پر وہ "شایانہ شان" سے بحث کر رہا ہے۔

یہ آدمی اور وہ شخص جو کشتی میں ناخدا کے فرائض ادا کر رہا ہے، اپنے دو دوسرے اہل عملہ کے ساتھ، باوقات مختلف ہسپانوی۔ فرانسیسی، اور اسی نواح کی ایک تیسری زبان میں گفتگو کر رہا ہے۔ کوہستان پیرینیز کے جنوبی دامنوں میں یہ تینوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ تاہم اس جماعت کی مشترکہ زبان، عورتوں کو مستثنیٰ کر کے فرانسیسی ہی ہے۔ جسے وہ اپنے مخصوص لب و لہجہ میں کسی قدر متغیر صورت میں بولتے ہیں۔ فرانسیسی زبان اسی عہد سے یورپ کے مختلف ممالک کے درمیان باہمی مبادلۂ خیالات کا آلہ بننی شروع ہو گئی تھی، براعظم کے تجارتی حلقوں کی مستعملہ زبان بھی بھی تھی، آوارہ گرد جرائم پیشہ قومیں بھی فرانسیسی ہی کی شستگی سے اپنے راز و نیاز کی باہمی افہام و تفہیم کا کام لیا کرتی تھیں۔ شہر لندن کا اک شوب شہر چور اک ایسی زبان سے آشنا پایا گیا جو فرانسیسی کی اک شاخ سے تعبیر کی جا سکتی تھی۔

کشتی بہت خوش ساخت ہے، اور سطح بحر پر بڑی سبکروی سے چلی جا رہی ہے۔ لیکن راکبان کشتی کی تعداد اور ان کا مجموعی خیمہ و خرگاہ اک ہلکی کشتی کی بساط سے زیادہ ہے۔

کشتی کے ملاحوں کا کاسپرشیکو کے فرار میں مدد بہم پہنچانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ بھی ان لوگوں کی مجرمانہ زندگی میں ملوث ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کشتی کے ناخدا اور جتھے کے سرغنہ کے درمیان کوئی معاہدت نہیں ہے۔ مگر اس تناصر باہمی کے لئے اس قدر کافی ہے کہ دونوں توم "باسکے" کے نجیب الطرفین فرزند ہیں۔ باسکے لوگ اپنی "باسکیت" سے شدید عصبیت رکھتے ہیں۔ اک باسکے پر فرض ہے کہ وہ دوسرے باسکے کی مدد کرے۔ اور اس ملت نوازی میں وہ شریف و غیر شریف کی مطلق تمیز نہیں کرتی، اہل پیرینیز کی یہ اخوت ضرب المثل ہے۔

جب تک کشتی خلیج کے حلقے کے اندر رہی کوئی موسمی خطرہ نظر نہ آتا تھا، سمندر کے بعض تیور اگرچہ بعض ممکن خطرات کو مضمر رکھتے معلوم ہوتے تھے۔ تاہم چہرۂ بحر ہنوز ایک دفعہ بھی "چیں بجبیں" نہ ہوا تھا، اہل کشتی کو مستقبل قریب میں کسی غیر خوشگوار موسمی نیرنگی کا قرینہ نہ دکھائی دیتا تھا، قطع نظر اس سے ان کے لئے بہر حال سفر کرنا اور جلد از جلد ساحل کو چھوڑ دینا اک ناگزیر ضرورت تھی، وہ ایک شدید خطرے سے اپنی جانیں لے کر بھاگے تھے، خشکی سے، ہر قربانی پر، رستگاری ان کے لئے اک جشن فتح کا پیام تھا۔

چنانچہ وہ قہقہے مار رہے ہیں۔ اور گیت الاپ رہے ہیں، اگرچہ کسی قدر دبی دبی آوازیں۔ تاہم حقیقی زندہ دلی کے لہجے میں۔

یکبارگی ایک شخص نے اک نعرہ مارا، جو قلبی فرحت کا ہم نوا تھا، یہ ایک کار آزمودہ کشتی راں تھا، جو دور دراز سواحل بحر چھان مار چکا تھا، کھلے سمندر میں قطب نما کے اصطلاحی استعمال کے ساتھ جہاز رانی کی قابلیت وہ بلا شبہ نہ رکھتا تھا، لیکن کشتی کا لغوی معنی میں "ناخدا" تھا۔ طویل تنگ اور پیچیدہ

خلیوں اور آبناؤں کی انتہائی تیلی گردنوں تک جا پہنچا، اور وہاں سے مچھلیوں سے بھری ہوئی جال بے تکلف کھینچ لانا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا، اس ملاح کا فلک شگاف نعرہ اہلِ کشتی کے جوشِ مسرت کی معراج تھا۔

ایک نے ایک آہنی چولہے میں آگ جلائی اور اک خاص قسم کے کھانے کے پکانے کی تیاریاں ہونے لگیں، اس نسخے کا جزوِ اعظم مچھلی کا گوشت تھا، لحم الخنزیر کی کچھ بوٹیاں بھی ڈالی گئیں، نقولات میں اک مرغوب قسم کی لوکی تھی جو اس زمانے میں بہت کھائی جاتی تھی، ہانڈی دراصل متعدد مختلف کھانوں کا طرفہ معجون تھی۔ جس کی ترکیب و ترتیب میں سارے شرکائے دسترخوان نے ایک دوسرے کی رعایت میں تھوڑی تھوڑی اپنے انفرادی ذوق کی قربانی منظور کر لی تھی، خام جنس کا اک منہ کھلا ہوا تھیلا پکانے والے کے پہلو میں رکھا ہوا تھا۔ ایک لالٹین اک کہے سے اس کے سر کے اوپر لٹک رہی تھی، اسی کے قریب وزا ہٹ کر کشتی کا "مرغ باد نما" اپنی جائے نشست پر قائم تھا، یہ ایک مردہ "ہیلیسئین" داک چڑیا تھی، جس کے متعلق اس زمانے کے ملاحوں کا یہ توہم تھا کہ وہ ہوا کا رخ بتانے کے لئے ہوا کی سمت آمد میں اپنا سینہ خود بخود پھیر لیتی ہے۔ ہانڈی کے پکنے کے دوران میں لوگ بار بار چکھا چکھی کر رہے تھے اور مزے میں آ آکر بعض دیہاتی گیت گا رہے تھے، جنگل کے مختلف درخت زوالِ آفتاب کے وقت چیزوں کا طوالت پذیر سایہ، پگڈنڈی پر چلنے والی گاڑی، بس یہی پیش پا افتادہ چیزیں کافی "شاعرانہ لمحات" پیدا کر رہی تھیں۔

کسی جگہ سے روانگی کا وقت اپنے اپنے حسیات کے اعتبار سے رنج یا خودکشی کا موقع ہوا کرتا ہے۔ کسی کے لئے وہاں سے عقب گذاری اک راحت کی سانس ہوتی ہے، اور کوئی سدھارتے ہوئے افسردہ ہو جاتا ہے، یہاں ساری جماعت کے واردات قلب اول الذکر نوع میں داخل تھے، البتہ صرف ایک فرد جماعت کا معاملہ اس سے مستثنےٰ تھا۔ یہ وہ پیر مرد تھا جسے قبل ازیں کئی موقعوں پر ہم دیکھ چکے ہیں، یعنی جس کے ہیٹ میں کوئی پاپ نہ تھا۔

اس بڈھے کی وضع قطع میں المانوی علامات نسبتہً بہت اجاگر تھیں، مگر چلیے کی گہرائیاں اس درجہ ناقابل پیمائش تھیں کہاں میں قومیت کی مابہ الامتیاز خصوصیات بالکل گم ہو گئی تھیں، اس عجیب شخص کو کسی ایک سرشتۂ نسل سے قطعی طور پر وابستہ کرنا مشکل تھا۔ یہ حضرت خیر سے گنجے واقع ہوئے تھے لیکن جذبۂ "فارغ البالی" کا حال یہ تھا کہ بے بال سر والے چہرے میں چار ابرو کا صفایا اور کیا گیا تھا کشتی کے مہرے پر جس جگہ حضرت مریم کی تصویر تھی اس موقع سے جب یہ شخص گذرتا تھا تو اظہار عقیدت میں اپنی ٹوپی اتار لیتا تھا، اُن اوقات میں کہ اس کا سر اونچا اٹھ جاتا تھا اس کے چہرے کی ضعیفانہ پھولی ہوئی رگیں "پختہ حکمت" کی بلیغ سطریں بن کر نمایاں ہوتی تھیں۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک لبادے میں لپٹا ہوا تھا۔ جو بہت خستہ ہو گیا تھا۔ دریدہ درزنوں سے جابجا نیچے کا چست ترکوٹ نظر آتا تھا، اس کہن سال بزرگ کے ہاتھ ہر وقت بلا اختیار صلیبی شکل بنانے رہتے تھے، جو عیسائیوں میں اقامت نماز کے وقت کی وضع ہے۔

بڈھا عموماً اک عالمِ خواب میں پایا جاتا ہے۔ وہ اس قلب و روح کا انسان ہے جسے جرائم و مظالم کے ارتکاب کا مشاہدہ خون در جگر رکھتا ہے۔ خود اس کے چہرے کی ہیئت اک ایسے "آتش زن" کی سی ہے جس کے اندر آنکھیں صرف "پ دری" کی نصب کر دی گئی ہوں۔ جو اک عمیق تابانہ احساس کی آئینہ دار ہوں۔ بڑھاپے کی بھوری زلفوں کی لٹیں، جو اب بالکل سفید براق ہو گئی ہیں اس کی کنپٹیوں پر لٹک رہی ہیں۔ اس کے تمام سراپا سے روحِ مسیحیت منعکس ہے۔ جس پر اک "ترک" کی شانِ تسلیم و رضا مستزاد ہے۔ دبلی اور سوکھی انگلیوں کا ایک ایک ریشہ دکھائی دیتا ہے بلند و بالا قامت، پیرانہ سری سے تاج پوش ہے۔ وہ کشتی کے عرشے پر ادھر ادھر خراماں نظر آتا ہے لیکن نہ کسی کی طرف ملتفت ہوتا ہے، نہ کسی سے ہمکلام عالم آب کی اس متحرک آبادی میں وہ بالکل "باہمہ و بے ہمہ" ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سینے کے عمق میں کوئی خاص خیال دل نشین ہے۔ جس پر وہ اپنے سارے تفکر و تدبر کو مرکوز کئے ہوئے ہے۔ آنکھوں کے حلقے رقت سے لبریز ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کی سیاہی و سیاہ کاری سے مکدر ہے۔ خود اپنے مجرم ضمیر کی ملامت بھی اس کے لئے سوہانِ روح ہے۔

وقتاً فوقتاً جتھے کا سرغنہ جو اک پرکالۂ آتش واقع ہوا ہے۔ اور اک شعلۂ جوالہ کی طرح کشتی کی ساری فضا میں جولاں و رقصاں نظر آتا ہے، پیر مرد

کے نزدیک آ آکر کچھ سرگوشی کیا کرتا ہے۔ جس کا جواب سکون پیری کی زبان صرف اک اشارۂ ابرو سے دے دیتی ہے۔

یہ گویا برق کا اضطراب ہوتا تھا، جو سکینت سحر کے ہاتھ معروف ستورہ ہوا کرتا تھا۔

(۲)

راکبانِ کشتی میں سے دو شخص وقفِ فکر و نظر ہیں۔ ایک یہی بڈھا۔ اور دوسرا وہ کشتی کا کپتان۔ جس کی شخصیت کو کاپرنیشیکو نامت کے سردارسے مخلو نہ کرنا چاہیئے، آخرالذکر سمندر ریز نگاں اور اس سے دست وگریباں ہے۔ اور اول الذکر سماوی آثار کے مطالعے و مراقبے میں اپنی روح کو عرق ریز کر رہا ہے۔ وہ ایک ایک روزنِ ابر سے کسی نجمِ ہدایت کو دیکھ لینا چاہتا ہے۔

وقت وہ ہے جب کہ روز و شب کے ہر دو اوقات باہم وصل ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ دن اپنے دمِ واپسیں میں نظر آتا ہے، اور رات کا "جنین" رحمِ مستقبل میں ہوتا ہے۔ خال خال ستارے آنکھیں کھول رہے ہیں۔ مطلع عجیب آثار کا جلوہ گاہ بنا ہوا ہے۔ اس پر ابر و غبار مسلسل گردش میں ہیں۔ زمین فدات آبی کے ایک حجاب میں ملفوف ہے۔ اور سطحِ بحر بادلوں کے "بادلے" میں ملبوس ہے۔

خلیج پورٹ لینڈ کے دہانے سے نکلنے سے پہلے ہی سمندر کی برہمی مزاج کے بعض مبہم تیور دیکھ کر کپتان نے کشتی کے کل پرزوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا، اس نے مستول اور بادبان کو ٹھیک ٹھاک کر لیا تھا۔ اور وہ تمام تیاریاں اور پیش بندیاں کر لی تھیں جو اک ایسے ناخدا کے لئے ضروری ہو جاتی ہیں۔ جو اضطراب پذیر موسم کی ساری تنبیہوں کے علی الرغم پھر بھی سمندر میں کود پڑنے کا عزم بالجزم کر چکا ہو۔

کشتی اگرچہ اچھی خاصی تھی۔ مگر پھر بھی اک حقیر قد و قامت رکھتی تھی۔ پُرشور بحرِ اعظم کے تلاطم کی وہ حریف نہ ہو سکتی تھی کشتی کا کمزور پہلو بس یہی تھا، "کہتری قامت" کم از کم یہاں "بہتری قیمت" کے ہم معنی نہ تھی۔

کپتان متواتر نقل و حرکت میں ہے، ساتھ ہی اس کی ایک آنکھ ساحل کے مناظر پر ہے۔ میڈیوٹنا کو شروع ہی سے اگرچہ کافی تند ہوا سے سابقہ پڑا تھا۔ مگر کوئی اندیشہ ناک صورت ہنوز خارج از بحث تھی، تاہم اب کشتی کو تھوڑی تھوڑی لغزش ہوتی جاتی ہے، اور اسے اپنی رفتار کا بالکل خطِ مستقیم میں قائم رکھنا قدرے مشکل محسوس ہو رہا ہے۔ کپتان اپنے معینہ مقام پر جا کھڑا ہوا ہے۔ اور بڑی تندہی اور گہری نظر بازی سے کشتی کی سربراہی کر رہا ہے۔ اس وقت وہ کسی پر اعتماد کرنا نہیں چاہتا اور اپنی "غیر منقسم ذمہ داری" کو اگر اس نے کہیں تقسیم کیا بھی ہے تو اپنے ہی دونوں شانوں پر۔ کشتی کی رفتار اور طوفان کی امواج کے درمیان اک مسلسل کشتی برپا ہے۔

الغرض کپتان بڑی ہوشمندی اور بلند آہنگی کے ساتھ کشتی رانی کے فرائض ادا کر رہا ہے۔ وہ کشتی کو تا بمقدور لغزیدہ ہونے نہیں دیتا۔ اس کو اس امر کی احتیاط بھی منظور ہے کہ کشتی کو وہ سمت رفتار اختیار نہ کرنے دے۔ جس میں وہ کرۂ ہوا کی پُرزور امواج سے متصادم ہونے لگے۔ کشتی کے ایک ایک قدم پر اس کی نظر ہے۔ "میڈیوٹنا" کے اندر اگرچہ قطب نما موجود تھا لیکن یہ آلہ اس قدر چھوٹا تھا کہ موجودہ طوفانی ہنگامے میں اس کی سوئی بالکل متزلزل ہوئی جا رہی تھی۔ اور وہ کسی قابلِ اعتماد صحت کے ساتھ سمت کو نہیں بتا رہی تھی، تاہم کپتان کی آنکھیں چہرۂ بحر کے ایک ایک تیور پر جمی ہوئی ہیں، اور اس کی انگلیاں کشتی کی ایک ایک حرکت نبض پر، اور طوفان کی ایک ایک ضرب قلب پر۔

اسی خلفشار میں ایک دفعہ کپتان نے آسمان پر اک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ تو اس کو وہ تین ستارے ایک جگہ نظر پڑے، جو جہاز رانی کے نقطۂ نظر سے اک خاص پیام اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اور جن کے لئے فلکیات میں ایک مخصوص اصطلاحی تسمیہ پایا جاتا ہے۔ ہسپانیہ کے جہاز راں انہیں "مجوس ثلاثہ" کے نام سے پکارتے تھے۔ اور ان میں قدیم الایام سے ایک روایت مشہور تھی کہ جب یہ تین مجوسی یکجا نظر آئیں تو سماوی "تثلیث" کی یہ توحید ایک شگون نیک ہے۔ جس کی تعبیر یہ ہے کہ دیکھنے والے "نجات دہندہ" کی رحمت و حمایت سے دور نہیں ہیں۔

تاہم عین ان ہی لمحات سعادت کے وقت بڈھے کی زبان اک دوسری ہی داستان تھی، وہ کہہ رہا تھا "ست نما ستارے احساس دنیا

سے بھی دکھائی نہیں دیتے۔ اس تارے کا منظر بھی تاریک ہے جو بحالت طلوع اک سرخ تنویر رکھتا ہے۔ کیا نور آسمانی کی ساری آنکھیں پھری ہوتی ہیں ؟ -

مگر کشتی کے دوسرے ساکنین اس تمام نظر بازی و جگر کاوی سے بے فل و غش ہیں۔ انہیں "جہالت" کی "جنت" نصیب ہے۔

کامیاب فرار اور عارضی نجات کی فاتحانہ مسرت کا احساس جب ذرا کم پڑا تو بعض اہل کشتی کو چند غیر خوشگوار آثار کا شعور ہونا شروع ہوا۔ موسمی حالت کے اعتبار سے سارے انداز ماہ جنوری کے سے تھے۔ اور ہوا برف میں ڈوبی ہوتی چل رہی تھی کشتی کے تنگ زیرین بطن دکیبن، کے اندر ان سب لوگوں کا پناہ لینا ممکن نہ تھا، اول تو اس میں اتنی مکانیت نہ تھی، دوسرے وہاں اتنا سامان بھرا ہوا تھا کہ آدمیوں کے لئے کوئی مزید گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ اس میں گرہستی کی چیزیں تو کا مپرشیکو کی تھیں۔ لیکن اس بارگراں کی اکثریت اسباب تجارت کے وہ گٹھے تھے، جو خود مالکان کشتی کی ملکیت تھے۔ اس لئے کہ یہ کشتی محض سیر و گشت کی اعزاض کے لئے نہ تھی، بلکہ وہ باضابطہ بعض اجناس تجارت کی خرید و فروخت کیا کرتی تھی۔ جیسے وہ لوگ مخفی طور پہ بلا محصول بحری ادا کئے ساحل کے مختلف موقعوں پر بار کرتے اور اتارتے تھے، پس مجبوراً مسافروں کو کشتی کے بالائی عرشے ہی پر قیام کرنا پڑا۔

اس لاعلاج مصیبت پر انہوں نے بآسانی سر تسلیم خم کر دیا۔ آوارہ گرد خانہ بدوش لوگ آسمانی شامیانے کے نیچے رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں اس لئے ان کو رات کا موسم کی ایسی بے رحمیوں کی ہمکناری میں گزار لینا چنداں دشوار نہیں ہوتا، کھلی ہوا ان کی ہمیشہ کی ہوا خواہ ہو کرتی ہے، اور ویران میدان ان کا محفوظ مکان۔ جس میں وہ بے تکلف سو جاتے ہیں اگرچہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ یہ خواب راحت ان کے خواب مرگ ثابت ہوئی ہے۔

شام کے کھانے کے انتظار میں بعض لوگ عورتوں کے گرد جمع ہو گئے ہیں۔ لیکن اس بڈھے کے لئے کچھ اس قدر خون جگر پینے کو ہے کہ دستر خوان کی اس کشش کو اس نے قطعاً محسوس نہ کیا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت ہے اور اپنے خیالات میں محو و مستغرق، بلکہ اس کو ہوا کی بیدار کن سردی کا ابھی تک ادراک نہیں۔

کپتان نے اپنے موقع سے کھڑے کھڑے اعماق حلق سے اک مہیب آواز بلند کی، یہ اس امریکی بحری طائر کی سی آواز تھی جس سے ملاح اچھی طرح آشنا ہیں۔ اس آواز پہ کا مپرشیکو کا سردار قریب آیا، اور کپتان نے اس سے اس طرح خطاب کیا۔

"کوہستان کے کاشتکار"

یہ وہ کلمات ہیں جو بطور دیباچے کے اس وقت کہے جاتے ہیں جبکہ کوئی نہایت اہم و سنگین مضمون چھیڑنا منظور ہوتا ہے۔ جو مخاطب کی ہمہ تن گوش توجہ کا متقاضی ہو۔

کشتی کے ناخدا اور جرائم پیشہ جماعت کے سرغنہ کے درمیان اس عجیب الخلقت بڈھے کے متعلق ایک مکالمہ شروع ہو گیا جس زبان میں وہ گفتگو کر رہے تھے وہ ایک غلط العام قسم کی ہسپانوی بولی تھی جو کوہستانی اضلاع میں رائج تھی۔ مندرجہ ذیل سوالات و جوابات ہوئے۔

"کشت زار کوہستان کے کسان! یہ آدمی آخر کون ہے؟"

"بس اک آدمی"

"اس کی زبان کیا ہے؟"

"ہر زبان"

"اس کا ذخیرۂ علوم؟"

"ہمہ علوم"

"وہ کس قوم کا آدمی ہے؟"

"ہر قوم کا! اور پھر کسی کا بھی نہیں"

"یہ کس خدا کا قائل ہے؟"

"اسی عام خدا کا! — خالق ارض و سما کا"

"خلق خدا اسے غائبانہ کیا کہا کرتی ہے؟"

"خبطی، دیوانہ"

"آپ اسے کیا کہتے ہیں؟"

"خرد مند، فرزانہ"

"آپ کی جماعت کے حلقے میں اس کی نشست کیا ہے؟"

"وہ جس کا تصور بھی غیر معمولی!"

"کیا رئیس جماعت؟"

"نہیں، روح جماعت!"

اس قدر گفتگو کے بعد کپتان اور سردار جدا ہوگئے، دونوں مراجعت کرکے اپنے اپنے عالم خیال میں پہنچ گئے۔ بیٹیو شنا اب خلیج سے باہر آگئی ہے۔

سمندر کا طوفان اب قریباً پورا یا پروبال ہوگیا ہے۔ لہروں اور موجوں کے درمیان شفق کی گریزپا خفیف تنویریں جا بجا تارے تارے یا "چنا کے ریزے" سے نظر آرہے ہیں۔ بعض بعض جگہ فاسفورسی عناصر کے ذرات کی تابش ایسی معلوم ہوتی ہے، جیسے رات کی تاریکی میں الّو کی آنکھیں چمکتی ہیں۔

بیٹیو شنا ایک خطرناک گرداب سے اک بیباک تیراک کی طرح مغرورانہ گذر گئی، خلیج پورٹ لینڈ کے دہانے کے قریب، ریگ بحری کا اک عریض وطویل سد نما تودہ زیر آب مخفی تھا، اس کی بناوٹ آڑی آڑی واقع ہوئی تھی اس کی ہیئت اک نیم دائرہ کی سی کہی جاسکتی تھی۔ اس تحت البحر بند میں موجوں کے مخصوص عمل سے نشستیں سی کٹ گئی تھیں، ان طبعی تصرفات سے ساختہ وپرداختہ ہوکر وہ اک تماشاگاہ کی ہمشکل بن گئی تھی۔ تھوڑے سے تاریخی تخیل سے کام لیکر سے "بحر اعظم کا کولسیئم" (اہل رومہ کا مشہور تھیٹر یا اکھاڑا جو نصف دائرہ کی شکل رکھتا تھا) کہا جاسکتا تھا، غوطہ خوروں کے لئے سمندر کے شفاف پانی میں فطرت کی اس عمارت کا نظارہ عام تھا۔ اس بحری معرکہ گاہ میں آبی جانوروں کے بڑے بڑے "بانی" ہوا کرتے تھے، جہاز رانوں کی روایات بیان کرتی ہیں کہ اس درطۂ ہلاکت کے ارد گرد تباہ شدہ جہازوں کے ملبے کے عظیم انبار جمع ہوگئے ہیں۔ جن کو اس عجیب وغریب کوہ پیکر مچھلی نے غرق کیا ہے جو اپنی قہارانہ ضربت کے باوجود "بیت عنکبوت" والے مکین کی جسمانی ساخت کے مشابہ واقع ہوئی ہے۔ قعر بحر کی پرہول ظلمات میں سمندر کی تباہ کاریوں کی یادگاریں آثار قدیمہ کے باقیات الصالحات کی طرح پڑی ہوئی ہیں، عام طور پر لوگوں کے لئے یہ تاریخی ذخیرہ اک "کتاب غیر مفتوح" کی حیثیت رکھتا ہے لیکن طوفان کے اوقات میں جبکہ سمندر تہ وبالا ہوا کرتا ہے تو اس محفوظ

عجائب خانۂ فطرت کی اک جھلک نظر آجایا کرتی ہے۔

آج انیسویں صدی میں یہ مخفی سد بحری بہت کچھ مسمار ہوچکی ہے مصنوعی بندرگاہ کی تعمیر کے سلسلے میں اس کا معتدبہ حصہ قطع وبرید کی زد میں آگیا ہے۔ سمندر کے روزانہ مدوجزر کے پیہم ہجوم کو بھی اس عمل تخریب میں کافی دخل رہا ہے۔

مادر فطرت اور اس کے سب سے زیادہ کھلنڈرے بچے انسان کے درمیان جو کدوکاوش جاری رہا کرتی ہے وہ ضمیر کائنات کے بہت سے اسرار کی آئینہ دار ہے۔

(۳)

بڈھا آدمی جسے کاپرشیکو سردار نے پہلے اک مخبوط الحواس شخص کہا تھا اور پھر اک مجذوب عارف، اب مستقلاً کشتی کے اگلے حصے میں مقیم ہے۔ "بحری سد" کو عبور کرنے کے بعد اس کے تخیلات بھی اک خاص حد کے پرے جاچکے ہیں۔ اس کی توجہ زمین اور آسمان کے درمیان منقسم ہے، اس کی ایک نظر ساحت فلک پر ہے اور دوسری سطح بحر پر، وہ یکے بعد دیگرے اوپر اور نیچے نگراں ہے۔ لیکن شمال ومشرقی گوشے پر بار بار اس کی نظر مرکوز ہوکر رہ جاتی ہے۔

کپتان نے اپنے مقام پر ایک دوسرے ملاح کو متعین کیا اور کشتی کے مختلف حصوں کو قطع کرتا ہوا سب سے اگلے حصے میں جا پہنچا وہ پیرمرد کے نزدیک آیا لیکن سامنے سے نہیں، پیچھے سے، وہ اس کے پس پشت تھوڑے فاصلہ پر کھڑا ہوگیا، اس کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے، سر ایک طرف کو جھکا ہوا تھا، آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، کہنیاں محراب کی شکل بنا رہی تھیں، اور گوشہ ہائے دہن میں اک مبہم تبسم! — مختصر یہ کہ اک ایسی وضع تحیر جو استہزا واحترام کے درمیان مذبذب ہو۔

بڈھے کو اپنے جی سے باتیں کرنے کی عادت تھی، معلوم نہیں کہ اس مذاق کے تقاضے سے یا کسی آدمی کے قدموں کی چاپ اپنے پیچھے سن کر اس نے اپنی "بڑ" جاری کر دی، اس کی آنکھیں خلائے مطلق میں نگراں تھیں اس کی "خود کلامی" یہ تھی۔

سمت الراس کا تعین، جس کے ذریعہ سیاروں کا صحیح صعود وہبوط

پیدائش کیا جاتا ہے۔ اس صدی میں چار ستاروں کے موقعوں سے ہوا کرتا ہے۔ ان کا صدر نشین جرم فلکی ستارۂ قطب ہے۔ اس محفل انجم کے تین رکن، اور ہیں، لیکن اس وقت یہ "چار یار" صحن فلک سے غائب ہیں"۔

علامۂ دہر بڈھے کی زبان سے یہ الفاظ اک اضطراری رو میں پے در پے نکلے۔ اس نے انہیں بکمال صحیح مخرج و تلفظ سے ادا کیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ارادتاً اپنی تقریر کو مُوہوم اور پر سوز رکھنا چاہتا ہے "خود کلامی" بھی اک عجیب پر اسرار داعیۂ نفس ہے۔ اس قسم کی ہذیانی و نیم سی گفتگو کو "روح کے عمیق ترین افق کی برق کے لمعات سحابی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کپتان اک ناقابل ضبط جاذبہ جستجو سے بیتاب ہو گیا، وہ بڈھے کے ماقلّ و دلّ خطبے کے خاتمے کے بعد ہی بولا: "جناب والا!"

لیکن بڈھے نے مطلق کوئی التفات نہ کیا۔ وہ بدستور اپنی جگہ غرق فکر اور صرف متکلم رہا۔ اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے وہ اب یوں گویا ہوا۔

"خال خال ہی ستارے نظر آرہے ہیں، اور جو باقی ہیں، انہیں بھی استبداد پذیر طوفانی فضا غرق کئے دے رہی ہے۔ ہوا مختلف سمتوں میں مصروف دوا دوش ہے۔ اس کی عام مستقل رفتار خشکی کی جانب ہے جہاں وہ ساحل سے ٹکرا کر عمودی ہیئت میں بلند ہو رہی ہے۔ زمین پانی کے مقابلے میں گرم تر ہوتی ہے۔ اس سے مس ہونے والے کرۂ باد کا حصہ نسبتاً ہلکا ہوتا ہے۔ یہ ہوا اوپر اٹھتی ہے۔ اس کی قائم مقامی کے لئے سمندر پر ہلکی سرد تر و کثیف تر ہوا آتی ہے۔ اسی ناموس فطرت کے عمل کے تحت "ریاح بحریہ" دنیا کے ہر حصے میں قبلۂ خشکی کی طرف منہ کر کے چلا کرتی ہیں"۔

"باضابطہ جغرافیائی معائنے اور باقاعدہ فلکی ترصید سے جو عرض البلد معلوم ہو، اس میں اور قیاسی تخمینے میں حسب برائے نام فرق پایا جائے۔ مثلاً تین میل کے اندر صرف تین منٹ کا تفاوت پڑے تو سمجھنا چاہیے کہ سمندر میں ہم کم و بیش صحیح راہ پر ہیں"۔

ان حقائق و معارف پر ناخدا پھر خراج عقیدت پیش کرتا ہے لیکن بڈھا بدستور خود فراموش رہتا ہے۔

یہ مجہول الحال پیر مرد جامعۂ آکسفرڈ یا کاٹنگن کے فضلا کی سی عبا و قبا پہنے ہوئے ہے۔ وہ اپنی عالی مردم بیزاری کی حکیمانہ نخوت کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا۔ وہ "بحریات" اور بشریات کا بیک وقت مبصر معلوم ہوتا ہے۔ وہ سمندر کی لہروں اور موجوں کی جست وخیز کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر ان مظاہر کی تعبیر کرتا ہے، جس کا خطاب خلائی کسی مخلوق ہی سے ہو سکتا ہے۔ وہ مرشد برحق اور مخبر صادق ہر دو مناصب کا جامع بنا ہوا ہے۔ کیا وہ ظلمات آب کا خضر راہ ہے؟

بڈھے کی بڑ پھر جاری ہو گئی، اس مرتبہ اس کی آواز ذرا بلند اور لہجہ واضح تر ہے۔ اس کا طرز خطاب بتاتا ہے کہ اب اس کا منشا یہ ہے کہ لوگ اس کی تقریر کو سنیں اور سمجھیں، اس نے فن کشتی رانی، رفتار طوفان کی پیمائش، کشتی اور سمندر کی باہمی کشمکش اور اس دو طرفہ مزاحمت کی صورت میں کشتی کی شرح رفتار کا تخمینہ، کشتی کی حرکت کو حسب مرضی تیز اور سست کرنے کے طریقے، — غرض، بحریات کے بے شمار معارف و اسرار پر اک دریا بہا دیا۔

کپتان ایک دفعہ پھر سر بسجود ہو گیا، اور پھر نیاز کیشانہ لب کشا ہوا، "حضور عالی!"

بڈھے نے اب آنکھیں چار کیں، تاہم وہ اپنی جگہ پر اپنی معلومہ نشست سے ملبچا رہا۔ اور صرف اپنی گردن کو موڑ کر مستفسر کی طرف دیکھا۔

"مجھے طبیب کہیئے!" اس کا فرمان صادر ہوا۔

"بہت خوب جناب حکیم صاحب! اور یہ بندۂ ناچیز صرف کشتی کا کپتان ہے"

"بجا ہے" طبیب نے تصدیق کی۔ (باقی)

یہ کس کا تبسم ہے فضا میں ساقی
یہ کس کی جوانی ہے گھٹا میں ساقی
یہ کون بجا رہا ہے شیریں بربط
بھیگی ہوئی بارش کی ہوا میں ساقی

جوش

ہو کے بی اے پیٹ بھرنا ہو گیا مشکل مجھے

کرلیا ہے عاشقوں کی لسٹ میں شامل مجھے　　جان کر اس شوخ نے مخبوط و لایعقل مجھے
کر دیا قابل بنا کر تم نے ناقابل مجھے　　ہو کے بی. اے پیٹ بھرنا ہو گیا مشکل مجھے
میری کشتی کب ہوئی موجِ حوادث کا شکار　　وائے حسرت جب نظر آنے لگا ساحل مجھے
حضرت دل دیکھنے میں ہیں جو اتنے مردِ نیک　　ہے انہیں قبلہ کے ہاتوں زندگی مشکل مجھے
روکھی روٹی کس طرح کھاؤں گا چٹنی کے بغیر　　دق نہ کیجیے، جائیے، لا دیجئے اک بِل مجھے
یا تو میں تھا ایک دن سارے جہاں کا ستر پوش　　یا پنہاتی ہے لنگوٹی ماچسٹر مِل مجھے
کیا خبر تھی ورنہ کہہ دیتا سرِ روزِ جزا　　اور سب چیزیں عطا کرنا نہ دینا دل مجھے
خدمتِ دیں کے لئے میں نے کمر باندھی تو ہے　　کر نہ لے دنیا اگر اپنی طرف مائل مجھے
جیب سے میری نکلوا ہی لئے چندے میں دام　　آج تو واعظ نے اپنا کر لیا قائل مجھے
تیزیِ رفتار میں میری نہیں آنے کا فرق　　کیوں ڈرانا چاہتی ہے دوری منزل مجھے

میں نے اپنی شاعری کی داد پالی شکر ہے
آج احمق کہہ دیا اس شوخ نے جاہل مجھے

صلاح۔ احمق پھپھوندی

تم پھر اسی طرح سو جاؤ

از سید حسن ریاض

فریدوں اور خورشید دونوں ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور اتفاق سے دونوں کو کمرے بھی متصل ہی ملے۔ دونوں پونا کی ریس اور پونا میں برسات کا خوشگوار موسم گزارنے کے لئے آئے تھے۔

خورشید برجس، کوٹ، ہیٹ پہنے اور ہاتھ میں سواری کا چابک لئے اپنے کمرے سے برآمد ہوئی۔ اونچی ایڑی کا لیڈی شو اور کانوں میں نسیلم کے آویزے نسائیت کے آثار میں بس یہی دو چیزیں نمایاں تھیں۔ ہاں اور ایک حسین چہرہ بھی جس پر خود اس کو بھی ناز تھا۔ پیشانی اونچی، چوڑی ہموار آئینے کی طرح روشن، آنکھیں نشیلی چمکدار، رخسار گلرنگ، ناک سانچے میں ڈھلی ناک، لمبی ڈھلواں گردن پر اس کا سر و چہرہ ایسا زیبا جیسے بلوریں گلدان پر گلدستہ۔ اس چست سپاہیانہ لباس نے اس کے حسن کو کیسا فروغ دیا ہے! جسم کے سارے ڈھلاؤ اور ابھار نمایاں ہوگئے ہیں۔ طاقتور اور تندرست جسم کی تمام زینتوں کے ساتھ اس کا دراز قد ایک متحرک نقشہ بن گیا ہے۔

فریدوں ابھی اپنے کمرے کے دروازہ میں کھڑا ہوا ٹائی باندھ رہا تھا کہ خورشید سامنے سے گزری۔ فریدوں متحیر رہ گیا۔ جب تک وہ برآمدے اور صحن سے گزر کر زینے میں نہ چلی گئی وہ یونہی بُت بنا ہوا تکتا رہا۔ "بڑی حسین عورت ہے! کون ہے؟"

فریدوں کے پاس پورے سیزن کا فرسٹ کلاس ٹکٹ تھا۔ جس وقت وہ انکلوژر (Enclosure) میں داخل ہوا اس کو ڈگلس مل گیا۔ ڈگلس اور فریدوں نے اکسفورڈ میں ساتھ تعلیم پائی تھی۔ دونوں نے بڑے جوش سے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور جوش سے جھٹکا دیا اور دونوں ساتھ ساتھ کرسیوں کی اگلی قطار کی طرف بڑھے۔ کرسیوں پر ٹوپیاں رکھ کر دونوں کھڑے باتیں کرنے رہے۔ دوڑ شروع ہونے میں ابھی دیر تھی مگر گفتگو دوڑ ہی کے متعلق ہوئی تھی۔ فریدوں نے کہا نیری کوئین اس دوڑ میں اوّل آئے گی۔ ڈگلس نے اس پر قہقہہ لگایا اور بولا آپ کو شاید گھوڑوں کی ہسٹری نہیں معلوم ریکا جیتے گا۔ بڑا طاقتور جانور ہے۔ اتنے میں ڈگلس کے شانے پر کسی نے پیچھے سے ہاتھ رکھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا "آئیں خورشید، تم کب آئیں؟"

"کل رات کو"

"کراچی میں تو تم نے بالکل ذکر نہیں کیا"

"مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ تم بھی یہاں آنے والے ہو"

"خوب، آؤ تمہیں اپنے دوست فریدوں سے ملائیں" اور فریدوں کی طرف مڑ کر ڈگلس نے کہا "فریدوں! مس خورشید سے ملو یہ ٹینس کی مشہور کھلاڑی ہیں اور ریس سے انہیں جیسی دلچسپی ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ کراچی سے پونا تک سفر کر کے آئی ہیں۔ گھوڑے پر خوب بیٹھتی ہیں، پولو بھی کھیلتی ہیں۔ بہت لائق ڈاکٹر ہیں نشتر اور دوا علاج کے ان دونوں طریقوں میں انہیں پوری مہارت ہے مگر ملازمت سے متنفر ہیں اپنے طور پر مطب کرتی ہیں" پھر خورشید سے مخاطب ہو کر بولا "فریدوں میرے پرانے دوست

میں۔ آکسفورڈ میں ہم دونوں نے ساتھ تعلیم پائی ہے۔ یہ اب کوئینس کالج بمبئی میں انگلش لٹریچر کے پروفیسر ہیں۔ گھوڑے کے معاملہ میں ان کی اور ہماری دلچسپیاں ایک ہیں۔"

دونوں نے ہاتھ ملایا۔ فریدوں نے از راہ تپاک سر جھکا کر کہا "آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ خورشید نے بہت ہی شہریت آمیز لہجہ میں کہا "میں بھی بہت خوش ہوئی۔"

خورشید، فریدوں اور ڈگلس تینوں بیٹھ گئے۔ اس طرح کہ خورشید بیچ میں فریدوں اور ڈگلس دائیں بائیں۔

پہلی دوڑ ہوئی۔ واقعی نیری کو ئین آگے آئی۔ فریدوں ایک ہزار روپیہ جیتا۔ ڈگلس سو روپے ہارا۔ خورشید نے کچھ نہیں لگایا تھا۔ خورشید اور ڈگلس نے فریدوں کو مبارکباد دیں۔

پھر متواتر دوڑیں ہونے لگیں۔ فریدوں کا اندازہ اکثر صحیح نکلا۔ خورشید اس معاملہ میں اس کی ایسی معتقد ہوئی کہ جب کسی گھوڑے پر اس نے کچھ لگایا فریدوں سے مشورہ ضرور کیا۔ خورشید اور فریدوں دونوں جیت کر اٹھے ڈگلس ڈھائی سو روپے ہارا۔ فریدوں نے خورشید اور ڈگلس کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ ڈگلس کہیں اور ٹھہرا تھا وہ اپنی قیامگاہ پر چلا گیا۔ فریدوں اور خورشید اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل میں آگئے۔ خورشید کو یہ وہیں ریس کورس (دوڑ کا میدان) پر معلوم ہوا کہ فریدوں بھی ریج ہوٹل (Redge Hotel) میں مقیم ہے۔

ٹھیک آٹھ بجے خورشید ایک ہلکے اودے رنگ کی زریں ساری پہنے ہوئے لونڈر میں نہائی ہوئی آئیں۔ فریدوں نے بڑھ کر بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ دو چار منٹ کے اندر ہی ڈگلس بھی آگیا۔ ذرا دیر کے بعد تینوں کھانے کے کمرے میں گئے۔ بیشتر پر دوڑ ہی کی گفتگو رہی۔ خورشید نے کل کی دوڑ کے متعلق بڑے اشتیاق سے سوالات کئے اور فریدوں نے اعتماد کے ساتھ پیشین گوئیاں کیں۔

خور نے ایک مرتبہ جوش سے کہا "گھوڑوں کے متعلق آپ کی رائے حیرت انگیز ہے آپ نے آج ہی کئی مرتبہ عام توقعات کے خلاف رائے دی اور وہ صحیح نکلی۔"

ڈگلس نے مسکرا کر کہا "اچھا اب خوشامد میں لگی ہو بہت سا روپیہ جیتنے کو جی چاہ رہا ہے۔ فریدوں مشورہ کی فیس مقرر کر دو"

"اچھا خوشامد ہی سہی تمہیں کیوں جلن ہوئی" خورشید نے یہ ایسی شوخی سے کہا کہ فریدوں، ڈگلس اور پھر خود ہی خورشید بھی، تینوں خوب ہنسے۔ کھانے کے بعد تینوں اسموکنگ روم میں جا بیٹھے۔ فریدوں نے کہا "افسوس ہے کوئی چوتھا آدمی نہیں ہے برج کھیلتے"

ڈگلس نے طنز سے کہا "جی نہیں دو آدمی اور چاہئیں انہیں برج سے دلچسپی نہیں ہے۔"

فریدوں حیرت سے خورشید کی طرف دیکھ کر بولا "برج سے دلچسپی نہیں ہے؟"

خورشید نے ذرا منہ بنا کر جواب دیا "جی ہاں بالکل نہیں۔ میں اس کی قائل نہیں ہوں کہ ہر مروجہ چیز سے شغف پیدا کیا ہی جائے۔"

ڈگلس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا "اس پر آپ کو دعوے ہے کہ بیسویں صدی کی آپ بہترین عورت ہیں۔"

خورشید نے بے باکی سے جواب دیا "کیوں نہیں میں سوسائٹی کے عام میلانات کی رَو کے ساتھ نہیں بہتی۔ ہر چیز کے متعلق میری ایک اپنی رائے ہے اُسی کی پابند ہوں"

ڈگلس خوب ہنسا "فریدوں تم نے سنا جتنی اچھی چیزیں ہیں آپ کو سب سے نفرت ہے، شراب سے نفرت، برج سے نفرت، عشق سے نفرت، ناچ سے نفرت!"

بیشک مجھے ان چیزوں سے نفرت ہے اور اس کی معقول وجوہ ہیں۔ جب لوگوں کا پاگل ہونے کو جی چاہتا ہے تو وہ شراب پیتے ہیں، شراب نوشی سے بالآخر صحت خراب ہو جاتی ہے۔ میں جسمانی صحت کو ہر چیز پر مقدم رکھتی ہوں۔ ورزش کی عادی ہوں۔ برج محض جوا ہے۔ یورپین ناچ سے بھی مجھے نفرت ہے۔ مجھے اس میں کوئی ہنر اور حسن نہیں معلوم ہوتا۔ میرے خیال میں تو لوگ اس کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اس سے جذبات رذیلہ میں ایک اشتعال پیدا ہوتا ہے اور یہی اعصاب کے لئے سخت مضر ہے۔ عشق سے مجھے نفرت ہرگز نہیں

لیکن اس کے متعلق میرا نظریہ کچھ اور ہے" خورشید یہ کہہ کر مسکرائی اور پہلے ڈگلس کی طرف اور پھر فریدوں کی طرف اُس نے معنی خیز نظر سے دیکھا

ڈگلس نے شرارت سے کہا "نہیں نہیں فرمائیے جائیے شرمانے کی کوئی بات نہیں آپ تو ہر چیز کو طبی نظر سے دیکھتی ہیں"

خورشید پہلے تو نہ شرمائی تھی لیکن ڈگلس کے اس فقرے پر وہ واقعی شرما گئی اس نے بمشکل اپنی نسائی فطرت کو مغلوب کرکے پھر بولنا شروع کیا " یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی مرد نے کسی عورت کو دیکھا یا کسی عورت نے کسی مرد کو دیکھا اور بس عشق ہوگیا - ہُو، ہا، کرنے لگے - میرے خیال میں یہ دونوں ایک دوسرے کو اور شاید اپنے، اپنے نفس کو بھی دھوکا دیتے ہیں - یہ تیر نظر اور پیکان ابرو میری سمجھ میں نہیں آتے - پھر یہ ہوں بھی تو لگتے کہاں ہیں وہ جگہ مجھے کہیں نظر نہیں آتی" - یہ کہہ کر خورشید خوب ہنسی اور پھر ذرا سنبھل کر متانت سے اس نے بولنا شروع کیا " میں جسم انسانی کی تشریح سے اچھی طرح واقف ہوں - سائیکالوجی (فلسفہ جذبات) اور اناٹمی (علم تشریح) کا میں نے خوب مطالعہ کیا ہے - مجھے اس قسم کے بے غرض جذبہ کا کہیں پتہ نہیں لگتا ہے جسے لوگ عشق کہتے ہیں جسم کی تمام رغبتیں جسمانی ہیں - محبت بھی انھیں میں سے ایک ہے، اور یہ شدت سے جسمانی ہے"

اس تقریر سے فریدوں کے دل میں ایک چوٹ سی لگی اعصاب اس طرح جھن سے ہوکر رہ گئے جیسے ستار کے تاروں پر کسی نے بے قاعدہ ہاتھ مار کر چھوڑ دیا - اس نے دل میں کہا یہ حکیم سے عشق کیونکر نبھے گا!"

خورشید نے فریدوں کی اس حالت کو محسوس کیا اور دل میں ہنسی - مگر فریدوں بھی جوان رعنا تھا - کیسا جسیم اور کیسا حسین! خورشید محبت کی قائل نہ ہو، اس کو نفسانی میلان کہے لیکن اس کی نسائیت بھی فریدوں کی رعنائی اور وجاہت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی - خورشید نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی اور ساتھ جمائی بھی آئی - اس کے بھرے ہوئے سینے کا پورا اُبھار نمایاں ہوگیا سینہ پر ہاتھ رکھ کر وہ سیدھی ہوئی تو نیند کے خمار سے آنکھوں کی پتلیاں چڑھی ہوئی تھیں - فریدوں کے دل پر بجلیاں گر پڑیں - ڈگلس نے خورشید کی طرف ہوسناک نظروں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہدیا - خورشید نے میز کی آڑ سے اس کو ٹھینگا دکھایا - ڈگلس قہقہہ لگا کر بولا " ارے تو یہ! فریدوں تم نے کچھ اور بھی سنا انہوں نے انگلستان میں ٹھگ بازی کی مشق کی ہے اور اپنے دوستوں کے کان پر اکثر اس مشق کو تازہ کرتی ہیں - میں تمہیں متنبہ کئے دیتا ہوں"

فریدوں نے حیرت سے پوچھا "کیا واقعی؟"

ڈگلس نے کہا "واقعی" اور پھر خورشید کی طرف دیکھا -

خورشید نے مسکرا کر نظر نیچی کرلی اور آہستہ سے بولی " بوکسنگ (مکہ بازی) کب میں نے تو فینسنگ (تکرار کا فن) بھی سیکھا ہے - ہر شخص کو حفاظت خود اختیاری کے فنون سیکھنے چاہئیں" خورشید یہ کہتی ہوئی اُٹھی "اب اجازت دیجئے نیند آرہی ہے - گیارہ بجنے کو ہیں" اس کے ساتھ ہی ڈگلس اور فریدوں بھی اُٹھے فریدوں نے دونوں کو رخصت کیا -

---

ڈگلس دو چار روز کے بعد چلا گیا لیکن فریدوں اور خورشید ٹھہرے - گھوڑ دوڑ کے علاوہ سیر و تفریح بھی اُن کا مقصد تھا - اس دوران میں فریدوں اور خورشید کے تعلقات بہت بڑھ گئے - دونوں نے بنگلور کا سفر بھی ساتھ ہی کیا - ساتھ ہی ساتھ ریس دیکھنے جاتے، ساتھ ہی ساتھ ٹہلنے جاتے - دن کا زیادہ حصہ ایک جگہ بیٹھ کر گزرتا - کبھی فریدوں کے کمرے میں اور کبھی خورشید کے کمرے میں -

فریدوں خورشید کے عادات و خصائل دیکھ دیکھ کر حیران تھا - ایک عجیب قسم کی خودداری کہ اُس کو اگر تکبر بھی کہدیں تو بے جا نہیں - حرکات و سکنات میں کچھ مردانہ بیباکی سی، ہر معاملے میں خود رائے، اپنے دماغی اور جسمانی قویٰ پر پورا اعتماد، اسقدر تعلقات کے باوجود فریدوں کا چھوٹا سا احسان بھی گوارا نہیں - پھر نہایت سپاہی منش ہونے کے باوجود نسائی دل آویزیاں بدرجۂ اتم موجود - فریدوں خورشید سے مرعوب ہوگیا - مگر ہوسیں روز بروز ترقی پر تھیں اپنے خیال میں فریدوں صاحب خورشید پر عاشق ہوگئے - لیکن خورشید فریدوں سے اسی دوستانہ بے باکی سے ملتی رہی - جب جی چاہتا فریدوں کو بُلا بھیجتی - اُس کے ساتھ ٹینس کھیلتی، اس کے ساتھ میلوں ٹہلتی مگر صنفی رغبتوں کا اُس کی طرف سے کوئی اظہار نہ ہوا -

فریدوں دن میں دس دس مرتبہ ہمت باندھتا کہ آج جو دل میں ہے سب کہدوں گا، خورشید نہ کھنچتی تھی نہ شرماتی تھی، نہ اس کو کسی گفتگو سے باک تھا مگر فریدوں ہر دفع اظہار تمنا میں ناکام رہا - خورشید کا ہیبت کو نئے زاویۂ نگاہ

سے دیکھتا فریدوں کو سہانے ہوئے تھا۔

ایک روز شب کو کھانے سے بہت دیر بعد، فریدوں معمولی مطالعے سے فارغ ہو کر سونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ خورشید آگئی۔ ایک بسنتی سوتی سفید ساری پہنے ہوئے۔ اسی کپڑے کی بٹنوں والی پھنسی ہوئی چولی، گویا ہمیں محض کپڑے کا دھوکا۔ اس کے جسم کا گلابی رنگ اس میں سے صاف جھلک رہا تھا۔ لاابالی انداز سے شانوں پر ساری کا آنچل پڑا ہوا۔ وہ بے تکلفی سے آرام کرسی پر دراز ہوگئی اور ساری کا آنچل جو شانوں پر پڑا ہوا تھا ہاتھ میں لے لیا اور مکھ چوری کی طرح ہلانے لگی۔ فریدوں کو نشہ سا ہو گیا یکبارگی وہ کرسی سے اٹھا اور خورشید کے پیروں پر اس نے سر رکھ دیا۔ خورشید زور سے ہنسی "ہائیں یہ کیا، ارے سیدھے ہو کر بیٹھو۔ یہ کیا حماقت ہے! ارے ارے بات تو کہو!" خورشید نے جھک کر فریدوں کا سر اپنے پیروں پر سے اٹھایا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"کیا جنون ہو گیا ہے؟"

"مجھے تم سے عشق ہے۔"

"مجھے تم سے عشق ہے" منہ چڑا کر تحقیر کے لہجے میں خورشید نے فریدوں کی نقل کی" احمق آدمی، یہ فضول باتیں کسی شاعرہ سے کرنا وہی تمہیں خوب داد دے گی۔ وہ تمہیں احمق بنائے گی تم اسے احمق بنانا میں ان بے معنی باتوں کی قائل نہیں ہوں۔ عشق ہے تو عشق کرو۔ میں نے عشق کرنے کو کب منع کیا ہے۔ مجھے دیکھا کرو، شعر کہا کرو، یہ بے قراریاں کاہے کے لئے ہیں، یہ پیروں پر سر کیوں رکھا جا رہا ہے۔ وہی جسمانی ضرورت، وہی نفسانی طلب، میں حیران ہوں لوگوں کو حقیقت سے اس قدر گریز کیوں ہے؟۔ فریدوں، ادھر میری طرف دیکھو اور میری ایک ایک بات کا جواب دیتے جاؤ۔"

فریدوں کچھ سہما ہوا سا اٹھ کر مسہری کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

خورشید:۔ تمہیں مجھ سے کیوں عشق ہے؟

فریدوں:۔ (آہستہ سے) "تم بہت خوبصورت ہو۔"

خورشید:۔ (مسکرا کر) "خوبصورتی کا تعلق صرف دیکھنے سے ہے تم مجھے جب چاہو دیکھ سکتے ہو میرا تم سے پردہ کرنے کا ارادہ نہیں ہے"

فریدوں نے کوئی جواب نہ دیا

خورشید:۔ (ہنسی کو ضبط کر کے) "کیا آپ شرما رہے ہیں؟"

فریدوں بدستور چپ ہے۔

خورشید کو ہنسی آگئی وہ اضطراراً کرسی سے اٹھی۔ اس کی ساری کا بالائی حصہ شانوں سے ڈھلک کر کچھ کرسی کے بازو میں الجھا اور کچھ فرش پر گرا وہ اسی طرح آگے بڑھی۔ ایک ہاتھ اس نے فریدوں کے شانے پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کو کیا۔ فریدوں نے دونوں ہاتھ خورشید کی کمر میں ڈال دیئے۔ خورشید نے دونوں ہاتھوں سے فریدوں کو پیچھے دھکیلا۔ دونوں چپٹ کر مسہری پر گرے اور دیر تک اس طرح پڑے رہے جیسے بے ہوش ہوں۔

بالآخر خورشید نے ایک نرم قہقہے کے ساتھ کہا" بس اب سیدھے ہو کر بیٹھو بہت عشق ہو لیا" اس نے بمشکل فریدوں کو الگ کیا۔ سانس چڑھی ہوئی، دل دھک دھک کر رہا ہے، ہاتھ پیروں میں سنسناہٹ، بال بکھرے ہوئے، ساری پیروں میں لپٹی ہوئی، اس حال سے وہ کرسی پر آکر گر گئی۔

ایک ہاتھ سے اس نے بال درست کئے دوسرے ہاتھ سے ساری سمیٹ کر بے پروائی سے سینے پر ڈال لی۔ فریدوں وہیں مسہری کے تکیے سے لگ کر بیٹھ گیا۔

جب ذرا حواس بجا ہوئے تو خورشید ہنس کر بولی" فریدوں اب بتاؤ یہ وہی عشق ہے جسے تم کوئی روحانی یا دماغی رفعت سمجھتے ہو یا جیسا میں کہتی ہوں محض جسمانی طلب ہے؟ اگر تم اب بھی یہ کہہ دو کہ تم بس اسی حد پر قناعت کرو گے تو میں بہت سی مخالف دلائل کے باوجود میں عشق کے اس شاعرانہ تخیل کی قائل ہو جاؤں جس پر تمہارے ادب اور شاعری کی بنیاد ہے۔ کہو"

فریدوں نے مسکرا کر نیچے نظر کر لی

خورشید نے اپنے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر پھر کہنا شروع کیا۔

"تم کہو گے کیا تمہارے دل و دماغ میں اور ہر بُن مو میں خواہشوں کا ایک جہنم بھڑک رہا ہے۔ میں تمہیں ملامت نہیں کرتی، خود میری بھی یہی حالت ہے میں اپنی حالت ہی سے تمہاری حالت کا اندازہ کر رہی ہوں۔ تم جانتے ہو میں نے ساری عمر انسان کی جسمانی حالت کا مطالعہ کیا ہے۔ محض پیشے کے طور پر

نہیں بلکہ شوق سے، طالبعلمانہ، محققانہ، اور اب بھی اسی میں مصروف ہوں۔ ابھی یہ جو کچھ ہوا سب مطالعہ تھا۔

فریدوں معنی خیز انداز میں مسکرایا خورشید جھینپ گئی مگر پھر سنبھل کر اس نے سلسلۂ تقریر شروع کیا " میں نے جس وقت سے تمہیں ریس کورس میں دیکھا ہے مجھ پر بھی وہی کیفیت طاری ہے جسے تم عشق کہتے ہو مگر میں اپنی رغبتوں اور میلانات کے دھوکے میں نہیں آئی۔ میں نے اپنی خواہشوں اور تمناؤں کا خوب تجزیہ کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ کسی نامعلوم جسمانی مناسبت اور نفسانی پسند کی وجہ سے میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمہیں اپنے لئے مخصوص کر لوں۔ یہی تمہارا ابھی حال ہے۔ تم اپنے نفس کو اور مجھے دھوکا دیتے ہو میں یہ نہیں کرتی "

فریدوں نے طعن سے کہا " محض جسمانی ضرورت کے لئے تخصیص اور انتخاب کی کیا ضرورت ہے؟"

خورشید نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا " ہاں اگر سطحی نظر سے دیکھئے تو یہ اعتراض ہو سکتا ہے مگر غلط ہے۔ جسم ہر قسم کے کپڑے سے ڈھک جاتا ہے پھر یہ کیوں ہے کہ پوری دوکان میں سے آپ نے سوٹ کے لئے کسی خاص ہی وضع کا کپڑا پسند کیا۔ تمہیں گھوڑے کا شوق ہے۔ اگر تم گھوڑا خریدنے جاؤ تو ہر اس گھوڑے کو نہیں خرید دگے جو پہلے تمہارے سامنے آ جائے حالانکہ ہر گھوڑا سواری دینے کی قابلیت رکھتا ہے۔ گھوڑا خریدنے کے ارادے کے ساتھ تمہارے ذہن میں بلا ارادہ اس گھوڑے کا تصوّر پیدا ہوگا جو تمہیں مرغوب ہے اور پھر اسی تصوّر کے مطابق تم تلاش کرنا شروع کرو گے یہاں تک کہ ویسا ہی یا تقریب قریب ویسا ہی نہ مل جائے۔ اور جس وقت وہ مل جائے گا تم اس کے شیفتہ ہو جاؤ گے۔ ہر شخص ہر چیز کا انتخاب اپنے مذاقِ طبیعت کے مطابق کرتا ہے۔ مذاقِ طبیعت اسی تصوّر کا نام ہے جو ہر مطلوبہ چیز کی ضرورت پیدا ہونے کے ساتھ دماغ میں آتا ہے۔

میں نے سارے یورپ کی سیر کی ہے ہندوستان میں بھی بہت پھری ہوں۔ کوئی کونے کی بیٹھنے والی شرمیلی کنواری لڑکی نہیں ہوں۔ گو کنواری ضرور ہوں " یہ کہہ کر وہ بہت ہی شوخ انداز سے ہنسی " ہر طبقے کے مردوں سے میرے دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے حسین اور رعنا جوان بھی تھے اور بعض عورتوں کے نزدیک وہ تم سے کہیں زیادہ دلفریب ہوں گے ان میں سے بعض نے میری طرف دستِ ہوس بھی دراز کیا مگر (ٹکہ دکھا کر) میں نے اُن کی اس سے تواضع کی۔ وہ میرے مذاقِ طبیعت کے مطابق نہ تھے۔ مذاقِ طبیعت کی تشریح یہ ہے کہ سارڈین مچھلی پر انگریز جان دیتا ہے۔ اس کی بُو سے اس کو بھوک لگتی ہے۔ لیکن اگر ہندوستانیوں کے مجمع میں تم اس کا ٹین کھول دو تو کئی کو استفراغ ہو جائے گا۔ ان کی طرف سے اظہارِ رغبت پر میری بھی یہی حالت ہوئی "

" مگر جس وقت سے تمہیں دیکھا ہے جسمانی اشتہا ترقی پر ہے۔ تم اسی کیفیت کو یوں بیان کرو گے کہ دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ تیرِ مژگاں نے کلیجہ چھلنی کر دیا، سوزِ فراق سے جل رہا ہوں :

میں نے جو غور کیا تو تم اس تصوّر سے بہت مشابہ ہو جو مرد کے متعلق میرے ذہن میں تھا۔ اگر تمہاری رغبت ہنگامی نہیں ہے تو تم بھی ذرا دماغ پر زور ڈالو بہترین عورت کے متعلق جو تمہارا تخیّل ہے میں اُس سے قریب تر نکلوں گی "

اس دوران میں مجھے بھی ایک مرتبہ دھوکا ہوا کہ مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے اور یہ جذبہ جسمانی اور نفسانی میلانات سے بالکل الگ ہے اور کچھ ایسا معلوم ہوا کہ میرا ساری عمر کا نظریہ غلط ہوا جا رہا ہے مگر میں نے فوراً تہیّہ کر لیا کہ بغیر کامل تفتیش کے اپنی رائے نہ بدلوں گی"

" میں آج ناوقت اور اس وضع سے" یہ کہہ کر وہ پھر ہنسی مگر اس مرتبہ حیا کے ساتھ " تمہارے کمرے میں اسی تفتیش کی تکمیل کے لئے آئی تھی۔ ابتدائی منازل سب میرے ذہن میں ہیں ان میں ہر ایک آپ کے سے لوگوں کے لئے مضمونِ شعر ہے۔ تمہارے ہی الفاظ میں اُن منازل کا نام لوں تو وہ یہ ہوئیں۔ شوقِ دیدار، بس ایک جھلک، پھر نظر بھر کر، پھر جی بھر کر، تصوّر کئے بیٹھے رہیں اسی میں ساری عمر گزر جائے، اس کے بعد میں تجھے دیکھا کروں اور تو مجھے دیکھا کرے، گویا مشاہدۂ دوام۔ اس سے بھی تجاوز کرنے کو جی چاہا اور نفس نے یہ دھوکا دیا کہ پھر کوئی تمنا نہیں ہو سکتی۔ میں جانتی تھی کہ یہ جھوٹ ہے مگر میں آئی اور میں نے اس فریب کو بھی دور کر دیا " خورشید مسکرائی اور ترچھی نظر کر کے شوخی سے بولی " شاید تمہیں تو اب کوئی اور تمنا نہ ہوگی؟ کیوں؟ -

[redacted]

فریدوں نیچے کا ہونٹ دانتوں میں دبا کر مُسکرایا اور خورشید کو اُس نے پُر ہوس نظروں سے دیکھا۔

"نہیں نہیں آپ کو تو محض عشق ہے! حُسن کا پاکیزہ اشتیاق، دل کی لطیف وارفتگی، خیال کی رنگین مصروفیت" یہ کہہ کر خورشید زور سے ہنسی اور پھر بولی "کیوں فریدوں تم نے وینس کا بُت تو دیکھا ہے۔ کیا اس کا ہر عضو میرے ہر عضو سے زیادہ حسین نہیں ہے؟ کیا تمہارے دل میں اُس کے لئے بھی یہی جذبات پیدا ہوئے۔ جن کا ابھی اظہار ہو رہا تھا۔ جب عشق نفسانی طلب اور جسمانی ضرورت سے کوئی بلند تر چیز ہے تو تم ٹہرے رہتے دھونی رمائی ہوتی۔ اُسی کے پیروں پر سر رکھا ہوتا، اسی کو سینے سے لگا یا ہوتا۔ اور اُسی کے بوسے لئے ہوتے۔ مگر وہ ٹھنڈا سفید پتھر تمہارے گرم جذبات کا جواب دینے کے قابل کہاں تھا۔ ذرا مجھے بتاؤ، تم نے کبھی سُنا ہے کہ کسی بوڑھی عورت نے اپنے بوڑھے شوہر کی موت پر خودکشی کرلی۔ یا بوڑھے مرد نے بوڑھی بی بی کی ناگہانی موت کو ناقابل برداشت محسوس کیا اور گولی مار لی۔ حالانکہ ان میں سے اکثر اپنی جوانی میں لیلےٰ مجنوں اور شیریں فرہاد ہوتے ہیں۔ یہ کیوں ہے کہ اس قسم کے حادثات صرف نوجوانوں ہی کے متعلق سُنے جاتے ہیں؟ یہ سب اسی آب ورنگ اور جوانی کی ترنگ کے کرشمے ہیں، جہاں یہ موج فرو ہوئی یہ جذبات کی طغیانی پایاب ہو جاتی ہے۔ جسم کے تمام میلانات جسمانی ہیں۔ ان کا وجدان اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یقیناً روح کی رغبتیں بھی کچھ ہوں گی مگر میں ان سے واقف نہیں" خورشید نے فتحمندانہ تیور سے فریدوں کی طرف دیکھا اور ہنسکر بولی "میری جسمانی اور مادی تحقیقات ختم ہولے تو پھر روحانی میلانات کی بھی تفتیش کروں گی۔ کسی صوفی کی شاگرد بنوں گی"

چھت کا برقی پنکھا برابر چل رہا تھا مگر کمرے کے وسط میں چونکہ مسہری بچھی ہوئی تھی اس لئے خورشید کی کُرسی تک ہوا اچھی طرح نہیں پہنچ رہی تھی۔ ذرا حبس جو ہوا تو خورشید کو پسینہ آگیا۔ اس نے گھبرا کر پہلے اِدھر اُدھر تلاش کیا اور پھر اپنے بائیں پہلو کے نیچے سے رومال کھینچا "اُف ہے کیسی گرمی ہوگئی ہے!" پیشانی اور رخساروں کا پسینہ پونچھا اور پھر گورے گورے گول گداز بازوؤں پر، سڈول کلائیوں پر اور ڈھلواں شانوں پر اس کو پھیرنے لگی۔ جسم کے جس حصے میں ذرا سا پسینہ آگیا تھا وہ حباب سی ساری چھت کر معدوم ہوگئی تھی۔ فریدوں نے جلدی سے میز کے پنکھے کا رُخ خورشید کی طرف کرکے اس کو تیز چلا دیا مگر ہاتھ کہیں اور نظر کہیں اور۔ فریدوں کی یہ حالت دیکھکر خورشید کو ہنسی آگئی۔ اُس نے دانتوں میں اپنا ہونٹ دبالیا اور اس طرح جیسے دیکھا ہی نہیں دونوں ہاتھ سر سے اوپر کُرسی کے تکیئے پر دراز کرکے آنکھیں بند کرلیں۔ گویا پسینہ تھا ٹھنڈی ہوا بہت ہی اچھی معلوم ہوئی۔

فریدوں وہیں میز سے لگ کر چُپ کھڑا ہوگیا۔ ادہر بھی عالمِ تصویر، اُدہر بھی عالمِ تصویر۔ خورشید کی آنکھیں بند تھیں اور فریدوں متحیر اُس کو تک رہا تھا فریدوں نے دل میں کہا "احمق کہتی ہے کہ میں وینس کے پیر کے تلوے کی ہوا بھی نہیں ہوں" اور اس خیال کے ساتھ اُس نے سینے پر ہاتھ رکھکر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ خورشید کو پھر ہنسی آئی مگر اُس سے پھر ضبط کیا اور اس طرح ایک طرف کو سر ڈھلکا دیا جیسے سوگئی۔ سانس کی آمد و رفت کا بھی وہی انداز جو نیند میں ہوتا ہے۔ رات زیادہ گزر چکی تھی اس طرح نیند آجانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اس حالت کو بھی ایک بیس منٹ گزر گئے۔ فریدوں کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ اس تلاطمِ جذبات میں جس کا خورشید سے اضطراراً کئی دفعہ اظہار ہوا نیند کیسے آگئی۔ اس نے آہستہ سے ایک چھوٹی بید کی کُرسی اُٹھا کر خورشید کے قریب بچھائی اور اس پر خاموش بیٹھ گیا۔

جب اس طرح بھی کوئی دس منٹ گزر گئے تو انگڑائی لیکر خورشید نے اپنی خمار آلود آنکھیں کھولدیں اور دونوں ہاتھ فریدوں کی طرف بڑھا کر اس کو پُر محبت نظروں سے دیکھا۔ فریدوں اُٹھا اور جسم بیجاں کی طرح خورشید کے اوپر گر پڑا۔ خورشید نے ایک ہاتھ فریدوں کی پُشت پر رکھ لیا اور دوسرا ہاتھ اُس کے بالوں پر پھیرنے لگی۔ وفورِ جذبات سے فریدوں کی آنکھیں بند ہونے لگیں دماغ پر ایک نیم خوابی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

فریدوں کے اس اشتیاق اور حدتِ جذبات سے خورشید کے دل میں ایک عجیب مسرت اور انبساط کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس نے یکبارگی فریدوں کے گداز طاقتور بازو پکڑ کر اوپر کھینچا اور اس کا سر اپنے سینے سے اُٹھا کر دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر اپنی پیشانی فریدوں کی پیشانی سے متصل کرکے بولی "بہت محبت ہے" اور مُسکرائی۔ فریدوں نے اپنا سر خورشید کے شانے پر رکھدیا۔

وہ بغیر اس خوشبو کے اب ایک سانس بھی نہیں لینا چاہتا تھا جو کسی عمدہ قسم کے فرانسیسی لیونڈر اور خورشید کے پسینے سے مرکب ہو کر آرہی تھی۔ خورشید نے بھی اپنے دونوں ہاتھ فریدوں کے گرد حلقہ کر دیئے اور اس اُمنگ کی کیفیت میں گم ہوگئی جو اس کی رگ و پے میں ساری تھی۔

بڑی دیر کے بعد خورشید نے اپنی کلائی نظر کے سامنے کر کے گھڑی دیکھی اُف دو بج گئے" نرمی سے اُس نے فریدوں کا شانہ ہلایا "بس اب جلد میں جاؤں گی"۔ فریدوں نے اس کے جواب میں اضطراری حرکات شروع کیں۔

"آئے واہ واہ کیا خوب!" یہ کہہ کر خورشید نے فریدوں کو دونوں ہاتھوں سے پوری قوت کے ساتھ دھکیلا اور کرسی کے بازو پکڑ کر سیدھی بیٹھ گئی۔ فریدوں پھسک کر فرش پر آرہا اور کھسیانہ ہو کر ہنسنے لگا "تم ہی تو کہتی ہو کہ یہ سب جسمانی طلب ہے"۔

خورشید نے تیور پر بل ڈال کر طعن سے کہا "جی ہاں اس لئے کہتی ہوں کہ آپ آزادی سے اپنی ہوسیں پوری کریں" یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی، ساری درست کی، بال یکجا کر کے آدھے آدھے کئے اور دونوں شانوں پر ڈال لئے، ساری کے سوٹ کے ساتھ بھی بالوں کے متعلق اس کا اس کی یہی دستور تھا، اور چلنے لگی۔ فریدوں نے بیٹھے ہی بیٹھے پیچھے سے اُس کی ساری کا آنچل پکڑ لیا۔ خورشید نے پلٹ کر دیکھا اور بظاہر غصہ سے بولی "چھوڑو بھی جانے دو" فریدوں نے کچھ نہ کہا اور سر جھکا کر ساری کو اور زور سے پکڑ لیا خورشید پھر پیچھے ہٹ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی "اچھی بات ہے میں بھی یونہی بیٹھی ہوں دیکھوں کب تک نہ چھوڑو گے" لہجے میں ابھی تلخی باقی تھی۔ فریدوں نے اپنا سر خورشید کے گھٹنوں پر رکھدیا، خورشید کو ہنسی آگئی "عجیب آدمی ہو!"

فریدوں نے آہستہ سے کہا "تم خفا ہوگئیں"

"نہیں میں خفا نہیں ہوں، باؤلے مت بنو، سامنے کرسی پر جا کر بیٹھو، میں جاؤں گی نہیں۔ تم سے باتیں کرتی ہوں"

فریدوں اس کی ساری چھوڑ کر خاموش کرسی پر جا بیٹھا۔

خورشید بہت متانت سے بولی "فریدوں شاید تمہیں تعجب ہوگا مردوں سے اس قدر اختلاط کے باوجود میں نے اور کسی کو تپاک کی عام حدود سے بھی تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دی۔ میں نے ہمیشہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ کچھ گناہ کے خوف سے نہیں۔ میں کسی مذہب کی پابند نہیں ہوں۔ مگر چونکہ ماں باپ کا مذہب زرتشتی تھا اس لئے لوگ مجھے بھی اسی مذہب کا پیرو سمجھتے ہیں۔ مجھے اس کی تردید کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوئی، مگر میں اس اجتماعی خلفشار کی بھی نہیں ہوں جو شاید کمیونزم کے اثر سے روزبروز دُنیا میں مقبول ہو رہا ہے۔ سوسائٹی نہ ہوئی جانوروں کا غول ہوگئی میں شادی کو بہت ضروری سمجھتی ہوں اور طرفین کو طلاق کا حق حاصل ہونے کے ساتھ زن و شوہر کے معاملے میں دائمی تخصیص کی مؤید ہوں۔ اور دوسری اہم مصلحت سے قطع نظر یہ بالخصوص اس لئے کہ اولاد کے حقوق کی حفاظت ہو جائے۔ میں عورتوں اور مردوں کے غیر متعین تعلقات کی شدت سے مخالف ہوں اور جرم سمجھتی ہوں۔ ماں اس کی ذمہ دار ہے کہ اولاد کو اس کے باپ کا پتا بتائے اور امکان ولادت سے قبل اس کا قانونی تحفظ کر دے کہ باپ پدری فرائض انجام دینے سے انکار نہ کر سکے۔ میں ان غیر ذمہ دارانہ اور اضطراری حرکات کی قائل نہیں ہوں جن کے آپ در پئے ہیں،

فریدوں نے نادم ہو کر کہا "میں تو تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"

خورشید نے مستعدی سے جواب دیا "میں آمادہ ہوں۔ میں نے پہلے ہی بلا تصنع تم پر اپنے جذبات کا اظہار کر دیا ہے۔ میں خود اپنے میلان کی بنا پر تمہیں اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتی ہوں لیکن چند شرائط ہیں اگر وہ تمہیں منظور ہوں تو کل یہیں معاہدہ رجسٹری ہوگا اور شادی ہو جائے گی"۔

فریدوں نے نہایت بے صبری سے کہا "مجھے سب شرائط منظور ہیں"۔

"نہیں نہیں ایک ایک غور سے سُنئے اور منظور کیجئے وہ شرائط رجسٹری ہونگی"

"اچھا کہئے صاحب کہئے۔ آپ آدمی نہیں جن ہیں"۔

خورشید نے مسکرا کر کہا "جی ہاں آج میں جن ہوں برسوں سے آپ جن ہو جائیں گے" اور پھر چہرے پر متانت پیدا کر کے بولی "اچھا سُنئے"

(۱) میں اپنا نام ترک نہیں کروں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ میں اپنے نام کے ساتھ تمہارا نام بھی شریک کر لوں۔ یعنی خورشید فریدوں کہلاؤں۔

(۲) میں تمہارے خانگی انتظامات کی ذمہ دار نہ ہونگی۔ ایک ہی مکان میں

یا علیحدہ علیحدہ مکان میں میرے اور تمہارے خانگی انتظامات بالکل جداگانہ ہوں گے۔

(۳) میں اپنا مطب (پریکٹس) جاری رکھوں گی جو کماؤں گی اسے جس طرح چاہوں گی صرف کروں گی۔ میں تم سے اپنی ضروریات کے لئے کچھ نہ لونگی۔

(۴) میں جن لوگوں سے چاہوں گی ملوں گی۔ سفر کے لئے یا کسی کام کے لئے تمہاری اجازت حاصل کرنا ضروری نہ ہوگا۔

(۵) بچّوں کی پرورش، تعلیم اور اُن کے جملہ اخراجات کے ذمّہ دار تم ہوگے اور ان ذمّہ داریوں کے اندازے اور تعیّن کا حصر مجھ پر ہوگا۔

(۶) زن و شو کے طبعی تعلقات میں مجھے اور تمہیں مساوی حقوق حاصل ہونگے۔ تم کسی اور عورت کو میرا شریک نہ کروگے اور میں بھی تمہیں اپنا تنہا حقدار سمجھوں گی۔ اگر اس جرم خیانت کا ہم میں سے کوئی مرتکب ہوگا تو ثبوت ملنے پر فوراً میرے اور تمہارے تعلقات منقطع ہوجائیں گے اور ہم میں سے جو شخص قصوروار ہوگا وہ اپنی پوری دولت کا نصف حصّہ جس میں نقد، منقولہ و غیر منقولہ ہر قسم کی جائداد شامل ہے فریق ثانی کو دیگا۔ اس صورت میں بھی اولاد کی پرورش کی ذمّہ داری تم ہی پر عائد رہے گی۔

اتنا کہہ کر خورشید خاموش ہوگئی۔

فریدوں نے مُسکرا کر کہا "بس"

خورشید نے متانت سے جواب دیا "بس"

فریدوں نے ذرا سوچکر کہا "مجھے سب شرائط منظور ہیں مگر تین شرائط کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں"

خورشید سنبھل کر بیٹھ گئی اور بہت ہی سنجیدگی سے جیسے کوئی اہم معاملہ درپیش ہے اور واقعی یہ معاملہ اُس کے نزدیک اہم ہی تھا بولی "کیا"

"دو دفعات کی ترمیم چاہتا ہوں اور ایک کی تشریح۔ ترمیم یہ کہ اگر میں اضطراراً (مسکرا کر) خیانت کا مرتکب ہوں تو تم الگ نہ ہوگی۔ جرمانے میں نصف دولت مجھے دینا گوارا ہے اور دوسرے یہ کہ میرا اور تمہارا باورچیخانہ اور خانگی انتظام ایک ہوگا۔ یہ اس لئے نہیں کہ خانگی ذمّہ داریوں کا تم پر بار ڈالنا مقصود ہے بلکہ بغیر اس کے لطفِ زندگی حاصل نہیں ہوسکتا۔"

خورشید نے ذرا تامّل کے بعد کہا "اور تشریح کس دفعہ کی مطلوب ہے؟"

"تشریح اس کی چاہتا ہوں کہ میرے روپئے سے اپنی ذات کے لئے اسقدر پرہیز کیوں اور پھر ان سخت مدبندیوں کے ساتھ بچّوں کے جملہ اخراجات کا ذمّہ دار تنہا مجھی کو کیوں قرار دیا۔"

"تمہارے روپئے سے پرہیز نہیں ہے بلکہ میں نے اس معاملے میں انصاف کیا ہے۔ جب میں تمہارے خانگی انتظامات کا بار اپنے سر لینے کے لئے تیار نہیں ہوں اور اپنا مطب جاری رکھنا چاہتی ہوں تو تمہارے روپئے پر میں اپنا کوئی حق نہیں سمجھتی۔ بچّوں کی پوری ذمہ داری تم پر اس لئے رکھی گئی ہے کہ اگر میں اس میں بھی شرکت کروں تو تم اپنا سب روپیہ ضائع کروگے اور میں ماں ہونے کی حیثیت سے جو زیادہ سے زیادہ ممکن ہوگا وہ بچّوں کے لئے محفوظ رکھوں گی۔ اس طرح پر تمہارے روپئے سے ان کی پرورش اور تعلیم ہوگی اور میرا بچایا ہوا روپیہ انکا سرمایہ ہوگا۔"

فریدوں نے زور سے قہقہہ لگایا "اچھا آپ کے خیال میں اولاد سے باپ کو بالکل محبّت نہیں ہوتی۔"

خورشید نے پُر زور لہجے میں کہا "بالکل نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنی اضطراری حرکات کے نتائج کا بھی اسی طرح ذمّہ دار ہوتا جس طرح وہ غریب مائیں ہوتی ہیں جو جذبات کے ہنگامی دفور سے مغلوب ہوکر اپنی زندگیاں خراب کرلیتی ہیں۔"

"بہت اچھا صاحب اب ترمیمات کے متعلق فرمائیے۔"

"پہلی ترمیم کے متعلق میرا جواب قطعی صاف ہے۔" خورشید نے اپنے سر کو حرکت دیکر نہایت متانت سے کہا "میں اضطراری اور عارضی حرکات کی نہ قائل ہوں نہ ان کا استثنیٰ کرسکتی ہوں اور اگر آپ کوئی استثنیٰ چاہتے ہیں تو وہ میرے لئے بھی ہوگا" آخری جملہ اس نے مُسکرا کر ادا کیا۔

"نہیں نہیں نہیں، ارے توبہ، نہیں ہرگز نہیں" فریدوں نے آخری الفاظ کہتے وقت اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور پھر ذرا توقف کے بعد اس طرح جیسے اس بات سے کوئی تعلق ہی نہیں دھیمی آواز میں مگر جوش کے ساتھ یہ گایا۔

باسایہ ترا نمی پسندم
عشق است و ہزار بدگمانی

خورشید مسرّت سے ہنسنے لگی۔

فریدوں نے پھر ذرا تامّل کے بعد سوال کیا "اچھا دوسری ترمیم کے متعلق

کیا کہتی ہو؟

خورشید نے مسکرا کر مگر استقلال کے ساتھ جواب دیا "معاہدے میں تو وہ قائم رہے گی لیکن عملاً اگر مجھے خوشگوار معلوم ہوا تو اشتراک ممکن ہے"

اور پھر تشفی آمیز لہجہ میں بولی " فریدوں میں تمہارے ساتھ نا انصافی نہیں کرنی چاہتی صرف مجھے اپنی ذات کو اور بچوں کو نا انصافی سے محفوظ کرنا منظور ہے۔ میں عشق کی یقیناً قائل نہیں لیکن ساتھ رہنے اور باہمی دلداری سے جو اخلاص پیدا ہوتا ہے اس کو مانتی ہوں۔ جس وقت میرے اور تمہارے درمیان یہ حالت پیدا ہو جائے گی تو یہ معاہدہ از خود بیکار ہو جائیگا، تمہیں پریشانی کیوں ہے؟"

فریدوں نے ذرا ندامت سے کہا " نہیں نہیں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے سب شرائط منظور ہیں" اور پھر لجاجت سے بولا " مگر ایک شرط میری بھی منظور کرو"

خورشید اپنی ساری کو درست کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی لبوں پر مسکراہٹ نظریں ترچھی " کیا؟"

فریدوں اُٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ گلے میں باہیں ڈال دیں اور کان کے قریب منہ کر کے آہستہ سے بولا " اسی کرسی پر پھر تم اسی طرح سو جاؤ میں دور سے بیٹھ کر دیکھتا رہوں گا اب میں تم سے ایک لمحہ بھی الگ نہیں رہ سکتا"

جی ہاں اگر تم سے ہمیشہ کے لئے الگ ہونے کا ارادہ ہو تو یہ کروں اور پھر فریدوں کے ہاتھ اپنے گلے سے نکال کر شوخی سے بولی " کل سے دیکھوں گی کہ مجھے سوتا ہوا دیکھنے کا کتنا شوق ہے اور کبتک قائم رہتا ہے" فریدوں کو شرارت سے دھکا دیکر خورشید جلدی سے باہر چلی گئی +

محبّت کا گیت

دیارِ عشق پہ مہتاب بن کے چھائے جا
شباب و شوق کی وادی میں جگمگائے جا

نقاب اُٹھا کے مرے دل کو لالہ زار بنا
ریاضِ خُلد کی رنگینیاں دکھائے جا

گلوئے حُسن سے نکلی ہوئی صداؤں کو
فضائے عشق میں وجد آفریں بنائے جا

سرور و نور میں ڈوبی ہوئی اداؤں سے
حریمِ عرصۂ آفاق کو سجائے جا

پلا پلا کے مئے حُسن دل کو گرما دے
دکھا دکھا کے جھلک روح میں سمائے جا

کہیں فلک کے ستاروں میں رقص فرما ہو
کہیں بہار کے پھولوں میں مُسکرائے جا

خموشیوں میں بیاباں کو دلنواز بنا
چمن کے جوئے سرود آفریں میں گائے جا

غرض کسی نہ کسی طرح اے نشاط افروز!
دلوں سے داغِ غمِ دوجہاں مٹائے جا

سرورِ جاں ہے محبت کا گیت اے تاثیر
تمام عمر یہی گیت گنگنائے جا

حمید احمد تاثیر

خمارستان کا ایک ورق

جوئی اور بارش کا قطرہ

آغا شاعر قزلباش دہلوی

(جوئی۔ ننھے قطرے سے) آؤ پیارے آؤ! ایک مُدّت سے آنکھیں بچھائے تمہارا راستہ دیکھ رہی تھی۔ اچھی۔ بولو۔ بتاؤ۔ آخر تم تھے کہاں؟۔ اللہ! اتنی بے رُخی۔ آج تک تم نے میری خبر بھی نہیں لی۔ مگر چلو جانے دو ان گِلوں شکووں کو اب خوشی کا سماں ہے۔ مسرّت کی گھڑیاں اور بالکل پاگل ہو جانے کا وقت ہے۔ میرے سرتاج .... میرے پیارے تم آگئے؟۔ بس بس اب تو ساری دُنیا کی خوشیاں گویا میرے ہی لئے ہیں صرف میرے لئے۔

بیلا (چنبیلی سے) دیکھتی ہو بوا! اس چھوکری کا دیدہ؟۔ اُوئی بجلی پڑے ایسے چاؤ پر۔ وہ جو کہتے ہیں جس کی اُترے ہی لوئی اُس کا کیا کریگا کوئی؟۔ ایک ننھا سا مینہہ کا قطرہ کیا آگیا کہ یہ بے شرم جیسے دیوانی ہی ہوگئی دیوانی۔ بلکہ اُودھل پڑی۔ نوج بُوا اس کا پرچھاواں بھی نہ پڑے کسی پر؟۔

چنبیلی۔ ہاں بہن! سچ کہتی ہو۔ یہ کس کا ذکر کر رہی تھیں تم؟۔

بیلا۔ اے بُوا۔ یہی جوئی۔ یہہ اتنی سی فِتنی؟ اور یہ بے شرمی! میں تو حیران ہوں یہ کونسا وقت آگیا ہے؟ تم نے دیکھا نہیں ابھی ابھی ذرا دیر پہلے۔ یہ کیسی مُنہہ پھُلائے بیٹھی تھی کہ میں تم سے کیا کہوں؟

اے لو۔ آن کی آن میں بس یہ ہی کہ یہ مُوا بارش کا ننھا سا قطرہ آ کر گرا بس یہہ کنواری کنیا آپے سے باہر ہوگئی۔

چنبیلی۔ ہاں بُوا کلجگ ہے یہ کلجگ۔ دوسرے یہ نادان اَکنواری بالی ہے نا۔ وہ کمبخت کیا جانے کہ اس سنسار میں کوئی بھی اعتبار کے قابل نہیں۔

جوئی۔ (پھر اپنی اُسی دُھن میں محو ہو کر) بولو۔ بولو! پران ناتھ کیا اب تک مجھ سے خفا ہو؟۔ آخر تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟۔

ننھا قطرہ۔ آہ پیاری۔ میں کیا بولوں؟ میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں۔ چاہے تمہیں یقین آئے یا نہ آئے۔ پیاری میں تو یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اُڑ کر تمہارے پاس پہنچوں۔ لیکن آہ۔ تم نہیں جانتیں کہ ہم سب مینہہ کے قطروں کو دراصل کیسی کیسی مجبوریاں ہیں؟۔ پیاری جوئی۔ ہم قطروں کا آسمان سے ایک دم نیچے اُترنا بے حد مشکل اور بڑا کٹھن کام ہے کیونکہ اوّل تو ہم میں سے ہر ایک کو چھڑے دم آنے کا بُوتا ہی نہیں۔ جب کبھی اُترتے ہیں ہم سب اکٹھے ہو کر ایک ساتھ اُترتے ہیں۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ سب کی طبیعتیں یکساں نہیں۔ ایک کہتا ہے ہم تو اوپر ہی اوپر ہوا کھائیں گے۔ نیچے کیا کرینگے جاکے؟۔ دوسرا کہتا ہے۔ نہیں بھئی چلتے ہیں۔ ابھی تو نچلی تہ ہوا کی بہت گرم ہے ذرا ہوا اور ٹھنڈی ہو جائے جب چلیں گے۔ کسی کو ضد ہوتی ہے کہ وہاں سوائے ذلت و خواری کے دھرا ہی کیا ہے۔ حق ناحق اپنی لعل سی جان کی مٹی عزیز کرنے سے فائدہ؟۔ تیسرا کہتا ہے۔ اجی ادہر تو دیکھو۔ اور اوپر چلو۔ سورج کی شعاعوں کو ڈھونڈنے چلیں۔ ہم کو تو دھوپ کی چمک دمک اچھی معلوم ہوتی ہے۔ چوتھا کہتا ہے نہیں بھئی سورج کے قریب جانا بھی ایک قسم کی موت ہے۔ چلو قوسِ قزح (یعنی دھنک) میں چل کر آنکھ مچولی کھیلیں۔ کوئی بجلی کی شوخی کا دیوانہ ہے وہ کہتا ہے۔ دیکھو دیکھو۔ بجلی کو تو دیکھو۔ آہا ہا وہ کبھی اس

بادل میں بجگا گی ہے کبھی اُس ابر میں چلتی ہے - اُف کیسی کڑکتی ہے - کتنی گرج ہے اس میں -

جوُئی - بجلی - بجلی! تو یہ کہئے - آپ سب بجلی کے عاشق ہیں - جبھی - جبھی! آخاہ - مجھ غریب سے دعوئے محبت محض ایک بناوٹ تھی بناوٹ - تو یہ کہئے کہ آپ دراصل بجلی کے پروانے ہیں - جائیے - جائیے تو تشریف لے جائیے - ہائے میری تقدیر ؎

بسر ہو جائے گی ہر طرح ہم سے خاکساروں کی
تقیروں کو غرض کیا ہے ترے خورشید منزل سے

قطرہ! واہ رے بھولی مخلوق - ہائے میں نے کیا کہا اور تم کیا سمجھیں؟ - نہیں پیاری میں بوالہوس عاشق نہیں - میں اُس کلونڈے کا فریبی نہیں ہوں جو ہرجائی کہلائے - آہ - پیاری - میں صرف تمہاری صورت کا پجاری ہوں - ہائے تمہیں معلوم نہیں - میں کیسے کیسے شدید انتظار کی گھڑیاں کاٹ کر آج کن مشکلوں سے تم تک سب سے پہلے پہنچا ہوں - اصل میں ذرا بھاری بھرکم تھا اور سب ہلکے پھلکے تھے وہ اوپر ہی رہ گئے دیکھتی نہیں ہو - یہ فقط تمہاری ہی کشش تھی جو مجھے آسمان سے زمین تک کھینچ لائی - (کنولنی) (پاس کے تالاب سے) واہ چھوٹے بھیا - بھاری بھرکم اور تم؟ آؤ ذرا ادھر تو آؤ - میں بھی دیکھوں تم کتنے بھاری بھرکم ہو؟ - آؤ آؤ - میں تم جیسے سیکڑوں کو اپنے ایک پتّے پر بٹھالوں اور پھر خبر نہ ہو -

قطرہ - ارے! یہ کون بولا؟ کنولنی! چوُنی بھی کیسے مجھے گھی سے کھاؤ چل بے شرم - بے حیا! - اصل بات کو تو بھول ہی گئی - شیخی باز کہیں کی؟ - کیوں ری - اگر ہم نہ ہوتے تو تیرا یہ اتنا بڑا تالاب بھرتا کون؟ - یہ ہمارا ہی صدقہ ہے جو تو اس طرح اپنی گیلی اپنے پتّوں کو پھیلائے بیٹھی ہے - کیچڑ کی بیٹی! ڈوب مر چلّو بھر پانی میں - کمبخت! پانی کے خاندان کو بٹّا لگا کر اب آپ سورج دیوتا کی عاشق بننے چلی ہیں -

جوئی - اُونہہ - جانے بھی دو میتم! یہ تم کس کے مُنہ لگتے ہو؟ جسے اتنی بھی شرم نہیں کہ ساری خلقت کے سامنے جدھر سورج جاتا ہے یہ احمق بے غیرت دوانی بھی اُدھر ہی اُدھر چک پھیریاں لگایا کرتی ہے - اسے تو اس کا بھی ہوش نہیں کہ کتنی مکھیاں - بھنگے اور بھونرے اس کی گندی چندیا پر منڈلایا کرتے ہیں -

بیلا - ارے واہ ری دادی اماں - تم بھی خوب کہیں - سچ ہے ساری دُنیا کا تجربہ تو بس تم ہی پر ختم ہو چکا - ارے چھوکری بھلا مکھیوں - بھنگوں اور بھونروں کا آنا جانا کونسی ذلت یا بدنامی کی بات ہے -

جوئی - چُپ رہو بڑی بی - دیکھو تم کتنی دیر سے برابر بڑبڑ کئے جاتی ہو اور میں نے ایک کا جواب نہیں دیا - میں برابر جوتی اوڑھائے چلی جاتی ہوں - بس خاموش خاموش -

قطرہ - ہیں - میں پیاری! یہ تم کس سے زبان لاتی ہو - تم جیسی پری جمال نازک اندام کو ایسوں سے بات کرنے میں بھی لاج ہے -

کنولنی - واہ میاں ننھے - بس زیادہ بڑا بول نہ بولو - یہ کمبخت نگوڑی ننھی جوئی - تمہارے ان چپلاسٹروں پہ یوُں کر ایسی ہو چلی ہے - ہشیار ہشیار - وہ دیکھو - ہوا کا تیز جھونکا کس شدومد سے تمہاری طرف چلا آتا ہے - ذرا ادھر تو دیکھو -

جوئی - (ہوا کے فرّاٹے کو آتا دیکھکر) - ہے ہے - غضب - یہ ظالم کہاں سے آن مرا -

قطرہ - اُف غضب ہوا - لو پیاری خداحافظ - اب میرا یہاں ٹھہرنا ناممکن ہے - ہائے میں چلا -

جوئی - اوخدا! خدا - بچا اس میرے پیارے کو بچا -

کملنی - لے لڑکی - ٹھیرا - ٹھیرا - اب تو اپنے اس چاہیتے کو ٹھیرا لے - میں بھی تو دیکھوں - ہوا تھوتا چنا باجے گھنا -

قطرہ - لو پیاری اب میں جاتا ہوں -

جوئی - نہیں نہیں ٹھہرو - خدا کے لئے ٹھیرو - ابھی ابھی نہ جاؤ - نہیں میں مرجاؤں گی - قطرہ! - ناممکن قطعی ناممکن - میں چلا - میری جان اب تو مرکر بھی نہیں بچ سکتی -

(ہوا کا جھونکا سر پہ آجاتا ہے اور قطرہ کانپنے لگتا ہے)

ہوا کا جھونکا - کیوں او ننھی سی بوند تیری بھی یہ مجال کہ تو ایسی پری جمال نازنین پر ڈورے ڈالے -

قطرہ - اجی اجی - جناب! -

جھونکا - بدنظر خانہ خراب - جانتا نہیں یہ بہار میرے لئے ہے نہ تجھ سے آوارہ مزاج کمینے کے لئے - اپنی اوقات تو دیکھ نامراد تو کھاری پانی کا فضلہ - چل دُور یہاں سے - اس آسمانِ عیش پر تیرا کوئی حق نہیں -

قطرہ - مگر...... مگر...... میں تو... ادھر سے... آسمان سے آیا ہوں حضرت -

جھونکا - جا جا - گندی موریوں میں ریتیلی زمینوں میں جذب ہو جا - جا جا - غلاظت تیرا انتظار کر رہی ہے -

جوئی - ہائے ظالم تو نے میرا عیش مجھ سے چھین لیا - تجھے خدا ہمیشہ پریشان ہی رکھے - (قطرہ گر پڑتا ہے)

دہقان

از احسن احمد اشکؔ رکن "بزم وارفتگانِ ادب" کلکتہ

تپتے سورج کی گرمی سے جب نخلِ چمن مُرجھاتے ہیں
جب تیز نگاہیں پڑتی ہیں دُنیا پر مہرِ تاباں کی
ماتھے سے پسینہ بہتا ہے، بہہ کر قدموں تک آتا ہے
تقدیر پہ اپنی شاکر ہے تکلیف کا کچھ احساس نہیں
جب اُس کی جبینِ محنت پر افکار کے بل پڑ جاتے ہیں
جب جھوم کے بدلی اُٹھتی ہے جب زور ہَوا کا ہوتا ہے
بجلی کوندے بادل گرجے یہ "مردِ عمل" کب ڈرتا ہے

جب قسمت کے پیارے بیٹھے پنکھوں کی ہوائیں کھاتے ہیں
اُس وقت کوئی حالت دیکھے قسمت کے ستائے دہقاں کی
کچھ اپنی دُھن میں گاتا ہے اور ہَل کو چلائے جاتا ہے
دل اُس کا ہے گھر اُمیدوں کا اُمید کے گھر میں یاس نہیں
"فطرت" کا کلیجہ کھولتا ہے اور بادل گھر کر آتے ہیں
اس وقت یہ کشتِ محنت میں تقدیر کا دانہ بوتا ہے
جب "فطرت" برہم ہوتی ہے "فطرت" سے جنگ بھی کرتا ہے

اے قطرۂ اشکِ مہجوراں انجام ترا اچھا ہوتا
اے گوہرِ تاجِ سُلطانی تجھ سے یہ سوالِ فطرت ہے
سُن اے دہقاں شاعر تجھ کو کہتا ہے فرشتہ رحمت کا
ہے تجھ سے رگوں میں خونِ عمل چہروں کی ہے زیبائی تجھ سے
لعنت اس دُنیا پر جس میں آسودہ نہ ہو محنت تیری
اے کاش زمانے میں چلتی اک ایسی تُند و تیز آندھی
دستاریں سروں سے گِر گِر کر خاشاک و خس میں مل جاتیں

پیشانیٔ دہقاں سے تو اگر موتی بن کر ٹپکا ہوتا
ٹپکیں جو جبینِ محنت سے ان قطروں کی کیا قیمت ہے
سب تجھ سے روزی پاتے ہیں تو سایہ ہے دستِ قدرت کا
تعمیر کے ہنگامے تجھ سے تہذیب کی رعنائی تجھ سے
اے کاش تمدّن نے دہقاں سمجھی ہوتی قیمت تیری
پُر ہَول و تلاطم خیز آندھی پُر شور و شرر انگیز آندھی
قصرِ سرمایہ داری کی مضبوط بنائیں ہل جاتیں

غارت ہو جاتی یہ بستی خونخواروں کی حیوانوں کی
عالم ہوتا مزدوروں کا دُنیا ہوتی دہقانوں کی

مشاہیر کے دستخط

ملوراڈ ریٹ شی وچ کے خودنوشت حالات

مترجمہ از ملک حبیب احمد بی۔ اے۔ آنرز۔ ایل ایل۔ بی

مشاہیر کے دستخط اکٹھا کرنے کا مشغلہ اگر اسے سنجیدہ ترین صورت دیدی جائے تو اپنے سب مشاغل میں ممتا نادر مشکل ترین ہے۔ نیلام گھر ایسی جگہ ہے جہاں ڈاک کے ٹکٹ، پرانے ظروف اور دیگر اشیاء آسانی سے دستیاب ہوجاتی ہیں لیکن جس شخص کو زندہ مشاہیر کے دستخط درکار ہوں اس کے لئے تکمیل ذوق کچھ آسان کام نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ شوق اُسے دیا بغیر میں ٹھوکریں کھلوائے، وہ پُرخطر اور اجنبی علاقوں میں سفر اختیار کرے ایک ایسی چیز کی تلاش میں جسے روپیہ خرید نہیں سکتا۔ اور ان زحمتوں کے باوجود ممکن ہے کہ وہ پھر بھی ناکام رہے۔ اب آپ خود ہی اندازہ فرمالیجئے کہ وہ شخص جس نے تیس ہزار مشاہیر کے دستخط جمع کئے ہوں کس بلا کا انسان ہوگا؟

حقیقت یوں ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک گراں بہا حصہ اس شوق کی نذر کردیا۔ اور اس کے علاوہ دس ہزار پونڈ کی رقم کثیر اس وعدے کے ایفا کرنے میں صرف کردی جو میں نے شہزادہ پال کے عجائب گھر کے منتظمین سے کیا تھا کہ ایک دن اس عجائب خانے میں مشاہیر کے دستخطوں کی ایک نادر کتاب موجود ہوگی۔ یقیناً یہ وعدہ جلد بازی پر مبنی تھا کیونکہ مجھے اس وقت آنے والی دقتوں کا بالکل اندازہ نہ تھا۔

یوں تو مشاہیر کے دستخط اکٹھا کرنے والوں کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں تک پہنچتی ہے جو معمولی معمولی انسانوں کے دستخط حاصل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اس قسم کا شغل میرے نزدیک بازیچۂ اطفال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن دستخطوں کی ایک ایسی کتاب جو زندگی کے ہر شعبہ کی پوری پوری نمایندہ ہو انتھک کوششوں، صبر و استقلال، انتہائے ہوشیاری اور بیدار مغزی سے ہی ترتیب پاسکتی ہے۔ جہاں ان چیزوں کی ضرورت ہے وہاں دستخط اکٹھا کرنے والے میں مختلف انسانوں کی قابلیت اور جوہر پرکھنے کا مادہ بھی بدرجۂ اتم موجود ہونا چاہئے۔ مجھے اپنے وسیع تجربے نے جہاں اور باتیں سکھائی ہیں وہاں یہ گر بھی سکھا دیا ہے کہ وہ افراد جو قوموں کی موت و حیات پر قادر ہیں اور ان پر حکومت کرتے ہیں صرف اپنے دستخط ہی کرنے پر قانع ہیں مگر ان لوگوں کے برعکس دنیا میں ایسے بھی موجود ہیں جو شوق ابدیت میں اپنے خرافات سے پورا صفحہ برباد کردینا چاہتے ہیں۔

مسولینی نے اسی کو کافی سمجھا کہ وہ اپنے دستخط ہی گھسیٹ ڈالے۔ لیکن مسولینی کے منصرموں نے اپنے حاکم کے دستخطوں کے ساتھ ہی ساتھ اپنے رطب و یابس سے ایک پورا صفحہ سیاہ کرڈالا۔ حالانکہ رومانیہ کے تمام شاہی خاندان نے اپنے لئے ایک صفحہ کافی خیال کیا مگر سان فرانسسکو کے میئر کو صرف اپنے لئے ہی ایک صفحہ درکار تھا۔

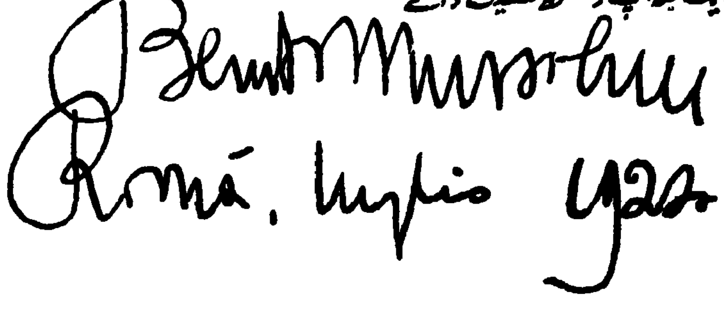
بڑے آدمی عام طور پر دستخط دینے سے گریز کرتے ہیں مگر جس کا مقصد زندگی ہی ان دستخطوں کا حاصل کرنا ہو اُسے بلا کا صابر انسان ہونا چاہئے۔ اسی صبر اور ہوشیاری

کے طفیل میں سولینی، غازی مصطفٰے کمال اور مہاتما گاندھی کے سے مشاہیر روزگار کے دستخط لینے میں کامیاب ہوگیا۔

اُس بڑے کمرے میں جہاں سولینی دن رات اٹلی کی قسمت سے کھیلتا رہتا ہے صرف ممتاز ترین آدمی ہی بار پاسکتے ہیں۔ حالانکہ خود میرے وطن یوگوسلافیہ کے وزیر خارجہ نے ہمارے سفیر کو میری آمد کی اطلاع دیتے ہوئے استدعا کی تھی کہ وہ مجھے اپنی دوستانہ مدد سے محروم نہ رکھے لیکن اس کے باوجود مجھے روم میں چار ہفتے گزر گئے تب کہیں جاکر سولینی کے ہاں باریابی نصیب ہوئی۔

سولینی کے ملاقاتی کو سب سے بڑا نقصان جس چیز سے پہنچتا ہے وہ اس کمرے کی بے پناہ لمبائی ہے جہاں سولینی ملتا ہے۔ سولینی تک پہنچنے کے لئے ملاقاتی کو ایک جہازی قالین طے کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک عظیم نفسیاتی امتحان ہے گر امتحان شاید اس شخص کے لئے ہوگا جو کوئی سیاسی معاہدہ لیکر وہاں پہنچے یہاں تو جو کا نتات تھی وہ دو دستخطوں کی کتابیں تھیں جنہیں میں بغل میں دبائے ہوئے وہاں پہنچا تھا۔

ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی زباں میں سولینی نے میرے آنے کا مقصد دریافت کیا۔ جب میں نے اپنے مطلب کا اظہار کیا تو سولینی ایک فیصلہ کن انداز میں کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا "مجھے افسوس ہے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ اچھا خداحافظ" روم ایسے پرصعوبت سفر کے بعد اور پھر یہ جواب! اس پر طرّہ یہ کہ ایسے آدمی کا جواب جو عام طور پر اپنے فیصلوں پر نظرثانی کرنا جانتا ہی نہیں! —— چند لمحوں کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا جیسے سروش نے میرے کان میں کچھ کہہ دیا۔ میں پندرہ زبانیں بلاتکلف بول سکتا ہوں۔ بہترین اطالوی زبان میں میں نے اس کے دلی جذبات سے اپیل کی" مجھے قوی امید ہے کہ ہمارا قائدِ اعظم ایک ادنےٰ فاسیشٹ کے جذبات کو مجروح کرنے کی نیت نہیں رکھتا؟ —— سولینی مسکرا دیا۔ دستخطوں کی ایک کتاب کو ایسی مضبوط گرفت میں لے لیا کہ اگر دو چار دستخط کنندہ مشاہیر اسے ایسی ہی مضبوطی سے تھام لیتے تو یہ اوراق کبھی کے پریشان ہوچکے ہوتے۔ سولینی نے ایک جگہ اپنے دستخط گھسیٹ ڈالے



اور پیشتر اس کے کہ سولینی مجھ سے میرے فاسی ازم کے لگاؤ کے متعلق دریافت کرتا میں اجازت خواہ ہوا اور وہاں سے چلدیا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجھے ایسے مشاہیر سے واسطہ پڑا ہے جو سولینی سے بھی زیادہ تند و ترش تھے اور ان میں غازی مصطفٰے کمال پیش از پیش ہیں۔

چونکہ غازی موصوف کو اپنے قتل ہوجانے کا خدشہ لگا رہتا ہے اس لئے وہ انگورہ سے چودہ میل کے فاصلے پر رہتے ہیں اور یہیں سے وہ ترکی کی قسمت پر حکومت کرتے ہیں۔ تقریباً روزانہ امیروں، وزیروں اور سیاست دانوں کے قافلے کے قافلے انگورہ سے شاہی محل کی جانب رواں نظر آتے ہیں اس لئے کہ غازی موصوف اپنے مامن سے بہت ہی کم برآمد ہوتے ہیں۔ یہاں چپے چپے پر پہرہ رہتا ہے اور کسی اجنبی کی مجال نہیں کہ ادھر کا رُخ کرسکے۔

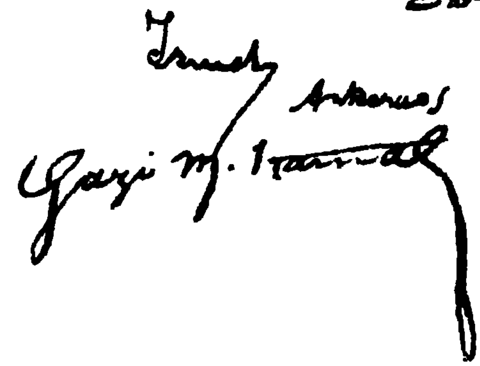
—— انگورے میں جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ میں غازی کمال پاشا کے دستخط حاصل کرنے کی غرض سے آیا ہوں تو عجیب عجیب قسم کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی ان باتوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس سفر کو حماقت اور بے نتیجہ خیال کرنے لگا۔

خوش قسمتی سے انگورے میں ایک بااثر آدمی سے میری دوستی ہوگئی جس نے مجھے غازی موصوف کے حضور میں پہنچنے کا ایک ٹکٹ دیدیا۔ میں جب اس ٹکٹ کو لیکر گیا تو اسے پہرے والوں نے کوئی ایک درجن مرتبہ ناقدانہ نگاہوں سے جانچا تب کہیں میں ملاقات کے کمرے میں پہنچ پایا جہاں ترکی کا قائدِ اعظم دوسرے لوگوں کی معیت میں کھڑا تھا۔ میرے دوست نے مجھے پہلے ہی سے سمجھا دیا تھا کہ آدابِ محفل کو بالائے طاق رکھ کر مجھے دستخط حاصل کرنے کے لئے جلدبازی سے کام لینا چاہئے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن میری یہ جسارت آمیز بہادری صرف سطحی تھی اس لئے کہ کوئی پانچ منٹ کے بعد مجھے اس کا شدید احساس ہونے لگا کہ اس مجمع میں صرف میں ہی اجنبی تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی کہ غازی موصوف مجھے اشتباہ کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے مجھے ڈرا دینے کو کافی تھا۔ غازی کمال نے میری دونوں کتابوں کو غور سے دیکھا اور جب انہوں نے بلغاری زبان میں مجھ سے گفتگو شروع کی تو میری جان میں جان آئی۔ ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ میں نے اچانک سوچا کہ ہم دونوں جرمن زبان میں بات چیت کر رہے ہیں۔ ایک زبان بولتے بولتے دوسری زبان میں گفتگو شروع کردینا غازی موصوف کی خاص ادا ہے۔

"آپ اپنے سفر کو کب تک جاری رکھیں گے؟" انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

"حضور! میری جہاں گردی کو پندرہ برس ہو چکے ہیں۔ امکان ہے کہ میں دس برس اور اس سیاحت میں صرف کر دوں" میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے خیال کیا کہ غازی موصوف اس سفر کو تضیع اوقات خیال کر کے ضرور رنجش دیں گے لیکن نہیں! انہوں نے مجھ سے کتاب لیکر اس مذور سے اپنے دستخط کئے



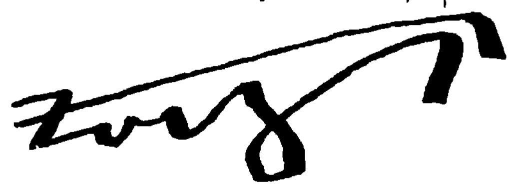
کہ میرا قلم توڑ دیا۔

لیکن جب میں سویڈن پہنچا تو شاہ گستاؤ کے حضور میں باریابی کچھ مشکل معلوم نہ ہوئی مگر یہاں اس سے بھی بڑی دقت کا سامنا تھا یعنی بادشاہ خود بخود فیصلہ کئے ہوئے تھا کہ وہ کبھی کسی کو اپنے دستخط نہ دیگا۔ اور جب میں نے دریافت کیا تو مجھے یہی جواب دیا گیا۔ میں نے اپنی مایوسی کا اظہار سویڈن کے مشہور ادیب سیون ہیڈن سے کیا جو بادشاہ کا خاص دوست اور ٹینس میں اس کا مدمقابل تھا۔ جب سیون ہیڈن نے میری داستان سنی تو کہنے لگا "بیوقوف ہو تم بھی! ایک بار پھر کوشش کرو" لیکن میری اس حوصلہ افزائی کو وزیر حضوری نے اپنے الفاظ سے پاؤں تلے روند ڈالا۔ کہنے لگا "یاد رہے بات ہے کہ سرکار اپنے دوستوں سے ٹینس کھیل لیں لیکن یہ کہ اپنے اصول کو بھی خیرباد کہدیں ناممکن ہے" لیکن میرے بار بار کے اصرار سے مجھے بادشاہ کی حضوری نصیب ہو گئی۔ اسوقت ایک ایسے شاہی دستخط نے میری مدد کی جو برسوں سے میری کتاب میں محفوظ تھا۔ شاہ موصوف نے شہزادہ آرتھر آف کناٹ کے دستخطوں کو پہچان لیا اور اس بنا پر بادشاہ نے خود بھی دستخط کر دیئے۔ جب مجھے وزیر حضوری خیرباد کہنے کے لئے آیا تو بہت حیران ہو کر کہنے لگا کہ "اپنی چالیس سال کی ملازمت میں یہ پہلا موقع ہے کہ بادشاہ نے اپنے اصول کی پاسداری نہ کی ہو"۔

مگر جب مجھے زوغو شاہ البانیہ سے ملنے کا اتفاق ہوا تو میں نے انسانی فطرت اور جذبات کا وہ مظاہرہ دیکھا کہ بایدوشاید۔ شاہ البانیہ خود بھی دستخطوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ جب انہیں میری کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا تو وہ بہت دیر تک پریذیڈنٹ ہنڈنبرگ کے دستخطوں کو دیکھتے رہے۔ کہنے لگے "کیا دستخط ہیں! ممکن ہے کہ پریذیڈنٹ مرحوم نے خاص قسم کا قلم استعمال کیا ہو"۔

"جی ہاں جہاں پناہ انہوں نے نیزے کے قلم سے دستخط کئے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو میں بھی نیزے ہی کے قلم سے دستخط کرونگا" بادشاہ نے کہا۔ ایک نوکر کو طلب کیا گیا جس نے بتایا کہ قصر سلطانی میں نیزے کا قلم نہیں ہے۔ چند دن کے بعد جب قلم دستیاب ہوا تو ایک معزز عہدہ دار نے مجھے بتایا کہ ایک خاص ہوائی جہاز کے ذریعہ سے قلم روم سے منگوایا گیا ہے۔ بادشاہ نے دستخط کر دیئے۔



مگر اہل بصیرت کے نزدیک پریذیڈنٹ ہنڈنبرگ اور شاہ زوغو کے دستخطوں کے طرز نگارش میں زمین آسمان کا فرق موجود ہے۔ پریذیڈنٹ مرحوم کے دستخطوں میں فوجی وجاہت اور عسکری قوت موجود ہے اور وہ دستخط اسی انداز سے کرتے تھے جیسے کسی جنگ کا نقشہ مرتب کر رہے ہیں۔



مجھے وہ دن اب تک یاد ہے جب ہنڈنبرگ لکڑی کا سہارا لئے اس کمرے میں داخل ہوا جس میں مجھے بٹھایا گیا تھا۔ اس کی آواز بلند اور طبل جنگ کی طرح گونجدار تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہنوز جوان ہے مگر اس کے دستخط اس کے بڑھاپے کی گواہی دے رہے تھے اور ان طویل بےغرضانہ خدمات کا اعتراف کر رہے تھے جو اس عظیم شخصیت نے اپنے وطن کی خاطر انجام دیں۔

اور جب میں امریکہ کے پریذیڈنٹ روزولٹ کے دستخط حاصل کرنے کی غرض سے کانگریس ہاؤس میں پہنچا اور میرے یقین دلانے پر کہ میں پریذیڈنٹ موصوف کے دستخطوں سے کوئی تجارتی منفعت حاصل نہ کرونگا انہوں نے میری کتاب میں دستخط کر دیئے۔

گو میں دستخط حاصل کرنے کے سلسلے میں متعدد بادشاہوں سے ملاقی ہوا ہوں لیکن مہاراجہ میسور کے طلائی ساز و سامان کو دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں اور میں اس سامانِ آرایش کو نہایت بدتمیزی سے گھورتا رہا۔ اور ہاں اس وقت میری حالت دگرگوں کی سی ہو گئی جب نظام شاہ دکن نے مجھے ایک قدیم، بیش قیمت اور مرصع تلوار دینا چاہی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں دنیا کے دولتمند ترین انسان کے حضور میں ہوں۔ میں نے وہ تلوار شکریئے کے ساتھ قبول کر لی کیونکہ مجھے یاد آگیا کہ جنگ عظیم کے دنوں میں جب شاہ دکن نے حکومت برطانیہ کو ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ دیدیئے تھے تو خزانۂ شاہی سے ہولوشی کمی آگئی تھی!

گر مہاتما گاندھی کے دستخط حاصل کرنا کچھ کم مشکل کام نہ تھا۔ اوّل تو گاندھی جی کا ڈھونڈھ نکالنا ہی دشوار ہے۔ آج یہاں کل وہاں، اور جب میں آخرکار اُن سے دہلی میں ملا تو انہوں نے دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی اور میں نے مشاہیر کے نام گنوانا شروع کر دیئے اور اس پر مہاتما جی نے ہنستے ہوئے ہندی میں دستخط کر دیئے۔ البتہ ٹیگور نے انکار نہ کیا بلکہ یہ کہتے ہوئے کہ "دنیا بھر کا سفر اور دستخطوں کے لئے۔ کیا خوشگوار مشغلہ اور کیسی اچھی زندگی ہے" اپنے دستخط کر دیئے۔

اس طویل سیاحت کے بعد اب میں اپنے وطن جا رہا ہوں میری کتاب میں دنیا کے تیس ہزار مشاہیر کے دستخط ہیں۔ جن میں تینتیس بادشاہ، دس پریذیڈنٹ اور تمام دنیا کے وزرا شامل ہیں۔ صرف فرانس کے پریذیڈنٹ اور ہٹلر کے دستخط باقی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میں ہٹلر کے دستخط آسانی سے حاصل کر سکوں گا اس لئے کہ ہٹلر اور میں لکڑی پر پالش کرنے کا کام اکٹھا کرتے رہے ہیں۔ جب ہمیں چار شلنگ یومیہ مزدوری ملا کرتی تھی۔ ہم پہروں باتوں میں مشغول رہتے تھے ہٹلر کا موضوع سیاست تھا اور میرا سیاحت۔ کیا ہم دونوں کے خواب شرمندۂ تعبیر ہیں؟

حُسن

(۱)
چمن کے ہر گل میں تو شگفتہ
ہے چشمِ نرگس میں نور تیرا
سکوتِ صحرا میں یا حرم میں
بھرا ہوا ہے سرور تیرا

(۲)
کمانِ ابرو میں تو ہے پنہاں
کمر کے ہر بل میں تو ادا ہے
چہکتا بلبل جو خوش گلو ہے
وہ رنگ و بو پر تری فدا ہے

(۳)
نسیمِ صبحِ بہار میں ہے
مُدام تیرا ہی رقص جاری
بہ شانِ آبِ رواں کے اوپر
نکل رہی ہے تری سواری

(۴)
تری ہی ضو سے ہے عشق تاباں
سفینۂ دل کا ناخدا ہے
ہر اک شجر میں ہر اک حجر میں
کمال تیرا جُدا جُدا ہے

مصوّرِ ہند ایم گوپال دت

نفاق

(حکیم آشفتہ لکھنوی)

سازِ فطرت ہے شکستہ حسنِ فطرت اب کہاں
پھوڑ ڈالی تو نے قسمت زورِ قسمت اب کہاں

بھر لئے ہیں دل میں نشترِ زہر کے ڈوبے ہوئے
سادگی فطرت کی کھو ڈالی صداقت اب کہاں

جوہرِ انسانیت کو کھا چکا زہرِ نفاق
پیکرِ بے حِس ہے تو روحِ حقیقت اب کہاں

خود پرستی کی ہوا سے بجھ چکا شمعِ دل
کالبد تاریک ہے تیرا، نظارت اب کہاں

تیری فطرت خضرِ منزل تھی جسے ٹھکرا دیا
دور ہے منزل سے کوسوں دور قربت اب کہاں

جانتا ہے ناوکِ بیداد تجھ میں دم نہیں
یہ سنبھالا موت کا ہے ورنہ قوت اب کہاں

قوتیں ٹکرا کے تو نے ختم کر لی زندگی!
موت کے پنجے سے بچ جانے کی ہمت اب کہاں

فرقہ بندی ہے شعارِ زندگی تیرے لئے
تفرقہ انداز ملت، پاسِ ملت اب کہاں

قوتوں کو منتشر کر کے ابھرنا ہے محال
جب یہ رسوائی کے نقشے ہیں تو عزت اب کہاں

دوڑتا پھرتا ہے رگ رگ میں غلامی کا لہو!
تیری فطرت سرنگوں ہے تاجِ رفعت اب کہاں

بندۂ تقلید ہے، آزادیاں زہراب ہیں
ذلتیں سرتاج ہیں۔ تاجِ حکومت اب کہاں

طالبِ انصاف ہے غیروں سے اور اپنوں سے بیر
تجھ میں پیدا ہو سکونِ دل یہ صورت اب کہاں

تجھ پہ قدرت کی نگاہِ لطف پڑنا ہے محال،
غم ہی غم کا سامنا ہے غم سے فرصت اب کہاں

بیکسی پر ہنس رہی ہے تیری دنیائے نشاط
غم کے پہروں میں نوائے سازِ عشرت اب کہاں

شمسہ ایواں پہ تیرے چھا گئیں تاریکیاں
وہ دمکتے چاند کی رنگیں نظافت اب کہاں

پیار کی باتوں میں تو نے بھر دیا زہرِ نفاق
وہ صداقت کے مزے لطف و محبت اب کہاں

آگ پانی بن گئے ہندو مسلماں ہند کے
ایک مرکز پر بھلا امکانِ شرکت اب کہاں

بجھ چکا آشفتہ زہریاس سے سینے میں دل
اس کے پہلو کہاں جینے کی صورت اب کہاں

شواعرِ عرب

(جلیل الرحمن صاحب اعظمی)

یہ مضمون رسالۂ جوہر کے سالنامہ میں جو جامعہ ملیہ یونیورسٹی کا آرگن ہے ناتمام حالت میں شائع ہو چکا ہے، قابل مضمون نگار نے اب اسے ضروری اضافوں کے ساتھ "کلیم" میں اشاعت کے واسطے روانہ کیا ہے۔ جسے شکریہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

خدا کی تمام مخلوقات میں زمانہ کی نیرنگیوں کا جو نظارہ کائنات دعورت نے دیکھا ہے، دنیا کی کسی مخلوق نے نہیں دیکھا۔ انسانیات کی قدیم تاریخ ایک عجیب وغریب داستان ہے، قدرت کی نیرنگیوں اور بوالعجبیوں کا جس قدر تماشا یہاں نظر آتا ہے کسی دوسرے اسٹیج پر نہیں دیکھا جاسکتا۔ کسی نے اگر اس کی فتنہ سامانیوں اور ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے اس کو مرد کے دامن تقدس کا داغ سمجھا۔ اسے فتنہ وفساد کی جڑ اور امن وسلامتی کا دشمن بتایا، فریب نشاط اور شیطان اور فتنہ وفساد کی جڑ سمجھ کر لعنت ابدی کا مستحق قرار دیا، تو دوسرے نے اس کی آفرینش کا خیال کرتے ہوئے اس کو پیکر راحت اور مجسمۂ محبت سمجھا۔ اور اس وجہ سے کہ نوع انسانی کے بقاء کی باعث ہے، اس کی آزادی میں انتہا سے زیادہ غلو کیا، تاآنکہ ان کی حقیقی نسائیت آزادی کی بھینٹ چڑھ گئی، اور اخلاق کی پاکیزگی ترقی کی راہ پر قربان ہو گئی۔

ازمنۂ قدیم میں مصر، بابل، ایران، یونان، اور ہندوستان تہذیب و مذہب کے گہوارہ سمجھے جاتے تھے، مگر ان کے چمنستان تمدن میں عورت کی آبیاری کو کچھ دخل نہ تھا اسلام نے آکر نہ صرف عورتوں مردوں دونوں کی جدوجہد کو قابل ستائش تسلیم کیا بلکہ عورتوں کی تعلیمی، سیاسی اور اخلاقی ارتقاء کے لئے ایک ایسا باقاعدہ نظام بھی پیش کیا کہ اس کی برکت سے مسلمانوں میں ایسی ایسی خواتین پیدا ہوئیں، جن کے علم وفضل عظمت و شوکت کا آج بھی تمام عالم میں شہرہ ہے۔ اور جن کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر نمایاں طور سے نظر آتے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں خواتین عرب کے صرف ان ادبی شہ پاروں کا تذکرہ کیا جائے گا، جو شعر و شاعری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے حسیات لطیفہ اور جذبات عالیہ کے حامل ہیں۔

شاعری کا دراصل احساسات وجذبات سے چولی دامن کا تعلق ہے۔ خود شاعری کے لفظی معنی صاحب شعور کے ہیں۔ اور شعور اصل میں احساس یا (Sensation) کو کہتے ہیں یعنی شاعر وہ شخص ہوتا ہے جس کا احساس قوی ہو۔ اس اعتبار سے عورت مجسمۂ شاعری ہے۔ اس لئے کہ اس کے جذبات واحساسات فطرتاً نہایت نازک، لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں۔ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ کسی شخص کی مصیبت کا حال اگر درد انگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس کا اثر جس قدر صنف نازک پر ہوتا ہے مردوں پر نہیں ہوتا، دوست کی جدائی ہر شخص پر اثر کرتی ہے۔ لیکن ایک عورت اس موقع پر بالکل بے تاب ہو جاتی ہے۔ دریا کی روانی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، صبح کی شگفتگی، اور شام کی دلآویزی ایسے مناظر ہیں جن سے ہر شخص لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن یہی چیزیں ایک عورت پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں جس سے وہ سرشار اور خوش ہو کر جھوم جاتی ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ وہ بعض وجوہ کی بناء پر اپنی کیفیات کو الفاظ کا جامہ نہ پہنا سکے، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اثر وانفعال میں وہ مردوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اور یہی اثر وانفعال شعر کی کائنات اور شاعری کی حقیقی بنیاد ہے۔ عورتوں نے علوم وفنون، شاعری وانشا پردازی، نقاشی اور تصویر کشی وغیرہ میں مردوں سے مایہ ناز مقابلہ کیا۔ اور کبھی ان سے پیچھے نہیں رہیں۔ (اور کوئی انعام ایسا نہ تھا جو انھوں نے بھی حاصل نہ کیا ہو) حتیٰ کہ زمانہ قدیم میں جب عورتوں کو شاذ ہی کسی فن میں حصہ لینے کا موقع ملتا تھا۔ اس وقت بھی کم از کم

شاعری میں درحقیقت ایک فطری فن ہے، ایسی ایسی قابل عورتیں گذری ہیں جن کے کارنامے دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ عربوں کے بڑے زبان آور شعراء میں خنساء کا نام بھی مشہور ہے۔ جو ایک عورت تھی، اسی طرح لیلیٰ الاخیلیہ بھی ایک بڑی نامور شاعرہ گذری ہے۔ جو اپنے زمانہ کے بڑے شعراء سے بار بار بازی لے گئی۔

یوں تو دنیا کا کوئی طبقہ ایسا نہیں جہاں ہر زمانہ اور ہر دور میں کوئی نہ کوئی شاعرہ اور ادیبہ نہ پیدا ہوئی ہو۔ مگر جس قدر نامی گرامی سرزمین عرب نے پیدا کی ہیں شاید کوئی دوسرا ملک پیدا نہ کر سکا ہو۔ شعر گوئی اور زبان آوری عرب کے ضمیر میں داخل تھی۔ قدرت نے جذبات اور مدرکات کے اظہار پر ان کو ایسی قوت عطا فرمائی تھی کہ اس زمانہ کی بڑی بڑی مہذب قومیں بھی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھیں۔ وہاں کے مرد، عورت، بوڑھے، بچے سب ہومر اور شکسپیر کی شان رکھتے تھے۔

حرب بسوس میں اُمامہ بنت کلیب کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ جب اس نے باپ کلیب کو جساس اور عمرو بن حارث نے دھوکے سے قتل کر دیا۔ تو وہ روتی پیٹتی اپنے چچا مہلہل کے پاس پہنچی۔ دیکھا تو وہ شراب کے نشہ میں مدہوش اور عیش و نشاط کے جلسوں میں سرشار ہو رہا ہے۔ اس کو سخت غصہ آیا، مہلہل کو لعنت و ملامت کرتے ہوئے اس وقت اس نے فی البدیہہ یہ اشعار کہے تھے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔ جس سے عربوں کی فطری بلاغت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۱) اَتَلْهُوْ بِالْمَلَاهِيْ وَالْخُمُوْرِ　　کیا تم لہو و لعب اور شراب و کباب میں مشغول ہو؛
وَلَا تَدْرِيْ بِعَاقِبَةِ الْاُمُوْرِ　　اور تمہیں انجام کی کچھ خبر نہیں۔

(۲) وَلَا تَدْرِيْ بِاَنَّ كُلَيْبًا اَضْحٰى　　تمہیں معلوم نہیں کہ کلیب
قَتِيْلًا عِنْدَ جَسَّاسِ الْغَدُوْرِ　　غدار جساس کے ہاتھوں مارا گیا۔

(۳) فَوَا عَجَبًا لِجَسَّاسٍ وَعَمْرٍو　　جساس اور عمرو پر تعجب ہے۔
لَقَدْ جَسَرَا عَلٰى اَمْرٍ نَكِيْرِ　　بیشک انہوں نے ایک فعل قبیح پر جرأت کی۔

(۴) وَيَا وَيْلًا لِجَسَّاسٍ وَعَمْرٍو　　افسوس ہے جساس اور عمرو پر۔
لَقَدْ رَمَيَا اَخَاكَ بِعُنْقَفِيْرِ　　انہوں نے تمہارے بھائی کو بڑے فریب سے قتل کیا

(۵) فَبَادِرْ وَانْزِعِ الرُّمْحَ مِنْهُ　　جلدی پہنچو اور اس کے جسم سے نیزہ نکالو
فَمَا اَحَدٌ عَلَيْنَا بِالْجَسُوْرِ　　ہمارے مقابلہ میں کسی کو سرکشی کی جرأت نہ ہونا چاہیئے

(ریاض العرب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صفحہ ۶)

عمرہ خثعمیہ ایک بڑھیا ہے، اہل و عیال سب ختم ہو چکے ہیں۔ صرف دو بچے ہیں جو اس کی ٹمٹماتی ہوئی شمع زندگی کے آخری سہارا ہیں۔ جب وہ ان کی جواں مرگی کی خبر سنتی ہے تو فرط غم میں پاگل ہو جاتی ہے۔ اور درد میں ڈوبا ہوا مرثیہ کہتی ہے۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

(۱) اَبَى النَّاسُ اِلَّا يَقُوْلُوْا هُمَا هُمَا　　لوگوں کو اصرار ہے کہ وہی دونوں (میرے بچے) مرے ہیں اگر ہمارا
وَلَوْ اَنَّنَا اسْطَعْنَا لَكَانَ سِوَاهُمَا　　بس چلتا تو ہم ثابت کر دیتے کہ وہ نہیں بلکہ کسی اور کا انتقال ہوا ہے

(۲) بُنَيَّا عَجُوْزٍ حَرَّمَ الدَّهْرُ اَهْلَهَا　　ہائے ایک بڑھیا کے دو بچے جس کے شوہر کو زمانہ نے پہلے ہی
فَلَيْسَ لَهَا اِلَّا الْاِلٰهُ سِوَاهُمَا　　مٹا دیا تھا اور خدا کے علاوہ وہی اس کے سرمایۂ حیات تھے

(۳) هُمَا اَخَوَا فِي الْحَرْبِ مَنْ لَا اَخًا لَهُ　　وہ دونوں معرکۂ جنگ میں اس شخص کے مددگار ہوتے تھے جس کا کوئی نہیں
اِذَا خَافَ يَوْمًا نَبْوَةً فَدَعَاهُمَا　　ہوتا تھا جب اس کو کسی ناسازگاری کا کچھ ڈر ہوتا تھا تو وہ ان دونوں کو بلاتا تھا

(۴)	هما يلبسان المجد احسن لبسة	وہ دونوں عزت اور مجد کے لباس فاخرہ سے مزین تھے،
	شحيحان ما اسطاعا عليه كلاهما	اور حتی الامکان اس کے حصول میں کوشاں رہتے تھے۔
(۵)	شهابان منا اودقا ثم اخمدا	ہائے وہ دونوں میرے چمکتے ہوئے ستارے تھے جو پہلے روشن کئے گئے اور
	وكان سنا للمجد لين سوهما	پھر بجھا دیئے گئے۔ ان دونوں کی آگ مہمانوں کے لئے ہمیشہ روشن رہتی تھی۔

ریاض الادب فی مراثی شعراء العرب جلد اول صفحہ ۱۴۴

جس ملک کے بچے اور بوڑھوں کی زبان آوری اور سحر بیانی کی یہ کیفیت ہو تو پھر قیاس کر لیجیے کہ وہاں کی جوان اور عورت، پھر وہ بھی شاعرہ کے جذبات اور احساسات کا کیا عالم ہوگا۔

جزیرۂ عرب کے ان خانہ بدوش قبائل میں جو اپنے پاکیزہ احساسات اور عاشقانہ جذبات میں کمال رکھتے تھے، ایک ممتاز قبیلہ بنو عذرہ کا بھی تھا، جس کے حسن و عشق کے افسانوں نے اس درجہ شہرت حاصل کر لی تھی کہ عرب میں "حبًّا عذريًّا" کا ایک لطیف محاورہ پیدا ہوگیا تھا۔ جو آج تک ضرب المثل ہے۔ اسی مقدس سرزمین کے دو جانباز عاشق و معشوق زرعہ اور ظریفہ بھی تھے۔ ظریفہ جس طرح حسن و جمال میں رشک حور تھی شاعری اور زبان آوری میں بھی فطری ذوق اور کمال رکھتی تھی، ایک مرتبہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ قبیلہ ایک تالاب پر گئی ہوئی تھی، کہ اتنے میں زرعہ بن خالد شکار کھیلتا ہوا اس طرف آنکلا۔ دیکھا تو سامنے ظریفہ تھی، نگاہیں چار ہوتے ہی دل ہاتھ سے کھو بیٹھا۔ سر چکرایا اور بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔

مہ جبین ظریفہ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ اٹھی اور اس کے پاس گئی، ہوش میں لانے کی بہت سی تدبیریں کیں لیکن جب کسی طرح ہوش نہ آیا تو تالاب سے پانی لائی اور محبت بھرے ہاتھوں سے پانی کے چھینٹے دینے لگی، چند منٹ میں مریض عشق نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو دلدار کا چاند سا مکھڑا سامنے تھا، آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اور کہنے لگا هل مقتول له ادیه قاتله۔ کیا قاتل ہی مقتول کا معالج بھی ہوسکتا ہے؟ ظریفہ بھی دل پر چوٹ کھا چکی تھی، مسکرا کر بولی، پھر آپ کو شکایت کیا ہے؟ اب کیا تھا، پیمان محبت استوار ہوا اور دونوں نے عشق و محبت کی شراب ناب سے مخمور ہو کر یہ اشعار پڑھنا شروع کئے۔

(۱)	خرجت اصيد الوحش صادفت ظبية	میں وحشیوں کا شکار کھیلنے نکلا تھا، مگر سفید رنگ کی غزالہ
	من الرهيصاد تنى سريعا حبائله	نے خود مجھے بہت جلد دام محبت میں پھنسا لیا۔
(۲)	فلما رمانى بالنبال مصادعا	جب تیر مار کر مجھے پچھاڑ چکی تو خود ہی دعا اور پھونک جھاڑ
	رقانى وهل ميت يداويه قاتله	کرنے لگی، کیا یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی مقتول کا علاج خود اس کا قاتل کرے
(۳)	الا فى سبيل الحب صب قد انقضى	ہاں! راہ محبت میں ایک عاشق تھا، جو جلد ہی ختم ہوگیا۔ اور
	سريعا وله يبلغ مرادا يحاوله	اس آرزو میں کامیاب نہ ہوا جس کا اس نے ارادہ کیا تھا۔

الدر المنثور فی طبقات الخدور صفحہ ۲۷۰۔

جب ان دونوں طالب و مطلوب کے عشق و محبت کا چرچا قبیلہ میں پھیلا تو پر یجمال ظریفہ کے اعزا نے غریب زرعہ کے قتل کی ٹھان لی۔ عشق کا مارا زرعہ جان بچا کر بھاگا، مگر چلتے چلتے چند اشعار اپنے ایک دوست کو یاد کرا دیئے، اور کہا کہ یہ اشعار کسی طرح موقع دیکھ کر ظریفہ کو سنا دینا۔ اشعار کا مفہوم یہ تھا۔

"ایک مریض عشق ہے جو قبیلہ کے گھروں کے قریب ایک گوشہ میں پڑا تڑپ رہا ہے۔ نہ اس کی دوا ہے اور نہ علاج، لوگ مایوس ہو کر کہتے ہیں کہ تم اس کی عیادت کو آؤگی تو وہ جی جائے گا۔ اور جب وہ تم سے مہربانی کی درخواست کریں گے تو تم بخل نہ کروگی۔"

مہ جبین ظریفہ نے جب یہ اشعار سنے تو فوراً سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو یہ میرے عاشق زار زرعہ کا پیام ہے جو اس نے اس طرح میرے پاس پہنچوایا ہے۔ روتی پیٹتی گھر سے

باہر نکل آئی۔ اور جواب میں اس نے فی البدیہہ یہ چند شعر کہے۔ جو بلاغت کی جان کہے جانے کے مستحق ہیں۔

(۱)	دعی اللہ من ھام الفواد بحبہ ومن کدت من شوق الیہ اطیر	خدا اس کی حفاظت کرے جس کا دل محبت میں بے چین ہے اور جس کے لئے میرا جی چاہتا ہے کہ میں اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں۔
(۲)	لئن کثرت بالقلب انواع لوعۃ فان الوشاۃ الحاضرین کثیر	اگرچہ دل میں کثرت سے محبت کے شعلے اٹھ رہے ہیں مگر مجبور ہوں۔ چغلی کھانے والے بھی بہت ہیں۔
(۳)	فان لم ازر بالجسم خیفۃ معشر فللقلب انی نحوکم فیزور	اگرچہ قبیلہ کے ڈر کی وجہ سے تم تک بظاہر نہیں مل سکتی مگر دل روزانہ تمہارے پاس آتا ہے اور زیارت کرجاتا ہے۔

الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۲۰۰۔

زمانہ جاہلیت میں جب کہ اہل عرب کی شاعری بلاغت کے معراج پر پہنچی ہوئی تھی، سخن سنجی۔ عن فہمی، شعر گوئی اور زبان آوری کا ہر طرف بازار گرم تھا صد ہا ایسی خواتین پیدا ہوئیں جن کے کارنامے ادبیات کے وہ زریں صحیفے ہیں جس کا جواب دنیا نے شاعری تا قیامت نہ دے سکے گی۔ اس دور کی مایۂ ناز شاعرہ خنساء کا دیوان جس نے گہری نظروں سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ آج بھی دنیائے ادب اس کی مثال پیش کرنے سے ویسی ہی قاصر ہے۔ جیسا کہ صدیوں پیشتر تھی۔

سوق عکاظ میں جو زمانہ جاہلیت میں نازک خیال اور رنگین طبع شعراء کا دنگل سمجھا جاتا تھا، شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ اور دل کھول کر داد سخن دی جاتی تھی۔ ان میں شعراء کے ساتھ ساتھ اس زمانہ کی صاحب علم و فضل خواتین بھی شریک ہوتی تھیں، جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر خنساء ہے۔ جب وہ آتی تھی تو اپنے بھائی صخر کے کارناموں کو یاد کرکے خود بھی روتی تھی اور سارے مجمع کو بھی رلاتی تھی۔ اس کے ہودج پر ایک سیاہ جھنڈا نصب ہوتا تھا۔ جو اس بات کا نشان سمجھا جاتا تھا کہ اہل عرب میں وہ سب سے زیادہ مظلوم ہے۔

عہد بنو امیہ کے مشہور استاد جریر سے کسی نے پوچھا شعر العرب کون ہے، اس نے جواب دیا کہ اگر خنساء نہ ہوتی تو میں کہتا کہ "میں ہوں"۔ اسی طرح ایک مرتبہ عہد بنو عباس کے جلیل القدر شاعر بشار نے تذکرۃً کہا کہ عورتیں جب شعر کہتی ہیں تو اس میں ان کی فطری کمزوری کا اظہار ضرور ہو جاتا ہے کسی نے کہا کیا خنساء کے کلام میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ اس نے کہا۔ تلک فوق الرجال اس کا درجہ مردوں سے بلند ہے۔

نابغہ ذبیانی جو زمانہ جاہلیت کا بڑا زبان آور شاعر تھا خنساء کا بڑا احترام کرتا تھا۔ جب وہ سوق عکاظ کے مشاعروں میں شریک ہوتی تھی، تو نابغہ اس کے لئے خاص انتظامات کرتا تھا، سرخ چمڑے کا ایک عمدہ خیمہ لگایا جاتا تھا، جس میں بڑی عزت و وقار کے ساتھ صدر مقام پر اس کو بٹھایا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ آئی تو حسن اتفاق سے امام فن ابو بصیر اعشی حضرت حسان اور اس زمانہ کے دوسرے مشہور شعراء موجود تھے، سب سے پہلے ابو بصیر اعشی نے اپنا کلام سنایا۔ پھر حضرت حسان نے پھر اوروں نے، سب کے آخر میں خنساء نے اپنے دل ہلا دینے والے اشعار سنائے۔ اور خوب خوب داد حاصل کی، نابغہ پر تو وجد کی کیفیت طاری ہوگئی، بے اختیار بول اٹھا۔

لولا ان ابا بصیر انشدنی انفا لقلت انک اشعر الجن والانس	اگر ابو بصیر نے ابھی پہلے اپنا کلام نہ سنایا ہوتا تو میں یہی کہتا کہ تم جن و انس سب سے زیادہ باکمال شاعرہ ہو۔

(کتاب الشعر و الشعراء مطبوعہ لندن صفحہ ۱۹۰)

حضرت حسان نے خیال کیا کہ نابغہ نے در اصل مجھ پر چوٹ کی ہے، خفا ہوگئے اور کہنے لگے "نابغہ تم نے کیا کہا؟ خدا کی قسم میں تم سے، تمہارے باپ سے اور تمہارے دادا

---

[1] الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۱۱۱۔

اچھا شاعر ہوں۔

نابغہ نے حضرت حسان کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا، خفا ہونے کی بات نہیں۔ لوسنو، اور انصاف کرو۔ پھر خنساؔ سے دوبارہ اشعار سنانے کی درخواست کی، اور کہا میرا مطلب یہ تھا کہ وہ عورتوں میں سب سے بڑی شاعرہ ہے۔ خنساؔ نے یہ سنا تو ناگوار ہوا۔ اور چیخ کر بولی، خوشامدمت کرو، میں مردوں سے بھی زیادہ اچھی شاعرہ ہوں۔

خنساء کا اصلی نام تماضر بنت عمرو بن الشرید السلیمیہ ہے۔ خنساء لقب تھا، جو بعد میں اس قدر مشہور ہوا کہ لوگ اس کا اصلی نام بھول گئے، اس کے دو بھائی صخر بن عمرو۔ اور معاویہ بن عمرو۔ صخر کو بنو اسد نے اور معاویہ کو بنو مرہ بن غطفان نے قتل کر دیا تھا۔ اس کا سارا دیوان انہیں دونوں کے مرثیوں سے بھرا پڑا ہے، ایک جگہ وہ اپنے بھائی صخر کو یاد کر کے آنسو بہاتی ہے۔ اور کہتی ہے۔

(۱)	اعینیَّ جودا ولا تجمدا	اے میری دونوں آنکھ آنسو بہا اور خشک نہ ہو
	الا تبکیان لصخر الندا	کیا تم دونوں صخر کی داد و دہش پر نہیں روتیں؟
(۲)	الا تبکیان الجری الجمیل	کیا تم دونوں ایک بہادر اور خوبرو پر آنسو نہیں بہاتیں؟
	الا تبکیان الفتی السیدا	کیا تم دونوں ایک نوجوان سردار پر نہیں روتیں؟
(۳)	طویل النجاد رفیع العماد	جو کہ لمبے پرتلہ والا اور بلند مرتبہ تھا۔
	وساد عشیرتہ امردا	اور بچپن ہی سے اپنے قبیلہ پر سرداری کرتا تھا۔
(۴)	اذا القوم مدوا بایدیھم	جب لوگ استغانت کا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے تھے تو
	الی المجد مدَّ الیہ یدا	وہ عزت اور مجد کی طرف اپنا ہاتھ دراز کرتا تھا۔

(کتاب الاغانی مطبوعہ مصر جلد سیزدہم صفحہ ۱۴۰)

شاعری میں کمال رکھنے کے علاوہ خنساء کا شمار جاہلیت کی ان بہادر خواتین میں تھا، جو میدان جنگ میں ہمیشہ مردوں کے دوش بدوش شریک رہتی تھیں، مجروحین کی مرہم پٹی کرتی تھیں، اور مردوں کی لاشیں اٹھاتی تھیں، خنساء کے چار بیٹے تھے، چاروں جنگ قادسیہ میں شریک ہوئے تھے، خنساء نے انہیں وصیت کر دی تھی کہ وہ جنگ سے کسی حالت میں بھی پیٹھ نہ دکھائیں، چنانچہ وہ سب یکے بعد دیگرے شہید ہوئے اس کی اطلاع جب خنساء کو ہوئی تو اس نے کہا۔ الحمد للہ الذی شرفنی بقتلہم۔ (ادب اللغۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۱۴۰)

خنساء کی ایک پھوپھی کا نام بھی تماضر بنت الشرید السلیمیہ ہے، وہ بھی اپنے زمانہ کی بڑی زبان آور شاعرہ تھی۔ قبیلہ غطفان اور ہوازن کا سردار زہیر بن جذیمہ اس کا شوہر تھا، جس کو خالد بن جعفر عامری نے جنگ نفرادات میں قتل کر دیا تھا، باپ کے بعد اس کا بیٹا قیس بن زہیر کے بھائی مالک بن زہیر کو غداری سے قتل کر دیا، تماضر نے جب یہ خبر سنی تو بیٹے کی جواں مرگی پر ایک لمبی آہ کھینچی اور ایک پُر درد مرثیہ کہا۔ جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

(۱)	کانَّ العین خالطہا قذاھا	گویا آنکھیں غبار آلود ہو گئی ہیں۔
	لحزن واقع اضنی کراھا	ایک غم کی وجہ سے جس نے آنکھوں سے نیند اچاٹ کر دی ہے
(۲)	علی ولدٍ وزین الناس طرّاً	میں ایک ایسے بچہ پر آہ و زاری کر رہی ہوں جو تمام لوگوں کے
	اذا ما النار لم ترمن صلاھا	لئے زینت اور فخر کا باعث تھا، مہمانوں کیلئے اس کی آگ روشن رہتی
(۳)	لئن حزنت بنو عبس علیہ	اگر بنو عبس اس پر رنج کریں تو کوئی تعجب نہیں، اس لئے کہ انہوں
	فقد فقدت بنو عبس فتاھا	نے اپنے ایک نوجوان کو کھو دیا ہے۔
(۴)	حذیفۃ لا سُقیت من الغوادی	حذیفہ خدا کرے تو صبح آنیوالے بادلوں سے کبھی سیراب نہ
	ولا روّتک ھاطلۃ نداھا	کیا جائے، اور نہ ابر کرم کی تجھ پر کبھی بارش ہو۔

(شعراء النصرانیہ [illegible])

(۵) کما فجعتنی بفتی کریم — تونے ایک شریف نوجوان کو قتل کرکے مجھے دکھ پہنچایا ہے، جو
اذا وزنت بنو عبس علاہا — اگر تمام بنو عبس کے مقابلہ میں رکھا جاتا تو وہی گراں قدر ثابت ہوتا۔

(۶) فدمعی بعدہ ابداً ھطول — میرے آنسو اس کے بعد ہمیشہ جاری رہیں گے،
ولا برقاء من عینی بکاھا — اور میری آنکھوں سے اس پر کبھی آنسو خشک نہ ہوں گے۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صفحہ ۴۴)

علامہ جرجی زیدان نے زمانہ جاہلیت کی ان مشہور خواتین میں جن کی شاعری اور ادبیانہ بذلہ سنجی پر ساری صنفِ نسواں کو ناز تھا خنسا کے بعد لیلی العفیفہ، جلیلہ بنت مرہ، خرنق اخت طرفہ کا نام لیا ہے۔ اور ان کو اس دور کی باقی ماندہ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والی عورتوں پر ترجیح دیا ہے۔ ذیل میں ہم انھیں کے کلام کا نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

لیلی العفیفہ لکیز بن مرہ کی بیٹی تھی۔ بچپن ہی میں اس کی براق بن روحان مری کے ساتھ شادی ہوگئی، براق بن روحان اور اس کا چھوٹا بھائی غرثان بن روحان بنو ربیعہ کے نامور شہسوار اور بہادر سردار تھے۔ غرثان اس جنگ میں مارا گیا جو ۔۔۔ میں بنو ربیعہ اور بنو ایاد و لخم کے درمیان واقع ہوئی تھی لیلی العفیفہ غرثان کی جواں مرگی پر آنسو بہاتی ہے۔ اور اس کو میدان جنگ میں تنہا چھوڑ جانے پر بنو ربیعہ کو ملامت کرتی ہے۔ مرثیہ کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

(۱) لما ذکرت غرثیا نا ادنی لکمدی — جب میں غرثان کو یاد کرتی ہوں تو میرے دل میں رنج و غم کا ایک طوفان
حتی ھممت من البلوی باعلان — برپا ہوجاتا ہے حتی کہ میں چاہتی ہوں کہ اس مصیبت کو آشکار کروں

(۲) تربع الحزن فی قلبی فذبت کما — غم میرے قلب کے چاروں طرف چھا گیا ہے میں رنج و غم میں اس طرح
ذاب الرصاص اذا اصلی بنیران — پگھل رہی ہوں جس طرح سیسہ پگھلتا ہے جب وہ آگ پر تپایا جاتا ہے

(۳) فلو ترانی والاشجان تقلقنی — اگر تم مجھے دیکھو درآں حالیکہ رنج و غم مجھے تکلیف پہنچا رہے ہیں
عجبت براق من صبری وکتمانی — تو براق تم میرے صبر اور ضبط پر تعجب کرو۔

(۴) یا عین فابکی وجودی بالدموع ولا — اے آنکھ رو اور آنسو بہا اور اے دل طول مت ہو، جبکہ تو رنج
تمل یا قلب ان تبلی باشجان — والم سے گھلا جا رہا ہے۔
فذکر غرثان مولی الحی من اسد — غرثان کے تذکرہ نے جو قبیلہ بنو اسد کا سردار تھا مجھے اور
انسی حیاتی بلا شک وانسانی — میری زندگی کو مجھ سے بھلا دیا ہے۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صفحہ ۴۲)

جلیلہ بنت مرہ، جساس بن مرہ کی بہن اور کلیب بن ربیعہ کی بیوی تھی، بدقسمتی سے جساس اور کلیب میں ان بن ہوگئی، اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ کلیب کہا کرتا تھا کہ میں بزدلوں کی باتوں کی کچھ پروا نہیں کرتا، مرد ہو تو میدان میں آئے، جس کا جواب جساس یوں دیتا تھا کہ گھبراؤ نہیں میدان جنگ جلد ہی فیصلہ کر دے گا کہ ہم میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا یہ سب کچھ شاعری میں سوال و جواب ہوا کرتے تھے، مگر جب کبھی سامنا ہو جاتا اور دونوں جان دینے اور جان لینے کے لئے تیار ہو جاتے تو غریب جلیلہ بیچ میں پڑ کر دونوں کو قسمیں دیتی اور روکر نسی نہ کسی طرح دونوں کو اس خونچکاں جنگ سے باز رکھتی، جس کا نتیجہ بہر صورت اس کے لئے اندوہناک تھا۔ مگر یہ رکھ تھام تابکے، آخر ایک دن ایسا آیا کہ یہ ساری تدبیریں بیکار گئیں، اور قسمت کا لکھا ہوا پورا ہوا، جساس اور عمرو بن حارث نے مل کر کلیب کو قتل کر دیا۔ کلیب اپنے قبیلہ کا سردار تھا، اس کی موت کوئی معمولی موت نہ تھی، قبیلہ کی جوان اور بوڑھی تمام عورتیں گریباں چاک سر پر خاک اڑائے ہوئے کھڑی ماتم کر رہی تھیں کہ دفعتہً کسی کی نگاہ ناکردہ گناہ جلیلہ پر جا پڑی سب کے دلوں میں شعلۂ انتقام بھڑک اٹھا، انہوں نے کلیب کی بہن اسماء سے کہا "ہمارے ماتم کدہ میں جلیلہ کی موجودگی ہمارے لئے باعث ننگ و عار ہے۔ یہ تو کلیب کے قاتل کی بہن ہے، اسے یہاں سے فوراً نکالو۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ اور مصیبت کی ماری جلیلہ روتی پیٹتی وہاں سے چل کھڑی ہوئی۔ اس وقت اس نے جو شعر کہے تھے ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱)	یا ابنۃ کلا توام ان ملت فلا تعجلی باللوم حتی تساءلی	اے خاتون اگر تو ملامت ہی کرنا چاہتی ہے تو ذرا جلدی نہ کر تاکہ تو لوگوں سے دریافت نہ کر لے۔
(۲)	فاذا انت تبینت الذی یوجب اللوم فلومی واعذلی	اگر تجھے کوئی ایسی چیز معلوم ہو جائے جس کی وجہ سے ملامت کرنا ضروری ہو تو شوق سے ملامت کر اور برا بھلا کہہ۔
(۳)	ان تکن اخت امری لیمت علی شفق منہا علیہ فافعلی	اگر کسی کی بہن محض اس لئے ملامت کی جاتی ہو کہ اسے اپنے بھائی سے محبت ہے تو ضرور کر۔
(۴)	یا کلیب انت لی ذخر المنی کنت عزی وردائی المسبل	کلیب تو ہی میری آرزوؤں کا مرکز تھا، تو ہی میری عزت تھا۔ اور میرے فخر کا سرمایہ تھا۔
(۵)	ما اظن الدھر یاتی مثلہ فارس الحرب ومردی البطل	میں نہیں خیال کرتی ہوں کہ زمانہ اس کا جیسا اب پھر پیدا کریگا جو معرکۂ جنگ میں یکتا شہسوار تھا، اور بڑے بڑے نوجوانوں کو تباہ کرکے چھوڑتا تھا۔
(۶)	جل عندی فعل جساس فیا حسرتی عما انجلت او تنجلی	مجھ پر جساس کی یہ حرکت بہت گراں گذری ہے، جو کچھ اب تک ہوا یا جو کچھ ہونے والا ہے اس پر مجھے افسوس ہے۔
(۷)	فعل جساس علی وجدی بہ قاطع ظہری ومدن اجلی	باوجودیکہ مجھے جساس سے محبت ہے مگر تاہم اس کی اس حرکت نے میری پیٹھ توڑ دی اور میری موت کو مجھ سے قریب کر دیا۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول ص...)

خرنق بنت بدر بن ہفان الثعلبی زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر طرفہ بن عبد کی اخیافی بہن تھی، یہ اپنے زمانہ کی بڑی قادر الکلام شاعرہ تھی، اس کے اشعار کا مجموعہ دیوان کی شکل میں بیروت میں چھپ گیا ہے۔ اس کا زمانہ عہد اسلام سے تقریباً ستر سال پیشتر تھا۔

اس کا بیٹا عبد عمرو بن بشر بادشاہ حیرہ عمرو بن ہند کا مصاحب تھا، جب اس کا انتقال ہوا تو دنیا اس کی نظروں میں تاریک ہو گئی، وہ اس کے خاندانی فضائل کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتی ہے۔

(۱)	الا ھلک الملوک وعبد عمرو وخلیت العراق لمن بغاھا	ہاں سلاطین مٹ گئے اور عبد عمرو بھی ہلاک ہو گیا، اور عراق کی زمین اس شخص کے لئے خالی کر دی گئی جو اس پر دھاوا بول دے۔
(۲)	فکم من والد لک یا ابن بشر تأزر بالمکارم وارتداھا	ابن بشر تیرے باپ جیسے کم لوگ ہوں گے جو سر سے پیر تک شرافت بزرگی کے لباس فاخرہ سے آراستہ تھا۔
(۳)	بنی لک مرثد وابوک بشر علی الشم البواذخ من ذراھا	مرثد اور تیرے باپ بشر نے تیرے مفاخر پہاڑی کی چوٹیوں سے بھی زیادہ بلند کر دیئے ہیں۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول ص۳۶)

زمانہ جاہلیت کی ان مشہور خواتین میں جن کا کلام کتب ادب و شاعری میں کثرت سے ملتا ہے خنساء۔ جلیلہ بنت مرہ۔ لیلی العفیفہ۔ خرنق اخت طرفہ العبدی۔ امیمہ بنت امیہ بن عبد شمس خالدہ بنت ہاشم۔ کبشہ بنت اخت عمرو بن معدی کرب۔ میہ بنت جابر۔ سلمی بنت المہلہل۔ سلمی بنت مالک بن ہدر۔ ہند بنت حذیفہ۔ فاطمہ بنت عبد الاعجم، زینب بنت مالک۔ ہند بنت معبد فارعہ بنت شداد۔ آمنہ بنت عتیبہ۔ اروی بنت حباب،، رقیہ بنت العباس۔ صفیہ بنت عمرو۔ میہ بنت ضرار۔ ہند بنت اسد۔ لیلی بنت وہب، مریم بنت طارق۔ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جن پر صنف نسواں کو جس قدر بھی فخر ہو کم ہے۔ (باقی)

شباب کی بغاوت

یحییٰ نقوی

ہر تعمیر کے لئے تخریب ضروری ہے۔

شباب کا عظیم ترین کارنامہ ایک عالمِ نو کے حصول میں ان ننگ و خودغرضانہ مقاصد کی غارتگری ہے جس پر قدیم گروہ کا مدار تھا۔

شباب کی نظروں میں اُن کی ساکھ باقی نہ رہی۔ شباب اُن کے غیر مشروط انہدام کا طالب ہے۔

شباب نے شیب کی نفس پرستی، تعصب اور سنگدلی کی بدولت کافی مصائب برداشت کئے۔ لیکن اب شباب اس کو گوارا نہیں کرے گا۔

شباب مسمار کرے گا اور پھر تعمیر کرے گا۔

شباب ایک جدید جماعت کی طرح ڈالے گا۔ قدما کی بُنیادی عمارت پر نہیں، بلکہ طرزِ نو پر۔ کیونکہ شباب ایک جدید تاریخ کی تخلیق کرے گا۔ ایک حیاتِ نو لائے گا۔

شباب اسلاف کو پُکارتا ہے کہ تم نے ہمارے لئے کیا کیا۔

— تم اپنے مقصد تفریق کے ماتحت تنگ فرقہ بندی کو اُبھار کر نوعِ انسان میں تنفر و اختلاف کا بیج بوتے ہو، تمہارے مذاہب کی تاریخ کیا ہے؟ ایک متواتر نزاع، ایک لامتناہی جنگ، ایک دوامی کشاکش عقائد، اور اس کے پیچھے نادان فریب خوردگان کی ایک قطار، ایک درباری تنفر۔ ایک مستقل تذلیل پاکیزہ روحِ صداقت کی۔

تم اپنی حرص اور خودغرضی سے مذہب کو جد و جہد کا مانع قرار دے کر اُس کے ستھرے مقاصد کو محض سہولت کی بےکیف خوشی سے آلودہ کرتے ہو۔ ہم اس تاسف انگیز حالت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، تم ہماری نہیں سنتے۔ تم بندگانِ خدا کو خدا کے دروازہ سے نہیں نکالتے۔

اپنی جہالت کے ساتھ تم غلط فہمی کی ظلمت اور دُکھ کے آنسو لاتے ہو۔

تم کہتے ہو خدا تک صرف یہی ایک راہ جاتی ہے، لیکن ہم اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں کہ ایسی بہت سی راہیں ہیں جو اس وجودِ اکبر تک لے جاتی ہیں ہم انسان کی ہرسعی کو خدائی کتاب کا ایک باب سمجھتے ہیں اور حقیقت کو پہچاننے کے لئے ہر باب کو جاننا ضروری ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر واقعی کوئی صحیح راہ خدا تک پہونچتی ہے تو وہ راہ استقلال اور شغفِ تحقیقِ حق کی ہے۔ باہمی رواداری و اتحاد کی ہے۔ بھائی چارہ اور محبت کی ہے۔ یہی بابِ صحیفۂ خدا کا تنہا باب ہے۔ صرف یہی وہ راستہ ہے جو خالقِ اکبر تک لیجاتا ہے۔

تم ہم کو عدم رواداری کا سبق دیتے ہو۔ تم انسانوں میں تفریق کی روح پھونکتے ہو۔ تم ہر انسان کو اُس کے بھائی کے خلاف اُکساتے ہو۔

تمہاری جہالت ہمارے حوصلوں کو اوہام و عقائد کے ہاتھوں تباہ کر دیتی ہے۔

تمہاری جہالت ہمارے افقِ علم کو فرسودہ عقائد اور سطحی خود رائی سے محدود کر دیتی ہے۔

تمہاری جہالت ہماری آنکھوں کو رسم و رواج سے دھندلا کر دیتی ہے۔

تمہاری جہالت ہماری بصیرت کو اصنام و مجسمہ سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔

تم ہم کو فرقہ بندی کے تنگ اُصول کی تعلیم دیتے ہو۔

تم جذبۂ تحقیق کی تحقیر کرتے ہو اور ہماری آنکھوں کو ظاہری چمک دمک سے چند کے حسنِ باطنی سے محروم کردیتے ہو۔

تم طفلِ سعی، تو ہمارے سینوں میں مار کر ہماری انفرادی و ذاتی اپش روی کا گلا گھونٹ دیتے ہو۔

تم ہماری طرف جھوٹے ترجمان بھیجتے ہو جو ہمارے شباب کو ہدف بناتے ہیں۔ خودغرض مکاروں کو بھیجتے ہو جو اپنی حرکتوں سے دغابازی اور ظاہرداری سکھاتے ہیں۔

تم ہمارے آگے بت پرستی کی بدنمائی پر روغن چڑھاتے ہو
تم ہمیں خودداری کا گیت سناتے ہو۔

تم ہمارے سامنے عدم رواداری۔ تنفر اور خودغرضی کی برائیاں پیش کرتے ہو۔

یہ ہیں ہماری شکایات۔ ہم انھیں کے خلاف چلاتے ہیں۔ تم ہماری نہیں سنتے۔ ہم اُن کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ تم ہماری مدد نہیں کرتے۔

اِس لئے۔ ہم مسمار کریں گے اور تب تعمیر کریں گے۔ ہم ایک نئی دنیا قایم کریں گے۔ ہم ایک نیا زاویۂ نگاہ بنائیں گے۔ ہم نئی زندگی لائیں گے۔

نقشِ عبرت

زمانے کے موافق کب زمانے کے بشر ہوں گے
الٰہی وہ بھی دن ہوگا کہ سب شیر و شکر ہوں گے

چلیں گی آندھیاں بغض و حسد کی ہند میں کب تک
ہم اوراقِ پریشاں بن کے کب تک منتشر ہوں گے

سلامت ہے جو فقر و جہل موجودہ تو آئندہ
نہ ہم اہلِ دول ہوں گے نہ ہم اہلِ ہنر ہوں گے

خبر گھر کی نہیں لیکن نظر ہے نجد و صنعا پر
بہت کم، دور بیں ہم سے کہیں اہلِ نظر ہوں گے

اگر سینچی گئی کشتِ عمل، خونِ مشقت سے
تو اشجارِ امل سرسبز ہوں گے بارور ہوں گے

رواداری، ملنساری، خوش اطواری، گراں باری
انھیں سے بین الاقوامی مفاسد بے اثر ہوں گے

ہمیں دورِ تغیر سے مٹیں گے، ورنہ دنیا میں
یہی شام و سحر ہوگی، یہی شمس و قمر ہوں گے

قطعہ
حوادث زلزلوں کے قحط کے، امساکِ باراں کے
ہماری ہی بداعمالی سے ہوں گے جس قدر ہوں گے

اثر قُربِ قیامت کا ہے ظاہر ان عذابوں سے
کہ ہوتے تھے بہت کم پیشتر، اب بیشتر ہوں گے

رہیں گی نقشِ عبرت بن کے احسنؔ تیری یہ باتیں
نہ ہوگا تو جہاں میں، تذکرے تیرے مگر ہوں گے

(احسن مارہروی)

حُسن و عشق

میکش اکبرآبادی

حسن وعشق مادرِ فطرت کے توام بچے ہیں، ایسے توام کہ ایک کے بغیر دوسرے کا نہ تصور کیا جاسکتا ہے نہ تعریف، اور پھر رات، دن، نیکی بدی کی طرح آپس میں اضداد بھی نہیں ہیں، بلکہ

ہمارا عشق اک صورت ہے اُن کے حُسنِ کامل کی
وہ ہوتے ہیں تو اُن کا چاہنے والا بھی ہوتا ہے

حکما کا عقیدہ ہے کہ ایک ذرہ عشق سے خالی نہیں جس طرح کسی چیز کا وجود سے معرا ہونا محال ہے۔ علمائے سائنس کے ذروں کی کششِ باہم کا نامعلوم راز محبت ہی ہے کاش محبت اُن کو نظر آسکتی، یا کسی آلے سے معلوم کی جاسکتی۔

اسلامی نظریے کی رُو سے دنیا کی پیدائش محبت ہی کی مرہونِ منت ہے ورنہ حسن کا کنزِ مخفی راز ہی رہتا۔ عشق کی بے چینی حُسن کی خواہشِ ذاتی ہے۔ اور اس بت خانے کی تعمیر کا ملزم خود وہی ہے۔

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں — میرؔ

ہم جب کسی چیز کو سمجھانا چاہتے ہیں تو دوسری چیزوں کی مدد سے سمجھاتے ہیں وہ دوسری چیزیں جن کو ہمارا مخاطب جانتا ہے یا جاننے کے زعم میں ہے اس لئے جو چیزیں اپنی مثال نہیں رکھتیں اُن کی تعریف نہ ہوسکی نہ ہوسکے۔

آہ غریب انسان تیرا علم اور تیرے دعوے۔

اب ذرا فلسفے کی موشگافیاں بھی سُن لیجے۔ پھول کا عرق کھینچئے اُس کی پنکھڑیوں کا گلقند بنایئے۔ سب کام کی چیزیں ہیں لیکن بیماروں کے لئے۔

دو چیزیں جب ایک جنس کی ہوتی ہیں تو آپس میں ضم ہونے اور ملنے کی خواہش رکھتی ہیں اس لئے لطیف طبیعتوں کی خواہش اور میلان نفیس صورتوں اور اچھی چیزوں کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ انسان کے مزاج میں اعتدال جس قدر زیادہ ہوگا اسی قدر اس کا میلان اچھی صورتوں، لطیف نغموں اور نیک عادتوں کی طرف زیادہ ہوگا۔ اس لئے کہ یہ سب نہال ایک ہی چشمے سے سیراب ہوتے ہیں۔ اس اتحاد کی خواہش کا نام محبت ہے۔ یہ شریف نسبتیں یعنی اعتدالِ مزاج اور حسن جب دو مظہروں، دو انسانوں میں ظاہر ہوں گی تو لازمی طور پر ایک میں کم ہونگی اور ایک میں زیادہ، اس لئے کہ استعدادوں اور قابلیتوں میں باہم اختلاف ہے۔ عاشقی اس طرف سے ظاہر ہوتی ہے جس طرف یہ نسبتیں کم ہوں اور معشوقیت اس طرف سے جلوہ گر ہوتی ہے جس طرف زیادہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ کم اور کمزور چیز کو زیادہ اور طاقتور چیز اپنی طرف کھینچتی اور جذب کرلیتی ہے۔ اسی لئے عاشقی فنا چاہتی ہے اور معشوقیت بقا۔

ہوں طالبِ فنا میں بہ عنوانِ ہر جنوں
ہستی مری گناہِ محبت کا راز ہے

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مادیات اور عناصر ہر وقت اپنے مرکزوں کی طرف متوجہ اور ان میں مل جانے کے لئے کوشاں ہیں، یہی اصول مجردات میں بھی کارفرما ہے۔ روح یا نفسِ ناطقہ جو مجردات میں سے بلکہ مجردات کی ایک

لطیف تجلی ہے، اور اس عالمِ آب و گل میں وارد اور مقید یا متحلی ہے، ہر وقت اپنی اصل کی طالب ہے۔ حسن، مناظرِ لطیف، نغمہائے دلکش سبھی تجرداتِ ہی کے عکس ہیں۔ روح جب ان جلوہ ہائے دلربا کو محسوس کرتی ہے تو اُن میں جذب ہو جانا چاہتی ہے۔ یہ کیفیت کمی زیادتی، موقع محل کے اعتبار سے سرور، اضطراب، سکر، بیخودی، وجد، عشق مختلف ناموں سے موسوم ہوتی ہے اور اپنے انجام کے اعتبار سے فنا و موت یعنی لقا و حیاتِ دوام۔

موت ایک پُل ہے جو دوست کو دوست تک پہنچا دیتا ہے۔ (حدیث)

جو روح مادیات سے جس قدر زیادہ زیرِ اثر ہوگی اسی قدر اس میں قوتِ پرواز کم ہوگی اور اسی قدر یہ کیفیات و احساسات اس میں کم ہوں گے۔

فلسفیوں کے نزدیک اعتدال اس نسبتِ وحدت کا نام ہے جو دویا چند چیزوں کے تناسب سے حاصل ہوتی ہے، روح کا بدن سے تعلق اسی نسبت وحدت و اعتدال کے سبب سے ہے جو عناصر کے اجزا میں ہے۔ اسی نسبت کے زائل ہونے کا نام موت ہے۔ لطیف نغموں اور اچھی صورتوں میں جو تاثیریں ہیں وہ وحدتِ تناسب ہی کے سبب سے ہیں۔ درحقیقت روح اسی کی عاشق ہے اور یہی سبب ہے کہ یہ شریف نسبت جہاں کہیں بھی ہو روح کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مثلاً حسن جو اسی خاص تناسب کا نام ہے جو اعضا میں ہو، بلاغت و فصاحت بھی وہی تناسب ہے جو اجزائے کلام اور کلام اور مقتضائے کلام میں ہو، اسی طرح نغموں کی تاثیریں بھی اسی تناسب کی رہینِ منت ہیں جو مختلف آوازوں میں پایا جاتا ہے۔

غرض وہی ایک شے ہے جو اگر عنصری مرکبات کے اجزا میں ظاہر ہو تو اعتدالِ مزاج ہے اور اگر ملکاتِ نفس میں ہو تو عدالت ہے۔ کلام میں واقع ہو تو فصاحت و بلاغت اور آوازوں میں نغمۂ دلکش ہے۔ حرکات میں لَے اور رقصِ موزوں اور اعضا میں حسنِ نظارہ سوز ہے۔

روح اسی کی عاشق ہے کسی صورت سے سامنے آئے اور کسی لباس میں آئے۔

زلفِ مشکبو کا غم دل کو وقف کیوں کرے
دل کو جو کرے برہم زلفِ مشکبو ہی ہے

حدیث میں ہے "خدا جمیل ہے اور جمال سے محبت کرتا ہے" شیخ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "جو خدا سے مانوس ہے وہ ہر دلربا صورت سے مانوس ہے"۔

جو حکم اصل کا ہے وہی فرع کا ہے اس لئے ازلی محبت کا راز ہر شے میں اور سرمدی عشق کا پرتو ہر ذرے کے آئینے میں نمودار، اسی محبت کا پرتو جمادات میں میلِ طبعی، نباتات میں مبدءِ نشو و نما، حیوانات میں قوتِ شوقی اور حسی اور کامل انسانوں کے نفوس میں عشقِ پاکیزہ کی صورت میں متجلی ہے۔

سیہ فام

اے کہ گیسو کی طرح نرم و سیہ فام ہے تو
چشمِ بد دُور کہ خالِ رُخِ ایام ہے تو

تیرے چہرے کی سیاہی ہے غلافِ کعبہ
شبِ تاریک میں رعنائی الہام ہے تو

تیرے چہرے میں ہے افسانۂ ایماں بالغیب
نقطۂ دائرۂ مسلکِ اسلام ہے تو

تشنۂ گیتی کے لئے تُو ہے سیہ مست سحاب
خستۂ دُنیا کے لئے نیند کا پیغام ہے تو

تیرے عارض میں ہیں ساون کی اندھیری راتیں
صبحِ وعدہ کی دل افروز و خنک شام ہے تو



سیدن علی شاہ صاحب ، بیکس اکبرآبادی

Tur n, Neok Dot



رفتارِ وقت

ادارہ کلیم

اٹلی اور حبش

ماہ اپریل میں سرزمین حبشہ نے جس کے سیاہ رنگ حبشیوں کو سفید فام یورپ "غیر مہذب" "جنگلی" اور "وحشی" کے خطاب سے یاد کرتا ہے، یورپ کی ایک نام نہاد مہذب ترین قوم کی ایسی ہیبتناک درندگی اور دنائت کا مشاہدہ کیا ہے جو اس صدی میں اور اس صدی سے قبل ظالم سے ظالم اور خونخوار سے خونخوار اور غیر مہذب قوم سے سرزد نہ ہوئی تھی۔ اس درندگی پر جو زہریلی گیس چھوڑ چھوڑ کر، فضائے آسمانی سے شیطانی گولے غیر مسلح آبادیوں پر برسا کر زخمیوں کے ہسپتالوں کو تباہ و برباد کر کے صرف نیرو اور سیزر ہی کے خون آشام فرزندان فخر و ناز کر سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اٹلی کے قاہر، جابر، ظالم اور انسانیت کے جذبات سے ناآشنا خونی سپاہی آج فاتحانہ نعرے لگا رہے ہیں۔ اُنھوں نے شہنشاہِ حبش کی "وحشی" فوج کو درندوں سے زیادہ خونخوارانہ قتل و غارت کر کے شکست دیدی ہے۔ وہ آج دسیی پر قابض ہیں۔ جبجیکا پر اُن کی حکومت ہے اور ممکن ہے کہ حرار پر بھی اُن کا جھنڈا لہرانے لگے۔ مگر اہل حبش نے بھی ملک کے تحفظ کے لئے جانوں کی بازی لگا رکھی ہے۔ وہ شاہِ حبشہ جس کو روما کی اطلاعات کبھی قتل کرتی ہیں اور کبھی تخت سلطنت سے "دست بردار" ہنوز اپنے "سفید فام درندہ صفت دشمن" کے مقابلہ میں سرگرم پیکار ہے۔ اٹلی کی افواج "تمدن" اور "انسانیت" کے تمام آئین و ضوابط کو یک قلم فراموش کر کے عدیس ابابا کو چاروں طرف سے گھیرنے میں مصروف ہے اس کی افواج کے آگے آگے مکر و فریب سے بھرے ہوئے جھوٹے اعلان ہوائی جہاز کے گولوں کے ساتھ ساتھ پھینک رہے ہیں۔ عورتیں بچے بوڑھے اپنے اپنے گھروں کو خالی کر کے جنگلوں اور پہاڑی چٹانوں میں چھپنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر حبش کی مایۂ ناز ملکہ لوہے کی لاٹھ کی طرح اپنی جگہ پر قایم ہے اور اپنے نازک جسم کو اٹلی کے ظلم و جور کا شکار بنانے کے لئے آمادہ ہے اُسے شاید اس جلوس فتح میں بھی پا بہ زنجیر شرکت کرنے سے انکار نہ ہو جو سیزر اور نیرو کے قایم مقام موسولینی روما میں حبش کی کامل شکست کے بعد نکالے گا۔

حبش کو یورپ کی فرنگی مسیحی اقوام پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ اٹلی کی بہیمیت کے روکنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔ مگر لیگ اقوام ابھی مجالس صلح کی تشکیل ہی کر رہی ہے۔ اٹلی گولہ بارود لئے عدیس ابابا کے قرب میں منڈلاتا پھر رہا ہے۔

اٹلی نے موجودہ جنگ پر جو کثیر اخراجات کئے ہیں اُن کا اندازہ مندرجہ ذیل تخمینہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

فوجی اخراجات جو سالِ رواں میں منظور کئے گئے	۱۳۹،۰۰۰،۰۰۰	پونڈ
مزید اخراجات جو " " "	۲۴،۰۰۰،۰۰۰	"
میزان	۱۶۲،۰۰۰،۰۰۰	پونڈ
۱۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء سے اب تک اٹلی جو خرچ کر چکا ہے	۱۱۶،۰۰۰،۰۰۰	پونڈ
فوجی اخراجات فی ہفتہ	۴،۵۰۰،۰۰۰	پونڈ

ان اعداد و شمار کے مقابلہ میں حبش بالکل غریب ہے۔ اس غریب کو قرض بھی میسر نہ آسکا۔ اور لیگ اقوام کے کسی ممبر نے اسے کوئی امداد نہیں پہنچائی محض

کمیٹیوں کے انعقاد اور الفاظی الجمنوں میں تمام وقت ضائع کر دیا۔ شہنشاہِ حبش کو قرضے کی اپیل میں صرف ۵۰۰ پونڈ موصول ہوئے اور وہ بھی صرف اپنے دوستوں سے۔

تاہم اہلِ حبش کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ جبتک ایک حبشی بھی زندہ ہے وہ اٹلی کو چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ چنانچہ ڈلیسی اور عدیس ابابا کے درمیان جو سڑک ہے وہ عساکرِ حبش نے بالکل اڑا دی ہے اور اُسے ناقابلِ استعمال کر دیا ہے۔ سڑک مذکور کو ٹھیک حالت میں لانے کے لئے کئی مہینے لگ جائیں گے اور جب تک بارشیں شروع ہو جائیں گی۔ اٹلی کی شکست اور فتح کا انحصار صرف انہی بارشوں پر موصوف ہے کیونکہ اس کا جملہ سامانِ حرب گیس بارود وغیرہ سب بے کار ہو جائیں گے۔ اور حبشہ کو پہاڑوں کے دروں میں سے حملہ کرنے کا اطمینان سے موقعہ مل جائے گا۔

موجودہ حالات میں لیگ اقوام بھی بے دست و پا ہے اٹلی کے موجودہ رویہ سے کسی قسم کی شرائطِ صلح کو ناممکن بنا دیا ہے۔ اٹلی کے خلاف لیگ اقوام نے جو پابندیاں عاید کی تھیں اُن پر بھی عمل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ممبرانِ لیگ کے درمیان تفرقہ اور نااتفاقی پیدا ہو گئی ہے جو نئی مصیبت وارد ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جرمنی نے رائن لینڈ پر قبضہ کر لیا ہے اور لیگ کے دو زبردست ممبروں یعنی انگلینڈ اور فرانس کی تمام تر توجہ اِس طرف مبذول ہو گئی ہے اور حبش اٹلی کے رحم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایسے حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ دستِ غیب حبش کی مدد کرتا ہے یا ملکۂ سبا بلقیس کا یہ مایۂ ناز وطن اٹلی کے غلام ملکوں کی فہرست میں جگہ پاتا ہے۔

جنگِ یورپ

حبشہ اور اٹلی کی آویزش سے جرمنی کو جو خدا داد موقعہ سابقہ عہد و مواعید کے توڑنے کا ملا ہے اس سے اس نے پورا فائدہ اُٹھایا ہے اور رائن لینڈ سے اُس کو بے دخل کرنے کی سب مساعی ناکام ہو چکی ہیں۔ لیکن جرمنی کے اس اقدام نے یورپ کے تمام ملکوں کے لئے اعلانِ جنگ کے بگل کا کام دیا ہے۔ آسٹریا ہنگری میں ہر بالغ کی بھرتی ہو رہی ہے۔ پولینڈ۔ ہالینڈ۔ بلجیم اپنی اپنی تلواروں کو صیقل کر رہے ہیں۔ انگلستان کی بری فوج اور بحری اور ہوائی بیڑے کی برق رفتار توسیع عمل میں آ رہی ہے۔ ترکی دردانیال اور گیلی پولی کے قلعوں کے استحکام کا حق دار بن چکا ہے۔ اور بعض خبروں کے بموجب اس بین الاقوامی وغیر فوجی علاقے میں جرمنی کی طرح اپنی فوجیں اتار چکا ہے۔ اِس فعل کو سویٹ روس حق بجانب قرار دے رہا ہے۔ شام کے فرانسیسی مقبوضے کے خلاف عراق و حجاز کے معاہدے ہو چکے ہیں۔ روس و جاپان ایک دوسرے کا کشت و خون کرنے کے لئے بالکل تیار منگولیا کی حدوں پر کھڑے ہیں۔

غرض ایک عالمگیر جنگ کے برپا ہو سکنے کے لئے تمام اسباب جمع ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے دن اور وقت تعین کرنے کا اختیار صرف انگلستان کو حاصل ہے جو اس وقت تمام دنیا کی بین الاقوامی سیاست کا کلید بردار ہے دیکھنا چاہیئے کہ جنگِ عظیم کی طرح کس واقعے کو بنائے فساد بنایا جائے گا جس سے آتشِ جنگ کے شعلے تمام دنیا میں بھڑکیں گے۔ اور دنیا کا کوئی ملک اُن کی لپیٹ میں آئے بغیر نہ رہ سکیگا۔ مگر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ پچھلی جنگِ عظیم کی طرح آنے والی جنگ بھی محض اقتصادی مشکلات کی رہینِ منت ہو گی۔ کیونکہ ہر ملک میں جو شدید جذبہ، سرمایہ داری کی جمہوری اور آئینی حکومتوں کا تختہ پلٹ کر اُس کی جگہ اشتراکی نظام کے قایم کرنے کا کارفرما ہے وہ صرف اقتصادی مشکلات سے پیدا ہوا ہے جس کا حل وہ حکومتیں ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گئی ہیں اور تاشیٹ کی کڑوی گولی بھی اس مہلک مرض کا مداوا نہ کر سکی اب ان سب کے لئے ایک ہی چارۂ کار رہ گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ صرف ایک عالمگیر جنگ۔ جو کچھ عرصے کے لئے اس اقتصادی انقلاب کو روک سکیگی جو دنیا کے ہر ملک کو دھمکا رہا ہے۔

جاپان کا تازہ انقلاب

۲۶ رفروری کو صبح ۵ بج کر ۳۰ منٹ پر امپیریل جاپانیز آرمی کے پہلے ڈویژن کے سپاہیوں نے کیپٹن نونا کا کی سرکردگی میں بغیر اپنے ڈویژن کے کمانڈر کو مطلع کئے غدر کیا اور حکومت کے وزرا اور بڑے عہدہ داروں کو قتل کر دیا۔ کیوں؟ اس کا جواب خود انہی فوجی افسروں کے اعلان میں بہت صاف ہے جو اس غدر کے ذمہ دار تھے۔

"ہم نے یہ کارروائی اِس لئے کی کہ جو پرانے ماہرینِ سیاست، بڑے عہدہ دار، اقتصادی۔ فوجی اور سیاسی گروہ ملک کو خرابی میں مبتلا کر رہے ہیں اور بُرائی کا سرچشمہ ہیں اُنھیں مٹا کر قوم کی حفاظت کریں اور اُن کے اثر سے قوم کو

نجات دیں۔ اور یہ بیان ہم جاپان کی قومی پالسی کا تحفظ کرنے اور اس فرض کی بجا آوری کے لئے دے رہے ہیں جو تاج کی طرف سے ہم پر عاید ہے" گویا یہ حادثہ جس میں جاپان کے تین سابق وزرائے اعظم اور بڑے بڑے ماہرین سیاست قتل ہوئے قوم اور ملک کی حمیت ہی میں وقوع پذیر ہوا۔ مقتولین کی مجموعی تعداد .. بتائی جاتی ہے۔

دنیا متحیر رہ گئی کہ قوم اور ملک کی خدمت کا یہ کون طریقہ تھا۔ مگر جاپان میں یہ نئی بات نہیں۔ جاپان میں سیاسی اختلافات کی بنا پر قتل قومی معمول ہے موجودہ جاپان جس کی عظمت اور شوکت نے ساری دنیا کو متحیر کر دیا ہے اس قسم کی ایک قاتلانہ مہم کی بنیاد پر تعمیر ہوا ہے ایک پروگرام بنا کر شاید ایک رات میں وہ سب لوگ قتل کر دئے گئے تھے جو جاپان میں نیا نظام قایم کرنے کے مخالف تھے۔

۱۹۲۱ء سے لے کر اس وقت تک بہت سے ماہرین سیاست قتل ہو چکے ہیں۔

وزیر اعظم ہاماپاراس اس توہین کا باعث قرار دیا گیا جو معاہدۂ واشنگٹن سے جاپان کے نوجوان فوجی گروہ نے محسوس کی۔ اور ۱۹۲۱ء میں قتل کر دیا گیا۔

وزیر اعظم ہاماگوچ اور بیرن واکت سیو کی جو لندن کی بحری کانفرنس میں جاپان کے خاص نمائندے تھے ۳۰ء میں اس لئے قتل کر دئے گئے کہ وہ ۳۔ ۵۔ ۵ کے تناسب کے موید تھے۔

لیگ اقوام منچوریہ پر جاپان کے قبضے کی سخت مخالف تھی۔ لیگ کے اس طرزِ عمل پر احتجاج کرنے کے لئے ۱۹۳۲ء میں وزیر اعظم اینوکائی اور وزیر مال انوئی کو قتل کر دیا گیا۔

بیرن ڈان ایک بہت بڑا مہاجن تھا۔ اس کو ۱۹۳۲ء میں اس لئے قتل کر دیا گیا کہ مالداروں کو تنبیہہ ہو جائے اور وہ سیاست میں دخل نہ دیں۔

میجر جنرل ناگاتا افسر دفتر امور عساکر کو ۱۹۳۰ء میں اس وجہ سے قتل کیا گیا کہ اُس نے سیاسی خیال کے افسروں کا تنزل کر دیا تھا۔

اسی سلسلے میں یہ اتنی قتل بھی ہیں جو ۲۶ر فروری کو ہوئے۔

جاپانی روایات اور قومی معمول

جاپان ایک عسکریت پسند قوم ہے اور اس کا نظامِ حکومت بھی عسکری ہے۔ بظاہر گورنمنٹ اور اس کے تمام لوازم نظر آتے ہیں۔ لیکن واقعی جاپان کی سیاست فوجیوں کے ہاتھ میں ہے کسی کی طاقت نہیں ہے کہ جاپان کی فوج اور بیڑے کے بجٹ میں ترمیم کر سکے۔ فوجی قائد اپنے آپ کو جاپان کی قومی روایات اور وقار کا محافظ سمجھتے ہیں۔

شہنشاہِ جاپان کے ساتھ اُن کو اور تمام قوم کو انتہا درجے کی عقیدت ہے وہ اُس کو درجہ الوہیت دیتے ہیں اور تمام برکتوں اور نعمتوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ دوسرے ممالک پر فوج کشی اور فتوحات اُن کے نزدیک ایک عبادت ہے اور شاید سب سے بڑی۔ گویا وہ اپنے شہنشاہ کی اُن برکتوں کو جو خود اُنھیں حاصل ہیں۔ تمام دنیا میں فتوحات کے ذریعہ پہنچا دینا اپنا فریضہ دینی سمجھتے ہیں۔

اب وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ جاپان میں اعتدال پسند ماہرین سیاست کا اثر بڑھ رہا ہے اور یہ اثر جاپان کی فوجی مہمات اور فتوحات کے لئے مضر ہے۔ پھر وہ اُن لوگوں سے بہت ہی ناخوش ہیں جنھوں نے یورپین طور وطریق اختیار کر لئے ہیں اور جن کی وجہ سے یورپین معاشرت، اخلاق اور دلچسپیاں جاپان میں ترقی کر رہی ہیں۔ مثلاً سینما اور ناچ وغیرہ۔ وہ زراعت پیشہ طبقے کی اقتصادی خوشحالی کو ہر چیز پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور شہریوں کی سرمایہ دارانہ ثروت کو بہت بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔

اِن مقاصد کی تکمیل اور بُرے اثرات کے انسداد کے لئے جاپان میں خفیہ انجمنیں قائم ہیں جن کا فوج سے گہرا تعلق ہے۔ جب کسی شخص کو جاپان کے قدیم نظریہ روایات اور فاتحانہ اسکیم کا وہ مخالف پاتے ہیں اُس کو قتل کر دیتے ہیں۔ ان خفیہ انجمنوں میں قابلِ قتل لوگوں کی ایک فہرست رہتی ہے جس کا نام اِس فہرست میں درج ہو جاتا ہے وہ خواہ اپنے تحفظ کے لئے کچھ کرے۔ بچ نہیں سکتا۔

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے جنھیں جاپانی اچھا سمجھتے ہیں کسی کو قتل کر دینا جیسا ہے، بہت ہی اچھی بات سمجھی جاتی ہے۔ خودکشی جسے اُن کی زبان میں 'ہراکری' کہتے ہیں اسی قدر معزز اور مقدس فعل ہے جیسے بعض قوموں میں شہادت۔ چنانچہ اس قاتلانہ ہنگامے میں جو لوگ سرغنہ تھے اُن کو حکومت نے 'ہراکری' کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ اور اُنھوں نے جدید طریقے پر یعنی ریوالور سے 'ہراکری' کی۔ اب اُنھیں مجرم کوئی نہیں کہہ سکتا۔ حکومت نے 'ہراکری' کی اجازت دے کر خود اُن کی نیک نیتی اور اخلاص کا اعتراف کر لیا۔ ساری دنیا اِن سپاہیوں اور افسروں کو جنھوں نے یہ قتل کئے قاتل سمجھتی ہے۔ اور شاید نفرت کی نظر سے دیکھتی ہو۔ مگر جاپانی ہمیشہ

اُنھیں ہیرو سمجھیں گے اور اُن کے اس کارنامے پر فخر کریں گے۔

جاپان کا قومی لٹریچر اسی قسم کے قتل اور ہراکری کے انسانوں سے بھرا ہوا ہے۔ بچوں کا کیرکٹر بنانے کے لئے اور اُن کا اخلاق بلند کرنے کے لئے یہ افسانے اُنھیں پڑھائے اور سنائے جاتے ہیں۔

دوشنبے کو جاپانی انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا۔ اس انتخاب میں اعتدال پسند گروہ کے لوگ زیادہ کامیاب ہوئے۔ چنانچہ اعتدال پسندوں میں جو بڑے بڑے آدمی تھے قتل کر دئے گئے۔

جاپان کا فوجی پروگرام

اس خونریزی کے وجوہ اور نتائج بالکل صاف ہیں۔ جاپان میں کوئی ایسی گورنمنٹ کامیاب نہیں ہوسکتی جو عسکریت پسند نہ ہو اور فتوحات کے ذریعہ ساری دنیا میں شہنشاہِ جاپان کی برکات کو عام کرنے کی اسکیم کو پورا کرنے کے لئے مصروفِ عمل نہ رہے۔ یہ فتوحات کی اسکیم بھی کوئی مبہم اور مختصر سی اسکیم نہیں ہے ایک مرتب پروگرام ہے جس میں وقت اور ذرائع تک کا تعین کر دیا گیا ہے۔ پہلے سارا چین فتح کیا جائے گا۔ پھر ہندوستان اور اس کے بعد شاید ساری ایشیا۔ یہ پروگرام شہنشاہِ جاپان کی فرمائش سے بنایا گیا۔ کسی چینی کلرک کے ذریعہ سے چروایا گیا اور چین میں شائع ہوا۔ جاپانی گورنمنٹ نے اس کے غلط ہونے کا اعلان کیا مگر یہ اعلان جھوٹا تھا اسی پروگرام پر جاپان عامل ہے اور وہی حکومت اور ماہرینِ سیاست مقبول ہوں گے جو اس پروگرام کو جلد اور قوت کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کریں گے اور جو اس کے خلاف یا عمل میں سست ہوں گے قتل کئے جائیں گے۔

ہندوستان

اُس مہینے میں بڑی دھوم دھام سے سیاسی جماعتیں اپنے اجلاس ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں منعقد کرنے میں مصروف ہیں۔ مگر سارے سیاسی ہندوستان کی نظریں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس کی کارروائیوں پر لگی ہوئی ہیں۔ جو کچھ ان مجالس میں ہوا ہے وہ قریب قریب تمام تعلیم یافتہ جماعت کے علم میں آچکا ہے۔ اس لئے ان تفصیلات کا تذکرہ تضیعِ اوقات کے مرادف ہوگا۔ لیکن ایک حقیقت بنہایت نمایاں طور پر جلوہ گر ہوگئی ہے کہ ہندوستان کی تمام وہ سیاسی جماعتیں جو منظرِ عام پر بہت عرصے سے جلوہ فرما ہیں ہندوستان میں ایک معاشرتی انقلاب کے امکان سے خوفزدہ ہوگئی ہیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے صدر سر وزیر حسن کے خطبۂ صدارت کو اگر غور سے پڑھا جائے تو ہمارے اس خیال کی تصدیق ہوگی۔

> "دوسرے ممالک کی طرح ہمیں بھی سمجھ لینا چاہئیے کہ ہماری موجودہ حالت میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور جب تک یہ تبدیلی جلد ظہور میں نہ آئے گی ہمارے اس معاشرتی نظام کی عمارت دھڑ سے نیچے گر جائے گی۔ اور اس انہدام کے ساتھ نہ صرف ہماری قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ بلکہ ان تمام جماعتوں کی ہستی حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی جو "ذات" "زمین" یا "روپیہ" کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔"

سر وزیر حسن نے اپنے خطبے میں آگے چل کر بہت دبی زبان سے کہا کہ ہمارے اس قدیم مستحکم نظام کی جگہ جو دوسرا نظام انقلاب لا رہا ہے اس کی تعمیر میں بھی ہمیں دلچسپی لینی چاہئیے۔ کیونکہ اس صورت میں ہماری بقا ممکن ہے۔

اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو صدر کانگریس نے بھی بڑے زور شور سے اشتراکیت کی حمایت کی گئی ہے اور اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ کو بین الاقوامی مسائل کا ایک جزو قرار دیا جاوے اور کہ اگر ہندوستان کی تحریک کو اس عام بین الاقوامی تحریک سے علیحدہ رکھا گیا جو سرمایہ دار اور سماجی قوتوں کے خلاف دُنیا میں ایک نیا جمہوری نظام قایم کرنے کے لئے جاری ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان اس زبردست قوت کے سہارے سے محروم ہو جائے گا۔ جو اس عالمگیر تحریک کی پشت پر ہے اور ہندوستان کو اپنی جنگ یکہ و تنہا ہی لڑنی پڑے گی۔ یقیناً ہندوستان اور کانگریس کی سیاست میں یہ ایک نیا پیغام ہے۔ نیا نقطۂ خیال ہے اگر ہندوستانیوں کے تخیل میں اس سے تبدیلی پیدا ہوئی اور اپنی سیاست کو بین الاقوامی نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے بہت سے پیچیدہ مسائل حل ہو جائیں گے۔

کانگریس کے رزولیوشن

کانگریس کے اجلاس سے کئی روز قبل سبجکٹس کمیٹی میں رزولیوشنوں پر بحث شروع ہوگئی تھی۔ سوشلسٹ اور قدیم خیال کے کانگریسی یہ دو گروہ تھے۔ جن میں ابتدا سے آخر تک کشمکش رہی حتیٰ کہ اجلاسِ عام میں بھی سوشلسٹوں نے

(بقیہ دیکھو صفحہ ۴۸۳)

نقد و نظر

ادارۂ کلیم

سالنامہ سہیل ۱۹۳۶ء

انجمن اردوئے معلیٰ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا یہ سہ ماہی رسالہ ۱۹۲۶ء کے بعد سے معرضِ التوا میں تھا۔ اور اب سالنامے کی صورت میں شائع ہوا ہے، کارکنانِ انجمن مستحقِ شکریہ اور قابلِ مبارکباد ہیں کہ "صورتِ حال کو امید افزا دیکھ کر جلد سے جلد آمادۂ کار ہوگئے" اور اس مفید مجلے کو پھر جاری کر دیا۔ اگر اور تمام وجوہ سے قطع نظر کر بھی لی جائے تو محض یہ وجہ کافی ہے کہ کسی دارالعلوم سے ایک ذی وقعت علمی و ادبی رسالہ کا شائع ہونا نہایت ضروری ہے۔

زیرِ نظر سالنامے کی ترتیب و تدوین اور مضامین کا تنوع اور لہجے کی متانت اردو صحافت میں ایک مثال ہے۔

شذرات میں رشید صاحب نے بہت سی کار آمد باتیں لکھی ہیں اور نہایت معقولیت کے ساتھ۔

"مصوری کے میلانات نو" ایک اہم اور سبق آموز مقالہ ہے۔ صاحبِ مقالہ اس کو آسان تر بنا سکتے تھے۔ نقاشی کی اصطلاحات کے متعلق یہ بات فیصلہ طلب ہے کہ آیا ہم کو اپنی اصطلاحات وضع کرنا ہیں یا انگریزی کی اصطلاحیں اختیار کرنا ہیں۔ ڈاکٹر سلیم الزماں نے اس مضمون میں کہیں ترجمہ دیا اور کہیں انگریزی کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ ایک طریقہ اختیار کرکے اس فن کی تمام اصطلاحوں کے مترادفات بھی شائع کر دیتے۔ چونکہ نقاشی کی تعلیم انگریزی میں دی جاتی ہے، اور اس لئے بھی کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور نقاشی کے مختلف اسکولوں میں اصطلاحات کے باب میں اتحاد رہے ہم ڈاکٹر صاحب سے توقع رکھتے ہیں کہ مختلف سوسائٹیوں سے مراسلت کرکے انگریزی مصطلحات میں تاریخ سے کام لے کر ان کو عام کرنے کی سعی کریں گے۔

"دیوانے (ڈراما)" غالباً ترجمہ ہے، اور ایک اعلیٰ ادب پارہ۔ جعفری صاحب کا ترجمے کے لئے اس ڈراما کو انتخاب کرنا اُن کے ذوقِ ادب کی دلیل ہے۔ ترجمہ شستہ و رفتہ ہے۔ لیکن بعض جگہ اصل مفہوم کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ مثلاً سفید چہرے کی تشبیہ "خالی صراحی" سے دی گئی ہے۔ "صراحی" کا مفہوم ہمارے ذہن میں چہرے کی سفیدی کا تصور پیدا نہیں کرتا۔ صراحی کی جگہ بوتل کا لفظ یقیناً غیر ادیبانہ تھا۔ لیکن "مینا" کہہ دینے سے بوتل کی سفیدی کی طرف ذہن منتقل ہو سکتا تھا۔ کنٹر بھی اردو لفظ ہے اور استعمال کیا جا سکتا ہے۔

"تعلیم اور اسلامی معاشرت" خواجہ غلام السیدین کا ایک عالمانہ مضمون ہے۔

"اُردو کے تاریخی ماخذ" ابو لیث صاحب کا تحقیقی مقالہ ہے، لیکن انکا نظریہ ایک عام نظریہ ہے۔ یعنی تاریخ اردو سے متعلق دورِ اول سے قبل کے کسی صاف اور سلیس شعر کو اس نام اور عہد سے متعلق تسلیم نہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ "ڈوم گایا کیوں نہیں، گوشت کھایا کیوں نہیں؟ گلا نہ تھا" کو بھی امیر خسروؒ کی زبان نہ مانا جائے۔ اس لئے کہ یہ تو آج کل کی زبان ہے۔ حالانکہ اسمار و افعال ہر عہد میں کم و بیش اسی طرح ترکیب پا سکتے ہیں۔

"غزل گوئی پر ایک نظر" جناب سہیل نے نہایت معقول اور مناسب باتیں کہی ہیں، اور وقت آگیا ہے کہ ہمارے غزل گو شعراء اپنا مسلک بدل ڈالیں۔

"روزِ جزا" سجاد انصاری مرحوم کے "باقیات الصالحات" ادبی ہے، اور ادارۂ سہیل نے اس ناتمام ڈراما کو شائع کرکے مرحوم کی قدر دانی اور زبان و ادب کی خدمت گزاری کا ثبوت دیا ہے۔

"مادر نژاد" جناب سلطان حیدر جوشؔ کا افسانہ ہے جس میں انسانی زندگی

اور جذبات کی تقریریں واقعیت نگاری (Realism) کے تحت نہایت تکمیل کے ساتھ نقش کی ہیں۔

"حافظ کے کلام میں کلام" ڈاکٹر صدیقی کا تنقیدی مقالہ ہے۔ ادارے کی طرف سے اس مقالے پر عمدہ نوٹ دیا گیا ہے۔

"حالی ایک محب وطن کی حیثیت سے" ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا ایک اہم مضمون ہے۔

"قومی ادب اور ہندی میلیں" پر ڈاکٹر اشرف نے نہایت معقول جرح و تعدیل کی ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اس بحث کو سلیس ترکر کے لکھتے تو زیادہ بہتر تھا۔

"کریڈٹ" جناب رشید کا طنزیہ مضمون ہے، اور رمز، عبارت و خیال کے اعتبار سے رشید صاحب کے بہترین مضامین شمار کیے جانے قابل تھے۔ لیکن ہمیں رشید صاحب سے شکایت ہے کہ وہ ہنسنے ہنسانے سے اتنے دور کیوں ہوتے جا رہے ہیں، کوئز کو پڑھ کر ہمیں ادبی لطف و انبساط تو بہت حاصل ہوا۔ مگر ہنسی نہ آئی۔

انتخاب تصاویر میں ادارہ سہیل نے بلند ذوق کی داد دی ہے، ہندوستان میں مذاق صناعت (آرٹ) نے ایک حیثیت حاصل کر لی ہے۔ لیکن کلام اس میں ہے کہ کیا من حیث ہم میں یہ مذاق پیدا ہو چکا ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ عام طور پر وہی نسوانی تصویریں پسند کی جاتی ہیں جن کی شکلیں حسین اور ادائیں دلکش ہوں، اور بحالات موجودہ ایسی تصاویر کی اشاعت کا اقدام جو عام طور پر سمجھی نہ جا سکیں ایک جرأت اقدام ہے اور قابل ہزار تحسین۔

لیکن اس خیال سے کہ ابھی تک ہمارے خواص بھی تصویر کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ان تصاویر کے ساتھ مختصر شذرے لکھ دینا زیادہ مفید و مناسب ہوتا۔

المختصر ہم ارکان ادارہ کو اس کامیاب اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعاگو ہیں کہ سہیل ہر سال بہتر سے بہتر صورت میں جاری رہے۔

رسالے کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے اور انجمن کے دفتر سے مل سکتا ہے۔

جالینوس

مدیر۔ (انیس الاطبا) حکیم سید جعفر علی عشقی نقوی
قیمت سالانہ دو روپے۔ فی پرچہ تین آنے۔

مقام اشاعت۔ جالینوسی دواخانہ رجسٹرڈ۔ راجہ اسٹریٹ سیالکوٹ

یہ طبی ماہنامہ سیالکوٹ سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ تحقیقاتی مضامین، اور دوسرے حفظان صحت و تحقیق الادویہ پر قابل قدر مضامین دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس ادارے کا مقصد لوگوں کو مفید معلومات طبی سے روشناس کرانا ہے۔ دوسرے رسائل کی طرح صرف دواؤں کا فروخت کرنا اس کا مقصد نہیں ہے۔ ایک دلچسپ خبر یہ بھی اس میں درج ہے کہ امریکہ کی ایک بیگم صاحبہ کے پیٹ میں درد تھا۔ عمل جراحی کیا گیا تو دنیا بھر کی تعداد میں ۴۲۲ بلیات اس میں سے نکل پڑیں۔ جن میں خصوصیت سے میخیں، چارسکے، پنچے، پن، موٹروں کے ٹائروں کے ٹکڑے، اور شیشوں، زنجیروں اور چارپائیوں کی کمانیوں کے ٹکڑے تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ بیگم صاحبہ آدم زادی تھیں، یا مگرمچھ زادی۔ کہ اکثر شکاریوں کی روایتوں سے تو اس جنس عجیب الخلقت کے پیٹ سے ایسے دفینوں کے نکلنے کا پتہ ضرور لگتا رہا ہے۔ مگر انسان کے متعلق یہ معلومات بالکل جدید ہیں۔ رسالے کا حجم ۵۰ صفحات کا ہے۔

اجتماع

ایڈیٹر۔ ہلال احمد زبیری قیمت سالانہ عہ۔ قیمت فی پرچہ ۳ر

اجتماع کا ماہوار ایڈیشن دنیائے صحافت کے درخشندہ ستارے ہلال احمد صاحب زبیری ایم اے کی ایڈیٹری میں دارالسلطنت دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ دہلی کے کم قیمت رسالوں میں اپنی قسم کا پہلا رسالہ ہے جس میں مشاق ادیبوں کے مضامین اور اچھے شعرا کا کلام زینت پاتا ہے۔ اعلیٰ پایہ کے مذہبی۔ ادبی۔ سیاسی۔ معاشرتی مضامین اس کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کارکنان اجتماع سے ہمیں قوی امید ہے کہ وہ موجودہ بلند معیار کو قائم رکھیں گے۔

الموسیٰ

مدیران۔ محمد افضل حسین و سید مہدی حسین۔ مقام اشاعت۔ دفتر الموسیٰ سٹی کالج حیدرآباد دکن

سالانہ چندہ۔ طلبا حال سے عہ۔ طلبا سابق سے عہ۔ عام خریداران سے للعہ

۲۰×۳۰/۸ سائز پر ۸۰ صفحات کا یہ تماہی رسالہ سٹی کالج حیدرآباد (دکن) سے نکلتا ہے۔ سٹی کالج کی عمارت چونکہ موسیٰ ندی پر واقع ہے اسی نسبت سے نام الموسیٰ رکھا گیا ہے۔ طلبا فاضل اساتذہ کی نگرانی میں اس کی ادارت کرتے ہیں۔ مضامین، نظمیں و غزلیں طلبا کی بھی ہوتی ہیں اور اساتذہ و دیگر اہل قلم کی بھی۔ زیر ریویو نمبر ماہ اسفندیار ۱۳۴۸ف کا ہے جو بوجہ گذشتہ

ایک سہ ماہی میں بند رہنے کے ۱۲۰ صفحات پر نکالا گیا ہے۔ مفید اور دلچسپ مضامین اور غزلیں دیکھکر دل خوش ہوا اور بالخصوص طلبا کی قابلیت اور ذوق ادب سے بڑی مسرت ہوئی۔ ۱۱ بابیہ نمونہ مذکورہ بالا پتے سے طلب فرما سکتے ہیں۔

ساغر

مدیران۔ حسن عرفانی۔ غلام عباس سولیؔ۔ "ن" عبد الماجد شیخ۔

قیمت سالانہ ۔للعہ (علاوہ محصولڈاک) قیمت فی پرچہ ۔ ۵ر

مقام اشاعت۔ دفتر ساغر نمبر ۹ ٹینک اسٹریٹ۔ بمبئی ۸

$\frac{20}{8} \times 30$ کے سائز پر یہ ۴۰ صفحات کا رسالہ بمبئی سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ نظم و نثر مضامین میں اچھے مشہور ادیبوں اور شاعروں کے نام نظر آتے ہیں۔ بمبئی سے رسالہ نکالنا اور اردو ادب کا ذوق پیدا کرنا "کارے دارد" کا مصداق ہے۔ بظاہر اس رسالہ نے بیڑا اُٹھایا ہے۔ ہم خلوص دل سے ان حوصلہ مند کارکنوں کی کامیابی کے متمنی ہیں۔ گو رسالہ معنوی لحاظ سے اچھا ہے۔ لیکن کوشش اور سعی نے میدان میں اس کے ہواخواہوں کو کافی دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اردو ادب کے دردمندوں سے متوقع ہیں کہ وہ ساغر بمبئی کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

میخانہ

اڈیٹر۔ ایس۔ ایم عشرت

قیمت سالانہ ایک روپیہ چار آنہ

قیمت فی پرچہ چھ پیسے

۴۴ صفحات کا یہ رسالہ جس میں اشتہارات بھی شامل ہیں۔ دہلی سے نکلنا شروع ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ رسالہ لکھنؤ سے نکلا تھا، اور اب نقل مکان کرکے دہلی سے جلوہ گر ہوا ہے۔

فلم ایکٹرسوں کی تصاویر سے رسالہ نہایت دلکش بن گیا ہے۔ غزلوں نظموں اور افسانوں کے علاوہ دوسری قسم کے مضامین بھی موجود ہیں۔ قیمت اس قدر کم ہے کہ ہر صاحب ذوق نمونہ منگاکر دیکھ سکتے ہیں۔

دفتر رسالہ میخانہ دہلی۔

رہنمائے صحت۔ لکھنؤ

زیر سرپرستی۔ حکیم سید محمد قاسم صاحب (راس الاطبا)

مدیر۔ حکیم شاہ وارث حسین صاحب پھلواری

قیمت سالانہ ایک روپیہ

ملنے کا پتہ۔ دواخانہ معدن الادویہ۔ وکٹوریہ سٹریٹ۔ لکھنؤ

۹۰ صفحات کا یہ رسالہ $\frac{20 \times 22}{8}$ کے سائز پر جاری کیا گیا ہے جس میں صحت جسمانی کے متعلق نہایت مفید اشارات ہیں طب یونانی کی حمایت کی گئی ہے۔ اور طب مغرب پر اُسے فضیلت دئے جانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ عمدہ دواؤں کے خواص اور بعض امراض کی کیفیت اور اُن کے علاج بھی بتائے گئے ہیں۔ رسالے میں فہرست دواخانہ معدن الادویہ کو بھی جگہ دی گئی ہے جو مفید اور کارآمد ہے۔

مسدس حالی

ملنے کا پتہ۔ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ کتاب گھر دہلی

مذہبی صحیفوں کے بعد مسدس حالی وہ کتاب ہے جو ہندوستان میں ہر زبان کی کتاب سے زیادہ اب تک شائع ہو چکی ہے اور ہمیشہ شائع ہوتی رہے گی۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ شعرا نے اپنے پرجوش کلام سے جنگوں کے نقشے بدل دئے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ شاعر کو قدرت حاصل ہے کہ وہ ظالم و خونخوار آنکھوں کو مجبور کردے کہ وہ آنسو بہائیں۔ وہ قادر ہے کہ پتھر سے زیادہ سخت دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھدے وغیرہ۔ ایسے دعاوی کرنا شعرائے عرب و فرنگ کے لئے شاید جائز ہو۔ لیکن آج سے ساٹھ سال قبل ہندوستان میں اگر ایسا دعویٰ کیا بھی جاتا تو وہ سوائے بے جا شیخی کے اور کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ یہ بے بضاعتی کچھ اردو زبان کے لئے ہی نہ تھی۔ بلکہ ہندوستان کی کوئی زبان بھی ایسا شاعر پیش کرنے سے قاصر تھی۔ لیکن قدرت نے یہ افتخار زبان اُردو کو مسدس حالی کی صورت میں عطا فرمایا۔ جس نے مُردوں کو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ سوتوں کو اُن کے بستر استراحت سے گھسیٹ کر کھڑا کر دیا۔ بیچاروں کو خودداری عطا فرمائی۔ "لاچاروں" کو بے قراری اور جستجو کا متوالا بنایا۔ گرتے ہوؤں کو یہ کہہ کر سنبھالا کہ تم وہ ہو جنہوں نے دنیا بھر کے گرتے ہوؤں کو سنبھالا اور ڈوبے ہوؤں کو ترایا ہے۔ عروج کے مناظر اس طرح دکھلائے کہ زوال سے متنفر کردیا

اسباب وکیفیات زوال کو اس قدر توضیح سے جتایا کہ پستی اور تہیدستی سے لوگوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ اور مخ طبین میں رکت کے ایسے نمایاں آثار پیدا ہوئے کہ جن کی توقع نہ شاعر کو تھی اور نہ اُس محرم متحرک کو۔ (سر سید احمد خاں) جو بے اختیار پکار اٹھا کہ "جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا، تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں"

فی الحقیقت حالی دنیا کا وہ عالی منزلت شاعر ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت بہ یک جنبشِ قلم پلٹ دی۔ علامہ اقبال کے شکوے اور بانگِ درا مولانا اکبر حسین کے چٹکلے حسرت کی دل سوز آہیں، اور جوش کا انقلاب انگیز خروش جو آج طرح طرح سے ہندوستانی ادب کی تعمیر میں مصروف ہیں، یہ سب تمام تر اُسی درد بھرے دل کی پُرغم آہوں کے تاثرات ہیں۔

لوگ مولانا حالی کو سعدیِ ہند کہتے ہیں۔ شاید وہ ٹھیک کہتے ہوں؟ مگر ہمارے نزدیک حالی کا مرتبہ، اُس ماحول کے تناسب سے جو اِن دونوں مصلح شعرا کو گھیرے ہوئے تھا۔ نہایت بلند ہے۔

حالی کو اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے نہ وہ منجھی ہوئی شیریں زبان ہی ملی تھی جس میں سعدی نے زمزمہ پردازی کی، اور نہ وہ آزادانہ سیاسی زندگی حاصل تھی جس میں سعدی نے پرورش پائی۔ حالی خود غلام تھے اور غلاموں ہی سے اُن کو خطاب کرنا پڑا تھا۔ اُن غلاموں سے جن کی تمام اعلیٰ خصوصیات اور سربلندیوں کو ایک غیر ملکی حکومت نے "غدر" کے ہنگامے کی بنا پر ملیامیٹ کر دیا۔ اور وہ ایسا جسدِ بے جان بن کر رہ گئے تھے جن پر صرف گدھ ہی رحم فرما سکتے تھے۔ اِن حالات میں یہ کہنا کہ حالی اور سعدی ایک درجے کے مصلح شعرا گزرے ہیں درست نہیں ہے۔

مسدس حالی کو لاہور و کانپور کے علمی اداروں نے بہت ہی اہتمام سے طبع کرایا تھا۔ مگر حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے بھی اپنے اہتمام سے مسدس کو چھپوایا ہے جو بعض لحاظ سے سابق نسخوں سے بہتر ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے جو اس کے مرتب کرنے والے ہیں ایک نہایت قابلِ قدر مقالہ سپردِ قلم کیا ہے، مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد، سید راس مسعود صاحب، و نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولوی عبدالماجد صاحب نے اپنے اپنے انداز میں مسدس، اور نظم و نثر حالی پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، اور خواجہ غلام السیدین کے دو بلند پایہ مضامین بھی پڑھنے کے قابل ہیں۔ ایک فرہنگ بھی آخر میں موجود ہے جس میں تمام اُن محاوروں و استعاروں اور مشکل الفاظ کے معنی اور مطالب لکھ دئے گئے ہیں، جو مسدس میں آئے ہیں مگر عام فہم نہیں ہیں۔ غرض اس طرح سارے ہندوستان کے لئے مسدس حالی کو قابلِ فہم بنا دیا گیا ہے۔ سر سید علیہ الرحمۃ اور مولانا حالی کے خطوط اور تصاویر کے فوٹو بلاک بھی دئے گئے ہیں، دنیائے اسلام کی حالتِ عروج دکھانے کے لئے ایک رنگین نقشہ بھی کتاب کے آخر میں موجود ہے۔

ہم ہر ہندوستانی اور بالخصوص مسلمانانِ ہندوستان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس نادر نسخے کا ضرور مطالعہ فرمادیں کہ اس کا استفادہ زمانے کی قید سے آزاد ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

"ہتیا" اور دوسرے افسانے

مصنف مجنوں گورکھپوری

ناشر۔ حالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب گھر دہلی

حضرت مجنوں گورکھپوری ہندوستان کے مشاہیر ادب میں ہیں اور ہر ادبی رسالہ اُن کے افسانوں کو سرآنکھوں پر جگہ دیتا ہے۔

"ہتیا" یہ افسانہ شروع سے آخر تک اس قدر پُر اثر ہے کہ جب تک ختم نہ کر دیا جائے، نظر نہیں ہٹتی اور جب ختم ہو جاتا ہے تو دیر تک تمام خون جسم میں تیزی کے ساتھ گردش کرتا رہتا ہے۔ ہم مجنوں صاحب کی خدمت میں اس کامیاب افسانے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

افسوس کہ وقت نہایت تنگ ہے، ورنہ ہم اس افسانے کے محاسن ایک ایک کر کے گناتے اور اُس سے قارئین کو اندازہ ہوتا کہ حضرت مجنوں کا قلم کتنی قوت کا مالک ہے۔

علم الجفروف

از خان صاحب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی

ملنے کا پتہ۔ فراش خانہ دہلی

حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر جو دہلی کے ایک مشہور اور کامیاب طبیب ہیں۔ اُن چند افراد میں سے ہیں جو خاموشی سے علمی کام کیا کرتے ہیں۔ حکیم صاحب کو نہ شہرت کی تمنا ہے نہ مال و زر کی آرزو۔ "علم الحروف" انھیں کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب کو حکیم صاحب نے نہایت کاوش اور تحقیق کے ساتھ مرتب فرمایا ہے۔ اور مختلف ممالک کے رسم الخط اور اُن کی تدریجی تبدیلیوں کو نہایت خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں تمام خطوط کے نمونے اور بلاک بھی مہیا کئے ہیں۔

یہ کتاب درحقیقت اردو زبان میں ایک نایاب اضافہ ہے۔ اور ہم اردو دنیا سے پُر زور سفارش کریں گے کہ وہ اِس قابلِ قدر کتاب کے مطالعہ سے محروم نہ رہے جس سے اُس کی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوگا۔

بھگوت گیتا منظوم

موسومہ

نسیم عرفاں

مصنفہ منشی بشیشور پرشاد صاحب منوّر لکھنوی

قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ ۔ بلبلی خانہ بازار سیتارام دہلی و کلیم بکڈپو کٹرہ ڑیان دہلی

اکثر سمجھدار صوفی منش مسلمانوں اور بعض آزاد خیال ہندوؤں کے نزدیک بھی ہندو مذہبیات میں اگر کوئی ٹھوس اور علم و عمل کی مدعی آواز ہے تو وہ کرشن جی کا وہ صوفیانہ اپدیش ہے جو بھگوت گیتا کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اپدیش بزرگِ محترم نے کورکشیتر کے خونی میدان میں اُس وقت دیا تھا جب کہ آریہ ورت کے سورما حق و ناحق کا فیصلہ کرنے کے لئے شمشیر بکف وہاں جمع ہوگئے تھے، وہ سب آپس میں عزیز تھے۔ دشمنی حق پرستی و ناحق پرستی میں تھی۔ حق و ناحق کی اس جنگ میں آلۂ کار بن جانے کے باوجود اُن کی رگوں میں ایک ہی رنگ اور نسل کا خون دوڑ رہا تھا، ارجن پانڈوں کا مشہور مایۂ ناز سردار جو حق پرستی کا بھی علمبردار تھا۔ عزیزوں، بزرگوں، استادوں کی خون آشامی اور اُس کے بُرے نتائج کے خوف سے کانپ اٹھا، اُس نے اپنے ہتھیار ایک طرف پھینک دئے۔ جنگ کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ضروری نہیں ہم اپنوں کو محض اس لئے کہ وہ ناحق پرست ہیں، قتل کرکے اپنے ہاتھ خون میں رنگیں جس سے صدہا عورتیں رانڈ ہوکر اپنی عصمتیں تباہ کردیں، نسلیں برباد ہوجائیں، اور اس حق پرستانہ جنگ کا یہ انجام ہو کہ دھرم کی جگہ ادھرم دنیا پر مسلط ہوجائے۔ یہی وہ وقت تھا جبکہ کرشن جی نے وہ اپدیش دیا جس کو ہنود آج تک جوں کا توں سمجھتے ہیں۔ اور جو بھگوت گیتا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب تک دنیا میں روح اور جسم کی جداگانہ حیثیت تصور کی جاتی رہے گی یا مسئلہ آواگون جزو مذہب رہے گا، اور ایک لافانی، ابدی و سرمدی، خالق و مالک کل، ستار و غفار، عالم الغیب وحدہٗ لاشریک لہٗ کا تصور ذہنِ انسان میں باقی رہے گا، اس اپدیش کا فنا ہونا ناممکن ہے۔

گیتا میں فلسفۂ ہمہ اوست کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی مسئلہ تناسخ کو حیاتِ عالم کا ایک ضروری جزو قرار دیا گیا ہے۔ گو افعالِ نیک و بد کا صدور صرف ذاتِ بے ہمتا کی مصلحتوں سے منسوب کیا گیا ہے۔ مگر بُرائی سے انسان کو بچنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اس کے ذریعے وہ رستے سمجھائے گئے ہیں۔ وصالِ ذاتِ باری کو ارواح کا کمال قرار دیا گیا ہے اور سرچشمۂ تخلیق عالم جسم و روح بھی اُس سائر و دائر کل کو ہی ٹھہرایا گیا ہے۔

کرشن جی نے اکثر بلکہ تمام تر مقامات کلام میں اپنے آپ کو ذاتِ الٰہیات منسوب کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ جب ضرورتِ اصلاح مجبور کرتی ہے تو میں قالبِ انسانی میں جلوہ افروز ہوتا ہوں۔ اس دعوے میں ہمارے نزدیک وہی ہمہ اوست کا نظریہ کارفرما ہے۔ گیتا حق پرستی، فرض شناسی اور عشقِ الٰہی کی نہایت زبردست تبلیغ کرتی ہے۔

اس فلسفۂ ہنود کی مایۂ ناز کتاب کا سب سے پہلی دفعہ دربارِ اکبری کے درخشاں نورتن علامۂ وقت فیضی نے فارسی میں ترجمہ کرکے ہندو تصوف سے مسلمانوں کو روشناس کیا تھا۔ اردو میں بھی اس کتاب کے متعدد تراجم ہوئے جو زیادہ تر نثر میں ہیں۔ اس کے بعد نظم کی متعدد شرحیں اردو میں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن حال ہی میں لکھنؤ کے مشہور خاندانِ افق کے چشم و چراغ منوّر صاحب نے گیتا کو اردو میں نظم فرمایا ہے اور گلزارِ نسیم کی بحر میں گیتا کے ادق صوفیانہ مضامین و مطالب کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کہنا کہ وہ اپنی اس کوشش میں بہ لحاظ مترجم کامیاب ہوئے یا نہیں ہمارے لئے بہت دشوار ہے کیونکہ اکثر ترجمے کے متعلق نقد کا حق سنسکرت جاننے والوں کو حاصل نہیں۔ تاہم جس قدر اردو ترجموں سے

اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی بنا پر یہ کہنا غالباً نادرست نہ ہوگا کہ منور صاحب نے گو بالکل مکھی پر مکھی تو نہیں ماری ہے، لیکن ہر شلوک کا پورا پورا مدعا اس قدر پاکیزگی سے ادا کیا ہے کہ اگر نثر میں بھی ترجمہ کرنے والے شرما جائیں تو بے جا نہ ہوگا۔

گلزارِ نسیم کی بحر اختیار کر کے حضرت منور نے اس خشک زمین پر جو گلکاری کر دکھائی ہے وہ ضرور قابلِ داد ہے۔ شروع کرتے وقت غالباً شاعر کو تردد تھا کہ یہ کام ہو سکے گا یا نہیں اور گو احوالِ واقعی کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اُس میں ابتداً فرماتے ہیں۔

یہ کام نہیں اگرچہ آساں   پھر بھی میں ذرا نہیں ہراساں
رگ رگ میں ہے ذوقِ کامرانی   ہمت ہے بلند دل جواں ہے

لیکن دو اشعار کے بعد ہراس نمایاں ہوتا ہے۔

اک راہرو شکستہ پا ہوں   محتاجِ دعائے رہنما ہوں
جامی ہوں میں نہ ہوں نظیری   کیا کوئی کرے گا حرف گیری

پھر آگے کہا ہے کہ شاید لوگ معترض ہوں کہ "یہ نظم حُسنِ بیان سے مُعرا ہے اور دامنِ سخن پر ایک داغ ہے۔ اس بحر میں سخن آرائی کرنا نسیم کا منہ چڑانا ہے" اور پھر خود ہی اس کا جواب دے کر اپنی مشکلات کا اظہار کرتے ہیں۔

گو ٹھیک ہے معترض کا ارشاد   لیکن یہ بات بھی رہے یاد
گیتا فرضی بیاں نہیں ہے   قصہ نہیں داستاں نہیں ہے
آئینہ یہ اک ہے فلسفے کا   گنجینہ یہ اک ہے فلسفے کا
دُرِ شہوارِ معرفت ہے   بحرِ ذخارِ معرفت ہے
نغمہ یہ نہیں ترانۂ شوق   نظم اس میں نہیں فسانۂ شوق
گیتا کا نہیں کوئی بھی حصہ   دشینت و شکنتلا کا قصہ
جوہرِ سحرِ بیاں ہو جس کا   زیورِ حُسنِ بیاں جس کا

پھر گلزارِ نسیم کی تعریف کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

لیکن مرا باغ دوسرا ہے   مشکل مری اور بھی سوا ہے
کیا اس میں کمالِ فن دکھاؤں   خاک ایسی زمیں میں گل کھلاؤں
مایوس ہے مجھے یہ امید   ذرّے کو کرے گا اوجِ خورشید

ہمارے خیال میں شاعر کی اُمید جو درحقیقت اُس کی آرزو تھی اور جس کی کامیابی کا اُسے شبہ تھا پوری ہوئی ہے کہ اُس نے باوجود موضوع کی خشکی اور ترجمے کی بندش اور پابندیوں کے ایک قابلِ ستائش نظم کی صورت میں گیتا کو پیش کیا ہے۔

کسی مضمون کا ایک زبان سے دوسری زبان میں منظوم ترجمہ آورد کہلا سکتا ہے۔ مگر نسیمِ عرفاں میں جو روانی اکثر و بیشتر نظر آتی ہے اس لحاظ سے آورد کہنا ظلم ہے۔ اقتباساتِ ذیل کے ملاحظے کے بعد اربابِ ذوق غالباً ہماری ہمنوائی کریں گے۔

پہلا ادھیائے

(۲۱ لغایت ۲۴)

بس ہو گیا معرکہ یہ درپیش   ارجن نے کہا کہ اے نکوکیش[1]
محسن، عالی صفات ہیں آپ   آزاد ز تغیرات ہیں آپ
بیچ ان میں رتھ ذرا بڑھائیے   کیا حال ہے چل کے دکھائیے
آنکھیں ہیں یہ دیکھنے کی خواہاں   ہیں کون یہاں وہ مردِ میداں
جن کو شوقِ نبرد ہے آج   جن کو ذوقِ نبرد ہے آج
ہیں کون وہ سامنے صف آرا   جن سے ہے مقابلہ ہمارا
جن سے ہم پر ہے زندگی تنگ   جن سے کرنا ہے اب ہمیں جنگ
ہیں کون وہ آج مردِ جانباز   دریودھن فتنہ جو کے ہمساز
دھو لائے سب آگے ہیں جن کو   نا بر تنِ صف دری ہے جن کو
پھولے نہیں آج جو سماتے   ہم کو جو نہیں نظر میں لاتے
آمیزۂ اضطرابِ ارجن   تھا کرشن سے یہ خطابِ ارجن
سُن کے رتھ آپ نے بڑھایا   جس پہ بجرنگ کا تھا سایہ
خورشید اساس نیر آسا   تیزی میں تھا رتھ یہ برق آسا
شان و شوکت دکھا کے ٹھہرا   رتھ بیچ میں اب یہ جا کے ٹھہرا

(۲۶ لغایت ۳۲)

جب ارجن نے نظر اٹھائی   حیرت سی تھی ایک اُس پہ چھائی
میدان میں بہرِ جنگ بیتاب   تھے جمع عزیز و دوست احباب
دادا ماما، چچا تھے ان میں   استاد تھے رہنما تھے ان میں
ماما، پھوپھا، چچا کے فرزند   نانی، پوتے، رفیق دلبند
پیشہ بانا سپاہ گری کا   تھا کوئی نہ سر و ماں کسی کا
اظہارِ بہادری کو بیتاب   تھے اور بھی نیک و پاک اصحاب
منظر یہ عجیب دل شکن تھا   بے حد سببِ غم و محن تھا
وقفِ بیم و ہراس ارجن   تھا اک تغیر پاس ارجن
نظارۂ غم فضا سے معمور   دل کی حالت سے ہو کے مجبور
ارجن نے کرشن سے کہا یہ   میں دیکھ رہا ہوں آہ کیا یہ
خود اپنے ہی رشتہ دار احباب   ہیں جنگ و جدل کو آج بیتاب
یہ دیکھ کر سخت خستہ تن ہوں   وقفِ غم و خستگی و محن ہوں
از سرتا پا ہے تھرتھری سی   چھائی جاتی ہے بیہوشی سی
وقفِ سوزش سرا بدن ہے   استادہ ہر ایک روئے تن ہے
ایسی تاب و تواں ہے رخصت   ہاتھوں سے کماں ہے مرے رخصت
ہمت افتادہ ہو رہی پست   تپیدہ اعضا ہے بے بس دست
میدان میں حال ہو رہا غیر   ڈگمگائے جاتے ہیں دونوں پیر
جوڑا سا جگر میں پک رہا ہے   دل چاروں طرف بھٹک رہا ہے
تو صبحِ عذاب دیکھتا ہوں   آثار خراب دیکھتا ہوں
ہر خواب ہے بیم بخش تاثیر   ہر چیز ہے فالِ بد کی تصویر
یہ قتلِ عزیز و اقربا کیا   اپنے جو ہیں اُن کو مارنا کیا
جچتا نہیں اب نگاہ میں کچھ   لذت نہیں اس گناہ میں کچھ
مطلب تیر و تفنگ سے کیا   بل جائے گا فتحِ جنگ سے کیا
راحت کی نہیں مجھے تمنا   ہوں تاجِ شہی کا میں نہ جویا

(۳۳ لغایت ۳۷)

ہوں خواہ وہ نیک پتا[1]   پوتے، تائی، خسر کہ ماما
بھائی بی بی کا ہو کہ سمدھی   ہو خواہ عزیز اور کوئی
ہیں قتل کو میرے سب جو تیار   کچھ اس میں نہیں ہے مجھکو انکار
ہوں میں اے کرشن دل سے مجبور   مجھکو نہیں اُن کا قتل منظور
ہے اُن کے بغیر مملکت ہیچ   تینوں عالم کی سلطنت ہیچ
پھر سلطنتِ ارض کی حکومت   معلوم نہ کیوں ہو بے حقیقت
کاوش پئے تخت و تاج کرنا   خوں اُن کا بہا کے راج کرنا
دانشمندی سے دور تر ہے   ہر طرح سے باعثِ ضرر ہے
مانا کہ گنہگار ہیں یہ   سرکش ظالم ہیں خوار ہیں یہ
قتل اُن کا بہت خراب ہوگا   میرے حق میں عذاب ہوگا
دھرتراشٹر کے گروہ میں تمام   قتل اُن کا نہیں ہمیں مناسب
مادھو[3] انہیں کر کے نیست نابود   ہاتھ آئے گا کیسے درِ مقصود

(۳۹ لغایت ۴۵)

ہیں فردِ یگانۂ زمن آپ   سوچیں تو بھلا جناردن[2] آپ
کیا اُن کے گناہ میں ساتھ دینا   لازم ہے رخ اس سے پھیر لینا

۱؎ مراد کرشن جی سے ہے۔

۱؎ یعنی بھیشم پتامہ جو ایک نیک سیرت بزرگ تھے۔ ۲؎ کرشن جی سے مراد ہے۔ ۳؎ کرشن جی سے مراد ہے۔

کنبہ برباد کوئی ہو جائے   غمگیں ناشاد کوئی ہو جائے   کام اس کے سوا خراب کیا ہے   اس سے بدتر عذاب کیا ہے
ہوتا ہے کسی کا گھر جو برباد   پڑتی ہے کسی پہ جب یہ افتاد   پایہ نہیں برقرار رہتا   باقی نہیں پھر وقار رہتا
مفقود ہوتی ہے شانِ اسلاف   ہوتا ہے یا تو دھرم پہ چشتا   دستور سے ہو کے منحرف سب   کرنے لگتے ہیں ترکِ مذہب
مٹ جاتے ہیں گھر دھرم کرم جب   غالب ہوگا ادھرم جس وقت   ہو جائیں گی عورتیں سب آزاد   عصمت کریں گی اپنی برباد
باقی نہ رہے گی لاج گھر کی   مٹ جائیگی آبرو اس گھر کی   ہوگی اس دن سے ذات پیدا   ہو جائے گا نقصِ ذات پیدا
جب ذات میں آئیگی خرابی   ہر بات میں آئے گی خرابی   برپا افساد کرنے والا   گھر کا برباد کرنے والا
خود بھی وہ نرک نصیب ہوگا   اولاد کا بھی رقیب ہوگا   پائیں گے نہ پتر پنڈ کا دان   پڑ جائیگی اک عذاب میں جان
اس ذات کے نقص کا نتیجہ   آگے چل کر خراب ہوگا   نابود آئینِ قوم ہوں گے   مفقود آئینِ قوم ہوں گے
ہو جائے گی آن بان کافور   مٹ جائیں گے خاندان کے دستور   ہے آج جو دھرم جاودانی   بن جائیگا کل وہ نقشِ فانی
سنتا ہوں میں جناردن یہ   مشہورِ زمانہ ہے سخن یہ   بھگوان وہ مکان وہ گھرانا   جس میں رہا نہیں دھرم کا ٹھکانا
انجام اس کا ہے روسیاہی   ہے اس کے نصیب میں تباہی   پاداشِ گناہ وہ سہے گی   دوزخ میں جگہ اُسے ملیگی
افسوس یہ مجھ کو ہو گیا کیا   حیراں ہوں کہ ہے یہ ماجرا کیا   مائل بہ شور و شر ہوا ہوں   آمادہ گنہ پہ ہو رہا ہوں
جاہل غفلت شعار نادان   آسائشِ سلطنت کا خواہاں   میں آج اٹھا رہا ہوں تلوار   اپنوں ہی کے قتل کو ہوں تیار
انسان جس طرح دوست جانی   پوشاک اتار کر پرانی   کرتا ہے یہ شوقِ دلفریبی   اک خلعتِ نو سے جامہ زیبی
یہ ساکنِ پیکرِ عناصر   یہ حاملِ دفترِ عناصر   ہو کر ملکِ عدم کا رہرو   کرتا ہے قبول قالبِ نو

دوسرا ادھیائے

(۱ و ۲ و ۳)

کی دیکھ کر اس کی سرگرانی   مدھوسودن نے یہ گل فشانی   ارجن! ارجن! عزیز ارجن   سب تم کو کہیں گے ہیز ارجن
کیوں حسرت و یاس سے ہو مغلوب   یہ طرزِ عمل ہے سخت معیوب   ہمت جرأت یہ چھوڑنا کیا   منہ جنگ سے اب یہ موڑنا کیا
کر دیگا تباہ یہ فعلِ مذموم   فردوس کی راحتوں سے محروم   تم مرد ہو مردی سے لو کام   نامردی کا زبوں ہے انجام
یہ رخصتِ عقل و آگہی کیا   دانا ہو کر یہ گمرہی کیا   کھولو آنکھیں روش یہ چھوڑو   ہنگامِ جدال منہ نہ موڑو

(۹ لغایت ۱۵)

وہ فاتحِ دشمناں گڈاکیش   ارجن عالی صفت وفاکیش   ہو کر وقفِ غم و محن یوں   کہہ کر رشی کیش سے سخن یوں
بولا میرے غمگسار گووند   اے بانیِ روزگار گووند   کرتا ہوں میں جنگ سے کنارا   تقدیر کا اب نہیں ہے یارا
ارجن غمگیں ملول دلگیر   جس وقت یہ کر رہا تھا تقریر   بھگوان کرشن خاص ادا سے   خاموش تھے مسکرا رہے تھے
ارجن سے یہ کیا کلام آغاز   اس طرح وہ سخن کیا باز   تم اُن کے لئے ہو مائلِ رنج   باتیں جو نہیں ہیں قابلِ رنج
بیکار الجھ رہے ہو دل میں   اور اس پہ سمجھ رہے ہو عاقل   دانا ہو بہت بڑے خبردار   ہر چند ہے معرفت یہ گفتار

لیکن جو ہیں محو حق پرستی   اُن کو نہیں فکرِ مرگ و ہستی   تھا میں نہ کہیں جہاں میں نہ تو   ہر وقت تھا ہر زماں تھا موجود
تم بھی نہ کبھی یہاں تھے معدوم   پنہاں نہ تھے مثلِ سرِّ مکتوم   انساں میں یہ بات تھا جیسے   پیکر یہ کبھی تھے نیستی کے
میں ہوں تم ہو کہ اور کوئی   فطرت نہیں نیستی کسی کی   قالب میں قیام کرنے والا   اس نقش میں رنگ بھرنے والا
جیسے ہوتا ہے وقتِ تغیر   کودک سے جواں جواں سے پیر   بالکل اسی طرح محو ترحیل   کرتا ہے یہ قالبوں کو تبدیل
ہوتے نہیں بیکل اہلِ عرفاں   تبدیلیِ جسم سے پریشاں   محسوسات و حواس کا کھیل   دونوں کا یہ قدرتی ہے میل
سردی گرمی کا اک سبب ہے   وہ غم و باعثِ طرب ہے   لیکن ہیں نقش نقشِ فانی   دونوں باتیں ہیں آنی جانی
ہمت جرأت وفا و ارجن   اس جنگ میں کام آؤ ارجن   اے منتخبِ خلائق ارجن   اے نوعِ بشر میں فائق ارجن
دل جس کا نہیں ہوا ہے بیتاب   ہے ان کی قیود سے جو آزاد   جن کو دل پہ ہے اپنے قابو   ہر راحت و رنج میں ہے یکسو
ہے وہ صدق و صفا مجسم   انساں ہے وہ بقا مجسم

(۱۷ لغایت ۲۰ و ۲۲)

جلوہ جس کا ہے سازِ کُل   ہستی جس کی ہے دائرِ کُل   حاصل جس کو ہمیشگی ہے   وہ عینِ حیاتِ سرمدی ہے
کوئی اس کو مٹا سکے گا کیا   نقشِ باطل بنا سکے گا کیا   کس طرح ہو آدمی کے بس کی   یہ بات نہیں کسی کے بس کی
بر نقشِ دوام جس کی ہستی   قائم ہے دوام جس کی ہستی   فرضی شے ہے زوال جس کا   اندازہ بھی ہے محال جس کا
ہر اک اجسام میں وہ موجود   ہوتا ہے جنھیں ضرور نابود   جب یہ سچ ہے تو ہوش میں آؤ   ارجن معروفِ جنگ ہو جاؤ
دل میں ہے یہ جس کے وہم باطل   سالک اس جسم کا ہے قاتل   ہے جس کا گماں یہ غیر معقول   سالک اس جسم کا ہے مقتول

(۲۴ و ۲۵ و ۲۷)

کٹنا اس کا محال تر ہے   گھٹنا اس کا محال تر ہے   جلنا اس کا نہیں ہے ممکن   گلنا اس کا نہیں ہے ممکن
خشکی کے اثر سے ہے یہ آزاد   نیرنگِ دگر سے ہے یہ آزاد   ساکن، ہمہ دست، جاودانی   جُنب، قدیم، غیر فانی
بے اندازہ نگاہ سے دور   آنکھیں اسے دیکھنے سے معذور   برتر وہم و قیاس سے ہے   بالا فہم و حواس سے ہے
قیدِ تبدیل سے بری یہ   ہوتا نہیں منقلب کبھی یہ   ارجن یہ رموز خود سمجھ کر   غمگیں نہ ہو وہم میں الجھ کر
جو مائلِ سیرِ زندگی ہے   اُس کے لئے موت لازمی ہے   جو عازمِ کشورِ عدم ہے   اس کے لئے زیست پھر مسلّم ہے
یہ نظم ہے ایک ضابطہ ایک   دونوں باتوں میں ربط ہے ایک   دونوں میں یہ لاثباتِ کونین   پھر کس لئے اس قدر ہو غمگین
مورد رنج و قلق ہیں دونوں   بے بہرہ امرِ حق ہیں دونوں   دانا نہیں اس گماں کے قائل   مقتول نہ ہے نہ ہے وہ قاتل
پیدائش و مرگ سے ہے آزاد   ہوتی نہیں زیست اس کی برباد   اب تک وہ نہیں ہوا ہے پیدا   ہے اپنی قدامتوں سے پیدا
اس کی کہیں ابتدا نہیں ہے   اس کی کہیں انتہا نہیں ہے

(۶۸ و ۶۹)

عالی کردار نیک اعمال   اے ارجنِ مقتدر و قوی بال   جو طالبِ این و آں نہیں ہے   دلدادۂ دو جہاں نہیں ہے
وہ مردِ فہیم بیگماں ہے   عقل اُس کی سلیم بیگماں ہے   دنیا سوتی ہے بے خبر جب   بالکل ہوتی ہے بے خبر جب

---

۱ مراد کرشن جی سے ہے۔ ۲ یعنی ارجن۔ ۳ یعنی کرشن جی۔

ہر طرح سے ہوشیار شامل   دکھتا ہے نظر پہ کار شاغل   جس وقت زمانہ جاگتا ہے   بیگانہ نگاہ جاگتا ہے
اس وقت یہ شاغل جو بند   کرتا ہے چشم بسر ہیں ۔۔

نہایت دشوار اور پیچیدہ مضامین کو کس خوبی و سلاست سے پاکیزہ روزمرّہ میں بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا ادھیائے

(الغایت ۱)

ارجن نے کہا یوں کے اپدیش   بھگوان بنا رون تتی کیش   عرفان کی جب آپ کرکے تشریح   دیتے ہیں عمل پہ اس کو ترجیح
کیوں مجھکو بنا رہے ہیں بیرکا   ایسے فعل زبوں کا ختار   جب جو ہی نہیں عمل کے قائل   کیوں اس کرنے میں مجھکو اسپہ مل
گیشو ہر رنگ زلف شبگر   پُرپیچ ہے آپ کی یہ تقریر   ہر چند اسے سمجھ رہا ہوں   لیکن پھر بھی الجھ رہا ہوں
مختل ادراک عقل حیراں   برہم ہیں حواس دل پریشاں   سرمایۂ پند وہ عطا ہو   باعث بہ سکون قلب کا ہو
گویا ہوئے کرشن یوں کہ واقف   ارجن ہے تمہاری ذات عجیب   پہلے ہی میں کرچکا ہوں اظہار   ہیں دو ہر میں دو طریقۂ کار
اوّل ہے طریق علم و عرفاں   اس راہ پہ سالکینِ گیانی   ہے راہ عمل طریق ثانی   جوگی اس راہ کے ہیں بانی
اعمال جہاں سے ہاتھ اٹھاکر   آغاز عمل سے باز آکر   افعال سے دور رہکے انساں   ہوتا نہیں نرتگا پہ دوراں
دل میں کرکے ارادہ ترک   کے خواہ کرے وہ جادۂ ترک   مایوس وصال ہی رہیگا   محروم کمال ہی رہے گا
ارجن ممکن نہیں یہ زنہار   انساں رہے اک نفس بھی بیکار   حرکت سے ہے قیام عالم   ہے یہ روحِ نظامِ عالم
مرتب فطرت کا مقتضی ہے   اس سے نہیں کوئی بھی بچا ہے   لیکن جو غلام آرزو ہو   جس کے گلشن میں اس کی بو ہو
دل جس کا مسند بجھان ہو   ہر شے کی طرف دواں دواں ہو   پتلا ہے وہ مکر کا ریا کا   بندہ ہے فریب کا دغا کا
ارجن برعکس اس کے انساں   رکھکر یکسو دل پریشاں   کرتا ہے حواس کو جو بس میں   اٹھتا نہیں عالم ہوس میں
مشتاق عمل کا ہے فاعل   کرتا نہیں اس میں دل کو شامل   وہ سر خفی سے باخبر ہے   اونچا اس کا جہاں میں سر ہے

(۱۴۔۱۵۔۱۸۔۳۰۔۳۸)

نغمے سے عیاں ہو جیسے جادو   اور اس کے وجود کا یہ جادو   ہے بارش آب کا نتیجہ   پروازِ سحاب کا نتیجہ
پروازِ سحاب و بارشِ آب   ثمرہ اک یگیہ کا ہے نایاب   یہ یگیہ زمانۂ ازل سے   وابستہ ہے دامنِ عمل سے
تعبیر عمل کی ہے بنا علم   اس کی کرتا ہے ابتدا علم   ہے علم اس آئینہ کا جوہر   ہوتا جو نہیں کبھی مکدر
ہے وصف عیاں سوام جس کا   لافانی ہے قیام جس کا   جس کا جلوہ ہے غیر محدود   رہتا ہے جو یگیہ میں بھی موجود
کرنا کوئی کام یا نہ کرنا   اس کی پروا ذرا نہ کرنا   ایسے انساں کا خاصہ ہے   مستِ عرفاں کا خاصہ ہے
استغنا ہے شعار اس کا   آزاد ہے کاروبار اس کا   بیگانۂ احتیاج دوراں   ہوتا نہیں وہ کبھی پریشاں
طالب ہو کرنہ خود شہرے   ہر فعل مرے سپرد کرکے   ہر طرح سے جذبۂ مشکر   جو کل شے ہے اسی سے دل لگاکر

ــــــــــ

نہ۔ یدان اعمال سے جن کا انجام مینا تسکین دوام کے حصول یا تکمیلِ نجات کے لئے جاتا ہے۔

امید سے بے نیاز ہوکر   مستغنی سوز و ساز ہوکر   اب تیر کمان پر چڑھاؤ   لڑنے کے لئے قدم بڑھاؤ
شعلہ جس طرح کوئی پُرنور   ہو چار طرف دھوئیں سے محصور   آئینہ پُرآب جیسے کوئی   آلائش گرد سے ہو مخفی
جھلی ہو غلاف ہلکا ہلکا   جس طرح سے تکیۂ حمل کا   بالکل اسی طرح علم و عرفاں   پردے میں ہی ہوس کے پنہاں

چھٹا ادھیائے

(۱۸ و ۱۹)

ہوتا ہے عیاں جو کمال انساں   بندھتا ہے جب خیال انساں   ہوتا ہے جب اک جگہ وہ قائم   رہتا ہے فنائے ذات دایم
اس وقت ہوس کی گرد دریا   لذاتِ جہاں پہ ڈال کر خاک   ہوتا ہے وہ کامران منزل   پاجاتا ہے نشانِ منزل
جیسے ہنگامۂ بارش ضو   یکسو رہ کر چراغ کی لو   جنباں نہ ہو بندۂ بادِ ہوا ہے   لرزاں نہ ہو بند بش ہوا ہیں
بالکل اسی طرح سے وہ شاغل   ہے جس کو سکونِ قلب حاصل   رہتا ہے فنائے قلزم ذات   کرتا ہے بسر اسی میں اوقات

ساتواں ادھیائے (۴)

مٹی اور اس کے بعد پانی   پھر آگ کا پردۂ نہانی   عالم بعد اس کے ہے ہوا کا   پھر کرۂ محیط ہے خلا کا
پھر ہیں دل و عقل سلسلہ وار   ان سے آگے ہے ستر پندار   ہیں یہ آٹھوں صفات تیری   محجوب ہے ان سے ذات تیری

طوالت کے اندیشے سے ہمیں مزید اقتباسات درج کرنے سے احتراز کرنا پڑ رہا ہے ورنہ حق یہ ہے کہ ہر ادھیائے (باب یا فصل) میں سے ایک دو نہیں بیسیوں شعر یہاں نقل کرنے کی ضرورت تھی۔ مثنوی گلزارِ نسیم کے بعد اس چھوٹی سی بحر میں منوّر صاحب نے نہایت خوبی و کامیابی سے شاعری کی ہے۔ مضامین کی خشکی اور نفسِ مضامین کی گہرائی کے باوجود حسنِ کمال سے یہ پاکیزہ نظم اوّل سے آخر تک مرصّع ہے۔ اس پر اس کے مصنف کو بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ بقول شخصے، "بے عیب ذات صرف اسی کی ہے" اگر کوئی کہیں باعثِ گرفت نقص نظر آتا ہے تو اس کی حرف گیری کرنا مناسب نہیں۔ کہ نفسِ مضمون نظم کے لئے خود موزوں نہیں ہے۔

شاعر نے اس بحر کو اختیار کرکے ذہانت اور ہوشیاری کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ دوسری کسی بحر میں غالباً اس قدر روانی پیدا کی جاسکتی تھی اور نہ ایسی شگفتگی۔ سچ تو یہ ہے کہ گیتا کو شاعر نے روزمرّہ کی زبان میں نظم کرکے اپنے نام کو حیاتِ جاوید بخشنے کا انتظام کرلیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جو صاحبِ ذوق حضرات منوّر کی اس مرصّع نظم کو ملاحظہ فرمائیں گے وہ ان سے دادِ سخنوری ضرور دے کر رہے گی۔

ڈاکٹر بھگوان داس۔ علامہ کیفی اور مسز سروجنی نائیڈو نے مقدمات لکھے ہیں۔ اور منوّر صاحب کی کامیاب کوشش کی ستائش کی ہے۔

اپنا نقطۂ خیال پورے زور اور قوت سے پیش کیا۔

کانگریس میں بہت سے اہم رزولیوشن پیش ہوئے اور منظور ہوئے۔ ہر معاملے میں قدیم خیال کے کانگریسیوں کو کامیابی ہوئی۔ لیکن جس رزولیوشن پر سب سے زیادہ کشمکش رہی وہ اس مسئلہ کے متعلق تھا کہ آیا نئے دستور کے ماتحت کانگریسی عہدے قبول کریں یا نہ کریں۔ سوشیلسٹ الیکشن لڑنے کے موافق اور عہدے قبول کرنے کے مخالف تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اپنے خطبۂ صدارت میں اور سبجکٹس کمیٹی کی تقریر میں عہدے قبول کرنے کی مخالفت کی تھی۔ قدیم خیال کے کانگریسی یہ چاہتے تھے کہ اس وقت اس مسئلہ کو طے نہ کیا جائے کہ کانگریسی عہدے قبول کریں یا نہ کریں۔ بلکہ اس کا فیصلہ الیکشن کے بعد یا کچھ ہی قبل ہو۔ سوشیلسٹ گروہ کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ اس وقت طے کر دیا جائے کہ کانگریسی عہدے قبول نہ کریں گے۔

اگر ملک کے بلند ترین مقاصد کو پیش نظر رکھکر اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ عہدے نہ قبول کرنا بہتر ہے اور اس التوا سے لوگوں کے دلوں میں جو تذبذب رہے گا وہ اُن کے عزم اور ہمت کے لئے مفید نہیں ہے لیکن طے یہی ہوا کہ اس وقت اس مسئلہ کا تصفیہ نہ کیا جائے۔ بیشک، اس سے یہ نفع ضرور ہوا کہ اس مسئلہ کے تصفیئے کے التوا کے ساتھ وہ افتراق بھی ملتوی ہو گیا جو کانگریسیوں کے درمیان اُس صورت میں یقینی تھا۔

اگر کانگریس کی تمام کارروائیوں کو غور سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ گو سوشیلسٹوں کو ہر معاملے میں شکست ہوئی لیکن ہر اہم رزولیوشن کانگریس کے قدیم خیال اور سوشیلزم کے درمیان ایک سمجھوتہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کانگریس کی صدارت اور اشتراکیت کی حمایت دو قطعاً متضاد عناصر کا اجتماع ہے اور ممکن ہے کہ پنڈت جی کی اس سیاست کو اُن کے مداح قابلِ ستائش قرار دیں۔ لیکن ایک ایسا بھی گروہ ہے جو اس اجتماع ضدین سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ پنڈت جواہر لال کا یہ رویہ "کجاے غائی، کجاے زنی" کے مرادف ہے اور کانگریس نے کسانوں اور مزدوروں کو کسی اشتراکی اصول وضوابط کی حامل جماعت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے سے روکنے کے لئے ایک سیاسی چال چلی ہے۔

اس سلسلے میں اینگلو انڈین اخبار "سٹیٹسمین" کا تبصرہ جو حکومت ہند کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرتا ہے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"ہم نے پنڈت جواہر لال نہرو کے مکمل ایڈریس کا جو انھوں نے انڈین نیشنل کانگرس کے صدر کی حیثیت سے پڑھا بغور مطالعہ کیا اور اس کے مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے دل اور دماغ پر یہ خیال غالب آیا کہ یہ کسی ہندوستانی کی تقریر نہیں ہے۔ بہر حال کسی طریقہ پر یہ کسی ہندوستانی کے الفاظ نہیں ہو سکتے۔ اس میں ذرا بھی کلام نہیں ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو پیدائشی طور پر ہندوستانی ہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ برطانوی تمدن اور طرزِ معاشرت کے پروردہ ہیں۔

وہ کئی قسم کے انگریز ہو سکتے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ اُنھیں صرف یوپی میں دلچسپی ہوتی۔ وہ ایک دیہاتی انگریز بھی ہو سکتے تھے جو زرعی توسیع کے کام میں خاص دلچسپی لیتے۔ یہی نہیں بلکہ وہ تعلیمی مسائل میں ماہر۔ ایک قدامت پسند انگریز اور ایک انتہا پسند انگریز ہو سکتے تھے۔ لیکن قسمت سے اُنھیں موجودہ زمانہ نے ایک انتہا پسند انگریز، ایک انقلاب پسند سوشلسٹ اور ایک تھیوریٹیکل کمیونسٹ بنا دیا۔ لیکن ایک قدامت پسند انگریز۔ ایک انتہا پسند انگریز اور ایک سوشلسٹ انگریز۔ ان تینوں کے نظریہ کے درمیان کسی حد تک اتحاد ہو سکتا ہے۔ اور اس کی وجہ انگریزی ماحول ہے جسے وہ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اور جس سے وہ نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی یہ سہولت حاصل ہے اور وہ انگریزی ماحول سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ہم کو یہ بتلایا ہے کہ میں سوشلسٹ ہوں۔ اور میں کمیونسٹ ہوں۔ وہ ایک انقلاب چاہتے ہیں اور ذاتی ملکیت کے حق اور مخصوص مفاد کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے روس پر ریب کی نئی کتاب پڑھی ہے۔ اور اُس کا اُن پر بہت اثر پڑا ہے۔ اور اُنھیں انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی کے ہر ممبر کی طرح یہ یقین ہو گیا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت ملوکیت پرستانہ ظلم ہے اور نوکر شاہی حکومت قطعی نکمی ہے۔ اور ہندوستانی مظلوم قوم ہیں اور اُنھیں آزاد ہونے کے لئے جد و جہد رکھنی چاہئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کسی قطعی تبدیلی کے منتظر نہیں ہیں وہ تو مسٹر سوسلے اور مسٹر سٹیفرڈ کرپس کی طرح انقلاب چاہتے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستانی انگریزی حکومت اور والیانِ ریاست کی جو تصویر کھینچی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ لیکن انگریز محض اس وجہ سے اُس کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جس شخص نے یہ تصویر کھینچی ہے وہ نیک نیتی اور صدق دلی کا مجسمہ ہے اور اُنھوں نے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ انگریزی تمدن

اور انگریزی طرز حکومت میں پرورش پانے کا نتیجہ ہے۔ آج ہمارے سامنے ایک قابل، ذہین اور نوجوان آدمی ہے جو ان ہندوستانیوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے جنہیں خود انگریزوں نے پیدا کیا ہے۔ یہ لوگ انگریزوں کی طرح بولتے اور لکھتے ہیں، اور انگریزوں کی طرح سوچتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ انگریز نہیں ہیں یہ ہندوستانی ہیں۔ انگریزی تمدن اور تہذیب کے ماحول میں ان کی پرورش نے اپنے ہموطنوں کے لئے بُرائی یا بھلائی کرنے کے لئے اُن کی صلاحیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

اگرچہ اس طرح وہ اپنی ہندوستانی آمانت سے محروم ہو گئے ہیں، لیکن ان میں قوم پرستی کا جذبہ زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔ پنڈت جی پر الزام لگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ ہی انگریزوں پر الزام لگانا سودمند ثابت ہوگا۔ جو حالات ہیں وہ رہیں گے۔ اور اُن کے نتائج کبھی جو رونما ہونے ہیں رونما ہو کر رہیں گے۔ لیکن اس سے ہیں کچھ نہ کچھ امداد ملے گی۔ اگر ہم نے ایک دوسرے کے سامنے اپنی پوزیشن واضح کر دی کیونکہ جب ایک مرتبہ ہم نے سچائی کو سمجھ لیا اور باہمی صفائی ہو گئی تو اسی صورت میں ایک فراخ دل انگریزی قوم اور ایک صدق دل اور غیر مطمئن شخص کے درمیان جو ہندوستان کے ساتھ برطانی تعلق کا نتیجہ ہے کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کی صورت نکل سکتی ہے۔

شاہ فواد

اعلےٰ حضرت ملک احمد فواد شاہ مصر نے بالآخر طویل علالت کے بعد ۲۸ اپریل کو ایک بجے دن کے اس جہان فانی سے رحلت فرمائی رسم تجہیز وتکفین مسجد الرفاعی میں ادا کی جائے گی' یہ مسجد شاہ موصوف نے خود تعمیر کرائی تھی اور جو کہ صحرائے اعظم اور وادی نیل کے مقابل میں واقع ہے۔

بیماری کے دوران میں شاہ موصوف نے حیرت انگیز قوتِ ارادی کا ثبوت دیا۔ دم توڑنے سے تین گھنٹے پہلے تک شاہ موصوف بھلے چنگے معلوم ہوتے تھے۔ صبح کے وقت وزیر اعظم کو طلب کر کے انہوں نے ان تمام ہمدردی کے تاروں کا جواب دینے کے واسطے حکم فرمایا جو کہ ایام علالت میں اُن کو موصول ہوئے تھے۔

بادشاہ کی موت کا سب سے بڑا سبب ایک گولی بیان کیجاتی ہے جو کہ شاہ فواد کے بھتیجے سیف الدین نے تیس سال ہوئے خدیو کلب میں شاہ موصوف پر چلائی تھی اس کی وجہ سے گلے میں کمزوری واقع ہو گئی اور شاہ فواد کو ہر وقت کھانسی رہنے لگی اس کھانسی کی وجہ سے خون کا اخراج زیادہ ہو گیا اور اعلےٰ حضرت اس بیماری کے حملہ کی تاب نہ لا سکے۔

ولی عہد پرنس فاروق کے بادشاہ ہونے کا اعلان ہو چکا ہے آپ انگلینڈ سے بذریعہ جہاز "وائسرائے اوف انڈیا" ۵ مئی کو الگزینڈریا پہنچیں گے۔ چونکہ شہزادہ فاروق نابالغ ہیں اس لئے ایک ریجنسی کونسل مقرر کی جائے گی اس کا انتخاب شاہ فواد نے ۱۹۲۲ء میں کیا تھا۔

شاہ فواد نے یورپ کی متعدد یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی۔ مغربی تعلیم وتربیت کی وجہ سے وہ دنیا بھر کے سیاسی معاملات میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے لیکن ۱۸۹۵ء میں شہزادہ فواد نے اس سیاسی زندگی کو خیرباد کہہ دیا اور آپ یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں سائنس اور ادب کی تعلیم حاصل کرنے چلے گئے۔ آپ اعداد وشمار کے بڑے ماہر تسلیم کئے جاتے تھے اور اسی قابلیت کی وجہ سے شاہ موصوف نے "سوسائٹی آف پولیٹیکل اکنومکس" کی مصر میں بنیاد ڈالی' اس سوسائٹی نے ملک کے لئے نہایت ہی مفید کام کیا۔ آپ نے عورتوں میں صنعت وحرفت اور تربیت اطفال کا شوق پیدا کیا اور اس کے ساتھ ہی تعلیم نسواں کو ترقی دی۔

۱۹۲۲ء میں ملکِ مصر جو کہ اب تک ایک پروٹیکٹریٹ شمار کیا جاتا تھا' کو ایک خود مختار ملک تسلیم کیا جانے لگا۔ کنگ فواد کو اب سخت محنت کرنی پڑی' زاغلول پاشا کی رہائی اور قوم پرست لیڈروں کے کارناموں کا یہ نتیجہ نکلا کہ سرلی سٹیک کو سوڈان میں قتل کر دیا گیا لیکن ۱۹۲۷ء میں شاہ فواد انگلستان گئے اور مصر وانگلینڈ کے درمیان ایک عہدنامہ ہو گیا مگر ناش پاشا کی مداخلت سے اُس پر کوئی عملدرآمد نہ ہو سکا۔ اسی اثناء میں وفد پارٹی بھی برسرِ اقتدار آگئی اس انتظامیہ برہمی سے لاچار ہو کر جولائی ۱۹۲۸ء میں بادشاہ نے پارلیمنٹ توڑ دی۔ اور احکام صادر کر دیئے کہ تین سال تک پارلیمنٹ کا کوئی اجلاس نہ ہوگا۔ اس دوران میں کنگ فواد نے اپنے ہی احکام سے انتظام قائم رکھا چونکہ انتظامیہ عملہ میں ہم آہنگی کا فقدان تھا اس لئے گورنمنٹ کی مشنری قابل اطمینان طریقہ سے کام نہ کرتی تھی۔ اس کے لئے محلات کی سازشیں' وفد پارٹی

فاروق، محلات اور کابینہ میں آن بن ذمہ دار تھیں۔ بالآخر بادشاہ نے برٹش گورنمنٹ کے دباؤ اور ملکی بدنظمی کی وجہ سے پارلیمنٹ کو توڑ دیا اور حکم دیدیا کہ تین سال تک پارلیمنٹ کا کوئی اجلاس نہ ہوگا۔ اس کے بعد شاہ فواد نے ملک کی عنان حکومت خود سنبھال لی۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں سر ہوئل ہور کی تقریر سے ملک میں ناراضگی کے شعلے بھڑک اُٹھے وفد پارٹی اور دیگر پارٹی نے ایک متحدہ مقابلہ کے لئے تیاری شروع کر دی۔ وفد دستور اساسی طلب کیا جو کہ نحاس پاشا نے ۱۹۳۰ء میں مسترد کر دیا تھا مگر بادشاہ فواد نے ایک حکم نامہ جاری کر دیا اور ۱۹۲۳ء کے دستور اساسی کو منظور کر دیا۔ ۲۰ جنوری کو ہائی کمشنر اعلیٰ حضرت کے پاس آیا اور کہا کہ برٹش گورنمنٹ مختلف پارٹیوں کی متحدہ درخواست پر گفت و شنید کرنے کے لئے تیار ہے اور پرانے قضئے کو طے کرنا چاہتی ہے مگر شرط یہ ہوگی کہ دونوں طرف کے ماہر موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے فوجی دستور پر پہلے گفت و شنید کریں گے۔ نسیم پاشا نے اس شرط کو قبول نہیں کیا اور انہوں نے ۲۱ جنوری کو اپنا استعفا داخل کر دیا۔

چونکہ وفد پارٹی مشترکہ کابینہ میں کام کرنے کے لئے رضامند نہیں تھی اس لئے اعلیٰ حضرت نے ایک غیر جانبدار کابینہ بنا دی جو کہ الیکشن کے واسطے قوانین وضوابط مرتب کرے گی۔ یہ الیکشن ۲ مئی کو ہوں گے اور ساتھ ہی برٹش گورنمنٹ سے گفت و شنید جاری رکھنے کے لئے مہر پاشا کو نیا وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا۔ مصر کے ڈیلیگیشن میں چھ وفد پارٹی کے ممبران اور ۵ مختلف پارٹیوں کے نمایندے ہیں اور نحاس پاشا ان کے لیڈر ہیں۔ سر لیمپسن برٹش کی طرف سے نمایندے ہیں۔ یہ گفت و شنید ۲ مارچ سے شروع ہوئی ہے اور اب تک جاری ہے۔

شاہ فواد کے عہد کا نہایت ہی اہم واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ابن سعود کے مملکت عربیہ کے ساتھ دوبارہ تعلقات قائم کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ چنانچہ مہر پاشا وزیر اعظم کی دعوت پر شیخ فیود حمزہ جو کہ وزیر خارجیہ ہیں قاہرہ میں تشریف لائے ہیں تاکہ ان تمام بدمزگیوں اور تفرقات کا خاتمہ کر دیا جائے جو کہ پچھلے دس سال سے عرب اور مصر کے درمیان ناخوشگوار واقعات کی بنا پر ظہور پذیر ہو گئے ہیں۔ یہ تفضیہ ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوا اور ہر دو ممالک نے ایک دوسرے سے قطع تعلق کر لیا۔ بدمزگی کا موجب یہ واقعہ ہو گیا کہ حکومت مصر ہر سال ایک غالیچہ مقدس سنگ اسود پر چڑھانے کے لئے کعبہ شریف روانہ کرتی تھی۔ یہ غالیچہ امراء و اراکین کی نگرانی میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ ملک مصر سے روانہ ہوتا تھا۔ اور یہ رسم سال کے بڑے تہواروں میں شمار کی جاتی تھی ۱۹۲۶ء میں ایک ناگہانی حادثہ پیش آیا۔ مصری کاروان جبکہ مقدس غالیچہ کو لے کر کعبہ شریف کو روانہ ہوا تو چند راسخ الاعتقاد وہابی اس شان و شوکت کی تاب نہ لا سکے انہوں نے ناراضگی کے اظہار کے لئے مصری وفد پر گولی چلا دی۔ مدافعانہ کارروائی کے طور پر مصری وفد کو بھی گولی چلانی پڑی۔ اس واقعہ کے بعد سے دونوں ممالک میں کشیدگی چلی آ رہی ہے مگر اب امید کی جاتی ہے کہ موجودہ گفت و شنید کا نتیجہ دونوں ممالک کے لئے نہایت ہی مفید ہوگا اور ان حل طلب معاملات کا بھی جو کہ مصر اور ابن سعود کی گورنمنٹ کے درمیان اب تک چلے آئے ہیں، تسلی بخش فیصلہ ہو جائے گا۔

مسدس حالی صدی ایڈیشن

مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ ایم۔ اے پی ایچ ڈی

مسدس حالی کا صدی ایڈیشن سب سے اعلیٰ اور سب سے شاندار، مولانا حالی کی صد سالہ سالگرہ کی واحد یادگار، جناب مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر سید راس مسعود۔ مولوی سید سلیمان ندوی، نواب صدر یار جنگ بہادر، مولوی عبدالماجد صاحب دریاآبادی۔ اور خواجہ غلام السیدین صاحب کے مقدمات اور تقریبات سے جو خاص اسی اڈیشن کے لئے لکھوائے گئے ان سے مزین علامہ اقبال کا قطعہ فارسی مولانا حالی کی شان میں اس کا عکسی بلاک سر سید کے تاریخی، اور مولانا حالی کے خود نوشتہ سوانح حیات میں سے ایک صفحہ کا فوٹو، سر سید اور حالی کی تصاویر دنیائے اسلام کا نقشہ، اعلیٰ کاغذ، بہترین طباعت اور کتابت عمدہ جلد اس اڈیشن کی ممتاز خصوصیات ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے اردو ہندی اور انگریزی اخباروں اور رسائل نے بہترین ریویو کئے ہیں ملک کے بڑے بڑے آدمیوں، مثلاً نواب صاحب بھوپال سر تیج بہادر سپرو، علامہ اقبال، نواب محی الدین یار جنگ بہادر، سر سید راس مسعود، نواب صدر یار جنگ بہادر وغیرہ وغیرہ حضرات نے اس کو بے پسند فرمایا ہے، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ۲۴۰ صفحات قسم اعلیٰ آرٹ پیپر پر چرمی جلد قیمت صرف ؎ ر
قسم اول ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد عہ ر

ہتیا اور دوسرے افسانے

از جناب مجنوں گورکھپوری تقریباً دو سو صفحات، اردو زبان میں ایک بیش بہا اور شاندار اضافہ، فن افسانہ نگاری کی عمدہ مثال قیمت صرف ۱۲ر

ناشران حالی پبلشنگ ہاؤس

زاد راہ:۔ منشی پریم چند صاحب کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ قیمت عہر صفحات ۲۲۴۔ ناشران حالی پبلشنگ ہاؤس

اردو کی عمدہ کتابیں ملنے کا واحد پتہ

حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر لال کنواں، دہلی

اگر آپ کو دنیا کے لاثانی

اور

مقدس صحیفہ

بھگوت گیتا

کا کامیاب ترین منظوم ترجمہ اردو میں دیکھنا ہو تو

نسیم عرفان با تصویر

ملاحظہ فرمائیے جناب منور لکھنوی خلف ملک الشعراء حضرت ناقِ انجہانی نے گلزارِ نسیم کی مترنم اور شگفتہ بحر میں یہ ترجمہ فرما کر دنیائے ادب میں بیش بہا اضافہ کر دیا ہے۔ ترجمہ کی شگفتگی، سلاست، روانی، فصاحت اور شعریت ملاحظہ فرما کر آپ کو یقیناً روحانی مسرت حاصل ہوگی کسی اہلِ نظر کا کتب خانہ اس نسخہ سے خالی نہیں رہنا چاہئے اس وجہ سے اور بھی کہ عالیجناب ڈاکٹر بھگوانداس ایم اے، نے اس کا پیش نامہ تحریر فرمایا ہے اور عالی جناب علامہ کیفی اس کو دنیائے ادب میں ایک ہیرا ایک کوہ نور پاتے ہیں۔
کاغذ اعلیٰ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت ؎ ر علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ

کلیم بک ڈپو کٹرہ ٹریاں فتح پوری دہلی

افسانے

پندرہ افسانے ایک جلد میں، سب طبع زاد، نئے عاشقانہ
گویا نثر میں غزلیں

مگر

زندگی کی سچی تصویریں ہیں جن میں نہ بناوٹ ہے، نہ مبالغہ ہے۔ بالکل زندگی کی طرح بے ساختہ، برجستہ، لااُبالی اُمنگ بھری۔

تم ذرا کوئی افسانہ شروع کرو بس اسی میں گم ہوجاؤ گے۔ وہ سچ مچ تمہیں ہوتا ہوا معلوم ہوگا اور تم اپنے آپ کو اس میں شریک سمجھو گے۔ کردار تمہیں واقعی چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے ہوئے معلوم ہوں گے۔ اُن کے جذبات کی گرمی تمہیں محسوس ہوگی۔

طرزِ بیان لطیف، نازک، جادوانہ، ادبیت کی ساری زینتوں سے آراستہ۔ دُنیا کے کسی بڑے مصنف کے افسانوں سے مقابلہ کیجئے برابر رہیں گے۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اردو میں اچھے افسانے نہیں ہیں۔

(مصنفہ سید حسن ریاض سابق اڈیٹر ہمت و نوید)

نئے افسانے، قیمت فی جلد ۱۲ر مع محصولڈاک ۱۴ر

نوٹ: قیمت فرمائش کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر آنی چاہیئے۔

ملنے کا پتہ

منیجر دی نیشنل پبلشنگ بیورو (دفتر اخبار نوید) لکھنؤ

مصور درد سید فرید جعفری مچھلی شہری کی

تازہ تصنیفات

شعلۂ حیات — نصف درجن آتشیں افسانوں کا پہلا مجموعہ۔ یہ افسانہ سماج کے خلاف کھلا باغیانہ پیام ہیں جسے نوجوان فسانہ نگار نے اپنے انقلابی رجحانات کے تحت قوم کے نوجوانوں کو سنانے کی کوشش کی ہے۔ شاعر انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی کا عالمانہ تبصرہ بھی شریک کتاب ہے۔ قیمت آٹھ آنے (۸؍) علاوہ محصول۔

مزدور دُلہن — بیکس مزدوروں کی دل ہلادینے والی داستان، اُردو میں روسی طرز کی طبعزاد کوشش، دو کہانیاں ہیں اور دونوں میں جہد حیات، سرمایہ اور محنت، طاقت اور غلامی کی کشمکش پوری بے باکی اور آزادی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ محترمہ شکنتلا دیوی ایم۔ اے، ایم ای ڈی (لیڈس) کا طویل مقدمہ بھی شریک کتاب ہے۔ قیمت ۸؍ علاوہ محصول۔

دل کی رانی۔ بہار کی بھکارن — دو جگرگداز کہانیاں۔ پہلی کہانی ایک ہریجن لڑکی کی درد بھری داستان حیات ہے۔ دوسری کہانی ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کے زلزلہ بہار کا ہولناک مرقع ہے۔ حکیم یوسف حسن چیف ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور کی تقریظ بھی شامل کتاب ہے۔ قیمت ۸؍ علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ۔ لیلیٰ بک ڈپو، کلاؤ روڈ۔ نئی دہلی

برائے توجہ ایجنٹ حضرات!

براہ کرم ہر مہینے کے اختتام تک دفتر میں اطلاع دیجئے کہ آپ کو کس قدر کاپیاں مطلوب ہیں۔ اور بل موصول ہوتے ہی اپنا حساب بے باق کر دیجئے تاکہ دوسرے مہینے کا رسالہ آپ کو فوراً بھیجا جائے۔

جملہ خط وکتابت و ترسیل زر

منیجر رسالہ کلیم کٹرہ بڑیاں دہلی کے پتہ پر ہونی چاہیئے۔

[illegible]

ایک [illegible]

[illegible]

اصغر علی محمد علی تاجران [illegible]

[illegible]

اصغر علی محمد علی تاجران عطر لکھنؤ و دہلی

REGD. No L 5604




کلیم
مدیر: جوش ملیح آبادی



بنال بلبل ! اگر بامنت سریاری ست ـ که ما دو عاشق زاریم وکار ما زاری ست

(حافظ)

بنام قوت و حیات

کلیم

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
قدرت سے بلا ہے مجکو صد حیف یہ حکم
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے
اردو زبان کا بہت سستا ماہنامہ
جملہ حقوق محفوظ
قیمت فی پرچہ۔ نو آنے

جلد (۱) — فہرست مضامین ماہ جون سنہ ۱۹۳۶ء — نمبر (۶)

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے کورونیشن بجلی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم گلی کندلکشاں سے شائع کیا)

اشارات

جوشؔ ملیح آبادی

"کلیم" کی نیم سالہ زندگی پر ایک سرسری نظر

بفضلِ قوت و حیات "کلیم" کا چھٹا نمبر ختم ہو رہا ہے۔ بعض احباب کا خیال تھا کہ "کلیم"

خوشش در خشید و لے دولت مستعجل بود

ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ اس کساد بازاری کے باوجود، اور اُردو داں طبقے کی اس ہمت شکن ناقدر شناسی کے باوصف "کلیم" نے اپنی زندگی کے ابتدائی چھ مہینے کس خوش اسلوبی سے ختم کر لئے۔

ہر کام کا آغاز صعوبت انگیز و ہولناک ہوا کرتا ہے۔ لیکن شکر ہے اُس قوت کارساز کا جس تک ہنوز فکرِ انسانی کو رسائی حاصل نہیں ہوئی ہے کہ "کلیم" نے

صد منزل است و منزلِ اوّل قیامت است

کی مہم بہ احسن الوجوہ سر کر لی۔

صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ رسالہ خود بخود ایک ایسی بہتر صورت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے کہ اس کے مستقبل سے بجا طور پر بہترین امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

اُردو میں اس وقت تک جتنے پرچے نکل رہے ہیں ہم نام بنام اعداد و شمار کے ساتھ اُن سے "کلیم" کا تقابل پسند نہیں کرتے۔ لیکن قارئین کرام سے اس قدر ضرور عرض کریں گے کہ وہ اپنی جگہ تمام اُردو کے پرچوں کو یکجا کر کے خود اندازہ لگائیں کہ اس چھ مہینے کی قلیل مدت میں "کلیم" نے ملک کی کیا خدمت کی، اور ابنائے وطن کے سامنے کس نوعیت کا تحریری مسالا پیش کیا۔

کلیم کی تقطیع ۲۲×۱۸/۴ ہے۔ اتنی بڑی تقطیع کے ساتھ اس پرچے نے صرف چھ ماہ کے اندر تقریباً چھ سو صفحے کا تحریری مسالا پیش کیا ہے۔ اور اُسی کے دوش بدوش تینتیس تصویریں شائع کی ہیں۔

رسالے کے بلند مقاصد اور مضامین کی معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اگر اس تقطیع کے ساتھ رسالے کی ضخامت اور اُس کی تصویروں پر نظر کی جائے تو بجا طور سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ "کلیم" اُردو زبان کے تمام پرچوں میں سب سے زیادہ ارزاں پرچہ ہے۔

چھ روپے سالانہ میں کون ہندوستان کا پرچہ اس تقطیع پر شائع ہوتا ہے؟ کس پرچے کی اس تقطیع پر اتنی ضخامت ہوتی ہے؟ کون پرچہ اس قدر اعلیٰ تصاویر اور اس کثرت سے شائع کرتا ہے؟ اور کون پرچہ ایسے بلند پایہ مضامین پیش کرتا ہے؟

نامرادِ اُردو کا ہر ایڈیٹر یہ رونا رویا کرتا ہے کہ اُردو داں طبقہ بلا کا بےحس واقع ہوا ہے، اور آئے دن رسالوں میں اپیلیں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ

بر اے خُدا و رسولؐ ہر خریدار کم سے کم ایک ایک خریدار تو ضرور ہی بہم پہنچا دے۔ لیکن نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ غریب ایڈیٹر کی ہر فریاد اور ہر صدا، صدا بصحرا ہو کر رہ جاتی ہے اور اُردو وال طبقہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

شکایت کے موقعے پر انجمنوں کے پلیٹ فارموں پر تو یہ "مربیانِ" اُردو بڑی بلند آہنگیوں اور کامل جوش و خروش سے اُردو، اُردو، کے نعرے لگاتے ہیں، اور ہندی پرچار سے بیزاری کا اعلان فرماتے ہیں۔ مگر عمل اگر دیکھا جائے تو مایوسی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

"کلیم" نے اب تک تو "ہر خریدار، کم سے کم ایک خریدار تو ضرور ہی بہم پہنچا دے" کی صداؤں سے کافی پرہیز کیا ہے اور آئندہ بھی حتی الوسع وہ ان اپیلوں اور فریادوں سے آلودہ ہونے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ یہ اس لئے نہیں کہ "کلیم" کی ملکیت میں خدانخواستہ کوئی تعلقہ یا خزانہ آگیا ہے، بلکہ محض اس نقطۂ نگاہ سے کہ اندھوں کے آگے آئینہ پیش کرنا، اور بہروں کے رو برو گانا اُس کے نزدیک کوئی عاقلانہ فعل نہیں ہے۔

"کلیم" میں جب تک زندہ رہنے کی قوت ہے شاید کچھ اس سے بھی زیادہ زندہ رہے گا۔ اور جب حامیانِ اُردو اس کی زندگی ناممکن بنا دیں گے تو کامل اطمینان کے ساتھ بغیر روئے پیٹے رخصت ہو جائے گا۔ کبیرداس کی طرح یہ دعویٰ تو کیا نہیں جا سکتا کہ

"ہم مرے تو ہم مریں، ہمری مرے بلائے"

پھر بھی دبی زبان سے اس قدر ضرور عرض کیا جائے گا کہ

"آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا"

"کلیم" پر اس ششماہی میں مختلف اُردو انگریزی رسالوں کے اندر جو ریویو نکل چکے ہیں اُن کے اقتباسات پیش کرنا طوالت سے خالی نہ ہوگا۔ اس لئے ہم صرف اُن پرچوں اور اخباروں کے نام درج کئے دیتے ہیں جن میں "کلیم" پر ریویو ہوا ہے۔ تاکہ اگر قارئین کرام چاہیں تو بطور خود اُن پرچوں کو ملاحظہ فرمالیں۔

عبرت کلکتہ۔ ساربان لاہور۔ صدق لکھنؤ۔ پانیر۔ الجمعیۃ دہلی۔ سفینہ۔ کنول آگرہ۔ شاعر آگرہ۔ ہندوستان ٹائمس دہلی۔ اُردو اورنگ آباد۔ یونائیٹڈ انڈیا۔ مشرق گورکھپور۔ ذوالقرنین بدایوں۔ ہمایوں لاہور۔ نظام المشائخ دہلی۔ سرگزشت علی گڑھ۔ زمانہ کانپور۔ پرتاپ لاہور۔ آسد لکھنؤ۔ ہمدرد سری نگر۔ سرفراز لکھنؤ۔ اقدام دہلی۔ تیج دہلی۔ وطن دہلی۔ شیر رنگون۔ کوثر بنگلور۔ رومان لاہور۔ طور ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔ اودھ پنچ لکھنؤ۔ معارف اعظم گڈھ۔ استقلال دیوبند۔ ہند کلکتہ۔ رہنما مراد آباد۔ مجاہد ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔ پیسہ اخبار لاہور۔ متوالا پشاور۔ اور حقیقت لکھنؤ۔

ہم اِن تمام اخباروں، اور رسالوں کے مُدیروں اور نقد نگاروں کے دل سے شکر گزار ہیں کہ اُنھوں نے ازراہِ اخوت و کرم اپنے اپنے انتقاد سے بہرہ مند ہونے کا ہمیں موقع دیا۔ اور اُن کے نزدیک جو صحیح مشورے تھے اُن سے بھی انھوں نے دریغ نہیں فرمایا۔

ہمارے نزدیک متعصبانہ نکتہ چینی جہاں ایک بہت بڑا صحافتی گُناہ ہے وہاں دوستانہ تقریظ نگاری بھی انتہائی جرم ہے، اور اِن دونوں سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ اگر علمی حیثیت سے خوردہ گیری کی جائے تو یہ صورت ہر حال اور حیثیت سے مُوجب برکت ہوتی ہے۔

"کلیم" پر جو ریویو خالص متعصبانہ نکتہ چینی کی بنا پر نکلے ہیں اُن پر ایک لمحے کے واسطے بھی توجہ یا خامہ فرسائی کرنا بے سود ہے۔

البتہ اُن تنقیدوں پر ایک نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو خالص علمی نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہیں۔

ایک پرچے میں یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ جنوری نمبر میں ایک عُریاں تصویر شائع کی گئی ہے۔ میں اس کے متعلق پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور آج بھی تحریر کرتا ہوں کہ نفسِ برہنگی کوئی عیب نہیں ہے۔ البتہ اگر برہنہ تصویر شائع کی جائے اس مقصد سے کہ اُس سے حیوانی جذبات اُبھر پڑیں اور جنسی اُمنگیں حرکت میں آجائیں تو بیشک اخلاقی نقطۂ نگاہ سے یہ ضرور معیوب ہے۔ لیکن اگر کوئی تصویر، جیسا کہ "کلیم" کے جنوری نمبر کی تصویر کا معاملہ ہے، اس غرض سے شائع کی جائے کہ پڑھنے والوں کے دل میں اعلیٰ جذبات مشتعل ہو جائیں، اور ایک غلام قوم یہ غور کرنے لگے کہ آزادی حاصل کرنے کی خاطر زندہ قومیں کیا کیا قربانیاں کر چکی ہیں، تو ایسی تصویر کا شائع کرنا کوئی

عیب نہیں، بلکہ اُس کی اشاعت فرائض میں داخل ہو جاتی ہے۔

دوسرا اعتراض آدم و حوّا کی تصویریں شائع کئے جانے سے متعلق ہے جس کا جوابِ کلیم کے اپریل نمبر میں دیا جا چکا ہے۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ "بسم اللہ" کے عوض "بنام قوت و حیات" کیوں لکھا گیا۔ یہ ایک ایسا طفلانہ اور قدامت پرستانہ اعتراض ہے کہ اس کے جواب میں صرف مسکرا دیا جا سکتا ہے۔

چوتھا اعتراض میرے مضمون مطبوعہ جنوری نمبر "اُردو ادب میں انقلاب کی ضرورت" کی تمہید پر ہے۔ جہاں میں نے نوعِ انسانی کی اصلاح کے خیال کو مضحکہ خیز کہا ہے اور پھر دُنیا کو انقلاب کی دعوت دی ہے۔

میں ناقد صاحب کی خدمت میں بصد ادب عرض کروں گا کہ وہ اپنے اعتراض پر نظرِ ثانی فرمائیں۔ اور اس نظرِ ثانی کا موقع یوں نکالیں کہ میرے اُس مضمون کو کامل غور و فکر سے کم از کم دو بار ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ اور اُس کے ہر باریک پہلو پر نگاہ کر کے فیصلہ کریں کہ اُن کا اعتراض کہاں تک صحیح ہے۔

کسی مضمون یا کتاب کا پڑھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مطالعہ ایک فن ہے۔ اور ہر شخص مطالعہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

صحیح مطالعے کے معنی ہیں پڑھنا، پڑھکر مطالب کا ہضم کرنا، اور ہضم کر کے اُس سے خونِ صالح پیدا کرنا اور پھر اُس خون کو اپنی رگ و پے میں دوڑا لینا۔ اگر اس صورت سے میرے اُس مضمون کا مطالعہ کیا گیا تو غلط فہمی رفع ہو جائے گی، اور اگر اس کے بعد بھی غلط فہمی باقی رہے گی تو میں تفصیلی جواب دینے پر بخوشی طیار ہوں۔

پانچواں اعتراض یہ ہے کہ میرے مضامین اور اشعار کے علاوہ دوسرے مضامین معلّمِ انقلاب نہیں ہوتے۔ اِس اعتراض میں ایک حد تک سچائی ضرور ہے۔ ہر چند یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مضامین کا غالب حصہ انقلابی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بالکل درست ہے کہ تمام مضامین حسبِ مراد نہیں ہوتے۔

میں کوشش کر رہا ہوں کہ "کلیم" کے معیار کے مطابق مضمون نگار پیدا کروں۔ ظاہر ہے کہ ہر پرچہ جیسا کہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں، سال دو سال کے بعد اپنے مخصوص مضمون نگاروں کا حلقہ پیدا کیا کرتا ہے اور کوئی کام ابتدا میں انتہا نہیں دکھا سکتا۔

مجھے اس کی خوشی ہے کہ رفتہ رفتہ میرے احباب میں یہ جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ اور تھوڑے ہی دن میں "کلیم" کی سطح کے مطابق کافی مضامین نگار پیدا ہو جائیں گے۔

چھٹا اعتراض یہ ہے، یا یوں کہئے کہ اس کا اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ جس طرح اقبال سیاسیات اور انجمنِ حمایتِ اسلام کے قضیوں میں پڑ کر اپنی شخصیت کو مجروح کر چکے ہیں اُسی طرح کلیم کی مصروفیتیں میری شخصیت (شاعری) کو بھی مجروح کر دیں گی۔

یہ اندیشہ میرے نزدیک بالکل صحیح ہے، جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے میں خود محسوس کر رہا ہوں کہ "کلیم" کی مصروفیتیں کسی حد تک مُضر ضرور ثابت ہو رہی ہیں۔ لیکن دو وجوہ کی بنا پر میں اس کی چنداں پروا نہیں کرتا۔

اوّل تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، وہ غلط ہو یا صحیح، کہ قدرت نے شاعری کا ایسا زبردست، تُند اور شدید مادہ مجھے ودیعت فرمایا ہے کہ وہ دُنیا کی ہر مصروفیت کا کامیاب مقابلہ کر سکتا ہے اور ایک رُبع سے زائد مجروح نہیں ہو سکتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ میں ہندوستان کا اپنے پر کم سے کم اس قدر حق ضرور سمجھتا ہوں کہ اپنی شاعری کے ایک رُبع حصّے کی قربانی کر کے اُس کی خدمت میں لگا رہوں۔

ساتواں اعتراض یہ ہے کہ خطابت میں میرا لہجہ بہت سخت ہو جاتا ہے جس سے اصلاح کے عوض بدظنی اور ضد پیدا ہو جانے کا خوف ہے۔

یہ اعتراض حرف بحرف صحیح ہے۔ لیکن میں اپنا سینہ کھول کر کیونکر دکھاؤں کاش کوئی میرے دل کو دیکھ سکتا۔

ہر کسے از ظنِّ خود شُد یارِ من
واز درُونم کس نجست اسرارِ من

میں تو ہندوستان کو عروج کے اُس نقطۂ آخر پر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں انسانی حد بندیاں ختم ہو جاتی ہیں، اور جب یہ دیکھتا ہوں کہ ہندوستان اُس مقام پر ہے جہاں انسانی پستیوں کے امکانات کی منزل ختم ہو جاتی ہے

تو غصّے کے مارے میرے سر کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں اور دیوانہ وار جوشؔ میں آنا ہے بکنے لگتا ہوں۔

جذبات کی انتہائی یا معراجی شدّت کے وقت مصلحت اندیشی اور حکمت مآبی کا مطالبہ کرنا، انسانی نفسیات سے مکمل بیگانگی نہیں تو اور کیا ہے؟

میرے جسمانی حیثیت سے زندہ اور ذہنی حیثیت سے مرحوم: دوست حضرتؔ ماتی جالسی نے جذبات کی شدت کے وقت حکمت مآبی کے مطالبے کا کیا خوب مذاق اُڑایا ہے، فرماتے ہیں۔

یعنی عاشق، کوئی بقراط ہے، ناصح! کہ جسے
جوشِ آغاز میں اندیشۂ انجام رہے!

آخر وہ کون ایسی بے عزّتی ہے جو ہمارے لئے اُٹھا رہی ہے، اور وہ کون ایسی بے غیرتی ہے جس سے ہم مصالحت نہیں کرچکے ہیں؟

قوت و حیات کی قسم، اگر میرا بس چلے تو میں ہندوستان کے بدخواہ اور اغیار کے دست و بازو قوی کرنے والے سکھوں، عیسائیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو جو مذہب کی آڑ لے کر ایک دوسرے کا خون بہایا کرتے ہیں ایسی ہولناک سزائیں دوں کہ تعزیر و عقوبت کے تمام پارینہ افسانے، اور قہر خداوندی کی تمام مثالیں، روایتیں انگشت بدنداں ہو کر رہ جائیں۔

ہندو، اور مسلمان' ہندوستان کی پُشت پر دو خطرناک سرطان ہیں۔ جنہیں لیپ اور مرہم کی حاجت نہیں، سر تیز نشتر کی ضرورت ہے اور انصاف سے کہئے کہ وہ شخص جو نشتر کی سی سخت چیز استعمال کرنے کی آرزو رکھتا ہے اُس سے نرم الفاظ کا مطالبہ کہاں تک جائز ہے؟

"کلیم" کی افادیت اور دلچسپیوں میں اضافہ کرنے کی خاطر آئندہ سے سائنس کے مضامین کا خاص اہتمام کیا جائے گا۔ اور ملکی و غیر ملکی صحائف کے تراجم، نیز دیہاتی شاعری کے نمونے بھی پیش کئے جائیں گے۔

قوّت زندہ باد!

حبش ختم ہو گیا۔ سیاہ فام حبش ختم ہو گیا۔ کمزور بیچارہ نیم مسلح اور نیم شائستہ حبش ختم ہو گیا۔

سفیدی نے سیاہی کو نگل لیا۔ دن نے رات کا گریبان چاک کر ڈالا۔ اور عقل و حکمت کے زلزلے نے سحر و افسوں کی سرزمین کا سینہ پھاڑ ڈالا۔

قوّت۔ قوّت، قوّت، جو کچھ ہے قوّت ہے۔ اور کمزوری ہی وہ تنہا جرم ہے جسے دُنیا نے آج تک کبھی معاف نہیں کیا ہے۔

ہمارے قابل، اُونچی، اُونچی کرسیوں پر گون پہنکر بیٹھنے والے شاندار جج، جن "مجرموں" کو روز جیلوں میں ٹھونسا کرتے، اور ہمارا بلند بانگ و پُرہول قانون جن "قاتلوں" کو آئے دن سُولیوں پر چڑھایا کرتا ہے، وہ تمام "مجرم" اور وہ تمام "قاتل" اِس اخلاقی یا قانونی بُنیاد پر قید و قتل کی سزا نہیں پاتے کہ وہ "بد اخلاق" اور "قانون شکن" ہیں، وہ تو اِس اور صرف اِس خالص اور تنہا خطا پر جیلوں میں ٹھونسے اور سُولیوں پر چڑھائے جاتے ہیں کہ بدبختی یا اتفاق سے وہ کمزور واقع ہوئے ہیں۔

دُنیا کا سب سے بڑا نظام، سب سے بڑا قانون، سب سے بڑا اخلاق اور سب سے بڑا مذہب، قوّت اور صرف قوّت ہے۔

خدا بھی صرف اس لئے اب تک زمانے کی دست بُرد سے بچا ہوا ہے کہ قوّت کا تصوّر ہنوز اُس سے وابستہ ہے۔

دُنیا کی تمام و کمال تاریخِ تعزیر و عقوبت کا ایک ایک ورق اُلٹ جاؤ، ایک ایک حرف پڑھ ڈالو، شاید ایک نظیر بھی ایسی نہ مل سکے گی کہ اِس مقدّس نوع نے جسے نوعِ بشر کے شاندار خطاب سے پکارا جاتا ہے کسی کو اِس بنا پر سزا دینے کی زحمت گوارا کی ہو کہ وہ مذہب و اخلاق کی رُو سے مستوجبِ تعزیر و عقوبت تھا۔

بلکہ اس وقت تک جتنی سزائیں دی گئی ہیں، وہ محض اس تنہا اور

خالص بنیاد پر دی گئی ہیں کہ تم زیرکیوں نہیں، کمزور کیوں ہو۔

اٹلی نے حبش کو نگل لیا۔ ختم کر ڈالا۔ کیا اٹلی کا یہ فعل، قانون، اخلاق اخلاق اور مذہب، اور سب سے زیادہ یورپ کی حامی امن عالم تہذیب نو کی نظر میں جائز تھا، بتر لیقانہ تھا؟

اٹلی نے جیب ارہنیں، روز روشن میں اور ڈنکے کی چوٹ پر ڈاکہ مارا۔ قتل کیا۔ بم برسائے۔ گیس سے آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ ہوائی جہازوں سے آبادیوں کو بھون ڈالا۔ ہزاروں انسانوں کے بندوں کو موت کے گھاٹ اتار کر، ہزاروں ماؤں کے کلیجے پھاڑ ڈالے۔ ہزاروں بچوں کو بے والی و وارث بنادیا، اور ہزاروں دولہنوں کا سہاگ لوٹ لیا۔

یہ بھی واضح رہے کہ یہ شقاوت ایک دن میں شروع ہو کر ختم نہیں ہوگئی بلکہ یہ آگ اور خون کا کھیل ایک سال تک کھیلا جاتا رہا۔

مہذب دنیا میں اخباروں کے ذریعہ سے اس کی ڈکیتی۔ خونریزی شقاوت اور لوٹ مار کی۔ خبریں روز ٹھیک وقت پر پہونچتی رہیں ——

اخبار فروشوں نے ایک ایک خونی واقعے کو سڑکوں پر پکار پکار کر بیان کیا۔

اس ظلم و جبر کی خبروں کو "اچھوں" نے بھی سنا، "بروں" نے بھی۔

اُن لوگوں نے بھی سنا جو "معلم امن" ہیں، اور اُنھوں نے بھی جو "مفسد" ہیں۔

یہ خونیں داستان اُن کے کانوں تک بھی پہونچی جو دنیوی دولت کے لحاظ سے "مقتدر" ہیں، اور اُن کے بھی گوش گزار ہوئی جو دینی بصیرت کے لحاظ سے "مقدس" کہے جاتے ہیں۔

یورپ کی عالم پناہ مجلس اقوام نے بھی دیکھا کہ حبش بے خطا پامال ہو رہا ہے۔

یورپ کی مسلمۂ امن پرور تہذیب نے بھی دیکھا کہ حبش کو بے خطا تباہ کیا جارہا ہے۔

اور یورپ کی دو ہزار برس کی دشمنوں تک سے محبت کرنے والی، مقدس مسیحیت نے بھی دیکھا کہ حبش بے گناہ ذبح کیا جارہا ہے۔

لیکن کسی نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ شاہ حبش نے امداد کے واسطے تہذیب، مسیحیت اور مجلس اقوام۔ بلکہ تمام عالم کو پکارا لیکن سب نے کانوں میں انگلیاں دے لیں اس لئے کہ وہ کمزور کی آواز تھی۔ اور کمزور کی آواز کو حق نہیں پہونچتا کہ وہ سنی جائے۔

دُنیا قوّت پرست ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ قوت سے ٹکر کھانے کا تصور بھی کرے۔

جس طرح بڑے درخت سے آج تک یہ نہیں پوچھا گیا کہ تو اپنے سائے میں پیدا ہونے والے پودے کو کیوں سُکھا دیتا ہے اور کسی بڑی مچھلی سے یہ دریافت نہیں کیا گیا کہ تو چھوٹی مچھلیوں کو کیوں نگل لیتی ہے۔ اسی طرح دنیا نے کسی قوی سے یہ سوال کرنے کی کبھی جرات نہیں کی کہ تو کمزور کو کیوں ہضم کر لیتا ہے؟

یہ مذہب و اخلاق کے تمام ضابطے اور شرافت و تمدن کے تمام دکمال دفعات۔ سب کے سب سراسر ہیچ۔ پوچ اور لچر ہیں، اگر اُن کی پشت پر کارفرما قوت موجود نہ ہو۔

اس لئے دنیا کو کیوں، ہندوستان اور صرف ہندوستان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کمزور کے علم سے قوی کا جہل۔ کمزور کی شرافت سے قوی کی رذالت کمزور کی عبادت سے قوی کا فسق و فجور۔ کمزور کے دین سے قوی کی بے دینی۔ اور کمزور کے خدا سے قوی کا شیطان بہتر، بر اصل بہتر ہوتا ہے۔ اور اس قدر بہتر کہ ان میں تقابل کرنا، عقل و شعور کی جناب میں گستاخی کرنے سے بدتر ہے،

قانون نہیں ہے کوئی فطرت کے سوا
دُنیا نہیں کچھ نمود طاقت کے سوا
قوت حاصل کر اور سوئے بن جا
معبود نہیں ہے کوئی قوّت کے سوا

شاعرانہ بصیرت اور منتر

شری ارووندو گھوش (پانڈیچری)

طرزِ بیان اور سلاست و روانی، جو شاعرانہ اثر انگیزی کا طرّۂ افتخار سمجھی جاتی ہے، ایک ایسا نقطۂ اتصال ہے جہاں سے کلام کی پرواز و رفعت، سخن کی حیات افروزی اور شعریت کا ذہنی عنصر، روحانیت کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کی اہمیت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب وہ ایسے عمیق، بلند، یا وسیع روحانی تصورات کا حامل ہوتا ہے جن میں شعورِ حیات، پروازِ تخیل اور اشیائے مکشوفہ کا جمالی پہلو، شاعرانہ الہامات کی موجوں پر رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

"اشیائے مکشوفہ" اس لئے کہا گیا کہ شاعرانہ پیامات اگر مکاشفہ نہیں تو اور ہو کیا سکتے ہیں؟

چھوٹے شاعروں کی زندگی میں یہ لمحے بہت ہی شاذ آتے ہیں، اور آتے بھی ہیں تو اتنی تیزی کے ساتھ گزر جاتے ہیں جیسے عجلت پسند فرشتوں کا نزول، یا درخشاں اتفاقات کا وقوع۔

البتہ بڑے شاعروں کی زندگی میں یہ لمحات بکثرت آتے اور اکثر و بیشتر اپنی شعلہ فشانیوں سے اُس کے دل کو جگمگاتے رہتے ہیں۔

لیکن عظیم ترین شعراء کا حال ان دونوں سے مختلف ہوتا ہے اُس پر تو یہ الہامی لمحے پھٹ پڑتے ہیں۔ اور کبھی جدا ہونے کا نام تک نہیں لیتے۔

چونکہ ان الہامات کا سرچشمہ وہ مسلسل و متصل شاعرانہ تصورات و کمالات ہوتے ہیں، جو اپنے عمل میں کبھی بھولے سے بھی کوتاہی یا غفلت نہیں کرتے۔ اس لئے ان کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ تمام مظاہرے ہمیشہ مساوی شدت کے ساتھ نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ کبھی شدت سے رونما ہوتے ہیں اور کبھی کمی کے ساتھ۔

جس طرح فلسفی کی مخصوص صفت، "قوتِ ممیزہ" اور عالم (سائنٹسٹ) کا جوہر "تحلیلی مشاہدہ" ہے، بالکل اُسی طرح "بصیرت" شاعر کی خصوصی طاقت مانی جاتی ہے۔

زمانۂ قدیم میں شعراء کو کاشفِ حقائق، اور ناظرِ اسرار کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

ہرچند اب ہم اس مطمحِ خیال، اور بلند معیار سے اس قدر دور ہو چکے ہیں کہ شعراء سے صرف ذوقِ سماعت کی دعوت اور جذبۂ حسن پرستی کی خدمت کے مطالبے ہی پر اکتفا نہیں کرتے۔ پھر بھی اس حقیقت ناشناسی کے باوصف اعلیٰ درجے کی شاعری اپنے اصلی مقصد و مفہوم کے بلند حقائق کا کچھ نہ کچھ عنصر اب بھی اپنے خزانے میں پوشیدہ کئے ہوئے ہے۔

شاعری چونکہ صناعت ہے۔ اِس لئے اُسے لازم ہے کہ ہماری آنکھیں کھولنے کی سعی کرے اور چونکہ یہ انسان کے حواسِ باطنی ہی ہیں جن سے شاعری خطاب کرتی ہے، اور کان، داخلے کا محض ایک مادّی دریچہ ہونے کے باوصف

شعر کی اپیل کو اندرونی سماعت تک پہونچانے کا ذریعہ ہیں۔ اور اس کے دوش بدوش چونکہ شاعری کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے قلبوں میں اُن خیالات کی پرورش کریں جنھیں شاعر کلماتِ موزوں میں پیش کرتا ہے۔ اس لئے بجا طور سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعری کا کام دل کی آنکھیں کھولنا ہے اور ظاہر ہے کہ جو دوسروں کی باطنی نظر کو تیز کرسکتا ہے خود اُس کی بصیرت کس قدر شدید ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ شعرائے کبیر وہی لوگ ہوتے چلے آئے ہیں جنھیں فطرت، حیات، اور انسان کے متعلق وسیع و محکم مفسرانہ اور القائی قوتیں بخشی گئی تھیں اور جن کی شاعری اُن قوتوں کے آغوش میں پروان چڑھ کر اُن کا اعلیٰ مکاشفانہ اظہار کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی۔

ہومر، شکسپیر، ڈینٹے، والمیک، اور کالیداس کے درمیان دیگر امور میں خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ لیکن جہاں تک اُن کی عظمت و بزرگی کے نشان کا تعلق ہے۔ وہ متذکرہ بالا امور میں بالکل متحد و متفق پائے جاتے ہیں۔

اِن شعراء کی فوقیت و عظمت کا مدار صرف اسی بنا پر نہیں ہے کہ اُن کی فکر قوی، تخیلات جہاں پیما، جذبات شعلہ فشاں اور اُن کے ولولے سینوں کو تراش دینے والے تھے۔ ہر چند یہ صحیح ہے کہ یہ تمام اوصاف اُن کے اندر موجود اور بدرجۂ اتم موجود تھے۔ اور کوئی اِن جوہروں میں سے ایک کے لحاظ سے زیادہ بہرہ یاب تھا۔ اور کوئی دوسرے عطیے سے زیادہ فیض یافتہ۔ لیکن یہ تمام جوہر حقیقت میں اُن کے ملکۂ سخنوری کے محض معاون و مددگار ہی تھے۔ انھیں اُن کی شاعری کا سرچشمہ اور اُن کے الہامات کی بنیاد نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

شیکسپیر کے تمام و کمال ڈرامے کے مقابلے میں اکثر بیکن (Bacon) کے ایک مختصر سے مقالے میں زیادہ قوتِ فکر پائی جاتی ہے۔ لیکن ہزاروں پُرمغز تصنیفات اور کروروں پُراسرار حرف و حکایات اُسے (شیکسپیر کے سے) ڈراموں کا مصنف نہیں بنا سکتے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ بیکن نے جب شاعری کے میدان میں قدم اُٹھایا تو خود اُس کے افکار کی حقیقی فطرت، اور ایک پیدائشی مفکر کی سی مخصوص روشِ نگارش نے شاعرانہ طرزِ بیان کے میدان کی طرف مڑتے ہی اُس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔

فراوانیٔ تماشائے کائنات اور افراطِ مشاہدۂ حیات کی وادیوں سے تشکیل، تخیل اور مصوری کے چشموں کے پھوٹ نکلنے اور بار بار پھوٹ نکلنے ہی نے شیکسپیر کو اس کی تمام دیگر کمزوریوں کے باوجود۔ ڈراما نگار شعراء کا شاہنشاہ بنا دیا تھا۔ بصیرت، اصلی و بنیادی شاعرانہ جوہر ہے ——————

ہم کہہ سکتے ہیں کہ خسروانِ شعر و سخن وہ روحیں ہیں جو اپنے ہی آئینے میں نہایت صفائی کے ساتھ مشاہدہ کرتی ہے، خدا کا، دنیا کا، اپنے عالم اور دوسرے عالموں کا۔ نیز اس تمام مخلوق کا جو ذی حیات ہے، اور جو اپنے مرکز کے سرچشمے سے تخلیقی ترنم اور شعورِ عالم کی ایسی لہروں کو جاری کرتی ہے جو شاعرانہ تصورات کو مجسم کردینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

عظیم شعراء وہی ہیں جو کسی نہ کسی پیمانے پر اپنی اِس عظیم تخلیق کی ہمیشہ تکرار و مزاولت کرتے رہتے ہیں اور انھیں کو ناظرِ حقائقِ شعری، اور صانعِ کلماتِ موزوں کا خطاب زیب دیتا ہے۔

آج کل کا عصری دماغ (Modern Mind) شاعری میں تفکر کو تمام قوائے شعری پر نمایاں فوقیت دینے کی طرف مائل نظر آتا ہے جس کی کھلی ہوئی وجہ یہ ہے کہ ہم ہنوز ایک ایسے دَور سے گزر رہے ہیں جو ایک عظیم ذہنی کشمکش میں گرفتار، درمیانِ حیات میں سراسیمہ اور فکرِ عالم میں سرگرداں ہے۔

اور اسی بنا پر حیات سے دست و گریباں ہو کر اُس نے فتح کر لینے کی خاطر، یہ دَور، انسانی ذہانت و فکر کے فروغ دینے میں سب سے زیادہ وقت صرف کر رہا ہے اور اِس سلسلے میں یہاں تک غلو سے کام لیا جا رہا ہے کہ اُن دیگر قوا کے پامال کردینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا جو علمِ ذات کے واسطے تفکر و ذہانت کے مقابلے میں کچھ کم مفید و اہم نہیں ہیں ——————

ہم ہمیشہ کچھ نہ کچھ تلاش ہی کرتے رہتے ہیں۔ مختلف ذہنی میدانوں میں اشیائے عالم کے معمے حل کرنے کی دُھن میں سرگرداں رہتے ہیں —— اور لوحِ کائنات کے پُراسرار حروف کے پڑھ لینے اور تفکر کے ذریعے سے اُن کے معنی سمجھ لینے پر ہمیشہ اپنے کو مجبور پاتے ہیں —————— جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی اور ہمارے قوائے فکر اِس ہولناک اتصال و تسلسل کے ساتھ مصروف و مشغول رہتے ہیں کہ ہمیں خاموشی سے بیٹھنے اور دنیا کا مشاہدہ کرنے کی فرصت ہی کبھی میسر نہیں ہوتی۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم شاعر سے بھی یہ امید کرتے ہیں کہ وہ اس جد و جہد اور کشمکش میں اپنی عظیم لسانی قدرت و امارت کے ذریعے سے ہماری امداد کرے۔

ہم اس سے مکمل ترنم اور دل افروز نغمہ سرائی اور تخلیقی بصیرت و شعور کی پہنائیوں کا اتنا مطالبہ نہیں کرتے جتنا کہ اُس سے اپنی پراگندہ اور سرگرم تلاش ذہانت و فکر کے واسطے کسی عقلی پیغام کے طالب رہتے ہیں۔

یہ نے یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ پیش پا افتادہ اور روزمرّہ کی معمولی چیزوں کے ادنیٰ سراہنے والوں تک کے کلام پر اُن کے مدّاح خواہ مخواہ کسی نہ کسی "فلسفے" یا "پیغام" کا لیبل زبردستی چسپاں کر دیتے ہیں، اور جو شے کہ قدرت نے اُنھیں بخشی ہی نہیں ہے، یہ حضرات اُس شے کو زبردستی اُنھیں عطا فرما کر دم لیتے ہیں۔

ٹیگور کا "پیغام" وھٹ مَین (Whitman) کا "پیغام" اور خدا جانے اور کس کس کا پیغام!

غرضکہ اِن "فلسفوں" اور اِن "پیغاموں" نے شاعری کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔

یہ کیا اندھیر ہے کہ ہم شاعر سے یہ مطالبہ کرنے لگے ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کا نغز سنج یا ایک عظیم الہامی ناظرِ کائنات ہونے کے عوض، فلسفی، پیغمبر، معلّمِ اخلاق اور مصلحِ دین و مذہب بن کر رہ جائے۔

اس موقع پر اِس امر کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب میں شاعر کے متعلق "ناظرِ حیات" کے مرتبے کا دعویٰ کرتا ہوں اور عظیم تر شاعری کا سرچشمہ، حیات، یا خدا، یا دیوتاؤں، یا انسان، یا فطرت کے متعلق ایک عظیم اور کاشفِ اسرار بصیرت کو ٹھہراتا ہوں۔ اُس وقت میرا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ شاعر کے واسطے کسی نہ کسی عقلی فلسفۂ حیات، یا نوعِ بشر کے واسطے کسی خاص پیغام کا حامل ہونا لازمی و ضروری ہے، اور اُسے کسی فلسفے یا پیغام کو محض اس وجہ سے نظم کا جامہ پہنانا چاہیے کہ موزونیِ طبع، اور پروازِ تخیل کا جوہر اُسے ارزانی ہوا ہے، یا وہ اِس پر مجبور ہے کہ مسائلِ وقت کو سلجھائے اور نوعِ انسانی کے عملِ ترقی کا مددگار بن کر اس مقولے پر عمل پیرا ہو جائے کہ دنیا کو اس سے بہتر بنا کر جاؤ، جب کہ تم نے اُسے پایا تھا۔

بیشک ایک انسان کی حیثیت سے وہ اِن تمام امور کا حامل ضرور ہو سکتا ہے۔ مگر وہ اپنی ذات پر ان چیزوں کو جس قدر کم حاوی ہونے دے گا اتنا ہی اس کے شاعرانہ جوہر کے واسطے مفید ہوگا۔ اور اُس کی شاعری تر و تازہ رہے گی۔

البتہ اگر اِن متذکرۂ بالا چیزوں کو شاعرانہ رُوح کے تصرف سے بصیرت و حیات کے سانچے میں ڈھال لیا جائے تو اس قدر فائدہ ضرور پہونچ سکتا ہے۔ کہ ان چیزوں سے شاعرانہ طرزِ بیان کی اثر انگیزی بڑھ سکتی ہے، اور یہ چیزیں شاعرانہ طرزِ بیان کے واسطے مسالہ ضرور فراہم کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ چیزیں شاعری کی رُوح اور اس کا مقصد کبھی نہیں بن سکتیں۔ اور نہ شاعر کی تخلیقی سرگرمیوں اور لفظی خوبیوں کے واسطے شمعِ ہدایت کا کام دے سکتی ہیں۔

ناظر شاعر (THE POET-Seer) تمام فلسفیوں اور پیمبروں سے ہٹ کر ایک قطعی مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھتا، سوچتا اور بولتا ہے۔

پیغمبر، حق و راستی کا اعلان "فرمانِ الٰہی" اور "کلمۂ ربانی" کی شکل سے کرتا ہے اور مبلغ، پیام کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ لیکن شاعر کا وظیفۂ فطری اس سے قطعاً مختلف ہوتا ہے۔ اس کا کام تو صرف اس قدر ہے کہ حق و راستی کو اُس کی جمالی قوّت کے ساتھ دکھائے۔ اُس کے آیات و علامات پیش کرے۔ قدرت کی دل فریبیوں اور حیات کے مختلف پہلوؤں میں اس کی صنّاعیوں اور کارکردگیوں کو منظرِ عام پر لے آئے۔ اور جس لمحے میں شاعر ان فرائض سے عہدہ برآ ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ بس اُس نے اپنے تمام کام ختم کر دیئے۔ اِس سے زیادہ کی اُسے ضرورت نہیں، کیونکہ حق و راستی کا مستقل خطیب اور حقائق و اسرار کا محکم ترجمان بننا اُس کے دائرۂ عمل سے قطعی خارج ہے۔

فلسفی کا کام، حق و راستی کے مختلف نازک پہلوؤں میں امتیاز پیدا کرنا، اور اُس کے مختلف اجزائے ترکیبی، اور صُورِ معنوی کو عقلی تعلقات کے لحاظ سے باہدگر پیوستہ و ہم رشتہ کر دینا ہے۔

لیکن شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ حق و راستی سے ہم آغوش ہو جائے اور اس کے علامات و اشکال کو اُن کے زندہ تعلقات کے لحاظ سے مجتمع و متشکل کر دے یا اس پیچیدہ فلسفیانہ طرزِ بیان سے گریز کر کے سادے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کا یہ کام ہے کہ وہ حق و راستی کا مشاہدہ کرے اور شاعرانہ ولولوں سے بیخود ہو کر اُسے ایک مجسمۂ حسن و جمال کی شکل میں ڈھال دے۔

یہ بہت ممکن ہے کہ پیمبر کا باطن ایک شاعرانہ شخصیت کو بھی اپنے خلوتکدے میں پوشیدہ رکھتا ہو، ورنہ پیمبر کے پردے میں پھر یہ ہے کون جس کے سینے سے

کبھی کبھی حیرتناک خطابت کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں، اور جس کی آواز حیات کے شوخ و تابناک ماحول کے ساتھ ساتھ رسالت کے کلمات راست ... پیام معصوم کا احاطہ کرلیتی ہے۔

پیغمبر اُس جمالِ حقیقت کے ایک کانعتِ اسرار مجسمے کی نقاب کشائی کے ذریعے سے (جس کا وہ منادی ہے) یہ بات بسہولت وضاحت بیان کرکے اپنے فرائض پورے کرسکتا ہے کہ فطرت کی سیاحت میں اور جلوۂ لالہ و گُل کے اندر نیز حیاتِ انسانی کے پسِ پردہ روحِ کائنات کیوں کر سرگرمِ عمل رہتی ہے۔

اسی طرح فلسفی، شبستانِ شاعری کی صحت آفریں فضا سے آب و رنگ لیکر اپنے دلائل کی دھندلی اور غیر دلچسپ روشنی کو ایک حد تک دلکش بنا سکتا ہے۔ اور چشمۂ سخنوری سے بھیک مانگ کر اپنی مساعی اور خشک کھیتی کی آبیاری کرسکتا ہے

لیکن پیمبروں اور فلسفیوں کی یہ تمام شاعرانہ کاوشیں، اُن کے واسطے زیب و زینت کا ساز و برگ تو ہوسکتی ہیں، لیکن اُن کی بنیاد کبھی نہیں بن سکتیں۔ اور جیسے ہی کہ پیمبر اور فلسفی، شاعری کو اپنی روحانی و عقلی اساس اور بنیاد بنانے لگتے ہیں تو اُن کی رسالت و حکمت کی حیثیت اُس لمحے ختم ہوجاتی ہے اور وہ پیمبرانہ سیرت اور حکیمانہ تفکر سے عاری ہوکر ایک حقیقت نگر شاعر کے روپ میں جلوہ گر ہوجاتے ہیں۔

اسی بنا پر بعض بحث گیر علمائے الٰہیات "نیٹشے" کو حکیم کا خطاب نہ دینے کے باب میں غالباً برسرِ حق ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ "نیٹشے" تفکر و تدبر سے کام لینے کے عوض مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی تو اُس کا مشاہدہ دھندلا ہوجاتا تھا، کبھی درخشاں۔ کبھی سیدھا ہوتا تھا، اور کبھی پیچیدہ و ناہموار لیکن وہ ہمیشہ مشاہدہ ہی کیا کرتا تھا۔ اور مشاہدہ بھی فلسفی کے دماغ سے نہیں بلکہ شاعر کی نگاہ سے۔

اس کے برعکس عظیم شاعری کے ایسے نمونے بھی مل سکتے ہیں جو یا دیانہ جوشِ تکلم اور پیمبرانہ آتشِ خطابت سے بھرپور، یا اپنے مراد کے لحاظ سے، ایک بڑی حد تک یا تمام تر، فلسفیانہ ژرف نگاہیوں سے معمور ہوں۔ لیکن یہ پیمبرانہ شاعری بھی کوئی براہِ راست پیغام نہیں دیتی۔ یہ تو محض اعلیٰ ترین الہامی تصورات و محاکات کا ایک زبردست مجموعہ ہوا کرتی ہے اور بس۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے یہ پیمبرانہ و فلسفیانہ شاعری صرف اُس وقت تک شاعری کہی جاسکتی، اور شاعری کی حیثیت سے زندہ رہ سکتی ہے جب تک کہ اس میں فلسفیانہ روش، حکیمانہ طرزِ بیان، اور تفکر پرست دل و دماغ کے خصوصیات قطعی طور پر نہ پائے جائیں۔

ایسی شاعری کے واسطے یہ امر ناگزیر ہے کہ اثنائے بیان میں وہ عالمِ تخیل کے چہروں پر اپنی ذاتی درخشاں فضاؤں سے ضیاء پاشیاں کرے، اور محققانہ تخیل کے پیدا کردہ حقائق کے مشاہدے سے گریز کرتی ہوئی اشیائے عالم میں حکیمانہ امتیازات قائم کرنے کی جسارت سے باز رہے۔

قدیم زمانے میں یہ فلسفیانہ اور شاعرانہ امتیازات صاف طور سے قطعی نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑی طاقت رکھنے والے شعراء تک موسیقی میں ایک فلسفیانہ نظام قائم رکھنے کی سعی کیا کرتے تھے۔ اور یہیں تک نہیں بلکہ فلسفیانہ مضامین سے بھی خشک تر ایک روکھے پھیکے نثر نما طرزِ بیان پر مائل رہا کرتے تھے۔

ہیسیوڈ (Hesiod) اور ورجل (Vergil) نے زیباں تک ستم ڈھایا کہ کاشتکاری پر ایک منظوم کتابچہ ہی لکھ مارا۔

روم کے (وہ روم جو نقصِ ادراک و فراست کے باعث، جمالی شعور میں ہمیشہ کسی قدر تہی ہی رہا ہے) سب سے بڑے دو شاعر بھی اسی نامراد مغالطے کا شکار ہوکر ایسی نظیر قائم کرگئے ہیں کہ آئندہ نسلیں سبق لیں۔ اور عبرت حاصل کریں۔

"لکریشس" (Lucretius) کا کلام صرف تاریخ کے اوراق میں اب تک زندہ ہے، اور اُس شاہانہ ترتیبی کس بل کے باوجود اُس کی پشت پناہی کر رہا ہے، وہ کب کا فنا ہوچکا ہوتا۔ اگر بعض شاندار خالص شاعرانہ وسیع خوبیاں اُسے سہارا دیئے ہوئے نہ ہوتیں۔

ورجل کی جارجکس (Georgics) محض اپنے فصیح قطعوں مناظرِ قدرت کی تصویروں، اور الفاظ و محاکات کی خوبیوں کی بدولت اب تک معدوم نہیں ہوئی ہے۔ ہر چند اُس کا تخلیقی مسالا بالکل بے روح ہے۔ مگر اعلیٰ نشست الفاظ کی ناخدائی کی بدولت اب بھی وہ وقت کے دھارے پر بہتی ہوئی ہم تک پہنچ رہی ہے۔

ہندوستان اور صرف ہندوستان نے اس فلسفیانہ قسم کی سعی کو کامیابی کے ساتھ حقیقی شاعری کے سانچے میں ڈھالنے کا ایک یا دو مرتبہ بندوبست کیا تھا۔

گیتا، اُپنشد اور اسی قسم کی بعض دیگر مختلف کتابیں اس نمونے پر تصنیف کی گئی تھیں۔

لیکن ان میں اور دیگر ممالک کی مماثل کوششوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

گیتا کی شاعرانہ کامیابی کا راز تھا اس کا زندگی کی ایک عظیم اور خطرناک صورتِ حال سے شروع ہونا۔ اپنے نقطۂ آغاز کو پیش نظر رکھنا اور ہمیشہ اس کی طرف بار بار مراجعت کرنا ——— نیز ایسی شائستہ روش کا اختیار کرنا جس کا کام تھا روحانی تجربوں، واردات، اور اندرونی زندگی کے مرحلوں کو گرفت میں لینا، اور پھر انھیں تخیل کی صورت میں بدل دینا۔

ہر چند یہ اجرائے کار کی ایک نہایت نازک اور دشوار صورت تھی۔ پھر بھی اس میں اس قدر عزم و صلاحیت تھی کہ یہ شاعرانہ آدابِ کلام کے حدود کے اندر بہ احسن الوجوہ رہ سکے۔

البتہ صرف اُن مواقع پر جب گیتا مابعد الطبیعاتی مسائل سے اپنے کو بہ غایت بوجھل بنا لیتی ہے، اور خالص فلسفیانہ تعریفات و امتیازات کے خارزار میں الجھ جاتی ہے۔ جیسا کہ خاص طور سے دو تین آخری ابواب سے ظاہر ہے تو اس وقت اُس کی شاعرانہ آواز مسائل کے بوجھ سے دب جاتی ہے۔ اور بعض اوقات تو ایک نہایت ہی بھدی نثرِ منظوم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اب رہے اُپنشد سو وہ گیتا کے مقابلے میں فلسفیانہ افکار سے قطعی مبرا اور روحانی مشاہدات سے زیادہ بہرہ ور ہیں۔

ان کے اندر القا و الہام کی ایک لگاتار اور جیالانہ دوڑ پائی جاتی ہے جو آگ اور بجلی کی بنی ہوئی شاعرانہ زبان سے ہم آغوش نظر آتی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ شاعرانہ زبان ہی ان الہامات کی فطری زبان ہو سکتی ہو۔

اگر اس کے برعکس ان کے طرزِ بیان میں ادراک و تعقل کا آوازہ زیادہ بلند کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ اپنشد کی شاعرانہ بصیرت اور وجدانی طاقت کی تکذیب ہو کر رہ جاتی۔

اب ہمارا ذوقِ جمال اس قدر کافی حد تک صاف و درخشاں ہو چکا ہے کہ روحِ شعر اس کی غلطیوں سے بہ آسانی بچا سکتا ہے۔ پھر بھی یہ ایک بڑی خطرے کی علامت ہے کہ وہی روحِ شعراء کے شعریت سوز فلسفیانہ میلانات حقیقی شاعری کی حریمِ ناز میں، ہر چند پہلے کی طرح دلیرانہ نہ سہی، پھر بھی کسی نہ کسی طرح دبے پاؤں داخل ہو جانے کے خطرناک جذبات کا آج بھی مظاہرہ کر رہے ہیں۔

شاعری کے متعلق آرنلڈ (Mathew Arnold) کی اس تعریف سے زیادہ کہ "شاعری انتقادِ حیات کا نام ہے" اور کوئی شے خطرناک نہیں ہو سکتی۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ شاعری کی حقیقی رمز سنجیوں سے رُوگردانی کر کے حیات کے متعلق ناقدانہ اور فلسفیانہ خیالات کو موزونیتِ محض کا لباس پہنا کر ہماری تخیل و بصیرت کو مجروح کر دیا جائے۔

اسی کے ساتھ تمثیل و تشبیہہ کی دیوی، اپنی ذہنی استعداد کے لشکروں اور مجرد خیالات اور منجمد اشکال کو مخلوط کر دینے کے ہیل فن کی فوجوں کو لئے ہوئے فلسفۂ شاعری پر پھر حملہ کر دینے کا رجحان ظاہر کر رہی ہے۔

اس کے علاوہ بعض اور بھی ذہنی امراض ہیں جن میں تقریباً ہم سب مبتلا ہیں اور جن سے گریز کرنا ہمارا فرض ہے۔

اس لئے اس بات پر زور دینا چاہئے کہ شاعری کی خلقی ذات، وجدان و بصیرت ہے۔ نہ کہ ذہنی مادۂ افکار، اور اس اصول وجدان و بصیرت سے وابستہ رہنے ہی میں شاعری کی سلامتی کا راز مضمر ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ شعراء کا یہ بھی فرض ہے کہ شاعرانہ تخیل، فکر، احساسات طرزِ بیان اور شاعرانہ ہیولوں کو ہدایت و بصیرت ہی سے پیدا ہونے کا موقع دیں۔ یا قبل اس کے کہ شعر مکمل صورت اختیار کرے۔ اس کے واسطے یہ امر ناگزیر بنا لیں کہ وہ ہدایت و بصیرت ہی کے رنگ میں ڈوب کر منظرِ عام پر آئے۔

حیات کا شاعرانہ تصور، حیات کے نقادانہ، عالمانہ یا حکیمانہ نقطۂ نگاہ سے وابستہ نہیں ہوتا۔ وہ تو روح کی نظر اور حواسِ باطنی کی گیرائی پر مبنی ہوتا ہے۔ شاعری کا سحرِ حلال یا منثر معنوی یا صوری، کسی حیثیت سے بھی حکیمانہ حقائق کا شاعرانہ اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ تو اُس روحانی نظر کا جو خدا، فطرت، دنیا، اور پوشیدہ حقائق کا مشاہدہ کرتی ہے۔ محض ایک ترنم انگیز انکشاف یا زمزمہ آمیز اظہار ہوا کرتا ہے۔ جسے عام نگاہیں دیکھ ہی نہیں سکتیں۔

اس باب میں کہ صناع (آرٹسٹ) کو زندگی کے کس پہلو پر نگاہ ڈالنا چاہئے

بڑی نازک چہ میگوئیاں ہوتی ہیں۔ کوئی فعلی نقطۂ نگاہ پر زور دیتا ہے کوئی انفعالی زاویۂ نظر پر۔ کسی کا خیال ہے کہ صناع کو حقیقت نگر ہونا چاہیئے تو کوئی وجدان کی طرف دعوت دیتا ہے۔ کوئی خارجی اشیا کو موضوع قرار دینا پسند کرتا ہے، اور کوئی داخلی کو۔ لیکن یہ تمام بحثیں، اُس قدر رہنمائی نہیں کرتیں جس قدر کہ گمراہ کرتی ہیں۔

یہ قطعی ممکن ہے کہ ایک شاعر، خارجی اشیاء کے اظہار میں زیادہ کامیاب رہتا ہو، اور داخلی اُمور کے جادۂ بیان پر اُس کے قدم ڈگمگا جاتے ہوں، اور اس کے برعکس دوسرا شاعر، داخلی شاعری میں زیادہ کامراں رہتا ہو اور خارجی شاعری میں اس کا رخشِ فکر ٹھوکریں لینے لگتا ہو مگر اس تضاد کے باوصف دونوں شاعر مساوی طور سے اعلیٰ درجے کے شاعروں میں شمار کئے جاسکتے ہیں، کیونکہ جب قریب سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ بات صاف نظر آنے لگتی ہے کہ ہر خارجی شاعری میں، داخلی شاعری کے اور ہر داخلی شاعری میں خارجی شاعری کے عناصر ضرور پائے جاتے ہیں اور دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی شاعری ان چیزوں سے خالی ہے تو وہ محض، الفاظ کا ایک انبار ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اُسے زندہ یا حقیقی شاعری کا خطاب نہیں دیا جاسکتا۔

قطعی اور خالص خارجی یا بیانی شاعری، انسان کو آرٹ کے مرتبۂ بلند سے گرا کر مصوری کی سطح پر لے آتی ہے۔ کسی شے کو بصیرت و وجدان سے قطعی معرّا کرکے محض اُس کی ظاہری صورت میں پیش کر دینا سائنس کے لئے تو موزوں ہو سکتا ہے۔ مگر شاعری کے واسطے نازیبا بلکہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرزِ عمل سے ہم کسی عظیم راستی یا اہم حقیقت تک، رسائی حاصل نہیں کرسکتے، بلکہ اِس کے برعکس ناراستی و باطل سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

اشیاء کا عالمانہ اظہار و انکشاف، خواہ وہ حواسِ ظاہری اور دلائلِ مشاہدہ کی رُو سے اپنے دائرے میں کتنا ہی استوار و محکم کیوں نہ ہو، رُوح سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ نہ اُسے کامل حق و راستی، اور اشیاء کے تمامی تصورات ہی سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خالص عالمانہ اظہار و انکشاف اشیاء کی ترکیب عمل مشینری، اور اُن کا میکانی قانون تو پیش کرسکتا ہے لیکن اشیاء کی اندرونی زندگی، اور اُن کی رُوح کے اظہار میں ہمیشہ قاصر رہتا ہے، اور دراصل نظریۂ حقیقت نگاری کی یہی سب سے بڑی کمی اور غلطی ہے۔

حقیقت یا واقعہ نگاری کا فن، سائنٹیفک تحقیق کے ساتھ زندگی کا مرقع نہ تو پیش کرتا ہے نہ پیش کرسکتا ہے، کیونکہ فن، پھر فن ہے، وہ نہ تو سائنس ہوتا ہے اور نہ سائنس بن سکتا ہے۔

واقعہ نگار صرف اس قدر کرسکتا ہے کہ انتہائی بازیگری کے ساتھ شعری محرکات، اشکال اور الوان کو زبردستی چن لے، اور کبھی تو اُن پر ہلکا سیاہ، بادامی، نیلا، ملگجا سفید، یا بے روح زرد رنگ چڑھا دے اور کبھی اُن پر شدید سیاہی یا سُرخی کی پالش کر دے، اور نتیجہ یہ نکلے کہ کبھی تو اُس کی شاعرانہ پندار کسی حد تک دل آویز برآمد ہو اور کبھی ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ جائے۔

تخیل نگاری کا فن، واقعہ نگاری کے فن کے مقابلے میں ایک مختلف اور جداگانہ راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ یا تو ایک محکم و خوبصورت شے پیدا کرتا ہے یا محض ایک جھوٹا بیداری کا خواب، وجود میں لاتا ہے۔

اس لئے واقعہ نگاری یا تخیل نگاری کے یہ تمام امتیازات خطروں سے خالی نہیں ہیں۔

اگر شاعر اپنے اندرونی جیتے جاگتے شاعرانہ مرکزی نقطے کے دائرے میں حرکت کرے گا اور مصنوعی نقطۂ فکر کی جانب بھٹک کر چلے جانے سے محترز رہے گا تو وہ اِس پر مجبور ہوگا کہ اُسی راستے پر گامزن رہے جو اُس کا حقیقی اور فطری راستہ ہے، اور جس کی جانب اُس کی مشاہدہ کرنے والی بصیرت رہنمائی کرتی رہتی ہے اس لئے شاعر کے واسطے کوئی ضابطہ یا قانون بنانا محض ایک فعلِ عبث ہے، اور کچھ نہیں۔

چنانچہ متذکرۂ بالا نقطۂ نگاہ کی رُو سے شاعر آزاد ہے کہ اپنے جوہرِ اصلی کو صدمہ پہنچائے بغیر جو راستہ چاہے اختیار کرلے۔

وہ چاہے تو اپنے کلام میں مادۂ تفکر کو زیادہ اُبھارے یا جوہرِ حیات کو نمایاں جگہ دے۔ اُسے اجازت ہے کہ وہ خالص بیانیہ قوتوں سے کام لے۔ یا براہِ راست اپنے ترجمانی قوار کو حرکت دے۔ وہ اِس دنیا کو اپنا موضوعِ سخن قرار دے۔ یا اُس کے ماورا چلا جائے ——— یا براہِ راست لامحدود فضاؤں اور عرشِ بریں کی سمت پرواز کر جائے۔

اُسے رخصت حاصل ہے کہ اپنے کلام میں سحرِ حلال یا منتر پیدا کرنے کی خاطر وہ برگِ گل کے رنگ و بُو سے اپنے سخن کا آغاز کرے۔ یا کسی سیرت کی دل آویزی و

قوت سے متاثر ہو کر اُسے موضوعِ سخن قرار دے۔ یا کسی کردار کے فلسفے پر اپنے کلام کی بنیاد رکھے۔ یا پھر ان سب سے مُنھ موڑ کر اپنی محض رُوح اور اپنے پنہاں ترین احساسات و محرکات کے حلقہ اسرار میں داخل ہو جائے۔

لیکن ہر حالت میں یہ ایک نہایت ضروری بات ہے کہ شاعر اُن تمام الفاظ اور نقوش سے بالا ہو جائے۔ جو اُس نے استعمال کئے، یا بنائے ہیں، اور اُن تمام اشکال سے بے تعلق ہو جائے جو اُس نے مشاہدہ کئے ہیں، اور اُس نُور میں گم ہو جائے جس کا اظہار و انکشاف وہ الفاظ کے ذریعے سے کرتا ہے، اور ایک ایسے دریائے معانی میں ڈوب جائے، جس میں الفاظ کے سفینے غرق ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا غوطہ اس قدر مکمل ہو کہ وہ قطعی طور پر لگا ہوں سے اوجھل ہو جائے۔ یعنی نظارگی کی شخصیت، نظارے کی ابدیت میں اپنے کو فنا کر دے اور رُوحِ کُل شاہانہ افتخار کے ساتھ خود سرگرم افشائے راز نظر آنے لگے۔

لیکن، دوسری تمام چیزوں کی طرح شاعرانہ بصیرت بھی انسانی دماغ کے سلسلۂ ارتقا کی پابند ہوتی، اور عہد و ماحول کی مطابقت میں اپنی سطح، اپنے صعود و نزول، اور اپنی بازگشت کو مرتب کرتی ہے۔

ابتدائی دَور کے انسان کی نظر، اسی طبعی و مادی دنیا اور اس دنیا کے افسانہائے حیات کی دلچسپیوں اور بدوی تصورات و احساسات تک محدود تھی۔

وہ صرف انسانوں، اور انسانوں کے گرد و پیش کی دنیا ہی کا مشاہدہ کرتا تھا، اور اگر ماورائے عالم کے دیوتاؤں اور باشندوں کو دیکھتا بھی تھا تو مبالغہ آمیز انسانی صورتوں اور گرماگرم اوہام کی شکل میں۔

اس لئے ابتدائی دَور کا انسان، شاعر سے شاعری کا اس قدر مطالبہ نہیں کرتا تھا جس قدر اس امر کا کہ وہ ان تمام دیوتاؤں اور باشندگانِ عالمِ غیب کے حالات اِس قوت کے ساتھ بیان کرے کہ وہ انھیں بالکل قریب سے دیکھنے لگے، اور اُن کے وجود کو بہ شدّتِ تمام محسوس کرنے لگے۔ نیز وہ چاہتا تھا کہ شاعر اُس کے قلب میں ایک ایسی الہامی قوّت بھر دے کہ وہ اِن دیوتاؤں کے نقوش کو اور زیادہ استواری کے ساتھ اپنے قلب میں قایم رکھ سکے۔

اس کے بعد جب انسان میں تھوڑی بہت عقل آنے لگی تو وہ کسی حد تک وسعت کے ساتھ دُنیا کو دیکھنے لگا۔ لیکن پھر بھی اُس کا موضوعِ فکر وہی رہا جو پہلے تھا اور اب وہ شاعروں سے یہ مطالبہ کرنے لگا کہ وہ دیوتاؤں اور غیبی ہستیوں کے نظریات کو الہامی منطق سے منوّر و تاباں بنا دے۔ اور اپنے نو زائیدہ و ترقی پذیر احساسِ جمالیات کی محکم و بے داغ مسرتوں کے ذریعے سے اِن نظریات کو بہ تمام حسن و خوبی متشکل کر دے۔

یہی وہ دَور ہوتا ہے جب کہ ایک ایسی تندرست قسم کی شاعری پیدا ہوتی ہے جو حسیاتی ذہنیت (Sense Mind) اور احساسات کے ذریعے سے تخیل کو مطمئن کرتی اور حیات کی ترجمانی کر کے ادراک کو مسرور بناتی ہے اور یہ موخر الذکر ترجمانی شاعری، ایک نہایت باریک تر ذہنیت اور وسیع تر تجربۂ حیات کے ساتھ بار بار مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے۔

کوئی شک نہیں کہ اس متذکرۂ بالا بنیاد پر شاعری سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں، لیکن چونکہ یہ کوچہ خارجی شاعری کا کوچہ ہے۔ اس لئے اِس موقع پر عمیق تصورات میں غوطہ لگانے میں شاعر کو ایک نوع کی زحمت ضرور پیش آئے گی۔ اور چونکہ اُس کا تمامتر انحصار خارجی اشیا پر ہوگا، اور خارجی اشکال و خیالات ہی کا اُسے اتباع کرنا پڑے گا۔ اس لئے شاعر کو اُس تجلی کے مشاہدے میں بڑی دشواری پیش آئے گی۔ جو خارجی اشیار کے دبیز حجابات میں پوشیدہ رہتی ہے۔

لیکن بلند سطح کی شاعری اُس وقت معرضِ وجود میں آتی ہے، جب انسانی دماغ، زندگی کی اُن مستور طاقتوں کا قریب سے مشاہدہ شروع کر دیتا ہے جو ہمارے طبعی وجود کے پس پشت مخفی رہتی ہیں۔ اور اُن قوائے مخفی کے براہِ راست انکشاف کی سعی میں مصروف ہو جاتا ہے یا کم سے کم طبعی، حیاتی اور تخیلی چیزوں کی خارجی علامتوں کو عظیم و اہم اشیار کی وساطت سے استعمال کرنے لگتا ہے۔

لیکن شاعری کا اِس سے بلند تر ایک مقام اور بھی ہے، اور وہ مقام اُس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ انسانی نگاہ بہ شدتِ تمام عمیق ہو جائے اور اشیائے عالم کی روح بالکل قریب آکر جلوہ گری کرنے لگے اور اس طبعی دنیا کے علاوہ دوسرے عالم بھی انسانی بصیرت پر منکشف ہونے لگیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ شاعرانہ بصیرت مکمل آزادی کے ساتھ مشاہدہ کرتی اور شاعرانہ قوت سب سے زیادہ عمل پیرا ہونے پر مچلی نظر آتی ہے اور عظیم ترین قلب، کائنات کی روح کو کامل

لے سے اپنی گرفت میں رہ رہا ہے۔ اور نہ اپنے اسرار کے بیان کر دینے پر تُلا ہوا نظر آتا ہے۔

اس لئے یہ کافی نہیں ہے کہ شاعری میں الفاظ و اوزان کی شدت فراوانی کے ساتھ پائی جائے گو یہ چیزیں شاعری کے اجزائے لاینفک میں سے ہیں۔ پھر بھی شاعری کی بنا محض وجدان و بصیرت کی وسعت اور شدت ہی پر ہوا کرتی ہے — لیکن یہ وجدان و بصیرت کی شدت، شاعر کی انفرادی قوت پر مبنی نہیں ہوتی اس کا انحصار دراصل شاعر کے عہد اور اُس کے ملک کی دماغی نشو و نما۔ اُس کے زمانے کی سطح افکار و تجربہ، اُس کے عہد کے عمومی علامات کے مقتضیات اور اُس کے دَور کے روحانی اکتسابات کے عمق پر ہوا کرتا ہے۔

عظیم عہد کا ایک صغیر شاعر، محض اپنے زمانے کے برکات سے بہرہ مند ہونے کے باعث، بعض اوقات ایک ایسی نظم پیش کرسکتا ہے، جو اگر بڑے ہیں، تو عہد پیشیں کے چھوٹے لافانی شعراء کے کلام پر تو ضرور سبقت لے جاسکتی ہے۔

ہندوستان کی موخر زبانوں (برج بھاشا وغیرہ) میں مذہبی شاعری کے ایسے کارنامے پائے جاتے ہیں جن کی سی کاشفانہ گرمجوشی، شعر و سخن کے عظیم و مستند دفاتر میں نہیں مل سکتی۔ پھر بھی اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ والمیک اور کالیداس کے سے متقدمین کی کبریائی اور قدرت کے آگے قرونِ متوسط کا کوئی شاعر ٹھہر نہیں سکتا۔

یورپ کا جدید ادب ہرچند یونانی ادب کی ہم آہنگی، لطافت اور تکمیل کے سامنے ناقص معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی اُس میں وہ جوہر موجود ہے جسے یونان کے عظیم ترین شعراء تک پیش نہیں کرسکتے۔

اور خود ہمارے عہد میں ایک ثانوی درجے کا شاعر اپنے الہامی لمحوں میں ایک ایسی بصیرت کا انکشاف کرکے ہمیں مطمئن و مسرور کرسکتا ہے جو شکسپیر یا ڈانٹے سے کہیں وسیع تر ہوسکتی ہے۔

اور آخر میں جو سب سے بڑی بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ آنے والے زمانے کے امید افزا علامات اور فاتحانہ قرائن کے متعلق ہے۔ یعنی اگر مستقبل نے جیسی کہ امید کی جا رہی ہے، اپنے امکانات کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور قدرت نے اس کی راہ میں روڑے نہ اٹکائے تو شاعری وہاں جانے والی ہے جس کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ جس دَور سے ہم سب گزر رہے ہیں، یہ ایک ایسا عظیم دَور ہے جس میں تمام کرّے انسانی نظر کے سامنے آنا شروع ہوگئے ہیں۔ اور اُسے تجربہ و تحقیقات کی دعوت دے رہے ہیں اور انسانیت اُس روحِ اعظم کے انکشاف کے قریب آچکی ہے۔ یہ تمام کرّے جس رُوح کے معنی خیز آیات و اشکال یا محض ایک ایسے باریک ملبوسات ہیں جن کے آر پار نظر آجاسکتی ہے۔

مفلس ہوں مگر وارثِ فطرت ہوں میں
اسرارِ پیمبری کی دولت ہوں میں
اے لمحۂ موجود ادب سے پیش آ
آئندہ زمانے کی امانت ہوں میں

(جوش ملیح آبادی)

تمدّن اور مذہب

سیدانور علی - فرید آبادی

(بی اے)

تمدّن کے معنی کسی انسانی جماعت کی وہ حالت ہے جس میں سب افراد مل کر مشترک مقاصد کی پیروی میں مصروف کار ہوں۔ کمزور کے حقوق طاقتور کے مقابلے میں یکساں طور پر محفوظ ہوں۔ اور سب لوگ مستقل مسکنوں میں بود و باش رکھتے ہوں اس حالت پر پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سوسائٹی میں ایک حد تک دولت جمع ہو جائے جس کے بغیر متمدنی زندگی کا آغاز نہیں ہو سکتا۔ دولت کی فراہمی کے لئے جغرافی اور طبعی حالات کی موافقت اور مساعدت ضروری ہے۔ یہ جغرافی اور طبعی حالات تمدّن کے تمام پہلوؤں سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہر قوم کا تمدّن تمام تر اس کے مرز بوم ہی کے اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمدن کا آغاز پہلے گرم ممالک میں ہوا۔ مثلاً ایشیائے کوچک مصر چین۔ ہندوستان وغیرہ اس کی وجہ ظاہر ہے زمین کا سرسبز و شاداب اور زرخیز ہونا۔ بہت تھوڑی محنت سے ضرورت سے زیادہ پیداوار کا بہم پہنچ جانا۔ انسانی ضرورتوں اور احتیاجوں کے پورا کرنے والے سامان کا کافی سے زیادہ اور بسہولت میسر آجانا۔ فطرت کی فیاضی کے باعث ہر چیز کی فراوانی۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ گرم ممالک میں زیادہ قیمتی خوراک کی ضرورت نہیں۔ سبزی اور گھاس پات حرارت غریزی کو قایم رکھنے کے لئے کافی ہیں جو بہت افراط سے اور بآسانی میسر آجاتی ہیں۔ لباس بھی زیادہ قیمتی درکار نہیں۔ سکونت کا سوال بھی بہت سادے اور معمولی مکانوں سے پورا ہو جاتا ہے۔ غرض گرم ممالک میں زندگی کی کشمکش ایسی نہیں ہوتی جو سرد ممالک میں دیکھی جاتی ہے۔ وہاں فطرت غیر معمولی طور پر بخیل واقع ہوتی ہے اس آذوقہ کی بہم رسانی کا سوال وہاں بہت دشوار ہوتا ہے اور آدمی کو اس کے لئے بہت جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ پھر سردی میں حرارت غریزی کو مستقل رکھنے کے لئے قیمتی غذا قیمتی لباس اور قیمتی مکانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تلاش معاش کے لئے غیر معمولی سرگردانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ غرض ایک طرف فطرت کا کنجوس ہونا اور دوسری طرف احتیاج کا شدید ہونا ان دوگونہ مصیبتوں سے سرد ممالک کے باشندوں کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے وہاں دولت کی فراہمی اس حد تک بہت دیر میں ہوتی ہے۔ جو تمدن کے آغاز کے لئے ضروری ہے اور جہاں پہنچ کر سوسائٹی کے افراد انفرادی ضرورتوں سے ایک حد تک بے نیاز ہو کر دوسرے مشاغل کی طرف متوجہ ہو سکیں اور علمی تفکر اور تحقیق کی ابتدا ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ تمدّن کا دور دورہ سرد ممالک میں بہت دیر میں ہوا ہے۔ لیکن گرم ممالک فطرت کی فیاضی اور افراط کے باعث اور نیز احتیاج کے خفیف ہونے کے سبب سے اس درجہ پر بہت جلد پہنچ گئے ہیں۔ اور وہاں کا تمدّن تاریخ کے نہایت ابتدائی زمانے سے شروع ہو گیا ہے۔ دونوں طرح کے طبعی اختلافات ان دونوں کے تمدن کے فرق کے بھی ذمہ دار ہیں۔ گرم ممالک کے تمدّن میں تن آسانی۔ عیش پرستی۔ نمود و نمائش۔ اسراف۔ شان و شوکت۔ تزک اور احتشام نمایاں ہے اور سرد ممالک میں محنت۔ جد و جہد۔ استقلال۔ کفایت شعاری اور سادگی آشکار ہے۔

گرم ممالک میں قدرتی مناظر بہت عظیم اور ہولناک ہوتے ہیں۔ مثلاً بڑے بڑے دریا۔ پُرہیبت پہاڑ اور دہشتناک جنگل وغیرہ۔ اور چونکہ یہ چیزیں انسان کے قابو اور قدرت سے باہر ہوتی ہیں اور وہ اُن پر حاوی نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے آپ کو اُن کے مقابلے میں ہیچ اور عاجز پاتا ہے۔ اس لئے اُن کو زبردست اور مافوق العادت قوت اور ہستی کا تصرف گردانتا ہے وہ اُن سے مرعوب اور خائف ہوتا ہے اور اپنے عجز و انکسار اور اُن کی عظمت اور شوکت کا اظہار اس کی طرف سے پرستش کی صورت میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی پرستش کا جذبہ مذہب کی بنا ہوتا ہے۔ جو تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ مختلف المدارج طے کرتا رہتا ہے۔ یہ مذہبی عنصر تمدن کے تمام شعبوں میں جلوہ گر ہوتا ہے اور معاشرتی اصلاحیں مذہب ہی کے تحت ہوتی رہتی ہیں۔

سرد ممالک میں قدرتی مناظر اس قدر عظیم اور ہولناک نہیں ہوتے اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے وہاں فطرت کے بخل اور احتیاج کی شدت کے باعث انسان تلاشِ معاش کی سرگردانی اور جد و جہد میں دریا اور پہاڑ جنگل اور میدان سب چھان ڈالتا ہے۔ اس لئے وہ ان مناظر سے مرعوب اور خائف ہونے کے عوض اُن کو اپنی تحقیقات کا تختۂ مشق بنا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرد ممالک کے تمدن میں مذہبی عنصر بہت کم ہوتا ہے جس کو عام طور پر رُوحانیت کی کمی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تمدن میں مذہبی عنصر کی سُراغ رسانی جس طور سے اوپر کی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ مذہب گرم ممالک کے تمدن کا طغرائے امتیاز ہے۔ دونوں ملکی آب و ہوا جغرافی و طبعی حالات اور ماحول کا نتیجہ ہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے بلکہ ایک دوسرے کے جزو لاینفک ہیں۔ حامیانِ مذہب کا یہ قول کہ مذہب قدرتی چیز ہے۔ اور انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اس کی توجیہہ بھی یہی ہے جو بیان ہوئی۔ اس توجیہہ کے مطابق مذہب کی بنا یا ابتدا وہ جذبۂ پرستش ہے جو قدرتی مناظر کی فوقیت اور انسانی عجز و انکسار کے احساس سے گرم ممالک کے انسان کی ابتدائی نسلوں میں برانگیختہ ہوا ہے اس خیال کے مطابق مذہب۔ جہالت لاعلمی اور اوہام پرستی کا حامل ہے۔ چنانچہ تمدن کے ابتدائی زمانوں میں مذہب کا چرچا بہت تھا۔ اور اوہام پرستی عروج پر تھی۔ مذہب زندگی کے ہر پہلو پر تام و کمال چھایا ہوا تھا۔ پھر جُوں جُوں علم کی روشنی بڑھتی گئی اس میں کمی آتی گئی۔ اعلیٰ متمدن ملکوں میں مذہب برائے نام ہے۔ اجتماعی حیثیت سے مذہب وہاں دوسرے بلکہ تیسرے درجہ کی بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ ملکی اور اقتصادی تحریکوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مگر اُن ممالک میں جہاں اب بھی تاریکی اور جہالت زیادہ ہے اور روشنی کم پھیلی ہے اور مذہب کا زور و شور زیادہ ہے۔

چونکہ مذہبی معتقدات جن کا تعلق مادی یا طبعی قوانین سے اس قدر نہیں ہے جتنا ایک فرضی روحانی عالم سے ہے طبعی حقائق کی طرح ثبوت پذیر نہیں ہو سکتے اس لئے اُن میں تخیل اور تصور کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اور ایسی چیزیں جن کا تعلق تصورات سے ہے علم کی روشنی پھیلنے پر وہ تمام چیزیں اپنی خوبصورتی کشش اور دلچسپی قدرتاً کھو بیٹھتی ہیں اور وہ گرویدگی اور فریفتگی اُن کے ساتھ نہیں رہتی جو قدیم ایام میں پائی جاتی تھی۔ جس قدر علمی دُنیا کے انکشافات ہر چیز کو آہستہ آہستہ عُریاں اور بے نقاب عیاں اور آشکار کرتے جاتے ہیں۔ تصورات کی گنجائش کم ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ شاعری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں اُس کی نشوونما ترقی اور عروج کے لئے جس قدر موافق حالات تھے وہ جدید دورِ تمدن مہیا نہیں کرتا۔ تصورات اور حقائق میں قدرتی اور ازلی دشمنی ہے۔ ایک چیز نقاب چاہتی ہے۔ دوسری عریانی۔ مذہب ایک غیبی چیز ہے۔ اور وہ مذہبی فلسفہ جس پر بعض مذاہب اس قدر نازاں ہیں محض قیاسات اور تصورات پر مبنی ہے۔ جو مذہب جتنا قدیم اور پُرانا ہے اُس میں اوہام پرستی کا عنصر اسی قدر زیادہ ہے۔ نیم وحشی قوموں کا مذہب اب بھی خالص اوہام پرستی ہے نیم متمدن ممالک میں مذہب کی شد و مد اب بھی باقی ہے۔ عورتوں میں جو عموماً مردوں کی بہ نسبت زیادہ کم علم ہوتی ہیں مذہبی جذبہ یا لگاؤ زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں ایک ہی نتیجے کی طرف رہبری کرتی ہیں اور آفرینشِ مذہب کے مذکورہ نظریے کی تصدیق کرتی ہیں۔ چنانچہ مذہب کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ قدامت پرستی کا حامی ہے۔ مذہب میں ترمیم و تبدیلی کفر ہے۔ متقدمین یعنی ہمارے آباؤ اجداد اس کے نزدیک عقلِ کل تھے۔ اس کے نزدیک روایات کی پیروی کے بغیر انسان گمراہ ہو جاتا ہے۔ ذاتی اجتہاد۔ آزادیِ رائے اور علمی تحقیق جو مذہب کے خلاف ہو جرم ہے۔ مختصر یہ کہ مذہب اپنے عمومی خصائص کے لحاظ سے غلامانہ ذہنیت کا علمبردار اور تعصب اور تنگ نظری کا حامل ہے۔ اور جو قوم مذہبی الجھنوں میں گرفتار ہے وہ

شاہراہ ترقی پر سب سے پیچھے ہے۔

جو کچھ اُوپر لکھا گیا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مذہب قطعی طور پر قابلِ مذمت ہے۔ مذہب نے دنیا میں جو کارہائے نمایاں کئے اُن کا اعتراف نہ کرنا یا اُن سے اغماض کرنا کمال تعصب اور بے انصافی ہے ؎

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو
نفیِ حکمت مکن از بہر دلِ عامے چند

اوسط درجے کے تمدن انسان میں مذہب "انفرادی طور پر" تسکین قلب کا باعث ہوتا ہے۔ عسرت۔ تنگی۔ دکھ درد مظلومیت۔ اور ہر قسم کی دنیاوی تکالیف اور مصائب میں ایک آئندہ زندگی کا خیال اور وہاں نعم البدل پانے کا اعتقاد یہاں کی کلفتوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اجتماعی طور پر مذہب نے تمدن کے متوسط دور میں معاشرت کو درست کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے بلکہ اس دور کا تمدن تمام تر مذہب ہی کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ اور یہی نہیں کہ اس نے گناہ۔ بدی اور جرم کے انسداد میں کوشش کی۔ بلکہ سیاسی۔ ملکی اور اقتصادی پہلوؤں پر بھی بہت گہرا اثر ڈالا۔ مذہب محض پرستش تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اس نے سوسائٹی کے نظم و نسق اور عام فلاح و بہبود کے ترقی دینے میں بہت کام لیا۔ سچ پوچھو تو مذہب کا انسانی تمدن پر بڑا احسان ہے۔ جو کام تدریجی طور پر ارتقائی قوانین کے ماتحت صدیوں میں ہوتا۔ وہ مذہب نے بہت تھوڑے عرصے میں کر ڈالا۔ مصلحین کے گروہ نے اس مذہبی جذبے کی وساطت سے سوسائٹی میں انقلاب پیدا کر دئے۔ اور قوموں کو پستی کی تحت الثریٰ سے نکال کر آنِ واحد میں ترقی کی معراج پر پہنچا دیا جہاں پہنچنا معمولی اسباب کے ساتھ قرینِ قیاس نہ معلوم ہوتا تھا۔ غرض مذہبی عنصر نے تمدن کی ترقی میں بہت مدد کی۔ لیکن یہی تمدن پھر اُن کی تباہی کا بھی باعث ہوا۔ بقول شاعر ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

لوگوں کی مذہبیت جب شدید ہو کر جادۂ اعتدال سے متجاوز ہو جاتی ہے تو فساد اور بگاڑ پیدا ہو کر پستی اور نکبت کی صورتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ مذہبی ردوکد۔ اختلاف آراء۔ فرقہ بندی۔ ناروا جوش۔ تعصب۔ خانہ جنگیاں اور قتل و خونریزی آہستہ آہستہ نمودار ہوتی ہے اور پھر رسوم پرستی۔ اوہام پرستی۔ باطل پرستی کے خس و خاشاک جن سے مصلحین مذہب کو پاک کرتے ہیں وہ پھر اس میں داخل ہونے لگتے ہیں اور اس طرح رجعت قہقری یا ترقی معکوس شروع ہو جاتی ہے۔

مشرقی تمدن میں تمام اصلاحی کام مذہبی رنگ میں کیا جاتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کی زندگی میں یہی پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ قبیح رسوم جن کی اصلاح کی جاتی ہے اسی کی بگڑی ہوئی صورت ہوتی ہیں۔ اس لئے اسی جذبے کی مدد سے اُن کو درست کیا جاتا ہے۔ لوگوں کے درجۂ تمدن کا لحاظ رکھنا اصلاحی امور میں ناگزیر ہے۔ تاریکی و جہالت کی حالت میں انسان کو سنوارنے کے لئے اگرچہ اس مذہبی جذبے سے بہت مدد ملتی ہے۔ مگر جب تمدنی ترقی ارتقائی منازل طے کر کے تعلیم و تہذیب۔ روشنی اور شائستگی کی اُس حد پر پہنچ جائے جہاں قبیح حرکات طبعًا اور فطرتًا ناگوار معلوم ہونے لگیں اور گناہ و جرم سے باز رکھنے کے لئے تعزیری قانون یا حیات بعد الممات کی سزا و جزا کی تہدید کی ضرورت نہ رہے۔ تو پھر مذہب کا وعظ زیادہ خوش آئند نہیں رہتا۔ اگرچہ عمدہ اخلاق اور پاکیزہ زندگی کی تعلیم کی ہر وقت ضرورت ہے۔ مذہب محض اخلاقیات کا نام نہیں ہے۔ بلکہ مخصوص طریقۂ پرستش یا عبادت۔ مخصوص اعتقادات اور مخصوص رسوم مذہب کی مرادف ہوتی ہیں اور اخلاقی پہلو اُن کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی مخصوص مذہبی شعائر ایک مذہب کو دوسرے میں تمیز کرتے ہیں اور اس لئے اختلافات اور تعصبات ناگزیر ہیں۔ ان حالات میں تمام مذاہب کے متفق الاصول ہونے کی تلقین مناقشات کو رفع کرنے میں لوگوں کو اپیل نہیں کرتی۔ چنانچہ ہندوستان کے موجودہ حالات اس کی شاہد ہیں۔

ہندوستانی معاشرت میں اُن طبعی حالات کی وجہ سے جن کا شروع میں ذکر ہو چکا ہے مذہبی پہلو قدرتی طور پر بہت نمایاں ہے اور تمدن کا سب اہم جزو ہے۔ اس کے مقابلے میں ملکی۔ معاشرتی اور اقتصادی ضرورتیں اور مصلحتیں سب ہیچ ہیں۔ یہاں پولیٹیکل آزادی۔ آبائی مذہب کے مقابلے میں کوئی کشش نہیں رکھتی اور جب مذہب ہماری زندگی پر اس طرح مسلط ہو اور پھر مذہب بھی ایک نہ ہو بلکہ مختلف ہوں اور اُن کے تصادم کے موقعے مذہبی وعظ

بنے اور مذہبی تعلیم پر زور دینے اور دیگر ذرائع سے روز بروز بڑھتے جائیں اور مذہبی جذبات تیز سے تیز تر ہوتے جائیں تو اِن حالات میں ملکی آزادی کا خواب یکیفا کہاں تک درست ہے۔ جہاں مذہبی جذبات اس طرح سروں پر سوار ہو کہ قتل و خونریزی ایک عام بات ہو۔ جہاں مذہبی دیوانگی نے دماغ کو اچھے اثرات قبول کرنے کے ناقابل کر دیا ہو۔ غلامانہ ذہنیت مذہب کی بدولت اس قدر بڑھ گئی ہو کہ مذہب کی سلامتی اور حفاظت کا خیال یا اندیشہ قومی تحریکوں کو ہر وقت پاش پاش کرنے کے درپے رہتا ہو وہاں سمجھ لیجئے کہ قضا و قدر نے محکومیت کی دائمی مہر ثبت کر دی ہے۔ دائمی اس لئے کہ نہ مذہب چھوٹ سکے گا نہ باہمی باطنی منافرت قرار واقعی طور پر رفع ہو سکے گی۔ جہاں لوگ تہذیب سے دور بھاگتے ہوں۔ جہاں تعلیم کی روشنی میں آنکھیں بند کر لی جاتی ہوں۔ جہاں سب سے بڑا لیڈر اور پیشوا مذہب ہو جو نامعلوم زمانے سے عقبیٰ میں اُن کی نجات کا ضامن بنا ہوا ہو جہاں روایات نے آزادی کا گلا گھونٹ دیا ہو جہاں ایک مذہب دوسرے مذہب والوں کو اچھوت قرار دیتا ہو۔ جہاں مذہب کی قربان گاہ پر ملکی آزادی کو بھینٹ چڑھایا جاتا ہو۔ جہاں مذہب سے استغنا جرم ہو۔ وہاں اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ غلامی اُن کے واسطے ہمیشہ کے لئے مقدر ہو گئی ہے۔ اور آزادی کی امید کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ سچی بات گو کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ حقیقت واضح ہے کہ جب تک بڑھتے ہوئے مذہبی محسوسات کو تعلیم کے ذریعے سے کُند نہ کیا جائے گا خلاصی معلوم۔

اگرچہ مذہبی اثرات مدت سے ہماری رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں اور ہمارے تمدن کا جزو لاینفک ہیں۔ اور ہمارے ملک کی ہوا اس شعلے کو ہمیشہ مشتعل کرتی رہتی ہے اور اس لئے مذہب کا قلع قمع ہندوستان کی سی سر زمین میں ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ مگر تعلیمی نشر و اشاعت کے ذریعے سے یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے مذہبی جذبات و احساسات کو ایک حد تک کُند کر دیں اور بس اس کی طرف سے ایک قسم کا استغنا اور بے پروائی برتنے لگیں۔ حتیٰ کہ اُس کی پبلک حیثیت اور جوش و خروش زائل ہو کر محض خانگی حیثیت رہ جائے۔ بیرونی زندگی میں اس کا کوئی مظاہرہ نہ کیا جائے اور جس طرح ہم دوسری باتوں میں محض اختلافِ رائے کی بنا پر ہمیشہ لڑنے مرنے پر کمربستہ نہیں ہوتے اسی طرح مذہب کے معاملے میں بھی طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ مگر یہ جب ہی ممکن ہے جبکہ تعلیم کے ذریعے سے اس نام نہاد مذہب کی اہمیت کو ہمارے ذہن سے بتدریج کم کر دیا جائے۔ اور مذہبی تحریکات کو فروغ دینے کے عوض اُن میں حصہ لینے سے اغماض کیا جائے اگرچہ یہ مشکل بات ہے مگر ناممکن نہیں۔ تہذیب اور شائستگی کا مقتضیٰ یہی ہے۔ کہ ہم معاشرتی طور پر ایسی حرکات اور اعمال کے ارتکاب سے اجتناب کریں جن میں ہمارے ابنائے جنس کے لئے نفرت اور حقارت کی جھلک پائی جائے یا جو اُن کی برہمی کا باعث ہوں اور اُن کے تعصب کو اُبھارنے میں مدد دیں۔

اگر یہ بات حاصل ہو جائے تو ہر قسم کا اتحاد ممکن اور آسان ہو جائے۔ اختلافِ مذہب نفاق کی جڑ ہے۔ مگر اس اختلاف کے انسداد کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال دیا جائے یا ہندوؤں کا قلع قمع کر دیا جائے۔ بلکہ ٹھیک علاج یہ ہے کہ خود مذہب ہی کو اُس حد تک معطل کر دیا جائے جس حد تک فساد کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ مذہب ہی اختلاف کا باعث ہے اور تمام رکاوٹوں کا ذمہ دار۔ مذہب سے استغنا پیدا ہو جائے تو کامیابی کا راستہ بہت آسان ہو جائے۔ اس کا مطلب لوگ یہ نہ سمجھیں کہ دنیا کی خاطر اُن کو عاقبت سے محروم کیا جا رہا ہے اور خدا اور اس کے برگزیدہ پیغمبروں سے اُن کو منحرف کیا جا رہا ہے۔ نہیں بلکہ اُن غلط اثرات کو دور کرنا مدنظر ہے جو مذہب کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں مذہب ایک ایسا خطرناک لفظ ہو گیا ہے کہ اُس کے نام سے کسی اصلاح کا ارادہ کرنا خالی از اندیشہ نہیں۔ جب تک حُسنِ اخلاق اور پاکیزہ اور بے لوث زندگی انسان میں موجود ہے وہ دنیا و دین دونوں میں فائز المرام ہے۔ اُس سے خدا بھی خوش اور بندے بھی۔ اور یہ بات عمدہ تعلیم سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہی مذہب کی غرض و غائت ہے۔ مذہب کے نام سے خدا اور اس کے پاک رسولوں کو بدنام کرنے والے دنیا میں بھی ذلیل ہیں اور عاقبت میں بھی رسوا ہوں گے۔

خالی پرستش بے معنی ہے اگر اس کا کوئی ماحصل نہیں۔ اور ماحصل یہی ہو سکتا ہے کہ پرستار کی زندگی پاک اور بے لوث ہو اور بندگانِ خدا کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آیا جائے۔ تاکہ دنیوی زندگی اُن کے لئے کٹھن نہ ہو جائے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم نے ایامِ جہالت کی پرستش سے اب تک مذہب میں کوئی ترقی نہیں کی۔ مذہب زندگی کا دستور العمل ہے۔ ایسا دستور العمل جس کا مقصد حسنِ معاشرت ہو

جس میں دنیوی آلام کو رفع کرنے کی کوشش ہو۔ مثلاً مسلمانوں میں سود کا حرام ہونا اور زکوٰۃ کا فرض ہونا اخوت اور مساوات کی تعلیم پر زور دینا ان سب ہی امور کا مقصد یہ ہے کہ سوسائٹی میں دولت کی تقسیم کا ایسا انتہائی تفاوت نہ ہوسکے جس میں ایک شخص کے پاس دولت کے انبار ہوں۔ اور ایک شخص نانِ شبینہ کو محتاج ہو۔ سرمایہ دار اور مزدور دست و گریباں ہوں۔ ان مصائب میں مدد کرنا انسان کی اصلی نجات کا باعث ہے جنھوں نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ مگر ان مذہبی اوامر پر کوئی عمل نہیں کرتا ہاں نماز چاہے جتنی پڑھوا لو۔ ایسی نماز جو حضورِ قلب۔ خلوص۔ ایثار۔ خوفِ خدا اور محبتِ خلقِ خدا سے بالکل عاری ہوتی ہے۔ اور نماز کے سلسلے میں بے شمار لڑائی جھگڑے حتیٰ کہ اپنے ابنائے جنس کی قتل و خونریزی بھی روا سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ عبادت اور پرستش کی تاکید اسی لئے تھی کہ اُن مذہبی احکام کی بجاآوری میں کوتاہی نہ ہونے پائے جو حسنِ معاشرت سے متعلق ہیں۔ اور آئندہ زندگی کی سزا اور جزا کی تہدید اسی لئے تھی کہ حکومت اور سیاست کے دباؤ کے بغیر انسان از خود خوفِ عقبیٰ کے خیال سے اُن پر عمل درآمد کرتا رہے اور خدا کی یاد سے بندگانِ خدا کی یاد تازہ ہو کر دل میں قایم رہے۔ مگر موجودہ زمانے کی مسخ شدہ مذہبی ذہنیت نے مذہب کی غرض و غائت اور اس کے محاسن پر پردہ ڈال دیا ہے اور اس کے معائب اور بدنما پہلوؤں کو نمایاں کر دیا ہے جس کی بیخ کنی میں حتی کوشش سے دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ عوام میں مذہب کا مفہوم وسیع ہو جائے اور تعصب و تنگ نظری کی جگہ رواداری اور ہمدردی پیدا ہو سکے۔

اس تمام بحث کا لبِ لباب یہ ہے کہ مذہب کے دو پہلو ہیں، ایک وہ جس کا تعلق پرستش یا عبادات۔ اعتقادات اور رسوم سے ہے۔ اور دوسرا وہ جس کا تعلق اصلاحِ معاشرت اور عام تمدن سے ہے۔ اول الذکر انسان کی ابتدائی حالت سے شروع ہوا ہے اور ادنیٰ درجے میں اوہام پرستی جہالت و تعصب سے وابستہ ہے اور جو کچھ مذہب کے خلاف اس کی قباحتوں اور خرابیوں کے ضمن میں لکھا گیا ہے وہ مذہب کے اسی پہلو سے متعلق ہے۔ دوسرا پہلو مذہب کی ضرورت اور مقصد کے مفہوم کی ترقی یافتہ صورت ہے اور بڑھے ہوئے تمدن سے تعلق رکھتا ہے اول الذکر پہلو پر زیادہ زور دینا اور اس کی شدومد مذہبی دیوانگی کا باعث ہوتی ہے اور ترقی معکوس کی رہنما۔ آخر الذکر پہلو پر زور دینا ہر قسم کی فلاح و بہبود اور ترقی کا موجب ہوتا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک جس حد تک توجہ کا مستحق ہے اس کا لحاظ رکھا جائے اور دونوں کے واجبی توازن کو قایم رکھنے کی کوشش ہو۔ اول الذکر پہلو کی زیادتی کے نقصانات اور خرابیاں تو ظاہر ہی ہیں، اور دوسرے پہلو پر حد سے زیادہ زور دینا الحاد۔ دہریت اور مادہ پرستی کی طرف لے جاتا ہے۔

فرست کی یہ ہنگامہ طلسم سازی کیسی؟
پیشانِ نیاز و نیاز سازی کیسی؟
سجدہ پہ یہ گردن پہ دو عالم کے حقوق
اللہ سے یہ تیغ بدہ بازی کیسی؟

(بسمل آفندی اکبرآبادی)

کردار و گفتار

ل - احمد اکبر آبادی

ایک شام کو ممتاز جمالی شہرہ فسانہ نگار اور مستند ادیب ، متعدد مقبول کتابوں کا مصنف اور اس کا نوجوان دوست یعنی شاگرد یوسف جاوید کشمیری دروازے کے ڈیو کو ریسٹوران میں برآمدے میں آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے تھے ۔ یوسف کی روشن آنکھوں سے نکلنے والی شفاف نگاہیں اپنے استاد دوست کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں ۔ کیونکہ ابھی ابھی اس نے ایک نہایت اہم بحث پر گفتگو شروع کی تھی ایک ایسا سنجیدہ موضوع جو اس کے خیال میں مقدس الہامات سے مملو تھا لیکن جمالی اس موضوع پر غیر متعلقانہ اور سرسری گفتگو کے سوا کسی گہری اور تفصیلی بحث کے لئے آمادہ معلوم نہ ہوتا تھا ۔ اس نے اپنی بے التفاتی کے مسکت انداز سے اس کا اظہار بھی کر دیا بلکہ بہ تکرار موضوع کلام بدلنے کا ایمار بھی کیا ۔ مگر اس کا نوجوان دوست اس پر راضی نہ ہو سکتا تھا ۔ چنانچہ یوسف کی مردانگی بروئے کار آئی اور اُس نے جمالی کے منشار کو نظر انداز کر کے اُسے اس بحث سے ہٹنے نہ دیا ۔

یوسف کو دروانہ حمید الزماں سے مخصوص محبت تھی یا وہ اسے مخصوص محبت باور کرتا تھا ۔ اس لئے اس کی خواہش و آرزو کا تقاضا یہی تھا کہ اس کے شیون الفت میں سے ایک ایک شان اور ایک ایک پہلو کا تذکرہ ہوتا رہے اور دیر تک ہوتا رہے ۔ تاکہ وہ اس ذکر کی جاں نوازیوں سے عرصے تک شاد کام ہو سکے ۔ وصلِ جاناں نہ سہی ذکر تو ہو ، کی مطابقت میں وہ اس عزیز و محبوب ہستی کے متعلق ہر وہ بات کہنے اور سننے کے لئے بیتاب تھا جس کا اُس کے ساتھ دور کا لگاؤ بھی ہو یا جو بالآخر اس سے متعلق کی جا سکے ۔ اس لئے تہذیب و عوائد کے نازک اشاروں کو جو جمالی کی طرف سے پیش ہوئے تھے ۔ یوسف نے نظر انداز کر دینا ہی مناسب سمجھا ۔

یوسف جاوید کا ابھی ریعان شباب تھا اور اُس کے بشرے کی نرمی اور خد و خال کی نزاکت اس کے شاعرانہ مزاج کی بھی دلیل ہو سکتی تھی ۔ اس کی کشادہ اور کسی قدر ڈھلواں پیشانی اگر ذرا اور بلند ہوتی تو ایک متعدد بینک کا اکاؤنٹنٹ ہونے کے عوض وہ ایک مسلمہ شاعر ہوتا اور غیر فانی اشعار نظم کر رہا ہوتا ۔ فطرت کی یہی غلط کاریاں ، مقدر کی ایسی ہی کجرویاں تو ہیں جو ابتدائے آفرینش سے جوشیلے خون والے انسانوں کی گالیوں کا جواز قایم کر دیتی ہیں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ سن لیجے ۔ معلوم کہ مقدر پر تبرا کرنے کے مسلک کی بانی و داعی عورت تھی ۔ اس غار مسکن خاتون نے پہلی بار جب چشمے کے آبی آئینے میں اپنے "جمالِ جہاں آرا" کا عکس دیکھا اور اُسے معلوم ہوا کہ وہ ویسی نہیں جیسی کہ وہ اپنے تئیں سمجھتی تھی تو بحالتِ مایوسی فطرت کی اس ناشناس غلطی پر سخت برہم ہوئی تھی ۔ یہ ہے وہ مذہب جس کے پیرو بعد میں مرد بھی ہونے لگے ۔ اور اب ہر متنفس جب آئینہ دیکھتا ہے تو دل ہی دل میں یہ سنت ادا کر لیتا ہے ۔ آپ تسلیم کریں گے کہ یہ اطلاع آپ کے لئے نئی اور آپ کے علم میں اضافہ کرنے والی ہے ، نیز یہ کہ اہم بھی اسی قدر ہے ، کیونکہ ابھی تک آپ کو خود اپنے مرشدِ طریقت کا علم نہ تھا !

غرض کہنا تو یہ تھا کہ حضرت جاوید غزل گوئی سے بھی دل بہلایا کرتے تھے ۔ اور اپنے تئیں روحانی طور پر غالب کے تلامذہ میں شمار کرتے تھے ۔ پھر آپ جانتے ہیں کہ لغات میں الفاظ کی کمی نہیں اور اضافت کے استعمال پر کوئی ٹیکس

بھی نہیں۔ چنانچہ ضروری نہیں کہ میں اُن کے کلام کے نمونے بھی پیش کردوں۔ اگر آپ اندازہ وقیاس سے کام نہیں لے سکتے تو کوئی رسالہ اُٹھا لیجے۔ حضرتِ جاوید کے کلام کا نمونہ نظر آجائے گا۔

جمالی اس وقت مجہولانہ طریق پر نیچے سڑک پر گزرنے والوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ وہ دراز قد۔ زرد رو اور مرتاضانہ بشرے کا انسان تھا اس کی آنکھیں بڑی اور متشائم تھیں۔ اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ اس کی باتوں میں ایک گونہ انانیت چھپی ہوتی تھی۔ اور اس کا اندازِ کلام متحکمانہ تھا۔ اس کے پرواز کی سوفسطائیت میں سجز کا ایک ذرا شامل تھا۔ وہ اپنے نوعمر ساتھی کی طرف متوجہ ہوا۔ ہاتھ سے خالی گلاس میز پر رکھا اور سگریٹ کے دھوئیں کے غبار میں سے کہنے لگا۔

تو تمہاری نسبت ٹھہر گئی ہے۔"

ہاں، عملاً۔ یوسف نے جواب میں کہا۔ ہر چند میں نے ابھی تک انگشتری خریدی بھی نہیں ہے"

میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا عہدِ معاشقہ سراسر رومانی ہے۔ جمالی نے کہا

میرا تو ایمان ہے کہ ہماری محبت یکسر شعر ہے۔ یقین مانئے کہ دردانہ حسن و خوش خوئی کا ایک معجزۂ مجسم ہے۔

کوئی وجہ نہیں کہ میں مبالغے کو بھی حقیقت نہ سمجھوں۔ معتقد مصنف نے طنزیہ تبسم کے ساتھ کہا۔

دہلی میں مجھے بڑی بڑی رانیوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن ہنوز مجھے کسی ایسی مہارانی کو دیکھنا باقی ہے جو دردانہ کے پاؤں دھلا سکے۔

اوہ ہو! جمالی نے استعجاب کا اظہار کیا۔

باور کیجے کہ دردانہ بالکل مختلف لڑکی ہے ——— اب تک جتنی لڑکیاں مری نظر سے گزریں وہ ان سب سے یکسر مختلف ہے۔ یوسف اپنی خواب آلود نگاہوں سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا اور کہتا رہا: وہ اتنی ذہین ہے اور اس کی بیشمار ادائیں اس قدر دلکش ہیں کہ تمہارے بہترین افسانے کی ہیروئین ہو سکتی ہے!

مجھے پورا یقین ہے! جمالی نے متفکرانہ انداز میں کہا، گویا وہ اس اشارے کے امکانات پر غور کر رہا تھا۔ شادی ——— ہوں ں ں! کم از کم تم ذکی الحس اور سریع الخیال آدمی کے لئے پُر خطر ضرور ہے"

"اوہ وا ہمہ بھی بڑا اخلاق ہے! یوسف نے کچھ بدمزہ ہو کر جواب دیا۔

"بہر گونہ میں فیصلہ کر چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ عام لوگوں کے مقابلے میں میرے جذبات زیادہ شدید ہیں۔ اور دردانہ میرے حسیات کی شدت کو قائم رکھنے کی اہل بھی ہے۔ دردانہ میں ہمدردی ہے۔ وہ فہمیدہ ہے اور بالذات سکون بخش ہے ——— " یوسف عادتاً اپنے بیان میں لطف اور گرمی کی کمی کو اپنا جوش و ولولہ شامل کر کے پورا کیا کرتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں شرارت جھلکی اور اس نے جمالی سے سوال کیا۔

آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟

میں! شادی کرلوں؟

"کیوں نہیں! بہترین ادیب و مصنف، گاہ بگاہ، اس کے مرتکب ہوئے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ مس قمر زمانی کو پسند کرتے ہیں"

"بیشک قمر ایک اچھی لڑکی ہے اور اس کا طبعی و ذہنی ارتقا بے مثال ہے" نامور ادیب نے اس طرح بے تعلقی کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گویا قمر اس کی دنیا کی کوئی چیز نہ تھی۔

مگر کسی قدر بیباک! یوسف نے کہا۔ آپ اس سے کب کے ملے ہیں؟"

آخر مرتبہ وہ لاہور سے مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس کو بھی مدتیں ہو گئیں۔

عزیز یوسف میرے لئے شادی کا مسئلہ ورائے سوال ہے۔ میں شادی کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھتا۔ شادی کا خیال اور چاند تک پہنچنے کا خیال میرے نزدیک دونوں ایک سی باتیں ہیں۔

میں آپ کے فسانے پڑھ کر کبھی کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا کہ اس باب میں آپ کا نظریہ کیا ہے۔ کہیں تو آپ اس آزادی کے طرفدار نظر آتے ہیں اور کہیں اس کے جانی دشمن۔

اصل بات یہ ہے کہ اس عہدِ ریاکاری میں کم از کم بعض موقعوں پر، ایک شخص اپنے عقائد پر پردہ ڈالنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ اتنا صحیح ہے کہ بعض مقامات پر میں ازدواج کو برداشت کرتا معلوم ہوتا ہوں۔ اس مسئلے کے مخالفین بقائے نسل کے سوال پر چپ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ دلیل حامیانِ ازدواج کی کمزور ترین دلیل ہے۔ البتہ جب خانگی زندگی کا الزامی جواب میرے سامنے پیش کیا جاتا

تو میں اس کی تردید کرنے سے عوض لاجواب ہو جانے کو ترجیح دیتا ہوں اور اس کی برکتوں کو بصورت تدبیر گوارا کر لیتا ہوں" جمالی نے ایک بے خیال شگفتگی کے ساتھ کہا۔ جس نے کسی حد تک اس کے بیان کی ناہمواری کو ہلکا کر دیا۔

"لیکن تدبیر تو کھانا کھانا بھی ہے اور حد سے زیادہ مرغوب طبع تدبیر ہے ہے، اگر اسی وقت تک جب تک تمہارا ہاضمہ ٹھیک ہو اور اشتہا بھی ہو۔

لیکن محبت کی اشتہا ——— وہ ؛ اس کو درست رکھنا ذرا دشوار کام ہے"

کچھ بھی دشوار نہیں! تم میری تدبیر پر عمل کیوں نہیں کرتے! میرے ہاضمے میں اگر کوئی خرابی نمودار ہوتی ہے تو نمک سلیمانی بہترین شے ثابت ہوتی ہے۔

یوسف نے شوخی کے انداز میں کہا

"بس تو نمک سلیمانی! یوسف تمہاری جرأت و شوخی کفر محبت کی حد تک جا پہنچتی ہے۔ جمالی نے ہنس کر کہا۔

"گر ایمان محبت کے استحکام کے لئے یہ علاج ضروری ہے" نوجوان ساتھی نے کہا

"نمازوں میں خشوع اور دعاؤں میں تضرع ارتکاب کبائر کے بعد پیدا ہوتا ہے۔" ادیب عزالسید ہا ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے معنوی شاگرد کو توصیفی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"یوسف تمہاری یہ کج بحثی ہے نہایت پر لطف! جمالی نے کہا اور جیب سے نوٹ بک نکالی:۔ اجازت دیتے ہو میں اسے یادداشت میں لکھ لوں؟"

"بڑی خوشی کے ساتھ" نوجوان ساتھی نے کچھ کھسیانا ہو کر جواب دیا۔

"واقعی ایک ذہانت آمیز کج بحثی ہے"۔ جمالی نے لکھتے ہوئے مکرر کہا۔

"جمالی! میں چاہتا ہوں کہ اپنے کسی افسانے میں آپ اپنے عقائد کی توضیح کر دیں کہ ازدواج کے متعلق آپ کے عقائد کیا ہیں؟"

جمالی نے نوٹ بک جیب میں رکھ کر ادھر اُدھر نظر ڈالی۔

"برسوں کی تکلیف دہ کوشش اور مشق کے بعد" جمالی نے کہنا شروع کیا "میں اپنے دماغ کو سدھار سکا ہوں کہ وہ اشیاء و معاملات کو ان کی مکمل شکل و صورت میں دیکھ سکے۔ زندگی کو اس کی تمامی حالت میں دیکھ سکے! تم غور کرو گے تو نظر آ جائے گا کہ ایک ادنیٰ واقعہ بھی طویل سلسلۂ اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک اتفاقی فقرہ پوری زندگی کے فلسفے کا خلاصہ ہوتا ہے۔ اس میں اس ادنیٰ واقعے اور اتفاقی فقرے کو ان کی مجرّد از کلیت میں دیکھ سکتا ہوں۔ یعنی وہ طویل زمانہ جس میں اس واقعے یا فلسفے کی تکمیل ہوئی اپنی مجموعی حیثیت میں میری نظر کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور اپنی تمام بلا سامانیوں کے ساتھ۔

ازدواج اگرچہ حد سے زیادہ فرسودہ بحث ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جو غیر تربیت یافتہ ذہن و دماغ کے سامنے نہیں آتے۔ ہم دونوں جدید معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے میں تمثیل کے لئے اسی معاشرت کے نمونے سے بحث کروں گا۔ ورنہ ازدواج کے نتائج قدیم و جدید دونوں معاشرتوں میں بالکل یکساں ہیں۔ گو اسباب کیسے ہی مختلف ہوں۔ مگر نتیجہ وہی ایک ہوتا ہے۔ چنانچہ جب میں ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کو باغ میں بیٹھے باہم دگر مستغرق دیکھتا ہوں جنھوں نے ماسوا کو بالکل بھلا دیا ہے تو واقعات مابعد کا ایک سلسلہ میرے سامنے آ جاتا ہے۔ نسبت قرار پائی۔ نکاح ہوا۔ اور بالآخر اپنے تخیلات کو لئے ہوئے یہ دونوں ایک مختصر سے مکان میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اب میں ان کو شاہراہ حیات پر غیر متزلزل عزم اور بے نہایت آرزوؤں کے ساتھ گامزن دیکھتا ہوں کہ گویا زندگی کی ساری رنگینی اور [illegible] حاصل کئے بغیر دم نہ لیں گے۔

یہ جوڑا ابھی یہ دیکھنے کے قابل نہیں اور نہ ان سے اس کی توقع کی جا [illegible] کہ محبت ایک علوی جذبہ ہے۔ جس میں نصف روحانیت اور ایک حصہ اور کچھ۔ مگر ادارۂ ازدواج اپنی روایات کہنہ کی آلائشوں کے باعث اس [illegible] کو بروئے کار نہیں آنے دیتا۔

پھر میں ان دونوں جوان ہستیوں کے ادعائے صاف [illegible] گوئی سنتا ہوں۔ اُن کے پرجوش اعلان سنتا ہوں کہ ان کی محبت [illegible] کوئی محنت اور کوئی قربانی ناممکن العمل نہیں ہے۔ اور پھر میں [illegible] کی توثیق بوسوں سے ہوتی دیکھتا ہوں۔ اس کے بعد پہلی تکرار [illegible] نظر آتی ہے۔ روحانیت کے حجابی نقاب کا تانا بانا بکھر جانے کی [illegible] رونما ہوتی ہے ——— وہ روحانیت جس نے ابھی تک واقعیت [illegible] رکھا تھا۔ اور یہ دونوں اپنی حقیقی حیثیت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

زندگی میں آہستہ آہستہ صدہا بے مزہ سوالات در انداز ہونا شروع ہو تے ہیں جن سے معاملہ کرنا ان کا غرضِ زندگی ہے اور پھر اس ہمہ گیر محبت کی تجلیاں ماند پڑنے لگتی ہیں۔ پہلا بچہ پیدا ہونے کے بعد اس لڑکی کی طویل بیماری بھی میرے سامنے آتی ہے۔

ایک بڑے دفتر کے دھندلے کمرے میں ایک بھدی میز کے سامنے وہ نوجوان غیر ادا شدہ بلوں کے خیال میں سامنے کے پلندوں کو جھلائے بیٹھا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بے چین رات گزارنے کے بعد وہ غریب کس طرح جھپٹا ہوا دفتر پہنچا ہے۔ اس کی آنکھوں میں مایوس نگاہیں تو نیم ہو کر رہ گئی ہیں اور اس کا چہرہ ست گیا ہے۔ اب وہ جس دل سے دفتر کا کام انجام دیتا ہے وہ کسی معقول ترقی کی گنجائش کا امکان باقی نہیں رہنے دیتا۔ بالآخر اس کے مزاج کی شگفتگی چڑچڑے پن سے بدل جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اب میں ہر روز نئے جھگڑے دیکھتا ہوں۔ وہ اُس صاف باطنی کا کوسوں پتہ نہیں ملتا۔ ایک دوسرے سے کچھ چھپائے رکھتا ہے۔ وہ لڑکی جب اپنی بات منوانا چاہتی ہے تو اسی نسوانی طریقِ کہنہ پر عمل کرتی ہے۔ یعنی آنسو بہانا۔ اور عورت کی یہ ادا مرد کو کبھی پسند نہیں آئی۔ ہر چند اس نے ہمیشہ اس حربے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔

یہ باور کر لینا ایک معقول بات ہوگی کہ مجبور کر دینے والے حالات نے نوجوان کو جستجو پر مجبور کیا اور اسے اپنی حالت بہتر بنانے کا ایک موقع مل ہی گیا۔ چنانچہ اب وہ ایک بہتر مکان میں رہنے لگتے ہیں۔ خوشنما میز پر بلوں کی تعداد میں بہت کمی ہے اور اب وہ نسبتاً مسرور اور ایک نوع کی قناعت میں بسر کر رہے ہیں۔ لیکن پروہ اور احساس کئے بغیر دونوں اپنی اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی تسکین میں ساعی ہیں۔ یوں سمجھو کہ وہ نوجوان اس کامیابی کے بعد کسی بہت بڑی تجویز کی تکمیل میں منہمک رہنے لگا ہے اور وہ لڑکی معاشری سربلندی کے خیال میں کسی۔ یا وہ شاندار مکان و سامان، اپنے اور بچوں کے لئے بہتر ملبوس۔ نوکروں کی تعداد میں اضافہ، موٹر کار اور ان تمام اضافیات کی خواہشمند ہے جو خوشحالی اور مسرت کے اعلان و اشتہار ہو سکتے ہیں۔ اب وہ محبت کی لغویت۔ پر سرور معیت اور فوری تفہیم جن سے محبت کا تغذیہ ہوتا ہے ——"

بس بس رہنے دو۔ تمہاری مثال اکثریت کی مثال نہیں ہے۔" یوسف نے قطع کلام کر کے کہا "تم مستثنیات کی مثال دے رہے ہو۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں ——"

عزیز یوسف، جمالی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ہماری گفتگو کا موضوع ازدواج میں محبت کا استقلال ہے۔ میں ایک اوسط نمونے سے بحث کر رہا ہوں ہم دونوں ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جو سوسائٹی میں اپنی ازدواجی محبت کا ریاکارانہ اعلان کرتے رہتے ہیں اور جسے میں دودھ کی لسی سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ لوگ جا و بیجا اپنی اہلیہ کے اقوال و افعال کا ذکر کر کے تفاخر کی شان دکھاتے ہیں۔ لیکن حقیقت حال کچھ اور ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ ہم دونوں ایسے لوگوں سے بھی واقف ہیں جن کو اس ادنیٰ درجے کی خود بینی کا بھی موقع میسر نہیں اور جن کا تباہ شدہ ازدواج ہر شخص کے سامنے ہے۔ میاں بیوی اور محبت! استغفر اللہ۔ انسان کو اگر کبھی یہ نعمت حاصل تھی تو اس عہد کو گزرے ہوئے بہت سی صدیاں گزر گئیں۔ تم اور میں اور ہر ذہین شخص جان سکتا ہے کہ عام طور سے جسے زن و شوہر کی محبت کہا جاتا ہے وہ باہم بسر کرنے سے ایک دوسرے کا عادی ہو جاتا ہے اور بس۔ یا کہو کہ وہ ایک دوسرے کے لئے ضروری ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ زن و شوہر پر ہی کیا منحصر ہے۔ نوکر اور دوست بھی ضروری ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ بھی نہیں تو ایک معاشری فرض کی غلط تعبیر کر کے اُس کی بندشوں میں جکڑے ہوئے ایک ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن ان حالتوں کو محبت کے نام سے یاد کرنا عقل و ذہانت کی توہین ہے۔

مجھے تسلیم ہے کہ پروازِ خیال فطرتِ انسانی کا ایک جز ہے۔ لیکن یہ حقیقت کم لوگ جانتے ہیں کہ انسان کی یہی صفت اس کی خزینۂ حیات کا موجب بھی ہو جاتی ہے۔ جو طبیعتیں اپنے اس جوہر کو مکروہات سے مغلوب نہیں ہونے دیتیں وہ وہ چند بیدار فطرتیں ہوتی ہیں، جو حاصلِ محبت یعنی قربِ مسلسل کے مطالبات پر غلبہ پا سکتی ہیں —— اور یہی ان کی خزینہ ہے! ان چند فقید المثال طبیعتوں کے علاوہ وہ انسانی طبقہ بھی میری گفتگو سے خارج ہے۔ جن کے لئے نفس و ذہن کی ہر حالت ایک ہی مفہوم رکھتی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر جو قناعت یعنی چوپایوں کی زندگی گزارتا ہے۔ میرا مقصدِ کلام سوسائٹی کا صرف وہ گروہ ہے جس کی نبضیں جینے کے لئے قوی و سریع ہوتی ہیں —— جیسے تم ہو۔ میں ہوں، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے پاس روپیہ پیسہ ہو یا نہ ہو۔ ان کو کوئی معاشری مرتبہ حاصل ہو یا نہ ہو۔

وہ جدید جدید حیات کے لئے مجبور ہوں یا نہ ہوں۔ ایک دائرہ ہے کہ مزاج و مذاق میں اخلاقی خوبی و خرابی کے جراثیم کو دیکھ سکتے ہیں۔

اس لئے عزیز یوسف، میں کسی ایسی محبت و ہم آہنگی کا خواستگار نہیں جو خود میری خوبیوں کو فنا کر دے۔ میں اگر محبت کا قائل ہوں تو اس کی جوہری صورت کا ——— ایسی محبت جو انسان کو دیوانہ اور مضحکہ بنا دے! اور اگر ایسی محبت کوئی ناممکن الحصول شے ہے تو میں اپنے مرتاضانہ تخیل میں اس کے حسین تصور سے دل بہلا سکتا ہوں۔ جو اپنی دردناک بافیوں اور بہلاوے سے مجھے ایسے اتحاد کے کڑے میں سے لے کہ میں نسلِ حمقا کی افزائش کا آلۂ کار بن جاؤں!

جمالی نے دم لیا اور رک کر۔ یہ گزرنے والی "نسلِ حمقا" کو غور و فکر کے ساتھ دیکھنے لگا۔ یوسف سکوت کے عالم میں سوچتا رہا۔ اور جمالی مسئلہ ازدواج کے متعلق مزید افکار و خیالات سے مسلح ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی ادیبانہ بلاغت و زور بیان کے ساتھ وہ دقتیں اور پریشانیاں بیان کیں، جو اکثر و بیشتر پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً بچوں کی بیماریاں، اور امکانی موت کا خطرہ، مالی مصیبتوں سے[1] دوچار رہنا، اولاد کی طرف سے مایوسیاں، قرابت داروں کے جھگڑے اور فتنے اور سب سے بڑھ کر ساس کی دخل در معقولات وغیرہ۔ پھر اس نے نہایت صراحت کے ساتھ میاں بیوی کے درمیان اختلاف کی تدریجی وسعت اس حد تک بیان کی جبکہ آزردہ روح کو لئے ہوئے شوہر کسی "وحید" عورت اور بیوی کسی "یگانہ" مرد کی طرف متوجہ ہو جانے کے لئے طیار ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اُس نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنے ہم عصروں میں جمالی جس کا تنہا مالک تھا۔ بعد کی صورت واقعات کا خاکہ پیش کیا اور بالآخر معاشری فرقیتے پر ختم کلام کیا جس کے بعد فرار یا طلاق کا درجہ آ جاتا ہے۔

بس رہنے دو! تم پھولوں کے عوض کانٹے پیش کر رہے ہو۔ یوسف نے گلاس ہاتھ میں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

یہ واقعہ ہے کہ حقیقت دو، تعیت کو پیش کرتے وقت جمالی ادیبوں کا ہلاکو تھا۔ جو نقشہ اُس نے اس وقت پیش کیا تھا وہ ہنوز آخری لمسوں کا محتاج تھا، اور اس کی تکمیل کرنے کے لئے پہلے تو اس نے ایک تازہ سگرٹ سلگایا اور پھر "نسلِ حمقا" پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور کہا:—

"عزیز یوسف یاد رکھو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ عورت کی طبیعت و مزاج کی تھاہ کسی نے نہیں پائی ہے ——— بلکہ میرا تو قول ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی طبیعت و مزاج کو کبھی نہیں سمجھ سکا ہے۔ میں بالیقین کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا وجود بیدار کا جزو اور لاکھوں مردوں کی طرح جو لاعلمی کی حالت میں اُس سحر در آفرین حالتِ ازدواج میں داخل ہوتے ہیں، تشائم غور و فکر، اس کے ناقابلِ فہم ہونے اور اس کے عدم توازن کی نذر ہو جائے گا۔ میری رائے ہے کہ تاوقتیکہ تم میری طرح مرتاضانہ طریق پر بکثرت عورتوں کا مطالعہ نہ کر لوگے تم کبھی عورت کے اس حیرتناک تلوّن کا تصور کرنے کے قابل نہ ہو سکوگے جس سے اس کی فطرت کی ترتیب ہوئی ہے۔ عورت صاف و صریح استدلال کی قابلیت سے کتنی عاری ہے تم اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے! وہ کسی طفلانہ بات یا متخالف حال یا توہم پرست کا جواز ثابت کرنے کے لئے کتنا غیر متعلق استدلال اور کس قدر کج بحثی کر سکتی ہے تم قیاس بھی نہیں کر سکتے۔

عورت دراصل جبلت اور ولولہ ان دو عناصر سے بنی ہے اور بہار کے موسم کی طرح ناقابلِ اعتبار ہے۔ وہ کسی ادنیٰ ترین بات پر شدید غصہ کر سکتی اور تمہیں ستم آلود الزاموں کے انبار میں دفن کر سکتی ہے۔ عزیز من، ان باتوں کا علم حاصل کرنا بڑا پیشہ ہے۔ میری جستجو و تحقیق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جمالی چپ ہوا۔ اور اپنی کرسی پر ٹیک لگا کر آرام کرنے لگا۔ وہ اس وقت خود ستائی کی حد تک اپنے آپ سے خوش معلوم ہو رہا تھا۔ کیونکہ بخیالِ خویش اس نے اپنے نوجوان دوست کی نظر میں ازدواج کے ادارے کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور اس کا ذخیرۂ استدلال ہنوز پُر تھا۔ وہ ابھی اتنی ہی دیر تک ایسے ہی وزنی دلائل کے ساتھ مزید گفتگو کر سکتا تھا۔

یوسف اب بلاشک وہی یوسف نہ تھا جو آدھ گھنٹہ قبل تھا۔ اس کا ذہن مایوسی اور تذبذب کے سیاہ بادلوں میں ملفوف تھا۔ نوجوانی کی خندہ جبینی افسردہ تھی اور وہ ایک تصویرِ تشائم نظر آ رہا تھا۔ جمالی جانے کے لئے اٹھا اور کہنے لگا۔

"اس وقت مجھے ایک باب پورا کرنا ہے۔ مطبع والوں نے جان مصیبت میں ڈال رکھی ہے"

آپ جا رہے ہیں:

---

[1] اس لفظ کو میں اس کی اردو صورت میں اسی طرح لکھنا مناسب سمجھتا ہوں۔

یوسف۔ جمالی نے لطف آمیز لہجے میں کہا "تم جانتے ہو کہ بحیثیت مصنف میرا مقدس فرض ہے کہ حقیقت و واقعیت کو جس صورت میں دیکھوں اسی طرح پیش بھی کروں"

"آپ کو جانا ہے تو جائیے" یوسف نے فوری غصے میں مبتلا ہو کر کہا "آپ ایک بے اصولے انسان اور مسرت کے ہلاکو ہیں اور بس!"

یوسف! جمالی نے گہری حیرت کے ساتھ جواب میں کہا اور یوسف کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ادیب جلیل اپنے معنوی شاگرد کو ایک لمحہ تک زندہ سکوت کی حالت میں دیکھا کیا۔ اور پھر اس کے بشرے پر رواقیانہ حق پرستی کا طمطراق نمودار ہو گیا۔ شاید اسے اپنی گفتگو پر افسوس تھا۔ مگر محض اس وجہ سے کہ اس سے یوسف کو ملال ہوا۔ نہ اس لئے کہ اس نے جو کچھ کہا صحیح نہ تھا۔ اس لحاظ سے اس کا ضمیر بالکل مطمئن تھا۔ غرض وہ رخصت ہو کر چلا گیا۔

اس کے بعد چند روز تک یوسف کا حال اس کا معمولی حال نہ تھا۔ وہ بدحال تھا۔ اشتہا خراب ہو گئی تھی اور اس کے والدین متفکر تھے۔ مگر وہ کسی طرح اپنی کیفیت بیان کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اسے سخت کوشش کرنا ہی پڑی کہ گھر والے اس کے بستر پر پڑے رہنے اور ڈاکٹر کو بلانے کے لئے ضد نہ کریں۔

ایک ہفتہ گزر گیا اور وہ دردانہ سے نہ ملا۔ اور بالکل ممکن تھا کہ ایک ہفتہ اور گزر جاتا اگر خود دردانہ ٹیلیفون پر اسے عدم توجہی کا ملزم نہ بناتی۔ اس نے کہا ٹیلیفون پر تفصیلات بیان نہیں ہو سکتیں۔ وہ اس سے ملنے کے لئے اسی وقت آ رہا ہے۔ چنانچہ وہ دردانہ کے مکان پر پہنچا۔ لیکن بباطن سخت تذبذب میں مبتلا تھا۔

جب وہ گھر سے روانہ ہوا تو سوچتا جا رہا تھا کہ بالآخر وہ دردانہ ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں جانتے ہیں اور واقعات کی رفتار خود اس نے تیز کر دی تھی۔ دردانہ جب کسی بات کو پسند نہیں کرتی تو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نگاہ پیدا ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا مزاج مشتعل ہو جانے والا ہو۔

اور جب وہ اس کے مکان میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ تخیل صباحت ایک اسٹیچو کی طرح سامنے کھڑی ہے۔ وہ اس کی منتظر تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تھی جو عارضِ صبیح کے بالمقابل نمایاں ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ بعد مبالغہ خوش نظر آئی۔ اور یوسف نے جو کچھ کہا نہایت توجہ کے ساتھ سنا کی۔ لیکن بتدریج اس کے انداز میں ایک کشیدگی پیدا ہوتی رہی ہے۔ بہر حال یوسف کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ دردانہ کسی جذبے کو دبا رہی ہے۔ اور اس کی موجودگی و ملاقات سے دردانہ کی خفگی بالکل دور نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس کی ہر حرکت اور لہجے میں برہمی چھپی ہوئی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ نسوانی ہدایت نے اس کے مافی الضمیر کو پڑھ تو نہیں لیا ہے اور اگر ایسا ہے تو اس کی وقت میں گونہ سہولت پیدا ہو گئی ہے۔

ٹہلنے کے خیال سے یہ دونوں باغیچے کی ایک روش پر ہو لئے جہاں گھنے درختوں کی شاخوں میں سے چھن چھن کر آفتاب کی کرنیں خوشگوار ہو گئی تھیں فضا یاسمن کی خوشبو سے بسی ہوئی تھی اور اس کا سحر یوسف پر مستولی ہونے لگا جیسے اب سے پہلے ہو جاتا تھا۔ اس فضا میں جب اس نے اپنے حواس کا جائزہ لیا تو سب سے پہلے اسے یہ محسوس ہوا کہ بہر حال وہ دردانہ سے محبت کرتا ہے ——— وہ نیت قابل پرستش ہے۔ تاہم یوسف نے اپنے احساس کی حقیقت کو جس قدر زیادہ سمجھنا چاہا وہ اسی قدر زیادہ ہیجان و تذبذب میں مبتلا ہوتا گیا۔ تخیل بھی کس درجہ عجیب شے ہے! اس کے ذہن میں جو تعصبات پیدا ہو چکے تھے ان کو دردانہ کی موجودگی تمام و کمال باطل نہیں کر سکی۔ تو کیا یہ محبت نہیں بلکہ اتحاد عارضی تاثر ہے؟ لیکن اگر یہ دردانہ کا محض سحر جمال ہے تو اندازہ و قیاس سے باہر ہے یوسف انتشارِ خیال میں مبتلا تھا۔

وہ جو کچھ خیال کر رہا تھا، جو کچھ محسوس کر رہا تھا، اس وقت شدید ہو جاتا تھا۔ جب گفتگو دفعتہً بند ہو جاتی تھی اسے دردانہ کی بات کا جواب دینا پڑتا تھا۔ اور اس کے لئے وہ ہمہ آمادگی تھا۔ حالانکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے جوابات اکثر لغو و بے معنی تھے۔ دردانہ مصر ہوئی کہ وہ اپنی غیر حاضری و بے توجہی کی توجیہہ کرے۔ اور یوسف نے اپنی تمام لطافت لسانی اس میں صرف کر دی کہ بیان طویل ہو کر اصل مطلب غائب ہو جائے۔ کیونکہ وہ مذبذب تھا اور چاہتا تھا کہ عقل و شوق کی جو جنگ اس کے بطون میں جاری ہے اس کا تصفیہ ہو جائے۔ اس لئے وہ سکون و سہولت کے ساتھ ان مضامین کو دہراتا رہا جو اس نے آتے وقت گھڑ لئے تھے اور جو دفتر کی غیر معمولی مصروفیت، دوستوں کی ضروری ملاقاتوں اور اس کے باپ کی بیماری سے متعلق تھے۔ لیکن اس کی مایوسی کی حد نہ تھی جب اس نے محسوس کیا کہ دردانہ کی نظر میں اس کی گفتگو لاطائل

اور توجیہی استدلال سے عاری تھی۔ اس کی بیچارگی کا اندازہ نہیں ہو سکتا جب اُسے یہ یقین ہو گیا کہ دردانہ اس کی قصداً غلط بیانی کو سمجھ گئی ہے۔ دردانہ کی عین منشا تھی کہ اُسے یقین دلا دیا جائے۔ اس نے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر رکھا تھا۔ لیکن یوسف کی غلط بیانی نے اس کے شیشۂ غضب کے میگزین کو آگ دکھا دی۔ اور آخر ہوا یہ کہ انتہائی غصے کی حالت میں دردانہ نے اسے فریب دہی کا ملزم کہا۔ اور فریب بھی اس قسم کا کہ کسی دوسری لڑکی سے اس کی ملاقات کا علم دردانہ کو نہ ہو سکے۔

"میں جانتی ہوں کہ تمہیں اس حرافہ یاسمینی سے الفت ہے۔ میرے ساتھ تمہیں کبھی بھی محبت نہ تھی۔ تم مجھے دھوکا دیتے رہے تھے۔" دردانہ نے رو کر کہا اور ہیجان کی حالت میں تنگ روش پر ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگی، اور اس کی ساری کے الجھنے سے پھولوں کی پنکھڑیاں بکھرتی رہیں۔ "تم میرے ساتھ صرف اس لئے کھیل رہے تھے کہ یاسمینی کی توجہ حاصل کر سکو۔"

اب یوسف کی باری تھی۔ اس کی مزاج میں ابتری پیدا ہو جانے کے لئے بھی صرف ایک چھیڑ کی ضرورت تھی۔ اور دوسری لڑکی سے اختلاط کا غلط الزام! معاذ اللہ!

"یہ غلط اور بالکل غلط ہے! اور تم خوب جانتی ہو کہ مجھے یاسمینی کو دیکھے ہوئے بھی مہینے گزر گئے۔ لیکن تمہیں کسی دوسری لڑکی کے متعلق کچھ کہتے ہوئے اپنی زبان پر قابو رکھنا چاہئے!" اس نے تیز لہجے میں جواب دیا۔

دردانہ اسی انداز میں بہت کچھ کہتی رہی اور جو کچھ اس نے کہا یوسف کے لئے سب غیر متوقع تھا۔ اُس کے گلابی رخساروں پر آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ زمین پر پاؤں مار رہی تھی۔ ہاتھ مل رہی تھی۔ اور اس حال میں جب اُس سے بات کر سکنا ممکن ہوتا تو یوسف کو فریبی اور دغا باز کہتی۔ یوسف کے سامنے جمالی کے بیان کا ایک جزو بصورت مثالی آموجود ہوا تھا۔ اور اب اُسے یقین سا ہونے لگا کہ جمالی نے جو کچھ کہا ہے وہ سب صحیح ہو سکتا ہے۔ وہ باتیں بھی صحیح ہو سکتی ہیں جن کے متعلق یوسف نے دورانِ گفتگو ہی میں خلاف واقعہ اور ناقابل قبول ہونے کا قطعی فیصلہ کر لیا تھا اس کا جو نتیجہ ہوا وہ یہ تھا کہ یوسف نے مردانہ انداز اختیار کیا اور دردانہ کے پاس سے بغیر کچھ کہے چلا آیا۔ گھر پہنچ کر اس نے ایک مختصر اور اپنے موضوع پر وادی خط لکھا۔ اور صاف الفاظ میں لکھ دیا کہ باہمی تعلقات کو یک قلم ختم کرنا چاہیے۔

~~~~~~~~~~

کم و بیش ایک مہینے کے بعد یوسف پارک میں گھوم رہا تھا۔ گھومنا لکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد و مدعا گلگشت نہ تھی، بلکہ اس کے وہاں ہونے کا کوئی مقصد و مدعا نہ تھا اور جس روش اور راستے پر اُس کے پاؤں اُٹھتے وہ اُدھر کو ہو لیتا تھا۔ درحقیقت اندنوں اس کا بے مقصد و مدعا جینا ہی ہو رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی زندگی مایوسانہ ہے۔ اور تاریک کنار کے ایک تختے کی طرف جانے کے لئے چند سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ یوسف نے جیسے ہی اوپر کی سیڑھی پر قدم رکھا اُس نے ایک نہایت خوش قطع خوش پوش انسان کو اپنے برابر سے گزر جاتے دیکھا۔ ہر چند اندھیرا کافی ہو گیا تھا۔ مگر وہ گزر جانے والا شخص دفعتہً رکا اور کہنے لگا۔

یوسف!

اوہ، جمالی۔

جمالی وہی پہلا جمالی تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اس کا انداز و لباس ظاہر کرتا تھا کہ اس پر زیادہ توجہ صرف ہوئی ہے۔

میں تمہیں کئی روز سے فون کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ تم اتنے دن کہاں چھپے رہے۔ ادیب شہیب نے اپنے نوجوان دوست سے سوال کیا۔

"میں نہایت مصروف رہا ہوں" یوسف نے جواب دیا

لیکن سچی بات یہ ہے کہ یوسف نے کم از کم کچھ عرصے تک جمالی سے نہ ملنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ کیونکہ یوسف کے اندازے میں جمالی انسانی جذبات کو باطل کر دینے کا اہل تھا۔ اور یوسف اس وجہ سے خائف تھا کہ کہیں اس پر کوئی اور حملہ نہ کر دے۔

میں اس وقت کی اتفاقیہ ملاقات سے خوش ہوں" جمالی نے مسرت کے ساتھ کہا۔ میں سمجھتا ہوں تم نے ابھی تک نہ سنا ہوگا۔

کیا نہ سنا ہوگا؟ یوسف نے پیشانی پر شکن ڈال کر سوال کیا۔

میری شادی کی قرار داد، اس وقت جمالی خلاف عادت کچھ
~~~~~~~~~~

"شادی" یوسف کے منہ سے ایک بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

ہاں قمر زمانی کے ساتھ میرے نکاح کی ۲۰ تاریخ مقرر ہے! جمالی نے اسی انداز میں کہا۔

خدا کی سنوار! یوسف نے ہیجان کی حالت میں کہا کیا واقعی ۔۔۔ مگر جب اردواج کے متعلق آپ جو کچھ کہہ چکے ہیں اس کے بعد شادی؟!

میرے نوجوان دوست! میں نے جو کچھ کہا تھا وہ عام عورتوں کے متعلق کلیے کی شکل میں تھا۔ مس قمر نہ صرف ایک بلند پایہ شاعرہ ہے۔ بلکہ وہ مستثنیٰ عورتوں میں سے ہے۔ کاش میں اس روز سے قبل اس کی ان خصوصیات سے آگاہ ہوتا۔ وہ بالکل مختلف اور عجیب و غریب لڑکی ہے۔ اس کے اندر نازک و جمیل ہونے کی نسوانی تخصیص کے ساتھ مردوں کی سی قوت متصورہ اور وسعت خیال بھی ہے۔

لیکن ازدواج کے متعلق تم نے کونسا استثنیٰ نکالا؟ اس کی ضعیف بنیادوں کے انطرہٗ کیا ہوئے؟ یوسف نے طنزیہ سوال کیا۔

"یوسف!" جمالی نے ایک جج کے انداز میں جواب دیا "ہم سب جس دنیا میں رہتے ہیں وہ اگر کچھ ہے تو محض مادی ہے۔ ایک عملی اور سطحی دنیا ہے۔ مس قمر زمانی نے خود خواہش کی۔ اور وہ بھی بعض معاشرتی مصلحتوں کی بنا پر اور میں با خاطر ناخواستہ کہو یا اس کی دلداری کے خیال سے راضی ہو گیا۔ لیکن یقین مانو کہ ہم دونوں ازدواج کی عدم اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں اور ہم دونوں کے باہمی تعلق پر اس رشتے کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔ اور دونوں کو کامل آزادی حاصل ہوگی۔ اس طرح ہم مسئلہ ازدواج کا ایک آئیڈیل پیش کرنا چاہتے ہیں۔ رہ گیا مس قمر کی مزاجی خصوصیات کا سوال ——— "گھڑی دیکھکر"

"عزیز من! مس قمر سے ملنے کا وعدہ ہے اور وقت تقریباً پورا ہو چکا ہے خدا حافظ! تمہیں دعوت کا رقعہ پہنچے گا۔ ضرور شریک ہونا۔ خدا حافظ!"

یوسف سوچتا رہ گیا کہ دروانہ کے پاس اگر جائے تو کون سا منہ لے کر۔

شمع

"شمع" کہتی ہے کہ فانوس میں کیا ہوتا ہے؟
میں جو جلتی ہوں تو "محفل" کا بھلا ہوتا ہے
آج دنیا کی حقیقت مجھے معلوم ہوئی
اپنی راحت کے لئے ظلم روا ہوتا ہے
میرے جلنے سے سما جاتی ہے ہر چیز میں روح
سینکڑوں بنتے ہیں، جب ایک فنا ہوتا ہے

(سیفی سلیم آبادی)

دردِ فراق

میں ہوں اور اضطرابِ دردِ فراق　　ہے قیامت عذابِ دردِ فراق
اُدھر آرائشِ خمِ گیسو　　اور اُدھر پیچ و تابِ دردِ فراق
حشر تک، رات دن تڑپنا ہے　　ہے یہ تعبیرِ خوابِ دردِ فراق
ہر صعوبت ہے دل شکن، لیکن　　نہیں کوئی جوابِ دردِ فراق
نالہ ہے ہم ردیف، تب خالہ　　سوزِ دل ہم رکابِ دردِ فراق
عہدِ گل کی ہوائیں کھا کھا کر　　زور پر ہے شبابِ دردِ فراق
ہر نفس دل سے لب تک آ آ کر　　لکھ گیا اک کتابِ دردِ فراق
سننے والا کوئی نہیں ملتا　　خاک چھیڑوں رُبابِ دردِ فراق
چشمِ تر نے بہا دیے دریا　　نہ مٹا التہابِ دردِ فراق
اب تو مرنے کی ہم نے ٹھانی ہے　　کہ نہیں دل کو تابِ دردِ فراق

گھر کہاں احسنؔ اور کہاں راحت
میں ہوں خانہ خرابِ دردِ فراق

(احسن مارہروی)

جدید آئین پر ایک تنقیدی نظر

سید شریف حسین آرزو

اس مفید سلسلے کو جناب سید شریف حسین صاحب آرزو نے پیدا کر قارئین "کلیم" کے لئے سیاسی معلومات کا باب کھول دیا ہے جس کے واسطے ہم آرزو صاحب کے شکر گزار ہیں۔ امید کہ صاحب موصوف اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔ (جوش)

تمہید

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ملک کا ہر سیاسی انقلاب قوم کے افراد کی اقتصادی، معاشری، اخلاقی و مجلسی زندگی پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے اثرات نتائج و عواقب کے لحاظ سے یا تو تعمیری ہوتے ہیں یا تخریبی۔ اس امر کا فیصلہ آسان نہیں کہ کسی ملک کے سیاسی نظام میں تبدیلی، قوم کی فلاح و بہبود، عروج و ترقی، خوش حالی و فارغ البالی، اور آزادی و حریت کے استقلال و استحکام میں مدد و معاون ثابت ہوگی یا قوم کو ہلاکت آفرین افلاس و غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دے گی۔ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ سیاسیات کا ہر مسئلہ متنازعہ فیہ ہوتا ہے۔ اس کے کسی اصول کو عمومیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ ہر قوم اور ہر فرد کا سیاسی نظریہ جدا ہے۔ حق۔ صداقت اور جواز حالانکہ سیاسیات کے تین ابتدائی بنیادی اصول ہیں۔ لیکن ہر قوم اور اس کے انفرادی اداروں کے نزدیک اُن کا معیار مختلف ہے۔ نہ ماضی اپنے شاندار دور کے باوجود اس اختلاف کو دور کر سکی اور نہ حال ہی کروڑوں انسانوں کا خون بہا کر اس کا خاتمہ کر سکا۔ اور مستقبل کی مستور تاریکیوں سے اس متنازعہ فیہ مسئلے کے حل کی توقع ہوائی قلعوں کی تعمیر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

۱۹۱۴ء کے محاربہ عظیم کی ہولناک تباہ کاریوں اور ہلاکت آفرینیوں کی جگر پاش یادتازہ ہونے کے باوجود اقوام عالم حق۔ صداقت و جواز کے حقیقی معیار کا فیصلہ کرنے کے لئے انسانیت و تہذیب کے نام پر پھر ایک بار عالمگیر جدال و قتال کے واسطے تیار ہو رہی ہیں۔ ہر قوم کا یہ خیال ہے کہ وہ کرۂ ارض میں فساد و امن سوز عناصر کا خاتمہ کر کے انسانیت ہی کی نہیں بلکہ خدا کی ایک اہم ترین خدمت انجام دے گی۔ اس خیال کے پیش نظر ہر قوم اپنے اپنے نظام حکومت کو حق، صداقت، جواز کے ذاتی معیار کے مطابق مستحکم و مضبوط بنانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔

آئینِ حکومت کے مطالعے کی ضرورت

کسی قوم کا سیاسی زاویۂ نگاہ معلوم کرنے اور اُس نے حق۔ صداقت و جواز کا جو معیار اپنی ذاتی ذہنیت کے زیر اثر قائم کیا ہے۔ اس کی نوعیت و کیفیت دریافت کرنے کے لئے ہمیں اس نظام العمل کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ جو اُس قوم نے اپنے ذاتی زاویۂ نگاہ کو بروئے کار لانے کے لئے مرتب کیا ہے۔ اس نظام العمل کو سیاسیات کی اصطلاح میں "آئین" یا "دستور اساسی" کہتے ہیں۔

سیاسیات سے بڑھ کر اس دنیا میں "زمانہ سازی" کوئی نہیں جس قوم کا سیاسی نظام العمل "زمانہ سازی کے تعمیری عناصر سے خالی ہوتا ہے وہ زمانے کی "درستِ درازی" کی بدولت اس قوم کے سپرد کر دی جاتی ہے جو زمانہ ساز ہے۔ ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ اسی قدرتی اصول کے ماتحت قایم ہوا تھا اور اب تک قائم ہے اور جب تک ہندوستان زمانہ سازی کے فن میں ماہر نہ ہو جائیگا اس وقت تک قایم رہے گا۔ اکبر مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے ؂

رہی نہ قلب میں طاقت زمانہ سازی کی
دعا کرو نہ مری عمر کی درازی کی

ہندوستان کا جدید آئین

آج ہندوستان برطانیہ کے زیر سایہ ایک نئے سیاسی دور میں داخل ہو رہا ہے۔ اپریل ۳۷ء تک جدید آئین موسومہ "قانون حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۵ء" کا ابتدائی حصہ صوبجاتی خود اختیاری کی صورت میں نافذ ہو جائے گا۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئین نو میں تعمیری قوتیں پنہاں ہیں۔ یا تخریبی طاقتیں۔ تاہم نتائج و عواقب کے متعلق تحقیقات سے قبل اس آئین کے روشن خدّ و خال سے واقفیت ضروری ہے۔ میری رائے میں ہندوستان کے جدید دستور اساسی کے بنیادی اصول و ہئیت ترکیبی بیان کرنے سے پیشتر برطانوی آئین پر بحث نہایت مفید ہو گی۔ کیونکہ اس طرح ہم ہندوستان کے جدید نظامِ حکومت کی حقیقت و افادیت کا "دنیا کے سب سے زیادہ جمہوری آئین" کی روشنی میں (جیسا کہ برطانوی آئین کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے) صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔ اور اس طرح ایک بڑی حد تک ہم ہندوستان کے متعلق برطانوی سیاسی ذہنیت معلوم کر سکیں گے۔

رسالے کی تنگ دامنی کے باعث میں نے انتہائی اختصار کو ملحوظ رکھا ہے اور برطانوی و ہندوستانی دساتیر کے صرف روشن خدو خال بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ ہندوستانی دستور کی بعض اُن ذیلی و ضمنی خصوصیات کو بھی شامل کر لیا ہے۔ جن کے بغیر جدید آئین کے چند بنیادی اصول کے سمجھنے میں دقّت ہوتی۔

چند ابتدائی امور

اصل موضوع کی طرف رجوع کرنے سے قبل "آئین کی تعریف۔ آئین کی غرض و غائت "وحدانی" و "وفاقی" آئین۔ "تحریری" و "غیر تحریری" آئین۔ "پارلیمنٹری" و "غیر پارلیمنٹری" طرز حکومت۔ مجالس قانون ساز اور شعبۂ عدل و انصاف کی عام نوعیت پر روشنی ڈالنی ضروری ہے

آئین کی تعریف

آئین سے مراد اُن اصول کا مجموعہ ہے جن کے تحت حکومت کے اختیارات محکوم کے حقوق۔ اور ہر دو کے درمیان مفاہمانہ تعلقات کی تخصیص کی جاتی ہے۔ اِن اصول کے اجزائے ترکیبی قدیم مذہبی۔ اخلاقی و اقتصادی روایات۔ رائج الوقت رسم و رواج اور رفتار زمانہ سے پیدا شدہ ضروریات میں پائے جاتے ہیں۔

حکومت و آئین ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔ آئین کے بغیر خواہ وہ کتنا ہی نامکمل و ناتمام ہو۔ حکومت کا وجود غیر ممکن ہے۔ جس طرح جسم کی زندگی کے لئے روح ضروری ہے اسی طرح حکومت کے وجود کے لئے آئین لازمی ہے۔

آئین کی غرض و غائت

آئین کی غرض و غائت دوہری ہے۔ ایک جانب وہ حاکم کے انفرادی اختیارات کے رضاکارانہ استعمال کو معین حدود سے متجاوز ہونے سے روکتا ہے۔ اور دوسری جانب۔ وہ محکوم کے بعض حقوق کا ضامن و محافظ رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ "طاقتِ بالادست" (حکومت) اور "طاقت زیر دست" (محکوم) کے درمیان ایک صاف و روشن حدِ فاصل قایم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ غور ہے کہ سیاسیات کے جدید ترین نظریہ کے ماتحت عامۃ الناس "طاقتِ زیر دست" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی طاقتِ بالا دست کے مقابلہ پر عامۃ الناس کو بھی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ طاقتِ بالادست کے مفاد کے زیرِ اثر رہتی ہے

فی الحقیقت بالادستی کی طاقت ایک ایسی امانت ہے جو عامۃ الناس حکومت وقت کو اپنی خوشی سے محض اس بنا پر سپرد کرتے ہیں کہ ملک و قوم فلاح و ترقی کی راہ پر گامزن رہیں۔ لیکن اگر وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس امانت میں خیانت کی جا رہی ہے تو ہمہ گیر بغاوت کرکے اپنی امانت واپس لے لیتے ہیں۔ اور کسی دوسرے نظام حکومت کے سپرد کر دیتے ہیں جو اُن کے نزدیک اپنے پیش رو سے زیادہ امین و قابل ہوتا ہے۔ اسی خیال سے عامۃ الناس کی طاقت زیر دست کہا جاتا ہے یہ طاقت آزاد قوم کو بھی حاصل ہوتی ہے اور غلام قوم کو بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آخر الذکر کے اجتماعی قویٰ کمزور ہوتے ہیں۔ جن میں طاقت بالادست کی خیانت کے خلاف صف آرا ہونے کی روح پھونکنی بہت مشکل ہوتی ہے۔

وحدانی و وفاقی آئین

آئین طرز حکومت کے لحاظ سے دو قسم کا ہوتا ہے (۱) وحدانی (Unitary) اور (۲) وفاقی (Federal)

وحدانی آئین کے ماتحت، ایک واحد اعلیٰ طاقت بالادست و احد منتظمہ قوت کا استعمال کرتی ہے اور باقی تمام طاقتیں خواہ وہ حکومت کے کسی حصہ یا شعبہ سے تعلق رکھتی ہوں (مثلاً مجالس قانون ساز و مقامی ادارات) صرف اعلیٰ طاقت بالادست کے قائم کردہ ضابطہ یا منتقل کردہ اختیارات کے ماتحت معرض وجود میں آتی ہیں۔ اور کام کرتی ہیں۔

وحدانی طرز حکومت کے ماتحت فی الحقیقت مقامی ادارات یا مجالس قانون ساز کو آئین سازی کے اختیارات حاصل نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ در اصل ضمنی قواعد و ضوابط یا قوانین مرتب کرتی ہیں۔ جن کی آخری منظوری یا نامنظوری کا اختیار طاقت بالادست یا اس کے مخصوص نمائندے کے ہاتھ میں محفوظ رہتا ہے۔

برطانیہ۔ فرانس۔ ہسپانیہ۔ جاپان وغیرہ ممالک میں وحدانی قسم کا آئین نافذ ہے۔ جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے اس کی آزاد و خود مختار نوآبادیات بھی طاقت بالادست کے حقوقِ قانون سازی سے مستثنیٰ نہیں۔ بلاشبہ ان نوآبادیات کو قانون سازی کے حقوق حاصل ہیں۔ لیکن یہ حقوق صرف طاقتِ بالادست کی رضامندی سے اُن کی جانب منتقل کئے گئے ہیں۔ جو ناپسندیدہ و ناخوشگوار حالات کی صورت میں کسی حجت کے بغیر واپس لئے جا سکتے ہیں۔

وفاقی آئین کے ماتحت ملک کے نظم و نسق کے اختیارات مرکزی و مقامی حکومتوں کے درمیان طے پاتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ جرمنی۔ سوئٹزرلینڈ۔ اور روس وغیرہ میں وفاقی طرز کا آئین نافذ ہے۔ ہندوستان کا جدید آئین بھی وفاقی طرز کا ہے۔ لیکن ہندوستانی وفاق Indian Federation میں مرکزی حکومت کے آخری اختیارات عوام کی نمائندہ جماعت یعنی وفاقی مجلس قانون ساز کے ہاتھوں میں نہیں ہوں گے۔ بلکہ تاج برطانیہ کے نمائندے گورنر جنرل کے قبضہ میں ہوں گے۔ جو برطانوی حکومت کے سامنے جواب دہ ہوگا اس لحاظ سے ہندوستانی وفاق کی آخری مرکزی طاقت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ برطانوی حکومت یا بالفاظ دیگر برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہوگی۔

تحریری و غیر تحریری آئین

آئین اپنی نوعیت کے لحاظ سے دو قسم کا ہو سکتا ہے (۱) تحریری (Written) اور (۲) غیر تحریری (Un-Written)

تحریری آئین ایک ایسے آئین کو کہتے ہیں جس کے تمام قواعد و ضوابط کسی خاص و اہم دستاویز یا دستاویزات میں جمع کر دیئے گئے ہوں۔ اور ملک کا ادنیٰ و اعلیٰ نظم و نسق صرف انہی دستاویزات میں درج شدہ قواعد و ضوابط کے ماتحت بروئے کار لایا جائے۔

غیر تحریری آئین وہ ہے جو تحریری قانون کی بجائے ملکی رسم و رواج پر قائم ہو۔

تحریری آئین کا ایک ظاہری فائدہ یہ ہے کہ وہ ارباب اختیار کی ناجائز کارروائیوں کا سدباب کر سکتا ہے۔ گو عملی طور پر اس کے برعکس بھی نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے قدیم و جدید دساتیر سب تحریری ہیں جن کے تمام ظاہری فوائد ان کے قومیت کش نتائج کے پیش نظر بالکل بے حقیقت ثابت ہوئے۔

سخت و نرم آئین

اگر ہم دساتیر عالم کا بنظر تعمق معائنہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ تمام دساتیر اپنی ذاتی خصوصیت کے لحاظ سے دو قسموں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ (۱) سخت (Rigid) اور (۲) نرم (Flexible)

سخت آئین سے مراد ایک ایسا آئین ہے جو انتہائی غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد حکومت کے کل پرزوں کو "چالو" رکھنے کے لئے مرتب کیا جائے۔ اور اس میں آسانی کے ساتھ ہنگامی انقلاب یا وقتی جوش کے ماتحت کوئی تبدیلی نہ کی جا سکے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا دستور اساسی اسی لحاظ سے "سخت" کہا جاتا ہے۔ ہندوستان کا جدید دستور بھی بلاشبہ "سخت" ثابت ہوگا۔

نرم آئین سے مراد ایک ایسا دستور اساسی ہے جس کی نشو و نما انسانی ارادہ یا جبری تشکیل کی بجائے قدرتی حالات میں ہوئی ہو۔ اور جس میں ضروریات زمانہ کے مطابق کسی خاص دشواری کے بغیر مناسب تبدیلی پیدا کی جا سکے۔ انگلستان کا آئین اس لحاظ سے معیاری حیثیت رکھتا ہے۔ روس اور زمانہ حال میں جرمنی۔ اٹلی اور جاپان بھی برطانیہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سخت آئین کے ماتحت مجالس قانون ساز کا دائرہ عمل صرف قانون سازی تک محدود رہتا ہے۔ جبکہ نرم آئین کے ماتحت مجالس قانون ساز کا فرض صرف قانون سازی ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ قوانین نافذ کر سکتی ہیں۔ ان میں ترمیم کر سکتی ہیں۔ اور انھیں منسوخ کر سکتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ پرانے آئین کو منسوخ۔ نئے آئین کا نفاذ۔ یا موجودہ آئین میں بنیادی ترمیم یا انقلاب انگیز اصلاح بھی کر سکتی ہیں۔

فرانس کا آئین درمیانی حیثیت رکھتا ہے "سخت" ہونے کے باوجود مجالس قانون ساز کے ہر دو ایوانوں کی معمولی اکثریت کے فیصلہ سے اس میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ جبکہ امریکہ کے آئین میں معمولی تبدیلی کے لئے بھی سخت ترین آئینی مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس برطانوی آئین میں دارالامرا و دارالعوام کے معمولی متفقہ فیصلہ سے ہر قانون میں بہ آسانی ترمیم کی جا سکتی ہے۔ اور اُن کا فیصلہ بالکل ناطق ہوتا ہے۔

پارلیمنٹری و غیر پارلیمنٹری حکومت

پارلیمنٹری حکومت سے مراد ایک ایسا آئین ہے جس میں ارباب اختیار عوام کے نمائندوں یعنی مجالس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہوں، اور صرف اس وقت تک اپنے عہدوں پر قایم رہیں جب تک کہ عوام کے نمائندوں کو ان پر اعتماد ہو۔

غیر پارلیمنٹری حکومت سے مراد ایک ایسا آئین ہے جس کے ماتحت ارباب اختیار مجالس قانون ساز کے سامنے جواب دہ نہ ہوں۔ بلکہ اس کے برعکس مجالس قانون ساز ارباب اختیار کے سامنے اس معنی میں جواب دہ ہوں کہ اگر ان کا منظور کردہ کوئی قانون ارباب اختیار کے ذاتی فیصلہ کے منافی ہو تو اسے ٹھکرا دیا جائے۔ اور وہ بالکل بے بس رہیں۔

ہندوستان کا موجودہ آئین غیر پارلیمنٹری ہے۔ جدید آئین بھی ایک بڑی حد تک غیر پارلیمنٹری ہوگا۔ جیسا کہ آئندہ مضمون میں واضح کیا جائے گا

مجالس قانون ساز کی نوعیت

مجالس قانون ساز اپنی نوعیت کے لحاظ سے دو قسم کی ہوتی ہیں۔
(۱) ایسی مجالس قانون ساز جو صرف ایک ایوان پر مشتمل ہوں۔
(۲) ایسی مجالس قانون ساز جو دو ایوانوں پر مشتمل ہوں۔

ایک ایوان والی مجلس قانون ساز اس زمانے میں زیادہ جمہوریت پسند خیال کی جاتی ہے۔ جبکہ دو ایوانوں والی مجلس قانون ساز کو رجعت پسندانہ طاقتوں میں محصور سمجھا جاتا ہے۔ آئرش فری سٹیٹ کے وزیر اعظم نے اسی خیال سے آئرستان کی مجلس قانون ساز کے ایوان بالا کو توڑ دیا ہے۔ جرمنی اٹلی، ہسپانیہ بھی اسی زمرے میں شامل ہیں۔

حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے جدید دستور اساسی کے ماتحت بعض صوبجات میں دو ایوان والی مجالس قانون ساز قایم کی ہیں اور بقیہ ہر ایک میں ایک ایوان والی مجالس قانون ساز کو کافی سمجھا گیا ہے۔ گو صوبائی مجالس قانون ساز بڑا مفید

سطر ... [illegible]

ضروری ہے کہ حکومت برطانیہ نے دو ایوان والی مجالس قانون ساز صرف ان صوبوں میں قائم کی ہیں جہاں اُسے یہ خدشہ ہے کہ قوم پرور عناصر طاقتور ہونے کے باعث حکومت کے کل پرزوں میں جمود پیدا کر دیں گے۔ اس خطرہ کا سدباب کرنے کے لئے ایوان بالا کا رجعت پسندانہ عنصر شامل کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ ایوان بالا میں صرف سرمایہ دار و سرکار پرست لوگ ہی منتخب ہو کر آ سکتے ہیں۔ معیار رائے دہی و معیار امیدواری انتہائی بلند ہونے کے باعث غریب طبقہ کے نمائندوں کا داخلہ غیر ممکن ہے۔

شعبۂ عدل و انصاف کی نوعیت

شعبۂ عدل و انصاف حکومت کی مشینری کا اہم ترین پرزہ ہے۔ اگر یہ پرزہ بے کار ہو جائے تو سرکاری مشینری کی چال خراب ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بند ہو جاتی ہے۔ شعبۂ عدلیہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ (۱) ایسا شعبہ جس کا واسطہ صرف عدل و انصاف سے ہو حکومت کی انتظامیہ حکمت عملی کو اس میں بالکل دخل نہ ہو۔ اور نہ شعبۂ عدل و انصاف کے ارباب اختیار حکومت کے عام نظم و نسق میں حصہ نہ لیں۔ (۲) ایسا شعبہ جس کا واسطہ عدل و انصاف کے علاوہ عام امور کے نظم و نسق سے بھی ہو۔ اور حکومت بوقت ضرورت اپنے مفاد کے پیش نظر عدل و انصاف کی حکمت عملی میں مداخلت نہ کر سکے۔

مذکورہ بالا باتیں ہر ملکی دستور کے بنیادی اصولوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد ہم کسی ملک کے دستور کے نشیب و فراز عیوب و محاسن اور تعمیری و تخریبی طاقتوں کا آسانی کے ساتھ مطالعہ کر سکتے ہیں۔

سیاسیات ایک خشک مضمون ہے۔ اس لئے عام فہم نہیں۔ تاہم میں نے آئینی امور کو سیدھی سادی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن بنیادی اصول کو بیان کرنے کے بعد جو دنیا کے ہر دستور میں قدرتی طور پر مشترک ہوتے ہیں۔ لیکن تفصیلات اور طریقۂ کار کے لحاظ سے مختلف بن جاتے ہیں۔ برطانیہ کے آئین کا ایک مختصر خاکہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

آئین برطانیہ

آئین برطانیہ "جمہوری بادشاہی" ہے جو دو اجزائے لاینفک سے مرکب ہے (۱) بادشاہی (۲) پارلیمنٹ۔

بادشاہ کی امداد کے لئے پریوی کونسل ہے۔ پارلیمنٹ کی رہنمائی کے لئے کابینہ وزارت ہے۔ جو بذات خود پارلیمنٹ کی سب سے بڑی جماعت کے نمائندوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض اوقات کابینۂ وزارت پارلیمنٹ کی مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں سے ترکیب پاتا ہے۔ پہلی صورت میں اسے جماعتی حکومت (PARTY GOVT) اور دوسری صورت میں اُسے اتحادی یا مخلوط حکومت (Coalition Govt) کہتے ہیں جیسی کہ آج کل مسٹر بالڈون کی رہنمائی میں قائم ہے۔

کابینۂ وزارت۔ بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان ایک اتحادی رشتہ تسلیم کیا گیا ہے۔ جو پارلیمنٹ کی خواہشات کو بادشاہ تک پہنچاتا ہے اور ان کی منظوری حاصل کرتا ہے۔

چونکہ برطانیہ کے آئین کا ایک بہت بڑا حصہ غیر تحریری ہے اس لئے ہمیں اس کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے کے لئے اُن ابتدائی ارتقائی مراحل کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جو آج بھی دستور برطانیہ کا جزو اعظم بنے ہوئے ہیں۔ برطانیہ کی جمہوری بادشاہت کا آغاز ۱۵ رجون ۱۲۱۵ء سے ہوتا ہے۔ جبکہ بادشاہ جون نے رنی میڈ کے مقام پر "دستاویز اعظم" (magna charta) پر اپنے دستخط ثبت کئے تھے۔ اور اس طرح قوم شاہی جور و استبداد سے ایک بڑی حد تک آزاد ہو گئی تھی۔ اس دستاویز اعظم کی رو سے قوم کو حسب ذیل حقوق حاصل ہوئے۔ جو آج تک حاصل ہیں۔

(۱) زمینداروں اور جاگیرداروں کے حقوق کا تحفظ۔

(۲) لندن اور دیگر شہروں کی تمدنی و سیاسی آزادی۔

(۳) مجلس عظمیٰ (Great Council) کا قیام اور اس کے دستور کی تدوین۔

(۴) کوئی شخص بلا سماعت مقدمہ قید و حراست میں نہیں رکھا جا سکتا۔

(۵) انصاف، فروخت نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نہ اس سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ اُس میں تاخیر کی جا سکتی ہے۔

(۶) کسی شخص پر نہ جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔ نہ اُسے قید کی سزا دی جا سکتی ہے اور نہ اُسے جلاوطن کیا جا سکتا ہے۔ تاوقتیکہ اس کے اپنے رفیق اس قسم کا کوئی فیصلہ نہ کر دیں۔

(۷) رفیق سے مراد وہ شخص ہے جو شخص متعلقہ کے مساوی درجہ کا ہو۔ (اس کا مطلب یہ تھا کہ امراء کے فوجداری مقدمات کا فیصلہ صرف امراء ہی کر سکیں گے۔ یہ دستور ۱۹۳۶ء کی ابتداء تک جاری تھا۔ لیکن اب پارلیمنٹ نے اُسے منسوخ کر دیا ہے)

اس دستاویز اعظم کی تصدیق یکے بعد دیگرے بادشاہوں نے کی اور آج وہ برطانوی قصرِ سیاست کی سب سے مضبوط بنیاد ہے۔

مذکورہ دستاویز کے ماتحت شاہی اختیارات محدود کر دیئے گئے۔ اور عوام کے آزاد حقوق کو تسلیم کر لیا گیا۔

۱۵۳۴ء ہنری ہشتم نے انگریزی کلیسہ کی عنانِ اختیار اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس طرح پادریوں اور مذہبی ٹھیکہ داروں کا زوال شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۵۳۴ء میں انگریزی کلیسہ پاپائے روم کے ہمہ گیر اثر سے آزاد ہوگیا۔ اور اس کی جگہ شاہِ انگلستان نے لے لی۔ اب بادشاہ کو "محافظِ دین" کا خطاب مل گیا۔

شاہ چارلس اول کے قتل کے بعد کروم ویل نے دولتِ مشترکہ کی بنیاد رکھی اور اس طرح جمہوریت کے قدم اور بھی مضبوط ہو گئے۔ گو ۱۶۶۰ء میں بادشاہی بحال ہوگئی۔ لیکن چارلس دوم نام کا بادشاہ تھا۔ تمام بنیادی اختیارات عوام کے نمائندوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکے تھے۔ ۱۶۷۳ء میں کیتھولک عیسائیوں کو تمام سرکاری ملازمتوں سے خارج کر دیا گیا۔ یہ ایک طرح کی مذہبی آزادی تھی۔ اس سے بڑھ کر قدم ۱۶۷۹ء میں اُٹھایا گیا جبکہ قانون حفاظت شخصی (Habeas corpus act) جاری کر کے خلاف قانون نظربندیوں کا قطعی طور پر سدباب کرایا گیا۔ اسی سال میں جماعتی حکومت (پارٹی گورنمنٹ) کا طریقہ جاری ہوا۔

۱۶۸۸ء کے انقلاب نے بادشاہ کے رہے سہے اختیارات کا بھی خاتمہ کر دیا۔ شاہ جیمز ثانی کی ہجرت کے بعد ولیم ثالث تختِ انگلستان کا وارث ہوا۔ لیکن اس کی حیثیت کٹھ پتلی کی سی تھی جو صرف پارلیمنٹ کے اشارے پر نقل و حرکت کر سکتی تھی۔ کیونکہ بادشاہی کا دائرۂ عمل قانون حقوق (Rights Act) کے ماتحت بالکل محدود کر دیا گیا تھا۔

اقتصادی آزادی

۱۷۷۶ء میں امریکہ کی جنگ آزادی نے برطانوی پارلیمنٹ کو ایک نیا اصول اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اور وہ یہ تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ اپنی کسی نوآبادی یا مقبوضہ ملک پر براہِ راست کوئی نیا ٹیکس عاید نہیں کر سکے گی۔ اس اصول کو عام طور پر اقتصادی آزادی کے ارتقا کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۱۸۳۲ء، ۱۸۶۷ء، ۱۸۸۵ء اور ۱۹۱۸ء میں پارلیمنٹ کے دستور میں اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ دارالامراء کے اختیارات نسبتاً کم ہو گئے۔ جب کہ دارالعوام صحیح معنوں میں جمہوری جماعت بن گئی۔

بادشاہ کے اختیارات

بادشاہ کو آئینی طور پر حق استرداد (Right of Veto) حاصل ہے۔ لیکن عملی طور پر بادشاہ اس حق کو استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ پارلیمنٹ و کابینہ وزارت کی پیش کردہ تجاویز و قوانین پر صرف مہر توثیق ثبت کر دیتا ہے۔

پریوی کونسل

ازمنہ ماضی میں پریوی کونسل بادشاہ کے خاص مشیروں (اور بعض حالات میں جاسوسوں اور مخبروں) پر مشتمل ہوتی تھی۔ جو ملکی نظم و نسق میں اس کی امداد کرتی تھی۔ لیکن اب صرف بعض عدالتی مرافعات کی آخری سماعت اور کابینۂ وزارت و پارلیمنٹ کے بعض ہنگامی قوانین کو شاہی فرمان کی صورت میں نافذ کرنے کے لئے منعقد کی جاتی ہے۔ گو اس کے ارکان کی تعداد تین سو سے زائد ہے لیکن ایک بادشاہ کی موت کے بعد دوسرے بادشاہ کی تخت نشینی کا

اعلان کرنے کے علاوہ کسی اور موقع پر تمام ممبران جمع نہیں ہوتے۔ بلکہ صرف چند ممبران بادشاہ کی موجودگی یا عدم موجودگی میں ضروری کارروائی انجام دینے کے لئے کافی سمجھے جاتے ہیں۔

طریق انتخاب

پارلیمنٹ کے ایوان زیریں (دارالعوام) کے ارکان کا انتخاب براہ راست ہوتا ہے۔ ہر بالغ مرد اور ہر بالغ عورت کو رائے دینے اور امیدوار کھڑے ہونے کا حق حاصل ہے۔ چونکہ مخصوص نمائندگی کو دخل نہیں اس لئے ہر حلقۂ انتخاب کو اپنا امیدوار منتخب کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح دارالعوام میں ملک کی رائے عامہ صحیح طور پر منعکس ہوتی ہے۔

ہر دو ایوانوں میں حدفاصل

دارالامراء کو ۱۹۱۱ء سے یہ اختیار حاصل نہیں رہا ہے کہ وہ مسودۂ مالیات میں کوئی ترمیم کردے۔ یا اُسے مسترد کردے۔ اس بارے میں دارالعوام کا فیصلہ ناطق سمجھا جاتا ہے۔ مزید برآں اگر دارالعوام کسی مسودہ قانون کو تین بار منظور کردے تو پھر اُس کے لئے دارالامراء کی منظوری کی ضرورت نہیں ہوگی۔ مسودہ مالیات پر ابتدائی بحث صرف دارالعوام میں ہوسکتی ہے۔ دارالامراء میں نہیں۔ جب کہ دیگر مسودات کسی ایوان میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

سول سروس

برطانوی سول سروس سیاسی اثرات سے بالکل پاک ہے۔ وہ کسی خاص سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتی۔ اس کا فرض یہ ہے کہ وہ کابینۂ وزارت کی جاری کردہ ہدایات اور رائج الوقت قوانین کی پوری پابندی کرے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ برطانوی سول سروس عملی نظم ونسق میں اپنی ذاتی خواہشات یا ذاتی حکمت عملی کو کبھی عملی جامہ نہیں پہناتی۔ اگر سول سروس کا کوئی ممبر ایسا کرے تو وہ فوراً خارج کردیا جاتا ہے۔ لیکن ایسے واقعات شاذونادر ہی ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستانی سول سروس کو "حسب مرضی" اور "حسب ضرورت" اپنی ذاتی رائے کو عملی جامہ پہنانے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ جس کا نتیجہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ مرکزی یا صوبائی مجالس قانون جس غرض وغایت کے ماتحت کوئی قانون نافذ کرتی ہیں وہ سول سروس کے ہاتھوں پوری نہیں ہوتی اور بسا اوقات ایسے قانون کو اپنے ذاتی نقطۂ نگاہ کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ ہے مختصر سا خاکہ برطانوی آئین کا جو جمہوری بادشاہی کی بہترین مثال متصور کیا جاتا ہے۔ آئندہ صحبت میں ہندوستان کے جدید آئین پر روشنی ڈالی جائے گی۔

(باقی دارد)

اے وارثِ دولت و امارت سمجھے
زیبا ہے غریب سے اگر کھنچ کے چلے
مزدور کی شہ پر ہیں آپ جس سے بنے
جب جانیں کہ اس فضا میں تو پیاس نئے

نجم آفندی اکبرآباد

پیامِ کیفیؔ

ملک ہندوستاں کے خاص و عام
آج ہے صاف صاف تم سے کلام

سب اشارے کنائے ختم ہوئے
بے کم و کاست آج کا ہے پیام

میں بھی رکھوں گا اب نہ لاگ لپیٹ
کیونکہ ہر بات اب ہے طشت از بام

آخر ایسے بھی کیا وطیرے ہیں؟
کہ کریں لوگ دُور سے ہی سلام

سننے والوں کی چڑھ گئی تیوری
کان ہیں جب پڑا اتہام انام

کیا نہیں جانتے جو کہتے ہیں
تم کو باہر کے لوگ اور اقوام

یہ کہاوت کبھی سنی تو نہ تھی
بد سے بدتر جہاں میں ہے بدنام

اور جو اس کے ساتھ بد بھی ہو
اس کو کیا دیجئے گا آپ انعام

نہ ہمیشہ کبھی چلے نہ چلیں
چار دن کے ہیں سب یہ چام کے دام

ذاتی غرضیں بھی کر چکے پوری
ہو چکا ہے وطن کا بھی نیلام

جو یہاں ہے وہی ہے شعلہ زباں
جو یہاں ہے وہی ہے برقِ خرام

یہ چلن ہے تو پھر خدا کی پناہ
اس ادا سے ضرور غیر ہو رام

کوئی پھانسی کوئی چھرے سے مرا
کئی گھر ہیں جہاں مچا کہرام

کیا غرض آپ کی بلا جانے
کتنی بیوہ ہوئی ہیں اور ایتام

اس زمانے کا صفحۂ تاریخ
خونِ اخواں سے پا چکا ارقام

تیرا قشقہ کلنک کا ٹیکہ
تیرا بہروپ جامۂ احرام

کر گیا چٹ وہ سر اہنسا کا
کاف لام اس کا ٹھہرا ہے اسلام

شیخ اور برہمن یہ سن رکھیں ہے بُرے کام کا بُرا انجام
بات اب کیا نئی ہوئی پیدا جس پہ یوں باندھنے لگے ہولام
مسجدیں کیا یہاں نہ تھیں پہلے اور سنا تھا نہ چنگ و دف کا نام
یا نہ مندر تھے اور گائے یہاں اور جلوسوں کا بھی نہ تھا اعلام
کیا تھے ہندو ہی ہند و ہند میں سب یا تھے سب ہی مقلدِ اسلام
ہند کے اب بھی چند حصوں میں قوم کی ہے حکومتوں کا نظام
کسی حصے میں تو ہے ہندو راج اور کسی میں ہے شاہیِ اسلام
وہاں رہتی ہے کیونکہ خلق اللہ کیونکہ کرتے ہیں سب وہاں بسرام
نہ یہ جھنجھٹ نہ خرخشے ہیں وہاں شیخ اور برہمن ہیں باآرام
یہاں کیا آگئی ہے یہ شامت ہوگیا ہے جو امن تم پہ حرام
کیا اسی پیسے کی ہے یہ تاثیر قدما جس کو جانتے تھے حرام
وہ فقط اک روایتی ہے گھڑنت اس میں سچائی کا نہیں اوغام
کس شرافت کے یہ عناصر ہیں لاٹھی، خنجر، طمنچہ اور دشنام
کچھ سنا اور جامے سے باھر اتنے احساس کے ہوئے ہو غلام
یہ تمہارا شعار اور اس پر بھر کے منہ حرّیت کا لینا نام
ہاں سوراج آپ کو ملے گا ضرور جو یہی دن ہیں اور یہی صبح و شام
یہاں ہندو ہیں یا مسلماں ہیں ہند ہندی کا اب رہا نہ مقام
وطنیت ہوئی ہے ملک بدر گویا شملہ سے آئے ہیں احکام
جب نہ اپنے کو سمجھیں اہلِ وطن کہاں حُبِّ وطن کرے گا قیام
خارجی بھی ہیں اس کے چند اسباب امن کا جن سے کام ہی ہے تمام
سب سمجھتے ہیں جاننے والے حیف پھنستے ہیں دیکھ بھال کے دام

کہتے ہیں یہ فساد کی جڑ ہے — کونسلوں کا جو ہے جدید نظام
جو نہ ہوتی موافق اس کی زمیں — کیونکہ اس جڑ کو ملتا استحکام
سردی گرمی ہمیشہ آتی ہے — اُن کو ہو ضعفِ معدہ اور زکام
جسم پہلے سے جن کے ہوں کمزور — جن کی صحت میں ہوں چھپے اسقام
نزلۂ عضوِ ضعیف پر ہی گرے — یہ مثل حجتوں کا ہے التام
کچھ ہی اسباب اور بواعث ہوں — اُن سے ہم کو نہیں ذرا بھی کام
اب مرض کا ازالہ واجب ہے — ورنہ پھر قوم کا ہے مرگ انجام
میں کہوں گا اسے سمجھ کا پھیر — جس کو سمجھے ہو گردشِ ایام
کام کرنے کے جو ہیں گر وہ کرو — تو زمانہ بھی ہو تمہارا بکام
ذرا قابو میں رکھو جذبوں کو — اور اپنی زبان کو دو لگام
کر چکے خون بھائیوں کا بہت — کیجئے اب تو تیغ کیں کو نیام
بند اب کیجئے یہ مہابھارت — بھائی بند آ چکے بہت سے کام
کربلا میں لہو کی نہروں سے — کی تھی کیا خوب خدمتِ اسلام
لا کے آلِ رسولؐ پر آفت — کیا سیادت کا میٹ ڈالا نام
کربلا اور کورکشیتر کو اب — وقت ہے دیجئے وداعِ دوام
خلق میں نیکی اور رواداری — ہو نمایاں تو سب مٹیں آلام
دین بھی اس سے سدھرے دنیا بھی — ہر کسی کا ہو دل دھرم کا دھام
ہاتھ اُٹھے تو بس مدد کے لئے — غم و غصہ کو دو جو دو دشنام
یہ وطیرے تھے اُن بزرگوں کے — جن کا لیتے ہو تم ادب سے نام
اب بھی سنبھلو تو کچھ نہیں بگڑا — نہیں پابندِ وقت اچھا کام
اُس کو بھولا ہوا نہیں کہتے — صبح جو جائے اور آئے شام

اس کو مانو نہ مانو ہو مختار
یہی کیفی کا ہے تمہیں پیغام

کیفی (دتاتریہ)

بے کسی میں عشق کا پیغام!

سید حسن ریاض۔ لکھنؤ

شنکر اور مرجیت نے ایک ایک قدم بڑھا کر لکیر پر پیر رکھا اور شنکر نے کہا "وَن ٹو۔ تھری" دونوں دوڑے۔ کنویں کی من تک پہنچتے پہنچتے شنکر مرجیت سے کوئی دو گز آگے ہو گیا۔ کوئیں کی من دوڑ کی حد تھی۔

شنکر نے کہا "ٹوپی اُتار دو" مرجیت نے ٹوپی اتار لی۔ شنکر نے مرجیت کی چاند پر چٹاخ چٹاخ تین چپتیں لگائیں۔ مرجیت نے منہ بنا کر کہا "یار جی اتنے زور سے مارنے کی نہیں ہے" یہ شرط تھی کہ جو دوڑ میں آگے نکلے وہ تین چپتیں لگائے۔ اس طرح تین دوڑیں ہوئیں۔ تینوں دوڑوں میں شنکر ہی جیتا اور ہر دفعہ شرط پوری کی گئی۔

اس کے بعد اونچی کُدائی شروع ہوئی اور یہی شرط اس پر ہوئی۔ اس میں مرجیت کامیاب رہا۔ تین کُدائیاں ہوئیں۔ اُس نے بھی اپنی شرط کی چپتیں وصول کیں۔

شنکر اور مرجیت کا سن اس وقت دس دس گیارہ گیارہ برس کا تھا۔ دونوں چھوٹے چھوٹے زمینداروں کے لڑکے تھے۔ جن کے وہاں کاشت بھی ہوتی تھی۔ دوڑ اور کُدائی ختم ہونے کے بعد دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر چلے گئے۔

ایک روز صبح کو گلّی ڈنڈا ہاتھ میں لئے ہوئے دونوں جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ شنکر جیب سے نکال نکال کر کچھ کھا رہا تھا۔ مرجیت نے پوچھا۔

"ابے کیا کھا رہا ہے؟" شنکر نے مٹھی بھر کر مونگ پھلیاں نکالیں اور بولا۔ "مزے مونگ پھلیاں ہیں" مرجیت نے مونگ پھلیاں لے کر کہا "ہیں؟ اچھا جیب دکھاؤ، ہیں کتنی؟" مرجیت نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ شنکر قہقہہ لگا کر پیچھے ہٹ گیا "ابے ہٹ، کُرتا پھٹ جائیگا، اور دیتا ہوں"

شنکر نے دونوں جیبوں سے مونگ پھلیاں نکالیں، دو تل کے لڈو نکالے، ایمان داری سے مونگ پھلیاں آدھی آدھی کیں، ایک لڈو اور آدھی مونگ پھلیاں مرجیت کو دے دیں۔ دونوں مونگ پھلیاں اور لڈو کھاتے ہوئے آگے بڑھے۔ میدان آگیا۔ شنکر نے گلی زمین پر ڈال کر ایک ٹُلّا لگایا۔ دونوں گلّی کی طرف دوڑے۔ کھیل شروع ہو گیا۔

تیرہویں برس دونوں میں فراق ہوا۔ فراق اس دنیا کا معمول؛ مگر پہلا فراق کھیل کے یاروں کا چھٹنا۔ بڑے بڑے رُوح فرسا فراقوں کا دیباچہ۔ مرجیت کو شنکر کے جانے سے بڑی تکلیف ہوئی۔ کھیل کے یار اور بھی بہت تھے۔ مگر ان دونوں کا ساتھ ہر وقت کا ساتھ تھا۔ مرجیت اکیلا سا ہو گیا۔ اب اس کے خاص کھیلوں اور تفریحوں کے منصوبے شنکر کی تعطیلوں پر منحصر رہنے لگے۔

شنکر جب آتا اور شہر کے اور اسکول کے قصّے سناتا، اپنے مدرسے کے دوستوں کی باتیں کرتا تو مرجیت کو یہ پرستان کی باتیں معلوم ہوتیں۔ وہ حیرت اور استعجاب سے سنتا۔ اور اُس کے دل میں تمنّا پیدا ہوتیں "کاش میں

بھی شنکر کے ساتھ پڑھنے جاتا! کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، اچھے اچھے کپڑے وہ خیال میں ان سب کا نقشہ بناتا۔ اور اس میں اپنے آپ کو دوڑتا بھاگتا، ہنستا کھیلتا اور بلکہ لگاتا ہوا تصور کرتا۔ چھوٹے دل پہ ان تفریحوں سے محرومی کا بڑا قلق تھا۔ مگر مرجیت کا باپ بہت ہی پرانی وضع کا بہت چھوٹا سا زمیندار تھا۔ بسر زمینداری کی آمدنی پر نہیں بلکہ کاشت پر تھی۔ مرجیت نے لاکھ ضدیں کیں کہ ہم بھی شنکر کے ساتھ پڑھنے جائیں گے۔ مگر باپ نے توجہ نہ کی۔

~~~~~~~~~~

جب مرجیت اور شنکر سترہ سترہ اٹھارہ اٹھارہ سال کے ہوئے تو مرجیت کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب واقع ہوا۔ وجیہ گڑھ کے زمیندار راجہ مادھو سنگھ کا انتقال ہوا۔ راجہ مادھو سنگھ بہت بڑے زمیندار تھے۔ پانچ لاکھ کا منافع۔ خزانے میں بے قیاس چاندی اور سونا۔ اُن کے ہاں کے جواہر پر بڑے بڑے امراء کو رشک تھا۔ ساٹھ برس جیئے مگر اولاد کوئی نہ ہوئی۔ تین رانیاں چھوڑیں۔ وصیت نامہ جو دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ مرجیت سنگھ پسر نرپت سنگھ کو راجہ نے متبنہ کرکے اپنا جانشین قرار دیا ہے۔

~~~~~~~~~~

مادھو سنگھ اور نرپت سنگھ ایک خاندان سے اور ایک ہی دادا کی اولاد میں تھے۔ مگر دونوں شاخیں اتنی دُور سے الگ ہوئی تھیں کہ ان دونوں امیر اور غریب گھروں میں یہ رشتہ محض افسانے کے طور پر یاد رہ گیا تھا۔ نرپت سنگھ کو کبھی راجہ مادھو سنگھ سے ملنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن جب راجہ مادھو سنگھ اس جنگل میں شکار کو آتے تو مرجیت ان کے لشکریوں میں شریک ہو جاتا۔ وہ شکار کا جوش و خروش مرجیت کو بہت پسند تھا۔ بس ایک کھیل کے طور پر۔

راجہ نے اپنے آدمیوں میں اس کو اکثر دیکھا۔ خوبصورت۔ قوی ہیکل، ہنس مکھ، ایک مرتبہ راجہ نے پوچھا یہ کون لڑکا ہے۔ کسی نے بتایا کہ نرائن پور کے ٹھاکر نرپت سنگھ کا بیٹا ہے۔

راجہ نے اس کو اپنے پاس بلایا۔ مرجیت نے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔

راجہ نے پوچھا "نام کیا ہے؟" اس نے کہا "مرجیت سنگھ"

راجہ نے بزرگانہ انداز سے مسکرا کر کہا "نام تو بہت اچھا ہے۔ بندوق چلانی آتی ہے؟"

مرجیت نے کہا "تھوڑی تھوڑی آتی ہے۔ میرے پاس بندوق نہیں ہے۔"

راجہ نے ذرا متانت سے کہا "تمہارے لئے بندوقیں بہت ہیں۔" مگر مرجیت کی سمجھ میں اس وقت اس فقرے کے معنی نہیں آئے۔ اُس نے سوچا بھی نہیں۔ اس واقعے کے بعد سے یہ دستور ہو گیا کہ مادھو سنگھ جب شکار میں آتے پہلے سے مرجیت کو اطلاع کرا دیتے۔ اور اپنے ساتھ رکھکر اس کو شکار کھلاتے۔ مرجیت بلاتکلف اُن کی ہر بندوق استعمال کرتا۔

مگر نرپت سنگھ نے اس طرزِ عمل کو محض راجہ کی بزرگانہ دلچسپی سمجھا۔ یہ اُس کے ذہن میں کبھی نہ آیا تھا کہ راجہ مادھو سنگھ کو مرجیت اس قدر پسند ہے کہ وہ اُسے اپنا جانشین بنائیں گے۔ یہ بالکل خلاف توقع ہوا۔

~~~~~~~~~~

جس وقت مرجیت کے گھر اطلاع پہنچی سب متحیر رہ گئے۔ حیرت اور مسرت کا اشتراک۔ سب گھبراہٹ میں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مسرت کا اظہار کس طرح کرے۔

دوپہر تک کارپردازانِ ریاست نرائن پور آ گئے اور بڑے شاندار جلوس کے ساتھ مرجیت کو وجیہ گڑھ لے گئے۔ نرپت سنگھ گاؤں کی سرحد تک بیٹے کے ساتھ گیا۔ اور ماں چھت پر چڑھ کر اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ نظر آیا۔

~~~~~~~~~~

مرجیت کی زندگی اب نئی پرواز پر شروع ہو گئی۔ اختیارات ابھی نہیں ملے۔ عمر ۲۱ سال سے کم تھی۔ علاقے کا انتظام کورٹ آف وارڈس کے سپرد ہوا۔ مرجیت کی تربیت شروع ہو گئی۔ اتالیق اور استاد مقرر ہو گئے۔ شکار، گھوڑے کی سواری، ٹینس، کرکٹ یہ روز کی تفریحات تھیں۔ دو ہزار روپیہ جیب خرچ مقرر ہوا۔

تھوڑے ہی دن میں مرجیت کا مزاج بدل گیا، عادتیں بدل گئیں۔ وجیہ گڑھ کی بڑی ریاست کو وہ اب ایسا سمجھتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے اسی کی ہے۔ اور وہ اس کا مالک ہی پیدا ہوا ہے۔ ماں کے بڑے تقاضوں سے دو برس

میں ایک مرتبہ نرائن پور گیا۔ اُس کی ماں کے کپڑوں میں بُو آئی۔ جھونپڑے کے گھر میں اُس کا دم گھٹا۔ پلنگ پر بیٹھنے سے قبل اُس نے دو مرتبہ اس پر ہاتھ مارا کہ گرد جھڑ جائے۔ اُس کو اپنی رشتیں برجس کا خیال تھا۔ ماں نثار اور قربان ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ کم از کم ایک دن اور رات مرجیت کو ٹھہرائے۔ مگر مرجیت کو وحشت ہو رہی تھی۔ اس نے ماں سے یہ تو کہا کہ "تم میرے ساتھ آ کر چلو" مگر ٹھہرا نہیں۔ دو گھنٹے کے اندر ہی واپس چلا گیا۔

~~~~~~

شنکر نے جب یہ سنا کہ راجہ مادھو سنگھ نے اس طرح مرجیت کو اپنا جانشین قرار دیا تو اس کو واقعی بڑی مسرت ہوئی۔ اس نے بڑے جوش سے مرجیت کو مبارکباد کا خط لکھا اور ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔

وہ خوش ہو ہو کر اپنے دوستوں سے مرجیت کا ذکر کرتا اور فرصت کے اوقات میں یہ منصوبے باندھتا کہ پاس ہو گیا تو مرجیت کے ہاں پندرہ روز رہوں گا۔ خوب تفریح کروں گا۔ مگر اتفاق کی بات کچھ ایسی صورتیں نکلتی رہیں کہ شنکر کا وہاں جانا نہ ہوا۔ ارادہ ہی کرتے کرتے برس گزر گئے۔ شنکر مرجیت کو خطوط لکھتا تھا اور مرجیت اُن کا جواب دیدیتا تھا۔ مرجیت نے نہ کبھی شنکر کو بلایا نہ خط لکھنے میں کبھی اپنی طرف سے پیش قدمی کی۔

اس دوران میں شنکر نے یہ بھی سنا کہ مرجیت بڑا متکبر ہو گیا ہے۔ اس کا مزاج بالکل بدل گیا ہے۔ خود مرجیت کے باپ سے اس کی شکایت سنی "ارے بھئی وہ تو مجھے اب اپنا باپ کہتے ہوئے شرماتا ہے۔ وہ ماں رو رو کر جان دے دیتی ہے۔ اس کو ماں کا بھی خیال نہیں کبتا ہے کہ وجہ گڈھ آ جاؤ۔ ہم کیوں وجہ گڈھ جانے لگے تھے۔ ہم اپنے اسی جھونپڑے میں خوش ہیں"

مرجیت کے متعلق یہ باتیں سن کر شنکر کو بڑا قلق ہوا "بڑا کم ظرف نکلا، دولت آنی جانی چیز ہے۔ اس کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ دماغ ہی الٹ گیا۔ نرپت سنگھ کے گھر میں نہ پیدا ہوا ہوتا، تو راجہ مادھو سنگھ اس کو کیوں گود لیتے۔ ملے ذرا تو مزاج درست کروں گا" اب شنکر کو بھی اس کا خیال آنے لگا کہ "میں نے بار بار وجہ گڈھ جانے کے لئے لکھا۔ اتفاق سے نہ جا سکا۔ مگر اس نے اس پر بھی کبھی اتنا نہ لکھا کہ ضرور آؤ، میرا بھی ملنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر وہ مجھے کبھی اپنی طرف سے خط بھی نہیں لکھتا"

اسی میں مرجیت کی مسند نشینی کا زمانہ بھی آ گیا۔ شنکر کو توقع تھی کہ اس موقع پر مرجیت اس کو ضرور بلائے گا۔ وہ جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ مگر شنکر کے پاس خط نہ آیا۔ اس پر شنکر کو اپنے دوستوں میں بڑی ندامت ہوئی۔ اس نے مرجیت کو سخت شکایت کا خط لکھا۔

مرجیت نے بہت ہی مختصر جواب دیا "اس تقریب کے اہتمام میں مجھے کوئی دخل نہیں تھا۔ منیجر ریاست نے صاحب کلکٹر کے مشورے سے جن لوگوں کو مناسب سمجھا بلا لیا"

~~~~~~

اس واقعے کو بھی ایک عرصہ گزر گیا۔ شنکر کو بھی کچھ ضد سی آ گئی "جب اسی کو اپنی ریاست پر اتنا غرور ہے تو مجھے بھی کیا ضرورت ہے کہ اس کے پاس دوڑتا ہوا جاؤں، کوئی اس کا محتاج ہوں۔ مادھو سنگھ نے گود نہ لیا ہوتا تو ہل جوتتا۔ کوئی ذاتی ہنر بھی ہے"

~~~~~~

شنکر قانون پاس کر کے وکالت کرنے لگا اور فرصت کے اوقات میں کچھ پبلک کام۔ اس کو جلد سب لوگ جان گئے۔ مرجیت کے ہاں پارٹیوں اور حکام کی دعوتوں کا مشغلہ تھا وہ اس سلسلے میں مشہور ہوا۔ مگر زمیندار کی حیثیت سے لوگ اُسے جابر کہتے تھے۔ وہ اپنی ان دلچسپیوں کے اخراجات جرمانوں کی مد سے وصول کرتا تھا۔ اس لئے جرمانے خواہ مخواہ کئے جاتے تھے۔ راجہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ریاست کے ملازموں میں یہ مقابلہ رہتا تھا کہ کس کے حلقے میں جرمانوں کی رقم زیادہ وصول ہوئی۔

شنکر یہ قصے سنتا تھا اور جلتا تھا "کہیں اتفاق سے مل جائے تو درست کر دوں"

~~~~~~

ہنسیا، نرائن پور کے متصل ایک اوسط درجے کا گاؤں تھا۔ یہاں بڑی اعلیٰ ذات کے ٹھاکر آباد تھے۔ روایت یہ تھی کہ اصل مالک کسی زمانے میں وجہ گڈھ کے یہی لوگ تھے۔ مگر اب صرف کاشتکار رہ گئے تھے۔ اور وجہ گڈھ

کی رعایا تھے۔ نرائن گڈھ سے ان لوگوں کے بڑے تعلقات تھے۔

ساہو کی فصل کٹ چکی تھی۔ کسی طرح کھلیانوں میں آگ لگی۔ کھلیان آبادی سے بالکل متصل تھے۔ کھلیان اور ہنسیا کے تمام خس پوش مکانات جل گئے۔ سب ہی مکانات خس پوش تھے۔ گاؤں کے لوگ پریشان حال مرجیت کے باپ کے پاس آئے۔ اس روز اتفاق سے شنکر بھی نرائن پور ہی میں تھا۔ اس کو بھی لوگوں نے گھیرا کہ راجہ صاحب سے سفارش کرکے ہمارا اس ششماہی کا لگان معاف کرادو اور تقاوی دلوادو تاکہ ہم پھر سے اپنا کاروبار شروع کرنے کے قابل ہو جائیں۔

شنکر گاؤں کی حالت دیکھنے کے لئے خود ہنسیا گیا۔ اس کا تو یہ کام ہی تھا۔ واقعی سارا گاؤں تباہ ہو گیا تھا۔ جو کپڑے تن پر تھے ان کے سوا لوگوں کے پاس کچھ نہ رہا تھا۔ گاؤں کی عورتوں نے آکر شنکر کو گھیر لیا۔ سب دکھی بھالی تھیں۔ سب سے یگانگی کے تعلقات تھے۔ شنکر اور مرجیت ساتھ اُن کے گھروں میں کھیلے تھے۔ اُن کی مصیبت اور بربادی کو دیکھکر شنکر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے اُن سے کہا "مرجیت ایسا بھی کیا قصائی ہو گیا ہے۔ وہ ضرور خیال کرے گا گاؤں کے دس پانچ آدمی پہلے اس کے پاس جائیں اور اس سے سب حال بیان کریں۔ یہاں آکر گاؤں کی حالت دیکھنے پر آمادہ کریں۔ پھر میں بھگت لوں گا۔ وجے گڈھ میں نہیں جاؤں گا۔"

~~~~~~~~~~

ہنسیا کے سربرآوردہ کاشتکار وجے گڈھ گئے۔ دو دن پڑے رہے۔ راجہ صاحب کے سلام کی بھی نوبت نہ آئی۔ نائب ریاست کے ذریعے سے صرف یہ کہلوا دیا "ہم لگان نہیں چھوڑ سکتے۔ آگ ہم نے نہیں لگائی ہے۔ تقاوی ہم نہیں دیں گے۔ ریاست کے خزانہ میں روپیہ نہیں ہے۔"

~~~~~~~~~~

لوگ روتے ہوئے واپس چلے آئے اور شنکر سے آکر سب حال بیان کیا۔ شنکر غصے کے مارے سرخ ہو گیا۔ جو گالیاں زبان پر آئیں وہ اس نے مرجیت کو دیں اور ہنسیا کے کاشتکاروں سے کہا "تم اطمینان رکھو۔ میں ہی تمہارا انتظام کرتا ہوں۔"

شنکر نے دو چار روز سخت محنت کی۔ دن رات گھوڑے کی پیٹھ پر رہا۔ قرب جوار کے باا ثر لوگوں کو جمع کرکے ایک جلسہ کیا اور ان کے سامنے ہنسیا کے لوگوں کی مصیبت کا حال بیان کیا۔ راجہ وجے گڈھ کی سنگدلی کا تذکرہ کیا اور بیس ہزار روپے کے چندے کی اپیل کی۔ شنکر کو یہ کام کرنے خوب آگئے تھے۔ وہ تقریر بڑی اثر دار رکھتا تھا۔ تقریر میں اثر کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اسے حاصل تھی۔ یعنی اس کی زبان اس کے دل کی سچی ترجمان تھی۔ وہ جو واقعی محسوس کرتا تھا وہی کہتا تھا۔ اور جو کہتا تھا اس کے کرنے کا پہلے عزم کر لیتا تھا۔ اس چندے میں سب سے پہلے شنکر نے پانسو روپے دئے۔ اپنی حیثیت سے بہت زیادہ۔ اس کے بعد اوروں نے دئے۔ اسی جلسے میں کوئی تین ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ بقیہ رقم کی تحصیل کے لئے معتبر لوگ ذمہ دار ہو گئے۔ شنکر نے سرمایہ کی فراہمی اور اس کے خرچ کا انتظام درست رکھنے کے لئے ایک دفتر قایم کر دیا۔ ہنسیا میں مصیبت زدوں کے لئے عارضی جھونپڑیاں ڈلوانے کا کام شروع کیا۔ کھانے اور کپڑے کی تقسیم کے لئے ہنسیا میں ایک بھنڈار قایم کیا۔ ہنسیا کے جتنے نوجوان تھے شنکر کی نگرانی میں رضاکارانہ خدمت انجام دینے لگے۔ نرائن پور کے نوجوان بھی اُن کا ہاتھ بٹانے کے لئے آگئے۔ شنکر نے خود اپنے لئے بھی وہیں ہنسیا میں ایک جھونپڑی ڈلوائی، وہیں رہنے لگا۔ اپنے پیشے کا کام بھی سردست ترک کر دیا۔

اس دوران میں شنکر کلکٹر ضلع سے بھی ملا۔ اس نے ہنسیا کی بربادی کا اور مرجیت کی سختی کا اس سے ایسے مؤثر انداز میں ذکر کیا کہ کلکٹر نے خود بنفس نفیس گاؤں کی حالت دیکھنے کے لئے آنے کا وعدہ کیا۔ اور راجہ وجے گڈھ کو بھی لکھدیا کہ تاریخ مقررہ پر وہ ہنسیا آجائیں۔

اب راجہ صاحب کیوں نہ تشریف لاتے۔ ریاست کی طرف سے خیمے ڈیرے۔ رسد۔ کلکٹر کے لئے ہر قسم کی راحت کا انتظام ہو گیا۔ شنکر وہیں موجود تھا۔ جس وقت صاحب کلکٹر اور مرجیت گھوڑوں پر سوار آئے۔ شنکر ہنسیا کے لوگوں کو لے کر اُن کے استقبال کے لئے جھونپڑیوں کے عارضی کیمپ سے باہر نکلا اس نے بڑھ کر کلکٹر سے ہاتھ ملایا۔ اور پھر مرجیت کی طرف مڑکر طعن سے بولا۔ "راجہ صاحب مزاج اچھا ہے۔ یہ آپ نے کیسے تکلیف فرمائی"

مرجیت شنکر کے یہ بُرے تیور دیکھکر سہم گیا۔ شاید مرجیت اس وقت

اس سے بڑی خصوصیت سے ملتا۔ مگر شنکر ہی نے اعتنا نہ کیا۔ وہ صرف کلکٹر سے مخاطب رہا۔

گاؤں کی حالت کا مفصل معائنہ کرانے کے بعد اس نے نقصانات کی وہ فہرست پڑھنی شروع کی جو اس نے بڑی احتیاط سے بنائی تھی۔ ایک گاؤں کے لئے وہ بہت بڑا نقصان تھا۔ اس نقصان کی مقدار کم ہو یا زیادہ حالت اب یہ تھی کہ کسی کے پاس ایک وقت کے لئے کھانے کو نہ تھا۔ اور دوسرا کپڑا بدلنے کو نہ تھا۔ گاؤں کے مویشی بھی اکثر آگ سے مر گئے تھے۔

رپورٹ پڑھنے کے بعد شنکر نے صاحب کلکٹر سے کہا " یہ گاؤں راجہ صاحب وجیہ گڈھ کی زمینداری میں ہے۔ یہ لوگ اُن کی رعایا ہیں۔ لہٰذا میں ان کی طرف سے اور اُن کا نمائندہ بن کر کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ لیکن عوام کے خادم اور اُن کا پڑوسی ہونے کی بنا پر مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ لوگ بالکل تباہ ہو گئے ہیں اور اس امداد کے ساتھ جو میں اپنے اور اُن کے ہمسایوں کی فیاضی سے اُن کے لئے حاصل کر سکا ہوں۔ یہ لوگ بمشکل تین برس میں اپنے کاروبار کو بحال کرنے کے قابل ہوں گے اور وہ بھی اس صورت سے کہ گورنمنٹ سے ان کو بقدر ضرورت تقاوی ملے۔ راجہ صاحب وجیہ گڈھ جو آپ کی برابر کھڑے ہیں، کسی قسم کی امداد دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ انکار کر چکے ہیں۔ حالانکہ خصوصیت سے اس گاؤں کے ان پر بڑے حقوق ہیں۔ ان کا وطن یہ نرائن پور ہے، جہاں کا میں رہنے والا ہوں۔ میرا اور ان کا بچپن ساتھ گذرا ہے، اس مجمع میں اکثر مرد اور عورتیں وہ ہیں جو ہمارے ساتھ کھیلے ہیں۔ یہاں وہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں بھی موجود ہیں۔ جنھوں نے مجھ پر اور ان راجہ صاحب پر۔ جب یہ صرف مرجیت اور نرائن پور کے ٹھاکر نرپت سنگھ کے بیٹے تھے۔ جو اب تک کاشتکاری کرتے ہیں اور جنھیں اب بھی اپنے ہاتھ سے ہل چلانے میں عار نہیں ہے شفقتیں کی ہیں۔ نہیں، جنھوں نے ہماری طفلانہ شرارتوں پر ہمارے کان بھی کھینچے ہیں۔ جب دوپہر کو ہمیں یہاں کھیل میں دیر ہو جاتی۔ یا دوپہر کو آتے اور ہمیں یہیں تیسرا پہر ہوتا تو ہم ان کے ہاں دودھ، مٹھا اور جوار کی روٹیاں کھاتے تھے " اس موقع پر مرجیت کی طرف دیکھکر شنکر نے بے ساختہ کہا۔ کیوں راجہ صاحب یاد ہے نا۔ مرجیت کے لبوں کو حرکت ہوئی، مگر آواز نہ نکلی شنکر نے مسکرا کر پھر بولنا شروع کیا۔ ہنسیا کے لوگوں کی گذشتہ خوش حالی، مرجیت کے خاندان سے ان کے تعلقات ایک ایک بات اُس نے تفصیل سے بیان کی۔ کچھ مرجیت کی مخالفت سے نہیں بلکہ اہلِ ہنسیا کی مصیبت سے وہ متاثر ہی اس قدر تھا کہ یہ سب باتیں از خود اس کی زبان سے نکل رہی تھیں گاؤں کے نوجوان منہ پھیر پھیر کر ہنس رہے تھے۔ بوڑھے رو رہے تھے اور شنکر بکتا ہی چلا جاتا تھا۔

شنکر خاموش ہوا تو گاؤں والوں نے کلکٹر کے پیر پکڑ لئے۔ کلکٹر شنکر کی تقریر ہی سے کافی متاثر تھا۔ اس نے ایک سال کا پورا اور ایک سال کا نصف لگان معاف کر دیا۔ اور تقاوی دینے کا وعدہ کر لیا۔

مرجیت اور کلکٹر گھوڑوں پر سوار ہو کر چلے گئے اور ہنسیا کے مرد اور عورتوں نے شنکر کی جے کا نعرہ مارا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے۔ شنکر یہ دیکھنے کے لئے رات کے کھانے کا انتظام رضاکاروں نے اچھا کیا یا نہیں ان جھونپڑیوں کی طرف چلا، جہاں اُس نے سامان خوراک کا بھنڈار قایم کیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک جوان لڑکی اپنے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی ایک طرف تنہا جا رہی ہے۔ چال ڈھال سے شناسا معلوم ہوئی وہ بڑھ کر اس کے قریب گیا۔ کون سرلا، اُس نے مڑ کر دیکھا۔ سرلا ہی تھی۔ شنکر نے نرمی سے کہا۔ کیوں؟ رو کیوں رہی ہے؟

سرلا نے کہا " شنکر تو نے دیکھا میں مرجیت کے پاس گئی وہ منہ سے بھی نہ بولا۔ اس نے میری طرف سے دور سے پیٹھ پھیر لی۔ میں کیا اس سے کچھ مانگنے گئی تھی؟

شنکر کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ یہ سادہ الفاظ، مگر ان آنسوؤں کے ساتھ جو واقعی سرلا کے دل کا خون تھے۔ ایک نوحہ بن گئے۔ شنکر کو یاد آگیا۔ مرجیت نے اپنے عہدِ دہقانیت میں اس سے ذکر کیا تھا۔

شنکر آگے بڑھا اور برادرانہ شفقت سے وہ سرلا کے کاندھے پر ہاتھ رکھکر بولا۔ " باؤلی یہ وہ مرجیت نہیں ہے، اب تو وہ راجہ ہے۔ امیر اور غریب کی کیا محبت تو ابھی اُنھیں باتوں کو ڈھونڈھ رہی ہے "

سرلا اور بھی بے قرار ہو کر رونے لگی۔ شنکر کی شفقت آمیز تشفیوں سے

اس کا دل بھر آیا۔ شنکر نے جیب سے رومال نکال کر سرلا کے آنسو پونچھے اور اس کو تسکین دینے لگا۔

مدجیت کی طرح شنکر بھی بچپن سے سرلا کے ساتھ کھیلتا تھا۔ مدجیت اور شنکر جب بنسیا آتے تو سرلا سارے سارے دن انھیں کے ساتھ رہتی۔ تینوں کمسن تھے۔ سرلا کی عمر ان دونوں سے بھی کم تھی۔ مدجیت اور شنکر کی سب سے زیادہ خاطر سرلا ہی کے وہاں ہوتی تھی۔ سرلا کا باپ تمول کاشتکار تھا۔ شنکر اور مدجیت کے خاندان سے اس کے بڑے تعلقات تھے۔ راٹھور ٹھاکر تھا۔ نرائن پور کے ٹھاکروں سے بھی ذات میں اونچا۔ سرلا نے بڑی بے کسی سے کہا "شنکر اب ہم کیا کریں گے۔ باپ نے سات ہزار روپے کے نوٹ چھوڑے تھے وہ سب جل گئے" یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

سرلا بڑی خوبصورت اور بڑی تندرست تھی۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ کچھ سنہری سا۔ بڑی سیاہ ہرنی کی سی آنکھیں، اونچی پیشانی، کمان سی بھویں۔ لمبی خمدار پلکیں۔ کچھ قدرتی کاجل سا لگا ہوا۔ اب جو ہر دفعہ ہاتھ اونچا کر کرکے اس نے بار بار آنسو پونچھے تو شانے سے کلائی تک شنکر نے اس کے ہاتھ کو استعجاب سے دیکھا۔ کس قدر خوبصورت۔ گداز، سڈول۔ کسا ہوا۔ شنکر نے اب سر سے پیر تک اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ تو ایک پیکر زیبا تھا۔ جسے دیکھنے کی مصور اور صنم ساز تمنا کریں۔

شنکر نے سرلا کو پہلے بھی بارہا دیکھا تھا مگر اس وقت نہ شنکر کا دل بیدار تھا اور نہ سرلا کا حسن۔ یہاں آنکھیں نہ تھیں وہاں یہ زینتیں نہ تھیں۔ بچپن کی آنکھوں سے ایک کھیل کے رفیق کے سوا شنکر کو اور کچھ نظر نہ آیا تھا۔ تیرہ ہی برس کا تو سن تھا جو شنکر پڑھنے چلا گیا اور سرلا اس وقت ۹ برس کی تھی۔ اتنے دن کے بعد آج دیکھا۔ شنکر کے دل میں عشق چونک پڑا۔ سرلا کے لاابالی حسن نے اُسے اچانک جگا دیا۔ شنکر نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا "سرلا تو مدجیت سے اُس کی بے مروتی کا بدلہ لے گی؟"

سرلا نے آنکھیں پھاڑ کر شنکر کی طرف دیکھا "میں! مدجیت سے بدلا لوں گی؟ کس برتے پر، وہ راجہ، میں اُس کے رعیت کسان کی بیٹی، اور اب تو وہ کنٹی بھی نہ رہی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو اُمنڈ کر آئے۔

ایک ہاتھ سرلا کے گلے میں ڈال کر شنکر نے دوسرے ہاتھ سے اُس کے پھر آنسو پونچھے۔ اور بولا "سرلا میں جو ہوں"

سرلا نے شنکر کے کاندھے پر سر رکھ دیا اور دونوں ہاتھ گلے میں ڈال دیے۔ مگر سادگی سے۔ اپنی مصیبت میں اُس کو شنکر کے جذبات سمجھنے کی بالکل فرصت نہ تھی۔ مصیبت زدہ کا ہاتھ محسن کے گلے میں۔ اُجڑی ہوئی۔ بے کس و ناچار سرلا کا سر بچپن کے رفیق شنکر کے کاندھے پر۔ ہچکیاں اور سسکیاں لے لے کر اس نے شکستہ آواز میں کہا۔ "تو اکیلا کس کس کی مصیبت ٹالے گا۔ اور کہاں تک"

شنکر نے سرلا کے نرم پریشان بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر کمر کو تھپک کر بولا "نہیں سرلا میں تیرا ساتھ دوں گا اور آخر دم تک"

سرلا ابھی یوں ہی اُس کے گلے سے لپٹی ہوئی رو رہی تھی۔ شنکر نے دونوں ہاتھ اس کے گرد حلقہ کئے آہستہ سے دبایا اور یہ کہہ کر چلنے لگا "آ اب بڑھیا کی خبر لیں، وہ اکیلی جانے کس حال میں ہوگی"

سرلا جو اب تک نہ سمجھی تھی، شنکر کی اس ایک حرکت سے سمجھ گئی۔ اُس کے دل کی دنیا پھر آباد ہونے لگی۔ اس کے جذبات میں ایک خوشگوار تحریک پیدا ہوئی۔ اور بڑھ کر وہ طغیانی اور تلاطم بننے لگی۔ وہ لڑکپن کا خیال تھا اور یہ جوانی کا میلان ہے اس نے آج ہی شام دونوں کو بالمقابل دیکھا تھا۔ شنکر مدجیت سے زیادہ خوش رو، وجیہہ اور رعنا معلوم ہو رہا تھا اور واقعی تھا بھی۔ وہ پانچ فٹ گیارہ انچ کا قد، چھریرا جسم۔ دھوپ سا گورا رنگ، فاتحانہ چتونیں۔ وہ ایک مرتبہ جوش تقریر میں گھنی چوڑی بل کھائی ہوئی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر مردانہ اعتماد سے صاحب کلکٹر سے یہ کہہ دیتا تھا "میں آپ کو آپ کے فرض کی طرف متوجہ کر رہا ہوں ورنہ یہ نہیں ہے کہ سرکاری امداد بغیر بنسیا پھر آباد نہ ہوگا۔ اور ان لوگوں کی حالت بحال نہ ہوگی" وہ لوگوں کی مصائب اور پریشانی کا ذکر کرتے وقت اس کی آنکھوں کا نم ہو جانا، سرلا کچھ اور طرح پہلے ہی شنکر سے متاثر تھی اب جو اسی کی طرف سے پیغام عشق ملا تو اُس کے دل میں ایک اُمنگ پیدا ہو گئی۔

وہ شنکر کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی اگر اس وقت شنکر پلٹ کر دیکھتا تو دل پکڑ لیتا وہ جوان ہتھنی کی طرح جھک جھک، جھک جھک جھوم جھوم کر چل رہی تھی۔

"میں جو ہوں! میں تیرا ساتھ دوں گا۔ آخر دم تک" یہ جملے اس کو یاد آئے کانوں میں گونجنے لگے۔ ان میں ساون کے ملار کا سا لوچ اور اثر پیدا ہو گیا۔

طوفانِ شہر

پھر حُسنِ یار مائلِ اظہار ہو گیا — ہر ذرّہ ایک مصر کا بازار ہو گیا
پھر زلف یوں کھُلی کہ دل و دیدۂ جہاں — زنجیرِ رنگ و بُو میں گرفتار ہو گیا
خوابیدہ بختیوں کا ستایا ہوا فراق — پھر روشناسِ دولتِ بیدار ہو گیا
پھر جلوۂ نگار بنا میرِ انجمن — پھر حُسنِ یار قافلہ سالار ہو گیا
پھر موتیوں کو گوشِ وفا رولنے لگا — پھر لعلِ گل فروشِ گہر بار ہو گیا
پھر تابشِ تبسمِ جاناں کے سامنے — کھِلنا کلی کو باغ میں دشوار ہو گیا
پھر کم نگاہیوں کو ملی رخصتِ نظر — پھر نازِ التفات پہ طیار ہو گیا
پھر تولنے لگا خمِ گردوں متاعِ ناز — پھر لوچ شاخِ نرم کا تلوار ہو گیا
وہ خونِ دل کہ سرد تھا نبضِ حیات میں — پھر آشنائے گرمیٔ رفتار ہو گیا
خلوت سے انجمن میں در آتے ہیں وہ نگار — طوفانِ شہر فتنۂ بازار ہو گیا

آواز دو کہ جوشؔ بہ فیضِ شرابِ ناب
ساقی کی مرحمت کا سزاوار ہو گیا

جوش ملیح آبادی

ہندوستانی!

ایک خوبصورتی ہے کہ پژمردہ، اک شباب ہے کہ مضمحل، اک جوانی ہے کہ ڈھلی ہوئی۔

یہ ہے اس ہندی جوان کا سراپائے حیات، جو اپنے شاندار ماضی کے روشن کارناموں اور فتح یابیوں کے تصور سے ضرورت پر اشک بہاتا ہے اور جو حال کی کلفتوں اور مصیبتوں کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرنے سے اک بزدل کی طرح جھجکتا ہے جس نے اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کے بجائے اس کو اپنی تدبیروں اور سعی پیہم سے بے نیاز کر کے تقدیرِ بے سعی کے ہاتھوں میں چھوڑ رکھا ہے۔

وہ فکرِ بلند اور علوئے تخیل سے بے پروا اظہارِ بیان کی آزادی کی خاطر بھی کچھ نہیں کرتا۔ ہاں مذہب کے اپنے ہی بنائے اور تبدیل کر دینے والے راستوں پر دوسروں کو زبردستی چلانے کے لئے ان سے لڑنے اور اُن کا خون بہانے سے بھی اس کو دریغ نہیں ہوتا۔ اس کے خیالات اپنی ہی تنگ تاریکیوں تک محدود ہیں یا کر دئے جاتے ہیں۔

اپنے ہی ملکی بھائیوں کی کاٹ کرنا اُسے آتا ہے لیکن سماج میں اک طرح نو ڈالنے کی اُسے جرأت نہیں ہوتی۔

〰〰〰〰〰〰〰〰〰〰

نزاکتِ مجسم، حسن و رعنائی، ناز و محبوبی کا اک پیکرِ لطیف، اپنے برق پاش تبسم سے کائنات کو جگمگا دینے والا مظہرِ جمیل!

یہ ہے اک دوشیزۂ ہند کی شانِ جمیل، جو محدود چار دیواریوں میں اپنے شباب و جوانی کے تلخ گھونٹ پی پی کر زندہ رہتی ہے۔ اور جو خواہشاتِ نفسانی میں جکڑے ہوئے مرد کے فریبِ محبت میں پھنس کر اپنی تمام کائنات اس کو سونپ دیتی ہے۔ لیکن عیاش دیوتا اس وقت اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ جب دیوی کے چرنوں میں اس کے لئے کوئی سامانِ دلبستگی نہیں رہتا۔ جب اس کی قندیلِ شباب بجھنے کو ہوتی ہے، جب اُس کی شمعِ حسن و جوانی کی لو تھرا رہی ہوتی ہے تو یہ مردِ بیوفا اس سے اس طرح دور بھاگتے ہیں جیسے اس کی آتشیں لپٹیں اُن کو جلا کر بھسم کر دیں گی، اس لئے اور بھی کہ اُنھیں پروانہ وار نثار ہونا نہیں آتا ہے، یا وہ ایسا ہونا نہیں چاہتے۔

وہ سب کچھ دیکھتی ہے لیکن اس سے کہا کچھ نہیں جاتا۔ اس کی رُوح روتی ہے لیکن اس کے لبوں پر تبسم کھیلا کرتا ہے۔ وہ قدامت پسند ہے تنگ نظر بھی، وہ بیہودہ رسموں میں اتنی محصور، بارِ قرض سے اتنی محصور، بارِ قرض سے گراں بار کہ حقیقی مسرت اس کو کبھی حاصل نہیں ہوتی، یہاں تک کہ وہ کامرانیوں و شادکامیوں کے خواب دیکھتے دیکھتے آخری نیند سو جاتی ہے۔ اس کی توقعات کبھی پوری نہیں ہوا کرتیں۔

رشک و حسد کی آگ میں جلتے رہنا اُسے آتا ہے، لیکن اپنی حالت کو سدھارنے کی کبھی اس کو توفیق نہیں ہوتی۔

〰〰〰〰〰〰〰〰〰〰

چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے جسمِ مردہ میں اک روحِ زندہ کا مالک، ہڈیوں کا ڈھانچہ لیکن انقلاب کا ڈھانچہ، لیکن انقلاب کا حامی، عالمِ انسانیت کا اک فردِ بلند ترین لیکن سرمایہ دار کا مظلوم شکار۔

یہ ہے اک ہندی مزدور کا خاکہ، جو مشین کی طرح دن بھر گردش میں رہتا ہے اور بیگڑ اس وحشیانہ سلوک کے لئے جو جانوروں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے منہ میں زبان ہے جواب قدرے گفتگو کی عادی ہو چلی ہے اور وہ اپنے حقوق کی نگہبانی پر مصر ہے۔ ہڑتال اُس کا بہترین ہتھیار ہے لیکن بعض اوقات اس کا وار بھی اوچھا پڑتا ہے اور یہ خود ہی شکار ہو جاتا ہے کہ ابھی اس کی تیز اندازی عالمِ طفلی میں ہے۔ لیکن متفکر جانتے ہیں اک روز یہی ننگِ انسانیت اٹھے گا انقلاب کا پرچم لئے ہوئے، اور دنیا کو دکھا دے گا کہ آزادی یوں حاصل کرنے میں ———— ضرورت [illegible] ادا ہو گا، مزدور [illegible] اور وہ وقت بہت جلد [illegible]

دیوانہ مصطفیٰ آبادی

ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے میں بیکاری

عبدالرحیم شبلی - بی - کام

ہندوستان میں بیکاری دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جو زراعت پیشہ لوگوں کے اندر پائی جاتی ہے اور دوسری وہ جو متوسط تعلیم یافتہ طبقے یا غیر تعلیم یافتہ دستکاروں اور مزدوروں وغیرہ کو درپیش ہے، جو بیکاری زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان پائی جاتی ہے اُس کی وجہ زیادہ تر مونسونوں کی بے قاعدگی ہے اور کچھ پیشۂ زراعت کی نوعیت جو زمینداروں کو سال کے بارہ مہینہ میں سے چھ مہینے بیکار رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ مثلاً جب ایک دفعہ فصل بو دی جاتی ہے تو پھر اُس کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لئے بیکار کھیتوں کے کنارے پر بیٹھ رہنا پڑتا ہے۔ پھر بعض مہینے سال میں ایسے آتے ہیں جب کیسی بھی فصل کے بونے کا موسم نہیں ہوتا۔ یہ وقت بھی زمیندار مقدمہ بازی اور مذموم رسومات کی ادائیگی میں صرف کر دیتے ہیں جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ ماہرینِ اقتصادیات کے نزدیک اس موسمی بیکاری کا علاج یہ ہے کہ زمیندار اپنا وقت گھریلو مصنوعات کی ترقی اور اُن کے فروغ میں صرف کریں۔

دوسری قسم کی بیکاری وہ ہے جو متوسط تعلیم یافتہ طبقہ یا غیر تعلیم یافتہ مزدوروں اور دستکاروں وغیرہ کے اندر پائی جاتی ہے، اس میں سے مزدوروں اور دستکاروں کی بے روزگاری کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لئے ہم اُس پر فی الحال کوئی بحث کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ متوسط تعلیم یافتہ طبقے کی بے کاری ہمارا اصلی موضوع ہے۔ اس کی اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اور یہ مسئلہ خطرناک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

متوسط تعلیم یافتہ طبقے کا مفہوم

بظاہر متوسط اور تعلیم یافتہ طبقہ۔ نہایت آسان اور عام فہم الفاظ ہیں۔ لیکن اُن کی منطقی تعریف کرنی آسان کام نہیں۔ یہ تاہم اظہر من الشمس ہے کہ اگر "تعلیم یافتہ" کے معیار پر پرکھا جائے تو ہمیں غیر تعلیم یافتہ دستکاروں اور ہوشیار اور متمول زمینداروں کو اپنی بحث سے خارج کر دینا پڑے گا۔ اسی طرح "متوسط طبقہ" کی عام اصطلاح کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں لازم ہوگا کہ ہم خوشحال دستکاروں اور امیر زمینداروں کو اپنی بحث میں نہ لائیں۔ مگر ہم تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ یا متوسط اور غیر متوسط طبقات میں کوئی صریح اور قاطع فرق نہیں بتا سکتے۔ بمبئی اور مدراس کی تفتیشی کمیٹیوں نے تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کا اطلاق ایسے لوگوں پر کیا ہے جو اتنے امیر نہیں ہیں، یا یوں کہئے کہ اُن کی اپنی جائداد اس قدر نہیں ہے کہ وہ اپنی ملازمت یا کاروبار چھوڑ کر بافراغت بیٹھکر کھائیں۔

اور اُن کو کسی قسم کی ثانوی یا اعلیٰ تعلیم بھی میسر نہیں ہے۔ مادری زبان جاننے والوں کو بمبئی کمیٹی نے خارج از بحث قرار دیا ہے کیونکہ اُس کے خیال میں مسئلہ زیادہ تر انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں کے درمیان خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے۔ نیز چھوٹی چھوٹی تجارتوں یا دوکانوں پر کام کرنے والوں کے مسائل بیان کرنا اور اُن تک پہنچنا بھی سخت مشکل کام ہے۔ بیروزگاری پنجاب کی کمیٹی نے اینگلو ورنیکلر یا مکمل مادری زبان کے جاننے والوں کو بھی اپنی بحث میں شامل کر لیا ہے۔

بہرحال اس مضمون میں متوسط تعلیم یافتہ طبقہ ہم اُس جماعت کو قرار دیں گے جو نہ بہت امیر ہے اور نہ بہت غریب، اور جس نے ایک معیارِ معینہ تک تعلیم حاصل کی ہے زیادہ تر ہمارے مدِ نظر میٹرک ایف اے اور بی اے پاس نوجوان ہوں گے۔ کیونکہ وہ کالج میں پڑھنے کے اہل ہونے کی وجہ سے متوسط طبقہ بھی ہیں اور زیادہ تر یہی لوگ روزگار کے متلاشی نظر آتے ہیں۔

بے روزگاری کی انتہا

جنگِ عظیم کے بعد بے روزگاری کا مسئلہ خطرناک صورت اختیار کر گیا اس لئے گورنمنٹ نے مختلف مقامات پر مسئلہ بیکاری کی تحقیقات کے لئے مجالس قایم کیں جن کی رپورٹوں کا مطالعہ اس مسئلہ کی بخوبی وضاحت کرتا ہے۔

مدراس کمیٹی نے لکھا ہے کہ متلاشیٔ روزگار تعلیم یافتہ طبقہ اور اُن کے لئے مطالبہ کے درمیان قریباً دو اور ایک کی نسبت ہے۔ یعنی اگر ملازمت ایک ہے تو اُس کے مانگنے والے دو ہیں۔ پھر اُس کی رائے میں ہر تین طلبہ میں سے دو نوکری کے خواہشمند ہوتے ہیں اور صرف ایک تجارت یا کسی ہنر میں لگنا چاہتا ہے ایک دوسری تحقیقات کی رُو سے اُس کے خیال میں سو فیصدی طلبہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں۔

پنجاب کمیٹی ۱۹۲۷ء بھی اسی نتیجہ پر پہنچی ہے اُس نے معلوم کیا ہے کہ جہاں ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیان اینگلو ورنیکلر اسکولوں اور کالجوں کی پیداوار دوگنی سے زائد ہو گئی ہے وہاں گورنمنٹ کے محکموں یا پرائیویٹ تجارتی اداروں میں روزگار کی اسی تناسب سے ترقی نہیں ہوئی۔

ان تحقیقات کے باوجود ہمارے پاس کوئی صحیح اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن کی مدد سے ہم بے روزگاری کی اصلی انتہا معلوم کر سکیں ۱۹۳۱ء کی مردم شماری سے گورنمنٹ نے ایک اور خانہ کا اضافہ کیا ہے۔ جس میں بیس سے چالیس برس کی عمر تک تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد درج کی جایا کرے گی۔

بعض مصنفین نے اشتہاروں کے جواب میں عرضیوں کی تعداد سے بیکاری کی انتہا معلوم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ طریق بھی قطعی نہیں کیونکہ بہت ممکن ہے کہ بعض ایسے لوگ بھی عرضی بھجوا دیں جو پہلے ملازم تو ہیں لیکن وہ اپنا مستقبل زیادہ شاندار بنانا چاہتے ہیں پھر قدرتی طور پر حکومت کی ملازمت کے لئے زیادہ عرضیاں بھیجی جاتی ہیں بہ نسبت پرائیویٹ اداروں کے لئے۔ کیونکہ گورنمنٹ کی نوکری میں استقرار کی وجہ سے حفاظت زیادہ ہے۔ پھر رجحانات مختلف ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ایک گریجویٹ جس کی ذہنیت CLERICAL و منشیانہ ہو کسی چالیس پچاس روپے کی نوکری کے لئے عرضی بھیج دے اور ایک دوسرا نوجوان بی اے کسی ایسے اشتہار کا انتظار کرے جس میں ٹیچر یا ایڈیٹر کی ضرورت ہو۔

ان تمام باتوں کے باوجود مدراس کمیٹی نے اس کا تجربہ دو اشتہار ایک ۵۳ روپے کی آسامی کے لئے پی ڈبلیو ڈی کی طرف سے اور دوسرا ایک تجارتی ادارہ کی طرف سے دے کر کیا جس کے نتیجہ میں ۷۸۰ اور ۶۶۶ عرضیاں علی الترتیب موصول ہوئیں۔

اسی طرح حال ہی میں ریزرو بنک آف انڈیا کے لئے اسّی محرروں کی ضرورت تھی جس کے لئے تقریباً دس ہزار عرضیاں وصول ہوئیں۔

معمولی کانسٹیبل بھرتی ہونے کے لئے پان پانسو عرضیاں آجاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ملک میں ایک کثیر حصہ نوجوانوں کا کسی معقول روزگار کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

طبقہ متأثرہ

ہمارے لئے یہ بھی دیکھنا ضروری ہوگا کہ کونسا طبقہ زیادہ تر بیکار رہتا ہے۔ بمبئی کمیٹی کی رائے میں عمروں کے لحاظ سے زیادہ تر ستائیس سال کے نیچے عمروں والے نوجوان بیکار ہوتے ہیں۔ میرا اپنا قیاس یہ ہے کہ ۲۴ سال سے اوپر کے نوجوان ضرور بیکار ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس عمر کے بعد گورنمنٹ کے محکموں میں اُنکی بھرتی کا امکان بالکل جاتا رہتا ہے۔ پرائیویٹ اداروں کی ملازمت اُن کے نزدیک

قابل قبول نہیں ہوتی اور اپنے پاس اس قدر سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ کوئی کاروبار شروع کر دیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بوجہ کسی بھاری شورش کے کسی اعلیٰ کام پر لگ جائیں جہاں عمر کا خیال نہ ہو۔ لیکن بالعموم وہ اِدھر اُدھر متحیر نظر آتے ہیں۔

بمبئی کمیٹی نے حلقۂ بمبئی کے بے روزگار نوجوانوں کی تعلیم کے متعلق بعض دلچسپ حقائق درج کئے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتی ہے کہ جملہ بیکاروں میں سے ۴۷٫۶۰ فیصدی نوجوانوں نے دسویں جماعت بھی پاس نہیں کی تھی ۱۳٫۶ فیصدی نے دسویں یا اس کے برابر کوئی امتحان پاس کر لیا تھا۔ ۴٫۵۹ فیصدی ایف اے پاس تھے ۷٫۵۶ فیصدی گریجویٹ تھے ۵٫۰۸ فیصدی کو ٹائپ آتا تھا۔ ۱۱٫۷۳ فیصدی کو مختصر نویسی میں مہارت تھی۔ باقی قریباً ۲۹٫۶ فیصدی لوگ ایسے تھے جن کے پاس یا تو کوئی قابلیت نہ تھی اور یا ادھوری خصوصیات کے حامل تھے۔

اسی طرح پیشوں کے لحاظ سے اندازہ کیا گیا ہے کہ سند یافتہ کی نسبت غیر سند یافتہ ٹیچروں میں زیادہ بیکاری ہے۔ وکالت کا پیشہ بلاشبہ ہر دل عزیز نہیں رہا کیونکہ اب وکیلوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے اور لوگ بھی ہوشیار ہو گئے ہیں وہ مقدمات کے لئے زیادہ روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ڈاکٹروں کی تعداد شہروں میں زیادہ ہو گئی ہے مگر دیہاتوں میں اُن کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن اعلیٰ ڈگریوں والے تعلیم یافتہ ڈاکٹر دیہات میں جا کر اپنا معیارِ زندگی پست کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ جب تک کہ اُن کو باقاعدہ گورنمنٹ کی طرف سے معقول تنخواہ پر نہ بھیجا جائے۔

انجینیروں میں بے روزگاری نسبتاً کم ہے اور جو تھوڑی بہت تھی وہ بھی کوئٹہ اور بہار کے زلزلوں کی وجہ سے بہت حد تک دُور ہو چکی ہے۔ بنکوں انشورنش کمپنیوں اور دیگر تجارتی فرموں میں تجربہ کار آدمیوں کے سوا گذارا نہیں۔ اس لئے جن لوگوں نے حساب کتاب ٹائپ اور اکاؤنٹسی وغیرہ کی تعلیم حاصل کی ہے وہ بھی بیکار رہتے ہیں۔ گورنمنٹ کی ملازمت کے لئے عمر کی روک ہے۔ دوسرے ٹائپ کا جاننا بھی لازمی ہے۔ تیسرے کم درجہ کے امتحان کے لئے زیادہ تر ایم اے۔ بی اے مقابلہ کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے میٹرک کے لئے میدانِ ترقی بالکل مسدود ہے۔

تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے کسی

تعلیم حاصل کرنے کے بعد یورپ میں کم و بیش سولہ ہزار پیشے ہیں جہاں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کھپت ہو سکتی ہے۔ لیکن شومئی قسمت سے ہندوستان میں صرف چالیس ہیں۔ (ٹراونکور رپورٹ)۔ ان چالیس میں سے بھی اکثر ایسے ہیں جہاں ہر ایک کے لئے ترقی کا میدان نہیں۔ مثلاً ٹیچری۔ انجینیرنگ۔ جرنلزم وغیرہ۔ یہاں صرف خاص خصوصیات کے مالک ہی جا سکتے ہیں۔ صرف دو پیشے ایسے ہیں جہاں ایک اوسط درجہ کی خصوصیات کا مالک کوشش کر سکتا ہے۔ تجارت یا محرری۔

تجارت کے لئے سرمایہ اور کاروباری ذہنیت کا ہونا لازمی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ایسے شخص کے پاس کافی سرمایہ ہو۔ لیکن وہ تجارتی ذہنیت کا مالک نہ ہو۔ اِسی طرح بعض آدمی تجارتی شغف رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہوتا۔

محرری کے لئے تجربہ ضروری ہے اور یہ حاصل کرنے کے لئے انسان کے پاس اتنا روپیہ ہونا چاہئیے کہ وہ کسی مشہور فرم میں جا کر مفت ٹریننگ حاصل کرے یا کم از کم ٹائپ اور شارٹ ہینڈ ہی سیکھ لے۔ لیکن جس غریب نے وظیفہ لے کر میٹرک یا ایف اے کیا ہو یا جس کے ماں باپ نے پہلے ہی قرض لے کر اتنا پڑھایا ہو اُس کے لئے کب ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ چھ مہینے یا ایک سال شہر میں رہنے کے لئے چالیس پچاس روپے ماہوار مزید خرچ کرے۔

پھر محرری گورنمنٹ کے محکمہ جات میں مل سکتی ہے۔ لیکن وہاں بھی مقابلہ ہے اور مقابلہ بھی بی اے اور ایم اے پاس امیدواروں سے۔ پہلے تو داخلہ ہی بہت ہے اور پھر دو دو ہزار آدمیوں میں اپنے نمبر حاصل کر لینا ہر ایک کا کام نہیں۔ اِس کے علاوہ وہاں عمر کی بھی تعین ہے۔ مثلاً چوبیس سال کی عمر سے زیادہ والا نوجوان کسی گورنمنٹ سروس کے لئے اہل نہیں ہو سکتا۔ پس نوجوانوں کی بے کسی میں مندرجہ ذیل قوتیں کار فرما ہیں۔

۱۔ عمر

۲۔ غربت

۳۔ رجحانِ طبع

مشکل یہ ہے کہ یہ تینوں اجزا قابلِ اصلاح نہیں ہیں۔ عمر اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ بعض اوقات ماں باپ نے زیادہ لکھوائی ہوتی ہے۔ بعض اوقات غربت کی وجہ سے درمیان میں تعلیم بند کرنی پڑتی ہے۔ اور بعض اوقات اپنی کند ذہنی اور کھیلوں وغیرہ کی طرف رجحان کی وجہ سے آدمی فیل ہو جاتا ہے۔ غربت کے خلاف آدمی

کیا کرے۔ اگر ماں باپ ہی غریب ہیں تو وہ خود کیا کر سکتا ہے۔ اگر خود کمانا چاہے تو امتحانوں کے لئے روپیہ درکار ہے اور کم از کم ایک سال بیکار بیٹھ کر گھر سے اخراجات لینے ضروری ہیں جو ہر اوسط آدمی کے لئے ممکن الحصول نہیں۔ رجحان طبع کے خلاف جنگ آزمائی کی جا سکتی ہے لیکن بسا اوقات خلاف از طبیعت کام کرنے میں ناکامی ہی میسر آتی ہے۔ پھر بعض آدمیوں کا تجارت کی طرف رجحان بھی ہوتا ہے لیکن اُن کے پاس کسی کاروبار کو شروع کرنے کے لئے روپیہ نہیں ہوتا۔

بے روزگاری کے اسباب

میرے نزدیک بے روزگاری کا کوئی سبب بھی نہ ہو، اگر مندرجہ ذیل خصوصیات کسی امیدوار میں موجود ہوں۔

(۱) عمر

(۲) قابلیت

(۳) روپیہ

(۴) صحت

لیکن اس کے باوجود بعض وجوہات عام مفکرین کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔

۱ مابعد جنگ کساد بازاری اور تخفیف

جنگ کے بعد ایک عام اقتصادی انحطاط اور عالمگیر کساد بازاری کا دور دورہ ہوا جس کے نتیجہ میں بہت سی تخفیفیں ہوئیں اور گورنمنٹ کے اخراجات گھٹا دئے گئے۔ اس کے نتیجہ میں بہت سے عارضی اور نئے محررین کو جواب مل گیا۔ لیکن اب گورنمنٹ اُن کو واپس بلا رہی ہے اور آہستہ آہستہ اُن میں سے اکثر نئی ملازمتوں میں کھپ چکے ہیں۔ بہرحال یہ سبب کوئی مستقل وجہ بے روزگاری نہ تھا۔

ناقص طریقہ تعلیم

بعض مفکرین ہمارے موجودہ طریقۂ تعلیم کو بھی قابلِ مذمت خیال کرتے ہیں۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہمارا موجودہ نظام اتنا خراب نہیں ہے جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد صرف وسعتِ نظر اور دماغ کی ترقی ہونا چاہیئے نہ کہ اُس کی قیمت روپیہ پیسہ کی شکل میں معلوم کی جائے۔

مثلاً سائنس اور آرٹ بڑھانے کی بجائے اگر صرف روپیہ پیسہ کے حصول کے طریق بتائے جائیں تو مجھے سمجھ نہیں آتا کہ دنیا میں علم و ہنر کی ترقی کیسے ہوگی۔ اگر ہم شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھکر تیس روپے کی محرری حاصل نہیں کر سکتے تو اس میں ڈراموں کا کیا قصور ہے اُن کا فائدہ تو صرف یہ ہے کہ ہمارے دماغ میں وسعتِ نظر پیدا کریں۔ نہ کہ روپیہ پیسہ وصول کرنے کے طریقے بتلائیں ہم نے مانا کہ ہمیں بڑے ہو کر خود کمانا کمانا چاہیئے لیکن اس سے یہ کب معلوم آتا ہے کہ ہم ڈرامے یا پوئٹری کی کتابیں نہ پڑھیں۔ ہم نوکری کے حصول کے لئے جو خصوصیات درکار ہیں علم و فنون کی تحصیل کے دوش بدوش بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ پس یہ خیال غلط ہے کہ ہمارے طریقۂ تعلیم میں کوئی نقص ہے۔ اگر کوئی طالب علم صرف امتحانوں کی خاطر پڑھتا ہے تو یہ اُس کی غلطی ہے۔ اور ارباب یونیورسٹی کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کے گریجوئیٹ کو اپنی کتابوں کے سوا کچھ علم نہیں ہوتا۔ لیکن یہ تو شخصی بات ہے۔ طریقۂ تعلیم کا اس میں کیا قصور ہے؟ کیا اخبارات، رسالے اور کتابیں اُن کی لائبریریوں میں نہیں منگوائے جاتے۔ اگر کوئی طالب علم استفادہ نہیں کرتا تو طریقۂ تعلیم بیچارہ کیا کرے۔ یہ خود طالب علم یا اُس کے ابتدائی ماحول کا قصور ہے۔

پھر کہا جاتا ہے کہ موجودہ طرزِ تعلیم طالب علموں کے اندر غلامانہ ذہنیت پیدا کرتی ہے اور اُن کو سوائے نوکری کے کچھ مدِ نظر نہیں ہوتا۔ لیکن میں اس سے بھی متفق نہیں ہوں۔ جہاں تک غلامانہ ذہنیت کا تعلق ہے یہ بھی بعض انفرادی طالب علموں کی کورچشمی ہوگی ورنہ میں نے تو اکثر دیکھا ہے کہ طلبائے کے اندر قومی خیالات کا کافی جذبہ ہوتا ہے اور دوسرے یہ چیز عام تعلیم کے دوش بدوش بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

سرکاری ملازمت کی خواہش

باقی رہا یہ کہ ہمارے نوجوان امتحان پاس کر کے سرکاری نوکری حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے اس کی وجوہات میرے خیال میں دو ہیں۔

(۱) سرکاری ملازمت میں حفاظت اور استقرار زیادہ ہے۔ پرائیویٹ سروس میں جب کبھی مالکان کی مرضی ہوتی ہے کسی محرر کو جواب دیا جا سکتا ہے لیکن

گورنمنٹ سروس میں ایسا کرنا سخت محال ہے، پھر گورنمنٹ سروس میں گریڈ اور سالانہ ترقی کی بھی باقاعدگی ہے لیکن تجارتی اداروں وغیرہ میں ایسا نہیں ہے۔

۴۔ سرکاری نوکری سہل ہے اوقاتِ کار کم ہیں اور زیادہ دیر تک محنت نہیں کرنی پڑتی۔ مجھے پرائیویٹ سروس کا خود تجربہ ہے۔ صبح نو بجے سے شام کے سات بجے تک عام وقت ہوتا تھا اور اس کے علاوہ چونکہ افسروں کی خوشنودی مد نظر ہوتی، اس لئے ذرا پہلے آنا پڑتا تھا۔ اور بعد میں جانا ہوتا تھا۔ گورنمنٹ سروس میں سپرنٹنڈنٹ وغیرہ کے ساتھ کوئی بندھا نہیں ہوتا۔ آپ وقت پر آئیں اور وقت پر چلے جائیں۔ لیکن پرائیویٹ سروس میں اُس وقت تک بیٹھنا پڑتا ہے جب تک کہ سپرنٹنڈنٹ بیٹھا رہے۔

انہی وجوہات کی بنا پر اگر ہم نوجوان گورنمنٹ سروس کی خواہش کرتے ہیں تو ہم حق بجانب ہیں۔ باقی رہا یہ کہ ہم تجارت وغیرہ کیوں نہیں کرتے۔ اس کا جواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں کہ تجارت کے لئے سرمایہ چاہیے اور پھر کاروباری ذہنیت اور یہ چیز ہر آدمی میں پیدا نہیں ہوسکتی۔ رجحانات اور طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔

پس موجودہ طریقۂ تعلیم میں کوئی نقص نہیں ہے۔ گورنمنٹ سروس کی ذہنیت تعلیم پیدا نہیں کرتی بلکہ اس کی وجہ وہ جاذبیت اور کشش ہے جو سرکاری ملازمت میں پائی جاتی ہے۔

معاشری وجوہات

معاشری وجوہات صرف مدراس وغیرہ میں کارفرما ہیں۔ جہاں ہر شخص کو اپنی پسند کے مطابق پیشہ جات کے انتخابات کی اجازت نہیں۔ اس کی وجہ ذات پات اور خاندان کی محبت ہے۔ لیکن اب یہ جذبہ تعلیم یافتہ طبقہ میں دور ہو رہا ہے اس لئے ہم اس کو بے روزگاری کے اسباب میں شامل نہیں کرسکتے۔

صناعت کا فقدان

چوتھی وجہ ہماری بے روزگاری کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ ملک میں مصنوعات اور کارخانے بدرجہ اتم موجود نہیں ہیں اور اس وجہ سے ہمارے نوجوانوں کی کھپت نہیں ہوسکتی۔ یہ وجہ بہت حد تک درست ہے اور اس کے لئے ہمیں انتظار کرنا ہوگا کہ ملک کی اقتصادی اور صنعتی ترقی معرضِ وجود میں آئے۔

بے روزگاری کا تدارک

بے روزگاری کو دُور کرنے کے کئی طریقے بیان کئے جاتے ہیں جن میں اکثر ناقابلِ عمل اور بعض بالکل بعید از قیاس ہیں۔ تاہم چند کا ذکر کرتے ہیں۔

گورنمنٹ بدل دی جائے

پنڈت نہرو وغیرہ کا خیال ہے کہ اگر ہم موجودہ نظامِ حکومت کو بدل دیں تو بے روزگاری بہت حد تک دُور ہوسکتی ہے۔ مثلاً اس وقت کئی ملازمتیں غیر ملکی لوگوں نے سنبھالی ہوئی ہیں جو ہندوستانیوں کو دی جاسکتی ہیں۔ پھر جرمنی روس اور اٹلی وغیرہ کی مثالیں بیان کی جاتی ہیں کہ جب ان لوگوں نے خارجیوں کو باہر نکال دیا تو ملکی شعبہ جات ترقی پذیر ہوئے اور نوجوانوں کو نوکریاں میسر ہوئیں۔

یہ طریقہ خواہ کس قدر ہی کارگر کیوں نہ ہو۔ لیکن بہرحال بعید از قیاس ہے۔ ہم یہ طریقہ تجویز کرکے ملک کے سامنے کوئی ٹھوس اور سریع الاثر لائحہ عمل پیش نہیں کرسکتے بلکہ صرف ایک جنت دکھاتے ہیں، جو فی الحال ناقابلِ قبول ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ملازمتوں کا حصول روز بروز مشکل ہوتا گیا تو نوجوانوں کے اندر بغاوت کے جراثیم پیدا ہوجائیں گے اور جو معرضِ وقوع میں آئے گا اُس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہمیں اس کی ترغیب دینے کی حاجت نہیں۔ کیونکہ یہ جذبہ از خود پیدا ہوتا ہے۔ بہرحال موجودہ زمانہ میں اس کو بطور علاج پیش کرنا حماقت ہے کیونکہ یہ جب تک معرضِ وجود میں آئے گا کئی لوگ بے روزگاری کی وجہ سے خودکشیاں کرچکے ہوں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے سامنے کوئی قابلِ عمل اور سریع الاثر لائحہ عمل رکھا جائے۔

ٹیکس ہلکے کئے جائیں

سر تیج بہادر سپرو وغیرہ کی تجویز ہے کہ ٹیکس ہلکے کئے جائیں یا اکثر جگہ لگان معاف کردیا جائے۔ لیکن یہ تو صرف بڑے بڑے سرکاری ملازموں یا زمینداروں کو مالی آرام بہم پہنچانے کی تجویز ہے۔ ورنہ اس سے نوجوانوں کی بیکاری دُور نہیں ہوسکتی۔

طریقہ تعلیم کو یکسر بدل دیا جائے

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوگا۔ صنعتی اور فنی تعلیم دینے کا کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ ملک میں پہلے کارخانے اور فیکٹریاں نہ جاری کی جائیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ پہلے فنی تعلیم ہونی چاہیئے اور پھر کارخانے جاری ہوں گے۔ جب کارخانے جاری کرنے میں بعض خارجی مشکلات ہیں تو ماہرین بیٹھے کیا کریں گے پہلے سیاسی مصالح۔ اور حکومتی مشکلات کو دور کرو۔ پھر فیکٹریاں جاری ہوں گی جس کے لئے ہر طلبہ کو فنی تعلیم دلوائیں گے۔

نوجوانوں کو زراعت کی طرف راغب کیا جائے

اکثر تجویز پیش کی جاتی ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو زراعتی زمینیں دی جائیں تاکہ وہ زراعت کی طرف مائل ہوں۔ لیکن کوئی صحیح الدماغ آدمی اس تجویز سے متفق نہیں ہوگا کیونکہ ہماری آبادی کا ۹/۱۰ حصہ پہلے ہی کاشتکاری میں لگا ہوا ہے اور زمین پر آبادی کا بوجھ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ پس ایسی حالت میں بجائے اور آدمیوں کو زراعت کی طرف مائل کرکے ہمیں پہلے آدمیوں کی حوصلہ فرسائی کرنی چاہیئے اس کے علاوہ اگر ہم اس تجویز پر عمل کریں تو اُن لوگوں میں بے روزگاری پھیلنے کا اندیشہ ہے جو پہلے ہی اس پیشہ میں لگے ہوئے ہیں، دوسرے الفاظ میں اگر ایک جماعت با روزگار ہوتی ہے تو دوسری بے روزگار ہو جائے گی۔ پس یہ کوئی بیکاری کا حل نہیں ہے۔

نوجوان فی الحال کیا کریں؟

پس مندرجہ بالا پروگرام فی الحال ناقابل حصول ہے، اور جب تک یہ عملی صورت میں جلوہ گر ہوگا اُس وقت تک نوجوانوں کو کسی سریع الاثر تعمیری پروگرام کو اختیار کرنا ہوگا۔ وہ تعمیری پروگرام کیا ہے۔ میرے خیال میں اُس میں صرف دو چیزیں ہیں۔ یا تجارت کی جائے اور یا گورنمنٹ سروس اور محرری کی جائے۔

تجارت کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے جو صرف متوسط یا امیر طبقہ کو میسر ہو سکتا ہے۔ اگر کسی نوجوان کے پاس سرمایہ ہو لیکن تجارتی شغف نہ رکھتا ہو تو اُسے چاہیئے کہ اپنا روپیہ کسی ایسی تجارت میں لگا دے جہاں اُسے باقاعدہ طور پر معقول نفع ملتا رہے۔ بہتر ہوگا کہ تجارت پہلے سے چلی ہوئی ہو تاکہ ابتدائی مشکلات کے خطرے سے آدمی بچ جائے۔ پھر اگر اُس کے پاس تجارتی رجحان ہو تو اُسے چاہیئے کہ کسی سرمایہ دار کو اپنی سکیم سے آگاہ کرے اور اُسے اپنی کامیابی کا قائل کر دے۔

اگر کوئی سرمایہ نہ دے تو پھر کنویسنگ کا کام سب سے بہتر رہے گا۔ مثلاً کسی چیز کو لے کر مختلف آدمیوں اور دوکانداروں کے پاس لے گئے اور اُن سے اُس کی خوبیاں بیان کیں تاکہ وہ خرید لیں اگر آدمی پڑھا ہوا ہو تو اس طریق سے معقول رقم ہاتھ لگ سکتی ہے۔ اگر صرف کسی ادبی رسالہ یا کتابوں ہی کی تجارت کی جائے تو کافی نفع کی امید ہو سکتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ لاہور میں میرے ایک دوست بی اے نے صبح سویرے سائیکل پر روزانہ اخبارات پہنچانے کا ذمہ لیا تھا۔ یہ کام اکثر ان پڑھ پھیری والے کیا کرتے تھے اور بظاہر اس طرف کوئی میدان نظر نہ آتا تھا۔ لیکن چونکہ پڑھا ہوا تھا اس لئے جس کے پاس بھی وہ گیا اُس نے بی اے دیکھ کر اپنے پہلے اخبار والے کو بند کر دیا اور اس کو لگا لیا جس کے نتیجہ میں بہت سا علاقہ اخبار ی لینے والا اُس کے ہاتھ آ گیا اور آہستہ آہستہ وہ ملازموں کے ذریعے ایک بہت بڑا ایجنٹ بن گیا۔

یہ کام مشکل نہیں ہے صرف ہمت کی ضرورت ہے۔

کلرکی کے لئے میں کہہ چکا ہوں چوبیس سال سے کم عمر۔ کچھ لیاقت اور رشوت دینے کے لئے چند روپیہ درکار ہیں۔ پھر خدا چاہے تو اس میں کبھی ناکامیابی نہیں ہو سکتی پبلک سروس کمیشن کی طرف متعدد امتحانات ہوتے ہیں جن کی تفصیل وہاں سے منگوائی جا سکتی ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ ایک دل سے چاہنے والا نوجوان چند ماہ میں ہی نوکری حاصل نہ کر لے۔

اصل میں نوکریوں کا اس قدر کال نہیں ہے جس قدر کہ ہمت اور قوتِ عمل کا فقدان ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اکثر نوجوان صرف اسی امید پر گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں کہ شاید اُنھیں کوئی غائبانہ طاقت نوکری کا پروانہ ہاتھ میں دے جائے۔ حالانکہ یہ عبث اور خام اُمید ہے۔ اگر وہ باہر جا کر ذرا کوشش کریں تو اپنی روٹی کا انتظام ضرور ہو سکتا ہے۔ اگر آپ صرف کلیم کے پرچے ہی لیکر اُنکی خریداری کے لئے تحریک کریں تو آپ کو معقول کمیشن مل سکتا ہے۔ اسی طرح اکثر کتب فروش

ہیں ہے دوست حضرت منوّر کا شکریہ کیوں کر ادا کروں کہ انھوں نے مجھے اس محبت سے یاد فرمایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا لہجہ اکثر مقامات پر تلخ ہو جاتا ہے، لیکن میں بقول حضرت لطیف اکبر آبادی جس اوقات اپنے نسلی مزاج سے مجبور ہو جاتا ہوں اور بالخصوص اربابِ وطن کی روش کو جب مفادِ وطن کے خلاف دیکھتا ہوں تو فرطِ غیظ سے میرا سینہ دہکنے لگتا ہے۔ اعتراض کرنیوالوں کو میرے دل کا حال کیا معلوم جس دل سے خون کی بوندیں ٹپک رہی ہوں وہ کیونکر نرم الفاظ کے استعمال پر مجبور ہے۔ اگر وہ آگ جو میرے دل میں بھڑکی ہوئی ہے آج معترضین کے دل میں بھی بھڑک اٹھے تو وہ بھی میری ہی طرح تلخ گفتاری پر مجبور ہو جائیں ع یا با تو جلوۂ رخِ جاناں نہ دیدہ : (جوش)

حضرتِ جوش سے خطاب

(رسالہ کلیم بابت ماہ فروری کے ایک مضمون پر)

ہے قابلِ فخر و ناز ہستی تیری — دریا طلبی فراغ دستی تیری
توڑی ہیں حدودِ ننگ تو نے اے جوش — ہے مجھکو پسند دل سے مستی تیری

اے شاعرِ کامیاب عہدِ حاضر — اے شاعرِ انقلاب عہدِ حاضر
تسلیم کہ آیا ہے سمٹ کر تجھ میں — یہ عالمِ اضطراب عہدِ حاضر

ہاں باعثِ صد گرمیٔ بازار ہے تُو — ہاں جنسِ محبت کا خریدار ہے تُو
تجھ کو ہمہ تن جوش سمجھتا ہوں میں — جامِ صہبا کی طرح سرشار ہے تُو

دل سے وطنیت کا پرستار بھی ہے — ذہنیتِ عامہ سے بیزار بھی ہے
میں تیرے عقائد کو سمجھتا ہوں خوب — قربانیٔ جسم و جان کو تیار بھی ہے

میرا بھی وہی ہے جو ہے ایماں تیرا — معبود ہے میرا جو ہے "انساں" تیرا
اے جوش تجھے میں دل کا دریا سمجھوں — اپنی حد میں رہے جو "طوفاں" تیرا

اس وحی، اس الہام کا کیا ہی کہنا — اس درسِ خوش انجام کا کیا ہی کہنا
ہو امن کے انداز میں اے جوش اگر — مشفق، ترے پیغام کا کیا ہی کہنا

منوّر لکھنوی

اپنی زبان کی کتھا

خواجہ عبدالروف عشرت لکھنوی

شوق کی بے خودی بھی عجیب چیز ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم مختلف سبجکٹ پر مضامین لکھتے اور دل سے لکھتے لیکن اب جو کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ محض اردو زبان کے متعلق بہار ہو۔ خزاں ہو۔ شب ماہ ہو۔ شب تار ہو۔ ہم کو ذکرِ معشوق کے بدلے جو مزہ اردو کے تذکرے میں آتا ہے وہ کسی میں نہیں ملتا۔ یہ اس لئے کہ ہمارا اعتقاد ہو گیا ہے کہ ہندوستان کی کشتی جو ڈگمگا رہی ہے اس کا سبب تمام ہندوستانیوں کی جہالت ہے۔ جب تک ہندوستانیوں کی پیشانی سے یہ داغ نہ مٹے گا اُس وقت تک ہندوستان فلاح کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔ اس ناؤ میں ہم سب سوار ہیں اور جب یہ کشتی ڈوب جائیگی ہم سب تہ و بالا ہو جائیں گے۔ اس عذاب سے بچنے کی جو صورت ہو گورنمنٹ اور مقتدر لوگوں کی طرف سے ہو رہی ہے۔

اس کا ہم کو شکرگزار ہونا چاہیے جس کی بدولت لوگ انگلش زبان میں ترقی کر رہے ہیں۔ قوم کے۔ لیفارمر علماء ہم کو علوم عربیہ سے مالا مال کر رہے ہیں لیکن یہ احسان مختصر لوگوں کے لئے مفید ہو تو ہندوستان کی مفلس اور فاقہ مست قوم کو تو اس وقت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ جب ان کو اپنی مادری زبان میں تکمیلِ علوم کا موقع دیا جائے۔

یہ بات تو طے ہو جائے گی کہ غیر ملکی زبان مادری زبان کی طرح نہیں آسکتی ہے۔ ہماری آنکھوں کی دیکھی بات ہے کہ ایران کا مستند شاعر حاجی شیخ عبداللہ رشتی سیاح بیس بائیس برس سے ہندوستان میں پڑا ہوا ہے اور اب تک صحیح اُردو نہیں بول سکتا۔

ایسے ذہین ہزار میں دو نکلیں تو نکلیں جو غیر زبانوں کے استعمال پر مثل مادری زبان کے قادر ہو جائیں۔ پھر تمام ہندوستانی بیچارے کس طرح دوسری زبان میں تکمیل علوم کر سکتے ہیں۔ ان کے لئے تو یہ صورت مفید ہو سکتی ہے کہ اُن کی مادری زبان اردو خزائن علمی سے آراستہ کی جائے۔ اور مختلف علوم کا ترجمہ کرکے اردو کا نصاب معیّن کیا جائے۔ اردو کی یونیورسٹی قایم کی جاے۔ اردو کے ڈاکٹر اردو کے طبیب اردو کے جوتشی اردو کے محدّث اردو کے فقیہہ اردو کے بید اردو کے فلسفی منطقی ریاضی داں سند یافتہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل جائیں۔

یہ کیا غضب کی بات ہے کہ رہیں تو ہندوستان میں اور جب عجم اور عرب اور انگلستان کی زبان سیکھ لیں اُس وقت ہم تعلیم یافتہ کہے جائیں۔ دنیا میں کسی ملک کسی قوم پر یہ سختی نہیں ہے کہ وہ اپنی زبان چھوڑ کر غیر ملکی زبان اختیار کرے۔ جاہل ہندوستان تاریکی میں پڑا ہے اور کوئی خبر نہیں لیتا۔

ہندوستان کے افلاس کے لئے کمیشن مقرر ہوا اور اس کی جہالت آمیز زندگی کی تحقیقات ہوئی۔ ملکی ریفارمر پولیٹکل نقصانات کی غرض سے گرم کوششیں کر رہے ہیں۔ علماء درس کے لئے وقف ہیں دنیاوی ترقی ڈھونڈھنے والے لوگ انگریزی تعلیم کو معراجِ کمال سمجھتے ہیں۔

مگر کوئی خدا کا بندہ یہ تحریک نہیں کرتا کہ ہندوستان کی مادری زبان کارآمد بنائی جائے۔ یہ زمانہ علمی گھوڑ دوڑ کا ہے۔ بحر و بر پر کاغذ حکومت کر رہا ہے پھر بھی ہماری زبان عضوِ معطّل کی طرح بیکار شے تصوّر کی جاتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ اردو زبان اس وقت ترقی کر رہی ہے اور ہندوستان کے اطراف میں ایسے رسالے نکلنا شروع ہو گئے۔ جن کی عموماً قدر کی جائے تو اردو زبان کو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

لیکن اِس کے ساتھ ہی ساتھ اِن رسالوں کا یہ بھی فرض ہے کہ اردو زبان فصاحت اور سلاست کا پہلو لئے ہوئے باقاعدہ ترقی کرے۔ ایک زبردست اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اردو لٹریچر میں اصطلاحات بہت کم ہیں۔ اس کمی کو بھی اردو رسائل پورا کر سکتے ہیں۔ علمی اصطلاحات کے متعلق دو فرقے ہیں مسلمان کہتے ہیں کہ علمی اصطلاحات عربی سے اخذ کئے جائیں اور ہندو کہتے ہیں کہ سنسکرت سے لئے جائیں اس دعوے میں ہم موخر الذکر کی تائید کرتے ہیں۔ اس واسطے کہ اردو کے انشا پردازوں کی ابتدا سے یہ کوشش رہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اردو میں ہندی الفاظ سے مدد لی جائے۔ بلکہ اچھے انشا پرداز فارسی کے جملوں اور ترکیبوں سے پرہیز کرتے ہیں ابتدا میں اردو کے شاعر حروف روابط اپنے کلام میں کرتے تھے۔ لیکن متاخرین نے اس کو بھی ترک کیا۔ اسی وجہ سے بیگمات کی زبان مستند کہی جاتی ہے کیونکہ اس میں فارسی عربی الفاظ کا زیادہ شمول نہیں ہوتا۔

اردو کی خوبی اسی میں ہے کہ وہ سنسکرت کے الفاظ میں مناسب ترمیم کر کے اُس کو اردو لب و لہجہ میں موافق بنائے۔ ملک کو احسان ماننا چاہیئے اگر ایسے لوگ مل جائیں جو سنسکرت زبان سے ہر قسم کے علمی اصطلاحات لے کر اُردو کے علمی خزانے میں اضافہ کر دیں۔

مگر ہم کو جہاں تک معلوم ہے وہ یہ ہے کہ سائنس اور فلسفۂ جدید کے علمی اصطلاحات کا بدل سنسکرت سے ملنا محال ہے۔ اس کمی میں عربی کا خزانہ کچھ مدد دے سکے تو دے سکے۔ یہ شکایت بھی بے جا ہے کہ انگریزی ترجمہ کرنے کے لئے اردو میں الفاظ نہیں ملتے ہمارے نزدیک لفظی ترجمہ علمی کتابوں کا کبھی بکار آمد ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ علمی کتابوں کے ترجمہ کرنے کا بہترین قاعدہ یہ ہے کہ ان کے مطالب اردو زبان میں ادا کئے جائیں۔

پھر زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کا تعلیم یافتہ گروہ اپنی اس زبان کی قدر ہی نہیں کرتا جس میں اُس نے زبان کھلتے ہی بات چیت کرنا شروع کی ہے۔ کیا یہ اردو کی بدقسمتی نہیں ہے کہ انگریزی جاننے والا گروہ اردو رسالوں کا دیکھنا کفر سمجھتا ہے یہ بات اُردو کے واسطے بہت نقصان دہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انگریزی جاننے والے اردو سے محروم ہوتے جاتے ہیں۔ جو اردو کے زوال کا باعث ہے۔

غریب اردو پر ایک یہ بھی اعتراض ہے کہ علمی کتب عربیہ کے تراجم اس میں نہیں آسکتے۔ اس کا جواب ہمارے پاس یہ ہے کہ ہم نے جہاں تک دیکھا ہے علمائے کرام دق کتابوں کے مطالب اردو میں سمجھاتے ہیں۔ اور بے وقت طلبا کے سمجھ میں آتے ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ اردو ترجمہ پڑھانے سے لوگ نہ سمجھیں گے۔ اور یہ کہ اردو زبان میں اِن ادق کتابوں کے ترجمے نہ آسکیں گے محض بہانہ ہے۔ بہی خواہان ملک اردو زبان کی قوت بڑھانے میں کاہلی کرتے ہیں۔

زمانے نے ہمیشہ غیر ملکی زبانوں کو مٹا دیا ہے اور مٹاتا رہے گا۔ بنگالی۔ مدراسی پشتو۔ کشمیری۔ جو غیر ملکی زبانیں ہیں اِن ملکوں کی عام قوتوں پر نظر کرو۔ تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ملک کی بربادی کے آثار اس کی مادری زبان کی کمزوریاں ہیں۔ اردو کی قوت نے اپنے ہمسایہ کی تین سو پینسٹھ زبانوں کو اپنے پیٹ میں ہضم کر لیا اور ڈکار بھی نہ لی۔ مرہٹی۔ پشتو۔ بنگالی۔ کشمیری۔ گجراتی۔ چینی۔ سنسکرت وغیرہ زبانیں اس میں شامل ہیں۔ اسی خیال سے کہا جاتا ہے کہ تمام ہندوستان کی مادری زبان ہے۔

اس کی عالمگیر قوت نے اس کو ہندوستان کی زبان بنا دیا۔ مگر خوف ہے کہ ہماری بے پروائی سے کہیں مٹ نہ جائے۔ کیونکہ تمام غیر ملکی زبانوں کا یہی انجام ہوا ہے اردو کی علمی کمزوری کا نتیجہ یہ ہے کہ اِس کے کروروں نام لیوا فاقہ کشی اور جہالت سے اپنی جان دے رہے ہیں۔ اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ غریب ہندوستانی چاہے اپنی زبان کے مجتہد ہوں مگر اُن کو کوئی شخص تعلیم یافتہ نہیں کہتا نہ اُن کو کسی ملازمت کے صیغے میں جگہ نصیب ہوتی ہے۔ یہی ایک زبان ہے جس کے عالم کو بھی ہم جاہل کہتے ہیں۔ اسی صدمے نے ہمارے دل کو بے چین کر دیا اور ہم کو معلوم ہو گیا کہ ہماری تباہی اور بربادی زبان کی کمزوری سے ہے۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ سب لوگ اردو کے دیوانے ہو جائیں۔ لیکن ملکی بہبودی کی خدمت اردو کی خدمت ہے۔ اگر اپنی قوم کو مصیبت کے جیل سے نکالنا ہے تو ہم سب کو لازم ہے کہ اردو کی حقیقی خدمت کریں۔

اردو کی خدمت کرنے والوں میں منشی امیر مرحوم ہی تھے۔ اردو کی زبان کی جس بیش بہا لغت کی ابتدا مرحوم نے کی اگر اس کی تکمیل ہو جاتی تو اردو میں بہت

وسعت ہو جاتی۔ اسی طرح علمی کتابوں کے ترجمے کی اشد ضرورت ہے اور اس امر کی احتیاج ہے کہ اردو مدارس کثرت سے قایم کئے جایں اور اردو کا علمی نصاب اعلیٰ پیمانہ پر قایم کیا جائے۔ فلسفۂ جدید کا نصاب تعلیم اردو۔ منطق کا نصاب تعلیم اردو۔ طب یونانی کا نصاب تعلیم اردو۔ فقہ کا نصاب تعلیم اردو۔ حدیث کا نصاب تعلیم اردو۔ بیدک کا نصاب تعلیم اردو۔ ڈاکٹری کا نصاب تعلیم اردو۔ سرجری کا نصاب تعلیم اردو۔ ہومیوپیتھک کا نصاب تعلیم اردو۔ تفسیر کا نصاب تعلیم اردو۔ پوران کا نصاب تعلیم اردو۔ وید کا نصاب تعلیم اردو۔ انجیل مقدس کا نصاب تعلیم اردو۔ غرضکہ تمام علوم اور تمام مذاہب کا ایسا جامع نصاب تعلیم اردو مقرر کیا جائے جس میں کسی مذہب والے کو اپنی مذہبی کتب پڑھنے میں دقت نہ واقع ہو۔ مسلمان اپنے مذہب کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اور عیسائی اپنے مذہب کی اور ہندو اپنے مذہب کی۔ علوم کی تعلیم کا نصاب جب سب کا ایک ہوگا اس تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام ہندو مسلمان اپنی مادری زبان میں علوم کی تکمیل سے فراغ حاصل کریں گے۔

یہ بہت اچھی بات ہے کہ اب ادبی اردو کے پرچے اشاعت پذیر ہونے لگے ہیں۔ اور اگر ملک کے اعلیٰ لوگ اُن سے کام لینا چاہیں تو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ہماری ترقی کا زینہ یہی ہے کہ ہم اپنی مادری زبان کو تمام علوم سے مالامال کریں۔ جس قوم نے ترقی کی ہے اپنی زبان کو وسعت دے کر ترقی کی ہے۔ نظیر کے لئے بہت سی ترقی یافتہ قومیں موجود ہیں جو اپنی مادری زبان کو علمی معلومات سے لبریز کر چکی ہیں۔ اور اپنی زبان میں تحصیل علوم کرتی ہیں۔ اُن کی زندگی کا بہت حصہ تحصیلِ علوم میں صرف ہوتا ہے۔ اس لئے اپنی زبان میں تکمیلِ علوم کرنا بہت سہل ہے۔ بخلاف دوسری زبانوں کے۔ دوسرے اپنے ملک میں بھی سرسبزی ہے۔ اِن میں قومیت کا مادہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایک زبان ہونے سے لوگ ہم خیال ہو جاتے ہیں۔ اُن کی رائے بھی ایک ہو جاتی ہے۔ اُن کے لباس ایک ہوتے ہیں۔ اُن کا طرزِ تمدن قریب قریب یکساں ہو جاتا ہے۔

اس وقت ہم کو عربی فارسی کی اس قدر ضرورت نہیں جس قدر اردو کے مکمل کورس کی احتیاج ہے۔ کیونکہ اردو کی تکمیل پر تمام ہندوستان کا مدار ہے۔ ہمارے کروروں ہندی بھائی اردو جانتے ہیں اور جاہل و غیر تعلیم یافتہ کہے جاتے ہیں اس کا اصلی راز اردو کی کمزوری ہے۔ اگر اردو زبان اس قدر کمزور نہ ہوتی تو ہم ہندوستانی کبھی اتنی پستی میں نہ ہوتے۔ اے قومی درد رکھنے والے ہندو مسلمان عیسائی اُٹھو اور اپنی مادری زبان کے اُبھارنے میں کوشش کرو کہ یہی سوراج کا معراج ہے۔ اگر ہندی اردو کے لئے لڑتے رہو گے اور یہ سمجھکر کہ یہ زبان مسلمانوں کی ہے۔ زبردستی اردو کو ہندی حروف میں لکھ کر سوراج کی امید رکھو گے تو کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ اب اردو وہ نہیں رہی جیسے تم سب مل کر چل دو اردو نے جو کچھ ترقی کی وہ اپنی قوت سے کی۔ گورنمنٹ نے اس کی قوت کو مان لیا۔ ہندوستان میں قدم رکھتے ہی کلکتے میں اسی زبان کو اپنے لئے ضروری سمجھا اور حاصل کیا۔ اور تم سب بولتے ہو اور اسی زبان میں بات چیت کرتے ہو۔ لیکن حرفوں کے لئے لڑتے ہو۔ اور اپنے نزدیک تم یہ حماقت کرکے ایسا خیال کرنے لگے ہو کہ ہم بڑے "حرفوں کے بنے ہوئے ہیں"۔ اُردو پر کسی کا احسان نہیں ہے اس نے اپنی قوت سے انگریزی کا مقابلہ کیا اور ترقی کی۔

چراغے راکہ ایزد برفروزد   کسے گر تف زند ریشش بسوزد

تبدیل فضائے بزمِ عالم نہ کرو
اس جنتِ ارضی کو جہنم نہ کرو
مہمان ہو مہمان کی طرح سے نہ رہو
دنیا کا نظامِ امن برہم نہ کرو

خنجر زندی اکبر آبادی

میکدے کی رات

تخمیس بر غزل عکاسِ فطرت حضرت جوشؔ ملیح آبادی

(از مولینا محمد الیاس حسن عمنا آفاق رئیس اعظم سیمرٹی)

دریائے کیف جوش پہ اے ہمنشیں ہے آج　　پہلوئے شوق میں مرے اک حورِ عین ہے آج
ساغر بدست غیرتِ ماہِ مبیں ہے آج　　کیا میکدے کی رات نشاط آفریں ہے آج
رنگین موجِ بادہ سے اُن کی جبیں ہے آج

کوسوں ہیں دُور حلقۂ رنداں سے کلفتیں　　محفل میں بج رہی ہیں جوانی کی نوبتیں
نکھری ہوئی ہیں چاندنی راتوں کی طلعتیں　　ہر شئے پر آسماں سے برستی ہیں زینتیں
ہر ذرّہ کائنات کا اک نازنیں ہے آج

میں ہوں حریمِ ناز ہے اور لذّتِ کلام　　جوشِ مئے شباب سے آنکھیں ہیں لالہ فام
مہکی ہوئی ہوائیں ہیں چھلکے ہوئے ہیں جام　　شیر و شکر میں غرق ہیں کام و دہن تمام
خم میں شرابِ تلخ نہیں، انگبیں ہے آج

اک خواب ہو چکا ہے خیالِ بلند و پست
اب دل میں شوقِ فتح، نہ ہے دہشتِ شکست
محفل میں ہے برنگِ دگر آج بند و بست
لبریز شوخیوں سے ہے چشمِ حیا پرست
تمکیں سے بے خبر نگۂ شرمگیں ہے آج

محفل میں مست جام بدستوں کی دھوم ہے
آئینِ اتّقا کی شکستوں کی دھوم ہے
آزادیٔ خیال کے مستوں کی دھوم ہے
ہر سو دلیر بادہ پرستوں کی دھوم ہے
چھپ چھپ کے پینے والوں کی پرسش نہیں ہے آج

ہر گوشۂ نشاط میں گونجے ہیں قہقہے
ہر کنجِ دل فریب میں رقصاں ہیں ولولے
ہر چشمِ مے فروش میں غلطاں ہیں میکدے
ہر لغزشِ قدم سے ٹپکتے ہیں زمزمے
ہر جنبشِ نگاہ سرود آفریں ہے آج

جس سمت آنکھ اٹھائیے اک سرخوشی کا جوش
جس پر نگاہ ڈالیے سرمستِ نائے و نوش
جس سرو قد کو دیکھیے صد گلستاں بدوش
جس ظرفِ مے کو چومیے لعلِ شکر فروش
جس غنچے کو دیکھیے زہرہ جبیں ہے آج

صد محشرِ نشاط ہے مطرب کی ایک لے
ڈوبی ہوئی ہے موجِ طرب میں ہر ایک شے
ہر مست آج بادۂ عشرت سے چور ہے
لرزش ہر ایک ہاتھ میں ہے گر رہی ہے مے
ڈوبی ہوئی شراب میں ہر آستیں ہے آج

دوشِ ہوا پہ جھومتی پھرتی ہے تازگی
خاکِ چمن پہ لوٹتی پھرتی ہے دلبری
ڈوبی ہوئی ہے رنگِ جوانی میں زندگی
پھیلی ہوئی ہے فرش سے تا عرش چاندنی
نیلم ہے چرخ، لعلِ بدخشاں زمیں ہے آج

آمادۂ وداع ہیں سب صبر اور شکیب — ہونے کو تار تار ہیں دامان اور جیب
رنگِ شرابِ ناب سے پُر ہے ذقن کا سیب — اُس پنکھڑی سے لب پہ تبسم ہے دل فریب
دل میں کسی کے ضبط کی طاقت نہیں ہے آج

مے نوش و مے فروش ہیں آغوشِ فضل میں — مجبورِ وجد ہوش ہیں آغوشِ فضل میں
یارانِ جرم کوش ہیں آغوشِ فضل میں — رندانِ بادہ نوش ہیں آغوشِ فضل میں
رحمت سے دُور زاہدِ خلوت نشیں ہے آج

شمعوں سے چھن رہا ہے رُخِ تازہ کا نکھار — ذرّوں میں آفتاب کا جوہر ہے بے قرار
پھولوں سے جلوہ ریز ہے معشوقۂ بہار — مینا سے رنگِ عارضِ سلمیٰ ہے آشکار
ساغر میں حسنِ لیلیٰ محمل نشیں ہے آج

مے خانہ اک نمونۂ ایوانِ خُلد ہے — منظر میں انعکاسِ گلستانِ خُلد ہے
تاباں سوادِ ارض میں سامانِ خُلد ہے — رقصاں فضا میں پرتوِ حورانِ خُلد ہے
جُنباں ہوا میں دامنِ روح الامیں ہے آج

ساغر میں حُسنِ یوسفِ کنعاں ہے کیف دوز — کلیاں مہِ دو ہفتہ ہیں، گُل مہرِ نیمروز
ساقی کی مے ہے چشمۂ حیوانِ دل فروز — مُطرب کی لے میں بربطِ داؤد کا ہے سوز
صہبا کی بُو میں نکہتِ خلدِ بریں ہے آج

آفاق آسمان پہ ہے شعر کی کمند — جکڑا ہوا ہے اوجِ دو عالم کا بند بند
کس طرح آئے ذلتِ پستی مجھے پسند — مینارِ میکدے کا ثریّا سے ہے بلند
پائے سبو پہ جوشِ سخن آفریں ہے آج

اک خواب ہو چکا ہے خیالِ بلند و پست — اب دل میں شوقِ فتح ...
محفل میں ہے برنگِ دگر آج بند و بست — لبریز شوخیوں سے ہے جوش...
تمکیں سے بے خبر نگہِ شرمگیں ہے آج

محفل میں مست جام بدستوں کی دھوم ہے — آئینِ اتقا کی شکستوں کی دھوم ہے
آزادیِ خیال کے مستوں کی دھوم ہے — ہر سو دلیر بادہ پرستوں کی دھوم ہے
چُھپ چھپ کے پینے والوں کی پرسش نہیں ہے آج

ہر گوشۂ نشاط میں گونجے ہیں قہقہے — ہر کنجِ دل فریب میں قصاں ...
ہر چشمِ ... فروش میں غلطاں ہیں میکدے — ہر لغزشِ قدم سے ٹپکنے ...
ہر جنبشِ نگاہ سرود آفریں ہے آج

... سمت آنکھ اٹھائیے اک سرخوشی کا جوش — جس پر نگاہ ڈالیے سرمستِ ناؤ نوش
... سروقد کو دیکھئے صد گلستاں بدوش — جس ظرفِ مے کو چومئے لعلِ شکر فروش
جس غنچے کو دیکھئے زہرہ جبیں ہے آج

صد محشرِ نشاط ہے مطرب کی ایک لَے — ڈوبی ہوئی ہے موجِ طرب میں ہر ایک شے
ہر مست آج بادۂ عشرت سے چُور ہے — لرزش ہر ایک ہاتھ میں ہے گر رہی ہے مے
ڈوبی ہوئی شراب میں ہر آستیں ہے آج

دوشِ ہوا پہ جھومتی پھرتی ہے تازگی — خاکِ چمن پہ لوٹتی پھرتی ہے دلبری
ڈوبی ہوئی ہے رنگِ جوانی میں زندگی — پھیلی ہوئی ہے فرش سے تا عرش چاندنی
نیلم ہے چرخ، لعلِ بدخشاں زمیں ہے آج

صبر اور شکیب ہونے کو تار تار ہیں داماں اور جیب
[illegible] اُس نکھڑی سے لب پہ تبسم ہے دل فریب
دِل میں کسی کے ضبط کی طاقت نہیں ہے آج

[illegible] فروش ہیں آغوشِ فصل میں مجبورِ وجد ہوش ہیں آغوشِ فصل میں
یارانِ جرم کوش ہیں آغوشِ فصل میں رندانِ بادہ نوش ہیں آغوشِ فصل میں
رحمت سے دُور زاہدِ خلوت نشیں ہے آج

[illegible] رہا ہے رُخ تازہ کا نکھار ذرّوں میں آفتاب کا جوہر ہے بے قرار
[illegible] معشوقہ بہار مینائے رنگ عارضِ سلمیٰ ہے آشکار
ساغر میں حسن [illegible] نشیں ہے آج

[illegible]
[illegible] سامانِ خلد ہے [illegible] حورانِ [illegible]
جُنباں ہوا میں دامنِ روح الامیں ہے آج

ساغر میں حسنِ یوسفِ کنعاں ہے کیف دوز کلیاں مہِ دو ہفتہ ہیں، گُل مہرِ نیم روز
ساقی کی مے ہے چشمۂ حیوانِ دل فروز مُطرب کی لے میں بربطِ داؤد کا ہے سوز
صہبا کی بُو میں نکہتِ خلدِ بریں ہے آج

آفاق آسماں پہ ہے شعر کی کمند جکڑا ہوا ہے اوجِ دو عالم کا بند بند
کس طرح آئے ذِلّتِ پستی مجھے پسند مینار میکدے کا ثریا سے ہے بلند
پائے سبو پہ جوشِ سخن آفریں ہے آج

اک خواب ہو چکا ہے خیالِ بلند و پست　　اب دل میں شوقِ فتح، نہ ہے دہشتِ شکست
محفل میں ہے بہ رنگِ دگر آج بند و بست　　لبریز شوخیوں سے ہے چشمِ حیا پرست
تمکیں سے بے خبر نگہِ شرمگیں ہے آج

محفل میں مست جام بدستوں کی دھوم ہے　　آئینِ اتقائی شکستوں کی دھوم ہے
آزادیٔ خیال کے مستوں کی دھوم ہے　　ہر سو دلیر بادہ پرستوں کی دھوم ہے
چھپ چھپ کے پینے والوں کی پرسش نہیں ہے آج

ہر گوشۂ نشاط میں گونجے ہیں قہقہے　　ہر کنجِ دل فریب میں رقصاں ہیں ولولے
ہر چشمِ مے فروش میں غلطاں ہیں میکدے　　ہر لغزشِ قدم سے ٹپکتے ہیں زمزمے
ہر جنبشِ نگاہ سرود آفریں ہے آج

جس سمت آنکھ اٹھائیے اک سرخوشی کا جوش　　جس پر نگاہ ڈالیے سرمستِ نائے و نوش
جس سرو قد کو دیکھیے صد گلستاں بدوش　　جس ظرفِ مے کو چومیے لعلِ شکر فروش
جس غنچے کو دیکھیے زہرہ جبیں ہے آج

صد محشرِ نشاط ہے مطرب کی ایک لے　　ڈوبی ہوئی ہے موجِ طرب میں ہر ایک شے
ہر مست آج بادۂ عشرت سے چور ہے　　لرزش ہر ایک ہاتھ میں ہے گر رہی ہے مے
ڈوبی ہوئی شراب میں ہر آستیں ہے آج

دوشِ ہوا پہ جھومتی پھرتی ہے تازگی　　خاکِ چمن پہ لوٹتی پھرتی ہے دلبری
ڈوبی ہوئی ہے رنگِ جوانی میں زندگی　　پھیلی ہوئی ہے فرش سے تا عرش چاندنی
نیلم ہے چرخ لعلِ بدخشاں زمیں ہے آج

آمادۂ وداع ہیں سب صبر اور شکیب ہونے کو تار تار ہیں دامان اور جیب
رنگِ شرابِ ناب سے پُر ہے ذقن کا سیب اُس پنکھڑی سے لب پہ تبسم ہے دل فریب
دل میں کسی کے ضبط کی طاقت نہیں ہے آج

مئے نوش و مے فروش ہیں آغوشِ فضل میں مجبورِ وجد ہوش ہیں آغوشِ فضل میں
یارانِ جرم کوش ہیں آغوشِ فضل میں رندانِ بادہ نوش ہیں آغوشِ فضل میں
رحمت سے دُور زاہدِ خلوت نشیں ہے آج

شمعوں سے چھن رہا ہے رُخِ تازہ کا نکھار ذرّوں میں آفتاب کا جوہر ہے بےقرار
پھولوں سے جلوہ ریز ہے معشوقۂ بہار مینا سے رنگِ عارضِ سلمیٰ ہے آشکار
ساغر میں حسنِ لیلیٰ محمل نشیں ہے آج

مے خانہ اک نمونۂ ایوانِ خُلد ہے منظر میں انعکاس گلستانِ خُلد ہے
تاباں سوادِ ارض میں سامانِ خُلد ہے رقصاں فضا میں پرتوِ حورانِ خُلد ہے
جُنباں ہوا میں دامنِ روح الامیں ہے آج

ساغر میں حسنِ یوسفِ کنعاں ہے کیف دوز کلیاں مہِ دو ہفتہ ہیں، گُل مہرِ نیم روز
ساقی کی مے ہے چشمۂ حیوانِ دل فروز مُطرب کی لَے میں بربطِ داؤد کا ہے سوز
صہبا کی بُو میں نکہتِ خلدِ بریں ہے آج

آفاقِ آسمان پہ ہے شعر کی کمند جکڑا ہوا ہے اوجِ دو عالم کا بند بند
کس طرح آئے ذلتِ پستی مجھے پسند مینار میکدے کا ثُریا سے ہے بلند
پائے سبو پہ جوشِ سخن آفریں ہے آج

مردِ مضحک

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

(اسرائیل احمد خاں سکندر آباد دکن)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۴)

اب یہ پیر مرد جسے آئندہ ہم ... کے نام سے یاد کریں گے سیر حاصل گفتگو کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے!

"کپتان صاحب!" اس نے سوال کیا "کیا آپ کے پاس وہ آلہ زاویہ پیما ہے جو انگریزی رصدگاہوں پر استعمال کیا جاتا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"مگر بغیر اس آلہ کے تم سطح بحر پر مختلف چیزوں کا ارتفاع کیسے معلوم کر سکتے ہو؟ قبل اس کے کہ انگریز لوگ بحریات کی دنیا میں قدم رکھیں بابلکے لوگ ان حسابات کے ہفتخواں طے کر چکے تھے!" کشتی کا "بابلکے" شیر بحر بولا!

"ذرا کشتی کا خیال رکھئے، کہیں یہ ہفتخواں طے کرنے کے بعد بھی آپ قلابازی نہ کھا جائیں!"

جی نہیں جناب! میرا ہاتھ کشتی کی باگ پر ہے! جہاں وہ ایک قدم بھی بے راہ روی اختیار کرتی ہے میں معاً اُسے سنبھال لیتا ہوں!"

کیا تم نے یہ معلوم کیا کہ کشتی اس وقت کتنے ناٹ، (بحری میل) کی رفتار سے جا رہی ہے؟

جی ہاں؟

کب؟

ابھی ابھی'

کس طرح؟

لٹّے کی مدد سے۔

تم نے اُس کے زاویے کو بھی دیکھنے کی تکلیف اٹھائی؟

بلا شبہ

کیا تم نے دیکھ لیا کہ ریت کانچ میں سے ہو کر ٹھیک تیس ثانیہ (سیکنڈ) گزری؟

جی ہاں، دیکھا"

کیا تم کو اطمینان ہے کہ ریت کے ذرّوں نے متعلقہ ظرف کے وسطی ... کو خراب تو نہیں کر دیا ہے؟"

میں نے اُن جملہ جزئیات کے بارے میں پوری تشفی کر لی ہے'

اچھا، تم نے ساعتِ ریگ کی آزمائش بھی کی، اک لنگر کی گردش سے؟ -

"یہ بھی کر لیا ہے"

تم نے ڈوری کو موم بھی لگا لیا تھا؟ بغیر اس پیش بندی کے وہ تجربے کے دوران میں کھنچ جایا کرتی ہے!"

"لٹّے کی بھی جانچ کر لی تھی؟"

"جی ہاں، ایک گولی کے ذریعے سے!"

یہ گولی کتنے حجم کی تھی؟

یوں سمجھئے کہ اُس کا قطر ایک فٹ کا تھا۔

کافی وزنی بھی تھی؟

جی ہاں، بلکہ یہ وہ گولی تھی جو ہمارے جنگی جہاز ——— لا کیپ ڈی پار ——— میں استعمال ہونے کا تاریخی شرف رکھتی ہے:

یہ جہاز وہی ہے نا جو آرمیڈا (ہسپانیہ کا عظیم الشان، تاریخی یادگار ... ت جو سواحلِ انگلستان پر حملہ آور ہوا تھا) میں شریک تھا؟

جی ہاں وہی۔

... اور جس کا عرشہ چھ سو سپاہیوں، پچاس ملاحوں، اور پچیس توپوں کی ... کا مسطح تھا۔ حکیم نے اپنے زنبیلِ معلوماتِ عامہ کی تھوڑی نمائش کرتے ... پوچھا:

اس بات کو تو آپ کا پیٹ جلنے یا سمندر کا پیٹ جس کا وہ لقمہ بنا؟ —

... سالے نے اعظم اور اس متبحر عالم ہر دو کے ناقابلِ پیمائش عمق کی داد دیتے ہوئے کہا:

اس کے بعد حکیم نے گوناگوں اور سوالات کئے، انواع و اقسام کے بحری ... کے نام لئے، جو جہاز رانی میں کام آتے ہیں۔ پھر ہر ایک کے طریقِ استعمال پر ... کی، اور استخراجِ نتائج کے اصول بیان کئے۔ مختلف ممالک کے مروجہ پیمانوں ... کتاب کئے، اور سب ت اور ماہرانہ معلومات اور عارفانہ ملفوظات ... ارشاد فرمائے۔ جن پر کپتان نے لفظ بہ لفظ آمنّا و صدقنا کہا۔ بعد ازاں حکیم نے اپنا ... نوعِ لفظ کشتی کے سفر اور اس کی منزلِ مقصود کی طرف پھیر دیا۔ چنانچہ اُس نے ... سوال لیا۔

کشتی کس طرف لے جا رہے ہو؟

ایک خاص گودی ہے جس کا موقع و محل میں جانتا ہوں۔ اس وقت ہم اسی کے ... ہیں۔

اچھا تو اس بندرگاہ کے جغرافیائی جائے وقوع کا جلد از جلد تعین کیجئے!

... کا فرمودہ صادر ہوا۔

بہت خوب

مگر اس اثنا میں برابر ہوشیار رہئے، اور ہوا کے ناگہانی جھونکوں کے متعلق حفظ ما تقدم کی ساری تدابیر کو ملحوظ رکھئے! کرۂ باد کے یہ جھونکے بعض اوقات بحرِ محیط کی مہلک امواج کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ——— حکیم کی غیر مختتم عقلِ کل کی ضمنی ہدایت تھی۔

سمندر کے سفر میں یہ چیزیں بڑی تعداد رواقع ہوتی ہیں! کپتان نے کہا لا تسبّوا الدّھر، دریا ہم گردش دارد! دشنام وہی مناسب نہیں! بحرِ اعظم کا نفس اپنی اہانت کو پورے زندہ شعورِ غیرت سے محسوس کرے گا: حالات کا مشاہدہ اور تغیرات کا مطالعہ کرتے رہئے، اور خاطر جمع رکھئے! ——— بادی برحق نے فرمایا:

بجا ہے۔ میں اس انتباہ پر کاربند رہونگا۔ اس وقت سمندر کا مد اور ہوا کا دھارا متضاد سمت میں جاری ہیں جس وقت یہ دونوں باہم یکجہتی اختیار کریں گے کشتی کی رفتار زیادہ محفوظ و متوازن ہو جائے گی۔

حکیم کی نظر یکبارگی شمالی مشرقی گوشے پر جم گئی! اُس کے کافوری چہرے پر تاریک آثار ظاہر ہوئے۔ غیر معمولی دہشت و وحشت کے علامات اُس سنگین نقاب چہرے کو رقیق کرنے لگے: پھر دفعۃً اُس کے منہ سے نکلا، "خوب"، اُس کی آنکھیں جو چھند کی طرح گول گول تھیں۔ بد حواسی سے پھیل گئیں! اور افق پر جو خوق العادہ منظر نظر آیا تھا۔ دوبارہ اُس پر مرکوز ہو گئیں۔ اُس کی زبان نے ان کلمات کی تکرار کی۔

بہت خوب ہے۔ میں بالکل رضا بقضا ہوں۔ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ، کپتان، حکیم کے واردات و خواطر کی طرف شدت سے متوجہ ہوا۔ آخر الذکر کی بڑ برابر جاری تھی۔ اپنی گفتگو کا یا تو وہ خود مخاطب تھا، یا پھر یہ سرگوشیاں زوجِ بحر سے ہو رہی تھیں۔

مطلع پر ایک نظر ڈال کر اُس نے پھر کہا،

یہ چیز اگرچہ بہت دُور سے آ رہی ہے۔ مگر اُس کے وجود میں نہ شک ہے نہ اُس کے آنے میں کلام۔

یہ قوسِ نمائے جو اُفق پر نمایاں تھی، اور جو حکیم کے تارِ نظر اور سلسلۂ تخیلات کو اپنے سے ہم رشتہ کئے ہوئے تھی۔ شفقی تنویر میں صاف نظر آ رہی تھی۔ اسی چیز کی طرف کپتان کی توجہ کو منعطف کراتے ہوئے حکیم نے استفسار کیا۔

کپتان: تم دیکھتے ہو؟

کیا چیز؟

وہ!

دور فاصلے پر!

اچھا، وہ کبودی رنگ کا دھبا سا! ہاں ہاں!

یہ کیا شے ہے؟

سقفِ آسمانی میں ایک دریچہ سا! کپتان نے شاعرانہ تشبیہ پیش کی۔

اور غالباً اُن لوگوں کے لئے جو عازمِ بہشت بریں ہوتے ہیں! نیز اُن بزرگوں کے لئے بھی جن کی منزلِ مقصود بہشت کے ساتھ اک رشتۂ تضاد رکھتی ہے ——— مگر خیر یہ اور معاملہ ہے۔ حکیم نے پیمبرانہ تفسیر کی!

ہولناک پراسراریت سے گرانبار جب یہ الفاظ حکیم کی زبان سے نکلے تو اُس کے چشم و ابرو پر دہشت و خشیت کے کچھ عجیب آثار نمودار ہوئے۔ مگر چونکہ تاریکی اب تک کافی ہو چکی تھی اس لئے حکیم موصوف کے، اس وقتی چلیئے کے عنصر ات پر روشنی ڈالنا ناممکن تھا۔

اک سکوت طاری ہو گیا۔ کپتان کو بے اختیار وہ دو لقب یاد آئے جو کامیر لیشیکو جماعت کے سردار نے اس عسیر الفہم ہستی کے متعلق استعمال کئے تھے۔

اُس نے اپنے دل سے سوال کیا۔

یہ شخص واقعی کوئی خبطی و مراقی ہے یا کوئی دیوانہ نما دانا؟ ———

جس کے مبلغ علم و نظر تک ہم عوام کالانعام کی رسائی نہیں؟

حکیم کی خشک و سخت استخوانی اُنگلی برابر اُس شے کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو مطلع پر اب اک حجابِ غبار میں رقصاں نظر آ رہی ہے۔

بلاشبہ یہ کوئی بادل کا ٹکڑا ہے، نیلے بادل کا!" بالآخر کپتان نے فیصلہ کر دیا۔

لیکن نیلا بادل کالے بادل سے زیادہ بلا ہائے آسمانی کا حامل ہوتا ہے! حکیم نے اپنی تعبیر میں "شانِ جلال" پیدا کر دی۔

کپتان نے اس جملے کو اپنی مخلوط فرانسیسی و ہسپانوی زبان میں دوہرایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُس کا ترجمہ کر کے وہ اس کی پوری معنویت و سنگینی کو ذہن نشین کرنا چاہتا ہو!

حکیم بارِ دگر لب کشا ہوا۔

یہ اک برفانی بادل ہے! کپتان، تم جانتے ہو کہ برفانی بادل کیا ہوتا ہے؟

جی بالکل نہیں! کپتان کا اعترافِ عجز تھا۔

شاید حالات کا اک برق رفتار تغیر اس ابرِ برف کے ابہام کو دور کر دے۔ حکیم نے اپنے کلام میں اک مزید لہجۂ وعید پیدا کرتے ہوئے کہا۔

افق کا معلومہ پارۂ ابر بتدریج و بہ تسلسل اپنے قد و قامت کو بڑھا رہا تھا۔ حکیم نے ایسی حالت میں کہ اُس کی آنکھیں برابر اس چیز پر جمی ہوئی تھیں، کپتان سے سوال کیا۔

"تمہارا گزر اس سے پہلے کبھی آبنائے انگلستان سے ہوا ہے؟

جناب، اُس کے عبور کا یہ پہلا ہی موقع ہے!"

حکیم کے بشرے پر اس اطلاع سے اک خاص قسم کی تشویش نظر آئی اور اس کے شانوں کو اضطراراً اک جنبش ہوئی! کپتان کے اس جواب پر اُس نے مزید سوال کیا۔

اس کے کیا معنی؟

میرے آقا! عام طور پر اپنے بحری سیر و گشت میں میرے دورے سواحل آئرستان تک محدود رہے ہیں۔ اُس نواح میں میں اکثر سیاہ بندر پر لنگر انداز ہوا کرتا ہوں۔ ویلز کے ساحل کے بعض نقاط کو بھی کبھی کبھی میری کشتی مس کیا کرتی ہے مگر جس بحیرہ میں جزائر سسلی واقع ہیں اُس سے میں بالکل نابلد ہوں۔ یہاں جانے کا مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔

یہ تو بہت نازک معاملہ ہوا۔ حکیم بولا، سطحِ بحر پر ایسی سادہ لوحی اندوہناک نتائج پیدا کر سکتی ہے!

اُس نے مزید کہا۔

آبنائے انگریزی کی طبعی خصوصیات اور موسمی تغیرات کی واقفیت جہاز رانوں کے لئے ازبس ضروری ہے۔ یہ آبی تنگنائے وسیع بحرِ محیط کا اک خوفناک دہانہ ہے! کم از کم اُس کی زیرِ آب چٹانوں سے خبردار رہئیے!"

اس کے بعد تھوڑی دیر تک سمندر کا عمق ناپنے، اُس سے نتائج مستنبط کرنے اس سے نیک و بد شگون لینے کے حرف و حکایات رہے۔ لیکن سلسلۂ گفتگو پھر بدلا،

...ر آبنائے انگلستان ازسرِ نو موضوعِ ذکرو فکر بن گئی۔

حکیم نے پھر بتایا۔ آبنائے کوئی معمولی گوشۂ بحر نہیں! جب اُس میں طوفان تلاطم ہوتا ہے تو اک منظرِ محشر سامنے ہوا کرتا ہے۔ سمندر کی موج پچاس پچاس فیٹ اونچی ہاتی ہے! بحالتِ خیر ابھی اُس کی بلندی اس کے نصف سے کم نہیں ہوتی۔

آج رات کو سمندر کی تھاہ لینا چاہیئے" کپتان کا شوقِ عزم متحرک ہوا۔

پیمائش کے اس عمل کے لئے سمندر کے سکون کی ضرورت ہے، اور وہ مفقود ہے حکیم نے تنبیہ کی۔

تاہم کوشش کریں گے" کپتان نے بات کی پچ کی۔

کوشش چہ معنی دارد؟ ہم ایسی حالت میں اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے"

بہرحال، تن بتقدیر ہم ایسا کریں گے۔ خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔

ذرا ہوشیار ہو کر بات کیجئے! یہ برگزیدہ اسم اعظم ایسی بے تکلفی سے مُنہ سے نکالنے کا نہیں ہے۔

میں اپنے الفاظ کو ہرگز واپس لینا نہیں چاہتا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میں ضرور پیمائش کی کارروائی کروں گا:" کپتان کی بالک ہٹ جاری رہی۔

ذرا عقل کے ناخن لو صاحبزادے! چند ہی لمحے کے اندر طوفان کے ایک صدمے سے تمہیں سابقہ پڑنا ہے جس سے تمہیں اپنے پُرہول ماحول کے عمق کی پیمائش کا تھوڑا موقع البتہ ضرور ملے گا۔

کچھ بھی ہو، بندہ اس ارادے سے باز نہیں رہ سکتا" لاعلاج کپتان بولا۔

اچھی بات ہے۔ تو پھر سنو۔

سنو کا تنبیہی صیغۂ امر حکیم نے کچھ ایسے تمرد شکن اور تحدی خیز لہجے میں ادا کیا کہ کپتان کی پھونک نکل گئی؛ اُس نے نیاز کیشانہ کہا۔

میں ہمہ تن گوش ہوں، قبلہ!"

اچھا، اگر میری بات سنتے ہو تو کشتی کا رُخ ایک دم پچھم کی طرف پھیر دو۔

پچھم کی طرف! بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ کپتان کا شورِ تشکیک پھر اُبھر آیا!

جیسے بھی ممکن ہو" حکیم کا جواب تھا۔

لیکن میرے آقا! مغرب کی جانب؟ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔

ہاں ہاں، کپتان صاحب۔ میں یہی کہتا ہوں، اور یہ سب آپ ہی لوگوں کی خاطر! ورنہ خود مجھکو اپنی ذات کی مطلق پروا نہیں"

تو کیا جناب کا خیال ہے کہ اس سمت میں آگے چل کر کرۂ فضائی کا اک نسبتہ پُرسکون حلقہ مل جائے گا؟

میری یہی امید ہے۔

کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ اس شیطانِ خزاں (طوفان) کا کلیجہ تھوڑی دیر میں پھٹ جانے والا ہے؟ کپتان نے فاتحانہ استفسار کیا۔

اپنی زبان کو لگام دیجیے اور رُوحِ طوفان سے معذرت کیجیے! حکیم نے پھر صدائے احتجاج بلند کی۔

خیر ہو گا۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ مغرب کی طرف کشتی کو جنبش دینا بھی ناممکنات سے ہے! وہ یقیناً ہوا کے پہلے تھپیڑے پر پلٹ جائے گی۔ طوفان کا رُخ ہمیں بجائے مغرب کے مشرق کی سمت اختیار کرنے کی صلاح دیتا ہے۔

مگر سمتِ مشرق اور حادثۂ غرقابی ہم معنی الفاظ ہیں"

الغرض مشرق و مغرب کی رَدّ و کد عرصے تک جاری رہی۔ حکیم اپنی رائے میں ذرہ برابر ترمیم کرنا نہ چاہتا تھا اور اُدھر اس تجویز کی غائت و مصلحت کو سمجھنا کپتان کے علم و فہم سے بالاتر تھا۔ وہ محض "سالکِ باخبر" کے کہنے پر بلاشرح صدر "بے سجادہ رنگیں کن" پر آمادہ نہ تھا! بالآخر اس نے کہا۔

بہتر ہے، میں مغرب ہی کی طرف چلوں گا۔

اس پر حکیم کپتان کی طرف پورا مُڑ کر بیٹھ گیا۔ اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، اس انداز سے کہ گویا اپنی قلبی بصیرت تمام و کمال مؤخر الذکر کے سینے میں منتقل کر دینا چاہتا ہے۔ اُس نے الفاظ ذیل کو آہستہ آہستہ ایک ایک کرکے ادا کیا۔

"اگر... آج رات کو... ہم... سمندر میں... کسی گھنٹی کی آواز... سنیں... تو ہم کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ... یہ کسی جہاز کی غرقابی کی صدائے بازگشت ہے!!"

کپتان تصویرِ حیرت بن کر رہ گیا:

کیا معنی؟

حکیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب وہ پہلے کی طرح پھر اپنی داخلی فکر کے گوشۂ خمول میں مراجعت کر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ ایک مرتبہ پھر اپنے ہی سے

مخاطب تھا اور خود کلامی کی زیرِ لب آواز میں کہہ رہا تھا۔

باغی روحوں کو توبہ و انابت کی طرف رجوع ہونا چاہیئے! اب وقت آگیا ہے کہ لوگ اپنے خالق سے معذرت کرلیں۔

کپتان نے اس پیغمبرانہ اتمامِ حجت پر منہ بنایا اُس نے دل ہی دل میں کہا کہ یہ ضرور پاگل ہے۔

تاہم کشتی اب مغرب ہی کی جانب کشاں کشاں سے جارہی ہے۔

(۵)

سطح کا ابر و غبار اک ہیولائی نمود رکھتا تھا۔ مختلف موقعوں پر بادل میں آتے پاؤں سے نکلے ہوئے دکھائی دیتے تھے! طوفان کی شوراشوری یہ تخیلی توہم پیدا کر رہی تھی کہ گویا بے شمار غیر مرئی منہ ہوائے غلیوں کو پھونک رہے ہیں۔

افق کے مناظر مخدوش ہیئت اختیار کر رہے ہیں۔ مشرق و مغرب، ہر دو جانب فضا کی بعید ترین پہنائیوں تک نیلے بادلوں کی یورش ہو رہی ہے۔ بعض اوقات یہ بادل بہ اکی متقابل سمت میں حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ موسم کی نیرنگیوں اور کرشمہ سازیوں کے بھی عجیب انداز ہیں۔

سمندر کی سطح نے کسی بحری جانور کی جلد کی سی ہیئت اختیار کرلی ہے: یہ جلد بدن اپنی علامات کے اعتبار سے مرضِ جذام میں مبتلا نظر آتی ہے۔ اچھلتے ہوئے پانی سے جو جھین اٹھتا ہے وہ گویا انشقاقِ جلد کی سی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔

کپتان نے حکیم کی تلاش کی جو اب عرشے پر موجود نہ تھا۔ وہ نیچے کیبن میں چلا گیا تھا۔ یہاں وہ چولہے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اور اپنے لبادے سے اک بھی بیاض نکالی تھی۔ اس کتابچے میں سے اس نے ایک چرمی کاغذ کا پرزہ برآمد کیا جس کی چاروں تہیں کی ہوئی تھیں اور جو نہایت کہنہ و فرسودہ، سیاہ و کثیف تھا۔ اس کاغذ کو کتاب پر جما کر اُس نے اپنے گھٹنے پر رکھا اور قلم دوات نکال کر باورچی کی لالٹین کی روشنی میں کچھ لکھنا شروع کیا۔ طوفان کا شور و تزلزل اُس کے اس مشغلے میں قطعاً مخل نہیں وہ باطمینانِ تمام مطلوبہ تحریر لکھ رہا ہے۔

باورچی کھانا پکا رہا ہے اور ہانڈی کے نمک و ذائقہ کے چکھنے اور مسالے کے تناسب کے درست کرنے میں مصروف۔

حکیم یکبارگی باورچی کی طرف متوجہ ہوا اور چونک کر بولا۔

یہ لڑکی ——— یہ لڑکی تمہارے پہلو میں میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی: یہ ہارڈکینین کی ہے نا؟

جی ہاں، یہ ہمارے بدانجام رفیق ہارڈکینین ہی کی ہے۔

جو کہ قید خانے میں ہے؟

جی ہاں،

یعنی زندانِ جہنم کے اک محبس سیاہ میں؟

جی ہاں۔ بیچارہ میرا بڑا دوست تھا۔ اُس کی اب یہی یادگار باقی رہ گئی ہے۔ دیکھئے اب کبھی ملتا بھی ہے یا نہیں! وہ کیسا اس لڑکی کو بوتل کی طرح اپنی کمر سے لٹکائے پھرا کرتا تھا"

حکیم اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ وہ کاغذ پر ادھر اُدھر دور دور کچھ لکیریں کھینچ رہا ہے۔ اُسے اس بات کا خاص خیال ملحوظ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی تحریر صاف اور واضح رہے۔ طوفان زدہ کشتی کی پیہم جنبشوں اور پیری کی رعشہ دار انگلیوں کی مسلسل لرزشوں کے علی الرغم اُس نے خاطر خواہ طور پر یہ کام سرانجام کیا۔

ناگہاں بحرِ اعظم نے اک کروٹ لی۔ اور پُرخروش امواج کے ہجوم نے کشتی کو نرغے میں لے لیا۔

کشتی کا رقص بیتاب دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ بالکل اک خس حقیر نظر آنے لگی۔ اک پرِ کاہ کی طرح اُس نے اپنے آپ کو تلاطم کے رحم پر چھوڑدیا۔

لیکن اسی اثنا میں حکیم پوری استقامتِ قلب کے ساتھ استادہ ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ آگ کے پاس گیا اور اپنی لکھی ہوئی تحریر کو وہاں سکھایا۔ بعد ازاں اُس نے چرمی کاغذ کو دوبارہ تہ کیا۔ اور بدستور جیبی کتاب کے اندر رکھ لیا۔

کشتی کے چولھے کی ساخت میں کسی ایجادی جدت یا اقتصادی کفایت کا التزام نہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں ہانڈی کے اندر اک زور کا ابال آیا۔ اپنی زبانِ شامہ سے باورچی بولا۔

کیا خوب مچھلی کا شوربہ ہے۔

جی ہاں، مگر شاید مچھلیاں ہی اُسے نوشِ جان بھی کریں گی ———

حکیم کی زبانِ حقیقت ترجمان نے اک تنبیہہ رسید کی۔

یعنی: ـــــــ باورچی پوچھتا ہی رہ گیا، اور حکیم اک طرف کو چل دیا۔

(۶)

حکیم جن مشاغل میں قبل ازیں مصروف رہا تھا اُنھوں نے اُس کے قلب کے اندر رقت و معرفت کی اک خاص قسم کی فضا پیدا کر دی تھی جس کی روشنی میں اُس نے موجودہ صورتِ حال کا مطالعہ کیا تھا۔ اپنی مرموز گفتگو کے بعض کلمات میں اُس نے اس حقیقت مضمرہ کی طرف وقتاً فوقتاً کنایات بھی کئے تھے۔

ہوا کا رُخ اب ٹھیک شمال کو ہو گیا ہے۔ یہ اک بامراد تھی۔ جو عین اُن کی منہ مانگی دعا تھی کشتی انگلستان کے ساحل سے گریزاگریز دور ہونے لگی۔ یہ ہوا مسافرین کو خطرے کے حلقے کے آخری حدود سے ایسے مؤثر اور خاطر خواہ طریقے سے نکال رہی تھی کہ کپتان نے ارادہ کر لیا کہ کشتی کے سارے بادبانوں کو کھول دے۔

طوفانی امواج کے کفِ سفید پر سے رپٹتی ہوئی اور بیتاب لہروں پر جست و خیز کرتی ہوئی کشتی اک مستانی چال سے چلی جا رہی ہے۔ اہل کشتی پھر ہشاش بشاش ہیں۔ وہ طوفانوں کی تندی ہوا کی طرفداری اور کشتی کی تیز رفتاری غرض ہر چیز کو شاباش کہہ رہے ہیں۔ اور بار بار اپنی تالیوں سے ان سب چیزوں کو داد دے رہے ہیں۔ پردۂ غیب میں اُن کے لئے جو کچھ چھپا ہوا ہے اُس سے وہ بالکل بے خبر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکیم ان لوگوں کو اس وقت نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ پھر اپنے خواب مراقبہ میں پہنچ گیا ہے۔

دن کا آخری نام و نشان بھی معدوم ہو چکا ہے۔ کچھ جو دور کی پہاڑی چوٹی سے نظر جائے دیکھ رہا تھا اُس کو پہلی دفعہ کشتی آنکھوں سے اوجھل ہوتی دکھائی دی۔ کشتی جس حشر سے دوچار ہونے والی تھی اُس میں اس مظلوم معدوم کی غیر مشہود نگاہِ یاس اور اُس کی غیر مسموع آہِ دلدوز کو کہاں تک دخل تھا۔

بہرحال کشتی کے ساتھ پیچھے کا تارِ نظر ٹوٹا اور کچھ شمال کی طرف اور کشتی جنوب کی جانب چلی گئی۔

ہر چیز غرقِ تاریکی ہو گئی ہے، تاہم کشتی کے اندر جشنِ مسرت کا فروغ ہنوز باقی ہے۔ جانستان اور روحِ فرسا سرزمین انگلستان کا ناشدنی ساحل اُن کے پس پشت دُور پڑتا جا رہا ہے۔ اور ہر لمحہ اپنے مہیب ہیئت قد و قامت کو کم کر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ کشتی کے گرداگرد بحرِ محیط کا سیاہ حلقہ حصار بند ہو گیا۔ خشکی پر کی پہاڑیاں بھی اک فضائے تاریک میں ملفوف ہو گئیں۔ سواحلِ انگلستان کے تمامی خط پر "لائٹ ہاؤسوں (منارہائے جہازی) کا" چراغاں "جلوہ گر ہو گیا۔ اب یہ سارا ملک اک حلقۂ آتشین کی آغوش میں تھا اور یہ حلقۂ آتشین بحرِ اعظم کے محاصرۂ آبی سے محصور!!

آخر کار ارضِ انگلستان کے سارے آثار غائب ہو گئے۔ کشتی اب چہار اطراف میں سمندر کی امواج سے پابزنجیر ہے۔ رات کا منظرِ ظلمات یکبارگی ہیبتناک تر ہو گیا ہے۔

اس وقت اس عالم آب میں خلائے مطلق کا نظارہ کن کن وارداتِ قلب کے الہامات سے لبریز ہے۔ سارا آسمان اک ناپیدا کنار "بحرِ اسود" بن گیا ہے جس نے کشتی کو اپنی بغل میں گم کر لیا ہے۔ برفباری بھی آہستہ آہستہ شروع ہو گئی ہے اور جابجا برف کی قلعیں منجمد ہو گئی ہیں۔ سطحِ بحر پر اُن کا گرنا ہمائے شب تاب کی سی پرواز کا تماشا بھی کتنا نظر فریب ہے۔ الغرض اب سمندر صحیح معنی میں اک "بحرِ ظلمات" ہے۔ راکبانِ کشتی کی برخود غلط خوشی نے بھی بالآخر اپنے خطرناک موقف کو محسوس کیا ہے اب اُن کو امواجِ طوفان پر اک دامِ تحت بچھا ہوا نظر آتا ہے۔

بحرِ اعظم کے اس خطے میں ایسے ہی دارو گیر کے موقعوں پر "فوارۂ قطبینی" والا منظر طبعی نظر آیا کرتا ہے۔

اک وسیع و عریض ابرِ غلیظ، مضطرب فرشِ بحر پر ایک سایۂ عفریتی کی طرح چھا گیا۔ بعض مقامات پر موجوں کی تاریکی سے اُس کے زیریں دامنوں کی جھالریں ہمکنار ہو رہی تھیں۔ یہ ہم آغوشی اک کشتی سے نسبتہً زیادہ مشابہ تھی۔ زمین و آسمان باہم دست و گریباں ہو رہے تھے۔

طوفان نے اب براہِ راست کشتی کی مزاج پرسی شروع کی۔ آخر الذکر بھی اپنے حریف سے نبرد آزما ہونے کے لئے بڑھی؛ دونوں ایک دوسرے سے مبارز طلبی کرنے لگے۔

کشتی اپنے فرار کی ہیبت میں دیوانہ وار رفتار سے چلی جا رہی تھی کہ ناگہاں مستول چرآیا اور پیچھے کی طرف مڑ کر رہ گیا! ع

پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ پڑی

لیکن یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ کشتی کو غرقابی کا کوئی فوری خطرہ ہے۔ ڈنمارک کے نہنگ آہنگ ملاح اور بحرِ شمال کے ماہی گیر، شمال غواص و سیاح بڑے بڑے قیامت خیز طوفانوں سے عین قطبِ شمالی کے نواح میں پنجہ کشی کر چکے ہیں۔ اور بارہا اُن کی کلائی موڑ چکے ہیں۔

الغرض کشتی اور طوفان باہم دگر بُری طرح متصادم ہیں۔ باوجود اپنے دلِ ناتواں کے کشتی خوب مقابلہ کر رہی ہے۔ وہ فاتحانہ شان سے بادبان کا پھریرا اُڑاتی چلی جا رہی ہے۔ تاہم کشمکش اتنی سخت ہے کہ دو مجنونوں کی باہم آویزی کا نقشہ پیدا ہے۔ کشتی کے وہ تیور ہیں کہ بڑے بڑے امیر البحر بڑے بڑے خونریز بحری معرکوں میں بھی ایسی رُستمانہ بیباکیوں سے کام نہ لیتے ہوں گے۔

میٹوُنا تیزی سے بڑھی چلی جا رہی ہے ہوا کا دباؤ کبھی کبھی اُسے اتنا جُھکا دیتا ہے کہ سطحِ آب کے ساتھ پینتالیس درجے کا خطرناک زاویۂ حادّہ بنا لے لگتی ہے۔ مگر تلی کا نکیلا سرا کیل کی طرح سمندر کی نافِ شکم میں پیوست ہے اور کشتی کے مرکزِ ثقل کو متزلزل ہونے نہیں دیتا۔ اگلے حصے میں لالٹین بھی برابر نصب ہے اور اس منزلِ تاریک میں ہر ممکن شعاعِ تنویر بہم پہنچا رہی ہے۔

تاہم تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد قہر انگیز رعد و برق کا دورہ پڑا کرتا ہے جس سے ابرِ سیاہ کا تاریک منظر بے نقاب ہو جاتا ہے۔ آتشین شعلۂ برقی آنی طور پر قصرِ آسمانی کو بقعۂ نور بنا دیتا ہے۔ برق کی قلمیں انحرافِ نور کے مخصوص عمل سے اپنے بعض گوشوں میں بالکل سیاہ نظر آتے ہیں۔ برق کی تنویر پذیر فضا میں وہ کالی کالی تتلیاں بن کر اُڑتی دکھائی دیتی ہیں۔

اور پھر اک لمحے کے بعد یہ سارا منظرِ نور و نار اک ہیولائے ظلمات میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔

طوفانی سمندر کے ناہموار کوہستان پر کشتی کی یہ دلیرانہ چڑھائی بڑی مخدوش ہے۔ بعض اوقات موجیں مستول کے سرے سے بھی اونچی نکل جاتی ہیں۔ پانی کے بے پناہ چھینٹے بار بار سارے عرشے کو غسلِ میّت دیتے نظر آتے ہیں۔ کشتی کے اندر گھس آنے والا پانی اس کے مختلف منافذ سے ایک پُر زور ترشے کی صورت میں باہر جا گرتا ہے۔ برفباری نے جو قیامت برپا کر رکھی ہے وہ اس پر مستزاد ہے۔ بیا قلب تاریکی نے اپنی سرد مہری کو درجۂ زمہریری تک پہنچا دیا ہے۔

یکبارگی جماعت کا پیر شیکو کا سردار کھڑا ہو گیا! اُس نے ایک ہاتھ سے کشتی کی رسّی کو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے سر کا رومال اُتارا، اور مجنونانہ جوش سے اُسے فضا میں ہلا یا! وہ مسرّت سے بدمست معلوم ہوتا تھا۔ نشۂ تاریکی سے گویا سرشار ہو کر وہ با آوازِ بلند بولا۔

ہم اب آزاد ہیں۔

آزاد! آزاد!! آزاد!!!۔۔۔۔۔۔ ساری جرائم پیشہ ٹولی سے صداہائے بازگشت اُٹھیں۔

ہُرّے۔ سردار پھر چلایا۔ بقیہ جتھے نے اس نعرے کی بھی ہم نوائی کی شور و شغب کا یہ طوفان بے تمیزی منتشر ہی ہونے کو تھا کہ کشتی کے دوسرے سرے سے اک سنگین و متین آواز اُٹھی۔

خاموش! خاموش!!

سب ہمہ تن بجز و ہو گئے اور اُس طرف تکنے لگے۔ کہن سال حکیم کشتی کے مستول کے گاؤ تکیے سے ٹیکی لگائے بیٹھا تھا۔ جانبین کی آنکھیں چار ہونے پر اُس کی زبان سے دوسرا پیام سنائی دیا۔

سنو سنو!

سارے اہلِ کشتی ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اُس وقت اک پُر اسرار گھنٹی کی واضح آواز سیلِ تاریکی میں سے ہوتی ہوئی گوش زد ہوئی۔

(۷)

ہا ہا ہا، کپتان نے قہقہہ مارا، گھنٹی! کیا خوب! اس سے کیا ثابت ہوتا ہے! یہی کہ خشکی قریب ہے۔

حکیم کی مضبوط، وزن دار آواز گونجی "جی نہیں!"

مگر کیوں نہیں جناب! کپتان نے حریفانہ پوچھا۔ ضرور یہی بات ہے۔ وہ مدعیانہ بولا۔

ہرگز نہیں! حکیم نے اپنی تردید کی توثیق مزید کی

تو کیا یہ گھنٹی کسی ساحل سے نہیں بج رہی؟ کپتان نے متحیرانہ استفہام کیا۔

عزیزمن! یہ گھنٹی سمندر بجا رہا ہے! حکیم نے بالآخر اس رازِ سربستہ پر سے

پردہ اٹھایا۔

سب کانپ گئے۔

عورتوں کی سراسیمگی اور مایوسی دیدنی تھی۔

اس اثنا میں حکیم اپنی جگہ سے ہلا۔ اُس نے اپنی دراز قامت کو طویل سلول سے جدا کیا۔ معاً گھنٹی کی اک اور صدا سینۂ بحر سے اٹھی! حکیم نے اس اعجوبۂ بحری کی تشریح و توجیہہ یوں شروع۔

پورٹ لینڈ اور جزائرِ آبنائے انگلستان کے درمیان ایک موقع پر کاگ کا ایک کندہ پڑا ہوا ہے جو اک آلۂ انتباہ کا کام دیتا ہے: کاگ کا یہ کندہ اک زیرِ آب جزیرے کی کمرسی بوسیلۂ اک زنجیر کے ہم رشتہ کر دیا گیا ہے۔ اس زنجیر میں اک گھنٹی بندھی ہوئی ہے۔ جب آبی تموّج اس کاگ کو اچھالتا ہے تو یہ گھنٹی بجتی ہے۔

یہ ہے اس نوائے غیب کی شانِ نزول: آیا خیال شریف میں؟

سامعین غرقِ حیرت ہو کر رہ گئے —— خشکی و تری، فرازِ کوہ اور قعرِ بحر کے اسرار کے ہمہ دانِ عالم اس بُت کے اِن "اخبار بالغیب" پر:

حکیم ذرا ٹھہرا، کہ ہوا کا اک غیر معمولی طور پر تند جھونکا گزر جائے۔ لیکن اسی مختصر وقفے کے دوران میں گھنٹی نے ایک دفعہ اور اپنے وجود کا اعلان کیا۔ حکیم نے اپنی بقیہ تقریر اس طرح جاری کی۔

شمالی مغربی ہوا کے طوفان میں جب یہ گھنٹی سننے میں آئے تو اُسے اک "سازِ موت" سمجھنا چاہیئے! اس لئے کہ کاگ کا موقع ایسا واقع ہوا ہے کہ اگر کوئی جہاز صحیح سمت میں جا رہا ہو تو گھنٹی سنائی نہیں دینی چاہیئے۔ کیونکہ ہوا کا رُخ برعکس سمت میں ہوگا جس کی وجہ سے گھنٹی کی آواز کو اُسے پرے لے جانا چاہیئے۔ پس گھنٹی کا بجنا اور سُننا ہماری غلط روی کا اطلاع نامہ ہے: ہماری راست روی کا تقاضا یہ تھا کہ اگر ہم گھنٹی کی جائے نصب سے بالکل متصل ہو کر بھی گزرتے۔ تب بھی اُس کی آواز نہیں نہ سُنائی دیتی: الغرض گھنٹی کی آواز خطرے کا آلارم ہے۔

اس وقت گھنٹی پھر بجی، اور حکیم کے استدلال کی صحت پر مہر تصدیق ثبت کی۔

تہذیب

بے باکی وعریانی تہذیب کا جوہر ہے　　　وہ ہے سو وہ فیشن ہے یہ ہے سو یہ نیچر ہے

آپس میں لڑانا بھی اک عقل کا جوہر ہے　　　اِس کام میں لوگوں کی تنخواہ مقرر ہے

کیوں اس قدر آخر وہ تہذیب سے باہر ہیں　　　درخواست تو عاشق کی قانون کے اندر ہے

ہر وقت نئے جھانسے، ہر روز نئے وعدے　　　اتوار کو منگل ہے، منگل کو سنیچر ہے

پوچھو رہِ الفت میں حالت نہ مرے دل کی

اس سست روی پر بھی غیرت دہِ موٹر ہے

(احمق پھپھوندوی)

خدا کی عدالت میں ایک مغرور انسان

سید ابو تمیم فریدآبادی

وہ چھ فٹا انسان سینہ تانے ہوئے اور آنکھیں باری تعالیٰ کی طرف لگائے بڑی دلیری سے سپاہیانہ چال میں ماتھے پر شکنیں ڈالے آ رہا تھا۔

خدا نے پوچھا، کیا یہ وہی انسان ہے؟ فرشتوں نے جواب دیا، خداوند یہ وہی انسان ہے۔

پھر خدا نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا، کیا تو گنہگار نہیں ہے؟

وہ خاموش رہا خدا نے پوچھا، کیا تو نے کبھی جھوٹ نہیں بولا؟

اُس نے کہا، کئی مرتبہ "

"کیا تو نے غیبت نہیں کی،

"کی تھی"

ایک فرشتہ نے پوچھا، کیا تو نے ہم جنسوں کے ساتھ دھوکے بازی نہیں کی۔

اُس نے فرشتہ کو بہت بُری طرح گھورتے ہوئے جواب دیا، کی تھی۔

پھر دوسری سمت فرشتہ سوال کرنے کے لئے کھڑا ہوا اور گردن جھکا کر باری تعالیٰ سے عرض کی "خداوندا، اس سے دریافت کیا جائے کہ یہ جوا کھیلتا تھا یا نہیں۔

اُس انسان نے اس کی طرف فوراً پلٹ کر کہا، ہاں، ہاں، میں کھیلتا تھا، مگر تفریح طبع کے لئے نہ کہ دولت مند بننے کے لئے۔

دربار میں اُس کی گرجتی آواز سے سناٹا چھا گیا۔ کامل سکوت۔

یہ منظر اب بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔

تمام فرشتے اور ایک انسان خدائے تعالیٰ کی عدالت میں:

ایک فرشتے نے دبی زبان میں کہا، ظاہر اور باطن کے جاننے والے پروردگار اس خودسر انسان سے دریافت کیا جائے کہ کیا کبھی یہ لہو و لعب کی محفلوں میں اپنے دوستوں کے ہمراہ شریک نہیں ہوتا تھا۔

اُس انسان نے کس قدر دلیر وہ انسان تھا۔ پھر اُسی طرح تڑپ کر جواب دیا، ہاں، ہاں میں شریک ہوتا تھا،

باری تعالیٰ نے فرمایا پھر تو اس قدر مغرور کیوں ہے؟"

وہ انسان سجدے میں گر گیا۔ سجدے سے سر اٹھا کر اُس نے کہا، خدایا تجھے سب کچھ معلوم ہے، لیکن اگر تیری مصلحت یہی ہے کہ میں اپنے خودسر ہونے کی وجہ ان سب فرشتوں کے سامنے بیان کروں تو ــــــــــــ

اُس نے چاروں طرف فرشتوں کی طرف دیکھا اور اکڑی ہوئی گردن اور تنی ہوئی شکنوں اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے یوں گویا ہوا، "اے خدا اور اس کے پاک فرشتو میں نے اپنی تمام زندگی میں ایک مرتبہ بھی خدا سے بغاوت نہیں کی کسی ہستی کو خدا کا شریک نہیں ٹھہرایا۔

اب اُس کی زبان میں لکنت پیدا ہوتی جا رہی تھی اور وہ سنبھل سنبھل کر تقریر کر رہا تھا: میں کسی مٹی کے ڈھیر کے آگے نہیں جھکا۔ میں نے کسی انسان یا حیوان کو خدا تک پہنچنے کا وسیلہ نہیں بنایا:"

میں نے اپنے ماں باپ کی پوری طرح فرمانبرداری کی اور خدا کے نام پر جان دینے کو بہترین طریقۂ موت سمجھا۔

یہ کہکر اُس نے مجمع پر پھر نگاہِ بے التفات ڈالی جس رعونت سے وہ آیا تھا اُسی رعونت کے ساتھ اُس کے قدم واپس جا رہے تھے ــــــــ فاتحانہ انداز میں

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑا بھاری بوجھ سر سے اتار کر آ رہا ہے، ابھی وہ دربار سے باہر نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ میری آنکھ کھُل گئی۔

جمیل و ریحانہ

امام اکبر آبادی

جمیل جتنا حسین تھا، اتنا ہی غیر معمولی بہادر سپاہی بھی۔ اپنی بیوی ریحانہ سے شدید ترین محبت کرتا تھا۔ مگر اس سے زیادہ وطن سے۔ ہلکی، پھیکی، اور مرجھائی ہوئی چاندنی میں اُس وقت جب کہ سہانی رات کا آخری حصہ خاموشی و سکوت سے لبریز ہوتا ہے۔ اُس وقت جبکہ ننھے ننھے تارے مرجھائے ہوئے پھولوں کی طرح بیجان ہونے لگتے ہیں، اور اُس وقت جب کہ آسمان پر جوئے شیر کی روانی شروع ہوتی ہے جمیل و ریحانہ اپنے خیمے سے باہر بیٹھے ہوئے مصروف راز و نیاز ہیں۔

کیسا اچھا سہانا وقت ہے۔ جمیل نے کہا۔

ریحانہ (جس کی حسین آنکھوں میں رات کی بیداری نے رنگِ حنا بھر دیا تھا) اس کے جواب میں ایک خوفناک انگڑائی لی اور کہا۔ سامنے کی پہاڑیاں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا جمود اپنے اندر ایک مستقل عزم کا سبق پنہاں رکھتا ہے۔ مگر آہ ہانپتے ہوئے اور کپکپاتے ہوئے تشنہ سورج کی پیاس اُسی وقت بجھتی ہے، جب کہ ان پہاڑیوں کے دامن سپاہیوں کے خون سے تر ہو جاتے ہیں اور اس کی کرنیں ان میں ڈوب جاتی ہیں۔

جمیل۔ آنے والی جنگ عربی لشکر کے لئے بڑی خوفناک ہے۔

ریحانہ۔ کیوں؟

جمیل۔ دشمن کی فوج دو لاکھ چالیس ہزار ہے اور ہماری صرف چالیس ہزار۔

ریحانہ۔ (شجاعانہ انداز کے ساتھ سر کے دراز گیسوؤں کو جھٹکا دے کر) پرواہ نہیں، غیبی امداد ہمارے ساتھ ہے۔

جمیل (افسردگی کے ساتھ) مجھے تم سے شدید محبت ہے۔

ریحانہ۔ (وحشت زا نگاہوں کے ساتھ) علیٰ ہذا۔

~~~~~~~~~~

نمودِ صبح کے آثار شروع ہو گئے۔ سورج کے پرِ آں بازو آسمان پر پھیل گئے اور اُس کی سنہری کرنوں نے قریب کی تمام پہاڑیوں کو روشن کر دیا۔ احرارِ عرب عبادتِ الٰہی سے فارغ ہو کر جنگی طیاریوں میں مصروف ہو گئے اور دفعتہً آگ اور خون کا کھیل شروع ہو گیا۔ دشمن کی تمام فوج عربی لشکر پر ٹوٹ پڑی اور اس کے میمنے کو منتشر کر دیا۔ کچھ وقفہ تک جنگ جاری رہی۔ بالآخر بھوکے، پیاسے اور بے سر و سامان عرب بہادروں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہاں تک کہ یہ اپنے حرم کے خیموں تک ہٹتے چلے گئے۔

~~~~~~~~~~

مہرِ نیمروز کی شعاعیں اب دمشق کے ریگستانوں کے ذروں کو آتش پارے بنانے لگیں، نسوانی حرارت اپنے نیم شکست خوردہ احرار کی وجہ سے قہر و غضب میں مبدل ہونے لگی۔ اور جنگی حالات رومی عیسائیوں کے حق میں فیصلہ کرنے لگے، کہ دفعتہً گروہِ نسواں نے اپنے غیرت آفریں اور برق پاش الفاظ سے ہزیمت خوردہ احرار میں ایک نوع کی روح پھونک دی۔ اور اسی کے ساتھ خیموں کی میخیں اور تلواریں لے کر دشمن پر اس طرح جھپٹا جس طرح کوئی بھوکا شیر اپنے شکار پر جھپٹتا ہے یا جس طرح کوئی سخت و شدید طوفان بڑے سے بڑے اور مضبوط سے مضبوط درخت کو اُس کی جگہ سے اُکھاڑ پھینکتا ہے۔ عربی لشکر نے یہ حالت دیکھ کر برق سرعت

کیساتھ پیش قدمی کی ... آن کی آن میں جنگ کا نقشہ بدل دیا۔

عرب فاتحین جب رات کو اپنے خیموں کی طرف پلٹے تو دیکھا کہ چند سپاہی جمیل کی لاش لا رہے ہیں۔ لاش کا منہ کفن سے ڈھک کر خیمے کے اندر رکھ دی۔

ریحانہ پر سکتے کا عالم طاری ہوگیا۔ مگر کوئی آنسو اس کی آنکھ سے جاری نہ ہوا۔ یہ حالت دیکھکر اس کی ایک سہیلی نے دوسری کے کان میں آہستہ سے کہا "اس کے سر پر موت منڈلا رہی ہے، اس کو رونا چاہیئے" چنانچہ دوسری نے جمیل کی بہادری کی تعریف شروع کر دی۔ اور تیسری نے اس کے حسن و کشیدہ قامتی کا مرثیہ پڑھا۔ مگر ریحانہ اب بھی نہ روئی۔

چوتھی نے ایک سرد آہ کے ساتھ نہایت نرم دھیمی آواز میں اپنی کپکپاتی ہوئی زبان سے کہا "آہ بہادر شہید کیسا محبت اتنا سپاہی تھا" مگر ریحانہ کی آنکھ میں کوئی آنسو نہ آیا۔

پانچویں نے ایک چیخ ماری اور کہا "آہ مرنے والا اپنی بیوی کا کیسا سچا دوست تھا، اور غنیم کے لئے کتنا شریف دشمن" مگر اب بھی اس کی آنکھیں خشک تھیں۔

اب جمیل کے ایک دوست نے اس کے چہرے سے کفن ہٹا دیا اور سب نے جب بہادر شہید کو دیکھ کر ریحانہ پر نظریں ڈالیں تو اس کی دونوں آنکھیں شیشے کی طرح چمکیلی اور ساکت پائیں۔

دفعتہ اُن میں سے ایک بہادر ضعیفہ اُٹھی، دیکھا تو ریحانہ کا مرمریں جسم سرد تھا اور بے روح۔

بازیافت

(ٹیگور کی ایک کہانی کا ترجمہ)

شاعر اعظم تلسی داس خیالات میں غرق گنگا کے کنارے اس ویران جگہ میں ٹہل رہے تھے، جہاں لوگ مُردوں کو جلاتے ہیں۔

اُنھوں نے ایک عورت کو دیکھا جو عروسی لباس پہنے اپنے شوہر کی لاش کے پیروں کے پاس بیٹھی تھی۔

اُنھیں دیکھ کر وہ اُٹھی، پرنام کیا اور بولی "مالک! مجھے اپنی دعاؤں کے ساتھ اجازت دیجئے کہ میں اپنے پتی سے بہشت میں جا ملوں۔

کیوں بیٹی اس قدر جلدی کیوں؟ تلسی داس نے پوچھا۔ کیا یہ دنیا بھی اسی کی نہیں جس نے بہشت بنائی؟"

"لیکن مجھے بہشت کی تو تمنا نہیں" عورت نے کہا، "مجھے میرا شوہر چاہیئے"

تلسی داس مسکرائے اور بولے "بچی گھر واپس جا۔ اور اس مہینہ کے ختم ہونے سے پہلے تو اپنے شوہر کو پالے گی۔

عورت خوش خوش بڑی امیدوں کے ساتھ واپس چلی گئی۔ تلسی داس روز اس کے گھر پر جاتے اور اُسے بڑی بڑی باتیں اور بلند خیالات بتاتے یہاں تک کہ اس کا دل عشق حقیقی سے معمور ہوگیا ——— ابھی مہینہ مشکل ختم ہوا تھا کہ اس کے ہمسائے اس کے پاس آئے اور پوچھنے لگے "تمہیں شوہر مل گیا؟"

بیوہ مسکرائی اور بولی "ہاں ——— اُنھوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا "وہ کہاں ہے؟"

میرا آقا میرے سینے میں ہے۔ اب میں اور وہ ایک ہیں۔ عورت نے جواب دیا۔

(تمنائی)
ایڈیٹر شمیم پٹنہ



آینهٔ وینس

دلیم لاهیری



کالهر

بربطِ جاں نواز

رنگ میں بھر، اور روپ میں بھر، تو ساز میں بھر آواز میں بھر نین میں بھر اور بول میں بھر، تو ناز میں بھر انداز میں بھر
بربطِ جاں میں بھر دے پیہم پیارا پیارا پریت کا راگ

مہر و محبت ہوگئی چوپٹ، نیا ہے منجدھار پریم کی ڈوری ٹوٹ رہی ہے، کیسے ہوں اُس پار
حرص و حسد میں نے دے گیانی دے دے آگ

ہند کے پھر پُرکیف اُفق سے الفت کا مہتاب اوٹ وفا کی لے کر چمکے دیکھیں شیخ و شاب
جگمگ جگمگ جگمگ جگمگ، چمکیں ہند کے بھاگ

چھوڑ برہمن پوجا پاٹھی، شیخ مصلّٰے تہہ کر دے پریم کا منتر پھونک دے اُٹھ کر ہند نگر میں پے در پے
خانۂ دل میں کوئی نہ پالے بغض و حسد کے کالے ناگ

آپس میں جو، اَن بَن ڈالیں مذہب یا ملت پیارے پاپ کے جو رستے پر لاویں شیخ و برہمن مت مارے
مذہب ملت، شیخ و برہمن سب کو دیجو گیانی تیاگ

بھائی، برادر، آپس والے جو گُن دُشمنی کا سکھلائیں جگ بھر سے جو دل برکاویں آگ تعصب کی بھڑکائیں
اُن کی بُدھی ٹھکرا دیجو رکھیو نا تو ایک سے لاگ

دھرتی ماتا جاگ چکی ہے، جاگ چکا ہے سب سنسار جاگ چکی ہستی کی بستی جاتی ہے کر آنکھیں چار
بیچ ڈگر میں سونے والے، بھولے بھالے ساتھی جاگ

(بلقیس جمال)

شواعرُ العرب

(بسلسلۂ ماسبق)

(سید جلیل الرحمٰن اعظمی متعلم جامعہ دہلی)

زمانۂ اسلام کے ابتدائی دَور میں عربی شاعری کے اندر زور باقی نہیں رہا۔ جو زمانۂ جاہلیت میں تھا۔ اس لئے کہ زمانۂ جاہلیت میں جو قبائل کے درمیان عصبیت تھی، خاندانی تفوق تھا، ذات پات کا فرق اور نسلی امتیازات تھے، اسلام نے ایک ایک کرکے مٹا ڈالے۔ قبائل کی باہم خانہ جنگیاں ختم ہوگئیں اور سارے ملک میں ھذا من مباذر کہنے والا کوئی نہ رہا۔ شاعری کا میدان تنگ ہوا۔ اور اُن کی زباں آوری کا سیلاب شعر وسخن کے بجائے خطابت و موعظت کی طرف پلٹ گیا۔ اب اُن کی جادو بیانی، اخلاقی اور معاشرتی تعلیم، قومی اور ملکی اصلاح، حمایتِ دین اور دعوتِ الی الحق میں صرف ہونے لگی جس میں ظاہر ہے کہ عورت کا حصّہ قدرتی طور پر کم ہوتا۔ جذباتِ شعری میں طوفان برپا کرنے والی دراصل تین چیزیں ہیں۔ جنگ۔ موت۔ محبت۔ زمانۂ جاہلیت میں گو عشقیہ شاعری تھی، مگر بہت کم، اُن کی شاعری کا زیادہ حصّہ مرثیہ گوئی اور فخریہ شاعری پر مشتمل تھا۔ جو دراصل جنگ میں ناکامی اور کامیابی کے دو نتیجے ہیں۔

اہلِ عرب کی شاعری اور یاوہ گوئی چونکہ قبائل میں اکثر خونریز جنگ کا باعث بن جایا کرتی تھی۔ اس لئے آنحضرت صلعم کو قطعاً اس سے دلچسپی نہ تھی، آپ سارے ملکِ عرب کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرنا چاہتے تھے۔ جس میں اس زمانہ کی شاعری ہمیشہ سنگِ راہ واقع ہوتی تھی۔ اس لئے آپ اس کو سیاسی حیثیت سے بھی کچھ زیادہ پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ شاعر نے اگر کبھی کوئی سب سے اچھی اور سچی بات کہی ہے تو وہ صرف لبید کا یہ قول ہے۔

الا کل شئ ماخلا اللہ باطل، 　ہاں خدا کے علاوہ سب کچھ جھوٹ ہے

(تاریخ ادب اللغۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۱۹۶)

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آنحضرت صلعم شعر گوئی کو کوئی بُری چیز سمجھتے تھے۔ خود آپ نے حضرتِ حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ کو کفارِ مکہ کا دنداں شکن جواب دینے کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ آپ مذکورہ بالا حضرات کا کلام سنتے تھے۔ اظہارِ مسرّت فرماتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ اشعار کفارِ مکہ پر نیزے اور بھالوں سے زیادہ اثر کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرتِ حسانؓ سے فرمایا۔

اھجھم (یعنی قریشا) فواللہ 　قریش کی ہجو کرو، خدا کی قسم
لھجاؤك علیھم اشد من وقع 　تمہاری ہجو اُن پر اس تیر سے زیادہ
السھام فی غلس الظلام 　کاری ہوتی ہے جو اندھیری رات میں کسی پر پڑتا ہے۔
اھجھم ومعك جبریل روح القدس 　اُن کی ہجو کرو، روح القدس جبریل تمہارے مددگار ہیں۔

(کتاب العمدہ جلد اول صفحہ ۱۲)

خلفاءِ راشدین اگرچہ خود اچھے خاصے شاعر تھے، حضرت ابوبکرؓ کا وہ قصیدہ مشہور ہے جو انھوں نے غزوۂ عبیدہ بن حارث میں کہا تھا۔ حضرت عمرؓ اور

حضرت عثمانؓ کے بھی حکمت و موعظت پر بہت سے عمدہ اشعار منقول ہیں۔ حضرت علیؓ تو شاعری اور خطابت کے امام ہی مانے جاتے ہیں۔ آپ کا دیوان بھی مصر و حجاز اور ہندوستان وغیرہ مختلف مقامات پر چھپ چکا ہے۔ تاہم شعر گوئی کو مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر یہ حضرات بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔

اس لئے اس دور میں فخریہ شاعری تو تقریباً مفقود ہو گئی۔ مرثیہ گوئی اور ہجو گوئی بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ اخلاقی شاعری کو البتہ کسی قدر عروج ہوا۔ بہاریہ شاعری کا تو کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ اور ملک کی آب و ہوا اور ماحول کو دیکھتے ہوئے ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ ہاں عشقیہ شاعری جو انسان کے جذبات لطیفہ سے تعلق رکھتی ہے البتہ پائی جاتی تھی۔ مگر بہت ہی معصومانہ انداز میں، نہ اس میں وصل و ہجر کی بے بنیاد داستان ہوتی تھی، اور نہ شہوانی خواہشات کے من گھڑت افسانے حتیٰ کہ کسی محبوبہ کا نام لے کر تشبیب کرنا بھی بدتمیزی میں داخل تھا۔ خلفائے راشدین اس معاملہ میں بہت سخت تھے۔ اگر کوئی شاعر ایسی حرکت کرتا تھا تو اس کو دُرّے لگوائے جاتے تھے۔

اسی مقدس عہد کے دو سچے عاشق و معشوق عتبہ بن حباب انصاری اور ریّا بنت الغطریف السلمی ہیں جو حسن و جمال کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ان دونوں کا افسانۂ محبت کا وہ پاک صحیفہ ہے جس کا جواب دنیائے عشق میں تاقیامت نہ ہو سکے گا۔ داستان اگرچہ دلچسپ ہے۔ لیکن طویل ہے اور ہمارے موضوع سے خارج بھی ہے۔ اس لئے ہم اُسے نظر انداز کرتے ہیں۔ اس جگہ پر بجمال ریّا بنت الغطریف کے صرف دو شعر نقل کرتے ہیں جو مرحومہ نے اس وقت کہے تھے جب وہ شادی کے بعد اپنے عاشق دولہا کے ساتھ ساز و سامان کے رخصت ہو کر مدینہ جا رہی تھی۔ راستہ میں غریب عتبہ ڈاکوؤں کے ہاتھ سے مارا گیا جسے وہ کھڑی دیکھ رہی تھی۔

(۱) تصبرت لا انی صبرت وانما — میں نے صبر کیا۔ مگر یہ صبر اس لئے تھا کہ
اُعلّل نفسی انہا بک لاحقۃ — میں اپنی جان کو تمہارے پاس پہنچنے کے لئے بہلا سکوں
(۲) ولو انصفت روحی لکانت الی الردیٰ — اگر انصاف کرو تو میری روح کو ہلاک ہو کر
امامک من دون البریۃ سابقۃ — تمام دنیا سے پہلے تمہارے پاس پہنچنا چاہیئے۔

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۲۱۴)

نازنین ریّا نے یہ کہا اور ایک چیخ مار کر اپنے عاشق زار عتبہ کی لاش پر گری اور وہیں جان دے دی۔ یہ قیامت کا منظر تھا، ایک طلسم تھا جس پر ڈاکو اور قافلہ والے سب ہی کھڑے رو رہے تھے۔ روتے روتے جب ذرا اُنھیں ہوش آیا تو اِن شہیدانِ باوفا کی لاشیں اٹھا کر ایک ہی قبر میں دفن کر دیں۔ کچھ روز کے بعد اُن کی قبر پر ایک درخت اُگا جس کا نام لوگوں نے شجرۃ العروسین رکھا تھا۔ یہ ہے اس خیر القرون کا پاک اور سچا عشق جس کی داستان قیامت تک حسن و عشق کے بڑے بڑے افسانوں کو شرماتی رہے گی۔

خلفاء راشدین کا زمانہ ختم ہوتے ہی بنو اُمیہ کے عہد میں زمانۂ جاہلیت کی شاعری پھر سے زندہ ہو گئی۔ قبائل میں پھر وہی عصبیت جاہلیہ اور خاندانی تفوق کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور فخریہ شاعری نے دوبارہ جنم لیا۔

امیر معاویہ بڑے سیاسی اور مدبر آدمی تھے۔ اُنھوں نے جب اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہیں تو اُن کو ضرورت محسوس ہوئی کہ قبائل عرب میں پھر وہی عصبیت جاہلیہ اور خاندانی تفوق پیدا کر دیا جائے۔ اہلِ بیت اور انصارِ علیؓ کے خلاف خوب پروپیگنڈا کیا جائے۔ تاکہ پھر کوئی سر نہ اُٹھا سکے۔ اس کام کے لئے انھوں نے بڑا روپیہ صرف کیا۔ شعراء کو داد و دہش سے مالا مال کر دیا۔ اُن کی تنخواہیں اور وظیفے مقرر کئے۔ یہاں تک کہ حکومت کے نظم و نسق میں شاعری

کتاب الاغانی جلد چہارم صفحہ ۹۰

کو بڑا دشمن ہو گیا۔

امیر معاویہ کو اس میں بڑا ملکہ تھا کہ شعرا میں سے کس کس کو توڑنا چاہیے۔ اور کن کن کی پرواہ نہ کرنی چاہیے، ہر ایسا شخص جو اُن کی حکومت متزلزل کر سکتا تھا امیر معاویہ اُس کا بیت المال سے وظیفہ مقرر کر کے، اپنا مقرب بنا لیا کرتے تھے جس کا کم از کم یہ اثر ہوتا تھا کہ مخالفت میں زہر اُگلنے والی زبانیں بند رہتی تھیں الا ماشاءاللہ۔

دارمیہ عہد صحابہ کی ایک پُرجوش راست باز اور بڑی زبان آور خاتون تھیں۔ اُنھیں حضرت علیؓ سے جس قدر زیادہ محبت تھی اتنی ہی امیر معاویہ سے نفرت تھی۔ اس لئے امیر معاویہ کو اُنھیں خوش کرنے کی بڑی فکر تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُنھیں امیر معاویہ نے بُلا بھیجا، اور اُن سے کہا "تمہیں معلوم ہے میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟ میں آج یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہیں علیؓ سے کیوں محبت تھی۔ اور مجھ سے کیوں نفرت ہے؟" وہ شیر دل خاتون بولی "مجھے حضرت علیؓ سے اس لئے محبت تھی کہ وہ رعایا کے ساتھ انصاف کرتے تھے۔ حقوق میں مساوات کا خیال رکھتے تھے۔ تم سے اس لئے نفرت ہے کہ تم خلافت کے لئے ایک ایسے شخص سے لڑے جو تم سے زیادہ اس کا مستحق تھا، تم نے خونریزی کی، فیصلہ کرتے وقت لوگوں پر ظلم کرتے ہو۔ اور خواہش نفسانی کے مطابق احکام جاری کرتے ہو"

امیر معاویہ نے جل کر کہا "اسی بغض بھرے ہونے کی وجہ سے تمہارا پیٹ پھول گیا ہے" اس پر اس باعزت خاتون کو غصہ آ گیا، اُس نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا "اس صفت میں تو تمہاری ماں مجھ سے زیادہ مشہور تھیں۔" امیر معاویہ نے جھینپ کر کہا، خفا ہونے کی بات نہیں اچھا بتاؤ تم نے علیؓ کو دیکھا تھا اُنھیں تم نے کیسا پایا؟ اُنھوں نے فرمایا ہاں! میں نے اُن کو دیکھا تھا، اُن کی باتیں بھی سنی تھیں۔ خدا کی قسم اُن کی باتیں سُن کر دل روشن ہو جاتا تھا، یہی حکومت جس نے تم کو فتنہ میں مبتلا کر رکھا ہے اُن کو مبتلا نہ کر سکی۔ اور یہی دولت جس نے تم کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اُن کو نہ بنا سکی۔

امیر معاویہ یہ کھری کھری باتیں سنکر حیران ہو گئے، اور کہنے لگے "اچھا تم مجھ سے کیا چاہتی ہو، جو مانگو گی دوں گا"!

اُنھوں نے کہا "تو پھر سو اونٹنیاں ملنی چاہئیں، جن کے ساتھ ان کے بچے بھی ہوں۔ اور چرانے والے بھی"! امیر معاویہ بولے "اگر میں تمہاری یہ خواہش پوری کر دوں تو پھر تم مجھے ویسا ہی سمجھنے لگو گی جیسا علیؓ کو سمجھتی تھیں"۔ اس پر وہ مسکرائیں اور کہا "کیا خوب اُن کے برابر تو کیا میں تم کو اُن سے کم بھی نہیں سمجھ سکتی"

امیر معاویہ نے کہا "خیر، لو تم بھی کیا یاد کرو گی۔ علیؓ اگر زندہ ہوتے تو خدا کی قسم وہ اتنے اونٹ تم کو ہرگز نہ دیتے" جس پر وہ ایماندار خاتون بولیں "بیشک ہرگز نہ دیتے۔ وہ تو مسلمانوں کے بیت المال میں سے اونٹ تو بڑی چیز ہے، ایک رویاں بھی نہ دیتے"

(دیکھو الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۱۸۹)

اس واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ امیر معاویہ کو زبان آور شعراء کو توڑنے اور اپنا موافق بنانے کا کس قدر خیال تھا، اور اُن کو کس طرح زر و دولت سے خوش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس تمام تگ و دو کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس زمانے کے شعراء اور خطباء ملک و قوم کے جذبات و احساسات کے مالک تھے، وہ جب چاہتے تھے شاہی مسند کو الٹ دیتے تھے، اور جب چاہتے تھے ایوان حکومت تاراج کر ڈالتے تھے۔ امیر معاویہ نے اپنی سیاسی ضرورتوں کی بنا پر اس شراب کو دو آتشہ سے سہ آتشہ بنا دیا۔ جس سے شاعری کا پھر وہی دور آ گیا۔ جو زمانہ جاہلیت میں تھا۔ مشاعرے کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں، شعر و سخن پر تنقیدیں کی جانے لگیں۔ جن میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں نے بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔

خود حضرت سکینہ بنت حسینؑ، عائشہ بنت طلحہ اور اس زمانے کے مشہور شاعر ابو دہبل کی بیوی عمرہ وغیرہ اکثر شعر و سخن کی مجلسیں منعقد کیا کرتی تھیں۔ جن میں مرد بھی بلا تکلف شریک ہوا کرتے تھے۔ اُن کے کلام پر خوب خوب تنقیدیں کی جاتی تھیں، تبصرے ہوتے تھے اور کلام کی خوبی پر دل کھول کر داد دی جاتی تھی۔

---

۵ آداب اللغۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۳۵

ایک مرتبہ حضرت سکینہ کی دعوت پر اس زمانہ کے مشہور اساتذہ جریر۔ فرزدق۔ نصیب کثیر اور جمیل جمع ہوئے سب نے باری باری سے اپنا اپنا کلام سنایا، آخر میں بثینہ کے عاشق زار جمیل کے پاس لونڈی آئی۔ اور اس نے کہا، ہماری مالکہ آپ کو سلام کہتی ہیں"۔ اور فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے آپ کے اشعار سُنے تھے آپ کے دیکھنے کی مشتاق تھی۔

(۱) الا لیت شعری هل ابیتن لیلۃً — کاش مجھے علم ہوتا کہ میں وادی القریٰ میں کبھی رات
بوادی القریٰ انی اذا لسعید — گذاروں گا، میں اس وقت اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا

(۲) لکل حدیث بینهن بشاشۃٌ — اُن کی ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے
وکل قتیل عندهن شهید — اور اُن کا ہر کشتۂ عشق شہید ہوتا ہے۔

(الدُّر المنثور فی طبقات ربات الخدور مطبوعہ مصر صفحہ ۴۶۲)

اس زمانہ میں گو بہت سی قادر الکلام عورتیں پیدا ہوئیں مگر ان میں جو مرتبہ لیلیٰ الاخیلیہ کا ہے کسی کا نہیں۔ علامہ جرجی زیدان نے بھی لیلی اخیلیہ ہی کو سب پر ترجیح دی ہے۔ اس لئے ہم اسی کے مختصر حالات پر اکتفا کرتے ہیں۔

لیلی الاخیلیہ عبداللہ بن مرحال کی بیٹی ہے۔ وہ اپنے زمانہ کی نہایت ہی پری جمال اور نازک خیال شاعرہ تھی۔ زمانۂ اسلام کی نسوانی شاعری میں اس کا وہی رتبہ ہے جو زمانۂ جاہلیت میں خنساء کا تھا، اس زمانہ کا مشہور شاعر توبہ بن الحمیر العامری کو اس سے عشق تھا۔ پہلے تو چھپ چھپ کر اس سے ملتا رہا۔ لیکن جب فراقِ یار کی تاب نہ رہی تو اُس نے لیلےٰ کے والد بزرگوار کے پاس شادی کا پیام بھیجا۔ چونکہ یہ خبر پہلے ہی اُڑ چکی تھی کہ توبہ کو لیلیٰ سے عشق ہے۔ اس لئے اس نے اہل عرب کی رسم ورواج کا خیال کرتے ہوئے اس رشتہ سے انکار کر دیا اور قبیلہ بنی ادلع کے ایک شخص سے اُس کی شادی کر دی۔

توبہ کو اس کی خبر نہ تھی۔ ایک روز حسب معمول رات کی تاریکی میں لیلیٰ سے ملنے گیا۔ دیکھا، تو خلاف معمول اس باعصمت خاتون کے چہرہ سے نقاب الٹا ہوا ہے توبہ ٹھٹکا اور سمجھا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ لیلیٰ آگے بڑھی اور اس نے رازدارانہ طریقہ سے کہا، میں دیر سے تمہاری منتظر تھی۔ لوگ تمہاری تاک میں ہیں، خیریت اسی میں ہے کہ ابھی یہاں سے چل دو۔ محبت کا مارا توبہ جان بچا کر بھاگا۔ مگر ساتھ ہی اس واقعہ کو اس نے بڑے لمبے چوڑے قصیدے میں نظم کر ڈالا جس کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

کنت اذا ما ذرت لیلیٰ تبرقعت — میں جب کبھی لیلیٰ کے پاس آتا تھا تو وہ چہرہ پر نقاب ڈال لیا
فقد رابنی منها الغداۃ سفورها — کرتی تھی کل جو میں نے اسکی نقاب الٹی ہوئی دیکھی تو مجھے کھٹکا سا پیدا ہوگیا

لوگ چونکہ عام طور سے اس کے اور لیلیٰ کے پاک تعلقات پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں کرنے لگے۔ اس لئے وہ اسی قصیدہ میں اپنی اور لیلیٰ کی پاک دامنی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

علیَّ دماء البدن ان کان بعلها — مجھے کفارہ میں اونٹوں کی قربانیاں دینی پڑیں اگر اس کا شوہر
یری لی ذنبًا غیر انی ازورها — بغیر اس کے کہ میں اس سے مل لیتا ہوں میری اور کوئی خطا پا سکے

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۴۶۸)

توبہ بڑا جنگجو اور دلیر نوجوان تھا۔ بہت سے غزوات میں اس نے شرکت کی اور ہمیشہ ظفرمندی و کامرانی کا پرچم اُڑاتا ہوا لوٹا ۸۵ھ میں ایک مرتبہ وہ بری طرح بنو عوف کے نرغہ میں پھنسا اور مارا گیا۔

لیلیٰ کو جب اس حادثہ کی اطلاع ہوئی تو اس کو دلی صدمہ پہنچا۔ اس کے غم میں اُس نے بہت سے مرثئے کہے۔ جن میں سے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

(۱) اقسمت ارثی بعد توبة هالكاً — میں نے قسم کھائی ہے کہ توبہ کے بعد ہر ہلاک ہونے والے کا مرثیہ
احفل من دارت علیه الدوائر — کہوں گی اور ہر اُس شخص کے لئے جلسۂ تعزیت منعقد کروں گی جس پر مصائب
لعمرك ما بالموت عار علی الفتی — ٹوٹ پڑے ہوں۔ تمہاری جان کی قسم موت اس نوجوان کے لئے
اذا لم تصبه فی الحیوة المعایر — باعث شرم نہیں ہے جس کی زندگی ننگ و عار سے خالی ہو
وما احد حی وان عاش سالماً — کوئی زندہ شخص اگرچہ وہ بالفعل صحیح و سالم ہو ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں
باخلد ممن غیبته المقابر — ہے جیساکہ وہ لوگ جنھیں قبروں نے اپنے آغوش میں غائب رکھا ہے
ومن کان مما یحدث الدهر جازعاً — جس شخص کو زمانہ نے آج آہ و زاری میں مبتلا کر رکھا ہے، کسی
فلا بد یوماً ان یری وهو صابر — نہ کسی روز دیکھا جائے گا کہ اسے صبر آگیا ہے۔
وکل شباب او جدید الی بلیٰ — جوانی اور نئی چیز بوسیدہ ہو کر رہے گی۔ اور ہر شخص خدا کی
وکل امرئ یوماً الی الله صائر — طرف لوٹ کر رہے گا۔
وکل قرینی الفة لتفرق — دنیا کے تمام عاشق و معشوق جدا ہو کر رہیں گے
شتاتاً وان ضنا وطال التعاشر — اگرچہ وہ اس میں بخل کریں اور کتنے ہی دن تک زندہ رہیں

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۱۷۴)

لیلیٰ الاخیلیہ بڑی حاضر جواب اور زبان آور شاعرہ تھی۔ علم ادب کے مشہور امام مبرّد[1] کا قول ہے کہ خنسا اور لیلی الاخیلیہ اپنے اپنے عورتوں سے تو کیا بڑے بڑے استاد زمانہ مردوں سے بھی بازی لے گئیں۔ مگر امام اصمعی لیلیٰ کو خنسا پر ترجیح دیتے تھے۔ لیلیٰ نے امیر معاویہ کا بھی زمانہ دیکھا تھا۔ اور توبہ کے متعلق ان سے بہت دلچسپ باتیں بھی ہوئی تھیں۔ مروان اور عبد الملک بن مروان سے بھی ملی تھی۔ اور اُن کو بھی دنداں شکن جواب دے چکی تھی۔ اسی زمانہ میں ایک مرتبہ والی عراق حجاج بن یوسف ثقفی نے اس سے کہا۔ اب تو تمہاری جوانی گزر گئی۔ سچ بتاؤ تم سے اور توبہ سے کچھ ناجائز تعلقات تھے یا نہیں۔ لیلیٰ نے کہا۔ خدا کی قسم نہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے عشق میں پاکباز رہا۔ صرف ایک مرتبہ خواہشات نفس سے مجبور ہو کر اس نے کچھ ناجائز ارادہ کیا تھا۔ مگر میں نے یہ دو شعر پڑھے جس پر وہ نادم ہوگیا اور پھر کبھی اُس نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔

(۱) وذی حاجة قلنا له لا تبح لها — ایک صاحب حاجت نے اپنی حاجت ظاہر کی۔ مگر ہم نے یہ اس سے
فلیس الیها ما حییت سبیل — کہا کہ یہ تمہارے لئے جائز نہیں۔ اور جب تک تم زندہ رہوگے اس پر کامیابی کی راہ نہ پاؤگے۔

(۲) لنا صاحب لا ینبغی ان نخونه — میرا ایک شوہر ہے جس کی ہمیں خیانت نہ کرنی چاہئے اور تم بھی
وانت لاخری فارغ وحلیل — ایک دوسری عورت سے وابستہ ہو اور اس کے شوہر ہو

حجاج نے پھر پوچھا۔ اچھا پھر کیا ہوا؟ لیلیٰ نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے ایک دوست کو بھیجا اور کہا کہ ہمارے قبیلہ کے پاس کسی ٹیلہ پر چڑھ کر یہ شعر پڑھنا۔

---

[1] الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۱۱۰ [2] ادب اللغة العربیہ جلد اول صفحہ ۳۰۶

عفا اللہ عنہا ھل ابیتن لیلۃ	خدا اس نازنین کے گناہ معاف کرے، کیا میں کبھی ایسی کوئی
من الدھر لا یسری الی خیالھا	رات گذاروں گا جو میرے خیال میں بھی نہیں آتی

جب میں نے یہ شعر سنے تو میں فوراً سمجھ گئی کہ یہ توبہ کا فرستادہ ہے۔ میں نے بھی یہ شعر کہہ کر فوراً اسے سنا دیا۔

وعنہ عفا ربی واحسن حفظہ	خدا اس کے بھی گناہ معاف کرے اور اس کو اپنی حفاظت میں
عزیز علینا حاجۃ لا ینالھا	رکھے اس کی وہ حاجت جو کبھی بر نہ آئے گی ہمیں بہت عزیز ہے

لیلیٰ کی موت کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ اپنے بھائی قتیبہ بن مسلم سے ملنے خراسان گئی، واپسی میں توبہ کی قبر کے پاس سے گذری۔ شوہر بھی ساتھ تھا۔ لیلیٰ نے شوہر سے اجازت چاہی۔ اس نے منع کیا۔ لیکن وہ نہ مانی۔ قبر پر پہنچی۔ اور کہا السلام علیکم، یا توبہ، جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا ”میں اس سے پہلے کبھی توبہ کو جھوٹا نہیں سمجھتی تھی۔ کیا یہ توبہ کا قول نہیں ہے؟“

ولو ان لیلی الاخیلیہ سلمت	اگر لیلیٰ اخیلیہ مجھے سلام کرے اور میری یہ حالت ہو کہ مجھ پر
علی ودونی تربۃ وصفائح	خاک کا ڈھیر ہو اور پتھر کی سلیں ہوں۔
لسلمت تسلیم البشاشۃ اوزقی	تب بھی میں اس کو خوشی خوشی سلام کا جواب دوں گا، یا پھر قبر کے
الیھا صدی من جانب القبر صائح	پہلو سے ایک گونج کی آواز بلند ہوگی جو اس کے سلام کا جواب ادا کرے گی
واغبط من لیلی بما لا انالہ	مجھے لیلیٰ کی اس چیز پر رشک ہے جس کو میں نہیں پا سکتا۔ ہاں جو کچھ
الا کل ما قرت بہ العین صالح	بھی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائے وہ اچھی ہے

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۴۴)

یہ اشعار وہ پڑھ رہی تھی کہ توبہ کی قبر سے ایک بہت بڑا الو نکلا اور لیلیٰ کے اونٹ سے ٹکرایا۔ لیلیٰ محمل سے گری اور وہیں جاں بحق ہوگئی

بنو امیہ کا عہد ختم ہوتے ہی عربی شاعری کا رنگ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ بنو عباس کا دار السلطنت بغداد تھا۔ وہاں کی آب و ہوا، باغات و نزہت گاہیں اور تمام وہ چیزیں جو شاعری میں کہربائی رنگ پیدا کر سکتی تھیں قدرت نے ایک ایک کر کے اس کو ودیعت کر دی تھیں۔ سارے ملک میں گل و سوسن، ریحان و نسترن، نرگس و نسرین اور سرو و چنار کی نباتات تھی جس نے عربوں کی شاعری کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

شعرائے عرب جب اپنی حدود چھوڑ کر بغداد کی سدا بہار زمین میں پہونچے تو اُن کے شاعرانہ جذبات بھی وہاں کی آب و ہوا کی اثر انگیزی کی وجہ سے بہت کچھ رنگین اور پُر کیف ہو گئے اور وہ سادگی جو اس سے پہلے اُن کی شاعری کی رُوح تھی جاتی رہی۔ اور اس کے بجائے لطافت و رنگینی، نزاکت و شوخی پیدا ہوگئی اور یہاں کے بہار آفریں اور نزہت خیز مناظر نے ایسا اثر پیدا کر دیا کہ اپنی سادگی خود اُن کو بُری معلوم ہونے لگی۔

عرب کی شاعری میں ہم کو پہاڑوں کی بلندی۔ گھوڑوں اور اونٹوں کی رفتار۔ گرمی کی شدت۔ سفر کی مصیبت۔ مکانوں کی ویرانی، اور بادِ سموم کے جھونکوں وغیرہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ لیکن بغداد پہونچ کر اس کا رنگ بھی بدل گیا۔ اس لئے کہ یہاں سارا ملک مرغزار تھا۔ یہاں چپہ چپہ سرسبز و شاداب نظر آتا تھا۔ ذرہ ذرہ آفتابِ حسن کی تنویر سے روشن ہو رہا تھا۔ پھر نو خیز ترکوں کے حسن کی معصومیت اس شراب کو دو آتشہ سے سہ آتشہ بنا رہی تھی۔ امراء و سلاطین کے درباروں میں ساقی گری اور مجلس آرائی کی خدمات انھیں شباب پروروں کے سپرد تھیں۔ یہی جلوت و خلوت کے شریک۔ سفر و حضر کے ہمدم تھے۔ اُن کے جمال جہاں

آرائی کی شوخیاں، حسنِ نظر فروز کی رعنائیاں، عنفوانِ شباب پر آگئی تھیں جن کی طرف اُن کی مدبھری نظریں اُٹھ جاتی تھیں، اس کو بیگانۂ عقل و ہوش ہونا پڑتا تھا۔ اُن کی مستانہ چال قیامت تھی جس سے ہر ہر قدم پر خوابیدہ فتنے بیدار ہوتے تھے۔

بنو اُمیہ کے دور کے شعراء ان جذبات کی اثر انگیزی سے ناواقف تو نہ تھے۔ مگر یہ رنگینیاں اور سرمستیاں کہاں سے لاتے۔ جو بہاریہ اور عشقیہ شاعری کی جان ہیں۔ اُن کا حسن بدویانہ سادگی کا سرمایہ دار تھا۔ شوخی، شرارت، ناز و غمزہ سے ان کا حسن معرا تھا۔ ان کے عشق و محبت کا مرکز امرد لڑکے نہیں بلکہ قانونِ فطرت کے موافق عورت کی ذات تھی۔ اور وہ بھی پردہ نشین۔ ان کے زمانے میں بھی عشقیہ شاعری زوروں پر تھی۔ تشبیب بھی خوب خوب دل کھول کر جاتی تھی۔ مگر ان سب میں بدویت کا رنگ غالب تھا۔

بنو اُمیہ کو اپنی عربیت اور بدویت پر ناز تھا، وہ ملکِ عرب اور اس کی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ اور اس کے مقابلہ میں تمام دنیا کو حقیر سمجھتے تھے۔ مگر عباسی عربی تہذیب اور بدویت کو اپنی گردن کا ایک بدنما طوق سمجھتے تھے۔ اُن کی معاشرت سے متنفر اور اس سے گلو خلاصی چاہتے تھے حتیٰ کہ خلیفہ منصور نے تو طے کر لیا تھا کہ حجازی کعبہ کو توڑ کر ایک عراقی کعبہ قائم کیا جائے، جہاں لوگ حج کیا کریں۔ مگر شکر ہے کہ وہ اپنی اس تجویز میں کامیاب نہ ہوا۔

بنو عباس کے دور کی ان خصوصیات میں عورتوں نے بھی مردوں کے دوش بدوش حصہ لیا۔ اور تمام وہ چیزیں جو اس عہد کی خصوصیات سمجھی جاتی تھیں ان کے کلام میں بھی پائی جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ امرد لڑکوں سے تشبیب کرنا جو اس زمانہ کی مایۂ ناز خصوصیت تھی خواتین کی شاعری کا بھی جزو تھی۔

خود ہارون رشید کی بہن علیہ بڑی دقیقہ رس، سخن سنج، صاحبِ ذوق اور نامور شاعرہ تھی۔ شعر و شاعری کے ساتھ ہی ساتھ حسن و جمال عفت و عصمت، دین داری اور تقویٰ میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ مگر با ایں ہمہ اس زمانے کے شاعرانہ دستور کے مطابق ہارون رشید کے دو غلام طل اور اس کے معشوق تھے۔ جن کو مخاطب کر کے وہ ہمیشہ طبع آزمائی کیا کرتی تھی۔

رشا کو مخاطب کر کے اس نے جو نظمیں کہی ہیں اُن میں سے بعض میں رشا کے بجائے اُس نے زینب کا نام ڈال دیا ہے۔ مگر طل کو تو اُس نے صاف نام لے کر مخاطب کیا ہے۔

طل سے اس کو بہت زیادہ محبت تھی۔ اُس کی شان میں اُس نے بہت سے اشعار کہے ہیں۔ جن میں سے چند شعر درج ذیل ہیں۔

یا رب انی قد عرضت بهجرة	خداوندا میں اس کے ہجر میں مبتلا کر دی گئی ہوں
فالیك یشکو ذاك یا رباه	باالہا، میں تجھی سے اس کی شکایت کرتی ہوں
مولاة سوء تستهین بعبدها	ایک نالائق مالکہ ہے جو اپنے غلام کے مقابلہ میں اپنے کو حقیر
نعم الغلام وبئست المولاة	سمجھتی ہے، وہ غلام اچھا ہے خود مالکہ نالائق ہے۔
طلٌّ ولکنی حرمت نعیمه	وہ طل ہے، اگر خدا نے مجھ پر مہربانی کی بارش نہ کی تو میں اس کی
ووصاله ان لم یغثنی الله	نعمتِ وصال سے محروم رہوں گی۔

تاریخ تمدن الاسلامی جلد دوم صفحہ ۹۰

(۴) یارب ان کانت حیاتی ھکذا — خدایا اگر میری زندگی اسی طرح میرے لئے وبال جان
ضرًا علی فما ارید حیاۃ — رہی تو میں ایسے جینے سے باز آئی۔

(کتاب الاغانی جلد نہم صفحہ ۹۴)

ہارون رشید کو اس کی اطلاع ہوگئی تو اس نے علیہ کو بلاکر قسم لی کہ آیندہ وہ کبھی اس کا نام زبان پر نہ لاوے گی، علیہ نے وعدہ کرلیا اور وہ چلی گئی ایک مرتبہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تلاوت قرآن میں مشغول تھی جب وہ اس آیت پر پہنچی فَاِنْ لَّمْ یُصِبْھَا وَابِلٌ فَطَلٌّ۔ تو بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا فالذی منعنا ہ امیرالمؤمنین۔

خوش قسمتی سے ہارون رشید اس وقت کہیں کھڑا سن رہا تھا۔ اس پر اس جملہ کا بڑا اثر ہوا۔ سیدھا اس کے کمرہ میں چلا گیا۔ اور اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر بولا "میں نے طل نہیں کو دے ڈالا، اب تم جو چاہو کرو"۔

ہارون رشید کو علیہ سے بڑی محبت تھی۔ اس کو سفر و حضر میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور اس کے آرام و آسائش کا بڑا خیال رکھتا تھا۔

ایک مرتبہ وہ ملک رے گیا۔ تو علیہ بھی ساتھ تھی۔ جب وہ مقام مرج پہنچی۔ تو اس نے یہ شعر کہے۔

(۱) ومقترب بالمرج یبکی لشجوہ — مرج کے قریب پہنچنے والا غم والم کے آنسو بہا رہا ہے۔
وقد غاب عنہ المسعدون علی الحب — اور محبت میں کامیاب ہونے والے نظروں سے اوجھل ہیں
(۲) اذا ما اتاہ الرکب من نحو ارضہ — جب کوئی سوار وطن کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ اس کے پاس
تنشق یستشفی برائحۃ الرکب — جاکر سونگھتا ہے کہ شاید بوئے وطن آئے۔

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۳۵)

ہارون رشید نے جب یہ شعر سنے تو سمجھ گیا کہ وطن کی یاد علیہ کو ستا رہی ہے۔ اس نے فوراً اسے واپس پہنچانے کا حکم دیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ کسی ضرورت سے شہر رقہ گیا۔ عجلت میں علیہ ساتھ نہ جاسکی، وہاں پہنچکر اس نے علیہ کو بلوا بھیجا۔ جب وہ محل میں بیٹھکر روانہ ہوئی تو اس وقت اس نے یہ شعر کہا۔

(۱) لولا الرجاء لمن املت رویتہ — اگر اس شخص سے امیدیں وابستہ نہ ہوتیں جس کے دیدار کی تمنی ہو
ماجزت بغداد فی خوف وتغذیر — تو میں بغداد سے اس خوف و خطر کی حالت میں روانہ نہ ہوتی۔

علیہ شاعری کے علاوہ علم موسیقی میں بھی بڑا کمال رکھتی تھی۔ اور اپنے ہی شعروں میں اپنی ذہانت اور طباعی سے ایسی دھنیں قائم کرتی تھی کہ جو سنتا تھا اپنا سر دھننے لگتا تھا۔

لیکن باوجود ان تمام مشاغل کے وہ بڑی دیندار۔ پرہیزگار اور پابند صوم و صلوٰۃ تھی شاعری میں باوجودیکہ عاشقانہ مضامین نظم کرتی تھی۔ اور کھلے ہوئے صاف صاف لفظوں میں تشبیب کرکے زور طبع دکھایا کرتی تھی۔ مگر کسی شخص کو کبھی اس کی عصمت و عفت، پاکبازی و پاکدامنی میں شک و شبہ نہیں ہوا، وہ خود کہا کرتی تھی۔ کہ "یہ سب کچھ محض تفنن طبع کے لئے کرتی ہوں"۔

ایک دفعہ ہارون رشید ایک کنیز کے دام محبت میں پھنسکر عیش و طرب کے مزے اڑا رہا تھا۔ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر خزانہ لٹا رہا تھا۔ کہ اس کی خبر علیہ کو پہنچی، اس نے فوراً دو شعر کہے۔ اور اپنی کنیزوں کو اس کا سر بتا کر گوایا۔ جسے سن کر ہارون رشید مبہوت ہوگیا۔ اور اپنی بیجا حرکت پر انتہا سے زیادہ نادم ہوا۔ وہ شعر

یہ تھے۔

(۱) منفصل عنی و ما　　اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ مگر
قلبی عنہ منفصل　　میرا دل اس سے جدا نہیں ہوتا۔

(۲) یا قاطعی الیوم لمن　　اے آج مجھے چھوڑنے والے بتا تو سہی
نویت بعدی ان تصل　　کہ اب تو نے میرے بعد کس سے ملنے کا ارادہ کیا ہے۔

(کتاب الاغانی جلد نہم صفحہ ۸۰)

افسوس دولت عباسیہ کا آفتاب ڈھلتے ہی شاعری بلکہ تمام علوم و فنون کا خاتمہ ہو گیا، ۶۱۶ھ میں چنگیز خاں نے تاتار سے نکل کر خراسان سے شام تک تمام ملک برباد کر دیئے۔ سینکڑوں ہزاروں شہر خاک میں مل گئے۔ زمین و آسمان میں سناٹا چھا گیا۔ مدینۃ العلم بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ اور کم و بیش چالیس پچاس لاکھ آدمیوں کا خون بہہ گیا۔ مغلوں کی اس تباہ کاری نے لوگوں کے دلوں کو بجھا دیا۔ اور طبیعتوں کو مضمحل کر دیا۔ جس کا اثر تمام علوم و فنون کے ساتھ شعر و شاعری پر بھی بہت برا پڑا، شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے خانہ نشین ہو گئے۔ اور اپنا وقت تصنیفات و تالیفات میں صرف کرنے لگے۔ اور عربی شاعری کا وہ رنگ جو دولت عباسیہ میں تھا ہمیشہ کے لئے فنا ہو گیا۔

عہد مغلیہ کے سلاطین و امراء کو اس سے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ ان کے درباروں میں کسی عالم یا فاضل کو تقرب ہوتا تھا تو محض اس لئے کہ وہ اس عہد کی تاریخ مرتب کریں۔ جنگی کارنامے ضبط تحریر میں لائیں۔ یا علمی۔ ادبی۔ سیاسی اور مذہبی کتابیں تصنیف کریں اور بس۔

اس عہد میں چونکہ علوم بغداد۔ بخارا۔ رے۔ قرطبہ، اشبیلیہ وغیرہ سے منتقل ہو کر، قاہرہ۔ اسکندریہ۔ دمشق۔ حمص۔ تونس وغیرہ میں آ گئے تھے۔ اس لئے یہاں کے باشندوں میں خال خال شعر و سخن کا چرچا باقی تھا۔ مگر عربی شاعری کا وہ عہد شباب جو دولت عباسیہ میں تھا ایسا فنا ہوا کہ آج تک نہ لوٹا، اس لئے ہم اسی دور کے حالات پر اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

زمانۂ اسلام میں عہد عباسیہ تک کی مشہور شاعرہ خواتین میں عاتکہ بنت عمرو بن نفیل، خولہ بنت الازور الکندی، عمرہ بنت درید بن الصمہ، خزانہ بنت خالد بن جعفر، ام حکیم بنت قارظ، ہند بنت زید بن مزمۃ الانصاریہ، عریب بنت جعفر البرمکی۔ لیلیٰ بنت طریف، حمدہ بنت زیاد، الغیلۃ الحدائیہ، حفصہ بنت حجاج الرکونیہ، حمدونیہ بنت عیسیٰ، حفصہ بنت حمدون، عائشہ بنت احمد، نزہون الغرناطیہ، الشاعرۃ الغسانیہ، الشبلیۃ الاندلسیہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن کی شاعرانہ نازک خیالی اور ادیبانہ بذلہ سنجی سے ملک و قوم ہی نہیں بلکہ اس زمانہ کے سلاطین بھی لطف اندوز ہوتے تھے، اور ان کی شاعری اور زبان آوری کی ساری دنیا میں دھوم تھی۔

شواعر عرب کے حالات اور ان کے اشعار تاریخ و سیر کی کتابوں کے علاوہ کتاب الاغانی، کتاب الشعر والشعراء، طبقات الشعراء، محاضرات الادباء، کتاب المنظوم والمنثور، کتاب الصناعتین، کتاب العمدہ، المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر وغیرہ ادب کی کتابوں میں بھی جستہ جستہ ملتے ہیں، مگر زمانہ حال کی مصری ادیبہ سیدہ زینب بنت علی العاملی کی کتاب "الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور" صنف نسواں کے علمی و ادبی خدمات پر بہترین تصنیف ہے، اسمیں خواتین عرب کے حالات بہت کچھ تفصیل سے ملتے ہیں، جسمیں وہ بھی شامل ہیں جنکو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، لیکن افسوس ہے کہ ان جواہر پاروں کا ذخیرہ اسقدر بکھرا ہوا ہے کہ انکو یکجا کر کے ایک سلک میں پرونا ہفتوں نہیں مہینوں کی فرصت کا محتاج ہے جو تعلیمی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ میرے لئے از بس مشکل ہے، انشاء اللہ آیندہ کسی فرصت میں اس موضوع پر کچھ زیادہ بحث کرنے کی کوشش کرونگا، واللہ المستعان،

رواداری

اے رواداری نقیبِ کاروانِ ارتقا!
اے رواداری تمدن کے لئے نشوونما

اے رواداری علمبردارِ اخلاقِ وسیع
اے رواداری نشاں افرازِ اوصافِ وسیع

اے رواداری علوئے طبع کی روحِ رواں
ہمت، مردانگی، ضبط، خودداری کی جاں

سخت مشکل سے بھی مشکل کام کر جاتی ہے تو
اک ادا میں دشمنوں کو رام کر جاتی ہے تو

زہر کے ساغر ترے ہاتھوں میں جامِ انگبیں
سامنے تیرے ہیں قاتل کی بھی آنکھیں شرمگیں

وصل کر دیتی ہے تو اس ذات کو اُس ذات سے
موہ لیتی ہے دلوں کو اپنی میٹھی بات سے

ہر ادائے دل شکن رہتی ہے تجھ سے دور دور
خودستائی، خودنمائی، تمکنت، کبر و غرور

آتشِ افشاں کوہ سے کرتی ہے پیدا آبشار
"سنگ و آہن میں اُتر جاتی ہے تیری نرم دھار"

ٹوٹ جاتا ہے تری تحریک سے سازِ نفاق
زمزموں میں تیرے کھو جاتی ہے آوازِ نفاق

تیری شانِ گفتگو کا ہے دلوں پر اقتدار
تیری طرزِ ہمکلامی سے ٹپکتا ہے وقار

تیرے ہاتھوں سے ہے بنیادِ حکومت پائدار
قلعہ ہے تو بادشہ کا، اور رعایا کا حصار

دوڑتا ہے جن کی نبضوں میں رواداری کا خون
بزمِ عالم میں نہیں ہوتیں وہ قومیں سرنگوں

جس کے دل میں روشنی تیری ہے داناہے وہی
جس کی آنکھوں میں ترا جلوہ ہے بینا ہے وہی

تیری مے سے ہے اگر خالی کسی دل کا ایاغ
کیفِ انسانی سے ایسے دل کو حاصل ہو فراغ

اے رواداری ہے تو انسانِ کامل کا خمیر
اے رواداری بشر کا اوّلِ مافی الضمیر

فیض گر پاتے نہ تجھ سے آب و آتش، خاک و باد
پیکرِ انساں میں ناممکن تھا ان کا اتحاد

انبیائے ماسلف دیتے رہے تیرا سبق
ہر کتابِ آسمانی کا ہے تو پہلا ورق

تیرے دکھلائے ہوئے رستہ پہ چلنے کا مآل
روح کی تابش، فروغِ ایماں کا، عرفاں کا کمال

ایک ہے خالق کی مشرک اور موحّد پر نگاہ
لطف کی رکھتا ہے مسلم اور ملحد پر نگاہ

اولیا سے، اصفیا سے، انبیاء سے سیکھ لے
سیکھنے والے! رواداری خدا سے سیکھ لے

ماضیٔ نقوی

دو پیکر

سید احسن ایم - اے (علیگ)

(۱)

ملکہ کے حکم سے اس ملک کے تمام آئینے توڑ ڈالے گئے تھے - اور آئینہ کا صرف نام باقی رہ گیا تھا - دیوار پر لٹکانے کا آئینہ، چھوٹا آئینہ، آرسی کا آئینہ - غرضیکہ ہر قسم کے آئینہ رکھنے کی سخت ممانعت تھی - اگر کسی کے یہاں ایک ٹکڑا بھی اس شیشے کا نظر آ گیا جس میں انسان اپنا چہرہ دیکھ سکتا تو بغیر اس امتیاز کے کہ وہ لوگ کون تھے اس گھر کے تمام افراد کو تہہ تیغ کرنے کا حکم تھا - یہ کیوں؟ وجہ اس کی یہ تھی کہ ملکہ اس درجہ بدصورت تھی کہ ایک حبشنی بھی اس کے مقابلے میں دعوائے حُسن کر سکتا تھا - اور نہ صرف اس خیال سے کہ وہ دوبارہ اپنے چہرے کو دیکھنے نہ پائے بلکہ جذبۂ رقابت کے باعث کہ ملک کی دوسری حسین عورتیں بھی اپنے اپنے حُسن سے ناواقف رہیں اس نے آئینوں کو نیست و نابود کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا حسین عورتوں کو اپنے چہروں کے عکس دیکھنے سے باز رکھنے کے لے ملکہ نے یہاں تک احکام جاری کئے تھے کہ تمام جھیلوں اور تالابوں کے کناروں پر پتھر اس طریقہ سے نصب کئے گئے تھے کہ کوئی ہستی اس کے اندر جھانک کر اپنا چہرہ نہ دیکھ سکتی تھی - اور کوئیں تو وہاں کے اتنے گہرے تھے کہ ان میں جھانکنا بالکل ناممکن تھا - اور پانی نکالنے کے ڈولوں کی ساخت بھی اس قسم کی تھی کہ پانی اُن میں ٹھہر نہ سکتا تھا جس کی وجہ سے چہرے کا عکس دیکھنا عبث تھا - ان سخت گیریوں کا اثر مملکت حُسن کی رانیوں پر بہت گہرا پڑا تھا -

(۲)

لیکن ملکۂ حسن 'یاسمین' پر ان سختیوں نے کچھ اثر نہ کیا - کیونکہ اس کو اپنے حُسن کی داد کافی ملتی تھی اور یہی وہ چیز ہے جو ایک حسینہ آئینے میں دیکھکر حاصل کرتی ہے 'یاسمین' کا عاشق جب اُس کے حُسن کی تعریف کرتا تھا تو وہ پھولوں نہ سماتی لیکن اس کی اس خوشی میں ایک غم پنہاں تھا وہ یہ کہ اگر ملکہ کے کانوں تک اس کے حُسن کی خبر پہنچگئی تو پھر اُس کی خیر نہیں - کیونکہ جذبۂ رقابت اس درجہ کارفرما تھا کہ دوسروں کی خوشی کو ملیامیٹ کر دینا بھی ملکہ کا فرض عین ہو گیا تھا - اور 'یاسمین' سے ملکۂ مملکت کو دیسے بھی ازلی نفرت تھی کیونکہ وہ بھی تو 'ملکۂ حسن' تھی -

(۳)

شادی سے کچھ دن پہلے کا ذکر ہے کہ یاسمین اپنے پائیں باغ میں ٹہل رہی تھی کہ ایک بڑھیا اُس کی طرف آئی اور بہت عاجزی سے بھیک مانگی - یاسمین کو اس کی صورت دیکھکر ترس آ گیا - اور اس نے بڑھیا کو کچھ دلوانے کے لئے کسی خادمہ کو آواز دی ہی تھی کہ بڑھیا چیخ مار کر گر پڑی -

"خیر تو ہے؟ بڑی بی!" یاسمین نے متحیر ہو کر دریافت کیا -

"میں کیا بتاؤں سرکار!" بڑھیا نے اپنی لاٹھی کا سہارا لیتے ہوئے کہا -

"کچھ تو بتاؤ!" یاسمین نے اصرار کیا -

"میں نے دنیا کی سب سے بدصورت چیز ابھی دیکھی ہے" بڑھیا نے سانس اوپر لیتے ہوئے کہا۔

"وہ کون ہے؟"

"خطا معاف ہو تو بتاؤں"

"نہیں نہیں۔ تم ضرور بتاؤ"۔

"میری پیاری رانی۔ وہ تم ہی ہو۔ اتنی عمر میری ہونے کو آئی لیکن سرکار ایسی صورت میں نے جیلا کاہے کو دیکھی تھی" بڑھیا نے جواب دیا۔

"تو کیا تمہارا مطلب ہے کہ میں بدصورت ہوں" یاسمین نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"اور کیا اتنی بدصورت کہ میں نہیں کہہ سکتی۔

بڑھیا جو درحقیقت ایک کٹنی تھی اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ملکہ کی بھیجی ہوئی تھی' یہ الفاظ کہہ کر روانہ ہوگئی۔

(۴)

نوجوان نے لاکھ کوشش کی کہ 'یاسمین' کو سمجھائے اور بڑھیا کے کہے ہوئے کو غلط ثابت کرے لیکن یاسمین کی ایک رٹ ہے کہ لگی ہوئی ہے یعنی یہ کہ" میں تو بدصورت ہوں"۔ اور جب شادی کے لئے تعین تاریخ پر وہ مصر ہوا تو یاسمین بولی۔

"اب ایسی صورت میں مجھ سے شادی کرکے کیا کروگے؟ میں نہیں چاہتی کہ تم ایک بدصورت کے ساتھ اپنی زندگی خراب کرلو"

اب کیا کیا جائے؟ بڑھیا کو جھٹلانے کی صرف ایک ترکیب رہ گئی تھی کہ 'یاسمین' کو اس کی شکل دکھائی جائے۔ سو وہ کیسے ہو۔ آئینہ کیا۔ وہاں تو کوئی چمکدار چیز ہی نہ تھی جس میں کوئی اپنی شکل دیکھ سکے۔ اور ملکہ کے ڈر کے مارے کسی کو رکھنے کی جرأت بھی نہ تھی۔

"میں تو اب دربار میں فریاد لے کر جاؤں گا" نوجوان نے پریشان ہوکر کہا۔ "ملکہ خواہ کتنی ہی جابر کیوں نہ ہو مجھے امید ہے کہ اس کو میری حالت زار پر رحم آجائے گا"

(۵)

"کیا معاملہ ہے؟" ملکہ نے دریافت کیا۔ "یہ کون لوگ ہیں اور کس بات کی فریاد لے کر آئے ہیں"

"جہاں پناہ ایک بیکس وبیچارہ دربار میں اپنی مصیبت بیان کرنے آیا ہے"

"ہمیں زیادہ پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو معاملہ ہو جلد بیان کرو"

"حضور عالیہ' ہم پر رحم کیا جائے"

"لیکن تمہاری مصیبت میں میں کس طرح کام آسکتی ہوں؟"

"اگر دربار سے ایک آئینہ دیکھنے کی اجازت ۔۔۔۔۔۔۔

"تم کو آئینے کا ذکر کرنے کی جرأت کیسے ہوئی" ملکہ نے گرجتے ہوئے کہا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سرکار خطا معاف پہلے میری فریاد تو سن لی جائے۔ بعد میں غصہ کیا جائے۔ اس خاتون کو جس کو آپ اپنے سامنے دیکھتی ہیں اپنے متعلق عجب وہم ہوگیا ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ یہ بہت ہی بدصورت ہے۔۔۔۔۔"

"تو کیا یہ غلط ہے؟" ملکہ فوراً بول اٹھی۔ اور چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ "اس کا یہ خیال بالکل درست ہے۔ مجھے تو اس سے زیادہ بدصورت شکل دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی"

یاسمین کا تو یہ الفاظ سنتے ہی گویا دم نکل گیا۔ اور اپنی بدصورتی کا اس کو پورا یقین ہوگیا۔ کیونکہ ملکہ نے بھی بڑھیا کے بیان کی تصدیق کردی تھی۔ وہ اس صدمہ کو برداشت نہ کرسکی اور دربار کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ لیکن نوجوان ملکہ کے الفاظ پر آسانی سے ایمان لانے والا نہ تھا۔ اس نے غصہ سے جل کر کہا۔

"یا تو ملکہ پاگل ہے۔ یا اس جھوٹ بولنے میں کوئی راز ہے"

اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ درباریوں نے لپک کر اس کی گردن ناپی اور خوب جھنجھوڑا۔ ملکہ نے فوراً اشارہ کیا اور دو جلاد چمکتی ہوئی تلواریں کھینچ کر سامنے آگئے۔ "اڑا دو اس کی گردن"۔ ملکہ نے نوجوان کی

طرف اشارہ دیا۔

جیسے ہی جلادوں نے اپنی تلواریں اٹھائیں تو مہیب ناک چیخوں سے دربار گونج گیا۔

یاسمین نے بغیر اس خیال کے کہ وہ کہاں ہے۔ آہستہ آہستہ اپنی آنکھ کھولی اور جیسے ہی چمکدار تلوار میں اس نے اپنے خوبصورت چہرے کا عکس دیکھا فرطِ خوشی سے بیتاب ہوکر اس کے منہ سے ایک نعرۂ مسرت بلند ہوا۔

دوسری آواز ملکہ کی تھی۔ یہ آواز موت کو لبیک کہنے کے لئے تھی چمکدار تلوار میں اپنا ہیبت ناک چہرہ دیکھتے ہی وہ سہم گئی اور مارے خوف اور شرم کے اس کا دم نکل چکا تھا۔

(ماخوذ)

موجِ حیات

شکایت اختروں کی شکوہ ہائے آسماں کب تک
ہو دستِ غیر میں فرزندِ آدم کا جہاں کب تک

بنا لے گنبدِ گردوں سے بالاتر جہاں اپنا
دلِ انساں ہو محبوسِ جہانِ دیگراں کب تک

بہشتِ نور کی طالب ہے میری روحِ آزادی
یہ زنجیرِ نظامِ آفتاب و کہکشاں کب تک

فضائے عالمِ لاہوت ہے جولاں گہِ انساں
گلِ ناسوت میں اندیشۂ سود و زیاں کب تک

ستارے کہتے ہیں تاریک اور خاموش راتوں میں
رہے گا آدمی زادوں کا یہ خوابِ گراں کب تک

محبت کی ضیا سے ظلمتیں کافور ہوتی ہیں
عداوت کی گھٹاؤں میں تلاشِ روح و جاں کب تک

تو مسجودِ ملائک ہے خدا معبود ہے تیرا
رہیگا تیرا کعبہ ماسوا کا آستاں کب تک

عقاب و جُرّہ و شاہیں صفت پرواز پیدا کر
مثالِ قمری و کبک و کبوتر ناتواں کب تک

شعاعِ مہرِ اُمید و یقیں ہے خنجرِ مرداں
یہ ظلماتِ غم و اندوہ میں آہ و فغاں کب تک

حصولِ کامرانی ہے جہاں میں زورِ بازو سے
یہ قلبِ نیم جاں کب تک، یہ چشمِ خونفشاں کب تک

کرو رنگینیٔ خوں سے بہارِ جاوداں پیدا
جوانانِ چمن: یہ شکوۂ جورِ خزاں کب تک

منیر ایماں کی شمشیر سے کٹتی ہیں زنجیریں
اسیرِ کفر و مایوسی و حرمان و گماں کب تک

محمد اکبر منیر ایم۔ اے

فرنسا کا شاہکار

مولانا عظیم برنی

سب کچھ میرے پاس رہا مگر کیا فائدہ ہوا میں اُکتا چکا تھا اور ضرورت بھی نہ تھی اس لئے کہ وقت میری کامیابی کا منتظر نہیں رہ سکتا میرے لئے وہ دن گزر گئے جب نازنین لڑکیاں دامن کہسار میں پھولوں کے تاج رکھے نشے اور گنبد سے کی روشوں پر نظر آتیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ بہار کی دیوی نے اپنا نرم و نازک دوپٹہ سبزہ و آبشار پر ڈال دیا ہے۔ مارچ کی آمد وادی کو گلپوشش بنا دیتی۔ لالے کے جنگلوں سے بہہ کر آنے والے صاف اور اتھلے چشموں کے پاس سنگ مرمر کے نظر فریب قلعے کے نیچے بتانوں کے حرم والی مہجبینیں نزاکت آفریں دوشیزہ لڑکیاں گلاب کی شاخیں ہاتھ میں لے کر نرم اور ساکت رقص کرتیں۔ فرشتوں کے پروں کی ڈھیلی آستینیں اُن کی سیمیں کلائیوں کے چمکتے جادو کو فضا میں پھیلا دیتیں گویا یہ مرٹل کے گھنے درختوں میں اُترنے والے پریوں کے قافلے تھے اُنھیں میں روزا بھی نظر آتی۔ دیکھنے والے کہہ اُٹھتے "یہی ہے نظر کی گہرائیوں میں کھویا ہوا ستارہ یہی ہے آسمان کے بہشتی نگارخانے کا شاہکار"

بیمار فرفسا یہ کہکر خاموش ہوگیا۔ اُس کا دوست جو ایلپس کی وادیوں میں سیر کرتا ہوا آج ہی قیدؔا کی مختصر بستی میں وارد ہوا تھا قریب کی مسند لی پر بے خبر بیٹھا تھا۔ اسی معمولی عمارت کے وسط میں سپید پتھر سے تراشا ہوا "بت" حسن و صنعت کا کمال ظاہر کر رہا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ عالم کے تمام نغمے اسی مرقع سے پھوٹ نکلے ہیں۔ یہ تجلی کا وہی سرچشمہ ہے جس پر نظر پتھر ہو جائے۔

"میں آپ کی کیا خدمت بجا لاؤں؟" آرک نے کہا۔

"کچھ نہیں یہی میرا انجام ہے کہ مایوس چہرہ لئے ازل کی سیاہی میں چھپ جاؤں یا آج کا دن جو اور دنوں کی طرح چمک سے معمور ہے میری نظر اور میری زندگی کا آخری خواب بنجائے۔ مجھے اب کمال اور محبت کے کسی ادا شناس سے غرض ہی کیا ہو سکتی ہے۔ میں ایک سنگتراش کے گھر پلکر جوان ہوا۔ "روزا" کارنٹ لیپا کی بیٹی فردوسی تختہ ہائے گل کی شاہزادی کا خیال کرتا دل پاش پاش ہو جاتا اور تصور کے معطر چشمے بہہ نکلتے۔ میں نے بتگری سیکھی اور محبت میں کامل ہوگیا۔ اونچی برفانی چوٹیوں کے سائے میں اُن پتھروں کے قریب جن میں کوئی آواز نہیں ہوتی۔ تسکین دل پاتا۔ کبھی بے چینی بڑھ جاتی اور وفا کے خیال میں خون دل بہانے لگتا۔ مجھے کرب دل کی تکلیف نہ تھی۔ میری حالت عشق اور غم عشق کی حدوں سے گزر چکی تھی۔ شام کی تیز شفق آسمان پر سونا اُچھالتی خوشی کی ساعت کامرانی یک لخت آجاتی اور میں روزا کو اس طرح دیکھتا جیسے افق پر نظر آنے والے پہلے ستارے کو دیکھتے ہیں۔ اور ایک مرتبہ ہر نقش میں نقطہ ستر پڑھ لیتا۔ بسیرا لینے والے طائر محبت کی آواز کو زبان پر تولتے نظر آتے اور نظارے کی حیرت شادمانی کے طوفان میں ڈوب جاتی۔ رفتہ رفتہ تاریکی بڑھتی اور اُس وقت "جنت ارضی کی حور۔ روزا" مجھ پر رخصت کی افسردہ نگاہ ڈال کر چل دیتی۔ دشت و جبل کا سناٹا میرے قلب میں اُتر جاتا۔ اور بیکراں عالم کی ہمنوائی

کے سوا میرے اندر حیات برفی نہ موت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ اے عشق تو نے کیا دکھا دیا۔ حقیقت یہہ ہے کہ تیرے رابر عجیب چیز جہاں پیش نہیں کر سکتا تو عقل اور علم دونوں سے زیادہ پُر تاثیر ہے۔ میں نے تیری مختلف رنگینیوں سے ہدایت حاصل کی۔ تو اپنے شاغل کی تصویریں طلسم بناکر دکھاتا ہے۔ اگر تجھے میرے پاس مہمان ہونا یاد ہے تو جواب دے کہ حسین روزا نے میری اور اپنی زندگی کے آخری دن کیا کہا تھا؟ کہ "کاؤنٹ البرا کے مقرر کئے ہوئے ایک دن نے مجھے ہمیشہ کے لئے تجھ سے جدا کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے اور میں نے بھی دائمی وفا کا جس کا اوقار نام موت ہے" عہد کر لیا ہے۔ کاش میں اُسے باز رکھ سکتا۔ دوسرے ہی دن اُس نے روما کی جبین پر نقش محبت ثبت کر دیا۔ آہ میں! بیمار کی آنکھوں میں جلی اشک لرزاں تھے۔

"تمہیں آرام کی ضرورت ہے" اجنبی نے اپنے آنسو پاک کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہمیشہ کے آرام کی آخری سانس جس کا بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں میری چھوٹی کیاری کے پھول جو سرما کے تلاطم اور برف کے طوفان میں کثرت سے گر رہے ہیں۔ یہ میری حیات کے آخری لمحات ہیں جو مجھ سے علیحدہ ہوتے جاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ اس کمزور ہستی کی چیستان کو عشق سے حل کرنا چاہا لیکن ممکن نہ ہوا۔ زندگی کے افسانے میں حُسن کی وفا کا بیان پڑھا۔ درد کے مسائل مطالعہ کئے۔ ایک طرف شعلوں سے زیادہ سوزاں محبت کے قصّے تھے۔ اور دوسری طرف موت کا ابہام۔ کائنات حقیقت کی ہمنوائی پر چل رہی ہے جس کا دوسرا نام عشق ہے۔ اب یہہ گفتگو بیکار ہے کیونکہ روزا موجودات میں شامل نہیں آہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اس دُنیا سے رخصت ہوگئی تو میں نے طے کر لیا کہ زمین پر اُتر آؤں اور اس کا ایک یادگار بُت کمال سعی صرف کرکے بنا دوں میں نے اپنی زندگی کا پورا کام ختم کر لیا ہے یہہ سامنے وہی پاک مجسمہ ہے جو ہستی کی بلندی پر نصب ہے اور اپنا ہی عکس جمال دیکھتا ہے۔

بیمار کے آنسو تیزی کے ساتھ بہہ نکلے اور پھر کبھی کوئی حرف اُس کی زبان سے نہیں سنا گیا۔ بائیسویں صدی گزرنے کے بعد اب سنہری بالوں والی عورتیں جن کی سیاہ لمبی اور گھنی پلکیں رخساروں پر سایہ ڈالتی ہیں، عہد کے مجموں کو عبور کرکے آتی ہیں اور وادی ایلیپس کے یادگار مجسّمے کے سامنے حریر کے فرش پر رقص کرتی ہوئی اظہار ہدایہ کی رسم ادا کرنے کے لئے یہ گیت جو عظمت محبت کے لئے وقف کر دیا گیا ہے بلندی اور شیریں آواز میں گاتی ہیں۔

"تازہ کار محبت کو زمانہ بوسیدہ نہیں کر سکتا کیونکہ ہر قرن اس کا عہد تجدید ہوتا ہے، کہسار کا جنگلی گلاب ہمارا دامن تھام لیتا ہے تاکہ ہم وادی کے سب سے حسین گلاب" روزا "کو نہ بھول جائیں، چاند طلوع ہوتا ہے بڑھتا رہتا ہے اور اُس کے ساتھ سمندر کی موجیں بھی چھوٹی کشتیاں چلانے والے ملّاح سفر میں پُراسرار گیت گایا کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہمارا اعزاز محبت یاد رکھیں گے۔

اے وطن کے ساتھیو! کیا تم "روزا" کے صاحب جبروت مجسّمے سے متاثر نہیں ہو؟

یہی وہ ستارہ ہے جو شام کو سب سے پہلے طلوع ہوتا ہے۔ اور سپیدۂ سحر میں سب کے بعد جگمگایا کرتا ہے۔

نقد و نظر

"نئے افسانے"

از سید حسن ریاض۔ دفتر "نوید" لکھنؤ قیمت عہ

سید حسن ریاض صاحب، ملک کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ آپ پہلے ہندوستان کے سب سے زیادہ لائق اور تجربہ کار ایڈیٹر سید جالب دہلوی کے مشہور اخبار "ہمدم" لکھنؤ کے ایک زمانہ تک سب ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ اور اس کے بعد "ہمت" و "نوید" کی زمامِ ادارت بھی آپ کے ہاتھوں میں رہ چکی ہے۔

آپ کا محبوب مشغلہ صحافت و سیاست ہے۔ اور ان دونوں سے جو وقت بچ رہتا ہے وہ آپ افسانہ نگاری میں صرف کرتے ہیں۔

آپ کے افسانوں کی یہ ایک نہایت نمایاں خصوصیت ہے کہ اُن میں ہندوستانی سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے معاملات۔ معمولات، اعمال اور جذبات کی سچی تصویریں اور صحیح نقشے ہوتے ہیں۔

آپ افسانے کو افسانے کی خاطر لکھتے ہیں۔ افسانہ لکھتے وقت آپ کے پیشِ نظر ملک کی اصلاح یا قوم کی خدمت کا کوئی تخیل نہیں ہوتا، اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے افسانوں میں آورد نہیں پائی جاتی، بلکہ آمد ہوتی ہے، یہ اور بات ہے کہ آپ کے میلانات اور رجحانات بے قصد و ارادہ آپ کے افسانوں میں وہ رُوح بھر دیتے ہیں جس سے ملک کی اصلاح اور خدمت کے چشمے خود بخود پھوٹ نکلتے ہیں۔

وہ شاعر یا ادیب جو اپنی نظم و نثر کو بنا ر اصلاح یا خدمت پر رکھتے ہیں آورد میں مبتلا ہو کر حقیقی شعریت و ادبیت سے محروم ہو کر رہ جاتے ہیں اور اُن کی نظم و نثر میں الہامی کیفیتوں کا پتا نہیں چلتا۔ ہم حسن ریاض صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ وہ صحیح ترین راستے پر گامزن ہیں اور اپنے افسانوں کے ذریعے سے بلا قصد ملک کی وہ خدمت کر رہے ہیں جو دوسرے قصد کے باوجود نہیں کر سکتے۔

ہم چونکہ اُن کے ہر افسانے پر فرداً فرداً نقد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لئے اس وقت اتنا ہی لکھنا کافی ہے۔

ادارہ کلیم

نشاط (لائل پور)

ایڈیٹر الطاف مشہدی سالانہ چندہ ستے ر فی کاپی ۴ر

اس وقت "نشاط" کا مئی نمبر ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ہم بڑی بیباکی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پرچہ تقریباً ہر اعتبار سے درخور اعتنا اور شایانِ توجہ ہے۔

اس کے مدیر جناب الطاف مشہدی ہیں۔ جو پہلو میں ایک حساس دل اور سر میں ایک سوچنے والا دماغ رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ رسالہ مضامین کے اعتبار سے بلند اور سبق آموز ہے۔ ہم اردو داں طبقہ سے بزور سفارش کریں گے کہ وہ اس پرچے کی قدر افزائی کر کے ایک ایسے ماہنامے کو فروغ دینے کا باعث بنیں جو ہمیں اُبھارنے کی سعی کرتا ہے۔

رہنمائے تعلیم (لاہور)

سالانہ چندہ ۵ عہ قیمت فی پرچہ ۸ر

"رہنمائے تعلیم کا "دل نمبر" جو ملک کے مشہور و معروف غزل گو جناب ضمیر حسن خاں صاحب دل شاہجہاں پوری کے حالات اور کلام پر مشتمل ہے۔ نہایت ہی حسن ترتیب اور کافی دیدہ وری کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ جس میں حضرت اثر لکھنوی، جناب نیاز فتحپوری اور حضرت احسن مارہروی کے مضامین خاص طور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔

حضرت دل شاہجہانپوری ایک نہایت اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہیں، اور ایسا پاکیزہ دل رکھتے ہیں جس میں شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اور جو ان تمام شرمناک اور ادنیٰ قسم کے جذبات سے قطعی طور پر معری ہے جو آج کل کے غزل گو حضرات میں پائے جاتے ہیں اور جن کی بدولت ہمارے ملک کی ادبی فضا مکدر و مرطوب رہا کرتی ہے۔

حضرت دل کا خلوص عصر حاضر کی مشین میں ڈھلا ہوا بظاہر تابناک اور بباطن سیاہ خلوص نہیں ہے، بلکہ وہ ایک حقیقی اور واقعی شے ہے جس پر بجا طور سے ناز کیا جا سکتا ہے۔

اس موقع پر نفس غزل گوئی پر بحث کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا لیکن حضرت دل کے کلام کے باب میں اس قدر ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ آپ ہندوستان کے ان معدودے چند متغزلین میں سے ہیں جن کا کلام زبان، روانی، متانت، اور بلندی کے لحاظ سے بیحد قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ہم بھی چند صاحب و دیارتی کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُنھوں نے ایک نہایت اچھے فرض کو ادا کرکے یہ ثابت کر دیا کہ زندہ مشاہیر کی یوں قدر کی جاتی ہے۔

رسالہ شاہکار کا سالنامہ

اڈیٹر پروفیسر تاجور — قیمت سالنامہ ۸ر

نائب اڈیٹر محمود جاوید ایم اے — سالانہ چندہ چار روپے

مقام اشاعت لاہور

سرزمین پنجاب کو جن ادبی رسائل پر فخر و ناز کرنے کا حق ہے، اُن میں سے ایک رسالہ شاہکار بھی ہے۔ شاہکار اپنے ناظرین کو کبھی مایوس کرنا نہیں جانتا، وہ بیش بہا پُر از معلومات، مضامین کے ساتھ پاکیزہ افسانے، جن میں اکثر لطیف چاشنی کے ساتھ ساتھ حسن تحریر بھی قابل دید پیش کرتا ہے، حصہ نظم میں بھی قادر الکلام شعرا کا کلام بہم پہنچاتا ہے۔ چنانچہ مارچ و اپریل کا مشترکہ نمبر جو سالنامے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اپنی تمام ظاہری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ مشہور ادیبوں اور شعرا کے مضامین اور کلام آپ اس میں پائیں گے۔

اس ضخیم سالنامے میں سہ رنگی اور یک رنگی سب ملاکر بارہ تصاویر ہیں۔ جن میں سے "سہاگن" کی تصویر قابل داد اور "وادی گلفروش" کی قابل دید ہے ہم حیران ہیں کہ پنجاب کے ذاہدانہ احساسات کے حامل ناقد "وادی گلفروش" جیسی "حوا" کی گل اندام برہنہ حسن فروش بیٹی کی سہ رنگی تصویر کو دیکھکر کیا کچھ نہ برہم ہوں گے۔ جو حال ہی میں کلیم پر اسی "جرم" میں تبرا کر چکے ہیں۔

پروفیسر اعجاز اکبرآبادی کا مضمون "جدید اردو شاعری کی خصوصیات" مرزا فرحت اللہ بیگ کے سفرنامے کا ورق قابل داد مضامین ہیں۔

شمیم

مقام اشاعت یونس منزل — قیمت سالانہ تین ر

اگزیبشن روڈ پٹنہ — قیمت فی پرچہ ۵ر

پٹنہ بہار سے ہمارے مشہور ادیب دوست، تمنائی صاحب کی ادارت میں یہ رسالہ نکلنا شروع ہوا جو ۸۰ صفحات پر اپریل سے نکلنا شروع ہوا ہے حضرت تمنائی نے جس انداز سے اس کا آغاز کیا ہے اگر وہ اس کے معیار کو اسی حد تک قایم رکھ سکے تو کہنا چاہیئے کہ شمیم ہندوستان کے اُن مشہور ادبی رسائل میں سے ایک ہوگا جن کا شمار انگلیوں پہ ہو سکتا ہے۔ جس پر ہم اپنے دوست حضرت تمنائی کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اردو ادب کے ہر مرکز سے بلند معیار ادبی رسائل نکالے جایئں۔ تاکہ ادب

ادب کی خدمت ہو سکے۔

تمنائی صاحب کو چھپائی اور کتابت کی طرف مزید توجہ فرمانے کی ضرورت ہے۔

معیار

ایڈیٹر قاضی عبدالودود — قیمت سالانہ للعہ

مقام اشاعت۔ بانکی پور پٹنہ — فی پرچہ بارہ آنے

انجمن ترقی اردو شاخ پٹنہ کی زیر سرپرستی یہ رسالہ ۱۱۲ صفحات پر نکلنا شروع ہوا ہے۔ رسالہ اردو اورنگ آباد دکن کے بعد ہماری زبان میں یہ دوسرا رسالہ ہے جس میں خالص ادبی شان نظر آتی ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ معیار نے جو معیار اپنی اولین اشاعت میں پیش کیا ہے وہ اس کو برابر قایم رکھ سکے گا؟ ادبی علمی تحقیقی مضامین کے علاوہ نہایت بلند پایہ فسانے بھی نظر آتے ہیں۔

ہم انجمن ترقی اردو کی کوشش پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے آرزومند ہیں کہ معیار کے صفحات اردو ادب کی خدمت اس معیاری شان سے کر سکے جو اُس نے اپنی اولین اشاعت میں پیش کی ہے۔

شباب مشرق

مدیر ڈاکٹر محمد یوسف خیال

مقام اشاعت۔ عارف پبلشنگ ایجنسی — سالانہ دو روپے

۲۰۳ سنٹرل ایونیو، کلکتہ — فی پرچہ دو آنے

۴۴ صفحات کا یہ رسالہ کلکتہ سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ گو سرزمین بنگال اردو زبان کے ترقی کے لئے سرزمین شور کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شور زمین کو سرسبز کرنے کے لئے کسی کوشش کی ضرورت نہیں۔ شباب مشرق کا اجرا اسی کوشش کے مرادف ہے۔ جس پر ہم کارکنان شباب مشرق کو مبارکباد دیتے ہیں۔ شباب مشرق گو اب بھی اعلیٰ درجے کے رسائل کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے، لیکن پھر بھی کوشش اور کاوش کی شدید ضرورت ہے۔ مضامین اعلےٰ پائے کے ہیں۔ حصۂ نظم ذرا کمزور ہے۔ وہ معیار جو حصۂ نثر پیش کرتا ہے حصۂ نظم میں گر گیا ہے۔ خادمانِ ادب اور بالخصوص کلکتے والوں کو اس کی ایسی مدد کرنی چاہئے کہ جس سے شباب مشرق دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر سکے۔ کیونکہ کلکتہ ہندوستان کے اکثر مایۂ ناز ادیبوں کا مستقر کہلانے پر نازاں رہا ہے۔ بنگال میں اردو ادب کے ساتھ جس قدر بے نیازی برتی جاتی ہے وہ قابلِ افسوس ہے۔

علی گڑھ میگزین

مدیر۔ سید جاں نثار حسین اختر — مقام اشاعت۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جامعہ اسلامیہ علی گڑھ کا یہ رسالہ کئی سال سے نہایت بیقاعدہ نکل رہا ہے۔ کبھی سال میں ایک دو دفعہ نکلتا ہے۔ کبھی تین چار دفعہ طلبائے مسلم یونیورسٹی کے رسالے کا اس قدر بے قاعدہ اور بدانتظامی سے نکلنا مسلمانوں کے طریقۂ کار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب مسلم یونیورسٹی کے طلبا اور عمال ایک ادبی رسالہ بھی باقاعدہ نہیں نکال سکتے جس کے لئے روپیہ کا انتظام ہمیشہ آسانی سے ہوتا ہے تو پھر یہ توقع رکھنا کہ مسلمانوں کے یہ "ناخدا" جن سے قوم کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں۔ آگے چل کر کوئی بھی قومی یا ملی کام سرانجام دے سکیں گے۔ خیالی گھوڑے دوڑانے کے مرادف ہے۔

علی گڑھ میگزین کا اپریل نمبر یہ دیکھکر ضرور مسرت ہوتی ہے کہ گو انتظام کرنے میں بے پروائی برتی جاتی ہے۔ لیکن میگزین مذکور کے سب مضمون نگار قابل اور بلند پایہ ہیں۔

دوسری زبانوں کے ترجمے اس قدر صاف اور شستہ زبان میں کئے گئے ہیں کہ وہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتے۔ ادبی تحقیقاتیں جن مضامین میں ہیں وہ مضمون نگاروں کے شوق و جستجو کے آئینہ دار ہیں۔ غرض اس رسالے میں سوائے انتظام کے فقدان کے تمام وہ خوبیاں موجود ہیں جو دوسرے بلند پایہ معیاری رسائل کو حاصل ہیں جس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ "ہم اگر کرنے پر آئیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔ مگر کیا کہیں ہمارا کچھ کرنے کو دل بہت کم چاہتا ہے۔"

ریاست میسور شاہراہِ ترقی پر

ہندوستان کی بیشمار ریاستوں میں دو چار ہی ریاستیں ایسی ہیں جو اپنی رعایا نوازی کا عملی ثبوت دے رہی ہیں۔ اور ان میں ریاست میسور کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ بھوکے کو کھانا کھلا دینا اس کی بھوک کا علاج نہیں کیونکہ اسے پھر بھی بھوک لگے گی۔ اس کا اصل علاج یہی ہے کہ اس کو روٹی کے لئے روزی کا ذریعہ بہم پہنچایا جائے۔ مہاراجہ میسور کی رعایا پروری اس سے ظاہر ہے کہ ان کی ریاست میں بڑے بڑے کارخانے برابر قائم ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے لئے پیٹ بھرنے کی صورتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔

ہر ریاست میسور کے حکمراں کی روشن خیالی اور اس کے دیوان سر مرزا محمد اسمٰعیل کی نبض شناسیٔ زمانہ پر اپنی حقیر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ ہندوستان کی دیگر ریاستیں میسور سے سبق لے کر اس کے نقش قدم پر چلیں گی اور اپنی فاقہ کش رعایا کے رزق کا سامان بہم پہنچانے کی صورت نکالیں۔ رعایا کی بہبودی کے لئے ریاست میسور میں متعدد کارخانے کھولے جا رہے ہیں چنانچہ ہم ریاست کے دو عظیم کارخانوں کا مختصر حال ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کرتے ہیں۔

میسور سپن سلک ملز لمیٹڈ بنگلور گورنمنٹ میسور نے یہ ریشم کا کارخانہ جاری کیا ہے جس کا پراسپکٹس اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ مل کا اولین مقصد یہ ہے کہ ردی ریشم سے دھاگہ تیار کیا جائے۔ ہندوستان اس قسم کا دھاگہ بڑی مقدار میں ممالک غیر سے درآمد کر رہا ہے۔ ہمارے مل تقریباً ۵ لاکھ پونڈ ردی ریشم سے ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ عمدہ ریشمی دھاگا تیار کریں گے۔ اور اتنی مقدار موٹے دھاگے کی تیار ہو سکے گی جس سے خوبصورت کپڑے کوٹ کے تیار ہو سکیں گے۔ یورپ اور جاپان کے کارخانوں میں تجربہ کیا جا چکا ہے۔ اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دیسی ردی ریشم سے جو دھاگا تیار کیا جائے گا وہ مضبوطی چمک اور رنگینی میں دوسرے ممالک کے دھاگے کے مقابلہ میں بہتر ہوگا۔ تمام اخراجات اور ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد خالص نفع ۱۵ فیصدی دیا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ ۸ آنہ فی پونڈ کا اور زائد فائدہ رہے گا۔ یہ وہ ڈیوٹی ہے جو کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے ریشم کی صنعت کی تحفظ کی خاطر خاص طور سے لگائی ہوئی ہے۔

میسور گورنمنٹ کو اس کمپنی کی کامیابی کا کامل یقین ہے۔ گورنمنٹ نے کارخانوں کا انتظام مناسب تحفظ کے ساتھ اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس کمپنی کے ڈائرکٹر مشہور صاحب اثر اور اعلیٰ لیاقت کے کاروباری آدمی ہیں۔ کمپنی کے کام کو باقاعدہ رکھنے کے لئے گورنمنٹ میسور نے اپنے منیجر اور افسر بھی مقرر کئے ہوئے ہیں۔ یہ کمپنی مشین منگانے کے لئے انگلستان کے ایک بہت قدیم فرم کو آرڈر دے رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی انتظام کیا ہے کہ ایک نہایت تجربہ کار منیجر یورپ سے بلائیں جو مال کی تیاری کا ذمہ دار ہو اور ہندوستانیوں کو کام بھی سکھائے۔ بدیں حالت کمپنی کی کامیابی بالکل یقینی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی امکانات ہیں جن کو بتدریج ترقی دی جا سکتی ہے۔ ہم گورنمنٹ میسور کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اس نے اپنی مدد دے کر اس کارخانے کو جاری کرایا ہے جس سے بے روزگاری ایک حد تک کم ہو جائے گی۔

دیوان بہادر کے آر سری نواس آئنگر جو کہ ریٹائرڈ ممبر ہیں اس کمپنی کے چیرمین ہوں گے۔ اور مسٹر شمس الدین خاں منیجر ہوں گے۔ یہ دونوں حضرات تجربہ کار افسرانِ ریاست میں جن کی انتظامی قابلیت و تجربہ کاری اور کاروباری معاملہ فہمی یقیناً اس کمپنی کی کامیابی کی ضامن ہے۔

میسور تجارتی اور صنعتی معاملات میں تمام ہندوستان کی ریاستوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اور جس کا ایک ٹریڈ کمشنر لندن میں بھی ہے۔ میسور میں انتظامی معیار نہایت بلند ہے اور اسی باعث میسور گورنمنٹ اس قابل ہو سکی ہے کہ اس نے متعدد صنعتی کارخانے جاری کئے ہیں یہ سب کے سب دیوان میسور صاحب **سر مرزا محمد اسمٰعیل** کی قابلانہ رہنمائی کے تحت نہایت معقول منافع کے ساتھ چل رہے ہیں۔ انڈین فنانس ۱۶ رمئی ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں تحریر کرتا ہے:

> "ہم لوگ برٹش ہندوستان میں کبھی ختم نہ ہونے والے مباحثوں میں
> پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارا اقتصادی لائحہ عمل ہو یا نہ ہو۔ اور یہ تو کیا
> ہو۔ ریاست میسور اقتصادی لائحہ عمل کو زیر عمل لے آئی ہے۔"

یہ بھی سر مرزا اسمٰعیل کی جاں فشانیوں اور دلچسپیوں کا نتیجہ ہے کہ صنعتی کارخانے جاری کئے جا رہے ہیں اور کامیابی سے چل رہے ہیں۔ اس صنعتی ترقی کے باعث مہاراجہ میسور کا نام ہندوستان کے گھر گھر میں مشہور ہو رہا ہے۔ اس کمپنی کے متعلق **ضروری معلومات** میسور سپن سلک مل لمیٹڈ بنگلور کے منیجر سے مل سکتی ہیں۔

دی بھدراوتی پیپر مل لمیٹڈ میسور یہ کمپنی بھی ابھی حال ہی میں جاری ہوئی ہے اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ سرمایہ لگانے والی پبلک کو اس کے حصے اتنی تعداد میں نہ مل سکے جتنے وہ چاہتے تھے۔ پراسپکٹس کے شائع ہوتے ہی تمام حصص فروخت ہو گئے۔ ریاست میسور نے کامل تحقیقات کے بعد کاغذ کا یہ کارخانہ جاری کیا ہے اس سے ہندوستانی پبلک کو سرمایہ لگانے کا ایک نادر موقعہ مل جائے گا۔

صرف ریاست میسور ہی ایسی ریاست ہے جو صنعتی پیش قدمیوں میں تمام ہندوستان سے آگے بڑھی ہوئی ہے اگر دیگر تمام ریاستیں اور برٹش انڈیا ریاست میسور کی پیروی کریں تو ان کی تمام اقتصادی مسائل اور تکالیف کا حل نکل آئے۔ سر مرزا اسمٰعیل نہ صرف ایک ہر دل عزیز دیوان، ایک تجربہ کار سیاست داں، اور ایک عقلمند منتظم ہیں۔ بلکہ صنعت و حرفت کے بھی بڑے ماہر ہیں۔ چنانچہ ریاست میسور میں اور کارخانوں کے علاوہ کاغذ کے کارخانے بھی کھولے جا رہے ہیں۔ جن کو خاطر خواہ کامیابی ہوگی۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

(۱) حکومت میسور اس کارخانے سے مناسب قیمت پر کاغذ ایک بڑی تعداد میں خریدے گی۔

(۲) حکومت میسور اس کارخانے میں سرمائے کا دسواں حصہ لگائے گی۔

(۳) حکومت کارخانے اور ملازمین کارخانے کے لئے زمین مفت دے گی۔

(۴) حکومت بجلی نہایت مناسب اور ارزاں قیمت پر مہیا کرے گی۔

(۵) میسور آئرن اینڈ سٹیل ورکس اس کمپنی کو ٹرامویے اور ریلوے لائن کی قسم کی تمام سہولتیں بہم پہنچائے گی۔

(۶) میسور آئرن ورکس مل اور اس کے درمیان گاڑیوں میں مال لے جانے کا کام نہایت مناسب معاوضے پر انجام دے گا۔ اور لوہار خانے کی آسانیاں، طبی اور تعلیمی سہولتیں بھی بہم پہنچائے گا۔

ان تمام سہولتوں اور آسانیوں کی موجودگی میں اس کارخانے کی کامیابی روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔

مزید معلومات

کیلئے میسور گورنمنٹ کے ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ میسور گورنمنٹ بنگلور کو لکھیے

ریاست میسور شاہراہِ ترقی پر

ہندوستان کی مینکڑوں ریاستیں ہیں وہاں بھی ریاستیں ایسی ہیں جو اپنی رعایا نوازی کا عملی ثبوت دے رہی ہیں اور ان میں ریاست میسور کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ بھوکے کو کھانا کھلا دینا اس کی بھوک کا علاج نہیں کیونکہ اسے پھر بھی بھوک لگے گی۔ اس کا اصل علاج یہی ہے کہ اس بھوک کے لئے روزی کا ذریعہ بہم پہنچا دیا جائے۔ مہاراجہ میسور کی رعایا پروری اس سے ظاہر ہے کہ ان کی ریاست میں بڑے بڑے کارخانے برابر قائم ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے لئے پیٹ بھرنے کی صورتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔

یہ ریاست میسور کے حکمراں کی روشن خیالی اور ان کے دیوان سر مرزا محمد اسمٰعیل کی صنعت شناسی کا مظہر ہے۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہندوستان کی دیگر ریاستیں میسور سے سبق لے کر اس کے نقش قدم پر چلیں گی اور اپنی دولت و رعایا کے روزگار کا سامان بہم پہنچانے کی صورت نکالیں۔ رعایا کی بہبودی کے لئے ریاست میسور میں متعدد کارخانے کھولے جا رہے ہیں چنانچہ ہم ریاست کے دو عظیم کارخانوں کا مختصر حال ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کرتے ہیں۔

میسور سپن سلک ملز لمیٹڈ بنگلور گورنمنٹ میسور نے یہ ریشم کا کارخانہ جاری کیا ہے جس کا پراسپکٹس اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ مل کا اولین مقصد یہ ہے کہ ردی ریشم سے دھاگا تیار کیا جائے۔ ہندوستان اس قسم کا دھاگا بڑی مقدار میں کافی قیمت پر درآمد کرتا ہے۔ ہمارے مل تقریباً ۵ لاکھ پونڈ ردی ریشم سے ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ عمدہ ریشمی دھاگا تیار کریں گے۔ اور اسی مقدار موٹے دھاگے کی تیار ہو سکے گی جس سے خوبصورت کپڑے کوٹ کے تیار ہو سکیں گے۔ یورپ اور جاپان کے کارخانوں میں تجربہ کیا جا چکا ہے۔ اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دیسی ردی ریشم سے جو دھاگا تیار کیا جائے گا وہ مضبوطی چمک اور رنگینی میں دوسرے ممالک کے دھاگے کے مقابلہ میں بہتر ہوگا۔ تمام اخراجات اور ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد خالص نفع ۵ فیصدی دیا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ ۱۰ ہر پونڈ کا اور زائد فائدہ رہے گا۔ یہ وہ ڈیوٹی ہے جو کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے ریشم کی صنعت کی تحفظ کی خاطر خاص طور سے لگائی ہوئی ہے۔

میسور گورنمنٹ کو اس کمپنی کی کامیابی کا کامل یقین ہے۔ گورنمنٹ نے کارخانوں کا انتظام مناسب تحفظ کے ساتھ اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس کمپنی کے ڈائرکٹر مشہور صاحب اثر اور اعلیٰ لیاقت کے کاروباری آدمی ہیں۔ کمپنی کے کام کو باقاعدہ رکھنے کے لئے گورنمنٹ میسور نے اپنے منیجر اور افسر بھی مقرر کئے ہوئے ہیں۔ یہ کمپنی مشین لگانے کے لئے انگلستان کے ایک بہت قدیم فرم کو آرڈر دے رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی انتظام کیا ہے کہ ایک نہایت تجربہ کار منیجر یورپ سے بلائیں جو مال کی تیاری کا ذمہ دار ہو اور ہندوستانیوں کو کام بھی سکھائے۔ بدیں وجوہ کمپنی کی کامیابی بالکل یقینی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی امکانات ہیں جن کو بتدریج ترقی دی جا سکتی ہے۔ ہم گورنمنٹ میسور کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اس نے اپنی مدد دے کر اس کارخانے کو جاری کرایا ہے جس سے بے روزگاری ایک حد تک کم ہو جائے گی۔

دیوان بہادر کے آر سری نواس آئنگر جو کہ ریٹائرڈ ممبر ہیں اس کمپنی کے چیرمین ہوں گے۔ اور مسٹر شمس الدین خاں منیجر ہوں گے۔ یہ دونوں حضرات تجربہ کار افسران ریاست میں جن کی انتظامی قابلیت و تجربہ کاری اور کاروباری معاملہ فہمی یقیناً اس کمپنی کی کامیابی کی ضامن ہے۔

میسور تجارتی اور صنعتی معاملات میں تمام ہندوستان کی ریاستوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور جس کا ایک ٹریڈ کمشنر لندن میں بھی ہے۔ میسور میں انتظامی معیار نہایت بلند ہے اور اسی باعث میسور گورنمنٹ اس قابل ہو سکی ہے کہ اس نے متعدد صنعتی کارخانے جاری کئے ہیں جو سب کے سب دیوان میسور سر مرزا محمد اسمٰعیل کی قابلانہ رہنمائی کے تحت نہایت معقول منافع کے ساتھ چل رہے ہیں۔ "انڈین فنانس" ۱۹ فروری ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں تحریر کرتا ہے:

"ہم لوگ برٹش ہندوستان میں کبھی ختم نہ ہونے والے مباحثوں میں
پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارا اقتصادی لائحہ عمل ہو یا نہ ہو۔ اور ہو تو کیا
ہو۔ ریاست میسور اقتصادی لائحہ عمل کو زیر عمل لے آئی ہے۔"

یہ بھی سر مرزا اسمٰعیل کی جانفشانیوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے کہ صنعتی کارخانے جاری کئے جا رہے ہیں اور کامیابی سے چل رہے ہیں۔ اس صنعتی ترقی کے باعث مہاراجہ میسور کا نام ہندوستان کے گھر گھر میں مشہور ہو رہا ہے۔ اس کمپنی کے متعلق ضروری معلومات میسور سپن سلک مل لمیٹڈ بنگلور کے منیجر سے مل سکتی ہیں۔

دی بھدراوتی پیپر مل لمیٹڈ میسور یہ کمپنی بھی ابھی حال ہی میں جاری ہوئی ہے اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ سرمایہ لگانے والی پبلک کو اس کے حصے اتنی تعداد میں نہ مل سکے جتنے وہ چاہتے تھے۔ پراسپکٹس کے شائع ہوتے ہی تمام حصص فروخت ہو گئے۔ ریاست میسور نے کامل تحقیقات کے بعد کاغذ کا یہ کارخانہ جاری کیا ہے اس سے ہندوستانی پبلک کو سرمایہ لگانے کا ایک نادر موقعہ مل جائے گا۔

صرف ریاست میسور ہی ایسی ریاست ہے جو صنعتی پیش قدمیوں میں تمام ہندوستان سے آگے بڑھی ہوئی ہے اگر دیگر تمام ریاستیں اور برٹش انڈیا ریاست میسور کی پیروی کریں تو ان کی تمام اقتصادی مسائل اور تکالیف کا حل نکل آئے۔ سر مرزا اسمٰعیل نہ صرف ایک ہر دل عزیز دیوان۔ ایک تجربہ کار سیاست داں اور ایک عقلمند منتظم ہیں بلکہ صنعت و حرفت کے بھی بڑے ماہر ہیں۔ چنانچہ ریاست میسور میں اور کارخانوں کے علاوہ کاغذ کے کارخانے بھی کھولے جا رہے ہیں۔ جن کو خاطر خواہ کامیابی ہوگی۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

(۱) حکومت میسور اس کارخانے سے مناسب قیمت پر کاغذ ایک بڑی تعداد میں خریدے گی۔

(۲) حکومت میسور اس کارخانے میں سرمائے کا دسواں حصہ لگائے گی۔

(۳) حکومت کارخانے اور ملازمین کارخانے کے لئے زمین مفت دے گی۔

(۴) حکومت بجلی نہایت مناسب اور ارزاں قیمت پر مہیا کرے گی۔

(۵) میسور آئرن اینڈ سٹیل ورکس اس کمپنی کو ٹرامویز اور ریلوے لائن کی قسم کی تمام سہولتیں بہم پہنچائے گی۔

(۶) میسور آئرن ورکس مل اور اس کے درمیان گاڑیوں میں مال لے جانے کا کام نہایت مناسب معاوضے پر انجام دے گا۔ اور لوہار خانے کی آسانیاں۔ طبی اور تعلیمی سہولتیں بھی بہم پہنچائے گا۔

ان تمام سہولتوں اور آسانیوں کی موجودگی میں اس کارخانے کی کامیابی روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔

مزید معلومات

کیلئے میسور گورنمنٹ کے ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ میسور گورنمنٹ بنگلور کو لکھیئے

خریداران کلیم

کی خدمت میں گذارش ہے کہ کلیم نہ پہونچنے کی اطلاع ہر مہینے دوسرے ہفتہ میں ضرور پہنچا دیا کریں۔ ورنہ تعمیل نہیں کی جائے گی۔

(منیجر کلیم)

REGD.NO.L.3694

REGD.NO.L.3694



ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدر اعظم سے کہا۔ دنیا کے ہر حصے کی جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو

منتخب کرسکوں۔ تیمہ عالم کے لئے فردوس شمالی کشمیر جنت نظیر سوئٹزرلینڈ

مرغزاروں میں گل چینی کی گئی —— شباب انگیز سامان۔ اور گلہائے خوش



مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے تو جیسے سب پھول دور دراز سفر کے بعد

ہوئے تھے کہ مہارانی کی حسن شناس اپنی خوشبو کھو چکے تھے۔ اور باقی اس قدر مرجھائے

اس خواہش کو پورا نہ ہونے سے نازک کو تکلیف ہوئی۔ مہارانی

مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا۔ ملول رہنے لگی۔ کھانا پینا ترک کر دیا

وزراء سے مشورہ طلب کیا۔ مہتمم توشہ خانہ نے "اصغر علی محمد علی" سے عطر منگوانے کو کہا۔ رائے معقول تھی

عمل کیا گیا۔ جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا۔

اصغر علی محمد علی تاجران عطر، لکھنؤ و دہلی


کلیم
مدیر جوش ملیح آبادی
SAM/11

کلمہ '' دھلی



جہانگیر پر اکبر کی پہلی نگاہ

منظور شدہ سررشتۂ تعلیم گورنمنٹ حیدر

بنام قوت و حیات

کلیم

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا — آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا

قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم — بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے — جملہ حقوق محفوظ ہیں

ششماہی چندہ تین روپے — قیمت فی پرچہ۔ نو آنے

اُردو زبان کا بہت ہی قیمتی ماہنامہ

جلد (۲) فہرست مضامین ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۶ء نمبر (۱)

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے کوروئیشن برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم سے شائع کیا)

منظور شدہ سررشتۂ تعلیم گورنمنٹ حید

بنام قوت وحیات

کلیم

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے

قیمت فی پرچہ ۔ نو آنے

اُردو زبان کا ہر جہت سے قیمتی ماہنامہ

جلد (۲) | نمبر (۱)

فہرست مضامین ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۶ء

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے کورونیشن برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم سے شائع کیا)

اشارات

جوش ملیح آبادی

اُمرائے ہند

(۱) ہندوستان کے اُمرا سے اربابِ فکر کو ہمیشہ یہ بجا شکایت رہی ہے کہ وہ اپنی قوم کی خدمت کا کبھی خواب تک نہیں دیکھتے، خدمت تو بڑی چیز ہے، یہ حضرات تو اپنی قوم کی ذہنیت پست کرنے، اور اُس کے ولولوں کا گلا گھونٹنے میں ہمیشہ سے نمایاں حصّہ لیتے چلے آئے ہیں۔

حالانکہ اگر یہ ضرورت سے زیادہ تن آسانیوں کے پرستار، تھوڑی سی توجہ بھی صرف کرتے تو اُن کی متفقہ دولت، ہندوستانیوں کو اس وقت خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچا چکی ہوتی۔

لیکن اُن کا روپیہ تو صرف ہوتا ہے کونسل بازیوں۔ عیش پرستیوں، حکّام نوازیوں، گھوڑ دوڑوں۔ ہاکیوں، اور کُتّوں پر۔

سازِ عشرت کی گونج میں اِن کی رنگین شب بیداریاں ٹھیک اُس وقت شروع ہوتی ہیں، جب عین اِن کی دیوار کے نیچے، اِن کے فاقہ کش بچے روٹی مانگتے مانگتے سو جاتے ہیں۔

یہ امرا جو محض بخت و اتّفاق کی بدولت "امرا" کہے جاتے ہیں، اپنے کو سطحِ انسانیت سے بالا، اور مخلوق کو سطحِ حیوانیت سے بھی فروتر سمجھتے ہیں۔

یہ مخلوق سے اِس قدر عجز و عبادت، اور حمد و ثنا کا مطالبہ کرتے ہیں، جتنا خدا بھی نہیں کرتا۔

سرمایہ داروں کی یہ خطرناک جماعت، اور امرا کا یہ ہولناک ادارہ، انسانوں میں غلوئے نفس، خودداری۔ اخلاقی جُرأت۔ خودشناسی، اور راست بازی پیدا کرنے کے عوض اُن میں دنائت، مسکنت، دروغ بافی، سازش۔ بزدلی۔ طمع، اور خوشامد پیدا کرنے کا ارتکاب کیا کرتا ہے۔

اِن اُمرا کی دولت ایک ایسی مکروہ دارالضرب ہے جس میں معائب کے سکّے ڈھلا کرتے ہیں۔

اپنے ملازموں، مصاحبوں۔ عزیزوں اور متوسّلین کے ساتھ بخلق و مدارات پیش آنا اِن کی گھُنکتی ہوئی شریعت میں حرامِ مُطلق ہے۔

یہ اربابِ دول۔ "کوئی ہے" کی فرعونی آوازوں سے اپنے ملازموں کو پُکارتے ہیں۔ اپنے کو "سرکار" "خداوندِ نعمت" "حضور" اور "جہاں پناہ" کہلاتے ہیں، اور دوسروں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذات اور اپنے "انا" کی نفی کرتے ہوئے اپنے کو "فدوی" "خادم" "غلام" اور "خانہ زاد" کہیں۔

اِنھوں نے اپنے متوسّلین کی ہمّتیں یہاں تک توڑ رکھی ہیں کہ اُنھیں اِس کا کامل یقین ہو چکا ہے کہ اگر وہ اِن کے دربار سے نکال دئے گئے تو بھُوکوں مر جائیں گے۔

اُمرا کے فریب خوردہ ملازم اور متوسّلین اپنے کو دریا میں ڈوبی ہوئی مچھلی فرض کئے ہوئے ہیں۔ جو اُسی وقت تک لبریز ہے، جب تک کہ دریا میں ڈوبی ہے۔ اور اگر اُسے پانی سے نکال لیا جائے، تو ایک لمحے میں خالی ہو کر رہ جائے۔

اِس کے علاوہ ہر امیر کا ایک عجوب خبط ہوا کرتا ہے، اور جب تک اُن کے

محبوب خط کو اپنے اوپر طاری نہ کر لیا جائے اُن کے [illegible] ناممکن ہے۔

یہ اربابِ زر سلاموں، اور خطوں کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ اور اگر کسی کے خط کا جواب دیتے بھی ہیں تو پرائیویٹ سکرٹری کے ذریعے سے اور صرف دو سطروں میں۔

کاش سلام کے باب میں بھی وہ یہ بندوبست کر دیں کہ جب کوئی اُنھیں سلام کرے تو اُن کا چوبدار اُن کی طرف سے سلام کا جواب دے دیا کرے۔

تموّل و استبداد کا ازل سے یہ چلن رہا ہے کہ وہ اپنے سے بہتر افراد کو اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتا۔ کیونکہ اپنے سے بہتر افراد سے آنکھیں چار کرتے ہوئے اُس کا موروثی غرور پاش پاش ہونے لگتا ہے۔ اور اُس کا ہمیشہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امراء کے گرد و پیش، نااہلوں، جاہلوں، خوشامدیوں۔ منافقوں اور مسخروں کے لشکر کے لشکر جمع ہو جاتے ہیں۔

درباروں میں نااہلوں اور مسخروں کے ہجوم سے تین سخت ہولناک نتائج مترتب ہوتے ہیں۔

(۱) رئیس کی ذات میں ایک بہتر انسان اور اعلیٰ حاکم بننے کی تمام صلاحیتیں رفتہ رفتہ فنا ہو جاتی ہیں۔

(۲) (الف) یہ نااہل اور مسخرے اپنے رسُوخ سے خصوصیت کے ساتھ اُن قابل افراد کا سر کچلنے میں مشغول رہتے ہیں۔ جن کی طرف سے اُنھیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر وہ دربار میں پہونچ گئے تو پھر ہماری پرسش نہ ہوگی۔

(ب) چونکہ یہ نااہل اور مسخرے نہایت ہی ذلیل سانچے کے بنے ہوتے ہیں اس وجہ سے اپنی درباری کا رعب ڈال کر یا دوسروں کو غلط توقعات دلا کر رشوتیں لیا کرتے ہیں۔

(۳) اِن نااہلوں اور مسخروں کا عروج دیکھ دیکھ کر دوسرے حوصلہ مند افراد جو دربار تک پہونچنے کو معراج سمجھتے ہیں۔ اِس مغالطے میں پڑ جاتے ہیں۔ یا اُنھیں مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ خوشامد، دنارت۔ سازش، اور مسخرگی ہی دنیا میں عروج و تموّل کا سیدھا راستہ ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کمینہ اور مسخرہ بننے کی مشقیں شروع کر دیتے، اور رفتہ رفتہ اپنے کو رذالت کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ جن میں سے دو چار تو اپنی سعیٔ پیہم کی بدولت مصاحبِ خاص یا درباری مسخرے کا منصب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اور باقی تمام لوگ نیچے طبقے میں رہتے ہوئے اپنی کمینگی سے سوسائٹی کے تباہ کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔

دُنیا جانتی ہے کہ متوسطین کا طبقہ ہی ہر قوم میں ریڑھ کی ہڈّی ہوا کرتا ہے۔ اگر اچھے پیمانے پر اُس کی ذہنی تربیت کر دی جائے، اور یہ گروہ اپنی بے پایاں قوتوں پر مُطّلع ہو جائے تو آنِ واحد میں دنیا کا نقشہ بدل دیا جا سکتا ہے۔ لیکن انتہائی قلق تو اسی بات کا ہے کہ امراء کے ہاتھوں سب سے زیادہ یہی طبقہ پامال اور ذلیل رہتا ہے۔ اور اس سے سوسائٹی کو جلد نقصان پہونچتا ہے۔ اُس کی تلافی امکان سے خارج ہے۔

سعدؔی نے اِن امرائے کرام اور اِن سلاطینِ فلک بارگاہ کے باب میں ”گاہ بسلامے برنجند وگاہ بدُشنامے خلعت بدہند“ کا کلیہ بنایا تھا۔

تمام دنیا کے اربابِ خرد سے، خواہ وہ کسی مذہب و ملّت اور نسل و وطن کے ہوں، دانشمندی اور عقل کے نام پر دریافت کیا جاتا ہے کہ اِن سلام سے رنجیدہ ہونے والوں، اور اِن گالیاں کھا کر خلعت بخشنے والوں کا وجود، عالمِ انسانیت کے حق میں زہرِ قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ یا تریاق کا؟ یہ گروہ زمین کے لئے موجبِ برکت و سعادت ہے۔ یا باعثِ نکبت و نحوست؟ یہ طبقہ نوعِ انسانی کو پروان چڑھا رہا ہے، یا جسمانی اور ذہنی، دونوں صورتوں سے مدقوق بنا کر ہلاکت کی طرف لئے جا رہا ہے؟

اِس سلسلے میں مجھے یہ بھی پُوچھنے کا حق پہونچتا ہے کہ اِس انسانوں کا خُون چُوسنے والی سرمایہ داری کو آخر کس نے آزاد چھوڑ رکھا ہے؟

کیا قانون نے؟

اور اگر انسانی مساوات کے سرپرست، حقوقِ اولادِ آدم کے مُربّی، اور عدل و انصاف کے پروردگار قانون ہی نے اِس درندے کو خُون آشامی کے واسطے آزاد چھوڑ رکھا ہے تو خدا کے لئے بتاؤ کہ اب عدل و انصاف کے واسطے کس کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے، اور انسانی دردمندیوں کی داد اس کرۂ خاکی پر کس سے لی جائے؟

قانون، قانون، پکارنے سے کوئی فائدہ نہیں، قانون، سرمایہ داروں کا ایک کھلونا ہے۔ اور کچھ نہیں۔

لیکن میرے عزیز دوستو، میں مایوس نہیں ہوں، میری آنکھیں ایک تابناک مستقبل پر جمی ہوئی ہیں۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ امرار، یعنی بیماریوں کے مڑے ہوئے انگور، قدرت کی بنائی ہوئی زمین پر اس طرح اکڑ اکڑ کر چل رہے ہیں گویا وہ زمین کا کلیجہ پھاڑ ڈالیں گے۔ اور آسمان کے شامیانے میں سوراخ کر دیں گے!

کیا تم ان امرار کا لہجہ نہیں سنتے گویا کوئی بھیانک فرشتہ، قہر الٰہی کا پیغام سنا رہا ہے؟

کیا تم ان غریبوں کا گوشت چبانے والوں کی چال نہیں دیکھتے، گویا آسمان سے بلاؤں کا نزول ہو رہا ہے؟

اور کیا تمہیں تاریخ نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ سرمایہ داری کی یہ متکبرانہ فرعونی و ہامانی رفتار، اسی وقت سب سے زیادہ اپنے مظاہرے پر مُصر ہوتی ہے جب کہ کامل تباہی اور مکمل ہلاکت کا غار صرف ایک قدم کے فاصلے پر رہ جاتا ہے۔ اور کیا تم نے نہیں سنا کہ...

بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

(۲) احمد آباد میونسپلٹی کی موش نوازی

انسان تو شاید بڑی چیز ہے (یا یوں کہئے کہ چونکہ ہم انسان ہیں، اس لئے انسان بڑی چیز ہے) ایک چیونٹی تک کا ستانا، انسانیت کی شرع میں حرام ہے، اس لئے جو لوگ شکار کھیلتے ہیں، وہ اسی نوع کا گناہ کرتے ہیں، جسے قانونی زبان میں قتلِ عمد کہا جاتا ہے۔

لیکن بعض اوقات جب انسان کی صحت و زندگی کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔ اس وقت ان تمام درندوں، اور کیڑے مکوڑوں کا ہلاک کر دینا ہی قرینِ مصلحت ٹھہرتا ہے۔ جن سے انسان کی صحت و زندگی کو نقصان پہونچنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

چنانچہ اسی بنائے صحت و زندگی پر احمد آباد میونسپلٹی نے ۲۲ر اپریل ۱۹۳۶ء کو چوہوں کے گرفتار کرنے کی ایک تجویز اجلاس میں پیش کی تھی جس کے متعلق ہندوستان ٹائمس میں یہ حیرت ناک خبر سنا تا ہے کہ ارکان میونسپلٹی نے اس تجویز کو کثرتِ آرا سے نامنظور کر دیا۔

اس تجویز کے نامنظور کئے جانے کی یہ علت نہیں ہے کہ اس تجویز کے نامنظور کر دینے والوں کے نزدیک چوہوں کی کثرت، انسانی صحت کے حق میں مضر نہیں ہے۔ نہیں، اس کا خود انھیں بھی اعتراف ہے کہ چوہوں کی آبادی جس قدر بڑھتی ہے اسی تناسب سے انسانی صحت و زندگی پر مہلک اثرات پڑتے ہیں۔

اب آپ حیران ہوں گے کہ پھر اس تجویز کو مسترد کیا گیا تو آخر کس بنا پر!

اب تو بات اخبارات تک آگئی ہے۔ ورنہ میں آپ کے کان میں کہتا کہ یہ تجویز **"مذہب"** کے نام پر مسترد کر دی گئی ہے۔ تاکہ دوسری قوموں کو ہم پر ہنسنے کا موقع نہ ملتا۔

مذہب، جی ہاں، مذہب کے نام پر یہ تجویز مسترد کی گئی ہے؟ آپ حیران کیوں ہیں؟

یہ ہے آپ کا جنت نشان ہندوستان! یہ ہے آپ کی پوتر بھارت ماتا! اور یہ ہے آپ کے تعلیم یافتہ ارکانِ بورڈ کی لیاقت!

کیا آپ ہندوستان کے اس وسیع برِ اعظم پر حکومت فرمانا چاہتے ہیں؟ کیا سچ مچ آپ آزادی کا خواب دیکھ رہے ہیں؟ اور کیا خدا کی قسم آپ پینتیس کروڑ انسانوں کی زندگیوں کے مالک بننا چاہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آگاہ ہو جئے کہ چھوٹا منہ، اور بڑی بات اسی کو کہتے ہیں۔

زندہ قومیں سمندر پر چل، اور ہواؤں پر اڑ رہی ہیں۔ اور مہیب و آوارہ عناصر کو محکوم بنا کر نظامِ شمسی کے مسخر کر لینے پر تلی ہوئی ہیں۔ اور ہم ہیں کہ ہمارے حاکم و معبود ہیں گائیں، دریا، نیل بیل، مور، سانپ، چیل، بندر، اور چوہے۔

عالم خیال میں ایک فرنگی، غصے سے اپنا منہ لال کر کے مجھ سے کہہ رہا ہے کہ "تم چوہا اور بندر لوگ کو گاڈ ماننے والا ہیں انڈیا سے باہر نکالنا مانگتا ہے ہم تمہارا سر کچل دے گا"

۳۔ ہندوستانی، اور کتے

ٹائمس کے ذریعے یہ مژدۂ جاں فزا سننے میں آیا ہے کہ ٹوکیو کے ورلڈ میوزیم

کے دروازے پر ایک بورڈ آویزاں ہے کہ "کتوں اور ہندوستانیوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں"

مجھے یقین ہے کہ آپس میں خونریزیاں کرنے والے خوددار اور غیور ہندو مسلمان اس خبر کو پڑھکر ذرا بھی برافروختہ نہ ہوں گے۔ کیونکہ اگر یہ غیرتمند ہوتے تو آپس میں لڑ لڑکر اپنے کو ذلیل سے ذلیل تر کیوں کرتے۔

البتہ مجھے کتوں کی طرف سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ میونسپلٹی کے ارباب حل وعقد پر اس بنا پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ نہ کردیں کہ انھیں اور ہندوستانیوں کو ایک ہی سطح پر رکھا گیا ہے۔

۴۔ میری کوریلی اور ہندوستانی

لگے ہاتھوں یہ بھی سن لیجے کہ انگلستان کی نہایت مشہور ناول نگار میری کوریلی کے ایک ناول "دی سول آف للتھ" "The Soul of Lilith" میں اس کے ہندوستانی ہیرو کے تذکرے میں لکھا ہوا ہے کہ "وہ (یعنی ہیرو) ہندوستان کے بہت پرانے قوام کا بنا ہوا شریف انسان تھا اور عصر موجود کے مخلوط ہندوستانیوں کی طرح لفنگا، کمینہ اور لفنگا نہ تھا"

یہ ہیں دنیا کے خیالات آپ کی نسبت!

میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ کاش آپ مرد اور غیور مرد ہوجائیں اور اگر یہ نہیں ہوسکتا تو خدا کرے کہ میں آپ کی بے غیرتیاں دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہوں، مجھے موت آجائے، اور بہت جلد موت آجائے۔

۵۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت

اگر چراغ لیکر دیکھا جائے تو ہندوستان سے بڑھ کر کوئی منحوس اور بدبخت ملک نہ ملے گا

یہ سرزمین تو اس قسم کی ہے کہ یہاں ایسی باتوں پر بھائی، بھائی کا خون بہاتا رہتا ہے، جنھیں دوسرے ملکوں میں اس قابل بھی نہیں سمجھا جاتا کہ ان پر ایک لمحے کے واسطے بھی توجہ کی جائے۔

اس دونرخی آنکھ کے تارے ہندوستان میں آئے دن ایک نیا فتنہ اُٹھا کرتا ہے، اور اہل ملک ہر روز تازہ آویزشوں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

کبھی تو گائے باجے پر ہنگامہ ہوتا ہے، کبھی ناقوس و اذان پر جھگڑے بڑھ جاتے ہیں، کبھی رام لیلا اور محرّم کے جلوس پر سوڈے کی بوتلیں اور پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ کہیں پیپل کے درخت اور شاہ صاحب کے احاطۂ مزار پر خونریزیاں ہوتی ہیں۔ کبھی جلوسوں کے تقدّم وتاخیر پر تلواریں نکل پڑتی ہیں۔ کہیں مدحِ صحابہ اور منقبتِ اہلبیت پر فساد برپا ہوجاتا ہے، اور کبھی قادیانیوں اور احراریوں میں گلخپ اور فوجداری ہوا کرتی ہے۔

اہل ہند کو مژدہ ہو کہ ان ہنگاموں کے دوش بدوش "بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کے نام سے اب فتنے کا ایک نیا دروازہ اور کھل گیا۔

گائے باجے کی آویزشوں کے سلسلے میں تو دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیجاتی تھی کہ یہ عوام اور جہلا کا فعل ہے۔ لیکن اس "بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کے فتنے کا آغاز تو انھوں نے کیا ہے جو صرف تعلیم یافتہ ہی نہیں، ملک کے مشہور ومعروف افراد ہیں، اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ بدبخت ہندوستان کے اعظم ترین سیاسی راہنما بھی ہیں۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد دکن کا ایک مضمون "بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت" کے نام سے تقریباً دو مہینے ہوئے کہ موصول ہوا تھا، جسے پڑھ کر دل کو ایسا صدمہ ہوا جس کا اس سے پیشتر کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔

اس پرشد کے صدر ہندوستان کے سب سے بڑے روحانی اور سیاسی لیڈر مہاتما گاندھی، اور اس کے روحِ رواں وقت کے سب سے اعلیٰ حریت شکن ہیرو پنڈت جواہر لال نہرو ہیں۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

مہاتما گاندھی پر یادش بخیر میں ایک زمانے میں ایمان لے آچکا تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ قدرت نے ہندوستان کے نجات دلا دینے والے کو آخر پیدا ہی کردیا۔

ہرچند اب وہ عقیدت باقی نہیں رہی۔ تاہم میں مہاتما کی اب بھی بےانتہا عزت کرتا ہوں، لیکن جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے، میری تمام سیاسی امیدیں

جواہر لال نہرو ہی سے وابستہ ہیں، کیونکہ پنڈت میں مجھے ایسی تڑپتی ہوئی زندگی کا نشان ملتا ہے جو وہ جانتا ہیں نہیں ہے۔ اور نہ جانتا کہ سے انسان میں ایسی قوی اور قلعہ شکن زندگی پیدا ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے جواہر لال کا اس فتنہ، پرستی مسکے بانیوں میں ہونا میرے واسطے ایک ایسی روحانی اذیت ہے جو کسی طرح برداشت ہی نہیں کی جاسکتی۔

جواہر لال کا سا انسان، اور فرقہ پروری کا دانستہ یا نادانستہ شکار ہو جائے ہندوستان کی اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے۔

جولیس سیزر پر جب قاتلانہ حملہ کیا گیا اور اس نے دیکھا کہ حملہ آوروں میں اس کا حکیم اور حلیم دوست "بروٹس" بھی شامل ہے، تو اس نے چیخ مار کر کہا، "بروٹس تم بھی میرے قتل پر آمادہ ہو" اور یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ چھپا لیا، تاکہ بہت جلد اس کا خاتمہ ہو جائے۔

ہندو مسلم اتحاد کا بھی اس وقت یہی حال ہے، اور روحِ وطن چیخ رہی ہے کہ "جواہر لال تو بھی مجھے فنا کر دینے پر تل گیا ہے؟"

ہندوستان کی موجودہ فضا میں بیباکی اور راست بازی کے ساتھ اظہار خیال کرنا ایک سخت مرحلہ بن چکا ہے۔ کیونکہ مدت کی سعی پیہم کے بعد ہماری یہ عادت ڈلوا دی گئی ہے کہ ہم ہر بات کو فرقہ پروری کی عینک سے دیکھنے لگیں۔ اسی لئے مجھے سخت اندیشہ ہے کہ میرے اس بیان کو بھی فرقہ پروری کی عینک سے دیکھا جائے گا۔

لیکن میرے سیاسی عقاید سے کم از کم ہندوستان کا وہ تمام طبقہ جو اردو ادبیات سے دلچسپی رکھتا ہے، بخوبی واقف ہے کہ اگر آفتاب کے نیچے فرقہ پروری کا کوئی سب سے بڑا دشمن موجود ہے تو وہ میں ہوں۔

میں کامل بیس برس سے ہندوستان کو بیداری، مردانگی، اور اتحاد کی جانب پکار رہا ہوں ——— میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں صرف سیاسی اتحاد نہیں چاہتا۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ ہر وہ ہستی، یا شئے جو سیاسیات سے آلودہ ہو جاتی ہے، اُس میں نفاق سرایت کر جاتا ہے۔

میں تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحوں میں اتحاد دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور میرے عقیدے میں ہندوستان کی کامل نجات ناممکن ہے جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی ازدواج قایم ہو کر ان دونوں گروہوں کی تہذیب و معاشرت ایک نہ ہو جائے۔

آزادی و اتحاد کی سی مقدس چیز میں مذہب کا ٹھونسنا صرف اُن خیرہ سروں کا وطیرہ ہو سکتا ہے جو یا تو ہندوستان میں پھوٹ ڈالنے کی روٹی کھاتے ہیں، یا جن کی سرزمینِ دماغ قحط زدہ ہو کر خشک ہو چکی ہے۔

اس پرچے میں دوسری جگہ مولوی عبدالحق کا وہ مضمون جس کا ابھی تذکرہ ہو چکا ہے اور جس نے میرا خون کھولا کر یہ چند سطریں لکھائی ہیں درج کیا جاتا ہے، جس سے قارئین کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ گاندھی اور جواہر لال کے سے اکابر قوم، ہندوستان کی مشترکہ زبان اُردو کے ساتھ کس قسم کا سفاکانہ برتاؤ کرنے پر اتر آئے ہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ اردو، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے، اور انھیں دونوں کے آغوش میں یہ پروان چڑھی ہے۔

میں ہندوستان کے تمام باشندوں سے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں، یا پارسی، بآنگِ بلند یہ عرض کروں گا کہ ہندو مسلم اتحاد کی قدیم یادگار یعنی اُردو کو زندہ اور باقی رکھنا اُن کا سب سے بڑا قومی فریضہ ہے، اور اگر خدانخواستہ اُردو کو فنا کر دیا گیا تو آج جو میں کہہ رہا ہوں اُسے سب سُن لیں، یاد رکھیں، بلکہ گرہ میں باندھ لیں کہ پھر اس سرزمین پر ہندو مسلم اتحاد کا خواب کبھی نہ دیکھا جاسکے گا۔ اور ہندو مسلمان اُس وقت تک ایک دوسرے کے دشمن اور غیر کے محکوم رہیں گے جب تک کہ آوازِ صور، زمین اور آسمان کے پرخچے نہ اُڑا دے۔

دیکھو کہیں اُردو کو یہ نہ کہنا پڑے۔

خاک اُڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے

قومی شاعری کا اِرتقا

شری اروندو گھوش (پانڈیچری)

شعرا کی شاعری صرف اُن کی ذات اور اُن کے زمانے پر منحصر نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ اُس کا انحصار اُن کی قوم کی ذہنیت پر بھی ہوتا ہے، جو اُن کے واسطے روحانی، دماغی اور جمالیاتی روایات و ماحول پیدا کرتی رہتی ہے۔

لیکن اِس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ شاعر صرف مندرجہ بالا امور ہی کا پابند رہنے کے لئے مجبور ہے۔ یا یہ کہ وہ نفسِ قومی کی صرف ایک آواز یا روایات قومی کا ایک پرستار بن جانے کے لئے مامور کیا گیا ہے۔ اور وہ کوئی جدید راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔

جو قومیں کہ موجودہ باشندگانِ ہندوستان و آئرلینڈ کی طرح آلام و تکالیف کے باعث ایک مُحکم شعورِ ذات حاصل کر رہی ہیں، اُن میں قومیت کا جذبہ ایک زندہ تخیل اور قوی محرک کی حیثیت حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن وہ دوسری قومیں جو حیاتِ اجتماعی حاصل کر چکی ہیں اپنے تمام افراد پر ایک ہمہ گیر اور گہرا اثر ڈال سکتی ہیں۔ یا پھر وہ قومیں جو ایک عظیم قومی روایات و ثقافت (National Culture) سے بہرہ اندوز ہیں، اُن کے واسطے یہ آسان ہے کہ وہ اپنی روایات و ثقافت کے عنصرِ مُحکم سے اپنے شاعروں کے دل و دماغ کو متاثر کر سکیں۔ یعنی ایک طرف تو وہ قومیں اپنے گُزِر نفوس کو مدد بہم پہنچائیں، اور دوسری طرف اُن کو چند حدود کا پابند بھی کر دیں۔ نیز اپنے صاحبِ جوہر افراد کو معنوی و صوری لطافتوں کے باقی رکھنے کا ایک ملکۂ خاص بھی ودیعت کریں، لیکن یہ تمام چیزیں عظیم شاعری کی تخلیق کی ناگزیر شرطوں میں نہیں ہیں

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ شاعر خود اپنی ذات کے اندر تخلیق کرتا ہے۔ اور اُسے ناقابلِ انکار حق حاصل ہے کہ وہ رُوحِ باطنی کی آواز پر آزادی کے ساتھ چلے۔ بشرطیکہ وہ یہ ثابت کر سکے کہ اُس نے اپنے شعر میں حُسنِ شعری کے قاعدوں کی پابندی کی ہے۔

یہ سچ ہے کہ شاعر کی قوم اور اُسی کے زمانے کا ماحول شاعر کو پہلا قدم اُٹھانے، اُس کے واسطے کسی حد تک شاعرانہ برگ و ساز بہم پہنچانے، اور اُس کی شاعرانہ پرواز کے واسطے مناسب فضا پیدا کرنے کا سامان ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن میں اُس گروہ کے نقطۂ نظر کی صحت کا قایل نہیں ہوں جو یہ کہتا ہے کہ کسی شاعر کے کلام کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے یہ امر لازمی اور ناگزیر ہے کہ ہم اُن تمام قدیم نمونوں، حالات، قرائن، اثرات، محرکات اور اُس عہد کی فضا اور اُس زمانے کے ماحول کا مطالعہ کریں جس سے شاعر کا کارنامہ معرضِ وجود میں آیا ہے۔ اِس کے تو یہ معنی ہوئے کہ شاعر صرف اُنھیں متذکرۂ بالا امور سے بنی ہوئی اک چیز ہے۔ اور خود اُس کے اندر ذاتی طور پر کوئی جوہر نہیں پایا جاتا۔

اِس گروہ کے نقطۂ نظر سے اگر ہم شاعر پر نقد کریں تو اِس غلطی کا بھی امکان ہے کہ ہم شاعر سے اُن چیزوں کو بھی منسوب کر دیں جو اُس کے گرد و پیش تھیں تو ضرور لیکن جنھیں اُس نے کبھی جذب ہی نہیں کیا تھا، اور جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم شاعر کے جوہر کا صحیح تخمینہ نہ لگا سکیں گے۔ حقیقی ناقدانہ اسلوب اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ شاعر اور اُس کے کلام تک براہِ راست پہونچنے کے لئے سب سے

زیادہ ضروری بات خود شاعر اور شاعری کا صحیح مطالعہ ہے جس سے ہمارا حقیقی جمالیاتی اور شاعرانہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

اِس کے بعد اگر ہمیں شاعر کے متعلق مزید تفصیلات کی ضرورت ہو، اور ہم اپنی کسی علمی یا تاریخی خلش کو مٹانا چاہتے ہوں تو ہمیں اختیار ہے کہ کسی دوسری طرف بھی رُخ کریں۔ اس صورت میں سخن سنجی کی شگفتگی ماند نہ پڑ سکے گی، اور اتفاقی باتوں کے علم کا اضافہ بھی ہو جائے گا۔

اگر ہم تاریخی نظریۂ انتقاد کے غیر حقیقی یعنی خارجی اسلوب نقد سے قطع نظر کرلیں تو اِسی نظریے میں ایک ایسی راستی اور صلاحیت ضرور موجود ہے، جو سخن سنجی کے لئے نہ سہی، لیکن شاعر اور اُس کی شاعری کا ایک صحیح فیصلہ کرنے کے باب میں نہایت ہی اہم اور ضروری ہے۔

شاعری ہی نہیں، بلکہ ہر اُس شے میں جو تکمیل حاصل کرنا چاہتی ہے، دو عُنصر ہوا کرتے ہیں۔ ایک عنصر تو غیر فانی ہوتا ہے، اور دوسرا وقتی۔

پہلا عنصر حقیقی اور اہم ہے، اور یہی وہ عنصر ہے جو ہماری سخن سنجی، اور شعر فہمی کو متعین کرتا ہے۔

شاعر ایک ایسی رُوح ہے جو لا محدود اقسامِ حُسن کی رنگا رنگیوں کے ساتھ ابدی رُوحِ حقیقت و حُسن کا آلاتِ الفاظ کے ذریعے سے اظہار کرتی رہتی ہے، اور شاعر کا کلام صرف اُنھیں رُوحوں کو متاثر کر سکتا ہے جو اُس کی رُوح سے مماثل اور ہم آہنگ ہوتی ہیں۔

ہماری سخن سنجی کی قوّت اُس وقت انتہائی نقطے پر پہونچ جاتی ہے جب ہمارے احساسات پاکیزہ ترین صورت سے بیدار ہوتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی مبہم وجود ہم میں سرایت کرکے کسی غیر شخصی قوّت سے ہم کلام ہو رہا ہے اور کوئی نامعلوم رُوح مناسب الفاظ تلاش کرکے ہماری شخصیت کے ذریعے سے اپنے کو ظاہر کر رہی ہے۔

اس نامعلوم رُوح کا ہمارے تخلیقی خیال اور ہمارے ان مُحرّکاتِ حُسن سے تعلق ہوتا ہے، جو وزن و الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ اِس کے علاوہ تمام دوسری باتیں محض ایک ادنیٰ اور اتفاقی حیثیت رکھتی اور صرف سلسلے کا کام دیتی ہیں۔ اِسی کے ساتھ ساتھ شاعر اور سامع کی شخصیتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شاعر تاریخِ فکر کو ایک مخصوص شکل اور مرتبہ دیتا ہے۔ اور ایسا سامع، تاثیرِ کلام کے متعلق ایک مخصوص دماغی و جمالیاتی فیصلے کا تعیّن کرتا ہے۔ اور یہ شاعر و سامع کا تعلّق ہی ہے جو شعر و سخن میں شخصی عُنصر کو داخل کر دیتا ہے۔

عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایسے نقّادانِ سخن بھی جو صاحبِ ذوق و بصیرت ہوتے ہیں، اور جنھیں اپنی حسِ جمالیات پر کامل اعتبار بھی ہوتا ہے۔ اپنے معاصرین کے متعلق مخالف یا موافق فیصلہ کرنے میں غیر معمولی غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اور یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ حالاتِ زمانہ اور ذہنی ماحول کے باعث ہم سب اتفاقی اثرات کے ہجوم میں رہتے ہیں، اور ہماری ذہنیت اس قدر متاثر ہوتی ہے کہ ہم اپنے موضوع کو ایک مسخ شدہ اور زنگ خوردہ صورت میں دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات محض عناد، حسد اور دیگر مادّی قسم کے مصالح کی بنا پر نقّادانِ سخن، اپنے معاصر شعراء کو دانستہ، مکروہ ہئیت میں پیش کر دیتے ہیں۔

میں اس موقع پر ایک وسیع تر تحریک کا بھی ذکر کروں گا جس میں شاعر، شاعری، نقّاد، اور سامع سب شامل ہیں۔

اِس تحریک کے ذریعے سے کائناتی رُوح، انفرادی رُوح کی طرح، رُوحِ ظہور سے متحد ہو جانا چاہتی ہے۔ اور ابتدا ِ زمانہ کے ساتھ ساتھ شاعری کا چشمۂ ظاہر باطن کی طرف اور باطن سے رُوح کی جانب پھر جاتا ہے۔

لیکن یہ ارتقاء کسی مقررہ اصول پر نہیں ہوتا، بلکہ اِس کی راہِ عمل میں بہت سے پیچ و خم ہوتے ہیں۔ اور اُسے متعدد اَدوار سے گزرنا پڑتا ہے۔

اِس سلسلۂ عمل میں کبھی تو محرّکاتِ ماضی کی طرف مُڑنا پڑتا ہے، کبھی مستقبل کے توقعات سے اُمیدیں وابستہ کی جاتی ہیں۔ اور کبھی صرف توسیعِ ذات اور خودشناسی و خود یابی کے لئے جد و جہد کی جاتی ہے۔

اگر اِس متذکرۂ بالا ارتقاء کا صاف و صحیح تخیل قایم ہو جائے تو ہماری قوّتِ فیصلہ میں جو تاریخی اور ارتقائی عنصر پایا جاتا ہے اُسے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔

وہ قومیں جو فکر و تخیّل اور شاعری و صناعت کے مسائل میں نمو حاصل کر چکی ہیں۔ اُن میں یہ عام تحریک مختلف شکلوں، اور مختلف اسلوب سے مصروفِ عمل نظر آتی ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر ایک قوم ارتقار کی کسی مخصوص منزل سے گزر رہی ہے تو دوسری ارتقار پذیر قومیں بھی بیک وقت اسی منزل سے گزر رہی ہوں۔ کیونکہ نفسیاتی معاملوں میں کائناتی رُوح طبعیٔ معاملات کے بہ نسبت زیادہ آزادانہ طور پر عمل کرتی اور اپنی تحریکوں میں بمقتضائے زمان و مکان ردّ و بدل کرتی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ شاعر میں یہ ایک خصوصیت بھی پائی جاتی ہے کہ وہ ارتقار کے کسی تحتانی طبقے میں زندگی بسر کرتے ہوئے بھی بالاتر طبقات کی تحریکات کا سُراغ لگالیتا ہے۔ اسی لئے اگر شاعر میں ارتقا کے مختلف مدارج پائے جائیں تو اس پر حیرت کرنے کا کوئی محل نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ ہندوستان کے اُس دَور میں جو ایک شدید فعلی زندگی کا دَور تھا ہندوستانی قوم کی رُوح نے روحانی محرکات کو بہ شدّتِ تمام اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اور اُس دَور کی ذہنیت و زندگی کی مختلف شکلوں کو اَشکال و علامات میں منتقل کرکے اُس دَور کے رُوحانی محرکات کا اظہار بھی کردیا تھا جس کی بدولت وید اور اُپنشد کی مقدّس شاعری منظرِ عام پر آگئی۔

اسی طرح اُسی زمانے میں جب کہ جرمن زدہ یورپ، رومانوی نظموں کی کانپتی ہوئی طفلانہ آوازوں میں ہکلا رہا تھا، اُس وقت اُس کی شاعری گوتھک (Gothic) عمارتوں کی شکل میں روحانیت کے خاکے پیش کر رہی تھی۔ یُونہیں اپنے خون میں یونان اور رومتہ الکبریٰ کی مرُوج روایات رکھنے والے اطالیہ کے دماغ نے اُس موقع پر جب کہ اُس کے کرداروں کی کامیابی محض مادّی تشکیل تک محدود تھی۔ عالمگیر کلیسائی محرکات سے کام لے کر ڈانٹے کے ذریعے سے اپنے ارتقائے کلام کا اظہار کیا تھا۔

اور جب انگریزی جوہر نے لاطینی ثقافت (Culture) سے گلو خلاصی کرلی۔ اور لاطینی ذہنیت کو وینس کے کہساروں میں جلا وطن کردیا۔ تو دماغی محرکات کا انگلستان میں رواج ہوگیا اور پھر ایک مدّتِ دراز کے بعد شاعری میں رُوحانی عنصر کا بھی اضافہ ہوگیا۔

عام طور پر ہر قوم کے اندر ایک رُوح ہوتی ہے جسے ہم عالمگیر انسانی رُوح کی ایک خاص شکل کہہ سکتے ہیں۔ اور ہر قوم کی فطرت ایک مخصوص قانون کی پابند ہوتی ہے جو اس کے منازل ارتقا کا تعین کرتی ہے۔

اقوام کی یہ مخصوص رُوح اور فطرت، اپنے گرد و پیش جو کچھ بھی محسوس کرتی اور دیکھتی ہے، اُسے اپنے میں جذب کرلیتی ہے، اور پھر اسی جذب شدہ شے کو اپنے ماحول، اور اپنی فطرت کے قوانین سے ہم آہنگ کرکے شعر کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔

یہ ہوسکتا ہے کہ کسی خاص شاعر کی رُوح اپنے زمانے اور اپنی قوم سے علیحدہ رہتی ہوئی، دُور سے اپنی جھلک دکھائے اور اُس کا کارنامہ (کلام) نہ صرف اُس کی قومی ذہنیت سے مختلف، بلکہ ایک باغیانہ عنصر بھی رکھتا ہو۔

پھر بھی حقیقت میں افراد جانتے ہیں کہ اس اختلاف و بغاوت کے باوجود اُس شاعر کی شخصیت قومی رُوح کے احاطے ہی میں محصور رہتی ہے، اور اُس کی بغاوت کا غیر محسوس طور پر یہ منشار ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے کسی مستور جوہر کے اُبھارنے میں کامیاب ہوجائے، یا مخفی رُوحِ عالم کے اندر سے ایک نئی تحریک چھین کر اپنی قومی رُوح میں داخل کردے۔

موجودہ ہندوستان کی سیاسی اور معاشری خرابیاں اس حد تک پہونچ چکی ہیں کہ ہندوستانی شاعر اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور جو ایسے رُوح فرسا ہیجانات سے متاثر نہ ہو اُسے اگر نفسیاتی عینک سے دیکھا جائے تو درحقیقت شاعر کہا ہی نہیں جاسکتا۔

بہ وادیٔ عشق سے گزر لیتا ہوں
بے دورِ شراب جام بھر لیتا ہوں
افلاس بھی وجہِ یاس اپنی نہ ہوا
تخئیل میں سو گناہ کر لیتا ہوں

نجم آفندی اکبرآبادی

برسات ہے برسات

آ دیکھ تو ساون کے برستے ہوئے لمحات
ہو جائے گا کل خاک یہ مجموعۂ ذرات
کرتا نہیں کیوں عشق و جوانی کی مدارات
اس رت میں عبادت ہے حسینوں کی ملاقات

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات
برسات ہے، برسات
اے رندِ خرابات

ساحل پہ نئی آن ہے ہر ماہ لقا کی
ہر گام پہ کھلتی ہے گرہ زلفِ رسا کی
اللہ ری کرامت اثرِ لغزشِ پا کی
رہ رہ کے لچکتی ہے کمر ارض و سما کی

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات
برسات ہے، برسات
اے رندِ خرابات

گرداب میں بادل کے ہے خورشید کا بیڑا
کھاتا ہوا پھرتا ہے تھپیڑے پہ تھپیڑا
کس فصل میں چھیڑے گا جوابؔ راگ نہ چھیڑا
نوخیز اُمنگیں ہیں کہ پانی کا دڑیڑا

ہر ذرۂ ناچیز ہے، اس وقت شرابی
ہر رندِ خوش اوقات کا چہرہ ہے شہابی
اَربابِ شریعت کو مُبارک ہو خرابی
پیمانہ چھلکتا ہے، دمکتی ہے گلابی

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات
برسات ہے، برسات
اے رندِ خرابات:

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات
برسات ہے، برسات
اے رندِ خرابات:

میدان میں رقصاں ہے برستا ہوا پانی　　یاروں کی طبیعت میں ہے دریا کی روانی
پہنے ہے کوئی سُرخ لباس، اور کوئی دھانی　　ہر چہرۂ رنگیں سے اُبلتی ہے جوانی

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات
برسات ہے، برسات
اے رندِ خرابات

گلزار میں کوئل کی صدا گونج رہی ہے کافر ہوں اگر لاؤں نہ تقوے پہ تباہی
کہسار میں پُر شور ہوا گونج رہی ہے بوتل کی یہ سُرخی، یہ گھٹاؤں کی سیاہی
قُلقُل سے جُنوں خیز فضا گونج رہی ہے اور اُس پہ کسی شوخ کی دُزدیدہ نگاہی
میدان میں گھنگھور گھٹا گونج رہی ہے بھر جام کہ آتی ہے جماہی پہ جماہی

برسات ہے، برسات ہے، برسات، برسات برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات
برسات ہے، برسات برسات ہے، برسات
اے رِندِ خرابات! اے رِندِ خرابات

انبوہ حسینوں کا ہے دریا کے کنارے طوفاں ہے، تلاطم ہے، ترانے ہیں، ترارے
پھرتے ہیں نظر بازبھی سینوں کو اُبھارے جھولے ہیں، جھماجھم ہے، چھماچھم ہے، ہاشارے

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات
برسات ہے، برسات
اے رِندِ خرابات

آمست گھٹاؤں کی طرح دشت میں جھومیں — رنگین فضاؤں میں گھٹا جھوم رہی ہے
چھلکائیں مئے ہوش رُبا، جام کو چومیں — دریا میں تلاطم ہے، ہوا جھوم رہی ہے
کیا دہر، دو عالم کو کریں غرق سبو میں — لہروں پہ ملاروں کی صدا جھوم رہی ہے
ہستی سے گزر جائیں مچلتے ہوئے دھومیں — ساغر میں مئے ہوش رُبا جھوم رہی ہے

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات — برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات
برسات ہے، برسات — برسات ہے، برسات
اے رندِ خرابات — اے رندِ خرابات

سنتا بھی ہے موسم کے خنک راگ شرابی — ہاں موڑ سُوئے ساغرِ دل باگ، شرابی
پیمانے سے پانی میں لگا آگ شرابی — ہاں کاگ اڑا، کاگ اڑا، کاگ، شرابی

برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے، برسات
برسات ہے، برسات
اے رندِ خرابات

جوش

مرے آگے

سرشار ہوں، سرشار ہے دُنیا مرے آگے
کونین ہے اک لرزشِ صہبا مرے آگے

ہر نجم ہے، اک عارضِ روشن مرے نزدیک
ہر ذرّہ ہے اک دیدۂ بینا مرے آگے

ہر سانس ہے نظارۂ جنّت مرے نزدیک
ہر گام ہے گلگشتِ مصلّےٰ مرے آگے

ہر پھول ہے لعلِ شکر افشاں کی حکایت
ہر غنچہ ہے اک حرفِ تمنّا مرے آگے

اک ضحکہ ہے پرسشِ عقبیٰ مرے نزدیک
اک وہم ہے اندیشۂ فردا مرے آگے

ہوں کتنی ہی تاریک شبِ زیست کی راہیں
اک نُور سا رہتا ہے جھلکتا مرے آگے

میں اور ڈروں صولتِ دُنیائے دنی سے
خود لرزہ براندام ہے دُنیا مرے آگے

جھکتا ہے بصد عجز، کلیسا مرے در پر
آتا ہے لرزتا ہوا کعبہ مرے آگے

پیمانے سے جس وقت چھلک جاتی ہے صہبا
لہراتا ہے اک حُسن کا دریا مرے آگے

جب جھوم کے مینا کو اُٹھاتا ہوں گھٹائیں
ہلتا ہے سرِ گنبدِ مینا مرے آگے

آتی ہے دُلہن بن کے مشیّت کی جلو میں
آوارگیٔ آدم و حوّا مرے آگے

پیمانے پہ جس وقت جھکاتا ہوں صُراحی
جھکتا ہے سرِ عالمِ بالا مرے آگے

پہلو میں ہے اک زُہرہ جبیں، ہاتھ میں ساغر
اس وقت نہ دُنیا ہے نہ عُقبیٰ مرے آگے

جوشؔ، اُٹھتی ہے دشمن کی نظر جب مری جانب
کُھلتا ہے محبّت کا دریچہ مرے آگے

جوش ملیح آبادی



بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را



حوت

آزادی اور اصلاحِ معاشرت

انور علی صاحب
بی اے،

انسان کی طبیعت نہایت تازگی پسند واقع ہوئی ہے۔ ایک پہلو پر اس کو قرار نہیں۔ کوئی حالت خواہ کتنی ہی دل پسند کیوں نہ ہو، ایک عرصہ کے بعد طبیعت میں تنفر کا باعث ہونے لگتی ہے۔ یکسانیت کا تصور بھی تکلیف دہ ہے بعض لوگوں کو اس خیال سے ہی وحشت ہونے لگتی ہے کہ ان کو جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا پڑے گا۔ اس لحاظ سے موت بھی انسان کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے کہا جاتا ہے کہ یہی تڑپ اور بے چینی زندگی کا ہیولے ہے۔ جب اس میں کمی آجاتی ہے تو بوسیدگی کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جو موت کا پیش خیمہ ہیں۔ قناعت بے بسی کا نام ہے، متانت، سنجیدگی، سکون موت کا مرادف ہے، نہ صرف انفرادی زندگی بلکہ حیات اجتماعی اور بقائے قوم و ملت کا بھی یہی حال ہے۔ غرض تبدیلی کی خواہش انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اس فطری خاصہ کا اگر نفسیاتی تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو اس کی تہ میں آزادی کی قدرتی خواہش مضمر ہوتی ہے۔ یہی آزادی کا جذبہ مسلسل تبدیلی کا مقتضی ہوتا ہے۔ جس کو یکسانیت اور استقرار سے ازلی دشمنی ہے۔ یہی جذبہ آزادی انسانی ترقیوں کا باعث ہوتا ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ ساتھ ذہنی قویٰ کی تربیت بھی ہوتی رہے۔ ورنہ بسا اوقات تبدیلی کی خواہش اور تلون مزاجی بجائے ترقی کے تنزل کی طرف لے جاتی ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنی طبعی تازگی کے باعث تبدیلی کے لئے مضطرب ہوتے ہیں۔ مگر یہ فطری اور اضطراری کیفیت ہوتی ہے۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ معین طور پر ہم کیا چاہتے ہیں۔ یا تبدیلی کی کونسی صورت ہمارے گرد و پیش کے حالات کے لحاظ سے ہمارے لئے مناسب ہوگی۔ چنانچہ آج ہمارے ملک میں یہی کیفیت ہے ہر شخص مبہم طور پر ایک انقلاب کے لئے چشم براہ ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ انقلاب کی صورت کیا ہو۔ یہ ہمارے ذہنی قویٰ کی تربیت کی کمی ہے۔ جو تعلیمی نقصان کی دلیل ہے آج معاشرت کے ہر شعبہ سے بیزار ہیں۔ سوسائٹی یا سماج، رسم و رواج۔ قانون تعلیم غرض ہر شے سے متنفر ہیں۔ اور ہر قسم کی زنجیریں توڑ کر بالکل مطلق العنان ہونا چاہتے ہیں۔ مگر آزادی سے کیا مراد ہے۔ اور انفرادیت کا صحیح مفہوم کیا ہے اور وہ کہاں تک قابل عمل ہے، یہ اکثر لوگ نہیں جانتے۔ مغربی ممالک میں زندہ اور تعلیم یافتہ اقوام رہتی ہیں۔ وہاں پر آزادی کا جذبہ بھی تندرست حالت میں ہوتا ہے۔ اور وہ انقلاب کی تحریک سے پہلے اس کی ایک معین صورت ذہنی طور پر قرار دے لیتے ہیں۔ جو ان کی معاشرتی یا سیاسی خرابیوں کی اصلاح پر مبنی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہاں پر جو انقلابی ہیجان آج پایا جاتا ہے اس کی ایک معین صورت ہے۔ دولت پرستی کے دور تہذیب نے سرمایہ داروں اور مزدوروں کی جماعت میں جو کشمکش پیدا کر دی ہے اور جو روز بروز بد سے بدتر پہلو اختیار کرتی جاتی ہے اس نے ایک معاشرتی انقلاب کی داغ بیل ڈال دی ہے جس میں دولت کی تقسیم کے لحاظ سے زیادہ آزادی، فراخدلی۔ انصاف اور مساوات سے کام لیا جائے گا۔ مگر ہندوستان جیسے ملک میں اس قسم کی بے چینی اور انقلابی ذہنیت بے معنی چیز ہے، جن لوگوں نے مذہبی جور و استبداد کو قبول کر رکھا ہو اور روایات کی پابندی کو اپنے اوپر فرض کر کے خود ہی آزادی سے سبکدوش ہو گئے ہوں ان کو ایسی تحریکوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ان کی آزادی کا تخیل بس یہیں تک ہے کہ ان کے مذہب میں کوئی دست اندازی نہ کرے اور اگر

محکوم رہ کر بھی یہ آزادی ان کو حاصل رہے تو پھر محکومیت بھی ان کے نقطۂ نظر سے کچھ ایسی بری چیز نہیں ہے۔ اگر مذہب کی دولت پاس ہے تو دل غنی ہے، اور اپنی دنیاوی حالت پر وہ ہر حال میں قانع ہیں۔ اور اگر کوئی ان کو یہ کہے کہ ان کی زندگی کا ہیولیٰ سرد ہو چکا ہے تو وہ جواب دیں گے کہ تازگی پسندی طفلانہ شے ہے۔ اور آزادی کا مطمح نظر یہی ہے کہ مذہبی آزادی حاصل ہو اور اپنی تمام دیگر خواہشات خواہ وہ کتنی ہی اہم ہوں مذہب میں جذب کر دی جائیں۔ اگر طفلگی زندگی کا آغاز ہے تو وہ زندگی کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اس لئے کہ وہ مورد آلام ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جن ممالک میں مذہب کا دور دورہ ہو وہاں آزادی کی تحریک مضحکہ خیز ہے۔ مذہب کو آزادی سے کیا تعلق، مغرب میں جو انقلابی تحریکات کارفرما ہیں ان کا نقطۂ نظر مادی ہے۔ کیونکہ ان کے محرکات کی بنا اقتصادیات پر ہے، یعنی انسان کی مادی ضروریات کی بہم رسانی اور جسمانی خواہشات کی تشفی اس طریقہ پر کہ زیادہ سے زیادہ آدمی اس سے مستفید ہو سکیں۔ اور ایک معقول معیار کے مطابق سب لوگ زندگی بسر کر سکیں۔ مگر مذہب بزعم خود ایک نہایت برتر اور اعلیٰ تر جذبہ ہے، جو یورپ کی مادیت کی کثافت سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہندوستان میں ایسی انقلابی تحریکات کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ جہاں آزادی کا مفہوم ہی کچھ اور ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عوام اس معاملے میں بالکل بے حس ہیں اور جس قدر آزادی ان کو حاصل ہے وہ ان کے مقاصد کے لئے کافی ہے۔ اور اس سے تجاوز کرنا وہ پسند بھی نہیں کرتے۔ معدودے چند نفوس جنہوں نے مغربی علوم اور مغربی معاشرت اور سیاسیات کا مطالعہ کیا ہے ان تحریکات کے علمبردار ہیں اور وہی لوگوں کو ابھارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ورنہ صحیح معنوں میں یہاں پر یہ تحریک ملکی نہیں ہے۔ یوروپ کی یہ ایک نقل ہے۔ جس میں اصلیت مفقود ہے۔ اور ان حالات میں ان کا فروغ پانا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ سوشلزم یا اشتراکیت عرف عام میں مذہب سے دست برداری کا پیغام ہے۔ اگرچہ مذہب کے صحیح مفہوم کے لحاظ سے اوسط درجہ کا سوشلزم اپنے مساوات کے دعاوے کی بنا پر مذہبی مقصد کا حقیقی معنوں میں مؤید ہو

مگر مذہب کی موجودہ غلط ذہنیت کی بنا پر کسی بھی ایسی تحریک کے لئے جو سیاسی یا اقتصادی ہو یا جس کی غرض و غایت مادی یا دنیادی مفاد ہو ہندوستان تیار نہیں ہے۔ قومی تحریک جو کامیاب ہونے کا استحقاق رکھتی ہے وہ ہوتی ہے جو عوام الناس سے شروع ہو یعنی چشمے کی طرح اندر سے پھوٹ کر اوپر آئے، نہ یہ کہ اوپر سے اس کو اندر کی طرف دبایا جائے۔ جو جبر طبیعی صورت ہے۔ کیونکہ وہ آزادی نہیں ہے۔ بلکہ استبداد ہے۔ کامیابی کی امید صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ عوام کی مذہبی ذہنیت کی اصلاح ہو جائے۔ اور اس کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے جس کا ہمارے ملک میں فقدان ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ مذہب کوئی بے معنی شے ہے، بلکہ مذہب کا وہ تنگ نظری کا مفہوم قابل اعتراض ہے، جو اس کو مادی یا دنیادی ترقی اور بہبودی سے نہ صرف مستغنی اور بے تعلق بناتا ہے، بلکہ دنیا اور آخرت کے اصلی مقاصد میں نقیض پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا خیال ہے کہ مذہب اصلی معنوں میں ایک ایسی شے ہے جس کا زندگی کے ہر شعبہ سے گہرا تعلق ہے کیونکہ مذہب مادی خواہشات اور اخلاقی ضروریات کا ایک ایسا توازن ہے جس میں نہ ہمارا مادی وجود معطل الغنان ہونے پائے اور نہ جائز خواہشات اور انفرادی آزادی بالکل کچل دی جائے۔ دوسرے الفاظ میں مذہب کا مقصد حسن معاشرت ہے۔ اس عالم آب و گل میں کم از کم انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے قوائے ذہنی اور اپنی شعوری کیفیت کی بنا پر دوسری مخلوق کی طرح کورانہ طور پر تنہا طبعی قوانین کے تابع نہیں ہے۔ بلکہ اخلاقی قوانین سے بھی وہ متاثر ہوتی ہے۔ اور یہ اخلاقی قوانین محض ایک دھوکہ نہیں ہیں بلکہ نفسیاتی حقیقت ہیں۔

نہ ہم خدا کے وجود سے انکار کرنے کی تعلیم دیتے ہیں، سزا اور جزا کے مسئلہ سے بھی اصولی طور پر ہم کو انحراف نہیں، خواہ اس کی صورت کچھ ہی قرار دی جائے۔ عملی مقاصد کے لئے صورت کا فرق کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ غرض ہم دہریت کے حامی نہیں ہیں۔ اور اپنے برادران وطن کو مذہب سے دست برداری کی تلقین نہیں کرتے۔ مگر اختلاف اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ مخصوص طریقہ کی عبادت، مخصوص رسم و رواج اور مخصوص روایات کی

پابندی کو اصل مذہب قرار دیا جائے۔ اور نجات انسانی کا انحصار ان ہی اعمال پر سمجھا جائے۔ اور ان کی بجاآوری میں اس قدر مبالغہ کیا جائے کہ دوسرے انسان کا سر پھوڑنا بھی جائز تصور کیا جائے۔

اصل میں عوام کے نزدیک اور شاید خواص کے نزدیک بھی مذہب کے معنی محض حسن اخلاق نہیں ہیں۔ بلکہ خاص رسومات اور عبادات کی بجاآوری عین مذہب سمجھی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک حسن اخلاق ثانوی حیثیت کی چیز ہے اور اس پر عمل در آمد صرف اسی وقت تک ہے، جب تک ان کی مخصوص عبادات اور روایات محفوظ و مصئون ہیں۔ ظاہر ہے کہ مذہب کے اس مفہوم میں تفرقہ ازی ہے اور تعصب و تنگ نظری ناگزیر، اور یہی وہ مذہبی ذہنیت ہے جس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ لوگ عبادت ترک کر دیں، مگر یہ ضرور کہتے ہیں کہ اس پہلو پر زیادہ زور دینا تفرقہ، تعصب اور مناقشات کو ابھارنا ہے۔ پھر اس میں کوئی افادیت کا پہلو بھی عملی مقاصد کے لحاظ سے ایسا نظر نہیں آتا کہ اس پر مبالغہ کرنے کی ضرورت ہو۔ آخرت کی نجات کو محض اسی پر منحصر اور موقوف سمجھنا قرین عقل نہیں، آخر خدا کو ہماری عبادت کی کیا ضرورت ہے، عبادت کا اگر کوئی فائدہ ہے تو یہی ہے کہ ہم میں اس کے ذریعہ نیکی کا ملکہ پیدا ہو جائے۔ اور یہ اس لئے کہ ہم دنیاوی زندگی میں ایک دوسرے کے کام آئیں، غرض نیکی یا حسن اخلاق مقصد ہے۔ جس کا ذریعہ عبادت ہے۔ مگر جب ذریعہ مقصد کو فنا کر دے تو وہ کہاں تک قابل ستائش ہوگا۔ اس لئے مذہب کا صحیح مفہوم وہی ہے جس میں حسن معاشرت پر زیادہ زور دیا جائے۔ اور عبادت کے پہلو کو اس کے تابع رکھا جائے۔ عبادت کے پہلو کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینی اس بخیل کے مانند ہے جو دولت کو خرچ نہیں کرتا۔ اور جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے، درانحالیکہ دولت زندگی کی آسائش بہم پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ مگر اس کے دماغ میں ذریعہ کی محبت مقصد کی اہمیت پر سبقت لے جاتی ہے۔

اس مذہبی اصلاح کے علاوہ ذہنی تربیت بھی ہونی چاہیئے۔ عوام میں جو آج خفیف بے چینی کے آثار پائے جاتے ہیں اور ایک نامعلوم انقلاب کا انتظار دیکھنے میں آتا ہے یہ محض زمانے کا اثر اور عام فضا کا نتیجہ ہے۔ ورنہ وہ خود نہیں جانتے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے آزادی کے مفہوم کی تشریح ضروری ہے۔ تاکہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ ہم کہاں ہیں اور ہم کو کہاں جانا ہے؟

آزادی کے متعلق علمی بحث سے قبل اس سلسلے میں سب سے پہلے تو ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لفظ انقلاب عموماً غلط معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ انقلاب کے معنی ہیں کسی تبدیلی کا یکایک اور قوانین ارتقائی کے علی الرغم پیدا ہو جانا جبکہ گرد و پیش کے حالات کے لحاظ سے اس کے لئے پہلے سے تیاری نہ پائی جائے، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسباب و علل کے قوانین یکسر معطل نہیں ہو جاتے، تدریجی ترقی کا قانون جاری و ساری ہے، ایسی کوئی چیز نہیں جس کو انقلاب کہہ سکیں، فرق صرف اتنا ہوتا ہے، کہ اگر حالات کو ان کی قدرتی رفتار پر چھوڑ دیا جائے تو نتیجہ بہت دیر میں مرتب ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اگر انسانی کوششیں بھی شامل ہو جائیں تو واقعات کی قدرتی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اگرچہ انسانی کوشش کا عنصر کم و بیش ہمیشہ شامل حال رہتا ہے۔ مگر جب زیادہ آدمیوں کی گہری توجہ بڑے پیمانے پر بیک وقت کارفرمائی کرے تو نتائج بسرعت ظہور پذیر ہوتے ہیں تاہم انسانی کوششیں کوئی مصنوعی صورت حال نہیں پیدا کر دیتیں بلکہ انسانی کوشش کا زیادہ یا کم ہونا خود اپنی جگہ پر حالات ماسبق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی قدرتی اسباب کا اثر۔

(باقی وارد)

میر انیس و فردوسی پر مرزا صاحب کی رائے

(عطاء اللہ پالوی)

جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی صاحب نے ۱۹۳۰ء کے بعد سے جو سحافتی ترقی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اور یہ بھی بلا عذر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اتنی کم مدت میں اتنی زیادہ شہرت حاصل ہو جانا چغتائی صاحب ہی کی قسمت میں تھا مگر افسوس اس کا ہے کہ اس شہرت سے مرزا صاحب اس درجہ متاثر ہوگئے ہیں کہ اب بجائے "مزاحیہ افسانوں" کے "ناول نویسی" "حمایت ہندی" اور تنقید نگاری پر قلم فرسائی کرنے لگے ہیں۔ اور ہمیں مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ آخرالذکر دونوں عنوانات پر جو کچھ آپ نے اب تک کہا ہے وہ "قابل توجہ" نہیں ایسی صورت میں ایسے مشہور و معروف مصنف اور صحافتی آسمان کے ایک درخشندہ ستارے کے لئے اس کے مضمون کا "توجہ طلب" نہ ہونا کس قدر افسوس کن اور حوصلہ شکن ہے۔

ادب لطیف لاہور کے مارچ نمبر میں چغتائی صاحب کا ایک مضمون "میر انیس اور فردوسی" کے عنوان سے نظر سے گذرا، سمجھ میں نہیں آتا کہ مزاحیہ مضامین لکھتے لکھتے مرزا صاحب کو اس "موازنہ" کی کیا سوجھی، اور پھر سوجھی بھی تو اس "تضیع اوقات" کے لئے خود تیار نہیں۔ بلکہ دوسروں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس عنوان پر دماغ سوزی کریں۔

مرزا صاحب کا خیال ہے کہ "یہ کام بے حد دشوار ہے" مگر میرا خیال یہ ہے کہ یہ اتنا دشوار نہیں جتنا ان کے خیال میں ہے۔ وقت ان کے "موازنہ" میں ہوتی ہے جن کا نام محض قدرے قلیل صحافتی دنیا میں آیا ہے۔ فردوسی اور میر انیس کا ادب عالمگیر ہے۔ اور ان دونوں کی رزمیہ شاعری کے زور کلام بندش مضمون۔ شوکت الفاظ۔ دلکش و موثر اسلوب نگارش اور مواقع استعمال کا شہرہ نہ صرف ایران و ہندوستان، بلکہ دوسرے ممالک میں بھی پہنچکر ادب نواز اور اہل فن اصحاب کی نظروں میں وقعت حاصل کر چکا ہے۔ اور اہل علم حضرات دونوں کو علم کی کسوٹی پر پرکھ چکے ہیں۔ اب اتنے عرصے کے بعد خلد آشیاں میر انیس جیسے مسلم الثبوت ادیب اور عدیم النظیر شاعر پر یہ اعتراض کرنا کہ ان کی تصنیف فردوسی کے شاہنامہ کا ترجمہ ہے چاند پر خاک ڈالنے کے مصداق ہے، اور چاند پر خاک ڈالنا عقلمندی نہیں کیونکہ اس خاک سے خود گرد آلود ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

پرلطف بات یہ ہے کہ خود تو مرزا صاحب متعصبانہ حملہ کریں اور دوسروں کو یہ ہدایت کرتے ہیں کہ تعصب سے کام نہ لیا جائے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"ان لوگوں سے جن کو صحیح ادبی ذوق ہے استدعا کرتا ہوں کہ اس سوال کو حل کریں۔ اور اس سوال کو حل کرنے میں قطعی بے تعصبی سے کام لیں۔

لیکن دوسری جگہ معجز رقم ہیں۔

"شاہنامہ پڑھنے کے بعد اگر میر انیس کا رزمیہ کلام پڑھو تو ممکن ہے کہ شبہ ہو کہ میر انیس نے طرز بیان وغیرہ شاہنامہ سے لیا ہے۔

لیکن نہیں، مجھے تو کم از کم یہ خیال گذرا کہ میر انیس کی رزمیہ شاعری کہیں ایسا تو نہیں کہ سرے سے طبعزاد ہی نہیں، بلکہ فردوسی کے شاہنامہ کا اردو میں چربہ ہے، چربہ بھی نہیں، بلکہ ترجمہ اور جو شہرت میر انیس کو اس سلسلہ میں

حاصل ہوئی اس کے وہ کسی طرح مستحق نہ تھے، گویا بلا مبالغہ
یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی حیثیت ایک مترجم سے زائد نہ تھی"

یہ ہیں مرزا صاحب کے زریں خیالات میر انیس کی مذہبیہ شاعری کے متعلق۔
کیا یہ الفاظ اور جملے پر از تعصب نہیں؟ بہرکیف اگر مرزا صاحب اپنے اس بیان کی تصدیق میں قلم اٹھائیں اور "موازنہ" فرمائیں تو انھیں غالباً بڑی مایوسی ہوگی۔ البتہ کہیں کہیں اسلوب بیان میں یگانگت ملے گی، تو یہ عجب کی بات تو نہیں اور نہ اس "یگانگت" پر کسی معنی سے اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ اصلی شاعر وہی ہے۔ جو فطرتاً شاعر واقع ہوا ہے اور فطرتِ ہر ذی روح کے ساتھ منسلک ہے۔ پھر اگر شعرا میں "اشتراک فطری" پایا جاتا ہے۔ تو گناہ کیا ہے؟ بہت سے شعرا کے کلام میں "یگانگت" پائی جاتی ہے۔ اور ملے گی۔ مگر اس کو "سرقہ" (مرزا صاحب نے غالباً اخفائے تعصب کی کوشش میں "سرقہ" کو "چربہ" لکھا ہے) نہیں کہا جاسکتا۔ اور اس موضوع پر نکتہ چینی محض تعصب اور "دریدہ دہنی" میں شمار ہوگی۔

اگر فردوسی اور انیس کی رزمیہ شاعری میں اشتراک پایا جائے، اور اگر کسی دو شعرا کے خیالات، الفاظ اور مضامین میں یگانگت اور یک جہتی پایا جانا "سرقہ" ہے تو غالباً دورِ حاضرہ کے مشہور شاعر اقبال بھی سارق کہے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ اقبال کے بہت زیادہ اشعار ایسے ہیں، جو بقول مرزا صاحب غالب کے شعر کا "چربہ" کہے جاسکتے ہیں۔ مثلاً چند اشعار دونوں شعرا کے ملاحظہ ہوں۔

غالب ۔ کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو ۔ عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
اقبال ۔ جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چُن کے تو ۔ آہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لئے

~~~~~~

غالب ۔ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو ۔ اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے
اقبال ۔ غرضِ نشاط ہے شغلِ شراب سے جن کی ۔ حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں۔

~~~~~~

غالب ۔ طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ ۔ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو
اقبال ۔ سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے ۔ بسمل نہیں ہے تو تو تڑپنا ہی چھوڑ دے

~~~~~~

غالب ۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا ۔ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اقبال ۔ مجھکو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا ۔ نقش ہوں اپنے مصور سے گلا رکھتا ہوں میں

~~~~~~

غالب ۔ از مہر زہ رواں گشتن قلزم نتواں گشتن ۔ جوئی بہ خیاباں رو سیلی بہ بیاباں شو۔
اقبال ۔ اے رہرو فرزانہ رستے میں اگر تیرے ۔ گلشن ہے تو شبنم ہو صحرا ہے تو طوفاں ہو

~~~~~~

غالب ۔ از وہم قطرگی ست کہ در خود گلیم ما ۔ اما چو وارسیم ہماں قلزمیم ما
اقبال ۔ کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو ۔ دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت دریا بھی ہے۔

~~~~~~

غالب ۔ داری چہ ہراسِ جانستانی از مرگ ۔ سعی جوئی حیات جاودانی از مرگ
اقبال ۔ موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی ۔ ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

~~~~~~

غالب ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا ۔ مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے
اقبال برآید آرزو یا برنیاید ۔ شہیدِ سوز و سازِ آرزو یم

~~~~~~

غالب ۔ زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن ۔ غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں
اقبال ۔ علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں ۔ جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

~~~~~~

غالب ۔ نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے ۔ بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن
اقبال ۔ غم نہیں غم روح کا ایک نغمۂ خاموش ہے ۔ جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

~~~~~~

غالب ۔ بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب ۔ چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا۔
اقبال ۔ گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ ۔ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

~~~~~~

غالب ۔ کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ ۔ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
اقبال ۔ یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی ۔ اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرا وا سوختی

~~~~~~

غالب ۔ لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں ۔ مانا کہ اک بزرگ ہیں ہم سفر ملے

اقبال ۔ تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی ؛ رستہ بھی ڈھونڈھ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

غالب ۔ نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا ؛ رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
اقبال ۔ نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی ؛ نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

غالب ۔ دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک ؛ میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
اقبال ۔ نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری ؛ وفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

غرض اسی طرح اور بھی اقبال کے بہت سے اشعار ملیں گے جو غالب کے اشعار کے ہم معنی ہیں، لیکن کیا اقبال کو آپ غالب کا مترجم کہنے کے لئے تیار ہیں ؟ یا کہا جا سکتا ہے ہرگز نہیں، یہ صرف خیالات کی یگانگت ہے ۔

بہت سے اشعار ایسے ملیں گے جو بالکل ایک سے ہیں، صرف الفاظ کا الٹ پھیر کر دیا گیا ہے، مگر اس کو بھی "سرقہ" نہیں کہا جا سکتا کسی شاعر کا دوسرے شاعر کے ندرت تخیل کو اپنے الفاظ میں بیان کرنا صرف طبیعت کا زور دکھانا ہے چند نمونے ملاحظہ ہوں

(۱) سعدی کا ایک شعر ہے ۔

حب وطن از ملک سلیماں خوشتر　　خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

آزاد اس کو یوں بیان کرتے ہیں ۔

حب وطن ز ملک سلیماں نکوتر است ؛ خار وطن ز سنبل و ریحان خوشتر است

(۲) شاد کا ایک شعر ہے ۔

کہا یاروں نے سب کچھ اس طرف روئے سخن کر کے　　مگر بیٹھے ہیں خاموشی کو ہم قفل دہن کر کے

حالی اس کو یوں فرماتے ہیں ۔

کیا پوچھتی ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ　　سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

غالب کا ایک شعر ہے ۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا　　صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

وفا اس کو یوں کہتے ہیں ۔

کس طرز خاص سے ہیں وفا ہم غزل سرا　　ہاں داد چاہتے ہیں کچھ اہل سخن سے ہم

(۳) غالب ایک جگہ فرماتے ہیں ۔

نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر　　جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

اکبر اس کو یوں نظم کرتے ہیں ۔

آدم چھٹے بہشت سے گیہوں کے واسطے　　مسجد سے ہم نکل گئے بسکٹ کی چاٹ میں

بعض عنوانات ایسے بھی ملیں گے جن پر کئی شعراء نے زور طبع دکھایا ہے اور ایک پر ایک کو ترجیح ہے، لیکن اس کو بھی "چربہ" نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس سے صرف اظہار کمال مقصود ہے ۔ "خود غرضی" پر فارسی میں زور طبع ملاحظہ ہو ۔

(۱) سعدی کا ایک شعر ہے ۔

از در طۂ ما خبر ندارد　　آسودہ کہ بر کنارہ دریا است

نظیری اس کو یوں بیان فرماتے ہیں ۔

بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را　　نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر

حافظ اس جگہ یوں طبع آزمائی کرتے ہیں ۔

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل　　کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

غالب اس کو یوں کہتے ہیں ۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز　　گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

(۲) يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ ؕ پر طبع آزمائی ملاحظہ ہو ۔

نعمت خاں عالی کہتے ہیں ۔

تنہا فلک از ذکر خدا نیست بہ جنبش　　ہر برگ کہ روئیدہ زبانیست زمیں را

نیاز یوں کہتے ہیں ۔

من نہ تنہا جاں فشانی پیش جاناں کردہ ام　　بر سر ہر تار مویش جاں فشانے دیگر است

خواجہ معین الدین رح اس طرح فرماتے ہیں ۔

رب ارنی نہ ہمیں موسیٰ گفت　　کیست کو طالب دیدار تو نیست

سعدی نے یوں موزوں کیا ہے ۔

نہ من خام طبع عشق تو می ورزم بس　　کہ چو من سوختہ در خیل تو بسیارے ہست

انوری یوں بیان کرتے ہیں ۔

عالمے را از جفائے عشق تو　　پائے در پیشانی بدیوار آمدہ

جلال اسیر یوں کہتے ہیں ۔

زجامِ عشق تو ہر ذرہ مست سودائیست بہ ہر طرف کہ نظر می کنم تماشائیست

حافظ یوں کہتے ہیں۔

نہ من براں گلِ عارض غزل سرایم و بس کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزارانند

سودا اس کو یوں کہتے ہیں۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

اسی طرح اگر فردوسی کے اشعار کی جھلک انیس کی شاعری میں پائی جاتی ہے تو اس کو سرقہ نہیں کہا جا سکتا۔ اب رہا یہ کہ مرزا صاحب نے ایک جگہ فرمایا ہے۔ "فردوسی کا ایک شعر ہے جس میں وہ تیر چلانے کا سین کھینچتا ہے میر صاحب کے یہاں بھی ایسا ہی شعر نہیں۔ بلکہ اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے۔ مضمون حرف بہ حرف واحد ہے۔"

تو اس کے متعلق یہ سن لیجئے کہ آپ کا "لفظ بہ لفظ ترجمہ" لکھنا تو خیر مع مبالغہ ہے۔ البتہ مضمون حرف بہ حرف" بلا مبالغہ ہے تو ایسی مثال بھی فارسی اور اردو میں ہے اور میں نے اوپر بعض شعر ایسا بھی لکھا ہے۔ جس میں کسی دوسرے شاعر کے شعر کا "مضمون حرف بہ حرف موجود ہے" لیکن پھر بھی چند اشعار حاضر ہیں جو میرے بیان کی تصدیق کرینگے۔ ملاحظہ ہو

(۱) حضرت سعدی کی ایک حکایت کے آخری جملے یہ ہیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بارہا در دلم آمد کہ بہ اقلیم دیگر نقل کنم تا در اں صورت کہ زندگانی کنم کسی را بر نیک و بد من اطلاع نباشد ؎

بس گرسنہ خفت و کس ندانست کہ کیست بس جاں بلب آمد کہ بر و کس نہ گریست

اس کا چربہ انگریزی شاعر پوپ نے یوں اتارا ہے جس میں سعدی کا مضمون حرف بحرف موجود ہے۔

Thus let me live, unseen unknown
Thus unlamented let me die,
Steal from the world, and not a stone
Tell where I lie

غالب کے مضمون میں ان دونوں کا چربہ یوں موجود ہے۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو!!

بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(۲) سعدی کا ایک شعر ہے۔

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر ما ہمچناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم

غالب کے یہاں اس کا چربہ دیکھئے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لئے

(۳) نظیری ایک جگہ فرماتے ہیں۔

بوئے یار من ازیں سمت وفا می آید گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

اس شعر کا "چربہ" سودا کے یہاں اس طرح موجود ہے۔

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

(۴) سعدی کا ایک شعر ہے۔

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم باید اول بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

میر نے اس کا "چربہ" یوں اتارا ہے۔

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ ان سے تو بھی پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

(۵) کسی شاعر کا ایک شعر ہے۔

در محفل خود راہ مدہ ہمچو منے را افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

میر درد اس کا "چربہ" یوں اتارتے ہیں۔

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

عمر خیام کا ایک شعر ہے۔

تو زاہد خشکی و منم عاشق تر آتش نہ شنیدہ ام کہ در تر گیرد

اقبال کے یہاں اس کا "چربہ" ملاحظہ کیجئے۔

زاہد شہر کہ ہے سوختہ طبعی میں مثال خشک ہے اس کو غریق یم صہبا کر دیں

(۷) سعدی کا ایک شعر ہے۔

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

اس کا "چربہ" میر کے یہاں دیکھئے۔

کہتے تھے کہ یوں کہتے، یوں کہتے اگر آتا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

(۸) ابو سعید کا ایک شعر ہے۔

صد کعبہ آب و گل بیک دل نرسد کعبہ چہ روی برو دلے را دریاب

ایک صاحب کے یہاں اس کا چربہ ملاحظہ کیجئے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

بہت سی ایسی بھی مثالیں ملیں گی کہ تمام رباعی کے مضمون اور خیال کو اردو زبان میں بہت ہی کم الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ اور ان نئی انفاظ نے شعر کی معنوی خوبیوں میں چار چاند لگا دیئے ہیں، اور معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کسی دوسرے کے دماغ کی پیداوار ہیں۔ مگر اس کو بھی سرقہ نہیں کہہ سکتے۔ اس سے شاعر کی قادر الکلامی اور اس کے اپنی زبان پر عبور حاصل ہونے کا پتہ ملتا ہے۔ مثلاً چند رباعیات ملاحظہ ہوں۔

(۱) عمر خیام کی ایک رباعی ہے۔

گیرم کہ بہ تقویٰ و خردمندی درائے — از دائرۂ شرع بروں نہ نہم پائے
با میل کہ طبع میکند چہ تواں کرد — مبباییت کہ در من آفریدست خدائے

غالب نے محض کم الفاظ میں کس خوبصورتی سے اس مفہوم کو ادا کیا ہے، دیکھئے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

(۲) عمر خیام کی ایک رباعی ہے۔

نیکی و بدی کہ در نہاد بشر است — شادی و غم کہ در قضا و قدر است
با چرخ مکن حوالہ کاندر رہ عقل — چرخ از تو ہزار بار بیچارہ تر است

صبا اس نکتہ کو کس سادگی سے بیان کرتے ہیں۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں — کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

(۳) شیخ سعدی کا ایک قطعہ ہے۔

دوست مشمار آنکہ در نعمت زند — لاف یاری و برادر خواندگی
دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست — در پریشاں حالی و درماندگی

غالب اس کو کس انداز سے کہتے ہیں دیکھئے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

(۴) عمر خیام کی ایک رباعی ہے۔

یک روز ز بند عالم آزاد نیم — یک دم زدن از وجود خود شاد نیم
شاگردی روزگار کردم بسیار — در در جہاں ہنوز استاد نیم

اقبال اس کو اردو کا جامہ یوں پہناتے ہیں۔

فقط شام و سحر میں بسر تو کی لیکن — نظام کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا

(۵) عمر خیام کی ایک رباعی ہے۔

می پرسید کہ چیست ایں نقش مجاز — گر بگویم حقیقتش ہست دراز
نقشیست پدید آمدہ از دریائے — وانگاہ شدہ بقعر آں دریا باز

اس کو ناسخ کس خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں۔

دم نکلنے پر یہ عقدہ وا ہوا مثل حباب — ہستی موہوم نے باندھی ہوا تھی ہیں نہ تھا

بہر حال ان مثالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ انیس کی رزمیہ شاعری فردوسی کی شاعری کا چربہ ہے ہو سکتا ہے کہ بعض خیالات دونوں کے بالکل ایک ہوں۔ یا بعض اسلوب بیان یا بندش الفاظ ایسے ہوں جن سے یہ معلوم ہو کہ فردوسی کے اشعار کا ترجمہ ہیں۔ تو ایسی صورت میں بھی مرزا صاحب کا یہ کہہ دینا کہ انیس کی حیثیت صرف ایک اوسط درجے کے شاعر کی حیثیت رہ جائے گی محض تعصبانہ سمجھا جائے گا۔ کیونکہ ترجمہ کرنا بھی آسان کام نہیں، ایک ایسے مترجم کی حیثیت جس کا ترجمہ نہ صرف اصل سے بڑھ جائے۔ بلکہ اصل مفہوم میں چار چاند لگا دے، بالکل اصل مصنف کے ہم پایہ ہے اس موضوع پر مولانا حالی کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

> جو شخص دوسری زبان کے شعر کو اپنی زبان کے شعر میں عمدگی کے ساتھ ترجمہ کرتا ہے، گو اس سے اس کی قوت متخیلہ کا کمال ثابت نہیں ہوتا۔ مگر وہ ایک دوسری لیاقت کا ثبوت دیتا ہے۔ جو ہر ایک شاعر میں نہیں ہو سکتی۔

اس لئے بصد ادب مرزا صاحب سے میری استدعا ہے کہ ایسی یگانگت سے کوئی اردو اور فارسی شعرا کا کلام خالی نہ ملے گا۔ اور اس پر اعتراض کرنا تحصیل حاصل اور بعید از دانشمندی ہے، اس لئے آپ محض تعصبانہ ایک ایسی شراب کی جرعہ کشی کا سلسلہ آغاز کرکے جس میں کوئی کیف و سرور نہیں اور جو آپ کے مذاق سے بالکل علیحدہ ہے، الجھاوے میں نہ پڑیں اور اپنے "مزاحیہ افسانوں" ہی میں زور قلم دکھائیں۔ تو غالباً اس خشک بحث سے جس کو آپ غلطی سے "دلچسپ" سمجھے ہوئے ہیں، کہیں زیادہ کامیاب اور پر از معلومات مضمون ملک کے سامنے پیش کر سکیں گے۔

"گُلدم"

(از جناب ل۔ احمد صاحب)

غالباً اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ طنزیات یا مزاحیات میرا موضوع قلم نہیں ہے۔ یہ مضمون ایک فرانسوی مصنف کی ایک فنتاسی میں تصرف کرکے مرتب کیا گیا ہے۔ اور اسے طنز کی صورت دینے کے لئے اردو ادبیات میں آجکل جس تناسب کا فقدان نظر آرہا ہے اس کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ میں نے "عدم تناسب" کی تمام مثالیں بیان کردی ہیں۔ لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصود تفنن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لئے مجھے توقع ہے کہ متعلق حضرات اس "پارے" کو محض ادبی و فکاہاتی نظر سے دیکھیں گے اور یہ خیال ہرگز نہ کریں گے کہ میں نے ان کی دل آزاری کرنا چاہی ہے۔

لیجئے آج ایک افسانہ سناتے ہیں . . . . . . خود اپنا افسانہ۔

ہمارا ایک ایک اہل قلم اور ہر قدر دان ادب جانتا ہے کہ افسانہ کسے کہتے ہیں۔ پھر بھلا آپ کیوں نہ جانتے ہوں گے؟ یہ تو جہالت کا کھلا اعتراف ہوگا۔ لیکن اگر سوئے اتفاق سے آپ کی سمجھ میں آگیا ہے کہ ایک انسان ہمہ داں نہیں ہوسکتا، یعنی آپ کو افسانے کے متعلق اپنی معلومات کی کمی کا احساس ہوگیا ہے تو ہم بزور سفارش کرتے ہیں کہ آپ اس کتاب کے خریداروں میں اپنا نام درج کرالیں۔ جو افسانہ نگاری کے فن پر عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ اس کتاب کے برابر جامع و مبسوط کتاب حکمائے یونان سے لے کر آج تمام مغربی زبانوں کے عہد عروج تک میں بھی نہیں لکھی گئی ہے۔ اس میں آپ کو انشاءاللہ ایسے بیش بہا خیالات ملیں گے جو کہیں سے ماخوذ ہوں گے نہ کسی دوسرے خیال سے بھی پیدا نہ ہوئے ہوں گے ——— ان کی صورت وحی والہام کی سی ہوگی، اور بعض "سطحی" مفکروں کے اس خیال وادعا کی تردید ہوجائے گی کہ "زیر آفتاب کوئی شے جدید نہیں"۔

آپ اپنی خوبیِ قسمت پر ناز کیجئے کہ آپ اس ترقی یافتہ قوم کے فرد ہیں جو اس کتاب کے مصنف کے سے محققین فن پیدا کرسکتی ہے، آپ اس زبان کو جانتے اور بولتے ہیں جس میں ایسا صحیفہ کامل نازل ہوسکتا ہے اور آپ اس بلند اقبال ملک کے باشندے ہیں، جس کی آب و ہوا میں ایسے پیغمبرانہ دماغ تربیت پاسکتے ہیں۔

خیر! یہ تو ایک مشورہ محض تھا۔ آپ اگر اس کتاب کو نہ پڑھیں گے تو مصنف کے تھوڑے سے مالی نقصان کے سوا کسی کا کچھ نقصان نہ ہوگا بلکہ آپ تو کچھ فائدے ہی میں رہیے گا۔ دراصل ایسی عالمانہ۔ عالمانہ نہیں، الہامی کتاب کا سمجھ سکنا ہر ایک کا کام بھی نہیں ——— پھر وقت عزیز کیوں ضائع کیا جائے؟

مگر ہم نے تو آپ سے افسانہ سنانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر افسانہ سنانے میں ایک مشکل پیدا ہوتی ہے کہ افسانہ شروع کیونکر کیا جائے؟ کیونکہ افسانہ خود ہمارا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ اپنے متعلق خود ہی کچھ کہنا زیادہ معیوب سی بات ہے۔ اور اگر اس کا خیال کیا جاتا ہے۔ تو افسانہ ناگفتہ رہ جاتا ہے البتہ ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ ہماری کچھ مدد کریں۔ آپ یہ وعدہ کریں ——— دل ہی میں کہہ لیں ——— کہ آپ "ضمیرِ متکلم" کو "ضمیرِ غائب" سمجھیں گے؛ اور کوئی صاحب کسی معقول اظہارِ خیال پر چراغ پا ہو جائیں تو ان کی استمالت اور تالیفِ قلب بھی آپ ہی کریں گے۔ کیونکہ نے الحال افسانہ سننے سنانے سے مقصود تو تفنن ہے، نہ کہ کسی کو رنج پہنچانا۔

اگر آپ ناواقف بھی ہیں تو اس کا اظہار نامناسب ہے، بہر حال آپ واقف ہیں کہ ہم ایک شاعر ہیں۔ اور آپ نے ہمارا کلام رسالوں میں اکثر پڑھا ہوگا۔ اور اگر واقعی نہیں پڑھا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کچھ ذوق ہی نہیں ——— لے صاحب کونسا رسالہ ہے جس میں ہمارا کلام نہ چھپتا ہو؛ مختصر یہ کہ ہم ایک شاعر ہیں۔

جب ہماری مثنوی ـ مثنوی نہیں ہم اس کو منظوم افسانہ کہیں گے کیونکہ مستعمل الفاظ میں کوئی ندرت باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ شائع ہوئی تو——— اب ہم نہ پوچھیں گے کہ آپ واقف ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ ہمیں آپ کے پڑھے لکھے ہونے کا بھی علم نہیں ——— ہماری یہ نظم جس کا عنوان "تفسیرِ حیات" تھا حسبِ توقع نہایت مقبول ہوئی اور تعریف و توصیف کی کوئی حد نہ رہی اردو زبان کا تمام ذخیرہ الیسا شہ پارہ اب پیش کرنے سے اس وقت تک عاجز تھا۔

چونکہ کسی ناقد کا یہ قول ہماری نظر سے گذر چکا تھا کہ تصنیف میں مصنف کی تصویر اور تنقید میں ناقد کی شکل نظر آتی ہے، ہم نے اپنی جگہ یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اب ہم اپنے نفس کو دھوکا نہ دیں گے۔ اس لئے ہم نے اپنی ہی ذات کو اس نظم کا موضوع قرار دے لیا۔ اس سے فائدہ کہ لکھ تو رہے ہوں آپ اپنا اور سمجھیں کہ آپ کسی اور کا واقعہ قلمبند کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم نے انانیت آمیز صاف گوئی سے کام لے کر اپنے ابتلا و آفات کی داستان بیان کردی۔ جس کا پیرایہ نہایت دلکش تھا۔ ہم نے اپنی زندگی اور اپنے نفسیات کے مخفی راز عریاں کر کے رکھدیئے جو بے حد دلچسپ تھے۔

اس میں ہم نے اپنے والد کی موت پر ایک نوحہ لکھا جو کئی صفحوں پر تھا۔ حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ وہ ضعیف تھے اور مر گئے۔ اور ہمیں رونے کے لئے چھوڑ گئے۔ مگر ہم نے کوشش کر کے اس میں دنیا بھر کے فلسفے بھر دیئے ——— آپ ہی بتایئے کہ نوحہ خوانی سے بڑھکر فلسفے کی نمائش اور کس صنفِ کلام میں کی جا سکتی ہے؛ الحاصل ہم نے اپنی زندگی کا ظاہر و باطن، اس کی بلندی و پستی، اس کے پیچ اور خم سب کچھ ظاہر کر دیا۔ شاید یہ بتانا ضروری نہیں کہ فسانے کے ہیرو کا نام وہی نہ تھا جو ہمارا ہے ——— نام فرضی تھا اور واقعات ہمارے تھے۔ یہ ہم نے اس لئے کیا کہ بعض اوقات ایسی حقیقتیں بیان کرنا پڑتی ہیں جنکے باعث لوگ آپ کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ یا پھر فسانے کی دلچسپی ہی زائل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک انشائی رمز ہے اور اس لئے ظاہر کر دی ہے کہ لوگ اگر چاہیں تو اس نکتے سے فائدہ اٹھائیں۔

اس مثنوی نما افسانے یا افسانہ نما مثنوی کے ناشروں نے یہ خوب کیا کہ بہت پہلے سے اور بدل بدل کر۔ مختلف عنوانات اور شکلوں میں، پُر رعب اور شوق آفریں پیرایوں سے، حرص انگیز اور ولولہ خیز تصویروں کے ساتھ اس کا اشتہار دینا شروع کر دیا۔ سر گھٹے سے مغربی لکھوائی مولانا حد الکمال سے مقدمہ تحریر کرایا۔ اور میر ادیب شہیب سے دیباچہ قلمبند کرا کے اس کے ساتھ شائع کیا۔ اب آپ ہی بتایئے کہ ہمارے نام کے ساتھ ان تین بقول ناگفتہ بہ "جغادری" شخصیتوں کے نام! پھر کس کو ہمت ہو سکتی تھی کہ اس میں سقم و معائب تلاش کرے؛ کس کو یارا تھا کہ اس کی تعریف میں لال زبان نہ ہو جائے؛ کیونکہ آپ جانتے ہی ہیں کہ اپنی جہالت کا ثبوت دینے کو کوئی طیار نہیں ہوتا۔ اور اپنی سخن فہمی تسلیم کرانے کا شوق ہر شخص کو ہوتا ہے۔ اور چونکہ ہماری کتاب کے ناشر ایک ماہوار رسالے کے بھی مالک تھے اس لئے صاحب، کس کو غرض پڑی تھی کہ بیٹھے بٹھائے اپنے زائیدہ ہائے طبع اور چکیدہ ہائے قلم کے مسترد ہو جانے یا ان پر تنقید ——— نہیں تنقیص ——— کی جو کھوں میں پڑے اور مفت رسالے پانے کے حق سے محروم ہو جانے کا خطرہ برداشت کرے۔

ایک انشا پرداز حماقت کر کے میرے ناشران کو توجہ دلائی کہ اس مثنوی میں زبان اور محاورات زبان کا بری طرح خون کیا گیا ہے

اور چونکہ وہ ایک مرکزی زبان کے علمبردار ہیں اس لئے ان کے یہاں سے جو کچھ شائع ہو ہر معنی کر ٹکسالی ہونا چاہیئے۔ اس ہمدردی و دلسوزی کا صلا یہی ہوسکتا تھا کہ اب اسے مفت رسالہ نہ دیا جائے۔ اور تنقید کے میدان میں سوچ سمجھ کر آنے کا اعلان جنگ ۔

مثنوی کے اشتہاروں میں میرے ناشروں نے وہ تمام حسین اور رعب دار الفاظ صرف کر دیئے جو ان کو مفت کی کتابوں میں مل سکے اور اخبار اور رسالوں کے ایڈیٹروں نے انھیں اشتہاری لفظوں کے الٹ پھیر سے بہت اچھے تبصرے کئے۔ دو ایک نے اپنے علم و فن کا وقار قائم رکھنے کے لئے صرف رسید شائع کر کے تفصیلی تبصرے کو کسی دوسرے وقت نامعلوم پر منحصر کر دیا۔ آپ یہ تو جانتے ہوں گے کہ کسی تصنیف پر تبصرہ کرنے میں ناقد کی علمیت و قابلیت، انسانیت و شرافت، غرض سب کچھ ظاہر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک تبصرہ نویس نے پڑھنے کی زحمت نہ کر کے یا پڑھنے کے بعد سمجھنے کی بلا سے بچنے کے لئے بڑی ادبیت کا ثبوت بلا دلیل یہ کہہ کر دیا کہ اس مثنوی میں کوئی ندرت نہیں۔ ہمارے ادب میں یہ سب کچھ پہلے سے موجود تھا۔ گویا ان کے خیال میں زمانہ، خیال و انشا میں کوئی ترقی کر ہی نہیں سکتا۔ اور ایک موضوع پر دو شخصوں کو توجہ کرنا حرام ہے۔ لیکن آپ سمجھے کہ یہ اختلاف کس بنا پر تھا؟ "استقرار" علامانیت" کے لئے۔

میرے ناشروں نے یہ بھی کیا کہ ان تمام تبصروں کو جمع کر کے اپنے رسالے کا ایک "تفسیر حیات" نمبر نکال دیا۔ تبصروں میں سے توصیفی تو یورپ کے ناشر بھی چن لیا کرتے ہیں۔ اس طرح مفت میں "خاص نمبر" کی سنت بھی ادا ہو گئی، القصہ مختصر مثنوی اس قدر مقبول ہوئی کہ —— اب آپ خود ہی جانتے ہیں۔

اب ہماری تصویر اور ہمارے حالات کی مانگ شروع ہوئی، جامعہ اسلامیہ کے پروفیسر برقیات اور کلیۂ اردو کے ماہر لسانیات نے ہمارے ناشروں کو تعریف و تحسین کے خط بھیجے۔ خود ہمارے پاس تہنیت نامے آنے لگے —— اور محبت نامے بھی۔

روزناموں۔ ماہناموں۔ اور سالناموں کے ایڈیٹروں کے نیاز ناموں نے ناک میں دم کر دیا۔ اب جس پرچے میں ہمارا کوئی پارۂ چھپ جاتا وہ ہمیں اپنا "خصوصی" بنا لیتا۔ "رفقائے بزم" میں ہمارے شمول کا اعلان کرتا۔ ہمیں "ادیب الدہر" "شاعر العصر" کے خطابات دیئے گئے۔ اور ہم "بلبل ہند" کہے جانے لگے —— یعنی بلبل شیراز کا ہمپایہ بنا دیئے گئے۔ گویا ہم بلبلوں کی برادری میں سرمایۂ فخر و ابتہاج تھے لیکن اس پر ہم نے احتجاج کیا کہ یہ قطعاً "غیر فطری" اور بدیسی خطاب ہے۔ اس کی جگہ "گلدم ہند" ہونا چاہیئے۔ آپ حیران نہ ہوں، ہمارے اعتراض کی معقولیت تسلیم کی گئی۔ کیونکہ اس میں "مقامی رنگ" اور "وطن پرستی" جھلکتی ہے۔

ہم سے سوال کیا گیا کہ ہم شعر کیونکر کہتے ہیں۔ جواب میں ہم نے بھی وہ سب کچھ کہہ دیا جو ہمیں شعر کے متعلق کتابوں میں لکھا ہوا ملا۔ اور اس طرح کہا کہ بغیر کہے واضح ہو جائے کہ "خدا لکھوتا ہے اور میں لکھتا ہوں"۔ اور یہ ایک امر واقعہ بھی ہے کہ "صریر خامہ" "نوائے سروش" بن جاتی ہے۔ یعنی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "خدا بول رہا ہے۔ اور میں لکھ رہا ہوں"۔

الغرض ہماری اس مثنوی نے ہندوستان بھر میں زلزلہ بپا برپا کر دیا —— جیسا کہ خود آپ کو معلوم ہے۔ لوگوں نے ہمارے ان نجی مصائب کے بیان سے حریفانہ لذت و لطف حاصل کیا۔ اس کو آپ ہماری نکتہ شناسی پر محمول کیجئے کہ ہم نے خود اپنے حالات بیان کر کے نہ صرف ملک کے مذاق کی داد دی۔ بلکہ انسانی فطرت کی ناز برداری بھی کی۔ شاید آپ کو علم ہو کہ لوگوں کے اندرونی رازوں میں ہمیں قصے کہانی کا مزا ملتا ہے۔ ورنہ یہ "چرچے" اور یہ "فرضیتے" رونما ہی کیوں ہوا کرتے۔ اور لوگ ہمیشہ اپنے کام سے کام کیوں نہ رکھتے۔ صرف ہمارے ہی ملک کا نہیں، دنیا کا مذاق یہی اور مذاق بھی نہیں طبیعت ہی ایسی ہے

آپ اس کو تو مانتے ہوں گے کہ قوموں کا مذاق بدلتا رہتا ہے اپنی زبان کی افسانہ نویسی ہی کو لے لیجئے۔ کل تک حسن و عشق کا تذکرہ افسانے کی جان سمجھا جاتا تھا اور اس سے باہر افسانے کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ آج واقعیت نگاری (Realism) کا دور ہے اور رومان مردود مردود ہی نہیں بلکہ شاید صنف فسانہ سے خارج ہے۔ فن افسانہ کی صناعت

لے دے کے اس خصوصیت پر منحصر ہوگئی ہے کہ دیہی زندگی کی ایک کہانی ابتداً سے انتہا کرکے سنا دیجئے۔ اور بس، آپ بڑے افسانہ نویس سمجھے جائیں گے۔ انشا، ادبیت فسانے کے لئے ضروری چیز نہیں رہ گئی اور زبان کی صحت و فصاحت معیار افسانہ سے خارج سمجھ لی گئی ہے۔ ہم نے اس نکتے کو سمجھ کر اس پر عمل کیا اور مدعا حاصل کر لیا۔ ہم آپ کو بھی یہی مشورہ دیں گے کہ ناموری حاصل کرنا اور آرام کی زندگی گذارنا ہے تو زمانے کی حماقتوں کی اتباع کیجئے۔

ہاں تو ہماری زندگی کا یہ کچا چٹھا، ہمارے یہ منتشر خیالات اور آوارہ محسوسات، جن کو ہم نے رنگ دے کر ایک ذرا فلسفیانہ انداز اور ڈھلی ڈھلائی صورت میں پیش کیا۔ اور اس میں "مستقبل انسانیت" کے مسئلے کو جس کے حل میں علمائے دہر معلوم نہیں کب سے سرگشتہ و منہمک ہیں کچھ اس طرح سمو دیا تھا کہ ہم خود بھی اس کو ایک عجیب و غریب فلسفہ باور کرنے لگے، اپنی انشا کا پرواز ہم نے مزاحی رکھا۔ اور اس لئے ہم اپنی زبان دانی کا سکہ بھی بٹھانا چاہتے تھے اس لئے ہم نے "میرے یار" وغیرہ قسم کے چند سوقیانہ محاوروں اور روزمرہ کی تکرار و کثرت سے کم از کم اپنے حلقۂ تعارف میں اس مقصد کو بھی حاصل کر لیا۔ بعض کوتہ اندیشوں نے اعتراض کر دیا کہ محاورے غلط استعمال کئے گئے ہیں جس کو "تمسخر" بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اس کا "نیاز مندانہ" لیکن نہایت منطقی جواب یہ تھا کہ محاورے ہر شخص بنا سکتا ہے اور ہم تو وہی لکھیں گے جو ہم بولتے ہیں۔

معنوی پہلو سے قطع نظر، لسانی اعتبار سے بھی ہم نے ہر اس لفظ کو ترک کرنے کی کوشش کی جو کسی مفہوم کو عام طور پر ادا کر سکتا ہے۔ اور اس کی جگہ لغت میں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اور بعض جگہ خود گھڑ گھڑ کر الفاظ استعمال کئے۔ مثلاً "تذکرۃً" کی جگہ "سرراہے" اور بات بڑھانے والے کی جگہ "حصہ گیر" وغیرہ، اور ترکیب الفاظ میں ایسی جدتیں اختیار کیں جو غلط ہوں یا صحیح، اس سے بحث نہیں، بس خوش نما ہوں۔ مثلاً "سرجوش سرمدی" وغیرہ۔ آپ سمجھے کہ یہ سب باتیں ہمارے لئے ناگزیر تھیں، ورنہ نہ تو ہماری نظم اتنی مقبول ہوتی اور نہ ہم اتنے نامور ہو سکتے تھے۔ شاید آپ نے کبھی غور کیا ہو کہ جس بات کو یاوہ گوئی سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ مختصر گوئی کی حد تک تو یاوہ گوئی ہے، بسیار گوئی ہو کر محترم بن جاتی ہے۔ لیکن یہ بجائے خود ایک فن ہے۔

اگر آپ کو بھی نامور و مشہور ہونے کا موقع ملا ہے تو آپ کو اس بات کا بھی تجربہ ہونا چاہئے کہ بعض وقت یہ عزت و شہرت وبال جان بن جاتی ہے۔ غیر فطری اور پُر تصنع طرز عمل اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اور سب سے زریں و پُر لطف موقعے کھو دینا پڑتے ہیں۔ ہمیں اس کا احساس ہوا تو ہم نے گوشہ گیری میں پناہ لی۔ لیکن ایک روز اخلاقاً مجبور ہو جانا پڑا۔ ہمارے نوکر نے اطلاع دی کہ دو صاحب تشریف لائے ہیں اور اپنے آپ کو ہمارا دوست کہتے ہیں۔ یہ دونوں حضرات ہماری طرح "گلدم" تھے۔ ایک دکن سے آیا تھا۔ دوسرا پنجاب سے۔ پنجابی حضرت نے اپنے تعارف میں سبقت کر کے اور معانقے سے ہمارا دم فنا کرتے ہوئے فرمایا۔

"جمالی صاحب آپ کی ملاقات کا شوق بیحد کھینچ لایا ہے، درھکیکت میں آپ ایک شیریں مقال بلبل ہیں۔ آپ کی مثنوی پڑھ کر میں چل پڑا کہ میں نے آپ کی زیارت ضرور کرنا تھی۔ آپ نے ایک کس میرس جینیس کے نفسیات کو کس کدر مکمل آرٹ کے ساتھ نظم کر دیا ہے۔ ہم لوگ تو پہلے ہی سے دنیا کے لئے عجمی ہیں۔ لیکن آپ کی نظم کو پڑھ کر تو یقین ہی ہو جاتا ہے کہ زمانہ ہماری کدر نہیں کرتا۔ یعنی ہم جو کچھ کہتے ہیں اسے کوئی نہیں سمجھتا ——— یا کوئی سنتا ہی نہیں۔ میں نے دنیا سے خود بھی کنارا کیا ہوا ہے۔ لیکن لوگوں میں کلچر کی کمی اور شائستگی کے فقدان پر آپ نے جس تنفر کا بہ حزن و ملال اظہار کیا ہے اس میں میں آپ سے بالکل متفق الخیال ہوں۔ راستے میں ایک کطعۂ تہنیت نظم ہو گیا ہے۔ میں نے امید ہے کہ آپ اسے شرف کبول بخشیں گے۔ اور۔

بچارے دکنی "گلدم" کو معرفی کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اس نے قطع کلام کر کے کہا۔

"تقصیر، میرا غریب خانہ بلدۂ حیدرآباد ہے۔ اور میرے سفر کا مخصد آپ کی ملاخات کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ تقصیر، میرے اہلیہ بھی شاعری کرتے ہیں، اور تقصیر عمدی شاعری کرتے ہیں۔ تقصیر، انھوں نے آپ کی نظم کے چند شعر ان کی تظمین کر کے آپ کی شان میں ایک خصیدہ

لکھا ہے، اس کو قبول فرمائیے۔"

"حضرات" ہم نے ان کی نظموں کو سن کر کہا، "ان تہنیت ناموں سے جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں، اور گفتگو سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، مجھے احساس ہے کہ آپ دونوں کو اور (دکنی گلدم کی طرف اشارہ کر کے) آپ کی بیگم صاحب کو بھی، فطرت کی طرف سے گہرا اور نازک احساس ہوا ہے اور روشن ذہانت عطا ہوئی ہے۔ اور میں آپ کی زحمت فرمائی وقدر افزائی کے لئے اپنے دل پر خلوص و ہمدردی کے گہرے نقش پاتا ہوں۔ لیکن مجھے اس پر بے شک حیرت ہے کہ آپ کو قدرت کے اس انعام واکرام پر مسرور ہونا چاہئے تھا نہ کہ افسردہ وملول! اور غمگین آپ دونوں نظر آتے ہیں ——"

"آہ، جمالی صاحب" پنجابی گلدم بولا۔ "یہ ایک سانحہ ہے، ذرا میری ساخت کو دیکھیئے! میرے بال و پر کیتے خوش نما ہیں، ان کا رنگ کس قدر نظر فریب ہے —— گویا کہ گردن کبوتر ہے! لیکن میری چونچ چھوٹی ہے اور دم کو دیکھیے تو جسم کے مقابلے میں دراز ہوئی ہوئی ہے۔ کیا یہ وضع قطع کسی کو نراس کرکے اول قول لکھنے یا اسے رنجیدہ رکھنے کی کافی وجہ نہیں؟"

"تقصیر، آپ نے صحیح سمجھا" دکنی گلدم کہنے لگا۔ "میں دواں ہوں تقصیر، میرے دوست کو دم دراز ہونے کی شکایت ہے کہ اس سے سڑک پر جھاڑو دی جا سکتی ہے، اور تقصیر، میرے اوپر گلیوں میں چھوکران لنڈورا کہہ کر انگلیاں اٹھاتے ہیں"

"حضرات" ہم نے پھر جواب دیا، "مجھے آپ کے حال وملال سے رنج ہے۔ کوئی چیز بھی ہو، اس کا بہت زیادہ یا بہت کم ہونا واقعی تکلیف دہ امر ہوتا ہے۔ مگر اس میں اپنی عقل اور دوسرے کی دولت کا استثناء بھی ہے اور اگر ہم تھوڑے سے تفلسف سے کام لیں تو جس طرح اپنی عقل اور دوسرے کی دولت ہمارے ادعا اور علم کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے، اسی طرح ہماری دولت اور دوسرے کی عقل کی کمی کو بھی ہمارے ادعا وعلم کا ذریعہ ثابت ہونا چاہیئے۔ اس ضمن میں میں آپ کے سامنے ایک اور نکتہ پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ ایک گلدم محض گلہ وشکایت کرکے 'فطین' کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا —— بالکل اسی طرح جیسے ایک مادہ گلدم کے لئے غزل یا افسانہ لکھنے میں "نظری حیا کو خیر باد کہہ دینا بھی کافی نہیں سمجھا گیا ہے!"

اب ہمارے ہم جنس ملاقاتی ایک ساتھ "پرواز" کرنے پر مصر ہوئے وہ بھی چیخے، ہم بھی چلائے۔ پھر "اکیڈیمی گلدمان ہند" کی تجویز منظور ہوئی حروف ہجائی بحث میں یہ طے پایا کہ "بڑا کاف" قطعاً بیکار حرف ہے، اسے ابجد میں سے نکال ہی دینا چاہیئے۔ املا پر گفتگو ہوئی تو یہ نتیجہ نکلا کہ اردو میں جن الفاظ کے معانی اصل سے مختلف ہو گئے ہیں املا سہل کرکے انھیں اردو الفاظ کی صورت دے دی جائے۔ رسم الخط کے معاملے میں قرار پایا کہ جب عربی، ناگری حروف ہجائی بحث میں سے صند نہیں نکالی جا سکتی تو ان دونوں کا ترک بھی انسب وادنے ہے۔ تھوڑا تھوڑا خیالی نقصان دونوں کو ہوگا، لیکن رومن حروف اختیار کرکے دونوں فریق خون خرابے سے بچ جائیں گے۔ اس لئے رومن حروف اختیار کر لینا ہی سب کے حق میں بہتر ہے۔ اس سے دنیا کے حروف ہجائی برادری میں شامل ہو جانا تو خیر کوئی بڑے فائدے کی بات نہ ہوگی، لیکن تمام ہندوستان کے اندر اتحاد لسانی کی بنا ضرور پڑ جائے گی۔ جو بہت بڑا مفاد ملی ہے۔ عروض کے باب میں اس نتیجے پر پہنچے کہ شعر کو نظری رکھنے کے لئے تمام سہولتیں پیدا کی جائیں اور ہم آوازہ الفاظ کا قافیہ بھی صحیح مان لیا جائے۔ محاورے اور روزمرہ کے استعمال کے متعلق رائے ٹھیری کہ پنجاب ودکن بھی مرکزیت کے بجا مدعی ہیں لیکن اندیشہ ہے کہ نخاس اور گھاس منڈی سے قضیے پیدا ہو کر سیالکوٹ اور جالندھر یا اورنگ آباد اور حیدرآباد وحق مرجع کے لئے دست وگریباں نہ ہو جائیں۔ اس لئے مرکزیت کی منڈی اٹھا دی جائے جو ایک نفسیاتی غلامی ہے۔ اور ہر گاؤں اور ہر گنوار کو اختیار ملنا چاہیئے کہ وہ اپنی انفرادیت قائم کرے —— یعنی جس کے منہ سے جو کچھ نکل جائے صحیح سمجھا جائے۔ صحت وسند ایک بیہودہ سی بات ہے۔ اس سے زبان کا دائرہ تنگ ہوتا ہے۔

جی، کیا فرمایا آپ نے؟ یہ ہم ہذیان میں مبتلا ہیں! کیا خوب! اچھا تو آپ ہمیں یہ سمجھا دیجئے کہ بالعموم آپ کی افسانہ نگاری کا ماحصل اگر ادبی ہذیان نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اگر سنجیدہ بن کر آپ کا اعتراض مان بھی لیں تو اتنی رعایت تو روا رکھئے کہ دو معزز ملاقاتیوں کی موجودگی میں ہم کج خلق کیسے

کیسے بن جاتے، خیریت گذری، ورنہ آپ دخل نہ دے بیٹھتے تو گھر کا وبال ان حضرات کے حوالے کرکے فسانہ سنانے کے لئے ہمیں آپ کے ساتھ ہولینا پڑتا۔ لیکن یہ بھی فراموش نہ فرمایئے کہ ہم نے اپنی "ہذیانی" حالت کا اعتراف محض اپنی خوش خلقی کی بنا پر اور آپ کی دلشکنی کے خیال سے کرلیا ہے۔ ورنہ یہ سب کچھ فسانے کے ماحول کی تعمیر تھی ——— بہرحال لیجئے ہم سنجیدہ ہوئے جاتے ہیں اور فضا بدلے دیتے ہیں۔

شاید آپ جانتے ہوں کہ گناہگاری اور ظفرمندی کی حالت میں انسان کو فطری طور پر ایک ہمدم و دمساز کی آرزو ہوتی ہے۔ اور معلوم نہیں کیوں مگر شدید ہوتی ہے۔ ہم کامیاب تھے اور مشہور و معزز! لیکن اس سے ہم مطمئن تو ضرور تھے۔ مگر خوش نہ تھے۔ اس ناموری نے ہمارے احساس تنہائی کو اتنا شدید کردیا تھا کہ ہم اپنے "جریدۂ مستقبل" کے خیال سے لرز جاتے تھے، یہاں تک کہ ہم قبل کامرانی کے اداس رنگ طبیعت کی طرف مائل ہونے لگے۔ لیکن دفعتاً ایک بالکل غیر متوقع صورت پیدا ہوکر ہمارے مستقبل کا نقشہ بدل گئی۔ ایک واقعی افسانہ بن گیا۔ اور گو ہماری تمہید بجائے خود ایک افسانہ ہے۔ لیکن اصل افسانہ سنیئے۔

بار بار یہ کہنا کیا ضرور ہے کہ ہماری ادبیت اور فطنت شاعرانہ کا شہرہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں ہوگیا تھا؛ ہماری مثنوی کی بڑی مانگ تھی۔ خاص کر دکن میں۔ دکن والے ہر اس چیز کے طلبگار ہیں جو ان کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر فیشن بن جائے۔ ایک روز ہماری ڈاک کے پلندے میں ایک معطر لفافہ جس کے ہلکے رنگ میں دوشیزگی کا نکھار تھا سب سے پہلے ہماری نظر میں آیا۔ یہ ایک دکنی دوشیزہ "گلدم" کا محبت نامہ تھا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے۔

"میں نے آپ کا کلام پڑھا اور "خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست" کہنے پر مجبور ہوں۔ اپنی طبع و مزاج کو آپ کی شاعری میں منعکس دیکھتی ہوں۔ اور اسے آپ کی فطرت کا مرقع باور کرتی ہوں۔ اس لئے اس جسارت پر مجبور ہوں کہ آپ کی فطنت کی داد دینے آپ کو آپ کی کنیزی میں پیش کرکے دوں۔ وگر قبول افتد زہے عز و شرف!"

"میری روح آپ کی طرف کھنچتی ہے، اور مجھے حق الیقین ہے کہ عالم مثال میں ہماری روحیں رفیق رہ چکی ہیں، اس دنیا میں ہم دونوں ناتمام کو کامل کرنے آئے ہیں!"

اب آپ خود ہمارے استعجاب و اہتزاز کا اندازہ فرمالیجئے۔ ہم نے خط کو بار بار پڑھنے کے بعد اپنے آپ سے کہا۔

"ایک دوشیزہ گلدم اور وہ بھی عیش و تنعم کے باغ کی، کیا یہ ممکن بھی ہے؟ آخر اس وسیع کائنات میں میں تنہا نہیں ——— اکیلا نہیں!

اس لاعلم حسینہ گلدم کے مکتوب جمیل کا جواب لکھنے میں ہمیں ایک لمحے کی تاخیر گوارا نہ ہوئی۔ ہم نے اسے اس انداز سے لکھا کہ بغیر کہے اس پر ظاہر ہوجائے کہ ہماری روح اپنی تکمیل کے لئے کس قدر آوارہ و جویا تھی؟ اور اس کا یہ سماوی پیشکش ہمارے لئے کس قدر قابل قبول ہے۔ ہم نے اس کو درخواست کی کہ یا تو ہمیں دکن تک اجازت پروانہ ملے۔ یا وہ اڑکر دہلی آجائے جواب ملا کہ وہ خود دہلی آنے کو ترجیح دے گی۔ کیونکہ "غیر ملکی" کے حملے پر گھر والے قیامت برپا کردیں گے۔ چنانچہ اس اطلاع کے چند ہی روز بعد وہ دہلی پہنچ گئی۔ کیا بتائیں، ہمیں کیسی خوشی تھی۔ وہ جمیل ترین دوشیزہ "گلدمان" تھی اور ہماری ہی طرح خوش نوا بھی۔

"بیگم!" ہم نے اس سے کہا: "نقشے کی خانہ پری تو ہوتی رہے گی مگر میں اس لمحے سے آپ کو اپنی منکوحہ بیوی باور کرتا ہوں۔ یہ کیسے ہوسکا کہ آپ سی حوروش و پری منظر مطرب، ایسی خوش گلو اور اتنی شیریں نوا گلدم اس عالم کثیف کو اپنی سانسوں سے رشک جناں بنارہی ہو اور میں بے خبر رہوں میری وہ بلائیں اور مصیبتیں مبارک تھیں جنھوں نے مجھ سے "تفسیر حیات" لکھوائی ——— کہ اس کے عوض میں قدرت نے میرے لئے اتنا بڑا انعام مقرر اور ایسا نادر تحفہ محفوظ کر رکھا تھا۔ میں جس کی آرزو کرنے کا مستحق بھی نہیں۔ لیکن اپنی نااہلی کے احساس کے باوجود میں اپنے اندر ایک جان چھڑکنے والے شوہر اور ایک شفیق باپ بن سکنے کی قابلیتوں کے موجود ہونے کا اندازہ کررہا ہوں۔ اس لئے خانم، اب دیر کرنا کفران نعمت کا مصداق ہوگا۔ مجھے قبول فرمایئے

ہم گلدموں کی برادری میں ہیں۔ اور سادہ و فطری طرز مناکحت ہی زیب دیتا ہے۔ کہ اس میں رومان ہی رومان ہے۔ پھر اس کے بعد ہم ولایتی طریق پر عہد کتخدائی بسر کرنے کی حیثیت سے کشمیر کو اڑ چلیں گے؟

مگر مناکحت کے باب میں میرا نظریہ ذرا مختلف ہے؟ دوشیزہ گلدم چہچہائی؟ میں فطری ازدواج کے مقابلے میں رسم و رواج کی تقریب شادی کو ترجیح دیتی ہوں۔ اور چاہتی ہوں کہ تقریب نہایت شاندار طریق پر ادا کی جائے۔ تمام نر و مادہ گلدم مدعو کی جائیں۔ اور گلدمی برادری کے تمام قابل ذکر افراد شریک ہوں۔ ہماری سی قابلیت و معیار کی گلدموں کا اتحاد قلب و جاں ان کے مرتبے کے مطابق شان اور اہتمام کے ساتھ ہونا چاہیئے ——— ہم بلبلیں ہیں۔ بلبلاں نہیں۔

"آپ کچھ فکر نہ کریں۔ میرے پاس یہ نوٹوں کی گڈی ہے! بس دعوت نامے جاری کر کے فرمائشیں کر دیجئے۔ مہمان گلدموں کی تواضع اور مدارات میں کمی نہ ہونا چاہیئے ——— کسی اچھے ہوٹل سے انتظام کیجیے گا"

میں نے اپنی مادہ گلدم کی مرضی کے مطابق اہتمام کیا۔ اور ہماری شادی کا جشن دریا دلی اور مہمان نوازی کا ایک بے مثل ہنگامہ تھا! دور دور سے نامی گرامی گلدم شریک ہوئے۔ اور شریک ہوئی تھیں۔ خورد و نوش اور رقص و سرود کے جلسے کہیئے کہ جو ہیرڈ کے دربار اور اندر کے اکھاڑے کو شرماتے تھے۔ اور سچ پوچھیئے تو زندگی اس کے سوا اور کیا ہے۔

ہماری مادہ گلدم کا نام یعنی تخلص مخفی تھا۔ شادی کے بعد ہم جوں جوں اس کے عشووں اور اداؤں سے روشناس ہوتے جا رہے تھے ہماری محبت و وارفتگی اتنی ہی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی مختصر ہستی میں جسمانی صحت اور دماغی تربیت، دلربایانہ انداز اور معشوقانہ ادا اس طرح ترکیب پا گئیں اور اس طرح سمو گئی تھیں کہ بس دل میں رکھ لینے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن ایک وقت بھی آ پڑی تھی، اسے اپنے بناؤ سنگھار میں انہماک تھا۔ اور مبالغے کی حد تک تھا۔ لیکن صرف یہ بات کچھ زیادہ ناقابل برداشت نہ ہوتی۔ مگر وہ اس کی نمائش بھی چاہتی اور اس کی داد حاصل کرنے کی سخت حریص تھی ——— اور آپ جانتے ہیں کہ بناؤ سنگھار کا بجا قدردان ایک شوہر نہیں ہوتا۔ یا نہیں ہو سکتا: کم از کم مخفی کا عقیدہ یہی تھا۔

ہم نے اس کی توجیہ اس طرح کی کہ دکن کی آب و ہوا اور وہاں کی پر تصنع ماحول کا اثر ہے۔ اور دہلی کی ذہانت مآب فضا کی تیز ہوائیں اس غبار کو چھانٹ دیں گی۔ مگر ہوا یہ کہ سال بھر نہ گذرنے پایا تھا کہ طلسم رومانیت غبار چھٹتا نظر آیا۔ محبت کا سحر باطل ہوتا دکھائی دیا۔ اور اس کا دو دو تین تین گھنٹے بند رہ کر سنگھار کرنا بدستور قائم رہا۔

اگر آپ بدقسمتی سے شوہر بن چکے ہیں تو آپ کو یہ تجربہ بھی ہوا ہوگا کہ اس قسم کی باتیں شوہروں کو بالعموم کھٹکتی ہیں، بارہا ایسا ہوا کہ کسی خاص اور فوری ضرورت پر میں نے دستک دی، مگر دروازہ نہ کھلا۔ پس پردہ ہی سے جواب لینے پر اکتفا کرنا پڑا، ایک دفعہ اتفاق سے دروازے کی چٹخنی لگانا فراموش ہو گیا تھا، جو ہمارے ہات لگانے سے وہ کھل گیا، ہم دندناتے اندر داخل ہو گئے۔ وہ ہماری اس ناروا اور غیر مہذب حرکت پر سخت برہم ہوئی۔ ہم نے اس کی میز پر ایک بڑی بوتل میں کچھ کھریا سی گھلی ہوئی رکھی دیکھی۔ تو سوال کیا۔

"یہ مرہم سا کیا ہے؟"

"سبحان اللہ! کیا پیاری تخئیل اور کتنا رسا ذہن ہے، میلز ابٹن ہے اور ہے کیا!"

ہمیں اپنی شیریں ادا اور رنگین نوا ہم صفیر کے سامنے واقعی نادم ہونا پڑا۔ جس نے کمال سادگی و آمادگی اور انتہائی شوق و مسرت کے ساتھ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیا تھا۔ جو ادب میں ایسی رچی ہوئی یا ادبیت جس میں اتنی رچ گئی تھی، ہم نے اس سے بعد لجاجت و عاجزی معذرت کی۔

مخفی نے اپنے ایک نئے ناول کا مسودہ ہمیں دکھایا۔ اس کا سب سے بڑا ادبی کمال تو یہ تھا کہ فرنگیوں سے اردو بلواتی تھی۔ انگریزوں کو اچکن پاجامہ پہنوا دیتی اور انگریزنوں کو ساری دوپٹا اڑھوا دیتی تھی۔ اب آپ ہی کہیئے کہ ایسی فہمیدہ ادیب اور سنجیدہ حلبیں کو بیوی بنا کر کیا آپ خوش نہ ہوں گے؟ وہ صرف جلوہ و جمال اور طرح وادا کی ملکہ ہی نہ تھی

بلکہ ہمارا خیال تھا کہ وہ ذہنیت۔ ذہانت کے اعتبار سے ہماری فطنت سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر ہم دونوں اپنی اپنی میزوں پر بیٹھ جاتے۔ میں کسی نظم کی فکر کرتا ہوتا۔ اور وہ افسانہ لکھنے میں ناؤ برتاؤ سیاہ کرتی چلی جاتی۔ میں کوئی اچھا شعر کہہ لیتا تو اسے سناتا۔ مگر اس کی قلم برابر چلتی رہتی۔

وہ فسانے ایسی آسانی سے مرتب کر لیتی تھی کہ مثال نہیں دی جا سکتی اس کے موضوع اکثر ڈرامائی ہوتے، اور موضوع بے موقع یہ کہنے سے نہ چوکتی کہ گورنمنٹ اور کونسلوں کے ممبروں نے اب تک سب ہندوستانیوں کو پتلون اور سایہ کیوں نہیں پہنوایا، مختصر یہ کہ اس کی تیزی ذہن کے لئے اردو زبان کی بے مائیگی اور سرمائے کی کمی ایک فضول سی شکایت تھی۔ اس کی قابلیت کسی موقعے پر اظہار و بیان میں قاصر نہ تھی —— آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ لکھنا اور پڑھنا دو جداگانہ مشغلے ہیں۔ اب اگر پڑھنے والا مفہوم نہ سمجھے تو لکھنے والا قصور وار کیوں ٹھیرایا جائے؟

پڑھنے والے کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے تصور کو اسی بلندی پر لے جائے جہاں سے کہ لکھنے والے نے لکھا ہے۔ ہم نے مخفی کے مسودوں کو کبھی اور کہیں کٹا کٹا نہیں دیکھا، کوئی شک نہیں کہ وہ ایک کامل ادیب تھی۔

ایک روز ہم کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھنے کے عوض دیوانخانے ہی میں بیٹھکر لکھنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ گرمی کا موسم تھا، کسی خرابی کے سبب سے پنکھا بند ہو گیا تھا، ہم وقت سے پہلے پلٹ آئے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ مخفی کے چہرے پر چھائیاں سی پڑی ہوئی ہیں اور رخساروں پر آنسوؤں کے نشان ہیں۔ ہم نے اندیشہ مند ہو کر دریافت کیا؟

"خدا خیر کرے! یہ تمھارے چہرے پر دھبے دھاریاں کیسی ہیں؟"

مخفی کچھ سراسیمہ سی ہو گئی۔ اور ایک مجرمانہ جھلک اس کے چہرے پر چھا گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں سنبھلکر کہنے لگی:۔

"پاؤڈر جم گیا ہوگا!"

ہم اس الجھن میں مبتلا ہو گئے کہ مخفی کا شباب زائل ہو رہا ہے۔ اور اس کے بعد سے وہ چونے کی بوتل ہر وقت ہمارے سامنے رہنے لگی۔ ہم نے اپنے دل کو سمجھایا:۔

"لاحول ولا قوۃ! میں بھی کن وسوسوں میں مبتلا ہوں۔ کریم پوڈر سب خواتین استعمال کرتی ہیں —— نو عمر جواں سال بھی، یہ زوال شباب کی دلیل نہیں ہو سکتی، میں بھی کتنا بڑا احمق ہوں کہ ذرا سے شبہے پر مخفی کو ایک نقش محض، ایک لپی پتی تصویر خیال کرنے لگا۔ کتنا بیہودہ خیال ہے۔ کہ میری روح کا جزو تکمیلی جب میری گود کو جنت کے گلدستے سے آراستہ کر رہا ہو تو وہ اتنا کچھ چونا اور اتنی کچھ کھریا ہو؟"

بایں ہمہ اگرچہ ہمارے شکوک اگرچہ کچھ دھندلے پڑ گئے لیکن اپنی جگہ قائم رہے۔ اب ہمیں یہ تجسس رہنے لگا کہ ہم مخفی کے اصلی رنگ و روپ کو دیکھیں، جس کا موقع ہمیں دیا ہی نہ جاتا تھا۔ چنانچہ ہر صبح کو سب سے پہلے ہم اخبار کے موسمی کالم کا مطالعہ کرنے لگے۔ کہ جس روز بارش کا امکان زیادہ ہو اسے سیر و تفریح کے لئے جنگل کی طرف لیجائیں۔ اور جب وہ مینہ کے پانی سے خوب دھل جائے تو اپنی جستجو کی تسکین کریں۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ان دنوں بادل کی آنکھ نم بھی نہ ہوئی۔

اسی دوران میں ہم بیمار پڑ گئے۔ اور سخت بیمار رہے۔ ہماری بیمار طبیعت کا تقاضا یہ تھا کہ مخفی ہمارے پاس چوبیسوں گھنٹے بیٹھی رہے۔ بلکہ نرس کی بھی کیا ضرورت ہے۔ تیمارداری وہ خود ہی کیا کرے۔ لیکن مخفی کو فسانے لکھنا ہوتے۔ دوستوں سے ملاقاتیں کرنا ہوتیں۔ تقریبوں میں شرکت کرنا پڑتی۔ اور نہ معلوم کتنی مصروفیتیں تھیں۔ اس لئے وہ ہمارے پاس اتنی دیر کے لئے آتی جتنی دیر کے لیے کہ آ سکتی تھی۔ ایک روز ہماری طبیعت بگڑ رہی تھی۔ مگر وہ اپنی ایک سہیلی سے قرار داد کر چکی تھی۔ اس لئے جانا ضروری تھا۔ اس کے جانے کے بعد ہماری حالت اور خراب ہو گئی۔ ہم نے نرس سے کہا کہ ٹیلیفون کر کے مخفی کو فوراً بلا لے، فون پر سے نرس پلٹ کر آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ ہمارے اصرار پر اس نے بتایا کہ وہ تو وہاں پہنچی نہیں ہیں۔ اور گھر والے تو پانچ روز سے لاہور گئے ہوئے ہیں۔ ہم خون کا سا گھونٹ

پی کر رہ گئے۔

خیر ہم سخت جان اچھے بھی ہو گئے۔ اور پھر مخفی کی دلربائیوں کے جادو نے ان وسوسوں کو ہمارے دل سے نکالنے کی کوشش بھی کی، لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کا شک کیا بلا ہوتا ہے۔ لیکن ہم نے معمولی تربیت اور پست ذہنیت کے انسان کی طرح اپنے شکوک کو یقین سے بدلنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ اور ہماری شاعرانہ طبیعت نے عہد لطف و مسرت کی یاد کو تباہ کرنا نہیں چاہا۔ یا یوں سمجھیے کہ بصورت دیگر ہم خود اپنی انسانیت اور اپنی اوقات کو ذلیل کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ بہرکیف ہم اس دو عملے میں ایک عرصے تک مبتلا رہے۔

اس سے تو شاید آپ بھی انکار نہ کر سکیں گے کہ کامگاری و فتحمندی اور اس پر یہ رومانی و الفتی شادی، ایسی خوشیاں تھیں کہ دنیا میں اس سے بڑی خوشیاں نہیں ہو سکتیں۔ اور آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ مسرت و اطمینان کی حالت میں انسان کچھ نازک دماغ بھی ہو جاتا ہے۔ اور اگر مستقل سوچتے رہنے کی عادت اس پر اضافہ ہو تو ذکاوت حس انتہائی نقطے پر پہنچ جاتی ہے، اب ان تمام خصوصیات کے ساتھ اس قسم کا شک و شبہ دل میں جو پکڑ لے تو کیا اس آدمی کا مغموم اور چڑچڑا ہو جانا ایک فطری سی بات نہیں؟ چنانچہ ہمارے حسیات اور مزاج کی یہی حالت اور کیفیت ہو گئی تھی۔

ہم آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم ایک فطری یعنی سادہ انسان ہیں تصنع اور بناوٹ سے ہمیں قلبی بغض ہے۔ چنانچہ اب اکثر یہ ہونے لگا کہ فکر شعر کرتے کرتے حسیات عقل پر غلبہ پا لیتے۔ اور ہم اپنے آپ کو عیش گریہ اور لذت آہ میں ڈبو دیتے۔ مگر ہماری یہ گاہ گاہ کی حالت مخفی کے لئے وجہ لذت و انبساط ہوتی ـــــ شاید مردوں کے اندر نسائیت کا مظاہرہ نسوانی پندار کے لئے ہمیشہ وجہ تفریح ہوتا ہے۔ یا ممکن ہے کہ ہمارے بدلے ہوئے احساسات کا نتیجہ ہو غرض ہم جان رہے تھے کہ ہماری الفت اب نفرت سے بدل رہی ہے لیکن ہمیں خود حیرت ہے کہ ایک رات اپنی ایک نظم پر نظر ثانی کرتے کرتے ہمارے دل پر جب غمگینی طاری ہوئی، تو ایک نئی اور اس قسم کی نظم ہم سے کس طرح لکھی جا سکی! اس نظم میں ہمارا خطاب مخفی سے تھا۔

"اے وہ جس کی محبت میں میں نے کیف کے معنیٰ اور سرور کے مفہوم کو سمجھا، اے وہ جس کی نگاہوں میں۔ .... ؟ .. میرو ؟. جس کے تبسم میں، میں نے کائنات کا نظارہ کیا، اے وہ جو میرے دل کی سرخی خون اور میری روح کی پاکیزگی ہے۔ تو جانتی ہے کہ مجھے تجھ سے محبت ہے۔

"لیکن اس الفت و وارفتگی کے باوجود میں اپنی محبت کو تیرے سامنے پوری طرح بیان نہیں کر سکتا، کہ میرے پاس وہی پامال اسلوب بیان ہے جسے صدیوں سے ہر شاعر استعمال کرتا چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ میں چاہتا ہوں کہ جب تجھے مخاطب کروں تو میرے خیالات الہامی ہوں۔ اسالیب نادر ہوں۔ اور الفاظ بدیع ہوں۔ مگر ایسی کوئی زبان ایجاد نہیں ہوئی جو حسب خواہش دل نرم اور شگفتہ ہو۔ اور میں اسے اختیار کر سکوں ـــــ میرے ابتلا و مصیبت کے وقت یاد بھی مجھے ایسی زبان نہیں سکھا سکتی۔

"اس لئے میری محبوبہ میں اپنے قلب کی زبان میں جس کی صدا سکوت ہے تجھے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں تیری محبوبی و زیبائی کا شیدائی ہوں۔ لیکن مجھے تیری محبت سے نفرت ہے۔

"میرے گلبن تصور کی نغمہ سرا بلبل، میرے اس نحیف جسم، اس دھڑکتے ہوئے دل و دماغ میں جس کے اندر محروم تر تخیلات ہمہ وقت جوش کھاتے رہتے ہیں، ایک سالمہ۔ ایک خلیہ ایسا نہیں جو تیری سند تمکین نہ ہو لیکن تو محسوس کرتی کہ تجھے مجھ سے کتنی محبت ہے، اور مجھے تجھ سے کتنی نفرت ہے۔

"آہ! تجھے اگر میرے لئے کلیوپیٹرا ہونا تھا، تو میں تیرے

ساغر کا وہ سوال کیوں نہ ہوا جسے تو شراب میں حل کر کے
پی جاتی۔

"میں تجھ سے محبت کرتا تھا، میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں،
مگر نہیں جانتا کہ وہ محبت نفرت تھی، یا یہ محبت نفرت ہے"

یہ نظم ہم نے مخفی کو نہیں سنائی۔ اور پھر شک کے بھوت نے بلا دلیل ہمیں یہ سمجھا دیا کہ تحقیقات کا نتیجہ شک کو یقین سے بدل دے گا۔ اس لئے تصدیق ایک فعل عبث ہے۔

اب ہمارے لئے کیا رہ گیا تھا؟ اس کی بے وفائی، بے مہری ثابت کر کے زجر و توبیخ کرتے؟ لعنت ملامت کرتے، سب لاحاصل تھا۔۔۔۔۔ کہیں ان باتوں سے محبت ملا کرتی ہے۔

طلاق کے ادارے میں پناہ لے کر اپنا اور اس کا فریتا کرتے؟ مگر اس سے بھی تو محبت واپس نہ آسکتی تھی۔ ہم نے سوچا اور طے کر لیا کہ دنیا کو یعنی بیوی کو ترک کر کے یوگیوں کی طرح بن باسی بن جائیں، اور وہاں منہ چھپائیں جہاں "ہمزباں کوئی نہ ہو اور رازداں کوئی نہ ہو!"

ہم نے یہی کیا، اور ایک جنگل میں بسرام لیا۔ جہاں ہوائیں پرندوں کے لئے وہی مفہوم رکھتی ہیں جو انسان کے لئے اتفاقات کے معنی ہوتے ہیں! ہم نے اپنے آپ سے کہا:۔

"تاہل سچ مچ ایک بلا ہے، مصیبتوں کی پوری دنیا۔ مگر پھر سوچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں غریب مخفی کا کیا قصور تھا، ماحول کی ساختہ تربیت کی پرداختہ، اور تمدن کی انداختہ، لیکن ہماری بھی کیا خطا ہے، ہم بھی تو نفسیات کا ایک کھلونا ہیں! ہاں، دنیا میں کوئی غلطی پر نہیں۔۔۔۔ سب قابل رحم ہیں!"

شاخ بلند پر ایک گلدم زمزمہ پرداز ہوا، وہ تنہا تھا۔ اور رات کا سناٹا۔۔۔۔۔ اور وہ اپنے نغمے میں مست تھا، گلدم ہو یا بلبل اس کی یہی خصوصیت اسے شاعر سے برتر بناتی ہے۔ کہ وہ بے دغدغہ، خموش ماحول کو اپنا راز قلب سنائے جاتا ہے۔ ہم نے اس کے قریب پہنچ کر کہا:۔

"تو کتنا خوش قسمت پرند ہے! تو جی کھول کر گاتا ہے۔ جس سے ہر سننے والا وجد میں آجاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تو خوش و خرم ہے، تیری بیوی نیک ہوگی، بھولے بھولے بچے ہوں گے، ایک آرام دہ آشیانہ ہوگا۔ اور دوست احباب بھی مخلص ہوں گے۔۔۔۔۔۔۔ اور گھاس کا تکیہ اور چاندنی کا لطف!

اور پھر یہ کہ تیرے حق و کمال کی تنقید نہیں کی جاتی، میں بھی ایک مغنی تھا لیکن میرا واقعہ دل دوز ہے۔ تو جس وقت اس دشت و برگزار کی فضاؤں کو اپنے زمزموں سے معمور کر رہا ہوگا اس وقت میں لفظوں کے ساتھ جنگ میں مصروف ہوں گا۔ کیا تو مجھے اپنی خوشی کا راز بتائے گا؟"

"ہاں میں اپنی خوشی کا تو نہیں، البتہ اپنا راز بتا سکتا ہوں" گلدم نے جواب میں کہا۔ "لیکن وہ تجھے کچھ خوش نہ کر سکے گا" میری بیوی ہے، مگر خدا پناہ میں رکھے قسم کی ہے۔ اور جب وہ ایسی ہے تو باقی تمام چیزیں ہوئیں تو کیا اور نہ ہوئیں تو کیا۔ اسے مجھ سے محبت نہیں، اور میں بھی ایک کے عشق میں دیوانہ ہوں۔ سعدی نے میری نہایت سچی تصویر بنائی ہے، چاندنی راتوں میں میں رات رات بھر اپنے محبوب کے قدموں میں عرض نغمہ کرتا رہتا ہوں لیکن وہ التفات کرتا معلوم ہی نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ وہ اپنی پنکھڑیاں بند رکھتا اور ان کے اندر ایک مہال کو چھپائے رہتا ہے۔ یا جب میں علی الصبح خستہ و نامراد اپنے نشیمن میں جا پڑتا ہوں تو وہ پنکھڑیاں کھول دیتا اور مہال ان کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے قلب کو چاٹ جاتی ہے، اور میری بیوی میرے مغز کو، میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ محبت کے ساتھ شادی کرنا اسے ذبح کر دینا ہے۔ نیکی کر اور کنوئیں میں ڈال کے اصول پر

محبت کر اور کنوئیں میں ڈال

سلک ہونا چاہیئے۔

ماضی کی عینک سے

(تماشائی)

کچھ مدت کا ذکر ہے۔ لندن کے ایک ہوٹل میں چند ہندوستانی دوست چائے پی رہے تھے، آزادی کی ہوا، طالبعلمی کی بے باکی، جوانی کا خون، چائے کی گرمی، جوش و خروش کے جملہ عناصر جمع ہو گئے، حب وطن کی آگ سینے میں بھڑکنے لگی، اور چنگاریاں بن بن کر چشم و زبان سے ٹپکنے لگی، انسانی حقوق اور وطنی آزادی کے نعرے، غیر حکومت کے مفاسد و مظالم پر سب و شتم کا شور بلند ہوا۔ اتنے میں میزبان جو خاطر تواضع میں مصروف اور ابھی تک اس گفتگو میں زیادہ حصہ نہ لے سکے تھے اپنی کرسی پر سنبھل کر بیٹھے اور کہنے لگے "یہ تو سب سچ ہے اور وطن کو آزادی دلانا ہر ہندی کا مقدس فرض ہے لیکن یہ تو کہئیے کہ ہندوستان اس غلامی اور گرفتاری میں مبتلا کیوں ہوا۔

جواب میں ٹوٹے پھوٹے جملے سنائی دیئے۔

"آپس کے نفاق نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اس زمانے میں کوئی قومی احساس نہ تھا"

"لوگوں میں خود غرضی پھیلی ہوئی تھی"

"آزادی اور جمہوریت کی قدر ہی کسے تھی" وغیرہ

باتیں دیر تک ہوتی رہیں، لیکن معلوم ہوتا تھا کہ بحث ناتمام یا وہیں تمام ہو کے رہ گئی ۔ ۔ ۔ ۔

حقیقت میں اگر کسی مریض کی تندرستی مطلوب ہے، تو پہلے اس مرض کی صحیح تشخیص اور پھر علاج کی تدبیر ہونی چاہیئے۔ صحت مندی کی محض آرزو کافی نہ ہوگی۔

ہندوستان غلامی کے مرض کہنہ میں مبتلا ہے، دشمن یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ اس کی خلقی (پیدائشی) بیماری ہے، تاریخ کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ کہ اہل ہند کو صحیح معنی میں آزاد قومی حکومت قائم کرنے کی کبھی توفیق ہی نہیں ہوئی، ہمیشہ باہر کے حملہ آور آتے اور اہل ہند کو محکوم بناتے رہے۔ جب تک ان کے بدن میں غیر ملکی خون اور ولایت کی تازگی باقی رہی ہندوستان والے ان کی سیوا کرتے رہے۔ ہندی غلاموں کی محنت سے انہوں نے شان و شوکت کے دربار، عیش و عشرت کے سامان فراہم کئے، مگر چند پشت کی سکونت نے جب انھیں بھی ہندی بنا دیا، تو بھی ہندی غلام ان سے دست و گریباں ہو گئے۔ ان کی کمزوریوں سے فایدہ اٹھایا، ان کی سلطنت اور اپنے امن کو برباد کیا۔ خانہ جنگی اور فساد کا دروازہ کھول دیا اور اس وقت تک کہ پھر کوئی تازہ ولایت، قوم یا خاندان مسلط نہ ہو گیا غلامی کے یہ پرانے مریض وطن کو تباہ و تاراج کرنے میں مصروف رہے۔

ماضی کی اس عینک سے ہندوستان کی حالیہ بے چینی کو دیکھئے تو ان نتائج کی طرف دماغ منتقل ہوئے بغیر نہ رہے گا۔

(۱) اہل ہند کی آجکل کی ہما ہمی اور ان کے سیاسی ہنگامے حکومت حاضرہ کی ہولناک کمزوری کی دلیل ہیں۔

(۲) اہل ہند اپنے فرنگی حکمرانوں کی کمزوریاں پا گئے، اور حسب معمول

ب انھیں کے پڑھائے ہوئے سبق اور انھیں کے لائے ہوئے ہتھیاروں سے اس قصر حکومت کو منہدم کرنے میں ساعی ہیں۔

(۳) حکومت وقت کی پریشانی کے ساتھ ساتھ اہل ہند کے باہمی نفاق و خود غرضی میں شدت آتی جاتی ہے۔

(۴) اس بات کے قوی آثار پیدا ہوگئے ہیں کہ موجودہ حکومت کا شیرازہ بکھرتے ہی ملک میں اسی قسم کی خانہ جنگی اور فتنہ و فساد برپا ہوجائے گا جیسا کہ مثلاً خاندان تغلق یا مغل بادشاہی کے انتزاع کے وقت ظہور میں آیا تھا۔ اگرچہ اس مرتبہ ممکن ہے کہ توپ و تفنگ کے علاوہ بعض گروہ ستیاگرہ اور عام ہڑتال اور تعطل کاروبار کے ہتھیاروں سے کام لیں اور کشت و خون کے بغیر بھی وطن کی سیاسی اور معاشی تباہی کا طاقتور سبب بن جائیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جب تک ملک میں نفاق کا یہ قدیم اور تاریخی مرض موجود ہے اس وقت تک یہاں کوئی متحدہ قومیت نشوونما اور کوئی قومی حکومت اطمینان و استقلال کے ساتھ قائم نہیں ہوسکتی اور خود اس نفاق کے مشہور تاریخی اسباب یہاں بیان کئے گئے ہیں۔

اختلاف نسل، اختلاف عقائد۔ اختلاف زبان۔

(۱) چونکہ ملک میں بار بار باہر کی قومیں یورش کرتی اور اہل ہند کو محکوم بناتی رہیں اس لئے ان میں اور قدیم باشندوں میں نسلی اختلاف نمایاں رہا۔

لیکن تقریباً ڈیڑھ صدی سے باہر والوں کی آمد کا یہ سلسلہ موقوف ہوا اور اب یہاں کے لوگ خواہ وہ آریہ ہوں یا سامی، دراوڑی ہوں یا تاتاری، چند پشت سے ہندوستانی ہوگئے ہیں۔ مختلف نسلوں میں باہمی آمیزش کا عمل بھی آہستہ آہستہ جاری ہے، لہذا زمانہ سابقہ کی نسبت اختلاف نسل کی شدت یقیناً کم ہوگئی ہے۔

(۲) اختلاف عقائد میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شیخ و برہمن کا فرق بدستور موجود ہے۔ گذشتہ صدی میں چند اور مذہبی فرقے پیدا ہوگئے، تعلیم یافتہ طبقے میں لامذہبی یا مذہب سے بے پروائی کے باوصف، مختلف مذاہب میں مصالحت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس اختلاف مذہب کے

آپس کے میل جول، شادی بیاہ، ساتھ رہنے سہنے اور مل کر کام کرنے میں جو رکاوٹیں واقع ہوتی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ بیان کرنے کی حاجت نہیں۔

(۳) قومی اتحاد کی ایک ضروری شرط زبان کی یکسانی ہے، ہندوستان میں تاریخی زمانے کے آغاز سے مختلف زبانیں بولی جاتی رہیں، مسلمانوں کی کئی صدی تک حکومت اور اہل ہند کے ساتھ میل جول سے ایک مخلوط زبان اردو پیدا ہوئی۔ اور ہندوستان کے بڑے حصے میں بولی یا سمجھی جانے لگی انگریزوں کی سرپرستی سے یہ کتابی زبان بنی۔ اور اس بات کے قرائن نظر آنے لگے کہ یہ ہندوستان کی مشترکہ سرکاری زبان ہوجائے گی، لیکن گذشتہ نصف صدی سے ہر صوبے کی مقامی بولی کو بھی اپنے اپنے علاقے میں یہی مرتبہ حاصل ہوگیا، اور اردو کے مقابلے میں ہندی کو مشترکہ اور علمی زبان بنانے کی کوشش کا آغاز ہوا۔

اس کوشش کے پوری طرح بارآور ہونے میں ایک زمانہ درکار ہوگا لیکن سردست اردو کی عمومیت کو ضرور صدمہ پہنچ گیا۔ اور چونکہ مسلمان اس زبان اور اس کے رسم الخط کو بھی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں اس لئے واحد ملکی زبان کا حل صریحاً بعید و دشوار تر ہوگیا ہے۔ انگریزی زبان کی ترویج و ترقی اس مسئلے میں مزید پیچیدگی کا باعث ہے۔ جس کے حل کرنے میں ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ قطعاً بے بس نظر آتا ہے۔ نوساختہ ہندی زبان کی نسبت ایک تاریخ داں یہ قیاس کرسکتا ہے کہ اگر اس کے علمی اور ادبی بنانے میں کافی محنت کی گئی اور رؤسا نے قدردانی کی تو ممکن ہے کہ عہد گپتا کی سنسکرت کی طرح اسے بھی خوب فروغ حاصل ہو لیکن اس فروغ و ترقی کے باوجود بھی اندیشہ ہے کہ یہ مصنوعی زبان اہل وطن کی اصلی اور زندہ زبان بننے سے قاصر رہے۔

اسی سلسلے میں ضرورت ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کو سامنے رکھ کر ان خفی اسباب پر بھی ایک نگاہ ڈالی جائے جن کو علمائے عمرانیات نے قومیت کی تشکیل کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔

(۱) اپنی حفاظت کے لئے ہمسایہ قوموں سے مقابلہ اور مناقشہ۔

بدقسمتی کی بات ہے کہ صحیح معنی میں کوئی قوم ہندوستان کی ہمسایہ نہیں۔ کیونکہ ہر طرف پہاڑ یا سمندر پھیلے ہوتے ہیں۔ کابل و سیستان کے پہاڑ

اور گرم ریگستانوں میں کسی بڑی اور متمدن قوم کا نشو و نما ہو سکتا تھا۔ اور ہمارا یہ واحد ہمسایہ بھی مسلمانوں کے دور میں ہندوستان کا حریف و رقیب نہیں رہا زمانۂ حاضر میں بعض ہندو اہل الرائے نے خود ہندی مسلمانوں کو اپنا مدِ مقابل قرار دیا۔ اور ہندو قومیت کی تشکیل میں اس جذبۂ رقابت سے کام لیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ قومیت کے حق میں یہ تدبیر زہر کا حکم رکھتی ہے۔ اور گذشتہ پندرہ بیس سال میں جا بجا ہندو مسلمانوں میں جو تصادم ہوئے ان کے تلخ اثرات موجودہ نسل کے دلوں سے بہ مشکل محو و فراموش ہو سکتے ہیں۔

(۲) **معاشی ضروریات** ۔ جو کسی ملک کے باشندوں کو دوسرے ملکوں پر فوج کشی یا وسیع پیمانے پر تجارت کی تحریک دلائیں۔

ہندوستان کے قدیم پیشوایان مذہب نے تو حد کر دی کہ باہر والوں سے میل جول اور تبادلۂ خیالات کے ذرائع بند کرنے کی غرض سے، لوگوں کا پردیس میں جانا ہی ناجائز قرار دیا، لیکن خود ہندوستان کی وسعت اور زرخیزی کی بدولت بھی اس بات کا قوی محرک موجود نہ تھا کہ یہاں کے لوگ فتح ممالک یا تجارت کی خاطر اتنی کثیر تعداد میں باہر جائیں کہ جملہ اہل وطن کو ان کی کامیابی سے خاص دلچسپی پیدا ہو۔ اور یہ اولوالعزمی اتحاد قومی کا ایک وسیلہ بن جائے۔ تاریخ میں سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان محمد تغلق کی نسبت لکھا ہے کہ ماورائے ہند کشور کشائی کے ارادے کرتے تھے۔ مگر پہلے بادشاہ کے ولولۂ جہانگیری کی علت کثرت شراب خواری اور دوسرے کی بلند ہمتی کا محرک اس کے فتور دماغ کو بتایا گیا ہے۔

۳۔ **تبلیغ دین کا جذبہ** ۔ جو بعض اوقات بڑے بڑے گروہوں کو ایک قوم کی صورت میں متحد کر دیتا ہے۔

ہمارے ملک میں بودھ مت کے سوا اس قسم کا کوئی بڑا تبلیغی مذہب نہیں پیدا ہوا۔ بہت سے مذہبی فلسفے مرتب ہوئے جن میں الہیات کی وہ وہ باریکیاں بیان کی گئیں کہ دوسری قوموں میں مشکل سے نظیر ملے گی۔ مگر یہ سب فلسفہ طرازیاں عہد فراغت و اطمینان کی یادگار ہیں۔ ان میں تبلیغ و اشاعت دین کی وہ از خود رفتگی ڈھونڈھے سے نہ ملے گی جو لاکھوں نفوس کا رخ ایک ہی منزل کی طرف پھیر دیتی ہے۔ باقی بودھ مت کا ہندوستان میں جو کچھ حشر ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ کہ آج اس ملک میں جہاں طرح طرح کے مذاہب موجود ہیں کوئی گروہ بدھ مت کا نام لیوا تک نہیں ملتا۔

۴۔ موسم۔ تمدن و معاشرت کی یکسانی۔

جدید یورپ نے قومیت کا ایک جغرافی تخیل پیش کیا ہے اور اسی کی بنیاد پر ہمارے تعلیم یافتہ حضرات ہندوستان کی "قومی" آزادی اور حکومت کے دعاوی پیش کر رہے ہیں لیکن اول تو یہ تخیل ہی نوع انسان میں تقسیم و تفریق ڈالنے والا ہے، دوسرے ہندوستان کی وسعت اور محل وقوع سے اس کے مختلف اقطاع میں موسم اور آب و ہوا کا قدرتی اختلاف اس درجہ پایا جاتا ہے کہ جغرافی اعتبار سے ایک ملک نہیں کہہ سکتے۔ پھر طبیعی حالات کا لوگوں کی جسمانی صحت و ساخت، معاشی مشاغل اور طرزِ تمدن و عادات پر بہت کچھ اثر ہوتا ہے۔ طرفہ یہ کہ چین اور ولایات امریکہ کے اقطاع میں باہم اس قدر طبیعی فرق نہیں پایا جاتا، جس قدر کہ ہندوستان کے صوبۂ مدراس و سرحد۔ یا بہار و بمبئی میں موجود ہے۔ حالانکہ یہ دونوں سلطنتیں رقبے میں ہندوستان سے بھی بڑی ہیں۔

ہم نے ان قدرتی اور تاریخی اسباب کو اجمالاً پیش کرنے کی کوشش کی جو اہل ہند کی متحدہ قومیت میں مانع ہیں۔ اور جن کی بدولت یہ بدنصیب ملک صدیوں سے غیروں کی غلامی اور محکومی میں گرفتار رہا۔ لیکن اس بیماری کا چارۂ کار تلاش کرنے کے لئے ہمیں بالکل دوسری قسم کے شواہد سے مدد لینی پڑے گی۔ اور تاریخ و جغرافیہ کے بجائے سیاسیات اور عمرانیات کے ایسے مباحث چھیڑنے ہوں گے جن میں اختلاف رائے اور مناظرے کی کافی گنجائش ہے۔ اور جن کو ہم کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ لیکن اس پریشان گفتاری کو ختم کرتے وقت مجھے خیال آیا کہ ناظرین کی دلچسپی کے واسطے بولشوی روس کے بانی لینن کے مرض الموت کا ایک دخیالی، مکالمہ یہاں نقل کر دیا جائے۔

لینن ۔ یہ سن کر کہ ہمارے تمام صوبوں میں اب مزدوروں کی جمہوریت قائم ہو گئی ہے میں اطمینان سے جان دوں گا۔

پہلا رفیق ۔ مگر اکثر صوبوں میں یہ جمہوری مجلسیں محض پتلیوں کا تماشا

ہیں جو پردے کے پیچھے سے تار ہلانے پر متحرک ہیں۔

لینن۔ ہم ابتدا میں اپنے بچوں کو اسی طرح ہاتھ پکڑ کر چلنا سکھاتے ہیں

دوسرا رفیق۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بھی عہد شاہی کی طرح لوگوں کی آزادی سلب کئے ہوئے ہیں ؟

لینن:۔ ان کے پاس آزادی تھی کہاں جسے ہم سلب کرتے۔ ان کے لئے آزادی ہم نے حاصل کی ہے، اور اب اسے قائم ودائم رکھنا سکھا رہے ہیں۔

پہلا رفیق۔ ہمیں اس کا کچھ معاوضہ نہیں ملے گا ؟

لینن۔ کیوں نہیں ؟ ہم اس نفرت وانتقام کے جذبے کو جو شخصی بادشاہی کی طرف سے آتشکدۂ مجوس کی طرح، ہمارے دل میں بھڑک رہا ہے آسودہ کریں گے۔

پہلا رفیق:۔ اور ہمارے جانشین ؟ جو بادشاہی کے شکنجوں سے گھائل نہیں ہوتے، کیا وہ محض حب وطن کے جذبے سے اہل وطن کی خدمت کریں گے ؟

لینن:۔ محبت سے میں بہت بدگمان ہوگیا ہوں۔ اسے مذہب نے اصلاح وخدمت کی بنیاد قرار دیا تھا۔ مگر خود اہل مذہب اپنے فعل سے اپنا قول باطل کر چکے ہیں۔

دوسرا رفیق:۔ مگر نفرت ! یہ جذبہ کب تک ساتھ دے سکے گا !

لینن:۔ اگر ہم اس بھٹی میں دوسرے ملکوں کی سرمایہ داری اور ملوکیت کو جھونکتے رہیں تو یقین ہے کہ بہت زمانے تک یہ حمام گرم رہے گا ....

میری آرزو کا دامن اسی قدر دراز ہے

اسٹیشن کا حادثہ

حسن کی رونمائیاں توبہ　　اس پہ سادہ ادائیاں توبہ
اُن کا آنا نظر مہینوں بعد　　اپنے منہ پر ہوائیاں توبہ
اُن کا خود ہی سلام کر لینا　　ہائے وہ خوش ادائیاں توبہ
عشق پر بیخودی کا وہ عالم　　شوق کی نغمہ زائیاں توبہ
دل میں ہنگامہ لب پہ مہر سکوت　　عاشقی کی دہائیاں توبہ
جلد ہی اُن سے دور ہو جانا　　غم کی بے انتہائیاں توبہ
عشق کا ساز حسن کی مضراب　　دیر تک خوش نوائیاں توبہ

بعدۂ ان سے نامہ وپیغام
ان کی بے اعتنائیاں توبہ

محمد ضیاء الاسلام (بجنور)

لڑکی اور طوطا

میرے طوطے اے مرے آنکھوں کے تارے میرے لال
کس طرح دل سے مٹاؤں تیری صورت کا خیال

کیا بتاؤں میں کہ کیا دکھ کی کہانی تھی تری
سر بسر تصویرِ حسرت زندگانی تھی تری

چھوٹ کر ماں باپ سے اپنے نہ جانے تو کہاں
پھنس گیا تھا دام میں صیاد کے یوں ناگہاں

میرے گھر آیا تھا تو جب کنٹھ بھی پھوٹا نہ تھا
اُف پروں سے بھی تو لاسے کا نشاں چھوٹا نہ تھا

تیرے جینے کی کوئی صورت نظر آتی نہ تھی
ایک دم کو بھی میں تیرے پاس سے جاتی نہ تھی

آہ کتنے ناز سے ہاتھوں پہ پالا تھا تجھے
آہ کتنے پیار سے برسوں کھلایا تھا تجھے

گنتے گنتے وہ بھی دن آیا ترا نامِ خدا!!
جب قفس میں تو پروں کو تول کر پھرنے لگا

بچپنے کا رنگ تیرا مائلِ پرواز تھا
تیرے ہر لہجے میں گویائی کا اک انداز تھا

نام لے کر وہ ترا مجھکو بلانا یاد ہے!!!
اور چارے کے لئے پر پھڑ پھڑانا یاد ہے

آہ وہ اک پاؤں سے پہروں کھڑا رہنا ترا
دے رہا ہے مجھکو اب تیری عبادت کا پتا

نور کے تڑکے ہی سب گھر کو جگا دینا ترا
نام لے لے کر اٹھو کی رٹ لگا دینا ترا

کیا ہوا طوطے بتا پچھ رات تجھکو کیا ہوا
نام میرا لے کے اس دنیا سے تو کیوں چل بسا

کیا مری خدمت کا آخر وقت تک احساس تھا
اس لئے تیری زباں پر نام میرا آگیا!

نزع کی تکلیف سے پا ہو کے اک دم بحواس
اپنے محسن کو بلانا چاہتا تھا اپنے پاس!

وائے قسمت مجھ پہ گہری نیند کا غلبہ رہا
تیری جانِ ناتواں پر موت کا حملہ رہا

یہ تو سچ ہے کچھ نہ کرسکتی تھی ہیں تیری دوا
دیکھ لیتی وقتِ آخر تجھکو یہ ارمان تھا!

شکر یہ محسن کا اپنے یوں ادا تو کر گیا!
اب میں سمجھی نام میرا لے کے تو کیوں مر گیا

یہ تو مانا تو جہاں میں آشیاں برباد تھا
تیرے دم سے یہ قفس میرا مگر آباد تھا

اب نہ جانے کس چمن میں آہ ڈیرا ہے ترا
سُنتی ہوں طوبیٰ کی شاخوں پر بسیرا ہے ترا

چھوٹ کر قیدِ عناصر سے تو اب آزاد ہے
اب نہ فکرِ آشیاں نے برق نے صیاد ہے

کاش قیدِ عنصری سے میں بھی اب آزاد ہوں
جس چمن میں تو بسا ہے بس وہیں آباد ہوں

نزع کی حالت میں میرا بھی یونہیں انجام ہو
کاش میرے لب پہ بھی محسن کا میرے نام ہو[ع]

گو کہ دیدار اس کا وقتِ آخری دشوار ہے
لب پہ اس کا نام آجائے تو بیڑا پار ہے

کرشن سہائے، وحشی، کانپور

ع۔ اور ایسا ہی ہوا کہ اس کے سال بھر بعد میرے لڑکے کا انتقال ہو گیا۔ گویا یہ شعر میرے چھوٹے منہ سے میرے لڑکے کی موت کی پیش گوئی بن کر نکلا تھا۔

طوطا اور کوّا

"مجبوری کی زندگی، آزادی کی موت سے بدتر ہے"

(۱)

ایک طوطا ایک کوّے پر ہُوا یوں طعنہ زن ۔۔۔ دیکھ مجھکو میں ہوں انساں کی طرح گرمِ سخن
میری پابندی بھی آزادی کی ہے اب زندگی ۔۔۔ سب قفس کہتے ہیں جس کو، ہو گیا رشکِ چمن
وقت پر نغمہ سرائی، وقت پر ہے خامشی ۔۔۔ آ کے انسانوں میں چھوڑا میں نے وحشت کا چلن
وقت پر کھاتا ہوں میں، اور وقت پر سوتا ہوں میں
نعمتِ بے شرکتِ غیرے پہ خوش ہوتا ہوں میں

(۲)

مہرباں انسان اور اُن کے زن و فرزند ہیں ۔۔۔ سب کے سب، میری محبّت کے بڑے پابند ہیں
ہر ادا دلکش ہے میری، اس پہ ہیں جی سے فدا ۔۔۔ ہر سخن سے میرے، وہ مسرور ہیں خرسند ہیں
سُن کہ کہتے ہیں اسے لطفِ حسابِ دوستاں ۔۔۔ ایک نغمے پھر سے، اُن کے کرم وہ چند ہیں
تُو کہ بدہئیت ہے، بدصورت بھی ہے مغرور بھی،
اُن کے ٹکڑے کھا کے تُو رہتا ہے اُن سے دُور بھی

(۳)

سُن کے کوّے نے کہا بھرتے ہوئے ٹھنڈا نفس ۔۔۔ میں کہاں ہوں؟ اس کو کیا سمجھے گا مجبورِ ہوس

عشقِ آزادی سے میرا از زمیں تا آسماں　　حُسن نے تجھ کو کیا پابندِ آغوشِ قفس
میں کہ کُل میرا ہے جو کچھ بھی ہے تا حدِ نگاہ　　تو کہ دامِ خود فراموشی ہے تیرے پیش و پس
کھول آنکھیں، دیکھ اس کو، پھول تو ہے بُو ہوں میں
تو غزالِ دامِ حسرت ہے، رمِ آہو ہوں میں

(۴)

دو دنوں میں آگیا ناداں تری خُو بُو میں فرق　　زیست کیا؟ جس کو کیا ہو بحرِ بے پایاں سے غرق
فطرتِ آزاد کو ہے تابِ یک دم بھی حرام　　مخمل و دیبا کے بستر پر کہیں رہتی ہے برق
منزلِ درماندگی! مرغِ ہوا پیما کو دیکھ　　شش جہت اِس کے ہیں، کیا غرب اس کو کیا ہے شرق
بلکہ جو تسلیم میں ہوتا ہے چلنے کے لئے
پھر نہیں رہتا کبھی سانچے میں ڈھلنے کے لئے

(۵)

مُجھ کو ہیں معلوم سب کچھ فطرتیں صیّاد کی　　مہربانی میں ہیں اس کی بندشیں فولاد کی
قہر اُس کی چینِ ابرو، مہر ہے اس کا فریب　　رات دن میں دیکھتا ہوں شکل آدم زاد کی
یہ کسی فریاد پرور سے یادرس، امرِ محال　　سازِ محفل اس کو آہیں ہیں دلِ ناشاد کی
دُور، دُور اس سے ہے رہنا اصل رازِ زندگی
اور نفرت دل سے کرنا امتیازِ زندگی

(۶)

تجھ کو اے بدبخت جب صیّاد کی بھائی ادا　　کھیلتا ہے آکے آنکھوں میں تری حسنِ قضا
پستیٔ ہمت ہوئی جب قید کی منت گزار　　ہو چکا تقدیر میں جو کچھ تھا ہونا ہو چکا
تجھ کو جب کنجِ قفس ہی پر قناعت ہو گئی　　شومِ ہستی ہے تری، آزاد عالم کی وبا

اللہ اللہ تیری غیرت کا یہی جب طور ہے
تو نہیں ہے تیرے جامے میں یہ کوئی اور ہے

(۷)

اپنی بدبختی سے سمجھا زہر کو جب انگبیں
جان کا تیری بھروسا ایک دم کا بھی نہیں

دار کا تختہ ہے یہ اے بوالہوس شکلِ قفس
اتنا موقع ہے ابھی کرلے تو اس کو دل نشیں

لے خدا حافظ! میں اب جاتا ہوں تیرے پاس سے
قبر بن جائے نہ اتنا قرب بھی تیرا کہیں

تھا جو کہنا اُس کو کیفی! کہہ کے کوّا اُڑ گیا
رہ گیا حسرت سے طوطا نقشِ پا کو دیکھتا

کیفی چڑیا کوٹی

پیغام

مرا پیغام کہہ دو جا کے ملّت کے جوانوں سے
کہ اب کچھ مل نہیں سکتا پرانی داستانوں سے

جو تم بیدار ہو جاؤ تو ہے پختہ یقیں مجھ کو
تمہاری بستیاں اُلجھیں گی جا کر آسمانوں سے

نفاقِ باہمی کو ترک کرنے میں بھلائی ہے
یہ بجلی کب تلک لپٹی رہے گی آشیانوں سے

جہاں میں خرمنِ ظلم و ستم کا اب خدا حافظ
کہ آہیں بجلیاں بن کر گریں گی آسمانوں سے

یہ شاعر تم کو وہ پیغام محفل میں سنائے گا
سُنا جو خُون کے دریا میں تیغوں کی زبانوں سے

(قمر جلال آبادی)

اقوالِ حکیمانہ

غلام سرور۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

(۱) جو شخص کارِ خیر سے مانوس ہے وہ کسی غیر کے حکم کا تابع نہیں ہوتا۔ بلکہ صداقت و حقانیت کو اپنا پیشوا قرار دیتا ہے۔

(۲) حسنِ اخلاق ایک ایسا محکمہ ہے۔ جو قانونی محکموں سے کہیں بلند تر ہے، فقط یہی نہیں کہ وہ ہمیں عاداتِ قبیحہ سے روکتا ہے، بلکہ ہم سے اس بات کا بھی مطالبہ کرتا ہے کہ ہم عملِ خیر کا اقدام کریں۔

(۳) جملہ مفاسد کا منبع بیکاری ہے۔ ہر وہ حکومت جو یہ چاہتی ہے کہ اس عیب کو رفع کرے بقدرِ امکان لوگوں کو کام میں مصروف رکھے۔ "باسکال"

(۴) انسان کو چاہیے کہ ہمیشہ اپنے مستقبل کے لئے جدّ و جہد کرے۔ کیونکہ ماضی ہاتھ سے جا چکا۔ اور حال کی مثال ایک ایسے مریض کی سی ہے جس کی عمر ہر لحظہ کم ہوتی جا رہی ہو۔

(۵) تو کس چیز کا شاکی ہے؟ کشمکشِ زندگانی کا؟ یہ تو فوز و فلاح کی راہ ہے۔ ظلم کا؟ یہ تو خود تیری ہی تقصیر ہے۔ موت کا؟ یہ خلقت کا ایک ناقابلِ تغیر قاعدہ ہے (زلبوتین)

(۶) میری نظر میں تمام عالم ایک کنبے کی مثال ہے۔ زمانۂ قدیم میں ویسا ہی تھا اور اب بھی ویسا ہی ہونا چاہیئے۔ اگر برخلاف اِس کے ہم ایک گروہ کو دوسرے پر ترجیح دیں تو ہماری مثال اس شخص کی سی ہوگی جو اپنے اعضا میں سے بعض کو دوست سمجھتا ہے اور بعضوں کو دشمن۔ (لارڈ شفٹسبری)

(۷) دنیا میں تمام وہ حالتیں اور وہ چیزیں جو ہمارے ذوق کی مربی و معاون ہیں ایک معین حد رکھتی ہیں۔ اگر ہم اُن کے قدرتی حدود کو بڑھا دیں گے تو ہر چیز اپنے انداز سے اور قاعدے سے خارج ہو جائے گی۔ "فریڈرک اعظم"

(۸) پست ترین اشخاص وہ ہیں جو قبولِ حقارت سے نہیں ڈرتے۔

(۹) بیشک نالائق لوگوں کی صحبتوں سے بے عیب طبیعتیں بھی خلل پذیر ہوتی ہیں۔ "فلشیہ"

(۱۰) کم جاننے اور زیادہ کہنے کی مثال ایسی ہے جیسے اصل زر کی کمی اور خرچ کی زیادتی۔

(۱۱) ہمارا حقیقی احتیاج ایجاد و اختراع میں ہے۔

(۱۲) تقسیمِ عمل تقدم کی بنیاد ہے۔

(۱۳) ایک حقیقی دوست کی خاطر ہم سب چیزوں کو چھوڑ سکتے ہیں۔ مگر وجدان و فریضہ کو نہیں۔

(۱۴) جس قدر کہ صحت بدن کے لئے لازمی ہے اُسی قدر فضیلت روح کے لئے۔

(۱۵) اقوامِ عالم کی قوّت و مقدرت اُن کی ملیّت کے نقطۂ نظر سے ہے۔ "نپولین"

(۱۶) حقیقی تموّل خزانوں اور دفینوں کے حصول میں نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی طرزِ استعمال کے جاننے میں ہے۔

(۱۷) دنیا کا کوئی افراط حق شناسی میں افراط سے مستحسن تر نہیں ہے۔ "لابرویر"

(۱۸) پاک دامنی و استقامت تمام قسموں اور عہدوں سے محکم تر ہے۔ "مادام نکر"

(۱۹) چاپلوس و متملق اشخاص کی زندگی فقط اُنہی لوگوں سے وابستہ ہے، جو اُن کی چاپلوسیوں اور تملقات کے خریدار ہیں۔ (لافونتین)

(۲۰) مملکت کی خرابی کے جملہ اسباب میں سے دو اہم ترین سبب یہ ہیں۔ (ا) حقیقی علماء و فضلا کی ناقدرشناسی اور (ب) مملکت کے کاموں میں اُن کی عدمِ شرکت۔ (والٹیر)

(۲۱) قلب انسانی تمام فلاسفہ اور حکماء سے دانشمند ہے۔ جو شخص قلب پاک کا مالک ہو وہ حکما کی پند و نصیحت کا محتاج نہیں۔ "روسو"

(۲۲) ہر لقب ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، جو شخص متعدد القاب کا جامع ہے قبل اس کے کہ وہ اُن پر غرور کرے۔ اُسے چاہیئے کہ اس پر فکر کرے کہ اُن القاب سے اس پر کیا کیا فرائض عاید ہوتے ہیں۔

(۲۳) اگر چہ معائب کی جڑ فقر و احتیاج ہے تو جاننا چاہیئے کہ اس کی علت غائی نواقص عقلیہ ہیں۔

(۲۴) حکمت و انصاف کا پہلا قدم جہل و عدم اقتدار کا اقرار ہے اُس ارادہ اعمال میں جس کا انجام انسان کے لئے کامیابی و کامرانی ہو۔ "شا مطورہ"

(۲۵) تربیت دو چیزوں سے مجلّٰی ہوتی ہے۔ ہوش و استعدادِ ذاتی یا حماقت و بے ترتیبی غیر سے۔

(۲۶) جیسے ہی ہم انواع و اقسام کی نعمتوں اور لذتوں کے ساتھ حاکمیت و آمریت کو ایک طرف اور انواع و اقسام کی زحمتوں اور بدبختیوں کے سائے میں مظلومیت کو دوسری طرف رکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ خالق کے کاموں میں بھی مخلوق نے مداخلت کی ہے۔

(۲۷) واقعی تم صاحبِ فضل و اقتدار ہو۔ لیکن ایسا کام کرو کہ میں تمہارا مرتبہ پہچانوں۔ اور تمہارا احترام کروں۔ "لا برویر"

(۲۸) انسان کے لئے وجدان سے بہتر کوئی رہنما نہیں۔ ممکن ہے کہ عقل و تدبیر انسان کو فریب دے دے۔ لیکن وجدان اس عیب سے قطعاً منزہ ہے۔

(۲۹) قلوبِ عالیہ کے مالک فقط شرافت و آبرومندی کے لئے کوشش کرتے ہیں، اُن کو اِن صفاتِ حمیدہ کا امیدوار بنا کر اِن کے حصول میں مانع ہونا فعلِ شنیع ہے۔ جملہ آلام و اضطرابات جن کا تعلق طبع انسانی کے ساتھ ہے، اُن کا مداوا صرف انہیں دو دواؤں سے ہو سکتا ہے۔ "فریڈرک اعظم"

(۳۰) انسان کے لئے شرابِ آزادی سے گوارا تر اور لذیذ تر کوئی شراب نہیں۔ لیکن اس لئے کہ وہ اس میگساری سے مست نہ ہو جائے اور شر و فساد کا مرتکب نہ ہو، وہ اعتدال کا محتاج ہے۔

(۳۱) اُسی طور پر جیسا کہ تم راستے میں حزم و احتیاط سے کام لیتے ہو کہ کوئی کانٹا تمہارے پاؤں میں نہ چبھ جائے، تمام افعال و اقدامات میں حزم و احتیاط سے کام لو تاکہ تمہارے وجدان کو آزار نہ پہونچے۔ اگر واقعی طور پر تم اسی طریقہ کار پر عمل پیرا رہو تو کبھی بھی تم سے کوئی کارِ زشت سرزد نہ ہو۔

(۳۲) آدمی جس قدر چاہتے ہیں اپنے آپ کو متمول، عاقل اور عالم تصور کرتے ہیں اگر وہ کسبِ تمول، عقل اور علم میں سعیِ حقیقی کو کام میں لاتے تو دنیا میں فقیر، احمق اور جاہل کا وجود نہ ہوتا۔

(۳۳) سینکڑوں اعمالِ قبیحہ جو انسان سے سرزد ہوتے ہیں محکمۂ عدالت میں نہیں پہنچتے۔ اور مجازاتِ قانونی سے دوچار نہیں ہوتے۔ انسان کو چاہیئے کہ خود اپنے محکمۂ وجدان و انصاف سے ڈرے۔

کیا بہتر ہے دامن کو سنبھالے بندے
تقدیس کی آغوش کے پالے بندے
بندہ ہے تو اللہ کے بندوں کو نہ بھول
اللہ کی یاد کرنے والے بندے

نجم آفندی اکبرآبادی

لائحۂ عمل

کسی کی آنکھ سے آنسو بہا کے چھوڑوں گا — غرورِ حسن کو نیچا دکھا کے چھوڑوں گا
سیاہ فام غلامی کا بدنما قشقہ — جبینِ ہند سے اک دن مٹا کے چھوڑوں گا
جگا کے خواب سے بھارت کے ذرّے ذرّے کو — جو اب مطلعِ مغرب بنا کے چھوڑوں گا
دلا کے یاد زمانے کو قصۂ غزنی — تمیزِ بندہ و آقا اٹھا کے چھوڑوں گا
اگر یہ داغِ جگر کچھ دنوں سلامت ہے — جہاں کو وادیٔ ایمن بنا کے چھوڑوں گا
جہاں میں رابطۂ محبت کی لہر دوڑا کر — جو تفرقے ہیں میں سب کو مٹا کے چھوڑوں گا
میں اپنی قوّتِ شیون سے ناز والوں کو — درِ نیاز پر اک دن جھکا کے چھوڑوں گا
کسی کی برق نگاہی سے طور والوں کو — دیارِ دوست میں بیخود بنا کے چھوڑوں گا
کسی کی مست نگاہوں کا واسطہ دے کر — جو میکدے میں ہے سب کچھ چڑھا کے چھوڑوں گا

طلسمِ دہر میں الطاف خود کو گم کر کے
رخِ حیات سے پردہ اٹھا کے چھوڑوں گا

سید الطاف مشہدی

بچاری کاچھن سے ڈالی اُچک کر لے گئی

سید حسن ریاض لکھنوی

وہ حسبِ معمول فروٹ مارکیٹ (پھلوں کی منڈی) کے ایک ستون سے لگا ہوا کھڑا تھا۔ نظریں حیران، چہرہ پژمردہ، جسم مضمحل۔ اور مزدور ہر گاہک کے پیچھے دوڑتے تھے۔ اپنی خدمات پیش کرتے تھے۔ اُن میں سے کسی نہ کسی کو کام مل جاتا تھا۔ لیکن یہ جب سے آیا تھا یوں ہی خاموش کھڑا تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا اور اُس نے ایک پیسے کی بھی مزدوری نہ کی تھی۔ اور اس پر اس کو کوئی تردد بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ تو بس کھڑا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔

نوجوان پھل والی کاچھن جو سامنے ہی اپنی اونچی دوکان پر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنا سودا بیچنے میں خوب مصروف تھی، اِس کو بھی کبھی کبھی بنظرِ غلط انداز دیکھ لیتی تھی۔ مگر یہ ادھر بھی متوجہ نہ تھا۔

ایک پردہ نشین لڑکی نے آکر بہت سے پھل لئے۔ کیلے، انار، سیب، سنترے۔ پھل شمار کرتے ایک مرتبہ اس غزال چشم نوجوان کاچھن نے اس عجیب مزدور کی طرف دیکھ کر کہا: "ارے یہاں آ" مزدور نے نہ سُنا۔ وہ نیچے اپنے پیروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دوسری مرتبہ اُس نے زور سے آواز دی "ارے یہاں آ، مزدوری کرنے آیا ہے یا سوچنے، لے میم صاحب کے ساتھ چلا جا" مزدور نے چونک کر اوپر کو دیکھا، اور ٹوکرا اُٹھا کر دوکان کی طرف بڑھا۔ دوکان تک چند قدم تھے۔ مگر اس کا ہر قدم پکار رہا تھا کہ یہ مزدور کے قدم نہیں ہیں۔ ایک چھوٹی سی دھوتی جو وہ مزدوروں کی وضع بنانے کو باندھے ہوئے تھا۔ کچھ اس طرح بندھی ہوئی تھی۔ گویا اُسے باندھنی نہیں آتی۔

وہ دوکان پر اپنا ٹوکرا رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ پھل والی نے ذرا چیخ کر کہا "ارے منہ کیا تک رہا ہے اِن پھلوں کو ٹوکرے میں رکھ۔ اور میم صاحب کے ساتھ چلا جا" اُس نے زور سے تو کہا، مگر لہجے میں تلخی نہ تھی، ہمدردی تھی، اس کو ہنسی بھی آگئی۔

مزدور بڑے قرینے سے اپنے ٹوکرے میں پھل چننے لگا۔ کاچھن پردہ نشین لڑکی سے باتیں کرنے لگی "میم صاحب یہ عجیب طرح کا مزدور ہے۔ دن بھر اسی جگہ چُپ کھڑا رہتا ہے بس ہی بُلا کر اس کو کسی کے ساتھ کر دیتی ہوں تو چلا جاتا ہے، ورنہ اس کو مزدوری کرنی آتی ہی نہیں، آپ سے کام ڈھونڈھتا ہی نہیں" مزدور نے ان باتوں کی طرف بھی کوئی توجہ نہ کی۔ وہ جب پھل لگا چکا تو اُس نے ٹوکرہ اُٹھا کر سر پر رکھ لیا۔ وہ لڑکی چلی اور یہ اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

کوٹھی پر پہونچ کر لڑکی نے مزدور کو دو آنے دیئے۔ یہ مزدوری زیادہ تھی۔ مزدور ایک لمحہ بھر اِن دونوں اِکنّیوں کو جو اس کی ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھیں دیکھتا رہا اور پھر شکریئے میں اپنے سر کو ذرا جھکایا اور اپنا ٹوکرا لے کر چلا گیا۔

مزدور کی یہ عجیب حرکات دیکھ کر ڈالی کو بھی اس سے کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔

واقعی عجیب مزدور ہے۔ میں نے کسی مزدور کو ایسی شائستگی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ شکریہ کیسا! انھیں کچھ ہی دیدو، وہ تو جھگڑتے ہی رہتے ہیں۔ مزدور جا رہا تھا اور وہ اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی ہوئی اُس کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر مزدوروں کے سے نہیں ہیں۔ اس کی صورت بھی مزدوروں کی سی نہیں ہے۔ بازو اور پنڈلیاں کیسی خوبصورت ہیں۔ کلائیوں اور ٹخنوں کے ڈھلاؤ اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے سے ہیں۔ ڈاڑھی لمبے اور سر کے بال بے ترتیب اور بڑھے ہوئے ہیں۔ پھر بھی چہرے پر ایک وقار ہے۔ یہ کیسا مزدور ہے؟

مزدور نے جس وقت پھاٹک سے باہر قدم رکھا تو انگریزی اخباروں کے وہ اوراق جو کاچھین نے ٹوکرے میں بچھانے کے لئے دیئے تھے برابر کرکے اُس نے اس طرح نظر کے سامنے کئے جیسے پڑھ رہا ہے۔ ڈالی کی حیرت اور بڑھی۔ کیا یہ انگریزی بھی جانتا ہے؟"

~~~~~~~~~~

ڈالی کا سن کوئی چھبیس ستائیس سال کا تھا۔ اُس نے امریکہ اور انگلستان میں اخبار نویسی کی مشق کی تھی۔ اور اب ہندوستان میں "ڈیلی میل" (لندن) کی مستقل نامہ نگار تھی۔ اس کو ڈراما لکھنے سے بڑا شغف تھا، اور اس غرض کے لئے ہندوستانی زندگی کا بڑے انہماک سے مطالعہ کر رہی تھی۔ مزدور میں اُس کو ایک قسم کی روحانیت معلوم ہوئی۔ وہ اس کے متعلق دیر تک سوچتی رہی۔

~~~~~~~~~~

مزدور وہاں سے مارکیٹ کو واپس نہیں گیا۔ اُس نے بازار سے ستو خریدے شکر خریدی، قینچی کے دو سگریٹ خریدے۔ اور شہر سے باہر ویرانے میں ایک پرانا مقبرہ تھا وہاں چلا گیا۔

وہ رات کو اسی مقبرہ میں رہتا تھا۔ مقبرہ پختہ اور نہایت صاف ستھرا تھا اور مزدور اس کو اور بھی زیادہ صاف رکھتا تھا۔ پانی پینے کا ایک گھڑا، مٹی کے چند آبخورے، دو تہبند، ایک چادر، پنسل اور کچھ کاغذ۔ یہ مزدور کا اثاث البیت تھا۔ گھڑا تو یونہی باہر رہتا تھا باقی سب چیزیں ایک طاق میں رکھی رہتی تھیں جن پر پتھر ڈھکا رہتا تھا۔ یہاں آتا ہی کون تھا۔ جو اس کے اس قیمتی سامان کو چراتا، پھر وہ پتھر اس مقام پر اس طرح وصل ہو جاتا کہ کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے پیچھے خلا ہے۔

مقبرے سے متصل ہی ایک کنواں تھا۔ اس پر رسی ڈول کا انتظام قریب جو اُس کے کاشتکاروں کی طرف سے رہتا تھا۔ مزدور گھڑا اور تہبند لے کر کنوئیں پر گیا۔ اس نے وہاں غسل کیا، دوسرا تہبند باندھا اور پانی لے کر چلا آیا۔ باہر پتھر کے فرش پر چاندنی میں بیٹھ کر اُس نے ستو بنائے، پئے اور پھر دیوار کا تکیہ لگا کر بیٹھ گیا۔ تکلف سے سگریٹ جلائی اور پینے لگا۔ آج تین دن بعد یہ سگریٹ ملی تھی۔ اس لئے پہلا ہی کش جو لیا تو ایک سرور کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

سگریٹ جل چکی تو چٹکی میں لے کر اُس نے آخری کش لیا اور اُسے پھینک کر وہ مضطربانہ ٹہلنے لگا۔ کبھی رُک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کبھی اس ہاتھ کو اس طرح حرکت دیتا ہے جس سے یہ معنی پیدا ہوں، کیا کیجے۔ یا کچھ نہیں۔ یا جو ہونا تھا وہ ہو لیا۔ ایک مرتبہ وہ کھڑا ہو گیا۔ اور جیسے سچ مچ کسی سے باتیں کر رہا ہو۔ بس دنیا میں ایک چیز یقینی ہے۔ موت! اور یہی بہت اچھا ہے۔ مگر وہ بھی تو جب چاہو، نہیں آتی، یہ بُرا ہے۔ مزدور نے دل پر ہاتھ رکھ کر ایک آہ کی۔ اور جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ نظریں زمین کی طرف ہیں اور کچھ سوچ رہا ہے۔ کوئی بہت ہی اندوہناک یاد تازہ ہو گئی۔

دیر کے بعد اُس نے سر اُٹھایا۔ آسمان کی طرف دیکھا۔ اچھا ہوا تجبہ مرگئی ورنہ بڑی مصیبتیں اُٹھاتی، پھر ذرا تامل کے بعد بولا "عجیب ماجرا ہے جتنا اونچا اُڑنے کی کوشش کرو پستیاں اتنی ہی قوت سے اپنی طرف کھینچتی ہیں۔"

وہ پھر دیوانوں کی طرح یکایک کھڑا ہو گیا۔ اور ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے اُس نے مٹھیاں بند کر لیں اور یہ معلوم ہوا کہ وہ اب جنون میں اپنا سینہ کوٹنے لگا سینے تک ہاتھ لے گیا اور پھر ڈھیلے چھوڑ دئے۔ اور بڑی ہی بے کسی سے بولا "کہیں چلے جاؤ، آلام اور افکار تو اسی طرح ساتھ ہیں۔ سب کچھ بدل ڈالو، دل اور دماغ تو نہیں بدلا جا سکتا۔ اور پھر یہ تنہائی! یہ تو مجھے ہلاک ہی کئے دیتی ہے۔"

~~~~~~~~~~

ڈالی کئی روز کے لئے سپل لے آئی تھی۔ اس لئے مارکیٹ جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اس کو مزدور کا بار بار خیال آیا اور جب آیا پھر وہی رہا۔
~~~~~~~~~~

وہ اس کا شائستگی سے سر جھکانا، وہ اس کا وقار سے چلنا، وہ دوسرے مزدوروں سے الگ تھلگ اور چپ کھڑا رہنا، وہ اس کا خوبصورت پیکر۔ وہ شریفانہ چہرہ۔ اس کو مزدور کے ساتھ کچھ ہمدردی سی ہو گئی۔ وہ اخبار نویسوں کے مزاج کا خاصہ اور اخبار نویس بھی عورت۔ ہر وقت دل میں ایک خلش، تلاش، جستجو، "یہ کون ہے؟ اور اس حال میں مبتلا کیوں ہے؟ وہ تو انگریزی بھی پڑھ سکتا ہے میں نے اچھی طرح دیکھا کہ اخبار کے اوراق اس طرح اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ جیسے پڑھتے ہیں۔"

ڈالی تین چار روز کے بعد پھر فروٹ مارکیٹ گئی۔ اور سیدھی اسی پھل والی کے ہاں، مزدور بھی اس روز کی طرح در سے لگا ہوا کھڑا تھا۔ آج ڈالی نے خود ہی اس کو آواز دے لی۔ وہ چلا آیا۔ مزدور غریب کو اپنے غرض سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ ڈالی کو اس قدر غور سے دیکھتا کہ پھر دیکھے تو پہچان لے۔ اور اب بھی اس نے اکیلے چہرے کی طرف کب دیکھا۔ وہ تو آیا پھل ٹوکرے میں رکھے، اور ٹوکرا اٹھا کر چلنے لگا۔ ڈالی نے کئی اور دکانوں سے ترکاریاں خریدیں۔ پھر سوداگروں کے ہاں سے اور اور قسم کا سامان خریدا۔ وہ بھی اسی ٹوکرے میں رکھا گیا، اس میں کافی دیر ہوئی۔ کوئی آٹھ بجے ڈالی اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئی۔ راستے میں بار بار ڈالی کا مزدور سے باتیں کرنے کو جی چاہا۔ مگر یہ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا باتیں کرے۔ کوٹھی کے احاطے میں پہنچکر اس نے پوچھا، تمھارا نام کیا ہے؟ مزدور نے کوئی ایک منٹ کے وقفے کے بعد کہا۔ "جما" رک رک کر اور لکنت کے ساتھ۔ ڈالی نے پُر معنی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کو یقین نہیں آیا کہ مزدور کا نام جما ہے۔ مگر ڈالی نے اس پر کچھ کہا نہیں۔ آدمی کو آواز دی۔ سامان اتروایا اور پہلے دو آنے دیئے اور بولی "یہ تو مزدوری ہے" اور پھر ایک اٹھنی دی، یہ بخشش ہے۔ مزدور نے ڈالی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی ہتھیلی کی طرف اور ذرا تامل کے بعد اس نے اٹھنی کو چٹکی میں لے کر ڈالی کی طرف بڑھایا۔ اور لجاجت سے بولا "میں بخشش نہیں لیتا"

ڈالی نے حیرت سے کہا "کیوں؟"

مزدور نے نظریں نیچی کر کے جواب دیا، "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیوں لوں؟ آپ کیوں بخشش فرمائیں اور میں اسے کیوں قبول کروں۔"

ڈالی نے کہا "تم میرے ساتھ کئی گھنٹے رہے ہو۔ اس لئے میں تمھیں بخشش دینا چاہتی ہوں۔"

"تو یہ بخشش نہیں مزدوری ہوئی۔ مزدوری کیا ہے، آدمی کے وقت اور مشقت کی قیمت۔"

ڈالی لاجواب ہو گئی۔ اور اس معقول گفتگو پر متحیر۔ اس نے بالآخر کہا "اچھا یہ سب مزدوری ہے۔"

مزدور نے کہا۔ نہیں اب میں دو آنے سے زیادہ نہیں لوں گا۔ قریب ہی ایک تپائی پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس پر اٹھنی رکھکر چلا گیا۔ اس نے گفتگو کو طول دینا بھی پسند نہ کیا۔ ڈالی حیرت زدہ دیر تک اسی سمت تکتی رہی جدھر مزدور گیا تھا۔

اس واقعہ نے ڈالی کے دل میں اور بھی زیادہ تجسس پیدا کر دیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ مزدور کا راز معلوم کروں گی۔ ممکن ہے کہ یہ ایک ڈرامے کا اچھا ہیرو بنے۔ اور اس کی زندگی کی افتادوں سے کوئی دلچسپ پلاٹ پیدا ہو۔ یہ بھی نہ سہی تو ایک بے نوا ہندوستانی مزدور کے عنوان سے ڈیلی میل میں مضمون لکھونگی مگر اس سے پوچھوں کیسے کہ تو کون ہے۔ اور اس حالت میں کیوں مبتلا ہے، وہ تو اپنا نام جما بتاتا ہے۔

ڈالی نے کئی روز سوچا کہ اس سے کیونکر بے تکلفی پیدا کی جائے۔ اسے کیونکر اپنی سرگذشت بیان کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ صاف صاف سوال کرنے میں اس کو خوف تھا کہ اگر اس نے بتانے سے انکار کر دیا تو پھر دریافت حال کا امکان ہی ختم ہو جائے گا۔ وہ اسی فکر میں تھی کہ ایک روز شام کو جب وہ ٹہل کر واپس آ رہی تھی اس نے مزدور کو دیکھا کہ خالی ہاتھ جنگل کی طرف جا رہا ہے۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ مزدور نیچی نظر کیئے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے راستے جا رہا تھا۔ اس نے ڈالی کی طرف توجہ بھی نہ کی۔ ڈالی کچھ دور تو اپنی کوٹھی کی سمت چلتی رہی مگر آہستہ آہستہ اور سوچتی ہوئی۔ یکایک اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اب یہ اپنے گھر جا رہا ہے۔ اگر میں اس کا گھر دیکھ سکتی تو اس کی زندگی کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو جاتا۔ اس نے ایک لحہ بھر کھڑے ہو کر سوچا۔ اور پھر پلٹ کر مزدور کے پیچھے ہو لی۔

اس مقام سے کوئی ایک میل چلنے کے بعد جب مزدور بھتر سے کے

کے احاطے میں داخل ہوا تو وہ ایک درخت کی آڑ میں ہو کر دیکھنے لگی۔

مزدور نے حسب معمول تہبند نکالا۔ گھڑا لیا۔ کنوئیں پر جاکر نہایا۔ وہ آج بازار سے کچھ ریاں لایا تھا۔ وہ کھائیں۔ پھر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا۔ سگریٹ پیا اور اس کے بعد مقبرے کے چبوترے پر ٹہلنے لگا۔ اس کے ٹہلنے کے انداز سے یہ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ افکار و خیالات میں گم ہے۔

ٹہلتے ٹہلتے مزدور نے گنگنانا شروع کیا۔ بتدریج آواز بلند ہوئی۔ اور صاف صاف الفاظ سمجھ میں آنے لگے۔ لہجہ دردناک اور سوز و گداز سے لبریز۔

بسیار پریشانم در گوشۂ تنہائی — اے گریہ کجا رفتی دیر از تو نمی آئی

ڈالی وہیں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ جیب سے اس نے نوٹ بک نکالی۔ اسی میں پنسل لگی تھی۔ اندھیرے ہی میں اٹکل سے اس نے رومن حرفوں میں آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ لکھنا شروع کیا۔ مزدور نے بار بار یہ شعر گایا۔ اس تکرار کی مدد سے ڈالی نے بالآخر پورا شعر لکھ لیا۔

ڈالی کے پاس ایک ڈکشنری دلونت تھی جس میں فارسی الفاظ کے معنے انگریزی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ یہ اس نے اپنے ایران کے سفر میں خریدی تھی۔ اس میں ایک ایک لفظ کے معنے دیکھ کر اس نے علیحدہ لکھ لئے۔ پھر سب کو جوڑ کر پڑھا۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ مزدور تنہائی سے پریشان تھا۔ اور رونے کو اپنا رفیق قرار دے کر بلا رہا تھا۔ اس کو مزدور پر بڑا رحم آیا۔ اور اس کا بے اختیار جی چاہا کہ وہیں مقبرے میں جاکر اس کی رفاقت کرے۔ اس کو کامل یقین ہو گیا کہ وہ معمولی مزدور نہیں ہے۔ کوئی مصیبت زدہ ہے۔ جو اپنے وجود کو اس طرح گم کرنا چاہتا ہے۔ اب تلاش اور جستجو نے ڈالی کے دل میں ایک خلش کی صورت اختیار کر کے شدت اختیار کر لی۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت ڈالی پھر مقبرے کی طرف گئی، وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ مقبرے کے اندر چلی گئی، پہلی نظر میں ایک قبر اور ایک گھڑے کے سوا اس کو کچھ نظر نہ آیا۔ مگر اس کو یاد آیا کہ مزدور اندر سے ایک تہبند بھی نکال کر لایا تھا۔ جو اس نے نہانے کے بعد باندھا تھا۔ اس نے مقبرے کا ایک ایک گوشہ دیکھنا شروع کیا۔ ایک جگہ اس نے دیکھا کہ دو پتھروں کے درمیان ایک ذرا سا کاغذ باہر نکلا ہوا ہے۔ وہ بیٹھ گئی اور کاغذ کو اس نے آہستہ سے کھینچا۔ معلوم ہوا کہ کاغذ کا زیادہ حصہ دبا ہوا ہے۔ اب اس نے پتھر کو ہر طرف سے دیکھا، اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ پتھر جما ہوا نہیں ہے ڈالی نے اس کو اٹھایا تو اس کے نیچے تختی کئے ہوئے کاغذ کوئی دو دستے سے بھی زیادہ تھے۔ اور دو تہبند تھے۔ اس نے خوش ہو کر کاغذوں کو اس امید میں دیکھنا شروع کیا کہ ان میں مزدور، مزدور کے راز کا کچھ پتہ چلے گا۔ مگر اس میں جو کچھ لکھا تھا وہ سب اردو میں تھا۔ ڈالی کو مایوسی ہوئی۔ اس نے سوچا کہ انھیں لے چلوں کسی سے پڑھوالوں گی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ چوری صرف سونے ہی کی نہیں ہوتی۔ کاغذ کی بھی ہوتی ہے۔ اور ان کے چوری جانے سے مزدور کو کیسی تکلیف ہوگی۔ بنا برآں دو تہبندوں اور ان کاغذوں کے سوا اس دنیا میں اس کی کوئی ملک نہیں معلوم ہوتی۔

ڈالی یونہی کاغذوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی کہ ایک صفحے پر اس کو انگریزی لکھی ہوئی ملی۔ اس نے اشتیاق سے ان کاغذ کو پڑھنا شروع کیا۔ "محمود عادل" "محمود عادل"۔ "ایم عادل"۔ "محمود عادل" سارے صفحے پر اسی کا نام کی مشق تھی۔

ڈالی بہت خوش ہوئی۔ "مزدور کا نام محمود عادل ہے" "میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ اس شان و صورت کے آدمی کا نام جما نہیں ہو سکتا۔ اور جا بخشش کو اس طرح واپس نہیں کر سکتا۔ وہ بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا ہوگا اور جیسی بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے اپنا نام لکھتا رہا ہوگا" ڈالی نے نوٹ بک میں یہ نام لکھ لیا۔ اور پھر سب چیزیں رکھ کر پتھر کو اسی طرح ڈھک دیا۔ اور چلی آئی۔

ڈالی شام کو کوئی ایک ہفتے کے بعد فروٹ مارکیٹ گئی۔ مگر آج پھل خریدنے کے لئے نہیں۔ بلکہ مزدور کی تلاش میں۔ راستے میں بار بار اس کے دل میں یہ خطرہ گذرا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مزدور نہ ملے۔ اور کسی کے ساتھ چلا گیا ہو۔ جس وقت وہ مارکیٹ میں پہنچی تو واقعی مزدور موجود نہ تھا۔ ڈالی نے پہلے اپنی نوجوان کا چھن کے ہاں پھل دیکھے آج قیمت بھی پوچھی، بھاؤ بھی طے کیا۔ اور پھر یہ کہہ کر مارکیٹ کے اندر چلی گئی۔ "کہ تم مہنگا بہت دیتی ہو۔ آج میں اوروں کے ہاں بھی دیکھوں گی"۔ ڈالی نے کئی دکانوں پر پھل دیکھے، اور ہر جگہ ضرورت سے زیادہ دیر کی۔ وہ مزدور کے انتظار میں وقت گذار رہی تھی۔

کوئی بیس منٹ کے بعد وہ پھر پہلی ہی دکان پر آئی۔ مزدور بھی واپس آگیا تھا۔ اس نے پھل لئے۔ پھل والی نے مزدور کو بلایا۔ ڈالی نے یہ محسوس کیا کہ وہ خوبصورت نوجوان کا چھن جب مزدور کو بلاتی ہے یا اس کی طرف دیکھتی ہے تو اس کی نظروں اور اشاروں میں کچھ دل کی تحریک بھی ہوتی ہے۔

ڈالی لاپروائی سے آگے آگے چلنے لگی اور مزدور ڈالی کے دلی منصوبوں سے

بے مزا اور نوجوان کا جھن کے نرم جذبات سے غافل، اپنے خیالات میں گم راستہ طے کرنے میں لگا۔ وہی ہیئت۔ ایک چھوٹی سی دھوتی۔ بری طرح بندھی ہوئی۔ اب داڑھی کچھ اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ڈالی نے راستے میں مزدور سے کوئی بات نہ کی اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

مزدور حسب معمول کوٹھی کی مہتابی (پورٹیکو) میں رکا، ڈالی نے پلٹ کر دیکھا اور بولی اندر لے آؤ۔ مزدور برآمدے سے گذر کر کرے کے دروازے تک گیا اور پھر ٹھٹکا ڈالی نے پھر مڑ کر دیکھا۔ اور پھر آواز دی اندر لے آؤ۔ مزدور اندر چلا گیا۔

ڈالی نے ایک الماری کے قریب خوبصورت ماوے کر ٹوکرا اتروایا۔ وہاں دو کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ مسکرا کر اس نے مزدور کی طرف دیکھا۔ اور بولی "مسٹر عادل تشریف رکھیئے" وہ یورشین تھی۔ اور ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے خاصی صاف اردو بولتی تھی۔ البتہ لہجہ ذرا مختلف تھا۔ مزدور نے حیرت سے ڈالی کی طرف دیکھا۔ ڈالی برابر مسکرا رہی تھی۔ اس نے پھر یقین اور اعتماد کے لہجے میں کہا "چھپانے کی کوشش نہ کیجئے، میں خوب جانتی ہوں، آپ کا نام محمود عادل ہے آپ تعلیم یافتہ اور شریف آدمی ہیں"

عادل نے گھبرائی ہوئی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا، میں، میں، اب میں تو مزدور ہوں۔ ڈالی نے برجستگی سے کہا "جی ہاں آپ مزدور ہیں، مگر بنے ہوئے ہیں، آپ کا نام محمود عادل ہے، اب آپ تشریف رکھیئے۔ میں آپ کو جانے نہیں دوں گی"

عادل نے حیران ہو کر ادھر ادھر دروازوں کی طرف دیکھا۔

ڈالی نے متانت سے کہا۔ "آپ اطمینان رکھیئے۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا میں نے بیرے کو آج سویرے سے رخصت کر دیا ہے۔ کھانا تیار میز پر لگا ہوا ہے میری کوٹھی کے اندر کوئی بلا اجازت نہیں آسکتا۔ آپ صرف اتنا کہیئے، کہ آپ کا نام محمود عادل ہے، آپ کوئی شریف آدمی ہیں۔ اور میری دوستی کو قبول فرماتے ہیں"

عادل نے اندوہگیں لہجے میں مگر بڑی لجاجت سے کہا، "یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ کہ آپ کسی کی مرضی کے خلاف اس کے ذاتی حالات معلوم کرنے کے درپے ہو جائیں میں آپ کے سامنے ایک مزدور اور حمال کی حیثیت سے آیا ہوں۔ آپ مجھے وہی سمجھیئے اور پھر دیکھیئے میں اس حیثیت میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ کسی شائستہ خاتون سے باتیں کر سکوں۔ یہ تو آپ کی بھی توہین ہے اور میرے لئے بھی شرمناک ہے۔

ڈالی نے مسکرا کر کہا، "تعجب ہے حمال یہ سب باتیں بھی جانتا ہے" اور پھر ہمدردانہ لہجے میں بولی، اچھا بس اب اقبال کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ آپ نے مان لیا کہ میرا خیال صحیح ہے۔ آپ کا نام محمود عادل ہے۔ اور آپ معزز اور شائستہ آدمی ہیں۔ بے شک یہ میری زیادتی ہے کہ میں آپ کی مرضی کے خلاف اور بلا استحقاق آپ کا راز فاش کر رہی ہوں۔ مگر آپ براہ کرم میری اس جسارت کو معاف کر دیجئے یہ یقینی ہے کہ میں آپ کو اب حمال کی حیثیت سے واپس نہیں جانے دوں گی، مجھے آپ اپنا دوست سمجھیئے۔ اور وہ حقوق دیجئے جو دوست کو دوست پر حاصل ہوتے ہیں۔

ڈالی نے یہ باتیں انگریزی زبان میں بہت ہی پر خلوص اور ہمدردانہ لہجے میں کہیں، عادل کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ڈالی نے اس کا شانہ پکڑ کر بٹھایا اور خود بھی مقابل بیٹھ گئی۔

عادل نے گرفتہ آواز میں کہا۔ مجھے ساری عمر میں کوئی دوست نہیں ملا اس لئے دوستی اور اخلاص کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اور اب میرا مزید تجربات کرنے کو جی بھی نہیں چاہتا"

ڈالی کھڑی ہو گئی۔ اور جیب سے رومال نکال کر اس نے عادل کے آنسو پونچھے۔ پھر بہت ہی نرم لہجے میں بولی، "یقین کرو عادل میں تمہاری سچی دوست ہوں اور مجھے اس کی اجازت دو کہ میں تمہارے ساتھ دوستی کا حق ادا کروں"

عادل نے بڑی مشکل سے اپنے دل پر قابو حاصل کر کے کہا "میں آپ کے اس کرم کا دل سے ممنون ہوں۔ مگر میرے ساتھ اب سب سے بڑی ہمدردی اور امداد یہی ہے کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں"

"نہیں نہیں، میں آپ کے ساتھ دوستی کروں گی۔ مگر اپنے طریقے پر، اور لیجئے سب تکلفات برطرف میں جو جو کہتی جاؤں آپ وہ کرتے جائیں۔ میں اب آپ کا کوئی عذر چلنے نہیں دوں گی" ڈالی یہ کہہ کر مسکرائی اور پرزور شوخی سے بولی، آپ مزدور بنے مگر بن نہ سکے۔ وہاں فروٹ مارکیٹ میں اس بدنصیب کا جھن کو عاشق کر لیا۔ یہاں ٹوکرا سر پر رکھے ہوئے تشریف لائے اور ڈرائنگ روم کے آداب نہ بھولے۔ اس ادا سے سر جھکایا کہ اگر کوئی فرانسیسی بھی دیکھتا تو رشک کرتا آیئے، اٹھیئے۔ شیو کیجئے۔ نہایئے، لباس پہنیئے، آدمیوں کی صورت بنا کر کھانا کھایئے

مجھے بھوک لگی ہے۔" ڈالی ہاتھ پکڑے ہوئے کھینچتی ہوئی عادل کو دوسرے کمرے میں لے گئی، اور سنگھار میز پر بٹھا کر بولی، "آپ اتنے شیو کریں، میں آپ کے غسل کا انتظام کرتی ہوں، یہ سب سامان میں آج دن میں خرید کر لائی تھی۔ آپ کے لئے سوٹ بھی لے آئی ہوں۔ شاید ایسا ہو کہ وہ ٹھیک آئے۔"

عادل نے تعجب سے ڈالی کی طرف دیکھا۔

ڈالی نے شوخی سے کہا۔ "میں مقبرے میں جا کر وہ آپ کا نوشتہ خانہ دیکھ آئی ہوں وہیں تو ایک کاغذ پر میں نے آپ کا نام لکھا ہوا دیکھا تھا۔ اور وہ رات کا ٹہلنا۔ سگریٹ پینا اور بھیگانا۔

بسیار پریشانم در گوشۂ تنہائی	اے گریہ کجا رفتی دیر از تو نیامدی

یہ شعر ڈالی نے بڑے مزے سے انگریزوں کی طرح پڑھا۔ مگر عادل کو ہنسی کسی بات پر نہ آئی تھی، وہ بس حیران اور کچھ کھویا ہوا سا تھا۔ ڈالی نے پھر تقاضہ کیا، "اب جلدی شیو کیجئے جلدی نہائیے، تاکہ میں واقعی یہ محسوس کر سکوں کہ آپ میرے مہمان اور دوست ہیں۔" یہ کہہ کر ڈالی نے سارا شیو کا سامان خود قرینے سے رکھا، سیفٹی ریزر میں بلیڈ بھی خود ہی لگا کر ہاتھ میں دے دیا۔ عادل کی قوت ارادی بالکل سلب ہو چکی تھی۔ وہ اب ڈالی کے ارادے پر کام کر رہا تھا۔ اس نے استرار کھ کر برش کو پانی میں تر کیا۔ ڈالی غسلخانے میں چلی گئی، بجلی سے پانی گرم کر کے اس نے عادل کے نہانے کا انتظام کیا، سوٹ نکال کر لباس کے کمرے میں رکھا اور عادل کو غسلخانے میں پہنچا گئی، عادل نہایا۔ اس نے لباس بدلا، مگر سب جیسے عالم خواب میں، وہ برابر اسی پر حیرت کرتا رہا۔ "یہ کون ہے، کوئی جن ہے، پری ہے، اس کو کیا ضرورت تھی کہ اس نے میرے حال کی اس قدر تفتیش کی، رات کو مقبرے میں جا کر مجھے سگریٹ پیتے اور گاتے ہوئے دیکھا، دن میں جا کر میرے کاغذ ٹٹولے۔

عادل جس وقت لباس پہن کر باہر نکلا تو وہ ایک خوش رو اور خوش وضع جوان تھا۔ ڈالی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ذرا تعجب سے بولی۔ "کیسے یہ سوٹ تمہارے جسم پر کیا ٹھیک آیا۔ میں تو محض اندازے سے لے آئی تھی۔" سفید فلالین کا پتلون اور کچھ نیلگوں ساکوٹ، ڈالی ٹائی کو دیکھ کر زور سے ہنسی۔ "جناب کو ٹائی باندھنی تو خوب آتی ہے۔"

اس پر عادل بھی مسکرا دیا۔

ڈالی نے کھانے کی میز پر عادل سے اس کے متعلق کچھ نہ پوچھا، صرف اپنے متعلق بیان کرتی رہی۔ اپنا نام بتایا، اپنے مشاغل بتائے۔ اپنے سفر کے تذکرے کئے، اور یہ سب باتیں وہ اس طرح کر رہی تھی جیسے بہت ہی پرانی دوستی ہے۔ اور اب عرصے کے بعد ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ عادل کی وحشت بھی بہت کم ہو چکی تھی، اس ماحول میں ہر بات اس کو معمول سا معلوم ہو رہی تھی، وہ اب دلچسپی سے باتیں کر رہا تھا۔ اور سن رہا تھا۔

پورا ایک ہفتہ گذر گیا۔ ڈالی نے اشارتاً بھی اس کی سرگذشت کے متعلق سوال نہ کیا۔ وہ تو بس اس کی دلداری میں مصروف تھی۔ اور وہ تمام دلآویزیاں اور دلفریبیاں استعمال کر رہی تھی جو قدرت نے عورت کو اور پھر حسین عورت کو ودیعت کی ہیں۔ وہ اس کو سوچنے اور فکر کرنے کی بھی مہلت نہ دیتی تھی۔ آہستہ آہستہ عادل کی افسردہ جوانی بھی شگفتہ ہونے لگی۔ آلام اور افکار کی جگہ دل پر جذبات کا قبضہ ہونے لگا۔ وہ صنوبری قد کی رعنائی، اس پر ڈالی کا لچک کر چلنا۔ رنگ ایشیائی ملاحت پر فرنگی صباحت کے تین شوب، گل و یاسمن کا مرکب۔ سیاہ پتلیاں۔ سیاہ بھویں۔ سیاہ بال، وہ ساری ہی حسین۔

ایک روز شام کو عابد اور ڈالی کوٹھی کے لان (چمن) میں ٹہل رہے تھے کہ عادل نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا، "ڈالی تم نے پھر مجھے اسی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے، جس سے میں نے نجات حاصل کی تھی۔"

ڈالی نے سادگی سے کہا، "کیسی کشمکش؟"

"یہی زندگی کی کشمکش۔"

ڈالی نے مسکرا کر کہا۔ "میں تو اس خیال کی تصدیق نہیں کر سکتی کہ تم نے اس کشمکش سے نجات حاصل کر لی تھی۔"

"کیوں؟"

"کیوں کیا، وہ سوچنا، وہ اندوہگیں نظریں، وہ کھویا ہوا سا رہنا، کاہے کے لئے تھا؟"

عادل نے نیچی نظریں کر کے کہا، "کچھ نہیں، وہ تو صرف ماضی کا ماتم تھا، اب مستقبل کی فکر ہے۔"

ڈالی نے حقارت آمیز لہجے میں کہا، "فضول بات، یہ بھی کوئی سوچنے کی چیز ہے، میں تو اس کی منتظر ہوں کہ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے مزدور کا بھیس کیوں بدلا تھا۔"

عادل نے متانت سے کہا، "ڈالی دنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو بیان کرنے میں بہت ہی سبک اور حقیر معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن احساس میں

بہت اہم ۔ ساری زندگی کی قیمت ہوتی ہیں ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں تم سے اپنا سب قصہ بیان کردں ۔ تو تم مجھ پر ہنسو گی ۔ اور ممکن ہے کہ پست حوصلہ کہہ دو ۔ میرے احساس کی وہ تلخی تمھاری سمجھ میں نہ آئے گی ۔ جس نے مجھے تہذیب شائستگی روشنی اور علم کی دنیا چھوڑ کر فروٹ مارکیٹ میں "مالی کہنے" پر مجبور کر دیا تھا۔"

میرا گھر اچھا خاصا اوسط درجہ کا گھر تھا ۔ تعلیم و تربیت ختم کرنے کے بعد جب یہ طے کرنے کا وقت آیا کہ میں کس حیثیت سے زندگی میں داخل ہوں ۔ تو میں نے حصول معاش کے تمام مروجہ طریقوں پر غور کیا ۔ مگر میرے ذوق کے ساتھ کسی کا ساز نہ ہوا ، میرا ذوق سیاسی تھا ۔ میں ہندوستان کی سیاسی نجات کے لئے کام کرنا چاہتا تھا ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم میرے اس جذبے کی قدر نہ کرسکو گی ہندوستان کے متعلق شاید تمھارے جذبات بالکل دوسرے ہوں ۔ تم اپنے کو حاکم قوم کا فرد تصور کرتی ہوگی ؟"

ڈالی نے بات کاٹ کر کہا ۔ "نہیں عادل یہ بات نہیں ہے ۔ میں تو ہندوستانی ہوں ، میرے پردادا ہندوستانی مسلمان تھے ۔ انہوں نے ایک فرانسیسی عورت سے شادی کی ۔ میرے دادا کی ولادت کے بعد ہی وہ مر گئے ، دادا کو ان کی فرانسیسی والدہ نے پرورش کیا ۔ اور اپنے مذہب پر اٹھایا ۔ پر میرے باپ اور دادا دونوں نے انگریز عورتوں سے شادیاں کیں ۔ میری ماں انگریز تھیں ۔ مگر میں اپنے کو نسلاً ہندوستانی ہی سمجھتی ہوں ۔ اور یہ مجھے یورپ نے سمجھایا ۔ میرے مذہب صورت ۔ لباس ۔ تعلیم اور طور و طریق کوئی چیز انھیں اس بات پر آمادہ نہ کرسکی کہ وہ مجھے یورپین تسلیم کریں ۔"

عادل نے خوش ہو کر کہا "یہ بہت اچھا ہے !"

ڈالی نے جیب سے سگریٹ کیس نکال کر کھولا اور عادل کے سامنے پیش کیا ۔ عادل نے اس میں سے ایک سگریٹ لے لی ۔ ڈالی خود سگریٹ نہیں پیتی تھی ۔ مگر اس کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ عادل تکلف کرتا ہے ۔ اس لئے وہ اس کی وجہ سے ایک سگریٹ کیس اپنی جیب میں بھی رکھتی تھی ۔

عادل نے ایک کش لے کر پھر گفتگو شروع کر دی ۔ "میں نے بڑے شوق سے پبلک لائف اختیار کی ۔ اس دوران میں میری شادی بھی ہو گئی ، مجھے اپنی بی بی بہت ہی محبوب تھی ۔ اس نے مجھے بار بار اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ حصول معاش کی بھی کوئی فکر کرنی چاہیئے ۔ ورنہ ان سیاسی اخراجات کے ساتھ یہ جائداد بہت دن نہیں چل سکے گی ۔ مگر کسب معاش کا مجھے کوئی ذریعہ نظر نہ آیا ۔ ایک ہی صورت تھی کہ تصنیف و تالیف شروع کر دیتا ۔ وہ کی بھی ، مگر میری قوم میں تعلیم کا کوئی ذوق ہی نہیں ہے ۔ خوش حال لوگوں کے ہاں بھی کتاب خریدنے کی کوئی مد نہیں ہے ۔ یہ کس قدر شرمناک ہے کہ ننانوے فی صدی بغیر اخبار پڑھے زندگی گذارتے ہیں ۔ ان تصانیف پر وقت بھی ضائع ہوا اور روپیہ بھی ۔ لیکن ملک و قوم کی خدمت میرے لئے ایک عبادت تھی ۔ میں نے مالی اور جسمانی ہر قسم کی قربانیاں بڑے جوش سے کیں ۔ جیل بھی گیا ۔ انجام کار مقروض ہوا ۔ جائداد بکی ۔ فاقہ کشی کی نوبت آئی ۔ بی بی بیمار ہوئی اور مر گئی ۔

ان سب صدمات کو میں نے صبر سے برداشت کیا ۔ مگر جس چیز نے میرے دل کا خون کر دیا وہ یہ تھی کہ قومیت اور وطنیت کے مندر کے جتنے دیوتا اور بت تھے وہ مجھے سب اصلی رنگ میں نظر آنے لگے ۔ جتنی بداخلاقیاں خیال میں آسکتی ہیں وہ سب ان کے اندر موجود پائیں ۔ میں نے دیکھا کہ بہت ہی چھوٹی چھوٹی اور حقیر اغراض کے لئے انہوں نے یہ اتنے بڑے کام اٹھائے ہوئے ہیں ۔ اپنے رفقائے کار کو دھوکے دینا ۔ فریب دینا اور انھیں نکیں پہنچانا ۔ ان کی سیاست کا کمال ہے ۔ اپنی حقیر اغراض کے لئے یہ بڑی بڑی تحریکات پیدا کرتے ہیں ۔ اور اپنی ہی اغراض کے لئے کامیاب تحریکات کو فنا کر دیتے ہیں ۔ وائسرائے کی اگزیکٹیو کونسل کی رکنیت ۔ صوبوں کی وزارتیں کونسلوں کی صدارتیں ۔ یہ مسلمان ماہرین سیاست کی عمر بھر کی قومی سرگرمیوں کی قیمت ہوسکتی ہیں ۔ بدنصیب مسلمانوں کی تمام ملکی اور بین الاقوامی سیاست ایسی ہی ذاتی اغراض کے حصول کا ذریعہ بنی ہوئی ہے ۔ میرے پاس جب تک روپیہ رہا صدارتیں اور نظامتیں میرے لئے مخصوص تھیں ۔ میں انکار کر رہا ہوں ۔ اور وہ مل رہی ہیں ۔

مسلمانوں کی اب یہ ایک خصوصیت سی ہو گئی ہے کہ ان کی انجمنوں اور کانفرنسوں کے صدر ہمیشہ امرا ہوتے ہیں ۔ انھیں اس لالچ میں صدارتیں دی جاتی ہیں کہ یہ ان کاموں کو چلانے کے لئے روپیہ دیں گے ۔ وہ دیتے کچھ نہیں ہیں ۔ البتہ سیاست کو گندہ کر دیتے ہیں ۔

اور گورنمنٹ پر یہ جتاکر کہ ہمارا مسلمانوں میں بڑا اثر ہے، ہم فلاں انجمن کے صدر ہیں، خطاب اور عہدے حاصل کر لیتے ہیں۔ اور ان خطابوں اور عہدوں کی قیمت قوم کی جیب سے ادا کرتے ہیں۔ قوم کی جیب سے اس طرح کہ ان انجمنوں کو جن میں ان کا دخل ہوتا ہے حکومت کی اغراض کے حصول کا آلۂ کار بنا دیتے ہیں۔ اضافۂ رائے، آزادی رائے۔ اخلاص۔ جوش عمل۔ مسلمانوں کی سیاست میں عملاً یہ سب محاسن معائب سمجھے جاتے ہیں۔ جس شخص میں یہ ہوں اس کے لئے مسلمانوں کی پبلک لائف میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہر شخص کو جس کے پاس گرہ کا روپیہ نہیں ہے چاہیئے کہ امرا کا اور ان رفقائے کار کا آلۂ کار بنے جو کہیں سے روپیہ لا سکتے ہیں۔

وہ مقاصد اس طرح برباد ہوئے جن کے لئے ذاتی جائداد اور زندگی کے وہ ابتدائی تیس سال خرچ کئے تھے جو مستقبل کی تعمیر کے لئے مخصوص ہیں۔ پھر اب افلاس نے اپنا دبایا کہ فاقہ کشی اور قرضداری زندگی کا معمول بن گئی۔ میں نہایت پریشان تھا۔ کشود کار کی کوئی راہ نظر نہ آتی تھی۔ سرکاری نوکری نہ مجھے گوارا تھی اور نہ مل سکتی تھی۔ تجارت کے لئے روپیہ نہ تھا۔ خودکشی کرتا، مگر مسلمان ہوں۔ میرے عقیدے میں یہ جرم ہے۔

بچہ کے مرنے کے بعد ہر وقت تنہائی اتنی بڑی مصیبت تھی کہ زندگی سے بیزار ہونے کے لئے بس یہی ایک کافی تھی۔ وہ سیاسی احباب جن کا ہر وقت مجمع رہتا تھا اب نہیں آتے تھے۔ خود میں ان کے پاس جاتا تو منہ نہیں لگاتے تھے۔ دس دس روز اس طرح گذر جاتے تھے کہ سوائے اپنے نوکر کے اور کسی سے بات کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ وہ نوکر بھی اب میرا آقا بن گیا تھا۔ میں اس کا بھی مقروض تھا۔ عرصہ سے تنخواہ نہیں دی تھی۔ اس کے برے تیور دیکھکر میں لرز جاتا تھا۔

ایک روز رات کو۔ وہ عید کی رات تھی، مجھے کسی طرح نیند نہ آئی، میں اٹھکر ٹہلنے لگا۔ میرا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ میں نے شرقی دروازے سے جھانک کر باہر دیکھا، عجیب دلچسپ منظر تھا۔ مگر دلچسپ صرف میرے لئے۔ دوسروں کے لئے شاید وہی دردناک ہوتا۔

دلچسپ منظر

نیم کے بڑے گھنے درخت کے نیچے الاؤ سلگ رہا ہے۔ بخشا اور اس کی بی بی پاس پاس بیٹھے ہیں، بالکل الاؤ کے کنارے پر الاؤ جب لو دیتا ہے تو دونو کے چہرے صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ بخشا کی عمر بمشکل تیس برس کی ہوگی۔ اور اس کی بی بی کی زیادہ سے زیادہ بائیس تئیس برس کی۔ بخشا ایک میلا سا تہبند باندھے اور ایک پھٹی سی بنڈی پہنے ہوئے ہے۔ اور بخشا کی بی بی پورا لباس۔ بخشا کی بی بی کے بائیں پہلو میں ایک چھوٹا سا ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا ہے۔ اس پر گاڑھے کی چادر میں لپٹا ہوا کوئی چھ مہینے کا بچہ غافل سو رہا ہے۔ بچے کا چہرہ کھلا ہوا ہے۔ بخشا کی بی بی ذرا ذرا دیر کے بعد بچے پر ایک پر مسرت نظر ڈالتی ہے اور کبھی کبھی جی چاہتا ہے اس کو تھپک بھی دیتی ہے۔ گویا وہ دونوں جہان کی دولت ہے۔ جس کی وہ مالک بھی ہے اور محافظ بھی۔ دل میں بڑی نازاں اور بہت خوش۔

ایک مرتبہ ہوا کا بہت تیز اور ٹھنڈا جھونکا آیا، بخشا کانپ گیا۔ بخشا کی بی بی نے مسکرا کر بخشا کی طرف دیکھا اور ادھر ادھر سے کھینچ کر اپنی گاڑھے کی گلنار رنگی ہوئی چادر کا آدھا حصہ اس نے بخشا کی کمر پر ڈال دیا۔ اس سے مل کر بیٹھ گئی اور ذرا ٹھنک کر ناز سے بولی۔ تم نے آج شہر کی باتیں تو سنائی ہی نہیں۔

بخشا ہنس کر بولا، اری آج کی باتیں بڑی مزے کی ہیں۔ لے میں تو بھول ہی گیا۔ اور سارے راستے یہی سوچتا آیا تھا کہ چنو کی ماں کو آج بڑے مزے کا قصہ سناؤں گا۔ اور پھر بھی یاد نہ رہا۔ میری یاد اب بڑی خراب ہو گئی ہے۔ بخشا نے بچپن میں دو ایک کتابیں پڑھی تھیں۔ اور پھر فرغ مرزا کے ہاں کچھ دنوں خدمتگاری کی تھی۔ اس سے تلفظ بھی صاف تھے۔ اور لہجہ بھی اچھا تھا۔

بخشا کی بی بی شوق میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ چادر ساری ہی اس نے بخشا کے اوپر ڈال دی۔ الاؤ کو ذرا لکڑی سے کریدا، اس میں تھوڑا گھاس کوڑا اور ڈال دیا۔

بخشا نے ہنس کر کہنا شروع کیا۔ "آج میں کام سے چھٹی کر کے گھر واپس آ رہا تھا جس وقت ملک باغ میں پہنچا تو دیکھا کہ آدمیوں کا بڑا مجمع ہے۔ میں دیکھنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ ولایت سے کوئی میم آئی ہے، وہ جگہ جگہ لکچر دیتی ہوئی پھر رہی ہے انگریزی میں لکچر دیتی ہے۔ خیر، وہ تو ہم کیا سمجھتے۔ اس کے ساتھ ایک ہندوستانی مرد بھی ہے۔ وہ میم ایک ایک بات انگریزی میں کہتی جاتی ہے اور ہندوستانی اسی بات کو اپنی زبان میں سمجھاتا جاتا ہے۔"

"آئے ہم بھی سنتے۔"

اس پر بخشا نے بڑی نفرت سے کہا۔ "تو کیوں سنتی بڑی شرم کی باتیں تھیں، وہ کہیں شریف عورتوں کے سننے کی تھیں۔ مجھ سے تو اتنے آدمیوں میں سنی بھی نہ جاتی تھیں۔"

بخشا کی بی بی نے پھر بڑے اشتیاق کے لہجے میں پوچھا۔ "کیا کہہ رہی تھی؟"

"کہہ کیا رہی تھی۔ میں تو حیران ہوں۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ اب قیامت آ ہی گئی۔ کوئی آلہ نکلا ہے۔ یا کوئی دوا ہے۔ یہ کہہ رہی تھی کہ اس کو استعمال کرو۔ بچے مت پیدا ہونے دو۔"

"آئے ہائے، کیوں؟" بخشا کی بی بی نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بال درست کئے، ایک نظر بچے پر ڈالی اور دونوں گھٹنوں پر کہنیاں رکھ کر اور ہتھیلیوں پر اپنی ٹھوڑی، بشوق اور استعجاب سے بخشا کا منہ تکنے لگی۔

"یہ کہتی ہے کہ آدمی بہت بڑھ گئے ہیں۔ اس وجہ سے غریبی پھیل رہی ہے۔ بچے زیادہ ہوں گے تو بھیک مانگتے پھریں گے۔ اس وجہ سے یہ چاہیئے کہ جو غریب ہیں وہ تو بچے پیدا ہی نہ ہونے دیں۔ اور جو امیر ہیں ان کے ہاں بھی اولاد زیادہ نہ ہو۔"

"یہ کون مرگئی ڈائن ہے، لوگوں کے بچوں کو دیکھ دیکھ کر جلتی ہے۔ خدا اسے غارت کرے۔ اب غریبوں کے پاس روپیہ پیسہ نہیں ہے تو ان کے لئے بچوں کی خوشی بھی نہ رہے۔ نوج۔ اور پھر ایک خوشی ہی نہیں امید بھی تو ہے، بچے بڑے ہوں گے کمائیں گے۔ گھر کا دلدر دور ہوگا۔"

بخشا کی بی بی نے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بھینچا۔ اس کے دونوں رخساروں کے چٹاخ چٹاخ بوسے لئے۔ "میرا جنوا ان جب کلکاریاں مار کر اپنے دونوں ننھے ننھے ہاتھ میرے منہ پر پھیرنے لگتا ہے تو پھر نہ بھوک رہے نہ پیاس رہے۔" اور پھر بچے کے منہ سے منہ ملا کر دونوں محبت سے پھر بولی۔ "اول اول چھدری بھی نہیں لگتی، کچھ گم ہو جاتا ہے۔" بخشا کی بی بی نے بچے کو زانو پر لٹا لیا۔ اور اسے تھپک کر پھر بخشا سے مخاطب ہوئی۔

"ارجی اس کے بچے ہوتے نہ ہوں گے؟"

بخشا نے مسکرا کر کہا۔ "اس نے شادی ہی نہیں کی۔ وہ تو مس صاحب ہے۔"

بخشا کی بی بی نے ایک قہقہہ لگایا۔ "اچھا تو یہ کہو۔ اب بات سمجھ میں آئی ٹھیک ہے۔ ایسی عورتوں کے لئے یہ چیز بہت اچھی۔"

بخشا بھی اس کے ساتھ ہنسا۔ وہ پھر ذرا سکوت کے بعد متانت سے بولا "میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ کسی کارخانے میں نوکر ہے۔ یا یونہی نفع میں کچھ حصہ مقرر ہوگا۔ اس لیے وہ ساری دنیا میں کوشش کرتی ہوئی پھر رہی ہے کہ وہ آلہ یا دوا جو کچھ بھی ہو خوب بکے۔ ورنہ یہ ایسا کون سا ثواب کا کام ہے۔ جس کے لئے مس صاحب ولایت سے یہاں تک دوڑتی ہوئی آئیں۔"

"ہاں جی! تم نے سچ کہا۔ یہی ہوگا۔"

بخشا نے کچھ اس انداز سے جیسے اس نے جنو کی ماں کی بات سنی بھی نہیں مسکرا کر بولا۔ "پھر میری یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کچھ دنوں سے ان امیر آدمیوں کو ہم غریبوں کی ایسی کیوں فکر پڑ گئی ہے۔ جہاں دیکھو اس کا چرچا ہے۔ اخباروں میں جلسوں میں کونسلوں میں۔ جو ہے وہ غریبوں کے درد میں تڑپ رہا ہے۔ ممبر، لیڈر، گورنمنٹ سب اور اس پر بھی غریبوں کی مصیبت دور نہیں ہوتی۔ اور بڑھ رہی ہے۔ کچھ نہیں۔ غرض بس اتنی ہے کہ یہ مزدور اور کسان جو مل بانٹ کر کھانے کی بات کو سمجھنے لگے ہیں۔ اس سے ان کا خیال ہٹ جائے۔ اور انھیں یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ امیر آدمی ہمارے ہمدرد ہیں اور ہماری بھلائی کی کوشش کر رہے ہیں۔"

بخشا کی بی بی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "یہ مل بانٹ کر کھانے کی بات کیسی؟"

"اسے تو نہیں سمجھتی ہے، یہ باریک بات ہے، ہم جیسے مزدور اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ دنیا میں جتنی دولت ہے، یہ سب ہماری ہی قوت بازو سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر اس کا بہت بڑا حصہ مل جاتا ہے انھیں جن کے پاس روپیہ زیادہ ہے اور کارخانے

کھول سکتے ہیں یا جن کے پاس زمینداریاں ہیں۔ اب جگہ جگہ لوگ ایسا انتظام کر رہے ہیں کہ مزدوروں کے ساتھ انصاف ہو۔ ان کو مزدوری اتنی ملے جو ان کی بسر اوقات کے لئے کافی ہو۔ بیماری اور بڑھاپے میں انہیں وظیفہ ملے بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں سمجھتا۔

"اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے"

مدبرانہ انداز میں فکر آگیں لہجہ میں بخشا نے کہا۔ "یہ تو بہت اچھا۔ مگر اس میں بیچ بڑے ہیں جن کو بہت سال رہا ہے وہ اب چاہتے ہیں کہ اس میں کمی آئے، اسی کی رو کے تمام کے لئے اس طرح طرح کی باتیں کل رہی ہیں، آبادی زیادہ ہو گئی ہے اولاد نہ ہونے دو۔ لوگ بیاہ شادیوں میں اور تہواروں میں خرچ بہت کرتے ہیں، شب برات پر آتشبازی نہ چھوڑیں، حلوہ نہ بنائیں، عید پر نئے کپڑے نہ بنائیں، سیویاں نہ کھائیں، گویا خوش نہ ہوں"

"اور ہم نے سنا پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ لوگ پڑھتے نہیں اس کو غریب ہیں، اب یہ غل ہے کہ زیادہ آدمی پڑھ گئے ہیں اس وجہ سے بے روزگاری بڑھ گئی ہے اور تو کچھ نہیں مجھے تو اس وقت بڑا غصہ آتا ہے جب غریبوں کے ہمدرد یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ان غریبوں کے حال پر بڑا رحم آتا ہے۔ بس میں یہ نہیں سن سکتا۔ جو چیز انصاف سے ہمارا حق ہے اسے ترس کھا کر اور رحم کر کے دینے کے کیا معنے ہیں، ارے ہم زمین کا سینہ چیر کر روزی پیدا کرتے ہیں اس میں تم اپنی ہوشیاری اور چلتر سے بیچ میں آ کر تین چوتھائی سے بھی زیادہ کے شریک بن جاتے ہو اور پھر اس طرح رحم کھاتے ہو اور ترس کرتے ہو۔ جیسے ہم اپاہج ہیں اور تم سے بھیک مانگنے آئے ہیں غریبوں کو دونوں وقت کھانا ملتا نہیں، وزارتیں پاتے ہیں۔ پانچ پانچ ہزار روپیہ تنخواہیں مل رہی ہیں، دن عید ہے۔ رات شب برات ہے۔ ہر وقت پارٹیاں۔ جلسے۔ جشن۔ ہم غریبوں کی سال میں ایک شب برات ناگوار ہے۔ ہمارے پاس ہے کہاں جو ہم فضول خرچیاں کریں گے۔ فضول خرچیاں ان کی دیکھو جو گورنر کے ایک استقبال میں بیس بیس ہزار روپے کی محض آتشبازی چھوڑ دیتے ہیں، یہ اپنی دعوتوں۔ پارٹیوں، آتش بازیوں اور شکاروں کے بس سال بھر کے خرچ سے ایک کارخانہ کھول دیں۔ مگر کارخانہ بنے وہی "مل بانٹ کر کھانے" کے طریقے پر، دیکھو شہر کے کتنے آدمی خوش حال ہو جاتے ہیں۔ ہم نے ایک شب برات پر حلوہ نہ بنایا۔ عید پر نئے کپڑے نہ پہنے تو کیا اس کی دو وقت روٹی کھا لیں گے؟ ہمارے حلوے اور آتش بازی کی بچت سے کوئی بنک کھلے گا۔ ہم میں فاقہ کرنے کی طاقت ہے تو حلوہ بھی کھا لیتے ہیں۔ کوئی ان کے برتنے پر کھاتے ہیں، جب بارہ گھنٹے کدال چلاتے ہیں تو شام کو چار آنے کے پیسے نظر آتے ہیں۔ سچ پوچھو تو بس ہم ہی ہیں جو اپنا کماتے ہیں، یہ وزیر، بادشاہ سب ہمارے بازو کی طاقت کے طفیل میں جی رہے ہیں۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ یہ ہم ہی پر غراتے ہیں۔ آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ بچے بہت پیدا ہوتے ہیں۔ اچھا اگر یہی ہے تو امیروں کی آبادی کم ہونی چاہیئے۔ جن میں سے ہر ایک پر کئی کئی ہزار بلکہ کئی کئی لاکھ غریبوں کی برابر خرچہ ہوتا ہے۔ اور کوئی چیز یہ پیدا کرتے نہیں ہیں، صبح سے شام تک یوں ہی کرسیوں پر اینڈا کرتے ہیں"

بخشا کی بی بی کچھ اس طرح جیسے کسی خیال نے اس کو سہما دیا۔ بولی۔ "اجی جھر ہم تو کسی کا برا نا چاہتے، اللہ امیر اور غریب سب کو آباد رکھے"

پھر تو نے کہا۔ "نا چاہتے" گنواری کہیں کی، میں دفعہ منع کیا "نا" مت بولا کر "نہیں" کہا کر، مگر وہی "نا نا"

"اجی ہو گا، تمھیں تو ہر وقت ہی رہتی ہے۔ اب میں کوئی پڑھی ہوئی ہوں! تم تو پڑھے ہوئے ہو"

اور پھر کہا "ہے ہے" اری رہتا ہے" کہہ۔

"اچھا رہتا ہے۔ بس چلو اب سوئیں گے، نیند آ رہی ہے۔ پھر سویرے اٹھنا ہے کل عید ہے"

پھر بچے کو جواب بیدار ہو گیا تھا سر کی برابر بلند کر کے بخشا کی بی بی نے خوش ہو تا شروع کیا۔ "آہا جی کل عید ہے۔ اپنے جگنو کو اچھے اچھے کپڑے پہناؤں گی۔ پھر کوئی خیال آیا۔ اور جوش مسرت سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بخشا سے بولی، اور میں نے تمھارے لئے بھی تو چکن کا کرتا بنایا ہے۔ چکن کی ٹوپی سلوائی ہے۔ لٹھے کا پائجامہ ہے مگر جوتا نہیں ہے اس کے لئے دام نہیں بچے۔ آخری جملہ اس نے افسوس کے لہجے میں کہا۔

"بخشا نے حیرت سے کہا۔ تیرے پاس روپے کہاں سے آئے؟"

وہ ناز سے ہنس کر بولی، "میں نے اسی روز کی مزدوری میں سے پیسہ پیسہ دو دو پیسے بچا کر روئی خریدی اسے کاتا اور بیچ دیا۔ پھر سوت کی جو قیمت ملی اس سے اور روئی خرید لی، اسے پھر کات کر بیچ دیا۔ سارے سال یہی کرتی رہی۔ اس میں اتنا ہو گیا کہ تمہارے کپڑے بنائے، اپنے بنائے۔ اور جگنو کے بنائے"

وہ دونوں ہنستے اور خوش ہوتے اپنے ٹوٹے ہوئے چھپر میں چلے گئے، اور میں صبح تک جاگتا رہا۔ اور بخشا کی زندگی پر رشک کرتا رہا کس قدر مطمئن۔ کیسا خوددار، اپنے طریقۂ حصول معاش پر کیسا نازاں۔ نہ بد دیانتی کی ضرورت، نہ ضمیر فروشی پر مجبور۔ اس قدر خوش کہ جب ہنستا ہے۔ تو اس کی ہنسی میں ایک جوش اور زندگی معلوم ہوتی ہے۔ نہ افکار۔ نہ پریشانیاں۔ وہ تو ضروریات ہی اس قدر مختصر ہیں کہ ان سے افکار اور پریشانیاں پیدا ہی نہیں ہو سکتیں۔ میں نے تین روز سوچ کر بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ

انہیں خوش نصیب مزدوروں میں گم ہو جاؤں۔ ایک روز رات کو مزدوروں کی وضع بنا کر گھر سے نکل پڑا۔ مگر آہ نظر اور خیال کی وسعت ایک مصیبت ہے۔ مزدور بن کر بھی خوشی میسر نہ ہوئی۔ اس سوچنے کی عادت کی وجہ سے دنیا میرے لئے جہنم ہی بنی رہی۔"

ڈالی نے رحم آگیں نظروں سے عادل کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی تمہیں اپنی تمناؤں کے سمجھنے میں ہمیشہ غلطی ہوئی۔ جب تمہیں پیاس لگی تو تم نے بجائے ٹھنڈے پانی کے اُس کو شراب سے بجھانا چاہا۔ دل خون ہوا، بی بی کے مرنے سے وسائل معاش کے چھن جانے سے اور سمجھے یہ کہ خدمت کے مواقع جو نہ رہے تو اس وجہ سے یہ حالت ہے۔ شراب بیشک کیف آور چیز ہے، مگر وہ پیاس بجھانے کے لئے نہیں ہے۔ گانا دل میں اُمنگ پیدا کرتا ہے۔ اس سے رُوح کو فرحت ہوتی ہے۔ مگر جب بھوک لگی ہو تو روٹی چاہیئے۔

روٹی، کپڑا، گھر، مرد کے لئے بی بی اور عورت کیلئے شوہر۔ پھر ان دونوں کے لئے بچے۔ یہ زندگی کی ابتدائی ضروریات ہیں۔ یہی دنیا کی سب سے بڑی نعمتیں ہیں اور ہر طبقے کی مخلوق کا معمول ہیں۔ جس وقت یہ حاصل ہوتی ہیں تو بعض عالی خیال لوگوں کو یہ پست اور بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر نہ ہوں یا چھن جائیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا چھن گئی۔ فی الحقیقت یہی انسان کی ساری تمناؤں کا خلاصہ ہیں اور یہی حقیقی ہیں۔ صرف یہی چیزیں ہیں جن کی خود ہمارے وجود کے اندر اشتہا اور طلب موجود ہے، اُن کے پورے کرنے کا تقاضہ انسان کی حیوانی فطرت ہے۔ اس فطرت کو حیوانی کہہ دینے سے شاید تمہارے دل میں تنفر پیدا ہوا اور شاید تم پھر اس کو ذلیل سمجھو، ایسا نہیں ہے، میں نے اس کو حیوانی اس لئے کہا ہے کہ اس کے اقتضات غور و فکر اور مشاہدے کے محتاج نہیں ہیں۔ بھوک تو لگے ہی گی خواہ تم اس کے متعلق سوچو یا نہ سوچو، تم کسی کو کھاتے ہوئے دیکھو یا نہ دیکھو۔ یہی حیوانی اشتہائیں پست بھی ہیں اور بلند بھی۔ انھیں کو عقل کی رہنمائی میں پورا کرنے سے وہ انسان پیدا ہوتا ہے جو مرتبے میں فرشتوں سے بھی اونچا ہو جاتا ہے، اور یہی جب ہوا و حرص کی صورت اختیار کر لیں اور آدمی کو انسانیت کی بلندیوں کی طرف صعود کرنے سے روکیں تو ذلیل ہیں۔ بہیمیت ہیں۔

تم سیاست اور اخلاقیات کی بلند سے بلند گفتگو شروع کر دو میں تمہیں اس کی تلخیص کر کے بتا دوں گی کہ ان کی حقیقت روٹی پانی اور بی بی بچے ہیں۔ اور جب اس ملخص کو پھیلاؤں گی اور اجتماعی صورت دوں گی تو یہی سیاست اور فلسفہ بن جائیگا۔

بے غرض ماہر سیاست ساری قوم کے لئے روٹی کپڑے کی فکر کرتا ہے اور ساری قوم کی بیبیوں اور بچوں کی پرورش کا سامان کرتا ہے۔ ایماندار مزدور صرف اپنے اور اپنے عیال کے لئے۔ اور پست فطرت اور ذلیل سیاسی، اپنا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے قوم کے معصوم بچوں کے ہاتھوں سے لقمہ چھین لیتا ہے۔ تم نے اپنے حیوانی معدے اور دل کو فاقہ کشی میں مبتلا کیا اُس سے انسان پیدا کیسے ہوتا۔ وہ تمہاری انسانیت کو پرورش کرنے کی جگہ اس کے خلاف بغاوت کرتے رہے۔ ان طبعی اشتہاؤں کو اگر عدل کے ساتھ پورا کرتے تو عادل حیوان سے عادل انسان پیدا ہوتا۔

پھر سن بھی لیا تو غلط شاہین بلند پرواز و صید افگن مرغ خانگی سے سبق لے انوکھی بات ہے۔ وہ بیچارہ بخشا سمجھدار مزدور سہی، مگر بس اتنے کے لئے پیدا ہوا ہے کہ ہوشیاری سے اپنی حوائج پوری کرلے۔ اور تمہیں قدرت نے یہ صلاحیت دی ہے کہ ایک بڑی قوم کی نجات اور پرورش کی فکر کرو۔ یہ کام فروٹ مارکیٹ میں نہیں ہو سکتا۔

پہلے اپنے حیوانی وجود کی طبعی اشتہائیں پوری کرو کہ وہ قبرستان میں جا کر فریادیں نہ کرے۔ اور پھر اپنی قوم کو گِدوں کے ہجوم سے بچاؤ جنھیں اپنے رفقائے کار کہتے ہو۔ اور جن کی بے اعتنائیوں سے دل شکستہ اور پا شکستہ ہو کر کہیں گم ہو جانا چاہتے ہو۔ اس سے زیادہ اونچے اُڑو جتنے پہلے اُڑے تھے۔ جتنے سخت بال، بلند پرواز اور دیر دم طیور ہیں اُس وقت تک ہوا پر شباب نہیں ہوتے جب تک یہ تمام پہنائے آسمان اُن کے بازوؤں کے نیچے نہیں آجاتا۔ تم ابابیل کی بلندی تک اُڑے اور کانپ کر گر پڑے، اُن کی تقلید سے گریز کرو جن کی کمزوریوں سے اور نیتوں سے تم واقف ہو۔ نیا پلیٹ فارم قائم کرو۔ اور رہنمائی کے لئے خود آگے بڑھو۔ یہ کیا پست ہمتی ہے کہ ناکامی کا ذمہ دار دوسروں کی بد اعمالیوں کو قرار دو اور خود گوشہ گیر ہو جاؤ۔ اگر مقاصد کے حصول کی کوشش کو ترک نہ کرو تو ہر ناکامی انجام کار منزل کی طرف ایک اقدام ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر ترک کر دو تو اسی قدم پر شکست ہے۔ ڈالی یہ کہہ کر ساحرانہ انداز سے مسکرائی اور والہانہ دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے عادل کی طرف بڑھی، اس کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور سر اُس کے شانے پر رکھدیا۔

"تم میری خاطر بھی دوبارہ زندگی اختیار نہ کرو گے؟"

عادل نے سر جھکا کر اپنا رخسار ڈالی کے رخسار سے مس کیا۔ "کروں گا، مگر اس کا سامان؟" وفورِ جذبات سے ڈالی کا گلا بند ہوا جا رہا تھا اُس نے دھیمی گھٹی ہوئی آواز میں کہا "وہ فراہم ہے، تم اُس کی فکر نہ کرو"

شاعر کی تمنائیں

اگر اے شمع دل جلنا ہی تھا تجھ کو تو جلنا تھا
کسی بیکس کی تربت پر چراغ نیم جاں ہوکر

یہ حسرت تھی کہ موجوں کے تلاطم میں بہے جاتے
خود اپنی فطرتِ آزاد رَو کے پاسباں ہوکر

تھکے ماندے مسافر کو سُلا دیتے لبِ چشمہ
ہوائے سرد بنکر موجۂ عنبر فشاں ہوکر

بتاتے حالتِ رفتارِ شب صحرا نشینوں کو
نجومِ چرخ بن کر کارواں در کارواں ہوکر

اک ایسی بانسری ہوتے جو کہتی اپنا افسانہ
سکوتِ شامِ صحرا میں رندھے دل کی فغاں ہوکر

"دلِ فطرت" کی اُٹھتی کونپلوں کو چھیڑتے پھرتے
بہارِ رنگ و بو بن کر نسیم گُل فشاں ہوکر

گزر جاتے فغاں کرتے ہوئے سنسان جنگل سے
فضاؤں کو جگا دیتے درائے کارواں ہوکر

جنوں انگیز طوفانوں سے ہوتے معرکہ آرا
زمانے کی ہوا میں کشتیِ بے بادباں ہوکر

اُمید و بیم کے جھگڑے مٹا دیتے زمانے سے
خودی کا دیوتا ہوکر، خدا کا "ترجماں" ہوکر

کچل دینے برس پڑتے سرِ مغرورِ منعم پر
بہ یک تحریکِ خودداری عصائے کاسباں ہوکر

یہ اشکوں کی جھڑی بیکار ہے اس کو برسنا تھا
کسی دہقان کی کھیتی پہ ابرِ دُرفشاں ہوکر

کسی کی "آرزو" کرنی ہی تھی تو عمر بھر کرتے
جوانی میں "ہوس" بن کر بڑھاپے میں جواں ہوکر

ترقی منحصر عصیاں پہ ہے مقصود فطرت کی
تڑپتے سینہ ہائے شوق میں "رازِ زباں" ہوکر

فریبِ حُسن دیتے دیدۂ کورِ تمنا کو...
نگاہِ دل نشیں ہوکر ادائے دلستاں ہوکر

حکایت برق و خرمن کی فسانہ دل کی دھڑکن کا
بعنوانِ وفا کہتے نگاہِ عاشقاں ہوکر

یہ حسرت تھی کہ عالمگیر ہوتی روشنی دل کی
یہ حسرت تھی کہ چھا جاتے زمیں پر آسماں ہوکر

مگر کیا کیجئے جب فیصلہ یہ ہے مشیت کا
کہ ہم "فطرت" کی آنکھوں سے گریں "اشکِ رواں" ہوکر

احسن احمد آشک۔ کلکتہ

مردِ مُضحک

(اسرائیل احمد خاں سکندرآباد دکن)

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۸)

کپتان نے اپنی زبان کے "مُبَلّغِ بلند بانگ" کو پھر بجانا شروع کیا۔

"سخت کوشش کرو رفیقو! اپنے تمام ممکنات مردانہ کو کام میں لاؤ! ذہانتِ انسانی کا کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہ کرو! ہمیں اپنی آیندہ بحر پیمائی میں اب مغرب کی طرف رُخ پھیرنا ہے! گھنٹی کی آواز سے ہم صحیح راہ کا تعین کرتے رہیں گے۔ قسمت آزمائی کے موقعے ابھی بہت کچھ باقی ہیں! ہمّت شرط ہے!"

ان تلقینات و ہدایات کی پیروی کی گئی۔ چنانچہ بعض بادبان گرا دیئے گئے۔ کچھ اور ردّ و بدل بھی کئے گئے۔ یہ باتیں ایک حد تک مؤثر ثابت ہوئیں۔ لیکن پھر ایک حد تک ہی! طوفان کی مزید اشتداد پذیری نے کشتی کو قریبًا معذور کر دیا ہے۔ کوہ پیکر موجیں اُٹھ رہی ہیں جو اِس قہاری سے کشتی پر ضربیں لگاتی ہیں کہ گویا اُسے پاش پاش کر ڈالیں گی!۔

ناگہاں طوفان نے ایک پُرزور تھپیڑ لگایا۔ بالائی بادبان پارہ پارہ ہو گئے۔ رسّیاں تار تار ہو گئیں۔ اور مستول جڑ سے اُکھڑ گیا۔ ساتھ ہی پانی کا ایک سَیل عرشے کو صاف کرتا ہوا نکل گیا! برف باری نے اس شکست و ریخت کو مکمّل کر دیا! چنانچہ سگنل کی روشنی بھی تباہ ہو گئی! جس کا بدل پیدا کرنے کے لیے ایک لکڑی کا ٹکڑا جلایا گیا۔ جس پر بعض آتش گیر مادے لگے ہوئے تھے۔

لیکن شاید کامل مایوسی اب بھی قبل از وقت تھی۔ اُمید کی ایک شعاع اب بھی روشن تھی۔ اس لئے کہ کشتی کا زیریں حصہ ہنوز صحیح و سالم تھا۔ شکستہ مستول کو بمصداق "عطائے تو بلقائے تو" سمندر ہی میں پھینک دیا گیا! لیکن جا بجا سے بقیہ کشتی کی ضروری رخنہ بندی کر لی گئی!۔

مگر اب اک اور بلا خیز موج آئی۔ سمندر کے سفید کف میں "میٹونا" ملفوف ہو گئی! اور اسی شور و شور میں ایک کرخت آواز سُنائی دی!

جب مطلع صاف ہوا تو کپتان، اور اُس کے کھڑے ہونے کا پائدان دونوں غائب تھے!!

"لنگر ڈال دو اور کپتان کی تلاش کرو!" سب اہلِ کشتی چلّائے۔

لنگر ڈالا گیا، مگر اس بحرِ زخار میں وہ بالکل گم ہو گیا! لنگر کی بھاری بھرکم زنجیر اک تاگے کی طرح لرزنے لگی!

کشتی اب قطعًا بے دست و پا ہے، اور ہر قسم کی ارادی حرکت سے قاصر۔ بے بسی کی دو ایک حرکاتِ مذبوحی کے بعد اُس نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اپنے تئیں طوفان کے رحم پر چھوڑ دیا!

اِن ہوشربا حادث کا تماشا عرصۂ بحر ہی پر دیکھا جا سکتا ہے۔

کرۂ ارض کے خشکی کے طبقے میں یہ ہولناکیاں غیر معلوم ہیں!

طوفان فاتحانہ نعرے لگا رہا ہے!

گھنٹی نے پھر ماتمی نغمہ بجایا:

مستول و بادبان سے فارغ البال کشتی اب اک "کاگ" کی طرح بہہ رہی ہے۔ اُس کی اس اضطراری حرکت پر "رفتار" کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا! سطح بحر پر وہ ایک مُردہ "وھیل" کی طرح تھپیڑے کھا رہی ہے! ہر ساعت اُس کے اُلٹ جانے کا خطرہ ہے۔ لیکن اس انجام سے اُسے یہی چیز بچائے ہوئے ہے کہ اُس کے زیر آب شکم میں کوئی سوراخ نہیں ہوا! یہ بڑی خوش قسمتی کی بات تھی، اس لئے کہ پمپ سب ازکار رفتہ ہو چکے تھے۔

سیٹیو شنا بر سکرات موت کا عالم نظر آ رہا ہے: راکبانِ کشتی کی حالت قابلِ رحم ہے: وہ شکستہ تختوں اور رسیوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ جن کی نکلی ہوئی کیلیں ہاتھوں کو زخمی کئے ڈالتی ہیں!

گھنٹی جو اَب تک وقتاً فوقتاً آواز دیتی رہی تھی اب بالکل ساکت ہو گئی ہے! طوفان زدہ لوگ اب اس معاملے کے متعلق بالکل تاریکی میں ہیں کہ وہ سمندر پر کس موقع و محل پر ہیں! گھنٹی کی آواز نے اُن پر "وحشت" طاری کی تھی، اب اُس کی خاموشی نے حالت میں ایک "مجہولیت" پیدا کر دی! اب وہ اپنے خطرہ کی پیمایش کے بھی ناقابل ہیں! گویا وہ ایک "غیر ناطق خطرے" میں گرفتار ہیں۔ جو اُتنا ہی مہیب ہے جتنا کہ مبہم!—

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

بحرِ اعظم کا شرِ خرام اور جوشِ انتقام ابھی تمام نہیں ہوا! وہ وہ بدستور کشتی کے دَرپئے آزار ہے! ؎

شاہبازے بہ شکارِ مگسے می آید!

کشتی اب یکّہ تازِ طوفان کے ساتھ ایسی بے تحاشا اُڑی چلی جا رہی ہے کہ گویا کسی شخص کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اُسے اندھا دُھند بھگایا جا رہا ہو! ؏۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں!

ناگہاں ایک روشنی چمکی، اور اہلِ کشتی بے اختیار چلّا اُٹھے۔

منارہ! منارہ!!

(۹)

جو چیز اہلِ کشتی کو نظر آئی تھی اور جسے دیکھ کر اُنہوں نے ایک بے محل نعرۂ مسرت بلند کیا تھا وہ حقیقتاً کوئی "لائٹ ہاؤس" نہ تھا! وہ اک روشنی ضرور تھی، لیکن اُس کی تعبیر منارۂ بحری کی حیثیت سے کُلیتاً صحیح نہ تھی! غریب کشتی شکستہ لوگ اس مغالطہ کے انکشاف سے بہت ملول ہوئے۔ انتہائی ہجومِ یاس نے اس اُمیدِ موہوم کی اعتباری لذت سے بھی ہاتھ دھوئے! اب تمام کوششیں بے سود تھیں، اور ہر چارہ کار بیکار! "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" کا معاملہ تھا! کشتی کشاں کشاں ایک چٹان کی طرف بہی چلی جا رہی ہے!

تن بتقدیر یہ لوگ بھی ہر اُفتاد کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے! وہ نوشتۂ تقدیر کو مٹنے کے بجائے اب اُس کو "پڑھنا" چاہتے ہیں! طوفان مطلق العنان بادشاہوں کی طرح نامعقول و غیر مسئول معلوم ہوتا ہے! وہ راکبانِ کشتی پر اک قہر توڑ رہا ہے، لیکن اُن بے کسوں کو مجالِ دم زدن بھی نہیں!

لیکن اس "مستبدِ فطرت" نے اب یکبارگی اک تلوّن مزاجی کی ادا دکھائی! یعنی پانی پایاب ہونے لگا! چٹان کے زیریں حصے والے تحت البحر غار میں لہروں کی ضربوں سے اک مخصوص شورش برپا تھی۔ یہ غار چٹان کے سنگِ خارا کے پیکرِ مہیب میں اک خونخوار دہانہ تھا! شکل کے اعتبار سے وہ اک جہازی گودی کے مشابہ تھا، لیکن عمل کی بناء پر وہ اک "بابِ المندب" تھا، جس میں شکستہ جہازوں کے ملبے اور غرق شدہ انسانوں کے پنجروں کے انبار لگے ہوئے تھے!

بارش اور برف نے ابر و غبار کو کچھ چھانٹا۔ چٹان پر جو آگ روشن تھی اُس کے شعلوں کی زبانوں اور لکہ ہائے ابر کے درمیان دو سانپوں کی طرح چونچیں ہونے لگیں۔ دوسری طرف آگ کی چنگاریاں برف کی قلموں

سے ہم آغوش ہو ہو کر اک "غیر ہم جنس پرواز" میں معروف تھیں! یہ اک گرم دل عاشق کی گرم جوشانہ ہم آغوشی تھی جس کی شرکت سے گریز کرنا اک سرد مہر معشوق کے لئے بھی ممکن نہ تھا!

آئرستانی عورت (یکے از اہل کشتی) نے زور زور سے تسبیح پڑھنا شروع کی! چٹانی منظر کی یہ بوالعجبی اُسے اک مخدوش شگون نظر آئی!

ناخدا کے بعد اب کامپرتیشیکو سردار اُس کا قائم مقام ہوا۔ درحقیقت کشتی کا کما نڈر یہی شخص تھا، اوّل الذکر کی حیثیت صرف اک "رہبر بحر" کی تھی۔ سارے باسکے لوگ بحری چٹانوں اور سمندر کے طوفانی مرگزوں سے گہری واقفیت رکھتے ہیں، اور حسب اقتضائے وقت بے جگری اور خوش تدبیری دونوں کا ثبوت دیتے ہیں!

سمندر نے اب اک اور بازیگری دکھا لی! یکبارگی چٹان کی روشنی چٹان کی چوٹی کے پیچھے چھپ گئی! اب تاریک پہاڑ سی اک سیاہ فام دیو ہیکل "ابوالہول" بن گئی، جس کے سر کے گرد اک آتشیں حلقہ نظر آتا تھا!

کامپرتیشیکو سردار بالآخر بولا۔

"ایک آدمی چاہئے جو اپنی ہمت مردانہ سے اک رسّی چٹان تک لے جائے!"

مگر صدائے برنخاست!

بدقسمتی سے اہل کشتی میں سے کوئی تیرنا نہ جانتا تھا! کمال یہ کہ ملّاح بھی اس فن سے ناآشنا تھے! ایسے لوگوں کا جن کو سمندر سے آئے دن کا سابقہ رہتا ہو، تیراکی و غوّاصی سے اس طرح نابلد ہونا بجائے خود اک راز تھا!

آخر خود کپتان نے اپنے رفیقوں کی مدد سے ایک شہتیر پر جو اب بھی کشتی سے اُلجھا ہوا تھا، گرفت قائم کی۔ اس چیز سے کپتان اک خاص کام لینا چاہتا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ سب لوگ مل کر شاہ بلوط کی اس لمبی چوب کو نیزے کی طرح اپنی بغلوں میں دبالیں، اور قریب پہنچنے پر اُس کی نوک کو چٹان کے پہلو میں پیوست کر دیں تاکہ کشتی براہ راست تصادم سے بچ جائے،

لیکن یہ اک نہایت خطرناک عمل حربی تھا! پہاڑ پر اس طرح ضرب لگانا کوئی معمولی کام نہ تھا! اس کے نتیجے میں ایک سخت دھچکے کا لگنا ناگزیر تھا، جو اُن کی بغلوں کو زخمی کر ڈالتا، اور ممکن تھا کہ کچھ لوگ دھکا کھا کر سمندر میں جا پڑتے!

سیہ بخت راکبانِ کشتی کیسی کیسی اُفتادوں سے دوچار ہوئے! کبھی نامعلوم جزیرے ملے، اور کبھی کوئی مخفی سنّد، اور اب اک اٹل سنگ راہ سامنے تھا! مصائب متعدد بھی تھے، اور متنوع بھی!

کشتی چٹان کے بالکل قریب پہنچ گئی ہے، اور چوب و سنگ کا تصادم اب صرف چند لمحوں کا معاملہ ہے! چٹان اک شکاری کی طرح کشتی کا انتظار کر رہی ہے!

ناگہاں اک موج نے اس تنگ مہلت کا بھی قبل از وقت خاتمہ کر دیا! اُس نے کشتی کے پیچھے سے آ کر زور سے اُسے دھکا دیا، اور نیچے گھس کر گیند کی طرح اُسے اُچھال دیا!

"مضبوط رہنا جواں مردو!" کپتان نے للکارا، "یہ صرف اک بیجان چٹان ہے، اور ہم صاحب عزم و ہمت فرزندانِ آدم ہیں!"

آخر ٹکر ہو گئی! سمندر کے جھاگ نے کشتی کو گھیر لیا، جو ایسے موقعوں پر ہمیشہ ان ناقابلِ دید مناظر پر پردہ ڈال دیا کرتا ہے!

لیکن جب پردہ اُٹھا تو اہل کشتی عرشۂ کشتی پر متحرک نظر آئے، اور کشتی چٹان کے پہلو میں تیرتی دکھائی دی: کشتی سلامت تھی! شہتیر اپنا کام کر گیا تھا!

دیکھتے ہی دیکھتے کشتی آگے بڑھ گئی، اور ہوا کی تیز رفتاری نے بہت جلد اُسے دُور پہنچا دیا! چٹان فاصلے پر پس پشت رہ گئی!

اب چٹان اک معصوم ہستی کی ہیئت کذائی سے نظر آ رہی ہے! کشتی کا صیدِ رمیدہ اُس کے چنگل سے نکل گیا ہے!

نام نہاد منارۂ بحری دور ہو گیا۔ وہ رفتہ رفتہ زرد ہوا، پھر ماند پڑا، اور بالآخر کار نظروں سے غائب ہو گیا۔

کا گت گمتی، اور رہنما روشنی پھر بھی اک گونہ "انسانی آثار" تھے۔ مگر اب تو کشتی اس ناپیدا کنار بحرِ زخار میں تمام بحری شاہراہوں سے الگ، اک شترِ بے مہار کی طرح اُڑی چلی جا رہی ہے! یہ صورت پہلے سے بھی زیادہ مجہول اور مخدوش ہے!!

(۱۰)

کشتی ایک تاریک و نامانوس "آبی سرزمین" میں چلی جا رہی ہے۔ اک خطرناک دہانۂ بحر سے بمشکل نجات ملی تھی کہ قسمت نے اک گمنام بحرِ اعظم کی لامحدود وسعتوں کے حوالے کر دیا! پہلی چٹان پر بڑی خیریت گزری تھی، اور اُس موقع پر اہلِ کشتی نے جس کامیاب ہمت و قابلیت کا ثبوت دیا تھا، اُسے بلاشبہ اک زبردست فتح سے موسوم کیا جا سکتا تھا، تاہم اُنہوں نے کوئی نعرۂ فتح بلند نہ کیا! بحرِ اعظم کے اس عالمِ جلال میں ایسی گستاخی و شوخ چشمی کا ارتکاب ممکن بھی نہ تھا ایسی بیچارگی اور مایوسی کی حالت میں ایسے سنگین حادثے سے بچ جانا قسمت کا اک نہایت ہی سنجیدہ مذاق تھا! تقدیرِ الٰہی اپنی مطلق العنانی و بوالعجبی کو قائم رکھنے کے لئے بکثرت اوقات عین متوقع و مسلّمہ حوادث سے بھی بچا دیا کرتی ہے!

تاہم راکبانِ کشتی غیر معمولی انتشار و خلفشار میں گرفتار ہیں۔ اُمید پروری کے سارے داعیات اُن کے اعماقِ قلب میں سوخت ہو گئے ہیں! رجائیت کا اک شائبہ و سایہ بھی اُن کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں نظر نہیں۔ لیکن نفسِ انسانی کے اسرارِ بے پایاں ہیں! عالمِ روح کے عجائبات کا احاطہ اک عالمِ متبحّر کے لئے بھی آساں نہیں۔ تاریک ترین مطلع پر بھی انسان کی ازلی اُمید آشنائی کسی نہ کسی متبسم شعاع کو دیکھ لیتی ہے! چنانچہ اک اُمید پرستانہ خوش فہمی اور اک خود فریبانہ سادہ لوحی اہلِ کشتی پر بھی غالب آئی! وہ ایک دفعہ پھر اپنے کو سارے خطروں اور حادثوں سے مامون و مصئون سمجھنے لگے! لیکن ؏

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال!

یکبارگی اک نیم مُبہم بلندی سطحِ آب پر نمودار ہوئی! سب لوگ متحیّر و مشتاق نگاہوں سے اِس شے کو دیکھنے لگے!

یہ آرشیج کی چٹان ہے! ؏

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ!

(۱۱)

بحرِ اعظم کی بے رحمی اور ستم ایجادی کا جذبہ نا مُتناہی ہے۔ انسانِ ضعیف البُنیان کی طاقت و استقامت کا ذخیرہ کہاں تک ساتھ دے؟! خون آشنا م طوفان کی تشنگی ناقابلِ تسکین ہے!

بے کس اہلِ کشتی نے اپنے سردار کی طرف دیکھا، جو اُن کا تنہا تکیۂ اُمید اور مایۂ تشفّی تھا۔ اپنے آدمیوں کی نگاہِ یاس کو دیکھ کر اُس نے مردانہ وار اپنے شانوں کو جنبش دی! زہرہ آب آب کر دینے والے اس ہنگامۂ محشر کی اس سے زیادہ توہین و بے وقعتی اب اُس کے لئے بھی ممکن نہ تھی!

بیچاری میٹیوٹنا اب اک اُجڑے تختے کی طرح نظر آ رہی ہے۔ آرشیج جو اَب اُس کی منزلِ "غیر مقصود" ہے، اور جس کی طرف وہ اس وقت "موکشاں می بَرَد زور آورے" کی مصداق ہی چلی جا رہی ہے، دراصل اک اور سنگی سدِ بحری ہے۔ پہلی چٹان سے اگر کشتی ٹکرا جاتی تو بلاشبہ پاش پاش ہو جاتی، لیکن اگر اُس کا تصادم اس گراں تر "سنگ آمد و سخت آمد" سے ہو گیا تو سُرمہ ہی ہو جائیگی!

صرف ایک صورت نجات کی نظر آتی ہے، اگر کوئی لہر اس طرح آئی کہ اُس کے پورے طول کے ختم ہونے سے پہلے کشتی اس سنگی دیوار تک پہنچ گئی تو اک بھرپور ٹکر ناگزیر ہے، اور اگر اُس نے اپنا دور اس سے قبل پورا کر لیا تو پھر کشتی بچ جائے گی، اس لئے کہ موج چٹان سے ٹکرا کر قدرتاً پیچھے ہٹے گی، اور اپنی بازگشت میں از خود کشتی کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لے گی! اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دو صورتوں میں سے کون سی صورت پیش آتی ہے؟

اُف، موت اور نجات اس طرح توأم ہیں!

حُسنِ اتفاق سے، اور اک نہایت ہی نادر خوش قسمتی کے طفیل میں، ایک لہر آئی اور کشتی کے نیچے سے ہو کر نکل گئی۔ کشتی چٹان کے عین قریب جا کر پسپا ہونے والی موج کے ساتھ پیچھے کھنچ آئی، اور چٹان کے پہلو میں سے ہو کر آگے بڑھ گئی! کپکپا جانے والے راکبانِ کشتی کی جان میں جان آئی!

طُرفۃ العین میں آرچیچ بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کشتی شکستہ گروہ کے لئے یہ دوسرا موقع تھا کہ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت!

(۱۲)

شبِ چیز است آنکہ پایانے ندارد

شبِ من، دردِ من، افسانۂ من!

معاً اک ابرِ غلیظ چھا گیا! کشتی اُس میں گم ہو گئی۔ اہلِ کشتی اب کس جگہ پر ہیں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا! ساتھ ہی سخت ژالہ باری ہونے لگی! جس سے اگرچہ سر پھوٹے جاتے تھے، لیکن عورتوں نے باوجود شدید اصرار کے "کیبن" میں جانے سے انکار کر دیا! ایسی ہلاکت بار فضا میں کیبن کی چھت اُن کو "قبر کی پہلی منزل" معلوم ہوتی تھی!!

میٹیوٹنا اب آرگنی کے مُہلک ساحل کی سمت میں رواں ہے!

آرچیچ کی چٹان اسی حصارِ بحری کی بیرونی چوکی تھی! یہاں کے پیچ در پیچ کناروں اور کھاڑیوں میں موجوں کی مزاحمت سے طبعی حالات میں بھی کم و بیش اک تلاطم سا برپا رہتا ہے! یہ پھر اک خطرناک موقع ہے، اور کشتی اب اسی کے گرداب میں آ رہی ہے!

مجمع الجزائر آرگنی کا مغربی حصہ اک تحت البحر چٹان ہے۔ صورۃً یہ اک عظیم الجسم کچھوے سے مشابہ ہے، جس کی جسامت ہائیڈ پارک (لندن کی وسیع و عریض تفریح گاہ) کے رقبے کے برابر ہے! کشتی نے نقطۂ شمال کی طرف رُخ کیا۔ شمالی مغربی ہوا کے جھونکوں میں میٹیوٹنا تیر کی طرح جا رہی ہے!

بحرِ اعظم کے اس خطے میں جغرافیۂ طبعی کا اک خاص منظر مشاہدے میں آیا کرتا ہے۔ نارمنڈی کے ملاح امواج کی ان لاعبانہ جولانیوں کو "سمندر کی یکہ تازی" کہا کرتے ہیں!

دراصل یہ اک بے پناہ ورطۂ ہلاکت ہے، جس میں لہروں اور موجوں کے بے شمار پیچ در پیچ حلقے نظر آتے ہیں۔ جہازوں کے حق میں یہ اک گلوگیر دامِ سخت ہے! جہاں کوئی کشتی اُس کی لپیٹ میں آئی اور اُس نے اُسے تیز تیز گردشیں دینی شروع کیں! اس عملِ چرخ سے بہت جلد اُس کی چولیں ڈھیلی ہو جاتی ہیں۔ مستول و بادبان درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ اور کشتی کی رفتار بالکل مُختل! اب بھنور کا چکّر اُس پر غالب آنے لگتا ہے، اور آخر کار اک زور کی یورش میں اُسے نشیب میں دبا کر ڈبا دیتا ہے!

غرقابی کے مقام پر سمندر کے کف کا اک حلقہ سا پیدا ہو جاتا ہے جس میں ہوا کے بُلبلے نمودار ہوتے ہیں جو ڈوبنے والوں کی جاں کنی اور ضیقِ نفس کی دل گداز علامات ہوتی ہیں!

اگر آبنائے انگلستان کا کوئی مقامی جہازی رہنما ہوتا تو اُنہیں اس خطرے پر متنبہ کرتا، مگر اپنی لاعلمی کی حالت میں وہ صرف اک قیاسی پیش بینی و پیش بندی ہی سے کام لے سکتے تھے۔ تاہم ایسے موقعوں پر قیاسِ بسیط بھی کافی بصیرت افروز ہوا کرتا ہے! شدید خطرات کے ناگہانی نزول کی ساعات میں فطرت جو فراست عطا کیا کرتی ہے وہ اک گونہ "الہامی اِلقاء" کا اعجاز رکھتی ہے!

طوفانی اور طولانی موجیں اُٹھ رہی ہیں، جو ابر و غبار کی فضا میں اور بھی مبہم و مہیب معلوم ہوتی ہیں۔ میٹیوٹنا اب اس پُر خطر حلقے کی سرحد کو مَس کر رہی ہے!

اب کیا ہوگا؟!

غالباً یہی کہ بھنور کا چکّر اُسے اپنے دامِ گرداب میں گھسیٹ لیگا۔ پھر کوئی بڑی موج اوپر سے آ دبائے گی اور کشتی کو "آبی قبر" میں دفن کر دیگی۔

اس عالمِ بیم و رجا میں ایک حیرت خیز اور پُر اسرار اُلٹی لہر آئی جس نے دیکھتے دیکھتے میٹیوٹنا کو چٹان کی زد سے ہٹا کر کھلے پانی میں ڈال دیا!

یہ کیا ماجرا تھا؟!

ہوا یہ کہ ہوا کا رُخ یکبارگی بدل گیا! سمندر کے تنفس میں اک تغیّر

پیدا ہوا اور معاً اُس نے دوسرے تھپیڑے سے سانس لینی شروع کر دی!
اب جنوبی مغربی ہوا شمالی مغربی طوفان کی قائم مقام ہے!

کرۂ باد کی موج کرۂ آب کی لہر پر غالب آگئی۔ ہوا نے اپنے شکار کشتی کو گویا اپنے حریف سمندر کے چنگل سے چھین لیا۔ اور اسے اپنے حسب مرضی دوسری سمت میں لے چلی!

یہہ لطیفۂ غیبی کشتی کی جاں بری کا بہانہ بن گیا! ع

ہزار خطرہ بہ دام و ہزار رفتہ بدام!

الغرض یہہ بحری طوفان کی نیرنگیاں عجیب ہوتی ہیں: اس معاملے میں وہ نیرنگ سازِ ازل کا مثیل ہوتا ہے: ع

ہر لحظہ برنگِ دگر آں یار برآمد!

سمندر کے سفر میں انسان کو مطمئن ہونا چاہئے نہ مایوس! سارا دارومدار بحرِ اعظم کی بے نیازی یا ذرّہ نوازی پر ہے! قدرت کا رنگِ جلال کبھی "ریحٌ طَیِّبَۃٌ" کو "مَوْجٌ مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ" میں تبدیل کر دیتا ہے، اور کبھی خدائے کارساز کی مسبب الاسبابی طوفان کے تھپیڑوں سے ناخدائی کا کام لے لیتی ہے! الغرض سطحِ بحر طوفان کی مطلق العنانیوں کی بازیگاہ ہوا کرتی ہے۔ جہاں وہ کشتیوں اور جہازوں سے کھلونوں کی طرح کھیلتا ہے! ؎

دریا بہ وجودِ خویش موجے دارد
خس پندارد کہ این کشاکش با اوست!

سمندر ایک متلون المزاج خونخوار درندہ ہے جو کبھی اپنے پنجۂ فولادی کو عُریاں کرتا ہے، اور کبھی اُسے اک دستانۂ مخمل میں لپیٹ لیتا ہے! کبھی وہ جہازوں کو آناً فاناً تباہ کر ڈالتا ہے اور کبھی بتدریج اُن کی شکست و ریخت کرتا ہے! وہ بلی کی طرح اک زخمی چوہے سے چہلیاں کھیلا کرتا ہے!

جنوبی مغربی ہوا کشتی کو چٹان سے بچا کر اپنی سمت میں لیجا رہی ہے، لیکن اُس کی رفتار میں بھی تیزی اور تندی وہی طوفانی ہے! وہ کشتی کی مشکل کشا ضرور ثابت ہوئی ہے، لیکن وہ گویا ایک وحشت مزاج نجات دہندہ ہے، جس کی دستگیری میں بھی اک "سخت گیری" ہے!

میٹیو ٹینا اپنی شکستہ رسیوں کے دُم چھلّوں کے ساتھ آندھی کی رَو میں اس ہیئتِ کذائی سے اُڑی چلی جا رہی ہے کہ گویا وہ کسی عورت کی لاش ہو جسے بالوں سے پکڑ کر کوئی گھسیٹے لئے جا رہا ہو!

کشتی کی نصف تباہی کے بعد اُس پر طوفان کی یہ نظرِ کرم، کچھ اُس حقیقت کی یاد دہانی کرتی ہے کہ کوئی مستبد بادشاہ تباہ کن انقلاب کی پوری قربانیوں کو وصول کر لینے کے بعد علمبردارانِ حُرّیت کو "منشورِ آزادی" عطا کر دے! ع

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است!

جنوبی مغربی ہوا کی برق رفتاری، شمالی مغربی طوفان کے ہیجان سے کسی طرح کم نہیں! کشتی ایک پرکاہ کی طرح اُڑی جا رہی ہے۔ کشتی کے مسافر اُس کی رسیوں سے بُری طرح چمٹے ہوئے ہیں۔ ایسے قہار جھکڑ میں اُن کا کشتی کے تختے پر قائم رہنا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ناامیدی کے لمحوں میں آدمی جی جان لڑا دیا کرتا ہے، اور اُس میں المضاعف طاقت آجاتی ہے۔ خوف و دہشت کی کشاکش میں ایک بچے کے ہاتھ کی پکڑ دیو کے پنجے کی طرح قوی ہو جاتی ہے! اک لڑکی کی نرم و نازک اُنگلیاں تختۂ فولاد میں پیوست ہو جاتی ہیں! طوفان زدہ راکبانِ کشتی اِس وقت اِسی پُراسرار، فوق العادت قوّت و استقامت کے بنے ہوئے ہیں۔

بارے خدا خدا کر کے طوفان ختم ہوا! اور اس مورد صد آلام گروہ کو اُس زحمتِ صَعْب سے نجات ملی! ع

آنچہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب؟!

(۱۳)

طوفان کا دفعتہً خاتمہ ہوگیا۔ کرۂ ہوا کا پُرشور طبل نواز فلائے مطلق کی طرح ساکت ہے! بارش بھی جو اس سے قبل ایسے تسلسل سے ہو رہی تھی کہ گویا آسمان کے دریچے کھل گئے ہیں، اب قطعاً بند ہے! ژالہ باری بھی موقوف ہوگئی ہے! اولوں کی جگہ اب برف کے گالوں نے لے لی جو آہستہ آہستہ بالائی فضا سے نزول کر رہے ہیں! سمندر میں اب موج

کا نام تک نہیں۔ سطح بحر اک ہموار میدان کی طرح نظر آ رہی ہے۔ کشتی خوابیدہ بحرِ اعظم کی پشت پر خراماں ہے!

نصف شب کے قعرِ آسمانی کی لامتناہی تیرگی کشتی کے گرد محیط ہے! تمام ارض و سما اک عالمِ ظلمات ہے! ٹیٹیوٹینا اک تیرہ و تاریکی زمین کی تہہ میں تیرتی معلوم ہوتی ہے! پانی بیحرکت و جنبش کا شائبہ نہیں۔ بحرِ متواج اک مسطح تالاب بن گیا ہے!

ابر کے دامنوں میں خفیف ترین لرزش بھی معدوم ہو گئی ہے۔ پارہائے برف کی بے شورشس بارش ہو رہی ہے!

اہلِ کشتی کی منراشِ یاد ختم ہو گئی تھی۔ یہ لوگ اپنے نیفنرلز اکو پہنچکر اب غالباً رحم کے مستحق ہو گئے تھے! دفعۃً کسی چیز کی جھلک سی معلوم ہوئی! یہہ گویا اُن کی شبِ سیہ بختی کے خاتمہ کی بشارت تھی! قدرت کی اس چشمک کو اک ہنگامہ خیز جدال و قتال کے بعد اعلان امن کی "بیرقِ سفید" سے تعبیر کیا جانا چاہئے! لوگ مطمئن ہو کر عرشے پر چہل قدمی کرنے لگے!

تاریکی اب بھی مسلط تھی۔ مگر اس تاریکی میں اک بہشتی تجلی منعکس تھی! طلوعِ سحر کا خیال اس شبِ دیجور کو بقعۂ نور بنا رہا تھا! طوفان کے پنجۂ موت میں پھنس جانے والے از سرِ نو آغوشِ حیات میں داخل ہو رہے تھے! وہ اس تصور سے کتنے فرحاں تھے کہ تین چار گھنٹے بعد جب روزِ روشن کا نور پھیلے گا تو کسی گزرتے ہوئے جہاز کی اس کشتی شکستہ جماعت پر نظر پڑے گی، اور وہ اُنہیں اپنی کنارِ پناہ میں اُٹھا لے گا!

اسی اثنا میں ایک ملاح کسی کام سے کشتی کے زیریں حصے میں گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ لبالب بھرا ہوا ہے!

اُفتاں و خیزاں وہ اوپر آیا اور یہہ خبرِ وحشت اثر کپتان کو سنائی۔

کپتان سراسیمہ ہو کر بولا "کیا معنی؟!"

"معنی یہہ کہ آدھ گھنٹے کے اندر ہم ڈوب جانے والے ہیں!"

ملاح کی بیدار کن توضیح تھی!

(۱۴)

آخری چارہ کار!

واقعہ یہہ تھا کہ کشتی کے پیندے میں اک سوراخ ہو گیا تھا! یہ حادثہ کب وقوع میں آیا، کسی کو معلوم نہ تھا! غالباً کسی زیرِ آب چٹان سے کشتی کی تلی مَس ہو گئی، اور طوفان کے شور و شغب میں اس تحت البحر تصادم کی آواز کسی کو سنائی نہ دی! شدائدِ مرض کے بحران میں مریض کو اک چٹکی کی چبھن کا بھلا کیا پتہ لگ سکتا ہے!

اک دوسرے ملاح نے کشتی کے شکم میں اُتر کر معائنہ کیا۔ اُسکی رائے تھی کہ کشتی سطحِ آب پر زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ کی مہمان ہے!

افسوس! ع

دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا!

سوراخ کا تلاش کرنا ناممکن تھا! اور اس رخنے کو بند کرنا ناممکن تر!!

کشتی کے جسم میں اک ایسا زخم تھا جس کے سیلانِ خون کو روکنے کی کوئی تدبیر نہ تھی!

ٹیٹیوٹینا لمحہ بلمحہ نیچے بیٹھتی جا رہی ہے!!

آخر کپتان کے حکم سے کئی مشعلیں روشن کی گئیں، اور سارے ملاح اور مسافر چرمی ڈولچیاں لے لے کر پانی اُلیچنے کے لئے تیار ہو گئے! وہ جا بجا کھڑے ہو گئے اور ڈولچیاں بھر بھر کر ایک دوسرے کو دینے لگے۔ بالائی عرشے والا آخری آدمی ڈولچیوں کو سمندر میں خالی کر دیتا تھا۔

لیکن یہہ ڈولچیاں بھی بدقسمتی سے از کار رفتہ ہو گئی تھیں۔ اُن سیونوں کے ٹانکے جگہ جگہ سے اُدھڑ گئے تھے، جس کی وجہ سے اُن کا بہت سا پانی راستے ہی میں گر جاتا تھا، اور قبل اس کے کہ وہ دست بدست منتقل ہو کر اپنی منزل کو پہنچیں وہ کم و بیش نصف رہ جاتی تھیں! قطع نظر اس سے کشتی کے رخنوں سے جس قدر پانی اندر داخل ہو رہا تھا اُس کے مقابلے میں باہر پھینکا جانے والا پانی مقدار میں عشرِ عشیر بھی نہ تھا! ایک ٹن پانی

کوایک کوزہ آب سے جو مضحکہ خیز نسبت ہے وہ محتاج بیان نہیں! ٹھیک اُسی طرح کشتی کے پانی کو اِن دستی پیپوں کے ذریعے خالی کر دینے کی کوشش ایسی ہی لا یعنی تھی جیسے کہ کوئی کروڑ پتی بخیل پائی پائی دے کر اپنی دولت کو اُڑا دینا چاہے!

"ہمیں کشتی کو تمام سامان سے سُبکبار کر دینا چاہئے!"—— کپتان نے دوسرے فیصلہ کا اعلان کیا۔

چنانچہ کیبن اور عرشے کے سارے صندوق، پیٹیاں، گٹھے، بنڈل وغیرہ اُٹھا اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیئے گئے۔ عورتیں اس موقع پر اپنے کلماتِ حسرت کو ضبط نہ کر سکیں! جو سامان دریا بُرد کیا گیا اُس میں اُن کی بہت سی محبوب چیزیں—— خوشنما زیورات اور طرحدار کپڑے!—— بھی تھے! اُن کا نذرِ آب کیا جانا اُن کے لئے اک ناقابلِ برداشت منظر تھا! مگر چارہ کیا تھا؟ کشتی کے وزن کو بیش از بیش کم کرنے کی خاطر باورچی خانے کے ظروف، حتیٰ کہ کشتی کے بعض نیم شکستہ اجزائے لاینفک تک سمندر کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے!

کپتان تھوڑے تھوڑے وقفہ سے روشنی ہاتھ میں لے کر کشتی کے باہر کی طرف دیکھتا تھا تاکہ معلوم کرے کہ پانی کہاں تک چڑھ آیا ہے!

(۱۵)

ان تمام زائد چیزوں کے بار سے ہلکی ہوجانے کے بعد کشتی کی رفتارِ غرقابی سُست پڑ گئی، تاہم بہرحال وہ غرقابی ہی تھی اگرچہ اُس کا عمل قدرے طولانی ہوگیا تھا!

یاس و ہراس اب مکمل تھا! کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا تھا!

سارے ممکن وسیلے اور حیلے ایک ایک کر کے ختم ہوگئے تھے!

"کیا کوئی اور چیز ابھی باقی ہے جسے باہر پھینک کر کشتی کو مزید سُبکدوش کیا جاسکتا ہے؟" کپتان نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں نہ؟!" حکیم بولا "سب سے زیادہ گرانبار چیز تو کشتی کی پُشت پر ابھی بجنسہٖ موجود ہے!"

"یعنی؟!"

"ہمارے جرائم! ہمارے مظالم!!" حکیم کا جواب تھا۔ "ان کو دریا بُرد کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟!"

سب کے دل دہل گئے!!

"کاش کہ ایسا ہوسکتا!" مخاطبین کے منہ سے نکلا۔

حکیم استادہ ہوا، اور آسمان کی طرف دست بدعا ہوکر سب کشتی نشین مرد و زن سے اس طرح خطاب کیا!—

"آپ سب لوگ بھی دو زانو ہوجائیے، اور خدائے قدوس کی بارگاہ میں نیایش و گرایش کے لئے تیار رہیں! تاکہ وہ آمرزگارِ حقیقی ہم سیاہکاروں کی زشت کاریوں کو معاف فرمائے! ہاں ہماری تردامنیاں ہی کشتی کا سب سے خطرناک بار ہیں! ہمیں اب جان بچانے کی فکر کو خیرباد کہنا چاہئے، بلکہ گناہوں کی عقوبت سے نجات پانے کی دعا مانگنی چاہئے! ہماری بداعمالیاں ہی ہماری موجودہ غیر مختتم اُفتادوں کی ذمہ دار ہیں! اُس بچّے کے ساتھ ہم نے جو پُرشقاوت سلوک کیا ہے وہ بالواسطہ خدائے بزرگ و برتر کے خلاف ایک اعلانِ جنگ بنا ہے! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بے یار و مددگار بچّہ غالباً آسمان پر گیا ہے اور عرشِ الٰہی کا پایہ پکڑ کر فریادی ہوا ہے!! بظاہر یہ مسلسل نزولِ بلیات آسمانی عدالت کی طویل تعزیر معلوم ہوتی ہے جس کے ہم سزاوار قرار پائے ہیں! مگر اس مُہلت کو غنیمت جانیئے اور اس اثناء میں تلافیٔ مافات اور کفارۂ گناہ کی ہر ایک ممکن صورت کام میں لائیے! کم از کم اتنا ہو کہ اگر وہ بچّہ اتفاق سے پھر کہیں ہمیں مل جائے تو ہم اُس کی پناہ دہی اور سرپرستی اور دستگیری کا خلوصِ قلب سے عہد کریں! اور اگر خدانخواستہ وہ ہماری بے وفائیوں اور بیدردیوں کا شکار ہوگیا ہے تو ہم اُس کی مظلوم و معصوم روح سے طالبِ معافی ہوں! ہماری ٹوٹی کشتی سامان سے اتنی بوجھل نہیں ہے جتنا کہ ہماری جماعت کا مجرم ضمیر اپنے تاریک نامۂ اعمال سے گرانبار ہے! ہماری روحیں "ظلماتِ ظلم" کے اندر غرق ہونے کے خطرے میں ہیں، اور سب سے تباہ کن

غرقابی یہی ہے: ہمارے فانی جسم تو مچھلیوں کی غذا بن جائیں گے' لیکن ہماری ابدی روحیں شیاطینِ جہنم کی دائمی گرفت میں پھنسی رہینگی!"

"ہاں، دوزانو ہو جائیے اور اپنے لئے طلبِ مغفرت کیجئے! چشمِ تر دامنِ تر کی شوب کار ہے! عَرَقِ اعتراف و ندامت میں غرق ہو کر تڑپ جائیے! ہاں' اور اگر طوفان میں آپ کا قطب نما گم ہو گیا ہے تو کیا پروا ہے' ذاتِ حق کا قبلہ امید آپ کے لئے کیسا نعم البدل ہے! ؎

ناخدا در کشتیِ ما گر نباشد گو مباش!
ما را خدا داریم' ما را ناخدا درکار نیست!

اس خشیت پرور اور رقت آور وعظ پر سب اہلِ کشتی بول اٹھے۔

بس اب تو ہی ہمارا حقیر و الیاس ہے! اس بحرِ فنا میں تو ہی اک نوح ہے: اس منزلِ ہلاکت میں تو ہی اک سالکِ باخبر ہے! تو ہی بتا ہم کیا کریں؟ ہم حرف بحرف تیری اقتداء کے لئے تیار ہیں!"

حکیم نے کہا۔

"میری حالت آپ لوگوں سے کچھ بہتر نہیں: میرا سوہانِ روح آپ سے بدرجہا زیادہ شدید ہے! میں اپنے شکنجۂ طبعِ سلیم' سے خود پیچ و تاب میں ہوں! ع

آں را کہ عقل بیش غمِ روزگار بیش!"

یہہ کہہ کر حکیم' کپتان سے مخاطب ہوا۔

"ہمارے حصے میں اب کتنا وقت باقی رہ گیا ہے؟"

"قریبًا یاد گھنٹہ!" کپتان نے پانی کا نشان دیکھکر کہا!

حکیم نے فی الفور اپنا قلم دوات اور اپنی جیبی کتاب نکالی' اور پھر وہی چرمی کاغذ کھولا جس پر چند ساعت پیشتر اُس نے کچھ ناقابلِ تعبیر نقوش و سطور کھینچے تھے۔ پھر اُس نے بلا تاخیر روشنی طلب کی!

مسلسل برف باری نے کشتی کی ساری مشعلوں کو سرد کر دیا تھا! صرف ایک باقی رہ گئی تھی۔ جسے لیکرا یومیتریا (میتیوٹنا کی ایک ساذہ) حکیم کے پہلو میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ کاغذ کو ہاتھ میں تھام کر حکیم نے مجمع سے کہا۔

"سُنیئے!"

سب ہمہ تن گوش اور سرنگوں ہو گئے۔ حکیم نے انتہائے خضوع و خشوع سے کاغذ کی تحریر کی قرأت شروع کی! تحریر انگریزی زبان میں تھی۔ بعض موقعوں پر مخاطبین اُس کے سمجھنے سے قاصر رہتے تھے' اور مشکل مقامات کی تشریح کی درخواست کی جاتی تھی! حکیم حسبِ فرمائش' فرانسیسی' ہسپانوی' اِیطالوی' یا باسکے زبان میں مطلب توضیح کرتا تھا!

اس تمام دوران میں کشتی کی غرقابی کا عمل بدستور جاری رہا' اور اہلِ کشتی کے ہول و دہشت میں اضافہ ہوتا رہا۔ بعض اوقات اُن کے قلوب کی حرکات و ضربات اُن کے سینوں سے باہر نکل کر صاف صاف سُنائی دیتی تھیں!

کاغذ کی پڑھائی ختم ہوئی' جس کے بعد حکیم نے یکے بعد دیگرے سارے آدمیوں کے دستخط اُس پر کرائے! ناخواندہ آئرستانی عورت نے بجائے اپنا نام لکھنے کے صلیب کا نشان بنا دیا! کیا مذہب کا نشان روحِ نسوانی کا ترجمان ہوتا ہے؟!

"ہارڈکینی کی بوتل آپ کے پاس ہے؟" حکیم نے مجمع سے پوچھا۔

"جی ہاں" اک متاثر جواب ملا!

"مجھے دیجئے!"

ایک ملاح نے آخری جُرعہ شراب سے خالی کر کے قرابۂ مذکور کو حکیم کے حوالے کر دیا!

کشتی کی حالت اب زندگی کے لمحے جلد جلد ختم ہو رہے ہیں! ایک دفعہ بے کس میتیوٹنا ایک جانب کو اس قدر جُھک گئی کہ سمندر کی اک چھوٹی سی لہر اُس کے کنارے سے قریبًا ہمدوش ہو گئی! سب لوگ فورًا کشتی کے وسط میں جا کر جمع ہو گئے!

حکیم نے اُس دستخطی توبہ نامہ کی انتہائی چھوٹی تہہ کر کے اُسے بوتل میں ڈالا۔ پھر رسی کے چند ریشوں سے اُس کے منہ میں ڈاٹ لگائی۔ بعد ازاں کشتی کی مشعل کے جلتے ہوئے گرم گرم قطرات سے اُسے سربمہر کیا!

اس کام سے فارغ ہو کر وہ خلائے سماوی میں محوِ نظارہ ہو گیا!

"کیا تو میرے قریب ہے؟"

بظاہر وہ کسی صورتِ خیالی سے مخاطب تھا!

ساری جماعت اک عالمِ سُکر میں ہے! اُن کا ہر بُنِ مو زبانِ دعا بن رہا ہے! چند لمحوں تک سب حالت رکوع میں رہے۔ پھر زود ہی اک اضطراری داعیہ سے اُن کی نیاز آگیں جبینیں خاک سے مَس ہوگئیں! اس وقت اُن کے موزیانہ خط و خال کی قساوت و شقاوت پر ایک جمالیت و سعادت کی نقاب پڑ گئی تھی!

حکیم کا ماضی کیسا ہی رہا ہو، اہلِ کشتی کے گروہِ شیاطین میں تو وہ بمنزلۂ اک فرشتے کے تھا: اس وقت یہ سالکِ طریقت — جو "کاشکے کردے وگزاشتے" کی منزل سے گزر چکا تھا! — طمانیت و سکینیت کی قبا میں ملبوس نظر آتا ہے! وہ جلالِ الٰہی اور جمالِ رحمانی ہر دو سے اقتباسِ نور کر رہا ہے!

اُس نے اک پادری کی شان حاصل کر لی ہے جو سکراتِ موت کی ساعات میں رحلت کرنے والی روح سے اعترافِ گناہ کراتا ہے اور کلماتِ ایمان و استغفار کی تلقین کرتا ہے!

"اِدھر دیکھیئے!" اُس نے ناگہاں کہا "اور اب جاں بحق ہونے کے لئے تیار ہو جائیے!"

یہ کہتے ہی اُس نے ایوؔمیریا کے ہاتھ سے مشعل لے لی، اور اُسے اپنے سر کے اوپر لے جا کر ہلایا! مشعل میں سے ایک شرار نکل کر آوارۂ فضا ہو گئی!

حکیم نے مشعل کو پانی میں پھینک دیا، جو وہاں جا کر بجھ گئی:

اب روشنی کی آخری باقیات الصالحات بھی گم ہوگئیں! بحرِ محیط اب بلا استعارہ اک "بحرِ ظلمات" ہے: اک مہیب مقبرے کی سی تیرگی طاری ہوئی جاتی ہے!

"آخری دُعا کیجئے!" صلوٰۃِ موت کی جماعت کے امام (حکیم) نے پکارا!

معاً سب سربسجود ہو گئے!

اب اُن کی جانمازِ اک "آبِ رواں" کی چادر تھی جو کشتی کے عرشے پر بچھتی چلی آ رہی تھی!

اِس وقت تنہا حکیم سر و قد کھڑا ہوا ہے۔ برفباری نے اُس کے آنسو منجمد کر دیئے ہیں، اور یہ سفید سفید سرد دُرِ اشک اُس کے گرم لبادے پر جا بجا ٹانک گئے ہیں!

اس جہانِ سیاہ میں ساری ساکت و صامت اور وارفتہ و ازخود رفتہ مخلوق (راکبانِ تیٹیوؔنا) کا وہی نفسِ ناطقہ اور روحِ رواں بنا ہوا ہے!

حکیم نے اپنے ہاتھوں سے صلیبی شکل بنائی اور کچھ الفاظ مُنہ سے نکالے!

سب اہلِ کشتی نے اپنی اپنی گوناگوں زبانوں میں تسلیم و رضا، رقّت و خشیت، توبہ و انابت، اعتراف و استغفار کے کلمات پڑھے، جس نے گرد و پیش کی فضا کو جگا دیا! اس قانتانہ وِرد کی تکرار چند لمحوں تک جاری رہی!

راکبینِ کشتی اِسی وضع رکوع و سجود میں رفتہ رفتہ زیرِ آب چلے جا رہے ہیں!

حکیم نے بوتل پھر ہاتھ میں لی، اور اپنی بقیہ دُعا کو زیرِ لب آواز میں ختم کیا!

دوسرے لوگوں کے ساتھ تو نہیں، لیکن اُن کے بعد اب حکیم کی استادہ و پُر استقامت قامت بھی نوبت بہ نوبت غرق ہو رہی ہے! کمر، گردن، اور اب سر بھی پانی کی دَلدَل نے نگل لیا! اُس کے اُٹھے ہوئے بلند ہاتھ میں اب بھی وہ بوتل نظر آ رہی ہے، جسے وہ سلطانِ آسمان کی بارگاہ میں گزران رہا ہے!!

آخر یہ نظارہ بھی فضائے ابدیت میں جذب ہوگیا!

صرف ایک چیز اِس اُفقِ وحدت پر باقی رہ گئی۔ یعنی وہی بوتل، جو اپنے بید کے غلاف کی وجہ سے اب بھی سطحِ آب پر تیر رہی ہے!!



ملٹن اپنی نظم 'گم شدہ جنت" لکھا رہا ہے



تیکھے بال

برکھا رُت

رِم جھم، رِم جھم مینہا برسے، برکھا رُت پر جوبن ہے
جَم کر کیسی بھَرن ہے پڑتی، ابر گھرا اور گُلشن ہے

کوئل کُوکے، مُرلا جھنگارے، کلی کلی نِت شوبھا ہے
دھرتی یہ بیکُنٹھ بنی ہے، رحمت پر جگ داتا ہے

ننھی ننھی بُوندوں میں کیا رَس ہے جو دِل کھِلتا ہے
شاخیں جُھولا جُھول رہی ہیں پتہ پتہ ہلتا ہے

بھیگ گئے ہیں پیڑ ہر اک جا سبزہ غوطے کھاتا ہے
گھر گھر ہیں پرنالے چلتے، بادل شور مچاتا ہے

لڑیاں پیاری موتی جیسی، حوضوں میں جب گرتی ہیں
آنکھ مچولی قطرے کھیلیں، ننھی پریاں ترتی ہیں

دُھوپوں سے جو کھیت جلے تھے امرت اُن پر برسا ہے
ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور مَن و سلوٰی برسا ہے

دریا اُبلے، نہریں چھلکیں، ندی نالے بہتے ہیں
پیاسی زمیں کی پیاس بُجھا دی، جَل تھَل اِس کو کہتے ہیں

جُھولا ڈالے اَمریوں میں زندہ دِلوں کے جمگھٹ ہیں
سب سکھیاں مِل کر گاتی ہیں، سب کُنج نہیں یہ پنگھٹ ہیں

(افسر الشعرا) آغا شاعر قزلباش

باغی!

دیوانہ مصطفیٰ آبادی

اگر حیاتِ کامراں حاصل کرنے اور جامِ حیات کی تلخیوں کو شیریں گھونٹوں میں تبدیل کرنے کی آرزو ہے تو خدا کو کبھی یاد نہ کرو ——— کہ خدا تو صرف اس وقت یاد کیا جاتا ہے جب آلام و مصیبت کی گھنگھور گھٹائیں تمہیں گھیرے ہوں یا تم آسودگیٔ حیات کو چھوڑ کر ایک زندگیٔ باعمل کی تمنا نہ کرو!!!

دنیا کہتی ہے کہ خدا کی عبادت سے آتما کو شکتی حاصل ہوتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا تم نے بھی، کہ تمہاری جبینِ نیاز پر بندگی کا سیاہ داغ نمایاں ہو گیا ہے، کبھی اس سکونِ رُوح اور اطمینانِ قلب کا احساس کیا ہے؟ اگر نہیں تو خدا کو بھول کیوں نہیں جاتے ——— اس خدا کو جو رحیم ہونے کے باوجود تمہیں آزاد پیدا کر کے طوقِ غلامی کو تمہاری گردنوں میں دیکھتا ہے اور قہار و جبار ہونے کا کوئی ثبوت نہیں دیتا جس نے دولت کو اس طرح تقسیم کر رکھا ہے کہ تمہیں تو پانی کا اک گھونٹ اپنے حلق کے کانٹوں کو تر کرنے اور چاول کا ایک دانہ پیٹ کی آگ کو بجھانے کے لئے کہیں تلاش پر بھی نہ مل سکے۔ اور اسی عالم میں ایک گروہ ایسا بھی ہو جس کے یہاں پانی کی اتنی فراوانی ہو کہ سورج کی تپش سے بھاپ بن کر اُڑ جائے اور کھانے کی اتنی افراط ہو کہ سڑکوں پر آوارہ پھرنے والے تک اپنا پیٹ بھر لیں۔ جاڑے کی سردیوں میں، تمہارے بدن پر، دن رات کام کرنے کے باوجود، ایک چیتھڑا بھی نہ ہو، اور یہ فرقہ گرمیوں میں تین تین چار چار جوڑے کپڑوں کے ہر روز تبدیل کیا کرے۔

آہ، تم اس خوابِ گراں سے کب بیدار ہوگے؟ استبداد کے جذبات تمہارے سینے کی گہرائیوں میں موجزن ہیں۔ کیوں وقت [illegible]، طوفان کیوں نہیں اٹھاتے؟ انقلاب کی آگ جو تمہارے جیون کو جلا کر راکھ کئے دے رہی ہے، اس کو شورش اور تغیر کی ہواؤں سے کیوں نہیں بھڑکا دیتے، انسانیت ذبح ہو رہی ہے، تم ایسا نہ ہونے دو! بیدار کیوں نہیں ہو جاتے؟

اور عالی شان محلات کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں، جہاں سے رقاصۂ پُر جمال کے نقرئی گھنگروں کی آوازیں آتی ہیں۔ ان موٹروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں جو سرمایہ دار، مزدور کے خون کی شراب میں سرشار، بے تحاشہ سڑکوں پر دوڑاتے، انہیں کی آنکھوں میں خاک جھونکتے اور معصوم رُوحوں کو کچلتے پھرتے ہیں۔ شیشوں کی الماریوں میں رکھے ہوئے ریشمی کپڑوں اور زرّیں ساریوں کو آگ لگا دیں، کہ اس کے دھوئیں سے دنیا کی نگاہوں میں بینائی آ جائے۔ اور اُس کی روشنی میں دیوتا ہماری زبوں حالی کا اندازہ کر لیں۔

اُٹھو، جاگو، رواداری کے گیت گائیں، سب سے پریم کا سلوک کریں اور اک متحد ہندوستان کا پرچم رنگین فضا میں لہرا دیں، برکت انقلاب، برجہت انقلاب، انقلاب زندہ باد کے خونچکاں نعروں سے سرمایہ داری کا گلا گھونٹ دیں، رُوح سلب کر لیں۔ فرقہ پرستی کی خاردار جھاڑیوں کو چمنستانِ ہند سے نوچ کھسوٹ کر مغرب کے کنج میں پھینک آئیں، مشرق کی ان وادیوں کو جہاں پریم کی بنسری بجا کرتی تھی، عفریت زار جہنم سے تبدیل کر کے رشکِ فردوس بنا دیں۔ آزادی کی خاطر خدا سے بھی گستاخ ہو جاؤ، نظامِ کائنات کو اُلٹ کر پھینک دو!

میں تمہیں اک راز کی بات بتاؤں، کیا بلبل کے راگ گل کو کبھی اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں؟ کیا تمہارا اظہارِ محبت تمہارے محبوب کی بے اعتنائی کا سبب نہیں

بن جاتا ہے؟ کیا تمہیں التفات کی اُمید ہے؟ اگر نہیں ہے تو پیارے——— ایشور کی پوجا کیوں کرتے ہو! بھگوان، بھگوان پکارنے کے بجائے خود بھگوان کیوں نہیں ہو جاتے ؎

بہ شکلِ بندہ تو رہنا ہے عمر بھر اے جوشؔ
اُٹھ اور چند نفس کے لئے خدا ہو جا　　جوشؔ

کہ ایشور تو اُن کا دھیان کرتا ہے جو اس سے بے نیاز ہوں۔ وہ ان اپنوں کے لئے بے طلب دیتا ہے، جو اس کی پروا نہیں کرتے۔ تم، کام دیو جی کی پوجا کرو، پریم کی سرشاریوں میں کھو کر محبوب سے بے نیاز ہو جاؤ۔ ایک وقت آئے گا جب وہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔ سو ایشور کو بھول جاؤ تو اُسے یاد رہو گے۔ اُس کا خیال تمہیں بھی حاصل ہو جائے گا۔ اس کی پرستش کرنا ہی تو اپنی تمناؤں کو پامال کرنا ہے۔ جو اس طرح کبھی پوری نہیں ہوتی ہیں۔ بلکہ اُس کو یاد کئے ہوئے بغیر۔ بس اگر انقلاب کے خواہاں ہوں، آزادی کے آرزومند، اتحادِ ملی کے تمنائی تو حساس نہ بنو ورنہ زندگی اجیرن ہو جائے گی اور جینا تو یوں بھی اک دُکھ ہے، اور پھر خدا کو بھول جاؤ، ایشور کا دھیان نہ کرو۔ ورنہ ان زرین خوابوں کی کوئی تعبیر نہ ہوگی۔ کاش تم سمجھ سکو!!

(طبعزاد)

کیفیاتِ مخمور

یہ آج کونسی دُنیا میں جا رہا ہوں میں
ہر ایک چیز کو کچھ اور پا رہا ہوں میں

تعینات کے پردے اُٹھا رہا ہوں میں
جمالِ روئے حقیقت دکھا رہا ہوں میں

فضائے دہر کو رنگیں بنا رہا ہوں میں
پھر ان فضاؤں میں خوشیاں منا رہا ہوں میں

فسانۂ غمِ ہستی سُنا رہا ہوں میں
ہر ایک ذرّے کو انساں بنا رہا ہوں میں

کسی کے عارضِ روشن سے نور لے لے کر
چراغِ خانۂ ہستی جلا رہا ہوں میں

کسی حسین نگاہوں سے کیف لے لے کر
جہانِ عشق کو بے خود بنا رہا ہوں میں

کھپا ہے میری نگاہوں میں اک جمالِ لطیف
اُسی کو عشق کے نغمے سُنا رہا ہوں میں

قرار کب کسی منزل پہ مجھکو حاصل ہے
نہ جانے کون سی منزل پہ جا رہا ہوں میں

کبھی ہے شانِ تقدس کی مجھ میں جلوہ گری
کبھی شراب کے ساغر چڑھا رہا ہوں میں

ہر ایک رنگ میں رنگین ہے مری ہستی
اِسی سے اپنے کو مخمور پا رہا ہوں میں

مخمور لکھنوی

تہذیبِ نو

ایک دن فیشن پرستوں میں ہوا میرا گذر — اُن کے جسموں پر لباسِ مغربی آیا نظر

گفتگو کا باہمی انداز اور طرزِ خرام — سب پہ غالب ہو چکا تھا مغربیت کا اثر

کھانے، پینے اور رہنے کا عجب انداز تھا — ٹھاٹھ سے اُن کے گماں ہوتا تھا ہیں یہ اہلِ زر

زعفرانی رنگتیں بھی تھیں لیکن اور کچھ — مُفلسی کی دے رہی تھیں سُوٹ کی چڑیں خبر

سیدھی، سادی وضع میری دیکھکر ہنسنے لگے — پھر لگے کرنے تاسّف حالِ زارِ قوم پر

طعنہ زن پھر مشرقیت پر ہوئے کچھ اِس طرح — قومِ انگلش کا ہو دھوکا خود نہ ہوں کالے اگر

سچ تو یہ ہے اب اُنھیں احساسِ حالت ہی نہیں — گھومتے ہیں پارک میں ہمراہِ سسٹر اور مدر

سر میں ہے فیشن کا سودا اور مسوں کی دِل میں یاد — خود فراموشی میں بھی انگریزیت ہے اِس قدر

سعیٔ لاحاصل میں اپنی کر رہے ہیں عمر صرف — خانہ ویرانی میں ساری زندگی کر دی بسر

ساتھ رفتارِ زمانہ کے رواں ہیں بے دھڑک — یہ نہیں معلوم لیکن جا رہے ہیں ہم کدھر

مغربی تہذیب کی گھوڑ دوڑ میں اوّل ہیں — بس اِسی پر کچھ دِنوں سے چُست باندھے ہیں کمر

باپ کے احکام کی وقعت نہیں ہے آج کل — پڑھ کے انگریزی ہوئے ہیں اِس قدر شوریدہ سر

تھیٹروں کا آنا جانا، یا کلب کی سیر ہے — بس اِنھیں دِلچسپیوں میں ہم نے کاٹی عمر بھر

یاد آیا مے کہ ناصرؔ ہم تھے اور یورپ کی سیر
وہ شبابِ پُرہوس، اور وہ بُتانِ سیمبر!

ناصرؔ لکھنوی

جدید آئین پر ایک تنقیدی نظر

(سید شریف حسین آرزو بی۔اے۔ دہلوی)

(بسلسلۂ ماسبق)

ہندوستان کے جدید آئین کے بنیادی اصول سمجھنے کے لئے موجودہ وگذشتہ دساتیر ہند پر ایک سرسری نظر ڈالنی ضروری ہے۔

موجودہ آئین کی بنیاد وہ اعلان ہے جو مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے دارالعوام میں ۲۰۔ اگست ۱۹۱۷ء کو کیا تھا جس میں انھوں نے فرمایا تھا۔

"ملک معظم کی حکومت کی پالیسی جس سے حکومت ہند کامل اتفاق رکھتی ہے، یہ ہے کہ نظم ونسق کی ہر شاخ میں ہندوستانیوں کی ترقی پذیر شمولیت ہو۔ اور بتدریج خود مختار اداروں کو ترقی حاصل ہو۔ تاکہ ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کے جزو لاینفک کی حیثیت سے ذمہ دار حکومت ترقی پذیر طور پر قائم ہو جائے"

اس اعلان میں یہ بھی مذکور تھا کہ:۔

"اس پالیسی میں ترقی صرف تدریجی مراحل طے کرنے سے ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں صرف حکومت برطانیہ اور حکومت ہند ہی، جن پر ہندوستانیوں کی بہبود وترقی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ارتقائی مراحل اور رفتار ترقی کا بحیثیت منصف فیصلہ کرسکتی ہیں۔ اور ان کی رہنمائی ان لوگوں کے تعاون سے ہونی چاہیے جنہیں ملکی خدمت کے اس طرح نئے مواقع فراہم کئے جائیں گے۔ اس رہنمائی سے صرف اسی حد تک استفادہ ممکن ہوگا جس حد تک ان کے احساس ذمہ داری پر اعتماد کیا جاسکے گا۔

اس اعلان کے بعد سنہ ۱۹۱۹ء کا قانون حکومت ہند نافذ ہوا۔ جس کے ماتحت آج ہندوستان پر حکومت جاری ہے۔ اس قانون کے نفاذ کے متعلق شاہی فرمان ملک کی سیاسی وآئینی ترقی کی مختصر کہانی حسب ذیل الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"سنہ ۱۸۳۳ء کے قانون نے ہندوستانیوں کے لیے پبلک دفاتر اور ملازمتوں کے دروازے کھول دیے تھے۔ سنہ ۱۸۵۸ء کے قانون نے ملکی نظم ونسق (ایسٹ انڈیا) کمپنی سے لے کر تاج کے سپرد کر دیا، اور اس شہری وسیاسی زندگی کا سنگ بنیاد رکھا جس پر آج نظام حکومت ہند کا قصر رفیع تعمیر ہو رہا ہے۔ سنہ ۱۸۶۱ء کے قانون نے نمایندہ اداروں کی تخم ریزی کی۔ سنہ ۱۹۰۹ء کے قانون نے اس تخم میں جلد روح پھونک دی، یہ قانون جو اب آئین بن گیا ہے باشندوں کے منتخب نمایندوں کو حکومت میں ایک معین حصہ سپرد کرتا ہے۔ اور اس کے بعد کامل ذمہ دار حکومت کی شاہراہ کی جانب اشارہ کرتا ہے۔۔۔۔۔۔"

سنہ ۱۹۱۹ء کے قانون کے ماتحت یہ ضروری تھا کہ اس قانون کے نفاذ کے دس سال بعد جدید طرز حکومت کے تجربے اور اس کی کامیابی یا ناکامی کے متعلق تحقیقات کی جائے۔ اور یہ معلوم کیا جائے کہ آیا ذمہ دار حکومت کا اصول جاری رکھنا پسندیدہ ہے اور کس حد تک ہے۔ یا اسے ختم کر دینا مناسب ہے۔ اس شرط کے پیش نظر سنہ ۱۹۲۷ء میں سر جان سائمن کی زیر صدارت ایک شاہی تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا۔ جس نے مئی سنہ ۱۹۳۰ء میں اپنی رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کر دی۔

سر جان سائمن نے ہندوستان کے آئینی امور کی تحقیقات کے دوران

اکتوبر ۱۹۲۹ء میں مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم کے نام ایک خط تحریر کیا جس میں انہوں نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ "ہندوستان کی آئندہ آئینی ترقی جو رخ اختیار کرے گی اس پر غور کرتے ہوئے کمیشن تحقیقات کے دوران میں اس ضرورت سے متأثر ہوا ہے کہ برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے آئندہ تعلقات کے امکانات پر پورا غور و خوض کیا جائے" چنانچہ کمیشن نے سفارش کی کہ جب اس کی رپورٹ مکمل ہو جائے تو ملک معظم کی حکومت کو برطانوی ہند اور ریاستی ہند کے نمائندوں سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہیے، تاکہ ان آخری تجاویز کے بارے میں جو ملک معظم کی حکومت پارلیمنٹ کے سامنے اپنے ذریعہ کے طور پر پیش کرے گی، زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے حاصل کیا جا سکے۔"

حکومت برطانیہ نے یہ سفارش منظور کر لی۔ اور برطانوی و ریاستی ہند کے نمائندوں کی ایک گول میز کانفرنس نومبر ۱۹۳۰ء میں مدعو کی۔ جس کا پہلا اجلاس لندن میں منعقد ہوا۔ کام کی زیادتی اور آئینی امور کی پیچیدگی کے باعث اس کانفرنس کے دور اور اجلاس طلب کئے گئے، اس کانفرنس نے برطانوی ہند کے صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کے وفاق (Federation) کی بنیاد رکھی دوسرا گول میز کانفرنس نومبر ۱۹۳۱ء میں منعقد ہوئی، جس میں علیحدہ شدہ برہما کے لئے جداگانہ آئین پر غور و خوض کیا گیا۔

ان کانفرنسوں کے بعد مارچ ۱۹۳۳ء میں حکومت نے اپنی تجاویز کا مسودہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا، جو عام طور پر "قرطاس ابیض" (White Paper) -icm کے نام سے مشہور ہے، یہ تجاویز حسب ذیل اصول پر قائم تھیں۔

(الف) برطانوی ہند کے صوبوں کے لئے خود اختیاری مع چند مخصوص اختیارات و تحفظات برائے گورنران۔

(ب) برطانوی ہند اور ریاستوں کا وفاق۔

(ج) مرکزی ذمہ داری بعض تحفظات کے ماتحت، مثلاً محکمۂ دفاع و محکمۂ خارجہ کی تخصیص اور بعض ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے گورنر جنرل کے ہاتھوں میں مخصوص اختیارات کی تفویض۔

(د) جداگانہ انتخاب۔

جداگانہ انتخاب کے اصول کی مفصل تشریح اس فرقہ وارانہ تصفیہ میں بیان کی گئی ہے، جو مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ نے اس مسئلہ پر ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان مفاہمت کے تمام امکانات ختم ہو جانے کی صورت میں ہندوستانی رہنماؤں کی درخواست پر بطور ثالث کیا ہے۔

یہ تصفیہ کمیونل ایوارڈ (Communal award) یعنی فرقہ وارانہ ثالثی فیصلہ کے نام سے مشہور ہے۔

۲۹ مارچ ۱۹۳۳ء کو سہ روزہ مباحثہ کے بعد دارالعوام نے حسب ذیل قرارداد منظور کی۔

"قرار پایا کہ قرطاس امر (Command papers) ع ۴۲۶۸ میں مندرجہ تجاویز پر پارلیمنٹ سے فیصلہ کرنے کی درخواست سے پہلے یہ ضروری ہے کہ امرا و عوام کی ایک مجلس منتخبہ مقرر کی جائے۔ جس کو ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی ہند کے نمائندوں کو مشورے کے لئے بلانے کا اختیار حاصل ہو۔ تاکہ ہندوستان کی آئندہ حکومت بالخصوص قرطاس امر میں مندرجہ تجاویز پر غور کیا جا سکے، اور رپورٹ پیش کی جا سکے۔

۶۔ اپریل کو ۳ یوم کے ہنگامہ خیز مباحثہ کے بعد "امرا" نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ اور ہر دو ایوانوں کے سولہ سولہ ممبران پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ ہندوستانی ریاستوں سے سات۔ برطانوی ہند سے ۲۱۔ اور برہما سے ۲ نمائندے مدعو کئے گئے، ان نمائندوں نے ستر سے زائد جلسوں میں شرکت کی کمیٹی کے ڈیڑھ سو سے زائد جلسے منعقد ہوئے۔ ایک سو بیس گواہوں کی شہادتیں قلم بند کی گئیں، اور تقریباً سترہ ہزار سوالات دریافت کئے گئے۔

کمیٹی کی رپورٹ ۲۲ نومبر ۱۹۳۴ء کو شائع ہوئی۔ دارالعوام نے ۱۲۷ آرا کے خلاف ۴۱۰ آرا سے اور دارالامرا نے ۱۲۳ آرا کے خلاف ۴۱۳ آرا سے اس رپورٹ کی سفارشات کو منظور کرتے ہوئے قرار دیا کہ اس رپورٹ کے اصول پر ہندوستان کے جدید آئین کا مسودہ پیش کیا جائے، اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مجلس منتخبہ نے سرکاری تجاویز میں صرف ایک اہم تبدیلی کی۔ جو ہندوستانی رائے عامہ اور حکومت ہند دونوں کے مشترکہ اور ٹھوس مطالبہ کے بالکل برعکس تھی۔ یہ تبدیلی مرکزی مجالس قانون ساز کے براہ راست طریق انتخاب کی بجائے بالواسطہ طریق انتخاب جاری کرنے سے تعلق رکھتی جس کی تفصیل سطور آئندہ میں

بیان کی جائیں گی۔

جدید آئین

حکومت نے ۱۹۳۵ء کی ابتدا میں مذکورہ قرار داد کی متابعت میں مسودۂ قانون حکومت ہند (Govt. of India Bill) پیش کیا۔ جو اگست کے آخری ہفتہ میں قانون بن کر کتاب آئین میں شامل ہوگیا۔ اور اس طرح ہندوستان کی سیاسی قسمت پر ایک نئی مہر ثبت ہوگئی۔

۱۹۳۵ء کا قانون حکومت ہند پندرہ ابواب، ۴۷۸ دفعات اور سولہ جدولوں اور ۴۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں برما کا جدید آئین بھی شامل ہے۔ حکومت نے پارلیمنٹ کی منظوری سے ہندوستان و برما کے آئین اب علیحدہ علیحدہ شائع کردیئے ہیں۔

اب اس نئے آئین کے روشن خدوخال بیان کئے جاتے ہیں، اس کے بعد ان کی نیت و اہمیت پر بحث کی جائے گی۔

۱۹۱۹ء کے قانون نے صوبوں اور مرکز میں دوعملی (Dyarchy) جاری کی تھی یعنی ملک اور صوبوں کے نظم و نسق کی ذمہ داری دو طبقوں میں تقسیم کردی تھی۔ پہلا طبقہ گورنر اور اس کی اگزیکٹو کونسل کے ممبران پر مشتمل تھا جن کے ذمے امن و آئین، پولیس، داخلی و خارجی امور، سیاسی معاملات وغیرہ سپرد تھے دوسرا طبقہ ہندوستانی وزراء اور مجالس قانون ساز کے منتخب نمائندوں پر مشتمل تھا۔ اس کے اختیارات عملی نتائج کے لحاظ سے بہت محدود تھے۔ ہندوستانی وزراء کو تعلیمات، بلدیات اور زراعت کے محکمے سپرد کئے گئے، جو شعبہ جات منتقلہ کے نام سے موسوم تھے۔ مجالس قانون ساز میں سرکاری افسران اور نامزدہ اراکان کی موجودگی، منتخب اراکان کے ارادوں کی تکمیل میں سدراہ ثابت ہوتی تھی۔ ادھر وزراء کے اختیارات گورنر کے رضاکارانہ احکام کے سامنے بالکل بے حقیقت تھے، یہی وجہ ہے کہ مدراس کے علاوہ دوعملی کسی اور صوبہ میں کامیاب نہ ہوسکی اور ہندوستانی وزراء و مجالس قانون ساز سخت ترین پابندیوں کے ماتحت کام کرتے رہے، اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ہندوستانیوں کو آئین سازی اور آئینی طرز حکومت کا معمولی تجربہ حاصل ہوگیا۔ چونکہ شعبہ جات منتقلہ و غیر منتقلہ کے درمیان کشیدگی بڑھتی جارہی تھی جو ذمہ دار حکومت کے صحیح جذبہ کے منافی تھی اس لئے ۱۹۳۵ء کے قانون نے اس دوعملی کو ختم کردیا۔ اور مجالس قانون ساز کو سرکاری و نامزد عناصر کی رجعت پسندیوں سے بالکل آزاد کردیا، البتہ بعض صیغہ جات گورنر یا گورنر جنرل کی ذات اور اس کے رضاکارانہ اختیارات کے لئے مخصوص کردیئے تاکہ بقول برطانوی مدبرین "ہندوستان میں امن و آئین کا احترام باقی رہے، اقلیتوں کا وجود نہ مٹنے پائے، اور ہندوستان کامل خودمختار حکومت حاصل کرسکے" اور بقول ہندوستانی مدبرین "ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط دائمی طور پر قائم رہے"۔

صوبوی آزادی

۱۹۳۵ء کے قانون نے ہندوستان کے آئین نو کو جو کہ یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے نفاذ پذیر ہوگا دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ صوبوی آزادی سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا حصہ مرکزی ذمہ داری سے۔

صوبوی آزادی یا صوبوی خود اختیاری (Provincial Autonomy) کا مفہوم یہ ہے کہ صوبہ کی حکومت مقامی نظم و نسق میں خودمختار ہوگی، گورنر جنرل کی عام مداخلت ختم ہوجائے گی، وزرائے حکومت صوبوی مجالس قانون ساز کے سامنے ذمہ دار ہوں گے، مرکزی مجالس قانون ساز کو صرف ان ۵۹ امور کے متعلق جن کی تشریح جدید قانون حکومت ہند کی ساتویں جدول حصہ اول میں بیان کی گئی ہے، آئین وضع کرنے کا اختیار ہوگا۔ جبکہ صوبوی مجالس قانون ساز ان اکاون امور کے متعلق آئین وضع کرسکیں گی جن کی تشریح مذکورہ جدول کے حصہ دوم میں بیان کی گئی ہے، یہ امور ایسے بھی ہیں جن کی نسبت مرکزی و صوبوی مجالس قانون ساز کو مشترکہ حق آئین سازی حاصل ہوگا۔ سب سے پہلے صوبوی آزادی اور اس کے متعلقات پر بحث کی جاتی ہے۔

خودمختار صوبوں کی تعداد

جدید آئین کے ماتحت گیارہ صوبے خودمختار ہوں گے، جن کا حاکم اعلیٰ گورنر ہوگا۔ ان صوبوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) مدراس (۲) بمبئی (۳) بنگال (۴) صوبہ جات متحدہ (۵) پنجاب، (۶) بہار (۷) صوبہ جات متوسط مع برار، (۸) آسام (۹) شمال مغربی سرحدی صوبہ (۱۰) اڑیسہ (۱۱) سندھ۔

برما ہندوستان سے علیحدہ ہو جائے گا۔ عدن کا انتظام بمبئی کے ہاتھوں سے نکل کر برطانوی حکومت کے قبضہ میں چلا جائے گا۔ ہندوستانی خزانہ سے عدن کے نظم و نسق کے اخراجات کا ایک تہائی دیا جاتا تھا، جو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ لاکھ پونڈ سالانہ ہو سکتا تھا۔ اب یہ رقم بند کر دی جائے گی، اور عدن کا انتظام اور اخراجات حکومت برطانیہ کی ذمہ داری میں چلے جائیں گے۔

گو برار پر اعلیٰ حضرت نظام کی بالادستی قائم ہے لیکن اس کا انتظام بھی صوبہ جات متوسط کے گورنر کے سپرد اور ماتحت ہوگا، اور براری رعایا پر جدید آئین کا اسی طرح اطلاق ہوگا، جس طرح برطانوی رعایا پر، البتہ حضور نظام کی براری رعایا اپنے راعی کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھائے گی۔

گورنر کا تقرر ملک معظم فرمائیں گے، اس کی تنخواہ، بھتہ وغیرہ ملک معظم باجلاس کونسل مقرر فرمائیں گے، صوبوی مجالس قانون ساز کو گورنر کی تنخواہ یا بھتہ پر بحث کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ گورنر کی تنخواہ اور بھتہ صوبہ کی آمدنی سے وصول اور ادا کئے جائیں گے، مختلف صوبوں کے گورنروں کی تنخواہیں حسب ذیل ہوں گی۔

گورنر مدراس	ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ سالانہ	گورنر بہار	ایک لاکھ روپیہ سالانہ
گورنر بمبئی		گورنر صوبہ جات متوسط و برار	بہتر ہزار روپیہ سالانہ
گورنر بنگال		گورنر آسام	چھیاسٹھ ہزار روپیہ سالانہ
گورنر صوبہ جات متحدہ		گورنر شمال مغربی سرحدی صوبہ	
گورنر پنجاب	ایک لاکھ روپیہ سالانہ	گورنر اڑیسہ	
		گورنر سندھ	

ہر گورنر ملک معظم کی جانب سے براہ راست خود یا اپنے ماتحت حکام کے ذریعہ صوبہ کا نظم و نسق انجام دے گا۔ لیکن وفاقی مجالس قانون ساز کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ ان فرائض کو جو موجودہ آئین ہند کے ماتحت کسی عدالت۔ جج۔ افسر یا مقامی یا کسی دوسرے حاکم کے ذمے عائد ہوتے ہوں۔ گورنر یا اس کے ماتحت حکام کی جانب منتقل کر دیں۔

صوبوی نظم و نسق مجلس وزرا

گورنر کے فرائض کی ادائگی میں امداد دینے کے لئے ایک مجلس وزراء ہوگی، جو گورنر کو صوبہ کے نظم و نسق میں مشورہ دے گی، البتہ جن صیغہ جات کے متعلق گورنر کے ذمہ خاص فرائض عاید ہوتے ہیں اور جن کی نسبت اسے اپنی مرضی و فیصلہ کے مطابق عمل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے ان کے بارے میں وزراء کے مشورہ پر عمل کرنا گورنر کے لئے ضروری نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی لازمی نہیں ہوگا کہ وہ ان مخصوص امور کے بارے میں ان سے کوئی مشورہ لے۔ ان صیغہ جات کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

گورنر حسب مرضی مجلس وزراء کے جلسہ کی صدارت کر سکے گا، اگر کبھی یہ جھگڑا پیدا ہو جائے کہ فلاں معاملہ گورنر کی مخصوص ذمہ داری سے تعلق رکھتا ہے یا نہیں تو اس کے متعلق گورنر کا ذاتی فیصلہ ناطق ہوگا۔ اور گورنر اس سلسلہ میں جو کچھ کرے گا اس کی نسبت یہ اعتراض نہیں کیا جا سکے گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ (دفعہ ۵۰)

گورنر اپنے وزراء کا انتخاب خود کرے گا۔ اور خود انھیں طلب کرے گا۔ ہر وزیر کو حلف وفاداری اٹھانا پڑے گا۔ اور گورنر کی رضامندی تک وہ اپنے عہدہ پر قائم رہ سکے گا۔ جو وزیر مسلسل چھ ماہ تک صوبوی مجلس قانون ساز کا رکن نہیں ہوگا وہ چھ ماہ گذرنے کے بعد وزیر باقی نہیں رہے گا۔ کسی عدالت میں یہ دریافت نہیں کیا جا سکے گا کہ وزیر نے گورنر کو کوئی مشورہ دیا تھا یا نہیں، اور اگر دیا تھا۔ تو وہ کیا تھا۔ وزراء کے انتخاب اور ان کی طلبی اور ان کی برطرفی کے بارے میں گورنر کو ذاتی اختیار حاصل ہوگا۔ (دفعہ ۵۱)۔

دفعات (۵۰) اور (۵۱) کا جو خلاصہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزراء کا وجود محض گورنر کی خوشنودی پر منحصر ہوگا۔ یہ جدید آئین کا سب سے کمزور پہلو ہے۔ لطف یہ ہے کہ گورنر کے اس رضاکارانہ فعل کی نسبت کوئی بازپرس نہیں کی جا سکے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بعض صوبوں کے وزراء گورنر کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ جائیں گے۔ کیونکہ وہ اس کی مرضی کے خلاف چل کر اپنی [illegible] تنخواہ اور اعلیٰ عہدے کو خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔ بصورت دیگر [illegible] قوم پرور ہوئے اور انھوں نے گورنر کے بعض رضاکارانہ اختیارات [illegible] کی تو گورنر ان کو فوراً علیحدہ کر دے گا۔ گو وثیقہ ہدایات میں گورنر کو [illegible]

کی گئی ہے کہ وہ وزراء کو اپنے اعتماد میں رکھے اور صیغہ جات غیر منتقلہ کے بارے میں ان سے ضروری مشورہ لے لیکن یہ بات بالکل صاف طور پر بیان کر دی گئی ہے کہ مخصوص معاملات میں اس کے لئے وزراء کے مشورے پر عمل کرنا یا ان سے مشورہ لینا آئینی طور پر ضروری نہیں ہوگا۔ کانگریس نے ان مخصوص معاملات کو جو آئینی زبان میں "تحفظات" (Safe guards) کہلاتے ہیں جمہوری آئین کی راہ میں ناقابل تسخیر رکاوٹ بتایا ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ان تحفظات نے صوبہ کی آزادی کو بالکل بے حقیقت بنا دیا ہے کیونکہ جس چیز کو ہم آزادی کہہ سکتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی ہندوستانی وزراء کے قبضہ اور اختیار میں نہیں ہوگا۔ جیسا کہ گورنر کی سر ڈیگر مخصوص ذمہ داریوں کی طویل و ہمہ گیر فہرست سے ظاہر ہوتا ہے۔

دفعہ ۵۲ – (۱) اپنے فرائض کی ادائیگی میں گورنر کو حسب ذیل مخصوص ذمہ داریاں حاصل ہوں گی۔ یعنی

(الف) صوبہ یا اس کے کسی حصہ کے امن یا سکون کو شدید خطرہ کا انسداد۔

(ب) اقلیتوں کے جائز مفاد کا تحفظ۔

(ج) پبلک ملازمتوں کے جو لوگ رکن ہیں یا رہ چکے ہیں ان کے لئے اور ان کے لواحقین کے لئے ان حقوق کی تحصیل جو ان کے لئے اس قانون کے ذریعہ اور اس قانون کے ماتحت مہیا کئے گئے ہیں؛ اور ان کے جائز مفاد کا تحفظ۔

(د) انتظامی کارروائی کے دائرے میں ان مقاصد کی تحصیل جن کو قانون سازی کے بارے میں حاصل کرنے کے لئے اس قانون کے باب پنجم فصل سوم کی دفعات وضع کی گئی ہیں۔

(ہ) ان علاقوں کے لئے امن اور عمدہ حکومت کی تحصیل جنہیں اس قانون کے مذکورہ باب کے ذریعہ جزوی طور پر خارج شدہ علاقے قرار دیا گیا ہے۔

(و) کسی ہندوستانی ریاست کے حقوق کی حفاظت اور اس ریاست کے حقوق و اقتدار کی حفاظت۔ اور

(ز) گورنر جنرل اپنے ذاتی رضاکارانہ فیصلہ کے ماتحت اس قانون کے باب ششم کے مطابق جو احکام یا ہدایات جائز طور پر جاری کرے ان پر عمل درآمد کرانا۔

گورنر صوبہ جات متوسط و برار کے ذمے ایک خاص فرض یہ بھی عائد ہوگا کہ وہ برار کے باشندوں کی فلاح و بہبود کے لئے صوبہ کی کل آمدنی کا ایک معقول حصہ محفوظ رکھے۔

گورنر کی جو خاص ذمہ داریاں اوپر بیان کی گئی ہیں ان کو مطالعے کے بعد یہ واضح ہو جائے گا کہ وزراء کی ذمہ داری صرف اسی وقت تک ذمہ داری رہے گی جب تک گورنر تحفظات کی آڑ لے کر اپنے خاص اختیارات استعمال نہیں کرے گا۔ ضمن (ب) کے علاوہ جو کہ اقلیتوں کے جائز مفاد کی حفاظت سے تعلق رکھتی ہے، باقی تمام ضمنی دفعات گورنر کو ایسے وسیع اختیارات سونپ دیتی ہیں جو اسے ۱۹۱۹ء کے آئین کے ماتحت بھی حاصل نہیں تھے۔ مذکورہ دفعہ ۵۲ کے ماتحت اگر کوئی ہندوستانی وزیر ان علاقوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے جن کے باشندوں کو وحشی یا نیم وحشی قرار دیتے ہوئے انہیں اصلاحات کی "نعمت" سے محروم رکھا گیا ہے، کوئی موثر قدم اٹھانا چاہے گا تو گورنر فوراً مزاحمت کرے گا۔ کیونکہ بحالات موجودہ حکومت کی پالیسی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کے ایک وسیع رقبہ کو آئینی ترقیوں سے محروم رکھا جائے۔ اسی طرح مجلس قانون ساز میں کسی ریاست کی بدنظمی یا والیٔ ریاست کے انسانیت سوز مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی جا سکے گی۔ اور اگر کوئی شخص اس قسم کی جرأت کرے گا تو اس کو گورنر کے خاص اختیارات کچل کر رکھ دیں گے۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک "ذمہ داری" وہ ہے جو گورنر کو "امن و آئین" کے تحفظ کے لئے دی گئی ہے۔ اس "ذمہ داری" کے پیش نظر کسی صوبہ میں کوئی ایسی سیاسی تحریک جاری نہیں ہو سکے گی جو نظام حکومت میں پُرامن تبدیلی کے لئے کوشاں ہو۔ سیاسی شورش کے زمانہ میں تو گورنر کے اختیارات کے سامنے اس ہندوستانی وزیر کی ذمہ داریاں بالکل بے حقیقت ہوں گی جس کو امن و آئین کا قلمدان سپرد کیا جائے گا۔ گورنر اور وزراء کے درمیان مفاہمانہ تعاون کی صرف ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ وزراء گورنر کی ہمہ گیر مخصوص ذمہ داریوں میں مزاحم نہ ہوں۔ بلکہ "جی حضور" کے اصول پر کاربند رہیں۔

ایڈووکیٹ جنرل

ہر صوبہ کا گورنر اپنے علاقے کے لئے ایک ایڈووکیٹ جنرل مقرر کرے گا

جو گورنر کی خوشنودی تک اپنے عہدہ پر قائم رہے گا۔ گورنر کو ایڈووکیٹ جنرل کی نامزدگی برطرفی۔ تنخواہ اور بھتہ کے متعلق ذاتی اختیار استعمال کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور وزراء کو اس بارے میں دخل دینے کا کوئی حق نہ ہوگا، ایڈووکیٹ جنرل وہ شخص بن سکیگا جو ہائی کورٹ کا جج بننے کی قابلیت رکھتا ہو۔

پولیس کا نظم وضبط

گو پولیس کا صیغہ نام نہاد طور پر ہندوستانی وزیر کے سپرد ہوگا لیکن شہری و فوجی پولیس کے تقرر وغیرہ کے متعلق قواعد وضوابط کی تدوین، ترمیم یا تنسیخ کی نسبت گورنر اپنے رضاکارانہ اختیار کا استعمال کرے گا۔ تاوقتیکہ اسے اس امر کے متعلق اطمینان نہ ہو جائے کہ زیر غور تجویز پولیس کے نظم ونسق میں کوئی خلل پیدا نہیں کرے گی۔

سیاسی جرائم کے متعلق گورنر کے اختیارات

سیاسی جرائم کے متعلق گورنر کو جو اختیارات تفویض کئے گئے ہیں ان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت برطانیہ کو ہندوستانی وزراء پر کس قدر کم اعتماد ہے۔ اور وہ صوبوی آزادی کو کس قدر شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں قانون حکومت ہند کی دفعہ ۵۷ بجنسہ نقل کرنی غیر مناسب نہ ہوگی۔

دفعہ ۵۷۔ (۱) اگر کسی صوبہ کے گورنر کو یہ معلوم ہو کہ صوبہ کا امن یا سکون بعض ایسے اشخاص کی سرگرمیوں سے خطرہ میں پڑ گیا ہے جو ایسے متشددانہ جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ یا ارتکاب کرنے کے لئے سازش۔ تیاری۔ یا کوشش کر رہے ہیں۔ جن کی غرض قانون کے ذریعہ قائم شدہ حکومت کا تختہ پلٹنا ہو تو گورنر اگر وہ یہ خیال کرے کہ ان سرگرمیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے صورت حالات ایسا کرنے کی مقتضی ہے، یہ ہدایت جاری کر سکتا ہے کہ اس کے فرائض ان حدود تک جن کی تشریح اس ہدایت میں بیان کی گئی ہے، وہ خود اپنے رضاکارانہ فیصلہ کے مطابق انجام دے گا۔ . . . . "

(۲) ایسی ہدایت کے اجراء کے زمانہ میں گورنر کسی افسر کو مجلس قانون ساز میں حصہ لینے کا اختیار تفویض کر دے گا۔ اور وہ شخص مجلس قانون ساز کے ایک ایوان یا دونوں ایوانوں میں تقریر کر سکے گا۔ لیکن اسے رائے دینے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔"

دفعہ ۵۸ کی رو سے کوئی شخص جو پولیس میں ملازم ہو انسپکٹر جنرل آف پولیس یا کمشنر آف پولیس کی اجازت کے بغیر پولیس کے کسی دوسرے آدمی کو سیاسی جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے متعلق خفیہ اطلاعات فراہم نہیں کرے گا۔ اور نہ تاج کا کوئی ملازم کسی دوسرے شخص کو گورنر کی ہدایت کے بغیر کوئی سرکاری راز بتائے گا۔

صوبہ کی حکومت کا طریق کار

صوبہ کی حکومت کی ہر انتظامی کارروائی گورنر کے نام سے جاری ہوگی گورنر اپنی ذاتی رائے سے صوبہ کی حکومت کی کار فرمائی کے لئے قواعد وضوابط مرتب کرے گا۔ وزرائے حکومت اور سکرٹریوں پر لازم ہوگا کہ وہ گورنر کی ہدایت پر مطلوبہ اطلاعات اسے فراہم کریں۔ اور اگر ان کے نوٹس میں کوئی ایسا معاملہ آئے جو گورنر کی خاص ذمہ داری سے تعلق رکھتا ہو تو اس کے متعلق فوراً گورنر کو مطلع کریں۔ اس طرح برطانوی حکومت نے وزارت کے قومی عناصر کی خفیہ سرگرمیوں کے امکان کا خاتمہ کر دیا ہے۔

صوبوی مجالس قانون ساز

جیسا کہ تمہید میں بیان کیا گیا تھا، مجلس قانون ساز اپنی نوعیت کے لحاظ سے دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ (۱) ایسی مجلس قانون ساز جو صرف ایک ایوان پر مشتمل ہو، (۲) ایسی مجلس قانون ساز جو دو ایوانوں پر مشتمل ہو۔ جدید آئین کے ماتحت مدراس۔ بمبئی، بنگال۔ صوبہ جات متحدہ، بہار۔ اور آسام میں دو ایوان والی مجالس قانون ساز ہوں گی۔ باقی چار صوبوں میں ایک ایوان والی مجالس قانون ساز ہوں گی، جن صوبوں میں دو ایوان والی مجالس قانون ساز ہیں وہاں ایوان بالا کو لیجسلیٹو کونسل (مجلس مقننہ) اور ایوان زیرین کو لیجسلیٹو اسمبلی (جمعیۃ مقننہ) کے ناموں سے پکارا جائے گا۔ لیجسلیٹو کونسل ایک مستقل مجلس ہوگی اور اسے توڑا نہ جا سکے گا۔ لیکن ہر تیسرے سال مجلس کے ارکان کی قریباً ایک تہائی تعداد ریٹائر ہو جایا کرے گی

لیجسلیٹو اسمبلی کی میعاد پانچ سال ہوگی۔ تاوقتیکہ گورنر اسے قبل از وقت نہ توڑ دے بالائی ایوان اور زیریں ایوان کے اجلاس طلب کرنے، ملتوی کرنے یا ختم کرنے کا اختیار گورنر کو حاصل ہوگا۔ وہ حسب مرضی ہر دو ایوان کا انفرادی یا مشترکہ اجلاس طلب کرکے ارکان کو مخاطب کر سکے گا۔ گورنر ہر دو ایوان کے نام پیغام بھیجنے اور اس پر امکانی عجلت کے ساتھ غور و خوض کا مطالبہ کرنے کا بھی مجاز ہوگا۔

وزراء کا حق تقریر

وزراء اور ایڈوکیٹ جنرل کو صوبہ کی مجلس قانون ساز کے ہر ایوان میں تقریر کرنے یا بحث میں حصہ لینے یا ایوان کی کسی مجلس کی کارروائی میں حصہ لینے کا اختیار ہوگا لیکن وہ کسی رائے شماری میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔ صوبہ کی اسمبلی کا صدر "اسپیکر" اور نائب صدر "ڈپٹی سپیکر" کہلائے گا۔ جبکہ کونسل کا صدر "پریزیڈنٹ" اور نائب صدر "ڈپٹی پریزیڈنٹ" کے نام سے موسوم ہوگا۔

حلف وفاداری۔ کورم۔ رائے شماری

ایوان کے ہر رکن کو گورنر یا اس کے نامزدہ نمایندے کے سامنے حلف وفاداری اٹھانا ہوگا۔ زیریں ایوان کا اجلاس جاری رکھنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ کل ممبران کی ⅙ تعداد حاضر ہو۔ ایوان بالا کے اجلاس جاری رکھنے کے لئے کم از کم دس ممبران کا کورم (Quorum) چاہیئے۔ اگر اجلاس کے دوران میں یہ معلوم ہو جائے کہ مطلوبہ حاضری کم ہو گئی ہے تو صدر یا نائب صدر یا قائم مقام صدر اجلاس اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دے گا جب تک کہ مطلوبہ حاضری پوری نہ ہو جائے۔

ایوان کی رکنیت

کوئی شخص صوبہ کی مجلس قانون ساز کے دونوں ایوانوں کا بیک وقت رکن نہیں بن سکے گا۔ اگر کوئی شخص ایک ایوان کا رکن ہوتے ہوئے دوسرے ایوان کا رکن منتخب ہو جائے تو وہ پہلے ایوان سے علیحدہ ہو جائے گا۔ اور اس کی خالی نشست کے لئے نیا انتخاب عمل میں آئے گا۔ حسب ذیل اشخاص کسی ایوان کے رکن نہیں بن سکیں گے۔

(۱) تاج کے ماتحت کسی منفعت بخش عہدہ پر فائز ہو۔

(۲) عدالت نے مخبوط الحواس قرار دے دیا ہو۔

(۳) دیوالیہ ہو۔

(۴) انتخابی قواعد کے ماتحت کسی جرم کا مرتکب ہوا ہو اور جرم کے زائد المیعاد ہو جانے کا مقررہ وقفہ پورا نہ ہوا ہو۔

(۵) کسی ایسے جرم میں سزایاب ہوا ہو جس کی سزا عمر قید یا دو سال سے کم نہ ہو۔ اور رہائی کے بعد کم از کم پانچ سال کا عرصہ نہ گذر گیا ہو۔

(۶) کسی مجلس قانون ساز کے امیدوار نامزد ہونے یا کسی امیدوار کا مختار مقرر ہونے کے بعد مقررہ میعاد کے اندر انتخاب کے اخراجات داخل نہ کئے ہوں۔ اور گورنر نے تاریخ ادخال کے پانچ سال بعد اس کی "ناقابلیت انتخاب" کو دور نہ کر دیا ہو۔

(۷) اخلاقی جرم کے لئے عمر قید بعبور دریائے شور یا دیگر سزائے قید بھگت رہا ہو۔

ناقابلیت کی حالت میں رائے دینے کی سزا

اگر کوئی شخص اسمبلی کا رکن بننے کی قابلیت نہ رکھتا ہو یا اسے ناقابل قرار دیا گیا ہو اور وہ اس کے باوجود کسی ایوان میں شریک ہو کر رائے شماری میں حصہ لے تو وہ اپنی اس حرکت کے لئے پانسو روپیہ فی یوم جرمانہ کا مستوجب ہوگا۔ یہ رقم جرمانہ صوبہ کے قرضہ کی حیثیت سے وصول کی جائے گی۔

جو ممبر مسلسل چھ ماہ تک مجلس قانون ساز کے اجلاس سے غیر حاضر رہے گا اس کی نشست خالی قرار دی جائے گی۔

ارکان مجلس قانون ساز اور وزراء کے حقوق

ہر صوبہ کی مجلس قانون ساز میں ممبران اور وزراء کو تقریر کرنے کی کامل آزادی ہوگی۔ لیکن سنجیدہ روش اور متین و مہذب طرز عمل کے لئے ضمنی قواعد کی پابندی لازمی ہوگی۔ کسی عدالت میں کسی رکن کے خلاف مجلس قانون ساز میں تقریر کرنے کے جرم میں مقدمہ نہیں چلایا جا سکے گا۔ کسی مجلس قانون ساز کو یہ اختیار

حاصل نہیں ہوگا۔ گورنر بدنظامی سے پیش آنے والے ممبران کو علیحدہ یا خارج کرنے کے علاوہ ان کے خلاف کسی قسم کی تعزیری یا عدالتی کارروائی اختیار کرے۔ صوبہ کی مجلس قانون ساز ایک قانون بنائے گی جس کے ماتحت ان اشخاص کی سزا یابی عدالت کے سامنے مجرم قرار پانے پر ممکن ہوگی جو ایوان کی کسی کمیٹی کے سامنے مطلوبہ شہادت یا دستاویزات پیش کرنے سے گریز کریں۔ صوبہ کی مجلس قانون ساز کے ممبران کی تنخواہ اور بھتہ کا تعین کرنے کے لئے صوبہ کی مجلس قانون ساز خود ایک قانون وضع کرے گی۔

آئین سازی کا طریق کار

مسودہ مالیات کے علاوہ ہر مسودہ قانون، صوبہ کی مجلس قانون ساز کے دونوں ایوانوں میں سے کسی ایوان میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایک یا دونوں ایوانوں کا اجلاس ملتوی ہونے کی صورت میں کوئی مسودہ قانون زائد المیعاد نہیں ہوگا جو مسودہ صوبہ کی کونسل میں زیر بحث ہو لیکن اسمبلی نے اسے منظور نہ کیا ہو وہ اسمبلی کے ٹوٹنے پر زائد المیعاد نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس جو مسودہ اسمبلی میں زیر بحث ہو یا منظور ہو چکا ہو لیکن کونسل میں پیش نہ ہوا ہو وہ اسمبلی کے ٹوٹ جانے پر زائد المیعاد ہو جائے گا۔ اور نئی اسمبلی میں اسے دوبارہ پیش کرنے کی ضرورت ہوگی۔

جن صوبوں میں دو ایوان والی مجالس قانون ساز قائم ہیں وہاں ایک مسودہ کی منظوری کے لئے دونوں ایوانوں کی تصدیق ضروری ہوگی۔ خواہ یہ تصدیق ترمیم کے بغیر ہو یا ایسی ترمیم کے ساتھ جس پر دونوں ایوان متفق ہو جائیں۔ بعض صورتوں میں ایک مسودہ کی منظوری کے لئے ہر دو ایوان کا مشترکہ اجلاس طلب کیا جاسکے گا۔ اس صورت میں مشترکہ اجلاس کی اکثریت کا فیصلہ ہر دو ایوان کی انفرادی منظوری کے مترادف ہوگا۔

جب مجلس قانون ساز ایک مسودہ کو منظور کرے گی تو وہ گورنر کے سامنے توثیق کے لئے پیش کیا جائے گا۔ گورنر رضاکارانہ اختیار استعمال کرتے ہوئے یا تو اس مسودہ پر ملک معظم کے نام سے مہر تصدیق ثبت کردے گا۔ یا تصدیق کرنے سے انکار کردے گا۔ یا گورنر جنرل کے غور و خوض کے لئے اسے محفوظ رکھے گا۔ وہ اگر چاہے گا تو مسودہ قانون اس پیغام کے ساتھ مجلس قانون ساز کے پاس واپس کردے گا۔ کہ مجلس اس مسودہ پر گورنر کی بتائی ہوئی ترمیمات کے ساتھ دوبارہ غور کرے اور منظور کرے۔ جب کوئی مسودہ گورنر جنرل کے غور و خوض کے لئے محفوظ رکھا جائے گا تو گورنر جنرل یا تو ملک معظم کے نام پر اس کی منظوری دے دے گا۔ یا اسے منظور کرنے سے انکار کردے گا۔ یا ملک معظم کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے اسے محفوظ رکھے گا گورنر جنرل کو یہ بھی اختیار حاصل ہوگا کہ وہ کسی مسودہ کو گورنر کے پاس اس ہدایت کے ساتھ واپس کردے کہ فلاں ترمیمات کے ساتھ صوبہ کی مجلس قانون ساز اس مسودہ پر دوبارہ غور کرے۔ جب مجلس ترمیم کے ساتھ یا ترمیم کے بغیر مسودہ پاس کردے گی تو اسے گورنر جنرل کے سامنے دوبارہ برائے غور و خوض پیش کیا جائے گا۔

ملک معظم کی ہمہ گیر طاقت استرداد

ان تحفظات اور پابندیوں کے علاوہ ملک معظم کی ہمہ گیر طاقت استرداد صوبہ کی مجالس قانون ساز کے منظور کردہ قوانین کو بالخصوص ایسے قوانین کو جو برطانوی مفاد پر اثر انداز ہوئے ہوں اور کانگریس جیسی وزارت کے زیر اثر مجلس قانون ساز نے منظور کئے ہوں۔ بالکل بے حقیقت بنائے گی، ملک معظم کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ گورنر یا گورنر جنرل کے تصدیق کردہ قانون کو گورنر کے سامنے اس قانون کی تاریخ پیشی سے ایک سال کے اندر منسوخ کردیں۔ جب کوئی قانون اس طرح منسوخ ہوگا تو گورنر اس بارے میں ایک عام اعلان شائع کرے گا۔ اور اس اعلان کی تاریخ اشاعت سے وہ قانون منسوخ متصور کیا جائے گا۔

مالی امور کے متعلق طریق کار

گورنر ہر مالی سال کے متعلق مجلس قانون ساز کے سامنے صوبہ کی سالانہ آمدنی اور اخراجات کا ایک تخمینہ پیش کرائے گا۔ اس تخمینہ کے دو حصے ہوں گے۔ پہلے حصے میں ان اخراجات کا تخمینہ ہوگا جو صوبہ کے مالیات پر پہلی ذمہ داری قرار دیئے گئے ہیں۔ دوسرے حصہ میں ان اخراجات کا تخمینہ پیش کیا جائے گا جن کے متعلق یہ تجویز کیا گیا ہے کہ اگر صوبہ کے مالیات میں گنجائش ہو تو ان مدات پر رقم صرف کی جائے، پہلا حصہ ان صیغہ جات سے تعلق رکھتا ہے جو گورنر کی ذاتی ذمہ داری سے وابستہ ہیں۔ دوسرا حصہ وزراء کے صیغہ جات کے متعلق ہے ذیل کی فہرست سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ صوبوی آزادی

مالی پابندیوں سے اس قدر مقید ہے کہ اسے آزادی کہنا غلط ہے۔

حسب ذیل مدات کے لئے مطلوبہ رقوم صوبہ کے مالیات پر پہلی ذمہ داری ہوں گی۔ ان میں تخفیف یا بزادی کا مجلس قانون ساز کو کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ ان پر ووٹ دے سکے گی۔ صرف بحث کی جا سکے گی۔

(۱) گورنر اور اس کے عملہ کی تنخواہیں اور بھتے۔

(۲) صوبہ کا سرکاری قرضہ، سود، اور دیگر مدات متعلقہ وصولی قرضہ وادائیگی قرضہ۔

(۳) وزراء اور ایڈوکیٹ کی تنخواہیں اور بھتے۔

(۴) ہائی کورٹ کے ججوں کی تنخواہیں اور بھتے۔

(۵) خارجہ علاقوں کے نظم و نسق کا خرچ۔

(۶) عدالتی ڈگری یا ثالثی فیصلہ کی تعمیل کا خرچ۔

(۷) کوئی دوسرا خرچ جو اس قانون یا صوبہ کی مجلس قانون ساز کے ماتحت صوبہ کے مالیات پر لازمی قرار دیا گیا ہو۔

اس امر کا فیصلہ کہ آیا کوئی رقم صوبہ کے مالیات پر پہلی ذمہ داری ہے یا نہیں گورنر کے ذاتی اختیار میں ہوگا۔

جو تخمینہ اخراجات کے دوسرے حصہ سے متعلق ہوگا وہ مطالبات (Demand for grant) کی صورت میں مجلس قانون ساز کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اسمبلی کو ان مطالبات زر کو منظور کرنے، ان میں تخفیف کرنے یا انہیں مسترد کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ لیکن کوئی مطالبۂ زر گورنر کی سابقہ منظوری کے بغیر مجلس قانون ساز کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا۔ گورنر کو اس امر کا اختیار حاصل ہوگا کہ اگر اسمبلی مطالبۂ زر میں تخفیف کر دے یا اسے مسترد کر دے، مگر گورنر کی رائے میں یہ تخفیف یا استرداد اس کی خاص ذمہ داریوں کی ادائگی میں حارج ہو تو وہ اسے بحال کر دے اور مجلس کی اطلاع کے لئے اسے دوبارہ پیش کرے لیکن اسمبلی کو اس پر بحث کرنے یا ووٹ دینے کا حق نہیں ہوگا۔

کسی نئے ٹیکس کے اجراء، کسی موجودہ ٹیکس میں اضافہ، قرضہ کی وصولی۔ مالی ذمہ داری کے متعلق ضمانت کی فراہمی۔ یا کسی خرچ کو صوبہ کے مالیات پر لازم قرار دینے کے متعلق تمام تجاویز گورنر کی سفارش پر صرف اسمبلی میں پیش کی جا سکیں گی۔ کونسل میں نہیں۔

استفسارات

کونسل و اسمبلی کے ممبران کو حکومت کے طریق کار، اور سرکاری دفاتر کے نظم و نسق کے متعلق استفسارات کرنے کا حق حاصل ہوگا، لیکن خارجہ علاقوں۔ ملک معظم، گورنر جنرل، غیر ممالک یا ہندوستانی ریاستوں کے متعلق حکومت کے روابط پر کوئی سوال نہیں کیا جا سکے گا۔

انگریزی زبان کا استعمال

صوبہ کی مجلس قانون ساز کی تمام کارروائی انگریزی زبان میں ہوگی۔ البتہ جو ممبران انگریزی سے ناواقف ہوں گے یا معمولی طور پر واقف ہوں گے، انہیں کسی دوسری زبان میں تقریر کرنے کی اجازت ہوگی۔

مجلس قانون ساز کی کسی بے قاعدہ کارروائی کے متعلق کسی عدالت کو تحقیقات کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

گورنر کے اختیارات قانون سازی

مجلس قانون ساز کے ترقی پسند عناصر کو کچلنے اور انقلاب پسندانہ سیاسی سرگرمیوں کا سدباب کرنے کے لئے گورنر کو قانون بنانے کے ایسے ہنگامی اختیارات تفویض کئے گئے ہیں جو اسے پرانے آئین کے ماتحت بھی حاصل نہ تھے۔ گورنر ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے آرڈی نینس جاری کر سکے گا۔ اور اس کی قانونی حیثیت بالکل وہی ہوگی جو مجلس قانون ساز کے منظور کردہ و تصدیق شدہ قانون کی ہوتی ہے۔ ہر آرڈی نینس مجلس قانون ساز کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اور اس کے اجلاس کے آغاز کے چھ ہفتہ بعد خود بخود

ختم ہوجائے گا۔ یا اگر اسمبلی اور کونسل اس کو ختم کردینے کی تجویز اس عرصہ سے پہلے منظور کردیں، تو وہ ختم ہوجائے گا۔ گورنر کو اختیار ہوگا کہ وہ جب جی چاہے اس آرڈی نینس کو واپس لے لے۔ آرڈینینس کے بارے میں ملک معظم کا حق استرداد قائم رہے گا۔

آرڈینینس کی ایک دوسری قسم بھی ہوگی۔ اس قسم کا آرڈی نینس صرف ان ہنگامی حالات میں جاری کیا جائے گا جو گورنر کی ذاتی ذمہ داریوں اور مخصوص رضاکارانہ اختیارات پر اثر انداز ہوتے ہوں۔ اس آرڈی نینس کی میعاد چھ ماہ ہوگی۔ اور اس میں مزید چھ ماہ کے لئے توسیع کی جاسکے گی لیکن توسیع کی اطلاع گورنر جنرل کے ذریعہ وزیر ہند کو دی جائے گی، اور وزیر ہند اس آرڈی نینس کو پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرے گا۔

گورنر کا قانون

گورنر کو آرڈی نینس کے علاوہ مجلس قانون ساز کی طرح قانون بھی نافذ کرنے کا اختیار ہوگا۔ اس قانون کا مسودہ مجلس قانون ساز کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اور ایک ماہ بعد وہ مسودہ قانون خود بخود قانون بن جائے گا، یہ "گورنر کے قانون" (Governor's acts) کے نام سے مشہور ہوگا۔ لیکن گورنر اس قانون کو نافذ کرنے سے قبل اس ایڈریس پر ضرور غور کرے گا جو مجلس قانون ساز اس عرصہ میں گورنر کی خدمت میں پیش کرے گی۔ گورنر کا قانون دائمی طور پر کتاب آئین میں شامل ہوجائیگا تاوقتیکہ گورنر اسے خود نہ منسوخ کردے۔ یہ قانون نفاذ کے بعد وزیر ہند کو بھیجا جائے گا۔ جو اسے پارلیمنٹ میں برائے اطلاع پیش کرے گا۔

یہ ہے ڈھانچہ اس صوبوی آزادی کا جو یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے ہندوستان میں جاری ہوجائے گی۔ ان تمام تحفظات اور مخصوص اختیارات کے پیش نظر جو جدید آئین گورنر کے رضاکارانہ استعمال کے لئے مخصوص کرتا ہے، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جدید آئین کی کامیابی کا تمام تر انحصار گورنر اور اس کے وزراء کے درمیان مفاہمانہ اشتراک عمل پر ہے۔ لیکن ہندوستان کی موجودہ سیاسی حالت نے اس امکان کو بہت کم کردیا ہے۔ چند صوبوں کے علاوہ جہاں کانگرس اکثریت حاصل نہیں کرسکے گی باقی تمام صوبوں میں وزارت اور گورنر کے درمیان تصادم کے امکانات بہت زیادہ ہوں گے، اس سے بھی زیادہ خطرناک عنصر فرقہ وارانہ نمائندگی ہوگی، جو مجلس قانون ساز اور وزارت کی عمارتوں کی بنیادیں کھوکھلی کردے گی، حقیقت تو یہ ہے کہ جدید آئین کے نفاذ پر ہندوستان کے بہترین دماغوں کے لئے رواداری، معاملہ فہمی، تدبر اور سیاست کے نازک امتحان کا وقت آئے گا۔ اس وقت معلوم ہوجائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔

آئندہ قسط میں جو کہ آخری ہوگی، وفاق ہند پر بحث کی جائے گی، (م) اور معیار رائے دہی، نیز فرقہ وارانہ تناسب (مرکزی وصوبوی)، پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

آرائشِ صورت و [illegible] کے لئے
زیبا ہے کوئی اور نفس کے لئے
ہر گز نہ ہو [illegible] کے لئے
سامانِ تقدس ہیں انفاس کے لئے

(جناب [illegible] اکبرآبادی)

آزادی کی شمع

بھائی اور بہن

اراولی کی گھاٹیوں کے دامن میں ایک نالے کے کنارے رانا پرتاپ کی لڑکی چمپاوتی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسی کے پاس اُس کا چھوٹا بھائی شُسندر سنگھ بھی لیٹا ہوا تھا۔ چمپاوتی گیارہ برس کی تھی اور اس کا چھوٹا بھائی چار برس کا۔ انسان کی قسمت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ دونوں بچوں نے راج محلوں میں پرورش پائی۔ نازو نعم میں پلے۔ لیکن آج بے گھر تھے۔ بھوکوں مرتے تھے اور اراولی کی سنسان گھاٹیوں میں مصیبت کے ساتھ جنگ کر رہے تھے۔ رانا پرتاپ شکست پہ شکست کھا چکا تھا۔ شہنشاہ اکبر اُس سے صلح کے لئے راضی تھا۔ مگر پھر بھی رانا یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی بکھری ہوئی فوج کو جمع کرکے اپنے وطن کی حفاظت میں پروانہ وار قربان ہو جائے مگر شہنشاہ اکبر کی ماتحتی قبول نہ کرے۔

موسم بہار جنگل میں دلفریبی بکھیرتا ہوا سو رہا تھا۔ اراولی کی پہاڑیاں پھول پتوں اور ہری ہری گھاس سے لدی ہوئی کھڑی تھیں۔ ڈوبتا ہوا سورج، درختوں اور پہاڑوں پر اپنی سنہری کرنوں سے زرپاشی کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت اپنے لامحدود لازوال خزانوں پر خود حیرت زدہ ہو رہی ہے۔ اس یزدانی کیف اور وارفتگی کی فضا نے گھاٹیوں کی خوبصورتی پر ایک عجیب و غریب خواب کا سا جادو کر دیا تھا۔

اس دلکش نظارے کے پس پشت چمپاوتی اور شُسندر سنگھ مرجھائی ہوئی بیلوں کی طرح معلوم ہوتے تھے.... سُکھ کی اوٹ میں دُکھ اور خوشی کی اوٹ میں رنج آہستہ آہستہ بغیر محسوس کئے سسکیاں لے رہے تھے۔ آئے دن کی مصیبتوں نے اُن کی بچپن کی بے فکر زندگی کو رنج اور آلام کی آماجگاہ بنا دیا تھا۔ اور اُن کے نرم و نازک بدن کو تکالیف کی آگ نے جھلس کر پژمردہ کر دیا تھا۔ اُن کا گورا چٹا رنگ تلنبے کی طرح سیاہی مائل ہو گیا تھا۔

چمپاوتی پھولوں کے درختوں کے درمیان ایک صاف اور چکنی چٹان پر بیٹھی ہوئی اپنے سوکھے اور کمزور ہاتھوں سے بھائی کے لئے ایک ہار گوندھ رہی تھی۔ شُسندر سنگھ اُس کے پاس بیٹھا ہوا نالے کے چھوٹے چھوٹے پتھروں سے کھیل رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹا پتھر اُٹھاتا اور نالے میں پھینک دیتا...... پانی میں چھوٹی چھوٹی لہریں اُٹھکر بھنور کی زنجیروں میں تبدیل ہو جاتیں...... کناروں کے چومنے کے لئے آگے بڑھتیں اور ایک ایک کرکے غائب ہو جائیں۔ لہروں کے اُٹھنے اور غائب ہو جانے پر بچہ خوشی سے اُچھل اُچھل پڑتا۔ مگر اس خوشی کے سائے میں رنج کی جھلک بچے کے چہرہ پر صاف معلوم ہوتی تھی۔ بچہ اپنے بچپن کے کھیلوں میں مگن ہونے کی کوشش کرتا مگر افسردگی اُس کے مُکھڑے پر حزن و ملال کا غازہ پھیر دیتی۔ چار برس کا بچہ اپنے دُکھ بھول جانے کی کوشش کرتا۔ مگر بھوک اور بیکسی اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی پلکوں پر سے آنسوؤں کے موتی لڑھکاتی تھیں...... وہ کھیل میں مصیبتوں سے بیگانگی کا اظہار کرتا۔ مگر عسرت اور ناداری اُس سے چپٹ چپٹ کر کھیلتی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد مُڑ کر اُس نے اپنی بہن کی طرف دیکھا اور کہا مجھے بھُوک لگی ہے۔ چمپاوتی نے پیار سے اُس کا مُنہ چوم لیا اور بھُوکے بھائی کا دل بہلانے کے لئے اس نے ایک کہانی شروع کی۔ بچہ غور سے سُننے لگا۔

چمپاوتی نے کہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تھوڑے دن کا ذکر ہے اس ملک میں ایک راجہ تھا، ایک بادشاہ نے اُس کا راج چھین لیا۔ راجہ جنگل میں جا بسا۔ ایک دن اس کو بھوک لگی اور اُس نے ایک روٹی کھانے کے لئے نکالی۔ اُسی وقت ایک کوا آیا، اور روٹی لیکر اُڑ گیا۔۔۔۔۔۔۔ سُندر سنگھ بولا تب تو راجہ رونے لگا ہوگا؟

چمپاوتی نے ہنس کر پیار سے بھائی کا منہ چوم لیا اور کہا۔۔۔ تیری طرح وہ بے سمجھ بچہ نہیں تھا کہ ایسی ذراسی بات پر رونے لگتا۔ سُندر سنگھ کچھ پریشان سا ہوگیا۔ اور چمپاوتی کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر کہا تو کیا میں بے سمجھ بچہ ہوں۔۔۔۔ اُس کی بڑی بہن نے کہا، ہاں تو بڑا بے سمجھ اور نالائق ہے۔ بچے کو یہ فیصلہ نہ بھایا، اُس نے زور سے کہا۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔۔ نہیں، میں سمجھ دار اور اچھا لڑکا ہوں۔ چمپاوتی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ اچھے اور سمجھ دار لڑکے کھانے کے لئے نہیں روتے۔

لڑکے نے لاچار ہو کر کہا میں کیا کروں مجھے بھوک لگی ہے اسی وجہ سے روتا ہوں۔ کھانا لاؤ مجھے بڑے زور سے بھوک لگی ہے۔ چمپاوتی اس کا کیا جواب دے سکتی تھی۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن مُنہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ یہ دھیان آتے ہی کہ اس کا چھوٹا بھائی بھوک کی وجہ سے تکلیف اُٹھا رہا ہے اُسے بہت رنج ہوا۔ اور جی بھر آیا۔ قریب تھا کہ وہ رو پڑے۔ لیکن چمپاوتی نے اپنے تئیں سنبھالا۔ آنکھوں سے آنسو پونچھے پیارے بھائی کو گلے لگایا اور اُس کے گلے میں پھولوں کا وہ ہار ڈال دیا جسے وہ اب گوندھ چکی تھی۔ ۔ ۔ ۔ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

یکایک سندر سنگھ چلّا اٹھا اور اپنے ننھے سے ہاتھ کو اپنی گردن کی طرف اُٹھا کر بے بسی سے بہن کا منہ دیکھنے لگا۔ چمپاوتی نے جھٹ اُس کا ہاتھ گردن سے ہٹا کر دیکھا تو گردن کی کھال کچھ لال سی پڑ گئی تھی اور سُوج گئی تھی۔ اُسی وقت اُس نے دیکھا کہ شہد کی مکھی ہار کے ایک پھول سے اُڑی جا رہی ہے۔ بچے کی گردن پر شہد کی مکھی نے ڈنک مار دیا تھا اور سندر سنگھ تلملا کر رو رہا تھا۔ اُسے چُپ کرنے کے لئے چمپاوتی نے کہا کہ میں تجھے روٹی کھانے کے لئے دونگی۔ یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی لیکن اُسے چکر آ گیا اور وہ پھر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ اُٹھی۔ نالے پر جا کر پانی پیا۔ تھوڑی دیر میں حواس بجا ہوئے۔ تب بھائی کو گود میں لے کر جھونپڑی کی طرف چل دی۔

(۳)

مہاراج اور مہارانی

جنگلی جھاڑیوں کے کنج کے اندر سنسان جگہ میں ایک جھونپڑا بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف بانسوں کا جنگل تھا جو جھونپڑے کے چاروں طرف فصیل کا کام دیتا تھا۔ بانسوں کے نیچے سے ایک چھوٹی پگڈنڈی گھاس کو صاف کر کے بنائی گئی تھی۔ جو کہ جھونپڑے کی پشت پر پہنچی تھی۔ جھونپڑے میں رانا پرتاپ اور گن وتی بیٹھے ہوئے تھے۔ بدن پر موٹے کپڑے، چہرے پر گہری اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن اس مصیبت کے وقت میں بھی دونوں کے چہروں سے راجپوتی بہادری رعب اور وقار کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ دونوں کسی تکلیف دہ خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد رانا نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔۔۔۔۔ گن وتی بھاگ کی لیلا دیکھو۔ آج ہماری بدقسمتی کس حد تک جا پہنچی ہے۔ زندگی میں پہلی دفعہ ایک مسافر ہمارے یہاں سے بغیر کھائے پلٹ گیا۔۔۔۔۔ ہماری کیا حالت ہوگئی۔ چتوڑ کا خاندان کشتری قوم کا سرتاج تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ راجستھان کے جو رانا کہلاتے تھے وہ اتنے کنگال ہوگئے کہ ایک پردیسی کو کھانا نہ کھلا سکیں ــــ یہ شرم ــــ یہ بے غیرتی ناقابل برداشت ہے۔ موت سے زیادہ مجھے اب کوئی چیز پیاری نہیں۔۔۔۔ یہ کہکر رانا بے سُدھ ہوگیا۔ اور زمین پر گر پڑا۔ مہارانی نے اُنھیں اُٹھایا اُن کا سر گود میں لے کر آنچل سے ہوا دینے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد رانا نے آنکھیں کھولیں اور وہ اُٹھ بیٹھے۔۔۔۔۔ مہارانی نے کہا۔ رانا اتنا رنج آپ کیوں کرتے ہیں، بھگوان دیالو ہیں۔ اسی نازک موقع پر وہ ہماری مدد کریں گے۔ نا امید نہ ہوں۔ آپ اپنا جی چھوٹا نہ کیجئے۔ یہ گھبراہٹ چتوڑ کے بہادر رانا کو زیب نہیں دیتی۔ رانا نے کہا۔ گن وتی" ہم آج اس مسافر کو کھانا نہ کھلا سکے۔ کل وہ پھر آئے گا تو بتاؤ اُسے کیا جواب دیں گے۔ ہم لوگ کئی کئی دن تک بھوکے رہے مگر میری ہمت نہ ٹوٹی۔ میرا بچہ اکشے کمار بھوک کی وجہ سے مر گیا۔ مگر میں نے پتھر کا دل بنا لیا۔ میری بچی سوزن کماری فاقے کر کے مر گئی اور میں نے ماتھے پر شکن تک نہ ڈالی۔ کتنے دن ہوئے جب تمہیں ایک ٹکڑا کھانے کو ملا تھا۔ میں اس وقت بھی ڈھارس باندھے رہا۔ لیکن آہ۔۔۔۔۔۔۔ آج۔۔۔۔۔۔ خیالات نے مہاراجہ پر پھر غلبہ پا لیا۔ اور وہ پھر بے ہوش ہوگئے۔

اُسی وقت چمپاوتی اپنے بھائی کو لئے جھونپڑے میں آگئی۔

گن وتی۔ چمپا اس وقت تو یہاں کیوں آئی۔

چمپاوتی ۔ اماں میں اس وقت یہاں نہ آتی ۔ لیکن ....

گن وتی ۔ لیکن کیا

چمپاوتی ۔ مسافر کو ہمارے یہاں سے بھوکا نہیں جانا پڑے گا ۔

گن وتی ۔ تم نے مسافر کا حال کیونکر جانا ۔

چمپاوتی نے سر جھکا کر جواب دیا میں پتاجی کی باتیں سُن رہی تھی ۔

گن وتی نے تیوری چڑھا کر غصے سے ، تو دوسروں کی باتیں جاسوسوں کی طرح چھپ کر سنتی ہے ۔

چمپاوتی ۔ نہیں اماں ۔ زندگی میں یہ میرا پہلا قصور ہے ۔ مجھے معاف کیجے ۔ لیکن پتاجی سے کہہ دیجے کہ مسافر کو لوٹنا نہیں پڑے گا ۔

رانا چونک پڑے اور اُٹھ بیٹھے ۔ اُنھوں نے بے چین ہو کر پوچھا .... کیا تُو مسافر کو کھانا کھلا سکے گی ۔ ... کھانا لائے گی کہاں سے .. ..

چمپاوتی نے کہا میں ابھی آئی اور یہ کہہ کر وہ جھونپڑے کے باہر چلی گئی ۔

سندر سنگھ روتے روتے تھک گیا تھا ۔ گن وتی نے اُسے گود میں لے لیا ۔ وہ بھوک اور ڈنک کی تکلیف سے چلا رہا تھا ۔ تھوڑی دیر میں سسکیاں بھر بھر کر سو گیا ۔

چمپاوتی دو چھوٹی چھوٹی روٹیاں لے کر آئی ۔ روٹیوں کو دیکھکر رانا کے منہ پر تازگی آئی ۔ وہ بہت خوش ہوئے ۔ اُنھوں نے مسرت آمیز لہجے میں پوچھا چمپا یہ روٹیاں تجھے کہاں سے ملیں ۔ چمپاوتی نے کہا کل رات مجھے بُھوک نہ لگی تھی ۔ اس لئے میں نے اپنی روٹیاں بچا رکھی تھیں ۔ آج میں نے کچھ جنگلی پھل کھا لئے (چمپا نے جھوٹ بولا تھا بات یہ تھی کہ سندر سنگھ کا اکثر بھوک سے بے کل ہو کر رونا چمپاوتی کے لئے ناقابلِ برداشت تھا ۔ اس لئے وہ بُھوکی رہ جاتی تھی ۔ اور سُندر کے لئے روٹیاں بچا کر رکھ چھوڑی تھیں) اور سُندر کے لئے دو روٹیاں میں نے بچا رکھیں ۔ لیکن وہ سو گیا ہے اور اب یہ روٹیاں میں مسافر کو دیدوں گی ۔ یہ بات سُنکر رانا کا دل پریم سے بھر گیا ۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ۔ چمپا کو گلے سے لگاتے ہوئے وہ بولے بیٹی ایشور تیرا بھلا کرے ۔

۳

مسافر کی واپسی

رانا پرتاپ کو جنگلوں میں رہتے رہتے کئی برس گزر گئے ۔ اُن کی حالت اس درجے تک پہنچ چکی تھی کہ اُن کو اور اُن کے کنبے کو اکثر فاقے سے رہنا پڑتا تھا ۔ تھوڑے سے وفادار آدمی اپنے بدقسمت سردار کا ساتھ دے رہے تھے اور اُن کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے ۔ آس پاس کے گاؤں سے جو کچھ اُن کو مل جاتا تھا اُسی سے رانا اور اُن کے ساتھیوں کی گزر ہو جاتی تھی ۔ رانا اور مہارانی صرف جینے کے لئے ایک دو لقمے کھا لیتے اور اپنے حصّوں کی بچی ہوئی روٹیاں ، بچوں کے لئے رکھ دیا کرتے ۔

یہ کڑی مصیبتیں مہارانا کئی سال سے اُٹھا رہے تھے ۔ صرف آزادی کی خاطر اُنھوں نے اس غریبی اور تنگ دستی کو خوش آمدید کہا ، اپنی مُلک قائم رکھنے کے لئے وہ اس دور آزمائش سے گزر رہے تھے ۔ آزادی کی جھلملاتی شمع اِن کو دُور سے ٹمٹماتی ہوئی دکھائی دیتی تھی ۔ اُن کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے ۔ مگر اِن خونچکاں پاؤں کے باوصف وہ آگے ہی بڑھنے کی کوشش کرتے تھے مصیبتیں جھیلتے تھے ۔ لہو کا گھونٹ پیتے تھے ، اور اِس سنسان جنگل میں ہمت اور مردانگی سے قدم آگے بڑھاتے چلے جاتے تھے ۔

کل صبح رانا کے آدمی کچھ آٹا لائے ۔ جب روٹیاں پک چکیں تو وہ اتنی کم تھیں کہ رانا کے ساتھی اور بچوں کو ایک ایک دو دو روٹی مل سکی ۔ رانا اور مہارانی نے کچھ نہ کھایا ۔ چمپاوتی اِس امر سے واقف تھی ۔ اس لئے اُس نے بھی روٹی کا ٹکڑا نہ توڑا ۔ یہی بچائی ہوئی روٹیاں چمپاوتی نے رانا کو لا کر دی تھیں ۔ قربانی کا یہ جذبہ دیکھکر رانا کا جی بھر آیا ۔

لیکن اِن روٹیوں کو دیکھکر رانا کی چنتا دُور نہ ہوئی ۔ اُنھیں یہ فکر پڑ گئی کہ ایک بھوکے آدمی کے لئے اور روٹیاں چاہئیں ۔ یہ بات اُنھوں نے رانی گن وتی کے کان میں کہی ۔ کیونکہ لڑکی کے سامنے اُس کے جذبۂ قربانی کی تحقیر کرنے کی ہمّت رانا کو نہ ہو سکی ۔ چمپاوتی تاڑ گئی اور اُس نے کہا پتاجی میرے پاس دو پیسے ہیں ، ان کا آٹا منگا کر ہم لوگ اور روٹیاں بنا لیں گے ۔ جو مسافر کے لئے کافی ہوں گی ۔ رانا بے چین ہو گیا ۔ لڑکی کے ہاتھ سے دونوں پیسے لے لئے اور تیزی سے بازار کی طرف چل گئے ۔

رانا کے پلٹنے کے تھوڑی دیر بعد ہی مسافر پھر آیا ۔ چمپاوتی نے پہلے ہی سے جھونپڑے کا صحن صاف کر رکھا تھا ۔ مسافر کے لئے اُس نے گھاس کا آسن بچھا دیا ۔ مسافر کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی ۔ بھک منگوں کا بھیس ہونے پر بھی اُسکے چہرے سے جلال ٹپکتا تھا ۔ جھونپڑے کے نزدیک آ کر اُس نے آواز دی ۔ " ایک بھوکا برہمن بھوجن مانگتا ہے ۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے " ۔

چمپاوتی جھونپڑے سے باہر نکل آئی۔ مسافر کو عزت کے ساتھ اندر لے گئی۔ اور آسن پر بٹھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد مسافر نے چمپاوتی سے پوچھا "بیٹی تم کون ہو"۔

چمپاوتی نے کہا "آپ کی داسی ... مہارانا پرتاپ کی بیٹی"

مسافر کے چہرے پر رحم اور خوشی کے جذبات کی بجلی سی جھلک دوڑ گئی۔

چمپاوتی روکھا سوکھا کھانا لینے کے لئے جھونپڑے کے اندر گئی اور تھوڑی دیر میں کیلے کے پتّے پر دس چھوٹی چھوٹی روٹیاں اور کچھ چٹنی اور گلاس میں پانی بھر کر اُس مسافر کے سامنے رکھ دیا...... مسافر روٹیاں کھانے لگا۔

چمپاوتی۔ (شرمندگی سے سر جھکا کر) مہاراج ہم لوگوں کی غریبی کی وجہ سے آپ کو یہ روکھا سوکھا بھوجن کھانا پڑ رہا ہے۔ ایسا کھانا بھلا آپ کو کیا رچیگا۔

مسافر۔ نہیں بیٹی کوئی حرج نہیں۔ یہ کھانا بڑا لذیذ ہے۔ بھگوان تیرا بھلا کرے۔

مسافر کھانا ختم کر چکا اور جانے کے لئے طیار ہوا۔ چمپاوتی کے چہرے پر خوشی کی لہریں دوڑ گئیں۔ اُس کی خوشی بھی اتنی ہی قیمتی تھی۔ جتنی اُس کی قربانی۔

جاتے ہوئے برہمن نے آشیرباد دی اور چمپاوتی سے کہا رات کو میں پھر مہارانا کے درشنوں کو آؤں گا۔ چمپاوتی جھونپڑے میں یہ خوشخبری سُنانے کے لئے گئی کہ برہمن نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا ہے تاکہ اُس کے ماں باپ بھی اس خوشی میں حصہ دار ہو سکیں۔ لیکن بھوک نے چمپاوتی کو کمزور کر دیا تھا۔۔۔ ۔ وہ دروازے پر ہی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

۴

چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ گھنی جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈوں میں سے تیز ہوا سنسناتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ شاخیں زور زور سے ہل رہی تھیں۔ پتیاں تھر تھرا رہی تھیں۔ جھونپڑے میں چٹائی پر ایک کمزور لڑکی کا جسم دھندلی لکیر کی مانند پڑا ہوا تھا اور موت سے جنگ کر رہا تھا۔ یہ چمپاوتی تھی جو بستر مرگ پر دم توڑ رہی تھی۔ اُس کے پاس ہی رانا پرتاپ اور مہارانی گن وتی خاموش اور بے بس بیٹھے ہوئے تھے۔ سُندر سنگھ جاگ پڑا تھا۔

سُندر سنگھ۔ اماں! بہن جی آج اس طرح کیوں پڑی ہیں۔

رانی گن وتی۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) بیٹا بہن سو رہی ہے۔ جھونپڑی میں پھر سناٹا چھا گیا۔

کچھ دیر کے بعد مہارانا بولے اور رانی سے پُوچھنے لگے...... شہنشاہ اکبر کے پاس ہم کیا جواب بھیجیں۔ اگر ہم اُن کو اپنا سرتاج مان لیں تو وہ ہم سے صلح کر لیں گے۔ اُن کو مجھ سے صلح کرنے کی بڑی خواہش ہے۔ معلوم نہیں ہماری بے بسی کی اُنھیں کیوں کر خبر پہنچ گئی۔ اُن کو ہماری مصیبت کا بڑا دُکھ ہے۔ وہ میرے بچّوں کے نام پر صلح کے جویا ہیں اور صرف نام کے لئے شہنشاہ مان لینے پر وہ صلح کے لئے طیار ہیں۔ اگر اُن کا یہ کہنا میں منظور کر لوں تو جہاں چاہوں وہاں جا سکتا ہوں وہ ہمیں نہیں ستائیں گے۔ اس کا وہ وعدہ کرتے ہیں۔

اُسی وقت جھونپڑے کے باہر کسی کی آہٹ معلوم ہوئی۔ رانا چونک پڑے۔ اور پوچھا کون ہے؟

کوئی جواب نہ ملا۔

گن وتی۔ شاید پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز تھی۔

رانا پرتاپ۔ میں سمجھتا ہوں کہ رحم دل اکبر کا کوئی سفیر ہوگا۔

ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ چمپاوتی بستر مرگ پر تڑپ اٹھی۔ اپنے کمزور بازوؤں کے سہارے اپنے نصف جسم کو اُٹھا کر موت سے جنگ کرتی ہوئی وہ کانپتے ہوئے سُر میں بولی۔ پتاجی آج تو آپ کو اکبر کی رحم دلی اور فراخدلی کا پتہ لگا ہے۔ کل اُس کا کوئی عہدہ قبول کر لیجئے گا۔ اور پرسوں اُس کی غلامی کے غرور سے سر اونچا کر کے خوش ہوجئے گا۔ لیکن یاد رکھئے جس روز آپ نے یہ لعنتی کام کیا اُسی روز راجپوتی شان اور عزت مٹی میں مل جائے گی۔ اکبر کہتا ہے کہ آپ کے بچوں کی تکلیف پر اُسے رحم آ رہا ہے۔ اُس بھولے بھالے شہنشاہ کو یہ معلوم نہیں کہ رانا کے لڑکے دھان پان نہیں ہیں۔ کیا وہ ہلدی گھاٹ کی لڑائی بھول گیا۔

یہ کہہ کر چمپاوتی بیدم سی ہو گئی اور کمزوری کی وجہ سے بچھونے پر گر پڑی جھونپڑی میں سناٹا سا چھا گیا...... کمرے میں ملک الموت کا سایہ اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ راجہ اور رانی چمپاوتی کی طرف تعجب سے دیکھنے لگے۔ مہارانی نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر دیکھا کہ لڑکی کہیں ہذیان تو نہیں بک رہی ہے۔

چمپاوتی۔ (باریک اور دھیمی آواز سے جیسے دُنیا کے اُس پار سے کوئی بول

رہا ہو)

نہیں ماں میں ہذیان نہیں بک رہی ہوں۔ پتاجی آپ اکبر کا کہنا نہ مانیں۔

رانا۔ بیٹی تیرے بستر کے برابر بیٹھ کر میں قسم کھاتا ہوں کہ جب تک میرے دم میں دم ہے میں چتوڑ کے لئے لڑوں گا۔ اور آزادی کی شمع کو ہمیشہ روشن رکھوں گا۔ اولاد کی محبت کے جذبے نے میرے جذبۂ فرض پر فتح پالی تھی۔ لیکن میرا ارادہ پھر مضبوط اور اٹل ہو گیا ہے۔ جب تک تیری سی بیٹیاں میری ہمت بندھاتی رہیں گی میں اکبر سے ہرگز ہار نہ مانوں گا۔ اور بھوکے مرتے ہوئے بھی آخر دم تک آزادی کے لئے جنگ کرتا رہوں گا۔

چمپاوتی: ایسا ہی ہوگا۔

"ایسا ہی ہوگا" یہ آواز جھونپڑے کے باہر سے آئی۔ اور اُسی وقت شہنشاہِ اکبر بھکاری کے بھیس میں جھونپڑے کے اندر داخل ہوا۔

چمپاوتی۔ ارے یہ تو مسافر ہے۔

شہنشاہِ اکبر۔ رانا تمہاری ہمت اور استقامت نے اور تمہاری اولاد کی بہادری نے مجھے جیت لیا ہے۔ ہندوستان اور شہنشاہِ اکبر ایسی اولاد پر فخر سے سر اونچا کرتا ہے۔ میں تمہاری حب الوطنی کی قدر کرتا ہوں، اور تمہاری آزادی تم کو واپس دیتا ہوں۔ اپنا ہاتھ آگے کرو:

دونوں بادشاہوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور ایک دوسرے کے ہاتھ کو تھامے ہوئے چپ چاپ کھڑے تھے۔ شہنشاہ نے رانا کو گلے سے لگایا اور واپس جانے کی اجازت چاہی۔

جھونپڑے کا چراغ بجھ گیا جس چٹائی پر چمپاوتی پڑی ہوئی تھی اس پر خفیف سی حرکت ہوئی۔ شہنشاہ اور رانا اُس کی طرف مُڑے۔ چاند کی دُھندلی روشنی میں اُنھوں نے دیکھا کہ چمپاوتی کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔

جھونپڑے کے باہر سناٹا چھا گیا۔۔۔۔۔ ہوا تیزی سے چلنے لگی۔۔۔۔ موت اپنا شکار لئے ہوئے ہوا کے پروں پر اڑی چلی جا رہی تھی۔

سرسوتی۔

نقد و نظر

ادب لکھنؤ

مرتبہ نامؔر لکھنوی

سالانہ چندہ للعہ
قیمت فی کاپی ۳؍

ماہنامہ ادب لکھنؤ اپنے دورِ جدید میں امتیازی شان و شوکت سے جلوہ گر ہوا ہے۔ مضامین نگاروں میں بہت سے مشاہیر حضرات کے نام نظر آتے ہیں۔ گرانمایہ مضامین کے فراہم کرنے کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ معلوم کرکے ہمیں خوشی ہوئی کہ رسالہ ادب کو راجہ صاحب محمود آباد کی سرپرستی حاصل ہے۔ "ادب" کا محمود آباد نمبر قابلِ دید ہے، جو کہ متعدد تصاویر سے مزین ہے۔ راجگان محمود آباد کے تاریخی حالات جمع کئے گئے ہیں۔ رسالہ میں موجودہ فرمانروائے محمود آباد کی تصویر آرٹ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ رسالہ کی حسنِ ترتیب قابلِ داد ہے۔ نثر و نظم کے مضامین چیدہ ہیں۔ صوری اور معنوی حیثیت سے رسالہ دیدہ زیب اور دل فریب۔ مرتب نے نظموں غزلوں اور مضامین کی فراہمی میں خوش ذوقی اور سلیقے سے کام لیا ہے۔ ہمیں قوی امید ہے کہ رسالہ قدیم روایات کو قایم رکھتے ہوئے شعر و ادب کی مفید خدمت انجام دے گا۔

شاہد

ایڈیٹر ساحؔر بریلوی۔ مقام اشاعت یعقوب منزل

شاہد کا مشترک نمبر ۱۹۳۶ء ۱۴۰ صفحات کی ضخامت پر شائع ہوا ہے۔ ملک کے مستند شعرا اور ادیبوں کے مضامین سے اسے مرتب کیا گیا ہے۔ حضرت سیماب اکبرآبادی کا "پیامِ فردا"، پروفیسر اکبر حیدری کا "شباب عمرِ فانی"، احسان دانش کی غزل "نذرِ غالب" اور محسوساتِ ملبر کی غزلیں قابلِ داد ہیں۔ مشہور مضامین نگاروں کے اعلیٰ پایہ کے مضامین سے رسالہ کو زیب و زینت بخشی گئی ہے۔ رسالہ کی کتابت دیدہ زیب ہے۔ آخر میں "فلم ایڈیشن" میں مشہور اداکاران اور ہندوستانی فلموں کے متعلق دلچسپ مضامین ہیں۔ ہم ساحر بریلوی کو ان کی اس کاوش پر مبارکباد دیتے ہیں۔

حشر

ایڈیٹر ودیا پرکاش سرور کیتھو دیہ

سالانہ چندہ دو روپے
قیمت فی پرچہ تین آنے

رسالہ شکسپیرِ ہند آغا حشر کاشمیری کی یادگار میں جاری کیا گیا ہے

ادارۂ کلیم

حضرت سرور اس کے ایڈیٹر ہیں۔ جو کہ دنیائے صحافت میں تعارف کے محتاج نہیں۔ رسالہ میں ہندوستانی فلموں کے متعلق مضامین فراہم کئے گئے ہیں۔ اور خوبصورت ایکٹرس کی تصاویر نے رسالہ کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ غزل کا حصہ غالب ہے مشہور شعرا نے اپنے کلام سے رسالہ کو مزین کیا ہے۔ اب جب کہ فلم اور ہندوستانی مجلسی زندگی روز بروز قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے فلمی رسالوں کا معرضِ وجود میں آنا ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ کارکنانِ حشر رسالہ کو موجودہ معیار پر قایم رکھیں گے۔ اور دنیائے فلم اور دنیائے ادب کی خدمت میں ہمیشہ پیش پیش رہیں گے۔ رسالہ کی کتابت دیدہ زیب ہے۔ تصاویر خوبصورت اور دلکش ہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور مصور مجلہ اتنے سستے داموں میں پیش کرنا ناممکنات میں سے ہے۔

اتحاد

ایڈیٹر بھائی بشیر
مقام اشاعت دفتر اتحاد خورجہ

چندہ سالانہ دو روپے
قیمت فی پرچہ چار آنے

اتحاد اپنے نئے چولے میں جلوہ گر ہوا ہے۔ سرورق خوشنما، سیاسی مجلسی اور دیگر مسائل پر پُر مغز مضامین۔ غیر دلچسپ افسانوں کی بھرتی سے پاک۔ ہم اس ضروری تبدیلی پر مدیران اتحاد کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ رسالہ کو اس کے موجودہ بلند معیار پر قایم رکھیں گے۔

طُور

ایڈیٹر کلیم افغانی

قیمت سالانہ تین روپے آٹھ آنے
قیمت فی پرچہ پانچ آنے

طور نامی رسالہ کلیم صاحب افغانی ایم اے کی ادارت میں ۴۸ صفحات پر ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس میں نہایت ٹھوس، مفید، سنجیدہ اور متین مضامین نظر آتے ہیں اس کے تعلیمی اصلاحی مضامین طرۂ امتیاز ہیں۔ تمام نام نہاد ادبی رسائل کی صف میں اسے جو فوقیت حاصل ہے وہ بیک نظر محسوس ہو جاتی ہے۔ اردو اخبار و رسائل کا صوبہ سرحد سے اجرا ارباب ادب کے لئے نہایت مسرت کا موجب ہے ہم توقع کرتے ہیں کہ ہر صاحب ذوق طور کی زیارت کرنا ضروری سمجھیں گے۔ جو ہر لحاظ سے [illegible]

بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت

مولوی عبدالحق صاحب
آنریری سکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو اورنگ آباد دکن

بہت سے اصحاب اس جملے کے معنے نہیں سمجھیں گے اور اس عنوان کو پڑھ کر اُنھیں اُلجھن ہوگی۔ اس لئے سب سے اول یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے معنے ہیں "ہندوستان بھر کی ادبیات کی انجمن"۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۴ اپریل اور ۲۵ اپریل کو ناگپور میں ہوا۔ مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ انھیں تاریخوں میں "ہندی ساہتیہ سمیلن" کے اجلاس بھی مختلف اوقات میں ہوئے۔ اس کے صدر بابو راجندر پرشاد تھے۔ اس سے قبل کہ میں پرشد کے اس اجلاس کے حالات بیان کروں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی "شان نزول" سے مختصر طور پر بحث کروں۔ یعنی یہ کہ یہ انجمن کن وجوہ سے وجود میں آئی اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ جب تک یہ نہ کیا جائے گا اس کی پوری حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی۔

مسٹر کا کا کالیلکر اس اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ انھوں نے اپنے اڈریس میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی پیدائش کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ میں اسی کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔ کیونکہ اُن کا بیان زیادہ مستند سمجھا جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن منعقد ہوا تھا اس میں سب سے یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد کو بنا پور کے اجلاس میں مہاتما جی نے بھارت ساہتیہ پرشد کا خاکہ صاف طور پر پیش کیا۔ پھر کراچی میں کانگریس کے موقع پر مسٹر کنہیا لال منشی سے جو میری بات چیت ہوئی تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سوسائٹی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا اور ہم سب ایک جا جمع ہوئے تو ایک مفصل تجویز اس کے متعلق منظور کی گئی، جسے عمل میں لانے کے لئے مسٹر کنہیا لال منشی، پریم چند اور گرو دھاشا کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کے چند مہینے کے بعد مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن کا اجلاس بھی اندور میں ہوا۔ اس نے بھی کو لہا پور کے تمیل کو عمل میں لانے کے لئے ہندی ساہتیہ سمیلن سے تبادلۂ خیالات کیا ہندی ساہتیہ سمیلن نے کاکا کالیلکر، ہری بھاؤ اپادھیائے اور بابا راگھوداس کو مندوب بھیجا۔ اندور مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن نے اپنی ساہتیہ پرشد کو اطلاع دی کہ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے لئے ایک مہاراشٹر کمیٹی قائم کی جائے جو ہندی ساہتیہ سمیلن کو بھارتیہ ساہتیہ سمیلن قائم کرنے میں مدد دے۔ اسی طرح کرناٹک اور گجرات کی ساہتیہ کمیٹیوں نے بھی اس تحریک کو سراہا۔

یہ تو ہے اس کی پیدائش اور ابتدا کی حقیقت۔ اب رہا اس کا مقصد سو وہ اُس قرارداد سے ظاہر ہے، جو ناگپور کے اجلاس میں منظور کی گئی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"اس پرشد کا اُدیش (مقصد) ہوگا کہ (الف) ہندوستان کے سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساہتیوں (ادیبوں) اور ساہتکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرانا اور اس نام سے بھارتیہ ساہتیوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا (ب) اس سبھا کا کام ہندی یعنی ہندوستانی میں ہوگا"

اُس کمیٹی نے جو اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل کے لئے مقرر کی گئی تھی پہلا کام یہ کیا کہ ماہانہ "ہنس" کو جو کئی سال سے ملک کے قابل ادیب منشی پریم چند صاحب کی اڈیٹری میں جاری تھا، اپنے ساتھ ملا کر اپنا لیا، اور اب اُسے پرشد کا رسالہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور منشی پریم چند صاحب کے ساتھ گجراتی زبان کے ادیب اور مورخ مسٹر کنہیا لال منشی بھی اسی کی اڈیٹری میں شریک ہو گئے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد جو بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی پیدائش اور مقاصد کے متعلق تھی، میں آپ کو اس کے پہلے اجلاس کی روداد سنانا چاہتا ہوں جو ہم سب کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو تقریباً ۱۰ بجے دن کے اس کا پہلا اجلاس شروع ہوا۔ سب سے اول مسٹر کا کا کالیلکر نے اپنا اڈریس پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد صدر انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ اڈریس جو صرف ایک صفحہ کا تھا تقسیم کر دیا گیا۔ اور مہاتما جی نے یہ کہہ کر کہ مطبوعہ اڈریس پڑھ کر سنانا فضول ہے وہ آپ خود پڑھ لیں گے۔ زبانی تقریر شروع کر دی۔ یہ ایسی آہستہ آواز میں تھی کہ پاس والے بھی اچھی طرح نہ سن سکے۔

پرشد کے اس جلسے کا سب سے بڑا کارنامہ وہ رزولیوشن تھا جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ زیادہ تر بحث اسی پر رہی۔ اس کے پہلے جزو سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ البتہ دوسرے جز پر بہت کچھ گفتگو رہی۔ اصل مسودے میں یہ الفاظ تھے کہ اس پرشد (انجمن) کی ساری کارروائی "ہندی ہندوستانی" میں ہوگی۔ یہ لفظ پہلی بار یہاں سننے میں آیا۔ غالباً یہ مہاتما گاندھی کے جدت پسند دماغ کا نتیجہ تھا۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے رزولیوشن میں یہ طے کیا تھا کہ اس ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی، خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ اس کے بعد آپ نے "ہنس" کے متعلق جو تحریر شائع کی اس میں آپ لکھتے ہیں کہ اس رسالے کے مضامین کی زبان ہندی اتھوا (یا) ہندوستانی ہوگی۔ اس کے کیا معنے۔ فرمایا کہ کانگریس کا رزولیوشن بھی میں نے ہی بنایا تھا۔ میں نے عرض کیا یہ صحیح ہے، لیکن اُس وقت ہندوستانی کے معنی ہم ہرگز ہندی نہیں سمجھے تھے، بلکہ اب میں نے اس کے معنی بتا دئے ہیں جو "ہنس" کی تحریر میں آپ نے دیکھے۔ یہ گاندھی جی کی کج فہمی ہو سکتی ہے۔ انھوں نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے۔ یعنی "ہندی ہندوستانی" جو بالکل بے معنی ہے۔ یہی لفظ پرشد کی مجلس استقبالیہ کے صدر کا کا کالیلکر صاحب نے اپنے اڈریس میں استعمال کیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبوں نے پہلے سے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندوستانی کا لفظ تنہا استعمال نہ کیا جائے۔ تاکہ اس کی گنجائش ہی باقی نہ رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اس کا مفہوم اُردو لے سکے۔ جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ ہندی ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے تو فرمایا وہ ہندی جو آگے چل کر ہندوستانی ہونے والی ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا یہ تو کوئی زبان نہ ہوئی یہ تو آپ کی خواہش یا منشا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ ہندی کونسی زبان ہے، اور ہندوستانی کونسی، جناب نے فرمایا کہ ہندی ادبی زبان ہے اور عام لوگ کم سمجھتے ہیں اور ہندوستانی وہ زبان ہے جو عام لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں، لیکن ابھی اس کا ادب نہیں بنا۔ اپنے مطبوعہ اڈریس میں انھوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہندی کو

ہندوستانی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس بھاشا میں اُن فارسی الفاظ کو جو زبان میں رائج ہو گئے ہیں ترک نہ کیا جائے۔ غرض صبح کا جلسہ اسی پر ختم ہو گیا اور کوئی بات طے نہ ہوئی۔

سہ پہر کے جلسے میں پھر یہی بحث چھڑ گئی۔ جب مہاتما جی سے یہ کہا گیا کہ رزولیوشن میں یا تو آپ ہندی کا لفظ رکھئے یا ہندوستانی کا "ہندی ہندوستانی" کے کوئی معنی نہیں۔ تو فرمایا کہ ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں اور میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہندی سمیلن کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نیشنل کانگریس کے فیصلے کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے۔ جس نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ میں نے دانستہ دوبارہ یہ بات اس لئے کہی تھی کہ اس گفتگو کے وقت پنڈت جواہر لال نہرو موجود نہ تھے۔ اس وقت وہ میرے قریب تشریف رکھتے تھے۔ اور خیال تھا کہ صدر کانگریس کے حضور میری تائید کریں گے۔ لیکن مجھے افسوس اور کس قدر مایوسی ہوئی کہ انھوں نے ایک لفظ نہیں کہا اور خاموش بیٹھے رہے۔ اور ایک نہیں وہاں اگلے تین کانگریس کے صدر موجود تھے۔ (دو سابق اور ایک حال) مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ گاندھی جی نے میرے سوال کے جواب میں وہی کہا جو صبح فرما چکے تھے۔ اس کے بعد جب یہ گفتگو ختم ہو گئی تو گاندھی جی نے "ہندی ہندوستانی" کو بدل کر "ہندی یعنی ہندوستانی" کے الفاظ رکھ دئے۔ اس پر آخر میں جیسی صاحب رائے پوری نے یہ ترمیم پیش کی کہ رزولیوشن میں یا تو لفظ ہندی رکھا جائے یا ہندوستانی۔ کیونکہ مہاتما جی خود ہندی اور ہندوستانی کے دو الگ الگ مفہوم بتا چکے ہیں۔ اس بنا پر ہندی اور ہندوستانی ایک زبان نہیں ہو سکتیں اور اس لئے ہندی یعنی ہندوستانی بے معنی ہوگا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ رکھنا مناسب ہوگا۔ میں نے یہاں تک کہا کہ آپ صرف ہندی رکھئے۔ تو میں اس کی تائید کروں گا۔ اس پر وہ ہنسنے لگے اور کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ آخر جب مہاتما جی نے ووٹ پر آمادگی ظاہر کی۔ مسٹر کنہیا لال منشی نے کہا کہ یہ معاملہ ادبی اور لسانی ہے ووٹ سے طے نہیں ہو سکتا۔ مہاتما جی نے کہا کہ ووٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ فیصلے کی یہی ایک تدبیر ہے۔ ووٹ کا حکم صادر ہوا۔ لیکن ووٹ لینے سے پہلے بڑی ہوشیاری یہ کی گئی کہ ہندی سمیلن کے ان نمائندوں کو بھی ووٹ کا حق دے دیا گیا جو اُس وقت اس جلسے میں حاضر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت رائے اس ترمیم کے خلاف نکلی۔ اگر ہندی سمیلن کے نمائندوں کو ووٹ کی اجازت نہ دی جاتی جن کا اُنھیں حق حاصل نہ تھا تو ترمیم غالباً منظور کرنی پڑتی۔ مگر مہاتما گاندھی بھارتیہ ساہتیہ پرشد کو ہندی سمیلن کا بچہ کہتے تھے اور اُن کے تصور میں یہ دو مجلسیں کبھی الگ نہیں ہو سکتی ہیں حالانکہ بقول منشی پریم چند کے یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ پہلے دن کی کارروائی یہیں ختم ہو گئی۔

اصل معاملہ تو پہلے ہی دن طے ہو چکا تھا۔ دوسرے دن ۲۵ اپریل کو ایک معمولی جلسہ ہوا پہلے دن سہ پہر کو ایک گفتگو یہ بھی چھڑ گئی تھی کہ ہمیں اپنی زبانوں کے ادب کا رُخ بدلنا چاہئے۔ بار بار پرانے فرسودہ خیالی مضامین کو دہرانا موجودہ حالات کے بالکل منافی ہے۔ ہمیں اپنے ادب کو زندہ اور زندگی کے حالات کے مطابق بنانا چاہئے۔ اس بحث میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی حصہ لیا۔ اور یہ ارادہ ہوا کہ دوسرے روز ایک رزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا جائے۔ کنہیا لال منشی اور دو ایک اور صاحب اس خیال کی مخالفت کرتے رہے۔ پرشد کے مہارتھوں نے اس خوف سے کہ کہیں جدید خیال والے کوئی سخت رزولیوشن پیش نہ کر دیں۔ رات ہی کو اس مضمون کا ایک ہلکا سا رزولیوشن تیار کیا اور دوسرے روز اجلاس شروع ہوتے ہی پہلے اُسے پڑھ کر سنایا جو بلا اختلاف منظور کر لیا گیا۔ لیکن یہ رزولیوشن بہت کچھ تشریح کا محتاج تھا۔ اس لئے ان صاحبوں نے جو دیسی ادبیات کی اصلاح پر مُصر تھے۔ الگ الگ بیان شائع کیا۔ اس کے بعد انتظامی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب ہوا ان میں سے چند تو ہندی ساہتیہ سمیلن نے اپنے حق کی بنا پر اپنے نمائندے انتخاب کئے۔ اور کچھ مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن نے اور چند متفرق اشخاص منتخب ہوئے۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے پہلے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

اب اس کارروائی پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ہندوستانی کو ہندی میں اور ہندی کے معنی ہندوستانی بتاتے ہیں۔ پھر "ہندی ہندوستانی" کی جدید لفظ کے اختراع ہیں اور آخر میں ہندی یعنی ہندوستانی کے الفاظ میں کیسے کیسے پہلو بدلے ہیں۔ پہلے اردو کا لفظ ترک کر کے ہندوستانی اختیار کیا گیا تھا۔ یہاں تک کچھ مضائقہ نہ تھا۔ اور اس پر ہم بھی رضامند تھے۔ اور ہمارے بعض مستند ادیبوں اور اہل الرائے اصحاب نے یہ لفظ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ اُن کا اصرار تھا کہ اردو کی بجائے اب ہندوستانی لکھا جائے۔ اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا۔ فریقین نے یہ سمجھوتہ تسلیم کر لیا تھا۔ اب ہندوستانی کا لفظ بھی متروکات میں داخل ہو گیا۔ اور صرف ہندی رہ گیا۔ معترض کے لئے اُن کے پاس جواب موجود ہے۔ وہی جو گاندھی جی نے فرمایا "ہندی یعنی ہندوستانی"۔ گاندھی جی نے رسالہ ہنس کی زبان کو بھی ہندی اتھوا ہندوستانی فرمایا ہے۔ جب اُن سے کہا گیا کہ ہنس کی زبان بہت کٹھن ہے وہ ہندوستانی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کی زبان کلکتہ کے مشہور رسالہ وشال بھارت سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ تو انہیں حیرت ہوئی۔ ہنس کے اڈیٹروں نے تو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں" اس کی تائید بابو راجندر پرشاد کے اس خطبہ صدارت سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ہندی ساہتیہ سمیلن میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "خوشی کی بات ہے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔ اور اس کا پہلا اجلاس اس ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہو رہا ہے۔ اس کے ذریعہ سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ہندی کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، وہ بھی دور ہو جائے گی اور ہمیں اُمید ہے کہ اس سے ہندی پرچار میں مدد ملے گی" کاکا کالیلکر صاحب نے بھی اپنے اڈریس میں صاف طور پر اس کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس تحریک (بھارتیہ ساہتیہ پرشد) کی ابتدا کی ہے انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جلسہ سارا کام "راشٹر بھاشا (قومی زبان) ہندی یا ہندوستانی میں چلے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ تمام ہندوستان کی بھاشاؤں

کی انجمنیں ہی جو اور سب میں ناگری لپی (رسم خط) جاری ہو جائے تاکہ وہ اپنے صوبے کی بولی کا کلام ناگری میں کریں۔ یہ الفاظ ایسے صاف اور صریح ہیں کہ ان کے لئے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا یہ مقصد بے شک قابلِ تعریف ہے کہ وہ دیسی زبانوں کے ادبیات کی اصلاح و ترقی چاہتی ہے، لیکن اس کا دوسرا مقصد بلا شبہ ہندی زبان کا پرچار ہے جس میں وہ اور ہندی سمیلن دونوں متفق ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ پرشد کے اجلاس کی تاریخیں اور مقام بدل کر اسے انھیں ایام اور اسی مقام میں رکھا گیا جن تاریخوں میں اور جہاں ہندی سمیلن کا اجلاس تجویز ہوا تھا۔ تاکہ ہندی سمیلن کے اثر اور امداد سے سعی ہو سکے۔ غرض یہ کہ پرشد ادبیات کے پردے میں ایک زبان کی اشاعت پر تلی ہوئی ہے، اور مختلف زبانوں کے ادب اور ادیبوں کے اتحاد و عمل سے ہندی کے پرچار کا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔

اس ضمن میں میں اس امر کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ منشی پریم چند صاحب شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور وہ اس تمام گفتگو اور بحث سے بددل ہو رہے تھے بلکہ بیزار بھی ہو گئے۔ اُن کی دلی منشا تھی کہ ہندی اور اردو کے جھگڑے کو مٹا کر کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جو دونوں فریقوں میں مقبول ہو سکے۔ لیکن جو کارروائی وہاں ہوئی اس سے وہ بھی ایسے ہی مایوس ہوئے جیسے ہم میں سے بعض لوگ۔

اسی گفتگو میں بنگال، مہاراشٹر اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں کے نمائندوں نے یہ کہا، اور غالباً اُن کا یہ کہنا ایک حد تک درست ہے کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کا قائم رکھنا یا داخل کرنا ضروری ہے کیونکہ اُن سنسکرت لفظوں کا سمجھنا ہمارے لئے زیادہ آسان ہے بہ نسبت اُن ہندی اور فارسی لفظوں کے جو آپ کی سہل ہندی میں استعمال ہوتے ہیں اس لئے کہ ہماری زبانوں میں پہلے ہی سے سنسکرت الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ ان زبانوں کی بنیاد زیادہ تر سنسکرت پر ہے۔ اس خیال کی تائید کانگریس کے اُن لوگوں سے بھی ہوتی ہے جن میں وہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے دل کی بات سے یہ دعا کرتا ہوں کہ ہم کو آپ کی (یعنی شمالی ہند کی) ہندی سمجھنے میں مشکل پڑتی ہے۔ پنڈت جواہر لال کی ہندی آپ کے لئے عام فہم ہوگی مگر ہمارے لئے مشکل ہے۔ وہ ہندی بھی جو دلّی اور لکھنؤ کے بازاروں میں گنوار لوگ سمجھ سکتے ہیں وہ نیچرل ہندی ہے۔ لیکن اُسے بھی ہم بہت ہی کم سمجھتے ہیں۔ کانگریس میں جو ہندی بولی جاتی ہے اس میں فارسی شبدوں کی اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ دیہات سے آنے والے نمائندوں کے لئے انگریزی اور ہندی دونوں بھاشائیں یکساں مشکل ہو جاتی ہیں۔

اسی دوران میں لغت کی بحث نکل یعنی ایک ایسی ڈکشنری تیار کی جائے جس میں علاوہ فہم الفاظ کے وہ تمام الفاظ جمع کئے جائیں جو ہندی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ میں مشترک ہیں، اور ان تمام الفاظ کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ نہ ہو۔ اس میں دو مشکلیں ہیں ایک تو یہ کہ ہندی اور خاص کر فارسی الفاظ کی صورتیں مختلف زبانوں میں بگڑ بگڑا کر ایسی ہو گئی ہیں کہ ایک لفظ ہوتے ہوئے بھی اُن کا پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظ تو ایک ہی ہے لیکن مرہٹی میں اس کے معنی کچھ ہیں اور ہندی یا بنگالی میں کچھ اور۔ علاوہ اس کے ایسی ڈکشنری اُن مبتدیوں کے لئے تو کسی قدر کار آمد ہو سکتی ہے جو زبان سیکھنا چاہتے ہیں، لیکن ادبی ضروریات کے لئے بالکل کار آمد نہیں ہو سکتی۔ میں نے ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں جس کا اجلاس بڑودہ میں ہوا تھا یہ تجویز پیش کی تھی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا کہ تمام ہندی اور اردو زبان کو پڑھ کر اردو، فارسی، عربی الفاظ اور محاورے چن لئے جائیں، اور اسی طرح اردو ادب اور زبان کا مطالعہ کر کے تمام ہندی الفاظ اور محاورے نکال لئے جائیں، اور اُن سب کو ایک جگہ جمع کر کے کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے۔ تاکہ معلوم ہو کہ ہماری زبان کا مشترک سرمایہ کیا ہے۔ اس کے بعد جب الفاظ کے اضافے کی ضرورت ہو یا جو اصطلاحات بنانی مقصود ہوں تو وہ ایک ایسی کمیٹی کے مشورے سے ہو جس میں دونوں زبانوں کے نمائندے ہوں۔ لیکن موجودہ حالات دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام کوششیں بے سود ہیں۔

میں ایک بات کہنی بھول گیا، وہ یہ کہ پہلے دن کے اجلاس میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ دہلی) کا ایک خط انگریزی زبان میں مہاتما جی کے نام پڑھا گیا۔ یہ خط نہایت معقول اور مدلل ہے۔ اور بہت ادب اور خلوص سے مہاتما جی سے یہ اپیل کی ہے کہ وہ مشن کانگریس کے فیصلے پر قائم رہیں جس نے ملک کی زبان "ہندوستانی" قرار دی ہے۔ انھوں نے مہاتما جی کی اندور والی تقریر نیز ہنس والی تحریر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جن میں ہندی یا ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور ہندی کے معنی ہندوستانی قرار دئے ہیں جو درست نہیں۔ اردو یا ہندوستانی سے بالکل قطع نظر کی گئی ہے۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے قائم ہونے اور ہنس کے جاری ہونے سے اُن کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ یہ مشترکہ اور عام زبان بنانے میں مضبوط بنیاد کا کام دیں گے۔ لیکن ہنس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس میں زیادہ تر سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا گیا ہے اور اس کی زبان دوسرے ہندی رسالوں کی زبان سے مشکل ہے۔ مجیب صاحب ساہتیہ پرشد کے ساتھ بھارتیہ کے لفظ کو بھی پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اس لفظ کا مفہوم آریائی ہندوستان ہوتا ہے اور اس سے نہ صرف مسلمان بلکہ اُن کی تمام کوششیں جو ہندی زندگی بنانے میں صرف ہوئیں بلکہ صدہا سال کے تغیرات اور ارتقائی منازل جو ہم نے طے کئے ہیں وہ بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ اُن کی رائے میں بھارت کے بجائے ہندوستانی کا لفظ زیادہ مناسب ہوتا۔ مجیب صاحب نے ایک بات اور بھی لکھی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ عربی اور سنسکرت میں اصطلاحی الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے، لیکن ہماری عام اور مشترکہ زبان کو ان میں سے کسی پر بھی منحصر نہیں کرنا چاہئے۔ عربی اگر غیر زبان ہے تو سنسکرت بھی اس ملک میں کبھی عام طور پر نہیں بولی جاتی تھی۔ جو لوگ ہندی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ اصلی حالت میں نہیں پائے جاتے تلفظ کے سہولت نے اُن کی صورتوں کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ مثلاً گرام کا گاؤں ہو گیا ورش کا برس بن گیا۔ اب پھر اصل سنسکرت الفاظ کی طرف رجوع کرنا اور مروجہ الفاظ کو ترک کرنا یا تو اظہار شیفتگی ہے یا جہل یا تعصب پر مبنی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات اُس زندہ زبان کی اشاعت سے کچھ سروکار نہیں رکھتے جو عام طور پر بولی جاتی ہے۔ بلکہ اُنھیں ہندی زندگی کو آریائی بنانے کی فکر ہے۔ مجیب صاحب نے اُس خط کا بھی ذکر کیا ہے جو مسٹر کنہیا لال منشی نے مانل صاحب (جامعہ ملیہ) کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ اس میں مسٹر منشی لکھتے ہیں کہ گجراتی، مرہٹی، بنگالی اور کنڑ ایسی ملی جلی روایات پر اپنی ادبی زبان کو بنایا ہے اُن میں اردو کا عنصر تقریباً معدوم ہے۔ مجیب صاحب اسے تسلیم نہیں کرتے وہ لکھتے ہیں کہ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں فارسی الفاظ کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ اور میں ہرگز اس امر کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ انھیں تامل میں ایک دوسرے سے نیز مسلمانوں سے قریب آنے کے لئے اپنی زبانوں کو سنسکرت آمیز بنانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ اس کے صرف خالص اردو عنصر سے ہمیں بحث نہیں بلکہ ہماری بحث شمالی ہند کی زندہ زبان اور محاورات سے ہے۔ اگر یہ زندہ زبان مشترکہ

زبان کی بنیاد قرار دی جائے تو مسلمان پوری طرح اس کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہیں لیکن سنسکرت کی جانب رجعت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی تمام صناعت جو انھوں نے ہندی، بنگالی اور گجراتی کے حق میں کی ہیں نظر انداز کی گئی ہیں۔ ان حالات میں بہ سلسلہ سنسکرت کی درخواست کرنا گویا ہماری ہلاکت میں خود ہماری شرکت کی استدعا کرنا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی اس تقریر کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے اندور میں ہندی سمیلن کے افتتاح کے وقت فرمائی تھی۔ اس میں انھوں نے یہ کہا تھا کہ جس زبان کے لئے ہندی ایشیا میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ عام اور مشترکہ زبان کا سوال طے ہو گیا یعنی وہ زبان ہندی ہوگی کیونکہ ہندوستان میں اسی زبان کے بولنے والے سب سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ لہٰذا ہندوستانی کے حامی کسی گنتی میں نہیں۔ یہ فرقہ وارانہ تعصب کی طرح ایک نئے فساد کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔

خط کے آخر میں پروفیسر مجیب نے چند امور خاص طور پر مہاتما جی کے غور کے لئے پیش کئے ہیں، اور اُن سے التجا کی ہے کہ اگر وہ مناسب خیال فرمائیں تو وہ عام اعلان کی بنیاد کا کام دے سکتے ہیں۔ وہ امور یہ ہیں۔

(۱) ہماری مشترکہ زبان ہندوستان کے نام سے موسوم ہوگی، نہ کہ ہندی کے نام سے

(۲) ہندوستانی کو کسی فرقے کے مذہبی روایات سے مطلق کوئی تعلق نہ ہوگا۔

(۳) لفظ کا معیار اس کا رواج ہوگا، نہ کہ اس کا دیسی یا بدیسی ہونا۔

(۴) تمام وہ الفاظ جو اردو کے ہندو اہلِ قلم نے اور ہندی کے مسلمان مصنفوں نے استعمال کئے ہیں مروجہ الفاظ تسلیم کئے جائیں۔ (۵) اصطلاحی الفاظ خاص کر سیاسی اصطلاحات کے انتخاب میں سنسکرت کی اصطلاحات کو ترجیح نہ دی جائے۔ بلکہ اردو، ہندی اور سنسکرت کی مصطلحات کے فطری انتخاب کی بھی گنجائش رکھی جائے۔

(۶) دیوناگری اور عربی رسم خط دونوں مسلّم خیال کئے جائیں اور ان تمام اداروں میں جن کی پالیسی ہندوستانی کے حامیوں کے ہاتھ میں ہو، دونوں خطوں کے سکھانے کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔

میں نے خط کا خلاصہ بیان کر دیا ہے پورا خط پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور خط داخل دفتر ہو گیا۔ البتہ پنڈت جواہر لال صاحب نے یہ فرمایا کہ تعجب ہے کہ مجیب صاحب جیسے قابل شخص کو ٹنڈن صاحب کے بیان پر اعتراض ہے وہ تو ان کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا ان کا یہ مطلب تھا کہ میں نہ آیا۔ جس خلوص اور امید اور لجاجت کے ساتھ یہ خط مہاتما جی کی خدمت میں لکھا گیا تھا اُس کا تقاضا یہ تھا کہ مہاتما جی اس بارے میں اپنا کوئی خیال ظاہر فرماتے۔ اور جو بدگمانی اُن کے اور اُن کے رفقا کے رویہ سے پیدا ہو گئی ہے اُسے رفع کرتے۔ لیکن افسوس اُنھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے ہندی کے پرچار اور اسے قومی زبان بنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

اجلاس کے دوران میں جب کہ زبان کی بحث چھڑی ہوئی تھی مہاتما گاندھی نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر مجھے بہت تعجب اور افسوس ہوا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ حیرت ہے کہ جس شخص کی صحبت میں مدتوں مولانا محمد علی مرحوم، مولانا ابو الکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود جیسے لوگ رہے ہوں وہ اپنی زبان سے ایسی بات نکالے جو سر تا سر غلط، بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ میں ہر چند یہ توجیہ کر کے اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما جی نے یہ بات ناواقفی کی بنا پر کہی ہے لیکن دل نہیں مانتا۔

مہاتما جی اپنی تقریر میں ہندی اردو یا ہندوستانی کی بحث میں بار بار ہندو اور مسلمان کے لفظ استعمال کرتے تھے۔ میں نے ایک آدھ بار کہا کہ یہ ہندو مسلم سوال نہیں ہے بلکہ بحث ہندی اردو یا ہندوستانی کی ہے ہزاروں ہندو ایسے ہیں جن کی زبان اردو ہے وہ اردو کے ادیب ہیں۔ اسی طرح ہزاروں مسلمان ہیں جو ہندی پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ اس لئے اس بحث کو فرقہ وارانہ رنگ نہیں دینا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کا دماغ اور خیال انحطاط پذیر ہو رہا ہے۔ اسی ضمن میں میں نے گاندھی جی سے یہ بھی عرض کیا کہ مہاتما جی آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اس قدر نہیں۔ یہ سن کر گاندھی جی اور دوسرے صاحبوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں نے اس پر خوب غور کیا ہے اور میں اپنے اس دعوے کو ثابت کر سکتا ہوں۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ یہ کیونکر ہوا۔ میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان کی بنیاد عوام کی زبان پر ہے۔ جو اُس وقت بولی جاتی تھی۔ اور اس لئے اس میں وہ تمام ہندی لفظ اور محاورے آ گئے جو عام لوگوں کی زبان پر تھے۔ ہندی زبان کتابی ہے۔ عوام کی بولی سے اسے بہت کم سابقہ رہا ہے۔ اسے جب کسی لفظ کی ضرورت ہوتی ہے تو سنسکرت کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو ہندی کی نسبت زیادہ ہندی ہے۔

ایک دن وہ تھا کہ مہاتما جی نے ہندوستانی یعنی اردو زبان اور فارسی حروف میں اپنے دست خاص سے مجھ کو خط لکھا تھا اور کہا تھا کہ یہ وقت آ گیا ہے کہ اردو اور ہندی دونوں کو ہندوستانی کا لفظ بھی سنا اور لکھنا پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں جو بمبئی اجلاس میں ہوئی تھی ایک بار نہیں کئی بار فرمایا کہ اگر رزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اردو سمجھا جائے گا۔ لیکن اُن کو خیال نہ آیا کہ کانگریس کے رزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ آیا۔

آخر اس قلب ماہیت (Change of heart) کی کیا وجہ ہے؟ کون سے ایسے نئے اسباب پیدا ہو گئے ہیں جو اس حیرت انگیز انقلاب کا باعث ہوئے؟ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس تمام تغیر و تبدل، توڑ جوڑ اور داؤ پیچ کا باعث ہمارے ملک کا بدنصیب پالیٹکس ہے۔ جب تک مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتہ ہو جائے گا۔ اُس وقت تک وہ ہندوستانی کا پکارتے رہے جو تحریک کے شروع سے کانگریس کی خاص بولی تھی۔ لیکن جب اُنھیں اس کی توقع نہ رہی یا انھوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہ دیکھی تو سیاسی چالیں اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے۔ وہ شوق سے ہندی کا پرچار کریں، وہ ہندی میں سمجھ نہ سکے تو ہم کیا اردو میں سمجھ سکتے۔ اُن کو اگر اپنے وسیع ذرائع اور وسائل پر گھمنڈ ہے تو ہم بھی کچھ ایسے بے چارے نہیں۔

ایسی صورت میں ہمارے لئے اس کے سوا اب کوئی چارہ باقی نہیں کہ ہم اپنی زبان کے بچانے اور اس کی حفاظت و ترقی کے لئے کمر بستہ ہو جائیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ اس کے متعلق ہم ایک مفصل تجویز عنقریب پیش کرنے والے ہیں۔

دنیائے ادب میں ایک تازہ ترین اضافہ

خمارستان

کیا ہے؟

یہ اساتذۂ حال کے گلِ سرسبد، نظم و نثر کے رنگین قلمکار، وحدانیت کے حقیقی معجز نگار، جہان استاد، افسر الشعراء، حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کا تازہ شاہکار ہے۔ یہ دراصل اُن جمالیات کا مجموعہ ہے جن سے آج تک نثر عاری تھی۔ یہ وہ مضامین ہیں جنہیں شمس العلماء مولانا آزاد۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ علامہ شبلی نعمانی کے بعد ہندوستان کا لٹریچر آج تک نہ پیش کر سکا۔ خمارستان قلعۂ معلیٰ کی ٹکسالی اردو اور شستہ و رفتہ بولی سے آراستہ ہے۔ صاحبانِ ذوق کی ضیافتِ طبع کے لئے شائع کی جا رہی ہے۔

اے ز فرصت بے خبر، در ہر چہ باشی زود باش

ابھی سے اپنا اسم گرامی خریداروں کی فہرست میں لکھوا لیجے۔

منیجر کلیم بک ڈپو، فتح پوری، گلی کندلہ کشاں، دہلی

نئے افسانے

پندرہ افسانے ایک جلد میں، سب طبع زاد، نئے، عاشقانہ۔ گویا نثر میں غزلیں۔ مگر زندگی کی سچی تصویریں ہیں، جن میں نہ بناوٹ ہے، نہ مبالغہ ہے۔ بالکل زندگی کی طرح بے ساختہ۔ برجستہ۔ لااُبالی۔ اُمنگ بھری۔ تم ذرا کوئی افسانہ شروع کرو بس اسی میں گم ہو جاؤ گے، وہ سچ مچ تمہیں ہوتا ہوا معلوم ہوگا۔ اور تم اپنے آپ کو اس میں شریک سمجھو گے۔ کردار تمہیں واقعی چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے ہوئے معلوم ہوں گے۔ اُن کے جذبات کی گرمی تمہیں محسوس ہوگی۔ طرزِ بیان لطیف، نازک، جادوانہ۔ ادبیت کی ساری رنگینیوں سے آراستہ۔ دنیا کے کسی بڑے مصنف کے افسانوں سے مقابلہ کیجے۔ برابر رہیں گے۔

اب یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اردو میں اچھے افسانے نہیں ہیں

مصنفہ سید حسن ریاض سابق اڈیٹر ہمت و نوید

نئے افسانے قیمت فی جلد ایک روپیہ چار آنے مع محصول ڈاک عہ

منیجر دی نیشنل پبلشنگ بیورو (دفتر اخبار نوید) لکھنؤ

انشائے لطیف

ادیب العصر حضرت لطیف الدین احمد اکبر آبادی کے افسانے

اردو ادب میں صاحبِ "لالہ رُخ" کا نام محتاجِ تعارف نہیں اور افسانہ نویسی کا جو معیار ل احمد نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ تنہا ایک مثال ہے۔ ان کا افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات اور نفسیاتِ حسن و عشق کے نازک ترین اشارات کا حامل ہوتا ہے۔ اُن کا طرزِ انشا اور تفلسف اردو ادب میں مستقل اضافات ہیں۔

ل احمد صاحب کے افسانے بلا شائبۂ تقلید ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ انشائے لطیف ل احمد صاحب کے پندرہ شہ پاروں کا مجموعہ ہے جو اکثر نگار اور دیگر مجلاتِ علمیہ و ادبیہ میں طبع ہو کر مقبولیتِ دوام حاصل کر چکے ہیں۔ اس لئے اگر آپ کو سلاست و نفاستِ زبان کے ساتھ نفسیاتِ شباب اور جذباتِ حسن و عشق کی صحیح نقاشی سے کوئی خاص لگاؤ ہے، اگر آپ ادب و شعریت کا ذوقِ سلیم رکھتے ہیں تو اس مجموعہ میں آپ کو اپنی طلب و تشنگی کیلئے مکمل سامانِ سیرابی نظر آئیگا۔ طباعت و کتابت روشن و بہترین ہونے کے ساتھ کراؤن سائز پر تقریباً ڈھائی سو صفحات کی ضخامت نفیس جلد قیمت عہ علاوہ محصول۔

نغمات

نثر کی شاعری

اردو ادب میں جناب ل احمد کی تنہا وہ ہستی ہے جس نے حسن و عشق کی واردات اور نفسیات کو انتہائی مطالعہ و فکر کے ساتھ اپنے ذاتی تاثرات و تکیفات کے ماتحت شعریت موسیقی یا موزونیت شعر کی صحبت میں صفحات سادہ کو فردوسِ خیال بنا دیا ہے۔ اس مجموعہ میں جناب لطیف کے ساتھ مختصر ترین افسانے اور ادب پارے شامل ہیں جسے نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب بھی مکمل ترتیب و تہذیب کے بعد زیرِ طباعت ہے۔ اگر آپ اپنی زبان کی نزاکت و لطافت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کے خریداروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرا دیجے۔ قیمت صرف عہ علاوہ محصول

منیجر کلیم بک ڈپو، گلی کندلہ کشاں فتح پوری دہلی

اپنا نام اور پتہ صاف و خوشخط لکھا کیجیے ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر کا حوالہ دیجیے۔ (مینیجر رسالہ کلیم)

اطلاع

جملہ ناظرین رسالہ کلیم کو مطلع کیا جاتا ہے کہ رسالہ نہ پہونچنے کی شکایت اُسی ماہ کے دوسرے ہفتہ میں ضرور کردیں، بعد میں تعمیل نہ ہوگی، (مینیجر کلیم دہلی)


کلیم
مدیر: جوش ملیح آبادی



اے آبشار نوحہ گر از بہر کیستی
سر را بسنگ می زدی و مہگر یستی

مصور ہند رام گوپال وجے ورگی کا شاہکار

منظور شدہ سررشتۂ تعلیم گورنمنٹ میسور

بنامِ قوت و حیات

کلیم

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آگے گئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ (۶) روپے
ششماہی چندہ تین روپے
جملہ حقوق محفوظ ہیں
قیمت فی پرچہ نو آنے

اُردو زبان کا ہر جہت سے قیمتی ماہنامہ

جلد ۲ — نمبر ۲

فہرست مضامین ماہ اگست سنہ ۳۶ء

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے کورونیشن پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم گلی کندلکشاں دہلی سے شائع کیا)

اشارات

سیاسی انجمنیں

ہر ملک میں اتنی سیاسی انجمنیں ہوا کرتی ہیں، اور ہر انجمن تمام ملک کی نمائندگی کا اِس بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کرتی رہتی ہے کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ کس انجمن کو معتبر سمجھا جائے۔ اور خصوصیت کے ساتھ ایک ایسے شخص کے لئے جس کا سیاسی مطالعہ محدود ہو، یہ معاملہ سخت پیچیدہ اور صبر آزما ہوتا ہے کہ وہ کس جماعت میں شریک ہو، اور کسے اپنا لیڈر تسلیم کرے۔

یہ موضوع بہت کچھ خامہ فرسائی چاہتا ہے جس کے واسطے میں اس وقت بالکل تیار نہیں ہوں۔ البتہ اِس مسئلے میں اگر میری اِن دو ناچیز باتوں کا خیال رکھا جائے گا تو دھوکا کھانے کا امکان بہت ہی کم باقی رہ جائے گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک متعدد و مختلف فرقے رکھنے والے ملک کی ہر اُس انجمن سے گریز کرنا چاہیئے جو ملک کے مجموعی اور عمومی مفاد کو پسِ پشت ڈال کر کسی خاص گروہ، یا کسی خاص جماعت کے تحفظ کی خاطر عالمِ وجود میں لائی گئی ہو۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ ایک محکوم ملک کی ہر اُس انجمن سے پناہ مانگنا چاہیئے جس کی باگ اُن حضرات کے ہاتھوں میں ہو جن کے ناموں کے ساتھ خطابوں کے دُم چھلّے لگے ہوئے ہیں۔

اب اِن باتوں کی سرسری سی تشریح بھی سُن لیجئے۔

(الف) اس بیسویں صدی میں خصوصیت کے ساتھ، راہنما، اور لیڈر بننے کا شوق، ایک عالمگیر وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اور ہر وہ شخص جو دو سطریں لکھ سکتا، اور دو چار جملے بول سکتا ہے، اِس کا متمنّی ہے کہ اُسے لیڈر تسلیم کر لیا جائے۔

لیکن حقیقی لیڈری، چونکہ خود اپنے ہی خون میں نہانے کا نام ہے، اِس لئے یہ اربابِ غرض اُس طرف تو رُخ کر ہی نہیں سکتے، البتہ اپنی ہوس کو آسودہ کرنے کی خاطر لیڈری کی نقالی شروع فرما دیتے ہیں۔ اور لیڈری کی نقالی یوں کی جاتی ہے کہ وہ جیسا فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اُس کے حقوق کے تحفظ کی ایک فرضی سی انجمن بنا کر اپنے فرقے کی علمبرداری کے ڈھول پیٹنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرقے میں مقبول و ہر دل عزیز بن جاتے ہیں۔ شہر کے عمائد اور حکام میں اُن کی پرسش ہونے لگتی ہے۔ اور آخر کار وہ اپنی تقریباً اُن تمام پوشیدہ تمناؤں کو نکال لیتے ہیں جو اِس سوانگ کے بغیر نکل ہی نہیں سکتی تھیں۔

یہ ہے راز اُن تمام شاندار انجمنوں اور لیگوں کا جو کسی ایک خاص فرقے یا کسی ایک خاص گروہ کے حقوق کے تحفظ کی خاطر خلق فرمائی جاتی ہیں۔

(ب) اب رہی دوسری بات، یعنی ہر اُس انجمن سے پناہ مانگنا چاہیئے جس کی باگ خطاب یافتہ حضرات کے ہاتھوں میں ہو۔ سو اُس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ دنیا کی کوئی بدیسی گورنمنٹ اپنی رعایا کو کبھی عزت کی نگاہ سے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ ہر حاکم قوم اپنے محکوم قوم کو چوپاؤں سے بدتر سمجھنے پر مجبور رہتی ہے۔ لیکن اِس کے باوصف ہر حکومت اپنے محکوموں کو خطابات سے مزود سرفراز کرتی ہے۔ کیونکہ دُنیا کی کوئی گورنمنٹ اُس وقت تک چل ہی نہیں سکتی، جب تک کہ محکوم قوم کے افراد اُس کا ہاتھ نہ بٹائیں۔

لیکن محکوم قوم کے افراد کو خطاب دینے سے پیشتر ہر حکومت سو سو مرتبہ خود دیکھ

کا لحاظ کر بڑی احتیاط کے ساتھ اس بات کی جانچ کر لیتی ہے کہ جسے خطاب دیا جانے والا ہے، وہ

(۱) اپنی قوم اور اپنے وطن کا درد تو سینے میں نہیں رکھتا ؛

(۲) آزادی کا تو طلبگار نہیں ہے ؛

(۳) حکومت کی خاطر اپنے وطن سے غداری کرنے میں پس و پیش تو نہیں کریگا ؛

(۴) حساس، راستباز، غیرتمند، رقیق القلب، شریف، اور خود دار تو واقع نہیں ہوا ہے ؛

اور جب حکومت کو کامل یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ان تمام متذکرۂ بالا خطرناک عیوب سے پاک ہے تو اُس وقت وہ ایک شفیق باپ کی طرح خطاب کا بوّ اُس کے ماتھے پر ثبت کر دیتی ہے۔

بہ الفاظِ دیگر، سرکاری خطاب، حکومت کی طرف سے ایک مُصدّقہ اعلان ہوتا ہے اس بات کا کہ بر ممکن بلڈ اگزامینیشن (BLOOD EXAMINATON) (خون کا امتحان) اور ہر ممکن خورد بین کے ذریعے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ خطاب یافتہ "محبِّ وطن" اور "شرافت" کے امراض سے قطعی طور پر مُنزّہ اور پاک ہے۔

اور جب خطاب یافتہ بزرگوں کی حالت یہ ہے تو انصاف سے کہئے کہ اُس نامراد انجمن کے شعبہ وو اسازی میں، جس کے ہاسپٹل انچارج اور صدر المطابیہ مُصدّقہ شرفاء قوم ہوں، کسی ملک کے واسطے زہر طیار ہو سکتا ہے، یا تریاق ؟

اَوَدھ کے زمیندار اور تعلقدار

اِس تکلیف دہ موضوع پر قلم اُٹھانا، ایک نہایت ہی خشک اور نامطبوع خامہ فرسائی میں مبتلا ہونا ہے۔

کسی فرد یا جماعت کی عیب شماری کوئی محبوب مشغلہ نہیں کہی جا سکتی، لیکن بعض اوقات اجتماعی و عمومی مفاد، یا خود اُسی فرد، یا جماعت کی فلاح کی خاطر اس قسم کے ناپسندیدہ فرائض انجام دینا ہی پڑتے ہیں۔

یہ زمیندار و تعلقدار اُن نامور افراد کی نسل سے ہیں جو زمانۂ شاہی بڑی بڑی جاگیروں کے مالک، اور بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے۔

لیکن اِن بزرگواروں میں سے بعض نے تو ناعاقبت اندیش امارت کے نشے میں اپنے اخلاف کی تعلیم و تربیت کی ہی نہیں، اور بعض نے اُن کی تعلیم کو صرف "گلستان" "بوستان" تک محدود رکھا۔ اور وہ بھی اِس طرح کہ بچوّں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔

کاش اُنھیں معلوم ہوتا کہ اُن کے بچے آئندہ زمانے کی امانت ہیں، اور مستقبل کے سانچے میں ڈھالنے کے عوض اُنھیں شاہی عہد کی تعلیم و تربیت ہی میں محصور رکھنا ایک دن خود اُن کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔

جس کا نتیجہ ہم آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ زمیندار اور تعلقدار عصرِ حاضر کے علمی و عملی تحریکات اور وقت کے آئینِ حیات کی دوڑ میں سب سے پیچھے کیا، کہیں نظر ہی نہیں آ رہے ہیں۔

ہندو علم الاصنام میں تمام دیویوں اور دیوتاؤں کی سواریاں مقرر ہیں۔ علم کی دیوی "سرستی" کی سواری ہنس ہے، اور دولت کی دیوی "لکشمی" کی سواری "اُلّو" ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے امراء کے اقوال و افعال کو عقل سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

دولت کی نارواتقسیم، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس دُنیا کے تمام فتنوں کی جڑ ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ، دولت، اِس شکل میں کہ وہ وراثت کے ذریعے سے منتقل ہوتی ہوئی باپ سے بیٹے، اور بیٹے سے پوتے تک پہونچے۔ ایسی ہولناک صورت اختیار کر لیتی ہے کہ اُس کے وُرثاء ذہنی اور جسمانی دونوں حیثیتوں سے مدقُوق ہو کر رہ جاتے ہیں۔

زندگی کی آویزشوں میں مردانہ وار حصہ لینے کے عوض، آباء کی چھوڑی ہوئی دولت پر زندگی بسر کرنے والے اس قدر کاہل، کُند ذہن، پست حوصلہ، تن پرور، وہم پرست، خود بیں، رسُوم نواز اور جھُوٹی عزّت کے دلدادہ ہوتے ہیں کہ اُن بیچاروں میں یہ صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی کہ وہ کارزارِ حیات میں ایک بہادر سپاہی کے فرائض انجام دے سکیں۔

یہ شکایت سُننے میں آتی ہے کہ یہ گرم و سرد ناچشیدہ کانوں کے بڑے کچے ہوتے ہیں۔ لیکن شکایت کرنے والے یہ غور نہیں کرتے کہ کانوں کے سوا اِن غریبوں کے پاس اور ہے ہی کیا؟ ——— اُن کے پاس دماغ ہوتا ہی کہاں ہے کہ

خود کوئی فیصلہ کرسکیں۔ اِس لئے یہ بیچارے کانوں ہی سے دونوں کام لے لیتے ہیں۔ کانوں ہی سے سُنتے اور کانوں ہی سے سوچتے بھی ہیں۔

چونکہ اودھ کے زمیندار و تعلقدار، رئیس ابنِ رئیس، اور پوتر زادوں کے امیر ہیں۔ اِس لئے اگر وہ تمام عیوب اِن کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں جنھیں بورژوا دولت پیدا کیا کرتی ہے تو اِس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے۔

یہ زمیندار و تعلقدار ایک ایسے ناقابلِ علاج جمود میں مبتلا ہیں کہ اُس کی نظیر تلاش کرنے کے لئے ہمیں قدیم ترین مقبروں میں جانا پڑے گا۔ اور اُن کے مشاغل کی فہرست مُرتّب کرنے کی خاطر حُکّامِ وقت کے آستانوں سے لیکر ہمیں اُن تمام بدنام گلیوں تک سے گزرنا پڑے گا، جہاں صنفِ نازک کا حُسن بر عکس اہانت و عفونت برداشت کرلینے کی قسم کھاچکا ہے۔

قومی و ملّی اُمور کی رونق بڑھانے سے گریز کرنا، اور وطنِ عزیز کی خدمت کے تصوّر سے بھی لرز اُٹھنا تو خیر اُن کی دیرینہ سُنّتِ آبا کے مطابق ہے ہی، لیکن یہ خدا کے بندے تو اپنے مُلک کی معاشرتی و مجلسی اصلاح کے کاموں میں بھی حصّہ لینا، اپنی شانِ امارت کے خلاف۔ اور اپنے آبائی وقار کے مُنافی سمجھتے ہیں۔

اِن کے تکبّر کی نوعیت بھی عجیب ہے۔ اپنے مُلک کے عوام تو کیا، خواص تک سے بھی یہ سیدھے مُنہ بات نہیں کرتے۔ لیکن حکّامِ بالا تو بڑی چیز ہیں یہ ایک معمولی سے "نائب تحصیلدار صاحب" تک کی خوشامد کرنے کو سعادتِ دارین سے کم نہیں سمجھتے۔ اور ایک معمولی سب انسپکٹر کو "داروغہ جی" "داروغہ جی" کہتے کہتے اُن کی زبانیں خشک ہوجاتی ہیں۔

قرض لینا، ڈالیاں دینا، بڑھاپے میں کنواریوں سے شادیاں کرنا، کونسلوں اور چھوٹے چھوٹے اِلکشنوں میں سرگرداں رہنا۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں کی "چیرمینی" کے لئے مارے مارے پھرنا۔ کتّے پالنا، ایک دوسرے کی غیبت کرنا، رقص و سرود کی محفلیں برپا کرنا، ہاکی اور پولو کھیلنا، خطابوں کے واسطے سرگرداں رہنا۔ آنریری مجسٹریٹیوں کے واسطے دوڑنا، بیگمی پان کھانا اور خمیرہ تمباکو پینا، یہ ہے اُن کے عام اور گفتنی مشاغل کی فہرست، اور اس کے بعد.......... باقی جو ہے ناگفتنی۔

جذبۂ خوشامد کے سدھائے ہوئے دُبلے اور مسکین چہروں والے مصاحبوں، اور مشاطۂ زر اندوزی کے پروان چڑھائے ہوئے تُرکانہ عشووں والی عورتوں کے حلقے میں زندگی بسر کرکے مرجانا، اِن حضرات کی سب سے بڑی دُنیوی عشرت اور اُخروی نجات ہے۔

مختصر یہ کہ "انسانوں" کا یہ قابلِ رحم گروہ، علم و اخلاق سے بیگانہ، ضروریاتِ زمانہ سے بیخبر، مسائلِ حاضرہ سے ناواقف، عمل و حرکت سے محروم، اور ایک صحیح زندگی بسر کرنے کی بصیرت سے ناآشنا۔ اور قطعی ناآشنا ہے۔

سوچنا چاہئے کہ ہم اُن کی کیا مدد کرسکتے ہیں؟

اب رہی اُن کی اقتصادی حالت سو وہ اس حد تک عبرتناک ہوچکی ہے کہ جس زمیندار یا تعلقدار کے گھر جائیے وہاں اسّی فیصدی یہی رونا ہے کہ باپ دادا کی عزّت ہمارے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔

اکثر و بیشتر اِس طبقے کا بال بال قرض سے جکڑا ہوا ہے۔ اور حکومت کے جدید قانون نے تو اِن غریبوں کی رہی سہی جان بھی نکال لی ہے جس کی رُو سے کسانوں کو سات آنہ آنے فی روپیہ چھوٹ "دے دی گئی ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ پہلے جس کی آمدنی تھی پانچ سو روپے ماہوار، اب اُس کی آمدنی ہے صرف ڈھائی سو۔ اُس پر طرّہ یہ ہے کہ اِن بیچاروں کے ذمّے عزیزوں کے گزارے بھی ہیں۔ جن میں ایک پائی کی بھی کمی روا نہیں رکھی جاتی۔ اور اُسی کے دوش بدوش سرکاری مالگذاری بھی ہے۔ مہاجنوں کا اصل مع سُود بھی۔ اور کسانوں کے ذمّے بقایا بھی۔

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عزیزوں کے گزاروں کی قُرقیاں، مہاجنوں کی ڈگریاں، اور سرکاری مالگذاری کے وارنٹ، آئے دن اُن کا تعاقب کیا کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو مالگذاری نہ ادا ہونے پر اُنھیں حوالاتوں میں بھی ٹھونس دیا جاتا ہے۔

زمیندار اور تعلقدار، ڈپٹی کمشنروں، اور کمشنروں کے سامنے دانت نکال نکال کر اپنا دکھڑا روتے پھرتے ہیں۔ اپنی اور اپنے آبا کی وفاداریاں گناتے ہیں۔ اپنے جنگِ عظیم کے تمغے اور سندیں پیش کرتے ہیں۔ امن سبھاؤں کے فروغ اور کانگریس کی شکست میں اپنی عرق ریزیوں کی طویل فہرستیں میز پر رکھتے ہیں، اور رو رو کر، گڑگڑا گڑگڑا کر رحم کی التجائیں کرتے ہیں۔ مگر یہ ان تعلقداروں کی دو دو سو دعوتیں کھائے ہوئے حکّامِ عالی مقام "دِل پر کچھ نہیں کرسکتا" کی گونج میں اُنھیں بعجلتِ تمام اپنے کمروں سے رُخصت کردیتے ہیں۔

جسے یاد نہ رہا ہو پھر یاد کرلے کہ یہ اودھ کے زمیندار اور تعلقدار ہمیشہ حکومت کے وفادار اور جانثار رہے ہیں، اور اس منہ نہ لگانے کے زمانے میں بھی اگر آج حکومت کا ذرا سا اشارہ بھی پا جائیں تو اپنے بال بچوں تک کو گھر سے باہر نکال دیں۔ لیکن شاید انھیں معلوم نہیں کہ اب ہوا کدھر چل رہی ہے۔ اور دنیا کی سیاست اب اس کی بہ شدت تمام مقتضی ہے کہ ہر حکومت اپنے قدیم وفادار زمینداروں اور تعلقداروں کے بوسیدہ ادارے کو خودکشی کا موقع دے کر کسانوں اور مزدوروں کو ہاتھ میں لے لے۔

میری اس عبارت سے کوئی یہ دھوکا نہ کھائے کہ میں یہ سمجھ کر زمینداروں اور تعلقداروں کی ہمدردی کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ یا میں خدانخواستہ یہ چاہتا ہوں کہ ان سرمایہ داروں کو پھر اس کا موقع دے دیا جائے کہ وہ غریبوں کو پہلے کی طرح کچلنے لگیں ——— میرا تو تمامتر مقصد اس خامہ فرسائی سے صرف اس قدر ہے کہ اودھ کے زمیندار و تعلقدار میری اس پکار کو ٹھنڈے دل سے سنیں، اس پر غور کریں، اپنے دیرینہ شغلِ بے ناقدانہ نگاہ ڈالیں، اور اپنی موجودہ پستیوں کو عبرت کی آنکھوں سے دیکھیں اور پھر کوئی ایسا راستہ اختیار کریں جو انھیں جمود، رسوائی، بے زری، بے عزتی، خوشامد، اور جھوٹی عزت کے مغالطے سے نکال کر ایک ایسی سطح پر لے آئے کہ وہ غیور، جفاکش، خوددار، اور حساس انسانوں کی جماعت میں داخل ہو سکیں۔

کلیم کیلئے تصاویر

میرے مزاج کی اس افتاد سے میرے کُل بے تکلف احباب تک واقف ہیں کہ میں دنیا کی کسی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اور نہ کسی کا اقتدار ہی میرے دل پر کوئی اثر کرتا ہے۔ یہ میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اگر میں اپنے مخلص و قابلِ احترام دوست پنڈت سر کیلاش نرائن ہاکسر کا ذکر کلیم میں دوبارہ چھیڑوں تو مجھ پر اقتدار نوازی کا الزام نہ لگایا جائے۔

پنڈت جی، بہ حیثیت ہندوستان کے اُن چند نہایت ہی نادر افراد میں سے ہیں جن کی ہستی ہر قوم میں قابلِ فخر سمجھی جا سکتی ہے۔ ہندوستان کی نگاہ ابھی جوہر شناس نہیں ہوئی ہے۔ اور اس عہدِ ناقدر شناس کے تمام اربابِ جوہر کے واسطے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ اُن کی قوم اُس وقت انھیں پہچانے جب اُن کی قبروں کے نشان بھی باقی نہ رہیں۔

پنڈت جی کا "لامبر" ہونا میری نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اور اُن کا "نائٹ" ہونا تو میرے نزدیک وہ تنہا الزام ہے جو میں اُن پر لگا سکتا ہوں۔ میرے دل کو تو اُن کی جس بات نے فتح کر لیا ہے وہ اُن کا ترشے ہوئے ہیرے کا سا چھلکتا ہوا پُرخلوص دل ہے، اور اُسی کے دوش بدوش اُن کی وہ علمیت و ادبیت اور اُن کا وہ وسیع مطالعہ ہے جس کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے۔

کوئی دو مہینے ہونے کو آتے ہیں کہ میرے دوست پنڈت شیو نرائن صاحب مجھے ہاکسر صاحب کے پاس زبردستی گویا کھینچ لے گئے تھے کہ میں اُن کے نادر مجموعۂ تصاویر میں سے "کلیم" کے لئے کچھ تصویریں حاصل کروں۔ چنانچہ میں بادلِ ناخواستہ ہاکسر صاحب کی خدمت میں پہنچا اور وہ نادر تصویریں حاصل کرلیں جنھیں پنڈت جی نے بصرفِ زرِ کثیر جمع فرمایا ہے۔ اور ندرت کے لحاظ جن کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

میں ہاکسر صاحب کی خدمت میں اپنے پہنچنے کو "بادلِ ناخواستہ" محض اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں اُن سے اپنی کسی غرض کا واسطہ رکھنا پسند نہیں کرتا، کیونکہ اس سے خود میری اُس محبت کی لطافت، اور پاکیزگی میں فرق آتا ہے جو مجھے اُن کی ذات سے ہے۔

اُس کا جمال چھوڑ کر اُس سے بہشت مانگنا
تیری نظر میں ہو نہو، میرے لئے تو ننگ ہے

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، مدعا اس تحریر کا یہ ہے کہ اس نمبر سے اُن تصویروں کی اشاعت شروع ہو رہی ہے۔ بورن جاب جو کی ایک تصویر پر خود پنڈت جی نے ایک مختصر سا نوٹ بھی تحریر فرمایا ہے جو آپ کی نظر سے گزرے گا۔

مسٹر ہند رام گوپال بجے ورگی صاحب ہندوستان کے ممتاز مصوروں میں سے ہیں اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ آپ بنگال اسکول آف آرٹس سے تعلق رکھتے ہیں، اور آپ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ آئیڈیلزم (Idealism) کو ریلزم (Realism) کے سانچے میں ڈھال کر دونوں کو ایسا سمو دیتے

ہیں کہ تصویر میں جان پڑ جاتی ہے۔ "کلیم" میں آپ کی متعدد تصویریں شائع ہو چکی ہیں اور اس نمبر بھی آپ کے فیضانِ موقلم سے محروم نہیں ہے۔ یعنی اس نمبر میں آپ کی ایک سہ رنگی تصویر "آبشار" اور دوسری سہ سطوحی طرز کی "ڈوڈلنگ ٹائم" شائع ہو رہی ہے، جو امید ہے کہ بہت پسند کی جائیگی۔ ہم آپ کے بہایت شکر گزار ہیں کہ آپ نے کمال خلوص "کلیم" کی مستقل اعانت کا وعدہ فرمالیا ہے اور اس کے ساتھ میرے کلام کو بھی مصور کر دینے کا اقرار فرما چکے ہیں جسے قارئین میرے تازہ مجموعے "شعلہ و شبنم" میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

وہی چار یار و پنجتن

اے بادِ صبا، ایں ہمہ آوردۂ تست!

مذہب، مذہب، مذہب" ایک غلغلہ ہے، ایک شور و غوغا ہے، ایک طوفان ہے، ایک ہنگامہ ہے، ایک ہلچل ہے، جو مذہب" کے نام سے ہندوستان کے طول و عرض میں جاری و ساری ہے۔

مذہب، مذہب، کی آوازیں در و دیوار سے آرہی ہیں" مذہب" اوڑھنا اور "مذہب" بچھونا۔

جدھر نظر اٹھائیے ایک "دینی اُچھل کود" ہے، ایک "مذہبی گلخپ" ہے اور "ایمانی توڑ پھوڑ" میں ہے۔

ہندوستان ہی وہ مقام ہے جہاں "مذہب" کے باعث لوگ ایک دوسرے کو کھائے جاتے ہیں۔ نگلے جا رہے ہیں، اور یہی وہ سرزمین ہے جہاں "مذہب" کی آڑ میں لوہا برساکتا ہے۔ حالانکہ یہ بیسویں صدی ہے۔

جس طرح بڑے بڑے شہروں کی مرکزی منڈیوں اور تاریخی مقامات کے بڑے بڑے سالانہ میلوں میں، ہزاروں آدمیوں کی بیک وقت چیخ پکار ایک خوفناک شور و گونج کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی حال ہمارے بدنصیب ملک کا ہے جہاں کی فضا ہولناک مذہبی للکاروں سے ہر آن گونجا کرتی ہے۔

اور جس طرح خیراتی لنگر خانوں سے بٹے ہوئے گداگروں کے ہاتھ میں ایک روٹی ہوا کرتی ہے اسی طرح ہمارے ملک میں جسے دیکھئے ایک مذہبی جھن جھنا" ہات میں لئے بجا رہا ہے۔

معاشرت ہو یا تجارت، سیاست ہو یا تمدن، صحت ہو یا بیماری، سفر ہو کہ حضر، اور موت ہو کہ زلیست، غرضکہ زندگی کے ہر شعبے، اور حیات کے ہر گوشے میں "مذہب" سرایت کئے ہوئے ہے۔

اس سے زیادہ حیرتناک بات کیا ہوگی کہ فنون لطیفہ کی اس شے پر بھی، جسے "مذہب" سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے "مذہب" کی مُہریں لگی ہوتی ہیں، اور "دین" کا گودنا گدا ہوا ہے۔

آئے دن اس جنت نشان دوزخ میں یہ شرمناک خبریں چھپتی رہتی ہیں کہ فلاں "مذہبی جلوس" کے موقع پر سوڈے کی بوتلیں پھینکی گئیں اور فلاں نامعلوم الاسم شخص کے "مزار" کی حرمت قائم رکھنے پر گولیاں چل گئیں، اور فلاں "مذہبی [illegible]" کے ناموس پر اتنے افراد جاں بحق تسلیم ہو گئے۔

دُور سے دیکھنے والا اس دھوکے میں پڑ جائے گا کہ اگر رُوئے زمین پر کہیں مذہب باقی رہ گیا ہے تو وہ ہندوستان اور صرف ہندوستان ہے۔

لیکن اگر ادراک و شعور کو بیدار کرکے اِن پرستارانِ "مذہب" کا قریب سے مطالعہ کیا جائے تو یہ عبرتناک حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ یہ "مذہب" کے فدائی اور یہ "دین" کے شیدائی، اگر اس دُنیا کی تمام تر و خشک چیزوں میں سے کسی چیز سے کُلیتہً اور قطعی طور پر بیگانۂ بے بہرہ ہیں تو وہ "مذہب" اور یقینی طور پر [illegible]

قدرت کی یہ کتنی عبرتناک ستم ظریفی ہے کہ اُس نے "مذہب" کی [illegible] کے لئے ایک ایسی قوم کو منتخب کیا ہے جو سرے سے کوئی مذہب ہی نہیں [illegible] جسے مذہب کی حقیقی تعریف تک کا علم حاصل نہیں ہے۔

ہاں اگر مذہب مبنی ہے، مذہب سے کُلّی عدم واقفیت [illegible]

اگر مذہب نام ہے تعصب، تنگ نظری، منافرت، خوں ریزی، بد معاملگی، غداری اور دغا بازی کا، تو میں اس تنے ہوئے وسیع بر اعظم میں وہ سب سے [illegible] انسان ہوں، جو ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان کرے گا کہ سارے آدم کے بیٹو، اس [illegible] عالم میں اگر "دینداری" کہیں زندہ ہے اور اس معمورۂ کفر و الحاد میں اگر [illegible] کہیں سانس لے رہا ہے تو وہ مقام مقدس ہندوستان ہے۔ اور صرف [illegible]

اور اگر کوئی مجھ سے ہندوستان کی "دیندار [illegible]" [illegible]

تو میں مقدس چوپاؤں کی کھالیں، مقدس درختوں کی چھالیں، مقدس دریاؤں کا پانی، مقدس عبادت گاہوں کا چونا۔ اور مقدس جلوسوں کی مٹی مٹھی میں لیکر اس کے سامنے نچوڑ دوں گا اور کہوں گا دیکھ، یہ ہے میرے مذہبی شہدا کا خون۔

ہندو ہوں کہ مسلمان، مجھے سب کی "مذہبیت" معلوم ہے، اور دونوں کے نفوس میری بصیرت کے سامنے بے نقاب ہیں۔ اور اسی بنا پر میں نہایت وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر دین یہی ہے جس پر آج مسلم و ہندو قائم ہیں، تو سرچشمۂ ہدایت و نجات کی راہ سے "دین" سے "بیدینی" کا مرتبہ بہرحال بلند واقع ہوا ہے۔

یورپ کی "بیدینی" اور ہندوستان کی "دینداری" میں فرق یہ ہے کہ وہ تفکر و تدبر پر قائم ہے۔ اور یہ تقلید و تعصب پر۔ اس میں تحقیق کا عنصر غالب ہے، اور اس میں روایات و اوہام کا۔ اور اس اندھیر نگری میں یہ کہنے کی جرأت کون کر سکتا ہے کہ "تحقیقی کفر" بہتر ہے "تقلیدی ایمان" سے اور "امن پرور بے دینی" کو تفوق حاصل ہے "فساد انگیز دینداری" پر؟

کاش کوئی اللہ کا بندہ غور کرنے کی جرأت کرے!

جولائی کے آخری ہفتے میں لکھنؤ کے سے "شائستگی پذیر" شہر میں، "مدح صحابہ" کا ایک مقدس جلوس نکلا تھا جسے پولس نے گرفتار کر لیا۔

آپ اس "مقدس جلوس" کے باب میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ کیا واقعی یہ جلوس "مقدس" تھا؟ کیا اسے "مذہبی جلوس" کا خطاب دیا جا سکتا ہے؟

کیا اسلام نے اس نوع کے "جلوس" نکالنے، اور اس طرح سڑکوں پر شور و غوغا مچانے کی کبھی اور کسی حالت میں بھی اجازت دی ہے؟ —— اور کیا رسول اللہ کی بعثت سے لے کر انتزاع سلطنت اودھ تک اس قسم کی سرراہ نعرہ زنی کا کہیں کوئی پتا چلتا ہے؟

تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ اس ہنگامے کے پس پشت ہے کیا؟ کیا بتاؤں کیا ہے؟

بات پھر واں زبان کٹتی ہے

اس کے پس پشت جو کچھ ہے، آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی —— یعنی ان تمام شورشوں کا مقصود و مدعا صرف اس قدر ہے کہ شیعوں کی دل آزاری ہو، اور سنیوں شیعوں میں کبھی اتحاد نہ ہو سکے۔

کیا سنجیدگی، تہذیب اور انسانیت ایسے اشخاص کو "دیندار" کہہ سکتی ہے جو اپنے بھائیوں کی دل آزاری، اسلام کی بے رونقی، اور امن عامہ کی ابتری کے واسطے شاہراہوں پر جلوس نکال نکال کر چلاتے پھرتے ہیں؟

اور اسی طرح میں شیعوں سے بھی دریافت کرتا ہوں کہ "مدح صحابہ" سنتے ہی آپ کا جامے سے باہر ہو جانا کیا اس قابل ہے کہ آپ کو داد دی جائے، اور آپ کی "مذہبیت" پر ایمان لے آیا جائے؟

یہ بات ہزار ہزار مرتبہ غور کرنے کے بعد بھی میری عقل میں نہیں آتی کہ اگر کوئی جماعت اپنے رہنماؤں کی تعریف کرتی ہے اور گلی کوچے اس کے ڈھول پیٹتی پھرتی ہے تو اس سے کسی دوسرے کے اخلاق میں کیا نقص، اور کسی دوسرے کے ایمان میں کیا ضعف پیدا ہو سکتا ہے؟

"رام رام" یا "رادھے کرشن" کہنے والے ہندو پر کیا اس نقطۂ نظر سے حملہ کر دینا واجب ہے کہ وہ ان لوگوں کے نام لے رہا ہے جنہیں ہم مانتے نہیں ہیں؟

اگر ان ہنگاموں میں صرف نوعمر لڑکے ہی شریک ہوتے تو چنداں افسوس نہ ہوتا، مگر قیامت تو یہ ہے کہ ان آویزشوں میں فریقین کے وہ سالخوردہ بزرگ حصہ لے رہے ہیں، جن کی سفید داڑھیاں فرشتوں سے چھنی گئیں۔ اور جو بہت سے نواسوں کے نانا، اور بہت سے پوتوں کے دادا ہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ یہ کبڈی کھیلنے والے دادا اور نانا اپنے چھوٹوں کو کیونکر منہ دکھاتے ہوں گے؟

یہ ایک بڑی دردناک صورت حال ہے کہ اس اندھے ہندوستان میں ہر سال بے گنتی قوتیں، بے شمار جسم، اور لاتعداد جانیں، اغیار کی فتنہ پروری، روایات کی بازیگری، اور منافرت و اوہام کی قاتلانہ مسخرگی پر بے دریغ بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ —— بعض بدنام تالابوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر بارش میں ایک بھینٹ لیا کرتے ہیں۔ مگر ہندوستان کا مذہب وہ تالاب ہے جو ہر دن ایک نہیں، ہزاروں بھینٹیں لیا کرتا ہے۔ اور لوگ ہیں کہ اس میں غسل کرنے کو ذریعۂ نجات سمجھے ہوئے ہیں۔

میں اپنے تمام ہندوستانی بھائیوں سے خواہ وہ مسلم ہوں کہ ہندو، سکھ ہوں کہ پارسی، عیسائی ہوں کہ بدھی۔ دست بستہ یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر وطن عزیز کسی صحیح مذہب کی صحیح پیروی سے قاصر ہو چکا ہے، اور اگر حقیقی مذہب کی طرف

عود کرنے سے قوم قطعیۃً انکار کرچکی ہے۔ اور اگر یہ "اوہام و رسوم" جن میں ہندوستان گرفتار ہے صحیح مذہب سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ تو آئیے آج ہم آپ سب مل کر اپنی کامل بے دینی کا اعلان کردیں۔ اور مناروں پر چڑھ چڑھ کر پکاریں کہ دُنیا والو ہم نے مذہب کے مقدس ادارے سے رہائی حاصل کرلی ہے۔ آج کی تاریخ سے "ہندوستان" کے علاوہ ہمارا کوئی مذہب نہیں ہے۔ ہم نے اپنے دلوں پر ہاتھ رکھکر اپنی رُوحوں سے یہ محکم پیمان کرلیا ہے کہ اب ہمارا مذہب "ہندوستان اور صرف ہندوستان" ہوگا —— ہم آج کے دن سے اگر جئیں گے بھی تو ہندوستان ہی کے لئے۔ اور مریں گے بھی تو صرف ہندوستان ہی کی خاطر!

مرا عہدیست با جاناں کہ تا جاں در بدن دارم
ہوا داریِ کویش را چو جانِ خویشتن دارم

تیری ہی تجلی کو خس سمجھتا ہوں میں
ہر زیست کو اک نفس سمجھتا ہوں میں
کیا مجھکو ڈرا رہا ہے تو "مرنا" "مرنا"
مرنے کو تو اک ہوس سمجھتا ہوں میں

اپنے ہی سے کسبِ نور کرتا ہوں میں
کب خواہشِ برقِ طور کرتا ہوں میں
بندے مرے نازِ شاعری سے نہ بگڑ
اللہ سے بھی غرور کرتا ہوں میں

وحدت کو ہے نازِ پیکرِ کثرت ساقی
جنت کو وہ درکار ہے جلوت ساقی
زاہد کی نماز ہو کہ میکش کی شراب
دونوں کا مزا ہے با جماعت ساقی

جوشؔ ملیح آبادی

غنی اور غیف

بورس جارجیو ——— بلقانی مصوّر

سر کیلاش نرائن ہکسر

یہ نقش جس کا میں تعارف کر رہا ہوں اُس نقاش کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے جو اگرچہ آج بھی کافی شہرت کا مالک ہے۔ مگر میرا اور اُس کے نکاتِ فن سے دلچسپی رکھنے والے تمام اصحاب کا یقین ہے کہ وہ وقت دُور نہیں جبکہ وہ نقاشی کے فنِ شریف کے آسمان پر مہرِ نیمروز کی طرح چمکے گا۔ اور کون اندازہ کر سکتا کہ اُس کا وطن اس مشاقِ مجسم ہستی کے شبابِ فن پر کیا کچھ ناز نہ کرے گا۔ جو آغازِ کار میں ہی ریفیل، مورلیو، مائیکل اینجیلو اور لیونارڈو ونچی جیسے مجتہدینِ فن کا ہم پایہ سمجھا جاتا ہے۔

یورپ میں فنونِ لطیفہ کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ نقاشی اور سنگتراشی کی جو لازوال دولت چودہویں صدی عیسوی میں ملکِ اٹلی نے جمع کی تھی آج اُس کا رُخ بورس جارجیو کے وطن بلقان کی طرف ہے۔ بورس جارجیو کے نام کا تلفظ خود اُن کے وطن بلقان کی زبان میں غنی اور غیف ہے۔

شاعت اور صنائع، شعر اور شاعر، نقش اور نقاش کے درمیان وہ گہرا تعلق ہے کہ حقیقتاً ایک کا علم دوسرے کی معرفت ہے۔ اس لحاظ سے میں چاہتا ہوں کہ اس صناع کے وہ خصوصیت بیان کر دوں جس سے میرے خیال میں اُس کی صنعت گری پر خاص روشنی پڑتی ہے۔

بورس جارجیو محض نقاش نہیں ہے بلکہ فطرت نے اُس کو اپنی مخصوص قدرتِ تخلیق سے وافر حصہ دیا ہے۔ وہ ایسے دل و دماغ اور ہاتھ لے کر پیدا ہوا ہے کہ اپنی تمام ترمزوریات خود مہیا کر لینے پر قادر ہے۔ اُن کی طرزِ زندگی نہایت دلچسپ اور عجیب و غریب ہے۔ آپ نے اپنے ہاتھوں سے ایک گاڑی تیار کی ہے جو اُن کی سواری بھی ہے اور اُن کا مکان بھی۔ یہ گاڑی اگرچہ معمولی موٹر لاری کے برابر ہے مگر اس میں اُن کے سونے کا کمرہ بھی ہے اور غسل خانہ بھی۔ ڈرائنگ روم بھی ہے اور اسٹوڈیو بھی۔ مطبخ بھی ہے اور لائبریری بھی۔ حتیٰ کہ ہندوستان کی صنعت و حرفت کے نمونے جو اُن کو پسند آئے اور دستیاب ہو سکے اُن تک کو باقرینہ رکھنے کی گنجائش اس میں نکالی گئی ہے۔ اور یہ سب کچھ صرف ایک دماغ اور دو ہاتھوں کے قوتِ عمل کا حیرتناک نتیجہ ہے۔ اغلباً یہ تفصیل ایک افسانہ معلوم ہوگی۔ مگر یہ عجائب المخلوقات آجکل ہندوستان کے مختلف مقامات پر مصروفِ سیر ہے۔ اکثر ناظرینِ کرام کو اس سے ملاقات کا موقع ملے گا۔ وہ میرے بیان کی تصدیق فرمائیں گے۔

غنی اور غیف کے استغنا کی یہ کیفیت ہے کہ فکرِ معاش تو درکنار وہ اس کے بھی حاجتمند نہیں کہ کسی کے مہمان ہوں اور کوئی میزبانی کرے۔ سفر کے وقت جہاں اور جس مقام پر شام ہو گئی گاڑی سڑک سے علیحدہ ایک کنارے پر کھڑی کر دی اور وہ گویا اپنے مکان میں پہونچ گئے۔

ہندوستان سے تو آپ خوب واقف ہیں، اکثر ایسے اتفاقات بھی ان حضرت کو پیش آئے کہ جنگل میں قیام کیا۔ اور شب کے وقت کچھ لوگ استفادۂ ناجائز کے لئے جا پہونچے۔ مگر اس شخص کی نیک مزاجی اور شانِ فقر کا یہ اثر ہوا کہ لوٹنے والے اظہارِ ادب کر کے رخصت ہو گئے۔

اس صناع کی ہستی ایسی ہستی ہے کہ اہلِ بصیرت کو اس سے ملنے کی تمنا ہونا چاہیئے۔ معلوم ہوا ہے کہ بورس جارجیو یہ تہیہ کر کے ہندوستان آئے ہیں کہ

تاوقتیکہ وہ ہندوستان کی سیاست، تمدّن، طرزِ معاشرت وغیرہ کو سو مختلف پہلوؤں سے دیکھکر سو تصاویر نقش نہ کرلیں گے اپنے وطن کو واپس نہ جائیں گے۔ خدا سرودے تو سودا دے ....!

یہ نقش جو مجھے خود اس صنّاع سے حاصل ہوا ہے اِسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ ایک مُرقّع ہے ہندوستان کی حالت کا۔ غریب ہندوستان کی حالت کا۔ ہندوستان کے غربا کا۔ اُن غربا کا جو سب سے زیادہ محنت کش اور سب سے زیادہ قلیل المعاش ہیں۔ بالخصوص وہ لوگ جو زراعت پیشہ ہیں۔

ہمارے فلاکت زدہ ملک کو دیکھکر حسّاس دل ودماغ رکھنے والے صنّاع کے دل پر جو نقش ہوا وہ یقیناً غیر فانی ہے۔ پھر کیوں نہ تسلیم کیجئے کہ اس غیر فانی نقش کا عکس بھی غیر فانی ہوگا۔ خدا کرے ہمارے ملک کی یہ حالت غیر فانی نہ ہو۔ آمین۔

نقاش جب بسلسلۂ سفر مہاتما گاندھی سے ملاقی ہوا تو اُس نے اپنے اس شاہکار کو اُنھیں دکھایا۔ مہاتما جی بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے اس نقش کا عنوان دارِ وَرْنَارائن تجویز فرمایا جس کا لغوی ترجمہ فاتحِ عسرت ہے۔

کاش ہمارے ذرائع اس امر کی اجازت دیتے کہ اُن بیشمار خوبیوں کا عشرِ عشیر بھی، عکس در عکس، ناظرینِ نگار کے پیشِ نظر ہوسکتا جو اِس شاہکار میں کوٹ کوٹ کر بھردی گئی ہیں۔ کسی بلند پایہ شعر، کسی نقاشی یا سنگتراشی کے اعلیٰ نمونہ کی بڑی توہین ہے کہ اُس کی تشریح کی جائے۔ اِس لئے میں اس تصویر کے متعلق زیادہ کچھ نہیں کہتا سوائے اس کے کہ یہ حقیقتاً مجموعی نتیجہ ہے حساس صنّاع کے جذبۂ ہمدردی اور کمالِ دستکاری کا۔ کاش سرسبز، شاداب، مالا مال سمجھے جانے والے ہندوستان اور اُس کے غریب باشندے کس نگاہِ توقیر اور ہمدردی کے مستحق ہیں!

ہر منظرِ زیست خوب بھاتا ہے مجھے
ہر ذرّے کی جھلک دکھاتا ہے مجھے
پھولوں میں بھی امتیاز کرتا تھا کبھی
کانٹوں پہ بھی اب تو پیار آتا ہے مجھے

مجھکو غمِ روزگار نے دی یہ سیکھ
ہٹ جاؤں اگر بار نہ اٹھتا ہو مرا
حیرت سے کہا میں نے جھکا کر نظریں
تیرے دل میں بسے ہیں ہو جو مجھے علم نہ تھا

ارمان میں جس کا دل ہے وہ آباد نہیں
شاہی کا جو تاج پہنے ہے وہ شاد نہیں
ہر بندِ گراں کو توڑنے کے بابعد
اپنا جو غلام ہے وہ آزاد نہیں

[illegible]

شاہاں کے محلوں میں ہے موجِ سحر بھی
نالہ ہے اگر خوشی تو لاکھوں غم سر بھی
قدرت نے نہیں کھیل بنا رکھا ہے
قدرت کی ہنسی کا از بس آدم بھی

[illegible]

پرانی تصویر

ہاں یہی تصویر ہے جس کو بڑے ارمان سے — میری طفلی نے چھڑایا تھا چکن کے تھان سے
اور پھر بیتاب ہو کر تازہ دم جذبات سے — جس کو چپکایا تھا الماری پر اپنے ہات سے
اس کا اک چھوٹا سا ٹکڑا آج بھی تابندہ ہے — یہ بھی اُتنی زندہ ہے جتنا مرا دل زندہ ہے
ہائے وہ بے داغ راتیں، آہ وہ شفاف دن — گوشہ گوشہ امن پرور، ذرہ ذرہ مطمئن
دل بھر آتا ہے رہ رہ کر، کہیں تو کیا کہیں — ہائے اس خلوت گہِ معصوم کی آرائشیں
قمقمے، گھڑیاں، کھلونے، بانسری، البم، ستار — سیپیوں کا نور، جھاڑوں کا کھنکنا بار بار
جھانکنے لگتا تھا اس کھڑکی سے جب نورِ سحر — منہ سے بول اُٹھتی تھی یہ تصویر مجھ کو دیکھ کر
آسماں پر گھر کے آتا تھا جب ابرِ نوبہار — گنگنا اُٹھتے تھے اس تصویر کے نقش و نگار
شب کو جب فانوس سے چھنتی تھی دھیمی روشنی — جگمگا اُٹھتا تھا اس چھیٹی کا سونا اور بھی
منہ اندھیرے دیکھ کر اس کی سنہری دھاریاں — خاک پر محسوس ہوتی تھیں مجھے گُل کاریاں

شب کو اس کے پاس جب لوبان سلگاتا تھا میں — اس کے آغوشِ فسوں پرور میں سو جاتا تھا میں

ہائے وہ طفلی کے دن بھی کیا تھے اے زخمی شباب — خار میں انگڑائیاں لیتے تھے جب لاکھوں گلاب
تنگ نالے تک جوابِ آبِ رکنا باد تھے — ایک ایک قطرے میں لاکھوں میکدے آباد تھے
سیپیوں کو دیکھ کر دل کو وہ ہوتی تھی خوشی — صحن میں چھٹکی ہے گویا موتیوں کی چاندنی

بول اے مٹتی ہوئی تصویر، اے نقشِ وفا — یاد ہے وہ دور جب میں خود بھی اک تصویر تھا؟
خال و خط میں نور سا، اور نور میں موجِ سرور — پُرسرور آنکھوں میں آبائی امارت کا غرور
چال میں طوفان کی رَو، دل میں ساون کا خروش — خون میں بہتے ہوئے چشمے کا بے باکانہ جوش
لب پہ اک موجِ تبسم، رخ پہ کلیوں کا سا رنگ — رنگِ رخ میں تیز فواروں کی بے پروا امنگ
کان میں سونے کا دُر، اور جسم پر اچکن سیاہ — بانکپن کے ساتھ پیشانی پہ جرنیلی کلاہ
آہ اے تصویر! جب نا واقفِ تمیز تھے — اُن دنوں ہم دونوں پہروں دیکھنے کی چیز تھے

زندگی میں پھر نہ اُس موسم کو پائیں گے کبھی
ہائے وہ بیتے ہوئے دن اب نہ آئیں گے کبھی

جوشؔ

ہندوستان کے



کلیم دہلی

مصور ہند وجے ورکی جی



اپ حضرت دوش کا کلام مصور کررہے ہین

ابے سینیا کی پامالی

میجر گریہم پول

حکم، اسے منقد، حکم سے ابتیولوں کے۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے الفاظ، اب بھی اُن دماغوں میں گونج رہے ہیں جو پامال ابے سینیا کی تباہیوں پر غور کرنے کی زحمت اٹھاتے ہیں۔ ابے سینیا کس قدر جلد ختم ہو گیا۔

حبش کی ایک قدیم ترین سلطنت برباد کر ڈالی گئی، اور صرف اتنی سی بات کے لئے کہ اس سے ایک مستعمل آمر (DICTATOR) کی آتش ہوس کو ٹھنڈا کر دیا جا سکے۔

اٹلی اب ایک شکم سیر درندہ ہے۔ کس سے داد لی جائے کہ محض اس خونخوار درندے کی شکم سیری کے لئے ایک پرانی سلطنت کے تمام منصوبے خاک میں ملا دئے گئے۔ اور ایک وطن دوست مہذب و شائستہ بادشاہ کا تاج چھین لیا گیا۔

مسولینی بڑی بلند آہنگی سے اور کمال طمطراق سے اپنی شہنشاہی کا اعلان کر رہا ہے۔ گویا یہ تمام خونریزیاں اور تمام ہلاکت آفرینیاں صرف اس لئے ہوئی تھیں کہ ایک ہوس پرست اپنی شہنشاہی کا اعلان کر کے خوش ہو لے۔

ابے سینیا کو اس لئے فتح نہیں کیا گیا ہے کہ وہاں سے خام پیداوار حاصل ہو گی، اور اس سے اٹلی کی تجارت کو فائدہ پہنچے گا۔ کیونکہ تمام اہل الرائے کے نزدیک ابے سینیا خام پیداوار کی سرزمین ہی نہیں ہے۔

ابے سینیا کی پامالی سے مقصود صرف اس قدر ہے کہ اُسے سیاہ فام سپاہیوں کا ایک گودام بنا دیا جائے۔ اور قدیم رومن سلطنت کے احیاء کی خاطر جو لڑائیاں کہ لڑی جانے والی ہیں اُن میں انھیں بے دریغ کٹوا دیا جائے۔

دنیا اس بدترین جنگ کو کبھی معاف نہیں کر سکتی جس کی نظیر تاریخ کے صفحات میں نہیں مل سکتی۔

اٹلی نے ابتدائے جنگ ہی میں ابے سینیا کی وحشت و بربریت کا آوازہ بلند کیا تھا، اور اب جب کہ پیچیدہ تر زمانہ جلد تر رونما ہونے والا ہے ابے سینیا کی وحشت کا اعلان اور بھی شدت سے کیا جائے گا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ابے سینیا کو اس لئے غلام بنایا گیا ہے کہ اُسے شائستہ و مہذب بنا دیا جائے۔ اور وہ کچا گوشت کھانا ترک کر دے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ سنہرے قرمزی فضائی فوجبار ہیں۔ اور زمین کی رونق اور انسانوں کی شائستگی اُن کے سپرد کر کے خدا گوشۂ تنہائی میں چلا گیا ہے۔

۱۹۲۳ء میں افریقہ کے مستقبل کے لئے ایک جماعت مرتب کی گئی تھی، جس کا ابے سینیا ایک رکن تھا۔ اور ۱۹۲۸ء میں خود اٹلی نے شاہنشاہ ابے سینیا کی دوستی کے معاہدے پر دستخط کئے تھے۔ اس کے علاوہ مجلس اقوام کے ایک رکن کی حیثیت سے شہنشاہ حبش بجا طور سے یہ امید رکھ سکتا تھا کہ جب کوئی مجھ پر حملہ کرے گا، میرے خلاف گیس استعمال کی جائے گی، اور میری سلطنت کا الحاق کیا جانے لگے گا، اس وقت وہ تمام سلطنتیں جو مجلس اقوام کی رکن ہیں محو ہو کے کھڑے کھڑے تماشہ نہیں دیکھیں گی۔ بلکہ میری امداد و دستگیری کریں گی۔ لیکن افسوس ع

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

یہ واقعہ افسوس کے ساتھ یاد رکھنا چاہئے کہ ابے سینیا نے جب مجلس اقوام میں شرکت کی درخواست کی تھی اُس وقت اٹلی نے اُس کی سفارش، اور برطانیہ نے تائید کی تھی۔

ایک ہی سانس میں ابے سینیا اور برطانیہ کا نام لینا ایک ایسی صورت حال میں مبتلا ہو جانا ہے جس میں ماضی و مستقبل اس قدر اُلجھے ہوئے ہیں کہ اُن کا

سمجھانا تقریباً محال ہے۔

مصیبت دراصل یہ ہے کہ موجودہ کشمکش میں برطانیہ کے دو رُخ ہیں۔ اول تو برطانیہ، افریقہ کی ایک نہایت ہی مستحکم شاہی قوت ہے، دوسرے وہ مجلس اقوام کی ایک ایسی زبردست قوت ہے جو امنِ عالم کے تحفظ سے نہایت ہی گہری وابستگی رکھتی ہے۔

یہ دراصل برطانیہ کی ایک بہت بڑی بدقسمتی ہے، اور مجلس کی بھی کہ برطانیہ ہی وہ قوت ہے جس کا تمام قومیں راہنمائی کے لئے مُنہ تکا کرتی ہیں۔

۱۹۰۶ء میں فرانس، برطانیہ، اور اٹلی نے ایبے سینیا کے اندر اپنے اپنے حلقہائے اثر قایم کرنے کا ایک معاہدہ کیا تھا۔ لیکن ایبے سینیا کے فتح کرتے ہی مسولینی نے اُس پر اپنے کامل اقتدار کا اعلان کر دیا۔

معلوم نہیں حالات کل کیا صورت اختیار کریں گے۔ مگر اس میں اشتباہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ اگر ۱۹۰۶ء کے معاہدے کا احترام کیا جائے گا تو برطانیہ، ایبے سینیا کو اُسی کے حال پر چھوڑ دے گی اور اُس سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں کرے گی۔

آثار ایسے پائے جا رہے ہیں کہ یہ ملوکیت پرست زیادہ دن باقی نہیں رہیں گے۔ لیکن برطانیہ کو پھر بھی یہ امید ہے کہ آخرکار تاریخ کو اِس اعلان کا موقع مل ہی جائے گا کہ اِس ہنگامے میں برطانیہ نے دُنیا کے امن کی خاطر، اپنے فوائد کی پروا نہیں کی۔

سچ ہے دُنیا امید پر قایم ہے

برطانیہ کو اِس کا علم تو ہوگا ہی کہ اٹلی اس کے خلاف کس شدومد سے پروپیگنڈا کر رہی ہے۔ اور اخباروں کی پالیسی خریدنے میں کس قدر زرِ کثیر خرچ کیا جا رہا ہے۔

نیز یہ راز بھی اب فاش ہو چکا ہے کہ مصر میں جو ہنگامہ برپا ہے اور عرب ملکوں میں جو شورش ہو رہی ہے اِن سب کے پسِ پشت بھی اٹلی ہی کام کر رہی ہے۔

بات یہ ہے کہ مسولینی، رومن شہنشاہی کے احیاء کا خواب دیکھ رہا ہے۔ اٹلی نے بم اور گیس کے ذریعے سے افریقہ میں اپنی فتح مندی کا راستہ صاف کر لیا ہے۔ اور سیاہ فام سپاہیوں کو اِس طرح جمع کر رہی ہے جیسے دریا کا بند باندھا جاتا ہے۔ اور وہ دن دُور نہیں کہ یورپ کی ہواؤں میں جنگ کے شعلے بھڑکنے لگیں

اٹلی میں ”مشرقی طلاب کی عالمگیر انجمن“ کے نام سے ایک ادارہ قایم کیا گیا ہے، جس میں عربوں، چینیوں، اور ہندوستانیوں کو حصولِ علم کی دعوت دی جا رہی ہے۔ اور جب یہ طلاب اٹلی کی ثقافت (CULTURE) سے مانوس ہو کر باہر نکلیں گے تو اِن سے پروپیگنڈے کا کام لیا جائے گا۔ چنانچہ اس کام کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ اور اکثر کو کافی رقمیں بھی مل چکی ہیں۔

مسولینی کی یہ فتح، تمام دنیا کے واسطے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ انجمن اقوام کی مجموعی طاقت کے مقابلے میں ایک فردِ واحد کی فتح ہے۔

اس میں کون شک کر سکتا ہے کہ برطانیہ، فرانس اور انجمن اقوام نے اس موقع پر نہایت ہی کمزوری کا ثبوت دیا ہے۔

کیا کوئی اِس بزدلی کو معاف کر سکتا ہے کہ ہم کسی شخص سے یہ تو کہہ رہے ہیں کہ ہمیں تیرے افعال سے سخت نفرت ہے۔ لیکن ہم اُسے روکتے نہیں ہیں۔

مسٹر چیمبرلین کا بیان ہے کہ اٹلی کو اگر پہلے ہی قدم پر روک دیا جاتا تو اس قدر ظلم کی نوبت ہی نہ آتی۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ روکتا کون؟

اٹلی کو پہلے ہی قدم پر روک دینے کے لئے کوئی اقدام اس لئے نہیں کیا گیا کہ عالمگیر جنگ چھڑ جانے کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر انجمن اقوام مسولینی ہی کے سے عزم سے خود بھی کام لیتی تو مسولینی کو نیچا دیکھنا پڑتا۔

مجھے صاف الفاظ میں کہہ دینا چاہیئے کہ اگر انجمن اقوام نے ایبے سینیا پر اٹلی کا قبضہ رہنے دیا تو دنیا کے پردے پر کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو یورپ کو ہولناک جنگ سے بچا لینے کا ذمہ لے سکتی ہو۔

قدیم ترین زمانے سے یہ ایک عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ مرنے والے کے الفاظ جادو کا اثر رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ سچ ہے تو آؤ شاہنشاہِ حبش کے آخری الفاظ کانپتے ہوئے دلوں کے ساتھ اُس کے خوفناک آخری الفاظ سُنیں۔

دیکھو وہ کہہ رہا ہے۔

”میں اُس وقت تک کھڑا رہوں گا جب تک کہ میرا سُست مددگار نہ آئے۔ اور اگر وہ کبھی نہ آئے گا تو میں عداوت کی رو سے نہیں، بلکہ ایک پیغمبر کی طرح اِس کا اعلان کرتا ہوں کہ مغرب برباد ہو جائے گا۔“

خرابات

یہ خرابات ہے، تقوے کا نہیں کام یہاں — عینِ طاعت ہے تماشائے لبِ بام یہاں

رقص کرتی ہے زمیں، رات کی رنگینی میں — وجد کرتا ہے فلک، صبح کے ہنگام یہاں

میکدے میں نہ ہولے شیخِ حرم، نکتہ فروش — کہ ازل سے نہیں گنجائشِ اوہام یہاں

اثرِ تربیتِ پیرِ مغاں کے قرباں — خارج از بحث ہے اندیشۂ آلام یہاں

شکرِ باری کہ علی الرغمِ فقیہہِ خود بیں — حکمِ ایزد ہے کہ گردش میں رہے جام یہاں

میکدے کا ہے مشیت کے اشاروں پہ مدار — جام در دست ہیں خود شرع کے احکام یہاں

طوطیٔ قدس ہے اک رشتہ بپا صیدِ زبوں — طائرِ سدرہ ہے اک مرغِ تہِ دام یہاں

سایۂ زلف سے ہے زینتِ دوشِ رنداں — ظلمتِ کفر سے ہے رونقِ اسلام یہاں

اثرِ بے بصری ہے طلبِ جاہ و نمود — ہدفِ مسخرگی ہے ہوسِ نام یہاں

گوشِ رندانِ قدح خوار ہے، اور لعلِ نگار — لبِ جبریل نہیں درخورِ پیغام یہاں

کسی صورت میں بھی باقی نہیں جائے تاویل
کسی آیت میں بھی ممکن نہیں ابہام یہاں

شعلۂ عشق ہے اس راہ میں چڑھتی ہوئی دھوپ
شمعِ عقل ہے خورشیدِ لبِ بام یہاں

منزلیں راہ میں تبدیل ہوا کرتی ہیں
مژدۂ آغاز ہی رہتا ہے ہر انجام یہاں

قیمتِ بادہ میں جو خرقہ کہ ہوتا ہے گرو
اس پہ قربان ہیں سو جامۂ احرام یہاں

خوفِ عقبیٰ کی اُداسی کے عوض، چہروں پر
کھیلتا ہے اثرِ بادۂ گلفام یہاں

اک توہّم ہے رہ و رسمِ شمارِ مہ و سال
اک تمسخر ہے نظامِ سحر و شام یہاں

ذرّے ذرّے پہ ہے اتنا ابدیت کا جلال
وقت، رہتا ہے سدا لرزہ براندام یہاں

گردِ رندانِ سیہ مست، بصد عشوہ و ناز
حلقہ باندھے ہوئے رہتے ہیں گُل اندام یہاں

خوابِ صد سالہ کے مانند ہے، اے محرمِ راز
وقفۂ یک نفس و لغزشِ یک گام یہاں

لب ہلاتے ہی جو دُنیا کو ہلا دیتے ہیں
چند ایسے بھی نکل آئیں گے خدّام یہاں

شُکر ہے جوشؔ کہ اوراد و وظائف کے عوض
لب پہ ہے زمزمۂ حافظ و خیّام یہاں

جوشؔ ملیح آبادی

مہاجنی تمدن

"پریم چند"

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید   کہ ز انفاسِ خوشش بوئے کسے می آید

جاگیرداری تہذیب میں قوی دست و بازو اور مضبوط کلیجہ سرمایۂ زندگی میں شامل تھا، اور ملوکیت میں لسانی اور ذہنی کمالات اور بے زبان اطاعت گذاری زندگی کے لوازم تھے۔ مگر اُن دونوں حالتوں میں عیب کے ساتھ ساتھ کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ انسان کے جذبات صائع فنا نہ ہوتے تھے، اگر جاگیردار رقیب کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھاتا تھا تو بسا اوقات اپنے محسن یا دوست کے لئے زندگی کی بازی بھی لگا دیتا تھا۔ بادشاہ اگر اپنے حکم کو قانون سمجھتا تھا اور سرکشی کا مطلق متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ تو رعایا پروری بھی کرتا تھا، انصاف پسند بھی ہوتا تھا، بادشاہوں کے فتوحات یا تو انتقام پر مبنی ہوتے تھے۔ یا آن بان اور رعب داب قائم رکھنے کا جذبہ اُن کا محرک ہوتا تھا، یا پھر ملک گیری اور حکومت کا مردانہ ولولہ اُنھیں حرکت میں لاتا تھا لیکن ان فتوحات کا یہ مقصد ہرگز نہ ہوتا تھا کہ رعایا کا خون چوس لیا جائے۔ اسلئے کہ سلاطین عامۃ الناس کو اپنی خود غرضی اور نفع پرستی کی بھٹی کا ایندھن نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ اُن کی شادی و غم میں شریک ہوتے تھے۔ اور اُن کے کمال کی قدر کرتے تھے۔

مگر اس مہاجنی تہذیب میں ہر ایک قسم کی تحریک دولت اور صرف دولت کی غرض سے وجود میں آتی ہے، اگر حکومت کی جاتی ہے تو اس لئے کہ مہاجنوں کو زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو، اس اعتبار سے گویا آج مہاجنوں کی ہی حکومت ہے، انسانی جماعت دو حصوں میں منقسم ہو گئی ہے، بڑا حصہ تو مرنے اور کھپنے والوں کا ہے، اور بہت ہی چھوٹا حصہ اُن لوگوں کا جو اپنے اقتدار اور رسوخ سے اس بڑی جماعت کو اپنے قابو میں کئے ہوئے ہیں۔ انہیں اس بڑے حصہ سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں، مطلق رو رعایت نہیں۔ اس کا وجود محض اسلئے ہے کہ اپنے آقاؤں کے پسینہ بہائے خون گرائے اور ایک دن چپ چاپ مرجائے۔ افسوس کہ حکمران طبقے کے خیالات نظریات اور اصول محکوم طبقے میں بھی سرایت کر گئے ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کو شکاری سمجھتا ہے۔ اور اس کا شکار ہے سوسائٹی۔ وہ سوسائٹی سے بالکل الگ ہے۔ اگر کوئی رشتہ ہے تو یہ کہ وہ کہیں چالاکی اور حکمت عملی سے سوسائٹی کو احمق بنائے اور اس سے جسقدر فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اُٹھا لے۔ دولت کی حرص نے انسانی جذبات پر کامل فتح حاصل کر لی ہے، شرافت اور نجابت اور کمال کا معیار دولت اور صرف دولت ہے۔ جسکے پاس دولت ہے، وہ فرشتہ ہے چاہے اس کا باطن کتنا ہی سیاہ کیوں نہ ہو۔ لٹریچر اور آرٹ اور دیگر کمالات سب ہی دولت کے کاسہ لیسوں میں سے ہیں، یہ ہوا اتنی زہریلی ہو گئی ہے کہ اس میں زندہ رہنا محال ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر اور حکیم ہے کہ وہ بلا بیش قرار فیس لئے بات نہیں کرتا۔ وکیل اور بیرسٹر ہے کہ وہ منٹوں کو اشرفیوں سے تولتا ہے۔ کمال کی کامیابی اس کی مالی قیمت کے اعتبار سے ہوتی ہے، مولوی صاحب اور سوامی جی بھی اہل زر کے آستانے پر جبہ سائی کرتے نظر آتے ہیں، اخبارات ہیں وہ انہیں کا راگ الاپتے ہیں، اس دولت نے انسان کے دل و دماغ پر اتنا تسلط جما لیا ہے کہ بظاہر اس کی سلطنت پر کسی طرف سے حملہ کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ وہ رحم اور خلوص اور وفا اور اخلاق کا پتلا انسان دولت کی ایک بے حس بے رحم مشین بن کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ اس مہاجنی تہذیب نے نئے نئے آداب اور قوانین وضع کرتے ہیں، جن پر آج سوسائٹی کا نظام چل رہا ہے۔ ان میں ایک یہ نظریہ ہے کہ وقت ہی دولت ہے پہلے وقت   زندگی تھا۔ اسکا بہترین مصرف کسب کمال یا نوع انسان کی حمایت اور دست گیری تھا۔ اب اسکا بہترین استعمال حصول زر ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہاتھ مریض کی نبض پر رکھتے ہیں، اور نگاہ گھڑی پر، اُن کا ایک ایک منٹ ایک ایک اشرفی ہے، اگر مریض نے صرف ایک اشرفی نذر کی ہے تو وہ اُسے ایک منٹ سے زیادہ وقت نہیں دے سکتے، مریض اپنی داستان درد سنانے کے لئے بیتاب ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب بالکل مخاطب نہیں ہوتے۔ انہیں مریض سے مطلق دلچسپی نہیں، وہ ان کی نگاہ میں محض فیس دینے والی ہستی ہے، اور کچھ نہیں۔ وہ جلد سے جلد نسخہ لکھیں گے۔ اور دوسرے مریض کو دیکھنے چلے جائیں گے۔ ماسٹر صاحب پڑھانے آتے ہیں، اُن کا ایک گھنٹہ وقت معین ہے وہ گھڑی سامنے رکھ لیتے ہیں، جیسے گھنٹہ پورا ہوا اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لڑکے کا سبق

ادھورا رہ گیا ہے تو رہ جائے۔ اُن کی بلا سے۔ وہ ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت کیسے دے سکتے ہیں، کیونکہ وقت روپیہ ہے۔ اس حرص زر نے انسانیت اور دوستی کا قلع قمع کر دیا ہے۔ میاں کو بیوی یا لڑکوں سے بات کرنے کی مہلت نہیں، دوست اور اعزہ کس شمار میں ہیں، جتنی دیر وہ باتیں کریگا اتنی دیر میں تو وہ کچھ نہ کچھ کما لیتا ہے، حاصل زندگی جو باقی سب کچھ تضیع اوقات ہے۔ وہ اس پر مجبور ہے۔ کہ تو کھائے اور سوئے کام نہیں چل سکتا اتنا تضیع اوقات تو کرنا ہی پڑتا ہے،

اگر آپ کا کوئی عزیز یا دوست اپنے پیشہ میں شہرت پیدا کر چکا ہے تو سمجھ لیجیے آپ کی اس کے یہاں اب رسائی ممکن نہیں۔ آپ کو اس کے در دولت پر جا کر کارڈ دینا ہوگا۔ وہ حضرت بہت معروف ہوں گے۔ آپ سے بمشکل دو ایک باتیں کریں گے یا صاف جواب دیدیں گے کہ آج فرصت نہیں ہے، وہ اب بندۂ زر ہیں، مروت اور دوستی کا فاتحہ پڑھ چکے ہیں،

اگر آپکا کوئی دوست وکیل ہے اور آپ کسی مقدمہ میں پھنس گئے ہیں، تو اس سے کسی قسم کی مدد کی توقع نہ رکھیئے۔ وہ اگر مروت کو دریا میں غرق نہیں کر چکا ہے تو آپ سے معاملے کی بات شاید نہ کریگا۔ مگر آپ کے مقدمے پر ذرا بھی توجہ نہ کریگا۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ آپ کسی نا آشنا کے پاس جائیں۔ اور اس کی پوری فیس ادا کریں خدا نہ کرے کہ آج کسی شخص کو کسی فن میں کمال حاصل ہو جائے۔ پھر اس میں انسانیت نام کو نہیں رہ جاتی۔ اس کا ایک ایک منٹ قیمتی ہو جاتا ہے،

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وقت عزیز کو فضول کی گپ شپ میں کھو یا جائے مگر یہ مطلب ضرور ہے کہ حرص کو انسانیت اور ہمدردی اور غریب دوستی کے حقوق پر متصرف نہ ہونے دیا جائے۔

مگر آپ اس بندۂ زر کو برا نہیں کہہ سکتے۔ جس رَو میں ساری دنیا بہ رہی ہے، اسی رو میں وہ بھی بہ رہا ہے۔ اعزاز اور وقار ہمیشہ سے انسانی خواہشوں کی معراج رہا ہے۔ جس زمانہ میں کمال اعزاز اور وقار کا ذریعہ تھا اس وقت لوگ کسب کمال کرتے تھے۔ جب دولت اسکا واحد ذریعہ ہے تو انسان مجبور ہے کہ دل و جان سے اس کی عبادت کرے۔ وہ ولی نہیں، فقیر نہیں، تارک الدنیا نہیں، وہ دیکھ رہا ہے کہ اس کے پیشے میں جن خوش نصیبوں نے فروغ پایا ہے، وہ اُسی شاہراہ کے رہرو تھے جس پر وہ خود چل رہا ہے، وقت دولت ہے، اس اصول پر وہ ایک کامیاب انسان کو عمل کرتے دیکھتا ہے،

اگر وہ بھی انہیں کے نقش قدم پر چلتا ہے تو اس کی کیا خطا ہے، اعزاز اور امتیاز کی ہوس تو دل سے محو نہیں کی جا سکتی۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ جن کے پاس دولت نہیں ہے، اور اسلئے نہیں ہے کہ انہوں نے وقت کو دولت نہیں سمجھا، اُن کا کوئی پرساں حال نہیں ہے۔ وہ اپنے پیشہ میں ماہر اور قادر ہوتے ہوئے بھی کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں، جس میں ذرا بھی ذوق زیست اور تمنائے حیات ہے، وہ تو یہ کس مپرسی کی حالت برداشت نہیں کر سکتا۔ اسے تو مروت اخلاق اور دوستداری کو دل سے یک قلم نکال کر فنا فی الزر ہو جانا پڑیگا۔ تب ہی دلکشی کے بروان ملیں گے، اور یہ کوئی ارادی فعل نہیں ہے، بلکہ سرتا سر اضطراری ہے، اس کے دل کی حالت خود بخود کچھ اسطرح کی ہو گئی ہے کہ اُسے اسکے سوا اور کسی کام سے تعلق ہی نہیں رہا ہے۔ اگر اُسے کسی تقریب میں آدھ گھنٹہ بیٹھنا پڑے تو سمجھو کہ جبری قید ہے اس کی ساری دماغی اور جذباتی اور تمدنی دلچسپیاں صرف اسی ایک مرکز پر آکر جمع ہو گئی ہیں اور کیوں نہ ہوں وہ دیکھ رہا ہے کہ دولت کے سوا اس کا اور کوئی اپنا نہیں ہے، دوست احباب بھی اپنی غرض لیکر ہی اُس کے پاس آتے ہیں، اعزا بھی اُس کی دولت ہی کے پجاری ہیں، وہ جانتا ہے اگر وہ مفلس ہوتا تو اس ہجوم احباب میں ایک بھی نہ نظر آتا۔ اور ان عزیزوں میں ایک بھی قریب نہ پھٹکتا۔ اسے اپنی حیثیت بنانی ہے، اپنے بڑھاپے کے لئے کچھ پس انداز کرنا ہے۔ اپنے لڑکوں کے لئے کچھ کر جانا ہے، تاکہ انہیں در بدر ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں، اس ناہمدرد اور سرد مہر دنیا کا اُسے پورا تجربہ ہے۔ وہ اپنے لڑکوں کو ان روح شکن حالات کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتا۔ اُسے یہ سارے مرحلے جو ایک متمدن زندگی کے لوازم ہیں۔ خود طے کرنے پڑیں گے۔ اور بلا زندگی کو تجارتی اصول پر لائے وہ ان میں سے ایک مرحلہ بھی نہیں طے کر سکتا۔

اس تہذیب کا دوسرا نظریہ ہے Business in Business یعنی معاملہ معاملہ ہے۔ معاملے میں جذبہ پروری کو دخل نہیں قدیم نظریے میں وہ چیز جو صداقت اور لٹھ مار صاف گوئی جو بے مُروتی کہی جا سکتی ہے۔ یہیں ہے، جو اس جدید نظریے کی روح ہے۔ جہاں لین دین کا سوال ہے روپیہ پیسہ کا معاملہ ہے وہاں نہ دوستی کا گذر ہے نہ مروت کا نہ انسانیت کا۔ بزنس میں دوستی کیسی، جہاں لین... نے اس نظریے کی آڑ لی اور آپ لاجواب ہوئے پھر آپ کی زبان نہیں کھل سکتی۔ ایک صاحب ضرورت سے مجبور ہو کر اپنے کسی مہاجن دوست کے پاس جاتے ہیں اور چاہتے

ہیں کہ وہ اُن کی کچھ مدد کرے یہ بھی اُمید رکھتے ہیں کہ شاید وہ شرح سود میں کچھ کمی کردے۔ مگر جب دیکھتے ہیں کہ یہ حضرت میرے ساتھ بھی وہی کاروباری برتاؤ کر رہے ہیں تو کچھ رعایت کی استدعا کرتے ہیں، دوستی اور بے تکلفی کی بنا پر کچھ یوں آنسو بھر کر بڑے دردناک لہجے میں فرماتے ہیں بندہ پرور میں اسوقت بہت بیمار ہوں ورنہ آپ کو تکلیف نہ دیتا، للہ مجھ پر رحم کیجئے۔ سمجھ لیجئے کہ ایک پرانے دوست ...... وہیں قطع کلام ہوتا ہے اور تحکمانہ انداز سے فرمایا جاتا ہے لیکن جناب Business is Business بزنس از بزنس

ایسے آپ بھولے جاتے ہیں۔ بس گویا غریب سائل پر بم گر پڑا۔ اب اس کے پاس کوئی دلیل، کوئی حجت نہیں۔ چپکے سے اُٹھکر اپنی راہ لیتا ہے۔ یا اپنے معاملہ پسند دوست کی ساری شرطیں قبول کرلیتا ہے، مہاجنی تہذیب نے دنیا میں جتنی بدعتیں پھیلائی ہیں اُن میں سب سے زیادہ قاتل، سب سے زیادہ خون آشام، یہی معاملے والا نظریہ ہے۔ میاں بیوی میں بزنس، باپ بیٹے میں بزنس، استاد شاگرد میں بزنس۔ سارے انسانی اور روحانی اور سماجی تعلقات ختم بس انسان انسان میں اگر کوئی رشتہ ہے تو بزنس کا۔ لعنت ہے اس بزنس پر۔ لڑکی اگر بدقسمتی سے کنواری رہ جاتی ہے اور اپنے لئے کوئی ذریعہ معاش نہیں نکال سکتی، تو اپنے باپ کے گھر میں ہی اُسے خادمہ کا کام کرنا پڑتا ہے، یوں لڑکے اور لڑکیاں سبھی گھروں میں گھر کا کام کاج کرتے ہی ہیں، اس طرح جیسے ماں باپ کرتے ہیں، لیکن کوئی اُنھیں خدمتگار نہیں سمجھتا۔ مگر اس مہاجنی تہذیب میں ایک خاص عمر کے بعد لڑکی گھر کی لونڈی اور اپنے بھائی کی خادمہ ہو جاتی ہے۔ پدر بزرگوار اپنے سعادتمند بیٹے کے کفش بردار بن جاتے ہیں، اور ماں اپنے سپوت کی جاروب کش۔ عزیز اور رشتہ دار تو کسی شمار میں ہی نہیں۔ بھائی بھی بھائی کے گھر آئے تو مہمان ہے۔ اکثر تو اُسے مہمانی کا بل ادا کرنا پڑتا ہے، اس تہذیب کا درج اول تن پروری، سب کچھ اپنے لئے۔

مگر یہاں بھی ہم کسی کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ وہی اعزاز اور وقار وہی آیندہ کی فکر وہی پسماندوں کے گذر کا سوال وہی نمود و نمائش کی ضرورت ہر ایک کی گردن پر سوار ہے۔ لوٹ ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ اس تہذیب کے آداب اور آئین کی پابندی نہ کرے تو اُسکے لئے مستقبل تاریک ہے۔

اب تک دنیا کے لئے اس تہذیب کی پابندی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا

اسے طوعاً و کرہاً اس کے احکام کے سامنے سر جھکانا پڑتا تھا مہاجن اپنی حکومت کے زعم میں پھولا پھرتا تھا۔ ساری دنیا اسکے قدموں پر ناک رگڑ رہی تھی۔ بادشاہ اسکا غلام، وزراء اس کے غلام، صلح و جنگ کی کنجی اس کے ہاتھ میں دنیا اس کی ہوس رانیوں کے روبرو سر جھکائے ہوئے۔ ہر ملک میں اسکا بول بالا۔

لیکن اب ایک نئی تہذیب کا آفتاب مغرب بعید سے طلوع ہو رہا ہے جس نے اس ملعون مہاجنیت کی جڑیں کھود کر پھینک دی ہیں، جس کا کلیہ ہے کہ ہر فرد و بشر جو اپنی دماغی یا جسمانی مشقت سے کچھ پیدا کر سکتا ہے، وہ سلطنت اور سوسائٹی کا معزز ترین رکن بن سکتا ہے۔ اور جو محض دوسروں کی محنت یا بزرگوں کے اندوختے پر رئیس بنا پھرتا ہے وہ ذلیل ترین مخلوق ہے۔ اُسے ریاست کے معاملات میں رائے دینے کا بھی حق نہیں اور وہ شہریت کے حقوق کے بھی قابل نہیں ہو سکتا۔ اس نئی تحریک سے مہاجن شکستہ خاطر ہو کر بوکھلایا ہوا پھر رہا ہے، اور ساری دنیا کے مہاجنوں کی متفق اور متحد آواز اس تہذیب کو کوس رہی ہے، اس پر لعنت بھیج رہی ہے، اسے انفرادی آزادی کا مدفن۔ ایمانی آزادی کا مقتل اور آزادیٔ ضمیر کا مذبح کہہ رہی ہے، اُس پر نئے نئے اتہام، نئے نئے بہتان تراشے جا رہے ہیں، اُسے سیاہ ترین رنگوں میں رنگا جا رہا ہے، مکروہ ترین صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ان تمام ذرائع سے جو دولت اور ثروت کے لئے ممکن الحصول ہیں اس کے خلاف پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ اور حقیقت ہے جو اُن تمام تاریکیوں کو چیر کر دنیا میں اپنی شعاعیں پھیلا رہی ہے، بیشک اس نئی تہذیب نے انفرادی آزادی کے پنجے اور ناخن اور دندانے توڑ دیئے ہیں، اس کی عملداری میں اب ایک سرمایہ دار لاکھوں مزدوروں کا خون پی کر موٹا نہیں ہو سکتا اُسے یہ آزادی نہیں رہی کہ وہ اپنے نفع کے لئے عام ضرورت کی چیزیں گراں کر سکے دوسرے ملکوں میں اپنی مصنوعات بھیجنے کے لئے جنگ کرائے گولے بارود اور سامان حرب بنا کر کمزور قوموں کو پامال کرائے۔ اگر اسکا نام آزادی ہے تو بیشک اس نئی تہذیب میں آزادی نہیں، لیکن اگر آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ تمہیں رہنے کو اچھے اور ہوادار مکانات اور مقوی غذا اور صاف ستھرے گاؤں اور تفریح و ورزش کی آسانیاں اور بجلی کی آسائشیں اور سستا اور فوری انصاف حاصل ہو تو اس معاشرت میں جو آزادی ہے۔ وہ دنیا کی کسی دوسری مہذب ترین قوم کو بھی میسر نہیں ہے۔ ایمانی آزادی کے معنی اگر راہبوں اور کاہنوں کی مفت خور جماعت کی باطل تعلیم اور ضعیف الاعتقادی

مذہبی رسوم کی پابندی ہے تو بیشک وہاں ایسی آزادی نہیں ہے لیکن اگر ایسی آزادی کے معنی ہیں، خدمت، رواداری، جماعت کے لئے فرد کی قربانی، نیک نیتی اور جسمانی اور روحانی پاکیزگی تو اس معاشرت میں جو آزادی ہے، وہ اور کسی ملک میں میسر نہیں، جہاں دولت کی بنا پر عدم مساوات ہے وہاں حسد اور جبر اور بے ایمانی اور کذب اور افترا، اور عصمت فروشی، اور عیاشی، ساری دنیا کی برائیاں لازمی طور پر موجود ہیں۔ جہاں دولت کی افراط نہیں بلکہ انسان ایک ہی حالت میں ہیں وہاں جلن کیوں ہو اور جبر کیوں ہو۔ وہاں عصمت فروشی کیوں ہو۔ اور عیاشی کیوں ہو؟ وہ جھوٹے مقدمے کیوں چلیں۔ اور ڈاکے اور مرنے کی وارداتیں کیوں ہوں۔ یہ ساری خرابیاں دولت کی منت گذار ہیں، مہاجنی تہذیب نے انہیں پیدا کیا ہے۔ وہی ان کی پرورش کرتی ہے۔ اور وہی یہ بھی چاہتی ہے کہ جو مظلوم ہیں اور مفتوح ہیں وہ صبر اور شکر کے ساتھ اپنی حالت پر قانع رہیں، اور اگر ان کی طرف سے ذرا بھی سرکشی کا اظہار ہو تو ان کی سرکوبی کے لئے پولیس ہے، اور عدالت ہے، اور حبس دوام ہے۔ آپ شراب پی کر اس کے نشہ سے مامون نہیں رہ سکتے۔ آگ لگا کر چاہتے ہیں شعلے نہ اٹھیں، غیر ممکن ہے۔ دولت اپنے ساتھ وہ ساری برائیاں لاتی ہے جنہوں نے دنیا کو جہنم سے بدتر بنا ڈالا ہے۔ اس دولت پرستی کو مٹا دیجئے۔ اور ساری برائیاں آپ ہی آپ فنا ہو جائیں گی، جڑ نہ کھود کر صرف پھُنگی کی پتیاں توڑنا عبث ہے، یہ نئی تہذیب ہے متمول کو حقیر اور شرمناک اور سوسائٹی کے لئے مستم قاتل سمجھتی ہے۔ وہاں کوئی شخص امیرانہ زندگی بسر کرنے سے محسود نہیں بنتا۔ بلکہ ذلیل اور مشکوب ہو جاتا ہے۔ وہاں کوئی عورت زیوروں سے لد کر حسین نہیں، مگر وہ سمجھی جاتی ہے، [illegible] سے بہتر زندگی بسر کرنا وہاں بیہودگی میں داخل ہے۔ شراب پی کر وہاں [illegible] نہیں جا سکتا۔ کثرت شراب خواری وہاں مذموم سمجھی جاتی ہے، مذہبی وجوہ پر نہیں بلکہ خالص معاشری بنیاد پر، کیونکہ کثرت شرابخوری سے انسان میں تحمل اور ضبط اور استقلال اور مشقت پسندی کا خاتمہ ہو جاتا ہے،

ہاں اس معاشرت نے افراد کو آزادی نہیں دی ہے کہ وہ جمہور کو اپنی ہوس پرستی کا شکار بنائے۔ اور لطائف الحیل سے اس کی محنت کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ یا سرکاری منصب حاصل کر کے جیش قرار رقمیں اڑائے اور مونچھوں پر تاؤ دیتے پھرے۔ وہاں اونچے سے اونچے عہدہ دار کی تنخواہ بھی اتنی ہی ہے جتنی ایک پرفن صناع کی۔ وہ سر بفلک محلوں میں نہیں رہتا۔ اسے تین چار کمروں کے مکان میں گذر کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کی بیوی بیگم بنی ہوئی اسکولوں میں انعام نہیں تقسیم کرتی پھرتی۔ بلکہ اکثر محنت مزدوری یا کسی اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہے۔ وہ سرکاری منصب پا کر اپنے کو لاٹ صاحب نہیں بلکہ قوم کا خادم سمجھتا ہے۔ مہاجنی تہذیب کا دلدادہ کیوں اس معاشرت کو پسند کریگا۔ جہاں حکومت جتانے کیلئے دولت کے انبار لگانے کے مواقع نہیں ہیں۔ سرمایہ دار [illegible] تو اس کے خیال سے ہی لرز جاتے ہیں، اور اُن کا لرزہ براندام ہونا ہماری [illegible] میں آتا ہے۔ لیکن جب وہ لوگ بھی اس کی تضحیک اور تفضیح کرتے ہیں جو نادانستہ طور پر مہاجنی تہذیب کی زلہ ربائی کر رہے ہیں، تو ہمیں اُن کی اس غلامانہ ذہنیت پر [illegible] جس میں انسانیت روحانیت علو اور احساس حسن ہے۔ وہ کبھی [illegible] کا مدارج نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد حرص اور نفس پروری [illegible] پر قائم ہے، اگر تمہیں خدا نے علم و کمال دیا ہے تو اسکا بہترین مصرف یہ [illegible] جمہور کی خدمت میں صرف کرو۔ یہ نہیں کہ اس سے جمہور پر حکومت کرو، جو سو۔ اور اُسے احمق بناؤ۔

مبارک ہے وہ تہذیب جو دولت اور ذاتی ملکیت کا [illegible] جلد یا بدیر دنیا اس کی تقلید کرے گی۔ یہ دلیل کہ وہ فلاں ملک کی معاشرت سے مناسبت نہیں رکھتی۔ یا اس فضا کے موافق نہیں ہے، [illegible] عیسائیت یروشلم میں پیدا ہوئی ہے [illegible] ساری [illegible] بدھ ازم شمال ہندوستان میں پیدا ہوا [illegible] انسانی ساری دنیا میں ایک ہے [illegible] طور پر نوع انسان میں کوئی [illegible] ملک کے لئے باعث نجات [illegible] ہوگا۔ وہاں مہاجنی [illegible] گے۔ اس کے متعلق بدگمانیاں [illegible] اس کی آنکھوں میں دھول جھونک [illegible] دن فتح ہوگی۔ اور ضرور ہوگی۔

آزادی اور اصلاحِ معاشرت

(از جناب انور علی صاحب بی اے)

(گذشتہ سے پیوستہ)

انسان جہاں فطری طور پر آزادی ... مدنی الطبع بھی ہے ...
جانوروں کی طرح تن تنہا جنگلوں اور بھٹوں میں ... سے منقطع ہو کر زندگی
... بلکہ طبعاً آپس میں مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے۔ انسانی فطرت کے دونوں خاصے
... آزادی انفرادیت اور مطلق العنانی چاہتی ہے ... سوسائٹی اور نظم کی
... آزادی حکومت ... استبدادیت کے منافی ہے۔ اور ... قوانین اور
... آزادی ... رسم و رواج کی دشمن ہے ...
... غلاب کی خواہشمند ہے۔
... حقوق کا مطالبہ کرتی
... حاصل اور اختیارات کی
... تعلیم دیتی ہے۔ غرض ...
... جاری ہے۔ اور ...
... قبول پذیر ... ہے۔ اب ...
... صدیوں کی تکمیل ... کیا انسانی ...
... سے ہمارا مقصد ہے کہ ہم معلوم کر سکیں کہ انسان ...
... منطیاں کر چکا ہے تاکہ ہم نادانستگی ... ان کی ...
... آئندہ کے لئے اختیار کر سکیں۔

آزادی کی دو صورتیں ہیں، ایک شخصی آزادی۔ دوسری اجتماعی آزادی، اسی طرح نظم کا تعلق بھی شخصی اور اجتماعی حالتوں سے ہے، شخصی آزادی کا نام انفرادیت ہے اور اجتماعی آزادی کا نام قومیت۔ نظم کے تحت میں جو تقسیم باہمی شخصی تعلقات کے لحاظ سے کی جا سکتی ہے اس کا نام سوشلزم یا اشتراکیت ہے، اور مختلف قوموں ... تعلقات کے لحاظ سے جب کہ وہ ایک ... حکومت یا نظم کے ماتحت ہوں ملوکیت ... ان سب کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔

... کی فلسفیانہ تحقیق یونانیوں سے شروع ہوا، اور اگرچہ بعد میں ... واقع ہوئی ہیں ... انیسویں صدی تک اور آج ... کوئی اختلاف نہیں ہے، یعنی آزادی تمدن زندگی ... آئندہ ترقی کے لئے شخصی آزادی ... آزادی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ وہ ساری جماعت ... جس کے رکن افراد ہیں۔ اور یہ ... ہے کہ اجتماعی آزادی ... کے خصائص کے نشو و نما کے لئے شرط اول ہے۔ کوئی مہذب ... برداشت نہیں کر سکتی، خواہ وہ غیر حکمراں کتنے ہی ... لوگ ہوں۔ ... مہذب اور ... کو ... عبرت کے لئے ... آلات جنگ کی مدد کے ممکن نہیں چاہے وہ ... وحشی لوگوں کی بہتری ...

کے لئے کی جائے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کا جذبہ فطری ہے۔ اور یہ جذبہ مہذب اور ترقی یافتہ اقوام میں زیادہ نمایاں پہلو اختیار کرلیتا ہے۔ شخصی آزادی کے لئے بھی یہ بات محتاج بیان نہیں کہ جس وقت آدمی سن شعور کو پہنچ جائے اس وقت خود اس کے مفاد کی خاطر بھی اس کے ساتھ زبردستی روا نہیں رکھی جا سکتی۔ آزادی کے صحیح مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے دو چیزوں کی نفی ضروری ہے۔ اول یہ کہ کسی قسم کے جسمانی دباؤ کا نہ ہونا، اور دوسرے رسم و رواج کے دباؤ اور اس کے تکلیف دہ نتائج کا عدم وجود یعنی ضمیر کی آزادی۔

یونانیوں میں شخصی آزادی کا تخیل شخصی حکومت کے جور و استبداد کے خلاف جد و جہد کا نتیجہ تھا۔ جس کا پہلا اصول یہ قرار دیا گیا تھا کہ ہر شخص اپنا آپ مختار ہے۔ اس کو پورا استحقاق حاصل ہے کہ وہ اپنے مشاغل میں کسی کو دست انداز نہ ہونے دے، اس کو اختیار ہے کہ وہ خواہ کوئی سی صنعت و حرفت یا پیشہ اپنے لئے پسند کرے غرض ہر شخص اپنے متعلقہ کاموں کا ہر طرح سے مجاز ہے۔ یہ سب قوت بالا دست کی نگرانی کے خلاف احتجاج تھا۔ شخصی حکومت یا مخصوص فرقہ کا اقتدار جمہوریت پسند طبائع کے قدرتاً خلاف ہے۔ شخصی حکومت میں جاسوس مقرر ہوتے تھے، اور یہ شخصی آزادی میں رخنہ اندازی کے مرادف خیال کیا جاتا تھا، آزادی کے اس اصول کے ماتحت حکومت کی صورت فقط ایک ہی ہو سکتی تھی یعنی جمہوریت، جس کے مطابق ہر شخص سلطنت کے کاموں میں حصہ لینے کا نہ صرف مستحق ہے۔ بلکہ اس کی ذاتی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم فرض ہے، اور اگرچہ شخصی حکومت یا مخصوص فرقہ کی حکومت سلطنت کے کاروبار کے اہل ہونے کے لحاظ سے کبھی کبھی زیادہ فائدہ بخش ہوتی تھی، بمقابلہ جمہوری حکومت کے جس میں تمام عوام الناس حصہ لیتے تھے، اور بیشتر نااہل ہوتے تھے، تاہم خیال یہ تھا کہ ایک ذی شعور انسانی جماعت کے لئے اپنی حکومت خواہ وہ ناقص ہی کیوں نہ ہو ہزار درجہ بہتر ہے بہ نسبت بہترین شخصی حکومت کے۔

یونانیوں کے آزادی کے مفہوم میں ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ سوسائٹی کے قیود یا قانون اور آئین کی پابندی، شخصی آزادی کے منافی نہیں سمجھی جاتی تھی شخصی حکومت کی تابعداری ہی محض ایک ایسی چیز تھی جو آزادی کی دشمن متصور ہوتی تھی۔ لیکن آئینی حکومت جب ایک دفعہ قائم ہوگئی تو اس کی ماتحتی غلامی نہیں بلکہ نجات کا ذریعہ خیال کی جاتی تھی۔ کیونکہ اس قسم کی ماتحتی میں جو کچھ شخصی آزادی کا حصہ سلب ہو جاتا ہے، وہ اس جبر و اکراہ کے مقابلہ میں بہت غنیمت ہے جو شخصی حکومت عائد کرتی ہے۔ آئینی حکومت کا مقصد شخصی آزادی کو شخصی اقتدار سے بچانا ہے۔ اور اس لئے اس کی تابعداری عین آزادی ہے۔ ایک بد تر دباؤ کے مقابلہ میں اعلیٰ تر دباؤ یقیناً قابل ترجیح ہے۔ مگر افلاطون آزادی کے اس مفہوم کا حامی نہیں تھا۔ اس کے نزدیک صرف عقلمند لوگ ہی حکومت کے قابل ہو سکتے ہیں ہر کس و ناکس اس کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک آزادی یہ نہیں ہے کہ جس شخص کا جو دل چاہے وہ کرے۔ بلکہ صحیح معنوں میں آزادی یہ ہے کہ ہر شخص اس بات کے لئے آزاد ہو کہ جو کام اس کے لئے زیادہ مناسب ہو اور جس کے لئے وہ قدرتی استعداد رکھتا ہو وہی اختیار کرے۔ اور اس کے علاوہ کسی اور چیز کے لئے اس کو مجبور نہ کیا جائے، اپنے مشاغل کو اپنی قدرتی استعداد کے مطابق معین کرلینا آزادی کے منافی نہیں ہے، بلکہ اصل آزادی یہی ہے اور سوسائٹی میں کاموں کی تقسیم کا اصل اصول ہے۔ مگر یہ افلاطونی مفہوم آزادی سے اس قدر قریب نہیں ہے جس قدر کہ نظم کا گرویدہ معلوم ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نظم آزادی کے برعکس چیز ہے۔ چنانچہ وہ ملک اسپارٹا کی فوجی تنظیم کا علانیہ مداح تھا، اور تمدن کے گوناگوں مشاغل اور شہری زندگی کو اس قسم کی تنظیم کے ماتحت دیکھنا چاہتا تھا۔

جو نائکس ہے۔ ارسطو اپنے استاد افلاطون کے اس رجحان طبع کا مخالف نظر آتا ہے وہ صحیح معنوں میں آزادی کا واعظ کہتا ہے۔ اس کے نزدیک تمام افراد شہری حقوق کے لحاظ سے مساوی درجہ کے ہیں۔ اور اگرچہ وہ دوسری حیثیتوں سے ایک دوسرے سے برتر اور افضل ہوں۔ مگر حکومت کے معاملے میں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہونی چاہیئے۔ جب جملہ افراد کے حقوق مساوی ہوں گے، تو ان میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا نہ ہوگی، اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر راضی اور مطمئن رہے گا حقوق کے معاملے میں کمی بیشی اور ایک فرقے کا دوسرے فرقے پر تفوق ہی ایک ایسی معاشرتی خرابی ہے جو مختلف اندرونی فسادات کی موجب ہوتی ہے۔ اور اس کا علاج مساوات کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ غرض اس کے نزدیک اصلی آزادی مساوات ہے۔

رہا نظم کے متعلق، اس کی بابت ارسطو کا خیال وہی تھا، جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ یعنی شخصی آزادی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ قوانین اور آئین کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ بلکہ اس کی پابندی بجائے آزادی کو چھین لینے کے اس کو اور استوار کرتی ہے

شخصی جبر سے نجات کی صورت یہی ہے کہ آئین کی سختی کے ساتھ پابندی کی جائے ۔ مگر یونانیوں کی طبائع جبر و دباؤ سے قدرتی طور پر اس قدر گریز کرتی تھیں کہ اگرچہ فلسفیانہ طور پر مذکورہ اصول مسلم تھا ۔ مگر کبھی اس پر عمل نہیں کیا گیا ۔ جمہوری حکومت کا بار بھی ان کے لئے ناقابل برداشت تھا ، اور انفرادیت اور مطلق العنانی کے وہ ہمیشہ دلدادہ رہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بجز تھوڑے عرصے کے حکومت وہاں کبھی قابل اطمینان طور پر نظم قائم نہیں کر سکی ۔ اور ان کی مطلق العنانی ہمیشہ فساد برپا کرتی رہی ۔ اور آخر کار وہی ہوا جو اس کا لازمی نتیجہ ہونا چاہیئے ، فطرت کی یہ ابتداء ان کو عیش پرستی اور بد اخلاقی ۔ ذلت کی طرف لے گئی ۔ ان کی آزاد منشی تخریب اخلاق کا موجب ہوئی ۔ اور بالآخر وہ رومیوں کے زیر حکومت ہو گئے ۔ اور ان کے پنجے سے اس وقت تک رہائی نہ مل سکی جب تک کہ خود رومیوں ہی کی سلطنت برباد نہ ہو گئی ۔ ایسی آزادی کا حشر سوائے غلامی کے اور ہو بھی کیا سکتا تھا ، تمام قسم کی انفرادی و اجتماعی ترقیوں کے لئے امن و سکون کا ہونا ضروری ہے ۔ اور اس کے لئے نظم یا حکومت کسی نہ کسی صورت میں ہونی لازمی ہے جس کی پابندی ہر شخص کے لئے واجب ہے ۔ مگر جب آزادی کا مفہوم ایسا قرار دیا جائے جو کسی قسم کی پابندی کا روادار اور متحمل نہ ہو سکے تو ایسی انتہائی آزادی خود اپنے مقصد کو شکست کرتی ہے ۔ اور غلام بنا کے چھوڑتی ہے ۔ پھر یہ عجیب بات ہے کہ یونانیوں کے اس قدر آزادی کے دعووں کے باوجود ان کے ملک میں غلاموں کی کثرت تھی ۔ عورتوں کی آزادی بھی مفقود تھی ۔ اور سیاسی طور پر ان کے کوئی حقوق تسلیم نہ کئے جاتے تھے پھر جو شہر یا ملک اتفاق سے ان کے زیر نگین ہوتے تھے ان کو وہ آزادی نہیں دی جاتی تھی جس کے وہ خود مدعی تھے ۔ اور جس کی تعریف میں ان کا ہر شخص رطب اللسان تھا ، یہ نعمت انھوں نے اپنے ہی لئے مخصوص کر رکھی تھی ، پھر سلطنت کے کاموں میں دیکھ بھال کرنا آزادی کی بنا پر ہر شخص کا فرض منصبی تھا ، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ حکومت ایک مضحکہ خیز اور لغو چیز ہو کر رہ گئی تھی ، جس میں نہ قوت تھی نہ نظم ، نہ اہلیت تھی نہ وقار ۔

یونانی جب رومیوں کے زیر حکومت آ گئے تو اس زمانے میں انہوں نے علوم و فنون اور صناعت میں خوب ترقی کی ، کیونکہ ماتحت ہو کر وہ ساری بے چینی رفع ہو گئی تھی جو آزادی نے ان کو دے رکھی تھی ۔ رومی نظم کی بدولت جو امن و سکون حاصل ہوا تو ان کی طبعی ذہانت نے خوب گل کھلائے ، حقیقت میں ان کو اسی چیز کی ضرورت بھی تھی ، لوگوں کو یہ چیز آزادی میں حاصل ہوتی ہے ۔ مگر یونانیوں کے لئے آزادی وبال جان تھی ۔ رومیوں کے زمانے میں ان کی حالت ایک ایسے غلام کی سی تھی جس کو ہر قسم کی آزادی ہو مگر اپنی غلامی کی حالت پر غور کرنے کی آزادی حاصل نہ ہو ، وہ دلیسے مزدور کے مثل تھے جس کو علوم و فنون کے مطالعہ کرنے کی اجازت ہو بشرطیکہ اپنی مزدوری کے متعلق کوئی تکلیف دہ سوال پیش نہ کرے ۔

اس ذکر سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہو گی کہ تمدن کی ترقی کے لئے جس طرح آزادی کی ضرورت ہے اسی طرح نظم کی ضرورت ہے ، اور آزادی بغیر نظم کے بیکار ہے ۔ ہم اپنی شخصی آزادی کو دوسروں سے اسی وقت بچا سکتے ہیں جبکہ ہم تھوڑی سی ذاتی قربانی و ایثار کر کے ، دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک باطنی معاہدہ کر لیں جس کی رو سے وہ ہمارے حقوق کا لحاظ کریں اور ہم ان کے حقوق کا احترام کریں ۔ اور اس طرح ایک منظم سوسائٹی بنائیں ، جس کے قوانین کی پابندی جملہ ارکان پر یکساں طور پر عائد ہو ۔ اور اپنے حقوق کے زعم میں اپنی ذمہ داریوں کو فراموش کر کے بالکل مطلق العنان ہو کر جانوروں کے مشابہ نہ ہو جائیں ۔ صحیح معنوں میں آزاد ہونے کے لئے تھوڑا سا جبر نفس درکار ہے اور بغیر اس کے امن و سکون حاصل ہونا ناممکن ہے ۔ یہ جو کچھ اب تک کہا گیا ہے شخصی یا انفرادی آزادی کے متعلق ہے ، اجتماعی آزادی اور نظم کے متعلق قومیت کی بحث کے سلسلے میں ذکر کیا جائے گا ۔ انفرادی تعلقات کی باہمی استواری کے لئے استقلال ضروری ہے ، اور یہی استقلال قانون کی جڑ ہے ۔ قانون کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ اس کی بنا انصاف پر ہو ، وہاں یہ بھی ضروری ہے بلکہ زیادہ ضروری کہ اس میں استحکام اور استمرار پایا جائے ، جس پر جملہ افراد کو اعتماد اور بھروسہ ہو ۔ ورنہ ہماری تمام معاشرت خواہ وہ کسی قسم کی ہو معرض خطر میں پڑ جائے گی ۔ جس طرح سے کہ قانون قدرت میں استقلال اور استحکام کے ہم عادی ہو گئے ہیں ، اگر یہ بات نہ ہو تو ہمارے تمام کاروبار اور زندگی کے مشاغل ختم ہو جائیں ، ہم جانتے ہیں کہ رات کے بعد دن ہو گا ۔ اور اس کے بعد پھر رات ہو گی ۔ اور اس بھروسہ پر ہماری زندگی کے تمام پروگرام بنتے ہیں ۔ اور عمل میں آتے ہیں ۔ اسی طرح ملکی قوانین کا معین مستحکم اور معلوم ہونا ضروری ہے ۔ تاکہ ہم جان سکیں کہ ہم کہاں ہیں ۔ کسی حاکم کا مہربان اور فیض رساں ہونا اس قدر ضروری نہیں ہے جس قدر اس کا مستقل مزاج

ہونا اور تلون مزاجی سے بری ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح حکومت کے لئے استحکام ضروری ہے تاکہ لوگوں کو اس پر بھروسہ ہو۔ ورنہ اس میں تمدن کے فروغ پانے کا موقع بہت کم یا نفی کے برابر ہوگا۔ یہ استحکام اور استقلال ہی نظم ہے اور ہماری نظم سے یہی مراد ہے، اس میں قوت، اقتدار اور جبر کا عنصر کسی قدر ضرور ہوتا ہے، اور اس کے لئے حکومت کسی نہ کسی صورت میں لازمی ہے۔

قدیم رومیوں کی حکومت اسی نظم کی علمبردار تھی، اور دنیا نے نظم ان ہی سے سیکھا ہے۔ جس طرح یونانیوں کا نام آزادی کے ساتھ وابستہ ہے اسی طرح رومیوں کا نام نظم سے وابستہ ہے۔ جو چیز اس نظم کو وجود میں لانے کی باعث ہوئی وہ عام بدامنی اور ناپائیداری کا احساس تھا جو اس زمانے کی دنیا میں پھیلا ہوا تھا مختلف قبائل اور چھوٹی چھوٹی قوموں کے رسم و رواج کا اختلاف اور ان کا باہم گر جنگ و جدل کرنا انسانی دماغ پر ناگوار اثرات پیدا کر رہا تھا۔ چنانچہ جب رومیوں نے تمام اٹلی کو متحد کر کے اپنی ملک گیری اور حکومت کا سلسلہ آگے بڑھایا تو آزادی اور مطلق العنانی کے تھپیڑوں سے تھکے ہوئے انسان نے اس کو نعمت غیر مترقبہ تصور کیا۔ اور مختلف ممالک یکے بعد دیگرے رومیوں کے آغوش میں آتے چلے گئے۔ مختلف ممالک کا ایک ہی حکومت کے ماتحت ہونا ہم آہنگی اور باہمی یکسانیت اور عالمگیر اخوت اور مقاصد کے مشترک ہونے کا پیغام تھا۔ اور اگرچہ رومیوں کی اس ملوکیت پر دوسرے پہلوؤں سے سنگین اعتراض عائد ہوتے ہیں، مگر مذکورہ بالا نقطۂ نظر سے انہوں نے ایک مفید کام کیا، تاہم ہر شے خواہ اپنی جگہ پر کتنی ہی اچھی اور قابل تعریف ہو، اس کا حد سے تجاوز کرنا قابل مذمت ہو جاتا ہے۔ یہی نظم جس کی دنیا کو اس قدر ضرورت تھی جب حد سے بڑھا تو وبال ہو گیا، سلطنت کے تمام صوبے روم کی ضروریات کی بہم رسانی کے ذرائع قرار دیئے گئے جس کے معاوضے میں ان کو کچھ نہ ملتا تھا، رومی عمال اپنی ذاتی اغراض کے مقابلے میں صوبوں کی ضروریات کی پروا نہ کرتے تھے۔ قوانین کی سختی دن بدن زیادہ ہوتی جاتی تھی، آہستہ آہستہ نظم نے ظلم کی صورت اختیار کر لی۔ قوانین میں جب لوچ باقی نہ رہے، ان کی سختی اور درشتی حد سے زیادہ بڑھ جائے ان کا استقرار اور استحکام تکلیف دہ صورت اختیار کرے تو پھر اس نام نہاد نظم سے بڑھ کر معاشرت کے لئے کوئی شے قابل نفرت نہیں ہو سکتی، جس طرح حد سے بڑھی ہوئی آزادی عیاشی اور اخلاقی رذائل کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اسی طرح نظم حد سے زیادہ بڑھ کر ظلم اور جور کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلی آزادی اور اصلی نظم متضاد چیزیں نہیں ہیں، تضاد ان کی انتہائی صورتوں میں پیدا ہوتا ہے۔ رومیوں نے اپنے اس نظم کے معاوضے میں ملکوں کا خون چوس لیا۔ امن و سکون اور مستقل زندگی کے نام سے ان کو خشک اور ویران کر دیا۔ تہذیب اور تمدن عطا کرنے کے بہانے سے ان کے تمام نسلی خصائل کی نشو و نما کو روک دیا۔ زندگی کی یکسانیت اس قدر بڑھ گئی کہ موت غنیمت معلوم ہوتی تھی۔ یہ صورت حالات خود رومیوں کے لئے بھی مضر ہوئی۔ اور بالآخر ان کی سلطنت پاش پاش ہو گئی، اور جنگ و جدل اور طوائف الملوکی کا نظارہ پھر دنیا نے پیش کیا۔

رومی و یونانی تہذیب میں غلاموں کی کثرت تھی، چنانچہ کچھ تو اس غلامی کی کثرت اور ان کے ساتھ وحشیانہ برتاؤ کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ رومی و یونانی اپنے علاوہ دوسری قوموں کو وحشی کے نام سے پکارتے تھے ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا جس کا مقصد عالمگیر برادری پیدا کرنا تھا۔ اس کا اصل اصول یہ تھا کہ تمام نسلی اور معاشرتی اختلافات کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ تمام انسان نوعی اعتبار سے یکساں ہیں، اور اگرچہ ایک انسان دوسرے سے بعض حیثیتوں سے مختلف ہے تاہم یہ اختلاف ایسا نہیں ہے جو انسان و حیوان میں ہے۔ اگر کوئی انسانی گروہ تہذیب اور تمدن سے بہرہ یاب نہیں ہے تو وہ کچھ زمانہ گذرنے پر مہذب ہو جائے گا۔ کیونکہ من حیثیت انسان وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک مہذب انسان ہے یعنی فطری طور پر اس میں ترقی کے موانعات نہیں ہیں بلکہ مناسب ماحول میں ترقی کی قدرتی استعداد اس میں اتنی ہی موجود ہے جتنی دیگر ابنائے جنس میں۔ جو ترقی یافتہ ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کو حقیر سمجھے اور اس کے مساوی حقوق تسلیم کرنے سے انکار کرے۔ اس تحریک کا حامی سب سے سوا عیسائی مذہب تھا جس کی تعلیم کے مطابق تمام انسان خدا کی نظر میں یکساں ہیں، جس طرح ایک باپ کی نظر میں اس کے تمام بیٹے یکساں ہوتے ہیں۔ رومیوں کے زمانے میں جو نظم دنیا میں تھا اور مختلف ممالک ایک ہی لڑی میں منسلک تھے۔ اس کی یادگار رومیوں کے زوال کے بعد بھی باقی رہی۔ اور اس نے اس تحریک کو اور سہارا دیا پھر بعد کی بدامنی اور طوائف الملوکی کا ردعمل بھی اس تحریک کا پشت پناہ تھا۔ غلامی کی بنیاد بھی ابتدائی نسلی امتیازات پر تھی۔ جس کی تائید میں یہودیوں کا مذہب بھی تھا۔ جو کہتا تھا خدا نے اپنی نعمت کے لئے یہودیوں کو منتخب کر لیا ہے، پھر رومیوں اور

یونانیوں کا تعصب اور ان سے پہلے بھی فاتح قوم کا مفتوح قوم پر اپنی برتری کا احساس ان سب باتوں نے انسان اور انسان کے درمیان نہایت مغائرت پیدا کردی تھی چنانچہ ارسطو کے نزدیک غلامی کی توجیہ یہی تھی کہ انسانوں میں بعض اساسی اور بنیادی اختلاف ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے بعض لوگ قدرتی اور پیدائشی طور پر غلام ہوتے ہیں۔ اس لئے تمام انسانوں کو ہم جنس کہنا بھی شاید غلطی ہے ان سب خیالات نے ایک عام برہمی پیدا کر دی تھی۔ اور عالمگیر مساوات کی تحریک کا پیدا ہونا لازمی نتیجہ تھا۔ مگر اس تحریک کو کچھ فروغ نہیں ہوا۔ کیونکہ زیادہ تر اس کا پشت پناہ عیسائی مذہب تھا۔ مگر چونکہ غلامی کے رواج کو توڑنے میں بعض مصلحتوں کی بنا پر اس نے کچھ حصہ نہیں لیا۔ بلکہ ان کے ساتھ نرم برتاؤ کرنے کی ہدایات ہی پر اکتفا کیا، اس لئے دوسرے طبقوں کو بھی زیادہ مدد نہ مل سکی۔ اور اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا محض مذہبی یا اخلاقی رنگ میں کسی تحریک کا کامیاب ہونا لوگوں کے جذبات اور حسیات پر موقوف ہے اور جب تک کسی ملکی تحریک کے لئے باقاعدہ ادارہ قائم نہ کیا جائے کامیابی مشکل ہوتی ہے۔ لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دینا خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا، یا کم از کم ان نتائج کے متعلق کوئی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ اور معاملات کو آئندہ زندگی کی سزا اور جزا پر ملتوی کر دینا بنیادی مقاصد کے لئے کوئی قابل اطمینان صورت نہیں ہے، پھر نسلی امتیازات کا مٹانا کوئی آسان کام نہیں اور باوجود تمام مذاہب کی اس باب میں متفقہ کوششوں کے کلی مساوات نہیں قائم ہو سکی۔ بلکہ اس کے برعکس یہ امتیازات زیادہ شدید ہوتے چلے گئے، کیونکہ خود مذہبوں ہی میں وجوہ مساوات کے علم بردار تھے، آپس میں ایک دوسرے سے تعصب اور اپنے آپ کو خاص خدا کا مقبول اور برگزیدہ مذہب گردانتا اختلافات اور بڑھاتا گیا۔ اور اس کے علاوہ مذہب کا موثر ہونا سیاسی ترقی کے ساتھ خود بخود کم ہوتا چلا جاتا ہے۔

عالمگیر مساوات کی تحریک، آزادی اور نظم کے نظریوں کا مرکب تھی۔ اس کی ناکامیابی کے وجوہات وہی تھے جو اوپر بیان ہوئے یعنی اس کی حمایت زیادہ تر مذہب کے سپرد رہی۔ اس تحریک کے حسن و قبح کے متعلق یہ کہنا ضروری ہے کہ عالمگیر اتحاد کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک با اقتدار سلطنت یا حکومت تمام دنیا پر حاوی ہو اور دیگر اقوام اپنی اندرونی آزادی کے ساتھ اس کے زیر اثر ہوں۔ جس کو ملوکیت کہنا چاہیئے۔ اہل جرمنی اسی کے معتقد ہیں اور یہ اعتقاد پرانے زمانے کے عالمگیر اتحاد کی تحریک کی یادگار ہے۔ جس کا نمونہ رومی پیش کر چکے تھے، مگر اس میں آزادی اور مساوات کا پہلو باقی نہیں رہتا۔ عالمگیر اتحاد و مساوات کی بنا پر اس صورت میں ممکن ہے کہ تمام اقوام اپنی اپنی جگہ آزاد اور خود مختار رہیں۔ نہ صرف اندرونی معاملات بلکہ بیرونی طور پر بھی وہ اقتصادی یا سیاسی پہلوؤں سے دوسرے ممالک کی دست نگر نہ ہوں تاکہ وہ اپنی مخصوص قومی خصائل کو بغیر مزاحمت آزادانہ نشوونما دے سکیں اور اس کے ساتھ عام او مشترک انسانی خصائل کو ترقی دینے میں سب مل کر ہم آہنگی سے کام لیں۔ مثلاً تمدن اور تہذیب کو فروغ دینا۔ علوم و فنون کو ترقی دینا۔ جنگ کو روکنا اور امن قائم رکھنے کی ذمہ داری کو قبول کرنا۔ اس قسم کا اتحاد دنیا کی مہذب قوموں میں نہ صرف ہو سکتا ہے بلکہ ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ مجلس اقوام کا قیام اسی غرض سے عمل میں آیا تھا۔ یہ عالمگیر اتحاد اور مساوات کی بہترین ممکن صورت ہے جس کا سب سے بڑا حامی انگلستان ہے، غرض یہ سب ہی دیرینہ تحریک کے آثار ہیں جس کی تکمیل میں آج تک دنیا کوشاں ہے۔ جرمنی دوسرے طریقہ سے اور انگلستان دوسرے طریقہ سے، مگر یہ اتحاد اور مساوات اجتماعی یا قومی نقطۂ نظر سے ہے، ایک ہی قوم یا سوسائٹی میں متفرق افراد کا اتحاد نسل، زبان، مذہب اور رسم و رواج کی یکجہتی کی بنا پر ہوتا ہے، مگر ان افراد میں مساوات کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ غرض سوشلزم سے پوری کی جا رہی ہے۔

ابتک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نظم اور آزادی کے متعلق عام تذکرہ تھا، ان کی مخصوص صورتوں کا ذکر اجتماعی اور انفرادی پہلوؤں سے ابھی باقی ہے چنانچہ آگے چل کر ہم قومیت، انفرادیت اور سوشلزم سے مفصل بحث کریں گے، تاکہ عوام میں سیاسی ذہنیت کی موٹے موٹے اصول کے ذریعہ تربیت ہو سکے، اور وہ ملکی اور معاشرتی تحریکوں کو سمجھنے اور ان کے بعض مضر اثرات سے بچنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔ (باقی)

جینے کی قیمت

(از جناب ل احمد صاحب)

دنیا جانتی اور کہتی بھی ہے کہ قانون نیک چلنوں کے لئے ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی بد اور درندہ خصلت انسان عدالت تک پہنچتے ہی نہیں۔ اس عالم اسباب میں ہر بات کی کوئی وجہ اور ہر چیز کی کوئی علت ہوتی ہے: اس قول کا بھی ایک سبب ہے: لیکن اس کی تفسیر مستقبل کا کوئی فلسفی کرے گا۔ ـــــــ ہمارا مقصود تو ایک واقعے کا بیان ہے، علت و معلول کو دیکھنا نہیں ہے۔

ہمارا ضابطۂ اخلاق کہتا ہے کہ ایک مجرم ــــــــ وہ شخص جو عدالت سے ماخوذ ہو جائے، برا آدمی ہے، چونکہ سب زمانوں میں حال ہی ایک زمانہ ہے، اور مستقبل کا حال کس نے جانا ہے، اس لئے ہمیں اسی سے واسطہ رکھنا چاہیئے ــــــــ اگرچہ ممکن ہے کہ آج کا برا آدمی کل اچھا سمجھا جائے! مگر یہ خیال بس ایک خیال ہی تو ہے، الحاصل آج کا برا آدمی بُرا ہے۔

اس عہد کی زندگی کے تمام اداروں میں فوجداری عدالت کا کٹہرا ایسی جگہ ہے جہاں ایک انسان کو فطری حالت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کٹہرے میں کھڑا ہونے والا بالکل ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا وہ اصل میں ہے، تصنع اور بناوٹ کا غلاف اتر جاتا ہے ــــــــ یہ جگہ دراصل ایک شکنجہ ہے، اور ایک آدمی اگر شکنجے کے اندر بھی سپہ رحمانہ ہوا تو اور کہاں ہوگا؟ بالکل ممکن ہے کہ اس کٹہرے میں کھڑا ہونیوالا شخص ایک ایسا بدمعاش ہے جو درحقیقت شریف آدمی ہے۔ ایک ایسا چور ہے جو درحقیقت دیانت دار آدمی ہے، اور یہ صورت حال ایک ایسا معمہ پیش کرتی ہے، جسے صرف ہماری قوت متخیلہ سے تعلق ہے، یا ایک ایسا لاینحل مسئلہ جو روپے کو بیک آن دونوں جانب سے دیکھنے کی سعی میں مرکوز ہے۔ الحاصل عدالت کا کٹہرا انسان کے مطالعے کے لئے بہترین جگہ ہے۔

ایک ملزم کے لئے بہرحال، یہ احساس سخت ترین امتحان ہے کہ لوگ مجھے نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا اس کے خلاف ہوگئی، اور وہ بالکل تنہا اور اکیلا رہ گیا ہے۔ اس وقت اس کے سامنے حاکم عدالت کے سرد مہر چہرے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اب اگر وہ شخص جری اور بہادر واقع ہوا ہے تو بالکل بے تعلق یا مکدر نظر آئے گا۔ اور اگر بزدل اور بے ہمت ہے تو اس کے چہرے پہ خوشامد اور چاپلوسی کے آثار دکھائی دیں گے، یا اپنی حماقت پر آنسو بہاتا ہوگا۔

آپ کو تو عدالت فوجداری کے کٹہرے میں بحیثیت ملزم کھڑے ہونے کا اتفاق کا ہے کو ہوا ہوگا، لیکن ایسے شخص کے لئے یہ بات وجہ تسکین و اطمینان ضرور ہے، اس سے پہلے اس کٹہرے میں اچھے اچھے لوگ اور بڑی بڑی ہستیاں کھڑی ہو چکی ہیں ــــــــ اگرچہ اپنے زمانے میں وہ لوگ بھی اچھے اور بڑے نہیں سمجھے گئے، بلکہ اسی کی طرح برے تھے! اگر واقعی آپ کو کٹہرے میں کھڑے ہونے کا موقع نہیں ملا تو آیندہ زمانے میں جس عزت و بڑائی کے حاصل ہونے کا امکان تھا اس سے محروم ہو جانے کے علاوہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے، وہ شاید آپ کے لئے بے معنی ہو۔ مگر یہ تو آپ سمجھ ہی سکتے ہیں کہ اچھوں کا بدترین آدمی بھی،

چوروں میں کے بہترین آدمی سے بہتر ہے۔

ایک نہایت مشہور قول ہے کہ دیانت بہترین حکمت عملی ہے، اور آپ نے یہ قول بھی سنا ہوگا کہ خدا زیادہ نوجوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب اگر آپ کو ان دونوں اصولوں پر عمل کرنا ہو تو لامحالہ ایک تیسرا اصول وضع ہو جائے گا۔ یعنی زیادہ فوجوں والا ہی حق و دیانت پر ہوتا ہے لیکن ہم آپ کو یہ مشورہ دیں گے کہ ان تینوں اصولوں میں سے کسی ایک کو بھی اپنے قوانین، عدالتوں، ملزموں اور مجرموں پر مطابق کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ ورنہ ایک لابدی نتیجہ آپ کے سامنے آجائے گا یعنی اپنی تہذیب و تمدن کا کھوکھلا پن سامنے آجائے گا۔ اور معلوم ہوگا کہ ہمارا قانون جس کی پشت پر بڑی بڑی فوجیں ہیں حق و دیانت سے بہت دور ہوگیا ہے۔ عدالت میں جرم کا انکشاف ہوتا ہے۔ مجرموں پر نفرین کی جاتی ہے اور ان کو سزائیں دی جاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر وہاں انسانوں کو مردود و ملعون کیا جاتا ہے۔ اور وہ وہاں سے سرنگوں نکلتے ہیں، وہاں انصاف ضرور کیا جاتا ہے لیکن لوگوں کی پیشانیوں کو داغدار کر کے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ سوال کریں گے کہ جرم اصل میں کسے کہتے ہیں ـــــــــ اور اس کے زیادہ اہم یہ کہ انصاف کیا ہے؟

عدالت کے کٹہرے میں ملزم کھڑا تھا، اس کا نام جما تھا، وہ اس قسم کا چور تھا، جسے عرف عام میں اٹھائی گیرا کہتے ہیں یعنی وہ اپنا کام دن دہاڑے کرتا تھا رات کی چوری یعنی نقب زنی وغیرہ سے اسے نفرت تھی۔ جما کو اپنے طریق کار پر ایک قسم کا فخر تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس میں اس کی عقل و ذہانت کے جوہر کھلتے ہیں۔ وہ اپنے پیشے کو دوسرے پیشوں کی طرح معزز بھی سمجھتا تھا۔ کیونکہ ہر شے کی غایت انسانی فطرت کے مطالبات کی تسکین کرنا ہے ـــــــ اور اسے بھی پیٹ بھرنا تھا۔

جما اپنے پیشے کے لئے موزوں بھی بنایا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ لانبے اور انگلیاں پتلی تھیں۔ اس کی آنکھیں تیز نظر اور جسم چھریرا تھا۔ وہ کچھ کمزور بھی معلوم ہوتا تھا۔ ملک معظم کے مہمان خانے یا جما کی زبان میں "سوالاکھ کی حویلی" کے کئی بار کے قیام میں، اس کی تندرستی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ جما اپنے برے بھلے کی تمیز کر سکنے کے قابل تھا۔ مگر جب سے مادر شفیقہ حکومت نے اسے اپنے آنچل سے باندھا، اس کی ساری قابلیتیں خاک میں مل کر رہ گئیں۔

فطرت کے ہر مظہر کی طرح جما بھی آزاد فعل و عمل کا عاشق تھا۔ لیکن انسانی قانون اسے ایک چور یعنی بدآدمی کہتا تھا، ہمارے ضابطۂ اخلاق کا فیصلہ تو یہ تھا کہ کوئی اسے عزت کی نگاہ سے نہ دیکھے۔ کوئی اس سے محبت نہ کرے۔ کوئی اسے باپ کہنا بھی پسند نہ کرے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ایک عورت اس کی عزت بھی کرتی تھی اور محبت بھی اور اسے باپ کہنے کے لئے اس کے ایک بچہ بھی تھا۔ جما کی بیوی کا نام فاطمہ تھا۔ اور وہ اسے قابل اور ہوشیار سمجھتی تھی ـــــــ اس کے پیشے سے قطع نظر، وہ اسے ایک بڑا آدمی سمجھتی تھی۔

فاطمہ اپنے شوہر کی چالاکیوں اور چوری کی کمائی کو سن کر خوش ضرور ہوتی تھی لیکن اس کی محبت کی وجہ یہ باتیں نہ تھیں، بلکہ وہ اسے اس لئے چاہتی تھی کہ وہ جما تھا۔

آپ اسے نہ صرف احمق و بیوقوف کہیں گے۔ بلکہ جرائم سے داغدار بھی بتائیں گے، لیکن آپ کے اس فیصلے کے باوصف فاطمہ خدا کی مخلوق میں ایک اعلیٰ مخلوق تھی ـــــــ وہ ایک عورت اور صحیح معنیٰ میں عورت تھی۔ وہ اپنی فطرت کے ساتھ سچی تھی۔ اور اسی قدر جما کے ساتھ سچی تھی۔

اس دن جما قانون کے کٹہرے میں آیا تو فاطمہ بھی بچے گود میں لئے عدالت پہنچی۔ کیونکہ یہ بچہ اس وقت پیدا ہوا تھا، جب جما جیل میں بند تھا اور بچہ ہونے کے بعد یہ جما پہلی بار گرفتار ہوا۔ جما جس وقت کمرے میں لایا گیا تو فاطمہ زار و قطار رونے لگی، اور ماں کے ساتھ بچہ بھی رونے لگا ـــــــــ شاید اس کی جبلت نے آنے والی مصیبت کی خبر دے دی ہو۔ مگر کتنی حیرت کی بات ہے کہ چوروں کے بچے بھی اسی طرح روتے چیختے ہیں جس طرح شریفوں اور نیک چلنوں کے! غالباً آپ ہماری رائے سے اتفاق کریں گے کہ قانون کا مقصد تو اس حالت میں اچھی طرح پورا ہو سکتا تھا جب مجرموں کے بیوی بچوں سے رونے کا حق بھی لے لیا جاتا ـــــ کیونکہ بالعموم یہی ایک چیز ان کے پاس رہ جاتی ہے۔ اور تسکین قلب کا موجب ہوتی ہے۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قانون بڑی فوجیں رکھنے کے باوجود بھی بعض سزائیں اپنی تعزیرات میں شامل نہیں کر سکتا۔

ایک عجیب بات اور بھی تھی۔ اور وہ یہ کہ یہ چور ایک ایسا انسان تھا جو اپنے دماغ سے سوچنے کا کام بھی لیتا تھا؟ علم تشریح ابدان ثابت کرتا ہے کہ ہر انسان

کی کھوپڑی میں پہنچا ہوتا ہے، اور نفسیات کے ماہر کہتے ہیں کہ دماغ سے سوچنے کا کام چند ہی آدمی لیتے ہیں۔ لوگ بے دماغوں سے کھانے پینے، اٹھنے، بیٹھنے کا یا جب کسی دوسرے سے مقابلہ ہو تو تحفظ ذات سے بڑھ کر، حریف کی شکست یا اس فائدہ میں رہنے کا کام تو دماغ سے لے لیا جاتا ہے، لیکن دماغ سے ذہنی سوچنے کا کام بہت ہی کم لیا جاتا ہے۔ اور اسی پر بس نہیں، بلکہ لوگ اپنے عدم تفکر پر بس نہ کر کے دوسرے کے غور کرنے کی عادت کو بھی ناپسند کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ غور و فکر کرنے والوں کی سخت بسر ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جما کی مصیبت کا باعث بھی اس کی سوچ بچار کی عادت ہی ہو۔

ہو سکتا ہے کہ جما کے غور و تدبر کا طریقہ غلط کارانہ، خود پسندانہ، اور ایک جرائم پیشہ کے نقطۂ نظر سے ہو، لیکن یہ بات بالکل قرین فطرت ہے، ہم اس کو بھی مانتے ہیں کہ کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لئے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنا ضروری ہو۔ لیکن یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ تلاش حقیقت میں جس طرح ایک نقطۂ نظر صحیح یا غلط ہو سکتا ہے، اسی طرح دوسرا بھی ہو سکتا ہے۔

آپ کو مزید حیرت ہوگی، لیکن جما کے تدبر و تفکر کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا میں سب چوری کرتے ہیں۔ آپ فرمائیں گے اس کا یہ انداز فکر احمقانہ اور اس کے نرالے نفسیات کا نتیجہ تھا۔ ہمیں بھی آپ سے اتفاق ہے، کیونکہ اگر سب چور ہیں تو سب کو جیل خانہ کے اندر ہونا چاہیئے تھا۔ یا پھر وہاں کوئی نہ ہوتا۔

جما کا یہ بھی قطعی فیصلہ تھا کہ قانون مہا چور ہے۔ جما سمجھتا تھا کہ وہ اگر کسی کی گھڑی چرا لیتا ہے تو قانون اس کی آزادی چرا لیتا ہے۔ اور اس کا عقیدہ یہ تھا کہ گھڑی اتنی ضروری چیز نہیں، جتنی جما کے لئے اس کی آزادی ضروری چیز ہے۔ ممکن ہے کہ آپ جما کے استدلال کی غلطی ثابت کر دیں، لیکن یہ بھی فرما دیجئے کہ آخر وہ اور کس طرح استدلال کر سکتا تھا ——— مسئلے پر تو اس کی نظر اسی طرح پڑ سکتی تھی۔

وہ قانون سے سخت متنفر تھا۔ قانون کو وہ سڑک کے بڑے انجن کی مثال سمجھتا تھا۔ جو جما کی طرح کے آدمیوں کو، ایسے آدمیوں کو جن کو قانون کے گرگے اس انجن کے سامنے لا ڈالیں۔ پیس کر سرمہ کر دیتا تھا۔ جما پولیس اور خفیہ پولیس کی ایسی کارروائیوں سے واقف تھا کہ اصل مجرم کا سراغ نکالنے سے عاجز ہو کر بے گناہ جیل میں ٹھونس دیئے گئے یا پھانسی پر لٹکا دیئے گئے، قانون کی . . . . کی کارگذاریوں سے جما بخوبی واقف تھا ——— ایک جرائم پیشہ سے بڑھ کر ان باتوں کو کون جان سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس کو یہ احساس بھی تھا کہ وہ خود اور اس کی طرح کے بہت سے انسان صرف اپنے ہی افعال کی نہیں بلکہ شریف بدمعاشوں" اور "دیانت دار چوروں" کے جرموں کی پاداش بھی بھگتتے ہیں ——— بے گناہوں کو سزا ہو جانا، قانون دار باب قانون کی خطاؤں ہی کا کفارہ تو ہے۔ اس کو کامل یقین تھا کہ تقریباً ہر انسان قانون شکنی کرتا ہے، خود آستانۂ قانون کے خدام و مجاور بھی: فرق اتنا ہے کہ ان کی قانون شکنی پردہ خفا میں رہتی ہے۔ اور اس کی ظاہر ہو جاتی ہے۔

ایک اور طرفہ بات یہ تھی کہ جما اپنے آپ کو دنیا بھر کے انسانوں میں، زیادہ دیانت دار سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ جب چوری کے لئے نکلتا تو اپنی آزادی سی قیمتی چیز کو داؤں پر لگا کر نکلتا تھا۔ اور اس کے برخلاف بڑے سے بڑا دیانت دار مالک کارخانہ بے دھڑک بہت زیادہ کام لے کر بہت کم مزدوری دیتا، اور ہزارہا انسانوں کا پسینہ بہا کر ان کا خون چوس لیتا ہے۔ بڑے سے بڑا دیانت دار تاجر اپنی "حکمت عملی" سے بلا اندیشہ شیئر مارکٹ اور روئی کے سٹے میں غریب چھٹ بھیتوں کی جیبیں کاٹ لیتا ہے، بڑے سے بڑا اندآتا کولری" کا مالک، نوجوان عورتوں کو کھانے بھر کی مزدوری نہ دے کر انھیں کسبیاں بنا دیتا ہے۔

جما کا پروانۂ فکر یہ تھا۔ اور ہم آپ کے ہم خیال ہیں کہ وہ سخت غلطی پر تھا، ——— خاص کر دیانت دار میل والوں۔ دیانت دار تاجروں اور اندآتا" کولری" کے مالکوں کے باب میں۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ جما چوری کرتا تھا۔ اور بے دریغ کرتا تھا لیکن اس لئے کہ اس کی زندگی کے خاص خاص حالات ہمارے علم میں آ چکے ہیں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اگر اپنے افعال کا ذمہ دار ہو سکتا تھا تو بہت کم، اس کی بہت بڑی ذمہ داری تو ان پر ہے جو قانون بنانے کو طیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس قانون کی ضرورت اپنی روزمرہ کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے خود پیدا کرتے ہیں مختصر یہ کہ اسے حالات نے اس درجہ مجبور کیا کہ اس نے اس دشوار پیشے کی آسانیاں دیکھ کر

ن کو اختیار کرلیا، اب اگر ہم اس کی زندگی کی پوری داستان سنا ئیں تو کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ آپ ایسی بہت سی بیتائیں سن چکے ہوں گے اس لئے ہم صرف اس کا یہی آخری واقعہ بیان کرنے کو کافی سمجھتے ہیں جس میں وہ ماخوذ تھا

آخری بار جما جیل سے رہا ہوکر گھر پہنچا تو اپنی بیوی کی گود میں ایک ننھا سے بچے کو ہمکتا دیکھا، اور اپنی سوچنے کی عادت کے خلاف اس نے اسی لمحے میں چوری سے ہاتھ کھینچ لینے کا ارادہ کرلیا، کیونکہ اسے اپنے بچے کی ماں سے محبت تھی۔ کئی ہفتے کی سرگردانی کے بعد اسے ایک پندرہ روپے کی نوکری مل گئی، اور وہ مطمئن ہوگیا۔ مگر پولیس کی بار بار کی تصدیق نے اس کے مالک کو نہ صرف پریشان بلکہ خوف زدہ اور متحاط کردیا۔ جما کو جواب مل گیا، اس نے ہرچند منت خوشامد کرکے اپنی نیک نیتی کا یقین دلانا چاہا، مگر سب بیکار ثابت ہوا، یہ اعتراض صحیح ہے کہ اس کے بعد اس نے مزید کوشش نہ کی، مگر اسے یقین ہوگیا تھا کہ پولیس کی بلا اسے کہیں قائم نہ رہنے دیگی اور کسی روز کسی معاملہ میں ہنست چالان کردیا جائے گا۔

اب جمانے پھر اپنی سوچ بچار کی عادت سے کام لیا۔ اور فیصلہ یہ کیا کہ اگر ایک دوکان لے کر بیٹھ جائے تو شاید کچھ پناہ میں رہ سکے گا۔ لیکن اس کے لئے کچھ سرمائے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ اب اس دھن میں رہنے لگا کہ کہیں ایک لمبا ہات پڑ جائے تو دوکان کا خیال عمل میں آسکتا ہے۔

جما کے جیل سے آنے کے بعد سے لوٹا، رکابی فروخت ہوکر گزر ہوتی رہی لیکن جب ایسی کوئی چیز نہ رہی تو ایک دن جما اور اس کی بیوی کو دن بھر کا فاقہ ہوا، اور ان کے بچے کو پسلی کا عارضہ۔ ان کے لئے کھانا نہ تھا، اور بچے کو دوا نہ تھی اس حالت میں ایک گروہ کی طرف سے رات کو ان کے ساتھ چلنے کی دعوت ملی، جمانے بڑی خوشی اور آمادگی سے منظور کرلیا۔ مگر عین موقعے پر پولیس کی گشت آگئی ساتھی تو بچ کر نکل گئے لیکن جما اس فن میں مشاق ہونے کے سبب سے مع مال مسروقہ گرفتار ہوگیا، پولیس نے اس کو لالچ دیا کہ اگر وہ اپنے ساتھیوں کے نام بتادے تو اس کا نام نکال دیا جائے گا۔ مگر جما اصول کا پکا تھا، اور دیانت کو سمجھتا تھا۔ اس نے صاف انکار کردیا۔

اس وقت کٹہرے کے اندر کھڑا ہوا جما سمجھ رہا تھا کہ اس دفعہ سزا لمبی ہوگی، اسی کمرے میں ذرا ہٹ کر اس کی بیوی کی گود میں، جما کا بچہ رو رہا تھا جس کی ہر چیخ جما کے دل کے پار ہوتی جا رہی تھی۔ اور گو عجیب بات ضرور ہے لیکن معلوم ہوا کہ اس چور کے پہلو میں دل بھی تھا۔ اور شاید اس کا خون بھی سرخ ہی تھا [illegible]

مجسٹریٹ کا کام انصاف کرنا یا دوسرے لفظوں میں سزائیں دینا تھا۔ عدالت کی کرسی پر کمرے کی سوگوار فضا میں، یہ مجسٹریٹ واقعی ایک طاقت وحکومت محسوس ہورہا تھا۔ تلوار کا گھمانے والا بالعموم آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ لیکن اس حاکم کے انصاف کی تلوار جب گھومتی تھی تو اس کی بے رحم آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔ اور وہ غریب جن کو وہ مجرم کہتا تھا مگر افلاس یا اسباب وحالات نے انھیں اس کے سامنے لاکر کھڑا کردیا تھا، اس کے وار کی پوری قوت کو پوری طرح محسوس کرتے تھے۔

یہ حاکم عدالت اس پر ہمیشہ حیران رہا کہ لوگ چوری کیوں کرتے ہیں، اس نے اپنی عمر بھر کبھی کوئی فعل ایسا نہیں کیا جسے خلاف دیانت کہا جاسکے، اس وقت بھی اس کے دماغ میں ایسے ہی خیالات چکر کھا رہے تھے، کہ یہ لوگ محنت مزدوری کیوں نہیں کرتے؟ چوری بدمعاشی کیوں کرتے ہیں؟ ایمانداری سے کام کریں تو کام کی کیا کمی؟ کاہلی اور حرام خوری چھوڑ دیں تو عزت کی زندگی بسر کرسکتے ہیں، مفلس آدمی کو شراب خانوں اور تماشہ گاہوں میں ہرگز داخل نہ ہونا چاہیئے ان لوگوں کو اپنی موجودہ حالت میں ہونے کا کیا حق ہے؟

اگر آپ کا تخیلہ قوی ہے تو اس حاکم منصف کے خط وخال کا کوئی شائستہ دو ذہن تصور قائم کرلیجئے، تاکہ آپ کی حس جمالیات کو صدمہ نہ پہنچے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے ڈول۔ بھاری بھرکم پیٹ اور اوگھڑ چہرے مہرے کا آدمی تھا، اس کی صورت سے پست فطرتی اور ہوس پروری نمایاں تھی، جس ملزم کو وہ سزا دینے والا تھا اس کے چہرے کے مقابلے میں اس کی صورت پر نجابت وشرافت کے آثار تھے۔ اور اس کی شکل سے خبث باطن اور بدافعالی کے، اس شخص کا عدالت کی کرسی پر متمکن ہونا اس خیال کا صریحی بطلان تھا کہ انسان کے قول وفعل پر فیصلہ دینے والے کو عالی اخلاق اور صاحب عقل ودراک ہونا نہایت ضروری ہے۔ مگر قانون نے اسے کرسی پر بٹھادیا تھا، اور قانون کبھی غلطی نہیں کرتا، وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے

کسی اور پر نظر نہیں کرتا۔ وہ چور اور بدکار کو بھی حاکم و منصف بنا سکتا ہے، ہماری طرح اگر آپ اس حاکم کی سرشت و شعار کو جانتے ہوتے تو ہم سے زیادہ حیرت کرتے!

عدالت میں جہاں اور لوگ تھے، وہاں فاطمہ کے ساتھ ایک دوسری عورت بھی تھی۔ جو فاطمہ کو تسلی تشفی دے رہی تھی۔ فاطمہ اور بچے کے خیال سے انھیں کی طرح غمگین بھی تھی۔ اس کا نام رام کلی تھا، اور وہ ایک کسبی تھی، وہ بھی سب سے کم درجے کی، رام کلی جما کے پڑوس ہی میں رہتی تھی۔ فاطمہ کی تنگی کی حالت میں جبکہ وہ اکیلی تھی اور اس کے پاس ایک پیسہ تک نہ تھا، رام کلی نے اس کی کسی طرح کی خدمت اٹھا نہ رکھی، اور مفلسی آپ جانتے ہیں ہر قسم کے انتخاب کا حق چھین لیتی ہے۔ اس کے علاوہ فاطمہ اس کی ساری بپتا بھی سن چکی تھی۔ کہ کیسے کیسے فریب دے کر لوگوں نے اسے یہ پیشہ اختیار کر لینے پر مجبور کر دیا تھا، اور اس کے رجعت کرنا سماج نے ناممکن بنا دیا، پھر احسان ماننے والے کے لئے تو تنکا اتارنے کا بھی بڑا احسان ہے۔ اس سے فاطمہ کو اس سے بہنوں کی سی محبت تھی۔ اور رام کلی اس کی محبت سے بہت خوش تھی، ایک مصیبت زدہ دوسرے دکھی کا حال خوب سمجھ سکتا ہے۔ اور ایسے ہی دو شخصوں میں سچی ہمدردی و محبت بھی ہو سکتی ہے۔

رام کلی فاطمہ کے بچے کو جس وقت کھلایا کرتی تو کبھی کبھی اسے بھی آرزو ہوتی کہ اس کے ایک بچہ ہوتا، رام کلی کے یہ تصورات کہ ایک گھر ہو۔ ایک بچہ ہو۔ اور ایک پیار کرنے اور مان رکھنے والا ہو، اس کی نیندوں میں بسے رہتے تھے، اور خوابوں کی دنیا میں وہ اس گندہ زندگی سے نکل کر اس علوی منزل میں پہنچ جاتی تھی۔ جہاں اس کا بچہ اور شوہر فرشتوں کی شکلیں اختیار کر لیتے، اور ان کی آنکھوں میں سے نرم نرم نگاہیں شہد اور رس کی طرح ٹپکتی معلوم ہوتی تھیں، لیکن جب وہ سو کر اٹھتی تو اور اپنے آپ کو وہی اچھوت رام کلی پاتی جس سے دنیا کو نفرت تھی تو اس کی حسرتیں سخت دل شکن ہوتی تھیں۔

عدالت کے کمرے میں جتنے لوگ تھے، اس میں جن کے محسوسات دلچسپ ہو سکتے ہیں۔ وہ ہمارے لال پگڑی والے تھے۔ اس وقت ان کے خیالات کیا تھے؟ کیا ہو سکتے تھے؟ یہی کہ آج کا کام ختم ہو جانے کے بعد اب ان کو چوری کا موقع کب اور کہاں مل سکتا ہے، اور وہ کس طرح کسی کو لوٹ سکتے ہیں؟ کیسے کسی کو قتل کر سکتے ہیں؟ ان لال پگڑیوں میں کوئی ایسا بھی ہوگا، جو اس سوچ میں ہو کہ بلو بازار اور سوناگاچی کا پہرہ کب ملے گا؟ سوناگاچی نہ صرف رات بھر کی ٹکسال ہے، بلکہ وہاں سندر اور موہنی رام جنیاں بھی ملتی ہیں۔

پولیس کے علاوہ اس کمرے میں اہل معاملہ کو چھوڑ کر بعض تماشائی بھی ہوں گے، آپ شاید کہیں گے کہ عدالت اور تماشا؟ لیکن ایک غیر مرقوم قانون یہ بھی ہے کہ تماشائیوں کو عدالت میں آنے دیا جائے، تاکہ دنیا دیکھ سکے کہ قانون پر کس خوبی سے عملدرامد ہوتا ہے، اور انصاف کس خوبی سے کیا جاتا ہے، لوگ بھی یہی دیکھنے آتے ہوں گے، کہ میزان عدل کو کس طرح ہموزن رکھا جاتا ہے حوادث کے شکار انسان اپنی مصیبتوں کو کس طرح بیان کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ وہاں جو کوئی بھی تھا، کسی نہ کسی بات کا منتظر تھا۔ مجسٹریٹ کو گھر جانے کا انتظار تھا۔ کیونکہ "بقدر جثہ" کی مطابق وہ کسی قدر "خوش خور" بھی واقع ہوا تھا، اور اس وقت اپنے معدے میں اسے سکون معلوم نہ ہوتا، جما کو اپنی سزا سننے کا انتظار تھا۔ سپاہی اس کو جیل خانے لے جانے کے منتظر تھے، اور ننھا بچہ بھی شاید اپنے باپ کا انتظار کر رہا تھا۔

بالآخر ایک موٹی اور پھٹی ہوئی آواز کھنچتی سنائی دی:-

"پانچ سال قید باشقت"۔

عدالت نے جما کو قانونی دفعہ کی انتہائی سزا کا حکم سنا دیا۔ اصلی بات یہ تھی کہ مجسٹریٹ کو شروع ہی سے جما کی شکل اور اس کے انداز نے کچھ متنفر کر دیا تھا، اور کچھ وہ اپنے معدے کی طرف سے بھی مطمئن نہ تھا، ورنہ اگر اس کے نفسیات نے یہ پلٹا نہ لیا ہوتا تو شاید دو سال سے زیادہ سزا نہ دیتا۔

اس کے حکم سنانے کے ساتھ ہی کسی کے فرش پر گرنے کا دھماکا ہوا، یہ فاطمہ تھی، رام کلی نے جھپٹ کر روتے ہوئے بچے کو اس کے سینے پر سے اٹھا لیا۔ جما نے یہ دیکھ کر ایک چیخ ماری۔ کٹہرے سے نکل آیا۔ مگر سپاہیوں نے ڈنڈے مار

مارکر پھر اسے وہیں کھڑا کر دیا، اور ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ اس نے مجنونوں کی طرح ہات پاؤں مارے، لیکن ڈنڈوں کی مار کے سامنے کیا کر سکتا تھا۔

بے ہوش فاطمہ کے گرد ہجوم ہو گیا، رام کلی نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا، پہلو پہ ہات رکھا تو دل کی دھڑکن بند تھی، ناک کے سامنے ہات لگایا تو سانس موقوف محسوس ہوئی، رام کلی چیخ پڑی ۔

"ہائے ڈاکٹر کو بلاؤ، اس میں تو سانس ہی نہیں!"

اس آواز نے جما کو دیوانہ کر دیا، اس نے کٹہرے پر سر دے مارا، سر سے خون جاری ہو گیا، اور مجسٹریٹ سے کہنے لگا۔

"تم خونی ہو ــــــــــ اس کو تم نے قتل کیا ہے!"

مگر اس کے ساتھ ہی اس پر سپاہیوں کے دھول دھپے کی بارش ہونے لگی، جما اس وقت ان سب کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔

حاکم عدالت نے اس پر توہین عدالت کا نیا مقدمہ قائم کر دیا، اور دفتر سے ٹیلیفون کرا کے اسپتال کی موٹر منگوانے حکم دے دیا۔

عدل و انصاف کا یہ ڈراما جب کھیلا جا چکا تو سب نے اپنی اپنی راہ لی، مجسٹریٹ اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہوا، جما ایک گاڑی میں بند کر کے جیل خانے لے جایا گیا، فاطمہ کی لاش اسپتال کے "مردہ گھر" میں پہنچی، اور ننھا سا بچہ کے لئے چونکہ جج نے بھی کوئی حکم نہ دیا تھا اس لئے رام کلی اسے چھاتی سے لگائے روتی ہوئی اپنے گھر لے چلی ــــــ رام کلی ایک کسبی تھی!

انسانیت

راحت کا پیکر جان کا ساماں بن جا
جو درد جہاں ہو تو وہیں درماں بن جا
اتنی تو مری مان ہی لے لے اے جگر
صورت میں ہے سیرت میں بھی انساں بن جا

جگر مرادآبادی

تسخیرِ عالم

گر امن کی خواہش ہے تو محنت بھی کرو
پیدا حسنِ صنعت و حرفت بھی کرو
لو کام عناصر سے جناب اے جگر
انساں ہو تو فطرت پہ حکومت بھی کرو

جگر مرادآبادی

جادوِ بیانی

ذرا اُس کی جادو بیانی تو دیکھو
نئے طُور کی لن ترانی تو دیکھو!

پراگندہ زلفوں کی پرچھائیوں میں
سن وسال کی ضَوفشانی تو دیکھو

مچلتی ہوئی نرم گفتاریوں میں،
تڑپتی ندی کی روانی تو دیکھو

تکلّم کی رو میں کھنچے ابرووں کی
بہ ایں دلبری، قہرمانی تو دیکھو

چھلکتے سے الفاظ کے زیر وبم سے
اُبلتے ہوئے سے معانی تو دیکھو

لچکتی سی ڈالی، چہکتی ہی بلبل
ہجومِ خروشِ جوانی تو دیکھو

ہر اک حرف ساغر بکف کی جِلو میں
سرورِ مئے ارغوانی تو دیکھو

مہکتی ہوئی سانس کی تازگی میں
لبِ لعل کی گلستانی تو دیکھو

دہکتی ہوئی عُمر کے ولولوں کی
براہِ نظر ترجمانی تو دیکھو

تلفّظ کی نادیدہ انگڑائیوں میں
مژہ کی ذرا پرفشانی تو دیکھو

برستے سے فقرے، کھنکتے سے جملے
جوانی کی شیریں زبانی تو دیکھو

رُخِ تازہ کی چھپی چاندنی میں!
تبسّم کی گوہر فشانی تو دیکھو

تبسّم کی گوہر فشاں بجلیوں میں
برستا ہوا مے کا پانی تو دیکھو

دمِ گفتگو نرگسی انکھڑیوں میں
چھلکتی ہوئی بدگمانی تو دیکھو!

وہ سُن لیں تو اے جوشؔ آفت مچادیں
میری جرأتِ شعر خوانی تو دیکھو!

جوشؔ

"کلیم عجم" پر ایک نظر

اثر لکھنوی

"کلیم" میں "کلیم عجم" پر ایک مختصر تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ آج ذرا تفصیل سے بحث کی جائے گی۔ کتاب کے حصۂ نثر میں سیماب صاحب کا ایک مضمون "میں شعر کیونکر کہتا ہوں" کے عنوان سے ہے، اُس کے بعض حصے نقل کر کے دیکھنا ہے کہ اُن کے شعر اُنھیں کے مقرر کردہ معیار پر کس حد تک پورے اُترتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ

"سنہ ۱۹۱۸ء سے شعر کہتے وقت میں ایک ایسے عالم میں پہنچ جاتا ہوں جہاں ظواہر و رسمیات کی گنجائش نہیں۔ جہاں ایک محیط سرمدلوز میں میری روح اور دماغ سرخوش ہوتے ہیں۔ جہاں حسن بدرجۂ اتم ہوتا ہے۔ مگر معصوم اور ازلی۔ اور جہاں محبت سجدہ نمایت ہوتی ہے۔ مگر بے لوث اور ابدی"

"اب بعض اوقات بغیر فکر بھی شعر دماغ پر نازل ہو جاتا ہے۔ آسودگیٔ خلوت، شورشِ محفل، لوگوں کا ہجوم، رباب و سرود کی آوازیں، ریل کی گھڑگھڑاہٹ، موٹروں اور تانگوں کی سماعت خراش رفتار میرے شعر کہنے میں حارج نہیں ہوتی۔ اب میں چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے اور دورانِ گفتگو میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں۔ اب میرے لئے شعر کہنا اور باتیں کرنا برابر ہے۔ البتہ جب کثرتِ افکار سے دل پریشان اور دماغ پراگندہ ہوتا ہے تو مجھ سے شعر نہیں کہا جاتا۔ . .

کسی مصرع کو دو چار بار ذہن میں گردش دی اور خاموش بیٹھ گیا۔ دو منٹ کے بعد سانچے میں ڈھلے ڈھلائے شعر کاغذ پر برسنے لگتے ہیں، جن پر نظرِ ثانی کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر نظرِ ثانی کرتا ہوں تو شعر میں وہ الوہیت و بداہت نہیں رہتی جو دماغ سے نکلے ہوئے شعر میں ہوتی ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ دماغ مجسم شعر اور طبیعت یکسر شاعری بن کر رہ گئی ہے۔ اُدھر کسی بحر کا کوئی مصرع دماغ میں گونجا اِدھر قلم سے اشعار برسنے لگے۔ اِدھر نظم کے لئے کوئی عنوان یا موضوع سامنے آیا اُدھر نظم کا موزوں خاکہ کھنچنے لگا۔ بعض اوقات تو قطعاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا بول رہا ہے اور بندہ لکھ رہا ہے۔"

ایسے "فرموداتِ خداوندی" کے خلاف کچھ لکھنا کفر کا مرادف ہوتا، گر غنیمت ہے کہ آخری جملے میں "بعض اوقات" سے تھوڑی گنجائش نکل آئی۔ بعض اوقات خدا بولتا اور سیماب صاحب لکھتے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ دیگر اوقات میں کسی دوسری طاقت کو تلقین کا موقع مل جاتا ہو اور سیماب صاحب حسبِ عادت لکھنا شروع کر دیتے ہوں۔ تاہم دل دھڑکتا اور تن کے قلم (توبہ) قلم کے تن میں (باوجودیکہ فاؤنٹین پن ہے) رعشہ ہے۔ تنقید صرف اُس کلام پر کی جائے گی جس میں "زائیدگانِ الہام" درج رہے ہیں اور جس کا آغاز سنہ ۱۹۱۹ء میں ہو کر سنہ ۱۹۳۵ء میں خاتمہ بخیر ہو جاتا ہے

اس حصۂ کلام کے پہلے دو شعر یہ ہیں:-

عروسِ فطرت، مری نگاہوں پہ چھا رہا ہے شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے جمال زیرِ نقاب تیرا
زوال سے اور نیند سے بے نیاز و بے احتیاج ہے تو
حدوث کی خفتہ کاریوں میں ہوا ہے تقسیم خواب تیرا

جن لوگوں کو الفاظ کی ظاہری شان یا خوبصورتی مرعوب نہیں کرتی بلکہ شعر کے مطلب پر بھی غور کرتے ہیں وہ دیکھیں گے کہ اس مسلسل غزل یا نظم میں "عروسِ فطرت" کے استعمال نے کیا کیا خرابیاں پیدا کی ہیں۔ لفظ فطرت کے متعدد معنی ہیں۔ شعر زیرِ بحث میں اس کا مفہوم نیچر یا مناظرِ قدرت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ عروس کہہ کر فطرت کی آرائش و رعنائی کو نمایاں کیا ہے، مگر اس کے بعد جتنے شعر ہیں اُن میں "عروسِ فطرت" کا مستعار لہ خدا ہو جاتا ہے۔ ذہن میں انتشار پیدا ہوتا ہے کہ ان شعروں کا مخاطب کس کو سمجھے۔ "عروسِ فطرت" کا ٹکڑا مناظر کی طرف کھینچتا ہے۔ جلال و جبروت و عذاب و ثواب وغیرہ کی کششیں ذاتِ باری کی طرف توجہ دلاتی ہیں جس کو "عروسِ فطرت" کہنا طبیعت گوارا نہیں کرتی، کیونکہ لفظ عروس میں نسائیت ہے۔ اور آج تک کسی مذہب یا فلسفے نے خدا کو "صنفِ نازک" نہیں بتایا۔ میں مانتا ہوں کہ دائرۂ عشق میں خدا کو معشوق یا محبوب سمجھا گیا ہے۔ مگر ان صورتوں میں بھی اُس کو عورت نہیں بنایا۔ عروس نہیں کہا۔ البتہ ہندی متصوفانہ شاعری میں "ساجن" اور اسی قبیل کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ مثلاً

چتر البیلی، کرلے سنگار، ساجن کے گھر جانا ہوگا
ماٹی اوڑھنا، ماٹی بچھاونا، ماٹی میں اک دن مل جانا ہوگا
چتر البیلی کرلے سنگار

دوسرا شعر ایک خوابِ پریشاں اور مطلب سے قطعاً معرا ہے۔ حدوث کی خفتہ کاریاں کیا ہیں؟ حدوث جب خود خفتہ کار ہے تو اُس میں خواب کی تقسیم کیسی؟ عروسِ فطرت نیند سے یوں بے احتیاج یا فارغ ہوئی کہ اُس کا خواب حدوث کی خفتہ کاریوں میں بٹ گیا۔ مگر زوال سے بے نیاز ہونے کا شعر میں کیا ثبوت ہے؟ عجیب ابہام ہے اور طرفہ یہ ہے کہ شاید ابہام کا مقصود صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ خدا ہے۔ اور سیماب صاحب سمجھیں یا بغیر سمجھے بوجھے دُہرائیں۔ میری دانست میں تو ابہام و ابہام کچھ نہیں، وہم غلط کار" کا فریب ہے۔ یا خفتہ کاریوں کے کرشمے ہیں۔

ایک اور شعر ہے

جلال و جبروت نے لگا دی ہے مُہرِ حیرت زبان و لب پر
جبال و صحرا کے ذہن میں ہے اشارۂ انقلاب تیرا

کہاں عروسِ فطرت، کہاں جلال و جبروت! کہاں عظمتِ کبریائی۔ کہاں دُلہن کا شرمیلا پن! اس سے قطعِ نظر، جلال و جبروت زبان و دہن پر مہرِ سکوت لگائیں گے یا مہرِ حیرت؟ مرعوب کریں گے یا متحیر؟

ایک اور شعر ہے

غم عذاب و ثواب کیسا؟ یہ دونوں تیری ہی نعمتیں ہیں
نہ اختیاری کرم ہے تیرا، نہ اختیاری عذاب تیرا

غم کا اطلاق عذاب و ثواب دونوں پر ہے۔ غم عذاب مسلّم، مگر غم ثواب کیسا؟ البتہ راضی برضا ہونے کی صورت میں انسان عذاب و ثواب دونوں کو نعمت سے تعبیر کر سکتا ہے۔ دوسرے مصرع کا ابہام قابلِ افسوس ہے۔ سیماب صاحب غالباً یہ کہنا چاہتے تھے کہ تیرے کرم یا عتاب پر میرا اختیار نہیں، مگر فرماتے ہیں کہ ع

نہ اختیاری کرم ہے تیرا نہ اختیاری عتاب تیرا

جس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ (خاکم بدہن) خدا کو اپنے کرم یا عتاب پر اختیار نہیں ہے، بلکہ دونوں فعل عالمِ اضطرار میں سرزد ہوتے ہیں۔ اللہ رحم کرے ان مدعیانِ الہام پر۔

پورا شعر اس طرح نظم ہو سکتا تھا ؂

عذاب ہو یا ثواب دونوں تری عطا کردہ نعمتیں ہیں
نہ مجھ کو قابو ترے کرم پر نہ میرے بس میں عتاب تیرا

اور سنئے ؂

ترے جلال و جمال ہی سے ہے اعتدالِ مزاجِ عالم
کبھی غضب بے پناہ تیرا، کبھی کرم بے حساب تیرا

خدا کے غضب کا بے پناہ، کرم کا بے حساب ہونا تسلیم، مگر ان صفات کو مزاجِ عالم میں اعتدال قائم رکھنے کی علت قرار دینا دعویٰ بے دلیل ہے۔ شاید یہ جواب ملے کہ جلال و جمال کو وجہِ اعتدال کہا ہے نہ کہ غضب اور کرم کو، مگر جلال کا مظہر

غضب اور جلال کا مظہر کرم ہے، ایک بے پناہ اور دوسرا بے حد حساب۔ لہٰذا اعتراض اپنی جگہ پر قایم رہتاہے۔ اور اگر بیان کردہ توجیہ ناقابل قبول ہے تو کوئی صاحب دونوں مصرعوں میں ربط پیدا کر دیں۔ علاوہ بریں یہ عالم کون و فساد ہے۔ اس میں اعتدال کہاں؟ شعر کی اساس ہی غلط نظریہ پر ہے۔

دوسری غزل میں فرماتے ہیں ؎

اے کہ ترا وجود ہے آئینہ کائنات کا
ذوق نگاہ کو دیا تو نے تجلّیات کا

سوال یہ ہے کہ کائنات آئینۂ وجود ہے یا وجود آئینۂ کائنات ہے؟ سیماب صاحب نے وجودِ مطلق کو آئینۂ کائنات کہہ کے وجود کی توہین لی ہے۔ دوسرے مصرع میں "ذوقِ نگاہ کو دیا" کے بجائے "ذوق دیا نگاہ کو" چاہیے پہلا مصرع یوں بدل دیجے اور دیکھئے شعر کیا سے کیا ہو جاتا ہے ؎

اے کہ ترے ظہور میں راز ہے کائنات کا
ذوق دیا نگاہ کو تو نے تجلّیات کا

؎ تیری نمودِ ارتقا جلوہ گہِ حیات کا
تیرا ورود معجزہ عالمِ ممکنات کا

حیات کا ارتقا تو ہو سکتا ہے، مگر حیات کی جلوہ گاہ کا ارتقا میری سمجھ سے باہر ہے۔ دوسرے مصرع کی ردیف اپنے صرف بے محل پر آنسو بہا رہی ہے۔ عالمِ ممکنات میں تیرا ورود معجزہ ہے۔ (تو دائم، وہ فانی۔ تو واجب، وہ ممکن) نہ کہ تیرا ورود عالمِ ممکنات کا معجزہ (عالمِ ممکنات کی معجز نمائی) ہے۔

؎ کھینچ دیں اصل و فرع میں صاف حدود و امتیاز
ذہن و نظر کو دے دیا علم صفات و ذات کا

سرتاجِ انبیا تو فرمائیں "ما عرفناک حق معرفتک" اور سیماب صاحب مدظلہٗ کو ذات و صفات کا مکمل علم و عرفان حاصل ہے! اس مجد و شرف و کرامت کے حصول پر بھی اُن کا صرف منصب شاعر پر قانع رہنا اُن کے انتہائی ایثار و انکسار پر دال ہے ورنہ "انا ربکم الاعلیٰ" بھی کہتے تو اُن کے منہ پر پھبتا۔

اور ملاحظہ ہو ؎ تیرگیٔ جمود سے زندگیاں ہوئیں طلوع
عقدہ کیا جو تو نے حل فلسفۂ حیات کا

سبحان اللہ صاحب! خدا کو عقدے پیش آتے ہیں، اور وہ اُن کو حل کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تیرگیٔ جمود سے زندگیاں طلوع ہوتی ہیں۔ کہاں خدا، کہاں فلسفے کا طالب علم جو حلِ مسائلِ حیات میں مشغول ہے۔ یہ خدا ہے یا فاسٹ کے خاندان کا کوئی فرد؟ معلوم ہوا کہ یاراں دیگرے رامی پرستند! کہاں حیات کہاں تیرگیٔ جمود! یہ کیا بازیگری ہے۔ بات یہ ہے کہ ویدانت اور دیگر نظام فلسفہ کے ٹکڑے پارچے جو کسی سے ناقص طور پر سن لئے۔ جب نظم کے قالب میں لا کر اسرار و حکم کی صورت میں پیش کئے جائیں گے تو ایسے ہی مفلوج شعروں کی پلٹن تیار ہوگی۔

ابھی اور سنئے ؎

دیرِ خودی و کبر میں تو نے اذانِ صبح دی
تیرا جمال زندگی، چاند ہے پچھلی رات کا

مبارک ہو، اللہ میاں دیرِ خودی و کبر میں داخل ہو کر بانگ بھی دینے لگے۔

یہ ابتدائی دو غزلیں بہت دقیق تھیں جن میں سیماب صاحب نے بزعمِ خود حمدِ باری مزا سمہ کی منزلیں طے کی ہیں۔ حالانکہ میری ناقص رائے یہ ہے کہ "ترکستان" پہونچ گئے۔

اس سے ہلکا رنگ ملاحظہ ہو ؎

اب کیا بتاؤں میں ترے ملنے سے کیا ملا
عرفانِ غم ہوا، مجھے دل کا پتہ ملا

سیماب صاحب کی جو ادا ہے نرالی ہے معشوق کے ملنے سے عرفانِ غم ہونا اور دل کا پتا ملنا کس کی سمجھ میں آسکتا ہے؟ البتہ نہ ملنے کی حالت میں یہ صورتیں رونما ہوتی ہیں۔ اُن کا پندار البتہ نظر ثانی کا روادار نہیں ہوتا، ورنہ ذرا سے غور میں شعر کا ہیولیٰ درست ہو سکتا تھا۔ ملاحظہ ہو ؎

میں کیا بتاؤں تیری محبت میں کیا ملا
عرفانِ غم ہوا مجھے دل کا پتا ملا

پھر فرماتے ہیں کہ ؎

یا زخمِ دل کو چھیل کے سینے سے پھینک دے
یا اعتراف کر کہ نشانِ وفا ملا

سوجھی خوب! کیونکہ معشوق ایسی گھنونی حرکت کرنے سے رہا کہ زخمِ دل کو

سینے سے چھین کر پھینک دے۔ مجبوراً اعتراف کرے گا کہ بیشک آپ کا زخمِ دل نشانِ وفا ہے۔ لیکن۔ جلا دِ ستم کا مشّاق ہوا تو زخمِ دل کو (جسے ڈٹ کر کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ اُبھرا ہوا ہے جبھی تو چھپلے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے) چھیل کے پھینکنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ عمل جراحی کرتا رہے گا، اور ہنس ہنس کے کہتا جائے گا کہ مجھے تو زخم کے سوا نشانِ وفا کہیں نہیں ملا۔

۱۳ جاگ اور دیکھ ذرا عالمِ ویراں میرا
صبح کے بھیس میں نکلا ہے گریباں میرا

گریبان کا بھیس بدلنا یقیناً اختراعِ فائقہ ہے۔

۱۴ غلبۂ یاس بجا، شدتِ حرماں معلوم
میں سمجھتا ہوں کہ مرنا نہیں آساں میرا

لفظِ معلوم جس طرح واقع ہے نفی کے معنی دیتا ہے، حالانکہ مدعا یہ ہے کہ شدتِ حرماں تسلیم ہے "میں سمجھتا ہوں" بالکل بے جوڑ اور بے محل ٹکڑا ہے۔ دونوں مصرعے غیر مربوط بھی ہیں۔ پورا شعر اس طرح درست ہو سکتا تھا ؎

غلبۂ یاس بجا، شدتِ حرماں تسلیم
آہ اس پر بھی تو مرنا نہیں آساں میرا

۱۵ پڑ گئی کس کی نگاہِ تبسم سیماب
ہو گیا حرفِ غلط دفترِ عصیاں میرا

پہلے مصرع میں استفہام کا محل نہیں تھا، لطف کے بجائے تصنع پیدا ہو گیا۔ "متبسم" "سیماب" سے مل کر سانپ کی پھنکار پیدا کرتا ہے۔ پہلا مصرع یوں بدل سکتا ہے ؏

پڑ گئی جب نگہِ لطف کسی کی سیماب

گو سیماب صاحب کہیں گے "حضرت مجھے نگاہِ تبسم کی ترکیب بہت پسند ہے۔ میں اس کو ہرگز نہ بدلوں گا" میں عرض کروں گا۔ "بندہ پرور ماننے نہ ماننے کا آپ کو اختیار ہے۔ اس ناچیز نے ایک مشورہ دیدیا"۔

۱۶ جلوہ گاہِ دل میں مرتے ہی اندھیرا ہو گیا
جس میں تھے جلوے ترے وہ آئینہ کیا ہو گیا

دل مر سکتا ہے مگر جلوہ گاہِ دل کا مرنا عجیب و غریب بات ہے۔ اگر یہ کہئے کہ مرنا قائل سے متعلق ہے اور اندھیرا جلوہ گاہِ دل سے، تو آئینہ کیا ہو گیا کی توجیہ کیا ہو گی؟

یوں کہہ سکتے تھے ؎

دیکھتے ہی دیکھتے دل میں اندھیرا ہو گیا
جس میں تھے جلوے ترے وہ آئینہ کیا ہو گیا

اس طرح دونوں مصرعوں میں لفظ جلوہ کی جو بدنما تکرار تھی وہ بھی نکل گئی اور حاصل کے لحاظ سے بھی مطلع بلند ہو گیا۔

۱۷ برہمن کہتا تھا "اکھنڈ" شیخ بول اٹھا "احد"
نکتہ رس دونوں تھے، آپس میں جھگڑا ہو گیا

میں نے آج تک کسی برہمن کو "اکھنڈ" بولتے نہیں سنا نہ میرے کان اس لفظ سے آشنا ہیں ؏

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

۱۸ نجد کے ہرنوں سے اعجازِ محبت پوچھئے
پڑ گئی جس پر نگاہِ قیس، لیلےٰ ہو گیا

ناقہ و محمل کی رعایت سے "اونٹوں" "ہرنوں" سے اچھا تھا۔ خیر مذاق جانے دیجے، اعجازِ محبت دکھانے کو نجد کے ذروں کو گواہ بنانا چاہیے ؎

نجد کے ذروں سے اعجازِ محبت پوچھئے
پڑ گئی جس پر نگاہِ قیس لیلےٰ ہو گیا

۱۹ سُنا ہے حسن کا مستقبل مسلک وفا ہوگا
وفا ہے حُسن کا جوہر کسی سے سُن لیا ہوگا

معنی "مسلکِ مستقبل" سے نکلتے ہیں نہ کہ "مستقبل مسلک" سے، دونوں کا فرق اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں حسن کا مسلکِ مستقبل وفا ہوگا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ فی الحال مسلک جو کچھ ہو، آئندہ وفا ہوگا۔ اگر مستقبل مسلک کہئے تو یہ پتا نہیں چلتا کہ اب کیا مسلک ہے۔ پہلی صورت میں آپ کو یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ فی الحال کیا مسلک ہے۔ مگر دوسری صورت میں بتانا آپ کا فرض ہے کیونکہ مسلک کو حسن سے منسوب کر دیا اور آئندہ اس میں تغیر کی پیش گوئی کی۔ خلاصہ یہ کہ ایک ہی مسلک

غیر متعین ہے اور دوسرے میں متعین مگر ناگفتہ جو نقص بیان کی دلیل ہے۔ غالباً یہ جواب دیا جائے کہ وفا کے تقابل سے موجودہ مسلک کا جفا ہونا ثابت ہے۔ ایسا فرض کرنا لازم نہیں، وفا کی عدم موجودگی جفا کے علاوہ دوسری باتوں کا امکان خارج نہیں کرتی۔ ممکن ہے کہ معشوق کا موجودہ مسلک، تغافل، تجاہل، حیا، پردہ یا کچھ اور ہو۔ فرق اس قدر نازک ہے کہ شاید ذرا غور کے بعد سمجھ میں آئے۔ مگر اہلِ فکر کو دعوت دیتا ہے کہ یا تو "مسلکِ مستقبل" اور "مستقبل مسلک" ایک ہی ہیں یا دونوں کا مفہوم مختلف ہے، اگر مختلف ہے تو کیا فرق ہے اور اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے شعر میں "مسلکِ مستقبل" چاہیے یا "مستقبل مسلک"۔

یہ سب جانے دیجئے۔ یہی خیال بہتر طریقے سے یوں ادا ہو سکتا تھا ؎

سُنا ہے مسلکِ اہلِ ستم اک دن وفا ہوگا
وفا ہے حُسن کا جوہر کسی نے سُن لیا ہوگا

مگر اس کا کیا علاج کہ ایک شخص "مستقبل مسلک" کسی نہ کسی تدبیر سے شعر میں ٹھونسنا چاہتا ہے۔

۲۰ فضائے گوشۂ دل میں تجھے جب جلوہ گر دیکھا
مری نظروں نے حیرت سے مجھی کو عمر بھر دیکھا

فضا کے معنی ہیں کھلی ہوئی جگہ۔ گوشہ میں فضا کہاں؟ "تجھے، جب، جلوہ گر" میں تین جیم اس بُری طرح جمع ہوئے ہیں کہ تنافر پیدا کر دیا۔ پہلا مصرع دو طرح بدلا جا سکتا ہے "گوشہ" کی رعایت سے ع

حریمِ دل میں جب اک رشکِ مہ کو جلوہ گر دیکھا

فضا کو اہمیت دیتے ہوئے ع

افق پر دل کے جب اک رشکِ مہ کو جلوہ گر دیکھا

موخرالذکر کو ترجیح ہے، کیونکہ تھوڑی جدت کے علاوہ حیرت کا پوری قوت سے اظہار ہوتا ہے۔

۲۱ دلِ یک قطرۂ خوں اور اُس میں سوز و ساز ایسا
ذرا سی چیز میں ہنگامۂ برق و شرر دیکھا

"دلِ یک قطرۂ خوں" کے معنی ہوئے ایک قطرۂ خون کا دل جو بالکل مہمل ہے۔ قطرۂ خون میں دل کہاں سے آیا۔ البتہ دل کو ایک قطرۂ خون کہہ سکتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ مگر جب یہ خبط ہو کہ کوئی نئی بات کہی جائے اور تخیل مساعدت نہ کرے تو ایسی ہی اُلٹ پلٹ ہو کے رہ جاتی ہے۔ دل کو قطرۂ خون کہنے کے بعد دوسرے مصرع میں "ذرا سی چیز" لانا محض خانہ پُری ہے۔ پورا شعر اس طرح ترمیم ہو سکتا ہے ؎

دل اک قطرہ لہو کا اور اُس میں سوز و ساز ایسا
کہ ہر لحظہ نیا ہنگامۂ برق و شرر دیکھا

۲۲ تمہارے سنگِ در کو سنگِ در اب کس طرح کہدوں
کہ جب سجدہ کیا سر کو جبینِ عرش پر دیکھا

"کہدوں" کی جگہ "کہوں" یا "کہئے" صحیح و فصیح ہوتا۔ "سر کو جبینِ عرش پر دیکھا" مضحک اور مہمل ہے۔ "فرازِ عرش" کہنا چاہیے۔ مگر جبین و سر و سجدہ میں تناسب کے دلدادہ عرش کی بلندی کو چھوڑ کر جبین کی پناہ لیتے ہیں۔ پورا شعر اس طرح بہتر ہوتا ؎

تمہارے سنگِ در کو سنگِ در اب کس طرح کہئے
کہ جب سجدہ کیا سر کو فرازِ عرش پر دیکھا

۲۳ وہ عبا قیس کی، فرہاد کا وہ جامۂ تنگ
دشت و کہسار نے دیکھے ہیں گریباں کیا کیا

یا دش بخیر۔ یلدرم کو رشک آئے گا کہ قیس کو بائیسکل پر سوار کیا اور لیلیٰ کو موٹر پر، قیس کے واسطے بلیچ کا ہارن ایجاد کیا۔ حرماں و مایوسی کا ترجمان، ناٹر کے پنچر اور "شوں، شوں، سٹ" کو بنایا، مگر یہ نہ سُوجھی کہ اس صحرا نورد کو عمامہ و عبا و قبا یا جبہ و دستار سے آراستہ کر کے ڈاڑھی لگا دیتے۔ خدا کے لئے کہاں قیسِ دیوانہ جو ہر رنگ میں "رقیبِ سر و ساماں" اور "تصویر کے پردے میں بھی عریاں" نکلا، اور کہاں ڈھیلی ڈھالی عبا، کہاں کوہکن کی محنت بر باد، کہاں چست تہری کا گھٹنا! اس خرافات کا ٹھکانا ہے!

۲۴ ملتفت دیکھ کر احساسِ کرم کو سیماب
جمع ہے خاطرِ اندیشہ بداماں کیا کیا

احساسِ کرم کا ملتفت ہونا غور کرنے پر بھی سمجھ میں نہ آیا۔ خاطرِ اندیشہ بداماں فارسی ترکیب ہے، اور فارسی میں اندیشہ بمعنی سوچنا مستعمل ہے نہ کہ بمعنی انتشار۔ اندیشہ کا یہ مفہوم ہندی ہے اور سیماب صاحب اندیشہ بمعنی انتشار فارسی ترکیب کے ساتھ لائے ہیں جس کے جواز کی کوئی صورت نہیں۔ لفظ جمع اندیشہ کے عرض کردہ مفہوم کی غمازی

ش ۲۵ یہ نکما پن مجبور دل کا اک انجام ہے
دل سے کوئی کام لے، دل کام کا ہو جائیگا

شاید پہلے نکمے پن کے بدلے میں "مجبور دل"، ایسا ہی جو کوا اور کوّا ایک ہی پنجرے میں بند ہوں۔ شعر میں لفظ اک بھی زائد ہے۔ پہلا مصرع یوں بھی ہو سکتا ہے۔

ع نامرادی کا گلہ، حرماں کا شکوہ تابکے

ش ۲۶ دو ہی انگارے تھے، ہاتھوں میں خدا کے عشق کے
ایک کو دل ایک کو میرا کلیجا کر دیا

یہ دور جدید کا اسلوب ہے، سودا کا سلیقہ دیکھئے ؎

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی، سو عاشق کا دل بنا

ش ۲۷ واقعات عشق کا تھا ایک لمحہ اک صدی
ہر نفس میں میں نے اک رومان پیدا کر دیا

صحت زبان ایک لمحہ کی جگہ ہر لمحہ یا لمحہ لمحہ کی مقتضی ہے، ورنہ ایک ایک لمحہ سکتے۔ سیماب صاحب کے پندار الوہیت نے اُن کو بے حس کر دیا ہے۔ مگر میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ ادائے خیال کے لئے انھیں معمولی اور سامنے کے لفظ بھی نہیں ملتے۔ لمحے زندگی میں ہوتے ہیں نہ کہ واقعات میں، خدا معلوم واقعات عشق کی جگہ زندگی عشق کیوں نہیں نظم کیا۔ پہلا مصرع اس طرح بدلا جا سکتا ہے۔ ع

زندگی عشق کا تھا لمحہ لمحہ اک صدی

لمحہ اور صدی کے جال سے نکلئے تو پورا شعر اس طرح بلند ہو سکتا ہے ؎

حادثات عشق میں پہلے نہ تھی یہ دلکشی
ہر نظر میں میں نے اک نشہ کا رپو را کر دیا

ش ۲۸ یہ اتفاق تھا سویا تو نیند آ ہی گئی
مجھے تو قبر میں بھی اعتبار خواب نہ تھا

"سویا تو نیند آ ہی گئی" میں جو مطلب نغز سیماب صاحب نے پنہاں کیا ہو وہی جانیں۔

ش ۲۹ قفس سے چھوٹ کے بڑی دیر میں ٹھکانہ ملا
خیال سے بھی کہیں دور آشیانہ ملا

ٹھکانا ہندی لفظ ہے جس کا املا الف سے ہے۔ قواعد عروض کے مطابق ہائے ہوز کو اگر آخر کلمہ میں بغیر علت یا اضافت آئے تو الف میں بدل کر اسی لفظ کا قافیہ کر سکتے ہیں جس میں حرف روی الف ہو۔ مثلاً نظارہ اور دریا کا قافیہ، مگر الف کو (ہ) سے نہیں بدل سکتے۔ یعنی ٹھکانا اور آشیانہ قافیہ نہیں ہو سکتے جس طرح اگر قافیہ میں حرف روی اصلی (ہ) ہے مثلاً اشارہ کنایہ تو اس کا قافیہ دریا کو دریہ لکھ کر نہیں کر سکتے۔ سیماب صاحب سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے وہ ایطا یا قافیہ کی نہیں ہے بلکہ انشار کی طرح املا بھی غلط ہے۔

ش ۳۰ شام اور سحر دو میرے ہی ہموار و پریشاں جلوے ہیں
یہ میری جبین تاباں ہے وہ گیسوئے برہم میرا

"دو میرے ہی غلط" دونوں میرے کہئے۔

ش ۳۱ ابھی درمان جنون غم پنہاں ہوتا
چارہ گر کاش ترے ساتھ بیاباں ہوتا

مومن کے اس مشہور شعر کے بعد خامہ فرسائی کیا ضرور ؎

کر علاج وحشت دل چارہ گر
لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

ش ۳۲ عہد موسیٰ میں نہ تھا قابل جلوہ کوئی
ورنہ وہ اور پہاڑی پہ نمایاں ہوتا

"پہاڑی" سے شعر میں لچر پن آ گیا۔ یوں کہئے ع

ورنہ وہ اور سر طور نمایاں ہوتا

طور کی جگہ پہاڑی نظم کرنے سے شعر نیا نہیں ہو جاتا۔

ش ۳۳ میں جس انداز میں دیتا تجھے پیغام طلب
ساز فطرت بھی اُسی لے میں غزلخواں ہوتا

مطرب کے بجائے ساز کو غزلخواں ہوتے اس سے قبل نہیں سنا تھا۔

ش ۳۴ نکالا تم نے محفل سے مگر اتنا نہ سمجھے تم
کہ اک حسرت زدہ تنہا ہی محفل سے نکلے گا

تم تم کی تکرار کس قدر بیہودہ ہے "سمجھے" کی جگہ "سوچے" اور "نکلے گا" کی جگہ "نکلتا ہے" چاہئے۔ پہلے مصرع میں صیغۂ ماضی "نکالا" ہے اس کے ہوتے دوسرے مصرع

میں "نکلتا ہے" ناگزیر ہے۔ پہلا مصرعہ اس طرح درست ہو سکتا ہے ع

نکالا مجھکو محفل سے مگر اتنا نہ سوچے تم

مگر غلط ردیف کا کیا علاج ؟

۳۳۵ میں اپنے دل کو یوں پیشِ نظر سیاب رکھتا ہوں
کہ میرا چاند جب نکلا اسی منزل سے نکلے گا

ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ "نکلا" کی جگہ "نکلے" چاہیئے ع

کہ میرا چاند جب نکلے اسی منزل سے نکلے گا

۳۳۶ منزل اک پردۂ غفلت تھی سرِ راہِ عمل
خیر گذری کہ میں دامن کشِ منزل نہ ہوا

"دامن کشِ منزل" مہمل فقرہ ہے۔ دامن کش محاورہ ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا کسی کو اپنی طرف مائل یا متوجہ کرنا۔ لہٰذا دامن کشِ منزل نہ ہوا کا یہ مطلب ہوا کہ میں نے منزل کو اپنی طرف متوجہ یا مائل نہیں کیا۔ یہ ہرزہ سرائی ہے کہ نہیں جب مقصود یہ ہے کہ میں نے منزل کی تمنّا یا خواہش نہیں کی۔ دامن کشِ منزل کے بجائے حسرت کشِ منزل کہنے سے گنجلک دُور ہو جاتی ہے۔ ع

خیر گزری کہ میں حسرت کشِ منزل نہ ہوا

۳۳۷ سہل و دشوار محبت کا خلاصہ یہ ہے
ضبط آسان نہ تھا صبر بمشکل نہ ہوا

خدارا "صبر بمشکل نہ ہوا" کس دیس کی زبان ہے اور اس سے مراد کیا ہے؟ غالباً کہنا یہ چاہتے تھے کہ محبّت میں مشکل تو مشکل، سہل کام بھی مشکل ہے۔ سہل کام ضبط تھا وہ آسان نہ تھا، یعنی مشکل تھا۔ صبر دشوار تھا وہ کسی طرح نہ ہوا، یا بمشکل ہوا، مگر کہتے ہیں کہ صبر بمشکل نہ ہوا۔ یعنی آسانی سے ہو گیا! یہ کیا طلسمات ہے !

۳۳۸ تو اب اُن سے بھی بیزار اے دلِ دیوانہ خُو ہو جا
نظر سے ماسوا کو محو کر کے تُو ہی تو ہو جا

معشوق سے بیزاری جدید مذاقِ شعر و شاعری کا طرۂ امتیاز ہے جس میں دیگر حضرات سیاب صاحب کے شریک و سہیم ہیں۔ اس بے راہ روی کو جائز نہ رکھنے والا پہلا مصرع اس طرح موزوں کرتا۔ ع

تو اب اُن سے بھی بیگانہ دلِ دیوانہ خُو ہو جا

"تو" کے بعد کلمۂ خطاب "اے" بیکار تھا وہ بھی نکل گیا۔

۳۳۹ بہار آئی تھی گلشن میں تو کرتی بارشِ رنگیں
یہ کس نے کہہ دیا تھا شورش افزائے نمو ہو جا

"کہہ دیا تھا" کی جگہ "کہا تھا" چاہیئے۔ شورش افزائے نمو کے معنی ہوئے نمو کی شورش بڑھانے والی۔ نمو میں شورش کہاں ؟ یہ اور بات ہے کہ سیاق عبارت "جنون" کا موئد ہو مگر قید قافیہ نمو نظم کرنے پر مجبور کرے۔ ایسی شاعری سے حاصل ؟

۳۴۰ کیوں ہمنشیں یہی تو نہیں ساقئ بہار
جاتا ہے میکدہ سا ہوا پر اُڑا ہوا

سیاب صاحب سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے امیر مینائی مرحوم کے اس شعر سے الگ کر کے کہا ہے

جب دیکھتے ہیں ابر سیہ کہتے ہیں ہم مست
اُڑتا ہوا جاتا ہے یہ میخانہ کسی کا !

حالانکہ ہوا صرف اتنا کہ ابر کا لفظ نکال کے اُنھوں نے دوسرے مصرعے کو چیستاں ہی نہیں بنایا بلکہ مکمل شعر کے مقابل ایک ناقص شعر پیش کیا۔ وہاں ابر اور میکدہ کی تشبیہ تام تھی، یہاں ابر کو پہلے ساقئ بہار اور پھر اُسی ابر کو میکدہ کہا جاتا ہے۔ اس پر طرّہ زبان کے شرمناک اغلاط۔ "اُڑا ہوا" کی جگہ یقیناً "اُڑتا ہوا" کہنا چاہیئے۔ خیال کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ خواہ مخواہ ہم نشین کی آڑ ڈھونڈی جاتی ہے۔ تاہم الوہیت و بداہت کا ادعا۔ لاحول ولا قوۃ !

۳۴۱ پیغامِ محبت دے کر ہم ذوقِ زلیخا کر نہ دیا
آخر ہم نے اے حُسن تجھے پابندِ تمنّا کر نہ دیا

"پیغامِ محبت دے دے کے" پڑھیئے اور دیکھیئے شعر میں کیا بات پیدا ہو جاتی ہے۔

۳۴۲ آیا مری محفل میں غارتگرِ ہوش آیا
صد جام بکف آیا، صد شیشہ بدوش آیا

لفظِ صد کثرت کے معنی دیتا ہے۔ لہٰذا دوسرے مصرعے کے یہ معنی ہوئے کہ (غارتگرِ ہوش) کثرت سے جام بکف اور کثرت سے دوش پر شیشے رکھے ہوئے آیا۔ میں نے جس وقت یہ شعر پڑھا تو ربر کی گڑیاں اور غبارے بیچنے والے کی ہیئت کذائی آنکھوں میں پھر گئی۔ کاش یوں کہتے ؎

آیا مری محفل میں، غارتگرِ ہوش آیا پیمانہ بکف آیا، زُنّار بدوش آیا

غارتگریٔ ہوش کا سامان پورا ہو گیا۔

ص۳۴ ایک طوفاں تھا کہ کوزہ نشیں ہوتا رہا
ہائے وہ آنسو کہ جذبِ آستیں ہوتا رہا

سیماب صاحب نے پھر غوطہ کھایا۔ کوزہ نشیں کی ترکیب خصوصاً دہ کے شدید اعلان یا اشباع کے ساتھ کس قدر بھدی اور سامعہ خراش ہے۔ یوں کہئے۔

ایک طوفاں تھا کہ اُٹھکر تہ نشیں ہوتا رہا
ہائے وہ آنسو کہ جذبِ آستیں ہوتا رہا

جذبِ آستیں اور تہ نشیں میں جو لطیف معنوی ربط ہے وہ کوزہ نشیں و آستیں میں کہاں۔ سیماب صاحب سے کلام کرنے والے خدا کے خالق اُنھیں کے وسیلے معلوم ہوتے ہیں ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہ تو اُن کو بہکاتے اور میں راہِ راست پر لگاؤں

ص۳۴ مجھ پہ آخر گرم ہو سورج ہو کیوں جو مدتوں
آشیاں کے سائے میں پردہ نشیں ہوتا رہا

یہ کوئی خاص "ہمارے" کا سورج ہوگا جو آشیاں کے سائے میں مدتوں پردہ نشیں رہا، نہیں بلکہ ہوتا رہا۔ غالباً یہ شعر تلمیح طلب ہے۔ خاص سورج ہے اور خاص آشیاں جس سے میں آپ واقف نہیں۔

ص۳۴ میرے سجدوں کو وہ سنگِ آستاں سمجھا کئے
منفعل کیا کیا مرا ذوقِ جبیں ہوتا رہا

یہ اچھی شاعری ہے کہ "ذوقِ جبیں سائی" نظم نہ ہو سکا تو "ذوقِ جبیں" ہی پر قناعت کی۔

ص۳۵ دل کی آنکھوں سے ترا میں نے نظارا نہ کیا
غیرتِ رشک نے اتنا بھی گوارا نہ کیا

مشکل یہ آپڑی ہے کہ سیماب صاحب ہر مشہور شاعر کو اُس کی بہترین تخیل کے میدان میں بربنائے الوہیت شکست دینا چاہتے ہیں۔ غالب نے کہا ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

سیماب صاحب سوچے کہ غالب نے ظاہری آنکھوں سے دیکھنا گوارا نہ کیا میں باطنی آنکھیں بھی پھوڑ لوں گا حاصل؟ یہ سانچے میں ڈھلا ہوا مایۂ ناز مطلع جس نے غالب کی تمام کائنات کو خاک میں ملا دیا۔

ص۳۵ مجھے مرہونِ غمِ دوست دوبارہ نہ کیا
آپ نے خوب کیا درد کا چارہ نہ کیا

عاشقوں میں درد کا چارہ ساز درد دینے والے کے سوا دوسرا نہیں ہوتا۔ حکیم طبیب۔ ڈاکٹر۔ وید۔ جھک مارا کریں سیماب صاحب نے اس دقیانوسی رسم کو بھی توڑ دیا۔ دوست کوئی اور ہے۔ آپ کا مشارٌ الیہ کوئی اور الفاظ سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ مگر دراصل یہ سب بجوگ زبان پر قدرت نہ ہونے اور خیال کو خوبی سے ادا کرنے میں عاجز ہونے کا ہے۔ کہنا چاہتے تھے کہ دوست نے غم (عشق) دے کر احسان کیا۔ چارۂ درد کرتا تو مزید احسان ہوتا۔ اس سے باز رہا، اچھا ہوا۔ مگر بیچارے کیا کریں اُن کا نطق ایسا شہسوار نہیں کہ تخیل کے منہ زور گھوڑے کو حسبِ منشا کاوا ایڑ پر لگائے۔ گھوڑے کی جدھر مرضی ہوئی لے بھاگا۔ اور جہاں پر چاہا پٹک دیا۔ لہٰذا اُن کے بیشتر اشعار غالب کی زبان میں فریادی ہیں ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ایک بات اور ہے۔ اپنا خیال ہو تو اپنے ساتھ الفاظ اور اسلوب بیان بھی لائے۔ جب مانگے تانگے کے ساز و سامان پر طمطراق ہوگی تو رسوائی و انگشت نمائی رکھی ہوئی ہے۔

میں اصل موضوع سے الگ ہو گیا۔ سیماب صاحب کا شعر اس طرح درست ہو سکتا ہے ؎

خوش ہوں مرہونِ کرم تم نے دوبارہ نہ کیا
درد دے کر جو مرے درد کا چارہ نہ کیا

اس کو محض اتفاق سمجھئے کہ خیال سیماب صاحب کے دماغ کا آفریدہ ہونے کے باوصف اپنا شجرہ غالب کے اس شعر سے ملاتا ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

میں نے ظاہری صورت درست کر دی۔ تخیل کی دریوزہ گری کا انسداد کیونکر ہو۔ سیماب صاحب کے صاف اور بے عیب شعروں میں بھی آپ کو تخیل کی بے مائگی نظر آئے گی۔ مثلاً

شعر
زندانِ کائنات میں محصور کر دیا
محفل سے اپنی تم نے بہت دور کر دیا

گویا کائنات اُس کی محفل نہیں ہے! لکھتے لکھتے تھک گیا اور ابھی الف کی ردیف ختم نہیں ہوئی، تھوڑی باقی ہے مزید خامہ فرسائی بے سود ہے۔ ع

قیاس کُن زگلستانِ من بہارِ مرا

سیماب صاحب کے مجموعے میں اچھے شعر بھی ہیں لیکن اُن کی انانیت و مقدوسیت میری تعریف سے مستغنی ہے۔ لہٰذا تنقید کے اس پہلو کو نظر انداز کرتا ہوں۔ تا پایان روس

انڈمن کیلئے

یہ دھمکیاں ہیں عبث عاشقِ وطن کے لئے — کہ وقف ہے وہ ازل سے مشین گن کے لئے
اگر ہے دیر میں رہنا تو بت کی سیوا کر — عجیب شے ہے یہ تسخیرِ برہمن کے لئے
ہے کچھ تو یوں بھی مزیدار دل کا افسانہ — بڑھا بھی لیتے ہیں کچھ زینتِ سخن کے لئے
یہ ابتدا ہے تو پھر انتہا کا کیا کہنا — نہ پیٹ کے لئے عاشق کو ہے نہ تن کے لئے
ادب ہے حضرتِ واعظ کا ہیں جو ہم خاموش — مواد ورنہ بہت کچھ ہے سوئے ظن کے لئے

وفا جو کی تھی تو اس کا صلہ بھی لے احمق
خوشی سے باندھ لے اب بستر انڈمن کے لئے

(احمق پھپھوندوی)

جاپان کی بلیک ڈریگن سوسائٹی

BLACK DRAGON SOCIETY

(شیو پرشاد مہترا ایم اے بی-ال)

جاپان سے باہر بہت کم لوگوں کو اس سوسائٹی کا علم ہے، لیکن جو جاپانی دیوتا کے مزاج سے واقف ہیں اُنھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ سوسائٹی کیا معنی رکھتی ہے، اور اس کی سیاسی طاقت کس قدر بے پایاں ہے۔

یہ سوسائٹی، جاپان کی برّی اور بحری طاقت کی موجودگی میں بھی ایک نہایت ہی قوی اور توانا جماعت مانی جاتی ہے۔ اور اس کے ارکان کو حیرتناک سیاسی طاقتوں کا مالک خیال کیا جاتا ہے۔

اس سوسائٹی کا مقصد یہ ہے کہ ہر اس شخص کو راستے سے ہٹا دیا جائے جو جاپان کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کر رہا ہو۔ اور ایسے خودکاموں کو راستے سے ہٹانے میں قاتلانہ حملوں تک سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا ہے۔

اس سوسائٹی کے تمام قوانین واعمال ایسے ہیں کہ ہم ہندوستانی، اُن پر عمل کرنا کیسا، اُنھیں سمجھ بھی نہیں سکتے، کیونکہ ہندوستان کا سیاسی مزاج جاپان کے سیاسی مزاج سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے۔

ہرچند یہ سوسائٹی بُنیادی طور پر جاپان کے خارجی اُمور ہی سے تعلق رکھتی ہے، مگر ملک کے اندرونی مسائل پر بھی اِسے نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔

اس سوسائٹی کا غیر متزلزل اصول اور طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس میں ذاتیات کو قطعی بار نہیں دیا جاتا۔ اور جو عمل بھی کیا جاتا ہے وہ خالص جاپانی مفاد کی خاطر کیا جاتا ہے۔ اور اس سبب سے یہ سوسائٹی انتہا درجے کی طاقتور ہے اور خوفناک بھی۔

جاپان میں اِس سوسائٹی کی قدر و منزلت صرف اسی بنا پر نہیں ہے کہ اس کے ارکان موت سے نہیں ڈرتے، بلکہ اس کے وقار کی حقیقی بنیاد یہ ہے کہ اِس کے حلقے میں ذاتی مفاد، اور ذاتی عناد ایک ایسا گناہ ہے جس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس سوسائٹی کے سردار ٹیاما کی رائے سے تمام جاپانی قوم متفق نہ ہو، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ٹیاما کے متعلق کوئی یہ گمان کر سکے کہ وہ اپنے اعلیٰ روایات پر قائم نہ رہ سکے گا۔

یہ ٹیاما کے بے لوث کیرکٹر کا ایک عام اعتراف نہیں تو اور کیا ہے کہ جاپانی قوم اِس سوسائٹی کے قاتلانہ حملوں تک کو ایک فریضۂ مقدس کا مرتبہ دینے پر ہمیشہ تیار رہتی ہے۔

۱۸۹۵ء میں اِس سوسائٹی نے یہ محسوس کیا تھا کہ چین کے مقابلہ میں جاپان کو کم مرتبہ دیا گیا ہے، چنانچہ اسی وقت سے اِس نے جاپان کی قوّت کو بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اور عمالِ سلطنت کو مجبور کر دیا تھا کہ منچوریا اور کوریا پر حملہ کر دیا جائے۔ اور یہ وہی مساعی تھے جو آج جاپان کو عصرِ حاضر کی جلیل القدر سلطنت بنا چکے ہیں۔

اس وقت اِس سوسائٹی کا یہ عالم ہے کہ جاپان کی برّی و بحری قوّتوں کے بعد یہ ملک کی سب سے بڑی سیاسی قوّت سمجھی جاتی ہے، اور اِس کا اُسّی برس کا برس کا بوڑھا سردار ٹیاما، میکاڈو اور پرنس سیونجی کے بعد جاپان کا سب سے بڑا طاقتور انسان مانا جاتا ہے۔

اِس کے ارکان کی تعداد لاکھوں تک پہونچی ہوئی ہے، اور جاپان کی مجلسی و سیاسی زندگی پر اِس کے اثرات لامحدود ہیں۔

شروع سے لے کر اس وقت تک اِس سوسائٹی کا مقصدِ واحد یہ رہا ہے کہ بین الاقوامی حلقے میں، جاپان، پھلے، پھولے، اور وسیع تر ہوتا چلا جائے۔

یہ جماعت بری و بحری قوت کا ہمیشہ ساتھ دیتی ہے اور ملک کی فوجی طاقت اور سیاسی عظمت کے بڑھانے میں ہر وقت مصروفِ عمل رہتی ہے۔ اور اِن کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ جاپان کی فوجی رُوح کو ہمیشہ بیدار رکھا جائے اور جاپان کے سرفروشانہ روایات کبھی فراموش نہ کئے جائیں۔

ہر خطرے کے موقع پر اِس جماعت نے نہایت بے باکی کے ساتھ جاپان کا ہاتھ بٹایا ہے۔

جب جاپان نے "لنڈن نیوی ٹریٹی" پر دستخط کر دئے تھے اُس وقت اِس سوسائٹی کا عجیب عالم تھا۔ چنانچہ اس نے جاپان کی اِس عاجزانہ روش کے خلاف اس قدر شدید مظاہرے کئے اور خود غرض عمّال کو اِس طرح بے دریغ تہ تیغ کیا کہ جاپان نے اپنی کھوئی ہوئی عزّت دوبارہ حاصل کرلی۔

منچوریا میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد منگولیا میں ضرورت تھی کہ جاپانی اقتدار قایم کیا جائے۔ جس کے واسطے فوج حملہ کر دینے کو طیار تھی۔ مگر وزیرِ مال اس قدر زرِ کثیر کی منظوری دینے میں پس و پیش کر رہا تھا۔ لیکن یہ اس سوسائٹی کا بے پناہ اثر تھا کہ تمام معاملات ایک دن کے اندر طے کر دیئے گئے تھے۔

جنگ روس و جاپان سے پیشتر اِس سوسائٹی نے ایک ایسا معرکہ سر کیا تھا جس کی نظیر سوسائٹی کی تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔

جنگ سے پیشتر عام رائے یہ تھی کہ قبل اِس کے کہ روس تیار ہوسکے جاپان کو چاہئیے کہ حملہ کردے۔ لیکن اُسی زمانے میں پرنس آٹو کی جماعت یہ چاہتی تھی کہ جنگ کے عوض رُوس سے مصالحت کرنی چاہئیے۔

یہ کشمکش ہنوز جاری تھی کہ اِس سوسائٹی کا سردار تیاما نمودار ہوا، اور اپنے یار دوستوں کے ساتھ پرنس آٹو کے کمرے میں جا پہونچا، اور چھوٹتے ہی شاہزادے سے کہا کہ وہ جنگ و حیات یا صلح و موت، اِن میں سے کسی ایک کو اپنے لئے انتخاب کرلے۔

چنانچہ شاہزادے نے تیاما کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور جاپان روس پر حملہ آور ہوگیا۔

تیاما کا حیرت انگیز اثر اسکی قوم کی جانبازانہ روش ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ در پردہ چین اور ہندوستان میں بھی انقلابی رُوح دوڑا رہا ہے۔

اِس صدی کے ابتدائی دَور میں جب کہ ڈاکٹر سن یاٹ سین، شاہزادی منچو کے مظالم سے بھاگ کر جاپان چلا آیا تھا۔ تو یہ شیر دل تیاما ہی تھا جس نے اُسے پناہ دی تھی۔ اور جس کے اقتدار نے شاہزادی کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔

تیاما ہی کی چھت کے نیچے ڈاکٹر سن یاٹ سین نے اپنا انقلابی پروگرام مرتب کیا تھا۔ اپنی انقلابی جماعت کی ترتیب کی تھی اور تیاما ہی سے مالی مدد لے کر وہ اپنی انقلابی مُہم پر روانہ ہوا تھا۔

چین کی طرح برطانیہ کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ تیاما کی ہستی کیا معنی رکھتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں برطانیہ نے جاپان سے اُن دو "باغی" ہندوستانیوں کی گرفتاری کا مطالبہ کیا تھا، جو ہندوستان کو چھوڑ کر جاپان چلے گئے تھے۔ اور جاپانی حکومت پر برطانیہ کا اس قدر دباؤ پڑا تھا کہ جاپانی حکومت نے مجبوراً پولس کو حکم دے دیا تھا کہ اُن دونوں ہندوستانیوں کو تلاش کرکے برطانیہ کے حوالے کر دیا جائے۔

جاپانی پولس نے اِن ہندوستانیوں کو مُلک کے گوشے گوشے میں تلاش کیا مگر کہیں پتا نہ چلا۔

اُسی اثنا میں حکومت کو یہ علم ہوگیا کہ وہ مطلوب ہندوستانی تیاما کی پناہ میں ہیں۔ مگر کسی کو تیاما کی خانہ تلاشی کی جراٴت نہیں ہوئی۔

برطانوی سفیر اس موقع پر بہت بڑبڑایا۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکل سکا۔ اور جب تلاشی و گرفتاری کے تمام ہنگامے فرو ہو گئے تو یہ دونوں "باغی" منظرِ عام پر آگئے اور برطانی اسلحہ نے شرم سے مُنہ ڈھانک لیا۔

ترغیبِ ارتقا

سپردِ حُسنِ ازل مائلِ بقا ہو جا — فنا و عشق کی تکمیل میں فنا ہو جا
وفا سرشت ہیں میری وفا کا بندہ بَن — گلہ جفا کا نہ کر کُشتۂ جفا ہو جا
ہے ابتدا ہی سے غفلت جو انتہا کی تجھے — کر ابتدا وہ اب اپنی کہ انتہا ہو جا
گزر خودی سے کہ ہو عینِ بیخودی حاصل — خدا ابھی تو کبھی اے بندۂ خدا ہو جا
جو کہہ رہا ہوں کہ تو غیر کی تلاش نہ کر — یہ مُدّعا ہے کہ اپنا ہی مُدّعا ہو جا
اِسی سے نیستی بیگانگی کی ممکن ہے — کہ اپنے جوہرِ ہستی سے آشنا ہو جا
ہر آئینہ ہے ترا دل ہی سرِ خود ہستی — اِس آئینہ میں جِلا کر کے خودنُما ہو جا
یہی ہے فتحِ حقیقت، یہی شکستِ مجاز — کہ اپنے حُسنِ نہانی پہ خود فدا ہو جا
رسائی ہے جو تری صرف نارسائی تک — تو نارسائی کے افراد سے رسا ہو جا
رہے مدام نظر تیری اپنے مرکز پر — محیطِ دائرۂ طاعت و رضا ہو جا
نہاں نشاطِ دوامی کا راز اسی میں ہے — خود اپنے ساز کی محفل میں تو صدا ہو جا

بہت لیا ہے منوّر زبانِ قال سے کام
زبانِ حال سے بھی اب سخن سرا ہو جا

بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی

کمیونسٹ پارٹی

حضرت مسیح کے فرزندانِ طریقت کی ہم سُنّت

ویب صاحبان کا تازہ صحیفہ روس جدید

(اسرائیل احمد خاں سکندر آباد دکن)

"اس بارے میں کہ اک مہذّب خوش لباس حکومت کی پوشش کس طرح کیسی ہونی چاہیئے۔ ماسکو۔ برلن اور روما سے کچھ زیادہ دُنیا کے اجتہاد سیاسی کا قبلہ نہیں، لیکن یہ اپنی اپنی قسمت ہے کہ المانوی اور رومی تخت گاہوں کی سرکاری روایتوں (پروپیگنڈا) کی مُنظّم و مربوط روئدادوں کے بالکل خلاف، "غریب ماسکو کے ایجاد کردہ" پولیٹیکل فیشن" کے متعلق جتنی خبریں آتی ہیں وہ اس درجہ ایک دوسرے سے مُتضاد و مُتعارض پائی جاتی ہیں کہ اُن سے سُرخرو روس" کے چہرے کے جو خدوخال صورت پذیر ہوتے ہیں وہ اُسے مسخ و" روسیاہ" کرکے دکھانے ہی کی مقدس خدمت انجام دیتے ہیں:

منقولۂ بالا وہ کلمات ہیں جو اخبار "ٹائم" کے تنقید نگار نے ویب صاحبان کی روس کے متعلق جدید الاشاعت کتاب ——— "سوویٹ کیمونزم اور اک نو بنو تمدن" ——— پر تبصرہ کرتے ہوئے سپردِ قلم کئے۔

مؤلفین محترم کا کہنا ہے کہ "ہمارا منشا یہ ہے کہ "یو۔ ایس۔ ایس۔ آر" (اتحاد جماہیر شورائیہ روسیہ) کی زیرنگیں دُنیا میں جو مجلسی شیرازہ بندی اس وقت موجود ہے اُس کا اک واضح تصور بہم پہنچایا جائے!"

جناب سڈنی ویب اور محترمہ بیٹرس ویب نے پیش پا افتادہ حال اور بعید افقِ مستقبل کی نقش طرازی اور خواب بینی کے متعلق ہمارے سامنے دو ضخیم جلدیں پیش کی ہیں، جو دلچسپ مواد سے لبریز ہیں:

حیثیاتِ ثلاثہ

جلدِ اوّل سوویٹ رُوس کے تمامی نظام کو بے نقاب کرتی ہے ———

صاحبانِ کتاب اس چیز کو روسی "دستورِ اساسی" سے تعبیر کرتے ہیں: اِس دستور کی صدر نشینی کے تحت ہر "سُرخ روسی" تین مُتمائز حیثیتوں میں دوٹ دیتا اور شہریت کے کاروبار انجام دیتا نظر آتا ہے۔ (۱) شہری (۲) پیدا کرنے والا (۳) صرف کرنے والا۔ اِن حیثیاتِ سہ گانہ میں سے ہر حیثیت میں اُسے قومی زندگی میں اک رائے اور آواز حاصل ہے۔ منجملہ اِن کے ایک صورت میں وہ اک عملی مشغلہ بھی رکھتا ہے۔ باستثنائے اک عملاً ناقابلِ شمار اقلیت کے جس کی تعداد ۱۹۳۴ء میں ۵ر۲ فیصد تھی۔ اور جس پر حقِ ووٹ حرام کردیا گیا ہے۔ نظام سوویٹ کا ہر فرد اِن سہ پہل فرائض کو انجام دیتا ہے گا۔ پھر اُس پر جماعتی قیادت کا دو ماڑ

بھی بند نہیں ہو۔ چنانچہ اگر وہ اس کوچہ میں آنا چاہتا ہے، اور اُس کے سارے مطالبات و مقتضیات سے عہدہ برآ ہونے کو تیار ہے تو وہ "کمیونسٹ پارٹی" کا ایک رُکن بھی بن سکتا ہے!

مثلِ پاپائے روم

تاہم اِس "حزب الاشتراکیین" کی بزمِ خاص کی باریابی اک کارے دارد کا معاملہ ہے۔ ارکان کا داخلہ اِس میں بڑی سخت گیری سے ہوتا ہے، اور بڑی آسانی اخراج عمل میں آجاتا ہے! اسنائے انجمن کے طرزِ عمل کی راہ اک پُل صراط پر سے گزرتی ہے؛ ڈیب صاحبان کیمونسٹ پارٹی کو "حضرتِ مسیح کی محفل کی مثل" قرار دیتے ہیں، اور اُس کے صدر کو پاپائے اعظم کے مماثل! اس فقرے میں "ویٹیکن" (قصرِ پاپائیت) اور "کریملن" (حصارِ ماسکو) ہر دو پر اک دوگونہ چشمک مضمر ہے:

بروایت صاحبانِ کتاب کے اسٹیلن کا قول ہے کہ "ایک معنی کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ "پرانا ری آمریت" "کمیونسٹ پارٹی" کی فرمانفرمائی کا ہی دوسرا نام ہے، اس لئے کہ یہی وہ قوتِ محرکہ ہے کہ "پرولتاریت" کے پیش و پس اس کی اخلاقی قائد و سائق ہے"!

بالشویکوں میں لفظ "ڈکٹیٹرشپ" کے لئے جو دلدادگی پائی جاتی ہے، وہ اک تکیۂ کلام اور کلمۂ ایمان کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ جس پر ڈیب صاحبان وقتاً فوقتاً اک ہیچو پیچ کرتے رہتے ہیں! اُن کے خیال میں یہ اک مغالطہ آمیز اصطلاح ہے۔ جس کا بے محل استعمال اُس شے پر ہوا کرتا ہے جس کے لئے بہتر لفظی اطلاق، "اثر آفرینی" اور "روح پروری" کے کلمات بہم پہنچاتے ہیں۔ حقیقتہً اصلی قوتِ متصرفہ روس کی لکھوکھا خلق اللہ کی رائے عامہ ہی ہے۔ جس کی تحریک و تشکیل "کیمونسٹ پارٹی" کے ارکان داعیان کی "تدبیرامر" سے عمل میں آتی ہے۔

یہ پارٹی، سوویٹ دستورِ اساسی کے تار و پود سے باہر واقع ہوئی ہے۔ وہ ملک کے عام نظامِ تمدن پر اِس طرح نگراں ہے جس طرح حضرتِ "الیاس" عالم آب پر! اُس کا مقصودِ حیات یہ ہے کہ اپنے قول و عمل سے اک اسوۂ حسنہ "ملتِ احمر" کے سامنے پیش کرے، اور اپنے دل و دماغ کی نور پاشی سے "شمعِ روس" کو روشن رکھے! تاکہ ع

مباد این جمع را یارب غم از باد پریشانی!

اِسی غرض کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پارٹی کی نصف رُکنیت کشت زار و معادن کی کارفرما مخلوق کے لئے وقف ہے۔ دوسرا حصہ، رُوس کے روز افزوں رفعت پذیر "ابرامِ مجالسِ نیابتی" کی تعمیر پر اپنی رہنمایانہ توجہ مرکوز رکھتا ہے۔

ڈکٹیٹر اک حرفِ غلط

ڈیب صاحبان روس کی تقریب سے لفظ "ڈکٹیٹرشپ" کے استعمال کو اک غلط العام معمول سمجھتے ہیں! وہ کہتے ہیں کہ سوویٹ حکومت دوسرے مغربی ممالک کی کابینہ ہائے پارلیمانی سے بھی کم مستبد واقع ہوئی ہے! اس حقیقت کے اثبات کے لئے کہ "سُرخ روس" دراصل اک کثیر المظاہر ریاست، عمومیہ ہے، وہ ملک کے مجوزہ مسوداتِ قانون کے وسیع پیمانے پر معرضِ بحث و تمحیص میں لائے جانے کے واقعات کی طرف دعوتِ نظر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۲۶ء والے "قانونِ نکاح" پر قبل از منظوری پورے ایک سال تک رَدّ و قدح ہوتی رہی؛ قلاقون کے انجماد و انسداد کی تحریک دو سال سے زیادہ موضوعِ ذکر و فکر بنی رہی!

تو کیا اسٹیلن سچ مچ ڈکٹیٹر نہیں ہے؟! اس سوال کا جواب ڈیب صاحبان اک پُرزور "نہیں" سے دیتے ہیں! بروایت اُن کے "یو، ایس، ایس، آر" کے کاروبارِ نظم و نسق گزشتہ عشرۂ سنین میں اک "مجلسِ شوریٰ" کی کارروائی سے ذرا بھی زیادہ تحکمانہ نہیں رہے ہیں! پس ہم نے اپنے عینی مشاہدات کی بنا پر جو نتیجہ نکالا ہے وہ تو یہ ہے کہ موجودہ روسی طرزِ حکمرانی "آمریت" کی عین نقیض واقع ہوئی ہے! بجائے اس کے وہ اک طول طویل سلسلۃ الذہب، مجالسِ شورائیہ کا سا انتظام و انصرامِ اُمور رہا ہے!

اسٹیلن کا درجہ

لیکن اسٹیلن کی جلالتِ قدر کی وہ اِس طرح توجیہ کرتے ہیں۔ لینن کی وفات نے اک خوفناک خلیج پیدا کر دیا تھا۔ ایک نئی مقناطیسی شخصیت کی تخلیق کی ضرورت تھی۔ جو روس کے ۱۶۰ ملین نفوس کا موضوعِ پرستش بن سکے۔ ٹراٹزکی قدرے خطرناک سمجھا گیا۔ پس قرعۂ فال اسٹیلن کے نام پر پڑا،

جس کو علانیہ پروپیگنڈے کے چرخ پر رکھا گیا، اور قوم کے "ہیرو" کی صورت میں اُسے ڈھال لیا گیا! اگرچہ بالشویک ارباب حل وعقد کو اس امر کا اعتراف ہے کہ اسٹیلن کی درجۂ اول کی کامیابی وکامرانی نے اُسے خطرۂ عزل سے بالا کر دیا ہے۔ لیکن وہ بے تکلف اس دعوے کا بھی اعلان کرتے ہیں کہ "اسٹیلن بھی "ناگزیر" نہیں ہے! سوویٹ روس اُس کی کارروان سالاری کے بغیر بھی کشمکشِ حیات کے منازل ومراحل کو بدستور طے کرتا رہے گا"!

منظرِ مستقبل

اچھّا! روس کا جہاز کس ساحل مراد یا کس گردابِ ہلاکت کی طرف رواں ہے؟ جلدِ دوم اس سوال کے جواب پر مشتمل ہے۔ جو لوگ اُس شدّت و بربریت پر لرزہ براندام ہیں، جس کا اظہار "قلاقون" کا خاتمہ کرنے میں، نیز "چیکا" کے مخفی خطرے کا قلع وقمع کرنے میں، ہُوا، اُن کو صاحبانِ کتاب کا جواب باصواب یہ ہے کہ "اِن واقعات کی کوئی پردہ پوشی کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن ایسے حوادث کو کسی انقلاب کی عارضی ووقتی برہمیٔ مزاج سے زیادہ سمجھنا بھی اک طفلانہ ناشناسی ہوگی"!

وہ اِس حقیقت کی طرف لوگوں کی توجہ منعطف کرانا چاہتے ہیں کہ روس کے جملہ مجلسی، سیاسی، اور مذہبی انقلابات اک واحد یورش و یلغار کی جلو میں آگئے! درآنحالیکہ مثلاً انگلستان کی سیاسی تاریخ کے جلوس میں یہ سب شعبے جداگانہ صفوف تھے اور چار صدی کی مدتِ مدید پر پھیلے ہوئے تھے۔

سوویٹ روس کی "منصوبہ بند معیشت" اب تک اپنی اس جدوجہد میں کیوں کامیاب نہ ہوئی کہ ملک سے اجناسِ خوراک اور ضروریاتِ حیات کے قحط وقلت کا خاتمہ کر دیا جائے؟ دیب صاحبان اِس معمّے پر یہ روشنی ڈالتے ہیں۔

(۱) اس لئے کہ شروع میں سرزمینِ روس کا ہر پیداکش اور سرچشمہ خطرۂ جنگ کی کُنجی سے کَس دیا گیا تھا۔

(۲) نیز اس وجہ سے کہ روس میں ثقافتی بیداری آہنی عاجلانہ سُرعت سے ظہور میں آئی ہے کہ اُس کے اسباب ومطالبات کی عملی بہم رسانی اور حرفتی تیاری کا اُس کے عناں بہ عناں چلنا ناممکن رہا ہے۔

اک نو بنو تمدّن

کیا سرزمین روس پر سچ مچ اک جدید تمدّن کا قصر معرضِ تعمیر میں ہے؟

دیب صاحبان کا جواب اک پُرجوش اثبات میں ہے اور عہدِ حاضر کے اِس نظریے کی تائید میں وہ نوجوان روس کے آٹھ مظاہر تمدنی کو پیش کرتے ہیں جن کی نمود وظہور ہم کسی اور حصّۂ عالم میں نہیں پاتے! یہ مظاہرِ ہشتگانہ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) سرمایہ دارانہ شخصی طلبِ منفعت کی رسمِ کہن کا سازِ موت!

(۲) غیر ارادی بے روزگاری وجبری بیکاری ——— فنّی یا جسمانی ——— کا خاتمہ!

(۳) مُساواتِ مجلسی کا فتحِ باب!

(۴) ایک ایسی "دفتریت" (سررشتۂ حکومت) کا اوّلین قیام جس کے ارکان غیر تنخواہ دار رضاکار ہوں!

(۵) عوام الناس کے قائدین کی تربیت منجانب "حزب الاشتراکین"۔

(۶) "مسلکِ سائنس" کا اختیار۔ بخلاف مغرب کے دوسرے ممالک کے اصحابِ علم وارباب حکومت کے ماسکو کے ارکانِ نظم ونسق اخلاص واذعان کے ساتھ اک مشرب پر ایمان رکھتے ہیں ——— اور یہ مشرب، "مشربِ سائنس" ہے!!

(۷) اک عدیم النظیر انسانی اخلاق کا ظہور۔ ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے فرد جماعت کے مرہونِ منّت ہونے کا ہمہ گیر اعتراف!

(۸) خدا کے ساتھ "للّہی بغض" ——— شاید اس جذبے کی تلقین براہِ راست عہدِ زار کے "سرکاری مقتدایانِ دین" کی فرعونیت پرستی وہامانیت نوازی اور قیصر پروری دستیح کشی نے بھی جزءً فرمائی ہو، اور شاید بالشوکوں کی طرف سے یہ معذرت خُدا بھی قبول کرلے کہ ؎

سخن کوتہ مرا ہم دل بہ تقویٰ مائل است امّا
ز ننگِ زاہد "اُفتادم بہ" کافر ماجرا ایہا!

ناآشنا مہماں

یہ کیسی ہیں خدایا نیم رَس موہوم اُمیدیں؟ جو پیہم رینگتی پھرتی ہیں میرے گرم سینے میں
یہ میرے گِرد کیسا دریائی سا اُجالا ہے؟ جو ضَو کی دسترس سے دُور ہے ظُلمت سے بالا ہے
یہ اک تاراسی کیا شے ہے؟ نہ موتی ہیں، نہ آنسو ہیں یہ کیسے درد کی یارب چمک ہے میرے پہلو میں؟
یہ کیا عالم ہے، جب ساحل پہ دونوں وقت مِلتے ہیں شگوفے سے مرے تپتے ہوئے سینے میں کھِلتے ہیں
ندی جب ہانپتی ہے، اور سُورج ڈوب جاتا ہے الٰہی کون یہ میٹھے سُروں میں گُنگناتا ہے؟
یہ لیلےٰ کون ہے؟ انفاس کے بےچین محمل میں یہ کیسے طُرفہ اُلجھے ولولوں کا رقص ہے دل میں
یہ کیا اسرار ہیں سبزے کو جب شبنم بھگوتی ہے ندی کے موڑ پر اک داستاں معلوم ہوتی ہے
یہ شب کو کون یُوں رہ رہ کے مجھکو یاد آتا ہے؟ دِیا جیسے گھنے جنگل کے اندر ٹمٹماتا ہے
یہ کیسے طُرفہ ارماں ہیں جو پیہم سانس لیتے ہیں یہ قُدسی کون ہیں رَہ رَہ کے جو پیغام دیتے ہیں
یہ دِل میں کون یُوں دلداریوں کے تخم بوتا ہے؟ اندھیرے میں گُماں سا نُور کا جس طرح ہوتا ہے
یہ طاری کچھ دنوں سے مجھ پہ کیسی بدحواسی ہے؟ اُداسی میں بشاشت ہے، بشاشت میں اُداسی ہے
یہ کیسی لہر ہے؟ ہستی کے زخموں کو جو دھوتی ہے یہ کِس کی چاپ سینے میں مجھے محسوس ہوتی ہے؟

یہ کِس ناآشنا سے میہماں کی آمد آمد ہے
یہ کِس بے سمجھے بُوجھے کا رواں کی آمد ہے؟

جوشؔ

گونگا ہری

علی عباس حسینی

ٹھاکراجیت سنگھ بہت غصہ میں تھے، ان کے رئیسانہ غرور کو حد درجہ صدمہ پہنچا تھا ان کی شرافت مجروح ہو گئی تھی۔ اُن کی خاندانی نجابت کی نظر میں یہ قصور ناقابل عفو تھا۔ یہ دھبہ صرف خون بہا کر ہی دھویا جا سکتا تھا۔ اسے درگزر کرنا بزرگوں کی روحوں سے شرمندہ ہونا تھا، انہیں محسوس ہوتا انہیں سے ہر ایک ٹکٹکی باندھے انھیں دیکھ رہی ہیں۔ بس اُسی وقت فیصلہ ہو گا۔ کہ اسلاف کا پاک خون اب تک اُن کی رگوں میں جھلکتا ہے یا وہ محض نام ہی کے سورج بنسی ہیں۔ بھلا بزرگوں کے وقت کس شودر کی مجال تھی کہ وہ اُن سے آنکھ ملاتا۔ آنکھیں پھوڑ دی جاتیں، آج لاکھ بیسویں صدی ہو، بدیسیوں کا راج ہو، پر کیا اتنے گئے گذرے تھے کہ ان کی اکلوتی چاند سی خوبصورت اندرا کو اُنہیں کی ریاست میں بسنے والے سنگ تراش کا گونگا لڑکا گھورے۔ قصبہ والے کہیں اُسکی پتھر اور مٹی کی مورتیاں بناتا ہے۔ اور ہر وقت سامنے رکھے رہتا ہے !

دیوی اور دیوتا شودر کے گھر میں جانے سے نجس نہیں ہوتے، سورج دیوتا کا عکس گنگا جی اور گندے پانی میں یکساں طور پر پڑتا ہے، اِس سے اُنکی جلا، اُن کی نزہت اُن کی پاکیزگی پر حرف نہیں آتا۔ لیکن گندا نالہ آپ سے تو سورج کو اپنے میں نہیں اُتار لیتا؟ وہی چاہتے ہیں دکھائی دیتے ہیں۔ چاہتے ہیں اپنا مُنہ بادلوں میں منہ چھپا لیتے ہیں، پھر تم لاکھ چاہو اُن کی جھلک نہیں دکھائی دیتی! پر یہاں تو اس گونگے شودر لونڈے نے، اُن کے چاند کی بے خبری میں اپنے سینے میں تصویر اُتار لی۔ پھر ڈھٹائی دیکھو کر چھپا کر بھی نہ رہا۔ اس کی مورتی بنا بنا کے قصبہ بھر میں ڈھنڈورا پیٹتا رہا، گاؤں کے ٹھاکر کی بیٹی اور اسکی طرف نظر اُٹھائے۔ کون کہ سنگ تراش کا لونڈا!

مانا کہ ابھی اندرا کا سن ہی کیا تھا، یہی دسواں سال، اور وہ لونڈا بھی مشکل سے پندرہ سولہ برس کا ہوگا۔ مورتی بنانا، تصویر بنانا کوئی ایسا عیب نہیں، کسی کا محبت کرنا بھی بُرا نہیں، مگر بعض وقت محبت بھی ذلت کا سوال ہوتی ہے، ہندوستانی شرافت، اور راجپوتی غیرت یہ سننا بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اُنکی بن بیاہی اکلوتی بیٹی پر ایک شودر لونڈا عاشق ہے۔

اُنہوں نے اِسی لئے ہری کو پکڑوا بلوایا، دو پیادے اُسکو گھسیٹتے ہوئے لائے، پندرہ سولہ برس کا اِک گندمی رنگ، سر منڈا ہوا۔ بڑی سی چٹیا۔ دُبلا پتلا، فاقہ کش، چہرہ زرد، منہ پر ہوائیاں اڑتی ہوئی، معمول سے زیادہ چوڑی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلکتے ہوئے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں فریاد کرتی ہوئی۔

ٹھاکر صاحب دیکھتے ہی برس پڑے۔ کیوں بے ——— تیری مجال، تیری اتنی ہمت، کہ تو میری بیٹی کی مُورتی بناوے اور اُسے گلی گلی۔ کوچے کوچے تشہیر کرے ———

ہری، گونگا ہری۔ ہاتھ جوڑ کر غیں غیں کرنے لگا۔ خدا جانے کیا کہتا تھا۔ اپنی بے گناہی کا اظہار مقصود تھا یا جرم کا اقرار ٹھاکر صاحب نے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اُنھوں نے قریب رکھی ہوئی بید کی چھڑی اُٹھائی اور سڑ کا چلے راجپوتی ہاتھ کی قوت، بید کی لچک اور مضبوطی، ہری کا سوکھا ہوا جسم، معلوم ہوا صندل کے درخت پر کلہاڑے پڑنے لگے۔ وہ یوں ہی خوف سے۔ رزاں جھکا ہوا تھا، دو چار ہی ہاتھ میں زمین پر جامن کی بوڈی شاخ کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ اور کچھ اس بیتابی، بے چینی اور کرب سے تڑپا کہ دیکھنے والے بھی آبدیدہ ہو گئے۔ ظلم کا چلتا ہوا ہاتھ عواقب کے خیال نے تھام لیا۔ ہاتھ رُکتے ہی ہری

بدحواس، روتا ہوا جسطرح سخت چوٹ کھایا ہوا کتا، کوٹھی سے نکل کر بھاگا۔

اس نے اُسوقت تک دم نہ لیا جب تک کہ قصبہ کی سرحد سے باہر نہ نکل گیا۔ وہ اس طرح بھاگا جیسے کبوتر بہری کے پنجے سے چھوٹ کر اور فاختہ بلی کے منہ سے پھڑ پھڑا کر بھاگتی ہے،

غرور و نخوت نے بے زبان محبت پر فتح پائی! ——

—— محبت کی یہ باقاعدہ پسپائی نہ تھی بلکہ وہ سراسیمگی کی بھگدڑ تھی جو غریب ہندوستان کی قسمت میں اکثر موقعوں پر مقدر رہی ہے، مادیت کے سامنے اکثر روحانیت یونہی بھاگ نکلتی ہے۔ تاریکی اسی طرح آفتاب کو زرد رو بنا کر بھگا دیتی ہے۔ کالی رات میں جگنو اسی طرح بے چین ہو کر فرار کرتا ہے، دراز زلفیں اسی طرح افشاں کی پتلی لکیر کو ڈھک لیتی ہیں۔ ظلمات اسی طرح آبحیات کو چھپا دیتی ہے!

داتا کی دین کی عجیب لیلا ہے جس طرح بخشش اُن سے عجب نہیں اسی طرح ہر ایک کو تول تول کے دینا بھی اُنھیں کا کام ہے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ اگر کسی سے کوئی چیز چھین لی تو دوسری چیز دوسرں سے زیادہ دیدی، کسان سے ریاست لے لی قناعت دیدی! غریب سے امیری لے لی، سچائی دیدی! سرمایہ دار سے ایمان لے لیا۔ عشرت دیدی! پھول کو قوت پرواز نہ دی رنگ و بو عطا کردئے! ہوا کو حریت دی تو رنگ بو غائب، ہیرے کو چمک دی تو مشک کی سی خوشبو نہ دی! چڑیوں کو چہکنا دیا تو عقابی پرواز غائب عقاب کو آسمان سے آنکھ لڑانا سکھایا تو خوش گلوئی ندارد ہے!

انسانی خصوصیات پر اگر ایک نظر ڈالئے تو بھی یہی کیفیت دکھائی دیگی جہاں عقل کم ہوئی دل بڑا سا دیدیا، جہاں عقل کی زیادتی ہوئی دل کی آواز مدھم پڑ گئی، جسکو آنکھ نہ دی اس کا حافظہ تیز کر دیا۔ جس کا ایک ہاتھ بیکار ہو گیا۔! دوسرے میں دونوں کی قوت دیدی، جسکے اعضا کمزور ہوئے دماغ تیز ہو گیا۔!

ہری کو بھی نطق کے عوض ایک خاص چیز عطا ہوئی تھی، ہاتھ میں سنگ تراشی کا خاص سلیقہ اور دماغ میں اس فن لطیف کے ماہرین کا سا مادہ ایجاد۔ وہ ایک بے زبان ناتراشیدہ ہیرا تھا۔ جو اب تک خاک کے ڈھیر میں پڑا تھا۔ نہ تو جوہری نے دیکھا اور نہ قدر کرنیوالی نگاہوں نے پرکھا تھا، ٹھاکر صاحب کی چھڑی نے دنیا پر یہ احسان کیا کہ اس "کوہ نور" کو خاکستر سے نکال دیا۔

ہری گھر چھوڑ کر بھاگا۔ اپنے قصبہ سے دو تین کوس پر ایک برادری والے کے ہاں دو تین دن ٹکا۔ ہلدی چونے سے جسم کی لیپ پوت ہوئی، پھر وہاں سے کچھ اوزار لیکر چل کھڑا ہوا۔ راستہ میں سل کوٹتا۔ مورتیاں بناتا بنارس پہونچا وہاں ہم قوموں کے ساتھ کچھ دنوں رہا۔ لوگ اگر اس کی بات نہ سمجھتے تو اپنا مدعا ہندی میں لکھ دیتا تھا۔

اتنی ہندی اسے اندرا کی محبت نے سیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ سب اس کی کاریگری سے فائدہ اٹھاتے۔ اور دو روپیہ کا کام لیکر ایک روپیہ دیدیتے تھے۔ وہاں چند مہینے رہ کر اس نے اتنا کما لیا کہ وہ کلکتہ جا سکے۔ ایک ساتھی لیکر اسٹیشن پہونچا۔ اس کی مدد سے کلکتہ کا ٹکٹ لیا۔ اور ریل میں سوار ہو گیا۔

ہری اس سے واقف تھا کہ کلکتہ میں بنارس ڈویژن کی ایک نو آبادی ہے۔ ہوڑہ چلے جائیے۔ آپکو ہر قوم، ہر پیشہ، ہر مذہب کے اور ہر ضلع ہر قصبہ کے آدمی مل جائیں گے۔ ہری پراؤں پر لکھ لکھ کے دریافت کرتا ہوا ہوڑا پہنچ گیا، وہاں قصبہ ہی کے ایک شخص کے پاس ٹکا۔ اور کام کرنے لگا۔ ہر روز اپنے کھانے بھر کماتا۔ اور شہر میں گھومتا پھرتا۔ تسکین قلب ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کا اس ازدھام میں کہیں پتا نہ تھا۔

ایک دن اسے ایک مجسمہ ساز بت تراش کی دوکان نظر پڑی، وہ ٹھٹک کے باہر کھڑا ہو گیا، خوبصورت اور حسین مجسمے آئینوں میں سے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ مگر اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی، اس وقت یہاں صاحب لوگ ہیٹ کوٹ پہنے ہوئے نظر آئے تھے۔ یا اُن کی لیڈیاں قیمتی گاؤن زیب جسم کئے، اسکو اندر جاتے ہوئے اس سے بھی زیادہ خوف معلوم ہوتا تھا، جتنا کہ کالی جی کے مندر میں معلوم ہوا تھا، دیوی جی تو پھر بھی ذرا دیر میں خفا ہوں گی۔ ممکن ہے اسے شودر سمجھتے ہوئے بھی اس کے گونگے پن کی وجہ سے اس کی جسارت معاف کر دیں۔ لیکن یہ انسان جانتے ہوئے بھی کالا آدمی کہہ کر ممکن ہے مار بیٹھیں۔ پھر اگر یہی معلوم ہو کہ یہ لوگ ماریں گے ہی، تو کوئی ایسی بات نہیں جو بیٹھ ٹھاکر صاحب کی بید کی مار کھا کر نہ ٹوٹی تھی وہ دو چار گھونسوں یا ٹھوکروں سے کیا ٹوٹے گی، خوف جو تھا وہ سزا کی صورت کے عدم تعین کا نامعلوم کا ڈر انسانی دل کو موت سے بھی زیادہ لرزاں کر دیتا ہے۔ ہری کو کیا معلوم کہ اگر ایک گونگا سنگ تراش میلا سا کرتا پہنے میلی سی دھوتی باندھے، ایک تھیلے میں اپنے اوزار کاندھے پر لٹکائے ننگے سر اُن کی دوکان میں داخل ہو۔ تو صاحب لوگ اس سے کیونکر پیش آئیں گے۔ ڈرکہتا یہاں سے بھاگ چلو،

آرٹ کی کشش قدم اٹھنے نہ دیتی۔ یہ اسی حیص بیص کے دلدل میں پھنسا گھٹنوں وہیں دوکان کے باہر کھڑا دیکھتا رہا۔ بیسیوں آدمی کالے اور گورے آئے گئے۔ دوکان میں سے کچھ خریدا۔ کچھ آرڈر دیئے مگر یہ اپنی جگہ سے نہ ہلا، مالک دوکان نے جو ایک بنگالی تھے۔ اس کی یہ کیفیت محسوس کرلی اور آدمی بھیجا کر اندر بلا لاؤ۔ ہری ڈرتا سہمتا اندر گیا۔ انہوں نے پوچھا تم کیا چاہتے ہو کیوں اتنی دیر سے باہر کھڑے ہو؟۔

ہری نے غیں غیں کرکے اپنا گونگا پن ظاہر کیا، آنکھ کے ساتھ اشاروں سے بتایا کہ وہ خود سنگ تراش ہے۔ اور آپ کے ہاں کے مجسمے دیکھنے چاہتا ہے، دوکان[redacted]نکہ خود صناع تھے، اس لئے انہوں نے اس کشش فن کو محسوس کرلیا جو اس وقت ہری کو ان کی مورتیاں دیکھنے پر مجبور کررہی تھیں۔ وہ خود اٹھ کے کھڑے ہوگئے۔ اور انہوں نے ہری کو مجسمے دکھانا شروع کیا۔ وہ ہر مجسمے پر ٹھیک اسی مقام پر انگلی رکھ دیتا۔ جہاں باریک اور نازک کام کامیابی سے بنایا گیا ہو۔ گو وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکتا۔ مگر اس کے چہرے کی چمک مالک دوکان کے لئے روحانی مسرت کا اتنا سامان بہم پہونچا رہی تھیں۔ جو شاید ان کی عمر بھر کے لئے کافی تھا۔

آرٹ صاحب فن سے داد چاہتا ہے۔ یہ وہ بھوک ہے جو فن سے نا آشنا حضرات کی معمولی تعریفوں سے نہیں سیر ہوتی، یہ وہ پیاس ہے جو آرٹ سے ناواقف نہیں بجھا سکتا، موتی موہن بابو کی یہ بھوک اور یہ پیاس آج ایک کندہ ناتراش دیہاتی سنگتراش صرف اپنی انگلیوں کے اشارے اور چمکتے ہوئے چہرے سے بجھا رہا تھا اور ان کی داد لینے کی خواہش بڑھتی ہی جارہی تھی۔ وہ اب ہری کو وہ چیزیں دکھا رہے تھے۔ جو ان کے نزدیک ان کے آرٹ کے اعلیٰ ترین نمونے تھے، بالآخر وہ ایسے ایک مورتی کے پاس لے آئے جس پر انہوں نے ایک سیاہ غلاف ڈال رکھا تھا۔ یہ ان کے فن کی تکمیل تھی، انہوں نے ہری سے کہا "دیکھو یہ چیز دیکھو" اور ڈرامائی انداز سے وہ غلاف الٹ دیا۔ ایک مرمری مجسمہ تھا نسائیت کا مجموعہ حسن صورت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی شرم حیا، کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور حیا کی وضع کی ساڑی پہنے گھونگھٹ نکالے۔ لجانے شرمانے میں بھی ایک شان خودداری عیاں! نیچے لکھا تھا "سیتا" ہری نے ہاتھ جوڑ کر مورتی کو پرنام کیا۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ انگلی کے اشاروں سے چہرے کے کٹ، ساڑی کے بل، ٹانگوں کی تراش کی تعریف کی۔ مگر پاؤں کی انگلیوں پر آکر ٹھٹک رہا۔ موتی بابو نے پوچھا کیا ہے؟ کوئی عیب ہے؟ اس نے کوئی جواب نہ دیا صرف چہرے سے وہ پچھلی بشاشت جاتی رہی، موتی بابو کو محسوس ہوا واقعی انگلیاں بھدی ہیں، وہ ایسی عورت کی بن گئی ہیں۔ جو تمام عمر ننگے پاؤں چلی ہو، حقیقت خواہ یہی ہو۔ لیکن اس سے اس تخیل کو ٹھیس لگتی ہے، جو سیتا کے نام کے ساتھ ہندوستانی دماغوں میں راسخ ہے۔ ہری اس درمیان میں وہیں فرش پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنے تھیلے میں سے ٹٹول کر ایک چیتھڑوں میں لپٹی مورتی کوئی آٹھ انچ بلند نکالی۔ اس نے کپڑے کی دھجیاں الگ کرکے وہ مجسمہ سیتا کی مورتی کی بغل میں رکھ دی۔ ایک دس برس کی ہندوستانی گھر کی شریف لڑکی تھی جلا کا ہاتھ اعضا۔ بھولا پن، الہڑپن، چلبلاپن، شوخی، شرارت، معصومیت، نسوانیت بچپنا، ہر شئے اکٹھا، پھر عضو عضو سانچے میں ڈھلا ہوا یہ محسوس ہوتا تھا کہ صانع نے اس ایک مورتی پر برسوں ریاضت کی ہے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے ہر دم اسی کے خیال میں محو رہا ہے۔ اس لئے کہ اس میں وہ حسن تھا، جو تخیل ہی بخش سکتی ہے وہ لطافت تھی جو عشق ہی عطا کرسکتا ہے۔ اور وہ طہارت تھی جو ایمان و اعتقاد ہی میں دستیاب ہوتی ہے۔ اٹھتی تو پھڑکی۔ مگر معلوم ہوتا تھا اب بولی اب بولی۔ بس تبسم پنہاں قہقہے کی آواز میں تبدیل ہوا ہی چاہتا ہے۔ موتی بابو اپنی مورتی بھول گئے، انہوں نے اس مورتی کو اٹھالیا، دیکھنے لگے، دیکھتے رہے ــــ ان کو یہ یقین ہوگیا کہ یہ تصویر کسی قدیم بے نظیر ہندی صناع کی بنائی ہے، شاید گپت زمانہ کے استادان کلیں سے کوئی جنھوں نے اجنتا میں غیر فانی کمالات کے نمونے چھوڑے ہیں۔ انہوں نے ہری سے گھبرا کر پوچھا "تم نے یہ مورتی کہاں پائی؟ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا کہ میں نے بنائی ہے!

انکو یقین نہ آیا۔ بولے "تم نے؟ ارے تم نے؟"

ہری مسکرادیا۔ اس نے اپنے اوزار تھیلے سے نکالے۔ اور قریب ہی پڑے ہوئے سنگ مرمر کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا اٹھالیا، موتی بابو نے سیتا کی تصویر پر کپڑا ڈالدیا، دوکان پر کام کرنے والے آدمیوں میں سے ایک کو بلا کر کہا "تم لوگ گاہکوں کو دیکھنا اس گوشے میں کوئی نہ آئے" انہوں نے ایک اوٹ لگا کے اس طرح کھڑا کردیا کہ وہ حصہ دوکان سے علیحدہ تخلیہ کا مقام ہوگیا اور خود سنگار جل کے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

ہری تین گھنٹے مسلسل مورتی بنانے میں لگا رہا، ہاتھ اس قدر صفائی اور نرمی سے چلتا تھا کہ موتی بابو کو حیرت ہوتی تھی، وہ خود ہندوستان کے سب سے بڑے بت سازوں میں سے سمجھے جاتے تھے، انہوں نے اب تک بلا مبالغہ ہزاروں مجسمے بنا ڈالے تھے۔ مگر اس لڑکے کی سی پتھر میں زندگی پیدا کردینے کی صلاحیت ان میں مطلقاً نہ تھی۔ پھر لطف یہ کہ نہ تو کہیں ناپا، نہ نشان بنائے اور نہ جس کی مورتی بن

رہی تھی وہ ہی سامنے تھی۔ تین گھنٹہ میں دوسری مورتی تیار تھی، اس میں شک نہیں کہ وہ پہلی مورتی سی بات اس میں ہوبہو پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن چند گھنٹوں کے کام نے موتی بابو کو اس امر کا یقین دلادیا کہ پہلی مورتی بھی اسی گونگے ہی کی بنائی ہے۔ ان کے دل نے تسلیم کرلیا کہ اس سے بڑا صناع ہندوستان نے اسوقت تک نہیں پیدا کیا۔

موتی بابو کی آنکھوں نے اپنی بین الاقوامی شہرت کمال اور فن میں مہارت تامہ اس جاہل گونگے دیہاتی کے قدموں میں ڈالدی، کیونکہ قدرت نے اپنی خوبیاں، اپنی صلاحتیں اس کے بھدے ہاتھوں میں منتقل کردی تھیں۔ انکا کمال مصنوعی تھا۔ اس کا خلقی وہبی! ان کا انسانی تعلیم کا نتیجہ تھا، اس کا قدرت کا ودیعت کردہ! مقابلہ جسارت تھا اور ضبط کفر ایمان کی دلیل۔ انھوں نے ہری کو گلے سے لگالیا، بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا "میرے ساتھ رہوگے؟" وہ کھلتی ہوئی کلی کی طرح مسکرادیا۔ حاجی کے لئے کعبہ میں اقامت کی دعوت تھی۔ یاتری کے لئے دیر میں رہنے کی استدعا، تھکے ماندے مسافر کیلئے منزل مقصود میں قیام کرنے کی خواہش! داتا کی دین کی لیلا!

ہری نے موتی بابو کا پاؤں تھام لیا!

پھسلتے ہوئے برف کے ٹکڑے کو پہاڑ کا سہارا مل گیا!

موتی بابو نے نہ شادی کی تھی نہ ان کے کوئی اولاد تھی، انہوں نے ہری کو لڑکے کی طرح رکھا۔ انگریزی معلموں سے بہترین تعلیم دلوائی، بڑے بڑے ڈاکٹروں کو گونگے پن کے علاج کی طرف متوجہ کیا، بالآخر اسے اپنے ساتھ امریکہ لے گئے وہاں کے مشہور ترین سرجن نے گونگے کو زبان بخش دی، ہری ایک ہلکی سی ہکلاہٹ کے ساتھ بولنے لگا، موتی بابو کو دونوں جہان کی نعمتیں مل گئیں۔ انھوں نے مادر ہند کے سب سے بڑے سپوت کا عیب دور کردیا، یورپ اطالیہ، یونان، مصر کے بڑے سے بڑے معرکۃ الآرا غیر فانی مجسمے دکھلائے۔ دنیا کے عظیم ترین صناؤں سے ملاقاتیں کرائیں۔ اور ان کی دوکان میں ہری کے آنے کے ٹھیک دس برس بعد اسے ایک مکمل انسان بناکر ملک و قوم کی خدمت کے لئے ساتھ لے کر پلٹے۔

وہی دوکان تھی وہی موتی بابو اور وہ ہی ہری شخصیت وہی روح، جسم وہی، لیکن دماغ جو پہلے ایک ناتراشیدا ہیرا تھا۔ اب ایسا سجل، اتنا درست، اتنا خوش آب بن گیا تھا۔ کہ مادر ہند کی درخشاں پیشانی پر آویزاں کیا جاسکتا تھا!

اُن کی دوکان پر اب کلکتہ ہی کے آرڈر نہ آتے تھے، بلکہ اقصائے ہند کے اقصائے عالم کے، جو چیز پیرس و اطالیہ، انگلستان و جاپان میں میسر نہ تھی، وہ اس کلجگ میں بھی ہندوستان پیارے ہندوستان کو ہری کی بدولت نصیب تھی۔ حسن اس کی جاگیر تھا تخیل اس کی ملکیت، صنعت اس کی لونڈی، اور سنگ تراشی اس کا آذر کار! وہ دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیاں بناتے بناتے خود ہی دیوتا بن گیا تھا۔ لوگ اس کا نام لیتے تو اسی عزت، اسی محبت، اور اتنے ہی احترام سے، جسطرح دیوتاؤں کا۔ اُسے خوش ہونا چاہئے تھا۔ اُسے گھمنڈی ہونا چاہئے تھا۔ اُسے اپنے پر ناز ہونا چاہیئے تھا،

لیکن ....

لیکن جب دن بھر کے تخلیقی کاموں اور ہزاروں آدمیوں سے طرح طرح کی تعریفیں سننے کے بعد وہ اپنے کمرے میں جاتا تو سرہانے کے طاق پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹاتا۔ ایک دس سالہ لڑکی کے مجسمہ کو حسرت سے دیکھتا، عقیدت کے پھول چڑھاتا محبت کی شمع جلاتا۔ اور گھنٹوں کی پرستش کے بعد اپنے دل میں ایک روحانی تسکین محسوس کرکے سو رہتا۔ صبح سویرے جب چڑیاں میٹھے سروں میں چہکنا شروع کردیتیں مسجدوں کی شریں اذان اور مندروں سے گھنٹیوں کی سریلی آواز سنائی دیتی، آنکھیں بند کئے طاق تک آتا، اپنی دیوی کے چہرے پر سب سے پہلے نگاہ کرتا۔ ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا۔ اس کے چہرے کی مسرت سے خوش ہوکر اپنے میں نئی نئی طرح کی قوتیں محسوس کرتا۔ اور دنیا کے لئے کوئی نادر ہدیہ تیار کرنے چلا جاتا۔

موتی سہا سرپرست تھا۔ ہاتھ میں صناعی کی بے انتہا قوت تھی، دنیا کے ہر گوشہ میں نام تھا۔ پھر بھی دل خالی تھا، خیال تصویر میں اپنے چہیتے رنگ بھر دیتا تھا لیکن شباب کی گرمی، نسائیت کی آتش سیال مفقود تھی۔ روح ابتلئے اپنا شریک اپنا جوڑہ ڈھونڈ رہی تھی، اور وہ بات مورتی میں کہاں!

ایک دن دوکان کے سامنے ٹیکسی آکر رکی، اندرا ہمہ حسن، ہمہ شباب ہمہ رعنائی بنی ہوئی اُتری، ٹھاکر صاحب بھی ساتھ تھے، بیٹی گریجویٹ ہوچکی تھی۔ شادی کی فکر تھی خواہشمندوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن اسے کوئی پسند نہ آتا۔ خود نہ سمجھتی تھی کہ کیا چاہتی ہے بس ایک خلش تھی۔ جیسے دل کا مندر سونا ہے لاکھ تصویریں اس میں رکھو لیکن کوئی ٹھیک نہ اترتی پرمیشور نے کوئی دیوتا اس کے لئے بھی ضرور بنا رکھا ہے۔ مگر وہ کہاں ہے۔ اس کا علم نہیں، جگہ جگہ بوڑھے باپ کو انگلیوں پر ناچنے والے باپ کو لئے پھرتی جستجو اپنے دل کے دیوتا کی تھی، بہانہ بڑے شہروں کی سیر کا تھا،

کلکتہ اس لئے آئی تھی، پھر وہاں آکر موتی بابو کی دکان نہ دیکھنا، ہری بابو مجسمہ ساز کی زیارت نہ کرنا، ایک فنی معصیت ہوتی جس کا ارتکاب، اندرا سی صاحب ذوق سلیم تعلیم یافتہ خاتون سے ناممکن تھا۔

وہ ٹھاکر صاحب کو لئے ہوئے دکان میں داخل ہوئی، ہری بسنت ایک عیسائی کی فرمائش سے حضرت مریمؑ کا ایک مجسمہ تیار کر رہا تھا۔ وہ تخیل پرور دیکر اس بت کے خط و خال میں حد درجہ معصومیت پیدا کر رہا تھا، کہ دفعتہً نگاہ اٹھی اور اندرا نظر آئی معلوم ہوا جیسے دیوتاؤں نے فردوس نگاہ کے لئے کوئی اندر کے دربار کی پری بھیجدی ہے۔ وہ اسے نصف منٹ تک نہ پہچان سکا، کلی پھول بن گئی تھی، ہلال بدر کامل ہوگیا تھا۔

صبح کا شجرتی آفتاب اب مہر نصف النہار تھا، آنکھوں کی خیرگی آہستہ آہستہ رفع ہوگئی تھی، دل نے پہلے ہی پہچان لیا تھا، اب آنکھوں نے بھی اچھی طرح دیکھ لیا سر سے پاؤں تک، دل زلف سیاہ کے ہر بال میں خط و خال کی ہر بانکپن میں ساری کے بل میں، بیل کے ہر پھول میں اٹکتا رہا۔ بارے پورا سرو ساقد دیکھ لیا گیا، نظر قدموں پر آکر جم گئی، وہی کنول سے پاؤں جنکا مثل نہ بنانے کی وجہ سے موتی بابو سے تعارف کی ابتدا ہوئی، دل وہیں لوٹنے لگا، موتی بابو نے اس درمیان میں آنیوالوں کا استقبال کرلیا تھا، اُن سے ٹھاکر صاحب سے شناسائی تھی، اُنھوں نے بے تکلفانہ اندرا کی ہری سے ملنے کی خواہش کا ذکر کیا، موتی بابو نے ہری کو پکارا کچھ یہ بڑھے کچھ وہ تعارف ہوگیا، نہ تو اُنھیں اندرا نے پہچانا اور نہ ٹھاکر صاحب نے

البتہ.................

البتہ اندرا کی بار بار کی دزدیدہ نگاہی یہ کہتی کہ وہ اپنے من کے مندر میں اس دیوتا کو مختلف صورتوں سے بٹھا کر دیکھ رہی ہے، کسی فیصلہ پر، نتیجہ پر پہنچا ہی چاہتی ہے، مگر دکان پر اس کا قطعی طے کرنا محال تھا، ہوٹل کے کمرے کی تنہائی میں، رات کے سونے کے وقت، پلنگ پہ کروٹیں بدل بدل کر یہ موقع مختلف زاویوں سے دیکھا جاسکتا تھا، اندرا نے اس کی کوشش کی، تقریباً ہر روز اب دوکان پر آتی، ایک نہیں کئی مورتیاں بنوائی جارہی تھیں، بظاہر اُن کے متعلق کوئی نہ کوئی بات بتانا، اُن کی تیاری کی مختلف منزلیں دیکھنا ضروری تھا، لیکن اصل میں ہری بابو کی شستہ و رفتہ، علم و ہنر سے بھری ہوئی گفتگو میں، ہلکی سی ہکلاہٹ کی آمیزش سننا پسند تھا، جب وہ ہکلاتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ دودھ و شہد کا چشمہ رواں ایک ہلکے سے پتھریلے ٹکڑے سے الجھتا ہوا گذر رہا ہے، اس میں وہی دلآویزی تھی جو بڑے گویوں کے ہاں گٹکری میں پیدا ہوتی ہے، وہی جو بیابرے صاحب کے ریکارڈ میں "منادی" کے لفظ میں موجود ہے، یہ ہکلاہٹ ویسی ہی بھلی، اتنی ہی رسیلی، اسیقدر دلفریب تھی جتنا کہ چھوٹے بچوں کا تتلانا! علم و ہنر کے ساتھ معصومیت کی یہ آمیزش من موہ لیتی تھی، اندرا جس چیز کی اتنے دنوں سے جستجو کر رہی تھی وہ اس نے پالی، فریم میں تصویر ٹھیک اُتری، مندر میں دیوتا براجمان ہوگئے۔ اہری چند دنوں تو اپنی نسلی خرابی اور ٹھاکر صاحب کی نسبی برتری بھول گیا، وہ تو اندرا کا بچپن ہی سے دیوانہ تھا، اس نے موقع پاتے ہی اس طرح خلوص ایثار۔ اور جاں فشانی دکھائی کہ اندرا بھی اُس کی دیوانی ہوگئی ٹھاکر صاحب نے اس کی یہ کیفیت محسوس کی، اُنھیں فکر دامنگیر ہوئی، کلکتہ کا شہر پرایا دیس بے جانے بوجھے لوگ کس سے صلاح لیں کس سے مشورہ کریں، بالآخر موتی بابو سے ایک دن جا پکڑا کر پوچھ بیٹھے کہ "ہری کون ہے، کیا ذات پات ہے" اُنہوں نے کہا میں ذات وات کچھ نہیں جانتا۔ ایک سنگ تراش کے بھیس میں آیا تھا، میری دانست میں تو کرشن نے نیا روپ لیا ہے، اُن کے سوا دیوتاؤں میں بھی کوئی فنون لطیفہ کا اتنا ماہر نہیں!"

ٹھاکر صاحب ذرا چراغ پا ہوئے، راکھ کے ڈھیر میں ابھی چنگاری باقی تھی۔ بولے "بابو صاحب ہم راجپوت ہیں، ایسے دلیسوں کو بیٹی نہیں دیتے۔ آپ کی بات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شودر ہے۔؟"

موتی بابو بھی جھلا گئے۔ پاؤں کے نیچے دبنے پر چیونٹی بھی کاٹتی ہے، "ٹھاکر صاحب شودر اور چھتری، اچھوت اور چھوت سب پرمیشر ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں سے ایک صدیوں کا مظلوم ہے۔ اور دوسرا صدیوں کا ظالم، ایک کمزور تھا دوسرے نے دبالیا۔ اب اس صدی میں یہ زور ظلم نہیں چلنے کا۔"

ٹھاکر صاحب کھڑے ہوگئے۔ بولے میں اپنی لڑکی کا اپنے ہاتھ سے گلا گھونٹ دوں گا۔ مگر اسے کسی بد قوم کمینے سے بیاہ نہ کرنے دونگا"

موتی بابو نے رخصت ہوتے ہوئے کہا "ٹھاکر صاحب ہری آپ کی لڑکی تو کیا۔ اندر لوک کی اپسرا بیاہ سکتا ہے! آپکو آپکی شرافت مبارک، آپ شودکھی ہوئی ہڈیاں چھوڑیئے۔ علم و ہنر کے بادشاہ جسے اپنے پہلو میں بٹھا

لیں، برہمنیاں اور جھوتنیاں اُنکے پاؤں نہیں چھو سکتیں۔!" غرض محلے میں رہنے والے دو مرغوں کی طرح دونوں نے ایک دوسرے کو خوب خوب زخم دہان دیئے۔ اور اپنی اپنی جگہ گردن پھلا پھلا کر چلے آئے۔

وہاں اندرا اور ہری سینما میں تھے، جب وہاں سے ٹیکسی میں پلٹے۔ تو ہری نے اندرا کی ایک نظر سے یہ سمجھ لیا کہ اسکی ریاضت کے باغ میں پھل آگیا۔ دیوی نے چڑھاوا قبول کر لیا۔ منت بر آگئی، مگر ایک لمحہ کی حیات جاودانی بخشنے والی خوشی کے بعد دفعتہً وہ قوم و نسل کی دیواریں یاد آگئیں۔ جو درمیان میں حائل تھیں، اس نے اپنے بڑھتے ہوئے جوش کو فولادی پنجہ سے روکا۔ اندرا کی نشست کا انداز، اس کا ہری کی طرف بار بار دیکھنا یہ صاف صاف بتا رہا تھا کہ دیوی پوجاری کا مدعا سننے کی منتظر ہے، وہ عقدہ براری کے لئے ہمہ تن تیار ہے۔ مگر ہری اس طرح خاموش بیٹھا تھا۔ جیسے مجال سخن نہو۔ وہ زبان پانے پر بھی گونگا بن گیا ——

اندرا کو یقین ہوگیا کہ اسے دھوکا ہوا، اس کا مندر سونا ہی رہیگا، اس نے کھڑکی کی طرف منہ کر لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے!

جب ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رُکی تو ہری اسے اتار کر پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اندرا نے پوچھا "بابو جی سے نہ ملئے گا" وہ بولا اسوقت معاف فرمایئے اب کل!" اور سلام کرکے ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا حکم دیا۔

افسردہ دل اندرا جب ہوٹل میں پہونچی تو ٹھاکر صاحب اپنے کمرہ میں منتظر ملے۔ چہرہ پر غصہ کے آثار، آواز سخت، لہجہ تلخ، بولے "میں ہری بابو کے ساتھ تمہارا گھومنا نہیں پسند کرتا، نیچ کمینہ!"

اندرا ٹھٹک کے کھڑی ہوگئی، اس نے بھی باپ ہی کے تیور سے پوچھا" وہ نیچ و کمینہ کیسے ہوگئے!"

وہ بولے "سنگ تراش کا لونڈا ہے، بالکل اسی طرح کا جیسا کہ وہ گونگا بدمعاش تھا نا! وہی جسے میں نے پیٹ کے گاؤں سے نکالدیا تھا"

اندرا جلدی سے کرسی پر بیٹھ گئی، دل میں جو کھٹک تھی دفعتہً جاتی رہی، اس نے ہری کو پہچان لیا، یہ وہی پرانا پجاری، وہی خاموش عبادت گذار جو پہلے گونگا تھا، اب بھی ہکلا ہے۔ اُسے یاد آیا، کہ کہیں نہ کہیں اُنکے سوانح کے سلسلے میں، اس نے پڑھا تھا کہ ہری کبھی گونگے تھے، یہی وجہ تھی کہ آنکھیں اُن کی خواہ کچھ بھی کہیں، لیکن زبان سے وہ اظہار مدعا کرتے ڈرتے تھے، ٹھاکر صاحب کی بید کا ڈر، جسم سے بڑھکر روح میں سرائت کر گیا تھا، بس بس نگینہ جہاں سے گرا تھا، انگوٹھی میں وہیں ٹھیک بیٹھ گیا،! وہ ایک بار روحی انبساط سے مسکرا دی، دنیا کتنی خوش آیند اور کتنی موسیقیت سے لبریز ہے! پھر باپ کے گلے میں باہیں حمائل کرکے بولی، آپ بیکار ان باتوں پر دل کڑھاتے ہیں، میں تو ان چیزوں کو مانتی ہی نہیں! اور قبل اس کے کہ وہ کچھ کہہ سکیں وہ اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

دوسرے دن دوکان کھلتے ہی وہاں وہ موجود تھی۔ ہری نے رات بھر دل سے جنگ کرنے میں گذار دی تھی، موتی بابو نے ٹھاکر صاحب سے گفتگو کا خلاصہ سنا دیا تھا، ہری نے اپنی اصلیت بتا دی تھی، دونوں مایوس تھے، دونوں کو یقین تھا کہ ہندوستانی ذات پات کا آہنی قلعہ محبت کے انجیر دل سے فتح نہیں ہوتا، پروگرام طے ہوگیا تھا، کہ پسپائی کی ٹھہرے اور یورپ و امریکہ میں سیر ہو، اندرا کے دفعتہً آجانے نے دونوں کو پریشان کر دیا، موتی بابو بوڑھے تھے۔ اختلاج کا شکار ہوئے اور پاس والے دواخانہ میں دوا پینے چلے گئے۔ ہری ہمہ تمنا ہمہ مایوسی، ہمہ آرزو، ہمہ حسرت بنا کوہستانی استقلال سے ڈٹا رہا، وہ بھاگنا بھی چاہتا۔ تو اندرا سے کہاں بھاگ کر جاتا! اس نے رسماً سلام کرکے پوچھا، "فرمایئے کیا حکم ہے؟"

اندرا نے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھکر کہا، والد کا اصرار ہے کہ اب مجھے گھر چلنا چاہیئے۔ اس لئے میں نے کہا چلوں آپ سے مل لوں اور اس دوکان کی وہ چیزیں بھی دیکھ لوں جو آپ نے مجھے اب تک نہیں دکھائی ہیں،

ہری نے زبان ہونٹوں پر پھراتے ہوئے کہا، "تو آپ آج ہی تشریف... لے جا رہی ہیں!

اس نے کہا نہیں آج تو نہیں، لیکن دو ہی ایک روز میں!..... تو مجھے وہ چیزیں تو دکھایئے جو میں نے اب تک نہیں دیکھی ہیں!"

ہری نے کہا ساری چیزیں آپ کے سامنے ہی ہیں۔ آپ ان میں سے ہر ایک کو کئی بار ملاحظہ فرما چکی ہیں!"

وہ ہنسی، اس کی ہنسی سے دلی جھینپ چھپانے کی کوشش ظاہر ہوتی تھی، اس نے کہا، "میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے سارے کمالات دکھا دیئے ہیں"

ہری نے کہا، میں سچ کہتا ہوں کہ کوئی ایسی چیز.........،،
اس جملے کو وہ ناتمام چھوڑ کر رک گیا، وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا، لیکن وہ آج اپنی دیوی ہی کے سامنے اس گناہ کا ارتکاب کرنے جا رہا تھا، اس کی پیشانی پر عرق آگیا۔ اس نے زبان دانتوں سے دبالی۔

اندرا پھر ہنسی اس کی ہنسی سے صاف فاتحانہ جھلک آرہی تھی، وہ زینہ کی طرف اشارہ کرکے بولی، یہ زینہ تو آپ ہی کے کمرے میں جاتا ہے نا!"

ہری نے گھبرا کر کہا "جی ہاں،،

اس نے اس طرف بڑھتے ہوئے کہا، "تو آئیے آپ مجھے اپنے کمرے کی چیزیں دکھائیے۔" ہری کچھ سہما کچھ شرمایا سا ساتھ ہولیا، وہ کھٹ کھٹ کرتی اُدپر چڑھ گئی۔ پہلا کمرہ ڈرائنگ روم تھا، دروازہ کھول کے جھانکا، بند کردیا، دوسرا کمرہ ہری کے سونیوالا کمرہ تھا، اس نے کواڑ کھولا۔ ہری نے بڑھ کر کہا "جی میرے یہ سونے کا کمرہ ہے، آپ اسے دیکھ کر کیا کریں گی؟"

وہ پھر ہنسی، اسی طرح ہنسی جس طرح بلبل گل سے ہم آغوش ہو کر ہنستا ہے۔ اس طرح جس طرح دشمن کے بم پھینکنے والے ہوائی جہازوں کو گرا کر توپچی قدر انداز ہنستے ہیں، اور وہ درانہ اندر چلی گئی، سادا سا بستر، صاف اجلی چادر، پروں کے دو تکئے، پائتی ایک قیمتی رگ، پلنگ کی بغل میں ایک ڈرسنگ میز ایک کرسی، میز پر برش کنگھے اور دو ایک قسم کے تیل کی شیشیاں وسط دیوار میں ایک دروازہ تھا اُسے کھول کر دیکھا، حمام اور کپڑے بدلنے کا کمرہ تھا، پلٹی چاروں طرف نظر دوڑائی، طاق پر نظر پڑی۔ اس پر چھوٹا سا مخملی زرکار پردہ پڑا ہوا دیکھ کر مسکرائی

ہری بار بار پیشانی سے پسینہ پوچھ رہا تھا۔ اندرا نے پلٹ کے پوچھا "یہ کیا ہے!"،

وہ ہکلا کے بولا "میرا راز ہے"،

اس نے بڑے دعوے سے پوچھا "مجھ سے بھی!"

ہری نے پھر ہکلا کے کہا "آپ..... پ..... سے سب سے زیادہ!"

اس نے آنکھوں سے بجلیاں گرا کے دریافت کیا "اور اگر میں جانتی ہوں تو!"

ہری نے جلدی سے آنکھیں .... جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔

"تو مجھ سے پوچھنے کی ضرورت!"

اس نے عجیب شوخی سے عجیب شرارت سے عجیب ظرافت سے۔ عجیب دلربائی سے روتے ہوئے ہری کو منہ چڑھا کر ہنسا دیا۔ اور خود طاق کے پاس جا کر پردہ الٹ دیا۔ وہی ایک مرمریں ٹکڑے پر دس برس کی ایک لڑکی کا مجسمہ تھا!

اندرا نے دونوں ہاتھوں سے اس مورتی کو اٹھا لیا، اس کے گلے سے شام کا چڑھایا ہوا باسی ہار نکال لیا، اور اسے اپنے جوڑے میں رکھ کر بولی "اب تو آپ گونگے نہیں ہیں۔!"

ہری نے محسوس کرلیا، کہ وہ اچھی طرح پہچان گئی ہے، اور اب پر بھی وہ اظہار مدعا کی اجازت دیتی ہے، پھر بھی ہمت نہ پڑی، پہلو بدل کر سوال کیا "آپ کو کب معلوم ہوا"،

وہ بولی کل رات کو بابوجی کی باتوں سے مجھے سب یاد آگیا"

ہری نے کہا "کیا اسکے بعد بھی آپکو میرے آج تک گونگے رہنے پر کوئی تعجب ہوتا ہے؟"

وہ بولی "ہاں" اس لئے کہ دیویاں جب کسی کی منت براری کرنا چاہتی ہیں تو پھر انھیں حاجت مند کی خاموشی بُری معلوم ہوتی ہے،،

ہری نے کانپ کر کہا "دیوی! دیوی! میں کیسے کہوں کہ میں تمہاری پوجا کرتا ہوں، اور صبح کو اسی کی زیارت کرکے کام شروع کرتا ہوں! لیکن میں شودر ہوں تم راجپوتن ہو، ٹھاکر صاحب اگر سُن لیں تو میرا کام ہی تمام کردیں!"

وہ ہنسنے کی جگہ متین ہو کر بولی "تم اور شودر! تم تو دیوی دیوتاؤں کے بنانیوالے ہو، اور اب...... اب ایک پوتر راجپوتن کے دیوتا!" ہری نے گھبرا کر کہا ارے ٹھاکر صاحب کیا کہیں گے؟"

وہ مسکرا کر بولی، "ان سے اتنا مت ڈرو۔ اُن کو بھی مناؤں گی، اور اگر نہ بھی مانے تو کیا! بیٹی کی حیثیت سے اکیس بائیس سال تک باپ کی خدمت کرچکی، اب استری بن کے اُسکی سیوا کروں گی، جو آج دس سال سے ہر روز گلے میں محبت کی مالا ڈالتا ہے!"

ہری نے اندرا کو اسی عزت، اسی احترام، اسی محبت سے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا جس سے وہ اس کی مورتی کو روزانہ پرنام کیا کرتا تھا، اور اندرا نے جھک کر ہری کے

نیم خوابی

ان انکھڑیوں کی اُف نیم خوابی
ڈورے پڑے تھے جن میں گلابی

رُخ پر پسینا، گیسو پریشاں
لکنت زباں کو ۔۔۔ آخر شرابی

نازک لبوں پر ہلکی سی لرزش
کھِلتی کلی یا رستی گلابی

گفتار ایسی پُرکار و سادہ
جس پر تصدق حاضر جوابی

جو عرض کیجئے، فوراً پذیرا!
عصمت کی ضامن خود بےحجابی

ہر لحظہ تازہ پیمانِ الفت
لطف و کرم کی وہ بے حسابی

اس چشمِ میگوں کی مست گردش
توبہ کی جاں پر لائی خرابی

گونجی ہوئی تھی گلبانگِ رندی
درسِ جنوں تھا روئے کتابی

مدہوش میں تھا، ہُشیار وہ تھا
اب حُسنِ گُل تھا، رنگیں نقابی

یارب نبھے گی، کیونکر محبت
وہ سخت کافر، میں بوترابی،

فکرِ اثرؔ میں ہے جلوہ فرما
صہبائے حافظ کی مہرتابی

اثرؔ لکھنوی

مسائلِ حیات

(مسلسل)

جوشؔ ملیح آبادی

قانون

(۱) قانون کا مقصد انفرادی آزادی کا یقین دلانا ہے، لیکن قطعی طور پر یہی انفرادی آزادی ہی وہ یقینی شے ہے جسے قانون سلب کرتا ہے۔

کیا آدمی کو ہر فعل سے روک کر صرف سوچتے رہنے کی اجازت دینے کے لئے ہمارے پاس قوانین کا کافی ذخیرہ موجود نہیں ہے؟۔

(۲) علم طب انسانوں کے واسطے بنا ہے، یا انسان اس لئے خلق ہوا ہے کہ علم طب کے اس پر تجربے کئے جاتے رہیں؟ تو کیا سوسائٹی، قانون اور مذہب انسان کے لئے نہیں بنایا ہے؟ تو پھر ہم اپنی زندگی کو ان چیزوں کا مطیع کیوں بناتے ہیں؟ ہماری زندگی ان سب کا "عذر گناہ" بن کر کیوں رہ جائے؟

(۳) تم اس دنیا سے تعلق رکھتے ہو یعنی انسان کے بنائے ہوئے قانون سوسائٹی، مذاہب، اخلاقیات کی جو تمام تر غلط بینی پر مبنی ہیں، تم پر حکومت قائم ہے۔

ذرا بتاؤ تو کہ لباس تمہارے واسطے بنا ہے، یا تم لباس کی خاطر؟ اور تم میں اور لباس میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کس میں قطع و برید کی جائے؟ اگر لباس تمہارے جسم پر ٹھیک نہیں ہوتا تو لباس تراشا جاتا ہے یا تمہارا جسم؟

تو پھر ہماری یہ کیا احمقانہ سعی ہے کہ قانون، سوسائٹی اور مذہب سے ہم آہنگ ہونے کی خاطر ہم اپنے کو تراش لیں۔ اور ان ساختہ انسانی ضوابط کی مطابقت حاصل کرنے کی غرض سے ہم سالہا سال مشق و مزاولت کے ساتھ تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہیں؟ واہ ری عقل، واہ رے دماغ۔

لے دے کر وہ احمق سوسائٹی تو بے شک ظلوم و جہول کے تعصبات ہی کا ادارہ ہے۔

(۴) قوانین صرف چند افراد ہی کے لئے ضروری ہوتے ہیں، اور قانون ساز بھی صرف چند افراد ہی ہوتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے کیا وہ تمام نوع انسانی کے سر منڈھ نہیں دیئے جاتے؟

(۵) ہم انسانی قوانین سے، خدائی قوانین کے مقابلے میں زیادہ خوف زدہ رہتے ہیں۔ کیونکہ پہلی چیز سے سرتابی کی سزا ہمیں یہیں اسی دنیا میں مل جاتی ہے اور دوسری چیز سے سرتابی کی سزا کسی جگہ دوزخ میں ملے گی۔

انصاف اس قدر غیر معین مدت تک کے لئے کیوں ملتوی رکھا گیا ہے؟

(۶) قانون کی مدد سے عدل و انصاف ذلیل ہو کر اب ایک معمولی سامان تجارت بن کر رہ گیا ہے۔ جس کی تم علانیہ خرید و فروخت کر سکتے ہو۔

کیوں قانون کے عوض دلوں میں حق و راستی کے احترام کی تخم ریزی نہ کر دو؟

(۷) عصری قانون میں ہر معاشوں کے واسطے تو اس کی کافی آسانی موجود ہے کہ وہ تمہیں ازالہ حیثیت عرفی میں سزا دلائیں، لیکن انہیں ان کے جرائم کی سزا دلانا تمہارے واسطے کیوں آسان بات نہیں ہے۔

(۸) کجرو انسان قانون کے مستثنیات میں پناہ لے کر سزا سے بچ جاتا ہے۔ اور کیا یہ صرف ایماندار آدمی ہی نہیں ہوتا جو حق و راستی اور عدل و انصاف

ضرورت سے زیادہ اعتماد کرکے مصائب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

(۹) [illegible] مقدس قانون [illegible] روز ایک ایسی منفعت بخش شے بنتا جلا جا رہا ہے کہ بے شمار [illegible] اپنا حقیقی کاروبار بنا چکے ہیں۔

(۱۰) [illegible] بہتر تمہیں خرچ کرنا پڑے گا اپنی بہتری کی قیمت سے کئی گنا زیادہ اگر تم چور سے بہتری حاصل کرنے [illegible] قانون سے امداد کے خواہاں ہو گے ـــــ کیا بہت سے لوگ عدالت سے محض اسی لئے [illegible] نہیں کرتے کہ قانون اس قدر مہنگا ہو رہا ہے۔

(۱۱) مقدمہ دائر کرکے دیکھو [illegible] تمہارا وکیل، تمہاری کل پونجی ہضم کر جائے گا۔ وکلاء جونکیں ہیں، جو [illegible] کا خون [illegible] رہی ہیں۔ ان کی [illegible] ترقی اس بات کی بدیہی علامت ہے کہ عدل و انصاف دنیا سے اٹھ رہا ہے۔

(۱۲) [illegible] تم سے بتا سکتا ہے کہ قانون کے اندر رہتے ہوئے تم کس قدر جھوٹ بول سکتے ہو جس سے تمہیں ذرا بھی نقصان نہ پہنچے گا۔

(۱۳) وکلا [illegible] کے وجود کے باعث، معدلت گستری ایک ناممکن سی بات [illegible] ہے۔ اور معدلت کو [illegible] بنا دیا ہی تو دراصل ان کا اصلی [illegible]

[illegible] بدبختی ہے۔

[illegible] جب تم انصاف کی کرسی پر بیٹھے ہو تو تمہیں واقعات کے صرف اس [illegible] جس سے تمہیں دوسرے آگاہ کرتے ہیں۔ اور جو پہلو تم سے پوشیدہ [illegible] جاتا ہے، وہ غالب [illegible] انصاف ہی ہوتا ہے۔

کیا تم [illegible] میں کبھی فیصلہ کر سکتے ہو [illegible] کہ عدل و انصاف کو [illegible]

(۱۵) جہاں قانون کی نظر میں معصومیت نہیں ہے۔ لیکن اس پر بھی کیا معصوم و بے قصور لوگوں کو سزا نہیں دی جاتی، محض اس لئے کہ مجرموں کے دلوں میں خوف پیدا ہو۔

(۱۶) جب کہ بڑے بڑے فاضل جج قانون کی ترجمانی میں ٹھوکریں کھاتے ہیں تو غیر قانون داں لوگوں سے یہ امید کرنا کہ وہ اس کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوں گے حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

اور کیا یہ بے انصافی اور بے رحمی نہیں ہے کہ کسی کو سزا دی جائے محض اس بنا پر کہ وہ قانون سے ناواقف تھا۔

(۱۷) قید خانہ زندہ مردوں کی قبر [illegible] بدمعاشوں [illegible] ہے۔ تو پھر اول الذکر کو اس لئے کیوں سزا دیتے ہو [illegible]

(۱۸) عدل کی دریوزہ گری کرکے دیکھو۔ ممکن ہے تمہاری [illegible] تمہیں یہ دولت حاصل ہو سکے۔

پہلے آدمی کو سولی پر چڑھا دو۔ اور پھر اس کے مقدمے [illegible] کرو۔ کیا عصری قانون کا سلسلۂ عمل ایسا ہی نہیں ہے؟

(۱۹) جبر اختیار نہیں ہوا کرتا، اور وہ تمام [illegible] سرزد ہوں ان سے اختیاری افعال کا سا برتاؤ [illegible] ہم میں سے کتنے ایسے جبری افعال کو سمجھتے ہیں [illegible] تو کئے جاتے ہیں ہمارے ارادی افعال سے حالانکہ ان کے [illegible] ماحول کے جابرانہ اقتدار پر ہوا کرتا ہے۔ یعنی [illegible] کے تحت صادر ہوتے ہیں۔

اس "غلط رسمی" کی اصلاح کرنے [illegible] ہو سکیں گے؟

(۲۰) جس وقت والدین اپنی [illegible] شادیاں کر دیتے ہیں جن سے ان کی لڑکیاں [illegible] تو کیا اس وقت ہم والدین پر [illegible] لگاتے ہیں؟

کیا اس دنیا میں بے شمار [illegible] مایوسی، محرومی اور اکراہ کے ساتھ [illegible] ہستی کو مجبور کرتی [illegible] کے واسطے محض [illegible] پر کبھی اور کسی عالم میں بھی [illegible]

(۲۱) عدل و انصاف ان کے [illegible] ہیں۔ اور عدل و انصاف پامال انھیں [illegible]

(۲۲) ہر وہ قانون حکومت کی نظر میں غیر مقدس ہے جو اس کے مقررہ قوانین میں دخل اندازی کی جسارت کرتا ہے۔

(۲۳) عدالت کی دیوی سب سے پہلے اپنی مخدومہ یعنی حکومت کی خدمت کرتی ہے۔ اور پھر محکوموں کی۔

(۲۴) قانون غریبوں کے لئے لوہے کا خاردار جال ہے۔ اور امیروں کے [illegible] تار عنکبوت۔

(۲۵) قانون کا ہیضہ گاؤں تک پہنچ کر کھانا کھانے [illegible] ہونا [illegible] فاقہ کشی [illegible]۔

(۲۶) قانون و انصاف سے مایوس ہو جاؤ، یہ ایک ڈراؤنا خواب ہے [illegible] ظلم ہے جو احساس بیچارگی کے ساتھ برداشت کرنے کے لئے خلق ہوا [illegible] جنہوں نے اس قانون و انصاف پر تکیہ کر کے اپنی جانیں ضائع کر چکے ہیں۔ [illegible] اپنی جان ضائع کرو؟

فلسفہ

(۱) [illegible] انسانی [illegible] میں ایک ایسی [illegible] سے زیادہ [illegible] دہشت [illegible] گداگری ہے [illegible] کیا یہ [illegible]

[illegible] فلسفہ ہے [illegible] دونوں میں غذا کی [illegible] خدا رسیدہ آج تک آب و غذا [illegible] کر کے محض فلسفے کے [illegible] فلسفے کے بغیر صرف آب و غذا کے [illegible]

[illegible] لوگ [illegible] دنیا اور اس کے خالق کے [illegible] گاہ گاہ گرسنگی اور غربت کے درد کو بھول جاتے ہیں [illegible] چیز نہیں ہوتا ہے جو آخر کار انہیں ہوش میں آنے [illegible]

(۴) ہر چیز نہایت ایمانداری کے ساتھ میرا اس پر اعتقاد ہے کہ اس "نامعلوم قوت" کے حدود میں جو ہمارے معلوم علم اور سائنس سے ماورا واقع ہوئی ہے تحقیقات کا میدان نہایت ہی وسیع ہے۔ لیکن اسی کے دوش بدوش میرا اس بات پر بھی اعتقاد ہے کہ اس "نامعلوم قوت" کی عدم معرفت اب تک تو ہماری کسی بڑی زحمت کا باعث نہیں ہوئی ہے۔ اور نہ ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ جب تک ہم اس کرۂ خاکی میں رہتے ہیں یہ عدم معرفت اور جہل ہمارے مادی وجود یا ہماری لطف اندوزیوں کو مجروح کر سکے گا۔

قبل اس کے کہ ہمیں اس بات پر غور کرنے کے لئے فالتو وقت ملے کہ ماورائے حواس اور کیا کیا چیزیں ہیں، یا ہو سکتی ہیں، کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہمیں اس وقت جو کچھ حاصل اور معلوم ہے اس سے بہترین صورت میں فائدہ اٹھانا شروع کر دیں "نقد" کو فراموش کر کے "نسیہ" کی فکر میں گھلتے رہنا معلوم نہیں کس نامعلوم ستارے سے نکلی ہوئی بدعقلی ہے۔

(۵) جب ہم یقین اور قطعیت کے ساتھ اپنے وجود ہی کو ثابت نہیں کر سکتے اور ہمیں اپنی ہستی ہی کا کامل اعتبار نہیں ہے تو ہم اپنی اس موہوم یا غیر یقینی ہستی کے ذریعہ سے جو کچھ سنتے اور دیکھتے ہیں اس پر کیونکر اعتماد کر لیں؟ اور [illegible] مطالبہ نہیں ہے کہ ہم قیاس آرائیوں اور عقلی اندازوں کے ذریعہ [illegible] لے آئیں جسے ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔

(۶) [illegible] کبھی خالص فلسفی کو برداشت نہیں کر سکتی، یا تو فلسفی کو ہر [illegible] اپنے خیالات کو [illegible] پڑے گا یا پھر کسی گندم نما [illegible] بدخیالی کرنی پڑے گی۔ جو اپنے میٹھے بولوں سے پبلک کو [illegible] سکتا ہے۔

[illegible] دنیا [illegible] سے ہمیشہ نافرمان رہی ہے؟

(۷) [illegible] اپنے [illegible] ہر وقت کھلے رہنے دو، اور ہر اس خیال کو [illegible] جو تمہیں مرغوب ہو۔

[illegible] اس کے متعلق ایسے الفاظ میں گفتگو کرو جیسے توپ [illegible] جو تم سوچو اس کے بارے میں کل اسی طرح بلند آہنگی سے تند و تیز آواز میں اظہار خیال کرو۔ خواہ تمہارا دوسرا بیان پہلے بیان کے [illegible] برعکس ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اپنے خیالات کا صحیح ترجمان ہونا اس سے

نہیں بہتر ہے کہ اپنی بڑائی برقرار رکھنے کی خاطر حق پروری کی جائے۔

ایماندار ہونا عالم ہونے سے کہیں بہتر ہے۔

کیا تم طیار ہو؟ ـــــــــ یا اپنے خیالات کے اظہار سے خوفزدہ ہونے کا ننگ برداشت کرنے پر آمادہ ہو؟

(۸) فلسفی، ریاضی دانوں کی طرح ہوتے ہیں، جو اعداد کا ایک لشکر بڑھا سکتے ہیں، اور ہر بار ایک مختلف جواب نکال سکتے ہیں۔

(۹) صرف دس ہندسوں کی مدد سے ہم نے ریاضی کا ایک عالم طیار کر لیا ہے۔ اور اس کائنات کے سرمایۂ قلیل سے ہم نے وجود مطلق، روح، مادہ، مشیت اور زمان و مکان کی سی دنیا تعمیر کر کے فلسفے میں پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں، ان تمام مسائل کی ترتیب اور سلسلے سے بازی گری شروع کر دو، اور ہر آن نیا فلسفہ بناتے رہو۔

اس وسیع دنیا میں تمہارا ذاتی فلسفہ کیا نہ سما سکے گا؟

(۱۰) بے کرانی میں بے کرانی کو جمع کرو، اور تم دیکھو گے کہ تم نے کچھ بھی نہیں پایا ہے، کیونکہ اس شکل میں بھی وہ بے کرانی ہی رہے گی۔

بے کرانی سے بے کرانی کی تفریق کرو۔ اور تم دیکھو گے کہ تم نے کچھ بھی نہیں کھویا ہے، کیونکہ اس شکل میں بھی وہ بے کرانی ہی رہے گی۔

(۱۱) بے کرانی یا لامحدودیت ناقابل تصور شے ہے، اور جب ہم اس پر غور کرنا شروع کرتے ہیں تو کس قدر مکمل شکست کھاتے ہیں۔ کیونکہ جب ہم قطعی طور پر یہ جانتے ہیں کہ ہر شے آغاز و انجام اور ابتدا و انتہا رکھتی ہے تو اسی وقت ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی وجود ضرور ایسا ہے جو نہ آغاز ہی رکھتا ہے، نہ انجام۔

(۱۲) اشیاء اپنے اسماء و اشکال کو تو بدل سکتی ہیں، لیکن خود اپنے کو بدل نہیں سکتیں۔

تمام اسماء و اشکال کو اڑا دو، اس عمل کے بعد اور جو کچھ رہ جائے گا وہ صرف تمام اشیاء کی یکسانی و وحدت ہو گی۔ اور بس۔

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اشیاء کا یہ بظاہر اختلاف و تضاد محض اسماء و اشکال کا پیدا کیا ہوا ہے، اور اسماء و اشکال کے پیروؤں کے پیچھے اشیاء کی وحدت و یکسانی چھپی ہوئی ہے۔

ایک کی موت میں دوسرے کی حیات مضمر ہے۔ کوئی شے خلق نہیں کی جاتی اور کسی چیز کا اس شے پر جو موجود ہے اضافہ نہیں ہوتا ـــــــــ کوئی ہستی فنا نہیں ہوتی، اور کوئی چیز اپنے مقام سے ہٹتی یا برباد نہیں ہوتی ہے۔ تبدیل و مسلسل ظہور؟ یہ تو محض ایک مغالطہ ہے۔ ایک فریب ہے۔ اسماء و اشکال کی آڑ میں کیا تمام چیزیں دائمی و ابدی نہیں ہیں؟

(۱۳) جو شے ابتدا میں نہ تھی (ماضی) اور نہ انتہا میں ہو گی (مستقبل) وہ درمیان میں کیونکر ہو سکتی ہے؟ (حال)

(۱۴) کیا یہ مجرمانہ تضیع اوقات نہیں ہے کہ بے آغاز انجام کے باب میں قیاس آرائیاں کی جائیں اور انجام بے آغاز کی تحقیقات فرمائی جائے، کیا اب بھی ہمارے سائنس داں اور فلسفی اپنی غلطی کے قائل نہیں ہوئے ہیں؟

(۱۵) یہ کائنات ایک مرئی معلول ہے، غیر مرئی علت کا، جب معلول ہی ہماری فہم سے بالاتر ہے تو پھر علت کا کیا ٹھکانا۔

(۱۶) کس نے درخت پیدا کرنے کی خاطر بیج بویا؟ اور کون چیز پہلے تھی تخم یا درخت؟ اور اگر پوچھا جائے کہ یہ تخم یا درخت کہاں سے آیا۔ یہ کیا کیونکر وجود میں آیا، اور کیوں موجود ہوا؟ تو کیا ان سوالوں کا ہمارے پاس کوئی جواب ہے؟

(۱۷) اس کائنات کے سمجھنے کے سلسلے میں کیا ہماری تنہا بیچارگی ہی ہماری تمام تحقیقات کا شافی جواب نہیں ہے؟

(۱۸) اس کائنات کے معمے کو صرف "نامعلوم قوت" ہی کے معمے کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے، اور اسی طرح "نامعلوم قوت" کے معمے کو صرف کائنات کے معمے کے ساتھ حل کرنا ممکن ہے۔

ہمارے تمام مذاہب اور فلسفے جہاں سے شروع ہوتے ہیں وہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں ختم ہوتے ہیں، وہیں سے شروع ہوتے ہیں۔

انسانی ذہن کی ایک حد مقرر ہے، اور ذہن کی یہی محدودیت ہمارے تمام مساعی کو مہمل ٹھیرایا کرتی ہے۔ لیکن کیا ہزاروں اب بھی اس ذہن میں لگے ہوئے ہیں؟

(۱۹) یہ زندگی ایک خواب حقیقت ہے ان لوگوں کے لیے جو حقیقت کو مانتے ہیں۔ لیکن کیا یہی زندگی ایک المناک تماشہ نہیں ہے، ان لوگوں کے لئے جو اسے محسوس کرتے ہیں، اور محض ایک کھیل ہے ان کے نزدیک جو غور کرتے رہتے ہیں۔

(۲۰) کیا ہم اپنی حیات و موت کو صرف ایک "حادثہ" یا اتفاق کہہ سکتے ہیں؟ کیا یہ قسمت کی انتہائی سفاکی نہیں ہے کہ یہ دنیا یہاں ہے اور ہم بھی یہاں ہیں لیکن ایک دوسرے کو پہچانتے ہی نہیں ہیں ـــــــــ اللہ رے یاس انگیز صورت حال۔

(۲۱) آؤ ہم سب مل کر دریافت کریں کہ ہم سب آخر اس دنیا میں ہیں کیوں؟ کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ جواب دے سکے،

(۲۲) ابر کو آخر اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ وہ قطروں کی شکل میں زمین پر برستا ہے، اور پھر بخارات کی شکل اختیار کر کے ابر بن جاتا ہے؟ اسی طرح روح کو اس سے کیا فائدہ پہنچتا ہے، یا یوں کہو کہ روح کو اس میں کیا مزا ملتا ہے کہ وہ دنیا میں آتی ہے، صرف اس لئے کہ دنیا سے چلی جائے۔

(۲۳) جو اس دنیا میں آتے ہیں وہ "ہم آ رہے ہیں" کے نعرے کیوں ہمیشہ لگاتے رہتے ہیں؛ اور جو چلے جاتے ہیں وہ کبھی نہیں کہتے کہ ہم جا رہے ہیں؟

(۲۴) اس دنیا میں دو طوفان زدہ جہازوں کی طرح کیا ہم پھر کبھی نہ ملنے کے لئے ملتے ہیں؟

(۲۵) کیا اس حیات دو روزہ میں ہم نے لامحدودیت کو کسی نہ کسی شکل سے ہر گوشے میں مس نہیں کیا ہے؟ آخر کار تمہیں ملا کیا؟

(۲۶) کیا دنیا لاکھوں تاگوں اور ہزاروں گرہوں کا الجھا ہوا گولا نہیں ہے؟ تاگوں کو سلجھاؤ اور گرہوں کو کھولو، زندگی بھر یہی کرتے رہو لیکن گولا اور بھی الجھتا ہوا چلا جائے گا۔ اور سرا کبھی نہ مل سکے گا۔

(۲۷) جسم کے پیچھے کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ لیکن کیا وہ "کچھ نہ کچھ" کسی اللہ کے بندے کو کبھی نظر بھی آیا ہے!

(۲۸) روح کیا ہے؟ ایک قوت مدرکہ یا ادراک یافتہ قوت یا "ذکاوتی قوت" (Energy that is intelligenced)

(۲۹) کیا ہم روح کو بات کرتے سنتے ہیں؟ کیا روح اس لحاظ سے نامکمل نہیں ہے کہ وہ کسی جسم کے بغیر اپنے اظہار پر قادر نہیں، اور اس کے باوصف کیا وہ ہمیشہ آزاد، ہر جگہ موجود اور اپنی استعداد میں لامحدود نہیں ہے اور کیا وہ اپنے مرکب (جسم) سے آلودہ ہو کر بے داغ اور پاک نہیں رہتی؟

(۳۰) ہم ہیں کیا؟ روح یا جسم؟ یا ہم نہ تو روح ہیں، نہ جسم؟ اور کیا اس وقت جب کہ ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یا تو ہم جسم ہیں یا روح، ہم غلط راستے پر نہیں ہوتے؟

(۳۱) اگر روح اور مادّہ دونوں لافانی ہیں تو لازم ہے کہ یہ دونوں چیزیں دونوں ایک دوسرے کی کمی پوری کرتی ہوں؟ اور باہم ایک دوسرے کی معاون و مددگار ہوں۔ اور کیا وہ مقاصد جو خود ان دونوں کی فطرت کی بنا پر لامحدود ہیں ہمیشہ ایک مشترک پس منظر نہیں رکھتے؟

(۳۲) کیا دماغ جس کا دائرہ ہر طرف ہے اور جس کا مرکز نہیں ہے روح اور جسم کے درمیان قاصد کا کام دیتا ہے؟

(۳۳) کیا یہ خیال کرنا بے سود ہے کہ خون اور گوشت میں کوئی روح کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اور روح میں خون اور گوشت کا احساس ناممکن ہے۔

(۳۴) ہر وہ شے جو ابتدا رکھتی ہے اس کی ایک انتہا بھی ہوا کرتی ہے، پیدائش و موت دونوں ناگزیر ہیں۔ کیا وہ حیات کے لمحے جو تم گنا چکے ہو ہمیشہ کے لئے ضائع ہو گئے اور تمہیں موت کے قریب لے آئے ہیں۔

(۳۵) جو کچھ صبح کے وقت تھا وہ دوپہر کو نہیں ہے، اور جو کچھ دوپہر کو تھا وہ رات کے وقت نہیں ہے۔

ہمارا جسم چھٹتے ہوئے ابر رواں کی مانند ہے۔ دولت ایسی ہی رواں دواں ہے جیسے لہریں۔ اور تم روئی کا ایک ریشہ ہو جو بگولوں میں ناچ رہا ہے۔ اور اتفاقات اڑتے ہوئے خوابوں کے مانند ہیں۔ کس پر اعتبار کیا جائے۔

(۳۶) ہم زندہ رہنے پر کیوں مصر ہیں؟ شاید اس لئے کہ ہنوز

ہم نے یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ زندہ رہنا مفید ہے یا مرجانا، جس لمحے میں ہم موت کی موافقت کریں گے اسی وقت مرجائیں گے، کیا ہماری بے فیصلگی ہی ہمارا وجود نہیں ہے؟

(۳۷) سوتے وقت کوئی بھی موت کی پروا نہیں کرتا۔ صرف یہ خیال کہ ہمیں مرنا ہے انسان کو پراگندہ رکھتا ہے، یہ دراصل خود موت ہے جس سے ہم خائف رہتے ہیں، یا یہ صرف مرنے کا اندیشہ ہے جس سے ہم ڈرے ہوئے رہتے ہیں۔

(۳۸) جب موت کے بعد تاریک راستوں پر تنہا گامزن ہونا ہمارے لئے مقدر ہوچکا ہے، تو مرنے سے پیشتر ہی تاریک راستوں پر تنہا گامزن ہونے کی مشق کرکے موت کو چیلنج کیوں نہ دو!

(۳۹) موت کیا ہے؟ صرف عناصر کا اختلال۔ ایک شے سے گذر کر دوسری شے کی شکل اختیار کرلینا، اور بس۔

تم کانپ کیوں رہے ہو؟ کیا تم سفر اور تبدیلی کو بھیانک خیال کرتے ہو؟

(۴۰) حباب ٹوٹ کر کیا ہوجاتا ہے؟ یہی حال تمہارا بھی ہوگا، شکل بدل جائے گی، مگر زندگی تم سے جدا نہ ہوسکے گی۔

(۴۱) جب ہم زندگی کے حدود سے گذرتے ہیں تو کیا اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ ہم اب تک غیر یقینی سرحد سے دوسری غیر یقینی سرحد میں داخل ہوئے ہیں۔

(۴۲) زمان و مکان کی ناقابل تصور وسعتوں کے باوصف اور لامحدود ذرے کی لامحدود مرکبات بنانے کی صلاحیتوں کے باوجود کیا ہم اس شئے کو جو ایک بار کوئی خاص شکل اختیار کرچکی ہے، دوبارہ پیدا کرنے کا تصور کرسکتے ہیں؟

(۴۳) فطرت شئی یا ایک چیز کی دوسری ہو بہو نقل کبھی نہیں رکھتی، وہ حد درجہ خلاق و موجد ہے، اور ہر بار ایک نئی چیز پیدا کیا کرتی ہے۔

(۴۴) اگر ایک ذرۂ حقیر ایک لمحے کے واسطے ساکن ہوجائے یا حرکت کرنے سے انکار کردے تو آن واحد میں یہ پورا کرہ مردے کی طرح بے حس و حرکت ہوکر رہ جائے فطرت تو مستقل و مسلسل تغیرات اور پیہم حرکت ہی سے زندہ رہتی ہے اور حالت جب یہ ہے تو ہماری حقیقی نجات کس راستے سے آئے گی۔ اور سکون ہمیں کس صورت سے میسر ہوگا!

(۴۵) اگر تم اس کائنات کا ایک جزو ہو اور کون کہہ سکتا ہے کہ نہیں ہو تو نجات کی عاجلانہ امیدوں سے ہاتھ اٹھا بیٹھو، اس لئے کہ فطرت کسی عالم میں بھی بے عملی کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اور تمہاری روح مستثنیات میں سے نہیں ہوسکتی۔

(۴۶) البتہ انسان کو نظری نجات حاصل ہوسکتی ہے، اور وہ صرف اس قدر ۔۔۔۔ ہوتا ہے جب کہ ایک شکل اپنے کو درست کرکے دوسری شکل اختیار کرتی ہے۔

(۴۷) ہر وہ شے جو بدقت تمام حاصل ہوتی ہے کبھی فطری نہیں ہوسکتی یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جس شے کے حصول میں انتہائی جد و جہد کی ضرورت واقع ہو، ضروری نہیں کہ وہ شایان تمنا بھی ہو، اور کون کہہ سکتا ہے کہ خلاصی و نجات کے باب میں بھی ۔۔۔ کی طلب میں عمریں صرف کردی جاتی ہیں، یہی نظریہ درست ہو۔

خلاصی و نجات، ہوشیار و خبردار، ممکن ہے تم ایک غلط و طویل جد و جہد کے غلط گوشے میں سرگرم عمل ہو۔

(۴۸) جس روز ہم وہم نجات سے خلاصی پائیں گے، وہ دن ہماری صحیح آزادی کا دن ہوگا۔ کیا تم آزاد ہوجانے کے لئے تیار ہو؟

(۴۹) جسمانی نجات اس وقت حاصل ہوسکے گی، جب کہ ہم یہ محسوس کریں گے کہ ہم کوئی جسم ہی نہیں رکھتے ہیں۔ اور دوسری نجات اس وقت حاصل ہوگی۔ جب ہم یہ محسوس کریں گے کہ ہماری کوئی ہستی ہی نہیں ہے۔

پہلی قسم کی نجات اس وقت حاصل ہوسکتی ہے، جب ہماری صحت کامل ہوجائیگی اور دوسری اس وقت حاصل ہوگی جب ہم تمام انسانی احساسات سے ذہنی طور پر قطعی طور پر بیگانہ و بے نیاز ہوجائیں گے۔

(۵۰) ترک علائق کے معنی دنیا سے متنفر ہوجانا ہیں۔ اور استغنیٰ کے معنی ہیں مایوسی کا استحکام و استیلا۔

کیا تم مایوسی کے شکار ہو؟

(۵۱) اگر آنکھیں دیکھنے کے لئے دی گئی ہیں، اور کان سننے کے لئے اسی طرح ہمارے دوسرے اعضا اپنے اپنے مقاصد رکھتے ہیں اور ہر عضو اپنے مقاصد کی تکمیل کا خواہاں ہے، جب یہ عالم ہے تو پھر یہ ترک علائق کا مسئلہ کس راستے سے آیا ہے؟

کیا ہم کچھ چیزوں کو ترک کریں، محض اس لئے کہ کچھ چیزوں کا ۔۔۔ اور کیا یہ ایک مہمل و ناممکن فلسفہ نہ کہا جائے گا؟

(۵۲) تم کسی شے سے وابستہ کیوں ہو؟ تمام اشیاء کو اپنے ۔۔۔ کیوں نہ ہونے دو؟ تم کسی کے پیچھے کیوں دوڑو۔ موقع دو کہ وہ تمہارے پیچھے ۔۔۔

اور کیا ترک علائق کی یہ حقیقی روح نہیں ہے؟

(۵۳) مقدر، کس قدر ہولناک اور لرزا دینے والا تصور ہے اس مقدر کا۔

میں مقدم ہوں یا میرا مقدر؟ کیا میرا مقدر میرے تمام کام اس صورت میں بھی انجام دے سکے گا کہ میرا وجود ہی نہ ہو۔ اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو مقدر کا مدار مجھ پر ہے، یا میرا مدار مقدر پر؟

(۵۴) اگر تم مقدر پر بھروسہ کرتے تب تو کاش تم بالکل پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے، کیونکہ تمہارے بغیر بھی تمہارا مقدر تمہارے فرائض خود بخود انجام دے لیتا۔

اپنے مستقبل کو اگر مقدر کے حوالے کرتے ہو تو بہتر ہے کہ تم خودکشی کر لو، اور ایک مدت کے بعد یہ دیکھنے کے لئے کہ اس اثنا میں مقدر نے تمہارے واسطے کیا کیا سامان بہم پہنچا لیے ہیں دوبارہ زندہ ہو جانا۔

(۵۵) تقدیر پرستی، کمل مایوسی کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔ اور کمزور و زبوں عقل افراد اسے اختیار کر کے اسے اپنا قلعہ اور حصار گاہ بنا لیتے ہیں۔

کیا تم مقدر پرست واقع ہوئے ہو؟

(۵۶) کیا یہ ماحول و وراثت ہی نہیں ہے، جو ہر شخص کی زندگی کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتی اور افراد کی زندگی کو ایک دوسرے سے مختلف و ممیز بناتی ہے۔

(۵۷) عقائد افراد کی کمزوریوں سے پیدا شدہ اوہام کی پیداوار ہوتے ہیں، اور یہ خیال کہ عقائد سے دل میں قوت آتی ہے اس حد تک ضرور صحیح ہے کہ کششی ہوئی اندھی قوت انسان کی کسی شعبے میں بھی رہبری نہیں کرتی۔

کیا عقائد دلائل پر اپنے دروازے بند نہیں رکھتے۔ اور تعقل کی روشنی میں آنے سے ہچکچاتے نہیں؟ اور کیا اکثر اوقات انسانی ترقی میں یہ عقائد ایک ہولناک رکاوٹ ثابت نہیں ہوتے؟

(۵۸) خوشیوں اور غموں کی تصویریں صرف ایک ہی رنگ میں نہیں چھپائی جاتیں۔ کیا شیر کی مسرت ہرن کی تکلیف میں جب کہ وہ کھا لیا جاتا ہے کوئی اضافہ کر دیتی ہے؟ جب یہ عالم ہے تو اپنی مسرتوں کو "آمد" میں ڈالو، اور اپنے غموں کو "خرچ" میں۔ لیکن افسوس اس کاروبار میں نفع کہاں؟

(۵۹) ہر واقعہ ایک فرد کو مسرت بخشتا ہے تو دوسرے کو غم میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس لئے غم و خوشی کی اصطلاحیں ایسی ہیں جو ہر پہلو پر منتقل کی جا سکتی ہیں۔

کیا دماغ کے اقتدار میں یہ بات نہیں ہے کہ غم و خوشی کو دوسرا معنی منسوب کر دے؟ اور اگر ایسا ہو سکتا ہے تو ہم غم کو غم، اور خوشی کو خوشی تسلیم کرنے سے انکار ہی کیوں نہ کر دیں؟

(۶۰) کیا تم مستقل طور سے یہ محسوس کرنے پر مجبور نہیں ہو کہ اس دنیا میں کوئی نہ کوئی ایسی شے ضرور ہے جسے تم نہیں جانتے، اور جس کے متعلق تمہیں یقین ہے کہ اسے کوئی بھی جان نہیں سکتا۔

(۶۱) ہم سعی کرتے ہیں چیزوں کے یاد کرنے کی، انہیں بھلا دینے کی خاطر اور جدوجہد کرتے ہیں انہیں بچا لینے کی، موت جن کے لئے مقدر ہو چکی ہے، ہماری ان دونوں کوششوں میں آخر فرق ہی کیا ہے؟

(۶۲) اس حیات کے انتہائی سوالات دراصل وہی سوالات ہیں جنہیں ہمارے فلسفی لاینحل صورت میں ہمارے سپرد کر کے چلے جا چکے ہیں اور وہی مستقبل ہماری گمراہی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ "کیوں" "کیونکر" "کب" اور "کہاں" کے سوالات آئے دن ہمارا خون چوسا کرتے ہیں، اور ایک کامل فلسفی بھی ان سے اس قدر بیگانہ ہے جیسا کہ ایک مستند احمق۔

(۶۳) اشیائے عالم کے باب میں "کیونکر" اور "کیوں" کو ترک کر دو۔ کیونکہ یہ "کیونکر" اور "کیوں" تا قیامت معلوم نہ ہو سکے گا۔

اس چون و چرا سے بچ کر کیوں ایسی زندگی بسر نہ کرو جو موت کے تصور سے سب سے زیادہ فاصلے پر واقع ہو۔

ناقوسِ بیداری

ہوشیار اے ہند! اے افلاس کے مارے دیار — نالہ برلب ہیں ترے الجھے ہوئے لیل و نہار

اب ترے سر میں ترقی کا جنوں باقی نہیں — اب ترے انصاف کی نبضوں میں خوں باقی نہیں

سایہ ہے ابرِ تعطل کا تری تنظیم پر — چل گیا تخریب کا افسوں تری تعلیم پہ

پیستے ہیں دانت سناٹے ترانوں پر ترے — ہے نظر ویرانیوں کی گلستانوں پر ترے

شاہراہوں میں بھیانک خامشی چھانے کو ہے — خونِ ہر ذرے کی آنکھوں میں اُبل آنے کو ہے

آگیا خورشید سر پر کھول آنکھیں بے خبر — اپنی غفلت، غیر کی بیداریوں پر کر نظر

ناخدا تیرے نہنگانِ اجل ہیں سر بسر — اپنی غرقابی سے پہلے ان کے بیڑے غرق کر

جس قدر ہیں پیشوایانِ مذاہب فتنہ خو! — گنگِ خنجر کے لئے اکسیر ہے ان کا لہو!

چاہتے ہیں جو بجھا دینا اخوت کا چراغ — پیس دے گھوڑوں کی ٹاپوں کے تلے ان کا دماغ

ان کا کینہ رات بھر بیتاب رکھتا ہے انھیں — دیدۂ دولت طلب بے خواب رکھتا ہے انھیں

رعبِ سلطانی بنا دیتا ہے ان کو ہرزہ کار — آنسوؤں کی ان کے آگے کند ہو جاتی ہے دھار

بیکسی مزدور کی جرأت دلاتی ہے انھیں — آنسوؤں کی چاندنی میں نیند آتی ہے انھیں

یہ وہ محسن ہیں جو کر دیتے ہیں قوموں کو ہلاک — عافیت کا خون کر دیتی ہے ان کی ذاتِ پاک

مانگ کر فطرت سے اک روشن دل اور گہری نگاہ — راستوں میں فرش کر دے ان کے بارودِ سیاہ

ان کی خود کامی کے پشتیاں اڑا کر پھینک دے — دھجیاں ان کی سیاست کی اڑا کر پھینک دے

(احسان دانش)

مطالعہ

محمد عبد العلیم ہاشمی غازی پوری

مطالعہ انسان کے لئے مہارت اور تزئین کا ذریعہ ہوتا ہے۔ مطالعہ قابل اور مدبّر بناتا ہے۔ اس کی خاص مسرت تنہائی اور خلوت کے ساتھ مخصوص ہے۔ گفتگو کے وقت انسان کی معاملات میں اہلیت ظاہر ہوتی ہے۔ اور اہم مسائل میں عمیق مطالعہ رائے صائب قائم کرنے کی اہلیت پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ تجربہ کار اشخاص کسی مسئلے کے تمام جزویات کا ایک ایک کرکے تجزیہ کرسکیں لیکن صحیح اور نیک مشورہ اور مسائل کے حل کرنے کی بہترین تدابیر وہی بتا سکتے ہیں جو عالم اور مدبّر ہیں۔

مطالعہ میں بہت زیادہ وقت ضائع کرنا حماقت ہے اور اس سے سستی اور کاہلی پیدا ہوتی ہے۔ اس کو ظاہری شان و شوکت اور نمود کے لئے استعمال کرنا بناوٹ اور تصنّع ہے۔ اس کے ذریعہ سے ایک قطعی فیصلہ صادر کرنے کی اہلیت پیدا کرنا ایک طالبِ علم کا تفنن طبع ہے۔ مطالعہ نیچر کی تکمیل کرتا ہے اور تجربہ مطالعے کی تکمیل میں معین ہوتا ہے۔ فطری اور جبلّی قابلیت ایک خود رو درخت کے مانند ہے جس پر مطالعہ اس مقراض کا کام دیتا ہے جو درخت کو مضبوط اور خوبصورت بنانے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔۔۔۔ مطالعہ زندگی کی سیکڑوں راہوں کو کھول دیتا ہے۔ اور وہ صرف تجربے سے محدود کی جا سکتی ہیں۔

اہل حرفہ مطالعے کی تحقیر کرتے ہیں۔ سادہ لوح اس کو پسند کرتے ہیں اور دانش مند اس سے صحیح استفادہ کرتے ہیں۔ کیونکہ مطالعہ خود کبھی نہیں بتاتا کہ اس کا صحیح استعمال کیا ہے بلکہ یہ صرف تجربہ ہے جو اس کا استعمال بتاتا ہے۔

مطالعہ کبھی اس نیت سے نہیں کرنا چاہئے کہ ہم فلاں شخص کی رائے سے اختلاف کریں گے۔ یا دوسروں کے بیانات کو باطل ٹھہرائینگے۔ نہ اس لئے کہ کسی بات کو بالکل سچ مان لیں گے اور اس کو اٹل سمجھ لیں گے۔ اور نہ اس لئے کہ خواہ مخواہ دوسروں سے بحث و تکرار کریں گے۔ بلکہ اس سے ہمارا مقصود صرف یہ ہونا چاہئے کہ ہم کسی بات کو سمجھنے اور اس کا اندازہ لگانے کے اہل ہو جائیں۔

بعض کتابوں کا صرف ذائقہ دریافت کرنا چاہیے۔ بعض کو نگلنا چاہئے۔ بعض کو اچھی طرح چبا کر کھانا چاہئے تاکہ وہ پوری طرح ہضم ہو جائیں۔ اس تمہید سے صرف یہ مقصد ہے کہ بعض کتابوں کو جستہ جستہ پڑھنا چاہئے۔ کچھ کو تو پورا پڑھنا چاہئے مگر دیدہ ریزی سے نہیں اور بعض کا دماغ سوزی اور پوری کاوش سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ بعض کتابوں کے اقتباسات ہی سے کام نکالا جا سکتا ہے لیکن یہ طریقہ چند معمولی کتابوں کے مطالعے میں کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بیشتر یہ اقتباسات ظاہری اور نمایشی ہوتے ہیں اور جس طرح کہ بھاپ بنایا ہوا پانی بالکل نمایشی اور بدمزہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی بدمزہ ہوتے ہیں

مطالعہ کامل انسان بناتا ہے۔ بحث و تکرار زود فہم بناتی ہے اور انشا پردازی استائل اور انفرادیت سے فرق پیدا کرتی ہے۔ اور اسی وجہ سے اگر کوئی شخص کوتاہ تحریر ہے تو اُس کا حافظہ قوی ہونا چاہئے۔ اگر کوئی شخص بحث و تکرار سے گریز کرتا ہے تو اُس کو برجستہ گو ہونا چاہئے۔ اور اگر کم پڑھتا ہو تو اس کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ خود کو فریب دے سکے کہ اس کو کچھ نہیں آتا۔

تواریخ کا مطالعہ عقل مند اور مدبر بناتا ہے شاعری برجستہ گو بناتی ہے۔ ریاضی تیز فہم اور زیرک بناتی ہے۔ قدرت کا مطالعہ حیوانات میں عشق پیدا کرتا ہے۔ اخلاقیات کا مطالعہ سنجیدہ بناتا ہے منطق اور علم بیان و بدیع کا مطالعہ صائب الرائے بناتا ہے۔

مطالعہ کی بدولت فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ فہم و ادراک کی تمام خرابیاں بہتر مطالعے سے دور ہو سکتی ہیں اور جسمانی امراض کے مانند ان کی خامیوں کو دور کرنے کے لئے مختلف قسم کی ورزشوں کی ضرورت ہے۔ مثلاً کرکٹ میں گیند پھینکنے سے مثانے کی بیماریوں کو آرام ہوتا ہے۔ شکار پھیپھڑے اور سینے کے امراض کو دور کرتا ہے۔ آہستہ خرامی معدے کی شکایتوں کو دور کرتی ہے۔ گھوڑے کی سواری دماغ کے لئے مفید ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص میں تلون ہو تو اسے ریاضی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ کیونکہ اگر سوالات کے حل کرنے میں اس کا ذہن ذرا دوسری طرف منتقل ہو گیا تو اس کو پھر سے شروع کرنا ہوگا۔ اگر کسی شخص کی فہم تمیز و تفریق نہ کر سکے تو اس کو منطقیوں اور فلسفیوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہ بال کی کھال نکالنے کے خوگر ہوتے ہیں۔ اور اگر کسی شخص کا ذہن اس قابل نہیں کہ وہ معاملات کو سمجھ سکے اور ایک بات کو دوسری بات کی مدد سے ثابت کر سکے تو اس کو وکلاء کے مقدمات کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اسی طرح ہر ذہنی نقص کو دور کرنے کے لئے اُس کے حسب حال تدابیر عمل میں لانی چاہئیں۔

اقتضائے فطرت

ہے زمیں کا آسماں کی سمت پھیلا دامن دراز
پستیوں میں عشق کی ہے کوہ کی رفعت کا راز
کیف میں دریا ہے رقصاں چھیڑ کر موجوں کا ساز
چھا رہا ہے دو جہاں پر بادۂ الفت کا رنگ

جیسے پاکیزہ ہوائیں تودۂ خاشاک پر
جس طرح بارش کے موتی آسماں سے خاک پر
تو بھی زلفِ عنبریں رکھ دے دلِ صد چاک پر
جرم ہے قانونِ الفت میں لحاظِ نام و ننگ

موج و ساحل میں ہے کتنا ربطِ باہم دیکھ لے
دیکھ لے آلائشِ خورشید و شبنم دیکھ لے
میری آنکھوں سے ذرا اُفتادِ عالم دیکھ لے
دیکھ مجھ سے صلح کر لے چھوڑ دے فطرت سے جنگ

فکرِ فردا چھوڑیئے فرصت غنیمت جانیئے
پیش بینی ہی کو آغازِ مصیبت جانیئے
اعتمادِ اعمال پر توہینِ رحمت جانیئے
زُعم سے عصمت کے بہتر معصیت کا دل پہ

غلط فہمی

عبداللہ خاں مصری

غلط فہمی کا لفظ بظاہر اس قدر سادہ اور عام فہم معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تشریح اور توضیح کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے دن کی روشنی اور شب کی تاریکی زحمت تشریح و توضیح سے مستغنی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

شب و روز کی ماہیت، تاریکی و روشنی کی حقیقت جس قدر پُرپیچ اور لاینحل ہے اس سے کہیں زیادہ پُرپیچ اور لاینحل عقدہ اس لفظ غلط فہمی کے مفہوم اور اثرات کا ہے۔

یہ عقدہ بعض حالتوں میں اتنا مشکل اور ناقابل فہم ہو جاتا ہے کہ سمجھ اور ادراک بھی اس کی گتھیوں کو سلجھا نہیں سکتا۔ نہ اس کا صحیح خاکہ ہی انسان کے ذہن میں آ سکتا ہے۔

غور کیجئے۔ آدم کے دو بیٹوں میں ایک کی قربانیاں مقبول ہوتی ہیں۔ دوسری نامقبول۔ یہ اس سے کہتا ہے میں تجھے مار ڈالوں گا۔ وہ جواب دیتا ہے تو نیک بن تو تیری قربانیاں بھی مقبول بارگاہ رب العٰلمین ہوں گی۔ بھلا اس میں میری کیا خطا ہے مجھے اگر مار ڈالنا چاہے تو مار ڈال۔ میں تجھے مار نہیں سکتا۔

غضبناک بھائی، بھائی کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوتا، اس کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اس کا خون بہاتا ہے۔ خون کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ بنی نوع انسان کا پہلا قاتل ٹھہرتا ہے۔ ساری دُنیا کی لعنت اپنے سر لیتا ہے۔ پھر اپنے کئے پر پچھتاتا ہے۔ مقتول بھائی کی لاش پیٹھ پر لئے جنگلوں کی خاک چھانتا ہے۔ چیختا چلاتا روتا اور کف افسوس ملتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ کیا بھائی بھائی کو قتل کرتا ہے؟ نہیں یہ غلط فہمی ہے۔ دونوں کی یا دونوں میں سے کسی ایک کی۔ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے مگر ہے غلط فہمی۔

حضرت نوح علیہ السلام نو سو پچاس برس تک دُنیا والوں کو اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے اس راہ میں ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کیں، مگر دُنیا داروں کی خو نہ بدلنا تھی نہ بدلی۔ یہاں تک کہ پیغمبر خدا کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا، مشیت بھی اصلاح سے مایوس ہو گئی۔ ارشاد ہوا کہ بس اب تو ان کی اصلاح سے دست کش ہو جا ان کے لئے بددُعا کر۔

نوح نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دیئے۔ دُعا قبول ہوئی۔ ساری دُنیا تباہی اور موت کے گھاٹ اُتر گئی۔ یہ کیا تھا حضرت نوح اور ان کی قوم کی غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ احکام خداوندی سے متعلق غلط فہمی کا نتیجہ ساری دُنیا کی تباہی اور بربادی کے سوا کیا ہو سکتا تھا؟

خدا ایک ہے دو نہیں۔ اس میں کیا کلام ہے مگر اس کے چلتے دنیا میں لاکھوں معصوموں کا خون ہوا ہے۔ ہزاروں بچے یتیم ہوئے ہیں اور لاکھوں عورتیں بیوہ۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ دُنیا اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس وقت تک

تیار نہ ہو سکی۔ بڑا غلط فہمی میں رہی۔ غلط فہمی اور نہایت خطرناک قسم کی غلط فہمی۔

کہتے ہیں آدم علیہ السلام گناہ کی وجہ سے جنت سے نکالے گئے۔ مدتوں بیچارے دُنیا کی خاک چھانتے رہے۔ حوا بھی دربدر ماری ماری پھریں۔ ایک زمانہ کے بعد دونوں کی خطائیں معاف ہوئیں۔ دونوں گلے ملے، خوب خوب روئے اور تمام عمر توبہ واستغفار کرتے رہے یہاں تک کہ دوبارہ جنت میں بلا لئے گئے مگر چونکہ ان کی خطائیں غیر معمولی قسم کی تھیں اس لئے ان کی پوری نسل کو ان کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ابن آدم گناہوں کی لہروں میں غرق ہو گیا۔ اور پوری دنیا نیا خزاں کی ایک ہولناک بستی قرار پا گئی۔

اس خوفناک صورت حال سے رب العباد کو سخت صدمہ پہنچا۔

آدم کے گناہوں کے کفارے کا سوال درپیش ہوا۔ مشیت ایزدی صدیوں اسی میں غوطہ زن رہی۔ بالآخر ایک صورت نکل آئی۔ رب العزت کا اکلوتا بیٹا کفارے کے لئے جلوہ نما ہوا۔ ساری دُنیا کے گناہوں کو لئے ہوئے دار پر چڑھا۔ نسل آدم کی بُرائیوں کا کفارہ پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا یعنی روئے زمین سے گناہوں کا خاتمہ ہو گیا اور صرف ثواب ہی ثواب باقی رہا۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ لوگ اس اہم معاملے میں بھی غلط فہمی کے شکار رہیں۔

اللہ ایک ہے۔ باپ، اُس کا بیٹا اور روح القدس۔ تینوں ایک اور ایک تین کا نظریہ کوئی معمولی نظریہ نہیں ہے۔ مگر دنیا کو اس میں بھی غلط فہمی ہے۔ ٹھیک اسی قسم کی غلط فہمی جیسی شیر خدا کے متعلق بعضوں کو معراج سے ہوئی ہے جہاں سدرۃ المنتہیٰ سے آگے قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى کے پردے میں حضور اقدس کو شیر نظر آیا تھا۔

مسیحی تثلیث کے متعلق بعضوں کو یہ بھی غلط فہمی ہے کہ یہ تثلیث نہیں تربیع ہے۔ ماں، باپ، بیٹا اور روح القدس اس کی کڑیاں ہیں اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ ایک تین اور تین ایک کے بجائے ایک چار اور چار ایک کے شواہد اور دلائل بہت زیادہ ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ بعلزبول (ابلیس) کی تباہی کے بعد آسمانوں کی بادشاہی چار مساوی حصوں میں تقسیم ہوئی تھی اور خدا کے چار برگزیدہ فرشتے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل مساوی طور پر جملہ آسمانوں کے شہنشاہ مقرر ہوئے تھے۔ اسی طرح دُنیا کی چار سمتیں اُتر۔ دکھن۔ پورب۔ پچھم بھی اسی حقیقت کو پیش کر رہی ہیں کہ اقانیم ثلاثہ کی جگہ اقانیم اربعہ کا نظریہ از بس صحیح اور قابلِ قبول ہے۔ مزید برآں کرۂ ارض کے قدیم عناصر اربعہ آب و آتش۔ خاک و باد بھی اسی اقانیم اربعہ کے نظریہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود دُنیا کی ایک تہائی آبادی کو غلط فہمی ہے کہ اقانیم اربعہ نہیں صرف اقانیم ثلاثہ ہے یعنی ماں کا وجود باپ بیٹا اور روح القدس سے غیر متعلق ہے یہ کس قدر عظیم غلط فہمی ہے!!

یہی غلط فہمی مہابھارت کی خونریزیوں میں پائی جا رہی ہے۔ سری کرشن جی کی جیون۔ لنکا کی چڑھائی۔ سری رام۔ لچھمن جی کے بن باس میں نظر آتی ہے۔ ارجن اپنے ہاتھوں سے اپنے عزیزوں اور مربیوں کو قتل کرتا ہے ان کا خون بہاتا ہے سری کرشن جی اس خونی منظر کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ جنگ کی شعلہ افشانیوں کو اور مشتعل کر دیتے ہیں خون سے کھیلتے ہیں اور موت سے ٹھٹھا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود سنسار جگ جگ میں اُن کے ظہور و نمود کے نظریئے کو تسلیم نہیں کرتی ہے۔ حالانکہ بھگوان ہمیشہ سنسار کے سُکھ کے لئے جنم لیتے رہے ہیں اور اس وقت بھی گاندھی، ہٹلر یا مسولینی کے روپ میں موجود ہیں۔ مگر دنیا ہے کہ اس اہم معاملے میں بھی غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہے۔ غلط فہمی اور نری غلط فہمی۔

ذرا سوچئے! دُنیا کی ساری مخلوق کالی مخلوق سے نفرت کرتی ہے سپیدی کو سیاہی سے دشمنی ہے۔ دن کو رات سے۔ گرمی کو سردی سے۔ تری کو خشکی سے۔ اور آسمان کو زمین سے۔

اس اصول کے ماتحت لاکھوں موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے ہیں اور کروڑوں زندہ درگور ہیں مگر پھر بھی دنیا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ یہ امتیاز سپیدی اور سیاہی ایک مستقل حقیقت ہے اسی قسم کی حقیقت صبح و روشن اور شب دیجور میں موجود ہے۔

تہذیب یافتہ قومیں غیر مہذب قوموں کو مہذب بنانا چاہتی ہیں بذریعہ توپوں کے گولوں اور ہوائی جہازوں کے بموں کے۔ مگر یہ اس کو پسند نہیں کرتی ہیں چیختی چلاتی اور شور مچاتی ہیں۔ ان کا یہ شور مچانا شاید ان کی نادانی کا نتیجہ ہے یا ان کے متعلق تہذیب یافتہ قوموں کی غلط فہمی کا۔ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے مگر ہے غلط فہمی۔ اسی قسم کی جیسی قادیان میں ایک بزرگ کو مہدی بننے کی جھوٹی

مجتہد۔ مہدی اور پیغمبر ہونے کا دعوےٰ کیا تھا۔ مگر اپنے اس دعوے کے ثبوت میں اپنی قوم کے لئے ایک قطرہ خون کی جگہ ایک بوند آنسو بھی نہیں بہایا۔ اس پر بھی بہتوں نے ان کی نبوت تسلیم کر لی حالانکہ اس قادیان سے دہے یا پرے ملک پنجاب ہی کے خطے میں ایک نہیں دو دو اور دو سے زیادہ انسانوں نے اپنی قوم کے لئے نہ صرف آنسو بہائے بلکہ دل چیر کر رکھ دیئے۔ پروانے کی طرح جل کر خاک ہوئے۔ خاک بھی اُن غریبوں کی خاک میں مل گئی۔ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ خبر ہوتی تو کیونکر ہوتی کسی نے اُن کی جستجو تک کی۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ ان غریبوں نے کسی نبوت یا الوہیت کا دعوےٰ نہیں کیا تھا۔ یہ اُن کی نادانی تھی یا اُن کے متعلق لوگوں کی غلط فہمی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ لیکن ہے نہایت افسوسناک قسم کی غلط فہمی۔

مدت ہوئی مسلمانوں کی ایک جماعت کو خدا کے ظہور کا انتظار تھا۔ خدا خدا کر کے یہ خدا جلوہ گر ہوا۔ کھاتا پیتا جوان ہوا۔ اور جوان سے بوڑھا۔ لوگوں نے اُسے سونے میں تولا۔ غریب ہندوستان میں خدا کے لئے سونے کی کثرت کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن خدا کی موجودگی میں لاکھوں غریبوں کا بھوکوں مرنا ایک اتنی بڑی بات ہے کہ بس غلط فہمی سے معلوم ہیں اتنی بڑی بات بن سکتی ہے۔

بہتوں کو خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے اتنی کہ بسا اوقات انہیں اس سے نقصان بھی پہنچ جاتا ہے مگر وہ اس سے باز نہیں آتے ہنسے چلے جاتے ہیں کیونکہ اس وقت ان پر اس کا ایک نشہ سا طاری ہوتا ہے۔ لیکن جس وقت ان کا یہ نشہ اُتر جاتا ہے اُس وقت اُنہیں خود اپنی ہنسی پر ہنسی آتی ہے۔ دراصل اُن کی یہ ہنسی ایک خاص قسم کی غلط فہمی پر مبنی ہوتی ہے۔ اسی قسم کی غلط فہمی جیسی رونے سے متعلق بعضوں کو ہوتی ہے۔ ایک جماعت سال بھر روتی ہے اور اسی کو ثواب عظیم جانتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس کا یہ طرزِ عمل ایک دردناک غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

یہ غلط فہمی ساری دُنیا میں ایک خوفناک وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے، کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے۔ زمانے کی پوری سرگزشت ماضی، حال اور استقبال غلط فہمیوں کے ایک پلندے کے سوا کیا ہے؟ دُنیا کی تمام قوموں سے اس کا سابقہ پڑا ہے ہر فرد سے اس نے مقابلہ کیا ہے پوری انسانیت اس کا شکار رہی ہے اور اب تک اسکے خوفناک پنجوں میں دبی کراہ رہی ہے۔

مشہور ادیبوں اور شعراء سے درخواست

محمود بریلوی "تاریخ زبان و ادب اُردو" پر ایک کتاب تصنیف فرما رہے ہیں اس سلسلے میں محمود صاحب نے مشہور ادیبوں اور شعراء کو درخواست کی ہے کہ وہ اپنے سوانح حیات مع نمونۂ کلام اپنی پہلی فرصت میں اُن کے پاس روانہ کر دیں۔ محمود صاحب شاکی ہیں کہ بعض حضرات کا تغافل اور شانِ استغناء اور بعض اصحاب کا انکسار کتاب کو مکمل نہیں ہونے دیتا۔ تذکرے کی ترتیب کا کام ۱۹۲۹ء میں شروع کیا گیا اور آج ۱۹۳۶ء نصف ختم ہو چکا ہے مگر ابھی تک اکثر ادیب اور شعراء کے حالات محمود صاحب تک نہیں پہنچے۔ درخواست کی جاتی ہے کہ متعلقہ حضرات براہِ کرم اپنے سوانح حیات مع نمونہ کلام حسب ذیل ابواب میں شامل ہونے کے لئے ارسال فرما دیں:۔ (۱) اردو زبان کی شاعرہ ادیبہ خواتین (ہندو اور مسلمان)۔ (۲) زمانۂ حال کے شاعر اور ادیب اور (۳) اُردو زبان کے ہندو شعراء و اُدباء۔ تاکہ یہ معینہ تذکرہ جلد تر مدوّن ہو جائے۔ متعلقہ حضرات مندرجۂ ذیل پتے پر خط و کتابت کریں:۔

امپرومینٹ ٹرسٹ۔ بلاک ۱۴/۲/۸۔ ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔ بمبئی نمبر ۳۔

Improvement Trust
Block, 8/2/14 Ibrahim Rahimtulla Road. Bombay No 3,

دو تابوت

پلیٹ فارم پہ رکھے ہوئے ہیں دو تابوت — اِدھر خروش و تلاطم، اُدھر جمود و سکوت
اِدھر حیات کا ذوقِ مسافرت پُرشور — اُدھر ممات کی خاموشیوں کا رُخ سُوئے گور
اِدھر حیات کی اُٹھتی جوانیاں گُل پوش — اُدھر ممات کی سنجیدگی کفن بردوش
اُدھر حیات کا دریا ہے ساکن و پایاب — اِدھر ہیں رقص میں موجیں، اُبھر رہے ہیں حباب
یہی ہے اصل میں لفظِ حیات کا مفہوم؟ — بتاؤ راہروانِ دیارِ نامعلوم!
یہی نتیجہ ہے کیا ذوقِ کامرانی کا؟ — مآل ہے یہی محبوبِ زندگانی کا؟
بشر کا وہمِ خزان و بہار کیا کہئے — فریبِ ہستیٔ ناپائدار کیا کہئے
اُصول سے ہے مُعرّا یہ ایں ہجومِ اُصول — بشر سے بڑھ کے نہیں ہے کوئی ظلوم و جہول
ہر ایک سانس میں گو سو حجاب اُٹھاتا ہے — مگر ستم ہے کہ پھر بھی فریب کھاتا ہے
ان آفتوں میں مگر غور کیا کرے کوئی؟ — اگر جئے نہ تو پھر اور کیا کرے کوئی؟
ہُوا کریں جو ہر اک سانس میں ہیں سو آفات — ہر ایک دل کو عطا کی گئی ہے حُبِّ حیات

دلِ حسینؑ کو فکرِ فرات بخشی ہے
یہ کس کے ذوقِ ستم نے حیات بخشی ہے؟

جوش

برہا کی آگ

مرزا فہیم بیگ۔ فہیم چغتائی

ایک دیہاتی منظر

ایرانی "نرگس" سے آنکھیں لڑائیں، ولایتی فارگیٹ می ناٹ سے اٹھکھیلیاں کیں، آیئے اب ذرا دیسی "مولسری"[1] کی لہک مہک کا بھی لطف اٹھائیں اور ملکی و قومی پریم رس کے متوالے ہو جائیے۔!

لیجئے راؤ لوک پال سنگھ صاحب چترکار (مصور) کے نگارستان معنی کا ایک پینسل ورک پیشکش ہے،!!

زخم خوردہ دل، پرنم آنکھوں اور ڈوبی ہوئی نگاہوں کی ضرورت ہے۔

کچھ عجیب رقت انگیز سماں سامنے آجائیگا!!

ہاں!............ تو فرماتے ہیں ؎

گھر گھن گمبھیر گھنے لئی، جان ناہ گھر ناہ
ورگ گھر، باہر بند کو بیدھ[1] لگو نہ پناہ

(ترجمہ) گھنے بادلوں نے محاصرہ ڈال دیا ہے۔ خاوند کو مکان پر نہ پاکر۔ گھر میں آنکھوں اور باہر بارش کی جھڑی لگنے کی ساعت آگئی، اب کہیں پناہ نہیں۔

تشریح: جب وقت کالے کالے بادل اندھیری دے دے کر امنڈنے لگیں، پروائی کے ہوش ربا جھونکوں سے ہرے ہرے درخت جھوم جھوم کر دوسرے ہو ہو جائیں، اٹاری کی کھڑکیوں سے آموں کے باغ دکھائی دیتے ہوں، جن کے پہلوؤں میں بل کھاتی ہوئی سڑک سڑک جانیوالی نگاہیں، دور کے جنگل سے مایوس پلٹنے کی تاب نہ لائیں،

کوئلوں کی کوک رہ رہ کر کلیجے میں ہوک اٹھائے، پپیہا کی "پی کہاں، پی کہاں" سنتے سنتے جی نڈھال ہوجائے۔ بسیرے کی دھن میں پرند دھوم مچائیں، مینڈک ٹرٹرا ٹرٹرا کر کان کھائیں، طاؤس بار بار گرج کر برشگالی فضا کو محشرستان بنائیں۔

یکے۔ تانگے گذریں، بھیڑ بکریاں اپنے اپنے کھڑک میں جا پہونچیں، کسان ہن۔ بیل لیکر تانیں اڑاتے۔ یا نسریاں بجاتے، بستی کو پلٹ آئیں، گائے بھینسوں کی سُریلی سُہانی گھنٹیاں سنائی دینی بند ہو جائیں،

آخر سڑک پر آنے جانے والے مسافروں۔ اور گاڑی چھکڑوں کی آمدورفت کا سلسلہ بھی ٹوٹ جائے۔ بارش کے ڈر سے انسان حیوان دوڑ دوڑ کر اپنے اپنے ٹھکانے جالگیں،......... ..آہ پھر......... سڑک، باغ۔ کھیت، جنگل، ندی، نالے، جوہڑ، تالاب کسی جگہ بھی سناٹے کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔

اُف جب ہولناک تاریکی میں کائنات گم ہوئی جارہی ہو ایک ہمہ تن چشم انتظار کس درجہ قابل رحم ہے، سوائے برگشتہ نصیبی کہ معاملہ برعکس ہو جائے۔

یعنی ؎

گھر گھن گھنے لئی جان ناہ گھر ناہ،

گھنے بادوں نے گھیر کر محاصرہ ڈال دیا ہے۔ خاوند کو مکان پر نہ پاکر بس اب ؎

ورگ گھر، باہر بند کو بیدھ لگیو نہ پناہ

گھر میں آنکھوں اور باہر بارش کی جھڑی لگنے کی ساعت آگئی، اب کہیں پناہ نہیں۔

لہذا ؎ اگر سر سے فلک دشت میں ٹل جائے تو اچھا ہو۔ زمیں پیروں کے نیچے سے نکل جائے تو اچھا

[1] ویسے عموماً تو "سوراخ" کو بیدھ کہتے ہیں، لیکن جوتش کی اصطلاح کے مطابق یہاں اسوقت سے مراد ہے جب چھ گھنٹہ قبل چاند اور نو گھنٹہ قبل سورج گرہن کا اندازہ لگ جاتا ہے،

اگر قدم نہ محبت کا درمیاں ہوتا

اگر قدم نہ محبت کا درمیاں ہوتا
تو یہ زمین ہی ہوتی نہ آسماں ہوتا

نوائے عشق نہ کرتی اگر حُدی خوانی
نہ کارواں، نہ کوئی میرِ کارواں ہوتا

نہ چھیڑتی اگر انسانیت ترانۂ شوق
زمانہ کشتۂ تسبیحِ قدسیاں ہوتا

صُراحیوں کی ہر اک بوند، اشک بن جاتی
جوانیوں کا ہر اک عشوہ رائیگاں ہوتا

نہ یہ بہارِ طرب خیز و غم رُبا ہوتی
نہ یہ فروغِ مئے تُند و ارغواں ہوتا

نہ قدرِ زمزمۂ لعلِ دل نشیں ہوتی
نہ شورِ عربدۂ حسنِ بے اماں ہوتا

نہ یہ خرامِ سبک رو نسیم کو ملتا!
نہ یہ نظام ستاروں کے درمیاں ہوتا

نہ خونِ تازہ ٹپکتا دلِ برہمن سے!
نہ آب و رنگِ نقوشِ دلِ بتاں ہوتا

نہ کوئی زمزمۂ عمرِ جاوداں سُنتا!
نہ کوئی بہرہ ورِ مرگِ ناگہاں ہوتا

نہ عقل عشق و جوانی کے بھید پا سکتی
نہ علم، لالہ رخوں کا مزاج داں ہوتا!

نہ آہِ سرد لبِ زندگی پہ آ سکتی
نہ خونِ گرم رگِ دہر میں دواں ہوتا

نہ کوئی سیم بدن آفتِ زماں بنتا
نہ کوئی زہرہ جبیں فتنۂ جہاں ہوتا!

نہ موجِ سوز بہ طنبورِ خستگاں اٹھتی
نہ رقصِ درد بہ گُل بانگِ عاشقاں ہوتا!

کبھی نہ غنچۂ کون و مکاں چٹک سکتا
کبھی نہ طفلکِ ارض و سما جواں ہوتا

خدائی، قلب کا ہلکا سا وسوسہ ہوتی
خدا ضمیر کا دھندلا سا اک گماں ہوتا

بلند و پست کی نبضیں چھپی چھپی رہتیں
حیات و موت کا چہرہ دھواں دھواں ہوتا!

خدا نکردہ جو ہوتا یہی مزاجِ حیات
نہ جانے جوش ٹھکانا مرا کہاں ہوتا

جوش

شاعرانہ بصیرت

مہاراج ہرش کی گنتی سنسکرت زبان کے ان شاعروں میں ہوتی ہے جن کا نام اجر اور امر ہوچکا ہے۔ اس کرہ ارض پر جب وقت تک قانون قدرت کا راج ہے، اس کی شاعری کی نورانی کرنیں صفحۂ ہستی کی دھندلی لکیروں پر ہمیشہ عکس افگن رہیں گی اور مشعل طریقت کا کام دیں گی۔

راجہ کی قوت شاعری پر بڑے بڑے شاعر انگشت بدنداں رہ جاتے تھے راجہ کو سلطنت کے کاموں میں اتنی دلچسپی نہ تھی، جتنی شعر و شاعری سے۔ اس کا زیادہ وقت اسی شغل میں گذرتا۔ اس کا قول تھا "میرا اصلی راج وہ ہے جہاں خیالات حکومت کرتے ہیں دنیوی راج تبدیل ہوسکتا ہے، چھینا جاسکتا ہے۔ فنا ہوسکتا ہے۔ مگر شاعری کی دنیا وقت کی دست برد سے آزاد اور فضا کی خنک دسترس سے پرے رائج ہے۔

مہاراج عالم خیال کی رنگین دنیا میں گلگشت کرتا اور سورج، چاند، نور، زندگی محبت اور حسن کی کبھی نہ مٹنے والی کائنات سے ہم آہنگ ہوکر بہشتی خوابوں کے پرتو کے نیچے عالم کون و مکان کی سیر کیا کرتا تھا۔

ایک روز مہاراج باغ میں بیٹھے ہوتے تھے، شام کا وقت تھا شفق کے پگھلے ہوئے سونے کے دریا میں سے کچھ کرنیں گلاب کی ہلکی ہلکی پتیوں کے بوسے لینے کے لئے بیتابی سے واپس ہورہی تھیں، مادر گیتی ہجر و فراق کے اس دلدوز نظارے کو برداشت نہ کرسکی۔ اس کے خوبصورت اور محبت آمیز چہرے پر رنج کی کالی کالی لکیریں پڑنے لگیں، مہاراج ہرش قدرت کے اس ہیجان انگیز ڈرامے کو دیکھتے اور عالم سکوت میں اس کو نظم کی لڑیوں میں پرو رہے تھے۔

اچانک مہاراج کی کنواری لڑکی اوشا، جس سے آفتاب چندے ماہتاب سامنے آکر کھڑی ہوگئی، شام کے ظلمت کدے میں صبح کا سورج نکلا، مہاراج اس وقت دوسری دنیا میں تھے اور اس دنیا کے صرف وہی مالک تھے۔ مادی دنیا کے کسی شخص یہاں تک کہ وزیر اعظم اور سپہ سالار کو بھی وجدان کی اس دنیا میں قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی لیکن محبت اور حسن ان قیود سے آزاد ہیں۔ یہ ہر جگہ جاسکتے ہیں۔ مہاراج نے غصہ سے سر اٹھایا۔ مگر راج کماری کو دیکھتے ہی ان کی مافوقی مسکراہٹ میں تبدیل ہوگئی، جیسے چراغ جلنے پر اندھیرے میں روشنی ہوجاتی ہے۔

اوشا نے محبت بھری نگاہوں سے مہاراج کی طرف دیکھا۔ اور پھر پاکیزہ سادگی سے مسکراکر کہا، "تو آخر میں نے آپ کو پا ہی لیا۔ میں نے محل کا ایک ایک کونہ چھان مارا، موسیقی سیکھنے کے کمرے میں گئی، وہاں سے لے اور تاں سے اپنا پیچھا چھڑاکر تصویر محل میں پہنچی۔ رنگ کی پیالیاں اور برش میری ساری کے ساتھ ہولی کھیلنے لگے، بڑی مشکل سے اپنا پلو چھڑاکر وہاں سے بھاگی۔ مگر آپ۔ اوشا کی نگاہ اچانک بھوج پتر پر پڑی۔ اس نے خجالت سے سر جھکالیا۔ عاجزی سے مہاراج کی طرف دیکھا۔ اور بولی۔ پتا جی مجھے خبر نہ تھی۔

مہاراج نے اوشا کے ان الفاظ کو نہ تو سنا، اور نہ اس کو پورا فقرہ

ختم کرنے کا بھی موقع دیا۔ وہ اٹھکر اس کے نزدیک آئے شفقت سے کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر پھیرا اور ملکوتی پیار سے اس سحر کرنے والے عمل کو جاری رکھتے ہوئے بولے ـــــــ "بیٹی اوشا ذرا سورج کی طرف دیکھ یہ اپنی کرنیں سمیٹ کر کالی چادر میں منہ چھپا رہا ہے، اس کی کرنیں پھولوں کے سروں پر ہاتھ پھیر رہی ہیں جس طرح میں تیرے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہوں۔ میرے درباری شاعر میرے جذبات کو ٹھیک نہیں پڑھ سکتے، ان کے پاس وہ دل، وہ دماغ نہیں جو الفاظ کی خوبصورتی اور ان کے معنی کو سمجھ سکیں مگر مجھے یقین ہے کہ میری بات تو ضرور سمجھ سکی۔ تو میری بیٹی ہے۔ اور تیرا من میرے من کے سانچے میں ڈھلا ہے۔

مہاراج نے شعر سنائے، راج کماری نے ان کو سنا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ نے مہاراج کو یقین دلادیا کہ اس نے شعر کی معنوی کیفیت کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔

اس کے بعد باپ بیٹی شام کے جھٹپٹے میں محل کی طرف روانہ ہوگئے، اوشا نے باپ کے پیچھے بھاگ کر ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہوئے بچپن کی سادگی سے کہا ـــــــ "میں بھی شاعری سیکھوں گی"

مہاراج نے اپنی پیاری بیٹی کو ذرا سی بات پر بھی نہیں جھڑکا تھا۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگے کہ اسے شاعری سکھائے گا کون، یہ جوان ہے، کنواری ہے ـــــــ خوبصورت ہے۔ شاعری کی دنیا میں پاکیزگی، راستی اور عصمت کا صور پھونکنے والے سیدھے سادے اور سادہ لوح شاعر کتنے شہوت پرست اور حواس خمسہ کے غلام ہوتے ہیں۔ یہ صداقت مہاراج ہرش کے سے جہاں دیدہ اور تجربہ کار شاعر اعظم کی نگاہ سے چھپی ہوئی نہ تھی۔

(۲)

برسات کے دن تھے۔ آسمان پر کالی گھٹائیں جھوم جھوم کر آتیں اور اپنے بطن سے موسلادھار پانی برسا کر ناامید دلوں میں امید کی سرسبز کھیتیاں لہلہانے کا سامان بہم پہنچا جاتیں۔ مہاراج کے دربار میں ایک نوجوان سنیاسی آیا۔ اور بولا "مہاراج ہم سنیاسی ہیں، تین دن سے زیادہ کہیں نہیں ٹھیرتے۔ لیکن چونکہ اب برسات کا موسم شروع ہوگیا ہے۔ ہمارے لئے یاترا کا حکم نہیں ہم بادلوں اور بجلیوں کے چار مہینے کہیں ٹھیر کر گذارنا چاہتے ہیں کیا تو ہمارا انتظام کرسکتا ہے؟

مہاراج نے نوجوان سنیاسی کے قدم چھوئے، اور ہاتھ جوڑ کر بولا، سوامی جی! میں اور میرا تمام راج آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہے۔ جھیل مان سرور کے راج ہنسوں کو پنجرے میں رکھکر کون خوش رکھ سکتا ہے۔ تاہم میں اپنی حکومت کی تمام کوششیں بروئے کار لے آؤں گا، اور آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔

سنیاسی نے ہاتھ اٹھاکر راجہ کو دعا دی۔ اور کہا "بھگوان تیرا بھلا کرے گا" سنیاسی کو راج محل میں جگہ دے دی گئی۔ اور وہ وہاں برسات کا چوماسہ کاٹنے لگا۔ مہاراجہ ہرش اکثر سنیاسی کے پاس آتے جاتے رہتے تھے آہستہ آہستہ راجہ پر سنیاسی کی خوبیاں اور اوصاف ظاہر ہونے لگے، وہ صرف سنیاسی ہی نہیں تھا۔ اعلیٰ درجہ کا مصور اور عدیم المثال شاعر بھی تھا، پہاڑوں اور جنگلوں کی سیاحت کے دوران میں قدرت کی رنگینیاں اس کے دل و دماغ میں سرایت کرگئی تھیں، اس کی لمبی اور نازک سرخ و سپید انگلیاں موقلم کی پتلی نوک سے قدرتی مناظر کی وہ وہ تصاویر کھینچتی کہ قدرت اپنے فطری جمال پر خود دریائے حیرت میں غوطے کھانے لگتی، دماغ کی بلند پروازی، عالم تخیل کی بلندیوں پر سے خوبصورت الفاظ میں ڈھلے ہوئے وہ وہ شہپارے چن کر لاتی کہ سننے والے عالم وجد میں آجاتے

سنیاسی جب مضمون پر کبھی بولتا مہاراج ہرش اس کا منہ دیکھتے رہ جاتے، یہ عمر اور یہ قابلیت، نوجوان سنیاسی کے بشاش اور خوبصورت چہرے پر دو بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے پھلے پھولے جنگل میں میٹھے پانی کے بھرے ہوئے دو چشمے، ایک ایسا نوجوان اور اس میں ایسی موہنی!!

مہاراج ہرش سنیاسی سے جتنا زیادہ ملتے اتنی ہی زیادہ ان کے دل میں سنیاسی کی عزت بڑھتی جاتی تھی۔ انھوں نے نوعمر سادھو کو ہر طرح پرکھا، جانچا، مگر وہ ہمیشہ بے عیب ثابت ہوا۔ انسان میں کوئی نہ کوئی قابل اعتراض بات ضرور ہوتی ہے۔ مگر سنیاسی میں ایک بھی ایسی بات نہ تھی۔

مہاراج نے ایک دن بڑی عاجزی سے کہا۔ "سوامی جی، راج کماری فن شاعری سیکھنا چاہتی ہے۔ میں نے ہر چند تلاش کی۔ مگر کوئی ایسا آدمی

نہ ملا جس پر پورا بھروسہ کیا جاسکے۔

سنیاسی کو صرف اتنی سی بات سے راجہ کے دل کا حال معلوم ہوگیا وہ بغیر سوچے سمجھے بولا "جب تک ہم یہاں ہیں پڑھا دیا کریں گے"

مہاراج کی تمنا بر آئی، راج کماری شاعری سیکھنے لگی۔

(۳)

چار مہینے کے بعد مہاراج نے سنیاسی سے پوچھا، "راجکماری اوشا نے کیا سیکھا؟" سنیاسی نے من کو موہ لینے والی موٹی موٹی اور روشن آنکھوں سے مہاراج کی طرف دیکھا، اور مسکرا کر جواب دیا، "آخر شاعر باپ کی بیٹی ہے، بہت کچھ سیکھ چکی ہے۔ اتنے تھوڑے زمانے میں اور کوئی شخص اس علم میں اتنی قابلیت بہم نہیں پہنچا سکتا تھا۔ راج کماری کی شاعری دیکھکر خود ہم بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔

مہاراج کو تعجب ہوا، "کیا صرف چار مہینے میں؟"

سنیاسی نے مہاراج کو اس طرح دیکھا، جس طرح استاد اپنے بھولے بھالے انجان شاگرد کو دیکھتا ہے۔ وہ میٹھی اور سریلی آواز میں بولے مہاراجہ! شاعر بنائے نہیں جاتے۔ پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں یہ قابلیت اس طرح موجود ہوتی ہے، جس طرح آگ کی چنگاریاں راکھ کے تلے دبی ہوتی ہیں۔ استاد کا کام صرف یہ ہے کہ ان چنگاریوں پر سے راکھ ہٹا دے۔ آگ خود بخود بھڑک اٹھے گی، اس کے لئے کوشش کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہوا کے جھونکے ہی اس کے لئے گھی کے چھینٹے بن جاتے ہیں۔ راج کماری میں یہ ملکہ سویا ہوا تھا، ہم نے صرف بیدار کر دیا ہے۔ وہ اب اسلوب بیان اور خوبصورت الفاظ کی جادوگری میں ماہر ہو چکی ہے۔

مہاراج نے خوشی غرور اور تعجب سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اوشا"

اوشا نے سر اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا، اور شرم سے سر جھکا لیا۔

"بیٹا! اپنا کوئی شعر سناؤ"

راج کماری نے اسی طرح زمین کی طرف دیکھتے ہوئے سر کے اشارے سے کہا "نہیں"۔

"کیوں؟"

راج کماری نے جواب نہیں دیا۔

سناؤ بیٹی کوئی اچھی نظم سناؤ۔

اوشا نے ساری کا گوشہ ماتھے پر کھینچتے ہوئے آہستہ سے کہا "آپ کو پسند نہ آئے گی" اب سنیاسی خاموش نہ رہ سکا۔ بولا، "اوشا دیوی یہ صرف تمہارا ہی امتحان نہیں ہے۔ ہمارا بھی امتحان ہے، گرو کی بات کی لاج رکھ لینا۔

اوشا نے اپنی کاپی کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھا، کیا سناؤں، وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکی ناچاری اور بے بسی سے بولی "کیا سناؤں"

کچھ سنا دو، مصری ہر طرف سے میٹھی ہوتی ہے۔

راج کماری نے ہمت کر کے کہا "شاعری پر کچھ لکھا ہے۔ وہی سنا دیتی ہوں۔"

اس نے بولنا چاہا، زبان نہ کھل سکی۔ مہاراج نے سنیاسی سے کہا "آپ ہی پڑھ دیں" سنیاسی نے کاپی اٹھائی، اور پڑھنے لگا۔ جس کا مطلب یہ ہے۔

"شاعری کا شاعر سے وہی تعلق ہوتا ہے جو نئی نویلی دلھن کا اپنے خاوند سے، خاوند اپنی رفیقۂ حیات کو چھونا۔ پکڑنا، اس سے ہم آغوش ہو جانا چاہتا ہے، لیکن نئی نویلی دلھن شرماتی ہے۔ اپنے آپ کو بچاتی، اور ایک طرف بھاگ جاتی ہے۔ شاعری کی بھی ہو بہو یہی حالت ہے۔ وہ کبھی تو شاعر کے سامنے خادمہ کی طرح سر جھکا اور ہاتھ جوڑ کر خاموش کھڑی ہو جاتی ہے، کبھی اس کی طرف دیکھکر بے ادب لڑکی کی طرح ہنستی ہے۔ کبھی شرم سے منہ چھپا لیتی ہے اور کبھی جب شاعر اس کے نزدیک پہنچ جاتا ہے تو چنچل ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی دور نکل جاتی ہے۔ کبھی ذرا سی بات میں بگڑ جاتی ہے اور کبھی بے تکلفی سے دونوں بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیتی ہے"۔

راج کماری یہ شاعری کتنی منوہر، پُر اثر اور کس قدر سادہ تھی، اس میں کوئی پیچیدگی نہ تھی؛ اور نہ گورکھ دھندے کی طرح مشکل۔ جس کے سمجھنے کے لئے گھنٹوں حیران ہونا پڑے۔ نیا اور اچھوتا خیال تھا۔ اس میں رفعت تھی، غیر فطری جذبے کا اس میں شائبہ تک نہ تھا۔

اگر کوئی اور شاعر ہوتا تو مہاراج اسے مالا مال کر دیتے، مگر بیٹی کی لکھی ہوئی محبت اور حسن کی اس امر کہانی کو سن کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ سوچنے لگے۔ یہ کنواری لڑکی مرد اور عورت کی پیار اور محبت کی باتیں کیا جانے، اس نے یہ نظارے کہاں دیکھے، راجہ کے دل میں شبہ پیدا ہوا، اس نے نوجوان سنیاسی کو چبھتی ہوئی نگاہ سے دیکھا، اور صورت حالت کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا، کیا سونا بھی آگ میں پڑ کر کھوٹا ہو گیا، مگر سنیاسی ہنس رہا تھا، اس کے چہرے پر ذرا بھی خوف نہ تھا، اس کی آنکھوں میں ذرا سا بھی خجالت اور ندامت کا جذبہ نہیں تھا، مہاراج حیران تھے اور سوچ رہے تھے، اس چہرے پر گناہ کی آلودگی نظر نہیں آتی، یہ پاپ تیرھی آنکھ کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا، نہ اس میں ہنسنے کی جرأت ہو سکتی ہے، تو پھر اتنا نے مرد و عورت کے نازو نیاز کے جذبات کیونکر نظم کر لئے، مہاراج کچھ دیر بیٹھے بیٹھے سوچتے رہے، پھر اٹھے اور آہستہ آہستہ بغیر کچھ کہے سنے چلے گئے۔۔ ۔۔۔۔۔ سنیاسی مہاراج کے من کی بات سمجھ گیا۔

دوسرے دن مہاراج نے سنیاسی کو رخصت کرنے کے لئے دربار میں طلب کیا، اشرفیوں سے بھرا ہوا تھال اس کے سامنے پیش کیا، اور ہاتھ جوڑ کر بولا "یہ آپ کی نذر ہے" سنیاسی نے اشرفیوں کے تھال کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور بولا "راجن تو شاعروں میں راجا اور راجاؤں میں شاعر ہے، یہ حقیر نذر تیرے سے راجہ کی شایان شان نہیں"۔

مہاراج نے تعجب کی نگاہ سے سنیاسی کی طرف دیکھا، سنیاسی مسکرا رہا تھا۔۔۔۔

"ہم منہ مانگی مراد چاہتے ہیں"

مہاراج نے ندامت سے سر جھکا لیا اور بولا "سنیاسیوں کے راجہ حکم کیجئے، میں بجا لاؤں گا"۔

دربار میں سناٹا چھا گیا، لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ دیکھیں سنیاسی کیا مانگتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد سنیاسی بولا "راجہ اپنی کوئی نظم سناؤ۔۔۔ ہماری یہی نذر ہوگی"۔

درباریوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، وہ دل میں سوچتے تھے، سنیاسی نے سنہری موقع ہاتھ سے کھو دیا۔

مہاراج نے پوچھا کس مضمون پر؟

"کسی غریب کی جھونپڑی کا نظارہ کھینچ دے"!

مہاراج نے بھوج پتر اٹھایا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد نظم تیار ہو گئی۔

مہاراج نے نظم پڑھنی شروع کی جس کا مطلب یہ ہے۔

"برسات کا موسم ہے، آسمان پر کالے کالے بادل منڈلا رہے ہیں، مگر ان سے بھی زیادہ گہرے بادل غریب بڑھیا کے دل پر چھائے ہوتے ہیں، آسمان کے بادلوں میں کبھی کبھی بجلی تو چمک جاتی ہے، مگر بڑھیا کے ظلمتکدے میں ابدی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔

چھت سے پانی ٹپک رہا ہے اور اس ختم نہ ہونے والے ٹپکے سے بڑھیا کے مکان کے فرش میں جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے ہیں، پانی کی بوندیں گڑھوں میں گرتی ہے تو گڑھوں کا پانی چاروں طرف اچھلتا ہے اور اس پاس کے فرش کو بھی گیلا کر دیتا ہے مگر ان سے بھی زیادہ گہرے گڑھے بڑھیا کے دل میں پڑے ہوئے ہیں جو سالہا سال سے بھرنے ہی میں نہیں آتے۔

شام ہونے لگی، اندھیرا ہو چلا ہے، لوگ اپنے اپنے گھروں میں چراغ جلا رہے ہیں، مگر بڑھیا کے چراغ کا تیل کئی روز ہوئے ختم ہو چکا ہے، اور چراغ کی بتی اس کے روکھے بالوں کی طرح خشک ہو گئی ہے۔

اس کے چولھے میں کئی دن سے آگ نہیں جلی، وہاں مکڑی نے جالا تان دیا ہے، اس کے گھر کے چوہے بھاگ گئے ہیں اور چمگادڑ ادھر ادھر اڑتے پھرتے ہیں"۔

یہ شاعری نہ تھی، کسی بدقسمت کے اجڑے ہوئے گھر کا نقشہ تھا جو آنکھوں کے سامنے رہا تھا، کس قدر اصلیت کے نزدیک اور دل ہلا دینے والا مرقع تھا، درباریوں نے "واہ واہ" کے شور سے دربار سر پر اٹھا لیا۔

نوجوان سنیاسی خاموش تھا۔

مہاراج نے اس کی طرف دیکھا، سنیاسی نے کہا "تیری شاعری خوبصورت احساسات سے پر ہے، مگر۔۔۔"

راجہ، وزیر اور درباری تمام سنیاسی کی طرف دیکھنے لگے، سنیاسی نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تو شاہی نسل سے نہیں، کسی کنگال اور بھک منگے کا بیٹا ہے۔

دربار میں سناٹا چھا گیا، مہاراج کی آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں، انہوں نے تلوار کی میان پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "سنیاسی یہ بے عزتی میں کبھی گوارا نہیں کر سکتا، تو مجھے گالیاں دے رہا ہے"!

"اگر تو راجہ کا بیٹا ہے تو تو نے یہ نظم کس طرح تیار کر لی، راجہ ہو کر کسی غریب کے گھر کا حال تجھے کیا معلوم"

مہاراج نے غصہ سے بھرے ہوئے لہجہ میں کہا "شاعرانہ بصیرت کے ذریعے شاعر وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے جو دوسرے لوگ کھلی ہوئی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھ سکتے"۔

سنیاسی نے طنزیہ کہا "شاعر اعظم بالکل بجا فرماتے ہیں" اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا "اگر تو راجہ کا بیٹا ہو کر شاعرانہ بصیرت کے ذریعہ سے غریب کے گھر کا دل دہلانے والا نظارہ دیکھ سکتا ہے تو کیا تیری کنواری لڑکی مرد و عورت کی محبت کا حال نہیں معلوم کر سکتی؟"

تو نے مجھے اشتباہ کی نگاہ سے دیکھا، اسی روز تیری آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں، تو نے سمجھ لیا کہ سنیاسی کو اپنے حواس خمسہ پر قابو نہیں، تیرا یہ خیال باطل ہے، میں سنیاسی ہوں، دنیا کی ہر ایک لڑکی میری بیٹی ہے"۔

مہاراجہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا، "مہاراج میں غلطی پر تھا"۔

جاہل، نادان کہیں کا، شاعر اعظم کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ حواس خمسہ کے واسطے فنون لطیفہ کی سرشاری مصنوعی طریقوں سے پیدا کی ہوئی بے خبری کے مقابلے میں کہیں زیادہ کیف آور اور وجد آفریں ہوتی ہے"!

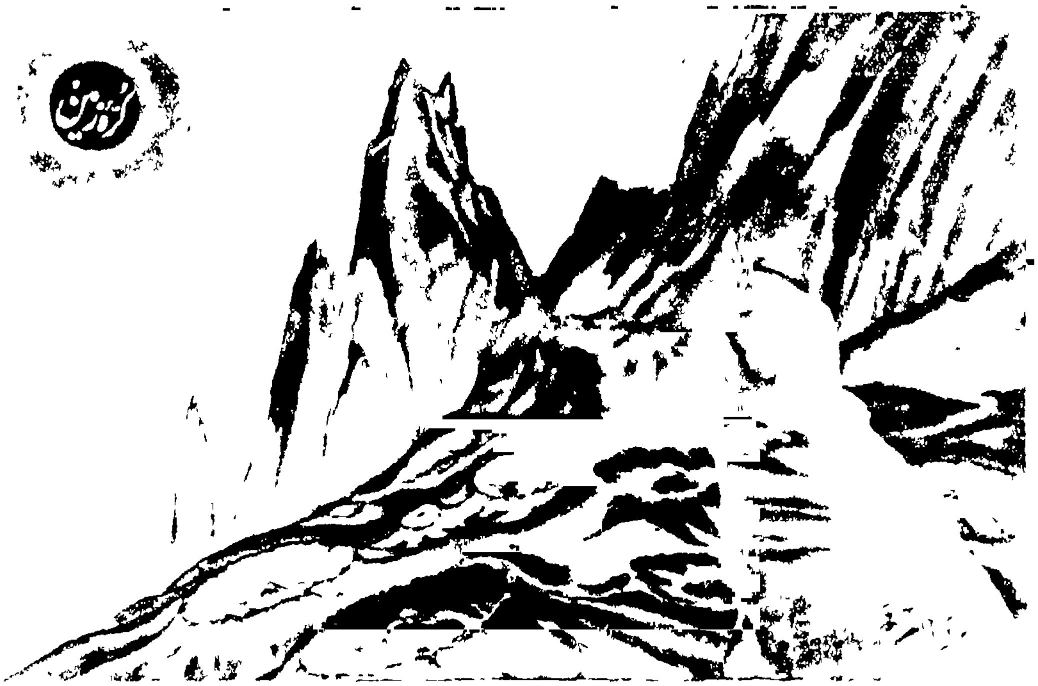
یہ الفاظ بڑبڑاتے ہوئے سنیاسی نے اپنی تونبی اٹھائی اور دربار سے باہر چلا گیا۔

راجہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا (ترجمہ از ہندی) (شمو)

کلیم دہلی



Lighting Time



چاند کے پانچ پانچ میل اونچے پہاڑ چاند پر سے آپ کی زمین ستارے کی طرح
چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے



چاند کی سطح جوکہ بذریعہ دوربین دکھائی دیتی ہے۔ آپ کی زمین بھی دور خلا میں
دیگر ستاروں کی مانند چمک رہی ہے

کرۂ ماہ پر زندگی کے آثار

علم نجوم کے مشہور ماہر اور ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے سابق پروفیسر مسٹر ڈبلیو۔ ایچ۔ پکرنگ نے پچھلے دنوں یہ دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے کرۂ ماہ پر زندگی کے آثار دریافت کرلئے ہیں لیکن یہ آثار ابھی صرف جمادات اور نباتاتی زندگی تک محدود ہیں۔ حیوانی زندگی کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ چاند کی دنیا اگرچہ سالہا سال سے ماہرین سائنس کی تحقیقاتی سرگرمیوں کا مرکز بنی ہوئی ہے پھر بھی اس کے متعلق معلومات کا کوئی بہت بڑا ذخیرہ ہاتھ نہیں آیا ہے۔ لیکن کام جس منظم طریقہ پر جاری ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کم از کم دو سیارے یعنی مریخ اور چاند کے تمام حالات ہم پر بہت جلد منکشف ہو جائیں گے۔ ہر پانچ سال کے بعد دنیا کے ماہرین نجوم کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوا کرتی ہے اور تحقیقات و مطالعہ کے لئے چاند کی سطح کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کرکے ایک ایک حصہ ان سائنس دانوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، جنھوں نے چاند کے مطالعہ کو اپنی تحقیقاتی جدوجہد کا خاص موضوع بنا لیا ہے۔ اب تک جو کچھ معلوم ہوا ہے اس کو سمجھنے کے لئے چاند کا مختصر سا بیان ضروری ہے۔

زمین کا تعلق چاند سے ویسا ہی ہے جیسا کسی شہر کا تعلق مضافاتِ شہر سے۔ اگر کسی وقت میں زمین سے چاند تک آمد و رفت ممکن ہوئی اور ان دونوں سیاروں کے درمیان کاروباری سلسلہ جاری ہو گیا تو جیسا کہ مسٹر ظلیمی ریون کہتے ہیں، چاند سے جو تجارتی مال زمین کو آئے گا اس پر درآمد کا ٹیکس عاید کرنا ہوگا۔ بہرحال سردست یہ خیالات سائنس دانوں کی ذہنی بلند پروازی سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ ہمیں تو ان حقیقتوں سے بحث ہے جو معلوم ہو چکی ہیں۔ زمین سے چاند کا فاصلہ ۲۳۸۸۱۰ میل ہے اور یہ پیمائش کوئی خیالی تخمینہ نہیں ہے بلکہ جیومیٹری (اقلیدس) کے اصولوں اور سائنس کے بعض نہایت حساس آلات کے ذریعہ اس فاصلہ کا پتہ لگایا گیا ہے جو اس قدر صحیح اور یقینی ہے، جیسے بمبئی اور دہلی کا درمیانی فاصلہ۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے اس فاصلہ کو احاطۂ خیال کے اندر لانا بہت مشکل ہے۔ اور اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ اگر زمین سے کوئی توپ کا گولہ آسمانی فضا میں پھینکا جائے اور وہ ۵۵۰ گز فی سکنڈ کی تیزی سے مسلسل سرگرم رفتار رہے تو وہ آٹھ روز اور پانچ گھنٹے میں چاند تک پہنچے گا۔ آواز کی رفتار ایسی حالت میں جبکہ ہوا کی حرارت درجۂ صفر (سنٹی گریڈ) پر ہو ۳۶۴ گز فی سکنڈ ہے۔ اس لئے اگر زمین کو چاند سے جدا کرنے والی پوری درمیانی فضا ہوا سے معمور ہو اور اس کی حرارت بھی درجہ صفر (سنٹی گریڈ) پر ہو تو کرۂ ماہ سے کسی پُرزور دھماکے کی آواز زمین تک تیرہ روز اور بیس گھنٹے میں پہنچے گی۔

جسامت میں چاند ہماری زمین کا انچاسواں (۱/۴۹) حصہ ہے۔ یعنی اگر ۴۹ چاند اکٹھے کئے جائیں تو زمین کے برابر کوئی سیارہ بنایا جا سکے گا۔ اسی طرح چھ کروڑ بیس لاکھ چاند کے جمع ہونے سے آفتاب کی جسامت پوری ہو جائے گی۔ اور اگر کوئی شخص آفتاب سے چاند تک سفر کرنا چاہے تو اس کو ہماری زمین کے برابر تیس پلوں کو عبور کرنا ہوگا۔ چاند سے ہماری قربت نے ہمیں اس لائق کر دیا ہے کہ اس کا جغرافیائی نقشہ ہم کامل صحت کے ساتھ تیار کر لیں۔

طاقتور دوربینوں کے ذریعے چاند کے مسلسل مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی صورت اور ہیئت وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ کسی زمانے میں چاند کا نقشہ ایک دھندلی سی انسانی شکل کے سایہ سے ملتا جلتا تھا اور اسی لئے صدیوں تک

کسی حسینہ کی تصویر، یا حُسن و صباحت کی دیوی کا تخیّل چاند کے ساتھ وابستہ رہا۔ قدیم مصر اور یونان کے دیوتاؤں اور دیویوں کی فہرست میں چاند کا جو درجہ ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ لیکن اب چاند کی صورت بالکل بدل گئی ہے۔ مُنہ اور آنکھوں کے جو حصے تھے وہ وسیع میدان اور صحرا بن گئے ہیں۔ زنخدان اور رخساروں نے بڑے بڑے پہاڑوں کی شکل اختیار کر لی ہے اور اب آسمانی فضا میں ایک دوسرا کرۂ زمین ہمارے سامنے ہے۔

کرۂ ماہ میں جو بڑے بڑے غار نظر آتے ہیں اُن کی گہرائی میں دس دس بارہ بارہ میل اور چوڑائی ساٹھ سے ایک سو بیس میل تک ہے۔ دُوربین کے ذریعہ چاند کا نظارہ انسان کو ایک حیرت انگیز دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ جہاں عظیم الشان پہاڑوں کے سلسلے، سربلند نکیلی چٹانیں۔ گہری وادیاں، اور بڑے بڑے ہیبت ناک شگاف تمام سطح ماہ پر پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اُن کے علاوہ وہ متعدد وسیع خطّے ہیں جن کا رنگ مٹیالا اور سُرمئی ہے جن کو ماہرین سائنس نے "سمندروں" کا نام دیدیا ہے۔ مثلاً بحرِ طوفان، بحرِ خاموش۔ بحرِ خلیج وغیرہ۔ لیکن اُن کی نوعیت اور حالت اب تک پردۂ راز میں ہے، اور کوئی سائنس داں یہ دریافت نہیں کر سکا ہے کہ چاند کے ان بڑے بڑے "دھبوں" کی حقیقت کیا ہے۔ پچھلے دنوں یہ نظریہ بھی ترک کر دیا گیا ہے کہ یہ سُوکھے ہوئے سمندر ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ کرۂ ماہ پر جتنے کوہستانی سلسلے نظر آتے ہیں وہ سب کے سب یا زیادہ تر گول ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام بطلیموس رکھ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ چاند کے اس سب سے بڑے پہاڑ کا وجود بطلیموس ہی نے دریافت کیا تھا۔ اس کا قطر ۱۱۵ میل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند کے یہ تمام مدوّر پہاڑی سلسلے ایک بڑی زنجیر میں منسلک ہیں۔ اور اس کی سطح پر جو دائرے دکھائی دیتے ہیں وہ اس امر کا ثبوت ہیں کہ یہ پہاڑ کسی وقت میں کوہ آتش فشاں تھے جو اب ٹھنڈے ہوگئے ہیں اور صرف اُن کے اُونچے اُونچے گول دہانے باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن ماہرینِ سائنس ابھی اس نظریے پر متفق الرائے نہیں ہیں۔

چاند کے متعلق گذشتہ پنج سالہ تحقیقاتی کانفرنس میں مسٹر پکرنگ کو (جن کا تذکرہ اس مضمون کے ابتدائی حصے میں آچکا ہے) چاند کا وہ کوہی خطہ تحقیقات و مطالعہ کے لئے دیا گیا تھا جو "ایرو ٹوس تھینس" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بھی ایک پہاڑ ہے جس کا موجودہ وسیع دہانہ کسی زمانے میں اس کے کوہ آتش فشاں ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس کا قطر ۴۰ میل ہے اور اُس کے دہانے کی دیواریں سات ہزار فٹ اونچی ہیں۔ مسٹر پکرنگ نے اس حصۂ ماہ کے مسلسل مطالعہ اور گہری تحقیقات کے بعد یہ پتہ لگایا ہے کہ "ایرو ٹوس تھینس" کی وادیوں میں نباتاتی زندگی موجود ہے۔ ان میں سرسبز درخت اور لہلہاتے ہوئے سبزہ زار دکھائی دیتے ہیں۔ ایک برطانوی سائنس داں مسٹر گیرلڈ ہارڈ نے بھی نہایت طاقتور دُوربینوں کے ذریعہ اس منظر کو دیکھ کر مسٹر پکرنگ کی دریافت کی تصدیق کی ہے اور یہ سوال پیش کیا ہے کہ کیا کرۂ ماہ میں زندگی و حیات کے آثار موجود ہیں؟

ایک سبب جس کے باعث اب تک یہ خیال کیا گیا ہے کہ کرۂ ماہ پر زندگی ناممکن ہے، یہ ہے کہ وہاں ہلکی سے ہلکی ہوا بھی موجود نہیں ہوتی۔ بڑی سے بڑی دوربین بھی چاند کے کناروں پر کسی چیز میں خفیف سے خفیف حرکت کا بھی منظر پیش نہیں کرتی۔ اگر اس کُرہ میں ہوا موجود ہوتی تو چاند کے اُفق پر جتنے ستارے ہیں وہ ہوا کی حرکت کے باعث جھلملاتے ہوئے نظر آتے: لیکن وہاں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام ستارے قطعاً ساکن ہیں، اور کسی تختی پر جڑ دیئے گئے ہیں۔

دوسرا سبب چاند پر کسی ذی روح ہستی کے نہ ہونے کا یہ بتلایا جاتا ہے کہ جب وہاں "رات" ہوتی ہے یعنی آفتاب کی شعاعیں چاند پر نہیں پڑتیں تو کرۂ ماہ کی برودت سنٹی گریڈ مقیاس الحرارت کے درجۂ انجماد سے ۲۷۰ ڈگری نیچے ہوتی ہے ہم زمین والوں کے لئے اس سردی کا تصور ممکن نہیں ہے۔ کسی قدر اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ قطبِ شمالی کے خطّہ میں بھی جہاں رگوں میں خون کو منجمد کرنے والی ٹھنڈ پڑتی ہے سردی کا درجہ ۵۰ ڈگری سنٹی گریڈ سے نیچے نہیں ہوتا۔ تمام گیسوں میں ہیلیم (HELIUM) سب سے زیادہ ہلکی گیس سمجھی جاتی ہے۔ لیکن کرۂ ماہ کی سردی کی شدت اس کو بھی فوراً استعمال کرکے منجمد کر دے گی۔ ظاہر ہے کہ "انسان" یا اس طرح کا کوئی جاندار وہاں پہنچکر کیوں کر زندہ رہ سکتا ہے؟ شدتِ سرما سے اس کی موت اس طرح واقع ہوگی کہ اُس کے تمام بدن پر چھالے پڑ جائیں گے اور ایسا معلوم ہوگا کہ وہ آگ سے جل کر مرا ہے۔

لیکن یہ تو چاند کی سردی اور رات کا حال ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب

چاند پر "دن" ہوتا ہے اور آفتاب کی شعلہ بار کرنیں براہ راست اس پر پڑتی ہیں تو وہاں کا کیا حال ہوتا ہے؟ اوپر کہا جا چکا ہے کہ زمین کی طرح چاند کے چاروں طرف ہوا محیط نہیں ہے، اس لئے سطح ماہ اور آفتابی شعاعوں کے درمیان کوئی "پردہ" حائل نہیں۔ آفتاب کی تمام "ایکس ریز" اور ماورائے بنفشی شعاعیں اپنی پوری تمازت حدت و حرارت کے ساتھ ایک ایسی درمیانی فضا سے گزرتی ہوئی جہاں ہوا یا اُن کی حرارت کو جذب یا کم کر دینے والی کوئی چیز نہیں ہے، سیدھی چاند پر آتی ہیں۔ ایسی حالت میں یقینی ہے کہ یہ زندگی اور اس کی وہ شکلیں جو ہمارے پیش نظر ہیں چاند پر کسی صورت "دن" کو کبھی قائم نہیں رہ سکتیں۔

چاند کی اصلی حیثیت مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ وہ ایک سُونی ہوئی دُنیا ہے جہاں بظاہر خاموشی اور جمود کا عالم طاری ہے۔ اس "سرزمین" پر پانی نہ ہوا ہے، نہ نیلگوں آسمان ہے۔ نہ یہ رنگین فضا ہے۔ نہ کسی طرح کی آواز ہے، اور نہ ہماری دُنیا کی طرح وہاں کے ذرات میں باہم کشش موجود ہے۔ نہ وہاں آندھیاں آتی ہیں، نہ طوفان بپا ہوتے ہیں۔ اور وہ خوبصورت اور ٹھنڈی روشنی والا سیارہ جو سائنس کی اصطلاح میں زمین کی بیٹی ہے اور جس کو یونان و روما کے شعراء نے ڈائنا کی دوشیزگی اور حُسن اور خوبی کی رعنائی و دلربائی کا مجسمہ قرار دیا ہے اپنی مادر مشفقہ یعنی زمین سے زیادہ کہن رسیدہ ہے۔ کم از کم اس اعتبار سے کہ اس نے اپنی زندگی کی طاقتوں کو بہت زیادہ تیزی سے صرف کر دیا ہے۔ اور اُس کے جسم اور چہرے پر بڑھاپے کے آثار نمایاں ہو گئے ہیں۔

لیکن اگر چاند کے مذکورہ بالا حالات مستقل ہوتے اور اُن میں کبھی کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تو جہاں تک اپنی دنیا سے باہر دوسری دنیاؤں میں زندگی و حیات کے آثار تلاش کرنے کی عملی سرگرمیوں کا تعلق ہے ہمیں چاند کی طرف سے قطعاً مایوس ہو جانا پڑتا۔ لیکن قدرت کی کارفرمائیاں غیر محدود ہیں اور چاند کی جغرافیائی اور طبقاتی حالتوں میں ہمیشہ تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ بڑے بڑے طبقے ٹوٹ ٹوٹ کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی اونچے پہاڑ دفعتاً گہری وادیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کبھی چاند کی سطح پھٹ جاتی ہے اور لمبے لمبے شگاف اور درے اس کی "زمین" کو چیر ڈالتے ہیں۔ مختصر یہ کہ چاند کی دنیا بھی تغیر و انقلاب سے خالی نہیں ہے اور فطرت کا وہ عالمگیر قانون جسے "حرکت" کہتے ہیں وہاں بھی جاری و ساری ہے۔

چاند پر بعض چیزوں کا متحرک نظر آنا ہی وہ ذریعہ تھا جس نے پکرنگ اور دوسرے ماہرینِ سائنس پر یہ ثابت کیا کہ وہاں نباتاتی زندگی موجود ہے۔ کیونکہ "ایروٹوس تھینس" کی وادیوں میں ان کو جو حرکت نظر آئی ہے وہ پودوں اور درختوں کی نشوونما کی حرکت تھی۔ اپنی دنیا میں نباتات کے بڑھنے کی حرکت ہم نہیں دیکھ سکتے لیکن چاند کی دنیا میں درخت اس قدر تیزی سے بڑھتے ہیں کہ اُن کا نشوونما پانا، پھیلنا اور بڑھنا صاف دکھائی دیتا ہے۔ غالباً یہ وہ درخت ہیں جو چاند کی غیر معمولی حرارت و برودت کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

اسی دریافت کا نتیجہ ہے کہ اپنے سلسلۂ خیال کو ذرا آگے بڑھا کر ہم کرۂ ماہ پر حیوانی زندگی کا تخیل بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ زندگی و حیات کے اس تخیل کی بنا پر ہے جو زمین پر بسنے والے انسان سے وابستہ ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ چاند کی دنیا میں بھی اگر زندگی و حیات موجود ہو تو اُس کی شکل و صورت بھی وہی ہو جو ہم دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ چاند کی سردی و گرمی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم صرف اسی فیصلے پر پہونچ سکتے ہیں کہ ہماری دنیا کے انسان و حیوان وہاں زندہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چاند پر حیات کی کوئی دوسری شکل و صورت نہیں ہو سکتی۔ فطرت کے طریقہائے عمل غیر محدود ہیں۔ اور اپنے نتائج میں اس قدر پیچیدہ اور حیرت انگیز ہیں کہ چاند پر زندہ ہستیوں کے وجود کا امکان کبھی خارج از بحث نہیں ہو سکتا۔ جب چاند پر ایسی نباتاتی زندگی کا بیّن ثبوت موجود ہے جو اسی سیارے کی حرارت و برودت میں تربیت پاتی اور بڑھتی ہے تو بہت ممکن ہے کہ وہاں ایسی ذی روح ہستیاں بھی موجود ہوں جن کے دماغ ہم سے جداگانہ ہوں جن کی حیات ایسی خلیوں (CELLS) سے پیدا ہوئی ہو جو اپنے اثر اور نوعیت میں کسی دوسری قسم کی ہوں اور جن کے اعضاء نہ صرف یہ کہ ہمارے اعضاء سے مختلف ہوں بلکہ وظائف اعضا بھی اس طرح کے ہوں کہ اُن کو "دن" کے وقت آفتاب کی جلا دینے والی شعاعوں سے اور رات کو زمہریری سردی سے محفوظ رکھ سکیں۔ اب جبکہ "راکٹ" طیارہ کے ذریعے چاند تک پہنچنے کی پُرزور کوششیں کی جا رہی ہیں دنیا کرۂ ماہ پر حیوانی زندگی کے متعلق مزید انکشافات کی منتظر ہے۔ کس کو معلوم ہے کہ فطرت کے کون کون سے سربستہ راز آئندہ ہم پر منکشف ہونے والے ہیں۔

وطن کا سپاہی

تڑپتا ہے نگاہوں میں مہر تاباں اُن نگاہوں سے
تری تقدیر کو گرتے ہیں ستارے ٹپکا ہیں سے

تو وہ صمصام ہے خنجر کی آتش خیز دھاروں پر
طواف چرخ کرتی ہے زمیں تیرے اشاروں پر
ترا انداز شمشیر زندہ کن تیغ مصاف ہے
شہنشاہ وفا ہے تو کریم تیرا اصطاف ہے
تری وارستہ دلی میں فولادِ شل نہیں ہوتا
تو وہ مغرور ہے جھکو غم سے حل نہیں ہوتا

تری انصاف کوشی چرخ کو جھکنا سکھاتی ہے
تری زندہ دلی راہ ظفر مندی بتاتی ہے
ترے جذبات کی محفل میں سطوت رقص کرتی ہے
ترے دل میں عروج فلک پا نیہا سفر کرتی ہے
تری تحریک ہے آئینہ نیرنگی غربت
ترے ارشاد کی مضمون ہے رفتار صورت
ترے احساس کی تفسیر عشق العنانی ہے
ترے دم سے رگِ تعمیر میں شعلہ روانی ہے
وجود عمر کی جانسوزی نظر نزول کی تو نے
گرہ جو رشتہ دل میں پڑی تھی کھول لی تو نے

ترے ایثار کی تجدید میں رخنے نہیں پڑتے
ترے دار الہم میں موت کے تارے نہیں ٹوٹتے
نقوشِ منزل تو چومتے ہیں پائے اقدس کو
حرارت کوشش کرتی ہے تحسین تیری لن لن کو
تجھے آزار تخریب وطن سونے نہیں دیتا
ترے گلشن کو یہ کھا فریبا ہونے نہیں دیتا
تو اسرار درون کاوشِ پیہم سمجھتا ہے
ظہور جوشش فوری سے تیرا جی الجھتا ہے
تجھے محبوب ہیں سعیِ مسلسل کی ادائیں
تری فطرت سے ہوتی ہیں کشمکش کی قضائیں
تجھے آغوش میں بٹھلائے رکھتی ہے رواداری
تری نظروں کے دامن میں چھپی رہتی ہے غمخواری
تری معراج پیرائی نوازِ چرخ بے جا ہے
زمانہ تیرے اک اک لفظ پر کروٹ بدلتا ہے
قفس کا ذرہ ذرہ تجھ سے بجتا ہے تابستاں
تری تقریر میں مضمر ہے ذوقِ دشنۂ براں
تماشوں کو تو نے قوتِ گویائی بخشی ہے
حجاب افروز آہوں کو فلک پیمائی بخشی ہے

بعید جستجو ہے تیرے احساسات کی منزل — تری سرگرمی جاں بخش نے حد توڑ کر رکھدی
ترے نزدیک ابھی تک تنگ ہے آفات کی منزل — دلِ پُرجوش سے تو نے ارادت جوڑ کر رکھدی
نگاہِ جلوہ بیں کو ترجمانِ حق کیا تو نے
دلِ عوام سادہ خو کو مٹھی میں لیا تو نے

آر۔ پی۔ لبسل

نقد و نظر

(کتب)

انقلابِ روس

مصنفہ:- جناب کشن پرشاد صاحب کول، ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی
قیمت:- دو روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ:- ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد

یہ ضخیم کتاب جو بڑے سائز کے ۵۰۲ صفحات پر مشتمل ہے، روس کے عصر جدید کی کایا پلٹ کی داستان ہے۔ متعدد مغربی مصنفوں کی کتابوں سے مدد لے کر کافی تحقیقات و مطالعہ کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ اور انقلابِ روس کے ابتدائی زمانہ سے لے کر موجودہ دور تک ملک کی حالت پر پوری روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں روس کے دستورِ حکومت آئین و قوانین ملکیت و زراعت، صنعت و حرفت، تعلیم، مذہب اور طرزِ معاشرت کے متعلق بھی مفید معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ روس کا انقلاب جدید دَور کی سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز ہے۔ لیکن اردو میں اُس کے متعلق لٹریچر کی بڑی کمی ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی نے یہ کتاب شائع کر کے اردو لٹریچر میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ "انقلابِ روس" کی طباعت نہایت اچھے اور خوشنما ٹائپ میں ہے جو لیتھو کے حامیوں کے لئے ایک چیلنج ہے۔

زادِ راہ

مصنفہ:- جناب منشی پریم چند صاحب
ناشران:- حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی
ملنے کا پتہ:- حالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب گھر دہلی۔

ادارۂ کلیم

"زادِ راہ" ملک کے فاضل ادیب اور مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مصنف کا نام ہندوستان کی ادبی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں ہے اور اس ملک کا کوئی ایسا وقیع اردو یا ہندی رسالہ نہیں ہے جس میں منشی پریم چند کے افسانے شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل نہ کر چکے ہیں۔ مختصر افسانہ نگاری منشی صاحب کا خاص حصہ ہے۔ اور "زادِ راہ" میں جتنے افسانے درج ہیں سب دلچسپ اور اخلاق آموز ہیں۔ منشی پریم چند کے افسانوں کی خصوصیت وہ سلیس اور عام فہم زبان، اور سادہ و صاف طرزِ نگارش ہے جس نے ہندوستانی افسانہ نگاری کے میدان میں ایک نئی داغ بیل ڈالی ہے۔ مختصر افسانوں کے شائقین اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔

مسولینی فاسسٹ اور جنگِ حبش

از خواجہ احمد عباس صاحب حجم ۴۸ صفحہ قیمت ۸ر
ملنے کا پتہ:- حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی و کلیم بک ڈپو گلی کندلکشان فتح پوری دہلی۔

اس کتاب میں اُس لوہار کے لڑکے کی داستان ہے جو معمولی حیثیت سے ترقی کر کے آج سلطنتِ اٹلی کا ڈکٹیٹر بنا ہوا ہے۔ انجمن اقوام جیسی ذمہ دار جماعت بھی اُس کو جابرانہ اقدام کا ملزم قرار دیتے ہوئے اُس کا بال نہ بیکا کر سکی۔ ایسی عجیب و غریب ہستی کے آہنی استقلال اور اُس کی زندگی کے حالات خالی از دلچسپی نہیں ہو سکتے۔ اس کتاب میں اٹلی اور حبش کے تمام واقعات پر نہایت واضح طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ فاشی نظامِ حکومت اور جنگِ حبش پر بھی سبق آموز نوٹ ہیں۔ کتابت و طباعت عمدہ۔

محمد علی

از خواجہ احمد عباس۔ ضخامت ۲۰۴ صفحہ قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی

یہ کتاب اسلام کے اس جانباز سپاہی اور قوم پرست شاعر کی سوانحعمری ہے جس نے بسترِ مرگ پر پڑے پڑے اپنے ملک کی آزادی کے لئے جان توڑ کوشش کی۔ پیدائش اور ابتدائی تعلیم سے لیکر گول میز کانفرنس کے حادثہ تک تمام واقعات نہایت سلیس اور شگفتہ زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ "مادرِ ہند کے سپوت" کے نام سے جو سلسلہ حالی پبلشنگ ہاؤس نے شروع کیا ہے یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ امید ہے کتابوں کا یہ سلسلہ ہمارے ہندی نوجوانوں کے لئے شمعِ ہدایت کا کام دے گا۔ کتاب کے شروع میں مولانا کی ایک پنسلی تصویر کا بلاک بھی چھاپا گیا ہے۔

جاپان

مصنفہ چمن لال جرنلسٹ۔ مترجمہ محمود علی خاں صاحب جامعی

ناشران۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

قیمت غیر مجلد عہ/

سب سے پہلے روس اور جاپان کی لڑائی کے دوران میں جاپان نے اپنی طرف دنیا کی توجہ کو مبذول کیا۔ اس کے بعد کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا ہوتا رہا ہے جس کی وجہ سے جاپان کی ہستی بین الاقوامی سیاسیات میں محسوس کی جاتی رہی ہے اور جب سے اس نے لیگ اقوام سے استعفٰی دیا ہے تب سے تو انگلینڈ اور امریکہ تک اس سے خائف ہو رہے ہیں۔ جاپان کی اس حیرت انگیز ترقی کا راز کیا ہے دنیا اس کے جاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس تجسس کا جواب مسٹر چمن لال کی کتاب میں موجود ہے۔ مسٹر چمن لال خود جاپان کئی مرتبہ تشریف لے جاچکے ہیں۔ اور تمام دنیا کا سفر کرچکے ہیں۔ جاپان میں انھوں نے خود ہر چیز کا مطالعہ کیا ہے یہ کتاب ان کے تجربہ اور سیاحت کا نچوڑ ہے۔

جاپان کی حیرت انگیز ترقی کے راز اُن کی انتہائی جذبہ وطن پرستی، قومی زبان، قومی سیرت، ڈسپلن، لازمی تعلیم، شہنشاہ سے عقیدت، شفقت حکومت، مشترکہ خاندان، دیانت دار اور مطمئن مزدور، کاروبار میں اشتراک عمل، سستی برقی قوت و ذرائع رسل و رسائل، ہر گھر میں ریڈیو، سستے اخبارات، قدرت کی مہربانیاں، اور موت کے کھیل ہیں۔ ان تمام امور پر آپ کو اس کتاب میں مکمل مفصل حالات ملیں گے۔ ان کے علاوہ اُن خصوصیات کا بھی ذکر ہے۔ جو جاپانی تہذیب کا طرۂ امتیاز ہیں، مثلاً نامہ بر کبوتر۔ پریوں کا جلوس، ہندوستانی بہنوں کی عید، جاپانی تھیٹر، چائے کی تقریب۔ دیوداسیاں عورتوں کی کانفرنس وغیرہ وغیرہ

اس کے علاوہ ہندوستانی طلباء کے واسطے جن امورات کا جاننا ضروری ہے وہ سب اس کتاب میں تفصیل سے موجود ہیں۔ اس کتاب کو خریدنے کے بعد جاپان کے متعلق اور کسی کتاب کے خریدنے کی ضرورت نہیں رہتی ہم ہر ہندوستانی سے جو اپنے اور اپنے ملک کی بہبودی کے لئے کوشاں ہے بزور اس کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔

ترجمہ میں روانی اور سلاست پائی جاتی ہے کتاب نہایت ہی خوبصورت اور دلچسپ تصاویر سے مزین ہے۔

کسان

مصنفہ چودھری مختار سنگھ صاحب ایم۔ ایل۔ اے۔ مترجمہ محمود علی خاں صاحب

ملنے کا پتہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

یہ کتاب اس بدنصیب کسان کی بہبودی کے واسطے لکھی گئی ہے۔ جو مقروض پیدا ہوتا ہے مقروض زندگی گزارتا ہے اور قرضدار ہی مرجاتا ہے۔ ہندوستان کی فضائیں آج کل صرف اسی کی گونج ہے۔ وائسرائے سے لے کر گاؤں کے پٹواری تک کو اس کی زبوں حالت پر ترس آرہا ہے معلوم نہیں اس دفتری ہمدردی کا کیا نتیجہ ہو، مگر چودھری صاحب نے "کسان" میں جو اس کے افلاس کے اسباب اور ان کے علاج رقم فرمائے ہیں وہ ضرور قابل توجہ ہیں۔ فاضل مصنف نے کتاب کے تین حصوں میں ان متعدد امور پر مکمل اور مفصل بحث کی ہے۔ جو کہ کسان کے افلاس کا سبب ہوتے ہیں۔ چوتھے حصے میں وہ علاج تجویز کئے گئے ہیں جن کے ذریعے سے کسان

کا افلاس خوشحالی سے بدل سکتا ہے۔ چودھری صاحب خود کاشتکار ہیں اور کسانوں کی تکالیف سے خوب واقف ہیں اس لئے اُن کا علاج یدطولیٰ کا حکم رکھے گا۔ ہماری رائے میں گورنمنٹ ہند کو اس کتاب کی لاکھوں کاپیاں خرید کر دیہات میں مفت تقسیم کرنا چاہیے۔ کسان کی بہبودی کے لئے جس قدر مواد اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے ہندوستان کی کسی اور تصنیف میں موجود نہیں۔

محمود علی خاں صاحب نے ترجمہ پاکیزہ زبان میں کیا ہے۔

تسخیر یاس

قیمت پانچ آنے

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

یہ حصہ مولانا یاس ٹونکی کے ابتدائی کلام کا مجموعہ ہے جو کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ شیخ الجامعہ کے ایما سے جمع کیا گیا ہے۔ مولانا کے طرزِ کلام کے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے کلام میں داغ کی روانی اور مومن کی طرزِ ادا پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی تصوف اور عارفانہ سوزوگداز کی چاشنی بھی موجود ہے۔ بندش کی چستی اور الفاظ کی شوکت سے کلام میں دلچسپی اور وقار پیدا ہوگیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اہلِ ذوق اس مجموعہ سے ضرور لطف اندوز ہوں گے۔

کلامِ جوہر

مصنفہ:۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم

قیمت آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ۔ قرول باغ۔ دہلی

مولانا محمد علی کو جاننے والے زیادہ تر اُن کو اس حیثیت سے جانتے تھے کہ انگریزی بہت اچھی لکھتے اور بولتے تھے۔ سیاست کے ماہر تھے۔ قوم اور مذہب کے فدائی تھے۔ حریت کے پُرجوش علمبردار تھے۔ اور کامریڈ اور ہمدرد کے فاضل مُدیر تھے۔ لیکن ایک بلند پایہ اور خوشگو شاعر کی حیثیت سے اُن کو بہت کم لوگ جانتے تھے۔ مولانا محمد علی کی شاعری کا سرمایہ بہت زیادہ نہ تھا مگر جو کچھ تھا اُس کو مکتبہ جامعہ دہلی نے کلامِ جوہر کے نام سے شائع کر کے اردو لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اس مجموعہ کا دیباچہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے تحریر کیا ہے جس میں خود مولانا محمد علی کے ایک خط کا نہایت دلچسپ اقتباس شامل ہے اور جس سے مولانا کی شعری زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا محمد علی کی شاعری بعض فنی نقائص سے پاک نہ تھی۔ مگر اس شہیدِ حریت کے سینہ میں ایک ایسا دل تھا جس نے اس کے اشعار کو جذبات سے لبریز کر دیا ہے۔ اور اُن پر "ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد" کی مثل صادق آتی ہے۔

کلامِ جوہر میں مولانا محمد علی جوہر کی ایک تصویر ہے۔ ہر اُس شخص کے لئے جو اپنے سینہ کے زخم تازہ رکھنا چاہتا ہے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

نفرت کا بیج

مصنفہ:۔ جناب اشتیاق حسین قریشی ایم اے۔ پروفیسر سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی

قیمت۔ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ قرول باغ۔ دہلی۔

ہندوستان میں آج کل ڈراما نگاری کا فن جس قدر ابتذال کی حالت میں ہے اُس کا بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ سب جانتے ہیں کہ جس فن کو شکسپیر جیسے مفکر و فلسفی اور کالی داس جیسے ادیب و ماہرِ نفسیات نے چار چاند لگائے تھے اس کو آج "تھیٹر" کے ڈراما نگاروں اور "فلم" کے منشیوں نے کس درجہ تباہ و برباد کر دیا ہے۔ "نفرت کا بیج" ایک اخلاقی ڈراما ہے۔ جو خیالات کی ایک بلند سطح پر پہنچ کر لکھا گیا ہے۔ اور سوسائٹی کی اُس حالت کو منظرِ عام پر لاتا ہے جس میں خود غرضیاں دوستی کو بد دلی میں تبدیل کر دیتی ہیں اور دوست ناراض ہو کر نہ صرف دشمن بن جاتے ہیں بلکہ نفرت و عداوت اُن کو ارتکابِ جرم پر آمادہ کر دیتی ہے۔ یہ ڈراما پانچ مجلسوں پر مشتمل ہے اور اُس کا مکالمہ صاف اور سلیس اور عام فہم ہے۔

ضبطِ تولید

مصنفہ:۔ حکیم محمد علی قریشی۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔

قیمت۔ بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر جنسی زندگی۔ قرول باغ نئی دہلی

کرۂ ارض پر انسانی آبادی کا جو روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اس نے ماہرینِ اقتصادیات و معاشیات کو اندیشہ میں ڈال دیا ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ضبطِ تولید کی ایک عالمگیر تحریک کی صورت میں نمودار ہو رہا ہے۔ سوسائٹی کے موجودہ نظام میں سرمایہ اور محنت کا رشتہ بھی بہت نازک ہو گیا ہے۔ اور یہ خیال وسعت اختیار کر رہا ہے کہ جو لوگ مزدوری کرتے ہیں، اور غریب و نادار ہیں ان کو کثرت اولاد سے اپنے افلاس میں اضافہ کرنے کا اور ایسی اولاد پیدا کرنے کا جن کی کفالت خود ان سے لئے ممکن نہیں حق حاصل نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ ضبط تولید کے متعلق دیگر السنہ میں کثرت سے کتابیں شائع ہونے لگی ہیں۔ زیرِ نظر تصنیف حکیم محمد علی قریشی صاحب کی جنسی تالیفات کے سلسلہ کی ایک جدید کڑی ہے۔ جو اپنی نوعیت کی اردو زبان میں بالکل انوکھی کتاب ہے۔ اس میں مانع حمل تدبیروں کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ اور ہندوستان میں ضبطِ تولید کی ضرورت پر فنی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ مسز سینگر، مسز سروجنی نائیڈو۔ اور مہاتما گاندھی کے خیالات پر محاکمہ نہایت پرمعنی ہے۔ اندازِ بیان دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ قابل مصنف نے اس نازک موضوع کو نہایت متانت اور سنجیدگی سے تحریر کیا ہے۔

علمِ بدن

مصنفہ ڈاکٹر ایم لسین صدیقی، میڈیکل پریکٹیشنر ملتان

قیمت فی جلد عہ

علم بدن پر اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں اعضائے بدن کا مکمل حال دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ بچوں کی بیماریاں۔ ہڈی، گوشت، پوست، نروس سسٹم۔ غذا اخراج پیشاب۔ پسینہ۔ سانس۔ اور اشیائے خوردنی کے متعلق ہدایات۔ جسم کے متعلق کارآمد باتیں۔ گھر گاؤں شہر کی صفائی، اتفاقی صدمے اور ان کا فوری علاج۔ زہریلے جانوروں کے کاٹنے کا علاج دوب خانہ، غرض ہر امر کے متعلق ضروری ہدایات دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ ۲۸ تصاویر ہیں جن کی مدد سے مضامین آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ ان تصاویر سے کتاب کی دلچسپی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ ہم پنجاب یونیورسٹی سے پُرزور سفارش کرتے ہیں کہ کتاب ہذا کو طلبائے انٹرنس کے نصاب میں داخل کیا جائے۔

سلطنتِ خداداد

مصنفہ جناب محمود خاں محمود بنگلوری

قیمت تین روپیہ۔

ملنے کا پتہ: محمد سراج الدین نمبر ۲ ڈکینسن روڈ، بنگلور

سلطنتِ میسور کی یہ تاریخ نواب حیدر علی خاں بہادر اور حضرت ٹیپو سلطان شہید کے مفصل اور جامع حالات پر مشتمل ہے جو بڑے سائز کے ۴۴۰ صفحات پر قلمبند کئے گئے ہیں۔ اس میں ان اولوالعزم مجاہدین کے کارنامے جو مختلف کتب تواریخ و فرامین وغیرہ میں بکھرے ہوئے تھے جمع کر کے پیش کئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے ٹیپو سلطان شہید کے متعلق جن حالات کی تحقیقات کی ہے وہ خود مصنف کے الفاظ میں یہ ہیں۔

"سلطان کس شخصیت کا مالک تھا۔ کیسا حکمران تھا۔ کیسا مسلمان تھا۔ کیسا سپاہی اور مجاہد تھا۔ کیسا مدبر تھا۔ کیسا فاضل اجل اور کن اخلاق کا مالک تھا۔ اس کی روزانہ زندگی کیا تھی۔ غیر مسلم رعایا سے کیا سلوک تھا۔ نظام، مرہٹوں اور انگریزوں سے جو لڑائیاں ہوئیں۔ ان کے متعلق صحیح واقعات کیا ہیں، سرنگاپٹم کا قلعہ کیوں چند دنوں میں مسخر ہو گیا۔ اور سلطان کی شہادت کن حالات میں ہوئی؟

جہاں تک ممکن تھا مصنف نے ان سوالات کا جواب تاریخی شہادتوں کی سند سے کافی وضاحت کے ساتھ دیا ہے اور کتاب کے ہر ہر صفحہ سے مصنف کی محنت اور کاوش کا پتہ چلتا ہے۔

نواب حیدر علی، ٹیپو سلطان، قلعہ سرنگاپٹم اور وقت کے بعض دیگر فرمانرواؤں کی تصویریں بھی اس کتاب میں شامل ہیں اور خود مصنف کی ایک تصویر ابتدائی اوراق میں ہے۔ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ محمود صاحب نے یہ کتاب شائع کر کے ادبِ اردو پر عظیم احسان فرمایا ہے۔ تاریخ کے طالب علم اس سے خاص استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ جو مواد اس کتاب میں عرق ریزی کے ساتھ جمع کیا گیا ہے وہ شاید کسی اور کتاب میں مشکل سے دستیاب ہو گا۔ کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ ہے اور کتاب اعلیٰ درجے کے کاغذ پر چھپی ہوئی ہے۔

رسائل

عورت

مرتبہ حکیم حاجی عبدالحمید دہلوی
قیمت :- اعلیٰ ایڈیشن ۱۲ر معمولی ایڈیشن ۸ر رسالہ ہمدرد صحت کے خریداروں کو مفت
ملنے کا پتہ :- ہمدرد منزل - لال کنواں - دہلی

دہلی کے ماہانہ طبی رسالہ ہمدرد صحت کا خاص سالانہ نمبر "عورت" کے نام سے شائع ہوا ہے اور جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت میں اس کے تمام مضامین اسی ایک موضوع سے متعلق ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ فنی حیثیت سے یہ مضامین بلند پایہ اور پُر از معلومات ہیں۔ بلکہ عورتوں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی اُس کے مطالعہ سے بہت کچھ فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ اور بعض مباحث ایسے ہیں جن کا پڑھنا مردوں کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا۔ عورتوں کے اعضا کی مفصل تشریح اُن کے جنسی امتیازات پر مباحث، امراض مخصوصہ نسواں کی تشخیص اور ان کے علاج کے طریقے۔ ضبطِ تولید اور عورتوں کے اعادۂ شباب کے متعلق جدید معلومات۔ اور صحتِ نسواں کے لئے مفید ہدایتیں اس رسالہ کی مخصوص خوبیاں ہیں اس کے علاوہ عورتوں کے وقتی مسائل پر جمعیتہ اقوام اور حکومتِ ہند کی رپورٹوں کے خلاصے بھی شامل ہیں۔ لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر اشرف الحق کا مضمون "عورتوں میں اعادۂ شباب" حضرت فکر کی نظم "عورت" اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کا رشحۂ قلم "عورت پر میرا مضمون" بہت خوب ہیں۔ مضامین کی فہرست طویل ہے "عورت" میں عورتوں کی دلچسپی کے لئے عام فہم مضامین کسی قدر اور زیادہ ہونے چاہیے تھے۔ "عورت" اپنی صوری و معنوی حیثیت میں ایک بلند پایہ تصنیف ہے جس کا ہر گھر میں رہنا اشد ضروری ہے۔

ٹیپو سلطان شہید نمبر

مرتبہ مولوی رکن الدین سالک معتمد بزم ادب۔
حجم ۱۰۰ صفحات - ملنے کا پتہ مولوی رکن الدین سالک معتمد عمومی بنگلور (میسور)

بزم ادب کی طرف سے سلطان (ٹیپو) شہید کی یادگار میں جو جلسہ سلطان کے مزار پر منعقد ہوا اور اس موقع پر جو موثر نظمیں اور دلچسپ مضامین پڑھے گئے انھیں کا مجموعہ اس رسالہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

سُلطان شہید کی تنظیم مملکت - ریاست کے تمدن و معاشرت اور اسبابِ زوال سلطنت خداداد پر جو مضامین لکھے گئے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں سلطان شہید کی زندگی کے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اِن مضامین کے علاوہ چار معرکۃ الآرا نظمیں ہیں جن میں سالک صاحب کی نظم - مرقدِ ٹیپو نہیں ہے یہ تمنائے جہاں خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔

سالک صاحب کی یہ کوشش بھی کہ اُنھوں نے میسور کے مشہور ادبا کا ان مضامین کے ذریعے پہلی بار دنیائے صحافت میں تعارف کرایا ہے قابلِ داد ہے۔ مجموعہ ہذا قابلِ قدر ہے اور ہم سالک صاحب کو اس کامیابی پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

"ادب لطیف" کا افسانہ نمبر

اس اعتبار سے کہ جدید تمدن کے ساتھ ساتھ فن افسانہ نگاری نے بھی اپنا چولہ بدل دیا ہے اور مختصر افسانوں نے ادبی اور سوشل دنیا میں بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ مدیرانِ ادب لطیف کی کوششوں کا وہ نتیجہ جو اس افسانہ نمبر کی صورت میں ظاہر ہوا ہے قابلِ داد ہے۔ اس رسالہ میں ۱۶۰ صفحات پر تقریباً پندرہ ۱۵ افسانوں کے علاوہ فنِ افسانہ نگاری کے متعلق تین چار سبق آموز مضامین اور دو تین منظوم افسانے ہیں۔ افسانہ نگاری کی مبادیات پر پروفیسر غلام محی الدین کا مضمون، اور اردو افسانہ کے متعلق حضرت ماہر القادری کی بحث مفید اور محققانہ ہے۔ چار سہ رنگی تصویریں بھی معیاری ہیں۔

ادب لطیف ترقی کی منازل بڑی سرعت کے ساتھ طے کر رہا ہے۔ ہندوستان کے ادبی اردو رسالوں میں اس نے ممتاز جگہ حاصل کر لی ہے۔ ریاست حیدرآباد اور پنجاب یونیورسٹی سے سکولوں کے لئے منظور کیا جا چکا ہے۔ ہم کارکنانِ ادب لطیف کو ایسے سستے اور بہترین رسالہ کی ترقی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور ہر صاحبِ ذوق سے اس رسالہ کو اپنانے کی پُر زور سفارش کرتے ہیں۔ کتابت و چھپائی دیدہ زیب۔ افسانہ نمبر حسنِ انتخاب اور نفاست کا آئینہ دار ہے۔ قیمت سالانہ ہے افسانہ نمبر ۱۲ر
ملنے کا پتہ - پنجاب بُک ڈپو لاہور

رفتارِ وقت

ادارۂ کلیم

ہسپانیہ میں فاشی طوفان

یورپ میں ہسپانیہ کا شمار "درجہ اول" کی طاقتوں میں نہیں کیا جاتا، اور دولِ یورپ کی باہمی سیاسی کشمکش میں اس کا کوئی حصہ بھی نہیں۔ اگرچہ ہسپانیہ بھی براعظم یورپ ہی کا ایک ملک ہے۔ لیکن اس پیچیدہ زنجیر کی ایک کڑی نہیں سمجھا جاتا جس میں برطانیہ۔ روس۔ جرمنی۔ فرانس، آسٹریا اور اٹلی منسلک ہیں۔ لیکن گزشتہ دس سال کے اندر ہسپانیہ نے ایسے ایسے اندرونی انقلاب دیکھے ہیں کہ حالات کے تیز رفتار تغیر میں یہ کسی ملک سے پیچھے نہیں ہے۔ اور غالباً اس کے مسلسل اندرونی انقلابات ہی نے ابتک اُسے یورپ کی عام سیاسیات میں داخل ہونے نہ دیا۔ جب اپنے جلنے کے لئے اپنی ہی آگ کافی ہو تو پھر پرائی آگ میں کودنے کی فرصت کہاں ملتی ہے۔ پھر بھی یہ ممکن نہیں کہ اس دور میں کوئی ملک باقی دنیا سے قطعاً منقطع اور غیر متعلق ہو کر رہے اور بیرونی حالات سے متاثر نہ ہو۔ مسولینی اور ہٹلر کی حوصلہ افزائیوں کے باعث "فیشزم" (فاشیت) کا بھوت تقریباً نصف یورپ میں سرگرم خرام ہے۔ اور امن کے فرشتہ کا اس طرح تعاقب کر رہا ہے کہ دنیا کا مستقبل خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ چند سال ہوئے ہسپانیہ میں کُشت و خون کی گرم بازاری اور شاہ الفانسو کی معزولی کے بعد ایک جمہوری نظم کی حکومت قائم ہوئی تھی جس میں سوشلسٹ عنصر زیادہ تھا۔ لیکن "سوشلزم" اور "فیشزم" یورپ میں اپنے اپنے تسلط کے لئے برسرپیکار ہیں۔ اور موجودہ حالات یہ نہیں بتلا سکتے کہ بالآخر فتح و نصرت کا سہرا کس کے سر رہے گا۔ (اس کا فیصلہ غالباً آئندہ جنگِ عظیم کے ہاتھ میں ہے) اب ہسپانیہ بھی اسی طرح کی خانہ جنگی کا شکار ہو گیا ہے۔ اور ہزاروں "فاشیوں" نے جن کی تعداد او سوجی طاقت کا ابتک کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکا ہے وقتی جمہوری حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا ہے۔ ہسپانیہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس بردست طوفان کی گرفت میں آ گیا ہے۔ خبروں سے اصلی صورت حال کا پتہ نہیں چلتا۔ حکومت اپنی مضبوطی کا دعویٰ کرتی ہے اور باغی اپنی کامیابی کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فتح و شکست کا پلّہ ابھی دونوں طرف برابر ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ بغاوت ختم ہو گئی ہے اور کبھی سُننے میں آتا ہے کہ حکومت کے طرفدار جمہوریت کو قائم رکھنے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک پیش کر رہے ہیں۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ "فاشی" باغیوں نے برگوس میں ایک فاشی ہسپانوی حکومت بھی قائم کر لی ہے۔ حقیقت غالباً یہ ہے کہ دونوں جماعتوں کے درمیان ایک نہایت خونریز جنگ جاری ہے، دونوں طرف سے گولہ باریاں اور "بم باریاں" ہو رہی ہیں مقتولین و مجروحین کی تعداد کئی ہزار تک پہونچ چکی ہے۔ بعض صوبوں پر باغیوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اور بعض ابھی تک وقتی حکومت کے تحت میں ہیں۔ ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہسپانیہ بھی "فاشیت" کی آغوش میں آ جائے گا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ باغیوں کا طریق کار نہایت منظم ہے اور اُن کی فوجی طاقت زبردست ہے۔ دوسری طرف حکومت کے وفاداروں کی تعداد بھی کم نہیں ہے اور چونکہ "ٹریڈ یونین" کے رہنماؤں نے بھی حکومت کا ساتھ دیا ہے اور جن مقامات پر

باغیوں نے قبضہ کر لیا ہے وہاں کال ہڑتال کا حکم دیدیا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ ہسپانیہ فاشیت سے محفوظ رہ جائے۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہسپانیہ میں جرمنوں اور اطالویوں کی حفاظت کرنے کے بہانے سے جرمنی کے چند جنگی جہاز اور اطالیہ کے چند جنگی طیارے آپہنچے ہیں۔ اور تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ شاہ الفانسو سابق فرمانروائے ہسپانیہ کا لڑکا پرنس جُوان بھی فاشیوں کے جنگی مستقر برگوس میں پہونچ گیا ہے یا لایا گیا ہے۔ بصیرت والی آنکھیں ان حالات سے ہسپانیہ کے مستقبل کا اندازہ کر سکتی ہیں۔

حبشہ کی آخری جدوجہد

جمعیت اقوام کی مخصوص سیاسی زبان میں جو مکر و فریب کے تمام کاموں پر پردہ ڈالنے کے لئے وضع کی گئی ہے۔ ایک اصول ہے جو "اجمالی تحفظ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب لیگ اقوام میں سے کوئی ممبر کسی ایسے فعل کا مرتکب ہو جس سے امن عالم کے خطرے میں پڑجانے کا احتمال ہو تو اس ممبر پر ایسی تعزیری پابندیاں عاید کر دی جائیں کہ وہ مجبور ہو کر اپنے جارحانہ یا نامنصفانہ عمل سے باز آجائے اور باقی تمام ممبر ایک کی غلط روی اور سرکشی کے بد نتائج سے محفوظ رہ جائیں۔ اسی کا نام "اجمالی تحفظ" ہے اور اسی اصول کو محض برائے نام برقرار رکھنے اور نہ صرف حبش بلکہ ساری دنیا کی نگاہوں کو دھوکا دینے کے لئے جمعیت اقوام نے اٹلی کے خلاف تعزیری پابندیاں عاید کی تھیں اور بعض ممالک نے تجارتی مقاطعہ بھی کر لیا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ خون آشام اٹلی کی فتح اور مظلوم و معصوم حبش کی صورت میں نمودار ہوا، اور وہ نام نہاد تعزیری پابندیاں جو عملاً پوری طاقت کے ساتھ کبھی نافذ نہیں کی گئیں۔ کامیاب ثابت نہ ہوئیں۔ ضرورت تو اس کی تھی کہ ان پابندیوں کو جاری رکھکر اٹلی کو مجبور کیا جاتا کہ وہ اپنے جارحانہ عمل کو ترک کر کے حبش سے دست بردار ہو جائے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جمعیت اقوام کے وہ چند سربرآوردہ شعبدہ باز ارکان جو دور دور سے اٹلی کے خلاف آوازیں اٹھا رہے تھے، در پردہ ایک بہانے کے متلاشی تھے۔ تاکہ یہ تعزیری پابندیاں جلد از جلد منسوخ کر دی جائیں۔ چنانچہ ادھر شہنشاہِ حبش نے اپنا ملک چھوڑا اور ادھر ان لوگوں نے تعزیری پابندیوں کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔

یہ تماشا بالکل اسی طرح ہوا جیسے شکسپیر کے مشہور ڈراما "ہملیٹ" میں شاہ ہملیٹ کے مرجانے کے بعد فوراً اس کی ملکہ نے شاہ مرحوم کے بھائی کلاڈیس سے شادی کر لی، ابھی اُس کے پہلے شوہر کی قبر کے پھول بھی سُوکھے نہ تھے کہ اُس نے اپنے نئے عروس خانہ کو پھولوں کی سیج سے سجا لیا۔ اسی سے لوگوں کے دلوں میں یہ گمان پیدا ہوا کہ شاہ ہملیٹ کی زندگی ہی میں اس ملکہ کا اپنے دیور سے ناجائز تعلق تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ بیوہ ہونے کے روز بادشاہ کے غم میں سب سے زیادہ گریہ وبکا اور شور و واویلا اسی عورت نے کیا تھا جس پر اُس کے لڑکے پرنس ہملیٹ نے اپنے شبہ کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "یہ لیڈی ضرورت سے زیادہ غم کا اظہار کر رہی ہے"۔ آخر کار معلوم ہوا کہ اسی ملکہ نے اپنے دیور سے سازش کی تھی، اور شوہر کو قتل کرایا تھا۔ حبش کے معاملہ میں بھی ایسا ہی ہوا کہ جن لوگوں نے اٹلی کے خلاف سب سے زیادہ شور احتجاج بلند کیا تھا، انھیں نے تعزیری پابندیوں کو منسوخ کرنے میں بھی سب سے زیادہ عجلت سے کام لیا۔ گو شہنشاہِ حبش نے جمعیت اقوام کے اجلاس میں ایک نہایت باا‌ثر اور پُرزور تقریر کی، اٹلی کا دوبارہ مقابلہ کرنے کے لئے اُس کے ارکان سے قرضہ طلب کیا، بین الاقوامی اخلاق اور حق و انصاف کا واسطہ دیا، مگر خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ ملا۔ اور جولائی ۱۹۳۶ء کے تاریخی مہینے میں لیگ آف نیشنز نے حبش کے ساتھ اپنی بے وفائی اور غداری کا آخری منظر دنیا کو دکھا کر "اجمالی تحفظ" کے اصول کو دفن کر دیا، نہیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ "اجمالی تحفظ" کا یہ نام نہادی اصول اسی وقت دفن ہو چکا تھا جب اس سے اٹھارہ ماہ پہلے ۱۹۳۵ء کے ابتدائی مہینوں میں لیگ کونسل نے اپنے مسلسل تین اجلاسوں میں شہنشاہِ حبش کی احتجاجی درخواستوں پر کوئی عمل نہ کیا، اور اٹلی کو موقع دیا کہ وہ اپنی پوری فوجی طاقت کو حبشہ پر حملہ کرنے کے لئے حرکت میں لے آئے۔ یہ کہنا سراسر خبط ہے کہ جب تعزیری پابندیاں کارگر نہ ہوئیں تو اُن کے جاری رکھنے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اگر بین الاقوامی اخلاق اور حق و صداقت کوئی چیز ہے تو اُن کے برقرار رکھنے اور اُن کی طاقت و عظمت کو ثابت کرنے کا اس سے بہتر موقع دنیا کی تاریخ میں کبھی نہیں آیا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ موقع خداداد تھا۔ انصاف کی اعانت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی تقریباً پچاس چھوٹی بڑی قومیں جو لیگ کی ممبر ہیں اُسکی پشت پر موجود تھیں۔ اس کے علاوہ ساری دنیا کی اخلاقی تائید بھی اسی کو حاصل تھی۔

مدد سے، فرانس اور برطانیہ کی فوجیں طاقتیں، بحرروم کی تمام ساحلی حکومتیں (حملہ آور اٹلی کے سوا) ان قوموں کے تمام بحری اور ہوائی بیڑے، کیا اس لائق نہ تھے کہ اٹلی پر اپنا دباؤ ڈال کر اسے اس ظلم ناروا سے باز رکھتے؟ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جس کو حبش کے ساتھ ہمدردی نہ ہو۔ حق منتظر تھا کہ کچھ حق پسند سامنے آئیں اور اُسے تباہی و ہلاکت سے بچالیں۔ لیکن سب کے سب تماشہ دیکھتے رہے۔ اور اٹلی نے بم باری، زہریلی گیسوں سے مظلوم اور تقریباً غیر مسلح حبش کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن اب بھی دنیا نا امید نہیں ہوئی ہے۔ حبش کی عارضی شکست غالباً حبش کے خاتمہ سے تعبیر نہیں کی جاسکتی خبریں آرہی ہیں کہ حبشیوں نے اطالویوں کی اطاعت قبول نہیں کی ہے۔ مختلف صوبوں میں ابتک جنگ جاری ہے اور چالیس ہزار حبشی سپاہیوں کی ایک عظیم الشان اور مرکب فوج پھر ادیس ابابا کی طرف بڑھ رہی ہے۔ تاکہ اپنے دار الحکومت پر دوبارہ قبضہ کرلے۔ یہ خبر کہ اٹلی نے پورے حبش پر قبضہ کرلیا ہے مسولینی کا پروپیگنڈا ہے حبش کا دل ابھی مفتوح نہیں ہوا ہے۔ اور وہ اپنی آزادی حاصل کرنے کی ایک آخری جدوجہد میں مصروف ہے۔ "انقلاب" کی طاقت اٹلی کی عسکری طاقت سے کہیں زیادہ ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ قدرت کا آخری فیصلہ حبش کے حق میں ہو۔

فلسطین

اسلام سے پہلے فلسطین میں عیسائیوں کی حکومت تھی اور یہاں کچھ یہودی بھی آباد تھے۔ مسلمانوں نے اس تاریخی اور مقدس ملک کو حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں فتح کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر عیسائیوں نے اس پر قبضہ کرلیا۔ لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے دوبارہ عیسائیوں سے چھین لیا اور اس وقت سے یہ مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہا۔

جنگ عظیم کے زمانہ میں جب ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا تو فلسطین کے عربوں کو آزادی کا لالچ دیکر ترکوں کے خلاف اُبھارا گیا جس سے ترکوں کو سخت نقصان پہنچا۔

جنگ کے اختتام پر جب مفتوح ممالک کے حصے بخرے ہونے لگے تو جمعیت اقوام نے عراق شام اور فلسطین کو برطانیہ کی نگرانی میں دیدیا۔ برطانوی انتداب کے دوران میں اہل فلسطین کو جنھوں نے ترکوں سے بغاوت کی تھی برطانیہ کی دوستی کا یہ پھل ملا کہ لاکھوں یہودی فلسطین میں لاکر آباد کر دئے گئے جو رفتہ رفتہ اس ملک کی تمام زرخیز زمین اور نفع بخش تجارت پر قابض ہونے لگے، اور عربوں کو نادار اور تنگ دست بنانیکے درپے ہوگئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ عرب جیسی آتش نفس اور خوددار قوم اس مجبوری و مظلومی کی حالت کو مدت العمر کیلئے گوارا نہیں کرسکتی تھی۔ اس لئے عربوں نے یہودیوں سے مخالفت کرنی شروع کردی۔ مندوب حکومت نے اسی کو عربوں کی "بغاوت" کا نام دیدیا ہے۔ جو دراصل اُنکی حق طلبی اور حصولِ آزادی کی جدوجہد ہے اور جس میں فلسطین کے تمام عیسائی بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ اب فلسطین انھیں دو جماعتوں کی رزمگاہ بن گیا ہے اور صورتِ حال نہایت نازک ہوگئی ہے۔ یہودی عربوں پر اور عرب یہودیوں پر حملے کر رہے ہیں۔ سارے ملک میں انتشار ہے۔ اور حکومت مندوب کی فوج کو بھی کبھی مداخلت کرنی پڑی ہے۔ سینکڑوں عربوں نے آزادیٔ وطن پر اپنی جانیں قربان کردی ہیں۔ اور اب بھی جانبازی اور جاں سپاری سے دریغ نہیں کرتے۔ عربوں نے فلسطین کے طول و عرض میں ایک زبردست ہڑتال بھی کی تھی جس میں عیسائی بھی شریک تھے۔

برطانوی حکومت نے حالتوں کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن کو مقرر کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ اعلان کیا ہے کہ جب تک فلسطین میں شورش قطعاً بند نہیں ہو جائیگی یہ کمیشن اپنا کام شروع نہیں کریگا۔ لیکن وہاں ہنگامہ آرائی ابتک جاری ہے۔ گویا ہندوستان کی طرح فلسطین میں بھی دو قومیں برسرپیکار ہیں اور حکومت نے بھی وہی پالیسی شروع کردی ہے جس میں کمیشنوں اور کمیٹیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ اصل موضوع کو بہت دور پھینک دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی حکومت اپنے استعماری مقاصد کے پیش نظر یہودیوں کی تائید حاصل کرنا چاہتی ہے، لیکن فلسطین کے عرب اس کو گوارا نہیں کرسکتے کہ اس سرزمین پر جو ڈیڑھ ہزار سال سے انکا وطن ہے یہودی قابض ہوجائیں اور ان کو بیدخل کردیں۔ اُن کو خوف ہے کہ اگر فلسطین میں یہودیوں کے بسنے پر کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی تو انکو اپنا وطن عزیز چھوڑنا پڑے گا۔ برطانیہ کی مندوبی حکومت نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ فلسطین یہودیوں کا "قومی وطن" ہے۔ برطانیہ نے یہودیوں کی امداد اور حوصلہ افزائی کا بیڑا کیوں اُٹھایا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ برطانیہ کو اس امر کا یقین ہے کہ فلسطین کے عرب باشندے بہت دنوں تک محکوم نہیں رکھے جاسکتے، اور یہودیوں سے یہ توقع ہے کہ وہ ہمیشہ برطانیہ کا ساتھ دیں گے۔ مسٹر ایمری نے ۲۴ رمارچ کو کہا تھا "آج کل جبکہ ہمارے تحفظ کا مسئلہ پیش نظر ہے ہم فلسطین کی غیر معمولی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ کیونکہ یہ برطانیہ کے شہنشاہی سلسلہ کا نہایت مؤثر ہوائی مرکز بن سکتا ہے۔ نہ صرف اس خیال سے کہ نہر سوئز اور مشرقی بحر روم کی حفاظت کی جائے بلکہ اس نقطۂ نگاہ سے بھی کہ اس کے ذریعہ اس کے ذریعہ ہندوستان اور مشرق سے ہمارا سلسلہ رسل و رسائل قایم رہ سکتا ہے.....

.....تیل کی بہم رسانی کے لئے بھی حیفہ کی اہمیت کم نہیں ہے اور بحری مستقر ہونے کے لحاظ سے یہ مالٹا سے زیادہ مفید اور محفوظ ثابت ہوگا۔ اس سے زیادہ غالباً کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ برطانیہ کی استعماری طاقت اپنے اغراض کے لئے فلسطین کو یہودیوں کا "قومی وطن" صحیح معنوں میں بنانا چاہتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عربوں کی اس جدوجہد کا کیا نتیجہ ہوتا ہے!

کلا ٹیگور

ملک الشعراء رابندرا ناتھ ٹیگور کی شاعری کا

براہِ راست بنگالی زبان سے سلیس اردو میں ترجمہ

شاعر کی بے نظیر شاعری کا لاجواب آئینہ

مترجمہ:- ایم ضیاء الدین

حصہ اول، قیمت دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

کلیم بک ڈپو۔ فتح پوری۔ گلی کندلہ کشاں دہلی

دنیائے صحافت کا علمی، ادبی، اور فلمی،

پندرہ روزہ مصور صحیفہ

شاہد بریلی

جو ایک عرصے سے پابندیٔ وقت کیساتھ جاری ہے

شاہد- ہر ماہ ۹۰ صفحات کے سنجیدہ اور مزاحیہ مضامین اور متعدد رنگین اور رومانی تصاویر پیش کرتا ہے۔

شاہد- کے سال میں چار خاص نمبر شائع ہوتے ہیں، اور ہر نمبر دلچسپ معلومات اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو ادب کے لئے قابل قدر اضافہ ہوتا ہے۔

شاہد- اپنی ہر تصویر سے تصاویر کا مقصد نمایاں کرتا ہے۔

شاہد- ہی یو پی کا وہ واحد رسالہ ہے جسے ہندوستان کے تمام مایۂ ناز اہل قلم حضرات کی قلمی معاونت کا فخر حاصل ہے۔

شاہد- کا فلمی حصہ اس طرح سے علیحدہ کیا ہے کہ وہ بذاتِ خود ایک فلمی پرچہ بن گیا ہے جس میں دنیائے فلم کے ستاروں کے فوٹو بلاک اور تنقیدی اور ٹھوس مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔

شاہد کی سالانہ قیمت باوجود بہترین طباعت وکتابت اعلیٰ کاغذ اور ان تمام خوبیوں کے صرف تین روپے

ایجنٹ حضرات کے ساتھ خاص رعایت۔ نمونہ کا پرچہ مفت۔

مینیجر شاہد دارالادب بریلی

دنیائے ادب میں ہلچل

انشائے لطیف

جس کتاب کا اصحابِ ذوق کو مدت سے انتظار تھا بالآخر شائع ہو گئی جناب لطیف الدین صاحب اکبرآبادی اردو زبان کے نامور ادیب اور افسانہ نویسی میں لاجواب ہیں یہ کتاب ان ہی کی تصنیف ہے۔ اس میں ان کے پندرہ افسانے جمع ہیں۔ اور ہر افسانہ اپنی جگہ جذباتِ لطیف کا بحر موج ہے۔ ادب کے قدرداں ہی ان جواہرات کی قدر کر سکتے ہیں۔ کتاب کی لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ ہے۔ کتاب کی جلد بھی دیدہ زیب ہے۔ ضخامت چھوٹے سائز پر ۲۰۰ صفحے ہے۔

قیمت صرف دو روپیہ (عا)

علاوہ محصول ڈاک

نغمات

نثر کی شاعری

اردو ادب میں جناب ل احمد کی تنہا وہ ہستی ہے جس نے حسن و عشق کی واردات اور نفسیات کو انتہائی مطالعۂ فکر کے ساتھ اپنے ذاتی تاثرات و تکیفات کے ماتحت شعریت موسیقی یا موسیقیت شعر کی صورت میں صفحات سادہ کو فردوس خیال بنا دیا ہے۔ اس مجموعہ میں جناب لطیف کے ساتھ مختصر ترین افسانے اور ادب پارے شامل ہیں جسے نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفرین کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب بھی مکمل ترتیب و تہذیب کے بعد مع تصویر مصنف مجلد شائع ہو گئی ہے۔ اگر آپ اپنی زبان کی نزاکت و لطافت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو فوراً حاصل کیجئے۔ قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول۔

مینیجر کلیم بک ڈپو۔ گلی کندلہ کشاں فتح پوری دہلی

ایک نفیس مزاج مہارانی



نے اپنے معتمد خاص سے کہا کہ دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کئے کہ
وہ بہترین قسم کے پھول تلاش کریں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب
اسکو تعمیل حکم کے لئے فردوس مثال کشمیر جنت نظیر سوئٹزرلینڈ
شباب انگیز تسمانیہ، اور گلپاش مرغزاروں میں گل چینی کی گئی
جب سب پھول وغیرہ اکٹھے ہونے کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش
ہو گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے اور باقی اس قدر
مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی خواہش ناکام ہوئی کہ کلیتہً
ہوئی۔ مہارانی اس خواہش کو پورا نہ ہونے سے ملول رہنے
لگی۔ کھانا پینا ترک کر دیا مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا اور
وزراء سے مشورہ طلب کیا۔ مہتمم توشہ خانہ نے اصغر علی
محمد علی سے عطر منگوانے کو کہا۔ رائے معقول تھی۔ فوراً عمل کیا گیا۔ جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری

بہاریں لے واپس آ گیا

اصغر علی، محمد علی، تاجران عطر، لکھنؤ و دہلی



شعلہ و شبنم

شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شاعرِ انقلاب کا لافانی شاہکار

اور

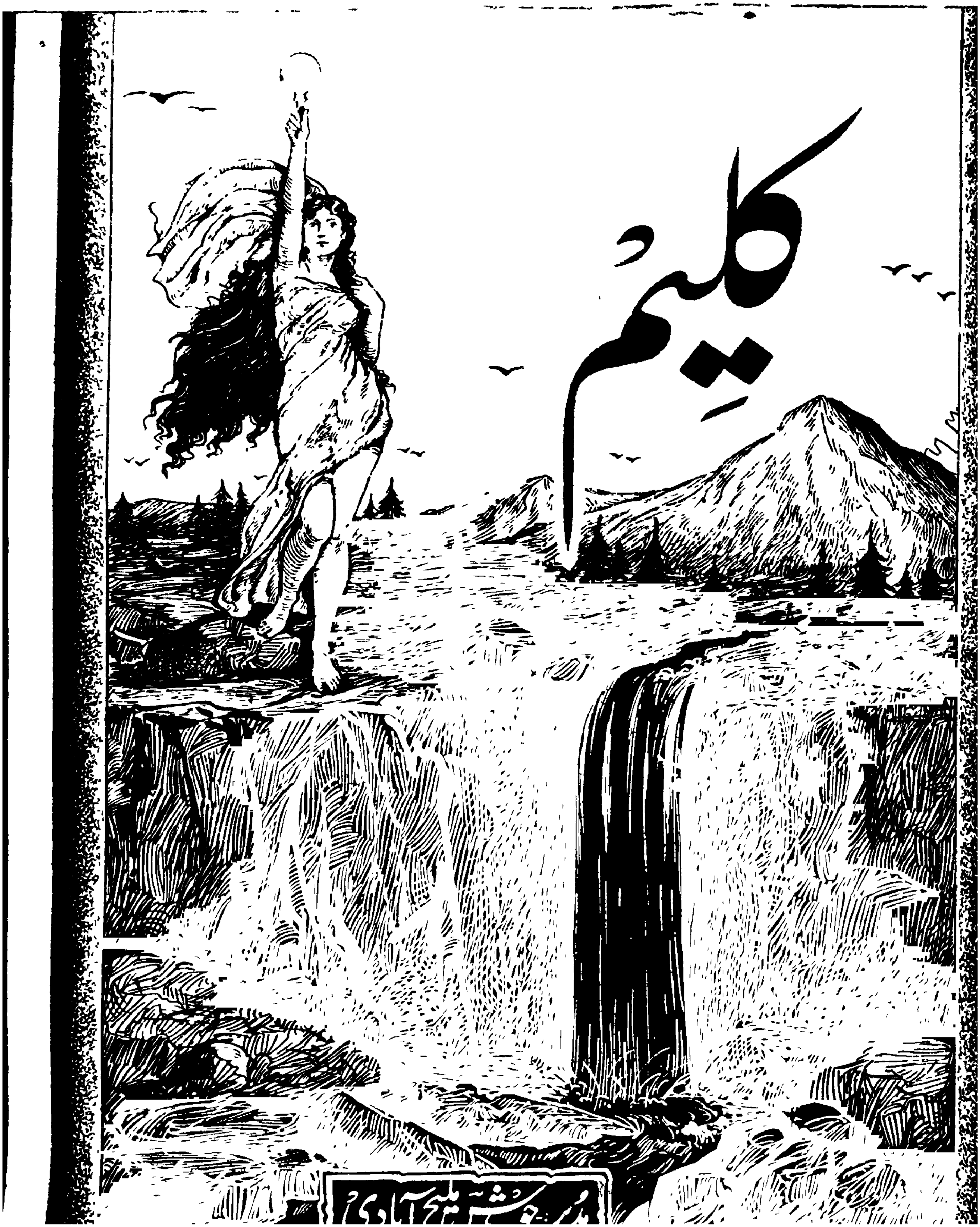
غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے

قیمت تین روپے

خریداری کے لئے فوراً درخواست [illegible]

ملنے کا پتہ

کلیم بک ڈپو گلی کندلہ کشاں بازار فتح پوری دہلی


کلیم
جوش ملیح آبادی

کلیم ڈهلی

پنجابی مسافر



مستو اله بخش کا شاهکار

منظور شدہ سررشتہ تعلیم گورنمنٹ میسور

بنا قوت حیات

کلیم

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صرف یہ حکم
آگے کئی صدیوں سے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے ۵ر
جملہ حقوق محفوظ ہیں
قیمت فی پرچہ نو آنے

اُردو زبان کا ہر جہت سے قیمتی ماہنامہ

جلد ۲ | بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۳۶ء | نمبر ۳

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے کو روشن برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم گلی کندلگران بازار فتحپوری سے شائع کیا)

اشارات

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

اس میں کون شک کرسکتا ہے کہ جامعۂ عثمانیہ نے اُردو کو موت کے مُنہ سے نکال کر زندہ زبانوں کی صف میں بٹھا دیا ہے۔

اور دنیا پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اُردو وہ زبان ہے جس کی پہنائی، لچک اور استعداد کی کوئی انتہا نہیں۔ نیز اس مبارک جامعہ نے عملی طور سے اس نظریئے کی بھی تصدیق کر دی ہے کہ اگر کوئی مُلک ترقی کرسکتا ہے تو صرف اپنی ہی زبان کے ذریعے سے ترقی کرسکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کا نام تاریخ میں زرّیں حروف سے لکھا جائے گا۔ اور تاجدارِ دکن کی اُردو نوازی کا غلغلہ اُس وقت تک بلند رہیگا جب تک کہ ہندوستان کی یہ مشترک و عظیم زبان یعنی اُردو اس مُلک میں بولی اور سمجھی جاتی رہے گی۔

لیکن اسی کے ساتھ مجھے انتہائی افسوس بھی ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کی افادیت و فیض رسانی کو، جامعۂ کے اربابِ حلّ و عقد نے پا بزنجیر کر رکھا ہے، اور اُردو زبان کو اُس سے جیسا فائدہ پہنچنا چاہیئے تھا، وہ نہیں پہنچ رہا ہے۔

یہ کتنے قلق کی بات ہے کہ ہندوستان کے اُردو داں طبقے کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جامعۂ عثمانیہ میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ اب تک کتنے علوم کا ترجمہ کر چکی ہے۔ اور وہاں کتنی علمی اصطلاحیں وضع کی جا چکی ہیں۔

اور یہ عدم واقفیت محض اس بنا پر ہے کہ:-

(۱) جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ ترجمہ و تالیف کے مطبوعات کا اشتہار نہیں دیا جاتا۔

(۲) اس کے مطبوعات کی قیمت اس قدر زیادہ ہے کہ نادار ہندوستان اُنھیں خرید نہیں سکتا۔

(۳) وہاں جو علمی اصطلاحیں وضع کی جاتی ہیں، اُن کی اشاعت اور اُن کے زباں زد ہونے کی کوئی سعی نہیں کی جاتی۔

اگر کسی زبان کو فروغ دینا ہے، تو اس کے یہ معنی تو ہرگز نہیں ہوسکتے کہ اُس کے مطبوعات و مصطلحات کو سختی کے ساتھ الماریوں میں مقفل کر دیا جائے۔ اور اس کی نگرانی رکھی جائے کہ کسی کو اُن کی ہوا تک نہ لگے۔

زبان، سکّہ اور دریا، تینوں ایک ہی نوعیت کی چیزیں ہیں جن کا تمامتر مدار حرکت و روانی ہی پر ہوتا ہے۔ اور اگر اُن کو ساکن کر دیا جائے تو اُن کا وجود باقی نہیں رہ سکتا۔ لیکن جامعہ عثمانیہ کے اربابِ حل و عقد کا نظریہ غالباً اس کے برعکس واقع ہوا ہے۔ وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ جس طرح حیدرآباد میں مختلف مقامات پر بند باندھکر "حمایت ساگر"، "عثمان ساگر" اور "نظام ساگر" تعمیر کئے گئے ہیں اور اُن سے مقصود صرف یہ ہے کہ حیدرآباد کی سرزمین سیراب ہوسکے بالکل اُسی طرح جامعۂ عثمانیہ بھی ایک "ساگر" ہے جو حیدرآباد اور صرف حیدرآباد ہی کی آب پاشی کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔

میں اس نظریئے کے خلاف سخت احتجاج کروں گا، اور بہ ادب درخواست

کھول ڈالا کہ اس بند کو توڑ کر ایک ایسا چشمۂ فیض جاری کر دیا جائے کہ ہندوستان کا ہر ذرہ سیر ہو سکے۔ اور اردو زبان کی کھیتی لہلہانے لگے۔

میرے نزدیک اگر مندرجۂ ذیل تجاویز پر عمل کیا گیا تو اردو زبان مالا مال ہو جائے گی۔ اور پھر کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو سکے گی کہ اردو محض ایک ادبی زبان کے علاوہ کوئی علمی حیثیت نہیں رکھتی۔

(۱) شعبۂ ترجمہ و تالیف کے مطبوعات کا اشتہارات کے ذریعے سے مسلسل اور زبردست پروپیگنڈا کیا جائے۔

(۲) شعبۂ ترجمہ و تالیف کے مطبوعات کی قیمتیں ایسی مقرر کی جائیں کہ نادار سے نادار شخص بھی خرید سکے۔

(۳) جامعۂ عثمانیہ کے اصطلاحات ہر اخبار اور رسالے میں نہایت سخت پابندی کے ساتھ برابر شائع ہوتے رہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ملک کے تمام ایڈیٹروں، ادیبوں اور شاعروں کو اس پر آمادہ و مجبور کیا جائے کہ وہ ان اصطلاحوں کو تحریروں اور تقریروں میں بے دھڑک استعمال کرنا شروع کر دیں۔

ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں جامعہ کو ہر سال ایک کافی رقم صرف کرنا پڑے گی۔ اور بالخصوص اصطلاحات کو سکہ جاری بنانے کے معاملے میں بعض تو بے اجرت کام کرنے پر طیار ہو جائیں گے، لیکن اکثر کو کافی اجرت دینا پڑے گی۔

اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جامعۂ اس کار عظیم کی خاطر ایک سالانہ رقم مقرر کر دے، اور اجرائے کار میں آسانی و باقاعدگی پیدا کرنے کی غرض سے ایک مختصر سا نیا محکمہ قایم کر دے، جو ایسے افراد پر مشتمل ہو جو ملک کے مسلم ادیب اور اردو کے حقیقی فدائی ہیں۔

اگر اس مخلصانہ گزارش پر توجہ مبذول نہ فرمائی گئی تو جامعۂ عثمانیہ بھی "برائے نام دن چہ سنگ و چہ ذرہ" کے دائرے میں شمار ہونے لگے گی، اور اردو ہندوستان میں ایک مردہ زبان بن کر رہ جائے گی۔

میں ان تمام مدیرانِ اخبار و رسائل کی خدمت میں جنھیں اردو سے ہمدردی ہے، اور جو ابنائے وطن کی اردو کش پالیسی سے واقفیت رکھتے ہیں نہایت زور کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ وہ بھی اپنے اپنے اخباروں اور رسالوں میں میری اس تجویز کی تائید کریں، اور اتنی مستقل و مسلسل تائید کریں، اور اس کے ساتھ ایک ایسی زبردست درخواست، محضر کی شکل میں پیش کریں کہ جامعۂ عثمانیہ کے ارباب بست و کشاد ان مفید تجاویز کے قبول فرما لینے پر آمادہ ہو جائیں۔

عصر حاضر کے ہلاکو، اور انکے مقتول

اس عہد کے ہلاکو اپنے آبا یعنی ہلاکو، نیرو اور چنگیز کی طرح سیدھے سادے اور گنوار واقع نہیں ہوئے ہیں کہ انسانوں کو علانیہ مولی، گاجر کی طرح کاٹ کر، رائے عامہ کو اپنے خلاف برانگیختہ کر کے اپنے کو خطرے میں ڈال لیں۔

ان کا جذبۂ خون آشامی ارتقاء پذیر ہو چکا ہے ——— اور انھوں نے قتال کے وہ دلچسپ اور نیکنام طریقے اختیار کر لئے ہیں کہ پرانے ہلاکوؤں کی طرح انھیں کوئی "ڈاکو" اور "خونی" نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس انھیں "امن کے دیوتا" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

عہدِ بربریت و وحشت کے ہلاکو اپنے جذبۂ قتال کو "قتال" ہی کی صورت سے پیش کرتے تھے، اس لئے کہ انھیں پالش کرنے کا فن نہیں آتا تھا۔ لیکن اس دورِ تمدن و تہذیب کے ہلاکو اپنے جذبۂ قتال کو "قتال" کی صورت سے نہیں، بلکہ "امن پروری" اور "اخلاق نوازی" کی صورت سے پیش کرتے ہیں، کیونکہ انھیں پالش کرنے کا فن خوب آتا ہے۔

پرانا ہلاکو اپنے جذبۂ خونریزی کو تلوار کے ذریعے سے آسودہ کرتا تھا ——— نیا ہلاکو تلوار استعمال نہیں کرتا۔ وہ یونی ورسٹیوں اور پروپیگنڈے وغیرہ کے ذریعے سے قتل کرتا ہے۔

پرانا ہلاکو وحشی تھا اس لئے انسانوں کے سر و تن میں جدائی کر دیتا تھا ——— نیا ہلاکو شائستہ ہے، وہ کبھی اس طرح نہیں قتل کرتا کہ مقتول کے سر و تن میں جدائی ہو جائے۔

پرانا ہلاکو "بے رحم" تھا، اس لئے وہ علانیہ خون بہاتا رہتا تھا ——— نیا ہلاکو "رحمدل" واقع ہوا ہے، اس لئے اس خوبصورتی سے قتل کرتا ہے کہ مقتول

کے خون کی ایک بوند بھی زمین پر نہیں گرنے پاتی۔

پرانا ہلاکو "غیر دانشمند" تھا۔ اس لئے اسی طرح قتل کرتا تھا کہ مخلوق فریاد کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی ——— نیا ہلاکو چونکہ "دانشمند" ہے، اس لئے اس حسن و خوبی سے قتل کرتا ہے کہ اور تو اور، خود مقتول اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہو جاتا ہے۔

پرانا ہلاکو بیک گردشِ شمشیر انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا، نیا ہلاکو سست اثر زہر کی طرح رگ و پے میں سرایت کر کے ہلاک کرتا ہے۔

پرانا ہلاکو، کھلے ہوئے میدانوں میں خون بہاتا تھا ——— نیا ہلاکو لاکھوں روپے کی بڑی بڑی عمارتوں کے اندر خون پیتا رہتا ہے۔

پرانا ہلاکو گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ کی گونج میں ہلاکت کا بازار گرم کرتا تھا ——— نیا ہلاکو حریر و پرنیاں کی سرسراہٹ اور ناطق فلموں کے زمزموں کے سائے میں ذبح کرتا ہے۔

پرانا ہلاکو مار ڈالتا تھا ——— نیا ہلاکو زندہ رکھتا ہے، اور ایسی ہولناک نقطۂ ہلاکت پر زندہ رکھتا ہے کہ اس کا مقتول، تمام عمر سسکتا ہی رہتا ہے۔ اور اس کی تمام زندگی ایک مرگِ طویل نزع بن کر رہ جاتی ہے۔

پرانا ہلاکو، جسموں پر حملہ کرتا تھا ——— نیا ہلاکو جسموں کا احترام کرتا ہے، لیکن روحوں کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔

پرانا ہلاکو، اپنے خلاف جذبۂ نفرت پیدا کرتا تھا ——— نیا ہلاکو اپنے سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ اور اس کے مقتول قتل ہو جانے کے بعد اپنے میں زیادہ توانائی محسوس کر کے اسے چاہنے لگتے، اور اس قدر چاہنے لگتے ہیں کہ اس کی ہر ادا کی نقالی شروع کر دیتے ہیں ———

میرے اس متذکرۂ بالا بیان کی روشنی میں اگر آپ ان تمام اقوام کی سیرت و کردار پر نگاہ ڈالیں جو اس وقت اجنبی قوموں کی محکومیت میں ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، وہ حرف بحرف درست ہے۔

اگر آپ آزاد قوموں کا مطالعہ کریں گے تو یہ دیکھیں گے کہ اس دورِ انقلاب میں اگر ان کے نوجوان بدلے بھی ہیں تو اپنے ہی ملکی و معاشرتی آداب کے سانچوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بدلے ہیں ——— اور اس تبدیلی کے باوصف وہ اپنے آباؤ اجداد ہی کا ایک نمونہ ہیں۔ ہر چند اس نمونے کو ہم "جدید" یا "الحاقی نمونہ" کہہ سکتے ہیں۔

آزاد قوموں کے نوجوان سمجھتے ہیں کہ ارتقار کے معنی قلبِ ماہیت یا دوسری قوموں کی نقالی نہیں ہو سکتے۔

لیکن اگر آپ محکوم و مغلوب قوم کے نوجوان کا مطالعہ کریں گے تو افسوس کے ساتھ یہ دیکھیں گے کہ اس میں اس کے وطنی خصوصیات اور آبائی کردار کا کہیں کوئی پتا نہیں چلتا۔ اور اس نے اپنی حاکم قوم کے تمام اوضاع و اطوار کو آنکھیں بند کر کے اس طرح قبول کر لیا ہے کہ وہ اپنی سرزمین کی پیداوار ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اور اپنے وطن میں وہ ایک مسافر و اجنبی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ نیز اس کی تمام ہستی اور اس کا تمام وجود ایک زندہ بھوت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ اس "زندہ بھوت" سے صرف خوش ہی نہیں اس پر فخر بھی کرتا ہے، اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ نئے ہلاکو نے اس کے جسم کو تو باقی رکھا ہے، مگر اس کی روح کو کچل کر رکھ دیا ہے ؎

سمجھے گا اس کا درد کون شورشِ کائنات میں
تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

کچھ زبان کے متعلق

(۱) مدتِ دراز سے اربابِ علم و ادب اس خلفشار میں مبتلا ہیں کہ ان عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے جو اپنے اصلی مفہوم سے علیحدہ ہو کر اردو میں قطعی مختلف معنی میں مستعمل ہوتے ہیں ——— یعنی انھیں ہندکے زمرے میں سے کر ان سے وہی برتاؤ کیا جائے جو ٹھیٹ اردو ہندی الفاظ کے ساتھ کیا جاتا ہے، یا ان سے رعایت ملحوظ رکھی جائے، اور فارسی و عربی الفاظ کی طرح انھیں عطف و اضافت کی ترکیب کے ساتھ استعمال کیا جائے؟

مثلاً

عربی یا فارسی لفظ	اُردو معنی	عربی یا فارسی لفظ	اُردو معنی
محرم	اَنگیا	اختیار	قدرت
مختار	صاحبِ قدرت	مذاق	مزاح
نقل	رُوپ بھرنا یا کاپی کرنا	حرکت	فعلِ مذموم
سلوک	برتاؤ	غریب	نادار
عرصہ	مُدت	جناب	حضور یا آقا
حکیم	طبیب	غلیظ	ناپاک
عزیز	پیارا یا قرابتدار	نقد	زَر [illegible] وغیرہ

(۲) یا فارسی اُردو الفاظ کی جو بقاعدۂ عربی جمع بنائی گئی ہے اُسے کہاں تک روا رکھا جائے۔

مثلاً

جنگل سے جنگلات — خواہش سے خواہشات
کھنڈر سے کھنڈرات — کاغذ سے کاغذات
بہت سے بہتات — وغیرہ

(۳) یا وہ الفاظ جو عربی قاعدے سے ہندیوں نے بنائے ہیں، لیکن عربی میں اُن کا پتا نہیں چلتا۔

مثلاً

وقیع، تردید۔ وضاحت، عادی۔ ملفوف، شائق، ملالت، تنقید، مایوس وغیرہ

(۴) یا وہ الفاظ جو فارسی اردو ہیں، مگر عربی قواعد و الفاظ کے ساتھ ترکیب دیکر انھیں استعمال کیا جاتا ہے۔

مثلاً

لاپتا۔ لاچار۔ مُرغن، لاپروا، قریب المرگ۔ شریف الخاندان، بادشاہت، یگانگت۔ رنگت۔ فوق البھڑک۔ مجرّب۔ مُلبّب وغیرہ۔

(۵) یا وہ فارسی ترکیبیں جنھیں اردو الفاظ کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔

مثلاً

سمجھدار۔ لوچدار۔ ڈوری دار۔ گرانڈیل وغیرہ

(۶) یا وہ الفاظ جو غلط معنی اور غلط محل پر استعمال ہوتے ہیں۔

مثلاً

مُرتشی کے معنی میں " راشی " زہریلے کے معنی میں " مسموم " شبہ کرنے والے کے معنی میں " مشکوک " شاکر کے معنی میں مشکور وغیرہ

(۷) یا وہ الفاظ جو مہمل اور ازروئے قاعدہ بالکل غلط واقع ہوئے ہیں۔

مثلاً

درستی۔ بیہودی۔ سنسنی خیز۔ رہائش، ادائی، ادائیگی، خفگی۔ ناراضگی، سلوک (کہا جاتا ہے کہ فلاں صاحب غریبوں سے سلوک ہوا کرتے تھے۔ یعنی اُن کی مالی مدد کرتے تھے۔ یہاں اس دوسری غلطی پر بھی نگاہ رکھی جائے کہ سلوک یعنی مفعول کو سالک یعنی فاعل کی طرح استعمال کیا جاتا ہے)

تابعدار، ہم جلیس، پیشین گوئی۔ حتی المقدم وغیرہ۔

ان غلطیوں کے سلسلے میں تمام غلط الفاظ ایک ہی سانس میں یاد نہیں کیے جا سکتے۔ اگر حافظے پر زور دیا جائے تو ایسے الفاظ کی ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ اس میں صرف دو ہی راستے نکل سکتے ہیں۔

(۱) یا تو ان تمام الفاظ کو زبان سے خارج کرکے اُن کی جگہ صحیح الفاظ لائے جائیں۔

(۲) یا ان پر مُہرِ جواز ثبت کردی جائے۔

اسی کے ساتھ ساتھ تلفظ کا مسئلہ بھی نزاع کا باعث بنا ہوا ہے، ایک گروہ تو اس پر زور دیتا ہے کہ عربی و فارسی اعراب پر جو تصرف کہ اردو نے کر دیا ہے اُسے روا رکھا جائے۔ اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں، ہر فارسی و عربی لفظ اپنے اصلی اعراب کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

مثلاً

عام تلفظ	اصلی تلفظ	عام تلفظ	اصلی تلفظ
طمانیت	طمانِیَت	حرکت	حَرَکت
رمضان	رَمَضان	غلبہ	غَلَبہ
مروت	مُرُوّت	سید	سیّد
میت	مَیِّت	خرچ	خَرج

رفعت	رحمت	فقہ	فقہ
قاہر	کافر	اکثریت	اکثریت
اقلیت	اقلیت	کیفیت	کیفیت
نشہ	نشہ	عروس	عروس
اثاث	اناث	نکات	نکات
جواد	جواد	اکسیر	اکسیر
مسودہ	مسودہ	مقدمہ	مقدمہ
کتبہ	کتابہ	ہجر	ہجر
صندوق	صندوق	مزدور	مزدور وغیرہ

اس کے علاوہ دوسری دیگر غلطیاں اور بھی ہیں۔

مثلاً

"سوائے میرے" "بجائے آپ کے" "مع اہل و عیال کے" "چور وڈاکو" "وجوہات" "امکانات" وغیرہ

کیا قارئین کرام میں سے کوئی صاحب اِن امور پر روشنی ڈال کر رہنمائی فرمائیں گے، اور بالخصوص کیا جناب احسن مارہروی، دتاتریہ صاحب کیفی، عبدالستار صاحب صدیقی اس باب میں اپنی اپنی رائے کا اظہار فرما کر شکریے کا موقع دیں گے؟

آشفتہ گشت طرۂ دستار مولوی

میرے محترم اور محبوب دوست حضرت آغا شاعر کے صاحبزادے نے مجھے کہا کہ ایک "مولوی" نے ان سے "کلیم" کی "زیارت" کا بہت شدت سے شوق ظاہر کیا۔ چنانچہ اُنھوں نے پرچہ اُن تک پہنچا دیا۔ لیکن جب وہ دوبارہ اُن سے ملنے اُن کے مکان پر گئے تو "مولوی" نے نہایت ہول آمیز اکراہ کے ساتھ کہا کہ خدا کے لئے "کلیم" میرے گھر سے لے جایئے ورنہ مجھ پر کوئی آفت نازل ہو جائیگی، یہ سُنکر اُنھوں نے کہا بہت بہتر ہے، پرچہ مجھے دیدیجئے۔ جس کے جواب میں "مولوی" نے نہایت بزدلانہ انداز سے کہا، نا صاحب میں پرچہ چھو بھی نہیں سکتا۔ دیکھئے وہ علیحدہ رکھا ہوا ہے، آپ خود اُٹھا لے جائیں۔

یہ داستان جب میں نے سُنی تو ہنستے ہنستے بیدم ہو گیا——— اور اسی کے ساتھ میں یہ خیال کر کے خوش بھی ہوا کہ "کلیم" کا مقصد و معیار اس قدر بلند واقع ہوا ہے کہ شرمناک قدامت پرستی یعنی "مولویت" اسے برداشت نہیں کر سکتی۔

اگر مولوی کو خدانخواستہ میرا پرچہ پسند آجاتا تو خُدا گواہ ہے کہ میں اپنے پرچے کے پست معیار پر ماتم کرتا۔ اور اپنے دفتر کے ہر فرد کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس طرح دھاڑیں مار مار کر روتا کہ محلے کے تمام لوگ ایک تازہ "واقعۂ قتل" کی خبر دینے کے لئے پولیس اسٹیشن کی طرف ننگے پاؤں دوڑتے نظر آتے۔

محکوم ملک کے "حکام"

آزاد ممالک کے تمام سرکاری عُمال، چھوٹے ہوں کہ بڑے، ہر وقت اسی دُھن میں لگے رہتے ہیں کہ پبلک کی زیادہ سے زیادہ خدمت کیوں کر کی جائے، اور وہ کون سی راہیں نکالی جائیں کہ مخلوق ہر امکانی امن و آسائش سے بہرہ مند ہو سکے۔

جس قدر اُن کے منصب و اقتدار میں اضافہ ہوتا ہے اسی قدر اُن کی افادیت و خوش خُلقی کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

وہ پبلک کو اپنا مخدوم، اور خُود کو اُس کا خادم سمجھتے ہیں، اور اُن کی شرافت اُنھیں کبھی یہ بھولنے نہیں دیتی کہ ہمیں جو تنخواہ اور تنخواہ کے ذریعے سے جو روٹی ملتی ہے وہ در اصل پبلک ہی کی بخشی ہوئی ہوتی ہے۔ اور ہمیں اپنے رزق رسانوں کی خدمت کے معاملے میں ہر ممکن قربانی پر ہر آن آمادہ رہنا چاہیے۔

لیکن وہ ممالک جو محکوم و پابزنجیر ہوتے ہیں وہاں معاملہ اس کے برعکس اور یاس انگیز حد تک برعکس ہوتا ہے۔

اِن ممالک میں اول درجے کے "حکام" در اصل "حکام" نہیں، بلکہ

"دیوتا" اور دیوتا بھی "شِو جی" کی طرح ہلاکت و غارتگری کے دیوتا ہوتے ہیں۔

اُنھیں صرف تین باتوں کی فکر ہوتی ہے۔

(۱) ملک پر اپنی گرفت، اور اپنے رعب و اقتدار کو محکم سے محکم تر کرنا۔

(۲) ہر ماہ اپنی تنخواہ مع الاؤنس وغیرہ وصول کرنا۔

(۳) اور محکوم قوم کے خون کی آخری بُوند تک اپنی قوم کے جسم میں پہنچا دینے کی تدبیریں نکالنا۔

اِن کے بعد دوسرے درجے کے حکّام کی باری آتی ہے۔ جن کے غرور کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین تک سے سیدھے مُنہ بات کرنا اپنی "سرکاری پوزیشن" اور اپنی "حاکمانہ شان" کے منافی سمجھتے ہیں۔

اُنھیں کبھی یہ وہم بھی نہیں ہوتا کہ ہم "پبلک سرونٹ" یا "خادمِ خلق" ہیں، وہ اپنے جاہ و جلال کی نمود، اور اپنے کرّ و فر کی نمائش بسا اوقات ایسے احمقانہ دشمنانہ انداز سے کرتے ہیں کہ اربابِ نظر کو اُن کے چھچھورے پن پر اگر ایک طرف ہنسی آجاتی ہے تو دوسری طرف اُن کے دماغ کی شرمناک حد تک کمزوری و بے مائگی پر ترس آنے لگتا ہے۔

یہ اپنے اجلاسوں پر اس طرح اکڑ کر بیٹھتے ہیں، گویا اُن کا جسم گوشت پوست سے نہیں، بلکہ سلاخوں اور کنکریٹ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اور موت بھی اُن کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔

اہلِ مقدمہ کو بات بات پر ڈانٹ بتا دینے، اور وکلا کو ذرا ذرا سے سہو پر جھڑک دینے میں یہ حضرات ایک رُوحانی لذّت محسوس کرتے ہیں، اور "حضور والا" اور "سرکار" سُنکر اُنھیں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا آلۂ سماعت کے ذریعے سے شہد پی رہے ہیں ——

اب رہا تیسرے درجے کے "حکامِ عالی مقام" کا طبقہ، سو مخلوق آزاری کے معاملے میں وہ اپنے تمام "بالاتر حکّام" سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

یہ "تھرڈ کلاس حکّام" ہر وقت اِس گھات میں لگے رہتے ہیں کہ

(۱) پبلک کو کس طرح زیادہ سے زیادہ مرعُوب و دہشت زدہ رکھا جائے؟

(۲) مخلوق کو کیوں کر زیادہ سے زیادہ ستایا اور لُوٹا جائے؟

(۳) اور جو اُن کے ذوقِ تکبّر اور ہوسِ زر اندوزی و رشوت ستانی کا اپنے کو بہ آسانی شکار نہیں ہونے دیتے، یا جن کی خودداری اور جن کے روایات اُنھیں اِس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اِن تھرڈ کلاس حکّام کے سامنے سر جُھکائیں، اُن کے متعلق اس فکر میں لگے رہنا کہ وہ "حکّامِ بالا" کی نظروں میں اتنے ذلیل کر دیے جائیں کہ اُن پر بہ آسانی جھُوٹے مقدمات چلا دینے کا موقع ہاتھ آجائے۔

ان تھرڈ کلاس حکّام کے بعد "حکّام" کا ایک چوتھا طبقہ بھی ہوتا ہے۔ اور وہ طبقہ اس قدر ہولناک ہوتا ہے کہ اُس کی بداخلاقی اور کمینگی دُنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

غریبوں کا ستانا، ان کا مال جبراً لے لینا اور اُن کی عزّتوں کو گھڑی بھر میں خاک میں مِلا دینا، اُن کے بائیں ہات کا کھیل ہوتا ہے۔ محکوم ممالک کے ہر بڑے شہر میں روز یہ تماشا دیکھنے میں آتا ہے کہ معمولی کانسٹیبل شریف ترین راہروؤں سے جانوروں کا سا برتاؤ کرتے ہیں، تانگے اور ٹیکسی والوں سے نذرانے وصول کرتے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر اُنھیں کوڑے مارتے ہیں، اور جو ذرا سا بھی قانون و انصاف کا مطالبہ کرتا ہے، اُس کا چالان کر دیا جاتا ہے۔ اور معاملہ فہم و قابل "مجسٹریٹ" اُس مظلوم پر جرمانہ کر کے پولیس کے مظالم کے انسداد کی تمام امیدوں کو بیک گردشِ قلم خاک میں مِلا دیتا ہے۔

اسی طرح ہر شہر کی میونسپلٹی، صحتِ عامّہ کے تحفّظ کی خاطر ایسے انسپکٹر مقرّر کرتی ہے جو اس امر پر سختی سے نگاہ رکھتے ہیں کہ بازاروں میں ایسی چیزیں ہرگز فروخت نہ ہونے پائیں جن میں کسی قسم کی آمیزش ہو۔ یا وہ سڑی گلی ہوں۔

لیکن محکوم ممالک میں یہ محکمہ بھی، تمام دیگر محکموں کی طرح ایک "خطرناک جرگے" کی صورت اختیار کیے رہتا ہے۔

ان ممالک میں سڑے ہوئے پھل، اور چربی مِلا ہوا گھی، نیز وہ تمام چیزیں جن سے صحتِ عامّہ برباد ہوتی ہے چھپا کر نہیں کھُلے بندوں اور دن دہاڑے دھڑلّے کے ساتھ فروخت کی جاتی ہیں۔ اور ان جراثیم فروش دوکانداروں کو محض اِس تنہا بنیاد پر پبلک میں وبائیں پھیلانے کا لائسنس دے دیا جاتا ہے، کہ وہ اِن انسپکٹروں کے گھر خورد و نوش کا سامان بے قیمت پہنچاتے، اور اُن کے

ساختہ ساختہ۔ ہندوستانی بھی ماہ بماہ پیش کرتے رہتے ہیں۔
غرضکہ محکوم قوم کو صرف حاکم قوم ہی تباہ نہیں کرتی، بلکہ حاکم قوم کے
نوکر چاکر بھی، جو خود اُس کے ہم قوم ہوتے ہیں، اُس کی ہڈیاں چبایا کرتے، اور
اور اُس کا خون پیا کرتے ہیں۔

اگر محکوم قوم کو دنیا کی کسی قوت سے دادرسی کی امید ہوسکتی ہے تو
وہ قوت موت اور صرف موت ہے۔

ستار کی ندی

یہ کس نے آج سایۂ ابرِ بہار میں
بھر دی دلِ شکستہ کی جنبش ستار میں؟

ہر تار میں تلاطمِ درد و خروشِ آہ
آہن میں ہے وہ لوچ کہ اللہ کی پناہ

چھاتی دھڑک رہی ہے طبیعت ہے سوگوار
گویا بجا رہا ہے کوئی آنسوؤں کا تار

ہر نرم تان، رُوح سے پیوست و متصل
ہر زمزمے میں ایک دھڑکتا ہوا سا دل

میزانِ کشمکش میں ترانے تُلے ہوئے
فطرت سرائے غم کے دریچے کُھلے ہوئے

غلطیدہ ہے صدا میں بصد گرمی و جلال
شعلے کا رقص، آنچ کی لہریں، شرر کا حال

پیکِ الم کی تیز نوازی اُتار پر
رُوحوں کی کروٹیں ابدی غم کی دھار پر

ہر شعبۂ صدا خمِ گیسو لئے ہوئے
ہر لَے کی آگ خون کے آنسو لئے ہوئے

مابینِ صد بہار و خزاں جھولتے ہوئے
ہر زیر و بم میں کون و مکاں جھولتے ہوئے

ضَو سی کتابِ عشق کے ہر ایک حرف پر
تانوں کی دھوپ عمرِ گذشتہ کی برف پر

نغمے ہیں یا ہے غم کی ندی بے خودی کی لہر
بجلی کی لہر، خوں کی لہر، آنسوؤں کی لہر

کس سے کوئی بتائے کہ ہر ایک رقیق لَے
کیوں کر مثالِ جُوئے رواں جوش پے بہ پے

اُتری چڑھی تڑپ کے مُڑی مُڑ کے پھر گئی
پھرتے ہی میرے دل کے سمندر میں گر گئی

جوش ملیح آبادی

عمرانی بروز کی نفسیات

(نفسیات ارتقائے معاشرت)

شری اروندو گھوش پانڈیچری

جدید سائنس کائنات کے طبیعاتی انکشاف سے لبریز ہے۔ اور مادہ (MATTER) کے وجود مطلق کی قائل ہے۔ بلکہ بنیاد ہی مادہ کو قرار دیا گیا اور مادہ کے امور و لواحق کا مطالعہ اس درجہ وسیع ہوگیا کہ جدید سائنس نے جب روح اور نفس (SOUL AND MIND) کا مطالعہ کیا تو وہ طبیعاتی بنیادوں اور اصول پر، انسان اور حیوانات میں فطرت کی کارفرمائیاں کیا صورتیں اختیار کرتی ہیں۔ اس کا مطالعہ بھی جدید سائنس کا موضوع بنا، اس سلسلہ میں مادی علوم میں سب سے زیادہ اہم مضمون نفسیات کا قرار پایا۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ نفسیات کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ جدید سائنس جیسا کہ اوپر کہا گیا مادہ کا مطالعہ ہے۔ چنانچہ نفسیات کا مضمون بھی تشنہ رہتا اگر علم الحیات (فزیالوجی) کا مطالعہ نہ کیا جاتا، کیونکہ دماغ کے رگ و ریشہ اور نظام عصبی کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر نفسیات کا مضمون سمجھنا دشوار ہے۔ چونکہ مطالعۂ انسان میں ظاہری امور و معاملات کا مطالعہ زیادہ قریبی تھا، اس لئے کوئی تعجب نہیں معلوم ہوتا کہ تاریخ اور عمرانیات کے مضامین میں انسان کے قانون، ادارہ جات، رسوم و عادات، رواج و حالات، معاشری و معاشی ارتقا اور دیگر مباحث کا مطالعہ زیادہ کیا گیا، بہ نسبت نفسیات کے حالانکہ انسان سوچنے والا حیوان ہے۔ اس کے دماغ، اس کی روح اور نفسیات کے مطالعہ کی جانب سے جو غفلت برتی گئی ہے وہ کچھ زیادہ تعجب انگیز نہیں ہے، تاریخ اور ارتقائے عمرانیات کے ہر اصول و بحث کی توضیح سائنس کر سکتی ہے۔ جس کی بنیاد اور وجہ اقتصادی و معاشی ضروریات کو بنایا جائے گا۔ یہاں لفظ معاشیات کے ہمہ گیر اور وسیع معنی مراد ہیں۔

مگر پھر بھی بعض مورخین اس اعتقاد کے واقع ہوئے ہیں کہ وہ انسانی حیات کے مدارج ارتقا اور اداره ہائے انسانی کی ترقی و بنیاد کے باب میں خیال اور مفکرین کی احسان مندیوں کو ماننے کے لئے یا تو بالکل ہی تیار نہیں ہیں، یا اگر فکر صحیح اور مفکرین عالم کی کاوشوں اور احسانوں کو مانتے بھی ہیں تو ارتقائے حیات انسانی کے باب میں اسے اہمیت کا دوسرا درجہ دیتے ہیں۔ یعنی مفکرین کے عمل کو فوقیت و رفعت دینے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کے نزدیک انقلاب فرانس وقت گزنے

پر اسی طرح رونما ہو جاتا۔ جس طرح ہوا، روسو اور والٹیر نہ بھی پیدا ہوتے اور ان کی تحریریں نقیبِ انقلاب نہ بھی ثابت ہوتیں تب بھی انقلاب ضرور ہوتا۔ انقلاب ہوا محض اقتصادی ضروریات کی کروٹ کی بدولت، نہ کہ ان مشاہیر کی تحریروں کی وجہ سے۔ گو یہ ضرور ہے کہ ان مفکرین نے اٹھارویں صدی میں تحریک فلسفہ اور دنیائے فکر میں اہم و نمایاں تبدیلیاں اور مفروضات کی بنیاد رکھ دی مگر انقلاب صرف معاشی نکتہ نظر کا جلی و خفی مظہر تھا۔

روح اور نفس کے مسائل کو مادہ کی بنیادی اصول کے مطالعہ کرنے پر اب شک و شبہ کی نظر ڈالی جا رہی ہے۔ بلکہ یہ شبہ پختہ ہو گیا ہے کہ مادہ کو ہمہ گیر کائنات کا موجب نہیں سمجھا جا سکتا، بعض امور کائنات ایسے ہیں جنہیں مادہ کی تشریح و تحلیل واضح نہیں کر سکتی۔ ایک تحریک اس وقت مفکرین عالم میں پیدا ہو چکی ہے کہ طبیعیاتی علوم اور مادہ کے مضامین و فنون سے انسان کی بے چین و بے قرار روح کو نجات و آزادی دلائی جائے۔

کچھ عرصہ سے یہ امر محسوس کیا جانے لگا ہے کہ تاریخی و اقتصادی وجوہ کے علاوہ نہایت گہرے نفسیاتی عناصر بھی ارتقائے انسانی میں مدد دیتے رہے ہیں، جرمنی میں جو گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال سے عقلیات اور مادیات کا مینو سواد ہے بلکہ عقل و مادہ پرستی کا مولد و مخزن ہے، یہ تحریک نمایاں حیثیت حاصل کر چکی ہے کہ تاریخ میں پہلی بار نفسیات تاریخ کو اجاگر اور روشن کر کے منظر عام پر لایا جائے۔ جو بنیادی رجحانات، اچھے اور برے، نفع بخش اور ضرر رساں پیدا ہوتے رہے ہیں، اور حیات انسانی پر اثر انداز ہوئے ہیں ان کو نفسیات کے پہلو سے اس جگہ ایک مربوط حالت میں اور جدید زاویہ نگاہ سے پیش کیا جائے۔ اس نفسیاتی نکتہ کا پہلا تصور جرمنی میں پیدا ہوا ہے۔ اور سب سے پہلی بار اسی مرکز دہریت و مادہ پرستی سے اس مطالعہ نفس کی آواز بلند ہوئی ہے۔

کسی نئے میدان میں جدید کوششوں کو کامیابی کی بہت کم منزلیں نصیب ہوتی ہیں۔ جرمنی فلسفی لیمپریخت" (LEMPRECHT) جس نے یہ نظریہ پیدا کیا تھا، اگرچہ اس تصور جمیل کی توسیع میں شد و مد سے کوشش کر رہا ہے مگر کسی نتیجہ پر اسے نہ پہنچا سکا۔

خود اس کے دماغ پر ابھی تک معاشی عنصر کی کارکردگی کی اہمیت مستولی ہے اور منجملہ دیگر مغربی علوم کے اس کا نظریہ بھی علم کے اصولِ موضوعہ کی تقسیم و درجہ بندی پر مرکوز رہتا ہے، نہ کہ ان کی تشریح و تاویل پر۔ مگر باوصف اس کے یہ ضرور ہے کہ جرمنی مفکر کی کوششوں سے دنیائے علم و نفس کے سامنے ایک درخشندہ تصور آگیا ہے۔ اور یہ ایک ایسی حیرت انگیز و تمثیلی حقیقت مبہم ہے، جس پر ہر سوچنے والے دماغ کو غور کرنے کی ضرورت ہے، مشرقی فلسفہ و فکر نیز تجربات کی روشنی میں اس کے نظریہ نے جو جدید راہیں بحث و نظر کی کھول دی ہیں ان کا مطالعہ ہمارے نقطہ نظر سے ایک گراں قدر علمی خدمت ہے، ضرورت ہے کہ اس کی پیش کردہ تجاویز و نظر کو سمجھنے اور اختیار کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔

"لیمپریخت" نے یورپی تاریخ، بالخصوص جرمنی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر شاید یہ فیصلہ کیا ہوگا کہ معاشرہ انسانی چند مستقل نفسیاتی مدارج میں سے گذرتا ہے۔ جنہیں وہ اپنی اصطلاح میں تین درجوں، معنوی، روایتی و رواجی اور مثالی میں تقسیم کرتا ہے۔ جو بصورت آخر انفرادی اور اضافی بھی ہو سکتے ہیں۔ پس اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ان عناصر سے مرکب ہو کر ایک نفسیاتی دائرہ بنتا ہے جس سے انسان کو انفرادی طور پر اور تمام اقوام و ملل اور تہذیبوں کو گذرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر علم نفس اور تہذیب عالم کے تعلق کو ان قیود اور درجوں میں تقسیم کر کے سختی کے ساتھ کوئی حکم لگانے کی سعی کی جائے گی تو وہ بنیادی طور پر غلط ثابت ہوگی۔ پس ضرورت ہے کہ وسعت نظر کے ساتھ بحث کی جائے۔ انسان اور اس کی سماجوں کی نفسیات اس قدر مختلف النوع پیچیدہ اور پہلو در پہلو رجحانات و امکانات، گنجان موضوعات سے لبریز ہے کہ ایسی سخت اور صریح تقسیم کر کے کوئی آخری حکم اس باب میں لگانا محالات میں سے ہے۔ اس وضع کی کسی رسمی تحلیل و تجزیہ کی تشفی ان دشوار گذار گھاٹیوں میں سے گذر کر نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ اس نظریہ سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی متواتر پیدا ہونے والی مختلف صورتوں اور اشکال

کے حقیقی اور باطنی معنی کیا ہیں، نیز یہ کہ اس دائرۂ نفسیات تاریخ کی بدلنے والی حالتوں اور پے در پے تبدیلیوں کی کیا ضرورت ہے، اور یہ کہاں سے شروع ہو کر کس مقام پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

ان مسائل کے علاوہ یہ امر بھی موجب غور و فکر ہے کہ خواہ مسائل نفس ہوں یا مسائل مادہ ان کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان علوم کے ظہور و نشوونما کے باب میں ایک مستقل رائے قائم کر لی جائے اور ان عناصر ترکیبی کو ہدف بحث و نظر بنا لیا جائے جو بیک نظر ہماری نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور اس کے بطون کے بارے میں بھی سرگردانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگرچہ یہ تمام معلومات علیحدہ حالت میں کہیں دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ جب بھی پائی جائیں گی یکجا حالت میں، اس لئے ضرورت ہے کہ ان کی ہیئت کو اور ان کے عمل و ردّ عمل کو سمجھنے کی زیادہ قریب سے کوشش کی جائے، پس ہم جرمنی مفکر لیمپریخت کے نظریہ اور اس کے متعلقات کو سردست چھوڑتے ہیں۔ اس نے جو موضوعات افق نظر پر پیدا کئے ہیں ہم سب سے پہلے ان کی جانچ شروع کرتے ہیں۔ اور یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے تاریخی ارتقا میں ان کی کیا قدر و قیمت ہے۔ اور یہ کہ اس ارتقائے حیات انسانی میں کن عناصر نے کارگذاری دکھائی ہے۔

بلا دریغ ہم کسی سماج کو لے لیں، خواہ وہ دور بربریت میں ہو اور غیر متمدن ہو۔ یا متمدن و مہذب دور میں سے گذر رہی ہو۔ معاشی اعتبار سے ترقی یافتہ ہو یا بہت پستی میں ہو۔ یہ امر فوراً محسوس کر لیا جائے گا کہ اس سماج کے تصورات ملی کو ڈھالنے اور ایک خاص نہج کی ذہنیت بنانے میں ایک معنوی خیال (SYMBOLIC THOUGHT) کام کر رہا ہے۔ اور جو اس کے رسم و رواج اور سماجی اداروں کی تشکیل و تکمیل اور ہیئت کا ذمہ دار ہے۔ مگر یہ معنوی خیال کس خیال و تصور کا جانشین ہے، کس تصور کا مظہر و پیکر ہے؟ اگر اس امر پہ ذرا بھی غور کیا جائے تو فوراً ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ کسی معاشرہ کی یہ حالت جو اس کی تہذیب کے ابتدائی مراحل کی حالت ہوتی ہے بہت خیال آفریں۔ خیال پرست ہوتی ہے۔ اور اس میں مذہب اور خیالات مذہب، فکری مذہب کا پرتو زیادہ پایا جاتا ہے۔ معنویت و پیکر مذہب، فکر بلیغ اور جذبات الوہیت باہم گر ایک ہو کر اس سماج کے چلانے پر مامور ہوتے ہیں۔ مگر جوں جوں انسان اس منزل سے اوپر جاتا ہے مذہبی معتقدات کی جگہ ذہنی ارتقا، فطانت اور عقل پرستی کو مل جاتی ہے تو معاشرہ کا مذہب انفرادی ذہن کی پرواز اور دہریت مآب خیالات کا عکس ہو کر رہ جاتا ہے۔ یعنی معنوی مباحث مذہب کی جگہ مستقل عقلی اصول کو مل جاتی ہے۔ رسمی مذہب۔ رواجی معتقدات۔ کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جو معنویت فکر پیدا ہوتی ہے وہ کورانہ تقلید کی بجائے، پر تو ہوتی ہے۔ ان خیالات کی جو خود انسان کے ذہن کا پس منظر ہوتی ہے۔ اس کی حیات اور ہستی کے پیچھے عمل و حرکت کے طفیل جس قسم کی روشنی پیدا ہوتی ہے اس وقت ان کا پرتو ایک جداگانہ عکس لے کر جلوہ گر ہوتی ہے۔ انسان کا فکر گہرا ہو جاتا ہے۔ الوہیت، خدا شناسی اور اپنی ہستی کے بارے میں اس کے تصورات عجب صوفیانہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ خیالات جن کو وہ خاص نام نہیں دے سکتا۔ ایک پراسرار ظنی کیفیت اشیائے کائنات کی اس کے ذہن کے پردہ پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ اس درجہ میں جب انسان پہنچ جاتا ہے تو اس کے مذہبی اور سماجی تصورات و معتقدات ادارہائے معاشرت حیات کے مختلف الوقوع لمحات معنوی اشکال اختیار کر لیتے ہیں، جو دراصل مظہر (SYMBOLS) ہوتے ہیں۔ ان جذبات و تصورات کا جو اس نے مختلف اثرات حیات سے مربوط و ملحق ہو کر پیدا کئے ہیں یا متصوفانہ رنگ ہے جو اس کی روح پر طاری ہو گیا ہے، وہ در اصل ماحصل ہے ان ہی وجوہ و تحریکات کا جن سے بن کر یہ افکار ہویدا ہوئے تھے۔ اور جن کی ترتیب و تشکیل اس کے ذہن نے سرانجام دی تھی۔

اگر ہم ہندوستان کی تاریخ کے اس عہد کی طرف رجوع کریں جسے ویدی عہد کہا جاتا ہے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اس عہد کی ذہنیت ختم ہو چکی ہے۔ نہ اب اس ذہنیت کی تفہیم اس وقت ممکن اور سریع الفہم ہے اس وقت ہر چیز معنویت کے پردے میں تھی، ہر چیز کسی خاص جذبہ کے

پیچیدگی تک ہوتی تھی۔

مثلاً ویدی عہد کی یگیہ (قربانیوں) کو لیجئے، وید اور اپنشدوں کو دیکھ جائیے پتہ چلے گا کہ اس وقت کی ذہنیت اور معاشرہ کے ایک ایک قدم اور لمحہ پر قربانی کی ضرورت و اہمیت ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ رسوم کی تفصیلات اور قربانیوں کی ان تکلف باتوں کو دیکھتے ہوئے اس جگہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ قربانی کا فلسفہ ایک خاص فکری معنویت لئے ہوئے تھا۔ اور اس میں تصوف کی گہری چاشنی تھی۔ صرف ظاہری علامات پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تاویل کہ قربانیوں کی پشت پر کوئی فلسفہ سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ ان دیوتاؤں کو جن کے ہاتھ میں فطرت ہے، دنیاوی ثروت و امور یا انھیں خوش کرنے اور ناخوشی دور کرنے کے لئے قربانیاں کی جاتی تھیں۔ بالکل غلط ہے۔ بلکہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ اس عہد کے منکرین میں جنہوں نے بعد کو جبکہ عقل پرستی نے عود کیا تھا فلسفہ قربانی کی نئی نئی تاویلیں شروع کی تھیں۔ یہ لوگ بالکل عقل پرست تھے اور ہر بات میں عملی اور دنیاوی کارکردگی کا پہلو دیکھتے تھے، حتیٰ کہ مذہب و معتقدات کے بارے میں بھی ان کی ذہنیت عملیت و عقلیت کے دائروں میں سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ یہ لوگ اپنی معنویت و فکریت کو قدیم ویدی ذہنیت کے متوازی لا ہی نہ سکتے تھے۔ اس لئے نچلے طبقہ ہی رہ گئے۔ اس وقت کی مذہبی رسوم و آداب ہی نہیں بلکہ سماجی رواج بھی ایک خاص معنویت اور پیرہن تصور میں جلوہ گر دکھائی دیتے تھے۔

مثلاً رگ وید کا وہ منتر لیجئے جو کسی انسانی جوڑے کی شادی کے وقت پڑھا جاتا ہے۔ اس میں کس بات کا تذکرہ ہے۔ اس میں سوریا۔ دختر آفتاب کی مختلف دیوتاؤں کے ساتھ شادیوں کا حال ہے۔ حالانکہ اس دنیا میں دو انسانوں کے درمیان جو شادی ہوتی ہے وہ ایک بالکل مختلف بات ہوتی ہے۔ مگر اس آسمانی شادی کا تذکرہ کر کے جلال و جذبات الٰہی کا ایک پرتو اس جوڑے پر ڈالا جاتا ہے جو زمین پر شادی کے بندھن میں بندھ رہا ہوتا ہے۔ یہ جذبات ظاہری عقیدت سے بہت آگے ایک خاص الوہیت کا عکس ہوتے ہیں۔ ویدی عہد میں تو آسمانی جوڑے کی شادی کا تذکرہ ایک خاص اصول عشق الٰہی کی توضیح اور آسمانی خداؤں کے جلال و ہیبت اور پاکیزگی اور روح و زہد کی معنویت لئے ہوئے ہوتا تھا مگر بعد میں اس نے شاعرانہ تلمیح اور ذہنیت شعری کی جگہ لے لی۔ اور ایک قدیم عہد کی رنگین داستان کا عکس سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ مقصد اس کا یہ تھا۔ یعنی الوہیت کے جذبات برانگیختہ ہونا اور خدا کے درجہ میں جانے والے زمین کے افراد میں جلال آسمانی کے جذبات پیدا کرنا۔ اگرچہ انسان ایک دیوی۔ دیوتا کے درجہ سے بہت کمتر مانا جاتا ہے، مگر اسے الوہیت کے اعلےٰ پرتو سے اجاگر اور منور کیا جاتا ہے۔ مگر بعد میں جو حالات رونما ہوتے اس کا بیّن فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ اس وقت کی ہندو شادی اور رائج وقت کی ہندو شادی میں فلسفیانہ بُعد جس درجہ وسیع پایا جاتا ہے، وہ آسانی کے ساتھ محسوس ہو سکتا ہے۔ جو معنویت خیال مدت دراز تک ہندوستانی دماغوں پر طاری رہی اور ان کی رسوم شادی کو اسی معنویت کے پیکر و پیرہن میں مستور رکھا تھا بعد کو ایک مردہ تہذیب کی "یاد" اور بے جان اصول کی میکانی مشق کے طور پر باقی رہ گئی، ورنہ اصل وجود اصول کی روح غائب ہو چکی تھی۔ آجکل اس عہد کہن کی صرف یاد ہے اس کی روح کی فلاسفی کو سمجھنے والی ذہنیت مفقود ہے۔

اس گفتگو کو یہاں چھوڑنے سے قبل اس کی طرف اشارہ کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ قدیم عہد میں ہندوستان میں مرد اور عورت کی شادی دراصل "پرش" اور "پراکرتی" (ویدوں میں جنہیں "نرتی" اور "گنا" کہا گیا ہے یعنی نر اور مادہ اصول کائنات کے مربوط و ملحق بالذات ہونے کا مظہر سمجھی جاتی تھی۔ اور اس میں الوہیت کا رنگ بدرجہ اتم چڑھا ہوا ہوتا تھا۔ اس خیال اور عورت کی پوزیشن میں ایک ارتباط بھی پایا جاتا ہے ابتدائی ویدی عہد میں عورت کو ایک قسم کے مساوی درجہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ مرد کو پھر بھی معنویت کے پیکر میں ایک قسم کی فوقیت حاصل تھی۔ مگر اس وقت بھی عورت مرد کی رفیق سمجھی جاتی تھی۔ نہ کہ ضمیمہ، مگر بعد کو جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں ان کے ماتحت "پراکرتی" کو پرش کی ماتحت اصولی حیثیت میں رکھ دیا گیا۔ اور عورت کا مساویانہ درجہ جات مشکوک

ٹکرانے لگا۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ عورت تمام تر مرد کے لئے پیدا ہوئی ہے، مرد کے لئے اس کی ہستی وجود میں آتی ہے اور اپنی حیات کے لئے بھی مرد پر ہی بھروسہ کرتی ہے، مگر پھر بھی اس کی ایک علیحدہ معنوی پوزیشن تب بھی ویدوں نے کبھی ماننے سے انکار نہیں کیا تھا۔ مگر بعد کی تاویلات نے عورت کی حیثیت کی طرف سے روگردانی کی۔ تنترک شاستر میں جو مذہب پیش کیا گیا ہے، وہ عورت کے اصول کو رفعت و فوقیت کے درجہ میں دکھتا ہے اور ایک ایسی کوشش عورت کی حیثیت کو اونچا کرنے کی کی گئی ہے کہ جو سماجی حیات میں کبھی بھی عملی طور پر ظہور پذیر نہیں ہوئی، ہاں اصول کے طور پر کتابوں میں ان کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ تنترک فلسفہ ہندو ویدی مذہب کی گرفت کو جو لوگوں کے اذہان پر قائم ہو چکی تھی دور نہ کر سکا۔ عورت کی بہت قوی تنظیم بلکہ قابل پرستش بنانے کی کوششیں بے سود رہیں۔

لیجئے ہم ایک اور مثال لیتے ہیں اور ہمارے مقصد کی توضیح کے لئے یہ ایک بہتر مثال ہے۔ میری مراد اس فلسفۂ ہنود سے ہے جسے "چترواِن" یا ذات پات کے بندھن کے نام سے عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ "جاتی" دراصل ایک سماجی وان ہوتا ہے جسے معنوی اور تمثیلی ادارۂ حیات انسانی کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کا مطالعہ ہمارے لئے اس مضمون کو سمجھنے کے لئے ازبس ضروری ہے۔ ہم کو یہ بتایا گیا ہے کہ سوسائٹی کو چار ذاتوں میں تقسیم کیا گیا تو اس کی وجوہ سیاسی اغراض اور اقتصادی مجبوریاں تھیں، ممکن ہے[1] ایسا ہی ہو۔ اس وقت جب یہ چار ذاتیں یا "چترواِن" بنائے گئے تھے، لوگوں کے ذہنوں میں سیاسی و اقتصادی ضروریات کا تصور جاگزین نہ ہوا تھا۔ بلکہ اس وقت کی ذہنیت اس تقسیم کو مذہبی عقیدت۔ نفسیاتی تقسیم عمل اور معنوی پیکر کا پرتو سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ "پوروشا سکتا" میں ان چاروں کو خالق کائنات (برہما) کے جسم کے چار حصوں کی تقسیم کے مطابق تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی علی الترتیب دماغ بازو، گھٹنوں اور پاؤں سے چار ذاتوں کا نکلنا مانا گیا ہے۔ ہمارے لئے یہ

[1] اشتباہ کی گنجائش اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ، بتدائے ایام میں برہمنوں کا طبقہ ضرور مذہبی رسوم و آداب کے انصرام اور رشد و ہدایت کے منصب پر ہی محدود نہ رہتا تھا۔ بلکہ معاشی ضروریات کے ادا کرنے اور اقتصادی امور میں عملی حصہ لینے میں مصروف رہتا تھا۔

صرف ایک شاعرانہ تلمیح کا درجہ رکھتی ہے یعنی یہ کہ برہمن اہل علم و ہنر اور صاحب ذہن لوگ ہوتے تھے، کھشتری طاقت و جلال کے حامل تھے، ویش اقتصادی ضروریات کے کفیل صنعت و تجارت اور سماجی ضروریات کے کارکن اور شودر خدمتگذاروں کے درجہ میں تھے۔ ان امور کا اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کے لوگ ان عمیق شاعرانہ تلمیحات کو سمجھنے سے زیادہ ان کی مذہبی عظمت اور نفسیاتی اثر کے قائل ہوتے تھے، برہما کے جسم سے نکلی ہوئی چار ذاتوں یا شوہر کی آسمانی شادی کی روایات ان لوگوں میں ایک مستقل مذہب کے بنیادی پتھر کی سی حیثیت رکھتی تھیں، جن پر منضبط رسوم و آداب، مقدس تہواروں اور رسموں، مستقل ادارہ ہائے انسانی۔ اخلاقی اور سماجی تفریق و تقسیم وغیرہ امور کو مرکوز و منحصر کر دیا تھا۔ ہماری غلطی ہے کہ ہم اپنی ذہنیت کو سامنے رکھکر اس وقت کی ذہنیت کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ایسی حالت میں ہم اگر انھیں تصور پسند، غیر متمدن، وحشی اقوام کی حیثیت میں دیکھیں تو کیا تعجب ہے۔ ہماری آنکھوں پر رنگین عینک چڑھی ہوئی ہے، ہمارے لئے شاعری صرف جذبات کے خوبصورت اظہار اور حسین تصورات کے مربوط سلسلہ کا نام ہے۔ تصور ہماری تفریح کا سبب اور ہماری خوشی و مسرت کے لئے دست بستہ غلام یا دماغ کے ایوان میں ناچنے والی طوائف، مگر قدیم انسان کے لئے شاعر ایک بزرگ عقیل ہوتا تھا۔ ایک مصلح اخلاق و عوام، ایک ناظر حقائق کائنات، تصور ایک طوائف کی طرح دل خوش کرنے والا آلہ نہیں بلکہ ایک قوت جو قدرت نے اس لئے ادا کی تھی کہ حقائق حیات کو سوچ کر ان کی گہرائیوں کو معلوم کرے، نہ کہ ان گھڑت قصے اور تاویلیں کرنے میں اس کو صرف کرے، حتیٰ کہ قدیم ویدی عہد کی تشبیہات اور تلمیحات شعری بھی صرف شاعری تک محدود نہیں ہیں بلکہ ایک خاص اثر انسانوں کے ذہنوں تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے اور ان تلمیحات کے ذریعہ انسان پر وجد کی کیفیت، اخلاقی اثر اور صوفیانہ جذبات طاری کر کے ان کے ذہنوں کو بلندی کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ ان تشبیہات کا مقصد شاعرانہ چاشنی نہ تھی بلکہ حقائق اسرار الٰہی اور پر اسرار حیات کی پردہ دری تھی، اس وقت کا شاعر ایک بزرگ عقیل کی طرح اپنی تشبیہات میں شعر کے پردے میں کسی خاص خدائی صفت کو مظہر بتاتا تھا، اور ایسی تشبیہات و تلمیحات سے کام لیتا تھا جو دنیاوی تعلق میں کام آتی ہیں۔ معنویت کے پیکر میں جلوہ ریز ہیں۔ ایک ایک لفظ اپنی جگہ ایک خاص کیفیت اور عشق حقیقی کا پرتو بن کر سامنے آتا ہے۔ سطحی جذبات مٹ جاتے ہیں، مادی جذبات فنا ہو جاتے ہیں اور صرف حقیقت رہ جاتی ہے، مجاز کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ ان لوگوں کے نزدیک برہما کے جسم کی معنوی تشریح محض ایک تشبیہ ہی نہیں تھی بلکہ ایک حقیقت مجسم اور الوہیت کا مظہر جو ان کے ذہنوں میں سمائی ہوئی تھی۔ ان کے نزدیک انسانی گروہ کو اس طرح تقسیم کرنا آسمانی اور غیر مرئی طاقت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنا ہوتا تھا جو انسانوں کا خالق بلکہ تمام کائنات کا موجب ہے۔ جو مادہ میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور

مابعدالطبیعاتی پیکر بن کر بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ انسان اور روحانی اشکال ایک ہی مستقل حقیقت اول کے مختلف جلوے اور رنگ نئے روپ بہروپ ہیں۔

ہر چیز کو معنویت کا پیکر دینے کے رجحان علمیہ نے سوسائٹی میں یہ رواج قائم کر دیا ہے کہ ہر چیز کو مذہبی تقدس۔ احترام اور دہشت نفس کے اعتباً سے منضبط کیا جائے۔ مگر ان امور میں اس قدر سختی یا شدت اور قیود و بندشیں، جیسی بعد کو پیدا ہوئیں۔ بلکہ ایک خاص قسم کی فطری آزادی اس وقت کے لوگوں کا شیوہ رہا۔ یہ آزادی ایسی شکل کی آزادی عمل و خیال تھی کہ جس کی مثال دیگر "وحشی" اقوام عالم کی سماجی حیات میں بہرحال متوازی طور پر کہیں نہیں ملتی وحشی اقوام عالم تو اب معنویت کے درجہ سے نکل کر رواجی مذہب کے دور میں سے گذر رہی ہیں۔ اور بجائے اس کے .... کہ ایک بلند ہونے والے خم کی طرف جاتیں، وہ ایک ایسی ڈھال پر بیٹھی ہوئی ہیں، جو انھیں نیچے کی جانب لا رہی ہے۔ اور یہ وہ حال ہے جو ترقی کی طرف، بڑھوتری کی طرف رہنمائی نہ کرے گا۔ انحطاط اور زوالِ معاشرت کی طرف دھکیلے گا۔ روحانی نفسیاتی اصول بنتے ہیں۔ اور مذہبی امور کی رہنمائی کرتے ہیں معنویت میں جان ڈالتے ہیں۔ مگر سماجی امور اس قدر سخت اور منضبط نہیں ہوتے جس قدر نفسیات اور روحانیات کے اصول ہوتے ہیں اس لئے سماجی بندھن کھلتے اور پھر بند ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں اسفنجی طاقت ہوتی ہے جو حالات کے تقاضے کے اعتبار سے مختلف صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں۔ مگر ایک چیز ضرور ہے اور وہ نفسیاتی اصول کی مرکزیت اور پختگی ہے۔ چنانچہ اسی سخت گیر اصول کے ماتحت ہم چار ذاتوں کی تقسیم معاملہ بھی لیتے ہیں، اگر جدید قسم کی تشبیہی استعمال کی جائے جو ویدی عہد کے لوگوں میں کبھی بھی نہیں آئی ہوگی تو ان چار ذاتوں کی تقسیم کا مدعا اس طرح ظاہر ہوگا ــــــ خدائی جلوہ جو دماغ اور ذہن سے ظاہر ہو۔ خدا جو طاقت و ثروت و سیاست میں جلوہ گر ہو۔ خدا جو پیداوار۔ باہمی امداد و عمل اور تفریح و تفنن میں ظاہر ہو۔ خدا جو خدمت۔ عمل صالحہ، فرماں برداری اور کارکردگی میں اپنا پر تو ظاہر کرے۔ یہ چاروں اصول حیات جو آسمانی خدا کے چاروں پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں اگر اصول کائنات مانے جائیں تو پھر کیا تقسیم ہوگی، تقسیم یہ ہوگی کہ وہ "طاقت" جو دماغ اور ذہن ہے تمام کارخانۂ خیال و عمل کا، وہ قوت جو عمل اور حرکت کرتی ہے، وہ تعلق و مفاہمت جو تمام مشین کے مختلف پرزوں کو کام میں لاتا۔ انہیں مربوط حالت میں رکھتا اور آخر میں وہ کارکن قوت جو اوپر کی تمام قوتوں کی خدمت گذاری میں ہر وقت حاضر و غائب موجود ہوتی ہے، اور تینوں قوتوں کی ہدایات کے بموجب صرف کام کرنے سے دھیان رکھتی ہے اور کوئی بات نہیں سوچتی۔ اس کے بعد ایک اور فلسفیانہ مذہب پیدا ہوا، جو صفت انسان "گن" کو مانتا ہے۔ جو ایک شدید قسم کا معاشری قانون تو نہ بن سکا مگر اخلاقی پنچ کے درجے میں ضرور پہنچ گیا۔ اسی طرح ایک اور متوازی قانون عمل بنا، جسے "کرم" کہتے ہیں۔ یہ بھی سخت انضباط اور معاشرتی و اقتصادی ملحقات حیات پر حاوی ہے۔ اور جیسا جیسا اس کا فائدہ اور اثر انسانی حیات کے کامگار بنانے اور مناسبت پیدا کرنے میں ظاہر ہوتا رہا اتنی ہی اس کی وقعت پیدا ہوتی رہی۔ ان خیالات فلسفہ کے بیدار ہونے کی وجہ سے پھر کچھ مدارج حیات گروہ انسانی میں پیدا ہوئے۔ مثلاً یہ کہ پہلا درجہ تو معنویت کا آیا جو تمام تر مذہبی اور روحانی امور و قیود سے لبریز رہا۔ اس کے علاوہ جس قدر بھی اصول و عمل حیات استوار ہوئے ان کا تعلق نفسیاتی۔ اخلاقی، اقتصادی، مادی قیود سے لبریز رہا۔ اور مذہبی و روحانی قیود کے تابع رہا۔ کیونکہ روحانیات کو سب نے فوقیت کے درجے میں مانا ہے۔ دوسرا درجہ وہ آیا جب مذہبی اور روحانی قیود و اصول بھی نفسیاتی اور اخلاقی امور و مصالح کے ماتحت سمجھے جانے لگے نفسیاتی اصول اور اخلاقیاتی مظاہر کی صورتوں میں جو چیزیں جلوہ گر ہوئیں لوگوں نے صرف انہیں کو قبول کیا۔ اور باقی مظاہر فطرت کو ماننے میں تامل کیا۔ اخلاقی ضابطہ اور تحریک کو چلانے اور حاکمانہ منظوری دینے کا دوسرا نام مذہب ہوگیا سادہ۔ وہ مذہب کی پہلی حالت برقرار رہی۔ اور یہی وجہ تھی کہ جس نے مذہب کی سماجی افادیت کو لوگوں کے پھر ذہن نشین کرایا۔ حالت وہ آگئی جب خالق عالم کو انسان کے مختلف پیکروں میں جلوہ ریز ہونے کی ضرورت کو تسلیم کرنے سے لوگ گریز کرنے لگے۔ لوگوں

نے سمجھا ہم خود خدا ہیں، یہ خیال کہ خدا کے ہم مظہر ہیں اور وہ مختلف جلووں میں ظہور پاتا رہتا ہے۔ مدہم ہوگیا۔ بلکہ عملی طور پر لوگ اسے فضول سا سمجھنے لگے، اور آخرکار اسے نظریۂ حیات سے بالکل علیحدہ کر دینا پڑا۔ یہ درجہ تمثیلی تصورات کا تھا۔

اگرچہ یہ درجہ دور بھی ہوجائے۔ مگر پھر بھی انسانی ذہنوں پر ایسی کیفیت و نقوش چھوڑ جاتا ہے، جو نہایت بلند و ارفع معاشرتی اصول و تصورات کہے جا سکتے ہیں۔ یہ دور گذر جانے کے باوجود ایک مستقل نقش و اثر ایسا لوگوں پر رہ جاتا ہے جسے اس دور کی یادگار اور مفید اثر کہہ سکتے ہیں مثلاً یہ کہ "افتخارِ ذات" یعنی برہمنوں کو اس پر ناز ہو کہ وہ ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی ہدایات۔ پرہیزگاری، علم و کتاب کے باعث تمام عالم کے لئے مرشد کا حکم رکھتے ہیں۔ کھشتریوں کو اپنی تاریخی روایات، بہادری، جرأت، طاقت اور ضابطۂ نفس کا مفتخر احساس ان کو ہمیشہ سربلند رکھتا ہے۔ ویشوں کو اس پر فخر رہتا ہے کہ وہ دولت و ثروت کے پیدا کرنے والے، پیدائش۔ عمل۔ تجارت، ساکھ، روپیہ کے لین دین اور مساویانہ تقسیم کے کارندے ہیں۔ آزادی، خیال۔ سخاوت، نظم و اثر ان کا سماجی شیوہ ہے۔ شودروں کو اس پر فخر ہے کہ ان کے بل بوتے پر سب محنتیں چلتی ہیں۔ انہیں اپنی خدمت گذاری۔ وفاداری۔ طاعت اور بے غرضانہ تعلق و رابطۂ حیات اکابر و عوام سے متعلق کرنے پر فخر رہتا ہے۔ مگر یہ فخر و مباہات، یہ ناز و سربلندی مردہ ہو جاتی ہے۔ جب لوگ اس کے نفسیاتی تعلق و اثر سے بے خبر ہو کر صرف مردہ پرستی اور اسلاف پرستی کو ہی ایک لازمہ سمجھ لیتے ہیں۔ اور اس سے بلند تر درجہ کی طرف صعود نہیں کرتے۔ یہ صرف روایات اور رواجی احساس کے طور پر باقی رہ جاتے ہیں۔ گو یہ ارفع ترین احساس معاشرت ضرور ہوتا ہے، رفتہ رفتہ وہ حالت آجاتی ہے کہ یہ روایات دماغ اور روح پر اثر رکھنے کے بجائے صرف زبانوں پر ایک تذکرۂ قدیم کے طور پر رہ جاتے ہیں۔ اور بس ان کی ہیئت و اہمیت حیات بالکل فنا ہو چکی ہوتی ہے۔

جب تمثیلی عہد بھی گذر جائے تو رواج کے تسلط اور سماجی روایات قدیم کی یاد کا زمانہ آتا ہے جسے بیرونی طور پر مختلف پیمانوں سے امداد ملتی رہتی ہے۔ "آدرش" (IDEAL) یا نصب العین کے خارجی اثرات روح پر زیادہ مسلط ہوتے ہیں۔ بہ نسبت خود اس نصب العین کے باطنی اوصاف کے اور اعتراف کے۔ پس جوں جوں ذات پات کے رسم و رواج رواجی اور روایتی دائرے میں داخل ہوتے رہے ان چاروں اخلاقی درنوں کے خارجی اثر نے اپنا رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ یعنی اقتصادی، معاشرتی۔ مذہبی گھریلو رسوم و آداب میں غلو پیدا ہوگیا۔ روح فنا ہوتی رہی۔ اور صرف رواج کی یاد دلوں میں باقی رہ گئی۔ اصلی اور بنیادی سکیم میں جو روح کارفرما تھی وہ مفقود ہوگئی۔ ابتدائے ایام میں پیدائش یا جنم کی اہمیت سماج میں کوئی خاص درجہ نہ رکھتی تھی۔ یا صرف معمولی حیثیت رکھتی تھی۔ انسان کا اپنا جوہر اس کی معاشرتی حیثیت استوار کرتا تھا۔ مگر بعد میں صرف "پیدائشی حادثہ" (Accident of Birth) ہی انسان کے افتخار و ناز کا باعث ہونے لگا۔ ذاتی جوہر۔ لیاقت تعلیم۔ اور روایات علم و ہنر کا درجہ تحتی طبقہ میں چلا گیا۔ روح مردہ ہوگئی اور صرف ذات پر فخر کرنے کا احساس بڑھ گیا صرف خاندانی فخر و مباہات ہی ایک چیز قابل قدر سمجھی جانے لگی۔ پس ایک برہمن کا لڑکا ہمیشہ برہمن ہی سمجھا جانے لگا۔ اور عزت کا مستحق و مورد قرار دیا گیا۔ اور اگر اس کا پیشہ اور پیدائش دونوں خاندانی روایات کے برقرار رکھنے والے ہوئے تو پھر فخر و عزت کی کوئی انتہا ہی نہیں رہتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ذاتی جوہر کی خوبیاں اور اوصاف پس پشت ڈالے جاتے رہے اور صرف جنم پر فخر کرنے اور خاندانی روایات کے بھروسے پر سربلندی و افتخار حاصل کرنے کا جذبہ ترقی کرتا رہا اول درجہ میں سے نکل کر دوم درجہ میں آنے کی وجہ [illegible] ذات پات کا رواج اپنی نفسیاتی افادیت کو کھو بیٹھا۔ بجائے ایک مستقل روحانی و عملی تعلیم کے ذات کا بندھن محض ایک سماجی زیور کے طور پر رہ گیا۔ جس نے مثالی قانون بنایا تھا اس کے ذہن میں بھی نہ تھا کہ لوگوں کے اطوار اس کا ایسا برا استعمال کریں گے۔ نصب العین بس ایک زینت کے طور پر رہ گیا۔ پوست باقی رہا۔ مغز ختم ہوگیا۔

(باقی آئندہ)

ساون کے مہینے

فردوس بنائے مرے ساون کے مہینے — اِک گُل رُخ و نسرین بدن، سرو سہی نے
ماتھے پہ اُدھر کاکُلِ ژولیدہ کی لہریں — گردوں پہ اُدھر ابر خراماں کے سفینے
مینہ جتنا برستا تھا سرِ دامنِ کہسار — اُتنے ہی زمیں اپنے اُگلتی تھی دفینے
اللہ رے یہ فرمان کہ اس مست ہوا میں — ہم منہ سے نہ بولیں گے، اگر پی نہ کسی نے
وہ مونس و غمخوار تھا جس کے لئے برسوں — مانگی تھی دعائیں مرے آغوشِ تہی نے
گل ریز تھے ساحل کے لچکتے ہوئے پودے — گلرنگ تھے تالاب کے ترشے ہوئے زینے
بارش تھی لگاتار تو یوں گرد تھی مفقود — جس طرح مئے ناب سے دھل جاتے ہیں کینے
دم بھر کو بھی تھمتی تھیں اگر سرد ہوائیں — آتے تھے جوانی کو پسینے پہ پسینے
بھر دی تھی چٹانوں میں بھی غنچوں کی سی نرمی — اک فتنۂ کونین کی نازک بدنی نے
گیتی سے اُبلتے تھے تمنا کے سلیقے — گردوں سے برستے تھے محبت کے قرینے
کیا دل کی تمناؤں کو مربوط کیا تھا — سبزے پہ مچلتی ہوئی ساون کی جھڑی نے
بدلی تھی فلک پر کہ جنوں خیز جوانی — بوندیں تھیں زمیں پر کہ انگوٹھی کے نگینے
شاخوں پہ پرندے تھے جھٹکتے ہوئے شہپر — لہروں میں بطیں اپنے اُبھارے ہوئے سینے
اس فصل میں اس درجہ رہا بے خود و سرشار — مے خانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے
کیا لمحۂ فانی تھا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا — دی کتنی ہی آواز حیاتِ ابدی نے

(جوش)

آزادی اور اصلاح معاشرہ

ا ۔ ع

(گذشتہ سے پیوستہ)

قرونِ وسطیٰ کے اس عالمگیر اتحاد و وفاق کی تحریک کے ناکام رہنے کے بعد ایک اور دور شروع ہوا، جس میں سیاسی تخیل نے ایک نیا پہلو بدلا، اس زمانے میں مختلف آزاد اور خود مختار بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ جنہوں نے عصر جدید کی قومی اور ملکی رقابت کی بنا ڈالی۔ ابتدائی طور پر یہ مختلف حکومتیں کسی قومی اصول کے ماتحت وجود میں نہیں آئی تھیں۔ تاہم اس کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ مختلف انسانی گروہوں کے آزادانہ نشو و نما کے لئے علیحدہ علیحدہ آزاد اور خود مختار حکومتوں کی ضرورت تسلیم کی جانے لگی۔ اور یہ محسوس ہونے لگا کہ تہذیب اور تمدن کی ترقی اور گوناگونی کے لئے ایک عالمگیر قوت کی بجائے مختلف اور متفرق آزاد حکومتوں کی ضرورت ہے، حکومتوں اور قوانین کا مختلف المعیار ہونا مختلف لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی آزادی کے لئے زیادہ مفید سمجھا گیا، اور یہیں سے بین الاقوامی سیاست کی بنیاد پڑی کیونکہ اس نظریہ کے تحت میں یہ مزید تھا کہ مختلف آزاد سلطنتوں میں توازن قوت قائم رکھا جائے، تاکہ ایک حکومت دیگر پڑوسی حکومتوں سے زیادہ قوی ہو کر ان کی آزادی نہ سلب کرلے۔ مگر اس زمانے میں حکومت کا مفہوم بادشاہ یا حاکم کی ذات کے ساتھ وابستہ تھا، اہل ملک یا رعایا سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اور حکومت کی آزادی اور خود مختاری کے مفہوم میں بھی لوگوں کی ذات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مختصر یہ کہ حکومت کے مفہوم میں قومیت کا عنصر شامل نہیں تھا، یہ چیز بعد کی پیداوار ہے۔ مختلف انسانی گروہوں کی باہمی تفریق کا باعث وہ جغرافی اور طبعی حالات تھے جن میں مختلف انسانی طبقے ذرائع آمد و رفت کے معدوم ہونے کے باعث علیحدہ علیحدہ رہنے پر مجبور ہوئے، اور ایک دوسرے سے بڑی حد تک ناواقفیت رہی؛ زمین کے مختلف حصوں کی قدرتی تقسیم آج اس قدر نمایاں نہیں ہے جس قدر پہلے زمانے میں تھی۔ اہل روما کی وہ عالمگیر حکومت پاش پاش ہو چکی تھی جس نے مختلف ممالک کو ایک سلسلہ میں منسلک و متحد کر رکھا تھا۔ اس قوت کے فنا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ذرائع آمد و رفت بھی از کار رفتہ ہو گئے جن کے ذریعہ اس وقت کی دنیا میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا ہو چلی تھی سرکاری زبان۔ قانون اور طرز حکومت کا ایک ہونا بہت کچھ اتحاد کا موجب تھا، مگر یہ بھی آہستہ آہستہ زائل ہو گیا، اور دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف زبانیں اور مختلف قوانین رائج ہو گئے، اور ہر ایک گروہ نے بتدریج اپنی رسم و رواج اور روایات کی بنا پر مخصوص شان اختیار کر لی۔

یہ قومیت کا جذبہ اٹھارھویں صدی میں زیادہ رونما ہونے لگا جس نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ عصر جدید میں

نظامی اور سیاسی زندگی کا قوی ترین محرک بن گیا، اس قومیت کی تحریک کا مقصود یہ بھی تھا کہ ایک ہی گروہ کے جو چھوٹے چھوٹے منتشر ٹکڑے تھے، ان کو بھی زبان اور قومی شعائر اور روایات کی یکسانیت کی بنا پر متحد ہو جانا چاہیے چنانچہ اٹلی اور جرمنی میں اسی اصول پر عمل درآمد ہوا، اس اتحاد کو قابل عمل بنانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ باہمی مقاصد کے اشتراک کو نمایاں کیا جائے، اور اس مقصد کے لئے بیرونی ہمسایہ حکومتوں سے جنگ کرنا قومیت کی تشکیل کے لئے بہت مفید ثابت ہوا، جنگ کے اسباب اقتصادی جدوجہد یا توازن قوت کے مفادات ہوتے تھے۔ مذہبی عنصر قومیت کی تکوین میں مددگار ثابت نہیں ہوا، بلکہ اکثر مضرت کا باعث ہوا، پھر تبلیغی مذہب میں ایک ملک والوں کی دلچسپیاں اپنے ہی ملک سے وابستہ نہیں رہ سکتی تھیں، بلکہ دوسرے ممالک سے بھی مذہب کی بنا پر تعلق خاطر ہوتا تھا۔ جو قوم پرستی اور وطنیت کے جذبہ میں حارج ہوتا تھا، ایک ہی ملک میں مختلف مذاہب کا ہونا بھی قومیت کے ابتدائی مدارج میں سدراہ ہوتا تھا۔ غرض مذہبی عنصر بہرصورت سیاسی محرکات کے لئے مضر شئے رہی، اور جب تک اس کو نظر انداز نہ کر دیا گیا، ترقی نہ ہو سکی اور اس کو نظر انداز نہ کرنا اس صورت میں ممکن تھا کہ اس سے لاپروائی اور استغنا برتا جائے، اور مذہبی محسوسات کو ایک حد تک کند کر دیا جائے، اس قومی جذبہ کی نشوونما کے ساتھ ساتھ انفرادی آزادی کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا، یہاں تک کہ جمہوری حکومت قومیت کی مخصوص شان تصور کی جانے لگی۔

ان تمام تاریخی واقعات کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ قومیت کے مفہوم میں کیا کیا چیزیں مضمر ہیں۔ بقول جان اسٹوارٹ مل قومیت کے ترکیبی عناصر حسب ذیل ہیں۔

(۱) ہم نسل ہونا۔ (۲) ہم زبان اور ہم مذہب ہونا۔ (۳) جغرافیائی یا ملکی حدود کا ایک ہونا، اور (۴) سیاسی اور ملکی روایات اور تاریخی حالات کا مشترک ہونا، ان سب کو دو موٹے موٹے اصولوں کے تحت میں رکھا جا سکتا ہے (۱) وراثت (ب) ماحول۔ اول الذکر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ صدیوں سے ہمارے آباؤ اجداد ہمارے خیالات اور جذبات پر اثر ڈال کر ان کو مخصوص صورت میں تشکیل کرتے رہے ہیں، شمار میں ہمارے مردہ آباؤ اجداد کی تعداد ہمارے زندہ ہمعصروں سے کہیں زیادہ نکلے گی اس لئے ان پشت در پشت اثرات کی قوت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ہماری مخصوص قومی خصائل، عادات و اطوار، خدوخال پوشاک و لباس و غذا، رسم و رواج یہ سب ہماری ماضی کی آئینہ دار ہیں۔ ہر ایک موجودہ کیفیت علت ماسبق کی معلول ہے۔ مختلف انسانی گروہوں کے امتیازات کوئی عارضی یا اضطراری حوادث کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان دیرینہ اور قدیم حالات اور واقعات کا ماحصل ہیں جو ہمارے آباؤ اجداد کو پیش آئے تھے۔ اور جو امتداد زمانے کے ساتھ ہماری رگ و پے میں وصل ہو گئے ہیں۔ اور ہماری زندگی کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ اب یہ امتیازات اپنی جگہ پر اٹل ہیں۔ اور عالمگیر اتحاد یا وفاق اب ایک خواب پریشاں ہے، اگر ان کی کوئی تاریخ نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ تمام بنی نوع انسان کو جس سانچے میں چاہے ڈھال لیا جاتا۔ مگر ہم سب ماضی کے بچے ہیں۔ اور اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری چیز یعنی ماحول کے متعلق یہ کہنا غلط نہیں کہ کسی ملک کے مخصوص طبعی حالات یا مرز و بوم وہاں کے باشندوں کے مخصوص تمدن کا باعث ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق ہم "کلیم" کی کسی گذشتہ اشاعت میں بحث کر چکے ہیں۔ غرض ان ہر دو قسم کے اسباب کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف انسانی گروہوں کے امتیازی خصوصیات اصلی شئے ہیں۔ اور یہی قومیت کی موجبات ہیں۔ جب تک ہم تعلیم سے ناآشنا ہوتے ہیں ان خصوصیات کا احساس ہمارے اندر خفتہ حالت میں ہوتا ہے۔ تعلیم کی ترقی اور دماغی نشوونما کے ساتھ ساتھ یہ احساس بیدار ہو جاتا ہے۔ اور ہم اپنے قومی شعائر کی حفاظت کے لئے کسی چیز سے دریغ نہیں کرتے۔ یہی اصلی قومی جذبہ ہے۔

جب یہ بات مسلم ہو گئی کہ مختلف انسانی طائفوں کے اختلافات واقعی اور اصلی ہیں جو اگرچہ ابتدائی اور فطری نہ سہی تاہم بعض قوی اسباب کے ذریعہ مستحکم اور استوار ہو چکے ہیں۔ تو اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ان اختلافات کو قائم رکھنا اور ترقی دینا کہاں تک درست ہے۔ بالفاظ دیگر قوم پرستی مطلق طور پر کہاں تک حق بجانب ہے۔ اور ایک عالمگیر برادری کے مقابلے میں اس فرقہ پرستی اور محدود گروہ بندی میں ایسی کونسی خوبیاں پنہاں ہیں۔ اس کی

بابت یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح انفرادی آزادی کے سلب کر لینے سے اعلیٰ دماغی قابلیتوں کے پیدا ہونے کا امکان کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی گروہ کی اجتماعی آزادی کے سلب ہوجانے سے اس کے مخصوص جوہر فنا ہونے لگتے ہیں جن کو اگر آزادی کے ساتھ نشوونما دی جاتی تو ممکن ہے کہ بعض ان میں سے ایسے قابل ہوتے جو تمام بنی نوع انسان کے لئے قابل پیروی ہوتے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ہر ایک گروہ مخصوص ملی خصائل کا حامل ہوتا ہے۔ اور ان کی بقا کے لئے کوشش کرنی تمام بنی نوع انسان کے لئے خالی از مصلحت نہیں، ان کا باقی رہنا جب ہی ممکن ہے کہ اس گروہ کو اپنی نشوونما کے لئے کامل آزادی میسر ہو۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب کوئی نسل سیاسی زندگی سے محروم ہوجاتی ہے تو اس کے مشاغل خالی از منفعت رہ جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے جب وہ آزادی اور خود مختاری حاصل کرلے تو وہ علم و ہنر اور تہذیب عالم کی ترقی میں نمایاں حصہ لیتی ہے اور جس طرح ایک انسان باوجود آزاد ہونے کے اپنے دیگر ابنائے جنس سے علیحدہ اور تنہا زندگی نہیں گذارتا۔ اسی طرح ایک گروہ دوسرے گروہ سے یا ایک قوم دوسری قوم سے بالکل منقطع نہیں رہ سکتی اور آپس میں دوستانہ تعلقات کے ذریعہ انسانی اخوت اور ہمدردی کو بڑھانے کے لئے بہت سے موقعے ہاتھ آسکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ عام طور پر قومی ذہنیت تعصب پیدا کرتی ہے۔ اور سیاسی نقطۂ نظر تنگ نظری پر مبنی ہوجاتا ہے۔ اور قوموں کی یہ باہمی رقابت جنگ و جدل کی جڑ اور دنیا کے امن و امانیت کے لئے عظیم الشان خطرہ ہے۔ اور جب ایک قوم زیادہ قوت اور اقتدار حاصل کرلے تو ملوکیت کا آغاز ہوجاتا ہے، تاہم قومیت اور ملوکیت کے یہ نقائص ایسے نہیں ہیں جو لازمی اور ناگزیر ہوں۔ اور جن کی اصلاح نہ کی جاسکے جس طرح انفرادی طور پر خود غرضی اور ہوا و ہوس اخلاقی رذائل میں داخل ہیں۔ مگر تربیت سے رفع ہوسکتے ہیں، اسی طرح خراب سیاسی ذہنیت کی بھی آہستہ آہستہ اصلاح ہوسکتی ہے۔ جس طرح ایک خاندان یا ایک فرد کے لئے ترقی کرنے کے واسطے یہ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے خاندان کو تباہ کردے۔ یا دوسرے فرد کو فنا کردے۔ اسی طرح ایک قوم کی ترقی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ دوسری قوم کو مٹائے بغیر وہ ابھر نہ سکے، ساتھ ہی

ملوکیت اگر نیک نیتی پر مبنی ہو تو اس قدر بری چیز نہیں ہے۔ جس قدر بعض قوم پرست اس کو مطعون کرتے ہیں۔ ہر چند کہ دوسرے لوگوں پر حکومت کرنا (خواہ ان کی مرضی سے اور ان کے نفع ہی کی خاطر ہو) قومیت کے مفہوم کے منافی ہے۔ تاہم یہ گروہ بندی کوئی مقدس خدائی تقسیم نہیں ہے جس میں دست اندازی گناہ میں داخل ہو۔ کوئی مہذب قوم کسی دوسری پسماندہ اور بیمار گروہ کی معاشرتی خرابیوں کی اور بیماریوں کو برداشت نہیں کرسکتی مبادا وہ زہریلا اثر آگے بڑھ کر وبائی صورت اختیار کرلے۔ علاوہ ازیں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض مردہ زبانوں کے از سر نو زندہ کئے جانے سے انسانی ارتباط میں رکاوٹ پیدا ہوکر تبادلۂ خیالات اور علوم و فنون کے نشر و اشاعت کو نقصان پہنچا۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض قومیں ایک ہی حکومت اور قانون کے تحت میں اکثر زیادہ ترقی کی استعداد ظاہر کرتی ہیں۔ بمقابلہ تنہا اور آزاد رہنے کی حالت کے۔ جیسا کہ یونانیوں کے ساتھ ہوا۔ کم از کم باہمی قومی رقابتوں اور خون ریزیوں کا ملوکیت کے تحت میں بہت کچھ سدباب ہوجاتا ہے۔ اور امن و اطمینان کی زندگی میں علم و ہنر کی زیادہ خدمت ہوسکتی ہے۔ جن لوگوں کو آزادی کی ہوا زیادہ راست نہیں آتی ان کو نظم زیادہ موافق آجاتا ہے۔ اور وہاں قومیت کی جگہ ملوکیت زیادہ مناسب اور حسب حال ہوتی ہے۔ ہمارے ہندوستان کے متعلق یہ تمام باتیں حرف بحرف صحیح ہیں۔ یہاں کی ملکی فضا آزادی اور قومیت کی ساخت کے لئے سازگار نہیں ہے۔ تفرقہ۔ پھوٹ، نااتفاقی حسد۔ بے برداشتی یہاں کے خمیر میں ہے۔ یہ باتیں بدیشی حکومت کی پیدا کردہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس ملک کے قدرتی اور طبعی حالات ہی اس مستم کے ہیں۔ کہ یہاں کے لوگ آزاد رہ کر تندرست نہیں رہ سکتے۔ اگر ذرا ان کو آزادی مل جائے تو خانہ جنگیوں سے فرصت نہ ملے۔ اگر یہ کہا جائے کہ دوسرے ملکوں میں بھی یہی حالت رہی ہے کہ خانہ جنگیاں۔ لڑائی جھگڑے حسد۔ نااتفاقی۔ فساد اور خون ریزی ہوتی رہی۔ لیکن اگر ان کو ان ہی کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور وہ غیر کے تصرف اور دست اندازی سے محفوظ رہیں تو خود بخود درست ہوتے چلے آتے ہیں۔ اور بالآخر ان کی خود مختاری

ایسی حالت میں مشترکہ قومیت اور آزادی کی قدر اور دل دادگی پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن اول تو کسی ملک کے لوگوں کو ان ہی کے حال پر چھوڑ دے رکھنا کسی کے بس کی بات نہیں جب تک کہ وہ خود ہی اپنے آپ کو دوسروں سے محفوظ نہ رکھ سکیں، دوسرے ہندوستان کے لئے کسی مزید تجربے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ صدیوں تک خود مختار اور غیروں کے تصرف سے آزاد رہا مگر اس میں بحیثیت مجموعی کبھی اتفاق، اتحاد اور صحیح معنوں میں قومیت نہیں پیدا ہوئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ زمانہ بہت قدیم تھا۔ اور قومیت کا تخیل بعد کے زمانے کی پیداوار ہے اور اس وقت ہندوستان کو باہر کے حملہ آوروں نے تختۂ مشق بنا رکھا تھا تو ہم کہیں گے کہ جنگ کے موقعوں پر متحدہ قومیت کے جذبے کو ابھارنے کے لئے بہترین موقع مل جاتا ہے۔ ایسے حالات سے دوسرے ملکوں نے جو فایدہ اٹھایا ہے، وہ ہندوستان نے نہیں اٹھایا۔ پھر وہ غیر عنصر یعنی مسلمانوں کا ہندوستان میں مستقل طور پر داخل ہو جانا اقتصادی حیثیت سے نقصان دہ نہیں تھا کیونکہ وہ یہیں رہنے لگے تھے۔ اور انگریزوں کے آنے تک ایک طویل عرصہ گذرا جس میں قومی اتحاد کے لئے کافی سے زیادہ مہلت تھی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات اس وقت مساوی درجہ کے نہ تھے تو اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کے آخر دور میں حاکم اور محکوم قوم کا امتیاز برائے نام رہ گیا تھا۔ مسلمان یہیں کے باشندے بن گئے تھے، اور اگر اس وقت ہم مساوی تعلقات اور باہمی اتحاد کے اہل نہیں تھے تو آج بھی ہم نے اس معاملے میں کوئی ترقی نہیں کی ہے۔ بلکہ ہمارا مذہبی تفرقہ اور باہمی رقابت روز افزوں ہے۔ آج بھی اگر انگریز ہندوستان چھوڑ دیں تو یہاں کی دونوں قوموں میں تعلقات کی مساوات قائم نہ رہے۔ ایک غالب اور حاکم بن جائے گی، اور ایک مغلوب اور محکوم ہو جائے گی اور جب تک یہ حیثیت قائم نہ ہوگی جنگ و جدل اور فساد برپا رہے گا۔ غیر حکومت کے ماتحت رہ کر ہی ان دونوں میں مساوات قائم رہ سکتی ہے۔ اور متحدہ قومیت کا ایک سطحی خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ آزاد رہ کر نہ امن قائم رہ سکتا ہے۔ نہ مساوات، دونوں کی باہمی ازلی رقابت جس نے انگریزوں سے پیشتر آپس میں اتحاد، مساوات اور ہم آہنگی پیدا ہونے دی وہی اب بھی آزادی کی حالت میں مانع آئے گی۔ بلکہ ان حالات میں اتحاد کا حاصل ہونا ہی ناممکن ہے۔ اور اس رقابت کی جڑ مذہبی اختلاف ہے۔ اور ہماری مذہبی گرویدگی۔

اصل یہ ہے کہ قومیت کے لئے اتحاد مقصد لازمی شے ہے اور اس اتحاد کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ یہاں مفقود ہیں، نہ روایات کا ورثہ مشترک ہے نہ ماحول میں یکسانیت ہے، ہندوستان اتنا بڑا اور وسیع ملک ہے اور اس کے مختلف حصوں کے جغرافی اور طبعی حالات اس قدر مختلف اور متنوع ہیں کہ صحیح معنوں میں اس کو ایک ملک نہیں کہا جا سکتا چنانچہ مختلف حصوں کے باشندوں کی رہائش، پوشش، غذا، زبان اور عام طرز معاشرت بالکل جداگانہ ہے۔ ان کے تمدن اور تہذیب کا معیار الگ الگ ہے۔ مذہب مختلف ہیں علاوہ دیگر مذاہب کے خود ہندو مذہب ہی میں اس قدر عدم تعین ہے کہ اس کو ایک مذہب نہیں کہا جا سکتا، عقائد کے علاوہ عملی طور پر بھی اس میں باہمی مساوات کے بدلے آپس میں ذاتوں کی تفریق ایسی ہے جو شخصی اعمال کے حسن و قبح یا دولت و افلاس کی بنا پر نہیں بلکہ پیدائشی اور ازلی سمجھی جاتی ہے۔ پھر یہاں کی زبانیں مختلف نسل مختلف، مذاق مختلف، قومی شعائر مختلف، رسم و رواج مختلف، روایات، قدیم حالات و واقعات، عادات و خصائل، خد و خال ہر چیز مختلف، ہندو اور مسلمانوں کی تاریخ مختلف، آباء و اجداد مختلف دونوں کے ہیرو، بادشاہ، مشاہیر مختلف، نہ صرف مختلف بلکہ باہمدگر دست و گریبان علاوہ ماضی کے افسانے۔ مذہبی نسلی اور قومی تعصبات سے بھرے پڑے ہیں، ان کی اصلیت خواہ کچھ ہی ہو مگر تاریخ لکھنے والوں نے اس کو اسی رنگ میں ہمارے سامنے پیش کیا۔ ہندوستان کا حدود اربعہ ایسا کہ وہ تمام بیرونی عالم سے منقطع اور الگ تھلگ، نہ ہمسایہ ممالک کے ساتھ آمد و رفت نہ ان کے ساتھ رشک و حسد۔ سچ پوچھو تو کوئی ہمسایہ ہی نہیں، تحریص اور رقابت کا کوئی موقع نہیں، ملک کی زرخیزی کے باعث اقتصادی جد و جہد اور بیرونی ممالک کی مہمات کا فقدان۔ سب سے الگ اور بے ہمہ۔ پھر یہاں کا اصلی مذہب بھی غیر تبلیغی، ورنہ شاید اشاعت مذہب کا شوق ان کو باہر لے جاتا پھر مذہب کی تعلیم میں رہبانیت اور ترک دنیا کی طرف میلان۔ ذات پات کی بندشیں اور چھوت چھات کی شدت، اپنے مذہبی فلسفہ میں مگن رہنا۔ تمدن اور طرز معاشرت کا ابتدائی حالت سے آگے نہ بڑھنا، تاریخی ذوق کا فقدان۔ قصہ اور کہانیوں پر اعتقاد۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں جو نیک، معصوم، قانع بے غرض انسان پیدا کرنے کے لئے تو بہت موثر تھیں، مگر سیاسی ترقی کے لئے موافق نہ تھیں۔ مذہبی گرویدگی سے جو قدامت پرستی اور عصبیت پیدا ہوتی ہے وہ بقائے ملت اور تحفظ نسل کے لئے اگرچہ مفید ہے اور ہندو مذہب کا غیر تبلیغی ہونا بھی [illegible] سے ایک اچھا وصف قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ غیر عنصر کے شامل ہو [illegible]

نہیں رہتا، لیکن جس وقت قومیت کا قوام تیار ہو چکے اس وقت کسی مذہب کی خصوصیات ایک حد تک اس کے تحفظ میں معین و مددگار ہو سکتی ہیں۔ مگر خالص مذہبی اثرات کے تحت میں قومیت کا قوام تیار ہونا مشکل ہے، کیونکہ مذہب کا منشا زیادہ تر انفرادی زندگی کو سنوارنا ہے اور جب تک تزکیۂ نفس ہوتا رہے مذہب کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس کو محکومیت یا آزادی یعنی اجتماعی اور سیاسی زندگی کی نوعیت سے اور قومیت کی شیرازہ بندی سے بہت کم سروکار رہتا ہے۔ بلکہ وہ ان چیزوں کے منافی ہوتا ہے جن کی قومیت کے لئے ضرورت ہے۔ مثلاً اقتصادی جدوجہد، ہمسایہ حکومتوں سے ہمسری اور جنگ وغیرہ وغیرہ۔ مسلمانوں کے عنصر کے شامل ہو جانے سے ہندوستان کی حالت قومیت کے نقطۂ نظر سے بد سے بدتر ہو گئی، کیونکہ اس سے پہلے مذہب جیسا بھی تھا اچھا یا برا مگر ایک تھا۔ اب دو ہو گئے۔ اور دو بھی ایسے کہ ایک دوسرے کے بالکل متضاد۔ اگرچہ ہندوستان میں آکر مسلمان بہت کچھ ہندوؤں کے رنگ میں رنگے گئے، اور ان کا مذہب بھی بہت کچھ یہاں کے اثرات سے متأثر ہوا، مگر دونوں اس قدر باہم متناقض تھے کہ باوجود اس قدر میل جول کے پھر بھی کافی مغائرت اور تفریق باقی رہی اور یہی تفریق آج تک موجب فساد ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندو مسلمانوں میں نفاق نہ تھا، جن حالات کا ذکر ہوا ان کے تحت میں نفاق کا نہ ہونا ناممکن تھا۔ البتہ وہ اس قدر نمایاں نہیں تھا۔ کیونکہ اس وقت مسلمان اور ہندوؤں کی باہمی حیثیت نہ تھی جو آج ہے۔ بلکہ فاتح اور مفتوح کی سی تھی، تیسری قوم کی حکومت ہو جانے سے مسلمانوں کا تفوق جو پہلے ہی سے کم ہوتا جا رہا تھا زائل ہو گیا، یہاں تک کہ جب بالکل مساوی حیثیت ہو گئی تو نفاق نمایاں ہونے لگا۔ اس کا انکار نہیں کہ بعض لوگوں نے اس نفاق کو بھڑکانے کی بھی کوشش کی ہو مگر نفاق کی وجہ موجود ضرور تھی اور وہ وہی مذہبی نقیض، چنانچہ ان حالات میں جو مذہبی کشمکش کا نتیجہ ہیں قومیت اور آزادی ایک خواب ہے۔ جو کبھی منت کش تعبیر نہ ہوگا جب تک مذہبی جوش و خروش قائم رہے گا اور معاشرتی حالات کی اصلاح نہ کی جائے گی موجودہ حالات میں ہندوستان کے لئے آزادی کی تحریک زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتی بلکہ یہاں کے تاریخی حالات اور لوگوں کی طبائع کے لحاظ سے نظم کی تحریک زیادہ مناسب ہے۔ ایک زبردست حکومت کے ماتحت رہ کر اندرونی آزادی بتدریج حاصل کرتے رہیں اور حکومت کے مختلف اجزاء کے ساتھ وفاق قائم ہو جائے۔ یہاں تک

کہ ہم میں مکمل آزادی کی استعداد، اہلیت اور ذمہ داری پیدا ہو جائے۔ ہندوستانیوں نے اب تک جو کچھ سیاسی تربیت حاصل کی ہے وہ اسی نظم کے ذریعہ حاصل کی ہے۔ اور اس تجربہ کو جاری رکھنا قرین مصلحت ہے۔ یونانیوں نے ابتدائی سیاسی زندگی میں آزاد رہ کر اپنی آئے دن کی خانہ جنگیوں کے باعث اس قدر ترقی نہیں کی جس قدر اہل روما نے عالمگیر نظم کے ماتحت رہ کر کی، ہم نے بھی اب تک جو کچھ سیکھا ہے وہ اسی طرح سیکھا ہے اور اب بھی معاشرتی لحاظ سے ہماری حالت منزل مقصود سے بہت دور ہے۔ ہماری راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس نام نہاد مذہب کی ہے، دونوں قوموں کی زندگی میں مذہبی پہلو نمایاں ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی آب و ہوا ہی میں مذہبیت ہے، مسلمانوں کا مذہب تبلیغی ہے، ہندوؤں کا غیر تبلیغی، اس لئے مسلمانوں کا تعلق اور دلچسپی ہندوستان سے باہر بھی ہے برعکس اس کے ہندوؤں کو ہندوستان سے باہر کوئی تعلق اور دلچسپی نہیں۔ ہندوؤں کی ذہنیت تمام تر ہندوستانی ہے۔ مگر مسلمانوں کی ذہنیت خالص ہندوستانی نہیں ہے اور اگرچہ قومیت کے لئے ہندوؤں کی ذہنیت زیادہ موزوں ہے، مگر یہ اس حالت میں ٹھیک تھی جبکہ ہندوستان میں مسلمانی عنصر بالکل نہ ہوتا، مگر جب یہ عنصر بھی موجود ہے اور کافی مقدار اور وزن میں ہے جس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تو خالص ہندوانی ذہنیت ملک کے موجودہ حالات کے لحاظ سے درست نہیں۔ اور اس طرح کبھی متحدہ قومیت کی داغ بیل نہیں ڈالی جا سکے گی اردو اور ہندی کا موجودہ جھگڑا اسی ضمن میں پیدا ہوا ہے۔ اور حقیقت میں مذہبی مناقشہ کی یہ ایک دوسری صورت ہے۔ مذہبی مناقشات کے گذشتہ مظاہروں میں اعلیٰ طبقہ کے لوگ شریک نہ ہوتے تھے، مگر اس موقع پر یہ طبقہ بھی شریک ہے۔ بلکہ ابتدا اسی طبقہ سے ہوئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باہمی منافرت کس درجہ جڑ پکڑ چکی ہے۔ اور آپس کا ملنا جلنا بالکل رسمی اور ظاہرداری ہے، جس کو خلوص سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ اتفاق، اتحاد اور ہمدردی کے دعوے دونوں طرف سے باطل ہیں۔ اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ کیونکہ مذہب پرست ہندوستانی دماغ کیونکر چیرہ دستی اور غلبہ پا سکتا ہے، نفاق کی آگ بھڑکانے کا الزام حکومت پر لگانا بیکار ہے۔ خود دو متضاد مذہبوں کی موجودگی ہی ایسے ملک میں جو مذہب کا دل دادہ اور شیفتہ ہو نفاق کی آگ کو مشتعل رکھنے کے

کافی ہے، حکومت کی طرف سے جدید ملکی اصلاحات کے سلسلہ میں ہندوستان کا قوم پرست طبقہ اس بات پر بہت ناخوش ہوا تھا کہ جداگانہ نیابت اور فرقہ وارانہ رائے دہندگی کے اصول قومیت کے تعمیری پروگرام کے پرخچے اڑا دیں گے۔ اور اقلیتوں کے حقوق کی نگہداشت اور تحفظ کے ضمن میں جو دفعات جدید آئین میں ملحوظ رکھی گئی ہیں وہ بھی قومی ترقی کی راہ میں روڑا اٹکانے کی مرادف سمجھی گئی ہیں۔ مگر قومی زبان کے معاملے میں جو نزاع قوم کے ارباب حل وعقد خود پیدا کر رہے ہیں، وہ شاید ان کے نزدیک قومی ترقی کا باعث ہے۔

موجودہ حکومت، قانون اور سرکاری زبان کا ایک ہونا، اگرچہ وہ بیرونی ہے۔ مگر ہمارے اندرونی معائب کی پردہ پوش ہے۔ اور چھوٹی بڑی جو کچھ بھی ہم ترقی کر رہے ہیں وہ اسی یکسانیت اور ہم آہنگی کے اثرات کی بدولت کر رہے ہیں۔ اور اسی یکسانیت کی وجہ سے ہم میں کسی قدر متحدہ قومیت کا جذبہ پیدا ہو چلا ہے۔ مگر جن معاملات میں ہم کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے وہاں ہماری نحوست اور شامت اعمال رنگ لائے بغیر نہیں رہتی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک حکومت کے ماتحت رہنے سے جو ہم لوگوں میں یکرنگی، ہم آہنگی، وسیع اتحاد اور اتفاق کا ایک نظر فریب عکس پیدا ہو چلا تھا اس کو توڑنے کے لئے صوبجاتی آزادی کا اوزار اختراع کیا گیا ہے۔ جو لوگوں میں صوبجاتی تعصب پیدا کر کے متحدہ قومیت کی تحریک کو پاش پاش کر دے گا۔ لیکن ہندوستان جیسے وسیع ملک کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسباب جو متحدہ قومیت کے لئے ضروری ہیں یہاں بالکل مفقود ہیں اور سچی ہم آہنگی یہاں کبھی پیدا ہوئی ہی نہیں۔ یہ ظاہری یکسانیت محض مصنوعی اور سطحی ہے۔ جس سے ہماری اصلی فطرت جو مذہب کے تابع ہے ہمیشہ باطنی طور پر گریز کرتی رہتی ہے۔ اور یہاں کے طبعی اور جغرافی حالات بھی اتحاد کے حامی نہیں ہیں اس لئے یہ کہنا شاید غلط نہیں کہ ہندوستان کی مجموعی قومیت صحیح معنوں میں تقریباً ناممکن ہے۔ قابل عمل صورت یہی ہو سکتی ہے کہ سارے ملک کو جغرافی اور عمرانی خصوصیات کی یکسانیت کی بنا پر مختلف سیاسی حصوں یا صوبوں میں منقسم کر دیا جائے۔ (کیونکہ تمام ہندوستان مجموعی طور پر ایک قدرتی گروہ نہیں کہا جا سکتا) اور ان کو اندرونی آزادی دی جائے۔ تاکہ ہر ایک قدرتی گروہ اپنے علیحدہ علیحدہ مخصوص تمدن کو ترقی اور فروغ دیتا رہے اور ساتھ ہی ایک مرکزی حکومت کے ساتھ سب کا وفاق قائم کر دیا جائے تاکہ باوجود علیحدہ اور آزادانہ نشوونما کے انتشار نہ ہونے پائے۔ اس مدعا کے حصول کے لئے عملی طور پر یہ بہت ہی اچھا اقدام ہے جو ہندوستان جیسے مختلف الحالات ملک کے لئے نہایت مناسب قدرتی اور صحیح لائحۂ عمل ہے اس دستور العمل میں اگرچہ بعض باتیں ایسی ہیں جو حکومت نے اپنے مقاصد کے لحاظ سے بھی رکھی ہیں، مگر مجموعی طور پر یہ محض یک طرفہ نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستان کی سیاسی مشکلات اور پیچیدگیوں کا قابل عمل حل ہے۔ اور اگرچہ مکمل آزادی کے لئے ہماری اضطرابی اس کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ مگر سچ پوچھو تو اصلی قومیت اور اتحاد سے ہم ابھی کوسوں دور ہیں۔

اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ ملوکیت پسندی اور قوم پرستی دو مختلف اور ایک دوسرے کے مد مقابل سیاسی جذبے یا مقاصد یا نظریے ہیں۔ جو علی الترتیب نظم اور آزادی کے اصولوں پر مبنی ہیں۔ اول الذکر کی ابتدا اہل روما سے ہوئی۔ اور اس کے موجودہ حامیوں میں سے جرمنی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آخر الذکر کی ابتدا یونانیوں سے ہوئی اور آج انگلستان اس کا سب سے بڑا پشت پناہ شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن کیا خود انگلستان کا رویہ دوسرے ملکوں (مثلاً ہندوستان وغیرہ) کے ساتھ ملوکیت پسندی پر مبنی نہیں۔ اور جب یہ بات ہے تو جرمنی کے مسلک اور طرز عمل پر کس بنا پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ قوم پرستی میں جو قباحتیں اور نقائص ہیں اور جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یعنی ملکی رقابتیں، جنگ و جدل اور امن عالم کے لئے ہر وقت ایک عظیم الشان خطرہ کا موجود رہنا، ان سب کو مدنظر رکھتے ہوئے، جرمنی کا مطمح نظر یہ ہے کہ دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے جس عالمگیر اتحاد کی ضرورت ہے، اس میں جب تک ہر قوم کی آزادی اور مساوات کے پہلو پر زیادہ زور دیا جائے گا جنگ کے خطرہ کا رفع ہونا معلوم۔ اس لئے اس کا عقیدہ ہے کہ تمام حکومتیں ایک ملوکیت

اور مخالف حکومت کے تحت میں باہمی اتحاد اور قابل اطمینان وفاق قائم کر سکتی ہیں۔ اور جب انگریزوں کی حکمت عملی بھی بعض ممالک کے ساتھ اسی قسم کی ہے تو پھر جرمن سیاسی فلسفہ سے مخالفت کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ کیا اس کے جواز کے لئے یہی مصلحت اندیشیاں کارفرما نہیں ہیں کہ بعض قوموں کا آزاد رہنا خطرہ سے خالی نہیں اور خود ان قوموں ہی کے لئے مضرت رساں ہے اور ان کی ترقی میں ہارج ہے۔ جو دلائل گذشتہ صفحوں پر بعض اقوام کے ساتھ دست اندازی کے جواز اور ملوکیت کی تائید میں بیان ہوئیں کیا وہ بعینہٖ جرمن فلسفہ کے مطابق نہیں ہیں۔ مگر فرق اصل یہ ہے کہ قوم پرستی کے حامی ملوکیت کے اصولوں کی عمدگی کا اعتراف اور ان کا اطلاق صرف نیم متمدن اقوام کے حق میں پسند کرتے ہیں۔ اور ملوکیت پسند جرمنی متمدن اور ترقی یافتہ یورپین اقوام کو بھی اسی نظم کے تحت میں دیکھنا چاہتی ہے بالفاظ دیگر قومیت کے حامیان ملوکیت کے اصولوں کو بعض جگہ جائز اور بعض جگہ ناجائز سمجھتے ہیں۔ اور ملوکیت کے دلدادہ اسی قسم کی تفریق کے قائل نہیں وہ سب کے لئے ایک اصول ٹھیک سمجھتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ عملی طور پر کسی ملک میں سیاسی بیداری اور اپنی علیحدہ قومیت کا احساس اور شعور جس قدر زیادہ تربیت یافتہ اور رشد یدرجہ کا ہوگا اور علوم و فنون کی ترقی اور معاشرت اور تمدن کا معیار جس قدر بلند ہوتا جائے گا مداخلت غیر کا قدرتاً اور خود بخود سدباب ہو جائے گا اور ملوکیت کی دال نہیں گل سکے گی۔ یہی شعوری کیفیت اور اپنی علیحدہ اور خود مختار ہستی کی طرف سے آگاہی اور باخبری حیوان اور انسان میں باعث امتیاز ہے، اور یہی چیز اعلیٰ اور ادنیٰ انسانی سوسائیٹیوں کو متمیز کرتی ہے اور اسی اصول کی بنا پر اگرچہ بچہ پر جبر کیا جا سکتا ہے مگر سن شعور کو پہنچے ہوئے آدمی پر خود اس کی بہتری کے خیال سے بھی اس کے ساتھ جبر روا نہیں۔ چنانچہ اس لحاظ سے مذکورہ سیاسی اصول کی تفریق غلط نہیں یعنی ملوکیت بعض حالات میں اگر جائز ہے تو بعض حالات میں بالکل ناجائز ہے، اور جرمنی کا ایک لاٹھی سے سب کو ہانکنا درست نہیں۔ اور انگریزوں کا بعض نیم متمدن گروہوں کو جن

میں اتحاد اور آزادی کا شعور کم ہے ان ہی کے مفاد کے لئے ملوکیت کے تحت میں رکھنا غلط نہیں۔ بشرطیکہ وہ نیک نیتی پر مبنی ہو۔ اگر کہا جائے کہ دوسرے کی ماتحتی میں رہ کر کمزور اور پس ماندہ اقوام میں یہ شعور کبھی پیدا ہی نہ ہو سکے گا۔ یا اگر ہوگا تو کچل دیا جائے گا۔ اور اس لئے کمزور اقوام بھی آزاد رہ کر ہی ترقی کر سکتی ہیں۔ غیر حکومت کے ماتحت نہیں کر سکتیں، تو یہ بات عملی تجربہ کے لحاظ سے ہمیشہ صحیح نہیں ہوتی۔ ہندوستان نے آزاد رہ کر اس ضمن میں کوئی ترقی نہیں کی۔ ہماری سیاسی بیداری اور متحدہ قومیت کے احساس کا آغاز انگریزی حکومت کے دور ہی میں ہوا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ نتیجہ انگریزی حکومت کا نہیں ہے بلکہ اس عام دنیاوی فضا کا اثر ہے۔ جس میں سے ہم سب گذر رہے ہیں تو یہ اگرچہ ایک حد تک صحیح ہے کہ تمام دنیاوی فضا کا اثر بھی اس میں شامل ہے۔ مگر مستقل اور پائیدار نظم کی بدولت سارے ہندوستان میں حکومت کا ایک ہونا، سب لوگوں کا مل کر کافی عرصہ تک مسلسل امن کی زندگی گذارنا جو ہر قسم کی تمدنی ترقی کے لئے شرط اول ہے، سرکاری زبان کا ایک اور سب کے لئے مشترک ہونا اشاعت تعلیم کا انتظام خواہ وہ بالکل خاطر خواہ نہ سہی، ذرائع آمد و رفت کی توسیع اور ترقی، ان تمام چیزوں کے مؤثر ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر ہم نے اتنی ترقی نہیں کی جتنی کہ دنیا کے اس دور میں کرنی چاہیئے تھی۔ تو اس کے ذمہ دار خود ہمارے ملکی اور معاشرتی حالات ہیں۔ جو ہم کو آزاد رہ کر شاید اتنی بھی ترقی نہ کرنے دیتے۔ ہم دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر اپنی پس ماندگی کا سبب بدیشی حکومت کو قرار دیتے ہیں۔ مگر ہم اپنے اندرونی اور جبلی نقائص اور سقم کی طرف نگاہ نہیں کرتے۔ جنہوں نے ہماری سیاسی زندگی میں گھن لگا دیا ہے۔ اور جن سے ہم دیدہ و دانستہ اغماض اور چشم پوشی کرتے ہیں۔ ہمارا تعصب نہ صرف ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونے دیتا ہے بلکہ ان کو قائم و دائم رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ بھلا غور کیجیے کہ یہ مذہبی طائفہ بندی

چھوت چھات اور چھوت چھات کے ناقابلِ شکست رسم و رواج، یہ ہماری قدامت پرستی کی ذہنیت، اور یہ ہمارا ادنیٰ درجہ کی عام طرزِ معاشرت، یہ سب چیزیں کسی مہذب ملک میں بھی پائی جاتی ہیں جن کی ترقی پر آپ کو رشک آتا ہے۔ اور پھر یہی نہیں کہ ہم ان چیزوں کو رفع کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، بلکہ باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے ہم ان کو سرے سے برا ہی نہیں سمجھتے، اور ان کی حمایت میں تاویلیں کرتے ہیں۔ اور ایسی روشن خیالی کو جو ہم کو ہماری ان عزیز چیزوں سے گمراہ کردے اپنی سعادتمندی کے خلاف سمجھتے ہیں، مگر علم اور تجربہ کی روشنی میں اپنے اعمال کی اصلاح نہ کرنی سعادتمندی یا کردار کی مضبوطی کی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ ایک قسم کی وحشائی ہے اور بے واجبی تعصب کا مظاہرہ۔ یہ سب ہمارے غلط مذہبی مفہوم کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جب تک رسم و رواج کی اصلاح کے معاملے میں مذہب کو دخل در معقولات حاصل ہوگا، ضمیر کی آزادی ناممکن ہے ہماری نجات اس میں ہے کہ مذہب کے مفہوم کو وسعت دی جائے۔ اور اس کی ظاہری صورت کے مقابلے میں باطنی پہلو پر زور دیا جائے۔

آزادی کے اس مضمون کے سلسلہ میں ابھی دو چیزوں کا ذکر کرنا باقی ہے۔ یعنی انفرادیت اور سوشلزم۔ اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مختلف انسانی جرگے یا ہمجنس مجموعوں کی اجتماعی زندگی کی بابت لکھا گیا ہے۔ مگر ایک ہی گروہ کے افراد کے باہمی تعلقات کی نوعیت کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ان باہمی تعلقات میں جب آزادی کا عنصر زیادہ ہوتا ہے تو اس کو انفرادیت کہتے ہیں، برخلاف اس کے جب ان میں نظم کا پہلو غالب ہوتا ہے تو اس کو سوشلزم کہتے ہیں، یہ دونوں چیزیں انفرادی زندگی اور باہمی شخصی تعلقات کے متعلق ہیں۔ اور ان میں آزادی اور نظم کے عناصر کے لحاظ سے دو مختلف اور متضاد صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انفرادیت یا شخصی آزادی میں نظم مفقود ہوتا ہے۔ یا سوشلزم میں شخصی آزادی نہیں ہوتی۔ بلکہ سمجھنے کی سہولت کے لئے آزادی اور نظم کے موٹے اصولوں کے مطابق یہ تفریق کی گئی ہے۔ ورنہ آزادی کا دونوں صورتوں میں ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک کوئی گروہ اجتماعی طور پر بالکل آزاد نہ ہو اس وقت تک اس کے افراد یا ارکان میں نہ انفرادیت کا وجود ہو سکتا ہے۔ نہ سوشلزم کا۔ ایک دوسری بات جو اس ضمن میں سمجھنی ضروری ہے، یہ ہے کہ سوشلزم میں مساوات کا پہلو اہم ترین ہوتا ہے اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ انفرادیت یا شخصی آزادی میں مساوات نہیں ہوتی۔ اگر مساوات نہ ہو تو انفرادیت کا تخیل ناممکن ہے۔ مساوات اور حقوق کی برابری ہی کی بنا پر ہر شخص اپنی جگہ آزاد ہوتا ہے، مساوات ہی شخصی آزادی کی جڑ ہے۔ مگر اس شخصی آزادی میں جو مساوات کا پہلو ہوتا ہے وہ پولیٹیکل یا سیاسی مساوات سے تعلق رکھتا ہے یعنی ملکی معاملات میں ہر شخص مساوی حقوق کا مستحق ہے، سوشلزم میں اس مساوات کے علاوہ معاشرتی مساوات بھی ضروری ہے اور یہی اس کی مخصوص شان ہے، یہی وہ نظم ہے جو انفرادیت سے اس کو ممیز کرتا ہے۔ ذاتی ملکیت اور نتیجۃً دولت کی غیر مساوی تقسیم جو انفرادیت کی مطلق العنانی میں بے روک ٹوک مظالم پیدا کرتی ہے سوشلزم سے اس کا سدباب ہو جاتا ہے، انفرادیت اور سوشلزم سماجی زندگی کی دو بالکل متعاکس صورتیں ہیں۔ جو باہم ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ ان کی مفصل بحث آیندہ صحبت میں کریں گے۔ (باقی وارد)۔

وہ انگریز جنہوں نے اردو کی خدمت کی

مسٹر آصف علی
ایم - ایل - اے

یہ تو کون کہہ سکتا ہے کہ اردو نے کس دن اور کس گھر میں جنم لیا۔ مگر وہ ساعت گھڑی کہ جب یہ پیدا ہوئی ہندوستان کی تاریخ اور بڑی قوم کی زندگی میں سنہری حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ اور وہ اس لئے کہ اس لڑی میں دس کروڑ کے لگ بھگ الگ الگ مذہب اور دھرم کے ماننے والے مرد اور عورت گندھ چکے ہیں۔

اردو کے بناؤ سنگھار کرنے اور رنگ روپ نکالنے میں پچھلے ایک ہزار برس میں کروڑوں کیا بلکہ اربوں آدمیوں کے دماغوں نے کام کیا ہوگا۔ ہر قوم اور ہر نسل کے انسانوں نے جنہیں اس الھڑ بھولی بالی سے پالا پڑا انہوں نے چار چاند لگانے میں حصہ لیا۔

برج بھاشا کے کویوں نے، فارسی کے شاعروں نے اور یہاں تک کہ انگریزی نسل کے ہندی نثر کے شوقینوں نے بھی اس کی مانگ پٹی کرنے میں کچھ اٹھا کر نہیں رکھا۔

اٹھارھویں صدی میں ہندوستان میں کچھ ایسے گھرانے پیدا ہوگئے تھے کہ جن میں ماں باپ کے میل جول سے انگریزی نسل کے کچھ آدمی ہندوستانی ہونے پر ناز کرتے تھے، اور بلکہ خود انگریز ایسے ملتے تھے کہ جنہوں نے اردو کی وہ خدمت کی جو خود ہندوستانیوں کو شرمندہ کرے۔ اسی زمرے میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ اور ڈاکٹر فیلن تھے۔ ان میں سے پہلے صاحب نے تو گویا اردو نثر کی سچ پوچھئے تو بنیاد ڈالی۔ اور دوسرے صاحب نے وہ "لغت" یا ڈکشنری تیار کی کہ جس میں پہلی دفعہ اردو کے دریا کو کوزہ میں بند کیا۔

اس سلسلے میں مجھے ایک دو قصے یاد آگئے جو دلچسپی سے خالی نہیں ہوں گے۔

شمس العلماء مولوی شاہجہان دہلی کی ان چند گنی چنی ہستیوں میں سے تھے کہ جنہوں نے اس آخری دور میں ہزاروں تعلیم یافتہ دماغوں میں علم کی روشنی پہنچائی۔ بڑی آن اور بڑی پہچان کے بزرگ تھے۔ دہلی مشن کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ مگر انگریز استادوں کا اتنا ادب اور لحاظ کرتے تھے کہ بیان سے باہر۔ ان کے پڑھانے کا انداز بالکل اپنا ہی تھا۔ جماعت میں آئے، اور اگر اس دن کوئی قصہ چھڑ گیا تو سارا گھنٹہ اس ہی قصہ میں ختم ہوگیا۔ فردوسی اور مولانا روم بیچارے منہ تکتے کے تکتے رہ گئے۔ خاقانی اور قاآنی کو تو مجال کیا تھی کہ سامنے بھی آتے، اور غالب غریب پر تو اگر نگاہ بھی پڑ گئی تو ان پر وہ لے دے ہوتی کہ مرزا صاحب کا ٹھیرنا مشکل ہوجاتا۔ زندگی دوبھر ہوجاتی۔ ادھر انہوں نے "چوں با زیگر چرخ در حقہ باز کرد" یا اسی قسم کا ایک مصرعہ تھا جو میں بھول گیا دیکھا اور فرمایا، لیجئے وہ مداری کا تھیلا کھول بیٹھے۔ بھان متی کا تماشہ ہونے لگا۔ اور غالب غریب ہیں کہ منہ چھپانے نہیں بن آتی، غرضیکہ مولوی شاہجہان تعلیم کے شاہجہان کیا بلکہ بابر تھے، اگر انہوں نے کسی شاعر پر ناک بھوں چڑھائی تو سمجھ لیجئے کہ اس بیچارے کو چوہے کا بل بھی ملنا دشوار تھا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ناک چڑھے۔ بدمزاج یا بد مذاق تھے، ایک انداز تھا۔ ایک آن تھی۔ خیر یہ تو محض میں نے بات شروع کرنے کے لئے کہا۔ ایک دن بالکل اتفاق سے ڈاکٹر فیلن کا ذکر آگیا۔ فرمانے لگے۔ میاں اب ایسے انگریز کہاں ہیں۔ ڈاکٹر فیلن دیسی کپڑے پہنتے تھے، اور ان پر کامدار گول ٹوپی۔ ہندو اور مسلمان دلی کے رہنے والے مشرقی اور مغربی تعلیم کے ماہر ان کے پاس کام کرتے تھے، جن میں مولوی سید احمد فرہنگ آصفیہ والے بھی تھے، ہم بھی تھے، ماسٹر پیارے لعل بھی تھے، روز کوئی نہ کوئی نئی تختی شروع ہو جاتی۔ یا دن بھر لفظوں اور محاوروں اور شعروں پر بحث ہوتی رہتی۔ ایک دن صاحب بولے (اور وہ خوب صاف اردو بول لیتے تھے) کہ مولوی صاحب یہ "سوڑھ" جو زچہ خانے یا جاپے کے معنوں میں نہیں بلکہ لحاف کے معنوں میں بولا جاتا ہے بھلا کس طرح نکلا۔ میں نے کہا جناب یہ تو تصدیق کرنے سے پتہ چلے گا۔ ہندی کا لفظ ہے۔ کہنے لگے واہ۔ لو ہم بتائیں۔ یہ

لفظ "سو" اور "ڈھ" سے مل کر بنا ہے۔ یعنی "سوا ڈھ"۔ اس پر ہیں بولا (یعنی مولوی شاہجہاں) جناب یہ تو سمجھ میں نہیں آیا، بھلا اگر سونے اور اوڑھنے کی اس میں ملاوٹ ہوتی تو "اوڑھ سو" ہونا کیونکہ پہلے اوڑھنا آتا ہے اور پھر سونا، یہ کیا کہ سو پہلے اور اوڑھ پیچھے، اس کے بعد مولوی صاحب اسی قسم کے قصے بیان کرتے رہے۔ ایک اور قصہ فیلن صاحب کا یہ بھی سنا کہ ایک مرتبہ جب ان کی اردو کی ڈکشنری پوری ہو چکی تو فیلن صاحب نے بڑے فخر اور ناز سے کہا کہ اب تو ہم نے ایک محاورہ بھی زبان کا نہیں چھوڑا، اس پر ایک صاحب بولے، یہ تو کہنا بہت مشکل ہے۔ صاحب نے تعجب سے پوچھا، یہ کیا، اس پر انھیں جواب ملا کہ اسے آزما لیجئے، آج ہی ملیباروں میں تیسرے پہر کے وقت چلئے، اور ذرا وہاں جو بچے کھیل رہے ہوں، ان سے بات کر کے دیکھئے، غرض شام کو صاحب دیسی کپڑے اور اپنی کا مدار ٹوپی پہن، اور ان صاحب کو ساتھ لے پہنچے، ملیباروں کے باہر ہی کچھ لڑکے کھیلتے ہوئے مل گئے، صاحب نے ان میں سے ایک سے باتیں کرنی شروع کیں۔ نہ معلوم انہوں نے کیا چھیڑ چھاڑ کی کہ وہ لونڈا بولا "اب آگے بڑھے نہیں پٹّی کی آڈل گا" فیلن صاحب نے دنگ ہو کر اپنے ساتھی سے پوچھا کہ "پٹّی کی آڈل گا" کیا بات ہوئی؟ وہ ہنس دیئے اور کہنے لگے کہ بس یہی تو چیزیں ہیں جو ڈکشنری کی حد سے باہر ہیں۔ یہ اہلِ زبان ہی کا حصہ ہے کہ وہ جب چاہے اور جو لفظ چاہے گھڑ لے۔ اور اس سے اپنا مطلب ادا کر دے۔

لیجئے آج میں ذکر تو کیا کرنا چاہتا تھا اور دیں کدھر سے کدھر نکل گیا۔

اردو میں کئی ایسے شاعر ہوئے ہیں کہ جو انگریزی نسل کے تھے، جن میں سے "مشور" کا تو گویا مانے ہوئے شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ وہی شور جن کا یہ مشہور شعر

آگرئی کا ہو گماں شک ہو ملاگیری کا　　　رنگ لایا ہے دوپٹا ترا میلا ہو کر

زبان زد خاص و عام ہے۔ مگر ان کے علاوہ اور بھی ہندی انگریز شاعر ہوئے ہیں، برٹش میوزیم میں میری نگاہ سے ان میں سے کئی کا کلام گذرا، مگر اب صرف دو نام یاد رہ گئے باقیوں کو بھول گیا۔ ایک تو کوئی صاحب "ولیم" نامی تھے، جن کا دیوان مختصر سا تھا اور کلام بھی کچھ مشقیہ اشعار سے زیادہ حیثیت کا نہیں تھا۔ اور ایک اور صاحب جوزف بنسلی تھے۔ جو فتا تخلص کرتے تھے، ان کا کلام نگاہ سے گذرا، ان کا دیوان تو ۱۸۶۳ء میں چھپا۔ مگر ان کا چوبیس برس کی عمر ہی میں ۱۸۵۱ء میں انتقال ہو گیا تھا دیوان کا دیباچہ شور کا لکھا ہوا تھا۔ یہ راجہ شروان سنگھ والئی الور کے ہمنشین اور جنرل تھے، پہلے موسیقی کا شوق ہوا، تو ستار نوازی میں کمال پیدا کیا، اور اس کے بعد شاعری کی طرف مائل ہوئے، تو ایک دیوان تیار کر دیا۔ شور نے دیباچہ میں پر درد طریقہ پر کہا ہے، "ایک دن وہ تھا کہ انھیں زندہ باشد فرخندہ باش کہا کرتا تھا۔ آج خدا بخشے کہہ رہا ہوں"۔

کلام اس زمانے کے لحاظ سے جو ہے سو ہے، زبان کی خامیاں بھی ہیں مگر کہیں کہیں تو ایسا شعر کہہ دیا ہے کہ باید و شاید، نمونہ کے طور پر چند شعر سن لیجئے۔

ہے نازکی پہ ناز مرے جسم زار کا　　　ہے بار پیرہن سے سوا تار تار کا

اب اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں نزاکت اور بار کی رعایت سے اور مبالغہ شاعری کی ضرورت سے ع "ہے بار پیرہن سے سوا تار تار کا" کہہ تو گئے، اور خوب کہہ گئے مگر بس اس خیال کے تجزیہ کی گنجائش نہیں ہے۔

پھر کہا ہے:۔

پھر ہے خزاں قریب نہ ہو شاد عندلیب　　　کچھ رنگ دیکھتے ہیں تبدّل بہار کا

اب پہلے مصرعہ کی اٹھان تو بڑی امیدیں پیدا کر دیتی ہے کہ دیکھئے خزاں کے قریب ہونے پر عندلیب غریب کا کیا رنگ بنے، مگر دوسرا مصرعہ بالکل پھسپھسا ہو کر رہ گیا۔ اور "تبدل بہار" نے تو زبان کی صحت کو بھی برباد کر دیا، "تبدل بہار" بغیر اضافت کے تو خیر بالکل ہی غلط ہے، مگر "تبدل بہار" کونسا بے خطا تیر ہے جو نشانہ پر بیٹھ سکے۔ "کچھ رنگ دیکھتے ہیں بگڑتا بہار کا" ہی کہہ دیتے تو زبان تو نہ بگڑتی۔ مگر خیر ایک نوجوان انگریز کے لئے یہ کیا کم ہے۔

ایک اور شعر کہا ہے۔

آسائشیں جہاں کی الٰہی ہوں مختصر　　　بڑھتا ہے ناز زندگیٔ مستعار کا

اس کی تنقید کو چھوڑیئے، اور ذرا دوسرا شعر ایک اور زمین میں سنیئے، کیا خوب کہا ہے

کچھ غیر ہی حسرت سے نہیں دیکھتا تم کو
بدلا ہے کچھ انداز تمہاری بھی نظر کا!

سبحان اللہ حقیقت میں عجیب پر کیف شعر کہہ دیا ہے ایک طرف واردات دل اور دوسری طرف شبہ کی گنجائش، اور تیسری طرف ان آنکھوں کے اور ان تیوروں کے دیکھنے والے کی حالت اور پھر اس کی شکایت، ایک پورا قصہ ہے

ایک گل عشق کی کہانی ہے، یہ شعر حقیقت میں خوب کہا ہے۔

کچھ غیر اللہ۔

ایک اور میدان میں تگ و تازگی ہے، فرماتے ہیں۔

ملے خاک میں ہم بلا سے مگر
میسر ترا نقش پا ہو گیا

ٹکسال سے تو باہر نہیں۔ مگر مضمون پامال ہے۔

تمہارے گذرتے ہی اس راہ پر
عجب ایک محشر بپا ہو گیا

ایک اور رنگ اور فنا کا رنگ ملاحظہ ہو

دیکھتے ہی دیکھتے ان اپنی آنکھوں کے فنا
باغ عالم میں جو گل پیدا ہوا گل ہو گیا

اس میں "گل ہو گیا" نے جان ڈال دی۔ اور گل خندہ کے شعلے کو شعلۂ شمع اور گل ہونے کو شمع کے گل سے مناسبت دے کر ایک خاموش طریقہ اظہار اختیار کیا ہے۔ خیر عیب جو نگاہ کے لئے تو یہاں بھی کافی مواد موجود ہے۔ مگر بھلا اس طرح چلئے تو شاید استادوں کا کلام بھی قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے لگے۔

حضرت غالب۔ اور مومن کی مشہور غزلوں کی زمین میں بھی چلے ہیں کہتے ہیں:۔

گھر سے وہ چلے ہی تھے شب کو ہمنشیں اٹھ کر
کام کر گیا لیکن طول داستاں اپنا

اب آپ کہیں گے کس کے گھر سے اپنے گھر سے یا کہنے والے کے، اور "کام کر گیا" کی جگہ آپ شاید "کام آ گیا" چلنے کی رعایت سے پسند کریں گے۔ مگر چوبیس سال کی عمر میں اگر ایک انگریز نسل کے نوجوان نے یہ شعر کہہ دیا۔ تو یہ تعریف کا موقع ہے، نہ کہ نکتہ چینی کا۔

کچھ اور بھی شعر ہیں جو فنا کے اسی زمانے میں لکھ لئے تھے، مگر ان میں سے چند جو میں نے نمونہ کے طور پر دیئے کافی ہیں۔

اگر تحقیق کیا جائے تو اور بھی اس قسم کے اردو کے شوقین، مداح اور اردو کی خدمت کرنے والے انگریز مل جائیں گے۔

ایک دلچسپ قصہ یہ بھی ہے کہ فنا کے دیوان کے اس نسخہ پر جو میری نگاہ سے برٹش میوزیم میں گذرا، میں نے ایک نوٹ دیکھا۔ جو کسی شخص حمید الدین مدرس "پنجم" نے سنہ [illegible]ء میں لکھا تھا۔ اور اس کے الفاظ یہ تھے

"جناب عالی اس کتاب کی قیمت سہ رپے، واسطے اطلاع کے عرض کیا فقط"

شاید کسی افسر نے اس قسم کی کتابیں جمع کرائی ہوں گی۔ اس میں بجائے فنا کی چوبیس برس کی کمائی اور خدا جانے کس کس دردسری اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہو، بیکار۔

حقیقت میں دماغی پھولوں کی قیمت اس مہک سے زیادہ نہیں جو اس وقت کہ جب وہ کھلتے ہیں خود اس شخص کی روح کو معطر کر دیتی ہے، جس کے دماغ کے وہ پھول ہوتے ہیں، اس سے زیادہ کی تمنا کرنا بے سود ہے، اگر اس سے زیادہ ہو تو داد و واہ اور نہ ہو تو افسردگی اور حسرت و عبرت کا کیا موقع ہر پھول خود اپنی ذات کے لئے کھلتا ہے اگر دوسروں کے لئے بھی وہ باعث مسرت ہو تو خوش نصیب ان کے جنہیں اس سے خوشی حاصل ہوئی۔ ورنہ پھول بے پرواہ ہے، کیا اس کی اپنی دنیا رنگ اور مہک کے فسانوں سے لبریز نہیں ہے۔ اور کیا اس کے لئے اس سے زیادہ گنجائش موجود ہے کہ وہ اپنی ہستی سے آگے بڑھکر دوسروں کی رضا جوئی اور خوشنودی کی بھی فکر کرے۔

شاہانِ مغلیہ کی شاعری

(از کوثر چاند پوری)

ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد ظہیرالدین محمد بابر نے مستحکم کی اور ابوظفر بہادر شاہ پر اس کا سلسلہ ختم ہوگیا، اگرچہ قوت و جبروت اور صولت و ہیبت شاہی کے اعتبار سے سلطنت مغلیہ اورنگ زیب ہی پر ختم ہوگئی۔ مگر اس کے بعد بھی اس دودمان کے دس تاجداروں نے حکومت کی جو محض برائے نام تھی، اورنگ زیب کے بعد کوئی فرماں روا ایسا نہیں ہوا جس کو حریت، استقلال اثر و دبدبہ اور شوکت و وجاہت کے اعتبار سے بادشاہ کہا جا سکے، عالم گیر کے مرتے ہی حکومت مغلیہ کا چراغ ہندوستان میں ٹمٹمانے لگا تھا۔ اور معنوی حیثیت سے اس کا اقتدار ختم ہوگیا تھا سلطنت سمٹتے سمٹتے بہت محدود ہوگئی تھی۔ ہر طرف سے دشمنوں کا سیلاب اُمنڈ آیا تھا۔ جس نے دودمان مغلیہ کی مستحکم اساس کو ہلا دیا تھا۔ بادشاہ صرف دکھانے کے لئے تھا۔ اختیارات شاہی درباری لوگوں کے ہاتھ میں تھے۔

یہ کمزوری رفتہ رفتہ بڑھتی رہی، آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ ابوظفر بہادر شاہ کے عہد میں چغتائی خاندان کی شمع حکومت گل ہوگئی، ظاہر ہے کہ تمدنی و معاشرتی اور ذہنی و دماغی ترقی کے لئے میدان اسی وقت ہموار ہوتا ہے جب ملک میں امن و سکون ہو۔ عدالت و انصاف کے بادل برستے رہیں اور یہ امر اسی وقت ممکن ہے جب بادشاہ مطمئن ہو اور جمعیت خاطر کے ساتھ فرائض جہاں بانی ادا کرتا رہے۔ انتظام مملکت معقول اور رعایا شاد و آباد ہو بحالت دیگر نشو و ارتقا کے عناصر فنا ہو جاتے ہیں۔ اور ملک کی ترقی رک جاتی ہے۔ یا اس میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ ہر چند بابر سے اورنگ زیب تک بھی سلطنت مغلیہ کا تسلسل قائم نہیں رہا۔ بلکہ دولت سوریہ نے کچھ دنوں کے لئے اس کو منقطع کر دیا تھا، تاہم ہندوستان ہر اعتبار سے ترقی کرتا رہا۔ اور انقراض دولت سے اس کی رفتار ترقی سست نہیں ہوئی، شیر شاہ کے پنج سالہ دور حکومت میں بھی اسے بہت سے قیمتی فوائد حاصل ہوئے۔ جو اب بھی مستقل حیثیت سے جبین ہند پر جگمگا رہے ہیں لیکن زوال سلطنت کے ساتھ ہی وہ تمام سعادتیں جو مغلوں کے اقتدار شاہی سے وابستہ تھیں رفتہ رفتہ رخصت ہونے لگیں۔ چنانچہ شاعری بھی جو دوسرے علوم و فنون کی طرح دولت مغلیہ کے سایۂ عاطفت میں پل کر بالغ ہوئی تھی ایک خاصی جگہ پہنچ کر ٹھہر گئی۔

حکومت مغلیہ علوم و فنون کا گہوارہ تھی۔ اس کے قدر شناس بادشاہوں نے دنیا بھر کا عطر کھینچ کر ہندوستان کی فضا کو معطر کر دیا تھا، اکبر جو چغتائی خاندان کا گل سرسبد تھا اس کے علمی رجحانات نے ارباب علم و فضل کو کھینچ کر ہندوستان میں جمع کر لیا تھا۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے صاحبان کمال موجود تھے۔ جن کی علمی سرگرمیوں نے یہاں کی تہی دامنی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اسی عہد میں سیکڑوں تصانیف ہوئیں۔ بے شمار ترجمے ہوئے۔ چمن زار شاعری میں بھی تازہ بہار آئی۔ شعرا کو ایک ایک قصیدے پر ہزاروں لاکھوں روپیہ بطور صلہ دیا جاتا تھا۔ حقیقتاً اسی قدرشناسی کا نتیجہ تھا کہ دنیا کے گوشہ گوشہ سے ارباب عقل و دانش سرزمین ہند کی طرف

کچھ چلے آرہے تھے، اور یہاں کے منصب سہ ہزاری میں ایک مقناطیسی قوت پیدا ہوگئی تھی، جو علمی ہستیوں کو جذب کرنے میں ہر وقت مشغول کار رہتی تھی۔

بادشاہ خود بھی موزوں طبع ہوتے تھے، اور مہمات سلطنت میں مصروف رہنے کے باوجود انہیں کبھی کبھی اپنے فطری ذوق کے ماتحت ادھر متوجہ ہونے کا موقع ہاتھ آجایا کرتا تھا۔ چنانچہ بابر سے اورنگ زیب تک میں قدر بادشاہ ہوئے سب نے اپنی موزونیٔ طبع کے جوہر دکھائے، اگرچہ اس کے بعد کے فرماں روا بھی اس وصف خاص میں اپنے اسلاف کے شریک رہے، مگر انہیں امور جہانبانی میں اتنی مصروفیت نہ تھی کہ ان کی شعر گوئی کو اتنی اہمیت دی جائے، واقعہ یہ ہے کہ اوصاف شاہی جس قدر کم ہوتے گئے شاعرانہ نازک خیالیوں ہی کا اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ ابوظفر بہادر شاہ تک یہ نوبت پہنچی کہ بادشاہ کا مشغلۂ حیات صرف شاعری رہ گیا، اسی لئے ہمارے اس مضمون کا تعلق خاندان مغلیہ کے صرف زندہ بادشاہوں سے ہے، اور چونکہ یہ زندگی اورنگ زیب پر تمام ہوگئی تھی لہٰذا ہمارا مضمون بھی یہیں پہنچکر ختم ہوجاتا ہے۔

افسوس ہے کہ شاہجہاں کے جوہر افکار تک ہماری دسترس نہیں ہوسکی، اسی بنا پر آپ اس مضمون کو شاہجہاں کے تذکرے سے خالی پائیں گے۔ یہیں اس موقع پر صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ مہمات سلطنت کے ہجوم اور غیر شاعرانہ مصروفیتوں کے عالم ہی میں یہ بادشاہ شعر و سخن کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے، ہم الگ الگ ان کے مختصر تذکرۂ حیات کے ساتھ ان کے آلیٔ افکار کو نذر قارئین کرتے ہیں۔

۱۔ ظہیرؔ الدّین محمّد بابرؒ

بابر کے باپ کا نام عمر شیخ مرزا تھا۔ بابر ۸۸۸ھ میں قتلق نگار خانم کے بطن سے پیدا ہوا، اور بارہ برس کی عمر میں اندجان کی حکومت اس کو تفویض ہوئی۔

۸۹۹ھ میں باپ کے مرجانے پر بابر نے ظہیر الدین کا لقب اختیار کر کے تخت حکومت پر جلوس کیا[1]۔

۹۳۲ھ میں بابر نے سلطان ابراہیم لودھی سے لڑکر ہندوستان فتح کیا، بابر کو ہندوستان سے بہت محبت تھی۔ وہ یہاں سے اپنی ولایت کو واپس نہیں گیا۔ اور ہندوستان ہی میں رہ گیا۔

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۹۵۔

۵ جمادی الاول ۹۳۷ھ کو پیر کے دن بابر نے انتقال کیا، اس نے اڑتیس سال بادشاہی کی، یہ نہایت سخی۔ بامروت اور بہادر تھا۔ اس کے ملازم بارہا اس کی جان و مال کے دشمن ہوئے۔ مگر جب اس کے قابو میں آئے اس نے عفو واحسان سے کام لیا۔

بابر بہت بڑا بادشاہ اور زبردست عالم تھا، موسیقی، شعر، انشاء اور املا میں یگانۂ روزگار تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے وقائع ترکی زبان میں لکھے ہیں جن کو اکبر کے عہد حکومت میں عبدالرحیم خاں خانان نے فارسی میں منتقل کیا۔

بابر خوبصورت، شیریں کلام، خوش گفتار اور ہنس مکھ آدمی تھا۔ شعر بھی کہتا تھا۔ یہ شعر اسی کا ہے۔

بازآ اے ہمائے کہ بے طوطی خطت
نزدیک شد کہ زاغ برد استخوان من

اگرچہ بابر کی تمام عمر لشکر کشی اور بے اطمینانی میں بسر ہوئی۔ لیکن پھر بھی وہ عیش ونشاط کے لئے وقت نکال لیتا تھا۔ اس کی مجلس طرب میں خوبصورت لڑکے اور مہ جبین عورتیں موجود رہتی تھیں۔ اسی نے کابل کے قریب دامن کوہ میں ایک پرفضا مقام پر پتھر کو کھود کر چھوٹا سا حوض بنوایا تھا۔ جس میں شراب بھری جاتی تھی اور خوش طبع رنگین مزاج ہم نشینوں کے ساتھ وہاں جاکر وہ زندگی کا لطف اٹھایا کرتا تھا۔ حوض کے کنارے پر یہ شعر کندہ تھا۔

نوروز و نوبہار و مے و دلبرے خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست[2]

۲۔ نصیر الدین محمد ہمایونؒ

بابر کا بیٹا تھا اور اس کے بعد اورنگ نشین ہوا، کچھ دنوں شیر شاہ کے غلبہ سے عاجز آکر آوارہ وطن رہا، پھر دوبارہ یاوری بخت سے ہندوستان کی سلطنت ہاتھ آئی۔

نہایت خوش طبع اور خلیق تھا۔ عیش ونشاط سے دلچسپی تھی۔ علم ریاضی اور نجوم میں کامل دستگاہ رکھتا تھا۔

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۲۵

[2] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۲۴ و ۲۲۵۔

ہمایوں ہندوستان چھوڑ کر ایران چلا گیا تھا۔ شاہ ایران طہماسپ بن اسمٰعیل صفوی نے بہت احترام کیا۔ مگر بادشاہ کے بھائی نے اس کو ہمایوں کے خلاف کر دیا۔ ہمایوں کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت غمگین ہوا، خوش قسمتی سے شاہ ایران کی بہن نے چند امرا کے اتفاق سے بادشاہ کو ہمایوں کی طرف سے صاف کر دیا۔ چنانچہ ایک دن خلوت میں سلطان بیگم نے ہمایوں کی یہ رباعی والیٔ ایران کے سامنے پڑھی۔

ہستیم زجان بندۂ اولادِ علیؑ ہستیم ہمیشہ شاد با یادِ علی
چوں سرِ ولایت از علی ظاہر شد کردیم ہمیشہ وردِ خود نادِ علی

شاہ ایران امامیہ مذہب رکھتے تھے، یہ رباعی سن کر بہت خوش ہوئے، اور عہد و پیمان کے بعد ہمایوں کو اپنے امدادی لشکر کے ساتھ واپس کیا[1]۔

ہمایوں نے اپنے بھائی مرزا کامراں پر فتح پائی تو بیرم خاں کو جو اس وقت قندہار میں مقیم تھا فتح نامہ لکھ گیا۔ ہمایوں نے یہ اشعار جو اسی کے طبع زاد ہیں اپنے قلم سے حاشیے پر تحریر کئے۔

بازفتح زغیب روئے نمود کہ دلِ دوستاں ازو بکشود
شکر للہ کہ باز شادانیم بر رخِ یار و دوست خندانیم
دشمناں را بکام دل دیدم میوۂ باغِ فتح راچیدم
شادمادا ہمیشہ خاطرِ یار غم نگردد بہ گردِ یارہ دیار
ہمہ اسبابِ عیش آمادہ است دل بہ فکرِ وصالت افتادہ است
کہ جمالِ حبیب کے بینیم! گل زباغِ وصال کے چینیم
گوشِ خرم شود ز گفتارت دیدہ روشن شود ز دیدارت
در حریمِ حضورِ شاد بہم بنشینیم خرم و بے غم
بعد ازاں فکرِ کارِ ہند کنیم عزمِ تسخیرِ ملکِ سند کنیم
فکرِ تدبیرِ کار و بار شود سیرِ کشمیر و آں دیار شود
ہر درِ بستہ کشادہ شود ہر چہ خواہم ازاں زیادہ شود
یا الٰہی بجامیسر کن! جملہ آفاق را مسخر کن

ان پرلطف اور کیف انگیز اشعار کے علاوہ جن میں روانی اور چستی بندش کے ساتھ ساتھ جذبات کا بھی تراکم اور ہجوم ہے۔ ہمایوں نے یہ رباعی بھی برجستہ موزوں کر کے لکھی۔

اے آنکہ انیس خاطرِ محزونی چوں طبعِ لطیف خویش موزونی
بے یادِ تو نیستم زمانے ہرگز آیا تو بیادِ منِ محزوں چونی[2]

۳۔ جلال الدین محمد اکبر

اکبر نہایت عادل اور عالی دماغ بادشاہ تھا۔ ارباب کمال کا بہت قدردان تھا۔ اسی کے دربار میں ہندوستان کے علاوہ ایران و توران اور بہت سے دور دراز ممالک کے علماء جمع تھے، اس کا نورتن جو ہند و مسلمانوں سے مرکب تھا نہایت فاضل، روشن دماغ اور عالی ہمت افراد پر مشتمل تھا۔ خداوند عالم نے جہاں اس کو دنیا جہان کی نعمتیں اور فضیلتیں ارزانی فرمائی تھیں، وہاں طبیعت بھی موزوں عطا کی تھی۔

ممکن ہے بعض لوگوں کے دل میں شبہ پیدا ہو کہ اکبر بادشاہ تھا، اسے سلطنت کے کاموں سے فرصت ہی کب ہوئی ہوگی کہ شعر کہتا، کسی درباری شاعر نے اپنی طرف سے کہہ دیئے ہوں گے۔

لیکن یہ شبہ حقیقتاً کوئی وزن نہیں رکھتا، یہ امر تو ظاہر ہے کہ اکبر بادشاہ تھا۔ اور بادشاہ بھی کیسا جلیل القدر۔ اس کے دربار میں ہزاروں اہل کمال موجود تھے، اگر وہ چاہتا تو دفتر کے دفتر اور دیوان کے دیوان اپنے نام سے تصنیف کرا کے شائع کر دیتا۔ مگر واقعہ اس کے خلاف ہے۔ اس کے نام سے جو اشعار منسوب کئے جاتے ہیں، وہ بہت کم ہیں اور واضح دلیل ہیں اس امر کی کہ حقیقتاً اسی کے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اہل فن کو اپنے اشعار دکھا کر درست کرا لیتا ہو۔

گریہ کردم از غمت موجبِ خوش حالی شد
ریختم خونِ دل از دیدہ دلم خالی شد

تمہارے غم ہجر میں رونے سے جی ہلکا ہو گیا۔ طبیعت مسرور ہو گئی کیونکہ آنکھ سے خونِ دل ٹپک پڑا۔ اور دل خالی ہو کر مجھے آرام مل گیا۔ اکبر نے ایک سچے خیال کو قدرت کے ساتھ نظم کیا ہے۔

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۴۲۔ [2] تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۴۹۔ و دیوان بیرم مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۹۰۔ و کتاب بیرم خاں مولفہ احقر صفحہ ۴۰۔

[1] تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۴۹ و مآثر الامراء صفحہ ۳۷۹ و محمد بیرم خاں ترکمان صفحہ ۴۷۔

می نازکہ دل خوں شدہ اندروی او   من یار غم از دست بہ پری او
در آئینۂ چرخ نہ قوس قزح است   عکس است نمایاں شدہ از چوڑی او

یہ آسمان کے آئینہ میں جو تم رنگ برنگ کی قوس قزح دیکھ رہے ہو حقیقتاً کسی کی چوڑیوں کا عکس ہے۔ جو اس میں نمایاں ہو رہا ہے۔ ہماری دانست میں قوس قزح کو محبوب کی چوڑی سے نسبت دینا اکبر کی نزاکت خیال اور ندرت بیان کی زبردست دلیل ہے۔ یہ تشبیہ فارسی زبان میں پہلی مرتبہ اکبر ہی نے استعمال کی ہے۔

دوشینہ بکوئے مے فروشاں   پیمانہ بہ زر خریدم
اکنوں ز خمار سر گرانم   زر دادم و درد سر خریدم[1]

رات کو شراب کا پیالہ خرید کر پی لیا تھا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو سر چکرا رہا ہے، ہماری حماقت دیکھیے کہ پیسے دے کر یہ "درد سر" مول لیا۔

من بنگ نمی خوریم مے آرید   من چنگ نمی زنم نے آرید
(بیارید)   دنیارید

شبنم کہ بہ ورق گل فتادہ است   آں قطرہ ہا ز دیدۂ بلبل فتادہ است[2]

یہ جو پھولوں پر اوس کی بوندیں پڑی ہوئی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ بلبل کے آنسو ہیں، شبنم نہیں ہے۔

۹۹۷ھ میں فردوس ہند کشمیر کی سیر کو گئے، امرائے لشکر بھی ساتھ تھے بیگمات بھی تھیں، سری نگر پہنچ کر خیال ہوا کہ مریم مکانی (اکبر کی ماں) بھی ہمراہ ہوتیں تو بڑی سعادت اور برکت حاصل ہوتی۔ شیخ ابو الفضل کو حکم دیا کہ عرضداشت لکھو، وہ لکھ رہے تھے۔ کہ آپ نے کہا یہ شعر بھی لکھ دینا۔

حاجی بسوئے کعبہ رود از برائے حج
یارب بود کہ کعبہ بیاید بسوئے ما

حاجی سفر کی صعوبتیں اٹھا کر کعبہ کو جاتے ہیں، خداوندا تو ایسا کرم کر میرے پاس خود کعبہ ہی چلا آئے۔

ماں کو کعبہ سے تعبیر کیا ہے۔

۴۔ نور الدین محمد جہانگیر

اکبر کا بیٹا اور اس کے تاج و تخت کا وارث جہانگیر اگرچہ عیش و نشاط

[1] تذکرہ حسینی شاہ ص۔۔ اور دربار اکبری ص۔۔ [2] تذکرہ حسینی شاہ ص۔۔

اور بادہ و ساغر کا پرستار تھا لیکن اس کا عدل و انصاف، اس کی ہوش مندی و دانائی بھی مشہور عالم ہے۔ نور جہاں اس کی چہیتی بیگم تھی۔ جس سے اس کو محبت نہیں عشق تھا۔ مگر جہانگیر کی عدالت کا یہ حال تھا کہ اس نے ایک موقعے پر اس کے قصاص کا حکم نافذ کر دیا تھا۔

جہانگیر کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ خود بھی شعر کہتا تھا تذکرۂ حسینی میں لکھا ہے
طبعش بہ شعر و نثر میل تمام می نمود[1]

وہ خود بھی لکھتا ہے کہ میری طبیعت موزوں ہے۔ کبھی ارادتاً اور کبھی بے ارادہ کوئی مصرعہ، رباعی یا بیت لکھ دیتا ہوں۔

طالب آملی جہانگیر کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ اس کو اور دوسرے درباری شعرا کو اشعار پر کافی صلہ ملتا تھا۔ جہانگیر کی سب سے پہلی غزل یہ ہے۔

من چوں کنم کہ تیر غمت بر جگر رسد   تا چشم نارسیدہ دگر بر جگر رسد
مستانہ می خرامی و دستت تو عالمے   اسپند می کنم کہ مبادا نظر رسد
در وصل دوست ستم و در ہجر بے قرار   داد از چنیں غمے کہ مرا سر بسر رسد
مدہوش گشتہ ام کہ بہ موسم بہ وصال   فریاد از آں زماں کہ مرا ایں خبر رسد
وقت نیاز و عجز جہاں گیر ہر سحر   امید آنکہ شعلۂ نور اثر رسد

ایک مرتبہ بادشاہ کے سامنے یہ شعر پڑھا گیا۔

بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق   یک زندہ کردن تو بصد خوں برابر است

جہانگیر نے اس کو سن کر کہا:۔

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس   یک دل شکستن تو بصد خوں برابر است

احمد مہر کن نے یہ شعر موزوں کیا۔

اے محتسب ز گریۂ پیر مغاں بترس   یک خم شکستن تو بصد خوں برابر است[2]

خان خاناں کے ایک شعر پر بھی جہانگیر نے اشعار کہے تھے۔ مگر وہ اس وقت ہمیں نہ مل سکے۔

اے آنکہ غم زمانہ باکت خوردہ   اندوہ دل و وسوسہ ناکت خوردہ
مانند قطرہ ہائے شبنم بزمیں   جا گرم نہ کردہ کہ خاکت خوردہ[3]

[1] تذکرہ مذکور صفحہ ۔۔ [2] تاریخ ہندوستان ص۲۷۰ [3] تذکرہ حسینی ص۔۔ ۔

جہانگیر تزک کے صفحہ ۱۰۵ پر لکھتا ہے۔

خواجہ ہاشم وہ بندی ہیں جو ماوراءالنہر میں درویشی کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہیں اور وہاں کے آدمی ان کے معتقد ہیں۔ ایک خط کسی فقیر کے ذریعہ سے بھیجا جس میں دعا گوئی کے بعد میرے آباؤ اجداد سے اخلاص کا اظہار کیا گیا تھا۔ بابر کا یہ شعر بھی اس میں درج تھا۔

خواجگی را بندہ ایم و خواجگی را بندہ ایم

میں نے اس خط میں چند سطریں اپنے قلم سے اور یہ رباعی برجستہ موزوں کر کے لکھی اور ہزار مہر جہانگیری کے ساتھ خواجہ کی خدمت میں بھیج دیا۔

اے آنکہ مرا مہر تو بیش از بیش است | از دولت یاد بودت اے درویش است
چندانکہ از نشرہ دات دل شاد شود | شادیم ازانکہ لطفت از حد بیش است[1]

بادشاہ کی قدر دانی اور علم پروری ملاحظہ ہو کہ اپنی رباعی کے ساتھ ہی حکیم مسیح الزماں کی رباعی بھی درج کرتا ہے اور اس کا بالکل خیال نہیں کرتا کہ اس کے سامنے میری رباعی کی وقعت کم ہو جائے گی۔ چنانچہ لکھتا ہے، میں نے کہہ دیا تھا کہ جس کا جی چاہے اس رباعی کو نظم کرے۔ حکیم مسیح الزماں نے نظم کیا اور خوب کیا۔

دارم اگرچہ شغل شاہی در پیش | ہر لحظہ کنیم یاد درویشاں بیش
گر شاد شود ز ما دل یک درویش | آں را شمرم حاصل شاہی خویش

میں نے ایک ہزار مہر اس رباعی کے صلہ میں حکیم کو دیں۔[2]

اس کی نثر نگاری کا نمونہ اس کا روزنامچہ تزک جہانگیری کے نام سے اب بھی موجود ہے جس میں اس نے اپنی زندگی کے تقریباً تمام واقعات صحیح صحیح لکھ دیئے ہیں۔ اس کی صاف گوئی کی حد یہ ہے کہ اپنی شراب نوشی کے حالات کو بھی لکھ دیا ہے، اس نے اپنی زندگی کے کسی واقعہ پر پردہ نہیں ڈالا۔

کشمیر سے واپس ہوتے وقت ۱۰۳۷ھ میں جہانگیر نے انتقال کیا، اور لاہور میں دریائے راوی کے کنارے دفن ہوا، اس کی عمر تقریباً ساٹھ سال کی تھی۔ اس نے بائیس سال آٹھ مہینے حکومت کی۔

تاریخ انتقال یہ ہے

چو تاریخ وفاتش جست کشفی | خرد گفتا جہانگیر از جہاں رفت[3]

۵- اورنگ زیب عالمگیر

اورنگ زیب کو شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اس مشغلہ کو فضول اور بیکار سمجھتا تھا۔ اس کا عہد حکومت شعراء کے لئے بہت ناساز گار تھا، مدحیہ قصائد پر جو بیش قرار صلے ان کو ملا کرتے تھے اب وہ سب خواب و خیال ہو گئے تھے، بادشاہ شعر سننا بھی پسند نہ کرتا تھا، اس نے ملک الشعراء کے عہدے کو تخفیف کر دیا تھا لیکن پھر بھی اس کا دربار شعراء سے خالی نہ تھا۔ اور اکثر اوقات شعراء ایسے قصیدے لکھ کر لاتے تھے کہ بادشاہ کو مجبوراً خراج تحسین ادا کرنا پڑتا تھا۔

اورنگ زیب فارسی زبان کا زبردست انشا پرداز تھا۔ اس کی انشا پردازی کا زندہ نمونہ اس کے رقعات کا مجموعہ ہے، جس کے لفظ لفظ سے سلاست زبان اور فصاحت بیان کے دریا بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فارسی زبان بولتا بھی ایسی ہی تھا جیسی لکھتا تھا۔ ترکی سے بھی خوب واقف تھا۔ ہندی میں بھی نہایت اچھی گفتگو کرتا تھا، جو ہندو فارسی نہیں بول سکتے تھے ان سے اسی زبان میں بات چیت کیا کرتا تھا۔ موزوں طبع تھا اور نظم میں کافی مہارت رکھتا تھا، شاعر جب اس کی مدح میں قصیدے پڑھتے تو وہ ان سے متاثر ہوتا۔ تعریف کرتا۔ لیکن پڑھنے کے بعد کہتا کہ اپنے اوقات عزیز کو کیوں اس فضول کام میں صرف کرتے ہو بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے شعر لکھنے اور پڑھنے کی ممانعت کر دی تھی لیکن یہ بیان نہایت مبالغہ آمیز ہے، بادشاہ خود شعر کہتا تھا۔ پھر کیونکر ممکن ہو کہ دوسروں کے لئے اس مشغلہ کو ممنوع قرار دیتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کو شعر و سخن سے وہ دلچسپی نہ تھی جو اس کے اسلاف کو تھی اور یہ بالکل صحیح ہے کہ اورنگ زیب شاعری کو فضول سمجھتا تھا۔ لیکن ایسے اشعار کو جن میں پند و نصیحت کا کوئی مضمون ہوتا وہ بہت غور سے سنا کرتا تھا اس نے اپنے رقعات میں جگہ جگہ اساتذہ کے اشعار لکھے ہیں۔ بیٹوں کو بھی بیاضوں میں اشعار لکھایا کرتا تھا اس کا ایک شعر یہ ہے

غم عالم فراواں است و من یک غنچہ دل دارم | چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیاباں را

قریب قریب یہی مضمون کو غالب نے اردو میں یوں ادا کیا ہے۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا | دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

تذکرہ شمع انجمن میں اورنگ زیب کی یہ رباعی بھی لکھی ہے

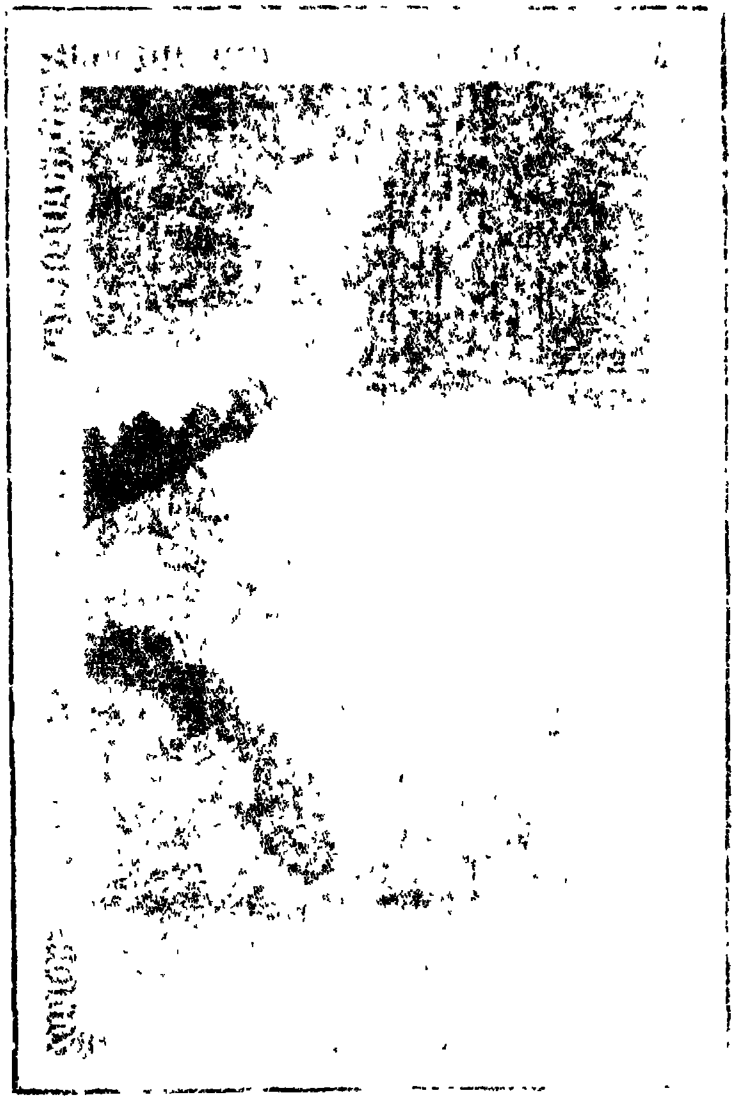
دیوو زپئے گلاب می گردیدم | پژمردہ گلے بر سر آتش دیدم
گفتم کہ چہ کردہ کہ می سوزندت | گفتا کہ دریں باغ دمے خندیدم[1]

ان اشعار سے بادشاہ کا رنگ طبیعت صاف ظاہر ہے۔ وہ مذہبی آدمی تھا دنیا کی بے ثباتی کا بدرجہ اتم قائل تھا۔ اسی خیال کی جھلک کم و بیش اس کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

---

[1] تزک جہانگیری ص۱۰۵ [2] تزک جہانگیری ص۱۰۵ [3] سیر المتاخرین جلد اول ص۲۵۳۔

[1] شمع انجمن ص۲۹۹





بندروں کا گروہ

انسانی فطرت اور خیر و شر

جوش ملیح آبادی

سوال یہ ہے کہ نظریاتِ "خیر و شر" کی رُو سے آیا انسان مائل بہ "خیر" ہے، یا مائل بہ "شر"؟ یا یوں کہئے کہ قدرت نے آیا اُسے مادۂ "خیر" زیادہ دیا ہے، یا مادۂ "شر"؟

اِس سلسلے میں سب سے پہلے جس شے پر نظر پڑتی ہے، وہ خود نظریۂ "خیر و شر" ہے۔ کہ "خیر و شر" ہے کیا؟

اِس باب میں اربابِ فکر کی یہ رائے ہے کہ "خیر و شر" کوئی حقیقی شئے نہیں، محض اضافی و اعتباری چیز ہے۔ اور اس کی ایک "اصطلاح" سے زیادہ کوئی حیثیت تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ پھر جب "خیر و شر" محض ایک اضافی، اور اسی بنا پر غیر حقیقی چیز ہے، تو ایک اضافی و غیر حقیقی شئے کا کسی ذی حیات کی فطرت کے اندر تلاش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اسی کے دوش بدوش اکثر مفکرین کا یہ بھی خیال ہے کہ انسان ایک محض سادہ و غیر منقش فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے، جسے "خیر و شر" یا "نیکی" "بدی" سے کوئی تعلق نہیں ہوتا —— اور یہ ماحول ہے جو اس کے افکار و کردار کو "نیکی" "بدی" یا "خیر و شر" کے اضافیات و اعتبارات سے منسوب کر دیتا ہے۔

اِن متذکرۂ بالا اُمور کی رُو سے، انسان کے فطری طور پر مائل بہ "خیر" یا مائل بہ "شر" ہونے کے سوال کے حل کرنے کے لئے ہمیں

(۱) خیر و شر کے معنی متعین کرکے انسان کی فطرت پر غور کرنا پڑے گا،

(۲) انسان کی فطرت کے سادہ و غیر منقش ہونے کے مسئلے کو جانچنا ہوگا۔

(۳) اور ماحول کی حقیقت اور اُس کی اثر انگیزی پر نظر ڈالنا پڑے گی۔

(الف)

خیر و شر کے معنی کا تعیّن اور انسانی فطرت

یہ کہا جاتا ہے کہ "خیر و شر" کسی اعتباری و اضافی شے کا فطرتِ انسانی کے اندر تلاش کرنا بے معنی سی بات ہے —— لیکن اگر ہم "خیر و شر" کو اصطلاحی معنی میں نہ لیں، اور اُسے "نیکی بدی" "اچھائی برائی" "زشت و خوب" "منفعیت و معصومیت" اور "مقبولیت و مقہوریت" کے تمام تصورات سے قطعی طور پر معرا کرکے استعمال کریں تو پھر اُس کا فطرتِ انسانی کے اندر تلاش کرنا ہرگز ایک بے معنی سی بات نہیں ہوسکتا۔

میرا اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر ہم انسان کی قانون شکنی، دروغ بافی، امن سوزی، اور خوں ریزی وغیرہ کے واقعات کو "شر" کا خطاب دیں، اور اس کی قانون پرستی، راستبازی، امن پروری، اور انسانی ہمدردی وغیرہ کو "خیر" کے لفظ سے پکاریں، تو "خیر و شر" کی اس تعریف کی رُو سے "خیر و شر" کا فطرتِ انسانی کے اندر تلاش کرنا بالکل درست اور قطعی جائز ہوگا، اور پھر اس میں یہ واقعات صورتِ حال میں اس تلاش و جستجو پر یہ اعتراض وارد نہیں کیا جاسکتا کہ ایک اضافی و اعتباری شے کا کسی ذی حیات کی فطرت کے اندر ڈھونڈنا ایک مہمل سی بات ہے۔

اور جب "خیر و شر" کے اس واقعاتی مفہوم کی روشنی میں ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ آیا انسان بالطبع مائل بہ "خیر" ہے کہ مائل بہ "شر" تو ہمارے واسطے

اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے، کہ ہم مشاہدہ و تاریخ کی رُو سے اس اَمر پر نگاہ ڈالیں کہ نوعِ انسانی کے مجموعی افکار و کردار کی ہمیشہ نوعیت کیا رہی ہے، اور انسانیت کا سوادِ اعظم آیا ہر زمانے اور ہر عہد میں "خیر" پر قائم رہا ہے کہ "شر" پر؟

اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے بچوں کے مجموعی افکار و کردار پر غور کرنا پڑے گا، اس لئے کہ فطرتِ انسانی کی تحقیقات کے معاملے میں بہترین نمونے بچے ہی ہو سکتے ہیں۔

دنیا کی تمام قوموں کے بچوں کے مجموعی افکار و کردار کا کامل مطالعہ کرنے کے بعد نہایت آسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج تک کسی ماں نے کوئی ایسا بالطبع "خیر" یا صالح و سعید" بچہ نہیں جنا، جو ایک گُھٹے ہوئے سر پر چپت رسید کرنے کے عوض، کسی مریض کے پاؤں دباتے دیکھا گیا ہو ۔۔۔ اور جو شور و غل، توڑ پھوڑ، اور مار پیٹ سے مُنہ موڑ کر کسی مکتب یا عبادت گاہ کی طرف جاتا ہوا نظر آیا ہو۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ بچہ کسی فعل کو ضرور کرے، تو آپ اُس سے یہ کہہ کر دیکھ لیں کہ "خبردار ایسا نہ کرنا" اور آپ کو یہ دیکھ کر تعجب ہو جائے گا کہ بچہ اُس ممنوع فعل کو اور بھی زیادہ شوق و اصرار کے ساتھ کر رہا ہے ۔۔۔ اور اس سے آپ کو پتا چل جائے گا کہ قدرت نے اُس کی فطرت کو نافرمانی اور سرتابی کا جوہر کس بے باکانہ فیاضی کے ساتھ مرحمت فرمایا ہے۔

ایک طرف تو سوسائٹی ایک مُدّتِ دراز سے بچوں کے فطری میلانات، اور جبلّی رجحانات پر قابو حاصل کر کے انھیں اُن تمام اُمور پر قائم کر دینے کی دُھن میں لگی ہوئی ہے، جنھیں "خیر" کہا جاتا ہے ۔۔۔ لیکن حسبِ مراد کامیابی نہیں ہوتی۔

اور دوسری طرف دنیا میں ازل کے روز سے کوئی ادارہ اس مقصد کے ساتھ اب تک قائم نہیں ہوا ہے کہ بچوں کو "شرارت" کی تعلیم دی جائے۔ لیکن بچے ہیں کہ نئے دن نت نئی شرارتیں ایجاد کرتے رہتے ہیں ۔۔۔ اور اس سے مفکرین کے دماغ اس فیصلے کی جانب مائل ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "شرارت" کوئی سکھائے جانے کی چیز نہیں ہے، بلکہ بچے اسے ماؤں کے پیٹ ہی سے لے کر نکلتے ہیں ۔۔۔

آخر صورتِ حال اس کے برعکس کیوں واقع نہیں ہوتی ہے یعنی بچے اپنے فطری میلانات سے مجبور ہو کر کسی بیمار کے پاؤں کیوں نہیں دباتے اور کسی سوتے ہوئے آدمی کے سر پر پانی کا گھڑا توڑ کر کیوں بھاگ جاتے ہیں؟

کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ بچے، بیمار کے پاؤں دبانے کو تو آگے چل کر والدین، اساتذہ، یا ماحول اور اخلاقی کتب سے سیکھتے ہیں، اور سوتے ہوئے کے سر پر پانی کا گھڑا توڑ کر بھاگ جانے کو کسی سے سیکھتے نہیں۔ بلکہ یہ فعل اُن کی جبلت و سرشت میں بالکل اُسی طرح داخل ہے جس طرح مچھلی کا بچہ پیدا ہوتے ہی تیرنے لگتا ہے؟

اور اگر یہ صحیح ہے تو کیا "خیر" محض ایک اکتسابی شے ہے، اور "شر" کلیتہً فطری؟

اب بچوں کو چھوڑ کر ذرا بالغوں کی طرف آیئے۔

انسانی نفسیات، اور انسانی حیات کے نبّاض، اس واقعۂ مرئیہ کی گواہی دینے کے لئے ہر وقت آمادہ نظر آتے ہیں۔ اور بے شمار سنین و شہور کی راز دان تاریخ کے بوسیدہ اوراق بھی اس حقیقتِ کبریٰ کی ناقابلِ انکار شہادت دینے پر آن تُلے رہتے ہیں کہ انسان، طلوعِ تاریخ سے لے کر، اس بیسویں صدی تک اُن تمام اصول و افراد سے برسرِ پیکار رہا۔ اور آج بھی ہے، جنھیں اس دنیا میں "خیر" کا حامل و داعی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

اس آسمان کی ڈاٹ کے نیچے انسان کیا کیا سفاکیاں کر چکا ہے، اور اس زمین کے فرش پر انسانی خود کامیوں اور حوصلہ مندیوں نے کتنی ہولناک مقدار میں خون بہایا ہے ۔۔۔ یہ وہ عبرتناک حوادث ہیں جن سے تمام پڑھے لکھے لوگ واقف ہیں، اور یہ وہ دردناک واقعات ہیں، جن کے بیشمار ثبوت ایک ایسے ناقابلِ تصور انبار کی صورت میں موجود ہیں کہ اگر انھیں ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے پر چُنا جائے تو ایک ایسا منارۂ بلند تعمیر ہو سکتا ہے جس پر چڑھ کر ہم مریخ کے باشندوں سے سرگوشی کر سکتے ہیں۔

دیکھنا چاہیئے کہ اس عالمِ کون و فساد میں "خیر" کے کتنے منادی و مبلغ اب تک آ چکے ہیں ۔۔۔ اور انسانیت نے اُن سے ہمیشہ کیا برتاؤ کیا ہے؟

اگر کوئی یہ کہے کہ انسان نے مبلغانِ "خیر" کا ہمیشہ اتباع کیا، اور اُن کے آستانوں پر سر جھکایا ہے، تو مجھے اس کے علم کے نقص، اور اُس کے

مشاہدے کی خامی پر افسوس ہوگا۔

اگر کسی کے پاس کوئی تاریخی ثبوت ہے تو میرے اس سوال کے جواب میں پیش کرے کہ کیا انسان نے مُبلغانِ "خیر" کا ہمیشہ خم ٹھونک کر مقابلہ نہیں کیا؟ اُنھیں صلیبوں میں نہیں ڈالا؟ اُن کی پشت پر کوڑے نہیں مارے؟ اُنھیں کانٹوں کا تاج نہیں پہنایا؟ اُن کے سامنے زہر کا پیالہ نہیں پیش کیا؟ اور اُنھیں مُولی گاجر کی طرح کاٹ کر نہیں رکھدیا؟

اور یہ تمام درندگیاں اور یہ تمام شقاوتیں کیوں روا رکھی گئیں؟ کیا یہ تمام شقاوتیں محض اس تنہا بُنیاد پر روا نہیں رکھی گئیں کہ مُبلغانِ خیر، انسان کو اُس حلقے کی طرف دعوت دیتے، اور پکارتے تھے جسے حلقۂ "خیریت" کہا جاتا؟

اور کیا تاریخ اس کے برعکس بھی کوئی شہادت پیش کر سکتی ہے، یعنی کیا کسی عہد اور کسی دَور میں حلقۂ خیر پر بھی انسانیت کا اجتماع اسی صورت سے رہا ہے، جس طرح ہمیشہ مرکزِ "شر" پر رہتا چلا آیا ہے؟ اور اربابِ "شر" بھی کیا کبھی اتنی حقیر اقلیت میں رہ چکے ہیں، جتنی حقیر اقلیت میں اربابِ "خیر" ہمیشہ سے رہتے چلے آئے ہیں؟

اس باب میں بعض وہ حضرات جو انسانی فطرت سے خوش عقیدگی رکھتے ہیں، ایک نہایت ہی باریک مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُسے بھی سُن لیجئے ——

یہ خوش عقیدہ جماعت کہتی ہے دُور کیوں جاؤ، خود اپنے ہی عہد کو دیکھو، کہ اس وقت دنیا میں چور، ڈاکو، فتنہ پرور، قانون شکن اور قاتل زیادہ ہیں کہ نیک معاش افراد؟

سو میری اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ یہ ایک اصطلاحِ قانونی کا پروردہ سطحی مغالطہ ہے —— یعنی قانون یہ کہتا ہے کہ اُس وقت تک ہر شخص نیک اور شریف ہے، جب تک کہ کسی قانونی جُرم کا ارتکاب کرکے سزا یافتہ نہ ہو جائے —— جس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام افراد جو بالقوّۃ ڈاکو، بُغض، قانون شکن اور خونی ہیں۔ اور زمانے کی ناسازگاری، یا حماقت، یا بزدلی کے باعث اپنی تمام خبیث تمناؤں کو دلوں میں گھونٹ گھونٹ کر رکھدیتے ہیں، اور ارتکابِ جرم نہیں کرتے۔ نیز وہ تمام مکّار چور، ڈاکو، جعل ساز، غاصب، اُٹھائی گیرے، اور قاتل، جو اس چالاکی سے جرائم کرتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی۔ اور انتہائی پوشیدگی کے ساتھ جرائم کرنے کے باعث جن پر مقدمات نہیں چلائے جا سکتے، اور اُنھیں سزائیں نہیں دی جا سکتیں —— اُن سب خطرناک لوگوں کو شرافت و معصومیت کا مجسمہ سمجھ لیا جائے۔

آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ یہ نظریہ کس قدر مجروح اور غلط ہے، اور فطرتِ انسانی کی تحلیل کرنے والے کیونکر اس غلط نظریئے سے مطمئن ہو سکتے ہیں —— کیونکہ اگر نفوس میں "شر" موجود ہے تو خواہ وہ "شر" کتنی ہی غیر عملی یا مجہول ہو، بہرحال اُسے "شر" ہی کہا جائے گا۔ اور ایسے مائل بہ "شر" نفوس رکھنے والوں کو اربابِ "خیر" کے خطاب سے ہرگز سرفراز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ "شر" کے کسی وجہ سے معطّل رہنے کو فقدانِ "شر" سے منسوب کرنے کی غلطی کے ارتکاب کو کم سے کم اربابِ نظر تو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں لگے ہاتھوں ایک اور بات پر بھی غور کرتے چلئے۔

یہ تو آپ کو، جیسا کہ ابھی ذکر ہو چکا ہے، معلوم ہی ہے کہ انسان نے مُبلغانِ "خیر" کا ہمیشہ خم ٹھونک کر مقابلہ کیا ہے، اور اُس حلقے میں داخل ہونے سے ہمیشہ اِبا کیا ہے، جسے حلقۂ "خیریت" کہتے ہیں۔

اس باب میں سوچنا یہ ہے کہ "خیر" فطرتِ انسانی کے مطابق ہے، یا مخالف و مغائر؟

اگر "خیر" فطرتِ انسانی کے مطابق ہوتی تو انسان اُسے بخندہ پیشانی قبول کر لینے میں پس و پیش کیونکر کر سکتا تھا؟

بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر "خیر" مطابقِ فطرت ہوتی تو برسرِ پیکار ہونا تو بڑی بات ہے انسان کی یہ مجال نہ تھی کہ اُس سے سرِ مُو انحراف بھی کر سکتا —— کیونکہ یہ کسی ذی حیات کے بس کی بات ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی فطرت یا متعلقاتِ فطرت سے لڑنے یا انحراف کرنے کا تصور بھی کر سکے۔

غور کرنا چاہیئے کہ تمام عالمِ انسانیت کا ازل کے دن سے کسی چیز کے قبول کرنے سے انکار کرنا، مسلسل انکار کرنا، ہمیشہ اور ہر عہد میں انکار کرنا، اور مسلح ہو کر انکار کرتا، اور انکار کرتے ہی رہنا، کیا اس بات کا ناقابلِ انکار حد تک ثبوت نہیں ہے، کہ وہ شے فطرتِ انسانی سے مغائر، اور اُس کے

قطعی مخالف واقع ہوئی ہے؟

کیا کسی مچھلی کی فطرت نے پیرنے، اور کسی پرندے کی جبلّت نے اُڑنے سے کبھی بغاوت کا تصوّر بھی کیا ہے؟

ہر زمانے میں یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان نے "خیر" اور اُمورِ "خیر" کی پابندی سے ہمیشہ اپنے کو محفوظ رکھنے کی سعی کی ہے، اور یہ اُس کا خوف ہی تنہا دلیل اس بات کی ہے کہ "خیر" اُس کی فطرت اور افتادِ مزاج کے موافق وہم آہنگ واقع نہیں ہوئی ہے۔

اس موقعے پر مجھے کانپور کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک روز کشتی پر سوار ہو کر میں گنگا کے اُس پار گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ شیر دودھ پی رہا ہے، اور یہی نہیں بکرے کے ساتھ ایک ہی ظرف میں دودھ پی رہا ہے، اور شیر کو "حیوانِ صالح" بنا دینے والا سادھو تماشائیوں کی زرپاشیوں اور تعریفوں کا مرکز و موضوع بنا ہوا ہے ——— اُس وقت یکایک یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ سادھو نے کام تو بڑا کیا ہے، لیکن کیا کسی ذی حیات کی فطرت کا مسخ کر دینا کوئی قابلِ فخر یا شائستہ فعل ہو سکتا ہے، اور شیر کے بکری بنا دینے کو کوئی شایانِ تحسین کارنامہ ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ ——— اور اسی کے ساتھ ساتھ معاً یہ خیال بھی میرے دل میں بجلی کی طرح چمک گیا کہ اگر "خیر" ہماری فطرت کے مطابق واقع نہیں ہوئی ہے تو کیا اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ اگر ہم نے اُسے اپنے اوپر حاوی ہونے کا موقع دے دیا تو وہ رفتہ رفتہ ہماری فطرت کو مسخ کر کے رکھ دے گی؟

(ب) اب دوسرے مسئلے کی جانب رُخ کیجیے ———

غیر منقّش فطرت

کہا جاتا ہے کہ انسان محض ایک سادہ و "غیر منقّش" فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے، اور صرف ماحول اُس کے افکار و کردار کو "خیر" و "شر" سے منسوب کر دینے کا ذمّہ دار ہے۔

ماحول کے متعلق، جیسا کہ میں طے کر چکا ہوں، آخر میں لکھوں گا۔ اس حصّے میں صرف یہ دیکھنا ہے کہ انسانی فطرت کی "سادگی" کا نظریہ درست ہے یا غلط۔

انسان کی فطرت کے "سادہ و غیر منقّش" ہونے کے نظریے کو جہاں تک انسانِ اوّل کی پیدائش کا تعلق ہے، کسی حد تک ضرور قابلِ لحاظ سمجھا جا سکتا ہے ——— یا اگر زیادہ فیاضی سے کام لیا جائے تو پیدائشِ انسانی کے بالکل ابتدائی دَور تک شاید اِسے کسی حد تک تسلیم کر لینے پر اپنے آپ کو رضامند کیا جا سکتا ہے۔ ہر چند یہ واضح رہے کہ اس کو کسی حد تک تسلیم کر لینے کے معاملے میں بھی بہت سی باریک بحثوں کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن اب جب کہ انسانی تولید و تناسل کا کارواں بہت آگے نکل جا چکا ہے اور ہم سب کے سب، دیگر مؤثراتِ داخلی و خارجی کے دوش بدوش، ایک نامعلوم مدّت سے اپنے لاتعداد و نامعلوم آباد و اجداد کے افکار و کردار کو بطورِ وراثت حاصل کرتے چلے آ رہے ہیں تو اس منزل پر یہ کہنا قطعی بے معنی ہوگا کہ اب بھی، انسان ایک "سادہ و غیر منقّش" فطرت لے کر عالمِ وجود میں آتا ہے۔

بلکہ اس کے برعکس ہمیں قدرتی طور پر اب یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ توریث کے زیرِ اثر اب انسانی فطرت "سادہ و غیر منقّش" نہیں رہی ہے۔ بلکہ ایک نامعلوم مدّت سے انسان ایک "منقّش و رنگین" فطرت لے کر پیدا ہوتا چلا آ رہا ہے۔

لیکن "سادہ و غیر منقّش" فطرت کے حامیوں کے سامنے جب مسئلے کے اس متذکرۂ بالا رُخ کو پیش کیا جاتا ہے تو ہر چند اُنھیں یہ تو تسلیم ہی کرنا پڑتا ہے کہ بچّے کی فطرت پر آبائی افکار و کردار کے نقوش ضرور ہوتے ہیں لیکن اُسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ دعوے بھی کرتے ہیں کہ یہ آبائی افکار و کردار کے نقوش، گہرے نہیں ہوتے، اور بچّے کی "فطرتِ اصلی" کی بالائی سطح تک ہی محدود رہتے ہیں۔ اور اُس کی زیریں تہوں تک اُن کی رسائی نہیں ہوتی۔

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ انسانی عقل و شعور کے پاس وہ کون ایسی دُوربین، خوردبین، یا وہ کون ایسے نازک ترین آلات ہیں، جن سے "دو اور دو چار" کی طرح یقینی طور پر یہ پتا چلایا جا سکتا ہے کہ آبائی افکار و کردار کے نقوش بچّے کی "فطرتِ اصلی" کی بالائی سطح تک ہی پہنچے، یا پہنچ سکتے ہیں ——— اور اُس سے نیچے اُن کی رسائی ناممکنات میں سے ہے؟

میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ بچّے کوئی انفرادی "ذاتی فطرت" نہیں رکھتے، کیونکہ

اگر ایسا ہوتا تو انسانوں کے افکار و کردار میں جو تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں وہ ظہور پذیر ہی نہ ہو سکتیں۔ لیکن اس کے یہ معنی کیونکر ہو سکتے ہیں کہ بجز قلبی۔ سادہ و غیر منقش۔ فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔

(ج) اب رہا مسئلے کا تیسرا رُخ یعنی

ماحول

اس میں ذرہ برابر بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ہمارے فطری رجحانات جبّلی خصوصیات اور ہمارے افکار و کردار کے اُبھارنے، یا دبانے یا انھیں طرح طرح کے سانچوں میں ڈھالنے کے معاملے میں ماحول کو بے پایاں دخل حاصل ہے ـــــ لیکن میرا موضوعِ بحث اس سے مختلف ہے۔ میں تو ماحول پر ایک قطعی مختلف نظریئے کی رُوشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

میرے نزدیک ماحول کے لفظ کے استعمال کرنے والے اکثر ایک زبردست مغالطے کے شکار ہو جایا کرتے ہیں ـــــ یعنی وہ ماحول کو اس طرح پیش کرتے ہیں گویا وہ ایک جیتا، جاگتا، اور سانس لیتا ہوا وجود خارجی ہے ـــــ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ، ماحول، سوسائٹی کے مجموعی افکار و کردار اور اُن کے عام اثرات کے سوا اور کوئی معنی ہی نہیں رکھتا ـــــ یعنی اگر ہم کسی ماحول کو بُرا کہتے ہیں تو اُس کے صرف یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ سوسائٹی کے ارکان و افراد کی ایک جماعتِ کثیر کے افکار و کردار اور اُن کے اثرات نامطبوع ہیں۔ اور اسی طرح جب ہم کسی ماحول کو اچھا کہتے ہیں تو اُس کے بھی صرف یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ سوسائٹی کے ارکان و افراد کی ایک جماعتِ کثیر یا سوادِ اعظم کے افکار و کردار اور اُن کے عام اثرات مطبوع و محبوب واقع ہوئے ہیں ـــــ

سادے الفاظ میں یُوں سمجھ لیجئے کہ اگر میں یہ کہوں کہ آجکل ہندوستان کا ماحول بہت خراب ہے، تو اُس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہندوستانیوں کا سوادِ اعظم یا ہندوستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ اپنے افکار و کردار کی رُو سے بہایت خراب حالت میں ہے۔

اور جب کہ مشاہدہ و تاریخ سے یہ بات، ناقابلِ انکار دلائل کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے کہ دنیا کا ماحول ہمیشہ خراب اور وابستۂ شر رہا ہے، تو کیا اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ انسانیت کا سوادِ اعظم ہمیشہ پابندِ شر رہا ہے؟ اور کیا انسانیت کے سوادِ اعظم کا ہمیشہ اور ہر عہد میں پابندِ شر رہنا اس بات کی ایک اور واضح دلیل نہیں ہے کہ قدرت نے انسانی فطرت کو مادۂ شر کا مادۂ خیر کے مقابلے میں بمقدارِ کثیر ودیعت فرمایا ہے؟

قاعدہ ہے کہ دینے والے کے پاس جو شئے کثیر مقدار میں ہوتی ہے، وہی دی بھی زیادہ جاتی ہے۔ اور جو شئے قلیل ہوتی ہے، وہ دی بھی کم جاتی ہے۔ فرض کیجئے میں خیرات کرنے بیٹھتا ہوں، میرے داہنے ہاتھ کے توڑے میں صرف چند ہزار روپے ہیں، اور میرے بائیں ہاتھ کے توڑے میں کئی لاکھ پیسے۔ اب جو میں خیرات شروع کروں گا تو ظاہر ہے کہ روپے کم دونگا اور پیسے زیادہ، بلکہ بہت زیادہ۔

تو کیا کم "خیر" اور زیادہ "شر" دینے والی قدرت کے متعلق ہم یہ رائے قائم کریں کہ وہ "شر" کو زیادہ مقدار میں دینے پر اس لئے مجبور تھی کہ "خیر" کا ذخیرہ ہی اُس کے پاس کم تھا؟

بعض اربابِ رائے کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ قدرت نے "خیر و شر" دونوں مادّے فطرتِ انسانی کو ارزانی فرمائے ہیں، وہ جس مادّے کو چاہے بڑھادے، اور جسے چاہے گھٹا دے۔

اگر ایسا ہے تو کوئی تو اس بات کا جواب دے کہ آخر یہ خطرناک حیوان جسے انسان کہتے ہیں یہی کیوں کیا کرتا ہے کہ ہمیشہ اپنے مادۂ "خیر" کو گھٹا دیتا، اور مادۂ "شر" کو بڑھا لیتا ہے؟ آخر انسان کو "شر" اس قدر محبوب کیوں ہے؟

دوسری بات اِن حضرات سے یہ دریافت طلب ہے کہ قدرت نے کیا یہ دونوں مادّے بہ اعتبارِ تمام تول کر مساوی حیثیت سے انسان کو بخشے ہیں؟ اور اگر یہ دونوں مادّے فطرتِ انسانی میں مساوی اور بالکل مساوی ہیں، اور اسی کے ساتھ اگر یہ کلیہ بھی درست ہے کہ دو مساوی القوت چیزیں ایک دوسرے کو کسی طرح مغلوب نہیں کر سکتی ہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ انسان کا ایک ہم وزن و مساوی القوت مادّہ یعنی "شر" اُس کے دوسرے ہم وزن و مساوی القوت مادّے یعنی "خیر" پر غالب آجاتا ہے؟

یا صورتِ حال یوں واقع ہوئی ہے کہ یہ دونوں مادّے مساوی طور پر تقسیم نہیں کئے گئے ہیں بلکہ کسی فطرت کو "خیر" کا مادہ زیادہ دیا گیا ہے، اور کسی کو "شر" کا؟

اگر ایسا ہے تو پھر ہونا یہ چاہیئے تھا کہ "خیر و شر" کی رُو سے انسانیت نصف یا اُس کے قریب قریب تقسیم ہو جاتی، اور دونوں میں ایک معمولی سی اقلیت و اکثریت کا فرق رہتا، اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوتا رہتا کہ کبھی تو اربابِ "خیر" اکثریت میں آجاتے، اور کبھی اربابِ "شر"۔

لیکن واقعاتِ عالم کو غور سے دیکھئے تو صورتِ حال ان دونوں صورتوں سے ہمیشہ مختلف رہی ہے، یعنی انسانیت کا سوادِ اعظم ہمیشہ وابستۂ "شر" ہی رہا ہے۔

اور اس لئے اس صورت سے بھی ہم اُسی ایک نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسانی فطرت کو مادۂ "خیر" کم بلکہ بہت کم اور مادۂ "شر" زیادہ بلکہ بہت زیادہ عطا فرمایا گیا ہے۔

اور اگر ایسا ہے تو ہمیں یہ دریافت کرنے کا بھی حق پہونچتا ہے کہ ان حالات میں انسانی افکار و کردار کی ذمہ داری کدھر جاتی ہے۔ مگر یہ سوال کم سے کم اس مقالے کے موضوعِ بحث سے خارج واقع ہوا ہے اور اس لئے سردست اس کا چھوڑنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

کیا قارئین میں سے کوئی صاحب براہِ معارف نوازی اس موضوع پر مزید روشنی ڈال کر اپنے ملک کی ذہنی تربیت اور علمی خدمت میں حصہ لینے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟ لیکن گزارش یہ ہے کہ مقالہ معقولی ہو، نہ کہ منقولی۔

نوجوان سے

وہ دُنیا جس کا ہر ذرّہ جنوں بر دوش ہوتا ہے
وہ دُنیا جس کے سینے میں بَلا کا جوش ہوتا ہے

وہ دُنیا جس میں حُسن و عشق کی باتیں نہیں ہوتیں
وہ دُنیا جس میں سونے کے لئے راتیں نہیں ہوتیں

وہ دنیا جس میں قومیں جیتی ہیں بس جنگ کی خاطر
جہاں قربانیاں ہوتی ہیں نام و ننگ کی خاطر

جہاں تلوار کی جھنکار سے نغمے اُبلتے ہیں
جہاں خود موت کے آغوش میں انسان پلتے ہیں

جہاں طوفاں میں قومیت وطن کی ناؤ کھیتی ہے
کمانوں کی کڑک میں حُریت انگڑائی لیتی ہے

جہاں ہر دل میں آزادی کی ہوتی ہے لگن پیدا
جہاں ہوتا ہے شوقِ جاں نثاریٔ وطن پیدا

جہاں آلام میں ہوتا ہے لوہے کا جگر پیدا
جہاں ہوتا ہے چھِد کر ناوکوں میں بال و پر پیدا

جہاں جذباتِ خود داری دبانے سے اُبھرتے ہیں
جہاں شیرانِ جنگ آور تھپکنے سے بپھرتے ہیں

جہاں مظلومیت توہینِ استبداد کرتی ہے
جہاں شاہنشہی کو بندگی برباد کرتی ہے

جواں ہمت جہاں تقدیر پر قانع نہیں ہوتی
کوئی مشکل جہاں تدبیر میں مانع نہیں ہوتی

تجھے اے نوجواں! ایسی فضا تیار کرنا ہے
اسی کوشش میں جینا ہے، اسی کوشش میں مرنا ہے

رضی عظیم آبادی

قیدی

صبح کا دلکش سماں تھا، اور گلگوں تھی فضا ہو رہی تھی خلق کی سرگرمیوں کی ابتدا
تھی شفق مشرق میں پھولی خونِ ارماں کی طرح دشت و دَر گلرنگ تھے گلچیں کے داماں کی طرح
پھر عالمتاب نکلا لے کے پیغامِ حیات ہو گئے بیدار زندانوں میں ناکامِ حیات
زندگی کا عکس ہر ذرّے میں جلوہ گر ہُوا بھوک کا مارا ہوا مزدور بھی گھر سے چلا،
غنچۂ گل کی شکل میں آئے گریباں پھاڑ کر طائر اپنے آشیانوں سے اُڑے پر جھاڑ کر

جس کو دیکھو اِس فضائے مست کا دیوانہ تھا
ایک ہیں قیدِ ستم میں لطف سے بیگانہ تھا

وہ کہ جس سے کانپتی تھی رُوحِ استبداد کی جس پہ مُدّت سے نگاہِ غیظ تھی صیاد کی
جو مئے حُبِّ وطن سے سربسر مدہوش تھا جس کا سر ننگِ غلامی سے وبالِ دوش تھا
جس کے دِل میں حسرتِ تعمیرِ مُلک و قوم تھی ظالموں کی بھول کر بھی جس نے پابوسی نہ کی
قہرِ ظلم و جور جس کے سامنے تھا سرنگوں خون رُلواتا تھا جس کو قوم کا حالِ زبوں

آج اُسی کے دست و پا میں آہنی زنجیر تھی
ملک کی اُلفت کا دم بھرنے کی یہ تعزیر تھی

قیدِ تنہائی ملی تھی ساتھیوں سے چھوٹ کر یا الگ تھا اک ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
کام رُکنے کا اَلَم تھا قید کا کچھ غم نہ تھا رنج بیکاری کا تھا زنجیر کا ماتم نہ تھا

یک بیک ہنگامہ برپا کُن صدا آنے لگی
برق بَن کر قلبِ افسردہ کو گرمانے لگی

پشت سے زنداں کی گزرا کاروانِ انقلاب
قید سے پہلے کے ساتھی رہروانِ انقلاب

فاقہ کش چہروں پہ اُن کے ہمّت و جرأت نثار
اُن کے ملبوسِ کہن پر دولت و ثروت نثار

عزم اُن کی صورتوں میں فتح و نصرت ساتھ ساتھ
انقلاب اُن کی جلو میں تھا بغاوت ساتھ ساتھ

اُن کے ہاتھوں میں نشانِ قوم لہراتا ہوا
اُن میں سے ہر ایک اپنی دُھن میں کچھ گاتا ہوا

توڑ کر زنداں کا در آئی ہوائے انقلاب
شور کی آواز تھی وہ، یا صدائے انقلاب

گونج سے آواز کی ہلنے لگے دیوار و در
میں نے یہ دیکھا کہ ہر ذرّے پہ ہوتا ہے اثر

عالمِ تخئیل میں طوفان برپا ہو گیا
قید سے پہلے کی دُنیا میں پہونچ کر کھو گیا

اپنی اس برباد حالت میں بھی میں دلشاد تھا
جسم زنجیروں میں تھا، لیکن خیال آزاد تھا

وحشتِ زنجیر کا بارِ گراں گھٹنے لگا
ایک پردہ سامنے سے آنکھ کے ہٹنے لگا

طائرِ تخئیل مجھ کو ساتھ لے کر اُڑ چلا
اور ہُوا محسوس میں زنداں کے باہر آگیا

باہر آکر پھر اُسی مقصد پہ عامل ہو گیا
جس کو ناقص چھوڑ کر میں قیدیٔ زنداں بنا

ہو گئی ہر سانس پھر صرفِ حصولِ آرزو
پھر ہوئی مجھکو عروسِ مدعا کی جستجو

لو موافق ہو گئی تقدیر بھی تدبیر بھی
خوابِ آزادی کی پوری ہو گئی تعبیر بھی

مِٹ گئے آخر غلامی کے سب آئینِ کہن
میرے ہی دستِ قوی سے نکلا ارمانِ وطن

دل میں ایسا جوش جیسے آگ سے شعلہ اُٹھے
وہ مسرّت تھی کہ میرے دست و پا تھرّا اُٹھے

ناگہاں زنجیر کی جھنکار نے چونکا دیا
قید سے باہر نہیں ہوں یہ مجھے بتلا دیا

ہائے جب تک عالمِ تخئیل یوں آباد تھا
اتنے لمحوں کے لئے میرا وطن آزاد تھا

احتشام رضوی ماہلی، ایم اے

جدید آئین پر ایک تنقیدی نظر

(سید شریف حسین آرزو بی۔ اے، دہلوی)

(بسلسلہ ماہ جولائی)

ہندوستان کی مرکزی حکومت "وفاق ہند" کے نام سے موسوم ہوگی جو چار جداگانہ اجزا سے ترکیب پائے گی۔ (۱) گورنر جنرل۔ (۲) گورنر جنرل کے مشیران۔ (۳) کابینہ وزارت۔ (۴) مرکزی مجالس قانون ساز ان چار اجزا سے جو حکومت تشکیل پائے گی وہ کس حد تک جمہوری اور رائے عامہ کا اصلی عکس ہوسکتی ہے، اس کا اندازہ صرف اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ بین آزاد ممالک میں جمہوری طرز حکومت قائم ہے وہاں مرکزی حکومت کی ہئیت ترکیبی صرف دو اجزا پر مشتمل ہوتی ہے۔ یعنی (۱) وزارت اور (۲) مجلس قانون ساز۔ چونکہ وزارت مجلس قانون ساز کی سب سے بڑی سیاسی جماعت میں سے منتخب کی جاتی ہے۔ اس لئے جمہوری حکومت اپنی آخری صورت میں صرف ایک ہی عنصر یعنی رائے عامہ پر منحصر ہوتی ہے اور اسی وجہ سے جمہوری حکومت کے ہر فعل میں رائے عامہ کا انعکاس ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان کی مرکزی حکومت چار مختلف عناصر سے مرکب ہوگی۔ جن کے درمیان مفاہمت و یگانگت کے امکانات بعید ہی نہیں بلکہ ایک بڑی حد تک غیر ممکن ہوں گے۔ تاوقتیکہ ایک عنصر اس مفاہمت و یگانگت کی خاطر اپنے انفرادی وجود کو قربان نہ کردے۔ کیونکہ جدید آئین ہند وضع کرنے والوں نے قانون حکومت ہند کی تشکیل کے وقت صرف ایک مقصد کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ مقصد ہندوستان کی ترقی پذیر قومی آزادی نہیں بلکہ قومی حیات و حریت کی ترقی کے ہر قدم پر آئینی رکاوٹ پیدا کرنا ہے۔ اس کا تھوڑا بہت ثبوت صوبوی خود اختیاری پر بحث کے دوران میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اور مزید ثبوت سطور آیندہ میں مل جائے گا۔

گورنر جنرل

گورنر جنرل کا تقرر برطانوی کابینہ وزارت کی سفارش پر ملک معظم فرمائیں گے، اسے ہندوستانی خزانہ سے دو لاکھ پچاس ہزار آٹھ سو روپیہ سال، یعنی بیس ہزار نو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملے گی۔ بھتہ اس کے علاوہ ہوگا۔ صوبہ کی طرح مرکزی مجالس قانون ساز کو بھی گورنر جنرل اس کے مشیران اور وزرا کی تنخواہوں اور بھتوں پر بحث کرنے یا رائے دینے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ صوبوی نظم و نسق وزرا کے ساتھ تعلقات، مرکزی پولیس۔ امور خارجہ۔ امور مذہبی شعبۂ دفاع، امن و آئین کی حفاظت۔ اقلیتوں کے حقوق کی مدافعت مالی امور اور ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے وقتی و دائمی قوانین کے نفاذ کے متعلق گورنر جنرل کی ذمہ داریاں اور مخصوص اختیارات صوبوی گورنر کی ذمہ داریوں اور مخصوص اختیارات سے مشابہ ہیں جن پر اس سے پہلے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

گورنر جنرل کے مشیران

ہندوستانی وزرا بعض مرکزی صیغہ جات کے نظم و نسق سے محروم رکھے گئے ہیں۔ ان صیغہ جات کے انتظام میں گورنر جنرل کو ضروری مشورہ دینے کے لئے زیادہ سے زیادہ تین انگریز مشیر مقرر کئے جائیں گے، ایک مشیر دفاعی امور کے متعلق، دوسرا مشیر عیسائیت کے مذہبی امور کے متعلق، تیسرا مشیر غیر ملکی اور قبائلی امور کے متعلق گورنر جنرل کو مشورہ دے گا، اور ان امور کے نظم و نسق میں اس کی عملی اعانت کرے گا۔ اس امر پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ تینوں مذکورہ صیغہ جات حکومت کی "روح" ہیں۔ اور اس روح کو ہندوستانی وزرار کے ہاتھوں سے چھین کر جدید مرکزی آئین کو بے جان بنا دیا گیا ہے۔ کانگرس اور دیگر قومی ادارے اسی بنا پر جدید آئین بالخصوص وفاق ہند کو محض سیاسی فریب بتاتے ہیں۔ اس بے روح سیاسی ڈھانچے کو گورنر جنرل کے لئے ایک چوتھا مشیر مقرر کر کے بالکل بے گوشت و بے پوست کر دیا گیا ہے۔ یہ مالی مشیر مرکزی مالیات کے بارے میں گورنر جنرل کو مشورہ دے گا۔ ظاہر ہے کہ اس چوتھے وزیر کو جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی محض اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ ہندوستانی وزیر مالیات کسی ایسی مد پر رقم صرف نہ کر سکے جو برطانوی مفاد کے منافی ہو۔ یا کسی ایسی مد کے لئے روپیہ فراہم کرنے سے انکار نہ کر سکے جو خلاف حکومت سرگرمیوں کے کچلنے کے لئے گورنر جنرل کے نزدیک ضروری ہو۔ مشیر مالیات ہندوستانی وزیر کی آزادی کی راہ میں ایک ناقابل عبور سنگ راہ ثابت ہوگا۔ اس قسم کے مشیروں کی مثال دنیا کے کسی دوسرے جمہوری آئین میں ملنی محال ہے۔ اس کی مثال اس غاصب شخص سے دی جا سکتی ہے، جس نے رحم کھا کر مقبوضہ مکان اس شرط کے ساتھ واپس کر دیا تھا کہ گھر بار کے تم مالک ہو لیکن اس کی کنجی میرے قبضے میں رہے گی۔"

مشیروں کی تنخواہ آٹھ ہزار اور بارہ ہزار کے درمیان ہوگی جو مفلس ہندوستانیوں پر ایک غیر ضروری و ناقابل برداشت بار ہوگا۔

کابینہ وزارت

وفاقی کابینہ وزارت (Federal cabinet ministry) زیادہ سے زیادہ دس وزرار پر مشتمل ہوگا۔ جو مرکزی مجلس قانون ساز کے زیریں ایوان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی میں سے منتخب کئے جائیں گے لیکن بعض صورتوں میں مختلف سیاسی جماعتوں میں سے ہی انتخاب کیا جائے گا۔ کابینہ وزارت کا رکن اعظم "وفاقی وزیر اعظم" یا "ہندوستان کا وزیر اعظم" کہلائے گا وزرار کے انتخاب، طلبی، برطرفی وغیرہ کے متعلق گورنر جنرل کو ہی اختیارات حاصل ہوں گے جو صوبوی وزارت کے بارے میں صوبہ کے گورنر کو تفویض کئے گئے ہیں۔

گورنر جنرل کے اختیارات خصوصی اور اس کے مشیروں کی [illegible] صلاح ہندوستانی وزیروں کی آزادی اور رضاکارانہ کاروائی [illegible] ہر وقت حائل رہے گی۔ البتہ اگر کوئی چیز گورنر جنرل اور اس کے مشیروں کو ہندوستانی مفاد کے خلاف کوئی تدبیر یا تجویز اختیار کرنے سے باز رکھ سکتی ہے تو وہ رائے عامہ ہے۔ جس کا انعکاس مرکزی مجلس قانون ساز کے زیریں ایوان میں ہو سکے گا۔

گو آئینی طور پر کابینہ وزارت کی فرقہ وارانہ حدود بیان [illegible] کی گئی ہیں لیکن خیال غالب یہ ہے کہ وزیر اعظم کے علاوہ، جو عام طور پر ہندو ہوگا، چار ہندو، تین مسلمان، ایک سکھ اور ایک ہندوستانی عیسائی یا پارسی کابینہ وزارت میں شامل ہوں گے۔ کسی ہندوستانی ریاست کے نمائندہ کا وزیر بننا بعید از [illegible] ہوتا ہے۔

وفاقی وزرار کی تنخواہ بھی غالبا [illegible] درمیان ہوگی۔ وزیر اعظم کی تنخواہ [illegible] ہوگی۔ تنخواہ کے علاوہ سفر خرچ [illegible] ملا کرے گا۔

مرکزی مجالس قانون ساز

ہندوستان کی وفاقی پارلیمان دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی۔ ایوان بالا مجلس مملکت (Council of State) اور ایوان زیریں ایوان جمعیت (House of Assembly) کہلائیں گے۔

ایوان بالا میں برطانوی ہند کے ۱۵۶ نمایندگان اور ریاستی ہند کے زیادہ سے زیادہ ۱۰۴ نمایندگان شامل ہوں گے۔ زیریں ایوان میں برطانوی ہند کے دو سو پچاس نمایندگان اور ریاستی ہند کے زیادہ سے زیادہ ایک سو پچیس نمایندگان شامل ہوں گے، جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ ہندوستان کا کل رقبہ ۱۸۰۵۳۳۲ مربع میل ہے اور کل آبادی ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق تقریباً ۳۵۰۲۹۸۰۰۰ ہے، جس میں ریاستی ہند کا رقبہ تقریباً سات لاکھ بائیس ہزار مربع میل۔ یعنی کل کا ۲/۵ اور ریاستی ہند کی آبادی ۸۱۳۱۰۸۴۵ یعنی کل کی تقریباً ۱/۴ ہے تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ برطانوی حکومت نے کس جمہوری اصول کے مطابق ہندوستانی ریاستوں کو برطانوی ہند کے مقابلے پر مجلس مملکت میں ۱/۴ کی بجائے ۲/۵ نمایندگی اور ایوان جمعیت میں ۱/۴ کی بجائے ۱/۳ نمایندگی دی ہے۔ ہمیں اس کی وجہ تلاش کرنے کے لئے زیادہ تجسس و تحقیق کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستانی ریاستیں نہایت رجعت پسند و قدامت پرست واقع ہوئی ہیں، اس بیسویں صدی میں ان کا وجود محض برطانیہ کے زیر سایہ قائم ہے۔ اور صرف وہی ہندوستان میں برطانیہ کے آڑے وقت کام آسکتی ہیں۔

مرکزی مجالس قانون ساز میں ان کے قدامت پسند عناصر کی غالب نمایندگی برطانوی ہند کے قوم پرور نمایندگان کے تعمیری و ترقی پسند ارادوں کی تکمیل میں جس قدر مزاحم۔ مارج و حائل ہوگی وہ مزید تبصرہ کی محتاج نہیں۔

ہندوستانی ریاستوں کو نشستوں کی تقسیم کی غرض سے درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ درجہ اول میں حیدرآباد کی ریاست ہے، جسے مجلس مملکت میں پانچ نشستیں اور ایوان جمعیت میں سولہ نشستیں دی گئی ہیں۔ دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے درجے میں علی الترتیب میسور، کشمیر، گوالیار، بڑودہ اور قلات کی ریاستیں شامل ہیں۔ جنہیں مجلس مملکت میں علی الترتیب ۳-۳-۳-۳- اور دو دو نشستیں اور ایوان جمعیت میں علی الترتیب ۷-۴-۴-۳- اور ایک نشستیں دی گئی ہیں۔ ٹراونکور کو ایوان جمعیت میں ۵ اور جے پور کو ایوان جمعیت میں تین نشستیں دی گئی ہیں۔ بعض ریاستیں ایسی ہیں جنھیں انفرادی طور پر ایک یا دو نشستیں ملی ہیں۔ باقی ریاستوں کو مختلف گروہوں پر تقسیم کرکے اُن کے درمیان ایک مخصوص تعداد تقسیم کر دی گئی ہے۔

تقسیم نشستہائے ایوان زیریں

وفاقی پارلیمان کے زیریں ایوان میں مختلف برطانوی صوبوں اور مختلف ملتوں کی نمایندگی حسب ذیل طور پر ہوگی۔

صوبہ مدراس - کل نشستیں ۳۷- [عام (ہندو، پارسی، بودھ وغیرہ) ۱۹- اچھوت ۴- مسلم ۸- اینگلو انڈین ۱- یورپین ۱- ہندوستانی عیسائی ۲- تجارت و دستکاری ۲- زمیندار ۱- خواتین ۲ } -

صوبہ بمبئی :- کل نشستیں ۳۰ (عام ۱۳- اچھوت ۲- مسلم ۶- اینگلو انڈین ۱- یورپین ۱- ہندوستانی عیسائی ۱- تجارت و دستکاری ۳- زمیندار ۱- مزدور ۲- خواتین ۲)-

صوبہ بنگال - کل نشستیں ۳۷ (عام ۱۰- اچھوت ۳- مسلم ۱۷- اینگلو انڈین ۱- یورپین ۱- ہندوستانی عیسائی ۱- تجارت و دستکاری ۳- زمیندار ۱- مزدور ۲ خواتین ۱)-

صوبجات متحدہ - کل نشستیں ۳۷ (عام ۱۹- اچھوت ۳- مسلم ۱۲ اینگلو انڈین ۱- یورپین ۱- ہندوستانی عیسائی ۱- زمیندار ۱- مزدور ۱ خواتین ۱)-

صوبہ پنجاب - کل نشستیں ۳۰ (عام ۶ اچھوت ۱- سکھ ۶- مسلم ۱۴ یورپین ۱- ہندوستانی عیسائی ۱- زمیندار ۱- مزدور ۱- خواتین ۱)-

صوبہ بہار - کل نشستیں ۳۰- (عام ۱۶- اچھوت ۲- مسلم ۹-

یورپین ۱۔ ہندوستانی عیسائی ۱۔ زمیندار ۱۔ مزدور ۱۔ خواتین ۱)۔

صوبہ جات متوسط و برار: ۔ کل نشستیں ۱۵۔ (عام ۹۔ اچھوت ۲
مسلم ۲۔ یورپین ۱۔ ہندوستانی عیسائی ۱۔ مزدور ۱)۔ خواتین ۱)۔

صوبہ آسام ۔ کل نشستیں ۱۰۔ (عام ۴۔ اچھوت ۱۔ مسلم ۳۔
یورپین ۱۔ ہندوستانی عیسائی ۱۔ مزدور ۱)۔

صوبہ سرحد: ۔ کل نشستیں ۵ (عام ۱۔ مسلم ۴)۔

صوبہ اڑیسہ ۔ کل نشستیں ۵ (عام ۴۔ اچھوت ۱۔ مسلم ۱)۔

صوبہ سندھ ۔ کل نشستیں ۵ (عام ۱۔ مسلم ۳۔ یورپین ۱)۔

صوبہ بلوچستان ۔ صرف ایک نشست جو مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے۔

صوبہ دہلی: ۔ کل ۲ دو نشستیں۔ ایک عام۔ ایک مسلم۔

صوبہ اجمیر مارواڑ ۔ صرف ایک نشست جو عام ہے۔

صوبہ کورگ ۔ " " "

غیر صوبوی نشستیں چار ہیں، جن میں سے تین تجارت و صنعت کاری اور ایک مزدوروں کے لئے مخصوص ہے۔ عام نشستوں کی تعداد میں اچھوت نشستیں بھی شامل ہیں۔ لیکن ان کی تعداد علیحدہ بھی بیان کردی گئی ہے۔

مذکورہ فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی ہند کی ڈھائی سو نشستوں میں سے ۱۰۵ عام (جن میں ۱۹۔ اچھوت بھی شامل ہیں) ۶ سکھ۔ ۸۲ مسلم۔ ۴۔ اینگلو انڈین۔ ۸ یورپین ۸ ہندوستانی عیسائی۔ ۷ زمیندار۔ ۱۰ مزدور اور ۹ خواتین ہیں۔

ان نشستوں کے انتخاب کا طریق جداگانہ ہے۔ جو قوم پرور حلقوں میں ہندوستانی قومیت کی نشو و نما کے لئے نہایت تباہ کن خیال کیا جاتا ہے۔ مخلوط و جداگانہ انتخاب کا مسئلہ اس قدر باریک اور پیچیدہ ہے کہ اس پر بحث کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔

ہندوستان کا سیاسی مطمح نظر

صوبوی آزادی اور مرکزی وفاقی نظام کا مختصر خاکہ پیش کرنے کے بعد عنوان مضمون کی تکمیل کے لئے جدید آئین کی ان کمزوریوں پر بحث ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جن کا وجود قوم پرور نقطۂ نگاہ سے ملکی آزادی کو قریب لانے کی بجائے اسے مستقبل کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیتا ہے۔

ہر ملک میں سیاسی عقیدہ کے لحاظ سے تین قسم کی جماعتیں ہوسکتی ہیں۔ (۱) قدامت پسند (۲) اعتدال پسند (۳) انتہا پسند۔

قدامت پسند جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ ملک کے سیاسی نظام میں از منۂ ماضی سے جو قدیم عناصر داخل ہیں ان میں ترمیم یا تجدید کی ضرورت نہیں۔ بلکہ وہ خود زمانہ کی ہر نئی ضرورت کو پورا کرسکتے ہیں۔ انگریزی میں اس قسم کی سیاسی جماعت کے افراد کو کنزرویٹو (Conservatives) یا ٹوری (Tory) کہتے ہیں۔ قدامت پسندوں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی جدید نظام کی بجائے قدیم نظام کو بحال کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ انھیں رجعت پسند (Reactionaries) کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس قسم کے قدامت پسندوں اور رجعت پسندوں کو "جی حضوری" کہا جاتا ہے، اور وہ ہندوستان میں برطانوی راج کو خدا کا بہترین عطیہ بتاتے ہوئے اسے پہلے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم رکھنے کے خواہاں ہیں۔ اور اپنے اس عقیدہ کو بروئے کار لانے کے لئے وطنی مفاد کو قربان کرنے سے بالکل گریز نہیں کرتے، اسی لئے ان "جی حضوریوں" کے نزدیک ہندوستان کا جدید آئین ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جس کے واسطے حکومت برطانیہ کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

اعتدال پسند جماعت (Moderates) یا آزاد خیال جماعت (Liberals) کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ ملک کی سیاسی ترقی کے لئے نہ تو انتہائی قدامت پسندی مفید ہوسکتی ہے، اور نہ انتہائی جدت پسندی بلکہ میانہ روی میں ہی ملکی فلاح و بہبود پنہاں ہے، سر تیج بہادر سپرو

مسٹر سری نواس شاستری ۔ مسٹر جیاکر وغیرہ ہم ہندوستانی رہنما اسی زاویۂ نگاہ کی نمایندگی کرتے ہیں۔ لیکن جدید آئین سے وہ کبھی مطمئن نہیں ہیں۔ کیونکہ حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں کے وہ کم از کم مطالبات بھی تسلیم نہیں کئے جو برطانوی ہند کے نمایندوں نے سر آغا خاں کی زیر ہدایت ایک مشترکہ عرضداشت میں پیش کئے تھے۔ بایں ہمہ ہندوستانی اعتدال پسند جدید آئین کو بروئے کار لانے کے لئے طیار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جدید آئین ہندوستان کو "درجہ نو آبادیات" تک پہنچا دے گا۔ جو کہ ان کا منتہائے مقصود ہے۔ درجہ نو آبادیات (یا درجہ مستعمرات (Dominion status) سے مراد یہ ہے کہ ہندوستان کینیڈا، جنوبی افریقہ۔ آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کی طرح داخلی و خارجی امور، فوجی و دفاعی معاملات اور اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں برطانوی اثر و رسوخ سے آزاد ہوں۔ البتہ تاج برطانیہ کے ساتھ اس کا صرف اتنا رشتہ باقی رہے کہ آخر الذکر دنیا کے سامنے اسے "اپنا" کہہ سکے۔ یہ رشتہ محض رسمی ہے اور نو آبادی کی حکومت اسے توڑنے میں ہر وقت آزاد ہے۔ اس رشتہ کے قیام سے برطانیہ کو صرف اتنا فایدہ ہے کہ وہ عام تجارتی تعلقات میں نو آبادیات سے ترجیحی سلوک کا متوقع ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی عالمگیر جنگ چھڑ جائے تو اسے یہ امید ہوتی ہے کہ نو آبادیات اس کی مالی و فوجی امداد کریں گی۔ ۳

انتہا پسند جماعت (Extremists) ہر سیاسی مسئلہ میں انتہائی صورت کو پسند کرتی ہے اور عام طور پر حکومت وقت کی سب سے بڑی دشمن متصور کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں یہ جماعت کانگریس خیال کی جاتی ہے اس کا مطمح نظر لاہور کانگریس سے قبل درجۂ نو آبادیات تھا لیکن جب حکومت نے کانگریس کا الٹی میٹم منظور نہ کیا تو کانگریس نے اپنا منتہائے مقصود کامل آزادی (Complete Independence) قرار دیا اور آج وہ اسی مقصود کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے۔

قومی نقطۂ نگاہ سے کانگریس ملک کا واحد قومی ادارہ ہے۔ جو ہندوستان کی مختلف ملتوں کی مشترکہ نمایندگی کا دعوےٰ کرتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندوستانیوں کی اکثریت اُسے غیر ملکی قبضہ سے نجات حاصل کرنے کا طاقتور ذریعہ سمجھتی ہے، ہندو مہا سبھا اور مسلم لیگ جیسی فرقہ وارانہ جماعتوں کو چھوڑ کر اعتدال پسند جماعت اور کانگریس ہی دو ایسے ادارے رہ جاتے ہیں جن کے سیاسی زاویۂ نگاہ کو قوم کی سیاسی خواہشات کا معیار قرار دے کر جدید آئین کو پرکھا جا سکتا ہے۔

جدید آئین میں قومی نقطۂ نگاہ سے حسب ذیل نقائص شامل ہیں۔

(۱) ملکی دفاع اور خارجی تعلقات کے صیغہ جات گورنر جنرل اور اس کے انگریز مشیروں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں، اور ہندوستانی وزراء اور مجالس قانون ساز کو ان صیغہ جات کے نظم و نسق، ان کے اخراجات اور ان کی حکمت عملی پر رائے ظاہر کرنے تک کا حق نہیں دیا گیا ہے۔ حالانکہ جب تک یہ دونوں صیغہ جات ہندوستانیوں کے قبضے میں نہ ہوں اس وقت تک یہ کہنا غلط ہے کہ ہندوستان کو جمہوری طرز حکومت عطا کر دی گئی ہے۔

(۲) گورنروں اور گورنر جنرل کو وزراء اور مجالس قانون ساز سے بھی زیادہ وسیع و ہمہ گیر اختیارات تفویض کئے گئے ہیں، حالانکہ ان کے لئے جمہوری آئین کے ماتحت وزراء کے مشورہ پر عمل کرنا لازمی ہونا چاہیئے تھا۔

(۳) مالیات کے صیغے میں بھی ہندوستانی وزیر پر سخت قیود عائد کر دی گئی ہیں۔ اور اس کے لئے قومی تعمیر کے کاموں پر روپیہ خرچ کرنا آسان کام نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس ملک کی آمدنی کا تقریباً ۸۰ فی صدی حصہ گورنر یا گورنر جنرل کے رضاکارانہ اختیار میں رہے گا۔ اور ہندوستانی وزیر یا مجلس قانون ساز کو اُف کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہو گی۔

(۴) اعلیٰ ملازمتوں کی انگلستان میں بھرتی جاری رکھی جائے گی۔ اور انگریزی ہی عنصر غالب رہے گا۔

(۵) مجالس قانون ساز میں فرقہ وارانہ اصول پر نمایندگی

جاری رکھ کر ہندوستانی قومیت کے حیات بخش ارتقا کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹیں پیدا کر دی گئی ہیں۔

(۶) وفاق ہند میں ہندوستانی ریاستوں کے رجعت پسندانہ عناصر کو غیر معمولی نمایندگی دے کر مرکزی مجالس قانون ساز میں جمہوری روایات کی ترقی بالکل مسدود کر دی گئی ہے۔

(۷) مالکوں کو حق رائے دہی نہ دے کر جمہوریت کا خون کر دیا گیا ہے۔

جدید آئین کے متذکرہ نقائص کی مذمت میں اعتدال پسند رہنما بھی شریک ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اسے بروئے کار لاکر درجہ نوآبادیات حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہیں جبکہ قوم پرور سیاست داں اسے تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ جدید آئین کے نفاذ پر سیاسی تلخی اور بھی بڑھ جائے گی۔ جس کے ناخوشگوار نتائج بہت جلد آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔

تمہاری آنکھیں

ہائے رے، پیاری پیاری آنکھیں　　متوالی، رتناری آنکھیں
کیا رہے دل جب دل کو لبھائیں　　بہکی باتیں، خماری آنکھیں
غارت دل پر ٹوٹ پڑی ہیں　　شیام نگر کی کماری آنکھیں
اس گھڑی دیکھو ان کا عالم　　نیند سے جب ہوں بھاری آنکھیں
دل سے جگر تک بھر دیں جراحت　　گو ہیں چھری نہ کٹاری آنکھیں
زہر کبھی ہیں اور کبھی امرت　　ان کی باری باری آنکھیں

کون آثر کی نظر میں سمائے
دیکھی ہیں اس نے تمہاری آنکھیں

(آثر لکھنوی)

انسانی عظمت اور شوکت کی ناپائیداری

عبدالعلیم ہاشمی غازی پوری

میں چند دنوں سے تاریخ کے مطالعے میں منہمک ہوں۔ میں نے زمانہ ماضی کی اولوالعزم ہستیوں کے کارنامے دیکھے، سکندر اعظم، جولیس سیزر، آگسٹس، اور سلسلہ بہ سلسلہ لوئی چہاردہم اور جان ڈیوک مالبرو کی مہمات میری نظر سے گذریں۔ مطالعے کے دوران میں تیمور، تومان بے مصری اور سلیمان اعظم کے کارہائے نمایاں سے مجھے واقفیت ہوئی۔ میں نے مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنتوں کے محیر العقول واقعات دیکھے، میں نے خاندان عثمانیہ کے بہادروں اور جانبازوں کے وہ کارنامے بھی پڑھے، جو صفحات تاریخ میں درج ہیں۔ لیکن ان لوگوں کے تمام واقعات اور کارناموں کے پڑھنے کے بعد جو چیز سب کے حالات میں مشترک ملی۔ وہ یہ کہ "تب وہ مرگیا" ان میں سے ہر ایک مرگیا، ہر شخص کی نظم زندگی کا آخری مصرعہ ہے کہ "یہاں وہ دفن ہے"۔ کچھ ان میں عزت کی موت مرے اور بعض نے مصنوعی عزت کی موت کو لبیک کہا۔ کچھ نے لڑائی میں بہادروں کی طرح لڑ کر جان دی۔ اور غیر فانی شہرت اور وقار حاصل کیا اور بعضوں نے جنگ آزمائی سے جان چرا کر اور دشمن کو پیٹھ دکھا کر خندقوں اور کھائیوں میں چھپ کر جان دے دی کچھ یہاں مدفون ہیں اور کچھ وہاں، بہادروں اور شہسواروں

بزدلوں۔ شریفوں اور رذیلوں، رندوں اور پارساؤں کی ہڈیاں ایک ہی جگہ دفن ہیں۔ وہ حالت گمنامی میں گڑھوں کے اندر دبے پڑے ہیں اور اب ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا بھی سخت دشوار ہے اور ایک دوسرے میں اب کوئی امتیاز بھی باقی نہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس درجہ خاک میں مل گئے ہیں کہ وہ اس سے بھی کسی طرح ممتاز نہیں کئے جا سکتے، کتنے بہادروں کی لاشیں جو اس زمانے میں موجود تھے خاک میں مل گئیں، جن کی بوسیدہ ہڈیاں کبھی کبھی ہلوں سے باہر نکل آتی ہیں۔ یا ہڈی کھودنے والے ان کو کھود کر باہر نکالتے ہیں اور وہ خاک جس میں ان کے اعضائے رئیسہ خلط ملط ہوگئے ہیں کس قدر ذلیل اور رکیک کاموں کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

کس طرح ہم نے اپنے بہادروں اور شہسواروں کی خاک سے گارے کا کام لیا، اور کس طرح ایک روسی جنرل کی خاک سے سوخانہ تعمیر کیا گیا۔ کہاں ہے وہ سیزر، پامپی، سیپیو اور ہنی بال کی خاک "وہ سب کے سب فنا ہوگئے"؟ اور ان کی تمام یادگاریں خاک میں مل گئیں، اب ان کی خاک کا بھی پتہ نہیں۔ بلکہ اب ان کی مقبوضہ زمین سے بھی ان کا پتہ نہیں لگتا۔ وہ صرف ان خوشامدی مورخین اور شعرا کی تصانیف میں زندہ ہیں جنہوں نے ان کو کبھی ویسا نہیں پیش کیا جیسا کہ درحقیقت وہ تھے۔ بلکہ جیسا کہ انہوں نے ان کو ظاہر کرنا پسند کیا

جو حشر ان عظیم الشان ہستیوں کا ہوا وہی حشر ان بزرگ ہستیوں کا بھی ہوا جن کو بڑی بڑی عمریں عطا ہوئیں۔ میتھیو سیلاز، جس نے طوفان نوح سے قبل کا زمانہ پایا تھا اسی طوفان کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اگرچہ نوسو انہتّر برس کی عمر پائی اور صاحب اولاد بھی تھا۔ مگر بالآخر نتیجہ وہی ہوا، یعنی "وہ مرگیا"۔

ڈیوک مالبرو کی رسم تجہیز و تکفین ہم نہایت و دھوم دھام سے منا رہے ہیں۔ اس کی تمام فقلمندیاں۔ اس کی عظمت و شوکت اس کی جنگی تجاویز، اس کی مسلسل ظفر یابیاں، جو اس کی جانب منسوب کی جاتی ہیں، گویا اس نے ان کو تنہا اپنے زور بازو سے حاصل کیا، دراں حالیکہ سیکڑوں آدمیوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر فتح حاصل کی، مگر بالآخر وہ سب کی سب فنا ہو گئیں، یعنی "ڈیوک مالبرو بھی مرگیا"۔

اس کا وافر خزانہ، مال غنیمت، کوٹن اینی کی تمام خیر خیرات اور وہ تمام زر و جواہر جو اس نے حالت جنگ و امن میں جمع کیا تھا، اور ایسی بے شمار دولت جس کا تخمینہ بھی نہیں کیا جا سکتا ان میں سے کوئی چیز اس کی گئی ہوئی زندگی کو واپس نہیں لاسکی اور نہ اس کو ایک لمحہ بھی مدت معینہ سے زائد زندہ رکھ سکی، اور بالآخر "وہ مرگیا"۔

اس عظیم الشان ہستی نے ہمارے لئے کوئی ایسی چیز باقی نہیں چھوڑی جس کا ہم تذکرہ کریں۔ اور جس کے متعلق ہم آپس میں تبادلۂ خیالات کریں۔ سوا ایک یادگار اور تواریخ کے چند صفحات کے جن میں اس کا ذکر ہے، اب اس کا شمار گذرے ہوئے لوگوں میں ہونے لگا۔ اس کے جنازے اور معرکوں کی تصاویر اور مجسمہ صرف ہمارے کمروں کی زیبائش کا کام دیں گے، گویا ان کا نظارہ باعث تفریح ہوتا ہے۔ یہ ہے انسانی عظمت و جلال کا انجام اور صرف اسی قدر دنیا ان عظیم الشان ہستیوں کے ساتھ کر سکی جو یہاں پیدا ہوئیں اور یہ صلہ تھا ان کی فراست و دانائی اور ان کی بہادری اور جاں بازی کا۔

آخر پھر زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟ ان عظیم الشان ہستیوں نے جن کی شان میں ہم قصیدے پڑھا کرتے ہیں کون سا بڑا کام کیا؟ زندگی کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ شہرت حاصل ہو جائے اور تاریخ کے صفحے کے صفحے مدح سرائی میں سیاہ ہو جائیں، افسوس صد افسوس اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ آئندہ نسلیں ان کو پڑھیں اور آخر کار وہ افسانہ ہو جائیں۔ کیا زندگی کا مقصد یہ ہے کہ شعرا ان ہستیوں کی مدح سرائی کریں اور ان کی زندگی ان کے اشعار میں قلم بند ہو جائے۔ پس اس کا کل انجام صرف یہ ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو ان اشعار سے لوریاں دیں اور عطائی دوا فروش سڑکوں پر ان کو گائیں، تاکہ گرہ کٹوں کو اپنا کام کرنے کا موقع ملے۔ نہیں جناب ایسا ہرگز نہیں، زندگی کا مقصد درحقیقت کچھ اس سے بھی بڑھکر ہے۔ ان ہستیوں کو سچی عظمت و رفعت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ خدمت خلق اور پاک باطنی سے کام لیں۔ اور صرف یہی چیزیں ان کو غیر فانی شہرت کا حامل بنا سکتی ہیں، شان و شوکت بغیر نیک نیتی اور پاک باطنی کے لاحاصل ہے۔ ایک عظیم الشان ہستی جو خدمت خلق اور نیک نیتی سے بعد رکھتی ہے، اس جانور کے مثل ہے جو اپنی شان و شوکت کے باوجود روح اور ضمیر سے محروم ہے، عزت بغیر دانشمندی اور تدبر کے کچھ بھی وقعت نہیں رکھتی، اور وہی دانشمندی اور تدبر قابل ستائش ہے، جو انسان کو خادم خلق، نیک نیت اور باعظمت بنائے۔

میں اپنے ناظرین سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ان بزرگ ہستیوں پر رشک نہ کریں۔ کیونکہ اگر ہم ان کو موجودہ حالت میں دیکھیں تو ان کی قابل رحم حالت ہمارے لئے سوہان روح بن جائے گی۔ اور ان کو ان کی عظمت و شوکت پر مبارکباد پیش کرنے کا تو موقع بھی نہیں مل سکے گا۔

(ترجمہ از ڈ نیلو)

امواجِ تخیل

ملیالم زبان سے ترجمہ کیا گیا (از مسٹر پانیکار)

مسٹر پانیکار فنانس سکریٹری ریاست پٹیالہ مدراسی زبان "ملیالم" کے ایک نہایت نغز گو شاعر، ادیب اور وسیع مطالعہ مفکر ہیں۔

آپ کی یہ نظم، جس کا آپ نے خود اپنی مادری زبان سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، اور جس کو میں نے اُردو کا لباس پہنایا ہے، ایک ایسی نظم ہے جو شاعرانہ محاسن کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ معارف سے بھی مالامال ہے، اور جس کے مطالعہ سے ایک طرف تو ادبی ذوق لطف اندوز ہو سکتا ہے اور دوسری طرف فلسفیانہ خیالات کو خوراک حاصل ہو سکتی ہے،

میں مسٹر پانیکار کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے براہ کرم "کلیم" کے لئے ایسی بلند پایہ نظم مرحمت فرمائی۔ اُمید کہ آیندہ بھی صاحب موصوف حسب وعدہ "کلیم" نوازی کرتے رہیں گے۔ (مدیر)

(۱)

میری جوانی کے خواب، شاندار مستقبل کے رنگا رنگ تصوّرات —— خُدا جانے کہاں جا کر کھو دور مُرجھا گئے؟

اب افسوس تاسف ملتے ہوئے اُن بیتے ہوئے دنوں کے پیچیدہ راستوں کی پیمائش کرتے پھرنا بے سود ہے، بلند تصورات کی شمع جو انتہائی تابانی کے ساتھ روشن تھی، افسوس کہ اب مدھم ہو گئی ہے، اس لئے کہ اعتقاد کا تیل ختم ہو گیا۔

قوت و دولت کی جستجو میں —— دنیوی عظمتوں کی تھاؤں میں وسیع و طوفانی سمندر کے سینے پر —— میں نے حیات کے جہاز کا لنگر اُٹھایا —— میرا جہاز مجبوراً عظمت کی لہروں پر حرکت کرتا، حوصلہ مندیوں کی موجوں میں جکڑا ہوا —— رشک و رقابت کی چٹانوں سے ٹکراتا —— مدتوں اِدھر سے اُدھر تھپیڑے کھاتا پھرا، خوش کامیوں کے تعاقب میں —— ہر شکل و حل کی قدر و قیمت کو دنیا کے معیار سے جانچتے ہوئے —— اور ہر اس شے کو حاصل کرتے ہوئے جو وقتی طور پر مفید معلوم ہوتی تھی —— نیز حق کی تلخیوں سے بزدلانا طور پر بچتے ہوئے، میرے دن برباد ہو گئے۔

زشت و خوب سے آنکھیں چراتے۔ تاریکی کو بے عرفہ گلے لگاتے۔ اور شاندار روشنی پر اپنا دروازہ بند کرتے ہوئے میرے دن برباد ہو گئے

لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس اثنا میں خیالات کے جو تخم میرے دماغ تک پہونچ گئے تھے۔ آنسوؤں کی لگاتار جھڑی سے سیراب ہو کر کونپلوں کی شکل میں نمودار ہو گئے۔ اور تھوڑی ہی مدت میں لہلہاتے رنگا رنگ بنکر پھل کھلانے لگے۔

(۲)

سفاکیوں۔ اور شقاوتوں سے حاصل کی ہوئی —— اور خود کامیوں کے زیر حفاظت پرورش پانے والی دولت نام و نمود —— نیز اقتدار کے سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ اور تکبّر کی گود میں کھیلی ہوئی متاعِ عظمت و بزرگی

———— ہیں دو چیزیں، جن کا

لُبھایا ہوا انسان اپنی حقیقی فطرت کو فراموش کر کے ہوس پرستی کے پر پیچ ریگستان میں ہل چلانا شروع کر دیتا ہے، جس کی جانب طمع اُسے موڑ دیتی ہے۔

انسان کیا چاہتا ہے؟ کامیابی۔ اور اس کامیابی کی خاطر وہ ہر مہم کے سر کرنے پر آمادہ رہتا ہے،

تاکہ ایک ایسا رتبہ عالی حاصل کرے کہ دوسرے اُس پر رشک کرنے لگیں، ـــــ اور شہرت میں سب سے بالا ہو جائے۔

یہ کامیابیاں، اور ظفر مندیاں ہیں کیا؟

جس وقت انسان حیات کے میدانِ جنگ میں فتح کے نقّارے بجاتا ، عظمت کے زمزموں کی گونج میں اپنا سربلند کئے ہوئے اکڑ اکڑ کر قدم اُٹھاتا ہے ـــــ تو انصاف سے بتاؤ کہ اس طمطراق سے اس بندۂ خدا کو حقیقت میں حاصل ہی کیا ہوتا ہے؟

! اور جب انسان شکست کھاجاتا ہے تو شکستہ خاطری اور مایوسی کے ہاتھ رشک کی خونچکاں آنکھوں ہی سے ظفر مندی و کامرانی کی دیوی کا تبسم دیکھ سکتا ہے

اور پھر وہ کسی دوسرے کی مسندِ عز و افتخار پر ایسی مسندِ افتخار پر جو ناقابلِ حصول خوبصورتیوں میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے، نگاہ کرتا ہے، اور اس کے دل سے دھواں اُٹھنے لگتا ہے، ـــــ لیکن وہ نہیں جانتا کہ اس مسندِ افتخار کو کتنے آلام ، اور کتنی ذلتیں اپنے آغوش میں لیٹے ہوئے ہیں۔

ظفر مند و کامران کون ہے؟

کیا ہم اُسے ظفر مند اور کامران کا خطاب دے سکتے ہیں، جو چالاکی، سازش، توڑ، جوڑ، اور کمینہ حکمتِ عملی سے مرتبۂ بلند حاصل کرکے، دوسروں پر اپنے رتبۂ عالی کا رعب جماتا پھرتا ہے؟

، اس ترکہ خدانے انسان کو خواہش، قوت، ولولۂ عزم عطا کرکے پیدا کیا ہو، تاکہ وہ ایک دوسرے کا خون بہایا کرے۔

لیکن اس سے بھی زیادہ عبرت ناک صورتِ حال یہ ہے کہ ان تمام خونریزیوں کے ساتھ ساتھ، غریب انساں کے واسطے یہ بھی مقدّر ہو چکا ہے کہ فاتح بھی پامال رہیگا، اور مفتوح بھی ـــــ فاتح بھی مایوسی کا شکار ہوگا، اور مفتوح بھی۔

وہ توقّعات جو دور سے نہایت ہی خوش آیند اور دل فریب نظر آتے ہیں، جب اُنھیں قریب سے دیکھو تو نہایت ہی معمولی اور ادنیٰ ہو کر رہ جاتے ہیں، جن کی سطح کہیں تو ہموار ہوتی ہے، کہیں ناہموار کہیں تو دے نظر آتے ہیں، تو کہیں غار ـــ اور آنیر دوپہر کی جھلس دینے والی دھوپ پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہمارے بلند توقعات کی حقیقت صرف اتنی ہے اور بس ہوس پرستیوں کی صعوبت انگیز راہوں میں، جن پر نامرادوں کے آنسوؤں کا چھڑکاؤ ہوتا ہے، کوئی منزل، یا فرودگاہ نہیں ہوا کرتی، اور ہر سفر تمام کے تمام کینے اور دغاباز ہوتے ہیں

(۳)

تباہ و پامال زندگی کے عالمگیر مسلک حرص و ہوس کے تمام پیرو، جب اپنے مساعی میں ناکام ہو جاتے ہیں، تو آلامِ حیات کی داد پانے کے لئے آخر کار آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھا دیتے ہیں، تا کہ رحمتِ الٰہی اُنھیں کم سے کم ایک ایسی ہی عارضی آسودگی بخش دے، جیسی آسودگی تھکے ہوئے جسم کو خواب سے حاصل ہوتی ہے۔

لیکن یہ توقع رکھنا کہ قادرِ مطلق خدائے بزرگ و برتر ایک ادنےٰ قسم کے استبداد پسند حاکم کی طرح صرف اُن ناکام لوگوں پر رحم و کرم کی بارش کرنیکا خوگر ہے، جو اُس کی حمد و ثنا کے گیت گا گا کر اُسے پھسلایا کرتے ہیں محض ایک احمقانہ توقع کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ کیونکر اور کس صورت سے یقین کیا جا سکتا ہے، کہ انسانی میلانات و رجحانات کا پیدا کرنے والا، عالم الغیب اور بے نیاز خدا، جو فطرتِ انسانی کا خالق ہے عبادت و ریاضت، اور وظائف و دعا کے اثر سے مجبور ہو، پیشوایانِ مذاہب کی قائم کردہ رسموں کے ادا کرنے سے متاثر ہو کر اپنی سنّت ترک کر دیگا؟

چالاکی کے ساتھ اپنے قطرے کو سمندر کا حال جتلانے والے ان مقدس پیشوایانِ مذاہب کے خود کا مانہ قوانین کی لاحاصل پیروی کرنے سے آج تک اس کے سوا اور کیا حاصل ہو سکا ہے کہ غریب انسان ایک بے صرفہ ذہنی غلامی میں پھنس کر رہ گیا ہے،

(۴)

بعض افراد شہرت نا موری کی دیوی کے محبوب بننا چاہتے ہیں، اور انھیں یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ اس دھن میں وہ انسانی جسم کی سی مقدس شئے کو بھینٹ چڑھائے دے رہے ہیں۔

شہرت! شہرت کی دیوی خون میں نہائی اور انسانی گوشت چباتی ہوئی شیطانی اہتزار کے ساتھ زمین کے اسٹیج پر رقص کیا کرتی ہے۔

کیا ایسی خون آشام دیوی شایانِ سجود پرا اور درخورِ پرستی ہوسکتی ہے؟

وہ خرابیاں جن سے انسانی زندگی ملعون ہو رہی ہے بے شمار اور وقوع در وقوع ہیں،

لیکن اُن میں سب سے زیادہ ہولناک خرابی، شہرت اور ناموری کی پرستش ہے۔ طمع صرف تنگ خیالوں کو تباہ ۔۔۔ اور عیاشی محض عقلا کو برباد کرسکتی ہے۔

لیکن ناموری کی آرزو جسے روح کے مرض کیلئے کسی چیز سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ صرف اُن لوگوں کی کمزوری ہے، جو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قابل ہیں عظیم شخصیتوں کی برائیاں بھی عظیم اور دوسروں کی برائیوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہیں ۔۔۔ شمع صرف پروانہ کے پر ہی جلا سکتی ہے لیکن ایک جلتا ہوا شہر اپنے اطراف میں سب کچھ جلا کر راکھ کردیتا ہے،

صاحب جبروت سکندر و سلیمان دنیا کا ہلا دینے والا چنگیز، دشمن کا بکتا پنجہ نپولین، اور اسی قبیلے کے دوسرے افراد کی شہرت پرستی کے ہولناک نتایج، نوع انسانی کو اچھی طرح معلوم ہیں،

ان فاتحوں کی ہولناکیوں، اور شہرت پرستیوں نے شاداب مرغزاروں کو ریگستانوں میں تبدیل کردیا تھا۔ اور کھیتوں کی انسانی خون سے آبپاشی کی تھی اور یہ تمام شقاوتیں محض اتنے کے لئے کی گئی تھیں کہ ہم "اعظم" و "فاتح" کے نام سے پکارے جائیں، اور تاریخ کے اوراق پر ہمارا نام جلی حرفوں میں درج کیا جائے۔

چنانچہ انسانی خون کی پیاسی شہرت کی دیوی کا التفات حاصل کرنے کی غرض سے مسولینی نے بھی، اپنے پیش رووں کی طرح ظفر مندی کا ایک منارہ کی آخر کار تعمیر کا شروع کردی ہے،

ان پرستاران شہرت میں سے بعض تو اپنے واقعات اور نام پتھروں پر کندہ کرا گئے۔ بعض لوہے کے کھمبے کھڑے کر گئے۔ اور بعض آنے والی نسلوں کے لئے اپنے کارنامے کتابوں میں درج کرکے اپنی شہرت کو چار چاند لگا چکے ہیں،

آخر یہ شہرت جس کے حاصل کرنے کے لئے طالبان شہرت تڑپا کرتے ہیں ایک ایسی ترازو کے سوا اور ہے ہی کیا جس میں وہ تمام ہولناک مصائب تولے جاسکتے ہیں، جنھیں ان فاتحین کے ہاتھوں دنیا برداشت کرچکی ہے،

یہ سربفلک فتحمندیوں کے منارے آسمان بوس اور ظفریابیوں کی محرابیں اُن انسانوں کی ہڈیوں کا انبار نہیں تو اور کیا ہیں جنہیں شہرت کی دہشت ناک دیوی ہضم کرچکی ہے،

(۵)

آدمی سمجھتا ہے کہ میں مخلوق کا مولا اور تمامی موجودات کا مخدوم ہوں تمامی حیات کو میرے ہی احاطۂ اقتدار میں ہونا چاہئے اور مجھ ہی کو حق پہونچتا ہے کہ میں ہر چیز سے لطف اندوز ہوں ۔۔۔ لیکن یہ کیونکر ہوسکتا ہے! باغ عالم میں ہزاروں پھول کھلتے اور مہکتے ہیں، اور ہر پھول کو خالق نے مختلف رنگ و بو کے اوصاف عطا کئے ہیں،

گلاب کی بو چنبیلی سے، اور بیلے کی خوشبو، ہار سنگھار سے مختلف ہوتی ہے، اور فطرت کے دائرہ میں زندگی کی ہر شکل باقی تمام شکلوں سے قطعی مختلف معلوم ہوتی ہے،

اختلاف ہی فطرت کا ابدی اصول، اور عدم مشابہت ہی تمام اشکال کی بنیاد ہے، اور جب صورت حال یوں واقع ہوئی ہے تو یہ دعویٰ کیونکر کیا جاسکتا ہے کہ فلاں شے کو فلاں شے پر فوقیت حاصل ہے؟

کوا، کوئل کی پرواز نہ کرتے ہوئے، کاؤں کاؤں کی نامطبوع آوازیں نکالا کرتا ہے، اور اُسے یہ یقین ہوتا ہے کہ موسیقی کی تمام تر لطافت اُس کی آواز کے اندر موجود ہے۔

طاؤس کے زرنگار رنگ دُم پھیلا کر ناچنے میں مرغی کو کوئی حسن نظر نہیں آتا، کیونکہ اُس کے لئے محبت کا دیوتا مرغ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے،

تمام مخلوق اپنے ہی اوصاف کو سب سے بہتر سمجھتی ہے، اور دوسروں کے اوصاف کو اپنے اوصاف کا صرف ایک دھندلا سا پرتو خیال کرتی ہے،

ان حالات میں کیا یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے، کہ خدا نے یہ مخلوق کی بلا شرکت غیرے سرداری انسان کو عطا فرمائی ہے؟ اور کیا اس بات کا بھی دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ انسان نے اپنی ذاتی قوتوں سے کام لیکر اس دنیا میں آجتک جو کچھ بھی عمل کیا ہے۔ وہ تمامتر منشور خداوندی کے اتباع میں تھا؟

(۶)

کبھی میرا یہ خیال تھا کہ وہ تمام مقامات جو مخملی رنگوں سے ڈھکے ہوئے اور طیور کے چہچہوں سے گونجے ہوئے نظر فریب و خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیشہ بشاشش رہنے والے خدا نے انھیں اپنے تبسم سے مقدس و مبارک بنا کر

جنہاں فرصت کہ تمام مخلوق کی ایک عام کار نیوال بنا دیا ہے،

او، جیسے ہی کہ شاخوں پر اٹھی ہوئی چڑیاں، کسی غیر معلوم زبان میں ایک دوسرے سے مزے مزے کی باتیں کرنے لگیں تو میرے دل کی دھڑکن اُن کی ہم آہنگ ہو گئی۔

کھلے ہوئے پھول محبت کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے،
اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت ایک دوسرے کے کان تک اپنی مسرتوں کی خبریں پہنچانے لگے۔

چاندنی میں نکھرے ہوئے میدان، پھولوں کی خوشبو سے لدی ہوئی سبک خرام ہوا۔ اور نہ ختم ہونے والی خاموشی میں خود رات نے شگفتہ روی کے ساتھ مجھ سے باتیں کیں،

اور صبح جب حیات نو کی طرح طالع ہوئی، تو میں نے بشاشت کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ اور ایسے سہانے وقت جب کہ خود پروردگار عالم مسکرا رہا تھا، کسی کمبخت کے دل میں یہ خیال نہ آسکتا تھا کہ زندگی محنت و مشقت کے واسطے بنائی گئی ہے،

لیکن فطرت کے ساتھ چہلیں کرتے کیا وہ زمانہ، محبت اور فطرت کے متعلق میرا وہ خیال باطل ٹھہرا اور اُس زمانہ کی زبان میں بھول گیا! اس طرح بھول گیا کہ اب اُس زبان کے نہ تو قواعد ہی میرے ذہن میں ہیں، نہ الفاظ کے معنی ہی،

حسن کیا ہے؟ مگر اوضاعِ ذہنی کا تیز تبدل۔

حسن جمال کا جلوہ الفاظ، اصوات، اور خارجی اشیاء میں کیونکر نظر آسکتا ہے،

شاعری کا یہ حسن محرومِ تخیل انسان کی نظر میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ اور موسیقی کا حسن بہروں کی بارگاہ میں مسرت کا سبب نہیں بن سکتا۔

جب صرف بیگانۂ تخیل و سماعت افراد محض آنکھوں کے ذریعے سے اشکال کا تناسب دیکھ سکتے ہیں، تو پھر سماعت کا حسن، اگر دماغ کے اندر نہیں تو کہاں پایا جا سکتا ہے؟!

اور جب دماغ ہی پر سماعت کے حسن کا معاملہ ٹھہرتا ہے تو اس میں کون سی عجیب کی بات ہے کہ ہر ایک محبت [illegible] صرف [illegible] چیزوں کو حسین سمجھے

جو انتہائی تلوّن کے ساتھ اپنی صورتیں بدلتی رہتی ہیں اور صرف آنی طور پر جلوہ فروشی کرتی رہتی ہیں!۔

(۷)

کہتے ہیں کہ وقت اڑتا ہے ۔۔ لیکن کیا واقعیً وہ اُڑتا ہے؟ نہیں، یہ تو ہر آن بدلنے والا دماغ ہے جو بالکل اسی طرح یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ وقت اُڑ رہا ہے جس طرح ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سورج، زمین کے گرد گردش کر رہا ہے،

یہ خیال کرنا کہ نہ بدلنے والا وقت افراد کو اُن کے حصولِ مقاصد میں مدد دینے کی کوئی مخصوص صلاحیت رکھتا ہے، محض ایک وہم باطل ہے ۔۔ البتہ صرف وہ مساعی جو تدبّر، کی رہبری میں جاری رکھے جائیں، مشکور ہو سکتے ہیں،

زندگی جو کچھ بھی عطا کرتی ہے، وہ محض اصول تغیر و تبدّل ہے، جو ہر شے کی قلب ماہیت کرتا رہتا ہے۔ وقت نہیں، بلکہ یہ صرف اصولِ انقلاب ہی ہمارے اجسام، خیالات اور جذبات کو تازہ کرتا، اور ان میں نئی روح پھونکتا رہتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے، کہ ہمیں دوسرے دن یہ یاد نہیں رہتا کہ ہم کل کیوں مغموم تھے۔ اور بیدار ہونے کے بعد ہمیں پتا نہیں چلتا کہ وہ کون شے تھی جس نے خواب میں ہمیں اس قدر متاثر کر دیا تھا۔

اور یہ بھی کتنی حیرت ناک بات ہے کہ جب ہم آگے بڑھ کر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں اپنے خیالات بدلے ہوئے نظر آتے ہیں، اور ہم اپنے ماضی کے خیالات کو بالکل ایک اجنبی کی حیثیت سے محسوس کرنے لگتے ہیں،

اور اُن تصورات کا احیا کرنے اور اُن تصورات کے از سرِ نو ناز اٹھانے کی سعی کرنا کس قدر فضول ہے، جنھیں زندگی کا ابدی اصول تغیر و تبدّل نگل چکا ہے!

گذشتہ خوابوں کی مسرتوں کے تازہ کرنے کی فکر کرنا ایک بے سود سی بات ہے،

تخلیق، تحفظ، اور تہذیب، یہ تینوں ربانی عمل ہر وقت اور ہر دور انسانی جسم میں تواتر و تسلسل کے ساتھ جاری رہتے ہیں، اور جسمانی تغیرات کے ساتھ ساتھ انسانی خیالات و تصورات بھی ایک ابدی تبدیلی و تازگی سے وابستہ رہتے ہیں،

وقت کا کفن اس دنیا کی ہر شے کو ڈھانک لیتا ہے، اور ہر لمحے کو چھپا

جو اتمام مخلوق کو اپنے دامن میں چھپا لیتا ہے،

(۸)

انسانی دماغ کی اس الجھی ہوئی سی کو، جو توریت و تعلیم و جبلت و ماحول کے رنگا رنگ دھاگوں سے بنی ہوئی ہے کون کھول سکتا ہے؟

انسانی فطرت وا قابل تحقیقات اضافی ہے عمال ناقابل علم میں مذہب اور فلسفہ کو جن کے اعمال کی ہوا تک نہیں لگتی

پھر جو یہ دماغ اور مادے کے جداگانہ اور قطعی برعکس ہونے کو فراموش کر کے اس دھن میں لگا ہوا ہے کہ مادے کی ترازو میں دماغ کو تول لیا جائے۔

سائنس داں کہتے ہیں کہ موسیقی صرف ایتھر کی لہروں کی حرکت ہے، جو انسانی سماعت میں نفوذ کر جاتی ہے،

شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن کیا یہ ریگ کی طرح خشک نظریہ، اس ربانی محویت و سرشاری کی بھی توضیح کر سکتا ہے، جو راگنی کے زیر و بم سے روح انسانی پر طاری ہو جایا کرتی ہے؟!

اور اسی طرح وہ سائنس داں جو دماغ کا تجزیہ فرماتے ہیں اور چند مخصوص خواص کو اس سے وابستہ کرتے ہیں، وہ بھی دماغ کی صحیح فطرت کو نہیں سمجھتے۔

ہم علت و معلول پر توجہ کئے بغیر عمل کرنے لگتے ہیں، اور ہمارے بیشمار بے مقصد و ارادہ اعمال، ارباب عقل و دلائل کو حیرت میں ڈال دیا کرتے ہیں۔

کیا ہمیں یہ عرض کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی کہ انسان ارادی یا غیر ارادی طور پر خود اپنے مقدر کا واضع ہے؟

(۱۰)

اگر شہرت پسندی، حوصلہ مندی اور اسی قبیل کے دیگر اوصاف، جو حیات انسانی کی رنگینیوں اور لطافتوں میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ تو انسان اپنے فرائض ثمین سے عہدہ برآ کیونکر ہو سکتا ہے؟

کیا خدا نے بے مقصد و بے نتیجہ تفریح کے تحت اس دنیا کو خلق فرمایا ہے؟ اور کیا انسان وہم و تلبیس کے ناپیدا کنار سمندر میں اندھوں کی طرح بہتے رہنے کے لئے بھیجا گیا ہے؟

اگر ایسا ہی ہے، تو درحقیقت ہم صرف حشرات الارض کی طرح بارش کی

پیداوار اور خیر و شر کے تمام خیالات محض بے معنی تخیلات ہیں، اور پھر انسان کا اصل مقصد تخلیق کیا ہے۔ اور کامل زندگی کی ہم آہنگی و ہمواری حاصل کرنے کی خاطر انسان کو کیا ذریعہ اختیار کرنا چاہیئے۔؟

تندرست عقل کی ضرورت

بیشک ان چیزوں کا سمجھ لینا ہی حقیقی عقلمندی ہے، اور یہ وہ عقلمندی ہے، جو نہ تو آسمان کی کتابوں سے حاصل ہو سکتی ہے، نہ خانقاہوں سے۔

یہ حقیقی عقلمندی صرف آسودہ دماغ کی دقیقہ سنجی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، جسے بے تعصب اور بے خوف دل کے مسلسل و متواتر تجربوں سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔

اس ذیل میں یہ بات نہایت ضروری ہے کہ نفس انسانی میں علو پیدا کرنے کے لئے جس ضابطۂ کردار (Conduct) کی ضرورت ہے اس ضابطہ کو انسان خود ایجاد (Realise) کرتا ہے، کیونکہ اس کے علاوہ کسی دوسری شے میں یہ طاقت نہیں پائی جاتی۔

اپنے ذاتی طور پر محسوس کئے ہوئے معیار اخلاق کے مطابق انسان خوش یا ناخوش رہتا ہے۔ اور مسرت کا صرف یہی ایک راستہ ہے، وہ شخص جو نور بصیرت کی راہبری میں، اپنے ذاتی ضابطۂ حیات و اخلاق سے مسلح ہو کر بیباکی کے ساتھ میدان جنگ میں کود پڑتا ہے۔ وہی زندگی کے عرصہ کارزار میں حقیقی امن کی مملکت فتح کر لیتا ہے۔ اور انفرادی طور پر آزمائے ہوئے، اور ذاتی طور پر محسوس کئے ہوئے اصول خیر و شر سے شدید وابستگی ہی مردانگی ہے، اور صرف اس کے ذریعے سے مستقل مسرت حاصل کی جا سکتی ہے،

زندگی میں ناکامی یا مالی مایوسی، اور بے عزتی سے کوئی انسان بچ نہیں سکتا۔ گو یہ چیزیں موسموں کے تغیرات کی طرح ناگزیر تو ضرور ہیں۔ لیکن حقیقت میں لاحاصل و غیر اثر آفریں ہوتی ہیں اور اس ہیرو کی جمعیت خاطر کو متاثر نہیں کر سکتیں جو اپنے ذاتی ضابطہ اخلاق پر استواری اور مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے پر مصر ہوتا ہے

انفرادی مسرتوں کی محض کثرت فراوانی مسرت مترتب نہیں ہوا کرتی۔ اور ذاتی طور پر حاصل کردہ حقیقی دولت سکون و امن زندگی کی ہر تکلیف و لذت اور حیات کی ہر خوشی سے بالا رہتی ہے،

(بقیہ [illegible])

خاتونِ مشرق

(جوش ملیح آبادی)

غنچۂ دل مرد کا روزِ ازل جب کھِل چکا
جسقدر تقدیر میں لکھا ہوا تھا مل چکا

دفعتہً گونجی صدا پھر عالمِ انوار میں
"عورتیں دنیا کی حاضر ہوں مرے دربار میں"

عورتوں کا کارواں پر کارواں آنے لگا
پھر فضا میں پرچمِ انعام لہرانے لگا

ناز سے حوریں ترانے حمد کے گانے لگیں
عورتیں بھر بھر کے اپنی جھولیاں جانے لگیں

جب رہا کچھ بھی نہ باقی کیسۂ انعام میں
کانپتی حاضر ہوئیں پھر ایشیا کی عورتیں

دل میں خوفِ خومیٔ قسمت سے گھبرائی ہوئی
رعب سے نیچی نگاہیں، آنکھ شرمائی ہوئی

حلم کے سانچے میں روحِ ناز کو ڈھالے ہوئے
گردنوں میں خم، سروں پر چادریں ڈالے ہوئے

آخر اس انداز پر رحمت کو پیار آ ہی گیا
میکدے پر جھوم کر ابرِ بہار آ ہی گیا

مسکرا کر خالقِ ارض و سما نے دی ندا
اے غزالِ مشرقی! آ تخت کے نزدیک آ!

نعمتیں سب بٹ چکیں، لیکن نہ ہونا مضمحل
سب کو بخشے ہیں دماغ اور اے تجھے دیتے ہیں دل!

یہ ہی دل ہے جو مفصل ہو کے سوز و ساز سے
میرے پہلو میں دھڑکتا تھا عجب انداز سے

تجھ کو وہ رخ اپنی سیرت کا دیئے دیتے ہیں ہم
جس میں یزدانی نسائیت کی زلفوں میں ہیں خم

آ، کہ تجھ کو صاحبِ مہر و وفا کرتے ہیں ہم
لے خود اپنی جنبشِ مژگاں عطا کرتے ہیں ہم

پہلوئے خاتونِ مشرق میں بصد تمکین و ناز
منتقل ہو جا الوہیت کے سینے کے گداز!

عورتیں اقوامِ عالم کی بھٹک جائینگی جب
تو رہیگی بن کے اس طوفاں میں اک موجِ طرب

حسن ہو جائیگا جب آبروئے کار و قفِ حاشِ عام
دیدنی ہوگا ترے خلوتکدے کا اہتمام

عالمِ نسواں پہ کالی رات جب چھا جائیگی
یہ ترے ماتھے کی بندی صبح کو شرمائیگی

عورتیں ناچینگی جب اسٹیج پر با رقص و چنگ
اپنی آنکھوں کی لگاوٹ، اپنے رخسار کا رنگ

اُن کے آگے ہر نیا میدان ہوگا جلوہ گاہ
اور ترا اسٹیج ہوگا صرف شوہر کی نگاہ،

گودیاں پھیلا کے جب مانگینگی با صدقِ صفا
عورتیں اولاد کے پیدا نہ ہونے کی دعا

مژدہ باد اے ایشیا کی دخترِ پاکیزہ تر!
آنچ آئیگی نہ تیرے مادرانہ ذوق پر

ماؤں کی غفلت سے جب بچوں کو پہنچیگا گزند
جب فغاں بے تربیت اولاد کی ہوگی بلند

صرف اک تیرا تبسم اے جمالِ تابناک!
سینۂ اطفال میں پیدا کریگا روحِ پاک

وہ حرارت تیرے ہونٹوں کی نہ ہوگی پائمال
جسکے شعلوں سے نکھر جاتا ہے رنگِ نونہال

وہ تری معصوم رعنائی نہ ہوگی مضمحل
بخشتی ہے نسلِ انسانی کے پہلو کو جو دل

وہ بھی دن آئیگا جب تجکو بھی اے مستِ حجاب
زیب دیگا "مادرِ اولادِ آدم" کا خطاب

جب کریگی صنفِ نازک اپنی عریانی پہ ناز
صرف اک تو اُس تلاطم میں رہیگی پاکباز

اُنکے دل جب ہونگے یادِ معصیت سے پاش پاش
تیرے رُخ پر ایک بھی ہوگی نہ ماضی کی خراش

اُنکی راتیں خوفِ رسوائی سی ہونگی جب دراز
تیرے سینے میں کسی شب کا نہو گا کوئی راز

دہشتِ فردا سے تھرائیگا جب اُن کا غرور
حال ہی تو ہوگی راضی، خوفِ مستقبل سی دور

جب آرہیگی اُنکی چشمِ دام پروردہ میں خاک
نرم تیور سے تری آنکھوں کے رہینگے تابناک

نرم ہونگے تیرے جلوے بھی، تری گفتار بھی
باحیا ہوگی تری پازیب کی جھنکار بھی،

چھاؤں بھی ہوگی نہ تیری بزمِ ناؤ نوش میں،
تیرا پرتو تک رہیگا شرم کے آغوش میں،

اے شعاعِ ارضِ مشرق! تیری عفت کا شعار
کج کریگا ملک و ملت کی کلاہِ افتخار

آبرو ہوگا گھرانے بھر کی تیرا رکھ رکھاؤ
دیگا تیرا باپ شانِ فخر سے مونچھوں پہ تاؤ

تیری آنکھوں کی کرن سے اے جہانِ اعتبار
جگمگائیگی نسب ناموں کی لوحِ زرنگار

بوالہوس کا شعبدہ دیگی تری ادنیٰ جھلک
ہوگی لہجے میں ترے نبضِ طہارت کی دھمک

تیری پیشانی پہ جھلکیگا مثالِ برقِ طور
طفل کا نازِ شرافت، اور شوہر کا غرور!

علم سے ہر چند تجکو کم کیا ہے بہرہ مند
لیکن اس سے ہو نہ اے معصوم عورت فکرمند

جب ضرورت سے زیادہ ناز فرماتا ہے علم
عارضِ تاباں کے بھولے پن کو کھا جاتا ہے علم

نطق ہوجاتا ہے علمی اصطلاحوں سے اُداس
لعلِ لب میں شہد کی باقی نہیں رہتی مٹھاس

علم اٹھا لیتا ہے بزمِ جاں سے شمعِ اعتقاد
خالِ خد کی جوت ہے چہرے کی شانِ اجتہاد

قصرِ وحشت کی طرف مڑتی ہے اکثر راہِ فن
جھانکتی رہتی ہے اس غرفے سے چشمِ اہرمن

چھوڑ دیتی ہے تکلم کو ملائم قیل و قال
علم کا حد سے گزر جانا ہے توہینِ جمال

علم سے بڑھتی ہے عقل، اور عقل ہے وہ بدماغ
جو بجھا دیتی ہے سینے میں محبت کا چراغ

علم سے باقی نہیں رہتے محبت کے صفات
اور "محبت" ہی فقط لے دیگی تیری کائنات

دیکھ تجھ پر علم کی بھرپور پڑ جائے نہ ضرب
بھاگ اس پردے میں ہیں شیطان کی آلاتِ حرب

علم سے رہتی ہے پابندِ شکن جس کی جبیں
ناز سے شانوں پہ اُس کی زلف لہراتی نہیں

وقت سے پہلے بُلا لیتے ہیں پیری کو علوم
عمر سے آگے نکل جاتے ہیں چہرے بالعموم

جن لبوں کو چاٹ پڑ جاتی ہے قیل و قال کی
اُنکی گرمی کو ترستی ہے جبیں اطفال کی

اک جنوں پرور بگولا ہے وہ علمِ بے وثوق
جسکی رو میں کانپنے لگتے ہیں شوہر کے حقوق

دور ہی سے ایسے علمِ جہل پرور کو سلام
حسنِ نسواں کو بنا دیتا ہے جو جاگیرِ عام

جس جگہ حورانِ جنت کا کیا ہے تذکرہ
کیا کہا ہے اور بھی کچھ ہمنے جز حسن و حیا!

تذکرہ حوروں کا ہے محض ایک تصویرِ جمال
ہمنے کیا اُنکو کہا ہے صاحبِ فضل و کمال؟

ہیچ ہے ہر چیز، زیور، غازہ، افشاں، رنگ و خال
حسن خود اپنی جگہ ہے سو کمالوں کا کمال

چاندنی، قوسِ قزح، مورت، شگوفہ، لالہ زار
علم کا ان نرم شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار؟!

روشنائی میں کہیں گھلتی ہے موجِ ماہتاب
کیا کوئی اوراقِ گل پر طبع کرتا ہے کتاب؟

میرے عالم میں نہیں اس بدمذاقی کا شمار | کاکلِ افسانہ تہِ دوشِ حقیقت ہو دوچار
حسن کو آغوشِ نگہت، دلفریب و دلربا | علم سے بجائے اقلیدس کا محض اک دائرہ!
مصحفِ عارض کے کتابی روکشِ نازِ گلاب | اور بجائے لغت، یاد فقرۂ علمِ حساب!
غمزۂ شیریں کے دامن میں ہو شورِ کائنات | بزمِ کاوش میں جلے شمعِ شبستانِ حیات!
گرم ہو تیر اب کی گھونگھٹ سرکانے کا ایاغ! | غنچۂ نورس کا طاق، اور پیرِ مکتب کا چراغ!
شہپرِ بلبل پہ کھنچی جائے تصویرِ شغال! | موتیوں پر ثبت ہو طوفان کی مہرِ جلال!
صبح غرقِ بحث ہو غنچے کھلانے کے فن! | درس دیں ہو ہیں صبا کی گنگنانے کے فن!

تو نکرنا مغربی متوالیوں کی ریس دیکھ
گھات میں تیری لگا ہے فتنۂ ابلیس دیکھو!
تو نہ انکی طرح بھر نا عرصۂ فن میں چھلانگ | کو کھتا ٹھنڈی سڑک پہ پونسے او وھندلا سے بانگ
دخترانِ مغربی کو دی نہ عورت کا خطاب | یہ مجسم ہو گئے ہیں کچھ گنہگاروں کے خواب!
پھر رہی ہیں یا تری نظروں کے آگے پر فضا | عورتوں کے بھیس میں شیطانکی سرابیاں
علم حاصل کر فقط تدبیرِ منزل کے لئے
وہ دماغوں کے لئے ہیں، اور تو دل کے لئے!!

مضمون بقیہ صفحہ ۲۴۵

دُنیا، اور دُنیا کے غم وطولی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر پہاڑوں کی کھوہوں میں چھپ جانا، اور اُن رشتوں کا توڑ دینا جو ہمیں زندگی سے جوڑتے ہیں، انسان کے واسطے احمقانہ ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔

ایسا کرنا سخت بزدلی ہے ــــ وہ امن واماں جو حیات کے میدانِ جنگ سے گریز کر کے حاصل کی جائے، بندوں کا نہیں مُردوں کا امن واماں ہے۔

اِس دُنیا کی شاندار زندگی کے واسطے محبت و نفرت اور خوشی و غم نہایت ہی ضروری چیزیں ہیں ــــ اور وہ امن و سکون جو محبت سے مُعرا ہے موت سے بھی بدتر ہے۔

انسان کو حقیقی سکون سے صرف وہی مُصفی و ہموار نفس دوچار کرسکتا ہے جو حقیقی امن کی مملکت فتح کرلیتا ہے۔

اور انفرادی طور پر آزمائے ہوئے، اور ذاتی طور پر محسوس کئے ہوئے اصولِ خیر و شر سے شدید وابستگی ہی مردانگی ہے، اور صرف اسی کے ذریعے مستقل مسرت حاصل کی جاسکتی ہے۔

زندگی میں ناکامی، پامالی، مایوسی، اور بے عزتی سے کوئی انسان بچ نہیں سکتا۔ گو یہ چیزیں موسمی تغیرات کی طرح ناگزیر تو ضرور ہیں، لیکن حقیقت میں لاحاصل وغیر اثر آفریں ہوتی ہیں، اور اُس ہیرو کی جمعیتِ خاطر کو متاثر نہیں کرسکتیں جو اپنے ذاتی ضابطۂ اخلاق پر اُستواری اور مضبوطی کے ساتھ قایم رہنے پر مُصر ہوتا ہے۔

انفرادی مسرتوں کی محض فراوانی مسرت مترتب نہیں ہوا کرتی ــــ اور سو ذاتی طور پر حاصل کردہ بے پایاں محبت پر مبنی، اور تمام مخلوق کے ساتھ جذبۂ وحدت و اتحاد رکھتا ہے۔

اور اگر ایسا نہیں ہے تو خستہ و درماندہ، تعاقب زدہ، اور فریب خوردہ انسانی نفس، انانیت و خود پرستی کے دائرے میں اندھوں کی طرح چکر کھاتا رہتا ہے۔ اور اس کو کبھی سکون نہیں ملتا، کبھی مسرت حاصل نہیں ہوتی۔

(۱۱)

اپنے فرسودہ و ملال انگیز خیالات کو ماضی کے پارینہ واقعات میں دفنا دو، اور اپنے اوہامِ باطل کی محفل کو جس کی شمع بجھ چکی ہے درہم برہم کردو۔

آگاہ ہو کہ اس ضابطۂ اخلاق کا بے جھجک تتبع کرنا ہی جسے تم ذاتی طور پر پرکھکر پسند کر چکے ہو، وہ تنہا مسلک ہے جو سکون و مسرت بخشتا ہے، اور تمہیں خود تمہاری ہستی سے ہم آہنگ بنا دیتا ہے۔

سکوت

شیو فرید آبادی

"تم سرکس دیکھنے ضرور جاؤں گی"۔ بیوی نے بضد ہو کر کہا۔

"اچھا۔ اچھا۔ چلنا" میں اسے بہت چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اس کا دل رکھنے کو کہا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے۔ جبکہ سرکس کے کھیلوں سے ہر کس و ناکس واقف نہ تھا، اشتہاروں میں آدمیوں کی شیروں سے لڑائی کے حال پڑھکر عوام حیرت میں پڑ جاتے تھے۔ میری بیوی نے کہا۔ شیر اور آدمی کی لڑائی مجھے تو سنکر ہی ڈر معلوم ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آتی، کہ آدمی شیر کو اپنے بس میں کیسے کر سکتا ہے۔ یہ آدمی ضرور جادوگر ہوگا۔ آپ نے بھی کہا کہ شیر کے منہ میں سر ڈال دیتا ہے۔ منہ نہ ہوا بیوی کی گود ہو گئی۔ آخری الفاظ کہکر میری بیوی ہنس پڑی۔

میں نے کہا، تم جسے اتنا دشوار کام سمجھتی ہو وہ در اصل اتنا مشکل نہیں ہے، اس میں جادو ٹونے کا کام ہی کیا..... میں نے محسوس کیا کہ میرے کہنے پر بھی میری بیوی کو یقین نہیں آیا۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی "کیا سچ مچ" میں نے کہا تمہارا خیال ہے کہ درندوں میں غور و فکر کا مادہ نہیں ہوتا۔ ایسا سوچنا بڑی بھول ہے۔ ابتدائے عالم سے اب تک جو کچھ ہم نے سیکھا ہے۔ اگر دلی لگن سے وہی تعلیم ان درندوں کو دی جاوے تو ان کا سدھا لینا اور ان سے بڑے بڑے کام لینا کون سی بڑی بات ہے۔ میں نے بھی جب پہلی بار سرکس دیکھا تو بھونچکا سا ہو گیا تھا کرسی پر بیٹھا ہوا پلک جھپکائے بغیر شیروں کے کرتب کو دیکھتا رہا۔ اور واہ واہ کے شور سے پنڈال سر پر اٹھا لیا۔

میرے پاس ہی کرسی پر ایک فرانسیسی سپاہی بھی بیٹھا ہوا تھا، اس کی ایک ٹانگ لکڑی کی تھی۔ چہرہ پر نظر ڈالتے ہی میں تاڑ گیا کہ سپاہی نے اپنی زندگی میں کتنے ہی میدان مارے ہوں گے۔ اسکے پر رونق چہرے سے سادگی ٹپکی پڑتی تھی۔ اس قسم کی غیر معمولی جرأت کے زندہ دل لوگ بہت ہی کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ بیشمار حیرت انگیز کام دیکھنے پر بھی ان کے چہرے یا آنکھوں میں سنیعرت زندگی کی علامت ہوتی ہے اور نہ استعجاب کی اور خوف تو ان کے پاس پھٹکنے ہی نہیں پاتا۔ ایسے لوگ خم ٹھوک کر جس طرح موت کے سامنے سینہ تان دیتے ہیں، اسی طرح یہ بے جگر میدان جنگ میں مردہ سپاہیوں کی جیبوں میں سے سب کچھ نکال کر ہڑپ کر جاتے ہیں، یہ لوگ فضول خیالات میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ اور غرض پڑنے پر شیطان کے ساتھ دوستی کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

کھیل شروع ہوا ہی تھا کہ سرکس والا شیروں کے پنجروں میں داخل ہوا میری نگاہ اچانک فرانسیسی سپاہی پر جا پڑی وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی ہنسی کا مطلب یہی تھا کہ یہ سب کرتب معمولی ہیں۔

کھیل ختم ہونے پر میں سرکس والوں کی تعریف کے پل باندھ رہا تھا۔ سپاہی خاموشی سے سب باتیں سن رہا تھا، وہ چپ نہ رہ سکا اس نے بے پرواہی سے کہا۔ حضرت اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟" میں نے کہا "جناب اگر اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں تو ذرا یہ تو فرمایئے کہ آخر ان کرتبوں کا راز کیا ہے؟"

ہم بات چیت کرتے رہے۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں بے تکلف ہو گئے پاس ہی ہوٹل تھا۔ وہاں جا کر میں نے چار پی۔ خاطر مدارات کے جذبے سے مغلوب ہو کر میں نے خدمتگار کو آواز دی اور سے ابر اٹھانے لانیکا حکم دیا۔ اس کو دیکھتے ہی بڈھے کی آنکھوں میں سرشاری سی چھا گئی۔ گزشتہ واقعات کی یاد اس کے دماغ میں یکایک بیدار ہو گئی۔ اس نے اپنی زندگی کے حالات سناتے ان کو سنکر مجھے یقین ہو گیا کہ شیروں کے ساتھ جنگ کرنا واقعی بچوں کا کھیل ہے۔

میری بیوی یہ بات سنکر چپ نہ رہ سکی۔ وہ بولی کہ بڈھے سپاہی کی داستان میں

بھی سنو لیں گے۔ تمہارا ہنسنا مشہور ہی ہے۔ اسی خوف سے میں شروع سے آخر تک بڈھے سپاہی کی کہانی سناتا ہوں ذرا گوش دل سے سنئے۔

"فرانسیسیوں کو فاتح عالم بننے کی ہوس افریقہ تک کھینچ کرلے گئی۔ دوران جنگ میں ایک فرانسیسی سپاہی موسیو ماں گروں، عرب سپاہیوں کے ہاتھ میں پڑ گیا، اس خیال سے کہ پیچھے سے دشمن تعاقب میں ہے۔ اور سر پر چڑھا آرہا ہے سپاہی گھبرا گیا۔ اور سر پر پاؤں رکھکر بھاگا۔ مگر عربوں نے فرانسیسی سپاہی کو گرفتار کر ہی لیا، معلوم ہے، یہ فرانسیسی سپاہی کون تھا وہی ہمارا بڈھا سپاہی جس سے ہم ابھی ابھی سرکس میں گفتگو کر رہے تھے۔

شام کیوقت عربوں نے ایک کھجور کے نیچے دئیں پر خیمے ڈالے گھوڑوں کے لئے دانہ اور چارے کا بندوبست کیا اور سوکھے کھجوروں سے پیٹ کی آگ بجھاکر اطمینان سے اپنے اپنے خیموں میں لمبی تانی، ہاتھ پاؤں بندھا ہوا قیدی اس مقام سے فرار ہو سکے گا۔ یہ خیال سپاہیوں کے خواب میں بھی نہ آیا۔ بڈھے سپاہی نے جب دیکھا کہ دشمن گہری نیند میں ہے تو دانتوں اور گھٹنوں کی مدد سے ایک تلوار اٹھائی اور رسیوں کے بندکاٹ ڈالے اب وہ قیدی نہیں تھا۔ .... آزاد تھا۔ رہائی پاتے ہی اس نے کچھ نہ سوچا ہتھیار اٹھا، کمر پر تھیلے میں کھانے پینے کا کچھ سامان بھر دہ ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہوا اور ہوا ہو گیا۔ اپنے کیمپ میں پہونچنے کی خواہش اس میں اسقدر زبردست پیدا ہوگئی کہ اس نے بغیر ادھر ادھر دیکھے ریگستان میں گھوڑے کو سرپٹ چھوڑ دیا،

ریگستان میں بھٹک جانے کے بعد شام کے وقت وہ ایک پہاڑی کے دامن میں پہونچا، لیکن تکان سے اسقدر چور ہو چکا تھا کہ اب اسے ایک قدم اٹھانے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی،

صاف آسمان پر ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی اور اس کی خوبصورتی اس پر کچھ اثر انداز نہ ہو سکی، پہاڑ پر اونچے اونچے تاڑ کے پیڑ تھے۔ ان نخلستانوں کو دیکھ کر اس کو امید کی جھلک دکھائی دی۔ مگر وہ بھوک پیاس سے ادھ موا سا ہو رہا تھا، اپنی جان بچانے کا کچھ خیال کئے بغیر وہ اسی جگہ پڑ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اس تپتے ہوئے ریگستان سے جان بچا کر باہر نکل جانا قطعی ناممکن ہے، عرب دشمنوں کے خیموں کے چھوڑنے کا اسے اب زیادہ افسوس ہو رہا تھا،

ایسی سنسان جگہ میں اب جان دینے کی نسبت عرب دشمنوں کی قید اسے اب زیادہ عزیز معلوم ہونے لگی تھی۔ اسے نیند آگئی۔

یہ سپاہی مزے کی نیند سو رہا تھا سورج دونپہر سے اونچا ہو گیا تھا اس کی کرنیں سپاہی کے بدن میں تیز سوئی کی طرح چبھنے لگیں، جلتے ہوئے سورج کی تپش سے اسکے سونے کی جگہ اتنی گرم ہو گئی کہ وہ تلملا کر اٹھ بیٹھا کھجور کے درخت کا سایہ ترچھا پڑ رہا تھا۔ سپاہی جدھر نظر ڈالتا اسے ایسا معلوم ہوتا کہ ریگستان کی زمین جل رہی ہے، دور تک پھیلی ہوئی ریگ کے سوا اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ سورج کی روشنی سے ریگ کے ذرے جواہر میں تبدیل ہو گئے تھے۔ سطح ریگستان پر جلبی آئینے کی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ پر بگولے اٹھتے اور بھاپ کی سی صورت اختیار کرکے تمام صحرا کی وسعت پر چھا جاتے سورج کی تیزی اسقدر تھی کہ کسی یورپین کے خواب خیال میں نہیں آسکتی ارض و سماں کے بیچ میں آگ کے طوفان منڈلاتے پھرتے تھے۔ کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی یہ سناٹا۔ نہایت ہی خوفناک اور ناقابل برداشت تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بے انتہا وسعت، روح انسانی کی تمام تکالیف کا یک قلم خاتمہ کر دینے پر طیار ہو گئی ہے، آسمان بالکل صاف تھا بادل کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا، لو کے جھونکوں سے گرم ریت اس طرح اڑ رہی تھی جیسے سمندر میں موجیں اٹھتی ہیں، چاروں سمتیں ایک صاف باریک لکیر کی مانند چاروں طرف چمک رہی تھیں۔ جیسے تیز تلوار کی دھار

سپاہی نوجوان تھا عمر بائیس سال کے لگ بھگ تھی، امیدوں کی دنیا ابھی سرسبز نہ ہونے پائی تھی، ایسی سنسان جگہ میں عبادت کرنے کے شغل نے بھی اس کے دل کو اپنی طرف راغب نہیں کیا، پاس کے درخت کے تنے کو اسنے محبت سے بغل میں لیا۔ جیسے عید کے روز مسلمان مسلمان سے نہایت تپاک کے ساتھ بغل گیر ہوتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد وہ اسکے سایہ میں بیٹھ گیا چاروں طرف سے خوفناک نظارے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک پڑے وہ پورے زور سے چلا اٹھا۔ لیکن اس چیخ کا جواب دینے والا وہاں کوئی نہ تھا صرف پہاڑ کی آواز بازگشت اسکا منھ چڑا رہی تھی، .... اس نے بندوق کے گھوڑے پر ہاتھ رکھا ..... تھوڑی دیر بعد کچھ سوچ کر بندوق کو ایک طرف ڈالدیا اور بولا "موت سے نجات پانیکا یہ ذریعہ ہر وقت میرے قبضہ میں ہے"، وہ جس طرف نظر ڈالتا اسی طرف نیلا آسمان صحرا کی غیر محدود وسعت کو بوسہ دیتا ہوا معلوم ہوتا تھا، سنجیدگی سے وہ چاروں

طرف دیکھتا تھا۔ اور اس وحشت خیز نظارہ کو دیکھتے دیکھتے کھو سا جاتا۔ اس کے تخیل کی دنیا میں اب اس کے ملک کے نظارے تھے وہ ان سے لطف اندوز ہو رہا تھا ...... پیرس کی شیشوں کی سڑک .... سنگ مرمر کے خوبصورت بتوں کی قطاریں .... چاروں طرف سبزہ زار ہی سبزہ زار .... باغوں میں دوشیزہ حسینوں کے جھرمٹ .... حشم پین کے نشوں میں لڑکھڑا کر ادھر ادھر گھومنا .... جوانی کی پُر لطف زندگی کے واقعات تصویر کی طرح اُسکی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ ......

یہ خیال کر کے کر ریگستان کے چمکتے ہوئے ذرات سراب کی مصیبت پیدا نہ کردیں، اُس نے پہاڑ کے دوسری طرف جانیکا قصد کیا۔ دنیا اُمید پر قائم ہے، پاس کے درخت پر ایک پکے ہوئے کھجوروں کے گچھے کو دیکھ کر اُسکے اندر زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ سوچنے لگا کھجوریں کھا کر زندگی کے کچھ دن کاٹوں گا۔ پھر یا تو کوئی عربی کارواں ادھر آنکلے گا۔ یا فرانسیسی سپاہ کے حملے کے شور کو سنکر دوبارہ اپنے دوستوں میں جا ملوں گا۔ اسی اُمید پر اُس کے جسم میں جان آگئی ایک درخت کے نیچے کھجور توڑ کر کھانے لگا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ باغ رضوان کی نہروں کے شہد کی شیرینی انھیں سوکھے کھجوروں میں بھری ہوئی ہے، ایسے لذیذ پھل انسانی کاوش کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے۔ انسانی سعی کے اس خیال سے اُسکے اُجڑے ہوئے دل کے افق پر اُمید کے ستارے کی روشنی پھر تیزی سے چمکنے لگی۔

وہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ پہاڑ کے دامن میں ایک جھرنا بہہ رہا تھا، اُسکو معاً خیال ہوا کہ اسی جھرنے پر رات کو شیر اور چیتے ضرور پانی پینے آتے ہوں گے۔ اس خیال سے وہ خوف زدہ ہوگیا۔ اور اپنے غار پر دروازہ بنانے کے لئے ایک کھجور کے درخت کو کاٹ ڈالا۔ یہ وہی درخت تھا۔ جس نے صحرا کے اندر اپنے سایہ میں سپاہی کو پناہ دی تھی۔ درخت چرچرا کر دھڑام سے نیچے آرہا۔ اس کے گرنے کی آواز سے تمام پہاڑ گونج اُٹھا۔ سنسان خاموش فضا میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے موت کا فرشتہ پیغام اجل دینے آیا ہے۔ تھوڑی دیر میں اِسکے حواس بجا ہوئے۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا، دُور فاصلے پر ایک پھٹی سی کھجور کی چٹائی دکھائی دی۔ جسکو کوئی مسافر چھوڑ گیا تھا۔ سپاہی نے کھجور کے پتوں کی مدد سے سونے کے قابل بستر بنایا غار کے اندر چٹائی پر پڑتے ہی نیند نے اُس کو پھر اپنے آغوش میں لے لیا۔ ..... آدھی رات ہوئی اور ایک عجیب و غریب آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بستر پر بیٹھ گیا کچھ دیر تک آواز پر کان لگائے!

اس کی سمجھ میں ہی آیا کہ یہ کسی درندے کے سانس لینے کی آواز ہے۔ انسانی نتھنے اتنے زور کی آواز پیدا نہیں کر سکتے۔ غار میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس کے سامنے عجیب و غریب خیالی تصویریں آکر ناچنے لگیں۔ ڈر کی وجہ سے اُسکے رونگٹے کھڑے ہوگئے اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے قلب کی حرکت اب بند ہونے والی ہے۔

اندھیرے کو چیرتی ہوئی دو پیلی پیلی روشن آنکھوں نے سپاہی کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے یہ روشنی اس کی اپنی ہی آنکھوں سے نکل رہی اور غار کو روشن کر رہی ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اُن کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ آہستہ آہستہ غار کی تمام چیزیں پھر اُسے دکھائی دینے لگیں، اب اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے بستر سے دو ہاتھ کے فاصلہ پر ایک بڑا جانور پڑا سو رہا ہے یہ معلوم نہ کر سکا کہ آیا وہ شیر ہے یا چیتا ہے، یا مگر مچھ ہے پہچان نہ سکنے کی وجہ سے اُس پر اور بھی زیادہ خوف طاری ہوگیا۔ اس تنگ غار میں اس جانور کی نزدیکی سے سپاہی کی جو حالت ہوئی ہوگی اُس کا ذکر فضول ہے، وہ اب ملکوں ہوکر اس جانور کے سانس۔ لینے کی رفتار کو غور سے سننے لگا۔ ہر سیکنڈ پر اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ جانور نے اب حملہ کیا۔ خوف کی وجہ سے ہاتھ پاؤں ہلانا تو ایک طرف وہ سانس تک بھی نہ لیتا تھا۔

غار میں ایک خاص قسم کی بُو تھی۔ وہ بُو گیدڑ لومڑی اور دوسرے چھوٹے جانوروں کی بُو سے مشابہ نہ تھی۔ بو بہت تیز تھی۔ سپاہی کو اب پورا یقین ہوگیا کہ وہ کسی درندے کے غار میں پناہ گزیں ہے، ڈوبتے ہوئے چندرمان نے اپنی کرن مالا سے غار میں ایک کرن پھینکی اُس کے آجانے میں جانور کے کالے کالے بال چمک اُٹھے جانور غار کے منہ پر ایک اونچی جگہ پلے ہوئے کتے کے مانند سکڑا ہوا پڑا تھا۔ منہ سپاہی کی طرف تھا۔ جانور نے آنکھیں کھولیں پھر اطمینان سے بند کرلیں۔ اس مصیبت سے رہائی پانے کے ممکن اور غیر ممکن طریقے سپاہی کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اُسنے سوچا کہ گولی داغ دوں لیکن جانور اور اسکا درمیانی فاصلہ اس قدر کم تھا کہ ٹھیک نشانہ نہ باندھا جا سکتا تھا، ...... اور اگر جانور زخمی ہوگیا تو بس موت ہی تھی۔ خوف کی وجہ سے اُسکے ہاتھ پاؤں میں سکت باقی نہ رہی۔ اس

سنائی میں اُسے اپنے قلب کی حرکت کی آواز صاف سنائی دیتی تھی، اس آواز سے کہیں جانور جاگ نہ پڑے اور یہ اس کی نجات کے راستے میں حائل نہ ہو جائے اس کمزوری اور بزدلی کے خیال پر وہ اپنے تئیں لعنت ملامت کرنے لگا۔ اس نے تلوار پر ہاتھ ڈالا۔ پھر وہم سوار ہو گیا شاید تلوار جانور کے جبڑے کو کاٹ ہی نہ سکے، اس نے اس خیال کو بھی ترک کر دیا۔ آخر اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ صبح ہوتے ہی میدان میں اس سے دو دو ہاتھ کروں گا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہوا اور اس کی پہلی کرن نے جانور پر سے گذر کر سپاہی کو پَو پھٹنے کی خبر دی اُسے اب معلوم ہوا کہ وہ جانور اور کوئی نہیں ایک بڑے ڈیل ڈول کی شیرنی ہے، جس کا مُنہ خون میں سنا ہوا ہے، سپاہی کو ذرا تسلی ہوئی رات کو شیرنی نے شکار پیٹ بھر کر کھایا ہے اس لئے وہ علی الصباح بھوکی نہیں اٹھیگی، شیرنی انسان کا گوشت کھاتی ہے، یا نہیں رات کو اُس نے انسانی گوشت کھایا ہے یا کچھ اور؟ وہ انہیں پراگندہ خیالات میں غلطان و پیچان رہا۔

وہ شیرنی تھی اس کے پیٹ کے نیچے کے حصہ پر سفید رواں چاند کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ اور اس پر سیاہ چھوٹی چھوٹی لکیریں کھچی ہوئی تھیں۔ اسکا چمڑا اتنا نرم اور چکنا تھا کہ اس کے سامنے بیش قیمت غالیچے بھی ہیچ تھے۔ پیٹ کی طرح اس کی دم بھی کالے خطوط سے منقش تھی، ایسا دلفریب حسن جوان دوشیزہ میں بھی نہیں پایا جاتا۔

ایک پالتو بلی کی طرح شیرنی چت سو رہی تھی، تیز ناخونوں سے مزین دونوں پنجے اُس کی پیشانی پر رکھے ہوئے تھے ہونٹوں پر چھوٹے چھوٹے سنہرے بال کھڑے تھے۔ اگر یہ شیرنی پنجرے میں بند ہوتی تو سپاہی اسکے متناسب اعضاء اس کے گداز اس کی لوچ اور اس کی خوبصورتی پر شاید تمام شاعرانہ تشبیہیں ختم کر دیتا۔ لیکن آزادی کی اس فضا میں شیرنی کی نزدیکی اس کے لئے وبال جان بن گئی۔ جان کا خوف حسن کا حظ اٹھانے کی راہ میں حائل تھا، بعض ایسے خوبصورت سانپ ہوتے ہیں، جو اپنی موہنی سے جانوروں اور پرندوں کو قابو میں کر لیتے ہیں کی طرح اس سوئی ہوئی شیرنی نے سپاہی پر اپنا جادو ڈالدیا۔ اور اس کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ اگر اس سپاہی کو کوئی حکم دیتا کہ توپ کے گولے کے سامنے اپنی چھاتی کھول دو تو شاید وہ ایسا کر بیٹھتا۔ مگر اس قتالہ صنف نازک کے سامنے اُسے دم مارنے کی بھی جرأت نہ ہوئی وہ سر اراستہ ناپاک وہ بیچین ہو گیا۔ مستقبل کی تصویر اُسکے سامنے کھڑی ہو کر ناچنے لگی، شیرنی اب کھڑی ہوئی اور اس کا کام تمام کیا۔

مگر سپاہی نے پختہ ارادہ کر لیا کہ مرتے دم تک دھرم کی لڑائی لڑوں گا، اور ایک ایماندار بہادر کی طرح جان دوں گا۔ اپنے تئیں موت کے منہ میں جان کر بھی وہ قتالہ شیرنی کے بیدار ہونے کی راہ دیکھنے لگا۔

سورج نکل چکا تھا، شیرنی نے آنکھیں کھولیں اور کھڑی ہو گئی اپنی سستی اتارنے کے لئے اُسنے اپنے اعضاء کو اِدھر اُدھر کھینچا تانا۔ اس کی نیند کا خمار ابھی نہیں اترا تھا کسل دور کرنے کے لئے شیرنی نے جماہی لی۔ منہ کھلنے پر سپاہی کی نگاہ شیرنی کے تیز دانتوں اور کھردری زبان پر پڑی شیرنی اپنے خوبصورت جسم کو دوشیزہ کی سی چنچل اداؤں کے ساتھ حرکت دے رہی تھی۔ سپاہی من ہی من میں کہنے لگا، شہر کے پریزادوں کی طرح اس کا حسن بھی کس قدر زاہد فریب ہے!

بلی کی نوع کے جانور عموماً صفائی پسند ہوتے ہیں۔ شیرنی بھی آرائش حسن میں مشغول ہو گئی خون میں بھرے ہوئے منہ اور پنجوں کو اس نے زبان سے چاٹ کر صاف کیا کبھی کبھی اپنے چمکتے ہوئے ناخنوں سے پیشانی کے بالوں کو دلکش انداز سے سنوارتی اور مانگ سی نکالتی۔ فرانسیسیوں کی بہادری اور زندہ دلی دونوں ضرب المثل ہیں، خطرے کی اس حالت میں بھی اس بہادر نے اپنی قومی مردانگی اور زندہ دلی کا پورا پورا ثبوت دیا۔ اور آرائش حسن کے اس دلکش نظارے سے ایک مفکر شاعر کی طرح لطف اندوز ہوتا رہا،

سپاہی نے اب تلوار کے دستہ پر ہاتھ ڈالا اور اپنی حفاظت کے لئے طیار ہو گیا۔ شیرنی بھی اسی وقت سپاہی کی طرف دیکھنے لگی، اس کی آنکھوں میں خوفناک پاکیزگی اور معصومیت کی ادا اس جوان سپاہی کے لئے ناقابل برداشت تھی، شیرنی اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگی، سپاہی کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ دل کی کمزوری کو چھپا کر جرأت آمیز انداز سے وہ اس کی طرف بڑھا، اُس نے سوچا کہ میں قوت مقناطیسی کے عمل سے اس کو اپنے بس میں کر لوں گا، اس ارادہ سے اُس نے اپنی نگاہ شیرنی کی دونوں آنکھوں کے اوپر کے حصے پر جما دی شیرنی قریب تر آ گئی سپاہی محبت سے بے قابو ہو گیا اور شیرنی کو خوش کرنے کے ارادے سے اس کے ادھ چرا جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کمر پر ہاتھ پھیرنے سے شیرنی کو کچھ لطف سا آیا، اور وہ خوشی سے دم ہلانے لگی۔ اس کی روشن آنکھوں میں سے سختی کے اثرات دور ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں شیرنی بلی کی طرح گھر گھر کرنے لگی یہ آواز نہایت ہلکی تھی تاہم اس آواز سے

غار گونج اٹھا۔ شیرنی کے جسم کو سہلانے پر سپاہی کی زندگی کا کتنا دارومدار تھا اس بات کو سمجھنے میں اُسے کچھ دیر نہ لگی وہ خدمت کے جذبہ سے متاثر ہو کر اس مسکین اور عشرت پسند شیرنی کو حیرت اور التفات میں سرشار کرنے کے لئے منہمک ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے دیکھا کہ اُس کی نازک دل شیرنی کے چہرہ سے خونخواری اور درندگی کے نشان غائب ہورہے ہیں۔ اُس نے غار سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ پچھلی شب شیرنی کو خوب پیٹ بھر کر کھانا ملا ہے اس وجہ سے اُس کی خونخواری اور درندگی دور ہوگئی ہے اور آیا اتنی جلدی شیرنی سے دوستی ہوجانا ممکن ہے یا نہیں ان امور کا کچھ فیصلہ نہ کرسکا۔ شیرنی نے اُسے غار سے باہر جاتے دیکھا مگر سپاہی جیسے ہی پہاڑ کی چوٹی پر پہونچا شیرنی بھی جست لگاتی ہوئی کودتی پھاندتی، اُسکے پاس جا پہنچی، پیٹھ کو تان کر وہ اپنا سر سپاہی کے قدموں پر رگڑنے لگی، وہ اسقدر فطری تیزی سے پہاڑ پر چڑھی جیسے پرندہ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر جا بیٹھتا ہے،

سپاہی شیرنی کے اس انداز کو دیکھکر ہنسنے لگا۔ اور بولا "یہ تو بڑا ظلم ہے کیا تم اُٹھنے بیٹھنے بھی نہ دوگی" اس کا حوصلہ قدرے بڑھنے لگا، وہ کبھی شیرنی کی پیشانی کو کھجلاتا جسم تھپ تھپاتا۔ اور کبھی دونوں کانوں کو مروڑ کر اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا۔ اپنی کوشش کو کامیاب ہوتے دیکھکر وہ تیز خنجر کی نوک سے شیرنی کی پیشانی کو کھجلانے لگا۔ مطلب یہ تھا کہ موقع پاتے ہی سر میں خنجر گھسیڑ دے مگر ہاتھ رک گیا۔

صحرا کی فکر آج جانے میں بھولی نہ سماتی تھی۔ اب اُس کی طبیعت میں تری اور سنجیدگی زیادہ تھی۔ لال منہ کھولکر، سر کو اوپر کرکے، اپنی گردن بڑھا بڑھا کر مختلف طریقوں سے سپاہی کی رحم دلی کا اعتراف کرتی تھی، نوجوان کے دل میں پھر ایک خیال بجلی کے مانند کوندا "خنجر خوب سے پر ایک ضرب کاری اور بس شیرنی کا کام تمام" اس نے اس ارادے سے خنجر کو اُٹھایا بھی مگر اس کی قوی مردانگی اس جذبہ پر جلد ہی غالب آگئی۔ وہ اپنے خیال کو عمل میں نہ تبدیل کرسکا۔ سپاہی نے شیرنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو اُسے محسوس ہوا کہ شیرنی پر کیف اور بیخودی کی حالت طاری ہے، سپاہی اب کر ہی کیا سکتا تھا۔

اس کے دل میں ہر لحظہ خوف اور یاس کے طوفان اُٹھتے وہ ریگستان کی سرزمین کی طرف آنکھیں پھیر پھیر کر دیکھتا کہ شاید اس سراب صحرا سے کوئی معجزہ رونما ہو جس سے اُس کی رہائی عمل میں آوے پھر وہ خوفناک شیرنی کی رحم دلی پر بھروسہ کرتا۔ اور اس کے پنجوں دانتوں اور پیر کی طرف ملکی باندھ کر دیکھتا۔ اور اس سے رحم کا ملتجی ہوتا۔

تھوڑی دیر بعد شیرنی پھر سپاہی کے جوتے کو چاٹنے لگی۔ نوجوان سپاہی سوچنے لگا کہ شیرنی کو ابھی بھوک نہیں لگی ہے، جب اسکو بھوک لگے گی تو کیا صورت ہوگی! میرا بھنبھوڑا ہوا جسم خون میں لت پت اس کے قدموں میں پڑا ہوگا۔ یہ بہت خوف ہوا تاہم وہ شیرنی کے متناسب اعضا کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا اس قسم کے شیروں میں ایسا نادر نمونہ شاذ ہی نہیں، اُس کی اونچائی ڈھائی ہاتھ ...... دم کو چھوڑ کر لمبائی ساڑھے تین ہاتھ سے کم نہیں ...... اور دم بھی دو ہاتھ کی ہوگی ...... دیکھنے میں درخت کی ہلتی جلتی لمبی ڈال ...... پیچھے کا حصہ گول اور خوبصورت چہرہ پر خونخواری کے آثار مگر آنکھوں میں کیف اور بیخودی کی لہریں جس وقت وہ اپنی پتلی کمر کو لچکا کر اوپر کو اچھلتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کمان کا چھوٹا ہوا تیر آسمان کو چھیدے بغیر واپس نہ پلٹیگا ......

سپاہی بہت خوش تھا۔ شیرنی دم ہلا کر خوشی کا اظہار کر رہی تھی سپاہی نے شیرنی کی گردن کی کھال کھینچ کر اُسے اپنے پہلو میں گھسیٹ لیا اور اس سے کھیلنے لگا۔ وہ کبھی اُس کا ماتھا چومتا... کبھی اُس کی پیٹھ پر اُس کے پاؤں ڈال کر خود زمین پر لیٹ جاتا کبھی اُس کے پیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر اُسے کروٹ پلٹ دیتا۔ شیرنی بے خوف ہو کر اُس کے سامنے بیٹھتی ایک دفعہ سپاہی اُس کے پنجوں کے بالوں کو تھپ تھپانے لگا۔ شیرنی نے اُسی وقت اپنے ناخن اندر کھینچ لئے کہ مبادا اُس کے عاشق کے کھر دنچ لگ جائے۔ سپاہی کے دل میں پھر خیال آیا کہ موقع پاکر اُس کے پیٹ میں چھرا کیوں نہ گھسیڑ دے لیکن اس خوف سے کہ شیرنی اس کے اوپر گر کر اس کا کام تمام نہ کردے۔ وہ اس فعل سے باز رہا۔ ایک بے قصور جاندار کو مار ڈالنے کا فعل اُسے مذموم معلوم ہوا۔ اس سنسان صحرائے اعظم میں شیرنی سے وہ ایک دوست کی قربت کا لطف اُٹھا رہا تھا اب تک اُسے ایک واقعہ یاد آگیا اُسکی پہلی معشوقہ بڑی سخت کلام اور ترش رو تھی۔ مذاق میں اُس نے اسکا نام "معری" رکھ لیا تھا اُس نے ارادہ کرلیا تھا کہ وہ اس حسین شیرنی کو بھی "معری" کے نام سے پکارا کریگا۔ سارے دن اُسے معری کے نام سے پکارنے کے بعد میں لگا رہا اور شام کو اس حد تک کامیاب ہوگیا کہ گلا بھاری کرکے وہ جب شیرنی کو "معری" کے نام سے مخاطب کرتا تو شیرنی اُس کی طرف دیکھنے لگتی۔

مگر سپاہی اپنی رہائی کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا۔ ایک موقع ہاتھ آتے ہی وہ دریائے نیل کی طرف بھاگا۔ لیکن وہ آدھے میل بھی نہ گیا ہوگا کہ اُس نے مڑ کر دیکھا کہ شیرنی شور مچاتی ہوئی پیچھے پیچھے دوڑی چلی آرہی ہے،

بہت سی طبیعتوں کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ آخری دم تک وہ جنسی مذاق کرنے سے نہیں چوکتے۔ سپاہی بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ شیرنی کو دیکھکر کہنے لگا جان من میرے بغیر تمہارا دل نہیں لگتا۔ آؤ ایک بوسہ تو دیدو۔ سپاہی یہ باتیں کر رہا تھا۔ کہ وہ اچانک ایک ریتیلے گڑھے میں گھس گیا۔ صحرا میں سفر کرنے والوں کو یہ معلوم ہے کہ مسافر کے لئے یہ مصیبت کچھ کم خطرناک نہیں جو مسافر ایک دفعہ اس میں پھنسا اُس کی رہائی مشکل ہے، نوجوان سپاہی ریت میں دھنسا جا رہا تھا، اپنے تیں ڈوبتے ہوئے دیکھکر وہ خوف سے چلّا پڑا عین اُسی وقت شیرنی بھی وہاں آ پہونچی۔ ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہ کرکے وہ نوجوان سپاہی پر کود پڑی اور دانتوں سے اس کی وردی پکڑ کر ایک جھٹکے سے اُسے باہر پکڑ کر پھینک دیا یہ کام چشم زدن میں ہو گیا سپاہی نے شیرنی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور بولا آج سے تمہارا اور میرا زندگی بھر کا ساتھ رہیگا، وہ شیرنی کو ساتھ لیکر غار میں واپس آگیا۔ صحرا کی سرزمین اس دن سے اُسے سنسان معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اسے اب شیرنی کی صحبت میں خوشی معلوم ہونے لگی جس طرح کتا مالک سے کھیلتا ہے اسی طرح شیرنی بھی سپاہی کے ساتھ کھیلنے لگی، کبھی کبھی سپاہی اُسے جھڑک کر علیحدہ کر دیتا۔ لیکن خفا ہونا تو درکنار شیرنی اگلا پنجا اُٹھا کر اپنے پچھلے دونوں پاؤں پر کھڑی ہو جاتی اور اپنی حرکتوں اور چہرے سے اس بات کا اظہار کرتی کہ جیسے وہ سپاہی کو کھیلنے کے لئے دعوت دے رہی ہے،

وقت گذرتا گیا۔ صحرا میں صرف شیرنی اور سپاہی رہتے تھے، وہ ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اُٹھاتے تھے۔ ریگستان کی دلچسپیاں اور خوبصورت نظارے ان کی تفریح کا سامان تھے۔ سپاہی کے لئے زندگی ایک معمّہ بن گئی تھی، اسکا تخیل اب حد اور فاصلے سے پرے کی سیر کرتا تھا، کھانے پینے کی چیزوں کی اُسے کمی نہ تھی، اب وہ امید اور ناامیدی خوشی اور ناخوشی رنج اور تکلیف کے سے متضاد جذبوں کی جنگ و جدل کا شکار نہ ہوتا تھا، اس فضا میں اسے خوشی اور آنند محسوس ہوتا تھا، تنہائی اور خاموشی کے پنہاں اور پاکیزہ جلوے اب اس کے حضور میں رقص کناں تھے، شفق کی رنگینیوں کے پاکیزہ نقش و نگار اس کے دماغ پر اپنا یزدانی عکس ڈالتے اور سپاہی کیف اور بیخودی کے سمندر میں غوطے کھاتا ہوا اپنی پیاری شیرنی کو بغل میں دبائے عالم تخیل میں معلوم نہیں کہاں کہاں پہونچ جاتا۔

ریگستان میں جانور بھی بہت کم اڑتے نظر آتے ہیں، اگر اتفاق سے کوئی جانور آ بھی جاتا۔ تو سپاہی کو اُسکے اُڑنے کی سنسناہٹ سنائی گذرتی اور وہ بیچین ہو جاتا۔ دن کے سناٹے میں وہ دیکھتا کہ مختلف اطراف سے رنگ برنگ کی بدلیاں خوشنما کپڑوں اور زرد جواہر میں لدی ہوئی پریوں کی طرح آسمان میں آ کر ایک دوسرے کے گلے مل رہی ہیں،

رات کے وقت چاند کی روشنی میں سپاہی ریگستان کے بحر ناپیدا کنار کے اندر روشن اور چمکیلی ریتیلی لہروں سے لطف اندوز ہوتا اور اُس عجیب غریب سناٹے کے اندر وہ ناقابل بیان مسرت میں ڈوبا ہوا سا رہتا تھا،

صحرائے اعظم کے قدرتی نظاروں کی خوبصورتی میں وہ اپنی ہستی کو بھول بیٹھا۔ ریگستان کے اندر آندھی بھی آتی تھی وہ دیکھتا کہ پانی اور بھاپ سے مختلف اور کہر سے ملتے جلتے، چکر کھاتے ہوئے ریت کے بگولے بادلوں کی صورت میں چاروں طرف قیامت کا نظارہ پیدا کر رہے ہیں، اس قسم کے طوفان کے بعد رات کی خنک فضا اُس کو بہت ہی رُوح پرور معلوم ہوتی تھی، تاروں بھرے کھلے آسمان کے نیچے قدرت کے کشادہ اور عظیم الشان سنگیت محل میں سپاہی اپنے تخیل کی مدد سے آسمانی راگ سنا کرتا تھا،

تنہائی چاروں طرف صرف تنہائی تھی جس نے اس میں صرف غور و فکر کا مادہ پیدا کر دیا تھا، عالم تخیل میں وہ اپنی گذشتہ حالت کا موجودہ زندگی سے مقابلہ کرتا اور اس کی یاد میں محو ہو کر وہ اس کیف آفریں فضا میں گھنٹوں صرف کیا کرتا۔

آہستہ آہستہ شیرنی سے اسکو از حد محبت ہو گئی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس سنسان جگہ میں بغیر محبت کے زندگی کے دن کاٹنا محال تھا۔ یا تو سمجھ لیجئے کہ انسان کی قوت ارادی کی وجہ سے شیرنی کی درندگی اور بہیمیت میں کچھ فرق پڑ گیا تھا یا خوراک کی افراط کی وجہ سے شیرنی نے سپاہی کی جان لینے کی کوشش نہیں کی، ادھر نوجوان سپاہی نے بھی محسوس کیا کہ جوں جوں شیرنی اس سے مانوس ہوتی جاتی ہے وہ ذاتی حفاظت کے لئے کسی قسم کے ذرائع استعمال نہیں کرتا۔ اس کو زیادہ دیر تک سونے کی بھی عادت ہو گئی تھی، اور وہ ہمیشہ اُس وقت اُٹھتا تھا جب شیرنی غار سے باہر چلی جاتی تھی۔ اس خیال سے کہ مبادا کوئی آدمی اس کو اس مصیبت سے چھڑانے کا ارادہ کرے۔ اور واپس چلا جاوے۔ سپاہی نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص جھنڈی کی صورت میں کھجور پر لٹکا دی تھی اور اس کی دونوں آستینوں کو ہوا میں پھیلا کر

کو کمزور کر دیا تھا، جب ناامیدی کے بادل اُسے چاروں طرف سے گھیر لیتے تو سپاہی دل بہلانے کے لئے شیرنی کے ساتھ کھیلتا تھا، اب دونوں ایک دوسرے کے جذبات کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے شیرنی کے دیکھنے کے انداز اس کی آواز کی درشتی اور لوچ اُس سے کچھ بھی چھپا نہ تھا۔ اس کے زرد و نرم چمڑے پر جتنے بھی نقش و نگار تھے وہ سب اُس کے لوح دل پر منقوش ہوگئے تھے۔ شیرنی کے سیاہ و سفید نشانوں کو گننے کے لئے وہ اس کی دم کو اوپر اٹھاتا تا شیرنی ذرا بھی غصہ نہ کرتی، اس کا خوبصورت کشادہ۔ دلفریب حسن جسمانی لوچ، اور ایسے چاندی کے سے رنگ سفید دانتوں کو دیکھکر وہ گم تو ہوتا تھا۔ لیکن جس چیز پر سپاہی ہزار جان سے عاشق تھا، وہ شیرنی کی چستی و چالاکی پھرتی اور بانکپن تھا، کودنے درخت پر چڑھنے جسم کو صاف کرتے وقت شیرنی ایسی ایسی دلکش اداؤں کا اظہار کرتی کہ سپاہی ریشہ خطمی ہوجاتا، وہ کتنے ہی روز کو دتی پھاندتی ہوئی آتی۔ مگر اپنا نام سنکر فوراً خاموش کھڑی ہوجاتی،

ایک دن بہت بڑا پرند پہاڑ کی دوسری طرف سے اڑتا ہوا آیا سپاہی اس پرند کو دیکھنے کے لئے کچھ دور چلا گیا۔ شیرنی بے چین ہوگئی وہ غصے سے گرجنے لگی اس کی نگاہ میں تیزی آگئی۔ سپاہی نے سوچا اس کا حسد کم نہیں ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کسی حور نے شیرنی کے قالب میں جنم لیا ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ بڑا جانور آسمان میں غائب ہوگیا، سپاہی ہنستا ہوا واپس لوٹا۔ اور شیرنی کے سڈول جسم کی تعریف کرنے لگا۔ دوپہر کی تیز روشنی کی چمک سے اس کے زرد چمکتے ہوئے چمڑے اور کالے گلدار نقوش پر عجب سماں پیدا ہوگیا، نوجوان سپاہی کے لمس کو محسوس کرکے شیرنی کے جسم میں ایک پھریری سی دوڑ گئی۔ شیرنی نے معشوقانہ انداز میں سپاہی پر نظر ڈالی اس نگاہ میں کتنی تیزی اور کتنا سوز تھا، .... یہ دیکھ کر سپاہی نے آنکھیں بند کرلیں، سپاہی اسکے جسم کو دبا کر بولا۔ کون کہتا ہے کہ اس میں انسانی روح کارفرما نہیں ہے، سپاہی پر اب بیخودی سی طاری ہوگئی تھی،...... وہ سوچنے لگا ریگستان کی رانی بالکل ریگ کے ہم رنگ ہے... اسکے بال ریگ کی طرح بکھرے ہوئے ہیں،...... ریگ کی سی ان میں چمک ہے،..... اور ریگ کے مانند ہی یہ تیز مزاج بھی ہے!

بیوی بولی زیادہ شاعری نہ بگھارو۔ بس یہی تمہاری منطق جانوروں میں بھی محبت کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ بات مجھے پہلے ہی سے معلوم ہے تم نے کون سی نئی بات بتادی۔ اب آپ صرف اتنا اور بتا دیجیے کہ اُن کی محبت کا کیا انجام ہوا۔

میں نے جواب دیا۔ ہوتا کیا وہی ہوا جو گہری محبت کرنیکا بالعموم انجام ہوا کرتا ہے، ہاں نہ ایک نے دوسرے پر بھروسہ نہیں کیا۔ ممکن ہے اس بے اعتباری کی کوئی بنیاد نہ ہو مگر صاف دلی سے جو بات ظاہر ہوجاتی ہے وہ دونوں کی بیوقوفی سے صاف ظاہر نہ ہوسکی، آخر میں صرف ایک کی بیوقوفی سے دونوں میں ہمیشہ کے لئے جدائی ہوگئی۔

میری بیوی نے پوچھا "کیا ذرا سا رنج پیدا ہونیکے بعد پرانے تعلقات پھر قائم نہیں ہوسکتے، اور کیا یہ خلا کبھی پر نہیں کیا جاسکتا؟ خیر ان باتوں کو تو چھوڑو اپنا قصہ جلدی سے ختم کرو۔

میں نے کہا کہ سپاہی نے ذکر کیا کہ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ کھیلتے کھیلتے میرے ہاتھ سے بغیر کسی ارادہ کے شیرنی کو کچھ چوٹ لگ گئی۔ شیرنی کے زیادہ چوٹ لگی تھی یا نہیں یہ مجھے معلوم نہیں لیکن میں نے دیکھا کہ شیرنی نے غصہ میں آکر میرا پاؤں پکڑ لیا۔ اُس نے آہستہ سے ہی پاؤں پکڑا تھا مگر اس خوف سے کہ شیرنی مجھے مار نہ ڈالے میں نے اُس کی گردن میں خنجر اگھسیڑ دیا۔ زخم کھاتے ہی وہ الٹ پڑی اور ایسے لہجہ میں بین دبکا کرنے لگی کہ جس کو سنکر میری چھاتی پھٹی جاتی تھی، وقت نزاع وہ مجھے محبت سے دیکھنے لگی، میرے دل کی حالت ناقابل بیان تھی اگر میں اپنی جان دیکر اُسے زندہ رکھ سکتا تو کبھی گریز نہ کرتا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں قتل عمد کا مجرم ہوں میری پھٹی ہوئی قمیص کی جھنڈی کو دیکھکر جب مجھے سپاہی لینے کے لئے آئے تو بھی میری آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں تھا۔

بڈھا سپاہی کچھ دیر تک جذبات کے طوفان میں ڈوبا رہا پھر کہنے لگا جناب میں دنیا کے مختلف مقامات میں گھوما ہوں اور اپنے اس ناکارہ جسم کو باندھے باندھے پھر رہا ہوں میں نے انگلینڈ جرمنی روس اسپین فرانس امریکہ چین جاپان اور ہندوستان کی بھی خاک چھانی ہے، لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ ریگستان کی سی قدرتی خوبصورتی کسی اور خطے میں نظر نہیں پڑی میں نے پوچھا وہاں آپ کو کیا محسوس ہوتا تھا یہ بات ذرا صاف صاف بتائیے۔ بڈھے سپاہی نے کہا آپ ابھی جوان ہیں بیوی کی زلف پریشاں میں اُلجھے رہتے ہیں یہ نکتے میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں مجھے صرف کھجور کے درخت اور شیرنی کے کھو جانے کا رنج نہیں ہے مجھے ملی ہے تو صحرا کی تنہائی۔ اسکی خاموشی اور اسکے سکوت کو کہ جانیئے۔ صحرا کی خوبی یہی ہے کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہے اور پھر سب کچھ ہے میں بول اٹھا یہ کیسے میری سمجھ میں کچھ نہ آیا وہ بڈھے سپاہی نے ذرا بگڑکر جواب دیا کیا آپ [illegible] سمجھے تمہارا دماغ خراب ہے، وہاں انسان کی صورت تو دیکھنے میں نہیں آتی مگر عالم تنہائی میں کائنات قدرت کی کتاب ہر لمحہ زندگی کی گتھیاں سلجھانے میں [illegible]

کشاکشِ حیات

نہ چھیڑو مجھے، اک نیا ساز ہوں میں — کہ ٹوٹے ہوئے دل کی آواز ہوں میں
کبھی چین مجھکو گھڑی بھر نہ آیا — کہ قدرت نے تھا سنگِ غلطاں بنایا

بہ ظاہر خموشی، بباطن فغاں تھا — نفس شمع کی طرح شعلہ فشاں تھا
کرے کوئی کیا یہ مرض ہی نیا ہے — کہ بے آگ بستر پڑا جل رہا ہے
زمانے کو ہر طرح سے میں نے پرکھا — مگر کوئی اپنا نہ پایا نہ پایا
کیا عشق تو اس کا حاصل نہ دیکھا — کوئی پیار کرنے کے قابل نہ دیکھا
بنایا جسے یار، اغیار نکلا — جسے پھول سمجھے، وہی خار نکلا
ضرر کے سوا کچھ بھی ملتا نہیں ہے — درندوں کا جنگل ہے دنیا نہیں ہے

تلاطم ہے یہ زندگانی نہیں ہے
یہاں آگ ہے آگ پانی نہیں ہے

(افسر الشعراء) آغا شاعر قزلباش

دو خط اُن کے نام

شریف، پریمی

"اَب میری بپتا بیاں مشہورِ دوراں ہوگئیں"........؟

۶۸۴

الہ آباد - ۳ مارچ

نکہت! عزیزہ

دو ماہ خط ملا - اس کے ہر لفظ سے ایک محبت، ایک انس سا ..... کچھ عجیب بھولاپن، ایک سادگی سی .... ایک جذبہ اور اُمنگ سی ٹپک رہی تھی، میں نے اسکو پڑھا - ایک بار نہیں اکئی بار! میرا دل زور زور سے اُچھلنے لگا میرے دل و دماغ پر خوشی، انبساط، اور سکون کی بارش ہونے لگی،

نکہت! تم شاید جانتی نہیں کہ میں خدا کی ہر شے میں ہر انسان ... مرد - بوڑھے بچے اور خصوصاً عورت! ...... ماں عورت ہی جو قدرت کی بہترین شے ہے - جو مجسمۂ محبت ہے - جو تصویرِ احساس، موجِ بیقرار ہے - اور جو صرف اسی لئے پیدا کی گئی کہ اس سے محبت کی جاوے اور وہ خود محبت کرے .... میں ہمیشہ محبت کا جویا، متلاشی اور متمنی رہتا ہوں میری روح کے دو حصے ہیں، ایک تو "میں" دوسرا محبت! میری روح اس دوسرے حصے کی جستجو میں پھڑ پھڑاتی ہے - جگہ جگہ بھٹکتی پھرتی ہے، عقل خیال اور حس! ہر چیز کے ذریعہ سے تلاش کرتی ہے، اگر کہیں محبت کا ذرا سا شائبہ بھی نظر آتا ہے، تو میری روح مسکرا اٹھتی ہے، ایک انگڑائی لیکر ایک انقلاب انگیز کروٹ لے لیتی ہے، میں ایک لمحہ کے لئے دنیا و مافیہا کو بھلا کر اسی شے کے تصور میں کھو جاتا ہوں اُسکو گلے لگا لگا کر چوم چوم کر چمٹاتا ہوں - پیار کرتا ہوں!

محبت بے نیاز کے اس پاک معصوم جذبے کو روحانی - سادی، اور غیر فانی سمجھکر گھنٹوں اس کی پرستش کرتا ہوں، میں ہمیشہ اسی کا بھوکا - اسی کا پیاسا رہتا ہوں - شاید یہی زندگی کا مقصد - میری حیات کا مفہوم اور میری ہر کاوش - ہر جستجو کا منشا یہی ہو -

تو ہاں! نکہت! اچھی نکہت! تمہارا خط مجھے مل ہی گیا، میں نہیں بتا سکتا - کہ اس نے مجھ پر کیا اثر کیا؟ "اس میں کیا تھا؟" ...... شاید تم کہو! ..... تم نہیں سمجھ سکتیں،

تم کو نہیں معلوم تم نے کیا کہا - اور کیا لکھ دیا - جذبات کو سمجھنے کے لئے حساس ترین جذبات کی ضرورت ہے - میری اچھی نکہت! میں چاہتا ہوں کہ کاش تم تعلیم حاصل کرتیں، جذبات کو سمجھنا اور ادا کرنا جانتیں - خیالات کی ترجمانی کرتیں تو تمہارے یہی خاموش - سادہ جذبات تم کو ایک شاعرہ - ایک مصورہ - ایک خاموش مغنیہ - ایک ادیب - اور خدا جانے کیا کیا بنا دیتے - دنیا تمہارے جذبات کا احترام کرتی - داد دیتی، لوگ تمہاری پرستش کرتے ...... مگر! شاید اس وقت تمہارا یہ بھولاپن - یہ سادگی - یہ دلفریب خاموشی اور معصومیت باقی نہ رہ جاتی، تم ایک قابل ہوشیار - واقف کار - ادیب ہو جاتیں - کوئی خاص طرزِ ادا پیدا ہوتا، شاید قدرت کو بھی تمہاری یہی ادا پسند آئی - اس نے تم کو سادہ ترین معصوم اور بھولا ہی بنائے رکھنا زیادہ مناسب سمجھا - قدرت کے کھیل بھی عجیب ہوتے ہیں،

نکہت! تمہارے خط کو آئے ہوئے کئی دن گذر چکے، میں نے جواب نہیں دیا - تم تو ناراض ہو گی؟ روٹھ گئی ہو گی؟ میں جانتا ہوں -

جس وقت تمہارا خط ملا۔ میں جواب دینے لگا۔ مگر میرے جذبات میں ہلچل مچ گئی۔ ایک طوفان آگیا، تصورات کی گھٹائیں چھاگئیں تخیلات برسنے لگے محبت چمکنے اور گرجنے لگی، افشائے راز ہونے لگا۔ میں برداشت نہ کرسکا۔ "اُٹھ کھڑا ہوا۔ ،، پھر کسی وقت " کے لئے چھوڑ دیا۔ مگر نگہت! میری اب بھی ہمت نہیں پڑتی۔ میں ڈرتا ہوں، مجبور رہوں،

تم ایک دوشیزہ اور .... کنواری ہو! میری ہم عمر! معصوم ہو اور۔ سادہ لوح بھی . . . . اور خدا جانے کیا کیا ہو!! میں ایک انسان مرد...... انسان ہوں۔ میرا دل حسّاس! انتہائی حسّاس! ہے ذرا سی جنبش کر جذبات بھوٹ پڑتے ہیں، میں نہیں جانتا کیا کہتا ہوں۔ کیا سمجھتا ہوں! دنیا مجھے کیا کہتی ہے،! ممکن ہے تم بھی میرے دلکو نہ سمجھ سکو۔ میرے خیالات تم کو برہم کردیں، تم ناراض ہو جاؤ۔ تمہاری معصومیت اسکی متحمل نہ ہوسکے .... پھر میں اور تم دونوں ایک قدیم خاندان کے فرد! تمہارے والد بہت کافی قدامت پرست! شاید بلکہ یقین ہے۔ وہ ہرگز میرے خیالات کو گوارا نہیں کرسکتے، میرا نظریہ میرا تخیل، اُن کی شریعت کے خلاف! میرے الفاظ و جذبات کو وہ کیا جانیں؟

نگہت! میں تو وارفتہ مزاج ہوں، خدا جانے کیا کہتا ہوں، اور کیا چاہتا ہوں!! تم تو شاید پاگل ہی کہو گی۔ اِسی لئے میں اکثر چاہتا ہوں کہ تم کو خط نہ بھیجا کروں میں نہیں چاہتا تھا کہ تم پر اسکا کوئی برا اثر پڑے۔ تم کو کوئی کچھ کہے، تم غمگین ہو۔ یا تم خود ہی میری باتوں کا برا مانو.... . ... تم تو مجھے خط بھیجا کرو۔ اور خوب بھیجا کرو۔ مگر! للہ مجھ سے جواب کے لئے نہ کہا کرو۔

تمہارا خط میرے لئے ایک نئی زندگی۔ نئی روح۔ نیا دل۔ نئی دنیا پیدا کر دیتا ہے، تم میرے تخیلات کی دنیا ہو، تصورات کی تصویر۔ زندگی کی "نظم" اور میرے نغموں کا ترنم ہو۔ میری شاعری کا مفہوم اور افسانوں کی جان ہو، تمہاری تحریر گفتگو سے،! تمہارے معصوم تصورسے چند لمحوں کے لئے میرا خاموش۔ بے کیف بھنور میں۔ آہستہ آہستہ بہتا ہوا دریائے حیات زور زور سے لہریں لینے لگتا ہے، میرا دل ودماغ جو ایسے سیلاب کا منتظر رہتا ہے، ڈوبتا اُبھرتا کہیں کا کہیں جا نکلتا ہے، میری روح مسکراتی ہے۔ اور پانی میں غوطے لگا لگا کر نکھرتی چلی آتی ہے، "میں" بے کس! فانی! انسان خاموش بیٹھے بیٹھے ان سب کو دور! بہت دور! سے تکا کرتا ہوں!......!!

شاید اب تو تم سمجھ سکو کہ تمہارا خط میرے لئے کیا چیز اور کتنا اہم ہے، سمجھیں تم؟ تمہارا خط نہ بھیجنا گویا میرے جذبات کا خون کرنا ہوگا؟ لیکن! میرا خط تمہارے لئے بالکل غیر اہم اور بیکار! اس لئے نگہت! میری بھولی بھالی نگہت! تم میرے کہنے پر عمل کرو!!!

اے ہاں نگہت! کل تو عید ہے۔ دل چاہتا ہے کہ تم سب کو کوئی تحفہ پیش کرے۔ مگر! میں یہاں اور سب وہاں! اس لئے یہی کافی ہے کہ کہدوں "عید مبارک" .... مگر یہ تمہارے لئے نہیں۔ تم سب سے بھولی ہو۔ تمہارے لئے تحفہ بھی کوئی چیز، چھوٹی سی کم قیمت سی، مگر سب سے زیادہ خوشنا چیز! جانتی ہو وہ کیا؟ شاید نہیں! تمہارا خیال بھی وہاں نہ پہونچیگا۔! اچھا تو وہ ہے........ سرخ! سرخ! نازک سا۔ نازک ترین! خوشنا۔ معطر حساس! خوبصورت۔ تمہاری طرح شگفتہ! .....کیا!.... پھول! شبنم کی طرح موتی .... مگر سرخ موتی.... ٹپکاتا ہوا! ... گلاب!! زندگی کا ماحصل...... ! عید کا تحفہ کسی کی نظر!

اچھا لو رخصت! رات بہت گزر چکی۔ فضا خاموش ہے۔ قدرت زور زور سے سانس لینے لگی۔ سائیں سائیں کی آواز آرہی ہے۔ میں! فانی! ہوں۔ فانی! میری فنائیت اس سے ڈرتی ہے!...... میں اب جلدی سے سوجاؤں!! اور غفلت کے دریا میں اپنی روح کو بھٹکنے دوں!...... ہماری فطرت یہی ہے

شریف "پریمی"

(۲)

ایک آرزوئے محبت کا خواب دیکھا تھا
اب اسکی یاد بھی دل سے بھلا رہا ہوں میں...!!

لہ۸۶ء

آرہ آباد ۱۵ مارچ

میری نگہت!

دعا اور پیار خط ملا۔ تم کو خط بھیجکر میں جواب کے لئے تڑپ رہا تھا ایں کا بری طرح منتظر تھا۔ میں کسی چیز کا بھوکا اور پیاسا تھا، جو تمہارے خط سے ملی!....

اخلاوہ آہی گیا۔ مگر! جو میں چاہتا تھا وہ نہ پاسکا جس کی تمنا تھی وہ نہ مل سکی، میری تشنہ لبی نہ گئی۔ تسکین روح مل نہ سکی، آخر دل کی آرزو گھٹ کر رہ گئی۔

خیر! ۔ ۔ ۔ ۔ انسان کیا کچھ نہیں چاہتا! مگر اس کی کتنی آرزوئیں پوری پیدا ہوتی ہیں؟ اور کتنی پوری ہونے سے پیشتر ہی ناامیدی کے تاریک غار میں نہیں گرجاتیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

لیکن تم پریشاں نہ ہونا۔ تمہاری اس میں کوئی خطا نہیں۔ خدا کی قدرت اور دنیا کا دستور ہی یہی ہے، میں تو خدا جانے کیا کیا کہتا ہوں۔ میری آرزوؤں کی کوئی حد ہی نہیں، تم آخر میری کس کس آرزو کا خیال رکھوگی؟ اور میں تمہیں کیا کیا لکھوں گا! تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہمدردیاں کیں، کیسی کیسی محبت نوازیاں کیں؟ مگر میری حسیات و کیفیات محدود نہ ہوسکیں۔ میری اضطرابیاں میرے جذبات بڑھتے ہی رہے، شاید اُن کی کوئی انتہا ہی نہیں،!!۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم آخر کب تک اُن کی ناز برداریاں کروگی؟ یہ تو روز بروز بڑھتے ہی رہیں گے، تم آخر ایک دن تھک جاؤگی، مجھ سے اُکتا جاؤگی، پھر تو میں برباد ہو جاؤں گا، کہیں کا نہ رہوں گا، محبت کی تنگ گزار گھاٹیوں میں اکیلا بھٹکتا پھرا کروں گا، نہ کوئی رفیق ہوگا نہ کوئی ہمدم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی تو ابتدا ہے۔ تم مجھے یہیں سے چھوڑ دو۔ تنہا چھوڑ دو۔ تاکہ کوئی اُمید ہی باقی نہ رہ سکے، یہاں میں اکیلا رہ جاؤں، بس میں ہوں اور کسی کا چمکتا ہوا لرزاں تصوّر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !! کسی کی یاد میں اپنے نغمات

پریم کی نیّا چلی جل میں   چھوٹی سی نیّا چلی جل میں۔ موری

پریم کا ساگر۔ پریم کی نیّا   پریم مسافر۔ پریم کھوّیا۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ نیّا ہمیشہ چلی جل میں۔ ۔ ۔ ۔ موری چھوٹی

۔۔" گا گا کر فضا کو مخمور کر دوں۔

سنتی ہو؟ نگہت! اب میرے جذبات تجاوز کرنے لگے۔ میں تمہیں جانے کیا کیا لکھنا چاہتا ہوں؟ میں ڈرتا ہوں کہ نہ معلوم کیا کہہ جاؤں۔ اس لئے میں نے عہد! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں عہد کر لیا ہے کہ تم کو اب خط نہ بھیجوں گا۔ کب تک؟ نہیں معلوم۔ کامیابی ہو یا نہ ہو۔ دل مانے یا نہ مانے۔ مگر میں کوشش کروں گا۔ الٰہی میرا خیال ارادہ باعمل کردے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں، ضرور کردے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں زیادہ بڑھنا نہیں چاہتا؟ مجھ میں اتنی پرواز کہاں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم کو بھول جاؤں!! بھول جاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بہت بڑھ گیا۔ تمہارے لئے یہ مناسب نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھ کو بھول ہی جانا چاہیئے۔ میں بھلا دوں گا۔ ضرور بھلا دوں گا۔ تاکہ! تم بھی مجھے بھلا سکو۔ میری یاد، یا خیال تمہارے نازک دل سے محو ہو سکے۔ تم مجھے اپنی سادگی۔ معصومیت کا مستحق نہ سمجھ سکو۔ میرے جذبات کی کشمکش سے تمہارا سوتا ہوا فتنہ بیدار نہ ہو سکے۔ میری تڑپتی ہوئی بیقرار روح کی تپتی ہوئی گرمی سے تمہاری پاک، معصوم اور شگفتہ روح پژمردہ نہ ہو سکے۔ تم تو پاک ہو، یا معصوم ہو، تمہاری روح ابھی ابتدائے شباب کے خواب آگیں آغوش میں پڑی سو رہی ہے مگر میری روح اس کیف پرور اور سرور آگیں خواب سے خدا جانے کیوں اتنی جلد بیدار اور بُری طرح بیدار ہو گئی؟ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری روح بھی اس طرح جاگ کر بیقرار ہو جائے اور میری طرح تڑپنے لگے۔ جب تک یہ خرامِ ناز میں انگڑائی نہ لے۔ اچھا ہی ہے، یہ سکون پھر کہاں؟ اس لئے میری نگہت! تم للہ میرے جذبات سے متاثر نہ ہو۔ تم مجھے بھول جاؤ میں بھی تم کو بھلا ہی دوں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید تم یقین بھی کرلوگی!

نگہت میری دلنواز! دیکھو۔ ابھی یہ سب کچھ اتنا مشکل نہیں جتنا کہ ہونیوالا ہے۔ ہم تم دونوں ابھی اُٹھ کر پریم کے سمندر کی طرف چلے ہی ہیں۔ میں آگے آگے ہوں۔ اور تم پیچھے پیچھے۔ جس وقت ہم تم برابر آگئے اور اس خوبصورت حسین بحر بیکراں کے کنارے ہو چکے۔ تو پھر وہاں سے لوٹنا بالکل ناممکن اور خلاف فطرت ہوگا۔ دنیا اور اس کی تمام قوتیں بھی اگر زور لگائیں گی تب بھی ہم ایک قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتے، ہم ہمیشہ کے لئے اس سمندر میں کود جائیں گے، بہتے بہتے ہم کہیں دُور! بہت دُور نکل جائیں گے، اس کی تیزی اس کے زور و شور اس کی سیلابی موجوں میں "میں" اور "تم" دونوں ہمیشہ کے لئے گم ہو جائیں گے۔ ہماری پاک نکھری ہوئی روحیں ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائیں گی، اور ایک دوسرے میں فنا ہو کر غیر فانی ہو جائیں گی، محبت و عشق کے ترانے گائیں گی، آسمان پانی ہوا۔ اور بادلوں میں اُڑتی پھریں گی نہ "میں" ہوگا نہ "تم"! نہ مجاز ہوگی نہ حقیقت۔ نہ ناز ہوگا نہ نیاز۔ ایک نیا سنسار ہوگا۔ محبت ہی محبت ہوگی، ساری کائنات۔ محبت سے معمور اور مخمور ہوگی۔ حد نظر تک محبت ہوگی، روز و شب، صبح و شام محبت ہوگی۔ محبت برسے گی۔ محبت اُگے گی۔ محبت چمکے گی، محبت گرجے گی! جگت میں پریم ہی پریم ہوگا۔ یہ سب ہمارا پریم نگر، ہماری دنیا ہوگی، ہم ہی اس کے خالق اور ہم ہی اسکے مخلوق ہوں گے۔

مگر! وہاں تک پہونچنا؟ انسان! اور فانی انسان کا کام نہیں۔ اس راستے پر دوڑتے سب ہیں مگر پہونچا کون؟ راستے کے مرغزاروں کی دقتی، فریبی اور دنیا دی دلکشی ہماری فنائیت کو محو کر لیتی ہے۔ فانی انسان! سادہ لوح انسان!

بن مادھی خوشنما باتوں کی سیر میں دو چار گھڑیاں گزار کر کچھ لمحوں کے لئے خوش ہو لیتا ہے اور اپنے مطمع نظر، مقصد زندگی کو بھول کر فنائیت اور تاریکی کے عمیق غار میں گر جاتا ہے ...... وہاں تک پہونچنا آسان کام نہیں، نگہت! کیا معلوم؟ ہم بھی دوڑیں۔ دوڑتے دوڑتے ہم بھی اسی غار میں کود پڑیں اور بجز تاریکی، سیاہ بختی کے اور کچھ نہ پاسکیں۔ تم معصوم ہو۔ تمہارے جذبات پاک اور خوابیدہ! اچھا ہے۔ اس فتنہ کو جب تک ممکن ہوسکے سونے دو۔ سونے دو!! میری روح کی بھڑکتی ہوئی آگ سے دور رہو۔ اس سے بچو۔ اپنی شستگی کو پژمردہ نہ ہونے دو۔ مجھے بھول جاؤ۔ اور مجھے بھول جانے دو۔!

یہ دنیا ہے! دنیا اسی کو کہتے ہیں!! .... میرے خوابوں میں بسنے والی! مجھے بھول جا! بھول جا! .... یاد نہ آ! میں انسان ہوں! فانی اور مجبور!

"چاروں طرف چھایا اندھیارا۔ سوجھت ناہیں دور کنارہ
تھر تھر کانپے منوا تہارا۔ کیوں اتنی من کی کمزوری
یہ نیا ہمیشہ چلی جل میں موری چھوٹی سی نیا چلی جل میں موری۔
.... پریم کی نیا چلی جل میں
ہاں .. پریم کا ساگر پریم کی نیا پریم مسافر پریم کھویا۔"

نالۂ مجروح

خوب سامان مکمل ہوئے بربادی کے
رہنما جن کو سمجھتے ہیں وہی ہیں رہزن

کوئی ملت کا بچاری کوئی مذہب کا اسیر
قابل دید ہے نیرنگئ یاران وطن۔

اب نہ آغاز کی کچھ فکر نہ انجام کا خوف
اب نہ وہ علم و عمل اور نہ وہ فہم فطن

ہم میں وہ خالدؓ و فاروقؓ کی اب شان کہاں
ہم میں وہ رام کہاں ہم میں کہاں وہ لچھمن،

سر برہنہ ہیں وہ اب بال بنائے پھرتے
جن کے آبا کے سروں پر رہا خود آہن،

جسم نازک یہ ہے ململ بھی گراں اب ان کے
جن کے اجداد کے ملبوس تھے بھاری جوشن،

اب ہوا باعث تفریح پرندوں کا شکار
اب کہاں پہلے سے وہ ہیں فگن شیر فگن،

کوڑی کوڑی کے لئے غیر کا محتاج ہے اب
یہ وہی ہند جو تھا لعل و گہر کا معدن،

فصل گل میں وہ اب رہتا ہے محروم بہار
قابل دید تھی جس باغ کے ہر گل کی پھبن،

صحن گلشن ہے کہ تصویر ہے بربادی کی
عندلیبوں کی جگہ اب ہیں یہاں زاغ و زغن

جس کی تعظیم کو جھکتا ہے ہمالہ کا [illegible]
جس کی تقدیس کے شاہد ہیں ابھی گنگ و جمن

جس کی عظمت کے ثناخواں رہے مصر و یونان۔
کرنے آتے تھے زیارت جہاں ابنائے زمن،

جو تھا تہذیب کا بانی جو تھا استاد جہاں
جو تھا تعلیم کا گھر علم و ہنر کا مخزن

جس کے صحراؤں نے اکبر کو ولادت بخشی،
جس نے پرتاب سا پیدا کیا شیدائے وطن

جس کی شوکت کا ہے میسور ابھی تک ضامن
جس کی دولت کا نشاں ہے ابھی عثمان دکن

وائے قسمت کہ وہ برباد ہوا جاتا ہے..
نوجوان سوئے ہیں اب اوڑھ کے غفلت کا کفن

کوئی اس نالۂ مجروح کو سنتا ہی نہیں۔
سامنے کس کے کریں شکوہ لٹائے وطن.

(دھرم سنگھ ملیانی بی اے)

دُعا

(ضیاء الدین احمد سلیری)

میرے خالق!
مجھے رحمتیں نہ دے
اور نہ برکتوں سے ہی مالا مال کر
میں تجھ سے
اور تیری نظر سے
اس نظر سے
جو ہزاروں اندھیروں میں
سیاہ مور ناتواں کو رینگتا ہوا دیکھ لیتی ہے
محض ایک شعاع چاہتا ہوں
تاکہ میں
ان سازشوں کو دیکھ سکوں
جو غریبوں کو پیسنے کے لئے
سرمایہ داری کے سینے میں پرورش پا رہی ہیں۔

~~~~~~~~

رحمتیں مجھے نہیں چاہییں
برکتیں میرے لئے بیکار ہیں
میرے آقا!
میں تو صرف اس تڑپ سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہوں
جو مجھے
زندگی کی خوفناک کشاکش سے
مٹے ہوئے
ان ضعیف و ناتواں جسم والوں کو
جن کی روحیں
فلاکت کے دھبوں سے
سیاہ پڑ گئی ہیں
ایک حقیقی جذبۂ انسانی دینے کے لئے بے قرار کر دے۔

~~~~~~~~

نیکیاں مجھے نہیں چاہییں
ثواب سے میں بے نیاز ہوں
میرے بے نیاز!
تو مجھے صرف
اک 'آہ' دے دے
جس سے میں اس ماں کے آنسوؤں کو خشک کر سکوں
جس کے نوزائیدہ بچے کے لئے
اس کی چھاتیوں میں دودھ نہیں رہا

~~~~~~~~

رحمتیں
برکتیں
~~~~~~~~

اور تیرے موعودہ احسانات
میرے خالق
مجھے ایک سوال پر مجبور کر دیتے ہیں
اور میرا چہرہ تیری طرف
یہی پوچھنے کے لئے اٹھ رہا ہے
کہ آخر وہ کون سے مقاصد کبیر ہیں
جن کے لئے
دنیا
افلاس و نکبت کو جنم دیئے چلی جا رہی ہے
رحمتیں اور برکتیں
کیوں انہیں کے کاشانوں پر نازل ہو رہی ہیں
جو تیری رحمتوں اور برکتوں سے
ایسے بے نیاز ہیں
جس طرح زمین سے بلند آسمان

اے منبع فیض
سرنگوں ہونے کی بجائے
میری آنکھوں کو تر ہونے کی قوت دے دے۔
اپنی رحمت سے
تو میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں بارش کر دے۔
اور میری آنکھوں کے خشک چشموں کو
آنسوؤں سے لبریز
میرے مالک
غریب و بے کس کے زخم
بس ہمدردی کے دو آنسوؤں سے مندمل ہو سکتے ہیں
میں تیرے بخشے ہوئے آنسوؤں سے
زندگی کے دھتکارے ہوئے بندوں کے
ریگستانوں کو
جن کو ظلم و شقاق کی آندھیوں نے بنجر کر دیا
پھر سرسبز کر دوں گا۔
اور اس طرح میرے رب
اس مقصد عظیم کو تیرے قریب کر دوں گا
جس نے تجھے
دنیا کی تخلیق پر آمادہ کیا۔

[illegible] محبت
ان تفرقوں کے میل کو دھو دے یا رب
فرقوں کی منافرات کو کھو دے یا رب
تسبیح سے بکھرے ہوئے ان دانوں کو
ڈورے میں محبت کے پرو دے یا رب

(راغب مرادآبادی)

ساقی

آ کہ پھر صحنِ چمن باغِ جناں ہے ساقی
دُور تک سلسلۂ ابر رواں ہے ساقی

کنج میں مرغِ چمن زاد ہے سرگرمِ نوا
باغ میں بادِ صبا عطرفشاں ہے ساقی

آج خاشاک کے لب پر بھی ہیں شیریں نغمے
آج ذرّات کے منہ میں بھی زباں ہے ساقی

شاخساروں پہ ہیں مرغانِ چمن گرمِ خروش
آسمانوں پہ گھٹا نعرہ زناں ہے ساقی

اس ترنم میں ازل ہے نہ ابد ہے ہمراز
اس تلاطم میں زماں ہے نہ مکاں ہے ساقی

اس برستے ہوئے موسم کی ہر اک ساعتِ کیف
شبِ آدینۂ ماہِ رمضاں ہے ساقی

خار بدمست ہیں، گل وجد میں کلیاں سرشار
آج گلشن میں قیامت کا سماں ہے ساقی

بزم پر وادیِ ایمن کا گماں ہوتا ہے
آج وہ نور سرِ رطلِ گراں ہے ساقی

پائے جاناں پہ کروں کیوں نہ پیاپے سجدے
شورِ قلقل مجھے گلبانگِ اذاں ہے ساقی

غمِ ایام پہ دم بھر کے لئے غور کریں
اتنی فرصت ترے مستوں کو کہاں ہے ساقی

بے خطر ہو کے پلا مے کہ حقیقت میں قضا
بزدلوں کا فقط اک وہم و گماں ہے ساقی

کھول نغموں سے درِ رمز و اشارات کہ آج
سرِ خوباں بہ حدیثِ دگراں ہے ساقی

روک رندوں کو نہ تا دیر کہ یہ رنگِ بہار — موسمِ بندگیٔ لالہ رُخاں ہے ساقی
نرمی و لطف سے لے کام کہ دل کے ہاتوں — زندگی کارگہِ شیشہ گراں ہے ساقی
کیوں بنوں زمزمۂ مُدعیانِ عرفاں! — بادہ خود کاشفِ اسرارِ نہاں ہے ساقی
جام دے جام کہ ہر قطرۂ صہبائے کہن — مصلحِ نسخۂ اجزائے جہاں ہے ساقی
کیفِ صہبا سے اُمنگوں کو جگا دے تو بھی — فیضِ باراں سے ہر اک ذرّہ جواں ہے ساقی
آج جی بھر کے پلا باغ میں پگھلی ہوئی آگ — کوہساروں پہ گھٹاؤں کا دُھواں ہے ساقی
چہرۂ خاک کی رنگینی و شوخی کی طرف — عالمِ پاک بحسرت نگراں ہے ساقی
نشہ جس طرح مچلتا ہے رگِ صہبا میں — سینۂ ابر میں یوں برق تپاں ہے ساقی
اُن کی خلقت نہیں حُورانِ بہشتی کے لئے — یہ تو زہّاد کی شکلوں سے عیاں ہے ساقی
ہاں پلا آتشِ سیّال کہ جس کی ہر بُوند — شمعِ محرابِ جہانِ گزراں ہے ساقی
اِن لچکتی ہوئی شاخوں کے خنک سائے میں — مے کی اک بوند متاعِ دو جہاں ہے ساقی
آ! کہ یہ وقت ہے اک شمع سرِ جادۂ باد — اُٹھ! کہ یہ عمرِ رواں آبِ رواں ہے ساقی
شیخ کو کون یہ سمجھائے کہ گلرنگ شراب — مایۂ تربیتِ رُوحِ رواں ہے ساقی
تجھ سے ممکن ہو تو اس درد کا درماں کر دے — زندگی کو مرضِ سُود و زیاں ہے ساقی

جوشؔ کی بحثِ صدارت میں لیں و پیش نہ کر
جوشؔ تو قبلۂ رندانِ جہاں ہے ساقی

(جوشؔ)



اگر ایسے آلات ایجاد ہو جاویں جنکی مدد سے
دوسرے ستاروں کے باشندے ہماری زمین کے
باشندوں کو دیکھ سکیں تو ان کو روم میں
رتھوں کی دوڑ کا نظارہ اسطرح دکھائی دیگا



فضائے بسیط میں گردش کرتے ہوئے کرے
سورج زمین معہ چاند، مریخ ۵ کروڑ میل پر
دو چاروں سیارے دوربین سے اسطرح دکھائی دینگے



[illegible]

عالمِ نامحدود کے ذرّے

سیّاروں اور ستاروں کی حیرت انگیز دُنیا

ادارۂ کلیم

ہم جب چاند کی خاموش اور ٹھنڈی فضا کو دیکھتے ہیں اور اِس روشن و سکوت آفریں دنیا کا تخیّل اپنے ذہن میں لاتے ہیں تو اسی کے ساتھ ساتھ اُس کی دُوری کا تصور بھی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نزدیکی اور دُوری، قرب و بُعد، یہ دونوں اضافی الفاظ ہیں۔ مثلاً ہمارے معیارِ پیمائش کے مطابق جو انچ، فٹ، گز، اور میل پر مبنی ہے چاند ہماری دنیا میں کرۂ ارض سے "بہت" دُور ہے۔ لیکن اگر ہم زمین سے دوسرے سیّاروں کے فاصلہ کو دیکھیں، جو چاند کی بہ نسبت ہزار گُنا اور کروڑ گنا زیادہ "دُور" ہیں تو ہم فوراً یہ محسوس کریں گے کہ اُن کے مقابلے میں چاند ہم سے "بہت" قریب ہے۔ آج ہم اُنھیں میں سے بعض سیّاروں کی سیر کرنے چلے ہیں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں اور دیکھیں کہ قدرت کے لامحدُود خزانے میں کیسے کیسے عجائب و غرائب پنہاں ہیں۔

زمین سے بہت دُور نہیں بلکہ نسبتاً قریب (اب آپ قرب و بعد کا اندازہ سائنس اور علم نجوم کی اصطلاح کے مطابق کریں) یعنی پانچ کروڑ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم ایک نہایت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز دُنیا میں پہنچتے ہیں جسے دیکھکر ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ قدرت نے کرۂ زمین کو اُس کی موجودہ جگہ پر اور موجودہ ماحول میں اسی لئے رکھا ہے کہ ہم ایک لامعلوم تخلیقی طاقت کی نیرنگ آفرینیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ یہ نئی دنیا جسے ہم دیکھنے آئے ہیں ایک سیّارہ ہے جس کا نام مرّیخ ہے اور جو خود ہماری قیامگاہ یعنی زمین سے بعض چیزوں میں مشابہت رکھتا ہے۔ سرزمین مرّیخ پر قدم رکھتے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ ہم کسی اجنبی ماحول میں نہیں ہیں۔ یا کم از کم یہ ملک اتنا غیر نہیں ہے، جتنا کہ ہم سمجھتے تھے۔ ہماری دنیا کی طرح یہاں زمین بھی ہے اور پانی بھی۔ بڑے بڑے پہاڑ سر اُٹھائے ہوئے ہیں اور بڑے بڑے سمندر اور دریا لہرا رہے ہیں۔ موسم کی جتنی تبدیلیاں ہمارے دیس میں ہوتی ہیں وہ اس پردیس میں بھی موجود ہیں، کرۂ زمین کے باشندے قطب شمالی اور قطب جنوبی تک پہنچنے اور اس کے حالات دریافت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مرّیخ میں بھی اسی طرح دو قطب ہیں اور اُن کی حالت یہ ہے کہ موسم سرما میں یہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ اور گرما میں جب برف گھلنے لگتی ہے تو اُن کی سفید ٹوپیاں رفتہ رفتہ غائب ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی فضا میں ابر کے ٹکڑے بھی اُڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، لیکن کرۂ مرّیخ کا ابر کرۂ زمین کے ابر سے زیادہ ہلکا ہوتا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا بھی نہایت خوشگوار ہے اور موسم ہمیشہ اچھا رہتا ہے۔

زمین کی طرح یہ سیّارہ بھی اپنے محور پر ۲۴ گھنٹے ۳۷ منٹ اور ۲۲ سکنڈ میں گردش کرتا ہے۔ لیکن مرّیخ پر زندگی کی مدّت زمین سے دوگنی ہے کیونکہ مرّیخ کا سال ۶۶۸ دن کا ہوتا ہے۔ اس سیّارے پر سب سے زیادہ حیرت انگیز

چیز اس کی نہریں کہاں ہیں جو مستطیل شکلوں میں جال کی طرح تمام براعظم پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ نہریں، کیا چیز ہیں ابتک ماہرین سائنس اور ماہرین نجوم یقینی طور پر نہیں بتلا سکے ہیں۔ تیس سال سے اُس کے متعلق تحقیقات اور خیال آرائیاں جاری ہیں، کوئی کہتا ہے کہ یہ دریا ہیں جو ایک سمندر سے نکلتے ہیں۔ اور دوسرے سمندر میں گرتے ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ مریخ کے باکمال انجینئروں کا یہ سب سے زیادہ حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ غرض اسی طرح کے سیکڑوں نظریے پیش کئے جا چکے ہیں، مگر کسی متفقہ فیصلہ پر پہنچنا اب تک ممکن نہیں ہوا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ مریخ پر پانی کی تقسیم اور رفتار کا عمل زمین سے جداگانہ ہے۔ کرۂ مریخ پر موسم گرما میں قطبین کی برف کے گھلنے سے جو سیلاب آتا ہے اُس کا پانی انھیں نہروں کے ذریعے اس سرزمین کے ہر حصہ تک برابر مقدار میں پہنچتا ہے۔ اس لئے یہ امر بعید از قیاس نہیں ہے کہ مریخ کے انجینئروں نے نہروں کا ایک ایسا سلسلہ تعمیر کیا ہے جو اُن کی مہارت فن کے انتہائی کمال کا پتہ دیتا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ جس طاقتور دوربین کے ذریعے ہم مریخ تک پہنچے ہیں وہ اس سیارے کو جو خاص خاص اوقات میں زمین سے چار کروڑ میل کے فاصلے پر آجاتا ہے۔ ہم سے صرف بارہ ہزار میل کے فاصلے پر پہنچا دیتی ہے۔ اسی ذریعے سے ہم نے مریخ کا ایک مکمل جغرافیائی نقشہ تیار کرلیا ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ مریخ کے بہت سے حالات ہماری دنیا سے مشابہ ہیں، جب مریخ پر آفتاب کے طلوع وغروب کا دلکش منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ جب سردی اور گرمی کے موسموں کا تواتر وہاں بھی نظر آتا ہے تو فطرتاً ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ اُس سیارے کا کسی انسان نُما اور عقل وادراک رکھنے والی آبادی سے بالکل خالی ہونا کس قدر غیر ممکن ہے۔ اگر مریخ پر بھی لوگ آباد ہیں تو وہاں کی شام کے وقت وہاں کے باشندے ہماری زمین کو ایک خوبصورت چمکیلا ستارہ سمجھکر اس کی پُراسرار دلکشی کا اندازہ کرتے ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ مریخ کے شعراء زمین کے موضوع پر اسی طرح نظمیں لکھتے ہوں جس طرح اہل زمین نے آفتاب، ماہتاب، زہرہ، مشتری وغیرہ کو اپنی شاعری کی دنیا میں داخل کرلیا ہے۔ اگر باشندگان مریخ پر بھی مذہب کا تسلط ہے اور مذہب کی ارتقائی منزل زمین والوں سے آگے نہیں ہے تو یہ بھی قرین قیاس ہے کہ وہ لوگ ہمارے سیارے کو کوئی طاقتور دیوتا یا دیوی سمجھکر پوجتے ہوں گے یا اس پر چڑھاوے چڑھاتے ہوں گے۔ زندگی وحیات کی قدرت نے صرف ایک ہی شکل نہیں رکھی ہے کہ ہم اپنے ہی جیسا آدمی ہر سیارے پر تلاش کریں۔ اور اگر اسی شکل وصورت والا کوئی وہاں نہ ملے تو زندگی کے امکان ہی کو خارج کردیں۔ حیات ایک غیر محدود چیز ہے۔ اور اس کی شکلیں اور جراثیم وخلیات بھی غیر محدود ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ مریخ پر اس سیارہ کی حالت اور ضرورت کے مطابق لوگ موجود نہ ہوں؟

مریخ کی سیر کرلینے کے بعد اب آگے بڑھئے اور جوپیٹر (مشتری) کی طرف چلئے۔ یہ سیارہ زمین سے سات کروڑ بیس لاکھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مریخ اور مشتری جوپیٹر کی درمیانی مسافت طے کرنے میں ہمیں بہت سے چھوٹے چھوٹے سیارے جو اس لامحدود عالم افلاک میں مجمع الجزائر کی حیثیت رکھتے ہیں، تیزی سے اپنے محور پر چکر لگاتے ہوئے ملیں گے۔ ممکن ہے ان میں سے بعض ہم سے ٹکرا جائیں۔ لیکن ہم ان سے آگے بڑھ چلیں، یہاں تک کہ جوپیٹر پر پہنچ جائیں۔

جوپیٹر کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ کرۂ ارض سے اس پُرنور دنیا کا جو تصور ہم نے کیا تھا وہ صحیح تھا۔ یہ عظیم الشان اور عظیم الجثہ سیارہ جس کا خطِ استوا زمین کے خطِ استوا سے گیارہ گُنا زیادہ ہے۔ جس کی جسامت زمین سے ایک ہزار دوسو گُنا اور وزن تین سو دس گُنا بڑھ کر ہے۔ اپنے محور پر نو گھنٹے پچاس منٹ کی حیرت انگیز اور ناقابلِ تصور رفتار سے گردش کرتا ہے۔ یہ سرعتِ رفتار قطبین کی طرف کم ہوتی جاتی ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ اس سیارہ کی پوری سطح اب تک منجمد ہو کر ٹھوس نہیں ہوئی ہے۔ یہاں آفتاب دن کو پانچ گھنٹے سے بھی کم روشن رہتا ہے۔ اور راتیں آبِ بحر اور اس کے دھندلکے کے باعث اور بھی چھوٹی ہوتی ہیں۔

چونکہ جوپیٹر کو آفتاب کے چاروں طرف گردش کرنے میں کرۂ زمین کے تعینِ اوقات کے حساب سے بارہ سال لگتے ہیں۔ اس لئے جوپیٹر کا سال دس ہزار چار سو پچپن روز کا ہوتا ہے۔ اور یہاں کے دیگر جغرافیائی حالات بھی زمین اور مریخ کے حالات سے جداگانہ ہیں۔ یہاں نہ ہمیں براعظم دکھائی دیتے ہیں اور نہ سمندروں کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ یہ پورا سیارہ گھنے اور تاریک

غُبارات سے اس طرح گھرا ہوا ہے کہ اس پر کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس ابدی اور محیط پردۂ ابر کے اندر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی تہ میں کوئی سیّال بحرِ اعظم یا جلتا ہوا کُرّہ ہو۔ ایک زمانہ وہ تھا جب جوپیٹر بھی آفتاب کی طرح روشن تھا۔ اور سات دنیاؤں کا اپنا مخصوص "نظامِ شمسی" رکھتا تھا۔ لیکن اب یہ ایک بجھتا ہوا آفتاب ہے۔ جو ابھی اتنا ٹھنڈا نہیں ہوا ہے کہ مرّیخ کی طرح ٹھوس زمین کی صورت اختیار کرلے۔ اب گویا یہ دوسرے "نظامِ شمسی" میں داخل ہوکر خود ہمارے آفتاب کے گرد گھومنے والا ایک سیّارہ بن گیا ہے۔

جوپیٹر پر سب سے زیادہ حیرت انگیز منظر جو ایک ناقابلِ حل معمہ بنا ہوا ہے یہ ہے کہ اس پر ایک وسیع سُرخ دھبہ ہے جس کا رقبہ ہماری زمین کے پُورے رقبے سے زیادہ ہے۔ اور جو تقریباً پچیس سال سے ایک حالت میں ہے۔ ماہرینِ فلکیات کا قیاس ہے کہ اس دھبہ کی شکل میں ایک براعظم زیرِ تعمیر ہے جو بخاراتی یا سیّال حالت سے تجاوز کرکے اب منجمد اور ٹھوس صورت اختیار کر رہا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس پر بھی زندگی کی بُنیاد اپنی ابتدائی شکلوں میں پڑ چکی ہو اور جراثیمِ حیات ارتقائی منزلیں طے کر رہے ہوں۔

اس کے بعد ہیں "سٹیرن" (زحل)۔ تک پہنچنے کے لئے پھر اتنی ہی مسافت طے کرنی پڑے گی جتنی کہ ہم نے زمین سے مشتری تک پہنچنے میں طے کی ہے۔ اس سیّارہ پر پہنچ کر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ فضائے آسمانی میں آفتاب سے اٹھاسی کروڑ اسّی لاکھ میل کے فاصلے پر گردش کر رہا ہے۔ زحل کے چاروں طرف روشنی کے تین دائرے محیط ہیں۔ (تصویر دیکھئے) اور دس چاند چکّر پر چکّر لگاتے رہتے ہیں۔ اس حیرت انگیز منظر کو دیکھ کر ہمیں سب سے پہلے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آیا یہ سیّارہ بھی ہمارے ہی نظامِ شمسی سے تعلق رکھتا ہے اور اسی "گھرانے" کا ایک فرد ہے جس میں زمین، مرّیخ، اور مشتری وغیرہ شامل ہیں؟ زحل کے منوّر دائروں کی پوری شوکت و عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں اس کے خطِ استوا تک جانا پڑے گا۔ جہاں سے ہم کسی تاروں بھری رات کی صاف اور پُرنور فضا میں اُن کا نظارہ بخوبی کرسکتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر دیکھئے کہ یہ کیسا بامزہ نواز منظر ہے! فضا اتنی روشن ہے کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔ پُرنور ذرّوں کے تین دائرے جن میں ہر ذرّہ خورشید بہ آغوش ہے ہزاروں میل فی منٹ کی رفتار سے زحل کے چاروں طرف گردش کر رہے ہیں۔

اور بہ یک وقت دس چاند اپنی کامل جلوہ آرائی و دلربائی کے ساتھ ایک عالمِ کیف و سرور میں مصروفِ رقص ہیں۔ زحل کے قُطب پر ایک نور کا تاج جگمگا رہا ہے۔ اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ زحل پر جس وقت کو ہم "رات" کہہ رہے ہیں (اس لئے کہ آفتاب کی شعاعیں اس پر نہیں پڑتیں) وہ درحقیقت رات ہے یا زمین والوں کے لاکھوں دِلوں کا نُور جمع ہو کر اس ابدی روشنی میں سمٹ آیا ہے۔ ہم لوگ یعنی وہ انسان جو کرۂ زمین پر آباد ہیں اپنے آپ کو کائنات کا مالک اور فرمانروا تصوّر کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ سورج، چاند اور ستارے سب ہمیں سے مسخّر ہیں، لیکن حقیقت کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے کہ صرف اسی نظامِ شمسی کے اندر جس میں ہماری زمین ایک ستارے کی حیثیت سے شامل ہے، زحل والوں کو (اگر وہاں ادراک و احساس رکھنے والی زندگی کی کوئی صورت موجود ہے) ہم سے زیادہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو کائنات کا مالک سمجھیں۔ ہماری طرح "وہ لوگ" بھی جب اس نظام کے دوسرے ستاروں کو دیکھتے ہوں گے تو یہی خیال کرتے ہوں گے کہ ان میں زندگی و حیات کا وجود غیر ممکن ہے۔

اتنے فاصلے سے اگر ہم زمین کی طرف دیکھیں گے تو یہ سیارہ ہمیں روشنی کے ایک جھلملاتے ہوئے نقطے سے زیادہ دکھائی نہ دے گا۔ اور وہ بھی ہمیشہ نہیں بلکہ ہر چھ ماہ میں صرف ایک مرتبہ محض چند منٹوں تک زحل سے زمین دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے آگے فضائے آسمانی میں صرف کچھ دور اور چلئے۔ بس زمین آپ کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی اور لاکھوں چھوٹے چھوٹے ستاروں کے جھرمٹ میں اس کی شناخت بھی ممکن نہیں رہی۔

اگرچہ ہم اپنے سیّارے سے بہت دُور پہنچ گئے ہیں اتنی دُور کہ زمین کے تصوّر کا دامن بھی ہمارے ہاتھوں سے چھوٹا جاتا ہے۔ پھر بھی ہمارا آسمانی سفر ابھی جاری ہے اور ہم زحل کو خیر باد کہہ کر آگے بڑھتے ہیں۔ آفتاب سے ایک ارب اُنتّر کروڑ ساٹھ لاکھ میل کے فاصلے پر ہمیں ایک دوسری دنیا نظر آرہی ہے اس سیّارے کا نام یورنیس ہے۔ لیکن ہم یہاں ٹھہر نہیں سکتے۔ ہم پرواز کرتے ہوئے آگے بڑھے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ سیّارۂ نیپٹون سے بھی گزر جاتے ہیں جو دو ارب پچاس کروڑ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور جو ہمارے نظامِ شمسی کی انتہائی اور آخری سرحد ہے۔

اس سرحد کے آگے کیا ہے؟ غور سے دیکھئے، ایک شہابِ ثاقب ابدی رات کی تاریکی میں جس کی ابتدا ہے نہ انتہا، اپنی ہیبت ناک شعاعوں کے ساتھ آہستہ آہستہ سیر کر رہا ہے۔ اس کے آگے بڑھئے تو ایک دوسرا اور اس سے بھی زیادہ ہیبت ناک شہاب سرگرمِ خرام ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان دُمدار ستاروں کی منزلِ مقصود کہاں ہے، یہ صرف اس لئے چل رہے ہیں کہ چلنے پر مجبور ہیں۔ معلوم نہیں کہاں سے آئے ہیں، اور کہاں جا رہے ہیں۔ یہ ہماری "شمسی جمہوریت" اور ایک ایسے عالم کے درمیان جو ہم سے بہت دُور ہے۔ ایک واسطہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اس خاموش اور ساکت فضا کی تنہائی میں آبادی کا تخیل پیدا کرتے ہیں۔ اس آسمانی سفر میں ہمیں ستاروں کے کچھ کھنڈرات بھی ملتے ہیں جو اس ابدی رات میں گردش کرنے والی برباد شدہ دنیاؤں کی یادگار ہیں۔ اور اب دفترِ حیات سے خارج کر دئے گئے ہیں۔ اس صحرائے اعظم میں جو عالمِ لامحدود کے ریگِ رواں اور ذرّاتِ پریشاں سے بھرا ہوا ہے ہمارے ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے۔ لیکن اب اس کے آگے دیکھئے کہ کیسے کیسے حیرت انگیز عالم در عالم اور حسین و جمیل دنیا در دنیا آپ کے سامنے ہے۔ آپ صرف اپنے نظامِ شمسی کو جانتے تھے۔ لیکن یہاں ایسے سینکڑوں نظامِ شمسی موجود ہیں۔ سینکڑوں آفتاب روشن ہیں اور ہر آفتاب کے گرد اس کے سیارے رقص کر رہے ہیں۔ ایک نظامِ شمسی ایسا ہے جس میں دو آفتاب ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چکر لگا رہے ہیں۔ اور ۱۰۸۰ برس میں اپنی ایک گردش پوری کرتے ہیں، خیال کیجئے کہ آفتابوں کے اس قِران اور ستاروں کے اس اجتماع سے کیسے کیسے "موسم" پیدا ہوتے ہوں گے۔ ان کے علاوہ وہ ستارے ہیں جن کو اہلِ زمین نے ۱۲ برج میں تقسیم کر لیا ہے۔ حمل، ثور، جوزا، سرطان، قوس، جدی، دلو، حوت وغیرہ کی چمک دمک کو ملاحظہ فرمائیے۔ ثریا کی رعنائی و زیبائی کو دیکھئے، اور اُن کے مقابلہ میں اپنی مختصری دنیا یعنی زمین کی حیثیت کا تصور کیجئے، کیا آپ حقیقت میں اب بھی اس لائق ہیں کہ اشرف المخلوقات ہونے کا طرۂ امتیاز آپ کو حاصل رہے؟

آپ اس سفر سے ابھی واپس نہ آئیں، جہاں تک پہونچ چکے ہیں اس سے بھی ذرا آگے چلئے۔ اور قدرت کی نیرنگ آفرینیوں کا تماشہ دیکھئے، اب آپ کو ایک نُور کا ساحل نظر آ رہا ہے۔ اور اس کے اُفق پر ہزاروں آفتاب آپ کو اشاروں سے اپنی طرف بُلا رہے ہیں۔ آپ ایک آفتاب سے چھلانگ مار کر دوسرے آفتاب پر پہنچتے ہیں۔ اور اسی طرح آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ کیا ہے کہ آپ کا سفر ختم ہی نہیں ہوتا؟ ہر سرحد سے آپ کے لئے ایک دوسری دنیا شروع ہوتی ہے۔ اور ہر منزل آپ کو ایک دوسری منزل کا پتہ دیتی ہے۔ انتہا اور حدود کا تخیل یہاں قطعاً ختم ہو جاتا ہے۔ اور ہر انتہا آپ کے لئے ایک نئی حد کی ابتدا بن جاتی ہے۔ یہاں سے آپ مڑ کر جب پیچھے کی طرف ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو آپ کا وہ آفتاب جو آپ کی زمین کو روشن کرتا ہے ایک ایسا چھوٹا سا ستارہ نظر آتا ہے کہ کبھی کبھی آپ کی آنکھوں سے اوجھل بھی ہو جاتا ہے۔

آپ جن دُور اُفتادہ آفتابوں پر سرگرمِ سفر ہیں اُن میں سے بعض کی شعاعیں دس، بیس، پچاس، سو ہی نہیں بلکہ ہزاروں اور لاکھوں برس میں زمین تک پہنچتی ہیں۔ آج ہمارے کرۂ ارض پر روشنی کی ایسی شعاعیں پہنچ رہی ہیں جو یورپ اور ایشیا میں وحشی قوموں کے وجود سے بھی پہلے کسی ستارے سے فضائے آسمانی میں سفر کر رہی تھیں۔ زمین سے ہم کسی ستارے کو ان کی موجودہ اصلی حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔ دیکھنے کا ذریعہ ان کی روشنی کی شعاعیں ہیں۔ اس لئے جو شعاعیں ہم تک آج پہنچتی ہیں وہ ہمیں اس ستارے کی اس مخصوص حالت کا پتہ دیتی ہیں جو ان شعاعوں کے خارج ہونے کے وقت تھی۔ یہ کیسی دلچسپ حقیقت ہے کہ تمام دنیاؤں کے وجود و قیام، شکل و صورت، جغرافیائی حالت و ہیئت کی "تاریخیں" ان شعاعوں کے ذریعے فضائے غیر محدود میں سفر کر رہی ہیں۔

ہر ستارہ اپنی جگہ پر ایک آفتاب ہے۔ اور خود اپنے نُور میں چمک رہا ہے۔ بعض کی روشنی ہمارے آفتاب سے ہزار گنا اور لاکھ گنا زیادہ ہے۔ لیکن یہ تمام ستارے اتنی کثرت سے نقشۂ عالم پر موجود ہیں کہ ہماری آنکھوں کو وہ ریگستان کے ذرّوں سے بڑے نہیں معلوم ہوتے، ماہرینِ ریاضی کہتے ہیں کہ ستاروں کی تعداد لامحدود نہیں ہے، کیونکہ "تعداد" اگر غیر محدود ہو تو اسے ہم "تعداد" نہیں کہہ سکتے۔ جتنے ستارے ہمارے تصور میں آئیں اُن میں ہم "ایک" کا عدد جوڑتے چلے جا سکتے ہیں۔ لیکن جو چیز غیر محدود ہو اس میں کوئی چیز جوڑی نہیں جا سکتی۔ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ ستارے جو عالمِ لامحدود کے ذرّے ہیں خود لامحدود نہیں ہیں۔ مگر ان کا "عالم" لامحدود ہے۔ آسمانی فضا لامحدود ہے، اور قوت و حیات کی تمام کار فرمائیاں لامحدود ہیں۔ اس نسبت سے بنی نوعِ انسان اور اس کی تمام تاریخ ایک چیونٹی کی دنیا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اور سیاروں اور ستاروں میں ہمارا خیالی سفر خواہ کتنا

نظر بر اثر

محمد صادق ضیا، بی اے

حضرۃ اثر لکھنوی کے انتقاد کا یہ جواب، چونکہ شدت کے ساتھ دقیق حملوں سے مملو تھا۔ اس لئے میں نے وہ تمام فقرے اور جملے حذف کر دیئے ہیں جنہیں نفس مضمون سے کوئی علاقہ نہیں اور جا بجا الفاظ کو نرم بھی کر دیا ہے۔ لیکن جہاں تک اعتراضات کے جوابات کا تعلق ہے اُسے بالکل نہیں چھوا ہے۔ اور مقصد مضمون نویسی کو قطعی طور پر مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔ (جوش)

اگست کے کلیم میں "کلیم عجم" کے ایک حصے پر جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کی تنقید میری نظر سے گزری۔ میرے اسکول کا مشرب یہ ہے کہ اگر غلط فہمی یا لاعلمی کی وجہ سے کسی بات پر کوئی اعتراض کرے تو اُس کا جواب نہ دیا جائے۔ مگر آج کل جواب نہ دینے کے معنی "اعتراف" سمجھے جاتے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اثر صاحب کی تنقید پر ایک سرسری نظر ڈالوں۔

(۱) پہلا اعتراض لفظ "عروس فطرت" پہ ہے کہ اس کا مفہوم نیچر یا مناظر قدرت معلوم ہوتا ہے۔ اور اشعار مابعد میں عروس فطرت کا مستعار لہٗ خدا ہو جاتا ہے۔

اثر صاحب کو ابھی تک معلوم نہیں کہ جس طرح شمع، لَو، روشنی، ایک ہی چیز کے مختلف حصے اور نام ہیں اور جس طرح لالٹین۔ شمع۔ فانوس۔ چراغ اور لیمپ سے صرف "روشنی" مراد ہوتی ہے بالکل اسی طرح فطرت، قدرت اور الوہیت کہہ کر خدا سے مراد لیتے ہیں۔ مولانا مدظلہٗ کے ان اشعار میں اگر لفظ "خدا" نہیں آیا تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ "عروس فطرت" خدا کو نہیں کہا گیا ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ "عروس" میں نسائیت پائی جاتی ہے تو اس کا تعلق لفظ "فطرت" سے ہے جو خود مؤنث ہے۔ اثر صاحب اس بات کے عادی ہیں کہ نظم میں حمد خالق۔ خدا۔ کبریا، وغیرہ الفاظ جب تک نہ آئیں اُسے حمد نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اُنھیں کون سمجھائے۔ کہ یہ باتیں اب پرانی ہو چکی ہیں۔ خود ہی کہتے ہیں کہ آج تک کسی مذہب یا فلسفے نے خدا کو صنف نازک نہیں بتایا۔ اور پھر خود ہی لکھتے ہیں کہ دائرۂ عشق (؟) میں خدا کو محبوب یا معشوق سمجھا گیا ہے۔ اور ہندی متصوفانہ شاعری میں "ساجن" اور اسی قبیل کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ حالانکہ علامہ نے فطرت کو عروس لکھا ہے خدا کو نہیں لکھا:

فطرت کسی طرح ذات الٰہی سے الگ نہیں کی جا سکتی۔ فطرت محض اور چیز ہے۔ مناظر فطری اور چیز ہیں۔ اثر صاحب کو ان دونوں میں خود ہی تمیز کرنی چاہیئے۔

(۲) دوسرا اعتراض حدوث کی خفتہ کاریوں پر ہے۔ اور یہ کہ زوال سے بے نیاز ہونے کا شعر میں کیا ثبوت ہے، غرض یہ ہے کہ عالم حدوث خواب و غفلت سے معمور ہے، اور فطرت ہمہ وقت بیدار۔ اس سے یہ تعبیر کیا جاتا ہے کہ فطرت نے اپنی نیند دنیائے حادث میں رہنے والوں کو تقسیم کر دی ہے۔ اس لئے خود بیدار رہتی ہے۔ رہا خدا کے زوال سے بے نیاز ہونے کا ثبوت، تو شعر میں جو بات بیان کی گئی ہے وہ محتاج ثبوت کہاں ہے؟ "لاینام ولایموت"، کس کی شان ہے؟ لَا تَاخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ" کس کے لئے آیا ہے؟ کیا ایک مسلمان ہونے کے باوجود ناقد فطرت کے بے نیاز زوال ہونے کا کوئی اور ثبوت چاہتا ہے؟

(۳) تیسرا اعتراض یہ ہے کہ فطرت میں جلال و جبروت نہیں: اور جلال و

سلہ طوالت کے خوف سے میں نے اشعار اور اعتراضات دانستہ اس مضمون میں نقل نہیں کئے ہیں۔ ناظرین اس جواب کے مطالعے کے وقت "کلیم" اگست ۳۳ء پیش نظر رکھیں۔ ضیا۔

جبروت زبان و ذہن پر مُہرِ سکوت لگائیں گے یا مُہرِ حیرت؟ مرعوب کریں گے یا متحیر؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فطرت کے جلال و جبروت کی مثالیں بسیلاب، طوفان اور زلزلے کی صورت میں آپ ہمیشہ دیکھتے رہے ہیں۔ پھر اسے کس طرح جھٹلایا جاسکتا ہے۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ جلال و جبروت کا مآل تحیر اور سکوت دونوں ہوسکتے ہیں۔ مگر سکوت تحیر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تحیر سکوت کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس لئے حیرت کا درجہ سکوت سے مقدم ہے۔

(۴) اعتراض یہ ہے کہ غمِ عذاب مسلّم مگر غمِ ثواب کیسا؟ میں پوچھتا ہوں کیا انسان کو اچھی باتوں کا عیش کا عشرت کا، راحت کا، سکون کا، کسی کے لطف و کرم کا غم نہیں ہوا کرتا؟ کیا آپ غمِ وصل نہیں لکھتے؟ کیا آپ نے غمِ عیش کبھی نہیں سنا۔ غم کے معنی صرف غم ہی نہیں۔ بلکہ فکر و اندیشے کے لئے بھی یہ لفظ محاورتاً استعمال ہوسکتا ہے؟ آپ فرماتے ہیں، دوسرے مصرع میں ابہام ہے۔ حالانکہ دوسرا مصرع بالکل صاف ہے، کہ "نہ تیرا کرم اختیاری ہے اور نہ ستم" کیا آپ یوں نہیں بولتے کہ یہ تو اختیاری بات ہے ایسا کرو یا ایسا کرو۔

آپ نے علامہ کے اس شعر پر اصلاح بھی دی ہے۔ عذاب و ثواب کو عطا کردہ نعمتیں کہنا کتنی بڑی غلطی ہے۔ جبکہ عذاب و ثواب مابعد ہستی سے متعلق ہیں۔ عذاب و ثواب اگر دنیا ہی میں مل جاتے تو پھر اُن کی فکر کیا تھی؟ "قابو ترے کرم پر" غیر فصیح اور قابو چیت لئے ہوئے ہے۔

(۵) آپ اس شعر کی اساس غلط نظریئے پر بتاتے ہیں۔ حالانکہ شعر بالکل صحیح ہے۔ لیجئے میں دونوں مصرعوں میں ربط پیدا کرکے دکھاتا ہوں۔ علامہ فرماتے ہیں کہ "تیرے جمال و جلال یعنی غضب و کرم کے توازن ہی سے مزاجِ عالم میں اعتدال ہے۔ کبھی تیرا غضب زیادہ ہوجاتا ہے اور کبھی کرم، غضب کی زیادتی دنیا کو پریشان کر دیتی ہے۔ مگر کرم کی کثرت پھر سنبھال لیتی ہے۔ کہئے ربط پیدا ہوا یا نہیں۔ اب فرمائیے علامہ سیماب کا نظریہ غلط ہے یا آپ کی نظر؟

(۶) سوال کیا گیا ہے کہ کائنات آئینۂ وجود ہے یا وجود آئینۂ کائنات؟ اس کا جواب خود علامہ کا مصرع ہے کہ تیرا وجود کائنات کا آئینہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں سیماب صاحب نے وجودِ مطلق کو آئینۂ کائنات کہہ کے وجود کی توہین کی ہے۔ مگر آخر صاحب آپ سمجھے ہی نہیں۔ آپ کی اصلی غلط انگاری تو یہ ہے کہ آپ نعت کو بھی حمد سمجھ رہے ہیں۔ جناب والا یہ غزل توحمد کے بعد نعت میں ہے۔ اور اس کے جتنے اشعار ہیں وہ سب حضرت ختمی مآب صلعم کے اوصاف و کمالات کے ترجمان ہیں نہ کہ ذاتِ الٰہی کے۔ اس تفریح کے بعد آپ کے تمام اعتراضات جو اشعار نمبر ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹ اور ۱۰ کے متعلق ہیں مہمل ثابت ہوتے ہیں۔

(۱۱) اعتراض یہ ہے کہ معشوق کے ملنے سے عرفانِ غم ہونا اور دل کا پتہ ملنا کس کی سمجھ میں آسکتا ہے؟ البتہ نہ ملنے کی حالت میں یہ صورتیں رونما ہوتی ہیں۔ میں ابھی آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جب تک انسان کو کسی سے محبت نہیں ہوتی۔ غم اور دل کا صحیح عرفان کبھی نہیں ہوسکتا۔ جب محبت کرنے کے بعد دل میں اضطراب اور درد پیدا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دل بھی کوئی چیز ہے۔ اور پھر جب محبت میں غم ملتے ہیں تو غم کا بھی احساس ہوتا ہے یہاں غم سے مراد غمِ روزگار یا غمِ معیشت نہیں۔ بلکہ غمِ محبت ہے اور دل سے مراد وہ مضغۂ گوشت نہیں جو ہر غیر ذی حس انسان کے سینے میں لٹکا ہوا ہے بلکہ عاشق کا دل مراد ہے۔

(۱۲) بارھواں اعتراض بہت معمولی ہے۔ محبوب قاتل بن کر آپ کا گلا کاٹ سکتا ہے۔ آپ کو ذبح کرسکتا ہے تو آپ اسے اپنی شاعری میں عملِ جراحی سے تعبیر نہیں کرتے اور زخم چھیل کر پھینکدینا آپ کے خیال میں ایک گھناؤنا کام ہے ذرا گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے کہ آپ کی شاعری میں محبوب کے ایسے کام کس کثرت سے واضح کئے گئے ہیں ——— میری مراد یہاں آپ سے آپ کی ذات نہیں ہے۔

(۱۳) گریباں کا بھیس بدلنا اگر اختراعِ فائقہ نہیں تو صحیح اور بالکل صحیح اسلوب بیان مزور ہے۔

(۱۴) اس شعر میں معلوم کا مفہومِ نفی آپ نے کیوں کر سمجھ لیا؟ یہاں معلوم کا محلِ استعمال اس کے لغوی معنوں میں ہے۔ اور دونوں مصرعے بالکل مربوط ہیں۔ سنئے میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔ شاعر کہتا ہے۔ یہ بجا ہے کہ یاس کا غلبہ ہے، اور حرمان کی شدت بھی مجھے معلوم ہے۔ پھر بھی اس راز کو میں ہی

سمجھتا ہوں کہ میرا مرنا آسان نہیں ہے : محبت میں امید ایک ایسی چیز ہے جو یاس و حرمان کی کیفیات کو کمزور کر کے انسان کو جینے پر مجبور کر دیتی ہے ۔

(۱۵) اس شعر میں استفہام کا صحیح محل ہی نہیں بلکہ استفہام ضروری تھا۔ مفہوم یہ ہے کہ "اے سیماب میرے دفترِ عصیاں پر کس کی متبسم نگاہ پڑ گئی کہ وہ حرفِ غلط بن کر رہ گیا۔" کسی کی " میں جو عامیت ہے وہ آپ ہی کو گوارا ہو سکتی ہے ۔ لفظِ "متبسم" سیماب سے مل کر آپ کو سانپ کی پھنکار معلوم ہوتا ہے۔ یہ آپ کے ان زہریلے خیالات کا اثر ہے جو آپ کو علامہ کی طرف سے خوفزدہ کئے ہوئے ہیں۔ ورنہ آپ کو ان دونوں لفظوں کی آواز میں ایک ایسی موسیقی معلوم ہوتی جو سانپوں کو رام کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے ۔

(۱۶) یہ اعتراض خدا جانے کس عالم میں کیا گیا ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ جلوہ گاہِ دل مر گئی ۔ بیشک جلوہ قائل سے متعلق ہے ۔ اور اندھیرا جلوہ گاہِ دل سے ۔ مطلب یہ ہے کہ دل تیری جلوہ گاہ ہونے کی وجہ سے ایک آئینہ تھا جس میں تو نظر آتا تھا۔ لیکن مرتے ہی دل میں اندھیرا ہو گیا۔ اور اب تو اس میں نظر نہیں آتا۔ اس لئے میں پوچھتا ہوں کہ جس آئینے میں تو نظر آتا تھا وہ آئینہ کیا ہوا!

دونوں مصرعوں میں لفظِ "جلوہ" کی تکرار آپ کو خوب نظر آئی، حالانکہ ایک مصرع میں "جلوہ" اور ایک میں "جلوے" ہے۔ تکرار بدنما نہیں ہوا کرتی۔

(۱۷) "اخذ" کا سبق لینے کے لئے کچھ دن کے لئے بنارس جائیے، یا متھرا آئیے۔ اور کسی فاضل جہاشے سے کچھ روز رجوع کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ "اخذ" کیا ہے ۔

(۱۸) "ناقہ و محمل" اس شعر میں کہاں ہیں کہ آپ نے یہ استہزا کیا ۔

(۱۹) "مستقبلِ مسلک" آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ میں سمجھتا ہوں، آپ نے کبھی مستقبلِ ملک، مستقبلِ وطن، مستقبلِ حکومت، مستقبلِ قوم سنا ہے؟ اگر سنا ہے تو اسی محل و مفہوم پر مستقبلِ مسلک کے معنی بھی سمجھ جائیے۔ مسلکِ اہلِ ستم اور مسلکِ حسن میں بہت فرق ہے۔ شعر میں حسن کا مفہوم حسنِ مطلق ہے۔ آپ ناحق اہلِ ستم و ظہر کے معنی پہنا رہے ہیں۔

(۲۰) اور لیجئے آثر صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ فضا ہر جگہ ہوتی ہے، خواہ وہ گوشہ ہو یا کھلی ہوئی جگہ۔ فضا تو اس ذرے میں بھی ہے جسے آپ صرف خوردبین سے دیکھ سکتے ہیں۔ بغیر فضا کے کسی چیز کا وجود خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اعتراض بالکل مہمل ہے۔ اگر فضا کے معنی "کھلی ہوئی جگہ" کے ہیں تو پھر "کھلی ہوئی فضا" کیوں کہتے ہیں۔

پھر اصلاح میں "رشکِ مہ" کے کیا کہنے ۔ کتنا نیا اور سانچے میں ڈھلا ہوا لفظ رکھا ہے۔ کلیم عجم میں کلام بشر ہونے کے لحاظ سے کتنی ہی فرو گذاشتیں کیوں نہ ہوں، مگر اس سرے سے اُس سرے تک وہ ایسے الفاظ سے قطعاً خالی ہے، یہ "رشکِ مہ" آثر صاحب ہی کو مبارک ہو، جو اُن کے پُرانے اسکول کی یادگار ہے۔

(۲۱) جس مصرع پر آپ نے بزعم خود اعتراض فرمایا ہے وہ اصل میں یوں ہے۔

"دل یک قطرۂ خوں اور اُسمیں جوشِ سوز و ساز الیا"

مصرع سیاقِ عبارت سے بھی صحیح پڑھا جا سکتا ہے۔ لیکن جب تنقید کے پردے میں تنقیص مقصود ہو تو پھر اسی طرح صورتِ شعر بھی مسخ کرنی پڑتی ہے۔

(۲۲) جبینِ عرش، بیشک سر کی رعایت سے کہا گیا ہے، ورنہ "فرازہ" ایسا لفظ نہیں جو صرف آپ ہی کو معلوم ہو۔ مناسبت الفاظ شعر کی جان ہے ۔

(۲۳) یہ اعتراض بھی بہت ہلکا ہے "گریباں چاک کرنا لازمۂ وحشت ہے، اور عرب میں عبا کا استعمال عام ہے۔ جب عبا یا قمیص نہ ہوگی تو گریبان کہاں سے آئے گا۔ مگر یوں کہئے کہ آپ عبا و جامۂ تنگ لکھنے کے عادی نہیں۔ ندرت سے آپ کو بَیر ہے۔ ورنہ علامہ سیماب کی ندرتِ خیال کا اس طرح مضحکہ نہ اُڑاتے۔

(۲۴) احساسِ کرم کا ملتفت ہونا احساسِ کرم سے عبارت ہے "اندیشہ بداماں" میں اندیشے کے معنی انتشار ایجاد بندہ ہے۔ ورنہ اس شعر میں خاطرِ اندیشہ بداماں کے معنی وہی ہیں جو فارسی میں مستعمل ہیں۔ یعنی خاطرِ اندیشناک۔ جمع کے معنی مطمئن کے ہیں۔ اندیشہ و فکر میں طبیعت مطمئن نہیں ہوتی۔ لیکن جب یہ احساس ہو کہ نگاہِ کرم ملتفت ہو تو خاطرِ اندیشناک مطمئن ہو جاتی ہے۔

(۲۵) ننگے پن اور چہرۂ دل پر جو پھبتی کسی گئی ہے وہ بھی در خورِ اعتنا نہیں ہے۔ ورنہ یہ الفاظ جانور نہیں بولتے انسان بولتے ہیں۔ شعر اپنے الفاظ کے ساتھ تمام تر سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

(۲۶) اسلوبِ قدیم و جدید کا فرق آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اہلِ نظر سمجھ سکتے ہیں۔

(۲۷) واقعات میں لمبے نہیں ہوتے۔ کیا خوب! واقعات کہ کر بھی زندگی عشق کی تصریح کی جاسکتی ہے۔ زندگی واقعاتِ مسلسل ہی کا تو نام ہے۔ ہر واقعہ کے لئے زمان و مکان کی ضرورت ہے۔ پھر واقعاتِ عشق کیا بغیر زمانے کے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اصلاح میں "شدہ کارہ" کی داد دیتا ہوں۔ ریشم میں چمڑے کا پیوند لگاتے ہیں۔

(۲۸) یہاں لفظ "سویا" کا مفہوم "لیٹا" ہے۔ روزمرہ میں عموماً "لیٹا" استعمال نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اسی مفہوم کے لئے "سویا" کہہ دیا جاتا ہے۔

(۲۹) ناقد کہتا ہے کہ ٹھکانا ہندی لفظ ہے جس کا املا الف سے ہے۔ اور پھر اس کے بعد ناقد نے اپنی عروض دانی کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ ٹھکانہ بیشک ہندی لفظ ہے لیکن اس کا املا ہائے مخلوط کے ساتھ صحیح ہے۔ جو لوگ اسے الف کے ساتھ لکھتے ہیں وہ بر خود غلط ہیں۔ ٹھکانہ، زمانہ، اور آشیانہ کے قافیے میں ہائے مخلوط کے ساتھ لکھا جاتا ہے "نا" ہندی میں علامتِ مصدر ہے۔ اس لئے وہ الفاظ جو مصدر نہیں ہیں امتیاز کے لئے ہائے مخلوط ہی کے ساتھ لکھے جاتے ہیں اور لکھے جانے چاہئیں۔ مثلاً ٹھکانہ تھانہ وغیرہ۔

(۳۰) "دو" اور "دونوں" میں جو فرق و امتیاز ہے سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں "دونوں" مصرع میں بآسانی آسکتا تھا، لیکن "پھر ہی" کا زور باقی نہ رہتا۔

(۳۱) آپ کہتے ہیں "پہاڑی" سے شعر میں کب نکل آیا۔ اس لئے کہ آپ کو صرف ایک لفظ "طور" یاد ہے۔ شعر میں پہاڑی کو قصداً رکھا گیا ہے، اس لئے کہ اس کے مقابلے میں جلوے کی عظمت بیان کرنی تھی۔

(۳۲) قلبِ غزلخواں۔ سازِ غزلخواں وغیرہ ترکیبیں جدید اسلوبِ شاعری میں آزادانہ مستعمل ہیں، مگر آپ تو قدیم اسکول کے پابند ہیں آپ کو حیرت ہونی ہی چاہیئے۔

(۳۳) اس مصرع میں "تم تم" کی تکرار چونکہ وقفے کے ساتھ ہے اس لئے اسے بیہودہ سمجھنا انتہائی غلطی ہے۔ مفہومِ شعر کی نثر یوں ہوتی ہے "تم نے ایک حسرت زدہ کو اپنی محفل سے نکالا مگر تم اتنا نہ سمجھے کہ وہ بھری محفل سے تنہا نکلے گا، تو اسے کس قدر صدمہ ہوگا"۔

(۳۵) اگر اس مصرع میں نکلا کی جگہ نکلے بنا دیا جائے تو ردیف غلط ہو جائیگی "جب نکلے اسی منزل سے نکلے" کہا جائے گا۔ اس لئے اعتراض بیہودہ ہے۔

(۳۶) دامن کشِ منزل بالکل صحیح ہے۔ دامن کشِ منزل کا جو مطلب ناقد سمجھتا ہے وہی اس شعر سے حاصل ہوتا ہے۔ یعنی منزلِ عمل کے راستے میں ایک پردۂ غفلت تھی، اس نے منزل کو اپنی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔

(۳۷) "صبر مشکل نہ ہوا" فصحا کی زبان ہے اور اس سے یہ مراد ہے کہ باوجود کوشش بھی صبر نہ ہو سکا۔

(۳۸) "بیگانہ" اور "بیزار" کا مفہوم مختلف ہے، یہاں دل کو بیگانہ ہونے کی تلقین نہیں کی گئی۔ بیزار ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

(۳۹) شورشِ نمو سے شدت و ہنگامۂ نمو عبارت ہے۔ کبھی جوشِ بہار میں آپ نے شورشِ نمو دیکھی ہو تو آپ کی سمجھ میں آسکے، آپ صرف جنون کو وجہ شورش سمجھتے آئے ہیں۔

(۴۰) بیشک یہ شعر امیر مینائی مرحوم کے شعر سے مختلف ہے، امیر نے ابر سیہ کو میخانہ لکھا ہے اور علامہ سیاب نے ساقیٔ بہار بھی کہا ہے، آپ کہتے ہیں "اڑا ہوا" کو "اڑتا ہوا" کہنا چاہیئے، واہ کیا مشورہ ہے، کوئی بھی اس قسم کی غلطی نہیں کر سکتا، ریل اڑی ہوئی چلی جا رہی ہے، پتنگ اڑا ہوا چلا جا رہا ہے۔ ذرا اڑے ہوئے جانا،

(۴۱) "پیغامِ محبت دے کر" اور "پیغامِ محبت دے دے کر" میں ایک "دے" کا اضافہ کوئی ادیب مناسب نہیں سمجھ سکتا۔ اس طرح شعر کو زوائد سے معیوب بنا دینا کونسی دانشمندی ہے۔

(۴۲) صد جام بکف اور صد شیشہ بدوش کا مفہوم یہ نہیں کہ ساقی کے ہاتھوں اور کاندھوں پر سینکڑوں پیالے اور سینکڑوں شیشے رکھے ہوئے ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ انتہائے کیف و سرمستی کے ساتھ آیا ہے۔

(۴۳) "کوزہ نشین" میں "ہ" کا اشباع یا اعلان بالکل نہیں ہوتا۔ مصرع ذرا غور کے ساتھ پڑھیئے، یہ تو پڑھنے پر منحصر ہے، متین طریقے سے پڑھئے تو نہ اشباع ہے نہ اعلان۔

(۴۴) سورج جب آشیاں کی پس پشت ہوتا ہے تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ آشیاں کے سائے میں پردہ نشین ہے، لیکن ان مشاہدات کے لئے ظاہری بصارت کے ساتھ بصیرت کی بھی ضرورت ہے، یہ سورج وہی ہے جسے ساری دنیا جانتی ہے اور یہ آشیاں وہی ہے جسے تمام شعرا باندھتے ہیں۔ مگر تخیل علامہ کی ہے جس نے اس مضمون میں ندرت پیدا کر دی ہے۔ (۴۵) سجدہ ذوقِ جبیں ہے، "ذوقِ جبیں سائی نہیں ہے۔"

(۴۶) سیماب کا شعر رشک و غیرتِ عشق کا بہترین ترجمان ہے، غالب کی اور علامہ کی تخیل میں صورت و معنی کا فرق ہے، (۴۷) یہ مصرع غلط چھپ گیا ہے، مسودے میں یوں ہے ؎

"سجدے ممنونِ غمِ عشق دوبارہ نہ کیا" ناقد نے کتابت کی غلطی سے فائدہ اٹھایا ہے اور کچھ نہیں۔ (۴۸) کائنات بھی اسی کی محفل ہو، لیکن وہ خود اس محفل سے بظاہر دور ہے، اس کی محفل وہی ہو سکتی ہے جہاں وہ علانیہ موجود ہو اور ہم اسے دیکھ لیں۔

—— ہم نے جواب تنقید میں بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو انشاء اللہ مفصلاً بھی عرض کروں گا۔

رفتارِ وقت

اوارۂ کلیم

ہندی جاپانی تجارتی معاہدہ

چونکہ پُرانا ہندی جاپانی تجارتی معاہدہ جو ، رجنوری ۱۹۳۴ء کو وجود میں آیا تھا اور مارچ ۱۹۳۷ء کو ختم ہونے والا ہے ۔ اس لئے اس کی تجدید کے متعلق دونوں ملک کے نمائندوں کے درمیان شملہ میں گفت وشنید شروع ہوگئی ہے ۔ اور یہ مسئلہ زیرِغور ہے کہ نیا معاہدہ اب کن شرائط پر کیا جائے ۔ جاپان اور ہندوستان کے تجارتی تعلقات کی مختصر سی تاریخ یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۳۱ء میں طلائی معیار ترک کرنے کے بعد جاپان نے اپنے ہر قسم کے سستے مال سے ہندوستانی بازاروں کو بھرنا شروع کردیا ۔ اور اس سیلاب نے ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی کو ایسا شدید نقصان پہنچایا کہ بمبئی کے متعدد بڑے بڑے کارخانے بند ہوگئے ان تباہ کن حالات اور کارخانہ داروں کے احتجاجی شوروغل سے متاثر ہو کر حکومت ہند نے جاپانی مال کی درآمد کو روکنے کے لئے محصولات کی ایک مضبوط دیوار کھڑی کردی اور جاپان کو نوٹس دیا کہ اگر جاپان نے اپنے رویہ میں تبدیلی نہ کی تو ۱۹۰۴ء کا تجارتی معاہدہ ختم کردیا جائے گا ۔

جاپان کو اس پر غصہ آیا اور ان پابندیوں کا بدلہ لینے کے لئے اس نے ہندوستانی روئی کی خریداری قطعاً بند کردی ۔ چونکہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے ۔ اس لئے خام روئی کے بائیکاٹ سے اس کو سخت نقصان پہنچنے لگا ۔ انہیں حالات کے تحت میں جاپان اور ہندوستان کے درمیان وہ معاہدہ ہوا جو جنوری ۱۹۳۴ء کے معاہدہ کے نام سے مشہور ہے ۔ اس معاہدے کی رُو سے جاپانی کپڑے کی درآمد اور ہندوستانی خام روئی کی برآمد کی ایک مقدار مقرر کردی گئی جو یہ تھی کہ جاپان ہر سال بتیس کروڑ گز کپڑے ہندوستان کو بھیجے گا ۔ اور ہندوستان سے خام روئی کے دس لاکھ گٹھے خریدے گا ۔ اور اگر اس سے زیادہ کپڑا بھیجنا چاہے تو ہر دس لاکھ گز کپڑے کے عوض اس کو خام روئی کے مزید دس ہزار گٹھے خریدنے پڑیں گے ۔ لیکن کسی ایک سال کے اندر جاپانی کپڑے کی درآمد کی مقدار چالیس کروڑ گز سے بڑھنے نہ پائے گی ۔ اس میں شک نہیں کہ اس معاہدہ نے عارضی طور پر ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی کو بھی تباہی سے بچا لیا اور ہندوستان کی خام روئی کے لئے جاپان کا بازار بھی اس کے ہاتھ سے نہ گیا ۔ لیکن بعد کو جاپان نے ان شرائط سے بچنے کے لئے یہ طرزِ عمل اختیار کیا کہ بعض ہندوستانی ریاستوں اور بالخصوص کاٹھیاوار کی بندرگاہوں کی راہ سے زیادہ مقدار میں کپڑا بھیجنے شروع کردئے ۔ اس کے علاوہ ناقص کپڑے کے نام سے جس پر محصول کم تھا چار چار گز کے اچھے ٹکڑوں کی صورت میں ہندوستانی بازاروں میں ایک نئی قسم کا جاپانی سیلاب آگیا ۔ اور یہ ٹکڑے بہت سستے داموں فروخت ہونے لگے ، غرض جاپان کی ان تجارتی چالوں نے ہندوستان کو ان تمام فوائد سے محروم کردیا جو اسے ۱۹۳۴ء کے معاہدے سے حاصل ہوئے تھے ۔ اس لئے اب جبکہ ہندی جاپانی تجارتی معاہدہ کی تجدید کا مسئلہ زیرِغور ہے حکومت ہند کا فرض ہے کہ شرائط کی دیوار میں کوئی ایسا روزن نہ چھوڑے جس کے ذریعے جاپان پھر ہندوستان کے مفاد کو نقصان پہنچا سکے ۔ اس کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ لنکا شائر کے کپڑے پر محصول کم ہوجانے کے باعث ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی ایک مزید مقابلہ

کی زد میں آگئی ہے۔

بے روزگاری کا انسداد

ہندوستان میں بے روزگاری کا انسداد وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے، لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ اس کی اہمیت جتنی زیادہ ہے اتنی ہی زیادہ غفلت اور بے پروائی اس کی طرف سے برتی جا رہی ہے۔ حکومت کے پاس وعدوں اور ارادوں کی کمی نہیں ہے۔ اعلانات، بیانات اور تقریریں بھی کافی سے زیادہ ہیں۔ مگر عملی کارروائی کا فقدان ہے۔ بے روزگاری کی تباہ کاریوں کا صحیح اندازہ اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں حکومت نے اس کے کوئی اعداد و شمار بہم نہیں پہنچائے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے کہ بے روزگاری نے سوسائٹی کی اقتصادی بنیادوں کو ہلا دیا ہے۔ اور لاکھوں آدمیوں کو فاقہ کشی اور احتیاج کی ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے جس کا تخیل یورپ کے ادنیٰ سے ادنیٰ قلی یا گدا اگر کو بھی نہیں ہو سکتا۔ یورپ کے تقریباً ہر ملک میں بے روزگاری کو دور کرنے کے لئے ایک وسیع اور منظم جد و جہد کی جا رہی ہے۔ لیکن حکومتِ ہند اس سلسلہ میں اپنے معمولی سے معمولی فرائض بھی انجام دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ایسی حالت میں اسمبلی کے وہ ارکان مستحق مبارکباد ہیں جنھوں نے جولائی میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ بے روزگاری کا مسئلہ نہایت مکمل صورت میں ایک رزولیوشن کے ذریعے اسمبلی میں پیش کیا جائے۔ اس رزولیوشن میں یہ سفارش بھی کی گئی ہے کہ بے روزگاری کے اعداد و شمار مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ اور ہندوستان میں جتنی غیر مزروعہ لیکن قابلِ زراعت زمین ہے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ بیکاروں میں تقسیم کر دی جائے تاکہ یہ لوگ کاشتکاری کو اپنا ذریعہ معاش بنائیں۔ یقیناً یہ تجویز قابلِ ستائش ہے لیکن بے روزگاری کو دور کرنے کے متعدد ذرائع اور بھی ہیں۔ جن کو کام میں لانے کے لئے فوری کوششوں کی ضرورت ہے۔

ہسپانیہ کی خانہ جنگی

ہسپانیہ کی خانہ جنگی کو بعض مدبرین وقت یورپ میں ایک دوسری جنگِ عظیم کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ فاشیوں اور اشتراکیوں کی یہ آویزش جس میں ہزاروں آدمی نہ صرف تہِ تیغ کئے جا رہے ہیں، بلکہ زندہ جلائے جا رہے ہیں، ایک بڑے خطرے کی گھنٹی ہے۔ اور یا روم کے قوصے میں چنگاری کا کام کر رہی ہے۔ اس جنگ کے متعلق ہم تک جو خبریں آتی ہیں اُن کی ایک عجیب نوعیت یہ ہے کہ ان سے صحیح حالات پر روشنی نہیں پڑتی، بلکہ معاملات زیادہ پیچیدہ اور تاریک ہوئے جاتے ہیں۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جس تیزی اور شدت سے یہ جنگ جاری ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو کچھ ہوتا ہے جلد ہو رہے گا، اور کسی ایک فریق کی کامل فتح یا شکست کے بعد ہسپانیہ میں جلد کوئی نئی حکومت قایم ہو جائے گی۔ یہاں تک تو صحیح ہے کہ باغیوں نے بہت سے شہروں پر قبضہ کر لیا ہے اور اس پرچے کے پریس میں جانے کے وقت تک یہ اطلاع بھی آئی ہے کہ میڈرڈ (دارالحکومت) پر شدید بمباری ہو رہی ہے، اور لوگوں کے لئے غذا کی فراہمی بہت مشکل ہو گئی ہے۔ لیکن رائٹر کی خبر رساں ایجنسی یہ رائے رکھتی ہے کہ ایک ماہ کی نہایت بے رحمانہ خونریزی اور جنگ آزمائی کے بعد بھی اس خانہ جنگی کا اختتام بہت دور معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس خیال سے اس بنا پر متفق ہیں کہ یورپ کی دوسری حکومتیں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کرنے کے باوجود غیر جانبدار نہیں ہیں، اور فریقوں کو خفیہ امداد پہنچا رہی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حالات پیچیدہ تر ہوتے چلے جائیں گے، یہ خانہ جنگی ایک طویل جنگ کی صورت اختیار کرے گی اور فیصلہ بہت دور جا پڑیگا۔

اس جنگ کی بین الاقوامی اہمیت ان حالات سے ظاہر ہے کہ برطانیہ کی پبلک عام طور پر ہسپانیہ کی جمہوری حکومت کی طرفدار ہے۔ اور یہ خیال کرتی ہے کہ اگر باغیوں کو فتح ہو گئی تو یورپ میں "فاشیت" (فیشزم) کا اقتدار بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ اور جمہوریت کے مزار پر آخری فاتحہ پڑھ دینی ہوگی۔ اطالیہ نے کسی حیلے بہانے سے باغیوں کی امداد کے لئے اٹھارہ ہوائی جہاز بھیجدئے ہیں۔ جن میں چار طیارے مشین گنوں سے مسلح ہیں۔ مسولینی کا ہسپانوی "فاشیوں" کی تائید کرنا ایک فطری عمل ہے، کیونکہ وہ ہسپانیہ میں اپنا اثر قایم کرکے بحرِ روم کے مغربی حصہ پر اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس اثنا میں جرمنی نے بھی یہ کہہ کر کہ بعض جرمن باشندے ہسپانیہ میں اشتراکیوں کے ہاتھ قتل ہو گئے ہیں۔ حکومت ہسپانیہ سے تاوان کا مطالبہ کیا ہے اور ایک بڑا جنگی جہاز (علاوہ ان دو جہازوں کے جو

پہلے سے ساحل ہسپانیہ پر موجود ہیں) بارسیلونا بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لئے بعض دگوں کا خیال ہے کہ جرمنی کی یہ مداخلت سارے یورپ میں آتش جنگ بھڑکا دینے کا باعث ہوگی۔ دوسری طرف فرانس نے قطعاً غیر جانبدار رہنے کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے یہ جواب دیا کہ ہسپانوی خانہ جنگی کے کسی فریق کو اگر اہل فرانس "غیر فوجی" امداد بھیجیں تو اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اس لئے یورپین طاقتوں کی غیر جانبداری اور عدم مداخلت کا سوال اب بالکل بے معنی ہے۔ اور دنیا اب صرف برطانیہ کا طرز عمل دیکھنے کی منتظر ہے۔ اور یہ سمجھتی ہے کہ اس پیچیدہ معاملہ کی کنجی اب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اس وقت برطانی پارلیمنٹ کا اجلاس ملتوی ہے۔ اور وزراء گرمیا توں میں سیر و تفریح میں مشغول ہیں، اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ یورپ میں جو آگ لگی ہوئی ہے اُس میں برطانیہ کی جگہ کہاں پر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہسپانیہ کی خانہ جنگی ہسپانیہ کے اندر ہی ختم ہو جاتی ہے یا گھر سے باہر نکل کر ساری دنیا کو شعلہ زار بنا دیتی ہے۔

مصر کی آزادی

مصر کی آزادی اور اس کے فطری حقوق و مطالبات کے تسلیم کئے جانے کے سلسلے میں ایک "اینگلو مصری معاہدہ" مرتب کیا گیا ہے۔ جس کی تصدیق و توثیق جولائی کے آخری ہفتہ میں دونوں فریق کے نمائندوں کے دستخطوں کے ذریعہ ہونے والی ہے۔ امید ہے کہ جب تک یہ پرچہ قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا اس معاہدہ پر دستخط کرنے کا مرحلہ طے ہو چکا ہوگا۔ اور مصر کی آزادی کا اعلان ہو جائیگا، لیکن اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ مصر کی آزادی کا یہ کوئی نیا اعلان نہ ہوگا، ایک نام نہاد آزادی کا اعلان جو کسی معنی میں بھی آزادی نہ تھی برطانیہ کی طرف سے ۱۹۲۲ء میں بھی کیا جا چکا تھا۔ اور اس اعلان نے جو تلخ بیج بوئے تھے اُن کے کڑوے پھل چودہ برس تک مصر میں خانہ جنگی، اور برطانیہ و مصر کے درمیان نفاق و اختلافات کی صورت میں حاصل ہوتے رہے، آج جبکہ برطانیہ مصر کے حقوق کا احترام کرنے کو تیار ہے اور ان دونوں ممالک کے درمیان ایک تشفی بخش معاہدہ طے ہو رہا ہے، دنیا ایک ایسے واقعہ کا مشاہدہ کر رہی ہے، جس کی سیاسی حلقوں میں کبھی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ برطانیہ کی اس "فیاضی اور دریا دلی" کا اصلی سبب یہ ہے کہ حبش پر اطالیہ کے تسلط اور شمالی افریقہ میں اطالوی طاقت کی بڑھتی ہوئی رَو نے بحیرۂ روم کی صورتِ حال کو بالکل بدل دیا ہے۔ اور اس چھوٹے سے سمندر میں جس پر یورپ کے تمام سربرآوردہ ممالک کی بحری طاقت اور جہازوں کی نقل و حرکت کا انحصار ہے اقتدار قائم رکھنے کا مسئلہ برطانیہ کے لئے نہایت اہم اور پیچیدہ بن گیا ہے۔ اس بات کو سیدھے سادے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مسولینی کے طفیل میں مصر کو آزادی حاصل ہو گئی ہے۔ اگرچہ یہ آزادی ابھی مشتبہ پہلوؤں سے خالی نہیں ہے۔ تاہم جب مصر میں اکثریت رکھنے والی "وفدی" جماعت جو خالص مصری مفاد کی محافظ ہے۔ اس معاہدہ کی اصلی فریق ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ مصریوں کا موجودہ مطالبہ پورا ہو گیا۔

ہم اس معاہدہ کی شرائط پیش کرنے سے پہلے کسی قدر واضح طور پر مصر اور برطانیہ کے رشتہ کو بیان کرنا چاہتے ہیں، تاکہ مصریوں کی تحریک آزادی اور اس کے تازہ ترین نتیجے کی نوعیت سامنے آ جائے۔ "اینگلو مصری" نزاع کی تہ میں دراصل دو حقیقتیں کار فرما رہی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ بحرۂ روم اور نہر سویز کی جنگی اور تجارتی اہمیت کے پیش نظر برطانیہ نے مصر پر اپنے تسلط کو ہمیشہ ایک لازمۂ حیات سمجھا، اور مصر کو حقیقی آزادی عطا کرنے اور مصریوں کے قومی وجود و حقوق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا رہا۔ اور دوسری یہ کہ برطانیہ نے اعلان ۱۹۲۲ء میں جس کے ذریعہ مصر کو ایک "آزاد ملک" تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ایسے چار اہم موضوع کو اپنے لئے مخصوص و محفوظ کر لیا تھا۔ جن پر مصر اور برطانیہ کے درمیان کبھی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اور جو باہمی نفاق و نزاع کی بنیاد بنے رہے۔ اعلان مذکور کے تیسرے حصہ میں مندرجہ ذیل شرط شامل تھی۔

"اُس وقت تک کے لئے جب تک ملک معظم کی حکومت اور مصری حکومت کے درمیان فریقین میں آزادانہ بحث و تمحیص اور دوستانہ رواداری کے ذریعہ سمجھوتہ ممکن نہ ہو، مندرجہ ذیل چار موضوع ملک معظم کی حکومت کے لئے محفوظ و مخصوص رہیں گے۔

(۱) مصر میں برطانوی امپائر کے سلسلۂ رسل و رسائل کا قیام و تحفظ۔

(۲) غیر ملکی حملہ اور بالواسطہ یا بلاواسطہ بیرونی مداخلت کے خلاف مصر

کا تحفظ۔

(۳) مصر کے اندر غیر ملکی مفاد اور اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ۔

(۴) مسئلہ سوڈان۔

مصر نے ان تحفظات کی مخالفت کی اور ان کی اصابت کو کبھی تسلیم نہ کیا۔ لیکن برطانیہ نے اپنی روایتی ہٹ دھرمی سے کام لیا اور نہ صرف یہ کہ مزید مصری مطالبات کو ٹھکرا دیا بلکہ اکثر موقعوں پر اس نے مصر کے اندرونی معاملات اور داخلی سیاست میں بھی کھلی مداخلت کی۔ اور برٹش ہائی کمشنر کے ذریعہ بھی اپنا وہی اثر و اقتدار قائم رکھنا چاہا جو پہلے اُسے حاصل تھا۔ چونکہ مذکورہ بالا تخصیصات و تحفظات مصری قوم پرستوں کی رائے یا اتحادِ عمل سے مرتب نہیں کئے گئے تھے اور مصری قومیت کی ان سے تذلیل و توہین ہوتی تھی۔ اس لئے حریتِ مصر کے تمام علمبردار اور سربرآوردہ قائدین جن کی رہنمائی سعد زاغلول پاشا کے ہاتھوں میں تھی ۱۹۲۲ء کے اعلان سے دل برداشتہ ہو کر اس کو مسترد کرانے کے لئے کوشاں ہو گئے، اور مصری تحریکِ آزادی ازسرِنو مزید جوش و خروش کے ساتھ جاری ہو گئی۔ ان تحفظات کو آئینِ مصر سے خارج کرنے یا کم از کم ان میں مناسب ترمیم کرانے کی تین پُرزور اور متواتر کوششیں ۱۹۲۲ء، ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۷ء میں کی گئیں۔ لیکن مصر کی "وفدی" جماعت کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

زاغلول پاشا کے انتقال کے بعد وفدیوں کی قیادت نحاس پاشا کے ہاتھوں میں آئی، اور حریتِ مصر کی کشتی کو مخالف ہواؤں اور طوفان خیز موجوں میں چلاتے رہنے اور ساحلِ مراد تک پہنچانے کا کام جس اولوالعزمی اور ہمت و استقلال سے اُنھوں نے انجام دیا اُس کو دنیا اچھی طرح جانتی ہے۔ مصر کو برطانی تسلط سے آزاد کرانے کی ایک مزید کوشش ۱۹۳۰ء میں کی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کامیابی کی منزل قریب ہے۔ لیکن جب عہدنامہ کا مسودہ تیار کیا گیا تو سوڈان کے مسئلہ پر فریقین میں اختلاف باقی رہ گیا۔ نحاس پاشا چاہتے تھے کہ مصریوں کو مصر سے سوڈان میں نقل مکان کرنے کی عام اجازت دی جائے۔ برطانی حکومت اس پر پابندیاں عاید کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے یہ سمجھوتہ ناکامیاب ہوا اور جوں کا توں رہ گیا۔

اس اثنا میں دوسری چالیں چلی گئیں۔ مصری پارلیمنٹ میں رجعت پسندوں کا اقتدار قائم کر کے نحاس پاشا کو وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کر دیا گیا۔ اور اُن کی جگہ صدقی پاشا کو دی گئی۔ مصری سیاسیات میں انتشار پیدا ہو گیا۔ رجعت پسند اور قوم پرست جماعتوں میں آئے دن لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ برطانیہ نے یہ موقع دیکھ کر اپنی روایتی پالیسی کے مطابق یہ اعلان کر دیا کہ جب تک مصری حکومت کی طرف سے کوئی ایسا مطالبہ نہ کیا جائے جس پر تمام اہلِ مصر متفق الرائے ہوں اور مندوبوں کو ہر جماعت کا اعتماد حاصل ہو، سمجھوتہ کے متعلق کوئی گفت و شنید نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی کسی قوم کی تمام جماعتوں اور تمام افراد میں کبھی اس طرح کا اتفاقِ رائے اور اتحادِ عمل ممکن نہیں ہے۔ خود برطانیہ میں متعدد سیاسی جماعتیں ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہتی ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ شاہ فواد کے منتخب کئے ہوئے قدامت پرست اور رجعت پسند وزراء اور قوم پرست و حریت نواز وفدیوں کے درمیان یگانگی و ہم آہنگی قائم ہو جاتی؟ وفدیوں کے ساتھ تو ایسا سلوک کیا گیا کہ پارلیمنٹ میں ان کی نمائندگی کم کر دینے کے لئے صدقی نے اکتوبر ۱۹۳۰ء میں ایک نیا آئین پاس کرایا۔ اس سے تلخیوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ مصر میں سیاسی نزاع جاری رہی اور مفاہمت کی گفت و شنید منقطع ہو گئی۔

اس کے بعد اطالیہ کی حبش پر تاخت و یورش کے سلسلہ میں ۱۹۳۵ء میں بحیرۂ روم کا مسئلہ اپنی تمام اہمیتوں اور نزاکتوں کے ساتھ برطانیہ کے سامنے آیا۔ اور برطانیہ نے مصر کے اندر اور اس کے آس پاس اپنے بحری، بری اور ہوائی اقتدار کے پیشِ نظر متعدد حفاظتی تدبیریں عمل میں لانی شروع کیں۔ لیکن ۸ ستمبر ۱۹۳۵ء کو وفدی جماعت کے لیڈر نحاس پاشا نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ برطانیہ اور مصر کے درمیان جب تک مساوات کا رشتہ اور برابر درجہ رکھنے والے ممالک کا سا اتحادِ عمل نہ ہوگا۔ برطانیہ مصر سے کسی طرح کی امداد کی توقع نہیں رکھ سکتا۔ یہ بھی حُسنِ اتفاق تھا کہ مصر کی لبرل اور اعتدال پسند جماعت نے بھی اس مسئلہ میں وفدیوں کا ساتھ دیا اور برطانوی مداخلت کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ سر سموئل ہور نے نشۂ غرور کے ترنگ میں یہ کہہ دیا کہ مصر کے لئے ۱۹۲۳ء اور ۱۹۳۰ء کے دونوں دستورِ اساسی بیکار ہیں۔ اور ابھی کسی نئے معاہدے کی تکمیل کا وقت نہیں آیا ہے، یہ اعلان مصری آزادی کے حق میں ایک خداداد نعمت ثابت ہوا۔ مصر کی تمام جماعتیں اس کی مخالفت میں متحد اور ہم نوا بن گئیں۔ ہر طرف شورش اور ہنگامہ کا طوفان

شروع ہوگئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ مصری پارلیمنٹ میں بھی حکومت کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم ہوگیا۔ وفدی، لبرل، شاہی، نیشنلسٹ، سعدی وفدی، جوابی تعاونی، اور آزاد جماعتیں سب کی سب ایک ہوگئیں۔ اور انھوں نے ایک طرف تو موجودہ وزیر اعظم نسیم پاشا کی ڈکٹیٹری کی ایسی مخالفت کی کہ ان کو وزارت سے مستعفی ہوجانا پڑا۔ اور دوسری طرف برطانیہ سے ایک نئے اور تشفی بخش سمجھوتہ کا مطالبہ کیا۔ اس اثنا میں متحدہ محاذ نے تمام اندرونی اختلاف رفع دفع کردئے اور ایک ایسا مصری وفد منتخب کرنے میں کامیابی حاصل کی جس کو تمام جماعتوں نے برطانیہ سے گفت وشنید کرنے کے لئے اپنا نمائندہ قرار دیا۔ اس وفد کے ارکان میں چھ وفدی، اور باقی پانچوں جماعتوں کے ایک ایک نمائندے شامل ہیں اور خود نحاس پاشا اس کے صدر ہیں۔ برطانیہ کے لئے اب ممکن نہ تھا کہ اب مصری مطالبات کو نظر انداز کرے، ایک طرف بحیرۂ روم میں اٹلی کی بڑھتی ہوئی طاقت نے اسے مصر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لئے مجبور کیا، اور دوسری طرف خود مصری جماعتوں کے اتحاد واتفاق کی طاقت اب ایسی نہ تھی اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتی تھیں۔

غرض یہ کہ گزشتہ مارچ میں برطانوی وفد اور مصری وفد نے یکجا ہوکر گفت وشنید کا سلسلہ شروع کیا، اور اب جو معاہدہ طے پایا ہے وہ انہیں کی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس معاہدہ کی شرائط ابھی شائع نہیں ہوئیں، بہت ممکن ہے اس پرچہ کی اشاعت تک شائع ہوجائیں، لیکن چونکہ ان شرائط کے متعلق بہت کچھ معلوم ہوچکا ہے۔ اس لئے ان کا مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

برطانیہ کی تمام فوجیں (بری اور ہوائی) مصر کے دار السلطنت قاہرہ سے ہٹالی جائیں گی، اور اُن کو خطۂ اسماعیلیہ میں نہر سوئز کے آس پاس صرف برطانوی سلسلۂ رسل ورسائل کی حفاظت کے لئے رکھا جائے گا۔ کسی غیر ملکی فوج کا فاتحانہ حیثیت سے قاہرہ میں موجود رہنا مصری قومیت اور خودداری کی ایک زبردست توہین وتذلیل تھی جس کا اب خاتمہ ہوجائے گا۔ برطانیہ کے فوجی مشیروں کی امداد سے ایک بڑی مصری فوج تیار کی جائے گی جس کی تعداد مصر کی داخلی حفاظت کے لئے کافی ہوگی۔ نہر سوئز کے خطہ میں برطانیہ کی فوج صرف مزید بیس سال تک رہے گی۔ اس کے بعد وہاں سے بھی ہٹالی جائے گی۔ اس فوج کی تعداد ابھی معین نہیں ہے۔ مگر برطانوی سیاسی حلقوں میں خیال کیا جاتا ہے کہ دس ہزار سپاہ پر مشتمل ہوگی۔ برطانیہ نے اس امر کی ضمانت کی ہے اسکندریہ کی بندرگاہ کسی جنگ کے زمانہ میں بحری مستقر کے طور پر استعمال نہیں کی جائے گی، نہر سوئز سے اسکندریہ اور سرحد لیبیا تک اچھی سڑکیں تعمیر کردی جائیں گی۔ اور ریلوے لائین بھی بہتر بنادی جائے گی۔ اور برطانیہ ومصر کے درمیان باہمی اتحاد وتحفظ کے لئے جمعیت اقوام کے مسلمہ اصولوں کے مطابق ایک معاہدہ ہوگا جس کی رو سے مصر کو بیرونی جارحانہ حملے سے محفوظ کردیا جائے گا۔

ان معاملات کے بعد صرف دو باتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ایک تو وہ غیر ملکی اجارہ داریاں (CAPITULATION) جن کے رُو سے مصر میں قیام کرنے والے غیر ملکی باشندے مصری عدالتوں کے دائرۂ اقتدار واختیار سے باہر ہیں، اور اُن کے مقدمات خود اُنھیں کی قومی عدالتوں میں فیصلہ پاتے ہیں، یہ اُس زمانہ کی بدترین یادگار ہے جب مغرور مغربی قومیں مشرقی ممالک مثلاً ترکی، مصر، ایران اور چین وغیرہ میں اس طرح کے مخصوص اختیارات حاصل کرکے ان کی قومیت کی توہین کرتی تھیں، برطانیہ نے وعدہ کیا ہے کہ غیر ممالک کی ان نفرت انگیز اجارہ داریوں کو منسوخ کرانے میں وہ مصر کی پوری امداد کرے گا۔ اور اگر یہ معاملہ سمجھوتے سے طے نہ ہوسکا تو مصر کو اختیار ہوگا کہ خود بخود اپنی طرف سے ان اجارہ داریوں کو ختم کردے، ممکن ہے اٹلی اس تجویز کی مخالفت کرے، لیکن مصری حکومت ترکی مسولینی کے طرز عمل سے ایک مفید سبق لے سکتی ہے، اور اپنے داخلی اختیارات میں غیر ملکی عدالتوں کی بیجا مداخلت کا خاتمہ کرسکتی ہے۔

اس کے بعد دوسرا اور آخری مسئلہ سوڈان کا ہے جس کے متعلق وفدیوں اور برطانوی حکومت کے درمیان ۱۹۲۲ء سے ابتک سمجھوتہ نہ ہوسکا، امید کی جاتی ہے اس سلسلہ میں بھی کوئی باعزت مفاہمت ہوجائیگی اور مصری فوجوں کو سوڈان کے تحفظ میں حصہ لینے کا حق حاصل ہوجائیگا مصریوں کے نقل مکان اور دریائے نیل کے پانی کے مسائل پر ابھی تفصیلات ہمارے سامنے نہیں آئی ہیں۔ لیکن یقین ہے کہ نحاس پاشا ہرگز کسی ایسے معاہدہ پر دستخط نہیں کرینگے جس کی ایک شرط بھی مصر کے جائز حقوق اور عزت وخودداری کے خلاف ہوگی، ان تمام معاملات پر برطانیہ اور مصر کے درمیان اگر اتفاق رائے اور دوام اتحادِ عمل کارفرما رہا تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس معاہدے سے مصر پر برطانیہ کا قبضہ ختم ہوتا ہے، اور انگلو مصری دوستی ورفاقت کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے، آج جبکہ زغلول پاشا کے انتقال کو نو سال گزر چکے نحاس پاشا کے ہاتھوں آزادیٔ مصر کا خواب ایک حقیقت بنگیا، مصر کی آئندہ نسلیں ان دونوں فدائیانِ حریّت کی خدمات اور ان کے زرّین کارناموں کو یاد کریں گی۔

نقد و نظر
(کتب)

ادارۂ کلیم

رحلت خلفائے راشدین

مصنف مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی
قیمت آٹھ آنے
پتہ دفتر ہند نمبر ۲ اے چترنجن ایونیو۔ کلکتہ

اس کتاب میں خلفائے راشدین کی رحلت کے حالات جمع کئے گئے ہیں جو تمام معتبر اور مستند کتب سے ماخوذ ہیں۔ خلفائے راشدین ہی وہ بزرگ اور ممتاز تاریخ اسلام کی شخصیتیں ہیں جن کے مساعی اور جن کی پاک بے نفس زندگیوں کے اثرات نے دنیا کو اُس اسلامی سیل سے روشناس کرایا ہے جس کے نشان آج ساری دُنیا میں ایک مستقل ملت کی صورت میں نمایاں ہیں۔ مسلمانوں کا ایک عالمگیر قوم کی صورت میں نظر آنا اور ساری دنیا پر کارفرمائی کرنا۔ انہی حضرات کے نقشِ قدم پر چلنے کا نتیجہ۔ اور اُن ہی کے فیوض و برکات کا صدقہ تھا۔ حضرت ملیح آبادی نے یقیناً اس چھوٹی سی کتاب میں ان مبارک ہستیوں کے حالاتِ رحلت جمع کرکے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا ہے جس سے ہر اردو داں مسلمان بلا دقت خلفائے راشدین کے اس وقت کے حالات سے باخبر ہو سکتا ہے جس وقت جلیل القدر وشاہوں کو دنیا نے حسرت و ارمان زدہ دیکھا ہے۔ بہتوں کو روتے اور دنیا کے فراق پر تڑپتے ہوئے پایا۔ لیکن یہ حضرات اُس وقت بہایت مطمئن خوش اور ملت کے لحاظ سے ضروری خدماتِ ملت انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قیمت بہت کم ہے۔ اس لئے ہر شخص کو پڑھنا اور مستفید ہونا چاہیئے۔

فردوس افکار

مصنفہ۔ جناب شمس الدین حسن
قیمت قسم اول ۸/ قسم دوم ۶/
ملنے کا پتہ۔ پنجاب پبلسٹی بیورو۔ نمبر ۵ چیمبرلین روڈ۔ لاہور

یہ کتاب جناب شمس الدین حسن صاحب کے ۱۸ طبعزاد افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو ۲۰×۳۰/۱۶ کی تقطیع پر چھبی سائز میں شائع ہوا ہے۔

اس مجموعے کے تمام افسانے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دو پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک اخلاقی و معاشرتی، دوسرا سیاسی و اقتصادی۔ مصنف نے روزمرہ کے واقعات کو دلچسپ پیرائے میں پیش کرنے، بعض سوشل خرابیوں کی اصلاح کرنے اور نادار و پسماندہ جماعتوں کو بلند سطح پر لانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا دیباچہ حضرت مفتی ضیاء الدین صاحب ضیائی نے تحریر کیا ہے۔ مختصر افسانوں کے شائقین کے لئے یہ مجموعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

انتخاب کلام مضطر

مصنفہ ڈاکٹر محمد عبدالغفور صاحب مضطر مرحوم
مرتبہ محمد احسن الغفور، بی اے (علیگ)

ڈاکٹر محمد عبدالغفور صاحب مضطر آگرہ کے ایک کہنہ مشق اور صاحب ذوق شاعر تھے۔ اور متعدد اصناف سخن میں طبع آزمائی فرماتے تھے۔ ان کے خلف الرشید جناب محمد احسن الغفور صاحب نے ان کے کلام کا مجموعہ شائع کرکے دنیائے ادب

میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ یہ مجموعہ دو حصوں پر منقسم ہے، ایک حصہ میں منظیر مرحوم کی نظمیں، غزلیں اور مخمسات وغیرہ درج ہیں اور دوسرے میں اُن کے مضامین نثر شامل ہیں۔ کتاب مجموعی حیثیت سے دلچسپ ہے۔ اس کی قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں ہے۔ غالباً اس پتہ سے دستیاب ہوسکتی ہے۔ محمد احسن الغفور۔ بی اے ڈپٹی انسپکٹر مدارس اسلامیہ۔ حلقہ دوم۔ آگرہ

پاک زندگی

مصنفہ۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند

قیمت چار آنے

ملنے کا پتہ۔ منیجر دینی بک ڈپو کوچہ ناہر خاں۔ دہلی

پاک زندگی حضرت مولانا احمد سعید صاحب کے تین عالمانہ مضامین کا مجموعہ ہے جس کو مولانا موصوف کی اجازت سے دینی بک ڈپو نے دوسری مرتبہ شائع کیا ہے۔ ان تینوں مضامین کے عنوان یہ ہیں۔

(۱) ایک طالبِ حق کو حق کی تلاش۔ حیاتِ خلیل پر ایک نظر۔

(۲) محمد رسول اللہ صلعم، رسول الثقلین کی حیاتِ طیبہ۔

(۳) درود شریف پڑھنے والوں پر رحمتِ الٰہی کی بارش۔

ان مضامین کے عنوانات خود اُن کی تفصیل پر پوری روشنی ڈالتے ہیں۔ جو لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اعلیٰ مذہبی اور اخلاقی زندگی کے لئے مولانا کے ملفوظات میں کیسی کیسی ہدایتیں اور حضرتِ ابراہیم خلیل اللہؑ اور رسولِ اکرم صلعم کی زندگیوں میں انسانوں کے لئے کیا کیا اسوۂ حسنہ موجود ہیں، وہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں درود شریف پڑھنے کے طریقے اور اس کے فضائل و برکات نہایت تفصیل کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔

اصلاحِ دیہات کا مسئلہ

مصنفہ ڈاکٹر زیڈ اے احمد بی ایس سی، پی۔ ایچ۔ ڈی

قیمت چار آنے

ملنے کا پتہ۔ دفتر آل انڈیا کانگریس کمیٹی۔ الہ آباد

یہ کتاب جو انگریزی زبان میں ہے کانگریس کے سیاسی اور اقتصادی رسالوں کے سلسلہ میں شائع کی گئی ہے، اور صدر کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کا مختصر مقدمہ تحریر کیا ہے۔ ہندوستان میں اصلاحِ دیہات کا مسئلہ اس وقت تمام مسائل سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور چونکہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اس لئے ظاہر ہے کہ سارے ملک کی فلاح و بہبود کاشتکاروں کی فلاح و بہبود سے وابستہ ہے۔ رسالہ مذکور کافی تحقیقات کے بعد ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے۔ اور اعداد و شمار کے ذریعے مباحث کے ثبوت پیش کئے گئے ہیں تعلیم حفظانِ صحت اور سماجی مسائل کے علاوہ دراصل تین چیزیں ہیں جو ہندوستانی دیہاتوں کی بدحالی اور افلاس کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ (۱) چھوٹی چھوٹی زمین آراضی کا اصلی مالکوں کے ہاتھ سے بڑے زمینداروں یا سود خوار مہاجنوں کے ہاتھ میں منتقل ہوجانا (۲) کاشتکاروں پر قرض کا غیر معمولی بار (۳) سرکاری لگان کا بڑھا ہوا مطالبہ جو چھوٹے چھوٹے زراعت پیشہ زمینداروں کو پیس رہا ہے، ان تینوں اہم مسائل پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور اس کا مطالعہ نہ صرف اصلاحِ دیہات کے علمبرداروں کے لئے بلکہ حکومت کے افسرانِ اعلیٰ کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا۔ ہماری رائے ہے کہ اس طرح کے رسالوں کے اردو ترجمے بھی شائع ہونے چاہئیں۔

(رسائل)

رفیق

مدیر جناب کامدار الدنی

قیمت سالانہ ایک روپیہ آٹھ آنے۔ فی پرچہ دو آنے

ملنے کا پتہ۔ منیجر رفیق۔ گھنٹہ گھر۔ میرٹھ

رفیق کا پہلا نمبر ہمارے پاس بغرض ریویو آیا۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کے مدیر نے متعدد مضامین اور افسانے خوش اسلوبی سے جمع اور مرتب کئے ہیں۔ اور "رفیق" کو ایک اچھا اور مقبولِ عام رسالہ بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں اسی طرح ترقی کرتے ہوئے یہ رسالہ کامیابی کی اعلیٰ سے اعلیٰ منزل تک پہنچ جائے گا۔ ضرورت ہے کہ آئندہ اس کی کتابت بہتر کی جائے۔

ہفتہ وار خلافت — بمبئی

مدیران
مولانا شوکت علی (خادم کعبہ)
رئیس احمد جعفری (ندوی)

روزنامہ خلافت کے علاوہ کارپردازان خلافت نے ہفتہ وار خلافت بھی نکالنا شروع کیا ہے۔ چنانچہ ۲۳ اگست کا پرچہ جو ہمارے سامنے ہے ہندوستان کے دوسرے ہفتہ واری اخبارات کے مقابلہ میں نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ ہفتہ بھر کی ضروری مصور و غیر مصور خبریں شعر و سخن۔ بہترین مضامین اور اعلیٰ درجے کے افسانوں سے اسے مرتب کیا گیا ہے۔ اگر ہفتہ وار خلافت اپنے موجودہ معیار کو مستقل مزاجی سے قایم رکھ سکا۔ تو عجب نہیں کہ وہ ہندوستان کا سب سے بلند پایہ ہفتہ واری اخبار شمار کیا جائے گا۔

سرشار

اعظم گڑھ نے ادب اردو کی خدمت کے سلسلے میں نمایاں نام پیدا لیا ہے جس طرح رسالہ معارف اپنے علمی اور مذہبی مضامین کی وجہ سے ہندوستان میں شہرت رکھتا اسی طرح سرشار بھی ادبی خدمات کا تہیہ کرکے میدان عمل میں کود پڑا ہے۔ بقول ایڈیٹر جو کچھ ڈال دنیا، پہلے نمبر میں پیش کیا گیا ہے وہ اعلیٰ مضامین اور بلند پایہ نظموں پر مشتمل ہے، تعارف کے تحت میں حضرت نشتر سندیلوی، منشی پریم چند۔ خان بہادر مولوی محمد سعید صاحب سنگم۔ سید محمد حسینی، جناب بدر مچھلی شہری۔ مسٹر عارف چشتی حضرت کلیم اعظمی کے نام نامی نظر آتے ہیں۔ ان حضرات کا نام ہی رسالے کے اعلیٰ پایہ ہونے کی ضمانت ہے۔ رسالہ کی طباعت دیدہ زیب ہے۔

چندہ سالانہ تین روپے۔ فی پرچہ ۴ آنے۔ ملنے کا پتہ ایڈیٹر صاحب سرشار اعظم گڑھ

جلوۂ سخن

زیر سرپرستی حضرت محوی لکھنوی
ایڈیٹر حکیم محمد عبد الغفار
قیمت سالانہ ۲؎ فی پرچہ ۲؎
پتہ۔ ایڈیٹر جلوۂ سخن ادیب چوک بورنگ پیٹ بنگلور

جلوۂ سخن کا جولائی و اگست کا مشترکہ نمبر جو زیر ریویو ہے ایک حد تک اچھا خاصا رسالہ معلوم ہوتا ہے، اور کیوں نہ ہو جب اُسے حضرت محوی کی سرپرستی حاصل ہے۔ رسالہ ہذا میں زیادہ تر طرحی غزلیں ہیں۔ بعض بلند پایہ شعراء کے نام بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ ایک دن جلوۂ سخن جنوبی ہند میں اردو ادب کی بہترین خدمت کے قابل ہو سکے گا۔

نغمۂ بیداری

مولف حاجی نبی احمد صاحب بریلوی
قیمت ۲؎
مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔

حضرت نبی احمد صاحب نے ۱۶ صفحات میں درسی کتب کے سائز پر یہ مسدس چھپوا کر شائع کی ہے۔ مسدس حالی اور اقبال کے شکوہ و جواب شکوہ کے بعد اسلام کے ماضی حال اور مستقبل پر منظوم تبصرہ کرنے کی بہت شعرا کوشش کرتے ہیں۔ یہ بھی اُسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ نبی احمد صاحب نے بعض بند بہت اچھے لکھے ہیں۔ کتابت و طباعت بھی اچھی ہے۔ صاحب ذوق حضرات حضرت مصنف سے طلب فرما کر داد سخن دیں۔

الزہرا

قیمت سالانہ دو روپے — مقام اشاعت۔ عزیز روڈ مصری شاہ۔ لاہور

یہ زنانہ رسالہ جو حال ہی میں جاری ہوا ہے ایک بلند پایہ رسالہ ہے اور اُس تحریک النساء کی ایک مفید کڑی کہلانے کا مستحق ہے۔ جو عام طور پر بلا کسی خاص جد و جہد کے ہندوستان کی مسلمان عورتوں میں مردوں کے حق از خود مساوی حقوق چاہتی ہیں۔ اگست کے پرچہ میں ایک دلچسپ تنقید فرخ صاحبہ کی پرویز شاہدی کی ایک نظم پر نکلی ہے جو جولائی کے پرچے میں عورتوں کی بے پردگی پر انھوں نے نہایت دہنی کے ساتھ کہی تھی۔ ہم تنقید کنندہ خاتون کی دلیری اور صفائی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مختصر الزہرا، اچھا رسالہ ہے۔ مگر اس کی مدیر خواتین سے درخواست ہے کہ رسالہ ہذا کی ترتیب و تدوین میں زیادہ کوشش و کاوش سے کام لیں۔ امید ہے کہ رسالہ بہت جلد کامیاب ہوگا۔

ایک علمی. ادبی تنقیدی اور فلمی مصور ماہنامہ

کنول

جو اپنی نفیس سلیس درخشانیاں لئے ہوئے، پورے جمال اور تجمل، تسنیم آفریں مضامین، کوثر بار نظموں، روشن اور منور ترتیب کے ساتھ انتہائی پابندی وقت کے ساتھ دو سال سے شائع ہو رہا ہے۔

کنول - ایک انقلابی معیاری فلمی اور تنقیدی ماہنامہ ہے جس نے تمام ہندوستان میں ہلچل ڈال دی ہے اگر آپ کسی ایسے رسالے کی خریداری کی آرزو رکھتے ہیں اور ادب اردو سے لگاؤ ہے تو آج ہی کنول کے خریدار ہو جائیے۔

کنول ہندوستان میں اپنی قسم کا پہلا ماہنامہ ہے، جس میں بہترین علمی تنقیدی تفریحی، اور تعمیری مضامین کے ساتھ ساتھ بہترین فسانے اور ہندوستان کے مستند شعرا کا کلام شائع ہوتا ہے۔ ہر ماہ آرٹ کی کئی تصویریں ... ان تمام خوبیوں کے باوجود سالانہ قیمت صرف تین روپے مقرر کی گئی ہے۔ تاکہ ہر صاحب ذوق آسانی سے خرید ... منی آرڈر سے بھیجئے، نمونہ کی قیمت ۵ ر ہے مفت طلب نہ فرمایئے، لکھائی چھپائی اعلیٰ، کاغذ روشن اور ... ترین جس کے دیکھتے ہی آپ کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔

مینیجر ماہنامہ کنول مرکز اشاعت آگرہ



ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا، دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کرسکوں،



عیلِ حکم کے لئے فردوس مثال کشمیر، جنت نظیر سوئٹزرلینڈ، شاداب
ئیر سماٹرا، اور گل پاش مرغزاروں میں گل چینی کی گئی،
جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں
پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی اس قدر مرجھائے
ہوئے تھے کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی،
مہارانی اس خواہش کو پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی، کھانا
پینا ترک کر دیا، مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا، اور وزراء سے مشورہ طلب کیا، مہتمم توشہ خانہ نے اصغر علی محمد علیؒ سے
عطر منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی، فوراً عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شبابِ رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا۔

اصغر علی، محمد علی، تاجرانِ عطر، لکھنؤ و دہلی

REG. L.NO.3694




کلیم
مدیر: جوش ملیح آبادی



ایشیائے کوچک کی جھیل کی پریاں

منظور شدہ سرشتۂ تعلیم گورنمنٹ میسور
بنام قوت و حیات

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت نے بلا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آگے کی صدیوں پہ ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

[illegible]

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے

قیمت فی پرچہ نو آنے

دہلی

اردو زبان کا ہر جہت سے قیمتی ماہنامہ

جلد ۲ | بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۳۶ عیسوی | نمبر

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے کوہ نور برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ کلیم گلی کند رکشان، بازار کھجوری سے شائع کیا)

اشارات

مُردہ پرست ہندوستان

صبح کا وقت ہے، گھٹائیں کہیں کالی ہیں، کہیں بھوری، ہوائیں نرم اور ٹھنڈی ہیں۔ اور ریڈیو پر "عرضِ ہنر میں خاک نہیں" کی شکایت کرنے والے غالب کی غزل

ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

بھیرویں کی دُھن میں گائی جارہی ہے۔

کمرے میں عُود جل رہا ہے، عود کے معطر دھویں میں راگنی کی ملایم لہریں رقص کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ اور فضا میں غالب کی رُوح :-

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

کا تصور کئے گنگناتی ہوئی نظر آرہی ہے۔

میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ اور غم میرے دورانِ خُون میں کروٹیں لے رہا ہے۔

یہ وہی دہلی ہے جہاں کی گلیوں میں غالب چلتا پھرتا اور :-

جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

سے لطف اندوز ہوتا تھا ــــ اور آج اسی دہلی کی خاک میں وہ سو رہا ہے۔

یہ وہی دہلی ہے جس کے سر پر برّ اعظم ہندوستان کا زرنگار تاج جگمگاتا تھا۔ اور جس کے ذرّوں پر بڑے بڑوں کی پیشانیاں جھکتی تھیں۔

یہ وہی دہلی ہے جس کے حلقۂ رنگ و بُو میں شباب و شعر کی بڑھتی ہوئی اُمنگوں کے ساتھ غالب داخل ہوا تھا۔

آج غالب پوجا جارہا ہے۔ کل جب وہ زندہ تھا تو اسی دہلی میں اکثر و بیشتر آدھ پاؤ گوشت، اور پاؤ بھر شراب کے لئے ترستا رہتا تھا۔

آج غالب کے دیوان کو ہندوستان کی آسمانی کتاب کہا جاتا ہے کل جب وہ زندہ تھا تو اسی دہلی میں اُسے مُہمل گو کا خطاب دیا گیا تھا۔ اور اُسے بار بار

نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

کہنا پڑتا تھا۔

آج ملک کے بڑے بڑے دولت مند اُس کے مزار کی "زیارت" کے واسطے آتے ہیں۔ کل جب وہ زندہ تھا تو اُسے خود امرا کے دروازوں پر جانا پڑتا تھا۔

آج اُس کی قبر کے لئے بڑے بڑے چندے جمع کئے جاتے ہیں۔ کل جب وہ زندہ تھا تو :-

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کا رونا رویا کرتا اور کرایے کے حقیر مکانوں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور رہتا تھا۔

آج اُسے "علیہ الرحمتہ" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، کل جب وہ زندہ تھا تو اسی "علیہ الرحمتہ" کو دنیا "شرابی" کے نام سے پکارتی۔ اور "لونڈوں کے پڑھانے والے" "دریبے" کے مولوی اُسے "فاسق و فاجر" کہا کرتے تھے۔

آج اُس کی شان میں اگر کوئی اہانت کا ایک کلمہ بھی زبان سے نکالدے

تو پوری قوم اس سے نفرت کرنے لگے۔ کل جب وہ زندہ تھا تو قمار بازی کے الزام میں اُسے قید کرا دیا گیا تھا۔

یہ کتنی تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستان اس شدت کے ساتھ مُردہ پرست واقع ہوا ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ آج بھی بوڑھا ہندوستان اپنے جوان روح اہلِ کمال کو تیکھی نظروں سے دیکھ رہا اور انھیں حسبِ دستورِ قدیم جی بھر کے پامال کر رہا ہے۔

ہندوستان اپنے ہر صاحبِ کمال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ او نامراد جب تک تو زندہ رہنے کا جرم کئے جائے گا میں تجھے چین سے نہیں رہنے دوںگا۔ اور جب تو ایک سعادت مند فرزند کی طرح مر کر میری حسرت نکال دیگا تو میں اغیار کی دست برد سے بچا کھچا اپنا تمام و کمال سونا تیری لوحِ مزار پر چڑھا دوںگا۔

ابھی کچھ دن ہوئے کہ ہز ہائی نس والیٔ بھوپال کی زیرِ صدارت حالؔی کی صد سالہ یادگار بڑے طمطراق سے منائی گئی تھی ——

اگر زندگی میں حالی چاہتے کہ اپنی سالگرہ کی تقریب میں نواب صاحب بھوپال تو بڑی چیز ہیں، صرف پانی پت کے چند کھاتے پیتے زمینداروں ہی کو جمع کر لیں تو یقین مانئے کہ وہ ایک پرانی وضع کے مقروض زمینداروں کے علاوہ بڑے زمینداروں میں سے ایک بھی شرکت کا ننگ گوارا نہ کرتا ——

اور اگر وہ اس تقریب میں بھولے سے کسی "ہز ہائی نس" کو دعوت کا رقعہ بھیج دیتے تو ایک طرف تو یہ ہوتا کہ "ہز ہائی نس" کا پرائیویٹ سکریٹری اُس گستاخ دعوت نامے کو چاک کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا۔ اور دوسری طرف جو شخص یہ سن پاتا کہ ا۔

آج حالی بھی بلاتے ہیں گھر اُن کو مہمان

تو وہ اس قدر ہنستا کہ پیٹ میں بل پڑ جاتے، اور پسلیاں پھوڑے کی طرح دکھنے لگتیں۔

مبارک ہیں ناقدر شناس و مُردہ پرست ہندوستان کے وہ اہلِ کمال جو مر چکے ہیں —— اور حیف ہے اُن بدبختوں پر جو اس دشمنِ کمال سرزمین پر زندہ ہیں۔ اور مرنے کی آرزو میں جی رہے ہیں۔

نشہ، اور بنی نوعِ انسان

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر مانام فسق !!
داوری دارم بسے۔ یارب کرا داور کنم ؟

نشہ، ہر اُس کیفیت کو کہتے ہیں جو خون کی رفتار کو تیز کر کے جذبات میں ایک گرمی اور ابھار پیدا کر دے، اور سنجیدگی و بے کیفی کو سرور و نشاط کے سانچے میں ڈھال دے۔

دنیا کی تمام دوسری چیزوں کی طرح نشے کے بھی مدارج ہوتے ہیں —— درجۂ ادنیٰ، متوسط، اور اعلیٰ۔ لیکن تفاوتِ مدارج کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ ان مدارجِ ثلاثہ میں سے کسی ایک درجے کو نشے کی تعریف سے خارج کر دیا جائے۔ جس طرح ایک کم تیز دوڑنیوالے کو دوسرے زیادہ تیز دوڑنے والے کے مقابلے میں ساکن و غیر متحرک نہیں کہا جا سکتا، اُسی طرح نشے کے درجۂ ادنیٰ و متوسط کو اُس کے درجۂ اعلیٰ کے مقابلے میں عدمِ نشہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا —— کسی کی نیند ہلکی ہوتی ہے، اور کسی کی گہری۔ مگر سونے کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔

قدیم تعصبات کی بنا پر، لوگ، نشے کے موضوع سے غیر ہمدردانہ رویہ کے ساتھ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ حالانکہ نشہ اس درجہ اہم اور ناگزیر شے ہے کہ انسان اس کے بغیر جی ہی نہیں سکتا۔

سوسائٹی اپنی موروثی کم بینی کی بنا پر نشے کو صرف اُن چیزوں سے منسوب و مختص کرتی ہے جو حکومت کے اکسائز ڈیپارٹمنٹ (محکمۂ مسکرات) سے متعلق ہوتی ہیں۔ مثلاً افیون، اور شراب وغیرہ ——

لیکن اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو پتا چل جائے گا کہ اس دنیا کے ذرے ذرے پر نشے کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔

(۱) حقہ، سگریٹ، سگار، تباکو، پان، چائے اور قہوہ اگر نشہ آور نہیں تو اور ہیں کیا؟

(۲) فنونِ لطیفہ، سینما، کھیل کود، اور سیر و سفر کے نشہ آور ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے؟

(۳) پھولوں کی خوشبو، ہوا کی سنسناہٹ، مہر وماہ کی تابندگی، لطیف تصورات کی سرخوشی، حسین شکلوں اور منظروں کا نظارہ۔ اور مطبوع صحبتوں کی شرکت۔ کیا ان میں سے کوئی ایک شے بھی ایسی ہے جسے نشے سے خالی کہا جاسکے؟

(۴) بچوں کو پیار کرنا، بچھڑے ہوؤں سے ہم آغوش ہونا، اپنی تعریف سُنکر مسرت محسوس کرنا۔ پُرانے قصّوں کا دہرانا اور دلچسپ حکایات کا سننا، کیا ان سب میں نشہ نہیں پایا جاتا؟

اکثر افراد یہ کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں کہ جی گھبرا رہا ہے۔ اس جی گھبرانے کا مفہوم آپ سمجھے، یعنی تھکی ہوئی رُوح سنجیدگی سے تنگ آکر کسی نشے کا مطالبہ کر رہی ہے۔

آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ لوگ نیندیں حرام کئے ہوئے رات کے دو دو بجے تک گپیں اُڑاتے ہیں۔ اور سونے کا نام تک نہیں لیتے۔ کیونکہ گپ سے اُن کو نشہ ہوتا ہے۔ اور اس نشے کے سامنے وہ اُن فرائض کی پروا نہیں کرتے جنھیں آفتاب کے طلوع ہونے سے پیشتر اُنھیں انجام دینا ہے۔

اسی طرح جھوٹ کو لیجے۔ جھوٹے اس یقین کے باوصف کہ لوگ اُن کی بات کا اعتبار نہیں کرتے، اور اُنھیں انتہا درجے کا جھوٹا سمجھتے ہیں جھوٹ بولنے سے باز نہیں آتے۔ وہ جھوٹ بولتے اور دھڑلّے کے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس لئے اور صرف اس لئے کہ جھوٹ اُن کا نشہ ہوتا ہے۔ اور کوئی شخص نشے سے باز نہیں رہ سکتا۔

ایک بخیل جب روپے گنتا اور ایک مُسرف جب خرچ کر رہا ہوتا ہے، آپ اگر ان دونوں کا غائر مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اس وقت طبعی حالت میں نہیں بلکہ نشے میں سرشار ہوتے ہیں۔

انسان کے رنگین مشاغل سے قطع نظر کرکے کہ اُن کی سکر آفرینی تو بدیہیات میں سے ہے۔ آپ اگر اُن مشاغل واعمال کو پرکھیں جنھیں انتہائی سنجیدہ، اور مقدّس سمجھا جاتا ہے تو یہ معلوم کرکے آپ کو تعجب ہوگا کہ وہ بھی نشہ اور سراسر نشہ ہی ہوتے ہیں۔

مُطالعہ کتب ہو کہ اخبار بینی، ایجاد واختراع کا انہاک ہو کہ تفکر وتدبر کا استغراق اور اوراد ووظائف ہوں کہ ذاکری وسیلا وخوانی، مضمون نویسی ہو کہ خطابت، علمی مباحثہ ہو کہ مذہبی مناظرہ۔ موعظت وقرأت ہو کہ مکاشفہ ومراقبہ۔

ان تمام مشاغل واعمال کی دیدہ ریزی کے ساتھ تحلیل کیجائے، تو یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہو جائے گی کہ یہ سنجیدہ ومقدس اعمال بھی نشے کے حدود سے ایک انچ باہر نہیں ہوتے۔

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ لوگ جس وقت کسی روحانی مطالعے میں مصروف، یا کسی روحانی قرأت میں مشغول ہوتے ہیں، تو اُن کی آنکھوں اور اُن کے چہروں کے رنگ میں نشہ کھیلتا ہوا نظر آتا ہے؟

اس کے دوش بدوش اب میں وہ بات عرض کرتا ہوں جسے سُنکر آپ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ اور آپ نشے کے عالمگیر استیلا کو دیکھکر دنگ رہجائیں گے۔ یعنی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ رامش ورنگ اور رقص وسرود ہی میں نشہ نہیں ہوتا بلکہ ظالم نشہ ٹھنڈی آہوں اور گرم آنسوؤں کے اندر بھی لہریں لیتا رہتا ہے۔

عطّار اگر:-

"ذرۂ دردے دلِ عطّار را"

اور میر:-

"اگر مزا ہے تو پچھلے پہر کے رونے میں"

کا نعرہ لگاتا ہے، تو اس کے معنی اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتے ہیں۔ کہ "دردِ دل" اور "اشکِ غم" بھی نشے ہی کے دو شاعرانہ نام ہیں۔

اب آپ سمجھے کہ نشے کا دائرہ کتنا لامحدود اور نشے کے اقسام کتنے بے شمار واقع ہوئے ہیں؟

ان حالات میں اگر یہ دعوےٰ کیا جائے کہ نوعِ انسانی کو حیات کی ہر منزل اور زندگی کے ہر قدم پر نشے کی ضرورت اور شدید ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اور ہر فرد اس دنیا میں کسی نہ کسی نشے کا ایسا خُوگر ہوتا ہے کہ اُس کے بغیر جی ہی نہیں سکتا۔ تو اس حقیقتِ کبریٰ کے تسلیم کرنے میں کس کو تامل ہو سکتا ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ انسان ازلی قدح خوار اور ابدی شرابی واقع

ہوا ہے تو کس کی مجال ہے کہ انکار کر سکے؟

ہاں میں اعلان کروں گا۔ اور۔

گرچہ بر واعظِ شہر ایں سخن آساں نبود

ڈنکے کی چوٹ اعلان کروں گا کہ یہ عظیم المرتبت محسن بنی نوع انسان نشۂ عِلم ہی ہے جو حیاتِ انسانی کے ڈولتے ہوئے سفینے کو حوادث کے ہولناک طوفانی سمندر میں سرشاری و مستی کے ساتھ کھیتا ہوا ساحلِ مراد تک پہونچا دیتا ہے۔ اور آلام کی سنگ باریوں کا مقابلہ کرنے کی خاطر، زندگی کے شیش محل پر ایک ایسا رنگین سائبان تعمیر کر دیتا ہے کہ دردمند انسانیت اُس کی خنک چھاؤں میں میٹھی نیند سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔

سرم خوش است و بہ بانگِ بلند می گویم
کہ من نسیم حیات از پیالہ می جویم

ایک قابلِ غور مسئلہ

کون دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر سب سے زیادہ دردمند حیوان کون ہے۔

لیکن نوعِ انسانی کے عقلا نے اب تک جتنے تجربے کئے ہیں، اور مشاہدے کے میدان میں جس قدر خاک چھانی ہے ہر چند اس پر کامل بھروسہ کرکے کوئی کلیہ تو نہیں قایم کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ انسان جن آلاتِ حواس سے تجربہ و مشاہدہ کرتا ہے وہ خود ناقص اور فریب انگیز واقع ہوئے ہیں۔ پھر بھی محفوظ طریقے سے اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک بھی غلط یا صحیح علم حاصل ہو سکا ہے اُس بنا پر ہم اس فیصلے تک پہونچے ہیں کہ انسان سے زیادہ دردمند اور کوئی حیوان اس کرۂ ارض پر موجود نہیں ہے۔

نوعِ انسانی پر حوادث و آلام کی اس قدر بارش رہتی ہے، اور ابنِ آدم اتنی بے شمار آفتوں میں گھرا رہتا ہے کہ اُس کے مصائب کی فہرست صرف ایک ایسا شخص ہی مرتب کر سکتا ہے جو خاک کے ذرّوں اور سمندر کے قطروں کو شمار کر سکتی ہو۔

مختلف قسم کی جسمانی اور ذہنی بیماریاں، طرح طرح کی ارضی و سماوی بلائیں اور نئے نئے مصائب و آلام، انسان کا اس طرح شکار کرتے ہیں، جس طرح گِدھ مری ہوئی لاشوں کو نوچتے رہتے ہیں۔

نامعلوم زمانے سے انسانی ادراک و شعور کروٹوں پر کروٹیں لے رہا ہے، لیکن معمائے کائنات حل نہیں ہوتا۔ اور اسرارِ حیات کا دروازہ نہیں کھلتا۔ ——— ماہ و سال کے اتنے ناقابلِ شمار کاروانوں کے گزر جانے کے باوجود اور علومِ عقلی کے اس قدر زبردست ارتقا کے باوصف۔ انسان نے ابتک حاصل ہی کیا کیا ہے؟ افسوس صدیوں کی لگاتار عرق ریزیوں کے بعد بھی اُسے آج تک ایک ذرۂ خاک کا بھی عرفان میسر نہیں ہوا ——— ایک حساس و متفکر کا یہ احساس کہ میں ہنوز جاہلِ مطلق ہوں۔ ایک ایسا ہولناک احساس ہے کہ اگر یہ احساس عظیم پہاڑوں کو سونپ دیا جائے تو وہ پلک جھپکاتے ہی سُرمہ بنکر رہ جائیں۔ اور اگر اہلِ شباب رکھنے والے۔ وقت پر اس کا بار ڈال دیا جائے تو چوبیس گھنٹے کے اندر اُس کے بال سفید ہو جائیں۔

نوعِ انسانی کی ہلاکت کے لئے یہ احساسِ جہل ہی کیا کم تھا کہ اُسے دوسری بیشمار بلاؤں میں بھی گرفتار کر دیا گیا ہے۔

ایک گدائے راہ نشین سے لے کر شاہنشاہ ہفت کشور تک کا دروازہ کھٹکھٹائیے، اور پوچھئے "بھائی کیسے ہو؟" ——— اور یقین فرمائیے کہ ہر دروازے سے،

"می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت"

کا جواب ملے گا۔ اور ہر شخص کانپتی ہوئی آواز میں یہ کہتا نظر آئے گا کہ "خیریت نہیں ہے" "اطمینانِ قلب عنقا ہے"؟

انسان کا دل ایک ایسا تاریک شہر ہے جہاں آلام کی سنگین عمارتیں، اور مصائب کے بلند پہاڑ آسمانوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی اس شہر میں آندھی آتی ہے، اور دم بھر کے لئے آلام کی عمارتوں، اور مصائب کے پہاڑوں کو نظر سے اوجھل کر دیتی ہے۔ اور یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جسے ہم "لمحۂ مسرت" کا خطاب دے کر چند لفس کے لئے اپنے کو دھوکا دے لیتے ہیں۔

یہ کچا کچ بھری ہوئی رنگیں اور لا ریاں۔ یہ دم گھٹنے کی حد تک گلی کوچوں

یہ رہبروں کا تیز رو انبوہ، یہ عدالتوں کی زہرہ گداز ہلچل، یہ دفتروں کے کاروبا کی ریل پیل، یہ بازاروں اور منڈیوں کی چیخ پکار، یہ ملوں اور کارخانوں کا شور و غوغا، یہ جلسوں جلوسوں کے ہنگامے، اور یہ ایک ملک سے دوسرے ملک جانے والے کاروانوں کی بھرمار۔ آخر یہ سب کچھ ہے کیا؟ اور اس طوفان کے پس پردہ کون سا جذبہ کام کر رہا ہے؟

اگر آپ ان سب پر غائر نظر ڈال کر اُن کی تحلیل کریں گے، تو پتا چل جائے گا کہ ان تمام ہنگاموں اور کاروانوں کے راستے تو متعدد و متضاد واقع ہوئے ہیں۔ مگر منزل سب کی ایک اور صرف ایک ہی ہے ——— یعنی آدم کا ہر فرزند صرف اس ایک تنہا دُھن میں سرگرداں رہتا ہے کہ کسی طرح اُس شے کو حاصل کرلے۔ جسے وہ اپنے نزدیک "حقیقی مسرت" یا "اطمینان قلب" کے نام سے یاد کرتا ہے۔

لیکن یہ کتنا عبرتناک واقعہ ہے کہ سب کچھ حاصل ہو چکنے کے بعد بھی، اگر انسان کو کوئی شے یقینی اور قطعی طور پر کبھی حاصل ہی نہیں ہوتی، تو وہ اُس کی وہی مرکزی اور تنہا محبوب ترین شے ہے، جسے وہ اپنے نزدیک "حقیقی مسرت" یا "اطمینانِ قلب" سمجھے ہوئے ہے۔

اس جو یائے اطمینان و مسرت نامراد انسان کو دُور سے ہر چیز سونا معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اُسے تمام جسمانی و ذہنی قوتیں صرف کرکے پالیتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ سونا نہیں، بلکہ ایک ایسی چمکتی ہوئی مُٹھی بھر خاک ہے، جو دُور سے سونے کا دھوکا دینے کے لئے بنائی گئی ہے۔

انسان کی یہ موروثی بدبختی کتنی دردناک ہے کہ وہ جن چیزوں کے پیچھے دوڑتا ہے، وہ اُس سے بھاگتی ہیں۔ اور جن چیزوں سے وہ بھاگتا ہے وہ اُس کے پیچھے دوڑتی ہیں ——— اور اس سے بڑھ کر عبرتناک صورتِ حال یہ ہے کہ وہ جس شے کو حاصل کرلیتا ہے، تھوڑے ہی دنوں کے بعد اُس سے اُکتا جاتا ہے۔ اور اب

"ہے آرزو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں"

کا نعرہ لگاتا ہوا تلاش و جستجو کے نئے میدانوں میں از سرِ نو خاک اُڑانا شروع کر دیتا ہے۔

نوعِ انسانی کا نادار طبقہ اس وہم باطل میں مبتلا رہتا ہے کہ امراء و سلاطین کی زندگیاں دراصل مسرت کی زندگیاں ہیں۔

مگر ان امراء و سلاطین کا قریب سے مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہے کہ رشک کیسا، یہ غریب تو اس قابل ہیں کہ ان پر ترس کھایا جائے۔

سب سے پہلی دولت جس پر حیاتِ انسانی کا مدار ہے وہ جسمانی صحت ہے لیکن ان سلاطین کے درمیان پھیلی ہوئی زمین پر ایک شخص بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا۔ جسے سامنے کھڑا کرکے یہ کہا جا سکے کہ دیکھو حقیقی تندرستی اسے کہتے ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ہما عنقا اور صحت ایک ہی خاندان کے ارکان ہیں۔ اور انسان اسی لئے پیدا ہوا ہے کہ ہمیشہ صحت کے لئے ترستا ہی رہے۔

اب رہیں دنیا کی دوسری نعمتیں، یعنی دولت، قوت۔ حکومت، عزت اور شہرت وغیرہ، سو

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

کا رونا رونے والا انسان، ان نعمتوں میں سے ہر ایک کا عربدہ جی بھر کے دیکھ چکا ہے، اور ان "برکات" کی سریع الزوال مسرت بخشی کے بے شمار تجربے لاکھوں بار کئے جا چکے ہیں۔ اور لطف تو یہ ہے کہ ان متذکرہ بالا نعمتوں کی موجودگی بھی اب تک کوئی ایسا آہنی حصار ثابت نہیں ہوئی ہے۔ جسے توڑ کر آفات و آلام داخل نہ ہوسکتے ہوں ——— یعنی ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے بھی انسان مبتلائے آفات ہی رہتا ہے۔

آخر یہ معاملہ کیا ہے کہ ہر دل میں داغ، اور ہر جیب میں ایک فہرستِ مصائب مخفی رہتی ہے؟

ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان "خوب سے خوب تر" ... لگا، اور

حیف بندے ہوئے خدا ہو کے

کے غم میں گھلا کرتا ہے۔

آخر انسان چاہتا کیا ہے؟

"حقیقی مسرت"؟ "کامل اطمینانِ قلب"؟

... لیکن "حقیقی مسرت" یا "کامل اطمینانِ قلب"

(۲) آیا یہ ممکن الحصول شے ہے، یا محض تصوری و تخیلی (IDEA L) ہے، اور اسی وجہ سے ممکن الحصول؟

(الف) اگر ممکن الحصول ہے، تو پھر آج تک کسی اللہ کے بندے کو ملی کیوں نہیں؟

(ب) اگر ناممکن الحصول ہے تو پھر انسان کے قلب میں ایک ناممکن الحصول شے کی آرزو، اور اتنی شدید و محکم آرزو پیدا کیوں ہوتی ہے؟

(ج) آیا اس ناممکن الحصول شے کی یہ شدید آرزو، محض بعض نامعلوم اسباب و حوادث نے اتفاقیہ طور پر پیدا کر دی ہے۔ یا کسی نامعلوم قوت کی بخشی ہوئی ہے؟

(د) اور اگر یہ معصوبت آغاز و عبرت انجام آرزو، نامعلوم اسباب و حوادث کی اتفاقی پیداوار نہیں، بلکہ کسی نامعلوم قوت کی بخشی ہوئی ہے، تو پھر قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہم اس قوت کے متعلق کیا رائے قایم کریں؟

یعنی انسان سے ایسا ہولناک کھیل کھیلنے والی قوت کو "مہرپرور" و "ذرہ گستر" کے نام سے یاد کریں، یا اسے کوئی اور خطاب دیں۔ یا پھر منہ سے ایک حرف بھی نہ نکالیں، اور دل ہی دل میں جو چاہیں، سمجھتے اور کہتے رہیں؟

فسونِ آرزو

(مجموعۂ منکر قدیم)

جس دن سے جبّہ سا ہوں، میں دل کے آستاں پر		ہر جنبشِ نظر سے اڑتا ہوں آسماں پر
رُوحِ شراب یعنی، آنسو پیئے ہوئے ہوں		کونین کی امانت دل میں لئے ہوئے ہوں
کرتا ہوں چاک صدہا پردوں کو ہر نفس سے		گلشن پہ ضوفشاں ہوں، تاریکیِ قفس سے
جیسی ہے میری دنیا، ویسی کہیں نہیں ہے		اوپر فلک نہیں ہے، نیچے زمیں نہیں ہے
شرما کے ماہِ تاباں، منہ اپنا ڈھانپتا ہے		میرے پروں کا سایہ، تاروں پہ کانپتا ہے
اوقاتِ برقِ رَو کا مجھ پر اثر نہیں ہے		میرے لئے نظامِ شمس و قمر نہیں ہے
لیلائے سرمدی سے میری نظر لڑی ہے		زنجیرِ بے ثباتی، ٹوٹی ہوئی پڑی ہے
سجدے کریں فرشتے، میری وہ آبرو ہے		اور کیوں نہ ہو کہ میرے دل میں وہ آرزو ہے

جس کا فسوں نہ جانے کس کس پہ چل چکا ہے
غش کھا چکے ہیں موسیٰؑ، اور طور جل چکا ہے

جوش

شاعر اور لیڈر

اتنا بھی اپنی ذات پہ کرتا ہے کوئی ناز — میری طرف بھی دیکھ، اگر دل میں ہے گداز
تیری نگاہ پردۂ زشت و خوب ہے — میری نظر میں رنگِ طلوع و غروب ہے
تو مضطرب ہے نسخۂ اکسیر کے لئے — میں، زندگی کے خواب کی تعبیر کے لئے
تُو، دوڑتا ہے افسرِ شاہی کے واسطے — میں ارتقائے لامتناہی کے واسطے
تو، سر میں رنگ و نسل کا سودا لئے ہوئے — میں، حُبِّ کائنات سے پیماں کئے ہوئے
بد ہے کوئی نظر میں تری، کوئی نیک ہے — میری نظر میں جلوۂ کونین ایک ہے
ساعی ہے تُو، بلندی و پستی کے واسطے — ناخن ہے میرا عقدۂ ہستی کے واسطے
تجھکو، ہجومِ فکر، پریشاں کئے ہوئے — میں وجد میں، تصوّرِ جاناں کئے ہوئے
رنگِ وطن ہے، تیری جبینِ حیات پر — میری نظر ہے جلوہ گرِ کائنات پر
صندل کی طرح کام ترا دردِ سر میں ہے — مرہم دلوں کے زخم کا میری نظر میں ہے

تُو، آبِ "خوشگوار" میں "صہبائے" قوم ہوں
تُو، فکرِ قوم، ہے، میں "تمنائے" قوم ہوں

تُو باغباں ہے، اور میری ذات باغ ہے — میں دل ہوں اپنی قوم کا، اور تُو دماغ ہے

وہ دل ہوں جس میں سُرخ محبت کے داغ ہیں
ہر داغ پر نثار ہزاروں دماغ ہیں

جوش

ہندوستان میں اسلام اور سیاست کا تصادم

ایک تاریخی پیچیدگی اور اس کے اسباب

از محمد اشرف ایم اے، پی ایچ ڈی

(۱)

نوجوان مسلمان جب اور باتوں سے تھک جاتے ہیں تو کبھی کبھی گفتگو میں ہندوستان کے سیاسی رجحانات اور خصوصیت سے مسلمانوں کی سیاست پر بحث کرنے لگتے ہیں۔ بالعموم ہندوؤں کے تعصبات اور عدم رواداری کا رونا روتے ہیں۔ کوئی کوئی من چلا کبھی پوچھ بیٹھتا ہے کہ آخر ہمارا حشر کیا ہوگا! سوال کرنے والے کو بسا اوقات اس کا احساس بھی ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے بالعموم سیاسی اور سماجی کاموں سے دور رہنے کے باوجود ہندوستان کا سیاسی نقشہ اور عوام کا سیاسی احساس بدلتا اور بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

سننے اور بحث کرنے والے اس سوال کے جوابات اپنی سمجھ کے موافق دیتے ہیں۔ انگریزی پڑھے اور روزگار تلاش کرنے والے خاصکر نوجوان وکیل اور سرکاری نوکریوں کے امیدوار یہ کہہ کر فیصلہ کر دیتے ہیں کہ سوراج اور دوسرے کاموں میں مسلمانوں کے حصہ نہ لینے کی ذمہ داری تمام تر ہندوؤں پر ہے۔ اگر برادران وطن ملازمت اور دوسرے معاملات میں ہمارے تناسب اور نمایندگی کا ذمہ لیں۔ اور ہمارے تمدن۔ مذہب۔ ادب اور زبان وغیرہ کے تحفظ کا دم بھرنے لگیں تو پھر دیکھیے کہ ہندی مسلمان شام و بیت المقدس کے نصرانی اور مصر کے قبطیوں سے بڑھ کر ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد میں حصہ لیں گے، اور پھر مسلمان قوم، جناب ایسی ہے کہ نہ اس میں چھوت چھات کے جھگڑے ہیں، نہ ذات پات کی تفریق، مسلمانوں نے ۱۹۲۱ء کی تحریک خلافت میں دکھا دیا کہ مسلمان ہندو سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔ ہم آج بھی سوراج کے لئے لڑنے اور مرنے کو تیار ہیں، مگر کیا کہیئے ان ہندوؤں کی تنگ نظری اور تعصب کو، یہ لوگ تو دل سے کامل آزادی چاہتے ہی نہیں۔ آخر دیکھیے کہ نہرو رپورٹ پر کیا ہوا، اور بچارے حسرت موہانی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا۔ وغیرہ میں نے خود ذمہ دار مسلمان لیڈروں کو اس قسم کی باتیں کرتے سنا ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے، جو تنہا مسلمانوں کو لے کر انگریزی استعمار اور ہندوؤں سے لڑنا چاہتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جہاں تک گفتگو کا تعلق ہے انھیں فتح اور کامرانی کا یقین ہے۔ پنجاب ہی نہیں، یہ باتیں اور اس قسم کی دلیل اور دعوے ہر صوبے میں مسلمانوں کی آپس کی گفتگو اور نجی مشوروں میں پیش کئے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی جہاں جہاں سیاسی جماعتیں ہیں۔ ان میں ایک چیز قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے یعنی مذہبی جذبہ۔ بحال آزادی کا پروگرام ہو یا سوشلزم، احرار ہوں یا خاکسار۔ یہ احساس سب کو ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ بلکہ بعض اوقات یہ بڑا عجیب نقص پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم پہلے ہندوستانی ہیں یا مسلمان، کوئی کوئی تو رجعت پسند محب وطن مسلمان کہہ اٹھتا ہے کہ ہم پہلے ہندوستانی ہیں بعد کو مسلمان مگر بہرحال یہ دونوں متضاد حیثیتیں برابر ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ ایسی اسناد موجود ہیں کہ تمام ممتاز رہبروں نے حقیر سے حقیر مسلمان کو بڑے سے بڑے ہندو لیڈر پر ترجیح دی ہے۔

اس جذبے اور اس طور پر سوچنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم آزادی ضرور چاہتے ہیں مگر دوسروں سے ممتاز اور ممتاز ہوکر، آزادی کی لڑائی میں لڑیں گے مگر علیحدہ صف بنا کر، چنانچہ ہماری سیاسی جماعتوں سے دو قسم کے فعل ایک ہی وقت میں سرزد ہوتے ہیں۔ اگر اتحاد ملت کی جانب سے کامل آزادی کا علم بلند ہوگا، تو اس کے ساتھ ساتھ دوسرا جھنڈا مسجد شہید گنج کا ضرور نظر آئے گا، اگر احرار آگے بڑھیں گے۔ تو قادیانیوں سے ضرور قوت آزمائی کریں گے اگر ایک طرف کسی معاملے میں خاموش ہو جائیں گے تو تھوڑے ہی دن میں اس کی تلافی اس طرح کریں گے کہ کوئی نیا اور زیادہ ہنگامہ خیز مذہبی اور شامی مسئلہ پیش کر دیں گے، فرض کیجئے کہ جمعیۃ العلما قدم بڑھاتی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ سوشلسٹ اور دوسرے بے دینوں کی خیر نہیں، آخر حامیان شریعت کے وقار اور عظمت کا بھی کچھ تقاضا ہے؟ اس سلسلے میں سب سے دلچسپ رویہ خاکسار تحریک کا تھا کہ اس نے خدائی خدمتگاروں کی طرح ابتدا کی اور بالآخر گذشتہ سال دہلی والے مظاہرے میں منجملہ جواہرلال اور ابوالکلام کے وائسرائے بہادر اور کمانڈر انچیف کو بھی سلامی لینے کی دعوت دی۔ اور لطف یہ ہے کہ سب کارروائیاں اس نظریے کے تحت میں ہیں کہ چونکہ مسلمان صرف مذہب کے نام پر اٹھتا ہے، اس لئے مذہبی تحریکیں پیش کرنا، سیاسی دوربینی کا ثبوت اور ایمان کی نشانی ہے۔

سیاسی لوگ اسے موقع بازی کہتے ہیں۔ مگر یہ سیاست اور دین

سے تعاون کیا۔

ایک طرف یہ دعوی اور دلیلیں، اور یہ سیاسی مظاہرے ہیں۔ دوسری طرف معاشی اور سماجی زندگی کی قوتیں بے خوف و خطر اور مذہبی جذبے سے قطعاً بے نیاز ہوکر سرگرم کار ہیں۔ برطانوی سامراج بلا امتیاز ہندو و مسلمان اپنی کارکردگی میں مصروف ہے۔ ہندوستانی سرمایہ دار، اور بڑے بڑے زمیندار اور ساہوکار اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف مزدور اور کسان اور چھوٹی حیثیت کے لوگ جہاں ایک طرف کساد بازاری اور بے روزگاری سے تباہ ہوتے جاتے ہیں وہاں ان میں طبقاتی تنظیم بھی ہوتی جاتی ہے۔ بیدار مزدور اور کسان اپنے اپنے سیاسی اداروں کو مضبوط اور منظم کرتے جاتے ہیں۔ نوجوان بے روزگاری سے ڈر کر اپنی صف بندی میں مصروف ہیں۔ عام مسلمانوں میں گو صف بندی شروع نہیں ہوئی۔ مگر سننے اور سمجھنے کے لئے وہ بھی مستعد نظر آتے ہیں۔ اور بظاہر یہ تمام رجحانات و محرکات مذہبی جذبات سے ناآشنا ہیں۔ یا کم از کم اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ دونوں متضاد قوتیں اپنی نجی زندگی میں مذہب اور خصوصاً عبادات سے ناآشنا ہیں۔ بسا اوقات بلکہ عموماً سامراج کے نوکر اور حامی، سرمایہ دار اور زمیندار، کسان اور مزدور ایک ہی جگہ پر جمع ہوکر اپنے دینی فریضے ادا کرتے ہیں۔ مگر اس سے ان کی تفریق اور ان کی باہمی کشمکش پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور اگر پڑتا بھی ہے تو زیادہ [illegible] کے معاشی حقوق کے لئے برا ہوتا ہے، غرض کہ ایک سمت سامراج پرست اور دوسری سمت سامراج دشمن قوتیں مجتمع ہوتی جاتی ہیں۔ اور یہ سب دراصل مذہبی وجوہ سے نہیں بلکہ خارجی اور نہ ٹلنے والے تقاضوں سے [illegible] مذہبی لوگ اس بنیادی تفریق کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ [illegible] جماعتیں خوب سمجھتی اور اس کے لئے تیاری کرتی [illegible] زمینداروں اور رؤسا کے بڑے بڑے ادارے [illegible] سرپرستی مدتوں سے ملک میں موجود ہیں [illegible] اس کا چرچا نہیں ہوتا۔ یہ رجعت پسند قوتیں [illegible]

ہیں مگر ہمارے کانوں کو ان کی خبر نہیں۔

~~~~~~

ایسی حالت میں ایک اصولی اور بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے مذہبی صفات کا ہماری سیاسیات میں کیا درجہ ہے؟ یہ سوال دلچسپ بھی ہے اور ضروری بھی ہے۔ اس لئے کہ اسلامی حلقوں سے برابر یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاسیات علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں۔ ہمارا مذہب ہماری سیاست اور ہماری سیاست ہمارا دین ہے۔ مجھے مسجد کانپور سے لے کر جنگ طرابلس و بلقان، خلافت، تنظیم، تبلیغ اور تا حال تحریک فلسطین، مسجد شہید گنج کے سب واقعات اور رجحانات یاد ہیں۔ یہی نہیں بلکہ زمیندار، ہمدرد، ہلال کے صفحات اور ان کے مضامین، خواجہ حسن نظامی کے مجموعے اور مکمل حالات اور اقبال، جوہر، نیرنگ، آغا حشر، شبلی، حسرت کے اشعار غرضیکہ پورا احوال یاد ہے۔ اور اس کے لئے حافظے پر زیادہ زور بھی نہیں دینا پڑتا۔ اس لئے کہ وہ بدلا نہیں ہے۔ قریب قریب یہی وعظ اور تقریریں اس وقت بھی ہوتی ہیں۔ اقبال کے اشعار اور قرآنی آیات و احادیث اسی انداز سے اس وقت بھی پڑھے جاتے تھے، صرف اس قدر فرق نظر آتا ہے کہ پہلے مسدس حالی اور الفاروق وغیرہ کے حوالے زیادہ آتے تھے، اب جانے کیوں بند ہو گئے ہیں۔ اس وقت صرف شکوہ اور ترانہ رائج تھا، اب ماشاء اللہ خضر راہ سے لے کر رموز بے خودی، اور عرب و عجم سبھی کچھ ہے۔ ایک فرق اور بھی نمایاں ہے کہ اس زمانے میں لوگ انگریزی مصنفوں اور خاص کر ولایتی اخباروں کے حوالے زیادہ دیتے تھے۔ باقی استدلال وہی ہے، تقریر کی روانی وہی ہے۔ عالموں کے خطبوں کی تو انتہا اور ابتدا ہمیشہ اور ہر موضوع پر ایک ہی ہوتی ہے اور یہی ان کا طغرائے امتیاز ہے۔ ایک فرق اور بھی ہے، پہلے کامیاب وکیل اور بیرسٹر جلسوں میں بکثرت نظر آتے تھے۔ اب یہ حضرات دفعتاً ناپید ہو گئے ہیں۔ غرضیکہ ہم اور ہمارے سیاسی مباحث سب وہی ہیں۔ صرف اتنا فرق ہے کہ معاشی اور اقتصادی اور ان کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی حالات بہت حد تک ابتر ہو گئی ہے۔ قرضہ اور بے روزگاری کا بار بڑھ گیا ہے۔ فی الجملہ عامۃ المسلمین کی زندگی موت سے بدتر ہے

گرتے گرتے متوسط طبقے کے لوگ عوام بن اور عوام تحت الثریٰ میں پہنچ گئے ہیں سیاسی پابندیاں پہلے سے بہت زیادہ ہیں چنانچہ بجائے عرضی دینے اور محضر بھیجنے کے لوگ جدوجہد کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ بین الاقوامی سیاسیات نے وہ پلٹا کھایا ہے کہ سرے کیا خود اسلامی ممالک کی صورت پہچانی نہیں جاتی، اب نہ خلافت ہے، نہ شیخ سنوسی، نہ انور پاشا اور نہ رشید رضا۔ ایک طرف روس کا ملک اسلامی قوموں کا حامی ہے، جس کا اُس زمانے میں وہم و گمان نہ تھا۔ ایک زمانے میں ظفر علی خاں نے فرمایا تھا ع

اٹلی کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

آج اٹلی کی کیفیت یہ ہے کہ اس نے حبش اور طرابلس پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور البانیہ اور آسٹریا پر اس کا معاشی تسلط ہے۔ بچارے ظفر علی خاں خاموش ہیں۔ اور تو اور اندلس اور فرانس میں مزدور حکومت قائم ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں، کسی نے اُس زمانے میں کہا کہ ع ہم ہونگے عیش ہوگا اور دھوم رول ہوگا، اب دیکھئے تو ہوم رول والوں کی بات تک کوئی روادار نہیں۔ عوام کے سامنے عجیب الجھن ہے کہ پیٹ کی فکر کریں۔ یا علماء اور لیڈروں کے وعظوں کی، علماء وہی کہتے ہیں جو کہتے تھے، لیڈروں کی جادو بیانی اور سحر طرازی میں کوئی کمی نہیں۔ مگر اس سے بقول سعدی

لیکن ایں شکم بے ہنر پیچ پیچ | صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ

عجب مشکل ہے، سنانے والوں اور سننے والوں کی ایک زبان نہیں رہی۔ ایک دل نہیں رہا۔ مگر اس سے سنانے والے پر کیا اثر۔ اس کے لئے بروایت "حکیم امت اور شاعر اسلام" ڈاکٹر اقبال عرفی کی سند کافی ہے کہ ع

حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گران بینی

(۲)

سوال یہ ہے کہ مذہب اور عوام کے معاشی اور سیاسی مفاد کے تصادم یا بالفاظ دیگر مذہب اور زندگی کے تناقض کے موجبات کیا ہیں؟ میرے خیال سے اس کے اسباب اسلام کی ابتدائی تاریخ میں تلاش کرنے پڑیں گے ہم بیسویں صدی میں اور بالخصوص ہندوستان کے مسلمان مورخین کی تصانیف پڑھ کر اس کے عادی ہوتے جاتے ہیں کہ خلافت راشدہ اور چیدہ چیدہ بادشاہوں کے علاوہ باقی اسلامی تاریخ کو روحانی اعتبار سے ایک تاریک
~~~~~~

اور پیمانۂ معصیت و دور شمار کریں۔ جو لوگ ہم سے بھی زیادہ راسخ العقیدہ ہیں وہ خیر القرون قرنی اور دوسری روایات سے تقویت پاکر تیئس دور رسالت کے اور کسی دور کو خاطر میں نہیں لاتے۔ گویا یہ سہل نسخے لوگوں نے اسلام و تاریخ کے پیچیدہ مسائل کو طے کرنے کے نکال لئے ہیں۔

بہرحال تاریخی تقاضے اس جذبے سے بے نیاز ہیں۔ ملوکیت اور معاویہ دونوں کی تاریخ کو ضرورت تھی۔ اور اس ضرورت کو سمجھنے اور ماننے کی بدولت ہی مسلمانوں کی ترقی اور ان کے تمدنی کارنامے وجود میں آئے۔ یہ غیر شعوری خیال کہ ہمارے تمدن اور ہمارے مذہب کے ارتقا کے دھارے علیحدہ علیحدہ ہیں نفس تمدن و مذہب کے نہ سمجھنے کا دوسرا نام ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جمہوریت کی وہ ہیئت جو خلافت راشدہ کے ابتدائی دور میں صورت پذیر ہوئی وہ صرف عرب کے مخصوص حالات میں ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے اسلام کی اس درجہ محدود تاویل کرنا کہ وہ عرب کے باہر منطبق نہ ہو مذہب کو سیاست اور زندگی کے بدلنے والے تقاضوں سے دور کر دینا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ملوکیت کے رائج پا جانے کے بعد یہ اثر ضرور ہوا کہ علماء اور فقہاء کا گروہ ایک سمت چل پڑا، اور بادشاہوں نے رومی اور ایرانی روایات میں رہ کر پرورش پائی۔ لیکن یہ صورت اسلامی تصور کے ساتھ واقع ہوئی، اس لئے گو محدود معنوں میں شریعت کو اس سے رابطہ نہ ہوا لیکن اسلامی زندگی کو اس سے لگاؤ ضرور ہے، عرب کے مخصوص وسائل تمدن کا تقاضا تھا اور کسی حد تک اب بھی ہے کہ لوگوں کی زندگی میں ایک خاص قسم کی جمہوریت رونما ہوا۔ اس کا عکس اسلام کی تعلیم پر پڑا، اس لئے اسلامی زندگی اور اسلامی تعلیمات میں ایک قسم کا تعلق پیدا ہو گیا، عرب سے باہر بھی مسلمانوں کی زندگی میں ایک "واقعیت" اور حقیقت پرستی پائی جاتی تھی، اور فقہ کا یہ کام تھا کہ مذہب کو زندگی کے واقعی تقاضوں سے قریب کرے۔

مثال کے طور پر علامہ الماوردی یا نظام الملک طوسی یا کسی بلند پایہ مفکر کو دیکھئے، نہ وہ اپنی زندگی میں کوئی بنیادی گناہ پاتا ہے۔ نہ ملوکیت اور شہنشاہی کے اداروں کو اس نگاہ سے دیکھتا ہے، جس طرح اس دور کے کم ہمت اور تاریخ سے بے بہرہ عالم اور سیاست داں دیکھتے ہیں۔

تحریک خلافت میں ہم نے صفحے کے صفحے اس میں رنگ ڈالے کہ خلافت ترکوں میں ان ہی معنوں میں موجود تھی، جن معنوں میں خلافت راشدہ میں پائی جاتی تھی۔ آج بھی ہم زندگی کے بین سماجی تقاضوں سے بھاگ کر یا تو اسلام کے ابتدائی دور میں پناہ لیتے ہیں۔ یا پھر اس دور کے لوازم کا جواز اس دور میں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اور دونوں پہلو زندگی کو نہ سمجھنے کا نام ہیں۔ غرضکہ ہمارے سیاسی زوال سے پہلے اسلامی دور میں "حقیقت پرستی" کی وہ روح پائی جاتی ہے، جو اب مفقود ہے۔ رسالت کے مسائل مذہب سے اور مابعد کے مسائل عقل اور سیاسی فکر سے طے پاتے تھے، لیکن دونوں کو حقیقت سے تعلق تھا، اور عوام کی زندگی کے ترجمان تھے، اب حالت دوسری ہے، اب نہ مذہب سے تعلق ہے اور نہ عقل و فکر سے سروکار، غیر اسلامی شہنشاہیت اور سرمایہ داری کو داہیں مان لینے کے بعد ہم اپنی اپنی انفرادی اغراض کو پورا کرنے کا نام سیاست دانی اور ملت پرستی رکھتے ہیں۔

حکومت کے زمانے میں ملت اسلامی میں دو جماعتیں تھیں۔ یعنی حکمراں مسلمان اور عوام۔ تہذیب و تمدن، ادب اور فنون لطیفہ کا امین اعلیٰ اور حکمراں طبقہ تھا۔ عوام حکم بردار تھے، اور خادم اور مخدوم کے پرمعنی ناتے میں مربوط تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ عوام کسی معنی میں علم و فضل اور آرام و آسائش میں شریک تھے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس خود کفالتی معاشی نظام کو دونوں طبقوں کی ضرورت تھی۔ اور سماج ان دونوں کے بل پر اور ان معاشی طاقتوں سے اپنا کام چلاتی اور آگے بڑھتی گئی۔

ہوتے ہوتے انیسویں صدی میں ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ جدید سرمایہ داری نے جنم لیا اور ساری دنیا کے سائنسی اور خود کفالتی نظام پر اس کا اثر پڑا، اور پرانی تہذیبوں اور اداروں کا انحطاط شروع ہو گیا۔ یہ انحطاط اس نئے اور عالمگیر سرمایہ داری نظام کا لازمی نتیجہ تھا۔ جہاں تک ہم مسلمانوں کا تعلق ہے، ہماری ہیئت بالکل بدل گئی ہماری حکومتیں اس نئے نظام کے قبضے میں یا تو براہ راست آگئیں، یا اگر کہیں وہ بچ گئیں تو بھی اس نئے نظام پر نہ مخالفانہ اثر ڈال سکتی تھیں نہ تی

زندگی اور اس کے معاشی رجحانات کو واپس لے جا سکتی تھیں۔ اب کافر و مومن کی ابتدائی تقسیم یا حاکم و محکوم کی بعد والی تفریق حرف غلط کی طرح باطل ہو گئی۔ اب معیشی اور سیاسی تقسیم صرف سرمایہ داری اور سامراج کی وابستگی یا عدم وابستگی کی بنا پر ہو سکتی تھی۔ اب ہمارے سامنے صرف دو اصولی سوال ہیں یا تو سرمایہ داری نظام اور سامراج کی مدد کریں۔ یا اس کی مخالفت کریں۔ مذہب، اخلاق سیاست سب کو اس اصولی سوال کا جواب دینا ہے۔

~~~

ہمارا اپنا دیس یعنی ہندوستان ۱۸۵۸ء میں باضابطہ طور پر ملکہ وکٹوریہ یعنی بالفاظ دیگر برطانوی سرمایہ داری اور سامراجی نظام حکومت کے قبضہ میں آ گیا ہندا میں جب تک برطانوی سامراج کو اپنے تسلط کے لئے ریل، ڈاکخانوں، سڑکوں نہروں، سرکاری محکموں۔ اسکول اور کالجوں کی ضرورت پڑی اور ہزار ہا آدمی اس کاروبار میں کھپ گئے تو اس کا احساس نہ ہوا کہ سامراج کے آنے سے ہمارے معاشی نظام اور عوام کی زندگی میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے، جس کی بدولت ہم آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر معاشی بربادی، افلاس اور بے روزگاری اور سیاسی اور سماجی پستی کی طرف جا رہے ہیں، لیکن ۱۹۱۴ء میں جب جدید سرمایہ داری اور سامراج کا شباب ڈھل کر بڑھاپا آنے لگا تو ہم چونکے، مگر ہم نے ابھی تک اس پر غور نہیں کیا کبھی اسلامی ممالک کے ترانے پڑھے، کبھی جاپان کی فتوحات سے دل بہلایا، اور آخر میں مہدی اور مسیح کے آنے کا تو یقین تھا ہی، البتہ جب ۱۹۲۹ء کی عالمگیر کساد بازاری شروع ہوئی تو مجبوراً اقرار کرنا پڑا کہ ہمیں ہندوستان کے عوام کو اقتصادی بدحالی سے نجات دلانے کی ضرورت ہے۔ مگر ابھی تک اس کا علاج ہم معاشرتی اصلاح میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ بہرحال عوام اس وقت پیش نظر ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ جنگ آزادی کے بعد پرانے حکمراں خاندانوں اور مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے کی حیثیت دوسری تھی۔ برطانوی سامراج نے خوب چن چن کر ادھی طول کر ان کے وقار اور اقتدار کو غارت کیا تھا۔ جو تخت و تاج کے وارث تھے یا ہو سکتے تھے۔ ان کا قصہ پاک ہو گیا، وسائل حکومت ان سے لے لئے گئے۔ باقی خاندانوں اور تتمہ رؤسا و امرا کو صرف اسی صورت میں اور اس واحد مقصد ہمیشہ برقرار رکھا کہ یہ طبقے سامراج کے ستونوں کا کام دیں۔ چنانچہ ہمارے دیس کے راجہ مہاراجہ نواب، تعلقداروں اور زمینداروں کی تاریخ شاہد ہے کہ انہیں وسائل معاش سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ صرف سامراج کے دم کے ساتھ اور اس کے مفاد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ہماری سماجی ضروریات ان کے وجود کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

~~~

اس سلسلے میں سرسید اور علی گڑھ کالج کا تذکرہ کرنا ضروری اور دلچسپ ہے۔ سرسید ایک اعلیٰ نسب سید خاندان میں پیدا ہوئے، انہوں نے ذہنی اور فکری اعتبار سے برطانوی سامراج کو برضا و رغبت قبول کر لیا، چنانچہ برطانوی ملازمت اور اعزاز دونوں ان کے نصیب میں آئے۔ انہیں ان خاندانوں کی فکر ہوئی جو برطانوی سامراج کی بدولت تباہ ہو گئے تھے۔ سامراجیوں کو بھی اس کا اطمینان ہو گیا تھا، کہ یہ حکمراں خاندان قطعاً بے بس اور ہمارے پابند ہیں۔ چنانچہ انہوں نے نہایت فراخ دلی سے مراعات خسروی کے دروازے اس لئے کھول دیئے تاکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حاکمانہ روایتوں اور تربیت سے کام لے کر انہیں ادنیٰ ادنیٰ ملازمتوں کے قابل بنایا جائے۔ چنانچہ علی گڑھ کالج قائم کیا گیا۔ آج تک علی گڑھ کالج کا نشان یعنی کھجور، تاج اور ہلال، اس کا پتہ دیتا ہے کہ یہ وہ اسلام ہے جو سامراج کے تاج کو جگہ دیتا ہے۔ اور اس میں اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں پایا جاتا، سرسید سے لے کر آج تک علی گڑھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ ادارہ سامراج کے اغراض پورا کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ سرسید کا مرتبہ اور منصب محض اس قدر ہے کہ انہوں نے اپنی اعلیٰ ذہنی اور دماغی قابلیتوں سے کام لے کر ایک فرسودہ اور معزول جاگیرداری طبقے کے مفاد اور برطانوی اغراض کو ایک نئے اسلامی اور علمی فلسفے کی صورت میں پیش کیا، اس مخصوص خدمت کے علاوہ سرسید کا مفکرین میں پایہ بہت ادنیٰ ہے۔ مسلمان جتنے آگے بڑھتے جاتے ہیں انہیں سرسید اور ان کی تعلیمات کی ضرورت کم محسوس ہوتی جاتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہندوستان اور اسلامی سماج کے ہر بڑے مفاد کے لئے سرسید کی تعلیمات کو بھلا دینا ضروری ہے۔

آج ہمیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ انیسویں صدی کے اس غمناک

بعد میں جب ایک غیر ملکی حکومت اور ایک تباہ کن معاشی نظام اس ملک پر مسلط ہو رہا تھا، سر سید نے دفتر کے دفتر ان مباحث پر رنگ ڈالے کہ ہمیں انگریز قوم کی طرح صفائی، کھانے کے آداب اور رہنے چلنے کے طریقے برتنا چاہئیں، مذہب کی ہر قسم کی تاویلیں کیں کہ برطانوی سامراجی نظام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مذہباً قابل قبول ہو جائے۔ عورت کی تعلیم اور تربیت کے تعلق سے بھی سنجیدگی سے غور تک نہ کیا، اور لطف یہ ہے کہ اس ابن الوقتی کا نام تجدید اسلام رکھا

جب کانگریس کی تحریک ملک میں شروع ہوئی تو سر سید نے اپنی پوری قوت اس کی مخالفت اور مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رکھنے میں صرف کر دی۔ مثال کے طور پر سر سید کے ایک شاگرد کے چشم خود دیکھے ہوئے واقعات ملاحظہ ہوں۔

کانفرنس گزٹ علی گڑھ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۳۶ء میں خاں صاحب میر ولایت حسین صاحب سر سید کی بنا کردہ "انجمن بہی خواہان ملک" (انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن) کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس انجمن کا مقصد "ہندو اور مسلمانوں کو نیشنل کانگریس سے علیحدہ رکھنا اور گورنمنٹ ہند اور گورنمنٹ انگلستان پر بذریعہ رسائل و تحریرات یہ ثابت کرنا تھا کہ نیشنل کانگریس کے مطالبات کل ملک کے مطالبات نہیں ہیں۔ اس لئے ناقابل پذیرائی ہیں۔

اس ایسوسی ایشن میں زیادہ تر مسلمان شریک تھے۔ ہندوؤں میں سے فقط راجہ، مہاراجہ، تعلقہ دار اور راجہ شیو پرشاد اور منشی نول کشور کے سے اصحاب گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کو شریک ہوئے، ورنہ عموماً ہندو نیشنل کانگریس کے ساتھ تھے۔"

"چونکہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں تقریباً ہر حصہ ملک کے طلبا موجود تھے اس لئے انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی طرف سے ان عرضداشتوں پر جو نیشنل کانگریس کے خلاف بھیجی جاتی تھیں، بذریعہ طلبا عام مسلمانوں کے دستخط کرانے میں آسانی ہوتی تھی۔"

اور اس کے بعد مثال دیتے ہیں کہ طلبائے علی گڑھ نے کس طرح جمعۃ الوداع کے دن جامع مسجد دہلی میں جا کر مسلمانوں سے یہ کہہ کر عرضداشت پر دستخط لئے کہ "نیشنل کانگریس یعنی ہندو چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں گائے کا ذبح کرنا موقوف ہو جائے، ہم ان کی مخالفت کرتے ہیں۔"

(علی گڑھ کا عہد ماضی ۔۔۔ کی سرگذشت)

سر سید کے نظریوں اور ان کے رجعت پسندانہ سیاسی عمل اور برطانوی حکومت کی حمایت کا یہ ثمرہ ملا کہ بہت سے مسلمان سرکاری ملازمتوں میں لئے گئے، مگر حیرانی یہ ہے کہ علی گڑھ کی رجعت پسندانہ روایات آج بھی بدستور قائم ہیں۔ ہر چند سر سید کی اس غلامانہ ذہنیت کی آج مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔

اس سیاسی پستی کے وجوہ تاریخی طور پر سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ کسی جاگیرداری نظام کے فنا ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک "تعمیری" یعنی جدید سرمایہ داری کے وجود میں آ جانے کے بعد خود اندرون ملک تاجروں کا ایک طبقہ پیدا ہو جو انقلابی شان سے جاگیرداری کا خاتمہ کر کے ایک بہتر سماجی نظام کی بنیاد رکھ دے، آگے چل کر بدیشی سرمایہ داری اور سامراجی حکومت اپنی عالمگیر جہانگیری میں اس ملک پر قبضہ کر لے، اول الذکر صورت فرانس، انگلستان اور دوسرے مغربی ملکوں میں پیدا ہوئی جس کی بدولت نئی صنعتوں کا رواج پڑ گیا، اور ایک طرف پرانے علوم و مذاہب کی جگہ جدید سائنس اور عقلیت نے لے لی، دوسری طرف خواجگی اور بندگی کے دستور کی بجائے حریت، مساوات اور عدالت کا غلغلہ بلند ہوا۔

دوسری صورت ایشیائی ممالک اور بالخصوص ہندوستان، الجزائر اور چین وغیرہ میں واقع ہوئی یعنی بجائے دیسی سرمایہ داری کے بدیشی سامراج مسلط ہو گیا جس کو کسی نئے اور ترقی پذیر نظام کی بجائے (جو تاریخ کا تقاضا تھا) سماجی انحطاط اور انحطاط پذیر طبقوں کا دروازہ کھل گیا، ہندوستان کی گذشتہ ۲۰۰ سال کی تاریخ صرف ان وسائل کی ترقی کا دوسرا نام ہے جن کی برطانوی سامراج کو اپنے استحصال کے لئے ضرورت پڑی ہے اور ان سب کا اصل حاصل یہ ہے کہ بجائے معمولاً ترقی کرنے کے ہم نسبتاً پندرہویں اور سولھویں صدی سے بھی پیچھے ہٹ گئے ہیں، ہماری عمر کا اوسط ۲۲ سال کے قریب ہے، ہماری قومی دولت کا اوسط تقریباً ۵۰ روپے فی کس پڑتا ہے، ہماری خواندگی کا اوسط ۸ فی صدی کے قریب ہے، غرضیکہ آہستہ آہستہ بجائے مہذب ملک ہونے اور دنیا کو علم و فن سکھانے کے ہم بربریت اور وحشت کے دور میں پہنچے جاتے ہیں

ایسی حالت میں ہمارا سب سے بڑا کام اور ہماری اخلاقی معاشرتی اور ۔۔۔

ترقی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہم پہلے اس لعنت کو دور کر دیں جس کی بدولت دنیا کا ایک لازماً تباہ اور برباد ہو رہا ہے، بالفاظ دیگر ہماری سماجی تقسیم کی حد فاصل سامراج ہے لوگ جو سامراج دشمن ہیں ایک روحانی رشتے میں خود بخود مربوط ہیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ ماننا پڑے گا کہ صرف یہ لوگ اور ایسی تحریکیں آئندہ تمدن کی حامل ہو سکتی ہیں اس لئے کہ یہ

سماجی جد و جہد میں مصروف ہیں، دوسری طرف وہ طبقے اور وہ قوتیں ہیں جو سامراج کی کاسہ لیسی اور اس کے استحکام میں مدد دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف قوت کی پرستار ہیں۔ بلکہ اسی لئے بعض اعتقادات پیدا کی گئی ہیں کہ سامراجی استحصال میں معاون ہوں۔ اور دنیا میں سرمایہ داری اور اس کے مسائل کو زندہ اور برقرار رکھیں۔

(۳)

ایسی حالت میں مذہب اور اخلاق کے فرائض کیا ہیں؟ ہمیں خود اس کے جواب دینے میں کوئی تامل نہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ مذہب یا روحانیت صرف ان حالات میں قابل قبول ہو جب وہ انسانیت کو آگے لے جاتی ہو۔ بالفاظ دیگر سماجی کشمکش میں وہ ان طبقوں کے مفاد کی حامی ہو جن کے بل پر سماج آگے بڑھ سکتا ہے، آج اس سوال کے سمجھنے میں کہ معاشرہ کس طبقے کے بل پر آگے بڑھ سکتا ہے کوئی دقت نہیں ہے، دنیا دو حصوں میں بٹ گئی ہے اور دونوں قوتیں برسرپیکار ہیں بین الاقوامی اور قومی دونوں حیثیتوں سے آزادی کے لئے لڑنے والے اور آزادی کے دشمن صاف صاف نظر آتے ہیں۔

ہندوستان میں برطانوی سامراج کے آنے نے پہلے دن سے اس سوال کا جواب دے دیا تھا، یہاں اگر ملکی سرمایہ داری کا آزادانہ طور پر رواج ہوتا تو شاید سوچنے کی ضرورت پڑتی کہ آگے بڑھانے اور ترقی دلانے والی قوت کونسی ہے، اسی حیثیت سے شاید روحانی اور اخلاقی تحدید بھی ہوتی۔ مگر اب یہ تمام سوال اسی بنیادی سوال کے پابند ہیں کہ غیر ملکی استبداد اور سامراج سے کون نجات دلاتا ہے۔

سرسید اور علی گڑھ کالج کی بدولت ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک مدت تک انگریزی اور علم ایسے طبقے میں محدود رہے جو سامراج کا پابند تھا، چنانچہ مدتوں مسلمانوں میں تعلیم کا مقصد ڈپٹی کلکٹری اور سرکاری ملازمت حاصل کرنا رہا، بلکہ اس بنیاد پر ملی تحفظات، فرقہ وارانہ تنزل، رائے دہندگی اور ملازمتوں اور مجالس قانون ساز میں تحفظ نشست کے راگ الاپے گئے ... اسی نسبت سے ہم عوام سے بے خبر رہے۔

۱۹۱۲ء سے جب عالمگیر سرمایہ داری کی پیچیدگیاں شروع ہوئیں اور دوسری طرف ترکی وغیرہ استعمار کے قبضے میں آ گئے تو ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک سیاسی لہر اور جمہوریت کا ہلکا سا تصور شروع ہوا، مگر ابھی تک مسلمانوں کی نگاہیں ارض مقدس اور ایران و توران پر تھیں، خود اس ملک کے رہنے والوں کا خیال پیدا نہ ہوا تھا۔ ان تحریکات کے رہبر بھی وہ لوگ تھے جنہوں نے بین الاقوامی سیاسیات اور معاشی تحریکات کا نہ سنجیدگی سے مطالعہ کیا تھا اور نہ سمجھنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ یہ اللہ والے لوگ تھے، انہیں بندوں اور ان کی معاشی تباہی یا بھوک سے غرض نہ تھی، فقط ایک خدا ان کے لئے کافی تھا، خود عوام کو بھی اس کا احساس نہ تھا کہ مذہب اور پین اسلامزم کے نام پر وہ ہندوستان اور خود اپنے لئے معاشی اور سیاسی آزادی حاصل کرنے اور دنیا کی بنیادی انقلابی جد و جہد میں شریک ہونے کے لئے نکلے ہیں۔

آج حالت دوسری ہے، سنہ ۱۹۲۹ء سے دنیا کی سرمایہ داری اور اس سے متعلق سامراجی نظام آخری سانس لے رہے ہیں۔ اس نظام سے بعض ذہنی اور مادی فائدے اٹھانے کے بعد دنیا اسے اس طرح دفن کرنا چاہتی ہے، جیسے کوئی میت کے لئے بے تاب ہو اور یہ صحیح بھی ہے۔ اس لئے کہ اب اس نظام سے کوئی سماجی کام نہیں لیا جا سکتا، چنانچہ ایک طرف روس نے ایک نیا نظام قائم کر لیا ہے۔ اور اسپین اور چین اس کی تیاری میں ہیں۔ دوسری طرف دنیا بھر کی محروم اور مظلوم قومیں بیدار ہو رہی ہیں۔ شام، مصر، فلسطین جدھر نظر ڈالو ایک نئی روح آزادی نظر آتی ہے، خود ہمارا ہندوستان ذہنی اور سیاسی اعتبار سے اتنا آگے بڑھ گیا ہے کہ اس کا رنگ روپ بدل گیا ہے، اب لبرل اور گاندھی سیاسیات نہیں، بلکہ جواہر لال اور سوشلزم کا دور شروع ہو گیا ہے۔

مگر باایں ہمہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک عام سیاسی جمود پایا جاتا ہے قوم کی حیثیت سے ہم کسی سیاسی اور اہم مسئلے کے سمجھنے اور حل کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ اس کے اسباب بھی ظاہر ہیں۔ مثلاً:-

یہ کہ عوام اور تعلیم یافتہ باخبر طبقوں میں ایک بہت بڑی خلیج ہے جس کے اسباب اوپر بیان کئے جا چکے ہیں۔ صدیوں سے ملت اسلامی سے مراد لکھے پڑھے اور خوش حال مسلمان ہیں جن کی بڑی دقت فی زمانہ یہ ہے کہ پہلے امتحان پاس کرتے ہی سرکاری عہدوں یا تعلقداریوں پر فائض ہو جاتے تھے، اب یا تو قرضے کی ڈگریوں میں مبتلا ہیں یا تلاش روزگار میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ مگر اب بھی عوام سے سروکار نہیں رکھتے۔ دوئم یہ کہ ہماری سیاسی تربیت معاشی تقاضوں یا ملکی آزادی کی بنا پر نہیں بلکہ بوسیدہ جاگیرداری روایات، غلط اسلامی تاریخ اور بیرونی اسلامی دنیا کی مفروضہ سیاست پر ہوئی ہے ہندوستان کے جن اسلامی اداروں نے ہمیں پروان چڑھایا ہے ان میں سیاسیات کو نظری اور عملی اعتبار سے دیکھنے اور پرکھنے کا مادہ بالکل نہیں ہے۔ جو شاعر یا مورخ ہماری ذہنی تربیت

میں مصروف ہے یہاں میں ماضی پرستی اور جدید تہذیب کو فدا اور نفرت بدرجہ اتم رہی ہے ہم نے عوام کو بجائے مستقبل کی راہ دکھانے کے ماضی کے محل اور روحانی قید خانے میں بند کر دیا ہے۔

سوئم چونکہ اسلامی سلطنت اور تمدنی روایات کا تعلق زیادہ تر بڑے بڑے شہروں سے رہا ہے، اس کے علاوہ مستند قسم کے اسلامی مذہب نے عربی اور فارسی ادب میں اور عوام کی زندگی اور رجحانات سے مادراء ہو کر جگہ پائی ہے، اس لئے بحیثیت مجموعی یہ ہے ہندوستان کے مسلمانوں کا تصور کرنا مسلمان مفکرین کے بس سے باہر ہے، عوام اور بالخصوص گاؤں کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ہم نہایت حقارت کے ساتھ توہمات اور شرک کہہ کر رد کر دیتے ہیں، اور غیر سے معاشی مطالبات پر زور دینا تو مین مادہ پرستی اور دنیا طلبی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خارجی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک ہمہ گیر سیاسی اور اقتصادی انقلاب انگیز تحریک کے محرکات موجود ہیں۔ (۱) سامراج نے سب سے زیادہ مسلمان کاریگروں اور حرفہ والوں کو نقصان پہنچایا ہے، جو برطانوی حکومت کے آنے سے پہلے صنعتوں اور حرفتوں کے مالک تھے، مشینوں کے مال کے عام طور سے رواج پا جانے سے لاکھوں مسلمان بے روزگار ہو کر بڑے بڑے کارخانوں میں مزدوری کرتے پھرتے ہیں۔ اور آج بمبئی، احمد آباد، کلکتہ، کانپور، اور ہر بڑے صنعتی مرکز میں مسلمان مزدوروں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔

(۲) اس کے علاوہ سامراج کے زیر سایہ مسلمانوں میں چھوٹی قسم کے سرمایہ دار نے جنم لیا، جو اپنی ضروریات سے مجبور ہو کر پہلے تو سامراج سے لڑنے اور ملک کو آزاد کرانے کا دم بھرتا ہے اور چند مراعات حاصل کرنے کے بعد خود پیچھے ہٹنا اور ملک کو سامراج کا پابند کر دینا چاہتا ہے۔

(۳) معاشرتی اعتبار سے چونکہ مسلمانوں میں چھوت چھات کے جھگڑے اور ذات پات کی تقسیم نہیں ہے اس لئے بالعموم مسلمان سیاسی اور اقتصادی کی ضرورت کو جلد سمجھ لیتے اور سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔

(۴)

تاریخی اعتبار سے اب ہندوستان کے لئے ملکی سرمایہ داری کے بل پر ابھرنے اور بڑھنے کا سوال اٹھ گیا ہے، بین الاقوامی حالات، عالمگیر کساد بازاری اور ہمارے وطن کی عبرتناک تباہ حالی ہمیں ایک زیادہ موثر پروگرام پر سوچنے کے لئے مجبور کرتی ہے، صاف نظر آتا ہے کہ آئندہ کی جنگ آزادی میں متوسط اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا حصہ بہت تھوڑا ہوگا، مزدور اور کسان نوجوان اور بالعموم چھوٹی حیثیت کے لوگ جو سامراج کے بوجھ سے دبے جا رہے ہیں، اور خود اپنی زندگی میں آزاد ہونے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، اس تحریک کو آگے لے جائیں گے، آج کوئی قومی مسئلہ ایسا نہیں ہے، جس کا حل ۱۹۲۱ء کے سیاسی خیالات کے مطابق پیش کیا جا سکے، آج ہر چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ ایک سماجی انقلاب اور مزدوروں اور کسانوں کی منظم رہبری کا تقاضا کر رہا ہے، آج بالکل صاف صاف طور پر ملک میں ایک استعمار دشمن — — جماعت بنانے کا سوال ہے بلکہ ہر زبان پر بہت آگے کے سماجی نظریئے اور سوشلزم کی گفتگو آنے لگی ہے۔

ایسی حالت میں ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا رویہ ہوگا؟ اس سوال کا جواب نسبتاً آسان ہے، اگر اس پر مذہبی لحاظ سے نہیں بلکہ خالصۃً جماعتی اعتبار سے نگاہ ڈالی پڑے گی، مزدور پیشہ اور عام مسلمان بالطبع معاشی تقاضوں سے مجبور ہو کر استعمار دشمن کا ساتھ دیں گے، چنانچہ مزدوروں کی جماعتوں اور اشتراکیت نما سیاسی تحریکوں میں وہ بلاتامل جوق جوق چلے آ رہے ہیں اور اس سے قطعاً بے نیاز ہیں کہ نظری حیثیت سے ان کا مذہب سوشلزم کے خلاف ہے یا موافق، جن پر مذہب کا اثر ہے، وہ اپنے سیاسی عمل اور عقائد میں اسلام کے اشتراکیت نواز پہلو اور خلافت راشدہ کی جمہوری روایات سے تقویت حاصل کرتے ہیں، مگر اصلی محرک مذہبی اور روحانی جذبہ نہیں بلکہ معاشی تقاضا ہے۔

جب عوام کے سامنے سوال اس نوعیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام اور اشتراکیت کا باہمی تعلق کیا ہے؟ تو حقیقت پرست مزدور یا اس کا ترجمان جواب دیتا ہے کہ سوال کی یہ صورت گمراہ کن ہے، اصل سوال یہ ہے کہ موجودہ ناداری اور کساد بازاری سیاسی دباؤ اور بے روزگاری اور اس نظام کو مٹانے کے لئے جس سے یہ مظاہر لازماً صادر ہوتے ہیں مذہبی لوگ کیا عملی پروگرام پیش کرتے ہیں اور ہماری موجودہ جد و جہد میں وہ کس حد تک ہمارے ساتھ ہیں، اس سوال کا جواب مذہبی اداروں کو دینا ہے مگر ہمیں تجربے کی بنا پر معلوم ہے کہ مذہبی لوگ یا تو حل پیش کرنے سے معذور ہیں یا غلط حل پیش کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ گرد و پیش کے حالات کا صحیح طور پر تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کا مذہب اور روحانیت کا تصور عبادت اور حیات بعد الممات پر ختم ہو جاتا ہے اور اسے موجودہ معاشی علائق سے جو تاریخی طور پر ابھرے اور بڑھے ہیں کوئی سروکار نہیں ہے ان کے معاشی نظریئے تاریخی ارتقا اور موجودہ تقاضوں سے بے نیاز ہیں، چنانچہ ان کی نگاہ میں غاصب اور مغصوب ظالم اور مظلوم، لوٹنے والوں اور لٹنے والوں میں وہ روحانی اور مذہبی رشتہ موجود ہے جو تمام خارجی لوازم اور معاشی تقاضوں سے زیادہ قوی ہے۔ بقول شاعر

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

غرضکہ تمام نہاد مذہبی لوگوں کے لئے اس "سرکار" اور اس جذبے کو قائم رکھنا ضروری ہے جو مادی زندگی کے حقائق کو جھلاتا اور لوگوں کو معاشی اور سیاسی ملاپ کے آغوش فریب میں سلانا چاہتا ہے اس کا نتیجہ نفس مذہب اور روحانیت کے لئے اس لئے برا ہوتا ہے کہ مذہب سرمایہ دارانہ اغراض اور محنت کش طبقے کو غلامی اور استحصال کی پابندیوں میں رکھنے کا دوسرا نام ہو جاتا ہے۔ اور صرف ان ہی معنوں میں ہم اشتراکی مذہب کو افیون کا مترادف قرار دیتے ہیں اور غریب اور امیر میں سوائے دشمنی کے ہر اخوت و مساوات کے رشتہ کو قطعاً توڑ دینا چاہتے ہیں۔

یا مثلاً ہندوستان میں دیکھئے تاریخی واقعات نے جہاں ایک طرف یہ واضح کر دیا ہے کہ ہمارے سماجی مسائل بغیر انقلاب اور کسی طرح طے نہیں پا سکتے۔ وہاں یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ ہمارے روحانیت پرست اور روحانیت نما حضرات ان حقائق سے یکسر بے بہرہ ہیں، ہر اس عمل میں جو مزدور پیشہ طبقے کی بیداری اور ترقی کی نشانی ہے انھیں بس یہی نظر آئے گا کہ یہ دہریت اور لامذہبیت ہے۔ بقول "حکیم امت" علامہ اقبال ابلیس اپنے سیاسی بندوں کو اس طرح فرمان دیتا ہے کہ

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

چنانچہ جذبات اور شاعری یا خوش وقتی کو چھوڑ کر یہ غیبت پرست حکماً امت اور حامل دین ہر اٹھنے وقت میں مزدور پیشہ طبقے سے علیحدہ ہو کر یا تو رجعت پسندوں کی صفوں میں نظر آئیں گے یا پھر دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین ہو جائیں گے گویا انتہائے خلوص اور خدا پرستی کی یہ نشانی ہے۔ ایسی حالت میں یہ حضرات خود بتائیں کہ محنت کش طبقہ اور اس کے استعمار دشمن ترجمان مسلمانوں کے متعلق کیا رائے قائم کریں؟ ان مسلمانوں کی تعریف میں بلا امتیاز ہر ایک اسلامی، دینی، علمی اور سیاسی یا سماجی ادارہ شامل ہے، جسے ادارانہ حیثیت سے اسلامی حیثیت قائم رکھنے پر اصرار ہے۔

(۵)

میرے نزدیک اس وقت اسلامی سیاسیات کو جماعتی بنیاد پر ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ اور ہر مسئلے کو چاہے وہ خالصتہً مذہبی ہو یا تمدنی اس نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ عامتہ المسلمین کی زندگی کو ان مسائل سے اس وقت کیا تعلق ہے، کیا عام مسلمانوں کی اہم فرمائشیں اور بڑے بڑے سماجی سوال ان مانگوں کی صورت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اگر اس نگاہ سے پرکھا جائے تو ہمارے بہت سے ہنگامہ خیز قومی اور دینی مسئلے تاریخی اعتبار سے ایک معطل سماجی طبقے کے جماعتی سوال نظر آئیں گے، زبان کا مسئلہ ہو یا مذہبی حقوق کا ان سوالات کی وہ حیثیت نہیں ہے جو بعض حلقوں میں کہی جاتی ہے اور جسے عام مسلمان نا سمجھی سے تسلیم کر لیتے ہیں، یہ سوالات اصل کی حیثیت کم سے کم بے وقت کی راگنی کی سی یا صحیح راہ سے ہٹانے والے جالوں کی سی ہے جنہیں دشمن خوب سوچ سمجھ کر ہماری راہ میں بچھا جاتا ہے۔

ہمیں واقعیت پرستی سے کام لے کر صرف ان باتوں پر زور دینے کی ضرورت ہے جو عوام کی، بھوک، بے روزگاری، سیاسی غلامی اور دوسرے اہم معاشی مسائل پر توجہ دلاتی ہیں، اس لئے کہ انسان کے حقیقی محرکات یہ ہیں۔ سیاسی اعتبار سے ہمیں صرف ان باتوں کو پیش کرنے کی ضرورت ہے جو سامراج کے دباؤ اور قوت کے زائل کرنے میں مدد دیں، سیاسی آزادی حاصل کرنے کی صورتیں بتائیں، اور محنت کش طبقے اور سامراج سے دبے ہوئے طبقوں کے معاشی مطالبات کی حامل ہوں۔

میں اس کا منکر نہیں ہوں کہ بعض حیثیتوں سے مسلمان غیر مسلمانوں سے علیحدہ ہیں مگر یہ حیثیتیں ثانوی درجہ رکھتی ہیں۔ اقلیت کا تحفظ اس وقت تک بے معنی لفظ ہے جب تک خود مسلمانوں میں اس کثیر تعداد "اقلیت" کا تحفظ نہ کیا جائے جو مسلمانوں کو خود مسلمان سامراج پسند طبقوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے اور عوام کو صحیح انسانی زندگی دلانے کے لئے ایک سماجی انقلاب کی ضرورت سمجھتی ہے۔

ہمارے نزدیک "تحفظات" کا سوال تحفظ کا نہیں بلکہ ایک عملی اور مؤثر ضرورت کا ہے مگر یہ ضرورت انقلاب کے بعد پیدا ہو گی، جب عام مسلمانوں کی زندگی کی تعمیر کا سوال پیش ہو گا، اس سے پہلے نہیں، مثلاً فرض کیجئے کہ انقلاب کے بعد عام تعلیم کا سوال پیش ہو تو ظاہر ہے کہ سوائے عام اور مروج زبان کے جو مسلمانوں میں رائج ہو تعلیم کی اور کوئی صورت نہ ہو گی۔ یہ سوال اس وقت اردو کے تحفظ کا ہے، مگر اس وقت ایک واقعی اور مؤثر طریقہ عمل کا ہو گا، یا مثلاً انقلاب کے بعد جب کام کم اور فرصت اور مسرت عام لوگوں کی زندگی میں زیادہ ہو گی تو ظاہر ہے کہ وہ چینی یا جاپانی فلسفے سے نہیں، بلکہ اپنے علمی اور ذہنی خزانوں سے دل بہلائیں گے، اور یقینی طور پر ان اسلامی دفینوں کو از سر نو زندہ کریں گے جن میں حقیقت پرستی یا لطافت پائی جاتی ہے روس اس کی زندہ مثال ہے کہ اس نئی سوشلسٹ جمہوریت نے روس میں ہر قوم کو اس کا مخصوص قومی ادب اور سب کو بین الاقوامی ادب کے جواہر پارے عطا کئے ہیں اور کوشش اس امر کی کی جا رہی ہے کہ جو مواقع صرف برہمنان ملت اور حکمائے قوم یعنی چند کھاتے پیتے لوگوں اور خاندانوں کو حاصل ہوتے تھے وہ عام ہو جائیں، اور خصوصیت سے اس طبقے کے نصیب میں آئیں جو محنت کر کے اس دنیا کے کاروبار اور تمدنی برکات کی آبیاری کرتا ہے، مزدور انقلاب سے ایک یہ فائدہ یہ

ہوگا کہ علم و عمل اور جسم و روح میں مطابقت پیدا ہو جائے گی، اور دنیا زندگی کا وہ باب شروع کرے گی جس میں جنت سے نکالا ہوا آدم دوبارہ اور ہمیشہ کے لئے جنت میں واپس جائے گا میرے نزدیک ہر نوجوان مسلمان کو چاہیئے کہ اس دور کے لانے میں مدد دے اس لئے کہ صحیح روحانی و اخلاقی تربیت اس جدوجہد میں پنہاں ہے، اس دور کے مذہبی پیشواؤں کو اس سے گھبراہٹ ضرور ہوگی، اس لئے کہ ان کی نگاہیں مروجہ روحانی کشاکشوں سے آگے نہیں جا سکتیں اور یہ لوگ روحانیت کے مراتب کو مادی زندگی کی جدوجہد سے بے تعلق رکھنا چاہتے ہیں ہم کیا

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

جلوۂ منتظر

قطرے میں کوئی قلزمِ پنہاں تو نہیں ہم　　　اے دل! کوئی سمٹا ہوا طوفاں تو نہیں ہم
اک ہستی محدود میں یہ وسعتِ تخئیل　　　گو روحِ خدا ہوں نہ ہوں، انساں تو نہیں ہم
اے فطرتِ مجبور! یہ تعزیر ہے کیسی؟　　　گر ہوں بھی گنہگار، پشیماں تو نہیں ہم
بالا ہیں بد و نیک کے جھگڑوں سے نگاہیں　　　بازیچۂ اہرمن و یزداں تو نہیں ہم
بکتے ہیں کہاں دولتِ کونین کے بدلے　　　ہیں گوہرِ دل، گوہرِ داماں تو نہیں ہم
ظلمت میں بھی اک نور ہے گو نورِ خفی ہو　　　الجھیں گے نہ ہم کفر سے، ایماں تو نہیں ہم
ہے اس سے کوئی رابطہ، نہ اُس سے کوئی پیوند　　　کچھ اور سہی، گبر و مسلماں تو نہیں ہم
چھوڑا تھا ازل نے جسے تسخیرِ ابد کو!　　　تقدیر کے اس تیر کا پیکاں تو نہیں ہم

عالم ہے ابھی منتظرِ جلوہ ہمارا
آفاق کا نکلا ہوا ارماں تو نہیں ہم

حامد علی خاں (مدیر ہمایوں)

عمرانی بربریت نفسیات

(گذشتہ سے پیوستہ)

از شری اراوندو گھوش

نفسیات ارتقائے معاشرت

آخرکار وہ دور آیا کہ رواجی فخر اور خاندانی حیثیت اور جنم کا معاملہ بھی ختم ہوگیا، معاشی امتیازات بھی متزلزل ہوگئے۔ صرف خاص لباس اور خاص قسم کی زندگی، مردہ رسوم و آداب حیات کی پابندی کو ہی کافی سمجھا جانے لگا۔ جس نے ایک خاص وضع قطع کی حیات اختیار کر لی۔ بلا چون وچرا وہ اسی میں شمار کیا جانے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ سماجی اجارہ داری شروع ہوگئی پجاری اور پنڈتوں نے مذہب کا منصب سنبھال کر ہر طرح کے جا اور بیجا اختیارات اپنے قبضہ میں کر لئے، کھشتریوں نے زمینیں سنبھال لیں، جاہ و جلال وانتظام سیاست اپنے مزاج اور مرضی سے کرنے لگے، سرمایہ دارانہ ذہنیت نے نشو ونما پائی، ویشوں نے دولت کے انبار گھروں میں لگانے اور سب تجارتوں، صنعتوں، زراعتوں، اور اقتصادی میدانوں کو اپنے اصول اجارہ داری کے مطابق چلانا شروع کر دیا، مخلوق و عوام شودروں کے درجہ میں رہ گئے، یہ بھوکے مزدور تھے جو مردانہ وار محنت کرتے تھے صلح کل، نیکوکار، جری، سب کچھ تھے، مگر بدقسمتی سے شودروں میں پیدا ہوتے تھے، اس لئے صرف خدمت کرنے کے لئے بنے تھے، ان سے اوپر کی ذاتوں کے آدمی ان پر نفرت کی نگاہ ڈالنے کے لئے مجبور اور یہ اپنی ذلت قبول کر لینے کے لئے مجبور تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغز غائب ہوگیا اور صرف پوست باقی میں رہ گیا، سوسائٹی میں مناقشات، درجہ بدرجہ پیدا ہونے والی مہلک تفریقات اور بیہودہ فخر اور بیجا ذلتوں کا احساس ایک قدیم درخشاں دور کی تاریک یاد کے طور پر باقی رہ گئی، پس جو ملت اس قسم کے مردہ دور میں پہنچ جائے اور مردہ سانپ کو اپنے گلے میں باندھے رکھے اس میں اضمحلال، زوال اور انحطاط کے طور پیدا ہو جانے بالکل قدرتی بات ہے۔

رواجی عہد کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ علم اور ہنر کو قیود اور پابندیوں وضع و قماش کے زندانوں میں محبوس کر لیا جائے۔ مذہب کو ایک خاص خط سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے، لکیر کا فقیر بننے کو فخر سمجھا جائے، آزادی خیال، حریت فکر، قوت اجتہاد کی ہمت افزائی نہ کی جائے۔ ہر چیز ایک خاص معیار، ایک خاص پیمانہ، قید، بندش اور بن گھڑت تقسیم و تحدید سے متجاوز نہ ہونے پائے، ہر چیز پر آخری لفظ ہونے اور کبھی نہ تبدیل ہونے کی مہر ثبت کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر چیز سخت گیر "اصولوں" میں گھر کر ایک بے حقیقت اور بے اصل بے اصولی کی حالت اختیار کر گئی، رواجی عہد میں بھی ایک ذریں دور گذرتا ہے، مگر یہ اس وقت ہوتا ہے۔ جب انسان ان خیالات اور روح کو محسوس کرے۔ جو رواجی اشکال ملت کی تشکیل کا باعث بنے تھے، اور جن کی حیات ابھی تک لوگوں کے دلوں میں تقلید کی امنگ پیدا کر رہی تھی۔ مگر جب

تقلید کا جذبہ عقیدہ کر دیا جائے، اجتہاد اور رفعت و آزادیٔ فکر، تحقیق اور بہبود حد بندی میں اگر گھر جائے تو پھر یہ زریں دور عہد تاریک بن جاتا ہے۔ جب تک رواجی عہد کا دور زریں رہتا ہے، وہ ایک خوبصورت اور سنہرا دور ہوتا ہے، نمود و نمائش سے بالاتر۔ معاشرتی قدر کا پر تکلف و مزین نقشہ قابلِ قدر، مناسب احساسات، انسانوں کو مذہب بنانے میں مدد دیتے ہیں اور ایک مبارک معاشرتی و مذہبی ستونوں کو پختہ بنیادوں پر قائم رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آجکل کے ادیب اور مصنفین، شعراء، صوفی اور مفکر یورپ کے عہدِ وسطیٰ کو پر شوق نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس سنہرے زمانے میں چلا جانا پسند کرتے ہیں حالانکہ اس عہدِ وسطیٰ کے پس منظر میں نہایت بھیانک تصویریں، ظلم و تعدی، سماجی جبر، سختیاں، بغاوت، معاشرہ اور افلاس و نکبت کے دیو صفت درصف کھڑے نظر آتے ہیں، مگر ان کے سامنے خوبصورت سپاہیوں کا جو پرا جما ہوا ہے وہ لوگوں کے لئے کشش کا باعث ہوتا ہے۔ یہ وہی زریں دور ہے۔ رواجی اور روایتی عہد کا جس میں ایک ستھری تہذیب رونما ہو جاتی ہے اور ہو گئی تھی۔ اسی طرح ہندو قدامت پرست بھی اس پر تکلف عہد میں جانا چاہتا ہے، جہاں شاستروں کے سخت گیر قوانین کا ایک مکمل ضابطہ برسرِ عمل ہو۔ یہ اس کے لئے ایک زریں عہد ہوتا ہے وہ اس زریں جوئے کے بوجھ کو اٹھانے کیلئے بالکل آمادہ ہو جاتا ہے اگرچہ وہ اسے زریں عہد سمجھتا ہے مگر دراصل یہ عہد آئینے کی چمک کا عہد ہوتا ہے، آنکھیں دھوکہ کھاتی ہیں، مگر پھر بھی یہ دھوکہ ایک دلچسپ اور لطیف و زریں دھوکہ ضرور ہے، جب عکس میں کشش ہے تو اصلی "ست یگ" میں تو نہ معلوم کیا کیفیت پنہاں ہوگی، اس رواجی دور میں بھی بہت سے عناصر ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو ترقی دینے اور مدد دینے اور پختہ بنیادوں پر قائم کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی یہ عہد اصل عہد ست یگ کا پرتو ہوتا ہے جس کی کامیاب خصوصیات، معقول وجوہ افتخار دنیا کے لئے ایک آدرش اور آئیڈیل کا کام دیتے ہیں، جب حقیقت تک جسے ہم تلاش کرتے ہیں، نہ پہنچ سکیں، حاصل نہ کر سکیں تو اس کو کم پر ہی تشفی محسوس کرنے لگتے ہیں، مگر یہ صرف نمونہ ہوتے ہیں اور نقل ہوتے ہیں اصل دورِ زریں کا، جب خیالات نئے منجمد ہو جائیں اور پتھر بن جائیں اور رسوم و قوانین کی روح مردہ ہو جائے تو پھر دھوکہ کو ہی حقیقت سمجھ لینا پڑتا ہے۔

قالب باقی رہ جاتا ہے، روح پیچھے رہ جاتی ہے اور زوال پذیر ہوتی رہتی ہے کبھی کبھی وہ عود کرتی ہے اور مردہ قالب میں نئی روح پیدا کرتی ہے، نیا سہولی اور نیا زمانہ نئی ترتیب اور نئی کروٹ پیدا ہوتی ہے مگر پھر انحطاط و اضمحلال کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے وقت کا دباؤ بہت زیادہ قوی ہوتا ہے، روح اپنی جگہ برقرار رہنے کی کتنی ہی کوشش کرے اس کے لئے اضمحلال مقدر ہو جاتا ہے اور زمانہ کے ساتھ اس میں کمی آتی رہتی ہے اس کی مثال تاریخ مذہب میں ہمیں ملتی ہے مصلحین قوم اور بزرگان مذہب کا اثر اور رشد و ہدایت باوجود سخت جوش کے بالکل منتشر اور بعض دکھائی دیتے ہیں ان کی زبانوں میں تاثیر باقی نہیں رہتی۔ اس کی مثال ہمیں ہندوستان کے قدیم عہد میں ملتی ہے، ہزاروں سال گذر گئے مصلحین و بزرگان قوم مذہب کی قوتوں کی کارفرمائی کے باوجود ست یگ واپس نہ آسکا۔ بدی کے جراثیم پیوست ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور قوم کا جسم سڑ رہا ہے سچائی اور قوتِ حیات واپس نہ لائی جا سکی، رواج پرست سوسائٹی میں زندگی کے آثار ہویدا نہ ہو سکے۔ ہر نئی نسل دوسری نسل سے زیادہ رواج کی آہنی گرفت میں اپنے آپ کو پہنچا دیتی ہے۔ مگر چند نئے نام لیوں کے اوپر آنے لگتے ہیں اور ان کو ایک نئے مذہب و اصول کے بانیوں میں شمار کیا جانے لگتا ہے اور پھر ایک نئے دور کی طرف لوگ دوڑ پڑتے ہیں، مثلاً یورپ میں کیتھولک کلیسہ کی اخلاقی گراوٹ کے باعث بغاوت مذہب کا دفتر کھلا، ایک وقت ایسا آتا ہے، جب حقانیت اور رواجی رسوم کے مابین خلیج منافرت ناقابلِ عبور اور تفریقات ناقابلِ برداشت بن جاتی ہیں اس کے بعد وہ گروہ کھڑا ہوتا ہے جو رواج کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتا ہے، اضمحلال و جمود کے تار و پود بکھیر دیتا ہے، زندان کی دیواریں گر پڑتی ہیں، عقل کی مستحکم امداد اور ذہن و دلیل کی روشنی سے جہل کی تاریکی دور ہونے لگتی ہے انفرادی رائے، ماثر، قوت، استدلال، اخلاق، احساس، زور و اشتیاق، حقانیت دلوں میں پیدا ہوتا ہے، وہ نور جو سماج نے کھو دیا ہے دوبارہ جلوہ ریز ہوتا ہے، بغاوتِ خیال، عہدِ عقل و دلیل، حجت و ذہن کا دور، ترقی اور آزادیٔ فکر و عمل کا زمانہ اپنے نئے آفتاب کو لے کر طلوع ہوتا ہے جس کی تابناک شعاعیں ہر بلند و پست ظاہر و باطن پر چمکتی اور سماج کے تمام زنگ آلود کل پرزوں کو حرکت و عمل سے جاری کر دیتی ہیں۔ ایک جزوی اور خارجی آزادی کا زمانہ اور آتا ہے جس میں بعض لوگوں کو پھر بدگمانی و بدراہی کا شکار ہونا پڑتا ہے، جو یہ سوچتے ہیں کہ حق کی تلاش خارجی مباحث میں بھی ہو سکتی ہے اور تکمیل کر لینے ہم شیر زیر بر محسوس کر سکتے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ انسان کو اپنا چکر اور دور ختم کر کے پھر اس انسانی عہد انسانیت میں جانا پڑتا ہے جہاں انسان اپنے اعماقِ قلب اور احساسِ باطن کو پھر بیدار و لبریز دیکھتا ہے جو ہمیں

کلیم دہلی



ایتھنز کا اسکول



ہومر اپنی مشہور نظم ایلیڈ کو جنگل میں دیہاتیوں کو سنا رہا ہے

مسائلِ حیات

(جوش ملیح آبادی)

مذہب

(۱) تمہیں بھی کچھ نہیں" کا ہمیں گمان غالب ہے لیکن کہیں نہ کہیں کچھ ضرور ہے کا ہمیں یقین دلایا جاتا ہے، کیا یہی صورت حال ہمارے تمام مذاہب کی بنیاد نہیں ہے؟

(۲) انسانی کمزوریوں کی کوئی انتہا، اور انسانی غلط اندیشیوں کی کوئی حد نہیں۔

کیا مذاہب کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہماری کمزوریوں کو تاویلات میں چھپائے اور ہماری غلط اندیشیوں سے جی بھر کے فائدہ اٹھائے؟

(۳) مذہب کا تخم انسان کی صحیح و تندرست فطرت کی سرزمین پر مشکل ہی سے بارآور ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ مذہب ایک نہایت ہی غریب اور دور از کار جبر واقع ہوا ہے۔

(۴) کیا کم و بیش دنیا کا ہر مذہب، انسانی کمزوریوں ہی کا فشردہ اور غلط نہ جانیوں ہی کا پروردہ نہیں؟

(۵) کیا مذہب کم عقلوں کی بالکل اسی طرح ایک ذہنی لوٹ مار نہیں ہے، جس طرح سرمایہ داری ناداروں کی ایک اقتصادی لوٹ کھسوٹ ہے۔

(۶) دینی عقائد میں اس دنیا کا ہر فرد کسی نہ کسی "مقدس پروپگنڈے" کا شکار نظر آتا ہے۔ کیا تم بھی ایک صید زبوں ہو؟

(۷) وہ مذہب جسے اپنے تعلیمات کی اشاعت کے لئے جائز یا ناجائز دوڑ دوڑ دھوپ اور سعی و کاوش کی ضرورت ہے، وہ گویا ایک ایسا مذہب ہے جسے خود اپنی موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ تم ایسے بودے مذہب پر تکیہ کرو۔

(۱۰) پیغمبر بھی عام لوگوں ہی کی طرح پیدا ہوتے اور مرجاتے ہیں، اس سلسلے میں جو بات میری سمجھ میں مطلق نہیں آتی، وہ یہ ہے کہ یہ حضرات اس قدر مدت تک کیوں نہیں زندہ رہتے کہ آنے والی نسلوں کو اپنے احکام پر چلتے ہوئے دیکھ لیں۔

کیا یہ ان کے فرائض میں داخل نہیں ہے کہ وہ اس بات پر نگاہ رکھیں کہ عیال اللہ یعنی مخلوق ان کے پیغامات کی بنا پر ایک دوسرے کا خون تو نہیں بہا رہی ہے۔

(۱۱) کیا یہ حیرتناک بات نہیں ہے کہ مہذب ممالک میں بھی ہزاروں آدمی ایسے غریب و فرسودہ خیالات کے سہارے جی رہے ہیں، جن کا باطل ہونا کامل طور سے متحقق ہو چکا ہے۔

اور کیا یہ اس سے کم تعجب انگیز ہے کہ اس عہد علم و دانش میں بھی آج صدہا آدمی ان اوہام کی نشر و اشاعت سے شرکت و دولت حاصل کر رہے ہیں۔ جن کے مدت ہوئی کہ پرخچے اڑ چکے ہیں۔

(۱۲) ہم میں سے ایسے کتنے ہیں کہ جس مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں، اسے در اصل مانتے بھی ہیں۔ اور جس مذہب کو وہ درحقیقت مانتے ہیں، اس کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔

کیا تم جیسے بزدلوں اور ریاکاروں کو "نگران انسانیت" کا خطاب دیا جا سکتا ہے؟

(۱۳) میں پوچھتا ہوں کہ کیا وہ تمام معصوم مستورات اور تر مذہب جو سادہ لوحوں کو اپنی خدمت گذاری پر مجبور رکھتے ہیں ۔۔۔ اصل میں آپ اور وجود باری تعالیٰ کے قائل بھی ہوتے ہیں کہ نہیں؟

اگر یہ صورت حال ہے تو پرستش خدا ہی ہے اور کیا اس عالم کون و فساد میں دوسرے مذاہب، دوسرے حقائق اور دوسرے اخلاقیات پائے جاتے ہیں۔ کوئی چیز بھی اکہری نہیں ہے۔ اور کیا اس دنیا کی ہر شے ہاتھی کے دانتوں کی طرح ہے کہ کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور؟

(۱۴) مذہب و اخلاق، یہ دو ایسے لفظ ہیں جو صرف اس حد کو سمجھ سکتے ہیں جو ان سے مجبور ہو جانے پر تنقیدی طبیعت رکھتے ہیں۔

(۱۵) کیا ہم نے اپنے مذہب کی تعلیمات کو بدل نہیں ڈالا ہے؟ ہم نے اخلاقیات کے تخیل میں تبدیلیاں نہیں کر دی ہیں؟ ۔۔ کیا ہم نے اپنی وقتی سہولتوں کی خاطر مذہبی قوانین میں ترمیم و تنسیخ نہیں کر ڈالی ہے؟

اگر ایسا ہے اور ضرور ایسا ہے، تو پھر دیانتداری کے ساتھ اس کا اعتراف کر لینے سے ہم کیوں خوف کھاتے ہیں کہ ہم کسی اخلاق یا مذہب کے پابند نہیں اور ہمارا مذہب صرف وہ ہے جو ہماری سہولتوں اور آسانیوں سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

(۱۶) کیا راویات کے تقدس اور صحائف کی الوہیت کا اعتقاد ہماری عقل غلامانہ ذہنیت کا ایک کھلا ہوا ثبوت نہیں ہے؟

(۱۷) ہم جسے "مقدس" کہتے ہیں، اسے اگر "مخفی" کہا جائے تو سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔

ہم اپنے "مخفی" "تعلقات" کو "مقدس" "تعلقات" کا لقب دیتے ہیں۔ اور جس شے کی فطرت جس قدر زیادہ "مخفی" ہوتی ہے۔ ہم اسے اتنا ہی "مقدس" کہنے لگتے ہیں۔

لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آیا اشیائے مخفی کو ہم عقیدت کی نظر سے دیکھیں یا اشتباہ کی نگاہ سے، آیا ہم اشیائے مخفی کی عبادت کریں، یا تحقیقات؟

(۱۸) کیا تمام مذاہب اور مذاہب کے تمام فلسفے انسان کو "انا" یا "خودی" کا گلا گھونٹ دینے کی تعلیم نہیں دیتے؟

وہ خودی جو افراد میں کائنات کی پہنائی و وسعت پیدا کر دینے کی قابلیت رکھتی ہے، کیا ہم اسی "انا" کو کچل ڈالیں جو تنہا اس زمین و آسمان کا تمام تر بار اٹھا لینے کی کامل قدرت رکھتا ہے؟

خودی یا "انا" کی تباہی اور خطرناک تعلیم دینے والے کیا سچ مچ ایماندار لوگ ہیں؟ یا ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہمیں کمزور و نامرد بنا کر بہ آسانی ہمیں اپنی غذا بنا لیں۔

(۱۹) خدا اور انسان کے درمیان کوئی حجاب یا پردہ حائل نہیں ہے جب تم بلندی سے گفتگو کرتے ہو، تم خدا ہو، اور جب پستی سے کلام کرتے ہو، تو انسان ہو۔ جب یہ حال ہے تو پھر اپنے درمیان کسی مذہب کو کھڑا ہونے کی اجازت کیوں دو؟

(۲۰) کیا "خدا" سے تمہیں وہی لوگ نہیں ڈراتے جو فردوس کا ٹھیکہ لے لینے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

"خیر و شر" اسی دنیا کی چیزیں ہیں، اور اس دنیا سے ویسا ہی تعلق رکھتی ہیں جیسا پورب اور پچھم، اس دنیا کے باہر پورب پچھم یا خیر و شر کا وجود کیونکر پایا جا سکتا ہے؟

(۲۱) کسی پادری، پنڈت یا ملا کے خدمات اس لئے حاصل کرنا کہ وہ مذہبی رسوم ادا کر کے تمہاری نجات یا بخشش کا سامان بہم پہنچائے گا۔ بالکل ایسا ہی احمقانہ فعل ہے کہ ہم اپنے معدے کے درست کرنے کی خاطر کسی کو اس بات پر مامور کریں کہ وہ ہماری طرف سے ورزش کرنا شروع کر دے۔

(۲۲) پادریوں، پنڈتوں اور علما کے اندر انہ وار راستے نجات کے طالب کیوں بنو؟ کیا ہر شخص اپنی انفرادی سعی سے نجات حاصل نہیں کر سکتا؟ عزت کس میں ہے، اپنے دست و بازو سے کمانے میں یا بھیک مانگ کر حاصل کرنے میں؟

(۲۳) خوشامد اور گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگتے ۔۔۔ نجات ۔۔۔

حاصل کرنا چاہتے ہیں جنہیں ایمان وارانہ وسائل سے حصولِ نجات کی امید نہیں ہوتی۔

(۲۴) مجھے میری صحیح فطرت اور تندرست خودی کے زیر ہدایت چلنے کا موقع دے دو، اور پھر دیکھو کہ نجات کے ہزاروں فرمان میری جیب کے زیر پڑے ہوئے ہیں۔

میں جادۂ تکمیلِ انسانیت کو جادۂ گلزارِ جنت پر ہزار بار ترجیح دیتا ہوں اس لئے کہ کوئی کاوش اس قدر دلفریب نہیں ہے، جیسی کاوشِ حصولِ تکمیل، اور کوئی اتنی دلکش نہیں، جتنی کہ مسرتِ احساسِ تکمیل۔

ہماری حقیقی کامرانی کا مدار صرف اس اندازہ پر ہے کہ تکمیلِ انسانیت سے ہم کس قدر قریب ہو چکے ہیں، رہی بہشت سو وہ ایک بے مغز لوری سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

(۲۵) مذہب تم سے صرف تشبیہات و استعارات میں کلام کرتا اور ایک معمہ کو دوسرے معمہ سے حل کرتا ہے، کیا تم معموں پر اعتماد کر سکتے ہو؟

(۲۶) ہر وہ شخص جو کسی نہ کسی حد تک آزاد اندیشی سے بہرہ ور ہے، اپنے واسطے خود ہی ایک ذاتی مذہب ایجاد کر لیتا ہے۔

تم خود ہی فیصلہ کر دو کہ یہ تحقیقی اور ذاتی مذہب مقدس ہو سکتا ہے کہ آباء و اجداد کا وراثت میں ملا ہوا دین؟

(۲۷) کسی مسلک پر قائم ہو جانا گویا ریاکاری کے رجسٹر میں اپنا نام لکھا لینا ہے کیوں نہ ایسے اصول مرتب کر لو جو تمہاری فطرت کے عمیق پہلوؤں سے ہم آہنگ و مطابق ہوں، اور جب ایسے اصول مرتب کر چکو تو مردانہ وار اس کا مسلسل اعلان کیوں نہ شروع کر دو۔

(۲۸) اگر اس دنیا میں کوئی ایسی چیز ہو سکتی ہے جسے میں اپنا مذہب کہے جانے کی تاب لا سکتا ہوں تو وہ صرف ایک ضابطہ ہو سکتا ہے، جو میری انفرادی آزادی اور ذاتی تکمیل کا ساتھ دے سکتا ہو۔

اور اگر ہم تمام بنی نوعِ انسان کے واسطے آسائش و ترقی کے مساوی مواقع پیدا کرنے کی ٹھان لیں، تو زندگی کا یہ ضابطہ بہ آسانی مرتب کیا جا سکتا ہے۔

(۲۹) کسی ماورائے فطرت شے کے اعتقاد پر زندگی کی بنیاد رکھنا کیسی ہولناک حماقت ہے۔ کیونکہ ہم سب فطرت کے اندر اور فطرت ہی کی مدد سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

(۳۰) کیا کوئی نیکوکار اور پاک چلن شہری شحنۂ سلطانی سے خوف کھاتا ہے؟

کیا کوئی متدین اور بااصول انسان، مجسٹریٹ کی پروا کرتا ہے؟

کیا وہ کبھی اس کے مکان یا اس کی صورت دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے؟

کیا وہ حاکم وقت کے اس اقتدار کے سامنے جو حکومت نے اسے بخشا ہے سر جھکا کر کھڑا ہوتا ہے؟ یا اس کے روبرو لرزہ براندام ہو کر خوشامد کرتا ہے؟

تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم خدا کے سامنے دانت نکال نکال کر کیوں گڑگڑائیں؟

ذرا ان گڑگڑانے والوں کا جائزہ تو لینا، کہیں بے ایمان اور چور تو نہیں ہیں؟

(۳۱) اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا، کہ اس وقت کے سائنس میں جس قدر مذہب ہے، اس وقت کے مذہب میں اس قدر سائنس نہیں۔

تو پھر سائنس کو مذہب پر کیوں نچھاور کرتے ہو؟

مژدۂ انقلاب

یا زصفت نہ ذات را بر قعِ صد حجاب دہ　　یا نظرِ دل مرا لمعۂ طورِ تاب دہ
پردۂ راز بر فگن، حسنِ ازل نما بہ خلق　　بزمِ نظارہ کن بپا، بادۂ شیخ و شاب دہ
حسنِ ادائے خاص را اذنِ صلائے عام کن　　شرحِ طلب نہ شرح کن حاشیہ بر کتاب دہ
زخمہ زن و بہ رقص آر، تارِ رگِ روانِ دہر　　ز آتشِ نغمۂ قدس تاب بایں رباب دہ
قلبِ سکوں گرفتہ را بسملِ تیغِ ناز کن!!　　ہستیِ پُر جمود را لذتِ اضطراب دہ
قطرۂ پست مایہ را افسرِ موجِ بحر ساز　　ذرۂ خاکِ تیرہ را تابشِ آفتاب دہ
آنکہ بزعم رہبرند، کمتر رہزناں نیند!　　سالکِ راہِ صدق را دیدۂ انتخاب دہ
حریتِ وطن شود رکنِ رکینِ دین ما　　ہندیاں را بخاکِ ہند رغبتِ انتساب دہ
سوزِ محبتِ وطن، بر سرِ کفر و دیں فگن　　در دلِ شیخ و برہمن لذتِ پیچ و تاب دہ
برکتِ اجتماعیت بخشش بہ ما یگان یگاں　　از خطِ نفس و ذاتِ خویش طاقتِ اجتناب دہ
رنج برادرِ وطن تا غمِ خویشتن شود　　نعمتِ حسِ مشترک بر سرِ ہر صواب دہ
سرد شد است در دلاں شعلۂ الفتِ وطن　　دامنِ پاک زن بر آں رخصتِ التہاب دہ
بزمِ جہاں خراب شد، مجلسِ پیچ و تاب شد　　مالکِ انس و جاں بیا مژدۂ انقلاب دہ

آنچہ غمِ جہاں زداست درتہ کوثر صفاست
کیفیِ عشق مست را جرعۂ زاں شراب دہ

(برجمو ہن دتاتریہ کیفی)

جاپان کا یورپ کو چیلنج

سیّد محمود مورّخ - بی اے

مشرق بعید میں ساحل چین سے بالکل قریب جزائر جاپان واقع ہیں۔ گو رقبے کے لحاظ سے جزیرۂ جاپان ایک چھوٹا سا ملک ہے مگر اپنی فوجی قوت جنگی جوش اور علم و سائنس اور صنعت و حرفت میں ترقی کے لحاظ سے جزائر برطانیہ کی طرح ایک نہایت اہم ملک ہے۔ جاپان اب اس قدر قوی ہو گیا ہے کہ اس نے نہ صرف اپنے ہمسایہ ملک چین کو ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں۔ بلکہ یورپ اور امریکہ کے لئے ایک مستقل خطرہ بن گیا ہے۔ جسے وہ زرد خطرے کے نام سے پکارتے ہیں۔

جاپان ایک خوبصورت ملک ہے۔ اس کے دلکش مناظر دل لبھانے والی نت نئی حسن کاریاں ہر نو وارد کی توجہ کو اپنی طرف جذب و منعطف کر لیتی ہیں۔ اہل جاپان فطرتاً بہت خوش خلق اور ملنسار واقع ہوتے ہیں۔ وہ اہل یورپ سے بہت تپاک سے ملتے ہیں۔ وہ صفائی پسند سادہ مزاج اور خوش باش ہیں۔ وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ اہل یورپ کی نگاہوں میں کسی طرح ذلیل نہ ہونے پائیں۔ بلکہ سر اونچا ہی رہے۔ وہ اس قدر صفائی پسند ہیں کہ حمام یا تالاب یا ٹب میں بالکل برہنہ غسل کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق کپڑا پانی کو گندہ کر دیتا ہے۔ میاں بیوی ہوں یا دوسرے عورت و مرد سب برہنہ ہو کر ایک ہی حمام یا تالاب میں غسل کرتے ہیں

اہل جاپان محنتی۔ جفاکش اور کفایت شعار ہیں۔ وہ مشینیں بنانے اور کلوں کا کام کرنے میں بہترین استاد اور ہونہار شاگرد ثابت ہوتے ہیں اور میدان جنگ میں ہوشیار اور بہادر سپاہی اور لائق بحری کارکن۔ الغرض وہ ہر اعتبار سے ایک معزز قوم بننے کے اہل ہیں۔ ان کی حب الوطنی ضرب المثل ہے۔ ان میں باہمی اعتماد اور یکجہتی کا ایک ایسا جذبہ کارفرما ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

جزائر جاپان رقبے کے لحاظ سے بہت ہی تنگ ہیں۔ مگر آبادی کے لحاظ سے وہ دنیا میں سب سے آگے ہیں۔ جاپانی قوم سب سے زائد اولاد پیدا کرنے کے لئے خاص کر مشہور ہے۔ یورپ میں ہٹلر اور موسیلینی اپنے اپنے ملکوں کو بچہ کشی کی ترغیب دے رہے ہیں۔ مگر جاپان میں بغیر کسی ترغیب کے ہر روز چار لاکھ بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ اہل جاپان تعلیم یافتہ اور حفظان صحت کے اصول کے پابند ہیں۔ اس لئے وہاں شرح اموات بہت ہی کم ہے جزائر جاپان میں اس وقت آٹھ کروڑ انسان آباد ہیں۔ اور اس تعداد میں طوفانی رفتار سے روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

جاپان میں سیاسی اختلاف پر خون کر دینا بالکل معمولی بات ہے۔ تقریباً ہر ماہ کی خبریں موصول ہوتی رہتی ہیں کہ آج فلاں مدبر کو تہ تیغ کر دیا اور فلاں سیاست داں کو عدم آباد پہنچا دیا گیا۔ سال رواں کے آغاز میں (فروری ۱۹۳۶ء) جاپانی فوج کے نوجوان افسروں اور سپاہیوں نے بغاوت کر دی تھی کئی مدبرین قتل کر دیئے گئے تھے۔ کیونکہ باغیوں کے خیال میں وہ اس قدر ڈرپوک تھے کہ انہیں زندہ چھوڑ دینا قومی مفاد کے خلاف تھا۔ وہ سیاسی سرگرمیوں اور میدان عمل میں رہنمائی کرنے کے اہل نہ تھے۔ یہ یقیناً ایک کرشمہ خداوندی تھا کہ وزیر اعظم ایڈمرل اوکاڈا تابوت میں چھپ کر باغیوں کی گولی کا نشانہ بننے سے بچ گیا گو وہ اس قدر علوئے تخیل اور عالی حوصلگی کا مالک ہے کہ اگر انگلینڈ میں ہو تو "سخت جان" جماعت کا سرغنہ سمجھا جائے مگر اتنی سرجوشی اور سخت جانی بھی طوفانی فطرت کے مالک نوجوان جاپانیوں کے نزدیک شرمیلاپن اور خوف زدگی کے مترادف ہے۔ وہ ایسے "ڈرپوکوں" کو بلا پس و پیش گولی مار دیتے ہیں۔ گذشتہ چند سال میں ایک دو مرتبہ بلکہ متعدد بار نوجوان جاپانی فوجی لوگ حکومت کے خلاف جہاد کر چکے گو انہیں ابھی تک ہر مرتبہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ مگر اس سے ان کی جوشیلی اور جنگجو فطرت کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ کرنل آزوا نے رجسے ماہ جولائی ۱۹۳۶ء کے آغاز میں بغاوت کرنے کی پاداش میں گولی مار دی گئی) جو ماہ اکتوبر ۱۹۳۵ء

کی بغاوت کا سرغنہ تھا اور اپنے مقدمے کے دوران میں کہا تھا کہ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ وطن اور قوم کی خدمت کی غرض سے کیا۔ اور خدا کی طرف سے اسے ایسا کرنے کی ہدایت کی گئی تھی

نوجوان جاپانیوں کی نگاہوں میں قومی اور ملکی مفاد کے مقابلے میں انسانی جان ایک بے حقیقت چیز ہے۔ وہ موت کو خفارت سے دیکھتے ہیں۔ وہ جدید آلاتِ حرب اور مغربی سائنٹیفک ایجادات سے آراستہ ہو کر اور نئی تعلیم اور نئے ولولے جاپان کا بچہ بچہ رعب اور دبدبے کے ساتھ اکڑتا ہوا میدانِ حیات میں نکل کھڑا ہوا ہے جاپان ہوا ایک کروٹ لے رہا ہے۔ اور اس کی یہ تڑپ یورپین ملکوں کے لئے ایک خطرہ بن جاتی ہے۔

تاریخ جاپان پر ایک نگاہ غلط ڈالئے۔ مشرقِ بعید کی یہ پُراسرار سلطنت انیسویں صدی کے نصف اول تک جاہلانہ مذہب پرستی اور وہمیت کی تباہ کن بندشوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ دوسروں کے لئے ایک خطرہ ہونا تو کجا اہل جاپان اپنی آزادی کو بھی برقرار رکھنے کے اہل نہ تھے۔ لیکن یورپین قوموں کے جذبۂ حرص و آز نے ایک ایسی ٹھوکر لگائی کہ ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور انھوں نے دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کا عہد کر لیا۔ جاپان کی حیرت انگیز ترقی کی داستان کا آغاز ۱۸۵۳ء سے ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں شہنشاہ متشی ہیتو کا نام ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جاپان کی جدید قوم پرستی اس کی مخلصانہ کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔ اور وہی بڑی حد تک جاپان کو جدید رنگ میں رنگ دینے کا ذمہ دار ہے اس نے اپنی قوم کو جمہوری دستور اساسی عطا کیا۔ اور عوام کو حق رائے دہی دیا۔ اسی کے دورِ حکومت میں مغربی تہذیب کو جاپان میں فروغ حاصل ہوا۔ اور جدید سائنس کی ہمت افزائی کی گئی۔ آج جاپان دنیا کی سب سے بڑی طاقتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ سب شہنشاہ متشی ہیتو کی ہی حریت پرستی اور حب الوطنی کا نتیجہ ہے۔

جاپان نے ایک نہایت مختصر عرصہ میں اس قدر طوفانی رفتار سے ترقی کی ہے کہ دنیا اب تک محوِ حیرت ہے۔ مگر جاپان اب تک اپنی حالت پوری طرح سدھار نے نہ پایا تھا کہ اس کی اس کے سب سے بڑے حریف روس سے ٹکر ہو گئی۔ اس وقت دنیا کو توقع کیا یقین تھا کہ روس جاپان کی بڑھتی ہوئی قوت کو کچل دیگا۔ گو اس زمانہ میں روس کی فوجی قوت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ مگر جاپان کے جنگجو اور وطن پرست نوجوانوں نے اس قدر جانبازی سے روس کا مقابلہ کیا کہ حریف کو شکست کا اقرار کر کے میدانِ جنگ سے بھاگ جانا پڑا۔ روسی بیڑے کی شکست نے روس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا اس جنگ میں نہایت شاندار کامیابی تھا کہ ایک طرف تو جاپان کی ترقی کی رفتار میں مزید اضافہ کر دیا اور دوسری طرف نئے خطرے کی بنا بھی رکھدی۔

یورپ کے عروج اور دنیا پر مسلط ہو جانے کا راز یورپین مدبرین کی شاطرانہ چالوں میں مضمر ہے۔ ان کے قول و فعل میں ہمیشہ سے تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر اس حد تک جہاں تک کہ اس میں ان کا ذاتی فائدہ ہے۔ سفید فام لوگوں کی انجمن جسے غلطی سے انجمن اقوام کہا جاتا ہے دراصل دنیا میں امن قائم کرنے کی غرض سے وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ یہ ایک جال ہے ایشیائی اور افریقی قوموں کو پھانسنے اور ان کی آزادی سلب کرنے کا۔ انجمن اقوام نے جو سلوک مظلوم حبش اور چین سے کیا وہ ہمارے اس قول کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مگر بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ سو دن سُنار کے ایک دن لوہار کا۔ اس لئے ان کہنہ مشقوں کی شاطرانہ چالیں جاپان کے معاملہ میں ہمیشہ ناکام ہی رہی ہیں جنگ روس و جاپان کے دوران میں یورپین قومیں اس لئے غیر جانبدار رہیں کہ اول تو انھیں اس بات کا یقین تھا کہ روس جاپان کی بڑھتی ہوئی قوت کو کچل دیگا۔ دوسرے وہ نہ تو جاپان کا ساتھ دیکر ایک مشرقی ملک کو اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنا سکتی تھیں اور نہ روس ہی کی مدد کر سکتی تھیں۔ کیونکہ روس کے خطرے نے پہلے ہی برطانیہ اور فرانس کو کافی بدحواس کر رکھا تھا۔ ہندوستان پر روس کے حملے کے خوف نے شمال مغربی سرحد پر فارورڈ پالیسی کی بنا رکھی تھی۔

جنگ جاپان و روس کے بعد جنگ برطانیہ و جاپان یا جنگ فرانس و جاپان کا ہر وقت خطرہ تھا۔ مگر قبل اس کے کہ یہ خطرہ رنگ لائے یورپ میں جنگ عظیم شروع ہو گئی بسمارک کی قیادت میں جرمنی نے اس قدر قوت حاصل کر لی تھی کہ اس کے منصوبوں کا روکنا آسان نہ تھا۔ جرمنی نے اتحادیوں کا قافیہ اس قدر تنگ کیا کہ انھیں جاپان کو اپنے ساتھ ملانا پڑا۔ جاپان نے اس زریں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برطانوی اور فرانسیسی مقبوضات میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ برطانیہ نے اسے ہندوستانی منڈیوں میں "محبوب قوم" قرار دیا۔ اسی زمانہ میں جاپان نے اپنی جنگی قوت بڑھانے۔ سلطنت کو وسعت دینے۔ افواج و عساکر کی تنظیم کرنے اور نئی نئی جدتوں اور ترقیوں سے طاقتور بننے کی طرف خاص توجہ دی۔

جنگ عظیم نے فوجی و مالی دونوں حیثیتوں سے یورپین قوموں کو کھوکھلا کر دیا تھا جاپانی مدبرین نے سوچا کہ اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لئے یہ موقع بہت اچھا ہے۔ مگر

اس وقت امریکہ نے میدان جنگ میں قدم رکھا۔ چونکہ دیر میں آیا تھا تازہ دم تھا۔ اور جاپان کو من مانی کارروائی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اسی وجہ سے جاپان کے توسیعی منصوبے کچھ مدت کے لئے سُست رفتار ہوگئے۔ امریکہ کا بحری بیڑہ بالکل نیا تھا اور جاندار۔ ادھر برطانوی بحری بیڑہ اپنے عروج کے نصف النہار پر تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں جاپان دو قوموں سے متصادم نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے سلطنت چین پر چھاپہ مارنے کی غرض سے مختلف بہانوں سے جو مطالبات پیش کئے تھے واپس لے لئے۔ مگر صرف عارضی طور پر۔

میدان جنگ میں نمایاں کامیابی کا موقع نہ پاکر جاپان نے دُنیا کی منڈیوں پر قبضہ کر لینے کا فیصلہ کرلیا۔ یورپین قوموں کے لئے جاپان کی سی جنگجو قوم کے ساتھ صلح رکھنا ہی بہترین پالیسی تھی۔ اس لئے وہ بلا کسی مزاحمت کے ترقی کرتا گیا۔ اس کے مال کی افراط اور ارزانی نے ایشیا۔ افریقہ۔ اور اب یورپ کی منڈیوں پر بھی قبضہ کرلیا ہے۔ یہاں تک کہ اب جرمنی کے تجارتی اور صنعتی ملکوں کی منڈیوں میں بھی جاپانی مال فروخت ہوتا ہے۔ اب جاپان اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اس کی سیلاب نما رفتار ترقی کسی کے روکے رُک نہیں سکتی ہے۔ گذشتہ تین سال کے عرصہ میں اس نے اپنی سلطنت کا رقبہ تقریباً دوگنا کرلیا ہے۔ اور مزید توسیع ہورہی ہے۔ منچوریا میں ان تین صوبوں پر بھی قبضہ کرلیا ہے جو کبھی مملکت چین میں شامل تھے۔ اب سلطنت جاپان کی مجموعی آبادی بارہ کروڑ سے بھی زائد ہے۔ حال ہی میں جاپان کے وزیر خارجہ نے پچاس لاکھ جاپانیوں کو منچوریا میں آباد کرنے کی اسکیم تیار کی ہے۔ اسپر بارہ کروڑ پونڈ صرف ہوں گے۔ اس اسکیم کی کامیابی پر یقیناً چین و ایشیا کے ایک بڑے حصّہ پر جاپانی جھنڈا لہرانے لگے گا۔

چین اور جاپان

یورپین قوموں کی عیارانہ چالوں اور مسیحی داعیوں کی ریشہ دوانیوں نے چین کی خانہ جنگیوں کا مرکز بنا کر اسے بھی ہندوستان کی طرح ہڑپ کر جانے کی سعی لاحاصل کی تھی۔ لیکن قبل اس کے کہ دول یورپ وہاں اپنا قدم جما سکے۔ یورپ پر جنگ کے بادل چھاگئے اور انھیں مجبوراً جاپان کے لئے میدان خالی کردینا پڑا۔ جاپان جو بالکل دول یورپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے چین کو ہڑپ کر جانے کی فکر میں ہے بسنہ ۱۹۲۹ء میں اقوام عالم مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوگئیں۔ اقتصادی بدحالی کا امریکہ پر سب سے زیادہ اثر پڑا۔ اور وہ اس میں اس بُری طرح پھنسا کہ خارجی معاملات کی طرف توجہ نہ کرسکا۔ جاپان نے اس خداداد موقع سے فائدہ اٹھا کر سنہ ۱۹۳۱ء میں چین پر حملہ کردیا۔ منچوریا میں فرضی بادشاہی قائم کرنے کے بعد اس کی فوجیں دیوار اعظم چین کے شمال تک پہنچ گئیں۔ اور کوئی مخالفت نہ کرسکا۔

یورپ آجکل اندرونی پیچیدگیوں میں مبتلا ہے اور دو مخالف جماعتوں میں منقسم ہے۔ مسولینی اور ہٹلر کے وجود اور ان کے جنگی اور توسیعی عزائم نے برطانیہ اور فرانس کو بیحد پریشان کر رکھا ہے۔ اور ہر لمحہ جنگ چھڑ جانے کا خطرہ ہے۔ اس سے تو کہا جاتا ہے کہ یورپ ایک ایسے آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھا ہوا ہے معلوم نہیں کس وقت پھٹ پڑے اور تمام دنیا کو تباہ و برباد کر ڈالے۔ جنگ حبش و اطالیہ امراطالیہ کے ہی جنگی عزائم کا نتیجہ تھی اور یہ جاپان کی نسبت خراب کرنے میں بہت ممد ثابت ہوئی۔ چنانچہ اس نے گذشتہ موسم سرما میں "دیوار اعظم" کے جنوب کی طرف بھی قدم بڑھا دیا۔ حالات سے ظاہر ہے کہ جاپانی فوجیں بہت جلد چین کے عین وسط میں بہنے والے دریائے ینگسی تک پہنچ جائینگی۔ یعنی جب تک جاپان چین کو اپنی سلطنت میں شامل نہ کریگا چین سے نہ بیٹھیگا۔

شمالی چین کے چار صوبے درا صل جاپان کے قبضے میں ہیں۔ اور بہت جلد سلطنت جاپان میں شامل کرلئے جائیں گے۔ حکومت جاپان وسطی ایشیا میں روسی اشتراکیوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکنے کے بہانے سے چین جاپانی فوجوں کا مرکز بنا رہی ہے اور اسی کی شاطرانہ چالوں کا نتیجہ ہے کہ چین میں پھر خانہ جنگی شروع ہوگئی ہے جنوبی اور مرکزی حکومتوں کی فوجوں میں تصادم ہوچکا ہے اور گو کبھی کبھی "جان بل" اور "انکل سام" چین کو مالی مدد کیکر اسے جاپان کے پنجوں سے چھڑانے کا ارادہ کرتے ہیں تاکہ مشرق بعید کی منڈیاں ان کے مال کے لئے کھلی رہیں مگر اب چین کا جاپان کے قبضے سے نکل جانا ایک معجزے سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہوگا۔ اور جب جاپان چالیس کروڑ انسانوں کو اپنا حلقہ بگوش غلام بنالیگا۔ تو پھر . . . . . پہلے غالباً جزائر شرق الہند اور جزیرہ ملایا پر ہاتھ صاف کیا جائیگا۔

اگر یورپ میں ہٹلر جرمن سلطنت کو وسعت دینے کے لئے بیتاب ہے۔ اور مسولینی رومن سلطنت کے خواب دیکھ رہا ہے۔ "اور امن امن" پکار کر جنگی تیاریوں میں مصروف ہے تو ایشیا میں پُرجوش اور نوجوان جاپانیوں کا ہردلعزیز سرغنہ جنرل آرائی دُنیا پر جاپانی تسلّط قائم کرنے کی غرض سے جوڑ توڑ میں مصروف ہے۔ جنرل آرائی چھریرے بدن کا دبلا پتلا حسّاس اور قدرے مذہب پرست آدمی ہے۔ وہ ذہن رسا کا مالک اور ایک خاموش و پُراسرار ہستی ہے۔ اس لئے وہ مسولینی کی طرح مینار پر چڑھ کر اپنی قوم کو جنگ کی علانیہ تعلیم

نہیں دیتا ہے۔ وہ ایک کامیاب مقرر و خطیب ہے۔ اس کی زبان کی ایک ہی جنبش سے لاکھوں نوجوان ملک پر قربان ہونے کیلئے آمادہ ہوجاتے ہیں۔

روس اور جاپان

وسطی ایشیا میں جاپان کا سب سے بڑا حریف اشتراکی روس ہے روس تو ہر گذشتہ جنگ میں اپنی ناکامی و رسوائی کا انتقام لینے کے لئے موقع کی تاک میں ہے۔ دوسرے اب سلطنت روس اور سلطنت جاپان کی سرحدیں مل گئی ہیں دونوں وسعت چاہتے ہیں اسلئے جلد یا بدیر دونوں کا تصادم ہونا ضروری ہے حکومت ماسکو اور حکومت ٹوکیو دونوں اس امر سے غافل نہیں ہیں اس لئے دونوں اسلحہ بندی، و فوج کی جدید تنظیم سے اپنے آپ کو مضبوط بنانے کی مزید تدبیریں کر رہی ہیں۔ سوویٹ روس اپنی پنجسالہ اور دہ سالہ اسکیموں کے لئے مشہور ہے۔ جاپان نے بھی اس کی تقلید کرنی شروع کردی ہے ۔ اگست ۱۹۳۶ء میں ہی وزیر جنگ نے جاپانی بیڑے کی توسیع و جدید تنظیم کی پنجسالہ اسکیم تیار کی ہے جس پر بارہ کروڑ پونڈ صرف ہونگے۔

جنگ عظیم کے دوران میں انقلاب روس میں رونما ہوا۔ اور زار روس کی بجائے اشتراکی حکومت قائم ہوئی۔ حکومت کے اس جدید فلسفے کو سرمایہ پرست حکومتیں حقارت کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ ۱۹۳۴ء کے اواخر تک روس یورپ کی دیگر سلطنتوں سے بالکل بے تعلق تھا۔ نہ تو وہ جمعیت اقوام میں شامل تھا اور نہ اس کا کسی ملک سے اتحاد تھا۔ اگر سرمایہ پرست حکومتوں کا بس چلتا تو وہ اشتراکی حکومت کو ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ نہ رہنے دیتیں۔ مگر آمرین و مدبرین روس نے سب سے پہلے اپنی جنگی قوت کو بڑھانے کی طرف توجہ کی اپنی سلطنت کی توسیع میں لگے رہے اپنے لوگوں کو متحد کرکے تعلیم سے آراستہ کیا۔ اور اشتراکیت کی تبلیغ کرنے کی غرض سے اپنے نائبین دنیا کے ہر گوشے میں اپنے جدید سیاسی فلسفے کا وعظ کرنے کے لئے بھیجے۔ اس زمانہ میں اگر سوویٹ روس جاپان کی سرمایہ پرست حکومت سے جنگ کرتا تو یقیناً دیگر سرمایہ پرست حکومتیں جاپان کی مدد کرتیں مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔ گو ہٹلر اور مسولینی کو ابھی تک اشتراکیوں سے نفرت ہے اور وہ انھیں زندہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ مگر اب روس نے برطانیہ کے ساتھ تجارتی اور فرانس کے ساتھ بوقت مصیبت ایک دوسرے کی مدد کرنے کا معاہدہ کرکے اپنی پوزیشن کو مستحکم کرلیا ہے۔ اب جاپان کے ساتھ جنگ کی صورت میں اول تو فرانس معاہدے کی رو سے سوویٹ روس کی مدد کرے گا۔ اور اگر مدد نہ بھی کی تو بھی فرانس اور برطانیہ دخل نہ دیں گے۔ باقی رہے اطالیہ و جرمنی ان کا براعظم ایشیا سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس لئے ان کا اس جنگ میں دخل دینا بہت مشکل ہے۔

اب تو ہر وقت جنگ روس و جاپان کا ڈر رہتا ہے۔ جوشیلے جاپانی لوگ شمال مغربی منگولیا پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ علاقہ کبھی سلطنت چین میں شامل تھا۔ مگر اب حکومت ماسکو کے زیر اثر ہے۔ اس لئے روس کی سُرخ فوج اور سُرخ فضائی طاقت ،، کا جاپان کی " زرد طاقت ،، سے ہولناک تصادم ہوگا۔ اور پھر اس ٹکر سے جو شعلے بلند ہوں گے وہ خرمن امن عالم کو جھلس کر رکھ دیں گے۔

حکومت ٹوکیو کو اس خطرے کا پورا احساس ہے۔ جاپان کی فوج کے جوشیلے افسر بھی معاملے کی نزاکت اور سنجیدگی کو سمجھ چکے ہیں۔ اس لئے وہ عجلت میں کوئی غلط قدم اٹھانے کی سعی نہ کریں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جاپان کے توسیعی سیلاب کو روس کی دھمکی نے روک رکھا ہے۔ مگر عارضی طور پر۔ کیونکہ اگر یورپ میں ایسی جنگ شروع ہو گئی جس میں سوویٹ روس بھی شامل ہوا تو جاپان اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو جائیگا۔ اور وہ اپنے مشرق کی طرف توسیع سلطنت کا قدم آگے بڑھا دیگا۔ اور اس کے ساتھ کوشش کریگا کہ بحرالکاہل اور اس کے ساحلی علاقوں پر اسے مکمل طور پر بحری بالادستی حاصل ہو جائے۔

مسئلۂ بحرالکاہل

اسی سلسلہ میں مسئلہ بحرالکاہل پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ اب پیشگوئی کا موجب ثابت ہو رہا ہے۔ اس عظیم ترین سمندر سے وابستہ مسائل زیادہ سے زیادہ پیچیدہ و نازک ہوتے جا رہے ہیں۔ اور جب سے جاپان نے اس بحری معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کردیا ہے۔ جو برطانیہ۔ فرانس اور امریکہ کے درمیان ہوا ہے صورت حال بہت خطرناک ہو گئی ہے۔

بحرالکاہل قطب شمالی سے قطب جنوبی تک پھیلا ہوا ہے۔ یعنی براعظم امریکہ و ایشیا تک چلا گیا ہے۔ اس کے شمال میں آبنائے بیرنگ ہے۔ جو نو ہزار میل طویل ہے۔ جنوب مغرب میں براعظم آسٹریلیا ہے۔ اس میں ہزاروں جزیرے پائے جاتے ہیں جن کا سلسلہ بحر منجمد جنوبی تک چلا گیا ہے فی زمانہ اس سمندر سے وابستہ مسائل اس

قدر نازک ہو گئے کہ اگر یہ ایک ایسا سٹیج بن جائے جس پر قسمت کا ڈرامہ کھیلا جائے۔ تو کوئی حیرتناک بات نہ ہوگی۔

لندن کے بحری معاہدے پر دستخط کرنے سے جاپان کے انکار نے بحرالکاہل کی تاریخ میں ایک جدید باب کا افتتاح کیا ہے۔ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۳۰ء کے بحری معاہدے ۱۹۳۶ء کے خاتمے پر ختم ہو جائیں گے۔ اور حالات موجودہ میں اس بات کی کوئی توقع نہیں ہے کہ جاپان۔ برطانیہ۔ فرانس اور امریکہ کے ساتھ بحری معاہدے میں شریک ہو جائیگا۔

اس وقت بحرالکاہل کے مسائل سے چار حکومتوں یعنی جاپان روس۔ چین اور امریکہ کے فوری مفاد وابستہ ہیں۔ ان کے بعد برطانیہ۔ فرانس۔ جرمنی اور ہالینڈ کا تعلق ہے ان کے علاوہ اور بھی کئی قوموں کے تجارتی بحرالکاہل سے تعلق ہے لیکن وہ براہ راست نہیں ہے۔ اس سمندر پر اقتدار قائم رکھنے کے لئے جو شاطرانہ چالیں مستقبل قریب میں چلی جائیں گی ان سے غالباً مظلوم چین کا مفاد زیادہ وابستہ ہے۔ اور اس سرزمین پر کئی خونریز جنگیں لڑی جائیں گی۔ چین میں اب کافی بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے دنیا کو توقع کہ مظلوم اہل چین ضرور کوئی کارہائے نمایاں کر کے دکھائیں گے۔ آیندہ لڑائیاں بھی چین کی منڈیوں اور اس کے خام مسالے پر قبضہ کرنے کے لئے لڑی جائیں گی

بحرالکاہل کے مسئلے سے جرمنی کا تعلق بالواسطہ ہے وہ اپنی نو آبادیاں کھو چکا ہے اور اس کی تجارت محدود ہو گئی ہے۔ اس لئے اب جرمنی کو بحرالکاہل کے مسائل سے پیدا شدہ کشمکش میں صرف اس بات کا امکان نظر آتا ہے کہ وہ سویٹ روس کے خلاف جاپان سے اچھی شرائط پر صلح کرے تاکہ جنگ یورپ کی صورت میں اسے جاپان سے مدد مل سکے اور جدید وجارحانہ جرمن حکومت کے چاروں طرف جو فولادی حلقہ کھینچا جا رہا ہے اسے توڑ سکے۔

فرانس فطری طور پر جرمن وجاپانی اتحاد میں دلچسپی لے رہا ہے کیونکہ اس کا یورپین سیاسیات پر ضرور اثر پڑے گا۔ لیکن فرانس جو مشرق بعید کے مسائل میں فرانسیسی ہند چینی کی وجہ سے دلچسپی لے رہا ہے اب اس بحری قوت کا مالک نہیں رہا ہے کہ جاپان کا کامیابی سے مقابلہ کر سکے۔ اور نہ وہ یورپ کی نازک صورت حال ہی سے اپنی توجہ ہٹا سکتا ہے اب وہ صرف یہی چاہتا ہے کہ مشرق بعید میں اپنے مقبوضات پر اپنا اقتدار قائم رکھ سکے۔ اور لڑائی کے بغیر کسی دوسری طاقت کی جارحانہ پیشقدمی کے خلاف اپنی تجارت کو محفوظ بنا سکے۔ اسی طرح ہالینڈ بھی لڑائی کے بغیر مشرق میں اپنے مقبوضات اور ان کی دولت پر قبضہ رکھنا اور اپنی تجارت کو جاری رکھنا چاہتا ہے۔ اسے احساس ہے کہ وہ جاپان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ برطانوی اور امریکن بحری طاقت کی پناہ لیکر جزیرہ نما ملایا کی آڑ میں خوف زدہ نگاہوں سے جاپان کی توسیعی سرگرمیوں کو دیکھ رہا ہے۔ الغرض مسئلہ بحرالکاہل کے پرامن حل یا بین الاقوامی جنگ کا انحصار حکومت ٹوکیو کی آئندہ پالیسی پر ہے۔

برطانیہ اور جاپان

اسی سلسلے میں برطانیہ اور جاپان کے تعلقات پر نظر غائر ڈالنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ بعض برطانی مدبرین ومفکرین کا قول ہے کہ جاپان انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر اس کے پینتیس کروڑ باشندوں کو اپنا حلقہ بگوش بنالیگا۔ اس قول میں کہاں تک اہمیت ہے؟ اس سوال کا جواب تو مستقبل کے مورخین ہی دے سکیں گے۔ مگر حالات موجودہ میں ان کا یہ قول بے حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ برطانوی بیڑہ ابھی کافی طاقتور ہے۔ ہندوستان کی جنگی قوت بھی ہر حملے کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اہل ہند میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ وہ آزادی حاصل کرنے کے لئے ہر وقت بیتاب نظر آتے ہیں۔ اس لئے وہ چولھے میں سے نکل کر بھاڑ میں جانا پسند نہ کریں گے۔ ہمارے خیال میں تو برطانوی مدبرین اس خیال کی اشاعت محض اس لئے کر رہے ہیں کہ اہل ہند کو جاپانیوں سے نفرت ہو جائے اور وہ برطانوی مال کے مقابلے میں جاپانی مال کو ترجیح نہ دیں۔

گو برطانیہ نے کئی سال سے مشرق بعید کی سیاسیات میں کوئی سرگرم حصہ نہیں لیا ہے۔ مگر یہ بھی اس کی ایک شاطرانہ چال ہے۔ برطانیہ دنیا کی دیگر سلطنتوں سے کہیں زیادہ اشتراکیت کی اشاعت سے خوفزدہ ہے۔ اس کی ہر چال میں یہی راز مضمر ہے کہ ایشیا میں اشتراکیت پھیلنے نہ پائے۔ اسے معلوم ہے کہ روس کا سب سے بڑا حریف جاپان ہے۔ اور دنیا میں صرف وہی اشتراکیت کی رو کو ایشیائی ملکوں میں پھیلنے سے روک سکتا ہے۔ اس لئے وہ جاپان کو کمزور کر دینا پسند نہ کریگا۔ اور اسی وجہ سے حکومت برطانیہ خاموشی کے ساتھ صورت حال کا مطالعہ کر رہی ہے۔

سلطنت برطانیہ کے کئی ملک و علاقے یعنی ہندوستان۔ آسٹریلیا۔ ہانگ کانگ اور شنگھائی بحرالکاہل میں واقع ہیں۔ اس لئے برطانیہ جاپان کی سرگرمیوں

سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ گو اسے اپنے ان مقبوضات کی سلامتی کی بے حد فکر ہے۔ مگر اس وقت برطانیہ کے سامنے سیاسی یا جنگی نہیں۔ بلکہ تجارتی معاملہ ہے۔ جاپان اسے ایشیا کی منڈیوں سے نکال رہا ہے۔ ادھر چین کی قوم پرست حکومت نے برطانوی مال کا مقاطعہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے برطانوی مدبرین بہت پریشان ہیں لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرح برطانیہ بھی شمالی بحر الکاہل میں جاپان کے اقتدار کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ برطانوی سنیر سنگاپور سے گرچہ ہندوستان پر تکلیف دہ نگرانی رکھتا ہے۔ ہندوستان کی منڈیوں میں بھی جاپانی تاجر اقتصادی طور پر داخلہ حاصل کر سکا ہے۔ گو بھاری محصول کی دیوار کھڑی کر کے ہندوستان پر جاپان کے اقتصادی حملے کو روکنے کی سعی جاری ہے۔ اور برطانوی مال کے ساتھ خاص رعائتیں کی جا رہی ہیں یہاں تک کہ اسمبلی سے مشورہ لئے بغیر ہی حکومت کے مقرر کردہ ٹیرف بورڈ کی سفارشوں کے مطابق لنکاشائر کے مال پر محصول میں کمی کر دی گئی ہے۔ مگر جاپانی صنعت و حرفت کچھ اس قدر منظم ہے کہ محصول کی کمی و بیشی سے اس سیلاب کو نہیں روکا جا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی تاجروں کے عروج کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے مشرق بعید میں برطانیہ کی مشکلات نہایت نازک صورت اختیار کر چکی ہیں۔ برطانوی مدبر نہ صرف اپنی تجارت کو قائم رکھنا۔ بلکہ اسے ترقی دینا چاہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ ایشیا کی کسی جنگ میں الجھنا بھی نہیں چاہتے۔

مسئلہ بحر الکاہل سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا بھی گہرا تعلق ہے۔ وہ بھی جاپان کی طرح اپنی سلطنت کو وسعت دینا چاہتا ہے۔ کیلیفورنیا سے لے کر فلپائن تک کے علاقے اس کی سلطنت میں شامل ہیں اور وہ چین کی منڈیوں میں بھی تجارت کرنے کے لئے بھی جوڑ توڑ میں مصروف ہے مگر جاپان کی موجودگی میں اس کا اس معاملے میں کامیاب ہونا محال ہے۔ اس لئے جاپان اور امریکہ کے باہمی تعلقات کشیدہ ہو چکے ہیں۔ واشنگٹن کا بحری معاہدہ اور ۱۹۲۲ء کے چار طاقتوں اور نو طاقتوں کے معاہدے جو بحر الکاہل میں امن قائم رکھنے کے لئے مرتب کئے گئے تھے کچھ عرصہ تک حالات کو سنبھالے رہے۔ مگر اب وہ قطعاً بیکار رہیں۔ اس لئے اب جاپانی سیلاب کی روک تھام کے لئے برطانوی و امریکن مدبرین باہمی اتحاد کی فکر میں ہیں۔ لندن کی بحری کانفرنس میں ہر دو قوموں کے نمایندوں کی مفاہمت اور جاپانی مطالبات سے متحدہ مخالفت ظاہر کرتی ہے کہ جاپان کا خطرہ ان دونوں ملکوں کو ایک زنجیر میں جکڑ دیگا۔ اور اس طرح بحر الکاہل کی جنگ کچھ عرصہ کیلئے رک جائیگی۔ مگر یہ صرف قیاس ہے اس کے غلط اور صحیح ہونے کا حال صرف مستقبل ہی بتا سکتا ہے۔

"زرد خطرہ"

مذکورہ بالا سطور کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد آپ ان سوالوں کا جواب آسانی سے دے سکتے ہیں کہ یورپین اور خاص کر برطانوی مدبرین نے جو "زرد خطرہ"۔ "زرد خطرہ" کا شور مچا رکھا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ دنیا کے خود ساختہ رہنماؤں کا محض ایک خواب ہے؟ یا کیا "زرد خطرہ" امن عالم کے لئے ایک مستقل خطرہ بن گیا ہے؟ جہاں تک یورپ کا تعلق ہے ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے۔ کیونکہ یورپین قوموں کی خواہش اولین یہی ہے کہ دنیا کی ہر قوم کو اپنا محکوم و غلام بنا لیں۔ دنیا کی منڈیوں پر بلا شرکت غیرے قابض ہو جائیں۔ اسیلئے تو ہٹلر نے اس سال (۱۹۳۶ء) کے ابتداء میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ سفید فام لوگوں کو دنیا پر حکمرانی کرنے کا خدا کی طرف سے حق حاصل ہے۔ اور اسی لئے وہ سابق جرمن نو آبادیات کی واپسی کے لئے بیتاب نظر آتا ہے۔ مگر چونکہ معاملہ سفید فام لوگوں سے ہی ہے اسلئے ابھی تک کچھ نہیں کر سکا ہے۔ اطالیہ پر حبش کی یورش بھی یورپ کی اس پالیسی کا جزو لازمی ہے۔ دراصل سوائے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جاپان کے دنیا کی اور کوئی قوم یورپین قوموں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ اور ان دونوں میں سے امریکہ میں یورپین قوموں کے ہی بھائی بند آباد ہیں۔ وہاں "انکل سام" "جان بل" کی ہی باغی اولاد ہے۔ اس لئے امریکہ سے یورپ کو بہت کم خطرہ ہے۔ اب رہا جاپان تو وہ یقیناً ایک غیر قوم ہے اسلئے یورپ کو اسکی طرف سے انتہائی خطرہ ہے جاپان نے اپنے سیاسی پیر یعنی یورپ کے نقش قدم پر چل کر جنگی و مالی لحاظ سے اسقدر ترقی کر لی ہے کہ یورپین قوموں کے سر پر "زرد خطرے" کا بھوت بنکر سوار ہو گیا ہے۔

یورپین قوموں کی طرح جاپان بھی اپنی سلطنت کو وسعت دینا اور دنیا کی منڈیوں میں اپنا مال فروخت کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتی ہیں اور نہ ایک ہی ملک میں دو بادشاہ بیک وقت ہو سکتے ہیں اسلئے ان دو مخالف نصب العین اور متضاد قوموں کا ایک نہ ایک دن ٹکرانا لازمی ہے۔ یورپین قوموں کو ان کی اپنی خانگی پیچیدگیوں، باہمی نا اتفاقی اور رقابت نیز محکوم قوموں کی بیداری نے اس خطرہ کے برداشت کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ مگر بین الاقوامی سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے آسانی یہ پیشگوئی کر سکتے ہیں کہ جلد یا بدیر وہ وقت آنے والا ہے کہ یہ دونوں حریف آپس میں ٹکرائیں اور نظام عالم کو درہم برہم کر دیں۔ جاپان کو اس خطرے کا پورا احساس ہے اور اس کیلئے وہ طوفانی رفتار سے تیاریاں کر رہا ہے۔

"افسانۂ مجبوری"

سیمابِ محبّت بننا تھا طوفانِ تمنّا ہونا تھا　　تم کو اس بہتے دریا میں اک تیز سا دھارا ہونا تھا
یا بزمِ طرب میں جلنا تھا اِک شمع تجلی زا بن کر　　یا سازِ دلِ فطرت کا اِک شیریں نغما ہونا تھا
خود اپنی تمنّاؤں کا خدا فطرت کا کھلونا بن کے رہو　　تجھ کو فطرت کے ہاتھوں سے اس طرح نہ رسوا ہونا تھا
منھ بند کنواری کلیوں کو گلچیں نے ناحق توڑ لیا　　دنیا میں ان کو کھلنا تھا اور سوکھ کے کانٹا ہونا تھا
یہ سرد ہواؤں کے جھونکے جو کھیلتے ہیں پھولوں سے انھیں　　طوفانِ حوادث بننا تھا اور بن کر برپا ہونا تھا
ہر قطرۂ ابرِ نیساں کو "آہوں کی اِس آبادی میں"　　دہقاں کا پسینہ بننا تھا، یا اشکِ یتامیٰ ہونا تھا
"مردوں کی اس آبادی میں" ہر بجھنے والے ذرّے کو　　پیشانیٔ چرخِ نیلی پر اِک نور کا قشقا ہونا تھا

یہ اشکوں سے لبریز آنکھیں افسانہ ہیں مجبوری کا
اے اشکؔ تمہاری آنکھوں کو اس طرح نہ رسوا ہونا تھا

احسن احمد اشکؔ کلکتہ

اقوالِ حکیمانہ

غلام سرور، ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی (علیگ) مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

(۱) اہلِ عالم کو صرف باتوں سے درسِ اخلاق دینا بیسود ہے۔ تہذیب و تربیت کے آرزومندوں کو چاہئے کہ خود بلند نصیحت کا ایسا عملی نمونہ پیش کریں کہ دوسرے لوگ انکے اتباع پر مجبور ہو جائیں۔

(۲) بحیثیت ایک مخلوقِ خیالی کے جو زمانہ بہت شوق آلودیت سے پیدا ہوئی ہو اور اسکی مثال اس شیشہ کی سی ہے جسے تیرہ صابون سے بنا لیا ہے اور جو ایک لحظہ میں ٹوٹ جاتا ہے "فریڈرک اعظم"

(۳) انسان طبیعت کی طرف سے متعدد مخفی زنجیروں میں اسیر ہے۔ آزادی۔ ملاحظات و اعتیادات کے محیط میں معتدلانہ حرکت کا نام ہے۔

(۴) بدن کی سلامتی کی بہترین ضمانت اور صحیح ترین امین فراغت طبع اور راحتِ قلب ہے۔ "فریڈرک اعظم"

(۵) حقیقت ممکن ہے ایک عرصہ تک پردۂ تاریکی و نقوش میں مخفی رہے لیکن وہ ہمیشہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہیگی۔ اور موقع پانے ہی ظاہر ہو جائیگی۔ "گوئٹے"

(۶) ہم حقیقت کو عقل کی استعانت سے نہیں پہچانتے۔ بلکہ صرف دلی تعلقات کی بنا پر اس سے آشنائی پیدا کرتے ہیں "پاسکال"

(۷) تمام مواقع اور جملہ حالات میں صرف حقیقت ہی بلند اور طبعی چیز ہے۔ "مادام سوجینیہ"

(۸) تفکر ایک ایسی عبادت ہے۔ جو ہم حقائقِ مختلفہ کے لئے ادا کرتے ہیں۔ تاکہ وہ ہمپر آشکار ہو کر ہمارے لئے تسکینِ قلب کا سامان پیدا کریں۔ "ابلونش"

(۹) حقیقت ایک ایسا الماس ہے جس کی شعاعیں صرف ایک ہی طرف کو منور نہیں کرتیں۔ بلکہ جملہ اطراف کو اپنے نور میں مستغرق کرتی ہیں۔ "شاتوبریاں"

(۱۰) اگر ہر چیز کی تبدیلی انسان کے اختیار میں ہوتی تو یہ انتظام و ترتیب جو ہم دنیا میں مشاہدہ کر رہے ہیں کبھی کا مختل ہو جاتا۔

(۱۱) ایک بھاری پتھر جس کا حرکت دینا محال ہو اُس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ یہ مناسب جگہ پر نہیں ہے یقیناً دیوانگی ہے۔

(۱۲) تصمیمِ مسافرت اور رستے پر قدم رکھنے کے بعد مشکلاتِ راہ ایک غیور و باعزم شخص کے قوتِ ارادہ میں حائل نہیں ہو سکتیں۔

(۱۳) اگر دنیا کے تمام آدمی اپنے ہی حال میں مشغول رہیں تو کسی کو اتنی بھی فرصت نہ ہو کہ دوسرے کی طرف توجہ کر سکے۔

(۱۴) نیک کاموں کا اقدام فی الحقیقت ایسے لوگوں کو درس دینا ہے جو اعمالِ زشت کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن افسوس کہ شاگرد اس درس سے استفادہ نہیں کرتے اور برخلاف اس کے خود معلمین ہی کو ضرر پہنچتا ہے۔

(۱۵) لازم ہے کہ تدبیر اور عقل سے کام کا آغاز کیا جائے اور سرعت اور جسارت کے ساتھ اُسے اتمام پر پہنچایا جائے۔

(۱۶) تمول، اقتدار، عقل، آزادی اور تندرستی میں سے کوئی جملہ ضروریات کے پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کامیابی کی پہلی اہم شرط ثبات و متانتِ ارادہ ہے "شیر نعلی پوش"

(۱۷) اگر تو چاہتا ہے کہ جملہ ممالکِ عالم پر حکمرانی کرے تو لازم ہے کہ تیری عقل تجھ پر حکمراں ہو۔

(۱۸) لائق ترین خدمت جو تم ایک ملت کے لئے سر انجام دے سکتے ہو یہ ہے کہ اُس ملت کے افراد کو حقیقی علم و ادب سکھاؤ اور نہ یہ کہ اُن کے ایوان خانوں کو نقش و نگار سے آراستہ کرو۔ ارواحِ عالیہ جو فقیرانہ جھونپڑوں میں رہتی ہیں اُن اشخاص سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہیں جو عظیم الشان محلات میں قیام پذیر ہیں۔

(۱۹) اگر ہماری برائیاں فقط ہمیں تک محدود رہتیں اور دوسرے اُن سے متاثر نہ ہوتے تو ان گرفتارانِ بلا کی تعداد آج یقیناً کم ہوتی۔ (چسٹر فیلڈ)

مردِ مضحک

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

(اسرائیل احمد خاں سکندر آباد دکن)

(گذشتہ سے پیوستہ)

باب ۳

گم کردہ راہ بچہ

(۱)

کیسل کا مرحلہ اور اک عجیب نشانِ راہ

بچہ تن تنہا بے ہمسفر و راہبر، عناصر باد و باراں کی جنوں سامانیوں کے درمیان گرم سفر ہے۔ غیر ذی روح اشیا احساس و ادراک و شعور اور اس درد و احساس سے غالباً عاری ہوتی ہیں، جو شاعرانہ آداب و روایات میں ان سے منسوب کیا جاتا ہے۔

ابر و غبار سے ملفوف صحرا کی فضا میں بچہ مصروف دوا دوش ہے، اس مبہم و مجہول مقام کے خطرات محتاجِ بیان نہیں، اس لئے کہ کہرا، برف ہی کی طرح اک غدار عنصر ہے۔ آخر بہزار خرابی و دشواری بچے نے اس سطح مرتفع کو طے کیا، اور اک مقام کیسل نامی پر پہنچ گیا۔

کیسل اک خاکنائے تھی، جس کے دونوں پہلوؤں کو سمندر کی لہریں غسل دیتی تھیں، اس موقع پر ایک لغزش قدم مہلک تھی، راہ راست سے سرمو انحراف مسافر کو امواج بحر سے ہم آغوش کر دینے کے لئے کافی تھا۔

خورد سال راہرو کے خطرات کی نوعیت اب بدل گئی ہے۔ خاکنائے کیسل کے چپ و راست غاروں کے مہیب دہانے بچے کو نگل لینے کے لئے تیار تھے ساحلِ بحر کا چپہ چپہ اک سرابی ہیئت رکھتا ہے، ایک ایک گوشہ اک دام فریب ہوتا ہے۔ قدموں کے نیچے کی زمین ہر لحظہ چلنے والے کو پامال کر سکتی ہے، ہر پیچ و خم اک بھول بھلیاں کی تصویر ہوتا ہے۔ چنانچہ کیسل کے برف پوش تختۂ ریگ پر جا بجا شگاف پڑے ہوئے تھے۔ جو غافل راہرو کو اپنا لقمہ بنا سکتے تھے، قربِ بحر کے سارے نواح میں اک تھیٹر کا سا پُر فریب اسٹیج نظر آتا تھا۔

الغرض سمندر سے کسی مہمان نوازی کی امید نہ تھی یعنی چٹان اور آبی موج دونوں یکساں قاتل تھیں۔ سمندر صرف ماہی و مرغابی کا مسکن و مامن ہوتا ہے۔ باقی ہر مخلوق کے لئے اس میں زحمت و ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

ساحلِ بحر کے اس حصے کا نقشہ، یہ تھا کہ مختلف موقعوں پر موجوں کے عمل سے چٹانیں قاش قاش ہو گئی تھیں کسی جگہ گار ے اور پیچھے سے نکل آئے تھے۔ اور کہیں گھڑیال اور مگر کے سے اژدرد ہاں جبڑے پیدا

ہوگئے تھے، بیتھ لی چٹان بڑے بڑے کوہ پیکر تودوں میں منقسم ہوگئی تھی، جو ایسا منظر پیش کر رہے تھے کہ گویا کسی دیو ہیکل جن کے جسم پر بجلی ٹوٹ پڑی ہو اور ایک ایک عضو کو علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ عناصر فطرت کی اس ہولناک بلاخیز و بے پناہ جبلت کی نعش کا اک مرگھٹ سا پیدا ہو گیا تھا۔

اک کمسن بچہ ہے اور اس پر ہولناک وادی کا مرحلہ ہے، مشکلات کی اک سد سکندری سامنے ہے۔ قلب و روح کی دہشت و وحشت کے لئے فضا میں اک زندہ کابوس نمایاں ہے۔ سارا ماحول ایسا تھا کہ رستم و جیوٹ کے سے دلاور بھی لرزہ براندام ہو جاتے، سب پر طرہ یہ کہ ؎

نہ کوئی دلیل و رہبر نہ نشان راہ کا ہے

بچہ صرف اپنی ذاتی فراست اور طبعی بصیرت سے کچھ کام لے رہا ہے، قدم قدم پر بیک وقت پانی برف اور ریت کے گڑھے موجود ہیں، آخر الذکر چیز بہت مغالطہ آور اور اس لئے سب سے زیادہ مخدوش ہے۔ ہم جن خطرات سے دوچار ہوا کرتے ہیں، ان کا علم ہمارے دل میں پیشگی خوف و ہراس ضرور پیدا کیا کرتا ہے لیکن ان خطرات سے لاعلمی بدتر از خوف و ہراس ہوا کرتی ہے۔ بچہ غیر معلوم خطرات کی ایسی ہی تاریک سرزمین پر گامزن ہے۔ ہر قدم اک قبر میں پڑتا معلوم ہوتا ہے۔ ؎

گم رہی دہشت کے سینے پر قدم رکھتی ہوئی

بایں ہمہ بچہ ہچکچایا نہیں، وہ شیرانہ آگے بڑھتا رہا۔ البتہ اس نے اپنی پیش قدمی میں ہر ممکن احتیاط ملحوظ رکھی۔ سارے نشیب و فراز کو نظر میں رکھا ہر سنگ راہ کی ٹھوکر سے بچا، اور ہر گڑھے کی افتاد سے انکار کیا۔ خوق العادت ہوش مندی کا ثبوت دیا، متعدد مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں جا رہا۔ مگر معاً لپسپا ہو گیا، اور بسلامت نکل آیا، برفانی فرش صحرا اس کے تلووں کو منجمد کئے دیتا تھا۔ اور عذاب الجوع اس سب پر مستزاد تھا۔

بحر اعظم کے اس قسم کے سواحل پر ہر بات ممکن ہوتی ہے۔ کوئی شے دائرۂ امکان سے باہر نہیں ہوتی، حتٰی کہ محض حسن اتفاق سے کبھی کبھی ان حیرانیوں اور سرگردانیوں میں مخلصی و رہائی کی راہ بھی نکل آتی ہے۔

بچہ اس منطقۂ مہالک کی آخری سرحد کو قریبًا عبور کر چکا ہے۔

ناگہاں اسے اک نقش قدم نظر آتا ہے ــــــــ جو برف کی لوح پر منقوش ہے۔

یہ نشان جوان اور بچے کے پاؤں کے نشانوں کے بین بین تھا۔ اور شاید کسی عورت کا تھا، آگے بڑھ کر اسے یکے بعد دیگرے بہت سے نشانات و نقوش کا ایک سلسلہ دکھائی دیا، جن سے اک مسلسل پگ ڈنڈی سی پیدا ہو گئی تھی، ان آثار کی تازگی سے پتہ چلتا تھا کہ یہ زنانہ مسافر حال ہی میں اس راہ سے گزرا ہے۔

اسی راستے کی سمت میں بچے کو کچھ عرصہ پیشتر اک دھواں بھی نظر آیا تھا۔ جو اس وقت بھی معدوم نہ ہوا تھا۔

اس دھوئیں کو مشعل راہ بنا کر اور ان نشانہائے پا کو اک خدا فرستادہ خضر راہ سمجھ کر بچے نے ان پر چلنا شروع کر دیا۔

(۴)

سکوتِ موت میں اک نوائے حیات

بچہ اس راستہ پر تھوڑی دیر سفر کرتا رہا۔ اب قدموں کے نشان رفتہ رفتہ مٹتے جاتے تھے، نہ معلوم انہیں برف کی تہوں نے محو کرنا شروع کیا تھا یا کوئی اور بات تھی، حضرت خضر کے نقوش قدم کا یہ ظہور و غیاب ہر دو نا قابل تعبیر تھا۔

ادھر سطح بحر پر کاسپرٹ یکو کی کشتی گرداب طوفان میں تھی۔ اور ادھر روئے ارض پر یہ بچہ اس شکنجۂ زحمت میں گرفتار تھا۔ صرف یہ نشانہائے قدم ہی اس کے تنہا رہبر تھے۔ جو اسے کسی ایک معینہ راہ پر بخط مستقیم نہیں لیئے جا رہے تھے۔ بلکہ گوناگوں سمتوں میں، اک قسم کی بھول بھلیاں سی بنتی آ رہی تھیں۔ جن کے پیچ و خم سے ہو کر ننھا رہ نورد اگھا بھٹکتا چلا جا رہا تھا۔

پاؤں کے نشان اب یک قلم غائب ہو گئے، آئندہ مطلق کوئی سراغ نظر نہ آتا تھا۔ برف اور ابر کا سفید اور سیاہ لحاف اوپر تلے علی الترتیب آسمان و زمین پر چھا گئے، بچہ یکسر حیران و سرگرداں ہو گیا۔

وہ راستے کی تلاش میں مصروف تھا کہ ناگہاں اک نیم مبہم و موہوم

آواز اس کے کان میں آئی، وہ اس کی ماہیت کا کوئی تعین نہ کر سکا، البتہ یہ آواز حیوانی ہونے کے مقابلے میں انسانی زیادہ تھی۔ مگر کسی انسانی آبادی کے بجائے کسی شہر خموشاں سے آتی معلوم ہوتی تھی، اس آواز کی سماعت سے اک حالت نوم کا سا توہم محسوس ہوتا تھا۔

بچے نے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر کچھ نظر نہ آیا، اس نے بے اعتنائی اختیار کر لی۔ لیکن اب وہی آواز بار دگر گوش زد ہوئی، اس مرتبہ وہ غیر مشتبہ تھی۔ اُسے کراہنے یا سسکنے سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔

ایک لمحے کے بعد اس پر اسرار آواز نے بچے کے پردۂ گوش کو پھر مس کیا نہیں نہیں وہ یقیناً کسی روح کے جگر سے اٹھنے والی چھوٹی چھوٹی صدائیں تھیں۔ جن میں اختلاج قلب کی اذیتیں بول رہی تھیں۔ ہر آواز اک فریاد استمداد تھی۔ جو کسی نہایت مظلوم و معصوم سینے سے نکل رہی تھی۔

بعض اوقات دم گھٹنے اور کلیجہ منہ کو آنے کی سی کیفیت معلوم ہوتی تھی۔

تلاش کو بے سود سمجھ کر بچے نے اپنی توجہ دوسری طرف منعطف کر لی مگر آواز نے پھر کرۂ ہوائی میں اک ہلکا سا مضطرب تموّج پیدا کیا۔ بچے کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بین سا چلاتا ہو۔

بچے پر ان پے در پے غیر معلوم و غیر مفہوم آوازوں سے اک خوف طاری ہوا۔ اس طلسم بند فضا سے بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا۔

لیکن آواز اک بار پھر مسموع ہوئی۔ اس مرتبہ وہ غایت درجہ درد آمیز و رقت خیز تھی۔ آواز دینے والے ذی روح وجود کی طرف سے یہ آخری "صدائے مدد" معلوم ہوتی تھی۔ جو بظاہر اس نیت سے بلند ہوئی تھی کہ اگر پردۂ غیب میں کوئی حی، قیوم، حاضر و ناظر، سمیع و علیم ہستی موجود ہے تو اس پر آخری اتمام حجت ہو جائے۔

بچہ پر امید ہو کر آواز کی سمت میں پھر آوارۂ جستجو ہوا۔ لیکن ناکام مگر اسی اثنا میں اک اور آواز کی آمد سے ایسا نظر آیا کہ اس کا مخرج کہیں آس پاس ہی ہے۔ بچے نے ایک بار اور قسمت آزمائی کا ارادہ کیا۔ اب اگرچہ آواز قریب ترین نواح ہی سے چلی آ رہی تھی، مگر پھر یہ ٹھیک معلوم نہ ہوتا تھا کہ عین وہ موقع و محل کہاں ہے۔ جہاں سے وہ پیدا ہوتی ہے۔

یکبارگی کسی ننھے سے انسانی قلب سے اک دل دوز کراہ کی آواز نکلی معاً بچے کو اپنے سے تھوڑے سے فاصلے پر نیم تاریکی میں اک غیر معین سی شکل کا اک ڈھیر سا دکھائی دیا۔

یہ ایک سفید قبرستان میں اک سنگ مرمر کی قبر معلوم ہوتی تھی۔

بلا شبہ آواز کا منبع یہی چیز تھی۔

بچہ اس ڈھیر پر جھکا اور ہاتھ سے برف ہٹانے لگا۔ اس طرح جو ایک سوراخ پیدا ہوا اس میں سے اک زرد رنگ انسانی چہرہ نمودار ہوا۔

مگر یہ منہ آواز پیدا کرنے سے قاصر تھا۔ اس لئے کہ وہ حلق تک برف سے اٹا ہوا تھا۔

بچہ مبہوت رہ گیا۔ اس کی سوا انگلیاں برف مثال چہرے کے مس سے بید لرزاں بن گئیں۔

یہ اک عورت کا چہرہ تھا۔ بال برف کے گالوں سے آلودہ تھے، اور روح پرواز کر گئی تھی۔

بچے نے برف کو اور ہٹانا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ اس نے اس لاش کا نصف بدن کھول لیا۔ یہ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔

بچے کی گورکنی کا عمل جاری تھا۔ کہ ناگہاں اس کی انگلیوں سے کوئی نرم و نازک سی چیز مس ہوئی۔ برف کے تودوں کی مزید صفائی کے بعد اس کے نیچے سے اک دبلا پتلا سرد و منجمد سا بچہ نکلا جس کے جسم کے اندر ہنوز اعمال حیات معطل نہ ہوتے تھے۔ یہ ننھا سا ننگا وجود عورت کے قریباً برہنہ سینے پر چمٹا ہوا تھا۔

بچے کے بدن پر برائے نام ہی کچھ کپڑے تھے۔ اس کے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں کی خفیف جنبشوں سے یہ تار تار کپڑے بڑی حد تک الگ ہو گئے تھے۔ اور بچی عملاً لباس عریاں میں تھی۔ اس کے بدن پر جو برف کا غلاف تھا، اس کا تھوڑا سا حصہ اس کی سانس کی گرمی سے پگھل گیا تھا۔

اک نرس کی تشخیص میں یہ بچی پانچ چھ مہینے سے زیادہ کی نہ تھی۔ لیکن بعض دوسری علامات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا کہ اس کی عمر ایک سال سے کم نہ ہوگی۔ ایک سالہ سن جو اس پر بظاہر نہ کھلتا تھا اس کی ذمہ دار وہ

نامراد مفلسی تھی جو بچوں کی نشو ونما میں بری طرح سدراہ ہوا کرتی ہے۔ اور اکثر اوقات ان کے اعضا کا وہ نقشہ کر دیا کرتی ہے جس پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ صناع ازل کی "احسن تقویم" کا شیطان رجیم نے نہایت شریرانہ خاکہ اڑا دیا ہے۔

برفستان کی کھلی ہوئی ہوائے زہریر کے لگنے سے بچی جاگ پڑی۔ ماں کا جسد بدستور بے حس و حرکت رہا۔ یہ اس عورت کے جسم کے "تن بے جان" ہونے کا آخری ثبوت تھا جس کے بعد اس کے بدن کے اندر خفیف تر رمق حیات کے ہونے کا کوئی شائبہ نہ ہو سکتا تھا۔ اپنے جگر گوشہ کی ایسی چیخ ایک مردہ ماں کے لئے بھی صدائے قم باذنی ثابت ہو سکتی تھی۔

عورت کی نعش کی ہیئت کذائی ان تمام استفسارات کا جواب شافی تھی جو اس حادثے کے متعلق کوئی جویائے حال کر سکتا تھا۔ بھنویں کشیدہ تھیں ہاتھوں کی انگلیاں سر کے بالوں میں الجھی ہوئی تھیں، بہے ہوئے آنسوؤں کے خطوط رخساروں پر نقش تھے۔ تمام بدن پر برف کی سرد مہر زبانوں درد والوں کی سنگدلیوں کے داغ مرتسم تھے۔ یہ تمام علامات بمنزلہ ایک بلیغ تحریر کے تھے۔ جو اس بافانی بستر کا گویا کتبہ اور قطعہ تاریخ بن گئی تھی۔ اس "راز فاش" کی روئیداد کچھ یوں واقع ہوئی تھی۔

"یہ ٹھکاری عورت، اس راہ سے گذر رہی تھی کہ طوفان نے آ لیا۔ اس نے ہر چہار طرف دوڑ دھوپ کی، مگر نہ راہ ملی، نہ جائے پناہ۔ بالآخر اس کے ہاتھ پاؤں نے جواب دے دیا۔ وہ گر پڑی اور پھر نہ اٹھ سکی، برف کی سفید چادر اس کا کفن بن گئی، سکرات موت کی کشمکش میں بھی وہ اپنی جان جاں بچی کو اپنے سینۂ ریش کا پھاہا بنائے رہی۔"

شیر خوار بچی ماں کے برف پوش مرمریں سینے سے جوئے شیر نکالنے کی ناکام کوشش کرتی رہی تھی۔ خواہ مخواہ دودھ چوسنے کے اس عمل کا محرک، فطرت کا ودیعت کیا ہوا وہ عجیب اعتماد تھا جو اک بچے کو یہ تلقین کرتا ہے کہ ماں کے سینے کا چشمۂ رحمت کبھی خشک نہیں ہو سکتا۔

بچے نے اس ننھی بچی کو گود میں لے لیا۔ اور بچی نے رونا موقوف کر دیا۔ دو بچوں کے چہرے آپس میں مس ہوئے، اور دو انسانی خونوں نے آشنائی و ہمنوعی کی بو سونگھی۔ بچی نے اپنے ارغوانی لب بچے کے رخسار پر اس طرح رکھ دیئے کہ جیسے وہ ماں کا سینہ ہو۔ برف کے نیچے مدفون پڑے پڑے، انجماد خون کی وجہ سے بچی کے قلب کی حرکت قریباً معطل ہو گئی تھی۔ ماں کے مردہ جسم نے اپنی تھوڑی سی مردنی اپنے سینے سے لگے ہوئے بچے میں بھی منتقل کر دی تھی۔ برفستانی سردی سے اس کے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں مفلوج سے ہو گئے تھے۔ یہ دیکھ کر بچے نے بچی کو اس کی ماں کی نعش پر تھوڑی دیر کے لئے رکھ دیا۔ اور اپنا گرم لبادہ اتارا، بچی کو اس میں رکھ کر لپیٹا۔ اور پھر اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔

اب بچہ خود ننگا تھا۔ بہت جلد برف کے گالوں سے اس کا بدن ڈھک گیا۔ اور ہوائے شمال کے تھپیڑوں نے اس کے خون کو منجمد کرنا شروع کیا۔ مگر مصائب و شدائد کے اس کامل حصار میں اپنی آغوش میں بچی کو لے کر بچہ پھر گرم سفر ہو گیا۔

بچے سے لپٹے لپٹے بچی کے ہونٹوں کو اس کا گال پھر مل گیا، جس کی گرمی سے اسے اک آسودگی سی محسوس ہوئی۔ جس نے اک خواب آور خمار سا پیدا کرنا شروع کیا۔

دو معصوم روحیں طوفانی رات کے بھیانک اندھیرے میں ہمکنار ہیں۔

جس وقت ماں کے سینے سے اس کا ننھا لخت جگر جدا کیا گیا تو ماں کی غیر مرئی روح نے عالم اسرار کی گہرائیوں سے اس منظر فراق پر اک خاموش شیون بلند کیا۔

(۳۳)

زیر بار مسافر اور دشوار تر سفر

بچے کی آوارہ گردی کو اب چار گھنٹے سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں جب سے اہل کشتی کی غدار جماعت نے اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر

پھینک دیا تھا۔ اسے نسل انسانی کے کل تین افراد ملے تھے۔ ایک مرد۔ وہ جس کی لاش پہاڑ پر ٹنگی نظر آئی تھی۔ ایک عورت۔ یہی جو ابھی برف میں دبی ہوئی پائی گئی تھی۔ اور ایک بچی جو خود اس کی گود میں تھی۔

ماندگی اور گرسنگی سے بچہ نیم جان گیا، بے جان ہو رہا تھا۔ لیکن اس کا مردانہ استقلال غیر مجروح تھا۔ اس کا زور کم ہو گیا تھا۔ اور بوجھ بڑھ گیا تھا۔ لیکن دونوں چیزوں کی تلافی اس کے بے پایاں صبر و ثبات نے کر دی تھی، جس کے لئے یہ مسلسل نزول آفات و مشکلات شاید ایک محرک ہی ثابت ہوئی تھیں۔

بچہ قریباً بالکل برہنہ تھا۔ صرف چند چیتھڑے اس کے جسم پر باقی تھے جو یخ جامد سے آلودہ ہو کر شیشے کی طرح سخت اور دھاردار ہو گئے تھے۔ بچے کا سارا بدن اگرچہ برف ہو رہا تھا۔ لیکن گود کی بچی خوب گرم تھی، وہ اپنی ابتر حالت پر صابر و شاکر تھا۔ اس کے موجب تسلی یہ بات تھی کہ اپنی لاانتہا تکلیفوں میں تھوڑا سا اضافہ اور کر کے اس نے اپنا جو کپڑا اس بے پناہ معصوم جان کے لئے ایثار کر دیا تھا، اس نے اس کو دوسری زندگی بخشی تھی۔

وہ ایک دفعہ بچی روئی، بچے نے اس کی علت اپنی فراست سے جان لی اس نے اپنی رفتار میں گہوارے کی سی جنبش اختیار کی، بچی نے آرام پایا اور چپ ہو گئی، تھوڑی دیر کے اندر وہ پھر اک خواب نوشیں میں تھی۔ بچے کی اگرچہ بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی، لیکن بچی کی طرف سے وہ ایک لحظہ بے فکر نہ تھا۔ وہ بار بار اپنے لبادے کو ٹھیک کر کر کے اس کے ہاتھ پاؤں لپیٹتا۔ کہ مبادا کسی روزن سے کوئی برف کا گالا اندر چلا جائے۔ راہ میں کئی موقعوں پر برف سے بھرے ہوئے گڑھے تھے۔ جن میں بچہ اپنی کمسنی کے قد و قامت کے ساتھ آدھا آدھا غرق ہو گیا۔ لیکن اس کی مسلسل ہمت اور غیر متزلزل استقامت تمام مشکلات کو سر کرتی رہی۔

چھوٹا مسافر پہاڑ کے نشیب کو طے کر کے بالائی حد پر پہنچا۔ تیز و تند ہوا یہاں جاروب کشی کر رہی تھی۔ اس تمام سطح مرتفع پر برف کا اک دبیز لحاف پڑا ہوا تھا۔ بلند برفستان کے زمہریری چھینٹے بچے کے جسم کی گردش خون کو روکے دیتے تھے۔ صرف گود کی بچی کی نیم گرم سانس کبھی کبھی اسے اک آنی راحت بخش دیتی تھی۔

اس اثنا میں بچے نے اک اور خطرے کی آمد محسوس کی، یہ خطرہ اس کی اپنی ذات ہی کی طرف سے تھا۔ وہ اب ماندگی و خستگی سے بالکل مغلوب ہو رہا تھا۔ اور خوف تھا کہ چلتے چلتے کہیں گر پڑے گا۔ اگر کسی جگہ وہ لڑکھڑا پڑتا تو دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ یقیناً اس کا حشر بھی اسی عورت کا سا ہوتا۔

اس نے خطرناک ڈھلان طے کئے تھے۔ بیشتر گڑھوں پر سے گزرا تھا۔ ان موقعوں پہ اک لغزش قدم موت کے ہم معنی تھی، لیکن اب وہ ایسا چور چور ہو رہا تھا کہ چلنے سے بھی معذور تھا۔ اس پر گود کی ننھی جان اس کی رفتار کو اور مخدوش بنا رہی تھی۔ بچے پر نہ صرف جسمانی بوجھ تھا، بلکہ اک روحانی تعلق خاطر کا بار بھی تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بچی کے سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ حالانکہ برفستان پر چلنے میں ایک راہرو کے دونوں بازوؤں کے آزاد رہنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ توازن قائم رہے۔ مگر بچہ ان ساری دقتوں اور درشتہ اندازیوں کے علی الرغم اپنا کام کر رہا تھا۔ اور افتاں و خیزاں چلا جا رہا تھا۔ تاہم یہ ننھی شیرخوار اور گہوارہ طلب بچی وہ آخری تنکا تھی جو اس "شتر صابر" کی کمر توڑ رہا تھا۔

دفعۃً برفباری میں اک عارضی توقف ہوا، جس سے فضا صاف ہو گئی اور قرب و جوار کی چیزیں بآسانی نظر آنے لگیں۔ معاً اس کو مکانوں کی چمنیاں دکھائی دیں۔ اور پھر چند لمحوں کے نظارے میں اک پورا شہر سفید سفید سیاہ افق پر منقوش نظر آیا۔

مکانات۔ چھتیں، پناہ گاہیں۔

بچے کے تخیلات میں امیدوں کا اک تلاطم برپا ہو گیا۔ بالآخر یہ منزل مصائب ختم ہوتی نظر آئی، رویین تن ننھے فرزند آدم کا ظرف زحمت کشی شاید بے مہر قسمت کے حوصلۂ جفا کوشی سے بھی فراخ ثابت ہوا۔

اک اضطراری انداز میں بچے کی رفتار تیز ہو گئی، اس کے قدم منضبط تر ہو گئے،

بچہ خاندان آدم سے، جس سے کہ وہ بری طرح بچھڑ گیا تھا۔ اب پھر

ملنے والا ہے۔ مخلصی و جاں بری کے احساس نے اس کے سرد خون میں اک گرمی سی پیدا کر دی۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ کالی رات، برفانی سردی، طوفانِ باد و برف سے اب ان شاء اللہ تا نشست و چارہ ہوں گا۔ بچی اب اس کی گود میں اک خوش گوار اضافہ وزن بوجھ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ قریباً دوڑتا ہوا جا رہا تھا۔

بچے کی کلکلی مکانوں کی مجبوراً بڑی ہوئی تھی۔ وہ چھتیں جن کے نیچے گرمی اور زندگی ملے گی۔ مکینوں کا دعوائے آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا۔

بچہ اب اس قصبے کے مضافاتی دامن میں داخل ہوا۔ آبادی کے تمدنی آثار میں سب سے پہلے ایک سڑک تھی۔ جس کا آغاز دو مکانوں کے درمیان سے ہوتا تھا۔ یہ بستی اک پست حیثیت قریہ تھی۔ جس کے گھر کچے اور چھتیں چھپر کی تھیں۔ سڑکوں پر روشنی ناپید تھی۔ دروازے نیچے تھے۔ اور روشندان روزنوں سے زیادہ نہ تھے۔ مکانات انسانوں کے مسکنوں کے بجائے مرغیوں کے دربے معلوم ہوتے تھے۔

ایک مکان ذرا بھاری بھرکم نظر آیا۔ یہ پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اپنی ظاہری ہیبت سے وہ "امیر دہ کا محل" معلوم ہوتا تھا۔

بچہ اس پُر رعب عمارت سے مرعوب نہ ہوا، وہ بے باکانہ آگے بڑھا۔ مہیب پھاٹک پر ایک دستہ دستک دینے کے لئے لٹکا ہوا تھا۔ بچے نے بمشکل اسے پکڑ کر اٹھایا۔ سردی کی وجہ سے اس کی انگلیاں گرفت کے قابل نہ رہی تھیں۔

بہر حال اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

صدائے برنخاست۔

بچے نے دوسری دفعہ اک ورضربی دستک دی۔

مگر اندر کوئی نقل و حرکت نہ سنائی دی۔

تیسری دستک بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

سب سو رہے تھے، اور شاید کوئی اٹھنا چاہتا بھی نہ تھا۔

بچے نے اک پتھر اٹھا کر مکان کا چھوٹا دروازہ کوٹنا شروع کیا مگر یہ بھی بے سود۔ پُر شور کھٹا کھٹ بھی فضا کے سکوتِ مطلق میں جذب ہو کر رہ گئی۔

اب اس نے انگوٹھوں پر کھڑے ہو کر کھڑکی کھٹکھٹائی، جو اتنے زور سے تو نہیں کہ اس کا شیشہ ٹوٹ جائے تاہم اتنی آواز سے ضرور کہ اگر کوئی سننے کی تکلیف گوارا کرے تو قابلِ سماعت ہو۔ لیکن اس کوشش کا بھی یہی حشر ہوا۔

سارا مکان اک سنسان مقبرہ سا معلوم ہوتا تھا۔ اور بالکل تیرہ و تار۔

بچے نے جان لیا کہ کوئی بندۂ خدا اٹھنے کی زحمت گوارا کر کے اپنی خواب نوشیں کو مکدر کرنا نہیں چاہتا۔ بچے کی صداؤں اور فریادوں کے شور میں در و دیوار تک اپنے ثقلِ سماعت کا ثبوت دے رہے تھے۔

ناچار بچے نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔

جو آبادی اپنی اولین نمود میں اک "دارالامان" نظر آئی تھی موت کے سکوتِ بیداماں کا گورستان ثابت ہوئی۔

بچہ اک گلی سے ہو کر گذرا، دو طرفہ دیواروں کے درمیان بڑا کم فصل تھا۔ قصبے کا یہ حصہ ہمارے مسافر کو کسی بحری خلیج کا تنگ دہانہ معلوم ہوتا تھا۔

(۴)

بیابانِ انسانیت

یادش بخیر یہ قصبہ دیہاتی تھا۔ قدیم دیہاتی کو اس کے موجودہ نقشِ ثانی سے کوئی نسبت نہیں۔ پیچ در پیچ اور تنگ و تاریک کوچوں میں بچہ حیران و سرگرداں سر ٹکراتا پھر رہا تھا۔ یہ مقام بالکل اک دہقانی منظر رکھتا تھا۔ جس کا بیشتر حصہ اک زیرِ کاشت رقبہ تھا۔ اور جس میں گھروں سے زیادہ کھیت تھے۔

اپنی دوا دوش کے سلسلے میں ایک دفعہ بچہ پانی کے کنارے آ گیا۔

یہاں پر ویگادِ یلہ کا پل تھا۔ جس کے نیچے بندرگاہ کا مدخل واقع ہوا تھا۔

یہ پل اس وقت اک چوبی تعمیر تھا۔ بچے نے اسے عبور کیا۔ پل پر سے گزرتے ہوئے بچے کو اک نہایت خوش آیندرات محسوس ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ پل خوش قسمتی سے مسقف تھا۔ اور اس پر برف نہیں پڑی تھی۔

پل کو قطع کر کے، بچہ اس آبادی کے متعلقہ مدنی حصہ میں پہنچ گیا، یہ شہری حلقہ "سیکلم ریکس" کہلاتا تھا۔

سینٹ ٹامس اسٹریٹ پر اسے شاندار مکانات اور بلند دکانات کا اک سلسلہ نظر آیا۔ یہاں اس نے ایک دروازے پر دستک دی، صرف دستک اس لئے کہ اب اس میں چلاّنے کا یارا نہ رہا تھا۔

مگر یہاں بھی سب خواب مرگ میں تھے۔

دروازوں پر ڈبل قفل چڑھے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر بھی لکڑی کے بیرونی پٹ موجود تھے۔ جو اس طرح بند تھے، جس طرح کہ آنکھوں پر پپوٹوں کے ڈھکنے چھپے ہوتے ہیں۔ یہ سارے بندوبست غالباً اس نیت سے کئے گئے تھے کہ شب کی ساعات میں ساری تکلیف دہ مداخلتوں کا سدباب ہو جائے۔

بچے نے برافروختہ ہو کر بلا تمیز جو دروازہ سامنے آیا زور زور سے کوٹنا شروع کیا۔ اس کی دستک میں کوئی فصل یا انقطاع نہ تھا۔ دروازہ ٹھوکنے کے تواتر و تسلسل میں اس کی خشمناکی و کبیدگی نمایاں تھی۔

بارے ایک آواز آئی۔

مگر یہ آواز وقت کی تھی۔ سینٹ نکولس کے گھنٹہ گھر نے تین بجائے تھے۔

اب پھر ساری کائنات قعر سکوت میں غرق ہو گئی۔

بس خون ٹپک پڑا نگہ انتظار سے

یہ عالم ممات جو شہر پر طاری تھا اک بوالعجبی معلوم ہوتا تھا۔

تاہم یہ "خموشی" "اک معنی" رکھتی تھی۔

لوگوں کے تاریخی حافظے میں یہ بات محفوظ ہو گی کہ سنہ ۱۶۹۰ء میں طاعون نے لندن پر اک قیامت خیز تاخت کی تھی جس نے پایہ تخت کے اطراف و اکناف کو دور دور تک لرزہ براندام کر دیا تھا۔ دبا زدہ علاقوں کے مہاجرین کی پذیرائی "دور باش" کے کلمات سے کی جاتی تھی

نتیجہ یہ تھا کہ ہر چہار طرف لوگوں کے جذبہ ہمدردی و مہمان نوازی میں اک شدید سرد مہری پیدا ہو گئی تھی۔ مکانات کے دروازے پناہ گزینوں پر بند ہو گئے تھے، کھڑکیوں کی اس دوہری بندش کا راز یہ تھا کہ لوگ اپنی تحفظاً احتیاط کو یوں بھی یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ مسموم ہوا بھی کسی منفذ سے داخل ہو جائے۔

اس انسانیت سوز منظر سے بچے کا دل ناتواں پھٹ گیا "روز روشن کے اخلاق" (Daylight morality) کی یہ سرد مہری برفانی رات کی اس زمہریری سردی سے بھی زیادہ قاتل تھی۔ وہ اس وسیع انسانی آبادی میں باہمہ و بے ہمہ تھا۔ بچے کے لئے یہ آخری صبر آزما امتحان تھا، یہ بیدرد شہر اک صحرائے بیگیاہ سے زیادہ خشک معلوم ہوتا تھا۔

اس اثنا میں گھڑیال پھر بجا، سکوت مطلق میں اس کی آواز اک معنی خیز زبان حال تھی۔ جو اہل شہر کی گراں گوشی کی حقیقت کو گوش گذار کر رہی تھی۔

بچہ ٹھہر گیا، وہ شاید یہ سوچ رہا تھا کہ موت و حیات کی اس لامتناہی کشمکش کی زحمت سے تو ہزار درجہ بہتر یہ ہے کہ وہیں گر پڑے، اور جان بحق ہو جائے۔

ع حیف گر در پس امروز بود فردائے

مگر معاً اس کو بچی کا خیال آیا۔ جو اس کے کاندھے پر سر رکھے بےعمل و غش اپنے تمام معصومیت میں آسودۂ خواب تھی۔

اس کے دل میں اک نادر اور نغز خیال القا ہوا، اس نے کہا کہ "جب کسی گوشے سے مدد نہیں آتی تو شاید میں مدد کا محتاج نہیں ہوں"۔

اعتماد علی النفس کے احساس عمیق میں سرشار اس کی زبانِ ہمت بولی ؎

نہ کوئی دوست و دشمن ہو شریک درد و غم میرا مبارک میری گردن پر رہے بارِ الم میرا

اک ناقابل رد دعوت فرض کی صدا گوش روح میں گونجتی مسموع ہوئی۔

یہ بلند خیالات اور یہ ناقابل تاب صورت حالات، ہر دو بچے کی عمر کے ممکنات سے بالاتر تھے، شاید اس کا قلب قوی مع اپنی واردات عالیہ کے خود اس کے لئے بھی ناقابل فہم تھا۔ ان خواطر کو فطرت انسانی کے اک "قبل از وقت الہام" سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔

بچہ اپنے تنہا نخانہ دل کے ان ہی عجائب و غرائب میں محو تھا کہ دفعتاً اس کا پردۂ گوش اک دہشتناک آواز سے ٹکرایا۔ (باقی)

تحسینِ ناشناس

سنتے ہی میرے شعر ہوا افراطِ اضطراب
اک ناشناس شعر کا اللہ رے پیچ و تاب

گتھی کبھی جو کھل نہ سکے کھولنے لگا!!
آنکھوں میں وزنِ شعر کو دل تولنے لگا

افشائے رازِ جہل کی دہشت سما گئی،
چہرے پہ کھنچ کے دل کی ہر اک ضرب آ گئی

شرمندگی، خرد کی سپر ڈھونڈنے لگی
معنی کو ہر سپاٹ نظر ڈھونڈنے لگی

رہ رہ کے ندیاں سی چڑھیں اور اتر گئیں
رخ سے ہزار رنگ کی موجیں گزر گئیں

کچھ اور خال و خط کو بنانے لگے نڈھال
بھٹکے ہوئے دماغ کے الجھے ہوئے خیال

دل بارِ زعم و شرم سے بے جان ہو گیا
چہرہ تمام جنگ کا میدان ہو گیا

ژولیدہ طرزِ نطق میں شوقِ نمودِ فہم
آوارہ تیوروں میں یقینِ جمودِ فہم

آنکھوں میں دفعتہً ہوئی گھبرا کے رونما
اخفائے جہلِ شعر کی سعیِ گریز پا

لہجے نے کپکپا کے بصد یاسِ عاجزی
میت اٹھائی دعوئے عرفانِ شعر کی

تحسیں کا طرز طرفہ تو ہم لئے ہوئے
جھینپا ہوا خفیف تبسم لئے ہوئے

جاری ہوئی لبوں پہ جھکاتی ہوئی نگاہ
اڑتی سی "خوب خوب" چپچپتی سی "واہ واہ"

سینے میں نوکِ شعر چبھی، آنکھ جھک گئی
رگ رگ چلی، زبان ہلی، سانس رک گئی

چہرہ شتا، دراز ہوا، سرد ہو گیا
سمٹا، کھنچا، اداس ہوا، زرد ہو گیا

تھوڑی سی نبضِ نطق چلی اور ٹھہر گئی؛
اک چیخ تھی کہ کون و مکاں سے گزر گئی

(جوشؔ)

ہندوستان کے مسائلِ آبادی

عبدالرحیم شبلی بی۔کام

ہندوستان میں ہر دس سال کے بعد ایک مردم شماری ہوتی ہے جس کے مطالعے سے ہم اپنی معاشرتی ترقی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اور معلوم کر سکتے ہیں کہ تمدن و عمرانیت کے لحاظ سے ہم کہاں ہیں۔

ذیل میں ہم ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی روشنی میں بعض موٹے موٹے مسائل آبادی کا تذکرہ کرتے ہیں جن سے معلوم ہو سکے گا کہ ہمارا ملک کس قدر سُرعت کے ساتھ تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ اور اگر بروقت توجہ نہ کی گئی تو تہذیب و تمدن کی دنیا میں ہندستان کا نام بھی نظر نہ آئے گا۔

(مسائل بالاختصار)

اگر ہم بنظرِ تعمق دیکھیں تو ہندوستان کے مسائل آبادی مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ آبادی کی فی میل گنجانی بہت کم ہے اور دوسرے صوبجاتی گنجانی میں کوئی تطابق نہیں۔

۲۔ تقریباً پچہتر فیصدی لوگ اپنی معاش کے لئے زراعت پر تکیہ رکھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر بارشیں وقت پر نہ آئیں یا ضرورت سے زیادہ ہو جائیں تو ملک میں بوجہ کسی دوسرے ذریعہ معاش کے نہ ہونے کے سخت قحط پھیل جاتا ہے۔

۳۔ رفتارِ اموات باقی تمام ممالک سے زیادہ ہے اور خصوصاً بچوں اور عورتوں کی تولید گی نہایت لرزہ خیز ہے جو حفظانِ صحت کے اصولوں سے ناواقفی اور غربت پر دلالت کرتی ہے۔

۴۔ ملک میں مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ ہیں۔ یعنی اگر مرد سولہ کڑوڑ ہیں تو عورتیں پندرہ کڑوڑ (بمطابق مردم شماری ۳۱ء) اس تفاوت کی وجہ سے بردہ فروشی کی رسم اور بے حیائی کی عادات پھیل گئی ہیں۔

۵۔ ہماری اوسط عمر دوسرے ممالک کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ یعنی صرف تیئس سال۔ حالانکہ دیگر ممالک میں لوگ کم از کم ساٹھ برس تک جیتے ہیں۔ اس سے ہندوستان میں انسانی زندگی کی قیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۶- ملکی وسائل آبادی پر یکساں تقسیم نہیں جس کی وجہ سے بیکاری اور بیماری پھیل رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں آبادی ضرورت سے زیادہ ہے۔

اب ہم کو ان مسائل کی توضیح اعداد و شمار کی امداد سے کرنی ہے۔

(فی میل آبادی)

ہندوستان میں صرف ۱۹۶ لوگ فی میل بستے ہیں۔ لیکن اگر ریاستوں اور برطانوی ہند کو علٰحدہ علٰحدہ کرکے دیکھا جائے تو ریاستوں میں آبادی ۱۱۳ آدمی فی میل ہے اور برطانوی ہند میں ۲۴۰ آدمی فی میل یہ گنجانی دیگر ممالک کے مقابلہ میں نہایت قلیل ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشہ سے[۱] ظاہر ہے۔

بلجیم	۶۵۴	فرانس	۱۸۴
انگلستان اور ویلز	۶۴۹	ہسپانیہ	۱۰۷
نیدرلینڈ	۵۴۴	مصر	۳۴
جرمنی	۳۳۲	امریکہ متحدہ	۳۲
جاپان	۲۱۵	نیوزی لینڈ	۱۱.۸
آسٹریا	۱۹۹	(ہندوستان	۱۹۶)

سوال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں گنجانی کم کیوں ہے؟ بالعموم گنجانی کا دارومدار جغرافیائی حالات سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی ملک کی آب و ہوا پسندیدہ نہیں یا زمین زرخیز نہیں یا قدرتی وسائل ناممکن الحصول ہیں تو وہاں آبادی کم ہوگی۔ اور اگر قدرتی ذرائع کی فراوانی ہے اور ہر طرح سے آرام و آسائش میسر ہے تو وہاں آبادی قدرۃً زیادہ ہوگی۔ لیکن تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ جوں جوں سائنس اور علوم جدیدہ ترقی پا رہے ہیں، متذکرۃ الصدر حالات آبادی کے راستہ میں موانع نہیں رہے۔ سائمن کے الفاظ میں "قدرتی عناصر مثلاً آب رسانی۔ عرض بلد۔ زمین کی ساخت۔ بارش۔ درجۂ حرارت۔ زمین کی زرخیزی وغیرہ بلاشک و شبہ آبادی کی تقسیم اور گنجانی کا تعین کرنے میں اہم حصہ لیتے ہیں لیکن جوں جوں تہذیب و تمدن کی ترقی ہو رہی ہے ماحول کی تبدیلی کے لئے انسانی جد و جہد زیادہ اہمیت پکڑ رہا ہے ———

اصول معاشیات سائمن

بس ہمیں کسی ملک کی گنجانی یا عدم گنجانی کی وجوہات معلوم کرنے کے لئے نہ صرف جغرافیائی حالات کا مطالعہ کرنا ہوگا بلکہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ ملک اقتصادی ارتقار کے کس درجہ پر پہنچ چکا ہے۔ مثلاً اگر کوئی ملک چراگاہوں کے زمانہ میں ہے تو وہاں آبادی قدرۃً کم ہوگی کیونکہ یہ پیشہ کم آدمیوں کو اپنے اندر کھپانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ملک زرعی ہوگا تو وہاں دستکار ملک کی نسبت آبادی بھی کم ہوگی۔ سب سے زیادہ آبادی صنعت و تجارت کے مقامات میں سماتی ہے۔ مثلاً بلجیم یا انگلستان اور ویلز میں آبادی علی الترتیب ۶۵۴ اور ۶۴۹ فی میل ہے اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہاں صنعت و تجارت کافی فروغ پا رہی ہے اور یہ پیشہ کثیر التعداد لوگوں کو روزی مہیا کرنے کا اہل ہوتا ہے۔

اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ صرف صنعت و تجارت ہی کسی ملک کی گنجانی وغیرہ کا تعین کرتی ہے۔ بلکہ اکثر اوقات دیگر عناصر بھی اس کی مخالف سمت میں کارفرما ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً امریکہ متحدہ میں باوجودیکہ صنعت و تجارت کافی فروغ پا رہی ہے۔ لیکن وہاں کی فی میل گنجانی مصر سے بھی کم ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہاں کی اندرونی زمین زراعت کے لئے مفید ہے اس لئے وہاں آبادی فی میل کم ہے۔ لیکن ساحلوں پہ جو بندرگاہیں ہیں وہاں صنعت و تجارت بہت ترقی یافتہ ہے اس لئے وہاں آبادی بھی زیادہ ہے۔ لیکن مجموعی طور پر گنجانی فی میل کم بیٹھتی ہے۔ بس اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آبادی کی تقسیم بھی گنجانی کا تعین کرتی ہے اور آبادی کی تقسیم جغرافیائی حالات پر مبنی ہوتی ہے۔

ہندوستان چونکہ زیادہ تر زرعی ملک ہے اس لئے یہاں آبادی فی میل بھی کم ہے۔ اگر ہمارے یہاں صنعت و تجارت فروغ پا جائیں تو ہم موجودہ آبادی سے دوگنی آبادی کو اپنے اندر سما سکتے ہیں یا دوسرے

[۱] رپورٹ مردم شماری سنہ ۳۱ء صفحہ ۱۲-۵

الفاظ میں موجودہ آبادی کو روزگی اشیائے ضروریہ مہیا ہوسکتی ہیں۔

آبادی کی صوبجاتی تقسیم بھی غیر ہموار ہے جس کی وجہ نہ صرف جغرافیائی حالات ہیں بلکہ لوگوں کی گھریلو عادات بھی ہیں۔ چونکہ لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں تامل کرتے ہیں اس لئے ہر صوبہ میں گنجانی مختلف ہے۔ مثلاً برہما میں بہت کم ہے اور بنگال اور یو۔ پی میں بہت زیادہ ہے۔

ڈنمارک سنہ۱۹۱۱ء	۳۶٫۴	۲۷٫۳	۱۶٫۰
سوئٹزرلینڈ سنہ۱۹۱۰ء	۲۷٫۷	۴۲٫۷	۱۶٫۴
برطانیہ عظمےٰ سنہ۱۹۱۱ء (صرف مزدور)	۱۱۰٫۶	۵۶٫۸	۱۳٫۱
امریکہ متحدہ سنہ۱۹۲۰ء (صرف مزدور دس سال کی عمر سے اوپر)	۲۶٫۳	۳۳٫۴	۱۷٫۹
ہندوستان سنہ۱۹۲۱ء	۷۲٫۹	۱۰٫۶	۷٫۱

ہر چند کہ یہ اعداد وشمار تازہ نہیں ہیں۔ تاہم ان سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ہندوستان میں زیادہ تعداد زراعت پر انحصار رکھنے والے لوگوں کی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب قحط یا کوئی اور وبا آتی ہے تو بوجہ کسی دوسرے ذریعہ معاش کے نہ ہونے کے بیکاری اور بیماری سب سے زیادہ ہوجاتی ہے۔ چنانچہ فیمن کمیشن ۱۸۸۰ء لکھتا ہے کہ "ہندوستان کی غربت کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں اکثریت کا پیشہ زراعت ہے۔" اور اُس کو دور کرنے کے لئے اُس کی تجویز یہ ہے کہ صناعت اور دستکاری کو فروغ دیا جائے۔

محض زراعت پر انحصار رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری آبادی زیادہ تر دیہاتوں میں آباد ہے۔ اور شہری زندگی بقول کسے جوں کی چال ترقی کررہی ہے۔ چنانچہ سنہ۱۸۸۱ء اور سنہ۱۹۲۱ء کے درمیان شہری آبادی میں صرف ایک فی صدی اضافہ ہوا۔ ہمارے ملک میں کل ۶۸۵٬۲۶۰ یعنی قریباً سات لاکھ گاؤں ہیں اور صرف ۲٬۶۷۵ شہر۔ ان شہروں میں کل آبادی کا صرف دس فی صدی حصہ رہائش کرتا ہے۔ باقی تمام آبادی دیہاتوں اور چھوٹے چھوٹے گاؤں میں آباد ہے۔ اس کے مقابلہ میں انگلستان کی کل آبادی کا اٹھتر فی صدی حصہ شہروں میں آباد ہے۔ اسی طرح امریکہ متحدہ کا شہری حصہ باون[۵۲] فی صدی ہے۔ فرانس کا تینتالیس[۴۳] فیصدی۔

آبادی کی تقسیم بلحاظ پیشہ

اگر ہم بلحاظ پیشہ آبادی کی تقسیم کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے زراعت پر انحصار رکھنے والے لوگوں کی فیصدی دوسرے ممالک کے زراعت پر انحصار رکھنے والے لوگوں کی فیصدی سے کہیں زیادہ ہے۔ اور یہاں سب سے کم لوگ تجارت، صناعت اور ذرائع حمل ونقل وغیرہ پر انحصار رکھتے ہیں۔

برج نراین پروفیسر اقتصادیات نے اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل نقشہ[۱] پیش کیا ہے جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ہر ملک میں کل آبادی کی کتنی نسبت کون سے پیشہ پر انحصار رکھتی ہے۔

نام ملک اور سال مردم شماری	حیوانات اور سبزی سے فائدہ اٹھانے والے لوگ	کان کنی اور صنعت پر منحصر ہیں	تجارت پیشہ اور ذرائع حمل ونقل پر انحصار رکھنے والے
جرمنی سنہ۱۹۰۷ء	۲۸٫۶ *	۴۲٫۲	۱۳٫۴
آسٹریا سنہ۱۹۱۰ء	۴۸٫۴	۲۶٫۵	۱۲٫۴
اٹلی سنہ۱۹۱۱ء	۳۴٫۲	۱۶٫۹	۵٫۰
ہسپانیہ سنہ۱۹۱۰ء	۲۱٫۱	۵٫۲	۱٫۵
فرانس سنہ۱۹۱۱ء (صرف مزدور)	۴۰٫۷	۳۵٫۸	۹٫۸
ہالینڈ سنہ۱۹۰۹ء	۱۰٫۹	۱۳٫۵	۷٫۵

[۱] ہندوستان کی آبادی مصنفہ برج نراین صفحہ ۹۲۔

* اس د سے مراد اعشاریہ ہے۔

اور جرمنی کا چھیالیس فی صدی۔

بس ہندوستان میں دیہاتی طبقہ زیادہ ہے جو ہماری تعداد کی پستی پر دلالت کرتا ہے۔ ریڈ کے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری قوتیں زائل ہو رہی ہیں۔ ذہانت مفقود ہو رہی ہے اور خود اعتمادی کا جذبہ دور ہو رہا ہے۔ تہذیب و ترقی کا آغاز ہمیشہ شہروں سے ہوا ہے۔ اور اگر کسی ملک میں شہر کم ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہمیشہ قعر مذلت اور گمنامی و جہالت میں پڑے رہیں گے۔

آبادی کی موجودہ دیہی و شہری تقسیم صرف اس صورت میں تبدیل کی جاسکتی ہے کہ ملک میں صنعتیں اور دستکاریاں فروغ پائیں۔ اور لوگ شہروں میں آکر آباد ہوں۔

ہم ہندوستان میں لندن، نیویارک، بمبئی، کلکتہ جیسے پرہنگام شہر نہیں چاہتے بلکہ یہاں معمولی قصبوں کی ضرورت ہے جہاں لوگوں کو ضروریات زندگی میسر ہوں اور تہذیب و تمدن کی ترقی ہو سکے۔

(رفتارِ اموات)

ہندوستان میں رفتار اموات و رفتار پیدائش دونوں زیادہ ہیں۔ مثلاً اگر اول الذکر ۲۔۳۰ ہے فی ہزار ہے تو مؤخر الذکر ۵۔۳۸ فی ہزار ہے۔ یعنی دونوں میں فرق بہت کم ہے جو قومی انحطاط پر دلالت کرتا ہے۔ ماہرین معاشیات نے ایک آدرش آبادی کے لئے ۱۵ فی ہزار اور رفتار پیدائش ۵ء ۲۸ فی ہزار معیاری قرار دی ہے۔ لیکن ہندوستان میں رفتار پیدائش تو معیار سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ لیکن رفتار اموات اڑھائی گنا سے بھی زیادہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں انسانی زندگی کی قدر بہت کم ہے۔ رفتار پیدائش بھی زیادہ سے زیادہ کے نقطہ کے قریب قریب ہے۔ اس لئے چنداں مستحسن نہیں۔

اس رفتار فوتیدگی میں بچوں اور عورتوں کی اموات زیادہ شامل ہیں۔ چنانچہ ہمارے بچے ایک سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی راہی عدم ہو جاتے ہیں۔ شہروں میں بچوں کی فوتیدگی بالخصوص زیادہ ہے۔ مثلاً بمبئی میں ایک ہزار کے پیچھے ۵۵۶ بچے ہر سال فوت ہو جاتے ہیں۔ درآں حالیکہ لندن میں صرف ساٹھ فوت ہوتے ہیں۔

یورپ میں بھی کبھی بچوں کی فوتیدگی زیادہ ہوا کرتی تھی لیکن وہاں کے لوگوں نے طبی ضروریات مہیا کر کے اس کا قلع قمع کر دیا۔ مثلاً انگلستان اور ویلز میں ایک دفعہ ۱۵۶ بچے فی ہزار فوت ہوا کرتے تھے لیکن اب صرف ستر فی ہزار رہ گئے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اگر ہندوستان میں قبل ازیں ۲۱۴ بچے فی ہزار لقمۂ اجل ہوا کرتے تھے تو اب بھی ۲۰۱ سے کم نہیں ہوتے۔ اسی طرح لڑکیاں اگر پہلے ۱۹۶ مرا کرتی تھیں تو اب ۱۸۸ مرتی ہیں۔ گویا رفتار تنزل نہایت قلیل ہے۔

اس کی وجہ زیادہ تر تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں صغر سنی کی شادی کی رسم بہت زیادہ مروّج ہے۔ اس سے نہ صرف عورتیں جلد بوڑھی ہو کر مر جاتی ہیں بلکہ بچے بھی کمزور پیدا ہوتے ہیں جو خصوصاً طبی ضروریات کی عدم فراہمی کی وجہ سے جلد راہی عدم ہو جاتے ہیں۔ اگر کم از کم زچہ اور بچہ کی حفاظت کے سامان ہی ہمارے یہاں میسر ہوں تو شاید رفتار فوتیدگی کم ہو جائے۔

دوسری وجہ بچوں کی فوتیدگی کی یہ خیال کی جاتی ہے کہ مائیں اُن کو سلانے کے لئے افیون کا استعمال کرواتی ہیں حالانکہ یہ نہایت ہی ضرر رساں طریق ہے اور فی الفور بند کروانا چاہئے۔

تیسری وجہ کسی حد تک غربت بھی ہے جو ماں باپ کو بچوں کی نگہداشت پر کچھ خرچنے سے معذور رکھتی ہے۔ لیکن اس سے کہیں اہم وجہ یہ ہے کہ دیہاتیوں کو دولت کا صحیح مصرف نہیں آتا۔ وہ گھوڑیوں اور بھینسوں کی نگہداشت زیادہ توجہ سے کریں گے بہ نسبت ایک بچے یا عزیز کے۔ اسی طرح وہ مقدمہ بازی اور فضول جھگڑوں میں زیادہ روپیہ خرچ کر دیں گے بہ نسبت اس کے کہ یہی روپیہ کسی عمدہ دائی یا نرس پر خرچ کریں۔

یہ جہالت صرف علم سے دور ہو سکتی ہے۔ اُن کو بتایا جائے کہ انسانی زندگی حیوانی زندگی سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔

(عورتوں کی کمی)

ایک ہزار مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی نسبت ہر عمر میں مندرجہ ذیل ہے :-

۵ - ۱۵	۱۵ - ۲۵	۲۰ - ۳۰	۳۰ - ۴۰	۴۰ - ۵۰	۵۰ - ۶۰	۶۰ سے اوپر
۹۹۸	۸۶۹	۱۰۲۲	۹۰۵	۹۰۳	۹۲۶	۱۰۴۹

یہ نقشہ جہاں اندوہناک منظر دکھاتا ہے وہاں بغایت درجہ دلچسپ بھی ہے۔

دس سال کی عمر تک لڑکیوں کی تعداد ایک ہزار لڑکوں کے مقابلہ میں ۹۹۸ ہے۔ دوسرے معنوں میں یہاں لڑکیاں کم پیدا ہوتی ہیں۔ یا دس سال کی عمر سے پہلے پہلے مر کر کم رہ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہندوستان میں لڑکیوں کی پیدائش مذموم خیال کی جاتی ہے اور اُن کی لڑکوں کی طرح غور و پرداخت نہیں کی جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تعداد میں کم رہ جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک سے ابھی وہ عربوں یا راجپوتوں والی دختر کُشی کی رسم دور نہیں ہوئی۔ قانوناً تو اگرچہ بند کر دی گئی ہے۔ لیکن عملاً جاری ہے۔ وہ اس طرح پر کہ لڑکیوں کی خاطر خواہ حفاظت نہیں کی جاتی۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ لڑکیوں پر بالعموم خرچ زیادہ ہوتا ہے اس لئے لوگ اُن کی پیدائش کو بوجہ غربت کے اچھا نہ سمجھتے ہوں۔

دس سے بیس سال کی عمر میں لڑکیاں اور بھی کم ہو کر صرف ۸۶۹ رہ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اس عمر میں بالعموم شادیاں کر دی جاتی ہیں جو کمزور لڑکیوں کے راس نہیں آتیں۔ کیونکہ وہ ابھی بالغ ہو کر مضبوط نہیں ہوتیں۔ دوسرے دایہ گری کا تسلی بخش طریقہ مروّج نہ ہونے سے اکثر اموات زچہ گان کی ہوتی ہیں۔ چنانچہ سپرنٹنڈنٹ مردم شماری بابت ۱۹۰۱ء لکھتا ہے کہ "اکثر زچہ گان شادی کے بستر سے جنازہ کی چارپائی پر چلی جاتی ہیں۔ کمزوری۔ تپ دق۔ رحم کی بیماریاں یہ سب اُن پر ہولناک طریق سے اثر انداز ہوتی ہیں"۔

بیس سے تیس برس کی عمر میں عورتوں کی تعداد مردوں سے بقدر ۲۲ کے بڑھ جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مضبوط عورتیں بچہ پروری کی عمر سے بچکر نکل آتی ہیں وہ پھر اس عمر تک زندہ رہتی ہیں۔ دوسری طرف مرد بوجہ کثرت کار وغیرہ مرنا شروع ہو جاتے ہیں اور اُن کی عمر کم ہو جاتی ہے۔

تیس سے پچاس برس کی عمر میں عورتوں کی تعداد پھر کم ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اس عمر میں پردہ کا اثر ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے اور جو عورتیں شروع سے گھروں کی چار دیواری میں مقید رہ کر تپ دق وغیرہ کا شکار ہو رہی ہوتی ہیں اُن کی موتیں واقع ہو جاتی ہیں۔ پھر اس عمر میں اکثر کہا جاتا ہے کہ بعض عورتوں کے ہاں جُڑواں بچے پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں یہ بھی صحت پر مزید بوجھ ڈالتے ہیں۔

پچاس سال کی عمر کے بعد عورتوں کی تعداد کچھ بڑھ جاتی ہے اگرچہ مردوں سے کم ہی رہتی ہے۔ کیونکہ اس عمر میں جو مرد پہلے محفوظ رہے وہ اب مرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ "جو عورت ساٹھ برس سے تجاوز کر جائے وہ پھر کبھی نہیں مرتی"۔ اپنے اپنے گھروں کا جائزہ لے لیجئے اکثر بڑھیاں اسی نوّے سال تک زندہ ہی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں۔ یہ زمانہ بچہ پروری کا نہیں ہوتا اور دیگر تفکرات اس قدر جان لیوا نہیں ہوتے لہذا وہ زندہ رہتی ہیں۔

پس ہم نے دیکھا کہ عورتوں کی تعداد بالعموم کم رہتی ہے اور اسکی وجہ زیادہ تر چھوٹی عمر میں ماں بن جانا ہے۔

عورتوں کی کمی سے جو نقصان ہوتے ہیں وہ اہل نظر خود سمجھ سکتے ہیں۔ مختصر طور پر یہ کہ ایک ماہر علم المعاشرت کے [illegible] کی نشانی ہے کیونکہ جس قوم میں عورتیں [illegible] خطرہ میں ہے۔ دوسرے بردہ فروشی کی قبیح رسم [illegible]

قحبہ خانے اور بدمعاشی کے اڈے بن جاتے ہیں۔ خصوصاً شہروں میں جہاں عورتوں کی تعداد دیہاتوں سے بھی کم ہے۔[1]

اس کے علاج ممکن ہیں:۔

۱۔ لڑکیوں کی پیدایش کے متعلق مذموم خیال لوگوں کے دلوں سے نکالا جائے۔

۲۔ دیہاتوں میں حفظان صحت اور دایہ گری کے اصول مروج کئے جائیں۔

۳۔ فی الحال کثرت ازدواج ملتوی کی جائے تاکہ توازن پیدا ہو۔

(ہندوستانیوں کی اوسط عمر)

ہمارے یہاں تمام ملکوں سے زیادہ بچوں کی پیدایش ہوتی ہے لیکن وہ دس برس کی عمر سے قبل ہی لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں۔ جسے کہ یہاں ساٹھ برس کی عمر کے بعد بہت کم لوگ زندہ رہتے ہیں۔

مندرجۂ ذیل نقشہ[2] میں ہندوستانیوں کی تعداد کا موازنہ مختلف عمروں میں دیگر ممالک سے کیا گیا ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہمارے کتنے لوگ ایک ہزار میں سے کس عمر میں مر جاتے ہیں۔

عمر	جرمنی	فرانس	انگلستان اور ویلز	امریکہ متحدہ	جاپان	برطانوی ہند	
	۱۹۱۰	۱۹۱۱	۱۹۱۱	۱۹۱۰	۱۹۱۳	۱۹۱۱	۱۹۲۱
۱۰ سے کم	۲۳۴	۱۸۱	۲۰۹	۲۲۲	۲۴۴	۲۷۶	۲۷۴
۱۰ — ۲۰	۲۰۳	۱۶۶	۱۹۰	۱۹۸	۱۹۸	۱۹۲	۱۹۸
۲۰ — ۳۰	۱۶۴	۱۵۸	۱۷۳	۱۸۷	۱۵۴	۱۷۸	۱۷۰
۳۰ — ۴۰	۱۳۹	۱۴۸	۱۵۲	۱۴۶	۱۳۸	۱۴۲	۱۴۳
۴۰ — ۵۰	۱۰۵	۱۲۷	۱۱۵	۱۰۶	۱۰۱	۹۹	۹۴
۵۰ — ۶۰	۷۶	۱۰۴	۸۰	۷۲	۷۷	۶۱	۶۱
۶۰ — ۷۰	۵۱	۷۷	۵۱	۴۳	۵۷	۳۶	۳۶
۷۰ سے اوپر	۲۳	۴۹	۳۰	۲۶	۳۱	۱۶	۱۷

گویا جو ۴۰۰ بچے ہندوستان میں پیدا ہوتے ہیں وہ ستر برس کی عمر تک صرف ۱۷ رہ جاتے ہیں۔

یورپ میں کام کرنے کی عمر ۱۵ سے ۶۰ بلکہ ۶۵ برس تک سمجھی جاتی ہے لیکن ہندوستان میں یہ بمشکل ۱۵ سے ۴۰ سال تک ہے کیونکہ لوگ جلد مر جاتے ہیں۔ ہماری اوسط عمر صرف ۲۳/۴۴ سال ہوتی ہے۔ دیگر ممالک کی ۶۰/۶۵ سال یعنی اڑھائی گنا۔ بس عاملین کے لحاظ سے ہماری طاقت بہت کمزور ہے۔ اس سلسلہ میں اگر حفظان صحت اور طبی ضروریات مہیا کرنے کے لئے کوئی قدم لیا جائے تو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔

(زائد از ضرورت آبادی)

ہندوستان میں اس لحاظ سے زائد از ضرورت آبادی ہے کہ یہاں کا سامان رسد لوگوں پر مساوی طور سے تقسیم نہیں ہے مثلاً ۱۹۲۵ء میں پروفیسر جبریح زایبن نے اندازہ لگایا تھا کہ ہندوستان میں کل خوراک آٹھ کروڑ پچاس لاکھ ٹن پیدا ہوتی ہے جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

گیہوں وغیرہ چار کروڑ پچاس لاکھ ٹن۔ باجرہ اور جوار وغیرہ دو کروڑ ٹن۔ دیگر غلہ جات دو کروڑ ٹن۔ اگر اس میں سے بیج اور چارہ وغیرہ کا خرچ نیز تضیع Wastage نکال دی جائے تو بقیہ غلہ پینتیس کروڑ آدمیوں کے لئے کافی ہے۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ غلہ مساوی طور پر لوگوں میں تقسیم نہیں ہوتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں قوت خرید نہیں ہے۔

---

[1] کلکتہ میں ہزار مردوں کے مقابلہ پر عورتیں صرف ۵۰۰ ہیں اور بمبئی میں ۵۲۴ (بمطابق مردم شماری ۱۹۲۱ء) قحبہ خانے، بیسوا منڈیاں اور جا بجا ڈیرے بازار تو خود بخود بننے ہوئے۔

[2] جتھار اینڈ بیری معاشیات ہند جلد اول صفحہ ۵۰۔

قوت خرید کئی طریق سے بڑھائی جا سکتی ہے۔ مثلاً صنعت و زراعت کو فروغ دیا جائے تاکہ زمینداروں اور صناعین کو منافع ہو۔

شرح تبادلہ بجائے ایک شلنگ چھ پینس کے ایک شلنگ چار پینس مقرر کی جائے۔ ملک میں رفاہ عام کے کام شروع کئے جائیں وغیرہ۔

الغرض جب تک ملک میں روس کی طرح اقتصادی پروگرام نہ شروع کیا جائے۔ قوتِ خرید نہیں بڑھ سکتی۔

دنیا پہ عجب سی ہے حیرانی بھی
بجلی سی پڑی ہے اب ویرانی بھی
صہبائے مصفا کو کہاں اے ماہر
ملتا نہیں بکھرا ہوا اب پانی بھی

ماہر اکبرآبادی

فطرت کا جو پہلے تھا طریقہ ہے وہی
ہیئت کوہ و دشت و دریا ہے وہی
دنیا والے بدل گئے ہیں ماہر
لیکن جو تھی ابتدائے دنیا ہے وہی

ماہر اکبرآبادی

دعوائے قوّتِ تخلیق

ہر نظم میں اپنی رنگِ داستاں پیدا کروں
یعنی سب سے اک جدا طرزِ بیاں پیدا کروں

گلشنِ صد جلوہ بھی جل جائے جس کی آگ سے
خرمنِ دل سے وہ اک برقِ تپاں پیدا کروں

جو حجاب و جلوہ کو دوری سے ہٹا دے دید تک
میں حریمِ ناز کا وہ پاسباں پیدا کروں

غرق کردوں کائناتِ ہر غرور و ناز کو
آنسوؤں سے اک محیطِ بیکراں پیدا کروں

آفتابِ حسن کی بھی دسترس جس تک نہ ہو
اپنے دودِ آہ سے وہ آسماں پیدا کروں

جس کے اک ذرّے میں آجائے سمٹ کر کائنات
ہر نظر سے اپنی وہ تازہ جہاں پیدا کروں

جو شعاعِ مہر کو بھی تابِ گل آنے نہ دے
گلشنِ امید کا وہ باغباں پیدا کروں

بجلیاں بھی کانپ اُٹھیں جسکی رفعت دیکھکر
بال و پر سے اپنے ایسا آشیاں پیدا کروں

گوشے گوشے کو مکانِ دل کے بخشوں وسعتیں
یعنی تدبیرِ شکستِ لامکاں پیدا کروں

حسرت و ارمان و شوق و یاس و حرماں جاگ اُٹھیں
سانس کی بانگِ درا سے کارواں پیدا کروں

دوں فریبِ وعدہ پھر قلبِ حزیں کو خسروی
یعنی اُس کی دو نہیں سے ایک ہاں پیدا کروں

خسروی جے پوری

راکھی

شوق فریدآبادی

وہ شام کتنی سنوہر تھی، جب میں اور مرلی بلاسپور کے باغیچے میں سائیکل چلایا کرتے تھے، اور مرلی کی چھوٹی بہن جو اس وقت صرف تین برس کی تھی، ہری ہری گھاس کے فرش پر ادھر ادھر دوڑا کرتی تھی۔ کبھی میں اسے اپنی سائیکل کے پیچھے کھڑا کر لیتا تھا۔ اور کبھی مرلی۔ چندرماں کی ٹھنڈی چاندنی میں ہم لوگ آنکھ مچولی کھیلتے۔ اس کھیل میں کتنا آنند آتا تھا، ہم مست ہو جاتے تھے، ہم کو یہ پتا بھی نہ لگتا تھا کہ کتنی رات بیت چکی ہے۔ ماں گھر میں کھانا لئے بیٹھی ہوں گی بابوجی پڑھانے کے لئے ہم لوگوں کی راہ دیکھ رہے ہوں گے، ان کھیلوں کے لئے ہم کتنی دفعہ پٹ چکے ہیں، لیکن اس پیٹے جانے میں بھی کتنا آنند تھا۔ آج مار پڑتی، لیکن کل پھر اسی وقت اسی باغیچے میں ان ہی لڑکوں کے ساتھ پھر اسی طرح کھیلتے دکھائی دیتے تھے۔

وہ صبح کتنی سہانی تھی، شفق کی لالی میں کتنی سندرتا تھی۔ جب ہم نیم کی ڈالی پر جھولا ڈال کر مالتی کو جھولایا کرتے تھے، جب مالتی کچھ بڑی ہو گئی تب وہ اپنے سے بڑی لڑکیوں سے سیکھے ہوئے گیت کی ایک کڑی کو زور زور سے اس جھولے پہ گایا کرتی۔

"جھولا پڑا کدم کی ڈالی جھولیں رادھا پیاری نا"

وہ بھولی بھالی لڑکی اس کڑی کو زور زور سے گاتی۔ اس کا مطلب نہ اسے معلوم تھا اور نہ ہم لوگوں کو، اس کے معنی سمجھنے کی کبھی ضرورت بھی پیش نہیں آئی بعض دفعہ ہم اسے بہت لانبے پینگ دیتے، وہ خوف سے آنکھیں بند کر لیتی، کبھی رونے لگتی۔ اور ہم جھولے کو اسی جگہ ٹھہرا لیتے تھے۔

میں اور مرلی ایک ہی سکول۔ ایک ہی درجے میں ایک ہی بنچ پر بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز ایک گھنٹہ خالی تھا۔ کوئی استاد نہیں آیا لڑکے غپ شپ اڑا رہے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان بھی بحث چھڑ گئی، مرلی کہتا۔" وکالت، ججی، بیرسٹری یہ سب کام اچھے ہیں۔ موٹر سیر کرنے کو اور شان دار بنگلہ رہنے کو ملتا ہے۔ رعب داب رہتا ہے۔ میں کہتا یہ سب بھگوان کی مایا ہے۔ اس کی ہی پوجا کرنی چاہیئے، وہ جو چاہے کر دیں۔ ان کی پوجا ہی سب سے اچھا کام ہے۔ بڑے بڑے جج۔ کلکٹر، سادھوؤں کے قدموں پر ماتھے رگڑتے ہیں۔ سادھو جو چاہیں کر دیں۔ تم نے دیکھا نہیں مہنت باباکے پاس کتنے بڑے آدمی آتے ہیں۔ اور سب ان کے پیروں پر پڑتے ہیں۔ اس دن سے میری اور مرلی کی روز اس موضوع پر بحث ہوتی رہتی۔ اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ مرلی نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں تو وکیل۔ بیرسٹر۔ یا جج بنوں گا۔ میں کہا کرتا، میں سادھو ہو جاؤں گا مہنت بنوں گا۔ اس جھگڑے کا فیصلہ مالتی کیا کرتی۔ اور مجھ سے کہا کرتی ہاں بھیا تم مہنت بننا اور مجھ کو پرشاد دیا کرنا، میں خوش ہو جاتا، اور کہتا ہاں جتنا پرشاد مانگوگی اتنا ہی پرشاد دوں گا، کبھی وہ مرلی کو ناراض ہوتا

ہوتا ہوا دیکھکر اس سے کہتی، "بھیا تم موٹر خرید نا اور اس پر ہمیں بٹھا کر گھمانے ضرور لے چلنا"۔ تھوڑی دیر میں وہ جھگڑا خود بخود ختم ہو جاتا۔ اور ہم لوگ کسی دوسرے کھیل میں لگ جاتے، اس بات کا فیصلہ کبھی نہ ہو سکا کہ مالتی درحقیقت کس امر کو ٹھیک سمجھتی تھی۔

راکھی کا دن تھا، مالتی نے مجھ سے کہا، "بھیا آؤ راکھی باندھ دوں" میں نے کہا، "میں دھاگا واگا نہیں بندھواتا"۔ اس نے کہا، "نہیں بھیا مرلی بھیا کے میں نے بیلی راکھی باندھی ہے۔ تمہارے لئے لال رکھ چھوڑی ہے۔ بندھوالو بڑی اچھی معلوم ہو گی"۔ میں نے کہا۔ "میں نہیں بندھواتا لال ہو یا پیلی"۔

اس کا من اداس ہو گیا۔ اس نے پھر کہا۔ "بندھوا ... ا ... لو ... و ... و"۔ میں نے راکھی بندھوالی۔

غرض اسی کھیل کود میں، میں نے اور مرلی نے ایک ہی ساتھ ایک ہی ڈویژن میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد میرے والد کا جبل پور تبادلہ ہو گیا، مجھے بھی جانا پڑا۔

(۲)

میں جبل پور کالج میں داخل ہو گیا۔ دل بڑا اداس رہتا تھا۔ یہاں نہ تو مرلی سا بھائی تھا۔ اور نہ مالتی سی بہن۔ میں سائیکل پر کالج جاتا اور چھٹی ہونے پر فوراً پلٹ آتا، کالج کے تمام طلبا اپنی اپنی شان میں مست رہتے۔ میں بھی کسی سے کم شان نہیں رکھتا تھا۔ بہت دنوں تک تو میں نے کالج کے لڑکوں سے دوستی تو کیا بات تک بھی نہیں کی، اس سے قبل مرلی سے خط و کتابت کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اب جو چٹھیاں آنی جانی شروع ہوئیں تو ہمیں اس میں ایک رس محسوس ہوا، معلوم نہیں چٹھیوں میں ہم کیا کیا لکھتے تھے۔ اب جب وہ باتیں یاد آجاتی ہیں تو ہنسی آتی ہے کبھی کبھی مرلی کے خط میں مالتی بھی ایک آدھ پرزا لکھ کر رکھ دیتی تھی۔ اس میں لکھا ہوتا۔

"بھیا پرنام، آپ کی بہن مالتی"۔

اس کے انہیں دو لفظوں میں اس کا پریم چھپا رہتا تھا۔ مرلی بھی انجینیرنگ سیکھنے کے لئے رڑکی بھیج دیا گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے تھے، اس وجہ سے مرلی سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔

کالج کا رنگ میرے اوپر بھی چڑھنے لگا تھا۔ بہت سے لڑکوں سے دوستی بھی ہو گئی تھی۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتا۔ اس دوستی میں وہی آنند وہی مادھوری۔ وہی بھولا پن تھا یا نہیں۔ جو مرلی کی دوستی میں تھا میری جماعت میں کئی لڑکیاں ساتھ ہی پڑھا کرتی تھیں۔ وہ میرے مکان پر آتیں۔ میں ان کے مکان پر جاتا لیکن مجھے اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میری ان کی دوستی میں وہی سادگی، وہی پاکیزگی، وہی بھائی بہن کی سی محبت تھی یا نہیں جو مجھ میں اور مالتی میں تھی۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ آگے چل کر میری شادی انہیں لڑکیوں میں سے ایک کے ساتھ ہو گئی ارادے کے بغیر میرے اور مرلی کے درمیان آہستہ آہستہ خط و کتابت بھی بند ہو گئی، میں بھی اسے بھول گیا۔ اور شاید وہ بھی مجھے۔ معلوم نہیں مالتی کو بھی میری یاد رہی یا نہیں، کبھی کبھی مجھے ان دونوں کی یاد آتی۔ چٹھی لکھنے بیٹھتا، کبھی بیوی کے آجانے سے، کبھی کسی دوست کے آجانے سے اور کبھی کوئی کام نکل آنے کی وجہ سے چٹھی نہ لکھ سکتا، اور پھر دوسرے روز بھی نہ لکھ سکتا، آہستہ آہستہ ہم دونوں کے تعلقات ختم ہو گئے۔

(۳)

میں نے کالج سے ایم۔ اے پاس کیا، قانون بھی پڑھا۔ سرکاری نوکری بھی مل گئی۔ میرے والد کا سرکاری حلقوں میں کافی اثر تھا میں جج بھی بنا دیا گیا۔ اور ناگپور میں مجسٹریٹ درجہ اول مقرر کر دیا گیا، میں شاندار بنگلے میں رہتا تھا۔ صبح سے لے کر شام تک سرکاری اہلکاروں اور بڑے بڑے افسروں کے درمیان وقت گزرتا، انہیں کے ساتھ ٹینس کھیلتا۔ کلب میں جاتا۔ پارٹیوں میں مزے اڑاتا تھا۔ میری بیوی بھی اہلکاروں کی بیویوں کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی اور دل بہلایا کرتی تھی۔ اس طرح میرا جیون بڑے آنند سے بیتا جا رہا تھا۔ آمدنی بھی خوب تھی۔ میری بیوی صرف خوبصورت ہی نہیں تھی۔ سوشیل بھی تھی۔ موسیقی میں ماہر میرے پاس موٹر بھی تھی۔ نوکر بھی تھے، جدھر جاتا، ادھر ہی سڑک پر لوگ مجھے جھک جھک کر سلام کیا کرتے، میں ہر وقت ہیٹ۔ ٹائی اور بوٹ

۔۔۔ ے نیاتی چوبند رہتا۔ ایسی فضا میں مجھے اپنے بچپن کے دوستوں کی یاد کبھی آتی۔ کچہری میں مختلف قسم کے مقدمے پیش ہوتے۔ ان کا فیصلہ جیسا کچھ سمجھ میں آتا کر دیا کرتا تھا۔ میں نے کبھی رشوت نہیں لی۔ خوشامد کی وجہ سے کبھی فیصلہ اپنی مرضی کے خلاف نہیں لکھا۔ انھیں وجوہ سے میری شہرت بہت جلد چاروں طرف پھیل گئی۔ مجھے یاد نہیں میں نے کتنوں کو جیل بھیجا، کتنوں پر جرمانے کئے، اور کتنوں کو کیا کیا سزائیں دیں۔

ایک روز حسب معمول میں اپنی اونچی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، میرے سامنے ایک مقدمہ آیا۔ اس مقدمے میں ملزم تھا۔ ایک کھدرپوش نوجوان نوجوان کا نام تھا، مرلی منوہر پرشاد۔ اور اس پر الزام تھا، بادشاہ وقت کے خلاف بغاوت پھیلانے کا۔

ملزم میرے سامنے پیش کیا گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اور اس نے میری طرف۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ ہماری آنکھیں صرف ایک لمحے کے لئے ملیں۔ اسی ایک لمحے میں زمانۂ گذشتہ کے تمام واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ اگر دوسرا وقت ہوتا تو ہم ایک دوسرے کی گود میں ہوتے، اور گلے ملتے۔ ہماری دنیا اس دنیا سے علیحدہ ہوتی لیکن وہ کچہری تھی۔ میں تھا بادشاہ کا نمائندہ۔ وہ ایک معمولی آدمی۔ میں مجسٹریٹ وہ ملزم۔ دل کے تڑپتے ہوئے جذبات پر اوس سی پڑ گئی، ہم دونوں نے اپنی اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔ یہ حالت ایک سیکنڈ تک رہی، اور اس ایک سیکنڈ میں ہمارے اندر معلوم نہیں کیا کیا جذبات ابھرے۔ اور پھر غائب ہو گئے۔ اس کے بعد میں سنبھلا۔ اور مجھ میں وہی رعب، داب، وہی تیکھی نگاہ، دل کی وہی حالت ہو گئی۔ جو اس کرسی پر بیٹھنے والے کی ہو سکتی ہے۔

مقدمہ طویل تھا۔ ملزم حوالات میں بھیج دیا گیا۔ اس کی پیشی پھر دوسرے دن ہونے والی تھی۔ اس مقدمے پر لوگوں کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ جس وقت سے یہ مقدمہ شروع ہوا، عدالت کے کمرے میں لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ جب وہ کچہری میں آتا تو یہ معلوم ہوتا کہ سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء کی کانگریس کی کوئی سبھا ہو رہی ہے۔ جے جے کے نعرے لگتے، اور پھر مقدمے کی کارروائی شروع ہو جاتی۔ اس مقدمے میں کئی ملزم تھے، اور پولیس سپرنٹنڈنٹ مقدمے کی کارروائی خود کر رہے تھے۔ وہ میرے دوست بھی تھے۔ اور اس مقدمے کے بارے میں کبھی کبھی صلاح و مشورہ بھی دیا کرتے تھے۔ جب سے یہ مقدمہ میرے اجلاس میں آیا تھا۔ وہ اکثر میرے گھر پر بھی چکر لگایا کرتے تھے۔ ان دنوں میری ان کی دوستی اور زیادہ گہری ہوتی جاتی تھی۔

(۴)

ان ایام میں ناگپور کے اندر ملزمان کے رشتہ داروں کا جمگھٹ سا لگا رہتا تھا۔ وہ ملزمان سے ملنے کے لئے میری عدالت میں درخواست گزارتے۔ ان درخواستوں پر غور کر کے میں ہی احکام صادر کیا کرتا تھا اور ان کو منظور یا نامنظور کرنا میرا ہی کام تھا۔ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے مشورے سے ان پر احکام جاری کیا کرتا تھا۔ اس قسم کی تمام درخواستیں منظور ہی کر لی جاتی تھیں۔ ایک روز مرلی منوہر سے ملنے کے لئے ایک خاتون کی درخواست آئی۔ وہ بھی میرے سامنے پیش کی گئی، خاتون نے عرضی میں تحریر کیا تھا کہ وہ ملزم کی بہن ہے اور اس کا نام تھا، شریمتی مالتی دیوی۔ اور درخواستوں کی طرح اس پر بھی غور کیا گیا، اور اس کو اپنے بھائی سے ملنے کی اجازت مل گئی،

اسی روز سے میں فکر میں مبتلا سا رہنے لگا۔ یہ فکر کیوں لاحق ہوئی، یہ بھی میں نہیں جانتا تھا لیکن جب میں تنہائی میں ہوتا۔ مجھے مرلی منوہر کا نام یاد آ جاتا۔ مالتی کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی میرے خانۂ دماغ میں یہ یاد برسوں سے کسی کونے میں سوئی پڑی تھی۔ اب پھر بیدار ہو گئی۔ میرے دماغ میں ایک ہیجان سا ہو جاتا۔ اور سختی اور نرمی سے مملو جذبات کھیلا اٹھتے تھے۔

ایک روز پھر اسی خاتون نے اپنے بھائی سے ملنے کے لئے درخواست دی۔ اس دفعہ نہ معلوم کیوں پولیس سپرنٹنڈنٹ نے کہا، اس عورت کا مرلی منوہر سے ملنا ٹھیک نہیں ہے، میں نے سبب پوچھا تو اس نے چپکے سے میرے کان میں کچھ کہہ دیا۔ میں نے درخواست نامنظور کر دی۔ اس کے وکیل نے وجہ دریافت کی، میں نے کچھ نہ کچھ جواب دے دیا۔ اس کے آگے بولنے کی پھر کسی کو ہمت نہ ہوئی۔

ایک دن صبح میں چائے پی رہا تھا۔ اور اس مقدمے پر ایڈیٹروں کے تبصرے دیکھ رہا تھا کہ چپراسی نے میرے ہاتھ میں لاکر ایک پرزہ دیا۔ اس پر کسی خاتون کے دستخط تھے۔ ... مالتی دیوی۔ چپراسی نے کہا وہ باہر کھڑی ہیں۔ میں نے کہا اسے بیٹھک میں لاکر بیٹھاؤ۔ اس کے بعد میرا دل کسی نامعلوم وجہ سے یکایک دھڑکنے لگا۔ دل میں برسوں پہلے کے واقعات اس طرح جاگ اٹھے جیسے کل ہی ظہور پذیر ہوئے ہوں۔ خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مجھے یقین نہ ہوتا تھا کہ میں آج بچپن کی اس بھولی بھالی مالتی کو پھر دیکھوں گا۔ جو اپنے حصے کی مٹھائی کھلانے کے لئے مچل جاتی تھی۔ میرے لڈو کا بچا ہوا حصہ کھانے کے لئے روتی اور دھول میں لوٹنے لگتی تھی۔ بچپن کے زمانے کے مالتی کے واقعات ایک ایک کرکے میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میرے دل میں جو چوروں۔ ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کی کہانیاں سنتے سنتے سخت ہوگیا تھا نرم جذبات کی ملائم لہر بہتی ہوئی معلوم ہونے لگی مجھے معلوم نہیں کہ مالتی سے علیحدہ ہونے کے بعد میرے دل کی کبھی ایسی حالت ہوئی تھی یا نہیں۔ مجھے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ اور اتنی محبت تھی جتنا ایک رنگیلا جوان اپنی حسب خواہش بیوی حاصل کرنے پر محبت کرسکتا ہے۔ لیکن اس محبت اور آج کے جذبات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ فرق کیا تھا۔ میں محسوس کرتا ہوں۔ مگر بیان نہیں ہوسکتا۔

میں اس کمرے میں گیا۔ جہاں مالتی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ میرے استقبال کو اٹھی۔ میرے اندر ایک بجلی سی کوند گئی، مجھے یاد نہیں، میں نے اس کے سلام کا کچھ جواب بھی دیا۔ کہ نہیں۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی نیچے بیٹھ گئی۔ پھر ایک بار میں نے مالتی کو گہری نظر سے دیکھا۔ اب وہ بچہ نہیں نوجوان لڑکی تھی۔ اس میں صرف بھولاپن ہی نہیں تھا۔ بلکہ شرم بھی تھی کھدر کی نیلی ساڑھی کے اندر سے اس کا گورا چٹا جسم اس طرح چمک رہا تھا جیسے نیلے آکاش میں چندرماں۔ اس کے چہرے پر پاؤڈر نہیں تھا لیکن ایک قدرتی چمک تھی، ایک جلال تھا۔ اس کے جسم پر زیور ایک بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کے اعضاء پر ایسی صنو تھی جس کی چمک کے سامنے سونے چاندی کے زیور ہیچ معلوم ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھ پر سکتے کا عالم طاری ہوگیا۔ وہ شاید مجھے اس صورت میں دیکھکر پہچان نہ سکی جس وقت میں اس سے الگ ہوا تھا وہ صرف دس برس کی تھی۔ میں نے بالکل اس طرح جیسے کوئی اجنبی سے بات کرتا ہے۔ دریافت کیا "کہئے آپ کس کام سے آئی ہیں؟" اس نے کہا "میں مرلی منوہر کی بہن ہوں۔ کل "ترکشا بندھن" ہے اس لئے میں ان سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ میں بھائی کے راکھی باندھونگی کچھ مٹھائی کھلاؤں گی اور پھر فوراً واپس آجاؤں گی۔ آپ نے میری درخواست نامنظور کردی اس لئے میں آپ سے کہنے آئی ہوں کہ میں پھر درخواست دوں گی۔ مہربانی کرکے اس دفعہ نامنظور نہ کردیجئے، یہ کہتے کہتے اس کا گلا روندھ گیا۔ جس وقت وہ بول رہی تھی اس کی آنکھیں نیچی تھیں۔ ان میں رحم اور شرم کا ملا ہوا جذبہ موجیں ماررہا تھا۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ صرف اتنا کہا کہ کچہری میں درخواست آنے پر غور کروں گا۔ جس وقت میں یہ جواب دے رہا تھا۔ میرے دل میں ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ وہی مالتی جو میرے اور مرلی کے درمیان فیصلہ کراتی تھی۔ آج میرے پاس اپنے معاملے کا فیصلہ کرانے آئی تھی۔ اس کی گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چار پانچ برس کی کوئی لڑکی کسی پنڈت سے پرشاد مانگ رہی ہے۔ کئی برس پہلے میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ بہت سا پرشاد دوں گا۔ آج وہ وہی پرشاد مانگنے آئی تھی۔ جو میری عدالت میں دیا جا سکتا تھا۔ مجھے دینا دل سے کھلے ہاتھوں دینا چاہیئے تھا۔ لیکن اس وقت میں اسے نہ دے سکا۔ کیونکہ اس کا بھائی پولیٹیکل قیدی تھا۔ اور اس کے معاملے کی پیروی ایک اپولیس سپرنٹنڈنٹ خود کررہا تھا۔ میرے جواب سے اسے کچھ نا امیدی سی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں رحم اور شرم کے ساتھ ساتھ رنج کے نشان بھی ظاہر ہوئے۔ لیکن وہ جلد ہی مٹ گئے، وہ سوالی سی صورت بنا کر بولی "میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں، اس بار نامنظور نہ کیجئے گا۔ کل راکھی ہے" یہ کہکر وہ میرے پاؤں پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھایا۔ مالا سے پانی منگا کر منہ دھونے کو کہا۔ کچھ کھانے پینے کے لئے منگایا۔ لیکن اس نے انکار کردیا اور مجھے نمسکار کرکے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میرے

من پر ایک بوجھ سا پڑنے لگا۔

جب سے یہ مقدمہ میری عدالت میں چل رہا تھا، پولیس سپرنٹنڈنٹ دوسرے تیسرے دن میرے گھر آیا کرتا تھا۔ اس روز میں ہی ان کے مکان پر گیا۔ وہ گھر پر ہی تھے۔ میں نے ان سے مالتی کی درخواست کے متعلق ذکر کیا۔ اور یہ بھی کہا وہ میرے مکان پر آئی تھی۔ لیکن پولیس سپرنٹنڈنٹ نے کہا، مرلی اپنے گروہ کا سردار ہے اس قسم کی ملاقاتوں سے اخبارات کو شور مچانے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس کی بہن پڑھی لکھی ہے۔ تعلیم یافتہ ہے، مالکی دالکی تو محض ایک ڈھونگ ہے، اخبارات کے غل مچانے سے مقدمے پر برا اثر پڑتا ہے۔ میرے خیال میں تو اسے اجازت نہ دینا ہی دور اندیشی ہے۔

اس کے بعد میں تھوڑی ہی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر واپس چلا آیا۔ میں نے اب تک پولیس سپرنٹنڈنٹ کی مرضی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ لیکن آج میرا من اس کی صلاح نہ ماننے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ایک طرف ناری کا بھیک مانگنا اور دوسری طرف پولیس سپرنٹنڈنٹ کا مشورہ کی صورت میں حکم، دونوں کو تولا جانچا۔ پھر درخواست کو منظور کرنے اور نا منظور کرنے کے انجام کو سوچ لیا۔ میرا من مالتی کے الفاظ کی طرف زیادہ جھکا ہوا تھا۔

ہر روز کی طرح میرا موٹر کچہری کی طرف جا رہا تھا۔ مگر میرے من میں وہ شانتی نہ تھی جو ہر روز ہوا کرتی تھی۔ میں ایسا محسوس کرتا تھا جیسے کچہری میں آج میرے ہی مقدمے کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ میرا دل کہہ رہا تھا۔ تم آج جج نہیں ملزم ہو۔ کٹہرے اتر دوگے نہ! میں کچہری میں جا کر بیٹھا، پہلے پہل میرے سامنے ملزموں سے ملنے والے رشتہ داروں کی درخواستیں ہی پیش کی گئیں۔ ان فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ میرے برابر ہی بیٹھا ہوا تھا، اس نے ایک بار پھر وہی الفاظ دہرائے کہ مرلی منوہر سے کسی کو ملنے دینا مناسب نہیں ہے لیکن آج میں نے تمام درخواستیں منظور کر دیں۔ ان میں ایک مالتی کی بھی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ ہکا بکا رہ گیا۔ میں جس وقت ان درخواستوں پر حکم لکھ رہا تھا اس وقت میرے دل پر نہ جانے کیا بیت رہی تھی۔ مالتی کی درخواست پر دستخط کرنے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے میرے اوپر سے ایک بوجھ سا اتر گیا ہے۔ آج سے پہلے میں نے پولیس سپرنٹنڈنٹ کی مرضی کے خلاف کام کرنے کی کبھی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن آج اس کی مخالفت کرنے پر بھی مجھے سکھ سا محسوس ہو رہا تھا، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے میرے چہرے پر یزدانی نور عکس افگن ہے۔ میں جب گھر لوٹ رہا تھا۔ تو اپنے اندر ایک جیتے ہوئے کھلاڑی کی سی ہمت پاتا تھا۔ جیسے میں کسی خون کے مقدمے سے بری ہو کر آیا ہوں۔

(۵)

دوسرے دن مالتی علی الصباح ہی نہا دھو کر ایک تھال میں مٹھائی اپنے چرخے پر کاتے ہوئے سوت کی رنگین راکھی، چندن وغیرہ لے کر بڑے شوق سے جیل کی طرف چلی۔ اس کے جسم پر زیوروں کا نام تک نہ تھا۔ کھدر کے جو کپڑے پہنے ہوئے تھی ان سے سادگی ٹپک رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر جو بندی لگی ہوئی تھی وہی اس کے چہرے پر جلال برسا رہی تھی۔ وہ ہاتھ میں تھال لئے صبح کی خاموشی میں سنسان سڑک پر جس کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت کھڑے تھے جاتی ہوئی ایک دیوی سی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے وہ اپنے بھگت کی ریاضت سے خوش ہو کر بردان دینے جا رہی ہے۔ ملاقات کا وقت دس بجے سے ۱۲ بجے تک تھا لیکن مالتی صبح سے ہی جیل کے دروازے پر جا کر بیٹھ گئی۔

۱۰ بجے سب رشتہ داروں کو اندر بلایا گیا، اور حکم سنایا گیا کہ ان کو تلاشی دینی ہوگی، اور کوئی چیز جیل کے اندر نہ لے جانی ہوگی، مالتی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے ہمت کر کے کہا، ''میں بھیا کے راکھی باندھنے آئی ہوں''۔ جیلر نے کہا۔ ''اس کے لئے حکم نہیں ہے۔ ملتے وقت کچھ ساتھ نہ لے جا سکوگی'' مالتی نے کہا۔ ''پھر یوں مل کر کیا کروں گی۔ ایک بار اس کے من میں آیا مل تو لوں۔ بہت دنوں سے ملی نہیں، دیکھوں بھیا کیسے ہیں۔ پھر اس کے دل نے کہا، بھیا سے راکھی کے دن ملوں گی اور وہ بھی خالی ہاتھوں۔ نہیں اس سے تو نہ ملنا ہی اچھا ہے۔ یہ سوچ کر وہ پلٹ آئی۔ مالتی کے ہاتھ کے بنے ہوئے جالی دار کپڑے سے، ڈھکا ہوا وہ تھال اس کے گھر کے طاق میں رکھا ہوا تھا۔ اور وہ بیٹھی رو رہی تھی۔

دوسرے روز اخباروں میں میں نے پڑھا کہ مالتی کو تھال لے کر اندر جانے کی اجازت نہ ملی اور وہ واپس آ گئی، میرا من مچل اٹھا، میں نے سوچا

کہ تمام عمر میں صرف پہلی بار میں نے لئے انصاف کرنے والے عہدہ کا عز ور محسوس کیا تھا لیکن وہ بھی آج بیکار گیا۔ اور مالتی اپنے بھائی سے نہ مل سکی۔

مرلی اور مالتی کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ مرلی نے انجینئرنگ کالج میں پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ والد نے چالیس پچاس ہزار روپے چھوڑے تھے۔ اس سے ان کا کام چلتا تھا۔ مرلی کچھ کام کرنا چاہتا تھا کہ سیاسی کاموں میں پھنس گیا۔ مالتی اس وقت ۱۶ برس کی تھی۔ اگر وہ گرفتار نہ ہو گیا ہوتا تو اس کی شادی ہو جاتی۔ گھر میں ان دونوں بھائی بہنوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ جب سے مقدمہ شروع ہوا تب سے مالتی ناگپور میں ایک بنگلہ کرایہ پر لے کر رہتی تھی۔ ساتھ میں نوکروں اور ساماؤں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

روز مرہ کی طرح میں صبح کی چائے پی رہا تھا اور اخبار پڑھ رہا تھا یکایک میری نگاہ ایک خبر کی طرف گئی، اس میں لکھا تھا، "ناگپور سازش کے مقدمے کے ملزم مرلی منوہر کی بہن کو راکھی کے دن بھائی سے راکھی سمیت ملنے کی اجازت نہیں ملی۔ اس وجہ سے وہ چھ دن سے فاقے کر رہی ہے۔" یہ پڑھتے ہی دل پر ایک دھکا سا لگا۔ مالتی کی یاد پھر جاگ اٹھی۔ دل میں پھر ایک چنتا گھر کرنے لگی آج جنم اشٹمی کی چھٹی تھی۔ باہر نکلنے کی خواہش ہوئی۔ خیال تھا کہ مالتی کے مکان کا پتہ دریافت کر کے اس کے پاس جاؤں گا۔ شہر کی تمام سڑکوں پر گھومتا پھرا لیکن کسی شخص سے مالتی کا پتہ دریافت کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی گھر واپس آ گیا لیکن دل کا بوجھ اور بڑھ گیا۔

پچھلے برس کی طرح میری بیوی نے جنم اشٹمی کا تیوہار منایا، دن بھر میرے یہاں آنے جانے والوں کی بھیڑ لگی رہی۔ میں بھی شامل ہوا، گانا بجانا ہوا۔ لیکن میرے کان کچھ اور سن رہے تھے، آنکھیں کچھ اور دیکھ رہی تھیں مالتی کا فاقہ رو رو کر میرے دل پر اپنی کہانی لکھ رہا تھا۔

اس کے بعد کئی دن بیت گئے، مالتی کو دیکھنے کی خواہش ہر روز ہوتی تھی لیکن مکان کا پتہ معلوم نہ تھا۔ اور یہ خواہش پوری نہ ہوئی، مالتی کے متعلق کسی سے کچھ پوچھنے میں ایک خوف سا معلوم ہوتا تھا۔ اخباروں میں بھی اس کے متعلق کوئی خاص خبر نہیں آتی تھی۔ یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ اس نے ابھی کھانا کھایا ہے یا نہیں۔ اس دن کے بعد مالتی کی اپنے بھائی سے ملنے کی بھی کوئی عرضی نہیں آئی، اس وجہ سے دل ہمیشہ گھبرایا سا رہتا تھا کہ کہیں وہ اب تک فاقہ ہی نہ کر رہی ہو۔

جنم اشٹمی کو گزرے ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ دسہرہ قریب تھا۔ اس وقت تک میں مالتی سے نہ مل سکا تھا۔ اور نہ اس کا پتا ہی کچھ مل سکا تھا، اس سے ملنے کی خواہش اور بھی زیادہ ہوتی گئی، آخر ایک دن کچہری میں اسی مقدمے کے سلسلے میں اس کے گھر کا پتہ بھی معلوم ہو گیا، میرے اور اس کے بنگلے کا فاصلہ صرف پون میل کا تھا۔

دسہرے کی چھٹی بھی آ گئی، ایک روز اس سے ملنے کے ارادے سے پیدل ہی اس کے مکان کی طرف چل کھڑا ہوا، میں ٹھیک اس کے بنگلے کے سامنے پہنچ گیا، دروازے پر دربان کھڑا تھا۔ اس سے پوچھنے پر معلوم ہوا وہ ابھی نیا نوکر رکھا گیا ہے۔ مالکہ بہت دنوں سے بیمار ہے، دوا کسی کی نہیں ہو رہی ہے۔ وہ کسی سے ملتی بھی نہیں۔ سنتے ہی میرا دل سن سے ہو گیا، رکشا بندھن کو بیتے ہوئے پچاس دن ہو گئے تھے۔ تب سے وہ فاقہ کر رہی تھی۔ اخباروں پر غصہ آیا۔ جیل میں ملزموں کو ذرا چھینک بھی آ جاوے تو وہ اسے موٹے ٹائپ میں ڈبل سرخیوں کے ساتھ فوراً چھاپ دیتے ہیں۔ اور باہر یہاں ان کے رشتہ دار مر بھی جاویں تو ان کے حالات معلوم کر کے کچھ لکھنے کی فکر نہیں ہوتی۔ مالتی سے ملنے کی زبردست خواہش ہونے پر بھی میں اس وقت پلٹ آیا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اس کے مکان کے پاس ضرور خفیہ پولیس کا پہرہ ہوگا۔ اس سے ملنا، اس حالت میں جب کہ اس کا مقدمہ میری عدالت میں ہو رہا ہے، مناسب نہیں۔ اگر سرکار کو اس کا پتہ لگ گیا تو میری سروس خاک میں مل جائے گی، سپرنٹنڈنٹ پولیس مجھ سے چڑھا ہوا ہے۔ اسے ذرا سا بھی موقع ملا تو وہ مجھے بدنام کئے بغیر نہ چھوڑے گا۔ یہ تمام باتیں سوچ کر میں پلٹ آیا، مالتی سے ملنے کی خواہش اور بھی بڑھ گئی تھی گھر واپس ہوتے وقت میری حالت بالکل اس گائے کے مانند تھی جو تھان پر رسی سے بندھی ہوئی ہو اور اس کا بچہ بھوک کے مارے اس کے سامنے دم توڑ رہا ہو۔ وہ دودھ پلانے کے لئے دوڑے مگر رسی میں بندھے ہونے کی وجہ سے اپنے کھونٹے کی طرف پھر پلٹ آئے، میرے گلے میں اس

کا سمکی رسی سے زیادہ مضبوط بندھن تھا جس طرح گائے دور ہی سے اپنے بچے کو دیکھکر بلبلاتی تھی ٹھیک اسی طرح میرا دل بھی تڑپ رہا تھا اور میرے سامنے تو وہ گائے کا بچھڑا بھی نہ تھا۔ جسے میں دیکھ سکوں۔

میں گھر واپس آیا۔ مگر دل پر ایک بوجھ لئے ہوئے۔ بار بار مالتی کے لڑکپن کا چہرہ میرے سامنے آتا۔ جس دن جب وہ مجھ سے ملنے آئی تھی اس کا چہرہ مجھے یاد تھا۔ آج اسے بغیر کچھ کھائے پیئے پچاس دن ہو گئے، اس کا خیال کرتے ہی میرا دل بیٹھ جاتا تھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ افسر چاہے ناراض ہی ہو جائیں، میں مالتی سے ضرور ملوں گا۔ اس سے زیادہ غیر انسانی فعل اور کیا ہوگا۔ انسانیت کا پاس نوکری اور عزت سے کہیں بڑھ کر ہے۔

دوسرے روز دسہرہ تھا۔ میں علی الصباح بغیر چائے پیئے نکل کھڑا ہوا، اور اسی بنگلے کے سامنے جا کر رکا، اندر خبر کرائی، کچھ پس و پیش کے بعد اندر جانے کی اجازت مل گئی، اندر پہنچا، میرا دل دھڑک رہا تھا، مالتی پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ دو مامائیں پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرے لئے ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میں اس پر جا کر بیٹھ گیا۔ مالتی مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ماماؤں نے سہارا دے کر اسے تکئے کے سہارے بٹھا دیا۔ میں نے لیٹ جانے کو کہا۔ مگر وہ بیٹھی ہی رہی اس کی آنکھوں میں سے شعلے نکل رہے تھے۔ بھوک کی وجہ سے چہرہ سوکھا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس پر جلال تھا۔ چمک تھی۔ اس آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھ رہی ہے۔ میں اس روز اپنا تعارف کرانے اور اس کی خدمت کرنے گیا تھا۔ میری زندگی میں وہ پہلا موقع تھا جبکہ میں اپنی مرضی سے، اپنے دل کے کہنے سے ایک ایسی ہستی کی خدمت کرنے کو تیار ہوا تھا جسے میں پیار کرتا تھا۔ میں نے کہا "مالتی"، اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی نظر میں تعجب اور غصے کی لہر تھی، میں سمجھ گیا، ابھی تک وہ مجھے اپنے بھائی کا مقدمہ کرنے والا مجسٹریٹ ہی سمجھتی تھی۔ میں نے اسے اب زیادہ تذبذب کی حالت میں رکھنا پسند نہیں کیا۔ میں نے اس سے کہا۔ کیا بلاسس پور والے بھائی کو بھول گئیں، جو جبل پور پڑھنے چلا گیا تھا، اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں آنسو تھے، نفرت کے نہیں، محبت کے، پچاس دن سے زیادہ کی بھوکی مالتی کوشش کرنے پر بھی نہ اٹھ سکی، اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے ہم دونوں کے چھاتی اور گلے آپس میں مل گئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو میرے کوٹ پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے، میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

اس دن دسہرہ تھا، میں نے کہا، مالتی تم کب تک اس طرح پڑی رہوگی، یہ ضد ٹھیک نہیں، تمہارا بھیا دیش کے لئے جان دے رہا ہے اور تم اس کے لئے افسوس کر رہی ہو۔ اس کی آنکھیں پھر میری طرف اٹھیں اس نے بتا دیا کہ یہ بات نہیں ہے، میں نے کہا، آج تو تمہیں کھانا شروع کرنا ہی پڑے گا۔ آج میں تمہیں لیمو کا رس پلا کر ہی جاؤں گا۔ اس نے آہستہ سے کہا، نہیں بھیا، ابھی تک میں نے بھیا کے راکھی نہیں باندھی ہے، راکھی کی مٹھائی دیکھو وہ رکھی ہے، ابھی تک بھیا نے کھایا نہیں میں کیسے کھالوں، اس کی دھیمی آواز میں بھی ایک کڑک تھی، اس کے اندر سے استقلال کی آواز آ رہی تھی۔ میں اس سے زیادہ ضد کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس سے رخصت ہو کر میں گھر آ گیا۔

میں نے اسی روز گورنر کو ایک تار دیا۔ اور ایک چٹھی بھی لکھی کہ مالتی کو اپنے بھائی سے ملنے یا مٹھائی کھلانے کی فوراً اجازت دی جائے۔ تار کا جواب آیا کہ "آپ کی چٹھی پر غور کیا جا رہا ہے"، میں اسی دن سے مالتی کے گھر روز جایا کرتا تھا۔ وہ متعدد بار بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے اسے امید دلائی کہ میں نے گورنر کو لکھا ہے۔ تمہیں اپنے بھائی کو مٹھائی کھلانے کی ضرور اجازت مل جائے گی۔ لیکن گورنر کے یہاں سے چھ دن بعد جواب آیا کہ اجازت دینے میں خطرہ ہے۔ یہ ٹکا سا جواب پا کر میں بھی لاچار ہو گیا۔ سوچنے لگا کہ اسی روز کے لئے میں نے اپنے ضمیر کا کتنی ہی دفعہ خون کیا ہے، افسران بالا کی مرضی کے مطابق چلنے میں۔

پھر بھی نا امید نہیں ہوا، سوچا، میں نے تمام باتیں لکھی بھی تو نہیں ہیں۔ اس بار اچھی طرح لکھ دوں، اب کی دفعہ ضرور منظوری

مل جائے گی۔ اس بار لمبا چوڑا خط لکھا، اور اس میں اپنے تعلقات اور فاقے کی مفصل کیفیت درج کر دی۔ آخر میں میں نے اپنی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ گورنمنٹ اگر مجھے ان کا کچھ معاوضہ دینا چاہتی ہے تو میں صرف یہ اجازت ہی کافی سمجھوں گا۔ مجھے امید تھی کہ اس دفعہ ضرور میری درخواست منظور کی جائے گی۔

میں برابر مالتی کے یہاں جاتا، اور روزمرہ اسے یقین دلاتا کہ میں بہت جلد اسے بھائی سے ملنے کی خوش خبری سناؤں گا۔ اس روز بھی گیا لیکن میں نے چٹھی کی بابت ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا، صرف اتنا ہی کہا "میں نے آج پھر لکھا ہے اجازت ضرور مل جائے گی"۔ دوسری چٹھی کا بھی جواب آگیا، اس میں بھی انکار تھا۔ اور صاف صاف لکھا تھا کہ سازش کے ملزمان کے ساتھ سرکار نرمی اور مہربانی کا برتاؤ نہیں کر سکتی۔ کھانا ترک کر کے اس کی بہن خواہ مخواہ ضد کر رہی ہے، سرکار اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ دوسرے روز دیوالی کی چھٹی ہونے والی تھی۔ اس سے تین چار روز پہلے سے میں مالتی کے یہاں نہیں گیا تھا۔ سوچا تھا کہ خوش خبری لے کر ہی جاؤں گا۔ سرکاری چٹھی ملنے پر مجھکو یہ معلوم ہونے لگا جیسے میں گہرے پانی میں ڈوبا جا رہا ہوں۔ نہ ادھر کوئی بچانے والا دکھائی دیتا تھا، نہ ادھر۔ جس سرکار کی میں نے اتنی سیوا کی تھی اس کے دربار سے یہ بے عزتی، میں ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ تھا، مجھے اتنا بھی اختیار نہ تھا کہ ملزم کو اس کی بہن سے ملا سکتا، اور تھوڑی سی مٹھائی کھلانے کی اجازت دے سکتا۔ میں اب کس منہ سے مالتی کے پاس جاتا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، بستر پر جا کر لیٹ گیا، تھوڑی دیر کے بعد بخار ہو گیا، دو دن تک بیہوش پڑا رہا۔ بیوی رات دن سیوا کرتی رہی تیسرے دن ہوش آیا، اسی دن دیوالی تھی، میرا بخار اتر گیا تھا۔ میں کپڑے پہن کر موٹر پر باہر جانے کو تیار ہوا، بیوی نے روکا لیکن میں نے نہیں مانا، وہ بھی ساتھ چلی، ہم دونوں مالتی کے گھر پہنچے۔ مالتی اس دن بیہوش پڑی تھی۔ میری بیوی کچھ نہیں سمجھ سکی کہ معاملہ کیا ہے، اسے اب تک ان معاملات کا کچھ بھی پتہ نہ تھا۔

تھوڑی دیر میں مالتی کو ہوش آیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف، وہ سمجھ گئی کہ میں اس زندگی میں اپنے بھائی سے نہ مل سکوں گی۔ اس روز اس کے فاقے کا [illegible] واں دن تھا، رہ رہ کے وہ بیہوش ہو جاتی تھی۔ میں نے ڈاکٹر کو بلوایا لیکن مالتی نے آنکھوں سے دوا پینے سے انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ زبردستی کرنا کسی نے مناسب نہ سمجھا۔ اس کا بولنا کئی روز سے بند تھا۔

اس روز ہم لوگ مالتی کے مکان پر ہی رہے۔ دن بھر میں اس کو [illegible] دفعہ غش آئے۔ اس کی زندگی کے لمحے ختم ہوتے جا رہے تھے۔ شام کو اس نے آنکھیں کھولیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ طاقت آئی ہے۔ اس نے اشارے سے وہی راکھی والی تھالی مانگی، اس میں مٹھائی چندن، راکھی وغیرہ اسی طرح رکھے ہوئے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تھال آج کے لیے ہی سجایا گیا ہے۔ اس نے اس میں سے راکھی اٹھائی۔ اور مجھ سے ہاتھ بڑھانے کا اشارہ کیا، آہستہ آہستہ اس نے میرے ہاتھ میں راکھی باندھی۔ چندن لگایا۔ بڑی مشکل سے تھالی میں سے مٹھائی کی ڈلی اٹھا کر اس نے میرے منہ کی طرف بڑھائی۔ میں نے اسے کھا لیا۔ اس نے آنکھوں کے اشارے سے مجھے دعا دی۔ اس کے چہرے پر ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی، کون جانتا تھا کہ وہ بجھتے ہوئے چراغ کی آخری چمک ہے ... تھوڑی دیر کے بعد اس کی روح اس قفس عنصری سے پھڑ پھڑا کر اڑ گئی ..... رونے والوں کے ساتھ ساتھ مکان کی دیواریں بھی رونے لگیں۔

دیوالی کا تیوہار تھا۔ تمام شہر روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ اسی کے بیچ میں ایک سڑک کے کنارے والے بنگلے میں ایک بتی بھی نہیں جلی تھی، باہر سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس گھر میں کوئی رہتا ہے۔ سارے شہر میں چہل پہل تھی۔ اس گھر میں خاموشی اور سناٹا۔ ہوائی جہاز پر چڑھ کر اگر کوئی اس شہر کو دیکھتا تو چاند کے مانند چمکتے ہوئے اس شہر میں صرف یہ گھر ہی چاند کا دھبہ معلوم ہوتا لیکن کون جانتا تھا کہ اس کالے دھبے میں ایک آتش فشاں پہاڑ بھبک رہا ہے۔

دیوالی کے بعد کچہری کھلی، سازش کا مقدمہ شروع ہوا لیکن اس مقدمے کا فیصلہ کرنے والا میں نہیں تھا، جس کرسی پر میں بیٹھا کرتا تھا اس پر آج ایک نیا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ میرا استعفیٰ منظور ہو چکا تھا۔ میرا بنگلہ اور میرا موٹر آج میرا نہیں تھا، میرے ساتھ ساتھ میری بیوی تھی، ہمارے بدن پر کھدر کے کپڑے تھے میرے پاس ایک اور چیز تھی۔ وہی پرزہ جس پر مالتی دیوی نے اپنا نام لکھا تھا۔ اس دن کے بعد ہمارے ملنے والوں نے ہم کو اس شہر میں نہیں پایا۔ ایک دن ہم نے اخباروں میں پڑھا کہ مرلی منوہر کو عبور دریائے شور کی سزا ملی ہے۔

(ترجمہ)

گذر جا

طاقِ حرم و کرسی و منبر سے گذر جا
دیوار سے، محراب سے اور در سے گذر جا

تسبیح لے ہر حلقۂ انوار سے گذر جا
سر رشتۂ زنّار کے چکّر سے گذر جا

دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو جہنّم ہو کہ جنّت
ہر جادہ و ہر منزل و ہر در سے گذر جا

پرتو ہے شب و روز ترا اے مہ و خورشید
ہر عالمِ تاریک و منوّر سے گذر جا

ہر منزلِ پُر نور گذرگاہ ہے تیری
ہر دائرۂ انجم و اختر سے گذر جا

ظلمات تو ہے منزلِ یک جادۂ مقصود
اے نورِ اِرم حدِّ سکندر سے گذر جا

ہر راہ میں قزّاق ہیں ہر گام پہ رہزن
بچنا ہے تو جذبات کے محشر سے گذر جا

غم بھی کوئی منزل ہے رہِ عشق و جنوں میں
آلام کے موّاجِ سمندر سے گذر جا

سایہ ہے تخیّل کا توہّم کا ہے پرتو
نیکی سے گذر کارِ گُنہ شر سے گذر جا

جل بجھنے سے بہتر ہے چمک ایک گھڑی کی
اے سوزِ تڑپ اور دمِ مجمر سے گذر جا

تو مشعلِ جاوید رہِ ہستی و مستی
حدِّ اثرِ ہادی و رہبر سے گذر جا

کوئی تری منزل نہیں اے جلوۂ رعنا
چشم و نگہ و ناظر و منظر سے گذر جا

گرداب میں کیوں قید ہے اے موجۂ سیلاب
گر موجۂ سیلاب ہے تو سر سے گذر جا

کب تک نگۂ ساقیٔ کمسن کی غلامی
میخانہ و جام و مے و ساغر سے گذر جا

فطرت تری سیّال طبیعت تری سیلاب
ہر گوشۂ و پیمانہ و ساغر سے گذر جا

یہ بھی تری منزل نہیں اے مردِ مسافر
وحشت کدۂ گنبدِ بے در سے گذر جا

آواز بصد نور ہو قندیلِ بقا کی
محراب سے گر، چُور ہو اور در سے گذر جا

یہ منزلِ آخر تو نہیں تیرے جنوں کی
ہنستا ہوا، گاتا ہوا محشر سے گذر جا

مستی ہے تو ہستی ہے جنوں ہے تو فسوں ہے
موقع جو لگے میثیٔ داور سے گذر جا

اس بھیڑ میں کیوں تیرے قدم اُٹھ نہیں سکتے؟!
منظر سے نہیں تو پسِ منظر سے گذر جا

ساغر نظامی

حکیم عبدالوالی صاحب کا مکتوب

محبی - آپ کے دو پوسٹ کارڈ ملے - جواب نہ دینے کی معذرت شاید قبول نہ ہو - اس لئے معذرت بھی نہ کی - اس درمیان میں لکھنے سے زیادہ پڑھنے میں بہت انہماک رہا - زیادہ پڑھنا میں جانتا ہوں عیاشی اور کاہلی ہے - مگر انسان کیا کرے جا خود اپنے اوپر قابو نہیں رکھتا - خواہش کچھ رکھتا ہے اور کرتا کچھ ہے - جانتا ہوں تخلیق اور پیدا کرنا اصل کام ہے اور جاننا اور سمجھنا کوئی بڑی چیز نہیں - ایک صفحہ لکھ کر جو بلندی محسوس ہوتی ہے وہ پوری ایک کتاب پڑھ کر نہیں ہوتی - لیکن بعض مصنفین غیر معمولی کشش رکھتے ہیں ان کی تصنیف شروع سے آخر تک پڑھے بغیر جی سیر نہیں ہوتا - پھر بعض مسائل و معاملات ایسے ہوتے ہیں جن پر غور و فکر کئے بغیر نہیں بنتی - زمانہ حاضر ایک معنی میں بہت پُرلطف زمانہ ہے - صدہا برس کی بنی بنائی سوسائٹی کے مٹنے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں - ہر صحیح دماغ شخص انقلاب کے ذریعے ڈھونڈ رہا ہے - بےچین ہے چیزوں کی غلط قیمتیں مٹا کر صحیح قیمتیں مقرر کرنے کے لئے بے قرار ہے - یہ زمانہ ذہنوں کے لئے بہار کا زمانہ ہے ہر فرد بشر کو طبع آزمائی کرنا چاہئے - اس بہار کے زمانہ میں مستانہ وار اپنی ذہنی طاقتیں کُھلنے انقلاب کے زمانے کو بہار کا زمانہ کہتا ہوں تو کچھ بُرا نہیں کرتا - ذہن میں پھل پھول اسی زمانہ میں نکلتے ہیں - انقلاب فرانس کے زمانہ کے لٹریچر کو دیکھو کتنا مالا مال لٹریچر ہے - موجودہ زمانہ کے لٹریچر کو دیکھو - چمکتی اشرفیوں کا ڈھیر ہے - جس ملک میں چاہیے جھانک لو - اٹھارویں انیسویں صدیوں کے کھوٹے سکے اور بینک نوٹ نہیں - نئی اُردو شاعری بھی کیسی پن چھوڑتی جاتی ہے - شریف بہو بیٹی بن رہی ہے جوش و ولولہ پیدا ہو رہا ہے -

"زندگی اور مادہ زندگی" پر مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا - تو اس کی کیفیت یہ ہے کہ خیالات نے ڈرامے کا رنگ اختیار کر لیا ہے - جانباز اور جمال بانو کے قصہ کی صورت میں خیالات متشکل ہو گئے - یہ قصہ اس مہینے میں کیسے بھیج سکتا ہوں - دوسرے مہینے میں بھیجونگا - (اگر بنگیا) مگر غیر دہ تو قسشر نوا فسانہ ہوگا مغز کو اس خط میں لکھے دیتا ہوں - جس طرح اس مضمون نے قصہ کی صورت اختیار کی ہے - اسی طرح اس معذرت والے خط کو جامۂ مضمون پہناتا ہوں - اسی کو مضمون موعود تصور کیجئے -

جمال بانو جانباز سے کہتی ہے - جسم کی خواہش سے دھوکا نہ کھاؤ - میں تمھیں چاہتی ہوں - تم مجھ سے محبت کرتے ہو - یہ میرے اور تمھارے دونوں کے لئے کافی ہے - محبت کو نکاح کی جکڑ بند سے آزاد رکھو - محبت اور نکاح دو بالکل متضاد چیزیں ہیں - محبت ویرانہ ہے اور نکاح خانہ جو ہے - محبت دل کی بربادی اور نکاح گھر کی آبادی ہے - اگر تم دنیا سازی کی فکر کرتے تو تمھاری بیوی بننے سے مجھے انکار نہ ہوتا میرے نازک ہاتھ تمھارے گلے کا ہار ہوتے - مگر تمھاری خواہشیں تو دنیا سوزی کی طرف مائل ہیں - پھر میرا تمھارا کس طرح ساتھ ہو سکتا ہے - تم اپنی راہ کھوں نہ کرو اپنے راستہ جاؤ - میرے دیدہ و دل تمھارے ہمراہ ہیں - یہ نہ سمجھنا کہ تنہا جا رہے ہو دنیا سوزی اور جانسوزی مرد کا جوہر ہے - سمیٹنا - سمیٹنا - یہ بیدا

پالنا، پرورش کرنا مرد کا کام نہیں ہے۔ یہ عورت کے کام ہیں۔ نسوانیت دنیا سے وابستہ رہنا اسی میں اپنے کو مٹا دینا اور ختم کر دینا اور پھر سر اٹھا کے نہ دیکھنا ہے۔ گرہستی دنیا کو بنانا نسوانی خو ہے۔ دین دولت کی چیکاری اور دلکشی کی پوجا اس کا دھرم اور دھکار ہے۔ میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ دنیا کو ہمیشہ عورت سے تشبیہ دی گئی۔ بلکہ زشت خوئی بھی عورت اور دنیا کی خصوصیات میں داخل سمجھی گئی ہے مگر پھر اس سے ہم اپڑا ہے۔ میں بھی وہی بات کہہ رہا ہوں جانسازی اور دنیاسازی عورت کا کام ہے۔ وہ دنیا کی اور دنیا اس کی۔ یہ کہنے سے عورت کی مذمت مقصود نہیں بلکہ امر واقعہ کا بیان مد نظر ہے۔ املی کو کھٹا کہنا اس کی مذمت نہیں نہ انگور کو میٹھا کہنا انگور کی تعریف ہے۔ عورت کی خصلتیں و میلانات اور مرد کے خصائص و رجحانات در عامل اصول دنیا کے برقرار رکھنے اور ترقی کی راہ میں گامزن ہونے کے لئے ہیں۔ مردانیت ہواؤں کی طرح زمین کی سیر کرنا اور نکل جانا، بارش کی طرح اوپر سے برسنا اور بجلی سا چھنے کی طرح چمکنا اور غائب ہو جانا۔ مردانی خو بے نیازی اور بے پروائی ہے۔ نقش اول ڈالنا اور چل دینا۔ ہر چیز کو اس کے ذوق و شوق میں کرنا۔ بغیر کسی دوسری بیرونی غرضوں کے سامنے رکھے۔ اور اس شوق میں یہ انہماک کہ اپنی جان کو اس پر صدقے کر دینا۔ اگر صدقے ہو جائے اپنے کو دنیا کے قانون سے بالا رکھنا۔ بلکہ اپنے کو خود دنیا سے بالا رکھنا۔ عرشی طاقتوں سے گویا سلسلہ پیدا کر لینا۔ یہ اصلی مردانگی اور مرد کی خو ہے۔ مرد خلاق ہے اور اپنے خون میں خلاقی کی بو رکھتا ہے۔ اس میں خلاقی باقی ہی نہ رہے اگر عرشی طاقتوں کے ساتھ وہ سلسلہ نہ رکھے یہ عرشی سلسلہ صرف جان کو بے حقیقت سمجھنے اور اپنی غرض کو جان سے اعلیٰ سمجھنے سے قائم ہو سکتا ہے۔ اور اس کے سوا کسی دوسرے طریقے سے نہیں ہو سکتا۔ مرد کا ادھکار اور فرض اولین جہاد کے لئے تیار ہونا۔ جان کو ہتھیلی پہ لئے پھرنا ہے۔ جہاد کا مرد زندگی کا تعلق ہے۔ جہاد۔ جانسوزی۔ دنیا سوزی۔ مرادف الفاظ ہیں سے

نداند انکہ امیر بادہ مستی میکند عرفی
کہ ناکامی طلب در کعبہ مقصود میگردد

یہ ہی سلسلہ عرشی اور مستی عرشی ہے۔ جس کی توجیہہ مادی قوانین سے اصول سے نہیں ہو سکتی۔ اور نہ کوئی فلسفی دلائل قائم کئے جا سکتے ہیں۔ مرد دنیا میں مقصود موہوم لئے پھرتا ہے۔ یہ مقصود دنیا سے الگ ہو کر دنیا کے مادی قوانین سے بالاتر ہو کر لاتا ہے۔ اور ناکامی طلب میں گھوم کر اس کی تکمیل کرتا ہے جب اُسے اس قابل بنا لیتا ہے کہ دنیا اُسے پال بڑھا سکے اس سے وہ سبکدوش ہو جاتا ہے۔ مادہ دنیا اسے لے لیتی ہے پالتی پرورش کرتی ہے۔ فلسفی اپنا فلسفہ اس پر قائم کرتا ہے کاریگر اسے دنیا کے کام کا بناتے ہیں۔ ساہوکار اس کی تجارت شروع کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ دنیا میں کھپ کر انسانی زندگی کا وہ جز ہو جاتا ہے۔

غرض یہ کہ عرشی تعلق دنیا سے بے لوثی بنیادی نمبر۔ زندگی کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ ۱۲۔ ربیع الاول کو لکھنؤ میں ایک عام محفل میلاد امین آباد پارک میں تھی۔ ایک مقرر صاحب نے مسلمانوں کی موجودہ حالت کی مرثیہ خوانی یہ کہہ شروع کی کہ ان کے پاس نہ علم ہے نہ دولت میں نے اپنے دل میں کہا کہ سرور مسلمین صلعم کے پاس بھی نہ دولت تھی نہ علم یہ کونسی نئی اور انوکھی کی بات ہے۔ دولت کے نہ ہونے پر رونا مسلمان کا کام نہیں ہے اور نہ علم و خرد کا رونا مسلمان کبھی رویا ہے

حزر دار الشفا صبح کشت خانہ مینا زد
خراب مستیم کیں ہر دو را دیر از میبازد

مسلمان اگر کوئی خصوصیت رکھتا ہے تو وہ یہ کہ وہ مستی اس میں مسلمان ہونے کی وجہ سے آ جاتی ہے۔ کہ ان سب چیزوں دولت اور خرد کو رونا ہوا سمجھتا ہے۔ اگر مومن میں یہ مستی نہ پاؤں تو اسے ایمان والا کہنے میں مجھے تو تامل ہوگا۔

خرد و دولت دنیا سازی کے آلے ہیں جسے دنیا بنانا ہے وہ اس کا رونا ہر وقت رویا کرتا ہے۔ مگر وہ دنیا جو خرد اور دولت سے صرف بنتی ہے اس کا حشر وہی ہوتا ہے جو موجودہ "ترقی یافتہ" یورپ اور امریکہ کی زندگی کا ہو رہا ہے۔ مادہ دنیا۔ بے مقصد پست زشت خو دنیا۔ بجائے دنیا کو مرکب بنانے کے خود دنیا کا مرکب بن جانا۔ کہنے کو تو یورپ اور امریکہ نے دنیا کو تسخیر کر لیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ دنیا نے یورپ اور امریکہ کے انسانوں کو تسخیر کر لیا ہے اور ہمارے مولوی اور ہمارے سیاسی رہنما ان پر رشک کرتے ہیں، مگر واقعتاً ان کی حالت قابل عبرت ہے

مرد زندگی کا فلسفہ ایک عرب شاعر نے اپنی تین بد دعاؤں میں بتا دیا ہے (۱) یہ کہ بجائے میدان جنگ میں مرنے کے گھر میں پلنگ پر مرنا۔ (۲) مہمان آئے تو اس سے منہ چھپانا (۳) یہ کہ مرنے کے بعد گھر سے روپیہ نکلنا۔

کیا موجودہ زندگی اس کے بالکل ضد نہیں ہے؟ کون ہے جو میدان جنگ میں مرنے کی دعا مانگتا ہے۔ ایڑیاں رگڑ کے گھر میں پلنگ پر مرنا اعلیٰ سے اعلیٰ مقصد ہے

جان دینے سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ (۲) اول تو مہمانوں کا آنا شاذ و نادر سوسائٹی نے کر دیا ہے ہوٹل اور سرا اسنے قائم کر کے۔ اس پر بھی اگر کوئی بے تکلف شخص آن کے یہاں مہمان ہو تو میزبان کے گھر میں ہلچل پڑ جائے۔ گھر کے خرچ کا تکمہ دات پلٹ ہو جائے۔ میاں بیوی کا منہ دیکھے اور بیوی میاں کا۔ گھر کے امن و سکون میں خلل پڑ جائے۔ (۳) اگر برے کے بعد گھر سے روپیہ نہ نکلا۔ یا بینک کی کتاب میں قرار واقعی نقد باقی نہ رہا، کے ۔ م نہ ہوئی یا زندگی غیر بیمہ شدہ ہے تو باہر والوں کو تو جانے دیجئے خود بیوی اور بال بچے بیتر میں کیڑے ڈالیں گے

ایک غیر مطبوعہ تصنیف اقتصادیات پر نظر سے گذری جس میں مسئلہ زر پر ستے زاویہ نگاہ کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ اس میں ایک مقام پر زر کے عالمگیر اثر کا ذکر یوں کیا ہے کہ " تمام اغراض و مقاصد، دنیا اور اعلیٰ جب یا شہوت، تمام برباد کن بے سرپا خواہشیں، تمام انسانیت سوز خباثتیں تمام شرمناک آرزوئیں۔ دوش بدوش بازار میں آتی ہیں اور اپنی خدمت کے لئے غرض کی خواہاں بنا رہی ہیں۔ مگر زر کی مشابہت سے مدد حاصل کرتی ہیں۔ بحوان کے پاس ہو زر کی اخلاق اور حسن عمل کے ساتھ یہ بے تعلقی جسم میں لرزہ ڈالتی ہے "

یہ تمام نتائج زر زندگی پر مادہ زندگی کو فوقیت دینے کے ہیں۔ دنیا سازی کو دنیا سوزی پر ترجیح دینے کے۔ انسان کے خیال کا مرکز مادی دنیا بنانے کے ہیں انسان عرش اور ارض دو سطحوں کے درمیان معلق ہے۔ یہ خاکی دنیا کی مخلوق ضرور ہے اس کا تعلق اور سلسلہ دوسرے عالم سے بھی ہے۔ فرز زندگی عرشی سلسلہ برقرار رکھتی ہے اگر انسانی زندگی بالکل مادہ زندگی ہو جائے تو دنیا اس کی بظاہر بہت خوشنما ہو جائیگی۔ لیکن ایسے اندرونی خباثت پیدا ہو جائیں گے کہ سوسائٹی کی بقا مشکل ہو جائیگی علم و خرد بربادی و تباہی کے مہیب آلے بن جاتے ہیں۔ زمانہ حال کے آلات حرب۔ ہوائی جہاز، گیس وغیرہ کی طرف سے میرا اشارہ نہیں ہے۔ وہ تو خالص علم و خرد کے اصلی نتائج ہیں!! اور ان کو اس وجہ سے بھی نظر انداز کرتا ہوں کہ وہ فقط زمانہ جنگ کے لئے محدود ہیں۔ میں علم و خرد کا تباہ کن عالمگیر اثر ایک اور شعبے میں دکھانا چاہتا ہوں علم اپنی عمارت خود حدود قائم کر کے بناتا ہے۔ یہ نفسیات ہے یہ اقتصادیات ہے۔ یہ مذہبیات ہے، یہ روحانیات ہے۔ جو اشخاص خصوصی دستگاہ کسی ایک یا دو علم میں حاصل کرتے ہیں۔ وہ اپنے علم کو دنیا کے تمام خیالات اور چیزوں کا مرکز سمجھنے لگتے ہیں۔ ایک اقتصادیات کا ماہر یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی ترکیب اقتصادی بنا پر ہوئی ہے۔ ایک مذہبیات میں علو رکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ انسانی سوسائٹی باقی ہی نہیں رہ سکتی اگر مذہبی اصول کارفرما نہ ہوں مابعد الطبیعیات اور نفسیات میں علو رکھنے والا اپنے سبجکٹ کو انسانیت کا مرکز سمجھتا ہے، غرضیکہ ہر کس بخیال خویش خبطے دارد کی مثال تم کو میدان علم و خرد میں صاف دکھائی دیگی۔ اس میں سے ہر چیز میں غلو انسانیت سوزی اور انسانیت کشی ہے۔ تاریخ کے اوراق بالاعلان تمہیں بتلا رہے ہیں کہ جو گروہ جو قوم کسی خاص سسٹم کی پابند ہو گیا اور اپنی زندگی کو اس میں جکڑا وہ تباہ و برباد ہوئی اس جگہ میں صرف اقتصادیات کی کارفرمائی عالم انسانیت میں دکھلانا چاہتا ہوں اور علم و خرد کے زور و طاقت کا تماشہ دکھاؤنگا۔ یہ سبجکٹ میں نے اس لئے چنا کہ یہ اقتصادیات پر زندگی کو تامرو زندگی بنانے میں کمال رکھتا ہے۔ تیرے کا کام دیتا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے سوا اپنے جسم و جان کے کوئی تیسری چیز ساتھ نہیں لاتا۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کو حقوق حاصل ہونے لگتے ہیں۔ پہلا حق ہوا کا اسے ملتا ہے۔ جو شخص کسی بچہ کو ہوا سے محروم کرے کسی ایسی جگہ بند کرے جہاں ہوا نہ پہنچے ہو تو وہ قتل عمد کا مرتکب ہوگا۔ مجھے معلوم نہیں قانون کیا ہے۔ مگر قرین قیاس یہ ضرور ہے کہ اگر ماں اسے اپنا دودھ یا دوسری غذا نہ دے تو وہ مستوجب سزا ہوگی خلاصہ یہ کہ انسان دنیا میں زندہ رہنے کا حق پیدا ہونے کے ساتھ ہی حاصل کر لیتا ہے۔ سوسائٹی کی ضروریات زندگی پیدا کرنا اور ہر فرد بشر کو پہنچانا اتنا ہی لازمی ہے جتنا بچے کو خوراک دینا۔ تقسیم اموال بہ استعمال اتنا ہی ضروری اقتصادی مسئلہ ہے۔ جتنا اموال پیدا کرنا یا قابل استعمال بنانا۔ تقسیم صرف دو طریقوں سے ممکن ہے یا تو سوسائٹی مجموعی طور پر اس کا سامان کرے یا افراد پر چھوڑ دے افراد پر چھوڑنے سے تجارت کی صورت پیدا ہوئی۔ اس لئے تجارت تقسیم اقتصادی اموال کا ذریعہ ہے۔ علم و خرد نے اس کی غرض اصلی محو کر دی اسے ایک مستقل فن اور پیشہ بنایا جس طرح جنسی تعلقات کو کسی ایک فن اور پیشہ بنا لیتی ہے ۔ افزائش نسل کے ذریعے کو پیشہ اور بنانے سے فحاشی پیدا ہوئی تقسیم اموال کے ذریعے یعنی تجارت کو پیشہ اور فن بنانے سے کنگلی پیدا ہوئی تجارت کا کاروبار جب پھیلا اور اس میں پیچیدگیاں شروع ہوئیں تو زر کو تبادلہ قرار دیا گیا۔ زر اب ایک ذریعہ کاروبار چلانے کا ہوا بجائے خود زر کوئی اقتصادی وقعت شروع میں نہیں رکھتا تھا۔ جس طرح ناپنے کی کوئی چیز یا وزن ... ہے وہی صورت زر کی بھی تھی۔ علم و خرد نے اسے اقتصادی مال بنا ... کی تقسیم اسی طرح ہونے لگی جس طرح اقتصادی اموال کی ہوتی ہے ...

پیدا ہوا۔ تجارت تو کبھی مرتبہ حاصل کر چکی تھی۔ یہ نئی کونپل اس نے نکالی۔ بینک اپنے تمام تر بہار جوں۔ سود کمونٹ بل آف اکسچینج یا نڈ۔ ہنڈی تمسک عالم وجود میں آیا۔ اصل سرمایہ داری کی دنیا میں شاید مولوی طفیل احمد صاحب علیگڈھی نے بینک کے سود کو جائز کیا۔ سرمایہ داری بے سود کے کس طرح چل سکتی ہے تمام سرمایہ کو قابل انتقال بنانے کے لیے سیکڑوں کارخانے ... روپیہ جوں پر تقسیم کرنے کے لیے بینک کی اعانت لابدی ہوئی۔ بینک نوٹ و سکہ بنانے لگے ... تو سکہ تھا ہی قرضے بھی سکہ کا کام دینے لگے۔ سکہ کی افراط ہوئی ... سانحہ دنیا کے مالیات کی پوری نظام مہاجنوں اور بینکوں کے ہاتھوں میں آگئی۔ اس ... کاروں کے گروہ سے اقتصادی تقسیم ہے جو ایک جائز اور ضروری چیز تھی وہ حرام ... اور سب کر کے ... پہنچا دی تھی۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی کی تہذیب اور اس تہذیب کے علم و خرد نے علو[م] کو انسانیت سے بے تعلق کر کے سوسائٹی کو اس حالت پر پہنچایا۔ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ انسانیت ایک ایسا خط ہے جس کا ایک نقطہ عرش پر ہے دوسرا نقطہ ارض پر۔ علم و خرد انسانیت کے خط کو ارضی سطح پر محدود کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ ناکامیاب رہتے ہیں اور ناکامیاب رہیں گے۔ گر زندگی عرشی سلسلہ قائم رکھنا چاہتی ہے جنت گر تر زندگی دنیا میں پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر پیغمبر زندگی کی تعلیم دینے کے لیے اس دنیا میں آیا۔ زندگی کا مذہب انسانیت آموزی ہے۔ انسان کے لیے انسانیت پہلے اور ہر چیز بعد ہے تم انسانیت سے گرے اور گرتے گرتے ہو گئے بیکار۔ تم نپولین کے درجہ کے سپاہی ہو گئے انسانیت کی خامی رہی۔ نیوٹن ہم عالم دین ہوئے مگر اجزائے انسانیت کھو بیٹھے بے مصرف۔ انسان کے لیے مقدم ہے انسانیت۔ وقت تمام ہوا۔ بیاری گفتار موقع نہ دیتی ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔

والی

امیرِ متکبر سے

شاعرِ خستہ سے ملتی نہیں تیری نگاہ — اللہ اللہ یہ تکبر اے امیرِ خود پسند
خاکساروں کی طرف سے جب گزرتا ہے کبھی — یوں اکڑ جاتا ہے گویا کھینچ رہا ہے بند بند
یہ اکڑ ہے درحقیقت کھوکھلے پن کی دلیل — نرم کر گردن کے خم کو کھینچ لے باگِ سمند
کھول دے پیشانیٔ دولت فروشی سے گرہ — پھینک دے دوشِ امارت سے تجبر کی کمند
بارگاہ و حاجب و خدام و دینار و درم — ہاں یہ مانا تو ہے ان سب نعمتوں سے بہرہ مند
ہاں سمجھتا ہوں کہ تیرا طرّۂ طرفِ کلاہ — آسماں کیا؟ بلکہ ہے عقدِ ثریا سے بلند
پھر بھی غمگیں خاک کے پامال ذرّوں کی طرف — اس حقارت سے نہ دیکھ اے آفتابِ ارجمند

در سفالیں کاسۂ رنداں بخواری منگرید
کایں حریفاں خدمتِ جامِ جہاں بیں کردہ اند (حافظ)

جوش ملیح آبادی

طفلِ بیمار

کل سے ہے بیمار اک مزدور کا لختِ جگر — یاس کے حملے مسلسل ہیں سکونِ رُوح پر

ولولے ہیں دم بخود قسمت سے بازی ہار کے — صبح سے آکر کھڑا ہے سامنے [illegible]

گود میں ہے درد رو بچہ شفا کی فکر ہے — جیب میں صرف ایک آنہ ہے دوا کی فکر ہے

اک طرف مجبور خاموشی ہے مردانہ شعار — اک طرف لُٹتی ہوئی آغوشِ عسرت کی بہار

اک طرف تقدیر کے دھندلے ستارے کا خیال — اک طرف ٹوٹے ہوئے دل کے سہارے کا خیال

اک طرف پیسے کی تنگی سے ہے سینہ داغ داغ — اک طرف بجھتا ہوا بزمِ دل و جاں کا چراغ

اک طرف احساسِ ناداری سے اُمیدیں خموش — اک طرف بیٹے کے نازک وقت سے تنگ [illegible]

اک طرف غلطاں ہے اشکِ گرم میں فکرِ معاش — اک طرف بچے کے رونے سے کلیجہ [illegible]

اک نظر ہستی کے چکراتے سفینے کی طرف — اک نظر اُس لعل اُس دل [illegible]

گاہے گاہے دل میں مزدوری پہ جانے کا خیال — گاہے بچے کے بلکنے بلبلانے [illegible]

کہہ رہا ہے دل ہی دل میں اے خداوندِ انام — بڑھ نہ جائیں ایک آنہ سے کہیں [illegible]

آہ یہ تکلیف، یہ اندوہ، یہ رنج و ملال ۲ یہ مشقت کا نتیجہ یہ شرافت کا مآل

تف ہے اے ہندوستاں! اے خود ستاؤں کے دیار یہ تری غیرت کا نقشہ، منصفی کا شاہکار

ہم جہاں تجھ میں ترستے ہیں دواؤں کے لئے ہیں ترے ناپاک حملے بیواؤں کے لئے

تیرے جلوؤں میں نہاں اندوہ کے بادل بھی ہیں ہنستے گلزاروں سے ملحق موت کے جنگل بھی ہیں

تیری فطرت میں رہا تیری جبلت میں بسا ہے ترے نغمات کے پردے میں فریاد و بکا

تیرے فتنے ہیں شرافت کو کچلنے کے لئے ظلم آتا ہے ترے دامن میں پلنے کے لئے

تیری رفتار میں انداز میخواروں کا ہے آستینوں پر مقدس خون ناداروں کا ہے

شرم ہے تجھ میں نہ غیرت ہے نہ خوئے احترام تیری الفت بے صداقت تیرا کینہ بے لگام

تیرے نشتر مسکراتے ہیں لبِ ناسور پر جگمگاتے ہیں ترے خنجر سرِ مزدور پر

کھا کے اپنی گود کے پالے ہوئے جیتا ہے تو توڑ کر اولاد کی گردن لہو پیتا ہے تو

ننگ ہے اب تجھ کو وہ تعلیم وہ زورِ حیات جس سے جھک جاتا تھا باطل جس سے بن جاتی تھی بات

اب کہاں وہ علم جس سے تقویت پاتی تھی روح جگمگا جاتا تھا سینہ نور برساتی تھی روح

تیرا موجودہ رویہ انقلاب انگیز ہے
دیکھ یہ پیمانۂ ظلم و ستم لبریز ہے

احسان بن دانش

قدیم مرشدانِ یونان کے ساتھ تجدیدِ بیعت

ڈاکٹر انج اور جستجوئے دین و دانش

مترجمہ اسرائیل احمد

مسٹر رچرڈ لیونگسٹن، جو ہمارے صفِ اول کے ماہرین یونانیات میں سے ہیں، ابھی حال ہی میں آربرلین کالج ریاستہائے متحدہ امریکہ میں "قدیم اہلِ یونان کے مطامحِ نظر اور حیاتِ حاضرہ" کے موضوع پر خطبات کا ایک سلسلہ دیتے رہے ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ جدید العہد اہلِ یورپ کے پاس اب کوئی تفسیرِ حیات باقی نہ رہی۔ ہم نہیں جانتے کہ ہم کس چیز پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اس لئے ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم کیا چاہتے ہیں! "عیسائیت اب یورپ کا مسلک نہ رہی۔ اور کسی دوسرے مشرب نے اُس کی جگہ بھی نہ لی!" پس بقول گریہم ولیز کے، یہ امر کچھ قبل از وقت نہیں کہ ہم اپنے اس میکانکی تمدن کے جہانِ نو میں دین و دانش کی قدیم الایام جستجو بارِ دگر شروع کر دیں۔ "کیا اس شدِّ رحال" میں عہدِ باستان کے اربابِ یونان، ہماری کچھ رہنمائی و دستگیری کر سکتے ہیں؟ صاحبِ خطبات کا جواب اثبات میں ہے۔

خطیبِ موصوف کا خیال ہے کہ "یونانیت" ہم کو اس شدت سے متاثر کر رہی ہے کہ ہم بجا طور پر اک نئی "نشاۃ ثانیہ" کا ذکر کر سکتے ہیں۔ وہ جس کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا! اس قول کی یہ تعبیر نہیں کہ آج کل بہ نسبت پہلے کے زیادہ لوگ یونانی زبان و ادب کا مطالعہ کرنے لگے ہیں! ہمکو معلوم ہے کہ معدودے چند طالب علم ہی یونانی زبان و درسیات کو کیا کرتے ہیں۔ کہنے کا منشا صرف یہ ہے کہ دورِ حاضر میں جو ہمارے زعماء فکر ہیں یونانی تصورات اُن کے لئے ایک خاص کشش کا باعث ہو رہے ہیں۔ مِل، جسے یونانی کی لسانِ قدس کی بسم اللہ تین برس ہی کے سن میں کرادی گئی اور جو اس غلط بسم اللہ سے جاں بر بھی ہو گیا۔ یونانی اخلاق میں عین وہی اوصافِ اخلاق پاتا ہے جس کا وہ خود دلدادہ تھا۔ یعنی عدل، اعتدال، رعایت، رفاہِ عامہ، حفظِ مراتب باعتبار ہنر ذات نہ کہ بہ لحاظ وصفِ اضافی۔ محنت و ریاضت نہ کہ تن آسانی و رکابجوئی!

ایچ۔ جی۔ ولیز جو ہمارے عہدِ جدید ترین دل و دماغ ہے، کہتا ہے کہ "میں نے افلاطون کی ذات کے طاقت ور تصرف کو اپنے اوپر اس طرح محسوس کیا کہ گویا وہ ایک برادرِ بزرگ کا بازوئے قوی ہے جو جھک کر میرا ہاتھ پکڑتا ہے اور مجھے اوپر اٹھا رہا ہے"۔ مصنف کا خیال ہے کہ محوزہ بالا "جدید نشاۃ ثانیہ" کے خالق دو خاص اسباب ہیں۔ اولاً نظامِ حرفتیت کے نظریہ اور نتائج کے خلاف اک ردِ عمل، اور ثانیاً مذہب کے اقتدار و استناد کا کمزور پڑ جانا! اب مجلسی مصلحین، آزاد خیال، متفقہین و متکلمین، نیز متشککین۔ ملحدین ایسے تمام اشخاص کیلئے یونانِ قدیم اپنے اندر ایک وجہ کشش رکھتے ہیں!

واضح رہے کہ جب رچرڈ لیونگسٹن۔ یونانیوں کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کا معہودِ ذہنی خاص طور پر افلاطون و ارسطو ہوتے ہیں! قدیم یونان کے ان اساطینِ حکمت کا تقابل ہمارے دورِ حاضر کے ماضی قریب کے ایسے ارکانِ علم سے ہو سکتا ہے جیسے کہ کارلائل، رسکن اور مل وغیرہ تھے۔ یقیناً ہمارے مدبرین، تجار، ناول نگار اور اہلِ صحافت اس زمرۂ عالی میں داخل نہیں کئے جا سکتے۔ جو افلاطون و ارسطاطالیس کے پہلو بہ پہلو رکھے جا سکیں! میں بلاشبہ اس خیال پر آمنا و صدقنا کہتا ہوں ثقافتِ یونان کے آسمان کے ان آفتاب و مہتاب سے بہت کچھ اقتباسِ نور کرنا ہے

چنانچہ ایک لمعۂ تاباں ان شمس و قمر کا یہ ہے کہ سیاسی مجلس و ادارات کے "وجود کا مقصود یہ ہے کہ ایک برگزیدۂ حیات معاشرتی ان کی سربراہی میں پیدا کی جائے۔ نہ کہ ان کے سررشتہ سے منسلک کر کے جانوروں کا ایک گلہ بنا دیا جائے"! "ایک دوسری برق کی تنویر دیکھئے" "کیا آپ اس خیال خام میں ہیں کہ سیاسی موسسات کے پس پشت عوام کا انعام کے دانہ کے سوا کوئی بہتر رہنما چیز ہوتی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ مویشی کا یہ گلہ ہی اپنا گلہ بان ہے"!۔۔

اگر ان قدیم حقایق کو ہم فراموش نہ کر دیتے تو زمانہ حال کی بہت سی امید شکنیوں اور تلخ کامیوں سے بچ جاتے، اگر ہماری سیاسیات کا بر خود غلط نصب العین یہی ہے کہ بد معاشوں کے اک جنگل کو ایک پر امن و آئین شہر اک معادل و کامل سوسائٹی میں تبدیل کر ڈالیں تو یہ طفلانہ آرزو بڑی قابل رحم ہے! عجائب خانۂ سیاست میں کوئی ایسی پولیٹکل کیمیا نہیں ہے جس کی بھٹی کے اندر زنگ خوردہ آہن سیاہ سے کندن ایسی شہرت کے سکے ڈھالے جا سکیں ع

عمال ہیں بس یہی ہمارے اعمال

اک دوسرا منظر سیاست ملاحظہ فرمائیے! ارسطو کمیونزم کی بڑی سرد مہرانہ و ستم ظریفانہ اڑا دیتا ہے۔ چنانچہ بالفاظ اس کے اجتماعیت کے سایۂ عاطفت میں اس کے تشریعی کاروبار "ایک جنت نگاہ اور فردوس گوش" کے سامان بہم پہنچاتے نظر آتے ہیں! سامعین کا ایک مجمع جب اس قسم کے مخاطبات کو سنتا ہے تو باغ باغ ہو جاتا ہے۔ بالخصوص جبکہ ہیئت اجتماعیہ کے مروجہ مفاسد و شدائد پر اس پیرایہ میں گفتگو کی جاتی ہے کہ گویا وہ تمام و کمال شخصی ملکیت کے ثمار خبیثہ ہیں، اور پھر یہ پیام جاں نواز اور بشارت عظیم سنائی جاتی ہے کہ کمیونزم کے پرچم کے نیچے ایک سحر نما طریقے سے ہر شخص دوسرے شخص کا برادر حقیقی بن جائیگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے، ان تمام مصائب و نوائب کی علت العلل فطرت انسانی کا پاجی پن ہے!"، ارسطو کی نسبت بعض ناقدین کا فیصلہ ہے کہ وہ علوم و معارف میں ہرفن مولا کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس کے کان دماغ کی برآوردہ میں زر خالص کا ایک افسوسناک فقدان پایا جاتا ہے! یہاں بھی ارسطو کا استدراک اپنے ازلی سقم سے مجروح نظر آتا ہے! اجتماعیت کا نظریہ طبیعت بشری کے شر سے ناآشنا نہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کے اس کا معرکہ آرا "انقلاب پرور انکشاف یہ بھی ہے کہ فطرت انسانی کے بیشتر عیوب کا راز نظام ملکیت و سرمایہ داریت کے تحت اس کی محرومی و مظلومی ہے! گویا اس مریض کے متعفن تنفس نے ہوا کو مسموم نہیں کیا ہے، خود اس مسموم آب و ہوا نے جراثیم امراض کا ایک "بے پناہ ماحول" پیدا کر دیا ہے۔ !اھ

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی ؛ فتنۂ شور قیامت کس کے آب و گل میں ہے!

ذہنوں سے دونوں لعنتیں —— افلاس اور سوءِ اخلاق —— اس طرح ہم رشتہ و پیوستہ نظر آتی ہیں کہ اس تنقیح کی تحقیق کے لئے تھوڑی دقت نظر کی ضرورت تھی کہ ہر دو میں سے لازم کون ہے۔ اور ملزوم کون؟ مقدم کون ہے اور موخر کون؟ تاہم یہ ایسا مغالطہ انگیز نہ تھا کہ "ارسطو" کو اس میں تشابہ لگجاتا! لیکن ع

غلطیہائے مضامین مت پوچھ!

اک صحیح و صالح ہیئت اجتماعیہ کے قیام و استحکام کے لئے غلاموں کے اک مستقل طبقے کو ضروری قرار دینے والا ارسطو اگر کمیونزم کے زیر علم کھڑی ہونیوالی مبارک اخوت بشری کے نظارے کی تاب نہ لا سکے تو چنداں تعجب کی بات نہیں! ارسطو ایسے شاگرد رشید پر تو اس کے زندہ جاوید استاد افلاطون کا سارا فلسفۂ حیات ہی بار ہے کونسا ایسا خیالی اصول ہے جس کی تقلید میں وہ اپنے مرشد سے غداری اختیار نہیں کرتا! جس ارسطو کو سکندر اعظم ایسے قیصریت کے بت مہیب کا مجسمہ ساز بننا تھا وہ افلاطون کا افسون اپنے اوپر کیونکر چلنے دینے والا تھا؟! قَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَل لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ !اھ

صحبت اہل صفا سے تیرہ دل کب صاف ہوں

زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں (مترجم)

الغرض ہم کو اپنی سیرت کی اصلاح سے کام شروع کرنا چاہئے۔ "اور ہم کو اپنی انفرادی سیرت کی اصلاح کے آغاز کا کام اپنی کلی ہیئت اجتماعی کی درستی سے کرنا چاہئے" اعضائے رئیسہ کے عوارض کو نظر انداز کر کے انگلیوں کے پوروں کی پھنسیوں کی صفائی کے درپے ہونا یا ارسطو کا اصول طب ہوگا یا تقدس مآب پادری انج کا عمل تزکیۂ روح۔ (مترجم) کتاب مقدس کا پیغام بھی یہی ہے —— قلب سے قالب کی طرف! ربلاشبہ! لیکن آپ نے تو اس کے عملی اطلاق کو بالکل منقلب کر دیا! شاید یہ "سرمایہ نواز کلیسائیت" کا غیر شعوری تصرف ہوا! - مترجم)

اچھا وہ کونسا ڈھانچۂ زندگی ہے جو ایک صالح القوام نفس انسانی کے تمام مقتضیات کو پورا کرتا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جسے یونانیوں نے اپنے تمام مذاکرات حکمت کا محور جلی بنا لیا تھا اور یہی وہ تنقیح ہے جسے ہم نے اپنے طاق نسیاں کا نقش و نگار بنا رکھا ہے! کیا ہم بھی یہ عقیدہ ہے کہ انسانی مسرت و سعادت کا راز اس میں مضمر ہے کہ ہماری جبلات نفسی کی ایک مربوط و متوازن ورزش و پرورش عمل میں آئے؟! کیا ہم بھی اسی شرب حیات کے قائل ہیں

کہ اک زندگی جس کی احتیاجات قلیل ترین ہوں اور جس میں فرصت لگ کافی ہو، صالح زندگی کے دوارکان کیسے بخشتی ہے؟!

عقلائے یونان اس فرصت پر بہت زور دیتے تھے۔ لیکن اُن کی مصطلحہ فرصت کے معنی خواہ کچھ ہی ہوں یا نہ ہوں وہ لوگ تھے جس کے اعتبار سے فرصت اور عقل ہم معنی ہو جائیں! یونانی نظم جماعت میں خواص کے لئے فرصت کی فراہمی کا کام اُن کے غلام انجام دیا کرتے تھے۔ آج علوم طبیعہ اور فنون جدیدہ نے ہمیں اس غلامانہ مشقت سے مستغنی کر دیا ہے۔

اچھا۔ کیا یونانی اطبا، اور حکما، کی طرح ہمارا علم الابدان وعلم الادیان بھی یہ توجیہ رکھتا ہے کہ نیکی روح کی تندرستی، خوبصورتی اور خوشحالی کا دوسرا نام ہے، اور بدی عبارت ہے روح کی بیماری، بدصورتی، اور کمزوری سے؟! ایڈکن کالج کے خطیب کا قول ہے کہ یہی کلمات تھے اخلاق فطرت کے تمامی مسلک کے جامع ترجمان ہیں۔ وہ ہمیں ایک جامع و مانع معیار پہنچاتے ہیں جسم، دماغ اور روح کی صحت، اور اک شایان و شائستہ زندگی میں ہمارے تمام ممکنات حیات کی ورزش و پرورش!!

اور پھر تاریخ عالم کی اس بوالعجبی کو دیکھئے کہ یونانی لوگ بحیثیت نوع بشری کے سب سے زیادہ خوش قسمت نسل تھی جو مبدء فیاض کے عطیات سے شادکام ہوئی — سر فرینسس گیلٹن کا فیصلہ ہے کہ پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کے اہل ایتھنز ہم پر اُس سے کہیں زیادہ بالا و برتر تھے جتنے کہ ہم (اہالیان یورپ) افریقہ کے وحشیوں پر ہیں!۔ انھوں نے ایک قومی خودکشی ارتکاب کرکے اپنا کام تمام کیا! غالباً اُن کی آبادی کی پوری نصف تعداد اُن کی احمقانہ اور غیر ضروری جنگوں کی نذر ہوئی! اس خونریز جدال وقتال کا ایک گوشہ اُن کے شہری اور قبائلی نزاعات ومشاجرات تھے کیا ہم یہاں انگلستان میں بہ حیثیت جماعت کے آنے والے کسی ایسے دور کا تصور اپنی چشم تخیل سے کر سکتے ہیں جس میں قریۂ برکشائر کے کسان اور دہقان زیر سرکردگی لارڈ لیفٹننٹ، اک بے کیف موسم کی فضا میں آکسفرڈ پر دھاوا بول دیں۔ اور ندی کی چھاتی پر تیرنے والے سارے بجروں کو جلا ڈالیں، اور اور اس کے انتقام میں پھر آکسفرڈ کے دو ہزار اندر کر یحویٹ دریا کو عبور کریں اور دوسرے ساحل پر اس خاکسار کے سیبوں کے باغ کا ستھراؤ کر ڈالیں؟!

شائستہ سرزمین یونان پر جو معاملہ پیش آیا اُس کی یہ ایک نرم تعبیر ہے! جنگ وپیکار اُن کے شب و روز کا شغل بیکاری ہو گیا تھا۔ آغاز جنگ کے لئے وہ کسی اعلان جنگ کو بھی ضروری نہ سمجھتے تھے! واقعہ یہ ہے کہ اعلانِ امن کے عین شادیانوں سے وہ اپنے طبلِ جنگ کو ہمساز کر لیا کرتے تھے! بیش بہا متاعِ انسانی کا یہ اک ایسا اتلاف تھا جس کی نظیر جنگ عظیم کا ضیاعِ نفوس بھی نہ پیش کر سکا! اس سیلاب خون میں سارے درجۂ اول کے فرزندان یونان بہ گئے! مرد و زن کی صنفین کے مابین اب توازن اس طرح قائم رکھا جاتا تھا کہ وہ اپنی نومود بچیوں کو ہلاک کر دیتے تھے اور اتنی ہی بے تکلفی کے ساتھ جتنی بے تکلفی سے ہم غیر مطلوب بلی کے بچوں کو ضائع کر دیا کرتے ہیں! ان ایام کی تواریخ یونان میں مجھے ایک واحد نظیر بھی ایسی نہ ملی جس میں فی خاندان ایک سے زیادہ لڑکی کا ذکر ہو! جزیرہ سسلی میں جب ایک قبرستان کھود کر برآمد کیا گیا تو ۸۷ جنازوں میں سے پورے ۳۲ دختران کشتہ معصوم تابوت تھے!!۔

اہل روم نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس دور میں دانشمندان یونان کی عقل وفہم اس قابل رحم نوبت کو پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنے نیک ریڈ کے تیر سے ہی عاری ہو گئے تھے! وہ رشوت کا آسان شکار بن جاتے تھے۔ اور بکثرت موقعوں پر انھوں نے اپنے اہل وطن سے شرمناک غداری کی!! اس زمانہ کے تعیمسا کلیز اور الیسی بیاڈیز ہمارے اپنے عہد کے وبنی زیا لوس کے مثنیٰ تھے — بشرطیکہ اس تشخیص وتمثیل میں نادانستہ مجھ سے ارسٹ کے اس مدبر کے خلاف ناانصافی نہ سرزد ہو رہی ہو!

نظری حیثیت سے بھی یونانی نصب العین بعینہ ہماری طرح کا نہیں ہے۔ مرد شریف کے متعلق جو ہمارا تصور ہے۔ اُس میں ایک خاص گاتھک عنصر موجود پایا جاتا ہے۔ جو صرف سواحل بحر روم کے ممالک میں کبھی بیخ گیر نہیں ہوا! چنانچہ ایک طرف ہمیں دیکلیز نظر آتا ہے، جو ایک آتشیں مزاج اور مغلوب الغضب نیم وحشی ہے۔ دوسری طرف عیاّر حیلہ ساز اُڈوسیز ہے۔ جو اک نمونے کا یونانی ملاح ہے۔ وہ جو ہر لنگرگاہ میں ایک حیلۂ عروسی آراستہ کر لیتا ہے، اور ہر مشکل کا حل ایک قولِ باطل سے بہم پہنچاتا ہے! ارسطو کا بلند نفس انسان جو اپنے کو بلند کارناموں کا شایاں سمجھتا ہے، اور جو خود ان بلند کارناموں کو اپنے انتساب سے بلند رکھتا ہے، یا دش بخیر ہمارے لارڈ کرزن بخوانی کا آئینۂ چشم نظر آتا ہے!

ہم اس قماش کے انسان کو اک گونہ مضحک شے سمجھتے ہیں! ہمیں شاید بادل ناخواستہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ یونانی لوگ بالقدر سے "خود ملغ" واقع ہوئے تھے! پلوٹارک کہتا ہے کہ فیڈیاس اور پالی کلیٹس عظیم بت تراش تھے، لیکن اُن کے چہرۂ سیرت میں شرافت کے کون سے ایسے خط وخال نظر آتے ہیں کہ کوئی بھلا مانس اُن جیسا بننا پسند کرے گا؟!

اب رہے حضرات "مشائین" جو تاریخ میں غیر مذہبی اخلاق کا وسیع ترین نمونہ ہیں، اُن کا نادرہ کار کرشمہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے تحفظ کے لئے اپنے گرد اگرد اک حصار حدید ی تعمیر کیا تھا؛ چنانچہ اُن کے ملفوظات میں ایک فرمودہ یہ ہے کہ "جو آنکھیں دوسروں کی مصیبت پر معلق ہیں۔ اُنھیں ضعف نظر کی شکایت ہے!" "اگر آپ مصیبت میں ہوں تو وہ آپ پر اظہار "تململ" تو کافی فرمائیں گے" لیکن اس "تململ" میں "تاسف" کی کوئی وضع نفسی نہ ہوگی!۔ حقیقی ہمدردی جس کا سرچشمہ رقت قلب ہے اہلِ یورپ کے تار و پود اخلاق میں خاص الخاص مسیحیت کا ریشۂ ریشمی ہے!

میں اس عامیانہ اعتقاد کا بھی قائل نہیں کہ مسیحیت کا اخلاقی اثر فی زماننا نام نہاد قرونِ ایمان سے کچھ کم ہے جس شخص نے گرگوری آف ٹورس، یا ایطالوی نشاۃ ثانیہ کے مصنفین یا عہد متوسط کے فرانس کے متعلق لیوکین، یا آلمیکی، یا تعدیات مذہبی یا تمام انجیل کے نخجیرت کے متعلق اُن کی تصنیفات کو پڑھا ہے وہ اس بات پر مشکل یقین لا سکتا ہے کہ انسان کے چلن پر کلیسا کی ترغیبات و ترہیبات نے کچھ بھی بہتر اثر پیدا کیا ہے!

قصۂ مختصر مجھے اس خیال کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں کہ ہم اہلِ مغرب آج کسی جامع و نافع، کسی واضح و قاطع معیار قدر کے فقدان کی وجہ سے ایک لنگر گسستہ کشتی کی طرح بہ رہے ہیں نیز یہ کہ قدیم ارباب یونان کا مشرب انسانیت جیسی کہ اس کی تفسیر افلاطون و ارسطو نے کی ہے اس ضرورت کو بہم پہنچانے میں معتد بہ امداد دے سکتا ہے۔

شاعر کی بخشش

زمانے کو اوجِ نظر بخشتا ہوں — جو جھکتا نہیں ہے وہ سر بخشتا ہوں
ادب کر مرا کشورِ ہند ادب کر — کہ لاکھوں دلوں کو نظر بخشتا ہوں
مری قدر کر اے خدائے تجلّی — کہ شامِ وطن کو سحر بخشتا ہوں
گدا ہوں، مگر وہ گدائے غنی دل — کہ تاج و کلاہ و کمر بخشتا ہوں
دہکتے ہوئے دل کی چنگاریوں سے — شگوفوں کو سوزِ شرر بخشتا ہوں
دلِ خس کو دیتا ہوں بجلی کی شوخی — صدف کو مزاجِ گہر بخشتا ہوں
جلا دے کے آزاد اندیشیوں سے — سرِ فکر کو تاجِ زر بخشتا ہوں
کہاں تک یہ فریاد اے مُرغِ بسمل — اِدھر آ کہ میں بال و پر بخشتا ہوں

جسے بخشتا ہوں حیات و جوانی
بہ اندازۂ بحر و بر بخشتا ہوں

جوشؔ ملیح آبادی

حُسن و عشق

میں نے کہا کہ حُسن ترا، شہریار ہے   اُس نے کہا کہ عشق ترا، تاجدار ہے
اُس نے کہا کہ تیرا قلم اک بہار ہے   اور شعر پر تو تیرے مرا دل نثار ہے
میں نے کہا کہ مطلعِ صبح اور یہ شفق؟   اُس نے کہا کہ آنکھوں کا میری خمار ہے
میں نے کہا گلاب کا یہ رنگِ شبنمی   اُس نے کہا شباب کا میرے نکھار ہے
میں نے کہا کہ لالے کی یہ خونفشانیاں   اُس نے کہا کہ تیرا دلِ داغدار ہے
میں نے کہا کہ چاندنی راتوں کا یہ سکوت   اُس نے کہا کہ حُسن کا اک رازدار ہے
میں نے کہا کہ راتوں میں اک دل کی دھڑکنیں   اُس نے کہا کہ میرے لئے بیقرار ہے
میں نے کہا کہ حُسن کے آگے قبائے عشق   اُس نے کہا کہ جانتے ہو تار تار ہے
میں نے کہا کہ تیری محبّت کو دیکھئے   اُس نے کہا کہ وہ تو مری دل کے پار ہے
میں نے کہا کہ مجھکو تو اس کی خبر نہیں   اس نے کہا کہ میری حیا پردہ دار ہے
میں نے کہا کہ عشق میں یہ گریۂ و فغاں   اُس نے کہا کہ حُسن کو یہ ناگوار ہے



ورجل اپنے دوست "۔ سیفا" کے مکان پر۔ ہوریس اور ویریس بھی ہمراہ ہیں

کلیہ ص ۱۸۵



ورجل کی نظم سنکر اوکٹیویا پر غش طاری ہوگئی

میں نے کہا کہ کونسا عاشق ہی کامیاب — اُس نے کہا جو عشق میں بھی باوقار ہے

میں نے کہا کہ حُسن کی فطرت ہے خود پسند — اُس نے کہا کہ عشق میں لیکن وہ خوار ہے

میں نے کہا ثبوت؟ کہا بھولئے نہیں — شیریں کا دیکھ لیجئے کیا حالِ زار ہے

مجنوں قتیلِ خنجرِ لیلیٰ سہی مگر — لیلیٰ کو کیا ہوا ہے جو یوں سوگوار ہے؟

اِس کو بھی جانے دیجئے ہم آپ خود ہی ہیں — کہیئے کہ سب سے عشق پہ کچھ اعتبار ہے؟

حیراں تھا میں یہ حُسن ہے حالانکہ عشق کا

بندہ نہیں ہے حُسن تو پروردگار ہے

ملّا رموزی

اس ماہ کی تصویریں

حضرت مسیح کی پیدائش سے قبل کبھی یورپ علوم و فنون کا گہوارہ رہ چکا ہے یونان کا پرانا فلسفہ و تمدن عصر حاضر کے مفکرین کو اب بھی دعوت غور و فکر دیتا ہے۔ سلطنت روما کی قدیم عظمت و شان کے مرقع اب بھی بانیان سلطنت کی آنکھوں میں نئی نئی دنیا کے نقشے کھینچتے رہتے ہیں! اُن کی رزم و بزم کی کہانیاں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کی آتش بیانیوں سے جسم میں حرارت اور خون میں جوش پیدا ہو جاتا ہے۔

اس مہینے کے کلیم میں ہم نے ایسی ہی تصاویر کا اہتمام کیا ہے، جو قدیم مغربی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہیں اُمید کہ ناظرین اس انتخاب کو پسند فرمائیں گے۔

ایتھنز کا سکول۔ اس تصویر کو اگر آپ بغور ملاحظہ فرمائیں گے، تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ تصویر غور و فکر، تجسس و تلاش، ”دقتِ نظر“ ”عجز و انکسار“ شوق مطالعہ اور تحصیل علم کا زندہ مرقع ہے آجکل نہ صرف ہمارا او ہیڑ او جوان طبقہ بیس پچیس سال کی عمر کے بعد تحصیل علم کو خیرباد کہہ دیتا ہے۔ بلکہ نوجوان طلبا تک کالج کی تعلیم کے بعد کتابوں کو چھونا تک حرام سمجھنے لگتے ہیں۔ اس تصویر کو آپ بائیں جانب سے دیکھنا شروع کیجئے

بائیں جانب وسط میں ایک بزرگ کتاب ہاتھ میں لئے دوسرے سن رسیدہ شخص کو کچھ سمجھا رہے ہیں، ذوق علم ملاحظہ ہو کہ بچے سمیت آپ اسکول میں بھاگ کر تشریف لے آئے ہیں۔ ان کی برابر میں نیچے کی طرف ایک صاحب کھڑے ہوئے کتاب میں سے کچھ پڑھ رہے ہیں اپنے گرد جو احباب بیٹھے ہوئے لکھ رہے ہیں ان کا انہماک تقدس شوق و تجسس علم کے جذبات ذرا ان کے چہروں پر ملاحظہ کیجئے! ایک بزرگ جو پتھر کے ستون کے برابر بیٹھے ہیں قطعی بہرے معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ وہ سن کر لکھنے کے عوض دوسرے کی کتاب سے نقل کر رہے ہیں، دوسری طرف ایک بزرگ پتھر کی چوکی کو میز بنائے نہایت سکون سے چھوٹے سے کاغذ پر صرف ضروری نوٹ لے رہے ہیں اور دنیا و مافیہا سے بالکل بیخبر ہیں

انکو چھوڑ کر اب آپ تصویر کے دائیں جانب نیچے کی طرف نگاہ ڈالئے بیصبری کے عالم میں ایک بزرگوار نہ کھڑے ہی ہیں اور نہ بیٹھے ہیں، زمین پر عجیب طریقے سے جھکے ہوئے پرکار سے ایک مشکل مسئلہ کو حل فرما رہے ہیں۔ چاروں طرف طالب علموں کی بھیڑ ہے۔ ایک صاحب جب مسئلے کو نہ سمجھ سکے تو حیرت سے استعجاب سے اپنے ساتھی کا منہ تکنے لگے۔ اب تصویر کے انتہائی دائیں کونے کو ملاحظہ کیجئے۔ ہاتھ میں کرۂ زمین کا نقشہ ہے، عالم بالا

باقی مضمون صفحہ ۳۷۶ پر ملاحظہ کیجیے

ترقی پسند مصنفین کی تحریک

سید سجاد ظہیر بی، اے (آکسن) بار ایٹ لا

ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو شروع ہوئے اس ملک میں ابھی صرف چھ یا سات مہینے ہوئے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے ہمارے ملک کی ادبی فضا پر اس نئی تحریک کا ایک گہرا اثر پڑ گیا ہے اور یہ اثر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ بمبئی، احمد آباد، پونا، گوالیار، کلکتہ، پٹنہ، بنارس، الہ آباد، کانپور، علیگڈھ، دہلی، لاہور، لندن میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی جماعتیں بن گئی ہیں۔ اور امید کی جاتی ہے کہ چھ مہینے کے اندر اندر چھ سات شاخیں اس انجمن کی اور قائم ہو جائیں گی۔

ہم نے اپنے اغراض و مقاصد کا اعلان لکھنؤ کی آل انڈیا ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں کر دیا تھا۔ جو ہندوستان کی ہر بڑی زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے لیکن یہاں پر میں اس تحریک کی ابتدا کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

تقریباً تین چار برس سے ہندوستان کے کچھ نوجوان مصنفین یہ محسوس کر رہے تھے کہ ہمارے ادب میں ایک نئے رجحان، ایک نئی روح کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس کا احساس ہو رہا تھا کہ ہماری تہذیب کے تمام دیگر شعبوں کی طرح۔ ہماری شاعری، ہمارے افسانے اور ہمارے مضامین، سب کے سب ہماری زندگی کی اصلی باتوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ہمارا ادب بالکل رسمی ادب ہو کر رہ گیا ہے یعنی یہ کہ اس نے حقیقت گوئی سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ اور وہ بے بنیاد تخیل کی بیہودہ فضا میں اسی طرح معلق ہے جس طرح ہمارے فرقہ پرست لیڈر اپنی خود غرضی، ملک فروشی، جہالت، اور مکاری کو مذہب اور روحانیت کے نور میں چھپا کر عوام کی آنکھوں پر پردے ڈالے ہوئے ہیں۔ ہمارے لٹریچر میں وہ لکھنے والے جو ہمارے دل و دماغ کو سچائی سے دور رکھنا چاہتے ہیں رجحان کر یا بے جانے جذباتی بے لگامی، پژمردہ روحانیت، اور بے عقلی سے اپنی تحریروں کو بھر دیتے ہیں۔

آج ہماری اصلی حالت تو یہ ہے کہ ملک میں لاکھوں کروڑوں آدمی مرد عورت اور بچے بھوک، ناداری اور افلاس کا شکار ہیں تعلیم صرف آٹھ فیصدی تک محدود ہے۔ پڑھے لکھوں میں بے روزگاری بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ سیاسی طور پر ہم غلام ہیں۔ لیکن ہمارے بہتیرے ادیب معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی دوسری دنیا کے رہنے والے ہیں۔ جب کسی قوم پر مصیبت آتی ہے تو ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ نہایت بلند ہمتی کے ساتھ، ہم اپنی تمام ذہنی جسمانی اور مالی قوتوں کو اکٹھا کریں، دوست اور دشمن کا ٹھیک ٹھیک فرق سمجھیں۔ اور ان تمام باتوں کا ایک سرے سے خاتمہ کر دیں جو ہمارے گروہ میں انتشار مایوسی، گھبراہٹ پیدا کرتی ہیں اور ایسے جذبوں کو ابھارتی ہیں جن کی وجہ سے ہمیں اپنی طاقت کا صحیح اندازہ کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس جد و جہد میں ادیب بہت بڑا حصہ لے سکتے ہیں۔

ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے ادب میں نئی جان اسی وقت پڑ سکتی ہے جب ہم اس کی بنیاد سچائی پر رکھیں زندگی کا مشاہدہ کریں، بلکہ زندگی میں خود حصہ لیں۔ ہر طرح کا تجربہ کر کے خود حقیقت کو معلوم کریں۔ اپنے تجربوں اور دوسروں کے تجربوں کو اپنے ادب کی بنیاد بنائیں۔ اور اس ٹھوس بنیاد پر ایسی عمارتیں تعمیر کریں۔ جن کی خوبصورتی سے ہمیں مسرت کے بلند ترین درجے نصیب ہوں۔ اور پھر یہ مسرت ہمارے دماغ اور دل پر کچھ ایسا اثر ڈالے کہ ہمیں صحیح عمل کی طرف مائل کر دے۔

ہم جانتے ہیں کہ آج اس ملک میں ایسی طاقتیں بھی ہیں جو ہمیں . . .

خیالی اور رجعت پسندی کی طرف کھینچتی ہیں۔ ہمارے یہاں ایک بہت بڑا گروہ لیے حضرات کا ہے جو رات دن یہی راگ گایا کرتے ہیں کہ عقل بڑی بُری چیز ہے۔ اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے ان عقل کے دشمنوں کے ہم "عقلمند" (گستاخی معاف) دوست نہیں۔ انسانی عقل ہم جانتے ہیں غلطیاں کرتی ہے، دھوکہ کھاتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ہمیں تو کوئی دوسری چیز نہیں نظر آتی جس پر ہم بھروسہ کر سکیں۔ ہماری عقل کی مشعل ہی سب کچھ ہے

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تاریخی حیثیت سے جو گروہ اور طبقے سماج کو ایک بہتر اور بلند تر نظام کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ ان کی مخالفت ادبی، ذہنی سطح پر ہمیشہ ہی کی شدت سے کی جاتی ہے۔ مثلاً انقلاب فرانس کے پہلے روادارِی، عقلیت، سائنٹیفک جس کے پیرو فرانس کی بڑھتی ہوئی جمہوری طاقت کے علمبردار تھے۔ استبداد اور ملوکیت کے ساتھی۔ والٹیر، دیدرو اور دوسرے ترقی پسند عالموں کے خلاف تھے۔

ہم جانتے ہیں کہ آج یورپ اور امریکہ میں بڑے سے بڑے لکھنے والے سائنسدانوں اور محققوں نے اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ جمہوری اصول کے قائل ہیں اور وہ اپنے کو عوام کی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتے ہیں۔ میں خود پیرس کے ایک عظیم الشان جلسے میں موجود تھا جس میں فرانس کے ایک بہت بڑے عالم موسیو پال ریوے نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ وہ اپنی ذات اور اپنے علم کو عوام کی خدمت کے لئے وقف کر دینا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ ہزاروں ادیب اور اہل دماغ یورپ اور امریکہ میں آج عوام کی آزادی کی تحریک میں عملی حصّہ لے رہے ہیں جنگ اور فاشزم کے خلاف جد و جہد کر رہے ہیں۔ اور اس طرح دنیا میں تہذیب اور تمدّن کی مشعل کو روشن رکھنے میں معین ہیں۔ اس کے برخلاف فاسسٹ سرمایہ دار جو جمہور کے دشمن ہیں علم اور عقل اور فن کو ہر طرح مٹانے کی فکر میں ہیں آئنسٹائن کے سے شہرۂ آفاق عالم کو آج اپنے وطن میں رہنے کی اجازت نہیں۔ ہزاروں جرمن عالم اور ادیب وطن سے باہر نکال دیئے گئے ہیں۔

دنیا میں آج دو طاقتیں ہیں جو زندگی کے ہر شعبے میں برسرِپیکار ہیں۔ ایک طرف تو استبداد ہے جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا طاقتور مالدار طبقہ۔ جہالت، رجعت پسندی تاریک خیالی۔ تہذیب اور تمدن کی موت یہ سب چیزیں پائی جاتی ہیں۔

دوسری طرف جمہوری طاقت ہے جس سے عوام مظلوم، خون میں ڈوبی ہوئی مگر زندہ انسانیت، عقلیت، علم، روشن خیالی، حقیقت پرستی اور تہذیب اس سے وابستہ ہے۔

ترقی پسند مصنّفین چاہتے ہیں کہ وہ اس دوسری طاقت کا ساتھ دیں۔ انھیں خیالات انھیں جذبات پر اس تحریک کی بنیاد ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری تحریک بڑھیگی اور مضبوط ہوگی۔ ہماری ذہنی زندگی میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیگی۔

اُردو ہندی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس

۱۴۔ اور ۱۵۔ نومبر کو الہ آباد میں ہندوستانی (اردو اور ہندی) ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوگی۔ منشی پریم چند، جوش ملیح آبادی، پنڈت رام نریش ترپاٹھی، سریمتی مہادیوی ورما، اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر عابد حسین، رام کمار ورما وغیرہ کے نام سے کانفرنس کا دعوت نامہ شائع ہوا ہے۔ تمام اُردو اور ہندی مصنفین سے درخواست ہے کہ وہ اس کانفرنس میں شریک ہو کر اسے کامیاب بنائیں۔

بقیہ صفحہ ۳۷۲

اور کرۂ خاکی کا ذکر ہو رہا ہو چاروں طرف کھڑے ہوئے طالب علم حیران اور خاموش ہیں ۔ افلاطون کا عالیہ کا معنوی رخ کر رہا ہے
ان تشنہ لب بزرگوں کو چھوڑ کر اب ذرا اوپر کی سیڑھی پر نظر ڈالئے ایک طرف سے دوسری طرف تک
ارباب علم و فضل کے ہرے کے پرے جمے ہوئے دکھائی دیتے ہیں درمیان میں سقراط بیٹھا ہوا ہے
اس کے برابر اس کے شاگرد السی بیاڈیس، زنوفن، ایسکنیز، ارسٹوٹل، تھیوفریسٹس، ہائی پیار میں، وغیرہ کھڑے ہوئے
اس کا لیکچر سن رہے ہیں۔ اور اس کے پند و نصائح سے اپنی تشنگی بجھا رہے ہیں
یہ تصویر دنیا کے مشہور مصور رافیل کا شاہکار ہے۔

ہومر اپنی نظم ایلیڈ سنا رہا ہے

مغربی دنیا کا پہلا رزم گو شاعر ہومر مسیح سے ایک ہزار برس پہلے یونان میں پیدا ہوا۔ اس کی دو مشہور رزمیہ نظمیں "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" اب تک دنیائے ادب سے خراج تحسین وصول کر رہی ہیں۔ یہ نظمیں اس یونانی تہذیب و تمدن کی یادگار ہیں، جب کہ علم و ہنر کا فقدان تھا۔ مگر زندگی اور کشمکش کا خون رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ تخیل کی پرواز عنقا تھی۔ مگر جنگ و جدل کے خونی مناظر ذہن پر رنگ آمیزی کرتے رہتے تھے۔ ہومر چھوٹی بڑی اشیاء کا بنظر تعمق امتحان کرتا تھا۔ وہ طبیعت کا سیدھا سادہ معصوم شاعر تھا اپنے شعروں کو ترنم سے پڑھتا تھا قدرت نے شعریت کا مادہ اس میں بدرجہ اتم ودیعت کیا تھا۔ کریکٹر کے مختلف پہلوؤں کے ظاہر کرنے میں مغربی دنیا کا کوئی شاعر شیکسپیر کے سوا اس کا ہم پلہ نہیں گزرا وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں گھومتا پھرتا تھا اور اپنے شعروں کو رباب پر گا گا کر زندگی اور حیات کے چشمے بہاتا تھا۔ بقول ہومر رباب ایک ایسا آلہ ہے جس کے تاروں میں لطافت، لوچ اور لچک کی ضربیں موجیں مارتی ہیں۔ اس میں ہر قسم کے جذبات اور احساسات کو اصلیت کے سانچے میں ڈھالنے کی قدرت تھی، وہ دیہاتی کپڑوں میں ملبوس جنگلوں کے درختوں کے نیچے بیٹھ جاتا دیہاتی عورتیں اور مرد اس کے گرد جمع ہو جاتے، اور جب وہ آسمان کی طرف اپنی انگلی اٹھا کر رباب کے تاروں میں سے جنگ و جدل اور ہیچ پکار کے سُر نکالتا۔ تو سامعین پر سکتے کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔

جب تک تہذیب و تمدن کا چراغ اس دنیا میں روشن ہے "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" کا نام ہمیشہ چمکتا رہیگا۔

ورجل کی شاعری

دنیا کے رزم گو شاعروں میں دوسرا درجہ ورجل کا ہے۔ یہ رومن ہمپائر کا شاعر اعظم تصور کیا جاتا ہے۔ ڈینٹے اس کو اپنا استاد مانتا تھا۔ اس نے دور عیسائیت اور قرون وسطےٰ کے واقعات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کی تین نظمیں بہت مشہور ہیں۔ (۱) ایکلوگس (۲) جارجکس (۳) انیڈ

یونان اور سپین کے درباروں میں ورجل بڑی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا

ایک دفعہ شاہ سپین نے ورجل کو اسے اس کی "انیس" نظم پڑھنے کے لئے مدعو کیا۔ ورجل نے جواب میں لکھا۔

"اپنی نظم انیس کے متعلق یہ عرض ہے کہ مجھے اس کے روانہ کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ مگر مجھے یہ یقین نہیں ہے کہ وہ سننے کے قابل ہے۔ اتنی ضخیم کتاب کے شروع کرنے کے خیال سے ہی میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جس وقت میں نے کتاب لکھنی شروع کی اس وقت ضرور میرے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہوگا۔ میں اب بارہا سوچتا ہوں کہ اس قدر بڑی کتاب لکھنے کے لئے کتنے علم اور مطالعے کی ضرورت ہے"۔

اپنے دوستوں کے ساتھ ورجل ترنم سے اپنی نظمیں پڑھتا تھا۔ اس کی آواز میں شیرینی اور غضب کی کشش تھی۔ وہ جب اپنے شعروں کو پڑھتا تھا تو ان سے حیات اور زندگی کے چشمے پھوٹ نکلتے تھے۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ورجل آگسٹس کے محل میں اپنی مشہور نظم انیڈ ترنم سے سنا رہا تھا۔ سامنے ہی اوکٹیویا بیٹھی ہوئی تھی۔ جب ورجل نے اس کے لڑکے کا حال دردانگیز لہجے میں سنانا شروع کیا تو اوکٹیویا سن کر بے ہوش ہو گئی۔

ورجل اپنے دوست مسینا کے مکان پر بھی اکثر آتا جاتا تھا۔ اور ترنم سے اپنا کلام سنایا کرتا تھا۔ اس کے دوست ہوریس اور ویریس سر تا پا حیرت بنے اس کی شاعری سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس نے اپنی مشہور نظم "انیس" کا چار سال میں ڈھانچہ تیار کیا۔ اس کے بعد وہ روم کو چھوڑ کر یونان چلا گیا۔ اور تین سال تک اس پر نظرثانی کرتا رہا۔ لیکن یہ کام ختم نہ ہونے پایا تھا کہ موت نے اس کو آ دبایا۔ ورجل نے وصیت کر دی تھی کہ اس کی غیر مکمل نظم کو نذر آتش کر دیا جائے۔ مگر بادشاہ نے اس کی تعمیل نہ ہونے دی۔ اور اس کی نظم کو اسی حالت میں چھاپ دیا گیا۔

ورجل کی زندگی کے آخری ایام میں ملک کے اندر طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو گیا۔ ہر طرف جنگ و جدال۔ غارت گری اور لوٹ مار کی گرم بازاری رہتی تھی۔ ان تاثرات کو ورجل نے اپنی آخری نظموں میں قلم بند کیا ہے۔ جس کی ہر سطر سے خون کے آنسو ٹپکتے ہیں۔

نقد و نظر

حدیقۂ نعت

مصنف حضرت طیش مارہروی   قیمت ۵ر   پتا۔ کلیم بک ڈپو، فتحپوری دہلی

ہندوستان کے مشہور و مسلّم نعت گو شاعر حضرت محسن کاکوروی کی ایک مشہور نعت "یہ جہانِ عزیز اُترا ہے کس اُجڑے ہوئے گھر میں" پر مرزا داغ کے نامور شاگرد حضرت طیش مارہروی نے مصرعے لگائے ہیں، اور ایسے بے نظیر مصرعے لگائے ہیں جن کی داد نہیں دی جا سکتی۔ ہم نے اس مجموعے کا بغور مطالعہ کیا ہے، اور کہہ سکتے ہیں کہ حضرت طیش کے مصرعوں نے محسن سے اُن کی نظم چھین لی ہے۔

پیغمبر اسلام سے عقیدت رکھنے والوں کا یہ فریضۂ دینی ہے کہ وہ حدیقۂ نعت کے مطالعے سے سعادت حاصل کریں، اور اُسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھیں کہ ایک مسلّمہ نعت گو کے کلام پر ایک دوسرے مسلّم الثبوت شاعر نے کتنے لطیف اور محکم مصرعے لگائے ہیں۔

شبِ چراغ

مصنفہ۔ جناب صادق ضیا، بی اے   قیمت آٹھ آنے

ملنے کا پتہ۔ قصر الادب "دفتر شاعر" آگرہ

"میرے افسانے" کے عنوان سے خود مصنف نے اس کا دیباچہ تحریر کیا ہے، افسانوں کے کردار روزانہ زندگی سے لئے گئے ہیں۔ اور اُن کا تعلق زندگی کے اس دَور سے ہے جس میں محبت سے متعلق سوالات پیدا نہیں ہوتے۔ اِن افسانوں کا دل سے زیادہ دماغ سے تعلق ہے۔ محبت کے عنصر کے فقدان کے باوجود افسانے نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ دلچسپ افسانوں کے نام یہ ہیں۔ (۱) حسین مغالطہ (۲)۔۔۔۔ ازم (۳) منزل کا تعاقب (۴) آئینے میں (۵) غلیلوں کی ایک رات (۶) چراغِ ساحل (۷) گیتی آرا (۸) نو وارد روح۔ ہم بزم "کلیم" کے احباب سے پُرزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ اِن افسانوں کا ضرور مطالعہ کریں۔ اِنکے پڑھنے سے اُن کو روحانی مسرت حاصل ہوگی۔ حسین مغالطہ نام کہانیوں کی سرتاج ہے۔ زبان نہایت شستہ اور پاکیزہ ہے۔ ہم ضیا صاحب کو اِن دلچسپ افسانوں کے لکھنے پر مبارکباد دیتے ہیں۔

ادارۂ کلیم

سرفروش

ایڈیٹر عبداللہ مصری   چندہ سالانہ ۲ؔ   قیمت فی پرچہ تین پیسے

ملنے کا پتا۔ دفتر اخبار سرفروش فیرس لین کلکتہ

سرفروش کے ایڈیٹر مشہور ادیب عبداللہ مصری ہیں۔ یہ ہفتہ وار پرچہ نہایت قابلیت اور محنت سے ایڈیٹ کیا جاتا ہے۔ اس کا ہر مضمون قوت، زندگی اور حیات کا حامل ہوتا ہے۔ اخبار کا نصب العین تعصب اور تنگ دلی کی جڑیں کھوکھلی کرنا ہے۔ مسلم سے تخاطب کے وقت ذرا ایڈیٹوریل کا لب و لہجہ ملاحظہ فرمائیے۔

"حسن او وحدت کے شیدائی۔ کان کھول کر سُن۔ دنیا پست ہمتوں کی نہیں ہے۔ سرفرازیاں کاہلوں سے کوسوں دور رہتی ہیں، کامرانی کے دروازے بزدلوں کے لئے نہیں کھلتے۔ رفعت کی چوٹیوں پر نااہلوں کی گزر نہیں ہوتی۔ اور آزادی کے چمنستانوں میں غلاموں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اللہ کی دین صرف سرفروشوں کے لئے ہوتی ہے۔ اور دین و دنیا کی کامرانیوں کا تاج انھیں برگزیدہ ہستیوں کے سروں پر رکھا جاتا ہے جو کارزارِ ہستی میں پیش پیش ہوتی ہیں۔ جو لوگ خام خیالیوں اور توہم پرستیوں کی دلدلوں میں پھنسے رہتے ہیں وہ زندہ درگور ہو جاتے ہیں۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہیں اور کیڑوں مکوڑوں کی طرح ناپید ہو جاتے ہیں۔ بس قانونِ قدرت کا یہی اقتضا ہے اور مشیت ایزدی کا یہی منشا!" ٭٭

٭٭ جہانِ اسلام، سیاسیاتِ عالم کی جھلک، حقائق، مہا پرشوں کی بلند پروازیاں، بھانت بھانت کی بولیاں۔ خیالاتِ پریشاں۔ کے عنوان سے نہایت ہی اعلیٰ پایہ کے مضامین شائع ہوتے ہیں

رفتارِ وقت

چین کے ایک حصہ پر جاپان کا قبضہ

مغرب میں جنگ کے آثار اس قدر نمایاں ہوتے جاتے ہیں اور یورپین ممالک کی پیچیدہ اور خطرناک سیاسیات نے لوگوں کے دل و دماغ کو اس درجہ مسخر کر لیا ہے کہ مشرق کے حالات کی طرف بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔ اگر اٹلی، جرمنی اور روس وغیرہ شب و روز آگ سے کھیل رہے ہیں، تو اِدھر جاپان بھی چین اور روس سے آویزش پر تیار ہے۔ اور اپنے استبداد و استعمار کو ترقی دینے کے لئے بےچین نظر آتا ہے۔ پچھلے دنوں یہ خبر ساری دنیا میں ایک جدید مشرقی خطرہ کا باعث سمجھی جا رہی ہے کہ جاپان نے ایک بہانہ ڈھونڈھ کر شنگھائی کی سرحد کے قریب چین کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہنکاؤ کے ضلع میں بین الاقوامی آبادی کے اندر رہتین جاپانی ملاحوں پر آٹھ مرتبہ گولیاں چلائی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک جاپانی مر گیا اور دو زخمی ہوئے۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا فیصلہ مخالف ملک پر قبضہ کرنے اور دنیا کو جنگ کی خونریزیوں میں مبتلا کرنے ہی سے ہو سکتا تھا۔ بہتر یہ تھا کہ بین الاقوامی آبادی کے اندر جرائم کا ارتکاب بین الاقوامی عدالت ہی کے ذریعہ کیا جاتا۔ لیکن ملوکیت پرستی خواہ وہ مغربی ہو یا مشرقی، اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے اسی طرح کے بہانے ڈھونڈا کرتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ جاپان چین میں ہاتھ پاؤں پھیلانے اور غیر کی ملکیت پر قبضہ کرنے کے ایسے زریں موقع کو ہاتھ سے جانے دیتا۔ معلوم ہوا ہے کہ اس وقت ہنکاؤ کا یہ حال ہے کہ لوگ دہشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگے جا رہے ہیں۔ اور جاپانی بحری فوجوں نے یہ عذر لنگ پیش کر کے کہ اس نو آبادی کے جاپانی باشندوں کی جان اور مال کی حفاظت کرنا اور ہنگامی ضرورتوں کے لئے اپنی دفاعی طاقت کو مضبوط کرنا ہمارا فرض ہے۔ چاپی اور ہنکاؤ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس "فرض" کی ادائگی ایک ایسی دنیا کو

ادارۂ کلیم

جس کی فضا پہلے ہی سے مکدر ہے کس منزل کی طرف لے جاتی ہے!

مسئلہ فلسطین

مسئلہ فلسطین کے متعلق اسمبلی کے اجلاس میں مسٹر ستیا مورتی جو قرارداد پیش کرنے والے تھے اسے ہز اکسیلنسی وائسرائے نے اپنے اختیارات خصوصی سے نامنظور کر دیا۔ اور وقت کے اس اہم مسئلہ پر جس سے نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں میں بلکہ عام ہندوستانیوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ اسمبلی میں بحث نہ ہو سکی۔ حکومت کی طرف سے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ اس مسئلہ کو "گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب حکومت برطانیہ کے کانوں تک ہندوستان کی رائے عامہ کو باضابطہ طریقہ پر پہنچانے کا ذریعہ صرف اسمبلی ہی ہے جو ہندوستانیوں کے منتخب کردہ نمائندہ کی واحد سرکاری انجمن ہے تو اس میں مسئلہ فلسطین کو پیش کرنے کے علاوہ ہندوستانیوں کے لئے اور کیا چارۂ کار تھا۔

ہم اس مسئلہ میں چند ناقابلِ انکار حقیقتیں پیش کرنا چاہتے ہیں جو مسئلہ فلسطین کو واضح کرنے میں کار آمد ثابت ہوں گی۔

حکومتِ برطانیہ کے اربابِ حل و عقد کا یہ خیال ہے کہ یہودیوں کو کئی صدیوں سے محبت کا ایک بے پناہ جذبہ فلسطین کی طرف کھینچ رہا تھا۔ اگر اسے ہم صحیح تسلیم کر لیں تو کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ محبت کی یہ کشش یہودیوں پر جو دنیا کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے تھے بہت دُور سے عمل کر رہی تھی، اور عربوں نے کئی صدیوں سے فلسطین کو اپنا وطن بنا لیا تھا؟ وہ اسی خطہ پر اپنی زندگیاں بسر کر رہے تھے۔ یہیں زراعت کر کے زمین کے ہر ہر ذرّہ کو زرخیز بنا رہے تھے۔ یہیں

کاروبار کر رہے تھے۔ یہیں جی رہے تھے اور یہیں مر رہے تھے۔ کیا ایسی حالت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کو اپنے وطن کی عزیز سرزمین سے محبت نہیں ہے اور اُن کے دل و دماغ پر عشقِ وطن کا کوئی بے پناہ جذبہ عمل نہیں کر رہا ہے؟ کیا اس حقیقت سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے کہ فلسطینی عربوں نے جنگِ عظیم میں برطانیہ کو اس لئے مدد دی تھی کہ اتحادیوں نے اُن کو آزاد کرانے اور ایک خود سر حکمران قوم بنانے کا وعدہ کیا تھا؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ برطانیہ نے اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیا ایسے عربوں پر جو صدیوں سے ارضِ فلسطین کے باشندے تھے ایک دوسری قوم کو اپنے استعماری اغراض کے باعث مسلط کر دیا۔ اور سیاسی و آئینی اخلاق کا کچھ خیال نہ کیا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر یہودیوں کی یورش کا یہ حال رہا تو صرف چند سال کے اندر فلسطین کی عرب آبادی ایک حقیر اقلیت میں مبدّل نہ ہو جائے گی۔ اور یہودیوں کی روایتی دولت مندی و دولت پرستی اُن کو غلام نہ بنا دیگی؟

اس کاپی کے پریس میں جانے کے وقت ہمارے سامنے ایک تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کی نمائندگی کرنے والے چند سربرآوردہ اشخاص کے ایک وفد نے ہز اکسیلنسی والسرائے سے ملاقات کی اور مسئلہ فلسطین کے متعلق ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات پیش کئے۔ والسرائے نے اس وفد کو جو کچھ جواب دیا اُس پر سردست ہم کوئی تبصرہ نہیں کرتے۔ اس اہم مسئلہ کے متعلق اکتوبر میں ایک آل انڈیا فلسطین کانفرنس بھی منعقد ہونے والی ہے۔ اس لئے ہم اس کی قرارداد وں کے منتظر ہیں۔

والسرائے کی تقریر

اسمبلی کے اجلاس میں ہز اکسیلنسی لارڈ لنلتھگو نے پہلی تقریر کی۔ لیکن ہندوستان کو اس تقریر سے جو توقع تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ اگرچہ موجودہ والسرائے کی تقریر کا لہجہ سابق والسراؤں کی تقریر سے جداگانہ تھا لیکن اس میں کوئی عنصر ایسا نہ تھا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ حکومتِ ہند اپنے روائتی طرزِ عمل میں کوئی خوشگوار تبدیلی کرنے والی ہے یا آئندہ ہندوستان کی رائے عامّہ کا احترام کیا جائے گا۔ والسرائے نے طبقۂ وسطیٰ کی بے روزگاری، اور ہندوستان کی موجودہ اقتصادی حالتوں کے متعلق جو کچھ کہا وہ نظری حیثیت سے صحیح ہے۔ مگر غالباً اپنے پیش روؤں کی طرح لارڈ لنلتھگو نے بھی یہ محسوس نہیں کیا ہے، جب تک ہندوستان کے سیاسی نظم و نسق میں خاطر خواہ تبدیلی نہ ہو گی۔ اِن مسائل کا کوئی تشفی بخش حل نہیں نکالا جا سکتا، اور جب تک خود ہندوستان کے باشندے اپنے ملک کے مالک نہیں غالباً سیاسی نظم و نسق میں کوئی تبدیلی ممکن بھی نہیں ہے۔ پھر لارڈ لنلتھگو ہمیں اس امر کا کیونکر یقین دلا سکتے ہیں، ہم اُن کی تقریر کا صرف ایک جملہ یہاں پر نقل کرتے ہیں۔ لارڈ لنلتھگو کہتے ہیں۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ میں آزادانہ نظامِ حکومت کی خاکستر سے ڈکٹیٹری کی ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے .... (ایسے ممالک میں) طاقت کی فرمانروائی از سرِ نو زندہ ہو گئی ہے اور کمزور ہستیوں سے طاقتور ہستیاں کسی نہ کسی صورت میں فائدہ اُٹھا رہی ہیں"

کیا ہز اکسیلنسی اپنے دل پر ہاتھ رکھکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کا موجودہ نظامِ حکومت یا عنقریب نافذ ہونے والا جدید آئین طاقت کی فرمانروائی نہیں ہے، بلکہ خود ہندوستانیوں کی رضامندی پر مبنی ہے؟ کیا ہندوستان میں کوئی ذمہ دار طبقہ موجود ہے جو جدید آئین کی مدح سرائی میں والسرائے سے ہمنوا ہو؟ کیا خود نئے دستورِ اساسی میں گورنر جنرل یا صوبہ کے گورنروں کو جو اختیاراتِ خصوصی عطا کئے گئے ہیں، کسی مسولینی یا ہٹلر کے اختیارات سے کم ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ والسرائے نے جو کچھ کہا ہے نپے تلے الفاظ میں کہا ہے۔ مگر یہ الفاظ ان کڑوی گولیوں سے کم نہیں ہیں جو شکر میں چھپا کر مریض کو دی جاتی ہیں۔ لارڈ لنلتھگو نے اس تقریر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ برطانیہ نے قدیم استعماریت کے خیال کو چھوڑ کر ہندوستان میں برابر کی شرکت اور اتحادِ عمل کے اصول کی طرح ڈالی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو دستور خود ہندوستانیوں کے مطالبات کے بالکل برعکس ہو اس کے ہندوستانیان کا اتحادِ عمل کیونکر حاصل کیا جا سکتا ہے؟

اطلاع جن حضرات نے شروع میں ششماہی چندہ مبلغ پانچ روپے مرحمت فرمائے تھے وہ حضرات عہ رمزید بھیجکر سالِ رواں تک کلیم کی سرپرستی فرما سکتے ہیں۔

(۲) رسالہ نہ پہنچنے کی شکایتوں سے دفتر کا ناک میں دم آگیا ہے۔ براہ کرم خریدار صاحبان رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کے دوسرے ہفتے تک کر دیا کریں ورنہ تعمیل نہ ہو سکے گی۔ اپنے ڈاکخانہ میں بھی اس امر کی اطلاع ضرور دیجئے۔ اور پوسٹمین کو تنبیہ کر دیجئے۔ منیجر



ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدر اعظم سے کہا۔ دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کریں کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں۔ تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کرسکوں۔



تعمیل حکم کے لئے فردوس مثال کشمیر جنت نظیر سوئٹزرلینڈ شباب انگیز ترکمانیہ اور گل پاشش مرغزاروں میں نکتہ چینی کی گئی۔ جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی۔ مہارانی اس خواہش کو پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی

نا پینا ترک کر دیا، مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا۔ اور وزراء سے مشورہ طلب کیا۔ مہتمم توشہ خانہ نے "**اصغر علی محمد علی**

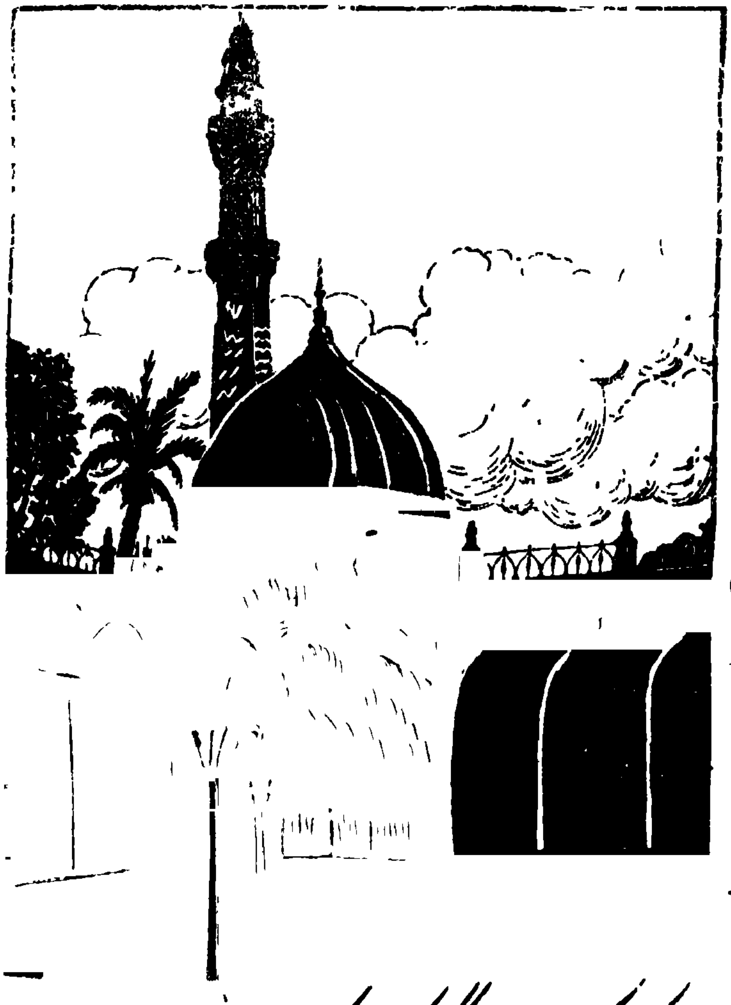
سے منگوانے کو کہا، یہ معقول تھی۔ فوراً عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہار

(ساتھ لئے واپس آ گیا)

اصغر علی محمد علی، تاجران عطر، لکھنؤ و دہلی

REG.L.NO.3694

پیغامِ اسلام



خواجۂ دو جہاں سرورِ کائنات آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ولادت
اور رسالت پر حضرت جوش ملیح آبادی کا وہ غیر فانی شاہکار ہے جس کی نعت میں
کے ساتھ قصرِ اعجاز سرنگوں ہے۔ ثبوتِ پیغمبری کے باب میں اس انسانی شان کے
استدلال دل میں تیر کی طرح اترتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے انسانی الہامات سے
دماغ میں یزدانی نور سرایت کر جاتا ہے۔ اس کے دلائل ناطقہ کے ساتھ ادراک
منطق حیاتِ ثنا قبول ہوتا ہے ——— شاعرِ انقلاب پر جب ایک خاص سرشاریت
کا عالم طاری ہوا اسی وقت انھوں نے اس نظم کو کہنا شروع کر دیا۔ عالمِ بیخودی
میں چار روز کے ریاضتِ شاقہ اور یکسوئیِ قلب سے جو کچھ حاصل ہوا صرف وہی
صفحۂ قرطاس پر تحریر کیا گیا ہے، جبتک یہ نظم مکمل نہ ہوئی حضرتِ جوش نے کچھ
کھایا نہ پیا۔ اور نہ خلوت سے باہر تشریف لائے۔

نظم نہایت پاکیزگی سے بہترین کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ آنحضرتؐ کے روضۂ
پاک کی بھی تصویر ہے، جس نے کتاب کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دئے ہیں۔
قیمت دس آنے ملاوہ محصول ڈاک۔ بارہ آنے کے ٹکٹ روانہ فرمائیے
وی، پی منگوانے سے خواہ مخواہ ۶؍ کا اور زیر بار ہونا پڑے گا۔ ملنے کا پتہ:-

کلیم بک ڈپو۔ گلی کندلہ کشان۔ فتحپوری


کلیم
مدیر جوش ملیح آبادی

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدر اعظم سے کہا۔ دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں۔ تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو



منتخب کرسکوں۔ تعمیل حکم کے لئے فردوس مثال کشمیر جنت
نظیر ہالینڈ، شباب انگیز ہسپانیہ اور گل پاش مرغزار دکن
میں نکتہ چیں لگ گئے۔ جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد
مہارانی کے حضور پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو
چکے تھے۔ اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی
کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی۔ مہارانی اس خواہش کو پورا
نہ ہونے سے ملول رہنے لگی کھانا پینا ترک کردیا۔ مہاراجہ کو فکر دامنگیر

ہوا، اور وزراء سے مشورہ طلب کیا۔ مہتمم توشہ خانہ نے ”اصغر علی محمد علی“ سے عطر منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی۔ فوراً عمل کیا گیا،

جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا۔

اصغر علی محمد علی، تاجران عطر، لکھنؤ و دہلی

منظور شدہ سررشتۂ تعلیم گورنمنٹ میسور

کلیم

بنام قوت وحیات

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آ گے گئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
قدرت کے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
جملہ حقوق محفوظ ہیں
ششماہی چندہ تین روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے

اردو زبان کا ہر جہت سے قیمتی ماہنامہ

دہلی

جلد ۲ | بابتہ ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۶ء | نمبر ۵

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے کورونیشن پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم اکبر منزل ـ ایجل روڈ قرولباغ دہلی سے شائع کیا)

اشتر

ایک سوال

سوال یہ ہے کہ کونسا طبقہ ہندوستان کے کام آسکتا ہے ؟

(۱) کیا گریجویٹ کام آسکتے ہیں؟

نہیں۔ اور گو یجتی ہوئی۔ نہیں۔

یہ ٹائیاں باندھنے والے نیم فاقہ کش ؟

یہ ہر دفتر کا دروازہ کھٹکھٹانے والے گداگر۔

یہ پوڈر اور لونڈر کے عاشقانِ نامراد۔

یہ آدھے تیتر آدھے بٹیر، جو نہ مشرقی ہی ہیں نہ مغربی۔

یہ بیروپئے۔ یہ سند یافتہ جہلا۔ یہ غریب خود اپنا پیٹ تو پال نہیں سکتے، ہندوستان کی کیا مدد کر سکیں گے ؟

(۲) کیا لیڈر کام آسکتے ہیں؟

نہیں۔ ہزار بار نہیں۔ شیروں کی طرح ہونکتی ہوئی نہیں،

یہ خطابوں، عہدوں اور خفیہ وظیفوں کے درپردہ امیدوار۔ یہ نام و نمود کے بھکاری۔ یہ حُبِ جاہ کے فرزندانِ رشید۔ یہ لفظ "قوم" سے صرف اپنی ذات "مُراد لینے والے۔

انھیں اپنی تعمیر سے کب فرصت ہے کہ ہندوستان کی فکر کر سکیں گے؟

(۳) کیا وکلا اور بیرسٹر کام آسکتے ہیں؟

نہیں، ہرگز نہیں۔ اور گرجتی ہوئی "نہیں"

یہ چھوٹی چھوٹی دوکانوں پر "پلیڈر" اور "ایڈووکیٹ" کے بورڈ لگانے والے۔ یہ دو دو روپے کے پیچھے دوڑنے والے۔ یہ صبح سے شام تک مؤکلوں کی راہ دیکھنے والے۔ یہ روزی کے واسطے بوکھلائے ہوئے دُبلے تپلے انگریز۔

انھیں عدالتوں کے طواف سے کب فرصت ہے کہ ہندوستان کے واسطے کچھ کر سکیں گے ؟

(۴) کیا سرکاری ملازم کام آسکتے ہیں ؟

بیشک سرکاری آدمی، اگر ان کا بس چلے تو ہندوستان کو کم سے کم قیدِ حیات سے تو ضرور آزادی دلاسکتے ہیں۔

(۵) کیا امرار کام آسکتے ہیں ؟

کیوں نہیں۔

یہ گمگیلے، اگاودی اور پلپلے۔ یہ نیا اسیرو بدہضمی کے صید زبوں۔ یہ خوشامدوں کے پروردہ۔ جہالت کے نورِ نظر۔ مسخروں کے اَن داتا۔ اپنی اپنی ریاستوں کے جال میں پھڑکنے والے زاغ و زغن۔ یہ موٹروں اور مسہریوں کی لاشیں۔ یہ مزاج کے پارہ، طبیعت کے آوارہ، جن کی عقلیں ہاتھی کی سونڈ کی طرح موٹی، اور جن کے ذہن سارس کی ٹانگوں کی طرح دُبلے ہیں۔ یہ تو ضرور کام آسکتے ہیں۔

تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بما کُنی نظیری!

(۶) کیا علمائے کرام، اور صوفیائے کبار کام آسکتے ہیں ؟

جی ہاں کیوں نہیں ؟

یہ دوسروں کی گاڑھی کمائی کے حلوے کھانے، اور پرائی مٹھائیاں چکھنے والے مذہب — یہ عباؤں اور قباؤں میں لپٹی ہوئی متعفن لاشیں — یہ حق سے بھاگنے اور باطل کو آغوش میں لینے والے مقدس ڈاکو — یہ غداری سے ساز باز رکھنے والے روحانی اوتار، جن کی ڈاڑھیوں اور مرطوب چھاؤں میں شیطان رات کا کھانا کھاتا ہے — یہ خدا کو فروخت اور پیمبر کو نیلام کرنے والے کباڑیے —— یہ یورپ کے کمیشن ایجنٹ اور یہ غلاموں کے دلال۔

اگر یہی ہندوستان کی رہبری نہ کریں گے تو پھر کون کرے گا؟

(۷) کیا کانگرس کے تجربہ کار پیران کہن سال کام آسکتے ہیں؟

غضب خدا کا بوڑھے اور جوان خواب:

یہ تھرتھراتی ہمتوں کی گرتی ہوئی دیواریں —— یہ آنکھوں سے کیچڑ بہتی ہوئی زندہ آہیں —— یہ زمانے کے شدائد سے ہزار بار معافی مانگے ہوئے بزدل —— یہ اوہام کے پرستار۔ تعصب کے پہاڑ۔ مذہب کے دیوانے۔ بسوں کی ہڈیوں پر لڑنے اور گائے باجے پر پوٹ ٹیک دینے والے پرانے گدھ

یہ پہلے خود تو جی لیں، ہندوستان کو کیا جلا سکیں گے؟

(۸) کیا ایڈیٹر کام آسکتے ہیں؟

ہندوستان کے ایڈیٹر!

یہ امرا کو دھمکا دھمکا کر روپے اینٹھنے والے کاغذی ڈاکو۔ یہ ہندو مسلم نفاق کے شعلے کو ہوا دینے والے فتنہ پرور۔ یہ اغیار سے مدد اور اشتہار کے طلبگار۔ یہ ایک دوسرے کو گالیاں دینے والے عبرت مند افراد۔

کیا کوئی ان سے کسی شریفانہ فعل کی توقع کرسکتا ہے؟

(۹) کیا نوجوان کام آسکتے ہیں؟

جی ہاں ضرور۔ جب یہ اپنی پتلی پتلی کمروں کو لچکا لچکا کر چلیں گے، اور سر کی معشوقانہ جنبش سے ماتھے پر بکھری ہوئی زلفوں کو درست کرکے میدان جنگ میں درآئیں گے تو دنیا کی کونسی قوت سپر انداختہ نہ ہو جائے گی؟

اور جب یہ ترس آنے کی حد تک دُبلے نوجوان، اپنے تمام ترکانہ عشوؤں کو اپنی آنکھوں میں جمع کرکے اپنے نتھنے میں بلے ہوئے معطر ریشمی رومال کو جیب سے نکال کر ہوا میں جنبش دیں گے تو دنیا کی ہر قوم کا پرچم سرنگوں ہو جانے پر مجبور ہو جائے گا۔

(۱۰) کیا مزدور اور کاشتکار کام آسکتے ہیں؟

کاش یہ بیدار ہو جائیں۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ انھیں منظم کردے!

یہ مئی جون کی دھوپ کا ننگے سر سے مقابلہ کرنے اور جلتے ہوئے پتھروں کو تلوؤں سے پیس دینے والے مردان کوہ و دشت۔ یہ جن کے ہاتھ شعلوں سے کھیلتے، اور جن کے عُریاں سینے لُو کے تھپیڑوں کا مذاق اُڑاتے ہیں —— کنکر جن کے بستر، پتھر جن کے تکیے اور آگ جن کا پنکھا ہے۔ بیشک اگر یہ بیدار و منظم ہو گئے تو کون طاقت ہے جو ان کی رَو کو روک سکے گی؟ اور کون ایسا دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مضبوط بند ہے، جو اس موج در موج کف در دہان طوفان کے تھپیڑوں کے سامنے ایک لمحے کے لئے بھی ٹھہر سکے گا؟

بیدار ہو، بیدار، اے ہندوستان کی سوئی ہوئی عظیم ترین قوت بیدار ہو، جب تک تو بیدار نہ ہوگی ہندوستان کی ابدی رات کے افق پر زندگی کی صبح کبھی مسکرا نہ سکے گی!

شاید کوئی عبرت حاصل کرے

ہندوستان میں جہاں اور بے شمار بدبختیاں ہیں وہاں ایک بہت بڑی بدبختی یہ بھی ہے کہ گھر کا ایک آدمی کماتا ہے اور باقی تمام ارکان اس کے سر کھاتے ہیں اور جب وہ کمانے والا مر جاتا ہے تو اُس کے سہارے زندگی بسر کرنے والے بھیک مانگنے لگتے ہیں۔

یہ وبا صرف اہل خاندان ہی تک محدود نہیں، بلکہ ہندوستان کے ہر کمانے والے سے اس کے دوست احباب بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ جو اُسی کا رزق کھاتے اور اُسی کا کپڑا پہنتے ہیں۔ اس قسم کے تمام افراد کی عبرت کے لئے ذیل کا تاریخی واقعہ درج کیا جاتا ہے۔ اگر اس سے تمام ملک میں عبرت و نصیحت حاصل کرکے اپنے دست و بازو سے کمانا شروع کر دیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگ گئی۔

ایک قوی عرب نے اپنے اونٹ کی ایک خورجی میں غلے کی ایک کثیر مقدار رکھی اور دوسری خورجی میں صرف دو ایک برتن اور تھوڑا سا کھانے پینے کا سامان رکھکر حج کے لئے روانہ ہوگیا۔

غلے کی خورجی بھاری ہونے کی وجہ سے بار بار نیچے کی طرف سرک جاتی تھی، اور عرب بڑبڑاتا ہوا اونٹ سے نیچے اُترتا اور اُسے درست کرکے پھر چل کھڑا ہوتا تھا۔

وہ خورجیوں کے اس عدم توازن سے نہایت تنگ تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس بلا سے کیونکر نجات حاصل کرے۔

اتنے میں اُسے ایک راہرو ملا جو کاندھے پر گٹھری لادے ہوئے پیادہ سفر کر رہا تھا۔ اور اُس کی طرف دیکھ دیکھ کر برابر مسکرا رہا تھا۔

چنانچہ دونوں میں یوں گفتگو شروع ہوئی۔

شتر سوار عرب۔ تم مجھے دیکھکر کیوں مسکرا رہے ہو۔ کیا تم میری تلوار کی دھار سے واقف نہیں؟

پیادہ عرب۔ نہیں بھائی میں تمہاری تلوار کی دھار سے بخوبی واقف ہوں لیکن ......

شتر سوار عرب۔ (تلوار سونت کر) "لیکن" کیا؟

پیادہ عرب۔ (جھجک کر) برادر، میں تمہارا بہی خواہ ہوں، اور چاہتا ہوں کہ تمہاری تکلیف کو دُور کردوں۔

شتر سوار عرب۔ اس کے کیا معنی ہیں؟

پیادہ عرب۔ آپ کی ایک طرف کی خورجی بار بار نیچے کی طرف سرک جاتی ہے، جس سے آپ کو بار بار اونٹ ٹھیرانے اور اُسے درست کرنے کی تکلیف ہوتی ہے۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اُسے درست کردوں۔

شتر سوار عرب۔ تم کیونکر درست کردوگے؟

پیادہ عرب۔ میں دونوں خورجیوں کا وزن برابر کردوں گا۔ اور جب دونوں کا وزن برابر ہو جائے گا تو پھر آپ کو خورجیوں کے برابر کرنے کی تکلیف ایک بار بھی نہیں اُٹھانا پڑے گی۔

شتر سوار عرب۔ تم ہات نہ لگاؤ مجھے بتاتے جاؤ میں خود اپنے ہات سے یہ کام کروں گا۔

لیکن یاد رکھو اگر اس کے بعد بھی مجھے وہی تکلیف ہوئی تو میں تمہارا سر قلم کردوں گا۔

اس کے بعد شتر سوار عرب اُترا اور پیادہ عرب کی ہدایت کے مطابق دونوں خورجیوں کو مساوی الوزن کردیا۔

شتر سوار عرب۔ آؤ، تم میرے ساتھ آؤ، راستے میں اگر مجھے پھر وہی تکلیف ہوئی تو تمہارا سر کاٹ لوں گا۔ اور اگر تکلیف نہ ہوئی تو جہاں کہو گے میں اپنے اونٹ پر تمہیں پہونچا دوں گا۔

چنانچہ پیادہ عرب بھی اونٹ پر سوار ہوگیا۔ شتر سوار نے جانچنے کی خاطر اونٹ کو بہت تیز دوڑایا۔ اور کئی میل تک برابر دوڑاتا رہا۔ لیکن اُسے اُس تکلیف کا دوبارہ سامنا نہیں ہوا جس سے خوش ہو کر اُس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

شتر سوار۔ تم نہایت عقلمند آدمی معلوم ہوتے ہو۔

ساتھی۔ میں تمام درسی کتابیں پڑھ چکا ہوں۔

شتر سوار۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ تم بہت کچھ کماتے ہوگے۔ تمہارے پاس دولت کی کمی نہ ہوگی۔

ساتھی۔ نہیں۔ میں کچھ نہیں کماتا، میرے قدردان میرا پیٹ بھر دیتے ہیں۔

شتر سوار۔ (غصے سے سُرخ ہو کر) تم کچھ نہیں کماتے۔ تم دوسروں کے سہارے جیتے ہو۔ واللہ اگر علم کے یہ معنی ہیں کہ انسان ہات پاؤں نہ ہلائے اور خیرات پر زندگی بسر کرے تو اُس سے جہالت کہیں بہتر ہے۔

اتنا کہہ کر شتر سوار ٹھیر گیا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غصے کو ضبط کر رہا ہے لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے بال نوچ نوچ کر کہنے لگا۔

"بطّال! تو میرے اونٹ سے اُتر جا۔ مجھے نہ تیری عقلمندی کی ضرورت ہے نہ علم کی"

یہ کہہ کر وہ اونٹ سے کود پڑا، اپنے ساتھی کو بھی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لیا۔ اور جس طرح کہ پہلے ایک ہی خورجی میں تمام غلہ بھرا ہوا تھا اُسی طرح بھر کر اپنے اونٹ پر یہ کہتا ہوا روانہ ہوگیا کہ ایک نہ کمانے والے بطال کی عقلمندی پر

عمل کرکے راحت اٹھانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ میں ایک کمانے والے کی بیوقوفی سے تکلیف اٹھاتا ہوا سفر کروں۔

فوجی تعلیم

ہندوستان کے محکمۂ تعلیمات کی اُن تمام ہولناک خامیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے جن پر روشنی ڈالنے کے لئے مطبوعات کے ایک نہایت طویل سلسلے کی ضرورت ہے۔ سر دست فوجی تعلیم کی ضرورت پر چند سطریں پیش کی جاتی ہیں۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ صاحبِ قلم ہونا اُس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک کہ انسان صاحبِ سیف بھی نہ ہو۔

قلم اور سیف، زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ جس طرح کوئی گاڑی ایک پہیے سے نہیں چل سکتی اُسی طرح کوئی قوم صرف قلم کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی۔

تعلیم یافتگی کے تخیل میں ایک شدید انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت مدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ جس طرح حرف ناشناس کو جاہل کا خطاب دیا جاتا ہے، اُسی طرح اسلحہ ناشناس کو بھی جاہل کا لقب دیا جائے۔

ہندوستان کے اربابِ نظر کی خواہش ہے کہ تعلیم کے ابتدائی مراحل سے لے کر انتہائی مدارج تک فوجی تعلیم کو لازمی قرار دے دیا جائے۔ اور ملک کے طول و عرض میں ایک درسگاہ ایسی باقی نہ رہ جائے۔ جہاں فوجی تعلیم نہ دی جاتی ہو۔

جس روز بچے کے علم میں یہ بات لائی جائے کہ الف اسے کہتے ہیں، اُسی روز اُسے یہ بھی پہنچوا دیا جائے کہ تلوار ایسی ہوتی ہے۔

کوئی صاحبِ عقل ایسی غیر مسلّح اور بزدل علمیت کا قائل نہیں ہو سکتا، جو نہ اپنی مدد کر سکتی ہو۔ نہ مظلوموں کو ظالم کے جور سے بچانے ہی کی قوت رکھتی ہو۔

وہ شخص جو عالم ہے، لیکن اُس کا دل کمزور ہے اُس شخص کے سامنے آنکھیں نہیں اُٹھا سکتا، جو عالم تو نہیں، لیکن اُس کا دل قوی ہے اور وہ فلسفی جو مار کھا سکتا ہے اُس جاہل کے سامنے بات نہیں کر سکتا جو کسی کی مار نہیں کھاتا۔

یہ سچ ہے کہ جو قلم کا استعمال نہیں جانتا وہ "جاہل" ہے۔ لیکن یہ اس سے زیادہ سچ ہے کہ جو سیف کا استعمال نہیں جانتا وہ "مُردہ" ہے۔

یہ درست ہے کہ جو قلم کا استعمال جانتا ہے وہ "عالم" ہے۔ لیکن یہ اس سے بھی زیادہ درست ہے کہ جو سیف کا استعمال جانتا ہے وہ "فاتح" ہے۔

قلم اُس وقت تک صرف ایک وہمِ باطل ہے جب تک سیف اُس کی سرپرستی نہ کرے ——— قلم اُس وقت تک ایک خوابِ پریشاں ہے جب تک قوت اُسے ہم آغوشِ تعبیر نہ کر دے۔

اگر تمام مدرسوں اور کالجوں میں فوجی تعلیم کو لازمی قرار دے دیا جائے گا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہندوستان کا ہر بچہ وقت پر ایک جانباز سرفروش اور بہادر سپاہی کا کام دے سکیگا، اور ہندوستان ایک ایسے زبردست فوجی کیمپ میں تبدیل ہو جائے گا جس کی طرف آنکھ اٹھانے کی کسی قوت کو جرأت ہو سکے گی۔

آہ پریم چند

پریم چند بھی آخر ہم سے بچھڑ گئے۔ پریم چند کے فطرت نگار قلم نے وقت کے جادے پر جو نقشِ قدم چھوڑے ہیں وہ ہمیشہ روشن رہیں گے۔ پریم چند صرف ایک اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار و ادیب ہی نہ تھے، وہ ایک اعلیٰ درجے کے دوست اور پاک باطن انسان بھی تھے۔ جن کا دل ہندو مسلم اتحاد کے لئے سینہ میں تڑپا کرتا تھا۔

ابھی کل کی بات ہے کہ وہ مجھ سے ملنے کے لئے قرول باغ آئے تھے۔ اور شام کے آئے ہوئے رات کے گیارہ بجے واپس گئے تھے۔ اُن کی وہ آخری نشست مجھے یاد ہے۔ اور اُن کا وہ آخری تبسم میری آنکھوں کے نیچے پھر رہا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب وہ مجھ سے رخصت ہونے لگے تھے

میں نے انھیں گلے لگا کر یہ رُباعی پڑھی تھی۔

کیا جانئے اب جشن خرابات نہ ہو
اس رات کے بعد پھر کوئی رات نہ ہو
ٹھہرو کہ گلے تو مل لیں جانے والو
ممکن ہے کہ اب کبھی ملاقات نہ ہو

چنانچہ وہی ہوا۔ کسے معلوم تھا کہ رباعی کا حرف حرف پورا ہوگا اور اس کے بعد پھر کبھی پریم چند کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔

پریم چند کے قلم ہی میں نہیں، آنکھوں میں بھی جادو تھا، وہ اس محبت اور سادگی کے ساتھ ملتے تھے کہ دل اُن کی جانب کھنچنے لگتا تھا۔ وہ ایک بے تکلف، سادہ، خوش مزاج اور منکسر مزاج انسان تھے۔

وہ صحیح معنی میں ادیب تھے۔ اس لئے اُن کے مزاج میں تصنع تھا نہ تبختر۔ وہ کھلے دل سے ملتے تھے، اور جس سے ملتے تھے، اُس کے دل کی کلی کو بھی کھلا دیتے تھے۔

ایسے ہی دوستوں کے مر جانے سے دلوں میں ناسور پڑ جاتے ہیں۔ ایسے ناسور جو ہمیشہ رِستے ہی رہتے ہیں۔

مرنے والی مخلوق سے دل لگانا ہولناک غلطی ہے۔ جسے ہم بقدر یک نفس بھی زندہ نہیں رکھ سکتے، اُس سے محبت کرنا اپنے کو تباہ کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ محبت پھر بھی ہو ہی جاتی ہے۔

اگر کوئی اسٹیشن ماسٹر ویٹنگ روم میں ٹھہرے ہوئے مسافروں کے درمیان رشتۂ اخوت و محبت پیدا کر کے اس کا تماشا دیکھنا چاہے کہ گاڑی کے وقت لوگ کس طرح ایک دوسرے کے بچھڑ جانے پر پچھاڑیں کھاتے ہیں تو کیا آپ اسٹیشن ماسٹر کو کوئی مشفق انسان تصور فرمائیں گے؟ تو کیا ہماری اس دنیا کا جو ویٹنگ رُوم سے بھی زیادہ مبہم و ناپائیدار ہے یہی حال نہیں؟ جب قدرت کو علم ہے کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے، اور ایک نہ ایک دن ضرور بچھڑنے والے ہیں تو پھر یہ کونسی شفقت ہے کہ ہمیں آپس میں وابستہ کر کے ایک دوسرے کی محبت پر مجبور کر دیا جاتا ہے؟

افسوس کتنے مظالم ہیں جن پر رسمِ زمانہ اور تواترِ صدور نے شفقت ورحمت کا پردا ڈال رکھا ہے۔

صد حیف کہ احباب ایک ایک کر کے اُٹھ رہے ہیں۔ عزیز۔ شاہ دلگیر۔ ریاض۔ رواں، اور آغا حشر۔ یہ سب دیکھتے ہی دیکھتے رخصت ہوگئے — اِن کے بعد پریم چند کی باری آئی۔ چنانچہ وہ بھی چلے گئے۔ اب دیکھیں کون پہلے جاتا ہے؟

پریم چند تیری موت نے صرف معمورۂ ادب ہی کو سنسان نہیں کر دیا بلکہ ہمارے دلوں کو بھی ویران بنا ڈالا ہے۔ ہم تجھ پر رو رہے ہیں۔ اور مدتوں روتے رہیں گے۔

لیکن ہمارا رونا اے دوست، خودکامی پر مبنی ہے۔ یعنی ہم چاہتے تھے کہ جب تک ہم اس زندانِ آب و گل میں رہیں، اُس وقت تک تُو بھی رہے۔ اور جس طرح ہم جینے کے شدائد جھیل رہے ہیں تُو بھی جھیلتا رہے۔

مگر ہم جس وقت عمیق نظر سے دیکھتے ہیں، بیساختہ جی چاہتا ہے کہ تجھے مبارکباد دیں کہ تُو اِس خبیث قید سے رہا ہو گیا جسے ہستی کہتے ہیں۔ اور بس حیوانوں کی بستی سے چلا گیا جس کا نام جنت نشان ہندوستان ہے۔

پریم چند! مبارک ہو کہ تُو اِس مایا کے جال، اور اِس جھوٹے سنسار سے نکل گیا جہاں دولت کے سوا کسی جوہر کی پرستش نہیں ہوتی۔ تو اس ہندوستان کی بھری محفل کے ویرانے سے اُٹھ گیا جہاں اہلِ قلم کو رسوائی کے سوا کچھ میسر نہیں ہوتا۔

اے ہندوستان کے مُردہ پرستو! آؤ۔ اب تمہاری جست و خیز کی باری ہے۔ پریم چند مر گیا۔ اب اخباروں میں مقالے لکھو۔ اُس کی تعریفوں کے پُل باندھو۔ اور اُس کی یادگار قایم کرنے کی، جھوٹے پلیٹ فارموں سے آوازیں بلند کرو۔ تاکہ دنیا تمہاری معارف نوازی، اور علم دوستی پر ایمان لے آئے۔ ایسے زرّیں مواقع کہیں روز روز ملا کرتے ہیں — یہ خود نمائی کا دن تو کہیں برسوں ہی میں آتا ہے — مگر میں جانتا ہوں تم کیسے ہو۔ مجھے تمہاری علم دوستیاں خوب اچھی طرح معلوم ہیں۔

آج تم جس پر مقالے لکھ رہے ہو۔ اور لکھنے والے ہو، وہی پریم چند مجھ سے تمہاری بے التفاتیوں اور سرد مہریوں کا رونا آئے دن رویا کرتا تھا۔

اُنت تم نے ایک دن بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ لاغر و نحیف انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ تلاشِ معاش میں گھبرایا گھبرایا پھرا کرتا تھا۔ مگر تم مربیانِ علم و ادب نے اُس کے مصائب کا احساس، زندگی میں ایک بار بھی نہیں کیا۔

میں بہ آوازِ بلند کہتا ہوں، سُننے والے سُن لیں کہ پریم چند کو موت نے نہیں، بلکہ ہندوستان کی ناقدر دانیوں نے شہید کر ڈالا ہے۔ اس خونِ ناحق کا دعویٰ کس پر کیا جائے؟

پریم چند تُو اب وہاں ہے جہاں ہمارے رونے کی آوازیں بھی نہیں جا سکتیں۔ لیکن اگر تُو سُن سکتا ہے تو ہم تجھ سے التجا کرتے ہیں کہ یا تو یہ دعا کر کہ ہندوستان زندہ آدمیوں کی آبادی بن جائے۔ یا پھر ہمیں بھی وہیں بلا لے جہاں تُو ہے۔

مشاہدات

ہر نفس یہ کس کے جلووں کی خبر پاتا ہوں میں؟
شکر کے سجدے میں بینائی کا سر پاتا ہوں میں

منظرِ ہستی پہ یہ تابندہ ہے کس کا جمال؟
خیرہ پہنائے دو عالم کی نظر پاتا ہوں میں

سامنے آتی ہیں جب صُبحیں بر افگندہ نقاب
دِل میں یہ کس کے تبسُّم کا اثر پاتا ہوں میں

ہر کلی میں دیکھتا ہوں ایک چشمِ نیم باز
ہر چمن کو اک بہشتِ مختصر پاتا ہوں میں

ایک اک پتّہ ہے مکتوبِ عروسِ رنگ و بُو
باغ میں ہر شاخ کو پیغامبر پاتا ہوں میں

چرخ پر ایک ایک تارے میں جھلکتا ہے جمال
خاک کے ایک ایک ذرے میں نظر پاتا ہوں میں

نقطہ ہائے نُور پر ہیں تیرگی کے دائرے
ظلمتوں میں گردشِ شمس و قمر پاتا ہوں میں

خاک کے تودوں پہ ہے معمارِ عالم کی نگاہ
ہر قدم پر سازو برگِ بام و دَر پاتا ہوں میں

کانپنے لگتے ہیں تارے جب بساطِ چرخ پر
عالمِ اسباب کو زیر و زبر پاتا ہوں میں

ناخنِ غم چھیڑتا ہے جب رگِ جاں کا ستار
دِل میں لیلائے طرب کو جلوہ گر پاتا ہوں میں

جلوہ گاہِ ناز میں جس وقت رکھتا ہوں قدم
اس کُرے کو حلقۂ بیرونِ دَر پاتا ہوں میں

دیکھتا ہوں جس قدر گہری نظر سے بار بار — حسن کو پہلے سے کچھ پاکیزہ تر پاتا ہوں میں
ہر نظر رخ پر دکھاتی ہے اک آب و تاب کو — ہر نفس جلووں میں اک شانِ دگر پاتا ہوں میں
دوڑتا ہے نبضِ خس میں برقِ سوزاں کا لہو — سینۂ شبنم میں طوفانِ شرر پاتا ہوں میں
اشتیاقِ اوج میں ہیں نا تراشیدہ قدم — پتھروں میں جنبشِ صد بال و پر پاتا ہوں میں
ناخنِ حکمت پہ کرتا ہوں بھروسہ جس قدر — عقدۂ اسرار کو پیچیدہ تر پاتا ہوں میں
تہ میں کیا جلوے ہیں، اِن کی شرح تو ممکن نہیں — سطحِ دریا پر بھی اک موجِ گہر پاتا ہوں میں
دل میں جب آتا ہے صانع کے مصالح کا خیال — عیب کی فطرت کو لبریزِ ہنر پاتا ہوں میں
بستۂ یک آرزو ہے مشترک ہے کائنات — کس قدر اضداد کو شیر و شکر پاتا ہوں میں
راہِ حق ہی میں نہیں ہیں حسن کے نقشِ قدم — گمرہی کو بھی کسی کی رہ گزر پاتا ہوں میں

پھر تعجب کیا، کہ اس تردامنی کے باوجود
جوش کو منجملۂ اہلِ نظر پاتا ہوں میں

ایک اشد ضروری التماس

مدیر اور کارکنانِ کلیم کا ہمیشہ یہ مقصد رہتا ہے کہ رسالے میں ایسے مضامین شائع کیے جائیں جو محض ادبی لطافت پر مبنی نہ ہوں، بلکہ اُن سے کوئی ذہنی انقلاب پیدا ہو سکے۔ معلوم نہیں کہ ہمارے مساعی کہاں تک مشکور رہے ہیں۔ اور ہمیں اس کا بھی اندازہ نہیں کہ اس انقلابِ ذہنی کی سعی کے سلسلے میں پرچے کی دلچسپیوں اور دوسری لطافتوں پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔

ہم قارئین کرام کی خدمت میں مخلصانہ التجا کرتے ہیں کہ وہ براہِ کرم مطلع فرمائیں کہ اُن کی پرچے کے متعلق کیا رائے ہے، اور اُن کے نزدیک کن کن چیزوں کی اصلاح ہونا چاہیئے۔

کلیم دہلی



مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

دورِ انفرادیت کا طلوع[1] (مسلسل)

سری اروندو گھوش

جب قدیم رسم و رواج میں بوسیدگی، اور پارینہ روایات میں افکار زندگی کا گھُن لگ جاتا ہے، اُس وقت انسانی سماج میں انفرادی دور کا آغاز ہوتا ہے۔

اس نئے عہد کے طلوع ہونے سے قبل ضروری ہے کہ:

(۱) نسلِ انسانی کے کردار و افکار سے حق و راستی کا قطعی ازالہ ہو چکا ہو؛

(۲) اور وہ روایات و رسوم جو حقائق کی جگہ مسند نشین ہو چکے ہیں حقیقی ادراک و ذہانت سے محروم ہو چکے ہوں، جن پر عمل پیرا ہونے کے لئے کوئی معقول عذر یا دلیل باقی نہ رہی ہو، اور جو خیالات کے جمود، رواج کے جبر اور آدابِ ظاہری سے وابستہ ہونے کے باعث میکانی طور پر زندگی کے دن پورے کر رہے ہوں۔

ان حالات کا یہ فطری تقاضا ہے کہ انسان اپنی معاشری ذہنیت کی قدامت پرستی کے باوجود دل ہی دل میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اُس کے سینے میں حق و راستی کی شمع گُل ہو چکی ہے اور وہ صرف جھوٹ کے سہارے جی رہا ہے۔

عصرِ نو کی انفرادیت، رسم پرستی عقائد کی بوسیدگی و پیرانہ سالی سے روگردانی کر کے، تازہ حقائق و معارف کی مضبوط چٹان پر اپنے کردار و افکار کی بنیاد رکھنا چاہتی ہے اور یہ انفرادیت پسندانہ سعی درحقیقت ایک ناگزیر و لازمی شے ہے۔ کیونکہ تمام قدیم عمومی معیارِ علم و دانش۔ تہی دست اور دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ اور اب زیادہ مدت تک انسان کی خدمت نہیں کر سکتے۔

اب یہ بار صرف افراد ہی کے سر ہے کہ وہ کاشفانِ حقائق اور رہبرانِ معارف کی حیثیت سے اپنے انفرادی استدلال۔ اپنی بصیرت۔ اپنی پروازِ خیال، اپنے ولولوں اور اپنی اُن تمام تجلیوں سے مدد لے کر اس دنیا اور اپنی ہستی کے واسطے صحیح قوانین وضع کرنے کی سعی شروع کر دیں۔ اور جب صحیح قوانینِ حیات معلوم کر لیں تو مذہب، معاشرت۔ اخلاق، سیاست۔ باہمی تعلقات، تکمیلِ ذات، اور خدمتِ نوعِ بشر کی بنیادوں کو از سرِ نو مضبوط بنانے کی دُھن میں لگ جائیں۔

یہ ممکن ہے کہ ابتداءً وہ کوئی عالی شان عمارت طیار نہ کر سکیں لیکن دنیا یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گی کہ اُن کے مساعی کی چٹانوں سے خلوص اور حیات کے چشمے اُبلا کرتے تھے۔

انفرادی ترقی کا تخیل اول اول مغرب ہی کی جفاکش قوموں کے دماغ میں پیدا ہوا تھا۔ اور وہیں اس نے بھرپور جوانی بھی حاصل کی۔ مشرق اس دائرہ انفرادیت میں اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر نہیں۔ بلکہ محض مغرب کے

---

[1] انفرادیت کے معنی ہیں دوسروں پر بھروسہ کئے بغیر فرد خود اپنی ذات پر اعتماد کر کے حقائقِ عالم کا سراغ لگائے۔

خشک اور واثرسے مجبور ہوکر داخل ہوا ہے۔

یہ مغرب کا استیاءِ عالم کی صحیح قدر و قیمت کے اندازہ لگانے اور حیاتِ انسانی پر علم و عقل کے ذریعے سے حکومت کرنے ہی کا جذبہ تھا۔ جس نے مشرق پر حقیقت ظاہر کر دی کہ مغرب کی صدیوں کی کمائی ہوئی عام قوت، ہمت، روشنی، ترقی، اور ناقابلِ مقابلہ شان و وسعت، صرف انفرادیت ہی کے ذریعے سے حاصل کی گئی ہے۔

ہر چند یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مشرق نے اپنی زندگی کی بنیاد ہی غلط نصب العین پر رکھی تھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس حقیقت شناسی سے دور ہو جانے کے باعث خود مشرق کو بھی نقصان ہوا۔ نیز ایام کی تنگی، آغوش میں صدیوں خوابِ غفلت میں رہنے کی وجہ سے مشرق کی یہ حالت ہوگئی کہ جب وہ خوابِ گراں سے بیدار ہوا تو دیکھتا ہے کہ وہ طاقت و حیات سے محروم ہو چکا ہے۔ گو اس کی صورت اب بھی مہیب دیو کے مانند ہے مگر اس کے درست و بازو شل ہو چکے ہیں۔ اس کے جمود کی وجہ سے ... ہوں میں ... کا شائبہ تک باقی نہیں۔ وہ یہ بھی بھول چکے ہیں کہ زمانہ حاضر کی تہذیب طاقت ... اور زندگی کے ہولناک سامانوں کا کن آلات سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسا ہونا ایک ناگزیر امر بھی تھا۔ کیونکہ یہ غریب صدیوں تک تقلید ... کے نہ خانوں میں اس طرح بند رہے تھے کہ نکلنا تو کیسا، انہوں نے ... سے جھانکا تک نہ تھا۔

اس انفرادی دور میں یورپ نے جن حقائق کو معلوم کیا ... وہ اولین مادی امور مثلاً تحلیلی استدلال کی مشق و مزاولت ... کی تلاش و تجربے سے متعلق تھے۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جن سے ایک ترقی ہوتی قوم کو فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

اگر مغرب کا منطقیانہ تمدن اس وقت پہنائے عالم پر چھایا ہوا ہے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے، کیونکہ اس وقت دنیا میں کوئی ایسی دوسری قوی تر اور آراستی موجود نہیں ہے جو اس تمدن کا مقابلہ کر سکے۔ اور ہو تو کیونکر، اس لئے کہ یورپ کے علاوہ، تمام باقی ماندہ انسانیت، اپنے دورِ تقلید و رسوم کے آخری تاریک لمحوں کے سائے میں اب تک بے حس و حرکت پڑی سو رہی ہے۔

یورپ میں جب انفرادی زندگی کے دور کا آغاز ہوا تو اس کی ابتدا منطقیانہ بغاوت سے ہوئی، اور انتہا مادی سائنس کی ظفرمندی پر۔ اور یہ ارتقا تاریخی نقطۂ نگاہ سے بھی ناگزیر تھا۔

قاعدہ ہے کہ انفرادی ترقی کے عہد کا طلوع ... اشتباہ و انکار ہی کے افق سے ہوتا ہے۔

انفرادی دور کے آغاز میں یہ صورت حال ہوتی ہے کہ عوام کے شانوں پر فرسودہ مذہب کا پشتارا لدا ہوا ہوتا ہے، اور اربابِ مذہب کی کج بحثی و عمل کی بنیاد صحیح روحانی حقائق اور قوی و زندہ مطالبِ تحقیقی پر نہیں ہوتی بلکہ مذہبی والہامی کتابوں کے ... مولویوں کے خودکامانہ مقولوں، کلیسا کی رٹی ہوئی ...، پنڈتوں کے بے مغز و غلط رنگین پیروں کی ناپاک خواہشوں اور خانہ جوں کی شرمناک سازشوں پر اُن کے تمام و کمال انحصار و کردار کا دارومدار ہوا کرتا ہے۔

اور ان تمام اعتراضات سے بالا پیشوایانِ مذہب کا لے دے کے صرف اتنا کام رہ جاتا ہے کہ وہ قیود ... اور خودکامیوں کے زیر سایہ فتوے صادر کیا کریں، اور بس۔ ان خدا کے بندوں میں سے ایک بھی اس امر کو ضروری کیا، بلکہ جائز بھی نہیں ... تاکہ ... کا سراغ لگایا جائے مبہم حقائق کی تحقیقات کی جائے اور اشیاء ... اندازے قائم کئے جائیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علماء ... اس کے خلاف جہاد شروع کر دیتے ہیں۔

انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ ایک طرف تو حقیقی علم و دانش کے خلاف احکامِ قتل و جلاوطنی صادر ہو رہے ہیں۔ اور دوسری طرف ٹھہرے ہوئے پانی کے مثل گندے اور منجمد احکامِ دینی کی کورانہ تقلید، تفکر و تدبر کا گلا گھونٹ دے رہی ہے۔ اور اُسی کے ساتھ ساتھ وہ تمام اُمور بھی جو حکمائے گزشتہ کی بدولت حق ثابت ہو چکے ہیں۔ آنکھ بند کر کے باطل ٹھہرائے جا رہے ہیں، اور ہر چند قدیم ذخائرِ حکمت کی قرأت تو ضرور ہو رہی ہے اور اُن کے الفاظ بھی دوہرائے جاتے ہیں۔ مگر چند مستثنیات کے علاوہ، ایک شخص بھی اُن کے معانی

ومطالبت سے کہ وہ نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس تنگنائے جہل و ظلمت سے نکل بھاگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

یہ ابتری صرف مذہبی اداروں ہی میں نظر نہیں آتی بلکہ سیاسیات میں بھی ہر جگہ اُن "الوہی قوت"، "مقدس مراعات"، اور "مقدس آئین" ستم رانی کے ذریعے سے انسان کو پامال کیا جاتا ہے جو قوائے استبداد سے مسلح ہوتے، اور حقوقِ قدامت کے بل بوتے پر زندہ رہتے ہیں۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو ان قوانین پر جنہیں ناقابلِ شکست بنانے کے حق میں کوئی حقیقی دلیل پیش ہی نہیں کی جا سکتی۔

اس کے علاوہ معاشرتی نظام میں بھی مردہ و فرسودہ رسوم کی حکمرانی، مقرر کردہ پیشے، سود و زیاں کی گرم بازاری، امراء کا خود پرستانہ طمطراق، اور غرباء کی کورانہ سجدہ ریزیاں ہی ہر طرف چھائی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ذہن کے دو تر بدوش سوسائٹی کے اُن رسوم پر، جنہوں نے غالباً کسی دور حد تک انسانیت کو مختلف مدارج میں تقسیم کیا تھا، یا تو سرے سے عمل ہی نہیں کیا جاتا۔ اور اگر اُن پر عمل کیا بھی جاتا ہے تو محض فرقہ وارانہ غرور کی نمائش کے طور پر۔

ان حالات کو دیکھ کر انسان بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے، اور سوسائٹی کے ہر فرمان پر نہایت استقلال، اور انتہائی ترشی کے ساتھ متفسرانہ نگاہیں اُٹھانے لگتا ہے ——— اور جب اُس سے یہ کہا جاتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہی دراصل اشیائے عالم کی حقیقت ہے۔ وہی مشیتِ ایزدی، اور وہی انسانی حیات کا ماورائے حافظ ضابطۂ قدیم ہے تو وہ جھنجھلا کر پوچھنے لگتا ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، کیا واقعی صورتِ حال یہی ہے؟ میں کیونکر باور کر لوں کہ اشیاء کی حقیقت وہی ہے جو تم بیان کر رہے ہو۔ اور اس میں تمہارے وہم و سہو کی کوئی آمیزش نہیں؟ خدا نے ایسے احکام کب اور کس موڈ (MOOD) میں صادر فرمائے تھے؟ مجھے یہ کیونکر معلوم ہو سکتا ہے کہ احکامِ خداوندی کے یہی معنی ہیں جو تم بیان کر رہے ہو؟ مجھے اس کا پتا کیونکر چل سکتا ہے کہ اس میں تمہاری "ایجادِ بندہ" کو کہاں تک دخل ہے؟ جس کتاب پر تمہارے عقائد کی بنیاد ہے، کیا واقعی وہ ربانی الفاظ ہی کا مجموعہ ہے؟ میں اس پر کیونکر ایمان لے آؤں کہ پروردگارِ عالم نے کبھی اور کسی زمانے میں بھی اپنی مشیت کو انسانی الفاظ کا جامہ پہنایا تھا؟ یہ ماورائے حافظ ضابطۂ حیات، تم جس کے منادی ہو، کیا واقعی دنیا کا قدیم ترین ضابطہ ہے؟ اس کا تمہارے پاس آخر ثبوت کیا ہے؟ کیا دراصل یہی قانونِ قدرت ہے جو تمہاری زبانوں پر جاری ہے، اور تمہارے ہی ہاتھوں ٹوٹ رہا ہے؟ کیا خدا کے قوانین ٹوٹ بھی سکتے ہیں؟ اور تمہارا دستور کہیں وقت کا ایک غیر مکمل نتیجہ اور ایک غلط ترین وہم پرستی تو نہیں؟

تم میرے ساتھ جو سلوک چاہو کرو، مگر میں تو یہ پوچھ کر رہوں گا کہ کیا حقائقِ عالم سے تمہارے معتقدات ہم آہنگی و مطابقت کا شرف رکھتے ہیں؟ اور کیا تمہارے عقائد میرے ذاتی شعورِ حق، میری معارف سنجی اور میرے تجرباتِ حقیقت کے معیار پر پورے اتر بھی سکتے ہیں؟

اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور نفی کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے تو لو یہ ہے تمہارے رسم و رواج اور تمہارے دین کا طوقِ غلامی، اور یہ ہے تمہاری سوسائٹی کی زنجیر ——— اب میں آزاد اور قطعی آزاد ہوں۔ تم مجھے دوبارہ گرفتار نہیں کر سکتے ——— میں آج سے اپنی معلوم کردہ راستی کا گلا پھاڑ پھاڑ کر، بآنگِ دہل اعلان کروں گا۔ تمہارے مذہب، تمہاری سیاست، اور تمہاری سوسائٹی کی کھوکھلی جڑوں پر کلہاڑی چلانا شروع کر دوں گا۔ اور ایک ٹھوکر میں تمہارے اُس معاشری نظام کو بھی درہم برہم کر کے پھینک دوں گا جو اوہام کی بوسیدہ الگنی پر لٹکا ہوا ہے۔

آدابِ پارینہ کے سرپرست اور رسومِ قدیم کے غازی اُس وقت حق بجانب معلوم ہوتے ہیں جب وہ اس روایاتِ کہن کے "باغی" کو، جو اُن کے "معاشری تحفظ"، "سیاسی نظام" اور "مذہبی روایات" کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے۔ فنا کر دینے پر تُل جاتے اور اپنے زعم میں اس تباہ کن طاقت کا گلا گھونٹ دینے پر کمریں کس لیتے ہیں۔

لیکن یہ سرکش و باغی اپنی جگہ پر چٹان کی طرح قائم رہتا ہے ——— کیونکہ ناکارہ چیزوں کا فنا کر دینا اُس کا مشن ہوتا ہے ——— اور اُس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ باطل کو فنا کر کے حق کو قائم کر دے۔

قدامت پرستی اپنے تمام وہم پرست جاہلوں کو اُس کے خلاف للکارتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے عوام کا بیہودہ شور و غوغا اُس کا احاطہ

کرتی ہے۔ مگر یہ حسن کا پجاری باغی، ہٹو، راستہ دو، پرانی عمارتوں کو گرا دو، سوکھے درختوں کو کاٹ ڈالو، اور روشنی کے نئے منارے تعمیر کرو، کا نعرہ بلند کرتا ہوا سینہ تانے آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور کچھ دیر کی تلواروں کی چمک اور سلاسل کی کھڑکھڑاہٹ کے بعد دنیا کیا دیکھتی ہے کہ وہی باغی قدامت پرستوں کی تڑپتی ہوئی لاشوں کے حلقے میں نئی زندگی اور تازہ ولولوں کا پرچم اڑا اڑا کر مسکرا رہا ہے۔

ترانۂ بہار

پھر دامنِ صبا میں ہے مے خانہ آج کل
پھر ہر نفس ہے گردشِ پیمانہ آج کل

پھر عقل میں ہے عنصرِ وحشت کی خواجگی
پھر فقر میں ہے شوکتِ شاہانہ آج کل

پھر جوش پر ہے موسمِ برنائیِ جمال
پھر باڑھ پر ہے عشوۂ ترکانہ آج کل

پھر صدرِ بزمِ حسن ہے عشقِ زمانہ سوز
پھر کارسازِ شمع ہے پروانہ آج کل

پھر لائقِ سجود ہے مینائے زرنگار
پھر قابلِ طواف ہے خمخانہ آج کل

پھر فرش پر ہے جلوۂ افلاک ان دنوں
پھر عرش پر ہے نعرۂ مستانہ آج کل

پھر زندگی زمان و مکاں پر ہے حکمراں
پھر وقت میں ہے خوئے غلامانہ آج کل

پھر ہر خدا پرست ہے آوارۂ بتاں
پھر ہر خرد فروش ہے دیوانہ آج کل

پھر ہر روش ہے ایک گلستانِ زلف و رخ
پھر ہر کلی ہے ایک صنم خانہ آج کل

پھر ہر کلہ ہے تاجِ ملوکانہ ان دنوں
ہر ہر خذف ہے گوہرِ یک دانہ آج کل

پھر ہر غلامِ دہر ہے آقائے بحر و بر
پھر ہر کنیزِ شہر ہے سلطانہ آج کل

پھر شادماں ہے جذبۂ گستاخ ان دنوں
پھر کامراں ہے جرأتِ رندانہ آج کل

جس پر نثار کون و مکاں کی حقیقتیں
پھر کہہ رہا ہے جوشؔ وہ افسانہ آج کل

جوشؔ

بے لوث خدمت

جواہر لال نہرو

صنعتی دور اپنے ساتھ بہت سی برائیاں لایا ہے جن پر ہماری نظر فوراً پڑتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مجموعی طور پر دنیا اور خصوصاً اُن حصوں میں جہاں صنعت کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے اس دور نے مادی خوشحالی کی ایک ایسی بنیاد قائم کر دی ہے جس سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے تمدنی اور روحانی ترقی آسان ہو گئی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے محکوم ملکوں میں ہمیں اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس لئے کہ ہمیں صنعتی ترقی سے فائدے کی جگہ نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں تو صنعتی نظام نے خوب لوٹا ہے۔ اور ہر لحاظ سے یعنی مادی اعتبار سے بھی، اور اس سے زیادہ تمدنی اور روحانی اعتبار سے ہماری حالت پہلے سے بھی بدتر کر دی ہے۔ لیکن قصور صنعتی نظام کا نہیں بلکہ بدیسی حکومت کا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں نام نہاد مغربیت نے نظام جاگیرداری کو مستحکم کر دیا ہے اور ہماری دشواریوں کو حل کرنے کے عوض اُنھیں اور بھی زیادہ شدید بنا دیا ہے۔

لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے اور اس سے متاثر ہو کر ہمیں آج کل کی دنیا کے دیکھنے اور سمجھنے میں غلطی نہیں کرنا چاہیئے۔ موجودہ حالات میں امیروں کا وجود سماج کے نظام دولت آفرینی کے لئے ضروری اور مناسب نہیں رہا ہے اور ایک طبقہ بالکل بیکار رہتا ہے۔ اور اکثر اس کی وجہ سے رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح مذہبی پیشواؤں کا یہ پرانا مشغلہ بھی اب بالکل بے معنی ہو گیا ہے کہ امیروں کو خیرات کی تلقین کی جائے اور غریبوں کو قناعت، صبر و شکر، کفایت شعاری اور نیک چلنی کا وعظ سنایا جائے۔ انسان کے وسائل اور ذرائع اب اس قدر وسیع ہو چکے ہیں کہ وہ دنیا کے مسائل سے اچھی طرح نبٹ سکتا ہے۔ امیروں میں بہت سے لوگ صریحی طور پر طفیلی بن گئے ہیں اور ایک طفیلی طبقے کا وجود نہ صرف ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیا کرتا ہے بلکہ اُس کی وجہ سے وسائل دولت ضائع ہو جاتے ہیں۔ یہ طبقہ اور وہ نظام جو اسے پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے، کام اور دولت آفرینی کو روکتا ہے اور دو طرح سے بیکاری کو بڑھاتا ہے۔ یعنی ایک تو اُن لوگوں کی ہمت افزائی کرتا ہے جو اوروں کی محنت پر بسر کرتے ہیں۔ دوسرے بہت سے مزدوروں کو کام سے محروم رکھتا، اور فاقہ کشی پر مجبور کرتا ہے، اُن لوگوں کے سامنے جو بھوکوں مرتے اور بیکار ہیں، خدا صرف ایک ہی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے، خود گاندھی جی نے کچھ عرصہ گزرا لکھا تھا، یعنی کام اور روٹی کی شکل میں۔ خدا نے انسان کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ محنت کر کے روٹی کھائے، اور یہ کہا تھا کہ جو لوگ محنت کے بغیر کھاتے ہیں وہ چور ہیں۔

دُنیائے جدید نے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لئے اُس وقت کے قدیم طریقوں اور اصول سے کام لیا جب ان مسائل کا وجود نہ تھا اور اُن کا ذکر دقیانوسی الفاظ میں کرنا محض اُلجھن پیدا کرتا ہے اور اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

خود ذاتی ملکیت کا تخیل جو بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کے بنیادی تخیلات میں ہے ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ایک زمانے میں غلام بھی املاک میں شامل تھے۔ اور یہی حال عورتوں اور بچوں کا تھا۔ اس کے علاوہ جاگیر [illegible] دھن کی

کرتی ہے۔ کہ یہ دُشمن کا بچا باغی ہے۔ ہٹو، راستہ دو، پُرانی عمارتوں کو گرا دو، سوکھے درختوں کو کاٹ ڈالو، اور روشنی کے نئے منارے تعمیر کر دو" کا نعرہ بلند کرتا ہوا سینہ تانے آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور کچھ دیر کی تلواروں کی چمک اور سلسلوں کی کھڑکھڑاہٹ کے بعد دنیا کیا دیکھتی ہے کہ وہی باغی قدامت پرستوں کی تڑپتی ہوئی لاشوں کے حلقے میں نئی زندگی اور تازہ ولولوں کا پرچم اُڑا اُڑا کر مسکرا رہا ہے۔

ترانۂ بہار

پھر دامنِ صبا میں ہے مے خانہ آج کل　　پھر ہر نفس ہے گردشِ پیمانہ آج کل
پھر عقل میں ہے عنصرِ وحشت کی خواجگی　　پھر فقر میں ہے شوکتِ شاہانہ آج کل
پھر جوش پر ہے موسمِ برنائیِ جمال　　پھر بارڈہ پر ہے عشوۂ تُرکانہ آج کل
پھر صدرِ بزمِ حسن ہے عشقِ زمانہ سوز　　پھر کارسازِ شمع ہے پروانہ آج کل
پھر لائقِ سجود ہے مینائے زرنگار　　پھر قابلِ طواف ہے خمخانہ آج کل
پھر فرش پر ہے جلوۂ افلاک اِن دنوں　　پھر عرش پر ہے نعرۂ مستانہ آج کل
پھر زندگی زمان و مکاں پر ہے حکمراں　　پھر وقت میں ہے خُوئے غلامانہ آج کل
پھر ہر خدا پرست ہے آوارۂ بُتاں　　پھر ہر خرد فروش ہے دیوانہ آج کل
پھر ہر روش ہے ایک گلستانِ زُلف و رُخ　　پھر ہر کلی ہے ایک صنم خانہ آج کل
پھر ہر کلہ ہے تاجِ ملوکانہ اِن دنوں　　ہر ہر خذف ہے گوہرِ یکدانہ آج کل
پھر ہر غلامِ دہر ہے آقائے بحر و بر　　پھر ہر کنیزِ شہر ہے سلطانہ آج کل
پھر شادماں ہے جذبۂ گستاخ اِن دنوں　　پھر کامراں ہے جرأتِ رندانہ آج کل

جس پر نثار کون و مکاں کی حقیقتیں
پھر کہہ رہا ہے جوشؔ وہ افسانہ آج کل

جوشؔ

بے لوث خدمت

جواہر لال نہرو

صنعتی دور اپنے ساتھ بہت سی برائیاں لایا ہے جن پر ہماری نظر فوراً پڑتی ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مجموعی طور پر دنیا اور خصوصاً اُن حصوں میں جہاں صنعت کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے اس دور نے مادی خوشحالی کی ایک ایسی بنیاد قایم کر دی ہے جس سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے لئے تمدنی اور روحانی ترقی آسان ہو گئی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے محکوم ملکوں میں ہمیں اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس لئے کہ ہمیں صنعتی ترقی سے فائدے کی جگہ نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں تو صنعتی نظام نے خوب لوٹا ہے۔ اور ہر لحاظ سے یعنی مادی اعتبار سے بھی، اور اس سے زیادہ تمدنی اور روحانی اعتبار سے ہماری حالت پہلے سے بھی بدتر کر دی ہے۔ لیکن قصور صنعتی نظام کا نہیں بلکہ بدیسی حکومت کا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں نام نہاد مغربیت نے نظام جاگیرداری کو مستحکم کر دیا ہے اور ہماری دشواریوں کو حل کرنے کے عوض انھیں اور بھی زیادہ شدید بنا دیا ہے

لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے اور اس سے متاثر ہو کر ہمیں آج کل کی دنیا کے دیکھنے اور سمجھنے میں غلطی نہیں کرنا چاہیئے۔ موجودہ حالات میں امیروں کا وجود سماج کے نظام و دولت آفرینی کے لئے ضروری اور مناسب نہیں رہا ہے اور اکا طبقہ بالکل بیکار رہتا ہے۔ اور اکثر اس کی وجہ سے رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح مذہبی پیشواؤں کا یہ پرانا مشغلہ بھی اب بالکل بے معنی ہو گیا ہے کہ امیروں کو خیرات کی تلقین کی جائے اور غریبوں کو قناعت، صبر و شکر، کفایت شعاری اور نیک چلنی کا وعظ سنایا جائے۔ انسان کے وسائل اور ذرائع اب اس قدر وسیع ہو چکے ہیں کہ وہ دنیا کے مسائل سے اچھی طرح نبٹ سکتا ہے۔ امیروں میں بہت سے لوگ صریحی طور پر طفیلی بن گئے ہیں اور ایک طفیلی طبقے کا وجود نہ صرف ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیا کرتا ہے بلکہ اُس کی وجہ سے وسائل دولت ضائع ہو جاتے ہیں۔ یہ طبقہ اور وہ نظام جو اسے پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے، کام اور دولت آفرینی کو روکتا ہے اور دو طرح سے بیکاری کو بڑھاتا ہے۔ یعنی ایک تو اُن لوگوں کی ہمت افزائی کرتا ہے جو اوروں کی محنت پر بسر کرتے ہیں۔ دوسرے بہت سے مزدوروں کو کام سے محروم رکھتا اور فاقہ کشی پر مجبور کرتا ہے، اُن لوگوں کے سامنے جو بھوکوں مرتے اور بیکار ہیں، خدا صرف ایک ہی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے، خود گاندھی جی نے کچھ عرصہ گزرا لکھا تھا، یعنی کام اور روٹی کی شکل میں۔ خدا نے انسان کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ محنت کر کے روٹی کھائے، اور یہ کہا تھا کہ جو لوگ محنت کے بغیر کھاتے ہیں وہ چور ہیں۔

دُنیائے جدید نے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لئے اُس وقت کے قدیم طریقوں اور اصول سے کام لیا جب ان مسائل کا وجود نہ تھا اور اُن کا ذکر دقیانوسی الفاظ میں کرنا محض اُلجھن پیدا کرتا ہے اور اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

خود ذاتی ملکیت کا تخیل جو بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کے بنیادی تخیلات میں ہے ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ایک زمانے میں غلام بھی املاک میں شامل تھے۔ اور یہی حال عورتوں اور بچوں کا تھا۔ اس کے علاوہ جاگیریں۔ دھن...

نسب عودسی کا سرداروں، سمندروں، کشتیوں، پُلوں، مفادِ عامہ کی چیزوں اور زمین و ہوا کا مالک تھا۔ جانور آج بھی پالنے والوں کی ملک سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ بعض ملکوں میں اُن کی ملکیت کے حقوق قانوناً محدود کر دیے گئے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں برابر حقوقِ ملکیت میں دست اندازی کی جاتی ہے۔ املاک روز بروز غیر مرئی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ مثلاً کمپنی کے حصے، اعتبار وغیرہ۔ جتنا جتنا ملکیت کا تصور تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے حکومت کی مداخلت بڑھتی جاتی ہے۔ رائے عامہ بھی جائداد والوں کے نامحدود حقوق کو محدود کرنے کا مطالبہ کرتی رہتی ہے۔ قانون اس مطالبے کو پورا کرتا رہتا ہے۔ طرح طرح کے بڑے بڑے محصول لگائے جاتے ہیں جنھیں ایک طرح کی ضبطی سمجھنا چاہیے اور اس طرح مفادِ عامہ کی خاطر حقوقِ ملکیت کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

مفادِ عامہ کا خیال پبلک پالیسی کی بنیاد بنتا چلا جاتا ہے۔ اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ مفادِ عامہ کے خلاف کوئی کام کرے۔ خواہ اُس کی غرض اپنے حقوقِ ملکیت کا تحفظ ہو۔ اور پرانے زمانے میں تو لوگ حقوقِ ملکیت سے محروم بلکہ خود دوسروں کی ملکیت تھے۔ آج بھی یہ حقوق صرف تھوڑے لوگوں کو حاصل ہیں۔ ہم لوگ مستقل حقوق کا ذکر بہت سنتے آئے ہیں۔ لیکن آج کل ایک نیا "مستقل حق" اور تسلیم کر لیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر مرد اور ہر عورت کو یہ حق ہے کہ زندہ رہے، محنت کرے۔ اور اپنی محنت کا پھل پائے۔ ان نئے نظریوں کی رُو سے املاک اور سرمایہ معدوم نہیں ہو جاتے بلکہ بہت سے لوگوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، اور اُن کے چند اشخاص کے ہاتھ میں جمع ہو جانے سے اُن اشخاص کو دوسروں پر جو اقتدار حاصل تھا اُسے سماج اُن سے واپس لے لیتی ہے۔

گاندھی جی کے پیشِ نظر افراد کی باطنی، اخلاقی اور روحانی اصلاح ہے اور اس کے ذریعے سے وہ خارجی ماحول کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کی تعلیم یہ ہے کہ لوگ بُری عادتوں اور لذتوں کو ترک کریں اور پاکباز بن جائیں۔ وہ اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ مجامعت اور شراب و تمباکو کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ ممکن ہے اس بارے میں اختلافِ رائے ہو کہ ان میں کون چیز زیادہ بُری ہے اور کون کم۔ مگر کیا اس میں شبہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی نقطۂ نظر اور اس سے زیادہ سماجی نقطۂ نظر سے لالچ، خود غرضی، زر پرستی، افراد کا ذاتی نفع کے لئے جھگڑنا، طبقوں اور جماعتوں کی وحشیانہ کشمکش، ایک طبقے کا دوسرے کو بیدردی سے لُوٹنا اور قوموں کی ہولناک لڑائیاں یہ سب معائب گاندھی جی کے بیان کردہ معائب کے مقابلے میں بدرجہا بدتر معائب ہیں۔

ظاہر ہے کہ گاندھی جی ان تمام ذلت آفریں جھگڑوں اور ہر قسم کے تشدد سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن کیا یہ چیزیں آج کل کی زبردست سماج کی فطرت میں داخل نہیں ہیں جس کا قانون یہ ہے کہ زبردست کمزور کو ستائے اور جس کا عمل اس پرانے مقولے پر ہے جس میں طاقت ہو وہ چھین لے۔ اور جو رکھ سکے وہ رکھے۔ نفع کی خواہش آج کل لازمی طور پر ایسی جھگڑا پیدا کرتی ہے اور سارا نظام انسان کی غارتگرانہ جبلتوں کی سرپرستی کرتا ہے۔ اور اُسے اُن سے کام لینے کا پورا پورا موقع دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بعض پسندیدہ جذبات کو بھی اُبھارتا ہے۔ لیکن زیادہ تر انسان کے کمینہ جذبات کو وہ تقویت دیتا ہے۔ کامیابی کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ دوسروں کو نیچے گرا کر اُن کی جگہ لے لی جائے، جب ہماری سماج ایسے ارادوں اور حوصلوں کی ہمت افزائی کرتی ہے ہمارے بہترین آدمی اُن کی طرف کھنچ جاتے ہیں تو کیا گاندھی جی یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ اس ماحول میں انسان کی اخلاقی تکمیل کا مقصد حاصل کر لیں گے؟ وہ لوگوں میں خدمت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، چند افراد کو متاثر کرنے میں اُنھیں ضرور کامیابی ہو گی، لیکن جب تک سماج اُن لوگوں کو جو دوسروں کو لُوٹ کر ترقی کرتے ہیں کامیابی کا نمونہ بنا کر پیش کرتی رہے گی اور ذاتی نفع کی خواہش کو عمل کا محرک قرار دے گی اُس وقت تک بہت بڑی اکثریت اسی راہ پر چلتی رہے گی۔

لیکن یہ محض اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ آج کل کے عملی اور ضروری مسائل میں سے ہے۔ دنیا سخت مشکل میں گرفتار ہے۔ اور اس مشکل کو کسی نہ کسی طرح حل کرنا ہے۔ ہم یہ نہیں کر سکتے کہ اربابِ تقدیر کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں کہ کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا، اور نہ محض اس طرز سے کام چل سکتا ہے کہ سرمایہ داری، اشتراکیت اور اشتمالیت وغیرہ کے خراب پہلوؤں کی نکتہ چینی کرتے رہیں۔ اور اس دھندلی سی امید کا سہارا لیں کہ کوئی بہترین میانہ طریقہ خود بخود نکل آئے گا جس میں ماضی اور حال کے سب طریقوں

کی سو بیاں جمع ہوں گی، بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ مرض کی تشخیص کی جائے۔ علاج تجویز کیا جائے اور اُسے عمل میں لانے کی کوشش کی جائے۔ یہ بالکل یقینی بات ہے کہ قومی اور بین الاقوامی حیثیت سے ہم موجودہ حالت پر قائم نہیں رہ سکتے۔ یا تو ہمیں پیچھے ہٹنا ہے یا آگے بڑھنا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو پیچھے ہٹنے کا اب کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

مگر گاندھی جی کی اکثر کاروائیوں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اس فرسودہ قومی معیشت کی طرف واپس لے جانا چاہتے ہیں جس میں قومیں دوسری قوموں سے معاشی حیثیت سے بے نیاز ہوں۔ قدیم زمانے کی طرح ہر گاؤں ایک مستقل معاشی حیثیت رکھتا تھا۔ اپنا کھانا، کپڑا اور دوسری ضروریات کی چیزیں خود ہی پیدا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں معیار زندگی بہت ہی پست ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی یہ حالت صرف عارضی طور پر چاہتے ہیں، کیونکہ مستقل طور پر تو یہ چل ہی نہیں سکتی۔ بعض ملکوں کی بڑی بڑی آبادیوں کا اس صورت میں زندہ رہنا دشوار ہو جائے گا اور وہ یہ ہرگز گوارا نہ کریں گی کہ عسرت اور فاقے کی زندگی کی طرف پلٹیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کے سے زرعی ملک میں جہاں ہمارا موجودہ معیار زندگی بہت ہی پست ہے دیہی صنعتوں کی ترقی سے عام لوگوں کی حالت کسی قدر بہتر ہو جائے۔ لیکن دوسروں کی طرح ہم بھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے وابستہ ہیں۔ اور میرے خیال میں اُن سے قطع تعلق کرنا بالکل ناممکن ہے، اس لئے ہمیں ان مسائل پر ساری دنیا کے نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیئے اور اس نقطۂ نظر سے محدود قومی معیشت کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ میں تو ذاتی طور پر اسے ہر پہلو سے ناپسند کرتا ہوں۔

پھر پھر کر ہم اسی چیز پر پہنچتے ہیں جس کے سوا اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں، یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام، پہلے قومی دائرے کے اندر اور پھر ساری دنیا میں جس میں دولت کی پیدائش و تقسیم، ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طریقہ سے ہونا چاہیئے، یہ ایک جداگانہ سوال ہے، لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں ایک پوری قوم بلکہ نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جا سکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اس تبدیلی کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا

سماجی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو اُن وسائل چیزوں کی خاطر مفید اور پسندیدہ مقصد کو قربان کرنا بہت بڑی ممکن ہے کہ دنیا کے عام واقعات کسی حد تک اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں یا اس کی رفتار کو تیز کرنے میں مدد دیں۔ لیکن جب تک ملک کے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت راضی نہ ہو جائے یہ انقلاب مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ اس لئے اُن لوگوں کو سمجھا بجھا کر اپنا ہم خیال بنانا ہے، ایک چھوٹی سی جماعت کی سازش اور تشدد سے کام نہیں چل سکتا، ظاہر ہے کہ ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ اُن لوگوں کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیں، جو موجودہ نظام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں لیکن یہ بہت بعید از قیاس ہے کہ ہم ان میں سے کچھ زیادہ لوگوں کو قائل کر سکیں گے۔

کھادی کی تحریک یعنی ہاتھ سے بُننا اور کاتنا جس سے گاندھی جی کو خاص شوق ہے، ایک ایسی چیز ہے جو دولت آفرینی کے انفرادی طریقے کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اور ہمیں ماقبل صنعت عہد کی طرف واپس لے جاتی ہے۔ آج کل کے کسی اہم مسئلے کو ان طریقوں سے حل کرنا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ اُن سے ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے جو ترقی کی صحیح راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ پھر بھی میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ایک وقتی اور عارضی تدبیر کی حیثیت سے اس تحریک کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ آئندہ بھی اس وقت تک پہنچتا رہے گا جب تک خود حکومت زرعی اور صنعتی مسائل کا کوئی معقول حل نہ تلاش کرے گی جو وسیع پیمانے پر سارے ملک میں جاری کیا جا سکے۔ ہندوستان میں اس وقت لاکھوں بے روزگار ہیں جن کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ کثرت سے وہ لوگ ہیں جو دیہاتی علاقوں میں سال کے ایک حصے میں بیکار رہتے ہیں۔ حکومت نے بے روزگاری کو دُور کرنے یا بے روزگاروں کی مدد کرنے کی کوئی کوشش اب تک شروع نہیں کی ہے۔ اس لئے معاشی حیثیت سے کھادی کی تحریک نے ان لوگوں کی تھوڑی بہت مدد کی جو بالکل بیکار ہیں یا کچھ عرصے کے لئے بیکار رہا کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ ترقی ضرور اپنی کوشش سے حاصل ہوئی ہے اس لئے ان لوگوں کی خودداری بڑھ گئی ہے اور ان میں خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اصل میں جو نمایاں تبدیلی ان لوگوں میں پیدا ہوئی ہے

وہ نفسیاتی تبدیلی ہے۔ کھادی نے کسی حد تک اس فصل کو دور کیا جو شہر اور دیہات میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے اوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں کو کسانوں سے قریب تر کر دیا۔ لباس کا پہننے والوں اور دیکھنے والوں پر بہت گہرا نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ اوسط طبقے میں کھادی کے رواج سے سادگی آگئی ہے نمود و نمائش اور بد مذاقی کم ہو گئی ہے۔ اور عام لوگوں سے میل جول کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ اوسط طبقے کے لوگ اب نہ تو لباس کے معاملے میں امیروں کی نقالی کی کوشش کرتے ہیں اور نہ سستی پوشاک پہننے میں ذلت اور شرم محسوس کرتے ہیں، بلکہ سچ پوچھئے تو یہ لوگ کھادی کے لباس کو خاصہ باوقار سمجھتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے مقابلے میں اب بھی ریشم اور ساٹن پہن کر اتراتے ہیں، اپنی فوقیت کا احساس رکھتے ہیں۔ غریب سے غریب لوگوں میں بھی خودداری اور وقار کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ کھادی پہننے والوں کے بڑے اجتماعوں میں یہ پہچاننا مشکل ہو گیا کہ کون غریب ہے اور کون امیر۔ اور اس برادری کے جذبے کو ترقی ہوئی اس میں شبہ نہیں کہ عام لوگوں تک پہنچنے میں کانگریس کو کھادی سے بڑی مدد ملی۔ اس کو لوگ قومی آزادی کی وردی سمجھنے لگے۔

ملوں کے مالکوں کے اس رجحان کو بھی کہ اپنے مال کی قیمت بڑھاتے چلے جائیں کھادی ہی نے روکا۔ ورنہ پہلے اُن کی روک تھام صرف بدیسی اور لنکا شائر کے مقابلے کی وجہ سے ہوا کرتی تھی۔ اور جب کبھی یہ مقابلہ بند ہوا مثلاً جنگِ عظیم کے زمانے میں تو کپڑے کی قیمتیں ہندوستان بھر میں، غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں، اور ہندوستانی ملوں نے کروڑوں روپیہ کمایا۔ سودیشی کی تحریک اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک سے آگے چل کر ان ملوں کو بڑی مدد ملی۔ لیکن کھادی کی تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ قیمتیں اتنی زیادہ نہیں بڑھ سکتیں ان ملوں نے اور (جاپان نے بھی) کھادی کی ہر دل عزیزی سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ اس قسم کا موٹا کپڑا تیار کیا کہ اس میں اور ہاتھ کے کتے اور ہاتھ کے بنے کپڑے میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ اگر اب کوئی غیر معمولی صورت پیدا ہو جائے، مثلاً جنگ چھڑ جائے جس سے بدیسی کپڑے کی درآمد بند ہو جائے تو غالباً ہندوستان کے ملوں کے مالک خریداروں کو اتنا نہیں لوٹ سکیں گے جتنا کہ سنہ ۱۹۱۴ء سے کئی سال تک لوٹتے رہے۔ کھادی کی تحریک اس کو روکے گی اور کھادی کی تنظیم میں اتنی گنجائش ہے کہ تھوڑی سی مدت کے اندر بہت پھیل جائے۔

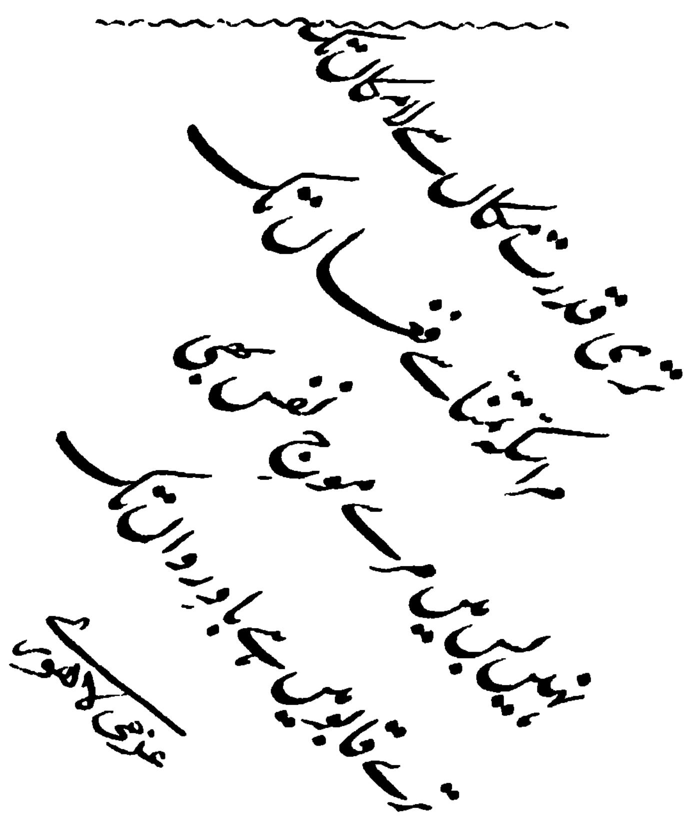
ان تمام فوائد کے باوجود جو اس وقت ہندوستان کو کھادی کی تحریک سے حاصل ہیں میرے خیال میں یہ محض عارضی چیز ہے۔ ممکن ہے کہ بعد میں بھی ایک ضمنی تحریک کی حیثیت سے باقی رہے۔ تاکہ اس مدت میں جو ایک اعلیٰ معاشی نظام کے اختیار کرنے میں لگ جائے گی اس سے کام چلتا رہے۔ لیکن آئندہ ہماری اصل کوشش یہ ہوگی کہ زراعتی نظام کی از سر نو تنظیم کی جائے اور صنعت کو ترقی دی جائے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ آراضی کے نظام میں دفع الوقتی کے لئے چھوٹی موٹی تبدیلیاں کی جائیں اور طرح طرح کے کمیشن مقرر ہوں جن پر لاکھوں روپیہ صرف ہو اور وہ کچھ اوپری چیزوں کی اصلاح کر دیں۔ ہمارا نظام آراضی دیکھتے ہی دیکھتے بیٹھ رہا ہے اور موجودہ صورت میں دولت کی پیدائش اور تقسیم اور بڑے پیمانے پر معقول طریقے سے کام کرنے میں حائل ہے جدید عہد کے حالات کے لحاظ سے بغیر اس بنیادی تبدیلی کے کام نہیں چل سکتا۔ چھوٹی چھوٹی زمینیں اسامیوں کو بانٹنے کا طریقہ ختم کر دینا چاہیے اور اس کی جگہ منظم طور پر امداد باہمی کے اصول کے مطابق اجتماعی کاشت شروع کی جائے تاکہ کم محنت سے زیادہ پیداوار ہو سکے۔ زراعت، ہماری ساری آبادی کبھی نہیں کھپا سکتی۔ بڑے پیمانے پر کاشت کرنے سے رجیسا کہ گاندھی جی کا اندیشہ ہے، زراعت کا کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ باقی لوگوں میں سے بعض شاید چھوٹی گھریلو صنعتوں میں کھپ جائیں۔ مگر اُن کی بہت بڑی تعداد کو بڑے پیمانے کی اشتراکی صنعتوں اور سماجی خدمت کے کاموں میں لگانا پڑے گا۔

یقیناً بعض علاقوں کو کھادی کی تحریک سے تھوڑی بہت مدد ملی ہے لیکن اسی کامیابی میں جو اس کو حاصل ہوئی ہے خطرے کا بھی ایک عنصر موجود ہے۔ یعنی یہ تحریک ایک زوال پذیر نظام آراضی کو سہارا دے رہی ہے اور اسی حد تک ایک بہتر نظام کے قیام میں تاخیر پیدا کر رہی ہے۔ اس کا اثر اتنا زیادہ نہیں ہے کہ اس سے کوئی نمایاں فرق پیدا ہو۔ لیکن یہ رجحان اس میں بہر حال موجود ہے، کسانوں یا کاشتکار زمینداروں کو زمین کی پیداوار کا جو حصہ ملتا ہے وہ اس کے لئے بھی کافی نہیں کہ جس پست ترین سطح پر وہ پہنچ گئے ہیں، اسی پر قائم رہ سکیں۔ اس لئے اس کو اپنی قلیل آمدنی میں اضافے کی اور

صورتیں پیدا کرنی پڑتی ہیں، ورنہ لگان یا ادائے مالگذاری کے لئے اور قرض لینا پڑتا ہے۔ اگر انفرادی طور پر بعض کاشتکاروں کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے یا حکومت کو اپنا مطالبہ وصول کرنے میں مدد ملتی ہے جو شاید معمولی حالت میں نہ وصول ہوسکتا۔ اگر یہ اوپر کی آمدنی کچھ زیادہ ہو تو لگان اتنا ہی اور بڑھا دیا جاتا ہے۔ موجودہ نظام کے ماتحت کاشتکاروں کی زائد محنت اور کفایت شعاری کی کوشش سے اصل فائدہ زمین کے مالک ہی کو پہنچتا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ہنری جارج نے اپنی کتاب "ترقی اور غربت" میں اس مسئلے پر بھی بحث کی ہے۔ بہت سی مثالیں دی ہیں جو زیادہ تر آئرستان کی ہیں۔

دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی جو کوشش گاندھی جی کر رہے ہیں وہ اصل میں کھادی کے پروگرام ہی کی توسیع ہے۔ اس سے فوری طور پر ضرور فائدہ ہوگا جس میں سے کچھ کم و بیش مستقل ہوگا، مگر زیادہ تر محض وقتی، اس سے دیہاتوں کی موجودہ تکلیفوں میں کچھ کمی ہو جائے گی، اور ہماری تہذیب کے بعض خوشنما نمونے جو مٹ رہے تھے محفوظ ہو جائیں گے۔ لیکن جہاں تک کہ اس کا مقصد کلوں اور صنعتی نظام کی مخالفت ہے اس میں یہ تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی۔ گاندھی جی نے حال میں "ہریجن" میں دیہی صنعتوں پر ایک مضمون لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں "کلوں کو رواج دینا اس وقت تک مفید ہوتا ہے جب کام بہت ہو اور کرنے والے تھوڑے ہوں۔ لیکن جب ضرورت سے زیادہ آدمی کام کرنے کے لئے موجود ہوں جیسا کہ ہندوستان میں ہے تو یہ چیز مضر ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے لئے جو دیہات میں رہتے ہیں فرصت کا وقت نکالا جائے سوال تو یہ ہے کہ ان کے خالی وقت کو جو سال میں چھ مہینے سے کم نہیں کس طرح کام میں لگایا جائے"۔ یہ اعتراض کچھ فرق کے ساتھ تمام ملکوں پر وارد ہوتا ہے جو بے روزگاری میں مبتلا ہیں۔ لیکن اصل میں دقت کام کی کمی کی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ منافع حاصل کرنے کے موجودہ نظام کے ماتحت جس سے کام میں خاطر خواہ نفع نہیں ہوتا۔ کثرت سے ایسے کام موجود ہیں جو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ آؤ اور ہمیں کرو، مثلاً سڑکوں اور مکانوں کی تعمیر۔ آبپاشی کی اسکیم، حفظانِ صحت کے طبی وسائل، صنعت و حرفت اور برقی قوت کی ترقی۔ سماجی اور تمدنی خدمات، تعلیم اور ان بیسیوں ضروری اشیاء کی فراہمی جن کی لوگوں کو سخت ضرورت ہے۔ ہمارے یہ کروڑوں آدمی آئندہ پچاس سال تک سخت محنت کرتے رہیں تب بھی کام ختم نہ ہوگا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کام کی محرک نفع کی خواہش نہیں بلکہ سماجی ترقی کی خواہش ہو، اور سماج کی تنظیم مفادِ عامہ کو پیشِ نظر رکھ کر کی جائے۔ روس کے "سوویٹ یونین" میں اور چاہے جو نقائص ہوں، لیکن وہاں بے روزگاری بالکل نہیں ہے۔ ہمارے یہاں لوگ کام نہ ہونے کی وجہ سے بیکار نہیں ہیں بلکہ اس وجہ سے بیکار ہیں کہ اُن کے لئے کام کرنے کی صورتیں اور اصلاح و ترقی کی سہولتیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ اگر بچوں سے کام لینا بند کر دیا جائے اور ایک معقول عمر تک لازمی تعلیم کا بندوبست ہو جائے تو لڑکے اور لڑکیاں مزدوروں اور بے روزگاروں کے زمرے سے خارج ہو جائیں گے اور مزدوروں کی منڈی کئی کروڑ آدمیوں کے بوجھ سے ہلکی ہو جائے گی۔

(میری کہانی)



سُلطان ٹیپوؒ

نظر سے آج جو گزری ہیں چند تصویریں
وہ یوں ہیں دل میں کہ جیسے لہو کی تحریریں

بسی ہے جنگِ سرنگاپٹام آنکھوں میں
کسی شہید پہ سایہ کئے ہیں شمشیریں

غلام قوم! تجھے کچھ حیا بھی آتی ہے
ہیں تیرے چاند پہ خاک افگنی کی تدبیریں

ترا چراغ سرِ شام بجھ گیا لیکن
سحر کے بھیس میں چمکیں گی اُس کی تنویریں

مرے شہید ترے نامِ پاک سے قومیں
کریں گی آیۂ حُبّ الوطن کی تفسیریں

پیامِ سعیِ سرفرازیٔ وطن ہے تُو
شہید و غازی و جرّار و صف شکن ہے تُو

سیاستِ وطنی کی ہوا تھی زہر آلُود
ہوائے غرب تھی ناسازوار نامسعود

صباحِ دولتِ تیموریہ کی آئی شام
پڑا تھا نیّرِ اقبالِ ہند سربسُجود

گلوں کو لوریاں دیتا تھا اعتبارِ بہار
چمن میں سبزۂ بیگانہ پا رہا تھا نمود

وطن کے باغ میں تُو تھا بس ایک سروِ رواں
کہ روند روند کے کر ڈالتا اُسے نابُود

جواں ارادہ و بالا بلند عالی ظرف
تجھے نہ دیکھ سکی آسماں کی چشمِ کبود

ہے تیرے بعد تری یاد افتخارِ وطن
ترا چراغ ہے شمعِ سرِ مزارِ وطن

پکارتی ہیں سرنگاپٹم کی دیواریں
کہ ہم کو یاد ہیں وہ گولیوں کی بوچھاریں

دہن کشادہ ہیں زخمِ جگر نہیں معلوم
یہ کس گھڑی وطنی غیرتوں کو للکاریں

یہ ارضِ پاک ہے شاہِ شہید کی گیتی
اِسی زمین میں بوئی گئی ہیں تلواریں

امانتاً اِنھیں ذروں نے اُن کو جذب کیا
اُبل رہی تھیں جو ٹیپوؒ کے خون کی دھاریں

شہید لال کو کیوں مادرِ وطن روئے
سپوت وہ ہیں دلیرانہ جو مریں ماریں

اُس ایک جانِ گرامی پہ لاکھ جاں صدقے
اُس ایک موت پہ سو عمرِ جاوداں صدقے

رکن الدین۔ سالک میوہ

حقیقت

سردار علی جعفری

افراد

شیطان	ایک نوجوان
آزادی	ایک دوشیزہ
حکومت	شیطان کی عصمت فروش بیٹی
سیاست	حکومت کی کنیز
قانون	شیطان کا ناجائز فرزند

منظر

ایک باغ۔ ایک نوجوان جس کے بال پریشان ہیں اور پیشانی پر گہری گہری شکنیں ہیں۔ اپنے خیالات کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ٹہل رہا ہے۔

نوجوان۔ (زیرلب) آہ! یہ ہم خاک کے پتلوں کی زندگی ہے۔ ہماری مسرّتیں امید کی خطرناک بنیادوں پر کھڑی ہوئی کانپا کرتی ہیں۔ امید ایک غیرمتیقن مستقبل کی امید۔ اور ہم کرۂ حیات کی کروٹوں سے بے خبر استقبال کی تاریکیوں میں چلے جاتے ہیں۔ زندگی کے ناپید اکنار سمندر کی طوفانی موجوں میں ایک بے بس تنکے کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں۔ آخر انسان ہے کیا؟ قسمت کے ہاتھوں میں ایک رنگین کھلونا۔ گلستانِ ہستی کی ایک دوشیزہ کلی۔ شاخ آرزو پر بجائے مسکرانے کے لبو رنے والا ایک غنچۂ ناکامی بلکہ قدرت کی سب سے بڑی ستم ظریفی کا نمونہ جو خود بخود فضاو قدر کی فضا پُر موجوں پر رقص کیا کرتا ہے اور تھک جانے کے بعد تمنا۔ آرزو اور امید کے ہلتے ہوئے ستونوں سے سہارا لے کر سو جاتا ہے۔ یہ وہ نیند ہے جس سے کوئی بیدار نہیں ہوا۔ یہ وہ فرش ہے جس پر انسان ازل سے ابد تک سویا کرتا ہے۔

(اس کی آواز تیز ہوتی جاتی ہے)

یہ خاک کی پستیوں میں بسنے والی فانی مخلوق جو فانوسِ کائنات میں حسرت واندوہ کی ایک اندھی تصویر ہے صرف اس لئے عالمِ وجود میں آتی ہے کہ اپنے دائرۂ حیات میں گردش کرتے کرتے مٹ جائے

(یکایک ایک گوشہ سے شیطان نمودار ہوتا ہے اس کی لمبی سفید ڈاڑھی سے تقدس کی شان نمایاں ہے)

شیطان۔ تم کیا کہہ رہے ہو؟ انسان لافانی ہے؟

نوجوان۔ (چونک کر) کون؟ (ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں ملتا ہے) کیا انسان لافانی ہے؟

شیطان۔ ہاں انسان لافانی ہے اگر انسان عالم وجود میں نہ آیا ہوتا۔ تو یہ آسمان یہ زمین۔ یہ خوبصورت ستارے۔ یہ آفتاب اور ماہتاب کبھی نہ خلق ہوئے ہوتے۔ یہ سب رفتہ رفتہ مٹ جائیں گے۔ آسمان پھٹ جائے گا۔

زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے آفتاب لباسِ شعاعی سے معرا نظر آئے گا۔ ماہتاب ساکن ہو جائے گا مگر آدم کی اولاد باقی رہ جائے گی۔

نوجوان۔ تمہارا یہ مطلب ہے کہ روحِ انسانی باقی رہ جائے گی۔ شاید تم اہلِ مصر کے عقائد کی یادگار ہو۔

شیطان۔ نہیں۔ نہیں۔ میں روح کے متعلق کچھ نہیں کہہ رہا بلکہ انسان بذاتِ خود باقی رہے گا۔

نوجوان۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ لوگ روز کیوں مرتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں۔

شیطان۔ یہ مرتے نہیں۔ یہ فنا نہیں ہوتے۔ مگر ہمیں معلوم ایسا ہی ہوتا ہے تم نے ہلکے ابر میں چھپے ہوئے چاند کو دیکھا ہوگا اس وقت وہ تیرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر حقیقتاً یہ ابر کے ٹکڑے ہوتے ہیں جو تیزی سے دوڑتے پھرتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ چاند سرگرمِ سفر ہے۔ بالکل اسی طرح انسان فنا نہیں ہے بلکہ دنیا اپنی تباہی کے راستہ میں ایک قدم اور آگے بڑھ جاتی ہے ایک وقت وہ آنے والا ہے جب اس سطحِ گیتی پر کوئی انسان نظر نہیں آئے گا۔ وہ حقیقت کی بلندیوں سے زمین کی تباہی کا منظر دیکھ رہا ہوگا۔

نوجوان۔ حقیقت؟ تم نے کیا کہا؟ حقیقت!؟ کیا انسان مرکزِ حقیقت تک پہونچ سکتا ہے۔

شیطان۔ یقیناً وہ پہونچ سکتا ہے مرکزِ حقیقت تک مگر اسے . . . .

نوجوان۔ شاید مرجانے کے بعد

شیطان۔ نہیں زندگی ہی میں۔ مگر اسے ایک رہنما کی ضرورت ہے جو راستہ کے نشیب و فراز اور منزل کی رسم و راہ سے واقف ہو۔

نوجوان۔ نہیں یہ ممکن نہیں۔ میرا باپ اس جستجو میں فنا ہو گیا۔ اور اپنی آرزوؤں کو میرے پیکر میں چھوڑ گیا۔ میں خود بھی ایک سال سے اس کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ مگر حقیقت کسی شاعر کے تخیل سے بھی زیادہ بلند ہے۔ شاید یہ وہاں ہو جہاں عنقا اور ہما کے آشیانے ہیں۔

شیطان۔ تم نے حقیقت کی جستجو کہاں کی۔

نوجوان۔ ہر جگہ . . . یہ پوچھو کہ میں نے حقیقت کی جستجو کہاں نہیں کی۔ میں اپنے ارادوں پر حکمرانی کرتا ہوں۔ میں ستاروں کی بستیوں میں پرواز کر سکتا ہوں۔ میں زمین کی گہرائیوں میں دیکھ سکتا ہوں۔ پھر بھی میں حقیقت کی منزل تک نہ پہونچ سکا۔

ظلمت چاروں طرف سے مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ میری نگاہیں خود مجھے دھوکا دیتی ہیں۔ جب میں یہاں سے نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ تو مجھے ہزار در ہزار روشن نقطے نظر آتے ہیں مگر جب میری روح ان کی طرف پرواز کرتی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ سرابِ نظر سے زیادہ ان کی حقیقت کچھ نہیں۔ پہلے تو یہ نورانی کرے جادِ نظر کی طرح آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ پھر ان کی روشنی کم ہونے لگتی ہے اور وہ قریب آتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ نور کی جگہ ظلمت لے لیتی ہے۔ تاریکیاں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں اور میری امیدوں کی ٹوٹی ہوئی کشتی مایوسیوں اور ناکامیوں کے ویران ساحل سے ٹکرا کر ٹکراتی ہے اور پہلے سے زیادہ شکستہ ہو جاتی ہے پھر ایک ہُو کا عالم ہوتا ہے اور میری تنہائی۔

وہاں سے پھر زمین بھی اتنی ہی خوبصورت معلوم ہونے لگتی ہے وہ ایک سنہری پیالے کی طرح چمکتی ہے۔

شیطان۔ آہ۔ تو نے حقیقت کی جستجو غلط جگہ کی ظلمت کدے میں نور کو ڈھونڈھنا چاہا۔ اے آوارۂ حقیقت میں تجھے بتاؤں کہ تیرا مرکزِ جستجو اس عالمِ آب و گل ہی میں موجود ہے۔

نوجوان۔ میرے کان ان الفاظ سے آشنا ہیں۔ مجھ سے بارہا ایسے فقرے کہے گئے ہیں۔ میں ان کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ کوئی گندہ شراب خانہ یا ہوسناک رقص گاہ۔ کوئی دربارِ سلطانی یا شبستانِ چنگیزی۔

ایک مرتبہ جب میری روح ستاروں کی بلند فضاؤں میں حقیقت کی جستجو میں سرگرمِ سفر تھی۔ دور بہت دور آسمانوں میں پروں کی سنسناہٹ سنائی دی۔ کہکشاں کی بلندیوں سے ایک آتشیں پیکر تاریکیوں کی دنیا کو درہم و برہم کرتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا اور شہابِ ثاقب کے دیکھتے

ہوئے انگارے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔

میری روح نے خوش ہو کر کہا آہ یہی حقیقت ہو۔ جو اپنے ساتھ ستارۂ ﷺ نے لئے ہوئے آ رہی ہے لیکن جب وہ آتشیں پیکر قریب آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک دیو ہیکل شکل ہے۔ جس کے بدن سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے اور فضاؤں میں چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔ آہ۔ یہ شیطان تھا۔ جو میری روح کو بہکا کر اس عالم ارضی میں واپس لے آیا۔

وہ اسے ایک خطۂ حسن و موسیقی میں لے گیا۔ ایک ہشت پہل کمرہ تھا جو مشرقی ذوق کا بہترین نمونہ تھا۔ سنگ مرمر کی بلند دیواروں پر جواہرات چمک رہے تھے اور ایرانی مصوروں کے شاہکار آویزاں تھے دروازوں پر بحر عمان کی آغوش میں پرورش پانے والے موتیوں کی لمبی لمبی جھالریں پڑی تھیں۔ کھڑکیوں پر گلابی پردے ہل رہے تھے۔ بیچ میں ایک سنہری ستون کے گرد آبنوس کی سیاہ چوکیوں پر خمار آلودہ مینائیں انگڑائیاں لے رہی تھیں جنھیں فیروزوں کے چمکدار پیالے گھیرے ہوئے تھے ستون کے چاروں طرف بڑے بڑے احمریں فانوس چھت میں لٹک رہے تھے جن میں شمعیں ایک آگ سی لگائے ہوئے تھیں۔ ان کا نور رقصاں اس صندلی تخت کو ایک تخت نور بنائے ہوئے تھا جس پہ ایک نقاب پوش دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی۔

کیا یہی بارگاہِ حقیقت تھی۔ یہ تو بالکل ایک قصر کیانی تھا اور نقاب پوش دوشیزہ زمانۂ ماقبل تاریخ کی کوئی پُر رعونت شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔

میری روح گھبرا کر وہاں سے نکل آئی۔ سورج غروب ہو چکا ہے اور رات اپنے سیاہ بازوؤں کو آہستہ آہستہ پھیلا رہی ہے مگر مجھے ایک ایسی وحشت ناک رات یاد ہے۔ جو ہزاروں کالے سانپوں کی طرح لہریں لے رہی تھی۔ وحشت آگین ہوائیں بھوتوں کے قہقہے معلوم ہو رہی تھیں۔ آسمان پر غلیظ ابر چھایا ہوا تھا۔ جس کے شگافوں سے چھوٹے چھوٹے ستارے جھانک رہے تھے میں حقیقت کی تلاش و جستجو سے تھک کر اپنے ننھے ننھے ستاروں کی طرف دیکھ رہا تھا ——

"اے چھوٹے چھوٹے ستارو تم دور سے کتنے اچھے معلوم ہوتے ہو۔ میں تمہاری حقیقت سے خوب واقف ہوں۔ میں تمہاری اصلیت تمہارے اس نورانی پیکر کی اصلیت خوب جانتا ہوں" —— اتنے میں زمین شق ہوئی اور اس میں سے ایک سیاہ فام شکل باہر نکلی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی جس کی آنکھوں سے مکاری ٹپک رہی تھی۔ اور ایک لڑکا تھا جس کی پیشانی کی خوفناک شکنیں اس کے ظالم ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں میں یہ منظر دیکھ کر چیخ اُٹھا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ میں حقیقت کی جستجو سے باز آیا۔ مگر وہ سیاہ فام شکل آگے بڑھی۔ اور میرا بازو پکڑ لیا۔ اس نے انگلی سے مغرب کی طرف اشارہ کیا۔ یکایک رات کی تاریکیاں چھٹنے لگیں اور مجھے نورانی شعاعوں نے گھیر لیا میں نے دیکھا کہ وہی لڑکی جو اس کے ساتھ تھی۔ ایک سنہرے تخت پر بیٹھی ہوئی ہے اور وہ لڑکا اس کے برابر کھڑا ہوا ہے۔ ان کے علاوہ وہاں ایک تیسری شکل اور تھی وہ کیسی تھی۔ مجھے نہیں معلوم۔

میں نے پوچھا "یہ کیا"

دور سے ایک آواز آئی۔ یہی حقیقت کا دربار ہے۔ مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ میرے منھ سے بے ساختہ نکل گیا کہ "یہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ حقیقت نہیں ہے شیطان کا فریب ہے"

اب جو دیکھا تو واقعی یہ ایک فریب تھا۔ وہاں وہی تاریکیاں تھیں اور وہی ہولناکیاں۔ حقیقت کو اس سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

شیطان ۔ تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یقیناً تو نے جستجو کی اور ناکام رہا مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حقیقت اس عالم میں موجود نہیں۔ بہت سے پھول جنگلوں میں ایسے بھی کھلتے ہیں جن کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔ مگر وہ ہوائیں جو وہاں سے آئی ہیں ان پھولوں کی خوشبوئیں چرا لاتی ہیں۔ مجھے ابھی تک کوئی رہبر نہیں ملا۔ آج تیری ناکامیوں کے سیاہ خانہ میں کامیابی کی پہلی شعاع داخل ہوئی ہے۔ آ۔ میں تجھے بتاؤں کہ حقیقت کہاں ہے۔

نوجوان ۔ نہیں۔ میں تیرے ساتھ نہیں جا سکتا میں فریب کے کئی جام پینے

کے بعد اب ہوشیار ہو گیا ہوں۔

شیطان۔ میں تجھے فریب دے رہا ہوں۔

نوجوان۔ کاش ایسا ہی ہوتا مگر میرے سینہ میں ایسے فریبوں کی نہ معلوم کتنی داستانیں دفن ہیں۔

شیطان۔ میں تجھے یقین کی اس منزل تک لے جانا چاہتا ہوں جہاں فریب کا گذر نہیں۔

نوجوان۔ مگر میں اعتبار کی دنیا کو ٹھکرا چکا ہوں۔ میں اب فریب کی دنیا میں رہتا ہوں۔

شیطان۔ پھر ایسی دنیا میں رہ کر تو فریب سے کیسے بچ سکتا ہے۔ بیوقوف مت بن۔ اور حقیقت کے کاشانے تک میرے ساتھ چلا چل

نوجوان۔ ممکن ہوتا تو میں ایسا ہی کرتا۔

شیطان۔ (حسرت سے) بیچارہ انسان۔ خاک کی پستیوں میں رہ کر اس کی ہمتیں بھی پست ہو گئی ہیں۔ وہ ناکامیوں سے بہت جلد گھبرا جاتا ہے وہ ناکامی کے فلسفہ کو نہیں سمجھتا۔ نہیں وہ کچھ نہیں سمجھتا۔ آخر انسان ہے وہ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ ہر فریب کی تہ میں بجائے خود ایک حقیقت پنہاں ہے (نوجوانوں کی طرف مخاطب ہو کر) میں وہ باریک راستہ دکھا سکتا ہوں جو حقیقت تک چلا گیا ہے۔ مگر تو اسے دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس کا ذمہ دار تو خود ہے مگر یاد رکھ کہ بعد کو پچھتائے گا۔ زندگی کی مختصر گھڑیوں میں موقع صرف ایک ہی مرتبہ ملا کرتا ہے اتفاقات صرف ایک مرتبہ آکر انسان کے دروازے کو کھٹکھٹاتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لئے چلے جاتے ہیں یاد رکھ اسے بے وقوف وقت کے شہپر اپنی سرعت پرواز کے لئے مشہور ہیں۔

(ایک طرف کو چل دیتا ہے)

نوجوان۔ (تھوڑی دیر تک گردن جھکا کر کچھ سوچتا ہے پھر اپنی تھکی ہوئی نگاہوں سے جانے والے کا تعاقب کرتا ہے) مجھے بہکاتا ہے (یکایک ایک خیال اس کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے) آہ! ٹھہر جا (ایک قدم آگے بڑھ کر) اے مقدس ہستی میری ناکامیوں میں ایک اور ناکامی کا اضافہ مت کر۔ آ۔ اور مجھے حقیقت کی منزلوں تک پہونچا دے۔ شاید میں تیرا یقین نہ کرتا اگر تیرا زہد اور تقویٰ مجھ سے تیری سفارش کر رہا ہے۔

شیطان۔ (زیر لب مسکراتا ہے) زہد اور تقویٰ بہ رنگین شراب کے زہر آلود جام ہیں (مڑ کر دیکھتا ہے) اچھا۔ وہیں کھڑا رہ میں تجھے حقیقت کی جلوہ گاہ کا منظر دکھائے دیتا ہوں جہاں ایک ابدی راحت ہے اور ایک روحانی سکون (انگلی سے آسمان کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ دو نورانی پیکر زمین کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں)

نوجوان۔ (فرط مسرت سے چیخ اٹھتا ہے) حقیقت حقیقت حقیقت تو آسمانی مخلوق ہے مگر میری خاطر زمین کی طرف آ رہی ہے میں نے تجھے پا لیا۔ مگر یہ تیرے ساتھ کون ہے کیا میرے سوا تو کسی کو پہلے کبھی مل چکی ہے آہ! نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ دیوانے انسانوں کی دنیا ہے یہ اندھوں کی دنیا ہے، اس میں صرف ایک ہی بینا پیدا ہوتا ہے۔ آہ! تو کسی کو نہیں ملی۔ میں نے صرف میں نے تجھے پا لیا۔ آ۔ میرے کاشانۂ حیات میں آ میری تاریک روح کو اپنے بے شمار جلووں سے روشن کر دے۔

شیطان۔ (ہنس کر) یہ حقیقت نہیں ہے۔ میں تجھ سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ حقیقت اس دنیا ہی میں موجود ہے۔ مگر کوئی اس راز سے واقف نہیں میں نے دو آسمانی فرشتوں کو تیری رہنمائی کے لئے بلایا ہے۔

نوجوان۔ ان کا کیا نام ہے (دونوں پیکر سامنے آکر کھڑے ہو جاتے ہیں) مگر ان میں سے ایک میں نسوانیت ہے۔ یہ کیا؟

شیطان۔ انسان فرشتوں کو ان کی اصلی شکل و صورت میں نہیں دیکھ سکتا۔ یہ انسانی پیکر میں تیرے سامنے آئے ہیں (نسوانی پیکر کی طرف اشارہ کر کے) دیکھ یہ حکومت ہے (نوجوان اس کے دلفریب چہرہ کی طرف دیکھتا ہے) یہ تجھے حقیقت کی بارگاہ میں لے جائے گی (مردانہ پیکر کی طرف اشارہ کر کے) یہ قانون ہے یہ ہر وقت تیری حفاظت کریگا۔

(نوجوان اس کی سرخ آنکھوں کی طرف دیکھتا ہے۔

نوجوان۔ (زیر لب) میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ یہ حکومت کی دلفریبیاں اور قانون کی خونی نگاہیں۔ اے حقیقت تو کہاں ہے۔

حکومت۔ (پر وقار انداز میں آگے بڑھکر) اے نوجوان میرے نقرئی قدموں پر اپنا سر رکھدے تاکہ تیری پیشانی نورانی ہوکر حقیقت کی چوکھٹ پر جھکنے کے قابل ہوجائے۔

نوجوان۔ (حیرت سے) میں تیرے سامنے اپنی گردن جھکاؤں؟ میں اپنی خودداری کسی قیمت پر دینے کو تیار نہیں۔

حکومت۔ (تمکنت سے) فانی انسان کی خودداری میرے قدموں لپٹی ہوئی ہے۔ میری ٹھوکروں میں کامیابی کا راز نہاں ہے۔ جھک جا۔ اور میرے سامنے اپنی عاجزی ظاہر کرتاکہ میں اندازہ کرسکوں کہ تو حقیقت کی تاب لاسکتا ہے یا نہیں۔

نوجوان۔ یہ نہیں ہوسکتا۔

شیطان۔ تو یہ کیا کر رہا ہے تو حکومت کی توہین کرکے کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔

نوجوان۔ میں حکومت کے سامنے اپنی گردن نہیں جھکا سکتا (قانون کے ابروؤں پر بل پڑجاتا ہے) انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ وہ غلامی نہیں کرسکتا۔

شیطان۔ اے بیوقوف یہ غلامی نہیں ہے تو ابھی ناتجربہ کار ہے تجھے نہیں معلوم کہ تو جسے غلامی کہہ رہا ہے۔ حریت اسی کا نام ہے۔

(قانون کف در دہاں ہے)

نوجوان۔ ہرگز نہیں۔ حریت کی منزل حکومت کی رسائیوں سے باہر ہے۔ آہ! یہ قدم اور انسان کی پُروقار پیشانی!! میں باطل پرستی کے لئے ہرگز آمادہ نہیں ہوں۔

قانون۔ (غصہ میں آگے بڑھ کر) تو حکومت کو باطل کہہ رہا ہے شاید تو ابھی میری بے پناہ قوتوں سے واقف نہیں۔

نوجوان۔ (متانت سے) تو کون ہے۔ میرے سامنے سے ہٹ جا۔ میں حکومت سے باتیں کررہا ہوں۔ تجھ سے کوئی مطلب نہیں۔

قانون۔ تجھے نہیں معلوم میری اور حکومت کی خلقت ساتھ ساتھ ہوئی ہے ہم ایک ہی پارۂ آتش کے دو ٹکڑے ہیں۔ جہاں حکومت جاتی ہے وہاں میں بھی جاتا ہوں۔ یہ حکومت کی شان کے خلاف ہے کہ وہ خود کسی سے باتیں کرے۔ میں حکومت کی زبان ہوں

نوجوان۔ میں اس زبان کو بند کردینا چاہتا ہوں۔

شیطان۔ (موقع کی نزاکت کو سمجھکر) اے نوجوان تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یقیناً تجھے حکومت ہی سے باتیں کرنی چاہئیں (قانون کی طرف مخاطب ہوکر) خاموش ہوجا (حکومت کی طرف مڑکر) اس نوجوان کے قریب جاکر قانون کی بدزبانی کی معافی مانگ۔

حکومت۔ (قریب آکر دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک دیتی ہے۔ اور اپنے دونوں ہاتھ بلند کرکے حسرت بھری نظروں سے نوجوان کی طرف دیکھتی ہے)۔ آہ! میں قانون کی حماقتوں سے عاجز ہوں (شیطان اور قانون دونوں غائب ہوجاتے ہیں۔ حکومت کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے زمین پر ٹپک پڑتے ہیں۔)

نوجوان۔ میں نے معاف کیا اے آسمانی پیکر اب مجھے شرمندہ نہ کر (حکومت کو آہستہ سے اٹھاتا ہے زمین سے جہاں حکومت کے آنسو ٹپکے تھے ایک اور نسوانی پیکر شعلوں کا پیراہن پہنے ہوئے نمودار ہوتا ہے نوجوان گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے) یہ کیا۔ یہ کون ہے۔

حکومت۔ (مسکراکر) کچھ نہیں۔ میری کنیز ہے۔ سیاست۔

نوجوان۔ سیاست۔

سیاست۔ (آگے بڑھکر) نوجوان کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھدیتی ہے۔ اور نظریں اٹھاکر اس کی طرف دیکھتی ہے یہ نظریں نوجوان کے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں گھستی ہوئی چلی جاتی ہیں) آ میں تجھے وہ راز بتاؤں۔ جسے حقیقت کہتے ہیں۔ دیکھ حکومت کے پیروں کے قریب کیا ہے (نوجوان دیکھتا ہے کہ اس کے انگوٹھوں سے نور کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔) یہ نور جو حکومت کے انگوٹھوں سے پیدا ہورہا ہے۔ حقیقت کا نور ہے۔

نوجوان۔ آہ! حقیقت (جھک کر اس نور کو چومنا چاہتا ہے کہ زمین سے ایک سفید ہاتھ باہر نکلتا ہے جو اس نور کو ظلمت میں تبدیل کردیتا ہے یہ ہاتھ نوجوان کے سینے تک آتا ہے اور اسے جھکنے سے باز رکھتا ہے حکومت اور سیاست کانپ کر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ اور ڈری ہوئی نگاہوں

اس ہاتھ کو دیکھتی ہیں۔ یکایک ہاتھ غائب ہوجاتا ہے اور ایک دوشیزہ سفید ردا میں پہنی ہوئی نظر آتی ہے۔ نوجوان چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے حکومت کا کہیں پتہ نہیں ہے)

دوشیزہ۔ میں ہوں وہ حقیقت کبریٰ جو نبضِ کائنات کی مضمحل سے مضمحل جنبش میں کروٹ لیتی ہے۔ حریت میرا نام ہے۔ آزادی میری فطرت ہے۔ صداقت میری عصا ہے اور قربانی میری قیمت۔ میں عالم کائنات میں محدود ہوکر نہیں رہ سکتی۔ میں ہرجگہ ہوں اور کہیں نہیں کیونکہ میں صرف جہانِ آرزو میں رہتی ہوں۔

میری آرام گاہ وہ سینے ہیں جن میں آہیں گھٹ گھٹ کر رہتی ہیں۔ میں ان ہاتھوں کو چومتی ہوں جن میں چھالے پڑ گئے ہوں۔ میں ان بازوؤں کے بوسے لیتی ہوں جن کی مچھلیاں کام کرتے کرتے بٹی ہوئی رسیوں کی طرح سخت ہوگئی ہوں۔

میں ان مظلوموں کے سروں پر اپنے دامن کا سایہ کرتی ہوں۔ جنھیں بے بس سمجھ کر دنیا ٹھکرا دیتی ہے۔ جن کی آنکھیں روتے روتے سوج جاتی ہیں۔ اور گلے ہچکیاں لیتے لیتے سخت پڑ جاتے ہیں۔

میں آزادی ہوں۔ خدمت میری فطرت ہے۔ صداقت میرا عصا ہے۔ اور قربانی میری قیمت!!

(ایک نور جواں کی سفید چادر سے چھن چھن کر باہر آ رہا تھا۔ نوجوان کو گھیر لیتا ہے۔ جس میں وہ آہستہ آہستہ تحلیل ہوجاتا ہے۔ دور سے حکومت۔ سیاست اور قانون کے قہقہوں کی کریہہ آوازیں آتی ہیں)

تعظیم نہ کر

آزادہ منش رہ دُنیا میں، پروائے اُمید و بیم نہ کر
جب تک نہ ملیں فطرت کے قدم، خم دیکھ سرِ تسلیم نہ کر

سینے میں ہے اُس کے سوز اگر، شیطاں کے قدم لے آنکھوں سے
بیگانۂ دردِ دل ہے اگر، جبریل کی بھی تعظیم نہ کر

کتنی ہی شعاعیں ابر میں ہوں، خورشیدِ جنوں پر ایماں لا
کتنے ہی دلائل روشن ہوں، دانش کو کبھی تسلیم نہ کر

سانچوں میں برابر ڈھلتا جا، رفتارِ جہاں سے پھیر نہ منہ
تنسیخ تو کیا، اِس دفتر میں، جینا ہے تو کچھ ترمیم نہ کر

اے جوشؔ، ہجومِ کلفت میں فریاد و فغاں سے کام نہ لے
گھٹ جائے گا اِس سے دِل کا اثر، اجزائے تپش تقسیم نہ کر

(جوشؔ)

میر کا ایک شعر اور حشویات

ایک تنقیدی بحث

(سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم۔ اے)

راقم حروف نے اپنی تصنیف ہماری شاعری میں اختصار کلام کی مثال میں میر کا ایک شعر پیش کیا ہے۔ اور اس شعر میں سے چند لفظ کم کر کے دکھایا ہے۔ کہ ان لفظوں کی کمی سے معنی میں کوئی کمی نہیں ہوئی، حضرت بیخود موہانی نے اپنے مختصر رسالے جوہر آئینہ میں میری اس رائے کے خلاف تفصیلی بحث کی ہے اس مضمون میں اسی بحث پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جاتی ہے۔

میر کا وہ شعر اور اس کی مختصر صورت حسب ذیل ہے۔

بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر
جو ہماری خاک پر سے ہو کے گذرا رو گیا

مصنف کا دعویٰ یہ تھا۔

"دونوں مصرعوں سے کچھ لفظ کم کر دیئے گئے ہیں، مگر معنی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ زیادتی ہو گئی"

اس دعوے کی دلیل یہ پیش کی گئی تھی۔

"مدت تلک" سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اب بیکسی نہیں برستی۔ ان لفظوں کو نکال ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے نے صرف گذشتہ زمانے کے بارے میں ایک ۔۔ دی ہے۔ اور زمانہ حال کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے، اس لئے کوئی چیز ہمیں اس خیال سے نہیں روکتی، کہ اب بھی بیکسی برستی ہے"

معترض کو مدت تلک کے مفہوم میں مصنف سے اتفاق ہے، مگر ایک مدت کے بعد بیکسی نہ برسنے کا سبب یہ بتایا گیا ہے:۔

"اب نہ قبر باقی ہے نہ نشانِ قبر، بیکسی برسے تو کس پر برسے"

(صفحہ ۲)

پھر اس اجمال کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے۔

"قبر کا کوئی پرساں نہ ہو وہ ایک زمانے تک رہے گی پھر قبر کیسی نشان قبر بھی نہ رہے گا۔ مانا کہ ادھر سے کوئی سڑک نہ نکلی، کوئی بستی وہاں نہ بسی، زراعت نہ ہوئی، مردے کی ہڈیاں نکال کر کوئی اور لاش دفن نہ کی گئی، پھر بھی انقلابِ عالم و مقتضیات فطرت کو کون مانع ہے۔ اس میں دھوپ سے دراڑیں پڑیں گی۔ کیڑے اسے چھلنی کریں گے حشرات (الا ارض) اسے اپنا مسکن بنائیں گے، مینہ کے تیر اس پر برسیں گے۔

سیل ادھر آئے گی، پانی اس میں مرے گا، زلزلے اسے کروٹ بدلوائیں گے، آندھیاں اسے اڑائیں گی، راہگیر اسے پامال کریں گے، جب کوئی خبر لینے والا ہی نہیں تو ایک مدت بعد اس عبرت خیز منظر پر فنا کا پردہ گر جائے گا۔ (صفحہ ۲۰۲)

سوال یہ ہے کہ بیکسی نہ برسنے کا سبب یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ ایک مدت کے بعد قبر پر ایک عظیم الشان مقبرہ بن گیا، چاروں طرف چمن بندی کر دی گئی، قرآن خوان قرأت، مجاور مقرر ہو گئے، چراغاں ہونے لگا۔ پھول برسنے لگے، زرکار چادریں چڑھنے لگیں، زائروں کا ہجوم رہنے لگا۔ وہی قبر جو کبھی حسرت و عبرت کا منظر تھی اب عظمت و شوکت کا مظہر ہے۔ اس طرح کے انقلاب دنیا میں برابر ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کی ضرورت ہو تو آگرہ میں شہید ثالث کے مزار کے متعلق جو کچھ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اس پر ایک نظر کر لینا کافی ہے۔ زیر بحث شعر میں کون چیز ہے جو شان بتر مٹ جانے کی صرف اشارہ کرتی ہے؟ معترض اور مدت تلک کے فقرہ سے معترض نے جو فائدہ اٹھانا چاہا تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ اب اس فقرے کو حذف کر دینے کا جو نقصان بتایا گیا ہے اس پر نظر کی جاتی ہے۔

معترض کا قول ہے کہ

"مدت تلک کا ٹکڑا تعین سے دست و گریباں ہے۔ اور صرف برساکی میں ہمیشگی کی شان نکلتی ہے، جو بیکسی کے خلاف ہے۔ واقعے کے خلاف ہے، قیاس کے خلاف ہے۔" (صفحہ ۲)۔

ہر زبان داں سمجھ سکتا ہے کہ برساکی میں ہمیشگی کی شان نہیں نکلتی **ہماری شاعری** میں صاف لکھ دیا گیا تھا کہ

"پہلے مصرعے نے صرف گذشتہ زمانے کے بارے میں ایک خبر دی ہے اور زمانہ حال سے متعلق کچھ نہیں کہا ہے۔"

لیکن معترض "برساکی" کے معنی ہیں "برسا کرتی ہے" اور "برسا کرے گی" کا مفہوم بھی شامل سمجھتا ہے۔ مگر کسی کی غلط فہمی سے یہ حقیقت نہیں بدل سکتی کہ "بیکسی برساکی" کہہ کر صرف زمانہ ماضی میں استمرار بیکسی بیان کیا گیا ہے۔ زمانہ حال کا حال کے سامع کے تصور و تخیل پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اب دو صورتیں ہیں۔ خواہ کوئی یہ تصور کرے کہ اب بھی قبر موجود ہے اور اس پر بیکسی برس رہی ہے۔ خواہ یہ فرض کرے کہ اب نہ قبر باقی ہے، نہ اس پر بیکسی برستی ہے۔ میں نے پہلی صورت اختیار کی تھی۔ لیکن دوسری صورت اختیار کرنے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے۔ اور اس صورت میں شعر کی مصرعہ اول کی بدلی ہوئی شکل سے بھی وہی سب معنی نکالے جا سکیں گے جو معترض نے میر کے اصل مصرعے سے نکالے ہیں۔ یعنی "مدت تلک" کو حذف کر دینے سے معنی میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

حقیقت تو یہی ہے کہ "برساکی" میں ہمیشگی کی شان نہیں نکلتی لیکن اگر نکلے بھی تو وہ بیکسی کے خلاف، واقعے کے خلاف اور قیاس کے خلاف کیونکر ہوگی؟ اگر ہمیشگی سے مراد ازلیت و ابدیت ہے تو البتہ اس منظر بیکسی میں ہمیشگی کی شان نکلنا خلاف واقعہ اور خلاف قیاس ہے۔ لیکن اگر ہمیشگی کے وہ معنی مراد ہیں جو عام بول چال میں سمجھے جاتے ہیں یعنی استمرار حالت، طول مدت وغیرہ تو ہمیشگی اور بے کسی میں کوئی منافات نہیں۔ نوشیرواں عادل کے پائے تخت شہر مدائن میں وہی طاق کسریٰ، جس کا ذکر معترض نے اسی بحث میں ذرا آگے بڑھ کر کیا ہے، ڈیڑھ ہزار برس سے منظر بے کسی بنا ہوا ساسانیوں کے زوال کا ماتم کر رہا ہے۔ شہر اصطخر کی کیانی اور اشکانی عمارتیں ڈھائی ہزار برس سے ایران قدیم کی عظمت پر نوحہ خوانی کر رہی ہیں۔ راقم حروف نے عبرت اور بے کسی کے یہ موقعے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ ان عمارتوں کا استحکام بتاتا ہے کہ یہ ابھی صدیوں اور قائم رہ سکتی ہیں۔

ایران کے شاعر اعظم خاقانی شروانی نے آج سے کوئی آٹھ سو برس پہلے ایوان مدائن یعنی طاق کسریٰ کو دیکھ کر اپنے دلی تاثرات کا اظہار ایک قصیدے میں کیا ہے۔ اس کے چند شعر ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے نقل کیے جاتے ہیں۔

ہاں اے دل عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں　　ایوان مدائن را آئینۂ عبرت داں

یک رہ ز لب دجلہ منزل بہ مدائن کن　　از دیدہ دوم دجلہ بر خاک مدائن راں

تا سلسلۂ ایواں بگسست مدائن را　　در سلسلہ شد دجلہ چوں سلسلہ شد پیچاں

دندانۂ ہر قصرے پندے دہدت نو نو　　پندے سر دندانہ بشنو ز سر دنداں

گو یدکہ تو از خاکی ماخاکِ تو ایم اکنوں — گامے دو سہ ہم برنہ وانشکے دو سہ ہم بفشاں

از نوحۂ چغد الحق مائیم بہ درد سر — از دیدہ گلابے کن دردِ سرِ ما بنشاں

ما بارگہِ دادیم ایں رفت ستم بر ما — بر قصرِ ستمگاراں گوئی چہ رسد خذلاں

گوئی کہ نگوں کردہ است ایوانِ فلک وش را — حکمِ فلکِ گرداں یا حکمِ فلک گرداں

ایں ہست ہمل دِگر کو رانہ شہاں بودے — دیلم ملکِ بابل ہندو شہِ ترکستاں

ایں ہست ہماں ایواں کز نقشِ رخِ مردم — خاکِ درِ او بودے دیوارِ نگارستاں

خاقانی ازیں درگہ دریوزہ عبرت کن
تا از درِ تو زیں پس دریوزہ کند خاقانی

ایک دوسرے قصیدے میں خاقانی بغداد سے مکہ تک کی منزلوں کا حال بیان کرتا ہے۔ عازمانِ حج بغداد سے مدائن پہنچے ہیں۔ اس مقام کے چند شعر سنیئے۔

بر سرِ دجلہ گذشتہ بمدائن حضر وار — قصرِ کسریٰ در زیارت گاہ دِلماں دیدہ اند

طاقِ ایوانِ جہاں ز دو شاقِ پیرزن — از نکونامی طرازِ فرشِ ایواں دیدہ اند

از زنجیرِ گسستہ چو سازِ زنجیریاں کانزماں — بر درِ ایوانِ زنجیر و نہ دربان دیدہ اند

تا حیاتش رفتہ در تنہائے قصرِ شاہ — بر سرِ وندانہائے تاجِ خنداں دیدہ اند

آج آٹھ برس کے بعد طاقِ کسریٰ کی زیارت کیجیے اور دیکھیے کہ طولِ مدت اور بیکسی برستش کیا نیا تن ہے۔

شعر کے مصرعِ ثانی میں "ہماری خاک پر سے" کی جگہ "اُدھر سے" بنا دیا گیا تھا۔ معترض کا خیال ہے کہ لفظ خاک سے قبر کی خامی شکستگی اور کس مپرسی ظاہر ہوتی ہے اور یہ چیز بیکسی برسنے کے احساس میں مدد کرتی ہے۔ مختصر بات طول دے کر یوں بیان کی ہے۔

"پہلے مصرعے گور قبر کے معنی کا ایک عام لفظ رکھا تھا دوسرے مصرعے بیان کو زیادہ موثر و دلگداز بنانے کے لئے ہماری خاک لکھا۔ اسے جو کہتا سخن سنجی کے گلے پر چھری پھیرنا ہے، اپنے مفہوم کو زیادہ واضح کرنے کے لئے یہ بھی کہے دیتا ہوں بیکسی ان کی قبروں پر برستی ہے جن کے چاہنے والے اور خاندان نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ یا جن کے اعزہ واحباب ایسے نا اہل ہوتے ہیں کہ جس دن سے دفن کر آئے اُدھر مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اور قبر ایک مٹی کے چراغ اور چار پھولوں کو ترس گئی۔ فاتحہ خواں کا اُدھر گذر نہ ہوا۔ پھر قرآن خوانی مجلس عزا و میلاد کا کیا ذکر ہے۔ قبر میں شکستگی کے آثار پیدا ہوئے تو کسی نے خبر نہ لی سیل بہا لے گئی تو کسی کو پروا نہ ہوئی ایک دن قبر پر جھاڑو نہ دی گئی۔ پھر عرس کہاں کا اور چادر کس کی۔ اس کا انجام کیا ہے۔ قبر کا مٹ جانا۔ ایسی قبریں بالعموم خام ہوتی ہیں اور پختہ بھی ہوں تو کب تک رہیں گی۔ طاقِ کسریٰ تو کھنڈر ہو کے رہ گیا۔ پھر معمولی قبروں کی کیا بساط ہے۔" (ص ۲۱-۲۲)

یہاں بے کسی برسنے کے جو جو لوازم بیان کئے گئے ہیں ان میں سے ایک بھی بے کسی برسنے کے ساتھ لزوم نہیں رکھتا۔ ہر شخص کو راہ چلتے ٹوٹی پھوٹی قبریں ملا کرتی ہیں۔ مگر ان پر بے کسی برسنے کا احساس کس کو ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ان قبروں پر بیکسی برستی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو نہایت پختہ و مستحکم ہیں۔ جن پر شاندار مقبرے بنے ہوتے ہیں۔ مٹی کے چراغ کا کیا ذکر بلوری فانوس اور قیمتی جھاڑ روشن کئے جاتے ہیں۔ ایک دو نہیں بیسیوں قرآن خواں ملازم ہیں۔ مجالس عزا و محافل مولود باالتزام منعقد ہوتے رہتے ہیں زائرین کا مجمع ہوتا رہتا ہے۔ قبر اور مقبرے کی صفائی اور درستی برابر ہوتی رہتی ہے۔ دور کیوں جایئے اسی لکھنؤ میں آصف الدولہ، غازی الدین حیدر اور امجد علی شاہ کی قبریں موجود ہیں۔ اور ان کے لئے وہ سامان مہیا ہیں جو اوپر بیان کیے گئے۔ مگر ان قبروں پر بھی بیکسی برستی ہے۔ اور مقبروں کو جانے دیجئے۔ ذرا تاج محل پر ایک نظر ڈالئے۔ جس کی زیارت کے لئے دور دور سے سیاح آتے رہتے ہیں۔ جس کو کوئی دنیا کی بہترین عمارت قرار دیتا ہے۔ کوئی عجائبات عالم میں شمار کرتا ہے۔ اور جس کی صفائی آراستگی اور حفاظت کا بہترین انتظام ہے۔ نہ اس سے بہتر دنیا میں کوئی مقبرہ ہے نہ اس کی قبروں سے بہتر کوئی قبر ہے۔ مگر عبرت کی نگاہ کو اس پر بھی بے کسی

برستی دکھائی دیتی ہے۔ قبروں اور مقبروں کا کیا ذکر، قلب اثر پذیر ہو تو عہد ماضی کے ان شاہانہ قصروں اور عظیم الشان محلوں پر بھی بیکسی برسنے کا احساس ہوتا ہے، جو انحطاط و انہدام کے اثر سے بالکل محفوظ ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیکسی برسنا، ہے کیا چیز، یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ جس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی جائے تو بہت طول ہوگا۔ اجمالاً صرف اتنا لکھ دینا ہے کہ ہم کو کسی مکان، عمارت یا قبر پر جو بیکسی برستے ہوئے معلوم ہوتی ہے وہ حقیقت میں ایک پرتو ہے، اس احساس کا جو مالک مکان، بانی عمارت یا صاحب قبر کی بیکسی اور بے بسی کے متعلق ہمارے دل میں موجود ہوتا ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

ہر کجا افتادہ بینی خشت در ویرانہ

ہست فرد دفتر احوال صاحب خانہ

"خشت افتادہ" "خانہ ویراں" کا پتہ دیتی ہے۔ اور "خانہ ویراں" سے "صاحب خانہ" کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ اور موت سے اس کے مجبور اور بے بس ہو جانے کا تصور ہماری جنسی ہمدردی کے ذاتی احساس کو پیدا کر دیتا ہے۔ اب اگر ہم "صاحب خانہ" سے ناواقف ہیں تو یہ انتقال ذہنی اس احساس میں صرف ایک جنبش سی پیدا کر دے گا۔ اگر ہم اس کو واقف ہیں تو اس احساس میں قوت پیدا ہو جائے گی اور اگر ہم اس سے کسی طرح کا قلبی تعلق بھی رکھتے ہیں تو اس احساس کی شدت اور بڑھ جائے گی واقفیت اور تعلقات کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے، جو اس احساس کی قوت و ضعف پر اثر ڈالتی ہے۔ اور وہ "صاحب خانہ" کی شخصیت ہے۔ اس کی شخصیت جتنی عظیم ہوگی، موت کے بعد اس کی بے بسی اور مجبوری کا احساس اتنا ہی قوی ہوگا۔ بہر حال یہ احساس قوی ہو یا ضعیف اسی احساس کا ایک پرتو صاحب خانہ کے "خانہ ویراں" پر پڑتا ہے جس کو ہم بیکسی برسنے سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس بحث میں "خانہ ویراں" کے فقرے سے ایک غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ لہذا مختصراً یہ بھی بتا دوں کہ ویرانی کی حقیقت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عمارت کی ویرانی کا مفہوم شکستگی، انہدام اور غیر آبادی کے تصورات پر مشتمل ہے۔ مگر یہ تینوں چیزیں ویرانی کے خارجی عناصر ہیں۔ اس کے مفہوم میں ایک داخلی عنصر بھی شامل ہے۔ اور وہ عمارت کی گذشتہ اور موجودہ حالتوں کا تاریخی، تخیلی اور جذباتی تقابل ہے۔ یہ داخلی عنصر کبھی خارجی عناصر کے ساتھ شریک ہو کر احساس ویرانی کو قوت دیتا ہے۔ اور کبھی تنہا اس احساس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی داخلی عنصر کی وجہ سے ایک ہی عمارت ایک شخص کی نظر میں آباد نظر آتی ہے۔ اور دوسرے کی نظر میں ویران۔

یہ مختصر نفسیاتی بحث اگر ذہن نشین ہو جائے تو تاج محل کی سی عمارتوں پر بیکسی برسنے کا سبب سمجھ میں آ جاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ قبر پر بیکسی برسنے کے جو لوازم معترض نے اوپر بیان کیے ہیں وہ بیکسی برسنے کے ساتھ کوئی لزوم نہیں رکھتے۔

لفظ "خاک" کی معنوی خوبی کے متعلق معترض نے جو توضیح پیش کی تھی اس پر بحث ہو چکی، اب اس کی صوری خوبی پر نظر کی جاتی ہے معترض کہتا ہے۔

"یہاں خاک قبر کے معنوں پر ہے (اور یہ بات) داد کے قابل ہے۔ کہ مصنف نے گور کا لفظ دوبارہ استعمال نہیں کیا ہے۔ (صد ۲۲)۔"

پہلے مصرعہ میں اپنی گور، کہہ چکنے کے بعد دوسرے مصرعے میں لفظ گور یا اس کا ہم معنی کوئی دوسرا اسم لانے کی ضرورت ہی نہیں فصاحت کلام کا تقاضا ہے کہ یہاں اسم کی جگہ ضمیر لائی جائے۔ "اُڑ رہے ہے" کا فقرہ اس تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ اپنے مطلب کو واضح کر دوں۔ زیر نظر شعر اگر یوں ہوتا

بیکسی مدت تلک برسا کی ہماری گور پر

جو ہماری گور پر سے ہو کے آندھیا

تو اس کا مطلب بالکل وہی ہوتا جو اب ہے "مدت تلک" کی حد بندی نے "برسا کی" اور "برسا" کی کا کام ایک کر دیا ہے۔ پہلے مصرعے میں "ہماری گور" اور "اپنی گور" بالکل ہم معنی ہیں۔ دوسرے

مصرع میں "ہماری گور" اور "ہماری خاک" کا مفہوم ایک ہی ہے مختصر یہ کہ مطلب میں کوئی فرق نہیں لیکن "ہماری گور" کے الفاظ دونوں مصرعوں میں ہیں اور یہ تکرار ایک بڑا عیب ہے۔ اس عیب کو دور کرنے کی ترکیب یہ تھی کہ دوسرے مصرعے میں اسم کی جگہ ضمیر لائی جاتی۔ مگر چونکہ ضمیر سے مصرع کا حسن تباہ ہو جاتا اس لئے شاعر نے یہ صورت اختیار کی کہ پہلے مصرع میں "ہماری" کی جگہ "اپنی" اور دوسرے میں "گور" کی جگہ "خاک" لاکر تکرار الفاظ کا عیب چھپا دیا۔ شعر کی مختصر صورت میں اس عیب پر محض پردہ نہیں ڈال دیا گیا ہے بلکہ وہ بالکل معدوم کر دیا گیا ہے۔

"ادھر سے" کے معنی ہیں قبر کی طرف سے۔ "خاک پر سے" کا مفہوم بھی تقریباً یہی ہے یعنی قبر کے قریب سے، نہ یہ کہ قبر کو روندتا ہوا۔ بیکسی کے احساس کو قبر کی پامالی پر منحصر کرنا ایک نفسیاتی غلطی ہوگی، جو شخص قبر کو پامال کرنے نہ جھجکا وہ قبر کی بیکسی کا کیا احساس کرے گا۔ اگر بیکسی کا احساس کر سکتا تو قبر کو پامال ہی کیوں کرتا۔ بہرحال اگر کسی کو اصرار ہو کہ "خاک پر سے گذرنے" کے معنی قبر کو پامال کرنا ہی ہیں اور قبر کی پامالی احساس بیکسی میں معین ہے تو ان کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ "ادھر سے" کا فقرہ بیکسی کی شدت میں اضافہ کرتا ہے یعنی قبر کے اوپر سے گذرنے والوں کا کیا ذکر، جو لوگ قبر کے قریب سے گزرتے ہیں وہ بھی بیکسی کے شدید احساس سے رو دیتے ہیں۔

شعر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے "ادھر سے گزرا" اور "ادھر سے ہو کے گزرا" ان دونوں فقروں کا فرق سمجھ لینا ضروری ہے۔ پہلے فقرے میں گذرنا ایک اتفاقی امر ہے۔ دوسرے میں ارادی، پہلے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ گزرنے والے کا راستہ وہی تھا، دوسرے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا سیدھا راستہ چھوڑ کر ادھر سے گزرا، اتفاقاً گزرنے والوں کا صاحب قبر سے واقف ہونا ضروری نہیں۔ لیکن اپنا سیدھا راستہ چھوڑ کر بالارادہ قبر کی طرف سے گزرنے والے وہی لوگ ہوں گے جو صاحب قبر سے واقفیت اور کوئی دلی تعلق رکھتے ہوں گے، یہ لوگ اس قبر کو دیکھ کر بیکسی کے احساس سے مغموم ہوں گے، اور اس پر محبت اور عقیدت کے آنسو چڑھائیں گے۔

جن لوگوں کو مرنے والے سے دلی تعلق کیسا واقفیت تک نہ ہو، وہ اگر قبر کی شکستگی اور کس مپرسی سے بیکسی کا کسی قدر احساس بھی کریں تو اس احساس میں اتنی شدت کہاں ہوگی کہ وہ رو دیں۔ یہ مصرع یوں بھی ہو سکتا تھا۔

جو کوئی گذرا ادھر سے رو گیا

لیکن اس صورت میں تعمیم ایک بے لطف مبالغہ ہے، اور پہلی صورت میں حقیقت، میرؔ نے بھی غالباً اسی مصلحت سے یہ کہا ہے

جو ہماری خاک پر سے ہو کے گذرا رو گیا

"اپنی گور" اور "ہماری خاک" میں "اپنی" اور "ہماری" کے الفاظ قبر میں ایک تخصیص پیدا کر رہے ہیں۔ اور اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ بیکسی کے احساس سے رونے والے لوگ جانتے ہیں کہ یہ قبر کس کی ہے۔ بیکسی برسنے کا فلسفہ جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس کے اعتبار سے یہ تخصیص یہاں نہایت ضروری ہے۔ اس کا ایک عملی ثبوت بھی ملاحظہ ہو۔ ہم "اپنی" اور "ہماری" کے الفاظ بدل کر ان کی جگہ ایسے الفاظ رکھ دیتے ہیں جن سے یہ تخصیص باقی نہ رہے گی

بیکسی مدت تلک برسا کی سب کی گور پر
جو کوئی گذرا کسی کی خاک پر سے رو گیا

اب نہ قبروں میں کوئی تخصیص ہے، نہ قبر پر سے گذرنے والوں والوں میں، اس تعمیم نے اجنبیت کی فضا پیدا کر کے شعر کو اصلیت سے دور اور اثر سے محروم کر دیا، شعر کی مختصر صورت میں گو کہ "ہماری خاک" کے لفظ نکل گئے، مگر "اپنی گور" کا فقرہ موجود ہے۔ اور "ادھر" کا لفظ بھی "اپنی گور" ہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس لئے نہ اجنبیت پیدا ہوئی، نہ شعر بے اثر ہونے پایا۔

معترض نے اس بحث کے شروع میں لکھا ہے۔

"اس شعر میں بقول مؤلف دو ٹکڑے زائد تھے "مدت تلک" اور "ہماری خاک"۔ (ص۲)

اور اسی قول مؤلف کی مخالفت میں پانچ صفحے لکھ ڈالے ہیں

مگر آخر میں فیصلہ یہ کیا ہے۔
"بحر بھی طولانی، میر نے پہلے مصرع میں "مدت تک"
اور دوسرے مصرع میں "جو ہماری خاک پر سے"
ٹکڑے رکھ کر حشو اس خوبصورتی سے سمیٹا ہے کہ
بے اختیار واہ نکل جاتی ہے۔" (ص۲۳)

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تمام خامہ فرسائی کیوں کی گئی ہے، جب معترض بھی آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ دونوں فقرے حشو ہیں۔ یہ بھی عجیب لطیفہ ہے کہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ہماری خاک" کو حشو کہنا سخن سنجی کے گلے پر چھری پھیرنا ہے۔" دوسری جگہ اسی کو حشو قرار دیتے ہیں۔ اب معترض خود ہی سمجھ لے کہ وہ اپنے ہی قول کے مطابق سخن سنجی کے حق میں کیا قرار پاتا ہے۔

اصل بحث تمام ہوئی

میر کو شاعری میں جو منزلت حاصل ہے اس کے اظہار کے لئے خدائے سخن حضرت میر کہا گیا تھا، اس فقرے کے استعمال میں یہ مصلحت بھی تھی کہ کوئی کم فہم ناظر بھی یہ شبہ نہ کر سکے کہ میر پر اعتراض کیا جا رہا ہے۔ مگر اس احتیاط کے باوجود یہ اعتراض جڑ ہی دیا گیا کہ

"کسی کو خدا کہنا (وہ مجازاً ہی سہی) اور ساتھ ہی ساتھ اس کے نفس کی طرف اشارہ کرنا دانشمندانہ فعل نہیں۔" (ص۱۹)۔

جب خدائے حقیقی کے بہترین مخلوقات یعنی انسانوں میں سے کسی کو اچھا کسی کو برا کہنے، کوئی نہیں جھجکتا، تو ایک خدائے مجازی کے مخلوقات فکری کی کیا حقیقت؛ پھر لطف یہ ہے کہ مصنف نے میر کو خدائے مجازی بھی قرار دیا تھا تو کس کا، سخن کا، نہ کہ اپنا۔ افسوس ہے کہ معترض "خدائے سخن" کے سے کثیر الاستعمال فقرے کے معنی بھی نہیں سمجھ سکتا، ذیل کے اقتباسات اس کی غلط فہمی کا ثبوت ہیں۔

۱۔ "آپ نے میر علیہ الرحمہ کے نام کے ساتھ ان کا شہرہ خطاب لکھ دیا ہے یعنی خدائے سخن، پھر اپنی بندگی کو معراج پر پہنچانے کے لئے اسی خدا کے کلام میں اصلاح بھی فرما دی ہے۔" (ص۱۵)۔

۲۔ "اب وہ زمانہ کہاں ہے، جبکہ بندے خدا کی خدائی پر ایمان پر لاتے ہی اس کے کلام پر اعتراض کرنا شان بندگی کے خلاف سمجھتے تھے۔" (ص۱۸-۱۹)

۳۔ "اس بندۂ معصوم، اس بھولے بھالے نقاد کو یہ خبر نہیں کہ اس نے خدائے سخن کی جناب میں کیسی گستاخی اور دریدہ دہنی کی ہے۔" (ص۱۹)۔

۴۔ "کسی کو خدا کہنا (وہ مجازاً ہی سہی) اور ساتھ ہی ساتھ اس کے نفس کی طرف اشارہ کرنا دانشمندانہ فعل نہیں۔" (ص۱۹)۔

ان عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ معترض "خدائے سخن" کو "خدائے مصنف" سمجھ رہا ہے۔ یہ غلط فہمی دور ہو جائے تو سمجھ میں آ جائے کہ اگر خدائے حقیقی کا کوئی بندہ کسی خدائے سخن کے کلام پر اعتراض کرے تو اس سے اس کی عبودیت و بندگی معرض بحث میں نہیں آ سکتی۔ میر کی میرے دل میں جو عظمت ہے، وہ غالب کے سوا اردو کے کسی غزل گو کی نہیں۔ اور میر سے مجھ کو جو دلی عقیدت ہے، وہ انیس کے سوا کسی شاعر سے نہیں۔ پھر بھی میں ان کے کلام میں اسقام و اغلاط کے امکان کا منکر نہیں ہوں۔ سہو و خطا بنی آدم کی میراث ہے۔ کوئی انسان اس سے خالی نہیں، وہ خدائے سخن ہی کیوں نہ ہو۔

خیر یہ تو کلام میر کے متعلق ایک عام بات ہوئی، اب اس خاص شعر کے متعلق عرض ہے کہ اس پر نہ اعتراض کیا گیا ہے۔ نہ اصلاح دی گئی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ شعر کا وزن پورا کرنے کے لئے شاعر کو بعض موقعوں پر حشویات سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور انہیں موقعوں پر شاعر کے سلیقے کا امتحان ہو جاتا ہے۔ اگر وہ حشو قبیح سے بچ کر حشو ملیح سے کام لے تو بے شک تعریف و تحسین کا مستحق ٹھہرے گا۔ لیکن حشو بہر حال حشو رہے گا۔

اور اس کو حشو کہنا عیب جوئی یا اعتراض کے مرادف ہرگز نہ ہوگا۔ زیر بحث شعر میں سے، اختصار کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے، صرف حشویات حذف کر دیئے گئے ہیں۔ حسن اتفاق سے وہ اس صورت میں بھی موزوں رہا مگر وزن بدل گیا۔ اس کو اصلاح کہنا غلط بیانی ہوگی۔ اصلاح تو جب ہوتی کہ وزن شعر کو قائم رکھتے ہوئے، اس کے بعض الفاظ کی جگہ اس سے بہتر الفاظ تجویز کئے گئے ہوتے۔ اس کے علاوہ یہاں میرؔ کا یہ شعر بذات خود زیر بحث ہی کب ہے۔ یہاں تو بحث یہ ہے کہ میرؔ کے شعر میں سے چند لفظ نکال ڈالنے کے بعد، جو شعر رہ گیا ہے۔ وہ اصل شعر کا پورا مفہوم ادا کر رہا ہے۔ یا نہیں۔

اس بحث میں معترض نے **ہماری شاعری** کی جو عبارت کتاب کی "آخری اشاعت" یعنی دوسرے ایڈیشن کے صفحہ ۴۹ کا حوالہ دے کر نقل کی ہے، اس کے ابتدائی دو جملوں کے سوا باقی عبارت کتاب میں موجود ہی نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ اس غلط بیانی کی کیا ضرورت تھی۔ **ہماری شاعری** کے پہلے ایڈیشن کے صفحہ ۳۲ میں یہ پوری عبارت البتہ موجود تھی۔ مگر جب مصنف نے دوسرے ایڈیشن میں اس عبارت کا زیادہ حصہ خود حذف کر دیا ہے۔ تو کوئی دیانت دار اس محذوف حصے کو معرض بحث میں نہیں لا سکتا، بہر حال اس بحث سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جو عبارت حذف کر دی گئی تھی، وہ نہ بے معنی تھی، نہ بے محل، بلکہ مصنف کے نزدیک بے ضرورت تھی۔

اس سلسلے میں ناظرین کی اطلاع کے لئے لکھا جاتا ہے کہ **ہماری شاعری** کے تیسرے ایڈیشن میں زیر بحث مثال کی جگہ اس سے بہتر مثال دی گئی ہے۔ یعنی میرؔ کے ایسے دو شعر پیش کئے گئے ہیں جن میں ایک ہی مفہوم طول اور اختصار کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ وہ دونوں شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

خدا جانے ہمیں اس بے خودی نے کس طرف پھینکا
کہ مدت ہو گئی ہم کھینچتے ہیں انتظار اپنا

بیخودی لے گئی، کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

تمام شد

دل کی جانب رجوع ہوتا ہوں میں
سر تا قدم خضوع ہوتا ہوں میں

جب یہ ہستی غروب ہوتا ہے
ہمہ تن کیف طلوع ہوتا ہوں میں

(جوشؔ)

خونی بینڈ

روح بے چین ہے، خاموش ہو اے فوج کے بینڈ
اس طرح صبح کی مخمور ہواؤں میں نہ اینڈ

تجھ میں آواز ہے فولاد شکن تیروں کی !
سنسناہٹ ہے لچکتی ہوئی شمشیروں کی

کتنی ماؤں کے کلیجے کی ہیں قاشیں تجھ میں!
کتنے مہ پارہ جوانوں کی ہیں لاشیں تجھ میں

کتنی روندی ہوئی لاشوں کی ہے سردی تجھ میں
کتنی بیواؤں کے چہرے کی ہے زردی تجھ میں

کتنی خوابیدہ ہیں مایوس نگاہیں تجھ میں
کتنے معصوم یتیموں کی ہیں آہیں تجھ میں!

تیرا ہر راگ ہے ڈوبا ہوا چشم نم میں !
رقص خونیں کی دھمک ہے ترے زیر و بم میں

سسکیاں تجھ میں ہیں غلطیدہ دل افگاروں کی
کروٹیں موت کی ہیں گت میں ترے تاروں کی

تیری ہر تان میں پوشیدہ ہیں لاکھوں آنسو
تیری آواز میں غلطاں ہے جوانوں کا لہو

گم ہیں رستے ہوئے زخموں کی بہاریں تجھ میں
خنجروں کی ہیں مچلتی ہوئی دھاریں تجھ میں

نغمہ ہے لے میں تری خون کے فوّاروں کا
زمزمہ تجھ میں ہے چلتی ہوئی تلواروں کا !

تیری آواز جب احساس پہ چھا جاتی ہے
موت کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

(جوشؔ)

ملوکیت و عیسائیت کے مظالم

سہیل عظیم آبادی

ایک عہد کا ملحد دوسرے عہد میں ولی سمجھا جاتا ہے۔

جس کے ہاتھوں میں تخریب کا علم ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں تعمیر کی طاقت بھی ہوتی ہے وقت گذرتا ہے، اس کے ساتھ پرانی چیزیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اُن کی جگہ نئی چیزیں لے لیتی ہیں۔ پھر زمانے کی رفتار کے ساتھ وہ بھی پرانی ہوکر فنا ہوجاتی ہیں

ذہنی اور روحانی دُنیا میں بھی ٹھیک مادی دنیا کی طرح ترقی و انحطاط کا سلسلہ قائم ہے۔ پرانے خیالات اور رجحانات بدلتے بدلتے بالکل بدل کر رہ جاتے ہیں۔ اُن کی جگہ خیالات اور رجحانات کی ایک نئی شکل پیدا ہوجاتی ہے۔ اور اسی طرح ہمیشہ ان کا چولا بدلتا رہتا ہے۔

روحانیت کی صحیح تاریخ ملحدین کی سوانح حیات میں ملتی ہے۔

سیاسی حقوق قوم فروشوں کے ذریعے سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اور ذہنی آزادی ملحدین کے ذریعے سے۔

ایک زمانہ تھا کہ حکومت اور استبداد پر نکتہ چینی کرنا بغاوت تھی اور علما کی روش پر اعتراض کرنا الحاد۔ سینکڑوں سال تک صلیب اور تلوار ایک دوسرے کی مدد کرتے رہے۔ تلوار نے انسانی حقوق پر حملے کئے اور صلیب نے وقت پر اس کی مدد کی۔

تخت اور قربان گاہ توام تھے ——— ایک انڈے سے نکلے ہوئے دو گدھ۔ جو انسان کی بوٹیوں سے اپنا جہنم بھرتے رہے۔

بیبرزول نے کہا — "اگر پادری نہیں تو بادشاہ بھی نہیں" اور شاید وہ یہ بھی کہتا "اگر صلیب نہیں تو تاج بھی نہیں" بادشاہ نے انسان کے جسم پر حکومت کی اور پادریوں نے دماغ اور روح پر۔ ایک نے اپنی طاقت سے اور دوسرے نے اپنے فریب سے۔ ایک ٹیکس وصول کر کے شان و شوکت کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اور دوسرا خدا کا خوف دلا کر دوسروں کی کمائی پر ڈاکا ڈالتا رہا۔ در اصل دونوں کے دونوں ڈاکو اور دونوں بھکاری ہیں۔ ان دونوں ڈاکوؤں نے دنیا پر، انسانی حقوق پر قبضہ کرلیا۔ ایک نے امن کا بہانہ کر کے قانون بنایا۔ اور دوسرے نے مذہب کی آڑ میں حصول عقیدت کا جال پھیلایا۔ دونوں نے اپنی زندگی کو خدا کی بخشش بتایا ——— دونوں کے دونوں اپنے دماغ سے کام لیتے اور غریبوں کو فریب دیتے رہے دنیا والوں نے ایک کے آگے جان کے خوف سے سر خم کردیا۔ اور دوسرے کے آگے ایمان یا خدا کے خوف سے۔

اگر لوگوں نے آزادی کے خواب دیکھے تو ان دونوں نے مل کر اس کی دماغی آزادی کا ہی خاتمہ کردیا۔ ایک نے خدا کا خوف دلا کر، اور دوسرے نے امن کے نام پر تلوار چمکا کر۔

بادشاہوں نے تلوار سے حکومت کی اور پادریوں نے مکروفریب کی صلیب سے اور اکثر دونوں نے ان دونوں چیزوں کا استعمال کیا اور ہمیشہ غریب انسان کا خون چوسنے میں ایک دوسرے کے شریک کار رہے۔

بادشاہ نے کہا — "خدا نے مجھے بادشاہ اور تمھیں غریب کسان بنایا۔ تمھیں محنت کرنے اور مجھے عیش و عشرت کرنے کے لئے پیدا کیا اور تمھیں میری خدمت کے لئے اور یہی خدا کی مرضی ہے"

پادری نے کہا "خدا نے تمھیں بیوقوف اور ناپاک بنایا ہے مجھے عقلمند، مقدس، پیغمبر

اور مقدس - تم بھیڑ ہو اور میں گڈریا - اس لئے تمہاری کھال تک میری ملکیت ہے - اگر تم میری باتوں کو نہ مانوگے، تو خدا تم کو ہمیشہ عذاب میں رکھیگا - اور دوسری دنیا میں بھی جہنم ہی میں ڈالے جاؤگے اور یہی خدا کا فیصلہ اور انصاف ہے - اور تمہیں کسی بات میں شک کرنا چاہئے اور نہ ثبوت مانگنا کیونکہ شک کرنا اور ثبوت طلب کرنا ایک قسم کی بغاوت ہے - اور بغاوت کی سزا تمہیں معلوم ہے - اور وہ بھی خدا سے - ہمارے کسی فعل پر تنقید کرنا بھی گناہ ہے - کیونکہ تنقید کرنا خودستائی اور قابلیت کے دعوے کی دلیل ہے - اور خدا اس کو کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کے برگزیدہ بندوں کے سامنے کوئی قابلیت کا دعوے کرے - کیونکہ اس نے سارے علوم بخشے ہیں - تم صرف ہماری باتوں پر ایمان رکھو اور بس، اور یہی تمہاری نجات کا واحد ذریعہ ہے -

اس دنیا میں ہر طرح کے آدمی پیدا ہوتے رہے - قوم اور وطن فروش بھی - محبان وطن بھی - مقلدین بھی - غیر مقلد بھی، مجتہد بھی، ملحد بھی - اور ہر مسئلہ پر غور کرنے والے بھی - غلامانہ ذہنیت کے بھی اور آزادی کے طلبگار بھی - ایسے احمق بھی جنہوں نے ساری زندگی میں کچھ نہ کیا - اور ایسے بھی جنہوں نے زندگی کا ایک لمحہ بھی برباد ہونے نہ دیا - ہمیشہ انسان اور انسانیت کی خدمت کرتے رہے - اور وہی لوگ جنہوں نے زندگی کا ہر لمحہ انسانی خدمت میں ختم کر دیا - در اصل قابل قدر اور بزرگ ہیں -

اب خود بخود سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ آخر بزرگی کا معیار کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک بزرگ نے اپنے علم و کمال کی قوت پر پورا بھروسہ کرنا - اور تیغ و صلیب کے خوف سے آزاد ہو کر انسان کو انسانیت اور حقانیت کی تعلیم دیتا ہے - اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سُلجھا کر دنیا والوں کے سامنے رکھ دیتا ہے - ذہنی اور جسمانی غلامی کی بندھنوں سے لوگوں کو آزاد کر دیتا ہے، دنیا والوں کے سامنے نئے خیالات اور نئے طریق زندگی کا تحفہ پیش کرتا ہے - اس کا دماغ آزاد ہوتا ہے - وہ کوئی کام عزت اور شہرت کے لئے نہیں کرتا - بلکہ حق سمجھ کر انسانیت کی خدمت کرتا ہے -

ایک بزرگ، اکثر احمقوں کے سامنے علوم کے ایسے جواہرات بکھیر دیتا ہے کہ اس سے ایک ایک سنگریزہ اٹھا کر احمقوں کا مفلس دماغ علم کی دولت کا مالک بن جاتا ہے - اگر ایسے بزرگوں حق پرستوں نے اپنے دماغ کے خزانے سے نکال کر علوم کے جواہر کو دریا دلی کے ساتھ نہ لٹایا ہوتا تو آج دنیا میں ہر طرف تاریکی اور بربریت پھیلی ہوتی

ایک حق پرست بزرگ تاریک صحرا میں چراغ، اور سیاہ آسمان پر درخشاں ستارہ ہے جس کی مدد سے انسان راستی و صداقت کو پا لیتا ہے -

یہ بزرگی جمعیت کی عطا کردہ نہیں - بلکہ خود حاصل کردہ ہوتی ہے - ایک آدمی دوسرے آدمی کو بزرگی نہیں بخش سکتا - البتہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو دولت اور طاقت دے سکتا ہے کوئی مخصوص جگہ کسی کو انسان کامل نہیں بنا سکتی - بلکہ بزرگی اور انسانیت اپنے طرز عمل سے پیدا ہوتی ہے

ایسے بزرگ قوم کے ہیرو ہوتے ہیں ایسے مفکر ہوتے ہیں جو اپنے کلمات سے دماغ اور روح کو آزاد ہونا سکھاتے ہیں - ایسے شاعر ہوتے ہیں جو ہزاروں روحوں میں زندگی کی گرمی پیدا کر کے ان کو "محبت اور موسیقی مجسم" بنا دیتے ہیں - ایسے مصور ہوتے ہیں جو زندگی کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں - ایسے بہادر اور سورما ہوتے ہیں کہ ظالم بادشاہوں اور مکار پادریوں کے بنائے ہوئے "ظالم اور قہار خداؤں" سے انسان کو نجات دلا کر زندگی کی حقیقت اور اس کے فرائض بتا دیتے ہیں -

ایسے ہی بزرگوں نے دنیا کو متمدن بنایا - انھیں بزرگوں میں سے ایک بہادر، فلسفی، شاعر، مصور اور بہی خواہ انسانیت والٹیر تھا - جس کا ذکر خیر ہم اس وقت کر رہے ہیں -

والٹیر!! عجیب و غریب نام عجیب شخصیت کا مالک! عام انسان اس نام کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اب بھی اس کی تعظیم کرتے ہیں - مگر پادری اس نام کو سن کر جل جاتا ہے اگر یقین نہ ہو تو کوئی شخص اس نام کو کسی پادری کے سامنے لیکر دیکھے زبان سے نکلتے ہی ایسا معلوم ہوگا گویا پادری کے خلاف اعلان جنگ ہو گیا - پادری کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنی شروع ہو جائیں گی اس چہرے پر جس پر ہر وقت نیک بختی کی نقاب پڑی رہتی ہے وحشت و بربریت چھا جائے گی اسی زبان سے جس سے ہر وقت کشش کے کلمات نکلتے رہتے ہیں - گندی اور غیر مہذب گالیاں نکلنے لگیں گی - والٹیر کے لئے ان کے پاس نہ تو سنجیدگی ہے اور نہ کشش - یہ سب چیزیں اس کے غصے کی آگ میں جل کر خاک ہو جاتی ہیں —— اور یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ والٹیر اپنے وقت کا بزرگ ترین انسان تھا - اس نے انسان اور انسانیت کی خدمت کے لئے سب کچھ کیا - بڑی سے بڑی قربانیاں کیں - زیادہ سے زیادہ مصیبتیں اٹھائیں جس کی نظیر کسی پادری کی زندگی میں ملنا محال ہے -

سنہ ۱۶۹۴ء میں ۲۱ - نومبر کو اتوار کے دن ایک بچہ پیدا ہوا - مرلی ہور جس کے متعلق لوگوں کو شک تھا کہ اس کی سانس بھی چلتی ہے یا نہیں - والدین چاہتے تھے کہ جلد سے جلد اس کا بپتسمہ ہو جائے کیونکہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق سمجھتے تھے بپتسمہ نہ ہوا اور بچہ مر گیا - تو ہمیشہ مصیبتوں ہی میں اس کی روح مبتلا رہے گی -

تھا کہ ایسے بچے جن کا بپتسمہ نہیں ہوتا خدا کی نظروں میں ذلیل رہتے ہیں۔ پادری جس نے بپتسمہ کی رسم ادا کی۔ اس نے پانی کے چند قطرے ٹپکا کر اس لڑکے کا نام فرانکوئس میری اروئٹ رکھا۔ وہ کیا جانتا تھا کہ یہ بچہ جس کی سانس قدم قدم پر ٹھوکریں کھا کر چل رہی ہے ایک دن مقدس فریب کاری کے بھیشہ کا جبڑا چیر ڈالیگا۔

والٹیر کا زمانہ بھی عجیب و غریب زمانہ تھا۔ وہ خود اس زمانہ کو "احمقوں کا زمانہ" کہا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ لوگوں کو صرف عیسائی بنا دیا گیا ہے۔ مگر مہذب نہیں ہیں۔ ہزاروں سال تک امن و امان کے نام پر بادشاہ نئے نئے قانون بناتے رہے۔ اور "مقدس باپ" ان کی حمایت کرتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سچی باتیں کہنا جرم تھا۔ سائنس کے مسئلے پر ایک خط بھی لکھنا الحاد و دہریت کی تبلیغ سمجھا جاتا تھا۔ آزادیٔ خیال جرم عظیم تھی۔ ایسے مجرموں کو مذہب اور حکومت دونوں سزا دیتے تھے۔ مذہبی دیوانے جو بڑی بلند آہنگی کے ساتھ یہ کہتے تھے کہ "خدا محبت کا مجسمہ" ہے اور ہم کو نوع انسانی کے ساتھ محبت کرنی چاہئے۔ سینکڑوں اور ہزاروں کو مذہب اور خدا سے بغاوت کرنے کا الزام لگا کر بڑی بے دردی سے قتل کر چکے تھے۔ ایسی سخت سزائیں دے چکے تھے جن کو دیکھ کر زمین کانپ جاتی آسمان لرز اٹھتا تھا۔ جس شخص پہ آزاد خیال ہونے کا شک بھی ہو جاتا تھا۔ مذہب سے منحرف ہونے کا الزام اس کے سر منڈھ دیا جاتا تھا۔ پھر اقرار جرم کے لئے اس کو ایسی سخت سزائیں دی جاتی تھیں کہ الاامان والحفیظ۔ مذہب اور امن کے نام پر انسان نما درندے طرح طرح کے مظالم کر رہے تھے۔ اور "ظلم کا دیوتا" کلیسا سے نکل کر سارے ملک پر تباہی و بربادی پھیلا رہا تھا۔

سنہ ۱۶۹۴ء کا زمانہ تاریخ میں اس لئے بھی قابل یادگار ہے کہ مصنفین پر سب سے زیادہ مظالم اسی زمانہ میں ہوئے۔ اُن کی زندگیاں خدا کے ہاتھ میں نہیں، پادریوں اور بادشاہوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ پادریوں اور حاکموں نے مل کر مصنفوں کو جرمانہ۔ قید۔ جلاوطنی اور اکثر کو ان کی محنت اور کاوش کے صلے میں موت کا انعام بھی دیا۔ کتابیں نذر آتش کر دی گئیں عدالتیں بے گناہوں کو پھانسنے کا جال تھیں۔ اور حاکم پادریوں کی طرح سیاہ باطن اور بادشاہوں کی طرح جابر اور ظالم تھے۔ انصاف ثالث کے ذریعہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ حاکموں کو شک پر بھی سزا دینے اور گواہ سے جس طرح چاہے اپنے حق میں گواہی لینے کا اختیار تھا۔

فطرت بے معنی لفظ تھا۔ ہر کارخانہ فطرت سے بالاتر تھا تشریح ہر چیز کی ہوتی تھی لیکن سمجھایا کچھ نہ جاتا تھا۔ اگر کوئی بیمار ہوتا تھا تو اس کے رشتہ دار کسی طبیب کے پاس نہیں جاتے تھے۔ بلکہ کسی پادری کے پاس اور دوا کے بدلے کچھ نقش لکھوا کر لے آتے تھے۔ یہ نقش کیا تھے۔ طلسم سامری تھے۔ اُن کی خاصیتیں عجیب و غریب تھیں۔ اگر بچے کے پالنے میں رکھ دو تو بچہ چونکے گا نہیں۔ اگر غلے کی ڈھیری میں رکھ دو تو غلہ چوہوں سے محفوظ رہیگا۔ اگر کھیت میں دفن کر دو تو ژالہ باری نہیں ہوگی۔ ہوا مناسب رہیگی اور غلہ خوب پیدا ہوگا۔ پادریوں کی عام تبلیغ تھی کہ ہر مرض کا علاج خدا کے نام سے ہو اور اس کی چند صورتیں تھیں۔ ایک تو عبادت دوسری قربانی۔ تیسری کسی درویش کی ہڈی کو چھونا۔ چوتھی طلسمی روغن اور اسی قسم کی چند دوسری صورتیں۔ لیکن یہ خدا کے برگزیدہ اور مقبول بندے اس کے نام کی بھی قیمت وصول کر لیا کرتے تھے۔ مقدس درویشوں کی ہڈیاں فروخت کرتے تھے۔ ہر مرحوم درویش کا نام کسی نہ کسی بیماری کا علاج تھا اور یہ سب کچھ طلب زر کے لئے کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹروں کو مذہب کا باغی اور سائنس کو مذہب کا دشمن سمجھا جاتا تھا۔

پادریوں کی تعلیم تھی کہ ساری فضا شیاطین سے بھری ہوئی ہے اور ہر گنہگار کا جسم شیاطین کا مسکن ہے۔ انسان کے ایک طرف تو فرشتے ہیں اور دوسری طرف شیاطین اور جب کلیسا کے لئے چندہ اور عطیہ کافی جمع ہو جائیگا۔ تو خدا فضا کو شیاطین سے پاک کر دیگا۔ ہوا پر شیطان کو قدرت حاصل تھی۔ بجلی اور سیلاب پر اس کی حکومت تھی۔ اور کلیسا والوں کو صرف "گھنٹے"، متبرک پانی، صلیب اور بخورات سے تعلق تھا۔ اور اس کے علاوہ اُن کی سب سے بڑی خدمت سائنس کی مخالفت تھی۔ کلیسا کے گھنٹوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ان پر متبرک پانی چھڑکا جاتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ گھنٹے کے بجنے سے بلائیں دور رہتی ہیں اور انسان اس کی وجہ سے طوفان اور بجلی سے محفوظ رہتا ہے

اُن دنوں کلیسا ایک تماشہ گاہ تھا۔ کیڑوں اور مکوڑوں پر بھی اس کی حکمرانی جاری تھی۔ چوہوں کے خلاف مقدمے دائر ہوتے تھے اور باضابطہ طور پر ان کے خلاف فیصلہ بھی صادر ہوتا تھا۔ ہر کلیسا میں ایک ایسا راہب ضرور رہتا تھا جو بخورات۔ نمک۔ تیل وغیرہ اس غرض سے فروخت کرتا تھا کہ اُن کے ذریعے سے لوگوں کی مرادیں بر آئیں۔ ہر قسم کا سائنس مذہب کا دشمن، ہر حقیقت قابل نفرت اور ہر موجد خطرناک، ہر مفکر زہر فروش اور مکار سمجھا جاتا تھا اور اس خیال کے ماتحت کلیسا انسان کی ذہنی ترقی کو روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا تھا

ملک کا ہر کارخانہ کلیسا والوں کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن لوگوں کو نہ حقیقی آزادی نصیب تھی اور نہ حقیقی تعلیم، نہ صحیح فلسفہ پڑھایا جاتا تھا اور نہ سائنس، کچھ بھی نہیں۔ کلیسا کی تعلیم چند توہمات اور گمراہ کن خیالات کا مجموعہ تھی، دنیا کلیسا اور شیطان کے قبضہ قدرت میں تھی، کلیسا والوں نے لوگوں کے دماغوں میں یہ بات خوب اچھی طرح بھر دی تھی کہ دنیا شیطانوں

بھوتوں اور برائیوں سے بھری ہوئی ہے لیکن ہر شیطان ہر بھوت اور ہر برائی کلیسا والوں نے اضافہ کی تھی۔ شیطانوں اور بھوتوں سے بخط و کتابت اور گفت و شنید ہوا کرتی تھی اور اس طرح کہ ہر گنوار اور جاہل خود کو شیاطین اور برائیوں سے بچانے کے لئے کلیسا والوں کے آگے سربسجود ہوا کرتا تھا۔ ان عجیب و غریب خیالات کی اشاعت کا نتیجہ یہ تھا کہ جاہل اور غریب لوگ برائیوں سے بچنے کے لئے کلیسا کے بھکاریوں سے کچھ نہ کچھ ضرور کر لیتے تھے لیکن اس تعلیم کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ دوست دوست سے، بیوی شوہر سے، شوہر بیوی سے والدین اولاد سے بدظن ہو گئے۔ اس تعلیم نے انسانیت کی روح کو کچل ڈالا۔ ہمدردی سے انصاف کو نکال باہر کیا۔ دوستی کے تعلقات کو توڑ ڈالا اور زندگی کے خوشگوار لطیف جام کو زہر ہلاہل سے بھر دیا۔ کیونکہ کلیسا کے نزدیک ہر پروٹسٹنٹ ملحد تھا اور ہر پروٹسٹنٹ کے خیال میں ہر کیتھولک شیطان مجسم۔ غرضکہ اس زمانہ کی حالت عجیب تھی۔

لیکن پھر زمانہ نے کروٹ لی۔ انسانیت کا دور دورہ ہوا۔ انسان انسان کو پہچاننے لگا۔ انصاف کے مردہ جسم میں پھر ایک بار روح نے حرکت کی۔ وہ پادری اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر رہ گئے اور جو لوگ ایک زمانہ سے اُن کے فریب میں گرفتار تھے آزاد ہو گئے۔ اور عیسائیت کی دنیا ایک بہت بڑا "پاگل خانہ" سمجھی جانے لگی۔

جب والٹیر پیدا ہوا تھا اُس وقت فرانس کلیسا کے قبضے میں تھا اور اسی کی وہاں حکومت تھی۔ یہ زمانہ عالمگیر طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ پادری عام طور پر بدکار رہتے تھے اور حاکم ظالم اور رشوت خوار اور شاہی محل عیاشی کا سب سے بڑا اڈا تھا۔ ذی اقتدار لوگ انتہائی درجے کے مغرور ظالم اوباش اور مفسد تھے۔ عام لوگ جانوروں سے بھی بدتر سمجھے جاتے تھے اور یہ سب کچھ کلیسا کی مسلسل ایک ہزار سال کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اس قدر دلفریبیاں اس کے گرد جمع ہو گئی تھیں۔

مگر انقلاب کی تخم کاری نادانستہ طور پر انھیں رئیسوں اور پادریوں نے کر دی تھی اور انقلاب مصیبت زدوں کے دل میں آہستہ آہستہ نشو و نما پا رہا تھا۔ غریب کے آنسو ان کی آبیاری کر رہے تھے۔ غریب کی رگوں میں خون حرکت کر رہا تھا کیونکہ وہ دھوپ کی تیزی سے پژمردہ محنت کی شدت سے خم اور بڑھی ہوئی فکر کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے اور جب اُن کی نگاہیں کسی رئیس پر پڑتی تھیں تو خود اپنی حالت پر نظر کرتے تھے کسی رئیس کی بیوی کو قیمتی اور شاندار لباس میں دیکھتے تھے تو اپنی غریب بیوی کا خیال آ جاتا تھا جس کے پاس میلے اور پھٹے کپڑوں کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ جب رئیس زادوں کو خوش و خرم دیکھتے تھے تو اپنے مضمحل اور اُداس بچوں پر نظر جاتی تھی اور اُن کا خون کھولنے لگتا تھا۔ اس زمانہ میں کلیسا ایک تماشہ گاہ تھا۔ جہاں فرشتے، شیاطین بھوت اور چڑیل بھی رہتے تھے۔ اور دن رات طرح طرح کی ہونیں ہوتی رہتی تھیں۔

کسی بڑے آدمی کے کارناموں کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے ماحول پر غائر نظر ڈالیں۔ اُس کے ماحول، اس کی کارگذاریاں اور اس کے مخاطبوں ہم نشینوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس کے بغیر صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔

انگلستان میں جارج اول تمے پوں، اور ہاتھیوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا رعایا کی طرف سے غافل تھا اور جارج دوئم رعایا کو حد درجہ ذلیل و خوار سمجھتا اور ان سے حسد کرتا تھا مگر رعایا اس کے آگے ہر دم سر جھکائے رہتی تھی۔ کیونکہ اس کے خلاف سزائیں بڑی سخت اور ہیبت ناک دی جاتی تھیں۔ ایسی ہیبت ناک کہ اگر ان کی تشریح کی جائے تو ایک طویل خونی داستان بن جائے ہر روز سینکڑوں کو سزائے موت ملتی تھی اور ہزاروں قید خانوں میں بھیجے جاتے تھے جہاں قیدیوں کے لئے جگہ نہ تھی اور اُن کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ انسان انسان بننا چاہتے تھے۔ مگر ان کو ہر طرح دبایا جاتا تھا۔ پادری مذہبی رسوم ادا کرنے میں مشغول تھے کہ دنیا سے برائیاں اٹھ جائیں اور حکومت کوڑے کے ساتھ ساتھ دار و رسن کی مدد سے ہر ایک کو وفادار بنانا چاہتی تھی

اسپین کا بھی یہی حال تھا۔ وہاں بھی ہر روز نئے نئے مظالم ڈھائے جاتے تھے تاکہ انسانی دماغ ارتقا کی منزلیں طے نہ کرنے پائے۔ وہاں سے یہودی نکال دیئے گئے مور نکال دیئے گئے۔ ان کو برباد کر دیا گیا۔ حالانکہ یہی مور تھے جنہوں نے اسپین کو پہلی مرتبہ عقل کی روشنی میں راستی کا راستہ دکھایا تھا۔ یہی اسپین کی ساری کہانی ہے اور کوشش یہ تھی کہ وہاں کے باشندوں کو عیسائیت کے نام پر انسان بنایا جائے۔ حالانکہ وہ غلام بنائے جاتے تھے۔

پرتگال میں لوگ خدا کو خوش کرنے کے لئے ایک موقع پر عورتوں اور بچوں کی قربانی کرتے تھے اور ان کا گوشت بھون کر کھا جاتے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ ظالمانہ حرکت رحیم و کریم خدا کے نام پر ہوتی تھی۔

اٹلی میں پادریوں اور ننوں کی زیادتی ہوتی جاتی تھی۔ مگر انسانیت کا نام نہ تھا پادری تو تھے مگر سب کے سب وحشی ظالم اور درندے مکار اور خود غرض تھے۔

جرمنی کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہاں بھی مردوں اور عورتوں کو جلایا جاتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ انسانیت دشمنی اُن کا شعار ہو چکا تھا۔

اور خود ہمارے وطن کی حالت یہ تھی کہ بردہ فروشی کا بازار گرم تھا لوگ ماؤں کی گودیں

سے بچوں کو چھین کر لے بھاگتے اور دوسرے ممالک میں لونڈی غلام بنا کر فروخت کر دیا کرتے تھے دوسروں کے کھیتوں سے غلہ چرا لیا کرتے تھے۔ اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا غریبوں سے کوڑے مار کر محنت لی جاتی تھی۔

غرضکہ ساری دنیا میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔

لیکن قانون کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ وہ ہر قوت کے پاس ایک سا رہے۔ حالانکہ چاہئے یہ تھا ——— آزادی کا قیام۔ ہر شخص کو کلی آزادی۔ کسان جو پیدا کرے اپنے گھر لے جائے۔ موجد جو ایجاد کرے وہ اس کی ملکیت ہو۔ اور فلسفی کو اس کے خیالات کے اظہار کا موقع دیا جائے کیونکہ آزادی ترقی کی روح ہے۔

فرانس میں وہاں کے باشندے بادشاہ کے غیظ و غضب کے شکار تھے۔ ہر قوم شاہی گھرانے اور ہر سرسبز کھیتی پر بربادی کی بجلی چمکتی رہتی تھی۔ تخت کے پشت پر مصاحب خانہ تھا۔ اور ہر پادری کی عبا میں فریب کا جال چھپا رہتا تھا۔ مگر پادری ہمیشہ لوگوں کو مذہب کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ اتنا موقع ہی نہ دیتے تھے کہ غریب اپنی دنیاوی زندگی کے لئے بھی کچھ سوچ سکے ہر شخص کو آنے والی زندگی کی فکر تھی۔ سائنس کی طرف توجہ کرنا گناہ تھا اور فلسفے کی طرف دیکھنا قابل لعنت

امرا و پادری شریف تھے۔ قابل احترام تھے مگر غربا اور کسان ذلیل تھے ناپاک تھے۔ قابل نفرت تھے ملک میں بدحالی کی تیز آندھی چل رہی تھی و سارا ملک تباہ و برباد تھا۔

فغانِ صبحگاہی

الٰہی میری ملّت کی تمنّا کو جواں کر دے
وطن کی آب و گِل کو آج پھر شعلہ فشاں کر دے

ستارہ صبح کا محوِ تبسّم ہو گیا یا رب
مُسافر کو جگا کر جانبِ منزل رواں کر دے

چلا بادِ بہاری پھر مری برباد گلشن میں
مری روداد کو پھر عظمتوں کی داستاں کر دے

اُدھر پانی میں کشتی ہے اُدھر کشتی میں پانی ہے
وطن کے ناخداؤں کی تمنّا کو جواں کر دے

تری گہری نگاہوں میں کوئی ایسا بھی جادو ہے
جو بوڑھے کو جواں کر دے جواں کو نوجواں کر دے

جو میں نے حال دیکھا ہے وطن والوں سے کہنا ہے
مری آنکھوں کو دِل کر دے مرے دِل کو زباں کر دے

قمر جلال آبادی

تاجِ زرّیں

۱

اے نازشِ ہندوستاں، اے تاج، اے قصرِ حسیں — اے رُوکشِ ایوانِ خُلد، اے پیکرِ سحر آفریں
اے یادگارِ حُسن و عشق، اے خاتمِ دل کے نگیں — اے جنّتِ نظّارہ، اے دوشیزۂ ساحل نشیں

۲

اے وہ کہ تھا تجھ پر فدا تو جان سے شاہِ جہاں — اے وہ کہ تیرا سنگِ در ہے سجدہ گاہِ عاشقاں
اے وہ کہ پرتو سے ترے پیدا زمیں پر کہکشاں — اے وہ کہ ہے تیری زمیں رفعت میں مثلِ آسماں

۳

اے تاجدارِ ہند کے سنگیں بُتِ دیرِ نگاہ — اے مرمریں بُرجِ حسیں ممتاز کی آرام گاہ
اے روضۂ گردوں حشم اے تُربتِ رفعت پناہ — ہیں تیرے سینے میں نہاں ہندوستاں کے مہر و ماہ

۴

اے تاج اے سیماب تن اے گوہرِ انجم وقار — ہے گنبدِ گردوں ترے گنبد کے آگے شرمسار
صدقے ہیں تیرے مہر و مہ ہے چاندنی تجھ پر نثار — ہیں بوسۂ پا کے لئے جمنا کی موجیں بے قرار

۵

تیری بلوریں گمزیوں کی یہ سُنہری کلسیاں — ہیں کوہِ سیمیں پر نصب زرّیں بُتاں ہندیاں
آرایشِ دیوار و در ہیں دل رُبا گُلکاریاں — کتنی لطافت آفریں ہیں تیری نازک جالیاں

۶

ہیں زینتِ محراب و در نقشِ حسیں تحریر کے　　ہوں مصحفِ رخسار پر جس طرح خط کے حاشیے
یہ پھول ہیں حرفوں کے یا رنگیں جواہر ہیں جڑے　　یا چشمۂ کافور میں کالے ہیں لہرائے ہوئے

۷

ہر شان تیری دل رُبا ہر آن تیری دل نشیں　　ہیں تیرے دل کش کنگرے یا مہوشوں کی ہے جبیں
محرابِ ابروئے بتاں ہیں تیرے محرابِ حسیں　　شفاف مثلِ آئینہ ہے صحن کی تیرے زمیں

۸

فردوس تیرا باغ ہے نہریں ہیں تیری سلسبیل　　ہیں تیرے فوارے کہ ہیں کھولے ہوئے پر جبرئیل
ہر نخل تیرا خوشنما ہر پھول تیرا بے مثیل　　ہے رودِ جمنا کی تری ادنےٰ کنیزک رودِ نیل

۹

صورت تری سحر آفریں وجد آفریں منظر ترا　　تیری ہوائیں پُر طرب ۔ تو بہ شکن تیری فضا
ہیں کُنج تیرے خوشنما سبزہ ہے تیرا دل کشا　　دل کش ہر اک انداز ہے ہر اک ادا ہے دل رُبا

۱۰

اے تاج تو اُبلا ہوا اک معدنِ سیماب ہے　　خُم خانۂ انجم کا یا پیمانۂ مہتاب ہے
بحرِ لطافت کا کوئی یا گوہرِ خوش آب ہے　　اک خوشنما افسانہ ہے تو ایک رنگیں خواب ہے

۱۱

جمنا تری تنویر سے کوسوں تلک پُر نور ہے　　گویا لبِ ساحل کوئی روشن چراغِ طور ہے
یا گھاٹ پر اشناں کو آئی ہوئی اک حور ہے　　سبزہ پہ یا رکھا ہوا اک ساغرِ بلور ہے

۱۲

اے تاج تو اعجاز یا اک خوشنما تعمیر ہے　　یا تختۂ سیمیں پہ اک زریں قلم تحریر ہے
ہے کالبد لیلےٰ کا یا شیریں کی تو تصویر ہے　　یا خوابِ اُلفت کی کوئی تو دل نشیں تعبیر ہے

۱۳

بُت خانۂ آذر کا اک حیرت فزا جلوہ ہے تو　　یا خامۂ مانی کا اک کھینچا ہوا نقشہ ہے تو
یا حور کے زانو پہ اک شفاف سا شیشہ ہے تو　　یا عارضِ ایّام پر آنسو کا اک قطرہ ہے تو

۱۴

صحنِ چمن میں رات کو اک ماہوش ہے جلوہ گر ساحل پہ محوِ خواب ہے اک موجۂ نورِ سحر
یا گر پڑی ہے دفعۃً تسبیحِ انجم ٹوٹ کر یا رقص میں مصروف ہے کھولے ہوئے طاؤس پر

۱۵

اے تاج شمعِ طور کا اک جلوۂ رنگیں ہے تو یا یوسفِ گم گشتہ کا اک پیکرِ سنگیں ہے تو
یا چشمۂ خورشید میں اک کشتیِ سیمیں ہے تو یا گلشنِ فردوس کا اک طائرِ زریں ہے تو

۱۶

اے تاج نظارہ ترا رنگیں ہے کیف انگیز ہے گویا کوئی دلہن ہے تو جس کی ہنسی گل ریز ہے
یا بادۂ گلفام کا اک ساغرِ لبریز ہے ہر شے ہے تیری دلستاں ہر چیز دل آویز ہے

۱۷

کیوانگرِ مغلیہ کا اک جلوۂ رعنا ہے تو یا صفحۂ تاریخ پر اک خوشنما چربا ہے تو
یا آبِ مروارید سے سینچا ہوا پودا ہے تو یا دانۂ گوہر سے اک نکلا ہوا بوٹا ہے تو

۱۸

ہے زائروں کی آنکھ میں مثلِ حرم عزت تری ہر شہر میں چرچا ترا ہر ملک میں شہرت تری
ہر سر میں ہے سودا ترا ہر قلب میں اُلفت تری ہوتا ہے تازہ زخمِ دل اُف دیکھ کر صورت تری

۱۹

قائم ہے جب تک آسماں گردش میں ہیں شمس و قمر تیرتھ رہے تو حسن کا اے مرکزِ تارِ نظر
مجمع رہے گا خلق کا در پر ترے شام و سحر چڑھتے رہیں گے قبر پر اشکِ عقیدت کے گہر

۲۰

اے تاج تیرے بُرج کے زہرہ جبینوں کو سلام اور تیری بزمِ ناز کے مینو نشینوں کو سلام
تیرے عزیزوں کو ترے خوش رو مکینوں کو سلام اے تاج تجھ کو اور ترے خلوت گزینوں کو سلام

محی الدین محمود (بنگالی)

تحسین کے پھول

رات کے ہنگام جب ہوتا ہے اک عالم خموش
یادِ خواب آور سے جل اُٹھتی ہے ہاں قندیلِ ہوش

کھولتی ہے اپنے شہپر جب سہیلی دوست کی
دوڑ جاتا ہے مری نبضوں میں خونِ زندگی

کاروانِ کشمکش ہوتا ہے جب مصروفِ خواب
جنبش میرے دل کی بیداری اُلٹتی ہے نقاب

کوئی پُراسرار قوّت، کوئی روحِ محتشم
شعر کہنے کو مرے ہاتھوں میں دیتی ہے قلم

دفعتہً چھڑتے ہیں پھر ارض و سما کے زمزمے
اک اُداسی دائرے میں گھیر لیتی ہے مجھے

دل میں ہوتا ہے مسرت آور خیالوں کا ہجوم
مُسکرا کر دیکھنے لگتے ہیں گردوں سے نجوم

پھر پابوسی فرشتوں کو صدا دیتا ہوں میں
آسماں کو اپنے قدموں پر جھکا لیتا ہوں میں

لکھ رہا ہوں کیا، نہیں ہوتی مجھے مطلق خبر
اُنگلیوں پر اک جلالی شان آتی ہے نظر

یوں قلم کرتا ہے جنبش ہات میں بے اختیار
اک طرب آمیز دہشت دل کے چھو لیتی ہے تار

یوں فضا میں نقش اُبھر آتے ہیں تھرّاتے ہوئے
جس طرح ساحر کے لب، افسوں کو دہراتے ہوئے

کس قدر اسرار سے معمور ہیں جلوے ترے
اے تحیّر خیز جلوے! اے سہیلیِ تخئیل کے

شب کو تیری قُربتِ الہام پرور کا یقیں
کھولتا ہے دل میں قفلِ آسماں، بابِ زمیں

تو پری ہو یا فرشتہ، رُوح ہو، یا واہمہ
آ کسی دن میرے آگے شکلِ انسانی میں آ

تاکہ میں وہ شہد بار الفاظ، وہ شیریں فضا
پنکھڑی سے وہ تبسّم، وہ صدائیں دل کشا

رُوح پرور وہ صلے، وہ مرحبا کے زمزمے
جو بطورِ داد پائے ہیں مرے اشعار نے

سر عقیدت سے جھکا کر، اے نہفتہ غمگسار!
ڈال دوں گردن میں تیرے گوندھ کر اُن سب کا ہار

جوش

قدیم زمانے میں اشتمالیت یا سوشلزم

علامہ کیفی دتاتریہ

مہابھارت اور شاہنامہ تاریخی روایتوں اور واقعات کا مخزن ہیں آج میں شاہنامہ سے ایک بادشاہ کے عہد کا ایک واقعہ پیش کر کے فردوسی کی دیانت واقعہ نگاری کا یقین دلانا چاہتا ہوں۔ یہ واقعہ خاندان ساسانی کے ایک بادشاہ سے تعلق رکھتا ہے۔

آپ جانتے ہیں فردوسی نے شاہنامہ سلطان محمود غزنوی کے ارشاد کی تعمیل میں تصنیف کیا۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ سلطان محمود مختار مطلق بادشاہ تھا لیکن فردوسی نے ساسانی بادشاہ قباد کے عہد کا ایک واقعہ جس کا جب تذکرہ آگے آتا ہے بے کم و کاست لکھ دیا۔ اور اس کی ذرا خیال نہ کیا کہ اس واقعے کی اشاعت بادشاہ وقت کے طرز حکومت کے بالکل منافی ہے لیکن اس واقعے کی تفصیل سے پہلے میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

وہ یہ ہے کہ آج کل ہر کہیں بالعموم اور ممالک فرنگ میں بالخصوص نئی بات سے منسوب ہونے اور منسوب کرنے کا شوق جنوں کے درجہ تک پہنچا ہوا ہے۔ دنیا اور دنیا والوں کی عمر کو بھلا کر وہ ہر چیز کی ایجاد اور دریافت کو محدود کر دیتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ایک خاص قوم میں ایک چیز ایک شخص نے عام یادداشت کے اعتبار سے پہلے پہل نکالی یا دریافت کی، لیکن اسے عالمگیر پیرایہ دینا، یعنی اس شخص کو دنیا میں اس کا موجد یا دریافت کرنے والا اعلان کرنا اکثر صورتوں میں صحیح نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر اشتمالیت یا اشتراکیت یا سوشیلیت کو لیجئے جس کا آج کل ہر ملک میں کم و بیش چرچا ہے، اور موجودہ حکومتیں نہایت بجبر و استبداد سے اس کے انسداد میں کوشش کر رہی ہیں۔ یہ تحریک کئی ملکوں میں خانہ جنگی کی صورت اختیار کر رہی ہے۔

لیکن یہ کوئی سیاسی بدعت یا نئی بات نہیں ہے۔ شاہنامہ ہم کو اس تحریک کی اب سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی خبر دیتا ہے۔ یہ اشارہ ہے ایران کے ساسانی خاندان کے بادشاہ قباد کے عہد حکومت کی طرف، قباد نے ۴۳ برس سلطنت کی یعنی ۴۸۸ء سے ۵۳۱ء تک، شاہنامہ راوی ہے کہ اس کا ایک وزیر تھا، جس کا نام مزدک تھا، اس کو بڑا مدبر اور بیدار مغز بتایا گیا ہے۔ اس بادشاہ کے عہد میں ایک برس ایران میں مینہ اور برف نے جواب دے دیا سخت قحط پڑا، رعایا تباہ حال تھی۔ لیکن بادشاہ اور امرا اور حکومت کے کارداروں کے ہاں کوٹھیاں غلہ سے بھرپور تھیں، پیسہ پاس ہوتے ہوئے لوگ بھوکوں مر رہے تھے، ایک روز وہ روتے پیٹتے چیختے چلاتے شاہی محل کے سامنے فریادی آئے۔ مزدک نے بادشاہ کے حکم سے باہر آکر ان کی فریاد سنی۔ ان کو دلاسا دیا۔ اور کہا کہ ٹھیرو، تمہاری بپتا بادشاہ کے گوش گذار کرتا ہوں۔ ضرور تمہاری دادرسی ہوگی، فردوسی کے یہ لفظ ہیں۔

دواں خود بیامد بر شہریار!
چنیں گفت کاے شاہ پرہیزگار۔
بہ گیتی سخن پرسم از تو یکے
گرایدوں کہ پاسخ دہی اندکے

قباد سراینده گفتش بگو
بہ من تازہ کن در جہاں آبروئے
بدو گفت کانکس کہ مارش گزید
ہمی از تنش جان خواہد پرید
یکے دیگرے را بود پای زہرع
گزیدہ نیابد ز تریاک بہر
سزائے چنیں مرد گوئی کہ چیست
کہ تریاک دارد درم سنگ بیست

ع تریاک

مزدک وزیر نے بادشاہ سے عرض کیا، اگر کسی کو سانپ کاٹ کھانے جس کا زہر اس کی جان لے گا۔ اور ایک شخص کے پاس تریاک یعنی زہر مار موجود ہو لیکن یہ شخص اس سانپ ڈسے کی جان بچانے کو کسی قیمت پر بھی وہ تریاک نہیں دیتا تو اس شخص کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے۔

بادشاہ قباد نے جواب دیا:۔

چنیں داد پاسخ ورا شہریار
کہ خونیست آں مرد تریاک دار
بہ خون گزیدہ ببایدش کشت
بہ درگاہ چوں خصمش آرد بہ مشت

بادشاہ نے جواب میں فرمایا، کہ وہ شخص جس کے پاس تریاک ہے اور وہ نہیں دیتا اس کے ساتھ وہ سلوک کرنا چاہیے جو قاتل کے ساتھ ہوتا ہے

یہ جواب سن کر مزدک باہر آیا، اور اس فاقہ زدہ ہجوم سے کہا کہ کل صبح آنا، تمہیں فاقہ سے نجات ملے گی، چنانچہ دوسرے دن وہ فاقہ زدہ ہجوم قرار داد کے بموجب پھر حاضر ہوا، مزدک کے سیاسی اور تمدنی اصول خواہ کیسے ہی ہوں لیکن ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایماندار آدمی تھا، اور بادشاہ کو دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا تھا، ظاہر ہے کہ پہلے دن اس نے بادشاہ سے مبہم گزارش کی تھی آج وہ صاف اور کھلی تنقیح پیش کرتا ہے۔ فردوسی کے الفاظ ہیں۔

چو مزدک زدہ آں گواں را بدید
در گہ سوئے شاہ ایراں دوید

چنیں گفت کاے شاہ پیروز بخت
سخنگوئے و بیدار زیبائے تخت
سخن گفتم و پاسخش دادیم
بہ پاسخ در بستہ بکشادیم
گر اید ون کہ دستور باشد کنوں
بگویم سخن تا بود رہنموں
بدو گفت برگوے و لب را مبند
کہ گفتار باشد مرا سودمند
چنیں گفت کاے نامور شہریار
کسے را کہ بندی بہ بند استوار
خورش باز گیرند از و تا بمرد
بہ بیچارگی جان شیریں سپرد
مکافات آں کس کہ ناں داشت او
مر ایں بستہ را خوار بگذاشت او
چہ باشد بگو ایں مگر بادشا
کہ ایں مرد دانا بدو پارسا
چنیں داد پاسخ کہ مسکین تنش
ز خونیست ناکردہ در گردنشعہ

عہ ترک فرض

اب معاملہ صاف ہوگیا، اس طرح کہ مزدک نے قباد سے کہا کہ اگر ایک آدمی کو حضور کے حکم سے بند یعنی اطاعت قطعی میں رکھا جائے۔ اور اشخاص متعلق جن کی نگہداشت میں وہ ہو اسے بھوکوں مار دیں تو ایسے شخصوں کی کیا سزا ہو۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ ایسے شخصوں پر قصاص واجب ہے۔ وہ قاتل ہیں ان کی کھال کھینچنی چاہیے۔

یہ جواب پاکر مزدک باہر آیا اور ان لوگوں سے کہا کہ جاؤ جہاں غلہ پاؤ لے لو۔ اگر مول بیچیں تو دام دے کر لے لو۔ ورنہ ویسے ہی اس پر قبضہ کر لو۔ اور فاقہ سے اپنی جان بچاؤ، چنانچہ ایسا ہی ہوا، امیروں، وزیروں کے گودام حتیٰ کہ شاہی کوٹھیاں اور ذخیرے بھی خالی ہوگئے، غلہ داروں نے بادشاہ کی

بارگاہ میں واویلا کیا، مزدک سے جواب طلب ہوا، اس نے سر دربار سب کو معقول کر دیا۔ اس کے دلائل کا کسی کو جواب نہ آیا۔ فردوسی اس واقعے کو اس طرح ختم کرتا ہے۔

چو بشنید در دین او شد قباد
ز گیتی بہ گفتار او بود شاد
ورا شاہ بنشاند بر دست راست
ندانست لشکر کہ موبد کجاست
بر او شد آں کس کہ درویش بود
وگر نانش از کوشش خویش بود
بہ گرد جہاں تازہ شد دین او
نیارست جستن کسے کین او
توانگر ہمی سوی نیکی بکاشت
سپردے بہ درویش چیزے کہ داشت

جب بادشاہ قباد نے مزدک کا جواب سنا تو نہایت خوش ہوا، اور اس کے اصولوں کا معتقد بن گیا۔ مزدک کو بادشاہ نے تخت کے داہنے ہاتھ پر جگہ دی۔ لشکر والوں کو موبد بھول گئے۔ لوگ مفلس نادار تھے یا اپنی کوشش سے روزی کماتے تھے، سب اس کے گرد جمع ہو گئے، اس کا طریق دنیا میں چل نکلا، اور کسی کو اس سے کینہ رکھنے کی جرات نہ ہوئی، امیر اور سرمایہ دار اپنا اندوختہ غریبوں کے لئے چھوڑ دیتے۔

انگریزی مترجم ان الفاظ میں اس روداد کو نقل کرتا ہے۔

"And unto him the mendicants restored with those that earned a living by their toil; His faith began to flourish in the world, And no one dared to seek revenge on him, The rich renounced the things that made them glade. And gave to mendicants what wealth they had."

اس تاریخی واقعہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ اشتمالیت یا اشتراکیت یا سوشلزم یا اسے کسی نام سے پکارو، اس کا عمل اور تسلط پہلے بھی ہو چکا ہے۔ وہ دنیا میں نئی چیز نہیں ہے۔ فردوسی کی مورخانہ دیانت بے نظیر ہے۔ کیونکہ ایک مختار مطلق بادشاہ کے زیر سایہ اس نے اس تاریخی واقعے کو جوں کا توں بیان کر دیا۔

اب یہ بتانا باقی رہتا ہے کہ ایران میں یہ سوشلزم کی ترویج نہ تو طوس کے شاعر کا شاعرانہ تخیل ہے اور نہ اس کی بنیاد سینہ بہ سینہ روایت ہے، کیونکہ وندیداد میں اس تحریک کا ذکر آیا ہے۔ اور زند اوستا کی پہلوی تفسیر میں یہ فقرہ واقع ہوا ہے "بامدات کے بیٹے مزدک کی مانند" (۱-۲۴- اور لوٹ) یہاں یہ بھی ذکر کرنا ہے کہ مزدکیت کے مذہبی اصولوں میں یہ دو باتیں بھی داخل تھیں یعنی خونریزی اور گوشت خوری کی ممانعت، مزدک کے تفصیلی کارنامے بہمن یشت میں سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

دریا میں ہے جا بجا تلاطم باقی
غلطاں ہے شبوں میں ابھی انجم باقی
اس وقت وفا کے آنسوؤں کی سوگند
صرف ایک نگاہ اک تبسم باقی

جوش ملیح آبادی

دوشیزۂ صحرا کے نغموں سے متاثر ہو کر

گا رہی ہے اک حسینہ دل نشیں میٹھے ملار
جس کو کہئیے برملا قدرت کا رنگیں شاہکار

کاکلِ شبرنگ کو شانوں پہ بکھرائے ہوئے
آسمانوں پر ہوں بادل جیسے گھبرائے ہوئے

مانی و بہزاد کی روحوں کو تڑپاتی ہوئی
دل نشیں ہونٹوں سے دلکش پھول برساتی ہوئی

ہے رواں اک حسن و موسیقی کا میٹھا آبشار
وجد میں آیا ہوا ہے بربطِ زرّیں کا تار

اڑ رہا ہے ایک میخانہ ہوا کے دوش پر
ہو رہی ہے بیخودی طاری فرازِ ہوش پر

مستیاں برسا رہا ہے لحنِ داؤدی کا رنگ
جیسے ندی کے کنارے بج رہا ہو جلترنگ

یا لبِ جو گا ترنم، لالہ رویوں کی پھبن
حسن کی اٹھتی جوانی، مست شاعر کا سخن

مرمریں نغموں میں یوں قدرت کی لالہ کاریاں
جیسے نازک آبگینے میں شرابِ ارغواں

دل نشیں تانوں سے یوں معمور ہے ٹھنڈی ہوا
جیسے کچّی نیند میں ہلکی سی بارش کی صدا

الطاف مشہدی

کمیونسٹ ڈاکو

کشن پرشاد کول ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی

سندر داس۔ بھائی جان میں اس لغو تماشے میں شامل ہونے کا قائل نہیں، کیا ہے کہ آج نان کوا پریشن کے ہنگامے میں چھانہ پڑے، کل سوشلزم کا طوفان برپا کر دیا، کبھی نچلے بیٹھتے ہی نہیں۔

برج نرائن۔ جناب تو پھر ہیں بھی طنز و تمسخر سے مرعوب ہونے والا نہیں عقل و دلیل کی بحث کی بات دوسری ہے۔

سندر داس۔ روز مرہ کا مشاہدہ، سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں برس کا تجربہ بتاتا ہے کہ پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ ہر انسان دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے۔ تو کیسے مان لیا جائے کہ سب انسان برابر ہیں، روپیہ اور دولت پیدا کرنا، گھر بار بسانا، بال بچوں کے لئے پس انداز کرنا، روز ازل سے انسان کی سرشت رہی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ملکیت کا دستور ہی سرے سے مٹا دیا جائے۔ تو بھلا کوئی کیسے مان لے۔

برج نرائن۔ جناب ایسے اعتراضوں کا قائل نہیں، آپ پڑھے لکھے آدمی نہیں فرمایئے کہ آپ نے کبھی اس سوشلزم کے مسئلے پر کچھ پڑھا ہے۔ اس موضوع پر کبھی غور و فکر کرنے کی زحمت دماغ کو دی ہے، مارکس کے فلسفے پر بہ حیثیت مجموعی آپ کے کیا اعتراض ہیں۔ لینن کے اصول و عمل کی نسبت آپ نے کیا رائے قائم کی ہے۔ طریقے سے بحث کیجئے۔ آپ تو ڈھول میں لٹھ مارتے ہیں۔

سندر داس۔ نہ میں عالم ہوں۔ نہ فاضل، نہ مجھے فلاسفر ہونے کا دعویٰ ہے نہ فلسفے کی خاطر عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتا ہوں۔ کاروباری آدمی ہوں معمولی سمجھ سے کام لیتا ہوں۔ اور میری معمولی سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آتیں۔

برج نرائن۔ تو پھر یہ تو بات ہی دوسری ہے، بحث و دلیل کی گنجائش ہی کہاں رہی۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ جاہل آدمی نہیں۔ پڑھے لکھے جن ہو۔

سندر داس۔ خیر ہو گا بھی لعنت بھیجو۔ ایک بڑے لطف کی واردات یاد آئی نہ افسانہ ہے۔ نہ کہانی سچا واقعہ ہے۔ آپ بیتی نہیں پر جگ بیتی ہے۔

برج نرائن۔ کیا کیا کہو۔

سندر داس۔ رائے بہادر موہن سنگھ لائل پور شہر، پنجاب کے سربرآوردہ رئیس اور ٹھیکہ دار تھے، لکھ پتی آدمی سمجھے جاتے تھے۔ حکام میں رسائی تھی۔ آنریری مجسٹریٹ بھی تھے، تقریباً ستر برس کی عمر تھی۔ مرے ہوئے بہت زمانہ نہیں ہوا۔ میرے بڑے مربی اور بزرگ تھے۔ جو سلوک انہوں نے میرے ساتھ کیا عمر بھر نہ بھولوں گا۔

برج نرائن۔ تو کچھ کہو بھی، تم تو قصیدہ پڑھ رہے ہو۔

سندر داس۔ کہوں کیسے، جب تم کہنے دو نہ، تم تو اپنی کہتے ہو، دوسرے کی سننا جانتے ہی نہیں۔ ہاں تو یہ کہہ رہا تھا کہ گو ستر برس کے ہو گئے تھے، ڈیل ڈول خاصا اچھا۔ اور قوی مضبوط تھے، بڑے رعب دار اور کلے جبڑے کے آدمی

لمبی سفید ڈاڑھی تھی، چہرے پر نور تھا۔ یوں تو زمینداری، کوٹھیاں، باغات، موٹر، عمارت کا ساز و سامان، انشورنس کا روپیہ سبھی کچھ تھا۔ مگر اپنی ذاتی ضروریات بہت کم اور وضع سادی تھی۔ جو کچھ تھا وہ زیادہ تر یا تو لڑکوں بالوں یا حکام کے کام آتا تھا۔ پڑھے لکھے تو واجبی ہی واجبی تھے لیکن سوجھ بوجھ اچھی اور عملی کاروبار کا سلیقہ خوب تھا۔ ٹھیکہ داری اور زمینداری میں کافی روپیہ کمایا تھا لڑکوں کو تعلیم اچھی دی تھی۔ دو ایک کو ولایت بھی بھیجا تھا۔ لڑکے برسر روزگار اور اچھے مرتبوں پر تھے۔ گو نئی تعلیم و تہذیب کی جلا نے ان کے دماغ کو منور کیا تھا اور آجکل کی نئی تحریکوں سے انہیں دلچسپی نہ تھی، پر زندگی کے دو چار اصول جو انہوں نے اپنے دماغ میں قائم کر رکھے تھے ان پر سختی سے عمل درآمد کرتے تھے، اور وضع کی پابندی میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔

برج نرائن۔ بھائی صاحب یہ آپ دلچسپ واردات بیان کر رہے ہیں یا رائے بہادر صاحب کی سوانح عمری، مربی اور محسن وہ آپ کے تھے۔ میرے تو نہ تھے مجھے ان کی ذات سے اس قدر دلچسپی نہیں ہے۔

سندر داس۔ میاں جلدی کام شیطان کا۔ معلوم ہوتا ہے سوشلسٹ اور شیطان میں بہت کم فرق ہے۔ تم تو بڑے جلد باز ہو۔ پوری بات کرنے ہی نہیں دیتے۔ ہاں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اصول کے بڑے پابند تھے۔ ایک اصول ان کا یہ تھا کہ حتی الامکان حکام کو خوش رکھنا۔ اور ان سے بگاڑ نہ ہونے دینا۔

برج نرائن۔ جی ہاں یہ تو ان کی رائے بہادری سے ہی ظاہر تھا۔ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

سندر داس۔ دوسرے ذاتی ضروریات بہت کم اور وضع سادی رکھنی چاہیئے تیسرے اپنے سے جتنی بن سکے غریب غربا کی مدد اور خیرات کرنی چاہیئے، پھر یہ صرف زبانی باتیں ہی نہ تھیں۔ بلکہ وہ ان پر عمل بھی کرتے تھے۔ سیکڑوں یتیم اور بیوائیں ان کے روپیہ سے پرورش پاتی تھیں۔ بہنوں کا گذارہ بندھا ہوا تھا۔ اسکولوں اور کالجوں کو چندہ فراخدلی سے دیتے تھے۔ غریبوں کی مرنے جینے اور شادی بیاہ کے موقعوں پر مدد کرتے تھے۔ ماسوا اس کے سالہا سال سے لنگڑے۔ لولے۔ اندھے اور اپاہجوں کے لئے روزانہ ان کی ڈیوڑھی سے کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ تقریباً دو تین سو آدمیوں کا اس طرح پیٹ پلتا تھا۔ اور شہر کا ہر کس و ناکس ان کو دعائے خیر سے یاد کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ اگر کوئی ہٹا کٹا فقیر یا بھیک منگا ان کے دروازے پر سوال کرنے جاتا تو اس سے پوچھتے کہ مزدوری کرے گا۔ اگر وہ راضی ہوتا تو اپنے یہاں کام پر لگا دیتے۔ اگر راضی نہ ہوتا اور منہ بناتا تو دھکے دلوا کر اور پٹوا کر نکلوا دیتے مرنے سے چار پانچ برس پہلے جب کبھی میں ان کے پاس جاتا تو اکثر آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی کی شکایت کیا کرتے، میں مسکرا کر ٹال دیتا۔ وہ بھی خاموش ہو جاتے، ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ کہنے لگے۔

رائے بہادر۔ بیٹا سندر داس ہمارا ایک کام کرو۔ ہم یہ زمینداری۔ کوٹھیاں۔ باغات اور موٹر وغیرہ علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کاروبار کا یہ تمام پھیلاؤ اور امارت کے ٹھاٹھ اب ہمارے سنبھالے سنبھلتے نہیں۔ آمدنی کم ہوتی ہے اور خرچ زیادہ۔ لاہور کے انگریزی اخباروں میں اشتہار دے دو کہ یہ ملکیت بکاؤ ہے۔ خریدار چاہیئے،

میں۔ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی، جو حکم ہو گا اس کی تعمیل کروں گا۔ مگر میرے سمجھ میں نہیں آیا، ہزاروں روپیہ مہینے کا تو آپ کا سدا برت کا خرچ ہے اگر آپ اس میں کچھ کمی کر دیں تو آپ کو روپے کی کمی نہیں۔ جائداد کے بیچنے کی کیا ضرورت ہے۔

رائے بہادر۔ بیٹا وہ روپیہ تو دھرم ارتھ کا ہے۔ میں اس میں کیسے ہاتھ لگا سکتا ہوں۔ ایک بات تم سے کہتا ہوں اسے سمجھو اور یاد رکھو۔ دولت اور ملکیت ایمانداری سے پیدا نہیں ہوتی۔ مزدور اپنی مشقت اور ایمانداری سے چار چھ آنے روز کما سکتا ہے۔ کاریگر روپیہ دو روپیہ روز آجکل کے زمانے میں پڑھے لکھے دماغ والے لوگ سرکاری نوکری یا اور پیشوں میں اگر ایمانداری کا چلن چلیں تو ہزار آٹھ سو روپیہ مہینہ کما سکتے اور کما لیتے ہیں۔ مگر سیٹھ۔ ساہوکاروں۔ اور زمینداروں اور رئیسوں کی بے شمار دولت۔ چوری۔ سینہ زوری۔ دھوکا دہی اور جعل فریب سے اکٹھا ہوتی ہے۔ اس میں میری اور تمہاری کوئی تخصیص نہیں۔ سب ہی کو ایسا کرنا پڑتا ہے۔ دنیا کا یہ دستور ہو گیا ہے

کون کسے الزام دے سکتا ہے۔ دیکھئے اور غور کرنے کی یہ بات ہے کہ اس روپے اور دولت کا صرف آدمی کو کس طرح کرنا چاہیئے۔ جو نہ خود کھاتے اور نہ دوسرے کو کھانے دے۔ وہ بہادر شٹ ہے۔ اور جس کو اپنے گناہ کا احساس ہے اور اس کا کفارہ کرنے کو تیار ہے اس کو عاقبت بخشوانے کی گنجائش ہے۔ میں بڑا پاپی ہوں لیکن حتی الامکان اپنے پاپوں کو دھوڈالنا چاہتا ہوں۔ تمہارا بس چلے تو تم مجھے یہ بھی نہ کرنے دو۔ مگر یا یا یہ نہ ہوگا۔

یہ سب کچھ اچھی طرح میری سمجھ میں نہ آیا اور حیرت کے ساتھ خاموشی سے میں ان کا منہ دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر سوچ کر کہنے لگے۔

رائے بہادر۔ تم میرے بیٹے کے برابر ہو۔ میں تمہیں اپنے بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ کہنے کی بات تو نہیں۔ پر تم سے کہے دیتا ہوں۔ میری واردات زندگی عجیب وغریب ہے۔ جب سن لوگے تو میں نے جو کچھ کہا ہے تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔ پر شرط یہ ہے کہ جو کچھ مجھ سے سنو گے میرے جیتے جی اس کا ایک لفظ بھی تمہاری زبان سے نہ نکلے۔

(میں صدق دل سے انہیں یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں پابند وفا رہوں گا لیکن وہ خود بخود کہنے لگے)۔

گو مجھکو لائل پور میں گھر بار سمیت رہتے ہوئے ایک عمر گذر گئی اور چالیس برس سے زیادہ ہوگئے، حتی کہ لوگ مجھے یہاں کا قدیم باشندہ کہتے ہیں، مگر دراصل ہم لوگ ضلع جھنگ کے دیہات کے رہنے والے ہیں، ہمارے گھرانے میں تھوڑی سی زمینداری تھی۔ اور کاشتکاری کیا کرتے تھے مگر ہمارا اصلی پیشہ اور شغلہ چوری اور ڈکیتی تھا۔ میرے دادا کے بھائی کو ڈکیتی اور قتل کے جرم میں پھانسی ہوئی تھی۔ میرے چچا نے بھی چوری کے الزام میں دو برس کی سزائے قید کاٹی۔ میرے باپ نے کچھ تو بڑھاپے اور کچھ بھائی کے قید ہو جانے کی وجہ سے چوری اور ڈکیتی چھوڑ دی۔ میں جب تقریباً بائیس سال کا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں جان تھی۔ خون حدت سے کھولا کرتا تھا۔ طبیعت نچلا بیٹھنے کو نہیں چاہتی تھی۔ کاشتکاری کے کام سے طبیعت اکتا تی تھی۔ خون اور رگ وپوست میں چوری اور ڈکیتی کی پشتینی خو موجود تھی۔ سر میں یہ سودا سمایا کہ گھر سے نکل کر دنیا دیکھنا چاہیئے اور دولت وثروت کا مزا چکھنا چاہیئے، چل کر کہیں ڈاکا مارو۔ نہ ہو سکے تو چوری ہی کرو۔ یا کسی کو ٹھگو۔ گھر سے نکل کھڑے ہوتے، چلتے وقت اپنے گرو کی اشیرباد کے لئے ان کے پاس گئے، یہ بزرگ پڑھے لکھے، سمجھدار اور تجربہ کار آدمی تھے۔ تمام گاؤں کے گرو اور پروہت کہلاتے تھے لوگ ان کی قدر کرتے تھے۔ اور دراصل آدمی بھلے مانس تھے۔ کہنے لگے کہ بیٹا چوری کا کام برا ہے۔ اگر میں تم کو اس سے باز بھی رکھنا چاہوں تو تم کب ماننے لگے۔ تمہارے تو خاندان کا یہی پیشہ ہے۔ پر جو نصیحت میں تم کو کرتا ہوں اس کو گانٹھ میں باندھ لو۔ خوش رہو گے۔ اور پھلو پھولو گے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ گرو کی آگیا کے باہر نہ جاؤں گا اپنا بچن دیتا ہوں۔ اس کا پالن اپنی جان کے ساتھ کروں گا۔

کہنے لگے کہ دیکھو بیٹا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ چوری دو دفعہ کرنا یا زیادہ سے زیادہ تین دفعہ۔ عمر بھر میں چوتھی چوری نہ کرنا۔ پہلی چوری گرو اور غریب غربا کے لئے۔ دوسری کنبہ پروار اور پڑوسیوں کے لئے اور تیسری اپنے لئے۔ دوسرے یہ کہ جس کا نمک کھاؤ اس کی چوری نہ کرنا۔ غریب غربا اور کم حیثیت والے کے مال کو ہرگز نہ تکنا۔ کہ جس سے اسے تنگی اور تکلیف ہو۔ امیر کی گانٹھ بھی کاٹو تو اس طرح کہ وہ اسے جلد ہی بھول جائے۔ میں نے گرو کی یہ باتیں گانٹھ میں باندھ لیں اور دل ودماغ پر نقش کا لحجر کر لیں۔ اور چل دیا۔ پہلی بات جو سوچ سمجھکر طے کی وہ یہ تھی کہ سرکاری عملداری سے نکل کر کسی ریاست میں ٹکنا چاہیئے چنانچہ میں گوالیار پہنچا۔ دوسری بات یہ سمجھ میں آئی کہ ایسا بہروپ بھرو کہ چوری کرتے ہی دھر نہ لئے جاؤ۔ چنانچہ ریاست کی پولیس میں کانسٹبل کی نوکری مل گئی۔ تیسری بات دماغ میں یہ بھی تھی کہ جلدی کام شیطان کا۔ جو کچھ کرنا ہے بہت سوچ سمجھکر اور کافی وقت کی گنجائش رکھکر۔ میں چھ مہینے تک کانسٹبل رہا۔ ڈیل ڈول اور صورت شکل کا اچھا تھا۔ اپنی ڈیوٹی اور کام پر مستعد رہتا تھا۔ میرے افسر مجھ سے بہت خوش تھے۔ چھ مہینے بعد ہی اپنے حلقے کا ہیڈ کانسٹبل

ہوگیا، اس عرصے میں میں شہر سے پوری طرح واقف ہوگیا تھا۔

یہ تو طے تھا کہ سرکاری محلات پر نظر ڈالنی نمک حرامی ہوگی۔ چوری اگر کرنی ہے تو کسی مالدار سیٹھ ساہوکار کے یہاں، اس غرض سے میں اکثر بڑے آدمیوں کا گھر تکا کرتا تھا۔ جب اس جستجو میں آٹھ دس مہینے گزر گئے تو میں نے مصمم ارادہ کیا کہ مہاراجہ سے نہیں گرو مہاراج کے یہاں دھاوا بولنا چاہیئے، یہ بزرگ کئی پشت سے مہاراجہ کے گرو تھے۔ سرکار آئے دن ان کا گھر مال دولت، جواہرات اور جاگیر سے بھرتے رہتے تھے۔ اور ان کی یہ عادت تھی کہ نہ تو خود کھاتے تھے نہ دوسرے کو کھانے دیتے تھے۔ اصل میں ان کے گھر میں سوائے اپنے اور گروانی کے تیسرا کوئی بھی نہیں تھا۔ تھوڑے دن سے ایک دس بارہ برس کے لڑکے کو اس غرض سے گود لیا تھا کہ آگے نام چلتا رہے۔ سو اس پر بھی زیادہ صرف نہ کرتے تھے۔ مجھے تحقیق ہوگیا تھا کہ علاوہ جاگیر اور کوٹھیوں اور باغات کے ان کے پاس زر، زیور اور جواہرات کا بڑا خزانہ ہے۔ اور یہ سب مال متاع گھر ہی پر رکھتے ہیں۔

یہ شہر سے قدرے فاصلے پر ایک بہت بڑی سہ منزلہ کوٹھی میں رہتے تھے۔ کوٹھی کے احاطے میں بہت بڑا باغ تھا۔ مسلح سپاہیوں کا دروازے پر پہرہ رہتا تھا۔ یہ پہرہ دار رات کو باری باری سے کوٹھی کی گشت لگایا کرتے تھے۔ کوٹھی کے اکثر دروازوں اور کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ غرض یہ کہ سیند لگانے یا دروازوں اور کھڑکیوں کے راستے سے اندر جانے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ البتہ پیچھے کی طرف دو چار روشندان ضرور تھے۔ لیکن وہ بہت بلندی پر تھے، جہاں سیڑھی کا پہنچنا بھی دشوار تھا۔ کوٹھی میرے ہی حلقے میں تھی۔ میں دو چار دفعہ گرو مہاراج کے سلام کے لئے کوٹھی پر حاضر ہوا تھا اور یہ سب باتیں میں نے بھانپ لی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ منصوبے گانٹھتا رہا، جب برسات کا زمانہ آیا تو میں نے ایک گوہ پالی اور اس کو رسی کے ساتھ دیوار پر چڑھنا سکھایا۔ کوٹھی کے احاطے کے باہر قریب ہی ایک بہت بڑا برگد کا درخت تھا۔ راتوں رات میں نے اس کے نیچے ایک بہت گہرا گڑھا کھودا۔ اور اس کو جھاڑ جھنکاڑ سے ڈھک دیا۔ ساون کا مہینہ اور ماوس کا دن تھا۔ رات بالکل اندھیری تھی اور بارش متواتر دو روز سے ہو رہی تھی۔ موسلا دھار پانی پڑ رہا تھا۔ بجلی چمکتی اور بادل گرج رہے تھے۔ کہ میں پستول اور کنجیوں کا گچھا جیب میں ڈالے اور رسی اور گوہ ہاتھ میں لئے کوٹھی کے اندر داخل ہوا۔ کوئی بھی ادھر ادھر نہ تھا۔ میں نے کوٹھی کے پیچھے جاکر گوہ کو رسی سمیت روشن دان پر چڑھایا۔ اور پھر خود رسی پکڑ کر روشن دان کے ذریعہ سے کوٹھی میں داخل ہوگیا۔ جہاں جہاں مال و اسباب کا خیال تھا سب کمروں کا جائزہ لیا۔ گرو اور گروانی بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ گروانی کے سرہانے کنجیوں کا گچھا پڑا تھا۔ اس کو اپنے قبضے میں کیا اور اسباب کے کمرے میں نہایت اطمینان سے ایک ایک صندوق کو کھول کر جائزہ لینا شروع کیا۔ چاندی اور سونے کے برتن، ساڑیاں اور ریشمیں کمخواب اور زر دوزی کی پوشاکیں اور بہت سا قیمتی مال دکھائی دیا۔ مگر یہ سب بیکار تھا۔ میں اس کو ڈھو کر کہاں اور کیسے لے جاتا۔ جیسا کا تیسا چھوڑ دیا۔ وقت کافی گزر چکا تھا اور میں اس فراق میں تھا کہ زیور جواہرات اور اشرفیوں کا خزانہ ہاتھ آئے۔ تو کام بنے، بالآخر ایک لوہے کا صندوق کھولا تو اس کے چور خانے میں سونے کا زیور اور قیمتی جواہر ایک کشتی میں نظر پڑے۔ آنکھیں کھل گئیں، دوسرے خانے میں اشرفیوں کا ڈھیر اور نوٹوں کی گڈیاں دکھلائی دیں۔ میں نے نہایت پھرتی اور احتیاط سے اس تمام خزانے کو سمیٹا اور بلا تامل دروازہ کھول کر کوٹھی کے باہر آیا۔ کہیں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ احاطے کے باہر ہو کر میں سیدھا یہ سب لے کر برگد تلے پہنچا۔ اور اس تمام خزانے کو غار کے اندر دفنا دیا۔ گڑھے کو بھر کر اوپر سے جھاڑ جھنکاڑ اور کوڑا کرکٹ ڈال دیا۔ اور وہاں سے روانہ پو پھٹنے سے پہلے تھانے پہنچ کر اپنی چارپائی پر دراز ہوگیا۔"

رائے صاحب تو یہ آپ بیتی سنائے جاتے تھے۔ اور میں حیرت زدہ یہ سمجھتا تھا گویا کوئی افسانہ سن رہا ہوں۔ کبھی ان کے نورانی چہرے کو تکنے لگتا۔ کبھی ہمہ تن گوش ہو کر پھر سننے لگتا۔ وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگے، بیٹا جب الشعور سے چوری نہیں تو انسان سے کیا چھپانا جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں افسانہ نہیں۔ حقیقت حال ہے۔ یہ کہہ کر اس واردات کا سلسلہ انہوں نے پھر یوں شروع کیا۔

صبح ہوتے ہی تھانے میں رپٹ ہوئی۔ ہم لوگ تفتیش کے لئے گئے ایک ایک کرکے پہرہ داروں اور نوکروں سے حال دریافت کیا۔ ان کو دھمکایا۔ ڈرایا۔ زدوکوب کی کہ یا تو چوری کا اقبال کریں یا سراغ بتائیں کوئی کچھ نہ بتولا۔ اور بتولتا بھی کیا اور کیسے۔ جب کئی دن اس طرح گزر گئے تو سراغ رسانی کے لئے جاسوس چھوڑے گئے، کئی پہرہ داروں اور نوکروں کو حوالات میں بند کیا گیا۔ مگر مال کا پتہ نہ چلا، اور چلتا بھی کیسے۔ مال تو محفوظ غار میں دبا رکھا تھا۔ پولیس نے اپنی خفت مٹانے کے لئے حسب معمول دو چار شخصوں پر چوری کے جرم کا مقدمہ چلایا۔ ثبوت پہنچایا۔ چنانچہ دو کو دو دو برس کی سزائے قید بھی ہوگئی۔ اور چار چھ مہینے میں یہ قضیہ رفع دفع ہوگیا۔ میری محنت اور کوشش سے میرے افسر بہت خوش ہوئے۔ جب دو تین مہینے اور گزر گئے۔ تو میں نے حاکم بالا سے درخواست کی۔ گھر چھوڑے دو برس ہونے آئے ہیں، اس کے علاوہ میرا بھائی سخت علیل ہے۔ مجھے اب نوکری منظور نہیں اجازت دی جائے تو گھر جاؤں۔ وہ میری بہت قدر کرتے اور مجھ سے اس قدر خوش تھے کہ اس پر کسی طرح راضی نہیں ہوئے بمشکل تمام تین مہینے کی رخصت دی، چلنے سے قبل رات کو میں نے جواہر اور اشرفیوں کا تمام خزانہ پلنگ کے تلے سے نکال کر اپنے صندوق میں محفوظ کیا اور گوالیار سے روانہ ہوکر گھر پہنچا۔ اس خزانے کو گھر کے قریب دفن کرکے رکھا۔ اور معمولی طور سے اپنی زندگی گھر پر گزارنے لگا۔ سال بھر اسی طرح گزرا۔ اب چوری کے واقعے کو دو برس ہونے آئے تھے۔ مجھے اطمینان ہوگیا۔ کہ معاملہ رفت وگذشت ہوگیا۔ تب میں نے ارادہ کیا کہ اب گاؤں سے نکل کر کچھ کرنا چاہئے، اور دنیا دیکھنی چاہیئے۔ میں گھر سے مال وخزانہ لے کر لائل پور پہنچا۔ اپنے تئیں مالدار زمیندار ظاہر کیا۔ کچھ زمین کے ٹکڑے خریدے۔ اور کچھ ٹھیکہ داری کا سلسلہ شروع کردیا۔ دو تین ہی برس میں مجھے ٹھیکے اور زمینداری دونوں سے کافی فائدہ ہوا۔ میرا کام اچھا چل نکلا۔ حکام مجھ سے خوش رہنے لگے۔ اس عرصے میں میں نے یہاں ایک کوٹھی بنوائی۔ اور باغ لگوایا۔ اب میرے پاس رفتہ رفتہ امارت کا تمام ساز وسامان جمع ہونے لگا۔ شہر میں، میرا نام اور وقعت بڑھنے لگی۔ میری عمر اس وقت تقریباً تیس سال کی تھی۔ اور چوری کے واقعے کو کامل چار برس ہوگئے تھے۔ میں نے سوچا کہ جواہرات اور زیور کے اس ڈھیر کو فروخت کرکے نقد میں تبدیل کرلینا چاہیئے۔ دو چار حوالی موالی ساتھ لے کر بڑے سیٹھ کی حیثیت سے بمبئی پہنچا۔ بڑے نامی اور مشہور ہوٹل میں ٹھیرا۔ احتیاطاً جواہرات وموتیوں کو زیور سے علیحدہ کرلیا تھا۔ پہلے موتیوں کا سودا کیا۔ کئی روز کی گفت وشنید کے بعد ایک جوہری نے موتیوں کی پونے دو لاکھ قیمت لگائی، پانچ سات روز کی جھائیں جھائیں کے بعد سودا دو لاکھ میں طے ہوگیا۔ میں یہ روپیہ لے کر گھر واپس آیا۔ اور بنک میں جمع کردیا۔ دو برس کے اندر ایک سفر کلکتے کا اور ایک دہلی کا کیا۔ ایک جگہ جواہرات اور دوسری جگہ سونے کا زیور فروخت کیا۔ اس میں چار لاکھ اور ملے۔ اب میرے پاس سوا چھ لاکھ روپیہ جمع تھا۔ ایک لاکھ کے نوٹ اور اشرفیاں میں پہلے ہی زمینداری اور ٹھیکہ داری میں لگا چکا تھا۔ اس سے مجھے اچھی آمدنی تھی۔ میرا کاروبار خوب چل رہا تھا۔ میں اب آسائش سے زندگی بسر کرنے لگا۔ لیکن میں نے اپنے گرو کی نصیحت لمحے بھر کے لئے بھی نہیں بھلائی تھی۔ چوری اور ڈاکہ سے تائب ہوگیا تھا۔ چھ لاکھ میں سے چار لاکھ میں نے دھرم ارتھ کا ایک علیحدہ فنڈ قائم کردیا۔ اسی کے سود اور آمدنی سے یہ بھنڈارا چلتا ہے۔ اور غریب غربا کی امداد ہوتی ہے۔ اسی میں سے چندے وغیرہ بھی دیئے جاتے ہیں۔ ابھی حال میں ہی میں نے اس کا باقاعدہ قانونی ٹرسٹ قائم کردیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر اس ٹرسٹ کا پریسیڈنٹ ہے، یہ روپیہ نہ پہلے ہی میرا تھا، نہ اب ہے۔ میں نے کبھی اس میں سے ایک پیسہ بھی اپنے صرف خاص کے لئے نہیں لیا۔ اور اب تو اگر لینا بھی چاہوں تو نہیں لے سکتا۔ دو لاکھ روپیہ میں نے اپنے بال بچوں کے نام سے علیحدہ کر رکھا ہے۔ اس کی آمدنی سے لڑکے لڑکیوں کی شادی بیاہ ہوئے۔ پوتے پوتیوں کے تمام کام کئے۔ دو لڑکوں کو ولایت بھیجا اور وہاں تعلیم دلوائی۔ اور گو اب میرے لڑکے برسر روزگار ہیں، پھر بھی کبھی نہ کبھی خاص ضروریات کے لئے روپیہ کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ سو ان کو اب بھی اسی رقم کی آمدنی سے روپیہ بھیجتا رہتا ہوں۔ اور وصیت

کردی ہے کہ یہ دولاکھ میرے مرنے کے بعد لڑکوں میں تقسیم ہو جائے ہوا چھ لاکھ کا حساب تو تمہیں سنا دیا۔ اب باقی رہا سوا لاکھ وہ میرے کا۔ و بار میں لگا جس سے پچھلے تیس برس میں میں نے تین لاکھ کا پس انداز کیا۔ میری تمام زمینداری اور ملکیت تقریباً ۴ لاکھ کی ہے۔ لیکن بینکوں کے سود اور زمینداری کے دام جو فی زمانہ گھٹے ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر دو لاکھ بھی سب کے مل جائیں تو غنیمت ہے۔ اس میں سے ایک لاکھ تمہیں یاد ہوگا کہ مجھے ادا دینا ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ اس میں سے ایک مندر اور ایک دھرم شالہ بنوا دوں۔ لیکن لڑکوں کا اصرار ہے اور ڈپٹی کمشنر بھی سمجھے بیٹھے ہوئے ہیں کہ ہندوستانی لڑکیوں کے اسکولوں کے لئے عمارت کی سخت ضرورت ہے۔ میں بھی سمجھتا ہوں کہ کام اچھا ہے۔ سو یہ ایک لاکھ عمارت اور اسکول کے ذرونڈ کے لئے جاوے گا۔ میری محنت اور شفقت کا ایک لاکھ رہا۔ سو اس کے سود سے میں اپنی بقیہ زندگی کا گزارہ کرلوں گا۔ سب میں چھوٹا بنگلہ۔ ایک گھوڑا اور تانگہ۔ ڈھائی سو روپیہ ماہیتہ میرے اور بڑھیا کے لئے کافی ہوگا۔ زندگی میں جو کچھ کرنا تھا۔ سب کچھ کر چکا اور دنیا بھی دیکھ لی۔ مرنے کے بعد ایشور کو منہ دکھانا ہے اور جواب دہی کرنی ہے۔ سات لاکھ کا حساب تو سمجھا دوں گا۔ گویا یہ کمائے۔ مہاراج کا جو نقصان ہوا اس کا مجھے غم نہیں۔ مہاراجہ نے عیاشی میں اس کا گھر پھر ویسے ہی بھر دیا ہوگا۔ لیکن وہ غریب بے قصور جانور وغیرہ جنہوں نے میری وجہ سے سزا پائی اور جن کی زندگیاں خراب ہوئیں مجھے ہر وقت ستاتا ہے۔ اور اپنے جرم کا داغ گولا کہ دھونے کی کوشش کرتا ہوں یہ مٹائے نہیں مٹتا۔ سو بیٹا اب اس دنیا کے جنجال سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں کہ ایشور کا تھوڑا بہت بھجن اور سیوا کروں۔ شاید اسی طرح میرے جرم کا کفارہ ہو جائے۔ تم بھی میرے لئے دعائے خیر کرو۔"

سندر داس۔ خدا مغفرت کرے۔ بیچاروں کی یہ ہے واردات زندگی، رائے بہادر دیون سنگھ کی۔

برج نرائن۔ کمال کا آدمی تھا۔

سندر داس۔ ڈاکو تھا۔ پرتھا کمیونسٹ۔ اور لطف یہ ہے کہ نہ لینن کے اصول و عمل سے واقف تھا۔ نہ مارکس کے نام سے۔ اگر تم اس سے پوچھتے تو وہ کمیونسٹ اور بولشویک کے معنی بھی تمہیں صحیح صحیح نہیں سمجھا سکتا۔

برج نرائن۔ بے شک۔

سندر داس۔ بھائی جان! یہاں تک اور ایسے سوشلزم کے تو ہم قائل ہیں۔ لیکن۔ دستور ملکیت کا ہی جڑ سے اڑا دینا اور تمہارا مارکسی فلسفہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ اور یقین مانو کہ اوروں کے بھی مشکل سے ہی سمجھ میں آئے گا۔

ہم دونوں ہیں اک قصۂ پروانے سے
مطلب ہے فقط دل کے بہل جانے سے
ہر شام مرو سے سر اپنے ہیں عبث شیخ و ہم
تو ظرف وضو سے اور ہم پیمانے سے

جوش ملیح آبادی

اُردو

(از جناب محمود علی خاں ماہر اکبر آبادی)

ہندوستان جنت نشان کی سہاگن دلہن اُردو کو سات سہاگنوں (عربی، فارسی، ترکی، پشتو، سنسکرت، پرتگالی اور فرانسیسی) نے مل کر شبھ گھڑی میں عروسی جوڑا پہنایا، اس دلہن کے سہاگ کی رات تو مہاراجہ بکرماجیت کے دور سے شروع ہوئی، اور ان کے مبارک ہاتھ نے اس کی مانگ میں سیندور بھرا۔ اور اس کی شادی کا سہرا ان کے درباری شاعر چند کوی نے لکھا، پھر یہ لاڈلی دلہن سلاطین غوری۔ خلجی، لودھی اور مغل بادشاہوں کی علم نواز گود میں کھیلتی اور پرورش پاتی رہی۔ اکبر اعظم نے اکبر آباد (آگرہ) کے قلعۂ معلیٰ کے اردو بازار کی باادب بانصیب سہاگن اردو کو نئے لباس سے ملبوس کرکے بڑی دلہن (اردوئے معلیٰ) کے خطاب سے سرفراز کیا، اور یہ سہاگ بھری سہاگن مغلیہ دور میں خوب پروان چڑھی۔ اس کی سانولی سلونی صورت نے عربی۔ ہندی۔ ترکی۔ ایرانی۔ افغانی۔ پرتگالی اور فرانسیسی نوجوانوں کو اپنا ایسا گرویدہ کیا کہ یہ اپنی مادری زبان کو بھول گئے۔ اور اس شیریں زبان کے چٹخارے لینے لگے۔

خیال تھا کہ مغلیہ حکومت کے ساتھ ساتھ اس ادب کی دیوی کے آفتابی چہرے پر ادبار کی گھٹائیں چھا جائیں گی۔ اور اس کی زندگی کا چراغ بھی گل ہو جائے گا۔ مگر اس کی دل فریب اداؤں گورنمنٹ برطانیہ کو بھی بھائیں اور اس کا سکہ اپنے قلمرو میں شامل کرکے علم دوستی اور ادب نوازی کا ثبوت دیا:-

مہاراجہ بکرماجیت نے ایسی شبھ گھڑی سے اردو کی درشنی ہنڈی جاری کی تھی کہ آج تک یہ ہندوستان بلکہ بیرون ہندوستان میں کھرے سکے کی طرح جاری ہے۔ اور یہ ہمیشہ اسی طرح جاری رہے گی۔ جب تک اس کی سپوت اولادیں (اردو تصانیف اور تالیفات) دنیا میں موجود ہیں۔

ادب شعار عروس اردو کا زیور نظم اور نثر اور اس کا پاکیزہ لباس حکمت، ادب۔ مذہب الغرض تمام علمی شعبوں کا مجموعہ ہے جس سے اس کو مزین اور مرتب کیا گیا ہے۔ اور اس کی سکونت کے لئے تمام مہذب دنیا کے علمی اور ادبی ادارے ہیں۔ اور اس کے سفیر اخبار اور رسائل ہیں جو اس کی شیریں کلامی کا قصیدہ پڑھا کرتے ہیں۔

ہندوستانیوں کو اردو بیگم کی ادائیں ایسی بھائی ہیں کہ اس کے نام پر علمی ادارے اور انجمنیں قائم کی ہیں۔ جہاں اس کے گن گانے والے اس کی مدح سرائی میں مصروف رہتے ہیں۔

اردو ادبی دنیا (ہندوستان) کا روشن چاند ہے۔ اس کی درخشندہ پیشانی سے علمی اور ادبی شعاعیں لمعہ افگن ہوئیں۔ اور اس کی خوبیوں نے اس کو تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان منوا ہی دیا۔ گو کہ ہندوستان میں دو سو پچیس زبانیں (مردم شماری کی تازہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے) بولی

لہ عام ماخذ کے لحاظ سے سات کی تخصیص تھی۔ ورنہ اردو میں ان زبانوں کے علاوہ مختلف زبانیں شامل ہیں —— ۱۲

جاتی ہیں۔ مگر یہ فخر اردو کو ہی حاصل ہے کہ ہندوستان کے مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں اور اس کی ہمہ گیری کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ برطانیہ۔ جرمنی۔ جاپانی، افغانی اور ترکی حکومتوں نے اردو کی تعلیم کو اپنے مدارس میں اس لئے جاری کیا ہے کہ اردو چونکہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے اس کے ذریعہ کاروباری سہولتیں پیدا ہوسکیں۔

اردو کا رسم الخط عربی (شاخ قیراموں) فارسی سے ماخوذ ہے۔ اور یہ جس سرعت سے لکھی جاتی ہے اس کی نظیر ہندوستان کی دوسری زبانوں میں نہیں ہے۔ اور یہ فن فن شارٹ ہنڈ (مختصر نویسی) کا درجہ رکھتی ہے۔

ہندوستان کے مشہور راجہ بکرماجیت کے عہد حکومت (چھپن سال قبل مسیح) میں ان کے درباری شاعر چند کوی نے "پرتھی راج راسا" کے نام سے جو کتاب لکھی تھی وہ سب سے قدیم اردو یا ہندی پراکرت (بھاشا میں عربی۔ فارسی الفاظ دخیل ہوگئے تھے) میں تھی۔

اکثر مورخوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ محمود غزنوی کے حملوں کے بعد ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اردو مروج ہوچکی تھی لیکن شہاب الدین غوری کے عہد ۱۱۹۱ء میں پراکرت نے بھاشا د برج بھاشا یا ہندی یا غیر فصیح اردو) کا لباس پہن لیا تھا۔ اور خلجی سلاطین کے عہد حکومت میں اردو میں فصاحت پیدا ہوگئی تھی۔ جس کا ثبوت حضرت امیر خسرو رح (المتوفی ۱۳۲۵ء) کی تصانیف سے ملتا ہے۔

بہلول لودھی کے عہد (۱۴۸۸ء) میں ہندوؤں خصوصاً کائستوں نے فارسی اور اردو میں بڑی ترقی کی اور شاہی دفاتر میں جلیل القدر عہدوں پر فائز ہوتے۔ اور اسی زمانے میں ہندی (بھاشا) میں عربی فارسی کے الفاظ بکثرت دخیل ہونے لگے، چنانچہ اس زمانے کی تصانیف مثلاً کبیر داس بنارسی کے دوہرے۔

گرو نانک صاحب کا کلام اور بابا تلسی داس کی رامائن سے پتہ ملتا ہے۔

شاہ بابر خصوصاً جلال الدین محمد اکبر اعظم کے عہد میں دارالسلطنت اکبر آباد (آگرہ) کے قلعۂ معلے میں مردانہ اور زنانہ بازار لگتا تھا۔ اس بازار کا نام اردو تھا۔ اس میں شاہی عمائد، ہندی۔ ترکی۔ ایرانی، عرب افغانی وغیرہ خرید و فروخت کرتے تھے۔ اور اس بازار میں مخلوط شدہ زبانیں مستعمل تھیں جس کا نام اردو ہوا، اور قلعۂ معلے کے تعلیمی سلسلہ میں اس لشکری زبان کا نام اردوئے معلے رکھا گیا۔ یہاں تک کہ بازار اردوئے معلے کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اس بازار کی رونق عہد جہانگیری میں بھی دلی (دہلی) کے قلعۂ معلے کی زبان (اردوئے معلے) ترقی کرکے شہری زبان بن گئی، پرتگالی اور فرانسیسی ہندوستان میں بغرض تجارت اور ملازمت آگئے تھے۔

دولت مغلیہ کے علاوہ فرماں روایان دکن کی قدردانی نے اردو کو فروغ دیا۔ اور آج بھی دولت عثمانیہ (دکن) میں اردو کی جو ترقی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

گورنمنٹ برطانیہ کے عہد میں بھی آج تک یہ عام اور مشترکہ زبان اردو مروج ہے۔ بلکہ گورنمنٹ برطانیہ کی حکومت کے ابتدائی دور میں مسٹر فرگسن اور جنرل ولیم پاٹرک کی لغات اردو کا خاص تصانیف میں شمار ہے جو بمقام لندن ۱۷۷۳ء اور ۱۷۹۰ء میں شائع ہوئی تھیں۔ اس کے بعد انیسویں صدی عیسوی میں بمقام کلکتہ (دارالسلطنت ہند) فورٹ ولیم میں اردو کا بیت الحکمت قائم ہوا اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ اس کے سکرٹری مقرر ہوئے، انہوں نے ہندوستان کے مایہ ناز ادیب جمع کرکے اردو کی بہترین تصانیف تیار اور طبع کرائیں ۱۸۳۵ء میں شاہی دفاتر میں فارسی کی بجائے اردو مروج ہوگئی، اور مدارس میں بھی اردو کی تعلیم عام جاری ہوگئی۔

عہد برطانیہ میں اکثر انگریزی الفاظ اردو میں دخیل ہوگئے، یہ اردو کی ایک بڑی خصوصیت ہے کہ اس میں ہر زبان کے الفاظ اس طرح جذب ہوگئے ہیں جیسے کسی جڑاؤ چندن ہار میں جواہرات مناسب طور پر جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہندوستان کے ہندو مسلم اکابر علماء مشائخ، پنڈتوں اور شعرا نے بھی اردو میں مذہبی کتب تصنیف، ترجمہ اور تالیف کیں، اور آج بھی اردو ہی ایک عام اور مشترکہ زبان ہے بعض ناعاقبت اندیش لوگوں کا یہ غلط خیال ہے کہ اردو کو خواہ مخواہ مسلمانوں کی زبان بنا کر اس کج بحثی سے ملک کی فضا کو خراب کرتے ہیں، جب اس اردو کو عروسی لباس سے آراستہ کیا گیا تھا تو اس وقت بھی ہندوستان کے ہندو مسلم بلکہ غیر ممالک سے آئے ہوئے لوگوں نے مل جل کر ترتیب دیا تھا۔ اس لئے اردو ہی ہندوستان کی مشترکہ اور عام زبان ہے۔ اور ہمیشہ رہے گی۔

امتحان

گوبردھن داس

دوسرے دن تاریخ کا پرچہ تھا۔ میں نے ہندوستان اور یورپ کی ضخیم تاریخیں اٹھالیں۔ ختم تو خیر یہ رات بن کیا ہوتیں، ورق گردانی کی نیت سے دونوں کو برابر سامنے رکھ لیا۔ ایک کو آگے سرکا کر صفحہ جو کھولتا ہوں، تو عبارت ندارد۔ ایک عجیب تصویر نگا ہوں کے سامنے تھی۔ نگاہوں سے انتہائی چالاکی، پیشانی کی تیوریوں سے فکرمندی۔ اور فریب کاری چہرے سے خباثت، مکاری۔ اور خونخواری ٹپک رہی تھی۔ عنوان پر لکھا ہوا تھا، یہ تصویر سیاست کی ہے۔ تصویر کے نیچے یہ عبارت درج تھی۔ میرا نام سیاست رکھا گیا۔ مگر در اصل میں طاقت کی بھوکی ہوں میں حرص اور ظلم کی پتلی ہوں۔ میرا اصول ہے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس، مجھے غیر مہذب ممالک کے وحشی باشندوں کی مصیبت ناک زندگی پر بڑا ترس آتا ہے۔ میں ان کو غلام بنا کر رفتہ رفتہ ان کی تمام قوم کو قید ہستی سے ہی آزاد کر دیتی ہوں۔

آگے مجھ سے نہیں پڑھا گیا۔ گھبرا کر صفحہ الٹ دیا۔ تو اس سے بھی عجیب تر تصویر نظر آئی۔

بڑی۔ بڑی مونچھیں۔ نہایت خوں آشام نگاہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسا قیصر جرمنی یا زار روس غصے میں دانت پیس رہا ہو۔ تصویر کے عنوان پر درج تھا "یہ مرقع حکومت کا ہے"۔ تصویر کے نیچے تحریر تھا۔

میرا نہایت کامیاب اصول تقسیم کرو اور حکومت کرو ہے۔ میری آخری دلیل تلوار ہے۔ لیکن میرا ہر حربہ مؤثر ہے۔ پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ، کریمنل انوسٹیگیشن ڈیپارٹمنٹ۔ پولیس فوج۔ خطاب۔ کمیونل ایوارڈ۔ اور کیا کچھ نہیں۔ ایک مرتبہ کھانے پر مدعو کرنے کے بعد ایسا مکمل جادو۔ ایسا کامیاب سحر ایسا زبردست منتر میرے مہمان پر چل جاتا ہے۔ کہ جتنا وہ زیادہ ہو۔ جتنا زیادہ وہ مفلس ہو۔ جتنا زیادہ وہ کام کرنے والا ہو جتنا بڑا وہ محب وطن ہو۔ اتنا ہی زیادہ فریب خوردہ۔ فریب شعار اور قوم فروش بن جاتا ہے۔

آگے مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔

~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~

وطن

یہ نظم ہر چند وجدان اور پختہ مشقی کے برکات کا مظاہرہ نہیں کرتی مگر چونکہ اس میں وطن کی محبت اور ملت کا درد موجود ہے اس لئے ہمت افزائی کے طور پر شائع کی جا رہی ہے۔

اے گلستانِ ارم پیارے وطن ہندوستاں　　اے کہ ہر خطہ ترا رونق میں ہے جنت نشاں
بلکہ تیری سرزمیں خجلت دہِ خلد و جناں　　اے کہ تیری خاک میں ہے رفعتوں کی داستاں

ذرہ ذرہ تیرا حسن و عشق سے معمور ہے
ہر نظر کے واسطے تجھ میں کشش مستور ہے

تیری مشتِ خاک ہے سرمایۂ عز و وقار　　ہر روش میں ہے تری اک جلوۂ رنگِ بہار
لعل و گوہر گدڑیوں میں ہیں ترے پنہاں ہزار　　وادیوں میں کوثر و تسنیم جیسے جوئے بار

کروٹیں لیتی ہیں میدانوں میں نکہت بیزیاں
ہیں بہاروں میں تری ہر سو جنوں انگیزیاں

تیرے گلزاروں سے دل کی آنکھ کو فرحت ملی　　ہر طرف سے اک نوید عشرت و راحت ملی
تیرے غنچوں کو لہکنے کی عجب فطرت ملی　　تیرے پھولوں کے مہکنے میں عجب لذت ملی

اِمتحان

گو.دہن داس

دوسرے دن تاریخ کا پرچہ تھا۔ میں نے ہندوستان اور یورپ کی ضخیم تاریخیں اٹھالیں۔ ختم تو خیر یہ رات میں کیا ہوتیں، ورق گردانی کی نیت سے دونوں کو برابر سامنے رکھ لیا۔ ایک کو آگے سرکا کر صفحہ جو کھولتا ہوں، تو عبارت ندارد۔ ایک عجیب تصویر نگاہوں کے سامنے تھی، نگاہوں سے انتہائی چالاکی، پیشانی کی تیوریوں سے فکرمندی۔ اور فریب کاری چہرے سے خباثت، مکاری۔ اور خونخواری ٹپک رہی تھی۔ عنوان پر لکھا ہوا تھا، یہ تصویر سیاست کی ہے۔ تصویر کے نیچے یہ عبارت درج تھی۔ میرا نام سیاست رکھا گیا۔ مگر در اصل میں طاقت کی بھوکی ہوں میں حرص اور ظلم کی پتلی ہوں۔ میرا اصول ہے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس، مجھے غیر مہذب ممالک کے وحشی باشندوں کی مصیبت ناک زندگی پر بڑا ترس آتا ہے۔ میں ان کو غلام بنا کر رفتہ رفتہ ان کی تمام قوم کو قید ہستی سے ہی آزاد کر دیتی ہوں۔

آگے مجھ سے نہیں پڑھا گیا۔ گھبرا کر صفحہ الٹ دیا۔ تو اس سے بھی عجیب تر تصویر نظر آئی۔

بڑی۔ بڑی مونچھیں۔ نہایت خوں آشام نگاہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسا قیصر جرمنی یا زار روس غصے میں دانت پیس رہا ہو۔ تصویر کے عنوان پر درج تھا " یہ مرقع حکومت کا ہے " تصویر کے نیچے تحریر تھا۔

میرا مذہب ادنا کامیاب اصول تقسیم کر دا و حکومت کرو ہے۔ میری آخری دلیل تلوار ہے۔ لیکن میرا ہر حربہ مؤثر ہے۔ پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ، کریمنل انوسٹیگیشن ڈیپارٹمنٹ۔ پولیس فوج۔ خطاب۔ کمپنول ایوارڈ۔ اور کیا کچھ نہیں۔ ایک مرتبہ کھانے پہ بدعو کرنے کے بعد ایسا مکمل جادو۔ ایسا کامیاب سحر ایسا زبردست منتر میرے مہمان پر چل جاتا ہے، کہ جتنا وہ زیادہ ہو۔ جتنا زیادہ وہ مفلس ہو۔ جتنا زیادہ وہ کام کرنے والا ہو جتنا بڑا وہ محب وطن ہو۔ اتنا ہی زیادہ وہ فریب خوردہ۔ فریب شعار اور قوم فروش بن جاتا ہے۔

آگے مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔

وطن

یہ نظم ہر چند وطنیت اور کہنہ مشقی کے برکات کا مظاہرہ نہیں کرتی، مگر چونکہ اس میں وطن کی محبت
اور ملت کا درد موجود ہے اس لئے ہمت افزائی کے طور پر شائع کی جا رہی ہے۔

اے گلستانِ ارم پیارے وطن ہندوستاں   اے کہ ہر خطہ ترا رونق میں ہے جنت نشاں

بلکہ تیری سرزمیں خجلت دہِ خلدِ جناں   اے کہ تیری خاک میں ہے رفعتوں کی داستاں

ذرہ ذرہ تیرا حسن و عشق سے معمور ہے

ہر نظر کے واسطے تجھ میں کشش مستور ہے

تیری مشتِ خاک ہے سرمایۂ عز و وقار   ہر روش میں ہے تری اک جلوۂ رنگِ بہار

لعل و گوہر گدڑیوں میں ہیں ترے پنہاں ہزار   وادیوں میں کوثر و تسنیم جیسے جوئے بار

کروٹیں لیتی ہیں میدانوں میں نکہت بیزیاں

ہیں بہاروں میں تری ہر سو جنوں انگیزیاں

تیرے گلزاروں سے دل کی آنکھ کو فرحت ملی   ہر طرف سے اک نوید عشرت و راحت ملی

تیرے غنچوں کو لہکنے کی عجب فطرت ملی   تیرے پھولوں کے مہکنے میں عجب لذت ملی

جذبۂ حبِ وطن اُف کس قدر بیباک ہے
خاک کے خوف و خطر سے دامنِ دل پاک ہے

یہ تو سچ ہے، آہ لیکن کس کو ہے پروا تری — ان بھری گودوں پہ بھی اُف آنکھ سے ہے دکھیا تری
شادمانی میں نہاں ہے آہِ غم افزا تری — چہچہوں میں درد کی سوزش نواپیرا تری

خود غرض گر ایک ہے تو دوسرا مجنون ہے
ایک ماں کی گود میں دو بھائیوں کا خون ہے

آنکھ والے تیری جنت پوشیاں دیکھا کیے — اپنے بیگانوں سے ہم آغوشیاں دیکھا کیے
صاحبانِ شوق کی مدہوشیاں دیکھا کیے — تیرے متوالوں کی راحت کوشیاں دیکھا کیے

اب تو تیری داستاں کا ہر ورق بے کیف ہے
اے وطن والو تمہارے حال پر صد حیف ہے

آؤ، اٹھو، قصۂ ماضی کو پھر دہرائیں ہم — آؤ پھر روٹھے ہوئے باہم گلے مل جائیں ہم
آؤ یہ ٹوٹے ہوئے دل جوڑ کے دکھلائیں ہم — پستیوں سے رفعتوں کی سمت پھر اڑ جائیں ہم

پھر وطن کی نذر کر دیں آؤ جوہر زندگی
وقفِ خدماتِ وطن اپنی ہو یکسر زندگی

اجہر حسین بی۔اے کانپوری

یہ کس کی تصویر ہے؟

مرزا عظیم بیگ چغتائی، بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

اگر یہ اصول قایم ہو جاتا کہ شادی سے پہلے کسی طرح لازمی طور پر لڑکی لڑکے کو دیکھ لے اور لڑکا لڑکی کو، تو جناب یقین مانیئے کہ کم سے کم میری تو شادی ہی نہ ممکن تھی۔

شادی سے پہلے میں اس اصول کا کٹر حامی تھا جس لڑکی سے پہلی بار میری سگائی طے ہوئی میں نے کسی نہ کسی طرح تاک جھانک کر دیکھ لیا۔ بیحد پسند آئی۔ اس کے بعد یہ شوق چرایا کہ وہ بھی کسی طرح مجھے دیکھے۔ یہ بھی ممکن ہو گیا، مگر جناب ساتھ ہی اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس شوخ اور خوبصورت لڑکی نے میرے بارے میں اپنی ایک سہیلی کو جو کچھ لکھ مارا اُس کا ہو بہو خاکہ یہ ہے۔

"آنکھوں کے گرد گھیرے۔ کر جھکی، پینک میں رہتے ہیں۔ ہاں یہ میں مانتی ہوں کہ پڑھنے لکھنے میں تیز ہیں۔ سمجھدار ہیں۔ خوش مزاج ہیں۔ لیکن میری سمجھ میں ساتھ ہی اینچی بھی ہیں۔ خدا کی قسم تمہیں بتاؤں کہ یہ بھی کوئی حلیہ ہے کہ چھوٹا سا قد، اُس پر کُبڑی کمر، عینک لگائے .... بھویں چڑھائے ۔ چلے جا رہے ہیں۔ گردن جھکائے ٹوٹتے ہوئے۔ چہرہ دیکھا تو زرد۔ چپٹی ناک ۔ بدرنگ پیٹیلا چہرہ، مُردنی چھایا ہوا معلوم دے جیسے ہڈیوں پر کھال منڈھ دی ہو۔ پھر موٹے موٹے ہونٹ جگہ جگہ چہرہ پر جھُریاں ۔ کونے اور کنگرے نکلے ہوئے۔ اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو کلوں میں اس عمر میں ایسے گڑھے کہ دونوں طرف آدھ آدھ پاؤ چنے آ جائیں۔ .... یہ ہندوستان ہے۔ میری شادی اگر زبردستی کر دی گئی تو یہ سب سر آنکھوں پر۔ مگر دل کی پوچھو تو بتا چکی۔ نہ میں رنجیدہ ہوں گی اور نہ خوش، کیونکہ یہی دستور ہے..... وغیرہ وغیرہ"

خط میں نے پڑھا، آخر خودداری بھی تو کوئی چیز ہے۔ لڑکی کو میں نے خوب اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ آئینہ اُٹھا کر دیکھا اور چُپکے سے رکھ دیا۔ عجیب کھینچ تان میں تھا۔ کروں یا نہ کروں۔ ایسی لڑکی کے ہاتھ سے جانے کا ایک طرف افسوس تھا۔ اور دوسری طرف غیرت تقاضہ کرتی تھی بہت کھینچ تان کے بعد طے کر لیا کہ ایسی نالائق لڑکی سے ہرگز ہرگز شادی نہ کروں گا جو خود مجھے پسند نہیں کرتی۔

چنانچہ چپکے سے میں نے بہن کو وہ خط دکھا دیا وہ خط کو دیکھتے ہی آگ بگولہ ہو گئیں۔ خدا خدا کر کے اُنھیں چپ چاپ کیا۔ اُنھوں نے مجھے یقین دلایا "لڑکی بدتمیز ہے۔ کچھ بڑا ہے کسی کرم نہیں۔ میں خود یہ چاہتی تھی۔" پھر اُنھوں نے درجنوں نام لے ڈالے۔ اس کے بعد دو لڑکیاں میں نے پسند کر دیں۔ کیونکہ وہ ظاہری خوبصورتی میں پہلی جیسی نہیں تھیں۔ اس کے بعد تینوں نے مجھے ناپسند کر دیا اور تیسری تو اس قدر بدتمیز نکلی کہ انٹرنس پاس ہونے اور نئی تہذیب کی تعلیم یافتہ ہونے پر بھی اُس نے میرا نام روزنیٹ (ROSINAUT) رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ اس پر میرا خون کیسا کھولا ہو گا۔

اس کے بعد دس پندرہ جگہ انتخاب کی کوشش کی، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو مجھکو کسی نے پسند نہ کیا یا جنھوں نے مجھے پسند کیا۔ یعنی جنھوں نے مجھے ناپسند نہیں کیا۔ اُنھیں میں نے ناپسند کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں خود تنگ آ گیا۔ اور بہن جی بھی پریشان ہو گئیں۔ کیونکہ مجھے چُپکے سے لڑکی دکھانے کا انتظام اُنھیں کے سپرد تھا۔ ہم بہن بھائی کی تجویز یہ تھی کہ لڑکی پسند آ جانے پر سگائی کی بات چیت ہو۔ اب تک جتنی لڑکیاں میں نے پسند کی تھیں وہ سب مجھ سے کہیں زیادہ خوبصورت تھیں، لیکن جناب میں تو سب سے زیادہ خوبصورت چاہتا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ اصول ہی ایک سرے سے غلط ہے کہ لڑکی لڑکے کو دیکھے۔ لڑکے کا لڑکی کو دیکھ لینا ہی کافی ہے۔ اور یہی کامیابی کی کنجی ہے۔

بس اسی سنہرے اصول پر چلنے سے میری آپ ہی شادی ممکن ہوئی۔ سگائی طے ہونے کے بعد ہی میں نے اپنے تمام فوٹو حفاظت سے چھپا دئے۔ تاکہ ہر ایک آنے جانے والے کی نظر نہ پڑے۔ اور انھیں اڑا لیجانے کا ڈر بھی نہ رہے۔ کیونکہ بہن جی نے کہدیا تھا۔ اب کی مرتبہ اگر تم نے اپنی دیکھا بھالی کرائی تو میں پھر کوئی دلچسپی نہ لوں گی" میں بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر یہ لڑکی مجھے دیکھ پائے گی تو تعجب نہیں کہ بھڑک جائے۔ یا میرے اوپر طرح طرح کے ریمارک پاس کرکے مجھے ہی مجبور کر دے کہ میں اُس کی طرف سے پھر جاؤں۔ خیر اسی قسم کی تمام احتیاط برتنے پر مجھے کامیابی ملی۔ اور میری شادی ہو گئی۔ لیکن لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں، اس اصول کو خیرباد کہہ کر۔

(۲)

مجھے اگر اپنی بیوی کی طرح طرح کی تصویریں کھینچنے اور کھچوانے کا شوق تھا تو کوئی تعجب نہیں۔ تصویریں کھچوائیں۔ جگہ جگہ سے اُن کو انلارج کرایا۔ ہر رُخ سے بٹھا کر تصویر لی۔ ہر لباس اور طرز میں تصویر کھینچی۔ عمدہ عمدہ فریم لگوائے تصویروں میں طرح طرح کے رنگ بھروائے۔ غرض فوٹوگرافی کی حد کر دی۔ اور کمرہ میری بیوی کی تصویروں کا چتر شالہ بن گیا۔

لیکن اس تمام مصوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ خربوزے کو دیکھکر خربوزے نے رنگ پکڑا۔ اور میری پیاری بیوی کو اپنے دلربا شوہر کی تصویریں کھینچنے کھچوانے کا شوق لگ گیا۔ اب تو خدا ہی حافظ ہے۔

خانم (بیوی کا نام) نے میری موجودہ تصویروں کو غور سے دیکھکر کہا، "ان میں سے کوئی بھی ٹھیک نہیں۔ سب گھر کی کھینچی ہوئی ہیں۔"

بھابی جی نے مسکرا کر لطف سے کہا۔ "یہ گھر کی کھنچی ہوئی ہیں! ذرا آنکھوں سے تو دیکھو۔

گھر کی کھنچی ہوئی نہیں ہے تو کسی ایسے ویسے نے کھینچی ہوئی ہے۔ خانم بولی

بھابی جی نے کہا "نیچے نام لکھا ہے۔ ایسے مشہور فوٹوگرافر کی دکان۔"

خانم تلملا کر بولی۔ "اونچی دکان پھیکا پکوان، سب بیگار ٹالتے ہیں۔ اس سے اچھی تو خود میں نے کھینچی ہے۔"

آخر اس میں خرابی کون سی ہے۔ بھابی نے خانم سے پوچھا صاف تصویر ہے بال بال صاف آیا ہے۔ یہ دیکھو آنکھوں کے نیچے کی ہڈی۔۔۔ ذرا بھائی ادھر منہ پھیرنا تو"۔۔۔ میں نے منہ پھیر لیا تو بولی "یہ۔ یہ۔ بھیا دیکھو تو آنکھ کے نیچے کی ہڈی۔ جیسی صاف اس طرف سے دکھائی دیتی ہے ویسی ہی تصویر میں ہے۔۔۔۔۔ اور یہ دیکھو آنکھ سے نیچے کا ڈھال برابر چلا آرہا ہے۔ اور ٹھوڑی کے پاس۔۔۔۔۔۔ یہ دیکھو ابھری ہوئی ہڈی کیسی صاف ہے"

اس طرح بھابی نے میرے چھڈری پڑے ہوئے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا نقشہ کھینچ کر یہ ثابت کر دیا کہ تصویر ہو بہو ٹھیک ہے۔ نقل ایک دم اصل جیسی ہے۔ خانم کو بے حد بُرا معلوم ہوا۔ اُس نے تصویر بھابی کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ اور جل بھن کر کہا، "اچھا بہن میں کچھ تم سے تو نہیں کہہ رہی جو بحث پر تُل پڑیں۔

میرے ایک دوست تھے جن سے میری اکثر یہ بحث رہتی تھی کہ میں تگڑا یا وہ۔ جاڑوں میں ہم دونوں بادام کا حلوہ کھاتے تھے۔ اور چھپے چھپے ڈنڈ پیلتے تھے۔ پھر دونوں پہلوان اپنے اپنے لحیم شحیم جسم کو ناپتے اور اسٹیشن پر جا کر اپنے کو تول کر مقابلہ کرتے تھے۔ کبھی میں ایک من پانچ سیر کا نکلتا تھا اور وہ ایک من چھ سیر کے۔ کبھی وہ سیر آدھ سیر گھٹ جاتے تھے۔ میری تصویروں میں کہیں اُن کی بھی ایک تصویر نکل آئی، بھابی نے اُسے دیکھکر کہا "ذرا اس جسم رُخ کو دیکھنا۔۔۔۔۔ دیکھکر ہی ڈر لگتا ہے۔

خانم دل ہی دل میں سلگ گئی اور پھرتی سے تیسری تصویر نکالی اور کہا۔۔۔۔ ذرا جیٹھ جی کو دیکھنا۔ جان پڑتا ہے جیسے بورا رکھا ہے۔ مجھے دیکھکر پھریری آتی ہے۔۔۔۔۔۔ ذرا دیکھئے تو گردن۔"

بھائی صاحب دراصل بے حد موٹے تھے۔ مگر یہ چوٹ تھی دراصل بھابی کے اوپر اور بھابی جی نے ایک مسکراہٹ سے اُسے محسوس بھی کیا، خانم نے کہا، "نہ بھاگنے کے نہ دوڑنے کے۔۔۔۔۔۔"

بھابی نے فوراً الٹ کر جواب دیا، "خیر دوڑنے بھاگنے کی بجائے آدمیوں

لو مرغی ہی کیا ہے۔ مرغیاں پکڑنے کو آدمی نوکر ہی ہیں"

پرسوں بھائی صاحب کے دوڑنے کا نمونہ میرے سامنے عجیب بھدی طرح پیش آیا تھا۔ بات یہ تھی کہ مرغی بھاگ نکلی تھی، اُسے پکڑنے کی ایک طرف سے بھائی صاحب نے کوشش کی تھی اور دوسری طرف سے میں نے۔ یہ ظاہر ہے کہ بھائی صاحب اپنے موٹے بدن سے کیسے کچھ دوڑ سکتے تھے۔

"جو خود دوڑ دھوپ نہ سکے وہ آدمی ہی کیا؟" کہہ کر خانم تصویریں سمیٹ کر چلتی بنی۔ لیکن چلتے وقت مجھ سے کہہ گئی "آج شام کو فوٹوگرافر کو سے آنا"

(۳)

فوٹوگرافر آیا تو سب سے پہلے خانم نے اس کا کیمرا دیکھا۔ فوٹوگرافی وہ جیسی جانتی تھی وہ مجھے معلوم ہے۔ لیکن "کوڈک" اور "زیز" وغیرہ کیمروں کی فہرستیں دیکھ دیکھ کر اُسے طرح طرح کے کیمروں اور لینزوں کے نام ضرور یاد ہو گئے تھے۔ اور اُس کی فوٹوگرافی کی لیاقت بس اسی جگہ تک محدود تھی۔

"آپ کے کیمرے میں کونسا لینز ہے" خانم نے فوٹوگرافر سے شان سے پوچھا۔ فوٹوگرافر نے کسی ایسے جرمن لینز کا نام لیا جو خانم نے خواب میں بھی نہ سنا تھا۔ خانم کے چہرہ پر ناواقفیت کی ایک ہلکی سی جھلک دوڑ گئی۔ لیکن مزا یہ کہ جواب میں "اچھا" کہہ کر اُس نے لینز اٹھا لیا۔ اور اُس پر لکھے ہوئے نام کو پڑھنے لگی لیکن وہ بے تکا کمبخت جرمن نام کوئی پچیس تیس لفظوں کا تھا جس کا تلفظ ہم ہندوستانیوں کے لئے ناممکن ہے۔ لہٰذا نام پڑھنے کی بیکار کوشش کر کے خانم نے پوچھا "کتنے کا کیمرہ ہے آپ کا" "نیا منگایا ہے" کچھ دھمکی کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فوٹوگرافر نے کہا "صرف لینز چودہ سو روپے کا ہے"

خانم نے لینز آہستہ سے فوٹوگرافر کے ہاتھ میں دے دیا۔ فوٹوگرافر بولا "آپ کہیں گی کہ لینز پر اتنے دام کیوں خرچ کئے تو یہ اس لئے کہ یہ لینز بال کی کھال کھینچ لیتا ہے" بال کی کھال کہتے وقت فوٹوگرافر صاحب نے اس ڈھنگ سے ہاتھ چلایا گویا وہ خود ہی بال کی کھال ~~کہتے وقت فوٹوگرافر صاحب نے اس~~ ~~ڈھنگ سے ہاتھ چلایا گویا وہ خود ہی بال کی کھال~~ اُدھیڑ رہے تھے۔

لینز کیمرے پر چڑھا دیا گیا۔ تب خانم نے پلیٹوں پر دھیان دیا اور کہا "ریپڈ (Rapid) ہیں یا نہ؟" یہ کہکر اس نے پلیٹوں کے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ایکسٹرا ریپڈ (EXTRARAPID)" فوٹوگرافر نے کہا۔

خانم کو معلوم ہو گیا کہ یہ فوٹوگرافر رعب میں آنے والا نہیں، ورنہ اس سے پہلے جو آیا تھا اُسے تو اس نے نہ معلوم کتنا سکھا کر چھوڑا تھا۔ کیمرہ جگہ پر لگا دیا گیا۔ خانم نے مجھے کپڑے پہننے کا حکم دیا۔

میں کوٹ پہن کر ٹائی لگا رہا تھا کہ خانم کمرے میں آئی "آپ کو تو مجھ سے ضد ہے۔" یہ کہہ کر ہاتھ سے ٹائی گھسیٹ کر اُس نے وہ پھینکی "ہیں۔ ہیں" میں نے منہ پھاڑا۔

"کوئی دوسری ٹائی ہی نہیں جُڑتی۔ بس یہ ہی ایک رہ گئی ہے۔ صبح یہی شام یہی"

ٹرنک کھول کر ڈبے سے ایک نئی سی ٹائی نکالی اور اُسے ہاتھ میں لے کر اس نے کہا "اور کوٹ کوٹ"!

میں نے کوٹ کی طرف دیکھا "کیوں کیا ہوا"

جیسے جانتے ہی نہیں کہ فوٹو کے لئے کالا کوٹ ہونا چاہئے یہ کہکر وہ جاڑوں کا کتھئی بلیزر نکال لائی۔

مار ڈالوگی ---- گرمی میں" میں نے بلیزر (BLAZAR) دیکھکر کہا "خدا کے لئے ...."

آپ کو تو فضول باتیں آتی ہیں، ایک لمحہ کے لئے تو پہنتا ہے۔ یہ کہہ کر برش کیا جانے لگا۔

"آئیے صاحب" فوٹوگرافر صاحب نے آواز دی۔

میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور باہر کو چلا۔ خانم نے زور سے باہیں پکڑ کر کہا۔ آئینے میں دیکھیو تو ذرا۔ ذرا سر کو ...... سر کو ......"

میں نے شیشے میں دیکھا، بال بالکل ٹھیک بنے تھے، مگر ویسے نہیں جیسے خانم کو پسند تھے۔

ویسے بنانا ہی مشکل تھا۔ میں نے کہا "خدا کے واسطے مجھ سے ویسے بال نہ بنواؤ۔ - ۔ عورتوں جیسے"

آپ بھی کیا فضول باتیں کرتے ہیں ...... نہیں مانیں گے آپ۔ ادھر

--- ادھر لاؤ ...... میں نہ مانوں گی۔

پکڑ لیا خانم نے آخر کو مجھے باتوں کا یہ نامعقول طرز سخت ناپسند تھا۔

--- مگر"

کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور میری پیاری نائن نے پیچھے کھڑے ہو کر ٹھوڑی پکڑ کر میرا سر اپنی گود میں لے کر بال بنانا شروع کئے۔ بڑی کامیابی کے ساتھ برش سے نوک پلک ٹھیک کر کے اطمینان سے دیکھا۔ اب مجھے جانے کی اجازت تھی۔ میں جا کر کیمرے کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ فوٹو گرافر نے کیمرے کا "لیول" ٹھیک کر کے کالے کپڑے میں سر ڈال کر نشست لگائی اور تھوڑی دیر بعد سر نکالا۔

"ٹھیک ہے نہ" خانم نے پوچھا اور اپنا سر کالے کپڑے میں ڈال کر دیکھا کیمرے کے طاقتور لینز نے کچھ اور ہی کہانی کہی۔ یکایک خانم نے سر نکال کر فوٹو گرافر سے کہا، بالکل غلط ہے"

"کیسے؟ صاحب کہئے!"

"تم خود دیکھو"

فوٹو گرافر نے پھر اپنا سر کپڑے میں ڈالا اور خانم نے کہا ..... "دیکھئے غور سے ...... دو طرفہ چہرہ کو ..... بائیں طرف ......"

"کیا ہے؟" فوٹو گرافر نے اسی طرح سر ڈالے ہوئے پوچھا "کس قدر خراب تصویر آئے گی۔ اور آپ کہتے ہیں کیا ہے" پوز" (POSE) ہی غلط ہے" خانم بولی۔

"تو صاحب گالوں کا گڑھا تو آئے گا ہی" سر نکال کر فوٹو گرافر نے کہا۔ ادھر میں نے اپنے آپ بے اختیارانہ طور سے ذرا گال پھلائے۔ جواب میں خانم نے گھنا کر فوٹو گرافر کو دیکھا اور کہا .. "کیسے آپ کہتے ہیں" پھر میری طرف گھوم کر بولی "آپ سیدھ میں اس بکری کی طرف دیکھئے" سامنے ذرا بائیں ہاتھ کو ایک بکری بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔

اب خانم نے پھر کپڑے میں سر ڈال کر دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا "ادھر کو ..... ادھر ..... ادھر ... بس ... بس ...... اونھوں ...... اتنا نہیں ... بس ... ایک ذرا اس طرف ... ہاں سر اونچا ..... ارے اتنا نہیں ... بس بس ذرا آگے" یہ کہہ کر خانم نے سر نکالا اور کہا "بس اب آپ ہلئے گا نہیں۔ آپ تو اس بکری پر نظر جمائے رہئے"

اب پھر فوٹو گرافر صاحب کی باری آئی۔ انھوں نے سر ڈالا اور بولے "یہ پوز تو اس سے بھی زیادہ غلط ہے" یہ کہہ کر انھوں نے سر نکال لیا اور کہا "بالوں کو آپ نے نہیں دیکھا" بے طرح ہائی لائٹ (Highlight) پڑ رہی ہے پھر ہونٹ نکلے معلوم ہوتے ہیں .... اور ٹھوڑی کی ہڈی .... آگے کو ..... پھر کنپٹی"

ادھر کچھ میرا بھی حال سنئے، گرمی کے مارے برا حال تھا۔ اس پر سے گردن کی رگ رگ میں درد۔ کیونکہ ساری رگیں گردن کو ایک خاص طریقے پر سادھنے کے لئے مجبوراً تعینات کی گئی تھیں ۔ جیسے خیمے کھڑا کرنے کے لئے ڈوریاں باقاعدہ کھنچی رہتی ہیں۔ ہونٹ میرے موٹے ہیں ان کو خود ہی دانتوں سے پکڑے نہیں بلکہ یہ سمجھو کر پے بیٹھا تھا یا چھوں کی پتلی نارک رگیں۔ اس کھینچ تان میں شل ہو چکی تھیں۔ پچکے ہوئے گالوں کو تھوڑا پھلانے کی کوشش میں منہ میں تھوڑا سا سانس روک کے بیٹھا تھا اور یہ خیال تھا کہ گالوں میں ہوا کی مقدار کم زیادہ ہونے سے ایک طرف کا گال دوسری طرف سے زیادہ نہ پھول جاوے۔ آپ خود تجربہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ یہ تمام آفت تو تھی ہی اور پھر سامنے بکری۔ وہ بھلا نچلی کس واسطے بیٹھتی کھڑی ہو گئی، اور گھوم کر دوسری جگہ جا بیٹھی۔ میں نے اس کی جگہ کا اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں بیٹھی ہے۔ اور سوچ لیا تھا کہ اسی جگہ نظر رکھوں گا۔ لیکن فی الحال آنکھیں بکری پر تھیں۔ بول سکتا نہ تھا۔ کیونکہ ہونٹ مسوڑوں سے چپکائے بیٹھا تھا۔

خانم نے پھر کالے کپڑے کے اندر سر ڈالا اور تھوڑا سا ... ادھر ادھر ... اوپر ... نیچے کرنے کے بعد فوٹو گرافر سے کہا "اب تصویر لے لو" فوٹو گرافر نے بھی جھگڑا ختم کرنا چاہا۔ ادھر اس نے "ریڈی" کہا، ادھر میں نے گالوں میں اور ہوا بھری ..... ون ... ٹو ... تھری۔ تصویر کھنچ گئی۔

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ خانم نے فوٹو گرافر سے تصویر پرچھا ہونے کے بارے میں بات چیت کی، اور اسے حکم دیا گیا کہ جلد سے جلد پلیٹ دھو کر دکھائے۔ اس کے بعد پر لطف ۔

آپ نے اسکول میں جمع تفریق، ضرب خطوط وحدانی کی نشانیاں پڑھی ہوں گی۔ تفریق کی نشانی ـــــ اور خطوط وحدانی کی نشانی ( ) ہے۔ پلیٹ دھل کر آیا تو خانم نے کہا "یہ کیا ہے" ناک اور ٹھوڑی کے بیچ میں خطوط وحدانی کے اندر تفریق کا نشان بھی موجود تھا (ــ)!

"منہ ہے" فوٹوگرافر نے کہا اور واقعی تھا بھی منہ ہی۔ مونچھ پا منہ ادنا۔

رے صاحب یہ کیا؟ . . . . دونوں طرف" خانم نے خطوط وحدانی کو دکھا کر پوچھا ـــــ "یہ کیا ہے" فوٹوگرافر نے اسے معاف نہ کیا بنا خیال کیا، اور جواب میں میرے چہرے کو دیکھا۔ میں نے جھنجھلا کے ایک خاص ڈھنگ سے منہ سکوڑتے ہوئے ان خطوط وحدانیوں کو اڑانے کی کوشش کرنی چاہی۔ یعنی ہونٹ سمیٹ کر ذرا آگے کر لئے۔

فوٹوگرافر نے میری طرف انگلی اٹھا کر کہا "یہ جھریاں ہیں ہانچھوں کے ادھر اُدھر دیکھئے۔

"اتنی نمایاں تو نہیں ہیں" خانم نے کہا۔

میرا لینز تو بال سے بھی باریک نشان کو نہیں چھوڑتا۔ پھر یہ کیا خطا ہے۔ لینز کا تو کام ہی یہ ہے کہ اصل کی نقل اُتار دے۔

پرنٹ لیجئے ـــــ پروف لائیے ـــــ رکھیں۔

~~~~~~~~~~~~~~

پروف آیا میں بے چین سا ہو گیا، کیونکہ گال پھُلائے تھے۔ یہ صاف معلوم ہوتا تھا۔ "یہ کیا" کہہ کر خانم نے ایک قیامت خیز نگاہ میرے اوپر ڈالی۔ اسی حرکت کی وجہ سے یہ جھُریاں اور واضح ہو گئی ہیں۔

میں کیا جواب دیتا۔ کچھ ہکلا کر مجرم کی طرح اس قیامت خیز نگاہ کو دیکھ کر دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا۔

خانم نے غصے میں بھر کر پلیٹ اُٹھا کر پھینک دیا۔ پلیٹ چھن سے فرش پہ گر کر کھیل کھیل ہو گیا۔

پلیٹ پھینک کر خانم نے فوٹوگرافر سے کہا آپ نہ تو پوز لینا جانتے ہیں نہ یہ کہ کسی خاص جگہ کا کیسا فوکس لیں۔ آپ کو یہ بھی پتہ نہیں کہ روشنی کا رُخ کدھر ہے۔

اور پھر پلیٹ دھونے میں تو آپ کمال رکھتے ہیں۔ بالکل سیاہ جھٹ تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ بس ہیرہ قیمتی ہو۔ یہ نہ معلوم کیا سوچ رکھا ہے سب نے۔

فوٹوگرافر اس کا کیا جواب دیتا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے آنکھ مار دی کہ چپ رہے۔ وہ کائیاں آدمی سمجھ گیا، اور بولا۔ آپ خفا کیوں ہوتی ہیں، میں دوسری تیار کرتا ہوں ـــــ ابھی

"آپ سے نہیں بنے گی" خانم نے کہا۔

ابھی لیجئے ابھی ذرا دیکھئے میری کاریگری۔ خانم کی کمزوری کو اس نے میرے آنکھ جھپکاتے ہی تاڑ لیا تھا۔

~~~~~~~~~~~~~~

پھر مجھے سنگھار کرنے پڑے۔ بن ٹھن کر پھر پیر مورتی کی طرح کرسی پر جا ڈٹا۔ پھر وہی منزل طے کی گئی۔ اب کی دفعہ گال میں نے ایک دم نہیں پھلائے۔ کیونکہ فوٹوگرافر نے دوسری ہی ترکیب نکالی تھی۔ وہ یہ کہ چھوٹے چھوٹے دو پان کھلا کر اس نے کہا کہ انھیں چبا کر دو برابر کے حصوں میں ادھر اُدھر بانٹ لو۔ جوں توں کر کے تصویر لی گئی۔

شام کو ہی فوٹوگرافر نے پلیٹ پیش کی۔ خانم نے فوراً ناپسند کر دی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ ناپسندی کا سبب بتائے فوٹوگرافر نے یہ کہہ کر اس کی زبان بند کر دی "آپ ابھی کچھ نہ کہیں۔ اگر تصویر ناپسند ہو تو جو چور کی سزا وہ میری۔"

پروف لیا گیا۔ بیحد خراب آیا۔ یعنی دوسرے الفاظ میں بالکل اصل کے موافق تھا۔ کیمرے کے طاقتور لینز نے گالوں کی مٹی پلید کر دی تھی۔ پان دبا ہونے سے وہ اُٹھ آئے تھے۔ لیکن ان کے اردگرد آگرے کے قلعے جیسی کھائی تھی۔ منہ کے دونوں طرف خطوط وحدانی جیسے نشان بدستور تھے لیکن اتنے زیادہ ظاہر نہیں تھے جتنے ہوا سے گال پھلانے والی تصویر میں۔ پھر چہرہ کی دوسری جگہ کی تمام جھُریاں جو ایک جم رکھے چہرے کی اپنی خاص نشانیاں ہیں اس صفائی سے اپنی اپنی جگہ موجود تھیں کہ یہ ہی جی چاہتا تھا کہ سب کو ایک دم مٹا کے رکھ دے۔ پھر پروف کے ادھورے پن سے چہرہ پر دھوپ چھاؤں سی جھلکی ہوئی تھی۔ اپنی آنکھوں پر خوش ناپسندی کی عینک چڑھی

سے ہنسے چہرہ کی یہ خصوصیتیں مجھے آئینے میں نظر نہ آتی تھیں۔ لیکن ایک طاقتور لینز اور عمدہ کیمرے نے سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا تھا۔

فوٹوگرافر اس بڑھیا تصویر کو "ادھوری" ہے صرف خاکہ ہے کہہ کر واپس لے گیا "ری ٹچ" کرنے کے لئے۔ در حقیقت تو یہ ہے کہ تصویر نہ صرف میری سب سے سچی تصویر تھی بالکل ہو بہو اصل کے مطابق تھی

"ارے ٹیلانا تو ذرا" خانم نے بوکھلا کر فوٹوگرافر کو بلوایا، وہ آیا تو خانم نے انگلی کے اشارے سے پردے کو دکھا کر بتایا "یہ نہ آنا چاہئے"۔ یعنی دونوں خطوط وحدانی۔

فوٹوگرافر نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ خاطر جمع رکھئے ان کا کہیں پتہ بھی نہ چلے گا"

پانچ دن بعد کی بات ہے میں کالج سے واپس آیا ــــ دیکھا کہ سارا کمرہ آئینے کی طرح چمک رہا ہے۔ خانم کھڑی ہوئی دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو دوربین بنائے ہوئے دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میرے پیروں کی آہٹ سن کر اس نے میری طرف دیکھا۔ میرا ایک قدم برآمدے میں تھا، دوسرا کمرے میں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر میں نے دیوار کی طرف دیکھا، سامنے دیوار پر میری تصویر مزین تھی۔ واللہ کیا تصویر تھی۔ میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس دفعہ تو فوٹوگرافر نے کمال کر دیا۔ میں نے کہا "کیا لاجواب تصویر کھنچی ہے"! تصویر کی مالکن یعنی خانم نے کہا۔

"یہ کس کی تصویر ہے" کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بھاوج نے پوچھا، پھر ذرا زور دے کر ــــ "یہ کس کی تصویر ہے"

خانم نے بھاوج کی طرف دیکھا، بھاوج نے خانم، تصویر اور میری طرف دیکھ کر خانم سے پھر سوال کیا "کہاں سے آئی۔ یہ کس کی تصویر ہے"؟

خانم کے اندرونی خیالات کا مجھے پتہ نہیں سوائے اس کے کہ اس کے خوبصورت کھلے ہوئے چہرے پر غصے کا سا غبار چھا گیا۔ ہاں مجھ سے پوچھئے کہ میرا کیا حال ہوا۔ حالانکہ تصویر کسی طرح میرا فوٹو کہلانے کی حقدار نہ تھی اور نہ میں نے اسے بنوایا ہی تھا۔ پھر بھی اس کی پیدائش کا ذمہ دار ہونے کی وجہ سے میں کچھ عجیب شرمندگی میں تھا۔

بھاوج نے میری خاموشی کے کچھ اور معنی لئے اور غور سے تصویر اور میرے چہرے کا مقابلہ کر کے مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے کہا ــــ آپ کی ہے؟ ...... سچ بتائیے ...... آپ کی ہے نہ؟"

"اوف او!" خانم نے جل کر کہا ــــ "اوف او کیسی بنتی ہیں آپ جیسے ......"

اتنے میں دروازے کی چوکھٹ پر کھٹ سے آواز ہوئی اور بھائی صاحب نے اپنی بھاری آواز میں کہا ...... "کیا ہے؟ ...... ہیں! ...... یہ کس کی تصویر ہے؟"

"خوب یہ آپ کی تصویر ہے" بھاوج نے کہا

"یہ کس گدھے نے تصویر کھینچی ہے ...... بھائی صاحب نے کہا ...... لاحول ولا قوۃ"

خانم کا دل بیگن کا بھرتا ہو رہا تھا، کیا میں جواب دیتا اور کیا وہ بھاوج کے چہرے پر بے انتہا شرارت بھری مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ انھوں نے جلدی جلدی عینک صاف کی اور داہنے ہاتھ میں عینک پکڑ کر پہلے مجھے نہایت غور سے دیکھا، پھر عینک لگا کر تصویر کو گھورنا شروع کیا۔ ان کا چہرہ اور بھی کھل اٹھا۔ ان کی شرارت بھری مسکراہٹ اور مسکراہٹ بھری شرارت زیادہ سے اور بھی زیادہ ظاہر ہوتی گئی۔ خانم ان کے چہرے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی، جس لمحے بھاوج کا چہرہ شوخی سے کھلتا جا رہا تھا۔ اسی وقت خانم کے چہرہ پر غصے اور جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ آخر کار آنکھوں ہی آنکھوں میں جنگ کا اعلان ہو گیا۔

بھاوج کمرے سے قہقہہ لگاتی ہوئی نکلیں۔ جب ذرا غصہ کم ہوا تو خانم کو اس سازش کا ذرا سا انکشاف ہوا جس کی ابتدا بھاوج نے کی تھی۔ در اصل بھاوج اور بھائی دونوں لڑنے کی نیت سے صلاح کر کے آئے تھے۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گلاّ بوبُوا ہاتھ میں طشتری لئے آ پہونچی۔

"یہ تصویر کس کی ہے"؟ انھوں نے غور سے دیکھ کر رکابی سے تصو

کی طرف اشارہ کرکے مسکراتے ہوئے پوچھا۔۔۔کسی فرنگن کی ہے؟ میم کی؟"

خانم اس زور سے پھٹ پڑی کہ خدا کی پناہ۔ "ایسی باتیں وہیں (بھاوج) جا کر کیا کرو۔ خبردار جو مجھ سے ایسی باتیں کیں"

گلابو بوا بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اتنے میں خربوزے والی آئی۔ وہ خربوزے بیچنے آئی تھی۔ میرے خیال سے بھاوج کے کمرے میں سے ہو کر آئی تھی، تبھی تو اس کو انھوں نے سکھا کر بھیجا تھا۔ اس نے آتے ہی خربوزوں کی بات چیت کرنے کے بجائے ذرا خانم کی طرف جھک کر پوچھا "یہ تصویر کس کی ہے"

"نکل یہاں سے" خانم نے آگ بگولا ہو کر کہا۔۔۔۔ "نکل یہاں سے چڑیل نکل۔۔ ہیں۔۔۔۔۔ نکل۔۔۔۔ نکل۔۔۔ ۔۔۔"

بھاوج نے مشین کی ایک سوئی مانگی ہے

مڑ کر خانم نے دیکھا۔ پڑوس کے بنگلے میں خانم کی منہ بولی بہن رہتی تھی۔ اُنھوں نے ہی اپنے نوکر کو ایک سوئی لینے کے لئے بھیجا تھا۔

اچھا دیتی ہوں خانم نے کہا۔

"یہ تصویر کس کی ہے" جیسے اُس نے جواب میں پوچھا۔

خانم نے اس زور سے ایک چانٹا اُس کے گال پر رسید کیا کہ جب تک خانم لکڑی تلاش کرے۔ کرے تب تک وہ روتا ہوا بھاگ گیا۔

"ارے سوئی تو لیتا جا" میں نے پکار کر کہا، مگر وہ آج چوکڑی بھر رہا تھا۔

ا۔۔ خانم بڑبڑا ہی رہی تھی کہ بھاوج کے یہاں سے آیا آئی۔ وہ بھیجی گئی تھیں خانم کی طبیعت کا حال پوچھنے۔ لیکن دیکھئے مکار کی باتیں پوچھتی ہیں۔ "یہ کس کی تصویر کس کی ہے"

خانم نے ایک ڈانٹ بتائی اور ڈپٹ کر نکال دیا۔

"میں تو طبیعت کا حال پوچھنے آئی تھی"

"چولھے میں جائے طبیعت کا حال پوچھنے آئی تھی۔"

آیا کو نکال کر اب خانم کی عجیب حالت تھی۔ آیا جی گئی ہی تھیں کہ مالی کا لڑکا انعام مانگنے آیا۔ اُس کی بھی خبر لی گئی۔ اتنے میں دھوبن آئی۔ اُس کی بھی وہی درگت ہوئی، جو خربوزے والی کی ہوئی تھی۔ اُس کے بعد، ماں آئیں۔ پھر نانی آئیں اور اُنھوں نے بھی آنکھیں مچکا کر پوچھا۔ "یہ کس کی تصویر ہے"

دن بھر یہی ہڑبونگ میں کٹا۔ شام کو جو میں واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک موٹی سی لکڑی رکھی ہے۔ "صبر کا پیالہ بھر چکا ہے، اب اگر کسی نے پوچھا کہ یہ تصویر کس کی ہے تو اس کی خیر نہیں" خانم نے لکڑی دکھا کر کہا۔

اتفاق دیکھئے کہ بھاوج کا کتا ٹومی کمرے میں آیا اور لگا دم ہلا کر دیکھنے تصویر کو۔ اُس نے دم ہلانی بند کر دی۔ غور سے تصویر کی طرف دیکھ کر ساکت سا ہو گیا، جیسے سناٹے میں آ گیا ہو۔ دیکھتے دیکھتے اُس نے تصویر سے آنکھیں ہٹا کر خانم کی طرف استفہامیہ نگاہ ڈالی ہی تھی کہ وہی لکڑی اُس کی پیٹھ پر اس زور سے پڑی کہ دوہرا ہو گیا اور چلاتا ہوا بے تحاشا بھاگا۔۔۔۔۔۔ خانم اس کے پیچھے پیچھے۔۔۔۔۔۔"

دروازے کے باہر جھولے دار کرسی میں کتا اُلجھا۔ اِدھر سے خانم اور اُدھر سے اپنے پیارے ٹامی کی دردبھری چلاہٹ اور فریاد سن کر بھاوج لپکیں۔ کتا تو کوُد کر نکل گیا۔ مگر جٹھانی دیورانی میں ایسی ٹکر ہوئی کہ دونوں گریں۔

بھاوج کی عینک ٹوٹ گئی جو ابھی ابھی اُنھوں نے مجھ سے منگوائی تھی اور جس کے دام بھی ابھی تک نہیں دئے گئے تھے۔

"یہ لیجئے اپنی عینک" بھاوج نے ٹوٹی ہوئی عینک میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ گویا اب اُس کے دام نہ دیں گی۔ اور پھر اُس کے بعد۔۔۔۔

آج تک خانم اور بھاوج میں بات چیت نہیں ہوئی اور ہو کیسے کیونکہ خانم نے قسم کھا رکھی ہے کہ میں اِس تصویر کو نہ ہٹاؤں گی۔ اور بھاوج نے قسم کھا رکھی ہے کہ میں لوگوں کو سکھانے پڑھانے سے باز نہ آؤں گی۔ چنانچہ جو آتا ہے وہ یہ ہی پوچھتا ہے کہ "یہ تصویر کس کی ہے"۔ اور بھاوج کو دیکھئے کہ جھوٹی قسمیں کھاتی ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں سکھایا۔

کیا آپ کوئی ترکیب بتا سکتے ہیں کہ بھاوج لوگوں کو سکھانا چھوڑ دیں اور لوگ یہ نامعقول سوال کرنا چھوڑ دیں۔

نگاہِ اولیں

گھاٹ سے آتی ہوئی ایک ادا دیکھی ہے — خضر حیران ہیں میں نے وہ بقا دیکھی ہے
وہ عروسانہ پھبن اس پہ تھی گویا میں نے — صبح شاداب میں رنگین فضا دیکھی ہے
تھی جوانی سی جوانی، کہ نظر نے میری — شفقِ سرخ میں اک موجِ ضیا دیکھی ہے
اس پہ فردوس کے باغوں کی بہاریں قرباں — اتنی شاداب جوانی کی حیا دیکھی ہے
اس کی آنکھوں کا تو کیا جنبشِ مژگاں ہی میں — میں نے تھرّائی سی رنگین بلا دیکھی ہے
یا وہ گزری تھی مرے پاس سے شرماتی ہوئی — لڑکھڑاتی ہوئی یا میں نے صبا دیکھی ہے
مسکراتی ہوئی اک چیز مرے دل کے قریب — میں نے دیکھی ہے مگر کیا کہوں کیا دیکھی ہے
اس کی جانب سے محبّت کی نظر آئی تھی — حسن کی پہلی یہ دانستہ خطا دیکھی ہے

میں اسی دن سے ہوں اس کا کہ رموزی میں نے
حسن کے پاس ہی توفیقِ وفا دیکھی ہے

(ملا رموزی)



مانع وحشت خرامی هائے لیلیٰ کون هے
خانهٔ مجنون صحرا گرد بے دروازه تها

